چانگوسر

یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ جاگیروں اور
نجی جائیدادوں کے موجودہ حقوق کس بنیاد پر جائز
ہیں۔ سب سے پہلی دستاویز تو تلوار کی نوک سے
تحریر کی گئی جسے جرنیلوں اور سپاہیوں نے اپنے ہاتھ
سے لکھا اور قیمت کے عوض تلوار، خنجر اور نیزے
کی ضربیں لگا کے انسانی خون کی مہریں ثبت کی
گئیں۔ وہ حضرات جو یہ فرماتے ہیں کہ وقت ہی
ناجائز کو جائز بنا دیتا ہے ازراہ کرم اس سوال کا تسلی
بخش جواب دیں کہ کسی گناہ کو نیکی بننے کے لئے
کتنا وقت درکار ہوتا ہے اور کس سالانہ شرح سے
ایک غیر قانونی اور ناجائز سودا قانونی اور جائز بن
جاتا ہے؟

کارل مارکس

RAKTAB
PUBLICATIONS
109' Bombay Hotel,
. I. Chundrigar Road Karachi.

۱

ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ خزاں رسیدہ پتے درختوں سے ٹوٹ کر گرے اور دور دور تک بکھر گئے۔ یہ ۱۹۵۴ء کے موسم خزاں کی ایک ویران رات تھی۔ لاری اسٹینڈ سنسان تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ دونوں اندھیرے میں دم بخود کھڑے تھے۔ ڈرائیور ہوٹل کے سامنے لکڑی کی بنچ پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ قریب ہی ایک آوارہ کتا ہڈی چبا رہا تھا۔ ہڈی اس کے دانتوں تلے رک رک کر ایک ہی انداز سے بجتی اور اس کی آواز سناٹے میں تحلیل ہو جاتی۔

دونوں سایوں کی مانند تاریکی میں دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ ایک کا قد کسی قدر نکلتا ہوا تھا۔ چھریرا بدن تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور اندر دبی ہوئی تھیں۔ رنگ گندمی تھا۔ یہ رحیم داد تھا۔ دوسرا لال دین تھا۔ مگر سب اسے لالی کہتے تھے۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا مضبوط جوان تھا۔ دونوں کی حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ سروں کے بال خشک اور بے ترتیب تھے۔ لالی بنچ پر لیٹے ہوئے آدمی کی چادر اتار لینا چاہتا تھا۔ اس نے چادر کا کونا پکڑ کر آہستہ سے کھینچا۔ وہ چونک پڑا۔ کروٹ بدلی اور نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔

"اوئے تنگ نہ کر۔"

اب وہ خاموش لیٹا تھا۔ رحیم داد اور لالی کو مطلق اندازہ نہ تھا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے دونوں سراسیمگی کے عالم میں کچھ دیر دم سادھے کھڑے رہے۔ جب نہ کوئی آہٹ ہوئی نہ آواز تو وہ دبے دبے قدموں چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

رحیم داد نے چلتے چلتے لالی سے پوچھا۔ "رات کتنی رہتی ہے؟" اس کے لہجے سے تھکن اور بے

زاری جھلک رہی تھی۔

"ابھی بہت رہتی ہے۔" لالی نے گردن اٹھا کر آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھا۔ چند لمحے خاموش رہا' پھر قدموں کی رفتار تیز کرتے ہوئے اس نے رحیم داد کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "اڑیل کھوتی نہ بن۔ مرداں والی چال چل۔"

"تو نے فیر تھانیداری شروع کر دی۔" رحیم داد نے احتجاج کیا۔

"ایسا کر یہیں لیٹ جا۔" لالی نے ایک بار پھر مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ "میں بیٹھ کر تیرے پاؤں دباتا ہوں۔ یہی چاہتا ہے نا۔"

رحیم داد نے زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر جھنجلا کر لالی کو دیکھا اور چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

آدھی رات تک دونوں منٹگمری جیل میں قیدی تھے۔ رحیم داد کو بلوے اور اقدام قتل کے جرم میں تین سال قید بامشقت ہوئی تھی۔ جیل ہی میں اس کی ملاقات لالی سے ہوئی۔ وہ پہلے سے وہاں موجود تھا اور ڈیڑھ سال کی سزا بھگت رہا تھا۔ ایک روز لالی نے رحیم داد کو اعتماد میں لیا اور جیل سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ رحیم داد کچا تھا۔ پہلے ذرا جھجکا اور انکار میں گردن ہلانے لگا۔ مگر جب لالی نے حوصلہ بڑھایا اور قید کی گھٹن سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے کی تمنا خوف و ہراس پر غالب آگئی تو وہ لالی کے ساتھ فرار ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ جیل کے گھڑیال نے رات کے بارہ بجائے۔ پہرہ بدلا۔ نئے پہرے دار بیرکوں اور چکیوں کے تالے بجا' بجا کر "کانٹا' تالا سب ٹھیک ہے۔" کی صدائیں بلند کر چکے تو لالی نے اپنا کام دکھایا۔ وہ رحیم داد کے ہم راہ نہایت صفائی سے جیل کی اونچی اونچی فصیلوں سے باہر نکلا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

جیل سے بھاگے ہوئے دو گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ صبح گنتی ہونے سے پہلے کسی کو ان کے فرار کی خبر نہ ہوگی۔ ان کے پاس چند گھنٹے اور تھے۔ اس عرصے میں وہ جلد سے جلد بہت دور نکل جانا چاہتے تھے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ کچھ دیر ایک ویرانے میں بھٹکتے رہے' پھر عارف والا روڈ پر آگئے اور چلتے چلتے لاری اسٹینڈ پر پہنچ گئے۔

لاری اسٹینڈ اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ جیل اس سے بھی پیچھے تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ستارے اجلے اجلے کنول بن گئے تھے۔ سڑک ویران تھی۔ دونوں جانب درخت تھے۔ پت جھڑ کے دن تھے۔ ہوا میں تیزی کے ساتھ ہلکی ہلکی خنکی بھی تھی۔ سڑک پر بکھرے ہوئے خشک پتے تیز جھونکوں سے خاموشی میں کھڑکھڑا رہے تھے۔

لالی اور رحیم داد ننگے پیر تھے۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل چل رہے تھے اور تھکن کے باوجود تیز تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں اس علاقے کے بارے میں کوئی اندازہ نہ تھا۔ نہ راستوں کا پتہ تھا اور نہ کوئی ایسا ٹھکانا جانتے تھے' جہاں وہ روپوش ہو سکتے۔ وہ منزل سے بے خبر آگے اور آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ رحیم داد کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"لالی' یہ تو بتا ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"یہ تو مجھے بھی پتہ نہیں۔" لالی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"مخول نہ کر۔ ٹھیک' ٹھیک گل کر۔ اس طرح ہم نے کب تک چلتے رہنا ہے۔"

لالی نے رحیم داد کا بازو تھام کر انگلیوں سے گوشت ٹٹولا۔ "دیکھنے میں تو تگڑا لگتا ہے' پر باتیں زنانیوں کی سی کرتا ہے۔ رحیمے! حوصلے سے کام لے۔ ایسے تو اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دے گا۔"

رحیم داد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عقب سے ہارن کی تیز آواز ابھری۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ سڑک کے موڑ سے روشنی ابھری اور خزاں رسیدہ درختوں کی برہنہ شاخوں سے چھن چھن کر ہر طرف بکھرنے لگی۔ وہ جھٹ سڑک سے نیچے اترے اور ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گئے۔ رحیم داد زیادہ سہما ہوا تھا۔ وہ گہری گہری سانس بھر رہا تھا۔ لالی بھی خوف زدہ تھا۔ مگر چوکس نظر آتا تھا۔ روشنی قریب آتی گئی۔ سڑک پر پہیوں کے تیزی سے دوڑنے کی آواز بڑھتی گئی۔

ذرا دیر بعد ایک جیپ عین ان کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ جیپ میں چار مسلح رینجرز سوار تھے۔ ایک ڈرائیور کے برابر بیٹھا تھا۔ تین پچھلی نشست پر تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں دبی تھیں۔ جیپ کے رکتے ہی اگلی نشست سے ایک شخص نیچے اترا۔ وضع قطع سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا۔ اس کے باہر آتے ہی ایک رینجر بھی جیپ سے اتر کر سڑک پر آگیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا نشیب میں اترا۔ جھاڑی کے قریب پہنچا اور اطمینان سے پیشاب کرنے لگا۔

رحیم داد اور لالی سانس روکے بیٹھے رہے۔ سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ ہوا کے تھپیڑوں سے چھینٹے' اڑ اڑ کر ان کے چہروں پر گرتے رہے۔ مگر ڈر کے مارے انھوں نے ذرا بھی جنبش نہ کی۔

سڑک پر ڈرائیور جھک جھک کر جیپ کے پہیے دیکھ رہا تھا۔ رحیم داد کو کھانسی کا ٹھسکا محسوس ہوا۔ اس کے حلق کے اندر خرخر ہونے لگی۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کا منہ دبوچ لیا۔ اسی اثناء میں ڈرائیور کی آواز ابھری۔

"پنکچر تو نہیں لگتا جی' پر ایک پہیے میں ہوا ضرور کم ہے۔"

جھاڑی کے قریب کھڑے ہوئے رینجر نے گردن موڑ کر اونچی آواز سے کہا۔ "سٹیشن تک تو پہنچ ہی جائے گی۔ وہیں پٹرول پمپ سے پہیئے میں ہوا بھروا لینا۔" وہ پتلون کے بٹن لگاتا ہوا مڑا اور جیپ کی جانب بڑھنے لگا۔

لالی اور رحیم داد جھاڑی کی اوٹ سے اسے دیکھتے رہے۔ ڈرائیور اور رینجر جیپ میں داخل ہوئے اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ رات کے سناٹے میں جیپ کا انجن زور زور سے گھڑگھڑایا۔ جیپ آگے بڑھی اور تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ ذرا دیر بعد نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ لالی گردن اٹھائے اسے دور تک دیکھتا رہا۔ پھر رحیم داد کی پیٹھ پر زور سے دھپ مار کر بے تکلفی سے بولا۔

"تو نے تو مروا ہی دیا تھا رہے۔"

"سوردا پتر بالکل منہ پر کھڑا موت رہا تھا۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر بے زاری سے کہا۔

"پر تیری کھانسی سے تو بیڑا ہی گرک ہو جاتا۔ وہ تو میں نے جھٹ تیرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ورنہ دونوں فیر جیل کی ہوا کھاتے۔" لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "اب یہیں بیٹھا رہے گا؟ جلدی کر۔ ابھی تو بہت چلنا ہے۔"

رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ لیکن خاموش رہا۔ لالی نے دریافت کیا۔ "کس سوچ میں پڑ گیا رہے۔"

"سوچ رہا ہوں۔ یہ پولسے ادھر کیسے آ گئے۔ کہیں انھیں ہمارے جیل سے فرار ہونے کا تو پتہ نہیں چل گیا؟"

"پولسے تو نہیں تھے۔ وردی سے تو رینجر لگتے تھے۔ پر ہمیں یہاں سے جلد ہی دور نکل جانا چاہئے۔"

"ہم نے جانا کہاں ہے؟" رحیم داد نے ایک بار پھر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ لالی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ "پروا نہ کر۔ بس ذرا کدم بڑھا کے چل۔"

دونوں جھاڑی سے نکل کر سڑک پر آ گئے اور خشک پتّوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

انھوں نے دو ڈھائی میل راستہ طے کیا ہوگا کہ بنجر اور اجاڑ علاقہ ختم ہو گیا۔ اب کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ سڑک پر چلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دونوں سڑک سے اتر کر کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والے کچے راستے پر چلنے لگے۔ یہ پیسا تھا۔ یہ اتنا کشادہ کچا راستہ تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔

پی ہے کے دونوں طرف گندم اور جو کی فصلیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی

چلتی۔ گندم اور جو کی بالیاں جھومنے لگتیں۔ کھیتوں میں دور تک لہریں ابھرتی اور ڈوبتی نظر آتیں۔ ہوا کی سرسراہٹ سے فصلوں میں سیٹیاں بجتیں۔ لالی اور رحیم داد ہر آواز پر چونک پڑتے۔ ان کے قدم ڈگمگا جاتے۔

یکایک ان آوازوں میں ایک نئی آواز ابھری۔ یہ گیدڑوں کا بے ہنگم شور تھا۔ وہ زور زور سے چیخ رہے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد گیدڑوں کا ایک غول کھیتوں سے نکل کر ان کے قریب سے گزرا۔ رحیم داد اور لالی ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔

دونوں کچھ دیر بعد آگے بڑھے۔ پیسا زیادہ طویل نہ تھا۔ مشکل سے دو ڈھائی فرلانگ کا راستہ تھا۔ دونوں بہت چوکنا تھے اور کسی انجانے خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ پیسا ختم ہو گیا۔ وہ کھیتوں سے نکل کر باہر آ گئے۔ سامنے رڑ تھا۔ اس کھلے میدان کے اس پار درختوں کا جھنڈ تھا۔ جھنڈ کے پیچھے مٹی کے بنے ہوئے کچے مکانات تھے۔ مکانوں کے بیچ سے گلی گزرتی تھی۔ گلی کے نکڑ پر دو منزلہ پختہ ماڑی تھی۔ اس کے پہلو میں پھوس کی چھت کا لمبا ڈھارا تھا۔ ڈھارے میں مویشی تھے، جن کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیاں رک رک کر سناٹے میں بج رہی تھیں۔

وہ آگے بڑھے۔ رڑ عبور کیا اور درختوں کے نیچے پہنچ کر اندھیرے میں کھڑے ہو گئے۔ ماڑی کی ایک کھڑکی سے روشنی ابھر کر اندھیرے میں بکھر رہی تھی۔ وہ دھندلی روشنی میں گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ دفعتاً قدموں کی آہٹ ابھری۔ ایک شخص نہایت مشتبہ حالت میں ان کے سامنے سے گزرا۔ اس کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا ڈھارے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ لالی اور رحیم داد آنکھیں پھاڑے اسے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ آگے بڑھا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد کچھ دیر تو حیرت سے گم صم رہا، پھر اس نے لالی کے کان کے قریب منہ لے جا کر دھیرے سے پوچھا۔

"لالی، یار یہ چکر کیا ہے؟"

"مویشی چور جان پڑتا ہے۔"

لال کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ کچھ دیر بعد وہ شخص مویشیوں کے ڈھارے سے باہر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رسی دبی تھی۔ وہ آگے آیا تو پیچھے سے ایک بھینس بھی نمودار ہوئی۔ وہ کسی اور سمت جانے کے بجائے سیدھا درختوں کے جھنڈ کی جانب بڑھا۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر لالی ایک درخت کے تنے کی آڑ میں دبک گیا اور ہاتھ پکڑ کر رحیم داد کو اپنی پشت پر کر لیا۔ وہ شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آ گیا۔ قریب اور قریب۔ جب وہ بالکل ان کے نزدیک پہنچ گیا تو لالی نے

جھپٹ کر بائیں ہاتھ سے اس کا منہ دبوچ لیا۔ اس شخص نے نہایت پھرتی سے دھوتی کے ڈب سے چاقو نکالا۔ لیکن لالی نے چاقو کھولنے کی مہلت نہ دی۔ جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیا۔ چاقو زمین پر گر پڑا۔

رحیم داد حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ لالی نے چاقو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈپٹ کر رحیم داد سے کہا۔ "کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔ اٹھا اور کھول لے اسے۔"

رحیم داد نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ جھک کر چاقو اٹھایا۔ اسے کھولا اور اس شخص کے قریب پہنچ گیا۔ اب رحیم داد کے ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کی نوک اس کی کمر سے لگی ہوئی تھی۔ لالی نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ سراسیمہ ہو کر دونوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ دونوں جیل کے قیدیوں کی وردی میں اس کے سامنے اس طرح کھڑے تھے کہ اندھیرے میں بھوتوں کی مانند ڈراؤنے نظر آتے تھے۔ وہ چند لمحے ہکا بکا رہنے کے بعد اٹکتے ہوئے بولا۔ "تسیں ہو کون؟" لالی نے تڑاق سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔

"سیدھی طرح گل کر۔ تیرا نام کیا ہے؟"

"ببھجا۔" اس نے آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

لالی نے قریب کھڑی بھینس کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "یہ ٹُو اٹھا کر لایا ہے نا؟ سچ سچ بتا۔"

"ہاں جی۔" اس نے دھیرے دھیرے اپنی گردن ہلائی۔

"یار ببھجے! تُو تو اونچا کاریگر لگتا ہے۔" لالی نے بے تکلفی سے کہا۔ "صاف اڑا لایا ٹُو۔ ذرا بھی کھٹکا نہ ہوا۔"

"بس جی اوپر والے کی مہربانی ہے۔" وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر فخریہ لہجے میں بولا۔ "جس ڈنگر پر ہاتھ پھیر دیا' سمجھ لے اپنا ہو گیا۔" وہ بھینس کی گردن اور پیٹھ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

لالی نے رحیم داد کے ہاتھ سے چاقو لے کر اپنے قبضے میں کیا۔ ببھجے سے پوچھا۔ "تیں نوں اب کتھے جانا ہے؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا لالی سے سوال کیا۔ "تسیں یہ کیوں جاننا چاہتا ہو؟"

لالی جل کر بولا۔ "تھانے میں تیرے خلاف پرچہ چاک کرانا ہے نا۔"

ببھجے نے دونوں کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ دھندلی دھندلی روشنی میں وہ شلوکے جیسے آدھی آستینوں کے کرتے اور گھٹنوں تک اونچے اونچے جانگیا نما پاجامے پہنے ہوئے تھے۔ کرتوں پر جیل کے نمبر نظر آ رہے تھے۔

"تسیں تھانے کیسے جا سکتے ہو؟" ببھجا انھیں مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا۔

"توں نے فیر ٹیڑھی گل بات کی۔" لالی نے کھلا چاقو اس کے سامنے کر دیا۔

ببھجا ڈر گیا۔ عاجزی سے بولا۔ "مجھے اب جانے دے۔ جاگ ہو گئی تو سارا کام گڑبڑ ہو جائے گا۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "غلطی شلطی ہو گئی تو معاف کر دے۔ میں نوں ابھی بہت دور جانا ہے۔"

"یہی تو پوچھ رہا ہوں تیں نوں کتھے جانا ہے؟" اس دفعہ لالی کا لہجہ نرم تھا۔

"میں نے جی پہلے اہر جانا ہے۔" ببھجے نے شمال کی جانب ہاتھ اٹھایا۔ "اہر ۵ میل ادھر جنگل میں ہے۔ تیں نوں تو پتہ ہی ہو گا' چوری کے ڈنگر اٹھانے کے بعد اہر ہی میں چھپا کے رکھے جاتے ہیں۔ اگے میں نوں بھی ایسا ہی کرنا ہے۔ ٹُو اہر میں لے جا کر رکھوں گا۔"

"ایہہ گل اے تو فیر ہاتھ ملا۔" لالی نے چہک کر کہا اور گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "جا' ایک ٹُو اور اڑا لا۔"

ببھجا انکار میں گردن ہلانے لگا۔ "نا جی نا' ایک ہی بہت ہے۔ میں دو مجیں اکیلے لے کر جا بھی تو نہیں سکتا۔ لما رستہ ہے۔ اگے نہر ہے۔"

"پروا نہ کر۔ ہم دونوں جو تیری مدد کو موجود ہیں۔ اہر تک تیرے ساتھ ہی چلیں گے۔" لالی نے اسے ہولے سے ٹھوکا دیا۔ "فٹافٹ جا' دیری نہ کر۔"

"ٹُو یہیں چھوڑ دوں؟"

"چھوڑ دے' چھوڑ دے' کہیں نہیں جائے گی۔" لالی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "ہم نے رسا گیری یا مویشی چوری نہیں کرنی۔ ہم ایسا گھٹیا دھندا نہیں کرتے۔ فکر نہ کر۔ واپسی پر ٹُو تجھے یہیں ملے گی۔"

ببھجا کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے ڈھارے کی سمت بڑھا اور ایک بار پھر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد اب تک خاموش کھڑا تھا۔ دل ہی دل میں لالی کی حرکتوں پر کڑھ رہا تھا۔ جب ضبط نہ ہو سکا تو جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یار لالی' تو نے یہ کیا چکر چلایا ہے۔ خامخا اتنا وقت خراب کیا۔ اب تک تو ہم بہت دور نکل

جاتے۔"

"کہاں نکل جاتے؟ نہ رستہ معلوم نہ جگہ کا کوئی اتا پتہ۔" لالی نے رحیم داد کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "رجے تو بیکار میں اپنا مُڈ خراب نہ کر۔ تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ تیں نوں پتہ نہیں بجا اپنے بہت کام آئے گا۔"

"کیا کام آئے گا؟" رحیم داد کے لہجے میں ابھی تک جھنجلاہٹ تھی۔

"اہر میں بجا جہاں مویشی چھپاتا ہے وہیں ہم بھی چھپ سکتے ہیں۔ پہلے کہیں چھپنے کا ٹھکانا ملنا چاہئے۔ اس کا بندوبست بجا کر دے گا۔ آگے بھی وہ کام آئے گا۔ وہ بھی مجرم ہم بھی مجرم۔ اور مجرم کی مدد مجرم ہی کر سکتا ہے۔ کیا سمجھا؟"

رحیم داد کی سمجھ میں لالی کی بات آگئی۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ بھینس ان سے چند قدم کے فاصلے پر چپ چاپ کھڑی جگالی کر رہی تھی۔ دم ہلا ہلا کر مچھر اڑا رہی تھی۔ رحیم داد اور لالی اس سمت گردن اٹھائے دیکھ رہے تھے جدھر بجا گیا تھا۔

لیکن اس بار بجا جلدی نہ لوٹا۔ اسے دیر ہوئی تو رحیم داد کو تشویش ہوئی۔ اس نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"بجا ابھی تک نہیں آیا۔ ایسا نہ ہو کوئی گڑبڑ ہو جائے۔"

"حوصلے سے کام لے، حوصلے سے۔" لالی نے رحیم داد کو تسلی دی۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ دونوں بجے کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے درختوں کے خشک پتے کھڑکھڑاہٹ پیدا کر رہے تھے۔ اب لالی بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اچانک ڈھارے کی طرف کوئی زور سے کھنکارا۔ ساتھ ہی آواز ابھری۔

"اوئے، کون ہے؟"

لالی اور رحیم داد نے گھبرا کر دیکھا۔ بجا، ڈھارے کے چھپر سے باہر نکلا۔ اندھیرے میں اس کی سفید دھوتی اور قمیص دور سے نظر آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے مویشیوں کا رکھوالا بھی ڈھارے سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی ڈانگ تھی۔ وہ ڈانگ سنبھالے بجا کے تعاقب میں دوڑا اور اونچی آواز سے "چور، چور" کی صدا بھی بلند کرتا رہا۔

لالی اور رحیم داد اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھ سکے۔ وہ سراسیمہ ہو کر جدھر منہ اٹھا، سرپٹ بھاگے۔ نہ انھوں نے قریب کھڑی ہوئی چوری کی بھینس پر توجہ دی اور نہ بجا کی طرف کوئی دھیان دیا۔ وہ جلد سے جلد گاؤں سے نکل جانا چاہتے تھے۔

☆

مشرقی افق پر ہلکا ہلکا دودھیا اجالا پھیل رہا تھا۔ رات رخصت ہو رہی تھی۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ لیکن صبح کی آمد کے ساتھ لالی اور رحیم داد کے لیے خطرہ بھی قریب آتا جا رہا تھا۔ دن کی روشنی میں وہ گھوم پھر نہ سکتے تھے۔ ان کے جسموں پر جیل کی مخصوص وردی تھی، جو دور سے چغلی کھاتی تھی کہ وہ مفرور قیدی ہیں۔

وقت کم تھا اور انھیں جلد سے جلد چھپنے کے لیے کسی ٹھکانے کی تلاش تھی۔ لالی نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اسے نشیب میں کچھ فاصلے پر سکنالا نظر آیا۔ یہ برساتی نالا اب خشک اور اجاڑ تھا۔ اس کے ایک کنارے پر فراش اور سرس کے گھنے درخت تھے جو بلندی پر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ لالی درختوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ اسے یہ جگہ چھپنے کے لیے مناسب معلوم ہوئی۔ اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ وہ زمین پر بے سدھ پڑا تھا اور گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ لالی نے جھک کر اسے جھنجوڑا۔

"بہت آرام کر چکا۔ اب اٹھ کے بیٹھ۔"

رحیم داد نے کروٹ بدلی اور تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مجھے تو اونگھ لگ رہی ہے۔"

لالی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "نہیں اٹھا تو میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔"

رحیم داد جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بتا، جانا کدھر ہے؟ سویرا ہو رہا ہے۔ اجالا پھیلتا جا رہا ہے۔"

لالی نے نشیب میں اترتے ہوئے کہا۔ "میرے پیچھے، پیچھے چلا آ۔ سکنالے کے اس پار جو جھل ہے، دن وہیں گزاریں گے۔" اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر درختوں کے دور تک پھیلے ہوئے سلسلے کی جانب اشارہ کیا۔ یہ گھنا جنگل تھا اور قریب بھی تھا۔

رحیم داد چپ چاپ لالی کے ہم راہ نشیب میں اترنے لگا۔ دونوں آگے بڑھے۔ سکنالے پر پہنچے۔ کچھ دور جانے کے بعد ٹوبا ملا۔ اس میں ابھی تک پچھلی برسات کا پانی موجود تھا مگر زیادہ گدلا نہ تھا۔ دونوں ٹوبے کے کنارے بیٹھ گئے۔ چلو بھر بھر کر پانی پیا۔ منہ دھویا، ہاتھ دھوئے اور تر و تازہ ہو کر درختوں کی جانب بڑھے۔

اب مشرق میں روشنی کا سرخ الاؤ دہکنے لگا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ مگر جھل کے درختوں کے نیچے ابھی تک اندھیرا تھا۔ وہ آگے اور آگے بڑھتے گئے۔ اجالا پھیلتا گیا۔ انھیں ایک پرانا درخت نظر آیا۔ اس کا تنا خوب چوڑا تھا اور اندر سے کھوکھلا بھی تھا۔ لیکن اس میں صرف ایک

آدمی کے چھپنے کی گنجائش تھی۔

دونوں دیر تک ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اب درختوں کے پتوں سے دھوپ چھن چھن کر نیچے بکھرنے لگی تھی۔ ہر طرف پرندے چہچہا رہے تھے۔ تھکن سے دونوں کا برا حال تھا۔ انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ نیند غالب تھی اور بھوک بھی ستا رہی تھی۔ انھیں ایک پگڈنڈی نظر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر چلنے لگے۔

کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ان کی نظر لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی بوسیدہ جھونپڑی پر پڑی۔ پہلے تو وہ قریب جاتے ہوئے ڈرے۔ مگر لالی نے اس دفعہ بھی ہمت سے کام لیا۔ اس نے جھونپڑی کے نزدیک پہنچ کر دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔

دروازہ چرچراتا ہوا کھل گیا۔ دونوں نے اندر جھانکا۔ جھونپڑی بالکل خالی تھی۔ فرش پر خشک گھاس بچھی تھی۔ جگہ جگہ گھوڑے کی لید بکھری ہوئی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئے اور نڈھال ہو کر فرش پر گر پڑے۔

لالی کچھ دیر خاموش لیٹا رہا' پھر اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ رحیم داد آنکھیں بند کیے خاموش پڑا تھا۔ لالی نے دروازہ کھلا رکھا اور چوکنا نظروں سے باہر دیکھتا رہا۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر جاگتا رہا۔ پھر نیند نے شب خون مارا۔ وہ جھومتے جھومتے ایک طرف لڑھک گیا۔

دروازہ کھلا تھا۔ لالی اور رحیم داد بے خبر سو رہے تھے۔

دوپہر ہوئی' سہ پہر ہوئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سائے طویل ہوگئے۔ یکایک سناٹے میں پگڈنڈی پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ خطرے کا احساس خوف بن کر اس کے چہرے پر منڈلانے لگا۔ اس نے آہستہ سے رحیم داد کو جھنجوڑا۔ وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آہٹ اس نے بھی سن لی تھی۔

دونوں بالکل خاموش تھے۔ انجانے خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ لالی کے پاس جیبی کا چاقو موجود تھا۔ اس نے چاقو کھولا اور دروازے کی اوٹ میں چوکس ہو کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد بھی اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔

آہٹ قریب ہوتی گئی۔ اتنی قریب کہ انھیں یہ اندازہ ہوگیا کہ آنے والا تنہا ہے اور بھاری بھاری بوٹ پہنے ہوئے ہے۔ مگر وہ ان کی طرف نہ آیا۔ آگے نکل گیا۔ اس کی چاپ خشک پتوں پر دیر تک ابھرتی رہی' اور جب سناٹے میں ڈوب کر ختم ہوگئی تو دونوں کے چہروں پر چھایا ہوا خوف

مٹ گیا۔ وہ تھکے ہوئے سے فرش پر بیٹھ گئے۔ ذرا سکون نصیب ہوا تو بھوک نے پریشان کیا۔

گھاس پر ادھر ادھر چنے کے دانے بکھرے ہوئے تھے۔ رحیم داد کی ان پر نظر پڑی تو چن چن کر کھانے لگا۔ لالی بھی کھانے لگا۔ انھوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک دانہ کھا لیا۔ چنے خشک اور کیلے تھے۔ مٹھی بھر بھی نہ تھے۔ بھوک تو کیا مٹتی' البتہ پیاس شدت سے بڑھی۔ مگر وہ دروازے سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ دن کی روشنی ابھی تک پھیلی تھی۔ اور روشنی میں نکلنا خطرے کو دعوت دینا تھا۔

سورج ڈوب گیا۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیل گیا۔ پیاس سے لالی اور رحیم داد کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ جب اندھیرا کسی قدر گہرا ہوگیا تو دونوں جھونپڑی سے باہر آئے۔ ہوا تیز تھی اور درختوں میں سنسناتی ہوئی گزر رہی تھی۔ خشک پتے اڑ اڑ کر شور مچا رہے تھے۔ دونوں خاموشی سے پگڈنڈی پر چلتے رہے۔ وہ ٹوبے کی جانب جا رہے تھے۔ لیکن لالی نے اس دفعہ نشیب میں پہنچنے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

میل' سوا میل فاصلہ طے کر کے دونوں ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔ ٹوبا زیادہ دور نہ تھا۔ مگر راستہ خراب تھا۔ نشیب میں اترتے ہوئے رحیم داد کا پیر پھسلا۔ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ لیکن وہ لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ ٹوبے پر پہنچ کر انھوں نے اس بے قراری سے پانی پیا کہ ان کے پیٹ پھول گئے۔ دونوں ٹوبے کے کنارے ہی لیٹ گئے اور دیر تک بے سدھ پڑے رہے۔

اس دفعہ ٹوبے کا پانی پی کر لالی کا جی متلانے لگا۔ مگر اس نے خود کو سنبھالا' اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد بھی چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ دونوں آگے بڑھے۔ لیکن وہ زیادہ دور نہ جا سکے۔ لالی کی طبیعت پھر بگڑی۔ وہ ابکائیاں لینے لگا اور ایک جھاڑی کے قریب نڈھال ہو کر گر پڑا۔ اس پر غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔

ذرا دیر وہ زمین پر لیٹا گہری گہری سانسیں بھرتا رہا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔ رحیم داد اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ لالی کا سر دبانے لگا۔

کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ اجالا پھیلنے لگا۔ چاند درختوں کے عقب سے دھیرے دھیرے طلوع ہو رہا تھا۔ دیکھتے' دیکھتے چاندنی ہر طرف پھیل گئی۔ ٹوبے کا پانی جھلملانے لگا۔ لیکن چاندنی جس قدر نکھرتی جا رہی تھی رحیم داد اسی قدر خوف زدہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیکھا تو فوراً اندازہ ہوگیا کہ وہ قطعی غیر محفوظ جگہ بیٹھا ہے۔ ہر طرف کھلا ریتلا میدان تھا۔

جھاڑی بھی زیادہ گھنی نہ تھی۔ اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر لالی ہر خطرے اور ہر خدشے سے بے نیاز گہری نیند سو رہا تھا۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ چاند چڑھ کر درختوں کے اوپر آ گیا۔ ریت کے ذرے جھلملانے لگے۔ سائے سمٹ گئے۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ ناگاہ رات کے گہرے سناٹے میں کوئی زور سے کھنکارا۔ ساتھ ہی خشک پتوں پر آہٹ ہوئی اور رفتہ رفتہ قریب آ گئی۔ کوئی ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا۔ مگر وہ ایک نہیں دو تھے۔

رحیم داد نے انھیں دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ جب وہ اسی سمت آنے لگے تو رحیم داد سخت گھبرایا۔ اس نے لالی کو آنے والے خطرے سے خبردار کرنے کی غرض سے زور زور سے جھنجھوڑا۔ مگر لالی بیدار نہ ہوا۔ کروٹ بدل کر بے خبر سوتا رہا۔

آنے والے نزدیک آتے گئے۔ وہ دھیرے' دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ رحیم داد اور زیادہ بدحواس ہو گیا۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا' جب اس نے اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اپنی جگہ دم بخود بیٹھا رہا۔ اس نے دیکھا' ان میں ایک مرد ہے اور دوسری عورت۔ مرد آگے' آگے چل رہا تھا۔ اس کے سر پر بڑی سی گٹھری تھی۔ عورت کی گود میں بچہ تھا۔ دونوں نے رحیم داد کو دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ جب وہ بالکل نزدیک پہنچ گئے تو عورت لمحے بھر کو ٹھٹکی۔ اس نے گردن موڑ کر رحیم داد کو دیکھا اور اس کے قریب پڑے ہوئے لالی کو بھی دیکھا۔ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"کوئی بندہ جان پڑتا ہے۔"

"ہو گا کوئی۔ سدھی' سدھی چل۔" مرد نے اسے ڈانٹا۔

دونوں نے مزید بات چیت نہ کی۔ چپ چاپ رحیم داد اور لالی کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ البتہ عورت مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ دونوں دور ہوتے ہوتے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ ان کی چاپ دیر تک خشک پتوں پر ابھرتی رہی۔ ان کے جانے کے بعد بھی رحیم داد کا خوف رفع نہ ہوا۔ وہ چوکنا نظروں سے بار بار اس سمت دیکھتا رہا جدھر وہ گئے تھے۔ ہر آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔

بہت دیر ہو گئی۔ کوئی نہ آیا۔ چاند چڑھتے چڑھتے آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ رات پوری طرح جاگ رہی تھی اور لالی سو رہا تھا۔ وہ آدھی رات کے بعد جاگا۔ اٹھ کر بیٹھا تو رحیم داد نے پوچھا۔

"اب تیرا جی کیسا ہے؟"

لالی نے انگڑائی لے کر جواب دیا۔ "ٹھیک ہی ہے۔" اس نے آنکھیں پھاڑ کر چاند کو دیکھا۔ "بہت رات ہو گئی۔ مجھے جگایا بھی نہیں۔"

"بہت جگایا' تجھے اپنا ہوش ہی کب تھا۔"

"طبیعت بہت گڑبڑ ہو گئی تھی۔" لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "ر نیکے' کھڑا ہو جا۔ اپنے پاس تو چلنے کے لیے رات ہی ہے۔ دن میں کہیں چھپ کر آرام کریں گے۔"

رحیم داد چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں آگے بڑھے' اور کہیں ٹھہرے بغیر مسلسل چلتے رہے۔ چاند ڈوب گیا۔ اندھیرا چھا گیا۔ راستہ دشوار ہو گیا۔ وہ سکنالے کی گزرگاہ پر چل رہے تھے۔ زمین ریتلی اور ناہموار تھی۔ دونوں طرف اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے تھے۔ کہیں کہیں ببول اور بیری کے درخت تھے۔ جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔

انھوں نے ستانے کی مطلق کوشش نہ کی۔ آگے' اور آگے بڑھتے گئے۔ جب صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلا اور اندھیرا چھٹا تو وہ ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں گھاس اور سرکنڈوں کے اونچے اونچے پودے تھے۔ زمین دلدلی تھی' اس قدر نرم اور پولی کہ پیر اندر دھنستے تھے۔ ان میں دلدل عبور کرنے کی ہمت نہ تھی۔ دونوں تھکن سے نڈھال ہو رہے تھے۔ سورج بھی طلوع ہونے والا تھا۔

انھوں نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔

دونوں نے بلندی سے دیکھا کہ دلدل کے اس پار بہت بڑا ٹوبا ہے' جو صبح کی روشنی میں شفاف جھیل کی طرح جھلملاتا دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ کچھ دور آگے سکنالے پر پل تھا جس پر سڑک گزرتی تھی۔ یہ پاک پتن روڈ تھی۔

لالی کچھ دیر رحیم داد کے ساتھ ٹیلے پر خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے ساتھ' ساتھ اطمینان بھی جھلک رہا تھا۔ اسے کسی ایسے ہی مقام کی تلاش تھی جو سڑک سے نزدیک ہو اور محفوظ بھی۔ یہ ایسا ہی محفوظ علاقہ تھا۔ دور' دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ نہ کوئی پگڈنڈی تھی نہ راستہ تھا۔ ہر طرف ٹیلے اور ٹبے تھے۔ جنگلی پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ کہیں کہیں فراش کے اکا دکا درخت بھی تھے۔

دونوں نے ادھر ادھر گھوم پھر کر ٹیلوں کے درمیان چھپنے کا ٹھکانا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جلد ہی انھیں ایک ٹھکانا مل گیا۔ یہ کشادہ اور قد آدم گہرا غار تھا۔ انھوں نے باہر سے غار کا جائزہ لیا۔ اندر داخل ہوئے اور چٹیل زمین پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔

وہ دن بھر گہری نیند سوتے رہے۔ آنکھ کھلی تو شام آہستہ آہستہ ٹیلوں اور ٹبوں پر اتر رہی تھی۔ دلدل پر اگی ہوئی اونچی اونچی گھاس اور سرکنڈوں کے پودے دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ غار سے نکل کر دونوں باہر آئے۔

سورج، ٹیلوں کے دور تک پھیلے ہوئے ناہموار سلسلے کے پیچھے ڈوب چکا تھا۔ مغرب میں گہری سرخ روشنی پھیلی تھی۔ اس روشنی میں رحیم داد بجّو کی مانند ڈراؤنا نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر نمایاں ہو گئی تھیں۔ بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا۔

لالی بھی بھوک سے نڈھال تھا۔ مگر اس ویرانے میں کھانے کے لیے کیا ملتا۔ اس وقت انھیں پیٹ کی آگ سرد کرنے کی فکر دامن گیر تھی۔ دلدل عبور کرنا خطرناک تھا اور ٹیلوں کے درمیان راستہ بنانا بھی آسان نہ تھا۔ مگر اندھیرا بڑھنے سے پہلے وہ آگے نکل جانا چاہتے تھے۔ جھٹ پٹے میں چلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ انھیں ٹیلوں کی بلندی پر دور ہی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ سڑک پر گزرنے والی گاڑیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھیں۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے کہیں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور غار کے دہانے پر بیٹھ کر چاند کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

رات کا ایک پہر گزرا۔ چاند طلوع ہوا تو دونوں غار سے باہر نکلے اور چھٹکی ہوئی چاندنی میں ٹیلوں اور ٹبوں کے درمیان چلنے لگے۔ وہ رفتہ رفتہ سڑک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مگر راستہ اس قدر پیچیدہ اور دشوار تھا کہ انھیں سنبھل سنبھل کر ٹھہر ٹھہر کر چلنا پڑتا۔ آخر وہ اونچے نیچے ٹیلے عبور کرنے کے بعد نشیب میں اترے۔

سامنے چاندنی میں جھلکتا ہوا ٹوبا تھا۔ اس کے ایک کنارے پر اونچی اونچی گھاس تھی۔ عقب میں دلدل تھی۔ ٹوبے سے کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر پل تھا۔ سڑک پر آمد و رفت قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

دونوں پل کی جانب بڑھنے لگے۔ چند ہی قدم آگے گئے تھے کہ سناٹے میں دور سے ہارن کی آواز ابھری۔ وہ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ سڑک کے موڑ پر تیز روشنی جھلملائی۔ ذرا دیر بعد کار کی دونوں بتیاں نظر آنے لگیں۔ کار بہت تیز رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ پلک جھپکتے ہی پل پر پہنچ گئی۔ پھر زوردار دھماکہ ہوا۔

لالی اور رحیم داد نے خوف اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ کار بے قابو ہوئی۔ پل کے جنگلے سے ٹکرائی۔ اچھلی اور ڈھلان پر تیزی سے لڑھکتی ہوئی نیچے آنے لگی۔ ساتھ ہی انسانی چیخیں

بھی ابھریں۔

ایک اور دھماکہ ہوا۔ یہ پہلے دھماکے سے زیادہ بڑا اور ہولناک تھا۔ لڑھکتی ہوئی کار سے اونچے، اونچے شعلے بلند ہوئے۔ کار ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ لالی اور رحیم داد بت بنے کھڑے رہے۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ اجلی چاندنی میں جلی ہوئی کار کا ڈھانچہ سیاہ دھبے کی مانند نظر آرہا تھا۔ یکایک خاموشی میں رک رک کر ایسی آواز ابھری جیسے کوئی شدید درد سے کراہ رہا ہو۔

لالی خاموشی سے کراہ سنتا رہا۔ مگر زیادہ دیر اسے سن نہ سکا۔ وہ آواز کی سمت بڑھا۔ رحیم داد بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ بہت سہما ہوا نظر آرہا تھا۔ دونوں کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ کراہ بند ہو گئی۔ مگر وہ رکے نہیں۔ آگے ہی بڑھتے گئے۔

قریب جا کر انھوں نے دیکھا، کار کے جھلسے ہوئے ڈھانچے کے نیچے ایک لاش دبی ہے۔ آدھا دھڑ الٹی ہوئی کار کے نیچے سے باہر نکلا ہوا ہے۔ چہرہ اور ہاتھ جل کر سیاہ پڑ گئے ہیں۔ ہر طرف جلے ہوئے گوشت کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ ڈھانچے کے آس پاس کار کے ٹوٹے ہوئے دروازے، دو پہیے اور دوسرے حصے ادھر ادھر بکھرے تھے۔ چاندنی میں رحیم داد نے کوئی چیز دیکھی اور اس پر بلی کی طرح تیزی سے جھپٹا۔ یہ ایک مڑی تڑی روٹی تھی۔ رحیم داد نے اسے جھٹ اٹھایا۔ اس میں لگی ہوئی ریت اور مٹی صاف کیے بغیر بے صبری سے ہبڑ ہبڑ کھانے لگا۔ ریت کے ذرے اس کے دانتوں تلے کرکراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ مگر وہ جلدی جلدی ایک کے بعد دوسرا لقمہ نگلتا چلا گیا۔ لالی بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔ رحیم داد نے روٹی کا ٹکڑا اسے بھی دیا۔ روٹی باسی اور ٹھنڈی تھی۔ لیکن دو اسے مزے سے کھاتے رہے۔

روٹی کھانے کے بعد انھوں نے ٹوبے پر جا کر پانی پیا۔ اب ان کے جسموں میں توانائی اور چستی آگئی تھی۔ انھوں نے کار کے ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے کے آس پاس کھانے کی اشیاء تلاش کرنا شروع کر دیں۔ جلد ہی انھیں بید کی الٹی ہوئی ٹوکری میں کھلا ہوا ناشتا دان مل گیا۔ اس میں بھنا گوشت تھا۔ ابلے ہوئے انڈے تھے۔ تین موٹے موٹے پراٹھے تھے۔ ٹوکری میں ایک ڈبل روٹی تھی اور بسکٹوں کے دو پیکٹ بھی تھے۔

کھانے کی اشیاء دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ دونوں ٹوکری کے قریب بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ایک پراٹھا اٹھایا۔ لالی نے فوراً اسے ٹوکا۔

"سب نہ کھا جانا' کئی روز کا راشن ہے یہ۔"

رحیم داد نے مسکرا کر آدھا پراٹھا لالی کو دیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آگے کی فکر ضرور کرنی چاہئے۔"

دونوں نے پراٹھوں کے آدھے آدھے ٹکڑوں پر تھوڑا سا بھنا ہوا گوشت رکھا اور اطمینان سے کھانے لگے۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے ناشتا دان بند کیا جو ایک طرف سے ٹیڑھا پڑ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے بند ہوا۔ رحیم داد نے اسے ٹوکری میں ڈالا۔ ڈبل روٹی اور بسکٹوں کے پیکٹ بھی رکھے۔

دونوں نے ایک بار پھر ٹوبے پر جا کر پانی پیا۔ پانی پی کر لالی زور زور سے ڈکاریں لینے لگا۔ رحیم داد کو خطرے کے احساس نے خوف زدہ کیا۔

"یار' روٹی تو کھالی' اب چلنا چاہئے۔"

"کہاں چلیں؟" لالی نے پوچھا۔

"آگے چلتے ہیں سڑک کا رستہ ٹھیک رہے گا۔"

لالی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "سڑک کا رستہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ آگے خطرہ ہے۔ یہ ٹھکانا ابھی چھوڑنا ٹھیک نہیں۔" وہ لمحے بھر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "یار روٹی کا تو بندوبست ہو گیا۔ پانی کا بھی راشن رکھنا ہو گا۔"

لالی کار کے ڈھانچے کی جانب چل دیا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ڈھانچے کے قریب ابھی تک جلے ہوئے گوشت کی بو پھیلی تھی۔ یہ بو اس قدر تیز اور ہولناک تھی کہ رحیم داد دور ہی ٹھہر گیا۔ لالی چند قدم آگے بڑھا پھر وہ بھی ٹھہر گیا۔ ڈھانچے میں اسے اپنے کام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ اس نے ڈھانچے کے ادھر ادھر جھک کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر اسے ایک چمکتا ہوا ڈبا نظر آیا۔ لالی کو اسی کی تلاش تھی۔ یہ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے کا ڈبا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈبا اٹھا لیا اور رحیم داد کو دے کر بولا۔

"لے یار! اپنا کام تو بن گیا۔ اس میں پانی بھر لے۔ کئی دن چلے گا۔"

رحیم داد نے ڈبا سنبھالا اور ٹوبے پر چلا گیا۔ اس نے ڈبا اندر اور باہر سے کئی بار دھویا اور پانی بھر کر اوپر سے ڈھکنا بند کر دیا۔ پانی سے بھرا ہوا ٹین کا ڈبا خاصا وزنی تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ٹوکری تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لالی کے پاس پہنچا۔ وہ ڈھانچے سے ہٹ کر کوئی بیس قدم دور ایک ٹوبے

کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے سامنے زمین پر ایک آدمی پڑا تھا۔ رحیم داد نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ آدمی کا چہرہ اور بال خاک سے لتھڑے ہوئے تھے۔ داہنا ہاتھ کہنی کے پاس سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا تھا۔ وہ سفید بش شرٹ اور گہری نیلی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ پیروں میں سیاہ جوتے تھے۔ اجلی چاندنی میں ایک ایک چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ وضع قطع سے وہ سرکاری افسر لگتا تھا۔ رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔

"مر گیا؟"

لالی نے پلٹ کر رحیم داد کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر جھک کر زمین پر پڑے ہوئے آدمی کے ہاتھ سے گھڑی اتاری اور اپنی کلائی پر باندھ لی۔ پھر اس کے پیروں سے جلدی جلدی جوتے اتارنے لگا۔ اس کے بعد اس نے پتلون کے بٹن کھولے اور دونوں پائنچے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ پتلون اتر کر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ لالی نے فوراً پتلون کی جیبیں ٹٹولیں۔ پچھلی جیب سے چمڑے کا بٹوہ نکلا۔ لالی نے بٹوہ کھول کر اندر نظر ڈالی۔ بٹوے میں نوٹ تھے۔ اس نے بٹوہ ٹوبے کی جانب اچھال دیا اور نوٹ جیب میں رکھ لیے۔ جب وہ بش شرٹ اتارنے لگا تو لاش میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔ ساتھ ہی اکھڑی ہوئی سانس لینے کی آواز ابھری۔ رحیم داد چیخا۔

"ابھی زندہ ہے۔"

لالی نے گھوم کر اس کی جانب قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "چپ کر کے کھڑا رہ۔"

اس نے بش شرٹ اس طرح اتاری جیسے قصائی بکرے کی کھال اتارتا ہے۔ پھر بنیان اور انڈرویر اتارے۔ بنیان اور انڈرویر خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بش شرٹ پر بھی خون کے دھبے تھے۔ مگر زیادہ بڑے نہیں تھے۔

زخمی آدمی کے جسم میں دوبارہ حرکت نہیں ہوئی۔ اس کے کٹے ہوئے ہاتھ سے خون بہنے کے باعث ریت پر بڑا سا سیاہ دھبا بن گیا تھا۔

لالی نے سارے کپڑے لپیٹے اور ٹوبے کی جانب چل دیا۔ اس نے سب سے پہلے بش شرٹ پانی میں ڈال کر دھوئی' بنیان اور انڈرویئر ایک طرف پھینک دیئے۔ لالی نے پتلون الٹ پلٹ کر دیکھی۔ اس پر بھی خون کے دھبے تھے۔

وہ پتلون دھونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اوپر سڑک پر آہٹ سنائی دی۔ لالی اور رحیم داد نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ یہ سڑک پر کسی گاڑی کے دوڑنے کی آواز تھی۔ دونوں کو خطرے کا احساس ہوا۔

لالی نے کپڑے سمیٹ کر بغل میں دبالیے اور رحیم داد کے ہاتھ سے ٹوکری لے لی۔ دونوں آگے پیچھے تیزی سے ٹیلوں کی جانب دوڑے۔ لیکن وہ ٹیلوں پر چڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ بریک لگنے کی تیز آواز ابھری۔

یہ ٹرک تھا اور پل پر ٹھہر گیا تھا۔ دونوں نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا۔ ٹرک ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی ٹرک سے باہر آیا۔ دونوں پل کے قریب کھڑے ہو کر نیچے جھانکنے لگے۔ ذرا ہی دیر بعد دونوں آگے پیچھے ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔

رحیم داد اور لالی نے انھیں نشیب میں اترتے دیکھا تو ایک ابھرے ہوئے اونچے تودے کی آڑ میں دبک گئے۔ مگر یہ جگہ قطعی غیر محفوظ تھی۔ چاند پوری تابانی سے ان کے سروں پر چمک رہا تھا۔ اجلی چاندنی میں ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ ان سے قریب تر گھنی جھاڑی بھی خاصی دور اور بلندی پر تھی۔ جھاڑی تک پہنچنے کی کوشش کرتے تو دونوں دور سے صاف نظر آجاتے۔

آنے والے رفتہ رفتہ قریب آرہے تھے۔ وہ نیچے پہنچ کر پہلے ٹوٹی پھوٹی کار کے جھلسے ہوئے ڈھانچے کے پاس گئے۔ لیکن انھوں نے ڈھانچے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ادھر ادھر جھک جھک کر دیکھتے رہے۔ انھوں نے ڈھانچے کے نیچے دبی ہوئی لاش بھی دیکھی۔ چند منٹ تک وہ ڈھانچے کے آس پاس منڈلاتے رہے۔ ایک بار وہ اس تودے کے بہت قریب پہنچ گئے جس کے عقب میں رحیم داد اور لالی دبکے بیٹھے تھے۔

دونوں ان کی چاپ صاف سن رہے تھے۔ لالی نے چاقو کھول لیا تھا اور آنے والے خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے چوکس تھا۔ رحیم داد نے بھی ایک پتھر ہاتھ میں اٹھالیا تھا۔

لیکن آنے والے زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ انھوں نے جلی ہوئی کار سے ٹوٹ کر علیحدہ ہو جانے والے دونوں پہیے اٹھائے اور آہستہ آہستہ چڑھائی پر چڑھنے لگے۔ لالی اور رحیم داد نے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔

وہ بھی آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے بلندی کی جانب بڑھنے لگے۔ جب گھنی جھاڑی کے عقب میں پہنچ گئے تو انھوں نے پل کی جانب دیکھا۔ ٹرک ابھی تک کھڑا تھا۔ وہ ٹرک کے اسٹارٹ ہونے اور آگے جانے کا انتظار کرنے لگے۔ مگر ٹرک اسٹارٹ نہیں ہوا۔ ذرا ہی دیر بعد دونوں پھر نشیب میں اترتے نظر آئے۔ وہ سیدھے ڈھانچے کے پاس گئے اور اس میں جڑے ہوئے پہیے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔

لالی اور رحیم داد بلندی سے انھیں پوری طرح دیکھ رہے تھے۔ اب وہ اس جگہ ٹھہرنے کے بجائے جلد سے جلد غار میں پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن جھاڑی سے نکل کر آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

وہ خاموش بیٹھے دونوں کو دیکھتے رہے۔ خاصی دیر ہوگئی۔ چاند آہستہ آہستہ مغرب میں اترتا جارہا تھا۔ سائے طویل ہوگئے تھے۔ چاند غروب ہو جانے کے بعد اندھیرے میں چلنا اور غار تک پہنچنا بہت دشوار ہوتا۔ ان کی بے چینی لحہ بہ لحہ بڑھتی جارہی تھی۔ ادھر وہ دونوں کھسکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

چاند جب مغربی افق کے قریب پہنچ گیا اور ٹبوں کے نشیب میں اندھیرا پھیلنے لگا تو لالی اور بے چین ہوگیا۔ اس نے بڑا سا پتھر اٹھایا اور پوری قوت کے ساتھ ڈھانچے کی جانب پھینکا۔ پتھر کار کے آہنی ڈھانچے سے ٹکرایا۔ سناٹے میں ٹن سے آواز ہوئی۔ ڈھانچے پر جھکے ہوئے دونوں آدمی فوراً سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے گھبرائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ ان میں سے ایک پل کی جانب سرپٹ بھاگا۔ دوسرا بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ دونوں تیزی سے چڑھائی عبور کر کے پل پر پہنچے اور ٹرک پر سوار ہو گئے۔ فوراً ہی انجن کا شور خاموشی میں ابھرا۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

ٹرک کے جانے کے بعد لالی ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ رحیم داد بھی مسکرانے لگا۔ لالی نے اس کی پیٹھ پر بے تکلفی سے دھپ مارا۔ "کہو استاد! کیسی رہی ترکیب نمبر ۳؟" وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ اس نے چاقو بند کیا۔ ٹوکری اٹھائی اور کپڑے بغل میں دبا لیے۔ دونوں سنبھل سنبھل کر ٹیلوں پر چڑھنے لگے۔ رحیم داد ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا ٹین کا ڈبا اٹھائے لالی کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

دونوں غار کے قریب پہنچے تو اندھیرا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ رحیم داد بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ پانی کا ڈبا کونے میں رکھ کر لیٹ گیا۔

لیکن لالی ٹوکری اور بغل میں دبے ہوئے کپڑے رکھنے کے بعد بھی نہیں لیٹا۔ اس نے گیلی بش شرٹ اٹھائی۔ جھٹکا دے کر پانی جھاڑا۔ غار کے دہانے پر پہنچا۔ بش شرٹ ایک تودے پر پھیلا دی اور اس کے کناروں پر بھاری بھاری پتھر رکھ دیے تاکہ تیز ہوا سے اڑ نہ جائے۔

ہوا سیٹیاں بجاتی ٹیلوں اور ٹبوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ چاند بہت دور ایک اونچے ٹبے کے پیچھے آہستہ آہستہ اتر رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ دہکتا ہوا الاؤ رہ گیا۔ بڑا دل آویز منظر تھا۔ لالی کھوئی کھوئی نظروں سے چاند کی الوداعی روشنی دیکھتا رہا۔ چاند ڈوب گیا۔ ٹیلے اور ٹبے تاریکی میں

ڈوب گئے۔ لالی مڑا اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا غار کے اندر چلا گیا۔

☆

لالی اور رحیم داد کے پاس اب صرف بسکٹوں کا ایک پیکٹ رہ گیا تھا۔ اس میں سے بھی وہ چار بسکٹ شام کو کھا چکے تھے۔ ڈبا بھی پانی سے قریب قریب خالی ہو چکا تھا۔ وہ ڈبے سے منہ لگا کر گھونٹ گھونٹ پانی پیتے۔ اگر کوئی زیادہ پانی پینے کی کوشش کرتا تو دوسرا جھٹ ڈبا اس کے ہاتھ سے چھین لیتا۔ دوپہر کو دھوپ تیز ہو جاتی۔ بنجر اور پتھریلے ٹیلے گرمی سے دہکنے لگتے۔ دونوں کو بار بار پیاس لگتی۔

شروع میں تو وہ اطمینان سے پانی پیتے رہے۔ مگر جب ڈبے میں پانی چوتھائی سے بھی کم رہ گیا تو دونوں کی خود غرضی بیدار ہوئی۔ وہ پانی پیتے وقت ایک دوسرے کو ٹوکتے' غصے سے گھورتے۔ زیادہ جھنجلاتے تو چھینا جھپٹی سے بھی دریغ نہ کرتے۔ لالی ہر بار زیادتی کرتا۔ رحیم داد ٹوکتا اور غصے سے بڑبڑاتا تو وہ بے غیرتی سے دانت نکال کر کھسیانی ہنسی ہنستا۔

اس شام انھوں نے دو دو بسکٹ کھائے اور ایک ایک گھونٹ پانی پیا۔ آپس میں یہ سمجھوتا ہوا کہ صبح تک نہ کوئی بسکٹ کھائے گا نہ پانی پیے گا۔ اس سمجھوتے پر سختی سے عمل کرنے کا عہد کر کے دونوں پڑ کر سو گئے۔

رات گئے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ جب قرار نہ آیا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لالی گہری نیند سو رہا تھا۔ باہر اجلی چاندنی چھٹکی تھی۔

رحیم داد آہستہ سے غار کے باہر نکلا اور اس کے دہانے پر کھڑا چاندنی میں ڈوبے ہوئے ٹیلوں اور ٹبوں کو دیکھتا رہا۔ وہ کئی منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ اس عرصے میں لالی نے نہ کروٹ بدلی نہ ہی جسم کو حرکت دی' بے خبر سوتا رہا۔

رحیم داد گردن موڑے اسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر ہولے ہولے چلتا ہوا غار کے اندر گیا۔ ٹٹول کر بسکٹ کا پیکٹ اٹھایا اور آہستہ آہستہ بسکٹ کھانے لگا۔ اس نے ایک بسکٹ ختم کیا' ٹین کا ڈبا اٹھایا۔ اس کا ڈھکنا کھولا اور جیسے ہی گردن اونچی کی۔ ڈبا منہ سے لگایا۔ اچانک کسی نے اس کی گردن دبوچ لی۔

یہ لالی تھا اور اسے خون خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ لمحے بھر خاموش رہ کر وہ غصے سے دھاڑا۔

"اوئے کنجر' یہ چار سو بیسی۔" رحیم داد کھسیانا ہو کر بولا۔

"یار میری گردن تو چھوڑ۔"

لالی نے زور سے دھکا دیا۔ رحیم داد لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس کا سر غار کی پتھریلی دیوار کے ساتھ کھناک سے ٹکرایا۔ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ چند لمحے خاموش پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پانی کا ڈبا اٹھایا اور غار کے باہر پھینک دیا۔ بسکٹوں کا پیکٹ بھی اٹھا کے غصے سے پھینک دیا۔ اور غضب ناک ہو کر بولا۔

"لے جا' سب کچھ لے جا۔ میں نوں کچھ نہیں لینا۔"

لالی اس حرکت پر اور جھنجلایا۔ دانت پیس کر رحیم داد پر جھپٹا اور گھونسوں اور لاتوں سے اس کی مرمت کرنے لگا۔ رحیم داد کچھ دیر تو خاموشی سے پٹتا رہا' پھر جھپاک سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گردن جھکا کر اس نے لالی کے منہ پر زور سے ٹکر ماری۔ چوٹ کراری آئی۔ لالی کا جبڑا ہل گیا۔ وہ تکلیف سے بلبلا کر رحیم داد کو مارنے کے لیے پل پڑا۔ رحیم داد بھی پسپانہ ہوا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

لالی کو جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ رحیم داد کو جس قدر کمزور اور بودا سمجھتا تھا ہرگز ایسا نہ تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں خاصا کس بل تھا۔ ایک بار اس نے زور لگا کر لالی کو گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ لالی بے بس ہو گیا۔

وہ ذرا دیر تک زمین پر پڑا بے بسی سے ادھر' ادھر گردن ہلاتا رہا اور رحیم داد تابڑ توڑ مکے لگاتا رہا۔ آخر لالی نے ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کا منہ دبوچ لیا اور دانت بھینچ کر پوری قوت سے دھکا دیا۔ رحیم داد کا سر زور سے پتھریلی دیوار سے ٹکرایا۔ وہ کراہتا ہوا وہیں ڈھے گیا۔

لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد دیوار کے پاس بے سدھ پڑا تھا۔ لالی خاموش بیٹھا اسے گھورتا رہا' اور ہونٹوں سے رستا ہوا خون ہاتھ سے بار بار پونچھتا رہا۔ وہ کھسکتا ہوا رحیم داد کے پاس گیا۔

رحیم داد آنکھیں بند کیے چت لیٹا تھا اور رک رک کر سانس بھر رہا تھا۔ لالی نے آہستہ سے جھنجھوڑا' مگر وہ بے سدھ پڑا رہا۔ لالی نے کئی بار جھنجھوڑا' لیکن رحیم داد نے آنکھ نہ کھولی۔ لالی کا سارا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ وہ پریشان ہو گیا اور رحیم داد کی پیشانی اور کنپٹیوں کو ہولے ہولے سہلانے لگا۔

بہت دیر بعد رحیم داد نے آنکھ کھولی۔ اس کے سر میں ابھی تک درد تھا۔ اس نے دیکھا' لالی اس کے سرہانے بیٹھا ہے۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی اور اٹھنے کی کوشش کی۔ لالی نے پیار سے ڈانٹا۔

"لیٹا رہ۔ طبیعت کیسی ہے؟"

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش لیٹا رہا۔ لالی نے پوچھا۔ "بول' بولتا کیوں نہیں؟ طبیعت تو اب ٹھیک ہے نا؟"

اس دفعہ بھی رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی نے نرم لہجے میں کہا۔ "یار! زیادتی ہو گئی۔ معاف کر دے۔ یہ غصہ بہت حرام کا تخم ہوتا ہے۔" اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ "لے' اب تو اٹھ جا پیارے!" رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لالی چپ چاپ اٹھا اور غار سے باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا۔ اس نے بسکٹ کا پیکٹ اور پانی کا ڈبا رحیم داد کے سامنے رکھ دیا' چمکار کر گویا ہوا۔

"سارے بسکٹ کھا لے۔ پانی بھی سارا پی لے۔ میری پروا نہ کر۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔" اس نے ایک بسکٹ اٹھایا اور رحیم داد کے ہونٹوں سے لگا کر بولا۔ "لے اب تو کھا لے۔ زیادہ نکھرا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

رحیم داد نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ "میں نے کچھ نہیں کھانا۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگا۔

لالی نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "توں تو زنانیوں کی طرح ٹسوے بہانے لگا۔ یار! اس میں رونے کی کون سی گل ہے۔" رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا خاموش بیٹھا سسکیاں بھرتا رہا۔ لالی نے پانی کا ڈبا اٹھا کر رحیم داد کے سامنے کر دیا۔

"لے گھونٹ بھر پانی پی لے۔"

"لالی! مجھے تنگ نہ کر۔ جی بھر کے رو لینے دے۔"

"مگر توں رو کیوں رہا ہے؟"

رحیم داد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اٹھا اور غار سے باہر جانے لگا۔

لالی اسے باہر جاتے دیکھ کر بولا۔ "کہاں جا رہا ہے؟"

"جیل!" رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

لالی اس کی جانب لپکا اور ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "تیرا دماغ چل گیا ہے؟"

رحیم داد نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "مجھے جانے دے۔ لالی! میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایسی زندگی سے تو جیل بھلی۔" لالی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "اتنی جلدی گھبرا گیا۔ یار! چند روز کی بات ہے۔ فیر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" رحیم داد بے زاری سے بولا۔ "مجھے نہ روک۔ میں تیرے رستے پر نہیں چل سکتا۔ میرے نصیب میں جتنے دن کی جیل لکھی ہے' کاٹ لوں گا۔"

"مگر اب تو دگنی کاٹنی پڑے گی۔ مشقت بھی زیادہ کرنی پڑے گی۔ قید تنہائی بھی ہو گی۔ جیل سے بھاگنا مخول نہیں ہے۔ کیا سمجھا؟"

"سب کچھ سمجھ گیا۔ مگر اب میں یہاں رہوں گا نہیں۔"

لالی نے ہلکا سا قہقہہ بلند کیا۔ "میرے ساتھ بھی نہیں رہے گا؟ جان من! یہ بے وفائی؟" وہ لمحے بھر رک کر بولا۔ "مگر میں تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے۔ لے اب تو مان جا۔"

لالی نے رحیم داد کا بازو پکڑا اور کھینچ کر اندر لے آیا۔ رحیم داد خاموشی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ لالی بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ "اب آرام نال گل بات ہو گی۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"گل ایہہ ہے لالی! مجھے یہ زندگی بالکل پسند نہیں۔"

"تو کیا مجھے چنگی لگتی ہے۔ ایک دم واہیات ہے۔ پر اب میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا۔"

"یہ تو سوچ' اس طرح کب تک کام چلے گا؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے' کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا اور جلدی کرنا پڑے گا۔" لالی ذرا دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تیار ہو جا! ابھی تو رات رہتی ہے۔ چاندنی بھی ہے۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ "بسکٹ کھا کر پانی پی لے۔ دیکھ انکار نہ کرنا۔"

رحیم داد نے کچھ کہے بغیر پیکٹ سے بسکٹ نکال کر کھانا شروع کر دیے۔ وہ بسکٹ کھاتا رہا اور لالی اپنی جیل کی وردی اتارنے لگا۔ وردی اتار کر اس نے پتلون پہنی۔ پتلون ذرا تنگ تھی' البتہ بش شرٹ اس کے جسم پر ٹھیک رہی۔ لیکن جوتے ڈھیلے تھے۔ لالی نے جیل کا کرتا پھاڑا اور اس کی دھجیاں بھر کر جوتے پہن لیے۔ جب وہ کپڑے بدل چکا تو ہنس کر بولا۔

"کیسا لگ رہا ہوں؟"

"بالکل صاحب بہادر لگ رہا ہے۔"

"پروا نہ کر' تجھے بھی صاحب بہادر بنا دوں گا۔" لالی نے جیب سے نوٹ نکالے۔ انھیں فضا میں لہرایا۔ "ایک سو چالی سے اوپر ہیں۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے افسردہ ہو گیا۔ "پتہ نہیں مرنے والا کون تھا۔ چنگا ہی بندہ تھا۔ اپنے لیے تو پتلون کی جیب میں یہ روپے چھوڑ گیا۔ کام بن گیا۔"

"اوپر سے راشن پانی کا بندوبست بھی ہو گیا۔ یار! میں کہتا ہوں' اس روز روٹی نکر نہ ملتا تو کیا ہوتا۔ ذرا سوچ' کیا ہوتا؟ چلا تک تو جا نہیں رہا تھا۔" رحیم داد نے بسکٹ کا پیکٹ لالی کی طرف

بڑھادیا اور بار بار انکار کے باوجود اصرار کر کے بچے ہوئے بسکٹ اسے کھلا دیے۔

مگر جب لالی نے پانی پینے کے لیے ڈبا اٹھا کر منہ سے لگایا تو مشکل سے چند قطرے نکلے۔ سخت کوفت ہوئی۔

بسکٹ کھانے سے گلا خشک پڑ گیا تھا۔ پیاس اچانک بڑھ گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی جیل کی وردی بھاری پتھر کے نیچے چھپائی۔ ٹین کا ڈبا اٹھا کر دور پھینکا اور رحیم داد کے ہم راہ غار سے نکل کر ناہموار ٹیلوں پر چلنے لگا۔

دونوں ایک بار پھر نشیب میں اتر رہے تھے۔ سامنے چاندنی میں جھلکتا ہوا ٹوبا تھا۔ آگے پل تھا اور سڑک ویران تھی۔ ٹوبے کے پاس پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ حادثے میں ہلاک ہونے والوں کی لاشیں اٹھائی جا چکی ہیں۔ البتہ کار کا جلا ہوا ڈھانچہ بدستور اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ اجلی چاندنی میں سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ لالی اور رحیم داد نے جھک کر ٹوبے سے پانی پیا' منہ ہاتھ دھوئے اور تروتازہ ہو کر آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتے ہوئے پل پر پہنچ گئے۔ دونوں کچھ دیر پل پر خاموش کھڑے رہے اور سوچتے رہے کہ انھیں کس سمت جانا چاہیے۔ مگر یہ فیصلہ لالی ہی کر سکتا تھا۔ رحیم داد ایسے موقعوں پر خاموش رہتا تھا۔ جدھر لالی چلتا' بغیر حیل و حجت اس کے پیچھے پیچھے چل دیتا۔ لیکن لالی بھی اس وقت تذبذب میں مبتلا تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں ہے؟ نہ یہ اندازہ تھا کہ کون سا راستہ دونوں کے لیے محفوظ رہے گا؟ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ چاند کی رنگت میں زردی آگئی تھی۔ پاک پتن روڈ بالکل سنسان تھی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ لالی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ اس نے رحیم داد سے مشورہ کیا۔

"رحیمے! اپنا تو کڑ کام نہیں کر رہا' تو بتا کدھر چلیں؟"

"میں نے کیا بتانا۔ جدھر کہے گا' تیرے سنگ چل دوں گا۔"

"پر تیں نوں کہیں تو جانا ہی ہو گا۔ تیرا تو گھر بار بھی ہے۔"

"ہے تو' تجھے بتا بھی چکا ہوں۔ گھر والی ہے۔ ایک چھوہری ہے۔ دو پت ہیں۔ چھوہری مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ یاد بھی بہت آتی ہے۔" رحیم داد اپنی بات کہتے کہتے غم زدہ ہو گیا۔ "مگر میں اس کے پاس کیسے جا سکتا ہوں۔ گھر جانے کے سارے رستے تو میں نے خود ہی بند کر دیے۔"

"یار تیرا تو پورا ٹبر ہے۔ میں نے یہ جھنجھٹ ہی نہیں پالا۔ تیری طرح کچھ یار دوست ہیں' انھی کے ساتھ گزرتی رہی۔"

یار دوستوں کے ذکر پر لالی کو شادو یاد آ گیا۔ اس کا بہت اچھا دوست تھا۔ عرصہ ہوا' وہ بھی اس کی

طرح جرائم پیشہ تھا۔ چوری اور رہزنی کرتا۔ کبھی اکیلے' کبھی لالی یا دوسروں کے ساتھ مل کر۔ ان کا باقاعدہ گروہ بن گیا۔ لالی بھی شادو کے ساتھ گروہ میں شامل تھا۔ انھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ بے جگری سے ڈاکے ڈالے۔ خوب گل چھرے اڑائے۔ مگر ایک تانگے والے کی مخبری پر پکڑے گئے۔ مقدمہ چلا۔ سزائیں ہوئیں۔ جیل سے نکلے تو گروہ تتر بتر ہو چکا تھا۔ شادو نے جیل کاٹنے کے بعد ایسی توبہ کی کہ پھر ادھر کا رخ نہ کیا۔ لیکن پولیس اسے برابر پریشان کرتی رہی۔ علاقے میں چوری' ڈاکہ زنی کی کوئی واردات ہوتی اسے ضرور تھانے میں بلایا جاتا۔ پوچھ گچھ ہوتی۔ ڈرایا' دھمکایا جاتا۔

اب شادو لائل پور میں رہتا تھا اور سائیکلوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اس نے شادی کر لی تھی۔ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ لالی اس سے برسوں نہ ملتا۔ مگر جب بھی ملتا' وہ ہمیشہ لالی کے ساتھ محبت سے پیش آتا۔ ایک بار لالی ڈاکے کی ایک واردات کے بعد دو ہفتے شادو کے گھر میں روپوش رہا۔ حالانکہ اس کی بیوی گھر میں لالی کے رہنے پر خوش نہیں تھی۔ ہر وقت کڑ کڑ کرتی رہتی۔ شادو کبھی اسے پیار سے سمجھاتا' کبھی ناراض ہوتا۔ آئے دن جھگڑا رہتا۔ لیکن شادو کی آنکھوں میں کبھی میل نہ آیا۔ وہ لالی کا ہر طرح سے خیال رکھتا۔

لالی پل پر کھڑا شادو کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کسی نہ کسی طرح شادو کے پاس لائل پور پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لائل پور جانے کے لیے لاری کے اڈے یا ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ضروری تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جیل سے فرار ہوئے اتنے دن ضرور ہو چکے ہیں کہ پولیس نے راستوں کی ناکہ بندی اور اسٹیشنوں کی نگرانی ختم کر دی ہو گی۔ لیکن سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ لباس تبدیل کرنے کے بعد لالی تو ہر جگہ پہنچ سکتا تھا مگر رحیم داد کی جیل کی وردی مسلسل خطرہ تھی۔ لالی کہیں جانے سے پہلے رحیم داد کو اس خطرناک وردی سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ صرف اسی صورت میں دونوں سفر کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ لالی کو یہ کام جلد سے جلد کرنا تھا۔

رحیم داد بھی کچھ دیر بھولی بسری یادوں میں کھویا رہا۔ مگر جب لالی گم صم کھڑا رہا اور آگے نہ بڑھا تو رحیم داد نے ٹوکا۔ "تو کس سوچ میں پڑ گیا؟ رات کم رہ گئی ہے۔"

لالی اس کی بات سن کر چونک پڑا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"پر توں کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟" رحیم داد نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

"کہیں تو چلنا ہی ہو گا۔ یہاں اس طرح کھڑا رہنا بھی خطرناک ہے۔"

لالی آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ چلا۔ دونوں پاک پتن روڈ پر کچھ دور تک چلتے رہے' پھر

نشیب میں اتر گئے اور جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ علاقہ بنجر اور ویران تھا۔ جگہ جگہ پھوگ اور لانا کے پودوں کے جھنڈ تھے۔ دونوں مغرب کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اب وہ پاک پتن روڈ سے بہت دور جا چکے تھے۔

۳

درختوں کے پیچھے کہیں کہیں روشنی جھلملا رہی تھی۔ کوئی بستی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ لالی اور رحیم داد آگے بڑھے۔ اب بستی کے نشان واضح ہوتے جا رہے تھے۔ چراغوں کی ٹمٹماہٹ بڑھ گئی تھی۔ اکاد کا مکان صاف دکھائی دے رہے تھے۔

دونوں نے نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے رڑ عبور کیا اور گاؤں میں داخل ہو گئے۔ گاؤں خاصا بڑا تھا۔ دور تک مکانوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ بیشتر مکانات مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ اکا دکا پختہ اور نیم پختہ تھے۔ مگر وہ مکانوں کے قریب نہ گئے۔

رحیم داد خوف سے سہما ہوا تھا۔ لیکن لالی چاق چوبند نظر آ رہا تھا۔ اس نے گردن گھما پھرا کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ رحیم داد کے ہم راہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا آگے بڑھا اور ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچ کر رک گیا۔ سامنے کچا مکان تھا جو گاؤں کے نکڑ پر تھا' اور دوسرے مکانوں سے الگ تھلگ بھی تھا۔

لالی چند لمحے ٹھہر کر آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں اس مکان کے نزدیک پہنچے اور دیوار سے لگ کر اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ لالی نے جھک کر اپنے جوتے اتارے اور رحیم داد کے حوالے کر دیئے۔ اس نے گردن اٹھا کر دیوار کی بلندی کا اندازہ لگایا۔ دیوار زیادہ اونچی نہ تھی۔ لالی نے دونوں ہاتھ بلند کئے۔ اچھلا اور ہاتھوں سے دیوار کا بالائی حصہ تھام لیا۔ وہ پیروں سے سہارا لیتا ہوا' دھیرے دھیرے اوپر پہنچ گیا۔ دیوار پر پہنچ کر اس نے اندر کا جائزہ لیا۔ ذرا دیر دیوار سے چپٹا ہوا جھانکتا رہا' پھر خاموشی سے صحن میں اتر گیا اور دیوار کے ساتھ دبک

کر بیٹھ گیا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ دیر تک جب کوئی کھٹکا نہ ہوا تو لالی اٹھا اور اس دروازے کی جانب بڑھا جو باہر گلی میں کھلتا تھا۔

لالی نے دروازہ کھولا۔ گردن باہر نکالی۔ آہستہ سے سیٹی بجائی اور ہاتھ کے اشارے سے رحیم داد کو اپنے قریب بلایا۔ رحیم داد اس کے پاس گیا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ لالی نے دروازہ بند کر دیا' مگر کنڈی نہیں لگائی۔ دروازے کے سامنے صحن تھا۔ ایک طرف شیشم کا پیڑ تھا۔ اس کے نیچے پتّل تھا جس میں ایک بھینس بندھی تھی۔ صحن سے ملا ہوا دالان تھا۔ اس پر پھوس کی خمیدہ چھت تھی۔ دالان کے عقب میں دروازہ تھا۔ اس کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

لالی نے رحیم داد کو بیرونی دروازے پر ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ خود ہولے ہولے چلتا ہوا دالان میں پہنچا اور دروازے سے لگ کر اندر جھانکنے لگا۔ کچھ دیر وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

چھت سے لالٹین لٹک رہی تھی۔ مگر اس کی روشنی دھیمی تھی۔ لالی نے ہلکی ہلکی روشنی میں دیکھا۔ دیوار کے پاس چارپائی تھی۔ اس پر بستر بچھا تھا۔ مگر بستر خالی تھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ ایک اور دروازہ بھی تھا۔ یہ ملحقہ کوٹھری میں کھلتا تھا۔ اس دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اندر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔

کمرے میں عجب نامانوس سی بو پھیلی تھی۔ ایسی بو' جو اس سے پہلے لالی نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس پراسرار بو نے کمرے کا ماحول آسیب زدہ بنا دیا تھا۔ کسی ان جانے خوف سے لالی کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ واپس چلا جائے۔ عین اسی وقت کوٹھری کے اندر گہری گہری سانسیں بھرنے کی سرسراہٹ ابھری۔ لالی نے آہستہ سے چاقو نکال کر کھولا اور کوٹھری کے دروازے کی جانب چوکنا نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایک منٹ گزرا' دوسرا گزرا۔ کوئی نہیں آیا۔ گہری گہری سانسوں کی سرسراہٹ بھی بند ہو گئی۔ لالی کی نگاہ لکڑی کے اس صندوق پر پڑی جو چارپائی سے ذرا ہٹ کر رکھا تھا۔

لالی نے صندوق دیکھتے ہی واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے ہاتھ اونچا کیا۔ لالٹین کی لو اور دھیمی کر دی۔ آگے بڑھا اور صندوق کے قریب جا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ صندوق کے کنڈے میں تالا پڑا تھا' مگر تالا کھلا تھا۔ اس میں کنجی بھی لگی ہوئی تھی۔ لالی کو کسی قدر حیرت بھی ہوئی۔ لیکن اس پر توجہ صرف کرنے کے بجائے اس نے آہستہ سے ایک ہاتھ سے ڈھکنا اٹھایا اور دوسرا ہاتھ

اندر ڈال کر کپڑے تلاش کرنے لگا۔ کپڑے نیچے تھے۔ اوپر ایک موٹی کھیس تہ کر کے رکھی گئی تھی۔

لالی نے ایک کپڑا نیچے سے نکالنے کی کوشش کی' اچانک اسے اپنی پشت پر آہٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی آواز آئی۔

"وے کون ہے؟"

لالی نے پلٹ کر دیکھا' کوٹھری کے دروازے کے بیچوں بیچ ایک عورت کھڑی ہے۔ اس کے بال بکھر کر چہرے پر آ گئے تھے۔ آنکھیں جنگلی کبوتر کی مانند گہری سرخ تھیں۔ اس کے داہنے ہاتھ میں چھری تھی اور خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ دھندلی روشنی میں عورت خوں خوار اور ڈراؤنی نظر آ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ لالی کی جانب بڑھی۔ لالی اسے دیکھ کر سخت حواس باختہ ہو گیا۔ صندوق کے اندر پڑا ہوا ہاتھ بھی باہر نہ نکال سکا۔ جس حالت میں تھا' اسی حالت میں دم بخود بیٹھا رہا۔ لالی کو خاموش دیکھ کر عورت گرجی۔

"سور دے پتر' چوری کرنے آیا تھا؟"

لالی کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی جانب دیکھ بھی نہ سکا۔ اس نے گردن جھکا لی اور خاموشی سے فرش تکنے لگا۔ عورت اس کے سر پر آ کر کھڑی ہو گئی اور اسی درشت لہجے میں بولی۔ "تیرے بھی ٹوٹے کر کے اسی کے برابر لٹا دوں گی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کوٹھری کی جانب اشارہ کیا۔

"دیکھے گا؟ چل دیکھ لے' کھڑا ہو۔"

لالی چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ عورت نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور کوٹھری کے دروازے کی جانب انگلی اٹھا کر بولی۔ "اتھے چل۔" لالی اس کی ہدایت پر سرکس کے سدھے ہوئے جانور کی طرح لڑکھڑاتے قدموں دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچا تو عورت نے ڈپٹ کر کہا۔

"اندر ٹر جا۔"

لالی خاموشی سے اندر چلا گیا۔ عورت بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی۔ کوٹھری صاف ستھری تھی۔ طاق میں چراغ بھی جل رہا تھا۔ اس کی زرد زرد روشنی میں سامنے چٹائی پر کوئی لیٹا تھا۔ اس کا پورا جسم چادر سے ڈھکا تھا۔ عورت نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ لالی نے دہشت زدہ ہو کر دیکھا' اس کی گردن کٹی ہوئی ہے۔ ہلکی ہلکی نامانوس بو اچانک تیز ہو گئی۔ مقتول کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس قدر ڈراؤنی تھیں کہ لالی نظر بھر کر نہ دیکھ سکا۔ عورت' لاش کے

سرہانے بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھی۔ لالی سہما ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"اسے کس نے قتل کر دیا؟"

"کون کرے گا اسے قتل؟" عورت نے لالی کو سرخ سرخ آنکھوں سے گھورا اور پاگلوں کی طرح سینے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "اسے میں نے قتل کیا ہے' ہاں میں نے کیا ہے۔" اس نے خون سے آلودہ چھری لالی کے سامنے کر دی۔ اس نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "یہ بھی پچھ۔ یہ کون ہے؟" اس نے قدرے توقف کیا۔ "یہ میرا یار ہے۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ عورت نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ ابھی تک گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔ لالی اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی عمر کی اس سرحد پر تھی جب جوانی کی دوپہر کا سورج ڈھلنے لگتا ہے۔ اس کے ہاتھ سخت اور کھردرے تھے۔ جسم کسا ہوا اور مضبوط تھا۔ چہرہ کڑی محنت اور تیز دھوپ سے سنولا کر صندلیں ہو گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں بجھ کر دھندلا گئی تھیں۔ چراغ کی دھندلی دھندلی روشنی میں لالی کو اب وہ نڈھال اور تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کوٹھری کے ایک کونے میں مٹکا رکھا تھا اور اس پر المونیم کا گلاس بھی تھا۔ لالی نے رسان سے کہا۔

"پانی پی لے۔"

"پلا دے۔" عورت نے لالی کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ اس دفعہ اس کے لہجے میں پہلے جیسی درشتی نہیں تھی۔

لالی نے مٹکے کا ڈھکنا اٹھا کر گلاس اندر ڈالا اور پانی سے بھرا ہوا گلاس بڑھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ پورا گلاس اس طرح غٹاغٹ پی گئی گویا بہت دیر سے پیاسی ہو۔ پانی پینے کے بعد اس کے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت کم پڑ گئی۔ اس نے دیوار سے پیٹھ ٹکالی اور چند لمحوں تک آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی۔ مگر جلد ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور کھوئی کھوئی نظروں سے لاش کو دیکھنے لگی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ "دیکھ تو کیسا گبھرو ہے۔"

لالی نے لاش کے چہرے کی جانب ایک بار پھر دیکھا۔ گھونگر والے لمبے لمبے بال' کھلتی ہوئی رنگت' تیکھے نقش و نگار اور مڑی ہوئی طرح دار مونچھیں۔ واقعی وہ بڑا وجیہہ اور بانکا جوان تھا۔ عورت رک رک کر کہتی رہی۔ "اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ پہلے اتنا سوہنا تھا۔ ایسا رنگ روپ تھا' ہاتھ لگاؤ تو میلا پڑ جائے۔ کوئی دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔" عورت اس کے ذکر میں لذت محسوس کر

رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی رفتہ رفتہ ہلکی پڑتی جا رہی تھی۔ "اس کی میری یاری آشنائی ہو گئی۔ جانے کیسے ہو گئی۔ بس ہو گئی' پھر سب ہی کچھ ہوا' وہی جو ہوتا ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جب بہت بدنامی ہوئی تب میں ایک رات اس کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔ ہائے کیسی کالی رات تھی۔ اسی رات میں جہانگیرہ آ گئی۔ اس پنڈ کا نام جہانگیرہ ہے۔" وہ لاش کو دیکھتی رہی اور اس طرح ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ بولتی رہی جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔

لالی نے اس کا بدلا ہوا انداز اور دھیما لہجہ محسوس کیا۔ "تو نے اس کا خون کیوں کر دیا؟"

عورت نے چونک کر اس طرح حیرت سے لالی کو دیکھا جیسے اسے یکسر فراموش کر چکی ہو۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے لالی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر لالی نے اسے خاموش نہیں رہنے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ عورت سب کچھ کہہ ڈالے۔ وہ ساری باتیں کہہ دیتی تو ٹھنڈی پڑ جاتی۔ نہ اس کی آنکھیں خون خوار رہتیں نہ چہرہ ویران نظر آتا۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک بار حوالات میں اس کے ساتھ ایک قاتل بھی بند تھا۔ وہ ساری رات جاگتا تھا۔ کھا جانے والی نظروں سے گھورتا تھا۔ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتا تھا۔ دوسرے ملزموں کا گلا گھونٹنے کے لیے جھپٹتا تھا۔ مگر جب اس نے پولیس کے سامنے سب کچھ اگل دیا تو واپسی پر حوالات میں آ کر دھڑام سے فرش پر گر گیا۔ مردے کی طرح ٹھنڈا پڑا رہا۔ ایسی گہری نیند سویا کہ دوسرے روز' زور زور سے جھنجھوڑنے پر جاگا۔

لالی نے اصرار کر کے عورت سے پوچھا۔ "بولتی کیوں نہیں؟ تو نے اس کا خون کیوں کر دیا؟"

"یہ نہ پچھ۔" عورت کی آنکھوں میں ایک بار پھر شعلے بھڑکنے لگے۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگی۔ "اس نے میری طرف سے آنکھیں بند کر لیں' مجھے دھوکا دیا۔" وہ گلہ کرنے کے انداز میں کہنے لگی۔ "میں نے اس کے کارن گھر بار چھوڑا۔ اپنے دونوں نکے چھوڑے۔ گھر والے کو چھوڑا۔ وہ برا بندہ نہیں تھا۔ جان چھڑکتا تھا مجھ پر۔ جو کہتی کرتا تھا۔ بس ذرا..." اس نے نہایت بے باکی سے گالی دی اور سامنے پڑی ہوئی لاش کی جانب اشارہ کر کے نفرت اور غصے سے منہ بگاڑا۔ "یہ دھوکے باز نکلا۔ ایک دم ہڈ حرام' نہ کام کا نہ کاج کا۔ ہر وقت مانگ کاڑھتا' مونچھیں مروڑتا' آڑا ترچھا ہو کر آئینہ دیکھتا۔ گلیوں میں اینڈتا پھرتا۔ شہر جا کر روز سینما دیکھتا۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں لیا۔ اپنے زیور اور کپڑے لتے بیچ کر ایک گئو خرید لی۔ دن رات محنت کرتی۔ لمبردار کی حویلی میں کام کاج کرتی۔ اپنا پیٹ پالتی اور اس کے نخرے بھی پورے کرتی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "اس کے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ اپنی ذرا بھی پروا نہ کی۔ میں ایسی نہ تھی۔ میرا ایسا روپ رنگ

نہ تھا۔ سب کچھ جل کر کوئلہ ہو گیا اور اس نے مجھے کیا دیا؟ میرا خانہ خراب کر کے کہیں اور آنکھ لڑالی۔"

عورت بات کرتے کرتے رک گئی۔ لاش کو گھورنے لگی۔ اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "کہتا تھا شاداں! تیرے بنا زندہ نہیں رہ سکتا۔ ریل کے نیچے لیٹ جاؤں گا۔ گلے میں پھندا ڈال کر مر جاؤں گا۔" عورت کے لہجے میں تلخی بڑھتی گئی۔ اس کا چہرہ وحشت ناک ہو گیا۔ "جھوٹا' مکار۔ مجھے چھوڑ کے اس کنجری کے ساتھ چپکے سے نکاح کر لیا۔ بھنوں نہ آتا۔ جب آتا' ہتھ پھیلائے ہوئے۔ کچھ لیے بنا نہ ٹلتا۔ میں جان بوجھ کر دھوکا کھاتی رہی۔"

وہ خاموش ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود چھری ابھی تک دبی ہوئی تھی۔ مگر لالی کو اب اس سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ عورت اپنا خول توڑ کر آہستہ آہستہ باہر آرہی تھی۔

لالی چاہتا تھا کہ وہ کچھ بھی اپنے دل میں نہ رکھے۔ ہر بات کہہ ڈالے۔ کھرے سکے کی طرح ٹن ٹن بولنے لگے۔ لالی نے اسے کریدا۔

"یہ تو بتا' آج کیا ہوا؟"

وہ کھوئی کھوئی نظروں سے لالی کو دیکھتی رہی' پھر دھیرے دھیرے کہنے لگی۔ "آج شام' پورے تین مہینے بعد آیا تھا۔ پہلے تو ڈھیر سارا پیار جتایا۔ وہی ایکٹروں والی فلمی باتیں۔ روز روز سینما جو دیکھتا تھا۔ کہنے لگا' اپنی ٹُک بیچ دے۔ اسے ادھار چکانا تھا۔ میں نے بار بار انکار کیا۔ وہ نہ مانا۔ اپنی ہی کہتا رہا۔ مجھے ایک دم سے آگیا۔ اٹھی اور جھلیانی سے چھری نکال لائی۔ چھری اس کے سامنے ڈال کر بولی۔ توں نے میرا خانہ خراب ہی کرنا ہے تو یہ چھری لے اور میرے گلے پر چلا دے۔ میں جیتے جی تو اپنی ٹُک بیچوں گی نہیں۔" وہ لمحے بھر رک کر بولی۔ "ایمان نال بتا' اپنی ٹُک بیچ دوں گی تو میرا کیا بنے گا۔"

بات ادھوری ہی چھوڑ کے وہ پھر خاموش ہو گئی۔

لالی نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔ "شاداں! تیرا نام شاداں ہی ہے نا؟ تو چبا چبا کر کیوں بات کرتی ہے۔ یہ بتا' اس کا خون کیوں کر دیا؟" وہ رفتہ رفتہ بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔

"اس نے ایک ایسی بات کی' میں غصے سے پاگل ہو گئی۔" شاداں اپنی بات کہتے کہتے ایک بار پھر ہنسی۔

"میں نے تجھے اس کا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "ہو گا کوئی نام۔"

"بالا۔" اس نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ پڑا ہے بالا۔ اب تو بس نام ہی رہ گیا ہے۔"

لالی بیزاری سے بولا۔ "اس کا منہ ڈھک دے۔ آگے بتا۔"

شاداں نے جھک کر بالا کی لاش کا چہرہ چادر سے ڈھک دیا۔ "ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ چھری دیکھ کر وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ جب ہنس چکا تو منہ ٹیڑھا کر کے بولا۔ بوڑھی ڈھگی کے گلے پر تو کسائی چھری چلاتا ہے۔ میں ایسا کام نہیں کرتا۔ کسائی کے پاس چلی جا۔ ٹُک میرے حوالے کر دے۔ سنا توں نے' اس نے کیا کہا؟" وہ لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "اس نے مجھے بوڑھی ڈھگی کہا۔ کیا میں بوڑھی ڈھگی لگتی ہوں؟" اس کا چہرہ بجھ کر دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے گہری سانس بھری اور تڑپ کر بولی۔

"ہاں میں بوڑھی ڈھگی ہی لگتی ہوں۔ پر بوڑھی ڈھگی بھی تو میں اسی کے ہاتھوں بنی۔ اس نے میرا سب کچھ چھین لیا اور آنکھیں بھی پھیر لیں۔ ایک نمبر کنجر نکلا۔"

شاداں کی آنکھیں پھر خوں خوار ہو گئیں۔ اس نے چھری مضبوطی سے پکڑ لی۔ "میں کچھ نہ بولی۔ چھری اٹھائی اور روتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس نے مجھے روکا بھی نہیں۔ آئینہ اٹھا کر اپنا حسن دیکھنے لگا' مونچھیں مروڑنے لگا۔ میں دیر تک اندھیرے میں بیٹھی روتی رہی۔ نہ وہ باہر آیا نہ میرے آنسو پونچھے۔ واپس آئی تو بستر خالی تھا۔ کوٹھری میں جا کر دیکھا تو آرام سے سو رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ سونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ بوڑھی ڈھگی کے ساتھ کیوں سوتا؟"

"فیر کیا ہوا؟" لالی نے بے قراری سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ میں کھڑی اسے گھورتی رہی۔ فیر دھیرے دھیرے اس کے پاس گئی اور سرہانے بیٹھ گئی۔ وہ اسی طرح آرام نال سوتا رہا۔ میں نے جل کر چاہا اس کے منہ پر تھوک دوں' پر میں نے تھوکا نہیں۔ چھری ہاتھ میں دبی تھی۔ اس کی گردن پر پھیر دی۔ پورا گلا کاٹ دیا۔" یہ کہہ کر جیسے اس پر غشی طاری ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سر دیوار سے ٹکا لیا۔ وہ بے سدھ پڑی ہولے ہولے سانسیں لے رہی تھی۔

کوٹھری میں گہری خاموشی چھا گئی۔ فضا میں خون کی بو بسی ہوئی تھی۔

لالی جلد ہی اس خاموشی سے اکتا گیا۔ "اب تیں نوں کیہ کرنا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" شاداں آنکھیں کھول کر رسان سے بولی۔ اس کی آواز اس قدر مبہم تھی' جیسے گھڑے کی اندر منہ ڈال کر بول رہی ہو۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"بتا' کیا کروں؟"

لالی نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ شاداں کی بڑی بڑی آنکھوں پر لمبی لمبی پلکوں کے سائے چھائے ہوئے تھے۔ چہرہ پچھلی رات کا چاند بن گیا تھا۔ اس وقت وہ اس شاداں سے قطعی مختلف تھی' جو کچھ دیر پہلے لالی کے سر پر خون سے لتھڑی ہوئی چھری تانے کھڑی تھی۔ جس کی آنکھوں میں شعلے دہکتے تھے' چہرے پر وحشت برستی تھی۔ لالی کو اب وہ ایسی عورت نظر آئی جو جوان تھی' سرکش تھی اور اپنی سفاکی کے باوجود قابل رحم بھی تھی۔ اسے شاداں سے لگاوٹ کی حد تک ہمدردی پیدا ہو گئی۔

"ایک بات کہوں' مان لے گی؟"

"بول۔" شاداں نے آہستہ سے کہا۔

"میرے ساتھ بھاگ چل۔"

"تیرے ساتھ بھاگ چلوں؟" شاداں نے غصے سے اسے گھورا۔ "صورت دیکھی ہے اپنی۔ آخ تھو۔" اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی کھسیانا ہو کر بولا۔ "اتّا برا کیوں مانتی ہے؟ میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا تھا۔"

وہ اسے قہر آلود نظروں سے گھورتی رہی' پھر تیوری پر بل ڈال کر بولی "وے دلّے' توں نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ میں کوئی کنجری ہوں؟" اس نے چھری لالی کے سامنے کر دی۔ "یہ چھری دیکھی ہے؟"

مگر لالی اس کی دھمکی سے مرعوب نہیں ہوا۔ "زیادہ اکڑ نہ دکھا۔ یوں بیٹھی رہے گی تو سدھی جیل جائے گی۔"

وہ اسی طرح تیکھے لہجے میں بولی۔ "جیل چلی جاؤں گی پر تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"نہ جا' ہرگز نہ جا۔ بھول جا یہ بات۔ اپنے یار بالے کو بھی بھول جا۔ آگے کی سوچ۔"

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ توں جا یہاں سے۔"

لالی ڈھٹائی سے بولا۔ "میں تو نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں جائے گا؟" وہ چھری تان کر غصے سے لالی پر جھپٹی۔ "آنکھیں نکال لوں گی تیری۔" لالی نے جھٹ اس کی کلائی زور سے دبوچ لی۔ وہ بلبلا کر بولی۔ "کنجر! میرا ہتھ چھوڑ۔"

لالی نے چھری چھین لی' اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "بول اب کیا کہتی ہے؟" شاداں نے کوئی جواب

نہیں دیا۔ وہ اپنی ہزیمت پر غصے سے ہانپنے لگی۔

"دل سے میل نکال دے۔ میں اتنا برا بندہ نہیں ہوں جتنا تو سمجھ رہی ہے۔" لالی نے توقف کیا۔ "جو ہونا تھا' ہو گیا' آگے کی سوچ' آگے کی۔"

"میں نے ٹھیک نہیں کیا۔" وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "نہ بیچ دیتی تو کیا ہو جاتا؟"

"تو خود کو بھی بیچ دیتی' تب بھی وہ تیرا نہ بنتا۔"

"سچ کہہ رہا ہے۔ پر میں اب کیا کروں۔ مجھے اب کچھ بھی چنگا نہیں لگتا۔ سب کچھ مک گیا۔ سارا کھیل ختم ہو گیا۔"

لالی نے اس کی دکھتی رگ چھیڑی۔ "تجھے اپنے بچے یاد نہیں آتے؟"

"آتے ہیں' بہت یاد آتے ہیں۔" ماتا کا جذبہ جاگ اٹھا۔ وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اب تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئے۔ جو نصیب میں لکھا ہے' پورا ہو گا۔"

"نصیب کو چھوڑ۔ ہوش سے کام لے۔"

وہ بے بسی سے بولی۔ "کچھ سمجھ نہیں آتی' کیا کروں؟"

"میرا کہا مان۔" لالی نے بالے کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "زمین کھود کر اسے یہیں دبا دے۔" لالی نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دور سے اذان بلند ہوئی۔ لالی گھبرا کر بڑبڑایا۔ "صبح ہو گئی۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شاداں نے ٹوکا۔ "کہاں جائے گا؟ یہیں ٹھہر جا۔ میں اکیلے زمین کیسے کھودوں گی۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ رحیم داد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ چند لمحے خاموش کھڑا رہا' پھر وہ دروازے کی جانب لپکا۔ شاداں نے پوچھا۔ "نہیں رکے گا؟ اب تو اجالا ہو گیا۔" اس نے کوٹھری کے روشن دان سے پھوٹتی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "رات کو اندھیرے میں چلا جاتا۔" اس کے انداز میں دبی دبی عاجزی تھی۔

"تو کہتی ہے تو نہیں جاؤں گا۔ باہر میرا ساتھی بیٹھا ہے۔ اسے لے کر آتا ہوں۔"

لالی باہر چلا گیا۔ کمرے سے گزر کر آنگن میں پہنچا۔ اس نے دیکھا' رحیم داد دروازے کے برابر دیوار سے پیٹھ ٹکائے گہری نیند سو رہا ہے۔ لالی نے قریب پہنچ کر اسے جھنجوڑا۔ رحیم داد نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ کھسیانا ہو کر بولا۔ "یار! اونگھ آ گئی تھی۔ توں نے دیر بھی تو کتنی لگا دی۔" اس نے صبح کی ہلکی ہلکی روشنی دیکھی تو ایک دم گھبرا گیا۔

"صبح ہو گئی۔ اب کیا ہو گا؟"

"ٹھیک ہی ہو گا۔ ہم نے اب کہیں نہیں جانا۔ یہیں ٹھہریں گے۔"

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر لالی کو دیکھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

لالی نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔ "میرے ساتھ آ۔"

دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کوٹھری کے دروازے پر پہنچے۔ شاداں ابھی تک اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ لاش کے چہرے سے اس نے چادر اٹھا دی تھی اور کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

رحیم داد نے لاش دیکھی اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھیں تو سراسیمہ ہو کر دروازے پر ٹھہر گیا۔ حیران و پریشان ہو کر بولا۔ "یار! یہ کیا چکر ہے؟"

لالی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑھ کر چادر اور سرکا دی۔ رحیم داد نے دھندلی روشنی میں لاش کا کٹا ہوا گلا دیکھا تو خوف سے آنکھیں اور پھٹ گئیں۔ لالی نے لاش کا چہرہ چادر سے ڈھکتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "دیکھ لیا تو نے؟ یہ چکر ہے۔" رحیم داد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ دم بخود کھڑا رہا۔ لالی نے شاداں کی طرف نظریں اٹھائیں۔

"کھڑی ہو۔ بہت ہو چکا سیاپا۔"

مگر شاداں وہیں بیٹھی رہی۔ "مجھے یہیں بیٹھا رہنے دے۔ توں باہر جا۔" اس نے لاش کے چہرے سے پھر چادر ہٹا دی۔ رحیم داد اس کی ڈراؤنی آنکھیں نہ دیکھ سکا۔ پریشان ہو کر کوٹھری سے باہر چلا گیا۔

لیکن لالی اپنی جگہ کھڑا رہا۔ شاداں بڑبڑانے لگی۔ "وہی آنکھیں' وہی چکتا متھا' وہی چھلے دار بال۔" وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا کرنے لگی اور لالی کی جانب دیکھے بغیر بولی۔ "لگتا ہے ابھی ابھی سویا ہے۔" وہ جھکی ہوئی اس کا چہرہ تکتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور بالے کے بے جان چہرے پر بکھرنے لگے۔ وہ بے قرار ہو کر اس کا ماتھا' اس کے ہونٹ چومنے لگی۔ اس نے سینے پر دوہتڑ مارا اور دل دوز آہ بھر کر زور سے چیخی۔ "ہائے ربا' میں مر گئی۔" وہ لاش کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کوٹھری کی دھندلی روشنی میں گھٹی گھٹی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

یکایک چراغ زور سے بھڑکا۔ کوٹھری کی دیواروں پر پرچھائیاں لہرائیں اور چراغ بجھ گیا۔ اندھیرا ہوتے ہی لالی اس طرح چونکا گویا سوتے سوتے آنکھ کھل گئی ہو۔ اس نے بوجھل آواز سے شاداں کو مخاطب کیا۔ "شاداں! اب اٹھ جا۔ بہت کر چکی پٹنی۔ وکھت کم ہے' ابھی بہت کام کرنا ہے۔"

شاداں پھر بھی نہ اٹھی۔ سسکیاں بھرتی رہی۔ لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ "اٹھتی ہے کہ نہیں۔" شاداں چپ چاپ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لالی نے جھک کر بالے کے مردہ چہرے پر چادر ڈال دی۔ دونوں کوٹھری سے باہر آگئے۔

رحیم داد کمرے میں گم صم کھڑا تھا۔ اس نے دونوں کو دیکھا مگر کوئی بات نہیں کی۔ لالی نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا' کنڈی لگائی۔ شاداں کمرے کے ایک گوشے میں دیوار سے پیٹھ ٹکا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں اور کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ راکھ بن گیا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں اور ابھی تک سرخ تھیں۔ لالی نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ کمرے سے نکل کر باہر آنگن میں گیا اور بیرونی دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ اب ہر سو صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ گھروں سے ملی جلی آوازوں کا شور آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ رات بھر کا سویا ہوا گاؤں بیدار ہو رہا تھا۔

لالی کمرے میں واپس آیا۔ رحیم داد خاموش کھڑا تھا اور شاداں اسی طرح کھوئی کھوئی بیٹھی تھی۔ ں نے لالی کی جانب نظریں اٹھائیں۔ مگر لالی خاموش نہ رہا۔ اس نے شاداں کو مخاطب کیا۔

"یہ کپڑے تو بدل۔ جا فٹا فٹ نہا لے۔"

لیکن شاداں اٹھنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ بیزاری سے بولی۔ "میں نوں کہیں نہیں جانا۔ یہیں بیٹھا رہنے دے۔ بہت تھک گئی ہوں۔"

"کیا چاہتی ہے؟ اگر تجھے جیل ہی جانا ہے تو مجھے کیوں روکا؟" شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ی نے ڈپٹ کر کہا۔ "بولتی کیوں نہیں؟"

شاداں نے گردن اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ "کیا بولوں؟"

"جو کہہ رہا ہوں' وہ کر۔ کپڑے بدل لے۔ ۓ کو پھاڑ تھا دے۔ ہمیں بھی روٹی کھلا۔ سخت بھوک ہے۔ پہلے پانی پلا۔"

شاداں نے اس کی ساری باتیں خاموشی سے سنیں۔ اٹھی' باہر گئی اور کٹورے میں پانی بھر کر ۔ لالی نے کٹورا لیا اور غٹا غٹ پانی پینے لگا۔ شاداں نے صندوق سے کپڑے نکالے اور بغل دبا کر کمرے سے چلی گئی۔ رحیم داد کھسک کر لالی کے قریب پہنچا اور آہستہ سے پوچھا۔ "یار! یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ سخت پریشان تھا۔

"وہی جو دیکھ رہا ہے۔"

رحیم داد بے زاری سے بولا۔ "مخول نہ کر۔ صاف صاف بتا' معاملہ کیا ہے! پتہ سمجھ نہیں

آئی۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کو رکا اور کوٹھری کے دروازے کی جانب اشارہ کر کے بولا۔

"اسے تو نے قتل کیا ہے؟"

"گھاس تو نہیں کھا گیا؟ میں کیوں قتل کرنے لگا۔ خون کس کے ہاتھ اور کپڑوں پر لگا ہے؟ تجھے اتنا بھی دکھائی نہیں دیتا؟"

"تیرا مطلب ہے' اس زنانی نے کیا ہے؟" اس نے گردن موڑ کر باہر آنگن کی جانب دیکھا۔ شاداں وہاں نہیں تھی۔ رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔

"یہ تو بہت ظالم ہے۔"

"وہ اس سے بھی زیادہ ظالم تھا۔"

"ہوگا' مجھے تو یہ بہت خطرناک لگتی ہے۔ آنکھیں دیکھیں ہیں' کیسی لال لال انگارا ہیں۔"

"دُرست۔ ابھی اس کے سر پر خون سوار ہے۔ نہالے گی تو اتر جائے گا۔"

"گھر والا تھا اس کا؟"

"نہیں' اس کا یار تھا۔" لالی نے تفصیل سے ایک ایک بات رحیم داد کو بتادی وہ سب کچھ سن چکا تو پریشان ہو کر گویا ہوا۔ "یہ بتا' اب کرنا کیا ہے؟"

"زمین کھود کر لاش دبانی ہے۔"

رحیم داد سہما ہوا تھا۔ "یار! کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ شاداں مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔"

"تو اسے نہیں جانتا۔ وہ ایسی ویسی زنانی نہیں ہے اور اگر بری ہے بھی تو اپنا کیا لے گی۔ اب تو اس کی ٹانگ بھی ہمارے ہی ساتھ بندھی ہے۔ چند روز یہاں چھپے رہیں گے۔ فیر آگے جانے کا پروگرام بنائیں گے۔ اس غار سے تو چنگی ہی جگہ ہے۔ روٹی بھی کھانے کو مل جائے گی اور کپڑے لتے بھی آرام سے مل جائیں گے۔"

دونوں چارپائی پر بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرنے لگے۔

شاداں کمرے میں واپس آگئی۔ وہ ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ اس کے گیلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر تازگی تھی۔ اجلے لباس میں وہ رات والی شاداں سے مختلف لگ رہی تھی۔ نہ آنکھوں میں خون خوار چمک تھی نہ چہرے پر وحشت۔ اس کے ایک ہاتھ میں خون آلود کپڑے دبے تھے۔ لالی نے کپڑے اس سے لیے اور کوٹھری کی کنڈی کھول کر سارے کپڑے اندر ڈال دیئے۔ جب وہ کوٹھری کا دروازہ بند کر کے دوبارہ کنڈی لگا رہا تھا تو شاداں نے پوچھا۔

"میرے کپڑے لتے وہاں کیوں ڈال دیئے؟"

"لاش کے ساتھ ہی انھیں بھی دبا دوں گا۔ چھری بھی رکھ دوں گا۔"

شاداں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟" پھر ذرا توقف سے بولی۔ "چھری تو دے دے۔ مجھے اس کی ضرورت ہوگی۔"

لالی بے پروائی سے بولا۔ "دوسری لے آنا۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں' کرنے دے۔ بیچ میں اپنی ٹانگ نہ اڑا۔"

شاداں نے خاموشی سے اس کی بات مان لی۔ "جیسی تیری مرضی" وہ دروازے کی جانب مڑی۔ "میں تم دونوں کے لیے روٹی ٹکر لے آؤں۔"

لالی نے پوچھا۔ "تمیں نوں کہیں دودھ تو نہیں پہنچانا؟"

"دودھی کو پہنچانا تو ہے۔ بعد میں پہنچا دوں گی۔ فکر نہ کر۔"

"نہیں' پہلے دودھ پہنچا دے۔ ہر کام ویسے ہی کر جیسے روز کرتی ہے۔ ہماری پروا نہ کر۔ ہم بعد میں بھی روٹی کھا لیں گے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کے لیے رکا۔ "گھر میں کوئی کدال ہوگی؟"

"کدال تو ہے۔"

"بیلچا بھی ہوگا؟"

"نہیں' بیلچا نہیں ہے۔ پڑوس سے لے آؤں گی۔ ابھی لائی۔" شاداں دروازے کی جانب بڑھی۔

لالی نے فوراً ٹوکا۔ "ٹھہر جا شاداں! رہنے دے' بیلچے کے بغیر ہی کام چل جائے گا۔"

"پر اس میں ہرج کیا ہے!"

"بہت ہرج ہے۔ تو یہ باتیں نہیں سمجھتی۔ جیسا کہتا ہوں' ویسا کر۔ میرا کام مجھ پر چھوڑ دے۔ توں اپنا کام کر۔ منہ کیا تک رہی ہے میرا؟ جا کدال اور ایک ٹوکری لے آ۔"

شاداں باہر چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کدال اور ٹوکری لے کر واپس آگئی۔ لالی نے کدال اور ٹوکری سنبھال کر رحیم داد سے کہا۔ "آ یار! تھوڑی سی کھدائی کر لیں۔ فیر اطمینان سے روٹی کھائیں گے۔"

"پہلے کچھ کھا پی تو لے۔" شاداں نے اصرار کیا۔

"کھا لیں گے' تو پہلے اپنا روز کا کام نمٹا لے۔ اور ہاں باہر جانا تو دروازے میں تالا ضرور ڈال

دینا۔" لالی نے چھت سے لٹکی ہوئی لالٹین اتاری' جو ابھی تک روشن تھی۔ اس نے لالٹین ہاتھ میں سنبھالی اور رحیم داد کے ہم راہ کوٹھری میں چلا گیا۔

اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ لالٹین کی بتی اونچی کر دی۔ روشنی بڑھی اور پھیلی تو فرش پر چادر سے ڈھکی ہوئی لاش نظر آئی۔ رحیم داد خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ مگر لالی نے لاش کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ اطمینان سے کدال اٹھا کر آہستہ آہستہ زمین کھودنے لگا۔ رحیم داد ٹوکری میں مٹی بھر کر ایک طرف ڈالنے لگا۔

زمین توقع کے خلاف اندر سے سخت نکلی۔ ایک بار لالی نے کدال چلائی تو زور سے ٹن کی آواز آئی۔ لالی نے ہاتھ روک لیا۔ جھک کر دیکھا تو ایک بھاری پتھر اڑا تھا۔ اسے نکالنے میں لالی اور رحیم داد پسینے پسینے ہو گئے۔ ذرا دم لینے کو رکے تھے کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی شاداں کی آواز ابھری۔

"دروازہ کھول۔ میں ہوں شاداں۔"

لالی نے دروازہ کھول دیا۔ رحیم داد کے ہم راہ باہر آ گیا۔ دونوں بہت تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

شاداں نے آہستہ سے پوچھا۔ "ہو گیا کام؟"

لالی منہ بگاڑ کر بولا۔ "اتنی جلدی کیسے ہو جائے گا کام۔ کیا تو نے ہمیں گورکن سمجھ رکھا ہے؟"

"منہ ہاتھ دھو لو۔ میں ابھی تمہارے لیے روٹی لاتی ہوں۔"

دونوں باہر آنگن میں گئے اور کنوئیں سے پانی نکال کر منہ ہاتھ دھونے لگے۔ اب ہر طرف زرد زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گلی میں بچے شور مچا رہے تھے۔ کہیں قریب دو عورتیں چیخ چیخ کر لڑ رہی تھیں۔

رحیم داد نے یہ آوازیں سن کر بیرونی دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ بند تھا اور زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔ دونوں آنگن میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ کمرے کے اندر آ کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔

انھیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شاداں ناشتا لے کر آ گئی۔ ناشتے میں روٹی تھی' ساگ تھا۔ مٹی کی ٹھوٹھی میں تازہ تازہ مکھن تھا اور دو گلاسوں میں لسی تھی۔ دونوں کو سخت بھوک لگی تھی۔ وہ کھانے پر پل پڑے۔ شاداں ان کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اصرار کر کے کھانا کھلانے لگی۔ بار بار مکھن نکال کر روٹی پر ڈال دیتی۔ اپنی بھینس کی اور اس کے دودھ کی تعریف کرتی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال سنوار لیے تھے۔ اس کے چہرے پر ہلکا ہلکا دکھ کا سایہ تھا۔ آنکھوں میں جلتے بجھتے

چراغ روشن تھے۔ اس کے جسم سے پسینے کی ہلکی ہلکی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہ لالی کے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ اتنے قریب کہ لالی اس کے جسم کی مہک محسوس کر سکتا تھا۔ لالی کو اس کا اس طرح سامنے بیٹھ کر چاؤ سے کھانا کھلانا بہت اچھا لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی کھا گیا۔

اس نے لسی کا پورا گلاس چڑھایا اور زور سے ڈکار لی۔ "مزا آ گیا۔" اس نے مڑ کر شاداں کو دیکھا۔ وہ بڑی طرح دار عورت تھی۔ اس کے چہرے پر ڈھلتی دھوپ کی جگمگاہٹ تھی۔ شاداں نے گردن کو خم دے کر دروازے کی جانب دیکھا۔ لالی کو شاداں کا یہ انداز بھا گیا۔ مسکرا کر اس سے مخاطب ہوا۔ "شاداں! تو بہت زور آور ہے۔ سوہنی بھی ہے۔ کیا بات ہے تیری۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے رکا۔ "سچ جان۔ بالا تجھے پہچان نہیں سکا۔ بچ اور گھنیا تھا۔"

شاداں نے جھٹ لالی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسی بات مت کر۔" اس کا ہاتھ کھردرا اور سخت تھا' لہجہ بھی کھردرا تھا۔

"توں میرے سامنے ایسی گل نہیں کہہ سکتا۔"

"وہ تجھے بھی مج سمجھتا تھا۔ دودھ دینے والی مج۔ بوڑھی ہو جائے تو کسائی کے کھونٹے سے باندھ دو۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

شاداں کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔ تلملا کر چیخی۔ "یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ توں کون ہوتا ہے بولنے والا؟ تھانے دار ہے؟"

لالی کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ انگلی سے سر کھجاتے ہوئے نرمی سے گویا ہوا۔ "یہ بتا....."

شاداں بات کاٹ کر بے زاری سے بولی۔ "مجھ سے کچھ نہ پوچھ۔" وہ ابھی تک ناراض تھی۔ لالی نے کوئی بات نہیں کی۔ چپ بیٹھا رہا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔

رحیم داد خاموشی سے اکتا کر بولا۔ "مجھے تو اونگھ آ رہی ہے۔ لالی! تیرا کیا ارادہ ہے؟"

لالی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شاداں بول پڑی۔ "سو جاؤ کچھ دیر۔ رات بھر کے جاگے ہوئے ہو۔"

شاداں کے لہجے میں پہلے جیسی تلخی نہیں تھی۔ لالی نے اس کا بدلا ہوا انداز دیکھا تو اسے مخاطب کیا۔ "تجھے بھی تو نیند آ رہی ہو گی۔ تو سوئی کب۔"

"میری فکر نہ کر۔ میری آنکھوں میں بالکل نیند نہیں۔ دودھی کو دودھ پہنچانا ہے۔ ملک کی حویلی پر کام کرنے جانا ہے۔ اور بھی بہت کام دھندا کرنا ہے۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ "دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ ویسے جب میں باہر جاؤں گی تو تالا ڈال جاؤں گی۔" شاداں کمرے سے باہر چلی گئی۔

رحیم داد نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ دونوں وہیں چٹائی پر ٹانگیں پسار کے لیٹ گئے۔ رحیم داد کچھ دیر جاگتا رہا اور بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ لالی لیٹتے ہی سو گیا۔ کچھ دیر بعد رحیم داد کو بھی نیند آ گئی۔

دونوں تھکے ہوئے اور رات بھر کے جاگے ہوئے تھے' بے خبر ہو کر سو گئے۔ انھیں کچھ بھی خبر نہ ہوئی کہ شاداں کب گھر سے باہر گئی۔

☆

کمرے میں ہلکا' ہلکا اندھیرا چھایا تھا۔ باہر آنگن میں گہری خاموشی تھی۔ شاداں ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ دونوں اٹھ کر کوٹھری میں چلے گئے۔ دن کی دھندلی دھندلی روشنی میں کھدائی کرتے رہے۔ جب اندھیرا بڑھ گیا تو لالی نے لالٹین روشن کر لی۔ کھدائی مشکل تھی۔ بار بار کدال پتھروں سے ٹکرا کر پلٹ جاتی۔ مگر انھوں نے ہاتھ نہیں روکا۔ لالی تھک جاتا تو رحیم داد کدال سنبھال لیتا۔ دونوں باری باری ڈیوٹی بدلتے رہے۔

بہت دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ لالی نے دروازہ کھولا۔ سامنے شاداں کھڑی تھی۔ لالی اور رحیم داد کوٹھری سے نکل کر کمرے میں آ گئے۔ انھوں نے دیکھا' باہر آنگن میں اندھیرا پھیلا ہے۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ گاؤں پر بھی سناٹا چھا گیا تھا۔ شاداں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کتنا کام رہ گیا ہے؟"

"ابھی بہت کام ہے۔ میں زمین زیادہ گہری کھودنا چاہتا ہوں۔"

"روٹی کھا لے۔"

لالی آمادہ نہ ہوا۔ "ابھی نہیں' کام ختم کرنے کے بعد۔" رحیم داد نے بھی لالی سے اتفاق کیا۔ دونوں جلد سے جلد کام نمٹا دینا چاہتے تھے۔

شاداں نے جھک کر سرگوشی کی۔ "کدال آہستہ چلا۔ آواز سنائی پڑتی ہے۔"

لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "ڈھول بجانا شروع کر دے۔"

"مسکری نہ کر۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"تجھے ڈر بھی لگتا ہے؟"

شاداں جھینپ کر رہ گئی۔ لالی نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ وہ رحیم داد کے ہم راہ کوٹھری میں چلا گیا۔ کھدائی شروع ہو گئی۔ اس دفعہ دونوں سنبھال سنبھال کر کدال چلا رہے تھے تاکہ آواز پیدا نہ ہو۔ مگر اس طرح کھدائی کی رفتار سست پڑ گئی۔ آدھی رات سے کچھ پہلے انھوں نے خوب گہری قبر

کھود لی۔ دونوں نے لاش اٹھائی اور نیچے اتارنے لگے۔

اسی وقت شاداں دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اس نے آتے ہی لاش کے چہرے سے چادر اٹھا دی اور گہری نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ بالے کا بے جان چہرہ نیلا پڑ چکا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور پہلے سے زیادہ ہی بے نور ہو گئی تھیں۔ لاش سے ہلکی ہلکی بدبو اٹھ رہی تھی۔ لالی نے شاداں کو زیادہ دیر وہاں ٹھہرنے نہیں دیا۔ اس بار شاداں نے اپنے سینے پر نہ دوہتڑ مارا' نہ چیخی' نہ روئی چپ چاپ باہر چلی گئی۔

لالی اور رحیم داد نے اس کے جاتے ہی لاش بستر میں لپیٹ کر نیچے لڑھکا دی۔ شاداں کے خون آلود کپڑے اور چھری بھی ڈال دی اور جلدی جلدی پتھر اور مٹی ڈال کر گڑھا بھرنے لگے۔ گڑھا بھرنے کے بعد جو مٹی بچ گئی' وہ انھوں نے کوٹھری میں پھیلا کر برابر کر دی۔ رحیم داد بالٹی میں پانی لے آیا۔

لالی نے کوٹھری کے فرش پر پانی چھڑک دیا۔ جب ہر کام لالی کی مرضی کے مطابق ہو گیا تو وہ کوٹھری کا دروازہ بند کر کے رحیم داد کی ساتھ باہر آ گیا۔

شاداں دالان میں چپ بیٹھی تھی۔ لالی نے آتے ہی کہا۔ "فٹا فٹ روٹی لا۔ بہت بھوک لگی ہے۔"

شاداں خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جب وہ جانے لگی تو لالی نے ٹوکا۔ "کل کوٹھری میں لکڑیاں یا بھوسا بھر دینا اور اس میں تالا لگا دینا۔ تجھ سے یہ کام نہ ہو تو ہم دونوں کر دیں گے۔ فکر نہ کر۔ سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔"

شاداں کھوئی کھوئی کھڑی رہی پھر خاموشی سے چلی گئی۔

☆

موسم اچانک بدل گیا۔ رات کسی قدر گرم تھی۔ ہوا بھی بند تھی۔ فضا غبار آلود تھی۔ شاداں نے اصرار بھی کیا مگر رحیم داد اور لالی چارپائی پر نہ لیٹے۔ چارپائی دالان میں پڑی تھی۔ شاداں نے لا کر ڈال دی تھی۔

دونوں اس پر نہ لیٹے تو شاداں خود لیٹ گئی۔ لالی اور رحیم داد جلدی سو گئے۔ صبح بہت تڑکے شاداں نے دونوں کو بیدار کیا۔ مگر دونوں پر نیند کا غلبہ تھا۔ وہ دالان سے اٹھ کر کمرے میں جا کر سو گئے اور دیر تک بے خبر سوتے رہے۔

دن چڑھے' شاداں نے آ کر پھر انھیں جگایا۔ لالی کو اشارے سے دالان میں بلایا۔ وہ گھبرائی ہوئی

نظر آ رہی تھی۔ "یہ جو تیرا ساتھی رکھے ہے' جیل سے بھاگا ہوا کیدی تو نہیں ہے؟"

لالی انکار نہ کر سکا۔ "ہے تو۔ توں نے اس کی جیل کی وردی نہیں دیکھی؟"

"اور تو بھی جیل سے بھاگا ہے؟"

لالی کو تشویش ہوئی۔ "تجھے کیسے پتہ چلا؟"

"میں ملک کی حویلی میں گئی تھی۔"

لالی نے اسے اپنی بات مکمل نہ کرنے دی۔ بیچ میں بول پڑا۔ "یہ ملک کون ہے؟"

"پنڈ کا لمبردار ہے۔ اس کا نام ملک اللہ نواز ہے۔ ملک کی حویلی میں تھانیدار بیٹھا تھا۔"

لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "تھانیدار اس کی حویلی میں کس لیے آیا تھا؟"

"جب سے ادھر تھانیدار لگا ہے' روز ہی ملک کے پاس آتا ہے۔ وہ ملک کا بھائی جو ہے۔" شاداں نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ "تھانیدار کہتا تھا۔ دو کیدی جیل سے بھاگ گئے۔ ابھی تک پکڑے نہیں گئے۔ پولیس ان کی کھوج میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔" شاداں نے لالی کے چہرے کی جانب دیکھا جس پر پریشانی چھا رہی تھی۔ "اس کی گلاں سن کر میرا متھا ٹھنکا۔ مجھے جھٹ تم دونوں کی یاد آئی۔ رکھے پر تو مجھے پہلے ہی کچھ شبہ ہوا تھا۔"

"تجھ سے تو تھانیدار نے کچھ نہیں پوچھا۔"

"مجھ سے کیوں پوچھتا؟ پر یہ ضرور کہتا تھا' ہر تھانے میں تم دونوں کی تصویریں لگا دی گئی ہیں۔ پورے دو ہزار پکڑوانے والے کو انعام ملے گا۔"

"پہلے روٹی ٹکر دے' فیر گل بات ہو گی۔"

لالی کمرے میں آ گیا۔ اس نے رحیم داد کو ہر بات بتا دی۔ تھوڑی دیر بعد شاداں لسی لے آئی۔ لسی کے ساتھ رات کی باسی روٹی بھی تھی۔ شاداں اس وقت بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ لالی نے لسی پیتے پیتے پوچھا۔

"بالے کے کپڑے لتے تو تیرے پاس ہوں گے؟"

"ایک ایک لتا لے گیا تھا۔ وہ اپنی ہر چیز لے گیا۔ اس کنجری کے لیے میرے راکھواں کپڑے لتے تک چرا لے گیا۔ جادو کر دیا تھا اس پر۔ میلے سے ڈھیروں چیزیں میرے لیے لاتا تھا' پر یہ بہت پہلے کی گل ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ بات کرتے کرتے یادوں کے سہارے بہت دور چلی گئی۔

"چھوڑ یہ باتیں۔ کام کی بات سن۔ تجھے رکھے کے لیے کمیس اور دھوتی لانی ہے۔ جوتا بھی لانا

ہو گا۔ جوتا تو مجھے بھی چاہئے۔ یہ سب کچھ آج ہی کرنا ہو گا۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا بالے کے لیے چاہئے ہے۔"

لالی نے اپنی ڈاڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "اس پنڈ میں داڑھی مونڈنے کے لیے بلیڈ شیڈ بھی مل جائے گا؟ یہ تو بہت وڈا پنڈ ہے۔ موضع لگتا ہے۔ یہاں تو سب کچھ ملتا ہو گا۔"

"پنڈ میں نائی بھی ہے۔ اسے بلا لاؤں؟" شاداں نے نہایت سادگی سے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "نہیں' نائی کا یہاں آنا ٹھیک نہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں کسی کو بتایا بھی نہیں۔"

رحیم داد نے تاکید کی۔ "بتانا بھی نہیں۔ کوئی پوچھے تب بھی نہ بتانا۔"

شاداں ہاتھ ہلا کر بولی۔ "فکر نہ کر' کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

لالی نے اسے ٹوکا۔ "جو کام میں نے بتایا ہے' فٹافٹ کرنا ہے۔ اب تو جا۔"

اس کے جانے کے بعد دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے' آخر کمرے کا دروازہ بند کر کے فرش پر لیٹے اور سو گئے۔ دن ڈھلے شاداں واپس آئی۔ اس نے آتے ہی لالی اور رحیم داد کو اپنی کار گزاری سنائی۔ قمیص کا کپڑا خرید کر اس نے گاؤں کے درزی کو سلنے کے لیے دے دیا تھا اور اس سے دوسرے روز سہ پہر تک قمیص تیار لینے کا وعدہ بھی لے لیا۔ جوتوں کے بارے میں اس نے بتایا کہ بدھ کو بازار میں ملیں گے۔ بازار لگنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ دھوتی کے بارے میں اس نے بتایا کہ اسے بھی بازار سے خرید لے گی۔ البتہ وہ گاؤں کی دکان سے ایک عدد بلیڈ خرید لائی تھی۔ لالی اس کی کار گزاری سن کر بہت خوش ہوا۔ جیب سے نوٹ نکال کر بولا۔ "میں نے پیسے تو تجھے دیئے ہی نہیں تھے۔ بھول گیا تھا۔ بول کتنے دے دوں؟"

وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ "رہنے دے اپنے روپے۔ رکھ لے' آگے کام آئیں گے۔ میں ملک کی گھر والی سے کچھ روپے لے آئی تھی۔ کام چل جائے گا' فکر نہ کر۔"

شاداں زیادہ دیر ان کے پاس نہ ٹھہری۔

ابھی اسے گھر کا بہت کام کاج کرنا تھا۔ وہ بڑی جفاکش اور محنتی عورت تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی۔ کہیں ٹک کر نہ بیٹھتی۔ کبھی یہاں' کبھی وہاں' کبھی ادھر' کبھی ادھر' کسی لمحے قرار نہ تھا۔ جاتے ہی وہ بھینس کے لیے چارہ کاٹنے بیٹھ گئی۔

بلیڈ ہاتھ آیا تو لالی کو ڈاڑھی کے بال صاف کرنے کی سوجھی۔ رحیم داد کو ایسا شوق نہیں چرایا۔ ویسے اس کی ڈاڑھی کے بال اتنے بڑھ گئے تھے کہ بلیڈ سے مونڈنا آسان نہیں تھا۔ مگر اس نے کپڑے دھونے کا صابن اور پانی ملا کر لالی کی ڈاڑھی کے بال کسی نہ کسی طور صاف کر دیئے۔

نڈھال کھڑی تھی۔

تینوں اپنے اپنے دکھوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد شاداں اٹھی اور خاموشی سے بستر پر جا کر سو گئی۔

لالی اور رحیم داد بھی اپنی اپنی جگہ سو گئے۔

نہ جانے رات کتنی گزر چکی تھی۔ اچانک لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا' شاداں اس کے سرہانے بیٹھی ہے۔

لالی نے کچھ کہنا چاہا تو شاداں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور آنگن کے آخری سرے پر لے گئی۔ اجلی چاندنی میں اس کا چہرہ نکھر گیا تھا۔ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ وہ گردن کو خم دے کر ایسے زاویئے سے کھڑی تھی کہ بھرپور عورت نظر آ رہی تھی۔ لالی چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

"میری ایک گل مان لے گا؟"

"بول کیا کہتی ہے؟"

شاداں نے اس کا ایک ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ شاداں کا ہاتھ گرم بھی تھا اور گداز بھی۔ لالی کو اس وقت ایسا ہی محسوس ہوا۔ اس کی سانس تیز ہو گئی۔

شاداں کھسک کر لالی کے قریب آ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بے ساختہ لالی سے چمٹ جائے گی۔ مگر شاداں نے ایسا نہیں کیا۔ جھکی اور جھک کر پیر سے جوتی نکالی۔ جوتی لالی کے ہاتھ میں دی اور تیکھے لہجے میں گویا ہوئی۔

"مجھے اس سے مار۔"

لالی گھبرا گیا۔ "کیوں؟"

"پہلے مجھے مار' فیر بتاؤں گی۔"

لالی خفا ہو کر بولا۔ "صاف صاف بتا۔"

"دھیرے بول۔"

لالی نے آہستہ سے استفسار کیا۔ "تو چاہتی کیا ہے؟"

وہ تڑپ کر بولی۔ "ہائے میں مر گئی۔ میں نے ملک سے صاف صاف بتا دیا' تم دونوں میرے گھر میں چھپے ہو۔" اس نے نظریں جھکا کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "دو ہزار کے لالچ نے مجھے اندھا کر دیا۔

ڈاڑھی ٹھیک سے نہیں منڈی تھی۔ چہرے پر کئی جگہ بلیڈ کے چر کے بھی لگ گئے تھے' مگر لالی خوش تھا۔ آئینہ ہاتھ میں لے کر بار بار اپنی صورت دیکھتا تھا۔

شام ہوتے ہی دونوں لالٹین لے کر کوٹھری میں گھس گئے۔ مٹی خشک ہو کر جم گئی تھی۔ انھوں نے معائنہ کرنے کے بعد لکڑیاں اور دوسرا کاٹھ کباڑ کوٹھری میں بھر دیا۔ دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ شاداں کوٹھری خالی رکھنا چاہتی تھی۔ مگر لالی نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ جو مرضی میں آیا وہی کیا۔

رات کو کھانا کھاتے ہوئے لالی نے شاداں کے سامنے بالے کا پھر ذکر چھیڑ دیا۔ اس مرتبہ بھی اس نے بالے کو اچھے الفاظ سے یاد نہیں کیا۔ شاداں ایک دم بھڑک اٹھی۔

"توں چاہتا کیا ہے؟"

لالی نے اپنے صفاچٹ رخساروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں توں اسے بھول جا۔ اس سے نفرت کرنے لگے۔"

شاداں جل کر بولی۔ "اور تیرے ساتھ بھاگ جاؤں؟" اس نے حقارت سے اپنا منہ بگاڑا۔ "توں سمجھتا کیا ہے ڈاڑھی منڈوا کر تو گبھرو بن گیا۔ جا' باہر چاندنی میں پیشاب کر کے اپنی شکل دیکھ لے۔"

وہ اس کی بات کی تلخی نظر انداز کر گیا۔ "میرا کہا مان' اپنے بال بچوں کے پاس چلی جا۔ بہت یاری آشنائی کر لی۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ بیزاری سے بولی۔

لالی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوا۔ "تو کیسی ماں ہے' ایک میری ماں تھی۔ میرے پیؤ نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ مجھ سے ملنے راتوں کو چھپ چھپ کر آتی تھی۔ گھر کے راستوں پر دن دن بھر میرا انتظار کرتی تھی۔ کئی بار میرے پیؤ نے اسے بالوں سے پکڑ کر مارا پر وہ باز نہ آئی۔ ایک بار اس کے سر پر ایسا گھما کر سوٹا مارا' وہیں ڈھیر ہو گئی۔ سانس بھی نہ لی۔ پیؤ کو لمبی جیل ہوئی۔ جانے زندہ ہے کہ مر گیا۔" لالی آہستہ آہستہ یادوں کے چراغ جلاتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"مگر وہ ماں تھی۔"

شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی نہ بولا۔ رحیم داد بھی خاموش تھا۔ تینوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ آنگن میں چاندنی اتر آئی تھی۔ اس کی رنگت کفن کی طرح سفید تھی۔ رات

سوچا ایک نئ اور خرید لوں گی۔ میں نے ٹھیک نہیں کیا۔" یہ کہتے کہتے وہ بے قرار ہو گئی۔ "لالی مجھے مار۔ مارتا کیوں نہیں؟ میں تیرے آگے ہتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ لالی کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر وہ اس سے صرف اتنا کہہ سکا۔

"توں نے جو کرنا تھا' کر چکی۔ اب مجھے بتا کیوں رہی ہے؟" اس نے شاداں کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "توں نے یہ نہیں سوچا' مجھے اور رحیمے کو پکڑوا کر تو بھی تو پھنس جائے گی۔ توں نے بالے کا خون جو کیا ہے۔ یہ بھول گئی؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب آگے کی سوچ۔ ملک اپنی گھوڑی پر تھانے گیا ہے۔" شاداں نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "پولسے آتے ہی ہوں گے۔ تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔ جہانگیرہ سے دور نکل جاؤ۔"

لالی نے خطرہ سر پر منڈلاتا محسوس کیا۔ وہ سخت پریشان ہو گیا۔ لپک کر رحیم داد کے پاس گیا۔ اسے جھنجھوڑ کر گہری نیند سے بیدار کیا۔ صورت حال سے آگاہ کیا۔

رحیم داد بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں فوراً چلنے پر کمربستہ ہو گئے۔ شاداں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلی۔ لالی کے منع کرنے کے باوجود چلی۔ تینوں گھر سے باہر نکلے۔ شاداں آگے' آگے چل رہی تھی۔ لالی چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا۔

گاؤں سنسان تھا۔ انھوں نے مشکل سے دو فرلانگ فاصلہ طے کیا ہو گا کہ رات سناٹے میں بھاری' بھاری بوٹوں کی آواز ابھری۔ لالی فوراً بھانپ گیا کہ یہ پولیس والوں کے قدموں کی آہٹ ہے۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ تیزی سے آگے بڑھا اور جھپاک سے قریب کے کھیتوں میں گھس گیا۔

لالی اور رحیم داد اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے' پودوں سے الجھتے' گندم اور جو کی فصلوں کے درمیان راستہ بناتے۔ آگے اور آگے بڑھتے گئے۔

۳

دور سے ریل کے انجن کی چنگھاڑ سناٹے میں ابھری۔ ساتھ ہی لوہے کی پٹریاں کھٹ کھٹ بجنے لگیں۔ رحیم داد اور لالی سراسیمہ ہو کر ٹھہر گئے۔ پلٹ کر ادھر دیکھنے لگے جدھر سے ریل گاڑی آ رہی تھی۔ اب ریل کی پٹڑی پر کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دونوں نشیب میں اترے اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ پٹڑیوں پر ریل گاڑی دوڑنے کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔

ذرا ہی دیر بعد سرمئی دھندلکے میں انجن کی تیز روشنی ابھری۔ دیکھتے دیکھتے ریل گاڑی ان کے سامنے آ گئی۔ دونوں چپ چاپ کھڑے اسے گزرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پہلے انجن دھاڑتا ہوا گزرا' پھر ایک ڈبا' دوسرا ڈبا' تیسرا ڈبا گزرا۔ پھر فرسٹ کلاس کا ڈبا سامنے آیا۔ ایک کھڑکی کھلی۔ دو ہاتھ ایک سوٹ کیس اٹھائے باہر نکلے۔

سوٹ کیس کھڑکی سے نیچے گرا اور پٹڑی کے نشیب میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ریل گاڑی کھٹ کھٹ کرتی تیزی سے آگے نکل گئی۔

سب کچھ "آناً فاناً" ہوا۔ دونوں حیران و پریشان جہاں تھے' وہیں کھڑے رہے۔ سوٹ کیس چند گز کے فاصلے پر ان کے سامنے پڑا تھا۔ وہ چند لمحے تک اسے حیرت سے تکتے رہے' پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ سیاہ چمڑے کا سوٹ کیس تھا۔ رحیم داد نے بے صبری سے جھک کر اسے اٹھانا چاہا۔

لالی نے روک دیا۔ "ٹھہر جا رحیمے!"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

لالی نے مشتبہ نظروں سے سوٹ کیس دیکھا۔ "مجھے تو کچھ گڑ بڑ نظر آتی ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "یار! اس کے اندر کہیں کٹی پھٹی لاش نہ رکھی ہو۔"

رحیم داد نے خوف زدہ ہو کر لالی کو دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "دیکھنے میں بھی بھاری بھاری لگتا ہے۔"

لالی مخمصے میں پڑ گیا۔ خاموش کھڑا سوٹ کیس کو تکتا رہا۔ چند لمحے دونوں گومگو کے عالم میں کھڑے رہے۔ آخر لالی نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا۔ سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑا' اسے اٹھایا اور آہستہ آہستہ اونچا نیچا کر کے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اندر کیا ہے۔ سوٹ کیس زیادہ بھاری نہیں تھا۔ اس کے وزن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اندر کپڑے اور دوسرا سفری سامان بھرا ہے۔

لالی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ "لے یار! بن گیا کام۔"

رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔ "کیا ہے؟"

"یہ تو کھولنے ہی پر پتہ چلے گا۔ مجھے تو کپڑے لتے معلوم ہوتے ہیں اور بھی کام کی بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ فسٹ کلاس کے ڈبے سے گرا ہے۔ سامان بھی اس میں فسٹ کلاس ہی ہو گا۔ یار! کیسا کھٹاک سے آکر گرا جیسے اپنے ہی لیے پھینکا گیا ہو۔"

"یار اسے کھول کر تو دیکھ" رحیم داد اپنی بے قراری پر زیادہ دیر قابو نہ رکھ سکا۔

"یہاں نہیں' آگے چل کے۔ اب یہاں زیادہ دیر ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔"

وہ سوٹ کیس ایک ہاتھ میں لٹکا کر چلنے لگا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ دونوں نشیب سے نکل کر اوپر آ گئے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ریل گاڑی کی پٹڑی دھند میں لپٹی سنسان پڑی تھی۔

دونوں آہستہ آہستہ پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ مگر وہ ادھر نہیں گئے' جدھر ریل گاڑی گئی تھی بلکہ اس طرف بڑھنے لگے جدھر سے آئی تھی۔ مشکل سے وہ پچاس ساٹھ قدم آگے گئے ہوں گے' ناگاہ درختوں تلے خشک پتوں پر آہٹ ابھری۔ انھوں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا' ایک شخص اندھیرے سے نکل کر ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دھندلی روشنی میں دونوں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ اس نے دور سے للکارا۔

"اوئے چھبڑ! سوٹ کیس رکھ دے۔"

لالی جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ لیکن اس نے سوٹ کیس نہیں چھوڑا۔ اجنبی اور قریب آ گیا۔ اس دفعہ وہ زیادہ گرج دار آواز سے بولا۔ "دیکھتا کیا ہے؟ جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔" وہ جھپٹنے کے انداز میں

تیزی سے لپکا۔ لیکن آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹک کے حیرت سے چیخا۔

"اوئے لالی! کتے 'حرام دے۔"

لالی نے فوراً اسے پہچان لیا۔ وہ اشرف تھا۔ کئی سال پہلے وہ اسی کے گروہ میں شامل تھا۔ جیل میں بھی ساتھ رہ چکا تھا۔ اشرف پیار سے گالیاں دیتا ہوا قریب آیا اور لالی کے گلے سے لپٹ گیا۔ نہایت گرمجوشی سے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچنے لگا۔ اس نے علیحدہ ہو کر لالی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

اس کی ملگجی بش شرٹ اور پتلون دیکھی' بڑھی ہوئی حجامت اور گرد سے اٹے ہوئے بال دیکھے۔ کبیدہ خاطر ہو کر بولا۔

"یار! تو نے یہ اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟"

لالی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "تجھے نہیں معلوم؟"

"مجھے پتہ ہے تو منٹگمری جیل سے بھاگا ہوا ہے۔ نصیرا تو تیرے ساتھ ہی جیل میں تھا۔ پرسوں چھوٹ کے آیا ہے۔ وہی بتاتا تھا۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ وہ لالی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اشرف نے اس کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ تیرے ساتھ کا دوسرا مفرور کیدی ہے نا؟ اس کی جیل کی وردی تو بدلوا دی ہوتی۔ یہ صاف تجھے پکڑوا دے گا۔"

لالی نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ "یہ بتا' اتنے سویرے سویرے یہاں کیسے آ ٹپکا۔"

"ڈیوٹی پر تھا۔" اشرف نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ "اسی کے انتظار میں تھا۔"

"کچھ اونچا چکر لگتا ہے۔" لالی نے آنکھ مار کر پوچھا۔ "معاملہ کیا ہے؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتا' تیرا پروگرام کیا ہے؟"

"میرا کیا پروگرام ہے۔" لالی کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "چھپتا لکتا پھرتا ہوں۔ نہ رہنے کا ٹھکانا ہے نہ روٹی ٹکر کا۔ کبھی یہاں' کبھی وہاں۔"

"ایسا کر میرے ساتھ چل۔" اس نے لالی کا کندھا ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ "راستے کی پروا نہ کر۔ کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ ادھر اپنی ہی عمل داری ہے۔ لور تک کی میں گارنٹی لیتا ہوں۔"

"ایسا کر۔ سوٹ کیس کھول۔ اپنے مطلب کے کپڑے نکل آئے تو بن گیا کام۔"

اشرف سوٹ کیس کھولنے پر آمادہ نہ ہوا۔ "یہ سنڈیکیٹ کا مال ہے۔ اسے صرف باس کھول سکتا

ہے۔"

"باس؟" لالی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "یہ باس کیا چیز ہے؟"

"بہت اونچی چیز ہے۔ فسٹ کلاس سے نیچے نہیں چلتا۔ کراچی گیا ہے۔"

"سوٹ کیس اسی نے پھینکا تھا؟"

"ہاں۔" اشرف نے جواب دیا۔ "میں بھی اسی ٹرین میں تھا۔ فسٹ کلاس کے ساتھ والے انٹر کے ڈبے میں تھا۔ پیچھے کادر آباد سٹیشن ہے۔ وہیں اتر گیا تھا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ رہا سامنے آؤٹر سگنل۔"

لالی نے سوٹ کیس اس کے حوالے کر دیا۔ "لے' سنبھال اپنی امانت۔" اس نے مسکرا کر پوچھا "کتنا مال پانی ہو گا اس کے اندر؟"

"مخبر نے تو لاکھ روپے سے اوپر کی اطلاع دی تھی۔ مال زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیش کے علاوہ جڑاؤ زیورات جا رہے تھے اس میں۔" اس نے سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اپنا سنڈیکیٹ چھوٹا شکار نہیں مارتا۔"

لالی مرعوب ہو کر بولا۔ "یار! یہ تو بہت اونچا چکر جان پڑتا ہے' پر خطرناک بھی اتنا ہی ہے۔"

"کوئی خطرناک شطرناک نہیں۔" اشرف نے ہنس کر بتایا۔ "مہینے سوا مہینے میں صرف ایک بار نکلتے ہیں اور تگڑا شکار مارتے ہیں۔ اکیلے نہیں کھاتے' مل بانٹ کے کھاتے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک سب کا حصہ بندھا ہے۔ اپنے پر کوئی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔" اس نے ایک آنکھ دبائی۔ "جی چاہے تو لگ جا لین میں۔ بول کیا کہتا ہے۔ چلتا ہے میرے ساتھ؟"

لالی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چلیں گے تو ہم دونوں ہی چلیں گے۔ تو سوٹ کیس کھولنے کو تیار نہیں۔ فیر اپنا رحیے کیسے چلے گا۔"

"اپنی بات کر۔" اشرف نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ "یار! برا نہ مان۔ یہ تو دیکھنے ہی میں یتیم مسکین لگتا ہے۔ اسے خاماخا نکال لایا۔ ایک بار پوری سزا کاٹ لینے دے' فیر فروٹ ہو کر نکلے گا۔ ابھی تو بہت کچا ہے۔"

"شرفے! بہت اونچا نہ اڑ۔ مارا جائے گا۔ یہ بتا میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کیا کرتا؟"

اشرف نے گردن اونچی کی۔ "پورا راشن لے کر چلتا ہوں۔" اس نے پتلون کی جیب سے پستول نکالا اور لالی کے سامنے گھما پھرا کر بولا۔ "پورا لوڈ ہے۔ کیا سمجھا؟" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "جھٹ پٹ فیصلہ کر' بول کیا کہتا ہے؟ میرے پاس ٹائم بہت کم ہے۔" اس نے مڑ کر

پیچھے دیکھا۔ "یوسف والا سٹیشن سے ٹرین آنے ہی والی ہے۔ مجھے اسی سے واپس لہور جانا ہے۔"

رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "چلا جا لالی! میری پروا نہ کر۔" اس کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔ "جو نصیب میں لکھا ہے' ہو کے رہے گا۔"

لالی نے اسے غصے سے ڈانٹا۔ "چپ کر رحیے! بکواس نہ کر۔ یہ میرا اور شرفے کا معاملہ ہے۔ خاماخا اپنی ٹانگ بیچ میں نہ اڑا۔" اس نے رحیم داد کا بازو پکڑا۔ اسے اپنی طرف کھینچا اور کمر میں ہاتھ ڈال کر بے تکلفی سے بولا۔ "شرفے! یہ اپنا جگر ہے۔ اسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ تو جا' میرا تیرا رستہ الگ ہے۔"

"جیسی تیری مرضی۔ جی تو چاہتا تھا تو ساتھ چلتا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے بٹوا نکال کر کچھ نوٹ نکالے اور لالی کی طرف بڑھا کر مخاطب ہوا۔ "یہ رکھ لے' کام آئیں گے۔ پیارے! ہم تو یاروں کے یار ہیں۔"

لالی نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ "انھیں اپنے ہی پاس رکھ۔ یاری دوستی کی بات کرتا ہے تو اتار دے کمیض' پتلون۔ تجھ سے زیادہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔" اشرف سٹپٹا کر خاموش کھڑا رہا۔ لالی منہ بگاڑ کر بولا۔ "جا دیکھ لیا تجھے بھی۔ خالی پیلی بڑھکیں مارنا جانتا ہے۔ اونہہ!" اس نے جھنجلا کر زمین پر تھوک دیا۔

اشرف بھڑک اٹھا۔ "گالی نہ دے لالی!" وہ جلدی جلدی اپنی قمیص اتارنے لگا۔ "تو بھی اتار اپنے کپڑے' جھٹ پٹ نال۔ ٹائم بہت کم ہے۔"

دونوں نے جھٹ پٹ کپڑے اتارے اور ایک دوسرے سے بدل لیے۔ لالی نے اشرف کا جوتا بھی ہتھیا لیا۔ وہ اس کے پیروں میں بالکل فٹ تھا۔ کپڑے البتہ ذرا ڈھیلے تھے۔ مگر لالی کے جسم پر بدنما نہیں لگتے تھے۔

اشرف نے ضد کر کے لالی کی جیب میں پچاس روپے بھی ڈال دیئے۔ لالی نے کہا۔ "یار! ذرا ٹھیر۔ ادھر کا کچھ اتا پتا تو بتا۔ اپنے کو تو کچھ نہیں ملوم۔ چاہتا ہوں جلد سے جلد اس ضلع سے باہر نکل جاؤں۔ تو بتا' کیا کروں؟"

"ایسا کر ریلوے لائن کے اس پار نکل جا۔ آگے ملتان روڈ ہے۔ اس سے کچھ ہی دور آگے نہر لوئر باری دو آب ہے۔ اسے پار کر لے تو جنگل اور بیلے ہیں۔ تیرے لیے بہت محفوظ ٹھکانا ہے۔ دن بھر وہاں رہ۔ رات کو چک ۶۷ کی طرف نکل جا۔ کھبے ہتھ کو ہے۔ ادھر سے سدھی سڑک نور شاہ جاتی ہے۔ نور شاہ نہ جانا۔ نور شاہ سے پہلے فیر نہر آئے گی۔ اس کے کنارے کنارے چلتا ہوا عالم

شاہ پہنچ جا۔ راوی نزدیک ہی ہے۔ کسی پتن پر پہنچ کر بیڑی میں بیٹھ کر دریا کے دوسری طرف پہنچ جا۔ وہاں سے ضلع لائل پور شروع ہو جائے گا۔ میں اس رستے سے دوبار لائل پور جا چکا ہوں۔ لائل پور پہنچ کر جی چاہے تو میرے پاس لہور آجانا۔ دیکھ ضرور آنا۔"

لالی نے اشرف کو گرم جوشی سے گلے لگایا اور پیشانی چوم کر محبت سے رخصت کیا۔

اشرف سوٹ کیس اٹھا کے آگے بڑھ گیا۔ وہ لالی کی میلی کچیلی بش شرٹ، تنگ اور اتنگی پتلون اور بڑے بڑے جوتوں میں بھدا اور بے ڈول لگ رہا تھا۔ لالی اسے جاتے ہوئے دور تک دیکھتا رہا۔ مگر اشرف نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا قادر آباد اسٹیشن کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دونوں پٹڑی عبور کر کے اس پار چلے گئے۔ کچھ ہی دور گئے تھے کہ سڑک آگئی۔ یہ ملتان روڈ تھی اور اس وقت بالکل ویران تھی۔ وہ سڑک کے دوسری جانب چلے گئے۔ نہر بھی زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔

دونوں نہر پر پہنچے۔ کچھ دور اس کے کنارے کنارے چلے۔ پل آگیا۔ پل سے گزر کر وہ نہر کے اس پار پہنچ گئے۔

اشرف نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نہر کے کنارے کھجور کے چند درخت تھے۔ ان کے عقب میں جنگلی درختوں اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا جنگل تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ جنگل ختم ہوا تو اونچے نیچے ٹیلوں اور ٹبوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

وہ ایک ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ اوپر پہنچے تو فراش کے اونچے اونچے درخت دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ دوسرے جنگلی درخت تھے۔ جھاڑیاں بھی تھیں۔ ٹیلے کی بلندی سے انھوں نے پیچھے مڑ کر نظر ڈالی۔ صبح کی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں جنگل کے اس پار نہر لوئر باری دو آب چاندی کے تار کی طرح جھلملا رہی تھی۔

وہ ڈھلانوں سے اترتے، چڑھائیوں پر چڑھتے اور آگے چلے گئے۔ اب وہ بہت تھک چکے تھے۔ انھیں کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی۔ دونوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ فاصلے پر انھیں جھاڑیوں کا جھنڈ نظر آیا۔ قریب ہی کبڑوں کی مانند جھکے ہوئے دو پتھریلے ٹیلوں کے درمیان ایسا خلا تھا جس کے اوپر ٹیلوں کی چوٹیاں ملنے سے محراب بن گئی تھی۔ یہاں وہ روپوش ہو سکتے تھے۔ دھوپ سے بچ کر دن میں سو بھی سکتے تھے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی اور انھیں اس وقت ویرانی ہی کی ضرورت تھی۔

دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے ڈھلان سے نیچے اترے اور محراب کے سامنے جا کر

ٹھہر گئے۔ محراب ان کے قد سے اونچی تھی۔ اندر کی زمین خاصی ہموار تھی۔ اس میں سخت مٹی کی تہہ اور پتھر تھے۔ مگر صاف ستھری تھی۔

محراب سے ذرا ہٹ کر فراش کا ایک درخت سر اٹھائے کھڑا تھا۔ محراب کے دوسری طرف کا حصہ بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس کے عین نیچے گہرا کھڈ تھا۔ کھڈ میں ریتلی مٹی کے اونچے اونچے تودے تھے۔

رحیم داد زیادہ کھڑا نہ رہ سکا۔ محراب کے نیچے چلا گیا اور نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ لالی بھی اس کے برابر لیٹ گیا۔ دونوں دیر تک خاموش پڑے رہے۔ باہر درختوں اور ٹیلوں پر زرد زرد دھوپ پھیلتی جا رہی تھی۔

رحیم داد زمین پر چت لیٹا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی۔ لمحے بھر لالی کے چہرے کو تکتا رہا، پھر گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ شاداں خطرناک زنانی ہے۔"

"ہے تو۔" لالی نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "پر اس میں ایک بات ہے جو ہر زنانی میں نہیں ہوتی۔"

رحیم داد حیرت سے بولا۔ "وہ کیا؟"

"شاداں کھرا روپیہ ہے، بجاؤ تو ٹن سے بولے۔"

رحیم داد نے احتجاج کیا۔ "کیا بات کر رہا ہے لالی؟ بال بال بچ گئے۔ ورنہ اس نے تو مروا دیا تھا دونوں کو۔"

"دو ہزار بہت بھاری رقم ہوتی ہے رحیمے!" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کو رکا۔ "میری تو سگی موسی نے صرف دو سو روپے کے لیے مجھے آگ میں جھونک دیا تھا۔"

"چوری کی ہو گی۔"

"نہیں۔" لالی اسی طرح چت لیٹا اوپر دیکھتا رہا اور آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "میں نے اس کے دو سو کے نوٹ دیوے سے جلا کر روشنی کی تھی۔ ان دنوں میں بہت چھوٹا ہوتا تھا۔ شرارت پر ماں کے ساتھ موسی کے گھر گیا تھا۔"

رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "بہت ظالم تھی۔"

"یہ بات بھی نہیں۔" لالی ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھ کر ہولے ہولے ہلانے لگا۔ "میرا موسا درزی تھا۔ سلائی کی مشین بیچ کر اپنی بیٹی کے ویاہ کے لیے دو سو روپے لایا تھا۔ موسی اس کی

دوسری گھر والی تھی۔ پہلی مرگئی تھی اور اسی کی بیٹی کا ویاہ تھا۔ میں نے موسا کے دو سو روپے جلا ڈالے تو وہ غصے سے پاگل ہوگیا۔ جلتا دیوا اٹھا کر موسی کے منہ پر مارا۔ اس کی ایک آنکھ جل گئی۔ اس نے اپنا غصہ مجھ پر اتارا۔ مجھے دھکا دے کر جلتے الاؤ میں پھینک دیا۔ ماں نہ ہوتی تو جل کر مرجاتا۔ ٹھیک ہی ہوتا۔" لالی کی آواز میں درد کی چبھن تھی۔

رحیم داد خاموش رہا۔ لالی بھی نہ بولا۔

دونوں یادوں کی دھوپ چھاؤں میں ڈولتے رہے۔ آخر ان کی آنکھ لگ گئی۔ وہ گہری نیند سوگئے۔ دھوپ ٹیلوں کی بلندی سے زینہ زینہ نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیری گھاٹیاں روشن ہوگئی تھیں۔ دن کا ایک پہر گزر گیا۔ دوپہر ہوگئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سورج کا الاؤ سرد پڑگیا۔ دونوں بے خبر سوتے رہے۔

☆

ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ لالی نے اسے بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سخت بھوک لگی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد کو سوتا چھوڑ کر باہر نکلا اور کچھ دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ پھر ایک طرف چل دیا۔ آگے بڑھ کے وہ آہستہ آہستہ نشیب میں اترنے لگا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر جھلملا رہی تھیں۔ نیچے گھاٹی میں نیل گوں دھندلکا پھیل رہا تھا۔ لالی آگے بڑھا تو سرس کے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ ان میں پیلے پیلے پھولوں کے گچھے جھول رہے تھے۔ ان کی مہک ہوا میں بسی ہوئی تھی۔ فضا میں پہلی رات کی دلہن کی سی چھب تھی اور لالی کو شدید بھوک لگی تھی۔

وہ ٹیلوں اور ٹبوں کے دامن میں اونچے نیچے ناہموار راستوں پر چلتا ہوا دور تک چلا گیا۔ یکایک تیز بو کا بھبکا آیا۔ لالی ٹھہر گیا۔ اس نے ایک ٹیلے کی بلندی سے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ایک مردار خچر پڑا ہے۔ دو گدھ اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ اوپر ٹیلے پر پانچ چھ گدھ قطار میں بیٹھے تھے اور اڑنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

مردہ خچر کے جسم سے اٹھتی ہوئی تیز بو کے باوجود لالی وہیں کھڑا رہا اور گردن اونچی کرکے متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

دور فراش کے درختوں کے پیچھے سے دھواں اٹھ رہا تھا جو شام کے دھندلکے میں آہستہ آہستہ تحلیل ہوتا جارہا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ قریب ہی کوئی آبادی ہے۔ وہ اسی طرف چل دیا۔ نزدیک جاکر دیکھا' ٹیلوں کے دامن میں ٹب لی کی طرح کا اونچا اور ابھرا ہوا میدان ہے۔

میدان میں جگہ جگہ اونٹ کے سیاہ بالوں کے بنے ہوئے نمدے کے خیمے لگے ہیں۔ ان خیموں کو خانہ بدوش پاوندے گیرے کہتے ہیں۔ خیمے پھٹے پرانے تھے اور بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

خیموں کے آس پاس اونٹ اور خچر بندھے تھے' بھیڑوں کے ریوڑ بھی تھے۔ خیموں کے باہر آگ روشن تھی۔ لالی نے دور ہی سے بھانپ لیا کہ وہاں پاوندوں نے پڑاؤ ڈالا ہے۔

وہ میدان میں پہنچنے کے لیے مڑا۔ جھٹ پٹے میں اس نے دیکھا' دو خانہ بدوش لڑکیاں آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ ایک دوسرے کے بال نوچ رہی ہیں۔ زور زور سے چیخ رہی ہیں۔ ان کے قریب ہی زمین پر سوکھی شاخوں کے گٹھے رکھے تھے۔ سامنے مٹی کے تودے پر ایک نوجوان پاوندا بیٹھا نہایت سکون سے لڑکیوں کو ایک دوسرے کے جھونٹے کھسوٹتے دیکھ رہا تھا۔ لالی کی چاپ سن کر نوجوان نے پلٹ کر سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ذرا دیر ہکا بکا بیٹھا رہا۔ پھر ایک دم اٹھ کر خیموں کی سمت بھاگا۔

لڑکیاں بھی دھینگا مشتی چھوڑ کر لالی کو حیرت سے تکنے لگیں۔ ان کے لباس بوسیدہ اور گندے تھے۔ بالوں کی چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں تھیں جو جھونٹے کھسوٹنے سے بکھر کر منہ پر آگئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ رخسار تازہ سیب کی طرح گلابی تھے۔ وہ بنجر ٹیلوں پر اگنے والے جنگلی پھولوں کی مانند تھیں جن میں رنگ ہی رنگ ہوتا ہے' خوشبو اور مہک نہیں ہوتی۔ توڑو تو ہاتھ میں کانٹے چبھ جائیں۔

ایک خانہ بدوش لڑکی بڑھ کر لالی کی قریب آئی۔ اس کے پہلو سے لگ کے اس طرح کھڑی ہوگئی کہ اس کے بدن کی تیز بو لالی کی سانس میں گھل مل گئی۔ لڑکی نے سر جھکا کر اپنے بکھرے ہوئے بال دکھائے اور دوسری لڑکی کی طرف اشارہ کرکے بولی۔ "اس نے مجھے مارا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ سٹ کر لالی کے اس قدر قریب آگئی کہ اس کی بھری بھری چھاتیاں لالی کے بازو میں پیوست ہوگئیں۔ لالی نے جھرجھری لی اور بے رخی سے اسے زور سے دھکا دیا۔ "پرے ہٹ کر بات کر۔" اس کے بھورے بھورے بال اور بکھر گئے۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی۔ اس نے لالی کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

دوسری نے زور کا قہقہہ لگایا اور لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "ڈیرے جاتا ہے؟"

"ہاں جی۔" لالی نے مختصر جواب دیا۔

مزید کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ خانہ بدوش لڑکیوں نے قریب پڑے ہوئے لکڑیوں کے گٹھے اٹھا کر

سروں پر رکھے اور ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ لالی آہستہ آہستہ ڈیرے کے جانب چلا۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک بوڑھا پاوندا' دو نوجوانوں کے ہم راہ خیموں کے پیچھے سے نکلا اور لالی کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب آکر تینوں پاوندوں نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔

بوڑھا پاوندا کھردرے لہجے میں بتانے لگا کہ پڑاؤ رات ہی کو ختم ہو جائے گا اور صبح تڑکے قافلہ کوچ کرے گا۔ وہ مظفر گڑھ کے راستے ڈیرہ غازی خان جا رہے ہیں۔ بوڑھا پوچھے بغیر لالی کے سامنے صفائی پیش کر رہا تھا۔ اسے یقین دلا رہا تھا کہ قافلے کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے نہیں ہے۔

☆

لالی کئی برس پہلے چند روز کے لیے پاوندوں کے ڈیرے میں قیام کر چکا تھا۔ چنانچہ عادات و اطوار اور ان کے طرز زندگی سے کسی حد تک واقف تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ پاوندے ان خانہ بدوش قبائل میں سے ہیں جو موسم سرما شروع ہوتے ہی افغانستان کے کوہستانی دروں سے نکل کر پنجاب اور سندھ کے میدانی علاقوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اینٹوں کے بھٹوں پر بتھیروں کا کام کرتے ہیں۔ دیہات کے کچے مکانات کے لیے' مٹی کی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ شہروں اور قصبوں میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ کمبل اور نمدے' بھیڑ اور لومڑی کی کھالیں' قراقلی ٹوپیاں' جڑی بوٹیاں' خشک میوے' ہینگ اور مشک' گھوڑے' ایرانی بلیاں اور گرے ہاؤنڈ شکاری کتے فروخت کرتے ہیں۔ ان کی عورتیں سخت جفاکش' محنتی اور منہ زور ہوتی ہیں۔ اس قدر آزاد اور بے باک ہوتی ہیں کہ غیر مردوں کے سامنے بھی ذرا حجاب محسوس نہیں کرتیں۔ پاوندے عورتوں اور بچوں کے ساتھ اونٹوں اور خچروں پر سوار ہو کر' خیمے اور سامان لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں۔

سفر کے دوران مرد اور عورتیں مل کر کوہستانی نغمے الاپتے ہیں۔ نغموں کے ساتھ ساتھ اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں بجتی ہیں جو نغمے کی لے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ساز کا کام دیتی ہیں۔ قافلے کی حفاظت کے لیے پاوندے اپنے ہم راہ روسی نسل کے کتے رکھتے ہیں۔ یہ کتے برف کی طرح سفید اور کوتاہ قامت ہوتے ہیں۔

درختوں میں پت جھڑ لگتے ہی پاوندوں کی واپسی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ دریائے سندھ عبور کر کے پہلے ڈیرہ اسماعیل خان پہنچتے ہیں جہاں دور دراز کے علاقوں میں بکھرے ہوئے قافلے مختلف سمتوں

سے آکر اکٹھا ہوتے ہیں۔ یہ ان کا آخری پڑاؤ ہوتا ہے۔ گرمی بڑھنے سے پہلے پہلے وہ درہ گومل کے راستے جہاں سے آتے ہیں وہیں لوٹ جاتے ہیں۔

پاوندوں میں جرائم پیشہ بھی ہوتے ہیں جو ڈاکہ زنی اور مویشیوں کی چوری کرتے ہیں یا چرس اور افیون کا ناجائز دھندا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس ان کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کرتی ہے۔ وہ جہاں پہنچتے ہیں' وہاں کے تھانے میں اپنی آمد کی باقاعدہ اطلاع دیتے ہیں۔

بوڑھے کی جانب سے خواہ مخواہ صفائی پیش کرنے پر لالی نے جلد ہی بھانپ لیا کہ پاوندے اس کی پتلون اور اجلی قمیص سے سخت مرعوب ہو گئے ہیں۔ اسے پولیس یا سی آئی ڈی کا افسر سمجھ رہے ہیں۔

لالی ان کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھا کر ہراساں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس ویرانے میں اپنی آمد کا بھی اسے کوئی نہ کوئی عذر پیش کرنا تھا۔ لہٰذا اس نے یہ ظاہر کیا کہ محکمہ جنگلات کے سرکاری کام کے سلسلے میں ادھر آیا ہے۔ لیکن اس کے عملے کے دوسرے لوگ ابھی پہنچ نہیں سکے۔ اس کے بعد اس نے سیدھی سیدھی معاملے کی بات کی۔ انھیں بتایا کہ وہ سخت بھوکا ہے اور بھوک ہی سے بے قرار ہو کر اس طرف آیا ہے۔

وہ ان کے ہم راہ ایک خیمے کے اندر گیا' ان کا مہمان بنا۔ کٹورا بھر بھیڑ کا دودھ پیا۔ شہد اور پنیر کھایا۔ قہوے کا گرم گرم پیالہ پیا۔ مکئی کی ڈھیر سی روٹیاں لیں۔ شہد اور پنیر لیا۔ مشکیزے میں پانی لیا۔ ہاتھ کا بنا ہوا کمبل اور ایک نمدا لیا۔ بھیڑ کی چربی سے جلنے والا چراغ لیا اور ایک تیز دھار چھری بھی لی۔

تیس روپے میں یہ سودا کسی طور برا نہ تھا۔ پاوندوں نے اسے چرس بھری سگریٹ بھی پلائی۔ چرس پر دم لگا کے لالی کے جسم میں سرخوشی اور جولانی آگئی۔ خانہ بدوش اس کے ہاتھ چرس بھی فروخت کرنا چاہتے تھے مگر لالی اس چکر میں نہیں پڑا۔ وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہرا بھی نہیں۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ راستہ ناہموار اور پیچیدہ تھا اور چڑھائی بھی چڑھنا تھی۔ وہ جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ رحیم داد اس کی اچانک غیر حاضری سے سخت پریشان ہو گا۔

دو پاوندے دور تک اس کے ہم راہ آئے۔ وہ اور بھی آگے تک اس کے ساتھ جانے پر آمادہ تھے مگر لالی نے ایک موڑ پر انھیں رخصت کر دیا۔ وہ انھیں نہ تو اپنا ٹھکانہ دکھانا چاہتا تھا نہ اپنے بارے میں کسی قسم کی اطلاع بہم پہنچانا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ پولیس والے برابر ان سے پوچھ گچھ

کرتے رہتے ہیں۔

لالی ایک ٹیلے کی آڑ میں کھڑا انھیں دور تک واپس جاتے دیکھتا رہا۔ دونوں نظروں سے اوجھل ہوگئے تو وہ آگے بڑھا۔ اس نے ناہموار چڑھائی عبور کی اور سامان سے لدا پھندا محراب کے قریب پہنچ گیا۔

☆

رحیم داد آہٹ سن کر گھبرایا ہوا باہر آیا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ مگر لالی نے کوئی بات نہیں کی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ رحیم داد اندھیرے میں ایک ایک چیز ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ جب اس نے کمبل کی تہہ کھولی اور اندر سے تازہ تازہ روٹیوں کی سوندھی سوندھی مہک نکلی تو وہ بچوں کی طرح چہک کر بولا۔

"او ہو' ہو یار! کمال کر دیا۔ روٹیوں کا تھبا تو بالکل گرم گرم ہے۔"

"شہد اور پنیر بھی ہے۔" لالی نے اسے مطلع کیا۔ جیب سے ماچس نکالی' جھک کر چراغ اٹھایا اور اسے روشن کر دیا۔ ہوا تیز تھی' چراغ کی لو بار بار بھڑکتی۔ لالی نے ادھر ادھر سے پتھر اکٹھا کر کے چراغ ان کی اوٹ میں رکھ دیا۔ اس طرح وہ ہوا سے محفوظ ہو گیا۔ روشنی بھی باہر جانے کے بجائے محدود ہو کر رہ گئی۔

رحیم داد نے زمین پر نمدا بچھا دیا۔ دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ لالی پاوندوں کے ڈیرے کا حال بتانے لگا۔ رحیم داد نے روٹیاں نکال کر باہر رکھیں۔ آٹھ روٹیاں تھیں۔ موٹی موٹی اور خوب بڑی بڑی۔

"یہ ۸ دن کا راشن ہے۔" لالی نے پاوندوں سے خریدی ہوئی چھری نکالی اور ہر روٹی کے چار چار ٹکڑے کر دیے۔

"روٹیاں تو چل جائیں گی۔ پر پانی کم ہے۔"

"ہوگی تو اپنے پاس ہے اور نہر بھی زیادہ دور نہیں۔ پانی نہر سے آجائے گا۔" لالی نے مسکرا کر مشکیزے کی جانب اشارہ کیا۔ "پر ۸ دن تک یہاں کون پڑا رہے گا؟ تب تک ہم بہت آگے نکل جائیں گے۔"

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "برا ہا مناتا۔ تیرا معاملہ تو ایک دم فسٹ کلاس بن گیا۔" اس نے اپنا میلا کچیلا لباس دیکھا۔ "یہ جیل کی وردی نہ جانے اپنے بدن سے کب اترے گی اور جب تک یہ نہیں اترے گی' میرے لیے تو خطرہ ہی خطرہ ہے۔"

"پروا نہ کر۔ جلد ہی تیرے لیے بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مجھے ہر دم اسی کی فکر رہتی ہے۔

خطرہ صرف تیرے لیے نہیں' میرے لیے بھی تو ہے۔ یہ تو سوچ تو اور میں کیا الگ الگ ہیں۔؟" اس نے رحیم داد کو ٹھوکا دیا۔

"دیکھ کیا رہا ہے؟ شروع ہو جا۔"

رحیم داد فوراً شروع ہو گیا۔ اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ اس پر تھوڑا سا شہد ڈالا' پنیر کا ٹکڑا رکھا۔ پھر روٹی گول گول لپیٹ کر دانتوں سے چباتے ہوئے بولا۔

"تو نہیں کھائے گا؟"

"نہیں۔" لالی نے انکار کر دیا۔ "مجھے دو گھونٹ پانی پلا دے۔ میں توں جانا ہے۔" وہ لمحے بھر کو رکا۔ "چرس پر دم لگا کر بھڑکی لگ جاتی ہے۔"

رحیم داد نے مشکیزہ لالی کی طرف بڑھا دیا۔ "یار! تو نے تو پاوندوں کے ڈیرے پر زبردست عیش کیے۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مشکیزہ منہ سے لگا کر پانی کے کئی گھونٹ پیے۔ مشکیزہ ایک طرف رکھا' ہاتھ سے منہ پونچھا اور کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے جلدی سے پوچھا۔ "اکیلا ہی جائے گا؟"

لالی نے رسان سے کہا۔ "ہاں۔"

"شاداں کے پاس تو نہیں جا رہا؟"

"جا تو وہیں رہا ہوں۔" لالی نے اقرار کیا۔

رحیم داد آنکھ مار کر بولا۔ "ایسا جان پڑتا ہے' شاداں پر تیرا دل آگیا۔"

"چھوڑ یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "اپنے پاس دل ہے کہاں؟ دل تو دل والوں کے پاس ہوتا ہے۔"

"تو چاہے کچھ کہے۔ تیری ایکل دیکھ کر تو مجھے ایسا ہی لگتا ہے' تو....."

لالی اس کی بات کاٹ کر بیزاری سے بولا۔ "مخرک بازی چھوڑ۔ کام کی بات سن۔" اس نے چھری پتلون میں اڑس لی اور اپنا چاقو نکال کر رحیم داد کو دیا۔ "اسے رکھ لے۔ میں کل رات کو لوٹوں گا۔ واپسی پر دیر ہو جائے تو فکر نہ کرنا۔"

"ابھی اندھیرا ہے۔ چاند نکل آئے تب جانا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھا اور قریب کے ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ بلندی پر جا کر اس نے دیکھا' ہر طرف ہولناک تاریکی چھائی ہے۔ دور دور تک کچھ نظر نہیں آتا۔ اس نے جھک کر محراب کے نیچے نظر ڈالی۔

رحیم داد چراغ کی دھندلی روشنی میں بیٹھا روٹیوں کے ٹکڑے گن رہا تھا۔ لالی زیادہ دیر ٹیلے پر نہ ٹھہرا۔ آہستہ آہستہ دوسری طرف اتر گیا۔ وہ چڑھائیوں پر چڑھتا' ڈھلانوں سے اترتا' ناہموار راستوں سے گزرتا ہوا ٹیلوں کے نیچے گھنے جھنگر میں پہنچ گیا۔ جھنگر عبور کر کے وہ نہر کی جانب بڑھنے لگا۔

وہ شاداں کے پاس جانا چاہتا تھا اور اس سے رحیم داد کے لیے کپڑے لانا چاہتا تھا۔ کپڑے مل جاتے تو وہ رحیم داد کو جیل کی وردی سے چھٹکارا دلا سکتا تھا اور اس کے ہم راہ شرفے کے بتائے ہوئے راستے سے لائل پور کی طرف نکل جاتا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ چلتے چلتے اچانک اسے خیال آیا کہ آج شاداں کے گاؤں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ کل ہی رات پولیس سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی ہے۔ اب پولیس نہ صرف شاداں سے پوچھ گچھ کرتی ہوگی بلکہ اس کے گھر کی نگرانی بھی کرتی ہوگی۔ گاؤں کے اندر اور باہر جگہ جگہ ناکوں پر پولیس تعینات ہوگی۔

یہ سوچتے سوچتے اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ نہر اب زیادہ دور نہ تھی۔ مگر لالی نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ واپس مڑا اور اپنے ٹھکانے کی جانب روانہ ہوا۔ جب وہ جھنگر سے گزر کر ٹیلوں پر چڑھ رہا تھا تو رات خاصی گزر چکی تھی۔ ہر طرف گہری ویرانی چھائی تھی۔

وہ کچھ ہی دور چلا تھا کہ روشنی پھیلنے لگی۔ دور فراش کے اونچے اونچے درختوں کے پیچھے سے چاند ابھر رہا تھا۔ گول گول سونے کے بڑے سے تھال کی طرح چمکتا دمکتا چاند ویرانے میں اس قدر خوبصورت نظر آ رہا تھا کہ لالی ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا۔ چاند ابھر کر اوپر آیا تو اندھیرے راستے روشن ہو گئے۔

اجلی اجلی چاندنی میں چلتا ہوا لالی کچھ ہی دیر بعد محراب کے قریب پہنچ گیا۔ رحیم داد ابھی تک جاگ رہا تھا۔ پتھریلے راستوں پر آہٹ سن کر وہ گھبرایا ہوا جھٹ نکل کر باہر آ گیا۔ لالی کو اس نے نکھری نکھری چاندنی میں دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

"یار' تو واپس کیوں آ گیا؟"

"اندر چل کر آرام سے گل بات کریں گے۔"

دونوں محراب کے نیچے پہنچ گئے۔ لالی دور سے چل کر آیا تھا۔ نمدے پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ مگر رحیم داد سخت بے چین تھا۔ خاموش نہ رہ سکا۔ "یہ تو بتا دے' رستے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔"

"ذرا دم لے' سب کچھ بتا دوں گا۔ ویسے پریشانی کی کوئی گل نہیں۔" لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا

رہا۔ "گل ایسے ہے رحیمے! میں نے خود ہی شاداں کے پنڈ جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "کیوں؟"

"میں نے چلتے چلتے سوچا' وہاں تو ابھی پولیس لگی ہوگی۔ تفتیش کرتی ہوگی۔"

"یہ تو تمیں نوں پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا۔ میں تو کہتا ہوں شاداں نے ہمارے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔"

"بتانا تو نہیں چاہیے۔ اس نے بالے کا خون جو کیا ہے۔ یہ بات ہم دونوں جانتے ہیں۔ ویسے ہمارے بارے میں وہ اتنا ہی جانتی ہے جتنا پولیس کو پتہ ہے۔"

"ایسا ہے تو اس نے ملک کو کیوں ہمارے بارے میں بتایا؟" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ "بتا اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"وہ تو اس نے دو ہزار انعام کے لالچ میں کیا۔ پر اسے جلد ہی اپنی غلطی کا پتہ چل گیا تھا۔ یار! وہ اتنی بری نہیں جتنی تو سمجھتا ہے۔"

"سوچ لے۔ ویسے میں تو یہی کہوں گا' تیرا اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔"

"میں تو تیرے لیے کپڑے لینے اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔" لالی اسے سمجھانے لگا۔ "یہ تو تمیں نوں بھی پتہ ہے جب تک تیرے بدن پر جیل کی وردی ہے' ہم کہیں جا بھی تو نہیں سکتے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہم دونوں فٹافٹ یہاں سے لائل پور کی طرف نکل جائیں۔"

رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔

باہر چاندنی چھٹکی تھی۔ رات نکھرتی جا رہی تھی۔ خنکی بھی بڑھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد رحیم داد جماہیاں لیتا ہوا بولا۔

"مجھے تو جھوک آ رہی ہے۔ میں تو اب سوتا ہوں۔"

یہ کہتا ہوا وہ نمدے پر لیٹ گیا۔ مگر لالی نہ لیٹا۔ اس نے پھونک مار کر چراغ بجھایا۔ باہر نکل کر کچھ دیر چاندنی میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ واپس آ کر وہ بھی لیٹ گیا۔ رحیم داد پہلے ہی سو چکا تھا۔ لالی ذرا دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

صبح اٹھ کر دونوں نے شہد کے ساتھ روٹی کا ایک ایک ٹکڑا کھایا' پانی پیا۔ محراب کے نیچے بیٹھے رہے یا اس کے قریب ہی منڈلاتے رہے۔ مگر دور نہیں گئے۔ شام کو انھوں نے پھر روٹی کا ایک ایک ٹکڑا کھایا۔ تھوڑا تھوڑا پنیر بھی کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے فوراً چراغ بجھا دیا۔ اندھیرے میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ چاند طلوع ہوا تو دونوں باہر نکلے اور کچھ دور جا

کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ بلندی سے انھوں نے گھوم پھر کر ہر طرف نظر دوڑائی۔ اجلی اجلی چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی تھی۔ مگر سناٹا بہت گہرا تھا۔ وہ بہت دیر بعد واپس آئے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔

دوسرا دن بھی اسی طرح گزرا۔ تیسرا دن بھی گزر گیا۔ مگر چوتھے روز پانی ختم ہوگیا۔ البتہ روٹیاں ابھی موجود تھیں۔ شہد اور پنیر بھی تھا۔ دن بھر وہ پیاسے رہے۔ شام ہوئی اور اندھیرا پھیلا تو لالی نے مشکیزہ اٹھایا۔ رحیم داد کو اپنے ساتھ لیا۔

دونوں ٹیلوں سے اتر کر جھنگر میں پہنچے۔ اسے عبور کیا اور نہر پر پہنچ گئے۔ اب رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ لالی نے نہر سے مشکیزے میں پانی بھرا اور مشکیزہ رحیم داد کے حوالے کر کے بولا۔

"میں اب شاداں کے پنڈ جہانگیرہ جاؤں گا۔ کوشش کروں گا سورج نکلنے سے پہلے واپس آجاؤں۔ آج نہ آسکا تو کل آجاؤں گا۔ مان لے مجھے آنے میں دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا۔ میں آؤں گا ضرور۔ میرا انتظار کرنا۔ تیرے پاس ابھی چار روٹیاں رہتی ہیں۔ شہد اور پنیر بھی ہے۔ یہ کئی دن کا راشن ہے۔ روٹیاں سوکھ جائیں تو پانی میں بھگو کر کھا لینا۔ صبح شام روٹیوں کا ایک ایک چپا کھانا۔ پانی مک جائے تو رات کے اندھیرے میں نہر سے لے آنا۔ پر دن میں ہرگز اپنے ٹھکانے سے باہر نہ نکلنا۔"

رحیم داد اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے بے چین ہو کر کہا۔ "یار! جتنی تال آجانا اور میرے لیے کپڑے ضرور لانا۔ ویسے مجھے ساتھ لے چلتا تو ٹھیک رہتا۔ مجھے ادھر کے رستوں کا کچھ تو اتا پتا ہے۔ تمیں نوں تو کچھ بھی پتہ نہیں 'توں تو بچپن سے لور میں رہا۔"

"پروا نہ کر۔ مجھے رستے کا سب پتہ ہے۔ میں جتنی آؤں گا اور تیرے لیے کپڑے ضرور لاؤں گا۔" لالی محبت سے اس کی پیٹھ تھپک کر بولا۔ "اب تو ٹھر جا۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ لٹکائے جھنگر کی طرف چل دیا۔

لالی خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو لالی نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا پل پر پہنچا۔ اسے عبور کیا اور نہر کی دوسری جانب چلا گیا۔ وہ آگے بڑھا تو سڑک آگئی۔ اس نے دور ہی سے دیکھا ' ایک لاری تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی گزر رہی ہے۔ اس کے جانے کے بعد گہرا سناٹا چھا گیا۔

لالی سڑک سے گزر کر ریل کی پٹڑی کی جانب بڑھا۔ ریل کی پٹڑی کے آس پاس سناٹا اور زیادہ گہرا

تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔

وہ ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے کچھ دور تک چلتا رہا ' پھر نشیب میں اتر کر جنگلی جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ لالی سنسان راستوں سے گزرتا ' ہر آہٹ پر چونکتا ' ایک بار پھر شاداں کے گھر کی دیوار کے نیچے کھڑا تھا۔ وہ ذرا دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر دیوار پر چڑھا اور آہستہ سے آنگن میں اتر گیا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور دالان کی جانب دبے دبے قدموں بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ شاداں دالان کے ایک کونے میں فرش پر لیٹی ہے۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے اجلی چاندنی میں لالی کا سایہ دیکھا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ لالی اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

شاداں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لالی نے کچھ کہنا چاہا تو شاداں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر رکھ دیا۔ کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ کیا اور لالی کا ہاتھ پکڑ کر آنگن میں آگئی۔

وہ اسے پڑچھتی میں لے گئی۔ آہستہ سے پوچھا۔ "توں آیا کیسے؟"

"دیوار پھاند کر۔" لالی بے نیازی سے بولا۔

"مسکری نہ کر۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"پہلے یہ بتا 'کمرے میں کون ہے؟"

"ہے کوئی 'کیا کرے گا جان کر۔" شاداں نے گول مول جواب دیا۔

لالی نے آنکھ مار کر بے تکلفی سے کہا۔ "کوئی نیا یار پھانس لیا؟"

شاداں ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "میں کوئی چھنال ہوں؟ مجھے سمجھتا کیا ہے کنجر۔" یہ کہہ کر اس نے غصے سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی نے اس کی برہمی پر ذرا بھی برا نہ مانا۔ ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ "ایسا نہیں ہے تو فیر چھپا کیوں رہی ہے؟ صاف صاف بتا کمرے میں کون ہے؟" اس نے لہجے بھر رک کر پوچھا۔

"تیرا خصم تو نہیں آگیا؟"

"نہیں۔" شاداں کے لہجے میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔ "وہ یہاں کیسے آسکتا ہے۔"

"کیوں نہیں آسکتا؟ تو اس کی گھر والی جو ہے۔ چھوٹ تو نہیں گئی۔ اس نے تجھے طلاک تو نہیں

دی۔"

"وے بھی نہیں سکتا۔" شاداں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "جب بالے کے ساتھ میرے جانے کا اسے پتہ چلا تو اس نے نہ پرچہ چاک کرایا نہ تھانے گیا۔ سب نے بہت کہا تب بھی نہ گیا۔ وہ اور ہی طرح کا بندہ ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ ذرا سا شرمائی اور دوپٹے کا پلو سر پر ڈال لیا۔ "اب بھی جان دیتا ہے مجھ پر۔"

لالی نے نظر بھر کر شاداں کو دیکھا۔ وہ پڑچھتی کے کنارے پر اس طرح کھڑی تھی کہ ہلکی ہلکی چاندنی کی پھوار میں اس کا چہرہ اجلے پیتل کی طرح دمک رہا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں میں کنول کھل رہے تھے۔

لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "تجھ پر جان دینے والے اور تیرے لیے تڑپنے والے تو اور بھی بہت ہیں۔ تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔" اس نے شاداں کی دمکتی ہوئی پیشانی اور آنکھیں بھرپور نظروں سے دیکھیں۔

"توں تو ابھی تک متسیل مٹیار لگتی ہے۔"

"وے مخول نہ کر۔" وہ شرما گئی۔ پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اب کیا رہ گیا مجھ میں، جل کر راکھ ہو گئی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "بالے مجھے برباد کر گیا۔"

"اس کی گل چھوڑ۔ ٹھیک ٹھیک بتا، کمرے میں کون ہے؟"

"نراض تو نہیں ہو گا؟" شاداں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میرے سر پر ہتھ رکھ کر بتا۔"

"نہیں۔" لالی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھے بغیر کہا۔ "نہیں مناؤں گا۔ بالکل نہیں مناؤں گا۔"

"ایسے نہیں۔" شاداں نے اصرار کیا۔ "سر پر ہاتھ رکھ کر بتا۔ برا تو نہیں منائے گا؟"

لالی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "لے اب بتا۔"

شاداں نے ذرا سا آگے جھک کر سرگوشی کی۔ "تاجی ہے، اندر منجی پر سو رہی ہے۔"

"کون تاجی؟" لالی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ ہونق کی طرح شاداں کا چہرہ تکنے لگا۔

شاداں ناک سکیڑ کر تیکھے لہجے میں بولی۔ "وہی کنجری، جس نے بالے کو مجھ سے چھین لیا تھا۔"

لالی نے خطرے کے احساس سے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "وہ یہاں کیسے آئی؟"

"آئی نہیں۔ میں خود جا کر لائی ہوں۔" شاداں مطلق خوف زدہ نہیں تھی۔

لالی اس کی بات سن کر سخت پریشان ہوا۔ جھنجلا کر بولا۔ "تیرا مگز تو نہیں چل گیا؟ یہ تجھے سوجھی کیا؟"

"نراض نہ ہو۔ تو نے میرے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔" وہ صفائی پیش کرنے لگی۔ "تپ چڑھی تھی اسے۔ کوئی دوا دارو بھی نہیں۔ میں شام کو اس کے لیے دوائی لائی ہوں۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ تڑپ کر بولی۔

"ہائے سرسوں کے پھول کی طرح پیلی پڑ گئی ہے۔"

لالی اس کی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ نہایت بے رخی سے بولا۔ "تجھے کس نے کہا تھا اسے اپنے گھر میں لا، اس کا علاج کرا۔ اور کوئی نہیں اس کا؟ کوئی تو ہو گا؟"

"ہے تو۔" شاداں نے جواب دیا۔ "ویر ہے، پر وہ کراچی میں ہوتا ہے۔ بھرجائی تھی، وہ بھی پچھلے دنوں اس کے پاس چلی گئی۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "ٹھیک ہی ہوا۔ ایسی چنڈال تھی۔ ہائے، کیا بتاؤں، روز تاجی کا ہاتھ پکڑ کر نکالتی تھی۔ مارتی تھی، جھونٹے کھسوٹتی تھی۔ تبھی تو بالے کے گلے پڑ گئی۔"

لالی اس کی باتوں سے اکتا گیا۔ بات کاٹ کر بولا۔ "خاماخا کی کڑ کڑ بند کر۔ یہ بتا وہ بالے کو تو نہیں پوچھتی تھی؟"

"کیوں نہیں پوچھتی تھی۔ میں اس کے پاس گئی تو اس نے پہلی بات یہی پوچھی۔ میں نے جھٹ کہا۔ بالے تو میرے پاس تین مہینے سے نہیں آیا۔ لہور گیا ہو گا، ایکٹر بننے۔ وہ تو اپنے کو سوہنا منڈا سمجھتا ہے۔" شاداں نے غور سے لالی کا چہرہ دیکھا۔

"غلط بات تو نہیں کہی میں نے؟"

"بات تو ٹھیک ہی کہی، پر اسے یہاں لے کیوں آئی؟"

"نہ لاتی تو کیا کرتی۔ بیمار ہے۔ کھانے پینے کو بھی گھر میں کچھ نہیں۔ پیسہ کوڑی بھی اس کے پاس نہیں۔" شاداں نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"توں چاہتا ہے مر جانے دیتی اسے؟"

وہ لالی سے اور قریب ہو گئی۔ اتنے قریب کہ لالی اس کے پتھر کے مانند سخت جسم کی چبھن محسوس کر سکتا تھا۔ شاداں رسان سے بولی۔ "تاجی کے پیٹ میں بچہ ہے۔ بالے ہی کا ہے۔ سچ جان اسی کا ہے۔" شاداں نے یہ بات ایسی لذت سے کہی کہ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔

لالی گم صم کھڑا رہا۔ اسے شاداں پر غصہ بھی آرہا تھا اور اس سے ہمدردی بھی تھی۔ شاداں اس کی الجھن سے بے نیاز کہتی رہی۔ "جنپا یہیں ہو گا۔ بچے کو خود پالوں گی۔ اپنے ہی پاس رکھوں گی۔

تاجی بھی یہیں رہے گی۔ میرا کیا لے گی' اپنے نصیب کا کھائے گی۔"

"تو سفنا تو نہیں دیکھ رہی؟" لالی نے مسکرا کر ٹوکا۔ "اب تو جاگ جا۔"

شاداں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ سب کرے گی کیسے؟"

شاداں نے شیشم کے پیڑ کے قریب پڑے ہوئے چھپر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ چتی دیکھ رہا ہے؟ ادھر آ۔" وہ لالی کا ہاتھ پکڑ کر چھپر کے پاس لے گئی اور اس کے نیچے بیٹھی ہوئی بھینس کی تھوتھنی محبت سے سہلاتے ہوئے بولی۔

"میری پوری دھرتی ہے۔ نیلی بار کی نَے ہے۔ بھاڑو ہے۔ کٹے کے بنا صرف چارے پر صبح شام پکا اٹھاراں سیر دودھ دیتی ہے۔"

"پر تیرا اس سے کیا بنتا ہوگا؟"

"لے یہ کم ہے۔" شاداں نے چہک کر کہا۔ "ملک کی حویلی پر دودھی آتا ہے۔ روز کے روز دام چکا کر دودھ لے جاتا ہے۔ شام کو چاٹی میں دودھ بلو کر مکھن نکال لیتی ہوں۔ وہ بھی بک جاتا ہے۔" شاداں نے قدرے تامل کیا۔ "اور سن' ساڑی کی فصل پر پھٹی کی چنائی بھی کرتی ہوں۔ خاصی چوگی مل جاتی ہے۔ ملک کی حویلی میں بھی کام کاج کرتی ہوں۔ محنت کرنے کے معاملے میں زبردست اہری ہوں۔ پرواہ نہ کر لالی۔ فکر کی کوئی گل نہیں۔"

"جب اتنے بہت سے کام کر لیتی ہے تو ایک کام اور کر۔" لالی مسکرانے لگا۔ "مجھے پکڑوا دے۔ ایک اور نَے آجائے گی۔"

"گالاں نہ نکال۔" وہ بگڑ کر بولی۔ "میں نے جتی تیرے ہاتھ میں دے دی تھی۔ جتی سے مار لے' پر ایسی گل بات نہ کہہ۔"

"مجھے پکڑوا دے گی تو تجھ سے کوئی گلہ نہ ہوگا۔ سچ کہہ رہا ہوں تجھے انعام ملے گا تو مجھے خوشی ہوگی۔" لالی کسی قدر جذباتی ہو گیا۔ "شاداں! توں بہت زوروں کی ٹیا رہے۔ مٹی جائے چندن بن کر مہکتی جائے۔ بالے تجھے پہچان ہی نہ سکا۔ وہ تو ایک نمبر......"

شاداں نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی' جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ مگر وہ چونک پڑا۔ شاداں کا ہاتھ بالکل خالی تھا۔ لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"شاداں! تیرے ہاتھ کی چوڑیاں کہاں گئیں؟"

"توڑ ڈالیں۔ بالے جو مر گیا۔"

"تجھ پر ابھی تک اس کی محبت کا بھوت سوار ہے۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس طرح اس کا سیاپا کرے گی تو ضرور جیل جائے گی۔"

"نراض کیوں ہوتا ہے۔ تو چاہتا ہے' میں خوشی مناؤں' سلاری باندھوں' دانتوں پر دنداسا ملوں' آنکھوں میں کاجل ڈالوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بتاتا ہوں' ابھی بتاتا ہوں۔" لالی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "ایسا کر پھانسی کے پھندے پر جا کر لٹک جا۔" شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی ذرا دیر چپ رہ کر بولا۔ "بھیجے سے کام لے بھیجے سے۔ تیری تو مت ماری گئی ہے۔ آج نہیں تو کل چرچا ہوگا۔ بالے کہاں گیا؟ ایسی گل بات زیادہ دنوں چھپی نہیں رہتی۔ خون سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ توں صاف پکڑی جائے گی۔ کچھ تو سوچ۔ سب تجھے کیا کہیں گے۔ مرنا ہی ہے تو ذلیل اور بدنام ہو کر کیوں مرنا چاہتی ہے؟" شاداں گم صم کھڑی اس کی باتیں سنتی رہی۔

لالی نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا' شاداں کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لے' کل جا کر چوڑیاں پہن لینا۔ جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔" لالی نے نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھ بند کر دیا۔ "سمجھ گئی نا میری بات کا مطلب؟"

"سمجھ گئی۔" شاداں نے سر ہلایا اور نوٹ ٹلکجے لاچے کے ڈب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بتا آج آیا کیسے؟" پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "کپڑوں کے لیے آیا ہوگا' ہائے میں تو بھول ہی گئی۔ جس رات تو گیا ہے' اس کے بعد تو دو روز تک تھانے دار نے پچھ پچھ کر میرا مگز خراب کر دیا۔"

"کیا بتایا توں نے؟"

"میں نے کہہ دیا' دونوں بالے سے ملنے آئے تھے۔ اس کا دوست بتاتے تھے۔ میں نے خوب آنسو بہائے۔ رو رو کر کہا' وہ مجھے چھری دکھا کر ڈراتے تھے۔ مار دینے کو کہتے تھے۔"

"توں تو ایک دم فروٹ نکلی۔ دیکھنے میں ایسی نہیں لگتی۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "بالے کے بارے میں بھی پوچھتے تھے؟"

"پوچھتے تھے۔" شاداں نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "میں نے وہی بات کہی جو تاجی سے کی تھی۔ کوئی غلط بات تو نہیں کہی میں نے؟"

"ابھی تک تو ٹھیک ہی جا رہی ہے۔"

"پر تجھ سے ڈر لگتا ہے تیرا کیا بھروسا۔ چور اچکا جو ٹھیرا۔"

لالی اس کی چوٹ اس طرح سہ گیا جیسے گونگا چپ چاپ کڑوی دوا نگل جاتا ہے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ شاداں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "آزما لے۔ لے چل ملک کے پاس پکڑوا دے مجھے' بھاگوں گا نہیں۔ بھاگ جاؤں تو پیشاب سے مونچھ منڈوا دینا۔" اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

"ایک رات تیرے پنڈ آؤں گا اور تجھے صاف اڑا لے جاؤں گا۔"

شاداں ایکدم بپھر گئی۔ "تو اپنے کنجرپن سے باز نہیں آئے گا۔" وہ غصے سے لالی کو گھورنے لگی۔ "مرجاؤں گی۔ پر تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

لالی ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ "توں ضرور چلے گی۔ میرے سوا تجھے کوئی بھگا کر نہیں لے جا سکتا۔ شرط بدلے مجھ سے۔" اس نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "آ ہاتھ مار۔"

شاداں نے تیوری پر بل ڈال کر کچھ کہنا چاہا۔ عین اس وقت کمرے کے اندر آہستہ آہستہ کھانسنے کی آواز ابھری۔ شاداں نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا۔ گردن جھکا کر سرگوشی کی۔

"لگتا ہے' تاجی جاگ گئی۔ تو اب ٹر جا۔"

لالی نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے والے تھے۔ چاند ڈوب گیا تھا۔ اندھیرے میں صبح کا ہلکا ہلکا اجالا ابھر رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر کہا۔ "ہاں اب مجھے چلنا چاہیئے۔ صبح ہونے والی ہے۔ توں کپیس اور دھوتی ضرور لے آنا۔ میں بعد میں آؤں گا۔" وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔

"ٹھہر میں بھی تیرے سنگ چلوں گی۔"

لالی آنکھ مار کر بولا۔ "رہنے دے' ابھی وہ رات نہیں آئی۔"

"بکواس نہ کر۔" شاداں نے اسے ڈانٹا۔ "تیرا ایسے جانا ٹھیک نہیں۔ چل میں تجھے رڑ کے کنڑ تک چھوڑ آؤں۔ بوری کو بھی ساتھ لے چلوں گی۔ کوئی پوچھے گا تو کہہ دوں گی۔ بیمار ہے' اسے موک لگ گیا ہے۔ سلوتری کو دکھانے ساتھ والے چک لے جا رہی ہوں۔"

لالی جاتے جاتے رک گیا اور چوکنا نظروں سے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ مگر کھانسی اب بند ہو چکی تھی۔ شاداں نے بھینس کھولی۔ اس کی گردن میں موٹی رسی کا ڈاہا ڈالا اور اسے ہنکاتی ہوئی لالی کے پاس پہنچی۔ دونوں گھر سے نکل کر گلی میں آ گئے۔ شاداں نے دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ ہر طرف دودھیا دھند پھیلتی جا رہی تھی۔ گھروں سے رک رک کر

مویشیوں کی اڑات' بوڑھوں کی کھانسی اور بچوں کے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

شاداں نے ان آوازوں سے پریشان ہو کر کہا۔ "بھیتی کر' بول برالا شروع ہو گیا۔"

لالی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تیز قدم اٹھا کر چلنے لگا۔ دونوں ویران راستوں سے گزرتے' درختوں کی آڑ لیتے آگے بڑھنے لگے۔ بھینس ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شاداں کبھی اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتی کبھی لاڈ سے تھوتھنی سہلاتی اور اسے ہنکانے کے لیے رک رک کر منہ سے "تت تت" کی آواز نکالتی۔

لالی صبح کا پھیلتا ہوا اجالا دیکھ کر اور زیادہ تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے جوتوں کی تیز رگڑ سے خاموشی میں آہٹ ابھر رہی تھی۔

شاداں نے اسے ٹوکا۔ "وے لالی! دھیرے چل۔ دگڑ دگڑ نہ کر۔"

لالی نے پلٹ کر شاداں کو دیکھا' اپنی رفتار سست کر دی اور خاموشی سے شاداں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جاتا۔ دونوں گاؤں سے نکل کر باہر آ گئے۔ اب رڑ شروع ہو گیا تھا۔ رڑ کے ایک طرف ربیع کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ صبح کی نرم نرم ہوا کے جھونکوں سے گندم کی بالیاں جھومتیں اور خشک پتوں سے سرسراہٹیں ابھرتیں۔ رڑ اس وقت سنسان تھا۔ اس کی زمین سخت اور ہموار تھی۔ کہیں کہیں بارش سے زمین میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ گاؤں کے سامنے کا یہ میدان کھیل کود کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر صبح کے سناٹے میں چٹیل نظر آتا تھا۔

دونوں کھیتوں کے ساتھ ساتھ رڑ سے گزرتے رہے۔ شاداں کے بال بپھری ہوا کے جھونکوں سے اڑ اڑ کر اس کے صندلیں چہرے پر بکھر جاتے۔ وہ ہر بار انھیں سمیٹ کر پیچھے کرتی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ گردن اونچی کیے چل رہی تھی۔ لالی چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس کے جسم کے دائرے اور پیچ و خم دیکھتا رہا۔ اب نہ وہ خوف زدہ تھا نہ بے چین۔ شاداں کی پناہ میں وہ خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا اور شاداں ملگجے لاچے میں اپنے بھاری کولھے گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلاتی آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ اپنی اوپر اٹھی ہوئی گردن کو ہلکا سا خم دے کر ادھر ادھر دیکھتی جاتی۔ ایسے جیسے کتیا اپنے پلے کی رکھوالی کرتے وقت چوکس نظر آتی ہے۔ سویرا بلندیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

ہر چیز خواب کے مانند دھندلی اور خاموش نظر آ رہی تھی۔ یکایک اس خاموشی میں دور سے گھوڑے کے دوڑنے کی آواز ابھری۔

شاداں گھبرا کر بولی۔ "ہائے میں مرگئی۔ یہ تو ملک جان پڑتا ہے۔"

لالی بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں رک گئے۔ دیکھتے دیکھتے کھڑی فصلوں کی آڑ سے نمبردار ملک اللہ نواز خان نکلا اور عین ان کے سامنے آگیا۔ وہ اپنی سفید گھوڑی پر مرغ کی طرح اکڑا بیٹھا تھا۔ آگے بندوق رکھی تھی۔ دونوں کو دیکھتے ہی اس نے گھوڑی کی راس زور سے کھینچی اور شاداں سے مخاطب ہوا۔ "اتنے سویرے کہاں چلی؟" اس نے شاداں کے پیچھے کھڑے ہوئے لالی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا اور اونچی آواز سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟" شاداں نے کچھ کہنا چاہا مگر ملک پہلے ہی بول پڑا۔ "یہ وہی جیل سے بھاگا ہوا کیدی تو نہیں ہے؟ وہی جان پڑتا ہے۔" ملک نے غصے سے ڈپٹ کر دریافت کیا۔

"ٹھیک ٹھیک بتا' کون ہے یہ؟"

شاداں کچھ نہ بتا سکی۔ اس کی آنکھیں خوف اور گھبراہٹ سے پھٹی ہوئی تھیں' ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ بالکل ہونق نظر آرہی تھی۔ شاداں کو خاموش پا کر ملک زور سے چیخا۔ "آج یہ نکل کر نہیں جائے گا۔" اس نے جھٹ سامنے رکھی ہوئی بندوق اٹھائی اور لالی کو للکارا۔

"آگے بڑھا تو گولی سے اڑا دوں گا۔"

"ملک جی!" شاداں اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ لیکن ملک اس کی التجا۔ ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ فلمی ولن کی طرح زور سے دہاڑا۔

"ہٹ جا میرے سامنے سے۔"

لالی خاموش کھڑا تھا۔ ملک بندوق تانے اسے خون خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی گھنی مونچھیں غصے سے ابابیل کے پروں کی مانند پھڑپھڑا رہی تھیں۔ اس کی کلف دار پگ کا اونچا طرہ ہوا سے لہرا رہا تھا۔

شاداں ابھی تک لالی اور ملک کے درمیان دیوار بنی کھڑی تھی۔ اچانک لالی نے پیچھے سے شاداں کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ منہ کے بل زمین پر گری۔ ملک کی نظریں بھٹک گئیں۔ لالی جھٹ قریب کھڑی ہوئی بھینس کے اوٹ میں جھک کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ ملک نشانہ باندھتے ہوئے چلایا۔

"باہر نکل' نہیں تو میں فائر کھول دوں گا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جھپاک سے چھری نکالی اور بھینس کی ٹانگوں کے بیچ سے ملک کی جانب تیزی سے پھینکی۔ چھری گھوڑی کی ایک ٹانگ چیرتی ہوئی گوشت میں پیوست ہو گئی۔ گھوڑی

نے ہنہنا کر دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا دیں۔ ملک بے قابو ہو گیا۔ اس نے گھبراہٹ میں ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلی اور چیختی ہوئی بھینس کے پیٹ میں اتر گئی۔ سب کچھ پلک جھپکتے ہوا۔ ملک کی گھوڑی ہنہناتی ہوئی سرپٹ بھاگی۔

ملک اللہ نواز پیٹھ پر بیٹھا اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر گھوڑی رکنا تھی نہ رکی۔ دوڑتی ہوئی دور نکل گئی۔ بندوق بھی ملک کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔

لالی نے تیزی سے دوڑ کر بندوق اٹھائی۔ اس میں ابھی تک کارتوس موجود تھا۔ وہ بندوق اٹھا کر پلٹا۔

شاداں کی بھینس زور زور سے ڈکرائی۔ چند قدم بھاگی پھر لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اس کے پیٹ سے خون نکل کر دور تک زمین پر پھیل گیا۔ بھینس بے بسی سے گردن ہلا کر زمین پر منہ رگڑنے لگی۔ شاداں دوڑ کر زخمی بھینس سے دیوانوں کی طرح لپٹ گئی۔ اس کے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے۔ دونوں آنکھیں اشکوں سے آبشار بن گئیں۔ لالی بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا بھینس کے قریب پہنچ گیا۔

شاداں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "توں گیا نہیں؟"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنا بھینس کو تڑپتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ "شاداں! تیری بوری مر رہی ہے۔"

"دیکھ رہی ہوں' پر توں یہاں سے ٹر جا۔"

لالی چپ کھڑا رہا۔ اس کی نظریں بھینس کے پیٹ سے ابلتے ہوئے لال لال خون پر جمی تھیں۔ یکایک شاداں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے سے بولی۔ "کھڑا کیوں ہے؟ جا یہاں سے۔ ملک اپنے کرندوں کو لے کر آتا ہی ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ لالی پر جھپٹی اور اسے زور سے دھکا دیا۔

"جا' بھیتی نال ٹر جا۔"

لالی لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا اور مڑ مڑ کر شاداں کو اور اس کی تڑپتی ہوئی بھینس کو دیکھتا رہا۔ مگر جب اس راستے کی جانب بڑھا جدھر سے گاؤں میں داخل ہوا تھا تو اس نے دیکھا' کئی ہالی' ہل پنجالی لیے سامنے کھڑے ہیں اور اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ لالی کی ان پر نظر پڑی تو وہ ٹھٹکا۔ اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی بندوق اٹھائی اور اس کی نال ان کی طرف کر دی۔ وہ خوف زدہ ہو کر ہلتے اور ہل پنجالی چھوڑ چھاڑ بگٹٹ بھاگے۔

لالی نے ان کی سراسیمگی سے فائدہ اٹھایا اور جھٹ کھیتوں میں داخل ہو کر ایک پگڈنڈی پر تیزی

سے دوڑنے لگا۔ اب اسے دور سے ملی جلی انسانی آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ آوازیں اسی سمت سے آرہی تھیں جہاں شاداں کی زخمی بھینس دم توڑ رہی تھی۔

پڑیلی میں دور دور تک جنگلی جھاڑیاں اور اونچی اونچی گھاس تھی۔ زمین خشک اور ریتلی تھی۔ صبح کا اجالا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ چڑیوں کے غول بھراٹا مار کر جھاڑیوں سے نکلتے اور چہچہاتے ہوئے فضا میں بکھر جاتے۔ لالی نے بندوق گھنی جھاڑیوں کے نیچے ایک گڑھے میں ڈال دی۔ اسے خشک پتوں اور پتھروں سے چھپا دیا۔ اب لالی کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خودرو پودے روندتا' جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کے درمیان سے راستہ بناتا' جدھر منہ اٹھا' اسی طرف بڑھتا چلا گیا۔
جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس سے بھری ہوئی پڑیلی ختم ہوئی تو اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سامنے سڑک ہے۔ سڑک صبح کے اجالے میں سانپ کی طرح بل کھاتی دور تک چلی گئی تھی۔ سڑک نیم پختہ تھی اور زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ سڑک کے دونوں جانب بنجر اور غیر مزروعہ علاقہ تھا۔ کہیں کہیں مٹی اور ریت کے تودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔

اس نے دو ڈھائی میل راستہ طے کیا تو دور سے ہریالی نظر آئی۔ آگے بڑھا تو کھیتوں اور درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی نہر ملی۔ سورج نکل آیا تھا۔ نہر کا پانی ہلکی ہلکی دھوپ میں جھلملا رہا تھا۔ سڑک نہر کے اوپر سے گزرتی تھی۔
لالی نے نہر دیکھی تو بے قرار ہو کر نیچے اترا۔ نہر کے قریب گیا۔ اسے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چلو بھر بھر کر پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور نہر کے کنارے لیٹ گیا۔ نرم اور خنک ریت پر لیٹ کر بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ٹھنڈے جھونکے آئے تو

نیند سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مگر وہ سویا نہیں۔ ذرا دیر سستا کر اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر سڑک پر آگیا۔ اس نے پل عبور کیا اور آگے بڑھنے لگا۔

اب دن نکل آیا تھا۔ اسے کسی ایسے ٹھکانے کی تلاش تھی جہاں روپوش ہو کر دن گزارا جا سکے۔ سڑک کے دونوں طرف کھیتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ ان کے پیچھے گاؤں کے مکانات نظر آ رہے تھے۔ کچھ ہی دور آگے بڑھا تھا کہ ایک لاری شور مچاتی' دھول اڑاتی سامنے سے آتی نظر آئی۔ وہ سڑک سے اتر کر نشیب میں آگیا۔ لاری تیزی سے دوڑتی ہوئی گزر گئی۔ لالی پھر سڑک پر آگیا۔

فرلانگ سوا فرلانگ فاصلہ طے کیا تو اسے سڑک سے ایک کچا راستہ گاؤں کی طرف جاتا نظر آیا۔ یہی کچا راستہ سڑک کے دوسری طرف بھی جاتا تھا۔ مگر اس طرف لاکھا تھا۔ جگہ جگہ ریت کے ٹیلے تھے اور ان کے درمیان گندم اور جو کے پودے لہلہا رہے تھے۔ چنے اور سرسوں کے کھیت بھی تھے۔ ہوا زور سے چلتی تو سرسوں کے پیلے پیلے پھول کسی الھڑ مٹیار کے بسنتی آنچل کی طرح لہراتے۔ ایک سانڈنی سوار ٹیلوں اور کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر گرد کے بگولے اڑاتا دور جاتا نظر آ رہا تھا۔

لالی مخمصے میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر جائے اور کون سا راستہ اختیار کرے؟ وہ خاموش کھڑا سانڈنی سوار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسی اثنا میں اسے اپنی پشت پر چاپ سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا کہ ایک شخص آہستہ آہستہ اسی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ اس کا لباس اجلا تھا۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ سر پر سفید پگڑی تھی۔ ڈاڑھی کے بال کھچڑی تھے۔ قریب آکر اس نے لالی سے پوچھا۔ "کیا تم لاری سے اترے ہو؟" لالی بات کا جواب فوراً نہ دے سکا۔

اسے خاموش پا کر وہ شخص مسکرایا۔ "مجھے بھی اسی لاری سے جانا تھا۔ پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ لاری نکل گئی۔"

"ابھی ابھی گئی ہے جی۔"

"یہ لاری تو کوٹ لنگر سے آ رہی تھی۔ تم بھی وہیں سے آ رہے ہو؟" لالی کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خود ہی بولا۔ "لگتا ہے' تم غلط جگہ آ گئے۔"

لالی اس کی بات کا جواب نہیں دے سکا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ نہ اسے آگے کا پتہ تھا نہ پیچھے کا۔ وہ پہلے کبھی اس طرف آیا ہی نہ تھا۔

وہ شخص بولا۔ "تم آگے چلے آئے' تمہیں پیچھے اترنا تھا۔ سفر میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ اسی لاری سے میں پہلی پہاڑ جا رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ جھوک آ گئی۔ آنکھ کھلی تو دیپال پور میں تھا۔ پہلی پہاڑ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ لمحے بھر کو رکا۔ "مگر ایسی کے لیے تمہیں شام سے پہلے کوئی لاری نہیں ملے گی۔ اس سڑک پر پچھلی بارشوں کے بعد بہت کم لاریاں چلتی ہیں۔ سڑک ٹوٹ پھوٹ کر بہت خراب ہو گئی ہے۔ پہلی لاری صبح صبح نکل جاتی ہے۔"

لالی کو وہ بھلا آدمی لگا۔ اس کے لہجے میں نرمی اور شفقت تھی۔ مگر لالی خاموش رہا۔ وہ ابھی تک بھونچکا تھا اور خود کو ذہنی طور پر آمادہ نہیں کر سکا تھا کہ اس شخص کے ساتھ کس طرح کا رویّہ اختیار کرے۔ یکسر نظر انداز کر دے یا اس کے جذبہ ہمدردی سے فائدہ اٹھا کر راستہ دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ جب لالی نے اس کی باتوں کے جواب میں کچھ نہ کہا اور گم صم کھڑا رہا تو وہ شخص بولا۔

"تم کس سوچ میں پڑ گئے؟"

آخر لالی کو بولنا پڑا۔ اس نے بات بنائی۔ "بات یہ ہے جی! میں یہاں دوسری بار آیا ہوں۔ کئی سال پہلے آیا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ یاد پڑتا ہے' اسی جگہ اترا تھا۔"

"لاری سے آئے تھے یا تانگے سے؟"

"آیا تو لاری ہی سے تھا۔" لالی نے گاؤں کی طرف نظر ڈالی جس کے مکانات درختوں کے پیچھے سے نظر آ رہے تھے۔ اس نے پلٹ کر سڑک کے اس پار لاکھے کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "سمجھ نہیں آتی' یہی جگہ تھی یا کوئی اور۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس شخص نے درختوں کی سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ رہا اپنا چک۔ تم چاہو تو شام تک میرے ساتھ ٹھہر سکتے ہو۔ یہاں دھوپ میں کھڑے کھڑے پریشان ہو گے۔ آؤ میرے ساتھ۔ جہاں تمہیں جانا ہے پہنچا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

لالی انکار نہیں کر سکا۔ چپ چاپ اس کے ہم راہ چلنے لگا۔ دونوں کچھ دور کچے راستے پر چلتے رہے۔ وہ شخص ایک پہیے کی جانب مڑ گیا۔ لالی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے رہے اور جب پہیا طے کر کے باہر آئے تو گاؤں شروع ہو چکا تھا۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے۔ ایک دو منزلہ پختہ مکان کے سامنے ٹھہر کر اس شخص نے کہا۔

"لو جی! یہ رہی اپنی ماڑی۔ یہ گھر کا اگواڑہ ہے۔ ساتھ ہی ڈیرا ہے۔ بیٹھک بھی اسی طرف ہے۔ ادھر ہی چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر گپ شپ ہو گی۔"

وہ مکان کے ساتھ ساتھ چلا اور سیدھے ہاتھ کو مڑ گیا۔ مکان کے آگے آم اور نیم کے پیڑ تھے۔ ان کے نیچے چارپائی بچھی تھی۔ اس شخص نے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم یہاں بیٹھو۔ میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔'' وہ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف واپس چلا گیا۔

لالی چارپائی پر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے سامنے مکان کا جو حصہ تھا' اس کے آگے کھلا ہوا اونچی چھت کا برآمدہ تھا۔ برآمدے میں ایک دروازہ کھلتا تھا اور اس کے ساتھ ہی کھڑکی بھی تھی۔ برآمدہ اس وقت خالی تھا۔

مکان آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس کے گردو نواح میں صرف چند کچے مکانات تھے۔ لالی نے گاؤں صرف ایک نظر دیکھا۔ اس میں کئی اور بھی دو منزلہ مکانات تھے۔ گاؤں اپنی آبادی اور رونق کے اعتبار سے جہانگیرہ سے بھی بڑا تھا۔ مکان دیکھ کر لالی کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا میزبان گاؤں کا کھاتا پیتا آدمی ہے۔ مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

درختوں کے نیچے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لالی بہت تھکا ہوا تھا۔ وہاں بیٹھ کر اسے سکون ملا۔ اس نے دل میں کہا کہ دن گزارنے کے لیے اچھا ٹھکانا مل گیا۔ شام کو چلا جاؤں گا۔ موقع ملا تو شاداں سے مل لوں گا۔ پچھلی رات کے بارے میں معلوم کروں گا کہ بعد میں اس پر کیا بیتی؟ اگر وہ کپڑے لے آئی تو آج ہی رات رحیم داد کو جیل کی وردی سے چھٹکارا دلا دوں گا۔ پھر آگے جانے کا پروگرام بنے گا۔ مگر شاداں کے گھر جاتے ہوئے اسے خطرے کا بھی احساس ہوا۔ اتنے سنگین واقعے کے بعد گاؤں بھر میں کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ ملک اللہ نواز بہت غصے میں ہوگا۔ ہو سکتا ہے' اس نے پولیس کو بھی بلایا ہو۔ تھانیدار اس کا بھائی ہے۔

لیکن شاداں کے گاؤں کی طرف جانا اس کے لیے ضروری تھا۔ رحیم داد کے پاس پہنچنے کا راستہ اسی طرف سے جاتا تھا۔ کوئی اور راستہ لالی جانتا بھی نہیں تھا۔ وہ اسی ادھیڑبن میں گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

اس نے نظریں اٹھائیں تو دو کانسٹیبل سامنے سے آتے نظر آئے۔ لالی لرز کر رہ گیا۔ اس نے سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور بھاگ کر کسی گلی میں گھس جانے کا ارادہ کیا۔ عین اس وقت برآمدے کی طرف سے آواز آئی۔

''ادھر بیٹھک میں آجاؤ۔ کچھ کھا پی لو۔ تم نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔''

لالی نے دیکھا' برآمدے میں اس کا میزبان دروازہ کھولے کھڑا ہے۔ لالی تو اس وقت چاہتا بھی یہی تھا۔ فوراً اٹھا' برآمدے میں پہنچا اور بیٹھک کے اندر چلا گیا۔ بیٹھک صاف ستھری تھی۔ ایک

طرف اونچے پایوں کا پلنگ تھا۔ اس پر اجلا بستر تھا۔ فرش پر دری بچھی تھی۔ موڑھے تھے۔ دو تین کرسیاں تھیں اور ایک میز بھی تھی۔ میز پر لیمپ رکھا تھا۔ اس کے قریب ہی چند پرانے اخبار پڑے تھے۔ دیواروں پر رنگین طغرے لگے تھے۔ ایک آئینہ بھی میز کے پاس ہی دیوار پر آویزاں تھا۔ اس شخص نے لالی کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک موڑھا کھینچ کر بولا۔

''میں تو جی اس پر بیٹھوں گا۔ مجھے تو اسی پر بیٹھنے میں آرام ملتا ہے۔''

لالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے جھجکا۔ میزبان نے اصرار کر کے اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ ذرا دیر بعد ایک عورت دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھانکتی ہوئی اس دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں حقہ تھا۔ اس نے حقہ موڑھے کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اس شخص نے حقے کی نے سنبھالتے ہوئے عورت سے کہا۔

''بھاگ بھری! کھانے کو کچھ روٹی شوٹی لا۔ جلدی کر۔''

''ابھی لائی جی۔'' یہ کہتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔

وہ شخص چپ بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا۔ ذرا دیر بعد بھاگ بھری لوٹے میں پانی لائی۔ لالی نے باہر جا کر منہ دھویا' پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ وہ شخص لالی سے مخاطب ہوا۔ ''برخوردار! تم سوچتے ہوگے۔ میں کون ہوں؟'' وہ زیر لب مسکرایا۔ ''میں مشرقی پنجاب کا مہاجر ہوں۔ میرا نام فیض محمد ہے۔ مگر لوگ مجھے ماسٹر جی کے نام سے جانتے ہیں۔ بات یہ ہے برخوردار کہ میں پہلے سکول ماسٹر تھا۔ جب پاکستان بنا تو میں بھوانی کے پرائمری سکول میں پڑھاتا تھا۔ ویسے میں رہنے والا سونی پت کا ہوں۔ فسادات اور بلوے ہوئے تو لٹ پٹ کر پاکستان آ گیا۔ کچھ دن ٹھوکریں کھاتا رہا' پھر پاک پتن میں سکول ماسٹر لگ گیا۔ سونی پت میں اپنی کچھ زرعی اراضی تھی۔ اس کا کلیم داخل کیا۔ بھاگ دوڑ کی تو کلیم منظور ہو گیا اور اس چک میں الاٹمنٹ بھی مل گیا۔ میں سکول ماسٹری چھوڑ چھاڑ یہاں آ گیا۔ اب غلہ منڈی میں آڑھت کا کاروبار بھی کرتا ہوں۔ چار مربعے کے لگ بھگ زمین ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ عزت کے ساتھ گزر رہی ہے۔'' اس نے قدرے تامل کیا۔ ''برخوردار! تم نے اپنے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا؟''

لالی صاف جھوٹ بول گیا۔ ''سرفراز۔ جی میرا نام محمد سرفراز ہے۔''

''اچھا' اچھا۔'' وہ مسکرایا۔ ''ادھر کیسے آنا ہوا؟''

''ایک دوست کے پاس آیا تھا۔''

''کیا نام ہے اس کا؟''

"جی وہ۔" لالی ذرا سا الجھا۔ "اس کا نام رحمت ہے۔"

"وہی تو نہیں' جو محمد حنیف پٹواری کا پتر ہے؟"

"مجھے اس کے پیو کا نام تو لوم نہیں جی۔"

"اگر یہ وہی رحمت ہے تو وہ اب اس چک میں نہیں رہتا۔" فیض محمد نے حقے کا کش لگا کر کہا۔ "اس نے ریلوے میں نوکری کر لی ہے۔ کبھی کبھار یہاں آتا ہے۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا' اسی اثناء میں بھاگ بھری ناشتا لے کر آ گئی۔ اس نے دری پر دستر خوان بچھایا اور ناشتے کا سامان اس پر رکھ دیا۔ ناشتے میں پراٹھے تھے' تلے ہوئے انڈے تھے' مکھن تھا اور چائے بھی تھی۔ ماسٹر جی نے لالی کو مخاطب کیا۔ "لو برخوردار! ناشتا کر لو۔" وہ اٹھا اور دستر خوان کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ لالی بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"میں نے تو صبح ہی ناشتا کر لیا تھا۔ تمہارا ساتھ دینے کے لیے صرف ایک پیالی چائے پیوں گا۔ تم میرا خیال نہ کرنا۔ اطمینان سے کھاؤ۔ کسی تکلف وکلف کی مطلق ضرورت نہیں۔"

لالی خاموشی سے بیٹھا ناشتا کرتا رہا اور فیض محمد اسے اپنے کاروبار اور زمیں داری کے بارے میں اودھر ادھر کی باتیں سناتا رہا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر لالی پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ فیض محمد نے اخبار اٹھایا اور اسے پڑھنے لگا۔ بھاگ بھری دستر خوان اور برتن اٹھا کر لے گئی۔ فیض محمد نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھایا اور لالی کو مخاطب کیا۔

"لو جی! یہ تو اپنے ہی ضلعے کی خبر ہے۔ دو قیدی منٹگمری جیل سے نکل بھاگے۔ ہفتے بھر سے اوپر ہو گیا۔ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگے۔ دو ہزار کا انعام بھی مقرر ہوا۔ تب بھی نہ پکڑے گئے۔" وہ مسکرایا۔ "پکڑے بھی کیسے جائیں۔ سب ملی بھگت ہے۔"

لالی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ فیض محمد نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ "سرفراز! تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ سو جاؤ۔" مگر دوسرے ہی لمحے اس نے لالی کو سونے سے منع کر دیا۔ "بھئی! پہلے حجامت بنوا لو۔ بہت بڑھ گئی ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں نائی کو بھیجتا ہوں۔ تم حجامت بنوا لو۔ پچھواڑے مویشیوں کا کڑا ہے۔ وہاں کنواں بھی ہے۔ جی چاہے تو نہا لو۔ پھر اطمینان سے سو جانا۔"

فیض محمد کے اٹھتے ہی لالی بھی احتراماً کھڑا ہو گیا۔ فیض محمد گھر کے اندر جانے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ جاتے جاتے ٹھٹک کر گویا ہوا۔

"میں گھوڑی پر بیٹھ کر منڈی چلا جاؤں گا۔ ویسے سائیکل بھی ہے۔ مگر مجھے گھوڑی کی سواری پسند

ہے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے واپس آ جاؤں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو کنڈی کھٹکھٹا کر بھاگ بھری کو بلا لینا۔ ادھر ڈیرے پر بھی کمی کمی اور نوکر چاکر موجود ہیں۔"

وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ لالی اس کے جانے کے بعد بھی خوف زدہ رہا۔ طرح طرح کے اندیشے پریشان کرنے لگے۔ باہر جانا خطرناک تھا اور کمرے میں بیٹھا رہنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ خاموش بیٹھا آنے والے خطرے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر خطرہ نہیں آیا۔ نائی آ گیا۔ اس نے لالی کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی صاف کی۔ مونچھیں کاٹ چھانٹ کر درست کیں اور سر کے بال بھی تراش دیے۔ اس نے حجامت بناتے ہوئے لالی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ مگر لالی نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ نائی پھر بھی خاموش نہ رہا۔ گاؤں کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں بتاتا رہا۔

حجامت بنانے کے بعد نائی چلا گیا۔ لیکن لالی سو نہ سکا۔ وہ نہانے کے لیے کنوئیں پر بھی نہیں گیا۔ بستر پر لیٹ گیا۔ مگر بستر پر لیٹے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بھاگ بھری کھانا لے کر آ گئی۔ کھانا کسی قدر پر تکلف اور خوش ذائقہ تھا۔ لالی نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانا کھایا۔ اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور تھکا ہوا بھی تھا۔ لیٹتے ہی ایسی گہری نیند سویا کہ چراغ جلے آنکھ کھلی۔

اس نے دیکھا' لیمپ روشن ہے۔ فیض محمد عرف ماسٹر جی سامنے مونڈھے پر بیٹھا ہے۔ اسے بیدار دیکھ کر فیض محمد نے کہا۔ "برخوردار! تمہاری لاری تو نکل گئی۔ میں دن ڈھلے ہی واپس آ گیا تھا۔ لیکن تم اس قدر گہری نیند سو رہے تھے کہ جگانے کو جی نہ چاہا۔" اس نے تامل کیا۔ "کوئی ضروری کام تو نہیں تھا؟"

"نہیں۔" لالی نے بہت مختصر جواب دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تب تو ٹھیک ہے۔ ویسے میں نے معلوم کیا تھا۔ رحمت تین روز بعد آ رہا ہے' کیوں نہ اس کا انتظار کر لو؟"

لالی پریشان ہو گیا۔ وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکا۔ بات یہ تھی کہ وہ سرے سے کسی رحمت کو جانتا ہی نہ تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس وقت اس کی زبان پر یہی نام آیا' ورنہ وہ کوئی دوسرا نام بتا دیتا۔ مگر اب رحمت اس کے لیے زحمت بن گیا تھا۔ اس مسئلے کا واحد حل اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ رحمت کے پہنچنے سے پہلے ہی گاؤں سے نکل جائے۔ ساتھ ہی اسے رحیم داد کا بھی رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ رحیم داد اکیلا تھا اور لالی نے رات تک اس کے پاس پہنچنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لالی کو

خاموش پا کر ماسٹر جی نے کہا۔

"برخوردار! تم کس سوچ میں پڑ گئے؟ اب آئے ہو تو رحمت سے مل کر ہی جانا۔ تین ہی دن کی بات ہے۔ تکلف چھوڑو۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب تک چاہو، ٹھہرو۔"

"صبح نہیں تو کل شام ضرور چلا جاؤں گا۔ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا جی!"

"جیسی تمہاری مرضی۔ ویسے میں تو یہی کہوں گا، تمہیں رحمت سے مل کر جانا چاہئے۔" فیض محمد نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "بھئی برا نہ ماننا۔ سنا ہے، رحمت کا چال چلن کچھ ٹھیک نہیں۔ بازاری عورتوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔"

"مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں تو جی اسے بہت دنوں سے نہیں ملا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ نوکری کے بعد اس نے پر پرزے نکالے ہیں۔ برخوردار! سچ پوچھو تو لڑکے کو جوان ہوتے ہی شادی کی زنجیر میں باندھ دینا چاہئے۔ زمانہ بہت بُرا ہے۔ محمد حنیف نے یہی غلطی کی۔ میں نے سمجھایا بھی مگر میری بات سن کر ٹال گیا۔ کہنے لگا، لڑکے کی مرضی نہیں ہے۔ لے بھئی اب دیکھ لڑکے کی مرضی۔" فیض محمد کھل کر مسکرایا۔ اس نے لالی کو غور سے دیکھا۔

"تم نے تو اپنا گھر بسا لیا ہو گا؟"

"نہیں۔" لالی معصوم صورت بنا کر بولا۔ "بات یہ ہے جی! ماں اور پیو تو اپنے ہیں نہیں۔ بھائی بھین بھی نہیں۔ بالکل اکیلا ہوں۔ نوکری چاکری بھی نہیں۔ رحمت کے پاس اسی لیے آیا تھا۔"

لالی کی بات سن کر فیض محمد نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا۔ لالی نے اس کا یہ رویہ دیکھا تو دل ہی دل میں پچھتایا کہ اس نے ماسٹر جی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ناحق ایسی بات کہی۔ ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنی پریشاں حالی بتا کر خود کو ماسٹر جی کی نظروں میں گرا لیا۔ ذرا دیر بعد فیض محمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کھانا آجائے گا۔ تم اکیلے ہی کھا لینا۔ میں رات کا کھانا نہیں کھاتا، عشاء کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتا ہوں۔ یہ میرا روز مرہ کا معمول ہے۔ اب تم سے صبح ملاقات ہو گی۔ فجر کی اذان سے پہلے میرے لیے حجرے سے باہر نکلنے کا حکم نہیں۔" فیض محمد دروازے کی جانب بڑھا۔

"کھڑکی کھول دینا۔ بہت اچھی ہوا آتی ہے۔ کمرے میں گرمی ہو تو باہر چارپائی پڑی ہے۔ ڈیرے سے رحمان کو بلا لینا۔ بستر لگا دے گا۔"

"نہیں جی! یہیں ٹھیک ہے۔ میں کھڑکی کھول لوں گا۔ فکر نہ کریں۔"

"تم دن بھر سوتے رہے ہو۔ نیند جلدی نہیں آئے گی۔ کرسی نکال کر باہر برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔ ذرا دل بہل جائے گا۔" فیض محمد نے شفقت کا اظہار کیا۔ "روٹی کھا کر سو جانا۔ ابھی تو سمجھو، رات شروع ہوئی ہے۔"

وہ چلا گیا۔ لالی چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ زیادہ دیر اس کے پاس نہ ٹھہرے۔ وہ بیٹھا رہتا تو باتیں بھی کرنا پڑتیں۔ نت نیا جھوٹ بولنا پڑتا۔ لالی اس سے بات کرتے ہوئے کتراتا تھا۔ کم سے کم بولتا اور بہت سنبھل سنبھل کر بولتا۔ اسے ہر لمحے دھڑکا لگا رہتا کہ اس کا عامیانہ لب ولہجہ کہیں سارا بھرم نہ کھول دے۔

فیض محمد کے جانے کے بعد لالی کمرے سے باہر آگیا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا درختوں کے نیچے جا کر ٹہلنے لگا۔ گاؤں کی گہما گہمی اب اجڑنے لگی تھی۔ سناٹا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لالی دور نہیں گیا۔ درختوں کے نیچے اندھیرے میں ٹہلتا رہا۔ رات دھیرے دھیرے تاریک ہوتی گئی۔ اسی اثناء میں برآمدے کی کھڑکی سے منہ نکال کر کسی عورت نے اسے مخاطب کیا۔

"روٹی کھا لو باؤ جی!"

لالی خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ مگر وہاں بھاگ بھری نہیں، کوئی دوسری عورت کھڑی تھی۔ عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ مگر سخت محنت اور خوراک کی کمی نے اس کی جوانی کا چراغ وقت سے پہلے ہی مدھم کر دیا تھا۔ لالی دسترخوان کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ عورت دروازے کے قریب کھڑی رہی۔ لالی نے کھانا کھاتے کھاتے مڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

"ربیا۔" اس نے جواب دیا۔ "میں جی رحمان کی گھر والی ہوں۔"

"ذرا پانی تو پلا۔"

ربیا نے گلاس میں پانی بھر کر دیا۔ لالی نے پانی پیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ربیا نے برتن سمیٹے، دسترخوان اٹھایا اور چلتے چلتے لالی سے پوچھا۔ "کوئی اور کام ہو تو جی بتا دیں۔ مجھے گھر جا کر ابھی اور کام کاج کرنا ہو گا۔"

"نہیں، اب تو جا۔"

ربیا خاموشی سے گھر کے اندر چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ لالی ذرا دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر برآمدے میں کھلنے والا دروازہ بند کیا اور کھڑکی کھول دی۔ پھونک مار کر لیمپ بجھایا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

وہ دیر تک جاگتا رہا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ پلنگ سے نیچے اترا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ رات کے اندھیرے میں سنسان گاؤں اونگھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے قریب کھڑے کھڑے اس نے سوچا کہ اب یہاں سے چلا جانا چاہئے۔ رحیم داد اس کا انتظار کر رہا ہو گا۔ مگر خالی ہاتھ رحیم داد کے پاس جا کر وہ کیا کرتا۔ جب تک رحیم داد کے جسم پر جیل کے قیدیوں کی وردی تھی اس وقت تک لالی کا ہر مقصد ادھورا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دروازے پر پہنچا' جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اس نے دروازہ ہولے ہولے ہلایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ لالی کو سخت کوفت ہوئی۔ وہ خاموشی سے بستر پر جا کر لیٹ گیا اور کروٹیں بدلتے' بدلتے سو گیا۔

سویرے بہت تڑکے فیض محمد نے اسے بیدار کیا۔ اصرار کر کے باہر لے گیا۔ برآمدے سے نکل کر وہ لالی کے ہم راہ گھر کے پچھواڑے گیا' جہاں باڑے میں اس کے مویشی اور چوکھر تھے۔ وہ ایک بھینس کے پاس گیا' جو کھوری میں منہ ڈالے سانی کھا رہی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ ماتھے اور کھروں پر سفید نشان تھے۔ فیض محمد نے بھینس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر بڑے فخر سے بتایا۔ "برخوردار یہ بلھا ہے۔ اس کے کھروں اور متھے پر سفید سفید پھلیاں دیکھ رہے ہو۔ ایسی نَے کو پنج کلیان بھی کہتے ہیں۔ یہ دھرلی ہے۔ پکا بیس سیر دودھ دیتی ہے۔"

لالی خاموش رہا۔ فیض محمد آگے بڑھا اور ایک بھوری بھینس کی گردن جھک کر آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی دھرلی ہے۔ اس کا کٹا پچھلے دنوں مر گیا۔ صرف چارے پر دودھ دیتی ہے۔ یہ بھی اعلیٰ نسل کی نَے ہے۔" اس نے فخر سے گردن اونچی کی۔ "یہ نیلی بار کی مشہور نَے ہے۔ پنج کلیان کے ساتھ میں اسے بھی میلے سے خرید کر لایا تھا۔ منہ مانگی قیمت دی تھی۔"

لالی نے بھوری بھینس کو غور سے دیکھا اور اس کی چکنی چکنی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "ماسٹر جی' یہ نیلی بار کی نَے ہے نا؟ یہ نیلی بار کیا ہوا جی؟"

"برخوردار' پہلے یہ سمجھ لو کہ بار کسے کہتے ہیں۔" فیض محمد' آدھتی سے فوراً اسکول ماسٹر بن گیا۔ "بار' ایسے غیر مزروعہ اور بنجر علاقے کو کہتے ہیں' جس پر کھیتی باڑی نہ ہوتی ہو۔ منٹگمری کسی زمانے میں ایسا ہی علاقہ تھا۔ اسے باری دو آب کہا جاتا ہے۔ یعنی راوی اور ستلج کے درمیان کا علاقہ۔ دراصل یہ پلیٹو ہے جس کا ایک ڈھلان راوی کی جانب ہے اور دوسرا ستلج کی جانب۔ پرانے زمانے کے جانوں نے باری دو آب کو چار باروں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ ہیں راوی بار' گنجی بار' بیاس بار اور نیلی بار۔"

"پر یہ نیلی بار کونسا ہوا ماسٹر جی؟"

"برخوردار! یہ تو تمہاری سمجھ میں آ گیا کہ بار کسے کہتے ہیں۔ اب آگے کی سنو۔ نہریں نکلنے سے پہلے' خاص طور پر نہر لوئر باری دو آب سے قبل' باری دو آب کا علاقہ اس قدر زرخیز اور سرسبز و شاداب نہ تھا جیسا آج ہے۔" ماسٹر فیض محمد نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "نیلی' دراصل دریائے ستلج ہی کا نام ہے۔ اس کا پرانا نام گھارا ہے۔ مگر اسے اب ستلج ہی کہا جاتا ہے۔ تحصیل دیپال پور میں بھی ستلج ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن ساتھ کی تحصیل پاک پتن میں اسے نیلی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ستلج کا پانی گہرا نیلا ہے۔ اسی لیے اسے نیلی کہتے ہیں۔ نیلی بار بھی اسی نیلی سے بنا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔

"اب تو تمہاری سمجھ میں نیلی بار کا مطلب آ گیا۔"

لالی نے مسکرا کر مستعدی سے جواب دیا۔ "بالکل آ گیا جی۔" وہ ایک بار پھر بھوری بھینس کی پیٹھ سہلانے لگا۔

لالی کی یہ شیفتگی اور پیار دیکھ کر فیض محمد خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ "ابھی یہ کھانگڑ تو نہیں ہوئی' پھر بھی اس کا دودھ گاڑھا ہوتا ہے۔ اس سے عجب طرح کی مہک آتی ہے۔ ایسی سوندھی' سوندھی خوشبو کہ دودھ کا گلاس منہ سے لگاؤ تو ہٹانے کو جی نہ چاہے۔"

فیض محمد اپنی دوسری بھینسوں کے بارے میں دیر تک خوش ہو ہو کر بتاتا رہا۔ آخر میں وہ گھوڑی کے پاس گیا اور اس کی خوبیاں گنانے لگا۔ دھوپ درختوں سے نیچے اترنے لگی تو وہ باڑے سے لالی کے ہم راہ واپس کمرے میں آیا۔ ناشتا تیار تھا۔ ذرا ہی دیر میں لگا دیا گیا۔ دونوں نے بیٹھ کر ناشتا کیا۔

ناشتے پر بھی فیض محمد اپنی بھینسوں اور دوسرے مویشیوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ لالی نے اس کی گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کیا اور جان بوجھ کر ناشتا دیر تک کرتا رہا۔ وہ صبح کی لاری سے سفر کرنا نہ چاہتا تھا۔ فیض محمد نے بھی اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی' بلکہ بار بار یہی اصرار کرتا رہا کہ اسے رحمت سے مل کر ہی جانا چاہئے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ زیادہ دیر لالی کے پاس نہ ٹھہرا۔ ہوا یہ کہ اس کے کچھ ملنے والے آ گئے۔ اس نے انھیں کمرے کے اندر نہیں بلایا۔ دروازہ کھول کر برآمدے میں گیا اور ان کے ساتھ درختوں کے نیچے پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر کچھ دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہا اور ان کے ساتھ

ہی اٹھ کر کہیں چلا گیا۔

دوپہر کو وہ لالی کے پاس آیا اور اس کے لیے سگریٹ کے پیکٹ اور ایک کنگھا بھی لایا۔ دونوں نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا۔ مگر خلاف معمول وہ چپ چپ تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے کھانا بھی رغبت سے نہیں کھایا۔ چند لقمے کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر اس نے خود ہی اپنی پریشانی کا سبب بتایا۔ "میرے منشی کا آج صبح انتقال ہو گیا۔ کل شام تک بالکل بھلا چنگا تھا۔ رات کو ٹھیک ٹھاک سویا۔ فجر کے وقت سینے میں ایسا شدید درد اٹھا کہ چٹ پٹ ختم ہو گیا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "اللہ اس کی مغفرت کرے۔ بڑا نیک اور محنتی بندہ تھا۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ یہی کوئی چھتیس سال کا ہوگا۔ چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔

"انھیں میں اپنے پاس لے آؤں گا۔ مگر ان پر یتیمی کا جو داغ لگ چکا ہے' اسے کون مٹا سکتا ہے۔"

لالی چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔ فیض محمد آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "قریب ہی کے پنڈ میں رہتا تھا۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔ شاید شام تک واپس نہ آسکوں۔ دیر ہو جائے تو میرا انتظار نہ کرنا۔ شام کو جانا تو رحمان یا کسی نوکر کو بتا دینا۔ ویسے میں چاہتا ہوں' تم آج کی بجائے کل صبح کی لاری سے جاؤ۔ بولو' کیا ارادہ ہے؟"

"آپ کہتے ہیں جی تو میں کل صبح ہی چلا جاؤں گا۔"

فیض محمد نے اس کے بعد کوئی بات چیت نہیں کی۔ چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔ لالی دیر تک خاموش بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ گیا اور شام تک سوتا رہا۔

عشاء کی نماز سے کچھ پہلے فیض محمد تھکا ہارا واپس آیا۔ لالی سے اس کی زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ چند منٹ ٹھہر کر وہ وظیفہ پڑھنے اپنے حجرے میں چلا گیا۔

رات کا کھانا کھا کر لالی کمرے سے باہر نہیں گیا۔ اس نے لیمپ پھونک مار کر بجھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔

☆

بیٹھک کا دروازہ کھول کر لالی خاموشی سے باہر نکلا اور دبے قدموں چلتا ہوا گھر کے پچھواڑے گیا۔ مویشیوں کے باڑے پر پہنچا۔ باڑا مویشیوں کے عام ڈھارے کی طرح کا نہ تھا جس پر بارش اور سردی سے بچاؤ کے لیے چھپر ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ باڑا احاطے کی مانند تھا جس کے گرد قد آدم

چار دیواری تھی۔ اس کا پھاٹک بند تھا اور پھاٹک کے عین سامنے مویشیوں کا رکھوالا چارپائی ڈالے سو رہا تھا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ لالی ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑا تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ رات سنسان تھی۔ لالی گومگو کے عالم میں تھا۔ یکایک عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ فیض محمد آہستہ آہستہ اسی طرف آ رہا تھا۔ لالی جہاں تھا وہیں دم بخود کھڑا رہا۔ وہ قریب آ کر ٹھہر گیا۔ مگر نہ اس نے کسی شک کا اظہار کیا نہ حیرت کا۔ حسب معمول نرم لہجے میں بولا۔

"برخوردار! تم یہاں ہو۔ بیٹھک میں تمھیں نہ پایا تو طبیعت پریشان ہوئی۔ خیریت تو ہے۔ تم اتنی رات گئے ادھر کیسے آ گئے؟" وہ دم بھر کے لیے رکا اور جلد ہی بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ "سمجھ گیا۔ سگریٹ کی طلب نے ستایا ہوگا۔ ماچس نہیں ہوگی۔ دینو کے پاس ماچس لینے آئے ہو گے۔ یہی بات ہے نا؟"

لالی کو اس کی نیک نفسی اور سادہ دلی پر پیار آ گیا۔ سعادت مندی سے سر جھکا کر بولا۔ "بات تو جی' کچھ ایسی ہی تھی۔"

"میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔" وہ بدستور مسکراتا رہا۔ "مجھے اس وقت یہاں دیکھ کر تمھیں بھی سخت حیرت ہوگی۔ مجھے تو اس وقت حجرے کے اندر وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہونا چاہئے تھا۔ باہر کیسے آ گیا؟ یہی بتانے تمھارے پاس آیا تھا۔"

مویشیوں کا رکھوالا دینو دونوں کی باتیں سن کر بیدار ہو گیا تھا اور حیران و پریشان آنکھیں پھاڑے انھیں دیکھ رہا تھا۔ مگر فیض محمد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ لالی کو مخاطب کیا۔ "آؤ' بیٹھک میں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔" وہ مڑا اور لالی کے ہم راہ چپ چاپ چلتا ہوا بیٹھک میں پہنچ گیا۔

لالی کو کمرے میں چھوڑ کر وہ گھر کے اندر گیا اور ماچس ہاتھ میں لیے واپس آ گیا۔ اس نے لیمپ روشن کیا اور میز کے قریب کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لالی بستر پر پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔ ذرا دیر توقف کرنے کے بعد فیض محمد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔

"برخوردار! آج عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں وظیفے کا ورد کر رہا تھا۔ خلاف معمول نیند کا ایسا زبردست جھونکا آیا کہ آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں' ایک بزرگ سامنے کھڑے ہیں۔ سفید براق لباس' چہرے کے گرد نور کا ہالہ' آنکھوں میں ایسا جلال کہ نظریں خود بخود جھک گئیں۔ کیا بتاؤں' کیا شان تھی ان کی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "چند لمحے وہ خاموش کھڑے میری جانب دیکھتے

رہے۔ پھر حکم دیا 'فیض محمد! اپنی بیٹی طاہرہ کو اس نوجوان کے حبالہ عقد میں دے دے جو دو روز سے تیرا مہمان ہے۔ نافرمانی کرے گا تو راندہ درگاہ ہوگا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ اب تک وہ آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔"

لالی بھونچکا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ ماسٹر فیض محمد نے اسے خاموش پایا تو نہایت شفقت سے کہا۔ "بھئی! اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ضرور ہے۔ میں نے بہت غور کیا تو یہ نکتہ ہاتھ آیا۔ تمہارے سر پر کسی کا سایہ نہیں۔ پریشان حال بھی ہو مگر نیک اور سعادت مند ہو۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ مجھے بھی بیٹی کی فرض سے سبکدوش ہونا ہے۔ کسی نہ کسی کے ساتھ تو اس کا پلو باندھنا ہی ہوگا۔ ویسے خاندان میں کئی لڑکے ہیں۔ پڑھے لکھے اور برسرروزگار بھی ہیں۔ لیکن مجھے تو تمہارے لیے حکم ملا ہے۔ تمہیں اپنی فرزندی میں لینے پر مجھے خوشی ہوگی۔ تم میرے پاس رہو گے' کاروبار میں ہاتھ بٹاؤ گے' میرا سہارا بنو گے۔ میرے لیے اس سے اچھا رشتہ اور کیا ہو سکتا ہے؟"

اس نے ایک بار پھر کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "عزیزم! میری طرف سے تو ہاں ہے۔ رہ گئی تمہاری مرضی' تو جو چاہو' اپنے بارے میں فیصلہ کرو۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ہم دونوں ہی کے لیے تائید غیبی ہے۔" لالی پھر بھی کوئی جواب نہ دے سکا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ کمرے میں کچھ دیر گہری خاموشی چھائی رہی۔ آخر فیض محمد کی آواز ابھری۔

"برخوردار! کیا اس خاموشی کو میں تمہاری مرضی سمجھوں؟"

اب لالی کے لیے خاموش رہنا ممکن نہ رہا وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں کیا بتاؤں جی! میں تو کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔"

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" فیض محمد نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ "سوچ لو۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تمہیں حق حاصل ہے' جو چاہو اور جیسا چاہو' اپنے بارے میں فیصلہ کرو۔"

اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے لالی سے پوچھا۔ "تمہاری گھڑی میں کیا بجا ہے؟"

لالی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر بتایا۔ "ساڑھے چار۔"

فیض محمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب تم سو جاؤ۔ میں تو اب سو نہ سکوں گا۔ کچھ ہی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ مسجد میں فجر کی نماز ادا کروں گا اور صبح کی بس سے منڈی چلا جاؤں گا۔ تم سے شام کو واپسی پر ملاقات ہوگی۔ تمہارے پاس خاصا وقت ہے۔ اچھی طرح غور کر لو۔ جو بھی فیصلہ کرو' مجھے بے جھجک بتا دینا۔"

اس نے لالی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ گھر کے اندر جانے کے بجائے بیٹھک کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ لالی نے سوچا تھا کہ اس کے جانے کے بعد چپکے سے نکل جائے گا۔ مگر اب اس کی گنجائش نہ تھی۔

صبح ہونے والی تھی اور فیض محمد ابھی باہر ہی تھا۔ اس نے سونے کی کوشش کی مگر بے چین رہا۔ ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ دن میں بھی وہ بے چین رہا۔

شام کو فیض محمد کی واپسی ہوئی۔ وہ روز کی طرح مسکراتا ہوا لالی کے پاس آیا اور نہایت شفقت سے مخاطب ہوا۔ "کچھ تھکے تھکے نظر آ رہے ہو۔" اس نے توقف کیا اور لالی کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی وضاحت کی۔ "بات یہ ہے کہ تم کہیں آتے جاتے بھی تو نہیں' تمام وقت تو کمرے میں رہتے ہو۔ ذرا باہر نکلا کرو۔ مگر سوال یہ ہے کہ کس کے پاس جاؤ' کہاں جاؤ؟ تمہارا کوئی ملنے جلنے والا بھی یہاں نہیں ہے۔ یہاں رہو گے تو سبھی سے میل ملاپ پیدا ہو جائے گا۔"

لالی چپ چاپ بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔

فیض محمد کچھ دیر خاموش رہا پھر یوں گویا ہوا۔ "برخوردار! تم بہت کم گو ہو۔ مجھے تمہاری یہ ادا پسند بھی ہے۔ مگر نوجوانوں کو اتنا خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ ہنسا بولا کرو۔ کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ رہو گے تو بولنے کی بھی عادت پڑ جائے گی۔ بھئی! میں زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ سخت الجھن ہوتی ہے۔ اور تم سے باتیں کر کے تو دل بہت خوش ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے' تین روز نہیں' تمہارے ساتھ تین برس بیت گئے۔"

وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ لالی بھی چپ بیٹھا رہا۔ مگر فیض محمد سے زیادہ دیر خاموش نہ رہا گیا۔ وہ حرف مطلب پر آ گیا۔ "برخوردار! کیا فیصلہ کیا تم نے؟" پھر خود ہی بولا۔ "فیصلہ کیا کرنا ہے۔ بھئی میں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ میرا کوئی بیٹا نہیں' اللہ تعالیٰ نے تمہارے روپ میں مجھے بیٹا دے دیا۔ میری دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی تو بیاہ کر پشاور چلی گئی۔ سال دو سال میں آتی ہے۔ سمجھو وہ تو غیر ہو گئی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔

"ہاں تو برخوردار! تم نے کیا سوچا؟"

لالی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ پچھلی رات سے جس سوال نے اسے الجھن میں ڈال رکھا تھا وہ ہنوز جواب کا محتاج تھا۔ لالی میں نہ صاف انکار کرنے کی جرات تھی' نہ وہ اپنے بارے میں اصل حقیقت سے آگاہ کر سکتا تھا۔ دونوں ہی صورتوں میں اس کے دل کو زبردست ٹھیس لگتی۔ لالی اسے کسی طور دکھ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنے جرائم پیشہ ہونے کا کبھی اتنی شدت سے احساس نہیں

ہوا تھا۔ وہ دلدل میں گر گیا تھا۔ اس دلدل سے نکلنے اور صاف ستھری زندگی بسر کرنے کا بہت اچھا موقع ملا تھا۔ مگر وہ اس دلدل میں اتنا دھنس چکا تھا' اس قدر لت پت ہو گیا تھا کہ اس موقعے سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسے سب سے بڑا دکھ اس بات کا تھا کہ جس زندگی کے اس نے کبھی سہانے خواب دیکھے تھے' وہ خود چل کر اس کے گھر آئی تھی۔ مگر وہ دروازے کے پٹ کھول کر اس کا خیر مقدم نہیں کر سکتا تھا۔

لالی کو خاموش اور گم دیکھ کر فیض محمد نے کہا۔ "برخوردار! جو کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔ تم انکار کردو گے تو میں یہی سمجھوں گا کہ مجھی میں کوئی خامی ہو گی۔ تمہیں میں اچھا سمجھتا ہوں' ہمیشہ سمجھتا رہوں گا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "مجھے جو حکم ملا' اس کی تعمیل میں سر جھکا دیا۔ اپنی پگڑی تمہارے سامنے ڈال دی۔ بیٹی باپ کی عزت ہی ہوتی ہے۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں کے پیمانے چھلک اٹھیں گے۔ لالی تڑپ اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ جھک کر اس کے پیر پکڑ لے اور اسے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دے۔ وہ بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ فیض محمد دل گرفتہ ہو کر بولا۔

"معلوم ہوتا ہے میری باتیں تمہیں ناگوار گزریں؟"

لالی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "ہرگز نہیں۔ جو آپ کا فیصلہ' وہی میرا فیصلہ ہے جی۔"

وہ تڑپ کر اٹھا اور لالی کو گلے سے لگا لیا۔ چند لمحے تک وہ لالی کو گلے سے لگائے خاموش کھڑا رہا۔ لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رو رہا ہے۔ اس کے جسم کی حرارت میں باپ کے پیار کا الاؤ تھا۔ اس نے شفقت سے لالی کے سر پر ہاتھ پھیرا' اس کی پیشانی چومی۔ "تم نے میری لاج رکھ لی۔ مجھے حکم عدولی کے عذاب سے بچا لیا۔" لالی سر جھکائے نہایت سعادت مندی سے کھڑا رہا۔

فیض محمد نے لمحہ بھر خاموش رہ کر کہا۔ "نیک کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ کسی دھوم دھام کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ وظیفے سے فارغ ہوتے ہی مسجد کے ملا جی کے پاس جاؤں گا۔ نمازیوں میں گواہ اور وکیل بھی مل جائیں گے۔ فجر کی نماز کے بعد نکاح ہو جائے گا۔ مجھے یہی بشارت ہوئی تھی۔"

وہ لالی کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ وظیفے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ گھر کے اندر چلا گیا۔

لالی بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے فیض محمد کا دل رکھنے کے لیے ہامی تو بھر لی تھی مگر اسے نباہ نہیں سکتا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد اس گھر سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔

رات کو لالی سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ دو چار لقموں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ پلنگ پر خاموش بیٹھا

رہا اور بار بار گھڑی دیکھتا رہا۔ اسے رات تاریک اور گلی کوچے سنسان ہو جانے کا انتظار تھا۔

کوئی دس بجے کا عمل ہو گا۔ لالی نے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ عین اس وقت گھر کے اندر جانے والے دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ لالی نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ دھندلی روشنی میں ایک سایہ لہرایا۔ کوئی دروازے کی اوٹ میں دبکا کھڑا تھا۔

لالی حیران و پریشان بیٹھا اس جانب دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد ایک نوجوان لڑکی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور سر جھکا کر لالی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنا بدن سفید چادر سے چھپائے ہوئے تھی' صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کھلتا ہوا چمپئی رنگ' سبک نقش و نگار' ابھری ہوئی سیاہ آنکھیں۔ وہ اچھی خوش شکل لڑکی تھی۔

لالی نے اٹکل سے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ "تم طاہرہ تو نہیں ہو؟"

"ہاں میں طاہرہ ہوں' ماسٹر جی کی بیٹی۔"

"تم اتنی رات گئے یہاں کس لیے آئی ہو؟"

اس دفعہ طاہرہ نے گردن اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ تیوری پر بل ڈالا اور ایک دم پھٹ پڑی۔ "یہ کہنے آئی ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

لالی ٹھٹھا کے رہ گیا۔ حیران ہو کر بولا۔ "کیوں؟"

"اس لیے کہ میں تمہارے ساتھ شادی وادی کا ڈھونگ رچانا نہیں چاہتی" وہ ویسے ہی تیکھے لہجے میں بولی۔ "تم مجھے بالکل پسند نہیں۔ تم صورت سے اجڈ اور لوفر لگتے ہو۔" اس نے غصے سے لالی کو گھورا۔

"جاؤ یہاں سے نکل جاؤ۔"

لالی نے پریشان ہو کر کہا۔ "دھیرے بولو۔ ماسٹر جی آ جائیں گے۔"

"آ جانے دو۔ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے' نہ تمہاری' نہ ابا جی کی۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں۔ سنا تم نے۔"

لالی جل کر بولا۔ "مجھے سنانے کیوں آئی ہو' جاؤ' جا کر اپنے ابا جی کو سناؤ۔"

"میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔" طاہرہ نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔ یہ بتانے آئی ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی' نہیں چاہتی۔"

"نہ کرو۔ میں نے تمہارے آگے ہاتھ نہیں جوڑے' پیروں پر پگڑی نہیں ڈالی۔ نہ کبھی تمہیں راستے میں چھیڑا' نہ آنکھ ماری' نہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا' اوئے سوہنیو! ہم تو قتل ہو گئے۔ میں نے

تو......"

"ارے ارے۔" طاہرہ اس کی بات کاٹ کر حیرت سے بولی۔ "تم تو بالکل لفنگے ہو۔" وہ ایک بار پھر دھاڑنے لگی۔ "تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ جاؤ' ابھی چلے جاؤ۔"

پہلی نظر میں وہ طاہرہ کو بھولی بھالی شرمیلی دوشیزہ سمجھا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر تیز اور طرار ہوگی۔ مگر جب وہ اپنی تمام تیزی اور طراری کے ساتھ کھل کر سامنے آگئی تو لالی نے دل ہی دل میں کہا۔ چھوہری تو زوردار ہے۔ اب اسے طاہرہ کو چھیڑنے میں مزا آنے لگا۔

"میں تو نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا۔" یہ کہہ کر وہ ٹانگیں پسار کر بستر پر لیٹ گیا۔ طاہرہ کو مخاطب کرکے بولا۔

"کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ آرام سے گل بات کرو۔"

وہ اسی طرح خفگی سے بولی۔ "میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ تم سے صاف صاف یہ کہنے آئی ہوں کہ تم میرے ساتھ شادی کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔" چند لمحے رک کر اس نے کہا۔ "ذرا اپنی شکل تو دیکھو۔ کیسی خطرناک غنڈوں کی سی مونچھیں ہیں۔ اونہہ!" طاہرہ نے حقارت سے منہ بگاڑا۔

مگر لالی بالکل ناراض نہ ہوا۔ مسکرا کر بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ کل صبح منڈوا دوں گا۔ تم چاہو تو استرا لا کر ابھی مونڈ دو۔ لے آؤ اسی بات پر استرا!"

طاہرہ نے غصے سے گردن ہلائی۔ "گویا مونچھیں منڈوا کر تم گل فام بن جاؤ گے اور میں تمہیں اپنا سرتاج بنا لوں گی۔ چغد! احمق کہیں کا۔"

"نکالو' نکالو جتنی چاہے گالاں نکالو۔ کل صبح کے بعد تم سے پوچھوں گا۔"

"کیا کرو گے تم؟"

لالی اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ گردن ذرا سی اکڑا کر نخوت سے بولا۔ "کل صبح میں تمہارا خصم بن جاؤں گا۔"

"خصم!" وہ تلملا کے بولی۔ "تم غنڈے ہو۔ بالکل تھرڈ کلاس غنڈے۔"

لالی نے مطلق ناگواری ظاہر نہیں کی۔ قمیص کی آستین چڑھائی اور طاہرہ کو اپنے بازو کی مچھلیاں دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ دیکھ رہی ہو؟ نزدیک آجاؤ۔ چھو کر دیکھو۔"

"دیکھ رہی ہوں' دیکھ رہی ہوں۔ تم دور ہی سے اچھے خاصے مسٹنڈے نظر آتے ہو۔"

"میں تمہیں اپنے بازو اس لیے دکھا رہا ہوں۔" لالی نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ "کل صبح کے بعد تم

نے کڑ کڑ کی تو سمجھ لینا۔ ایک چپیڑ ادھر سے لگاؤں گا دوسری ادھر سے۔" لالی نے ہاتھ گھما گھما کر خبردار کیا۔

"اوپر سے ایک ٹھڈا بھی لگاؤں گا۔ وہ جاؤ گی دور تک گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی۔ ساری کڑ کڑ نکل جائے گی۔"

"کیا کہا؟ تم مجھے مارو گے؟" اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "وحشی' درندے! بے غیرت! تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آئے گی؟ تم تو بالکل جنگلی ہو۔"

لالی نے مصالحت کرنے کے انداز میں کہا۔ "چلو' نہیں ماروں گا۔ اب تو غصہ تھوک دو۔ جو تم کہو گی' وہ کروں گا۔ مونچھیں بھی منڈوا دوں گا۔ ایک دم صفاچٹ۔ بال بھی نئے اسٹائل کے بناؤں گا۔ کمیض اور پتلون تو پہلے ہی پہنے بیٹھا ہوں۔ بولو اب تو میری گھر والی بننا منظور کر لو گی؟"

طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھکی ہوئی سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس دفعہ اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ میری شادی ہو جائے گی؟"

"سمجھنا کیا' سولہ آنے پکی گل ہے۔"

طاہرہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر دفعتاً اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "اچھا تو پھر یہ بھی سن لو بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لو۔" اس نے اپنے بدن سے چادر اتار کر میز پر رکھ دی اور نہایت بے باکی سے اپنا پھولا ہوا پیٹ دکھا کر بولی۔ "یہ کسی کی امانت ہے اور جس کی یہ امانت ہے میں اسی کی امانت ہوں۔"

لالی بھونچکا رہ گیا۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے سنبھل کر آہستہ سے پوچھا۔ "کس کا ہے؟"

"کسی کا بھی ہے۔ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے' بالکل ہے۔" لالی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "زیادہ کڑ کڑ نہ کرو۔ صاف صاف بتاؤ۔"

"چلو' یہ بھی سن لو۔" وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ "میں لہور میں اپنی خالہ کے پاس رہتی تھی۔ وہاں کالج میں پڑھتی تھی۔ کالج کے ایک پروفیسر مجھے گھر پر بھی پڑھاتے تھے۔ مجھے ان سے محبت ہوگئی۔ وہ بھی مجھ سے دیوانوں کی طرح محبت کرنے لگے۔" یہ کہتے کہتے وہ یادوں کے سہارے بہت دور نکل گئی۔ "ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت نہ ہوتی۔ گھر اور کالج کے باہر بھی ہم چھپ چھپ کر ملتے۔ کبھی...."

لالی بات کاٹ کر بولا۔ "شالیمار باغ اور لارنس گارڈن میں اس کے ساتھ ٹھمک ٹھمک کر گا۔ بھی گاتی ہوگی؟" وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ "یہ تو فلمی باتیں ہوئیں۔ آگے بتاؤ؟"

"آگے جو کچھ ہوا' وہ تمہارے سامنے ہے۔"

"اسے بھی دیکھ لیا۔ اور آگے بتاؤ۔"

"پروفیسر کی ایک بیوی پہلے سے موجود ہے۔ ایک بچہ بھی ہے۔ مگر مجھے اس کی دوسری بیوی بنـ منظور ہے۔ میں اس کی محبت میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں' لیکن اباجی تیار نہیں ہیں۔ وہ میری تعلیم ادھوری چھڑوا کر مجھے گھر لے آئے۔ اب تمہارے سر منڈھنا چاہتے ہیں مجھے' تاکہ ان کی بدنامی نہ ہو۔"

لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا' پھر بولا۔ "میں تو جی تم سے یہی کہوں گا' تمہیں بھی چاہئے کہ ماسٹر جی کی بدنامی نہ ہو۔ وہ بہت چنگے بندے ہیں۔ فرشتے' ہیں فرشتے' اتنے نیک اور بھلے مانس کہ جی چاہتا ہے ان کے پیر دھو کر پیوں۔" لالی نے دل کی بات صاف صاف کہہ دی۔

طاہرہ کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس میں حیا بھی تھی اور دبا دبا کرب بھی تھا۔ وہ ذرا دیر تک اسی عالم میں بیٹھی رہی' مگر جلد ہی غم کا سایہ آہستہ آہستہ اس کے چہرے سے ہٹ گیا۔ غصے اور نفرت کی کڑی دھوپ چھا گئی۔ "تم نرے چغد ہو۔ تمہیں کچھ بھی پتہ نہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ میں اباجی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ نہ وہ فرشتے ہیں نہ اتنے بھلے مانس جتنا تم انھیں سمجھ رہے ہو۔" طاہرہ نے قدرے تامل کیا۔

"وہ ایک نمبر فراڈ ہیں۔ پہلے تو انھوں نے چار سو بیسی کر کے بوگس کلیم منظور کرایا' پرائمری اسکول کے معمولی ماسٹر سے بڑے زمین دار بن گئے۔ پھر غلے کی آڑھت کا کاروبار شروع کر دیا۔" اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "سن رہے ہو؟"

"ہاں جی' بالکل سن رہا ہوں۔ کہتی جاؤ۔"

"اچھا تو اب یہ بھی سن لو۔ آڑھت کا تو صرف بہانہ ہے۔ وہ سمگلنگ کرتے ہیں۔ ادھر سے کنک اور چینی سرحد پار بھیجتے ہیں ادھر سے ہندوؤں کی بیمار اور بوڑھی گائیں بھینسیں لاتے ہیں۔ قصائیوں کے ہاتھ بیچ کر ان کا سڑیل گوشت لوگوں کو کھلاتے ہیں۔ دن بھر سمگلنگ کا دھندا کرتے ہیں۔ رات کو وظیفے پڑھ پڑھ کر اپنے گناہ بخشواتے ہیں۔" طاہرہ کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "سن لیا تم نے وہ کتنے نیک اور فرشتہ ہیں؟"

لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے قلابازی کھا گیا ہو۔ اسے دکھ بھی ہوا' حیرت بھی ہوئی۔ مگر طاہرہ اس

کے ذہنی خلفشار سے بے نیاز بولتی رہی۔ "اب تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ وہ تمہیں اپنے سمگلنگ کے دھندے میں ایجنٹ کے طور پر استعمال کریں گے تاکہ رینجرز اور بارڈر پولیس کے ساتھ گولی چلے تو تم ہی مارے جاؤ' تم ہی جیل جاؤ۔ مگر یہ سلسلہ بھی چند ہی مہینے چلے گا۔ میرے بچے کی پیدائش کے بعد وہ کسی مقدمے میں پھنسوا کر تم سے فارغ خطی لکھوا لیں گے اور میرا بیاہ اپنے بھتیجے سے کر دیں گے۔ وہ بدصورت ہے اور ایک ٹانگ سے لنگڑا بھی۔ مگر بہت بڑی زمیں داری اور جائیداد کا اکلوتا وارث ہے۔ اپنی یہ سکیم وہ آج ہی شام ماں جی کو بتا چکے ہیں۔" اس نے نظریں نیچی کر کے آہستہ سے کہا۔

"تم نے سب کچھ سن لیا۔ اب بتاؤ' کیا تم ایسی لڑکی سے شادی کر لو گے جس کے پیٹ میں کسی اور کا بچہ ہے؟"

"کتنے دن کا ہے؟" لالی نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ کی جانب دیکھ کر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"چھ سات مہینے سے تو کم کا نہیں لگتا۔"

"شاید!" طاہرہ نے مختصر جواب دیا۔

لالی مسکرا کر بے نیازی سے بولا۔ "صرف تین مہینے کی تو بات ہے۔ فیر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔"

طاہرہ نے لالی کو خوں خوار نظروں سے دیکھا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر بولی۔ "تم عجیب بے غیرت انسان ہو۔ تم ایسا بچہ قبول کر لو گے؟"

"کر لوں گا' ضرور کر لوں گا۔ حرج ہی کیا ہے جی!" وہ نہایت ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ "ویسے سچ پوچھو تو یہ میرا معاملہ ہے بھی نہیں۔ اولاد کے بارے میں صرف ماں بتا سکتی ہے کہ اس کا پیو کون ہے۔ میں کس کا پتر ہوں' یہ بات میری ماں بتا سکتی تھی۔ تم کس کی دھی ہو' یہ بات بھی ماسٹر جی نہیں' تمہاری ماں بتا سکتی ہے۔ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں میں؟"

طاہرہ نے زچ ہو کر کہا۔ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو' ٹھیک ہی کہہ رہے ہو گے۔" وہ نڈھال ہو کر پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔

لالی بھی خاموش رہا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اب لالی کو وہاں سے چلا جانا چاہئے۔ تھا۔ اس نے طاہرہ کو پھر چھیڑا۔

"تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اندر جاؤ۔ وٹنا ملو' خوشبو لگاؤ' ریشمی پٹانگل پہنو' سرخ چمکی اوڑھو'

سنگھار کرو۔ سویرے سویرے سامنے ایسے نہ آنا۔ وہنی بن کے آنا۔ میں تمہارا گھونگھٹ اٹھاؤں گا۔ گھنڈ چکائی دوں گا۔"

طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے گم صم بیٹھی رہی۔ پھر اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے لالی کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "کہو تو تمہارے پیروں پر سر رکھ دوں۔ خدا کے لیے میرے ساتھ شادی کا خیال دل سے نکال دو۔"

"اپنے اباجی سے کیوں نہیں کہتیں؟ ویاہ تو انھوں نے ہی طے کیا ہے۔"

"کہہ چکی ہوں' ان سے بار بار کہہ چکی ہوں۔ ان کے سینے میں دل نہیں' پتھر ہے۔ ماں جی کو بھی یہ رشتہ پسند نہیں۔ جب سے سنا ہے' بے چاری بیٹھی زار وقطار رو رہی ہیں۔" طاہرہ تیزی سے بولتے بولتے اچانک دھیمی پڑ گئی۔ اس نے لالی کا چہرہ غور سے دیکھا اور غم زدہ ہو کر بولی۔ "تم اتنے سنگدل کیوں ہو؟ تم مجھ سے شادی کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟ تمہیں مجھ سے محبت بھی نہیں ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "سیدھی سیدھی معاملے کی بات یہ ہے کہ اب تو میں ماسٹر جی سے اپنا ٹیکس وصول کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے چار سو بیسی جو کی ہے۔"

طاہرہ چونک پڑی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ جھٹ اپنے کانوں سے سونے کے جھمکے اتارے' ہاتھوں کے کنگن اتارے اور انھیں لالی کی طرف بڑھا کر بولی۔ "لو یہ لے لو۔ یہ تمہارا ٹیکس ہے۔ اب یہاں سے چلے جاؤ۔" لالی نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ طاہرہ تلملا کر بولی۔ "قسم کھا کر کہتی ہوں' زہر کھالوں گی' خودکشی کرلوں گی مگر تمہارے ساتھ شادی نہیں کروں گی' نہیں کروں گی۔"

"زیور پہن لو۔ زہر کھانے اور خودکشی کرنے کی ضرورت نہیں۔" لالی نے اس دفعہ نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "میں یہاں سے ابھی چلا جاؤں گا' پر ایک شرط پر۔"

"کیا شرط ہے تمہاری؟" طاہرہ کے چہرے پر خوشی سے پھول کھل اٹھے۔

"مجھے تمہاری نہیں' تمہاری بوری ٹ کی ضرورت ہے۔ وہ پکا اٹھارہ سیر دودھ دیتی ہے اور تمہارے پیٹ میں....."

طاہرہ بات کاٹ کر بولی۔ "ایک نہیں تم دو لے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جاؤ' جا کر نکال لاؤ دونوں کو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں صرف بوری ٹ لوں گا۔ مگر اسے لینے میں نہیں جاؤں گا۔ وہاں راکھا موجود ہے۔ تم خود

جاؤ اور ٹ لے کر آجاؤ۔"

"مگر وہ مجھے بھی نہیں لے جانے دے گا۔ میں اس سے کہوں گی کیا؟"

لالی اپنی ضد پر اڑا رہا۔ "یہ میں نہیں جانتا۔ ٹ نکال کر تم ہی لاؤ گی اور میرے ساتھ پنڈ کے آخری سرے تک جاؤ گی۔ بولو کیا کہتی ہو؟ اگر یہ کام کرسکتی ہو تو جلدی کرو۔ نہیں تو اندر جاؤ' مجھے سونے دو۔ صبح نکاح کے بعد تم سے ملوں گا۔"

طاہرہ کا دمکتا ہوا چہرہ ایک بار پھر سونا پڑ گیا۔ "تم یہ تو سوچو۔ میں اسے کیسے نکال کر لا سکتی ہوں۔" وہ گڑگڑانے لگی۔ "خدا کے لیے مجھے بتاؤ' میں کیا کروں؟"

لالی نے اس کا پریشان چہرہ دیکھا اور کھل کر مسکرایا۔ "تم مجھے بے وکوف' پاگل' احمق' جنگلی اور نہ جانے کیا کیا کہہ چکی ہو۔ پر تم نے یہ بھی سوچا' خود تمہارے پاس کتنی سمجھ ہے۔ اگر تمہارے پاس سمجھ بوجھ ہوتی تو یوں کسی ٹ کی طرح پیٹ پھلائے نہ بیٹھی ہوتیں۔" اس نے کچھ تامل کیا۔ حقارت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "ماسٹر جی وظیفے پڑھتے ہیں' بیٹی عشق لڑاتی ہے اور میں بے وکوف ہوں۔ احمق اور جنگلی ہوں۔"

طاہرہ خاموش بیٹھی اس کی جلی کٹی سنتی رہی۔ لالی اسے مخاطب کر کے بولا۔ "اس طرح یہاں بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ بتاؤ آس پاس کے کسی پنڈ میں تمہارا کوئی شریکا' کوئی رشتے دار ہے۔ ماماں' چاچا' موسا' تاؤ۔ کوئی نہ کوئی تو ہوگا؟"

طاہرہ نے جھٹ جواب دیا۔ "ماموں ہیں۔ چھ میل ادھر ایک چک میں رہتے ہیں۔ مگر وہ ہمارے گھر کم آتے ہیں۔ سگے ماموں نہیں ہیں۔"

"سگے' سوتیلے کی چھوڑو۔ ہمیں سے کام لو ہمیں سے۔ ماں جی تو تمہاری ہی طرف دار ہیں نا؟"

"بالکل ہیں۔ انھوں نے ہی تو مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

"تو بس تم سیدھی ان کے پاس جاؤ۔ ان سے کہو کہ وہ راکھے کو ماماں کو بلانے بھیج دیں۔ وہ ادھر جائے اور ادھر تم بوری ٹ نکال کر لاؤ۔ بن گیا دونوں کا کام۔"

طاہرہ نے خوش ہو کر گردن ہلائی۔ "یہ ترکیب ٹھیک رہے گی۔" اس نے موج میں آکر چٹکی بجائی۔ "بالکل ٹھیک ہے۔"

"خالی پیلی ٹھیک کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ جاؤ اور بوری ٹ لے کر فٹافٹ آجاؤ۔"

طاہرہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ "اور دیکھو ماسٹر جی کی ایک قمیض' پگڑی اور ایک دھوتی بھی لیتی آنا۔ ایک ڈانگ بھی لانا۔"

"وہ کس لیے؟"

"جیسا کہتا ہوں' ویسا کرو۔ بیچ میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ تم ایسے ہی نہیں لے جاؤں گا۔ اس کے ساتھ چاک یا گوجر بن کر جاؤں گا۔ آیا بھیجے میں؟ اور ہاں دیکھو۔ جاتے ہی ماسٹر جی کے حجرے کی زنجیر باہر سے چڑھا کر اس میں چپکے سے تالا ڈال دینا۔ ہر کام چوکس ہونا چاہیے۔"

طاہرہ چلی گئی۔ لالی بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ منٹ بعد طاہرہ واپس آئی' مسکراتے ہوئے بولی۔ "رکھوالا چلا گیا۔ کم بخت بڑی مشکل سے گیا۔ جب میں نے اور ماں جی نے نوکری سے نکال دینے کی دھمکی دی تب گیا۔" اس نے بغل میں دبے ہوئے کپڑے لالی کو دے دیے۔ ایک لاٹھی بھی لائی تھی' وہ بھی دے دی۔

لالی نے ساری چیزیں لے کر کہا۔ "اب اندر جا کر تھوڑی دیر انتظار کرلو۔ اتنی دیر میں رکھا پنڈ سے دور چلا جائے گا۔ جلدی نہ کرنا' ورنہ سارا کام گڑبڑ ہو جائے گا۔ سمجھ گئیں؟ اب تم جاؤ۔"

طاہرہ کے جاتے ہی لالی نے جھٹ پٹ کپڑے تبدیل کئے۔ اپنی پتلون اور قمیص تہہ کر کے بغل میں دبالی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے وہ جوتی بھی کپڑوں کے اندر رکھ لی جو ماسٹر جی نے عام استعمال کے لیے دی تھی۔ لالی نے گھڑی دیکھی' ساڑھے دس بج رہے تھے۔

طاہرہ دوبارہ کمرے میں آئی۔ اس نے لالی کو دیکھا اور حیرت سے بولی۔ "ارے! تم تو بالکل پینڈو لگ رہے ہو۔" اس نے لالی کو دو سو روپے کے نوٹ دیئے۔ "لو' یہ رکھ لو۔ تمہیں ضرورت پڑے گی۔"

لالی نے روپے لے کر دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔ طاہرہ نے ذرا دیر خاموش رہ کر چادر کے اندر سے چمڑے کی چار گول گول تھیلیاں نکال کر لالی کو دیں۔ "یہ کھسے ہیں۔ ماں جی نے کہا ہے' انھیں تم کے چاروں کھروں میں پہنا دینا تاکہ کھوجی تم کا سراغ لگانے نکلیں تو کھروں کے نشان پہچان نہ سکیں۔ سمجھ گئے؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" لالی نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔ "اپنے ماسٹر جی رساگیری کا دھندا بھی کرتے ہیں؟"

طاہرہ نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ بوری سامنے درختوں کے نیچے کھڑی ہے' اسے لے جاؤ۔"

لالی اڑ گیا۔ "نہیں' تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" وہ آگے بڑھا۔ اس نے برآمدے میں کھلنے والا دروازہ کھولا اور طاہرہ کو مخاطب کیا۔ "چلو آگے بڑھو۔ جو طے ہوا ہے' وہی ہوگا۔" اس کا

لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تمہیں بھگا کر نہیں لے جاؤں گا۔ ایسا ارادہ ہوتا تو یہاں سے جاتا ہی کیوں۔" طاہرہ نے گھبرا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے کی اوٹ میں اس کی ماں کھڑی تھی۔ لالی نے طاہرہ کو خاموش پا کر کہا۔

"خاما خا کا گھبرانہ کرو۔ آگے بڑھو۔ میرا منہ کیا تک رہی ہو۔"

طاہرہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی اور لالی کے ساتھ بیٹھک سے باہر نکلی۔ بھینس درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ لالی نے اسے دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ بھوری بھینس تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ بھینس کے چاروں کھروں میں چمڑے کے کھسے چڑھا دیئے۔ رسی کھولی اور بھینس کو آگے بڑھانے کے لیے دھیرے دھیرے تت تت کی آواز نکالی۔

بھینس آگے بڑھی۔ لالی اس کی رسی پکڑ کر چلنے لگا۔ طاہرہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے اپنا بدن چادر سے چھپا رکھا تھا۔

آسمان پر گہرا غبار چھایا تھا۔ چاندنی دھندلی اور میلی میلی تھی۔ طاہرہ بہت خوف زدہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔ ہر آہٹ پر کانپ اٹھتی۔ کسی قریب کی گلی میں کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ اس کی آواز سن کر طاہرہ ایسی بدحواس ہوئی کہ گرتے گرتے بچی۔

لالی نے جھٹ بازو پکڑ کر اسے سنبھال لیا اور جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ دونوں گھر سے لگ بھگ سو قدم کے فاصلے پر تھے اور ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑے تھے۔ طاہرہ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھی۔ لالی کو اس پر ترس آ گیا۔

"تم واپس چلی جاؤ۔ زبان کی تم جتنی فروٹ ہو اتنی ہی بزدل اور ڈرپوک ہو' بالکل چھچھوندر کی طرح۔ آہٹ ہوئی اور چرچر کرتی بھاگی۔" طاہرہ نے اس کی باتوں کا بالکل برا نہ مانا۔ مسکرا کر بولی۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ! تم بہت نیک بندے ہو۔"

لالی نے اس کی جانب ذرا جھک کر دھیرے سے سرگوشی کی۔ "میں بالکل نیک بندہ نہیں ہوں۔ ہاں تم بہت نیک اور چنگی ہو۔ نہ شادی ہوئی نہ بیاہ اور دہیج میں میرے لیے یہ تم لے آئیں اور دو سو روپے بھی۔" طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی تو لالی نے اسے ٹوکا اور اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"اپنے بچے کا نام لالی رکھنا۔"

"لالی!" وہ حیرت سے بولی۔ "یہ کیا نام ہوا؟"

"میرا نام بھی لالی ہے۔ میں بھی اپنی ماں کے پیٹ میں بالکل اسی طرح آیا تھا۔ ملوم نہیں' میرا پیئو کون ہے؟ میری ماں کے ویاہ کے بعد جو میرا پیئو بنا' وہ مجھے ہمیشہ حرام دا کہتا۔ ماں کو گالاں نکالتا' اور گھر سے مار کر باہر کر دیتا۔ مجھے اس سے ملنے نہ دیتا۔" وہ ایک لمحے کو رکا۔ "میرے ساتھ تمہارا ویاہ ہو جاتا تو میں تمہارے بچے کو کبھی حرام دا نہ کہتا۔ تمہیں مار کر کبھی گھر سے نہ نکالتا۔ پر میرے ہاتھ میں تو ویاہ کی لکیر ہی نہیں ہے۔"

طاہرہ نے نظر بھر کو لالی کو دیکھا اور واپس جانے کا ارادہ بدل دیا۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تمہیں گاؤں کے نکڑ پر جا کر رخصت کروں گی۔"

لالی نے مسکرا کر کہا۔ "اتنی جلدی جلدی فیصلے نہ بدلا کرو۔ ایک گڑھے سے نکلو گی تو دوسرے میں گر جاؤ گی۔" معا" رات کے سناٹے میں آہٹ ابھری۔ لالی نے ہولے سے طاہرہ کو دھکا دیا۔ "جاؤ' کوئی آ رہا ہے۔"

طاہرہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے گھر کی جانب چلی گئی۔ لالی آگے بڑھ گیا۔

لالی جہانگیرہ میں داخل ہو کر شاداں کے گھر پر پہنچا تو رات ڈھل رہی تھی۔ اس نے بھینس گھر کے دروازے کے نزدیک ایک درخت سے باندھی اور دیوار پھاند کر آنگن میں آہستہ سے اتر گیا۔ شاداں آنگن میں سو رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ لالی نے قریب جا کر دھیرے سے شاداں کا کندھا جھنجوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"وے لالی توں' تو بالکل جٹ لگ رہا ہے۔ میں تو ڈر گئی تھی' کون آ گیا؟"

"ڈرمت' میں تجھے اغوا کرنے نہیں آیا۔ یہ بتا تیری بوری کا کیا بنا؟"

"مر گئی' ملک نے اسے مار ڈالا۔" وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ ذرا دیر خاموش رہی۔ پھر شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ "میں ملک کا خون پی لوں گی۔ اس کی بوٹیاں چبا ڈالوں گی۔"

"بوری کو ملک نے نہیں' میں نے مارا۔ لے میری بوٹیاں نوچ کر چبا۔"

"لالی! تو یہاں سے چلا جا۔ مجھے کچھ چنگا نہیں لگتا۔" شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تمیں نوں پتہ ہے' میں نے بوری کے کارن بالے کا گلا کاٹ ڈالا۔"

لالی نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تاجی تو کمرے میں نہیں ہے؟"

"نہیں وہ آج سویرے مجھ سے لڑ جھگڑ کر اپنے گھر چلی گئی۔"

لالی نے شاداں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ "میرے ساتھ آ۔"

شاداں ہاتھ چھڑاتے ہوئے بیزاری سے بولی۔ "لالی! مجھے تنگ نہ کر۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میرا جی کرتا ہے' اپنا گوشت نوچ ڈالوں۔"

انکار کے باوجود لالی اسے کھینچتا ہوا آنگن کے دوسرے سرے پر لے گیا۔ مگر جب وہ دروازے کی جانب بڑھا تو شاداں نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ آنکھیں نکال کر بولی۔ "کیا چاہتا ہے؟ میں تیرے سنگ نہیں جاؤں گی۔"

"پاگل نہ بن' تیری مرضی کے بنا تجھے کوئی اپنے سنگ نہیں لے جا سکتا۔ یہ بات تو بھی جانتی ہے۔ فیر کیوں ڈرتی ہے۔" لالی نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ "دروازے تک تو آجا۔ یہ تو تیرے ہی گھر کی دہلیز ہے۔"

شاداں آہستہ آہستہ دروازے تک چلی گئی۔ لالی نے دروازہ کھولا۔ باہر گیا اور بھینس کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ شاداں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"ہائے! یہ بھینس تو کہاں سے لے آیا؟"

لالی نے دروازہ بند کیا۔ "ٹھیک طرح دیکھ لے۔ بوری ہے اور دھولی بھی ہے۔ پکا اٹھاراں سیر دودھ دیتی ہے۔ نیلی بار کی کھولی ہے۔ اب تو ہنس دے۔ تیری بوری واپس آگئی۔"

شاداں نے بھینس کی گردن اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ "لگتی تو ویسی ہی ہے۔" پھر اس کی تھوتھنی سہلاتے ہوئے بولی۔ "اٹھاراں ہی سیر دودھ دیتی ہے نا؟"

"بیٹھ جا' تھنوں کے نیچے۔ دوہ کر دیکھ لے۔"

"اس وکھت؟ تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔ یہ بتا کہاں سے لایا؟" اس کی نظر بھینس کے کھروں پر پڑی۔ "چوری کر کے تو نہیں لایا؟ اس کے کھرے میں کھسے کیوں پڑے ہیں؟"

"اس لیے کہ کھوجی اس کا کھرا نہ نکال سکیں۔" وہ نہایت ڈھٹائی سے بولا۔ "ویسے یہ مجھے دہیج میں ملی ہے۔ گھر والی تو نہیں ملی۔ اس کی مجھے ضرورت بھی نہیں تھی۔"

"ٹھیک ٹھیک بتا؟"

"میں نے کبھی تجھ سے جھوٹ بولا ہے۔" لالی نے مسکرا کر بتایا۔ "اسے نہ لاتا تو گھر والی گلے پڑ جاتی۔ تھی تو ایسی سوہنی' تجھے کیا بتاؤں۔ لہور کے کالج میں پڑھتی ہے' پر وہ کمبخت ہے۔ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔"

"تیری باتیں بالکل سمجھ نہیں آئیں۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "صاف صاف بات کر۔"

"آرام سے بیٹھ کر تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے یہ بتا' اس روز میرے جانے کے بعد کیا ہوا؟"

"تیرے جاتے ہی ملک اپنے کرندوں کو لے کر آگیا۔ مجھے زبردستی پکڑ کر اپنی حویلی میں لے گیا۔ بہت لال پیلا ہوا۔ بہت ناراض ہوا۔ مارنے کو بار بار اٹھا۔ مجھے دھمکی دی کہ کسی سے نہ کہوں کہ

بوری اس کی گولی لگنے سے مر گئی۔ پر پنڈ میں یہ بات سب کو ملوم ہے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے دم بھر کو رکی۔ "بوری کو اس کے کمی اور کرندے اسی وکھت ریڑھے میں ڈال کر لے گئے۔ کسائی کو دے دیا ہوگا۔ دور کسی گڑھے شڑھے میں ڈال دیا ہوگا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ملک سو روپے دیتا تھا۔ میں نے نہیں لیے۔ خالی ہاتھ چلی آئی۔"

"ٹھیک ہی کیا۔ اس نے پولیس تو نہیں بلائی؟"

"نہیں! بوری کے مرنے کے بعد ڈر گیا۔ پر اپنی بندوک کے بارے میں بار بار پوچھتا تھا۔ تو نے اس کا کیا کیا؟"

"ادھر بڑیلی کی ایک جھاڑی میں پھینک دی۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "اب تو یہ سوچ۔ کل سب پوچھیں گے' یہ بھینس کہاں سے آئی' تو کیا کہے گی؟"

"ہائے! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ بتا کیا کہوں؟"

"تیرا خصم کہہ دے گا' یہ بھینس اس نے تجھے دی ہے؟"

"کہہ دے گا۔ ضرور کہہ دے گا۔ جو کہوں گی' وہی کہہ دے گا۔"

"وہ تجھے اتنا پیار کرتا ہے تب بھی اس کے پاس نہیں جاتی۔ اس سے اتنا خار کیوں کھاتی ہے؟"

"تمیں نوں پتہ نہیں' مجھے وہ کبھی پسند نہیں آیا۔" وہ خیالوں میں کھو گئی۔ ذرا دیر خاموش رہ کر بولی۔ "میری ماں مر گئی تھی۔ سوتیلی ماں تھی۔ وہ مجھے بہت تنگ کرتی تھی۔ مارتی تھی۔ کھانے کو نہیں دیتی تھی۔ ننگی ننگی گالاں نکالتی تھی۔ میں چھوٹی سی تھی تو اس نے کھیردین سے میرا ویاہ کر دیا۔ میرے گھر والے کا نام کھیردین ہے۔ تو نے اسے نہیں دیکھا۔ بالکل ادھکڑ ہے۔ آدھے سے زیادہ تو اس کی داڑھی اور سر کے بال چٹے ہیں۔ ہائے' ایسی بری شکل ہے اس کی' تجھے کیا بتاؤں۔ یہ لمبا منہ اور باہر نکلے ہوئے یہ لمبے لمبے دانت۔ بالکل ندلو ہے۔ کمانا تو اسے آتا ہی نہیں۔ کبھی لڑائی جھگڑا نہیں کرتا۔ کوئی آنکھ دکھائے تو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سب کہتے ہیں۔ ہائے' کھیردین کتنا نیک بندہ ہے' کتنا بھلا ہے۔ فرشتہ ہے فرشتہ۔ شاداں ہی بری ہے۔" وہ غصے سے ایک دم بپھر گئی۔ "ایسا ہی بھلا ہے تو اس فرشتے سے اپنی دھی' اپنی بھین کیوں نہیں ویاہ دی؟ شاداں کیوں اس کے گلے میں ڈھول بنا کر ڈال دی؟ ماں نے چپکے سے تین سو روپے جو لیے تھے۔ ہائے کتنے سستے داموں بیچ دیا مجھے۔"

وہ نہ جانے اور کیا کیا کہتی مگر لالی نے اسے روک دیا۔ "اپنی ہی کہے جائے گی یا دوسرے کی بھی سنے گی؟"

"خصم کیا کہتا ہے؟"

"میرا کہا مان۔ کل سویرے ہی سویرے اپنے خصم کے پاس چلی جا۔ ہو سکے تو اسے اور بچوں کو چند روز کے لیے' یہاں لے آ۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" شاداں نے صاف انکار کر دیا۔ "ایک بار اس کے گھر سے چلی آئی' اب اس کی دہلیز پر قدم نہیں رکھوں گی۔ اس نے پہلے بھی بہت منتیں کیں پر میں نہیں گئی۔ اب کیسے جا سکتی ہوں؟"

"نہ جا۔" لالی جل کر بولا۔ "پکڑی جائے گی۔"

"تو کیا سچ مچ' تُو نے چوری کی ہے؟"

"پینو کی طرف سے چوری کی ہے' ماں اور دھی کی طرف سے دہیج میں ملی ہے۔ یہ دو سو روپے بھی ملے ہیں۔" لالی نے دھوتی کے ڈب سے روپے نکالے اور شاداں کو دے کر بولا۔ "لے یہ رکھ لے۔ مان لے' پولیس کوئی چکر شکر چلائے تو کچھ دے دلا کر معاملہ دبا دینا اور دیکھ' کل ضرور کھیر دین کے پاس جانا۔ دندلو تجھے اپنے لے لے دانتوں سے کاٹ تو نہیں کھائے گا۔ ویسے بھی تجھے برسوں کاٹتا رہا ہے۔ چند روز اور کاٹ لے گا تو تیرا کیا بگڑ جائے گا۔" لالی نے اسے نرم لہجے میں سمجھایا۔ "ضد نہ کر' میرا کہا مان۔ ورنہ گھر آئی تُو بھی ہاتھ سے جائے گی اور خود بھی کسی چکر میں پڑ جائے گی۔ بول' کیا کہتی ہے؟"

"توں کہتا ہے تو چلی جاؤں گی۔" شاداں صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے رضامند ہو گئی۔ "سویرے ہی سویرے چلی جاؤں گی۔"

"یہ بتا کپڑے لے آئی؟"

"نہیں' درزی پنڈ چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ برا نہ مان۔ کل شام تک ٹھہر جا۔ میں ضرور تیرے لیے' قمیص سلوا کر لے آؤں گی۔ دھوتی کا کیا ہے وہ میری لے لے۔ ویسے چادرے بھی کام چل جائے گا۔"

"اب ضرورت بھی نہیں' مجھے اب جانا ہے۔ ابھی رات رہتی ہے۔ اندھیرے میں نکل جاؤں گا۔ دیکھ' سویرے اپنے خصم کے پاس چلی جانا۔"

"تجھے کہہ تو دیا' چلی جاؤں گی' ضرور چلی جاؤں گی۔" شاداں نے بھینس کی رسی پکڑی اور لالی کو روک کر بولی۔ "بوری کو باندھ لوں۔ توں اکیلا نہیں جائے گا۔ میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

"آج نہیں۔ اب تو میرے ساتھ اس روز چلے گی جس روز میں تجھے بھگا کر لے جاؤں گا۔ تیار

رہنا۔"

"بکواس نہ کر۔" شاداں منہ بگاڑ کر بولی۔ "توں تو اڑیل ٹٹو ہے۔"

لالی کھل کر مسکرایا۔ "دیکھ اتنا تو ہوا۔ کنجرے مجھے اڑیل ٹٹو بنا دیا۔ سیڑھی سیڑھی نیچے اتر رہی ہے۔" وہ آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

☆

لالی اس راستے کی جانب بڑھا جو ریل کی پٹڑی کی طرف جاتا تھا۔ اسی راستے سے وہ پہلے بھی جہانگیرہ آ چکا تھا اور اب اس سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ وہ جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ ابھی اسے خاصا لمبا فاصلہ طے کرنا تھا۔ رات ختم ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ مگر وہ دو ڈھائی میل آگے گیا تھا کہ ایک موڑ پر قریب سے آواز آئی۔

"چوہدری! تیرے پاس ماچس تو ہو گی؟"

لالی سنی ان سنی کر کے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایک شخص اندھیرے سے نکل کر اس کی جانب بڑھا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" وہ سائیکل پر سوار تھا۔ لالی نے دھندلی دھندلی چاندنی میں فوراً بھانپ لیا کہ وہ سادہ لباس میں پولیس کا کانسٹیبل ہے۔ وہ لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ ڈھلتی عمر کے باعث اس کی کمر ذرا جھک گئی تھی۔ لالی نے ٹالنے کے لیے کہا۔

"میرے پاس ماچس نہیں ہے۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

وہ آگے بڑھ گیا۔ لیکن کانسٹیبل نے اسے جانے نہیں دیا' پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "چوہدری! گل سن۔"

لالی ٹھہر گیا۔ مگر خاموش رہا۔ کانسٹیبل نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور جھک کر اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "لگتا ہے' تجھے کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟" وہ لالی کو مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا۔

لالی نے جھٹ کہا۔ "تجھے ایسے ہی شبہ ہوا۔ میں تو اس پنڈ میں پہلی بار آیا تھا۔" اس نے چاہا کہ بڑھ کر آگے نکل جائے۔ لیکن کانسٹیبل نے اس کا بازو تھام کر روک لیا۔ "بات تو سن۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "تو لالی تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" لالی نے صاف انکار کردیا۔ "میں نے کہا نہیں' تجھے شبہ ہوا۔"

"میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔" کانسٹیبل نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تو لالی ہے۔ پچھلے دنوں جیل سے نکل کر بھاگا ہے۔"

"تجھے کیسے ملوم ہوا میں لالی ہوں۔" لالی نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے اسے دیکھا۔ "خالی پیلی تھانے داری جمانے کھڑا ہو گیا۔"

"میں نے تھانے میں تیری تصویر دیکھی ہے۔ تو لالی ہی ہے۔" کانسٹیبل نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تو میری نظروں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ ۳۰ سال ہو گئے' پولیس کی نوکری کرتے۔ ایک سے ایک اونچا مجرم دیکھا ہے اور ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔"

لالی نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ دس روپے کا نوٹ دھوتی کے ڈب سے نکالا اور کانسٹیبل کی طرف بڑھاتے ہوئے گویا ہوا۔

"لے اسے رکھ لے۔"

کانسٹیبل نے دس روپے کا نوٹ تو لے لیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ "تیرے لیے تو دو ہزار روپے کا انعام ہے۔ تیرا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟"

لالی نے ایک نوٹ اور نکالا اور کانسٹیبل کو دے کر بولا۔ "میرے پاس اب صرف ریل کا کرایہ رہ گیا ہے' وہ تجھے نہیں دوں گا۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "ساتھ ہی یہ بھی سن لے۔ میرا رستہ روکا تو یہیں لٹا دوں گا۔"

لالی نے جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ ہلکا سا جھٹکا دے کر ہاتھ کا شکنجہ کسا تو ادھیڑ عمر کانسٹیبل نیں نیں کرنے لگا۔ "خانہ خراب' میری گردن تو چھوڑ۔ میں نے کب تیرا رستہ روکا۔" لالی نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ "تیرے ہاتھ تو لوہے کے لگتے ہیں۔ تو نے تو میری گردن ہی توڑ دی تھی۔" وہ ذرا سا رکا۔

"جائے گا کہاں؟"

"بیکار کی ٹرٹر نہ کر۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔

"ناراض نہ ہو۔ میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ پولیس کی ایک پارٹی ذرا دیر پہلے ادھر سے گزری ہے۔ سب کے سب مسلح ہیں۔ صوبے دار بھی ان کے ساتھ ہے۔"

"راؤنڈ پر نکلے ہیں؟" لالی نے دریافت کیا۔ اس کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

"نہیں۔" کانسٹیبل ابھی تک رک رک کر اپنی گردن سہلا رہا تھا۔ "پرسوں رات یوسف والا

ریلوے کراسنگ پر زبردست ڈاکا پڑا۔ ڈاکوؤں نے بس لوٹ لی۔ گولی بھی چلائی۔ ایک زخمی اسپتال جاتے جاتے راستے ہی میں چل بسا۔ جب سے یہ واردات ہوئی ہے پولیس ہر طرف بھاگ دوڑ کرتی پھر رہی ہے۔ ویسے میں تو اپنے بھائی کے پنڈ جا رہا تھا۔ وہ سخت بیمار ہے۔" اس نے توقف کیا۔ "مخبروں نے بتایا ہے' ڈاکو ادھر ہی کہیں چھپے بیٹھے ہیں۔"

"صوبے دار کدھر گیا ہے؟"

کانسٹیبل نے شمال کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "پوری پارٹی ادھر گئی ہے۔" لالی کو بھی اسی طرف جانا تھا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اسے کوئی دوسرا راستہ معلوم نہیں تھا۔ کانسٹیبل نے اسے خاموش دیکھ کر دریافت کیا۔ "تمیں نوں کتھے جانا ہے؟"

"جدھر پولیس پارٹی گئی ہے۔"

"پر تو تو سٹیشن جائے گا۔"

"ہاں۔" لالی نے انکار نہیں کیا۔ حالانکہ اسے اسٹیشن ہرگز نہیں جانا تھا۔ مگر وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ قادر آباد اسٹیشن کے قریب پہنچ کر اسے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کا راستہ مل جائے گا۔

"میری مان تو اس طرف سے نکل جا۔" کانسٹیبل نے اس راستے سے ذرا ہٹ کر ایک طرف اشارہ کیا۔ "یہ رستہ چھوٹا ہے اور تیرے لیے ٹھیک بھی رہے گا۔ ایسا کر سیدھا سیدھا چلا جا۔ آگے جا کر نالو ملے گا۔ یہ برساتی نالا چک ۲۱ ای۔ بی کے نزدیک سے گزرتا ہے۔" وہ گردن اٹھا کر سوچنے لگا۔ "یہاں سے چار میل تو ہو گا۔ اس پر پہنچ کر ایسا کرنا' اس پار نہ جانا۔ چو کے کنارے کنارے چلا جانا۔ اس رستے پر جنگل ہے' جھاڑیاں بہت ہیں۔ تجھے کوئی دیکھ بھی نہ پائے گا۔ جہاں چو مڑتا ہے وہاں سے پورب کی طرف جانے والا رستہ پکڑنا۔ آگے جا کر نہر ملے گی وہ کادر آباد سٹیشن کے نزدیک سے گزر کر لوئر باری دوآب سے مل جاتی ہے۔ سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا' بالکل سمجھ گیا۔" لالی تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "پر تجھے ایک گل بتا دوں۔ اگر دو ہزار انعام کے چکر میں تو نے مجھے پھنسوا دیا اور میں پکڑا گیا تو اتنا سمجھ لے' میں جیل سے سیدھا یہاں آؤں گا۔ تجھے چھوڑوں گا نہیں۔" یہ کہہ کر لالی نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ "میرا نام لالی ہے۔ اتنا یاد رکھنا۔"

"تو کس چکر میں پڑ گیا۔ میرا نام واحد ہے۔ ادھر مجھے سب جانتے ہیں۔ پہلے بھی کئی مجرم پکڑوا چکا ہوں۔ دو بار اسی چکر میں زخمی ہو کر اسپتال بھی گیا۔ ان پر تجھ سے زیادہ انعام تھا پر ہر بار انعام اوپر والوں کو ملا۔ کسی کی وردی میں ایک سے دو پھول لگ گئے۔ مجھے کیا ملا۔ کپتان صاحب نے ہاتھ ملایا

اور کندھا تھپک دیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ میری تنخواہ ۲۰ روپے سے آگے نہ بڑھی۔ ۵ بچے ہیں۔ گھروا ہے اور اندھی ماں ہے۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہوگیا۔ "ذرا سوچ تو' اپنے پر کیا بیتی ہے۔ میری ماں اندھی ہے۔ اوپر والوں کی دونوں آنکھیں ہیں۔ تب بھی اندھے ہیں۔"

لالی بہت متاثر ہوا۔ اس نے کانسٹیبل کی باتوں پر اعتبار بھی کرلیا۔ ڈب سے دس روپے کا ایک نوٹ اور نکالا اور کانسٹیبل کو دے کر بولا۔ "لے' یہ بھی رکھ لے۔ پروا نہ کر۔ اپنا کام چل جائے گا۔" وہ اس سمت بڑھا جدھر کانسٹیبل نے جانے کی ہدایت کی تھی۔

کانسٹیبل نے چلتے چلتے ٹوکا۔ "دیکھ بھال کے رستہ چلنا۔ اتنا دھیان رکھنا' ڈاکوؤں کی دھاڑ بھی اسی علاقے میں ہے۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اس راستے پر چل پڑا جو کانسٹیبل نے بتایا تھا۔

چار' ساڑھے چار میل راستہ طے کر کے وہ برساتی نالے پر پہنچا اور اس کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔ کانسٹیبل نے ٹھیک کہا تھا۔ اس راستے پر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں' گھنی بھی اور اونچی بھی۔ لالی جھاڑیوں کی اوٹ میں تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھتا گیا۔ وہ مڑمڑ کر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا بھی جاتا۔ پولیس کا بھی خطرہ تھا اور ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہونے کا بھی دھڑکا تھا۔

☆

ایک گھنی جھاڑی کے قریب اندھیرے میں دو سائے لہرائے۔ لالی سنبھلا بھی نہ تھا کہ کسی نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا۔ ایسی مضبوطی سے گرفت میں لیا کہ لالی بے بس ہوگیا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا' ایک قوی ہیکل نوجوان اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچے خونخوار نظروں سے گھور رہا ہے۔ آن کی آن میں اسی وضع قطع کے دو اور نوجوان جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آگئے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے کرتے اور خوب گھیردار شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ ایک کے چہرے پر ڈھاٹا بھی بندھا تھا۔ لالی فوراً سمجھ گیا کہ وہ کون ہیں۔ یہ وہی ڈاکو تھے جنھوں نے پرسوں رات ریلوے کراسنگ پر بس لوٹی تھی۔ ایک ڈاکو نے لالی سے پوچھا۔

"کون ہے تو؟"

لالی نے غچا دے کر نکل جانا چاہا۔ "سٹیشن جا رہا ہوں۔ میں نے ملتان کے لیے گڈی پکڑنی ہے۔"

پیچھے کھڑے ہوئے ڈاکو نے جو دونوں ہاتھوں سے لالی کو جکڑے ہوئے تھا' اونچی آواز سے کہا۔ "مجھے تو پولیسا جان پڑتا ہے۔"

"مخبر ہوگا۔" دوسرے نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

لالی نے انکار میں گردن ہلائی۔ "نہیں۔"

"ٹھیک ٹھیک بتا' کون ہے؟" سامنے کھڑے ہوئے ڈاکو نے لالی کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ رسید کیا۔ لالی کا ایک گال اور کان جھنجھنا کے رہ گئے۔ آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔ اس نے بے بسی سے کہا۔ "یارو! مارتے کیوں ہو؟ میں سچ سچ بتادوں گا۔" اس نے اپنا گال سہلایا۔ "میرا نام لالی ہے۔ میں جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہوں۔"

چند لمحے وہ خاموش کھڑے رہے۔ ان کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں لالی کی بات پر یقین نہیں آیا۔ ایک نے شبے کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"ادھر کس لیے آیا تھا؟"

"پولیس کے ڈر سے۔ پولیس میری تلاش میں ہے۔ دو ہزار کا انعام میری گرفتاری پر رکھا گیا ہے۔"

"دو ہزار کا انعام؟" دوسرے نے حیرت سے کہا۔ "اوئے پھیرو! یہ تو کوئی اونچی چیز لگتا ہے۔"

پھیرو نے لالی کے بازو کا گوشت ٹٹولا اور اس کی مونچھ مروڑ کر اونچی کی۔ مسکرا کر بولا۔ "لگتا بھی زور آور ہے۔"

لالی نے عاجزی سے کہا۔ "یار! میری کمر تو چھوڑ۔ میں بھاگا نہیں جا رہا ہوں۔"

پھیرو نے اونچی آواز سے کہا۔ "عالم! چھوڑ دے اسے۔" عالم نے لالی کو اپنی گرفت سے آزاد کردیا۔

لالی گڑگڑا کر بولا۔ "جو پوچھنا ہے' پوچھ لو۔ ابھی اندھیرا ہے' میں سٹیشن چلا جاؤں گا۔"

مگر انھوں نے لالی کو جانے نہیں دیا۔ اسے اپنے نرغے میں لے کر ایک طرف چل دیے۔ انھوں نے خشک برساتی نالہ عبور کیا اور دوسری طرف پہنچ کر گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

قریب جا کر لالی نے دیکھا' وہاں بھی دو ڈاکو موجود ہیں۔ ایک مٹی کے تودے پر درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس بارہ بور کی دو نالی بندوق رکھی تھی۔ اپنی آن بان سے وہ ان کا سرغنہ لگتا تھا۔ اس نے لالی کو دیکھ کر دور ہی سے پوچھا۔

"کون ہے یہ؟"

پھیرو نے جواب دیا۔ "ٹھیک سے پتہ نہیں۔ کہتا ہے' جیل سے نکل کے بھاگا ہے۔"

عالم بولا۔ "یہ بھی کہتا ہے' اس کی گرفتاری پر دو ہزار کا انعام ہے۔"

سرغنہ نے لالی کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا۔ "سنا تو میں نے بھی ہے کہ پچھلے دنوں دو قیدی جیل سے نکل بھاگے۔" اس نے لالی سے پوچھا۔ "جیل کس چکر میں گیا تھا۔ کسی کا خون کیا تھا؟"

لالی نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

"ڈکیتی کی تھی؟"

"نہیں۔" لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔

"فیر جیل کیوں ہوئی تھی؟ کوئی چھوہری شوہری بھگائی تھی؟"

"نہیں جی' میں ایسا کام نہیں کرتا۔" لالی نے آہستہ سے کہا۔ "سیکل چرائی تھی۔"

"اوئے چوّدو! اتی وڈی توپ چلائی۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہوا۔ "ا سن لو۔ اس نیولے کے جیل سے بھاگنے پر دو ہزار کا انعام رکھا ہے۔ پولیس کی مت ماری گئی ہے۔" اس نے ڈپٹ کر لالی سے کہا۔ "اوئے نیولے! ادھر آ میرے نزدیک۔"

لالی اس کے پاس چلا گیا۔ وہ اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "لے' میری ٹانگیں دبا۔" لالی خاموشی سے اس کے نزدیک بیٹھ کر ٹانگیں دبانے لگا۔ ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے عالم کی جانب مڑ کر دیکھا۔

"رشید بلاّ ابھی تک نہیں لوٹا؟"

عالم نے جواب دیا۔ "اب تو جی مشکل ہی لگتا ہے۔ اجالا ہو گیا ہے۔ شام کو آئے گا وہ۔"

سرغنہ اونچی آواز سے گرجا۔ "تم سبھی چلے آئے۔ چاروں طرف پولیس پھیلی ہے اور تم یہاں کھڑے ہو۔ جاؤ' جا کر ہوشیاری سے ادھر ادھر دیکھتے رہو۔ خطرہ ہو تو فوراً سیٹی مارو۔" وہ پاس کھڑے ہوئے ڈاکو سے مخاطب ہوا۔ "کھیرے' تو بھی جا۔ کسی اونچے درخت پر چڑھ کر دور دور تک نظر ڈال لینا۔"

سب چلے گئے۔ صرف لالی رہ گیا۔ وہ گردن جھکائے سرغنہ کے پیر دباتا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے لالی کو مخاطب کیا۔ "نیولے!"

اس دفعہ لالی بھڑک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "دیکھو جی! مجھے نیولا شیولا مت کہو۔" ڈاکو نے جھٹ بندوق پر ہاتھ رکھا۔ تیوری پر بل ڈال کر چیخا۔ "کیا کہا؟"

لالی مرعوب نہیں ہوا۔ گردن اونچی کر کے گویا ہوا۔ "میرا نام لالی ہے' نیولا نہیں۔"

"چل لالی ہی سہی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا اور بندوق پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی جان لے' میرا نام داد محمد ساہو ہے۔ چھے خون کر چکا ہوں' پرسوں رات والا ساتواں تھا۔ تو چوری چکاری کرنے والا مجھے کیا جانے۔ پولیس جانتی ہے مجھے۔ میرے سر کی بولی بیس ہزار رکھی گئی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے ساہو' میں تجھے نہیں جانتا۔" لالی اس کے پیر دباتے ہوئے بولا۔ "تجھے کون نہیں جانتا؟ مگر مجھے گلہ ہے پولیس تو مجھے جانتی ہے' توں نہیں جانتا۔ جانتا ہوتا تو میرا رستہ نہ روکتا۔ مجھ سے تو تیں نوں کوئی خطرہ نہیں۔"

"اب تو اجالا بھی پھیل گیا۔ یہاں سے نکل کے کہاں جائے گا؟" داد محمد ساہو نے لالی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو نے تو اپنا ٹھکانا بھی دیکھ لیا۔ ابھی تجھے نہیں جانے دوں گا۔ دن یہیں کاٹ لے۔ رات کو اپنے ساتھ نکل چلنا۔ رشید بلاّ آ جاتا تو میں آج ہی نکل جاتا۔ مجھے اسی کا انتظار ہے۔ شام تک آ ہی جائے گا۔"

لالی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا اور خاموشی سے ساہو کے پیر دباتا رہا۔ ذرا دیر بعد ساہو درخت سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ "لے ذرا کندھے بھی دبا دے۔ بہت تھک گیا ہوں۔ رات بھر راؤنڈ پر رہا۔ پولیسے گھات میں ہیں۔ اپنے کو بھی چوکس رہنا پڑتا ہے۔" وہ چند لمحے آنکھیں بند کئے چپ بیٹھا رہا پھر لالی سے مخاطب ہوا۔ "لگتا تو جی دار ہے۔ کہاں پڑ گیا چوری چکاری میں؟ کیا دھرا ہے اس میں؟ پوچھو چرایا کیا؟ صرف ایک سیکل' ملا کیا؟ دو سو سے بھی کم اور سزا دو سال سے اوپر ہی ہوئی ہوگی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "جی کرے تو لگ جا اپنے ساتھ لین میں۔ ڈکیتی کا مزا بھی دیکھ لے۔ لومڑی سے ایک دم شیر بن جائے گا' شیر۔ کیا سمجھا؟"

"ڈاکے تو میں نے بھی ڈالے ہیں۔ راشن ڈپو لوٹا تھا' ایک پیٹرول پمپ بھی لوٹا۔" لالی اپنی بات کہتے کہتے ذرا سا رکا۔ "پر اس وکھت تو مجھے رحیم داد کے پاس جانا ہے۔"

"کون رحیم داد؟"

"وہی جو میرے ساتھ جیل سے فرار ہوا ہے۔"

"گولی مار اسے۔ اپنی سوچ۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میں اس سے دھوکا نہیں کر سکتا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ لیکن جب تک اپنا ادھر پڑاؤ ہے' تو نہیں جا سکتا۔ دن تو تجھے یہیں کاٹنا پڑے گا۔ رات کو تیرے بارے میں سوچوں گا۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد لالی کو اس بیگار سے نجات مل گئی۔ داد محمد سا بولا۔ "بس کر۔ نیند آ رہی ہو تو یہیں لیٹ جا۔ پروا نہ کر۔ دوپہر کی روٹی تجھے بھی ملے گی۔"

لالی اٹھا اور کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے گٹھری سرہانے رکھ کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جا ہوا تھا۔ نرم نرم جھونکوں سے آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

سہ پہر کو لالی بیدار ہوا۔ ساہو کھیس بچھائے بے خبر سو رہا تھا۔ سامنے فقیرا بندوق سنبھا۔ چوکس بیٹھا تھا۔ لالی بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ فقیرا اس کے لیے کھانا لے آیا۔ باسی روٹی تھی اور اس ۔ ساتھ صرف پیاز اور ہری مرچ تھی۔ البتہ پینے کو پانی گلاس بھر کر ملا۔ کھانا کھا کر لالی پھر لیٹ گیا مگ اسے نیند نہیں آئی۔ وہ پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ فقیرا خاموش بیٹھا لالی کو گھورتا رہا۔ عالم ایک بار آیا مگ ساہو کو سوتا پا کر چپ چاپ واپس چلا گیا۔

لالی پیشاب کرنے اٹھا۔ اس نے کچھ دور آگے جانا چاہا تو فقیرا بھی بندوق سنبھالے اس کے پیچھ پیچھے چلا۔ لالی نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ پیشاب کرنے کے بعد اپنی جگہ آکر لیٹ گیا۔ مگ اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اس نگرانی سے لالی سخت پریشان ہوا۔ رات کا جانا بھی مشکل نظر آیا۔

اسی پریشانی میں شام ہو گئی۔ داد محمد ساہو بیدار ہو گیا۔ مگر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ د بیٹھا انگڑائیاں لیتا رہا۔ اس نے پانی منگوا کر پیا۔ بندوق سنبھالی اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ فقیر جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔

لالی اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد ساہو واپس آیا۔ اس کے ہم راہ پھیرو بھی تھا۔ دونوں کھیس پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ و اس قدر آہستہ آہستہ بول رہے تھے کہ لالی ٹھیک سے کچھ نہیں سن سکا۔ البتہ ان کی باتوں سے اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ رشید بلّا ابھی تک واپس نہیں آیا اور اس کے نہ آنے سے ساہو بہت پریشان ہے۔

اندھیرا خوب گہرا ہو گیا تھا۔ ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آتی تھی۔ پھیرو جا چکا تھا۔ فقیرا بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا۔ ساہو اکیلا بیٹھا تھا اور سگریٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ دھوئیں کی تیز بو سے لالی تاڑ گیا کہ وہ چرس بھری سگریٹ پی رہا ہے۔ لالی اور ساہو ایک دوسرے سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ مگر دونوں خاموش تھے۔ اسی دوران سکنالے کے اس پار سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی اونچی آواز سے بول رہا ہو۔ ساہو نے سگریٹ بجھا دی اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

بندوق اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ ذرا دیر بعد اندھیرے میں کوئی تیز تیز قدموں چلتا ہوا آیا۔ یہ عالم تھا۔

ساہو نے پوچھا۔ "عالم! یہ آوازیں کیسی آ رہی ہیں؟"

"رشید بلّے نے مروا دیا۔"

"بات کیا ہے؟ ٹھیک بتا؟"

"پولیس نے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ انسپکٹر منہ سے بھونپو لگا کر بول رہا ہے۔ کہتا ہے 'ہتھیار ڈال دو۔'" یہ کہہ کر عالم رکا' پھر غصے سے چیخا۔ "کہاں گیا وہ حرام دا؟ میں نے پہلے ہی کہا تھا' یہ پولیس کا مخبر ہے۔" یہ کہتا ہوا عالم اندھیرے میں انکل سے آگے بڑھا اور لالی کے قریب پہنچ کر اس نے زور سے کمر پر لات ماری۔ لالی بلبلا کر زمین پر گر پڑا۔

وہ لالی کو اور مارتا مگر ساہو نے روک دیا۔ "رہنے دے عالم! اس سے بعد میں نمٹ لیں گے۔" وہ لالی سے مخاطب ہوا۔ "یہاں سے ہلا تو تیرے لیے فضول ایک کارتوس خراب کرنا پڑے گا۔"

"مجھے ایک کارتوس خراب ہی کر لینے دے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

ساہو نے ڈپٹ کر کہا۔ "بکواس نہ کر۔ اس چڑی چور کو گولی مار' کام کی بات کر۔ رشید بلّا جانے کس چکر میں پھنس گیا۔ راشن پانی اپنے پاس تک گیا ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرنا ہو گا۔ کل پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بتا' انسپکٹر کتھے ہے؟"

"چوکے اس پار جھاڑیوں کے پیچھے۔ آواز وہیں سے آ رہی ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنی ہے۔"

"ایسا کر' کمیرے کو میرے پاس بھیج دے۔ تو ملنگی کے ساتھ مورچہ لگا کر انسپکٹر کی پارٹی پر فائر کھول۔ پھیرو سے کہہ' وہ اور دارا تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مورچے لگا دیں۔ سمٹ کر رہنا۔ دور دور نہ بکھر جانا۔ فائر ایک ساتھ کھولنا۔ ایسا لگے جیسے چاروں طرف سے فائرنگ ہو رہی ہے۔"

"اب میں چلوں؟"

ساہو زور سے دہاڑا۔ "پوری گل تو سن۔ جلدی نہ کر' ورنہ مروا دے گا۔ میں کمیرے کے ساتھ پیچھے سے پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلنے کی کوشش کروں گا۔ مال پانی اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔ جب میری طرف فائرنگ ہلکی پڑ جائے' تو تم چاروں تیز فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹنا شروع کر دینا اور اندھا دھند گولی چلاتے ہوئے نکل جانا۔ میں نہر کی پلی کے پاس تمہارا انتظار کروں گا۔ ہر بات پوری طرح سمجھ گیا؟"

"پروا نہ کر۔ پولیس سے پہلی بار ٹاکرا نہیں ہے۔ پہلے بھی بہت گولی چلی ہے۔ اس دفعہ صاف نکل جائیں گے۔ راؤنڈ بھی اپنے پاس کافی ہیں۔"

"اب تو جا۔ فقیرے کو بھیج دے۔"

عالم چلا گیا۔ ساہو بندوق سنبھال کر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔

لالی زمین پر سہما ہوا پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور ساہو کے قریب جا کر صفائی پیش کرنے لگا۔ "سچ کہتا ہوں' میں لالی ہی ہوں' جیل سے بھاگا ہوا کیدی۔ میں پولیس کا مخبر نہیں ہوں۔ نہ جانے کیسے میرے بارے میں تجھے شبہ ہو گیا۔ میری بات کا یکین مان۔ جیسی چاہے کسم لے لے۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

ساہو بے نیازی سے بولا۔ "میں کب کہہ رہا ہوں' تو لالی نہیں ہے۔ پولیس کا مخبر تو تجھے عالم بتا رہا ہے۔ پتہ نہیں' کیسے اسے تجھ پر مخبر ہونے کا شبہ ہو گیا۔ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔"

"میں تو صبح سے تیرے سامنے ہوں۔ کہیں گیا بھی نہیں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تیرا ادھر آنا ہی کم شبے کی بات نہیں۔ تو کہتا تھا سٹیشن جانا ہے۔ کون سا سٹیشن؟ ادھر کوئی سٹیشن نہیں ہے۔ تو نے خود ہی شبہ پیدا کیا۔"

لالی عاجزی سے بولا۔ "رب سونہہ' میں لالی ہوں' جیل سے....."

ساہو نے اس کی بات کاٹ کر غصے سے کہا۔ "سن لیا' تو لالی ہے' جیل سے بھاگا ہوا کیدی ہے۔ میں نے تیری بات سچ مان لی۔ تو میرا مہمان تھا' بکواس بند کر اور چپ کر کے بیٹھ جا۔"

لالی نے اس کے بعد ایک لفظ نہیں کہا۔ خاموشی سے اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد فقیرا آ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی ساہو درخت کے تنے کے پاس اندھیرے میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گٹھری تھی۔ اس نے گٹھری مضبوطی سے فقیرے کی پیٹھ پر باندھی' مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "ادھر آ۔ تجھے بھی میرے ساتھ چلنا ہے۔"

لالی لرز اٹھا۔ انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے لاٹھی وہیں چھوڑ دی مگر اپنی گٹھری نہیں چھوڑی۔ اسے بغل میں دابا اور ساہو کے پاس پہنچ گیا۔

تینوں درختوں کے نیچے گھپ اندھیرے میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ لگ بھگ سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد داد محمد ساہو ٹھہر گیا۔ پلٹا اور منہ میں انگلیاں ڈال کر زور سے سیٹی بجائی۔ سیٹی بلند ہوتے ہی رات کے سناٹے میں برساتی نالے کے قریب گولیاں چلنے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ساہو اور فقیرا چپ کھڑے رہے۔ لالی بھی دم بخود تھا۔ عقب میں تابڑ توڑ گولیاں چلتی رہیں۔ لالی نے ساہو کی پشت پر لٹکی ہوئی فاضل بندوق دیکھ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "تیرے پاس کاربین ہے' مجھے بندوک دے دے۔ میں بالکل نہتا ہوں۔ تیری مدد بھی کر سکوں گا۔" ساہو نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "دے دوں گا۔ ضرور دے دوں گا۔" مگر اس نے بندوق دی نہیں۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے لالی کو ہولے سے دھکا دیا۔

"آگے چل۔"

لالی آگے بڑھا۔ ساہو اور فقیرا اپنی جگہ کھڑے رہے۔ انھیں اپنے ہم راہ نہ پا کر لالی ٹھٹکا۔ پلٹ کر دیکھا۔ ساہو نے ڈپٹ کر کہا۔ "دیکھتا کیا ہے؟ آگے بڑھ۔" اس نے لالی کو قرابین کی زد پر رکھ لیا۔

لالی آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ آگے پولیس تھی' پیچھے ساہو اور فقیرا تھے۔ ادھر بھی بندوقیں تھیں اور ادھر بھی۔ لالی دونوں کے بیچ میں تھا اور بالکل غیر مسلح تھا۔ بھاگنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اس کی پشت پر ساہو اور فقیرا بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھتا گیا۔ خشک پتے اس کے پیروں کے نیچے آہٹ پیدا کرتے رہے۔ جیسے ہی وہ درختوں سے نکل کر کھلی جگہ آیا سامنے سے پولیس نے بندوقوں سے باڑھ ماری۔ گولیاں چیختی ہوئی چلیں۔ لالی دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

فائرنگ مسلسل ہوتی رہی۔ گولیاں لالی کے سر پر سے' سینے پر سے' ٹانگوں پر سے سنساتی ہوئی گزرتی رہیں۔ وہ دم سادھے پڑا رہا۔ موت اس کے چاروں طرف منڈلاتی رہی۔ وہ رک رک کر سانس لیتا رہا۔

ساہو اور فقیرا نے جوابی فائرنگ نہیں کی۔ کچھ دیر بعد پولیس نے گولی چلانا بند کر دی۔ لیکن برساتی نالے کے آس پاس فائرنگ پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ لالی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کوئی گولی اس کے جسم کے کسی حصے میں لگی بھی ہے یا نہیں۔ اسے صرف اس قدر ہوش تھا کہ وہ زندہ ہے۔ لالی کی سمجھ میں یہ بات بھی نہ آئی کہ ساہو نے اسے تنہا آگے کیوں بڑھایا اور اسے پولیس کی گولیوں کی بوچھاڑ میں بالکل سامنے کیوں کر دیا؟ اپنے منصوبے کے مطابق نہ اس نے جوابی فائرنگ کی نہ ہی پولیس کا گھیرا توڑنے کی کوشش کی۔ لالی ذرا دیر دم سادھے پڑا رہا پھر آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا درختوں کی جانب بڑھنے لگا۔ آخر وہ درختوں تلے اندھیرے میں آ گیا۔ پولیس نے پھر فائرنگ شروع کر دی۔

مگر اب لالی فائرنگ کی زد سے باہر تھا۔ ساہو اور فقیرے نے اس بار بھی پولیس کے جواب میں

گولی نہیں چلائی۔

لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تیزی سے ایک طرف بھاگا۔ وہ فائرنگ کی زد سے زیادہ سے زیادہ دور چلا جانا چاہتا تھا۔ کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد وہ ٹھہر گیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ گٹھری ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبی ہے۔ پولیس رک رک کر فائرنگ کرتی رہی۔ لالی نے اپنے بہت قریب چاپ سنی۔ ساتھ ہی دھیمے لہجے میں باتوں کی آوازیں بھی ابھریں۔

"لالی مارا گیا۔" یہ فقیرے کی آواز تھی۔

فقیرے کے ساتھ ساہو تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اسے تو مارا ہی جانا تھا۔ آگے بھیجا اسی لیے تھا. دیکھ، پولیس کیسے چکر میں آگئی۔"

"پولیس ابھی تک اسی طرف گولی چلا رہی ہے۔"

"چلانے دے۔ چلانے دے۔ اپنے لیے ادھر کا رستہ صاف ہو گیا۔ چلا آ میرے پیچھے پیچھے۔"

دونوں دبے دبے قدموں آگے بڑھ گئے۔ لالی سانس روکے کھڑا رہا۔ ان کی آہٹ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔ پھر ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس طرف بھی گولیاں گونجیں جدھر ساہو اور فقیرا گئے تھے۔

☆

لالی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کدھر جائے؟ ہر سمت گولیاں تڑاتڑ چیخ رہی تھیں۔ مگر ٹھہرنا بھی خطرناک تھا۔ اسے جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہئے تھا۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا ایک طرف بڑھا اور کچھ دور تک بڑھتا گیا۔ وہ اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ اسی وقت دور سے ٹارچ کی روشنی ابھری۔ لالی نے دیکھا کہ پھیرو خون میں لت پت پڑا ہے۔ وہ مر چکا تھا۔ ٹارچ بجھ گئی، مگر اس کے ساتھ ہی گولیوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ لالی جھٹ زمین پر گر پڑا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے برابر سے گزرتی رہیں۔ قریب ہی پھیرو کی لاش پڑی تھی۔

چاند نکل آیا تھا۔ مگر آسمان پر غبار اس قدر گہرا تھا کہ چاندنی بہت پھیکی اور دھندلی پڑ گئی تھی۔ درختوں کے نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ لالی زیادہ دیر اس جگہ نہیں ٹھہرا۔ جیسے ہی فائرنگ ذرا تھمی، وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا تیزی سے بھاگا اور دور تک بھاگتا چلا گیا۔

وہ درختوں کے نیچے سے نکل کر باہر آ گیا۔ مگر یہ دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا کہ دھندلی چاندنی میں ایک کانسٹیبل عین اس کے سامنے کھڑا ہے۔

کانسٹیبل بھی اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ لالی سراسیمہ ہو کر ٹھٹکا۔ ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو تیزی سے دوڑتا ہوا سامنے کی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں کچھ دور آگے گیا تھا کہ اس نے سنا، کانسٹیبل کہہ رہا تھا۔

"نہیں جی! وہ لالی ہی تھا۔ کانسٹیبل واحد نے جو کپڑے بتائے تھے، وہی پہنے ہوئے تھا۔ میرے سامنے بالکل اس طرح کھڑا تھا جیسے تم کھڑے ہو۔"

"تم نے جھپٹ کر دبوچ نہ لیا؟"

"موقع ہی نہیں دیا اس نے۔ چھلاوے کی طرح نکل گیا، پر جائے گا کہاں؟"

لالی ان کی باتیں سنتا، جھاڑیوں میں دبکتا، گھبرایا ہوا اندھیرے میں تیزی سے چلتا رہا۔ پچاس ساٹھ گز فاصلہ اس نے جلدی جلدی طے کر لیا۔

اس کے آس پاس گہری خاموشی تھی۔ لیکن برساتی نالے کی طرف ابھی تک رک رک کر گولیاں چل رہی تھیں۔ چلتے چلتے وہ ایک طرف مڑا تو قریب سے بھاری بھاری بوٹوں کی آہٹ ابھری۔ ساتھ ہی آواز بھی آئی۔

"محمد خاں! ادھر اندھیرے میں جھاڑیوں تلے کوئی سفید چیز ہلتی نظر آتی ہے۔"

لالی نے جھٹ راستہ بدل دیا اور تیزی سے بھاگا۔ مگر ایک جھاڑی سے اس کی دھوتی ایسی الجھی کہ وہ ننگا ہو گیا اور وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہولے ہولے دھوتی جھاڑی سے علیحدہ کی۔ ڈب سے نوٹ نکل کر گر گئے تھے انھیں ٹٹول ٹٹول کر اٹھا لیا اور دھوتی کے پلو میں باندھ لیا۔ مگر دھوتی دوبارہ نہیں باندھی بلکہ جلدی جلدی قمیص بھی اتار دی۔

قمیص اور دھوتی سفید تھی۔ ان کا اجلا پن اندھیرے میں دور سے جھلکتا تھا۔ لالی نے جوتے بھی اتار دیئے۔ جوتوں سے آہٹ پیدا ہوتی تھی۔ اس نے دھوتی کے ساتھ قمیص اور جوتے بھی گٹھری میں باندھ لیے۔ اب وہ مادر زاد برہنہ تھا۔

کچھ دیر وہ جھاڑی کے نیچے دبکا بیٹھا رہا۔ جب قدموں کی آہٹ دور ہو گئی تو اس نے گٹھری بغل میں دبائی اور جھاڑیوں کے درمیان چھپتا چھپاتا آگے بڑھا۔ اسے پولیس والوں کی چاپ برابر سنائی دے رہی تھی۔ کبھی چاپ قریب آ جاتی، کبھی دور ہو جاتی۔

کئی منٹ تک وہ اسی طرح جھاڑیوں کی اوٹ میں چلتا رہا۔ بار بار راستے بدلتا رہا۔ کہیں قدموں

کی رفتار تیز کر دیتا، کہیں جھاڑی کی آڑ لے کر دبک جاتا۔ جھاڑیوں میں کانٹوں کی بہتات تھی۔

لالی کے برہنہ جسم پر کانٹوں سے جگہ جگہ خراشیں پڑ گئیں۔ خون رسنے لگا۔ مگر اس برہنگی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ اندھیرے میں گھل مل گیا۔ پولیس کے لیے اس کا سراغ لگانا مشکل ہو گیا۔

چلتے چلتے وہ ایسی جگہ آ گیا جہاں جنگل ختم ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی جھاڑیوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ سامنے چٹیل میدان تھا اور اس سے آگے کسی قدر بلندی پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ درختوں کی آڑ سے زرد زرد روشنی کا ایک دھبا نظر آ رہا تھا۔

لالی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور سرپٹ بھاگا۔ وہ میدان سے گزرتا ہوا بلندی کی جانب لپکا۔ دور سے کوئی چیخا۔ "ٹھیر جا لالی!" مگر لالی ٹھہرا نہیں۔ دوبارہ اور زیادہ زور سے چیخنے کی آواز ابھری۔

"ٹھہر جا، نہیں تو گولی چلا دوں گا۔"

لالی پھر بھی نہ ٹھہرا۔

گولی گہرے سناٹے میں زور سے گونجی اور لالی کے سر پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ لالی نے بدحواس ہو کر اپنی رفتار اور تیز کر دی۔

۶

لالی ایک گھنے درخت پر بندر کی طرح پھرتی سے چڑھ گیا۔ کچھ دیر شاخوں کی اوٹ میں دبکا ہوا بیٹھا رہا اور چوکنا نظروں سے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ جب درخت کے آس پاس کوئی نظر نہ آیا تو وہ ایک مضبوط ڈال سے چمٹ کر آہستہ آہستہ آگے کھسکنے لگا۔

اس نے ڈال کو دونوں ہاتھوں سے تھاما۔ ٹانگیں نیچے لٹکائیں۔ بنگلے کی چار دیواری پر پیر ٹکائے اور نہایت ہوشیاری سے نیچے اتر گیا۔ بنگلہ سامنے ہی تھا۔ بنگلے کی ایک کھڑکی سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ وہ پودوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا، دبے دبے قدموں چلتا، سیدھا اس کھڑکی پر پہنچا، جس سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اس نے شیشے سے قریب ہو کر اندر جھانکا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

کھڑکی کا ایک شیشہ چٹخا ہوا تھا۔ لالی نے انگلی پھنسا کر شیشہ نصف سے زیادہ توڑ دیا۔ مگر ٹوٹے ہوئے شیشے کی تیز دھار سے انگلی کٹ گئی۔ خون بہنے لگا۔ اس نے انگلی ہونٹوں میں دبا کر خون چوسا اور گردن جھکا کر زمین پر تھوک دیا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کے اندر جلدی سے ہاتھ ڈالا اور چٹخنی کھول دی۔ آہستہ سے کھڑکی کا ایک پٹ ہٹا کر راستہ بنایا۔ اوپر چڑھا اور اندر کود گیا۔

سامنے میز پر لیمپ رکھا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں ہر چیز نظر آ رہی تھی۔ لالی سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چار دیواری کے اس پار آہٹ ابھر رہی تھی۔ ساتھ ہی زور زور سے سیٹیاں بھی بجنے لگیں۔ لالی اور سراسیمہ ہو گیا۔

اس نے بنگلے کے بیرونی پھاٹک کے کھلنے کی آواز سنی۔ وہ بدحواس ہو کر آگے بڑھا اور ایک کرسی

سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ کرسی الٹ گئی۔ کرسی الٹنے سے آواز پیدا ہوئی۔ ساتھ ہی سامنے کا دروازہ کھلا۔ ایک شخص دھاری دار گاؤن پہنے دروازے سے نمودار ہوا۔ وہ گوار چٹا دہرے بدن کا آدمی تھا۔ چہرے پر بھوری بھوری پروقار مونچھیں تھیں۔ عمر چوالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول دبا تھا۔ دوسرا ہاتھ گاؤن کی جیب میں تھا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر لالی کو دیکھا۔ لالی اس کے سامنے بالکل ننگ دھڑنگ کھڑا تھا۔ سر کے بال گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ جسم پر بھی گرد ہی گرد تھی۔ جگہ جگہ آڑی ترچھی خراشیں بھی تھیں۔ ہونٹوں کے نیچے تازہ تازہ خون کا دھبا تھا جو تھوڑی سے نیچے تک چلا گیا تھا۔ وہ شخص لالی کی یہ ہیئت دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کون ہے تو؟ اندر کیسے آیا؟"

ابھی اس نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ بنگلے کے باہر زور زور سے بولنے کی ملی جلی آوازیں ابھریں۔ لالی دہشت زدہ ہو کر بولا۔ "وہ' وہ پولیس۔" گھبراہٹ میں وہ پوری بات نہ کہہ سکا۔ خوف اور بھاگ دوڑ سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔

"کیا پولیس تیرا پیچھا کر رہی ہے؟"

لالی نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ اس شخص نے دریافت کیا۔ "پولیس تیرا پیچھا کیوں کر رہی ہے؟"

لالی گڑگڑانے لگا۔ "مجھے بچا لیجئے۔ میں سب کچھ بتا دوں گا۔" ننگا دھڑنگا' خاک سے اٹا ہوا لالی دھندلی روشنی میں بڑا مسکین نظر آ رہا تھا۔ اس شخص نے اسے مسکرا کر دیکھا اور تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" اس نے ذرا تامل کیا۔ "یہیں کھڑا رہ۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ جس کمرے سے نکلا تھا پھر اس میں چلا گیا۔

لالی ایک گوشے میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا' کمرے میں ہر طرف اونچی اونچی الماریاں ہیں۔ الماریوں کے شیشوں کے پیچھے ترتیب سے رکھی ہوئی طرح طرح کی کتابیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف بڑی سی جھلکتی ہوئی میز تھی۔ میز پر لیمپ روشن تھا۔ اس پر دودھیا سرپوش تھا جس نے روشنی دھیمی کر دی تھی۔ میز پر کاغذات اور چند موٹی موٹی کتابیں رکھی تھیں۔

بنگلے کے پھاٹک پر آوازیں بند ہو گئیں تھیں۔ لالی ہنوز خاموش کھڑا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ لالی نے اس کھڑکی کی جانب دیکھا جسے پھاند کر وہ کمرے کے اندر آیا تھا۔ کھڑکی کا ایک پٹ ابھی تک کھلا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی جانب بڑھا۔ اس اثناء میں بنگلے کے صدر دروازے کے کھلنے اور بند

ہونے کی آواز سناٹے میں ابھری۔ لالی ٹھہر گیا۔ وہ دم بخود اور سہما ہوا تھا۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور وہ شخص کمرے میں دوبارہ داخل ہوا۔ اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا' غصے سے ڈانٹا۔ "کپڑے تو پہن لے۔"

لالی نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ گٹھری کھولی اور دھوتی نکال کر کمر کے گرد باندھنے لگا۔ اس شخص نے پوچھا۔ "کیا تو جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے۔"

"ہاں جی۔" لالی نے آہستہ سے گردن ہلائی۔

"میں نے تجھے پولیس سے بچا لیا ہے۔ اس لیے کہ میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا۔" اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "میں میاں حیات محمد خان وٹو ہوں۔ تو میری پناہ میں ہے۔"

لالی نے نظریں نیچی کر کے آہستہ سے کہا۔ "آپ نے جی مجھ پر بہت احسان کیا۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "بات یہ ہے جی....."

حیات محمد نے اس کی بات نہیں سنی۔ رعب اور دبدبے سے بولا۔ "تجھ سے صبح بات ہو گی۔" وہ چند لمحے خاموش کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے انگلی کے اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ "میرے ساتھ آ۔" وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

کمرے کا دروازہ کھول کر دونوں راہداری میں داخل ہوئے اور کچھ دور جا کر ایک دروازے کے سامنے ٹھہر گئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ حیات محمد خاں وٹو نے لالی سے کہا۔ "اندر جا کر سو جا۔ دروازہ بند کر لینا۔ اب تو بالکل محفوظ ہے۔"

لالی اندر چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ یہ مختصر سی کوٹھری تھی۔ ایک دیوار کی بلندی پر روشن دان تھا۔ اس پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں جڑی ہوئی تھیں۔ روشن دان سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ لالی دروازے کے پاس خاموش کھڑا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کی نظریں کوٹھری کے اندھیرے سے مانوس ہو گئیں۔ اس نے دیکھا' دیوار کے ساتھ اونچا چبوترہ ہے۔ لالی نے اس پر ہاتھ پھیرا۔ چبوترا صاف ستھرا تھا۔ وہ خاموشی سے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اس نے گٹھری سر کے نیچے رکھی اور ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند نہیں آئی۔

وہ چپ لیٹا رہا۔ گھنٹے سوا گھنٹے بعد وہ چبوترے سے نیچے اترا' گٹھری بغل میں دبائی' ہولے ہولے چلتا ہوا دروازے پر پہنچا اور کان لگا کر سن گن لی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ وہ چند لمحے دروازے کے قریب بت بنا کھڑا رہا۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کے دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ باہر سے

بند تھا۔ لالی نے پریشان ہو کر دروازہ دھیرے سے ہلایا۔ باہر سے کسی کی کھنکار ابھری۔ لالی ایسا دہشت زدہ ہوا کہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ گہری سانس بھری اور دل گرفتہ ہو کر دروازے پر سر ٹکا دیا۔

صبح کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ لالی نے دھڑکتے دل اور سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا' دروازے کے بیچوں بیچ اونچے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی کمر سے ریوالور لگائے کھڑا ہے۔ تمتمایا ہوا گہرا سانولا چہرہ' سر پر گھنے بال' ڈاڑھی مونچھ صاف' آنکھیں موٹی موٹی اور سرخی مائل۔ اپنے ڈیل ڈول اور وضع قطع سے وہ خاصا ہیبت ناک لگتا تھا۔

اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ گردن کو ذرا سا خم دے کر باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لالی باہر آ گیا۔ وہ شخص آگے بڑھا' لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں ایک تنگ غلام گردش سے گزر کر بنگلے کے باہر آ گئے۔

لالی نے چلتے چلتے اسے ٹوکا۔ "مجھے کہاں لیے جا رہا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ دونوں ایک پر فضا باغ کے کنارے کنارے پگ ڈنڈی پر چل رہے تھے۔ پگ ڈنڈی خاصی کشادہ تھی۔ اس پر سرخ بجری بچھی تھی جو جوتوں کی رگڑ سے ہلکی ہلکی آہٹ پیدا کر رہی تھی۔ سورج چڑھ کر درختوں کے اوپر آ گیا تھا۔ ہر طرف سنہری دھوپ پھیلی تھی۔ مارچ کا تیسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ دھوپ میں ہلکی ہلکی تمازت تھی۔ پت جھڑ ختم ہو رہا تھا۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ باغ بہت وسیع تھا۔ جگہ جگہ رنگا رنگ پھولوں کے تختے ہوا سے جھوم رہے تھے۔

باغ میں پھلوں اور میووں کے درخت تھے۔ نرم نرم گھاس کا دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار تھا۔ درمیان سے پتھر کی بنی ہوئی پختہ نہر گزرتی تھی۔ نہر پر دو بڑے بڑے فوارے تھے۔ فواروں سے چھوٹتی ہوئی پانی کی جھالر دھوپ میں جھلملا رہی تھی۔ باغ کے اس پار درختوں کی اوٹ سے بنگلے کی اونچی چار دیواری نظر آتی تھی۔

پگ ڈنڈی سے ذرا ہٹ کر ایک بوڑھا شخص گردن جھکائے' تر نگلی سے خشک پتے اکٹھا کرنے میں مصروف تھا۔ دونوں اس کے قریب پہنچے تو اس نے مڑ کر دیکھا اور تر نگلی کا لمبا دستہ سنبھال کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور مسکرا کر آہستہ سے کہا۔

"کتھے چلا دھیور؟"

دھیور نے کوئی جواب نہیں دیا' نہ اس کی جانب دیکھا۔ وہ لالی کے آگے آگے مرغ کی طرح

گردن اونچی کیے چلتا رہا۔ مگر وہ جتنا قد آور جوان تھا' چال سے اتنا ہی ڈھیلا ڈھالا لگتا تھا۔ چلتا تو کمر کو اس طرح ہلکا سا خم دیتا کہ اس کے بھاری بھاری کولھے ہولے ہولے لچکتے۔ کچھ دور جا کر دھیور ٹھہر گیا اور باغ کے اس گوشے کی جانب دیکھنے لگا جہاں چنبیلی کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے کنج کے نیچے چند کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ کرسیاں خالی تھیں۔ میز پر پانی سے بھرا ہوا شیشے کا قرابہ اور دو گلاس رکھے تھے۔ قریب ہی ایش ٹرے بھی موجود تھی۔ میز دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے وہاں سے کوئی اٹھ کر گیا ہے۔ دھیور ذرا دیر رک کر واپس مڑا۔ اب وہ لالی کے ہم راہ بنگلے کے صدر دروازے کی جانب جا رہا تھا۔ دروازے کے سامنے اونچے' اونچے ستونوں کا پورچ تھا۔ پورچ کے نیچے ایک لمبی چوڑی سیاہ بیوک کھڑی تھی۔ ڈرائیور جھاڑن سے کار کو جھاڑ پونچھ رہا تھا۔

بنگلہ قدیم طرز کا تھا۔ مگر خوب بڑا اور نہایت شاندار تھا۔ جگہ جگہ عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی تھیں اور کھپریلوں کی خمیدہ چھت پر دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لالی نے بنگلے کی وہ کھڑکی بھی دیکھی جس کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ یہ شیشہ اس نے پچھلی رات توڑا تھا۔ اس کی اس انگلی میں جو شیشہ توڑنے سے زخمی ہو گئی تھی' ابھی تک کسک تھی۔ دھیور بنگلے کی سمت بڑھتے بڑھتے لمحے بھر کو ٹھٹکا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے راستہ بدل دیا۔

دونوں آگے بڑھے۔ سامنے چار دیواری کا اونچا چوبی پھاٹک تھا۔ اب وہ اس راستے پر چل رہے تھے' جو پھاٹک سے بنگلے کے پورچ تک جاتا تھا۔ راستہ سرخ اینٹوں سے بنا تھا۔ دونوں جانب سایہ دار درخت تھے۔ پھاٹک سے کچھ فاصلے پر پختہ سائبان تھا۔ سائبان کے نیچے بجلی پیدا کرنے کا جنریٹر لگا تھا۔ اس کا انجن' شور کرتا ہوا چل رہا تھا۔ قریب ہی باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے کا کشادہ چبوترا فرش سے لگ بھگ چار فٹ اونچا تھا۔ چبوترے کے بیچوں بیچ تنور تھا۔ دو تندورچے اس کے نزدیک بیٹھے جھپا جھپ روٹیاں لگا رہے تھے۔ تنور سے ذرا ہٹ کر مٹی کا بڑا سا چولہا تھا' جس پر دیگچا چڑھا تھا۔ دیگچے کے نیچے لکڑیاں جل رہی تھیں۔ باورچی خانے سے متصل نوکروں اور کمیوں کے کچے مکانات تھے۔ مکانات کا سلسلہ خاصی دور تک چلا گیا تھا۔ لیکن ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ نوکر چاکر ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ مگر وہ چپ چاپ چلتے تھے۔ کوئی اونچی آواز سے نہیں بولتا تھا۔ جب لالی اور دھیور پھاٹک سے کچھ فاصلے پر رہ گئے تو لالی نے بے چین ہو کر ایک بار پھر دریافت کیا۔

"یار' یہ تو بتا' مجھے کہاں لیے جا رہا ہے؟"

اس دفعہ بھی دھیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پلٹ کر قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا اور خاموشی سے پھاٹک کی جانب بڑھنے لگا۔ پھاٹک کھلا تھا اور اس کے قریب دو مسلح پہریدار فرش پر بیٹھے گپ گزار رہے تھے۔

انھوں نے نگاہیں اٹھا کر دھیور اور لالی کو دیکھا، لیکن کوئی بات نہیں کی۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پھاٹک سے گزر کر باہر آگئے۔ پھاٹک کے آگے کنکر کی بنی ہوئی نیم پختہ سڑک تھی جو شیشم اور بکائین کے درختوں کے سائے میں دور تک چلی گئی تھی۔

سڑک کے اس پار تاحد نظر کھیتوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ کھیتوں کے ایک طرف آم کے باغ تھے۔ درختوں سے بور جھڑ چکا تھا۔ کہیں کہیں شاخوں میں کیریاں بھی جھول رہی تھیں۔ دونوں نے سڑک عبور کی۔ دوسری جانب پہنچے اور کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کھیتوں میں گندم کے پودے لہلہا رہے تھے۔ پودوں کی لمبی لمبی پتیاں اور ان کے اوپر جھومتی ہوئی گندم کی بالیاں زرد پڑ گئی تھیں۔ دھیور اور لالی آگے بڑھتے گئے۔ دھیور آگے تھا اور لالی پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ گندم کے پودوں کو دیکھتا رہا اور پتیوں اور بالیوں کا بدلتا ہوا رنگ دیکھ کر سوچتا رہا کہ ربیع کی فصل ابھی پک کر تیار نہیں ہوئی۔ اس کی کٹائی میں لگ بھگ مہینہ بھر باقی ہے۔ مگر فصل بہت اچھی تھی۔ بالیاں گندم کے دانوں سے لدی ہوئی تھیں۔

گندم کے کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو درختوں کے نیچے ایک ٹریکٹر نظر آیا جس کا بونٹ کھلا ہوا تھا۔ ایک ادھیڑ شخص، جو وضع قطع سے مکینک نظر آتا تھا، ٹریکٹر کے انجن پر جھکا ہوا کسی پرزے کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ٹریکٹر کے عقب میں کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر ٹیوب ویل تھا۔ ٹیوب ویل سے نکلتی ہوئی پانی کی موٹی دھار، آبشار کی مانند اوپر سے نیچے بم بی میں گر رہی تھی۔ بم بی میں بھرا ہوا پانی آڑ اور نالیوں کے ذریعے سرسوں اور چنے کے کھیتوں میں پہنچ رہا تھا۔ سرسوں کے بسنتی پھول ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔

دھیور کچھ اور آگے بڑھا۔ سامنے دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار تھا۔ سبزہ زار کے ارد گرد نالی، شرینہ اور سرس کے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ دھیور چلتے چلتے رک گیا اور گردن اٹھا کر تجسس انگیز نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لالی بھی اس کے قریب ہی کھڑا تھا اور بالکل خاموش تھا۔ اس نے دھیور سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔

ذرا ہی دیر بعد گھوڑے کے دوڑنے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں دور سے سنائی دیں۔ دونوں

اس سمت دیکھنے لگے، جدھر سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ دیکھتے، دیکھتے درختوں کے ایک جھنڈ سے میاں حیات محمد خاں وٹو نمودار ہوا۔ وہ اس وقت گھڑ سواری کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ میں چمڑے کا چابک دبا تھا۔

وہ پیروں سے ایڑ دیتا ہوا گھوڑے کو دوڑا رہا تھا۔ عقب میں شکاری کتوں کا غول تھا جو زور زور سے بھونک رہے تھے اور گھوڑے کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ حیات محمد نے نہ دھیور اور لالی کو دیکھا اور نہ ہی ان کی طرف آیا۔ بائیں موڑیں اور اس راستے پر گھوڑا دوڑانے لگا جو گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ جب میاں حیات محمد وٹو نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دھیور واپس مڑا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

دونوں بنگلے کے پھاٹک پر پہنچے۔ دھیور نے ہاتھ کے اشاروں سے منہ پھاڑ کر طرح طرح کی آوازوں سے پہریداروں سے بات کی۔ لالی کو پہلی بار اس حقیقت کا سراغ ملا کہ دھیور بالکل گونگا ہے۔ پھاٹک پر تعینات ایک پہریدار نے اس کے اشاروں کو سمجھتے ہوئے بنگلے کے صدر دروازے کی جانب ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

"میاں صاحب اندر چلے گئے۔"

دھیور خاموشی سے بنگلے کی جانب چل دیا۔ وہ لالی کے ہم راہ پورچ میں پہنچا۔ کار ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ ڈرائیور، دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر خاموش بیٹھا تھا۔ دھیور کو دیکھ کر وہ ایک طرف سرک گیا۔ مگر اس نے دھیور یا لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ دھیور اس کے قریب سے گزرتا ہوا آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا اور لالی کے ہم راہ اندر داخل ہو گیا۔ یہ خاصا طویل لاؤنج تھا۔ جگہ جگہ کیکٹس اور پام کے پودے گملوں میں لگے تھے۔ گملوں کے درمیان دو گرے ہاؤنڈ کتے چمڑے کے موٹے موٹے گدوں پر بیٹھے لمبی لمبی زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے۔ انھوں نے قدموں کی آہٹ سن کر تیز نظروں سے دھیور اور لالی کو دیکھا۔ لیکن خاموش بیٹھے رہے۔

لاؤنج سے گزر کر دونوں وکٹورین طرز کے کشادہ ہال میں داخل ہوئے جس میں دبیز قالین کا فرش تھا۔ ہال کی چھت، لاؤنج سے خاصی اونچی تھی۔ چھت کے بیچوں بیچ بہت بڑا بلوریں جھاڑ لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر چیتے اور تیندوے کے سروں اور کھالوں کے علاوہ قسم قسم کی تلواریں، خنجر، ڈھالیں، پرانی وضع کی لمبی لمبی بندوقیں اور قرابین آویزاں تھیں۔ دیواروں پر چند بڑی بڑی روغنی تصاویر بھی لگی تھیں۔

ایک تصویر میں جو سب سے بڑی تھی اور نہایت نمایاں طور پر آویزاں تھی، حیات محمد کھڑی

مونچھوں والے ایک قد آور انگریز سے مصافحہ کر رہا تھا۔ مصافحہ کرتے ہوئے وہ اس قدر باادب باملاحظہ بنا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ ہال میں مخمل اور زربفت کے صوفے اور دیوان قرینے سے رکھے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر نرم اور باریک ریشم کے پردے لہرا رہے تھے۔

دو نوجوان خادمائیں جھاڑن سے کھڑکیوں کے شیشے اور تصاویر جھاڑ پونچھ کر چمکا رہی تھیں۔ ایک شوخ اور عشوہ طراز خادمہ نے اپنی چھینٹ کی گھگریل ایک طرف سے پکڑ کر گھٹنے تک اوپر اٹھائی اور برہنہ پنڈلی کھجاتے ہوئے الھڑپن سے مسکرا کر دھیو رکو دیکھا۔ دھیو رنے غصے سے اس پر نظر ڈالی اور نفرت سے منہ بگاڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ہال عبور کر کے لالی کے ساتھ ایک طویل غلام گردش میں داخل ہوا۔

غلام گردش میں بھی سرخ قالین کا فرش تھا۔ دیواروں پر دل فریب مناظر کی تصاویر آویزاں تھیں۔ دیوار گیریوں سے پھوٹتی ہوئی ہلکی ہلکی نیل گوں روشنی میں ہر چیز گویا خواب کے سایوں میں تیرتی نظر آتی تھی۔

غلام گردش میں کئی دروازے کھلتے تھے۔ ان پر ریشمی پردے پڑے تھے۔ دھیو ر ایک بند دروازے کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اندر جھانکا' لالی کی جانب متوجہ ہوا اور کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

لالی اس قدر گم صم تھا جیسے پگھل کر بنگلے کی طلسمی فضا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ اندر جاتے ہوئے اس کے قدم نہ اٹھتے تھے۔ دھیو رنے اپنی لال لال آنکھوں سے اسے گھورا اور ہولے سے دھکا دیا۔ لالی جھٹ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں روشنی بہت دھیمی تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر دبیز پردے جھول رہے تھے۔ کمرے میں تمباکو کی تیز بو بسی ہوئی تھی۔ لالی ہکا بکا دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے دروازہ بند ہونے کی آہٹ سنی۔ پلٹ کر دیکھا' دھیو ر وہاں موجود نہیں تھا۔ اسی وقت کمرے کی پراسرار خاموشی میں بھاری بھرکم آواز ابھری۔

"ادھر آ۔"

لالی نے چونک کر دیکھا' کمرے کے ایک گوشے میں میاں حیات محمد خاں وٹو چوڑے چکلے صوفے پر بیٹھا ہے۔ لالی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا۔ حیات نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبایا۔ قریب رکھا ہوا پیڈسٹل لیمپ روشن ہو گیا۔ حیات محمد خاں خاموش بیٹھا پائپ پر ہلکے ہلکے کش

لگا رہا تھا اور لالی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے برابر والے صوفے پر جرمن شیفرڈ نسل کا موٹا تازہ السیشن لیٹا تھا۔ کتے کا چہرہ نہایت خوفناک تھا۔ رنگ گہرا سیاہ تھا۔ صرف ٹانگوں اور منہ کا کچھ حصہ بھورا تھا۔

وہ لالی کو قریب پا کر غرانے لگا۔ لالی نے اس پر نظر ڈالی تو دہشت زدہ ہو کر سہم گیا۔ کتا غرا کر اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس پر جھپٹنا ہی چاہتا ہو۔ وہ گردن اٹھا کر زور سے بھونکا۔ اس کی آواز اس قدر ڈراونی تھی کہ پورا کمرہ گونج اٹھا۔ لالی لرز کر رہ گیا۔

حیات محمد نے گردن موڑ کر کتے کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" وہ اس کی پیٹھ ایک ہاتھ سے آہستہ آہستہ تھپکنے لگا۔ کتے نے گردن نیچی کر لی اور غرانا بند کر دیا۔ حیات محمد چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے پائپ کی راکھ میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں جھاڑی اور لالی سے مخاطب ہوا۔

"میں نے تجھے سٹور میں بند کر دیا تھا۔ پتہ ہے میں نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "مجھے نہیں علوم جی۔"

"مجھے شبہ تھا' تو فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔" حیات محمد نے گردن کو ذرا سا خم دے کر نہایت بارعب انداز میں دیکھا۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "میں نہیں چاہتا کہ تو پکڑا جائے اور میری بدنامی کا سبب بنے۔"

لالی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کی بات کا کیا جواب دے۔ وہ مجرم کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات نے کہا۔ "فی الحال یہاں سے جانے کا خیال چھوڑ دے۔ میں تیرے ہی بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ پورے علاقے میں پولیس پھیلی ہے۔ کل رات ڈاکوؤں سے پولیس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوئی۔ ایک ڈاکو مارا گیا۔ دو پولیس والے زخمی ہوئے۔ پولیس نے پورے علاقے کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔

"کیا تو بھی ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے صاف' صاف بتا دے۔"

"میں تو جی انھیں بالکل نہیں جانتا۔ مجھے تو انھوں نے زبردستی پکڑ رکھا تھا۔ رات' پولیس کے ساتھ ان کی گولی چلی تو میں ان کے چنگل سے کسی نہ کسی طرح نکل بھاگا؟"

"سچ کہہ رہا ہے تو؟" میاں حیات محمد وٹو نے دریافت کیا۔

"میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا جی۔" لالی نے عاجزی سے کہا۔ "آپ نے ہی مجھے

گرفتاری سے بچایا ہے۔"

"بندوق شندوق چلانی تو تجھے آتی ہی ہوگی؟"

"آتی ہے جی' بالکل آتی ہے۔" لالی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "مجھے تو کاربین اور رمش بھی چلانی آتی ہے۔ نشانہ بھی میرا اچھا ہے۔"

حیات محمد نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ "اب تو جا۔ رات کو بات ہوگی۔ دھیور تیرے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا بندوبست کردے گا۔ دھیور گونگا ہے' بول نہیں سکتا۔ مگر سن سکتا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو اسے بتا دینا۔ یہاں تجھے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اب تو جا سکتا ہے۔"

لالی خاموشی سے باہر چلا گیا۔

☆

برآمدہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے سے راہداری گزرتی تھی۔ برآمدے میں دروازے کھلتے تھے۔ دھیور نے ایک بند دروازہ کھولا۔ یہ کوٹھری نما مختصر کمرہ تھا۔ اس میں چارپائی تھی۔ چارپائی پر معمولی بستر تھا۔ کمرے میں کھڑکی بھی تھی۔ اس میں لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔ کھڑکی کے عین سامنے ملبہ تھا۔ کوڑے کرکٹ کے اس ڈھیر کے ارد گرد جھاڑیاں اور گھنے درخت تھے۔ کمرے سے ملحق اتنا ہی بڑا ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں دھیور کا قیام تھا۔ دونوں کمرے بنگلے کے عقبی حصے میں واقع تھے اور ایک بڑے کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کرکے بنائے گئے تھے۔

دروازہ کھول کر دھیور نے لالی کی طرف دیکھا اور کمرے کے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ لالی نے کمرے میں جا کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دھیور دروازے پر خاموش کھڑا تھا۔ لالی نے اپنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیور سے کہا۔ "یار' کوئی نائی شائی ہوگا؟ میں نے داڑھی بنوانی ہے۔ بہت بڑھ گئی ہے۔" دھیور نے اس کی بات سن کر آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور ایک طرف چلا گیا۔ لالی بستر پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد دھیور واپس آیا۔ اس کے ہمراہ نائی بھی تھا۔ وہ دبلا پتلا اور ادھیڑ تھا۔ اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ برآمدے میں دروازے کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔ لالی کمرے سے باہر آیا اور نائی کے سامنے فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "داڑھی بنوانی ہے۔" نائی نے کوئی جواب نہ دیا۔ استرے سے اس کی ڈاڑھی مونڈنے لگا۔

دھیور برآمدے میں رکھے ہوئے ایک چوڑے اسٹول پر بیٹھا دونوں کو دیکھتا رہا۔ ڈاڑھی

مونڈنے کے بعد نائی نے اپنی کسبت سے آئینہ نکالا اور لالی کی طرف بڑھا دیا۔ لالی نے آئینہ ہاتھ میں لے کر اپنا چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھا۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے معاً اسے اپنا حلیہ بدلنے کا خیال آیا۔ اس نے نائی سے کہا۔ "یار' مونچھیں بھی صاف کردے۔" اس نے گردن موڑ کر دھیور کی جانب دیکھا' زیر لب مسکرایا۔ "مجھے بھی دھیور کی طرح صفاچٹ بنا دے۔" اس کی بات سن کر دھیور نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

نائی بھی نہیں بولا۔ اس نے استرے سے لالی کی مونچھیں صاف کردیں۔ حجامت بنا کر نائی نے اپنا سامان کسبت میں رکھا اور لالی سے کچھ کہے بغیر چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔ لالی نے رخساروں پر ہاتھ پھیرا۔ اور دھیور کو مخاطب کرتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ "لے یار تیری محبت میں' میں نے بھی اپنی مونچھیں صاف کرادیں۔ کیا یاد کرے گا' کوئی لالی ملا تھا۔ اب یہ بتا' نہانے دھونے کا کیا بنتا ہوگا؟ میں نہانا چاہتا ہوں۔ بھوک بھی زوروں کی لگی ہے۔ توں نے سویرے سے روٹی بھی نہیں کھلائی۔"

دھیور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ برآمدے کے برابر ہی دروازہ تھا۔ دھیور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ یہ غسل خانہ تھا۔ سامنے دیوار پر آئینہ لگا تھا۔ اس کے برابر ہی لکڑی کے تختے پر کنگھا' صابن اور سر میں ڈالنے کے لیے شیشی میں تیل بھی موجود تھا۔ غسل خانے میں ایک طرف نلکا تھا اور اس کے نیچے فٹ بھر اونچا چبوترہ تھا۔ لالی نے غسل خانے کا دروازہ بند کیا۔ کپڑے اتارے اور نلکے کے نیچے چبوترے پر بیٹھ کر نہانے لگا۔ وہ صابن مل کر دیر تک نہاتا رہا۔

نہانے سے فارغ ہوا تو اس نے کھونٹی پر لٹکے ہوئے تولیے سے بدن پونچھا۔ کپڑے پہنے۔ سر میں تیل ڈالا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھے سے بال سنوارے اور تر و تازہ ہو کر غسل خانے سے باہر آگیا۔

دھیور برآمدے کے سامنے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ لالی نے اسے دیکھا تو مسکرا کر بولا۔ "یار! میری گٹھڑی تو لا دے۔" اس نے اپنے لباس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "یہ کپڑے تو بہت گندے ہوگئے ہیں۔ گٹھڑی میں میرے کپڑے ہیں۔ انھیں نکال کر پہن لوں گا۔" دھیور نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

لالی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ غسل کرنے کے بعد اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ مگر وہ سویا نہیں۔ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ چند منٹ بعد دھیور واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں گٹھری دبی

تھی۔ اس نے گٹھری لالی کو دی اور اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا۔ لالی نے کپڑے تبدیل نہیں کئے۔ گٹھری لے کر ایک طرف رکھ دی۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ ایک بوڑھی عورت کھانا لے کر آئی۔ اس نے دھیور کی جانب دیکھا اور کمرے میں داخل ہو کر کھانا لالی کے سامنے رکھ دیا۔ لالی نے اسے مخاطب کیا۔ "بے بے! پانی بھر پلادے۔" عورت نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں ایک طرف المونیم کا گلاس رکھا تھا۔ عورت نے گلاس اٹھایا' خاموشی سے غسل خانے میں گئی اور پانی سے بھرا ہوا گلاس سر جھکا کر چپ چاپ سامنے رکھ دیا۔

لالی نے حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ "بے بے کیا تو بھی گونگی ہے؟" بوڑھی عورت نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھہری۔ الٹے قدموں واپس چلی گئی۔

لالی کھانا کھانے لگا۔ کھانے میں تنوری روٹی اور چنے کی دال تھی۔ اس کے ساتھ جنڈ کی پھلیوں کا اچار بھی تھا۔

لالی نے کھانا کھایا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک بنگلے کے پراسرار ماحول کے بارے میں غور کرتا رہا۔ وہاں حیات محمد کے سوا ہر شخص گونگا تھا یا خاموش اور سہما ہوا نظر آتا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ دن ڈھلے وہ نیند سے بیدار ہوا۔ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ دروازے کے سامنے اسٹول خالی تھا۔ دھیور وہاں نہیں تھا۔ لالی چارپائی سے نیچے اترا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا۔ اسی وقت دھیور بھی اپنے کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔

لالی نے اسے دیکھ کر کہا۔ "یار دھیور! چائے شائے بھی ملے گی؟"

دھیور نے حسب معمول آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور راہ داری میں اس طرف چل دیا جدھر سے بوڑھی عورت کھانا لے کر آئی تھی۔ لالی کا جی چاہا کہ وہ بھی دھیور کے پیچھے پیچھے چلا جائے' لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ برآمدے میں خاموش کھڑا چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ مگر ہر طرف دیواریں تھیں اور جھکی ہوئی نیچی چھت تھی۔ ذرا دیر بعد دھیور مٹی کی ٹھوٹھی میں چائے لے کر آگیا۔ چائے گرم تھی اور بہت میٹھی۔ اس میں شکر کے بجائے گڑ ڈالا گیا تھا۔ مگر دودھ کی مقدار زیادہ تھی۔

لالی نے چائے پی کر دھیور سے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی۔ مسکرا کر دریافت کیا۔ "دھیور! تیری گھروالی اور بچے کہاں ہیں؟"

دھیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنا اسٹول پر خاموش بیٹھا رہا۔ مگر لالی خاموش نہ رہا۔ اس نے دھیور کو کریدا۔ "تو نے دیاہ نہیں کیا؟" دھیور نے انکار میں گردن ہلا دی۔ مگر اس کے چہرے سے بیزاری ٹپک رہی تھی۔

لالی نے اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "اپنے تو تین بچے ہیں۔ بہت یاد آتے ہیں۔ مہینوں ہوگئے دیکھے ہوئے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ویسے تو یاد گھروالی بھی آتی ہے اور رات کو تو بہت یاد آتی ہے۔ سونے سے پہلے بہت چاؤ سے اپنی بُکا کو سا پلاتی تھی۔ ایسا گرم اور گاڑھا گاڑھا دودھ کہ پی کر مزا آجاتا تھا۔"

دھیور نے اس کی باتیں سن کر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری اور بالکل سپاٹ تھا۔ لالی کہتا رہا۔ "جاڑے کی راتوں میں گھروالی ساتھ ہو تو یار' کوسا کیا بہار دکھاتا ہے۔ ایسی البیلی ہوتی ہے' تجھے کیا بتاؤں۔" یہ کہہ کر اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ دھیور کے چہرے پر رفتہ رفتہ جھنجلاہٹ بکھرنے لگی۔ اس نے اپنی لال لال آنکھوں سے گھورا۔ لیکن لالی اس کے گھورنے پر ذرا خائف نہ ہوا' بے تکلفی سے آنکھ مار کر بولا۔

"یار! تیرا ایسا ڈھوجوان' گھروالی کے بغیر تیرا گزارہ کیسے......"

دھیور نے اسے آگے کچھ نہ کہنے دیا۔ تیزی سے جھپٹا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا سر اور ٹھوڑی اس زور سے جھٹکا دے کر دبایا کہ لالی کی زبان دانتوں کے درمیان آکر زخمی ہوگئی۔ وہ تلملا کے رہ گیا۔ دیر تک اس کی زبان میں ٹیس اٹھتی رہی۔ تکلیف سے وہ بول بھی نہ سکا۔ بھونچکا کھڑا سوچتا رہا کہ دھیور اچانک اس قدر خفا کیوں ہوگیا؟ اس نے تھوکا تو تھوک کے ساتھ خون بھی آیا۔ لالی چند لمحے غصے سے ہانپتا رہا آخر وہ اس دروازے کی جانب بڑھا' جو غلام گردش میں کھلتا تھا۔ وہ میاں حیات محمد ونو کے پاس جا کر دھیور کے وحشیانہ رویے کے خلاف فریاد کرنا چاہتا تھا۔ مگر دھیور نے اسے آگے جانے نہ دیا۔ لپک کر سامنے آگیا۔ لالی نے آگے بڑھنا چاہا تو دھیور نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس زور سے دھکا دیا کہ لالی سنبھل نہ سکا۔ لڑھکتا ہوا کمرے کی دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا۔

وہ گہری سانسیں بھرتا رہا اور قہر آلود نظروں سے دھیور کو گھورتا رہا۔ کچھ دیر وہ اسی عالم میں پڑا ہانپتا رہا۔ پھر ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا اٹھا اور دھیرے دھیرے دھیور کی طرف بڑھا۔ دھیور خاموش کھڑا رہا۔ لالی نے چاہا کہ جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لے۔ لیکن دھیور نے نہایت پھرتی سے اس کے دونوں ہاتھوں کی کلائیاں پکڑلیں۔ لالی نے

جھٹکا دے کر اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو اسے اندازہ ہوا کہ دھیور کے ہاتھ لوہے کے شکنجوں کی مانند سخت اور مضبوط ہیں۔

ذرا دیر تک دونوں میں زور آزمائی ہوتی رہی۔ لالی نے بہت زور مارا' مگر وہ دھیور کی گرفت سے اپنے ہاتھ نہ چھڑا سکا۔ دھیور چٹان کی طرح اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ لالی نے کبڈی کے کھلاڑیوں کی طرح حلق سے "ہُو ہُو" کی آواز نکالی۔ اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ اس کے دونوں ہاتھ دھیور کی پکڑ سے آزاد ہو گئے۔ دھیور کے قدم لڑکھڑا گئے۔ لالی نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ اچھلا اور سر جھکا کر پوری قوت سے دھیور کے سینے پر ٹکر ماری۔ وہ دھڑام سے پیٹھ کے بل گرا۔ لالی نے چاہا کہ جھپٹ کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے' مگر دھیور نے گرتے ہی جھٹ ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور تیندوے کی مانند تیز نظروں سے لالی کو گھورنے لگا۔

لالی جہاں تھا وہیں رک گیا۔ دھیور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آگے بڑھا اور قریب جا کر ایک ہاتھ لالی کی گردن پر رکھ کر پوری قوت سے دھکا دیا۔ لالی دہلیز سے ٹکرا کر لڑھکتا ہوا اپنی چارپائی کے پاس جا گرا۔ اس کے سر میں کراری چوٹ آئی۔ مگر سر پھٹا نہیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ سر میں شدید ٹیس اور کسک تھی۔ دھیور سامنے دروازے پر خاموش کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دبا تھا۔

لالی نے اس کی جانب نہیں دیکھا۔ سر کی چوٹ سے زیادہ لالی کو احساس ہزیمت نے تڑپا دیا۔ اپنی بے بسی پر اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ دھیور ذرا دیر تک کھڑا اسے گھورتا رہا' آخر دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

☆

شام کا جھٹپٹا ہوا تو اندھیرے کے ساتھ ہی بنگلے میں ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ لالی چارپائی کے پاس فرش پر گم صم بیٹھا رہا۔ جب اندھیرا زیادہ بڑھا تو دھیور نے لالٹین روشن کی۔ لالی کے کمرے میں آیا۔ اس نے لالٹین ایک طرف رکھ دی۔ لالی نے اس کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ دھیور کمرے سے باہر چلا گیا' سناٹا اور بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سناٹے میں چاپ سنائی دی۔ لالی نے گردن اٹھا کر دیکھا' سامنے بوڑھی عورت کھڑی ہے۔ وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ عورت لمحہ بھر کو ٹھٹکی۔ اس نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ جھک کر کھانا لالی کے سامنے رکھا۔ دن کے برتن اٹھائے اور سائے کی طرح خاموشی سے چلی گئی۔ لالی نے کھانا کھایا۔ مگر دو ایک روٹی سے زیادہ نہ کھا سکا۔ چپ چاپ جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ خود کو بہت مضمحل اور تھکا ہوا محسوس کر رہا

تھا۔ دیر تک خاموش پڑا رہا' پھر سو گیا۔

دس بجے کے قریب دھیور نے لالی کو جگایا۔ باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ لالی نے اٹھ کر گٹھری کھولی۔ پتلون اور بش شرٹ نکال کر پہنی۔ خاموشی سے باہر نکلا اور دھیور کے ہم راہ چلنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ میاں حیات محمد کے سامنے کھڑا تھا۔ سیاہ السیشن اس وقت بھی صوفے پر بیٹھا تھا۔ حیات محمد وہسکی سے شغل کر رہا تھا۔

اس نے لالی کو نظریں اٹھا کر دیکھا۔ مونچھوں سے صاف چہرے اور سلوٹیں پڑی ملگجی پتلون اور بش شرٹ کو دیکھا مگر ان کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ صرف اتنا پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک ہے' کوئی تکلیف شکیت تو نہیں؟"

لالی نے دھیور کی زیادتی اور اشتعال انگیزی کے خلاف احتجاج کیا۔ "ویسے تو جی ہر طرح کا آرام ہے' پر دھیور نے میرے ساتھ خاماخا کا غنڈا کیا۔ مجھے دھکا دے کر گرا دیا۔ پستول تان کر کھڑا ہو گیا۔"

"میں اسے سمجھا دوں گا۔ آگے وہ ٹھیک طرح پیش آئے گا۔" حیات محمد نے وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے کہا۔ "مگر وہ غیر ضروری بات کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے گا اور جیسا وہ کہے گا تجھے ویسا ہی کرنا ہو گا۔ تو اس کے چارج میں ہے۔ تجھے یہ بات نہیں بھولنی چاہئے۔"

لالی اپنی بات پر اڑا رہا۔ "ساب' میرا اس کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر گرمی دکھائے گا تو اپنا ہتھ بھی چل جائے گا۔ خاماخا' فیر کسی دن جھگڑا فسا ہو جائے گا۔ آج تو جی میں چپ کر گیا۔ پر آگے اس نے گرمی دکھائی تو....."

حیات ایک دم بھڑ گیا۔ لالی کی بات کاٹ کر زور سے چیخا۔ "کیا کہنا چاہتا ہے؟" اس کی برہمی کے ساتھ ہی کتے نے گردن اٹھائی اور زور زور سے غرانے لگا۔

لالی نرم پڑ گیا۔ سر جھکا کر کسی قدر عاجزی سے بولا۔ "میاں صاحب! مجھے جانے کی اجازت دے دیجئے۔ آپ کی بہت مہربانی ہو گی۔"

حیات محمد نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے کہا۔ "جیل جانا چاہتا ہے؟"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات محمد خاں چند لمحے چپ بیٹھا رہا اور قریب بیٹھے ہوئے کتے کی پیٹھ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ "شام کو ڈی ایس پی میرے پاس آیا تھا۔ یہ تو اسے جرات نہ ہوئی کہ کھل کر تیرے بارے میں مجھ سے پوچھتا۔ مگر اس کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اسے شبہ ہے' تو میرے بنگلے میں ہے۔"

"تب تو جی مجھے فوراً یہاں سے چلا جانا چاہئے۔"

"بیوقوف۔" حیات نے اسے غصے سے ڈانٹا۔ "یہاں سے نکلتے ہی تو گرفتار کرلیا جائے گا۔ پولیس تیری گھات میں ہر طرف بیٹھی ہے۔" اس نے وہسکی کا بڑا گھونٹ لیا۔ لہجے میں ٹھہراؤ پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"تو یہاں سے جانے کے لیے اتنا بے چین کیوں ہے؟"

"آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ صاف بات یہ ہے جی! مجھے رحیم داد کی بہت فکر ہے۔ میں جیسے تیسے اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا ہوں۔"

"یہ رحیم داد وہی قیدی ہے نا جو تیرے ساتھ جیل سے فرار ہوا تھا؟"

"جی ساب! آپ اسے جانتے ہیں؟"

"نہیں۔" میاں حیات نے بے رخی سے جواب دیا۔ "اس کے بارے میں ڈی ایس پی نے صرف اتنا بتایا ہے کہ اسے اقدام قتل کے جرم میں سزا ہوئی تھی۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "سنا ہے دونوں پارٹیوں کے درمیان مسلح تصادم ہوا تھا۔ کچھ زخمی بھی ہوئے، مگر ان میں سے ایک زخمی پچھلے دنوں چل بسا۔"

لالی نے رحیم داد کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "پر ساب! اچھے سات مہینے تو کیس چلا۔ رحیم داد نے تین مہینے سے اوپر جیل میں سزا کے گزارے۔ اب تو یہ بات بہت پرانی ہوگئی۔"

"میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔" حیات محمد نے بے زاری سے کہا۔ "مجھے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ بندہ مرگیا جو اس کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ اب پولیس اس کے خلاف قتل کے الزام میں ۳۰۲ کا مقدمہ قائم کرنا چاہتی ہے۔ پہلے اسے دفعہ ۳۰۷ میں سزا ہوئی تھی۔ اب جرم کی نوعیت بدل کر زیادہ سنگین ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ترمیم مقدمہ کی کارروائی بھی شروع ہوگئی ہے۔"

لالی نے کچھ نہ کہا۔ حیات بھی چپ بیٹھا رہا اور آہستہ آہستہ وہسکی کے گھونٹ بھرتا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے لالی کو مخاطب کیا۔ "پولیس تجھے گرفتار کرنے کی سرتوڑ کوشش اس لیے کر رہی ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے حیات محمد ذرا الجھا۔ "کیا نام ہے دوسرے مفرور قیدی کا؟"

لالی نے آہستہ سے جواب دیا۔ "رحیم داد۔"

"رحیم داد۔" حیات محمد نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ "پولیس تیرے ذریعے رحیم داد کا سراغ لگانا چاہتی ہے۔ پولیس کو ایسی اطلاعات ملی ہیں کہ کچھ دنوں پہلے وہ تیرے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ بعد میں روپوش ہوگیا اور اب تک لاپتہ ہے۔"

لالی نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ میاں حیات محمد وٹو نے ذرا دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔ "میں تجھے یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو بندہ رحیم داد کے ہاتھوں قتل ہوا، وہ صوبائی وزیر زراعت کا قریبی عزیز ہوتا تھا۔ بھانجا یا بھتیجا تھا۔ شاید کوئی اور رشتہ ہو۔ مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم۔ وزیر کا پیو پہلے ادھر ہی ہوتا تھا۔ بعد میں لہور چلا گیا اور وہیں کوٹھی بنوا کر رہنے لگا۔ اب تو وہ بوڑھا ہوگیا ہے۔ کسی زمانے میں وڈا سیاست داں ہوتا تھا۔ مقتول کے گھر والے اس پر اور اس کے پتر پر بہت دباؤ ڈال رہے ہیں۔ لہٰذا وہ تیری اور تیرے ساتھی رحیم داد کی گرفتاری میں ذاتی دلچسپی لے رہا ہے۔"

حیات نے اپنی بات کہتے کہتے قدرے تامل کیا۔ "جب کوئی وزیر کسی معاملے میں ذاتی دلچسپی لیتا ہے تو پولیس کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ ملازمت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ سن لیا تو نے؟"

لالی نے نہایت سادگی سے کہا۔ "یہ بات ہے، تب تو جی مجھے ساری بات رحیم داد کو فوراً بتا دینی چاہیے۔"

اس کی بات سن کر حیات محمد شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ غصے سے آنکھیں نکال کر بولا۔ "تو بالکل الو کا پٹھا ہے۔"

لالی اس کے برہم ہونے پر ڈر گیا۔ گڑگڑا کر گویا ہوا۔ "ساب جی! ناراض نہ ہوں۔ پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے، پولیس کو جب یہ شبہ ہے کہ میں یہاں ہوں تو وہ کسی دن چھاپا مار کر مجھے پکڑ بھی سکتی ہے۔"

"پولیس کی اتنی جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ میرے بنگلے پر چھاپا مارے اور تلاشی لے۔" حیات نے نہایت رعونت سے کہا۔ "شاید تجھے پتہ نہیں۔ کل رات جو پولیس انسپکٹر میری اجازت کے بغیر بنگلے کی چار دیواری کے اندر داخل ہوا تھا، اسے میرے صرف ایک ٹیلی فون کھڑکھڑانے پر تین کانسٹیبلوں کے ساتھ آج معطل کر کے لائن حاضر کردیا گیا۔ ڈی ایس پی کل رات ہی کے واقعے کے بارے میں معذرت کرنے میرے پاس آیا تھا۔" اس نے وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ گلاس میز پر رکھا۔ "میں نے سہ پہر کو وزیر زراعت سے بھی گل بات کی تھی۔ وہ میرا پرانا یار ہے۔ کالج میں ساتھ پڑھتا تھا۔ میری ہی کوششوں سے وزیر لگا ہے۔" لالی بت بنا خاموش کھڑا رہا۔ میاں حیات محمد کہتا رہا۔

"تو یہاں ہر طرح محفوظ ہے۔ رہ گیا رحیم داد تو اسے اب بھول جا۔"

لالی خاموش نہ رہ سکا۔ بے چین ہو کر بولا۔ "میاں صاحب، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسے ہی جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ رحیم داد جلد ہی گرفتار کرلیا جائے گا یا ہلاک کردیا جائے گا۔ مقتول کے بھائی اور خاندان والے بھی اس کی تلاش میں ہیں۔ دیکھتے ہی اسے قتل کردیں گے۔ پولیس کے ہاتھوں اگر وہ پکڑا گیا تب مقدمے کی سماعت کے دوران ہی اسے مار ڈالیں گے۔ تجھے تو پتہ ہی ہوگا کہ خون کا بدلہ یہاں ایسے ہی لیا جاتا ہے۔ عدالت کے فیصلے کا انتظار نہیں کیا جاتا' بلکہ عدالت کے احاطے کے اندر بھی قتل ہو جاتا ہے۔"

حیات محمد نے بوتل اٹھائی' خالی گلاس میں وہسکی انڈیلی' تھرماس سے برف نکال کر ڈالی' شیشے کے قرابے سے پانی ڈالا اور پیگ بنا کر وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ پھر سمجھانے کے انداز میں نرمی سے بولا۔ "دیکھ' رحیم داد کے ساتھ ہمدردی تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ مجھے ڈر ہے اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں تو بھی مارا جائے گا۔ گرفتار تو بہرحال کر ہی لیا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تو میرے پاس ٹھیرا رہ۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "رحیم داد زیادہ دنوں تک روپوش نہیں رہ سکتا۔ پولیس اس کا سراغ لگالے گی۔ اس کی گرفتاری کے بعد پولیس تیری طرف سے غافل ہو جائے گی۔ میں اپنے اثر و رسوخ سے تجھے جیل جانے سے بچالوں گا۔ کوئی تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

لالی نے سر جھکا کر نہایت عاجزی سے کہا۔ "ساب' آپ رحیم داد کے لیے کچھ نہیں کرسکتے؟ گل ایسہ ہے میاں جی' جیل سے میں ہی اسے نکال کر لایا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔"

حیات نے لالی کو آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ بات کاٹ کر بولا۔ "رحیم داد کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ سمجھ لے' وہ مرگیا۔" اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "میں اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ صرف تجھے بچا سکتا ہوں۔"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے ایک بار پھر درخواست کی۔ "آپ کی بہت مہربانی ہے جی' مگر۔"

"اگر مگر چھوڑ۔" حیات محمد وٹو نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "مجھے دو ٹوک جواب چاہئے۔ جیل جانا چاہتا ہے یا یہاں رہنا چاہتا ہے۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "مجھے صرف ٹیلیفون کرنا ہوگا۔ گھنٹے بھر کے اندر تو پولس کی حراست میں ہوگا۔ بول کیا چاہتا ہے؟"

لالی اس کی دھمکی سے مرعوب ہوگیا۔ گڑگڑا کر بولا۔ "میاں جی' میری کیا مرضی' جو آپ حکم کریں گے وہی کروں گا۔"

"شاباش۔" حیات محمد وٹو نے اونچی آواز سے کہا۔ اس کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ وہ خاموش بیٹھا' اپنے السیشن کی نرم نرم پیٹھ پر محبت سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ کتا دھیرے دھیرے' غراتا رہا۔ میاں حیات محمد نے گلاس اٹھایا اور ساری وہسکی غٹاغٹ چڑھا کر ایک بار پھر اسے خالی کردیا۔ اس نے گلاس میز

رکھا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ آ۔"

السیشن بھی صوفے سے اتر کر نیچے آگیا اور میاں حیات محمد کے ساتھ' ساتھ چلنے لگا۔ لالی کو اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر وہ سہما ہوا حیات محمد کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ حیات محمد' غلام گردش میں کھلنے والے دروازے پر پہنچا۔ اسے کھولا۔ باہر دھیرو کھڑا تھا۔ حیات محمد نے اسے کمرے کے اندر بلایا۔

دھیرو کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دروازہ بند کردیا۔ میاں حیات محمد نے جنوبی دیوار کا بند دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ یہ دروازہ کمرے کے دوسرے دروازوں سے کسی قدر مختصر تھا۔ اس میں تالا بھی پڑا تھا۔

دھیرو نے شلوار کی چور جیب سے کنجی نکالی اور نہایت مستعدی سے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔

میاں حیات محمد اپنے السیشن کے ساتھ ذرا سا جھک کر اندر داخل ہوا۔ اس نے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

لالی بھی اندر چلا گیا۔ دھیرو باہر رہ گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بند کردیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ حیات نے ہاتھ بڑھا کر دیوار میں لگا ہوا بجلی کا سوئچ دبایا۔ ایک بلب روشن ہوگیا۔ اس کی روشنی بہت دھیمی تھی۔

سامنے زینہ تھا جو نیچے جاتا تھا۔ دونوں آگے پیچھے نیچے اترے۔ یہ کشادہ تہہ خانہ تھا۔ فرش کچا تھا۔ تہہ خانے میں نمی تھی' گھٹن تھی اور عجیب طرح کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ تہہ خانے میں بھی صندلا بلب روشن تھا۔ ہوا کی آمد و رفت کے لیے چمنی تھی جو کھپریلوں کی چھت کے اوپر نکلی ہوئی تھی۔ چمنی کے نیچے آتش دان تھا۔ اس میں تہہ خانہ گرم رکھنے کے لیے موسم سرما میں لکڑی کے کندے اور کوئلے سلگائے جاتے تھے۔

☆

دھندلی دھندلی روشنی میں ایک بوڑھا شخص زمین پر لیٹا تھا۔ اس کی ڈاڑھی اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ وہ جیل کے قیدیوں کا سا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ایک پیر میں لوہے کی موٹی بیڑی تھی جس میں وزنی گولا پڑا تھا۔ قریب ہی تام چینی کا بوسیدہ تسلا رکھا تھا۔ ایک طرف مٹی کا گھڑا اور المونیم کا گلاس تھا۔ آہٹ سن کر بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میاں حیات اور لالی کو گھورنے

لگا۔ اس کی آنکھیں غصے اور نفرت سے جلدی ہی بھڑکتا ہوا شعلہ بن گئیں۔ چہرے پر وحشت طاری ہو گئی۔ وہ منہ بگاڑ کر چیخنے لگا۔

"تو آگیا۔ کتے! ذلیل! دور ہو جا میری آنکھوں کے سامنے سے۔ میں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ دفع ہو جا یہاں سے۔"

وہ چیخ چیخ کر حیات محمد کو گالیاں دیتا رہا اور گہری گہری سانس بھر کر ہانپتا رہا۔ حیات ٹھٹکا۔ ذرا دیر خاموش کھڑا رہا پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا' بوڑھے کی جانب بڑھا۔ حیات جس قدر قریب ہو تا گیا بوڑھے کی دیوانگی میں اسی قدر اضافہ ہو تا گیا۔ وہ اور زیادہ غصے سے چیخنے لگا۔ اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ آنکھیں وحشت سے ابل پڑیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حیات محمد پر تیزی سے جھپٹا مگر لوہے کے وزنی گولے نے اسے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے پیر میں پڑی ہوئی زنجیر جھن جھنا اٹھی۔ حیات کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ وہ بوڑھے کے عین مقابل کھڑا تھا۔ بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ تلملا کر اٹھا' کھڑا ہوا اور نفرت سے حیات کے منہ پر تھوک دیا۔ حیات نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ پونچھا۔ مڑ کر اپنے ساتھ کھڑے ہوئے السیشن کو دیکھا۔ اسے آہستہ سے ششکارا۔ کتا غرایا' زور سے بھونکا اور اچھل کر بوڑھے پر حملہ آور ہوا۔ بوڑھا زمین پر گر پڑا۔ کتا اسے زور زور سے جھنجوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

بوڑھا پھولی ہوئی سانس سے چیخا۔ "مار دے' مار دے۔ مجھے جان سے مار دے۔"

میاں حیات چپ چاپ کھڑا رہا۔ بوڑھا بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ کتا اس کے پھڑکتے ہوئے جسم کو جگہ جگہ سے جھنجوڑنے لگا۔ سینے پر سوار ہو کر اس نے بوڑھے کی گردن اپنے دانتوں سے دبوچنے کی کوشش کی۔ بوڑھے نے پھٹی پھٹی خوف زدہ آنکھوں سے حیات محمد وٹو کی جانب دیکھا۔

حیات نے ڈپٹ کر کتے کو اپنے پاس بلایا۔ کتے نے بوڑھے کو چھوڑ دیا۔ خاموشی سے حیات کے پاس آگیا اور اس کے پیروں کے قریب زمین پر لیٹ گیا۔ کتے کے جھنجوڑنے سے بوڑھے کا لباس کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ مگر جسم پر کہیں کھرونچا بھی نہیں آیا۔ وہ کروٹ کے بل زمین پر لیٹا ہوا ہانپ رہا تھا۔ حیات محمد خاموش کھڑا بوڑھے کو گھورتا رہا۔ پھر واپس مڑا۔ اس نے زینے کے برابر دیوار میں لگی ہوئی الماری کھولی۔ لالی سہما ہوا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

میاں حیات نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور بھاری بھر کم لہجے میں کہا۔ "ادھر آ۔"

لالی اس کے پاس چلا گیا۔ حیات نے الماری کے اندر سے ایک ڈبا نکالا۔ ڈھکنا کھول کر ڈبا لالی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کھلے ہوئے ڈبے کے اندر سے سرنج اور شیشی باہر نکالی۔ لالی کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ حیات محمد ایک بار پھر بوڑھے کے پاس گیا۔ لالی اس کے عقب میں خاموش کھڑا رہا۔

سرنج دیکھتے ہی بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف طاری ہو گیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ ہلا کر انکار کیا اور گھگیا کر بولا۔ "نہیں نہیں۔"

حیات نے اسے خوں خوار نظروں سے گھورا۔ بوڑھا سہم کر ایک طرف جھک گیا۔ حیات محمد اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ بوڑھے نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بے چارگی سے گردن جھکا دی۔ حیات نے اس کے بازو پر روئی سے اسپرٹ لگائی اور سرنج کی سوئی کھال میں داخل کر کے دوا رگوں میں اتار دی۔ انجکشن لگا کر وہ کھڑا ہو گیا۔ تہہ خانے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ بوڑھا گم صم بیٹھا رہا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ حیات محمد وٹو اور لالی چپ کھڑے رہے۔

بوڑھا گردن کو ذرا سا خم دے کر اس طرح سکڑ کر بیٹھ گیا گویا کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے چہرے پر اچانک گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ حیات سے مخاطب ہوا۔ "سن رہا ہے حیات۔ بہت تیز ہوا چل رہی ہے۔ طوفان آنے والا ہے۔ آندھی کے ساتھ بارش بھی ہو گی۔" وہ زور سے چیخا۔ "غضب ہو جائے گا۔ کنک کی واڈھو فصلیں تباہ ہو جائیں گی۔ اب کیا ہو گا حیات؟"

"ابھی فصلیں پک کر تیار نہیں ہوئیں۔ کٹائی میں دیر ہے۔"

"سچ۔" وہ خوشی سے چہک کر بولا۔ "سچ' سچ بتا۔ فصلوں کی واڈھی میں ابھی کتنی دیر ہے؟"

"اس بار مئی سے پہلے واڈھی نہیں ہو گی۔ یہ تو مارچ کا مہینہ ہے۔" حیات محمد وٹو نے اسے تسلی دی۔ "اب تم سو جاؤ۔"

بوڑھے نے بچوں کی سی معصومیت سے کہا۔ "اب میں سو جاؤں؟"

"ہاں' ہاں' اب تم سو جاؤ۔"

بوڑھے نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ذرا دیر چپ بیٹھا جھومتا رہا اور جھومتے' جھومتے ایک طرف لڑھک گیا۔ لالی خوف اور حیرت سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟

جب بوڑھا سو گیا تو حیات واپس ہوا۔ اس نے سرنج صاف کی۔ ڈبے میں رکھی۔ الماری کا

دروازہ کھولا اور ڈبا اس میں رکھ کر دروازہ بند کردیا۔ وہ مڑا' لالی کے ہم راہ زینے کی سیڑھیاں طے کیں اور اوپر پہنچ گیا۔ بلب بجھایا۔ دونوں باہر آگئے۔ کتا بھی باہر آگیا۔ دھیور دروازے کے قریب مستعدی سے کھڑا تھا۔ ان کے باہر آتے ہی اس نے بڑھ کر تہ خانے کا دروازہ بند کیا اور تالا ڈال دیا۔ کنجی اپنے پاس رکھ لی۔

حیات نے دھیور کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ کمرے سے چلا گیا۔ لالی نے بھی دھیور کے ساتھ باہر جانا چاہا۔ حیات نے اسے ٹوکا۔

"لالی تو ٹھہر جا۔"

میاں حیات محمد آگے بڑھا اور تھکا ہوا سا صوفے پر بیٹھ گیا۔ قریب کے صوفے پر اس کا لیشن بھی بیٹھ گیا۔ حیات نے وہسکی کا بڑا پیگ بنایا اور آہستہ آہستہ چسکی لگانے لگا۔ لالی اس کے روبرو خاموش کھڑا تھا۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ بنگلے کے باہر ہوا کے جھونکوں سے پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ سناٹے میں خشک پتوں کے کھڑکھڑانے کی ہلکی ہلکی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ گہری خاموشی میں حیات کی آواز ابھری۔ وہ لالی سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھ لیا تو نے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "یہ میرا وڈا بھرا میاں ریاض محمد خاں وٹو ہے۔ پاگل ہو گیا ہے۔"

"میاں ساب' آپ انھیں پاگل خانے کیوں نہیں بھیج دیتے۔"

"فضول بات نہ کر۔" حیات محمد نے خفا ہو کر کہا۔ "میرا بھائی پاگل خانے نہیں جا سکتا۔ وہ یہیں رہے گا۔"

لالی کے ذہن میں کئی سوالات ابھرے۔ مگر وہ حیات کی برہمی کے ڈر سے کچھ نہ کہہ سکا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات محمد چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "میں اس لیے تجھے اپنے ساتھ تہ خانے میں لے گیا تھا کہ جو کام آج میں نے کیا ہے' کل سے تجھے کرنا ہوگا۔" وہ مسکرایا۔ "تیری صرف اتنی ہی ڈیوٹی ہوگی۔ باقی وقت میں عیش کر۔ کھا پی' موجاں کر۔"

لالی نے دبی زبان سے پہلوتہی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے جی یہ کام کبھی نہیں کیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" حیات نے بے نیازی سے کہا۔ "بہت معمولی کام ہے۔ دوا کی شیشی تو دیکھ ہی لی ہے۔ سرنج میں دوا بھرنا۔ مریض کا ہاتھ پکڑنا اور کھال میں سوئی چبھو کر دوا اندر داخل کر دینا۔ کام ختم۔"

لالی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میاں جی' یہ کام تو دھیور بھی کر سکتا ہے۔"

"نہیں۔" میاں حیات محمد نے تیوری پر بل ڈال کر لالی کو دیکھا۔ "دھیور یہ کام نہیں کر سکتا۔ وہ

اکیلا تہ خانے کے اندر بھی نہیں جا سکتا۔" اس نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ "دھیور اگر اس کے پاس گیا تو ہو سکتا ہے' وہ اس کا خون کر دے۔ میرے بھائی نے ناراض ہو کر دھیور کی زبان کٹوا دی تھی۔ تب سے وہ گونگا ہے۔ مگر دھیور اس سے جتنی نفرت کرتا ہے' میرا اتنا ہی وفادار ہے۔ دھیور بہت ہی وفادار ہے۔ میرے دو ہی وفادار ہیں۔" اس نے قریب بیٹھے ہوئے السیشن کی طرف اشارہ کیا۔ "ایک یہ' دوسرا دھیور۔"

لالی نے آہستہ سے کہا۔ "میاں ساب! اپنے بھرا کا کسی چنگے ڈاکٹر سے علاج کرائیے۔ ایسے کب تک کام چلے گا۔"

"مجھے تیرے مشورے کی ضرورت نہیں۔" حیات نے لالی کو ڈانٹ دیا۔ "میں خود ڈاکٹر ہوں۔"

"اچھا جی! آپ ڈاکٹر بھی ہیں؟" لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔ "یہ مجھے پتہ نہیں تھا۔"

"میں نے ڈاکٹری لہور میں نہیں پڑھی۔" حیات نے بڑے فخر سے کہا۔ "انگلستان میں پڑھی ہے۔"

لالی نے اور زیادہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میاں ساب! آپ ولایت میں بھی رہ چکے ہیں؟"

"برسوں رہا ہوں۔"

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ ذرا دیر بعد لالی نے خاموشی توڑی اور عاجزی سے بولا۔ "برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں؟"

"کہہ' کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"میری کوئی اور ڈیوٹی لگا دیجیے۔"

حیات محمد چند لمحے لالی کو گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہے' تو بندوق چلانا بھی جانتا ہے۔ نشانہ بھی تیرا بہت ٹھیک ٹھاک ہے۔" اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ گلاس میز پر رکھا۔ "میں تیری نشانے بازی اور زور آوری بعد میں دیکھوں گا۔ تو کام کا بندہ لگتا ہے۔" حیات نے ایک بار پھر اسے بغور دیکھا اور ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔ "مگر فی الحال تجھے یہی کام کرنا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ میں تہ خانے میں جا کر انجیکشن خود لگانا نہیں چاہتا۔ وہ پاگل بندہ ہے۔ اس کے پاگل پن پر مجھے غصہ بھی آتا ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے۔ وہ میرا بھائی ہے نا۔"

"ساب! آپ کو ان پر غصہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"فیر فضول باتیں شروع کر دیں۔" حیات نے بگڑ کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں' تو اس کے بارے میں

بالکل نہ سوچ۔ یہ تیرا کام نہیں۔ تیرا کام صرف اتنا ہی ہے جس کے لیے میں نے تیری ڈیوٹی لگا ہے۔ تجھے روزانہ دو بار اسے انجکشن لگانا ہو گا۔ اور اس وقت لگانا ہو گا جب دھیور تجھے کہے گ تہہ خانے کی کنجی اسی کے پاس رہتی ہے۔ تہہ خانے کے اندر صرف تو جائے گا' وہ نہیں جائے گ سمجھ گیا؟"

"جی' بالکل سمجھ گیا۔"

"اور یہ بھی جان لے کہ تہہ خانے میں تیرے علاوہ صرف مائی جنتے جاتی ہے۔ وہ تہہ خانے' صفائی کرتی ہے۔ روٹی ٹکر پہنچاتی ہے۔ وہ گونگی ہے اور بہری بھی۔ تجھے بھی یہاں گونگا اور بہرہ بن' رہنا ہو گا' صرف آنکھیں کھلی رکھنا۔ منہ اور زبان بند رکھنا۔" حیات محمد نے قریب رکھی ہوئی میز' دراز کھولی۔ اندر سے سرنج اور دو شیشیاں نکالیں۔ ایک شیشی اس نے میز پر رکھ دی' دوسری شیشہ کی دوا سرنج میں بھری اور سرنج لالی کے ہاتھ میں تھما کر بولا۔ "میں چاہتا ہوں تو میرے سامنے انجکشن لگا کر دکھا۔"

لالی نے گھبرا کر کہا۔ "کس کے لگاؤں جی؟"

"میں تو بہر حال تجھ سے انجکشن نہیں لگوا سکتا اور نہ ہی تو اپنے بدن میں انجکشن لگا سکے ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ مسکرایا اور اپنے خوفناک السیشن کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے انجکشن لگا: ہو گا۔"

"اسے؟" لالی نے خوف زدہ نظروں سے دیکھا' کتا صوفے پر لیٹا اسے گھور رہا ہے۔ "میاں ساب! اس سے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر نہیں' یہ تجھے کاٹے گا نہیں۔" یہ کہہ کر حیات نے میز کی دراز سے چمڑے کا پوزہ بند نکالا۔ اسے کتے کے منہ پر چڑھایا اور اس کی پشت آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ کتا سر نیچے جھکا کر لیٹ گیا۔ حیات نے اس کی ران پر ایک جگہ انگلی رکھ کر حکم دیا۔ "یہاں انجکشن لگا دے۔" لالی جھجکا۔ حیات نے ڈپٹ کر کہا۔ "منہ کیا تک رہا ہے؟ لگا انجکشن۔"

لالی نے جھٹ کتے کی کھال میں سرنج کی سوئی داخل کر کے دوا اندر اتار دی۔ کتا خاموش پڑا رہا۔ جب لالی انجکشن لگا چکا تو حیات محمد نے مسکرا کر کہا۔ "بالکل اسی طرح تجھے تہہ خانے میں اس پاگل کو انجکشن لگانا ہو گا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تو اس کتے سے ڈر رہا تھا۔ یہ نہ کاٹتا ہے' نہ پنجے مارتا ہے اور اس انجکشن کے بعد تو یہ بالکل

ل ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔"

لالی نے دیکھا' کتا نڈھال پڑا ہے۔ حیات محمد نے پوزہ بند اس کے منہ سے اتار دیا اور تیکھے لہجے میں بولا۔ "لیکن یہ کبھی کبھی نہایت خطرناک بھی ہو جاتا ہے۔" اس نے میز پر رکھی ہوئی دوسری شی اٹھائی۔ "اگر اس کا انجکشن لگا دیا جائے تو یہ کتا اتنا خوں خوار ہو جاتا ہے کہ جس پر حملہ رے' اسے چیر پھاڑ کر ختم بھی کر سکتا ہے۔"

لالی نے خوف زدہ نظروں سے شیشی دیکھی اور سرنج ہاتھ میں دبائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات نے اس سے سرنج لی' اسے میز پر رکھا اور لالی سے مخاطب ہوا۔ "یاد رکھ' جیسا تجھ سے کہا جائے تجھے ویسا ہی کرنا ہو گا۔ میرے حکم کی خلاف ورزی تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ کچھ عرصے تک تیری کڑی نگرانی کی جائے گی۔ اگر تو نے ہر کام ٹھیک ٹھاک کیا تو نگرانی ختم کر دی جائے گی۔" اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا اور بھاری بھرکم لہجے میں بولا۔

"جا' جا کر سو جا۔"

لالی نے سر جھکا کر خاموشی سے حیات محمد کی باتیں سنیں۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھولا۔ باہر دھیور مستعدی سے کھڑا تھا۔ وہ اس کے ہم راہ اپنے کمرے میں پہنچا اور بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد دھیور نے اپنی چارپائی نکالی اور عین دروازے کے سامنے برآمدے میں ڈالی۔ بستر لگایا اور لیٹ گیا۔

دھیور کچھ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر سو گیا۔ مگر لالی کو نیند نہیں آئی۔ وہ سخت بے چین تھا۔ اس ل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے' کیا نہ کرے؟

رات کے پچھلے پہر وہ آہستہ سے اٹھا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر زرد زرد چاندنی بکھری تھی۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ لالی نے کھڑکی کی آہنی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے تھام کر پورا زور لگایا مگر سلاخیں بہت مضبوط تھیں۔ ایک بھی سلاخ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اچانک اسے اپنی پشت پر چاپ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا' لالٹین کی مدھم روشنی میں دھیور اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ خوں خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور لالی کا بازو پکڑ کر اس زور سے دھکا دیا کہ لالی لڑکھڑاتا ہوا بستر پر جا کر گرا۔ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ بستر پر خاموش پڑا رہا۔ دھیور نے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر کے چٹخنی لگائی اور کمرے سے باہر جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

چارپائی سے ٹکرانے کے باعث لالی کے کندھے میں چوٹ بھی آئی مگر وہ خاموش رہا اور کروٹ

بدل کر لیٹ گیا۔ آخر اسے نیند آ گئی۔ وہ سو گیا۔ صبح مائی جنتے نے لالی کو آہستہ سے جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ وہ اس کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ چائے کے ساتھ روٹی اور ساگ بھی تھا۔ یہ صبح کا ناشتہ تھا۔ مائی جنتے نے لالی کی جانب نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔ وہ چپ چاپ آئی اور چپ چاپ چلی گئی۔ لالی منہ دھونے کے لیے غسل خانے میں گیا۔ واپس آیا تو اس نے دیکھا، دھیورا اپنے کمرے میں چٹائی پر بیٹھا ناشتا کر رہا ہے۔ لالی کے کمرے کی کھڑکی بھی اب کھلی ہوئی تھی۔

لالی ناشتے سے فارغ ہوا تو دھیورا اسٹول پر آ کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ چپ بیٹھا لالی کو تک رہا تھا۔ لالی نے جتنی بار نظر اٹھائی، اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ اس طرح گھورنے پر لالی جھنجلا گیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھیور کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک دونوں پلک جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ آخر دھیور کی پلک جھپک گئی۔ لالی مسکرانے لگا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر دھیور کی تیوری پر بل پڑ گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر زمین پر تھوک دیا۔ اس کی اس اشتعال انگیزی پر لالی کا خون کھول گیا۔ مگر وہ طرح دے گیا۔ وہ نہتا تھا اور دھیور مسلح۔ لالی نظریں جھکا کر بستر پر لیٹ گیا اور کھڑکی کی سلاخوں سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک نوجوان غیار ٹوکری میں کوڑا کرکٹ بھر کر لائی اور اسے جھاڑیوں کے پاس انڈیل دیا۔ کوڑے میں شیشے کی ٹوٹی ہوئی بوتلیں بھی تھیں۔ ان کے گرنے سے چھناکا ہوا۔ لڑکی نے نظریں اٹھا کر بستر پر لیٹے ہوئے لالی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اس نے اپنی اوڑھنی کے پلو سے سر ڈھکا اور شرما کر زیر لب مسکرائی۔ لالی بھی مسکرانے لگا۔ دھیور جھٹ کمرے کے اندر داخل ہوا، کھڑکی کے پاس پہنچا اور قہر آلود نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لڑکی خالی ٹوکری بغل میں دبا کر سہمی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

دھیور نے ایک بار پھر کھڑکی کے پٹ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ لالی تملا کے رہ گیا۔ اس نے دھیور کی طرف نہیں دیکھا۔ کروٹ بدل کے منہ دوسری طرف کر لیا۔ دھیور اس کے پاس نہیں آیا، باہر چلا گیا۔

لالی خاموش لیٹا رہا۔ اس کے لیے وقت کاٹنا عذاب ہو گیا۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ ٹھیک بارہ بجے دھیور اس کے پاس آیا اور باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ لالی خاموشی سے اٹھا اور دھیور کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں غلام گردش کے راستے حیات محمد کے کمرے میں داخل ہوئے۔ حیات کمرے میں موجود نہیں تھا۔ دھیور نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا اور لالی کو ٹہوکا دے کر اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ لالی نے اندر جا کر سوئچ دبایا۔ بلب روشن ہو گیا۔ اس کی روشنی میں لالی سیڑھیوں سے نیچے تہہ

خانے میں چلا گیا۔

بوڑھا ریاض محمد خاں ونو آتش دان کے قریب زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کھانے کے برتن پڑے تھے۔ اس وقت وہ ہونٹوں سے گلاس لگائے پانی پی رہا تھا۔ پانی پیتے پیتے اس نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ خاموشی سے گلاس ایک طرف رکھا اور لمحے بھر تک لالی کو گھورتا رہا۔ لالی سیڑھیوں کے پاس ٹھہر گیا۔ دبے دبے خوف اور حیرت سے ریاض کو تکنے لگا۔ ذرا دیر تہہ خانے میں خاموشی رہی، پھر بوڑھے میاں ریاض محمد کی آواز ابھری۔

"آ، میرے نزدیک آجا۔"

مگر لالی جہاں تھا، وہیں کھڑا رہا۔ اس دفعہ بوڑھے نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ "ڈر نہیں، نزدیک چلا آ۔" لالی نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ آہستہ، آہستہ اس کی جانب بڑھا، مگر نزدیک جانے کے بجائے کچھ فاصلے پر رک گیا۔

میاں ریاض محمد نے کہا۔ "میں نے کل رات ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اب تیری ڈیوٹی لگائی جائے گی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "دور کیوں کھڑا ہے؟ نزدیک آجا۔ تو تگڑا جوان ہے اور میں بوڑھا، کمزور۔ پاؤں میں زنجیر بھی پڑی ہے۔ پھر بھی تو مجھ سے ڈر رہا ہے۔"

لالی نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھ کر نزدیک چلا گیا۔ ریاض محمد ونو تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا۔ "جب کوئی نیا نیا ڈیوٹی پر لگایا جاتا ہے، وہ مجھ سے اسی طرح ڈرتا ہے۔ سمجھتا ہے میں پاگل ہوں۔ کیا میں تجھے پاگل نظر آتا ہوں۔" لالی بدستور خاموش کھڑا رہا۔ بوڑھے ریاض نے گہری سانس بھری۔ "تو میری کل بات کیوں ماننے لگا؟" وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لالی گم صم کھڑا رہا۔ تہہ خانے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔

میاں ریاض محمد نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا اور کسی قدر بیزاری سے بولا۔ "کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔ جا، جا کر الماری سے سرنج نکال اور ٹھیز دے اس کی سوئی میری کھال میں۔ یہی تیری ڈیوٹی ہے اور اسی کے لیے تو یہاں آیا ہے۔ خاماخا کیوں وقت برباد کر رہا ہے۔"

لالی نے پھر بھی کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے الماری کے پاس گیا۔ اسے کھولا۔ سرنج میں دوا بھری۔ میاں ریاض کے پاس پہنچا۔ جھک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور بازو میں انجکشن لگانا چاہا۔ مگر ریاض نے منع کر دیا۔ نرم لہجے میں کہا۔ "آرام سے بیٹھ جا۔" لالی اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑا۔ بوڑھے ریاض نے ٹوکا۔ "میرا ہاتھ چھوڑ دے۔" اس نے کرتے کا دامن اٹھایا اور اپنی برہنہ کمر کا رخ لالی کی طرف کر دیا۔

"ہاتھ میں نہیں، کمر میں انجکشن لگا دے۔"

لالی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سرنج کی سوئی ریاض کی کمر میں چبھونے کی کوشش کی تو وہ بلبلا کر چیخا۔ "تو تو بالکل اناڑی لگتا ہے۔ پہلے کبھی انجکشن لگایا ہے؟" لالی نے زبان سے تو کچھ نہ کہا صرف انکار میں گردن ہلا دی۔ ریاض نے سرنج اپنے ہاتھ میں سنبھالی اور اس کی نوک کمر پر لگا کر بولا۔ "لے اب لگا دے انجکشن۔"

لالی نے اس کی ہدایت کے مطابق انجکشن لگایا۔ ریاض نے نہایت اطمینان سے انجکشن لگوالیا۔ مسکرا کر کہا۔ "اب تجھے انجکشن لگانا آگیا۔ کچھ دنوں بعد تو فٹافٹ انجکشن لگانے لگے گا۔" لالی نے اس دفعہ بھی کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اٹھ کر الماری کے پاس گیا۔ سرنج صاف کی۔ ڈبے میں رکھی اور الماری میں بند کر دی۔

لالی ایک بار پھر ریاض کے قریب گیا۔ مگر اس نے لالی کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ آنکھیں بند کیے دھیرے دھیرے سانس بھرتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا ہلکا خمار تھا۔ اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "اب تو جا سکتا ہے۔ تیری ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ میں تھوڑی دیر بعد سو جاؤں گا۔" مگر لالی نہیں گیا۔ ریاض نے بھی کچھ نہ کہا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر آنکھیں بند کیے جھومتا رہا۔ اور جھومتے جھومتے فرش پر لڑھک گیا۔

لالی واپس ہوا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر چڑھنے لگا۔ وہ سخت حیرت زدہ تھا۔ اس نے پچھلی رات جس ریاض محمد کو دیکھا تھا وہ اس ریاض محمد سے قطعی مختلف تھا، جس سے ذرا دیر پہلے اس کا سابقہ پڑا تھا۔ نہ وہ اسے دیکھ کر دیوانوں کی طرح چیخا، نہ گالیاں دیں اور نہ مارنے کے لیے جھپٹا، بلکہ نرمی اور شفقت سے پیش آیا۔ حتیٰ کہ انجکشن لگانے میں بھی اس کی رہنمائی کی۔ پورا پورا تعاون کیا۔

لالی نے اوپر جا کر بجلی بجھائی۔ بند دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ دھیور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے تہہ خانے کا دروازہ بند کیا اور تالا ڈال دیا۔ لالی کے ہم راہ کمرے میں واپس آگیا۔ لالی نے دوپہر کا کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔

رات کے گیارہ بجے وہ پھر دھیور کے ساتھ تہہ خانے کے دروازے پر پہنچا۔ حیات کمرے میں اس وقت بھی موجود نہ تھا۔

لالی تہہ خانے کے اندر گیا۔ ریاض محمد وٹو کو دیکھا، وہ جاگ رہا تھا۔ مگر اس نے لالی سے کوئی

بات نہیں کی۔ لالی بھی خاموش رہا۔ ریاض نے انجکشن لگوایا اور سو گیا۔ لالی واپس ہوا۔ دھیور کے ہم راہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کھڑکی سے ہوا کے نرم نرم جھونکے اندر آ رہے تھے۔ باہر چاندنی چھٹکی تھی۔ مگر دھیور کے ڈر سے لالی کھڑکی پر نہیں گیا۔

☆

لالی دن کے بارہ اور رات کے گیارہ بجے دھیور کے ہم راہ تہہ خانے کے دروازے پر جاتا۔ تنہا اندر داخل ہوتا اور بوڑھے ریاض کے جسم میں انجکشن لگاتا۔ انجکشن لگاتے وقت کبھی کبھار ریاض نے بات کرنے کی کوشش بھی کی مگر لالی نے مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ حیات محمد کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بالکل خاموش رہتا۔ لیکن ریاض کبھی ناراض نہ ہوا۔ نہ چیخا نہ چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ عام طور پر خاموش ہی رہتا۔

لالی واپس کمرے میں جاتا تو دھیور اس کی کڑی نگرانی کرتا۔ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتا۔ نہایت بے رخی اور حقارت سے پیش آتا۔ لالی تنہائی سے اکتا کر کبھی کھڑکی کی جانب جانے کی کوشش کرتا تو دھیور جھٹ کمرے میں جاتا اور لالی کی گردن پکڑ کر زور سے دھکا دیتا۔ دو بار ایسا ہی ہوا۔ لالی اس سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کھڑکی پر جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ بستر پر لیٹتا تو کروٹ بدل کر منہ موڑ لیتا۔

کمرے سے نکل کر وہ صرف برآمدے میں آ سکتا تھا یا غسل خانے تک جا سکتا تھا اور چوبیس گھنٹے میں صرف دو بار راہ داری سے گزر کر تہہ خانے میں جا سکتا تھا۔ دھیور ہر وقت اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہ تھا۔ مائی جنتے بھی گونگی تھی اور دھیور بھی گونگا تھا اور بوڑھے ریاض سے اسے بات کرنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ اس دوران حیات محمد وٹو سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔

لالی اس ماحول سے جلد ہی اکتا گیا۔ فرار ہونے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دھیور اس کے راستے میں دیوار بنا کھڑا تھا۔ دھیور پر قابو پانا یا اسے رام کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کا رویہ اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ لالی نے جب بھی اس کی طرف دیکھا، ہمیشہ قہر آلود نظروں سے اپنی جانب گھورتے پایا۔ دھیور صرف رات کو سوتا تھا اور لالی کے کمرے کے دروازے کے سامنے چارپائی ڈال کر سوتا تھا۔ مگر وہ اس قدر چوکنا اور چوکس رہتا کہ اگر لالی رات کو پیشاب کے لیے بھی اٹھتا تو اس کی چاپ کے ساتھ ہی دھیور جھٹ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ صبح ہوتی، شام ہوتی۔ مگر لالی نے سورج نہ طلوع ہوتے دیکھا، نہ

غروب ہوتے۔ بنگلے کے باہر کی دنیا کے بارے میں اسے کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ اسے رہ رہ کے رحیم داد کا خیال آتا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا کہ رحیم داد اس کے بارے میں نہ جانے کیا سوچتا ہوگا۔ حیات محمد کا کہنا تھا کہ وہ رحیم داد کو بھول جائے۔ اس کا خیال دل سے نکال دے۔ اسے مردہ سمجھ لے۔ مگر لالی کے لیے یہ ممکن نہ تھا۔

وہ رحیم داد کو بھولنا بھی چاہتا تو بھول نہیں سکتا تھا۔ اس نے رحیم داد سے ہر حال میں مدد کرنے کا عہد کیا تھا اور وہ اپنا یہ عہد پوری نیک نیتی سے نباہنا چاہتا تھا۔ لیکن میاں حیات محمد خاں وٹو کی قید میں رہ کر وہ رحیم داد کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس رحیم داد کی تلاش میں سرگرداں تھی اور رحیم داد کے مخالف اسے قتل کرنے کے لیے گھات میں لگے تھے۔ لالی کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے؟

☆

رات کے گیارہ بجے وہ معمول کے مطابق دھیور کے ہم راہ تہ خانے کے دروازے پر پہنچا۔ اس وقت بھی میاں حیات محمد کا کمرہ خالی تھا۔ لالی تہ خانے کے اندر گیا۔ بوڑھے ریاض نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ چپ چاپ انجکشن لگوایا اور سونے کے لیے فرش پر لیٹ گیا۔

لالی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ خلاف معمول تہ خانے کے دروازے کا ایک پٹ زرا سا کھلا ہے۔ وہ بھونچکا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں حیات محمد کی آواز خاموشی میں ابھری۔

"دھیور کمرے کے باہر کھڑا ہے۔ تہ خانے کا دروازہ بند کردے اور میرے پاس چلا آ۔"

لالی تہ خانے کا دروازہ بند کر کے حیات محمد خاں وٹو کے پاس چلا گیا۔ وہ مدھم روشنی میں صوفے کی پشت سے سر ٹکائے اس طرح بیٹھا تھا کہ دور سے نظر نہ آتا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں سامنے رکھی ہوئی میز پر پھیلی تھیں۔

وہ اس وقت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے جوتوں کے تلووں میں تازہ تازہ مٹی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ بھی تہ خانے میں گیا تھا اور غالباً" اس وقت گیا تھا' جب لالی گردن جھکائے ریاض کے جسم میں انجکشن لگا رہا تھا۔ لالی فوراً بھانپ گیا کہ حیات محمد بھی نہایت رازداری سے اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا ہے۔

حیات محمد وٹو کا سیاہ السیشن قریب ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ حیات کی آنکھیں نشے سے چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے لالی سے پوچھا۔ "اس پاگل نے تجھے تنگ تو نہیں کیا؟"

لالی نے جھٹ بتایا۔ "نہیں میاں جی' بالکل تنگ نہیں کیا۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے حیات محمد کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "ویسے تو جی وہ پاگل لگتے نہیں۔"

"نہیں۔" میاں حیات نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ پاگل ہی ہے۔ تجھے جلد ہی پتہ چل جائے گا۔"

لالی نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا۔ "سمجھ نہیں آتی جی۔"

"اس کے ساتھ تیری بات چیت تو نہیں ہوئی؟"

"انھوں نے جی بات کرنے کی کوشش تو بہت کی' پر میں بولا ہی نہیں۔ بالکل چپ رہا۔ اب تو جی وہ بھی نہیں بولتے۔ چپ کر کے انجکشن لگوا لیتے ہیں۔" لالی نے میاں حیات کی طرف نظریں اٹھائیں۔ "میں جی آپ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے' تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

لالی نے ایک بار پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میاں جی' آپ تہ خانے میں بھی گئے تھے؟"

حیات نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔ "تجھے کیسے پتہ چلا' میں تہ خانے میں گیا تھا؟"

لالی نے اس کے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے جوتوں میں جی ابھی تک تہ خانے کی کچی زمین کی مٹی لگی ہے۔ آج تہ خانے کا دروازہ بھی کھلا تھا' دھیور بھی دروازے پر نہیں تھا۔"

"تو دیکھنے میں جتنا گھامڑ لگتا ہے' اتنا ہے نہیں۔" حیات نے مسکرا کر کہا۔ "خاصا تیز ہے۔ عادی مجرم جو ٹھیرا۔"

لالی نے ہاتھ باندھ کر انکساری کا اظہار کیا۔ "میاں ساب' میں آپ سے بہت ڈرتا ہوں۔ اتنا تو کبھی پولیس سے بھی مجھے ڈر نہیں لگا۔"

میاں حیات نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی ٹھیک ہی ہوا کہ تجھے یہ معلوم ہو گیا کہ میں خفیہ طور پر معائنہ کرنے تہ خانے میں گیا تھا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا' یہ بات تجھے معلوم ہو جائے تاکہ تو آئندہ بھی اسی طرح احتیاط سے کام لے۔"

"جیسا آپ حکم کریں گے جی' ویسا ہی کروں گا۔"

"میں چاہتا ہوں' تو اس پاگل سے بالکل بات نہ کر۔" حیات محمد تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "وہ بات بھی کرے تو سختی سے روک دے۔ ضد کرے تو منہ پر تھپڑ مار کر اس کی زبان بند کردے۔ وہ پاگل پن میں الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تو ایسی باتیں نہ سن۔ ان پر بالکل دھیان نہ دے۔ میں ایک بار فیر تجھے خبردار کرتا ہوں' میرے اس حکم پر سختی سے عمل کرنا۔ ٹھیک اسی طرح

جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ سمجھ گیا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" لالی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "فکر نہ کریں جی۔"

"امید تو یہی ہے تو ایسا ہی کرے گا۔ تو خاصا تیز اور ہوشیار ہے اور کوئی ہوشیار بندہ جانتے بو گڑھے میں گرنے کی کوشش نہیں کرتا۔"

کمرے کی خاموشی میں صرف ائیرکنڈیشن کے دھیرے دھیرے غرانے کی آواز ابھرتی رہی۔ حیات نے نظر بھر کر لالی کو دیکھا۔ "میں صبح گورنر کے ساتھ شکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ شام کو واپسی ہو، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے پروگرام لمبا ہو جائے۔ دو تین روز بعد واپس آؤں۔ میری غیر حاضری میں کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہونا چاہئے۔" اس نے قریب رکھی ہوئی بڑی میز کی دراز کھولی، سو روپے ایک نوٹ نکالا اور اسے لالی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ رکھ لے۔ ویسے جس چیز کی ضرورت ہو دھیورے سے منگوا لینا۔"

لالی نے نوٹ لے کر کہا۔ "ساب، ویسے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ پر میرے پاس کپڑے بالکل نہیں، جو ہیں بہت میلے ہو چکے ہیں۔ دھونے سے بھی صاف نہیں ہوتے۔ میرے لیے کمیص شلوار بنوا دیجئے۔ برسوں سے شہر میں رہتا ہوں۔ ایسے ہی کپڑے پہنتا ہوں۔"

میاں حیات محمد نے غور سے لالی کا لباس دیکھا۔ "ہاں، تیرے کپڑے بہت گندے ہیں۔ میں شکار پر روانہ ہونے سے پہلے دھیورے سے کہتا جاؤں گا وہ تیرے لیے نئے کپڑے سلوا دے گا۔ بنگلے میں درزی موجود ہے۔ وہ کل تیرے پاس آ جائے گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اور کوئی بات؟"

"کمرے میں پڑے پڑے جی بہت گھبراتا ہے۔ دھیور بنگلے سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتا۔ وہ تو اتنی سختی کرتا ہے، کھڑکی پر کھڑا ہو جاتا ہوں تو گردن سے پکڑ لیتا ہے۔ میرا مطلب ہے۔"

"میں تیرا مطلب سمجھ گیا۔" حیات نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "ابھی تو بنگلے سے باہر نہیں جا سکتا۔ تیری کچھ دنوں اور اسی طرح سختی سے نگرانی ہوگی۔"

"جیسی آپ کی مرضی جی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تو اس معاملے میں کچھ نہ کہہ۔ ٹھیک ٹھاک رہے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تو یہاں محفوظ بھی رہے گا اور آرام سے بھی رہے گا۔ میں تیری تنخواہ بھی لگا دوں گا اور بھی تیرے لیے بہت کچھ کروں گا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہوگا جب تو آزمائش پر پورا اترے گا۔ جیسا میں کہوں گا تجھے ٹھیک ویسا ہی کرنا ہوگا۔" لالی گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات ذرا

دیر چپ بیٹھا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "کوئی اور ضرورت ہو تو صاف صاف بتا دے۔ نشہ وشہ تو نہیں کرتا؟"

"کرتا تو ہوں جی!" لالی نے دبی زبان سے اظہار مدعا کیا۔ "پر بہت دنوں سے بالکل نشہ پانی نہیں کیا۔ سگریٹ بھی پینے کو نہیں ملی۔"

میاں حیات مسکرا کر بولا۔ "مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے یہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب تیری یہ ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ دروازہ کھول، اندر جا۔ جو بوتل پسند آئے اٹھا لے۔ سگریٹ کل مل جائے گی۔"

لالی خاموشی سے آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا، اندر گیا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرہ نہایت کشادہ تھا۔ جگہ جگہ قیمتی صوفے پڑے تھے۔ فرش پر نرم نرم قالین بچھا تھا۔ ہر طرف ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ ایک گوشے میں نہایت شاندار بار تھا۔ شیشے کی الماریوں میں قسم قسم کی شراب کی بوتلیں تھیں، کنستر تھے۔ ہر رنگ کی شراب تھی اور ہر وضع کی بوتل۔ اسکاچ وہسکی تھی۔ عام وہسکی بھی اور ڈی لکس بھی۔ جونی واکر، ہیگ، اولڈ اسمگلر، وہائٹ ہارس، ڈمپل، بلیک ڈاگ، شیواز ریگل، جونی واکر بلیک لیبل، رائل سیلوٹ۔ وہسکی کے علاوہ شیمپین تھی، شیری تھی، مارٹینی تھی، ووڈکا تھی، جن تھی، پورٹ تھی، رم تھی، ہر طرح کی برانڈی اور کونیک تھی۔ خوشنما بلوری کنستروں میں فرانسیسی وائنز، شیلیس تھورن، شیلیس اروت تھی۔ بلیوتن تھی۔ لالی گھبرائی ہوئی نظروں سے ہر سمت دیکھتا تھا۔ کبھی ادھر نظر ڈالتا، کبھی ادھر۔ اس کے لیے انتخاب کرنا مشکل ہو گیا۔ آخر اس نے اسکاچ وہسکی کی ویسی ہی بوتل اٹھالی جیسی اس نے حیات محمد کی میز پر دیکھی تھی۔ بوتل عام سائز کی بوتلوں سے بڑی بھی تھی۔

وہسکی کی بوتل ہاتھ میں دبائے وہ واپس آیا۔ میاں حیات نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "جا سو جا کر۔ آگے تیرے نشے پانی کا بندوبست دھیور کر دے گا۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ تو شراب پی کر کبھی میرے سامنے نہیں آئے گا۔ نہ نشے کی حالت میں کوئی گڑبڑ کرے گا۔" اس نے پیچھے دیوار پر کھونٹی سے لٹکے ہوئے چمڑے کے ہنٹر کو ہاتھ بڑھا کر زور سے کھینچا اور اونچی آواز سے ڈپٹ کر کہا۔ "کبھی ایسا ہوا تو چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔" لالی سہما ہوا خاموش کھڑا رہا۔

کمرے کی خاموشی میں حیات کی آواز ابھری۔ "جا، باہر دھیور تیرا انتظار کر رہا ہے۔"

لالی زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر کمرے سے چلا گیا۔ دھیور دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے لالی

کے ہاتھ میں دبی ہوئی وہسکی کی بوتل حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھی۔ مگر بالکل چپ رہا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ لالی نے اپنے کمرے میں پہنچ کر بوتل ایک کونے میں رکھ دی۔ وہ بہت سہا ہوا تھا۔ خاموشی سے بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ صبح دن چڑھے اٹھا۔ رات کو دیر سے سونے کے باعث اب وہ دیر ہی سے بیدار ہوتا تھا۔

☆

دروازے کے پیچھے سے چیخنے چلانے کی آوازیں' رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لالی کو سخت حیرت ہوئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے تہہ خانے کے اندر داخل ہوا۔ زینے سے اتر کر نیچے پہنچا۔ سامنے بوڑھا ریاض بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی آنکھیں نکال کر بولا۔ "آگیا کتا میری ہڈیاں چچوڑنے۔" لالی کو تعجب تو ہوا مگر بالکل خاموش رہا اور آہستہ آہستہ ریاض کی جانب بڑھنے لگا۔ ریاض محمد خاں وٹو نے لالی کو اپنی جانب آتے دیکھا تو زور سے چیخا۔ "ہٹ جا میری نظروں کے سامنے سے' حرام کے تخم!"

لالی اس کے رویے میں یہ اچانک تبدیلی دیکھ کر بہت سٹپٹایا۔ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ میاں ریاض اور زیادہ غضب ناک ہو کر چلایا۔ "بے غیرت' دلے! میں تیری منحوس صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔" اس نے جھٹ سامنے رکھی ہوئی المونیم کی پلیٹ اٹھا کر ماری۔ پلیٹ لالی کے ماتھے پر کھٹاک سے لگی۔ ساتھ ہی ریاض کی آواز ابھری۔

"دفع ہو جا یہاں سے۔"

لالی چوٹ کھا کر تلملا اٹھا۔ غصے سے بے قابو ہو کر بوڑھے پر جھپٹا۔ اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مار کر چیخا۔ "اوئے چپ کر کے کھڑا ہو جا۔" اس نے ریاض کی گردن ایک ہاتھ سے دبوچی اور جھٹکا دے کر کھڑا کر دیا۔

ریاض محمد خاں اپنی گردن بے بسی سے ادھر ادھر جھٹک کر چلانے لگا۔ "مار دے مجھے' جان سے مار دے۔"

لالی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ میاں ریاض محمد زمین پر گر کر ہانپنے لگا۔ لالی نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ الماری سے سرنج نکالی۔ دوا بھری اور قریب بیٹھ کر ریاض کا بازو اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس نے نہ مزاحمت کی نہ چیخا۔ خاموشی سے انجکشن لگوا لیا۔ جب واپس جانے لگا تو لالی نے گہری گہری سانسوں کی سرسراہٹ سنی۔ پلٹ کر دیکھا' بوڑھا ریاض دونوں گھٹنوں پر سر رکھے سسکیاں بھر رہا ہے۔ اسے روتے دیکھ کر لالی کے دل کو ٹھیس لگی۔ وہ اداس ہو گیا۔

لالی تہہ خانے سے باہر نکلا اور دھیور کے ہم راہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ آج کے واقعے کے در ریاض اس کے لیے معمہ بن گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اسی روپ میں نظر آیا' جو اس نے حیات محمد کے ساتھ پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے سوچا حیات محمد ٹھیک ہی کہتا ہے۔ میاں ریاض واقعی پاگل ہے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر لالی بستر پر لیٹا ہی تھا کہ درزی آ گیا۔ اس کا قد اونچا تھا۔ چہرے پر سفید کھچڑی داڑھی تھی۔ اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ نہ مسکرایا نہ نظر ملائی۔ گردن جھکائے مختلف زاویوں سے لالی کے جسم کی ناپ لیتا رہا۔ لالی نے اس کی خاموشی پر ہنس کر بے تکلفی کا اظہار کیا۔ "بابے تو بھی گونگا ہے؟"

درزی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی نے کہا۔ "ایک قمیض اور شلوار تو فٹافٹ تیار کر دے۔ دیکھ تو میرے کپڑے کتنے گندے ہو رہے ہیں۔" درزی پھر بھی خاموش رہا۔ لالی کی جانب دیکھے بغیر چپ چاپ کمرے سے باہر چلا گیا۔

سہ پہر کو دھیور دیسی شراب کا ادھا اور سستے برانڈ کی سگریٹوں کے کئی پیکٹ لایا۔ لالی کے حوالے کیئے اور دروازے کے باہر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ لالی نے ادھا بھی وہسکی کی بوتل کے پاس رکھ دیا۔

دن گزرا' جھٹپٹا ہوا تو لالی کا دل مچلا۔ اس نے وہسکی کی بوتل اٹھائی۔ اسے آنکھوں کے سامنے کیا۔ مسکرا کر ہونٹوں سے چوما۔ بوتل کھولی' ناک سے لگا کر سونگھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے وہسکی گلاس میں انڈیلی' پانی ڈالا اور گلاس سامنے رکھ لیا۔ دھیور خاموش بیٹھا لالی کو دیکھتا رہا۔ لالی نے دھیور کی جانب دیکھا۔ گلاس اٹھا کر اس کے قریب پہنچا۔ مسکرا کر گلاس اس کے سامنے کیا۔

"لے یار تو بھی ذرا سی لگا لے۔ ولایتی شراب ہے۔ فسٹ کلاس چیز ہے۔ مزا آ جائے گا۔"

دھیور اس حرکت پر لالی سے ذرا بھی خفا نہیں ہوا۔ صرف انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگا۔ لالی نہ مانا۔ بار بار گلاس دھیور کی طرف بڑھاتا رہا۔ جب مسلسل اصرار کے باوجود دھیور پینے پر رضامند نہ ہوا تو لالی نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "یار اگر تو نہیں پئے گا تو میں نے بھی نہیں پنی۔" اس نے شراب پھینکنے کے لیے ہاتھ موڑا' دھیور جھٹ اپنی جگہ سے اٹھا۔ مسکرایا اور گلاس لالی کے ہاتھ سے لے کر غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔

لالی اس قدر خوش ہوا کہ اس نے بے ساختہ دھیور کا منہ چوم لیا۔ دھیور نے خلاف معمول اس

بے تکلفی پر نہ لالی کو گھورا نہ مارنے کے لیے جھپٹا' بلکہ کھل کر مسکرانے لگا۔ اس نے گلاس لالی کی طرف بڑھایا۔ لالی نے بھی تھوڑی سی وہسکی پی۔

ذرا دیر بعد دونوں لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اطمینان سے فرش پر بیٹھے شراب نوشی کر رہے تھے۔ دھیور بھی اپنا گلاس اٹھا لایا تھا۔ دونوں وہسکی کی چسکی لگا رہے تھے۔ گلاس ٹکرا رہے تھے۔ بے تکلفی سے ہنس رہے تھے۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رات آہستہ آہستہ اپنا دامن پھیلا رہی تھی۔ دونوں دیر تک وہسکی سے شغل کرتے رہے۔ انھوں نے آدھی سے زیادہ بوتل ختم کر دی۔ کھانا بھی ساتھ بیٹھ کر کھایا اور دیر سے کھایا۔

گیارہ بجے دھیور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی کی جانب دیکھا اور چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں راہ داری میں داخل ہوئے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ہلکی نیل گوں روشنی میں ہر چیز خواب میں تیرتی نظر آتی تھی۔ ان کی آنکھیں نشے سے مخمور تھیں۔

دھیور کچھ زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ اس نے بے تکلفی سے لالی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ دونوں جھومتے جھامتے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک دم سنبھل گئے۔

کمرہ خالی تھا۔ حیات محمد ابھی شکار سے واپس نہیں آیا تھا۔ دھیور نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا۔ لالی سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ اس کے قدم نشے سے کسی قدر لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ تہہ خانے میں پہنچا تو بوڑھے ریاض محمد خاں وٹو کی آواز ابھری۔

"آ گیا تو؟ میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ریاض نے اس کی نشے سے چڑھی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ "اچھا تو یہ رنگ ہے۔ کتنی پی؟" لالی پھر بھی نہ بولا۔ ریاض نے ایک بار پھر اسے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور دوپہر والے شوریدہ سر ریاض سے بالکل مختلف تھا۔ لالی کو خاموش دیکھ کر ریاض نے نرم لہجے میں کہا۔ "میرے پاس بیٹھ جا۔ لگا دینا انجکشن۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" مگر لالی بدستور کھڑا رہا۔ ریاض مسکرایا۔ "ڈر کیوں رہا ہے؟ بیٹھ جا۔ میں تجھے کاٹ نہیں کھاؤں گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "تیرے پاس سگریٹ تو ہو گی؟"

لالی نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں۔"

"تیرا نام کیا ہے؟"

"لالی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو مجھے آباد کار نہیں لگتا۔" بوڑھے ریاض نے اسے غور سے دیکھا۔ "دیکھنے میں تو جانگلی لگتا ہے۔ تو جانگلی ہے نا؟"

"میری ماں بھی یہی کہتی تھی۔"

"تو رہنے والا کہاں کا ہے؟"

"گوگیرہ کے نزدیک اپنا پنڈ ہے جی۔ پر میں زیادہ تر لہور میں رہا۔"

"تب تو تو اسی ضلعے کا ہوا۔" ریاض نے مسکراتے ہوئے لالی کو دیکھا۔ "مگر تو لہور میں رہ کر بھی بڑے لڑتی لگتا ہے۔ شراب پی کر تو اپنی آنکھوں سے اور بھی زیادہ خوف ناک ڈے لڑ لگتا ہے۔" اس نے آنکھ مار کر سرگوشی کی۔ "یہ بتا تو کس چکر میں یہاں آ گیا؟"

لالی اس کی بات ٹال گیا۔ خاموشی سے الماری کے پاس گیا اور دوا سے بھری ہوئی سرنج نکال کر ریاض کے پاس واپس آ گیا۔ وہ انجکشن لگانے کے لیے اس کے نزدیک بیٹھا تو ریاض نے کہا۔

"ٹھیک سے بیٹھ جا۔ آرام سے لگا دینا انجکشن۔ مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں۔"

"پر مجھے تو جلدی ہے۔" لالی نے کسی قدر بے رخی سے کہا۔ "نیند آ رہی ہے' جا کر سو جاؤں گا۔"

"نیند آ رہی ہے تو یہیں سو جا۔ ایک دن تو' تجھے یہاں سونا ہی ہو گا۔"

لالی اس کی بات سن کر چونکا۔ "کیوں؟" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"ہر نیا آنے والا یہی بات پوچھتا ہے۔ میں اسے جواب دیتا ہوں تو وہ یقین نہیں کرتا۔ تو بھی میری بات پر یقین نہیں کرے گا۔ ایسی بات پوچھنے سے کیا فائدہ جس پر یقین نہ آئے۔" ریاض کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔ اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔

لالی اور پریشان ہو گیا۔ گھبرا کر بولا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے' بابے تو پاگل شاغل نہیں ہے؟" ریاض صرف مسکرا کر رہ گیا۔ مگر یہ مسکراہٹ نہیں تھی' زہرخند تھا۔ لالی نے اصرار کیا۔ "بابے' کیا تو سچ مچ پاگل نہیں ہے؟"

"یہ سوال نہ کر۔ تیری زندگی اور مختصر ہو جائے گی۔" ریاض نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جس نے بھی مجھ سے یہ سوال کیا' وہ کچھ ہی دنوں بعد غائب ہو گیا۔ فیر یہاں نہیں آیا' اس کی لاش آئی۔ یہ جگہ سے کھدی ہوئی زمین دیکھ رہا ہے؟" اس نے تہہ خانے کے فرش کی جانب اشارہ کیا۔ "یہاں ان کی لاشیں دبی ہیں۔ اب تک ایسی تین لاشیں یہاں دبائی جا چکی ہیں۔ پچھلے چار مہینے سے

یہی تماشا دیکھ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تو چوتھی لاش بن کر یہاں نہ آئے اور مجھے بھوت بن کر رات کی تنہائی میں نہ ڈرائے۔" اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ چہرے پر وحشت طاری ہو گئی۔ "ہر رات جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو یہ بھوت اپنی کٹی ہوئی گردنیں اور زخمی سینے لے کر خون میں لتھڑے ہوئے یہاں آتے ہیں۔ ہنستے ہیں' ناچتے ہیں' شور مچاتے ہیں۔ کبھی میری گردن مروڑتے ہیں۔ کبھی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتے ہیں۔ میں ڈر کر چیختا ہوں تو حیات آجاتا ہے۔ مجھے ہنٹر سے سڑاک سڑاک مارتا ہے۔ یہ دیکھ میری پیٹھ۔" اس نے کرتا اٹھا کر اپنی برہنہ پیٹھ لالی کے سامنے کر دی۔

ریاض کی پیٹھ اور کمر پر لمبی لمبی سیاہ دھاریاں اور بلٹیں پڑی تھیں۔ لالی نے یہ بھی دیکھا کہ تہہ خانے کا کچا فرش جگہ جگہ سے کھدا ہوا ہے۔ لالی نے گنا' فرش تین جگہ سے ادھڑا ہوا ہے۔ گویا ریاض ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ لالی کسی ان جانے خوف سے لرز کر رہ گیا۔ اس نے سرنج ایک طرف رکھی اور ریاض کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر کسی قدر عاجزی سے بولا۔

"بابے! یہ تو بتا' یہ سب چکر کیا ہے؟"

"تو زیادہ دیر یہاں ٹھیرے گا تو حیات آجائے گا۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تو میرے ساتھ تیری چمڑی بھی ادھیڑ ڈالے گا۔"

لالی نے جھٹ کہا۔ "وہ تو شکار پر گئے ہیں جی! کل یا پرسوں آئیں گے۔" اسے فوراً دھیور کا خیال آیا۔ لالی کو اس سے بھی خطرہ تھا۔

وہ میاں ریاض سے کچھ کہے بغیر اٹھا اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچا۔ دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ کمرہ ہنوز خالی ہے۔ دھیور دروازے کے قریب فرش پر بے خبر سو رہا تھا۔

لالی تہہ خانے میں واپس پہنچا۔ ریاض نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تو اچانک کہاں چلا گیا تھا؟"

"میں دھیور کو دیکھنے گیا تھا جی۔"

دھیور کا نام سن کر بوڑھے ریاض کا چہرہ مکدر ہو گیا۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "وہ نمک حرام' حیات کا پالتو کتا ہے۔ اس کے پاس دو کتے ہیں۔ ایک السیشن دوسرا دھیور۔ ہر قتل کے لیے وہ انھی کو استعمال کرتا ہے۔ حیات بیرسٹر بھی ہے۔ ہر جرم میں اپنا ہاتھ صاف رکھتا ہے۔ قانون کو پوری طرح جانتا ہے نا۔"

"پر ابھی تو دھیور سو رہا ہے۔ اس نے بھی میرے ساتھ ہی پی تھی اور زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ اب نشے میں دھت پڑا ہے۔" لالی نے مطلع کیا۔

بوڑھے ریاض محمد وٹو نے دریافت کیا۔ "تجھے ٹھیک سے پتہ ہے حیات آج رات شکار سے نہیں وٹے گا۔"

"مجھ سے تو جی پچھلی رات انھوں نے یہی بتایا تھا' شام کو نہ لوٹے تو دو تین روز بعد واپسی ہو گی۔"

میاں ریاض محمد خاں نے لالی کی بات سنی تو گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لالی زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بے قرار تھا۔ اس نے بوڑھے ریاض کو کریدا۔

"میاں ساب' آپ کے جی سگے بھائی ہیں؟"

"ہاں۔" ریاض نے مختصر جواب دیا۔ وہ ابھی تک سوچتا ہوا نظر آرہا تھا۔

لالی نے اس کی خاموشی سے اکتا کر استفسار کیا۔ "پر انھوں نے آپ کو یہاں تہہ خانے میں کیوں ڈال دیا؟ کوئی بات تو ہو گی۔"

"تو بھی سن لے۔ کوئی لمبی چوڑی داستان نہیں' پر تو نہ سن تو اچھا ہے۔" اس نے چوکنا نظروں سے زینے کی جانب دیکھا۔ خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ "تجھے پورا یقین ہے' حیات آج شام واپس نہیں آیا اور دھیور نشے میں مدہوش سو رہا ہے۔"

"میں جی کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔ ابھی آپ کے سامنے ہی تو دیکھ کے آیا ہوں۔" لالی کھسک کر ریاض کے اور قریب ہو گیا اور اپنی بے چینی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے کچھ تو بتائیے جی۔ سمجھ نہیں آتی' یہ سارا چکر کیا ہے؟ سوچتے' سوچتے تھک گیا۔ اپنا تو بھیجا کام نہیں کرتا۔"

"بات صرف اتنی ہے۔ حیات جب بہت چھوٹا تھا۔ مشکل سے دو سال کا رہا ہو گا کہ ماں فوت ہو گئی۔ سال بھر بعد پیو بھی نہ رہے۔ میری پہلی گھر والی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ میں نے حیات ہی کو اپنی اولاد سمجھا' اور اولاد ہی کی طرح اسے پالا پوسا۔ وہ میرا اکلوتا بھائی ہے۔ مجھ سے لگ بھگ ۲۰ برس چھوٹا ہے۔ میری کوئی بہن بھی نہیں۔ میری تمام جائیداد کا وارث حیات ہی تھا۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ ساری جائیداد کا وارث وہی بنے گا۔"

لالی نے اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے لقمہ دیا۔ "ویسے بھی جی آدھی جیداد تو ان کی بنتی ہے۔"

"نہیں' ایسی کوئی گل بات نہیں۔" میاں ریاض نے فوراً وضاحت کی۔ "یہ جائیداد مجھے اپنے پیو سے ورثے میں نہیں ملی۔ وہ تو بہت معمولی زمیں دار تھے۔ ان کے پاس ۱۲۵ ایکڑ سے بھی کم اراضی تھی۔ ان کو زمیں داری سے کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے' میں پولیس میں بھرتی

ہو جاؤں یا پٹواری لگ جاؤں۔ اسی لیے انھوں نے مجھے مڈل تک تعلیم دلوائی۔" اس نے اپنا ماضی کریدتے کریدتے ٹھنڈی سانس بھری۔ "مگر انھوں نے جو چاہا' وہ نہ ہوا۔ ہوتا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔" میاں ریاض محمد نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ "یہ اتنی وڈی جاگیر میں نے اپنی صلاحیت اور محنت سے حاصل کی ہے۔"

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ ریاض محمد خاں وٹو بتاتا رہا۔ "فیر ایسا ہوا کہ میں نے دوسرا ویاہ کر لیا۔ تب تک میں اس جائیداد کا مالک نہیں تھا۔ منیجر لگا ہوا تھا۔ دوسری گھر والی سے میرا پتر نیاز پیدا ہوا۔ حیات تب جوان تھا۔ ان دنوں وہ لہور میں پڑھتا تھا۔ جب یہ جاگیر میری ہو گئی تو وہ بھی ادھر ہی آ گیا۔ زمیں داری کی دیکھ بھال میں میرا ہاتھ بٹانے لگا۔ سچ پوچھو تو ساری ہی ذمہ داریاں میں نے اسے سونپ دی تھیں۔ اب نیاز بھی کچھ لمبا ہو گیا تھا اور سکول میں پڑھتا تھا۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا۔ "پر حیات اس سے خوش نہ تھا۔ خار کھاتا تھا۔ پریشان رہتا۔ میں نے جلد ہی اس کی پریشانی کا سبب جان لیا۔"

"وہ پریشانی کیا تھی جی؟" لالی بیچ میں بول پڑا۔

"سیدھی سادی گل ہے۔" ریاض نے لالی کو مطلع کیا۔ "نیاز کے ہوتے ہوئے حیات میری جائیداد کا وارث کیسے بن سکتا تھا۔ میں نے حیات کی پریشانی کا علاج یہ نکالا کہ اسے اپنے دوست کرنل جانسن کے پاس پڑھنے کے لیے لندن بھیج دیا۔ یہ جاگیر اور تمام فارم شارم پہلے کرنل جانسن ہی کی ملکیت ہوتے تھے۔"

"پر جی' یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ کرنیل نے اتنی وڈی جگیر کیسے دے دی؟" لالی ایک بار پھر بیچ میں بول پڑا۔ "دیکھو نا جی' کوئی اپنی جیداد کسی کو کیسے دے سکتا ہے؟" اس نے نشے کی ترنگ میں لہرا کر بے تکلفی سے آنکھ ماری۔ "کوئی اونچا ہی چکر چلایا ہو گا۔"

"بکواس نہ کر۔" میاں ریاض محمد نے لالی کو غصے سے ڈانٹا۔ "بیچ میں بولے گا تو میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" وہ روٹھنے کے انداز میں منہ موڑ کر بیٹھ گیا۔

مگر لالی نے اسے خاموش نہ رہنے دیا۔ ریاض کا گھٹنا چھو کر گڑگڑانے لگا۔ "غلطی ہو گئی جی۔ اب نہیں بولوں گا۔"

لالی نے منت سماجت کر کے میاں ریاض کو منا لیا۔ وہ بتانے لگا۔ "میں چاہتا تھا حیات بہت تعلیم حاصل کرے۔ اسے بچپن میں ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ وہ ڈاکٹری پڑھنے لندن چلا گیا۔ پر ڈاکٹری پڑھتے' پڑھتے اچانک اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ مجھے لکھا کہ بیرسٹری پڑھوں گا۔ میں نے اسے خوشی

سے اجازت دے دی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "بیرسٹری کو میں نے یوں بھی پسند کیا کہ میں چاہتا تھا وہ بیرسٹر بن کر سیاست میں حصہ لے۔ اسمبلی کا ممبر بنے۔ وزیر بنے۔ گورنر لگے۔ سارے ہی سیاست داں عام طور پر وکیل یا بیرسٹر ہی ہوتے ہیں۔"

"فیر ایہہ گل بھی تو ہے۔" لالی نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔ "بیرسٹری کے ساتھ' ساتھ وہ سیاست میں لگ جاتے تو جگیر اور جیداد کی طرف ان کا دھیان ہی نہ جاتا۔ ورثے کی سوچتے اور نہ نیاز سے خار کھاتے۔" لالی نے داد طلب نظروں سے ریاض کو دیکھا۔ "میں نے غلط تو نہیں سوچا جی؟"

"تیرا خیال ٹھیک ہے۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" میاں ریاض نے اس دفعہ لالی کی مداخلت پر خفگی کے بجائے تائید کی۔ "ویسے یہ بھی ہے کہ اپنی برادری کے کئی زمیں دار سیاست میں ہیں۔ پچھلے صوبائی الیکشن میں' جو ۱۹۵۱ء میں ہوئے تھے' ادھر سے میاں خدا یار خاں وٹو جیتا تھا۔ اس کے سسر خاں بہادر میاں نواز احمد خاں مانیکا کا نام تو' تو نے بھی سنا ہو گا۔ اپنی ہی قوم کا بندہ ہے۔"

"نہیں جی' میں اسے نہیں جانتا۔" لالی نے گردن ہلا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"حد ہو گئی۔ تو اسے نہیں جانتا۔ اسے تو سب ہی جانتے ہیں۔" ریاض نے حیرت زدہ ہو کر کہا "خاں بہادر نور احمد مانیکا' پاک پتن کا بہت وڈا زمیں دار ہے۔ وہ تو پاکستان بننے سے بھی پہلے پنجاب اسمبلی کا ممبر رہ چکا ہے۔"

"وہ تو جی مانیکا ہوا اور تم ٹھہرے وٹو۔ فیر وہ تمھاری کوم کا کیسے ہوا؟"

"مانیکا بھی وٹو ہی ہوتے ہیں۔" ریاض نے لالی کو بتایا۔ "سارے ہی وٹو دراصل سورج بنسی راجپوت ہیں۔ پہلے ہندو ہوتے تھے۔ کہتے ہیں بابا فرید گنج شکر نے انھیں مسلمان بنایا تھا۔ اور اب تو بابا فرید کے خاندان سے وٹوؤں کی رشتہ داری بھی ہو گئی ہے۔ خاں بہادر میاں نور احمد مانیکا کی ایک دھی' بابا فرید کے گدی نشین دیوان غلام قطب الدین چشتی سے ویاہی ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مانیکا' کالوکا' تیجے کا' ٹھاکر کا' لالیکا' وٹوؤں کی گوتیں ہیں۔ اور بھی نہ جانے کتنی ہیں۔ ہماری گوت کالوکا ہے۔"

"میرے ساتھ جیل میں ایک کیدی ہوتا تھا۔ وہ اپنے کو راجپوت بتاتا تھا۔" لالی نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "پر وہ سیال تھا۔ میاں نہیں چوہدری کہلاتا تھا۔"

"چوہدری اور ملک تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔" میاں ریاض محمد نے وضاحت کی۔ "چوہدریوں اور ملکوں کی کوئی ذات' کوئی برادری نہیں ہوتی۔ چوہدری اور ملک تو ایک طرح کا خطاب ہوتا ہے۔ لیکن میاں صرف راجپوتوں کا خطاب ہوتا ہے۔ ویسے تو اب آرائیں اور شیخ بھی خود کو میاں

کہلواتے ہیں۔ مگر اصل میں یہ اونچی ذات کے راجپوتوں کا خطاب ہوتا ہے۔ خاص طور پر پہاڑی علاقے کے راجپوت' جو یہاں ہوتے ہیں' اس معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ وہ کھیتی باڑی نہیں کرسکتے۔ اپنی دھی کسی نچلی ذات کے راجپوت کو نہیں ویاہ سکتے۔ نہ وہ اپنی دھی کے لیے روپیہ پیسہ لیتے ہیں۔ ان کی زنانیاں سخت پردہ کرتی ہیں۔ اگر کوئی میاں راجپوت خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ میاں نہیں رہتا۔ نچلے درجے کا راجپوت بن جاتا ہے۔ اس کو ہل باہ یا بالی کہا جاتا ہے۔ راجپوت تو چھتری ہوتے ہیں ناں۔ ان کی شان تو تلوار ہوتی ہے۔ وہ فوجی بننا پسند کرتے ہیں۔ میاں سب سے اونچی ذات کے راجپوت ہوتے ہیں۔ ان کے بعد رانا ہوتے ہیں۔ فیر ٹھاکر ہوتے ہیں۔ اور سب سے نچلے درجے کے راؤ ہوتے ہیں۔ وہ رانگھڑ کہلاتے ہیں۔ سیال' چوہان' جویا' مہر' ٹوانے اور راٹھور بھی راجپوت ہوتے ہیں۔ جنجوعہ بھی راٹھوروں ہی کی ایک گوت ہے۔"

میاں ریاض محمد کو عرصے سے کسی کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ لالی نے اسے کریدا تو بات سے بات نکلتی رہی۔ میاں ریاض ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ اپنی اور اپنی ذات برادری کی بڑائی جتانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر لالی اس کی باتوں سے جلد ہی اکتا گیا۔ اسے نہ راجپوتوں سے دلچسپی تھی' نہ دلوں سے اور نہ ان کی مختلف گوتوں سے۔ اسے صرف میاں حیات محمد سے دلچسپی تھی' جس نے اسے اپنے بنگلے میں اس طرح قید کردیا تھا کہ نہ وہ باہر نکل سکتا تھا اور نہ رحیم داد کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ لہٰذا میاں ریاض کی بات نظرانداز کرکے اس نے ایک بار پھر میاں حیات محمد کا ذکر چھیڑ دیا۔

"یہ تو بتائیں جی' میاں ساب نے بیرسٹری پڑھی یا اسے بھی ڈاکٹری کی طرح چھوڑ دیا؟"

"نہیں' وہ ۵ سال بعد بیرسٹر بن کر لندن سے واپس آگیا۔ لندن سے اپنے ساتھ میم بھی لایا تھا۔"

"میں نے تو جی یہاں کوئی میم شیم دیکھی نہیں۔"

"وہ تھوڑے ہی دنوں بعد انگلستان چلی گئی۔ فیر واپس نہیں آئی۔ میں نے حیات کا ویاہ کردیا۔ اس سے ایک بچی بھی ہے۔ مگر گھر والی حیات کے ساتھ نہیں رہتی۔ وہ بری کڑی نہیں ہے۔ پڑھی لکھی اور سمجھدار ہے۔ یہی کمینہ اور بدمعاش ہے۔ شراب کے نشے میں وحشت ہوکر اسے ہنٹر سے مارتا ہے۔ وہ لنگریالوں کی دھی ہے۔ اتنے اونچے گھرانے کی بیٹی کب تک اس کا ظلم برداشت کرتی' آخر روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی۔ کبھی کبھار آجاتی ہے۔" ریاض نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ "لندن سے واپسی کے بعد حیات نے کبھی بیرسٹری نہیں کی۔ میرے بار بار کہنے پر بھی اس نے

پریکٹس شروع نہیں کی۔ ہاں سیاست میں ضرور حصہ لینے لگا۔ مگر نہ وزیر لگا نہ گورنر اور نہ کبھی اسمبلی کی ممبری کی کوشش کی۔ وہ صرف بادشاہ گری کرتا ہے۔"

لالی نے ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر حیرت سے پوچھا۔ "یہ بادشاہ گری کیا ہوتی ہے جی؟"

"وہ یہ ہوتی ہے۔ کسی کو اسمبلی کا ممبر بنوا دیا' کسی کو وزیر لگوا دیا۔ کسی پارٹی کو اوپر کرا دیا کسی کو نیچے۔ کبھی اس ٹولے کے ساتھ' کبھی اس ٹولے کے ساتھ۔ کہتا ہے' اصلی سیاست یہی ہے۔ پیچھے بیٹھے ڈوری ہلاتے رہو۔"

"اپنا میاں ساب تو بہت اونچا کاری گر معلوم ہوتا ہے۔" لالی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ نشے کا ایک بار پھر ریلا آیا۔ لالی بہکنے لگا۔ "وہ فلم تو آپ نے دیکھی ہوگی جی' استاد چکرم' کیا زوردار فلم تھی۔" لالی نے نیم وا آنکھوں سے ریاض کو دیکھا اور جھوم کر اپنی بھونڈی آواز میں گنگنانے لگا۔ "آنکھیں شرابی' چہرہ گلابی۔"

ریاض نے غصے سے گھورا۔ "فیر تو نے بکواس شروع کردی۔"

لالی چونک پڑا۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔ "معاف کرنا جی! تھوڑی سی چڑھ گئی ہے۔" لالی نے منانے کے لیے ایک بار پھر اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ "اب نہیں بولوں گا جی۔ رب سوہنہ بالکل نہیں بہکوں گا۔"

"معلوم نہیں' میں کیا کہہ رہا تھا۔" ریاض کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا' پھر بولا۔ "یاد آیا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا' حیات سیاست میں چور دروازے سے حصہ لینے لگا۔ مگر وہ زمیں داری کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتا۔ فیر اس نے ایک بہت کمینی حرکت کی۔ ادھر ادھر یہ مشہور کردیا کہ نیاز میرا نہیں' کرنل جانسن کا پتر ہے۔"

لالی پھر بیچ میں بول پڑا۔ "یہ تو بہت شرم کی گل ہے جی! بہت بدنامی ہوئی ہوگی۔"

لالی کی مداخلت پر ریاض خفا نہیں ہوا' گہری سانس بھر کر بولا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے۔ نیاز کی ماں نے یہ بات سنی تو اسے اتنا دکھ ہوا کہ خودکشی کرلی۔ میں نے تب ہی سوچا تھا' حیات کو دھتکار کر نکال دوں۔ مگر وہ میرے پیر پکڑ کر رونے لگا۔ میں نے اسے معاف کردیا۔ پر نیاز نے معاف نہیں کیا۔ وہ مشکل سے ۱۹ سال کا تھا۔ لیکن اتنا ناراض ہوا کہ اس کا بس چلتا تو حیات کو گولی سے اڑا دیتا۔ وہ بہت سرکش اور ضدی ہے۔ میں نے سوچا' کسی روز چاچا بھتیجے میں گولی نہ چل جائے' نیاز کو پڑھنے کے لیے امریکہ بھیج دیا۔ اسے وہاں گئے ہوئے لگ بھگ ڈیڑھ سال ہوچکا ہے۔ ابھی سال بھر اور امریکہ میں تعلیم حاصل کرے گا۔"

"آپ نے جی! اپنے لیے یہ ٹھیک نہیں کیا۔"

ریاض بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا کرتا۔ کوئی اور رستہ بھی نہیں تھا۔ مگر سال بھر بعد میں نے اسے واپس بلانا چاہا۔ ہوا یہ کہ نیاز کے امریکہ جانے کے چند ہی مہینوں بعد میری پہلی گھر والی بھی مرگئی۔ میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ میں چاہتا تھا' میرا پتر میرے پاس رہے۔ لیکن حیات نے کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے اسے واپس نہ آنے دیا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں نے یہ بھی غور کیا کہ زمیں داری کے معاملوں میں حیات من مانی کرنے لگا تھا۔ میری ذرا پرواہ نہ کرتا۔ جو جی چاہتا' فیصلہ کرتا۔ مجھ سے دور دور رہتا۔ بلاتا تو نہ آتا۔ ٹال مٹول سے کام لیتا۔"

"آپ کو تو جی تب ہی ہوشیار ہوجانا چاہئے تھا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" بوڑھے ریاض نے لالی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے یہی غلطی ہوئی۔ کیا کرتا' بھائی کی محبت نے اندھا کردیا تھا۔" اس نے لالی کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ "انھی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک رات میں دیر سے واپس آرہا تھا۔ بنگلے سے کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر اندھیرے میں مجھ پر اندھادھند فائرنگ ہوئی۔ میں بال بال بچ گیا۔ البتہ میرا ایک کرندہ بری طرح زخمی ہوگیا۔ بعد میں پوچھ تاچھ کرنے پر پتہ چلا' مجھ پر یہ قاتلانہ حملہ حیات کے اشارے پر دھیور نے کیا تھا۔ دھیور کو تو میں نے ایسی سزا دی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ حیات کو جاگیر سے علیحدہ کردوں تاکہ اس کے دماغ سے وارث بن جانے کا خناس ہی نکل جائے۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اسے ہٹاتا' اس نے مجھے اپنے راستے سے' ہٹا دیا۔ لگ بھگ چار مہینے سے اس تہہ خانے میں بند ہوں۔"

"پر یہ چکر کب تک چلے گا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ وہ مجھے قتل بھی کرنا نہیں چاہتا۔"

لالی نے پوچھا۔ "کیوں؟"

"مجھے قتل کرنے سے ابھی اسے کیا ملے گا۔ میری جائیداد کا وارث حیات نہیں میرا پتر نیاز ہے۔ حیات میرے سامنے بار بار وصیت نامے کی دستاویز لے کر آتا ہے' جس کے ذریعے وہ چاہتا ہے میں نیاز کو عاق کردوں اور تحریری طور پر یہ تسلیم کرلوں' نیاز میرا نہیں کسی اور کا نطفہ ہے۔ اس طرح نیاز کو جائیداد سے محروم کرکے حیات کو اپنا وارث بنادوں۔"

"میں تو کہتا ہوں جی' آپ دستاویز پر دستخط کردیں۔ کید سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔ فیر عدالت میں جاکر کہہ دیجئے گا' مجھ سے زبردستی دستخط کرائے گئے تھے۔"

"وہ تیری طرح بیوقوف نہیں ہے۔ دستاویز پر دستخط کرتے ہی مجھے مار کر یہیں تہہ خانے میں دبا دے گا۔ وہ ایک سال پہلے کی دستاویز پر مجھ سے دستخط کرانا چاہتا ہے۔ وہ بیرسٹر ہے' بیرسٹر۔ قانون کو ہر معاملے میں سامنے رکھتا ہے۔"

ریاض نے اپنی بات ختم کی تو تہہ خانے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے بعد لالی نے کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا جی کہ آپ پاگل شاغل بالکل نہیں ہیں؟"

"ویسے تو اس نے مجھے پاگل ہی بنا رکھا ہے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ مدت بعد سچ مچ پاگل ہوجاؤں گا۔ کبھی کبھی مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑتا بھی ہے۔ میں بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا ہوں۔ تب مجھے کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا۔ جب سے حیات نے یہ انجکشن لگانے شروع کئے ہیں' اس وقت سے مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا ہے۔"

"یہ بات تو میں نے بھی نوٹ کی۔ مجھے بھی ان انجکشنوں کا ایسا ہی چکر لگتا ہے۔"

"ویسے تو مجھے ان سے نیند آجاتی ہے۔" ریاض ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ "انجکشن لگنے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے میں بادل کی طرح بالکل ہلکا پھلکا ہوگیا ہوں۔ کبھی تیز ہواؤں کی آوازیں سنتا ہوں' کبھی پانی کا شور۔ کبھی اوپر سے نیچے جاتا ہوں' کبھی خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ فیر میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوجاتی ہیں۔"

"نیاز کو ان باتوں کا پتہ ہے؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے' اسے کچھ نہیں معلوم۔ اسے معلوم ہوتا تو فوراً یہاں آتا اور مجھے قید سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ وہ ضرور ایسا کرتا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا' اسے یہ باتیں معلوم ہوں اور وہ چپ کرکے بیٹھا رہے۔ تمھی سوچو' یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ میرا پتر ہے' میرا اپنا خون ہے۔"

ریاض جذباتی ہوگیا۔

لالی بھی اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ "مجھے نیاز کا پتہ بتائیں جی۔ میں ساری باتیں خط کے ذریعے اسے بتادوں گا۔" لالی نے گرم جوشی سے ریاض کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا اور بڑے جوش سے یقین دلایا۔

"پروا نہ کریں جی' یہ کام تو میں ضرور کروں گا۔"

لالی کی بات سن کر ریاض پریشان ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ وہ انکار میں دونوں ہاتھ ہلا کر بولا۔ "نہیں' نہیں تو ایسا نہیں کرسکتا۔" وہ گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ "تجھ سے پہلے ان تینوں نے بھی ایسی ہی کوشش کی تھی۔ اب وہ اس تہہ خانے میں دفن ہیں۔ میں نے منع بھی کیا

مگر نہیں مانے۔ اب مجھے رات کی تنہائی میں اپنے کٹے ہوئے سر اور زخمی سینے دکھا کر ڈراتے ہیں۔"

ریاض کسی ان جانے خوف سے لرزنے لگا۔ "حیات تجھے ایسا نہیں کرنے دے گا۔ وہ خوں خوار چیتے کی طرح بہت چوکنا رہتا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔" یہ کہتے کہتے یکایک اس کے چہرے پر وحشت طاری ہو گئی۔ وہ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے زور سے چیخا۔

"دیکھ' وہ آگیا۔"

لالی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا' میاں حیات زینے کے پاس کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہنٹر تھا اور سرخ سرخ آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ خوں خوار نظروں سے دونوں کو گھورتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ اس کا سیاہ کتا بھی تھا۔ لالی ذرا دیر تو سہما ہوا خاموش بیٹھا رہا' مگر جب حیات اس کے قریب پہنچ گیا تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ حیات محمد نے گرج دار لہجے میں کہا۔ "بیٹھا رہ۔" لالی جہاں تھا' وہیں بیٹھا رہا۔

ریاض نے حیات سے نظریں نہیں ملائیں۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر کے گردن جھکا لی۔ حیات تیزی سے ریاض پر جھپٹا اور اسے ہنٹر سے سڑاک سڑاک مارنے لگا۔ بوڑھے نے بے بسی سے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ گڑگڑا کر بولا۔ "نہیں' نہیں۔" مگر حیات باز نہ آیا۔ گھما گھما کے ہنٹر چلاتا رہا۔ ریاض بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ خوف اور دہشت سے اس کا پیشاب نکل گیا۔ دونوں ٹانگیں شرابور ہو گئیں۔ فرش بھی گیلا ہو گیا۔ حیات نے ہاتھ روک لیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے لالی سے دریافت کیا۔

"انجکشن لگا دیا تو نے؟"

لالی نے آہستہ سے کہا۔ "ابھی نہیں۔"

"انجکشن لگا۔"

لالی نے خاموشی سے سرنج اٹھائی اور ریاض کی کمر میں انجکشن لگا دیا۔ ریاض فرش پر پڑا آہستہ آہستہ کراہتا رہا' گہری گہری سانس بھرتا رہا۔ جب لالی انجکشن لگا چکا تو حیات نے اس کے ہاتھ سے سرنج لے کر الماری میں رکھ دی اور لالی کو مخاطب کیا۔

"میرے ساتھ آ۔"

لالی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں سیڑھیوں کے قریب پہنچے تو پیچھے سے ریاض کی آواز ابھری۔ "سنو۔"

لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ ریاض اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اس سے کہہ رہا تھا۔ "لاش بن کر یہاں آتا تو مجھے بھوت بن کر نہ ڈراتا۔ اپنی کٹی ہوئی گردن اور خون سے لتھڑا ہوا سینہ نہ دکھاتا۔"

حیات نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں زینے کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچ گئے۔ لالی سہما ہوا بوجھل قدموں سے چل رہا تھا۔ تہ خانے کے دروازے سے گزر کر دونوں کمرے میں آ گئے۔ دھیور مدھم روشنی میں ایک طرف کھڑا تھا۔ اس نے بڑھ کر تہ خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

حیات محمد آگے بڑھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ ہنٹر ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ لالی اس کے روبرو نظریں جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس کی پشت پر دروازے کے قریب دھیور موجود تھا۔ حیات تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا پھر لالی کی طرف متوجہ ہوا۔ تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ "کیا کہتا تھا وہ؟" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

حیات غصے سے ڈپٹ کر بولا۔ "خاموش کیوں ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟"

لالی گڑگڑانے لگا۔ "صاب غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیجیے۔"

حیات تیوری پر بل ڈالے خوں خوار نظروں سے اسے گھورتا رہا' گردن کو ذرا سا خم دے کر بولا۔ "مجھے معلوم ہے اس نے کیا کہا ہو گا۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ "وہ بہت مظلوم ہے۔ خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے اس نے تجھے بھی ایک دردناک داستان سنائی ہو گی۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ خود اس نے کتنا ظلم ڈھایا ہے۔ اس کے ظلم و ستم کا جیتا جاگتا ثبوت یہ کھڑا ہے۔" اس نے دھیور کی جانب اشارہ کیا۔ "اس کی زبان اس نے صرف اس لیے کٹوا دی کہ یہ اس کے گرے ہاؤنڈ کتوں کے راتب سے گوشت چرا کر کھا جاتا تھا۔ یہ دھیور تیرے سامنے کھڑا ہے۔ اس سے پوچھ' کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

لالی نے مڑ کر دیکھا' دھیور دروازے کے قریب کھڑا آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اقرار کر رہا ہے۔ حیات کہتا رہا۔ "اس سے یہ بھی پوچھ' اس نے اسے خصی بھی کرا دیا ہے۔ یہ اکیلا نہیں' اس بنگلے میں اور بھی ایسے ہی کئی کھسرے ہیں۔ ان سب کو اس نے خصی بنایا ہے۔ پتہ ہے اس نے ایسا کیوں کیا؟"

لالی نے آہستہ سے انکار میں گردن ہلا دی۔

حیات نے بتایا۔ "اسے اپنی دونوں گھر والیوں پر اعتماد نہیں تھا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "اس

نے یہ بھی نہیں بتایا ہوگا کہ یہ جائیداد اور جاگیر اس نے کرنل جانسن سے کس طرح حاصل کی۔ ریاض تو اس کا معمولی کرندہ تھا۔ ایسا خوشامدی اور وفادار تھا کہ اس کی خاطر مزارعوں کے کھیت کھلیان جلوا دیتا' ان کے گھربار تباہ کرا دیتا' ان کی لڑکیوں اور گھر والیوں کو اٹھوا لیتا۔ انھیں بے دخل کرنا' ان کے خلاف جھوٹے مقدمے بنوانا' انھیں جیل بھجوانا' قتل کرا دینا اس کے نزدیک بہت معمولی بات تھی۔ اس کارگزاری کے صلے میں وہ کرندے سے ترقی کر کے منیجر بن گیا۔" حیات محمد نے تہہ خانے کے دروازے کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "یہ تہہ خانہ پہلے بھی جیل خانہ تھا۔ اس کے اندر نہ جانے کتنی لاشیں دفن ہیں۔ اس بنگلے میں ایسے دو تہہ خانے اور بھی ہیں۔ ان میں ہمیشہ قیدی بند رہے اور بہت سوں کا قبرستان بھی بنے۔ اب تو صرف وہ اکیلا قیدی رہ گیا ہے۔ دوسرے تہہ خانے میں نے گودام بنا دیئے۔"

حیات نے قدرے توقف کے بعد اونچی آواز سے کہا۔ "سن لیا تو نے؟"

"میاں ساب! آپ نے تو ایسی باتیں بتائیں کہ اپنا سر چکرا گیا۔"

"وہ کہتا ہے' یہ جاگیر اور جائیداد اس نے اپنی محنت اور صلاحیت سے حاصل کی ہے۔ جانتا ہے اس نے کیسی صلاحیت دکھائی۔ اس نے اپنی عزت بھی داؤ پر لگا دی۔ اپنی نوجوان گھر والی کو کرنل جانسن کی رکھیل بنا دیا' پھر گلا گھونٹ کر اس کا خون بھی کر دیا۔ مشہور کر دیا کہ اس نے خودکشی کر لی۔"

حیات محمد خاموش ہو کر بے چینی سے اپنا ایک پیر آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔ کمرے میں گہری خاموشی پھیل گئی۔ چند لمحے بعد حیات کی آواز ابھری۔ وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔ "نیاز اس کا پتر نہیں ہے۔ وہ جھوٹ بولتا ہے' بکواس کرتا ہے۔ دربار ہال میں کرنل جانسن کی تصویر لگی ہے۔ نیاز کو تصویر کے برابر کھڑا کر دے اور دیکھ لے' وہ جانسن کا پتر ہے یا ریاض کا۔ یہ بات وہ بھی جانتا ہے۔ وہ چھوٹے بھائی کو جائیداد کا وارث بنانا نہیں چاہتا۔ کرنل جانسن کے پتر نیاز کو وارث بنانا چاہتا ہے۔ اس کا وفادار جو ہے۔" حیات نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "اونہہ' یہ اس کا بھی تو وفادار نہیں۔ پاکستان بنا اور انگریزی راج ختم ہوا تو اس نے جاگیر اور جائیداد ہتھیانے کے لیے اس کے خلاف سازشوں کا جال پھیلا دیا۔ میرے ذریعے مزارعوں کو بھڑکایا' سرکشی پر اکسایا۔ مزارعوں سے کہا' بٹائی دینا بند کر دو' فارموں پر کام کرنا چھوڑ دو۔ دوسری طرف کرنل کی حمایت میں ان پر فائرنگ بھی کرائی۔ ایسے سنگین حالات پیدا کر دیئے کہ جانسن سخت خوف زدہ ہو گیا۔ ایسا پریشان ہوا کہ دو لاکھ روپے سالانہ پر اپنے تمام فارم اور پوری زمینداری اس کے سپرد کر کے لندن چلا گیا اور اب تو وہ

کرنل جانسن کو کچھ بھی نہیں دیتا۔ ساری جاگیر ہتیا کر اپنے نام کرالی۔"

حیات محمد چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ "مجھے کہتا ہے' میں بے ایمان ہوں' ظالم ہوں۔ اب تو بتا۔ بے ایمان اور ظالم کون ہے؟" لالی نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ نظریں نیچے کیے چپ کھڑا رہا۔ حیات نے اونچی آواز سے پوچھا۔ "بول' جواب دے۔ خاموش کیوں ہے؟"

لالی نے ایک بار پھر گڑگڑا کر کہا۔ "میاں ساب! غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیجئے۔"

حیات محمد خاموش بیٹھا رہا۔ لالی نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "وہ ایسا ہوا جی' کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی تھی۔ بہت دنوں بعد پی تھی۔ بالکل یاد نہیں رہا۔ میں تو جی ان سے کبھی بات ہی نہیں کرتا تھا اور نہ ان کی سنتا تھا۔ فٹافٹ انجکشن لگا کر آجاتا تھا۔ وہ تو جی مجھے بھی گونگا بہرا سمجھتے تھے۔ پر آج اپنی مت ماری گئی۔"

حیات محمد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تیری نہیں' اس کی مت ماری گئی تھی۔" اس نے دھیور کی جانب گردن موڑ کر دیکھا۔ "مگر اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ میرا حکم نہ ماننے کی کیا سزا ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ ٹھیک سے دیکھ۔"

لالی نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر غور سے دھیور کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی سے کنپٹی کے نیچے تک سیاہ لکیر پھیلتی چلی گئی تھی۔ حیات بولا۔ "قمیص اٹھا کر اس کی پیٹھ بھی دیکھ لینا۔ میں نے تجھے اس کی نگرانی میں اس لیے نہیں دیا تھا کہ یہ نشے میں مدہوش ہو کر تہہ خانے کے دروازے پر سو جائے۔ اور تو تہہ خانے کے اندر آرام سے بیٹھ کر میرے خلاف اس بڈھے کھوسٹ کی بکواس سنے۔"

لالی عاجزی سے بولا۔ "ساب! معاف کر دیجئے۔ اب کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ آپ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" حیات محمد ونو نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ چپ بیٹھا ہنٹر مروڑتا رہا۔ لالی نے چند لمحے خاموش رہ کر ایک بار پھر التجا کی۔ "ساب جی اس بار معافی دے دیجئے۔ آگے ایسی غلطی ہو تو گولی مار دیجئے۔"

حیات نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور اونچی آواز سے بولا۔ "اس تہہ خانے میں پچھلے چند مہینوں میں تین لاشیں دبائی جا چکی ہیں۔ یہ بات شاید اس نے بھی تجھے بتائی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں چوتھی لاش تیری نہ ہو۔" اس نے قریب بیٹھے ہوئے اپنے اسیشن کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے جب دوسرا انجکشن لگایا جاتا ہے تو یہ اسیشن نہیں رہتا' تیندوا بن جاتا ہے۔ خونخوار ہو کر

جس پر جھپٹتا ہے' اسے چیر پھاڑ کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے۔ تو نے وہ سرا انجکشن بھی دیکھا ہے لیکن یہ نہیں دیکھا' اس کے لگنے کے بعد یہ کتنا خوفناک بن جاتا ہے۔" لالی خوف سے لرز گیا۔ السیشن حیات محمد کے پیروں کے پاس لیٹا دھیرے دھیرے غرا رہا تھا۔

لالی نے السیشن کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ سہما ہوا خاموش کھڑا رہا۔ یکایک کتا زور سے بھونک رات کے گہرے سناٹے میں اس کی آواز بہت ڈراؤنی معلوم ہوئی۔ لالی اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ حیات محمد جھک کر السیشن کی پیٹھ سہلاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "نہیں' ابھی وقت نہیں آیا۔" اس نے گردن اٹھا کر لالی کی طرف دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر بھاری بھرکم لہجے میں بولا۔ "لالی! وہ لمحہ بھر خاموش رہا۔ "آئندہ ایسی غلطی نہ ہو۔ میں تجھے آخری موقع دے رہا ہوں اور اس لیے دے رہا ہوں کہ وہسکی کی بوتل میں نے ہی تجھے دی تھی۔ اس کے نشے میں تو سب کچھ بھول گیا۔ میرا حکم بھی بھول گیا۔ تجھے یہ پتہ نہیں' میں کبھی غافل نہیں رہتا۔ ہمیشہ چوکنا رہتا ہوں۔"

لالی نے دونوں کان انگلیوں سے پکڑ کر کہا۔ "میاں ساب' اب شراب کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

"میں تجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگانا چاہتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں' میں جیسا کہوں' تو بالکل ویسے ہی کر۔ جب تک یہاں رہنا ہے' تجھے گونگا اور بہرا بن کر رہنا ہو گا بلکہ آنکھوں سے بھی کم سے کم کام لینا ہو گا۔ سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا جی' بالکل سمجھ گیا۔"

حیات نے حکم دیا۔ "جا' جا کر اب اپنی جگہ سو جا۔"

لالی نظریں جھکائے دروازے پر پہنچا۔ دھیور نے دروازہ کھول دیا' اور لالی سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ لالی باہر آ گیا۔ مگر دھیور نہ آیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ لالی کو دھیور کے نہ آنے پر تعجب تو ہوا مگر وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹ گیا۔

☆

رات کے پچھلے پہر اچانک لالی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ کمرے کے دروازے کے سامنے دھیور حسب معمول اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ مگر جب دھیور مسلسل کراہتا رہا تو وہ اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ دھیور بستر پر اوندھا پڑا تھا۔

لالی اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور دھیرے دھیرے اس کا سر دبانے لگا۔ دھیور نے اسے منع نہیں

لیا نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ بے حال پڑا کراہتا رہا۔ لالی نے اس کی قمیص کا دامن اٹھایا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں دیکھا' دھیور کی پیٹھ پر ہنٹر کی مار سے نیل پڑ گئے ہیں۔ کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔ زخموں سے خون نکل کر جم گیا ہے۔ لالی پریشان ہو کر بولا۔ "اوے ربا! میاں ساب نے تو سچ مچ تیری چمڑی ادھیڑ ڈالی۔ کیسے لمبے لمبے لاس پڑے ہیں۔"

دھیور خاموش لیٹا رک رک کر کراہتا رہا۔ لالی ذرا دیر دھیور کی زخمی پیٹھ تکتا رہا' پھر اٹھا۔ کمرے کے اندر گیا۔ کونے میں رکھی ہوئی وہسکی کی بوتل اٹھائی اور دھیور کے پاس آ گیا۔ اس نے بوتل کھولی۔ تھوڑی سی وہسکی ہتھیلی پر ڈالی اور اسے دھیور کے زخموں پر آہستہ آہستہ لگایا۔ وہسکی لگتے ہی دھیور نے تکلیف سے بلبلا کر ہائے کی۔

لالی نے اس کا سر پیار سے تھپک کر نرم لہجے میں کہا۔ "صبر کر۔ ذرا دیر میں چنگا ہو جائے گا۔"

دھیور نے مزاحمت نہیں کی۔ کراہتا رہا اور گہری گہری سانس بھرتا رہا۔ لالی چپ بیٹھا اس کی پیٹھ پر وہسکی لگاتا رہا۔ وہ اپنی چوٹ اور زخموں کا علاج بھی اسی طرح کرتا تھا۔ یہ نسخہ اس نے انور ڈشکرے سے سیکھا تھا۔ ان دنوں انور اس کے گروہ کا سرغنہ تھا۔ وہ لمبا چوڑا قوی ہیکل جوان تھا۔ لگتا بھی ڈشکرا تھا۔

لالی' دھیور کی پیٹھ کے زخموں پر ہولے ہولے وہسکی لگاتا رہا۔ دھیور کچھ دیر تو بے قرار ہو کر ادھر ادھر گردن ہلاتا رہا۔ رفتہ رفتہ زخموں کی ٹیس کم ہوتی گئی۔ سکون ملا تو اس نے کراہنا بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ سو گیا۔ لالی اس کے قریب خاموش بیٹھا رہا۔ دھیور منہ اوندھا کیے پیٹ کے بل بے سدھ پڑا تھا۔

اس کا ریوالور تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ لالی نے اسے دیکھا اور چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ چمڑے کے ہولسٹر سے نہایت ہوشیاری سے ریوالور نکالا۔ اسے گھما پھرا کر دیکھا۔ دھیور کو مطلق خبر نہ ہوئی۔

لالی آہستہ سے نیچے اترا اور چند لمحوں تک دھیور کے سرہانے چپ چاپ کھڑا رہا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ لالی نے وہیں کھڑے کھڑے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ دھیور گہری نیند سو رہا تھا اور اس کا ریوالور لالی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا غلام گردش کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے ہولے سے دروازہ کھولا۔ سامنے نیل گوں روشنی میں سیاہ السیشن بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی منہ پھاڑ کر غرایا۔

لالی نے جھٹ غلام گردش کا دروازہ بند کر دیا۔ الٹے قدموں واپس ہوا۔ دھیور کے سرہانے پہنچ

گر اس نے جس ہوشیاری سے ریوالور نکالا تھا' اسی ہوشیاری سے ہولسٹر میں رکھ دیا۔ وہ ا
کمرے میں گیا اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

دوسرے روز دن چڑھے درزی کرتا اور شلوار سی کر لے آیا۔ لالی نے غسل کیا۔ نیا لباس
اور دوپہر کو دھیور کے ہم راہ تہہ خانے کے دروازے پر پہنچا' اندر گیا' الماری سے سرنج نکالی'ا
میں دوا بھری اور ریاض کے قریب پہنچ گیا۔ لالی نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بات کرتا بھ
لالی نہ بولتا۔ وہ یہی طے کر کے تہہ خانے میں گیا تھا۔ ریاض بھی خاموش رہا۔ مگر جب لالی نے جو
کر اس کی کمر میں انجکشن لگایا تو ریاض نے سرگوشی کی۔

"بھاگ سکتا ہے تو بھاگ جا۔ آج رات تجھے قتل کر دیا جائے گا۔"

لالی کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے بوڑھے ریاض کو دیکھا۔ مگر زبان سے
نہیں کہا۔

ریاض نے گردن اٹھا کر زینے کی جانب دیکھا اور لالی کے چہرے کے قریب منہ لا کر بولا۔ "کچھ
رات حیات اور دھیور یہاں آئے تھے۔ انھوں نے تیری لاش دفن کرنے کے لیے قبر کا نشان؛
ڈال دیا ہے۔ وہ دیکھ۔" اس نے انگلی اٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا۔ لالی نے دیکھا' آتش دان۔
ذرا ہٹ کر دیوار کے پاس فرش تازہ تازہ اکھڑا ہوا ہے۔ لالی پریشان ہو گیا۔ وہ بدستور خاموش ر
ریاض مدھم لہجے میں اس طرح بولنے لگا جیسے بڑبڑا رہا ہو۔

"ٹھیک بارہ بجے رات کو بنگلے کی تمام بتیاں بجھ جائیں گی۔ ہر طرف اندھیرا چھا جائے گا۔ ا
رات کے سناٹے میں حیات کے السیشن کے زور زور سے بھونکنے کی خوف ناک آواز ابھرے گی
جب بتیاں دوبارہ جلیں گی تو ایک لاش یہاں آئے گی۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔" میاں ریاض محمد
ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ "ایک لاش' دوسری لاش' تیسری لاش اور اب چوتھی لاش آنے وا
ہے۔" اس نے نظر بھر کر لالی کا چہرہ دیکھا۔ "ابھی تو میرے سامنے زندہ بیٹھا ہے۔ جب رات آو
ہو جائے گی' تو خون میں لتھڑی لاش بن جائے گا۔ دھیور لاش اٹھائے کبڑوں کی طرح جھکا جھکا ز
سے نیچے اترے گا۔ اس کے پیچھے حیات ہو گا۔ دھیور لاش ایک طرف ڈال دے گا۔ فیرنہ تو رہے
نہ لاش۔" یہ کہتے کہتے بوڑھے کے چہرے پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ا
ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔

لالی کا تمام جسم ستار کے تاروں کی مانند جھنجھنا اٹھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے انجکشن لگایا
اور بوڑھے ریاض کی جانب دیکھے بغیر جلدی سے اٹھا۔ مگر جب سرنج الماری میں رکھ رہا تھا تو ا

نے سیڑھیوں پر آہٹ سنی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا' حیات محمد سیڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچ چکا ہے۔
اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔

"تو نے انجکشن لگا دیا؟"

"جی صاب!"

"کیا تو آج مقررہ وقت سے پہلے یہاں نہیں آیا؟"

"مجھے نہیں علوم جی۔" لالی نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے تو دھیور جب اشارہ کرتا ہے' میں اس کے
ساتھ آجاتا ہوں۔"

میاں حیات محمد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ اس نے بوڑھے ریاض محمد کی طرف دیکھا' وہ زمین
پر سکڑا سکڑایا' آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ حیات نے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور سیڑھیاں
چڑھنے لگا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں تہہ خانے سے باہر آئے۔ دروازے پر دھیور بت بنا
کھڑا تھا۔ حیات محمد نے اس سے بھی بات نہیں کی۔

دھیور نے تہہ خانے کا دروازہ بند کر کے قفل لگایا اور لالی سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میاں
حیات محمد وہ تو صوفے پر خاموش بیٹھا رہا۔ السیشن اس وقت بھی اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ گردن
اٹھائے لالی اور دھیور کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں آگے بڑھے اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلے گئے۔

کمرے میں پہنچ کر لالی نڈھال ہو کر بستر پر گر گیا۔ تھوڑی دیر بعد مائی جنتے کھانا لے کر آ گئی۔ لالی
نے کھانا رغبت سے نہیں کھایا۔ وہ ذہنی طور پر اس قدر پریشان تھا کہ کھانا کھایا ہی نہ گیا۔ وہ پھر لیٹ
گیا۔ لیکن نیند نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔
کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے جتنی بار باہر نظر ڈالی ہر بار دھیور کو اسٹول پر بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ
اس وقت ڈھیلا ڈھالا سفید کرتا پہنے ہوئے تھا۔ دھوتی بھی اجلی تھی اور اس کا چوڑا کنارا سرخ تھا۔
کندھے پر پرنا پڑا تھا جس سے وہ بار بار منہ پونچھتا۔ پیروں میں نئی گاے شاہی جوتی تھی۔ بالوں میں
تیل پڑا تھا اور بیچ سے مانگ نکال کر لمبے لمبے پٹے قاعدے سے جمائے گئے تھے۔ وہ خوب بن سنور کر
بیٹھا تھا۔

لالی اسے دیکھتا تو وحشت ہوتی۔ بے چینی بڑھ جاتی۔ دن اسی بے چینی میں گزر گیا۔ سورج
غروب ہو گیا۔ کمرے میں شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ دھیور نے لالٹین روشن کی۔ لالی کے کمرے میں
آیا۔ مگر اس نے لالی سے نظر نہ ملائی۔ چپ چاپ لالٹین رکھ کر چلا گیا۔ لالی دیوار سے سر ٹکائے
چارپائی پر خاموش بیٹھا رہا۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ رات ہو گئی۔ مائی جنتے کھانا لے کر آئی اور لالی کے

سامنے رکھ کر ہوا کے جھونکے کی مانند باہر چلی گئی۔

لالی نے کھانا نہیں کھایا۔ دھیور نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ اسٹول پر خاموش بیٹھا رہا۔ رات ایک پہر گزر گیا۔ سناٹا گہرا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد دھیور اپنی جگہ سے اٹھا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ لالی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا اور لمحے بھر تک آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ دھیور نے مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا اور بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

لالی چارپائی سے نیچے اترا مگر دھیور اس کے پاس نہ آیا۔ اس نے جھک کر وہسکی کی بوتل اٹھائی اسے کھولا اور منہ سے لگا کر غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ اس نے بوتل لالی کی طرف بڑھا دی۔ لالی نے بوتل ہاتھ میں لے لی۔ وہ کچھ دیر بوتل ہاتھ میں لیے خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے بھی بوتل منہ سے لگائی اور تھوڑی سی وہسکی پی کر بوتل دھیور کو واپس دے دی۔

انھوں نے کھڑے کھڑے بوتل خالی کر دی۔ دھیور دیسی شراب کا ادھا بھی اٹھا لایا۔ دونوں فرش پر بیٹھ کر پینے لگے۔ ادھا بھی خالی ہو گیا۔ وہسکی اور ٹھرے نے مل کر نشے کو کریلا اور نیم چڑھا بنا دیا۔ لالی نے کھانا اٹھا کر دھیور کے سامنے رکھ دیا۔ دونوں کھانا کھانے لگے۔ کھانا کھاتے کھاتے نہ جانے کیا سوچ کر دھیور بچے کی طرح قیں قیں کر کے ہنسنے لگا۔ لالی نے خمار آلود نظروں سے دھیور کو دیکھا اور وہ بھی ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے بولا۔

"ہنس لے پیارے! ہنس لے۔ میں نوں پتہ ہے تو کیوں ہنس رہا ہے؟"

دھیور نے گردن اونچی کی۔ لالی کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ لالی ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے انگلیوں میں دبا ہوا نوالہ پلیٹ میں ڈال دیا۔ اونچی آواز سے بولا۔ "تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ بوڑھے ریاض نے مجھے یہی بتایا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟" دھیور نے اس کی بات سن کر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ نظریں نیچی کر کے کھانا کھانے لگا۔ لالی کہتا رہا۔ "تو مجھے کیوں قتل کرنا چاہتا ہے؟ مجھے نہیں معلوم' پر تجھے یہ ضرور بتا دینا چاہتا ہوں' میں چاہتا تو کل رات تجھے قتل کر دیتا۔ میں نے تیرا پستول نکال لیا تھا۔ فیر جیسے نکالا تھا' ویسے ہی اسے رکھ بھی دیا۔ تجھے بالکل پتہ نہیں چلا۔ تو بے خبر سو رہا تھا۔" دھیور نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"دیکھ کیا رہا ہے؟ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" لالی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ نشے کی جھونک میں جھوم کر بولا۔ "پر یار! میں تجھے کیسے قتل کرتا؟ تجھ پر مجھے کرہ ہی نہیں آیا۔ جب تک کرہ نہ آئے' کوئی کسی کو کیسے قتل کر سکتا ہے۔ کبھی تو نے یہ بات سوچی؟ پر تو سوچتا ہی کب ہے؟" لالی ہنسنے لگا۔

دھیور نے کھانا چھوڑ دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ "میری بات تو سن۔" لیکن دھیور نے اس کی جانب مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

وہ کمرے سے باہر نکلا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

لالی دیر تک بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ واپس نہیں آیا۔ لالی اٹھ کر دروازے تک گیا۔ اس نے گردن باہر نکال کر دھیور کے کمرے میں دیکھا۔ دھیور وہاں بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ لالی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا اور لالی کے ذہن میں بہت سی بتیاں جل رہی تھیں بجھ رہی تھیں۔ تیز نشے کا ریلا سمندر کی سرکش موجوں کے مانند بار بار الڈ آتا اور جھاگ بن کر بکھر جاتا۔ ایک بار زور کا ریلا آیا۔ لالی نے لڑکھڑا کر کھڑکی کی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے تھام لیں۔ انھیں پوری قوت سے کھینچا۔ کئی بار زور آزمائی کی مگر سلاخیں نہیں ہلیں۔ لالی ہانپنے لگا اور جھومتا ہوا بستر پر جا کر دراز ہو گیا۔ لیکن قرار نہ آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دھیور ابھی تک غائب تھا۔

وقت قطرہ قطرہ بن کر رات کے سناٹے میں تحلیل ہو گیا۔ لالی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ یہ تہہ خانے میں جانے اور انجکشن لگانے کا وقت تھا۔ لالی اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ اب دھیور کو واپس آ جانا چاہیے تھا۔ کئی منٹ گزر گئے' دھیور نہیں آیا۔ لالی برآمدے میں خاموش کھڑا رہا اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے بنگلے سے فرار ہونے کا ایک بار پھر تہیہ کیا۔ وہ اس راہداری کی جانب بڑھا جس سے گزر کر وہ کچھ عرصہ قبل دھیور کے ہمراہ باغ میں پہنچا تھا۔

راہداری میں اندھیرا تھا۔ لالی لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتا گیا اور دیوار کا سہارا لیتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا کہ دروازہ بند ہے۔ لالی نے دروازہ آہستہ سے ہلایا۔

دروازہ تو نہ کھلا البتہ باہر سے کسی کی کھنکار ابھری۔ لالی سہم کر رہ گیا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا واپس ہوا۔ وہ ایک بار پھر برآمدے کے سامنے کھڑا تھا۔ دھیور وہاں نہیں تھا۔

لالی برآمدے کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ غلام گردش کی جانب بڑھا اور اندر داخل ہو گیا۔ غلام گردش میں گہرا سناٹا تھا۔ وہ اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا جس میں داخل ہو کر تہہ خانے میں جاتا تھا۔

اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا' اندر جھانکا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہ چپ چاپ کمرے میں چلا

گیا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہے۔ وہ کھلے دروازے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر جھومتا جھامتا اندر داخل ہو گیا۔ زینے سے نیچے اتر کر اس نے دیکھا' بوڑھا ریاض محمد وٹو دھندلی روشنی میں فرش پر لیٹا ہے۔

لالی نے الماری سے سرنج نکالی اور انجکشن لگانے کے لیے ریاض کے قریب پہنچ گیا۔ ریاض چت لیٹا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت تک رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا' زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک کان اور رخسار کا نچلا حصہ خون سے لت پت تھا۔ فرش پر بھی خون پھیلا تھا۔ زنجیر اور اس میں لگے ہوئے لوہے کے گولے پر بھی گاڑھا گاڑھا خون تھا۔ لالی نے گھبرا کر میاں ریاض محمد کو جھنجھوڑا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ اسے اپنے چاروں طرف خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ وہ سرنج وہیں چھوڑ کر گھبرایا ہوا تیزی سے زینے کی جانب لپکا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ دروازے سے گزر کر باہر آیا۔ کمرہ ابھی تک خالی تھا۔ لالی جلدی سے کمرے کا دروازہ کھول کر غلام گردش میں پہنچ گیا۔

☆

دیوار گیریوں کی ہلکی' ہلکی روشنی میں ہر چیز اونگھتی ہوئی نظر آتی تھی۔ غلام گردش کے آخری سرے پر ہال کا دروازہ تھا۔ دروازے کے شیشوں سے ہال کی روشنی جھلک رہی تھی۔ ہال بالکل خالی تھا۔ غلام گردش میں کئی دروازے کھلتے تھے۔ ان پر خوش رنگ پردے پڑے تھے۔ لالی نے گھڑی دیکھی' بارہ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔

لالی بدحواس ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دھیورا اس کی گھات میں کہیں قریب ہی چھپا بیٹھا ہے۔ ذرا دیر میں بتیاں بجھ جائیں گی' اور دھیورا اندھیرے میں کسی دروازے سے نکل کر اس پر تیندوے کی طرح جھپٹے گا۔

لالی نے خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ چھپنے کی کہیں گنجائش نہیں تھی۔ فرار ہونے کے لیے ہال سے گزرنا ضروری تھا۔ اس نے سوچا' جب روشنیاں گل ہو جائیں گی تو وہ اندھیرے میں ہال کے اندر داخل ہو جائے گا اور بنگلے سے نکل کر چار دیواری تک پہنچ جائے گا۔ چار دیواری پھاندنا اس کے لیے دشوار نہ تھا۔ مگر اندھیرا ہونے سے پہلے ہی اسے ہال کے دروازے تک پہنچ جانا چاہیے۔

وہ آہستہ آہستہ ہال کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب' اور قریب ہو آ گیا۔

مگر جب ہال کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر تھا تو اس نے دیکھا' حیات محمد وٹو ہال میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کے ہم راہ کوئی اور بھی تھا۔ لالی نے دروازے کے شیشوں سے دونوں کی ہلکی سی جھلک دیکھی۔ وہ خوف سے لرز کر رہ گیا۔ جلدی سے مڑا۔ غلام گردش خاصی طویل تھی۔ وہ غلام گردش سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو حیات محمد اسے دور ہی سے دیکھ لیتا۔ اس نے گھبرا کر چاہا کہ کوئی دروازہ کھول کر اندر چلا جائے۔ اس نے ایک دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اندر سے بند تھا۔ لالی لپک کر دوسرے دروازے پر پہنچا۔ وہ بھی بند تھا۔

لالی دیوار سے لگا لگا آگے بڑھا۔ اس نے مڑ کر ہال کی جانب دیکھا۔ میاں حیات محمد وٹو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ لالی نے سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور جو دروازہ قریب ترین پایا اس کے پردے کے پیچھے دبک گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ لالی جھٹ اندر چلا گیا اور دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔

یہ خواب گاہ تھی۔ نہایت نفاست سے آراستہ کی گئی تھی۔ کمرے کے وسط میں چوڑی چکلی مسہری تھی۔ مسہری کے قریب اونچے اسٹول پر پیتل کا اجلا اجلا گل دان تھا۔ اس میں گلاب کے سفید اور گہرے سرخ پھول تھے۔ مسہری سے ذرا ہٹ کر صوفہ سیٹ قرینے سے رکھا تھا۔ دروازوں پر جھلملاتے ہوئے ریشمی پردے تھے۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا اور ہلکی ہلکی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ کمرے میں گہرا سبز بلب روشن تھا۔

لالی دروازے کے قریب سہما ہوا کھڑا تھا اور رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ باہر غلام گردش میں قدموں کی آہٹ ابھر رہی تھی اور رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ دھب' دھب' دھب' آہٹ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

لالی کا بے قرار دل دھڑکتے دھڑکتے پل بھر کے لیے ٹھہر گیا۔ اس نے چاہا کہ لپک کر مسہری کے نیچے دبک جائے۔ مگر فوری طور پر مسہری تک پہنچنے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ دروازے سے ہٹ کر ایک کونے میں دیوار سے چپٹ کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ لالی نے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میاں حیات محمد خاں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ وہ سفید ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ اس کے داخل ہوتے ہی تیز خوشبو کا جھونکا آیا۔ حیات نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور یہ کہتا ہوا عورت کے قریب پہنچ گیا۔ "ناصرہ تمہارے بغیر' یہ کمرہ کتنا ویران' ویران لگتا ہے۔"

حیات محمد نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے سمیٹ کر اپنے قریب کر لیا۔

ناصرہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے بڑے ناز سے کہا۔ "ایسی با
سوچنے کی تمہیں فرصت مل جاتی ہے؟"

"نہیں جان من! ایسی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو تم شدت سے یاد آتی ہو۔" میاں حیات
نے گہری سانس بھری۔ "جب تم آجاتی ہو تو ایسا محسوس ہوتا جیسے ویرانے میں چپکے سے بہ
آجائے۔"

"آج کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آرہے ہو۔" ناصرہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "بات کیا ہے؟"

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" حیات محمد دو صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے پیار سے ناص
کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ بازو کے حلقے میں لے کر اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا اور اس کے با
انگلیوں سے آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔ "کل رات یہ
میں بڑی شاندار پارٹی ہے اور تم تو اس پارٹی میں جان محفل ہوگی۔ میں تو صرف میزبان ہوں گا۔"

ناصرہ نے اپنا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کسی قدر بیزاری سے کہا۔ "میں سمجھتی ہوں، میرا اس م
موجود ہونا ضروری نہیں۔"

"جان من! پہلے میری بات تو سن لو۔" حیات محمد نے اسے پھر سینے سے لگایا۔ "یہ پارٹی میں
ایک ایم، سی، اے کے اعزاز میں دی ہے۔ دستور ساز اسمبلی میں اس نے اپنا تگڑا گروپ بنا ل
ہے۔ تم تو اسے جانتی بھی ہو۔ میرا مطلب ہے...."

ناصرہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ عورتوں سے باتیں کرتے
ہوئے تم نے کبھی اس کے چہرے اور آنکھوں کو دیکھا ہے؟ مجھے تو اس کی صورت دیکھ کر دحشت
ہوتی ہے۔"

"کاک ٹیل پارٹی ہوگی۔ تم شیری پیتی رہنا۔ میں نے سیلریشن کریم اور ڈرائی فلائی پچھلے ہی دنوں
منگوائی ہے۔ دونوں ہی اعلیٰ درجے کی شیری ہیں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "پھر کوئی وحشت وحشت
نہیں رہے گی۔" اس نے ہولے ہولے ناصرہ کا رخسار تھپ تھپایا۔ "جان من! مجھے اس کے
گروپ کے ووٹوں کی شدید ضرورت ہے۔"

"کسی کو مرکزی وزیر بنوانا ہوگا۔"

"بالکل ٹھیک سمجھیں تم۔" حیات نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اب تو تم سیاست کو پوری طرح سمجھنے
لگی ہو۔"

"نہیں حیات! اپنی اس گندی سیاست میں مجھے نہ گھسیٹو۔" ناصرہ نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔

"تم جو چاہتے ہو، اب وہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں تمہاری اس سیاست سے اتنی عاجز آچکی ہوں کہ
مجھے خود اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ مجھ میں اور ایک....."

حیات نے محبت سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔" اس کے لہجے میں
تیکھا پن تھا۔ "تم دو تین روز یہاں رہو گی اور پارٹی میں بھی شریک ہو گی۔" اس نے قدرے تامل
کیا، پھر ناصرہ کے ہونٹ چوم کر بولا۔ "ناصرہ، میری جان! مجھے یہ کام ضرور کرنا ہے اور تم اس میں
میری مدد کرو گی۔ یوں سمجھ لو، وہ مرکزی وزیر بن گیا تو حکومت میں اپنی پوزیشن بہت مضبوط ہو جائے
گی۔ جو چاہوں گا، حکومت سے کروالوں گا۔ کیا سمجھیں؟" اس نے قہقہہ لگایا اور ناصرہ کو اپنے سینے
سے چمٹالیا۔

ناصرہ اس کے پہلو میں اس طرح دبکی بیٹھی تھی کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ حیات محمد اسے
رام کرنے کے لیے سر جھکائے پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا۔ دونوں صوفے پر بیٹھے باتیں
کرتے رہے۔ لالی خوف زدہ نظروں سے انھیں دیکھتا رہا۔ دونوں میں سے کوئی بھی پلٹ کر دیکھتا تو
ہلکی ہلکی سبز روشنی میں وہ دیوار کے ساتھ سائے کی طرح چپٹا ہوا نظر آتا۔ مگر جب ناصرہ کسمسا کر
حیات کے بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کے لیے مڑی تو اس کا چہرہ لالی کی طرف تھا۔ عین اس وقت
خواب گاہ کا سبز بلب بجھ گیا۔ ناصرہ کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ پھر اندھیرے میں حیات کی
آواز ابھری۔

"معلوم ہوتا ہے جنریٹر میں فیز گڑبڑ ہو گئی۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر ناصرہ کی تھرتھراتی ہوئی آواز ابھری۔ "آدھی رات کو جب اس طرح
بلیک آؤٹ ہو جائے تو یہ بنگلہ کتنا خوف ناک لگتا ہے۔ ہر طرف موت کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔"

اسی وقت باہر غلام گردش میں تیز تیز قدموں سے چلنے کی آہٹ ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ گھپ
اندھیرے میں السیشن کے زور زور سے بھونکنے کی آواز بھی ابھری۔ ناصرہ نے خوف زدہ لہجے میں
کہا۔ "یہ خوف ناک آوازیں سن رہے ہو۔ یہ سب کیا ہے حیات؟ موت کا یہ کھیل کب تک چلتا
رہے گا؟ آج کون....."

حیات نے اس کی بات کاٹ کر اونچی آواز سے کہا۔ "خواہ مخواہ کی باتیں نہ کرو۔ ذرا دیر میں
روشنی ہو جائے گی۔ میں تو کل صبح تمہارے پاس آنے ہی والا تھا۔ مگر تم اتنی رات گئے اچانک کیسے
آگئیں؟"

"میں موت کا کھیل دیکھنے نہیں آئی تھی۔ تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ نیاز کل رات کیلی فورنیا

سے واپس آگیا ہے۔"

حیات کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "نیاز' نیاز واپس آگیا؟ نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ کیسے واپس آسکتا ہے؟"

"میں تم سے غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"کہاں ہے وہ؟ یہاں کیوں نہیں آیا؟"

لالی دیوار کا سہارا لیتا ہوا دھیرے دھیرے دروازے کی جانب کھسکنے لگا۔ اس نے سنا' ناصرہ کہہ رہی تھی۔ "نیاز اپنے ماماں کے پاس ٹھہرا ہے۔" وہ کچھ رکی۔ اس نے رحمان سے بتایا۔ "تمہارے خلاف مقدمہ چلانے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے سب کچھ معلوم ہو گیا؟"

"نہیں! وہ کچھ نہیں جانتا۔ وہ صرف جائیداد اور زمینداری پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اپنے پیٹو جاگیر کا وارث جو ہوا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ مقدمے کی تیاری کر رہا ہے؟"

"آج شام وہ میرے پاس آیا تھا۔"

حیات غصے سے چیخا۔ "وہ تمہارے پاس کیوں آیا تھا؟"

"میرا خیال ہے اس کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ اس کی باتوں سے ایسا ہی لگتا تھا۔"

"نہیں! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ جاگیر نہ اس کی ہے نہ اس کے پیٹو کی۔ اور نہ وہ کسی طور اس کا وارث ہے۔" حیات تیز لہجے میں بول رہا تھا۔ "میں اسے جاگیر پر قبضہ کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ وہ سمجھتا کیا ہے؟ میں اس کی لاش بھی یہیں تہہ خانے میں لا کر دبا دوں گا۔"

"حیات!" ناصرہ کے لہجے میں التجا تھی۔ "یہ خطرناک کھیل اب ختم ہو جانا چاہئے۔"

"بکواس نہ کرو۔" حیات تلملا کر بولا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے' تمہی نے اسے بلایا ہے۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ "تم نے اسے سب کچھ بتا دیا۔"

"پاگل نہ بنو۔" ناصرہ نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "تمہیں میرے بارے میں اس طرح نہیں سوچنا چاہئے۔ میں تمہاری بیوی ہوں' تمہاری بیٹی مونا کی ماں ہوں۔ تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہئے۔"

"میں کسی پر اعتماد شاذ و نادر نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے' تم یہاں کس لیے آئی ہو۔ تم میرے خلاف اس سازش میں برابر کی شریک ہو۔"

لالی کھسکتا ہوا اب دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے سنا۔ حیات اندھیرے میں چیخ رہا تھا۔ "میں یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ میں نہ اسے زندہ چھوڑوں گا نہ تجھے۔"

اندھیرے میں کسی چیز کے زور سے ٹکرانے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی ناصرہ کی تیز کراہ سنائی دی۔ "ہائے۔" چند لمحے خاموشی رہی پھر صوفے پر گتھم گتھا ہونے کی سرسراہٹیں ابھرنے لگیں۔ لالی نے آنکھیں پھاڑ کر اس طرف دیکھا۔ گھپ اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ لالی دروازہ کھولنے کے لیے انگلیوں سے چٹخنی ٹٹولنے لگا۔ یکایک اسے عقب میں ناصرہ کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ وہ گڑگڑا رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔ خدا کے لیے نہیں۔"

لالی نے ایک بار پھر گردن موڑ کر ادھر نظر ڈالی۔ اسی وقت کمرے کا سبز بلب روشن ہو گیا۔ لالی نے دیکھا' ناصرہ کا سر صوفے کی پشت سے ٹکا ہے۔ حیات دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچے ہوئے تھا۔ ناصرہ کے بال بکھر کر اس کے چہرے پر آگئے تھے۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں لالی کی جانب اٹھی تھیں۔ اس نے لالی کو دیکھا اور اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"وہ' وہ۔"

حیات نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ ناصرہ کی گردن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "تو ابھی تک زندہ ہے۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا' خاموش کھڑا رہا۔ حیات نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"تو یہاں آ کیسے گیا؟"

"میں یہ بتانے آیا تھا' آپ کا بھائی میاں ریاض محمد مر گیا۔"

حیات بوکھلا گیا۔ "نہیں' وہ نہیں مر سکتا۔ وہ کیسے مر سکتا ہے۔ تو جھوٹ بول رہا ہے۔"

لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

حیات سخت بدحواس ہو رہا تھا۔ "مگر وہ کیسے مر گیا؟" وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ "اس نے وصیت نامے کی دستاویز پر دستخط نہیں کئے۔ مجھے اپنا وارث نہیں بنایا۔ اسے ابھی نہیں مرنا چاہئے۔" وہ بے قرار ہو کر بولا۔ "اسے کس نے مار ڈالا؟ اسے تو نے قتل کیا ہے۔"

"میں ایسا کام نہیں کرتا۔ میں نے آج تک کسی کا خون نہیں کیا۔"

"فیر اسے کون قتل کر سکتا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "دھیور؟ ہاں دھیور ہی ہو سکتا ہے۔" وہ ہولے ہولے اپنی گردن ہلانے لگا۔ "دھیور نے آج اپنا بدلہ لے ہی لیا۔" پھر وہ غصے سے پاگلوں کی

طرح چیخنے لگا۔ "مگر اس کتے کو ایسی جرات کیسے ہوئی؟ کہاں ہے وہ حرامی؟ کہاں ہے وہ؟"

"مجھے نہیں پتہ۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ تجھے ضرور پتہ ہو گا۔"

"میاں ساب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نوں تو یہ پتہ ہے' جب بارہ بجے سب بتیاں بجھ گئی تھیں' اس وکھت آپ کا خونی کتا مجھے چیر پھاڑ کر ختم کر دیتا۔ میری لاش تہہ خانے میں زمین کھود کر دبا دی جاتی۔"

حیات نے خونخوار نظروں سے لالی کو دیکھا اور سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی بیوی ناصرہ صوفے پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر پیچھے کر لیے تھے۔ اس کا حسین چہرہ اجلی چاندنی کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خوف تھا۔ وہ اپنی لمبی گردن داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے بار بار سہلا رہی تھی۔ کمرے کی فضا پر گہرا سکوت طاری تھا۔

لالی نے سکوت توڑا۔ عاجزی سے بولا۔ "ساب' میں جسے انجکشن لگاتا تھا' وہ تو مر ہی گیا۔ ساتھ ہی میری ڈیوٹی بھی ختم ہو گئی۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "اب مجھے بھی چھٹی دے دیجئے۔ آپ کی مہربانی ہو گی جی۔"

"نہیں' تو ابھی نہیں جا سکتا۔ یہاں سے نکلتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔"

لالی نشے کی ترنگ میں تھا۔ جل کر بولا۔ "گرفتار کر لیا جاؤں گا تو کیا ہو گا۔ جیل ہی تو چلا جاؤں گا۔ گولی تو نہیں ماری جائے گی۔"

"تو یہاں کے کئی راز جانتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تو پکڑا جائے اور میرے خلاف قانون کے ہاتھ مضبوط کرے۔"

"ساب' کون سا کنون' کیسا کنون؟" اب وہ خوف اور دہشت کا خول توڑ کر رفتہ رفتہ باہر نکل رہا تھا۔ "کنون تو میرے جیسے چھوٹے آدمی کے لیے ہے۔ میں تین بار جیل کاٹ چکا ہوں۔ میں نے تو کسی وڈے آدمی کو اپنی طرح جیل کاٹتے نہیں دیکھا' نہ پھانسی پر چڑھتے دیکھا۔" لالی کھل کر مسکرانے لگا۔ "میاں جی' آپ وڈے آدمی ہیں۔ آپ کنون شنون سے کیوں ڈرتے ہیں؟ آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ اس نے قسم کھا کر حیات کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "رب سونہہ' میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں تو یہاں سے سیدھا رحیمے کے پاس جاؤں گا۔ اس کے ساتھ آج ہی رات' بہت دور نکل جاؤں گا۔ آپ میری بات مان لیں۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

ناصرہ' جواب تک خاموش بیٹھی دونوں کی گفتگو سن رہی تھی' لالی کی حمایت میں بولی۔ "اسے جانے دو حیات۔"

"تاکہ میرے خلاف تمہارے ہاتھ چشم دید گواہ آ جائے۔" میاں حیات محمد نے قہر آلود نظروں سے ناصرہ کو دیکھا۔ "میں جانتا ہوں' تم اس کی سفارش کیوں کر رہی ہو؟"

"تم میرے بارے میں اتنی بدگمانی میں مبتلا کیوں ہو؟"

"یہ بدگمانی خود تم نے پیدا کی ہے۔ نیاز کیوں واپس آیا؟ وہ کیوں تمہارے پاس گیا؟ میرے پاس کیوں نہیں آیا؟"

"مجھے کیا معلوم۔" وہ آہستہ سے بولی۔

حیات محمد نے اونچی آواز سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے' وہ کیوں واپس آیا اور کیوں تمہارے پاس پہنچا؟" وہ اپنی مونچھوں کی نوکیں انگلیوں سے مروڑنے لگا۔ "میرے علاوہ صرف تین بندے ہیں جو ریاض کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر وہ بنگلے سے باہر نہیں جا سکتے۔ تم اور صرف تم ہو جو بنگلے سے باہر بھی رہتی ہو۔ یہ راز صرف تمہارے ذریعے نیاز تک پہنچا۔ مجھے یقین ہے' تمہی نے اسے نیاز تک پہنچایا ہے۔"

"اُف! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ تمہارا وہم ہے۔ سراسر وہم ہے۔" ناصرہ نے زچ ہو کر کہا۔

"ہرگز نہیں۔" حیات اپنی بات پر اڑا رہا۔ "دو ہفتے پہلے فون پر نیاز سے میری بات ہوئی تھی۔ اس کا امریکہ سے یہاں آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ اسی روز کی بات ہے جس روز تم مجھ سے لڑ جھگڑ کر روتی ہوئی یہاں سے گئی تھیں۔ مجھے یاد ہے' اس روز تم نے خودکشی کر لینے کی دھمکی بھی دی تھی۔" اس نے ناصرہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"اس روز تم غصے سے پاگل ہو رہی تھیں۔ تم نے یہاں سے جاتے ہی غصے کی حالت میں نیاز کو خط لکھا اور اسے ساری باتیں بتا دیں۔"

"تم' تم پاگل ہو گئے ہو۔" وہ جل کر بولی۔ "ریاض کے جسم میں پاگل آدمی کے جراثیم' انجکشنوں کے ذریعے داخل کرتے کرتے خود بھی پاگل ہو گئے ہو۔"

حیات کی آنکھیں بھڑکتا شعلہ بن گئیں۔ وہ سانپ کی طرح پھنکارنے لگا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ ٹکٹکی باندھے بیوی کو گھورتا رہا' پھر تیزی سے جھپٹا اور اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ بے بسی سے اپنی گردن ادھر ادھر ہلانے لگی۔ لالی ذرا دیر تک یہ لرزہ خیز منظر دیکھتا رہا۔ اس نے

حیات کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میاں ساب! یہ کیا کر رہے ہیں؟"

حیات محمد نے اس کی جانب دیکھے بغیر ڈپٹ کر کہا۔ "بکواس نہ کر۔" اس نے بیوی کو نیچے گرا دیا اور دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے اس کا گلا دبانے لگا۔ ساتھ ہی وہ غصے سے بڑبڑا تا رہا۔ "میں ثبوت بھی مٹا دوں گا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

لالی لپک کر دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ ناصرہ صوفے پر بے بس پڑی تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر دہشت طاری تھی۔ حیات کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ ناصرہ آنکھیں پھاڑے بے بسی سے لالی کو دیکھ رہی تھی۔ لالی بے قرار ہو گیا۔ اس نے حیات کا کندھا پکڑ کر کھینچا اور گڑگڑا کر بولا۔

"ساب جی! اب چھوڑ دیجئے۔"

حیات نے پلٹ کر لالی کو دیکھا' غصے سے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ "ہٹ جا میرے سامنے سے۔" اس نے لالی کو دھکا دیا۔ لالی لڑکھڑا کر گرا۔ اس نے اٹھنا چاہا تو حیات نے اور بھی زیادہ زور سے دھکا دیا۔ اس دفعہ وہ لڑھکتا ہوا میز سے جا کر ٹکرایا۔ میز الٹ گئی اور لالی کے سر پر گری۔ چوٹ ایسی سخت آئی کہ وہ چکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ نظریں دھندلی پڑ گئیں۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ رک رک کر سانس بھرنے لگا۔

ناصرہ نے اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ مگر حیات نے جھپٹ کر اس کی ساڑھی کا پلو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ ساڑھی کھل کر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے غصے سے ساڑھی ایک طرف پھینک دی۔ ناصرہ کے منہ پر تابڑتوڑ کئی تھپڑ مارے۔ پیٹ پر اس زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ ڈگمگا کر صوفے پر گر پڑی۔ حیات نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ جھپٹ کر ایک بار پھر اس کی گردن دبوچ لی۔ ناصرہ گلا پھاڑ کر چیخی۔

"نہیں' نہیں۔"

لالی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میاں حیات محمد خاں صوفے پر جھکا ہوا تھا۔ ناصرہ کی دونوں ٹانگیں بالکل برہنہ تھیں اور خزاں رسیدہ درخت کی شاخوں کے مانند جھول رہی تھیں۔ لالی ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا حیات کی جانب بڑھا۔ حیات نے چاپ سنی۔ پلٹ کے دیکھا اور زور سے چیخا۔

"ہٹ جا یہاں سے کنجر!"

لالی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "یہ نہیں ہو گا۔" حیات نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ لالی نرم پڑ گیا۔ گڑگڑانے لگا۔ "ساب! تم نے اس کے کپڑے اتار دیئے۔ وہ تمہاری گھر والی ہے' تمہاری عزت ہے۔" حیات اور غضب ناک ہو گیا۔ اس نے جھنجلا کر لالی کے منہ پر تھپڑ مارنا چاہا۔ لیکن لالی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

حیات نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تیزی سے مسہری کی جانب لپکا۔

ناصرہ نے ہانپتے ہوئے نحیف آواز میں لالی سے کہا۔ "وہ' وہ پستول لینے گیا ہے۔"

لالی نے دیکھا کہ حیات مسہری کے تکیے کی جانب جھک رہا ہے۔ لالی تیزی سے اس پر جھپٹا اور اس زور سے دھکا دیا کہ حیات چاروں خانے چت بستر پر گر گیا۔ وہ دانت پیستا ہوا اٹھا' چیخ کر بولا۔ "کتے! نمک حرام! تیری یہ ہمت۔" اس نے لالی کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔

لالی کا ایک کان جھن جھنے کے مانند جھن جھن کرنے لگا۔ وہ تکلیف سے تلملا اٹھا۔ نشے کا ایسا زبردست جھونکا آیا کہ وہ حیات کے ٹھسے اور طمطراق کے حصار سے باہر نکل آیا۔ اس نے خوں خوار نظروں سے حیات کو دیکھا اور دونوں ہاتھ بڑھا کر جھومتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔

حیات محمد نے رعب اور دبدبے کے ساتھ اسے ڈانٹا۔ "آگے نہ بڑھ۔"

مگر لالی نہیں رکا۔ نشے کے غلبے نے اونچ نیچ کے تمام بندھن توڑ دیئے تھے۔ اس کا امڈتا ہوا سیلاب خوف و دہشت کے سارے پشتے اور رکاوٹیں اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ حیات نے جلدی سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔

لالی نے اچھل کر اس کی کمر پر لات ماری۔ میاں حیات پھر بستر پر لڑھک گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر لالی نے جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ حیات غیں غیں کرنے لگا۔ اس نے گرفت سے نکلنے کے لیے لالی کا منہ نوچ لیا۔ لیکن لالی نے اسے نہیں چھوڑا۔ گریبان پکڑ کر اٹھایا اور دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔

حیات گھٹی ہوئی آواز سے چیخا۔ "دھیورا!"

لالی نے دیوار سے اڑا کر اس کا سر زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ آگے کھینچا' پھر ٹکرایا۔ کھٹ' کھٹ' کھٹ۔ لالی نشے کی جھونک میں پاگلوں کی طرح اس کے سر کو جھٹکے دے دے کر دیوار سے ٹکراتا رہا۔

لالی کا چہرہ کرخت ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔ میاں حیات محمد خاں ونو کے سر سے خون کی دھار نکلی اور پیشانی سے ٹپکتی ہوئی چہرے پر پھیلتی گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

گردن لٹک کر ڈگمگانے لگی۔

☆

ناصرہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی ساڑھی اٹھائی۔ اسے باندھا۔ جلدی' جلدی اپنا بے ترتیب لباس درست کیا۔ حیات محمد کی جانب بڑھی۔ وہ فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ ناصرہ نے جھک کر دیکھا۔ حیات کا چہرہ خون سے تربتر تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ رک' رک کر سانس لے رہا تھا۔ ناصرہ نے پریشان ہو کر لالی کی جانب دیکھا۔ لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ کیا کر دیا؟"

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ وہ مرا نہیں ہے۔"

دونوں خاموش کھڑے رہے۔ مگر لالی اب وہاں مزید ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ اس دروازے کی جانب بڑھا' جو غلام گردش میں کھلتا تھا۔

"کہاں جا رہا ہے؟" ناصرہ نے پوچھا۔

"باہر" لالی نے دروازے کے قریب پہنچ کر کہا۔ "مجھے اب یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

"ٹھہر جا۔"

"تم ٹھہر جاؤ۔" لالی دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ "یہاں رک کر تم اپنے خصم کی مرہم پٹی کرا تاکہ وہ تمہیں اطمینان سے قتل کر سکے۔ میں نہیں ٹھہر سکتا۔"

"حماقت نہ کر۔ باہر حیات کے بہت سے کتے پھر رہے ہیں۔ وہ تجھے بنگلے سے باہر نکلنے نہیں دیں گے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"تمہارا مطلب شکاری کتوں سے ہے؟" لالی رک گیا۔ اور مڑ کر ناصرہ کی جانب دیکھنے لگا۔

"نہیں' میں اس کے خونخوار درندوں کی بات کر رہی ہوں۔ انھیں پتہ چل گیا تو تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "میں بھی یہاں نہیں ٹھہروں گی۔" ناصرہ نے اپنے بکھرے ہوئے بال ایک بار پھر سنوارے' ساڑھی کی شکنیں اور سلوٹیں درست کیں۔ دروازے کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچ کر آہستہ سے دروازے کی چٹخنی کھولی۔ گردن بڑھا کر باہر دیکھا۔ رسان سے بولی۔

"باہر کوئی نہیں ہے۔"

لالی نے پلٹ کر میاں حیات محمد کو دیکھا۔ وہ ٹانگیں پھیلائے مردے کی طرح دیوار کے پاس بے حال پڑا تھا۔ لالی دروازے کی جانب بڑھا۔ پہلے ناصرہ باہر نکلی۔ اس کے پیچھے پیچھے لالی باہر آیا۔

ناصرہ ہال کے دروازے کی جانب نہ گئی۔ اس کمرے کی جانب بڑھی' جس میں تہہ خانہ تھا۔ لالی نے ناصرہ کو ادھر جاتے دیکھا تو سرگوشی کی۔

"اس کمرے میں نہ جاؤ۔"

ناصرہ نے دھیرے سے بتایا۔ "اس کمرے کا ایک دروازہ باغیچے میں کھلتا ہے۔ یہ سب سے محفوظ راستہ ہے۔" وہ آگے بڑھی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچی۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔

ناصرہ نے اسے کھولنے کے لیے آہستہ آہستہ ہلایا تو اندر سے السیشن کے غرانے اور زور زور سے بھونکنے کی آواز ابھری۔ وہ دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کی خوفناک آواز سن کر دونوں سہم گئے اور جہاں تھے' وہیں دم بخود کھڑے رہے۔

غلام گردش میں پراسرار سناٹا تھا۔ دونوں خاموش کھڑے رہے' ناصرہ مڑی۔ وہ اس دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی جو ہال میں کھلتا تھا۔ لالی اس کے پیچھے' پیچھے چلا۔ ناصرہ کشیدہ قامت خوبصورت عورت تھی۔ وہ سفید ساڑھی میں ملبوس راج ہنس کی طرح گردن اونچی کئے چل رہی تھی۔ اس کی چال میں وقار تھا' تمکنت تھی۔ لالی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دونوں دروازے سے گزر کر ہال میں آ گئے۔

ہال میں دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ صرف ایک بلب روشن تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر جب ہال عبور کر کے باہر نکلے تو انھوں نے دیکھا' دروازے پر مسلح پہریدار کھڑا ہے۔ ناصرہ کو دیکھ کر وہ ادب سے جھک گیا۔ ناصرہ نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ گردن اٹھائے آہستہ' آہستہ پھاٹک کی سمت بڑھنے لگی۔

لالی اس کے پیچھے' پیچھے چلتا رہا۔ پھاٹک کے قریب درختوں کے نیچے ایک سیاہ سیڈان کھڑی تھی۔ ناصرہ نے آہستہ سے آواز دی۔ "چوکیدار۔" اس کی آواز سنتے ہی پھاٹک پر کھڑا ہوا چوکیدار اپنی بندوق سنبھالے دوڑتا ہوا قریب آیا۔ ناصرہ نے پوچھا۔

"میرا ڈرائیور کہاں ہے؟"

"وہ تو جی سو گیا۔ وہ تو شاید ہی گاڑی چلا سکے۔"

ناصرہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "کیوں؟ کیا ہو گیا اسے؟"

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ڈریور نے تو جی نشہ وشا کر رکھا ہے۔"

"پاجی' سور۔" ناصرہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ چوکیدار کو مخاطب کیا۔ "تم جا کر جلدی سے اس

کی جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر لاؤ۔ میں خود ڈرائیو کروں گی۔"

چوکیدار تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ناصرہ اور لالی خوف زدہ نظروں سے ہال کی جانب دیکھنے لگے۔ دروازے پر مسلح پہریدار مستعدی سے کھڑا تھا۔ ہال خالی تھا۔ یکایک باہر کی جانب سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ دونوں گھبرا گئے۔ چوکیدار ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

دونوں بے چین ہو کر بار بار اس سمت دیکھتے جدھر چوکیدار گیا تھا۔ کتوں کی آواز کے ساتھ ساتھ قدموں کی آہٹ بھی ابھری۔ لالی نے جھک کر سرگوشی کی۔

"کوئی آ رہا ہے؟"

"ہاں۔" ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ "مگر وہ حیات نہیں ہو سکتا۔ اسے اب تک ہوش نہیں آیا ہو گا۔" اس نے ہال کی جانب دیکھا۔ "حیات آئے گا تو ہال ہی کے دروازے سے آئے گا۔"

خشک پتوں پر آہٹ بڑھتی گئی۔ لالی نے ناصرہ کی طرف جھک کر کہا۔ "میں دیوار پھاند کر باہر نکل جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ مڑا۔

ناصرہ نے اسے حیرت سے دیکھا اور رسان سے کہا۔ "ٹھہر جا۔"

آہٹ اور قریب آ گئی۔ لالی سہما ہوا کھڑا رہا۔ مگر آہٹ کچھ فاصلے پر بند ہو گئی۔ ایسا محسوس ہو جیسے کوئی اس طرف آتے آتے یکایک ٹھٹک کر رہ گیا ہے اور ان کے قریب ہی درختوں تلے اندھیرے میں کھڑا ہے۔ دونوں کی بے چینی بڑھ گئی۔ مگر نہ چاپ سنائی دی' نہ کوئی ان کے پاس آیا۔

چوکیدار اینٹوں کے پختہ فرش پر تیز تیز چلتا ہوا اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس نے قریب آ کر کار کی کنجی ناصرہ کو دیتے ہوئے کہا۔ "ڈریور تو جی ایسا پڑا ہے کہ اسے بالکل ہوش نہیں۔ میں نے بہت مشکل سے چابی تلاش کر کے اس کی جیب سے نکالی۔"

"گیٹ کھول دو۔"

چوکیدار نے لالی کی طرف دیکھا۔ "کیا اس نے بھی باہر جانا ہے؟"

ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے جی! بنگلے کا کوئی بندہ میاں ساب کے حکم کے بغیر رات کو باہر نہیں جا سکتا۔"

چوکیدار نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تو جی ہرگز نہیں جا سکتا۔"

ناصرہ نے کار کا دروازہ کھولا اور تیوری چڑھا کر کہا۔ "نہیں' یہ میرے ساتھ ہی جائے گا۔"

چوکیدار عاجزی سے بولا۔ "میاں ساب کو تو آپ جانتی ہی ہیں جی۔ آپ سے تو وہ کچھ نہیں

کہیں گے' میں غریب ایں ویں مارا جاؤں گا۔ میری تو وہ چمڑی ادھیڑ ڈالیں گے۔" اس نے مڑ کر ہال کے دروازے کی جانب دیکھا۔

ناصرہ نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں نوں جھتیتی نال جانا ہے۔ میاں صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ ٹیلی فون میں بھی گڑبڑ ہے۔ میں نوں خود جا کر ڈاکٹر کو لانا ہے۔"

"ایسی گل بات ہے جی تو میں ساب کے ڈریور کو بولتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر کو لے آئے گا۔"

"فضول بحث نہ کر۔ جو میں کہتی ہوں وہ کر۔" ناصرہ نے چوکیدار کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور ڈپٹ کر حکم دیا۔ "جا' جا کر گیٹ کھول۔"

چوکیدار چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر آہستہ آہستہ گیٹ کی جانب بڑھا۔ ناصرہ فوراً اسٹیرنگ وہیل سنبھال کر بیٹھ گئی۔ اس نے سیڈان کا پچھلا دروازہ کھولا۔ کچھ سوچ کر لالی سے مخاطب ہوئی۔ "نہیں' تم اگلی ہی سیٹ پر میرے برابر بیٹھ جاؤ۔" لالی کار کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔

ناصرہ نے کار اسٹارٹ کی۔ کار کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ لالی نے ان کی تیز روشنی میں دیکھا بائیں ہاتھ پر ایک درخت کے تنے کے ساتھ کوئی اندھیرے میں دبکا کھڑا ہے۔ اس کے پیروں کا نچلا حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ نئی گاہے شاہی جوتی پہنے ہوئے تھا اور اس کی اجلی دھوتی کا نچلا کنارہ گہرا سرخ تھا۔ لالی کو محسوس ہوا کہ وہ دھیورا ہے۔ کار تیزی سے آگے بڑھی اور پھاٹک سے گزر کر باہر آ گئی۔ لالی چپ بیٹھا دھیورا کے بارے میں سوچتا رہا۔

اسے گم صم دیکھ کر ناصرہ نے دریافت کیا۔ "کیا سوچ رہا ہے؟"

"میں نوں ایسا لگتا ہے جی' دھیورا ہمارے نزدیک ہی درختوں کے نیچے کھڑا تھا۔"

"دھیورا!" ناصرہ نے حیرت سے کہا۔ "نہیں' وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بہت سنگدل اور خونخوار ہے' تجھے ہرگز گیٹ سے باہر آنے نہ دیتا۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔"

ناصرہ خاموش بیٹھی رہی۔ سیاہ سیڈان دھول اڑاتی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ لالی بھی چپ بیٹھا تھا۔ کچھ دور جا کر نہر آ گئی۔ سیڈان نہر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی۔ یہ راستہ بھی کچا تھا مگر کشادہ تھا۔ زمین بھی قدرے نم تھی۔ اب زیادہ دھول نہیں اڑ رہی تھی۔ ایک طرف نہر تھی' دوسری طرف گندم اور جو کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ چاند چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ آ گیا تھا۔ ہر طرف اجلی اجلی چاندنی بکھری تھی۔ لگ بھگ چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سیڈان بائیں ہاتھ کو مڑی اور ایک نیم پختہ سڑک پر آ گئی۔

لالی نے منہ باہر نکال کر پیچھے دیکھا اور دبی زبان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "اگر میاں ساب کو ہوش آگیا اور انھوں نے ہمارا پیچھا کیا تو کیا ہوگا؟"

"موت۔" ناصرہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ ہم دونوں کو قتل کردے گا۔ اس کے لیے قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسے بچے کے لیے کھلونا توڑنا۔"

ناصرہ نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ کار ہچکولے کھانے لگی۔ اس نے رفتار سست کر دی او گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "پچھلے پہیے میں پنکچر ہوگیا۔" اس نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کردی۔

دونوں کار سے اتر کر باہر آگئے۔ سڑک کے دونوں طرف ویران اور بنجر کڑ تھا۔ البتہ کچھ دو آگے سڑک کے دائیں طرف درختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔ رات چپ چاپ کھڑی تھی۔ ہوا میں شورید سری تھی۔ تیز جھونکوں سے ناصرہ کے بال بکھر گئے تھے۔ ساڑھی کا آنچل باربار ڈھلک جاتا۔ و اپنے بال درست کرتی، ساڑھی سنبھالتی کار کے پچھلے حصے کی جانب گئی۔ اس نے کار کی ڈکی جلد سے کھولی۔ لالی سے پوچھا۔

"تمیں نوں پہیا بدلنا آتا ہے؟"

"میں نے تو جی کبھی یہ کام نہیں کیا۔" لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔

"کوئی گل نہیں۔ جیسا میں کہوں ویسے کرنا۔ یہ ایسا مشکل کام نہیں۔" ناصرہ نے اسٹپنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ پہیا باہر نکال اور کونے میں رکھا ہوا جیک اور ٹول باکس بھی نکال لے۔"

لالی اسٹپنی اٹھانے لگا۔ اسی وقت عقب میں تیز روشنی ابھری۔ ناصرہ نے روشنی دیکھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ وہ بدحواس ہوکر بولی۔

"وہ آرہا ہے، وہ آرہا ہے۔"

لالی نے مڑ کر روشنی دیکھی۔ وہ بھی پریشان ہوگیا۔ مگر اس نے جلدی سے اسٹپنی نکالنے کی کوشش کی۔ ناصرہ نے اسے روک دیا۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اسٹپنی باہر نہ نکال۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔" لالی خاموش کھڑا رہا۔

ناصرہ نے ایک بار پھر روشنی کی سمت دیکھا اور ڈکی کے ڈھکنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے لالی سے کہا۔ "بھاگ سکتا ہے تو بھاگ جا۔" اس نے ڈکی بند کردی۔

"نہیں جی، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں؟"

"نہیں، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ ورنہ تو بھی میرے ساتھ مارا جائے گا۔" ناصرہ نے گہری سانس بھری۔ اس کا لہجہ جذباتی ہوگیا۔ "مگر وہ مجھے قتل نہیں کرسکے گا۔ میں اس کے ہاتھوں نہیں مروں گی۔" وہ آگے کے دروازے کی جانب بڑھی۔

لالی نے گھبرا کر کہا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولی۔ "میں خودکشی کرلوں گی۔ خود کو گولی مارلوں گی مگر اس کے ہاتھوں نہیں مروں گی۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔"

لالی بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ ناصرہ دروازے کے اندر جھک کر ڈیش بورڈ کے خانے کا ڈھکنا کھولنے لگی۔ لالی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "میری گل تو سنو۔"

ناصرہ نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "جلدی سے بھاگ جا۔ تو کچھ نہیں کرسکتا۔" وہ زور سے چیخی۔ "جا یہاں سے۔" اس کے بال بکھر کے چہرے پر آگئے تھے۔ آنکھیں تیزی سے چمک رہی تھیں۔

"تمہارے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔ فیر پروا نہ کرو۔"

"تو کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ اکیلا نہیں ہوگا۔ اپنے خوں خوار کرندوں کے ساتھ ہوگا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے جی۔" لالی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "کیا گڈی آگے نہیں جاسکتی؟"

"جا تو سکتی ہے، مگر اس سے کیا ہوگا؟"

"گڈی سامنے درختوں کے نیچے لے چلو۔ سڑک سے اتار کر کچے میں ڈال دینا۔" اس نے دور تک پھیلے ہوئے بنجر میدان پر نظر ڈالی۔ "یہاں تو چھپنے کی بھی کوئی جگہ نہیں۔"

دیکھتے دیکھتے روشنی بہت قریب آگئی۔ سڑک پر کسی گاڑی کے تیزی سے دوڑنے کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ ناصرہ نے اس کی طرف دیکھا اور بدحواس ہوکر بولی۔ "لو، وہ آگیا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"فکر نہ کرو۔ بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ لاؤ پستول مجھے دو، بھیتی نال۔"

ناصرہ نے ڈیش بورڈ کے خانے سے پستول نکال کر لالی کو دیا۔ پستول لے کر لالی بولا۔ "تم یہیں گڈی کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

ناصرہ بیزاری سے بولی۔ "یہ تو کیا کر رہا ہے؟ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"زبان بند رکھو۔ جیسا کہتا ہوں، وہ کرو۔"

وہ سیڈان کے پچھلے حصے کی جانب بڑھا اور گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ روشنی اور قریب آگئی۔ اتنی

قریب کے لالی نے یہ بھی دیکھ لیا کہ آنے والی سفید رنگ کی کار ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا' کار کی رفتار ست پڑی' بریک لگانے کی آواز ابھری۔ کار کچھ فاصلے پر رک گئی۔ لالی نے نشانہ باندھا اور چوکس ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔

ذرا دیر بعد کار کا دروازہ کھلا۔ ایک شخص نکل کر باہر آیا۔ مگر وہ حیات محمد نہیں تھا۔ میانہ قدو قامت کا نوجوان تھا۔ وہ پتلون اور بش شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ لالی اندھیرے میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ اس کے نیچے اترتے ہی ایک اور شخص بھی دروازہ کھول کر باہر آیا۔ دونوں سیڈان کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ وہ کچھ فاصلے پر رک گئے۔ ایک نے تبصرہ کیا۔ "ایکسی ڈنٹ تو نہیں لگتا۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا اور اونچی آواز سے بولا۔ "کوئی ہے یہاں؟" لالی اس کی آواز سن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔ دونوں سیڈان کے قریب آ گئے۔ بش شرٹ والے نوجوان نے پوچھا۔

"کیا ہو گیا جی؟"

لالی نے جواب دیا۔ "پنکچر ہو گیا ہے۔"

ناصرہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنے بکھرے ہوئے بال درست کر رہی تھی۔ نوجوان نے اسے دیکھ کر حیرت سے کہا۔ "ارے آپ! آپ تو میاں حیات محمد وٹو کی بیگم ہیں نا؟"

ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں جی۔"

نوجوان مسکرا کر بولا۔ "میرا نام چوہدری ولی داد خاں بھٹی ہے۔ ادھر اپنی بھی زمیں داری ہے۔" اس نے توقف کیا۔ "میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

ناصرہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "شکریہ! میرا ڈرائیور اسٹپنی لگا دے گا۔"

بھٹی نے کہا۔ "جیسی آپ کی مرضی۔"

مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ دونوں واپس چلے گئے۔ اپنی کار میں جا کر بیٹھے۔ اسے اسٹارٹ کیا ذرا دیر میں ان کی کار سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی۔ جب کار دور چلی گئی اور اس کی پچھلی سرخ بتیاں دھندلی پڑ گئیں تو ناصرہ نے ایک بار پھر ڈکی کھولی۔ لالی نے اسٹپنی اور ٹول بکس نکالا۔ ناصرہ کی ہدایت کے مطابق لالی نے جیک لگا کر کار کا پچھلا حصہ اونچا کیا۔ وھیل کیپ اتار کر نٹ بولٹ کھولے اور پہیا نکال کر اسٹپنی لگا دی۔ ناصرہ اس کے قریب بیٹھی ضروری ہدایات دے رہی تھی اور اس کی مدد بھی کر رہی تھی۔

لالی نے پہیا اور ٹول بکس ڈکی میں رکھ دیئے اور اسے بند کر دیا۔ دونوں پھر کار میں بیٹھ گئے۔ لالی

نے پستول ناصرہ کو واپس دے دیا۔ ناصرہ نے پستول ڈیش بورڈ کے خانے میں بند کیا۔ کار اسٹارٹ کی۔ لالی کی جانب متوجہ ہوئی۔

"جانتا ہے میں نے کیا سوچا تھا؟ اگر حیات آ جاتا تو تجھے کہتی' مجھ پر گولی چلا دے۔"

"نہیں جی! میں ایسا کام نہیں کرتا۔ میں کسی زنانی کا خون کرنے کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ کام تو میاں حیات محمد کر سکتا ہے۔ وہ تو جی بہت ہی ظالم ہے۔ اس نے تو جی تمہیں مار ہی ڈالا تھا۔ ایسا گلا دبوچا تھا' چھوڑتا ہی نہ تھا۔" لالی یہ کہتے ہوئے نشے سے جھوم کر مسکرانے لگا۔ "برا نہ منانا۔ تمیں صرف بیگم ہو۔ تاش کی بیگم۔ اس کی مونچھیں ہی نوچ لیتیں' کاٹ کھاتیں' منہ پر تھوک دیتیں۔ کچھ تو کرتیں۔ نہ ہوئی شاداں' میاں حیات اس کا گلا دباتا تو وہ اس کی گردن چھری سے کاٹ کر سرالگ کر دیتی۔"

"کون ہے وہ؟"

"ہے کوئی۔ پر وہ بہت زور آور ہے جی!"

"تیری گھر والی ہے۔"

"اپنی کوئی گھر والی شر والی نہیں۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "اپنے سے بھلا کون کڑی ویاہ کر سکتی ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے' تو تین بار جیل کاٹ چکا ہے؟"

"ہاں جی۔" لالی انکار نہ کر سکا۔ "اور چوتھی بار جیل میں بند کرنے کے لیے پولیس میری تلاش میں ہے۔"

"سمجھ نہیں آتی' تم لوگ جرائم پیشہ کیسے بن جاتے ہو؟"

"چھوٹا سا تھا تو ماں مر گئی۔ پیو جیل چلا گیا۔ پتہ نہیں' زندہ ہے کہ مر گیا۔" لالی افسردہ ہو گیا۔ "میں تو جی کوڑے کا ڈھیر ہوں۔ کوڑے کے ڈھیر پر پلا اور کوڑے کا ڈھیر ہی رہا۔ کھاد بھی نہ بن سکا۔ مگر تمہارا خصم۔" لالی جھجکا پھر مسکرا کر بولا۔ "معاف کرنا جی! میں ایسے ہی بولتا ہوں۔"

"کہتا جا۔ میں تیری گل سن رہی ہوں۔"

"میں یہ کہہ رہا تھا' تمہارا خصم' میاں حیات محمد کیسے جرائم پیشہ بن گیا؟ وہ تو جی ولایت سے بیرسٹری پڑھ کر آیا ہے۔ قنون کو پوری طرح جانتا ہے۔"

ناصرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی خاموش ہو گیا۔ ذرا دیر بعد لالی کی آواز ابھری۔ "میاں ریاض تو مر گیا۔ اب کیا ہو گا بی بی جی؟"

"وہ زندہ ہی کب تھا۔ اسے تو مرے ہوئے بھی تین مہینے سے اوپر ہو گئے۔ اس کی تو قبر بھی موجود ہے۔"

لالی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اور وہ جو تہہ خانے میں تھا' وہ کون تھا؟"

"وہ ریاض ہی تھا؟"

"فیر وہ کبر کس کی ہے؟" لالی بدستور حیرت زدہ تھا۔

"یہ تو حیات ہی جانتا ہو گا' اس قبر میں کس کی لاش دفن ہے۔ مگر اس نے مشہور یہی کر رکھا ہے کہ وہ ریاض کی قبر ہے۔"

لالی اور حیرت زدہ ہو گیا۔ "تو یہ چکر بھی چل رہا تھا۔"

"حیات نے جب اپنے بھائی ریاض کو تہہ خانے میں بند کیا تو چند ہی روز بعد یہ خبر پھیلا دی کہ ریاض کار کے ایکسی ڈنٹ میں مر گیا۔" ناصرہ نے بتایا۔ "حیات کسی لاوارث کی لاش بھی لے آیا۔ اسپتال کے مردہ خانے سے رشوت دے کر منگوائی تھی یا کسی قبر سے نکالی تھی۔ لاش رات کو آئی تھی۔ ایسی کٹی پھٹی اور مسخ تھی کہ نہ چہرہ نظر آتا تھا' نہ گردن۔ اس میں اتنی سڑاند تھی' اتنی بدبو تھی کہ میرا جی متلا گیا۔ نہ معلوم لاش کو غسل بھی دیا کہ نہیں۔ رات ہی کو فٹافٹ دفن کر دیا۔ قبر بھی بنا دی گئی۔"

"پیسے میں جی بست طاکت ہے۔ زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ بنا سکتا ہے۔"

"شروع میں تو میں یہ سمجھی میاں ریاض مر گیا۔ مگر ایک روز ایسا ہوا' میں حیات کی تلاش میں تہہ خانے میں چلی گئی۔ اس وقت دروازہ کھلا تھا اور دھیور بھی پہرے پر موجود نہیں تھا۔ میں تہہ خانے کے اندر گئی تو کیا دیکھتی ہوں' ریاض زندہ بیٹھا ہے۔ حیات بھی وہاں موجود تھا۔ وہ اتنا ناراض ہوا کہ دھیور کو ہنٹر سے ڈنگر کی طرح پیٹا۔ مجھے بھی مارا۔"

"ریاض کے پتر میاں نیاز محمد کو بھی یہ گل بات ملوم ہے؟"

"نہیں۔ نیاز کو کچھ نہیں معلوم۔ وہ یہی جانتا ہے' اس کا پیو مر گیا۔ حیات نے اسے جو کچھ بتایا' اس نے مان لیا۔"

"فیر وہ مکدمہ شکدمہ کیوں چلا رہا ہے؟"

"جاگیر اور جائیداد اپنے قبضے میں لینے کے لیے۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے یہ سارا منصوبہ نیاز کے ماماں کا ہے۔" ناصرہ چند لمحے خاموش بیٹھی رہی اور ونڈ اسکرین سے سنسان سڑک کو دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر یکایک جھنجلاہٹ آ گئی۔ کسی قدر تیکھے لہجے میں بولی۔ "یہ جاگیر' سچ پوچھو تو ایسی

بڑی ہے' جس کے لیے تین کتے لڑ رہے تھے۔ ایک مر گیا' دو ابھی رہ گئے ہیں۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ نیاز' میاں ریاض کا نہیں' کرنیل جانسن کا پتر ہے؟"

"میں نوں اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔" ناصرہ نے بے نیازی کا اظہار کیا۔ "مگر حیات یہی کہتا ہے۔"

"وہ تو یہ بھی کہتے ہیں جی' ریاض اپنی گھر والی کو کرنیل کے پاس سونے کے لیے بھیجتا تھا۔ مجھے خود انھوں نے بتایا تھا۔ میں غلط نہیں کہہ رہا۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے بھی یہی بتاتا ہے۔ وہ سب سے یہی کہتا ہے۔" اس کے چہرے پر برہمی چھا گئی۔ "ریاض بھی بے غیرت تھا اور حیات بھی بے غیرت ہے۔ دونوں ایک جیسے ہیں۔"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہارا خصم بھی ایسا ہی چکر چلاتا ہے؟ میرا مطلب ہے.....؟"

"میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "اسی بات پر میرا اس کا جھگڑا شروع ہوا۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے مہمانوں کے دل بہلاؤں۔ ان کے ساتھ سوؤں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں اب تک آٹھ مہمانوں کے ساتھ سو چکی ہوں۔ کل رات وہ مجھے نویں کے ساتھ سلانا چاہتا تھا۔ اسے وہ سیاست کہتا ہے۔ بادشاہ گری بتاتا ہے۔ جب میں اس کی اس سیاست اور بادشاہ گری میں مدد کرنے سے انکار کرتی ہوں تو مجھے بے رحمی سے مارتا ہے۔ ہڈی پسلی توڑ دیتا ہے۔ لہولہان کر دیتا ہے۔ تجھے کس طرح بتاؤں۔ کیسے کیسے ظلم کرتا ہے۔" ناصرہ کی آواز میں کسک تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔

لالی اندھیرے میں ناصرہ کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ لالی بھی اداس ہو گیا۔ سیاہ سیڈان سنسان سڑک پر تیزی سے دوڑتی رہی۔

لالی اسے تسلی بھی نہ دے سکا۔ بت بنا خاموش بیٹھا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ ایک منٹ' دو منٹ' تین منٹ' کئی منٹ گزر گئے۔

لالی نے خاموشی سے اکتا کر کہا۔ "بی بی جی' ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھ' کیا پوچھنا چاہتا ہے۔"

"کیا نیاز کو امریکہ سے تم نے بلایا ہے؟"

"نہیں' وہ خود آیا ہے۔" ناصرہ نے جواب دیا۔ "ہاں' میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ جاگیر اور جائیداد نیاز کو مل جائے۔"

"اس لیے کہ وہ اصلی وارث ہے۔ جیداو پر اس کا حق بنتا ہے؟"

"کسی کا حق وق نہیں بنتا۔ اور نہ مجھے کسی کے حق سے کوئی دلچسپی ہے۔" وہ جھنجلا کر بولی۔ "میں تو یہ چاہتی ہوں کہ جاگیر حیات کے پاس نہ رہے۔ اگر جاگیر اور زمینداری اس کے پاس رہے گی تو وہ ساری عمر اپنی اکلوتی بیٹی کا ویاہ نہیں کرے گا۔ اس ڈر سے کہ جاگیر اور جائیداد اس کے خاندان سے باہر چلی جائے گی۔ وہ جاگیر کم کرنے کی بجائے بڑھانا چاہتا ہے۔ یہ بات وہ مجھ سے صاف صاف بتا چکا ہے۔ وہ جاگیر اور جائیداد کے سوا کسی سے بھی محبت نہیں کرتا۔" ناصرہ نے گہری سانس بھری۔ "جب تک یہ جاگیر اور زمینداری ہے' نہ وہ اپنی بیٹی کا پیو بن سکتا ہے' نہ میرا شوہر۔"

"جیداد اور زمینداری تو جی وہ چھوڑے گا نہیں۔ یہ بالکل پکی گل ہے۔" لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "پر بی بی جی تم اتنی پڑھی لکھی ہو۔ وڈے گھر کی دھی ہو۔ تمہارے لیے کسی چیز کی کو نہیں۔ فیر تم اس کی پروا کیوں کرتی ہو؟ کاگز لکھوا کر اس سے چھٹکارا کیوں نہیں پالیتیں۔"

"کیسے چھٹکارا پالوں۔ میرا پیو نہیں مانتا۔ وہ خاندانی جاگیردار ہے۔ کہتا ہے ہمارے خاندان کی کسی زنانی نے آج تک طلاق نہیں لی۔ جس کے ساتھ ایک بار ویاہ ہوگیا' ساری زندگی اسی کے نام پر کاٹ دی۔ میں نے کاغذ لکھوایا تو خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔" ناصرہ نے تامل کیا۔ "مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ میری بچی مونا کا مستقبل خراب ہو جائے گا۔ سب کہیں گے طلاقن کی بیٹی ہے۔"

"تمہاری مونا کتنی عمر کی ہوگی؟"

"ابھی تو بہت چھوٹی ہے اور بہت معصوم ہے۔ ابھی تو وہ کچھ بھی نہیں جانتی۔ اسے کچھ پتہ نہیں۔"

"جب میں چھوٹا سا تھا تو ساری گالاں سیکھ گیا تھا۔ ان کا کچھ کچھ مطلب بھی جان گیا تھا۔" یہ کہتے کہتے لالی یادوں کے دھندلکوں میں گم ہو گیا۔ ایک بار پھر نشہ اس پر حملہ آور ہوا۔ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ جھوم کر بولا۔ "ایک بار ایسا ہوا جی کہ میں نے پنڈ کی ایک ملے بار غیار کو آنکھ مار دی۔ وہ فصل کی واڈھی کے بعد کھیت میں پڑے ہوئے کنک کے سٹے چن رہی تھی۔ اس نے آنکھیں نکال کر مجھے گھورا اور دبا کے پٹائی کی۔ فیر تو جی چاچا نے مجھے اینٹوں کے بھٹے پر لگا دیا۔ سویرے تڑکے کام پر جاتا اور شام کو گھر آتا۔ چلچلاتی دھوپ میں جتھیروں کے ساتھ کام کرتا۔ بہت دنوں اینٹیں ڈھوتا رہا۔ ہاتھوں میں گھاؤ پڑ گئے۔ سر کے بال ایسے اڑے کہ بالکل گھون مون ہو گیا۔ کرتا بھی کیا۔ کھانے کو نہ ملتا۔"

ناصرہ خاموش بیٹھی رہی۔ لالی کہتا رہا۔ "میرا چاچا بے چارہ بہت بوڑھا تھا۔ اوپر سے اسے دمہ بھی تھا۔ پڑا پڑا' کھوں کھوں کھانستا رہتا۔ میری چھوٹی بہن پورے دس سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ چاچا نے اس کا ویاہ کر دیا۔ وہ کھاتی ڈھیر سا تھی اور گھر میں کھانے کو نہ تھا۔ ویاہ کے بعد اسے سب پتہ معلوم ہو گیا۔ کھٹا کھٹ بچے جننے لگی۔ اس نے تین خصم کیے۔ پر روٹی کو ترستی ہوئی مر گئی۔"

"ہمارے گھرانے میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارا خاندان بہت اونچا ہے۔" ناصرہ نے فخر سے گردن اونچی کی۔ "ہم کوٹ کمالیہ کے لنگریال ہیں۔ تمیں نوں پتہ ہے لنگریال کون ہوتے ہیں؟"

"اپنے کو تو جی کچھ پتہ نہیں۔"

"پرانے زمانے میں ہمارے وڈوں اور بزرگوں کے گھر کے دروازے محتاج اور حاجت مندوں کے لیے دن رات کھلے رہتے تھے۔ وہ بہت امیر ہوتے تھے۔ ان کی حویلیوں میں لنگر خانے ہوتے تھے۔ جس کا جی چاہتا' لنگر سے روٹی کھاتا۔ کوئی بھوکا نہ جاتا۔ ان کے لنگر خانے اتنے مشہور تھے کہ ہماری برادری کا نام لنگریال پڑ گیا۔" ناصرہ چند لمحے خاموش رہی۔ "حیات کی ذات کا کچھ پتہ نہیں۔ خود کو وٹو کہتا ہے۔ لیکن کوئی ڈوگر بتاتا ہے کوئی آرائیں۔ ڈوگروں کے بارے میں مشہور ہے' ڈوگر چور ہوتے تھے اور آرائیں پہلے شاہی مالی ہوتے تھے' اب تو خود کو میاں کہلواتے ہیں۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا اور تیکھے لہجے میں بولی۔ "نہ جانے ابا جی نے کیا سوچ کر مجھے حیات کے پلے باندھ دیا۔"

لالی اس کی باتیں سن کر بے تکلفی سے ہنس پڑا۔ "یہ خاندان اور برادری کا بھی عجیب چکر ہے۔ بات یہ ہے جی' اپنا تو سرے سے کوئی خاندان ہی نہیں۔ میں نوں تو ٹھیک سے یہ بھی پتہ نہیں میرا پیو کون تھا۔"

ناصرہ نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ "تو کیا تیری ماں....." اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں جی' وہ کنجری شنجری نہیں تھی' بہت نیک بندی تھی۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "برا تو وہ زمیندار تھا جس کی حویلی میں ویاہ سے پہلے میری ماں کام کاج کرتی تھی۔ غریب کی تھی۔ زمیندار نے اسے خراب کر دیا۔ فیر ایسا ہوا جی کہ میرا نانا اپنا پنڈ چھوڑ کر میری ماں کے ساتھ گوگیرہ کے نزدیک ایک چک میں آ کر بس گیا۔ جب اس نے میری ماں کا ویاہ کیا تو میں اس کے پیٹ میں تھا۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ ناصرہ بھی خاموش بیٹھی رہی۔

کھلی کھڑکی سے ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ نشے کا تیز ریلا آیا۔ لالی مسکرا کر بولا۔ "جب میں تگڑا جوان ہو گیا اور چوری چکاری بھی کرنے لگا تو مجھے اپنی ماں کے بارے میں بہت سی باتوں کا پتہ

چل گیا۔ مجھے زمیندار پر بہت غصہ تھا۔ ایک رات میں قتل کرنے کے ارادے سے اس کی
میں گھسا۔ جیسے ہی کھڑکی کے رستے کمرے میں گیا' کیا دیکھتا ہوں' وہ ایک چھوہری کے ساتھ بالکل
کھڑا ہے۔ وہ اس کی دھی سے بھی چھوٹی تھی۔ میں نے چاقو کھول کر دکھایا۔ اسے کہا' ابھی
کردوں گا۔ وہ ایسا ڈرا کہ تھر تھر کانپنے لگا۔ مجھے ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے اسے قتل کرنے کا ا
چھوڑ دیا اور اس سے پورے چار ہزار روپے لے کر چلا آیا۔ وہ بہت مالدار ہے جی۔ وڈا زمین
ہے۔ سنا ہے ملوث کا جنجوعہ ملک ہے۔ اسمبلی کا ممبر شمبر بھی رہ چکا ہے۔ اخباروں میں اس
تصویریں بھی چھپتی ہیں۔ آج کل وہ اپنی زمین داری میں بہت شاندار مسجد بنوا رہا ہے۔ اس
ساتھ یتیم خانہ اور مدرسہ بھی ہوگا اور میں نے جو تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سیکھا' وہ جیل میں سیکھا
لالی ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

ناصرہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی لمبی چوڑی کار تیزی سے سڑک پر دوڑتی رہی' ایک موڑ کاٹ
پختہ سڑک پر آگئی۔ کچھ دیر بعد ناصرہ نے پوچھا۔ "تیں نوں کتھے جانا ہے؟"

"میں نوں تو جی کادر آباد سٹیشن جانا ہے۔"

"قادر آباد تو ادھر رہ گیا۔" ناصرہ نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "آگے تو منگری
ہے۔ مگر میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کچھ دور جا کر نہر آئے گی اور اس کے ساتھ ہی میں لال مجے
جانب مڑ جاؤں گی۔ میں اپنی بہن کے گھر جاؤں گی۔"

"ایسا ہے جی تو مجھے یہیں اتار دو۔ اب تمہیں اپنے خصم کا بھی ڈر نہیں رہا۔"

ناصرہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔ "حیات کے سر سے بہت خون بہہ گیا تھا۔ جانے ا
اس کا کیا حال ہوگا۔"

لالی بے نیازی سے بولا۔ "مر گیا ہوگا۔"

ناصرہ غصے سے پھٹ پڑی۔ "تو بالکل جانگی ہے اور بے رحم بھی ہے۔"

لالی اس کی برہمی خاموشی سے پی گیا۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ نہ ناصرہ نے اسے روکا نہ لا
نے روکنے کے لیے کہا۔ دونوں چپ بیٹھے تھے۔ کار کسی بستی کے قریب سے گزر رہی تھی۔ درختو
کے جھنڈ کے پیچھے اکا دکا چراغ ٹمٹما رہے تھے۔

کار آن کی آن میں بستی کے آگے سے گزر گئی۔ سڑک کے دونوں طرف درخت اور ہرے
بھرے کھیت تھے۔ پت جھڑ کے مارے ہوئے درخت اجڑے اجڑے نظر آتے تھے۔ فضا غبار آلو
تھی۔ چاندنی دھندلی پڑ گئی تھی۔ لالی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ ناصرہ نے خاموشی سے اکتا کر

پوچھا۔

"کیا سوچ رہا ہے؟"

"تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔"

ناصرہ نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ "میرے بارے میں؟"

"ہاں۔" لالی نے رسان سے کہا۔ "میں سوچ رہا تھا' جب وہ جھکا ہوا دونوں ہاتھوں سے تمہارا
گلا دبا رہا تھا۔ میں نیچے زمین پر پڑا تھا۔ تمہاری ساڑھی الگ پڑی تھی۔ تمہاری سوہنی سوہنی
آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں' بال بکھر گئے تھے۔"

لالی بالکل بھول گیا کہ وہ شاداں سے نہیں میاں حیات محمد خاں وٹو کی بیگم ناصرہ سے بات کر رہا
ہے' جو ایک خاندانی جاگیردار کی بیٹی بھی تھی۔ لالی نشے کی ترنگ میں کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا۔
نہایت بے باکی سے کہتا رہا۔ "تمہاری دونوں ٹانگیں ننگی تھیں۔ ایک دم ننگی۔ ہری' ہری روشنی
میں....."

ناصرہ نے فوراً بریک لگایا۔ کار کے پہیے سڑک کی تیز رگڑ سے سناٹے میں زور سے چیخے۔ لالی کی
بات ادھوری رہ گئی۔ کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ناصرہ غضب ناک ہو کر چیخی۔ "بے غیرت!
بدتمیز! فوراً گاڑی سے نیچے اتر جا۔ نکل باہر۔"

لالی کھسیانا ہو کر بولا۔ "اتنا ناراض کیوں ہوتی ہو۔"

وہ ڈپٹ کر بولی۔ "میں کہتی ہوں نکل باہر۔" اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور ڈیش بورڈ کا
خانہ کھولنے لگی۔

"میں نوں پتہ ہے' تمہارے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔ پستول نہ نکالو۔ میں چلا جاؤں گا۔"
لالی نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا' ناصرہ کی طرف مڑا اور ڈھیٹ بن کر مسکراتے ہوئے
بولا۔ "مجھے جی زنانیوں کی ننگی ٹانگیں دیکھنے کا چسکا نہیں ہے۔ وہ تو میں دس روپے خرچ کر کے بھی
دیکھ سکتا ہوں۔ صرف ٹانگیں نہیں' پورا بدن دیکھ سکتا ہوں۔ میرے پاس بکیر اور جیسدا ہوتی تو
روز زنانیوں کو ننگا کر کے دیکھتا۔ خود بھی دیکھتا' دوسروں کو بھی دکھاتا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔
"میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا' تمہارا خصم بے رحم بھی ہے' بے غیرت بھی۔ میں نے اس کے منہ پر
اسی لیے تھوکا تھا اور اسی لیے اس کا سر دیوار سے ٹکرا کر پھوڑا تھا کہ وہ بہت وڈا بے غیرت ولا
ہے۔"

لالی نے کار کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ ناصرہ گردن موڑے اسے غور سے دیکھتی رہی' پھر

اس نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھہر جا۔" وہ اپنا پرس کھولنے لگی۔

لالی نے کار کا دروازہ دھیرے سے بند کیا اور اس کا سہارا لے کر زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"اسے نہ کھولو۔ اس میں ۱۷۰روپے تھے' وہ میں نے پہلے ہی نکال لئے ہیں۔ پروا نہ کرو۔ اپنا کام چل جائے گا۔ اب تم بس جاؤ۔"

لالی الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ناصرہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ کار اسٹارٹ کی' گیئر میں ڈالی اور جھنجلا کر ایکسی لیٹر اس قدر زور سے دبایا کہ سیاہ سیڈان چیختی ہوئی تیزی سے بھاگی اور آن کی آن میں بہت دور نکل گئی۔

۱۰

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سڑک نیم پختہ تھی اور زیادہ کشادہ بھی نہ تھی۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ لالی آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ کچھ ہی دور آگے گیا تھا کہ درختوں کی اوٹ سے روشنی نظر آئی۔ وہ اسی سمت بڑھنے لگا۔ قریب پہنچا تو پتھروں کی بنی ہوئی دو منزلہ عمارت نظر آئی۔ یہ ریسٹ ہاؤس تھا۔

لالی ٹھہر گیا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسی اثناء میں درختوں کے نیچے سے کتوں کا غول نکلا۔ کتے زور زور سے بھونکتے ہوئے لالی پر جھپٹے۔ وہ گھبرا کر سرپٹ بھاگا۔ کتوں نے اس کا تعاقب کیا۔ لالی دوڑتا ہوا ریسٹ ہاؤس کے قریب پہنچ گیا۔ مگر کتوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ زور زور سے بھونکتے اور دانت نکال کر غراتے ہوئے اس پر جھپٹتے۔ ان کے نرغے سے بچنے کے لیے قریب نہ کوئی جھاڑی تھی نہ درخت تھا۔ پتھر بھی نہ تھے کہ اٹھا' اٹھا کر مارتا اور کتوں کو بھگانے کی کوشش کرتا۔

اس کے پیروں کے نیچے خشک اور ریتلی زمین تھی۔ لالی جھٹ زمین پر جھکا اور دونوں ہاتھوں سے مٹی اڑانے لگا۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ کتے بکھر کے پیچھے ہٹے۔ گرد کا غبار چھا گیا۔ لالی کو ریسٹ ہاؤس کی دیوار تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔ اس نے زقند بھری اور دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔ دیوار کے باہر کتے مسلسل بھونک رہے تھے۔

ریسٹ ہاؤس میں ہر طرف ویرانی تھی۔ وسط میں دو منزلہ عمارت تھی۔ اوپر کی منزل کے ایک دریچے سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ عمارت کے اردگرد وسیع احاطہ تھا۔ احاطے میں اونچے

اونچے درخت تھے۔ درختوں کے پتے گر چکے تھے۔

برہنہ شاخیں تاریکی میں مکڑی کے جالوں کی مانند الجھی الجھی نظر آتی تھیں۔ خزاں کی اجاڑ رات نڈھال کھڑی تھی۔ ہوا چلتی تو خشک پتے کھڑکھڑاتے اور دور تک بکھر جاتے۔ لالی احاطے میں پہنچنے کے بعد اندھیرے میں دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گیا۔ چار دیواری کے اس پار کتے ابھی تک بھونک رہے تھے۔

لالی نے دم بھی نہ لیا تھا کہ عمارت کے عقب سے ایک شخص جھپاک سے نکلا اور عین اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لمبی لاٹھی تھی' دوسرے میں لالٹین لٹک رہی تھی۔ وضع قطع سے وہ ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار لگتا تھا۔ اس نے جھٹ لالٹین ایک طرف رکھی اور لالی پر لاٹھی تان کر بولا۔

"کون ہے تو؟"

چوکیدار اس طرح آنا" فانا" نکل کر سامنے آیا کہ لالی کے لیے راہ فرار اختیار کرنے کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور آہستہ سے کہا۔

"چاچا! ڈر نہیں۔"

"پر تو ہے کون؟" چوکیدار بدستور لاٹھی تانے کھڑا تھا۔ اس نے کسی قدر اونچی آواز سے کہا۔ "ٹھیک' ٹھیک بتا' یہاں آیا کیسے؟"

وہ دبلا پتلا ادھیڑ آدمی تھا۔ لالی نے اسے کمزور اور سن رسیدہ پایا تو نڈر ہو کر بولا۔ "چاچا! خاما خا گرمی نہ دکھا۔" وہ مسکراتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اپنی ڈانگ تو ہٹا۔ ذرا دم لے۔ میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔"

چوکیدار نے لاٹھی نیچے کر لی۔ چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے لالٹین اٹھائی اور لالی کے چہرے کے سامنے لا کر اس طرح چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے پوچھا۔ "تو عیدو کا پت لّلی' تو نہیں ہے؟ لگتا تو کچھ ویسا ہی ہے۔"

"نہیں جی' نہ میں عیدو کا پتر ہوں' نہ لّلی ہوں۔" لالی نے اس کا شک رفع کیا۔ "گل ایسہ ہے جی! میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ کتے بھونکتے ہوئے پیچھے لگ گئے۔ گھبرا کر بھاگا اور یہاں آگیا۔"

چوکیدار نے مڑ کر دیکھا' پھاٹک قریب ہی تھا۔ اس نے حیرت سے کہا۔ "پھاٹک میں تو تالا لگا ہے۔ تو آیا کیسے؟"

"پھاٹک پھاند کر اندر آگیا۔" لالی ایک بار پھر مسکرایا۔ "کرتا بھی کیا۔ یہاں نہ آتا تو کتے مجھے نہ

بھنبوڑتے۔ ایک دو نہیں' پورا غول ہے۔" احاطے کے باہر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لالی نے پشت کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "سن رہا ہے؟ ابھی تک کھڑے بھونک رہے ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" چوکیدار نے لالٹین زمین پر رکھ دی۔ "پچھلے دنوں ادھر ایک کھوتا مر گیا تھا۔ جانے کہاں کہاں کے کتے اسے کھانے آگئے۔ رات بھر بھونکتے ہیں۔" چوکیدار کا رویہ اب نرم ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا کر کسی قدر بے تکلفی سے بولا۔ "یہاں کھڑا کیوں ہے؟ ادھر منجی پر آجا۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔" چوکیدار مڑا' لالٹین اٹھائی اور آگے بڑھ گیا۔

لالی بھی ساتھ ساتھ چلا۔ چلتے چلتے اس نے پوچھا۔ "چاچا یہ کس کی حویلی ہے؟"

چوکیدار نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "یہ حویلی نہیں' ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں سرکاری افسر آکر ٹھیرتے ہیں۔"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "آج یہاں کوئی ٹھیرا ہے؟"

"نہیں!" چوکیدار نے جواب دیا۔ "ریسٹ ہاؤس بالکل خالی ہے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے درختوں کے نیچے پہنچ گئے۔ قریب ہی نیچی چھت کا پختہ کوارٹر تھا۔ کوارٹر کا دروازہ بند تھا۔ اس کے سامنے بوسیدہ چارپائی پڑی تھی۔ چوکیدار نے چارپائی کے نزدیک جا کر کہا۔

"لے' اب تو آرام سے یہاں بیٹھ۔"

لالی چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے لاٹھی ایک طرف رکھ دی۔ لالٹین کی لو دھیمی کی اور اسے بھی چارپائی کے قریب رکھ دیا۔ وہ لالی کے نزدیک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لالی نے ذرا دیر خاموش رہ کر پوچھا۔ "جب یہاں کوئی ٹھیرا نہیں ہے تو یہ اوپر بتی کیوں جل رہی ہے؟" اس نے گردن اونچی کی اور اوپر کی منزل کی وہ کھڑکی دیکھنے لگا جس کے شیشوں سے زرد زرد روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

"وہ تو میں اس لیے روز جلا دیتا ہوں کہ صاحب لوگ ادھر آئیں تو دور سے ریسٹ ہاؤس نظر آجائے۔ پر اب یہاں آتا ہی کون ہے۔ جو افسر کبھی دورے پر ادھر آتے بھی ہیں' وہ نمبردار اور زمین داروں کی حویلیوں میں ٹھیر جاتے ہیں۔ مہینوں میں کوئی بھولا بھٹکا ادھر آجاتا ہے۔"

کتے اب ریسٹ ہاؤس سے دور جا چکے تھے۔ مگر ان کے بھونکنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں ابھی سنائی دے رہی تھیں۔ لالی نے سوچا' ابھی باہر جانا مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ریسٹ ہاؤس

سے نکلتے ہی کتے پھر پیچھے لگ جائیں اور کسی نئے خطرے کا باعث بن جائیں۔ ریسٹ ہاؤس محفوظ جگہ تھی۔ چوکیدار سے اس نے یارانہ بھی گانٹھ لیا تھا۔ لالی نے کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور چوکیدار کی طرف بڑھا کر بولا۔

"چاچا! سگریٹ پئے گا؟"

"پلا دے۔" چوکیدار نے بے نیازی سے کہا اور ایک سگریٹ پیکٹ سے نکال لی۔ "سگریٹ پینے سے کھانسی بہت ہوتی ہے پر طبیعت بھی تو نہیں مانتی۔" لالی نے اپنی اور چوکیدار کی سگریٹیں ماچس جلا کر سلگائیں۔ چوکیدار سگریٹ پر کش لگاتے ہی کھانسنے لگا۔ ذرا دیر کھانستا رہا، کچھ سکون ہوا تو پوچھنے لگا۔

"تیرا ناں کیہ ہے؟"

لالی ایسے سوالات کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اس نے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "ناں تو جی اپنا محمد ابراہیم ہے، پر سب مجھے ہیما کہتے ہیں۔"

"بچے! یہ تو بتا، تو اتنی رات گئے ادھر آیا کیسے؟" چوکیدار نے دریافت کیا۔ "تیں نوں شمس پور تو نہیں جانا؟"

"جانا تو جی مجھے بہت آگے ہے۔" لالی نے گول مول جواب دیا۔ "سوچا، اسی رستے سے چلا جاؤں۔"

چوکیدار نے سگریٹ کا کش لگایا، لالی کے کرتے شلوار کو نظر بھر کر دیکھا۔ "تو کرتا کیا ہے بچے؟"

"میں جی اوکاڑہ ڈیری فارم میں نوکری کرتا ہوں۔"

چوکیدار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "تو کیا تو اوکاڑے جا رہا تھا؟" مگر لالی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ مسکرا کر بولا۔ "پیدل اوکاڑے کیسے جا سکتا ہے؟ وہ تو بہت دور ہے۔" اس نے ذرا تامل کیا۔

"تیں نوں کہیں اور ہی جانا ہوگا۔ کہاں کا ارادہ ہے؟"

"مینوں تو جی کادر آباد سٹیشن جانا ہے۔ ایک دو روز ادھر ٹھہر کر اوکاڑے چلا جاؤں گا۔"

"پر کادر آباد سٹیشن بھی یہاں سے دور ہے۔ ۲۰ میل سے کم نہیں ہوگا۔ تیرے لیے تو سیدھا رستہ منٹگمری کا ہے۔ لاری پکڑتا، منٹگمری جاتا اور وہاں سے ریل یا راوی ٹرانسپورٹ کی لاری سے کادر آباد چلا جاتا۔ تجھے اس طرف کا رستہ کس نے بتایا؟"

"اب تجھ سے کیا بتاؤں چاچا!" لالی نے بات بنائی۔ "ہوا یہ کہ میں جہاں خان پنڈ میں اپنے ایک دوست کے ویاہ میں آیا تھا۔ وہاں ہنسی مخول میں ہو گیا غثا۔ میں ایسا گرمی میں آ گیا کہ آدھی رات ہی

کو اٹھ کر چل کھڑا ہوا۔"

"کچھ زیادہ جھگڑا تو نہیں ہوا؟" چوکیدار نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "میرا مطلب ہے، کوئی خون شون تو نہیں ہو گیا جو تجھے اس طرح رات ہی کو وہاں سے بھاگنا پڑا؟"

"نہیں چاچا! ایسی کوئی گل نہیں۔" لالی نے ہنس کر کہا۔ "جھگڑا بڑھ تو جاتا پر میں ٹال گیا۔ جیسے بیٹھا تھا ویسے ہی اٹھ کر چل کھڑا ہوا۔ کپڑے لتے بھی ساتھ لایا تھا، وہ بھی وہیں چھوڑ آیا۔ میرے دوست اور دوسرے بندوں نے روکا بھی، پر میں نے کسی کی نہ مانی۔ پنڈ سے نکل کر آگے بڑھا تو پکی سڑک آ گئی۔ سڑک کے دوسری طرف تیرے ریسٹ ہاؤس کا رستہ نظر آیا۔ میں اسی پر چل کھڑا ہوا۔ سوچا، آگے جا کر کسی راہ گیر سے کادر آباد کا رستہ پوچھ لوں گا۔" اس نے باتوں باتوں میں چوکیدار سے قادر آباد اسٹیشن کا راستہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ "کوئی نہ کوئی رستہ تو ادھر سے کادر آباد جاتا ہی ہوگا۔ چاچا تجھے تو رستے کا پتہ ہوگا؟"

"رستہ تو ادھر سے جاتا ہے۔" چوکیدار نے بتایا۔ "آگے گوردا پورہ ہے۔ یہاں سے چار میل کے لگ بھگ ہوگا۔" اس نے شمال کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "وہاں سے نہر ملے گی۔ سیدھی کادر آباد جاتی ہے اور وڈی نہر، لوئر باری دوآب سے جا کر مل جاتی ہے۔ اب تو رات بہت ہو گئی۔ پیے نہر کے کنارے کی کسی بستی سے کادر آباد تک جانے کے لیے تانگا بھی مل جائے گا۔ زیادہ پھیر کا رستہ نہیں۔ نہر کے کنارے کی سڑک، ہے تو کچی پر ٹھیک ٹھاک ہے۔ صرف برسات میں کہیں کہیں سے خراب ہو جاتی ہے۔"

لالی ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ "چاچا! اب میں چلوں گا۔"

"تو اس وکھت جائے گا؟" چوکیدار نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔ "ذرا اپنی گھڑی دیکھ کر بتا، بجا کیا ہے؟"

لالی نے لالٹین کی جانب ہاتھ بڑھا کر گھڑی دیکھی۔ "اڑھائی بجا ہے۔"

"نہیں جی، اتنی رات گئے جانا ٹھیک نہیں۔ گوردا پورے کا رستہ بھی ٹھیک نہیں۔"

"تو فکر نہ کر چاچا! میں بے کھٹکے چلا جاؤں گا۔ ڈرنے شرنے کی کوئی بات نہیں۔"

"ڈرنے کی بات نہیں۔ پر گوردا پورے تک رستہ ذرا پھیر کا ہے۔ اندھیرے میں بھٹک کر جانے کدھر نکل جائے گا۔ ساری رات پریشان ہوگا۔ ایسا کیوں نہیں کرتا، صبح تک یہیں ٹھہر جا۔ پاک تن روڈ یہ سامنے رہی۔" چوکیدار نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "سویرے سویرے چلا جانا۔ دوپہر تک پہنچ جائے گا۔ اتنی رات کو کہاں بھٹکتا پھرے گا۔"

مگر لالی آمادہ نہ ہوا۔ "نہیں چاچا! میں چلا جاؤں گا۔ مجھے نہ روک۔ صبح ہونے تک تو ؛ کادر آباد کے نزدیک پہنچ جاؤں گا۔ ۲۰ ہی میل کا تو رستہ ہے۔ ابھی سورج نکلنے میں بہت دیری ہے اتنی دیر میں تو بہت سا رستہ طے ہو جائے گا۔" یہ کہتا ہوا لالی اٹھنے کے لیے کسمسایا۔ اب وہ ٹ ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا اور جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

لیکن چوکیدار نے اسے اٹھنے نہیں دیا' اپنی بات پر اڑا رہا۔ لالی کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "میرا مان' اس وکھت یہاں سے جانے کا وچار چھوڑ دے۔" اس نے پیار سے لالی کو ڈانٹا۔ "خاما خا نہ کر۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں تیرے سونے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

لالی نے چوکیدار کو اس قدر مہربان پایا تو انکار نہ کر سکا۔ ویسے بھی سورج نکلنے سے پہلے قادر آ پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ دن میں کہیں نہ کہیں ٹھہرنا پڑتا اور نیا خطرہ مول لینا پڑتا۔ "تو کہتا ہے تو میں نہیں جاؤں گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "چاچا! میری فکر نہ کر۔ میں کہیں بھی سو جاؤں گا۔ چ گھنٹے کی تو بات ہے۔" اس نے نظریں گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ "مجھے تو تیرے سوا یہاں کوئی دکھائی نہیں پڑتا۔ کیا یہاں اور کوئی نہیں رہتا؟"

"کیوں نہیں رہتا۔ میری گھر والی بھی ساتھ رہتی ہے۔"

"وہ تو کوارٹر میں پڑی سوتی ہو گی۔"

"نہیں' وہ اپنے بھرا کے گھر چک ۹۸ گئی ہے۔ بھتیجے کا ویاہ ہے' اس میں شریک ہونے گئی ہے۔ تین روز ہو گئے گئے ہوئے۔ کواٹر میں صرف نجیا ہے۔ نجیا میری سب سے چھوٹی دھی ہے۔ بہت کام کاج کرتی ہے جی۔ کوئی افسر آکر ریسٹ ہاؤس میں ٹھیرتا ہے تو وہی چائے بناتی ہے' روٹی شوٹی تیار کرتی ہے۔ خانساماں یہاں رہتا ہی کب ہے۔"

"خانساماں کہاں ہوتا ہے؟"

"ویسے تو ریسٹ ہاؤس ہی کا نوکر ہے پر کام ایس' ڈی' او صاحب کے بنگلے پر کرتا ہے۔ رہتا بھی وہیں ہے۔ کبھی کبھار آجاتا ہے۔ یہاں کام ہی کون سا ہے۔ اسے گئے دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔ سنا ہے' اس نے ملتان میں کوئی دھندا شروع کر رکھا ہے۔" چوکیدار پر ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ بھینچ کر دیر تک کھانستا رہا' جب ذرا قرار آیا تو گویا ہوا۔

"خانساماں کا کواٹر خالی ہے' اسی میں سو جا۔"

چوکیدار آگے بڑھا اور اپنے کوارٹر پر پہنچ کر کنڈی کھٹکھٹانے لگا۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا

وراس کی اوٹ دھندلا سایہ نظر آیا۔ یہ چوکیدار کی بیٹی نجیا تھی۔ اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز یں پوچھا۔ "کیا بات ہے بابا؟"

"خانساماں کے کواٹر کی چابی تو لا دے۔"

"کیا خانساماں چاچا آگیا؟"

"نہیں۔" چوکیدار نے جواب دیا۔ "اس کی منجی باہر نکالنی ہے۔"

ذرا دیر خاموشی رہی۔ لالی بھی چپ بیٹھا رہا۔ چوکیدار نے نجیا سے خانساماں کے کوارٹر کی کنجی لی' مڑ کر لالی کی جانب دیکھا اور اونچی آواز سے پوچھا۔

"چائے پئے گا؟"

"چاچا! یہ چائے پینے کا کون سا ٹیم ہے۔"

"یہ سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں ہر وکھت چائے چلتی ہے۔" چوکیدار نے بے تکلفی سے کہا۔ "اب تو نجیا جاگ ہی گئی۔ فٹافٹ چائے بنا دے گی۔"

مگر لالی چائے پینے پر آمادہ نہ ہوا۔ "نہیں چاچا! میں نے چائے شائے نہیں پینی۔ نیند آرہی ہے۔"

"جیسی تیری مرضی۔" چوکیدار نے آہستہ سے پھر بیٹی کو مخاطب کیا۔ "دروازہ بند کر لے نجیا۔" نجیا نے خاموشی سے دروازہ بند کر لیا۔ چوکیدار لالی کے پاس آگیا۔ "آ میرے ساتھ۔" دونوں اٹھ کر درختوں کے نیچے چلنے لگے۔ چوکیدار کے ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔ خانساماں کا کوارٹر قریب ہی تھا۔ چوکیدار نے تالا کھولا اور دروازے کا ایک پٹ کھول کر بولا۔ "اندر آجا۔" لالی اس کے ہم راہ کوارٹر میں چلا گیا۔ کوارٹر میں صرف ایک کمرہ تھا۔ کمرے کے آگے برآمدہ تھا۔ برآمدے کے ساتھ مختصر آنگن تھا۔ کوارٹر کی چار دیواری اونچی تھی۔ برآمدے میں ایک چارپائی بچھی تھی۔ چوکیدار نے چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کمرے میں بستر بھی ہے' بچھا لے۔ جی کرے تو کواٹر سے باہر نکال لے یا آنگن میں ڈال لے۔ جہاں جی چاہے اور جیسے جی چاہے آرام سے سو۔"

لالی بے نیازی سے بولا۔ "فکر نہ کر۔ میں سو جاؤں گا۔"

چوکیدار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے کے اندر جا کے ایک کھیس اور تکیہ اٹھا لایا۔ "جی میں آئے تو کھیس بچھا لے۔ دری میں نہیں لایا۔ بہت میلی ہو رہی ہے۔"

لالی نے کھیس اور تکیہ چوکیدار سے لیا اور نظریں جھکا کر نرم لہجے میں کہا۔ "چاچا! تو نے خاما خا

اتنی تکلیف اٹھائی۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "اب باتیں چھوڑ اور آرام سے سو۔ رات بہت ہو گئی۔" لالی خاموش رہا۔ چوکیدار کوارٹر سے چلا گیا۔

☆

دھوپ دیوار سے اتر کر کوارٹر کے آنگن میں پھیل گئی تھی۔ لالی نے آنکھیں کھول کر دیکھا چوکیدار چارپائی کے نزدیک کھڑا ہے۔ وہ اس کے لیے ناشتا لایا تھا۔ ناشتے میں چائے کے ساتھ حلوہ تھا' پراٹھے تھے۔

لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور چپ چاپ ناشتا کرنے لگا۔ چوکیدار اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ "لاری سے جانا ہے تو فٹافٹ تیار ہو جا۔ میں سیٹل پر ایس 'ڈی 'او صاحب کے بنگلے جا رہا ہوں۔ سویرے سویرے صاب کا فون آیا تھا۔ مجھے بلایا ہے۔ میں تجھے لاری کے اڈے تک پہنچا دوں گا۔"

لالی دن میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ وہ چوکیدار کے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ "چاچا! مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے۔ کچھ دیر اور سو لینے دے۔ دن ڈھلے لاری سے چلا جاؤں گا یا تیرے بتائے ہوئے رستے پر نہر کے کنارے کنارے نکل جاؤں گا۔"

"نیند تو تیری آنکھوں سے صاف ٹپک رہی ہے۔ آرام سے سو لے۔ میں دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔ دوپہر کی روٹی دونوں ساتھ ہی کھائیں گے۔"

لالی ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ "نہیں چاچا! مجھے اب اور کچھ نہیں کھانا۔ اپنے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

"جیسی تیری مرضی' اب اطمینان سے سو۔ میں چلا صاحب کے بنگلے کی طرف۔ واپسی پر آرام سے گل بات ہو گی۔"

وہ کوارٹر سے چلا گیا۔ لالی پھر بستر پر لیٹ گیا مگر سویا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد اٹھا۔ کوارٹر کے دروازے پر گیا۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ لالی نے اس کی آڑ سے دیکھا' چوکیدار سائیکل کا ہینڈل سنبھالے ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل رہا ہے۔ اس نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی۔ گیٹ بند کیا اور سائیکل پر سوار ہو کر چل دیا۔ لالی چند لمحے دروازے کے قریب کھڑا رہا' پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ دن خانساماں کے کوارٹر میں گزارہ جائے اور سورج ڈوبنے کے بعد جھٹ پٹے میں گوردا پورہ کے رستے نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا قادر آباد اسٹیشن پہنچ جائے۔ وہ رات بھر سفر

کر کے سویرا ہونے سے پہلے رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لالی کچھ دیر تو کروٹیں بدلتا رہا' پھر دوبارہ گہری نیند سو گیا۔

دن ڈھلے آنکھ کھلی۔ دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ چکی تھی۔ کوارٹر میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا تھا اور چوکیدار اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ لالی نے چوکیدار کو دیکھا تو جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے مسکرا کر کہا۔ "دوبار پہلے آیا اور تجھے بے خبر سوتا پایا' جوانی کی نیند بھی کیا نیند ہوتی ہے۔" اس نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ "لے گرم گرم چائے پی۔ بہت سو چکا' اب شام ہو رہی ہے۔"

لالی نے چائے کی پیالی سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ "چاچا! تو کب واپس آیا؟"

"میں تو دوپہری کو آ گیا تھا۔" چوکیدار اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "سیدھا تیرے پاس آیا تھا۔ پر تو تو بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔"

"مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"کیا کرتا جگا کر' لاریوں کی سویرے سے ہڑتال ہے۔ ایک بھی لاری سڑک پر نہیں چل رہی۔ تو جاتا کیسے؟"

"لاریوں کی ہڑتال کیوں ہے؟"

"پولیس نے کسی لاری کا چالان کیا اور اس کے ڈریور کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ سنا ہے' وہاں اس کی دبا کے پٹائی کی گئی اور حوالات میں بند بھی کر دیا۔" چوکیدار نے بتایا۔ "لاری والوں نے ہڑتال کر دی۔ ڈی سی آیا تھا۔ بتاتا تھا' لاریوں کے مالکوں اور پولیس کے افسروں کے درمیان بات چیت ہو رہی ہے پر ڈریور بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے۔ تھانے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ ایسا لگتا ہے' ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔ سڑک پر کوئی لاری نظر نہیں آتی۔"

"میں گوردا پورے کے رستے نہر کے کنارے کنارے پیدل چلا جاؤں گا۔ تانگا مل گیا تو پکڑ لوں گا۔ کچھ رستہ تانگے سے کٹ جائے گا۔" لالی نے نظریں اٹھا کر ڈوبتے ہوئے سورج کی دھوپ دیکھی' چائے کی پیالی ختم کر کے ایک طرف رکھی اور چارپائی سے نیچے اترتے ہوئے بولا۔ "مجھے اب چلنا چاہیے۔ شام ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔"

"کیوں خواہ مخواہ اس چکر میں پڑتا ہے۔ رات بھر یہاں اور ٹھہر جا۔ سویرے سرکاری گڈی ایس' ڈی' او صاحب کی ڈاک لے کر لاہور جائے گی۔ تو چاہے تو سیدھا اوکاڑے چلا جا یا کاور آباد۔ دونوں

ہی رستے میں پڑیں گے۔ میں نے ڈرائیور سے بات کرلی ہے۔ وہ کل صبح گڈی لے کر یہاں پہنچ گا۔" چوکیدار زیرِ لب مسکرایا۔ "ڈرائیور کو چائے پانی کے لیے ۸ آنے دے دینا۔ تیرا بھی کام ہو جائے گا' وہ بھی خوش ہو جائے گا۔"

"نہیں چاچا! میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔" لالی رضامند نہ ہوا۔ "فکر نہ کر۔ میں آرام کادر آباد پہنچ جاؤں گا۔"

چوکیدار لمحے بھر مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھتا رہا۔ "بچے! کوئی واردات کرکے تو نہیں آیا؟ تیری باتوں سے تو یہی پتہ چلتا ہے۔ سچ سچ بتا' اصل بات کیا ہے؟"

لالی اس کی بات سن کر پہلے تو ذرا پریشان ہوا پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ مسکرا کر بولا۔ "نہ چاچا! ایسی کوئی گل بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے جو تو پیدل جانے پر اڑا ہوا ہے؟ ایک دو میل نہیں' ۲۰ میل سے اوپر کا سفر ہے۔ جب سرکاری گڈی میں بیٹھ کر آرام نال کادر آباد پہنچ سکتا ہے تو خامخا اس چکر میں کیوں پڑتا ہے؟"

لالی نے اس کا شبہ دور کرنے کے لیے جھٹ کہا۔ "تو کہتا ہے تو سرکاری گڈی ہی سے چلا جاؤں گا۔ آج رات بھی تیرے پاس ٹھہر جاؤں گا۔"

"باہر آجا۔ یہاں اندھیرا بھی ہو گیا ہے۔" چوکیدار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "باہر منجی پر بیٹھ کر گپ شپ ہو گی۔ وہیں بیٹھ کر روٹی ٹکر بھی کھالیں گے۔"

چوکیدار بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ لالی بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں کوارٹر سے نکل کر احاطے میں آگئے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ اس چارپائی کے نزدیک پہنچے جو چوکیدار کے کوارٹر کے سامنے درختوں تلے بچھی تھی۔ لالی چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مگر چوکیدار نہیں بیٹھا۔ وہ کوارٹر کے اندر گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا تو جلتی ہوئی لالٹین اس کے ہاتھ میں لٹک رہی تھی۔ مگر لالی کی جانب آنے کے بجائے وہ ریسٹ ہاؤس کی دو منزلہ عمارت کی طرف گیا اور اس میں داخل ہو گیا۔ لالی خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے دیکھا' ریسٹ ہاؤس کی بالائی منزل کے ایک دریچے کے پیچھے روشنی جھلملا رہی ہے۔ چوکیدار نے وہاں لیمپ روشن کر دیا تھا۔ عمارت سے نکل کر وہ لالی کے پاس آیا۔ اس نے لالٹین ایک طرف رکھی اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اندھیرا اب بڑھ گیا تھا۔ ریسٹ ہاؤس پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔ لالی نے سناٹے کی شدت محسوس

کرتے ہوئے پوچھا۔ "چاچا! یہاں تو ابھی سے اتنا سناٹا ہے۔ لگتا ہے جیسے آدھی رات ہو گئی۔ یہاں تیرا جی نہیں گھبراتا؟"

"گھبراتا تو ہے پر نوکری جو کرنی ہوئی۔ اکیلے میں جی نہ گھبراتا تو تجھے اس طرح کیوں روکتا؟ آج کل گھر والی بھی نہیں ہے۔ تیرے ساتھ بات چیت میں ٹیم کٹ جائے گا۔"

لالی نے اندھیرے میں ادھر ادھر نظریں گھما کر کہا۔ "دیکھ تو' یہاں کتنی ویرانی ہے۔ لگتا ہے جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔"

پت جھڑ کے مارے ہوئے درختوں سے زرد زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ ہوا کا جھونکا آتا۔ گہری خاموشی میں ان کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوتی۔ یکایک چوکیدار کو کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ چند لمحے کھانستا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری اور بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"ایک زمانہ تھا' جب ریسٹ ہاؤس میں کوئی نہ کوئی ضرور ٹھہرا رہتا' خوب چہل پہل ہوتی۔ ایک جاتا' دوسرا آتا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا' مجھے بھی صاحب لوگوں کے لیے اپنی منجی دینی پڑتی۔ تب بھی کتنے ہی افسر واپس چلے جاتے۔ دن کا الگ' رات کا الگ' پورا سٹاف تھا۔" وہ افسردہ ہو گیا۔ "پر اب تو یہاں الو بولتا ہے۔"

"ایسا کیوں ہو گیا چاچا؟"

چوکیدار نے کوئی جواب نہیں دیا' خاموش بیٹھا رہا۔ لالی بھی ذرا دیر تک خاموش رہا' پھر اس نے کرید کر پوچھا۔ "کوئی خاص بات ہو گئی؟"

"خاص ہی بات کہہ لو۔" چوکیدار نے آہستہ سے کہا۔ "کہتے ہیں ریسٹ ہاؤس میں رات کو کسی زنانی کی روح بھٹکتی پھرتی ہے۔"

"روح بھٹکتی پھرتی ہے؟ نہیں چاچا! کوئی اور بات ہو گی۔"

"اللہ جانے' کہتے یہی ہیں' آدھی رات کے بعد وہ نظر آتی ہے۔ کبھی زور زور سے چیختی ہے' کبھی روتی ہے۔ کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستی ہے۔"

"دوسروں کی چھوڑ' اپنی بتا۔ کبھی اسے دیکھا بھی؟"

"نہ جی' نہ میں نے اسے دیکھا نہ اس کی آواز سنی۔ ویسے شبہ تو مجھے کئی بار ہوا پر ایمان لگتی بات یہ ہے' ٹھیک سے کچھ دیکھا نہیں۔ اپنے کو ویسے ہی رات کو کم دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے لوگوں نے اسے دیکھا ہے۔ کئی تو اسے دیکھ کر ڈر کے مارے چیخنے چلانے لگے۔ کسی کی گھگھی بندھ گئی۔ کوئی بے ہوش ہو گیا۔ نہر کے محکمے کا ایک افسر ایسا ڈرا کہ بیمار پڑ گیا۔ کتنے ہی دن اسپتال میں رہا۔ بس جی

یہی وجہ ہے لوگ یہاں ٹھہرنے سے گھبراتے ہیں۔"

لالی نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔ "تیری گل سمجھ نہیں آئی۔" پھر کچھ سوچ کر اس سے دریافت کیا۔

"یہ چکر شروع کب سے ہوا؟"

"یہاں ایک زنانی کا خون ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہی یہ چکر شروع ہوا۔" چوکیدار آہستہ آہستہ بتانے لگا۔ "اب تو یہ بات پرانی ہو گئی۔ ۳ سال سے بھی اوپر ہو گئے۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "مجھے اب تک یاد ہے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ شام ہی سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ہوا بھی تیز تھی۔ فیر خوب زور کی بارش ہونے لگی۔ ریسٹ ہاؤس اس روز بالکل خالی تھا۔ ایک ذیل دار ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ بھی شام ہونے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ کوئی دس بجے رات کو موٹر میں ایک افسر آیا۔ کوئی وڈا افسر لگتا تھا۔ لہور سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی گھر والی بھی تھی۔ میں اس روز اکیلا ہی تھا۔ خانساماں بیمار تھا۔ رات والا بیرا بھی ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا۔ انچارج بھی غائب تھا۔"

"چاچا! مجھے تو آج بھی تو اکیلا ہی نظر آ رہا ہے۔ خانساماں تو ایس۔ ڈی۔ او کے بنگلے پر کام کرتا ہے۔ ایک بیرا چھٹی پر ہے' دوسرے بیرے اور انچارج کہاں چلے گئے؟"

"جب کوئی آتا ہی نہیں تو دو بیروں کی چھٹی کر دی گئی۔ دونوں انچارجوں کا دوسرے محکموں میں تبادلہ کر دیا گیا۔ یہاں کام ہی کون سا ہے۔ سمجھو اب تو میں اکیلا ہی یہاں رہ گیا ہوں۔" چوکیدار پر ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ دیر تک کھانستا رہا۔ جب کھانس چکا تو بتانے لگا۔ "ہاں' تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ اس رات میں اکیلا ہی ڈیوٹی پر تھا۔ صاحب کے آنے کے بعد میں نے نیچے کے کمرے میں اس کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیا۔ آتش دان میں کوئلے سلگا کر کمرہ خوب گرم کر دیا۔ گیارہ بجے تک میں صاحب کے کمرے کے آس پاس ہی رہا۔ صاحب اور اس کی گھر والی دونوں خوش خوش تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔"

لالی چپ بیٹھا چوکیدار کی باتیں سن رہا تھا۔ چوکیدار کہتا رہا۔ "جب صاحب کے کمرے میں خاموشی چھا گئی اور روشنی بھی دھیمی پڑ گئی تو میں اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ صاحب کا ڈرائیور بھی میرے ساتھ آ گیا۔ اچھا گبھرو جوان تھا' یہ لمبا چوڑا۔ طبیعت کا بھی بہت بھلا تھا۔ چوبی پنجی سال سے زیادہ کا نہ ہو گا۔ میرے ساتھ کوارٹر میں بیٹھا آگ تاپتا رہا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے چائے بھی پلائی۔"

"وہ بنگلے میں نہیں سویا؟"

"چپ کر کے سنتا جا۔" چوکیدار کو لالی کی مداخلت ناگوار گزری۔ اس نے منہ بگاڑ کر اسے جھڑک دیا۔ "کوئی ایک بجا ہو گا۔ ڈرائیور میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ یہ زینہ دیکھ رہا ہے۔" اس نے لوہے کے اس زینے کی جانب اشارہ کیا جو دو منزلہ عمارت کے عقبی حصے میں باہر سے اوپر کی منزل پر گیا تھا۔ "اس زینے سے میں نے اسے اوپر جاتے دیکھا۔ وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں گیا اور میں نے باہر نکل کر بنگلے کا ایک راؤنڈ لگایا۔ ابھی تک ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ واپس آکر میں نے کوارٹر کا دروازہ بند کیا اور آگ کے سامنے بیٹھ گیا۔" چوکیدار چند لمحے خاموش رہا' پھر اس نے لالی کو مخاطب کیا۔

"پتر! سگریٹ ہو تو پلا دے۔"

لالی نے ایک سگریٹ سلگا کر اسے دی اور اپنی سگریٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔ چوکیدار نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ "اب آگے کی سن۔ ڈرائیور کے جانے کے بعد میں دیر تک جاگتا رہا۔ جانے کتنی دیر ہو گئی۔ ذرا سی جھپکی آئی تھی کہ اوپر کی منزل پر ٹھز' ٹھز دو فیر ہوئے۔ میں نکل کر باہر آیا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ مگر ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ گولی کی آواز سن کر خانساماں بھی گھبرا کر اپنے کوارٹر سے نکل آیا۔ اسے بخار تھا' وہ کمبل اوڑھے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہم دونوں ڈرتے ڈرتے بنگلے کے اندر گئے۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔ اوپر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں' لیمپ کی دھیمی روشنی میں ڈرائیور اور صاحب کی گھر والی دونوں خون میں لت پت پڑے ہیں۔"

"دونوں ہی مر گئے؟"

"نہیں۔" چوکیدار نے بتایا۔ "زنانی تو بستر پر پڑی تھی۔ اس کا سر پلنگ سے نیچے جھول رہا تھا۔ وہ مر چکی تھی اور بالکل ننگی تھی۔ میں نے جھٹ پٹ نال اس کے بدن پر چادر ڈال دی۔ ڈرائیور دیوار کے پاس زمین پر پڑا تھا۔ وہ بھی ننگا تھا۔ مگر زندہ تھا۔ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ گولی اس کے کندھے پر لگی تھی۔ میں نے نیچے سے چادر لا کے اس کا ننگا بدن ڈھک دیا۔ پستول بھی کمرے میں ایک طرف پڑا تھا۔"

"گولی کس نے چلائی تھی؟"

"صاحب نے چلائی تھی۔ ڈرائیور یہی کہتا تھا۔ ہوا یوں کہ ذرا ہی دیر بعد اسے ہوش آ گیا۔ اس نے پینے کو پانی مانگا۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ پوچھا تو اس نے صرف اتنا بتایا کہ صاحب نے کمرے میں گھستے ہی ٹھز ٹھز فیر کرنے شروع کر دیے۔"

لالی کھسک کر چوکیدار کے قریب ہو گیا۔ "اور صاب کیا کہتا تھا؟"

"ہم دونوں تھوڑی دیر بعد نیچے آئے۔ صاحب کمرے میں تھا۔ پر دروازہ اندر سے بند تھا۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹایا تب بھی وہ باہر نہ آیا۔ ہم سے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کمرے کے اندر بیٹھا ٹیلی فون پر کسی سے دھیرے دھیرے باتیں کر رہا تھا۔"

لالی کی سمجھ میں ابھی تک پوری بات نہیں آئی تھی۔ "چاچا' چکر کیا تھا؟"

چوکیدار مسکرا کر بولا۔ "ارے بھئی! گل ایسہ تھی' ڈریور سے صاحب کی گھر والی کی پہلے سے لگ سٹ تھی۔ صاحب تھا پکی عمر کا اور اس کی لگائی تھی جوان پٹھیا۔ میں تو کہتا ہوں دوسری تھی۔ مگر یہ بھی سننے میں آیا کہ گھر والی نہیں تھی' صاحب اسے پھانس کر لایا تھا۔ اسی کے محکمے میں کام کرتی تھی۔ اللہ جانے کون سی بات سچ ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں' پر اتنا ضرور ہے وہ صاحب کے جوڑ کی ہرگز نہیں تھی۔"

"پر وہ اوپر ڈریور کے پاس پہنچی کیسے؟"

"تو بھی کیا بچوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ خود گئی تھی۔ پہلے سے پروگرام بنا رکھا ہو گا۔ ہوا یوں کہ صاحب نے دبا کے شراب پی۔ خانساماں کا کہنا ہے' زنانی نے جان بوجھ کر اسے زیادہ ہی پلا دی۔ خانساماں ٹھیک ہی کہتا ہے۔ تھی بھی وہ بہت فروٹ۔ بانو نام تھا اس کا۔ ایسی آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کرتی تھی' میں تجھے کیا بتاؤں۔ بھرپور جوان تھی' اوپر سے رات کو بھی خوب سرخی پوڈر لگائے ہوئے تھی۔"

چوکیدار کو پھر کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ تھوڑی دیر کھانستا رہا' پھر بتانے لگا۔ "صاحب جب نشے میں دھت ہو کر سو گیا تو وہ چپکے سے اٹھی اور ڈریور کے پاس چلی گئی۔ ادھر صاحب کی آنکھ کھل گئی' وہ اسے ڈھونڈتا ہوا اوپر پہنچا۔ کچھ شبہ اسے ضرور تھا۔ تبھی تو بھرا ہوا پستول لے کر گیا تھا۔ دونوں کو ایک ہی بستر پر دیکھا تو غصے سے پاگل ہو گیا۔ گولی چلا کر دونوں کو وہیں ڈھیر کر دیا؟"

"پولیس شولیس تو نہیں آئی؟"

"آئی تھی۔" چوکیدار نے جواب دیا۔ "صاحب نے خود ٹیلی فون کر کے پولیس کو بلایا تھا۔ کمرہ بند کر کے پولیس کے ساتھ اس نے جانے کیا کھسر پھسر کی۔ بس جی رات ہی کو پولیس نے ساری تفتیش بھی پوری کر لی۔ لکھا پڑھی کی۔ تفتیشی رپوٹ تیار ہو گئی تو اس پر مجھ سے اور خانساماں سے بھی انگوٹھا لگوالیا۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے لاش بھی چلی گئی' زخمی ڈریور بھی گیا اور صاحب بھی اپنی گڈی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ دن چڑھے تھانے دار دو کانسٹیبلوں کے ساتھ آیا۔ اوپر والے کمرے کا

فرش دھلوایا۔ جہاں جہاں خون کے دھبے تھے' تھانے دار نے اپنے سامنے صاف کروائے اور خون میں ڈوبے ہوئے سارے کپڑے اور بستر بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ ریسٹ ہاؤس کے سارے بندوں میں سے کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا۔"

چوکیدار خاموش ہو گیا۔

لالی بھی خاموش بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "پھر کیا ہوا چاچا؟"

"ہونا کیا تھا؟" وہ تلخی سے بولا۔ "پولیس نے سارا معاملہ دبا دیا۔ بعد میں سننے میں آیا۔ گولی' پستول صاف کرتے ہوئے اتفاقیہ چل گئی تھی۔ ڈریور بھی اسپتال میں کچھ دنوں رہ کر ٹھیک ہو گیا۔"

چوکیدار نے ایک بار پھر کھنکار کر گلا صاف کیا۔ زیر لب مسکرایا۔ "گل ایسہ ہے جی! وڈے بندوں کی بات بھی وڈی ہوتی ہے۔ پولیس بھی ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ کنون شنون بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اپنے جیسا کوئی معمولی بندہ ہوتا تو کب کا پھانسی پر لٹک چکا ہوتا۔ ہڈیاں بھی اب تک کبر میں گل سڑ کر برابر ہو گئی ہوتیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے چاچا۔" لالی نے گہری سانس بھری۔ "کنون بھی تو ایک نہیں۔ وڈوں کا الگ' چھوٹوں کا الگ۔"

چوکیدار لمحے بھر خاموش رہ کر بتانے لگا۔ "۲۵ سال سے اوپر ہو گئے یہاں کام کرتے ہوئے۔ انگریزوں کے زمانے سے ملازم ہوں۔ ان آنکھوں نے یہاں کیا کیا ہوتے نہیں دیکھا۔" اس کے لہجے میں ہلکا ہلکا کرب تھا۔ "پر وہ بھی کیا دن تھے۔ ہر وکھت بھاگ دوڑ مچی رہتی۔ رات کو بھی دن کا سماں ہوتا۔ اب رات آتی ہے تو ریسٹ ہاؤس کبرستان بن جاتا ہے۔ بانو کا خون ہونے کے بعد سے ایسا اجڑا کہ لوگ ادھر آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ نور محمد بیرا ایک پیر بابا کو بھی لایا تھا۔ یہ لمبی داڑھی تھی ان کی۔ انھوں نے گول کمرے میں بیٹھ کر چلہ کھینچا۔ چار کیلیں پڑھ کر دیں۔ ریسٹ ہاؤس کے چاروں کونوں میں وہ کیلیں گاڑی بھی گئیں' پر کچھ بھی نہ ہوا۔"

☆

اندھیرے میں نبیا کی آواز ابھری۔ "بابا! روٹی تیار ہے۔ لے آؤں؟" وہ کوارٹر کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ لالٹین کی دھندلی روشنی میں پرچھائیں کے مانند نظر آ رہی تھی۔ چوکیدار مسکرا کر بولا۔ "لو جی! باتوں میں روٹی کا دھیان ہی نہ رہا۔" اس نے لالی کی جانب دیکھا۔ "تو نے تو دوپہر کی روٹی بھی نہیں کھائی۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اونچی آواز میں نبیا سے کہا۔

"وہیں ٹھہر۔ میں خود روٹی لینے آ رہا ہوں۔"

وہ اپنے کوارٹر کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا اور اندر داخل ہو گیا۔ ریسٹ ہاؤس پر چھائی ہوئی گہری خاموشی میں صرف خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ رات اب اور سیاہ ہو گئی تھی۔ لالی خاموش بیٹھا رہا۔ البتہ یہ بات ضرور کھٹکی کہ چوکیدار نے نجیا کو آنے نہیں دیا۔ خود ہی کھانا لینے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار لکڑی کی ٹرے میں کھانا لے کر آیا اور چارپائی پر رکھ دیا۔ اس نے لالٹین کی لو اونچی کی اور اسے قریب کے ایک درخت کی شاخ سے لٹکا دیا۔ اس نے لالی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ "اب تو سنبھل کر بیٹھ جا۔ میں پانی اور گلاس لے کر آتا ہوں۔" چوکیدار ایک بار پھر کوارٹر میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا المونیم کا جگ تھا' دوسرے میں گلاس دبا تھا۔ جگ اور گلاس اس نے چارپائی کے قریب فرش پر رکھ دیا اور خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔

دونوں اطمینان سے کھانا کھانے لگے۔ کھانا مزیدار تھا۔ لالی بھوکا بھی زیادہ تھا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ مگر چوکیدار کھانا کھاتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ ریسٹ ہاؤس کے بارے میں چھوٹے موٹے واقعات سناتا رہا۔ خانساماں اور بیروں کا تذکرہ کرتا رہا۔ دونوں کھانے سے فارغ ہوئے تو چوکیدار نے کھانے پینے کے برتن اٹھا کر کوارٹر میں پہنچائے اور واپس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

لالی کے پیکٹ میں ابھی چند سگریٹیں موجود تھیں۔ اس نے اور چوکیدار نے ایک ایک سگریٹ سلگائی اور آہستہ آہستہ کش لگانے لگے۔

دونوں تمباکو نوشی سے لطف اندوز ہو رہے تھے' اسی اثناء میں ایک بار پھر نجیا کی آواز ابھری۔ وہ چوکیدار سے کہہ رہی تھی۔

"بابا! بتی بجھ گئی۔ ماچس دے دے۔"

لالی نے مڑ کر کوارٹر کی جانب دیکھا۔ لالٹین کی ہلکی روشنی میں درختوں کے تلے اسے نجیا نظر آئی۔ وہ اسی طرف آ رہی تھی۔ روشنی اتنی کم تھی کہ لالی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ مگر قد و قامت دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھرے بھرے بدن کی نوجوان لڑکی ہے۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھی ہو گی کہ چوکیدار نے چارپائی پر رکھی ہوئی لالی کی ماچس اٹھائی اور لپک کر نجیا کے پاس پہنچا۔ اسے ماچس دی اور واپس آ گیا۔

نجیا کوارٹر میں چلی گئی۔ کچھ دیر لالی اور چوکیدار چپ بیٹھے سگریٹ کے کش لگاتے رہے' آخر چوکیدار نے پوچھا۔

"کیا کادر آباد جانا ضروری ہے؟ میں تو کہتا ہوں سیدھا ڈیوٹی پر اوکاڑے چلے جا۔"

"اوکاڑے بھی جاؤں گا پر کادر آباد دو روز ٹھہر کر جاؤں گا۔ ایک دوست سے ملنا ہے' وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"سیدھا اوکاڑے جاتا تو میرا ایک کام کر دیتا۔ اوکاڑے کے نزدیک ہی چک ۶۔ ایل ہے' وہاں۔" چوکیدار نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ رات کے سناٹے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی' جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ درخت کی شاخ سے لٹکتی ہوئی لالٹین اتار کر ہاتھ میں سنبھالی اور عمارت کی جانب تیزی سے بڑھا۔ وہ عمارت کے اندر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد چوکیدار کی آواز ابھری۔ مگر اس قدر دھیمی تھی کہ لالی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ چند منٹ بعد چوکیدار واپس آیا تو لالی نے پوچھا۔

"کس کا ٹیلیفون تھا؟"

"خانساماں تھا۔" چوکیدار نے لالٹین نیچے رکھی اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ایس' ڈی' او صاحب کے بنگلے سے بول رہا تھا۔"

"کیا کہتا تھا؟"

"وہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں یہاں پہنچ جائے گا۔ پی ڈبلیو ڈی کا کوئی افسر ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے آ رہا ہے۔ خانساماں بھی اس کے ساتھ ہی آئے گا۔ ابھی تو وہ ایس' ڈی' او کے بنگلے پر ہے۔"

لالی یہ سنتے ہی پریشان ہو گیا۔ اس نے خود کو سنبھالا' دبی زبان سے پوچھا۔ "خانساماں تو اپنے ہی کوارٹر میں ٹھہرے گا نا؟"

"ٹھہرے گا تو وہ اپنے ہی کوارٹر میں۔ تو بھی اسی کے ساتھ ٹھہر جاتا۔" پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "پر اس کے پاس منجی تو ایک ہی ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "تیرے کا کوارٹر بند ہے۔ چابی بھی اپنے ساتھ لے گیا ہے۔" چوکیدار کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

"چاچا! تو خامخا پریشان نہ ہو۔ اب مجھے جانے دے۔ روٹی بھی میں نے کھالی اور رات بھی زیادہ نہیں گزری۔" لالی نے لالٹین کی جانب ہاتھ بڑھا کر گھڑی دیکھی۔ "ابھی تو نو بھی نہیں بجے۔ گرمیوں کی رات ہے۔ میں......"

چوکیدار اس کی بات کاٹ کر کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو بار بار جانے کی گل کیوں کرتا ہے؟ تجھے رات بھر ہی تو یہاں ٹھہرنا ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں کہیں بھی رات گزار سکتا ہے۔"

"تو برا مناتا ہے تو نہیں جاؤں گا۔" لالی نے چوکیدار کے لہجے کی تلخی سے مرعوب ہو کر کہا۔ "ویسے میں نے تیری پریشانی کے خیال سے ایسا سوچا تھا۔"

"ایسا کر' تو اس منجی پر سو جا۔ میں ادھر لیٹ جاؤں گا۔" اس نے بنگلے کے عقبی حصے کے برآمدے کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "صاحب کے آنے کے بعد آدھی سے زیادہ رات تو اسی کی اردلی میں کٹ جائے گی۔ ویسے مجھے رات کو نیند ہی کہاں آتی ہے۔ سینکڑوں راتیں جاگتے گزر گئیں۔ ایک رات اور جاگتے گزر جائے گی تو کیا ہو جائے گا۔ ویسے برآمدے کا فرش صاف ستھرا ہے۔ روزانہ سویرے پورے ریسٹ ہاؤس کی صفائی ہوتی ہے۔"

"یہ نہیں ہو گا چاچا! میں منجی پر سوؤں اور تو رات بھر جاگتا رہے یا برآمدے کے فرش پر سوئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

چوکیدار چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ "ویسے تو ریسٹ ہاؤس میں کئی کمرے ہیں۔ صاحب کے آنے کے بعد بھی خالی رہیں گے۔ تو کسی میں بھی رات بھر کے لیے ٹھہر سکتا ہے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کو رکا۔ "پر صاحب کو پتہ چل گیا تو جانے وہ کیا سوچے۔ یہ بھی پتہ نہیں' طبیعت کا کیسا ہے۔"

"میرا کہا مان تو مجھے جانے دے۔" لالی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "خواماخواہ ضد نہ کر۔"

"ضد کی بات نہیں۔ رات کے سفر کے لیے یہ رستہ ٹھیک نہیں۔ ادھر ڈکیتی کی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں۔ پچھلے ہی ہفتے ریلوے کراسنگ پر ڈاکوؤں نے لاری لوٹ لی تھی۔ سنا ہے' بعد میں پولیس کا ان سے ٹاکرہ بھی ہوا۔ ایک ڈاکو مارا گیا۔ پولسے بھی زخمی ہوئے پر ابھی تک پولیس کسی کو پکڑ نہیں سکی۔"

"سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر اپنے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ ویسے میں ڈرنے والا نہیں۔" لالی چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس نے گردن اونچی کی اور سینہ تان کر مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ "تو کہے تو میں اوپر والے اس کمرے میں جا کر لیٹ جاؤں جس میں بانو کا خون ہوا تھا؟"

چوکیدار ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ "کمرہ تو وہ فسٹ کلاس ہے۔ ہوا بھی خوب آتی ہے۔" اسی وقت اوپر کھڑکی کے پیچھے جلتا ہوا لیمپ زور سے بھڑکا اور بجھ گیا۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ درختوں تلے خشک پتے آہستہ آہستہ کھڑکھڑائے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی دبے دبے قدموں چل رہا ہو۔ چوکیدار زور سے کھنکارا۔ اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔

"نہیں جی! اس کمرے میں تیرا سونا ٹھیک نہیں۔"

"چاچا! تجھے اس کمرے میں بھی ڈر لگا؟"

"میری بات چھوڑ۔" چوکیدار بے نیازی سے بولا۔ "میں کیا' میری نیجا تک نہیں ڈرتی۔ آج

ں شام اس کمرے کی صفائی کر رہی تھی اور میں تو روز اوپر کی منزل پر لیمپ جلانے جاتا ہوں۔ کچھ دیر پہلے تیرے سامنے لیمپ جلانے گیا تھا۔"

"تب تو میں اسی کمرے میں جا کر سوؤں گا۔" لالی کھل کر مسکرایا۔ "ارے چاچا! ڈرنا شرنا کیا۔ ایک زنانی ہی سے تو نمٹنا ہے اور زنانی کا معاملہ یہ ہے' ذرا ہاتھ لگا اور وہ نئی گھوڑی کی طرح بدک کر رہ جاتی ہے۔"

"کہتے ہیں چڑیل سے کبھی ٹاکرا ہو جائے تو اسے کابو کرنے کا ایک ہی گر ہے اور وہ یہ ہے' جھٹ اس کی چوٹی پکڑ لو۔ فیر تو وہ ہاتھ جوڑے گی' پیر پڑے گی۔"

"یہ تو زبردست ترکیب بتائی۔" لالی ہنس کر بولا۔ "اب تو میں اسی کمرے میں رات گزاروں گا۔"

"ایک گل اور بھی ہے۔ اس کمرے میں بانو کی واردات کے بعد سے نہ کوئی مہمان جاتا ہے نہ ٹھہرتا ہے۔ ویسے میں کسی کو ادھر جانے ہی نہ دوں گا اور ادھر جائے گا بھی کون۔ نیچے کی منزل کے سارے کمرے خالی ہیں۔ لمبے چوڑے بھی ہیں۔ ان میں فرنیچر بھی زیادہ عمدہ لگا ہے۔"

"تو فیر یہ طے ہو گیا' میں اسی کمرے میں سوؤں گا۔" لالی نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے نیند بھی بہت لگ رہی ہے۔"

لالی چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چوکیدار بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے لالٹین اٹھائی۔ دونوں ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے کی جانب بڑھے۔ لالی نے قریب جا کر دیکھا کہ برآمدے سے ذرا ہی آگے آہنی زینہ ہے۔ اس نے گردن اونچی کی۔ زینے کے آخری سرے پر نظر ڈالی۔ کمرے کا بند دروازہ دھندلی روشنی میں اس کے سامنے تھا۔ راستہ باہر سے تھا اور کمرے کی کھڑکی کے قریب سے پیپل کے گھنے درخت کی موٹی سی ڈال اس طرح گزرتی تھی کہ خطرے کے وقت وہ آسانی سے اس کے ذریعے ریسٹ ہاؤس کی چاردیواری سے باہر جا سکتا تھا۔ اس پہلو سے لالی کو وہ کمرہ زیادہ محفوظ اور مناسب لگا۔

دونوں آہستہ آہستہ زینے کے پاس پہنچ گئے۔ چوکیدار زینے پر چڑھنے لگا۔ لالی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

زینہ طے کر کے دونوں اوپر پہنچے۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ دونوں اندر گئے۔ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ دیواروں پر اجلی قلعی تھی۔ کھڑکی کے برابر پلنگ تھا۔ اس پر اجلا بستر بچھا تھا۔ پلنگ سے ذرا ہٹ کر میز اور دو کرسیاں تھیں۔ میز پر لیمپ رکھا تھا۔ چوکیدار نے ماچس جلا کر لیمپ روشن کیا اور کھڑکی

کے پٹ کھول دیئے۔ کھڑکی کھلتے ہی کمرے میں ہوا کے نرم نرم جھونکے آنے لگے۔ چوکیدار نے کہا۔

"اب تو سو جا۔ تجھے سویرے اٹھنا بھی ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے فوراً آواز دینا۔ میں تو جاگ ہی رہا ہوں۔ جھٹ آجاؤں گا۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔"

"فکر نہ کر چاچا! مجھے ڈر خوف نہیں لگتا۔"

"لگتا تو جی دار اور زور آور ہے۔ صاحب لوگوں کی طرح نہیں۔ وہ تو اپنے سائے سے بھی ڈر جاتے ہیں۔" اس نے نظر بھر کر لالی کا چہرہ دیکھا۔ "سچ پوچھ تو میں خود چاہتا تھا' تیرے جیسا کوئی زور آور جوان اس کمرے میں ٹھیرے۔ یہ بھوت پریت کا چکر ختم ہو اور صاحب لوگوں کا آنا جانا پہلے کی طرح شروع ہو۔"

چوکیدار کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جب سے یہ چکر شروع ہوا ہے' اپنا تو سمجھو کباڑا ہو گیا۔ صاحب لوگ آتے تھے تو بخشش اور انعام دے کر جاتے تھے۔ مزے سے گزر بسر ہوتی تھی۔ اب تو سوکھی تنخواہ پر گزارہ ہے۔ پیٹ بھرنا مشکل ہے۔ نیما جوان ہو گئی ہے۔ رشتہ بھی طے ہو چکا ہے۔ پیسہ ہو تو کل اس کا ویاہ کر دوں۔"

لالی نے جیب سے دس دس روپے کے دو نوٹ نکالے اور چوکیدار کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لے یہ رکھ لے چاچا!"

چوکیدار نے انکار کیا۔ "تو میری بات کا غلط مطلب سمجھا۔ میں تجھ سے کچھ نہیں لوں گا۔ تو میرے مہمان کی طرح ہے۔"

"دیکھ چاچا! نہ یہ بخشش ہے نہ انعام۔ ویسے بھی میں نہ افسر ہوں نہ صاحب جو تجھے بخشش یا انعام دوں۔ میری خوشی ہے تو اسے رکھ لے۔ انکار نہ کر۔"

چوکیدار نے پھر انکار کیا۔ مگر لالی نے اصرار کر کے اسے نوٹ دے ہی دیئے۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار چلا گیا۔

☆

لالی نے دروازہ بند کیا' لیمپ دھیما کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ مگر سویا نہیں۔ اس کمرے میں وہ سونے کے لیے آیا بھی نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اور خالی ہاتھ بھی جانا نہ چاہتا تھا۔ رحیم داد کے لیے اس نے جو کپڑے گٹھری میں باندھ کر رکھے تھے' وہ گٹھری کے ساتھ میاں حیات محمد ٹوکے بنگلے میں رہ گئے تھے۔

اس نے کمرے میں آنے سے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ کچھ نہیں تو ایک چادر ہی اٹھا کر لے جائے گا۔ اس سے رحیم داد کا کچھ تو کام چل ہی جاتا۔ مگر اب اسے ایک چھوڑ' دو چادریں مل گئیں۔ ایک بستر پر بچھی تھی' دوسری اوڑھنے کے لیے تھی۔

لالی بستر پر خاموش لیٹا رحیم داد کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ویران' ٹیلوں اور ٹبوں کے درمیان بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر اب تک جیل کی وردی تھی اور جب تک یہ وردی موجود تھی' نہ وہ باہر نکل سکتا تھا' نہ کسی سے مل سکتا تھا اور نہ لاری یا ٹرین سے سفر کر سکتا تھا۔ لالی کو سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی۔ وہ شرمندہ بھی تھا کہ اس نے تو اپنی جیل کی وردی اتار پھینکی تھی' مگر رحیم داد کو اس سے نجات نہ دلا سکا۔ چلتے وقت رحیم داد نے دبی زبان سے گلہ بھی کیا تھا۔ اس کا گلہ بھی بجا تھا۔ اسے جیل سے فرار ہونے پر لالی ہی نے آمادہ کیا تھا۔ اسے رہ رہ کر یاد آ رہا تھا کہ رحیم داد بڑی مشکل سے فرار ہونے پر رضامند ہوا تھا۔ وہ لالی کی طرح عادی مجرم نہیں تھا۔ لٰہذا ڈرتا بھی تھا۔

لالی بستر پر لیٹا یہی سوچ رہا تھا کہ میز پر آہستہ سے آہٹ ہوئی۔ کھڑکی کے باہر درخت کی ڈال زور سے ہلی۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ لیمپ کی لو بھڑکی۔ سامنے دیوار پر پرچھائیں لہرائی۔ لالی چونک پڑا۔ اس نے گردن اونچی کی۔ ادھر ادھر دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا۔ دروازہ بند تھا۔ چٹخنی اس نے اپنے ہاتھ سے لگائی تھی۔ مگر اسے تسلی نہ ہوئی۔ بستر سے اترا' میز دیکھی۔ میز ٹھیک ٹھاک تھی۔ لیمپ بھی اپنی جگہ تھا اور روشن بھی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچا اور اس کی چوکھٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

رات جاگ رہی تھی۔ آسمان پر ستاروں کے کنول روشن تھے۔ ہوا میں تیزی تھی۔ لالی نے کھڑکی کے برابر سے گزرتی ہوئی پیپل کے درخت کی ڈال دیکھی۔ ہاتھ بڑھا کر اسے مضبوطی سے پکڑا۔ دھیرے دھیرے ہلایا۔ ڈال خوب موٹی اور مضبوط تھی۔ اس پر وہ آسانی سے چڑھ سکتا تھا اور ریسٹ ہاؤس کی چار دیواری سے باہر بھی جا سکتا تھا۔ چار دیواری کے اس پار لا کھا تھا جس میں ریت کے اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان کہیں کہیں کھیت تھے۔ دور تک پھیلا ہوا یہ ریتلا اور ناہموار میدان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔

اس نے کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے ریسٹ ہاؤس سے نکل بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی پہر رات گزری تھی اور اسٹیشن پہنچنے کا راستہ چوکیدار نے بتا ہی دیا تھا۔ قادر آباد پہنچ کر وہ ریل کی پٹڑی عبور کر کے سورج نکلنے سے پہلے پہلے اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ

سکتا تھا۔

وہ کھڑکی سے ہٹ کر بستر کے قریب آیا اور بستر کی دونوں چادروں میں جوتے لپیٹ کر گٹھ باندھنے کا ارادہ کرنے لگا۔ اسی اثناء میں باہر سے چوکیدار کے کھانسنے کی آواز ابھری۔ ساتھ زمین پر لاٹھی بجنے کی آہٹ بھی ہوئی۔ آہٹ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ چوکیدار اسی طرف آرہا تھا۔ خشک پتوں پر اس کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ کھڑکی کے عین نیچے پہنچ کر چاپ بند ہو گئی۔ لالٹین کی روشنی لالی کو کھڑکی کے باہر دکھائی دے رہی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد چوکیدار زور سے کھنکارا۔ اس نے کھڑکی کے نیچے سے اونچی آواز میں لالی سے پوچھا۔

"بچے! جاگ رہا ہے؟"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بالکل خاموش رہا۔ چوکیدار ذرا دیر ٹھہر کر آگے بڑھ گیا۔ خشک پتوں پر اس کی چاپ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔ لالی ایک بار پھر کھڑکی کے قریب پہنچا۔ گردن بڑھا کر دیکھا، درختوں کے نیچے چوکیدار آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے ہاتھ میں دبی ہوئی لاٹھی زمین سے ٹکرا کر آہٹ پیدا کر رہا تھا۔ اس کے ہم راہ کوئی اور بھی تھا۔ وہ نجیا تھی۔ اس کی کلائیوں میں پڑی ہوئی چوڑیاں چلتے وقت آہستہ آہستہ بج رہی تھیں۔

دونوں مڑ کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ روشنی کا زرد زرد دھبا کچھ دیر تک نظر آتا رہا اور جب وہ بھی دھندلا پڑ گیا تو لالی بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چوکیدار کے چارپائی پر لیٹ جانے کا انتظار کر رہا تھا جس کی کھانسی پھاٹک کے پاس بار بار سنائی پڑ رہی تھی۔ کھڑکی کے راستے ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔

لالی کی آنکھیں غنودگی سے باربار بند ہو جاتیں۔ آخر نیند کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ اس کی آنکھیں بند ہو کر کھل نہ سکیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

☆

کمرے میں تیز خوشبو پھیلی تھی۔ لالی غنودگی کے عالم میں تھا۔ ایسا محسوس ہوا، کوئی سرہانے کھڑا آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا ہے۔

اب وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور سسکیاں سن رہا تھا۔ سسکیوں کے ساتھ رک رک کر چوڑیاں بھی بجتیں۔ ذرا دیر تک وہ سکتے کے عالم میں چپ لیٹا رہا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے

لگا۔ وہ اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ لیپ کی دھیمی دھیمی روشنی میں اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ میز سے ذرا ہٹ کر دیوار کے پاس ایک نوجوان عورت کھڑی ہے۔ وہ گردن جھکائے رک رک کر سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے بال بکھر کر چہرے پر آگئے تھے۔ وہ خوب سنگھار کیے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ ہونٹوں پر سرخی تھی۔ لباس بھی بھڑکیلا اور خوب چست تھا۔ اتنا چست کہ اس کی بھرپور جوانی لباس سے بے محابا جھانک رہی تھی۔ وہ تیز خوشبو میں اس طرح بسی ہوئی تھی کہ پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کے لالی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ لالی چند لمحے اسے گھورتا رہا، پھر پلنگ سے کود کر نیچے آگیا۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بالکل خاموش کھڑے تھے۔

کھڑکی کے باہر پیپل کی ڈال ہوا کے تیز جھونکوں سے جھول رہی تھی۔ خشک پتے اس طرح کھڑکھڑاتے گویا آہستہ آہستہ تالیاں بجا رہے ہوں۔ لالی چند لمحے چپ چاپ کھڑا رہا پھر دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ عورت نے اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو دیوار سے لگ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ نہ اس نے نظریں نیچی کیں نہ زبان سے کچھ کہا۔ برابر اسے گہری نظروں سے دیکھتی رہی اور ہولے ہولے کھسکتی رہی۔ وہ مڑ کر دروازے کی جانب لپکی۔ لیکن لالی نے اسے دروازے تک پہنچنے کا موقع نہیں دیا۔

وہ تیزی سے جھپٹا اور ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کی چوٹی پکڑلی۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ "کون ہے توں؟"

وہ بلبلا کر بولی۔ "میری چوٹی تو چھوڑ۔"

لالی نے چوٹی چھوڑنے کے بجائے اور زور سے مروڑ دی۔ عورت نے پلٹ کر بے بسی سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ یکایک تیز جھونکا آیا۔ لیپ زور سے بھڑکا اور بجھ گیا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔ باہر درختوں میں الو کے زور زور سے بولنے کی آواز رات کی خاموشی میں ابھری۔ لالی کسی ان جانے خوف سے کپکپا کے رہ گیا۔ مگر وہ اس کی چوٹی مضبوطی سے پکڑے رہا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ آخر لالی نے پوچھا۔

"تو بانو ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

لالی نے اس کی چوٹی کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور ایک بار پھر پوچھا۔ "بولتی کیوں نہیں۔ تو بانو ہے نا؟"

"کون بانو؟" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "میں کسی بانو وانو کو نہیں جانتی۔"

"سچ سچ بتا کون ہے تو؟"

وہ تکلیف سے منہ بگاڑ کر بولی۔ "کہہ تو دیا' میں بانو نہیں ہوں۔"

لالی مخمصے میں پڑ گیا۔ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ "تو چوکیدار کی بیٹی نیما تو نہیں ہے؟"

"میں کیوں ہونے لگی چوکیدار کی بیٹی۔"

لالی اور زیادہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس دفعہ اس نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔ "ٹھیک ٹھیک بتا۔ زیادہ کڑکڑ کی تو لگاؤں گا ایک چپیڑ۔" اس نے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

"بتاتی ہوں' بتاتی ہوں۔"

لالی اس کی چوٹی ہلا کر بولا۔ "تو فیر بتانا۔"

اس نے منہ بسور کر کہا۔ "میں زرینہ ہوں۔ صفدر علی اور سیر کی بیوی۔" وہ لمحے بھر خاموش رہ کر عاجزی سے بولی۔ "اب تو میری چوٹی چھوڑ دو۔" لالی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے؟ وہ اس کی چوٹی گھوڑے کی لگام کی طرح کھینچے ہوئے چپ کھڑا رہا۔ مگر وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہی۔ اس نے گردن ہلائی اور جھنجلا کر بولی۔

"دیکھو! میری چوٹی چھوڑ دو' نہیں تو میں چیخنے لگوں گی۔"

لالی اس کی دھمکی سے ڈر گیا۔ اس نے چوٹی چھوڑ دی۔ مگر وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ "تو یہاں پہنچی کیسے؟ دروازہ تو بند ہے۔" لالی نے اس دروازے کی جانب اشارہ کیا جو باہر لوہے کے زینے پر کھلتا تھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔

"تو کھڑکی کے رستے تو اندر نہیں آئی؟"

"کچھ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ میں کھڑکی کے رستے کیسے اندر آسکتی ہوں۔" اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اور یہ دروازہ نہیں ہے۔" زرینہ نے کمرے کے دوسرے دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "میں اسی دروازے سے سیڑھیاں چڑھ کر نیچے سے آئی ہوں۔ توبہ توبہ' کتنی سیڑھیاں ہیں۔ چڑھتے چڑھتے میرا تو سانس پھول گیا۔" اب وہ کسی قدر اطمینان سے بول رہی تھی۔

لالی نے اس کی بات سن کر کچھ نہیں کہا۔ میز کی جانب بڑھا۔ قریب جا کر اس نے لیمپ روشن کیا۔ زرینہ کمرے سے باہر جانے کے ارادے سے دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی نے ٹوکا۔ "ٹھیر جا۔ یہ تو بتا' تو ریسٹ ہاؤس میں آئی کیسے؟"

"سرکاری جیپ میں آئی تھی۔ صفدر علی لے کر یہاں آیا تھا۔ مجھے تو یہاں آئے ہوئے بھی آدھے گھنٹے سے اوپر ہو گیا۔ تم کو خبر ہی نہیں۔"

"تیرا خصم صفدر علی کہاں ہے؟"

"وہ جیپ میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔"

لالی پھر الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے تیکھی نظروں سے زرینہ کو دیکھا اور ڈپٹ کر بولا۔ "صاف صاف بتا۔ تیری باتیں سمجھ نہیں آئیں۔ پہلی بات تو یہ ہے' اس کمرے میں کیوں آئی؟"

"میں تو یہاں چھپنے کے لیے آئی تھی۔" وہ آنکھیں مٹکا کر الھڑپن سے بولی۔ تھی بھی الھڑ۔ اس کی عمر سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ شکل و صورت معمولی تھی مگر اس کی جوانی سمندر کا جوار بھاٹا تھی۔ انگ انگ سے ابل رہی تھی۔

اس کی بات سن کر لالی اور چکرایا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "یہاں چھپنے آئی تھی۔ مگر کیوں؟"

"کچھ ہے ایسی بات۔" زرینہ نے گول مول جواب دیا۔

لالی نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا اور ہاتھ بڑھا کر پھر اس کی چوٹی پکڑ لی۔ "ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"ارے ارے' میری چوٹی تو چھوڑ۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "وہ' وہ بڑا انجینئر ہے نا۔" زرینہ اپنی بات' کہتے کہتے رک گئی۔

لالی نے حیرت سے پوچھا۔ "کون انجینئر؟" اس نے زرینہ کی چوٹی چھوڑ دی۔

"وہی جو یہاں ٹھیرا ہوا ہے۔" زرینہ نے جواب دیا۔ "وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے یہاں آگیا تھا۔" اس نے ذرا رک کر بتایا۔ "صفدر کے ساتھ وہ بھی جیپ میں گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس آجائے گا۔"

"صفدر واپس نہیں آئے گا؟"

وہ نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔ "صفدر تو گھر گیا ہے۔ سویرے آئے گا۔ مجھ سے یہی کہہ کر گیا ہے۔"

بات اب لالی کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگی تھی۔ اس نے غور سے زرینہ کو دیکھا۔ "تیرا خصم پگلا تو نہیں ہو گیا؟"

"ایسی بات نہیں ہے جی۔ ہے تو وہ اوور سیر ہی۔" وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ "بات یہ ہے۔ وہ ایک چکر میں آگیا ہے۔ دو مہینے سے معطل ہے۔ اس کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔" وہ جھجکی۔ "سڑک کے ٹھیکے میں صفدر نے ایک ٹھیکیدار سے رشوت لی تھی۔ کسی نے اوپر شکایت لگا

دی۔ اب بڑا انجینئر انکوائری کرنے آیا ہے۔ جو رپورٹ وہ دے گا' اسی پر صفدر کے کیس کا فیصلہ ہو گا۔"

"اب اصلی گل سمجھ آئی۔ صفدر نے تجھے رشوت میں انجینئر کو پیش کیا ہے۔ تیرا خصم ہے بہت تیز۔ رشوت لینا بھی جانتا ہے اور رشوت دے کر بچ نکلنے کا رستہ بھی جانتا ہے۔" اس نے مسکرا کر زرینہ کو دیکھا۔ "رشوت بھی اس نے تگڑی دی ہے۔ جبھی تو اتنی بن ٹھن کر آئی ہے۔"

"توبہ کرو جی۔" وہ بے باکی سے بولی۔ "انجینئر کو دیکھ کر تو مجھے گھن آ گئی۔ وہ کوئی آدمی ہے' بالکل گینڈا لگتا ہے۔ سر بھی گنجا ہے۔ روشنی میں تالوت کی طرح چمکتا ہے۔" وہ کھل کھلا کر ہنسی 'مگر جلد ہی اس کا شگفتہ چہرہ بجھ گیا۔ "صفدر باہر گیا تو انجینئر کمرے میں میرے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ لگا مجھے دبوچنے۔ زبردستی میرے ہونٹ چوم لیے۔ اس کے منہ سے ایسی کڑوی کڑوی بو نکلی۔ اخ تھو۔" اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ "انجینئر کے جانے کے بعد مجھے اتنا ڈر لگا کہ رونا آ گیا۔ میں روتی ہوئی چھپنے کے لیے یہاں آ گئی۔"

لالی نے بے رخی سے کہا۔ "اب روتی کیوں ہے؟ گھر سے تو خوشی خوشی بن ٹھن کر آ گئی۔ اب کہتی ہے ڈر لگتا ہے۔" اس نے غصے سے منہ بگاڑا۔ "ایسا ہی ڈر تھا تو گھر سے نکلی ہی کیوں؟"

"کرتی بھی کیا۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "صفدر میرے آگے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ رو رو کر کہنے لگا' زرینہ! مجھے بچا لے۔ نوکری بھی جائے گی اور جیل بھی ہو جائے گی۔ تم ہی بتاؤ' جب اپنا آدمی اس طرح رو رو کر گڑگڑائے تو میں کیسے انکار کرتی۔ ابھی تو ہمارے بیاہ کو چھے مہینے بھی نہیں ہوئے' یہ مصیبت پھٹ پڑی۔"

"تو فیر بچا لے اپنے خصم کو اس مصیبت سے۔ نخرا کیوں کرتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں اس کی بات مان لے۔ فیر وہ جیل بھی نہیں جائے گا' نوکری بھی بچ جائے گی اور اب تو چالو ہو ہی گئی۔ اپنے خصم کو ترقی دلوا کر انجینئر بھی لگوا دے گی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نا جی نا۔ ایسی بات نہ کرو۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "تم مجھے انجینئر سے بچا لو۔"

"میں کوئی تھانیدار لگا ہوں جو تجھے بچا لوں۔" لالی نے نہایت بے مروتی سے کہا۔ "جا' جا کر انجینئر کا دل خوش کر اور اپنے خصم کو بچا۔ مجھے سونے دے۔"

زرینہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا' منہ لٹکائے کھڑی رہی۔ اس کے چہرے کی چمک دمک ماند پڑ گئی۔ لالی بھی چپ چاپ کھڑا رہا۔ ذرا دیر تک کمرے میں سکوت رہا۔ زرینہ نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا اور افسردہ لہجے میں بولی۔

"تم مجھے نہیں بچا سکتے؟"

لالی نے اس دفعہ اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "کچھ تو عقل سے کام لے۔ مان لے کہ آج میں نے تجھے بچا لیا۔ کل پھر تیرا خصم تیرے پیر پکڑ کر روئے گا۔ تو فیر ایسے ہی بن ٹھن کر چلی آئے گی۔ نہیں آئے گی تو انجینئر تیرے خصم کے خلاف رپورٹ دے دے گا۔ اسے جیل ہو جائے گی اور نوکری بھی جائے گی۔ میں تجھے کہاں کہاں بچاؤں گا۔ کب تک ہتھیلی لگاؤں گا۔"

"تم مجھے آج بچا لو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" اس نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی' الجھن سے بولی۔ "میں تمہارے پلنگ کے نیچے چھپ جاؤں گی۔ انجینئر یہاں آ کر تم سے پوچھے تو کہہ دینا' کون زرینہ' کیسی زرینہ؟ یہاں کوئی زرینہ ورینہ نہیں آئی۔ وہ تمہارا کیا بگاڑ لے گا؟"

"نہیں جی' میں ایسے چکروں میں نہیں پڑتا۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "اب یہاں سے جا۔"

لالی چاہتا تھا کہ زرینہ چلی جائے تاکہ وہ چادریں اٹھا کر جلد سے جلد بنگلے سے نکل سکے۔ اب وہاں مزید ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

مگر زرینہ اس کا صاف جواب سن کر بھی کمرے سے نہیں گئی۔ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ ذرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں اس کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ وہ رو رہی تھی۔ لالی اسے روتا دیکھ کر سخت پریشان ہوا۔ گھبرا کر بولا۔

"ارے ارے تو رونے لگی۔"

زرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کی سسکیاں بند ہو گئی تھیں۔ لالی مسکرا کر بولا۔ "معلوم ہوتا ہے' سینما بہت دیکھتی ہے۔ دیکھتی ہے نا؟"

"دیکھتی ہوں' ضرور دیکھتی ہوں۔"

"جبھی تو ایسی ایکٹنگ کر لیتی ہے۔"

زرینہ جلدی جلدی آنسو پونچھ کر گویا ہوئی۔ "تو میں پلنگ تلے چھپ جاؤں۔ انجینئر اب آتا ہی ہو گا۔"

"ایسا کر' بستر پر لیٹ جا۔ میں منجی کے نیچے دبک جاؤں گا۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"اس سے یہ ہو گا۔ جب انجینئر تجھ سے چھیڑ چھاڑ کرے گا تو میں نیچے سے نکل آؤں گا اور تھانے دار بن کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا۔"

"نہیں جی' یہ ٹھیک نہیں۔ کچھ اور سوچنا ہو گا۔"

لالی نے چند لمحے خاموش رہ کر سنجیدگی سے پوچھا۔ "سچ مچ انجینئر سے بچنا چاہتی ہے؟"

"کہہ تو رہی ہوں' اور کیسے کہوں۔" زرینہ نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ "بس تم مجھے اپنے پلنگ تلے چھپ جانے دو۔"

"کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہے۔" لالی نے اسے ڈانٹا' ذرا دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر بولا۔ "چھپنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا کر۔ نیچے جا اور بنگلے سے نکل کر باہر برآمدے میں کھڑی ہو جا۔ جب انجینئر واپس آئے تو رونا شروع کر دینا۔ وہ پوچھے کیوں روتی ہے؟ کہنا مجھے بنگلے میں ڈر لگتا ہے۔ میں یہاں نہیں ٹھہروں گی۔ یہاں ایک چڑیل ہے۔ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ کبھی روتی تھی' کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستی تھی۔ کہتی تھی' میرا نام بانو ہے۔ مجھے اوپر والے کمرے میں قتل کر دیا گیا۔"

"وہ میری بات کا یقین مان لے گا؟"

"کیوں نہیں مانے گا؟ بانو کو اسی کمرے میں قتل کیا گیا تھا۔ اب یہاں اس کی روح بھٹکتی پھرتی ہے۔ اسی لیے تو میں نے تجھ سے پوچھا تھا' کیا تو بانو ہے؟"

"ہائے۔" وہ منہ پھاڑ کر بولی۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"بالکل سچ ہے۔ چوکیدار تو موجود ہی ہے جس کے سامنے بانو کا قتل ہوا تھا۔ میں نے تجھے بچنے کی ترکیب بتا دی۔ ایکٹنگ تو کر ہی لیتی ہے۔ اس طرح رونا اور چیخنا چلانا کہ انجینئر بھی ڈر جائے۔ سمجھ لے' تیرا کام بن گیا۔ اس طرح تیرے عصمت پر بھی بات نہیں آئے گی۔ اب جا' مجھے سونے دے۔"

وہ بستر کی جانب بڑھا۔

زرینہ نے ٹوکا۔ "میری بات تو سنو۔" لالی رک گیا۔ زرینہ نے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم نے ایسی بات سنائی کہ مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں سیڑھیوں سے نیچے کیسے جاؤں گی۔ زینے میں تو بالکل اندھیرا ہے۔"

"ڈر کیوں رہی ہے؟" لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو تو خوب تگڑی ہے۔ اندھیرے میں بانو سے مڈبھیڑ ہو جائے تو جھٹ اس کی چوٹی پکڑ لینا' جیسے میں نے تیری چوٹی پکڑی تھی۔ چوٹی پکڑتے ہی کیسی میرے کابو آ گئی تھی۔ ایسے ہی اسے کابو کر لینا۔"

"نہیں جی' یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔" وہ بدستور خوف زدہ تھی۔ "میں اکیلی نہیں جاؤں گی۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

لالی اب سخت بیزار ہو گیا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ ریسٹ ہاؤس سے جلد از جلد نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ مگر زرینہ اس کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گئی تھی۔ اس نے بگڑ کر کہا۔ "خاماخا نکھرا نہ کھا۔" اس نے غصے سے ہاتھ اٹھایا۔

"جاتی ہے یا لگاؤں ایک چپیڑ۔"

"دیکھو ہاتھ نہ چلانا۔" وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "اتنی ہمت تو کبھی صفدر کو بھی نہیں ہوئی۔"

"وہ تو ولا ہے۔ اس کی بات مت کر۔"

اس دفعہ زرینہ نے عاجزی سے کہا۔ "تم مجھے نیچے پہنچا دو۔ پھر میں یہاں نہیں آؤں گی۔ بالکل نہیں آؤں گی۔"

لالی نے زچ ہو کر کہا۔ "اس طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ چل' میں تیرے ساتھ چلتا ہوں۔"

لالی آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا' کمرے سے نکلا۔ زرینہ بھی اس کے ساتھ ساتھ بڑھی۔ لالی آگے تھا۔ زرینہ اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ زرینہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سیڑھیوں پر گھپ اندھیرا تھا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے کہا۔

"انجینئر سے تو تجھے اتنا ڈر لگتا ہے' مجھ سے نہیں لگتا؟ مان لے' میں تجھے اندھیرے میں دبوچ لوں تو؟"

"میرے ہاتھ نہیں ہیں کیا؟" اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔ "منہ نوچ لوں گی' دانتوں سے کاٹوں گی۔ چیخوں گی' چلاؤں گی۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔

"مجھ پر ہاتھ ڈالنا ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔"

"فیر اس گینڈے سے اتنا کیوں ڈرتی ہے؟ یہ کارروائی اس کے ساتھ کیوں نہیں کرتی؟"

"اس کی بات دوسری ہے۔" زرینہ دھیرے سے بولی۔ "صفدر خفا ہو جائے گا۔ کہتا تھا' انجینئر کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی تو سمجھ لینا کھڑے کھڑے طلاق دے دوں گا۔"

لالی جل کر بولا۔ "وہ کنجریہ بھی کہتا ہے۔ دلاگیری کرتا ہے اوپر سے آنکھیں بھی دکھاتا ہے۔"

زرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سیڑھیوں سے نیچے اترتی رہی۔ لالی بھی خاموش رہا۔ اندھیرے میں دونوں ریلنگ کا سہارا لے کر نپے تلے قدم اٹھا رہے تھے۔ ناگاہ زرینہ نے چونک کر پوچھا۔

"کیا تم نے میری چوٹی کھینچی تھی؟"

"تیرا کمر تو نہیں چل گیا۔" لالی نے اس کی جانب گردن موڑے بغیر کہا۔ "میں آگے آگے چ رہا ہوں۔ پیچھے سے تیری چوٹی کیسے کھینچ سکتا ہوں؟"

وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ "سچ' مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری چوٹی پکڑ کر کھینچی ہے۔"

"بانو ہوگی۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ زرینہ خاموش رہی۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے' تو ہی بانو ہے۔"

لالی نے توقف کے بعد پوچھا۔ "تو بانو تو نہیں ہے؟" زرینہ ہنوز خاموش رہی۔ ذرا دیر تک کمز خاموشی رہی۔ لالی اس خاموشی سے گھبرا گیا۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ زرینہ اندھیرے میں پرچھائیں کی طرح دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ لالی نے اس دفعہ کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ "بول' بولتی کیوں نہیں؟"

"ہاں' میں بانو ہوں۔" لالی کے عقب سے منمنی آواز ابھری۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے زرینہ کو دیکھا۔

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ "بڑے بہادر بنتے تھے۔ ڈر گئے نا؟"

دونوں زینے سے اتر کر نیچے کوریڈور میں آگئے تھے۔ سامنے گول کمرہ تھا۔ اس میں لیمپ روشن تھا۔ زرینہ جھٹ لالی کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ ابھی تک شوخی سے مسکرا رہی تھی۔ لالی نے جھنجلا کر اسے دیکھا۔ "تو بھی ایک نمبری ہے۔ میں سچ مچ ڈر گیا تھا۔" اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "انجینئر کس کمرے میں ٹھیرا ہے؟"

"یہ رہا وہ کمرہ۔" زرینہ نے نکڑ والے کمرے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر لیمپ روشن تھا۔ لالی آہستہ آہستہ دروازے پر پہنچا۔ بڑھ کر دیکھا' کمرہ خالی ہے۔ زرینہ بھی اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک پہنچ گئی۔ لالی نے دریافت کیا۔ "انجینئر کے ساتھ ڈرائیور بھی ہے؟"

"ہے تو۔" زرینہ نے جواب دیا۔ "وہ آتے ہی ادھر پچھلے کمرے میں سو گیا تھا۔ اسے بخار ہے۔ جبھی تو انجینئر خود صفدر کو چھوڑنے گیا ہے۔ گاڑی چلانا جانتا ہے۔"

لالی نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک طرف کھونٹی پر انجینئر کا دھاری دار سلیپنگ سوٹ لٹکا تھا۔ قریب ہی میز پر چمڑے کا سوٹ کیس رکھا تھا۔ سوٹ کیس بند تھا۔ کمرے میں ایک طرف سنگھار میز تھی۔ اس پر شیو کرنے کا سامان بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے کسی نے شیو کیا ہے۔

لالی دھیرے دھیرے کھڑکی کے پاس گیا۔ چوکنا نظروں سے باہر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ درختوں کے نیچے گہرا سناٹا تھا۔ البتہ بنگلے کے پچھواڑے بوڑھے چوکیدار کی کھانسی رک رک کر سنائی دے رہی تھی۔

زرینہ بھی لالی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ پوچھنے لگی۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "کچھ نہیں۔"

اسی وقت گیٹ پر گاڑی رکنے اور ہارن بجنے کی آواز ابھری۔ زرینہ نے گھبرا کر کہا۔ "انجینئر واپس آگیا۔ اب کیا ہوگا؟"

لالی بھی گھبرا گیا۔ مگر اس نے اپنی گھبراہٹ ظاہر نہیں کی۔ "ہونا کیا ہے۔ باہر برآمدے میں جا کر کھڑی ہو جا۔ جیسے ہی انجینئر آئے رونا شروع کر دینا۔ وہی کہنا جو میں نے بتایا ہے اور دیکھ' میرے بارے میں بالکل کوئی بات نہ کرنا۔ ورنہ سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔" زرینہ گھبرائی ہوئی نظروں سے لالی کو دیکھتی رہی۔ لالی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے ڈانٹا۔

"میرا منہ کیا تک رہی ہے؟ اب جا باہر۔"

زرینہ دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی بھی اس کے ساتھ چلا۔ چلتے چلتے اس نے سرگوشی کے انداز میں رسان سے کہا۔ "ذرا اپنے بال وال تو بکھیر لے۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور خود ہی اس کے بال اس طرح بکھیر دیئے کہ وہ بے ترتیب ہو کر چہرے اور شانوں پر پھیل گئے۔ زرینہ چپ کھڑی رہی' پھر بکھری ہوئی لٹیں لہراتی کمرے سے نکلی اور کوریڈور کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں چلی گئی۔

لالی فوراً انجینئر کے کمرے میں واپس آیا۔ اس نے سوٹ کیس کا تالا ہلا کر دیکھا۔ مگر تالا آسانی سے کھلتا معلوم نہ ہوا۔ ادھر بنگلے کے باہر گیٹ کھلنے اور گاڑی احاطے میں داخل ہونے کی آواز ابھری۔

لالی نے لپک کر فوراً کھونٹی سے سلیپنگ سوٹ کا پاجامہ اتارا۔ قمیص اتاری' بستر سے اجلی چادر کھینچی۔ چادر میں سلیپنگ سوٹ لپیٹا اور اسی میں سنگھار میز سے شیونگ کا سامان اٹھا کر رکھا۔ جھٹ پٹ گٹھری باندھی اور کمرے سے نکل کر زینے کی جانب بڑھا۔

زینے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے سنا' انجینئر باہر برآمدے میں زرینہ سے کہہ رہا تھا۔ "ارے' تم رو رہی ہو؟"

اس کی آواز بھاری تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "یہاں کیوں کھڑی ہو؟ آؤ اندر چلیں۔"

ذرا دیر خاموشی رہی پھر زرینہ کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ "میں اندر نہیں جاؤں گی۔ وہاں مجھے ڈر لگتا ہے۔"

لالی اس سے زیادہ کچھ نہ سن سکا۔ وہ اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا اوپر پہنچ گیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے جلدی سے جوتے بھی گٹھری میں باندھ لیے۔ میز کے قریب گیا اور پھونک مار کر لیمپ بجھا دیا۔

نچلی منزل سے ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لالی نے ان آوازوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے گٹھری کندھے پر لٹکائی۔ بڑھ کر کھڑکی پر پہنچا۔ اس پر چڑھا اور پیپل کی ڈال پر چھلانگ لگا کر پہنچ گیا۔ ڈال اس کے بوجھ سے ہلی۔ لالی ذرا دیر تک ڈال سے چمٹا رہا پھر شاخوں کا سہارا لیتا دھیرے دھیرے نیچے اترنے لگا۔

نیچے پہنچ کر اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہیں چوکیدار ادھر نہ آجائے۔ مگر وہ اس وقت برآمدے میں تھا جہاں سے زرینہ کی آواز آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ پیپل کا تنا احاطے کی دیوار سے ملا ہوا تھا۔ وہ دیوار پر پہنچا اور آہستہ سے باہر لائے گھ میں اتر گیا۔

لالی نے ایک سنسان مقام پر ماچس جلا کر گھڑی دیکھی۔ دو بجنے والے تھے۔ لالی پریشان ہو گیا۔ گیارہ بجنے سے پہلے ہی وہ ریسٹ ہاؤس چھوڑ چکا تھا اور اب اسے چلتے چلتے تین گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ اسے بہت پہلے گوردا پورہ پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مگر اسے دور دور تک کوئی بستی نظر آئی نہ نہر۔ وہ راستے سے بھٹک گیا تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ پریشان ہو گیا۔ لالی آگے بڑھا' اور تیز تیز قدموں سے ایک سمت چلنے لگا۔

اس نے لگ بھگ تین میل راستہ طے کیا ہو گا کہ قبرستان آگیا۔ قبرستان کے آگے بستی تھی۔ نزدیک پہنچ کر وہ ایک بار پھر ٹھہر گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ قبرستان پر ویرانی چھائی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

قبرستان بہت پرانا تھا۔ جگہ جگہ جنگلی جھاڑیاں اور ببول کے درخت تھے۔ ان کے درمیان ٹوٹی پھوٹی' اونچی نیچی قبریں بکھری ہوئی تھیں۔ قبرستان کے ایک گوشے میں نیم اور سرس کے درختوں کا جھنڈ تھا۔

درختوں کے نیچے مٹی کا بنا ہوا مکان تھا۔ مکان میں چراغ روشن تھا جس کی دھندلی روشنی دور سے زرد دھبے کی طرح نظر آتی تھی۔

لالی اس طرف نہیں گیا۔ آگے بڑھا اور ایک پگڈنڈی پر چلتا ہوا قبرستان کے اندر داخل ہو گیا۔ پگڈنڈی قبروں کے درمیان سے پیچ و خم کھاتی ہوئی گزرتی تھی اور اس کچی سڑک سے مل جاتی تھی جو دھندلی روشنی میں قبرستان کے دوسرے سرے پر نظر آ رہی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا

آگے بڑھتا گیا۔

اس نے قبرستان کا نصف سے زیادہ حصہ طے کر لیا۔ اب پکی سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ سڑک کی جانب چلا۔ مگر کچھ ہی دور گیا تھا کہ قبرستان کی گہری خاموشی میں قہقہہ بلند ہوا۔ لالی سراسیمہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر اس نے ہمت سے کام لیا۔ گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہر طرف اونچی نیچی قبریں تھیں۔

وہ چوکنا نظروں سے دائیں بائیں دیکھتا ایک بار پھر آگے بڑھا۔ ذرا ہی دیر بعد اسے ملی جلی سرگوشیاں سنائی دیں۔ آوازیں بہت دھیمی تھیں اور داہنے ہاتھ کے ایک گھنے درخت کے نیچے سے ابھر رہی تھیں۔

لالی نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا تو اسے درخت کے نیچے دھندلی دھندلی روشنی بھی نظر آئی۔ وہ گھبرا کر واپس مڑا اور پگڈنڈی چھوڑ کر قبروں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا سڑک کی جانب بڑھنے لگا۔ کئی بار ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ مگر وہ قبروں سے ٹھوکریں کھاتا، جنگلی جھاڑیوں سے الجھتا سڑک سے قریب ہو تا گیا۔ وہ قبرستان کے ڈراؤنے اور آسیبی ماحول سے جلد سے جلد نکل کر پکی سڑک پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

سڑک اب بالکل اس کے سامنے تھی۔ مگر یہ دیکھ کر سخت پریشان ہوا کہ سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا ہے۔ وہ خوف سے جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک کے پچھلے حصے سے پولیس والے کود کود کر باہر نکلنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں تھیں۔ چند ہی لمحے بعد تھانے دار بھی اگلی نشست سے اتر کر نیچے آیا۔ اس نے گردن اونچی کی۔ کانسٹیبلوں پر نظر ڈالی اور انھیں حکم دیا۔

"قبرستان چاروں طرف سے گھیرے میں لے لو۔"

لالی بدحواس ہو کر تیزی سے پلٹا اور قبریں پھلانگتا ہوا سرپٹ بھاگا۔ ناگاہ اس نے اندھیرے میں ٹھوکر کھائی اور ایک ٹوٹی قبر میں دھڑام سے منہ کے بل گرا۔ قبر قد آدم گہری تھی۔ مگر اندر سے کچی تھی۔ چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ پھر بھی اس کے دو دانت ہل گئے۔ ایک گھٹنے میں بھی درد ہو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا۔ عین اس وقت قبر کے آس پاس تیز تیز قدموں سے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں ابھریں۔ وہ جس طور گرا تھا، اسی حالت میں چپ پڑا رہا۔

ذرا دیر بعد کوئی دھم سے قبر کے اندر کودا۔ مگر وہ لالی پر نہیں گرا۔ لالی نے بدحواس ہو کر سر اٹھایا۔ وہ پولیس والا نہیں تھا۔ اس کی سفید قمیص اندھیرے میں جھلک رہی تھی۔ وہ کونے میں دبک کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لالی بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کپڑوں کی سرسراہٹ سن کر اس شخص نے پلٹ کر لالی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں تاریکی میں شیشے کی گولیوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے۔ اس شخص نے سرگوشی کی۔

"کون ہے تو؟"

"میں کبر کا مردہ ہوں۔" یہ کہہ کے لالی نے جھپٹ کر ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور دیوار سے اڑا کر بے بس کر دیا۔

مگر وہ بھی جاندار اور تگڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر جھٹکا دیا اور اپنی گردن لالی کی گرفت سے چھڑالی۔ "صاف بتا کون ہے تو؟"

"کہہ تو دیا، میں اس کبر کا مردہ ہوں۔" لالی نے ناک سے منمنا کر اسے پھر دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی اور بدستور اس پر جھکا بیٹھا رہا۔

وہ نڈر ہو کر بولا۔ "یار! مسخری نہ کر، ٹھیک ٹھیک بتا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "نہ جانے کتنی ایسی راتیں قبرستانوں میں گزر گئیں۔ مجھے تو آج تک کوئی مردہ شردہ ملا نہیں۔ تو نرالا مردہ ہے۔ بولتا بھی ہے اور کپڑے بھی پہنے ہوئے ہے۔"

وہ شخص قبر کے ایک کونے میں سکڑا سکڑایا بیٹھا تھا اور آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ لالی کو اس کی بے باکی بہت شاق گزری۔ جی چاہا کہ اس کے منہ پر زور سے ایسا تھپڑ مارے کہ ساری ہیکڑی نکل جائے۔ مگر اب دور سے ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھرنے لگا تھا۔ شور سن کر لالی خود خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے سنبھل کر آہستہ سے پوچھا۔ "یہ تو بتا، یہ شور کیسا ہے؟" لالی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"پولیس نے چھاپا مارا ہے۔"

"پولیس نے چھاپہ مارا ہے۔" لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "پولیس نے کیوں چھاپا مارا ہے؟"

"ایک قبر میں ادھر جوا ہو رہا تھا۔" اس شخص نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

"تم بھی جوا کھیل رہے تھے؟"

"میں تو خامخا پھنس گیا۔" وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ "نوے روپے بھی ہار گیا۔"

"جوا کھیلنے کے لیے چنگی جگہ تلاش کی۔"

"آج ہفتہ ہے نا۔ ہر ہفتے کو یہاں ضرور جوا ہوتا ہے۔ کوٹ سلیم کے علاوہ شہر سے بھی کئی بندے جوا کھیلنے آتے ہیں۔ اونچا کھیل ہوتا ہے۔ پولیس کو بھی پتہ ہے۔"

"پولیس کی مرضی کی بنا تو ایسا دھندا چل ہی نہیں سکتا۔ پر آج چھاپا کیسے پڑ گیا؟ پولیس کا بھتہ نہیں پہنچا ہو گا؟"

وہ اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "یار! میں تو بال بال بچ گیا۔ جیسے ہی پتہ چلا کہ دوڑ آ گئی' میں نکل بھاگا۔ سامنے سے ایک کانسٹیبل آ گیا۔ اس نے جھپٹ کر اس طرح دبوچ لیا' میں تو سمجھا' لے بھئی بشیرے آج دھر لیا گیا۔ مگر میں نے زور سے جھٹکا دے کر بیٹھک لگائی۔ داؤ ایسا فٹ بیٹھا کہ اس کے ہاتھ کھل گئے۔ ادھر میں نے زمین پر بیٹھتے ہی پیچھے ہاتھ ڈال کر اس کی ٹانگ پکڑ کر زور سے کھینچی۔ وہ دھڑام سے گرا' پھر میں کہاں ہاتھ آتا۔"

"یار توں تو..." لالی اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اسی وقت قبر کے قریب بھاری بھاری قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ بشیرے نے جھٹ لالی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لالی خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں دم سادھے بیٹھے رہے اور دھڑکتے دلوں سے آنے والے خطرے کا انتظار کرتے رہے۔ آہٹیں اور قریب آ گئیں۔ پھر کسی کانسٹیبل کی آواز سنائی دی۔

"وہ آٹھواں جواری کہاں گیا جی؟"

ایک اور آواز ابھری۔ "اب وہ کہاں ہاتھ آتا ہے' اندھیرے میں نکل گیا ہو گا کسی طرف۔"

"اور بھی کئی ہوں گے۔"

"مگر یہ سب تو یہی بتاتے ہیں' کل آٹھ جواری تھے۔"

لالی اور بشیرا سہمے ہوئے ان کی باتیں سنتے رہے۔ وہ قبر کے بہت ہی قریب سے گزر رہے تھے۔ لیکن نہ وہ ٹھہرے نہ انھوں نے قبر کے اندر جھانکا۔

پولیس والوں کے پاس ٹارچیں بھی تھیں اور ٹارچوں کی رک رک کر ابھرتی ہوئی' تیز روشنی دونوں اپنے سروں کی بلندی پر دیکھ رہے تھے۔

ملی جلی آوازیں اور آہٹیں رفتہ رفتہ دور ہوتی گئیں۔ جب آوازیں خاصی دور ہو گئیں تو بشیرا آہستہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ لمبا تڑنگا جوان تھا۔ چھ فٹ سے بھی اونچا قد تھا۔ وہ گردن اٹھا کر باہر دیکھنے لگا۔

لالی بھی کھڑا ہو گیا۔ قبر کی اونچائی اس کی پیشانی تک تھی۔ اس نے پنجوں کے بل اٹھ کر دیکھا۔ ساتوں جواری پولیس والوں کے نرغے میں سڑک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک جواری

لڑکھڑا کر گرا۔ پولیس والوں نے سہارا دینے کے بجائے اسے اندھا دھند پیٹنا شروع کر دیا۔ چیخ چیخ کر گالیاں بھی دیں۔ وہ بدحواس ہو کر فوراً کھڑا ہو گیا۔

دونوں خوف زدہ نظروں سے یہ منظر دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد پولیس والے جواریوں کو مویشیوں کی طرح ہنکاتے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ٹرک کے قریب پہنچ گئے۔ سب اس میں سوار ہو گئے۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور سڑک پر دوڑنے لگا۔ جب وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا تو لالی نے بشیرے کا کندھا تھپک کر کہا۔

"لے یار! صاف بچ گیا۔"

وہ بے نیازی سے مسکرا کر بولا۔ "ویسے ہونا ہوانا کیا تھا۔ سو دو سو روپے دے کر ہر جواری چھوٹ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ رات بھر حوالات میں بند رہے گا۔ سویرے ضمانت پر رہا ہو جائے گا۔ پر میں اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔" اس نے مڑ کر لالی کی طرف دیکھا۔ "پر تو قبر کے اندر بیٹھا کیا کر رہا تھا؟ میں نے جواریوں کے ساتھ تو تجھے دیکھا نہیں۔"

"نہیں یار! میں جوا شوا نہیں کھیلتا۔" لالی نے حیلہ جوئی سے کام لیا۔ "میں تو اس ٹوٹی کبر میں بیٹھ کر وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ۴۰ دن کا چلّہ ہے۔"

"پر تجھے یہ پتہ نہیں' یہاں جوا بھی ہوتا ہے؟"

"چلے کا آج پہلا ہی دن تھا۔ تو نے آ کر میرا وظیفہ خراب کر دیا۔"

بشیرے نے آنکھ مار کر بدمعاشی سے کہا۔ "یاری آشنائی کا چکر ہے کچھ؟" وہ ہولے سے ہنسا۔ "کسی سے آنکھ لڑ گئی؟ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ ورنہ تیرے جیسا جوان کہاں قبروں میں بیٹھ کر چلے کشی کرتا ہے۔"

"نہیں جی! میرے ساتھ ایسا کوئی چکر نہیں۔ میں ایسے دھندوں میں نہیں پڑتا۔"

"کسی مقدمے میں پھنس گیا ہو گا۔" اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "یار اب اس قبر سے تو نکل۔"

بشیرے نے دونوں ہاتھ باہر زمین پر ٹکائے' اچھلا اور دونوں ٹانگیں قبر کے اندر کی دیوار سے ٹکا کر دھیرے دھیرے گھسٹتا ہوا اوپر چلا گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں اور کپڑوں پر سے خاک جھاڑی' جھک کر لالی کو دیکھا۔ ہنس کر بولا۔ "یار! تو اتنی گہری قبر سے باہر کیسے نکلتا ہے؟" اس نے اپنا ہاتھ لالی کی طرف بڑھایا۔

"لے میرا ہاتھ پکڑ لے۔"

"رہنے دے۔" لالی نے اس کے ہاتھ کا سہارا لینے سے انکار کر دیا۔ جھک کر اپنی گٹھری اٹھائی۔ اسے کندھے پر لٹکایا۔ دونوں ہاتھ اونچے کیے۔ قبر کے باہر کی زمین تھامی۔ اچھلا اور ایک ہی زقند میں اس صفائی سے باہر آیا کہ بشیرا دنگ رہ گیا۔

"یار توں تو کوئی اونچی چیز لگتا ہے۔"

لالی اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ "یہ بتا' تیں نوں اب کتھے جانا ہے؟"

"میں نے تو کہیں نہیں جانا۔ یہیں قبرستان میں رہوں گا۔"

"تو گورکن تو نہیں ہے؟"

"یار! تو نے حد کر دی۔" وہ کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔ "میں تجھے گورکن لگتا ہوں۔"

لالی نے اس کی سفید قمیص اور خاکی پتلون غور سے دیکھی۔ چند لمحے خاموش رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "دیکھنے میں تو پولسیا لگتا ہے۔"

وہ ہنس کر بولا۔ "ٹھیک اندازہ لگایا تو نے۔"

لالی گھبرا گیا۔ بشیرے نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "ڈر نہیں' دو سال ہوئے میں نے پولیس کی ملازمت چھوڑ دی۔"

"چھوڑ دی یا نکال دیا گیا۔"

"نکال دیا گیا' یوں ہی سمجھ لے۔ ویسے پولیس کی نوکری مجھے پسند نہیں تھی۔ تنخواہ کم اور ہر وقت کی ذلیل' رشوت نہ بھی لو تب بھی بدنام۔"

لالی خاموش رہا۔ بشیرا بھی چپ ہو گیا۔

اب رات کا چل چلاؤ تھا۔ مشرق میں صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ذرا دیر بعد دور سے اذان بلند ہوئی۔ لالی پریشان ہو گیا۔ اب قبرستان میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس نے بشیرے سے کہا۔

"تو یہاں ٹھہر۔ میں نوں تو اب جانا ہے۔" وہ چلنے کے لیے مڑا۔ بشیرے نے اسے روک لیا۔

"یار! ایسی بھی کیا جلدی' چائے پی کر جانا۔"

"چائے؟" لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔ "چائے یہاں کہاں ملے گی؟"

"کیوں نہیں ملے گی۔" بشیرا ہنس کر بولا۔ "ابھی تجھے چائے پلواتا ہوں۔"

"نہیں جی! میں نے چائے شائے نہیں پینی۔"

"چھوڑ یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" بشیرا بے تکلفی سے بولا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا

پیکٹ نکالا۔ لالی کی طرف بڑھایا۔ "لے' پہلے ایک سگریٹ پی۔" لالی نے سگریٹ پینے سے بھی انکار کر دیا' مگر بشیرا نہ مانا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور اصرار کر کے لالی کے ہونٹوں سے لگا دی۔ پھر لالی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "آ میرے ساتھ۔ آرام سے بیٹھ کر چائے پئیں گے' فیر جہاں تیرا جی کرے' چلا جانا۔"

اس نے ایسا مجبور کیا کہ لالی کے لیے مزید انکار کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ بشیرا کے ہم راہ چپ چاپ آگے بڑھنے لگا۔ دونوں قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کی جانب چلنے لگے۔ قریب جا کر بشیرا نے مکان کے بند دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ ایک بوڑھے نے جھک کر بشیرے کو دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اندر' آجاؤ' اندر آجاؤ۔"

اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ بشیرا اور لالی خاموشی سے اندر چلے گئے۔ بوڑھے نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ وہ ابھی تک گھبرایا ہوا تھا' بشیرے کو مخاطب کر کے بولا۔ "کہاں چلا گیا تھا؟ پولیس نے چھاپا مار کر کئی جواریوں کو پکڑ لیا۔ پولیس ذرا ہی دیر پہلے یہاں سے گئی ہے۔"

"مجھے سب معلوم ہے۔" بشیرا قریب پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے لالی کو بھی ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔ "چاچا! تو تو کہتا تھا' پولیس کل چھاپا مارے گی۔ آج کیسے دوڑ آئی؟"

"مجھے تو شیر محمد کانسٹیبل نے یہی بتایا تھا۔"

بشیرا شکوہ کرنے لگا۔ "چاچا! تو نے تو آج مروا ہی دیا تھا۔ بال بال بچ گیا۔"

"کیا تو بھی جوا کھیلنے بیٹھ گیا تھا؟"

"میں تو ایسے ہی کھیل دیکھنے گیا تھا۔ انھوں نے زبردستی بٹھا لیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔

"چاچا! اب تو فٹافٹ گرم گرم چائے پلوا دے۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"بختاور نے چولہا سلگا دیا ہے' ابھی چائے آجائے گی۔"

"سکندر واپس آگیا؟"

"نہیں جی! وہ شام تک شہر سے لوٹے گا۔" بوڑھے نے بشیرا کو بتایا۔ "تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمہارے لیے چائے بنوا کر لاتا ہوں۔" اس نے گھر کے اندر جانے والا دروازہ کھولا اور کمرے سے چلا گیا۔

بشیرے نے لالی سے کہا۔ "یہ پیر بخش ہے' قبرستان کا گورکن۔ اپنا پرانا یار ہے۔ سمجھو یہ اپنا ہی

گھر ہے۔" چند لمحے خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔

"یار! تو نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

لالی نے اس کے سوال کا جواب پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے بتایا۔ "میرا نام روشن ہے جی۔"

مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ دونوں رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ تھکن سے نڈھال تھے۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھا پیر بخش اندر آیا' کہنے لگا۔ "ادھر ڈیرے پر آجاؤ۔ میں نے تیری منجی کے ساتھ ایک کھٹ اور ڈلوا دی ہے۔ ساری رات جاگتے گزر گئی۔ اب تو سو جا۔"

بشیرا کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔ "سونا سلانا تو بعد کی بات ہے۔ چاچا! پہلے یہ بتا' چائے کا کیا بنا؟"

"خالی چائے سے کیا بنے گا۔ پیٹ میں تھوڑی سی روٹی بھی جانی چاہئے۔" پیر بخش نے مسکرا کر کہا۔ "اب کھڑا ہو جا۔"

بشیرا اور لالی کھڑے ہو گئے۔ پیر بخش کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے نکل کر دالان میں آ گئے۔ آگے کھلا صحن تھا۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ تینوں صحن میں پہنچ گئے۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ چھپر پڑا تھا۔ یہ جھلیانی تھی۔ اس میں چولھا تھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ چولھے کے قریب ایک نوجوان عورت بیٹھی پراٹھے تیار کر رہی تھی۔ وہ پیر بخش کی بہو بختاور تھی۔ آہٹ سن کر اس نے ان کی طرف دیکھا۔ سر سے ڈوپٹے کا آنچل کھینچا اور بکل مار کر چہرے کو کسی قدر چھپا لیا۔

پیر بخش نے اسے مخاطب کیا۔ " بکھتاور! جیتی ہتھ چلا۔ دونوں رات بھر کے بھوکے ہیں۔"

تینوں نے صحن عبور کیا۔ پیر بخش نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ باہر آ گئے۔ صحن کے دروازے کے سامنے برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے کمرہ تھا۔ درمیان سے پتلی سی گلی گزرتی تھی۔ گلی عبور کر کے تینوں برآمدے میں پہنچے اور کمرے کے کھلے دروازے سے اندر چلے گئے۔ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ اس میں دو چارپائیاں تھیں۔ ان پر بستر لگے تھے۔ فرش پر چٹائی بچھی تھی۔ تینوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ پیر بخش زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہرا۔ واپس آنے کا وعدہ کر کے باہر چلا گیا۔ مگر آیا نہیں۔ کچھ دیر بعد بختاور کمرے کے اندر آئی۔ اس نے اس وقت بھی ہلکا سا گھونگٹ نکال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں المونیم کا تھال تھا جس میں پراٹھوں کے ساتھ ساتھ دو پیالوں میں چائے بھی تھی۔ اس نے نظریں نیچی کئے ہوئے کہا۔

"چاچا باہر کسی سے گل بات کر رہا ہے۔ ادھر بستی میں موت ہو گئی ہے۔ کبر تیار کرنے کی گل ہو

رہی ہے۔"

وہ جھکی اور تھال بشیرا اور لالی کے درمیان رکھ کے واپس چلی گئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد لوٹے میں پانی لے کر آئی۔ کہنے لگی۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔"

وہ باہر چلی گئی۔ بشیرا اور لالی اٹھ کر برآمدے میں گئے اور لوٹے سے پانی لے کر کلیاں کرنے لگے۔ انہوں نے منہ دھویا اور اندر واپس آ گئے۔

دونوں چٹائی پر بیٹھ کر پراٹھے کھانے لگے۔ پراٹھے گرم تھے۔ دونوں بھوکے بھی تھے۔ مزے لے لے کر سارے پراٹھے کھا گئے۔

چائے پیتے ہوئے بشیرا نے لالی سے پوچھا۔ "روشن! یہ بتا' تجھے جانا کہاں ہے؟"

"سٹیشن۔" لالی نے مختصر جواب دیا اور جان بوجھ کر اسٹیشن کا نام نہیں لیا۔

"سٹیشن سے کہاں جائے گا؟"

"کراچی کی گڈی پکڑنی ہے۔"

"لے یار! ملا اسی بات پر ہاتھ۔" اس نے گرم جوشی سے لالی کا ہاتھ تھام لیا۔ "کراچی تو مجھے بھی جانا ہے۔ دونوں کل صبح کی ٹرین سے اکٹھے چلیں گے۔ رات کو تھوڑا سا کام کرنا ہے۔ تو بھی ساتھ لگ جا تو کام جلد ہی نمٹ جائے گا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "سچ پوچھ تو میں نے تجھے اسی کام کے لیے روکا تھا۔"

"کام کیا کرنا ہوگا؟"

"یہ میں تجھے رات ہی کو بتاؤں گا۔"

لالی ذرا دیر خاموش رہا پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "تو کفن چور تو نہیں ہے؟"

"نہیں یار! میں ایسا گھٹیا کام نہیں کرتا۔"

"فیر کیا کام ہے؟"

"کہہ تو دیا' رات کو آرام سے بات ہوگی!"

بشیرا اٹھا اور چارپائی پر جا کر دراز ہو گیا۔ لالی کچھ دیر چٹائی پر گم صم بیٹھا رہا پھر وہ بھی اٹھ کر دوسری چارپائی پر لیٹ گیا۔ بشیرا ذرا ہی دیر بعد خراٹے بھرنے لگا۔ مگر لالی کو نیند نہیں آئی۔ بشیرا کی باتوں نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ کمرے میں مختصر سی کھڑکی بھی تھی جو کمرے کے پچھواڑے کھلتی تھی۔

لالی کروٹ بدل کر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگا۔ باہر املتاس کا اجڑا ہوا درخت تھا۔ درخت کے پتے

گر چکے تھے۔ شاخوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہر طرف زرد زرد دھوپ پھیلی تھی۔ لالی منٹ تک چپ لیٹا رہا۔

غنودگی کا غلبہ ہوا تو وہ بھی گہری نیند سو گیا۔

دوپہر کو آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا بختاور دہلیز پر کھڑی ہے۔ وہ لالی کو بیدار کرنے کے دروازے کی کنڈی آہستہ آہستہ بجا رہی تھی۔ کھانا لے کر آئی تھی۔ لالی نے اسے دیکھا تو اٹھ بیٹھ گیا۔

بختاور نے کھانا چٹائی پر رکھ دیا اور قریب بیٹھ کر کھانے پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں ہاتھ ہلا ہلا اڑانے لگی۔ لالی نے بشیرے کی چارپائی پر نظر ڈالی۔ اس کا بستر خالی تھا۔ لالی چارپائی سے اتر کر آیا۔ اس نے بختاور سے پوچھا۔

"بشیرا کہاں ہے؟"

بختاور نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ "وہ چاچا کے ساتھ کوٹ سلیم گیا ہے۔ دن ڈھلے لوٹے گا اس نے روٹی کھالی ہے۔ توں اس وکھت سو رہا تھا۔"

"کتنی دیر ہوئی دونوں کو گئے ہوئے؟"

"زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ جانا تو انھیں سویرے ہی تھا پر چاچا کو ایک میت دفن کرنی تھی۔ اسی میں دیر ہو گئی۔"

لالی نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ وہ کھانا کھانے لگا۔ کھانے میں روٹی تھی۔ ساگ تھا۔ اچار او مکھن بھی تھا۔ بختاور چٹائی پر خاموش بیٹھی رہی۔ لالی نے کھانا کھاتے کھاتے نظر اٹھا کر اسے دیکھا وہ نہا دھو کر آئی تھی۔

اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔ بال خشک تھے۔ سانولی رنگت تھی۔ بدن مضبوط اور صحت مند تھا۔ ناک نقشہ سبک تھا۔ عمر بھی بائیس تئیس برس سے زیادہ نہیں تھی مگر اس کے چہرے پر عجب ویرانی برستی تھی۔ وہ بجھی بجھی دکھائی دے رہی تھی۔ لالی نے اس کے چہرے کی ویرانی محسوس کی اور یہ بھی محسوس کیا کہ قبرستان کی طرح گھر میں بھی گہری خاموشی ہے۔ اس نے بختاور سے پوچھا۔

"تیرے سوا یہاں اور کوئی نہیں؟"

"اس وکھت تو کوئی نہیں ہے۔" اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو گھورا۔ "پر تو یہ کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"ناراض کیوں ہوتی ہے۔" لالی مسکرا کر بولا۔ "تیرے بال بچے نہیں ہیں؟"

"نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ اس دفعہ اس کا لہجہ نرم تھا۔ "پنج سال پہلے مرا ہوا نکا پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد کوئی نہیں ہوا۔" اس کے سانولے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔

لالی نے اس کی افسردگی کا سبب فوراً تاڑ لیا۔ تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "فکر کیوں کرتی ہے۔ بال بچے بھی ہو جائیں گے۔ ابھی تو بوڑھی تو نہیں ہو گئی۔"

بختاور نے نگاہ اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ویران اور خالی خالی تھیں۔ وہ نظریں نیچی کئے چند لمحے گم صم بیٹھی رہی۔

اس نے گہری سانس بھری اور آہستہ سے بولی۔ "چاچا کو پوتا پوتی کا بہت چاؤ ہے۔ وہ سکندر کا دوسرا ویاہ کرنا چاہتا ہے۔" دل کی بات بے اختیار بختاور کی زبان پر آ گئی۔

"سکندر تیرا خصم ہے نا؟ وہ کیا کہتا ہے؟"

"وہ کیا کہے گا۔ جو پیو کہے گا' وہی کرے گا۔ ایک وڈی نتانی ہے' پڑوس کے چک میں ویاہی ہے۔ جب آتی ہے' وہ بھی پیو اور بھائی کو اکساتی ہے۔"

لالی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس مسئلے کا کیا حل بتائے۔ وہ چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ بختاور خاموش بیٹھی رہی۔ "ایک گل پوچھوں' برا تو نہیں منائے گا؟"

"پوچھ' کیا پوچھنا چاہتی ہے۔"

بختاور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "یہ گندا کام کرتے تیں نوں برا نہیں لگتا؟"

لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کیسا گندا کام؟"

"یہی جو بشیرا کرتا ہے۔"

"بشیرا کیا کرتا ہے؟" لالی ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

اس بار وہ زیر لب مسکرائی۔ "تیں نوں یہ بھی پتہ نہیں۔"

"مجھے کیا پتہ۔ میں تو بشیرا کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں۔ میرا تو اس سے کل رات ہی میل ملاپ ہوا ہے۔"

بختاور نے تعجب سے کہا۔ "رات توں بھی ادھر ٹوٹی کبر میں جوا کھیل رہا ہو گا؟"

"نہیں جی' میں جوا شوا نہیں کھیلتا۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو نے یہ نہیں بتایا' بشیرا کیا کام کرتا ہے!"

"اسی سے پوچھ لینا۔ چاچا خاما خا میرے گلے پڑ جائے گا۔"

لالی اب کھانا کھا چکا تھا۔ بختاور نے برتن اٹھائے اور کمرے سے جانے لگی۔ لالی نے اسے روکا۔ "گل سن بختاور۔"

"ہمہ کیا کہنا چاہتا ہے؟" اس نے پلٹ کر لالی کی جانب دیکھا۔

"ڈرتی کیوں ہے؟ میں تیرا نام نہیں بتاؤں گا۔ اب بتا' بات کیا ہے؟"

مگر بختاور نہیں رکی۔ "مجھے جانے دے۔ ابھی ڈھیر سارے کام کرنے ہیں۔" وہ کمرے سے چلی گئی۔

☆

لالی سخت مخمصے میں پڑ گیا۔ وہ حیران و پریشان بیٹھا سوچتا رہا کہ بشیرا ایسا کون سا کام کرتا ہے جسے بختاور بہت برا سمجھتی ہے' اور بتانے سے بھی ڈرتی ہے۔

بختاور کی باتوں سے اس نے یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ پیر بخش گورکن بھی اس دھندے میں بشیرا کے ساتھ شریک ہے۔ لالی کے ذہن میں کرید پیدا ہوئی کہ کسی طرح یہ بھید معلوم کیا جائے۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا' مگر قرار نہ آیا۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور برآمدے میں آ گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ برآمدے کے سامنے کی گلی بھی ویران تھی۔ گلی کے دوسری طرف پیر بخش کے گھر کا دروازہ تھا جو صحن میں کھلتا تھا۔

لالی برآمدے میں کھڑا دروازہ تکتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ شاید بختاور باہر نکلے۔ مگر نہ دروازہ کھلا نہ بختاور نظر آئی۔ آخر لالی خود ہی آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ دروازے پر پہنچا۔ دستک دینے کے لیے اس نے ہاتھ رکھا تو دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ بختاور پڑچھتی کے نیچے چبوترے پر ٹانگیں پسارے بیٹھی تھی' چاٹی میں مدھانی ڈالے اطمینان سے دودھ بلو رہی تھی۔ بختاور نے آہٹ سن کر دروازے کی جانب نظریں اٹھائیں۔ لالی کو اس نے وہاں کھڑے دیکھا تو دوپٹے کا پلو کھینچ کر گھونگھٹ نکال لیا' آہستہ سے پوچھا۔

"کیسے آیا؟"

"ماچس ہو تو دے دے۔"

بختاور فوراً کھڑی ہو گئی۔ "کمرے میں چل' میں ابھی ماچس لے کر آئی۔" وہ پڑچھتی سے نکل کر صحن میں آ گئی۔

لالی دروازے سے ہٹ کر کمرے میں پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد بختاور بھی کمرے میں آ گئی۔ اس نے

ماچس لالی کے سامنے ڈال دی۔ لالی نے ماچس اٹھا کر سگریٹ سلگائی اور ایک کش لگا کر بختاور کی جانب دیکھا۔

"کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔"

"کوئی اور کام ہو تو بتا دے۔" وہ بدستور کھڑی رہی۔ "میں نوں ابھی دودھ بلونا ہے۔ نمی پر چاٹی چھوڑ کر آئی ہوں۔"

لالی اس کی بات نظرانداز کر کے بولا۔ "کبھی سر میں تیل اور آنکھوں میں کاجل تو ڈال لیا کر۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "کبرستان میں رہتے رہتے تو بھی ٹوٹی پھوٹی کبر بن گئی۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ۔"

"تمیں نوں کیہ۔ پتہ' مجھ پر کیا بیتتی ہے۔" بختاور نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مرد ایسا ملا ہے' نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا اور چاچا تو صرف پیسہ جوڑتا ہے۔ جو آتا ہے' سیدھا اس کے گلک میں جاتا ہے۔"

"تیرے ماں پیو نہیں ہیں؟" یہ بات پوچھ کر لالی نے گویا بختاور کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور دہلیز کے پاس فرش پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "اپنا تو کوئی بھی نہیں۔" وہ لمحے بھر خاموش رہی۔

"ماماں تھا' وہ بھی دو سال ہوئے گزر گیا۔"

لالی نے خاموشی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا نوٹ نکال کر بختاور کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لے' یہ رکھ لے۔ اپنے لیے تیل' کاجل اور دنداسا شنداسا خرید لے۔"

بختاور نے نوٹ لینے سے انکار کیا۔ مگر لالی نے اصرار کیا تو اس نے نوٹ لے کر دھوتی کی ڈب میں رکھ لیا۔ ذرا دیر دونوں خاموش رہے پھر لالی نے دریافت کیا۔

"تیرا پیو بھی گورکن تھا؟"

"نہ جی' میرے تو ناتے داروں میں بھی کسی نے یہ دھندا نہیں کیا۔ کبر کھودنا' مردے دفن کرنا' یہ بھی کوئی کام ہے۔ شروع شروع میں تو یہاں اتنا جی گھبراتا تھا' ایسا ڈر لگتا تھا' سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ گھنٹوں رویا کرتی' بالکل پیلی پڑ گئی تھی۔ بخار رہنے لگا تھا۔" وہ بیتے دنوں کی یادوں میں کھو گئی۔ اس کا لہجہ رفتہ رفتہ افسردہ ہوتا گیا۔ "ماماں بے چارہ غریب مزارع تھا۔ اوپر سے مامی ہر وکھت کڑ کڑ کرتی رہتی تھی۔ سو ماماں نے مجھے سکندر کے پلے باندھ دیا اور میں جیتے جی کبرستان میں آ گئی۔" وہ بے خیالی میں زمین پر انگلی سے لکیریں بنانے لگی۔

"اب چاچا کہتا ہے' سکندر کا دوسرا ویاہ کروں گا۔"

"اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔" لالی نے اظہار ہمدردی کیا۔ "یہ تو بتا' تیرا گھر والا سکندر کیسا بندہ ہے؟ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔"

"تجھے کیا بتاؤں۔" بختاور نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ دل گرفتہ تھی۔ نہ جانے کب سے ہمدردی کے دو بول سننے کے لیے ترس رہی تھی۔ لالی نے اس کی ذات میں دلچسپی لے کر اظہار ہمدردی کیا تو موم کی طرح پگھل گئی۔ وہ اس وقت اپنے دل کی بھڑاس نکال دینا چاہتی تھی۔ "جب میرا ویاہ ہوا تو سکندر ۱۲ سال کا چھوہرا تھا اور میں ۱۶ سال سے بھی اوپر کی ہو چکی تھی۔ ویاہ کے وکھت پوری جوان تھی۔" یہ بتاتے بتاتے اس کے لہجے میں اچانک تلخی آ گئی۔ "پہلے پیو نے جورو کر رکھا۔ فیر دونوں نے۔ چاچا اتنا بوڑھا ہو گیا پر اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔"

"پیر بخش اتنا گھٹیا اور بے گیرت ہے' یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔"

"ایک دم بے گیرت ہے۔ سکندر بھی بے گیرت ہے۔" بختاور نے غصے سے منہ بگاڑا۔ "سب کچھ جانتا ہے پر پیو کے سامنے کتے کی طرح دم ہلاتا ہے۔"

لالی نے چند لمحے خاموش رہ کر دریافت کیا۔ "بشیرے کا کیا معاملہ ہے؟"

"وہ مجھے کبھی چنگا بندہ نہیں لگا۔" بختاور نے جواب دیا۔ "پر اس نے کبھی مجھے بری نظر سے نہیں دیکھا۔"

لالی نے تعجب سے کہا۔ "سکندر کی طرح بشیرا بھی تیری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ دیکھنے میں تو بری نہیں لگتی۔" لالی نے نظر بھر کر دیکھا۔ اسے بختاور میں شاداں کی جھلک نظر آئی۔ لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

"ابھی تو جوان مٹیار ہے۔ ذرا بناؤ سنگھار کرلے تو سوہنی نظر آنے لگے گی۔"

بختاور کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ شرما گئی۔ نظریں جھکا کر بولی۔ "ایسی گلاں کر کے کیوں مجھے بہکانے کی کوشش کر رہا ہے؟" یہ کہتی ہوئی وہ اٹھنے کے لیے کسمسائی۔ "چاچا آتا ہی ہوگا۔" اس کے چہرے کی شگفتگی فوراً ماند پڑ گئی' ہلکا ہلکا خوف منڈلانے لگا۔

مگر لالی نے اسے اٹھ کر جانے نہیں دیا۔ "میں تجھے کبرستان سے نکال کر باہر لایا' تو فیر کبرستان کی طرف چلی۔ زندہ رہنا ہے تو زندہ بن کر رہ۔ نہیں تو جلد ہی مر جائے گی۔"

"یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "سچ کہتی ہوں' میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گی۔"

"اور اب بھی کہاں زندہ ہے؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" وہ اور افسردہ ہو گئی۔ "کوئی بھی تو کھشی نہیں' کچھ بھی نہیں۔ ایسا جینا کس کام کا۔ مر جاؤں گی تو ٹھیک ہی ہوگا۔"

"کیا ٹھیک ہوگا؟" لالی کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "پیر بخش تو خوش ہوگا۔ وہ سکندر کا جھٹ دوسرا ویاہ کر دے گا۔ جو بھی نئی ویاہ کر آئے گی' اسے بھی تیری طرح اپنی جورو بنا لے گا۔ سکندر تو کچھ کہے گا نہیں۔ یہ تجھے بھی پتہ ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

بختاور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ زمین پر انگلی سے الٹی سیدھی لکیریں بنا رہی تھی۔ لالی نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔

"میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"بتا' میں کیا کروں؟"

"بتاتا ہوں' ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے مجھے یہ بتا' بشیرا کیا دھندا کرتا ہے؟"

بختاور کو لالی کی بات پسند نہیں آئی۔ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "مجھے اسی لیے روکا تھا؟ تو فیر سن لے۔ بشیرا کبروں سے مردوں کے پنجر نکالتا ہے۔"

"مردوں کے پنجر نکالتا ہے؟" لالی نے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھا جیسے یقین نہ آیا ہو۔ "مگر وہ انہیں کس لیے نکالتا ہے؟"

"پتہ نہیں۔" بختاور نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "میں نوں تو اتنا پتہ ہے وہ پنجروں کی ہڈیاں بکسوں میں بند کر کے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔" وہ چند لمحے چپ بیٹھی رہی۔ "اس نے چاچا اور سکندر کو بھی اسی رستے پر لگا دیا ہے۔ ذرا سوچ کتنا گندہ کام ہے۔ مردوں کی مٹی کھراب کرتے انہیں ذرا بھی تو ڈر نہیں لگتا۔"

"بشیرا یہیں رہتا ہے؟"

"نہ جی' وہ یہاں کیوں رہنے لگا۔ مہینے' ڈیڑھ مہینے میں ادھر کا پھیرا کرتا ہے۔ اس دفعہ تو کوئی تین مہینے بعد آیا ہے۔ پر جب بھی آتا ہے' تین چار روز ضرور ٹھیرتا ہے۔ اب کے وہ کئی دنوں سے ٹھیرا ہوا ہے۔ جواریوں کو پکڑنے پولیس کی جو دوڑ آئی تھی' بشیرا ہی نے چاچا کے ذریعے بلوائی تھی۔ چاچا مکھبری کرنے خود تھانے گیا تھا۔" لالی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بختاور کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔

"اب مجھے جانے دے۔"

"چاچا کا ڈر لگ رہا ہے' یہی بات ہے نا؟"

"تمیں توں پتہ نہیں' وہ کیسا بندہ ہے۔"

"اس کے بارے میں جاننے کو اب رہ کیا گیا ہے۔ سبھی کچھ تو بتا دیا۔ پر اس سے اتنا ڈرتی کیوں ہے؟"

"ڈروں نہیں تو کیا کروں۔ کتّا اپنے کھونٹے پر اچھلتا ہے۔ میرا کوئی بھی کھونٹا نہیں۔"

"مجھے پتہ ہے۔ پر تو جوان ہے اور جوان مٹیار کو جوان اور سوہنی ہی بن کر رہنا چاہئے۔ جس زنانی کا کوئی نہیں ہوتا' وہ اسی کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہے؟"

"سمجھ رہی ہوں' سب سمجھ رہی ہوں۔"

دونوں چند لمحے خاموش رہے۔ لالی نے کہا۔ "جانے سے پہلے ایک بار تیرے پاس ضرور آؤں گا' صرف ایک بات کہنے کے لیے۔ سونا نہیں' رات کو میرا انتظار کرنا۔"

وہ بے چین ہو کر بولی۔ "ابھی بتا دے۔"

"ابھی نہیں' رات کو بتاؤں گا۔ اب تو ٹر جا۔"

بختاور کمرے سے چلی گئی۔ لالی نے مڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہی شاداں کی چال' وہی گھڑی کے پنڈولم کے مانند ادھر سے ادھر جھولتے ہوئے کولھے' وہی پتھر کی طرح ترشا ہوا ٹھوس بدن۔ لالی اسے دیکھتا رہا۔

جب وہ صحن کا دروازہ کھول کر گھر کے اندر چلی گئی تو لالی اٹھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

☆

لالی بیدار ہوا تو کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا تھا۔ بشیرا چارپائی کے پاس کھڑا اسے آہستہ آہستہ جھنجوڑ رہا تھا۔ لالی نے آنکھیں کھولیں تو وہ ہنس کر بولا۔ "یار! بہت سو لیا۔ شام ہو رہی ہے۔ اب اٹھ جا۔" لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"منہ دھولے' نیند کا خمار اتر جائے گا۔"

لالی چپ چاپ چارپائی سے نیچے اترا' کمرے سے باہر گیا اور منہ ہاتھ دھو کر واپس آ گیا۔ بشیرے نے مسکرا کر کہا۔ "ادھر' میرے پاس آ کر بیٹھ۔ اب تجھ سے کچھ کام کی باتیں ہو جائیں۔"

مگر لالی اس کے پاس نہیں گیا۔ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ "پہلے یہ بتا' کیا تو کبروں سے مردوں کے پنجر نکالتا ہے؟"

"نکالتا تو ہوں۔" وہ انکار نہ کر سکا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا' مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "مگر یہ بات

تجھے بتائی کس نے؟"

"کسی نے بھی بتائی' پر میں اس چکر میں نہیں پڑوں گا۔"

بشیرا نے کسی قدر پریشان ہو کر کہا۔ "بات کیا ہے؟"

"بات یہ ہے کہ یہ بہت گندا کام ہے۔ میں ایسے کام نہیں کرتا۔"

بشیرا لمحے بھر تک لالی کو گھورتا رہا پھر تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کر۔ مجھے پتہ ہے تو کتنا نیک اور بھلا مانس ہے۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

"کہتا تھا' میں قبر کے اندر وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ لیکن تیرا ۴۰ دن کا چلہ ایک ہی رات میں ختم ہو گیا اور اب کراچی جانے کو کہتا ہے۔"

لالی نے فوراً بات بنانے کی کوشش کی۔ "کہنے کو تو میں نے یہ بھی کہا تھا' میں کبر کا مردہ ہوں۔"

بشیرا ذرا متاثر نہ ہوا۔ اسی طرح تیکھے لہجے میں بولا۔ "زیادہ باتیں نہ بنا۔ کسی مغالطے میں نہ رہنا۔ میری آنکھ پولیس والے کی آنکھ ہے۔ میں نے رات ہی کو تیری باتوں سے تاڑ لیا تھا' کوئی واردات کر کے بھاگا ہے۔ جبھی تو پولیس کے ڈر سے قبر میں چھپا بیٹھا تھا۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

لالی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پیر بخش لالٹین سنبھالے ہوئے داخل ہوا۔ اس نے لالٹین چھت سے لٹکائی اور بشیرے سے پوچھنے لگا۔ "تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ کام کب شروع کرنے کا ارادہ ہے؟"

"ذرا اندھیرا اور بڑھ جائے تو سکندر کے ساتھ کھدائی شروع کر دینا۔ میں آج ہی رات چلا جاؤں گا۔ ٹرک ایک بجے تک پہنچ جائے گا۔ لیکن تب تک سارا کام پورا ہو جانا چاہئے۔"

"فکر نہ کر۔ سارا کام ٹھیک ٹیم پر ہو جائے گا۔" پیر بخش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پر کام شروع کرنے سے پہلے کچھ کھا پی لے۔"

"مجھے تو بالکل بھوک نہیں۔" بشیرا نے لالی سے کہا۔ "اپنے لیے روٹی منگوا لے۔"

"بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے۔ میں بعد میں کھا لوں گا۔" لالی نے پیر بخش کی جانب دیکھا۔ "چاچا! میرے لیے روٹی یہیں رکھوا دینا۔ جب بھوک لگے گی' کھا لوں گا۔"

"جیسی تم دونوں کی مرضی۔" پیر بخش کمرے سے چلا گیا۔

لالی اپنی چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ بشیرا نے لالی کو ٹٹولا۔ "یار! اتنا گھبرا کیوں رہا ہے؟ یہ تو سیدھی سیدھی بزنس ہے۔" اس دفعہ اس کا لہجہ نرم تھا۔

"تیری بزنس شزنس سمجھ نہیں آئی۔ نہ جانے کیا چکر ہے۔"

"کوئی چکر شکر نہیں۔" بشیرے نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ "میں تجھے سب کچھ صاف صاف بتائے دیتا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے' میں کراچی کی ایک کمپنی کو مردوں کے پنجر سپلائی کرتا ہوں اور بھی کئی بندے یہ دھندا کرتے ہیں۔"

"یہ کمپنی پنجرلے کر کرتی کیا ہے؟"

"باہر کے ملکوں کو ایکسپورٹ کرتی ہے۔ آج کل مال یونان اور اٹلی جا رہا ہے۔ پانچ سو ڈھانچوں کا آڈر ہے۔"

لالی بدستور حیرت زدہ تھا۔ "مگر مردوں کے یہ پنجر کس کام آئیں گے؟"

"یار! حد ہوگئی۔" بشیرا ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "یہ میڈیکل کالجوں میں جو لڑکے لڑکیاں ڈاکٹری پڑھتے ہیں' انسانی ڈھانچوں اور پنجروں کے بغیر ان کی پڑھائی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ ڈھانچے ایسے ہی کالجوں کے لیے سپلائی کئے جاتے ہیں۔ اسپتالوں اور دوا بنانے والی کمپنیوں کو بھی ان کی ضرورت پڑتی ہے اور بھی ایسے ہی دوسرے کاموں میں استعمال ہوتے ہیں۔" وہ لمحے بھر خاموش رہا پھر اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو نے کبھی یہ بھی سوچا' اپنے اسپتالوں اور میڈیکل کالجوں میں جو انسانی ڈھانچے لٹکے نظر آتے ہیں' وہ کہاں سے آتے ہیں؟"

"مجھے کیا پتہ۔" لالی نے جواب دیا۔ "پر مجھے یہ پتہ ہے' ایسا کرنا جرم ہے۔"

"جرم تو ہے۔" بشیرا نے ڈھٹائی سے کہا۔ "اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ قبروں کی بے حرمتی کرنے کے الزام میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۷ کے تحت ضابطے کی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔"

لالی نے خبردار کیا۔ "کسی دن دھر لیا گیا تو سیدھا جیل جائے گا۔"

"چھوڑ یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" بشیرا نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ "حکومت بھی جانتی ہے یہ ڈھانچے کہاں سے آتے ہیں؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ انسانی ڈھانچے درختوں میں نہیں اگتے اور مردے قبروں سے نکل کر میڈیکل کالجوں اور اسپتالوں میں نہیں جاتے؟ کسی نہ کسی قبر ہی سے کھود کر نکالے جاتے ہیں۔"

"تیری بات کچھ کچھ سمجھ آتی ہے۔"

"کمپنی کے پاس حکومت کی طرف سے باقاعدہ ایکسپورٹ لائسنس ہے اور کمپنی بھی کوئی ایسی ویسی نہیں' برٹش کمپنی ہے۔ دوائیں تیار کرتی ہے۔ پاکستان میں کمپنی کا سول ایجنٹ اپنا حاجی صالح بھائی لال جی کافور والا ہے۔ بہت وڈا کاروبار ہے اس کا۔ مجھ سے تو پنجر اور ڈھانچے وہی خریدتا

ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "تجھے ایک راز کی بات بتاؤں' ہر وڈا سرکاری اسپتال مردوں کے ڈھانچے فروخت کرتا ہے۔"

لالی کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔ "نہیں جی' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں تجھ سے کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔" بشیرا نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔ "یہ جو اسپتالوں میں لاوارث لاشیں رہ جاتی ہیں' تیرے خیال میں کیا انہیں کفن میں لپیٹ کر دفن کیا جاتا ہے' قبر بنائی جاتی ہے؟ یار! کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایسی لاشیں کچھ عرصے تک اسپتالوں کے مردہ خانوں میں پڑی رہتی ہیں' بعد میں ڈاکٹری پڑھنے والے لڑکے لڑکیاں ان کی چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ پھر وہ لاشیں اسپتال ہی کے ایک حصے میں زمین کھود کر دبا دی جاتی ہیں۔ سال سوا سال بعد جب کھال اور گوشت گل سڑ کر مٹی بن جاتے ہیں اور صرف ہڈیوں کا پنجر رہ جاتا ہے تو اسے نکال کر فروخت کر دیا جاتا ہے۔"

"حد ہوگئی جی۔" لالی منہ بگاڑ کر نفرت سے بولا۔ "سرکاری اسپتال یہ دھندا بھی کرتے ہیں۔"

"اگر اسپتال یہ دھندا نہ کرتے تو اپنا دھندہ کیسے چلتا؟ یوں سمجھ لے' اسپتالوں کے نام پر اپنا دھندا بھی چل رہا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ سرکاری اسپتال سے ۱۰ پنجر خریدے جاتے ہیں تو رجسٹروں میں ۲۰ بتا کر دکھائے جاتے ہیں۔ جو کمی رہ جاتی ہے وہ ہماری سپلائی سے پوری کر دی جاتی ہے۔"

لالی ذرا دیر بھونچکا بیٹھا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "یار بشیرے! تو اس چکر میں کیسے پڑ گیا؟"

"یہ نہ پوچھ۔ اسی چکر میں تو پولیس کی ملازمت گئی۔" بشیرے نے گہری سانس بھر کر بتایا۔ "چار پانچ سال ادھر کی بات ہے۔ میں ان دنوں کراچی میں تعینات تھا۔ ہوا یہ کہ پولیس کو ایک رات سڑک پر ایک لاش ملی۔ لاش بری طرح کچلی ہوئی تھی۔ بظاہر ایکسیڈنٹ کا کیس لگتا تھا۔ پولیس کی ابتدائی تفتیش کے بعد لاش کئی روز تک اسپتال کے مردہ خانے میں پڑی رہی۔ جب کوئی لینے نہیں آیا تو اسپتال والوں نے لاش لاوارث قرار دے کر اسپتال کے اس حصے میں دبا دی جہاں ایسی لاشیں دفن کی جاتی ہیں۔ یادداشت کے لیے اس جگہ رجسٹر کے اندراج کے حساب سے تختی پر نمبر بھی لگا دیا جاتا ہے۔"

لالی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ اطمینان سے بتاتا رہا۔ "پھر ایسا ہوا کہ تین چار مہینے بعد اوپر والوں کو یہ اطلاع ملی کہ وہ ایکسیڈنٹ کا نہیں قتل کا کیس تھا۔ متوفی سرگودھا کا رہنے والا تھا' کاروبار کے سلسلے میں کراچی آیا تھا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "ایک مجسٹریٹ کی نگرانی میں عدالتی انکوائری ہوئی۔ جس جگہ لاش دفن تھی اس کی نگرانی کے لیے میری اور عبداللہ

خان کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگائی گئی۔ لاش زمین سے کھود کر نکالنے پر بھی ہم دونوں کو لگایا گیا۔ ایک روز ہم دونوں اسپتال میں تھے کہ صالح بھائی لال جی کافور والا بھی وہاں آگیا۔ وہ اسپتال والوں سے ڈھانچوں کا سودا کرنے آیا تھا۔ مگر دراصل وہ ہم دونوں کی تلاش میں تھا۔ اس نے ہم سے راز داری میں بات چیت شروع کی تو پتہ چلا کہ لاش سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ اس نے تین ہزار رشوت دے کر ہم دونوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اس جگہ کوئی اور لاش دبا دی جائے تاکہ ضابطے کی کارروائی پوری ہو جائے۔"

"مگر صالح بھائی' وہ لاش لایا کہاں سے تھا؟"

"اسپتال کے مردہ خانے سے لایا ہوگا یا کسی قبر سے کھود کر نکالی ہوگی۔ یہ لاش اس نے ہمیں دی۔ لاش بری طرح گل سڑ چکی تھی۔ ہم نے رات کے اندھیرے میں دیکھا بھی نہیں۔ فاقٹ زمین کھود کر اسے دبا دیا۔ اسپتال کے عملے کو صالح بھائی نے کھلا پلا کر پہلے ہی پکا کر لیا تھا۔ اس لیے کام آسانی سے ہو گیا۔ پوسٹ مارٹم ہوا تو پتہ چلا کہ لاش مرد کے بجائے کسی زنانی کی ہے۔ بس اسی سے معاملہ بگڑ گیا۔ ہم دونوں معطل کر دیئے گئے۔ سیدھی سیدھی جیل ہو جاتی مگر حاجی صالح بھائی بہت حوصلے والا بندہ ہے۔ اس نے بھاگ دوڑ کی' روپیہ پانی کی طرح بہایا اور ہم دونوں کو صاف بچا لیا۔ لیکن نوکری نہ بچ سکی۔ عبداللہ خان نے تو کوئی اور دھندہ شروع کر دیا۔ مجھے صالح بھائی نے اس لائن پر لگا دیا۔"

لالی کے مجرمانہ ذہن میں کھلبلی مچی۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ "یہ بتا کتل صالح بھائی نے کرایا تھا؟"

"یہ تو آج تک پتہ نہیں چل سکا' قتل کس نے کیا تھا اور کس نے کرایا تھا۔" اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ "میرا خیال ہے صالح بھائی اس میں شریک نہیں تھا۔ وہ کسی اور کے لیے کام کر رہا تھا۔"

"یار بشیرے کوئی اور دھندا کر' یہ تو بہت واہیات کام ہے۔"

بشیرا نہایت ڈھٹائی سے بولا۔ "مگر یار' اس کام میں فائدہ بہت ہے۔ میں دو ہزار میں حاجی صالح بھائی کو ایک پنجر سپلائی کرتا ہوں۔ چار پانچ سو روپے اس کے نکالنے اور پہنچانے پر خرچ آتا ہے۔ دو سو تو گورکن ہی لے لیتا ہے۔ فیر کرایہ بھاڑا ہے۔ ریلوے اور پولیس کو رشوت بھی دینی پڑتی ہے۔ اس طرح مجھے ایک پنجر پر لگ بھگ ڈیڑھ ہزار مل جاتا ہے۔ میں یہاں سے چار پنجر لے جاؤں گا۔ چھ ہزار سیدھے سیدھے ہاتھ آجائیں گے۔ اب تو ہی بتا' کسی اور دھندے میں اتنی کمائی ہو سکتی ہے؟" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

"اس کام میں مٹی سے سونا بنتا ہے۔ کیا سمجھا؟"

الی متاثر نہ ہوا۔ "یار! میں تو یہ سمجھتا ہوں' پیسہ بنانے کے چکر میں مرنے والوں کی مٹی خراب ر رہا ہے۔ تیرا یہ دھندا چلتا رہا تو کسی دن کبر میں ایک بھی مردہ نہ رہے گا۔ یہ تو سوچ' ایک دن جھے بھی مرنا ہے۔"

"شروع شروع میں ایسی باتیں میں بھی سوچتا تھا۔ ڈرتا بھی تھا' پر اب تو اس کام میں مزہ آنے لگا ہے۔ ادھر مال اٹھایا' ادھر پہنچایا' اپنے پیسے کھرے کیے۔ ایک ہی آرڈر سپلائی کرنے میں ہزاروں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔"

"کئی سال سے یہ کام کر رہا ہے' لاکھوں بنا لیے ہوں گے۔ ابھی تک تیری ہوس پوری نہیں ہوئی۔"

"نہیں یار' ایسی کوئی لوٹ پڑی ہے۔ روز روز سپلائی کہاں ہوتی ہے؟ مہینے دو مہینے بعد کام نکلتا ہے۔ یوں سمجھ لے' اب تک میں نے زیادہ سے زیادہ ۵۰ ڈھانچے یا پنجر سپلائی کیے ہوں گے۔"

"یہ تعداد کم ہے؟ تیرے ہی حساب سے دیکھا جائے تو اب تک ساٹھ ستر ہزار تو کما ہی چکا ہے۔ تنے روپے سے کوئی بھی کاروبار شروع کر سکتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں' اب یہ کام چھوڑ' کوئی اور ھندا کر۔"

بشیرے نے سگریٹ کا لمبا کش لگا کر دھواں اڑایا۔ "کہتا تو ٹھیک ہے۔ اپنا بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ سو ڈھانچے سپلائی کرنے کے بعد یہ دھندا ختم کر دوں گا۔"

"یار! یہ سو کی شرط کیوں رکھی ہے؟"

"تب تک اتنی رقم اکٹھی ہو جائے گی کہ میں کاٹن جننگ فیکٹری لگا سکوں گا۔ اس کا سودا بھی ہو ہا ہے۔ ایڈوانس بھی دے چکا ہوں۔ چھ مہینے کے اندر اندر پوری رقم ادا کرنی ہے۔"

"کراچی میں سودا کر رکھا ہے؟"

"لائل پور میں چنیوٹی شیخ برادری کا اپنا ایک یار ہے' سیٹھ حمید اللہ گھوں۔ بہت وڈا کاروبار ہے اس کا۔ کئی فیکٹریاں اور کارخانے ہیں۔ اسی کی معرفت سودا طے ہوا ہے۔ اس کے ساتھ میری اری دوستی بھی عجب طرح سے ہوئی۔ پتہ ہے کیسے ہوئی؟"

لالی خاموش بیٹھا رہا۔

"ہوا یہ کہ سیٹھ حمید گھوں کی بیٹی' لاکھ' ڈیڑھ لاکھ نقدی اور زیور لے کر ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں ان دنوں لائل پور میں تعینات تھا۔ سیٹھ حمید گھوں خود تھانے آیا۔ رات کا وقت تھا' میں

ڈیوٹی پر تھا۔ سیٹھ حمید کو شبہ تھا کہ دونوں ٹرین سے کراچی جانے والے ہیں۔ میں فوراً سٹیشن پہنچا۔ دیکھا' دونوں ٹرین میں سوار ہونے جا رہے ہیں۔ میں نے وہیں انہیں دھر لیا۔ سارا کام خاموشی سے ہو گیا۔ نہ بدنامی ہوئی' نہ ہنگامہ۔ گموں بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے ہزار روپے بھی دیئے۔ اسی روز سے اس کے ساتھ میری یاری بھی ہو گئی۔" بشیرا نے لالی کو غور سے دیکھا' ہنس کر بولا۔ "میں تو کہتا ہوں' اپنے ساتھ لگ جا' عیش کرے گا۔ بول' کیا کہتا ہے؟"

لالی نے صاف انکار کر دیا۔ "نہیں جی! میں ایسے دھندے میں نہیں پڑتا۔"

"نہ پڑ' تیری مرضی۔ مگر آج رات تو میرے ساتھ کام کرے گا۔ دیکھ' انکار نہ کرنا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ذرا دیر سر جھکائے کچھ سوچتا رہا' پھر بولا۔ "یہ بتا' مجھے دے گا کیا؟"

"چار سو روپے۔ مطلب یہ کہ ایک پنجر کے سو روپے۔"

"پورے پانچ سو کر دے۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "مگر میرے حصے کا روپیہ تجھے پہلے دینا ہو گا۔"

"منظور ہے۔" بشیرے نے جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور لالی کے حوالے کرتے ہوئے خبردار کیا۔ "ایک بات کان کھول کر سن لے' میرے ساتھ کوئی داؤ کیا تو یہ سمجھ لے' میں بہت خطرناک بندہ ہوں۔"

لالی نے روپے جیب میں رکھے اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نوں پتہ ہے تو کتنا خطرناک بندہ ہے۔ مگر میں بھی ایسا ویسا بندہ نہیں ہوں' اپنی بات کا پکا ہوں۔ وعدہ کروں گا تو پورا کروں گا۔ میدان چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں۔ وقت پڑے تو آزما لینا۔"

بشیرا ہنستا ہوا اٹھا' لالی کے پاس گیا اور اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ "زیادہ باتیں نہ بنا۔ چل اٹھ۔ ابھی بہت کام کرنا ہے۔" لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دونوں دروازے کی جانب بڑھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

☆

شام اب تاریک ہو چکی تھی۔ ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بشیرا اور لالی اندھیرے میں آگے بڑھنے لگے۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد بشیرا درختوں کے نیچے بنی ہوئی کوٹھری کے دروازے پر ٹھہر گیا۔ دروازہ بند تھا مگر اندر روشنی تھی۔

اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ کوٹھری میں چراغ جل رہا تھا۔ اس کی دھندلی روشنی میں پیر بخش اور سکندر فرش پر بیٹھے تھے۔ ان کے قریب

لمبی لمبی خشک گھاس کا ڈھیر تھا۔ ایک طرف لکڑی کے دو بکسے رکھے تھے۔ ان کے ڈھکنے کھلے ہوئے تھے۔ بکسے چیڑ کی لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ پیر بخش اور سکندر ان میں گھاس کی تہہ جما رہے تھے۔

بشیرے نے کوٹھری میں داخل ہوتے ہی کہا۔ "تم دونوں نے ابھی تک کھدائی شروع نہیں کی؟"

پیر بخش ہنس کر بولا۔ "میں نے سوچا' جب تک اندھیرا ہو' اتنی دیر میں یہ کام کر لیا جائے۔" اس نے بکسے میں بچھی ہوئی گھاس کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کام بھی تو ضروری ہے۔"

"یہ کتنی دیر کا کام ہے' بعد میں ہو جاتا۔ پہلے کھدائی ہونی چاہئے۔ یہ سمجھ لے' زُرک زیادہ دیر نہیں ٹھہرے گا۔"

پیر بخش اطمینان سے بولا۔ "فکر نہ کر۔ ادھر کا کام تو ہم نے نمٹا ہی دیا۔ بس اب کھدائی کا نمبر ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

سکندر بھی باپ کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ لالی نے سکندر کو غور سے دیکھا۔ وہ اٹھارہ انیس سال کا نوجوان تھا۔ لیکن پیر بخش کا بدن جس قدر گٹھا ہوا اور مضبوط تھا' سکندر اسی قدر دبلا پتلا' مریل سا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں' چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ وہ تمام وقت خاموش رہا۔ پیر بخش نے کوٹھری کے ایک کونے میں پڑی ہوئی کدالیں اٹھائیں اور سکندر کو دے دیں۔ اس نے چپ چاپ کدالیں کندھے پر رکھ لیں۔

بیلچے پیر بخش نے سنبھال لیے۔ دونوں کوٹھری سے چلے گئے۔ پیر بخش نے جاتے جاتے دروازے پر ٹھٹک کر بشیرے سے کہا۔

"چاروں کبروں پر نشان تو میں نے دن ہی کو لگا دیئے تھے۔ ہم دونوں جا کر پہلے پچھم والی کبروں کی کھدائی شروع کرتے ہیں۔ تسی کتنی دیر میں پہنچو گے؟"

"تم کھدائی شروع کرو' میں بھی ذرا دیر میں پہنچ جاؤں گا۔" بشیرا نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔

"روشن میرے ساتھ ہو گا' یہ بھی تمہارے ساتھ کام کرے گا۔"

پیر بخش اور سکندر چلے گئے۔

بشیرے نے لالی سے کہا۔ "اب یہ بھی سمجھ لے سارا کام کیسے ہو گا۔" اس نے دونوں بکسوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "ان پیٹیوں میں ڈھانچے بند کئے جائیں گے۔ ایک پیٹی میں دو ڈھانچے رکھے جائیں گے۔ انہیں گھاس میں اس طرح سنبھال کر رکھا جاتا ہے کہ ہڈیاں سفر میں ٹوٹنے

پھوٹنے نہ پائیں۔"

"انہیں ریل سے لے جائے گا؟"

"میں اس دفعہ ٹرین سے مال نہیں لے جاؤں گا۔"

لالی نے چونک کر پوچھا۔ "فیر کیسے لے جائے گا۔"

"ٹرک سے مال جائے گا۔" بشیرا نے جواب دیا۔ "اپنے جاننے والے ایک پولیس انسپکٹر کا کراچی تبادلہ ہو گیا ہے۔ اس کا سامان ٹرک سے جا رہا ہے۔ میں نے اس سے معاملہ طے کر لیا ہے۔ دوپہر کو اسی کے پاس گیا تھا۔ اس کے سامان کے ساتھ اپنی دونوں پیٹیاں بھی چلی جائیں گی۔ راستے میں کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ شہر سے ایک کانسٹیبل بھی اپنے ساتھ جائے گا۔"

"تب تو تیرا سٹیشن جانا نہیں ہو گا۔"

"اب سٹیشن جا کر کیا کروں گا۔ تجھے بھی تو کراچی ہی جانا ہے نا؟"

"نہیں یار! میں تو ٹرین سے جاؤں گا۔"

بشیرا نے لالی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "پولیس سے ڈر رہا ہے؟" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "پروا نہ کر، اپنے ساتھ رہے گا تو تجھ پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔" اس نے رازداری کے انداز میں آہستہ سے پوچھا۔

"یہ تو بتا، بات کیا ہے؟ کوئی اونچا پھڈا ہو گیا؟"

لالی نے صاف انکار کر دیا۔ "نہیں جی! ایسی کوئی بات نہیں۔"

"فیر تو اپنے ساتھ کیوں نہیں چلتا؟ ٹرک میں ٹرین سے زیادہ آرام سے وقت گزرے گا۔ میں تو کہتا ہوں، تو بھی اپنے ساتھ ہی چلا چل۔"

لالی چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا، پھر وہ آمادہ ہو گیا۔ "تیرے ہی ساتھ چلوں گا پر کراچی تک نہیں جاؤں گا۔ مجھے شہر پہنچنے سے پہلے اتار دینا۔ میں نے پہلے کادر آباد سٹیشن جانا ہے۔ وہاں ایک دوست میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں اسے ساتھ لیے بنا کراچی نہیں جا سکتا۔"

"یہ بات تو نے پہلے کیوں نہ بتائی؟" بشیرا نے مسکرا کر کہا۔ "اپنی باتوں سے تو خود ہی شبہ پیدا کرتا ہے۔"

لالی نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "بشیرے! تو اس طرف آتا جاتا ہی رہتا ہے۔ یہ بتا، گورداپورہ کتنے ہے؟"

بشیرا نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "وہ تو اس طرف رہا۔"

"یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"یہاں سے ۱۵ میل تو ہو گا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ہو گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "پر تو گورداپورے کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"گل ایسے ہے، میں گورداپورے ہی جا رہا تھا۔ کل رات اندھیرے میں رستہ بھٹک کر ادھر آ گیا۔"

"بہت دور نکل آیا۔ یہ تو اپنے میاں حیات محمد خاں وٹو کی جاگیر کا علاقہ ہے۔ یہاں سے تو گورداپورے کو کوئی کچا رستہ بھی نہیں جاتا۔"

حیات محمد وٹو کا نام سن کر لالی پریشان ہو گیا۔ "نہیں، اب مجھے گورداپورے نہیں جانا، تیرے ہی ساتھ چلوں گا۔"

بشیرا نے گھاس کے ڈھیر کے پیچھے سے بڑا سا تھیلا نکالا اور اندر ہاتھ ڈال کر دو بڑی بڑی ٹارچیں نکالیں۔ انہیں جلا کر دیکھا۔ اس نے ایک ٹارچ لالی کو دی۔ تھیلا اپنے ہاتھ میں لٹکایا اور لالی کو مخاطب کیا۔

"چل یار! اب کام شروع کیا جائے۔ بہت باتیں ہو گئیں۔"

دونوں کوٹھری سے باہر نکلے۔ بشیرے نے دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ درختوں کے نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ بشیرے نے ٹارچ روشن کی تو پگڈنڈی نظر آئی۔ یہ پگڈنڈی قبرستان کی طرف جاتی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ قبرستان اندھیرے میں بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔

کچھ دور آگے جا کر انہیں ایک طرف ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ دونوں قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے روشنی کی طرف بڑھے۔ قریب جا کر انہوں نے دیکھا، ایک گھنی جھاڑی کی آڑ میں لالٹین رکھی ہے۔ اس کی دھندلی روشنی میں پیر بخش کدال سے ایک قبر کا بالائی حصہ کھود رہا ہے اور سکندر بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر ایک طرف ڈالتا جا رہا ہے۔ قبر کچی تھی اور مٹ مٹا کر برابر ہو چکی تھی۔

بشیرے اور لالی کے پہنچنے کے بعد بھی دونوں اپنے کام میں جتے رہے۔ قبر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کھدائی شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری۔

جب قبر اتنی کھد گئی کہ تختے نظر آنے لگے تو دونوں نے ہاتھ روک دیئے۔ تختے بھی گل سڑ گئے تھے۔ پیر بخش نے کدال اڑا کر ایک تختہ نکالا، فوراً بو کا بھبکا اٹھا۔ لالی کا جی متلانے لگا۔ بشیرے نے

تھیلے سے چادر نکالی اور چہرے پر اس طرح ڈھاٹا باندھ لیا کہ صرف آنکھیں نظر آتی تھی۔ اس نے تھیلے سے دوسری چادر نکال کر لالی کو دی۔ اس نے بھی ڈھاٹا باندھ لیا۔ پیر بخش اور سکندر نے بھی اپنے سروں سے پگڑیاں اتار کر ناک اور منہ کے گرد لپیٹ لیں۔ مگر انھوں نے بشیرے اور لالی کی طرح پورے ڈھاٹے نہیں باندھے۔

ایک ایک کرکے تمام تختے نکال کر الگ کردیئے گئے۔ لالی نے بھی تختے نکالنے میں پیر بخش اور سکندر کی مدد کی۔ البتہ بشیرا الگ کھڑا رہا اور بار بار کہتا رہا۔ "دیکھو' مٹی اندر نہ گرنے پائے۔ کوئی ٹوٹا ہوا تختہ بھی نیچے نہ گرے۔"

پیر بخش اور سکندر تو اپنے کام میں منجھے ہوئے تھے لیکن لالی اناڑی تھا۔ بشیرے کو اسی سے خدشہ تھا۔ مگر لالی نے زیادہ اناڑی پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔

تختے ہٹ گئے تو قبر کا منہ کھل گیا۔ بشیرے نے ٹارچ سے قبر کے اندر روشنی کی۔ لالی نے جھک کر دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ قبر میں مردے کا ڈھانچا پڑا تھا۔ کھال اور گوشت گل سڑ کر مدت ہوئی خاک میں مل چکا تھا۔ اب تو صرف سفید سفید ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ ان پر جگہ جگہ مٹی جمی تھی۔ سرخ سرخ چیونٹے اور دوسرے کیڑے مکوڑے ادھر ادھر رینگ رہے تھے۔ لالی یہ ہولناک منظر زیادہ دیر نہ دیکھ سکا۔

پیر بخش نے ربڑ کے بڑے بڑے سیاہ جوتے پہنے۔ بشیرے سے ربڑ کے دستانے لے کر ہاتھوں پر چڑھائے اور قبر کے اندر اتر گیا۔ بشیرے نے تھیلے سے ایک اور چادر نکالی اور قبر کے قریب بچھا دی۔ پیر بخش قبر کے اندر سے ڈھانچے کی ہڈیاں نکال' نکال کر سکندر کو دینے لگا۔ اس نے سب سے پہلے کھوپڑی نکالی' پھر دوسری ہڈیاں نکالیں۔ سکندر انھیں سنبھال' سنبھال کر چادر پر رکھتا رہا۔

ڈھانچے کی تمام ہڈیاں باہر نکالنے کے بعد پیر بخش قبر سے نکل کر باہر آگیا۔ ہڈیوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ چادر میں لپیٹا گیا۔ پیر بخش اور سکندر اسے سنبھال کر اس کوٹھری کی طرف روانہ ہوگئے جہاں بکسے رکھے تھے۔ ادھر بشیرے کی ہدایت پر لالی نے قبر کے منہ پر تختے لگائے اور بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر تختوں پر اس طرح ڈھیر بنادیا کہ قبر ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگی۔

دوسری قبر جس کے اندر سے ڈھانچا نکالنا تھا' زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ بشیرے کی نشاندہی پر لالی نے کدال اٹھا کر اسے کھودنا شروع کردیا۔ وہ کھودتا بھی جاتا اور بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر الگ رکھتا جاتا۔ جب پیر بخش اور سکندر واپس آئے تو دوسری قبر کے تختے نظر آرہے تھے۔ لالی نے ان دونوں کی مدد سے ذرا ہی دیر میں تختے نکال کر علیحدہ رکھ دیئے۔ دوسری قبر سے بھی ڈھانچے کی کھوپڑی اور

ہڈیاں باہر نکالی گئیں۔ پیر بخش اور سکندر انھیں چادر میں لپیٹ کر ایک بار پھر کوٹھری کی جانب روانہ ہوگئے۔

بشیرا' لالی کو تیسری قبر پر لے گیا۔ لالی نے اسے بھی کھود ڈالا اور اس دفعہ پیر بخش اور سکندر کے آنے سے پہلے پہلے قبر کے بوسیدہ تختے بھی نکال کر علیحدہ رکھ دیئے۔ جب تیسرے ڈھانچے کی ہڈیاں بھی قبر سے باہر نکال لی گئیں اور پیر بخش اور سکندر اسے لے کر چلے گئے اور لالی نے تختے لگا کر ان پر مٹی بھی ڈال دی تو بشیرے نے منہ سے ڈھاٹا کھول دیا اور لالی سے مخاطب ہوا۔ "یار! تو نے تو کمال کردیا۔ فٹافٹ تین پنجر نکال لیے۔ اب تو بھی منڈاسا کھول دے۔"

لالی نے چہرے سے ڈھاٹا کھول کر کہا۔ "یار! میرا تو ارادہ تھا کہ کام ختم کرنے کے بعد ہی منہ کھولوں گا۔"

بشیرے نے محبت سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "پیارے! دل خوش کردیا۔ اب ایسا کر۔ کمرے میں جا کر منہ ہاتھ دھو۔ کچھ کھا پی لے۔ بہت کام کرلیا۔"

لالی چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ تھک گیا تھا' بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس نے بشیرے کی بات مان لی' اس سے دریافت کیا۔ "تیرا روٹی کھانے کا ارادہ نہیں؟"

"نہیں یار! مجھے بالکل بھوک نہیں۔ میں تو سارا کام ختم کرکے صرف چائے پیوں گا۔ تو اب جا اور تازہ دم ہوکر آ۔ ویسے اب کام زیادہ نہیں رہا۔ ایک ہی پنجر تو نکالنا رہ گیا ہے۔" اس نے ٹارچ روشن کرکے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "ابھی تو گیارہ بھی نہیں بجے۔ بہت ٹیم ہے اپنے پاس۔"

لالی خاموشی سے درختوں کی جانب چل دیا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ راستے میں پیر بخش اور سکندر مل گئے۔ پیر بخش نے پوچھا۔ "کتھے چلا؟"

"بھوک لگ رہی ہے۔ روٹی کھا کر آؤں گا۔ جب تک تم دونوں بھی آرام کرلو۔"

پیر بخش بولا۔ " بختاور نے تیرے لیے روٹی کمرے میں رکھ دی ہے۔ بالٹی میں پانی بھی ہے۔ روٹی کھانے سے پہلے ٹھیک طرح صابن سے ہاتھ اور منہ دھولینا۔ صابن بالٹی کے پاس ہی رکھا ہے۔"

سکندر اس دفعہ بھی نہ بولا' خاموش کھڑا لالی کو ٹکر ٹکر تکتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ پیر بخش کے ہم راہ آگے بڑھ گیا۔

لالی قبروں کے درمیان سے گزرتا ہوا پیر بخش کے ڈیرے کی جانب چلنے لگا۔ درختوں کے نیچے

پہنچ کر اس نے ٹارچ روشن کی۔ پیر بخش کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ گلی کے اس پار برآمدے میں کوئی اندھیرے میں کھڑا تھا۔

لالی نے ٹارچ بجھا دی' آہستہ آہستہ برآمدے میں داخل ہوا۔ دروازے کے قریب اسے بختاور نظر آئی۔ وہ' آہٹ پر سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ مگر لالی نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ بختاور بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں پہنچی۔

"بہت دیری کر دی۔ میں تو گھنٹے بھر سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔"

لالی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ کانوں میں چاندی کے مندرے تھے۔ بال سلیقے سے سنوارے گئے تھے۔ ان میں تیل چمک رہا تھا۔ دنداسا لگانے سے ہونٹ گلابی ہو گئے تھے۔

لالی نے اس کی یہ سج دھج دیکھی تو مسکرا کر بولا۔ "بختاور اب تجھے کسی کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ تیرا انتظار کرنے والے تو خود پیدا ہو جائیں گے۔ ایک دم سوہنی مٹیار بن گئی۔ ماجھے کی جٹی لگ رہی ہے۔"

بختاور ذرا شرمائی' مسکرا کر بولی۔ "یہ بتا' توں کیا کہنا چاہتا تھا؟"

لالی نے جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور بختاور کو دے کر بولا۔ "لے' یہ رکھ لے۔ یہ کمائی میں نے تیرے ہی لیے کی تھی۔ میں مردوں کا مال نہیں کھاتا۔"

وہ ٹھنک کر ناز سے بولی۔ "اور مجھے مردوں کا مال کھلانا چاہتا ہے؟"

"تیری بات دوسری ہے۔ برسوں سے مردوں کا مال کھا رہی ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ کمرے سے چلا گیا۔ باہر برآمدے میں جا کر اس نے صابن مل کر اچھی طرح ہاتھ دھوئے' منہ صاف کیا اور تازہ دم ہو کر کمرے کے اندر آ گیا۔ بختاور ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ لالی آتے ہی چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ بختاور نے پوچھا۔

"توں نے وہ بات نہیں بتائی؟"

لالی نے ان جان بن کر کہا۔ "کون سی بات؟"

"وہی بات جسے بتانے کا دن کو وعدہ کیا تھا۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"میں تو یہ چاہتا ہوں' اگر تجھے کبرستان ہی میں رہنا ہے تو مردوں کی بجائے زندوں کی طرح رہ۔"

وہ افسردہ ہو گئی۔ "کس کے لیے زندہ رہوں' کیسے زندہ رہوں؟"

لالی نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ بختاور چند لمحے تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے نظریں جھکالیں آہستہ سے بولی۔ "مجھے اس طرح کیوں گھور رہا ہے؟"

لالی نے گہری سانس بھری۔ "اس لیے کہ تو مجھے بہت سوہنی لگ رہی ہے۔ پتہ نہیں' میرے بارے میں تو کیا سوچتی ہے۔"

"توں برا بندہ نہیں ہے۔"

"میں کہوں تو میرے ساتھ بھاگ چلے گی؟ بول' کیا کہتی ہے؟"

"ڈر لگتا ہے۔ پتہ نہیں' توں کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ مجھے تو تیرے بارے میں کچھ بھی نہیں ملوم۔"

"ٹھیک ہی ہے کہ تجھے کچھ نہیں ملوم۔" لالی کسی قدر جذباتی ہو گیا۔ "میرے ہاتھ میں ایسی لکیر ہی نہیں کہ کسی مٹیار سے پیار کروں اور اسے اپنی گھر والی بناؤں۔"

"تیری باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ صاف صاف بتا؟"

لالی کچھ کہنے ہی والا تھا' اچانک دروازہ کھلا۔ سکندر اندر داخل ہوا۔ لیکن جیسے ہی بختاور پر اس کی نظر پڑی' ایک دم بھڑک اٹھا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہے؟"

بختاور کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھنے لگی۔ مگر لالی نے اسے اٹھنے نہیں دیا' ڈپٹ کر بولا۔ "بیٹھی رہ۔"

"میں ابھی بابا کو لے کر آتا ہوں۔ وہی اسے پوچھے گا یہاں کیوں آئی؟"

لالی نے مسکرا کر کہا۔ "اس کا خصم تو ہے یا تیرا پیو؟"

سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا' لالی کو گھورتا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے کہا۔ "توں ہمارے معاملے میں بولنے والا کون ہوتا ہے؟"

"خاما خا گرمی نہ دکھا۔ یہاں آ کر میرے پاس بیٹھ۔ فیر بتاؤں گا' میں اس معاملے میں بولنے والا کون ہوں؟"

سکندر چپ چاپ چٹائی پر بیٹھ گیا۔ لالی نے بختاور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ذرا اس کی طرف دیکھ اور سوچ' تجھے کیسی سوہنی گھر والی ملی ہے۔ تو اس کا مرد ہے۔ کبھی اسے پیار بھری نظروں سے بھی دیکھا؟"

بختاور بیچ میں بول پڑی۔ "یہ کیا دیکھے گا۔ چاچا دیکھنے ہی کب دیتا ہے۔ جو وہ کہتا ہے' وہی یہ کرتا ہے۔ بول' میں کوئی جھوٹ کہہ رہی ہوں؟"

سکندر مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "مجھے اس سے ڈر جو لگتا ہے۔"

"یوں ہی ڈرتا رہا تو فیریہ بھی سن لے' یہ کسی دن پھر سے اڑ جائے گی اور یہ سمجھ لے ایسی گھر والی تجھے دوبارہ نہیں ملے گی۔" لالی نے اسے خبردار کیا۔

"پر میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"اس سے پہلے کہ یہ کسی اور کے ساتھ بھاگے' اسے لے کر یہاں سے بھاگ جا۔"

"نہیں جی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" سکندر خوف زدہ ہو گیا۔ "بابا مجھے جان سے مار دے گا۔ توں جانتا نہیں وہ کیسا بندہ ہے؟"

لالی نے اندازہ لگا لیا کہ سکندر بھی اپنے باپ کے رویئے سے خوش نہیں ہے' مگر اس سے ڈرتا بھی بہت ہے۔ لالی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ "مرد بن۔ وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ۔ تجھے اس نے کیا بنا دیا ہے؟ کیسا بیمار اور مریل لگتا ہے۔"

بختاور تیکھے لہجے میں بولی۔ "یہی گل بات میں کہتی ہوں تو مجھ سے لڑتا ہے۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔ یہ تو ایک دم بے غیرت ہے۔ چاچا اس کے سامنے مجھے زبردستی اپنی کوٹھری میں لے جاتا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتا رہتا ہے' کچھ بھی تو نہیں کہتا۔" اس نے ذرا سا تامل کیا۔ "اب اس کا دوسرا ویاہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ آئے گی تو اس کے ساتھ بھی یہی بے غیرتی کرے گا۔"

سکندر ایک دم بھڑک اٹھا۔ "زیادہ کڑ کڑ نہ کر۔ بند کر اپنی بکواس۔"

"نراض کیوں ہوتا ہے؟ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ اس طرح کب تک کام چلے گا۔"

سکندر زچ ہو کر بولا۔ "تو میں کیا کروں؟"

"وہی جو میں کہہ رہا ہوں۔" لالی نے مشورہ دیا۔ "اسے لے کر شہر چلا جا۔ پنج سو روپے میں نے اسے دے دیئے ہیں۔ کچھ دن اس سے کام چلانا' بعد میں کوئی نہ کوئی دھندا مل جائے گا۔ بول' کیا کہتا ہے؟"

"میں تو تیار ہوں' پر یہ تیار نہیں ہو گا۔" بختاور نے اپنی رضامندی کا کھل کر اظہار کر دیا۔

"ہو جائے گا' ہو جائے گا۔ اسے میں تیار کر لوں گا۔" لالی نے سکندر کی پیٹھ تھپکی۔ "ہمت سے کام لے' سب ٹھیک ہی ہو گا۔"

سکندر پہلے تو جھجکا۔ پھر لالی کے سمجھانے بجھانے پر رضامند ہو گیا اور یہ طے ہوا کہ جس روز

پیر بخش شہر جائے گا' دونوں میاں بیوی چپکے سے نکل بھاگیں گے۔

☆

لالی اور سکندر ڈیرے سے نکل کر بشیرے کے پاس پہنچے۔ اس اثناء میں پیر بخش نے قبر کھود ڈالی تھی اور تختے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پیر بخش نے سکندر کو دیکھ کر غصے سے کہا۔ "اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

لالی فوراً بیچ میں بول پڑا۔ "چاچا! نراض نہ ہو۔ میں نے اسے روک لیا تھا۔ میں روٹی کھا رہا تھا' کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو کس سے منگواتا۔"

پیر بخش خاموش ہو گیا۔ لالی اور سکندر نے چہروں پر ڈھاٹے باندھے اور تختے اکھاڑنے لگے۔ تختے علیحدہ کر کے انھوں نے قبر سے ڈھانچے کی ہڈیاں نکالیں۔ پیر بخش اور سکندر انھیں چادر میں لپیٹ کر لے گئے۔

لالی نے جلدی جلدی قبر کے تختے لگائے اور بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر ان پر ڈال دی۔ اب کام کا ایک مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ بشیرے اور لالی نے اپنے چہروں سے ڈھاٹے ہٹا دیئے۔

بشیرے نے تمام سامان تھیلے میں ڈالا' اپنی اور لالی کی سگریٹ سلگائی۔ دونوں کش لگاتے ہوئے کوٹھری کی جانب روانہ ہو گئے۔

جب وہ درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچے تو دھندلی روشنی میں سڑک پر ایک لمبی چوڑی کار کھڑی نظر آئی۔ کار دیکھتے ہی دونوں ٹھٹکے۔ لالی کو شبہ ہوا کہ وہ میاں حیات محمد کی بیوک ہے۔ وہ اسے حیات محمد کے بنگلے کے باہر دیکھ چکا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ حیات محمد ونو کی بیوک اتنی رات گئے وہاں کیوں آئی ہے؟ کار دیکھ کر بشیرا بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں جہاں تھے' وہیں ٹھہر گئے اور کار کی جانب دیکھتے رہے۔

کار کے قریب آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی تھیں۔ مگر آوازیں اس قدر دھیمی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بشیرا اور لالی کان لگا کر باتیں سننے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن ان کے پلے کچھ نہ پڑا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ دونوں سہمے ہوئے خاموش کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد کار کی بتیاں روشن ہوئیں' انجن اسٹارٹ ہوا اور کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد دھندلی روشنی میں کوئی آتا ہوا نظر آیا۔ قریب آیا تو انھوں نے پہچان لیا۔ وہ پیر بخش تھا' مگر گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

بشیرے نے پوچھا۔ "چاچا! کس سے بات کر رہا تھا؟ یہ کار کس کی تھی؟"

"ذرا صبر کر۔ سب کچھ بتا دوں گا۔"

مگر بشیرا بے چین تھا۔ "بتاتا کیوں نہیں۔ چبا چبا کے کیوں بات کر رہا ہے؟"

"ارے ارے، توں تو خاما خا ناراض ہو گیا۔" پیر بخش نے نرمی سے کہا۔ "میاں حیات محمد کا منیجر آیا تھا۔ سویرے بھی آیا تھا۔"

"کس لیے آیا تھا؟"

پیر بخش لمحے بھر خاموش رہا پھر سرگوشی کے انداز میں رسان سے بولا۔ "تجھ سے کیا چھپانا۔ وہ جو اونچی کبر دیکھ رہا ہے۔" اس نے قبرستان کے شمال کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "وہ میاں حیات محمد کے بھائی میاں ریاض محمد کی کبر ہے۔ میاں حیات چاہتا ہے اس سے مردہ نکال کر دوسرا مردہ رکھ دیا جائے۔"

بشیرے نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "یہ چکر کیا ہے؟"

پیر بخش گردن ہلا کر بولا۔ "اپنے کو تو کچھ پتہ نہیں۔"

لائی فوراً تاڑ گیا کہ حیات محمد نے قبر میں پہلے جو لاش دفن کرائی تھی، اب اس کی جگہ ریاض محمد کی اصل لاش رکھنا چاہتا ہے جسے دھیور نے تہ خانے میں قتل کر دیا تھا۔

پیر بخش نے بتایا۔ "یہ کام بھی آج ہی ہو گا۔ کام مشکل بھی ہے۔ کبر بہت نیچے سے کھودنی ہو گی اور نیچے ہی نیچے پرانی لاش نکال کر نئی لاش رکھنی ہو گی تاکہ اوپر سے کبر ویسی کی ویسی رہے۔"

بشیرا گھبرا گیا۔ "یہ کام کب شروع ہو گا؟"

"میں نے انھیں دو بجے بلایا ہے۔ وہ تو ابھی شروع کرنے کو کہتے تھے پر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا مجھے پہلے ایک اور کبر تیار کرنی ہے۔ اب میاں حیات کے کرندے دو بجے سے پہلے پہلے لاش لے کر آجائیں گے۔"

بشیرے نے کہا۔ "تب تو ہمیں اپنا کام جلد سے جلد ختم کرنا ہو گا۔"

پیر بخش بولا۔ "میں تو کہتا ہوں، اپنا کام کل پر چھوڑ دے۔ مان لے ٹرک دیر سے آیا تو کیا ہو گا؟"

بشیرے نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "ٹرک تو ٹھیک ایک بجے پہنچ جائے گا۔" اس نے ٹارچ جلا کر گھڑی دیکھی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "چاچا! بارہ بجنے والے ہیں، جھیتی کر۔ ابھی بہت کام پڑا ہے۔"

تینوں آگے بڑھے اور درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گئے۔

کوٹھری میں چاروں ڈھانچوں کی ہڈیاں علیحدہ علیحدہ ڈھیریوں میں گھاس پر رکھی تھیں۔ ہر طرف تیز بو پھیلی تھی۔

سکندر ایک بڑے ڈبے سے سفید سفید پاؤڈر نکال کر ہڈیوں پر چھڑک رہا تھا۔ بشیرے نے دونوں بکسوں میں جھک جھک کر دیکھا۔ اندر ہاتھ ڈالا اور ان میں بچھی ہوئی گھاس جگہ جگہ دباتا رہا۔ اس نے پیر بخش سے کہا۔

"چاچا دیری نہ کر۔ ایک ایک پنجر کی ہڈیاں سنبھال سنبھال کر رکھنی شروع کر دے۔"

پیر بخش نے ہدایت کے مطابق ایک ڈھانچے کی ہڈیاں اٹھا کر بکسے میں گھاس کی تہ پر رکھیں۔ جب وہ ایک ایک ہڈی رکھ چکا، تو اس نے ہڈیوں پر گھاس کی دوسری تہ جمائی۔ اس نے گھاس کی اس موٹی تہ پر دوسرے ڈھانچے کی ہڈیاں ترتیب سے جما کر رکھ دیں۔ ایک بار پھر ہڈیوں پر گھاس کی تہ جمائی گئی۔ یہاں تک کہ بکسا پوری طرح گھاس سے بھر گیا۔ بشیرا نے ہر بکسے کا ڈھکنا بند کیا، تالا لگایا اور کنجی اپنے پاس رکھ لی۔ بقیہ دو ڈھانچے بھی اسی طرح دوسرے بکسے میں بند کر کے تالا لگا دیا گیا۔

جب یہ کام ہو گیا تو بشیرے نے جیب سے آٹھ سو روپے نکالے اور پیر بخش کو دے دیے۔ اس نے پچاس روپے اور نکالے اور پیر بخش کو دیتے ہوئے بولا۔ "یہ تیرے چائے پانی کے لیے ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"چاچا! اسی بات پر گرما گرم چائے پلوا دے۔"

"روٹی ٹکر کھا لے، توں نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔"

"میں روٹی نہیں کھاؤں گا۔ صرف چائے پلوا دے۔"

پیر بخش کوٹھری سے چلا گیا۔ سکندر وہیں ٹھہرا رہا۔ کچھ دیر بعد تینوں کوٹھری سے نکل کر ڈیرے میں آگئے۔ بشیرے نے چارپائی کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ اسے کھولا۔ اجلی بش شرٹ اور پتلون نکالی اور وہیں کھڑے کھڑے کپڑے تبدیل کیے۔ اس نے میلے کپڑے اور تھیلے کا سارا سامان سوٹ کیس میں رکھا اور اسے بند کر دیا۔ لائی نے اپنی گٹھری اٹھا کر ہاتھ میں لٹکائی۔ مگر پیر بخش ابھی تک چائے لے کر نہیں آیا تھا۔ خاصی دیر ہو گئی۔ بشیرے نے مڑ کر سکندر کو دیکھا۔ قدرے تیکھے لہجے میں بولا۔

"جا کر دیکھ، چائے کا کیا بنا؟"

مگر وہ جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔

لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ "یار! تو کیسا مرد ہے۔ بختاور تیری گھر والی ہے' تو کہے گا تو فٹافٹ چائے بنا دے گی۔ جا' کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔"

سکندر چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد صحن سے پیر بخش کے زور زور سے بولنے کی آواز ابھری۔ بشیرا اور لالی خاموش بیٹھے رہے۔ چند منٹ بعد پیر بخش بڑبڑاتا ہوا آیا۔ وہ دو پیالیوں میں چائے بھی لایا تھا۔ بشیرے نے چائے کی پیالی لے کر پوچھا۔

"کیا ہو گیا چاچا؟ بہت ناراض نظر آ رہا ہے۔"

"کلجگ آ گیا ہے جی' کلجگ۔" وہ شکوے کے انداز میں بولا۔ "سکندر مجھ پر آنکھیں نکال کر کھڑا ہو گیا۔ آج تک اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔"

لالی نے چائے کی پیالی لے کر پوچھا۔ "بات کیا ہوئی؟"

"ہونا کیا تھا جی! گھر والی کی حمایت کر رہا تھا۔"

پیر بخش نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ سکندر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے بختاور بھی تھی۔ سکندر کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا۔ "میں اس کی حمایت کر رہا تھا۔ تم دونوں خود دیکھ لو۔ اس نے کیا کیا ہے۔"

سکندر نے بختاور کا ہاتھ پکڑ کر سامنے کر دیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے' جھگے کا گریبان پھٹ گیا تھا اور سینہ عریاں ہو کر جگہ جگہ سے جھلک رہا تھا۔ بختاور کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا۔

پیر بخش غضب ناک ہو کر چیخا۔ "اوئے سور دے پتر! تیری اب اتنی ہمت ہو گئی؟"

"چاچا! گرمی نہ دکھا۔ یہ بتا اس کے ساتھ مار پیٹ کیوں کی؟" لالی نے بختاور کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ تیری نوہ ہے' گھر والی تو نہیں۔"

پیر بخش نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "بکواس نہ کر۔ توں ہمارے معاملے میں بولنے والا کون ہوتا ہے؟"

بشیرا نے لالی کو سمجھایا۔ "یار! اس معاملے میں نہ پڑ۔"

پیر بخش کو بشیرا کی شہہ ملی تو اس نے لالی کو ڈانٹا۔ "یہ بتا' توں نے ہمارے معاملے میں کیوں ٹانگ اڑائی؟ توں ہوتا کون ہے؟" اس نے لالی کو گندی سی گالی دی جھنجلایا ہوا اس پر جھپٹا۔ اور اس کا گریبان پکڑنا چاہا۔

لالی کے ہاتھ سے پیالی اچھل کر دور گری اور ساری گرم گرم چائے لالی کے منہ پر آ گئی۔ لالی کے

آگ ہی تو لگ گئی۔ اس نے جھپٹ کر پیر بخش کی گردن دبوچی اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دیوار سے جا کر ٹکرایا۔

پیر بخش نے اٹھنے کی کوشش کی تو لالی نے ایک بار پھر اسے دھکا دیا۔ پیر بخش نے پھر اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ زور زور سے ہانپتا رہا اور خوں خوار نظروں سے لالی کو گھورتا رہا۔

لالی نے کپڑوں سے چائے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "تو نے مجھے بھی سکندر سمجھا تھا۔ کچھ اور گرمی رہ گئی ہو تو وہ بھی اتار دوں؟"

سکندر اور بختاور خاموش کھڑے رہے۔ بشیرے نے لالی سے کہا۔ "یار! جانے دے' بہت ہو گیا۔ بیکار کا ٹنٹا نہ کر۔" اس نے پیر بخش کو سمجھایا۔ "چاچا! اب تو بوڑھا ہو گیا۔ اتنا غصہ نہ کیا کر۔" وہ پیر بخش کے پاس گیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ گھڑی دیکھی' ایک بج رہا تھا۔ بشیرا پریشان ہو گیا۔ "ٹرک اب پہنچنے والا ہی ہو گا۔" وہ سکندر کی طرف متوجہ ہوا۔ "باہر جا کر سڑک پر دیکھ' ٹرک تو نہیں آ گیا۔"

بختاور بولی۔ "پہلے ایک بات کا فیصلہ ہو جائے۔ ہم دونوں یہاں نہیں رہیں گے۔ تم ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو۔"

سکندر نے اس کی تائید کی۔ "ہاں جی! آج فیصلہ ہو جانا چاہیے۔"

"مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا؟ میں نے اسی دن کے لیے تجھے پال پوس کر جوان کیا تھا؟" یہ کہتے کہتے پیر بخش افسردہ ہو گیا۔

بشیرے نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "چاچا! پریشان نہ ہو۔ کوئی نہیں جا رہا۔"

سکندر نے کہا۔ "نہیں بشیرے بھائی! اب ہم دونوں کا گزارہ یہاں نہیں ہو سکتا۔"

"اتنی بگاڑ ٹھیک نہیں۔ چل' میرے کہنے سے اسے ایک موقع اور دے دے۔ یہ اب کے لڑائی جھگڑا کرے تو مجھے بتانا۔ میں مہینے بھر بعد آؤں گا' تم دونوں کو اپنے ساتھ کراچی لے جاؤں گا۔ میرا وعدہ رہا۔" بشیرے نے پیر بخش کو مخاطب کیا۔

"چاچا! اب تو بھی غصہ کرنا چھوڑ دے۔"

سکندر بولا۔ "بات صرف غصے کی نہیں۔ یہ اور ہی بات ہے۔ اب میں تمہیں کس طرح بتاؤں۔"

بشیرا ہنس کر بولا۔ "مجھے سب پتہ ہے' مجھے نہ بتا۔ میں جانتا تھا ایک دن یہی ہو گا۔ اب تو جا کر ٹرک دیکھ۔"

سکندر چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔ بختاور بھی اس کے ساتھ ساتھ گئی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پیر بخش مجرموں کی طرح سر جھکائے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ سکندر کئی منٹ تک واپس نہیں آیا۔ بشیرا بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اب سوا بج رہا تھا۔ آخر بشیرا خود باہر نکلا۔ لالی اور پیر بخش بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ تینوں درختوں کے نیچے جاکر ٹھہر گئے۔

سڑک بالکل ویران تھی۔ ٹرک کا دور دور نشان نہ تھا۔ سکندر سڑک پر انتظار کرتے کرتے واپس آگیا تھا۔ کچھ اور وقت گزر گیا۔ اب ڈیڑھ بج رہا تھا۔

پیر بخش نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میاں حیات کے کرندے آتے ہی ہوں گے۔"

بشیرا اور پریشان ہوگیا۔ اسی اثناء میں دور سے تیز روشنی ابھری اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ بشیرے نے اس دفعہ پیر بخش کو سڑک پر بھیجا۔ اس کے دل میں دھڑکا تھا کہ اگر یہ میاں حیات محمد کی کار ہوئی تو کیا ہوگا؟

لالی بھی کم پریشان نہ تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ حیات محمد ونو بھی آگیا تو دیکھتے ہی اس پر گولی چلا دے گا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پیر بخش نے آکر خوش خبری سنائی کہ ٹرک آگیا۔

بشیرا نے جلدی جلدی کوٹھری سے دونوں بکسے نکلوائے اور انھیں ٹرک میں بھرے ہوئے سامان کے نیچے رکھوا دیا۔

ٹرک میں فرنیچر کے علاوہ گھر گرہستی کا دوسرا سامان بھی تھا۔ ٹرنک اور صندوق بھی تھے۔ بشیرا کے بکسے بھی ان کے ساتھ انسپکٹر کے سامان کا حصہ بن گئے۔

بکسے رکھوانے کے بعد بشیرا اور لالی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اسی وقت سامنے سے تیز روشنی ابھری۔

بشیرے نے ڈرائیور کو ٹرک اسٹارٹ کرنے کی ہدایت کی۔ ٹرک اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھا تو سامنے سے آنے والی گاڑی کی بتیاں بجھ گئیں۔ ٹرک رفتہ رفتہ آگے بڑھتا گیا۔ لالی دم بخود بیٹھا تھا۔

ٹرک قریب پہنچا تو ایک بار پھر بتیاں روشن ہوگئیں۔ لالی نے دھڑکتے دل سے دیکھا کہ سڑک کے کنارے کار کھڑی ہے۔ اس نے پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا کہ وہ میاں حیات محمد کی بیوک ہے۔ مگر نہ کوئی کار سے اترا نہ کسی نے ٹرک روکنے کی کوشش کی۔ ٹرک گرد کے بادل اڑاتا تیزی سے کار کے برابر سے گزر گیا۔

ڈرائیور نے رفتار تیز کردی۔ ہوا کے تیز جھونکے اندر آنے لگے۔ لالی پہلے ہی تھکن سے

نڈھال تھا، جھونکے لگے تو اس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں۔ وہ ذرا دیر جھومتا رہا پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سوگیا۔ ٹرک تیزی سے دوڑتا رہا۔ خنک جھونکے اندر آتے رہے۔

لالی بے خبر سوتا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو اس نے گھبرا کر دیکھا کہ ٹرک سڑک کے کنارے کھڑا ہے۔ ٹرک سے تھوڑے فاصلے پر بشیرا دو کانسٹیبلوں سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہا ہے۔ لالی سخت پریشان ہوا۔

فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ کانسٹیبل دروازے کے عین سامنے تھے۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد اس نے دیکھا، کانسٹیبل سائیکلوں پر سوار ہوکر آگے بڑھ گئے۔

بشیرا ٹرک کی جانب واپس آیا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچا، مگر اندر نہیں آیا۔ اس نے لالی کو بیدار پایا تو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لالی نیچے اتر کر اس کے پاس گیا۔ بشیرے نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اسے اپنے ساتھ ٹرک سے ذرا دور لے گیا۔ اس نے رازدارانہ انداز میں آہستہ سے پوچھا۔

"یار! تیرا نام لالی ہے؟ تو جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے؟"

"کیا یہ بات تجھے کانسٹیبلوں نے بتائی ہے؟"

"ہاں، انھوں نے ٹرک رکوایا اور ٹارچ کی روشنی ڈال کر اندر جھانکنے لگے۔ میں جھٹ نیچے اترا۔ انھیں بتایا کہ ٹرک میں انسپکٹر شاہنواز کے گھر کا سامان بھرا ہے۔ ان کا کراچی تبادلہ ہوگیا ہے۔ سامان وہیں جا رہا ہے۔ یہ سن کر کانسٹیبلوں نے سامان کی تلاشی نہ لی۔ مگر تیرے بارے میں انھیں شبہ تھا کہ تو مفرور قیدی لالی ہے۔" وہ آہستہ سے مسکرایا۔ "پر میں نے تجھے انسپکٹر شاہنواز کا ملازم بتا کر ان کا شبہ دور کردیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "دونوں چلے گئے، لیکن ایسا لگتا ہے انھوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ سچ بتا، اصل بات کیا ہے؟"

لالی انکار نہ کرسکا۔ "اب تجھ سے کیا چھپانا، بات کچھ ایسی ہی ہے۔"

"یار! یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ بتائی؟"

"اب تو میں نے سب کچھ بتا دیا۔"

بشیرے نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے، آگے بھی پولیس والے ملیں گے اور اس دفعہ تجھ سے پوچھ گچھ بھی کریں گے۔ کانسٹیبلوں کی زبانی مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ پولیس نے ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے جگہ جگہ راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

بشیرے نے جواب دیا۔ "یہ پاک پتن روڈ ہے۔ آگے منٹگمری ہے۔" اس نے سامنے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ دور درختوں کے پیچھے شہر کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

"مجھے یہیں چھوڑ دے۔"

"مگر جائے گا کہاں؟"

"میری فکر نہ کر۔" لالی نے اعتماد سے کہا۔ "میں کچے رستے سے کسی طرف نکل جاؤں گا؟"

"جیسی تیری مرضی۔ سوچ لے۔"

"سوچنا کیا ہے۔ اب تم اپنے رستے جاؤ۔ میں اپنے رستے چلا۔"

دونوں سڑک کے کنارے کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ دور سے تیز روشنی ابھری۔ لالی روشنی دیکھتے ہی ٹرک کی جانب جھپٹا۔ اس نے اگلی سیٹ سے اپنی گٹھری اٹھائی اور تیز تیز قدموں چلتا ہوا قریب کے کھیتوں میں گھس گیا۔

بشیرا ٹرک پر جا کر بیٹھ گیا۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور آگے بڑھ گیا۔

راستہ ایک ٹیلے کے پاس جا کر ختم ہو گیا تھا۔ اب لالی کے سامنے ٹیلے کی صورت میں اونچا اور ابھرا ہوا ناہموار میدان تھا۔ لالی آہستہ آہستہ ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچا، میدان عبور کیا، نیچے آیا تو پختہ سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی اور بالکل ویران تھی۔ سڑک کے دونوں جانب کہیں کہیں گھنے درخت تھے۔ درختوں کے پیچھے نشیب میں جھنگر تھا۔ جھنگر جنگلی پودوں اور جھاڑیوں سے بھرا تھا۔

لالی سڑک پر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے مشکل سے چند فرلانگ راستہ طے کیا تھا کہ کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک کار نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ ٹھٹکا۔ کار کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا، جب اس نے واپسی کا ارادہ کیا۔ مگر وہ لوٹ کر جاتا بھی کہاں؟ لگ بھگ دو منٹ تک وہ گم صم کھڑا رہا۔ کار کوئی سو گز کے فاصلے پر بالکل اس کے سامنے تھی۔ مگر اس جگہ گہری خاموشی چھائی تھی۔

سڑک کے نشیب میں بکھری ہوئی جنگلی جھاڑیاں، تاروں کی مدھم روشنی میں سایوں کے مانند دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ لالی نے ہمت سے کام لیا اور کار کی سمت بڑھنے لگا۔ کار جس قدر قریب آتی گئی، اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ لالی چاہتا تھا کہ کار کے سامنے رکے بغیر تیزی سے آگے نکل جائے۔ وہ رفتہ رفتہ کار سے نزدیک ہوتا گیا۔ جب کار کا فاصلہ چند قدم رہ گیا تو کار کے اندر سے آواز آئی۔ "ہے، ٹھہر جاؤ۔" ساتھ ہی ایک شخص دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ لالی اسے دیکھ کر بھی نہیں رکا۔ اس نے چاہا کہ لپک کر نشیب میں اتر جائے اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپتا

چھپا تا کسی طرف نکل جائے' لیکن اس نے رفتار تیز ہی کی تھی کہ وہ شخص جھپاک سے عین اس کے سامنے آگیا۔

"بات تو سنو۔"

لالی نے بے رخی سے کہا۔ "کیہ گل ہے جی؟"

اس نے گردن موڑ کر اس شخص کو غور سے دیکھا اور ایک ہی نظر میں اندازہ لگالیا کہ وہ اسے آسانی سے زیر کر سکتا ہے۔ اس کا قد لالی کے برابر تھا۔ چھریرا جسم' اجلی سفید قمیص اور پتلون' آنکھوں پر چشمہ' سر پر گھنے بال' داڑھی مونچھ صاف' صورت شکل اور وضع قطع سے وہ کھاتا پیتا معقول آدمی لگتا تھا۔

اس نے لالی کو اپنی جانب گھورتے دیکھا تو مسکرا کر مخاطب ہوا۔ "یار' اس قدر ناراض کیوں ہو رہے ہو؟"

لالی پھر بھی نہ پگھلا' اکھڑپن سے گویا ہوا۔ "کہو' کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ شخص اور کھل کر مسکرایا۔ بے تکلفی سے بولا۔ "کیا بیوی سے جھگڑا کر کے آئے ہو؟ بات کیا ہے؟"

لالی نے اس دفعہ بھی بے رخی کا مظاہرہ کیا۔ "خاماخا کی باتیں نہ کرو۔ مطلب بتاؤ' فٹافٹ۔ کیا چاہتے ہو تم؟"

"چاہنا واہنا کیا ہے۔ یار! تھوڑی سی تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "ذرا گاڑی کو دھکا لگا دو۔" اس نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا۔ "لو' یہ رکھ لو۔"

لالی نے صاف انکار کردیا۔ "نہیں جی! میں دھکا شکا نہیں لگاؤں گا۔ مجھے جلدی ہے۔"

اس شخص نے جیب سے ایک نوٹ اور نکالا۔ "لو' اب تو مان جاؤ۔"

"سو روپے دو گے' تب بھی تمہاری گڈی کو دھکا نہیں لگاؤں گا۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "صاف بات یہ ہے جی! میں اس وکھت رک نہیں سکتا۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

اس شخص نے ہاتھ بڑھا کر لالی کا بازو تھام لیا۔ "یار ایسی بھی کیا بے مروتی۔ آدمی سے آدمی کا کام پڑتا ہے۔"

لالی نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑایا اور غصے سے تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "پرے ہٹ کے بات کر۔" اس نے آنکھیں نکال کے اسے گھورا۔ "کہہ دیا' میں نہیں رک سکتا۔ ایویں گلے پڑا جارہا ہے۔"

وہ شخص ڈھیٹ بن کر بولا۔ "یار! گالیاں دے لو۔ مگر گاڑی کو دھکا لگا دو۔"

لالی کا سارا طنطنہ جاتا رہا۔ اس نے چاہا بھی کہ غصہ آجائے اور اس شخص سے پیچھا چھوٹ جائے۔ لیکن اس نے تو غصے کا کوئی جواز ہی نہیں چھوڑا تھا۔ لالی چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر کسی قدر نرم لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔

"دیکھو جی! ناراضگی شراضگی کی گل نہیں۔ میں تمہاری مدد ضرور کرتا۔ پر مجھے بہت جلدی ہے۔"

"کہاں جانا ہے تمہیں؟"

"میں نے جی سٹیشن جانا ہے۔ لہور کی گڈی پکڑنی ہے۔"

"اسٹیشن یہاں سے خاصی دور ہے۔ تم پیدل تو صبح تک نہیں پہنچ سکتے۔" وہ شخص سوچنے لگا۔ "چار بجنے والے ہیں۔ ٹرین سوا چار بجے اسٹیشن پہنچے گی۔ ایکسپریس ہے۔ مشکل سے چند منٹ ٹھیرتی ہے۔ تم اسے کیسے پکڑ سکتے ہو؟"

لالی اڑا رہا۔ "نہیں جی! میں سیدھا سٹیشن جاؤں گا۔ اگر پہلی چھوٹ گئی تو دوسری سے چلا جاؤں گا۔"

"دوسری گاڑی دوپہر کو جاتی ہے۔ میں تمہیں اپنی کار سے اسٹیشن پہنچا دوں گا۔" اس نے نرم اور شگفتہ لہجے میں کہا۔ "اس وقت رات کو کہاں بھٹکتے پھرو گے اور ادھر سے تو کوئی راستہ اسٹیشن جاتا بھی نہیں۔ تمہیں ملتان روڈ جانا ہوگا۔"

لالی مخمصے میں پڑگیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا' پھر اس نے دریافت کیا۔ "تمہیں کتنی دور جانا ہے؟"

"پانچ میل سمجھ لو۔"

"پنج میل؟" لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "اتنی دور تک تو میں دھکا نہیں لگا سکتا۔ دھکا لگاتے لگاتے اپنا بلیتھن نکل جائے گا۔"

"تم اکیلے نہیں ہو' میں بھی تمہارے ساتھ دھکا لگاؤں گا۔"

لالی نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ کار کے قریب گیا' اس کا بونٹ چھو کر دیکھا اور اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ سٹارٹ بھی نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں یار! یہ اسٹارٹ نہیں ہو سکتی؟" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔" اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ وہ چند لمحے خاموشی سے سر کے بال کریدتا رہا۔ پھر بڑبڑانے کے انداز میں آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "سخت حماقت ہوگئی۔ آج ایک جگہ کھانے پر گیا تھا' پھنس گیا

وہاں۔ رات زیادہ ہوگئی۔ ڈرائیور کو پہلے ہی چھٹی دے دی تھی۔ اس کی بیوی بیمار ہے۔ حرام زادے نے یہ بھی نہیں بتایا کہ گاڑی میں پیٹرول کم ہے۔ ورنہ راستے میں کسی پیٹرول پمپ سے ڈلوا لیتا۔ بس ہوگئی حماقت۔ اب اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔

"یار! میل بھر تو میں نے دھکا لگایا' پھر اپنی ہمت نے جواب دے دیا۔"

لالی بے تکلفی سے بولا۔ "بے کار اس چکر میں پڑے۔ مزے سے گڈی کے اندر سوتے۔ سویرے کوئی نہ کوئی دھکا لگانے والا مل جاتا۔"

"سویرے تو دھکا لگانے والے بہت مل جائیں گے۔ دوسری گاڑی بھی آسکتی ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مجھے صبح چھے بجے کمشنر صاحب کو چھوڑنے اسٹیشن جانا ہے۔ وہ ملتان جارہے ہیں۔ انھیں کچھ ضروری فائلیں دینی ہیں جو میری گاڑی میں پڑی ہیں۔ ورنہ گاڑی چھوڑ کر پیدل ہی چلا جاتا۔"

لالی کسی قدر مرعوب ہوگیا' پوچھنے لگا۔ "جی! آپ ادھر کوئی افسر لگے ہوئے ہیں؟"

"یہ نہ پوچھو۔" وہ ایک بار پھر ہنسا۔ "تم سے پہلے بھی ایک راہ گیر ملا تھا۔ میں نے اس پر رعب جمانا چاہا۔ اسے بتایا کہ میں کون ہوں۔ میری بات سنتے ہی وہ بگٹٹ بھاگا اور سڑک سے نشیب میں اتر کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ یہ بھی سراغ نہ ملا' کہاں گیا' کدھر گیا؟" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مشکل یہ ہے کہ اس سڑک پر نہ کوئی لاری چلتی ہے نہ ادھر سے ٹرک گزرتے ہیں۔ یہ سڑک سیدھی میری کوٹھی تک جاتی ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں جی! پیدل ہی چلے جاتے تو ٹھیک تھا۔"

"بھئی مجھے تمھارے مشورے کی ضرورت نہیں۔" اس دفعہ وہ بھنا گیا۔ "لگا سکتے ہو تو گاڑی کو دھکا لگا دو۔ مجھے ہر حال میں صبح چھے بجے سے پہلے پہلے کوٹھی پہنچنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور دوسرے سے کار آگے دھکیلنے لگا۔

لالی چند لمحے خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر وہ بھی اس کے ساتھ کار کو دھکا لگانے لگا۔ چھوٹی مورس کار تھی' نئی تھی اور ہلکی پھلکی بھی تھی۔ سڑک صاف ستھری تھی اور آگے ڈھلان بھی تھی۔ لالی کو زیادہ زور نہیں لگانا پڑا۔ کچھ دور تک دونوں دھکا دے کر کار آگے بڑھاتے رہے۔ لالی نے چلتے چلتے پوچھا۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا جی! آپ یہاں کیا لگے ہوئے ہیں؟"

اس نے لالی کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے کہا۔ "یار! میں اس ضلعے کا ڈپٹی کمشنر ہمدانی ہوں۔" لالی کے کان کھڑے ہوئے' اس کے قدم رک گئے۔ ہمدانی بھی رک گیا۔ اس نے مڑ کر لالی پر

نظر ڈالی۔ "تم گھبرا کیوں گئے؟" وہ آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے زیر لب مسکرایا۔ "قتل کر کے بھی ے ہو تو پروا نہ کرو۔ تمھارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ڈرو نہیں۔ لگاؤ دھکا۔"

لالی نے دھکا نہیں لگایا' آہستہ سے بولا۔ "قتل شتل تو میں نے نہیں کیا۔ بات کچھ اور ہے۔"

"چوری کی ہے؟ ڈاکہ ڈالا ہے؟ عورت ووِرت بھگائی ہے؟" ہمدانی کھل کر مسکرانے لگا۔ صاف صاف بتاؤ' بات کیا ہے؟"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "صاف بات یہ ہے جی! میں جیل سے بھاگا ہوا قیدی لالی ہوں۔ یری گرفتاری پر دو ہزار انعام بھی رکھا گیا ہے۔"

ہمدانی اسی بے نیازی سے بولا۔ "یار! جیل سے تو قیدی بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ تم نے ایسا کون سا گین جرم کیا ہے۔" وہ خاموش ہوگیا اور چند لمحے سوچتا رہا۔ "یاد آیا۔ تمھارے معاملے میں وہ پنے وزیر زراعت کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اسی لیے تمھاری گرفتاری پر انعام وِنعام بھی رکھا گیا ہے۔ پولیس بھی بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم اس وقت یرے ساتھ ہو۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "یار تم بالکل پریشان نہ ہو۔ تمھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ پٹی کمشنر اپنے ضلعے کا بادشاہ ہوتا ہے۔"

"یہ تو مجھے پتہ چل گیا جی کہ آپ وڈے افسر ہو۔" لالی نے قدرے تامل کیا۔ "میاں حیات محمد نے بھی ایسا ہی وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی بہت وڈے زمیں دار ہیں' پر انھوں نے تو جی ایسے چکر میں ڈال یا تھا میں آپ کو کیا بتاؤں۔"

"حیات محمد تو نہایت واہیات آدمی ہے۔ بیگم اس کی البتہ بڑی آب و تاب کی عورت ہے۔" وہ مسکرانے لگا۔ "ہیرے کی طرح جگمگاتی ہے۔ تم نے اسے دیکھا ہوگا؟"

"کیا بات ہے جی ان کی۔" میاں حیات محمد وٹو کی بیوی ناصرہ کے ذکر پر لالی نے بھی لذت محسوس لی' چہک کر بولا۔ "میں نے تو جی انھیں ننگا بھی دیکھا ہے۔"

"نہیں یار!" ہمدانی حیرت سے اچھل پڑا۔ "تو تو بڑا چھپا رستم نکلا۔ وہ تو بہت اونچی چیز ہے۔ کہاں ٹکر گئی تجھ سے؟" اس نے توقف کیا۔ "یار! سچ سچ بتا؟"

"سچ ہی کہہ رہا ہوں!" لالی نے سینہ پھلا کر فخر سے کہا۔ "پچھلے سوموار ہی کی تو بات ہے۔ ہوا یہ ا۔ میاں حیات محمد نے غصے میں اس کی ساڑی نوچ کر پھینک دی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا بوچ لیا۔ وہ اپنی ننگی ننگی ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ میں صوفے کے نیچے زمین پر پڑا تھا' بالکل اس کے سامنے۔" لالی نے گہری سانس بھری۔ "میاں حیات تو اسے جان سے مار دیتا پر میں بیچ میں آگیا۔

اس نے مجھ پر بھی ہاتھ چلایا۔ بس جی! فیر تو میں نے بھی گتّے میں آنا ہی تھا۔ جھٹ میں نے اس کا گا پکڑ لیا۔ اس نے بہت زور مارا، پر جی اپنے ہاتھ بھی لوہے کے ہیں۔ میں نے دیوار سے اٹھا کر ٹھا ٹھک جو اس کا سر ٹکرایا، تو وہیں ڈھیر ہو گیا۔"

"لگتے تو تم جان دار ہو۔" ہمدانی نے لالی کا ایک بازو انگلیوں سے ٹٹولا۔ "یہ تو بتاؤ، اب میاں حیات محمد کی بیگم کہاں ہے؟ بعد میں اس پر کیا گزری؟"

لالی نے اسی جوش و خروش سے بتایا۔ "میں اسے صاف نکال لایا۔ وہ اپنی بھین کے پاس لال ٹبے کی طرف گئی ہے۔ خود ہی گڈّی چلا رہی تھی۔"

"یار! تم تو بڑے کام کے آدمی لگتے ہو۔"

"آپ نے جی مجھ سے جو وعدہ کیا ہے، مرد کا وعدہ ہے؟"

"بالکل مرد کا وعدہ۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔" ہمدانی نے ہاتھ بڑھا کر گرم جوشی سے لالی کا ہاتھ دبایا۔ "اور یہ بھی وعدہ رہا کہ میں خود تمہیں چھوڑنے جاؤں گا۔ مگر آج دوپہر کو نہیں، کل صبح پانچ بجے والی ٹرین پر۔ چلو، اب لگاؤ دھکا۔"

"پر میں نے تو قادر آباد سٹیشن جانا ہے۔"

"قادر آباد؟" ہمدانی نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ تو یہاں سے دور ہے۔ تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو؟ قادر آباد تو لاہور جاتے ہوئے راستے ہی میں پڑے گا۔"

"اب تو جی میں اپنے بارے میں آپ کو صاف صاف بتا ہی چکا ہوں۔" لالی نے ہچکچاتے ہوئے ہمدانی کو بتایا۔ "اب آپ سے کیا چھپانا۔ وہاں میرا ساتھی رحیم داد انتظار کر رہا ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔"

"چلو، تمہیں قادر آباد ہی پہنچا دوں گا۔ اب تو خوش ہو؟"

لالی واقعی خوش ہو گیا۔ چہک کر بولا۔ "یہ بات ہے جی تو آپ اندر بیٹھ جائیں۔ میں اکیلا ہی دھکا لگاؤں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ پنج ہی میل کا تو رستہ ہے۔"

"تم اپنی گٹھری تو اندر رکھ دو۔" ہمدانی نے مسکرا کر لالی کے کندھے سے گٹھری اتار کے کار کی پچھلی نشست پر ڈال دی اور خود اگلی نشست پر اسٹیرنگ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ لالی اکیلا کار کو دھکا لگانے میں جٹ گیا۔ وہ بہت جوش میں تھا۔

لالی کار کو دھکا دیتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ تین میل تک کار دھکیلتا ہوا لے گیا۔ پھر بری طرح ہانپنے لگا۔ ہمدانی نے کار ٹھہرا کے لالی کو ذرا دیر سستانے کا موقع دیا۔ لالی کار کا سہارا لیے لمبی

لمبی سانسیں بھر رہا تھا۔

ہمدانی خاموش بیٹھا رہا، پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ "یار! تو ٹھیک ہی کہتا تھا۔ گاڑی یہیں چھوڑتے ہیں۔ دونوں پیدل چلتے ہیں۔ لیکن تم فائلوں اور سرکاری کاغذات سے بھرا ہوا ٹرنک لاد کر چل سکو گے؟"

لالی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اب تو تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا ہے۔ آپ کو جی کار ہی میں بٹھا کر کوٹھی تک لے جاؤں گا۔"

ہمدانی نے کچھ نہیں کہا۔

مشرقی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھوٹنے لگا تھا۔ ستاروں کی چمک دمک ماند پڑتی جا رہی تھی۔ لالی نے تازہ دم ہو کر پھر دھکا لگانا شروع کر دیا۔ دوسرے ہلے میں وہ ستائے بغیر کار ہمدانی کی کوٹھی تک لے گیا۔ کوٹھی دور سے نظر آنے لگی تھی۔ قریب پہنچ کر لالی نے صبح کی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں دیکھا۔ کوٹھی کی بلندی پر قومی پرچم لگا تھا۔ پھاٹک پر مسلح پولیس کا پہرا تھا۔ کار پر نظر پڑتے ہی دو پہرے دار بھاگتے ہوئے آئے۔ ہمدانی کار سے باہر آ گیا۔ پہرے داروں نے اٹینشن ہو کر اسے کھٹاک کھٹاک سلیوٹ کیا۔

سلیوٹ کے ساتھ ہی وہ ہمدانی سے ایک دم ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ گردن اکڑ گئی، چہرے پر خشونت آ گئی۔ اس نے پہرے داروں کو بڑی رعونت سے مخاطب کیا۔ "گاڑی کی ڈکی کھولو۔" اس نے کار کی کنجی ایک پہرے دار کی جانب اچھال دی۔ پہرے دار نے کنجی سنبھالی اور ڈکی کھولنے لگا۔

ذرا سی تاخیر ہوئی تو ڈپٹی کمشنر زور سے چیخا۔ "کیا کرتا ہے؟ ڈکی تک نہیں کھلتی۔" پہرے دار کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ بار بار کنجی گھماتا رہا مگر ڈکی نہ کھلی۔ ڈپٹی کمشنر نے دوسرے پہرے دار کو ڈانٹا۔ "تم کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟ جاؤ، اس کی مدد کرو۔" دوسرا پہرے دار بھی لپک کر ڈکی کے پاس پہنچ گیا۔

دونوں نے ڈکی کھولی۔ اندر ایک سیاہ ٹرنک رکھا تھا۔ خاصا وزنی بھی تھا۔ دونوں پہرے داروں نے مل کر اسے نکالا۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا۔ "میرے کمرے میں پہنچا دو۔" وہ آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ "گاڑی گیرج میں کھڑی کر دو۔ ڈرائیور آئے تو اس حرام زادے کو فوراً میرے سامنے پیش کرو۔" ساتھ ہی اس نے انگلی سے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

لالی گردن جھکا کر سکڑا سکڑایا ڈپٹی کمشنر کے پیچھے چلنے لگا۔

اب ڈپٹی کمشنر کی چال میں تمکنت آگئی تھی۔ وہ پختہ سڑک پر جوتوں سے آہٹ پیدا کرتا پھاٹک کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو ایک بار پھر پولیس کے مسلح پہرے داروں نے کھٹاک سے اسے سلیوٹ کیا۔ اس نے گردن کو خفیف سی جنبش دی اور بے نیازی سے آگے بڑھتا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔

ایک اردلی سر پر پگڑی جماتا' وردی کے بٹن لگاتا' کمر پر سنہرا پٹکا درست کرتا کوٹھی کے عقب سے نکلا' برساتی میں پہنچا اور کوٹھی کے اندر جانے کا دروازہ کھول کر ایک طرف ادب سے کھڑا ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے سر کی جنبش سے اسے قریب بلایا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔

ڈپٹی کمشنر نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر لالی کی جانب دیکھا اور نہایت بے نیازی سے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

لالی سٹ پٹا کے رہ گیا۔ وہ گھبرا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ڈپٹی کمشنر نے لالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اردلی سے کہا۔ "نذیر بیگ! اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کے ٹھہرنے کا بندوبست کردو۔ شام کو اس کی پیشی کرنا۔" یہ ہدایات دے کر ہدائی آگے بڑھ گیا۔

لالی چند ہی قدم گیا تھا کہ دہرے بدن کا ایک ادھیڑ آدمی سامنے باغ میں ایک درخت کے نیچے سے نکلا۔ وہ لمبا گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں چھڑی' چہرے پر رعب اور دبدبہ۔ یہ ڈویژنل کمشنر تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر ڈپٹی کمشنر کی جانب دیکھا۔ ڈپٹی کمشنر کی اس سے نظریں ملیں تو افسر سے جھٹ ماتحت بن گیا۔ اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی پڑ گئی' ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ چہرے پر خشونت کے بجائے شگفتگی پھیل گئی۔ وہ تیزی سے کمشنر کی جانب لپکا' قریب پہنچا اور اس کے روبرو ادب سے گردن جھکا کر گھگیانے لگا۔

لالی نے ہدائی کو اس طرح گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھا تو سخت حیرت ہوئی۔ مگر نذیر بیگ اردلی نے اسے وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنے دیا۔ وہ لالی کو اپنے ہم راہ لے گیا اور انیکسی کے ایک کمرے میں ٹھہرا دیا۔ کمرہ مختصر تھا مگر ہوا دار تھا۔ اس میں چارپائی تھی۔ اس پر بستر لگا تھا۔ کمرے کے قریب ہی غسل خانہ تھا۔ نذیر بیگ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ رہا غسل خانہ' تم ذرا نہا دھولو۔ بہت تھکے ہوئے نظر آ رہے ہو۔"

لالی کو سب سے زیادہ اپنی گٹھری کی فکر تھی۔ "میری گٹھری صاب کی گڈی میں پڑی ہے۔ وہ مجھے پہنچا دو۔"

نذیر بیگ مسکرا کر بولا۔ "پروا نہ کرو۔ تمہاری گٹھری آجائے گی' کہیں جائے گی نہیں۔" وہ

دروازے کی جانب بڑھا۔ "میں تھوڑی دیر بعد تمہارے لیے ناشتا بھجوا دوں گا۔ سونا نہیں۔" وہ کمرے سے چلا گیا۔

لالی ذرا دیر تک بستر پر خاموش بیٹھا رہا' پھر اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ نہا کر غسل خانے سے نکلا تو دن نکل آیا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ درختوں کی بلندیوں پر جھلملانے لگی تھی۔ اس نے کوٹھی کی طرف دیکھا۔ ایک گہری نیلی شیورلٹ پھاٹک کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس پر کمشنر کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ پچھلی نشست پر ہدائی بھی کمشنر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پھاٹک پر سنتری' بندوقیں سنبھالے ایک ہاتھ پیشانی پر رکھے چاق چوبند کھڑے تھے۔ کار پھاٹک سے گزر کے آگے بڑھی۔ لالی اسے دور تک دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں' غسل کرنے کے بعد نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ بستر پر لیٹ کر سونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ناشتا آگیا۔ لالی نے ناشتا کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ آنکھ ہی نہیں کھلی۔

دن ڈھلے نذیر بیگ نے اسے جگایا۔ وہ اس کی گٹھری بھی لایا تھا۔ لالی نے گٹھری کھول کر شیو کرنے کا سامان نکالا۔ غسل خانے میں گیا۔ داڑھی مونڈی۔ منہ ہاتھ دھوئے اور تازہ دم ہو کر باہر آگیا۔ نذیر بیگ کمرے میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے پیشی کے لیے لے گیا۔

☆

ڈپٹی کمشنر ٹینس کورٹ میں ٹینس کھیل رہا تھا۔ لالی درختوں کے نیچے خاموش بیٹھا کھیل دیکھنے میں محو تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے مقابل اس کی بیوی کھیل رہی تھی۔ وہ بھی ہدائی کی طرح سفید نیکر اور آدھی آستینوں کی اسپورٹنگ شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ شرٹ کے بٹن دور تک کھلے ہوئے تھے۔ اس کا گورا گورا سینہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ حسین اور طرح دار عورت تھی۔ چہرے پر دل کشی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور غزالی تھیں۔ بدن سڈول تھا۔ لالی کو بہت اچھی لگی۔ وہ اسے بھاگتے دوڑتے اور اچھل اچھل کر ریکٹ سے گیند اچھالتے دیکھتا رہا۔

کھیل ختم ہوا تو دونوں ٹینس کورٹ سے باہر آگئے۔ خدمت گاروں نے آگے بڑھ کر دونوں کے ہاتھوں سے ریکٹ لیے۔ اجلے اجلے تولیے پیش کیے۔ انہوں نے تولیے لے کر چہرے اور گردن سے پسینہ پونچھا۔ سفید وردی میں ملبوس ایک بیرے نے دو گلاسوں میں لیمو کا تازہ رس پیش کیا۔ دونوں نے گلاس خالی کیے' بیرے کو دیے۔ اسی اثنا میں ایک آیا' ڈپٹی کمشنر کے دو بچوں کو لے کر آگئی۔ دونوں لڑکے تھے۔ بڑے کی عمر پانچ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ چھوٹا اس سے دو ڈھائی برس کم عمر تھا۔

دونوں بچے تن درست اور خوب صورت تھے۔ نہا دھو کر' ترو تازہ ہو کر آئے تھے۔ ڈپٹی کمشنر نے گال تھپک کر بچوں کو پیار کیا۔ ماں نے جھک کر دونوں کے گلابی رخسار چومے۔ آیا بچوں کو لے کر ایک طرف چلی گئی۔

ڈپٹی کمشنر بیوی کے ہم راہ کوٹھی کی جانب چلا۔ اس نے لالی پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی مگر کوئی توجہ نہیں دی۔ بیوی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ لالی نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ نذیر بیگ نے آنکھ مار کر لالی کو ڈپٹی کمشنر کے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ لیکن لالی آگے نہیں بڑھا۔ نذیر بیگ نے ڈپٹی کمشنر کی نظر بچا کر دوسری بار ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لالی نے قدم اٹھائے اور سہما سہما ڈپٹی کمشنر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ دونوں کے چہرے سنہری دھوپ سے دمک رہے تھے۔ سفید لباس میں دونوں راج ہنس کے جوڑے کے مانند خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ ڈپٹی کمشنر بیوی کے ساتھ ہنستا مسکراتا کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ اس نے پلٹ کر لالی کی جانب دیکھا تک نہیں۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ لالی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔

نذیر بیگ نے لالی کو کوٹھی کے باہر ہی روک لیا۔ "صاحب تھوڑی دیر میں باہر نکلیں گے۔ تم ان کا یہیں انتظار کرو۔" یہ کہہ کر وہ بھی چلا گیا۔

لالی کوٹھی کے باہر پڑی ہوئی لوہے کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ سورج ڈوب گیا۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا کوٹھی میں جگہ جگہ بجلی کے بلب روشن ہو گئے۔ مگر سناٹا بہت گہرا تھا۔ اردلی اور خدمت گار ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ لیکن سب خاموش تھے۔ وہ صرف اشاروں میں باتیں کرتے یا اس قدر آہستہ بولتے گویا سرگوشی کر رہے ہوں۔ کچھ دیر بعد ڈپٹی کمشنر کوٹھی سے باہر آیا۔ بیوی اس وقت بھی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں نہا کر آئے تھے اور زیادہ شگفتہ' زیادہ ترو تازہ لگ رہے تھے۔ ان کے لباس بھی بدلے ہوئے تھے۔

ڈپٹی کمشنر کو دیکھتے ہی لالی جھٹ کھڑا ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس دفعہ بھی لالی پر کوئی توجہ نہ دی۔ بیوی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لالی پھر بنچ پر بیٹھ گیا۔ اب وہ بہت بیزار اور اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔

ذرا دیر بعد نذیر بیگ اردلی آیا اور اسے اپنے ہم راہ باغ میں لے گیا۔ ڈپٹی کمشنر' بیوی کے ساتھ لان میں بچھی ہوئی بید کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی لوہے کے

قد آدم کھمبوں پر بجلی کے دو دھیا بلب روشن تھے۔ ڈپٹی کمشنر کے سامنے میز پر ٹیلی فون تھا۔ اسی میز پر وسکی سے بھرا ہوا گلاس بھی رکھا تھا۔ ڈپٹی کمشنر گلاس اٹھا کر آہستہ آہستہ چسکی لگا رہا تھا۔ لالی اور نذیر بیگ ذرا ہٹ کر ایک طرف خاموش کھڑے ہو گئے۔

نذیر بیگ چلا گیا۔ لالی اکیلا رہ گیا۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑا انتظار کرتا رہا کہ کب ڈپٹی کمشنر اشارہ کرے اور وہ اس کے قریب جائے۔ جب کئی منٹ تک ڈپٹی کمشنر نے اس کی جانب توجہ نہیں دی تو لالی کا جی چاہا کہ خود ڈپٹی کمشنر کے سامنے پہنچ جائے۔ لالی ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

ڈپٹی کمشنر نے بیوی کو اشارہ کیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور آہستہ سے کہا۔ "ملا دو۔" چند لمحے وہ ریسیور کان سے لگائے خاموش بیٹھی رہی پھر اونچی آواز سے بولی۔ "ہیلو!" اس نے ٹیلی فون پر کچھ سنا' مسکرائی اور ریسیور ڈپٹی کمشنر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"یاد ہے' آج پولی لیسین کلب کی نائٹ آف دی گریٹ چنس ہے۔ مسٹر سلیمان اسی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔"

ڈپٹی کمشنر نے ریسیور سنبھالا۔ "ہیلو سلیمان! مجھے یاد ہے۔ یار! یہ بھی کوئی بھول جانے والی بات ہے۔ کمال کر دیا تم نے۔" وہ مسکراتا رہا اور ریسیور پر سلیمان کی باتیں سنتا رہا۔ اسی اثنا میں اس کا چھوٹا بچہ آ گیا۔ ماں نے اٹھ کر اسے گود میں اٹھا لیا' سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ ڈپٹی کمشنر نے مڑ کر بیوی کی جانب دیکھا مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بچے کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتی رہی اور اس کے رخسار چومتی ہوئی کوٹھی کی جانب چلی گئی۔ بچے کے ساتھ اس کی والہانہ محبت دیکھ کر لالی بھی بے اختیار مسکرا دیا۔

ڈپٹی کمشنر نے ٹیلی فون پر باتیں سنتے سنتے ایک دفعہ چونک کر حیرت سے کہا۔ "سمرا صاحب پر دل کا دورہ پڑا ہے؟ یار! اب کنڈکٹ کون کرے گا۔ ان کا سا امپائر کہاں ملے گا؟" بات کہتے کہتے وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "وہ بوڑھے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ رنڈوے بھی ہیں۔ وہ امپائرنگ کیا کرتے ہیں گویا عمر رفتہ کو آواز دیتے ہیں۔ قسم خدا کی ان پر جوانی آ جاتی ہے۔ کبھی کنڈکٹ کرتے وقت ان کا چہرہ دیکھا ہے۔ بھئی کیا باغ و بہار آدمی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں' کسی طرح انہیں اسپتال سے اٹھا لاؤ۔ ان کا دل بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔ چند لمحوں تک ہوں ہوں کرتا رہا اور ریسیور پر سلیمان کی بات سنتا رہا' پھر اس نے کہا۔ "امپائر کا بندوبست کرنا میرے لیے مشکل ہو گا۔ یار' ڈپٹی کمشنر ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میرے حکم پر ہر کام ہو جائے۔ کم از کم ہتا

بنایا امپائر تو میرے حکم پر فی الفور مہیا نہیں ہو سکتا۔ ویسے کسی کو بھی امپائر بنا دو' مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" وہ ریسیور کان سے لگائے چپ بیٹھا رہا' پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اچھا' میں ہی کچھ کرتا ہوں۔ پروگرام ڈسٹرب نہیں ہو سکتا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا اور سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اسی عالم میں اس نے گردن اٹھائی' لالی کو دیکھا۔ لالی بائیں طرف کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ڈپٹی کمشنر اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ زیر لب مسکرایا۔ اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ وہ قریب آگیا تو ڈپٹی کمشنر نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ہنس کر بولا۔

"ٹھیک ہے' امپائر بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

لالی نے سادگی سے پوچھا۔ "وہ کیا ہوتا ہے جی؟"

"پروا نہ کرو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ یہ بتاؤ' کچھ انگریزی ونگریزی بھی جانتے ہو؟"

لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "ساب! انگریزی تو میں بالکل نہیں جانتا۔ میرے پیو نے تو کبھی مجھے سکول بھیجا نہیں' پر جیل میں ضرور پڑھا ہے۔ بات یہ ہے جی۔"

ڈپٹی کمشنر نے اسے آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ بات کاٹ کر بولا۔ "اردو میں کم از کم نام تو پڑھ لو گے؟"

لالی نے مستعدی سے جواب دیا۔ "وہ تو جی میں صاف پڑھ لیتا ہوں۔ کبھی انگوٹھا نہیں لگایا۔ ہمیشہ دستخط کرتا ہوں۔"

"بس۔ بس۔" ڈپٹی کمشنر نے ہاتھ اٹھا کر بے زاری کا اظہار کیا۔ "اتنا کافی ہے۔ اب تم امپائر بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مگر دیکھو' تم کم سے کم بولنا بلکہ سرے سے بات ہی نہ کرنا تو اچھا ہے۔"

ڈپٹی کمشنر نے ریسیور اٹھایا۔

"مسٹر سلیمان سے ملا دو۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ لالی سر جھکائے کھڑا رہا۔ ڈپٹی کمشنر بے چینی سے اپنا ایک پیر ہلاتا رہا۔ ذرا دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ڈپٹی کمشنر نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "سلیمان! امپائر کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اپنے ساتھ ہی لیتا آؤں گا۔ یار فضول باتیں چھوڑو' کام کی بات سنو۔ اس دفعہ ٹوکن انگریزی کے بجائے اردو میں ہوں گے۔ تم ٹوکن تیار کراؤ۔ میں آٹھ بجے تک نوشابہ کے ساتھ پہنچ جاؤں گا۔"

اس نے بات ختم کی۔ ریسیور رکھا۔ لالی کو ذرا اور قریب بلایا۔ "پریشان ہونے کی کوئی بات

نہیں۔ تم خاصے تیز آدمی ہو۔ آسانی سے امپائر کا رول ادا کر لو گے۔ اس میں رازداری بنیادی شرط ہے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ویسے تو تم خود ہی ایسا راز ہو جسے چھپائے چھپائے پھرتے ہو۔ کسی سے کچھ کہو گے بھی تو وہ تمہیں لپاڑیا سمجھے گا۔"

"اگر لاٹری شاٹری کا معاملہ ہے تب تو جی آپ بالکل پروا نہ کریں۔ میں ڈیڑھ سال تک سرکس میں لاٹری کھلاتا رہا ہوں۔" لالی مسکرایا اور سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ "مگر جی وہ تو صاف چار سو بیسی تھی۔ ایسا تو کوئی چکر نہیں؟"

"ہش' ایسا کوئی چکر نہیں۔" ڈپٹی کمشنر نے تیوری پر بل ڈال کر اسے گھورا' چند لمحے خاموش رہ کر گویا ہوا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہے کہ تم جانتے ہو' لاٹری کس طرح کھیلی اور کھلائی جاتی ہے' مگر یہ ویسی لاٹری نہیں۔ یہ اور قسم کی لاٹری ہے۔ بلکہ اسے قرعہ اندازی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ لاٹری تو سیدھی سیدھی قماربازی ہوتی ہے۔"

اس نے قرعہ اندازی کا طریقہ اور اس کے قاعدے قوانین پوری تفصیل سے لالی کو سمجھائے۔ ہر بات کئی کئی بار بتائی تاکہ ذہن نشیں ہو جائے اور وہ امپائر کا کردار اچھی طرح ادا کر سکے۔ لالی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔ جو بات سمجھ میں نہ آتی' اس کے بارے میں سوال بھی کرتا جاتا۔ ڈپٹی کمشنر اسے سمجھاتا جاتا۔ جب لالی ہر تفصیل سمجھ گیا اور اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا تو ڈپٹی کمشنر نے سامنے کھڑے ہوئے اردلی کو اشارے سے قریب بلایا۔ اسے کاغذ پنسل لانے کا حکم دیا۔ ذرا دیر بعد وہ کاغذ پنسل لے کر واپس آیا اور ڈپٹی کمشنر کے سامنے میز پر رکھ کر الٹے قدموں چلا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے پنسل اٹھائی۔ مسکرا کر لالی سے کہا۔ "مسٹر امپائر! اب ذرا تمہارا امتحان بھی ہو جائے۔" اس نے کاغذ پر کچھ لکھا۔ اور لالی کی طرف بڑھا کر بولا۔

"اسے پڑھ کر سناؤ۔"

لالی نے جھٹ پڑھ دیا۔ "امینہ۔" اس نے لمحے بھر تامل کیا پھر ہچکچاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"یہ بھی وہاں ہوں گی جی؟"

ڈپٹی کمشنر ایک دم ہمدانی بن گیا' ہنس کر گویا ہوا۔ "ہائے' یہی تو شہر میں قاتل بچا ہے۔ تین راؤنڈ ہو چکے ہیں' مگر اب تک نہیں جاگا میری قسمت کا ستارہ!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری' لالی کی طرف ذرا سا جھکا۔ "یار! آج تو تمہاری چودھراہٹ ہے۔ تمہارے ہی ہاتھوں کچھ ایسا ہو جائے کہ میں دروازے پر دستک دے کر کہوں' کھل جا سم سم' اور کھٹ سے سم سم کھل جائے۔ کیا سمجھے؟"

اس نے بے تکلفی سے آنکھ ماری اور کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

لالی خاموش کھڑا رہا۔ ہمدانی بھی کچھ دیر خاموش رہ کر گویا ہوا۔ "اب تمہارا ایک عدد نام بھی ہو جائے یہ لالی والی نہیں چلے گا۔" اس نے لالی کو غور سے دیکھا۔ "تم اپنے ڈیل ڈول اور حلیے سے تو بالکل بکر قصاب لگتے ہو۔ تمہارا نام بھی کچھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔" وہ ذرا دیر سوچتا رہا پھر چٹکی بجا کر بولا۔ "مل گیا نام۔ سردار نور محمد خاں بزدار کیسا رہے گا؟" اس نے ذرا سا توقف کیا۔ "یہی ٹھیک رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی تم مظفر گڑھ کے رئیس اور زمیندار بھی بن گئے۔ تمہارا تعارف اسی طرح کرایا جائے گا۔ مگر اپنی چونچ بند رکھنا۔ نام یاد رکھنا' سردار نور محمد خاں بزدار۔ اب ذرا تم اپنا حلیہ ٹھیک کرلو۔ نہا کر کپڑے بدل لو۔"

"میرے پاس تو یہی کپڑے ہیں۔"

"کپڑوں کی تم فکر نہ کرو۔ میرے وارڈ روب میں بڑی گنجائش ہے۔"

لالی نے کسی قدر گھبرا کر کہا۔ "ساب! مجھے ٹائی شائی باندھنی نہیں آتی۔"

"کون کہہ رہا ہے' تم ٹائی باندھو۔ ٹائی باندھ کر اور سوٹ پہن کر تم نہایت عمدہ قسم کے ہیڈ ماسٹر لگو گے۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "پتلون اور بش شرٹ چلے گی۔"

دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ ہمدانی گلاس اٹھا کر وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی نوشابہ آگئی۔ مگر کچھ سوچ کر فوراً جانے کے لیے مڑی۔ ہمدانی نے اسے ٹوکا۔ "بات تو سنو جان من! جانان من!" اس نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے میرے وارڈ روب سے بش شرٹ اور پتلون نکال کر دے دو۔ یہ آج کی ٹینس نائٹ کا امپائر ہے۔ اس کا نام سردار نور محمد خاں بزدار ہے۔"

نوشابہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "اور سرا صاحب؟ کیا انہوں نے امپائر بننے سے انکار کر دیا؟"

"نہیں جان من! وہ سخت بیمار ہیں۔" ہمدانی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "تم بھی تیار ہو جاؤ۔ حشر مجسم' فتنہ بداماں۔"

نوشابہ نے ناز سے ہمدانی کو دیکھا۔ پلٹ کر لالی پر نظر ڈالی اور منہ بگاڑ کر بولی۔ "کیا یہ امپائر کے لیے مناسب رہے گا؟"

"بالکل رہے گا۔ اس سے زیادہ مناسب امپائر فی الحال دست یاب نہیں ہو سکتا۔"

وہ کسی قدر بے زاری سے بولی۔ "ہمدانی! کبھی کبھی تو تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔" اس نے ایک بار پھر لالی کی جانب دیکھا۔ "یہ تو جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے۔ تم نے اس کے بارے میں یہی تو بتایا تھا۔"

"بتایا تھا' بالکل بتایا تھا۔ بات بھی یہی ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" ہمدانی نے پھر قہقہہ لگایا۔ "جاناں! یہ صرف امپائر ہے' کھیل کا کھلاڑی نہیں ہے۔ اس دفعہ امپائر کے معاملے میں بھی رہے گا۔ ہو جائے یاروں کے ساتھ تھوڑی سی ایڈونچر۔ کیا خیال ہے؟"

"اور جو کسی نے اسے پہچان لیا تو؟"

اسی وقت اردلی طشتری میں وزیٹنگ کارڈ رکھے ہوئے آیا۔ اس نے طشتری ہمدانی کے سامنے بڑھا دی اور نظریں نیچی کرکے ادب سے کھڑا ہو گیا۔ ہمدانی نے کارڈ اٹھا کر دیکھا اور فوراً ہمدانی سے ہی مشتربن گیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا' ہونٹ سمٹ کر جڑ گئے۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر اردلی کو دیکھا اور خفا ہو کر بولا۔ "میں نے ہدایت کی تھی کہ آج کسی کو ملاقات کا وقت نہ دیا جائے۔ پھر یہ کارڈ کیوں آیا؟"

اردلی نے اٹکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "سرکار! بات یہ ہے...."

ہمدانی نے اسے آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "مجھے معلوم ہے کیا بات ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "جاؤ' جا کر خان بہادر کو بھیج دو' اب اور کوئی ملاقاتی نہیں آئے گا۔ سمجھ گئے۔"

اردلی الٹے قدموں واپس ہوا۔ نوشابہ بھی کوٹھی کی جانب چلی۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا کوٹھی کے اندر چلا گیا اور نوشابہ کے ہم راہ ڈپٹی کمشنر کے ڈریسنگ روم میں پہنچ گیا۔ نوشابہ نے وارڈ روب کھولا۔ لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا' وارڈ روب قسم قسم کے کپڑوں سے بھرا ہے۔ بڑی تعداد سوٹوں کی تھی۔

نوشابہ نے لالی کے ڈیل ڈول کی مناسبت سے کئی کپڑے نکال کر دیکھے' پھر ایک پتلون اور بش شرٹ لالی کو دے دی۔ دونوں کپڑے' نہایت نفیس سلے ہوئے تھے۔ ان پر عمدہ استری بھی کی گئی تھی۔ نوشابہ نے ایک جوڑی جوتے کی بھی لالی کو دی۔ لالی نے کپڑے اور جوتے سنبھال کر حیرت سے پوچھا۔

"یہ واپس تو نہیں کرنے ہوں گے؟"

نوشابہ نے غصے سے اسے ڈانٹا۔ "احمقانہ باتیں نہ کرو۔ تمہیں آج رات امپائر کا رول ادا کرنا ہے۔"

"وہ تو جی میں بالکل ادا کرلوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ساب نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔"

"یہ بھی بتا دیا کہ اس کھیل میں رازداری نہایت ضروری ہے؟"

"کیوں نہیں بتایا جی! سارا کھیل تو رازداری ہی کا ہے اور رازداری بھی ایسی ہونی چاہیے کہ ساری زندگی کسی کو پتہ نہ چلے۔ بات تو تب ہوگی۔"

اس دفعہ نوشابہ نے مسکرا کر لالی کو دیکھا۔ "تم تو کچھ کچھ سمجھ دار بھی معلوم ہوتے ہو۔"

"سمجھ داری کی بات تو یہ ہے جی کہ سب قسمت کا کھیل ہے۔"

"کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ تم کم بولا کرو۔ کم سے کم اسپائر بننے کے بعد تم اپنا منہ بالکل بند رکھنا۔" اس نے بے رخی سے کہا۔ "اچھا' اب جاؤ اور تیار ہو کر برساتی میں پہنچو۔"

لالی نے ہینگر میں لٹکے ہوئے کپڑے اٹھائے۔ دوسرے ہاتھ میں جوتے سنبھالے۔ خاموشی سے چلتا ہوا انیکسی میں پہنچا۔ اپنے کمرے میں گیا اور فوراً نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ اس روز وہ بڑے اہتمام سے نہایا۔ ہمدانی کے دیے ہوئے کپڑے پہنے۔ کپڑے ذرا تنگ تھے مگر انہیں پہن کر وہ خوش تھا۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارے۔ مختلف زاویوں سے گھوم پھر کر اپنی سج دھج دیکھی۔

☆

پونے آٹھ بجے ڈپٹی کمشنر بیوی کے ہم راہ کوٹھی سے برآمد ہوا۔ نوشابہ ہلکے گلابی رنگ کا کرتا شلوار پہنے ہوئے تھی۔ میک اپ بھی اس نے بہت نفاست سے کیا تھا۔ چہرے کے نقش و نگار بلور کی طرح ترشے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں کوہستانی جھیلوں کی تابانی تھی۔ وہ ڈپٹی کمشنر کے بازو کا سہارا لیے نپے تلے قدموں سے چل رہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر بھی خوب بن سنور کر نکلا تھا۔ گہرے نیلے سوٹ میں وہ خاصا اسمارٹ اور وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس کے انداز میں تمکنت تھی' دبدبہ تھا۔

ڈرائیور نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ دونوں میاں بیوی خراماں خراماں کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ لالی نظریں جھکائے ایک طرف ادب سے کھڑا رہا۔ ڈپٹی کمشنر نے اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے لالی کو اگلی نشست پر اپنے برابر بٹھا لیا۔ کار روانہ ہوئی۔ پھاٹک پر مسلح پہرے داروں نے سلامی دی۔ لالی کی گردن بھی ذرا سی تن گئی۔

کار آگے بڑھی اور ملتان روڈ پر آ گئی۔ منٹگمری شہر سے گزری۔ عارف والا روڈ پر مڑی۔ کچھ دور جا کر نہر کا پل عبور کیا۔ نشیب میں اتری اور راجباہ بیروالا کے کنارے کنارے دوڑنے لگی۔ ہوا کے بھیگے بھیگے جھونکے کھلی کھڑکیوں سے کار میں آ رہے تھے۔ لالی خاموش بیٹھا قریب بہتی ہوئی نہر کا جھل مل کرتا پانی دیکھتا رہا۔

کار تیزی سے دوڑتی رہی۔ پھر وہ کنکر کی بنی ہوئی پتلی سڑک پر مڑ گئی۔ کار اب مہر سلیمان خاں کی جاگیر میں داخل ہو چکی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف آم اور مالٹے کے باغات تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ آم اور مالٹے کے درختوں کا سلسلہ حد نظر تک پھیلا تھا۔

سوا آٹھ بجے کار مہر سلیمان کے بنگلے پر پہنچی۔ بنگلہ کھیتوں اور باغوں سے الگ تھلگ اونچے ٹیلے پر بنا تھا۔ گردو نواح میں جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ خودرو پودے تھے۔ بنگلے میں بجلی بھی تھی اور اس کی روشنی رات کے اندھیرے میں دور سے نظر آتی تھی۔ نشیب میں ایک طرف رانی واہ بہتی تھی۔ یہ قدرتی نہر تھی۔ کسی زمانے میں اس جگہ برساتی نالا تھا جس میں صرف برسات کے موسم میں پانی ہوتا تھا۔

نہر کے آس پاس کی لگ بھگ چار ہزار ایکڑ زمین سلیمان کے سسر مرزا محمد خاں کی ملکیت تھی۔ اس کے انتقال کے بعد تمام زمین اور جائیداد سلیمان کی بیوی راحیلہ کو ترکے میں ملی۔ راحیلہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس وقت اس زمین کا بیشتر حصہ بنجر اور غیر مزروعہ تھا۔ یہ بنجر اور غیر مزروعہ زمین سلیمان کی تحویل میں آئی تو اس نے آم اور مالٹے کے باغات لگانے کا منصوبہ بنایا اور منصوبہ یہ دیکھ کر بنایا کہ برساتی نالا' راجباہ بیروالا کے بہت قریب سے بہتا تھا۔ اس نے اپنے مزارعوں اور کمیوں کو بیگار پر لگا کر برساتی نالے کی کھدائی کرائی اور اسے بیروالا کی بڑی نہر سے ملا دیا۔ اس طرح برساتی نالا' قدرتی نہر میں تبدیل ہو گیا۔ اب یہ نہر بنگلے کے عین نیچے بل کھاتی ہوئی بہتی تھی۔ اس کے قرب و جوار میں اعلیٰ قسم کے تخمی اور پیوندی آموں اور ریڈبلڈ مالٹوں کے باغات تھے اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت تھے۔ لیکن ابھی تک ہزار ڈیڑھ ہزار ایکڑ اراضی بنجر اور غیر مزروعہ تھی۔ اس میں جھاڑیوں سے بھرے ہوئے جھنگر اور چھتر تھے۔ انھی اجاڑ اور ویران جھنگروں اور چھتروں کے درمیان مہر سلیمان کا بنگلہ تھا۔

کار بنگلے کے پھاٹک سے گزر کر پورٹیکو میں جا کر ٹھہر گئی۔ سلیمان اور اس کی بیوی راحیلہ نے ہمدانی کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ سلیمان خوب لمبا تڑنگا تھا' سر پر گھونگر والے بال تھے۔ ان میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ رنگ کھلتا ہوا تھا۔ راحیلہ کا قد بھی اونچا تھا۔ بدن کسی قدر بھاری' اجلی رنگت' چہرہ سیب کی طرح سرخ۔ مگر اس کے چہرے پر نسائیت کم تھی۔ آواز بھی بھاری تھی۔ وہ اس وقت ٹھاٹ سے سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی عمر ۴۵ سال کے لگ بھگ تھی۔

لالی ڈرائیور کے ساتھ کار سے نیچے اتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ ہمدانی نے اس کی جانب

اشارہ کرتے ہوئے سلیمان اور راحیلہ سے کہا۔ "ان سے ملو۔ یہ آج کی سپنس نائٹ کے امپائر ہیں' سردار نور محمد خاں بزدار۔ مظفر گڑھ کے رئیس اور بڑے زمیں دار ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قابل اعتماد بھی ہیں۔" سلیمان اور راحیلہ نے باری باری ہاتھ بڑھا کر لالی سے مصافحہ کیا۔ لالی راحیلہ سے ہاتھ ملاتے وقت جھجکا۔ مگر راحیلہ نے جھٹ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا۔ لالی سخت پریشان ہوا۔ لیکن اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ ہمدانی نے لالی کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ اس نے فوراً پینترا بدلا۔

"تم نے اتنا اصرار کیا کہ میں مسٹر بزدار کو مجبور کر کے لے آیا۔ بھئی آئندہ مجھے امپائر و مپائر کے چکر میں نہ ڈالنا۔ اس کا بندوبست پہلے سے کر لیا کرو۔"

مسز سلیمان نے معذرت کے انداز میں کہا۔ "مجھے چھ بجے شام کو اچانک اطلاع ملی کہ سرا صاحب پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ تمہی بتاؤ' اتنے شارٹ نوٹس پر میں کیا کر سکتا تھا۔ تم جانتے ہو' میزبان کی حیثیت سے یہ میری ہی ذمہ داری ہے۔ بہرحال' تمہارا اور مسٹر بزدار دونوں کا بہت بہت شکریہ۔"

سلیمان اور ہمدانی باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھے مگر وہ بنگلے کے اندر نہیں گئے۔ سلیمان سب کو باغ میں لے گیا۔ باغ میں گھاس کے خوبصورت قطعے پر نیم دائرے میں صوفے رکھے تھے۔ روشنی بہت ہلکی تھی۔ صوفوں پر پہلے سے کچھ مہمان بیٹھے تھے' کچھ کھڑے تھے۔ مرد بھی تھے' عورتیں بھی تھیں۔ سب ملے جلے تھے۔ دھیمی روشنی میں ان کے چہرے دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔

ہمدانی اور نوشابہ پہنچے تو غلغلہ پڑا۔ دونوں نے مسکرا مسکرا کر سب سے مصافحہ کیا اور درمیان کے صوفوں پر ایک دوسرے سے جدا ہو کر بیٹھ گئے۔ لالی بھی ایک طرف چپ چاپ بیٹھ گیا۔

صوفوں سے خاصے فاصلے پر درختوں کے نیچے باقاعدہ بار تھا۔ کاؤنٹر پر قسم قسم کی بوتلیں رکھی تھیں۔ درختوں پر ننھے ننھے رنگ برنگے بلب روشن تھے۔ دو بارمین جھلکتی ہوئی سفید وردیاں پہنے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ بوتلیں کھول کھول کر گلاسوں میں شراب انڈیل رہے تھے۔ بیروں کی وردیاں بھی کلف لگی سفید سفید تھیں۔ شراب کے بار سے ذرا ہٹ کر روشنیوں سے جگمگاتے درختوں تلے اسنیک بار بھی تھا۔ کاؤنٹر پر کھانے کے لئے مختلف اسنیکس قرینے سے رکھے تھے۔ اجلی وردیوں میں ملبوس خانساماں کمر پر سنہرے پٹکے لگائے' نہایت مستعدی سے پلیٹوں میں کھانے کی اشیاء سجا کر رکھ رہے تھے۔ بیرے' ٹرے سنبھالے ہوئے آتے اور اپنے اپنے کاؤنٹر سے شراب کے گلاس اور پیالے' سوڈے کی بوتلیں' پانی بھرے جگ اور کھانے کی اشیاء سے سجی سجائی پلیٹیں

اٹھا کر لے جاتے۔ وہ علیحدہ علیحدہ ٹرے میں شراب اور اسنیکس اٹھائے مہمانوں کے درمیان گھوم رہے تھے۔

اس وقت اسکاچ وہسکی کا دور چل رہا تھا۔ البتہ عورتیں مارٹینی' شیری اور ہلکی فرانسیسی سرخ اور سفید وائن سے شغل کر رہی تھیں۔ صوفوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی میزیں تھیں۔ ان پر چاندی کی خوبصورت طشتریوں میں ماچس اور سگریٹیں رکھی تھیں۔ بعض عورتیں نہایت دھڑلے سے سگریٹ پی رہی تھیں۔

سب عورتیں اور مرد ایک دوسرے سے شناسا اور بے تکلف معلوم ہوتے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے اور بے تکان باتیں کر رہے تھے۔ محفل میں چھ مرد تھے' چھ عورتیں تھیں۔ ان کی عمریں چالیس اور پچاس کے درمیان تھیں مگر دیکھنے میں اتنی نہیں لگتی تھیں۔ سبھی صحت مند اور زندہ دل تھے۔ سب جوڑے جوڑے تھے۔ صرف لالی لنڈورا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ ایک صوفے پر خاموش بیٹھا تھا۔

محفل کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر لالی دیر تک حیران و پریشان رہا اور نظریں جھکائے گم صم بیٹھا رہا۔ اس محفل رنگ و بو میں جہاں زبان کے ساتھ ساتھ جسم بھی چہک رہے تھے' وہ خود کو بے حد اجنبی اور تنہا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اٹھ کر بھاگ جاتا۔ ایک بیرا اس کے پاس بھی شراب کی ٹرے لے کر آیا مگر اس نے انکار کر دیا۔ کئی بار اس نے یہی کیا۔ البتہ اسنیکس کی ٹرے سے کھانے کی چیزیں بار بار اٹھاتا اور پلیٹ میں رکھ کر کھاتا رہا' طشتری سے سگریٹ اٹھا اٹھا کر پھونکتا رہا۔

ایک بیرا' شراب کی ٹرے لے کر آیا۔ تھوڑا سا اصرار بھی کیا' لالی اس دفعہ انکار نہ کر سکا۔ اس نے وہسکی کا گلاس اٹھا لیا۔ بیرے نے اس میں سوڈا ڈال دیا۔ لالی آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگا۔ گلاس ختم ہوا تو اس نے ایک بیرے کو اشارے سے قریب بلایا' دوسروں کی دیکھا دیکھی ٹرے میں خالی گلاس رکھا اور بھرا ہوا گلاس اٹھا لیا۔ وہسکی کے دو پیگ لگا کر طبیعت میں سرخوشی آ گئی۔ اجنبیت کا احساس کم ہو گیا۔ وہ اطمینان سے نظریں اٹھا اٹھا کر سب کو دیکھتا رہا۔ محفل میں کوئی شخص لطیفہ سناتا' قہقہے بلند ہوتے۔ لالی بھی بے ساختہ ہنسنے لگتا۔

ہمدانی ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا' جسے وہ ٹھہر ٹھہر کر اٹھاتا' ہونٹوں سے لگاتا' وہسکی کی چسکی لگاتا۔ ہمدانی کبھی بیٹھ جاتا' کبھی کھڑا ہو جاتا اور زور سے قہقہے لگاتا۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتا۔ مگر نوشابہ بہت دیر سے ایک ہی جگہ بیٹھی تھی۔ وہ شیشے کے نازک گوبلٹ سے آہستہ آہستہ گہری سرخ اطالوی وائن پی رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ مارٹینی سے شغل کر چکی تھی۔

اس کا گلابی چہرہ اور نکھر گیا تھا۔ آنکھوں میں چراغ جھل ملا رہے تھے۔ وہ سلیمان کی بیوی راحیلہ سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ نوشابہ نہ زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی نہ تتلی کے مانند ادھر ادھر منڈلا رہی تھی۔ لالی کو وہ سب عورتوں سے زیادہ دل ربا اور باوقار نظر آئی۔

نو بجے سے پہلے ایک نیا جوڑا آیا۔ اس کے آتے ہی شور مچا۔ یہ مسعود تھا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی امینہ تھی۔ لالی کی نگاہیں دیر سے اسے تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے امینہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ سانولی سلونی بنگالن تھی۔ لمبے لمبے بال اور بیچ سے نکلی ہوئی سیدھی مانگ۔ ماتھے پر جگ مگ جگ مگ کرتی بندیا۔ تازہ کنول کی طرح شفاف آنکھیں۔ میانہ قد، چھریرا بدن، پتلی کمر۔ چلتی تو جسم اس طرح لچکتا جیسے نیا دھیرے دھیرے ڈولے۔ وہ زعفرانی ساڑھی باندھے ہوئے تھی مگر بدن پر بلاؤز قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ سینے پر دھجی کی طرح زرتار چولی تھی۔ ساڑھی ناف سے اس قدر نیچے بندھی تھی کہ کولھے کے دائرے صاف نظر آ رہے تھے۔ پیٹھ بالکل برہنہ تھی اور نشیب میں دور تک کھلتی چلی گئی تھی۔ اس نے اپنی برہنہ پیٹھ کی ستر پوشی لمبے لمبے چمک دار بالوں سے کر رکھی تھی۔ سن و سال چالیس سے تجاوز کر چکا تھا مگر کاٹھی بہت اچھی تھی۔ پہلی نظر میں وہ الھڑ دوشیزہ نظر آتی تھی۔

لالی نے سوچا ہمدانی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ بہت زوردار رن ہے۔ لیکن امینہ بھڑکتا شعلہ تھی تو اس کا شوہر مسعود اتنا ہی سنجیدہ اور کم گو تھا۔ وہ اونچے قد کا ادھیڑ آدمی تھا۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ تھا۔ رنگ ذرا کھلتا ہوا تھا، سر پر بال کم تھے۔ مگر مانگ نکال کر اچھی طرح جمائے گئے تھے۔ وہ ہونٹوں میں پائپ دبائے ہلکا ہلکا دھواں اڑا رہا تھا۔ ہمدانی نے امینہ کو نظر بھر کر دیکھا اور زور سے قہقہہ لگا کے چیخا۔ "یارو! اب روشنی گل دو۔" امینہ نے گردن کو ذرا سا خم دے کر ہمدانی کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم تھا۔ دنبالے کاجل کے حلقوں میں جگمگاتی آنکھیں گنگنا رہی تھیں۔ ہمدانی نے لہک کر شعر پڑھا۔

لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر

محفل میں زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ ہمدانی ہاتھ پکڑ کر مسعود کو اپنے ساتھ لے گیا اور ایک صوفے پر بیٹھ کر اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ امینہ آگے بڑھی اور سلیمان کے پاس ٹھہر گئی۔ لالی نے وہسکی کے تین بڑے پیگ لگا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ البتہ اس نے کھانا زیادہ کھایا۔ صبح سے بھوکا بھی تھا۔

پہر رات گزر گئی۔ ستارے زیادہ تاب ناک ہو گئے۔ ہوا میں تیکھا پن آ گیا۔ محفل کا رنگ نکھرتا جا رہا تھا۔ قہقہے تھے۔ آوازوں کا زیر و بم تھا۔ چہرے سرخوشی سے دمکتے تھے۔ جسم جل ترنگ تھے، آنکھیں دھواں دھواں تھیں۔ سب آپس میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ہم اور تم کی تمیز نہ رہی۔ صرف لالی اکیلا اور الگ تھلگ تھا۔ وہ صوفے پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ مگر محفل میں عملی طور پر شریک نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا حصہ بن گیا تھا۔ اسے بہت مزا آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا گویا کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔

ٹھیک دس بجے سلیمان نے کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا۔ "لیڈیز اینڈ جینٹل مین!" سلیمان کی آواز کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔ قہقہے سرد پڑ گئے، آوازیں مدھم ہو گئیں۔ سب چپ چاپ صوفوں کی طرف بڑھے۔ ہر بیوی اپنے میاں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اب ان کی تعداد چودہ تھی۔ سات مرد، سات عورتیں۔

بیرے محفل سے چلے گئے۔ صرف سلیمان اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے اونچی آواز سے بولنا شروع کیا۔ "لیڈیز اینڈ جینٹلمین! آج کی نائٹ آف دی گریٹ چنس میں ہمیں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑی۔ یہ امپائر کی تبدیلی ہے۔ بات یہ ہے، مسٹر کرم علی سمرا اچانک شدید بیمار پڑ گئے۔ اب وہ اسپتال میں ہیں۔ یہ اطلاع بھی آج ہی شام کو ملی۔ ان کی جگہ دوسرے امپائر کا فوری انتخاب خاصا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ مسٹر ہمدانی نے میری مدد کی۔ اس طرح یہ مسئلہ حل ہوا۔ ایک ممبر غیر حاضر ہیں۔ میری مراد مسٹر رؤف سے ہے۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ گزشتہ ہفتے کینیڈا چلے گئے۔ انہوں نے روانگی سے پہلے فون پر معذرت کر لی تھی۔"

سلیمان نے اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ لالی ایک بار پھر گھبرا گیا اور بوجھل قدموں سے سلیمان کے برابر جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلیمان نے لالی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ ہیں سردار نور محمد خاں بزدار۔ مظفر گڑھ کے رئیس اور بڑے زمیں دار ہیں۔ ان پر پورا، پورا اعتماد بھی کیا جا سکتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اکثر خاندانی رئیسوں کی طرح ان کے ساتھ بھی یہ حادثہ ہے کہ انگریزی نہیں جانتے۔ کوشش ہی نہیں کی۔ ان سے آپ کو اردو یا پنجابی میں بات کرنی ہوگی۔ یہ بات میں پہلے بتائے دے رہا ہوں تاکہ بعد میں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔" اس نے لمحے بھر توقف کیا۔ "آیئے، اب میں آپ کو ان سے ملوا دوں۔ یہ ضروری بھی ہے۔ سمرا صاحب کی بات دوسری تھی۔ سب کے ساتھ ان کی اچھی جان پہچان تھی۔" اس مختصر تقریر کے بعد سلیمان خاموش ہو گیا۔ لالی بھی چپ چاپ کھڑا رہا۔ نہ وہ بولا، نہ کسی نے اس سے بولنے کی فرمائش کی۔

سلیمان اسے اپنے ہم راہ آخری سرے پر لے گیا۔ لالی بدستور گھبرایا ہوا تھا۔ سلیمان نے باری باری ہر شخص کا لالی سے سرسری تعارف کرایا۔ سب سے پہلے وہ شیخ عبدالحمید گھوں سے ملا۔ شیخ حمید چنیوٹ کا رہنے والا تھا۔ لائل پور میں اس کے دو کارخانے تھے۔ شیخ عبدالحمید گھوں کا نام سن کر لالی چونکا۔ اسے یاد آیا کہ پچھلی رات بشیرے نے اس کا تذکرہ کیا تھا۔

اس نے شیخ حمید کو غور سے دیکھا۔ حمید گھوں کے ساتھ اس کی بیوی مہ جبین تھی۔ وہ گداز بدن کی گوری چٹی عورت تھی۔ ناک نقشہ سبک تھا مگر آنکھیں ذرا چھوٹی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے ہلکی ہلکی جھریاں تھیں۔ جھریاں چھپانے کے لیے خاصا میک اپ کیا گیا تھا۔ وہ ہاتھوں اور کانوں میں قیمتی جڑاؤ زیور پہنے ہوئے تھی۔ چشم وابرو اور نقشہ صاف چغلی کھاتا تھا کہ اس کا تعلق کبھی ارباب نشاط سے رہ چکا ہے۔ شیخ حمید گھوں خاصا تومند تھا۔ اس کا پیٹ ذرا سا آگے نکلا ہوا تھا۔ رنگ سانولا تھا' بات بھی کم کرتا تھا۔ وہ نہایت نفیس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی عمر ۴۵ سے اوپر تھی۔ مہ جبین بھی تقریباً اسی عمر کی تھی۔

دوسرے نمبر پر چوہدری محمد نواز بھنڈر تھا۔ وہ پولی ٹیسین کلب کا بنیادی رکن تھا۔ سپنس نائٹ میں شرکت کے لیے لاہور سے آیا تھا۔ وہ ریلوے میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ ادھیڑ عمر' مگر خوش رو اور خوش طبع۔ فاخرہ اس کی بیوی تھی۔ دبلی پتلی کامنی سی۔ چمپئی رنگت' چہرہ تر و تازہ اور صراحی دار گردن۔ گردن میں سونے کا جڑاؤ گلوبند تھا۔ سر پر بالوں کی پتلی سی سفید لٹ تھی جس نے اس کے چہرے کی دل کشی میں تنوع پیدا کر دیا تھا۔ وہ خاصی طرح دار عورت تھی۔ بات کرتی تو گردن کو ذرا سا خم دیتی اور نظریں ترچھی رکھتی۔

نواز بھنڈر کے قریب مرزا ابوالحسن بیٹھا تھا۔ وہ ایس پی تھا اور گٹھے ہوئے بدن کا تندرست آدمی تھا۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ رنگت گندمی تھی۔ وہ بات بات پر زور سے قہقہے لگاتا۔ اس کی بیوی سائرہ تھی۔ خوش شکل' رنگ صاف اور قد قدرے چھوٹا۔ چھوٹے قد کے باعث وہ اپنی عمر سے کم نظر آتی تھی۔ بات کرتی تو دانت چنبیلی کی کلیوں کی طرح خوبصورت لگتے۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ہلکے ہلکے نشے سے خمار آلود تھیں۔ لالی نے ایس' پی مرزا کو دیکھا تو سراسیمہ ہو گیا۔ مرزا نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ اس کے چہرے پر پولیس والوں کی مخصوص خشونت جھلکنے لگی۔ اس نے لالی کو بغور دیکھا اور مسکرا کر بہت آہستہ سے بولا۔ "تم نے مونچھیں بھی صاف کرا دیں؟"

لالی لرز کر رہ گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا' خاموش کھڑا رہا۔ ایس' پی نے تیوری پر ہلکا سا

بل ڈال کر سرگوشی کی۔ "تم تو لالی ہو' نور محمد بزدار کب سے بن گئے؟" اس نے ذرا تامل کیا۔ "تمہارا ساتھی رحیم دار کہاں ہے؟" لالی اور پریشان ہو گیا۔

ہمدانی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے صورت حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے فوراً مداخلت کی۔ "مرزا! نو آفیشل بزنس پلیز۔" اس نے پہلو بدلا اور مسکرا کر بولا۔ "پارٹی میں آیا کرو تو اپنا پولیس مین گیٹ کے باہر چھوڑ دیا کرو۔"

مرزا نے گردن موڑ کر ہمدانی کو دیکھا اور سنجیدہ ہو کر بولا۔ "سر! مجھے کچھ شبہ ہوا تھا۔"

ہمدانی ایک دم ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ "یہاں ہم اپنا شک و شبہ رفع کرنے کے لیے اکٹھا نہیں ہوئے ہیں۔"

ایس پی صفائی پیش کرنے لگا۔ "بات یہ ہے سر! وزیر زراعت نے فون پر فون کر کے اپنی ویل بلوا دی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ڈپٹی کمشنر لمحے بھر خاموش رہا۔ "یار! تم پکی نوکری والے' ان کچی نوکری والے وزیروں کو گھاس ہی کیوں ڈالتے ہو؟ یہ تو چڑھتی اترتی دھوپ چھاؤں ہیں۔ ان کا تو کام ہی سفارشیں کرنا ہے۔ کسی کو چھڑوا دیا' کسی کو اندر کرا دیا' یا پھر انہیں الاٹ منٹوں اور لائسنسوں کا عارضہ ہے۔ تم نے خواہ مخواہ ان لوگوں سے لمبی چوڑی امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ لاکھ کارگزاری دکھاؤ' تم پانچ سال سے پہلے ڈی آئی جی نہیں بن سکتے۔ وزیر زراعت کو مکھن لگانے سے بھی نہیں بن سکتے۔ ون یونٹ تو سمجھو بن ہی چکا ہے۔ چند مہینے کی بات اور ہے۔ پھر نہ یہ صوبہ رہے گا اور نہ اس کا کوئی صوبائی وزیر۔ کیا سمجھے؟"

ہمدانی خاموش ہوا تو مسٹر سلیمان نے بھی اظہار ناپسندیدگی کیا۔ "مرزا! تم کس کی لیگ پولنگ کر رہے ہو' میری یا ہمدانی کی؟ تم وردی اتار کر بھی وردی میں رہتے ہو۔ خواہ مخواہ کا ایک شوشا چھوڑ دیا۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

بات چیت بہت آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ لہٰذا دوسرے مہمان ایس پی کی باتوں کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ پھر بھی کسی نے مرزا کا رویہ پسند نہ کیا۔ چوہدری نواز بھنڈر نے ہنس کے کہا۔ "بھئی مرزا! اس ویرانے میں مہینے بھر بعد تو ایک خوبصورت رات ملتی ہے۔ تم اس کا بھی سارا حسن اور سارا مزہ کرکرا کر دینا چاہتے ہو۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "یار! ہم غربا و مساکین پر کچھ تو رحم کھایا کرو۔"

کچھ اور احتجاجی آوازیں بھی بلند ہوئیں۔ عورتوں نے سب سے زیادہ ناک بھوں چڑھائی۔ خود

مرزا کی بیوی سائرہ نے اسے ڈانٹا۔ "مرزا! ڈونٹ بی سلی۔" ایس پی ان تابڑ توڑ حملوں سے گھبرا گیا۔ شرمندہ ہو کر ہر ایک سے معذرت کرنے لگا۔ اس نے کئی بار اونچی آواز سے کہا۔

"سوری' آئی ایم ویری سوری۔"

لالی نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا' چپ کھڑا سب کی باتیں سنتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ سلیمان کے ہم راہ آگے بڑھا اور ڈاکٹر بٹ کے پاس پہنچا۔ بٹ محکمہ صحت کا ڈائریکٹر تھا اور شام ہی کو ملتان سے سیدھا سلیمان کے بنگلے پہنچا تھا۔ پچاس کے لگ بھگ سن' مگر زندہ دل اور یار باش۔ سر کے بال خشک اور کسی قدر لمبے تھے۔ لباس کے معاملے میں بھی وہ خاصا بے نیاز تھا۔ سرمئی پتلون پر کارڈرائے کا بش شرٹ نما فختئی کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ٹائی گہری سرخ تھی۔ وہ آنکھوں پر چشمہ لگائے آہستہ آہستہ پائپ پر کش لگا رہا تھا۔ وضع قطع سے اشٹیپو کُل لگتا تھا اور شکل و صورت کے اعتبار سے جاذب نظر تھا۔

ڈاکٹر بٹ کی بیوی ماہ رخ اس سے بھی زیادہ آشفتہ مزاج تھی۔ وہ سرخ ریشمی شلوار اور نہایت باریک ململ کا کڑھا ہوا سفید کرتا پہنے ہوئے تھی۔ کرتے کے نیچے اور کوئی کپڑا نہیں تھا۔ اندر سے اس کی گوری گوری جلد صاف جھلک رہی تھی۔ ناک ذرا چھوٹی تھی' مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور شبنم کے قطروں کی طرح جھل ملاتی تھیں۔ وہ سن سے اتر چکی تھی۔ لیکن بدن اب تک سڈول تھا اور اسے سڈول رکھنے کے لئے وہ پابندی سے ریاض بھی کرتی تھی۔

سب سے آخر میں لالی مسعود کے پاس پہنچا۔ مسعود محکمہ آبادکاری میں ایڈیشنل کمشنر تھا۔ چند سال تک بنگال میں مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکا تھا۔ اس نے کلکتے میں امینہ سے شادی کی۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی بنگال میں کئی سال گزارے' اب ادھر آ گیا تھا۔ اس کی بیوی امینہ کو موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ رقص کرنا بھی جانتی تھی۔ ہنستی تو گلے میں گھنگرو کا چھناکا ہوتا۔ اٹھتی تو بدن پھولوں سے لدی شاخ کی طرح جھومتا۔ چلتی تو بے ساختہ یہ مصرعہ زبان پر آ جاتا۔

ساغر کو مرے ہاتھ سے لیناکہ چلا میں!

نئے امپائر سے مہمانوں کے تعارف کی رسم ختم ہوئی تو سب کھڑے ہو گئے۔ روشوں پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باغ کے ایسے حصے میں پہنچے جو سرس اور شرینہ کے اونچے اونچے گنجان درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ درختوں کے درمیان جدید طرز کی دومنزلہ عمارت تھی جو کلب کے ممبروں میں ملے ژرہاؤس کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ نہر اس کے نیچے ہی بہتی تھی۔ عمارت کے دریچوں سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ ہمدانی نے چلتے چلتے سلیمان سے کہا۔

"سلیمان! امپائر کو ملے ژرہاؤس اچھی طرح دکھا دو تاکہ وہ اس کے جغرافیۓ سے واقف ہو جائے۔"

مہرسلیمان نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مجھے اپنی ذمہ داری کا بخوبی احساس ہے۔ امپائر نیا ہے' میں تو نیا نہیں ہوں۔"

☆

سب مہمان ملے ژرہاؤس میں داخل ہوئے اور کوریڈور سے گزر کر ایک کشادہ ہال میں پہنچ گئے۔ صرف سلیمان اور لالی زینے کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر چلے گئے۔ بالائی منزل پر طویل غلام گردش تھی۔ اس کے ایک طرف کمرے تھے۔ کمروں کے دروازے ایک سلسلے سے دور تک چلے گئے تھے۔

ملے ژرہاؤس کے طرز تعمیر سے مشرقیت جھلکتی تھی۔ غلام گردش کی آرائش میں بھی مشرقیت کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ جگہ جگہ محرابیں تھیں۔ ان میں پیتل کی منقش قندیلیں آویزاں تھیں۔ کہیں کہیں چھت سے فانوس لٹک رہے تھے۔ مگر روشنی مدھم تھی۔ اتنی مدھم کہ غلام گردش میں چلنے والے پرچھائیوں کے مانند دھندلے دھندلے نظر آتے۔ غلام گردش میں دبیز قالین کا فرش تھا۔ محرابوں کے نیچے ہر کونے میں ذرا اونچائی دے کر لکڑی کے خوش نما تختے لگائے گئے تھے۔ تختوں پر چھوٹے چھوٹے گملوں میں خوب صورت پودے تھے۔ ان کے قریب قد آدم سیاہ اور سفید مجسمے نصب تھے۔ دیواروں پر دل فریب تصاویر آویزاں تھیں۔ ان میں قرون وسطیٰ کے مشرقی شبستانوں کے رومانی مناظر پیش کیے گئے تھے۔ مجسموں کی طرح تصاویر بھی ہیجان انگیز تھیں اور جذبات میں تلاطم برپا کرتی تھیں۔

غلام گردش میں دس کمرے تھے۔ کمروں کے دروازوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا' جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کمرے بڑے اور کشادہ ہیں۔ ان کی کھڑکیاں نہر کی طرف کھلتی تھیں۔ ہر کمرے کے دروازے کے مقابل ذرا ہٹ کر غلام گردش میں جگہ جگہ صوفے پڑے تھے۔ دروازوں پر ریشم کے باریک پردے جھول رہے تھے۔ ہر دروازے پر پیتل کی تختی آویزاں تھی۔ تختی پر کمرے کا نمبر درج تھا۔ مگر ہر دروازہ مقفل۔ ہر قفل میں کنجی لگی تھی اور ہر کنجی پر کمرے کا نمبر لکھا تھا۔ سلیمان نے ایک ایک دروازے کا تالا کھول کر لالی کو دکھایا اور کنجی' تالے میں لگی چھوڑ دی۔ مگر وہ لالی کو کسی کمرے کے اندر نہیں لے گیا۔ لالی نے بھی اندر جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ تالوں اور کنجیوں کا معائنہ کر کے دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

مسٹر سلیمان نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمدانی 'لالی کو قرعہ اندازی کا طریقہ اور اس کے قاعدے قوانین بتا چکا ہے' ایک بار پھر قرعہ اندازی کے بارے میں تمام تفصیلات دہرائیں۔ اس نے لالی سے پوچھا۔

"مسٹر بزدار! میں نے یہاں کی ہر بات بتا دی۔ اب بھی آپ نے کچھ پوچھنا ہے' تو پوچھ لیجیے۔ میں بعد میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ ہر بات کا فیصلہ آپ ہی نے کرنا ہو گا اور آپ کے فیصلے کو کوئی چیلنج نہیں کرے گا۔"

لالی نے اعتماد سے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے جی! آپ پروا نہ کریں۔ میں نے ہر بات سمجھ لی ہے۔"

اس نے سلیمان سے صرف اتنی ہی گفتگو کی۔ باقی تمام وقت خاموش رہا اور ہر چیز حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے کرید کر کوئی بات نہیں پوچھی۔ وہ ہمدانی کی تنبیہہ کے مطابق کم سے کم بلکہ سرے سے بولنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اوپر کی منزل سے اتر کر دونوں ہال میں آئے۔ سارے مہمان بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی لالی چپ چاپ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد سلیمان بولنے کے لئے کھڑا ہوا۔ عین اسی وقت اس کا بوڑھا منیجر ہال کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ چہرے مہرے سے خرانٹ لگتا تھا۔ منیجر دروازے کے قریب سر جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر مسٹر سلیمان نے حیرت سے پوچھا۔

"سکھیرا! تم یہاں کیسے آ گئے؟"

اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "سر! میں جانتا ہوں' مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے۔ مگر بار بار ٹیلی فون آ رہے ہیں۔ بہت ارجنٹ کالز ہیں۔ مجھے مجبوراً آنا پڑا۔ یہاں ٹیلی فون بھی نہیں ہے۔ ورنہ میں فون پر آپ سے کنیکٹ کرتا۔"

سلیمان نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔ "کیسے فون آ رہے ہیں؟ کیوں آ رہے ہیں؟"

سکھیرا نے بتایا۔ "سر! کوئی دو گھنٹے پہلے ...... سٹیشن کے نزدیک دو ٹرینیں ٹکرا گئی ہیں۔ زبردست حادثہ ہوا ہے۔ ابھی تک گیارہ کے مرنے کی اطلاع ہے۔ زخمی تو بہت سے ہیں۔ ہر طرف چیخ پکار مچی ہوئی ہے۔"

ہال پر سناٹا طاری ہو گیا۔

سلیمان نے بے رخی سے کہا۔ "تو میں کیا کروں؟"

"نہیں سر!" سکھیرا نے فوراً وضاحت کی۔ "ساری کالیں چوہدری نواز بھنڈر صاحب' ڈپٹی کمشنر صاحب' ایس پی صاحب اور ڈاکٹر بٹ صاحب کے لیے ہیں۔"

"یار سکھیرا! تم اس وقت کہاں کباب میں ہڈی بن کر آ گئے۔" ہمدانی نے ہنس کر کہا۔ "بہرحال میرا اس معاملے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے مڑ کر نواز بھنڈر کی طرف دیکھا۔ "یہ تمہارا درد سر ہے۔ معلوم نہیں' مجھے کیوں ان کاموں میں گھسیٹ لیا گیا؟"

"ایسا نہیں ہے۔" نواز نے سنجیدگی سے کہا۔ "ذمے داری تو میری بھی ہے' تمہاری بھی' مرزا اور بٹ کی بھی ہے۔"

ایس پی مرزا نے اس کی بات پر احتجاج کیا۔ "مجھے کیوں انوالو کر رہے ہو؟ نواز! تمہاری ریلوے پولیس کس مرض کی دوا ہے؟"

سکھیرا نے ہچکچاتے ہوئے مطلع کیا۔ "مجھے بتایا گیا ہے کہ جہاں حادثہ ہوا ہے' وہاں بہت اندھیرا ہے۔ آس پاس کے پنڈ والوں نے لوٹ مار شروع کر دی ہے۔ سٹیشن پر صرف ایک کانسٹیبل تھا۔ وہ جائے حادثہ کی جانب گیا ہے۔ سر! وہ اکیلا کیا کر سکتا ہے؟ اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر نے مجھ سے خود بات کی ہے۔ وہ بہت پریشان لگتا تھا۔"

مرزا خاموش رہا۔ مگر نواز بھنڈر گویا ہوا۔ "ریلوے ٹریفک کا اتنا سٹاف موجود ہے۔ حادثے کی جگہ کوئی بھی پہنچ سکتا ہے۔ میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟" اس نے کچھ تامل کیا۔ "فون موجود ہوتا تو ڈی ایس کو وہاں پہنچنے کا حکم جاری کر دیتا۔ اور میں کیا کر سکتا ہوں؟ اتنی سی بات انہیں سمجھ نہیں آئی۔ بس ٹیلی فون کھڑکھڑانے شروع کر دیئے۔" اس نے جھنجلائی ہوئی نظروں سے سکھیرا کی جانب دیکھا۔ "اور تم انہیں ٹالنے کی بجائے فریاد لیے یہاں آ گئے؟"

ڈاکٹر بٹ نے سکھیرا کو مخاطب کیا۔ "سکھیرا! تم ایسا کرو' اسپتال ٹیلی فون کر کے میری طرف سے ڈیوٹی انچارج سے کہو' جتنی ایمبولینس اسپتال میں موجود ہوں' ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایک ٹیم کے ساتھ فوراً جائے حادثہ پر پہنچا دی جائیں۔"

"یار ڈاکٹر! تم کس چکر میں پڑ گئے۔ یہ بتا کر کہ تم یہاں موجود ہو' اخبارات کے لیے خواہ مخواہ ایک اسکینڈل کا میٹریل فراہم کر دو گے۔" ہمدانی نے سکھیرا کی جانب دیکھا۔ "فون پر تمہاری کس کس سے بات ہوئی؟"

سکھیرا نے جواب دیا۔ "منسٹروں کے سیکریٹریوں اور دوسرے افسروں کے فون آ رہے ہیں۔ دستور ساز اسمبلی کے ایک ممبر نے بار بار فون کیا۔ وہ حادثے والی ایک ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔

وہ بھی بہت پریشان لگتے تھے۔"

ڈاکٹر بٹ کی بیوی ماہ رخ نے گھبرا کر کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا' آج کا پروگرام کینسل کر دیا جائے؟"

ہمدانی مسکرا کر بولا۔ "ڈونٹ بی سلی ماہ رخ! پروگرام کیسے کینسل ہو سکتا ہے؟"

وہ بولی۔ "بھئی دیکھیے نا' کتنے بہت سے لوگ مر گئے۔ زخمی بھی بہت ہیں۔ نہ کوئی ریلیف ورک ہے نہ میڈیکل ایڈ۔ بہت سیریس بات ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔ ایمرجنسی جو ٹھہری۔"

مرزا نے اسے پریشان دیکھ کر کہا۔ "ماہ رخ! تم تو ایسی رقّت کے ساتھ بات کر رہی ہو' گویا سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے۔" ایس پی کے اس جملے پر ہلکا قہقہہ بلند ہوا۔

نواز کی بیوی فاخرہ کسی قدر بے چین ہو کر بولی۔ "بھئی! آپ لوگ ہم عورتوں کے جذبات کا بالکل لحاظ نہیں کرتے۔"

ہمدانی نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔ "سکھیرا! یہ بتاؤ' تم نے جواب کیا دیا؟ کوئی حماقت تو نہیں کر بیٹھے؟ یہ تو نہیں بتا دیا کہ ہم سب یہاں موجود ہیں؟ ویسے اصولی طور پر تمہیں یہ بات معلوم نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے مسکرا کر اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "یار تم بوڑھے ہو گئے اور ابھی تک تمہیں یہ معلوم نہیں کہ منیجر یا سیکرٹری کیا چیز ہوتا ہے؟"

سکھیرا نے جواب دیا۔ "سر! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ بنگلے میں ایک پارٹی ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس میں کون کون موجود ہے۔ پوچھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔ یہ بات بھی میں نے اس لیے کہی کہ فون کرنے والوں کو آپ لوگوں کے بنگلوں سے اطلاعات ملی ہیں کہ آپ لوگ یہاں ہیں۔"

مرزا نے اونچی آواز سے کہا۔ "لو بھئی' سن لو۔ آئندہ یہ پروگرام ٹاپ سیکریٹ رکھنا ہو گا۔ ورنہ ایسی مصیبتیں اکثر نازل ہوتی رہیں گی۔"

"ویسے تو یہ ٹاپ سیکریٹ ہی ہے۔" نواز نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "مگر حادثے کے سلسلے میں ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"یار! پروگرام ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہ کرو۔" ہمدانی نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا۔ اس نے مڑ کر سکھیرا کو دیکھا۔ وہ دروازے کے قریب سہما ہوا کھڑا تھا۔ "سکھیرا! ایسا کرو' لاہور یا کراچی سے کوئی اہم کال آئے تو صاف انکار کر دینا کہ ہم چاروں میں سے کوئی یہاں نہیں آیا۔ اس کے بعد فون ڈیڈ کر دو اور اطمینان سے سو جاؤ۔ آئندہ سے تمہارے لیے یہ قطعی ممنوعہ علاقہ ہو گا۔"

ڈاکٹر بٹ نے ہمدانی سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ "اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ہمیں خانہ پری کے لیے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

مسٹر سلیمان اب تک خاموش کھڑا تھا۔ وہ کسی قدر بیزاری سے بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج کا پروگرام کینسل کر دیا جائے؟"

ڈاکٹر بٹ نے فوراً صفائی پیش کی۔ "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ ٹھٹکا۔ "مگر تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ معاملہ بہت سیریس ہے اور بات اوپر تک پہنچ چکی ہے۔ میں خود جا کر فون پر اسپتال سے کنٹیکٹ کرتا ہوں اور ڈیوٹی انچارج کو ہدایت دیتا ہوں کہ وہ میڈیکل ٹیم لے کر جائے حادثہ پر پہنچ جائے۔" اس نے سلیمان کی طرف نظریں اٹھائیں۔ "سلیمان پروگرام ختم کرنے کی بجائے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اسے تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیا جائے؟"

"پروگرام تو ڈِلے کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ سوچ لو' تمہاری خانہ پری کی کارروائی سے کوئی پھڈّا نہ ہو جائے۔" ایس پی مرزا نے خبردار کیا۔

"نہیں' ایسا نہیں ہو گا۔" بٹ نے بہت اعتماد سے کہا۔ "میں پوری احتیاط سے کام لوں گا۔ ڈیوٹی انچارج میرے اعتبار کا ڈاکٹر ہے۔ اس کا ایک کیس بھی میرے پاس دبا ہوا ہے۔" اس نے چوہدری نواز کی جانب رخ کیا۔ "نواز! تمہیں بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ تم ٹیلی فون پر فوراً لاہور سے کنٹیکٹ کرو۔ کسی ریلوے افسر کی ڈیوٹی لگاؤ کہ وہ ایک ریلیف ٹرین لے کر فوراً حادثے کی جگہ پہنچ جائے۔ اگر اتنا کام ہو جائے تو سمجھ لو' نہ صرف ہم دونوں کی بلکہ سب کی ذمہ داری پوری ہو گئی۔"

نواز بھنڈر نے ڈاکٹر بٹ کی تجویز سے اتفاق کیا۔

ہمدانی بھی رضامند ہو گیا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر پروگرام زیادہ ڈِلے نہیں ہو سکتا۔"

سائرہ نے مسکرا کر کہا۔ "میرا خیال ہے' یہ ٹھیک ہے۔" اس نے ڈاکٹر بٹ اور نواز کی طرف دیکھا۔ "اب آپ دونوں دیر نہ کیجیے۔ جلدی سے یہ کام نمٹا کر آ جائیے۔"

ڈاکٹر بٹ اور نواز اپنی نشستوں سے اٹھے اور سکھیرا کے ہم راہ ہال سے چلے گئے۔ سلیمان اب تک کھڑا تھا۔ وہ بیٹھ گیا۔ اس کے برابر شیخ حمید گموں بیٹھا تھا۔ وہ بالکل گم صم تھا۔ ریلوے کا حادثہ سرے سے اس کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ وہ بار بار دزدیدہ نگاہوں سے سلیمان کی بیوی راحیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ راحیلہ کی سفید بنارسی ساڑھی کا پلو ڈھلک کر نیچے گر گیا تھا اور وہ نہایت اشتعال انگیز انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔

ہمدانی خمار آلود نظروں سے امینہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور امینہ کا شوہر مسعود خاموش بیٹھا آہستہ آہستہ پائپ کے کش لے رہا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ اور قطعی بے نیاز نظر آ رہا تھا۔

ماہ رخ نے چند لمحوں بعد خاموشی توڑی اور مسعود کو مخاطب کیا۔ "مسعود صاحب! آپ تو ایسے بے نیاز لگ رہے ہیں' جیسے حادثے کا آپ پر کوئی ری ایکشن نہیں ہوا؟"

مسعود نے ماہ رخ کو نظر بھر کر دیکھا اور ایش ٹرے میں پائپ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ "میں سوچ رہا تھا' کون سی ایسی قیامت آ گئی۔ گیارہ افراد ہی تو ہلاک ہوئے ہیں۔ کچھ اسپتال جاتے جاتے یا اسپتال پہنچ کر مرجائیں گے۔"

نوشابہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ کو اتنا کیلس اور بے حس نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کا تعلق تو محکمہ آبادکاری سے ہے۔"

مسعود مسکرا کر بولا۔ "نوشابہ! تم میری نفسیات نہیں سمجھ سکتیں۔ میں برسوں مشرقی بنگال میں رہا ہوں۔ وہاں ہر سال قحط' سیلاب اور سائیکلون سے ہزاروں افراد مرجاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جتنے لوگ ہر سال مرجاتے ہیں' اس سے کہیں زیادہ بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ موت اور زندگی کا کھیل ہے۔ ایک جاتا ہے' دوسرا آ جاتا ہے۔" اس کے چہرے پر فلسفیانہ سنجیدگی چھا گئی۔ "اس طرح بنگالیوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ کسی حد تک خود بخود حل ہوتا جا رہا ہے۔"

مرسلیمان نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "آبادی میں اضافہ صرف مشرقی بنگال کا نہیں' اس صوبے کا بھی مسئلہ ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو یہ انٹرنیشنل مسئلہ ہے۔ میں نے پچھلے دنوں عالمی ادارہ صحت کی ایک رپورٹ دیکھی تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ صدی کے آخر تک دنیا کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ شدید غذائی بحران پیدا ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ سمندر کی غذا پر بھی انحصار کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے ابھی سے کوششیں شروع کردی گئی ہیں۔"

مسعود نے ہنس کر کہا۔ "سلیمان! تم آج کی بات کر رہے ہو۔ مالتھس نے تو اٹھارویں صدی کے آخر میں دنیا کو اس خطرے سے خبردار کردیا تھا۔ وہ تھا تو پادری مگر انگریز تھا اور اکنامسٹ بھی تھا۔ اس نے بڑھتی ہوئی انسانی آبادی اور اس کے لیے ناکافی پیداوار کے پیش نظر جنگیں' وبائی امراض اور ناگہانی آفات ناگزیر قرار دی تھیں۔ آبادی ہر قیمت پر کم کرنے پر زور دیا تھا۔ اس کے یہ خیالات مالتھزم کے نام سے مشہور ہوئے اور آج اس نظریے کی بنیاد پر بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول

کرنے کے لیے نہایت سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔" اس نے پائپ میں تازہ تمباکو بھری اور اسے سلگا کر کش لگایا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ حادثات سے زیادہ ہمیں بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔ خصوصاً خواتین کو اس مسئلے پر اور زیادہ سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔" مسعود کی باتیں سب خاموشی سے سنتے رہے۔ اس نے بات ختم کی تو ہال پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا۔

لالی گم صم بیٹھا' حیرت سے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کی باتیں ہیں؟

☆

ڈاکٹر بٹ اور نواز بھنڈر ہال میں داخل ہوئے۔ دونوں تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر بٹ نے بیٹھتے ہی کہا۔ "حد ہو گئی ہے بے پروائی کی۔ اسپتال میں ایک بھی ڈاکٹر موجود نہیں۔"

مرزا نے ہنس کر کہا۔ "آج ہفتے کی رات ہے۔ نرسوں کے ساتھ کہیں ٹھرک لگا رہے ہوں گے۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" ڈاکٹر بٹ نے جواب دیا۔ "بہت مشکل سے ایک ڈاکٹر کو تلاش کیا۔ اسے میں نے ایک میڈیکل ٹیم جائے حادثہ پر لے جانے کی ہدایت بھی کردی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ صرف ایک ایمبولینس ہے۔ وہ بھی پرانی اور بوسیدہ۔ ہفتے بھر سے مرمت کے لیے لاہور کے کسی آٹو ورکشاپ میں پڑی ہے۔ میں نے حکم دیا' کوئی ٹرانسپورٹ نہیں ہے تو بس اور ٹرک ہی کا بندوبست کرکے چلے جاؤ۔ بہرحال میں جو کر سکتا تھا' وہ میں نے کردیا۔"

مسعود نے کہا۔ "تم نے تو خانہ پری کردی۔ چلو' یہ بھی ٹھیک رہا۔" وہ نواز بھنڈر سے مخاطب ہوا۔ "تم پر کیا بیتی؟"

نواز نے بتایا۔ "لاہور کی لائن بے حد خراب تھی۔ فون پر کنیکٹ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح کنیکٹ ہوا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ریلیف ٹرین روانہ کرنے کے انتظامات ہو رہے ہیں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "مگر حادثہ بہت سنگین ہے۔ مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ زخمی بھی بہت ہیں۔ نہ معلوم' کتنی لاشیں اور زخمی ٹوٹے پھوٹے ڈبوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور ابھی تک ریلیف کا کوئی کام شروع نہیں ہوا۔" پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ ہر شخص خاموش اور نڈھال نظر آ رہا تھا۔ ہال میں سب کے داخل ہوتے وقت فضا میں جو گہما گہمی اور شوریدہ سری تھی' اب غبار آلود ہو چکی تھی۔

مگر یہ بوجھل سکوت زیادہ دیر طاری نہ رہا۔ ہمدانی دیر سے چپ بیٹھا تھا' اس نے اچانک زور کا

قہقہہ لگایا اور اونچی آواز سے بولا۔ "یارو! یہ یبوست ختم کرو۔ جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے۔"

ہر طرف سے ہلکے ہلکے قہقہے پھوٹنے لگے' جسم لہکنے لگے' لب چہکنے لگے' آنکھیں بولنے لگیں' دھواں دھواں محفل میں چکاچوند پیدا ہو گئی۔ سلیمان نے کھڑے ہو کر اونچی آواز سے نعرہ بلند کیا۔ "سپنس سپنس۔"

سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور راہداریوں سے گزرتے ہوئے دوسرے ہال میں پہنچ گئے۔ یہ ہال بھی خاصا وسیع تھا۔ مگر روشنی برائے نام تھی۔ ہال کے وسط میں خاصی بڑی میز تھی اس پر چاندی کا خوشنما شمع دان رکھا تھا۔ شمع دان میں شمع روشن تھی۔ ہال میں اس شمع کے سوا کوئی روشنی نہیں تھی۔

نشستوں کی ترتیب اس طرح تھی کہ میز کے دائیں طرف عورتیں اور بائیں طرف مردوں کے لیے صوفے رکھے تھے۔ ہال میں داخل ہو کر عورتیں اور مرد اپنی اپنی نشستوں پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہال کے دونوں بازوؤں میں روشنی اس قدر کم تھی کہ چہرے سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آتے تھے۔ سلیمان نے لالی کو بڑی میز کے پاس اونچی کرسی پر بٹھا دیا۔

ہال میں چھائے ہوئے گہرے سکوت اور دھیمی دھیمی روشنی نے ماحول پر اسرار بنا دیا تھا۔ لالی سخت پریشان ہوا۔ وہ گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر اخروٹ کی لکڑی کی تین منقش صندوقچیاں رکھی تھیں۔ بیچ کی صندوقچی ذرا بڑی اور اونچی تھی۔ ہر صندوقچی میں روپے کے برابر گول گول ٹوکن پڑے تھے۔ دائیں صندوقچی میں جو ٹوکن تھے' ان پر عورتوں کے نام اور بائیں صندوقچی کے ٹوکنوں پر مردوں کے نام جلی حروف میں لکھے تھے۔ دونوں صندوقچیوں میں سات سات ٹوکن تھے۔ البتہ درمیان کی صندوقچی میں دس ٹوکن تھے۔ ان پر ایک سے دس تک نمبر درج تھے۔ صندوقچیاں کوئی پون فٹ اونچی اور اسی قدر چوڑی تھیں۔ تینوں صندوقچیاں بند تھیں۔ مگر ہر ایک کے اوپر اتنا بڑا ڈھکنا تھا کہ صرف ایک ہاتھ آسانی سے اندر جا سکتا تھا۔ صندوقچیوں کی قطار کے پیچھے لکڑی کا مختصر ریک تھا۔ اس میں بارہ خانے تھے' چھ اوپر اور چھ نیچے۔ خانوں پر ایک سے دس تک نمبر درج تھے۔ اوپر نیچے دو خانے ایسے بھی تھے جن پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ سب خانے بالکل خالی تھے۔ ریک کے خانوں کا رخ لالی کی جانب تھا۔ پچھلا حصہ اس طرح بند تھا کہ خانے صرف سامنے بیٹھا ہوا امپائر دیکھ سکتا تھا۔

لالی نے قاعدے کے مطابق ہر صندوقچی کھولی' ٹوکن گنے' ان پر لکھے ہوئے نام اور نمبر پڑھے

اور جانچ پڑتال کے بعد سب ڈھکنے بند کر دیے۔ اس نے سامنے دیوار پر لگا ہوا کلاک دیکھا۔ گیارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا بار بار کلاک دیکھتا رہا۔ اور بھی بہت سی نگاہیں بے چینی سے کلاک کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

کلاک نے ٹن ٹن گیارہ بجائے۔ دلوں کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو گئیں۔ ہال کے سکوت میں گہری سانسوں کی سرسراہٹیں ابھرنے لگیں۔ لالی کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے قرعہ اندازی کا آغاز کیا۔ کپکپاتے ہاتھ سے دائیں جانب کی صندوقچی کا بالائی ڈھکنا اٹھایا۔ اپنا دایاں ہاتھ اندر ڈال کے ایک ٹوکن نکالا۔ شمع کی روشنی میں اسے پڑھا۔ اس پر ماہ رخ کا نام درج تھا۔ لالی نے اونچی آواز سے پکارا۔ "ماہ رخ!" اس نے ٹوکن' ریک کے اوپر والے بے نمبر خانے میں رکھ دیا۔

ماہ رخ اپنی نشست سے اٹھی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لالی کے قریب آئی اور میز کے پاس عین اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ لالی نے درمیان کی صندوقچی کا ڈھکنا کھولا۔ ماہ رخ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا۔ ٹوکن نکال کر لالی کو دیا۔ لالی نے اسے پڑھا۔ اس پر پانچ کا ہندسہ درج تھا۔ لالی نے ٹوکن ماہ رخ کو دکھایا اور اسے ریک کے نچلے بے نمبر خانے میں رکھ دیا۔ وہ اٹھا اور ماہ رخ کے ہمراہ ہال سے چلا گیا۔

دونوں سیڑھیاں طے کر کے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ لالی آگے چل رہا تھا۔ ماہ رخ اس کے پیچھے تھی۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔ لالی کمرہ نمبر ۵ پر پہنچا۔ کمرہ بند تھا۔ دروازے میں لگی ہوئی کنجی سے اس نے تالا کھولا اور پلٹ کر دیکھا۔ ماہ رخ اس کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ باریک کرتے کے پیچھے سے اس کا گورا گورا سینہ جھلک رہا تھا۔ لالی نے اپنے جسم میں ہلکی سی جھرجھری محسوس کی۔ اس نے دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔

ماہ رخ نے کمرے میں داخل ہوتے وقت لالی کی جانب دیکھا' مسکرائی اور آہستہ سے کہا۔ "شکریہ!" لالی نے دروازہ بند کیا۔ تالا لگایا اور کنجی ہاتھ میں لے کر ہال میں واپس آ گیا۔ اپنی نشست پر بیٹھ کر اس نے کنجی ریک کے نمبر ۵ خانے میں رکھ دی۔ دائیں طرف رکھی ہوئی صندوقچی میں اس نے پھر ہاتھ ڈال کے ٹوکن نکالا۔ اس پر مہ جبیں کا نام درج تھا۔ لالی نے مہ جبیں کا نام پکارا۔ وہ میز کے نزدیک پہنچی۔ بیچ میں رکھی ہوئی صندوقچی کے کھلے ہوئے ڈھکنے کے اندر ہاتھ ڈالا۔ ٹوکن پر نمبر ۲ درج تھا۔ لالی نے نام اور نمبر کے ٹوکن ریک کے خانوں میں رکھے اور مہ جبیں کو کمرہ نمبر ۲ میں پہنچا کر تالا لگا دیا۔ واپسی پر اس نے کنجی' نمبر ۲ کے خانے میں رکھ دی۔ ماہ رخ کی طرح مہ

جبیں سے بھی لالی کی کوئی بات نہیں ہوئی۔

قرعہ اندازی میں نوشابہ کا نمبر ۱۰ نکلا۔ لالی اس کے ساتھ ہال سے نکلا۔ دونوں نے زینہ طے کیا اور بالائی منزل پر پہنچ کر غلام گردش میں چلے گئے۔ ایک محراب کے قریب نوشابہ نے رک کر لالی کو خبردار کیا۔ "سنو' کہیں خیر خواہی جتانے کے لیے ہمدانی کو یہ نہ بتا دینا کہ میں کس کمرے میں رہی اور نہ یہ بتانا کہ میرا کمرہ کسے الاٹ ہوا۔"

لالی کو اس کی یہ بدگمانی ناگوار گزری۔ "کیا سمرا صاحب سے بھی یہی بات کہی تھی؟"

"نہیں۔" نوشابہ نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم سمرا صاحب نہیں ہو۔ وہ ذمے دار اور قابل اعتماد شخص ہیں۔ سیشن جج رہ چکے ہیں اور تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو' عادی مجرم ہو۔"

لالی امپائری کی ترنگ میں تھا' وہسکی کے نشے نے بھی اثر دکھایا' بے رخی سے بولا۔ "جب یہ پتہ تھا' میں عادی مجرم ہوں تو......"

نوشابہ نے اس کی بات کاٹ کر ترشی سے کہا۔ "تمہارا اس طرح بات کرنے کا انداز مجھے بالکل پسند نہیں۔"

"بی بی جی! میں نے ہاتھ تو نہیں جوڑے تھے کہ مجھے امپائر بناؤ۔ میں تو خود اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔" لالی کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

"یہ میرا نہیں ہمدانی اور سلیمان کا فیصلہ تھا۔"

"قسم کا اتنا ہی ڈر تھا تو یہاں آئی کیوں؟" لالی اور زیادہ بے باک ہو گیا۔ "اس وقت تو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر خوب بن ٹھن کر چلی آئیں اور اب۔"

نوشابہ نے لالی کو پوری بات نہیں کہنے دی' تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

لالی اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔ اسے فوراً احساس ہوا کہ وہ ڈپٹی کمشنر کی بیوی ہے۔ نرم لہجے میں بولا۔ "میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں' ساب کو پتہ چل گیا تو کیا ہو گا؟ وہ سب ہی کچھ جانتے ہیں۔ سب کچھ ان کے سامنے ہی ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" نوشابہ کا لہجہ بھی نرم پڑ گیا۔ "مگر یہاں سے جانے کے بعد ہم ساری باتیں بھول جاتے ہیں۔ کبھی اس کے بارے میں بات نہیں کرتے۔"

دونوں کمرہ نمبر ۱۰ کے قریب کی محراب کے نیچے کھڑے تھے۔ محراب کے کونے میں سیاہ مجسمہ نصب تھا۔ مجسمے میں ایک صحت مند اور جوان عورت کو ایک مرد کی آغوش میں دکھایا گیا تھا۔ عورت مرد کا سہارا لیے لیٹی تھی۔ مرد کی گردن جھکی ہوئی تھی وہ عورت کی جانب دیکھ رہا تھا۔

عورت کی نظریں بھی اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے اور دونوں بالکل برہنہ تھے۔ لالی نے مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سب چکر کیا ہے؟"

"کوئی چکر وکر نہیں۔" نوشابہ نے رسان سے کہا۔ "دیکھو نا' یہ کتنا اجاڑ علاقہ ہے۔ ایک زمانے میں تو سرکاری افسر اسے کالا پانی کہتے تھے۔ اب تو ویسے حالات نہیں رہے۔ پھر بھی کوئی سوشل لائف نہیں۔ ویرانے میں الگ تھلگ پڑے ہیں۔ تمہیں کیا پتہ' یہاں دل کتنا گھبراتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرائی۔ "مہینے میں ایک رات سب کچھ بھول بھال کر ذرا دل بہلا لیتے ہیں۔"

لالی بھی مسکرانے لگا۔ "دل بہلانے کی ترکیب بہت چنگی نکالی ہے۔"

"یہاں کوئی مرد کسی کا شوہر اور کوئی عورت کسی کی بیوی نہیں ہوتی' صرف رات بھر کے لیے۔" نوشابہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "جب ایک سا کھانا کھاتے کھاتے اور ایک سا لباس پہنتے پہنتے طبیعت اکتا سکتی ہے تو ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت کے ساتھ رہتے رہتے بھی طبیعت اکتا سکتی ہے۔" وہ کچھ ٹھہری۔ "چھپ کر گناہ کرنے سے کیا یہ اچھا نہیں کہ گناہ' زندگی کی ایک ضرورت سمجھ کر کیا جائے۔ اس میں کتنا رومانس ہے' کتنا مزا ہے۔"

"وہ تو جی ضرور ہے۔ مجھے بھی بہت مزا آ رہا ہے۔" لالی چند لمحے خاموش رہا۔ "پر ساب یہ بات کیسے برداشت کر لیتے ہیں؟ بعد میں جھگڑا فساد نہیں ہوتا؟"

"نہیں' بالکل نہیں۔" نوشابہ نے بے نیازی سے کہا۔ "تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ ہر ایسی رات کے بعد ہمارے درمیان محبت کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتی ہے۔ سچ کہتی ہوں' میرا تجربہ یہی ہے۔ کلب کی دوسری ممبر عورتوں کا بھی یہی خیال ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو یہاں آتی کیوں؟ تم نے دیکھا نہیں' خوشی سے کیسی چہک رہی ہیں؟"

"کچھ سمجھ نہیں آتی جی۔" لالی نے رسان سے کہا۔ "دیر ہو رہی ہے۔ چلو' میں تمہیں کمرے میں پہنچا دوں۔" وہ آگے بڑھا۔ کمرے کا تالا کھولا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ نوشابہ کمرے میں داخل ہونے لگی تو لالی بولا۔ "اطمینان رکھو۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ اور ساب کو تو پوچھنے پر بھی ایک لفظ نہیں بتاؤں گا۔ بلکہ کسی کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔" لالی نے جوش اور جذبے سے اسے یقین دلایا۔ "مرد آدمی ہوں۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جو کہوں گا پورا کروں گا۔"

نوشابہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور آہستہ سے بولی۔ "شکریہ۔"

لالی نے دروازہ بند کیا' تالا لگایا اور کنجی ہاتھ میں دبا کر تیز تیز قدموں سے واپس ہوا۔ ہال میں پہنچا تو وہ گھبرایا ہوا تھا۔ سب اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ لالی اپنی کرسی پر بیٹھا' چند لمحے خاموش رہا پھر کسی طرف دیکھے بغیر اس نے صفائی پیش کرنے کے انداز میں اونچی آواز سے کہا۔

"معاف کرنا جی! تالے میں کچھ گڑبڑ تھی' اسے کھولنے میں دیر ہو گئی۔"

اندھیرے میں مہر سلیمان کی آواز ابھری۔ "کوئی بات نہیں' آپ امپائر ہیں جی! آپ کو کوئی معذرت شاذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔"

لالی چپ چاپ صندوقچیوں سے عورتوں کے نام اور نمبر نکالنے لگا۔ راحیلہ کا نمبر آٹھ' فاخرہ کا ۶' امینہ کا ۲ اور سائرہ کا ۴ نکلا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ باری باری بالائی منزل پر گیا۔ دروازہ کھولا ہر ایک کو تالا لگا کر کمرے میں بند کیا اور واپس آکر ہر کمرے کی کنجی اسی نمبر کے خانے میں رکھتا گیا۔ راستے میں کسی سے اس کی بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ چپ چاپ جاتا اور خاموشی سے لوٹ آتا۔ البتہ امینہ کے ہم راہ جاتے ہوئے کئی بار اس پر وارفتگی طاری ہوئی۔ وہ نہایت ہیجان انگیز خوشبو لگائے ہوئے تھی۔ آنکھوں سے شراب کا نشہ جھلک رہا تھا۔ بدن کا ایک ایک عضو بولتا تھا' چھلکتا تھا۔ وہ تند و تیز شراب سے بھرا ہوا ایسا پیالہ تھی جس میں طوفان امڈتے تھے۔

لالی' غلام گردش میں کچھ دور تک امینہ کے آگے آگے چلتا رہا پھر خود بخود اس کے قدم سست پڑ گئے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ چلتے چلتے امینہ ایک بار لڑکھڑائی۔ اس کی ساڑی کا آنچل ڈھلک کر نیچے گر گیا۔ دور تک نشیب میں کھلی ہوئی برہنہ پیٹھ لالی کے سامنے آ گئی۔ لالی تڑپ اٹھا۔ اس نے جھٹ امینہ کا نرم بازو تھام لیا اور اس وارفتگی سے تھاما گویا اب چھوڑے گا نہیں۔ امینہ نے ٹھہر کر اپنا آنچل درست کیا۔ مدھ ماتی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ مسکرائی اور اپنا بازو چھڑانے کے لیے آہستہ سے کسمسائی۔

لالی نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا' جیسے وہسکی کا نشہ اچانک تیز ہو گیا۔ اس کے قدم بہکنے لگے۔

لالی نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ امینہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے نہ لالی سے کوئی بات کی' نہ اس کا شکریہ ادا کیا۔ صرف خمار آلود نظروں سے لالی کو دیکھا' مسکرائی اور کمرے میں چلی گئی۔ لالی نے گہری سانس بھری' دروازہ بند کیا' تالا لگایا اور چوکھٹ کی تختی پر لکھا ہوا نمبر ذرا دیر تک ٹکٹکی باندھے تکتا رہا۔

کمرے کا نمبر ۲ تھا۔ اس کے بند دروازے کے پیچھے ایک دہکتا ہوا شعلہ فروزاں تھا جس سے لالی

اپنی انگلیاں جھلسا چکا تھا۔ امینہ کو کمرے میں مقفل کر کے لالی لوٹا تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

☆

قرعہ اندازی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ لالی نے تین خالی کمروں کے ٹوکن بے نمبر خانے میں رکھ دیئے۔ ان پر نمبر ا' نمبر ۳ اور نمبر ۹ درج تھے۔ نمبروں کے باقی سات ٹوکن اس نے چھ درمیانی صندوقچی میں ڈال دیئے۔ اب ہال کا وہ حصہ بالکل خالی تھا جس میں خواتین کی نشستیں تھیں۔ ہال کے دوسرے حصے میں بھی خاموشی تھی' صرف گہری گہری سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس حصے میں مردوں کی نشستیں تھیں۔ ان کی بے قراری سوا نیزے پر تھی۔ وہ بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ کھنکار کھنکار کر گلے صاف کر رہے تھے۔ مگر کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ لالی نے نظریں اٹھا کر گھڑی دیکھا۔ ساڑھے گیارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ بارہ بجے تک قرعہ اندازی ختم ہو جانا چاہیے تھی۔ اس کے پاس نصف گھنٹہ تھا۔ اتنے وقت میں پروگرام کے مطابق قرعہ اندازی اطمینان سے چلائی جا سکتی تھی۔

لالی خاموش بیٹھا مردوں کی بے چینی اور ذہنی کشمکش سے لطف اٹھاتا رہا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی بے قراری کا علاج صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایسی لذت تھی جو اس سے پہلے کبھی اس نے محسوس نہیں کی تھی۔

ہال میں صرف ایک شمع روشن تھی۔ اس کی ہلکی ہلکی کافوری روشنی میں سات مرد گم صم بیٹھے تھے۔ ان میں بڑے سرکاری افسر بھی تھے' جو پورے ضلعے کے سیاہ سفید کے مالک تھے۔ ان کے سامنے بڑے بڑوں کے سر جھک جاتے تھے۔ مگر اس وقت وہ لالی کی نگاہ کرم کے منتظر تھے۔ لالی جیل سے بھاگا ہوا قیدی تھا' یہ بات ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو معلوم تھی اور ایس پی بھی جانتا تھا۔ مگر دونوں اس وقت جیل کی کوٹھریوں کے بجائے پلے ژر ہاؤس کے بند کمروں کے بارے میں سوچ رہے تھے اور یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ ان کی قسمت کی لاٹری میں کیا لکھا ہے۔

آخر لالی نے بائیں ہاتھ کی صندوقچی کا ڈھکنا کھولا اور مقررہ قاعدے کے مطابق اپنا بایاں ہاتھ اندر ڈال کر ایک ٹوکن نکالا۔ اسے پڑھا۔ ٹوکن پر چوہدری نواز بھنڈر کا نام درج تھا۔ لالی نے اونچی آواز سے نام پکارا۔

نواز اندھیرے سے نکلا اور لالی کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ لالی نے درمیانی صندوقچی کا ڈھکنا اٹھایا۔ مردوں کے لیے جو قاعدہ وضع کیا گیا تھا' اس کے مطابق اس دفعہ لالی نے ہاتھ اندر ڈال کے ٹوکن نکالا اور ہاتھ کی آڑ میں اس طرح پڑھا کہ میز کے سامنے کھڑا ہوا شخص اسے نہ دیکھ سکے۔

ٹوکن پر نمبر ۷ لکھا تھا۔ لالی نے چودھری نواز بھنڈر کو ٹوکن کا نمبر دکھایا' نمبر ۷ کے خانے سے کنجی اٹھائی اور اسے دے دی۔ کنجی لیتے ہوئے نواز کے ہاتھ میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ لالی نے ٹوکن اسی نمبر کے خانے میں رکھ دیا اور نام کا ٹوکن بے نمبر خانے میں ڈال دیا۔ نواز کنجی لے کر ہال سے چلا گیا۔

لالی نے ایک بار پھر کلاک دیکھا۔ میز پر رکھی ہوئی چاندی کی طشتری سے سگریٹ اٹھا کر سلگائی اور آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔ ہال میں سگریٹ پینے کی صرف اسی کو اجازت تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ پر اب چھ مرد بیٹھے تھے۔ وہ نہ بول رہے تھے نہ ہنس رہے تھے۔ لالی بھی خاموش تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ نواز بھنڈر اوپر پہنچ کر اس کی دی ہوئی کنجی سے کمرہ نمبر ۷ کھولے اور اندر جا کر دروازہ بند کر لے۔ اس کے لیے تین منٹ مقرر تھے۔

تین منٹ بعد لالی نے دوسرا ٹوکن نکالا اور ڈاکٹر بٹ کو بلایا۔ بٹ آ گیا۔ لالی نے درمیانی صندوقچی سے ٹوکن نکالا اور ڈاکٹر بٹ سے چھپا کر پڑھا۔ اس پر نمبر ۵ لکھا تھا۔ لیکن یہ اس کی بیوی ماہ رخ کے کمرے کا نمبر تھا۔ قاعدے کی رو سے یہ کمرہ اسے الاٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ لالی نے ٹوکن پلٹ کر میز پر رکھ دیا۔ ٹوکن کا دوسرا رخ بالکل سادہ تھا۔ لالی نے ڈاکٹر بٹ کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میز پر رکھا ہوا ٹوکن کس عورت کے کمرے کا ہے۔ لالی نے پھر درمیانی صندوقچی میں ہاتھ ڈال کر ٹوکن نکالا۔ اس پر نمبر ۴ لکھا تھا۔ یہ مرزا ابوالحسن کی بیوی سائرہ کے کمرے کا نمبر تھا۔ لالی نے ٹوکن ڈاکٹر بٹ کو دکھایا اور ریک کے خانے سے کمرہ نمبر ۴ کی کنجی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ بٹ اپنی منزل کی جانب چلا گیا۔ لالی نے الٹا رکھا ہوا ٹوکن اٹھا کر پھر درمیانی صندوقچی میں ڈال دیا۔ دوسرے دونوں ٹوکن بھی نام اور نمبر کے خانوں میں رکھ دیے۔ لالی خوش تھا کہ ابھی تک کمرہ نمبر ۲ کا ٹوکن نہیں نکلا۔ یہ امینہ کا نمبر تھا۔

ٹھیک تین منٹ بعد سلیمان آیا۔ ٹوکن نمبر ۲ اس کے نام بھی نہیں نکلا۔ اس کے لیے نمبر ۶ نکلا۔ یہ نواز بھنڈر کی بیوی فاخرہ کا نمبر تھا۔ سلیمان گیا تو ہمدانی آیا۔ اس کے آتے ہی لالی کے ذہن میں ٹوکن نمبر ۲ سوالیہ نشان بن کر گردش کرنے لگا۔ لالی نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ڈپٹی کمشنر ہمدانی اس کے روبرو سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ خشک تھے۔ چہرے کی رنگت اڑی اڑی تھی۔ آنکھوں سے بے قراری جھلک رہی تھی۔ لالی ٹھاٹ سے کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ڈپٹی کمشنر اس کے سامنے اسی طرح کھڑا تھا جیسے عدالت میں ملزم گردن نیچی کئے بے قراری سے اپنے مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے کھڑا ہو۔ لالی کو معلوم تھا کہ ڈپٹی کمشنر کس کمرے کے الاٹمنٹ

کے لیے بے قرار ہے اور کس نمبر کا ٹوکن چاہتا ہے۔ وہ ٹوکن ابھی تک صندوقچی میں موجود بھی تھا۔

لالی نے درمیانی صندوقچی میں ہاتھ ڈالا۔ اس دفعہ اس کا دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ٹوکن نکال کے پڑھا۔ اس کی نظریں دھندلا گئیں۔ قسمت نے ڈپٹی کمشنر کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ ٹوکن نمبر ۸ تھا۔ یہ امینہ کا نہیں' راحیلہ کا نمبر تھا۔ راحیلہ کے چہرے پر نرمی سے زیادہ سرخی تھی' اس کی آواز بھاری تھی اور اپنی بھاری بھر کم آواز کے باعث وہ گونگوں کی طرح خاموش رہتی تھی۔ مردوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے سگریٹ کا دھواں اڑاتی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں لالی کو دھیور' یاد آتا تھا۔ دھیور جو میاں حیات محمد وٹو کے بنگلے کا تنومند خواجہ سرا تھا اور اس کی زبان کٹی ہوئی تھی۔

لالی کو ایسا محسوس ہوا کہ میز کے سامنے ڈپٹی کمشنر ہمدانی نہیں' صرف ہمدانی کھڑا ہے اور اندھیرا بہت گہرا ہے۔ وہ لمحہ بھر تک ٹوکن تکتا رہا اور سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ آخر اس نے ٹوکن پلٹ کے رکھ دیا۔ اس نے صندوقچی سے نیا ٹوکن نکالا' مگر ہمدانی کی قسمت ہی کھوٹی تھی۔ یہ بھی کمرہ نمبر ۲ کا نہیں' نمبر ۱۰ کا ٹوکن تھا۔ اس میں امینہ نہیں 'نوشابہ' تھی۔ لالی الجھن میں پڑ گیا۔ یہ ٹوکن وہ پلٹ کر نہیں رکھ سکتا تھا' نہ قاعدے کی رو سے اس کمرے کی کنجی ہمدانی کو دے سکتا تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا' فوراً کرنا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر تین مرد اندھیرے میں بیٹھے تھے۔ ان کی نظریں لالی کی جانب اٹھی تھیں۔ ان میں مرزا بھی تھا۔ وہ پولیس والا تھا۔ اس کی نگاہیں سب سے زیادہ تیز تھیں۔ لالی کے جرائم پیشہ ذہن نے اس مرحلے پر کام دکھایا۔ اس نے ٹوکن ہمدانی کے سامنے کیا اور کنجی خانے سے نکالنے کے لیے اتنا جھکا کہ اس کا چہرہ اندھیرے میں آ گیا۔ اس نے کنجی خانے سے ٹکرا کر ہولے سے آہٹ پیدا کی اور ساتھ ہی سرگوشی کی۔ "کمرہ نمبر ۲۔" اس نے نمبر ۲ کی کنجی نکال کے ہمدانی کے حوالے کر دی۔ کنجی لیتے ہوئے ہمدانی کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ اسے مسکراتا دیکھ کے لالی بھی خوش ہوا۔ ہمدانی کی دلی مراد بر آئی۔ وہ کمرہ نمبر ۲ کی جانب روانہ ہو گیا۔

اب لالی ایک نئی الجھن میں پڑ گیا۔ کمرہ نمبر ۲ کی کنجی ہمدانی کے پاس تھی اور اس نمبر کا ٹوکن صندوقچی میں تھا۔ طرفہ تماشا یہ کہ دو ٹوکن صندوقچی میں تھے اور دو باہر۔ مگر امیدوار صرف تین رہ گئے تھے۔ لالی چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے کمرہ نمبر ۱۰ کا ٹوکن اسی نمبر کے خانے میں رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مگر ٹوکن رکھا نہیں انگلیوں کے درمیان دبا لیا۔ اس نے میز پر الٹا رکھا

ہوا کمرہ نمبر ۸ کا ٹوکن نہایت صفائی سے اسی ہاتھ سے اٹھایا اور دونوں ٹوکن درمیانی صندوقچی میں ڈال دیے۔ ہمدانی کے بعد ایس پی مرزا کی باری آئی۔ ایس پی میز کے قریب آ کر کھڑا ہوا تو لالی' امپائر سردار نور محمد خاں بزدار سے ایک دم مفرور قیدی بن گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایس پی کی جانب دیکھا۔ ایس پی اسے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی تھی۔ لالی اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ اس نے گردن جھکا کر صندوقچی میں ہاتھ ڈالا۔ ساتھ ہی اسے یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ ٹوکن نمبر ۲ نہ نکل آئے۔

اس نے ٹوکن نکالا لوڑ یہ سوچ کر زیادہ احتیاط سے پڑھا کہ اگر نمبر ۲ ہوا تو اسے پلٹ کر میز پر رکھ دے گا۔ مگر اسے خدشہ تھا کہ بار بار ٹوکن پلٹنے سے ایس پی کو شبہ بھی ہو سکتا ہے۔ لالی نے دھڑکتے دل سے دیکھا۔ ٹوکن نمبر ۲ نہیں' نمبر ۸ تھا۔ ایس پی خاموش کھڑا تھا اور مسلسل لالی کو گھور رہا تھا۔ لالی نے اسے ٹوکن کا نمبر دکھایا اور کمرہ نمبر ۸ کی کنجی اس کے سپرد کر دی۔ ایس پی کنجی لے کر ہال سے جانے لگا۔ لالی کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔ کرخت چہرے والے ایس پی کے حصے میں کمرہ نمبر ۸ آیا تھا۔ اس میں مسز سلیمان کی بیوی راحیلہ تھی۔

اب مسعود آیا۔ اس کے نام کمرہ نمبر ۲ کے بجائے نمبر ۵ آیا۔ لالی ایک بار پھر ٹوکن پلٹنے اور دوبارہ قرعہ اندازی کرنے کے جھنجھٹ سے بچ گیا۔ سب سے آخر میں شیخ عبدالحمید لکھوں آیا۔ وہ لالی کے لیے خاصا ٹیڑھا مسئلہ بن گیا۔ پیچیدگی یہ پیدا ہوئی کہ امیدوار ایک تھا اور صندوقچی میں ایک کے بجائے ٹوکن دو تھے' نمبر ۲ اور نمبر ۱۰۔ اگر نمبر ۱۰ نکل آتا تو کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہوتی۔ وہ کمرہ نمبر ۱۰ کی کنجی اسے دے دیتا۔ لیکن ٹوکن نمبر ۲ نکلتا تو وہ اسے الٹا رکھ کر دوبارہ قرعہ اندازی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ نہ ہی وہ ٹوکن نمبر ۲ کی کنجی دے سکتا تھا۔ اس کے پاس تھی ہی نہیں۔ لالی نے جھٹ پینترا بدلا' مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔

"اب لاٹری شاٹری کیا نکالنی ہے جی! اپنے پاس صرف ایک چابی ہے اور اسی کا ٹوکن ڈبے میں پڑا ہے۔"

وہ کنجی خانے سے نکالنے کے لیے جھکا۔ حمید لکھوں نے کچھ کہنا چاہا مگر لالی نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ کنجی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لو جی' یہ رہی نمبر ۱۰ کی چابی۔ جا کر تالا کھولو اور دیکھو تمہارے نصیب میں کون سی لگائی آئی ہے۔" وہ ذرا کھل کر مسکرایا۔ "پر اس کمرے کے تالے میں ذرا گڑبڑ ہے۔ ہوشیاری سے کھولنا' بہت دیر میں کھلتا ہے۔ یاد ہے نا' میں اوپر سے دیر میں لوٹا تھا۔ وہ اسی کمرے کے تالے کا چکر تھا۔"

حمید لکھوں نے کنجی ہاتھ میں نہیں لی۔ "ایسی بات ہے جی تو یہ چابی اپنے ہی پاس رہنے دو۔ میرے ساتھ اوپر چل کر تالا کھول دو۔ مہربانی ہوگی۔ میں کہاں تالے کے ساتھ مغزماری کروں گا۔"

کلاک نے ٹن ٹن بارہ بجائے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ قرعہ اندازی کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ لالی نے حمید لکھوں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا' چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ حمید کے ساتھ ہال سے نکلا۔ دونوں زینے طے کر کے اوپر پہنچ گئے۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد شیخ حمید لکھوں ٹھہر کر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ لالی نے ہنس کر کہا۔ "سیٹھ حمید! تسیں تو ہانپنے بھی لگے۔ نمبر ۱۰ تو ابھی دور ہے۔"

لالی نے کمرہ نمبر ۱۰ کی جانب دیکھا' وہ طویل غلام گردش کے دوسرے سرے پر تھا۔

"میں ادھر کے ۸ چکر لگا چکا ہوں۔ یہ نواں ہے۔"

حمید نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں ذرا دیر میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔" اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ لالی کی جانب ذرا سا جھکا' آہستہ سے پوچھا۔ "دس نمبر میں کون ہے جی؟"

"میں تو جی اتنا جانتا ہوں' اس میں تمہاری گھر والی نہیں ہے۔"

"اتنا تو میں نوں بھی پتہ ہے۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ حمید بھی خاموش رہا۔ دونوں غلام گردش میں چلنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے کمرہ نمبر ۲ کو دیکھا۔ اس میں امینہ تھی جس کا انگ انگ چھلکتا تھا۔ مدھماتی آنکھیں شب خون مارتی تھیں۔ پیٹ ناف سے نیچے تک کھلا تھا' پیٹھ نشیب میں دور تک برہنہ تھی۔ امینہ اب ہمدانی کے پہلو میں تھی۔ اس کا شوہر محکمہ آباد کاری کا بڑا افسر تھا اور مالتھس کے نظریے کی بنیاد پر آبادی کم کرنے کا فلسفہ بگھارتا تھا۔ وہ اس وقت کمرہ نمبر ۵ میں ڈاکٹر بٹ کی بیوی ماہ رخ کے ساتھ تھا۔ لالی نے گہری سانس بھری اور آگے بڑھتا گیا۔ حمید لکھوں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ توند سے پھسلتی ہوئی پتلون بار بار درست کر رہا تھا۔

لالی جس کمرے کے سامنے سے گزرتا' اس کے متعلق سوچتا کہ بند دروازے کے پیچھے کون کس کے ساتھ ہے۔ حمید نے چلتے چلتے ایک بار پھر سرگوشی کی۔

"یار! بتاؤ تو سہی' آج اپنے حصے میں کون آئی ہے؟"

لالی نے اس کی بات نظرانداز کر کے دریافت کیا۔ "سیٹھ حمید! تم بشیرے کو جانتے ہو؟"

"جانتا تو ہوں۔" حمید نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "پر یہ نہیں جانتا کہ وہ دھندا کیا کرتا ہے؟"

"میں جانتا ہوں۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "وہ ڈریوروں کے ساتھ گھر سے بھاگنے والی کڑیاں برآمد کرنے کا دھندا کرتا ہے۔"

سیٹھ حمید مگوں اس کی بات سن کر بہت سٹ پٹایا۔ "کیا بشیرے نے تم کو یہ بات بھی بتائی تھی؟"

اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "لگتا ہے، تم بھی پولیس میں رہ چکے ہو۔" اس نے کچھ رک کے کہا۔ "چلو، یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔" اس نے کوٹ کی جیب سے نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ نکالا اور اسے کھولتے ہوئے آنکھ ماری۔ "کچھ رشوت وشوت لے لو۔ یہ بتادو کہ کمرے میں کون ہے؟"

"ایں دیں گلاں نہ کرو۔ سیٹھ! جو بھی ہوگی، تمہارے جوڑ کی ہوگی۔"

مگر حمید باز نہ آیا، جلدی سے بولا۔ "بات یہ ہے جی۔ آج کی سپنس نائٹ کے لیے میں بہت شاندار تحفہ لایا ہوں۔ ہوا یوں کہ سویرے ہی سویرے اپنے شاہ جی آگئے۔ بہت وڈے بزرگ ہیں۔ کیا بتاؤں، کیا تاثیر ہے ان کی زبان میں۔ سٹے کا بھاؤ جب بھی بتایا، ٹھیک ہی نکلا۔ آئے تو دیر تک میرا متھا تکتے رہے۔ کہنے لگے 'حمیدے! اج تین نوں کوئی بہت شاندار چیز ملنے والی ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اب میں یہی خوش خبری تم سے سننا چاہتا ہوں۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے چلتا رہا۔ حمید مگوں کو قرار نہ آیا۔

"اتنا تو بتادو راحیلہ چاؤلہ تو نہیں ہے؟"

"پتہ نہیں، وہ بھی ہوسکتی ہے۔" لالی نے اس دفعہ بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ نمبر ۱۰ میں نوشابہ ہے۔ دل کش و دل آرا نوشابہ، جس کی جوانی کافوری شمع کے مانند دھیرے دھیرے پگھل رہی تھی۔ لالی نے نظریں موڑ کر حمید مگوں کو دیکھا۔ اس کا جسم خاصا بے ڈول تھا۔ ناک نقشہ بھی موٹا موٹا تھا۔ سر پر بال کم تھے۔ اندر سے جلد صاف نظر آتی تھی۔ لالی کو نوشابہ پر بڑا ترس آیا۔ وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا اور خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ آخر کمرہ نمبر ۱۰ آگیا۔ لالی نے کہا۔ "لو جی! تمہارا کمرہ آگیا۔" یہ کہتے ہوئے لالی کمرے کی جانب مڑا۔ لیکن حمید مگوں اس کے ساتھ نہیں بڑھا۔ وہ دروازے کے سامنے رکھے ہوئے نرم نرم صوفے پر بیٹھ گیا۔ لالی نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ حمید نے اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ لالی اس کے پاس چلا گیا۔ حمید نے کوٹ کی جیب سے چھوٹا سا خوش نما کنٹر نکالا، اس کا ڈھکنا کھولا، مسکرایا۔ آنکھ مار کے رنڈی بازوں کی طرح بولا۔ "ذرا گرم ہو جاؤں جی۔ تم دروازہ کھول کر دیکھو، اندر کون ہے۔" اس نے کنٹر منہ سے لگایا اور چند گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر کنٹر لالی کی طرف بڑھا دیا۔

"بزدار صاحب! تھوڑی سی تم بھی لگالو۔ بہت سپیشل چیز ہے۔"

لالی نے انکار نہیں کیا۔ کنٹر اس کے ہاتھ سے لیا اور غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ بہت تیز شراب تھی۔ منہ کانوں تک جھن جھنا اٹھا۔ حلق جلنے لگا۔ لالی نے کنٹر شیخ حمید کو واپس کیا اور آگے بڑھ کے کمرے کے بند دروازے پر پہنچا۔ تالے میں کنجی ڈالی اور چند لمحے تک خواہ مخواہ اسے ادھر ادھر گھماتا رہا۔ آخر اس نے تالا کھول دیا۔ مڑ کر حمید کو دیکھا۔ حمید کھلا ہوا کنٹر ہاتھ میں دبائے اپنی گول گول آنکھوں سے لالی کو تک رہا تھا۔ لالی کو وہ بالکل الو کا پٹھا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ شیخ حمید مگوں نے بیل کی طرح گردن ہلا کر انتظار کرنے کی ہامی بھرلی۔

☆

لالی نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا، اندر گیا اور دروازہ بند کرلیا۔ آگے ایک اور پردہ پڑا تھا۔ لالی نے پردہ سرکا کے اندر جھانکا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں پیڈسٹل لیمپ روشن تھا۔ اس کے سرپوش سے گہری سرخ سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ دروازوں کے پردے بھی سرخ تھے۔ فرش کا قالین بھی سرخ تھا۔ کمرے کی ہر چیز سرخ تھی یا لیمپ کی روشنی میں سرخ نظر آرہی تھی۔ وسط میں جدید طرز کی نہایت نفیس مسہری تھی۔ جھلکتے ہوئے اجلے اجلے بستر پر گلاب کے سرخ سرخ پھول بکھرے تھے۔ مسہری کے سرہانے موتے اور چنبیلی کے ہار جھول رہے تھے۔ کمرے میں ہر طرف بھینی بھینی خوشبو پھیلی تھی

لالی پردہ ہٹا کر کمرے کے اندر پہنچ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے حجلہ عروسی میں آگیا ہو۔ مگر حجلہ عروسی سے دلہن غائب تھی۔ وہ ہکا بکا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شیخ حمید مگوں کی "۱۰ سپیشل" آہستہ آہستہ رنگ دکھا رہی تھی۔ لالی کی نظروں میں سہانے خوابوں کے دھندلکے منڈلانے لگے۔ چند لمحوں بعد بغلی دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ نوشابہ دروازے سے مسکراتی ہوئی نکلی۔ اس کے گلے میں تازہ پھولوں کا گجرا تھا۔ ہاتھ میں بھی گجرا لٹک رہا تھا۔ اس کا آب ناک گلابی چہرہ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی میک اپ کیا ہے۔ آنکھوں میں گہرا کاجل، ہونٹوں پر سرخی، پشت پر مہکتا جوڑا، جوڑے میں موتے کی کلیوں کا ہار گندھا ہوا اور پیشانی پر قمقمے کے مانند بڑی سی جگمگاتی بندیا۔

وہ جنوبی ہند کے قدیم مندروں میں رقص کرنے والی دیوداسیوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھی۔ سینے پر کلابتو کے جھلملاتے دائرے بناتی مختصر چولی تھی۔ ناف سے نیچے بندھی ہوئی زر۔ بفت کی گہری نارنجی ساڑھی۔ ساڑھی کا ایک پلو لانگ لگا کر پیچھے اڑس لیا گیا تھا۔ دوسرا پلو پنکھے کی طرح آگے

جھول رہا تھا۔ اس لباس میں اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اوپر تک کھلی ہوئی تھیں۔ چولی کے سوا اوپر کا دھڑ بالکل برہنہ تھا۔ دونوں ہاتھ بھی برہنہ تھے۔ ان پر صرف پھولوں کے بازو بند تھے۔ کانوں میں چمپا کے اجلے اجلے پھول تھے۔ نوشابہ کی یہ سج دھج دیکھ کر لالی کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو گئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سانس تیز ہو گئی۔

لالی کو دیکھتے ہی نوشابہ کے ہونٹوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ بجھ گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم؟ تم یہاں کیسے آ گئے؟"

لالی مسکرانے لگا۔ "بس آ گیا جی۔"

وہ غصے سے تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "کیا مطلب؟"

لالی مسکراتا رہا۔ "مطلب یہ کہ جی' یہ کمرہ مجھے الاٹ ہو گیا ہے۔"

"ہش؟" وہ جھنجلا کر بولی۔ "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

"اس میں دماغ خراب ہونے کی کون سی بات ہے۔" اس نے نوشابہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈھٹائی سے کہا۔ "یہ امپائر کا فیصلہ ہے اور اتنا تو تمہیں جانتی ہی ہو کہ امپائر کے فیصلے کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔"

"بکواس بند کرو اور فوراً کمرے سے نکل جاؤ۔"

لالی ڈھیٹ بنا کھڑا رہا۔ وہ چند لمحوں تک اسے گھورتی رہی پھر اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم چاہتے کیا ہو۔"

"چاہنا واہنا کیا ہے جی؟" لالی بچوں کی طرح مچل گیا۔ "یہ کمرہ مجھے کیوں الاٹ نہیں ہو سکتا؟" اس نے مسکرا کر نوشابہ کو چھیڑنے کے لیے جھوٹ بولا۔ "اپنی بھی گھر والی ہے' تین بچے ہیں۔ میرا مطلب ہے......"

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "میں تمہارا مطلب خوب سمجھتی ہوں۔" اس نے سیدھی سیدھی دھمکی دی۔ "جیل جانا چاہتے ہو؟"

لالی مرعوب نہیں ہوا' اڑیل ٹٹو کی طرح اڑا رہا۔ "جیل تو جانا ہی ہے' پہلے بھی تین بار جا چکا ہوں۔ چوتھی بار تم بھجوا دو۔ چلو' اس دفعہ تمہارے نام پر جیل کاٹ لوں گا۔"

نوشابہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی' پھر اس نے ذرا نرم لہجے میں لالی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو' ضد مت کرو۔ اس کھیل میں تم شریک نہیں ہو سکتے۔ اس کا ایک مقررہ قاعدہ اور مقررہ قانون ہے۔"

لالی نے جل کر طنز کیا۔ "قاعدہ تو میں نے پوری طرح دیکھ لیا۔ رہ گیا قانون تو ساتھ والے کمروں میں قانون کے رکھوالے خود قانون کی ایسی تیسی کر رہے ہیں۔ آج اتفاق سے وہ نہیں ہیں جو کبھی انصاف کی ترازو میں قانون تولا کرتے تھے۔ اندھیرے ہال میں بیٹھ کر قانون کی ایسی تیسی کرنے والوں کے لیے لازمی نکالتے تھے۔ غلط کہہ رہا ہوں؟"

نوشابہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا' دھیرے دھیرے مسہری کے قریب گئی اور سرہانے کی طرف پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا اور گردن کو ذرا سا خم دے کر بولی۔ "میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں یہاں آنے کی جرات کیسے ہوئی؟ تم... تم۔" اس نے غصے سے دانت پیسے' آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

لالی اس کا غصہ نظر انداز کر کے بولا۔ "میں اتنا بدصورت تو نہیں ہوں۔ یہاں مجھ سے بھی زیادہ بدصورت بندے موجود ہیں۔ ایک تو باہر ہی بیٹھا ہے۔"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں۔ میں سب کو جانتی ہوں۔ انھیں منتخب کرنے والوں میں کلب کی دوسری ممبر عورتوں کے ساتھ میں بھی شریک تھی۔" اس کے لہجے میں ٹھہراؤ آ گیا۔ "اگر سارے مرد اور ساری عورتیں خوبصورت ہی ہوتیں تو پھر قرعہ اندازی کیوں ہوتی؟ اس کھیل میں کوئی رومانس نہ ہوتا۔ کوئی بے قراری' کوئی سسپنس نہ ہوتا۔ مگر تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتے۔"

"سمجھنا چاہتا بھی نہیں۔"

نوشابہ نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ "تم جاؤ گے نہیں یہاں سے؟"

شیخ حمید گلوں کی شراب دو آتشہ کا تند و تیز نشہ کام کرتا رہا۔ لالی اور بے باک ہو گیا۔ "ارادہ تو نہیں ہے۔ یہ لال لال روشنی' یہ مہکتے پھول' یہ بھینی بھینی خوشبو اور تم۔ تمہاری تو بات ہی کیا ہے۔ ایسے لشکارے مارتی البیلی کہاں نظر آتی ہے؟" اس کی آنکھیں اس طرح جھلملانے لگیں جیسے شیشہ ٹوٹ کر بکھر جائے۔ "یہاں آ کر بھی کوئی واپس جا سکتا ہے۔" اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی کنجی دکھاتے ہوئے کہا۔

"کمرے کی چابی تو اپنے ہی پاس ہے نا۔"

"تم سمجھتے ہو' میں یہاں اکیلی ہوں اور کمرے کا دروازہ بند ہے۔" نوشابہ نے غصے سے آنکھیں نکال کر خبردار کیا۔ "تم نرے احمق ہو' الو ہو۔" اس نے ہاتھ بڑھایا اور مسہری کے سرہانے لگا ہوا سوئچ دکھاتے ہوئے بولی۔ "یہ سوئچ دیکھ رہے ہو۔ اسے دباتے ہی خطرے کا الارم بجنے لگے گا۔ ذرا دیر میں کمرے کا دروازہ بھی ڈپلی کیٹ چابی سے کھل جائے گا۔ اور تم پکڑ لیے جاؤ گے۔ مگر تم جیل

نہیں جاؤ گے۔ یہ جو نیچے نہر بہہ رہی ہے' تمہاری لاش ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے کنارے دبا دی جائے گی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی کہ ایک مغرور قیدی کا کیا حشر ہوا۔ تم جانتے ہو' اس ضلعے کی حکومت ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو اس ضلعے کا سب سے بڑا حاکم ڈپٹی کمشنر ہے اور میں اس کی بیوی ہوں۔"

"وہ کیا کرے گا؟" لالی بدستور مسکراتا رہا۔ "وہ تو خود کسی دوسرے کی گھر والی کو لیے بیٹھا ہے۔ پر میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ کون ہے۔"

"میں یہ بات تم سے پوچھنا بھی نہیں چاہتی۔" اس نے سوئچ پر انگلی رکھ دی۔ "میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ دبا دوں یہ سوئچ؟ بولو' کیا کہتے ہو؟"

نشے کا زوردار ریلا آیا۔ لالی اس ریلے میں بہہ گیا۔ اس نے نشے سے جھوم کر نوشابہ کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "دبا دو۔ موت اسی طرح آئی ہے تو یوں ہی سہی۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "پر ایک شرط ہے۔ تم اپنے سوہنے' سوہنے ہاتھوں سے میرے ٹونے کرنا۔ ہائے بھی نہیں کروں گا۔"

وہ جل کر بولی۔ "کم بخت! تو میرا عاشق کب سے بن گیا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی گل ہے۔" لالی نے اس آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "یہ اتنا بہت سا سنگھار تم نے کس کے لیے کیا ہے۔ وہ میں کیوں نہیں ہو سکتا؟"

وہ آہستہ آہستہ نوشابہ کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے' چہرے پر وحشت طاری تھی۔ نوشابہ نے اسے آگے بڑھتے دیکھا تو زور سے ڈانٹا۔ "رک جاؤ۔" لالی اس کی ڈانٹ سن کر چونک پڑا' جھجک کر کھڑا ہو گیا۔ نوشابہ نے تلملا کر کہا۔ "کیا تم یہ چاہتے ہو میں یہ سنگھار نوچ کر پھینک دوں؟" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "لو یہ بھی دیکھ لو۔" اس نے گردن میں پڑا ہوا گجرا پکڑا اور غصے سے جھٹکا دے کر توڑ ڈالا۔ گجرے کے پھول دور تک بکھر گئے۔ نوشابہ نے فرش پر پڑے ہوئے پھول مسلتے ہوئے بازو بند کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

لالی یہ وار جھیل نہ سکا۔ گھبرا کے بولا۔ "نہ' نہ ایسا نہ کرو۔"

نوشابہ کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے خوں خوار نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "اگر تم یہ نہیں چاہتے تو فوراً کمرے سے نکل جاؤ۔"

"ناراض کیوں ہوتی ہو۔" اس دفعہ لالی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم کہتی ہو تو چلا جاؤں گا۔" وہ جھینپ کے مڑا۔ پھر ٹھٹکا۔ "جانے سے پہلے اتنا ضرور پوچھوں گا۔ کیا میں صرف اس لیے تمہارے اس ناٹک میں شریک نہیں ہو سکتا کہ میں چھوٹا اور غریب بندہ ہوں؟" اس کے چہرے پر

ہ کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا۔

"یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔" نوشابہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "مگر اور بھی بہت سی باتیں ہیں جنھیں تم نہیں جانتے۔" وہ ذرا رکی۔ "یوں سمجھ لو کہ یہ چند شادی شدہ مردوں اور عورتوں کا خفیہ کلب ہے۔ اس کا نام پولی نیسین کلب ہے۔"

"یہ کیا نام ہوا جی؟"

وہ بیزاری سے بولی۔ "کیا کرو گے جان کر۔ تم کبھی اس کلب کے ممبر نہیں بن سکتے۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں' پر جب بتایا ہے تو یہ گل بھی بتا دو۔"

نوشابہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ "پولی نیسین' جنوبی سمندروں کے علاقے پولی نیسیا کے باشندوں کو کہتے ہیں۔ ان میں مختلف قبائل ہیں۔ تقریباً تین سو پچاس جزیروں میں صدیوں سے آباد ہیں۔ ان جزیروں میں نیوزی لینڈ' ایسٹر آئی لینڈ' ہوائی اور تاہتی بھی شامل ہیں۔ پولی نیسینوں کے نزدیک عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ایسی ہی عام بات ہے جیسے کھانا کھانا' پانی پینا۔ کوئی بھی عورت جب چاہے کسی بھی مرد سے تعلقات قائم کر سکتی ہے۔ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی۔ گانے' رقص کرنے' تیراکی اور مچھلی کا شکار کرنے کی طرح وہ اسے بھی تفریح یا کھیل سمجھتے ہیں۔ بلکہ تاڑ اور ناریل کے کنج میں بعض عورتیں گھر بنا کر رہتی ہیں اور جو مرد انھیں پسند آ جاتا ہے' اس کے ساتھ جب تک جی چاہتا ہے' رہتی ہیں۔ ایسے گھر چلے ٹر ہاؤس کہلاتے ہیں۔ مگر اب یہ باتیں رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہیں۔"

"وہاں ختم ہو رہی ہیں اور یہاں شروع ہو رہی ہیں۔"

"یہ بات نہیں۔" نوشابہ نے لالی کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تم مسٹر سلیمان سے تو مل ہی چکے ہو۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ رائل انڈین نیوی میں افسر تھے۔ جنگ کے دوران ان کا جہاز جاپانی ایئر فورس کے حملوں سے بھاگ کر جزائر مارکو ئیس کے ساحلوں پر لنگر انداز ہو گیا تھا۔ یہ جزائر بھی پولینیسیا کا حصہ ہیں۔ سلیمان وہاں دو ہفتے تک پولی نیسین باشندوں کے ساتھ ٹھہرے رہے۔ سچ پوچھو تو یہ کلب انھوں نے ہی قائم کیا' اس کا نام پولی نیسین کلب اور اس عمارت کا نام چلے ٹر ہاؤس رکھا۔ شروع میں چار جوڑے اس کے ممبر تھے۔ اب آٹھ ہیں۔ انھیں سب نے مل کر منتخب کیا ہے۔ سبھی نے مل جل کر اس کلب کے اصول اور قاعدے بنائے ہیں۔ رازداری کا باقاعدہ حلف اٹھایا ہے۔" اس نے چند لمحے توقف کیا۔ "ویسے تو میزبان راحیلہ ہے مگر ہر ممبر پانچ سو روپے مہینہ چندہ دیتا ہے۔ ممبر شپ کی فیس دو ہزار روپے ہے۔ وہ ماہانہ چندے سے الگ ہے۔ یہ جشن

جسے نائٹ آف دی گریٹ سینس کہا جاتا ہے' مہینے میں صرف ایک رات منایا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ مقرر ہوتی ہے اور پہلے سے باقاعدہ تیاریاں کی جاتی ہیں۔"

لالی خاموش کھڑا نوشابہ کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتی رہی۔ "اس رات کے لیے ہر عورت اپنی پسند کا لباس منتخب کرتی ہے۔ ایسا لباس ہر کمرے کے ڈریسنگ روم میں موجود رہتا ہے۔ اگر پہلے سے کاسٹیوم اسٹور میں نہیں ہوتا تو مہیا کر دیا جاتا ہے۔ ہار پھول اور سنگھار کا سارا سامان بھی یہاں موجود رہتا ہے۔ آج کی رات ہر عورت یہاں نئے سرے سے دلہن بنتی ہے۔" نوشابہ نے ہاتھ اٹھا کر ادھر ادھر لہرایا۔

"دیکھ رہے ہو' یہ سب کیا ہے۔ کیا تمہیں یہ پہلی رات کی دلہن کا کمرہ نہیں نظر آتا۔ ویسے آج کی رات عام طور پر عورتیں پولی نیسین لباس پہنتی ہیں۔ یہ لباس باریک جھالر نما ہوتا ہے اور کمر سے گھٹنوں تک ہوتا ہے۔ سینہ بالکل کھلا ہوتا ہے۔ مگر میں نے اپنے لیے آج مختلف لباس چنا تھا۔" وہ کسی قدر افسردہ ہو گئی' دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "تم بڑے سنگدل ہو۔ تم نے آج کی رات کا سارا حسن' سارا سہاگ اجاڑ دیا۔ میری ساری امنگیں' سارے ولولے خاک میں ملا دیے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میری خوشیاں چھین کر تمہیں کیا ملا؟"

لالی اس کی باتوں سے متاثر ہو کر صفائی پیش کرنے لگا۔ "بات یہ ہے جی! مجھے تم پر بڑا ترس آیا۔ تم اتنی سوہنی ہو' اتنی کہ میں کیا بتاؤں اور وہ.....وہ۔"

نوشابہ اس کی بات کاٹ کر بے رخی سے بولی۔ "وہ کوئی بھی ہے' اسے یہاں بھیج دو اور خدا کے لیے مجھ پر مزید ترس نہ کھاؤ۔"

لالی چپ چاپ دروازہ کھول کر کمرے سے چلا گیا۔ شیخ حمید گھوں صوفے پر پریشان پریشان بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی تیکھے لہجے میں بولا۔ "بہت دیر لگا دی جی؟"

"وہ ڈریسنگ روم میں بناؤ سنگھار کر رہی تھی۔ بہت دیر بعد نکلی۔"

"اوہ' یہ بات ہے۔ ٹھیک کہہ رہے ہو جی تم۔ کبھی کبھی تو سنگھار کرنے میں یہ زنانیاں گھنٹہ گھنٹہ بھر لگا دیتی ہیں۔" حمید گھوں کھڑا ہو گیا اور کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے آنکھ مار کر بولا۔ "بزدار صاحب' اب تو بتا دو' اندر کون ہے؟"

لالی نے نظر بھر کر اس کا چہرہ دیکھا' پھر جذباتی ہو گیا۔ "سیٹھ حمید! تو سچ مچ قسمت کا دھنی ہے۔ مٹی کو ہاتھ لگا دے تو سونا بن جائے۔ تو کیوں گھبراتا ہے۔ تیری قسمت تو جاگ رہی ہے۔ جا' اندر جا کر دیکھ لے۔ دروازہ کھلا ہے۔ تجھے کوئی روکنے والا نہیں۔"

حمید گھوں بدحواس ہو گیا۔ شراب کا خالی کنٹر لالی کے ہاتھ میں تھما کے تیزی سے آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

لالی خواب ناک نظروں سے چپ چاپ دروازہ تکتا رہا۔ چند لمحوں بعد دروازہ آہستہ سے بند ہو گیا۔ لالی نے گہری سانس بھری اور نڈھال ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ گم صم بیٹھا رہا۔ اس نے خالی کنٹر اپنے ہاتھ میں دیکھا۔ سخت تاؤ آیا۔ جی چاہا کہ شیشے کا کنٹر کمرے کے دروازے پر زور سے دے مارے اور وہ چھناکے کے ساتھ ٹوٹ کر بکھر جائے۔ مگر لالی ایسا نہ کر سکا۔ کنٹر صوفے پر ایک طرف رکھ کے اٹھا اور آہستہ آہستہ زینے کی طرف بڑھنے لگا۔ غلام گردش کا نصف سے زیادہ راستہ طے کیا۔ پھر کچھ سوچ کر لوٹ آیا۔

کمرہ نمبر ۱۰ کی کنجی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کمرے کے قریب پہنچ کر تالا کھولا اور دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے سرکا کر اندر چلا گیا۔ پردہ ہٹا کے سامنے نظر ڈالی' زور کا جھٹکا لگا۔ جسم میں بجلی کا کرنٹ سا دوڑ گیا۔ مسہری پر حمید گھوں بیٹھا تھا۔ نوشابہ کی بانہیں اس کے گلے میں پڑی تھیں۔ وہ اس کے زانو پر لیٹی تھی۔ حمید کے گلے میں پھولوں کا گجرا تھا۔ اور نوشابہ کے گلے میں سفید موتیوں کا قیمتی ست لڑا ہار تھا۔ اس کی چولی اتر چکی تھی۔ سینہ بالکل برہنہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں نہایت والہانہ انداز سے جھانک رہے تھے۔ ٹھیک اس مجسمے کے مانند جو کمرے کے باہر محراب کے نیچے ایک گوشے میں رکھا تھا۔

نوشابہ نے آہٹ سنی۔ پلٹ کر لالی کو دیکھا اور غصے سے پھٹ پڑی۔ "تو اپنے کمینے پن سے باز نہیں آئے گا؟"

لالی گھبرا گیا۔ "میں چابی دینے آیا ہوں۔ چابی میرے ہی پاس رہ گئی تھی۔"

نوشابہ نے ڈپٹ کر کہا۔ "ادھر میز پر ڈال دے اور فوراً کمرے سے نکل جا۔"

لالی نظر جھکائے آہستہ آہستہ میز کے پاس گیا۔ میز پر شیخ حمید کے اترے ہوئے کپڑے رکھے تھے۔ لالی دونوں کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے گھوں کے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں اور نہایت صفائی سے نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ پار کر دیا۔ کنجی میز پر رکھ کر وہ دروازے کی جانب چلا۔ پیچھے سے حمید کی آواز ابھری۔

"دروازہ بند کر دینا جی۔"

لالی کو اس کا لہجہ نہایت تحقیر آمیز معلوم ہوا۔ اس نے چلتے چلتے پلٹ کر دونوں کی جانب دیکھا۔ نوشابہ کا ایک ہاتھ ابھی تک حمید کی گردن میں حمائل تھا۔ اس کے عریاں گلابی سینے پر موتیوں کا ہار

جگمگا رہا تھا۔ لالی کے دل کو شدید ٹھیس لگی۔ اس نے گلوں کو مخاطب کیا۔ "سیٹھ حمید! میں نے تیری جیب سے بٹوا نکال لیا ہے۔ تو مجھے رشوت دے رہا تھا نا' یہ رہا تیرا بٹوا۔" اس نے بٹوہ حمید کو دکھایا۔

حمید گلوں گھبرا گیا۔ "نہیں' نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ بٹوے میں پانچ ہزار سے بھی زیادہ روپے ہیں' تم اتنے روپے نہیں لے جاسکتے۔"

لالی نے ہنس کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ "حمیدے! تو بنئے کا بنیا ہی رہا۔ تیرے پاس ایسی بانکی تیکھی نیار چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ پنج ہزار کیا' اس کے لیے پنج لاکھ بھی کم ہیں۔ اگر یہ مانگے تو اس کے لیے سرکاٹ کے ہتھیلی پر رکھ کے پیش کردوں۔" اس کی نظریں نوشابہ کے چہرے پر جم گئیں۔ "آزما لے نوشابہ! فیر کبھی نہیں ملوں گا۔ چاہنے والے تو نے بہت دیکھے ہیں' مرنے والا بھی دیکھ لے۔" وہ نشے سے جھوم رہا تھا۔

نوشابہ کا منہ فق ہوگیا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے لالی کو دیکھا اور حمید کو مخاطب کرتے ہوئے گھبرا کر بولی۔ "اسے نہ روکو حمید۔ جانے دو اسے۔"

لالی مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور بوجھل قدموں سے چلنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے غلام گردش میں جلتی ہوئی تمام روشنیاں بجھ گئیں اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ اس نے غلام گردش طے کی' زینے سے نیچے اترا اور چند لمحے گم صم کھڑا رہا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا قرعہ اندازی والے ہال میں داخل ہوگیا۔ ہال میں کوئی نہیں تھا۔ تمام نشستیں خالی تھیں۔ شمع دان میں موم بتی ابھی تک روشن تھی اور پگھل پگھل کر چوتھائی سے بھی کم رہ گئی تھی۔

لالی تھکا ہوا امپائر والی اونچی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سامنے دیوار پر لگا ہوا کلاک دیکھا۔ ایک بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ اس نے نمبروں والے خانوں پر نظر ڈالی' دو خانے خالی تھے۔ ان میں کوئی ٹوکن نہیں تھا۔ لالی نے درمیانی صندوقچی کا بالائی ڈھکنا کھولا۔ ہاتھ اندر ڈالا۔ دو ٹوکن ابھی صندوقچی میں موجود تھے۔ اس نے ایک اٹھالیا اور دھندلی روشنی میں ہتھیلی پر رکھ کے دیکھا۔ اس پر ۱۰ کا ہندسہ لکھا تھا۔ یہ نوشابہ کے کمرے کا نمبر تھا۔ نوشابہ جو حمید گلوں کی گردن میں محبت سے بانہیں ڈالے لیٹی تھی۔ لالی بجھی بجھی نظروں سے ٹوکن تکتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری اور آنکھیں بند کرلیں۔

دو گرم گرم آنسو اس کی پلکوں میں الجھ کر رہ گئے۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ ٹوکن نمبر ۱۰ صندوقچی میں ڈال دیا اور دوسرے ٹوکن بھی خانوں سے

اٹھا اٹھا کر صندوقچی میں ڈالنے لگا۔ جب وہ سب ٹوکن ڈال چکا تو صندوقچی کا ڈھکنا بند کردیا۔ اس نے ناموں والے خانے دیکھے۔ ان میں سات ٹوکن موجود تھے۔ اس نے ایک ٹوکن اٹھالیا' اس پر شیخ حمید گلوں لکھا تھا۔ لالی نے نفرت سے ٹوکن دیکھا۔ ہاتھ اٹھایا۔ چاہا کہ اسے دروازے سے باہر پھینک دے' مگر کچھ سوچ کر ہاتھ روک لیا۔ دوسرے ہاتھ سے پتلون کی جیب ٹٹولی جیب میں بٹوہ موجود تھا۔ لالی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

☆

ہال میں چاپ ابھری۔ لالی نے چونک کر دیکھا۔ ہمدانی اندھیرے سے نکل کے یکایک اس کے سامنے آگیا۔ وہ مسکراتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا۔ جھٹ لالی کا ہاتھ پکڑ کے جوش سے چوما۔

"یار! تو تو زبردست کلاکار ہے۔ بہت اونچی چیز ہے۔ مان گئے تجھے۔"

"مجھے تو یہ خوشی ہے جی' آپ کا کام بن گیا۔" لالی احتراماً کھڑا ہوگیا۔ ہمدانی نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے بٹھادیا۔ وہ کھلنڈرے موڈ میں تھا۔ ہنس کر گویا ہوا۔ "یار بیٹھا رہ۔ تکلف وکلف چھوڑ۔" وہ اچک کر میز پر بے تکلفی سے بیٹھ گیا' ہلکا قہقہہ لگا کے بولا۔ "ایسا ویسا کام بنا ہے۔ نہ پوچھ' اپنے ساتھ کیا واردات گزری۔ جیسے ہی کمرے میں پہنچا' وہ ڈریسنگ روم کا دروزہ کھول کر باہر آئی۔ وہ کیا آئی۔ قیامت ہم رکاب آئی۔ امینہ پولی نیسین کے سوا قبیلے کی دوشیزاؤں کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ بال کھلے تھے۔ ایک کان کے اوپر بالوں میں سفید گلاب کا بڑا سا پھول لگا تھا۔ گلے میں نمپا کی کلیوں کا گجرا تھا۔ کمر سے گھٹنوں تک سنہرے ریشمی دھاگے میں پروئے ہوئے گل چاندنی کے پتوں کا لباس۔ یار! لباس کیا تھا' چلمن پڑی تھی اور سینہ کچے ناریل کی طرح بالکل عریاں۔" اس نے وارفتگی کے عالم میں لالی کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا۔ "اف' کیا گدرائی ہوئی عورت ہے امینہ۔ بانکی چتونوں کے کیا بان چلاتی ہے۔ ہائے' نہ پوچھو' ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے!" ہمدانی نے گہری سانس بھری اور آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

جس کو ہو زندگی عزیز' اس کی گلی میں جائے کیوں!

"یہ بات ہے جی' تو آپ چلے کیوں آئے؟"

"یار! یہ پوچھنے چلا آیا' بعد میں کوئی فوپا تو نہیں ہوا؟ میرا مطلب ہے' کسی قسم کی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں جی! سب کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہوا۔ اناڑی نہیں ہوں۔ برسوں لاٹری کھلاتا رہا ہوں۔"

"مگر یار تو نے تو کمال کردیا۔ ایسی ہاتھ کی صفائی دکھائی' میں تو دنگ رہ گیا۔" ہمدانی نے ہنستے

ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ ہم نے ایسا فول پروف سسٹم رکھا ہے کہ کسی ہیر پھر کی گنجائش ہی نہیں۔"

"میں نے تو جی آپ کے لیے دوبار ٹوکن نکالے اور دونوں ہی بار معاملہ الٹا گیا۔"

"دوبار؟" ہمدانی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کیا پہلا ٹوکن نوشابہ کے کمرے کا نہیں تھا؟"

"پہلا نہیں' دوسرا تھا۔ پہلا تو راحیلہ کے کمرے کا تھا۔"

"ارے مار دیا ظالم!" ہمدانی نے حیرت سے پلکیں پٹ پٹائیں۔ "تب تو یار! تو نے زبردست کام دکھایا۔" وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "اچھا' اب کام کی بات ہو جائے۔ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ وہ سالا ایس' پی تمہاری گھات میں ہے۔ تمام وقت بیٹھا تمہی کو گھورتا رہا۔ وہ ضرور اپنی کارگزاری دکھانے کی کوشش کرے گا۔ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ الہ آباد میں میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ وہ تو پیدائشی پولیس والا ہے۔ باپ بھی اس کا پولیس انسپکٹر تھا۔" اس نے مڑ کر کلاک کی جانب دیکھا۔ "یہ بتاؤ ایس پی مرزا کے ساتھ کمرے میں ہے کون؟"

لالی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "ساب! یہ بات نہیں بتاؤں گا' چاہے آپ ناراض ہو جائیں۔"

"ناراض واراض ہونے کی بات نہیں۔" ہمدانی نے مسکرا کر کہا۔ "میں تمہارے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ اگر مہ جبین یا راحیلہ اس کے پلے پڑ گئیں' تب تو سالا مارا گیا۔ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اجازت لے کر باہر آجائے تو تعجب کی بات نہیں۔ وہ بالکل کاٹھ کا الو ہے۔ البتہ اس کی جورو سائرہ بڑی کاٹنے کی عورت ہے۔ اس پر تو کبھی کبھی عاشق ہو جانے کو دل چاہتا ہے۔"

لالی نے بے چین ہو کر کہا۔ "تب تو جی' مجھے اب چلنا چاہئے۔"

"قادر آباد اسٹیشن تو تم اس وقت نہیں پہنچ سکتے۔ وہ تو بہت دور ہے' مگر تمہیں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہئے۔"

"آپ تو میرے ساتھ سٹیشن جائیں گے نہیں؟"

"یار! یہ ظلم نہ کرو' میں کیسے جا سکتا ہوں۔ آج تو وصل کی رات ہے۔" ہمدانی ہنس کر بولا۔ "تمہیں راستے کا بھی کچھ اتا پتا ہے؟"

"مجھے تو جی کچھ پتہ نہیں۔ یہ بھی نہیں ملوم' یہاں سے کون سا رستہ جاتا ہے۔"

"تم ایسا کرو۔ یہ جو نیچے نہر بہتی ہے' اسے پار کر کے دوسری طرف چلے جاؤ۔ میل سوا میل بعد

پکی سڑک آئے گی۔ وہ بڑی نہر تک جاتی ہے۔ نہر عبور کرنے کی ضرورت نہیں۔ کنارے کنارے چلے جاؤ۔ عارف والا روڈ آئے گی' اور آگے بڑھو گے تو پاک پتن روڈ آجائے گی۔ تم اس پر نہ جانا۔ آگے نکل جانا۔ قادر آباد کے نزدیک ہو جاؤ گے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "اس سڑک سے جاؤ گے جو سلیمان کے بنگلے کے سامنے سے گزرتی ہے تو یہ راستہ بھی لمبا ہے اور اگر ایس پی تمہاری تلاش میں نکل آیا تو راستے ہی میں دھر لے گا۔"

لالی جلدی جلدی ناموں کے ٹوکن خانے سے نکال کر بائیں ہاتھ کی صندوقچی میں ڈالنے لگا۔ اس نے ڈھکنا بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔

"چلو میں تمہیں یہاں سے تو اپنی حفاظت میں باہر نکال دوں۔ یہاں سے نکلنا بھی آسان کام نہیں۔ ہر طرف سخت پہرا ہے۔"

اس نے پھونک مار کر موم بتی بجھائی اور لالی کے ساتھ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا ہال سے باہر آگیا۔ دونوں ایک طویل غلام گردش میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے کہا۔ "ایک بات پوچھوں جی! آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟"

"پوچھو' ضرور پوچھو۔" ہمدانی نے ہلکا قہقہہ لگا کر کہا۔ "اس وقت تو تمہیں سات خون معاف ہیں۔"

"آپ کو جی' اس بات پر ذرا بھی برا نہیں لگتا کہ آپ کی گھر والی ساتھ والے کسی کمرے میں دوسرے مرد کے ساتھ سو رہی ہے؟"

"برا لگتا تو ہے۔" ہمدانی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "مگر اتنا زیادہ نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔"

"یہ بات سمجھ نہیں آئی جی!"

"یار! سیدھی سادی بات ہے۔ یہ تو تم نے سنا ہی ہو گا کہ پرائی عورت اور پرائی دولت سب کو بھی لگتی ہے۔ اسے اڑا لینے کو ہر ایک کا دل مچلتا ہے۔ تم نے کبھی سوچا' ایسا کیوں ہے؟" ہمدانی نے لالی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "مگر یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بتاؤ' تمہاری جورو درو ہے؟"

"وہ تو نہیں ہے جی۔" لالی نے انکار میں گردن ہلائی۔

"پھر تم کیسے سمجھ سکتے ہو۔" ہمدانی ہنسنے لگا۔ "ایک عدد جورو بیاہ کر لے آؤ۔ کبھی نہ کبھی تو تمہارا دل اس سے بھر ہی جائے گا۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ شروع میں عورت محبوبہ ہوتی ہے بیوی بن جاتی ہے۔ پھر ایسا وقت آتا ہے کہ محبوبہ اور بیوی ختم ہو جاتی ہے اور عورت صرف

بچوں کی ماں رہ جاتی ہے۔ جب وہ صرف بچوں کی ماں رہ جائے اور اس میں تمہارے لیے کوئی کشش، کوئی دلچسپی نہ رہے تو اس کا ایک عدد یار پیدا کردو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے؟"

"ساب، آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ جب اس کا یار پیدا ہوجائے گا تو وہ جوان اور خوبصورت ہونا شروع ہوجائے گی۔ بچوں کی ماں ایک دم محبوبہ بن جائے گی اور تم اس کے عاشق بن جاؤ گے۔ ہروقت اس کے یار سے اسے چھین لینے کے چکر میں رہو گے، اور جب وہ واپس ملتی نظر نہ آئے گی تو اس کے عشق میں ایسے پاگل دیوانے ہوجاؤ گے کہ اس کے یار کو قتل کردو گے۔ بلکہ اسے بھی قتل کردو گے اور ٹھنڈے ٹھنڈے جاکر پھانسی کے پھندے سے لٹک جاؤ گے۔"

لالی قائل نہ ہوا۔ "ساب! عزت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"یار! یہ عزت وزت سب بکواس ہے۔" ہمدانی بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ "چلو، تمہاری بات مان لی۔ جب تمہاری جورو صرف بچوں کی ماں رہ جائے اور تمہارا دل اس سے اکتا جائے تو اسے طلاق دے دینا۔ پھر تو عزت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ طلاق کے بعد وہ کسی اور سے نکاح پڑھا کر بیٹھ جائے گی۔ تم اسے دوسرے کے پہلو میں دیکھو گے تو دل میں کڑھو گے۔ اپنی آگ میں خود جلو گے۔ اس سے چھپ چھپ کر ملنے کی کوشش کرو گے۔ اس کی منت سماجت کرو گے کہ پھر تمہارے قبضے میں آجائے اور اگر وہ راضی نہ ہوئی یا اس کا شوہر آمادہ نہ ہوا تو تم شوہر کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کرو گے اور وہ تمہیں اپنی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔"

"ساب! کیا ایسا ہوتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہوتا؟ میرے سامنے روز ایسے مقدمات پیش ہوتے ہیں اور اکثر اس وقت پیش ہوتے ہیں جب کسی کا قتل ہوجاتا ہے۔ اسی لیے تو فساد کی جڑ زر اور زمین کے ساتھ زن کو بھی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ ہر قتل کے پیچھے کوئی عورت ہوتی ہے۔" ہمدانی بولتا رہا۔ "یار! بات صرف اتنی ہے کہ ہم نے اپنی جوروؤں کے ایک چھوڑ، چھ سات یار پیدا کردیے ہیں۔ جب سے ان کے یار پیدا ہوئے ہیں، وہ روز بہ روز زیادہ جوان اور زیادہ خوبصورت ہوتی جا رہی ہیں۔ ادھر ہم رقابت کی آگ میں اندر ہی اندر سلگتے ہیں اور اپنی اپنی جوروؤں کے عشق میں دیوانے رہتے ہیں۔ کل صبح سے عشق کا شدید دورہ پڑے گا۔ سچ پوچھو تو ابھی سے ہولے ہولے ابھرنے لگا ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اس یاری آشنائی کا فائدہ یہ ہے کہ اپنی جورو بھی ہاتھ سے نہیں جاتی اور پرائی جورو کا ذائقہ بھی چکھنے کو مل جاتا ہے۔ نہ اغوا کرنے یا پھانسنے کا چکر۔ نہ

نئی شادی رچانے کا جھنجھٹ۔ اس میں عجب مزہ، عجب نشہ ہے۔ میاں بھی خوش، بیوی بھی خوش۔" اس نے مسکراتے ہوئے مڑ کر چلے ڑرباؤس کی دوسری منزل پر جانے والے زینے کی جانب نظر ڈالی۔ "اوپر کے کسی کمرے میں جاکر دیکھو۔ یہی عورتیں جو چند مہینے پہلے باسی نماڑوں کی طرح بھدی اور پلپلی لگتی تھیں، اس وقت ایسے جوبن پر ہیں کہ کوہ قاف کی پریوں کو بھی مات کر رہی ہیں۔"

لالی کسی قدر پریشان ہوگیا۔ "ساب ایسا کہاں ہوتا ہے؟ ہو بھی نہیں سکتا۔"

"ہو کیوں نہیں سکتا۔" ہمدانی نے بے نیازی سے کہا۔ "ٹنڈرا کے رہنے والے اسکیمو بڑی خوشی سے اپنی بیویوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتے ہیں اور جب تک جی چاہتا ہے، ساتھ رہتے ہیں۔ نہ بیوی کو اعتراض ہوتا ہے نہ شوہر کو۔ ان کے نزدیک یہ کوئی عیب نہیں۔ جب جی چاہا، جس وقت جی چاہا، آپس میں بیویاں بدل لیں۔ پولی نیسین قبائل تو نہ صرف بیویوں کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں بلکہ گھر میں مہمان آئے تو میزبان خوشی سے اپنی بیوی رات کے وقت مہمان کو پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں، جس کا جس وقت جی چاہا، دوسرے کی جورو کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ مگر اس کے لیے ایک دوسرے کی رضامندی ضروری ہے۔"

"ساب! میں نے تو ایسی بات نہ دیکھی، نہ سنی۔"

"تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔" ہمدانی کھل کھلا کر ہنسا، چند لمحے خاموش رہا پھر کسی قدر سنجیدہ ہوکر بولا۔ "یار! راز کی بات یہ ہے کہ ڈپٹی کمشنری خوب صورت بیوی کے بغیر نہیں چلتی۔ خصوصاً انگریز کے راج میں تو چل ہی نہیں سکتی تھی۔ انگریزوں نے اپنے آئی سی ایس افسروں کے لیے خوبصورت بیوی رکھنا، خوب صورت انگریزی بولنا اور خوب صورت انگریزی لکھنا بنیادی شرط رکھی تھی اور یہ بنیادی شرط آج بھی نہیں بدلی۔ کیا سمجھے؟"

لالی نے معصومیت سے پوچھا۔ "تو کیا سارے ڈپٹی کمشنر اور بڑے افسر یہی دھندا کرتے ہیں؟"

"نہیں یار!" ہمدانی نے تردید کی۔ "بہت سے تو بالکل ہی صوفی ہیں۔ رؤف اسی لیے اپنی جورو کو لے کر کینیڈا چلا گیا۔ جورو بھی ایسی چھانٹ کر لایا ہے، بالکل مرقع چغتائی لگتی ہے، پھولوں کی طرح نازک اور شفاف۔ ایسی اجلی کہ ہاتھ لگاؤ تو میلی ہوجائے۔ پچھلی قرعہ اندازی میں وہ میرے حصے میں آئی تھی۔ عورت کیا ہے، نسن بلیک لیبل شیمپین ہے۔ جس قدر آہستہ آہستہ پیو، اتنا ہی خمار ہوتا جائے اور رؤف تو ایک دم کاٹھ کا الو ہے۔ صبح جب وہ اسے اپنے ساتھ لے کر گیا تو گاڑی میں بیٹھتے ہی بیٹے سے چمٹا کر رونے لگا۔ میں نے اسی روز بھانپ لیا تھا، اب یہ دوبارہ سیکس نائٹ میں شریک

نہیں ہو گا۔ یہی ہوا چند روز پہلے ہی وہ سرکاری دورہ نکال کر جورو کے ساتھ کینڈا چلا گیا۔"

لالی چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "ساب! برا نہ منائیے گا' میں چھوٹا اور غریب بندہ ہوں۔ میں تو یہ جانتا ہوں میری ماں کے ساتھ لمبردار نے زبردستی منہ کالا کر لیا تھا۔ وہ بہت غریب زنانی تھی۔ میرے پیو نے اس کا یہ گناہ کبھی معاف نہیں کیا۔ روز گالاں نکالتا تھا' مارتا تھا اور مارتے مارتے آخر اس نے اس کا کام تمام کر دیا۔ بات یہ ہے جی! دنیا میں سارا کھیل پیسے کا ہے۔ پیسہ آدمی کے سب عیب چھپا دیتا ہے۔" لالی غم زدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔

ہمدانی نے مزید بات چیت نہیں کی۔ دونوں چپ چاپ چلتے ہوئے پلے ژر ہاؤس کی دو منزلہ عمارت سے نکل کر باغ میں آ گئے۔ چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ قریب کے درختوں کے نیچے آہٹ ہوئی' ساتھ ہی آواز آئی۔

"کون ہے۔"

انہوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ ہمدانی فوراً ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ اور شگفتگی غائب ہو گئی' گردن تن گئی۔ اس نے حکم دینے کے انداز میں بلند آواز سے کہا۔ "سامنے آؤ۔" درختوں تلے آہٹ تیز ہو گئی۔ اندھیرے سے ایک مسلح پہرے دار نکل کر سامنے آ گیا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر کو دیکھتے ہی دونوں جوتے بجا کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور اٹینشن ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس پر اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر بے نیازی سے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

پہرے دار نے مستعدی سے جواب دیا۔ "تاج محمد۔ میں جی ساہیوال کا رہنے والا ہوں۔" اس کے لہجے سے گھبراہٹ صاف عیاں تھی۔ "منٹگمری کو جی پہلے ساہیوال ہی کہا جاتا تھا۔"

ڈپٹی کمشنر نے اس کی گھبراہٹ نظر انداز کرتے ہوئے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "تاج محمد! اسے اپنے ہم راہ لے جاؤ اور جہاں یہ جانا چاہے' اس جگہ کا پتہ معلوم ہو تو بتا دو۔ یہ نہر کے اس پار جائے گا۔ یہ اسی راستے سے جانا چاہتا ہے۔" ہمدانی مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر عمارت میں داخل ہو گیا۔

ڈپٹی کمشنر چلا گیا تو پہرے دار نے لالی سے پوچھا۔ "تیں نوں کتھے جانا ہے؟"

لالی نے مختصر جواب دیا۔ "کاور آباد سٹیشن۔"

پہرے دار نے کسی قدر حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "ٹیشن تو یہاں سے دور ہے۔ توں سویرا ہونے تک

وہاں نہیں پہنچ سکتا۔"

"فکر نہ کر۔ مجھے نہر کے اس پار پہنچا دے۔"

دونوں درختوں کے نیچے ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ کچھ دور جا کر نشیب میں اتر گئے۔ سامنے نہر تھی۔ دونوں نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ اس جگہ روشنی تھی اور یہ جگہ پلے ژر ہاؤس کے عین نیچے تھی۔ لالی اور پہرے دار جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ سے نکل کر کھلے میدان میں آ گئے تھے۔ لالی نے چلتے چلتے گردن اٹھا کر پلے ژر ہاؤس کی دوسری منزل کی طرف دیکھا۔ کھڑکیوں سے گہری سرخ سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ایک کھڑکی پر اس کی نظر پڑی تو وہ دم بخود رہ گیا۔ ایس پی مرزا کھڑکی میں کھڑا تھا اور گردن جھکائے دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ یہ کمرہ نمبر ۸ تھا۔ جس میں اس کے ساتھ راحیلہ تھی۔ لالی نے پہرے دار سے کہا۔

"اب میں چلا جاؤں گا۔"

"نہر یہاں گہری ہے۔ یہاں سے جائے گا تو بھیگ جائے گا۔ کمر تک پانی ہے۔ نہر کا بہاؤ بھی آج کل تیز ہے۔ رات کا ٹیم ہے' کہیں پیر ڈگمگا گئے تو بہتا ہوا نہ جانے کدھر نکل جائے گا۔"

لالی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "فیر نہر کے اس پار کیسے جاؤں؟"

"گھبرا نہیں۔ پوری گل سن لے۔" پہرے دار نے جواب دیا۔ "فرلانگ' سوا فرلانگ آگے جا کر نہر میں پانی بھی کم ہے اور بیچ میں جگہ جگہ اونچے اونچے پتھر ہیں' انھی پتھروں پر چل کر سارے بندے اس پار جاتے ہیں۔ نہر کے پار جانے کے بعد بجے ہاتھ کو مڑ جانا۔ میل بھر آگے پکی سڑک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔ تو فکر نہ کر۔"

"جیسی تیری مرضی۔ میں تو چاہتا تھا' تجھے نہر کے اس پار پہنچا دوں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کا حکم ہے۔"

لالی نے اصرار نہیں کیا تو پہرہ دار بھی خاموش ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ مڑا اور کچھ دور جا کر نشیب سے اوپر چڑھنے لگا۔ لالی مڑا مڑ کر اسے دیکھتا رہا۔ جب پہریدار نظروں سے اوجھل ہو گیا تو لالی نے پلے ژر ہاؤس کی جانب گردن اونچی کر کے دیکھا' کمرہ نمبر ۸ میں سرخ بتی جل رہی تھی۔ مگر ایس پی کھڑکی پر نہیں تھا۔ لالی پریشان ہو گیا۔ اس نے رفتار تیز کر دی۔ آگے گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے اسے بار بار ٹھہرنا پڑتا۔ مشکل یہ تھی کہ جھاڑیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ لالی کچھ دور تک جھاڑیوں سے الجھتا ہوا چلتا رہا۔ آخر اس نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسے ڈر تھا' کہیں ایس پی نہ پہنچ جائے۔ وہ کھڑکی سے اسے دیکھ ہی چکا تھا۔ لالی جلد سے جلد

نہر کے اس پار پہنچ کر دور نکل جانا چاہتا تھا۔

اس نے جلدی جلدی جوتے اتارے' پتلون کے پائنچے چڑھائے اور نہر میں اتر گیا۔ کنارے پر پانی کم تھا۔ وہ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا گیا' پانی اونچا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ کمر تک آ گیا۔ لالی نہر کے بیچوں بیچ پہنچ چکا تھا۔ پہرے دار نے ٹھیک کہا تھا۔ پانی کا دھارا تیز تھا۔ لالی کے قدم بار بار ڈگمگا جاتے۔ مگر وہ سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتا گیا۔ اچانک پانی کا زور دار ریلا آیا۔ لالی کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ سنبھل نہیں سکا۔ اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پانی کے تیز ریلے میں بہتا ہوا آگے نکل گیا۔

۶

نہر' نیم دائرہ بناتی ہوئی مغرب کی سمت مڑ گئی تھی۔ موڑ پر بائیں جانب کھال تھا' جو کنارے کاٹ کر آب پاشی کے لیے بنایا گیا تھا۔ کھال تنگ تھا۔ گہرائی بھی کم تھی۔ لالی' پانی کے تیز ریلے کے ساتھ بہتا ہوا کھال میں داخل ہو گیا۔ وہ گردن' پانی سے باہر نکالے آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔

کھال کے ایک طرف گندم اور جو کے کھیت لہلہاتے تھے۔ کھال کی گہرائی اتنی کم تھی کہ کچھ ہی دور جانے کے بعد لالی آسانی سے چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ مگر اس طرف گندم اور جو کے کھیت نہ تھے۔ سرکنڈوں اور بھیلی کے اونچے' اونچے گھنے پودوں کی جھاڑیاں تھیں اور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لالی' پانی سے شرابور اور تھکن سے نڈھال تھا۔ وہ کھال کے کنارے ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر ستانے لگا۔

ذرا سکون ملا تو اس نے پتلون کی جیب ٹٹولی۔ بٹوہ موجود تھا۔ لالی نے بٹوہ نکالا۔ بٹوہ بھیگا ہوا تھا۔ اس میں رکھے ہوئے نوٹ بھی کسی قدر بھیگ گئے تھے۔ لالی نے مسکرا کر بٹوہ دیکھا اور سنبھال کر پھر جیب میں رکھ لیا۔

رات کے آنگن میں ستاروں کے کنول جھلملا رہے تھے۔ ہلکے ہلکے جھونکوں سے پودوں میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ لالی کئی منٹ خاموش بیٹھا گہری گہری سانسیں بھرتا رہا' پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

کھیتوں کے اس پار جوہڑ تھا اور اس کے آگے گاؤں کے مکانات تھے۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں مٹی کے مکانات دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ رات کے پچھلے پہر کی گہری خاموشی میں

گاؤں بالکل سنسان تھا۔ لالی اس طرف نہ گیا۔ وہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے پلی پر
چلنے لگا۔
کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو جنگل شروع ہو گیا۔ جنگل کے آگے چٹیل میدان تھا۔ وہ جنگل کے
ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ مگر تین میل سے زیادہ نہ چل سکا۔ اس کے برہنہ پیر جنگلی جھاڑیوں کے
کانٹوں سے لہولہان تھے۔ اب اس میں آگے جانے کی سکت نہیں تھی۔ وہ بہت تھک چکا تھا اور
کہیں ٹھہر کر آرام کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایسی جگہ مل بھی گئی۔ یہ فراش کے درختوں کا کنج تھا۔ کنج کی
زمین ہموار تھی اور خاردار جھاڑیوں سے صاف تھی۔ وہ کنج میں روپوش ہو کے رات بسر کر سکتا
تھا۔

لالی فراش کے درختوں تلے چلا گیا اور نڈھال ہو کے اندھیرے میں زمین پر لیٹ گیا۔ اس کے
کپڑے ابھی تک گیلے تھے۔ اسے سردی محسوس ہوئی۔ اس نے کروٹ لے کر جسم سکیڑ لیا اور
آنکھیں بند کر لیں۔ ذرا دیر بعد اسے نیند آ گئی۔

وہ گہری نیند سوتا رہا۔ رات گزری، صبح ہوئی۔ سورج چڑھ کر بیچ آسمان پر آ گیا۔ آنکھ کھلی تو چونک
کر دیکھا، ایک شخص اس پر جھکا ہوا کلائی سے گھڑی اتارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لالی نے جھٹکا
دے کر ہاتھ چھڑایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ شخص بھاگنے کے لیے تیزی سے مڑا۔ لیکن لالی نے اسے
فرار ہونے کا موقع نہیں دیا۔ جھٹ اس کی ٹانگ پکڑ لی اور زور سے کھینچی۔ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل
گرا۔

لالی نے چیل کی طرح جھپٹ کے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ اس شخص کی عمر تیس سال
کے لگ بھگ تھی۔ جسم لمبا اور مضبوط تھا۔ اس نے زور لگایا اور لالی کی گرفت سے خود کو آزاد
کرا لیا۔ لالی پھر اس سے لپٹ گیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے
زور آزمائی کرنے لگے۔

دونوں خاک میں لتھڑے ہوئے ہانپ رہے تھے۔ اس شخص نے ایک بار پھر نکل بھاگنے کی
کوشش کی۔ مگر اس کی دھوتی لالی کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے جھٹکا دے کر دھوتی کھینچ لی۔ اس
شخص کا نچلا دھڑ برہنہ ہو گیا۔

وہ ٹھٹک کر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ لالی نے ہاتھ میں دبی ہوئی دھوتی ایک طرف پھینکی اور اچھل
کر اس کی کمر پر زور سے لات ماری۔ وہ گرا اور زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔ لالی نے اسے سنبھلنے کا موقع
نہیں دیا۔ جلدی سے اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ بے

بس ہو کر غیں غیں کرنے لگا۔
لالی نے غصے سے اس کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ مارا۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ "بندہ کی ہے توں؟"
"نہیں جی، میں چوری چکاری نہیں کرتا۔ میں ڈھڈی راج پوت ہوں۔" اس نے ہانپتے ہوئے
رک رک کر کہا۔ "میرا ناں اللہ دتا ہے۔"

لالی نے ایک ہاتھ سے پتلون کی جیب ٹٹولی۔ یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ بٹوہ موجود ہے۔
لالی نے اللہ دتا کے گلے پر رکھا ہوا ہاتھ علیحدہ کیا اور اس کے سینے سے اتر کر ایک طرف ہو گیا۔ اللہ
دتا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پگڑی کھل کر نیچے گر گئی تھی۔ دونوں خاموش بیٹھے ہانپتے رہے۔ ذرا دیر
بعد اللہ دتا نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے عاجزی سے کہا۔
"میری دھوتی دے دے۔"

"اٹھا لے۔" لالی نے قریب پڑی ہوئی دھوتی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔
"پر بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ تو مجھ سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتا۔ میں تجھے ابھی جانے نہیں دوں
گا۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "اطمینان رکھ، میں بھاگوں گا نہیں۔" اس نے دھوتی اٹھا کے باندھی اور
لالی کے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔
لالی نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا۔ "سچ سچ بتا، کیا کرتا ہے تو؟"
"میں جی چاک ہوں۔ داؤد پور کے زمیں دار کے چوکھر اور مویشی چراتا ہوں۔"
"یہ داؤد پور کدھر ہوا؟"

"یہاں سے بہت دور ہے۔" وہ مشرق کی جانب ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "آگے عارف والا روڈ ہے۔
لال ٹبے سے اوپر چلو تو پاک پتن روڈ آ جاتی ہے۔ روڈ کے اس پار پنج میل دور داؤد پور ہے۔"
"تب تو بہت دور ہوا۔ تو یہاں کیسے آ گیا۔"

"بس جی آ ہی گیا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "جنگل کے ادھر علی شاہ ہے۔ میں پہلے اس پنڈ
میں مزارع تھا۔"

لالی کو یاد آیا کہ پچھلی رات وہ اسی گاؤں کے کھیتوں سے گزرتا ہوا ادھر آیا تھا۔ اس نے اللہ دتا
سے دریافت کیا۔ "تو مزارع تھا۔ کھیتی باڑی چھوڑ کر چاک کیوں بن گیا۔" وہ بے تکلفی سے
مسکرایا۔ "مزارع تو زمیں دار بننے کی سوچتا ہے، تو کمی کیسے بن گیا؟"
"گل ایسہ ہے جی، علی شاہ کا زمیں دار نور علی کھوکھر ہے۔ وڈا زمیں دار ہے۔" اس نے بنجر

میدان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہزاروں کلّا زمین اسی کی ہے۔"

"پر یہ بنجر کیوں پڑی ہے؟" لالی نے حیرت سے کہا۔ "پاس ہی نہر بھی بہتی ہے۔"

"یہ نہر شہر کہاں ہے جی' یہ تو رانی واہ ہے۔ اس میں تو جی برسات کا پانی آتا ہے۔ کچھ راجباہ بیروالا سے آجاتا ہے۔ اوپر کرم والا میں مہر سلیمان خاں کے باغ ہیں۔ سینکڑوں کلّے پر کھیتی باڑی بھی ہے۔ سارا پانی تو اس کے باغ اور کھیت کھا جاتے ہیں۔ ویسے بھی جی یہ مہر سلیمان کی اپنی نہر ہے۔ پہلے یہاں سک نالا ہوتا تھا۔ اس میں صرف برکھا کا پانی آتا تھا۔ مہر سلیمان نے سک نالہ بیروالا کی وڈی نہر سے ملادیا۔ آٹھ نو برس اودھر کی بات ہے۔ میرے سامنے ہی یہ سک نالے سے نہر بنی۔ تیں نوں پتہ ہوگا' پہلے زمیں دار اپنی نہریں بنوا سکتے تھے اور آبیانہ بھی نہیں دیتے تھے۔ اب ادھر پچھلے کئی سال سے سرکار نے یہ کنون بنادیا ہے' کوئی زمیں دار اپنی نہر نہیں بنوا سکتا۔"

"اس وکت تو نہر میں بہت پانی ہے اور اتنی تیزی سے بہہ رہا ہے کہ میں نے پچھلی رات کرم والا میں نہر کے پار جانا چاہا تو دھارے میں بہہ گیا۔ پانی گہرا بھی ہے۔ تیرنا نہ جانتا تو کب کا ڈوب گیا ہوتا۔ گھبرا بھی اتنا گیا تھا کہ ہاتھ میں دبے ہوئے جوتے چھوٹ گئے۔ رات کے اندھیرے میں بہہ کر جانے کدھر چلے گئے۔" اس نے اپنے برہنہ پیروں کو دیکھا۔

"توں اس طرح یہاں پہنچا۔" اللہ وتا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "لگتا ہے مہر سلیمان نے نہر کے افسروں سے مل کر بیروالا کی نہر میں شگاف ڈال دیا۔ اس دفعہ کچھ زیادہ ہی چوڑا شگاف ڈالا ہے۔ جبھی تو اتنا بہت سا پانی یہاں تک آگیا۔ بات یہ ہے جی' گرمیوں میں جب نہر سوکھ جاتی ہے تو مہر سلیمان اپنے باغوں اور کھیتوں میں پانی دینے کے لیے ایسا ہی کرتا ہے۔ اس کے خلاف پانی کی چوری پر نہ پرچہ کٹتا ہے نہ کوئی کارروائی ہوتی ہے۔ وہ تو جی جگیر دار ہے۔ سارے ہی وڈے افسروں سے اس کی یاری ہے۔"

"علی شاہ کا زمین دار نور علی کھوکھر بھی تو جگیر دار ہے۔" لالی نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "اس کے پاس بھی ہزاروں ایکڑ زمین ہے۔ سرکاری افسروں سے اس کی بھی یاری ہوگی۔ فیر اس نے اپنی زمیں کیوں بنجر اور کلر بنا رکھی ہے؟"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ کھوکھر کی بھی افسروں سے یاری ہے۔ اس کا میرا اسمبلی کا ممبر ہے۔ پر کھوکھر اپنی زمین بنجر اور کلّر ہی رکھنا چاہتا ہے۔" اللہ وتا نے سامنے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہاں سے ڈیڑھ میل آگے کلر اٹھی ہے۔ وہاں بھٹیاں لگی ہیں۔ ان میں شورہ بنتا ہے۔ اسے اونٹوں پر لاو کر ٹیشن پہنچایا جاتا ہے۔ فیر ریل گاڑی سے اوکاڑے بھیجا جاتا ہے۔ وہاں بہت وڈا کارخانہ ہے

اس میں مشینوں سے شورہ صاف کیا جاتا ہے اور صاف کرکے قلمی شورہ بنادیا جاتا ہے۔ میں نے جی وہ کارخانہ دیکھا ہے۔"

"توکیا ادھر کلر اٹھی میں بہت کلّر ہے؟"

"بہت زیادہ ہے جی۔" اللہ وتا نے لالی کو بتایا۔ "کلر اٹھی کے آس پاس کی ساری زمین اتنی کلّر ہے' جدھر نظر ڈالو' سب کچھ سفید ہی سفید نظر آتا ہے۔ کلر اٹھی کے نزدیک کسی پرانی اور اجاڑ بستی کے کھولے اور کھنڈر ہیں۔ اس کی دیواروں پر' زمین پر ہر جگہ اتنا کھار اچڑھتا ہے کہ سارا ہی کھنڈر دور سے کپاس کی ڈھیری دکھائی پڑتا ہے۔ ہر سال یہ سارا کھرچ کر اتار لیا جاتا ہے۔ بھٹیوں میں اس کا شورہ بنایا جاتا ہے اور جی سال گزرتا بھی نہیں کھنڈر کھارے سے فیر ایک دم سفید پڑ جاتا ہے۔"

"ادھر بہت زیادہ کلّر ہوگا پر یہاں تو اتنا نہیں ہے۔ یہ تو زیادہ تر بنجر ہی زمین ہے۔ یہ کھیتی باڑی کے کام آسکتی ہے۔"

"پر کھیتی باڑی کے لیے پانی بھی تو چاہئے۔ یہ تو نہری پو بنجر ہی ہے۔ تیں نوں پتہ ہے پو بنجر ہی میں تو پانی ہمیشہ کم ہی پہنچتا ہے۔ تب ہی تو سوکھی پڑی رہتی ہے۔ سارا پانی تو اوپر ہی اوپر ہضم کرلیا جاتا ہے۔ ادھر تو اتنا ہی پانی ملتا ہے کہ علی شاہ یا ایسے دو چار اور پنڈ اس نہر کے کنارے آباد ہوسکتے ہیں۔ پر بنجر زمین بھی بالکل بیکار نہیں جاتی۔ اس پر لانے کے بوٹے اگتے ہیں اور ادھر تو کاؤگان لانا اور پھوگ کے بوٹے ہوتے ہیں۔ آگے جاؤ تو بہت نظر آئیں گے۔ تونے لانے کا بوٹا دیکھا ہے؟"

"دیکھا تو ہے۔ یہ بھی پتہ ہے' لانا کے بوٹے سے سجّی بنتی ہے اور سجّی سے کپڑے لتے دھو کر صاف کئے جاتے ہیں۔"

"کاؤگان لانا سے بہت زیادہ سجّی نکلتی ہے۔" اللہ وتا نے پوچھا۔ "تونے کبھی سجّی دیکھی ہے؟ میں تجھے بتاتا ہوں' سجّی کیسے بنتی ہے۔ سجّی بنانے کے لیے لانے کے بوٹے جڑ کے پاس سے کاٹ لیے جاتے ہیں۔ زمین میں گڑھا کھود کر کٹے ہوئے بوٹے اس طرح بھر دیے جاتے ہیں کہ اوپر تک ڈھیری بن جاتی ہے' ڈھیری میں آگ لگا دی جاتی ہے۔ پتیاں جل جاتی ہیں اور ڈنٹھلوں سے رس بہہ بہہ کر نیچے گڑھے میں جمع ہوجاتا ہے۔ ٹھنڈا پڑ کر ایسا جم جاتا ہے کہ پتھر کی طرح سخت لگتا ہے۔ سجّی اسی طرح بنتی ہے' پر کلر اٹھی کے پاس تو سجّی بنانے کی بھٹیاں لگی ہیں۔ ڈھیروں سجّی روزانہ بنتی ہے۔ کچا شورہ بھی اتنا ہی ڈھیر کا ڈھیر ہر روز تیار ہوتا ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کچے شورے اور سجّی سے کھوکھر کو بہت زیادہ آمدنی ہوتی ہوگی۔ جبھی تو اس نے اتنی بہت سی زمین کلّر اور بنجر بنا رکھی ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا جی۔ میں نوں ٹھیک سے پتہ نہیں۔"

لالی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "تو نے علی شاہ کیوں چھوڑ دیا؟ تو مزارع تھا نا؟"

"مزارع ہی تھا پر کچھ ایسا چکر چلا میں نوں پنڈ چھوڑنا پڑا۔"

"کوئی خاص بات ہو گئی؟"

"یہ نہ پوچھ۔ یوں سمجھ کیا نہیں ہوا۔" اللہ دتا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اپنا تو سبھی کچھ تباہ ہو گیا۔ میرے ساتھ چھوٹا بھائی اللہ دیتو بھی تھا۔ دو ہل تھے۔ سولاں کلّے سے اوپر زمین پر اپنے کھیت تھے۔" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیلنے لگے۔ "سچ پوچھ تو اس کلراٹھی نے اپنا ناس مار دیا۔ پہلے اس کا مالک سردار سنتوکھ سنگھ ہوتا تھا۔ بہت زور آور جوان تھا۔ رہتا تو ادھر کھوکھراں میں تھا پر روز ہی اپنی سفید گھوڑی پر بیٹھ کر کلراٹھی آتا تھا۔ علی شاہ بھی آتا جاتا رہتا تھا۔ کلراٹھی پر کام کرنے کے لیے ادھر سے مزدور بھی لے جاتا تھا۔ فصل پکنے لگتی تو پنڈ کے مزارعے بھی کمیوں کے ساتھ کلراٹھی پر کام کرنے آتے۔ سنتوکھا مزدوری بھی چنگی دیتا تھا۔ شام کو جب چھٹا بٹتا تو منشی کے ساتھ خود بھی موجود ہوتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کی مزدوری نہیں ماری اور نہ مزدوری پر جھگڑا کیا۔"

"تو نے بھی کلراٹھی پر مزدوری کی ہے؟"

"کی تو ہے، پر جی وہاں کام کرنے سے مجھے ایسی کھانسی ہو گئی تھی کہ کھانستے کھانستے رات جاگتے ہوئے کٹتی۔ وہ ایسا ہے جی، کلر کھودتے ہوئے کھارا ایسے اڑتا ہے جیسے دھواں ناک میں گھس کر اندر چلا جاتا ہے۔ اسی لیے منہ پر منڈاسا باندھ کر کلراٹھی پر کام کرنا پڑتا ہے۔ فیر بھی بہت کھانسی آتی ہے۔ کتنے ہی مزدوروں کو دمہ ہو گیا۔" اللہ دتا چند لمحے چپ رہا۔ "پاکستان بنا اور فسادات ہوئے تو سنتوکھ سنگھ بھی بھاگ کر سرحد پار چلا گیا۔ کلراٹھی پر مہینوں کام بند رہا۔ نور علی کھوکھر بھی کھوکھراں ہی میں رہتا ہے۔ وہاں اس کی حویلی ہے۔ سردار سنتوکھ سنگھ کے جانے کے بعد کھوکھر نے افسروں سے مل کر ایسا چکر چلایا کہ کلراٹھی اور سنتوکھ سنگھ کی ساری زمین اس کے کبضے میں چلی گئی۔ یہ بنجر اور کلر زمین پہلے سنتوکھ سنگھ ہی کی ہوتی تھی۔"

"سنتوکھے نے بھی بنجر زمین پر کھیتی باڑی کی کوشش نہیں کی؟"

"اس کی زمین کئی میل آگے ہے۔ ادھر بالکل پانی نہیں۔ کنواں کھودو تو بہت زیادہ گہرائی میں جا کر پانی ملتا ہے۔ چند ہی برسوں میں سوکھ کر ڈل بن جاتا ہے۔ پر کلراٹھی جب کھوکھر کے کبضے میں آئی تو علی شاہ کے مزارعوں اور کمیوں کے لیے مصیبت آ گئی۔ کھوکھر نے سب سے وگار لینی شروع کر دی۔ پہلے پہلے تو تھوڑی بہت مزدوری بھی دیتا تھا، فیر وہ بھی بند کر دی۔ پنڈ والوں نے گلہ کیا۔ کئی

نے تو کلراٹھی پر کام کرنے سے انکار بھی کر دیا۔ فیر تو جی کھوکھر ایسا ناراض ہوا، جس جس نے انکار کیا، اسے زمین سے بے دخل کرنا شروع کر دیا۔"

"تو نے بھی کلراٹھی پر کام کرنے سے انکار کر دیا تھا؟"

"ہاں جی، میں نے بھی انکار کر دیا تھا۔ ایک تو وگار کرنی پڑتی تھی۔ اوپر سے مجھے کھانسی بھی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بے دخل کرنے کے لیے طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میرے مویشی اور چوکھر اٹھوا لیے۔ ربیع کی وادھو فصل بھی کٹوا کر اٹھا لے گیا۔ میں نے تھانے میں اس کے منشی اور کرندوں کے خلاف پرچہ چاک کرایا تو پولیس نے الٹا میرے خلاف مویشی چوری کا مقدمہ بنا دیا اور مجھے جیل میں بند کر دیا۔ چار مہینے سے بھی زیادہ مقدمہ چلا۔ میں چھوٹ گیا۔ پر ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ کھوکھر نے میری گھر والی کو اٹھوا لیا اور کھوکھراں میں اپنی حویلی کے اندر بند کر دیا۔ اس وقت میرے دو چھوٹے چھوٹے نکّے تھے۔ ماں کے بنا روتے تھے، مچلتے تھے، ضد کرتے تھے۔ اللہ دیتو کا ویاہ نہیں ہوا۔ گھر میں کوئی زنانی نہیں تھی جو بچوں کی دیکھ بھال کرتی، روٹی پکا کر کھلاتی، مویشیوں اور چوکھروں کا سویرے پٹھا دتھا کرتی، دوپہر کو کھیت پر بھتا پہنچاتی۔ میں تو جی گھر والی کے بنا بالکل تباہ ہو گیا۔ وہ تو میرا بازو ہے۔"

"تو نے پولیس میں پرچہ چاک نہیں کرایا؟"

"ایک بار کرایا تھا تو چار مہینے جیل میں بند رہا۔" اللہ دتا کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "اس دفعہ نہ جانے کتنے جھوٹے مقدمے میرے خلاف بنائے جاتے۔ اس ڈر سے میں نے پرچہ شرچہ تو چاک کرایا نہیں۔ کھوکھر کو سفارشیں پہنچائیں پر اس نے کسی کی نہ مانی۔ اس چکر میں ڈیڑھ سال گزر گیا۔ میری گھر والی کھوکھر کی حویلی میں تھی۔ اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ میں ہر طرف سے مایوس ہو کر آخر ایک روز خود اس کے پاس کھوکھراں گیا۔ پگڑی اتار کر اس کے پیروں پر ڈال دی۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔ "زمیں دار! میرا بازو مجھے واپس دے دے۔" پہلے تو وہ بہت گرم ہوا۔ دیر تک گالاں نکالتا رہا۔ میں نے منت سماجت کی تو اس نے گھر والی کی واپسی کے تین ہزار روپے مانگے اور دو ہفتے کی مہلت دی۔ میں پہلے ہی تباہ ہو چکا تھا۔ اتنی زیادہ رقم کہاں سے لاتا۔"

"دوبارہ کھوکھر کے پاس جاتا۔ اس کے فیر پیر پکڑ لیتا۔"

"یہی کیا جی۔ اس دفعہ اس نے گھر والی کو واپس کرنے کی یہ شرط لگائی کہ مجھے اور اللہ دیتو کو سال بھر تک کلراٹھی پر وگار کرنی پڑے گی۔ میں نے اللہ دیتو سے بات کی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے، جھٹ تیار ہو گیا۔ میں نے کھوکھر سے وگار کرنے کی ہامی بھر لی۔ اس طرح مجھے اپنا بازو واپس مل

گیا۔"

لالی نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "آگے کیا ہوا؟"

"آگے کیا ہونا تھا جی۔ کھوکھر نے کلراٹھی کے پاس اپنی جیل بنا رکھی ہے۔ مجھے اور اللہ دیتو کو اس میں ڈال دیا گیا۔ دن بھر ہم دونوں بھائی کلراٹھی پر کام کرتے اور شام کو دوسرے کیدی مزدوروں کے ساتھ بند کردیے جاتے۔ دیواریں اتنی اونچی ہیں انھیں کوئی پھاند نہیں سکتا۔ صرف ایک دروازہ ہے اور اس پر تالا ڈال دیا جاتا ہے۔ باہر راکھے رخل سنبھالے کڑی نگرانی کرتے ہیں۔ فیر بھی کیدی مزدور جب تک اندر رہتے ہیں، دو کیدیوں کے ایک ایک پیر ملا کر پنڈلیوں میں لوہے کے کڑے ڈال دیے جاتے ہیں۔ درمیان میں ہاتھ بھر لمبی زنجیر ہوتی ہے۔ کڑوں میں تالے پڑے ہوتے ہیں اور ان کی چابیاں راکھوں کے انچارج کے پاس رہتی ہیں۔ ان پر نمبر پڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح جی ایک زنجیر کے دونوں کیدی ایک ساتھ لیٹتے ہیں، ایک ساتھ اٹھتے ہیں، ایک ساتھ سوتے ہیں۔ ایک کروٹ بدلے تو دوسرا جاگ اٹھتا ہے۔ ایک کو ٹٹی پیشاب لگے تو دوسرے کو بھی ساتھ ساتھ جانا پڑتا ہے، ساتھ ساتھ بیٹھنا پڑتا ہے۔ اسی لیے کیدیوں میں روز جھگڑا ہوتا ہے، مارکٹائی ہوتی ہے۔ جب دنگا زیادہ ہوتا ہے تو راکھے اندر آکر دونوں ہی کیدیوں کو ٹھڈے مارتے ہیں۔"

لالی نے تشویش کا اظہار کیا۔ "یہ تو سرکاری جیل سے بھی زیادہ کڑی سزا ہوئی۔"

"نہ پوچھ میں نے اٹھ مہینے کس طرح کلراٹھی پر گزارے۔" اللہ دتا نے گہری سانس بھری۔ "دن بھر مویشیوں اور چوکھروں کی طرح بھٹیوں پر کام کرنا پڑتا۔ کھدائی کرنی ہوتی۔ راکھے چمڑے کے لمبے لمبے چھانٹے اور کوڑے ہاتھوں میں دبائے شکاری کتوں کی طرح مزدوروں کو تاکتے رہتے ہیں۔ کسی نے ذرا سستی سے کام لیا، راکھا جھپٹ کے اس پر سڑاک سڑاک چھانٹے لگاتا ہے۔ میری کمر دیکھ۔"

اس نے کرتا الٹ کر اپنی پیٹھ برہنہ کردی۔ اس کی کمر اور پیٹھ پر اب تک سیاہ اور بھوری لکیریں موجود تھیں۔ "یہ لاسے، چھانٹوں کے نشان ہیں۔ کھارے میں کام کرنے سے مجھے کھوکھری بھی ہوگئی تھی۔ بار بار کھانستا۔ دن کا تو کچھ نہیں تھا پر رات کو کھانستا تو دوسروں کی نیند خراب ہوتی۔ وہ ناراض ہو کر گالاں نکالتے۔ میں جب کلراٹھی پر وگار کرتا تھا تو ۵۲ کیدی مزدور تھے۔ شام کو ان کی گنتی ہوتی تھی اور بند کرنے سے پہلے ہی روٹی کھلادی جاتی تھی۔"

"سارے کیدی تیرے ہی پنڈ کے تھے؟"

"نہیں جی، اپنے پنڈ کے تو اس وکھت اٹھ کیدی تھے اور ان میں ہم دونوں بھائی بھی شامل تھے۔ کھوکھر جس مزارعے یا کمی سے ناراض ہوتا ہے اسے کلراٹھی میں وگار پر لگا دیتا ہے۔ کھوکھر بہت وڈا زمیں دار ہے۔ اس کے اور بھی کئی پنڈ ہیں۔ ہزاروں کلا زمیں داری ہے اور اب تو جی ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی زمینوں پر قبضہ کرکے اس نے اپنی زمیں داری بہت بڑھالی ہے۔ اس کی پوری بگیر ہے جی۔ لہور میں کوٹھی بنوا رہا ہے۔ یہ لمبی موٹر خریدی ہے۔ دو پتر ولایت پڑھنے بھیجے ہیں۔ بہت عیش ہیں جی اس کے۔"

"کلراٹھی کی جیل میں تیری گھر والی تجھ سے ملنے نہیں آئی؟"

"کیدی مزدوروں سے کسی کو ملنے کی بالکل اجازت نہیں۔" اللہ دتا نے جواب میں مطلع کیا۔ "کسی کو ان کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں جاتا۔ انھیں پکڑ کر رات کے اندھیرے میں اونٹھ پر بٹھا کر کلراٹھی میں لایا جاتا ہے اور جیل میں بند کردیا جاتا ہے۔ ان کے گھر والوں کو بالکل پتہ نہیں چلتا وہ کہاں گئے؟ میری گھر والی کو بھی دو ہفتے تک میرے اور اللہ دیتو کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا، ہم دونوں کہاں ہیں؟ وہ نور علی کھوکھر کی حویلی پر گئی، پر وہ اسے نہیں ملا۔ فیر وہ اس کے منشی دلاور لنگاہ کے پاس گئی۔ وہ اسے لارے لپے دیتا اور رات کو اپنے پاس بلا لیتا۔ ایک روز اس نے شراب پی رکھی تھی۔ اس رات میری گھر والی اس کے پاس تھی۔ لنگاہ نے نشے میں مست ہو کر بتادیا کہ مجھے اور اللہ دیتو کو کلراٹھی کی جیل میں رکھا گیا ہے۔ پر وہ ہم دونوں کو چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔"

"اللہ دتا! تجھے تو کھوکھر نے سال بھر کے لیے وگار پر کید میں ڈالا تھا۔ تو چار مہینے پہلے کیسے باہر نکل آیا؟"

"جب میں نے تجھے سبھی کچھ بتادیا، تو ایہہ گل بھی سن لے۔" اللہ دتا نے جواب دیا۔ "علی شاہ یہاں سے نزدیک ہے۔ کلراٹھی کے راکھے کبھی کبھار وہاں جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک راکھے میران خاں سے میری گھر والی نے میل جول پیدا کرلیا۔"

لالی نے ہنس کر کہا۔ "یاری لگالی ہوگی۔"

"ایسی ہی گل تھی۔" اللہ دتا نے جھینپ کر نظریں جھکالیں۔ "پر میران کے ذریعے وہ چپکے چپکے مجھے گھیور، مرونڈے اور حلوہ پکا کر بھجوا دیتی، میں اور اللہ دیتو چھپ چھپ کر کھا لیتے۔"

"دوسرے بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے؟ ایسے ہی جیسے سرکاری جیلوں میں باہر سے چوری چھپے سامان اندر آجاتا ہے۔"

"ایسا ہوتا تو ہوگا پر مجھے پتہ نہیں۔ اب اگے کی سن۔ ایک رات ڈیوٹی پر میران خاں اکیلا رکھوالی پر تھا۔ دوسرے روز عید کی چھٹی تھی۔ کام بند تھا۔ کلراٹھی پر چار راکھے تھے۔ ان میں سے تین شام کو کام بند ہوتے ہی اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ میران خان کا گھر میاں والی میں تھا۔ اس لیے وہ ٹھہر گیا۔ یہ بات اس نے میری گھروالی کو بتادی تھی اور اسے رات کو کلراٹھی پر اپنے پاس بلایا۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ آدھی رات تک اس کے ساتھ رہی۔ پانچ سو روپے رشوت بھی دی تاکہ وہ مجھے چھوڑ دے۔"

"لگتا ہے' تیری گھروالی بہت تیز ہے۔ سوہنی بھی ہوگی۔"

اللہ دتا اس کی بات نظرانداز کرکے بولا۔ "فیر ایسا ہوا جی' آدھی رات کے بعد میران خان اندر آیا۔ اس رات اس نے مجھے اور میرے ساتھی کیدی کو کونے والی کوٹھڑی میں سلایا تھا۔ کیدیوں کو راکھے اپنی مرضی کی جگہ سلاتے ہیں اور سونے سے پہلے ان کے معاتے پر بھی آتے ہیں۔ ان کی گنتی بھی کرتے ہیں۔ اس وکھت سارے کیدی بے خبر سو رہے تھے۔ کئی کوٹھڑیوں میں اور کئی کوٹھڑیوں کے باہر دلان میں سو رہے تھے۔ میران خان میری کوٹھڑی میں آیا۔ چپکے سے میرے کڑے کا تالا کھولا' کڑا پیر سے نکال دیا' آہستہ سے جھنجھوڑ کر مجھے جگایا۔ میں نے گھبرا کر بولنا چاہا' اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرا پیر ہلا کر بتایا' کھلا ہوا ہے۔ کوٹھڑی میں اتنا اندھیرا تھا کہ میں میران خان کو پہچان نہیں سکا۔ وہ کوٹھڑی سے باہر چلا گیا اور میں دم سادھے پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے آہستہ سے کروٹ لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ والا گہری نیند سو رہا تھا۔ میں کوٹھڑی سے باہر آیا۔ دلان سے گزر کر وہڑے میں گیا اور دبے دبے چلتا ہوا دروازے پر پہنچا۔"

"تیں نوں پتہ تھا دروازہ کھلا ہے؟"

"ہاں جی' میں نوں اسی وکت کچھ اندازہ ہوگیا تھا جب میرے پیر کا کڑا کھولا گیا تھا۔" اللہ دتا نے بتایا۔ "میرا وچار ٹھیک نکلا۔ میں نے باہر والے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ میں باہر نکلا۔ گھروالی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میران خاں دروازے کا تالا بند کرنے لگا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ کلراٹھی سے نکل کر پنڈ پہنچے' بچوں کو ساتھ لیا' ضرورت کا سامان گٹھڑی میں باندھا اور نکل کھڑے ہوئے۔ سویرا ہونے تک ہم پنڈ سے بہت دور نکل جانا چاہتے تھے۔"

"تیری گھروالی نے بتایا' اس نے تجھے کس طرح چھڑایا؟"

"اس نے رستے میں مجھے سب کچھ بتادیا تھا۔ میں نے میران خاں سے اس کی یاری کی گل سنی تو بہت گرم ہوا۔ وہ بھی گرم ہوگئی' بگڑ کر بولی۔ زمیں دار کے پاس جب میں ڈیڑھ برس سے بھی اوپر

رہی اور حرام کا تکا بھی جن کر ساتھ لائی تب توں نے کچھ نہ کہا۔ اب میں نے تجھے چھڑانے کے لیے میران سے یاری لگائی تو ناراض کیوں ہوتا ہے؟"

"گل تو اس نے ٹھیک ہی کہی تھی۔" لالی ہنس کر بولا۔ "پر تو نے اپنے بھائی اللہ دیتو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کا کیا بنا؟"

"وہ جی' ابھی تک کلراٹھی کی جیل میں ہے۔ نور بخش کھوکھر نے اسے سال بھر بعد بھی نہیں چھوڑا۔ وہ میرا بدلہ اس سے لے رہا ہے۔" اللہ دتا نے لالی کو مطلع کیا۔ "وہ ایسا ہوا جی کہ اللہ دیتو اور میں شروع میں رات کو ایک ہی زنجیر سے پیروں میں کڑے ڈال کر جکڑ دیئے جاتے پر بعد میں ہم دونوں کو الگ الگ کیدیوں کے ساتھ کردیا گیا۔ میں نے جیل سے باہر آنے کے بعد میران خاں کی بہت منت کی۔ گھروالی نے بھی اس کو منانے کی کوشش کی پر وہ کسی طرح اللہ دیتو کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا۔ بلکہ میرے گڑگڑانے پر ایک دم بھڑک اٹھا۔ ایسا نراض ہوا کہ مجھ پر بندوک تان کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اسے اتنا گرم دیکھا تو ڈر گیا۔ بات یہ ہے کلراٹھی کے سارے ہی راکھے بہت ظالم اور خوں خوار ہیں۔ میران خاں تو سب سے زیادہ ظالم اور خونی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' ایک کیدی کو جھگڑا کرنے پر میران خاں نے گولی سے اڑا دیا۔ ڈز ڈز فیر کئے۔ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ وہ گبھرو جوان تھا۔ کچھ دیر اپنے ہی خون میں پڑا تڑپتا رہا۔ فیر اس نے دم توڑ دیا۔ کسی نے ڈر کے مارے اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ سب اپنا کام کرتے رہے۔"

"کسی کیدی نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی؟"

"دو نے ایسی کوشش کی تھی۔ ان میں سے ایک تو بھاگتے ہوئے راکھوں کی گولیوں سے مارا گیا۔ دوسرا نکل گیا۔ مگر راکھے بعد میں اسے بھی پکڑ لائے اور گولی مار کر اس کا بھی خون کردیا۔ جو بھی راکھوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے' اسے کلراٹھی سے کچھ دور گڑھا کھود کر دبا دیتے ہیں۔ نہ اس پر کفن ڈالا جاتا ہے نہ اسے نہلایا جاتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں چپ چاپ زمین میں گاڑ دیتے ہیں۔ میرے سامنے تین کیدی مارے گئے۔"

"اللہ دیتو کے بارے میں تیں نوں پتہ ہے' وہ زندہ ہے؟" لالی نے پوچھا۔

"ہن جی' یہ تو پتہ ہے۔ ویسے وہ ہے تو تگڑا جوان' پر اسے سمجھ کم ہی آتا ہے۔ ویسے بھی سارے ہی کیدی راکھوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ جیسا راکھے کہتے ہیں' ویسا ہی کرتے ہیں۔ ہر بات چپ کر کے مان لیتے ہیں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "زمیں دار تو میرے سامنے کبھی کلراٹھی پر نہیں آیا' پر اس کا منشی دلاور لنگاہ ہفتے میں ایک بار دورے پر ضرور آتا ہے۔"

"یہ بتا' تو نے اللہ دیتو کو چھڑانے کے لیے کیا کیا؟"

"نہ پوچھ' کیا نہیں کیا۔ میں نے پولیس میں پرچہ چاک کرایا۔ اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی اوپر درخواستیں لگائیں' چٹھیاں بھیجیں' خود شہر گیا۔ افسروں کے سامنے گڑگڑایا' فریاد کی پر کچھ بھی نہ بنا۔ نور علی کھوکھر کو ان باتوں کا پتہ چل گیا۔ اس نے مجھ پر حملہ کرا دیا۔ میں ان دنوں نیلا ڈوبا میں تھا۔ علی شاہ چھوڑ کر وہیں چلا گیا تھا۔ ادھیارے پر تو کلا زمیں لے لی تھی۔ اس طرح میں پاہی بن گیا۔ ادھیارے کی پہلی فصل خریف کی تھی۔ میں نے بڑی محنت کی۔ چھٹی اور کماد بہت چنگی رہی فصل تیار کھڑی تھی۔ چھٹی کی چنائی شروع ہونے والی تھی۔ میں نے چنائی کے لیے چوکیوں سے بات بھی کر لی تھی۔ لو جی' ایک رات کھوکھر کے گرندے ر-ندلوں او-بر چھیوں سے مسلح ہو کر نیلا ڈوبا پہنچے۔ سردی تو اس رات زیادہ نہیں تھی۔ پر دھند بہت تھی۔ انھوں نے پنڈ میں گھستے ہی اندھا دھند گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ پر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی میں نے گھر والی کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے نکل کر مکئی کے کھیت میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ دروازہ توڑ کر گھر میں گھس گئے اور توڑ پھوڑ کر کے چلے گئے۔ جاتے جاتے میری واڈھو فصل کو آگ لگا دی' گھر کو نہیں لگائی۔ اس میں تینوں بچے تھے' جل کے راکھ ہو جاتے۔ میں نے تب نیلا ڈوبا چھوڑ دیا اور اپنے ایک شریکے کے پاس داؤد پور چلا گیا۔ نیلا ڈوبا نہ چھوڑتا تو کھوکھر مجھے جان سے مار دیتا۔"

"جب یہ بات ہے تو ادھر کیسے آ گیا؟"

"میں جی اللہ دیتو کو چھڑانے آیا ہوں۔ کل کلراٹھی پر کام بند رہے گا۔ آج رات بھی ایک ہی راکھا ڈیوٹی پر رہے گا۔"

"پر کل تو عید نہیں ہے۔ کلراٹھی پر چھٹی کیسے ہو گئی؟"

"کل رات نور علی کھوکھر کی ماں کی موت ہو گئی۔ اس لیے کلراٹھی پر دو روز کام بند رہے گا۔ یہ بات مجھے کل سویرے کلراٹھی کے ایک راکھے کے ذریعے ملوم ہو گئی۔"

"وہ راکھا میران خاں ہو گا؟"

"نہیں جی' میران خاں کو تو کھوکھر نے نوکری سے نکال دیا۔ اسے تو کلراٹھی چھوڑے ہوئے بھی دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔ پتہ نہیں کہاں گیا۔ مجھے کلراٹھی کا جو راکھا ملا تھا' اس کا ناں طور محمد لکھیرا ہے۔ آج رات وہ اکیلا کلراٹھی کی رکھوالی کرے گا۔ دوسرے راکھے شام کو اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔"

لالی نے اسے چھیڑا۔ "آج بھی تو اپنی گھر والی کو ساتھ لایا ہو گا؟"

"نا جی' ایسی کوئی گل نہیں۔" اللہ دتا نے انکار میں گردن ہلائی۔ "طور محمد لکھیرا ایک ہزار روپے لے کر اللہ دیتو کو چھوڑنے پر راضی ہو گیا ہے۔ طور محمد لکھیرا خود بھی کلراٹھی چھوڑ کر بھاگنا چاہتا ہے۔ ہزار روپے مل گئے تو وہ آج ہی بھاگ جائے گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ "تو جانتا ہے' میرے پاس اب کچھ بھی نہیں رہا۔ چوکھر چرانے والا غریب چاک ہوں۔ ہزار روپیہ کہاں سے لاتا۔ جب کچھ بن نہ پڑا تو گھر والی کو داؤد پور کے سنار کے پاس سرگانے پر رکھ کر ہزار روپیہ ادھار لیا۔ تیں نوں تو پتہ ہی ہے' جب تک ادھار ادا نہ ہو گا تب تک وہ اس کے گھر میں ویگار کرے گی۔ ہر طرح کا کام کرے گی۔ یوں سمجھو اس کے پاس گروی رہے گی۔ کیا کریں جی' اللہ دیتو کو رہائی دلانی بھی تو ضروری ہے۔ وہ ماہر اور محنتی ہے۔ وہ آ گیا تو ہم دونوں بھائی محنت کر کے گھر والی کو سال بھر میں ادھار ادا کر کے سرگانے سے چھڑا کر واپس لے آئیں گے۔"

لالی نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ "تو کبھی جہانگیرہ گیا ہے؟"

"کیوں نہیں گیا۔ سڑک کے ساتھ ہی ہے۔ وہاں میرا ایک چچیرا رہتا ہے۔ میں تو جہانگیرہ کے لمبردار ملک اللہ نواز خاں کو بھی جانتا ہوں۔ ویسے تو اس کی کوم کھٹیانہ ہے' پر اس کا پیو خوشاب سے ملکوں کی کڑی دیاہ لایا تو خود ملک بن گیا اور اس کا پت تو بالکل ملک بن گیا۔ یہ لمبے طرے کی پگ لگاتا ہے۔ گھوڑی پر بیٹھ کر ایسی آکڑ کے ساتھ نکلتا ہے جیسے بہت وڈا زمیں دار ہے۔ تیں نوں پتہ نہیں وہ زبردست رساگیر ہے اور جب سے اس کا ایک بھرا تھانے دار لگ گیا ہے' اس وکت سے تو وہ ایسا نڈر ہو گیا کہ کھلم کھلا رساگیری کا دھندا کرتا ہے۔ میں تجھے اس کے بارے میں ایک گل بتاؤں۔"

"نہ بتا تو ٹھیک ہے۔" لالی جہانگیرہ کے زمیں دار ملک اللہ نواز کے ذکر سے بے زار ہو کر بیچ میں بول پڑا۔ "یہ بتا' داؤد پور سے جہانگیرہ کتنی دور ہے؟"

"باراں میل سے زیادہ نہیں ہو گا۔ پر تیں جہانگیرہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟ تیں نوں تجھے وہاں جانا ہے؟"

"ہاں میں نوں وہاں جانا ہے۔ مجھے جہانگیرہ پہنچا دیتا' میں ہزار روپے رشوت دیئے بنا اللہ دیتو کو نکال لاؤں گا۔ اللہ دیتو کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا اور ہزار روپے سرگانے کے دے کر اپنی گھر والی کو لے آتا۔ وہ سرگانے پر گروی نہیں رہے گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اللہ دتا نے حیرت سے منہ پھاڑ کر کہا۔ "تیری گل بالکل سمجھ نہیں آئی۔"

"ابھی نہیں سکتی۔" لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسے مجھ پر چھوڑ دے۔"

اللہ دتا نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

☆

فراش کے گھنے درختوں کے نیچے روشنی دھندلی تھی۔ آس پاس جھنگر تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ سامنے چٹیل میدان تھا' جس پر تیز دھوپ پھیلی تھی۔ میدان کے آخری سرے پر اونٹوں کی قطار گرد کے بادل اڑاتی گزر رہی تھی۔ اونٹوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں آہستہ آہستہ جھنکار رہی تھیں۔

اللہ دتا نے لالی کو مخاطب کیا۔ "یہ اودھر دیکھ رہا ہے۔ لگتا ہے' کلرا تھی سے آ رہے ہیں۔ ان پر کچا شورہ لاد کر ٹیشن بھیجا جا رہا ہے۔ وہاں کھوکھر کا منشی ہو گا۔ وہ ریل سے اوکاڑے بھیج دے گا۔ وہاں کارخانے میں اسے صاف کیا جائے گا۔"

مگر لالی کو شورے سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے سویرے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ اس نے اللہ دتا سے پوچھا۔

"تو یہاں کب آیا تھا؟"

"سویرے ہی آ گیا تھا۔ میں نے تجھے دیکھا تھا۔ دو تین بار نزدیک سے گزرا' توں بے خبر سو رہا تھا۔ میں سمجھا کوئی تجھے مار کر یہاں ڈال گیا ہے۔ تیرے ہاتھ کی گھڑی دیکھ کر میں نوں لالچ آ گیا۔" اس نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکائیں۔ "معاف کرنا جی' غلطی ہو گئی۔ میں تو یہاں چھپنے کے لیے آیا تھا۔"

"پر تو نے صبح سے کچھ کھایا نہیں۔ تجھے بھوک نہیں لگی؟"

"لگ تو رہی ہے' گھر سے روٹی لایا تھا۔" اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "ادھر جھنگر میں چدر سے باندھ کر رکھ دی ہے۔"

"یہ چنگا کام کیا۔ میں تو تجھے علی شاہ بھیجنے والا تھا' وہاں سے جا کر روٹی شوٹی لے آ۔"

"نہیں جی' علی شاہ جانا ٹھیک نہیں۔ وہاں گیا تو کھوکھر کو پتہ چل جائے گا۔ سارے کمی اور مزارعے اسی کے بندے ہیں۔ کسی نے کھوکھراں جا کر اسے میرے بارے میں بتایا تو وہ چوکنا ہو جائے گا۔ فیر تو اللہ دیتو کو نکال لانا مشکل ہو جائے گا۔ وہ ضرور اپنے کسی کرندے کو شام سے پہلے پہلے کلرا تھی پر بھیج دے گا۔ میں تو کہتا ہوں جی' علی شاہ میں کسی کو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہئے۔"

"اب باتیں چھوڑ' جا کر روٹی لے کر لا۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نوں سخت بھوک لگی ہے۔ میں بھی تیرے ساتھ کچھ کھا لوں گا۔"

"پروا نہ کر۔ روٹی اتنی ہے' دونوں کھا سکتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "پینے کو ٹین کے ڈبے میں پانی بھی ساتھ لایا ہوں۔ نہر کا تو میں نوں پتہ ہی نہیں تھا اس میں پانی ہو گا۔ آج کل تو بالکل سوکھی رہتی ہے۔"

اللہ دتا اٹھ کر درختوں کے نیچے چلنے لگا۔ کچھ دور جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد اللہ دتا ایک گھنے درخت کی آڑ سے نمودار ہوا۔ قریب آیا تو اس کے ہاتھ میں پوٹلی اور ٹین کا ڈبا لٹک رہا تھا۔

وہ لالی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے چادر کھولی۔ اندر سے چار موٹی موٹی روٹیاں نکلیں۔ ان کے ساتھ چنے کی نرم کونپلوں کا پکایا ہوا پلی کا ساگ اور پیاز کی دو گٹھیاں تھیں۔ اللہ دتا نے مسکرا کر روٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ گوگیاں ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے ہی پکائی تھیں۔ کیا کریں جی' گھر والی تو ہے نہیں۔ خود ہی روٹی پکانی پڑتی ہے۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا' لقمہ توڑا اور ساگ ملا کر کھانے لگا۔ اللہ دتا بھی کھانے لگا۔ روٹی باسی تھی۔ سخت بھی تھی' مگر دونوں بہت بھوکے تھے۔ اطمینان سے بیٹھے کھاتے رہے۔ نوالہ حلق میں پھنستا تو ڈبا منہ سے لگا کر پانی پی لیتے۔ چار روٹیوں میں دونوں کا پیٹ بھر گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اللہ دتا نے پوچھا۔ "یہ تو بتایا نہیں توں طور محمد نکھیرا کو ہزار روپے دیئے بنا اللہ دیتو کو کیسے نکال لائے گا؟"

"اندھیرا ہو جانے دے۔ میں تیرے ساتھ کلرا تھی چلوں گا۔" لالی نے جواب دیا۔ "وہاں جا کر آس پاس کا معائنہ کروں گا۔ جیسا تجھ سے کہوں ویسا ہی کرنا۔"

"پر یہ جان لے۔ راکھے کے پاس بھری ہوئی رائفل رہتی ہے۔" اللہ دتا کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں منڈلانے لگی۔ "کوئی گڑبڑ ہو گئی تو دونوں مارے جائیں گے۔"

"حوصلے سے کام لے۔" لالی نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ "پروا نہ کر' سب ٹھیک ہی ہو گا۔"

"توں پولسیا تو نہیں ہے؟" اللہ دتا نے لالی کی ملگجی پتلون اور بش شرٹ غور سے دیکھی۔ "لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔"

"نہیں جی' میں پولسیا شولسیا نہیں ہوں۔ خامخا کی باتیں سوچنا چھوڑ۔ اب توں آرام کر اور اندھیرا پھیلنے کا انتظار کر۔"

اللہ دتا نے زمین پر چادر پھیلا دی۔ دونوں اس پر لیٹ گئے۔ لالی ذرا دیر آنکھیں بند کئے پڑا رہا' پھر اسے نیند آ گئی۔

دن ڈھلنے لگا۔ سورج رفتہ رفتہ مغرب میں اترنے لگا۔ دھوپ کی رنگت بدلنے لگی۔ سائے طویل ہوتے گئے۔ فراش کے درختوں کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا۔ جھاڑیوں میں چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

شام کی آمد آمد تھی۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اللہ دتا موجود نہیں تھا۔ لالی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑا کر اللہ دتا کو تلاش کرنے لگا۔ مگر اس کا دور دور پتہ نہ تھا۔ لالی کو تشویش ہوئی۔ وہ حیران و پریشان بیٹھا سوچتا رہا کہ اللہ دتا کہاں چلا گیا۔ دو منٹ گزرے' پانچ منٹ گزرے' دس منٹ گزر گئے۔

لالی کی تشویش بڑھتی گئی۔ وہ اٹھ کر میدان میں جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ درختوں کے خشک پتوں پر آہٹ ابھری۔ لالی چوکنا نظروں سے اس طرف دیکھنے لگا۔ آہٹ قریب' اور قریب آتی گئی۔ ایک درخت کے تنے کے پیچھے سے اللہ دتا نکل کر سامنے آ گیا۔

"کہاں چلا گیا تھا؟"

"میں جی' ادھر جنگل میں ٹٹی کرنے گیا تھا۔"

اللہ دتا آگے بڑھا اور لالی کے قریب بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش رہے۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھتا گیا۔ سناٹا گہرا ہو گیا۔ جنگل میں جھینگروں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ رات ہو گئی۔

جب پہر رات گزر گئی اور ہر طرف ہو کا عالم طاری ہو گیا تو دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اللہ دتا نے چادر اٹھا کر کندھے پر ڈالی۔ لالی آگے بڑھا۔ اللہ دتا اس کے ساتھ چلا۔ دونوں درختوں کے نیچے سے نکل کر کھلے میدان میں آ گئے۔

آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ نرم نرم جھونکے چل رہے تھے۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے احتیاط سے کلراٹھی کی جانب بڑھنے لگے۔ دونوں کچھ دور آگے گئے تو میدان میں جگہ جگہ لانا کے پودوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ لانا کے پودے کمر کمر تک اونچے تھے۔ وہ کھلے میدان سے ہٹ کر لانا کے پودوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ خطرے کے وقت وہ لانا کے پودوں کی اوٹ میں چھپ سکتے تھے۔ انھوں نے نصف میل سے زیادہ راستہ لانا کے پودوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے طے کیا۔ آگے لق و دق ریتلا میدان تھا۔

میدان کے سرے پر ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں پانی کی وسیع جھیل جھلملا رہی تھی۔ لالی نے

اسے حیرت سے دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر اس طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ادھر اتنا پانی کہاں سے آ گیا؟"

"تو اسے پانی کی جھیل سمجھ رہا ہے؟" اللہ دتا ہنس کر بولا۔

"تب تو یہ ڈاہر ہو گا۔ روہی کے علاقے میں ریت کے ٹیلوں کے درمیان میں نے ایسے ڈاہر دیکھے ہیں۔ بہت دن ہوئے' میں ایک بار گرمیوں میں ادھر گیا تھا۔"

اللہ دتا نے انکار میں گردن ہلائی۔ "نہیں جی! یہ تو باڑہ ہے۔ اس سے بہت دھوکا ہوتا ہے۔ اس وقت تو خشک ہے اور بہت سخت ہے۔ پر جب بارش ہوتی ہے تو باڑھے کی مٹی بھیگ کر اتنی نرم پڑ جاتی ہے کہ دلدل بن جاتی ہے۔ یہ دلدل بہت خطرناک ہوتی ہے۔ پیر رکھتے ہی بدن اندر دھنستا چلا جاتا ہے۔"

لالی نے اس کی باتیں توجہ سے سنیں۔ دونوں آگے بڑھتے رہے۔ اللہ دتا کی بات ٹھیک تھی۔ باڑہ مانند سراب تھا۔ دونوں جس قدر آگے بڑھتے' پانی کی جھلملاتی جھیل نظروں سے دور ہوتی جاتی۔ کچھ دیر بعد وہ باڑھے کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ اس کی مٹی سخت' چکنی اور چمک دار تھی۔ اس میں نمکیات اور ابلی کی آمیزش تھی۔ زمین اتنی سخت تھی کہ چلتے ہوئے قدموں کی آہٹ صاف سنائی دیتی تھی۔

دور دور تک سبزے کا نام و نشان نہ تھا۔ پودوں اور جھاڑیوں کا ذکر کیا' جنگلی جڑی بوٹیاں تک نہ تھیں۔ صرف اجلا اجلا سفید چٹیل میدان تھا۔ دونوں نے باڑہ عبور کیا تو ایک مرتبہ پھر لانا اور پھوگ کے جھنڈ نظر آنے لگے۔

وہ آگے بڑھتے گئے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ خاموشی بہت گہری تھی۔ انھوں نے لگ بھگ چار میل فاصلہ طے کیا تو دور سے روشنی ٹمٹماتی نظر آئی۔

اب لانا کے پودوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں جال کے درخت بھی سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے چھوٹے چھوٹے تھے۔ مگر شاخیں خوب گھنی اور گول دائرے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جال' خودرو صحرائی درخت ہے۔ اس کی شاخوں اور جڑوں کی مسواک بنتی ہے۔ جون کا تپتا ہوا مہینہ ختم ہوتے ہی جب بادل گھر کر آتے ہیں اور رم جھم مینہ برستا ہے تو جال کے درختوں میں پھل لگتے ہیں۔ یہ سرخ سرخ پیلو ہوتے ہیں جنھیں ذوق و شوق سے کھایا جاتا ہے۔ میاں والی کے تھل میں' چولستان اور بہاول پور کے ریگستانوں میں جال کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں۔ ان میں پیلو لگتے ہیں تو ریگ زاروں کی پروردہ الھڑ دوشیزاؤں کی ٹولیاں پیلو چننے کے لیے صحرا میں نکل جاتی ہیں۔ پیلو

چن چن کر جگہ جگہ اونچی اونچی ڈھیریاں لگاتی ہیں۔ جال کے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر پیلو کے گیت گاتی ہیں۔

آچنوں رل مل یار
پیلو پکیاں نی
پکیاں گل گلنار
پیلوں پکیاں نی
پیلوں پتھروین جیٹھ مہینے
تھل دیاں جٹیاں مارن سینے

وہ پیلو چنتی ہیں۔ قہقہے لگاتی ہیں۔ لہک لہک کر گاتی ہیں اور گیت کے بولوں کے ذریعے آپس میں یوں چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں۔ "آ' میرے محبوب! مل جل کر پیلو چنیں۔ پیلو پک کر گل گلنار کے مانند سرخ پڑ گئے ہیں۔ جیٹھ کا مہینہ ہے۔ ریگستان میں پلنے والی کنواریں سینہ ابھار کر چلتی ہیں اور پیلو چنتی ہیں۔"

مگر اس سنسان رات میں نہ جال کے درختوں میں پیلو لگے تھے اور نہ صحرائی دوشیزائیں پیلو چنتے ہوئے لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اللہ دتا اور لالی روشنی کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ روشنی قریب آ گئی۔ اللہ دتا نے روشنی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مدھم لہجے میں لالی کو بتایا۔

"سامنے کلراٹھی ہے۔ بول آگے کیا کرنا ہے؟"

"سیدھا پہرے دار طور محمد لکھیرا کے پاس چلا جا۔ ہزار روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دینا۔ روپے دیکھ کر وہ مگن ہو جائے گا۔ میں جال کے درختوں کی آڑ لیتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ جاؤں گا۔"

اللہ دتا نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "فیر کیا ہو گا؟"

"آگے جو کچھ ہو گا' اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔" لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "تو آگے بڑھتا جا۔"

اللہ دتا نے ایک بار پھر خدشہ ظاہر کیا۔ "سوچ لے' کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ راکھے کے پاس بھری ہوئی رائفل ہے۔" اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ وہ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"میں نوں پتہ ہے پہرے دار کے پاس بھری ہوئی رائفل ہے۔" لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ڈر نہیں' حوصلے سے کام لے۔ سب ٹھیک ہو گا' پروا نہ کر۔"

ہلکی روشنی میں بیگار کیمپ کے دھندلے دھندلے نشانات نظر آنے لگے تھے۔ آگے بہت وسیع کلّر میدان تھا جس کی تھور زدہ زمین پر کھار کی جمی ہوئی سفید تہہ دور سے اجلی اجلی نظر آ رہی تھی۔ میدان کے آس پاس جال کے گھنے درخت تھے۔ میدان سے ذرا ہٹ کر ایک کچا راستہ بیگار کیمپ تک جاتا تھا۔

لالی نے اللہ دتا کو اس راستے پر چلنے کا اشارہ کیا اور خود علیحدہ ہو کر درختوں کی آڑ میں دبے دبے قدموں چلنے لگا۔

اللہ دتا آگے بڑھا۔ اس کی چاپ ابھری تو دور سے آواز آئی۔ "کون ہے؟"

اللہ دتا نے آواز پہچان لی۔ یہ پہرے دار کی آواز تھی۔ اللہ دتا نے جواب دیا۔ "میں ہوں جی' اللہ دتا۔" وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔

پہرے دار ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں بندوق سنبھالے اس کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچ کر ٹھٹکا۔ ہاتھ اٹھا کر لالٹین اونچی کی اور اللہ دتا کو پہچاننے کی کوشش کی۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو اس نے کہا۔ "توں آ گیا؟"

اللہ دتا نے جواب دیا۔ "توں نے بلایا جو تھا۔"

اللہ دتا اس کے بالکل قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ طور محمد لکھیرا نے مسکرا کر کہا۔ "بہت دیری کر دی توں نے۔ میں دیر سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔"

اللہ دتا نے معذرت کے انداز میں کہا۔ "ہاں جی' کچھ دیر ہو گئی۔"

"روپے لایا ہے؟"

اللہ دتا نے مستعدی سے جواب دیا۔ "بالکل لایا ہوں۔ روپے نہ لاتا تو تیرے کول کیوں آتا۔"

"آ میرے ساتھ' ادھر منجی پر بیٹھ کر آرام نال گل بات ہو گی۔"

دونوں کلراٹھی کی اس عمارت کی جانب بڑھنے لگے جس میں بیگار کرنے والے مزدور قیدی رکھے جاتے تھے۔

لالی ایک درخت کی آڑ میں دم سادھے کھڑا تھا۔ عمارت اس کے بالکل سامنے تھی۔ یہ عمارت مٹی کی بنی ہوئی تھی اور کسی پرانے قلعے کے مانند نظر آتی تھی۔ اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواروں کی فصیل تھی۔ قریب ہی چند نیم پختہ مکانات تھے۔ ان میں پہرے دار اور نوکر چاکر رہتے تھے۔ کلراٹھی میں جگہ جگہ جھگیاں تھیں۔ ایک بڑی بھٹی بھی تھی جس کی پختہ چمنی بلندی تک چلی

گئی تھی۔

کلراٹھی اور اس کے بیگار کیمپ پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ صرف ایک پہرے دار طور محمد لکھیرا ڈیوٹی پر تھا۔ دوسرے پہرے دار اور نوکر چاکر شام کو اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ کلراٹھی پر کام بند ہوتا تو وہ اسی طرح چپکے سے کھسک جاتے تھے۔ حالانکہ ان کے لیے یہ حکم تھا کہ منشی کی اجازت کے بغیر بیگار کیمپ چھوڑ کر نہ جائیں۔ مگر رات کو اس ویرانے میں نور علی کھوکھر اور اس کے منشی کے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا' لہٰذا وہ چھٹی کے موقعے پر رات کو چلے جاتے اور صبح تڑکے واپس آجاتے۔

پہرے دار اور اللہ دتا آہستہ آہستہ قید خانے کی عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ قید خانے میں آمدورفت کے لیے صرف ایک دروازہ تھا اور اس پر تالا پڑا تھا۔ دروازے کے عین سامنے چارپائی بچھی تھی۔ پہرے دار نے لالٹین چارپائی کے قریب رکھ دی۔ البتہ بندوق اس کے ہاتھ میں بدستور دبی ہوئی تھی۔

وہ اللہ دتا کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اپنے ڈیل ڈول کے اعتبار سے برچھا لگتا تھا۔ اس کا قد لمبا' جسم چوڑا چکلا اور مضبوط تھا۔ مونچھیں گھنی تھیں۔ چہرہ ایسا کرخت اور درشت تھا کہ سخت ہیبت ناک نظر آتا تھا۔

لالی درختوں کی آڑ لیتا کھنڈر کے قریب پہنچ گیا۔ یہ کوئی اجڑی ہوئی قدیم بستی تھی۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں اس قدر شور زدہ تھیں اور ان پر کھار کی تہہ اس طرح جمی تھی کہ وہ برف پوش نظر آتی تھیں۔

شور زدہ کھنڈر سے قید خانے کی عمارت زیادہ دور نہیں تھی۔ لالی وہاں سے پہرے دار اور اللہ دتا کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ وہ شکستہ دیوار کی آڑ میں دبکا ہوا تھا۔ اس کی نظریں پہرے دار اور اللہ دتا کی جانب تھیں۔

لالی سانس روکے چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ اللہ دتا نے دھوتی کے ڈب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور پہرے دار کو تھما دی۔ پہرے دار گردن جھکا کر نہایت انہماک سے نوٹ گننے لگا۔ کھنڈر اور عمارت کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ اسے عبور کرنا سخت خطرناک تھا۔ پہرے دار کی نظر لالی پر پڑ سکتی تھی۔ مگر وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر نوٹ گننے میں محو تھا۔

لالی نے جھپاک سے درمیانی فاصلہ طے کیا۔ لالٹین کی دھندلی روشنی میں اس کا سایہ لہرایا۔ پہرے دار نے پلٹ کر دیکھا۔ لالی فوراً قید خانے کی دیوار سے چپٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پہرے دار گردن

موڑے دیکھتا رہا۔ اللہ دتا کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ چھا گئی۔ وہ نظریں جھکائے پہرے دار کے برابر خاموش بیٹھا رہا۔ کوئی نظر نہیں آیا تو پہرے دار نے گردن جھکا کر پھر نوٹ گننا شروع کر دیے۔

لالی دیوار سے لگا دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ اس کے عقب میں پہنچا۔ تیزی سے اچھلا' پہرے دار کے سر پر پہنچا اور ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کی گردن دبوچ کے تیزی سے جھٹکا دیا۔ پہرے دار کے زانو پر رکھی ہوئی بندوق پھسل کر نیچے گر گئی۔ اللہ دتا ہکا بکا ہو کر خوف زدہ نظروں سے لالی کو تکنے لگا۔ لالی نے اسے زور سے ڈانٹا۔

"منہ کیا تک رہا ہے۔ اٹھا لے بندوک۔"

اللہ دتا نے جھک کر بندوق اٹھالی۔ پہرے دار نے گردن نیچی کرتے ہوئے زور آزمائی کی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر لالی کی کلائی پکڑلی اور اسے زور سے کھینچا۔ اس طرح لالی کی گرفت سے اس نے اپنی گردن چھڑالی۔

پہرے دار طور محمد لکھیرا بندوق چھیننے کے لیے اللہ دتا پر جھپٹا۔ لالی نے تیزی سے بڑھ کر پھر اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ مگر پہرے دار بہت مضبوط اور طاقت ور تھا۔ اس دفعہ وہ لالی کی گرفت میں نہیں آیا۔ اس نے اٹھ کر اللہ دتا کے ہاتھ پر زور سے تھپکی دی۔ بندوق اللہ دتا کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

پہرے دار اسے اٹھانے کے لیے لپکا۔ لیکن لالی نے اسے اتنی مہلت نہیں دی۔ وہ پیچھے ہٹ کے اچھلا اور سر جھکا کے پہرے دار کے منہ پر پوری قوت سے ٹکر ماری۔ چوٹ کاری آئی۔ پہرے دار سنبھل نہ سکا' چارپائی پر چاروں خانے چت گرا۔ لالی نے اسے کروٹ بھی نہ لینے دی۔ چارپائی اٹھا کر پلٹ دی۔

پہرے دار لڑھک کر نیچے آگیا۔ چارپائی اس کے اوپر گری۔ اس نے چارپائی کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ چارپائی ہٹا کر باہر آتا' لالی نے جھٹ بندوق اٹھالی۔ بندوق ہاتھ میں لیتے ہی لالی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ بندوق نہیں رائفل ہے۔ لالی نے رائفل کی نال پہرے دار کی جانب کر دی۔ ڈپٹ کر خبردار کیا۔

"اٹھنے کی کوشش کی تو گولی چلا دوں گا۔"

پہرے دار نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ جس طرح چارپائی کے نیچے فرش پر پڑا تھا' ویسے ہی پڑا رہا۔ اس کا چہرہ اور دھڑ کا اوپری حصہ چارپائی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ لالٹین اپنی جگہ رکھی تھی۔

اس کی روشنی میں نوٹ ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ پہرے دار خاموش پڑا لالی کو خوں خوار نظروں سے گھورتا رہا۔

لالی رائفل تانے کھڑا رہا۔ اللہ دتا جلدی جلدی بکھرے ہوئے نوٹ اٹھانے لگا۔ نوٹ اکٹھا کرکے اس نے دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔ لالی نے اسے مخاطب کیا۔ "اللہ دتا! پگڑی اتار۔" اس نے پہرے دار طور محمد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے دونوں ہاتھ پگڑی سے باندھ دے۔"

اللہ دتا نے سر سے پگڑی اتاری۔ لکھیرا کے پاس گیا اور اس کے دونوں ہاتھ پگڑی سے کس کر باندھنے لگا۔ پہرے دار غصے سے بولا۔ "توں نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔"

اللہ دتا تو خاموش رہا لیکن لالی نے اسے ڈانٹا۔ "بکواس نہ کر' چپ کرکے پڑا رہ۔" پہرے دار نے پھر کچھ نہیں کہا۔

اللہ دتا نے اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر مضبوط گرہ لگا دی۔ لالی نے اسے حکم دیا۔ "اب منجی اٹھا دے۔" اللہ دتا نے پہرے دار پر پڑی ہوئی چارپائی اٹھا دی۔

لالی نے پہرے دار سے پوچھا۔ "اٹھ کر بیٹھ۔ بتا جیل کے دروازے کی چابی اور دوسری چابیاں کہاں ہیں؟"

لکھیرا نے کمر پر کہنی مار کر اشارہ کیا۔ اللہ دتا نے بڑھ کر اس کا کرتا اٹھایا۔ کمر پر کنجیوں کا گچھا لٹک رہا تھا۔ اللہ دتا نے گچھا کھول کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ لالی نے کہا۔ "اللہ دتا! دروازہ کھول کے اندر جا اور اللہ ڈیٹو کو نکال لا۔"

اللہ دتا آگے بڑھا۔ اس نے لالٹین اٹھائی' تالا کھولا اور قید خانے کے اندر چلا گیا۔ لالی رائفل کی نال پہرے دار پر تانے چوکس کھڑا رہا۔ پہرے دار گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

☆

اللہ دتا ہاتھ میں لالٹین لٹکائے دروازے سے نکلا۔ اس کے ہم راہ اللہ ڈیٹو بھی تھا۔ اس کی عمر اکیس بائیس سال ہوگی۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ داڑھی اور مونچھیں بڑھ کر بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ وہ پھٹی ہوئی بوسیدہ قمیص پہنے تھا۔ دھوتی بھی میلی کچیلی تھی۔ نہ پیروں میں جوتے تھے نہ سر پہ پگڑی۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے لالی کو دیکھنے لگا۔

اللہ دتا بولا۔ "یہ اللہ ڈیٹو ہے جی۔"

لالی نے اللہ ڈیٹو کو قریب بلایا اور ایک ہاتھ سے اس کی پیٹھ تھپک کر دل جوئی کی۔ "اتنا ڈرا سہا

کیوں ہے؟ اب تو اس جیل سے چھوٹ گیا۔" اس نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ "فٹافٹ اس کی ادوائن کھول لے۔"

اللہ ڈیٹو خاموشی سے آگے بڑھا اور ادوائن کھولنے لگا۔ اللہ دتا نے بھی اس کی مدد کی۔ دونوں نے ادوائن کھول کر رسی نکال لی۔ لالی نے پہرے دار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ ڈیٹو سے کہا۔

"پگڑی کھول۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کرکے رسی سے باندھ دے۔ اللہ دتا! تو بھی لگ جا۔ فٹافٹ باندھ۔ وقت کم ہے۔"

دونوں بھائیوں نے پگڑی کھول کر چارپائی کی مضبوط ادوائن سے پہرے دار کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ وہ چپ بیٹھا رہا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔

لالی نے لالٹین کی روشنی میں رائفل کا میگزین کھول کے دیکھا اس میں نو کارتوس موجود تھے۔ دسواں چیمبر میں تھا۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر رائفل اللہ دتا کو دی اور کنجیوں کا گچھا اس سے لے لیا۔

اللہ دتا نے پوچھا۔ "ان کا کیا کرے گا؟ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

"ابھی چلتے ہیں' تھوڑا سا کام اور کرنا ہے۔ دوسروں کو بھی تو رہا کرنا ہے۔"

"انھیں چھوڑ' ہم نے ان سے کیا لینا؟"

"بیکار کی گزگز نہ کر' چپ کرکے کھڑا رہ۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔ "انھیں رہا کرنا ضروری ہے۔ اگر سب نہ چھوٹے تو نور علی کھوکھر تجھے اور ڈیٹو کو اپنے کرندوں سے قتل کروا دے گا۔ سب چھوٹ گئے تو کس کس کو قتل کرائے گا۔ ویسے وہ بھی تو اللہ ڈیٹو کی طرح ویگار کے لیے پکڑ کر بند کیے گئے ہیں۔ انھوں نے کوئی جرم تو نہیں کیا اور یہ بھی تو سوچ' ان کے بھی گھر والے پریشان ہوں گے' انتظار کرتے ہوں گے۔"

پہرے دار طور محمد بولا۔ "ایسا نہ کر۔ سب نکل گئے تو منشی مجھے جان سے مار دے گا۔"

لالی قریب گیا اور اس کی پیٹھ پر ہولے سے دھپ مار کر بولا۔ "فکر نہ کر لکھیرے۔ تجھے بھی رہا کر دوں گا۔ تو بھی بھاگ جانا۔ کوئی اور دھندا کر لینا۔ یہاں رہے گا تو ایک نہ ایک دن مارا جائے گا۔ ویسے بھی یہاں کی پہریداری گندہ کام ہے۔ تجھے ان بے چارے کیدیوں پر ظلم کرتے دکھ نہیں ہوتا؟ انھوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟ اب چپ کرکے بیٹھا رہ۔ گڑبڑ کی کوشش کی تو گولی چلا دوں گا۔ اور جیسے تو نے کیدیوں کو قتل کرکے ان کی لاشیں دبائی ہیں' ویسے ہی گڑھا کھود کر تجھے بھی دبا دوں گا۔ کسی کو پتا بھی نہ چلے گا۔ بول کیا کہتا ہے؟"

پہرے دار نے اسے یقین دلایا۔ "جیسا کہتا ہے' ویسا ہی کروں گا۔ پر مجھے بھی رہا کر دینا۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "میں یہاں بندھا پڑا رہا تو زمیں دار اور اس کا منشی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

اس نے اللہ دتا کی طرف اشارہ کیا۔ "میران خاں راکھے نے یہاں سے نکل جانے میں اس کی اور دو کیدیوں کی مدد کی تھی۔ اس پر منشی نے پچھلے دنوں میران خان کو قتل کرادیا اور اس کی لاش جال کے درخت کے نیچے دبا دی۔ مشہور کردیا اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی کرے گا۔"

لالی نے اسے باور کرایا۔ "پروا نہ کر' تجھ سے جو وعدہ کیا ہے' پورا کروں گا۔"

لالی نے اللہ دتا سے رائفل لے کر اپنے ہاتھ میں تھام لی۔ اللہ دتا کو چوکس رہنے کی ہدایت کی۔ اسے پہرے دار کی نگرانی پر مامور کیا اور اللہ دیو کے ہم راہ قید خانے کے اندر چلا گیا۔ اللہ دیو لالٹین اٹھائے آگے آگے تھا۔ لالی اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

لالی نے عمارت میں داخل ہو کر دیکھا۔ اندر بہت وسیع صحن تھا۔ اس میں دو طرف سلسلے سے تنگ و تاریک کوٹھریاں تھیں۔ نہ کسی کوٹھری میں کھڑکی تھی نہ روشن دان تھا۔ کوٹھریوں کے آگے طویل بر آمدہ تھا۔ اس پر پھوس کی خمیدہ چھت تھی۔

قید خانے میں ہر طرف بدبو اور سڑاند پھیلی تھی۔ شام کو جب تمام قیدی ایک بار بند کر دیے جاتے تو کسی کو باہر جانے کی مطلق اجازت نہ ہوتی۔ رات کو وہ صحن ہی کے ایک حصے میں پیشاب اور رفع حاجت کرتے تھے جسے صاف کرنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ قید خانے کی تمام عمارت کچی تھی اور اس کی دیواریں شورزدہ تھیں۔

قید خانے میں اس وقت ۳۳ قیدی تھے۔ وہ بر آمدے میں مونج کی بوسیدہ اور کھردری چٹائیوں پر لیٹے تھے۔ ان کے پاس نہ تکیے تھے اور نہ اوڑھنے کے لیے چادریں تھیں۔ ویسے گرمی شروع ہو چکی تھی۔ چٹائیوں میں کھٹمل تھے۔ قیدی اپنی کمر اور ٹانگیں بار بار کھجاتے۔ وہ خوف زدہ اور گھبرائے ہوئے نظر آتے تھے۔

قیدی جوڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کے ایک ایک پیر میں لوہے کے کڑے پڑے تھے۔ کڑوں کے درمیان فٹ بھر کی زنجیر تھی اور ان میں تالے لگے تھے۔

لالی ہاتھ میں رائفل سنبھالے ہوئے تمام قیدیوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھتا چلا گیا۔ تمام قیدی خاموش بیٹھے رہے۔ انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ لالی ان کا معائنہ کر چکا تو اس

نے اونچی آواز سے کہا۔ "میں تالے کھول کر تم سب کو رہا کردوں گا پر کوئی گڑبڑ نہ ہو۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "کسی نے گڑبڑ کی کوشش کی تو گولی سے اڑا دوں گا۔"

چند لمحے وہ خاموش بیٹھے رہے پھر ایک قیدی نے' جو دوسروں سے کسی قدر سن رسیدہ تھا' سب کی ترجمانی کرنے کے انداز میں کہا۔ "ہمیں جی گڑبڑ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تو ں ہمیں رہا کردے گا تو دعا ہی دیں گے۔ گڑبڑ کیوں کریں گے؟ تو جیسا کہے گا' ویسا کریں گے۔"

"میں یہی چاہتا ہوں۔" لالی نے نرم لہجے میں کہا۔ اللہ دیو کو کنجیوں کا گچھا دیا۔ "دیو! باری باری سب کے تالے کھول دے۔"

اللہ دیو ہاتھ میں لالٹین سنبھالے آگے بڑھا۔ وہ ایک ایک قیدی کے پاس گیا اور کڑوں کے تالے کھولنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی سارے قیدیوں کے تالے کھول دیے۔ جب سب آزاد ہو گئے تو لالی نے باہر چلنے کی ہدایت کی۔ وہ اٹھے' دلان سے نکل کر صحن میں آئے اور دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔

آگے آگے لالٹین سنبھالے اللہ دیو تھا۔ اس کے پیچھے قیدیوں کا غول تھا۔ سب سے پیچھے رائفل سنبھالے لالی چل رہا تھا۔ قیدی دروازے سے گزر کر باہر آ گئے۔

لالی بھی باہر آ گیا۔ اس نے انھیں ایک بار پھر مخاطب کیا۔ "سنو' اب تم سب آزاد ہو۔ جس کا جہاں جی کرے نکل جائے۔ ابھی تو رات آدھی بھی نہیں ہوئی۔ بھاگنے کے لیے تمہارے پاس بہت وقت ہے۔ پر یہاں سے نکل بھاگنے سے پہلے تم سب کو ایک کام کرنا ہو گا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔

"کلراٹھی پر کھدائی کرنے کے لیے کدالیں تو ہوتی ہیں نا؟"

"ہاں جی' کیوں نہیں ہوتیں۔" کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ "بہت ہیں۔"

"کدالیں جہاں رکھی ہیں' تم سب جا کر وہاں سے نکال لاؤ۔" لالی نے مٹی اور اینٹوں سے بنی ہوئی بھٹیوں کی جانب ہاتھ لہرایا۔ "یہ ساری بھٹیاں توڑ پھوڑ کر برابر کردو' فٹافٹ۔ اس کے بعد یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

بیگار کیمپ کے پہرے داروں اور نوکروں کی کوٹھریاں سامنے تھیں۔ ان کے قریب ہی ٹین کا لمبا سائبان تھا۔ اس کے نیچے کھدائی کا ساز و سامان رکھا تھا۔ اس میں کدالیں اور بیلچے بھی تھے۔ سارے قیدی سائبان کے اندر چلے گئے اور کدالیں ہاتھ میں سنبھالے باہر آ گئے۔ وہ ادھر ادھر بکھر گئے اور کدالوں سے بھٹیاں کھودنے لگے۔ کھدائی اور توڑ پھوڑ کی آوازیں رات کے سناٹے میں

ابھر رہی تھیں۔

لالی اور اللہ ڈیٹو پہریدار کے پاس چلے گئے۔ اس کے ہاتھ اور پیر رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے عین سامنے کچھ فاصلے پر اللہ دتا کھڑا تھا۔

لالی کو دیکھ کر پہرے دار نے حیرت سے پوچھا۔ "توں بھٹیوں دی توڑ پھوڑ کیوں کروا رہا ہے؟"

لالی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اللہ دتا اور ڈیٹو سے کہا۔ "تم دونوں بھی کدالیں لے کر کھدائی میں لگ جاؤ۔ کام جھیتی نال ہونا چاہئے۔ ابھی بہت دور جانا ہے۔"

اللہ دتا نے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں' توں بھٹیوں شٹیوں کے چکر میں نہ پڑ۔ ہم نے اب جھیتی نال یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

"بیچ میں ٹانگ نہ اڑا۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔ "جیسا کہتا ہوں' ویسا کر۔"

اللہ دتا خاموش ہو گیا اور اللہ ڈیٹو کے ہم راہ کدالیں لینے سائبان کی جانب چلا گیا۔ لالی نے رائفل ایک طرف رکھی' الٹی چارپائی اٹھا کر بچھائی۔ رائفل سنبھالی اور چارپائی پر چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ توڑ پھوڑ کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ ملبے سے گرد و غبار اڑ اڑ کر پھیل رہا تھا۔ پہرے دار سر جھکائے لالی کے سامنے فرش پر خاموش بیٹھا تھا۔

رات کا اندھیرا بڑھتا گیا۔ کدالیں چلنے اور ملبہ گرنے کی آوازیں سناٹے میں ابھرتی رہیں۔ آخر آوازیں بند ہو گئیں۔ خاموشی چھا گئی۔ قیدی ٹولیوں میں بکھرے ہوئے لالی کے قریب آئے۔ لالی چارپائی سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ اللہ دتا آگے آگے تھا۔

لالی نے پوچھا۔ "ساری بھٹیاں توڑ ڈالیں؟"

"ہاں جی۔" اللہ دتا نے جواب دیا۔ "جا کر دیکھ لے' سب توڑ کر برابر کر دیں۔"

قیدی اس کے سامنے ہجوم کی صورت میں چپ کھڑے تھے۔ لالی نے لالٹین کی روشنی میں انھیں دیکھا۔ سب کے چہرے اور بال گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کدالیں دبی تھیں۔

لالی نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے ہدایت کی۔ "کدالیں وہیں رکھ دو جہاں سے اٹھا کر لائے تھے اور جدھر تمہارا جی کرے' چلے جاؤ۔"

ان کے چہروں پر مسرت پھیل گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے سائبان کی طرف چلے گئے۔ ذرا دیر بعد سائبان کے نیچے کدالیں رکھنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لالی نے لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں دیکھا۔ قیدی سائبان کے نیچے سے ٹولیوں میں باہر نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے مختلف سمتوں میں

چلے گئے۔ کچھ دیر تک وہ دھندلی دھندلی پرچھائیوں کی مانند نظر آتے رہے' پھر رات کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔

بیگار کیمپ پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ اللہ دتا اور ڈیٹو موجود تھے۔ وہ لالی کے قریب کھڑے تھے۔ لالی نے اللہ دتا کو پہرے دار کی نگرانی پر مقرر کیا اور اللہ ڈیٹو کے ساتھ سائبان کی جانب بڑھا۔ ہر طرف ٹوٹی پھوٹی بھٹیوں کا ملبا بکھرا ہوا تھا۔ اللہ ڈیٹو ہاتھ میں لالٹین سنبھالے آگے آگے چل رہا تھا۔ سائبان کے قریب پہنچ کر لالی رک گیا۔ اس نے اللہ ڈیٹو سے پوچھا۔

"کلرانھی پر شورہ لے جانے کے لیے اونٹھ بھی رہتے ہیں' ان کا ڈھارا کتھے ہے؟"

"اتھے ہے۔" اللہ ڈیٹو نے عمارت کے پچھواڑے کی جانب ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "پر سارے اونٹھ تو آج شورہ لاد کر ٹیشن چلے گئے۔ سویرے واپس آئیں گے۔"

"تیرا مطلب ہے' اب ڈھارے میں کوئی اونٹھ نہیں رہا؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔ آج بہت مال بھیجا گیا تھا۔"

"مجھے ڈھارا تو دکھا۔ شاید کوئی اونٹھ مل جائے ورنہ صبح تک ہم تینوں داؤد پور کیسے پہنچ سکیں گے؟" لالی کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

دونوں عمارت کے عقب میں گئے۔ جال کے ایک درخت کے قریب مٹی کی اونچی اونچی دیواروں پر چھپر کی چھت تھی۔ یہ اونٹوں کا باڑا تھا۔ دونوں اس طرف بڑھے۔ لالٹین کی روشنی میں انھیں دو اونٹ چھپر کے نیچے بیٹھے نظر آئے۔ لالی کے چہرے پر مسرت پھیل گئی۔

"کام بن گیا۔ تجھے اونٹھ کی سواری آتی ہے؟"

"کیوں نہیں آتی جی۔ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ میں تو بچپن سے اونٹھ چلا رہا ہوں۔"

"اللہ دتا بھی جانتا ہو گا؟" لالی نے دریافت کیا۔

"بالکل جانتا ہے جی۔ وہ تو کئی مہینے اونٹھ چلانے والا جتال بھی رہ چکا ہے۔" اللہ ڈیٹو نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "دونوں اونٹھ کھول کر باہر نکال لوں؟ ان پر بیٹھ کر نکل جائیں گے۔ اب زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے۔"

"ابھی نہیں۔ پہلے میرے ساتھ اس طرف چل جہاں کلرانھی کا سامان رکھا جاتا ہے۔"

اللہ ڈیٹو خاموش رہا۔

دونوں ایک بار پھر سائبان کی جانب چلے۔ وہاں کدالیں اور بیلچے رکھے تھے۔ مٹی کے تیل کے دو پیپے بھی تھے۔ پھٹے پرانے کپڑے اور بہت سا کاٹھ کباڑ تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ خالی

بوریوں کا ڈھیر تھا۔ شورے اور نجّی سے بھری ہوئی بوریاں بھی تھیں مگر زیادہ نہیں تھیں۔

لالی نے اللہ ڈیتو کی مدد سے مٹی کے تیل کے پیپے سائبان سے نکال کر باہر رکھ دیئے۔ اس کے بعد وہ اللہ ڈیتو کے ساتھ پہرے دار طور محمد لکھیرا اور اللہ دتا کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پہریدار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اللہ دتا سے کہا۔ "اس کے ہاتھ اور پیر کھول دے۔" اللہ دتا اس کے ہاتھ پیر کھولنے لگا۔ پہرے دار خاموش بیٹھا رہا۔ لالی نے رائفل اس کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

"تو بھی بھاگ جا۔"

پہرے دار چپ چاپ اٹھ کر ایک طرف چل دیا۔ لالی' رائفل سنبھالے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ کچھ دور جا کر اس نے ڈانٹا۔ "زنانیوں کی چال نہ چل۔ دوڑ لگا۔" پہرے دار تیزی سے بھاگا اور اندھیرے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

لالی نے واپس آ کے اللہ دتا اور اللہ ڈیتو سے کہا۔ "ڈھارے میں جا کر دونوں اونٹھ باہر نکال لو۔" اس نے جال کے ایک درخت کی جانب اشارہ کیا جو بیگار کیمپ سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ "تم دونوں اونٹھ اتھے لے جاؤ اور میرا انتظار کرو۔ میں نوں ابھی ایک کام اور کرنا ہے۔ میں ہمیتی نال تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

دونوں بھائی اونٹوں کے باڑے کی طرف چلے گئے۔ لالی سائبان کی سمت بڑھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں لالٹین تھی۔ اس نے رائفل ایک طرف میدان میں رکھ دی۔ سائبان کے نیچے گیا۔ وہاں سے پھٹے پرانے کپڑے اور خالی بوریاں نکالیں۔ انھیں اٹھا کر باہر لایا۔ مٹی کے تیل کے پیپے کھولے۔ تیل پھٹے پرانے کپڑوں اور بوریوں پر چھڑکا۔ لالٹین ہاتھ میں لی اور تیل سے بھیگی ہوئی دو بوریاں اٹھا کر قید خانے کی عمارت میں گیا۔ لالٹین کی چمنی اونچی کی اور اس کی لو سے ایک چیتھڑا جلایا۔ جلتے ہوئے چیتھڑے سے اس نے ایک بوری میں آگ لگائی اور جلتی ہوئی بوری برآمدے کے چھپر کی جانب اچھال دی۔ چھپر جلنے لگا۔ لالی نے دوسری بوری میں بھی آگ لگائی اور دالان میں بچھی ہوئی مونج کی چٹائیوں پر ڈال دی۔ اس نے چمنی نیچے کی اور لالٹین اٹھائے باہر نکل آیا۔

لالی نے تیل سے بھیگے ہوئے کپڑوں اور بوریوں میں لالٹین کے ذریعے آگ لگائی اور انھیں جلدی جلدی کوٹھریوں کی چھتوں پر پھینک دیا۔ کچھ جلتے ہوئے کپڑے سائبان کے نیچے رکھے ہوئے سامان پر ڈال دیئے' کچھ جلتی ہوئی بوریوں سے دروازوں میں آگ لگا دی۔ اس نے رائفل اٹھائی۔ لالٹین ہاتھ میں لٹکائی اور اونٹوں کے باڑے میں پہنچا۔ تیل سے بھیگی ہوئی ایک بوری میں اس نے

آگ لگائی اور اسے پھوس کی بنی ہوئی باڑے کی چھت پر پھینک دیا۔ لالٹین اس نے چھت کے نیچے بکھری ہوئی خشک گھاس پر ڈال دی اور تیز تیز قدموں سے جال کے اس درخت کی جانب لپکا جہاں اللہ دتا اور ڈیتو اونٹوں کے ساتھ کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اللہ دتا نے لالی کو اپنے ساتھ اونٹ کی پیٹھ پر بٹھایا' دوسرے اونٹ پر اللہ ڈیتو سوار ہوا۔ دونوں نے اونٹ آگے بڑھائے اور تیز رفتار سے دوڑانے لگے۔ لالی نے مڑ کر دیکھا۔ بیگار کیمپ کے در و دیوار جل رہے تھے۔ سرخ سرخ شعلے بھڑک رہے تھے۔ دیواریں چیخ رہی تھیں' چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ ہر طرف آگ ہی آگ پھیلی تھی۔ دھوئیں کے سیاہ بادل فضا میں پھیلتے جا رہے تھے۔

☆

دونوں اونٹ داؤد پور میں داخل ہوئے تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اللہ دتا نے اونٹ اپنے گھر کے سامنے ٹھہرائے۔ تینوں نیچے اترے۔ اللہ دتا نے آگے بڑھ کر تالا کھولا۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ اللہ دتا کے تینوں بچے گھر میں نہیں تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ انھیں بیوی کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ یہ مٹی کا بنا ہوا چھوٹا سا گھر تھا۔ اس میں صرف ایک کمرہ اور دو کوٹھریاں تھیں۔ اللہ ڈیتو نے گھر پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر وہ بالکل خاموش تھا۔

اللہ دتا نے کمرے میں داخل ہو کر چارپائی پر بستر بچھا دیا' لالی کے پاس آیا۔ "تو اب سو جا۔ تھکا ہوا بھی ہے اور رات بھر جاگا ہے۔" لالی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کمرے میں گیا اور نڈھال ہو کے بستر پر لیٹ گیا۔ دوپہر کو اللہ دتا نے اسے جگایا۔ لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اللہ دتا اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"بہت سو لیا' اب روٹی کھا لے۔"

لالی خاموشی سے نیچے اترا۔ اللہ دتا کے ساتھ صحن میں گیا۔ منہ دھویا' کلی کی اور کمرے میں واپس آیا۔ ابھی تک اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چنگیری تھی۔ اس میں روٹیاں تھیں۔ دوسرے ہاتھ میں دال سے بھرا ہوا پیالہ تھا۔

اس نے چنگیری اور پیالہ فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر رکھ دیا اور دوپٹے کا پلو سر سے کھینچ کر آگے گرا لیا۔ وہ ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔

اللہ دتا نے کہا۔ "یہ سرداراں ہے' میری گھر والی۔"

لالی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اس کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگت گیندے کے

پھول کی طرح زردی مائل تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں' چہرہ بیضوی تھا' جسم بھرا بھرا گداز اور سڈول تھا۔ وہ خوش شکل عورت تھی مگر اپنے سن سے کچھ زیادہ ہی لگتی تھی۔ سرداراں نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ وہ کسی طور اتنی تیز اور ہوشیار نظر نہیں آتی تھی جیسا اللہ دتا نے بتایا تھا۔ وہ سیدھی سادی عام دیہاتی عورت تھی۔

لالی نے مسکرا کر قریب کھڑے ہوئے اللہ دتا کو دیکھا اور سرداراں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "اسے سرگانے سے چھڑا کر کب لایا؟"

"سویرے ہی سویرے سنار کے گھر پہنچا۔ اس کے ہزار روپے واپس کئے اور سرداراں کو لے آیا۔ بچے بھی آ گئے' باہر کھیل رہے ہیں۔"

لالی نے پوچھا۔ "تو سویا نہیں؟"

"کیسے سوتا؟ میں نے کئی کام کرنے تھے۔" وہ کھانے کے سامنے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ "پہلے روٹی کھا لے۔ آرام سے باتیں کریں گے۔" لالی بھی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

سرداراں باہر چلی گئی۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد دو کٹوروں میں لسی لے کر واپس آ گئی۔ لالی اور اللہ دتا کھانا کھانے لگے۔ لالی نے لسی کا گھونٹ بھرا اور کٹورا رکھتے ہوئے بولا۔ "داؤد پور تو موضع لگتا ہے۔"

"بالکل موضع ہے جی۔" اللہ دتا نے مستعدی سے جواب دیا۔ "یہاں پٹواری ہے۔ تین زمیندار رہتے ہیں۔ ان کی اونچی اونچی ماڑیاں ہیں۔ سنار نے بھی اپنی ماڑی بنوالی ہے۔ بچوں کی پڑھائی سکول بھی ہے۔ داؤد پور میں دکانیں ہیں۔ بازار ہے۔ اس موضعے کے کئی پنڈ ہیں۔"

"اللہ دتا! تو مجھے بازار سے ایک دھوتی' ایک چادر' جوتا' سر پر باندھنے کی پگڑی لا دے۔ جہانگیرہ اتنا وڈا نہیں ہے۔ وہاں یہ چیزیں نہیں ملتیں اور ہاں روپے رکھنے کے لیے ہمیانی بھی چاہئے۔ مل جائے گی؟"

"مل جائے گی اور بھی چیزیں مل جائیں گی۔" یہ کہتے کہتے اس نے سرداراں کی طرف دیکھا۔ "بازار جا کر یہ چیزیں خرید لا۔" وہ مسکرایا۔ "تو سستا ہی خرید کر لائے گی۔ دکان داروں سے مول تول پر جھگڑا بھی کر سکتی ہے۔"

"میں تو کسی سے جھگڑا نتا نہیں کرتی۔" سرداراں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تجھ سے جھگڑا کرتی ہوں؟ ایمان نال بتا' جو کہتا ہے' وہ کرتی ہوں۔"

"کرماں بھری ناراض کیوں ہوتی ہے؟" اللہ دتا مسکرا کر بولا۔ "میں نے تو ایسے ہی گل بات کی تھی۔"

لالی ان دنوں کی نوک جھونک نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "سرداراں! میری بش شرٹ اور پتلون دھو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں دھو سکتی۔" اس نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "توں نے اللہ دتا کی اتنی مدد کی۔ میں تیرے لیے کیا نہیں کر سکتی۔ کپڑے اتار کر چادر یا دھوتی باندھ لے۔ میں تیرے کپڑے دھو کر دھوپ میں ڈال دوں گی۔ شام تک سوکھ جائیں گے۔ پہن لینا۔"

"اللہ دتا تیرے بارے میں ٹھیک ہی کہتا ہے۔ تو زبردست اہری ہے۔" لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے کوئی چادر یا اللہ دتا کی دھوتی لا دے۔ میں اپنے کپڑے اتار کر دھونے کے لیے تجھے دے دوں گا۔"

سرداراں باہر چلی۔ لالی اور اللہ دتا کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ لالی نے بٹوہ نہیں نکالا۔ جیب سے تیس روپے کے کھلے ہوئے نوٹ نکالے اور اللہ دتا کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ "اتنے روپے سے کام چل جائے گا؟"

اللہ دتا نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔ "چل تو جانا چاہئے۔"

سرداراں' ملگجی سی دھوتی ہاتھ میں دبائے اندر آئی اور لالی کو دے دی۔ اس نے کھانے کے برتن اٹھائے اور کمرے سے چلی گئی۔ لالی نے بش شرٹ اور پتلون اتار کر دھوتی باندھ لی اور اللہ دتا سے کہا۔ "یہ کپڑے دھونے کے لیے سرداراں کو دے دے۔ بازار جا اور جو کچھ میں نے بتایا ہے' خرید لا۔ میں تب تک سوتا ہوں۔ مجھے اونگھ لگ رہی ہے۔"

اللہ دتا نے لالی کے میلے کپڑے اٹھائے اور باہر جانے لگا۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ "اندھیرا ہوتے ہی میں تیرے ساتھ جہانگیرہ چلوں گا۔ لے چلے گا نا؟"

"کیوں نہیں لے چلوں گا؟" اللہ دتا نے مسکرا کر کہا۔ "جہانگیرہ کیا' جہاں کہے وہاں لے چلوں۔ اب تو میرے پاس ایک چھوڑ دو اونٹھ ہیں۔"

لالی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔ "دونوں اونٹھ جتنی جلدی ہو سکے' بیچ دے۔ انہیں رکھنا ٹھیک نہیں۔ نور علی کھوکھر کے کرندے تیری تلاش میں ہوں گے۔ وہ اونٹھوں سے تیرا پتہ چلا لیں گے۔ اس دفعہ وہ تجھے چھوڑیں گے نہیں۔ تجھے اور اللہ دیتو' دونوں کو مار کے گھر میں آگ لگا دیں گے۔"

"کہتا تو ٹھیک ہے۔" اللہ دتا سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ "کھوکھر بہت ظالم ہے۔ وہ ضرور مجھ پر حملہ

کرائے گا۔ پتہ ہے' وہ کتنا ظالم ہے؟"

"داؤد پور بھی چھوڑ دے۔ کسی اور طرف نکل جا۔" لالی نے خبردار کیا۔ "یہاں رہے گا تو تیرے لیے ہر وکھت خطرہ ہی رہے گا۔ کھوکھراں یہاں سے دور تو ہے پر بہت زیادہ دور نہیں' ایک ہی تحصیل ہے۔"

اللہ دتا خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ چند لمحوں بعد اس نے کہا۔ "حاصل پور میں سرداراں کی ایک پھپھی ہے' اس سے پیار بھی کرتی ہے۔ اس کے پاس بھی جا سکتا ہوں۔ حاصل پور تو بھاول نگر میں ہے۔ میں وہاں جاتا رہتا ہوں۔"

"اونٹھ بیچ کر ہل خرید لینا۔ کسی زمیں دار کا مزارع بن جانا۔" لالی نے اللہ دتا کا سہا ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔ "آج ہی رات اللہ ویتو اور بال بچوں کے ساتھ دونوں اونٹھ لے کر یہاں سے نکل جا۔ رستے میں اونٹھ بیچ دینا۔"

اللہ دتا نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ "ایسا ہی کروں گا۔ تیں نوں جہانگیرہ چھوڑ کر واپسی پر حاصل پور نکل جاؤں گا' سرداراں سے کہتا جاؤں گا' چلنے کی تیاری کرلے۔" اللہ دتا چلا گیا۔ لالی بستر پر لیٹ کے سو گیا۔

شام کو لالی بیدار ہوا۔ کمرے میں چراغ روشن تھا۔ سرداراں دہلیز پر خاموش بیٹھی تھی۔ لالی اٹھ کے بیٹھ گیا۔ سرداراں مسکرا کر بولی۔ "توں سوتا بہت ہے۔ اللہ دتا تو بالکل نہیں سویا۔ تیری ساری چیزیں بازار سے لے آیا۔ میں نے تیرے کپڑے لتے بھی دھو دیئے' سوکھ بھی گئے۔ یہ سامنے پڑے ہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کے چٹائی کی طرف اشارہ کیا۔

لالی نے دیکھا' چٹائی پر پتلون اور بش شرٹ کے علاوہ ویسی جوتوں کی ایک جوڑی' دھوتی' چادر اور ہمیانی رکھی ہے۔ لالی بستر سے اتر کر نیچے آگیا اور انگڑائی لے کر بولا۔

"سب ہی کچھ آگیا۔ اللہ دتا بہت کام کا بندہ ہے۔"

"پر دوسری کمیس تو تیرے پاس ہے نہیں۔ اللہ دتا کے پاس ایک پرانی کمیس پڑی ہے' پر بہت پھٹ گئی۔ توں اسے پہن نہیں سکتا۔ میں سنارے کے گھر سے ایک کمیس مانگ کر لائی ہوں۔ ہے تو وہ بھی پرانی پر پھٹی ہوئی نہیں ہے۔ یہ رہی۔" اس نے زانو پر پڑی ہوئی قمیص لالی کے سامنے ڈال دی۔

لالی نے قمیص الٹ پلٹ کے دیکھی۔ "ٹھیک ہی ہے۔ یہ تو نے بہت چنگا کام کیا۔" لالی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "سرداراں! تو بہت کام کی زنانی ہے۔ اللہ دتا نصیبوں والا ہے کہ

اسے تیری ایسی اہری اور سمجھ دار گھر والی ملی۔"

"کیا کریں جی! ہمی خوشی علی شاہ میں رہتے تھے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کھوکھر کا بیڑا گرک ہو۔ اس نے ہمیں تباہ کر دیا' کچھ بھی نہیں رہا۔ اللہ دتا حاصل پور چلنے کو کہتا ہے' پر اپنے پاس تو کھانے کو بھی نہیں۔ تجھ سے تو کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ تجھے تو سب پتہ ہے۔ اللہ دتا مجھے بتا چکا ہے' تیری اس سے کیا کیا بات ہوئی۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا۔"

لالی نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جیب سے بٹوا نکالا۔ سو روپے کا ایک نوٹ کھینچ کر انگلیوں میں دبایا۔ سرداراں کی جانب بڑھا کے گویا ہوا۔ "لے یہ رکھ لے۔ اپنا کام چلا۔ اونٹھ بک گئے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے اللہ دتا سے یہی کہا ہے۔"

سرداراں نوٹ لیتے ہوئے بولی۔ "توں نے پہلے ہی ہماری بہت مدد کی ہے۔ اللہ دتا کی مدد نہ کرتا تو جانے میں کب تک سر گانے پر سنار کے گھر میں بند ھک رہتی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "دن بھر اس کی ماڑی میں کام کاج کرتی تھی۔ سنار کی گھر والی بھلی زنانی نہیں ہے۔ مجھے بالوں سے پکڑ کر مارتی۔ نوچتی کھسوٹتی' چیخ چیخ کر گالاں نکالتی۔" سرداراں کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

"رونا دھونا چھوڑ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تو اب ٹر جا۔ میں ذرا کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤں۔ شام ہو گئی' مجھے اللہ دتا کے ساتھ جہانگیرہ جانا ہے۔"

سرداراں چلی گئی۔ لالی نے قمیص پہنی' دھوتی باندھی۔ سر پر پگڑی لپیٹی۔ جوتے پہنے اور وضع قطع سے دیہات کا رہنے والا پینڈو بن گیا۔ اس نے ہمیانی میں بٹوے سے روپے نکال کر رکھے اور اسے کمر کے گرد مضبوطی سے باندھ لیا۔ تھوڑے سے روپے رکھ کر بٹوے کو قمیص کی جیب میں ڈال لیا۔

اس نے کونے میں رکھی ہوئی رائفل اٹھائی۔ اس میں بھرا ہوا کارتوس نکال کر میگزین میں لگا دیا۔ رائفل اپنے کپڑوں میں لپیٹی' چادر پر رکھی اور لمبی سی گٹھری بنائی۔ یہ تیاری کر کے وہ اللہ دتا کا انتظار کرنے لگا۔

باہر صحن میں شام اتر آئی تھی۔ اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اللہ دتا آگیا۔ اس کے پہنچتے ہی سرداراں کھانا لے کر آگئی۔ کھانے میں پراٹھے اور تلا ہوا مرغ تھا۔ سرداراں نے مرغ کی طرف اشارہ کر کے لالی سے کہا۔

"یہ ککڑ میں نے تیرے ہی لیے تلا ہے۔"

اللہ دتا نے مسکرا کر کہا۔ "میرے لیے نہیں؟"

"توں بھی کھا لینا۔" وہ شرمائی۔ "ویسے یہ تیرا بھی مہمان ہے۔ توں مجھ سے الگ تو نہیں ہے۔"

وہ ذرا دیر بعد چلی گئی۔

لالی کو بھوک نہیں تھی۔ اس نے تلے ہوئے مرغ سے تھوڑا گوشت نوچ کر کھایا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ اللہ دتا نے اصرار بھی کیا۔ مگر اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اللہ دتا کھانا کھاتا رہا۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوا تو لالی اور اللہ دتا گھر سے باہر چلے گئے۔ دروازے کے قریب ہی اونٹ موجود تھا۔ اللہ دتا نے ساری تیاری پہلے ہی مکمل کر لی تھی۔ اندھیرا خاصا بڑھ گیا تھا۔ دونوں اونٹ پر سوار ہوئے اور جہانگیرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اللہ دتا کا اندازہ غلط تھا۔ جہانگیرہ بارہ نہیں، سترہ میل سے بھی زیادہ فاصلے پر تھا۔ جب وہ جہانگیرہ پہنچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ لالی گاؤں سے دور اتر گیا۔

☆

جہانگیرہ میں داخل ہو کر لالی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور بستی کی جانب بڑھنے لگا۔ رائفل گٹھری میں بندھی ہوئی اس کی پشت پر لٹک رہی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ نیم کے درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑا تھا۔ گاؤں پر گہری خاموشی طاری تھی۔ کہیں کہیں مکانوں میں چراغوں کی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ جب دیر تک کوئی آہٹ اور آواز نہیں ابھری تو وہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا شاداں کے گھر کے قریب پہنچا اور آنگن کی چار دیواری سے لگ کر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اچھل کر دونوں ہاتھوں سے دیوار پکڑی اور اوپر پہنچ گیا۔ وہ چند لمحوں تک دیوار سے چمٹا ہوا لیٹا رہا۔ آنگن بالکل سنسان تھا۔

لالی دھیرے سے نیچے اترا۔ آنگن میں پہنچ کر سب سے پہلے اس نے دالان کی جانب دیکھا۔ دالان کے ایک کونے میں لالٹین روشن تھی۔ اس کی لو مدھم تھی۔ دالان میں چارپائی بچھی تھی اس پر کوئی سو بھی رہا تھا۔

لالی ہولے ہولے چلتا ہوا دالان میں پہنچا۔ بستر کے قریب گیا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ شاداں ہے۔ شاداں بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ لالی نے پشت پر لٹکتی ہوئی گٹھری اتار کر دالان میں ایک طرف رکھی۔ ایک بار پھر شاداں کے نزدیک گیا اور اسے آہستہ سے جھنجوڑا۔ شاداں نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا اور خوف و حیرت کے ملے جلے لہجے میں بولی۔ "لالی!" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

لالی نے کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ "اندر تو کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں۔" وہ اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر جوڑا باندھتے ہوئے بولی۔ "میرے سوا گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

لالی اس کے قریب ہی چارپائی پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ شاداں نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔

"اب کس لیے آیا ہے؟"

"تو کہتی ہے تو نہیں آؤں گا۔"

"یہ بات نہیں۔" شاداں نے آہستہ سے بتایا۔ "پولیسے تیری تلاش میں دو بار یہاں آ چکے ہیں تھانیدار نے بھی ایک روز مجھے بلایا تھا۔ تیں نوں پتہ ہے، وہ ملک کا بھرا ہے۔ اس نے ڈرایا دھمکایا، الٹے سیدھے سوال کر کر کے میرا مگر خراب کر دیا۔"

"تو نے کیا کہا؟"

"کہنا کیا تھا۔" شاداں نے جواب دیا۔ "میں نے ہر بار یہی کہا، وہ بالے کا یار ہے۔ اسی سے ملنے آیا تھا۔"

"بالے کے بارے میں تو کچھ نہیں پوچھا؟"

"کیوں نہیں پوچھا۔ پر میں نے یہی کہا، مجھے کیا پتہ، وہ کہاں ہے؟ وہ تو تین مہینے سے اوپر ہو گئے، میرے پاس آیا نہیں۔ تاجی جانتی ہوگی۔ بالے اسی کے پاس رہتا تھا۔ اس نے ویاہ بھی کر لیا تھا۔"

"تاجی کہاں ہے؟"

"اس کا بھرا کراچی سے آیا ہے۔ وہ اسی کے پاس رہتی ہے۔ کہتی تھی، کراچی جاؤں گی۔ بالے وہیں گیا ہے۔"

چل، یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ تاجی کا تیرے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں تھا۔"

"نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہوا۔" شاداں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں چاہتی تھی، وہ میرے ساتھ رہے۔ اس کے بچہ پیدا ہو۔ وہ بالے ہی کا تو ہو گا۔ میں اسے پالتی، اپنے پاس رکھتی۔"

"تجھے اپنے بچے یاد نہیں آتے؟"

"یاد کیوں نہیں آتے۔" شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "پر جس دن میں نے بالے کے سنگ گھر چھوڑا، اسی دن بچوں کو بھی چھوڑ دیا۔ اب وہ میرے پاس کیسے آ سکتے ہیں؟"

"کیسے نہیں آ سکتے۔" لالی نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "پچھلے دنوں تیرا کمعو آیا تھا، بچے بھی

آئے ہوں گے۔ ان میں سے کسی کو اپنے پاس رکھ لیتی۔ گھر میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ تیرا جی نہیں گھبراتا؟"

شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جی تو بہت گھبراتا ہے پر میرا گھر والا مانے گا نہیں۔ کہتا تھا' میرے ساتھ چل۔"

"چلی جا اس کے پاس۔ یہاں کب تک اکیلی پڑی رہے گی۔ اب تو بالے بھی نہیں رہا جس کے لیے تو نے گھربار چھوڑا' بچے چھوڑے۔"

شاداں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لالی بھی ذرا دیر خاموش رہا۔ اس نے اصرار کر کے پوچھا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

مگر شاداں نے پھر بھی جواب نہ دیا' بات کا رخ پلٹتے ہوئے بولی۔ "تیں نوں پتہ نہیں' آج کل مجھ پر کیا بیت رہی ہے؟"

لالی نے کسی قدر پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیوں' کیا ہو گیا تجھے؟"

"مجھے تو کچھ نہیں ہوا پر بوری کا دودھ روز بہ روز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ وہ گبھن ہے۔" وہ لمحے بھر خاموش رہی۔ "تو ہی بتا' وہ دودھ دینا بالکل بند کر دے گی تو کیا ہو گا۔ اسے کہاں سے کھلاؤں گی اور اپنا گزارہ کیسے کروں گی؟ مجھے ہر دم یہی فکر رہتی ہے۔" شاداں غم زدہ ہو گئی۔

مگر لالی ذرا بھی متاثر نہ ہوا' مسکرا کر بولا۔ "پروا نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے مجھے روٹی ٹکر دے۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

"شام کو تو میں نے کچھ پکایا نہیں۔ دن کی روٹی پڑی ہے' کہے تو لے آؤں؟"

"لے آ' پر چھیتی نال۔"

شاداں خاموشی سے اٹھی' کمرے کا دروازہ کھولا۔ لالٹین کی لو اونچی کی۔ چھت سے لٹکے ہوئے چھینکے سے چنگیری اتاری اور لا کر لالی کے سامنے رکھ دی۔ چنگیری میں دو روٹیاں تھیں۔ لالی نے روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا اور اسے چبانے لگا۔ شاداں نے اسے روکھی روٹی کھاتے دیکھا تو مسکرا کر بولی۔ "بہت ہَکا لگتا ہے۔ روکھی روٹی کیسے کھائے گا۔ ذرا صبر کر۔" وہ دالان سے نکل کر آنگن میں چلی گئی۔

لالی ایک کے بعد دوسرا لقمہ چباتا رہا۔ ذرا دیر بعد شاداں واپس آئی۔ وہ پیالے میں مکھن لے کر آئی۔ دوسرے ہاتھ میں پیاز کی گٹھی تھی۔ اس نے مکھن اور پیاز لالی کے سامنے رکھ دی۔ "گھر میں

اور کچھ نہیں تھا۔ یہی ملا' پر اس سے کام چل جائے گا؟" اس نے بے زاری سے منہ بگاڑا۔ "مجھے تو ڈھیر سی نصیحت کرتا ہے۔ کبھی یہ بھی سوچا' تیرا کام اس طرح کب تک چلے گا؟"

لالی نے کھانا کھاتے کھاتے مسکرا کر شاداں کی جانب دیکھا' مگر کوئی بات نہیں کی۔ چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ دونوں روٹیاں' مکھن اور پیاز سب چٹ کر گیا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے شاداں سے پانی منگوایا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس غٹاغٹ پی گیا۔ وہ شاداں کی جانب متوجہ ہوا۔

"اب بتا' کیا کہہ رہی تھی؟"

"کہنا کیا ہے۔" شاداں نے لالٹین کی لو دھیمی کی۔ اسے کونے میں رکھا اور لالی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ "یہ تو سوچ تیرا کیا بنے گا؟ کب تک پولیس سے چھپتا پھرے گا۔"

"میری فکر نہ کر۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "پہلے اپنے بارے میں سوچ۔"

"وہ تو میں ہر وکت سوچتی رہتی ہوں۔" شاداں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب سے تیری لائی ہوئی بوری کے گبھن ہونے کا پتہ چلا ہے' میرا تو سوچتے سوچتے برا حال ہو گیا۔"

"مجھے پکڑوا دے۔ دو ہزار روپے انعام ملے گا۔"

شاداں نے غصے سے لالی کو دیکھا۔ "تیرے دل میں ابھی تک میل ہے۔ مجھے تیری یہ گل بالکل پسند نہیں۔ تو یہاں نہ آیا کر۔ کسی روز دوڑ آ گئی۔ پولیس نے تجھے پکڑ لیا تو یہی سمجھے گا' میں نے پکڑوا دیا۔" اس نے اپنی بات پر زور دے کر ترش روئی سے کہا۔ "تیری باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے' ضرور یہی سمجھے گا۔ رب سوں......"

لالی نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اب چپ بھی کر' بہت کہہ لیا۔" لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سچ سچ بتا' تو مجھے کیسا بندہ سمجھتی ہے؟"

"تو برا بندہ نہیں' حوصلے والا بھی ہے پر......"

لالی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں نوں پتہ ہے' تو کیا کہنا چاہتی ہے۔"

شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی ذرا دیر چپ رہا۔ اس نے کمر سے بندھی ہوئی ہمیانی کھولی اور دو ہزار روپے نکال کر شاداں کو دیتے ہوئے بولا۔ "لے' ان سے دوسری نئ خرید لینا۔"

شاداں نے روپے ہاتھ میں لے لیے۔ چند لمحے حیرت سے لالی کا منہ تکتی رہی۔ اس نے دریافت کیا۔ "اتنے ڈھیر سے روپے کہاں سے لے آیا؟" اس نے تامل کیا۔ "چوری کی ہو گی؟"

"چوری چکاری تو میں نے بہت کی ہے۔ پر اس دفعہ چوری نہیں کی' ایک زنانی کا سودا کیا تھا۔"

شاداں کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مگر لالی اس کے تاثرات سے بے نیاز کہتا رہا۔ "نہ پوچھ کیسی

باگی بجلی نار تھی۔ ایسی سوہنی کہ تجھے کیا بتاؤں۔"

شاداں نے جھنجلا کر لالی کو دیکھا۔ "تو جانگی ہے' یہ تو میں جانتی ہوں۔" اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "جانگی ہو کر چوری چکاری کر سکتا ہے پر تو یہ دھندا بھی کرتا ہے' یہ میں نوں پتہ نہیں تھا۔" وہ لمحے بھر رکی اور ہاتھ میں دبے ہوئے روپے لالی کی جانب پھینک کر بولی۔

"مجھے ایسے روپے نہیں چاہئیں۔ میں تجھے ایسا بندہ نہیں سمجھتی تھی۔" وہ چارپائی سے نیچے اتری اور لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "اب سمجھی' تو کیوں بار بار میرے پاس آتا ہے۔"

لالی نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "گل تو سن۔"

شاداں نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑا لیا۔ "میں نے اب تیری کوئی گل بات نہیں سن نی۔" اس نے غصے سے ڈپٹ کر کہا۔ "اٹھا اپنے روپے اور ابھی میرے گھر سے نکل جا۔"

"اتنا ناراض کیوں ہوتی ہے؟" لالی بھی چارپائی سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "تو میری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔"

مگر شاداں کی برہمی کم نہ ہوئی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا اور تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو مجھے کوم کا باہنی وال لگتا ہے۔"

"تو کوم کی بات کرتی ہے' میں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں' میرا پیئو کون تھا۔" لالی بے نیازی سے مسکرا کر بولا۔ "ویسے تو کہاں کی لنگریال ہے۔ کون سے تیرے گھر پر لنگر کھلے ہیں۔"

"لنگریال تو نہیں ہوں۔ پر میرا پیو دادا خیانے کا تھا۔" شاداں نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "میں خیانوں کی بیٹی ہوں۔"

"ہو گی' ضرور ہو گی۔" لالی نے اسے منانے کی کوشش کی۔ "پہلے میری بات تو سن لے۔"

"میں اب تیری کوئی بات نہیں سنوں گی۔" وہ غصے سے ہانپ رہی تھی۔ "دلّا' کنجر' عورتوں کو بھگا کر چکلوں میں بیچتا ہے۔ بے غیرت' آخ تھو۔" اس نے حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے شاداں کو دیکھا۔ "زیادہ کڑ کڑ نہ کر۔ ورنہ....." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ورنہ کیا کرے گا؟" شاداں کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔ "دلّا گیری کرتا ہے' اوپر سے آنکھیں دکھاتا ہے۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غصے سے بے قابو ہو کر بھڑکتا شعلہ بن گیا۔ اس نے ایک ہونٹ دانتوں میں دبا کر شاداں کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ ہاتھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ شاداں سنبھل نہ

سکی۔ لڑھکتی ہوئی دہلیز پر جا کے گری۔ اس کا سر دروازے کی چوکھٹ سے زور سے ٹکرایا۔ چند لمحوں تک وہ خاموش پڑی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ غصے سے ہانپتے ہوئے بولی۔

"یہاں سے چلا جا۔ نہیں تو چیخ چیخ کر سارے پنڈ کو اکٹھا کر لوں گی۔"

"سب کو اکٹھا کر لے۔ مجھے پکڑوا دے' پر تو ایسی بات نہیں کہہ سکتی۔ میں ایسی گالی نہیں سن سکتا۔" لالی نے اس کی دھمکی سے بے نیاز ہو کر کہا۔ "میں چوری ڈکیتی ضرور کرتا ہوں پر ایسا گندا دھندا نہیں کرتا۔ اور یہ بھی سن لے' میں بالے نہیں ہوں۔ زنانی کی کمائی نہیں کھاتا۔ اسے دینا جانتا ہوں' اس سے لینا نہیں جانتا۔"

شاداں دروازے سے پیٹھ لگائے خاموش بیٹھی رہی۔ لالی نے لالٹین کی دھندلی روشنی میں دیکھا' خون کی ایک پتلی دھار شاداں کے سر سے بہہ کر ماتھے اور کنپٹی پر پھیلتی جا رہی ہے۔ لالی کا سارا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ تڑپ کر شاداں کی جانب بڑھا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے خون پونچھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو شاداں نے غصے سے جھٹک دیا۔ منہ بگاڑ کر بولی۔

"رہنے دے اپنا لاڈ۔ بڑا آیا' میرا سکا بن کر۔"

"پاگل نہ بن۔" اس نے شاداں کا خون پونچھا تو اس کا ہاتھ تربتر ہو گیا۔ لالی نے گھبرا کر کہا۔ "تیرے تو بہت چوٹ آ گئی۔"

شاداں چپ رہی۔ خون کے سرخ سرخ قطرے ٹپ ٹپ شاداں کے رخساروں پر گرتے رہے لالی نے جھٹ اس کا دوپٹا اتارا' جھٹکا دے کر جھرسے پھاڑا اور اس کے ایک ٹکڑے سے خون صاف کرنے لگا۔ مگر خون نہیں رکا۔ چوٹ گہری آئی تھی۔ لالی تیزی سے آنگن میں گیا۔ کٹورے میں پانی بھر کر لایا۔ اس نے دوپٹے کا ایک ٹکڑا اور پھاڑا۔ اسے پانی میں بھگو کر سر اور رخساروں سے خون صاف کرنے لگا۔ خون پونچھنے کے بعد اس نے زخم پر کپڑے کی گدی بنا کر رکھی اور دوپٹے کا جو حصہ باقی بچا تھا' اسے سر سے لپیٹ کر پٹی باندھ دی۔ شاداں نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔

لالی نے اس کا بازو تھام کر آہستہ سے کہا۔ "چل' بستر پر لیٹ جا۔"

شاداں نے بے رخی سے کہا۔ "مجھے یہیں بیٹھا رہنے دے' میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ "تو نے اکیلی اور لاوارث جان کر مجھے مار لیا۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے پر رکھ لیے اور تڑپ کر بولی۔ "ہائے ربا! میں مر گئی۔ میرا کوئی نہیں۔"

رات کے گہرے سناٹے میں شاداں کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ لالی اس کے قریب چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے شاداں کے سر پر ہاتھ رکھ کر اظہار معذرت کیا۔ "شاداں! معاف کردے۔ میں نوں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نے بہت برا کیا۔" شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سسکیاں بھرتی رہی۔ لالی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چہرے سے ہٹائے۔ چہرہ اوپر اٹھایا' مگر شاداں نے نظریں نہیں ملائیں۔ لالی نے نرمی سے کہا۔ "نہ رو شاداں!" وہ پھر بھی روتی رہی' آنسو چھلکتے رہے۔ لالی جذبات سے بے قرار ہوگیا۔ تڑپ کر بولا۔

"تونے رونا بند نہ کیا تو میں بھی اپنا سر پھوڑ لوں گا۔"

وہ تڑپ کر اٹھا۔ آگے بڑھا اور پاگلوں کی طرح دیوار پر دھم سے ٹکر ماری۔

شاداں نے رونا بند کردیا۔ پریشان ہوکر لالی کو دیکھا۔ لالی نے ٹکر مارنے کے لیے دوبارہ سر جھکایا۔ شاداں نے جھٹ اس کا سر تھام لیا۔ گھبرا کر بولی۔ "یہ کیا کر رہا ہے؟ تیرا مگر تو نہیں چل گیا؟"

"ہاں' میرا مگر ہی چل گیا ہے۔" لالی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تجھے روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔"

شاداں نے آنکھیں مل کر آنسو پونچھے۔ "لے' میں نے رونا بند کردیا۔ سمجھ نہیں آتی تو کیسا بندہ ہے؟"

"بات یہ ہے شاداں! تو لاوارث نہیں' لاوارث تو میں ہوں۔ میرا تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔" لالی کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس کا لہجہ اور جذباتی ہوگیا۔ "تو نوجوان ہے' سوہنی اور متحیل ہے۔"

شاداں بات کاٹ کر جھٹ بولی۔ "کہاں رہی جوان اور متحیل۔ اب تو جل کر راکھ ہوگئی ہوں۔"

لالی نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا' پھر اس نے پوچھا۔ "ایک بات بتا شاداں! تیری کتنی عمر ہوگی؟"

"پتہ نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "جب میرا ویاہ ہوا تھا تو میں تیراں سال کی تھی۔ تین سال بعد میری پہلی نکّی پیدا ہوئی پر وہ چھ مہینے بعد مرگئی۔ دو سال بعد جیجا پیدا ہوا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "کتنے سال ہوئے یہ؟"

"تیراں اور تن' سولاں' ساڑھے سولاں اور دو اٹھاراں۔" یہ حساب لگا کر اس نے شاداں سے

پوچھا۔ "جیجا اب کتنے برس کا ہے؟"

۔ "پچھلے جاڑوں میں نویں سال میں لگ گیا۔"

"اس حساب سے تو تیری عمر ۲۷ سال ہوگی۔"

"تو یہ کم عمر ہوئی؟" شاداں مسکرا کر بولی۔

"ارے یہ تو کچھ بھی نہیں ہوئی۔" لالی کھل کر مسکرایا۔ "میں نے تو ۴۵ سے بھی اوپر کی زنانیاں دیکھی ہیں۔ ایسی جوان' ایسی بانکی سجیلی۔ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ بالکل غیار لگتی تھیں۔"

"ہٹ' ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟"

"میں کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔" لالی نے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "کل ہی رات کی تو بات ہے۔ پوری سات زنانیاں تھیں۔ کوئی بھی ۴۰ سال سے کم نہیں تھی پر اتنا زوروں کا سنگھار کیے ہوئے تھیں کہ ہر ایک اتنی سوہنی اور جوان لگتی تھی' میں تجھے بتا نہیں سکتا۔"

شاداں نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "کسی چکلے میں تو نہیں چلا گیا تھا؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔ بہت وڈے افسروں کی گھر والیاں تھیں۔ ان کے خصم بھی موجود تھے۔"

"پر تو وہاں کیسے پہنچ گیا؟ تیں نوں ڈر نہیں لگا؟"

"وہ کچھ اور ہی چکر تھا۔" لالی نے مسکرا کر بتایا۔ "سب لاٹری ڈال کر ایک دوسرے سے اپنی گھر والیاں بدلتے تھے اور میں اس لاٹری کا امپائر تھا۔ امپائر جانتی ہے؟ وہ لاٹری کا جج ہوتا ہے۔ میں باری باری ہر ایک کی لاٹری نکالتا تھا۔ جو زنانی جس مرد کے حصے میں آتی' وہ رات بھر کے لیے اسے مل جاتی۔"

شاداں نے حیران و پریشان ہوکر پوچھا۔ "کیسی زنانیاں تھیں' انھیں ذرا بھی لاج نہ آئی؟"

"تو زنانیوں کی بات کرتی ہے۔ مرد تو زنانیوں سے بھی زیادہ بے غیرت تھے۔ ہنسی خوشی اپنی گھر والی کو دوسرے مرد کے پاس سونے کے لیے بھیجتے تھے۔ اسی چکر میں تو میں نے نوٹوں سے بھرا ہوا یہ بٹوا اڑا لیا۔" لالی نے جیب سے بٹوا نکال کر دکھایا۔ "چوری کرکے نہیں لایا۔ دکھا کر اور بتا کر لایا ہوں۔ بعد میں اس میں سے روپے نکال کر میں نے ہمیانی میں باندھ لیے۔"

شاداں ابھی تک حیرت زدہ تھی۔ "یہ تو نے عجب گل سنائی۔"

"عجب گل تو ہے' پر تیں نوں کیہ پتہ' دنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔"

"میرا پیو ٹھیک ہی کہتا تھا۔ یہ چودھویں صدی ہے۔ کلجگ ہے کلجگ۔ جو کچھ نہ ہو جائے' تھوڑا

ہے۔"

"چھوڑ یہ کھِک کھِک۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "اب یہاں کب تک بیٹھی رہے گی چل اٹھ، منجی پر جا کر لیٹ۔ تیں نوں بہت چوٹ آ گئی ہے۔ یہ کمر بھی بہت حرام دا ہو تا ہے۔ اس نے شاداں کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا۔ شاداں خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور لالی، جسم کا سہارا لیے ہوئے چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی۔ مگر بستر پر لیٹی نہیں۔ لالی کے اصرار پر بھی نہ لیٹی۔

لالی نے بستر پر بکھرے ہوئے دو ہزار کے نوٹ اٹھائے اور شاداں کی طرف بڑھا کر بولا۔ "۔ اب تو انھیں رکھ لے۔ دوسری بچ خرید لینا۔"

شاداں نے نوٹ لینے سے انکار کر دیا۔ "انھیں اپنے ہی پاس رہنے دے۔"

"ابھی تک ناراض ہے؟"

"نہیں، یہ بات نہیں۔" شاداں نے آہستہ سے کہا۔ "بوری مر گئی تھی تو تو نے مجھے دوسری لادی۔ اب تو مجھے اتنے روپے کیوں دینا چاہتا ہے؟"

"خامخا کی باتیں نہ کر۔" لالی نے پیار سے ڈانٹا۔ "انھیں یہ سمجھ کر رکھ لے کہ بالے مر گیا۔"

"پر وہ تیرا کون لگتا تھا۔"

"میرا تو کوئی نہ تھا پر تیرا تو تھا۔ جب کسی کا کوئی مرجاتا ہے تو جات برادری والوں کو کچھ نہ دینا ہی پڑتا ہے۔" اس نے ذرا سا تامل کیا۔ "میں اس کا نہیں پر تیرا تو کچھ لگتا ہی ہوں۔ نہ مان بات دوسری ہے۔" شاداں خاموش بیٹھی رہی مگر لالی خاموش نہیں رہا۔ "میرا پیو کوم کا کھل تھا میں نے سنا ہے، کھل، ہرل، لکھیرے، اپیرے اور قیانے، سب ایک ہی کوم کے ہوتے ہیں۔" کھل کر مسکرایا۔ "لے، اب انکار نہ کر۔"

لالی نے اصرار کر کے نوٹ شاداں کو دے دیئے۔ اس دفعہ اس نے انکار نہ کیا، خاموشی سے سارے نوٹ لے کر دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔ لالی اس کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ذرا دیر بعد خاموشی میں شاداں کی آواز ابھری۔

"لالی! ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتائے گا؟"

"پوچھ! ضرور پوچھ۔"

شاداں نے ہچکچاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "یہ بتا، تو اس طرح راتوں کو چھپ لک کر میرے کول کیوں آتا ہے؟ میری ہر طرح مدد بھی کرتا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں کرتا ہے؟"

"سچ سچ بتا دوں؟"

"میں سچ سچ ہی سننا چاہتی ہوں۔"

"سچ تو یہ ہے شاداں! میں نوں خود نہیں ملوم، میں تیرے کول کیوں آتا ہوں۔" لالی آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "مجھے پتہ ہے، تو نے زندگی میں صرف بالے سے پیار کیا۔ وہ مر گیا پر تو آج بھی اسی سے پیار کرتی ہے اور اسی کے پیار کی کارن ابھی تک اسی گھر میں رہتی ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نہیں! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شاداں نے اعتراف کیا۔

"اور میں یہ بھی جانتا ہوں، مجھ سے تجھے ذرا بھی پیار نہیں، ہو بھی نہیں سکتا۔ میں چور اچکا جو ہوں۔ جیل سے بھاگا ہوا کیدی ہوں۔ ایسے بندے سے کوئی زنانی، کوئی مٹیار، پیار نہیں کر سکتی اور تو تو بالکل نہیں کر سکتی۔" اس نے شاداں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "تو مجھ سے ڈرتی ہے اور اس لیے ڈرتی ہے کہ میں بالے کے کتل کا راز جانتا ہوں۔"

شاداں چپ بیٹھی رہی۔ لالی ذرا دیر خاموش رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "مجھے ایک چدّر دے دے، رحیم داد کو دوں گا۔ ویسے میرے پاس چدّر ہے۔ ایک اور دے دے۔ میں اب سیدھا اسی کے پاس جاؤں گا۔ جانے وہ کس حال میں ہو گا۔"

شاداں خاموشی سے اٹھی۔ کمرے کے اندر گئی اور ایک چادر لے کر واپس آئی۔ چادر دیتے ہوئے اس نے لالی سے کہا۔ "ذرا دیر ٹھہر جا۔ میں تیرے لیے روٹی پکا دوں۔ کل کیا کھائے گا؟"

"تو نے پہلے کبھی یہ بات نہیں کہی، آج کیا بات ہے؟"

"میں نے پہلے بھی کہا تھا، میں تجھے برا بندہ نہیں سمجھتی۔ تجھ سے نفرت بھی نہیں کرتی۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکی۔ "لالی! تو چوری چکاری کا دھندا نہیں چھوڑ سکتا؟"

"تو کہتی ہے تو چھوڑ دوں گا، پر ایک شرط ہے۔"

"کیا شرط ہے؟" شاداں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "بتا، وہ بھی بتا۔"

"میرے ساتھ بھاگنے پر تیار ہو جا۔"

"تو نے فیر مسکری شروع کر دی۔"

"نہیں! میں مسکری بالکل نہیں کر رہا۔" لالی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں تجھے بھگا کر لے جانا چاہتا ہوں۔ اسی طرح جیسے بالے تجھے بھگا کر یہاں لایا تھا۔"

شاداں چند لمحے خاموش رہی پھر مسکرا کر بولی۔ "مان لے، میں تیرے ساتھ جانے کو تیار بھی ہو جاؤں تو مجھے کہاں لے جائے گا۔ خود بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ پولیس کے ڈر سے چھپتا لکتا رہتا

ہے۔"

"میرا انتظار کر سکے گی؟" لالی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں ایک رات آؤں گا اور جیسی آؤں گا۔ تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اس روز میں نئی زندگی شروع کروں گا' تیرے ساتھ لور یا کراچی چلا جاؤں گا۔ محنت مزدوری کروں گا۔ کوئی بھی دھندہ کرلوں گا پر چوری ڈکیتی ہرگز نہیں کروں گا۔ تجھے خوش رکھوں گا۔" اس نے شاداں کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چراغ جھلملانے لگے۔ "بول' کیا کہتی ہے؟" لالی بہت جذباتی ہوگیا۔ اس نے اپنے بازو پھیلا کر شاداں کو اپنے سینے سے لگایا اور اس کے سر کا زخم چوم لیا۔ "اب تو ہاں کہہ دے۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "مجھ سے دھوکا تو نہیں کرے گا؟"

"یہ مرد کا وعدہ ہے۔ تجھ سے دھوکا کروں تو مجھے بھی بالے کی طرح چھری سے ٹوٹے کرکے زمین میں دبا دینا۔ میں نے تیرا پیار دیکھا ہے' تیری نفرت اور گھن بھی دیکھی ہے۔ میں تجھے پہچان گیا ہوں۔ مجھے پتہ ہے' تو کیسی زنانی ہے۔" شاداں' لالی کے سینے سے لگی خاموش کھڑی رہی۔ رات ساکت اور نڈھال تھی۔ دونوں کونے میں رکھی ہوئی لالٹین کی دھندلی روشنی میں چپ چاپ کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد لالی کی آواز ابھری۔ "شاداں! مجھے اپنے پیو کا لاڈ ملا' نہ ماں کی ممتا ملی اور نہ بہن بھائیوں کا پیار۔ مجھے دنیا میں کچھ بھی نہیں ملا۔ تو مجھے سب کچھ دے سکتی ہے۔" اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ وہ بے قرار ہو کر رو پڑا۔ اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو ٹپک کر شاداں کے سر اور ماتھے پر گرنے لگے۔

شاداں کسمسائی۔ اس نے پریشان ہو کر گردن اٹھائی۔ لالی کو دیکھا۔ "رو رہا ہے؟" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا' روتا رہا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ شاداں نے پیچھے ہٹ کر ہاتھ اٹھایا۔ لالی کے آنسو پونچھے۔ "میں تیرا انتظار کروں گی' یہ شاداں کا وعدہ ہے۔ میں نے کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔" وہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی' پھر تڑپ کر بولی۔ "سمجھ لے' آج بالا میرے لیے مرگیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مرگیا۔"

لالی نے دونوں ہاتھوں سے شاداں کے رخسار تھام کر اس کا چہرہ اوپر کیا' چند لمحے اس کی کنول کے مانند خوبصورت اور شفاف آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر رخسار اور آنکھیں چوم کر بولا۔ "شاداں! اب میں چلوں گا۔"

شاداں نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھہر جا' کل چلا جانا۔ میں تیرے لیے روٹی پکا دوں' ساتھ لے جانا۔

جانے اب تو کب آئے۔"

"تو کہتی ہے تو کل ہی چلا جاؤں گا۔"

شاداں چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ لالی دالان میں رکھی ہوئی لالٹین کی جانب بڑھا۔ اسے اٹھایا اور پھونک مار کر بجھا دیا۔ دالان میں اندھیرا چھا گیا۔ باہر صحن میں ستاروں کی روشنی پھیلی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ لالی آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور چارپائی پر جاکر بیٹھ گیا۔ شاداں اب کروٹ کے بل خاموش لیٹی تھی۔

رات دھیرے دھیرے گزرتی رہی۔

☆

اچانک آہٹ ہوئی۔ لالی نے نظریں گھما کر دیکھا۔ آنگن کی دیوار پر دھندلی روشنی میں ایک سر ابھرا ہوا نظر آیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک شخص چڑھ کر دیوار پر آگیا۔ وہ آہستہ سے نیچے اترا اور گردن ادھر ادھر موڑ کر چوکنا نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ دروازے پر گیا اور اس کی کنڈی آہستہ سے کھول دی۔

وہ دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ وہاں سے دبے قدموں چَل کی جانب بڑھا۔ چھپر کے نیچے شاداں کی بھوری بھینس بندھی تھی۔ لالی چپ رہا۔ چند لمحے گزر گئے۔ وہ شخص چھپر کے نیچے سے نہیں نکلا۔ لالی فوراً تاڑ گیا کہ وہ کس ارادے سے دیوار پھاند کر گھر میں آیا ہے۔

لالی آہستہ سے اٹھا۔ اس نے جوتے اتار دیے۔ دالان سے اتر کر آنگن میں آگیا۔ جھک کر دبے دبے قدموں چَل کی سمت بڑھا۔ قریب پہنچا تو اس نے دیکھا' دھندلی روشنی میں وہ شخص اکڑوں بیٹھا ہے۔ اس کی پشت لالی کی طرف تھی۔ وہ بھینس کی رسی آہستہ آہستہ کھونٹے سے کھول رہا تھا۔ لالی تیزی سے جھپٹا اور ہاتھ بڑھا کر اس کا منہ مضبوطی سے دبوچ لیا۔ وہ آواز بھی نہ نکال سکا۔ لالی کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ وہ اکہرے بدن کا نوجوان تھا۔ لالی نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کنپٹی پر زنانے کا تھپڑ مارا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ لالی نے ہاتھ ہٹا لیا۔ ساتھ ہی ایک تھپڑ اور رسید کیا۔ وہ گڑگڑا کر بولا۔

"مارو نہیں۔"

"کون ہے تو؟ یہ اٹھانے آیا تھا؟"

"ہن جی! آیا تو اسی لیے تھا۔" وہ گھگھیا کر بولا۔ "زمیں دار نے بھیجا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر چار میل ادھر اُدھر لے جانا تھا۔"

لالی نے عقب میں چاپ سنی' وہ پلٹا۔ دھندلی روشنی میں شاداں کھڑی تھی۔ وہ حیران و پریشان نظر آرہی تھی۔ اس نے لالی سے پوچھا۔ "یہاں پٹل کے نیچے کیا کر رہا ہے؟"

لالی نے مویشی چور کی گردن دبوچی اور اسے اٹھا کر شاداں کے سامنے لایا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "ہائے! یہ کہاں سے آگیا؟"

"تیری بچ اٹھانے آیا تھا۔ اس سے پوچھ لے۔" اس نے مویشی چور کے منہ پر ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ "بتا' اسی لیے آیا تھا نا؟"

وہ گردن ہلا کر مری ہوئی آواز میں بولا۔ "ہن جی! اسی لیے آیا تھا۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "مجھے جانے دے۔ غلطی ہوگئی معافی دے دے۔" وہ لالی کے قدموں پر گر پڑا۔ پیر پکڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "اب کبھی اتھے نہیں آؤں گا' اگر آؤں تو جان سے مار دینا۔"

شاداں نے لالی سے کہا۔ "جانے دے اسے۔"

لالی نے جھک کر ایک بار پھر گردن دبوچی۔ اسے اٹھایا اور کھینچتا ہوا دروازے تک لے گیا۔ دروازہ کھول کے اس نے چور کو زور سے دھکا دیا۔ وہ اندھیرے میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ لالی نے دروازہ بند کر لیا۔

پاس پڑوس کے گھروں سے کھانسنے کھنکارنے کی آوازیں ابھرنے لگیں تھیں۔ لالی پریشان ہوگیا۔ لپک کر دالان میں گیا۔ چادر کھول کر رائفل نکالی۔ شاداں بھی اس کے قریب پہنچ گئی۔ رائفل دیکھ کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہائے تیرے پاس تو بندوک بھی ہے۔" لالی خاموش رہا۔ چیمبر میں کارتوس چڑھا کر رائفل لوڈ کرنے لگا۔ اس نے بھری ہوئی رائفل کندھے پر لٹکائی۔ شاداں کی دی ہوئی چادر' قمیص اور شلوار کے ساتھ رکھ کر گٹھری بنائی اور اسے بھی پیٹھ پر لٹکا لیا۔ شاداں حیرت سے دیکھتی رہی۔ بے چین ہو کر پوچھا۔

"یہ سب کیا کر رہا ہے؟"

"مجھے اب جانا ہے۔ یہاں ٹھیرنا میرے لیے خطرناک ہے۔"

شاداں کھسک کر اس کے قریب آگئی۔ "کب آئے گا؟"

"میرا کہا مان' اپنی بچ فوراً بیچ دے۔ ملک اللہ نواز اسے اٹھوا لے گا اور یہاں رہی تو تجھے بھی اٹھوا لے گا۔ وہ زبردست رسّہ گیر ہے۔ تیں نوں پتہ ہی ہے' اس کا بھائی ادھر تھانے دار لگا ہے۔"

"پر میں جاؤں گی کہاں؟"

"کادر آباد جانتی ہے؟"

"جانتی ہوں۔ ادھر تو سٹیشن بھی ہے۔"

"وہاں تیرا کوئی جاننے والا ہے؟"

وہ سوچنے لگی۔ لالی نے کہا۔ "جھیتی نال بتا۔ میں نوں اب جانا ہے۔"

شاداں نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ "ادھر میرا ایک ماماں ہے۔ چھوٹی تھی تو اس کی پاس جا کر رہتی بھی تھی۔ پر یہ بات کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"تو اس کے پاس چلی جا۔ میں تجھے وہیں آکر ملوں گا۔"

"پر مجھے وہاں کیسے ملے گا؟" شاداں نے دریافت کیا۔ "ویسے میرے ماماں کا نام کرامت ہے۔ وہ دودھی ہے۔ گھروں سے دودھ اکٹھا کر کے دکان داروں کو بیچتا ہے۔"

"بس اتنا کافی ہے۔ میں تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"پر مجھے کادر آباد کیوں بھیجنا چاہتا ہے؟ صاف صاف بتا' مجھ سے چھپا نہیں۔"

"تجھ سے اب کیا چھپانا' اب تو میری بن ہی چکی ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "میں کادر آباد کے اس پار لوئر باری دو آب نہر کے پیچھے ٹبوں پر رسّے کے ساتھ چھپا ہوا ہوں۔ پر جلد ہی وہ ٹھکانا چھوڑ دوں گا۔ شام کو نہر پر آجائے گی تو تجھے آسانی سے مل لوں گا۔ نہر تو کادر آباد سے بالکل نزدیک بہتی ہے۔ بیچ میں صرف سڑک ہے۔"

"وہاں کب تک پہنچے گا؟"

"میں وہیں جا رہا ہوں۔ تو جلد سے جلد وہاں پہنچ جا۔ کادر آباد جا کر جی چاہے تو دوسری بچ خرید لینا۔ تیرے پاس روپے ہیں اور تیرا ماما دودھی بھی ہے۔ تجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

لالی آگے بڑھا۔ شاداں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دروازے پر پہنچ کر بولی۔ "میں تیرے ساتھ رڑی تک چلوں گی۔"

"نہیں' تو گھر ہی میں رہ۔" لالی نے اسے منع کر دیا۔ "آج خطرہ بہت ہے۔ ڈنگر چور مار کھا کر سیدھا اللہ نواز کے پاس گیا ہوگا۔ ویسے اس کے ساتھی بھی باہر ہوں گے۔ تیرا اس وکھت میرے ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔"

لالی نے رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی۔ شاداں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ لالی نے پیار سے اس کا گال تھپ تھپایا۔ "جھیتی نال کادر آباد پہنچ جانا۔" لالی دروازے سے گزر کر باہر گلی میں آگیا۔

وہ رائفل سنبھالے' چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا' گلی سے نکلا۔ رڑ میں پہنچ کر اس نے

نصف سے بھی کم راستہ طے کیا تھا کہ سامنے سے کسی نے اونچی آواز میں ٹوکا۔ "کون ہے جی؟" لالی نے جھٹ راستہ بدل لیا۔ تیزی سے کھیتوں کی جانب لپکا اور گندم کے ایک کھیت میں گھس گیا۔ اسے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ لالی گندم کے پودوں کی اوٹ میں چھپا ہوا کھسک کھسک کر آگے بڑھنے لگا۔

رات ڈھل رہی تھی اور سناٹے میں رڑی کی طرف سے بولنے کی ملی جلی مدھم آوازیں بھی آرہی تھیں۔ لالی کے لیے پودوں کے درمیان سے گزرنا مشکل تھا۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح کھیت سے نکل کر پگڈنڈی پر آگیا اور گردن جھکا کر راستے کا اندازہ کیے بغیر تیزی سے آگے بڑھا۔

۱۱

لالی ایک لق دوق میدان کے نشیب میں آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ یہ دریائے بیاس کی قدیم گزرگاہ سے نکلنے والا بڈہ تھا' جو کسی زمانے میں مشرق سے جنوب کی جانب بہتا تھا۔ بیاس اور ستلج نے اپنے راستے بدلے تو بیاس' فیروز پور کے قریب' ہری کے پتن پر' دریائے ستلج سے مل گیا۔ بیاس کی پرانی گزرگاہ خشک اور بنجر ہوگئی۔ اس کا یہ بڈہ بھی خشک ہو کر اجاڑ ہوگیا۔ نہ جانے یہ بڈہ کب سے خشک پڑا تھا۔ اس کی مٹی نرم اور ریتلی تھی۔ جگہ' جگہ ریت کے تودے تھے۔ تودوں کے آس پاس کہیں کہیں کیکر' کریل اور لانا کے اکا دکا پودے بکھرے ہوئے تھے۔

دور' دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ اجالا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لالی مسلسل چلتے چلتے تھک چکا تھا۔ مگر اسے اپنی تھکن کی فکر نہیں تھی۔ کسی ایسے ٹھکانے کی تلاش تھی جس میں روپوش ہو کر دن بسر کیا جاسکے۔ ایسا کوئی ٹھکانا نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ کہیں جھنگر تھا نہ جنگلی پودوں کی کوئی بڑی جھاڑی تھی۔ اس کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

اجالا اب گہری سرخ روشنی میں بدلتا جا رہا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ لالی کی تشویش اور بڑھ گئی۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ خشک اور بنجر بڈہ سے کچھ فاصلے پر ایک اجڑی ہوئی بستی کے کھنڈر نظر آئے۔

وہ نشیب سے نکل کر اوپر آگیا اور کھنڈر کی جانب بڑھنے لگا۔ کھنڈر کی دیواریں مٹی کی تھیں اور ٹوٹ پھوٹ کر ملبے کا ڈھیر بن گئی تھیں۔ نہ کہیں چھت تھی' نہ کوئی دروازہ بچا تھا۔ صرف اونچی

اونچی دیواریں تھیں اور خود رو پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ لالی کو یہ کھنڈر غنیمت نظر آیا۔ وہ اس میں ٹھہر کر دن گزار سکتا تھا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا' آگے بڑھا اور کھنڈر میں داخل ہو گیا۔

یہ کھنڈر کوئی قدیم گاؤں تھا۔ قحط سالی کے باعث اجاڑ اور ویران ہو گیا تھا۔ کھنڈر میں گھس کر اس نے چھپنے کی جگہ تلاش کی اور اسے ایسی جگہ مل بھی گئی۔ یہ قد آدم دیواروں کے درمیان صاف ستھری اور ہموار زمین کا ٹکڑا تھا جو کبھی کمرے یا کوٹھری کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ اس نے کندھے پر لٹکی ہوئی گٹھری اتار دی۔ اسے ایک طرف رکھا۔ رائفل بھی پاس رکھ دی اور زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔

وہ بہت تھکا ہوا اور نڈھال تھا۔ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ دھوپ آہستہ آہستہ کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر پھیلتی جا رہی تھی۔ دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ مگر ابھی تک ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔

لالی رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ جلد ہی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ غنودگی بڑھنے لگی۔ اس نے گٹھری کھولی' اندر سے وہ چادر نکالی جو پچھلی رات شاداں نے دی تھی۔ لالی نے زمین پر بکھرے ہوئے سنگریزے صاف کیے۔ چادر بچھائی۔ گٹھری ایک بار پھر باندھی اور تکیے کے طور پر سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ رائفل بھی اس نے اپنے سرہانے ہی رکھ لی۔ تھوڑی دیر تک وہ آنکھیں بند کیے چپ لیٹا رہا پھر سو گیا۔

دوپہر کو اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ ہر طرف تیز دھوپ پھیلی تھی۔ سورج ٹھیک اس کے سر کے اوپر تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کہیں سایہ نہیں تھا اور اسے سخت پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ پانی کی تلاش میں نکلا۔ کھنڈر خاصی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اور اونچی نیچی دیواروں کے درمیان سے گزرتا' خود رو پودے روندتا' خاردار جھاڑیوں سے الجھتا' ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ مگر کہیں پانی کا گڑھا تک نہ تھا۔

وہ اپنے ٹھکانے کی جانب لوٹ رہا تھا کہ کچھ دور دو راہ گیر نظر آئے۔ وہ بڈہ کے نشیب سے گزر کر اوپر آئے اور آگے بڑھنے لگے۔ مگر وہ کھنڈر کی جانب نہیں آئے۔ لالی بھی ان کے پاس نہیں گیا اور نہ اس کا کوئی ایسا ارادہ تھا۔ ان سے ملنے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ لیکن انھیں دیکھ کر اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ میل دو میل کے گرد و نواح میں کوئی بستی ہے۔ وہ راہ گیروں کی نظروں سے بچنے کے لیے

ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں دبک گیا۔ قریب ہی ملّھا تھا۔ یہ خاردار جھاڑی تھی۔ اس میں چھوٹے کوکن بیر لگے تھے۔

کوکن پک کر پیلے پڑ گئے تھے۔ لالی انھیں توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ کوکن کھانے سے پیاس کم ہو گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گردن اونچی کی۔ کھنڈر کے باہر دیکھا۔ دونوں راہ گیر بہت دور جا چکے تھے۔

لالی ہاتھ میں دبے ہوئے کوکن کھاتا ہوا اس طرف چلا جہاں کچھ دیر پہلے وہ سو رہا تھا۔ مگر وہاں ابھی تک تیز دھوپ پھیلی تھی۔ گٹھری پر ایک کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ لالی اسے دیکھ کر خائف ہوا اور شش و پنج میں پڑ گیا۔

رائفل بھی گٹھری کے پاس ہی رکھی تھی' ورنہ وہ اس کے بٹ سے سانپ کا منہ کچل دیتا۔ ایک بار پھر وہ باہر آیا۔ ببول کے درخت سے موٹی شاخ توڑی' اس کے پتے صاف کیے اور شاخ ہاتھ میں دبا کر گٹھری کے پاس پہنچا۔ مگر سانپ اب گٹھری سے نیچے اتر رہا تھا۔ لالی نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

سانپ لگ بھگ دو گز لمبا تھا۔ وہ زمین پر رینگتا ہوا آگے بڑھا اور دیوار میں بنے ہوئے ایک بل میں گھس گیا۔ لالی یہ سوچ کر لرز گیا کہ چادر پر سوتے وقت اس کا ایک پیر بل کے عین منہ پر تھا۔ اب یہ جگہ محفوظ نہیں رہی تھی۔ دھوپ بھی بہت تھی۔ اس نے چادر سمیٹ کر کندھے پر ڈالی۔ رائفل اٹھائی اور سائے کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ اسے ایک ایسی دیوار نظر آئی جس کے قریب ہی ببول کا گھنا درخت تھا۔ درخت زیادہ اونچا نہیں تھا۔ دیوار اور درخت کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ اس پر سایہ بھی تھا۔ یہ جگہ صاف ستھری نہیں تھی۔ اس پر گھاس پھوس اور چھوٹے چھوٹے خود رو پودے تھے۔ مگر سایہ ہونے کے باعث اس نے یہی جگہ منتخب کی اور چادر بچھا کر بیٹھ گیا۔

لالی زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا۔ ایک بار پھر نیند کا غلبہ ہوا۔ اس نے گٹھری سر کے نیچے رکھی۔ رائفل بھی اس کے ساتھ ہی پڑی تھی۔ وہ ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا اور دوبارہ گہری نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب پیاس کے ساتھ ساتھ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چادر تہہ کی اور گٹھری میں رکھ دی۔ شام آہستہ آہستہ کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں سے نیچے اترنے لگی۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ کھنڈر زیادہ ویران اور پر ہول نظر آنے لگا۔

اب وہاں ٹھہرنا مناسب نہ تھا۔ ایک سانپ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ نہ جانے کھنڈر میں اور کتنے

سانپ ہیں۔ وہ کھنڈر سے نکلا مگر زیادہ دور نہیں گیا۔ ٹھہر کر اندھیرا بڑھنے اور پھیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔

شام تاریک ہو کر رات میں ڈھل گئی۔ لالی نے اپنے سفر کا آغاز کیا اور اس سمت چلنے لگا جدھر اس نے دوپہر کو دو راہ گیر جاتے ہوئے دیکھے تھے۔ وہ بنجر میدان میں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اس نے دو ڈھائی میل راستہ طے کیا تھا کہ کھیت نظر آنے لگے۔ جگہ جگہ سرس اور جنڈ کے درخت تھے۔ وہ کھیتوں سے دور درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے ٹھہر گیا۔ اسے کھیتوں کے اس پار گاؤں میں ٹمٹماتے چراغوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ اسے یہ آوازیں ختم ہونے اور خاموشی میں ڈوب جانے کا انتظار تھا۔ بھوک اور اس سے بھی زیادہ پیاس اسے پریشان کر رہی تھی۔

مگر اس نے پیاس اور بھوک قابو میں رکھنے اور دبانے کی کوشش کی۔ وہ گاؤں میں جانا چاہتا تھا' مگر سناٹا پھیلنے سے پہلے گاؤں میں داخل ہونا خطرناک تھا۔

پہر رات گزر گئی۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ خاموشی اور گہری ہو گئی۔ لالی کے حلق میں شدید پیاس سے کانٹے چبھ رہے تھے۔

گرمیوں کی رات تھی۔ نو بجے کا عمل تھا۔ گاؤں کی طرف ابھی جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مگر لالی کے لیے پیاس اب ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گٹھری کندھے پر لٹکائی' رائفل ہاتھ میں سنبھالی اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا کھیتوں کی جانب بڑھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔

کھیتوں کے درمیان سے ایک بہا گزرتا تھا۔ لالی دبے دبے قدموں پی بے پر چلنے لگا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ گھپ اندھیرے میں اس کا ایک پیر آڈ میں چلا گیا۔ آڈ کے ذریعے کھیتوں میں پانی پہنچایا جا رہا تھا۔ لالی کو اسی کی تلاش تھی۔ اس نے جھٹ اپنا پیر آڈ سے باہر نکالا اور ایک کھیت کی منیڈھ پر بیٹھ کے چلو بھر بھر کے بے صبری سے پانی پینے لگا۔ پانی پی کر ذرا قرار آیا تو بھوک کا غلبہ بڑھا۔ اس نے کھڑے ہو کر نظریں دوڑائیں۔ وہ چنے کے کسی کھیت میں گھس جانا چاہتا تھا' جہاں کچے چنوں سے اپنی بھوک مٹا سکتا۔ مگر چنے کا کوئی کھیت قریب نہیں تھا۔ دونوں طرف کھیتوں میں چری کے پودے کھڑے تھے۔ گندم کے نہیں تھے' ورنہ وہ گندم کے دانے کھا کر بھی کام چلا سکتا تھا۔ لیکن دور دور تک صرف چری کے کھیتوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

چلتے چلتے وہ ایک موڑ پر پہنچا تو خاموشی میں یکایک کہیں قریب ہی زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ ساتھ ہی باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ٹھٹکا' کچھ دیر سہما ہوا چپ چاپ کھڑا رہا' پھر چند قدم آگے بڑھا۔ چری کے پودوں کی آڑ سے اس جانب دیکھا جدھر سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ سامنے کھیتوں کے درمیان کچھ فاصلے پر کھلی جگہ تھی۔ وہاں دھیمی دھیمی آگ جل رہی تھی۔ آگ پر لوہے کا لمانڈا رکھا تھا۔ قریب ہی دو آدمی لمانڈے میں گھی ڈال کر مرغ تل رہے تھے۔ مرغ تلنے کی تیز خوشبو فضا میں پھیلتی جا رہی تھی۔

آگ سے ذرا ہٹ کر آڈ سے کھیتوں کو سیراب کرنے کا نکا تھا۔ نکا اس وقت کھلا تھا۔ نکّے پر بھی دو آدمی بیٹھے تھے۔

لالی نے آگ کی سرخ روشنی میں انھیں دیکھا۔ وضع قطع سے وہ مزارعے نظر آتے تھے۔ آڈ کے کھلے نکّے سے اپنے کھیتوں میں پانی پہنچا رہے تھے۔ مرغ تلنے کی مہک نے لالی کی بھوک اور بڑھا دی۔

وہ ابھی یہ طے نہ کر سکا تھا کہ کس طرف جائے۔ معاً نکّے سے ایک شخص اٹھا اور اس کی جانب بڑھا۔ بھاگنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لالی جھٹ چری کے قریبی کھیت میں دبک گیا۔ اس نے رائفل دونوں ہاتھوں میں سنبھالی اور آنے والے خطرے سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار کر لیا۔ قدموں کی آہٹ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ لالی چوکس بیٹھا راستہ تکتا رہا۔ آنے والا عین اس کے سامنے آ گیا۔

وہ چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ مگر نہ وہ ٹھٹکا نہ جھجکا بلکہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ جب وہ دور چلا گیا تو لالی کو اپنے اردگرد منڈلاتے ہوئے خطرے کا شدت سے احساس ہوا۔ اب کھیتوں میں ٹھہرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ لالی پلٹا اور پی بے پر چلتا ہوا کھیتوں سے باہر نکل گیا۔ سامنے جوہ تھا۔ اس قدرتی چراگاہ میں دن کو گاؤں کے چاک اور چرواہے مویشی چراتے تھے۔ اس وقت جوہ بالکل سنسان تھا۔ اس میں جگہ جگہ جنڈ' ٹاہلی اور بیری کے پیڑ تھے۔ جوہ کے اس پار گاؤں تھا۔ لالی جوہ میں داخل ہوا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا گاؤں کی جانب بڑھا۔ گاؤں پر سناٹا چھایا تھا۔ گلی کوچے ویران تھے۔

لالی ایک گلی میں داخل ہوا مگر آگے نہیں گیا۔ وہ نکڑ کے مکان کی چاردیواری کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ چند لمحے دم سادھے خاموش کھڑا رہا' پھر اس نے زقند بھری اور دونوں ہاتھوں سے دیوار پکڑ کر اوپر پہنچ گیا۔

اس نے گردن جھکا کر اندر جھانکا۔ گھر پر خاموشی چھائی تھی۔ صحن میں ایک طرف جھلیانی تھی۔ یہ مختصر سا باورچی خانہ تھا۔ اس میں چراغ جل رہا تھا۔ لالی دبے دبے قدموں چلتا ہوا جھلیانی کے قریب گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ جھلیانی میں داخل ہو گیا۔ چولھا ابھی گرم تھا۔ انگارے دہک رہے تھے۔ چولھے پر الومنیم کی گڑوی رکھی تھی۔ اس میں دودھ گرم ہو رہا تھا۔ لالی چولھے کی جانب بڑھا۔ عین اسی وقت صحن میں آہٹ ہوئی۔ لالی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔

جھلیانی میں تیکھے نقش و نگار کی ایک سانولی سلونی نوجوان عورت داخل ہوئی۔ وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کا جوڑا باندھتی ہوئی چولھے کی سمت بڑھی۔ لالی نے جھٹ ہاتھ بڑھا کر اس کا منہ دبوچ لیا۔ عورت کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ مگر لالی نے اس قدر زور سے منہ بھینچا کہ اس کی آواز نہ نکل سکی۔

وہ دہشت زدہ ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے لالی کو دیکھنے لگی۔ لالی ذرا دیر اس کا منہ دبائے خاموش کھڑا رہا' پھر اس نے سرگوشی کی۔ "گھر میں تیرے علاوہ اور کوئی بھی ہے؟" عورت نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اقرار کیا۔

لالی نے کرید کر پوچھا۔ "تیرا خصم ہے؟" عورت نے انکار میں صرف گردن ہلا دی۔ لالی نے مسکرا کے استفسار کیا۔ "تیرا یار ہے؟" عورت نے کوئی جواب نہیں دیا' نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

لالی نے دریافت کیا۔ "تیرا گھر والا کہاں ہے؟"

عورت نے دھیرے سے جواب دیا۔ "کھیتوں کو پانی لگانے گیا ہے۔"

"کب تک واپس آئے گا؟"

"وہ تو پوہ پھٹے آئے گا۔ رات بھر کھیتوں پر رہے گا۔" عورت نے لالی کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "تو ہے کون؟"

"میں کوئی بھی ہوں' پہلے مجھے روٹی ٹکر کھلا۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

عورت نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "تو چور تو نہیں ہے؟"

"بکواس نہ کر۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔ "فٹافٹ روٹی دے۔ میں روٹی کھا کر چلا جاؤں گا۔ میں تجھ سے اور کچھ نہیں لینا۔" اس نے چولھے پر رکھی ہوئی گڑوی کی طرف اشارہ کیا۔ "پہلے مجھے دودھ دے' چھیتی نال۔ ڈرنا شرنا چھوڑ۔ میں نوں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔"

عورت نے کچھ کہے بغیر بڑھ کر گلاس اٹھایا۔ چولھے کے پاس گئی اور گڑوی اٹھا کر گلاس میں دودھ انڈیلنے لگی۔ اسی اثناء میں باہر کوئی آہستہ سے کھنکارا۔ ساتھ ہی چاپ بھی ابھری۔ لالی نے رائفل اٹھائی اور نشانہ باندھ کر باہر صحن کی جانب دیکھنے لگا۔ عورت گلاس چھوڑ کر تیزی سے لالی کی طرف لپکی۔ رائفل پر ہاتھ رکھ کر بے قراری سے بولی۔

"وے گولی نہ چلاتا۔"

"چپ کر۔" لالی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں نے گولی چلا کر سارے پنڈ کو جگانا ہے؟" وہ اس کی جانب دیکھے بغیر کھل کر مسکرایا۔ "تو بھی پکڑی جائے گی' تیرا یار بھی پکڑا جائے گا اور میں بھی پکڑا جاؤں گا۔ میں ایسے خطرناک کام نہیں کرتا۔"

عورت چپ چاپ اس کے قریب کھڑی رہی۔ چند لمحوں بعد جھورا نمودار ہوا۔ وہ مضبوط جسم کا اچھا خوش شکل جوان تھا اور دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ اوپر کا دھڑ بالکل برہنہ تھا۔ اس نے لالی کو دیکھا اور اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل دیکھی تو خوف زدہ ہو کر جہاں تھا' وہیں رک گیا۔ چند لمحے سہما کھڑا رہا پھر اس نے عاجزی سے کہا۔ "میرا کرتا ادھر حجرے میں پڑا ہے۔ اس میں جو کچھ ہے' لے لے' اور بھی جو جی چاہے اٹھا لے۔" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"دھیما بول۔ میں نوں کچھ نہیں لینا۔" لالی نے عورت کو ٹھوکا دیا۔ "اسے اندر لے آ۔"

عورت آگے بڑھی اور جھورا کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "اندر آجا۔" اس نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے چوری چکاری نہیں کرنی' بھکھا ہے۔ روٹی کھا کر چلا جائے گا۔"

جھورا' عورت کے ساتھ جھلیانی کے اندر آگیا۔ لالی نے رائفل نیچے جھکالی۔ جھورا نے عورت سے پوچھا۔ "میداں! یہ ہے کون؟ اور یہاں آیا کیسے؟" میداں نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "میں نوں کیہ پتہ؟ اسے نوں پچھ۔" وہ چولھے کے پاس گئی' گلاس دودھ سے بھرا اور لالی کو دے دیا۔

لالی نے گلاس منہ سے لگایا اور غٹاغٹ پورا گلاس چڑھا گیا۔ اس نے میداں کی طرف مڑ کر دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "روٹی شوٹی بھی لے آ۔ ابھی پیٹ نہیں بھرا۔"

میداں نے بڑھ کر چبوترے پر رکھی ہوئی چنگیری اٹھائی۔ دوسرے ہاتھ سے قریب رکھا ہوا پیالہ اٹھایا اور لالی کے نزدیک آگئی۔

وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے رائفل اپنے زانو پر رکھ لی۔ میداں نے چنگیری اس کے سامنے رکھ دی۔ پیالہ بھی رکھ دیا۔ میداں اس کے روبرو بیٹھ گئی۔ لالی نے جھورا سے کہا۔ "کھڑا کیوں ہے؟ تو

بھی بیٹھ جا۔"

وہ دیوار سے ٹیک لگا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ لالی نے لقمہ توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے مڑ کر جھورے کو دیکھا۔ وہ ابھی تک سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ لالی نے لقمہ چبا کر حلق سے نیچے اتارا اور مسکرا کر جھورا سے مخاطب ہوا۔ "رات کو چھپ کر مشوکا سے ملنے آیا اور دل چڑی کی طرح اتنا چھوٹا سا ہے۔" لالی نے دوسرا لقمہ توڑا۔

"جھورے! تو رہتا کہاں ہے؟"

"رہتا تو میں ساتھ والے چک میں ہوں۔" جھورا نے رسان سے پوچھا۔ "پر تو ہے کون؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" لالی بے تکلفی سے بولا۔ "میں نوں تو صرف روٹی کھانی ہے۔ میداں سے یاری نہیں لگانی۔" اس نے مڑ کر میداں کو دیکھا۔ "ویسے تو ہے سوہنی اور جھورے سے زیادہ حوصلہ رکھتی ہے۔ تو مجھ سے اتنا نہیں ڈری جتنا یہ ڈرا سہما نظر آتا ہے۔"

جھورے نے کچھ نہیں کہا۔ میداں بھی خاموش رہی۔ لالی نے ایک روٹی ختم کرنے کے بعد دوسری روٹی سے لقمہ توڑا اور میداں سے مخاطب ہوا۔ "پینے کو پانی تو دے۔" وہ چپ چاپ اٹھی۔ گلاس سنبھالا اور باہر جانے کے لیے مڑی۔

جھورا نے اسے ٹوکا۔ "گل سن میداں! حجرے سے وہ مٹھائی بھی لیتی آ جو تو نے اپنے گھر والے کے لیے رکھ چھوڑی ہے۔" اس کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ زیر لب مسکرایا اور لالی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ تیرا مہمان ہے۔ مہمان کو ٹھیک سے روٹی ٹکر کھلا۔" میداں خاموشی سے باہر چلی گئی۔

"جھورے! تو میداں سے ملنے روز اسی طرح چھپ کر آتا ہے؟"

"نہیں جی۔ ایسی گل بات نہیں ہے۔ بہت دنوں بعد آج رات موکا ملا تھا۔" اس نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "میداں کا گھر والا روز روز رات کو پانی نہیں لگاتا۔ آج ہی سے رات کو اس کی پانی لگانے کی باری شروع ہوئی ہے' پر تو نے سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔"

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔" وہ آہستہ سے ہنسا۔

جھورا نے پریشان ہو کر سرگوشی کی۔ "دھیما بول۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "ساتھ والے مکان میں میداں کے گھر والے کا پیو رہتا ہے۔ اسے نیند بھی کم آتی ہے۔ تیرے آنے سے پہلے وہ دیر تک کھانستا رہا۔"

لالی خاموش رہا۔ جھورا نے بھی کچھ نہیں کہا۔ میداں واپس آ گئی۔ اس نے پانی سے بھرا ہوا گلاس لالی کے سامنے رکھ دیا۔ لالی نے گلاس اٹھا کر پانی پیا۔ جب وہ پانی پی چکا تو میداں نے دوپٹے کا پلو کھول کر کاغذ میں لپٹی ہوئی مٹھائی نکالی اور لالی کے سامنے رکھ دی۔ لالی نے دیکھا کہ کاغذ میں برفی کے تین ٹکڑے رکھے ہیں۔ لالی نے ایک ٹکڑا اٹھایا اور دانتوں سے توڑ کر کھانے لگا۔ برفی خوش ذائقہ تھی۔ لالی کو پسند آئی۔

جھورا خاموش بیٹھا تھا۔ میداں بھی چپ تھی۔ لالی نے نصف ٹکڑا کھایا تھا' ناگاہ جھورا پر اس کی نظر پڑی۔ اسی وقت جھورا نے میداں کی جانب دیکھ کر آنکھ ماری۔ آنکھ مارنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ لالی کو شبہ ہوا۔ اس نے فوراً ہاتھ روک لیا۔ برفی کا بچا ہوا ٹکڑا کاغذ میں ڈال دیا۔ گلاس اٹھا کر پانی پیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جھورا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "کہاں چلا؟ تو نے مٹھائی بھی نہیں کھائی۔ تھوڑی ہی سی تو ہے۔ اسے کھا لے۔ فیر چلا جانا۔"

"میں نوں اب جانا ہے۔" لالی نے گٹھری کندھے پر ڈالی' رائفل سنبھالی اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے جھورا سے پوچھا۔ "جھورے! تجھے کادر آباد کے رستے کا پتہ ہے؟ میں نے وہیں جانا ہے۔"

"کادر آباد تو یہاں سے بہت دور ہے۔ ایسا کر یوسف والا چلا جا۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ وہاں سے کادر آباد چلا جانا۔ یوسف والا ٹیشن ہے۔ تجھے کادر آباد کے لیے گڈی مل جائے گی۔ لاری جاتی ہے۔ تانگے بھی جاتے ہیں۔"

"یوسف والا کا رستہ بتا دے۔"

"پنڈ سے نکل کر پورب کو جائے گا تو نہر ملے گی۔" جھورا نے بتایا۔ "نہر پر پلی آئے گی۔ اس پار چلا جانا۔ سامنے ہی سڑک ہے۔ سڑک پر آگے جائے گا تو نہر ملے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ چلا جانا۔ یوسف والا پہنچ جائے گا۔"

لالی نے مڑ کر میداں کو دیکھا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی تھی۔

لالی نے مسکرا کر کہا۔ "میداں! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تجھے بہت پریشان کیا۔ تو سوہنی ہے اور طبیعت کی بھی چنگی ہے۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا' پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور میداں کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ روٹی ٹکر کی قیمت نہیں۔ تیری مہمان داری کا دتا ہے۔ اسے رکھ لے۔ دیکھ'

انکار نہ کرنا۔" لالی نے نوٹ میداں کے ہاتھ میں دے دیا۔ میداں کا ہاتھ کپکپایا۔ نوٹ نیچے گر گیا۔ لالی نے جھک کر نوٹ اٹھایا اور میداں کے ہاتھ میں رکھ کر آہستہ سے اس کی مٹھی بھینچ دی۔

لالی نکل کر صحن میں آگیا۔ میداں جھلیانی میں گم صم کھڑی رہی۔ مگر جھورا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں نے آنگن عبور کیا۔ جھورا نے آگے بڑھ کر آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھولی۔ لالی نے اس کی پیٹھ تھپک کر مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔ "جا سو جاں کر۔ ابھی سویرا ہونے میں بہت دیر ہے۔"

جھورا نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ لالی دروازے سے گزر کر باہر گلی میں آگیا۔

گلی بالکل سنسان تھی۔ لالی آگے بڑھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاؤں سے نکل کر ایک بار پھر جوہ میں آگیا۔ اس نے جوہ عبور کیا اور جھورا کے بتائے ہوئے راستے پر پورب کی سمت کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہوا نرم اور سبک تھی۔ کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا' نہر آگئی۔ لالی نہر کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جا کر پلیا آگئی۔ پلیا سے گزر کر وہ نہر کے دوسری جانب چلا گیا۔

نہر کے کنارے کھجور کے درخت تھے۔ وہ ان کے نیچے پہنچا۔ گٹھری کھولی۔ ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل اس میں رکھ کر پھر گٹھری باندھی اور کندھے پر لٹکالی۔ درختوں کے نیچے سے نکل کر وہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے دو ڈھائی فرلانگ راستہ طے کیا ہوگا کہ ستاروں کی مدھم روشنی میں اسے پاک پتن روڈ چمکتی نظر آئی۔

وہ سڑک کی سمت بڑھا۔ یکایک اسے گھبراہٹ اور بے کلی محسوس ہوئی۔ پیٹ میں سخت مروڑ اٹھی۔ جی متلایا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو سنبھالا اور سڑک کی جانب بڑھنے لگا۔

سڑک کے کنارے پہنچتے پہنچتے اس کی طبیعت اور بگڑ گئی۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ ہمت کرکے کچھ اور آگے بڑھا۔ مگر سڑک کے کنارے پہنچ کر اس کے قدم ڈگمگائے۔ وہ خود کو سنبھال نہیں سکا۔ نڈھال ہو کر زمین پر گر گیا۔ اسے زور کی ابکائی محسوس ہوئی۔ وہ اٹھا۔ اندھیرے میں قے کی۔ پھر لیٹ گیا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔ نقاہت بڑھ گئی تھی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے

شرابور تھا۔ آنکھوں کے آگے سیاہ پردے لہرا رہے تھے۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆

لالی سڑک کے کنارے بے سدھ پڑا تھا۔ یکایک تیز روشنی نمودار ہوئی۔ ایک کار سڑک پر تیزی سے دوڑتی نظر آئی۔ لیکن لالی کے قریب پہنچتے پہنچتے کار کی رفتار سست پڑ گئی۔ ڈرائیور نے گردن نکال کر جھانکا' نیچے اترا۔ لالی کے نزدیک گیا۔ حیران اور پریشان ہو کر اسے دیکھا اور آہستہ آہستہ جھنجوڑ کر بولا۔ "لالی! لالی!" اس نے لالی کا سر پکڑ کر ادھر ادھر ہلایا۔ لالی نے آنکھیں کھول دیں۔ "کون ہے؟" اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

"لالی! میں شادو ہوں۔ تیرا لائل پور والا یار' شادو۔"

لالی نے ہمت سے کام لیا۔ اٹھ کر بیٹھا۔ شادو کو دیکھا۔ شادو کار کی تیز روشنی میں اس پر جھکا ہوا تھا۔ لالی نے اسے پہچان لیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا جی متلایا اور اس نے ابکائی کے ساتھ قے کر دی۔

قے میں خون ہی خون نکلا۔ لال لال خون سڑک پر پھیل گیا۔ خون دیکھ کر شادو پریشان ہو گیا۔ لالی پر قے کرتے ہی پھر غشی کا دورہ پڑا۔ وہ بے حال ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔ شادو نے اسے دھیرے دھیرے جھنجوڑا۔ "لالی! لالی! تجھے کیا ہو گیا۔ تو بہت بیمار لگتا ہے۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شادو نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ لالی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ شادو نے گٹھری اٹھائی۔ اسے بھی لالی کے قریب ہی کار میں رکھ دیا۔ کار نئے ماڈل کی کوئزلر تھی۔ لمبی چوڑی تھی۔ سیٹیں بھی کشادہ اور نرم تھیں۔ لالی کار میں آرام سے لیٹا رہا۔ شادو اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھا۔ کار کا انجن اسٹارٹ تھا۔ اس نے گیئر بدلا۔ ایکسی لیٹر پیر سے دبایا۔ کار سڑک پر دوڑنے لگی۔

رات ڈھلتی گئی۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ تیز جھونکے کار کے اندر آتے رہے۔ لالی کی طبیعت قدرے سنبھلی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ذہن پر زور دے کر سوچا۔ اسے شادو یاد آگیا۔ لالی نے نحیف آواز میں کہا۔

"شادو! تو شادو ہی ہے نا؟"

شادو نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں میں شادو ہی ہوں۔ اب تیری طبیعت کیسی ہے؟"

"شادو! تو مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟"

"میں تجھے سرکاری اسپتال لے جا رہا ہوں۔ منٹگمری آگے ہی ہے۔"

"تو مجھے وہاں نہ لے جا۔" لالی نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔"

"بکواس نہ کر۔ چپ کر کے پڑا رہ۔" شادو نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "تیری طبیعت بہت خراب ہے۔ تجھے اسپتال لے جانا ضروری ہے۔"

لالی تھوڑا سا اوپر ہو کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "شادو تمیں نوں پتہ ہے' میں جیل سے بھاگا ہوا ہوں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میری گل سن رہا ہے شادو؟"

"سن رہا ہوں۔ میں نوں پتہ ہے' تو جیل سے بھاگا ہوا ہے۔"

"تب بھی تو مجھے اسپتال لے جانا چاہتا ہے؟" لالی نے شکوے کے انداز میں کہا۔ "تو مجھے گرفتار کروانا چاہتا ہے؟"

"بکواس نہ کر۔" شادو نے اسے پھر ڈانٹا۔ "اسپتال میں اس نیم رات کو تجھے کون پہچانے گا۔"

لالی آمادہ نہیں ہوا۔ "گڈی روک لے۔ مجھے یہیں اتار دے۔ میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔ تو مجھے کاور آباد پہنچا دے۔"

"وہاں جا کر کیا کرے گا؟ ادھر تیرا جاننے والا کوئی ڈاکٹر یا حکیم ہے؟"

"کاور آباد کے نزدیک نہر کے اس پار بیلوں میں رحیم داد چھپا ہوا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی جیل سے بھاگا تھا۔ وہ میرا وہاں انتظار کرتا ہو گا۔ تو مجھے کاور آباد پہنچا دے۔" لالی کے لہجے میں عاجزی آ گئی۔

"شادو تیری مہربانی ہو گی۔"

"پر تیری طبیعت بہت خراب ہے۔ تجھے خون کی الٹی ہوئی تھی۔" شادو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "بیلوں پر تیرا علاج کون کرے گا؟ وہاں جنگل اور ویرانہ ہے۔"

"پر میں اسپتال ہرگز نہیں جاؤں گا۔ ویسے میری طبیعت اب ٹھیک ہے۔"

"ہرگز ٹھیک نہیں ہے۔ تو اسپتال جانا نہیں چاہتا تو میں تجھے حکیم چشتی کے پاس لے جاؤں گا۔ منٹگمری سے آگے کمال گڑھ ہے۔ حکیم وہیں رہتا ہے۔ بہت ٹھیک ٹھاک علاج کرتا ہے۔ اس کی دوائی سے تو بالکل چنگا ہو جائے گا۔"

"اسی کے پاس لے چل۔ حکیم سے دوائی لینے کے بعد تو مجھے کاور آباد پہنچا دینا۔ میں نوں رحیم

داد کے پاس ضرور جانا ہے۔"

"چلا جانا۔ ضرور چلا جانا۔ پر ابھی اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ فیر جہاں کہے گا' وہیں پہنچا دوں گا۔"

لالی رک رک کر گہری سانسیں بھرتا رہا۔ شادو اسٹیرنگ وہیل سنبھالے سامنے دیکھتا رہا۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ پھر لالی کی آواز ابھری۔ "شادو! تو یہ کار کہاں سے لے آیا؟"

"یہ میاں عبدالسبحان کی کار ہے۔ میں نے اس کی نوکری کر لی ہے۔ ڈرائیور لگ گیا ہوں۔ میاں سبحان وڈا زمیں دار ہے اور بہت نیک بندہ ہے۔"

لالی خاموش رہا۔ اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی تھی۔ پیٹ میں مروڑ اٹھی۔ ماتھے پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ وہ لیٹ گیا اور رک رک کر سانس لینے لگا۔ اس کی طبیعت بگڑتی گئی۔ ایک بار پھر غشی طاری ہوئی اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ بے حال پڑا رہا۔

کار منٹگمری شہر سے گزری۔ لالیاں والا سے آگے نکلی۔ لالی نے کار رکوائی' ایک بار پھر خون کی قے کی اور بے سدھ ہو کر کار میں لیٹ گیا۔

☆

کار کمال گڑھ کی جانب مڑنے لگی۔ لالی کو کچھ خبر نہ تھی کہ کار کہاں جا رہی ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ کار کمال گڑھ میں داخل ہوئی اور حکیم نذر محمد چشتی کے گھر کے سامنے جا کر رک گئی۔ شادو کار سے نکلا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے دروازے کی آڑ سے پوچھا۔ "کون ہے؟" یہ حکیم کی بیوی تھی۔ اس کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

شادو نے پوچھا۔ "حکیم جی ہیں جی؟"

"وہ تو سو رہے ہیں۔ آج تو ویسے بھی دیر سے سوئے ہیں۔ اب تو نہیں اٹھ سکتے۔"

شادو کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازے کے پیچھے سے حکیم چشتی کی آواز ابھری۔ وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ "نیک بخت! میں نے ہزار بار کہا' کوئی مریض آئے تو مجھے فوراً جگا دیا کر۔" حکیم نے دروازہ کھولا۔ باہر آیا اور نرم لہجے میں پوچھا۔

"اس وقت کون آیا ہے؟"

"میں ہوں جی شادو۔"

"اچھا تو ہے۔" حکیم آنکھیں ملنے لگا۔ "میں سویرے بوٹیاں چننے بیلوں کی طرف چلا گیا۔ شام کو

لوٹا۔ بہت تھک گیا تھا۔ ایسی گہری نیند سویا کہ تیرے بار بار کھٹ کھٹانے پر بھی آنکھ نہیں کھلی۔"

حکیم نے تامل کیا۔ مسکرا کر پوچھا۔ "یہ بتا' کیسے آیا اتنی رات کو؟ تیری گھر والی اور بچے تو خیریت سے ہیں؟"

"رب کا شکر ہے جی۔ وہ سب تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں تو جی ایک مریض کو دکھانے لایا تھا۔"

"کہاں ہے مریض؟"

شادو نے کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کار کے اندر پڑا ہے۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

"کار میں تو اندھیرا ہوگا۔ تو اسے اٹھا کر لے آ۔ میں ابھی مطب کھولتا ہوں۔ تو اسے لے کر مطب میں آجا۔" حکیم گھر میں چلا گیا۔

شادو کار کی جانب بڑھا' دروازہ کھولا۔ وہ مضبوط جسم کا لمبا چوڑا جوان تھا۔ لالی کو ایک بار پھر اس نے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ لالی ابھی تک بے حال تھا' اسے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ شادو اسے اٹھائے ہوئے مطب کی جانب بڑھا۔ مطب کا دروازہ کھلا تھا۔ شادو اندر داخل ہوا۔ حکیم چشتی ہاتھ میں لالٹین لٹکائے اس کا منتظر تھا۔ مطب میں دیوار سے لگا ہوا تخت تھا۔ اس پر چٹائی بچھی تھی۔ چٹائی پر سفید چادر کا فرش تھا۔ تخت پر گاؤ تکیہ بھی رکھا تھا۔ تخت کے سامنے کئی مونڈھے پڑے تھے۔

حکیم نے اشارہ کیا۔ شادو نے لالی کو تخت پر لٹا دیا۔ وہ آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑا رہا۔ حکیم نے شادو سے دریافت کیا۔ "اسے کیا ہو گیا؟"

"یہ تو جی پتہ نہیں۔ یہ میرا پرانا یار ہے۔ میں میاں صاحب کے ایک دوست کو چھوڑ کر حسین والا سے واپس آرہا تھا۔ مجھے یہ سڑک کے کنارے پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے جھنجوڑا تو اس نے آنکھ کھولی۔ مجھے پہچان لیا۔ اٹھ کر بیٹھ بھی گیا۔ اسے الٹی آئی۔ الٹی کے ساتھ خون ہی خون تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کار میں ڈالا اور ادھر لے آیا۔ رستے میں اس نے مجھ سے بات چیت بھی کی تھی۔ فیر ایک الٹی اور آئی اور اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ اس کے بعد سے اسے کچھ ہوش نہیں ہے۔"

حکیم نے ہاتھ بڑھایا اور لالی کی نبض دیکھنے لگا۔ نبض دیکھنے کے بعد اس نے شادو سے کہا۔ "اسے کسی نے سنکھیا کھلا دی ہے۔"

شادو نے گھبرا کر پوچھا۔ "حکیم جی! اب اس کا کیا بنے گا؟ سنکھیا کھانے سے تو موت ہو جاتی ہے۔"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس کے پیٹ میں سنکھیا کی زیادہ مقدار نہیں گئی ہے۔" حکیم نے شادو کو اطمینان دلایا۔ "دو چار دن میں بھلا چنگا ہو جائے گا۔ کسی سے دشمنی تھی اس کی؟"

شادو نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے بتایا۔ "پتہ نہیں جی! یہ تو مجھے سڑک پر پڑا ہوا ملا تھا۔"

اسی اثناء میں لالی نے آنکھیں کھولیں۔ حکیم کو اپنے قریب بیٹھے دیکھا۔ حکیم نے اسے ہوش میں پایا تو نرم لہجے میں پوچھا۔ "کیا کھایا تھا؟"

لالی نے نحیف آواز میں رک رک کر جواب دیا۔ "روٹی تھی' سرسوں کا ساگ تھا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا اور گہری گہری سانسیں بھرتا رہا۔ "برفی بھی کھائی تھی۔ لگتا ہے' اس میں زہر تھا۔ میں نے آدھا ہی ٹکڑا کھایا تھا۔"

"جبھی تو بچ گیا۔ برفی میں زہر ہی تھا۔" حکیم نے تسلی دی۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تو خاموش پڑا رہ۔ زیادہ بات چیت نہ کر۔"

حکیم گھر میں کھلنے والے دروازے تک گیا۔ ایک پٹ کھولا اور جھانک کر اونچی آواز سے کہا۔ "عائشہ کی ماں! جاگ رہی ہو؟"

اندر سے آواز ابھری۔ "کیا کام ہے جی؟"

"گھر میں دودھ تو ہوگا اور گرم بھی ہوگا۔ پیتل کے بڑے گلاس میں دودھ ڈالو اور اس میں تقریباً آدھا پاؤ گھی ملا کر مجھے دے دو۔"

حکیم یہ ہدایت دے کر لالی کے پاس آگیا اور تخت پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ مگر اس نے لالی سے بات چیت نہیں کی۔ لالی آنکھیں کھولے چت لیٹا تھا اور چپ چاپ چھت تک رہا تھا۔ حکیم نے شادو سے پوچھا۔

"میاں سبحان کا کیا حال چال ہے؟ لائل پور میں ہیں یا رحیم یار خاں گئے ہیں؟"

"رحیم یار خاں تو جی وہ کم ہی جاتے ہیں۔ ادھر کی زمیں داری کی دیکھ بھال ان کا چھوٹا پت کرتا ہے۔ ویسے میاں صاحب ان دنوں ذخیرے کے جھل میں شکار کی تیاریاں کر رہے ہیں۔"

"وہ تو ہر سال کرتے ہیں' سنا ہے۔ بہت شاندار شکار ہوتا ہے۔ دور دور سے بڑے بڑے افسر اور زمیں دار شکار کھیلنے آتے ہیں۔"

حکیم نے بات ختم ہی کی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ حکیم اٹھ کر گیا۔ اس کی بیوی نے دروازے کی آڑ سے دودھ کا گلاس دیا۔ حکیم نے گلاس سنبھالا اور لالی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "شادو! اسے گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا دے۔" شادو بڑھ کر لالی کے پاس گیا۔ کمر اور گردن کے نیچے

ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ لالی خاموش رہا۔ اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ حکیم اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا اور گلاس اس کے منہ سے لگا کر بولا۔

"اسے پی لے۔"

لالی نے چند گھونٹ پیے اور منہ ہٹا لیا۔ حکیم نے دل جوئی کی۔ "حوصلے سے کام لے۔ اسے پینے کے بعد تو بھلا چنگا ہو جائے گا۔" لالی نے گلاس سے منہ لگایا اور آنکھیں بند کر کے دھیرے دھیرے سارا دودھ پی گیا۔

دودھ پیتے ہی اسے ابکائی آئی۔ حکیم آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔ لالی کو ذرا قرار آیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد بے چین ہو کر ادھر ادھر گردن ہلانے لگا۔ حکیم نے پوچھا۔ "الٹی کرے گا؟" لالی نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ حکیم نے شادو سے کہا۔

"اسے اٹھا کر باہر لے جا۔"

شادو نے لالی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور مطب سے باہر لے گیا۔ لالی اکڑوں بیٹھ گیا اور ابکائیاں لینے لگا۔ پھر اس نے قے کی۔ حکیم نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ قے میں دودھ کے ساتھ خون بھی نکلا۔ قے کرتے ہی لالی نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ شادو نے اسے اٹھانا چاہا۔ مگر حکیم نے منع کر دیا۔

"اسے یوں ہی پڑا رہنے دے۔ یہاں ہوا اور ٹھنڈک ہے' اسے آرام ملے گا۔"

قے کرنے کے بعد لالی کو سکون محسوس ہوا۔ الجھن اور گھبراہٹ کم ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پچھلی رات کی ہوا کے نرم اور خنک جھونکے جسم کو لگے تو لالی کو نیند آ گئی۔ حکیم نے اسے سوتے دیکھا تو شادو سے کہا۔ "اسے گاڑی میں لٹا دے۔" شادو نے آہستہ سے لالی کو ہاتھوں پر اٹھایا اور کار کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔

شادو واپس حکیم کے پاس آیا۔ حکیم نے کہا۔ "اب اسے لے جا۔ راستے میں الٹی ہو تو کرا دینا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سنکھیا کا سارا زہر الٹی کے ساتھ نکل جائے گا۔ اسے کوئی اور دوائی دینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کا صحیح علاج کر دیا۔ کل شام تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے کل تک صرف دودھ یا لسی پلانا۔ دو ایک روز کمزوری رہے گی پھر ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔

جوان ہے اور حوصلے والا بھی ہے۔"

شادو اظہار معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "حکیم جی! میں نے اتنی رات کو تمہیں تکلیف دی۔"

"کوئی بات نہیں۔" حکیم نے مسکرا کر نرم لہجے میں کہا۔ "اپنا تو کام ہی بیماروں کی خدمت کرنا ہے۔ میرے لیے دن رات سب برابر ہیں۔ تو بالکل فکر نہ کر۔"

شادو نے جیب سے دو روپے نکال کر حکیم کو دیئے۔ اس نے خاموشی سے روپے لے لیے۔ شادو نے کار میں بیٹھ کے اسے اسٹارٹ کیا۔ کار آگے بڑھی۔ چند میل کچے راستے پر چلنے کے بعد ملتان روڈ پر آ گئی اور تیز رفتار سے سڑک پر دوڑنے لگی۔

☆

کار ضلع لائل پور کی حدود میں داخل ہوئی۔ کمالیہ پہنچی۔ آگے جا کر سمندری کی جانب مڑی۔ مرید والا کے قریب لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کار رکوا کے قے کی۔ اس دفعہ خون کی مقدار بہت کم تھی۔

شادو نے سہارا دے کر لالی کو پھر پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ وہ نڈھال ہو کر دھیرے دھیرے ہانپنے لگا۔ اب دن نکل آیا تھا۔ سورج چڑھ کر اوپر آ گیا۔ ہر طرف دھوپ پھیلی تھی۔ لالی پھر سو گیا۔

کار سمندری تک نہیں گئی۔ راستے ہی میں شادو نے کار موڑی اور اسے سنڈیانوالا جانے والی کچی سڑک پر دوڑانے لگا۔ گاؤں سنڈیانوالا سے آگے تھا۔ گاؤں پہنچ کر اس نے پرانی وضع کی ایک حویلی کے سامنے کار روک لی۔ حویلی کی دیواروں پر کائی جمی تھی۔ اس نے لالی کو بیدار کیا۔ اب لالی کی طبیعت قدرے سنبھل چکی تھی۔

وہ شادو کے سہارے چلتا ہوا حویلی کے مہمان خانے میں گیا۔ مہمان خانے کے پچھواڑے نوکروں کے لیے ایک ہی قطار میں سلسلے وار کئی کوٹھریاں تھیں۔ ان کے آگے ٹین کی چھت کا سائبان تھا۔

شادو اسے مہمان خانے کے اسی حصے کی ایک کوٹھری میں لے گیا۔ کوٹھری خاصی کشادہ تھی۔ اس میں چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی پر بستر لگا تھا۔ شادو نے لالی کو بستر پر لٹا دیا' باہر گیا۔ کار سے لالی کی گٹھری اٹھا کر لایا اور چارپائی کے سرہانے ایک کونے میں رکھ دی۔ لالی کچھ دیر آنکھیں بند کیے پڑا رہا' پھر سو گیا۔

شام کو اس کی آنکھ کھلی۔ شادو اسی وقت واپس آیا تھا۔ اس نے لالی کو بیدار پایا تو قریب ہی بستر پر بیٹھ گیا۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" لالی نے نقاہت سے کہا۔ "پر کمزوری بہت ہے۔"

"فکر نہ کر۔ کمزوری بھی ختم ہو جائے گی۔ تو جلد ہی بھلا چنگا ہو جائے گا۔" شادو نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔ "بھوک تو نہیں لگ رہی ہے؟"

"بھوک بالکل نہیں ہے۔"

"ایسا کر' تو گرم دودھ پی لے۔ کمزوری کم ہو جائے گی۔ حکیم جی نے دودھ پینے کو بتایا ہے۔ میں تیرے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکوں گا۔ میں نے جیپ لے کر توبہ ٹیک سنگھ جانا ہے۔ کل دوپہر تک واپسی ہوگی۔ میں خداداد خاں سے کہتا جاؤں گا۔ وہ تجھے دودھ پلا دے گا۔" اس نے دروازے کی طرف منہ کیا اور اونچی آواز سے پکارا۔ "بابے! ادھر آ۔" خداداد خاں کوٹھری میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔

کوٹھری میں روشنی ہو گئی۔ خداداد نے لالٹین طاق میں رکھ دی۔ وہ بوڑھا اور لاغر تھا۔ سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ شادو نے کہا۔ "بابے! اسے دودھ لا دے۔ روٹی نہ دینا۔ ویسے اسے بھوک ہے بھی نہیں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "بابے! یہ بیمار ہے۔ اس کی ٹھیک سے دیکھ بھال کرنا۔ میرا یار اور گہرا یار ہے۔"

خداداد نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔ "پروا نہ کر۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں نوں پتہ ہے' یہ بیمار ہے۔ آیا تھا تو چلا بھی نہیں جاتا تھا۔"

شادو نے لالی سے کہا۔ "اب میں چلوں گا۔ بابا خداداد موجود ہے' بہت بھلا اور نیک بندہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے تجھے یہاں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔" شادو کوٹھری سے چلا گیا۔ خداداد خاں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا گیا۔

لالی چپ لیٹا رہا۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی تھی۔ باہر صحن میں اندھیرا تھا۔ لالی پچھلی رات کے واقعات یاد کرنے لگا۔ اسی اثناء میں بوڑھا خداداد خاں آہستہ آہستہ کھانستا ہوا آیا۔

اس کے ہاتھ میں دودھ سے بھرا ہوا گلاس تھا۔ لالی تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے خداداد سے دودھ کا گلاس لیا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ دودھ گرم اور میٹھا تھا۔ اس نے دودھ پی کر خالی گلاس خداداد کو دے دیا۔ وہ گلاس لے کر چلا گیا۔

لالی تنہا رہ گیا۔ وہ کچھ دیر تکیے کے سہارے بیٹھا رہا پھر لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند نہیں آئی۔ خداداد خاں واپس آ گیا اور کوٹھری کے باہر سائبان کے نیچے برآمدے میں فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ دروازے

دہلیز کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ مگر لالی نے اس سے بات چیت نہیں کی۔ خاموش لیٹا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے نیند آ گئی۔

دوسرے روز بھی وہ بستر پر لیٹا ہی رہا۔ سویرے اس نے لسّی پی۔ دوپہر کو خداداد نے اسے دودھ میں بھگو کر روٹی کھلائی۔ شادو سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے آیا۔ وہ لالی کے لیے تازہ پھل لایا تھا۔ اپنی ایک اجلی قمیص اور شلوار بھی لایا تھا۔

"کل صبح نہا کر کپڑے بدل لینا۔ تیرے کپڑے بہت میلے ہو رہے ہیں۔"

"یہ تو نے بہت چنگا کام کیا۔ کچھ اور میلے کپڑے بھی ہیں۔" لالی نے سرہانے رکھی ہوئی گٹھری کی جانب اشارہ کیا۔ "انھیں میں سویرے دھو ڈالوں گا۔"

"یہ کام تجھے کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کل میاں سبحان کو لے کر لائل پور جا رہا ہوں۔ گھر والی کو تیرے کپڑے دے دوں گا' وہ انھیں دھو ڈالے گی۔ میں نے سویرے گھر والی سے تیری بیماری کا کہا تو وہ گھبرا گئی۔ یہاں آنے کو کہتی تھی پر بچے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ انھیں گھر میں چھوڑ کر وہ کیسے آ سکتی ہے۔ اسی لیے میں اسے نہیں لایا۔"

"ٹھیک ہی کیا۔ خاما خا پریشان ہوتی۔ ویسے میری طبیعت اب ٹھیک ٹھاک ہے۔" لالی نے مسکرا کر شادو کی طرف دیکھا۔ "بھابی اب تجھ سے جھگڑا ٹنٹا تو نہیں کرتی؟"

"جب سے میں نے نوکری کی ہے' بہت راضی خوشی ہے۔" شادو بھی مسکرانے لگا۔ "ویسے اس کی ناراضی ٹھیک ہی تھی۔ روز پولیس والے گھر پر رات کو آواز لگاتے تھے۔ تھانے بلاتے تھے۔ اسے تکلیف ہوتی تھی۔ پاس پڑوس میں بدنامی ہوتی تھی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنا ایک کان پکڑا۔ "یار' اللہ کسی کو ہسٹری شیٹر نہ بنائے۔ پولیسے ایک بار پیچھے لگ جائیں تو جان نہیں چھوڑتے۔ ہزار نیک چلنی کا ثبوت دو' مانتے ہی نہیں۔"

"تجھے میاں سبحان نے پولیس کے چکر سے نکلوا دیا۔ تو بال بچے والا ہے' تیرے لیے یہ بہت ٹھیک ہوا۔"

"سوچتا ہوں' تیرا کیا بنے گا؟" شادو نے تشویش کا اظہار کیا۔ "تو کہہ تو میاں سبحان سے تیرے لیے بات کروں؟ اس کا بہت اثر و رسوخ ہے۔ سارے سرکاری افسر اس کی بات مانتے ہیں' اس کے دو پت بھی وڈے افسر لگے ہوئے ہیں۔"

"تو میرے بارے میں میاں سبحان سے بالکل بات نہ کرنا۔ جانے کیا گڑبڑ ہو جائے۔" لالی نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ "تو مجھے ہیتی تال کا ور آباد پہنچا دے۔ میں نوں رحیم داد سے ملنا

ہے۔ وہ میرے لیے بہت پریشان ہو گا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ میں نوں اب جاتا ہے۔ میاں صاحب انتظار کرتے ہوں گے۔"

شادو نے لالی کے سرہانے سے گٹھری اٹھائی۔ اسے کھول کر میلے کپڑے نکالے۔ رائفل الٹ پلٹ کر دیکھی۔ "یہ رائفل تیرے ہاتھ کیسے آ گئی؟"

"بس ایک چکر میں مل گئی۔ آگے کام دے گی۔"

شادو نے کچھ نہیں کہا۔ رائفل پھر چادر میں لپیٹ کر رکھ دی۔ وہ لالی کے کپڑے اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔ کہنے لگا۔ "کل لائل پور جاتے ہوئے تیرے کپڑے لے جاؤں گا۔" وہ چلا گیا۔

لالی نے رات کا کھانا کھایا اور کوٹھری سے نکل کر کھلے صحن میں ٹہلنے لگا۔ اب اس کے جسم میں دھیرے دھیرے توانائی لوٹ رہی تھی۔ دوسرے روز اس نے غسل کیا۔ اجلے کپڑے پہنے۔ اب کمزوری بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ غسل کے بعد وہ تازگی اور سکون محسوس کر رہا تھا۔ مگر مہمان خانے سے باہر نہیں گیا۔

شام کو اس نے چارپائی کوٹھری سے نکال کر باہر صحن میں ڈالی۔ بستر بچھایا اور اس پر لیٹ گیا۔ اسے شادو کا انتظار تھا۔ شادو چراغ جلے آیا مگر ٹھہرا نہیں۔ لالی کے میلے کپڑے لے کر چلا گیا۔

بابا خداداد خاں آ گیا۔ وہ کھانا لایا تھا۔ لالی کھانا کھانے لگا۔ خداداد چارپائی کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔

مہمان خانے میں خاموشی طاری تھی۔ لالی نے کھانا کھاتے ہوئے بوڑھے سے پوچھا۔ "بابے! یہاں تیرے سوا کوئی دوسرا نوکر چاکر نہیں ہے؟"

"کئی ہیں جی' پر سارے ہی نوکر ادھر جالی فت یانہ سے آگے جھل کے سامنے میدان میں خیمے لگا رہے ہیں' شکار کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ کل سویرے سے شکار شروع ہو گا۔ نوکروں کے علاوہ چند کے لگ بھگ سو مزارعے اور کمی بھی شکار کے لیے ویگار پر لگائے گئے ہیں۔"

"تیری باتوں سے لگتا ہے' بہت زوروں کا شکار ہوتا ہے۔"

"نہ پوچھ' کیسا زوردار شکار ہوتا ہے۔" خداداد خاں نے بتایا۔ "شکار کھیلنے والے بھی بہت ہوتے ہیں۔ اونچے اونچے افسر' وڈے وڈے زمیں دار' دوسرے ضلعوں تک سے شکار کھیلنے والے آتے ہیں۔ کئی تو اپنی گھر والیوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ سارے ہی مہمان چھولداریوں میں ٹھہرتے ہیں۔ دن بھر شکار کھیلا جاتا ہے۔ رات کو زبردست دعوت ہوتی ہے۔ دبا کے شراب پی جاتی ہے' ناچ گانا ہوتا ہے۔ زبردست موج میلا ہوتا ہے۔"

"ہر سال ایسے ہی شکار کھیلا جاتا ہے؟"

"ایک بار نہیں' سال میں دو بار کھیلا جاتا ہے۔ گرمیوں میں پت جھڑ لگنے کے بعد ادھر شکار ہوتا ہے۔ یہ تو سرکاری جھل ہے۔ میاں سبحان کے پاس برسوں سے اس کا ٹھیکا ہے۔ پر اصلی شکار تو برسات کے بعد ادھر رحیم یار خاں میں ہوتا ہے۔ وہاں ریتی میں میاں سبحان کی اپنی شکار گاہ ہے۔ میں تو شکار کے دنوں میں وہاں بھی جاتا ہوں۔ بہت شان دار شکار گاہ ہے۔ میاں سبحان نے شکار کے لیے ادھر طرح طرح کے پرندے' خرگوش اور دوسرے جانور پال رکھے ہیں۔ شکار کا مزہ تو رحیم یار خاں میں آتا ہے۔"

لالی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا۔ میاں سبحان وڈا زمیں دار ہے؟"

"تمیں نوں پتہ ہے' وہ کتنا وڈا زمیں دار ہے؟ بگیر دار ہے' بگیر دار۔" خداداد نے جوش و خروش سے اظہار کیا۔ "ادھر لائل پور میں تو اس کے صرف ۳۰ مربعے ہیں' پر رحیم یار خاں میں تو لگ بھگ چار سو مربعے ہوں گے۔ ۲۵ مربعے پر تو اس کی شکار گاہ ہے۔ دو سو مربع زمین پر کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ سو پر آم' امرود اور مالٹے کے باغ ہیں۔ باقی زمین پر جھاڑیاں اور جھنگر ہیں۔ سنا ہے میاں سبحان اسے بھی صاف کرا کے مویشی فارم بنانا چاہتا ہے۔"

"جب ادھر اس کی دس ہزار ایکٹر زمین ہے تو یہاں لائل پور میں کیوں رہتا ہے؟"

"یہاں وہ اپنے تیسرے پت کے لیے کپڑا بنانے کا کارخانہ لگانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس کا پت ابھی لہور میں پڑھ رہا ہے۔ میاں سبحان اسے کاروباری لین میں ڈالنا چاہتا ہے۔ سننے میں تو یہی آیا ہے۔ ویسے جی' اسے کیا پروا۔ اللہ نے بہت دے رکھا ہے۔ اس کے دو پت وڈے افسر لگے ہیں۔ ایک لہور میں ہے۔ دوسرا پنڈی میں لگا ہے۔ فوج میں کرنیل ہے۔" خداداد کو کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ چند لمحے وہ کھانستا رہا۔ ذرا قرار آیا تو بتانے لگا۔

"سچ پوچھو تو جی' شکار کا بندوبست تو میاں کا لہور والا پت ہی کرتا ہے۔ میاں سبحان تو آج لائل پور چلا گیا۔ اب نہیں آئے گا۔"

"ویسے شکار کا سلسلہ تو میاں سبحان نے شروع کیا ہو گا؟"

"نہیں جی' یہ بات نہیں ہے۔" خداداد خاں نے بتایا۔ "شکار تو اس کا پیو بھی اسی شان سے کھلاتا تھا۔ یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ میں پہلے اسی کے پاس نوکر تھا۔ اسی نے رحیم یار خاں میں شکار گاہ کے لیے جنگل لگوایا تھا۔ انگریز افسروں' راجوں اور نوابوں کو شکار کھیلنے کے لیے

بلاتا تھا۔ سردی شروع ہوتے ہی شکار کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ شکاریوں کے ٹھیرنے کے لیے چھولداریاں لگائی جاتیں۔ انگریز افسروں کے ساتھ ان کی میمیں بھی شکار کے پیچھے گھوڑے دوڑاتیں۔ شام کو شکار سے تھک کر آتیں تو ٹبوں میں نہانے کے لیے گرم گرم پانی بھرا ہوتا۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "بالکل ننگی ننگی نہاتیں۔ انھیں ذرا لاج نہ آتی۔ زور زور سے ہنستیں۔ ٹھٹھے لگاتیں۔"

"اب ایسا نہیں ہوتا؟"

"ہوتا تو اب بھی ایسا ہی ہے۔ پر اب وہ بات نہیں رہی۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بات یہ ہے جی! وہ اپنی جوانی کے دن تھے۔ اب بڑھاپے میں کچھ چنگا نہیں لگتا۔ اسی لیے ادھر پڑا رہتا ہوں۔ شکار دیکھنے نہیں جاتا۔"

"میاں سبحان کا دادا بھی وڈا زمیں دار ہوگا؟"

"پہلے تو نہیں تھا' بعد میں وڈا زمیں دار بن گیا۔ میں نے تو اسے دیکھا نہیں' پر سننے میں ایسا ہی آیا ہے۔"

لالی نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ "بابے! وہ اتنا وڈا زمیں دار کیسے بن گیا؟ کہاں سے اس کے پاس اتنی بہت ساری زمین آگئی؟"

"میرا پیو اسے ٹھیک طرح جانتا تھا۔ وہی اس کے بارے میں بتاتا تھا۔ میاں سبحان کے دادا کا نام رحمان تھا۔ وہ ملتان کے انگریز کمشنر برکلے کا سائیس تھا۔"

لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "سائیس تھا؟"

"ہاں جی' سائیس ہی تھا۔" خداداد خاں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "برکلے تھا تو اسسٹنٹ کمشنر پر اس نے بہادری میں بہت نام پیدا کیا۔ میراثی اس کی بہادری کے گیت بنا بنا کر گاتے تھے۔ جاگیرداروں' سرکاری افسروں اور انگریزوں سے خوب انعام پاتے تھے۔ کچھ تو ڈھڈے اور سارنگی پر مرزا صاحباں کی دھن پر گاتے تھے۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر لمبی تان سے برکلے کی بہادری کی سد لگاتے تھے۔ کچھ میراثی برکلے کی شان میں وار بھی گاتے تھے۔ میں نے ایسے سد اور وار بہت سنے ہیں۔ اب بھی کوئی بوڑھا میراثی مل جائے تو اسے ایسے گیت یاد ہوں گے۔ اب ان کا رواج نہیں رہا۔ انگریزوں کے راج میں تو بہت گائے جاتے تھے۔"

"یہ تو نے عجب گل سنائی۔" لالی نے مسکرا کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "میاں سبحان کا دادا برکلے کا سائیس ہوتا تھا۔ پر سائیسی کرتے کرتے وہ اتنا وڈا زمین دار کیسے بن گیا؟"

"وہ ایسا ہوا جی' جب ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا تو احمد خاں کھرل بھی انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ تو تمیں نوں پتہ ہی ہوگا کہ کھرل گوگیرہ اور اس کے آس پاس راوی کے دونوں کناروں پر آج بھی بستے ہیں۔ جڑانوالا' تاندلیانوالا' کھڑیانوالا اور اس سے بھی آگے دار برٹن اور سیدوالا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان دنوں گوگیرہ سرکاری ہیڈ کوارٹر ہوتا تھا۔ برکلے بھی وہیں ہوتا تھا۔"

لالی خود بھی گوگیرہ میں پیدا ہوا تھا اور اس کا باپ بھی کھرل تھا۔ مگر اس نے اس کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا خداداد خاں کی باتیں سنتا رہا۔

"پر احمد خاں کا گھر جھمرے میں تھا۔ وہ کھرل اپیروں کا سردار ہوتا تھا۔ تب ہی تو اسے احمد خاں اپیرا بھی کہا جاتا ہے۔ بہت ہی بہادر اور حوصلے والا بندہ تھا۔ سنا ہے ڈیڑھ ڈیڑھ گز لمبے تو اس کے ہاتھ تھے۔ پہاڑ کی طرح اونچا اور یہ چوڑا سینہ۔" خداداد نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ "بہت لما تڑنگا اور زور آور تھا۔ ایسا زور آور تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ شیر کی طرح جھپٹ' جھپٹ کر حملے کرتا تھا۔"

لالی کھانے سے فارغ ہو چکا تھا' لیکن اس نے مداخلت نہ کی۔ خداداد خاں پرجوش لہجے میں بولتا رہا۔ "گوگیرہ کا سردار رائے ساون خاں اور اس کا پت' سادو خاں بھی احمد خاں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ فت یانوں اور وٹوؤں کو بھی احمد خاں نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ سچ پوچھ تو راوی سے ستلج تک سارے ہی سردار لڑائی میں احمد خاں کے ساتھ تھے۔ صرف جویا الگ رہے۔ ستلج کے اس پار ہو وٹو تھے وہ بھی اس کے ساتھ نہ آئے بلکہ انگریزوں سے مل گئے۔ اسی وفاداری کے صلے میں ان کو مربعے ملے۔ جائیدادیں اور لمبرداریاں ملیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پاکستان بنا تو وہ پناہ گیرے بن کر ادھر آگئے اور جی انگریزوں کی دی ہوئی زمینوں کے بدلے یہاں بھی متروکہ جائیداد میں سے اتنی اراضی الاٹ کرائی کہ کئی تو وڈے جاگیردار بن گئے۔"

"ایسا تو بہت ہوا۔ متروکہ جائیداد کی الاٹمنٹ کرنے والے افسر تو وہی تھے جو انگریزوں کے وفادار رہ چکے تھے۔" لالی نے تبصرہ کیا۔ "وہی کیا' سارے ہی افسر ایسے تھے۔ کسی کو بھی ہٹایا نہ گیا بلکہ میں نے تو سنا ہے' ان کے عہدے اور بڑھا دیے گئے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔"

"بابے! تو احمد خاں کھرل کے بارے میں بتا رہا تھا۔" لالی نے خداداد کو یاد دلایا۔

"ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا' احمد خاں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکانا شروع کر دی۔" خداداد خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اس نے گوگیرہ میں بھی بغاوت کرا دی اور

ایسی بغاوت کرادی کہ کیدیوں نے جیل کا پھاٹک توڑ ڈالا' پر باہر نکلنے نہ پائے۔ تب تک دہلی سے انگریزوں کی مدد پہنچ گئی۔ اس فوج نے نہتے کیدیوں پر فائر کھول دیا۔ کیدیوں کے پاس صرف پتھر اور لوہے کی سلاخیں تھیں۔ اندھا دھند فائرنگ کے سامنے کب تک ٹھیرتے؟ ۵۱ مارے گئے اور زخمی تو بہت ہوئے۔ جیل کی زمین اور دیواریں ان کے خون سے لال ہو گئیں۔"

"احمد خاں کھرل نے ان کی کوئی مدد نہیں کی؟"

"اس کے پاس ان دنوں بہت تھوڑی فوج ہوتی تھی۔ تب تک وہ چھپ چھپ کر انگریزوں کی فوجوں پر حملے کرتا تھا اور اس کے ساتھ' ساتھ اپنی طاکت بھی بڑھاتا جا رہا تھا۔" خداداد نے لالی کو مطلع کیا۔ "میں نے تو سنا ہے تھوڑی فوج ہونے پر بھی احمد خاں نے جیل کے کیدیوں کی مدد کے لیے جم کر لڑائی لڑی۔ پر انگریزوں کے پاس بہت زیادہ فوج تھی۔ احمد خاں کے کتنے ہی ساتھی اس لڑائی میں مارے گئے۔ ان میں رائے ساون خاں بھی شامل تھا۔ ساون خاں بہت بہادر سردار تھا۔ اس کے مرنے پر احمد خاں کھرل کمزور پڑ گیا۔ وہ گوگیرہ سے نکل کر اپنے پنڈ جھمرے کی طرف پلٹا۔ برکلے اپنی فوج لے کر اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ راوی پار کرنے سے پہلے ہی احمد خاں کو گرفتار کرلینا چاہتا تھا۔ پر وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں راوی کے بیچ سے گھوڑا دوڑاتا ہوا صاف نکل گیا۔"

"برکلے نے راوی پار کرنے کی کوشش نہیں کی؟" لالی نے دریافت کیا۔

"نہیں وہ راوی سے آگے نہ بڑھا۔" بوڑھے خداداد خاں نے بتایا۔ "جھمرے پہنچ کر احمد خاں نے دوبارہ اپنی فوج اکٹھی کی اور دلّی کے بادشاہ کے ساتھ کھل کر وفاداری کا اعلان کردیا۔ دوسرے سرداروں نے بھی اس کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا۔ فیر تو جی چناب سے ستلج تک ہر طرف بغاوت پھیل گئی۔ باغیوں نے کمالیہ پر کبضہ کرلیا۔ کمالیہ کا سردار رائے سرفراز خاں انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ سکھ سردار بیدی بھی شریک تھا۔ دونوں بھاگ کر گوگیرہ چلے گئے۔ احمد خاں کھرل اور اس کے ساتھی سرداروں نے ان کا پیچھا کیا۔ راوی سے گزر کر دوبارہ گوگیرہ پہنچے۔ زبردست معرکہ ہوا۔ احمد خاں اور اس کے ساتھی ایسی بہادری سے لڑے کہ انگریزوں کی فوجیں ٹھہر نہ سکیں۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ میدان جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اس فتح نے احمد خاں کھرل کا حوصلہ اور بڑھا دیا۔"

"انگریزوں کا کیا بنا؟" لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"انگریز بہت گھبرا گئے۔ انھوں نے مدد کے لیے الفنسٹن کو بھاری فوج دے کر بھیجا۔ اس میں زیادہ تر سکھ فوجی تھے۔ فیر یہ بھی ہوا کہ بھاول پور کے نواب صادک محمد خاں نے بھی اپنی پوری دس

ہزار ریاستی فوج انگریزوں کی مدد کے لیے دے دی۔" اس نے لحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ "ادھر احمد خاں کھرل نے سیدوالا کے نزدیک راوی کے کنارے ایک پنڈ 'مرآباد' میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا وہ انگریزوں کو پنجاب سے نکال دینے کی تیاری کر رہا تھا۔"

"انگریزوں کو اس کی تیاریوں کا پتہ نہیں تھا؟"

"بالکل پتہ تھا۔ اسی لیے تو انھوں نے اپنی فوجی طاکت بڑھانے کے لیے یہ چال چلی کہ اپنے کرندوں کے ذریعے ایک رات چپکے سے جھمرے میں آگ لگوا دی۔ ساری بستی جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔ جھمرے اور آس پاس کے دوسرے سرداروں میں یہ افواہ پھیلا دی' آگ احمد خاں نے لگوائی ہے اور ان کے سیکڑوں مویشی بھی اٹھا کر لے گیا۔ کھرل سردار انگریزوں کے بہکانے میں آ گئے اور اتنے ناراض ہوئے کہ احمد خاں کا ساتھ چھوڑ دیا۔"

خداداد خاں کو کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ وہ دیر تک کھانستا رہا۔ جب ذرا قرار آیا تو بتانے لگا۔ "ہاں تو جی میں یہ کہہ رہا تھا۔ کھرل سرداروں نے احمد خاں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس طرح وہ بہت کمزور پڑ گیا۔ پریشان بھی ہوا۔ پر اس نے حوصلے سے کام لیا۔ ادھر کے وٹو اور فتیانے تو اس کے ساتھ تھے ہی' بیک کے کھرلوں کے سردار سارنگ خاں کو بھی اس نے اپنی ساتھ ملا لیا۔ مرآباد کو چھوڑا اور اس بار گنجوری کے جنگل میں اپنا ٹھکانا بنایا۔ انگریزوں کی اتنی وڈی فوج سے کھل کر لڑنے کی تو اس کے پاس طاکت نہیں تھی۔ اب اس نے نئی طرح کی لڑائی شروع کی۔ جنگل سے اچانک نکلتا۔ انگریزوں کی فوج پر چھاپے مارتا اور فیر جنگل میں گھس جاتا۔ انگریز اس کے ان اچانک حملوں سے بہت پریشان ہو گئے۔ انھوں نے فوجی مدد منگوائی۔ بہت زبردست فوج اکٹھی کی اور گنجوری کے جنگل کا محاصرہ کرلیا۔ ایسی سخت ناکہ بندی کی کہ احمد خاں کی فوج کو رسد ملنی بالکل بند ہو گئی۔"

"تب تو وہ انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا ہو گا۔" لالی نے قیاس آرائی کی۔

"نہیں جی' اس نے ایسا نہیں کیا۔" بوڑھے خداداد نے کڑک کر کہا۔ "وہ بہادر بندہ تھا۔ بزدلوں کی موت مرنا نہ چاہتا تھا۔ جب حالات بہت خراب ہو گئے تو ایک روز وہ جنگل سے نکل کر انگریزوں کی فوجوں کے سامنے آیا۔ ایسی زبردست لڑائی ہوئی کہ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیتی تھیں۔ احمد خاں اور سردار سارنگ اس لڑائی میں مارے گئے۔ کہتے ہیں احمد خاں آخر دم تک لڑتا رہا۔ اس کے بدن پر زخم ہی زخم تھے۔ وہ خون میں نہایا ہوا تھا۔ جب وہ زخموں سے نڈھال ہو کر گھوڑے سے گرا تو ایک گورا اس کا سر کاٹنے کے لیے جھپٹا' پر احمد خاں کھرل نے گرتے گرتے بھی تلوار کا ایسا ہاتھ مارا کہ حملہ کرنے والے انگریز فوجی کا سر گردن سے کٹ کر دور جا گرا۔" خداداد

کے چہرے پر دکھ کا سایہ پھیل گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "زمین پر آ کر احمد خاں کھرل نے سجدے کے لیے سر جھکا دیا اور کلمہ پڑھنے لگا۔ سردار سرفراز خاں اور سردار بیدی گھات میں تھے۔ جھٹ آگے بڑھے اور احمد خاں کھرل کا سر کاٹ دیا۔ اسے لے کر خوشی خوشی انگریز افسر کے سامنے پہنچے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس کی سفارش پر سردار سرفراز خاں کو نواب کا خطاب اور کمالیہ کی جگہ ملی۔ سردار بیدی کو پاک پتن میں سیکڑوں مربعے ملے۔ یہ مربعے اب انگریزوں کے وفادار وٹوؤں کو الاٹ کر دیئے گئے ہیں۔"

خداداد خاں کی آواز بھرا گئی۔ وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ لالی دم بخود بیٹھا رہا۔ چند لمحے خاموشی رہی' پھر خداداد کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "آج احمد خاں کھرل کو کوئی نہیں جانتا۔ کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی بہادری کی شان میں کسی میراثی نے گیت نہیں گایا۔ کوئی سد نہیں لگایا۔ لگاتا تو جیل میں بند کر دیا جاتا یا گولی سے اڑا دیا جاتا۔ میں تو کہتا ہوں ایسا سد بھی کسی نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے بنایا ہوگا۔

بوتڑیاں دے گیت کوئی نہیں گاوندا
بزدلاں دی سد کوئی نہیں لاوندا

لالی مسکرا کر بولا۔ "بابے! تو سچ مچ بوڑھا ہو گیا ہے۔ اب تیرا بھیجا کام نہیں کرتا۔ میں نے میاں سبحان کے دادا کے بارے میں پوچھا اور تو نے احمد خاں کی گل چھیڑ دی۔"

"تینوں کیہ پتہ' میرا دادا بھی احمد خاں کھرل کے ساتھ انگریزوں کے خلاف لڑا تھا۔ اسے پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ وہ بھی اپیرا سردار تھا اور بہت جی دار بھی تھا۔" خداداد خاں نے گردن اونچی کرتے ہوئے فخر سے کہا۔ "اب اپنے مطلب کی گل سن۔ احمد خاں کے مارے جانے کے بعد بھی باغیوں نے انگریزوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ ان میں فتیانوں اور وٹوؤں کے ساتھ ترانے اور سیال بھی شامل تھے۔ کوڑے شاہ کے نزدیک راوی کے کنارے ان کا برکلے سے ٹاکرہ ہوا۔ اس لڑائی میں انگریزوں کی زبردست ہار ہوئی۔ ان کے ۵۰ فوجی مارے گئے۔ برکلے بری طرح زخمی ہوا۔ سبحان کا دادا رحمان اس کے ساتھ تھا۔ اس نے زخمی برکلے کو گھوڑے پر ڈالا اور لڑائی کے میدان سے نکال کر نزدیک کے بیلے میں لے گیا۔ اس نے برکلے کی جان بچانے کی بہت کوشش کی۔ وہ بچ تو نہیں سکا پر رحمان کی وفاداری اور خدمت سے اتنا خوش ہوا کہ مرتے دم اس نے اپنے خون سے کاغذ کے ایک پرزے پر یہ لکھ دیا کہ رحمان انگریزوں کا زبردست وفادار ہے۔ اس نے میری جان بچانے کے لیے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ اس کی وفاداری اور خدمت کو تسلیم کیا جائے اور

حکومت کی جانب سے اسے وفاداری کا صلہ دیا جائے۔ لو جی اس کاغذ سے رحمان کا نصیب جاگ اٹھا۔"

لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"ہوا یہ کہ انگریزوں نے جب بغاوت کچل ڈالی اور ان کی فتح ہوئی تو وہ فتح کے نشے میں جگہ جگہ کچہریاں لگاتے' باغیوں کو پکڑ کر پھانسی پر لٹکاتے اور انگریزوں کے وفاداروں کو انعام اور بخشش دیتے۔ کرنل ہیٹن ادھر کی انگریز فوج کا کمانڈر تھا۔ وہی ہر جگہ جا کر کچہری لگاتا۔" بابا خداداد خاں ٹھہر ٹھہر کر بتاتا رہا۔

"رحمان سیدھا کرنل ہیٹن کے پاس پہنچا۔ کرنل ان دنوں رحیم یار خاں میں تھا۔ اس نے اپنی کچہری لگا رکھی تھی۔ رحمان کچہری میں گھس گیا۔ کرنل نے ناراض ہو کر اسے گھورا۔ رحمان نے دھوتی کے ڈب سے جھٹ برکلے کا خون سے لکھا ہوا پرچہ نکالا اور اس کے سامنے پیش کیا۔ کرنل ہیٹن نے اسے پڑھا تو اس کی ساری ناراضی جاتی رہی۔ جھٹ پٹ نال اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سر سے ٹوپی اتار کر رحمان کو سلام کیا' ہاتھ ملایا اور اپنے برابر کرسی پر بٹھا کر بولا۔ ول مسٹر رحمان! کمپنی بہادر کی حکومت تمہاری وفاداری کی پوری پوری کدر کرتی ہے۔ تمہیں اس وفاداری کا صلہ بھی ملے گا۔ تم اصطبل سے ہمارا گھوڑا لو' اس پر بیٹھو' جتنی زمین پر تم گھوڑا دوڑاؤ گے وہ سب تمہاری ہوگی۔ اس نے فوراً حکم بھی جاری کر دیا۔"

"رحمان نے فیر کیا کیا؟"

"کرنا کیا تھا جی' اس نے جا کر اصطبل سے گھوڑا نکالا۔ اس پر سوار ہوا۔ اسے دوڑایا اور دوڑاتا چلا گیا۔ جب وہ لوٹا تو گھوڑا تھک کر اتنا نڈھال ہو چکا تھا کہ رکتے ہی لڑکھڑا کر گرا اور مر گیا۔ رحمان کا یہ حال ہوا کہ ہانپتے ہانپتے زمین پر لیٹ گیا۔ کرنل ہیٹن نے اپنے گھوڑے کی موت کا بالکل برا نہیں منایا۔ اس نے رحمان کو شاباشی دی۔ خوش ہو کر اس کی پیٹھ ٹھونکی اور جتنی زمین پر رحمان نے گھوڑا دوڑایا تھا' ساری کی ساری رحمان کو بخش دی۔"

لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "تو اس طرح میاں سبحان کے دادا کو اتنی وڈی زمینداری ملی۔"

"ہاں جی بالکل اسی طرح۔ میرا پیو یہی بتاتا تھا۔" خداداد خاں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "میاں سبحان کے دادا نے انگریزوں کا ساتھ دیا' وفاداری دکھائی' وہ سائیں سے جاگیردار بن گیا۔ خان بہادری کا خطاب بھی پایا۔" اس کے لہجے میں تلخی پیدا ہو گئی۔ "میرے دادا محمد خاں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی۔ کرنل ہیٹن ہی کے حکم پر پھانسی پر لٹکایا گیا۔ وہ بھی کھرلوں کا

سردار ہوتا تھا۔ اس کی تمام جائیداد اور زمین ضبط کرلی گئی۔ مویشی بھی سارے کے سارے چھ
لیے گئے۔ سب کچھ چلا گیا۔ سرداری بھی گئی۔ انگریز' باغی سرداروں اور ان کی آل اولاد کو جا
کہتے تھے' سو میں اور میرا پیو جانگلی کہے جانے لگے۔ سجان اور اس کا پیو میاں بن گئے۔ اب رحما
سائیں کا پوتا زمین داری کرتا ہے اور سردار محمد خاں کھرل کا پوتا خداداد خاں اس کی نوکری ک
ہے۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر آہ سرد کھینچی۔ "اپنا اپنا نصیب ہے جی۔"

"بابے! تیرا کوئی پتر نہیں ہے؟"

"دو ہیں جی۔" خداداد نے بے نیازی سے کہا۔ "وڈا پت تو ایک رسا گیر زمیں دار کے لیے ڈ
چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اب جیل کاٹ رہا ہے۔ دوسرا میاں سجان کے فارم پر رحیم یار خا
میں مزدوری کرتا ہے۔" اس کے لہجے میں درد کی چبھن تھی۔ "جانگلی پیو کے جانگلی پتر اور کر بھی
سکتے ہیں جی!"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ بوڑھا خداداد خاں کھرل بھی خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے کی جھریا
اور نمایاں ہو گئیں۔ آنکھوں سے ویرانی جھلکنے لگی۔ وہ کچھ زیادہ بوڑھا اور کمزور نظر آنے لگا۔ کچ
دیر اسی عالم میں گم صم بیٹھا یادوں کی دھندلی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا رہا' پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی کے
سامنے سے اس نے کھانے کے برتن اٹھائے اور باورچی خانے کی جانب چلا گیا۔

☆

شادو سویرے آیا اور لالی کو اپنے ہم راہ جیپ میں بٹھا کر شکار دکھانے لے گیا۔ جیپ گلیوں سے
گزرتی ہوئی گاؤں سے باہر نکلی اور ایک کچے راستے پر جنگل کی جانب دوڑنے لگی۔ جنگل زیادہ دو
نہیں تھا۔ خوب گھنا تھا اور دریائے راوی کے کنارے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جنگل کے سامنے کھلا
میدان تھا۔ میدان میں جگہ جگہ خیمے لگے تھے۔ ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ شکاری
رات ہی کو پہنچ گئے تھے۔

جیپ خیموں کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ لالی نیچے اترا۔ شادو بھی اترا اور ایک خیمے میں داخل
ہو گیا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ آسمان پر اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ شکاری بیدار ہو چکے تھے۔
خیموں کے اندر ان کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ سور کے شکار کا ہانکا کرنے والے کمی اور مزارعے
لمبی لمبی لاٹھیاں اور برچھے ہاتھوں میں دبائے ایک جگہ جمع تھے۔ ان کے ساتھ شکاری کتے اور ان
کے راکھے بھی تھے۔

سورج نکلا۔ زرد زرد دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر جگمگانے لگی۔ ہانکا کرنے والے اور راکھے

شکاری کتوں کے ساتھ جنگل میں گھس گئے۔ وہ جنگل کے دلدلی حصے کی جانب جا رہے تھے جہاں گھنے
چھتے تھے۔ ان چھتروں کے اندر جنگلی سور دن میں چھپے رہتے ہیں۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ان کے
غول کے غول جنگل سے نکلتے ہیں۔ آس پاس کے دیہات کی جانب جاتے ہیں۔ کھیتوں میں گھس
جاتے ہیں۔ ربیع کی فصل ہو تو گندم اور جو کے خوشے اور چنے اور سرسوں کے پودے کھا جاتے
ہیں۔ خریف کی فصل ہو تو مکئی کے بھٹے اور کپاس کے ڈوڈوں سے نکلی ہوئی سفید پھٹی کھا جاتے ہیں۔
جس کھیت میں گھستے ہیں' اسے روند ڈالتے ہیں۔ ان کھیتوں سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ مویشی بھی ان
کے پودے نہیں کھاتے۔

دھوپ رفتہ رفتہ ہر طرف پھیل گئی۔ سورج چڑھ کر اوپر آ گیا۔ شکاری ناشتے سے فارغ ہو کر
خیموں سے باہر نکلنے لگے۔

وہ تین ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ایک ٹولی جیپوں میں بیٹھ کر سور کے شکار کے لیے چھتروں کی جانب
روانہ ہو گئی۔ اس میں اکثریت زمیں داروں کی تھی۔ دوسری ٹولی کے شکاری جیپوں کے علاوہ
گھوڑوں پر بھی سوار تھے۔ ان کے ساتھ شکاری کتے بھی تھے۔ وہ خرگوش اور ہرن کا شکار کھیلنے جا
رہے تھے۔ تیسری ٹولی کے شکاری بھی جیپیں اور گھوڑے دوڑاتے ہوئے جنگل میں گھس گئے۔ وہ
پرندوں کے شکاری تھے۔

بیشتر شکاری بڑے افسر تھے۔ شکاریوں میں اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ بڑے زمیندار بھی
تھے۔ بہت سے شکاریوں کے ساتھ ان کی بیویاں بھی تھیں۔ وہ تیز خوشبوؤں سے مہکتی' بنی سنوری
اپنے شوہروں کے پہلو سے لگی جیپوں میں بیٹھی تھیں۔ لالی نے حیرت سے دیکھا' کئی پالکیاں بھی
تھیں اور انھیں کمی اور مزارعے اٹھائے ہوئے چل رہے ہیں۔ پالکیوں میں بھی شکاریوں کی بیویاں
اور بیٹیاں سوار تھیں۔ وہ نئے نئے فیشن کے خوب صورت لباس پہنے ہوئے تھیں۔ انھوں نے
نہایت اہتمام سے میک اپ کیا تھا۔ بال طرح طرح سے سنوارے تھے۔ وہ خوبصورت اور طرح
دار نظر آ رہی تھیں۔ کھلی پالکیوں میں بیٹھی وہ ہنستی مسکراتی' پرندوں' خرگوشوں اور ہرنوں کا شکار
دیکھنے جا رہی تھیں۔

سور کا شکار کھیلنے والی پارٹی میں صرف دو شکاریوں کی بیویاں شریک تھیں۔ وہ نصف آستینوں کی
جالی قمیص اور پتلونیں پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے ہاتھ میں بندوقیں دبی تھیں۔ وہ صرف شکار دیکھنے
نہیں آئی تھیں بلکہ سور کا خطرناک شکار کھیلنے کا حوصلہ بھی رکھتی تھیں۔ لیکن پرندوں' خرگوشوں
اور ہرنوں کا شکار کھیلنے والی بیگمات کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں بھی قمیص اور پتلون پہننے والیاں

شامل تھیں۔

شادو نے لالی کو بھی جنگل میں لے جانا چاہا مگر وہ نہیں گیا۔ کچھ دیر بعد شکاری اپنی بیویوں کے ساتھ جنگل میں داخل ہو کر گھنے درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ لالی خیموں کے اردگرد گھومتا رہا' پھر حویلی کی جانب واپس ہوا۔ مہمان خانے میں پہنچا۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور سو گیا۔

دن ڈھلے وہ سو کر اٹھا۔ اس نے غسل کیا اور تروتازہ ہو کر شادو کا انتظار کرنے لگا۔ اب اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ کمزوری بھی بڑی حد تک ختم ہو گئی تھی۔ وہ قادر آباد جانا چاہتا تھا اور اسی روز جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

سورج غروب ہو گیا۔ مگر شادو نہیں آیا۔ لالی اس سے ملنے کے لیے اس میدان کی جانب چل دیا' جس میں شکاریوں کے خیمے تھے۔ شادو وہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے لالی کو یہی تاثر دیا تھا۔ لالی میدان میں پہنچا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جنگل میں منگل کا سماں ہے۔ مٹی کے تیل سے چلنے والے جنریٹر کے ذریعے بجلی پیدا کی جا رہی تھی۔ ابھی شام ہی تھی مگر خیموں کے اندر اور باہر ہر طرف بلب روشن تھے۔

نوکر چاکر نہایت مستعدی سے ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ خیموں سے کچھ فاصلے پر میدان میں بڑے بڑے چولھوں میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ ان پر رکھی ہوئی دیگوں میں طرح طرح کے کھانے پکائے جا رہے تھے۔ کہیں دہکتے ہوئے سرخ سرخ انگاروں پر مرغ تلے جا رہے تھے کہیں کباب بنائے جا رہے تھے۔

شادو کی تلاش میں لالی ادھر ادھر نظریں دوڑاتا خیموں کے درمیان گھومتا پھرتا رہا۔ مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اس نے ایک ملازم کو ٹوکا جو قریب کے خیمے سے نکلا تھا۔

"گل سن! تیں نوں پتہ' شادو کتھے ہے؟"

ملازم نے ایک خیمے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "وہ تو جی' میاں سبحان کے وڈے پت میاں سلیم کے پاس اس خیمے میں ہے۔"

لالی نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ اس خیمے کی طرف بڑھا' قریب پہنچا' خیمے کا پردہ کھلا تھا۔ میاں سلیم چوڑی چوڑی دھاریوں کی ریشمی قمیص اور ویسا ہی پاجامہ پہنے' آنکھیں بند کئے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ و سفید تھا' سر کے بال آگے سے کسی قدر اڑے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی مونچھ صاف تھی۔ قد اونچا تھا اور جسم خاصا بھاری بھرکم تھا۔ عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ صوبائی حکومت کے محکمہ زراعت و خوراک کا سیکرٹری تھا۔

شادو فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا میاں سلیم کے پیر دبا رہا تھا۔ شادو نے مڑ کر لالی کو دیکھا' مسکرایا اور اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ لالی خیمے میں چلا گیا۔ شادو نے میاں سلیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "صاحب جی! یہ خود یہاں آ گیا۔ میں اسی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ میرا بہت پرانا یار ہے۔"

سلیم نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "تب تو یہ بھی جرائم پیشہ ہو گا؟"

شادو نے جھٹ بات بنائی۔ "نہیں جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔ یہ بہت نیک بندہ ہے۔"

سلیم نے لالی سے کہا۔ "تو میرے کندھے اور بازو دبا دے۔ آج تو میں بہت تھک گیا۔ سارا جسم دکھ رہا ہے۔" اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

شادو نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لالی کرسی کے پیچھے گیا اور چپ چاپ میاں سلیم کے کندھے اور بازو دبانے لگا۔

خیمے میں خاموشی تھی۔ خیمہ خاصا بڑا اور کشادہ تھا۔ ایک طرف لوہے کا فولڈنگ پلنگ تھا۔ اس میں اسپرنگ لگے ہوئے تھے۔ پلنگ پر موٹا گدا بچھا تھا اور اس پر اجلی چادر اور نرم نرم تکیوں کا بستر تھا۔

پلنگ کے اوپر مچھردانی تھی۔ قریب ہی میز رکھی تھی۔ اس کے سامنے کرسی تھی۔ میز پر سنگھار کا سامان اور ملکی و غیر ملکی عطریات کی چھوٹی بڑی شیشیاں تھیں۔

☆

پینتیس چھتیس سال کی ایک عورت خیمے میں داخل ہوئی۔ وہ سلیم کی بیوی تھی۔ سرو قامت' گوری چٹی اور طرح دار۔ اس کا باپ' مخدوم نور علی شاہ گیلانی' خانقاہ عالیہ کا گدی نشین تھا' ملتان کے بڑے جاگیرداروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے باعث اس کا غصّہ بھی بہت زیادہ تھا۔

آہٹ سن کر سلیم نے آنکھیں کھول دیں۔ بیوی کو مسکرا کر دیکھا اور نرم لہجے میں گویا۔

"فرخندہ! تم نے ابھی غسل نہیں کیا؟"

وہ اٹھلا کر بولی۔ "میں برابر کے ٹینٹ ہی سے ہو کر آ رہی ہوں۔ نہانے کا پانی بہت گرم ہے۔ پتہ نہیں' اس موسم میں اتنا گرم پانی ٹب میں بھرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"مگر یہاں تو ایسی گرمی نہیں ہے۔ ڈارلنگ! ویسے گرم پانی سے نہانے کے بعد ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ آج تم نے بھاگ دوڑ بھی بہت کی ہے۔ تھک گئی ہو گی۔"

"تھکن تو بہت معلوم ہوتی ہے۔ مگر میں غسل ابھی نہیں کروں گی۔"

وہ میز کے سامنے جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ "میں دائی کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ اب تک آئی کیوں نہیں؟"

"اسے اب تک آ جانا چاہئے تھا۔ آتی ہی ہوگی۔" میاں سلیم نے قیاس آرائی کی۔

فرخندہ نے کچھ نہیں کہا۔ کنگھا اٹھا کر اپنے بال سنوارنے لگی۔ اس کے بال گردن تک ترشے ہوئے تھے۔ ان پر خاک کے ذرات چمک رہے تھے۔ سلیم نے آنکھیں بند کر لیں۔ لالی اس کے کندھے اور بازو دبا تا رہا اور شادو سامنے فرش پر بیٹھا انگلیوں سے اس کی پنڈلیوں کا مساج کرتا رہا۔ فرخندہ بالوں میں کنگھا پھیرتی رہی اور آئینے میں اپنا چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھتی رہی۔

چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک ایسی عورت خیمے میں داخل ہوئی جو وضع قطع سے حویلی کی خادمہ یا کسی مزارعے کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی عمر فرخندہ سے کم تھی۔ رنگت کبھی گوری رہی ہوگی مگر تیز دھوپ میں محنت مشقت کرنے سے اس کا رنگ جھلس کر زردی مائل خیالا پڑ گیا تھا۔ چہرے پر ابھی سے بڑھاپے کی لکیریں ابھرنے لگیں تھیں۔ اس کا بدن مضبوط اور چھریرا تھا۔ اسے دیکھ کر فرخندہ نے پوچھا۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "میرا ناں کریماں ہے جی۔"

"ادھر آ میرے نزدیک۔" فرخندہ نے نہایت رعب اور دبدبے سے اسے بلایا۔ وہ چپ چاپ اس کے نزدیک جا کر کھڑی ہو گئی۔ فرخندہ نے اپنی ناک آگے بڑھا کے اس کا لباس سونگھا۔

"نہا دھو کر آئی ہے؟"

"ہاں جی' ٹھیک طرح نہا کر آئی ہوں۔ کپڑے لتے بھی آج ہی دھو کر پہنے ہیں۔ انھیں سوکھنے میں دیر ہو گئی۔ اسی لیے آنے میں دیر ہو گئی جی۔"

فرخندہ نے نظریں اٹھا کر کریماں کے لباس کا جائزہ لیا۔ وہ سفید دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ جگی بھی سفید ہی تھی۔ البتہ دوپٹا گہرا نیلا تھا۔ فرخندہ منہ بگاڑ کر بولی۔ "پتہ نہیں' کیسے نہائی تھی۔ ابھی تک پسینے کی سڑی ہوئی بو نکل رہی ہے۔"

فرخندہ نے میز پر سے صندل کے عطر کی شیشی اٹھائی اور کریماں کی جانب مڑی۔ "ہاتھ کھول۔" کریماں نے ہاتھ بڑھا کر کھول دیا۔ فرخندہ نے شیشی کھولی اور کریماں کی ہتھیلی پر عطر کی چند بوندیں ٹپکا دیں۔

"اسے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں چپڑ کر گردن' ناک' ہاتھوں اور کپڑوں پر لگا لے۔"

کریماں اس کی ہدایت کے مطابق عطر لگانے لگی۔ وہ عطر لگا چکی تو فرخندہ نے کہا۔ "یہ شیشی لے اور انگلیوں کے ناخنوں پر بھی خوشبو لگا لے۔" اس نے عطر کی شیشی کریماں کو دے دی اور ایک بار پھر منہ بگاڑا۔ "نہ جانے ان جانگلی عورتوں کے ناخنوں سے اتنی بدبو کیوں نکلتی ہے۔ دماغ سڑ جاتا ہے۔" کریماں خاموش رہی۔ اس نے عطر کی شیشی کھولی اور گردن جھکا کر اپنے ناخن خوشبو سے بسانے لگی۔

فرخندہ نے کنگھا میز پر ڈالا۔ اٹھ کر کھڑی ہوئی' پلنگ کے پاس گئی' مچھردانی کا پردہ اٹھا کے اوپر ڈالا اور شلوار کے پائینچے گھٹنوں تک چڑھا کے نرم نرم تکیے پر چہرہ ٹکا کر اوندھی لیٹ گئی۔ کریماں آگے بڑھی' مچھردانی میں داخل ہو کر فرخندہ کے قریب بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گوری گوری پنڈلیاں اور کمر ہولے ہولے دبانے لگی۔ فرخندہ کچھ دیر خاموش لیٹی رہی پھر اس نے اپنے شوہر کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

"سلیم! تم جا کر غسل کر لو۔ تمہیں اب تیار ہو جانا چاہئے۔ یہ نہ بھولو کہ تم میزبان بھی ہو۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ مجھے اب تیار ہو جانا چاہئے۔" اس نے آنکھیں کھول کر خیمے کے باہر پھیلتا ہوا اندھیرا دیکھا اور کھڑا ہو کر شادو کی جانب متوجہ ہوا۔ "تو منیجر انوار خاں کے پاس چلا جا۔ جو کام وہ بتائے کرنا۔ انوار خاں' میرے پی اے ماجد کے خیمے میں ہوگا۔"

شادو خاموشی سے اٹھا اور خیمے سے چلا گیا۔ لالی بھی اس کے ساتھ نکلا۔ خیمے سے دور جا کر اس نے کہا۔ "یہاں تو عیش ہو رہے ہیں جی!"

"تو کیا تو یہ سمجھ رہا تھا' خالی شکار ہی ہوتا ہے؟" شادو نے ہنس کر بتایا۔ "کچھ دیر بعد شراب کا دور چلے گا۔ فیر زوردار دعوت ہوگی۔ مجرا بھی ہوگا۔ لہور اور ملتان سے کنجریاں بلائی گئی ہیں۔ زوروں کا جشن ہوتا ہے اور برابر تین روز تک ہوتا ہے۔ دیکھے گا تو پھڑک اٹھے گا۔"

"میں تو آج ہی جانا چاہتا ہوں۔ تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔ میں اسی لیے تیرے کول آیا تھا۔"

"چلا جانا' چلا جانا۔" شادو بے نیازی سے بولا۔ "پورا جشن دیکھ کے جانا۔"

"نہیں شادو! میں اب نہیں رک سکتا۔" لالی نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔ "تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔ رحیم داد میرے انتظار میں بہت پریشان ہوگا۔"

شادو آمادہ نہیں ہوا۔ "آج رات تو میرا جانا بہت مشکل ہوگا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ میں نے تو آج ہی رات جانا ہے۔ میں اب یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھیر

سکتا۔"

"تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟" شادو نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "تو پیدل یہاں سے کادر آباد جائے گا۔ کادر آباد پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ تو ہے کس خیال میں؟"

"اسی لیے تو میں تیرے ساتھ آنا نہیں چاہتا تھا۔" لالی نے گلہ کیا۔ "تو مجھے خامخا یہاں لایا۔"

"تو کیا تجھے سڑک پر مرجانے دیتا؟ حکیم کے پاس نہ لے جاتا تو زندہ بچ سکتا تھا؟ پتہ ہے، تجھے سنکھیا کھلائی گئی تھی۔"

"میں تو آج ہی جاؤں گا۔" لالی اڑا رہا۔ "آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔"

"میرا کہا مان، رحیم داد کا چکر چھوڑ۔ وہ اپنی فکر آپ کرلے گا۔" شادو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تو میرے ساتھ لائل پور چل۔ ایک بار ضلع منٹگمری سے نکل آیا، دوبارہ وہاں جانے کی غلطی نہ کر۔ ادھر کی پولیس تیری تلاش میں ہے۔ یہاں تیرے لیے زیادہ خطرہ نہیں ہے۔"

"نہیں جی، یہ نہیں ہوگا۔ میں رحیم داد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں نے اس سے جو وعدہ کیا ہے اسے ضرور پورا کروں گا۔ میں تو آج ہی رات جاؤں گا اور ابھی جاؤں گا۔" لالی کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔ "تیری بہت بہت مہربانی۔ آگے مجھے تیری مہربانی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اتنا ناراض کیوں ہوتا ہے۔" شادو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تیری مرضی جانے ہی کی ہے تو رات ہونے کا انتظار کر۔ روٹی کھانے کے بعد ناچ گانا شروع ہوجائے گا تو میں تجھے کادر آباد لے جانے کی کوشش کروں گا۔ میاں سلیم سے اجازت لینی ہوگی۔ امید تو ہے وہ اجازت دے دے گا۔ طبیعت کا بھلا بندہ ہے۔"

لالی نے اور کوئی بات نہیں کی۔ شادو بھی خاموش رہا۔ دونوں خیموں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ کئی خیموں کے پردے کھلے تھے۔ انھوں نے دیکھا، اکثر خیموں میں سرکاری افسروں کی بیگمات اجلے اجلے بستروں پر لیٹی ہیں۔ حویلی کی خادمائیں یا مزارعوں اور کمیوں کی عورتیں، ہاتھوں کے ناخنوں میں طرح طرح کی بھینی بھینی خوشبوئیں لگائے بیگمات کے نرم و گداز بدن دبا کر ان کی تھکن اتار رہی ہیں۔

شادو چلتے چلتے ایک خیمے کے قریب رکا اور اندر داخل ہوگیا۔ لالی بھی اس کے ہم راہ چلا گیا۔ یہ خیمہ نوکروں کے لیے تھا، مگر اس وقت خالی تھا۔ اس میں مونج کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ شادو نے لالی سے کہا۔

"تھوڑی دیر یہاں لیٹ کر آرام کرلیں۔ تو بھی تھکا تھکا نظر آرہا ہے اور میرا تو دن بھر بھاگتے

بھاگتے بیلتھن نکل گیا۔"

"انوار خاں کے پاس نہیں جائے گا؟"

"چلا جاؤں گا، ذرا آرام کرلوں۔ تو بھی لیٹ جا۔ حویلی جا کر کیا کرے گا۔ یہیں میرے ساتھ روٹی کھالینا۔ اکٹھے چلیں گے۔"

"تو مجھے کادر آباد لے چلے گا نا؟"

"کہہ تو دیا، پکے کاغذ پر لکھ کر دے دوں؟" شادو نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "پر میاں سلیم سے تو اجازت لینی ہی پڑے گی۔"

لالی چٹائی پر شادو کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اسے تھکن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سوگیا۔

لالی کی آنکھ کھلی تو شادو موجود نہیں تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر چپ بیٹھا رہا، پھر شادو کی تلاش میں خیمے سے نکلا۔ بیشتر خیموں میں سناٹا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔

خیموں سے ذرا ہٹ کر کھلے میدان میں ایک جگہ جگمگاتی روشنیوں میں عورتیں اور مرد جمع تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ لالی اس طرف چلا گیا۔ قریب جا کر دیکھا، ایک طرف بار بنا ہے۔ کاؤنٹر پر طرح طرح کی شرابیں رکھی ہیں۔ بارمین اجلی اجلی وردیاں پہنے، کمر اور سر کے صافے پر سنہری پٹکے لگائے نہایت مستعدی سے بوتلیں کھول کھول کر گلاسوں اور گوبلٹوں میں طرح طرح کی شرابیں انڈیل رہے تھے۔ شیشے کے بڑے بڑے پیالوں میں برف کے ٹکڑے بھر رہے تھے۔ جگوں میں پانی یا سوڈا ڈال رہے تھے۔

کاؤنٹر خاصا لمبا تھا۔ اس کے ایک حصے میں تلے ہوئے مرغ، کباب اور تکے بھی پلیٹوں میں رکھے تھے۔ سفید وردیوں میں ملبوس بیرے خالی گلاس، جگ اور پلیٹیں ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے آتے۔ انھیں ایک طرف رکھتے اور دوسری ٹرے اٹھاتے۔ ان پر شراب کے گلاس اور گوبلٹ، برف سے بھرے ہوئے شیشے کے پیالے، پانی اور سوڈے سے لبریز جگ یا تلے ہوئے مرغ، کباب اور تکے رکھتے اور مہمانوں کے پاس پہنچ جاتے۔ یہ کاک ٹیل پارٹی تھی۔ مہمان ہاتھوں میں گلاس سنبھالے گھونٹ گھونٹ شراب پی رہے تھے۔ بے تکان باتیں کر رہے تھے، ہنس رہے تھے۔ لالی ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

کچھ دیر بعد شادو کاؤنٹر کے پاس آیا۔ لالی لپک کر اس کے نزدیک پہنچا، آہستہ سے پوچھا۔ "تو چپکے

سے اٹھ کر کتھے ٹر گیا تھا؟"

"میں دو ڈھائی گھنٹے سو کر ادھر آ گیا۔ تو گہری نیند سو رہا تھا اس لیے تجھے جگایا نہیں۔" وہ ایک بوڑھے بارمین سے مخاطب ہوا۔ "چاچا! دو پیگ وہسکی کے مجھے بھی بنا دے۔" اس نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا یار لہور سے آیا ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر ذرا شغل کرلوں گا۔" بارمین نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ بوتل کھول کر دو گلاسوں میں وہسکی انڈیلی۔ برف کے ٹکڑے ڈالے اور شادو سے پوچھا۔

"پانی ڈالوں یا سوڈا؟"

شادو نے ہنس کر کہا۔ "سوڈا ہی ڈال دے چاچا!"

بارمین نے بوتل کھول کر گلاس میں سوڈا ڈال دیا۔ شادو نے دونوں گلاس اٹھائے اور کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا۔ لالی بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں ایک درخت کی آڑ میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس جگہ روشنی کم تھی۔

شادو نے ایک گلاس لالی کو دیا اور آنکھ مار کر بولا۔ "اسکاچ وہسکی ہے' تھوڑی سی لگالے' ساری کمزوری اور تھکن دور ہو جائے گی۔" اس نے اپنا گلاس لالی کے گلاس سے ٹکرایا' گلاس ہونٹوں سے لگایا اور کئی گھونٹ چڑھا گیا۔

لالی بھی پینے لگا۔ گلاس ختم ہوئے تو شادو اور لے آیا۔ دونوں نے وہسکی کے دو بڑے پیگ لگائے۔ ان پر سرخوشی طاری ہو گئی۔ لالی اپنے جسم میں حرارت اور توانائی محسوس کرنے لگا۔

کاک ٹیل پارٹی دس بجے ختم ہو گئی۔ مہمان بکھر کر شامیانے کے نیچے چلے گئے۔ شامیانے میں کھانے کا بندوبست تھا۔ شادو اور لالی بھی نوکروں کے خیمے میں چلے گئے۔ خیمہ ابھی تک خالی تھا۔ شادو کھانا وہیں لے آیا۔

دونوں نے کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی شادو کھڑا ہو گیا۔ "میں میاں سلیم کے پاس جا رہا ہوں۔ اس سے اجازت لے کر تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔" شادو چلا گیا۔

لالی خیمے میں خاموش بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا' مگر وہ ایسا گیا کہ دیر تک نہیں لوٹا۔ لالی بے چین ہو کر خیمے سے نکلا اور شامیانے کی جانب گیا۔ مگر اب وہاں سناٹا تھا۔

☆

میدان کے ایک گوشے میں ایک اور بڑا شامیانہ تھا۔ اس کے چاروں طرف قناتیں لگی تھیں شامیانے میں تیز روشنی تھی۔ اندر سے ناچ گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لالی کو اندازہ ہو

مجرا شروع ہو چکا ہے۔ شادو بھی وہیں ہو سکتا ہے۔

لالی اسی طرف چل دیا۔ وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ قریب کے خیمے سے ایک شخص نکلا۔ لالی نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ ہمدانی تھا۔

ہمدانی نے بھی لالی کو پہچان لیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی ٹھٹکا' مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ "یار' تو بھی آ گیا؟ مگر یہاں پہنچا کیسے؟" اس کے انداز میں بے تکلفی کے ساتھ حیرت بھی تھی۔

لالی نے نظریں جھکا کر کہا۔ "بس جی پہنچ ہی گیا۔"

"تو ہے بہت تیز۔ اس رات ایس پی کے پھندے سے صاف بچ نکلا۔" ہمدانی نے قہقہہ لگایا۔ اس نے تجھے گرفتار کرنے کا پورا بندوبست کر لیا تھا۔ تو فرار کس راستے سے ہوا؟"

"وہ ایسا ہوا جی' نہر میں پانی زوروں سے بہہ رہا تھا۔ میں نہر میں اترا تو پانی کے تیز بہاؤ میں پیر اکھڑ گئے اور میں دور تک بہتا چلا گیا۔"

"اندر خیمے میں آجا۔" ہمدانی نے اپنے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ہمدانی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لالی اس کے سامنے مودب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا دیر خاموشی رہی پھر ہمدانی کی آواز ابھری۔

"یہیں لائل پور میں روپوش ہے یا کہیں اور جانے کا ارادہ ہے؟"

"صاحب! آپ سے کیا چھپانا۔" لالی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میں نے رحیم داد سے ملنے قادر آباد جانا ہے۔ ابھی تک اس کے پاس نہیں پہنچ سکا۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"وہاں جانا تو تیرے لیے خطرناک ہو گا۔ ایس پی مرزا کو مہر سلیمان خاں کی کوٹھی کے چوکیدار سے اسی رات اطلاع مل گئی تھی کہ تو قادر آباد جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے وہاں پولیس لگا کر نگرانی شروع کر دی ہے۔"

"صاحب! آپ نے پہلے بھی میری مدد کی ہے۔" لالی نے عاجزی سے کہا۔ "اس بار اتنی مدد اور کریں کہ اپنی موٹر میں مجھے قادر آباد پہنچا دیں۔ آپ کی موٹر دیکھ کر پولیس والے کچھ نہیں بولیں گے۔ میں نہر پار کر کے رحیم داد کے پاس مہتوں پر پہنچ جاؤں گا۔"

"نہیں یار! میں تیری ایسی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" ہمدانی نے صاف انکار کر دیا۔ "میں تو تجھے یہ مشورہ دوں گا کہ تو خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے۔ رحیم داد کو پکڑوا دے اور خود سرکاری گواہ بن جا۔ مقدمہ میری عدالت میں پیش ہو گا۔ میں کوشش کروں گا تو بری ہو جائے' ورنہ تیری سزا کم از کم بہت کم ہو جائے گی۔ میں تیری یہی مدد کر سکتا ہوں۔"

"صاحب! یہ نہیں ہو سکتا کہ میں رحیم داد کو گرفتار کروا دوں۔ میں اس کے ساتھ دغا نہیں کر سکتا۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اتنا کوڑھ مغز بھی ہو سکتا ہے۔" ہمدانی چند لمحے خاموش رہا پھر مسکرا کر بولا۔ "پولی لیسین کلب کی نائٹ آف دی گریٹ سسپنس میں تو نے بہت ہوشیاری اور اعتماد سے ایپیارنگ کی تھی۔ میں تو دنگ رہ گیا۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "تو کنوں کے الٹ پھیر میں تو کمال کر دیا تھا۔"

"صاحب! صبح شکاریوں کے ساتھ آپ مجھے دکھائی نہیں دیئے' آپ کدھر تھے؟"

"میں آج دوپہر یہاں پہنچا ہوں۔"

"بیگم صاحبہ بھی آپ کے ساتھ آئی ہیں؟"

"نہیں۔" ہمدانی نے بتایا۔ "نوشابہ ان دنوں اپنے بھائی کے پاس پنڈی میں ہے۔ وہ فوج میں میجر ہے۔"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "انھوں نے بعد میں میرے بارے میں تو کچھ نہیں کہا؟"

"کبھی تیرا تذکرہ نہیں کیا۔ یاد ہی نہیں آیا ہو گا۔ البتہ مجھے بعد میں تو بہت یاد آیا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "اس رات تو ایپیارٹ نہ ہوتا تو امینہ ہرگز میری پارٹنر نہ بنتی۔ تو نے ہاتھ کی ایسی صفائی دکھائی کہ وہ پکے پھل کی طرح میری جھولی میں آگری۔ یار مزا آگیا۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "آج رات بھی تجھ سے ایک ایسا ہی کام لینا ہے۔"

"کیا یہاں بھی لاٹری شاٹری ڈالی جائے گی؟" لالی نے سادگی سے پوچھا۔ "پر آپ تو آج اکیلے ہی ہیں۔"

"نہیں یار۔ یہ کچھ اور ہی چکر ہے۔ تجھے نواب فخرو کے خیمے جانا ہو گا۔ وہاں سے تو ان کی بیٹی گیتی آرا کو میرے خیمے میں لے آنا۔ وہ نخرا تو بہت کرتی ہے مگر آجائے گی۔ تو اسے لے کر ہی آنا۔"

لالی نے پیچھا چھڑانا چاہا۔ "صاحب! میں تو انھیں جانتا بھی نہیں۔"

"اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ان کے خیمے پر جا کر صرف اتنا کہنا کہ مجھے ہمدانی صاحب نے بھیجا ہے۔ زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بات پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "میں اپنے ڈرائیور یا اردلی کو ادھر بھیج دیتا' دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ میاں سلیم کے کسی نوکر چاکر سے بھی کام چل سکتا تھا مگر تو مجھے سب سے موزوں معلوم ہوتا ہے۔ تجھ پر مجھے اعتماد بھی ہے۔ کسی اسکینڈل کا بھی خطرہ نہیں اور ایسے معاملوں میں تو ہوشیار بھی ہے۔"

"نہیں صاحب! میں نے دلالی گیری کا دھندا کبھی نہیں کیا۔" لالی نے دبی زبان سے انکار کر دیا۔

"یار! خواہ مخواہ کا نخرا نہ دکھا۔ مجھے یقین ہے' تو ضرور پکڑا جائے گا اور یہ بھی جان لے' کبھی نہ کبھی تو میرے ہی سامنے پیش ہو گا۔ اس وقت تجھے معلوم ہو گا میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "تجھے کم سے کم سزا دوں گا۔ میرے فیصلے کے خلاف اپیل نہ کرنا' ورنہ ہو سکتا ہے زیادہ ہی لمبی سزا کاٹنی پڑے۔"

لالی اس کی دھمکی سے ڈر گیا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ نظریں جھکا کر فرش کو تکنے لگا۔ ہمدانی کھڑا ہو گیا۔ خیمے کے پردے کے قریب پہنچا۔ لالی کو اپنے پاس بلایا اور ایک خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"دوسری لائن میں وہ جو ساتواں خیمہ ہے' وہی ہے نواب فخرو کا خیمہ۔ وہاں جا کر تجھے اتنی ہی بات کہنی ہے جتنی میں نے تجھ سے کہی ہے۔ اب تو ادھر جا۔ میں تیرا انتظار کرتا ہوں۔"

لالی باہر آیا اور ہمدانی کے بتائے ہوئے خیمے کی طرف روانہ ہو گیا۔ خیموں میں خاموشی چھائی تھی۔ دور شامیانے کے نیچے طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کے چھناکے کے ساتھ رات کے سناٹے میں گانے کی آواز ابھر رہی تھی۔

لالی آہستہ آہستہ چلتا ہوا نواب فخرو کے خیمے پر پہنچا۔ خیمے کا پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا۔ اس نے بڑھ کر دیکھا۔ گیتی آرا کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے میز پر آئینہ رکھا تھا۔ وہ آئینے میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ رہی تھی۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ہلکی ہلکی تہہ جما رہی تھی۔ اس کی روشن آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا۔ چہرہ بیضوی تھا' رخسار گلابی تھے اور بلب کی تیز روشنی میں تمتما رہے تھے۔ بدن نرم اور گداز تھا۔ اس میں دائرے تھے' پیچ و خم تھے۔ وہ تیئس چوبیس سال کی خوبصورت لڑکی تھی۔ سنگھار کے بعد وہ اور زیادہ دل کش نظر آ رہی تھی۔

قریب ہی نواب فخرو بھی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ چہرے پر وقار اور دبدبہ تھا جسے اس کی چڑھی ہوئی مونچھوں نے اور بارعب بنا دیا تھا۔ وہ دراز قد تھا اور گہرے سرمئی سوٹ میں معزز نظر آ رہا تھا۔ نواب فخرو سے ذرا ہٹ کر اس کی بیگم بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔

وہ گوری چٹی عورت تھی۔ چہرے کے اجڑے نقوش بتا رہے تھے کہ جوانی میں وہ بھی گیتی آرا کی طرح حسین اور دل کش ہو گی۔ اس کا جسم خاصا پھیل گیا تھا جس نے اسے بے ڈول اور بد وضع بنا دیا تھا۔ لالی تینوں کو صبح شکاریوں کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ نواب فخرو بندوق سنبھالے جیپ میں بیٹھا

تھا۔ بیٹی اور بیگم پالکی میں سوار تھیں۔

لالی ذرا دیر پردے کے قریب کھڑا رہا پھر آہستہ سے کھنکارا۔ نواب فخرو نے اونچی آواز سے پوچھا۔ "کون ہے؟" وہ اٹھ کر پردے کے پاس آگیا۔

"مجھے جی ہمدانی صاحب نے بھیجا ہے۔"

"اچھا اچھا' تم یہیں بیٹھو۔ تمہیں ذرا دیر انتظار کرنا پڑے گا۔" وہ واپس جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ لالی بھی چپ چاپ خیمے کے پردے سے لگ کر فرش پر بیٹھ گیا۔

نواب فخرو نے اپنی بیگم سے کہا۔ "ہمدانی صاحب کا ملازم آیا ہے۔"

"سن رہی ہو گیتی آرا۔" بیگم نے بیٹی کو مخاطب کیا۔ "ہمدانی صاحب کا ملازم لینے آیا ہے تمہیں۔" گیتی آراء آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی رہی اور لپ اسٹک سے اپنے ہونٹوں کو سرخ گلاب کی پنکھڑیاں بناتی رہی۔

ماں نے چند لمحے بیٹی کے جواب کا انتظار کیا پھر کسی قدر تیکھے لہجے میں بولی۔ "اے' میں نے کہا گیتی آراء! تم نے سنا نہیں۔ بیٹی' میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"امی حضور! میں کسی کے پاس نہیں جاؤں گی۔" گیتی آرا نے ماں کی جانب دیکھے بغیر بیزاری سے جواب دیا۔ "میں اسی لیے یہاں نہیں آرہی تھی۔ آپ اصرار کر کے زبردستی مجھے لے آئیں۔ اب یہ حکم صادر کئے جا رہے ہیں' اس سے مل لو' اس کے پاس جاؤ۔ واہ' یہ خوب رہی۔"

"اے' میں نے کہا' سن رہے ہو نواب فخرالدولہ' تمہاری صاحب زادی کیا فرما رہی ہیں؟" بیگم نے شکایت کے انداز میں شوہر سے کہا۔ "اب تمھی اسے سمجھاؤ۔ میری تو یہ سنے گی نہیں۔ تمھی مناؤ' تمھی نے سر پر چڑھا کر اس کا دماغ خراب کیا ہے۔"

"سر پر تو ہم نے تمہیں بھی چڑھا رکھا ہے۔"

"اے' بڑے آئے مجھے سر پر چڑھانے والے۔" بیگم تنک کر بولی۔ "تمہارے سر پر تو دل آرام کا بھوت سوار تھا۔ اس موئی حرّافہ کے ہوتے ہوئے تم مجھے کیسے سر پر چڑھاتے۔ تمہیں اتنا ہوش ہی کب تھا۔"

"مگر تمہاری تو ہم نے کبھی حق تلفی نہیں کی۔" نواب فخرو نے رسان سے کہا۔ "ہم نے تمہارے ساتھ تو کوئی زیادتی نہیں کی۔"

"اے میں کہتی ہوں کیا نہیں کیا تم نے؟" بیگم کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔ "لاکھ کا گھر خاک میں ملا دیا۔ ساری جائیداد اور زمین داری لالہ گردھاری لال رستوگی کے پاس رہن رکھ دی۔ میرا زیور

تک نہ چھوڑا۔ اب بیٹھے فرما رہے ہیں' ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ ریس اور رنڈی بازی میں سب کچھ تباہ کر دیا۔"

"یہ طعنہ نہ دو۔" نواب فخرو کا لہجہ بھی تیز ہوگیا۔ "یہ نہ بھولو کہ تمہیں بھی ہم بالاخانے سے اتار کر گھر میں بیگم بنا کر لائے تھے۔ ہم نے شمع محفل سے تمہیں شمع خانہ بنا دیا۔ نہ خلد آشیانی قبلہ ابا حضور کی برہمی سے خائف ہوئے' نہ اماں جان کی پروا کی۔ سارے خاندان سے تمہاری خاطر مخالفت مول لی۔"

"میرا منہ نہ کھلواؤ۔ تمہاری نانی کون سی شریف زادی تھی۔ وہ بھی تو ذات کی ڈومنی تھیں۔ ویسے بھی تم نے کیا احسان کیا مجھ پر۔ گھر میں قیدی بنا کر ڈال دیا۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "ہر وقت تو ایک ایک کے طعنے سنتی تھی۔ تمہارے خاندان والوں نے تو مجھے نکّو بنا دیا تھا۔ تمہیں کیا خبر' میں نے کیا کیا ظلم نہ سہے۔ تم تو اس وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ تم نے میری بات ہی کب سنی۔ میرا کہا مان لیتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ یہاں آکر یہ ذلت و خواری نہ دیکھنا پڑتی۔ سفارشوں کے لیے یوں ایک ایک در کی خاک نہ چھاننا پڑتی۔"

"سفارشیں بھی تو کام نہیں آئیں۔" نواب فخرو نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بڑوں بڑوں تک رسائی حاصل کی۔ صاحب زادے کو کسٹمز میں ایسی اچھی ملازمت دلوائی۔ اب وہ کراچی میں بیٹھے اپنے بال بچوں کے ساتھ عیش کرتے ہیں۔ پلٹ کر یہ بھی خبر نہیں لیتے کہ ماں باپ زندہ ہیں یا مر گئے۔"

"اس کا تو تم میرے سامنے نام بھی نہ لو۔" بیگم بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "وہ تو ہمیشہ کا خود غرض ہے۔ اوپر سے بیوی اس کی ایسی شتّاح ہے۔ ایسا اسے اپنے جال میں پھانسا ہے کہ ہر وقت اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں اسے الّو کا گوشت کھلا دیا ہے۔ دوسرے صاحبزادے ہیں' انھیں ایکٹنگ کا شوق چرّایا ہے۔ بمبئی میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں یا آغا جانی کے در پر پڑے رہتے ہیں۔ کتنے خط لکھے کہ لکھنؤ جا کر جائیداد کے کاغذات بھجوا دو۔ ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔"

"کیا جواب دیتا۔" نواب فخرو نے اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف سے صفائی پیش کی۔ "کون سی جائیداد کے کاغذات بھجواتا۔ ساری جائیداد فروخت ہو چکی ہے یا رہن پڑی ہے۔"

"اے میں کہتی ہوں' کس نے ایمانداری سے کلیم حاصل کیا ہے۔" بیگم نے جھنجلا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "کس نے جعلی دستاویزیں نہیں بنوائیں؟ دور کیوں جاتے ہو' وہ تمہارے بٹ

صاحب کہاں کے مہاجر ہیں۔ زندگی بھر سیالکوٹ میں رہے' اب مہاجر بن بیٹھے۔ لاہور میں ایک کوٹھی الاٹ کروالی۔ آج کل کوئی فیکٹری الاٹ کرانے کی کوشش میں لگے ہیں۔ خود ان کی بیوی نے بتایا ہے مجھے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ متروکہ جائیداد کی تو ایسی لوٹ مار مچی ہے کہ نہ کبھی سنی تھی نہ دیکھی۔ وہ اپنے دلّی کے نواب اختر مرزا ہیں' دو کوٹھیاں اور ایک کارخانہ کلیم میں الاٹ کرا چکے ہیں۔" نواب فخرو نے مسکرا کر کہا۔ "خود کو بہادر شاہ کا پوتا بتاتے ہیں۔ انھوں نے تو لال قلعے کے بدلے لاہور کا شاہی قلعہ الاٹ کرنے کا کلیم بھرا ہے۔ کمال ہو گیا بھئی۔ سنا ہے گلی قاسم جان میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ دروازے پر ٹاٹ کا پھٹا پردہ پڑا رہتا تھا۔"

بیگم کی نظر اچانک لالی پر پڑ گئی۔ وہ خیمے کے پردے کے پاس بیٹھا ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بیگم تلملا کر بولی۔ "اے میں نے کہا' نواب فخرالدولہ! یہ موا جانگلوس یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ کیسا دیدے نکالے اجڈ پن سے تک رہا ہے۔"

"بیگم تم تو ہر ایک کے سر ہو جاتی ہو۔ اسے ہمدانی نے بھیجا ہے۔ ہم نے اس سے یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا تھا۔" اس نے مڑ کر گیتی آرا کو دیکھا۔ "بٹی! اب کھڑی ہو جاؤ۔ ہمدانی صاحب انتظار کرتے ہوں گے۔"

گیتی آرا نے باپ کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "ابا حضور! آپ آخر مجھے کس کس کے پاس بھیجیں گے؟ آپ کے حکم پر میں محکمہ بحالیات کے کمشنر کے بنگلے پر چلی گئی۔ آپ کا اتنا بڑا کلیم منظور کرا دیا۔ تصدیق کے لیے کاغذات ہندوستان بھی نہیں بھیجے گئے۔ سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گیا۔ چیچہ وطنی میں ڈھائی سو ایکڑ زمین' عارف والا میں آئس فیکٹری اور لاہور میں رہنے کے لیے کوٹھی' آخر کس طرح آپ کے نام ہوئی۔ سب آپ کی مرضی کے مطابق ہی تو ہوا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ بیٹے تو دونوں ہی نکمے اور خود غرض نکلے۔" نواب فخرو نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔ "واللہ' تم نے بٹی ہو کر بیٹوں کا حق ادا کر دیا۔" نواب نے آہ سرد کھینچی۔ "کیا کریں بٹی! اللہ نے ہم پر وقت ہی ایسا ڈالا ہے۔ تم اتنی قربانی نہ دیتیں تو فاقے کرتے کرتے مر جاتے۔ اس عمر میں مجھے کون ملازمت دیتا۔ تعلیم بھی میری صرف انٹرنس تک ہے۔" گیتی آرا خاموش رہی۔ نواب فخرو اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ پیار سے گویا ہوا۔ "بٹی! چلی جاؤ گی تو کام بن جائے گا۔ اب تو صرف آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ زمین اور فیکٹری کا الاٹمنٹ تو ہو گیا مگر قبضہ ہمدانی کے مدد کے بغیر نہیں مل سکتا۔"

وہ اس کا سر آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ "بٹی عزت کی زندگی گزارنے کا یہ آخری موقع ملا ہے۔ زمین اور فیکٹری کا قبضہ مل گیا تو آرام و سکون سے گزر بسر ہو گی۔ تمہارے لیے رشتہ بھی اچھا مل جائے گا' بلکہ ایک لڑکا میری نظر میں ہے بھی۔ وہ سی' ایس' پی ہے۔ شکل و صورت کا بھی اچھا ہے۔ خاندان بھی ہماری طرح شرفا کا ہے۔" گیتی آرا گم صم بیٹھی رہی۔ نواب فخرو کے لہجے میں عاجزی اور رقّت پیدا ہو گئی۔

"بٹی! تم اپنے بوڑھے باپ کی مدد نہیں کرو گی؟"

گیتی آرا نے آہستہ سے کہا۔ "ابا حضور! میں نے پہلے بھی کب آپ کا حکم ٹالا ہے۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ ماں پلنگ سے اتری۔ گیتی آرا کے نزدیک پہنچی۔ اس کے سر پر ہاتھ لگا کر چٹ چٹ بلائیں لیں۔ مسکرا کر نواب فخرو کی طرف دیکھا۔ "دیکھ رہے ہو نواب فخرالدولہ! میری بچی کتنی فرماں بردار ہے۔ چاند کا ٹکڑا لگ رہی ہے۔ اے' میری نظر نہ لگ جائے۔" اس نے پیار سے تھتکارا۔

گیتی آرا مسکرا کر بولی۔ "امی حضور! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔"

وہ آگے بڑھی' خیمے کے پردے تک پہنچی۔ بیگم فخرو بیٹی کی ساتھ ساتھ چلیں اور اسے رخصت کرتے ہوئے بولیں۔ "بٹی! اللہ کے سپرد۔"

گیتی آرا ریشمی غرارے کے پائنچے ایک ہاتھ سے سنبھالے ہوئے خیمے سے باہر نکلی۔ لالی اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گیتی آرا کے ہم راہ چلنے لگا۔ دونوں دھندلی روشنی میں خیموں کے درمیان سے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے نشے کی ترنگ میں گیتی آرا کو چھیڑا۔

"صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے' تمہارا نکھرا بہت زیادہ ہے۔"

گیتی آرا نے جھنجلا کر اسے ڈانٹا۔ "بدتمیز۔"

"میں تو جی بدتمیز ہوں۔ جانگلی جو ٹھیرا بلکہ جانگلوس ہوں۔ تمہاری ماں نے تو یہی کہا تھا نا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "پر تم تو اس وکھت تمیز کا دھندا کرنے جا رہی ہو۔"

"اجڈ گنوار کہیں کا۔" وہ تلملا کر بولی۔ "ایسی باتیں کیں تو میں نہیں جاؤں گی۔"

"نہ جاؤ۔" لالی مسکرا کر بے نیازی سے بولا۔ "تم میرے لیے تو جا نہیں رہی ہو۔"

وہ روٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے مسٹر ہمدانی کا خیمہ بتا دو۔ میں خود چلی جاؤں گی۔"

"چلو چلو' خاماخا کا نکھرا نہ دکھاؤ۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "وہ رہا صاحب کا خیمہ۔"

گیتی آرا خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ وہ آگے بڑھی اور غرارے کے پائنچے

سنبھالتی' آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی' لالی کے ہم راہ چلتی رہی۔ ہمدانی کے خیمے پر پہنچ کر لالی نے گیتی آرا سے کہا۔ "تم اندر جا کر عیش کرو۔ میں اب چلا۔" گیتی آرا نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور پردہ اٹھا کر خیمے میں داخل ہو گئی۔

لالی مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اب اسے شادو کی تلاش تھی۔ وہ پھر اسی خیمے میں پہنچا جس میں شادو اسے چھوڑ گیا تھا۔ خیمے میں شادو چٹائی پر لیٹا ہوا جاگ رہا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی بولا۔ "کدھر چلا گیا تھا؟ یہاں آکر تجھے نہ پایا تو میں پریشان ہو گیا۔"

"ایک چکر میں پڑ گیا تھا۔" لالی مسکرا کر بولا۔ "میاں سلیم نے تجھے جانے کی اجازت دے دی؟"

"اجازت تو دے دی' پر صبح تک واپس آنے کو بھی کہا ہے۔"

"تو فیر دیر کیوں کر رہا ہے' کھڑا ہو جا۔ گڈی کتھے ہے؟"

شادو کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "باہر میدان میں ہے۔"

دونوں خیمے سے نکلے۔ کار زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ کار میں سوار ہونے سے پہلے لالی نے کھانا منگوایا۔ شادو دیگچی میں قورمہ بھر کر لے آیا۔ قورمے کے ساتھ آٹھ روٹیاں تھیں۔ تلے ہوئے مرغ تھے۔ کباب تھے اور پلاؤ بھی تھا۔ لالی نے صرف دیگچی میں بھرا ہوا قورمہ اور روٹیاں رکھ لیں باقی کھانا واپس کر دیا۔

شادو نے لالی کو اپنے پاس بٹھایا۔ کار اسٹارٹ کی اور حویلی پہنچا۔ لالی مہمان خانے میں گیا اور چادر میں لپٹی ہوئی رائفل لے آیا۔ کار میں بیٹھ کر لالی نے چادر کھولی۔ رائفل نکال کر پچھلی نشست پر رکھ دی۔ روٹیاں اور کھانے کی دیگچی چادر میں باندھ کر آگے رکھ لی۔ اس نے شادو سے پوچھا۔ "تو میرے کپڑے لائل پور سے دھلوا کر لے آیا نا؟"

شادو نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تو گھر ہی میں پڑے ہیں۔ لائل پور سے واپسی پر میں گھر جا ہی نہیں سکا۔ ویسے بھی میرا خیال تھا تو دو تین روز یہاں ٹھیر کر جائے گا۔"

لالی نے پریشان ہو کر کہا۔ "مار دیا ظالم! سارا کام خراب کر دیا۔" وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کار کچی سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑنے لگی۔ گاؤں سے نکل کر آگے بڑھی اور پختہ سڑک پر آگئی۔

شادو نے رفتار تیز کر دی۔ کار کمالیہ سے آگے بڑھی۔

ملتان روڈ پر پہنچتے ہی اس نے رفتار اور تیز کر دی۔ شادو بڑا ہوشیار ڈرائیور تھا۔ وہ ستر اسی میل

کی رفتار سے کار دوڑاتا رہا۔ جب کار منٹگمری کے قریب پہنچی اور دور سے شہر کی روشنیاں نظر آئیں تو لالی کے چہرے پر گھبراہٹ پھیل گئی۔ مگر کار "آنا" فانا" شہر سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ کار سڑک پر تیزی سے دوڑتی رہی۔ یوسف والہ سے آگے بڑھتے ہی لالی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے شادو سے کہا۔

"گڈی کی سپیڈ کم کر دے۔"

"کیوں' کیا تیں نوں کادر آباد نہیں جانا؟"

"نہیں مجھے کادر آباد نہیں جانا۔ تو مجھے پہلے ہی اتار دینا۔"

شادو نے رفتار کم کر دی۔ لالی نے قادر آباد سے میل' سوا میل پہلے ہی کار رکوائی اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ شادو اس کے پاس آیا۔ دونوں گرم جوشی سے گلے ملے۔ شادو پھر کار میں بیٹھ گیا' اسے موڑا اور تیزی سے دوڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔

☆

رات سنسان اور تاریک تھی۔ دور سڑک کے اس پار اندھیرے میں قادر آباد اسٹیشن کے آؤٹ سگنل کی روشنی نظر آرہی تھی۔ قریب ہی نہر لوئر باری دو آب بہہ رہی تھی۔ لالی نہر کے ساتھ' ساتھ کچھ دور تک چلتا رہا۔ وہ مڑا اور جنگلی جھاڑیوں سے بھرے میدان میں گھس گیا۔

اس نے میدان عبور کیا اور اونچے نیچے ٹیلوں پر چڑھنے لگا۔ رات اب ڈھل چکی تھی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔

بلندی پر پہنچ کے وہ رک گیا۔ مڑ کر پیچھے دیکھا۔ نہر کا پانی پچھلے پہر کے روشن ستاروں کی روشنی میں جھل ملا رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ لالی ٹیلوں کے درمیان راستے سے گزرتا ہوا اپنے ٹھکانے کی جانب بڑھنے لگا۔

وہ ٹھکانے پر پہنچا۔ اس نے صبح کاذب کی دھندلی دھندلی روشنی میں دیکھا' رحیم داد دو خمیدہ ٹیلوں کے اتصال سے بنی ہوئی محراب کے نیچے ایک کونے میں سکڑا ہوا پڑا ہے۔ وہ کمزور اور لاغر نظر آرہا تھا۔

اس کے جسم پر ابھی تک جیل کی ملگجی وردی تھی۔ بال بے حد بڑھ گئے تھے۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ لالی نے کھانے کی گٹھری کندھے سے اتار کے ایک طرف رکھی اور رائفل بھی اس کے قریب نکال کر کھڑی کر دی۔

وہ رحیم داد کے نزدیک گیا۔ سرہانے بیٹھ کر اس کا بازو ہلایا۔ رحیم داد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ حیرت

سے آنکھیں پھاڑ کے لالی کو تکنے لگا۔ پھر اس نے بے قرار ہو کر کہا۔ "لالی! تو آ گیا؟" اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور چمٹ گیا۔

لالی نے محسوس کیا کہ رحیم داد اس کے شانے پر سر رکھے آہستہ آہستہ رو رہا ہے۔ لالی نے اس کی پیٹھ محبت سے تھپکتے ہوئے پوچھا۔ "تو رو رہا ہے رحیمے؟"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ گہرے سناٹے میں اس کی سسکیاں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لالی چپ بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد رحیم داد علیحدہ ہوا اور آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "میں تو سمجھا تھا' اب تو لوٹ کر نہیں آئے گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا تھا۔" لالی نے اعتماد سے کہا۔ "پکڑ لیا جاتا' تب تو گل ہی اور تھی ورنہ میرے واپس نہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بھلا میں تجھے چھوڑ سکتا ہوں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "تو تو میرا یار ہے' میرا جگر ہے۔"

"تو نے لوٹنے میں اتنی دیری کر دی۔ میں سمجھا' مجھے چھوڑ کر کسی طرف نکل گیا یا پکڑا گیا۔" وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ "یہ بتا' اتنے دنوں رہا کہاں؟"

"ایک چکر کے بعد دوسرے چکر میں پھنستا گیا۔ تجھے کیا کیا بتاؤں' پر میں جہاں بھی رہا' رب سونہہ' تجھے ہر دم یاد کرتا رہا۔"

"کیا یاد کرتا رہا۔" رحیم داد نے شکوہ کیا۔ "یہ نہ سوچا ادھر مجھ پر کیا بیتی۔"

"مجھے اس کا اندازہ تھا۔ پر کیا بتاؤں' میں کیسے کیسے چکروں میں الجھا رہا۔"

"شاداں نے پھنسوا دیا ہو گا کسی چکر میں۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر کہا۔ "پتہ ہے' وہ کتنی خطرناک ہے۔"

"اس کی گل نہ کر۔ تو اسے سمجھ ہی نہیں سکا۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہ بتا' روٹی پانی کا کیا بنا؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" رحیم داد بیزاری سے بولا۔ "آخر میں تو روٹیاں بالکل سوکھ گئی تھیں' پنیر اور شہد پہلے ہی مک گیا تھا۔ سوکھی روٹیاں پانی میں بھگو بھگو کر کھاتا رہا۔"

"کب تک ان سے کام چلا؟"

"پچھلے دو روز سے نہ روٹی ملی ہے نہ پانی۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "ادھر ایک ٹبے کے پاس جنڈ کا پیڑ ہے۔ اس میں پھلیاں آ گئی ہیں۔ انھیں توڑ توڑ کر کھاتا رہا۔ پر اس سے پیاس نہیں جاتی۔"

"نہر سے پانی لے آتا۔" اس نے قریب پڑے ہوئے مشکیزے کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ بوکی تو تیرے پاس موجود ہی تھی۔ اس میں پانی بھر کر لے آتا۔"

"پانی تو تیرے جانے کے بعد تیسرے ہی دن مک گیا تھا۔ میں شام کو اندھیرا بڑھنے کے بعد نہر پر گیا۔ بوکی میں پانی بھر لایا۔ پانی تو ایسے ہی لاتا رہا' پر پچھلے دنوں نہر سے بوکی میں پانی لا رہا تھا تو سڑک پر پولیسے نظر آئے۔ میں پریشان ہو گیا۔ دوسرے دن میں نے ٹبوں پر سے چھپ کر دیکھا۔ پولیس کی ایک ٹولی گشت کرتی دکھائی دی۔ ان کے پاس بندوقیں بھی تھیں۔ تیسرے دن بھی مجھے سڑک اور نہر کے آس پاس پولیس والے نظر آئے۔ تب سے میں نہر پر نہیں گیا۔ پانی بوند بوند پی کر کام چلایا۔ آخر وہ کب تک چلتا' مک گیا۔"

"مجھے بھی آج رات پتہ چل گیا تھا' پولیس ہم دونوں کی ادھر نگرانی کر رہی ہے۔"

"تجھے یہاں آتے ہوئے پولیس ملی ہو گی۔ تو اس سے بچ کر کیسے نکل آیا؟"

"میں یہاں آتے ہوئے کچھ دور پہلے ہی کار سے اتر گیا تھا۔ میں لائل پور کے ایک پنڈ میں تھا۔ شادو مجھے وہاں لے گیا تھا۔ وہ آج کل میاں سبحان کا ڈرائیور لگ گیا ہے۔ وہی کار میں بٹھا کر لایا بھی تھا۔ تیرے لیے کپڑے نہیں لا سکا۔ میلے تھے۔ شادو انھیں دھلوانے اپنے گھر لائل پور لے گیا تھا۔ واپسی میں بھول گیا۔"

رحیم داد نے جل کر کہا۔ "تو مجھے جیل کی وردی سے چھٹکارا دلانا نہیں چاہتا۔"

"ایسی گل بات نہ کر رحیمے! تینوں کیہ پتہ' مجھے یہ جان کر کتنا دکھ ہوا۔ ویسے چدّر تو ہے' اسے اوڑھ کر تو اپنی یہ وردی تو چھپا ہی سکتا ہے۔" لالی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ "اب چدر کھول کر روٹی ٹکر کھا۔" اس نے مشکیزے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بوکی مجھے دے۔ میں نہر سے جا کر اس میں پانی بھر لاؤں۔"

رحیم داد نے خدشے کا اظہار کیا۔ "نہر پر تیرا جانا ٹھیک نہیں' پولیسے تاک میں لگے ہیں۔"

"ابھی تو وہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے ٹبوں پر چڑھ کر ادھر دیکھا تھا۔ بالکل سناٹا ہے۔" لالی نے جھک کر باہر دیکھا۔ اب اندھیرا چھٹنے لگا تھا۔ ہلکا ہلکا اجالا پھوٹ رہا تھا۔ "ابھی زیادہ اجالا نہیں ہوا۔ میں جا کر پانی بھر لاؤں۔"

لالی نے مشکیزہ اٹھایا اور ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نہر کی جانب چلا۔ میدان میں اترنے سے پہلے اس نے ٹیلوں کی بلندی سے نہر کی سمت دیکھا۔ وہاں ابھی تک گہرا سناٹا چھایا تھا۔ سڑک بھی سنسان تھی۔ وہ نشیب میں اترا اور جھاڑیوں سے بھرے ہوئے میدان کے آخری سرے پر پہنچ

گیا۔ مگر وہ جھنگر سے باہر نہیں نکلا۔

اس نے گردن اٹھا کر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اجالا اور بڑھ گیا تھا۔ اسے دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ اسی اثناء میں سڑک پر ایک لاری ملتان کی سمت سے نمودار ہوئی اور تیزی سے گزر گئی۔

لالی آگے بڑھا۔ اس نے مشکیزے میں پانی بھرا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پھر جھنگر میں گھس گیا۔ اس نے میدان طے کیا۔ ٹیلوں پر چڑھتے ہوئے بار بار پلٹ کر نہر اور اس سے کچھ فاصلے پر گزرتی ہوئی سڑک دیکھتا رہا۔ مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔

وہ درختوں اور ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ رحیم داد محراب کے باہر کھڑا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"پولیسے تو نہر پر نہیں ملے؟"

"مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ سڑک بھی سنسان ہے۔"

رحیم داد نے بے صبری کے ساتھ مشکیزہ اس کے ہاتھ سے لیا اور منہ سے لگا کر غٹا غٹ پانی پینے لگا۔ پانی پی کر اس نے مشکیزے کا منہ چمڑے کی ڈوری سے بند کیا' لالی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"لگتا ہے جیسے دوبارہ زندگی مل گئی۔"

"تو نے روٹی کھالی؟"

"روٹی تو تیرے جاتے ہی کھالی تھی' پر پیاس بہت ستا رہی تھی۔ جی بھی گھبرا رہا تھا۔ سچ' تجھے پولیس نہیں ملی؟"

"میں نے تجھے بتایا نہیں' وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ لگتا ہے' پولیس ہٹالی گئی۔"

لالی' مٹی کے ایک تودے پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے مشکیزہ رائفل کے قریب رکھا۔ واپس آکر لالی کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ رائفل کہاں سے لے آیا۔ رائفل ہی ہے نا؟"

"تجھے کیسے پتہ چلا کہ یہ بندوک ہے یا رائفل؟"

"میں نوں بالکل ٹھیک طرح پتہ ہے۔ بندوک اور رائفل دونوں چلانا جانتا ہوں۔ نشانہ بھی بہت سچا ہے۔ احمد کوٹ سے آگے بیلا ہے۔ اس کے چھتروں میں باہر والے بہت ہیں۔"

"تیرا مطلب ہے جنگلی سور؟"

"ہاں' میں نے زمیں داروں کے ساتھ سور کا شکار بہت کھیلا ہے۔ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اس کی کھال اتنی موٹی ہوتی ہے کہ گولی اس پر بیکار ہو جاتی ہے۔"

"میں نوں بھی اتنا پتہ ہے۔"

"یہ بتا' اب پروگرام کیا ہے؟ کپڑے تو میرے لیے لایا نہیں' پر چدّر سے کام چل جائے گا۔ اب یہاں زیادہ ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی یہ روٹی کتنے دن چلے گی۔"

"میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ میں آج رات کادر آباد جاؤں گا۔ کوشش کروں گا تیرے لیے قمیص اور دھوتی لے آؤں۔ یہ کام ہو جائے تو دونوں اطمینان سے سفر کر سکتے ہیں۔"

رحیم داد نے تعجب سے پوچھا۔ "کادر آباد میں تیرا کون ہے؟"

"شاداں ہے۔" لالی نے آنکھ مار کر کہا۔ "میں نے اس سے کادر آباد آنے کو کہا تھا۔ وہ وہاں ضرور پہنچ گئی ہوگی۔ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"ادھر تیرا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ پولیسے ہمارے پیچھے لگے ہیں۔ میں نے انھیں سڑک اور نہر پر گشت کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تو شاداں کا چکر چھوڑ۔"

"وہ تو اب چھوٹ نہیں سکتا۔" لالی کی آنکھوں سے مسرت جھلکنے لگی۔ "تجھے پتہ نہیں' وہ اب میری بن چکی ہے۔ اب میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔"

رحیم داد نے جل کر کہا۔ "تجھے بھی بالے کی طرح کسی رات سوتے میں چھری سے کاٹ کر ٹوٹے بنا ڈالے گی۔ اتنا سوچ لے۔"

"مجھے پتہ ہے۔ دھوکا کروں گا تو وہ میرا گلا بھی چھری سے کاٹ سکتی ہے۔ پر شاداں اگر جان لے سکتی ہے تو اپنے یار کے لیے جان دے بھی سکتی ہے۔ مجھے ایسی ہی عورت چاہیے تھی۔ تجھے پتہ نہیں' وہ کتنی زور آور اور محبت کرنے والی زنانی ہے۔" لالی کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔

"میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔ میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا۔ کادر آباد میں وہ اپنے مامے کے پاس ٹھیری ہوگی۔" لالی نے گہری سانس بھری۔ "رحیمے! مجھے اس سے بہت پیار ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "اس سے ملنے کے بعد میں تجھے لے کر شادو کے پاس لائل پور جاؤں گا۔ شاداں سے کہوں گا وہ بھی لائل پور پہنچ جائے۔ کچھ دن ہم تینوں لائل پور ٹھیریں گے۔ فیر آگے کا پروگرام بنائیں گے۔"

"جانا ہی چاہتا ہے تو شاداں سے ملنے ضرور جا' میں تجھے نہیں روکتا۔ لیکن لائل پور جانے سے پہلے میں اپنی گھر والی نوراں اور بچوں سے ملنے احمد کوٹ جاؤں گا۔ مجھے نوراں اور اپنے بچے بہت یاد آتے ہیں۔" رحیم داد کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ "تیں نوں پتہ نہیں' میں بھی نوراں سے بہت پیار کرتا ہوں۔ تو نے اسے دیکھا ہی ہے۔ کتنی سوہنی ہے اور مجھے کتنا چاہتی ہے۔ جیل میں

جب ملنے آتی تھی پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔ تونے تو اپنی آنکھوں سے اسے روتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے' پر یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ اس نے دو مہینے بعد اچانک تیرے پاس جیل آنا چھوڑ دیا تھا۔"

"بیمار پڑ گئی ہوگی اور میرے ہی دکھ میں بیمار پڑی ہوگی۔ ورنہ یہ ہو ہی نہیں سکتا وہ میرے پاس نہ آئے۔ بعد میں ضرور مجھے ملنے جیل گئی ہوگی۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "لالی! مجھے نوراں سے بہت پیار ہے۔ میں اسے اور اپنے تینوں بچوں سے ملنے احمد کوٹ ضرور جاؤں گا۔ نہ گیا تو نوراں میرے لیے روتے روتے مرجائے گی۔"

"پر یہ سوچ لے' احمد کوٹ جاتے ہی پولیس تجھے گرفتار کرلے گی یا تیرا خون کردیا جائے گا۔" لالی نے اسے خبردار کیا۔ "میں تجھے یہ بتانا تو بھول ہی گیا' جھگڑے میں جو بندہ تیرے ہاتھوں زخمی ہوگیا تھا' وہ پچھلے دنوں اسپتال میں مرگیا۔"

"تو سیف اللہ کی گل کر رہا ہے؟" رحیم داد نے پریشان ہوکر کہا۔ "پر میں نے تو سنا تھا وہ بالکل چنگا ہوگیا تھا۔ اسپتال سے اسے چھٹی بھی مل گئی تھی۔"

"تونے ٹھیک سنا تھا۔ پر اس کا زخم پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ وہ دوبارہ اسپتال میں داخل ہوا اور اس کی موت ہوگئی۔ اب پولیس گرفتار کرکے تجھ پر کتل کا مکدمہ چلانا چاہتی ہے۔ پہلے تجھے دفعہ ۳۰۷ میں سزا ہوئی تھی' اب ۳۰۲ میں مکدمہ چلے گا۔ جب سے سیف اللہ مرا ہے' اس کے بھائی اور شریکے تجھے کتل کرنے کی تاک میں ہیں۔ سیف اللہ کا ایک شریکا بھی آج کل وزیر لگا ہے۔ اسی کے حکم پر تو پولیس ہم دونوں کی تلاش میں اتنی بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ ہماری گرفتاری اسی لیے دو ہزار کا انعام بھی رکھا گیا ہے۔"

رحیم داد گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے بعد اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "جھگڑا تو سیف اللہ ہی نے کھڑا کیا تھا۔ کھیتوں کی وٹ بندی پر شروع ہوا تھا۔ فیر اس نے میری کنال سے بھی زیادہ زمین دبالی۔ میں نے اس کے خلاف مکدمہ کردیا۔ دو سال تک مکدمے بازی چلی۔ میں عدالت سے مکدمہ جیت گیا تو سیف اللہ اور اس کے بھائیوں نے مجھ پر حملہ کردیا۔ جمال دین اللہ ورایو میرے ساتھ نہ ہوتے تو انھوں نے مجھے مار ہی دیا تھا۔"

"رحمے! یہ باتیں تو مجھے جیل میں بھی سنا چکا ہے۔ میں تو تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں احمد کوٹ تیرے لیے بہت خطرناک ہے۔ گھر والی اور بچوں سے تجھے ملنا ہی ہے تو پڑوس کے کسی پنڈ میں چلا

اور چپکے سے انھیں وہاں بلالے۔"

"یہ تونے ٹھیک کہا۔" رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ "تیری بات سمجھ آتی ہے۔ اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں۔ نوراں اور بچوں سے بھی مل لوں گا اور نوراں سے کہوں گا بچوں کے ساتھ لائل پور آجائے۔"

"انھیں لائل پور بلانا ٹھیک نہیں۔ یہ میں تجھے بعد میں بتاؤں گا' انھیں کہاں بلایا جائے۔" لالی نے اسے مشورہ دیا۔ "ایک گل اور سمجھ آتی ہے۔ تو اپنی گھر والی سے کہنا وہ سیف اللہ کے گھر جائے اور اس کی رانڈ کے سامنے اپنے دوپٹے کا پلو پھیلا کر کھڑی ہوجائے۔ جب کاتل کی گھر والی بہن یا دھی' اس طرح پلو پھیلا کر داد فریاد کرتی ہے تو مکتول کے گھر والے خون معاف کردیتے ہیں۔ یہ پرانی ریت ہے۔ اسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔"

"نہیں جی' یہ نہیں ہوسکتا۔" رحیم داد نے ترش روئی سے کہا۔ "میرے پاس ویسے تو اب صرف ۱۲ کلا زمین رہ گئی ہے' پر ہوں تو میں زمیں دار۔ میری گھر والی اس طرح پلو پھیلا کر فریاد نہیں کرسکتی۔ میں آباد کار ہوں۔ کوم کا آرائیں۔ آباد کاروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ تو جانگلی ہے نا' یہ جانگلیوں کی ریت ہے۔"

"تو فیر جو تیرا جی کرے کر۔" لالی نے تلخی سے کہا۔ "میں کچھ نہیں کہتا۔"

"نراض نہ ہو۔" رحیم داد نرم پڑ گیا۔ "بات یہ ہے' آباد کاروں کی زنانیاں خون معاف کرانے کے لیے دہائی نہیں دیتیں۔ یہ عزت آبرو کا سوال ہے۔ یہی تو آباد کاروں اور جانگلیوں میں فرک ہے۔ تو شاداں ہی کو دیکھ۔ گھر والے کو چھوڑ کر بالے کے ساتھ بھاگی۔ فیر اس کا خون کردیا۔ اب اس نے تجھ سے یاری لگالی۔ میری گھر والی ایسا کبھی نہیں کرسکتی۔ وہ مرتے دم تک میرے نام پر بیٹھی رہے گی۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ رحیم داد بھی چپ رہا۔ اب صبح ہوچکی تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دھوپ ٹیلوں کی چوٹیوں اور درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر جھلک رہی تھی۔ لالی نے منہ کھول کر جمائی لی اور کھڑا ہوکر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "مجھے اب نیند لگ رہی ہے۔" وہ محراب کے نیچے گیا اور فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد گہری نیند سوگیا۔

☆

شام ہونے سے کچھ دیر قبل رحیم داد نے اسے جھنجوڑ کر جگایا۔ لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ

گیا۔ اس نے دیکھا' محراب کے نیچے روشنی دھندلی پڑ چکی ہے۔ دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔

رحیم داد نے کہا۔ "ابھی روشنی ہے۔ روٹی کھا لے۔ تو نے تو سویرے سے کچھ بھی نہیں کھایا۔"

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد روٹیاں اور دیگچی اٹھا کر لے آیا۔

لالی نے دیگچی کا ڈھکنا ہٹا کر سونگھا۔ قورمہ سڑ گیا تھا۔ اندر سے کھٹی کھٹی بو اٹھ رہی تھی۔ اس نے دیگچی ایک طرف رکھتے ہوئے منہ بگاڑا۔

"رحیمے! گوشت تو خراب ہو گیا' کھانے کا نہیں رہا۔"

دونوں نے باسی روٹیاں کھائیں۔ مشکیزے سے پانی پیا اور محراب کے نیچے سے نکل کر باہر آ گئے۔ سورج اونچے اونچے ٹیلوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ لالی نے کہا۔

"رحیمے! میں کاور آباد جا رہا ہوں۔"

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "اندھیرا بڑھ جائے تب جانا' ابھی اجالا ہے۔ اس وکھت جانا ٹھیک نہیں۔"

"جھٹ پٹی چلا جاؤں گا تو جھٹ پٹی لوٹ بھی آؤں گا۔ اب یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے۔ آج ہی رات ہم دونوں یہاں سے نکل جائیں گے۔ میں شاداں سے تیرے لیے کمیص' دھوتی اور جوتی لے آؤں گا۔ شاداں اپنے مامے ہی کے پاس ٹھہری ہو گی۔ اس نے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"جیسی تیری مرضی' سوچ لے۔ میرے احمد کوٹ جانے کے بارے میں تو نے کیا سوچا؟"

"سویرے تجھ سے اس بارے میں بات تو ہوئی تھی۔" لالی نے جواب دیا۔ "یہاں سے چلنے سے پہلے آگے کا پروگرام بنا لیں گے۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ لالی آگے بڑھا۔ ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نیچے میدان میں اترا اور جھنگر میں داخل ہو گیا۔ وہ جنگلی جھاڑیوں سے الجھتا ہوا نہر کی جانب چلنے لگا۔ جھنگر ختم ہوا تو نہر نظر آنے لگی۔ لالی نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا نہر کے کنارے پہنچ گیا۔

وہ پل کی جانب بڑھنے لگا۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اس کے کانوں میں یہ آواز پڑی۔ "یہ تو جی لالی لگتا ہے۔" لالی ٹھٹکا۔ اس نے گھبرا کر نہر کے اس پار نظر دوڑائی۔ کھجور کے ایک درخت کے نیچے دھندلی دھندلی روشنی میں دو کانسٹیبل دکھائی دیے۔ وہ بالکل اس کے سامنے تھے۔ درمیان میں

نہر تھی۔

کانسٹیبلوں کو دیکھتے ہی وہ سراسیمہ ہو کر پلٹا اور تیزی سے جھنگر کی جانب لپکا۔ اسے اپنے عقب میں نہر کے اس پار سے ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ لالی نے آوازوں پر مطلق دھیان نہیں دیا۔ جھنگر میں گھسا اور تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔ اس نے جنگلی جھاڑیوں سے بھرا ہوا میدان طے کیا اور ٹیلوں پر چڑھنے لگا۔

بلندی پر پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا' پولیس والوں کا ایک جتھا پل عبور کر کے نہر کے دوسری طرف بڑھ رہا ہے۔ لالی اونچے نیچے ٹیلوں پر چڑھتا اترتا تیزی سے اپنے ٹھکانے کی جانب لپکا۔ محراب کے قریب پہنچا تو وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ رحیم داد نے اسے اس عالم میں دیکھا تو پریشان ہو کر پوچھا۔

"تو اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟"

"نہر پر پہنچا تو پولیسے مل گئے۔" لالی نے پھولی ہوئی سانس قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے مجھے پہچان لیا۔"

"یہ تو خطرناک بات ہو گئی۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ تیزی سے محراب کے نیچے پہنچا۔ رائفل اٹھائی۔ چیمبر میں کارتوس چڑھایا اور قریب کے ٹیلے پر چڑھتا ہوا بلندی پر پہنچ گیا۔ وہ چوکنا نظروں سے سامنے دیکھنے لگا۔ یکایک پتھریلے راستوں پر بھاری بھاری بوٹوں کی آہٹ ابھری اور اس کے ساتھ ساتھ گہری خاموشی میں ملی جلی انسانی آوازیں بھی سنائی دیں۔ لالی نے گھبرا کر اس طرف نظر ڈالی۔ ایک اونچے ٹیلے کے پیچھے سے پولیس والے نکلے' سب مسلح تھے۔ ان کے ساتھ ایک انسپکٹر بھی تھا۔ اس نے لالی کو ٹیلے کی بلندی پر دیکھ لیا۔

لالی جھٹ ایک ابھرے ہوئے پتھر کی آڑ میں رائفل سنبھال کر بیٹھ گیا۔ پولیس والے تعداد میں درجن بھر سے زیادہ تھے۔ وہ ٹیلے کے عقب سے نکل نکل کر اوپر آ رہے تھے۔ جب پولیس کی پوری نفری ٹیلے پر پہنچ گئی تو انسپکٹر نے انھیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ اس کی ہدایت پر تین ٹولیوں میں بٹ گئے۔

لالی پتھر کی آڑ سے ان کی نقل و حرکت دیکھتا رہا۔ وہ لالی سے دو ڈھائی سو گز کے فاصلے پر عین اس کے سامنے والے ٹیلے پر تھے۔

لالی نے ان پر گولی نہیں چلائی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد بھی نشیب سے نکل کر لالی کے قریب

آگیا اور اس کے برابر ہی پتھر کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔

دونوں نے دیکھا' پولیس کی ایک ٹولی دھیرے دھیرے ٹیلے سے نیچے اتری۔ مگر آگے آنے کے بجائے دائیں ہاتھ کو مڑی اور ایک ٹیلے کی آڑ لے کر بڑھنے لگی۔ لالی فوراً بھانپ گیا کہ وہ اس کے عقب میں پہنچنا چاہتی ہے۔ یہ دونوں کو گھیرے میں لینے کا منصوبہ تھا۔ لالی نے نشانہ باندھا اور اس ٹولی پر گولی چلا دی۔

گولی شام کے سناٹے میں چیختی ہوئی تیزی سے گزری۔ پولیس والے گھبرا کر جھپاک سے زمین پر لیٹ گئے اور دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے پتھروں کے پیچھے دبکنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی نقل و حرکت میں اس اچانک تبدیلی سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ لالی کے مسلح ہونے سے قطعی بے خبر تھے۔

پولیس کی جو ٹولی ٹیلے پر موجود تھی' گولی کی آواز سنتے ہی نشیب میں اتر گئی۔ پولیس والے بکھر کر ادھر ادھر دبکنے لگے۔ لالی نے اس ٹولی پر ایک اور گولی چلائی جو دھیرے دھیرے اس کے عقب میں جانے کے لیے کوشاں تھی۔ دوسری گولی چلا کر وہ پولیس کی اس ٹولی کو آگے بڑھنے سے روکنے میں کامیاب ہو گیا۔

مگر اب پولیس نے بھی دو طرف سے اس پر جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ گولیاں چیختی ہوئی لالی اور رحیم داد کے سروں پر سے گزرتی رہیں۔ ایک گولی اس پتھر پر لگی جس کے پیچھے دونوں چھپے ہوئے تھے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر لالی کے کندھے پر لگا مگر چوٹ خفیف سی آئی۔ لالی اور رحیم داد جھٹ زمین پر لیٹ گئے۔

لالی نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر سرگوشی کی۔ "رحیمے! تو پیچھے سے نکل جا۔ میں نے ادھر بڑھنے والی پولیس پارٹی کو روک دیا ہے۔" اس نے ایک گولی اور چلائی۔ "تو ٹیلوں کے اندر اندر ہوتا ہوا ڈھلوان سے اتر کر سکنالے کے اس پار نکل جا۔ آگے اونچائی پر جنگل ہے' تو وہاں چھپ کر میرا انتظار کرنا۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "تو نہیں چلے گا؟"

"میری پروا نہ کر۔" لالی نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر ہمیانی کھولی اور اسے رحیم داد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لے' اسے رکھ لے۔ اس میں تین ہزار سے اوپر روپے ہیں۔ اور دیکھ' یہاں سے نکلتے ہوئے چدّر ضرور اوڑھ لینا۔"

رحیم داد نے ہمیانی لیتے ہوئے کہا۔ "تو کتنی دیر میں پہنچے گا؟" وہ آہستہ آہستہ نیچے کھسکنے لگا۔

"جھیتی آنے کی کوشش کرنا۔"

"آجاؤں گا' آجاؤں گا۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔ "تو اب پھوٹ جا۔ جھیتی نال ٹرجا۔ ورنہ تیرا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔" اس نے گولی چلائی۔ "میگزین میں ابھی چھ کارتوس ہیں۔ میں ان سے پولیس کو روکے رکھوں گا۔ تو فٹافٹ نکل جا۔ دیری نہ کر۔"

رحیم داد کھسکتا ہوا نیچے اترا۔ محراب کے نیچے پہنچا۔ ہمیانی کمر سے باندھی' چادر اٹھا کر اوڑھی۔ باہر نکلا اور ٹیلوں کی آڑ میں دبا دبا پیچھے کی ڈھلان سے نیچے اترا۔ اندھیرے میں اونچے نیچے راستوں پر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے' اور آگے بڑھتا گیا۔

☆

لالی ٹیلے پر پتھر کی آڑ میں مورچا سنبھالے بیٹھا تھا۔ پولیس اس پر دو جانب سے اندھا دھند فائرنگ کرتی رہی۔ اب رات ہو چکی تھی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ اسے پولیس والے دھندلے دھندلے سایوں کے مانند نظر آ رہے تھے۔

وہ رک رک کر گولی چلاتا رہا تاکہ پولس اس کے [illegible]ب میں نہ پہنچ سکے اور اس اثناء میں رحیم داد اس کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔

اندھیرا بڑھتا گیا۔ گولیاں اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان رات کے سناٹے میں چیختی رہیں۔ لالی کی رائفل کے میگزین میں کارتوسوں کا ذخیرہ رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ رحیم داد کو گئے ہوئے لگ بھگ پون گھنٹہ ہو چکا تھا۔ لالی کے اندازے کے مطابق اب رحیم داد کو برساتی نالے کے اس پار جنگل میں پہنچ جانا چاہئے تھا۔

لالی نے گولی چلائی۔ اب اس کی رائفل میں آخری کارتوس رہ گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ نشیب میں آیا اور اس ٹیلے کی جانب بڑھا جس کے قریب سے پیچھے کی ڈھلان کی جانب راستہ جاتا تھا۔

لالی ٹیلے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے گولی چلائی اور آخری کارتوس بھی ختم کر دیا۔ وہ تیزی سے ڈھلان کی جانب دوڑا۔ مگر اندھیرے میں اس نے ٹھوکر کھائی۔ لڑکھڑا کر گرا۔ اس کا سر ایک ابھرے ہوئے پتھر سے اس قدر زور سے ٹکرایا کہ آنکھوں کے سامنے ستارے گردش کرنے لگے۔ وہ ذرا دیر بے سدھ پڑا رہا' پھر ہمت کر کے اٹھا اور آگے بڑھا۔ مگر چکرا کر گرا اور ایسا گرا کہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کوشش کے باوجود نہ اٹھ سکا۔ ٹھکیا کھانے کے بعد وہ بہت

جھک گیا تھا' کمزور اور لاغر ہو گیا تھا۔ اس میں پہلے جیسی قوت اور توانائی نہیں رہی تھی۔
وہ ٹیلے کے دامن میں پڑا رہا اور گہری گہری سانسیں بھر کر ہانپتا رہا۔ اب ٹیلوں پر بھاری بھاری بوٹوں کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔

ناگاہ بائیں ہاتھ کے ٹیلے سے ٹارچ کی تیز روشنی ابھری۔ روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ لالی نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت قریب کے ٹیلے کی بلندی سے ایک کانسٹیبل کود کر نیچے آیا۔ اس نے جھپٹ کر لالی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ لالی نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

۱۴

رات آدھی ہو گئی' کاجل کی طرح کالی ہو گئی۔ جھل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ رکڑ ویران تھا۔ اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبّے دم بخود تھے۔ ہوا کا تیز جھونکا آتا' خشک پتے کھڑکھڑاتے' خاموشی کا طلسم درہم برہم ہو جاتا۔ رحیم داد چوکنّا ہو کر ادھر ادھر دیکھتا۔ رات ڈھلنے لگی۔ رحیم داد کی نگاہیں رکڑ کے عقب میں ابھرے ہوئے ٹیلوں اور ٹبّوں کی سمت اٹھی ہوئی تھیں۔ مگر ٹیلوں پر نہ کوئی چاپ ابھری نہ سایہ نظر آیا۔

رحیم داد تھکن سے مضمحل تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے جسم کو چادر سے ڈھانپے' سکڑا سکڑایا ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ نیند بار بار یلغار کرتی۔ وہ جھومنے لگا اور جھومتے جھومتے لڑھک گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے رکڑ پر زرد زرد دھوپ پھیلی تھی۔ مگر لالی اب تک نہیں پہنچا تھا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ بہت دیر ہو گئی۔ دھوپ درختوں سے چھن چھن کر جھل میں پھیلنے لگی۔

اب جھل میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ رحیم داد کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگا۔ فراش کے گنجان درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آگے جھنگر تھا۔ جھنگر میں گھنی جھاڑیاں تھیں' خودرو جنگلی پودے تھے۔ زمین سخت اور ناہموار تھی۔ جھنگر نشیب میں دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ رحیم داد جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے آگے بڑھتا گیا۔ جھنگر سے نکل کر چٹیل میدان میں پہنچ گیا۔

دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ پانی کی تلاش میں رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ دور سرس کے ایک گھنے درخت کے نیچے کنویں کی منڈیر نظر آئی۔ وہ اس جگہ پہنچا۔ کنواں پرانا اور بہت بڑا تھا۔ آب پاشی کے لیے بنایا گیا تھا۔ منڈیر کے قریب چوبچے جیسا بچلا تھا۔ اس میں رہٹ کے نسیار سے کنویں کا پانی گرتا تھا۔ بچلے سے کھیتوں میں پانی پہنچانے کے لیے آڈ اور نالیاں نکلتی تھیں۔ مگر اب کنوئیں کی منڈیریں منہدم ہو چکی تھیں۔ بچلا ٹوٹ پھوٹ کر گڑھا بن گیا تھا۔ آڈ اور نالیوں کے نشانات دھندلے پڑ چکے تھے۔ کھیت اجڑ کر بنجر میدان میں تبدیل ہو گئے تھے۔ رحیم داد نے جھک کر کنوئیں میں نظر ڈالی۔ کنواں بالکل خشک تھا' اس کی تہ میں جھاڑیاں اور خود رو پودوں کے جھنڈ تھے۔ یہ اندھا کنواں تھا۔ اسے ڈل کہا جاتا ہے۔

ڈل سے سو سوا سو گز دور کسی ویران بستی کے ٹوٹے پھوٹے مکانات کے کھولے اور کھنڈر تھے۔ کھنڈر کے عقب میں بھی دور تک پھیلا ہوا لق ودق میدان تھا۔ میدان کے ایک حصے میں مزدور کھدائی کرتے نظر آ رہے تھے۔

وہ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کچھ مزدور کدالوں سے سخت اور پتھریلی زمین کھود کر کنکر نکال رہے تھے۔ کچھ بیلچے سنبھالے زمین کے اندر سے نکلنے والے کنکروں کی ڈھیریوں کے چٹے بنا رہے تھے' کچھ بڑے اور گہرے گڑھے مٹی سے بھر کر ہموار کر رہے تھے۔ ان گڑھوں سے کنکر نکالے جا چکے تھے۔ دو ڈھائی سال بعد مٹی سے بھرے جانے والے ان گڑھوں میں پھر کنکر پیدا ہو جاتے ہیں۔ انھیں کھود کر نکال لیا جاتا ہے۔

مزدور اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ چمکتی دھوپ میں ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ وہ بار بار پیشانیوں سے پسینہ پونچھتے۔ قریب ہی بوسیدہ چھولداری استادہ تھی۔ چھولداری کے سامنے ٹھیکے دار کا منشی چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ وہ اونچی آواز سے مزدوروں کو ہدایات دیتا اور ڈانٹتا پھٹکارتا۔

رحیم داد منڈیر کی آڑ سے مزدوروں کو کام کرتے دیکھتا رہا۔ منشی کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ رحیم داد خوف زدہ ہو گیا۔ اسے اپنے سر پر خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ وہ پلٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پھر جھنگر میں گھس گیا اور چلتے چلتے جھل میں پہنچ گیا۔ فراش کے درختوں کے نیچے ٹھنڈک تھی۔

وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اسے ابھی تک لالی کے آنے کی توقع تھی۔ ہر

آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ چونک کر ادھر ادھر نظریں دوڑاتا' مگر لالی کو نہ پا کر سخت مایوس ہوتا۔

وقت گزرتا رہا۔ اسے بھوک نے ستایا مگر پیاس کا غلبہ زیادہ تھا۔ وہ بے قرار ہو کے کھڑا ہو گیا اور پانی کی تلاش میں سک نالے کی جانب بڑھا۔ جھل کے بائیں کنارے پہنچ کے اس نے درختوں کی آڑ سے دیکھا۔ سامنے نشیب میں سک نالا ٹیلوں اور ٹبّوں کے درمیان سے بل کھاتا ہوا گزرتا تھا۔ سک نالے کی خشک ریت کے ذرے دوپہر کی زرد' زرد دھوپ میں جھلملا رہے تھے۔ ایک ٹیلے کے دامن میں جگ مگ کرتی چھوٹی سی جھیل تھی۔ یہ ٹوبھا تھا۔ اس میں ابھی تک پچھلی بارش کا پانی موجود تھا۔

ہوا کے جھونکوں سے ٹوبھے میں ہلکی ہلکی لہریں ابھر رہی تھیں۔ ٹوبھا زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ پانی دیکھتے ہی رحیم داد کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے نشیب میں اترنے لگا۔

کچھ ہی نیچے اترا ہو گا کہ نشیب میں اسے جھاڑیوں کے قریب انسانی سایہ نظر آیا۔ رحیم داد ٹھٹکا۔ گردن بڑھا کر چوکنا نظروں سے دیکھا کہ ایک شخص گردن جھکائے جنگلی پودوں کی پتیاں توڑ توڑ کر ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلے میں ڈال رہا ہے۔

وہ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کی سفید قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پر مٹھی' سوا مٹھی گول کترواں ڈاڑھی' آنکھوں پر پرانی وضع کی عینک اور سر پر اونچی باڑ کی سیاہ جناح کیپ۔ وہ حکیم نذر محمد چشتی تھا۔ رحیم داد سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ لیکن پتیاں توڑنے کی محویت میں اس نے رحیم داد کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔

سامنے ٹوبھا تھا۔ اس کا پانی دھوپ میں جگمگا رہا تھا۔ رحیم داد کو بہت شدت کی پیاس لگی تھی۔ اس نے ہمت سے کام لیا' چادر سے جیل کی وردی اچھی طرح چھپائی اور حکیم چشتی کی نظروں سے بچتا بچاتا ٹوبھے کی سمت بڑھنے لگا۔

وہ احتیاط سے نشیب میں اتر رہا تھا۔ پھر بھی پتھر کا ایک ٹکڑا اس کے پیروں سے ٹکرا گیا اور لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ آہٹ پر حکیم نے گردن موڑی اور رحیم داد کو دیکھ کے سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد اسے نظر انداز کرتے ہوئے نیچے اترنے لگا۔

حکیم نے اسے ٹوکا۔ "گل سنتا جی!"

رحیم داد نہیں رکا۔ وہ ڈھلان سے نیچے اترا اور ٹوبھے کی جانب نظریں اٹھائے آگے بڑھتا گیا۔ دونوں کے درمیان فاصلہ اور کم ہو گیا۔

اس دفعہ حکیم چشتی نے اسے کسی قدر بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ "میں نے کہا' بادشاہو! کتھے بڑھے چلے جا رہے ہو؟ بات تو سنو۔" رحیم داد ٹھٹکا لیکن اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ حکیم چشتی نے مسکرا کر پوچھا۔

"ٹوبھے پر پانی پینے جا رہے ہو؟"

رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں جی! پانی ہی پینے جا رہا ہوں۔ سخت پیاس لگی ہے۔"

"ناں ناں۔" حکیم نے انگلی کے اشارے سے منع کیا۔ "ٹوبھے کے پانی میں جونکیں ہیں۔" وہ آہستہ آہستہ رحیم داد کی جانب بڑھا۔ "تم ادھر کھالے کے پاس کنکر تو نہیں نکالتے؟" اس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔

"تم مجھے نئے مزدور لگتے ہو۔ پہلی بار' ادھر آئے ہو کیا؟"

رحیم داد نے مختصر جواب دیا۔ "ہاں جی!"

"میں نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "میں یہاں اکثر آتا ہوں۔ کنکر کی کھدائی کرنے والے مزدور بھی کبھی کبھار ٹوبھے پر نہانے یا پانی پینے ادھر آنکلتے ہیں۔" حکیم نے قدرے تامل کیا۔

"ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مزدور میرے سامنے ٹوبھے پر آیا۔ اس نے چلو بھر بھر کر پانی پیا۔ بہت زیادہ پیاسا لگتا تھا۔ پانی پی کر ستانے کے لیے ایک جھاڑی کے سائے میں بیٹھ گیا۔ یہی آگ گرمیوں کے دن تھے۔ نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ میں نے اس کی جانب دھیان نہیں دیا' گردن جھکائے بوٹیاں توڑتا رہا۔ اچانک میں نے ابکائی کی آواز سنی۔ پلٹ کر دیکھا کہ وہ الٹی کر رہا ہے۔ الٹی میں خون ہی خون نکلا۔ الٹی کے بعد وہ نڈھال ہو کے زمین پر لیٹ گیا اور اکھڑی اکھڑی سانسیں بھرنے لگا۔ میں جھٹ اس کے پاس پہنچا اور کلائی تھام کے نبض دیکھنے لگا۔"

"لگتا ہے جی! تسیں حکیم ہو؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ہاں' میں حکیم ہوں۔" اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "میرا نام صوفی حکیم نذر محمد چشتی ہے۔" حکیم نے بات جاری رکھی۔ "ہاں تو جی! میں کہہ رہا تھا' کہ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ مگر اس کی بیماری میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بہت غور کرنے پر اتنا پتہ چلا کہ اس کے پیٹ میں کوئی زہریلی چیز چلی گئی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے پیٹ سے کیسے نکالا جائے۔ اس وقت اپنے پاس کوئی دوائی بھی نہیں تھی۔ فیر ایسا ہوا کہ مریض نے خون کی قے کی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔"

رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "اسے بیماری کیا تھی جی؟"

"وہ بیماری کوئی بہت ہوشیار اور تجربہ کار حکیم ہی سمجھ سکتا تھا۔ مریض کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر' میں خود پریشان ہو گیا تھا۔ فوری طور پر علاج نہ کیا جاتا تو وہ مر جاتا۔ میں نے مرض کی تشخیص تو کرلی تھی۔ غور کرتے کرتے علاج بھی سمجھ میں آگیا۔ جھٹ ٹوبھے پر پہنچا۔ پانی پر جگہ جگہ کائی جمع تھی۔ میں نے کندھے پر پڑا ہوا پرنا اتارا اور اس میں ڈھیر ساری کائی بھرلی۔ گھڑا بھر کائی ہوگی۔ مریض کے پاس پہنچا اور اسے کائی کھلانے لگا۔"

"اس نے کائی کھالی جی؟"

"نہیں جی! وہ کائی کھانے پر بالکل تیار نہیں تھا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے' بڑی ضد کی۔ مگر میں نے اس کا منہ کھول کے زبردستی ساری کائی کھلا دی۔"

"ذرا دیر بعد اس نے ابکائیاں لینی شروع کر دیں۔ الٹی کی۔ الٹی میں کائی کے ساتھ خون بھی نکلا۔ میں جو چیز باہر نکالنا چاہتا تھا' وہ الٹی کے ساتھ' پیٹ سے باہر آگئی۔ وہ جونک تھی۔ یہ لمبی۔" اس نے ایک انگلی بڑھا کے رحیم داد کے سامنے کر دی۔ "جونک ٹوبھے کے پانی کے ساتھ اس کے پیٹ میں چلی گئی تھی۔ جونک باہر نکلتے ہی مریض کی حالت سنبھلنے لگی۔ الٹی بند ہو گئی۔ بالکل چنگا ہو گیا۔ صرف کمزوری رہ گئی تھی۔"

"یہ کب کی گل ہے جی؟"

"پچھلے ہی سال کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد کنکر کی کھدائی کرنے والوں میں سے کوئی ادھر پانی پینے نہیں آتا۔ میں نے تو سنا ہے کہ ٹھیکے دار نے پینے کے پانی کا ادھر ہی بندوبست کر دیا ہے۔ تم کیسے ادھر آگئے پانی پینے؟"

رحیم داد نے خود کو سنبھالا۔ جھٹ بات بنائی۔ "وہ ایسا ہے جی! میں پہلی بار مزدوری کے لیے ادھر گیا تھا پر کام نہیں ملا۔ میں اس طرف چلا آیا۔ ٹوبھا دیکھ کر پیاس لگی۔" اس نے مڑ کر ٹوبھے کی جانب دیکھا جس میں ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں' چمکیلی دھوپ میں آئینے کی کرچیوں کے مانند جھلملا رہی تھیں۔ رحیم داد کو ایک بار پھر شدت سے پیاس محسوس ہوئی۔ بے قرار ہو کر بولا۔

"زبردست پیاس لگی ہے جی! کیا کروں؟"

"پریشان نہ ہو۔" حکیم نے اسے تسلی دی۔ "میرے پاس پینے کا پانی ہے۔ میں جب بھی یہاں آتا ہوں' روٹی پانی ساتھ لاتا ہوں۔"

رحیم داد نے عاجزی سے کہا۔ "حکیم جی! مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔" اس نے خشک ہونٹوں پر

زبان پھیری اور منہ کھول کر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ حکیم نے اس کی بے قراری محسوس کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "آؤ' میرے ساتھ۔" وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ چلا۔

چند ہی قدم پر ایک گھنی جھاڑی تھی۔ جھاڑی کے قریب پہنچ کر حکیم ٹھہر گیا۔ رحیم داد بھی رک گیا۔ جھاڑی کے نیچے مٹی کے تودے پر المونیم کا ناشتے دان رکھا تھا۔ قریب ہی چھوٹا سا سفری تھرماس بھی تھا۔

حکیم نے آگے بڑھ کر ناشتا دان اور تھرماس اٹھایا اور جھاڑی کے نیچے صاف ستھری جگہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ حکیم نے تھرماس کھولا' ڈھکنے میں پانی انڈیلا اور رحیم داد کی جانب بڑھایا۔ "لو پیاس بجھانے کے لیے تھوڑا سا پی لو۔" رحیم داد سارا پانی ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔

حکیم نے تھرماس کا خالی ڈھکنا اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "میں تمہیں پینے کے لیے اور پانی نہیں دوں گا۔ اب روٹی کھالو' پھر پانی پینا۔ خالی پیٹ پانی پینا مناسب نہیں ہوتا۔ لگتا ہے' تم نے سویرے سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے؟"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ حکیم نے ناشتے دان کھولا۔ اس میں بھنا ہوا گوشت تھا اور روٹیاں تھیں۔ حکیم نے ایک روٹی نکالی' رحیم داد کی جانب بڑھائی۔ دوسری اپنے ہاتھ میں دبا کر بولا۔ "لو جی! بسم اللہ کرو۔" اس نے لقمہ لیا۔

رحیم داد بھی کھانا کھانے لگا۔

حکیم نے کھانا کھاتے کھاتے کہا۔ "میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا تم پہلی بار ادھر آئے ہو۔ اتفاق سے میں آج یہاں موجود تھا ورنہ تم بھی ٹوبھے کا پانی پی کر بیمار پڑ جاتے۔"

"کیا ٹوبھے کا پانی پی کر سبھی بیمار پڑ جاتے ہیں؟"

"نہیں' صرف وہ بیمار پڑتے ہیں جن کے پیٹ میں پانی کے ساتھ جونکیں چلی جاتی ہیں۔ ویسے ٹوبھے کا پانی پینے سے پیٹ کی دوسری بیماریاں بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ ٹھہرا ہوا پانی صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔"

"حکیم جی! تسیں روز ادھر آتے ہو؟"

"نہیں' مجھے اتنی فرصت کہاں کہ روز روز آؤں۔ کبھی تو مہینوں نہیں آتا۔" وہ مسکرایا۔ "تم سوچ رہے ہو گے' میں اس ویرانے میں کس لیے آتا ہوں۔ یہی سوچ رہے ہو نا؟"

رحیم داد نے روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ "ہاں جی۔"

"میں یہاں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں آتا ہوں۔" حکیم چشتی نے ہاتھ اٹھا کر ادھر ادھر لہرایا۔

"یہ جھاڑیاں اور بوٹے دیکھ رہے ہو۔ یہ قدرت کا ان مول خزانہ ہے۔ ان بوٹوں کی پتیوں' جڑوں' ڈنٹھلوں میں نہ جانے کیسی کیسی بیماریوں کا علاج چھپا ہوا ہے۔ مگر اسے ڈھونڈنے اور پہچاننے کے لیے نظر چاہیے۔" عینک کے شیشوں کے پیچھے حکیم چشتی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ دلچسپی اور توجہ سے رحیم داد کو بتاتا رہا۔

"یہ خودرو بوٹے ہیں۔ ہر موسم میں اگتے ہیں۔"

"کئی بوٹے تو جی فصلوں کے ساتھ کھیتوں میں نکل آتے ہیں۔" رحیم داد نے بھی اپنی معلومات کا اظہار کیا۔

"یہ عجب بات ہے۔" حکیم مسکرا کر بولا۔ "کھیتوں میں بوائی سے پہلے پوری طرح صفائی کی جاتی ہے تب بیج ڈالے جاتے ہیں۔ مگر فصل کے ساتھ ایسے خودرو بوٹے ضرور نکلتے ہیں جو دوا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ہی زمین پر ایک ہی سی کھاد ڈالنے اور ایک ہی طرح پانی لگانے کے باوجود دونوں فصلوں پر مختلف بوٹے اگتے ہیں۔ ربیع کے الگ ہوتے ہیں' خریف کے الگ۔ ان میں السی' سداب' حرمل' کاسنی' کلتھی' منڈی' کچری' سرپھوکہ' شاہترا' بتھوا اور ایسی ہی نہ جانے کتنی جڑی بوٹیاں شامل ہوتی ہیں۔" حکیم نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ "پتہ ہے' یہ کتنی مفید اور کار آمد بوٹیاں ہوتی ہیں؟"

"میں توں ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں جی؟"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" حکیم کھل کر مسکرایا۔ "تمہاری طرح اور بھی بہت ہیں جن کو یہ پتہ نہیں کہ السی' اخراج بلغم کے لیے نہایت مفید ہے۔ محلل اورام ہے' مسکن ہے۔ تم نے سداب کا بوٹا دیکھا ہو گا۔ گندم کے بوٹوں کے ساتھ ہی اگتا ہے۔ دو گز تک اونچا ہوتا ہے۔ سداب پیٹ کی بیماریوں کے علاوہ تشنج' قولنج اور نفخ شکم رفع کرتا ہے۔ اسی طرح حرمل' جسے اسپند بھی کہتے ہیں' مقوی اعصاب ہے۔ اس کے بیجوں میں تیل وافر مقدار میں ہوتا ہے جو بدن سے رطوبت خارج کرتا ہے۔ کاسنی کی بوٹی جگر کے امراض کے لیے مخصوص دوا ہے۔ اس کے پتے' بیج اور جڑ' سب کام آتے ہیں۔ یہ حرارت بجھاتی ہے۔ پیاس کی شدت دور کرتی ہے۔ محلل اور مسکن ہے۔ یرقان کے مریض کو شفا دیتی ہے۔"

حکیم نذر محمد چشتی نہایت سنجیدگی سے علم طب کے اسرار و رموز بیان کرتا رہا۔ "منڈی اور سرپھوکہ' مصفی خون ادویات ہیں۔ کلتھی مشہور بوٹی ہے۔ پتھری توڑتی ہے۔ کچری' پیٹ کے مروڑ اور بلغمی امراض کے لیے نہایت مجرب ہے۔ اسی طرح دوسری جڑی بوٹیوں کے بھی خواص ہیں۔

کہاں تک بیان کروں۔"

"حکیم جی! تسیں انھیں اتنی کام کی بوٹیاں بتاتے ہو پر کھیتوں کی گوڈی اور تلائی کرتے ہوئے ان کو نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔" رحیم داد نے حکیم کو مطلع کیا۔

"یہی تو ظلم ہے۔" حکیم چشتی بے قرار ہو کر بولا۔ "افسوس کہ لاعلمی کے باعث اتنی کارآمد جڑی بوٹیاں کھیتوں سے اکھاڑ کر ضائع کر دی جاتی ہیں۔ جنگل یا ویرانے میں پیدا ہوں تو مویشیوں کی خوراک بن جاتی ہیں۔ موسم کے سرد و گرم کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہیں۔" رحیم داد سر جھکائے چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

حکیم نے بات جاری رکھی۔ "میں ان جڑی بوٹیوں سے مختلف دوائیاں تیار کرتا ہوں۔ کمال گڑھ میں میرا مطب ہے۔ دور دور سے مریض آتے ہیں۔"

کھانے سے فارغ ہو کر حکیم نے ناشتے دان میں بچا کھچا کھانا ڈالا اور اسے تھرموس کے ساتھ ایک طرف سنبھال کر رکھ دیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ میں خشک برساتی نالا' ریگ زار جیسا نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ مگر جھاڑی کے سائے میں سکون تھا' ٹھنڈک تھی۔ ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ لو بھی پانی جھلملا رہا تھا۔ رحیم داد کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ نیند کا غلبہ بہت بڑھا تو وہ کھڑا ہو گیا۔ حکیم نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"کہاں چلے؟"

"میں نے تو جی اپنے پنڈ واپس جانا ہے۔"

حکیم نے اسے جانے نہیں دیا۔ "اس وقت دوپہر میں جا کر کیا کرو گے؟ میرا کہا مانو تو ٹھہر جاؤ۔ دن ڈھلے دونوں اکٹھے چلیں گے۔ میں کمال گڑھ جاؤں گا۔ تم اپنے پنڈ چلے جانا۔" رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا۔ وہ ٹھہرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے؟ وہ خاموش کھڑا رہا۔ حکیم مسکرا کر بولا۔

"دھوپ ڈھلنے تک یہاں ٹھہر جاؤ۔ بوٹیاں چننے میں میری مدد کرو۔ تمہیں اور کوئی کام بھی تو ہے۔ گھر ہی تو جانا ہے۔ چلے جانا۔"

"میں نوں تو جی یہ بھی پتہ نہیں کون سی بوٹی توڑنی ہے؟"

حکیم بے تکلفی سے ہنسا۔ "تم فکر نہ کرو۔ آسانی سے شناخت کر لو گے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

دونوں جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ڈھلان کے پاس پہنچے۔ حکیم نے ایک پودے کی

جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ رہا وہ بوٹا۔"

پودا بالشت سوا بالشت اونچا تھا۔ اس کی پتیاں نوکیلی تھیں۔ شاخوں میں باریک باریک کانٹے تھے اور چند ننھے' ننھے زرد پھول بھی لگے تھے۔

حکیم نے جھک کر پودا اکھاڑا اور رحیم داد کو دکھا کر بولا۔ "اس بوٹے کا نام سنکھنی ہے۔ یہ ندی نالوں کے کنارے پتھریلی زمین میں اگتا ہے۔ اس کی عجب تاثیر ہے۔ اس کی جڑ ابال کر پیو' خونی یا بادی کیسی بھی بواسیر ہو' فوراً افاقہ ہو گا۔ بچوں کے پیٹ میں کیڑے پڑ جائیں' جڑ پیس کر' ذرا سا شہد ملا کر چٹاؤ' سارے کیڑے فضلے کے ساتھ پیٹ سے نکل جائیں گے۔ کالی کھانسی ہو تو اسے جلا کر ہاون دستے میں کوٹ لو' باریک کپڑے سے چھان کر سفوف بنا لو۔ تھوڑا سا نمک ملاؤ' رات کو سوتے وقت مریض کو ایک چٹکی کھلا کر گرم پانی پلا دو۔ چوتھے روز کالی کھانسی جاتی رہے گی۔ جڑ قوت باہ کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔ گھیکوار کے ساتھ پیس کر حلوہ بنا لو۔ اس میں حسب ضرورت پستے' بادام ڈالو۔ جاڑوں میں استعمال کرو۔ نہایت ممسک ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"لیکن یہ تو رئیسوں کے چونچلے ہیں' تم کہاں اس چکر میں پڑو گے؟"

"اپنی تو جی ساری گل ہی سمجھ نہیں آئی۔ اس چکر میں کیا پڑنا۔"

"اچھا ہی ہے تم اسے نہ سمجھو۔ تم ابھی تکڑے جوان ہو۔ تمہیں کسی ایسے نسخے کی کیا ضرورت لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ آزمودہ اور مجرّب نسخہ ہے۔" حکیم چشتی سنکھنی کا پودا گھما پھرا کر دیکھنے لگا۔

"جڑ کی اور بھی بہت خوبیاں ہیں' کہاں تک بیان کروں۔"

"پر میں نے تو جی تمہیں اس کی پتیاں توڑ کر تھیلے میں ڈالتے دیکھا تھا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" حکیم مسکرانے لگا۔ "میں تو تمہیں اس بوٹے کی خصوصیات بتا رہا تھا۔ جڑ کی طرح اس کی شاخیں اور ڈنٹھل بھی بہت سی بیماریوں کا علاج ہیں۔ اسی طرح اس کے پھولوں اور پتیوں کی بھی خصوصیات ہیں۔" وہ پتیاں توڑ توڑ کر ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلے میں ڈالنے لگا۔ "مجھے آج کل اس کی پتیوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں ان پتیوں سے کئی پیچیدہ امراض کا علاج دریافت کرنے کا تجربہ کر رہا ہوں۔ مجھے اس میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔"

حکیم نے تمام پتیاں توڑ کر تھیلے میں ڈالیں اور پودا ایک طرف پھینک دیا۔ رحیم داد چپ کھڑا رہا۔ حکیم آگے بڑھا۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر سنکھنی کے پودوں کا جھرمٹ نظر آیا۔ حکیم کے

چہرے پر مسرت پھیل گئی۔

"لو جی! اپنا کام تو بن گیا۔" اس نے پودوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سب سنکھری کے بوٹے ہیں۔ اب تو تم بھی انھیں پہچان سکتے ہو۔ اچھا' اب ان کی پتیاں توڑ توڑ کر اکٹھی کرو۔" اس نے اپنا تھیلا رحیم داد کو تھما دیا۔

رحیم داد خاموشی سے پتیاں توڑ توڑ کر تھیلے میں ڈالتا رہا۔ حکیم کچھ دور کھڑا تھا۔ رحیم داد کو جھاڑیوں کی الجھی ہوئی شاخوں کی آڑ سے اس کی پیٹھ کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ وہ جھکا ہوا یا تو پتیاں توڑ رہا تھا یا کسی پودے کا معائنہ کر رہا تھا۔

رحیم داد پتیاں توڑ کر تھیلے میں ڈالتا اور متجسّس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا بھی جاتا۔ اسے ابھی تک لالی کا انتظار تھا۔ ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی تھا کہ اگر لالی گرفتار ہو گیا تو پولیس اب سرگرمی سے اس کی تلاش میں ہو گی۔

☆

سائے سمٹتے جا رہے تھے۔ سک نالے کی ریت کے ذرے دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد سائے میں کھڑا تھا۔ گر موٹی چادر نے اس کا جسم پسینے سے تر کر دیا تھا۔ حکیم کے سامنے وہ چادر اتارنا نہیں چاہتا تھا۔

رحیم داد نے سنکھری کے تمام پودوں کی پتیاں تھیلے میں بھر لیں۔ مگر تھیلا ابھی خالی تھا۔ وہ اسے ہاتھ میں دبائے حکیم کی جانب چلا۔ حکیم پتیاں توڑ توڑ کر اپنی ٹوپی میں بھر رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر حکیم نے گردن موڑی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد کیکر کے ایک گھنے درخت کے نیچے سے گزرتا ہوا آگے بڑھا۔ یکایک وہ ٹھوکر کھا کے لڑکھڑایا۔ اس کی چادر کیکر کی خاردار شاخوں میں الجھ گئی۔ رحیم داد دھڑام سے زمین پر گرا۔ سب کچھ آناً فاناً ہوا۔ رحیم داد جیل کی وردی میں زمین پر پڑا تھا اور اس کی چادر ایک شاخ سے الجھی ہوئی لٹک رہی تھی۔ حکیم لپک کے اس کے نزدیک پہنچا۔ رحیم داد گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔

حکیم نذر محمد چشتی نے ہمدردی سے کہا۔ "چوٹ تو نہیں آئی؟" اس نے رحیم داد کے جسم پر جیل کی وردی اور اس پر پڑا ہوا دھندلا نمبر مشتبہ نظروں سے دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر ہکلانے لگا۔

"تم...... تم؟"

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے چادر شاخ سے اتارا کر اوڑھ لی مگر حکیم سے نظریں نہیں ملائیں۔ اس کا تھیلا گرتے وقت ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ تھیلے سے پتیاں بھی نکل کر بکھر گئیں

تھیں۔

رحیم داد اکڑوں بیٹھ کر خاموشی سے پتیاں اٹھا اٹھا کر تھیلے میں ڈالنے لگا۔ حکیم اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ رحیم داد نے ساری پتیاں تھیلے میں بھر دیں اور کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے رہے' پھر حکیم کی آواز ابھری۔ "کیا تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو؟"

رحیم داد گردن جھکا کر آہستہ سے بولا۔ "ہاں جی!"

"تمہارا روّیہ اور حلیہ دیکھ کر مجھے پہلے ہی شک گزرا تھا۔" حکیم نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ کل رات نہر کے کنارے تبوں پر پولیس کے ساتھ تمہاری گولی چلی تھی۔ تم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر تمہارا ساتھی پکڑا گیا۔"

رحیم داد نے گھبرا کر پوچھا۔ "تمیں نوں کیسے پتہ چلا وہ پکڑا گیا؟"

"سویرے جب میں اِدھر آ رہا تھا تو شہر سے بس میں تین کانسٹیبل بھی سوار ہوئے۔ وہ قادر آباد تک آئے۔ ان میں سے ایک کانسٹیبل میرا جاننے والا نکل آیا۔ اس کی گھر والی میرے زیرِ علاج رہ چکی ہے۔ بے چاری کو عرق النسا کی بیماری ہے۔ اسی کانسٹیبل سے دوران گفتگو معلوم ہوا کہ تمہارا ساتھی پکڑا گیا اور اب پولیس کی حراست میں ہے۔" رحیم داد کے چہرے پر پریشانی چھا گئی۔ حکیم کچھ دیر خاموش رہ کر نرم لہجے میں بولا۔

"تم کوئی بھی ہو' مجھے تم سے کیا لینا۔ پر میں اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔"

رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔ "فیر تے میں نوں یہاں سے چھیتی نال ٹر جانا چاہیے۔" اس نے خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"تم اس وقت کہاں جاؤ گے؟" حکیم چشتی نے دریافت کیا۔

"مجھے خود پتہ نہیں جی کہاں جانا ہے۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ لالی جہاں لے جاتا' میں وہیں چلا جاتا۔ وہی مجھے جیل سے نکال کر لایا تھا۔ آگے کا بھی اسی کو پتہ تھا۔"

"خطرہ تو تمہارے لیے یہاں بھی ہے۔ مگر اس وقت کہیں جانا اور بھی زیادہ خطرناک ہو گا۔" حکیم نے اسے مشورہ دیا۔ "میری مانو تو سورج ڈوبنے تک یہیں رہو۔ شام ہو جائے تو اندھیرے میں جدھر تمہارا جی چاہے نکل جانا۔ آگے تمہاری مرضی۔"

رحیم داد نے حکیم کا مشورہ قبول کر لیا اور اس کے ساتھ سنکھنی کے پودوں سے پتیاں توڑ توڑ کر تھیلے میں ڈالنے لگا۔

دونوں جھاڑیوں کے درمیان ادھر ادھر گھومتے رہے۔ رحیم داد ابھی تک اپنا جسم چادر سے چھپائے ہوئے تھا۔

حکیم نہایت انہماک سے پتیاں توڑ توڑ کر اپنی ٹوپی میں ڈالتا جا رہا تھا۔ ٹوپی بھر جاتی تو پتیاں رحیم داد کے ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلے میں ڈال دیتا۔ رحیم داد نے پتیاں توڑتے توڑتے حکیم سے دریافت کیا۔

"حکیم جی! تمیں خالی پتیاں کیوں اکٹھی کر رہے ہو؟"

حکیم چشتی اس کی بات سن کر مسکرایا۔ "جڑ اور ڈنٹھلوں کا میرے پاس پہلے ہی وافر ذخیرہ ہے۔ آج کل مجھے صرف پتیوں کی ضرورت ہے۔ میں ان دنوں ایک نئی دوا تیار کر رہا ہوں۔ اس کی تیاری پر بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔" اس نے ٹوپی میں بھری ہوئی پتیاں تھیلے میں ڈال دیں۔ "انھیں بھگنے کے لیے رات بھر اوس میں رکھوں گا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے پہلے اٹھا کر کورے گھڑے میں بھر دوں گا۔ پھر گھڑے پر ڈھکنا رکھ کر گیلی مٹی کے لیپ سے اس کا منہ اچھی طرح بند کروں گا۔ اس کے بعد زمین میں کمر تک گہرا گڑھا کھودوں گا' اس میں گھڑا رکھوں گا۔ اسے اپلوں سے بھر کر مٹی سے ہموار کروں گا۔ جب برسات گزر جائے گی تو زمین کھود کر گھڑا باہر نکال لوں گا۔ اس وقت تک گھڑے میں خوب خمیر اٹھ آئے گا۔ پتیاں گل سڑ کر گاڑھی گاڑھی لگدی سی بن جائیں گی۔ اس لگدی میں حسب مقدار عود صلیب' زراوند طویل' عاقرقرحا' زیرہ سیاہ' خولنجان' رب السوس اور اسطوخودوس شامل کروں گا۔ پھر اسے کھرل میں پیس کر مٹر کے دانے برابر گولیاں بناؤں گا۔ یہ گولیاں سائے میں سکھائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد سمجھو' دوا تیار ہو گئی۔"

رحیم داد حیرت سے حکیم کی باتیں سنتا رہا۔ "دوائی کی تیاری میں تو جی بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔"

"محنت تو واقعی بہت کرنی پڑتی ہے۔" حکیم نے گردن اٹھائی اور کھل کر مسکرایا۔ "مگر یہ ایسے مرض کی دوا ہے جسے لاعلاج کہا جاتا ہے۔ یہ مرگی کا مرض ہے۔ اسے طب یونانی میں ام الصبیان اور عربی میں صرع کہا جاتا ہے۔ تم نے مرگی کے مریض تو دیکھے ہوں گے؟"

"دیکھے ہیں جی' بالکل دیکھے ہیں۔ میرے پڑوسی کرامت کو یہی روگ ہے۔ بہت علاج کئے پر اب تک اس کی بیماری نہیں گئی۔"

"اس مرض کا سبب وہ سدّہ ہوتا ہے جو دماغ کے بعض بطون اور اعصاب کے بعض حصوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہی اعصاب ہوتے ہیں جو اعضا کو حرکت دیتے ہیں اور قوت حس ان کی طرف پہنچاتے ہیں۔ جب تک اس سدّے کو رفع نہ کیا جائے مرض ختم نہیں ہوتا۔" حکیم چشتی نہایت بلیغ انداز میں مرگی کے مرض کے بارے میں بتاتا رہا۔ رحیم داد خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ حکیم نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"تم اپنے پڑوسی کو میرے پاس لانا۔ میری گولیوں کے استعمال کے بعد اسے یہ بیماری کبھی نہیں ہو گی۔ بالکل چنگا ہو جائے گا۔ کہتے ہیں' مرگی لاعلاج مرض ہے مگر میں نے اس کا علاج دریافت کر لیا ہے۔" وہ ہاتھ اٹھا کر جوش و خروش سے بولا۔ "کتنے ہی مریضوں کو اس دوا سے بھلا چنگا کر چکا ہوں۔ یہ تیر بہدف علاج ہے۔ نہایت مجرّب اور آزمودہ ہے۔ میرا دعویٰ ہے۔" حکیم کی زبان اچانک لڑکھڑانے لگی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا اور خاموش ہو گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں چڑھ گئیں۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ لڑکھڑایا اور دھڑام سے زمین پر گرا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ حکیم پر مرگی کا دورہ پڑا تھا۔

وہ بے ہوش تھا اور رحیم داد اسے حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے جھک کر حکیم کو آہستہ آہستہ جھنجوڑا۔ مگر حکیم بے سدھ پڑا رہا۔ اس کی سانس رک رک کر چل رہی تھی اور حلق سے ہلکے' ہلکے خرانوں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ رحیم داد حیران و پریشان کھڑا اسے تکتا رہا۔

☆

ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ دھوپ ریت کے ذروں پر جھلملا رہی تھی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں اچانک تیز چمک پیدا ہوئی۔ اس نے چوکس نظروں سے ادھر ادھر دیکھا مگر دور دور تک نہ آدم تھا' نہ آدم زاد۔

رحیم داد نے جھٹ چادر ایک طرف پھینکی۔ جلدی جلدی جیل کی وردی اتاری اور حکیم کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے حکیم کی شلوار اتاری اور اسے پہن کر قمیص بھی اتارنے لگا۔ اس نے حکیم کی قمیص بھی پہن لی۔

حکیم زمین پر ننگا دھڑنگا پڑا تھا۔ اس کے منہ سے سفید سفید جھاگ نکل کر ہونٹوں کے گوشوں پر پھیل گیا تھا۔ حکیم مردے کے مانند بے جان نظر آ رہا تھا۔

رحیم داد نے حکیم کے کپڑے پہننے کے بعد چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ وہ چند قدم چلا پھر ٹھہر گیا۔ اس نے حکیم کے پیروں سے جوتے نکالے اور انھیں پہننے لگا۔ جوتے ذرا تنگ تھے' مگر اس نے کسی نہ کسی طرح پہن ہی لیے۔ حکیم ابھی تک بے حس و حرکت پڑا تھا۔ رحیم داد قریب کھڑا تیکھی نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

اس نے جیل کی وردی حکیم کو پہنا دی۔ حکیم نذر محمد چشتی کی ٹوپی اٹھائی' آنکھوں سے عینک اتاری' ایک بار پھر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور اس ٹیلے پر چڑھ گیا جس کے نیچے حکیم بے ہوش پڑا تھا۔

ٹیلے پر پہنچ کر اس نے نیچے دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ٹیلے کے نیچے حکیم چشتی نہیں' جیل کی وردی میں ملبوس وہ خود بے سدھ پڑا ہے۔ وہ اسے گھورتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر وحشت اور سختی چھا گئی۔ اس کی سانس تیز ہو گئی۔

حکیم کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ رحیم داد نے جھٹ قریب پڑا ہوا بھاری پتھر اٹھایا' سر سے بلند کیا اور تاک کر حکیم کے چہرے کی جانب پھینکا۔ پتھر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ حکیم کے حلق سے گھٹی ہوئی آواز نکلی اور خاموشی میں ڈوب گئی۔ اس کا چہرہ بھاری پتھر سے کچلنے کے بعد بری طرح مسخ ہو گیا۔ نہ آنکھیں نظر آ رہی تھیں' نہ ناک اور کان۔ اس کا پورا چہرہ گوشت کا کٹا پھٹا لوتھڑا بن گیا تھا۔ حکیم کا جسم ذرا دیر تک پھڑکتا رہا پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔

رحیم داد چٹان سے اتر کے حکیم کی لاش کے قریب گیا۔ اس نے پتھر اٹھا کر حکیم کا چہرہ اور مسخ کر دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ بھی پتھر سے کچل ڈالے۔ وہ کوئی ایسا نشان چھوڑنا نہیں چاہتا تھا جس سے اس کی شناخت ہو سکے۔

لاش پوری طرح مسخ کرنے کے بعد وہ اس جھاڑی کے نیچے گیا جہاں حکیم کا ناشتے دان اور تھرماس رکھا تھا۔ اس نے ناشتے دان اور تھرماس پتیوں سے بھرے ہوئے تھیلے میں ٹھونسے۔ حکیم کی ٹوپی اوڑھی' عینک لگائی۔ اپنی چادر لاش کے قریب ڈالی۔ ٹوبھے پر پہنچا۔ خون سے بھرے ہوئے ہاتھ پانی سے دھوئے۔

ہاتھ دھو کے وہ ٹوبھے کے کنارے کنارے کچھ دور چلتا رہا' پھر جھاڑیوں میں گھس گیا اور جھاڑیوں سے گزر کر ایک ٹیلے پر چڑھنے لگا۔

بلندی پر پہنچ کے اس نے دیکھا دور دور تک اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبّے ہیں۔ آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور فراش کے ایک گھنے درخت کے سائے میں ٹھہر گیا۔

درخت سے چند قدم دور ایک اونچے ٹیلے کی چوٹی تھی اور اس کے نشیب میں جنگلی جھاڑیوں اور خود رو پودوں کا بہت گھنا جھنڈ تھا۔

رحیم داد نے سوچا' ہاتھ میں دبا ہوا تھیلا جھاڑیوں کے پیچھے چھپا دے۔ وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچا اور خود رو پودے روندتا ہوا جھنڈ کے اندر چلا گیا۔

جھاڑیوں کے پیچھے اسے غار نظر آیا۔ غار دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے گردن جھکا کے غار میں جھانکا۔ غار بالکل خالی تھا۔ اور اتنا گہرا اور کشادہ تھا کہ وہ اس میں اطمینان سے روپوش ہو سکتا تھا۔ مگر وہ ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا' جلد سے جلد کہیں دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس نے تھیلا غار کے ایک گوشے میں رکھ دیا۔

جھاڑیوں سے باہر نکلتے ہوئے اس نے سک نالے کی جانب دیکھا۔ عینک کے موٹے موٹے شیشوں سے صاف نظر نہیں آیا۔ اس نے عینک اتار کر قمیص کی جیب میں رکھ لی۔ اب اس کے سامنے نشیب میں سک نالا تھا جس کی ریت کے ذرے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ بائیں ہاتھ پر ٹوبھا تھا۔ اس کا پانی بھی جھلملا رہا تھا۔ ٹوبھے کے پار ایک جھاڑی کے قریب حکیم چشتی کی لاش پڑی تھی۔

رحیم داد لگ بھگ نصف فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مگر ٹیلے کی بلندی سے لاش صاف نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد سہمی ہوئی نگاہوں سے لاش تکنے لگا۔ پھر اس کی نظر نشیب سے بلندی کی جانب گئی۔ وہاں جھل تھا اور اسی جھل سے گزر کر وہ سک نالے میں اترا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جھل کے گھنے درختوں سے نکل کر ایک شخص باہر آ رہا ہے۔

رحیم داد گھبرا کے جہاں تھا' وہیں دبک گیا۔ مگر چوکنا نظروں سے اسے دیکھتا بھی رہا۔ وہ وضع قطع سے کنکر کی کھدائی کرنے والا مزدور لگتا تھا۔ مزدور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا ڈھلان سے نیچے اترا اور ٹوبھے کی جانب نظریں اٹھائے آگے بڑھنے لگا۔ رحیم داد جھاڑیوں کی آڑ سے بغور اسے دیکھتا رہا۔

چلتے چلتے مزدور نے گردن ذرا جھکا کر حکیم کی لاش کی طرف دیکھا اور ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے وہ لاش دیکھتا رہا' پھر آہستہ آہستہ لاش کے قریب گیا۔ جھک کر اسے دیکھا' لیکن فوراً سراسیمہ ہو کر پیچھے ہٹا' پلٹا اور تیزی سے چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ بلندی سے اس نے ایک بار پھر لاش دیکھی اور بھاگتا ہوا فراش کے درختوں کے نیچے چلا گیا۔ ذرا دیر میں وہ رحیم داد کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رحیم داد نے چاہا کہ جھاڑیوں سے نکل کر دور چلا جائے مگر وہ سما ہوا بیٹھا رہا۔ اس کے آس پاس چٹیل ٹیلے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ٹیلوں پر چلنا خطرے کو دعوت دینا تھا۔ خوف اور پریشانی سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

وہ جنگلی پودوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا خاموشی سے غار میں داخل ہو گیا۔ اس نے تھیلے سے تھرماس نکالا۔ ڈھکنا کھول کر دیکھا کہ تھرماس میں تھوڑا سا پانی موجود ہے۔ اس نے تھرماس منہ سے لگا کر گھونٹ بھر پانی پیا۔ پانی پینے سے کسی قدر سکون ملا۔ اس نے غار سے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

غار کی زمین خشک اور صاف ستھری تھی۔ رحیم داد سورج غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ غار میں نرم نرم جھونکے آ رہے تھے۔ رحیم داد نے تھیلے سے ناشتے دان نکال کر تھرماس کے ساتھ ایک کونے میں رکھ دیا اور پتیوں سے بھرا ہوا تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ مگر غار اتنا طویل نہیں تھا کہ وہ پوری طرح ٹانگیں پھیلا سکے۔ اس نے اپنا جسم کسی قدر سکیڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں لیکن نیند نہیں آئی آسے بار بار حکیم کا خون میں لتھڑا ہوا خوف ناک چہرہ نظر آتا۔ گھبرا کر وہ آنکھیں کھول دیتا۔

وقت گزرتا رہا۔ رحیم داد بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اسی عالم میں اسے نشیب میں ملی جلی انسانی آوازیں سنائی دیں۔

وہ پریشان ہو کر اٹھا اور غار سے نکل کر دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ اس نے جھاڑیوں کی آڑ سے دیکھا کہ حکیم نذر محمد چشتی کی لاش کے قریب کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ وہ کنکر کی کھدائی کرنے والے مزدور تھے۔ ان میں وہ مزدور بھی شامل تھا جس نے لاش سب سے پہلے دیکھی تھی۔ وہ گرد و نواح کے ٹیلے اور ٹبّے بھی متجسّس انداز سے دیکھ رہے تھے۔ چند مزدور ٹوبھے پر پہنچے۔ انھوں نے ٹوبھے کے پانی سے منہ ہاتھ بھی دھویا۔ وہ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے اور پریشان اور سہمے ہوئے نظر آتے تھے۔

مزدور لگ بھگ نصف گھنٹے تک لاش کے نزدیک کھڑے رہے یا اس کے آس پاس منڈلاتے رہے۔ آخر بلندی پر چڑھ کر جھل کے گھنے درختوں میں داخل ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد ویرانی چھا گئی۔

حکیم کی لاش جھاڑی کے پاس پڑی تھی۔ سورج اب ایسے رخ پر آ گیا تھا کہ دھوپ پوری طرح لاش پر پڑ رہی تھی۔ رحیم داد دوبارہ غار میں چلا گیا۔ مگر اس دفعہ لیٹا نہیں، سر جھکائے خاموش بیٹھا

رہا۔ اب دن ڈھلنے لگا تھا، سائے طویل ہو گئے تھے۔

رحیم داد بے چین ہو کر پھر غار سے نکلا۔ اس نے جھاڑیوں کی الجھی ہوئی شاخوں کے درمیان سے حکیم کی لاش دیکھی۔

دو گدھ لاش کے کھلے ہوئے چہرے سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ گدھوں اور چیلوں کا ایک غول اوپر فضا میں منڈلا رہا تھا۔ دھوپ مٹیالی پڑ گئی تھی۔ سورج مغرب میں فراش کے اونچے اونچے درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ چکا تھا۔ سک نالے پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔ گدھوں کے ساتھ اب چیلیں بھی لاش سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہی تھیں۔

رحیم داد جھاڑیوں کی اوٹ سے حکیم چشتی کے مردہ جسم کی درگت بنتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ گدھ پھرا مار کر اڑ گئے۔ چیلیں بھی اڑ کر ادھر ادھر فضا میں بکھر گئیں۔ پولیس کا ایک انسپکٹر چار کانسٹیبلوں کے ہم راہ ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی رحیم داد کے اوسان خطا ہو گئے۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

پولیس والے نشیب میں اترنے کے بعد لاش کی جانب بڑھے اور جھک جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگے۔ گدھوں اور چیلوں کا غول ابھی تک فضا میں منڈلا رہا تھا۔ انسپکٹر نے لاش کے بعد خون سے بھرے ہوئے پتھر کا بھی معائنہ کیا جس سے رحیم داد نے حکیم کا چہرہ اور ہاتھ کچل کر مسخ کر دیئے تھے۔

انسپکٹر نے رحیم داد کی چادر بھی دیکھی۔ چادر لاش کے قریب ہی پڑی تھی۔ انسپکٹر لاش کے آس پاس گھومتا رہا۔ وہ قریب کی جھاڑیوں میں بھی گیا۔ چڑھ کر ٹیلے پر پہنچا۔ بلندی سے جھک جھک کر لاش دیکھتا رہا۔ نیچے اترا اور لاش کے نزدیک کھڑے ہو کر قدموں کے نشانات دیکھنے لگا۔

وہ قدموں کے نشانات دیکھتا ہوا ٹوبھے کی جانب بڑھا اور کنارے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ اس کے ہم راہ ایک کانسٹیبل بھی تھا۔ انسپکٹر ہاتھ اٹھا کر کانسٹیبل کو قدموں کے نشانات دکھا رہا تھا۔

جیل میں جرائم پیشہ قیدیوں کے ساتھ رہنے کے باعث رحیم داد جرائم کے بارے میں بہت سے گر اور حربے جان گیا تھا۔ اس نے حکیم چشتی کو قتل کرتے ہوئے اپنے طور پر پوری کوشش کی تھی کہ پولیس کو مغالطے میں ڈال دے۔ وہ اپنی کامیابی پر مطمئن تھا۔ مگر جب انسپکٹر قدموں کے نشانات دیکھتا ہوا ٹوبھے تک پہنچ گیا تو رحیم داد کو اپنے اناڑی پن کا احساس ہوا۔ لاش کے قریب سے فرار ہوتے وقت اسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ ریت پر اس کے قدموں کے نشان صاف نظر آ رہے ہیں۔

لیکن یہ سوچ کر اسے کسی قدر ڈھارس ہوئی کہ کنکر کھودنے والے مزدوروں کے قدموں کے نشانات بھی اس کے قدموں کے نشانات کے ساتھ گڈمڈ ہوگئے تھے۔ چند مزدور منہ ہاتھ دھونے ٹوبے پر بھی پہنچے تھے۔

رحیم داد نے غور کیا کہ قدموں کے ملے جلے نشانات نے انسپکٹر کو الجھن میں ڈال دیا۔ انسپکٹر ٹوبھے کے کنارے کھڑا تھا اور مڑمڑ کر نشانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر ٹوبھے کے کنارے کنارے چلتا جھاڑیوں میں داخل ہوا۔

جھاڑیوں سے گزر کر وہ ٹیلوں پر پہنچنے کے لیے چڑھائی کی جانب بڑھا۔ کانسٹیبل اس کے ساتھ تھا۔

رحیم داد جھاڑیوں کی شاخوں کے پیچھے سے دونوں کو چوکنا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر جب اس نے انھیں اوپر آتے دیکھا تو سخت پریشان ہوا۔ وہ جنگلی پودوں کے درمیان سے کھسکتا ہوا غار میں داخل ہوگیا۔ غار کے ایک گوشے میں جاکے وہ دم بخود بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد سخت اور چٹیل زمین پر بھاری بھاری بوٹوں کی آواز ابھری' کھٹ کھٹ کھٹ۔ آواز قریب آتی گئی۔ رحیم داد کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ خوف اور ڈر سے اس کا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے جھاڑیوں کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

قدموں کی آہٹ عین غار کے سامنے سنائی دی۔ رحیم داد کو الجھی ہوئی شاخوں کے پیچھے انسپکٹر اور کانسٹیبل نظر آئے مگر وہ ان کا صرف نچلا دھڑ دیکھ سکا۔

کانسٹیبل کہہ رہا تھا۔ "لاش تو جی جیل کی وردی سے رحیم داد ہی کی لگتی ہے۔"

"لیکن اسے اتنی بے دردی سے کیوں قتل کیا گیا؟ لاش ایسی مسخ ہوگئی ہے کہ شناخت کرنا مشکل ہوگیا۔"

"میں تو یہ کہتا ہوں جی....."

رحیم داد کانسٹیبل کی پوری بات نہیں سن سکا۔ دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے قدموں کی آہٹیں دھیمی پڑ گئیں تو رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ مگر وہ ہنوز خوف زدہ تھا۔ سہما ہوا چپ چاپ دونوں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ منٹ' دس منٹ' پندرہ منٹ' آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ لیکن وہ واپس نہیں آئے۔ پتھریلی زمین پر ان کے بوٹوں کی آواز نہ ابھری۔ ہر طرف گہری خاموشی چھاگئی تھی۔ غار میں اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ سائے پھیل کر اور طویل ہوگئے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔

رحیم داد دیر تک ڈرا سہما بیٹھا رہا۔ نہ کوئی آہٹ ابھری نہ آواز آئی۔

وہ غار سے نکلا۔ جنگلی پودوں میں دبک کر گردن ذرا اونچی کی۔ ڈوبتے ہوئے دن کی ہلکی ہلکی روشنی میں حکیم کی لاش جھاڑی کے قریب پڑی تھی۔ مگر اب اس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ کچھ فاصلے پر دو کانسٹیبل بیٹھے لاش کی نگرانی کر رہے تھے۔ انسپکٹر دوسرے کانسٹیبلوں کے ہم راہ جائے واردات سے جا چکا تھا۔

رحیم داد بلندی سے لاش کی نگرانی کرنے والے کانسٹیبلوں کو دیکھتا رہا۔ سورج جنگل کے گھنے درختوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ برساتی نالے کے نشیب میں شام آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ فضا دھواں دھواں تھی۔ سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔

رحیم داد نے غار میں واپس جاکے ناشتے دان کھولا۔ ناشتے دان میں ابھی ایک روٹی باقی تھی۔ تھوڑا سا سالن بھی تھا۔ اس نے آدھی روٹی سالن سے کھائی اور آدھی ناشتے دان میں رکھ کر ڈھکنا بند کردیا۔

رحیم داد نے تھرماس سے پانی کے چند گھونٹ پیے اور غار سے باہر نکلنے کا ارادہ ترک کردیا۔

☆

پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد آنکھیں بند کیے چپ لیٹا تھا۔ کہیں قریب ہی گیدڑوں کی آوازیں گہرے سناٹے میں ابھریں۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عین اسی وقت نشیب میں کانسٹیبل زور سے کھنکارے۔ گیدڑوں کا غول غار کے سامنے سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا۔ رحیم داد کو وہ دھندلی پرچھائیوں کے مانند نظر آئے۔ وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تو ایک بار پھر لیٹ گیا۔ رات گزرتی گئی' کالی سیاہ ہوگئی۔ سویرا ہونے سے کچھ دیر پہلے رحیم داد کی آنکھ لگ گئی۔ وہ گہری نیند سوگیا۔

آنکھ کھلی تو غار کے باہر دھوپ پھیلی تھی۔ وہ غار سے نکلا۔ پودوں کے درمیان دبک کر اس نے جھاڑیوں کی اوٹ سے نیچے دیکھا۔ چادر سے ڈھکی ہوئی حکیم نذر محمد چشتی کی لاش ابھی تک اپنی جگہ موجود تھی۔

لاش کی نگرانی پر تعینات رات والے دونوں کانسٹیبل جاچکے تھے۔ مگر انسپکٹر موجود تھا۔ اس کے ہم راہ پانچ کانسٹیبل بھی تھے اور لالی بھی تھا۔

رحیم داد نے پہلی ہی نظر میں لالی کو پہچان لیا۔ لالی کا لباس وہی تھا جو لائل پور سے پہن کر آیا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ کانسٹیبلوں کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔ قریب ہی انسپکٹر مٹی کے تودے پر بیٹھا تھا۔ وہ گردن جھکائے مشیر نامہ لکھنے میں مصروف تھا۔ لکھتے لکھتے اس نے گردن اٹھائی اور ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ کانسٹیبل نے بڑھ کر لاش پر پڑی ہوئی چادر ہٹادی۔ انسپکٹر کی ہدایت پر لالی لاش کے قریب گیا۔ اس نے جھک کر لاش دیکھی' پھر انسپکٹر کی جانب مڑ آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ انسپکٹر اس سے سوالات کرتا رہا۔ لالی جوابات دیتا رہا۔ رحیم داد اتنی دور بیٹھا تھا کہ دونوں کی بات چیت بالکل نہیں سن سکا۔ مگر یہ اندازہ ہو گیا کہ لالی نے لاش اسی کی بتائی ہے۔

لاش پھر ڈھانک دی گئی۔ انسپکٹر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اس کی تفتیش ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے گھوم پھر کر لاش کے آس پاس کی جھاڑیوں کا معائنہ کیا اور ٹیلے کے نیچے کھڑے ہو کر دیر تک اوپر دیکھتا رہا۔

رحیم داد نے اسی ٹیلے سے حکیم کے چہرے پر بھاری پتھر پھینکا تھا۔

انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہم راہ نوبھے کی جانب بڑھا۔ اسے اپنی سمت آتا دیکھ کر رحیم داد گھبرا گیا۔ اس نے جھٹ گردن نیچے کی اور دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا غار میں چلا گیا۔ وہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانس بھرنے لگا۔

خوف اور دہشت سے رحیم داد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے کان بھاری بوٹوں کی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ رحیم داد پچھتانے لگا کہ رات کے اندھیرے میں اس مقام سے دور کیوں نہ چلا گیا۔ تمازت بڑھتی جا رہی تھی مگر ٹیلوں کی پتھریلی زمین پر بوٹوں کی آہٹ نہیں ابھری۔

رحیم داد سہما ہوا بیٹھا رہا۔ نشیب سے رک رک کر مدھم آوازیں ابھرتی رہیں۔ پھر یہ آوازیں بند ہو گئیں۔ گہرا سناٹا چھا گیا۔ لیکن رحیم داد غار سے باہر نہیں نکلا۔ خطرہ ابھی تک سر پر منڈلا رہا تھا۔

سورج چڑھ کر بیچ آسمان پر آ گیا۔ دوپہر ہو گئی' گرمی بڑھ گئی۔ رحیم داد غار سے باہر آیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نوبھے کے پار دیکھا۔ مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ لاش بھی نہیں تھی۔ جس جگہ لاش پڑی تھی' وہاں پتھروں سے حصار بنا دیا گیا تھا۔

رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مگر ہر طرف ویرانی تھی۔ اسے اطمینان ہوا۔ چہرے سے خوف کے سائے مٹنے لگے۔ وہ دیر تک جنگلی پودوں کے درمیان بیٹھا رہا' پھر غار میں چلا گیا۔ اس

نے ناشتے دان میں پڑی ہوئی باسی روٹی نکالی۔ اسے کھا کے تھرماس سے پانی پیا۔ اب ناشتے دان بالکل خالی تھا لیکن تھرماس میں تھوڑا سا پانی موجود تھا۔ وہ پھر لیٹ گیا اور شام کے اندھیرے کا انتظار کرنے لگا۔

دن ڈھلے تک وہ سوتا رہا۔ بیدار ہوا تو پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے تھرماس منہ سے لگایا اور اسے خالی کر دیا۔

لالی کا دیا ہوا چاقو اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور غار کے دہانے سے ذرا ہٹ کے گڑھا کھودا۔ گڑھے میں تھرماس' ناشتے دان' مقتول کی ٹوپی اور سنگھرنی کی پتیوں سے بھرا ہوا تھیلا رکھ دیا۔

اس نے گڑھا مٹی سے بھر دیا۔ جنگلی پودوں کی شاخیں اور پتھروں کے ٹکڑے اس طرح بکھیر دیئے کہ گڑھا بالکل چھپ گیا۔

رحیم داد غار میں نہیں گیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھا رہا۔ وہ بار بار اس طرف دیکھتا' جہاں اب لاش کی جگہ صرف پتھروں کا حصار رہ گیا تھا۔

سورج کا دہکتا ہوا الاؤ سرد پڑ گیا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں میں پرندے شور مچا رہے تھے۔ پھیکی' پھیکی دھوپ غائب ہوتی گئی۔ اندھیرا دم بدم پھیلتا گیا۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ فراش کے اونچے' اونچے درخت دم بخود نظر آ رہے تھے۔

رحیم داد جھاڑیوں سے باہر نکلا۔ اس نے چوکنا نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔

وہ آگے بڑھا اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا ٹیلوں اور ٹبّوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ اس نے میل' سوا میل راستہ طے کیا۔ برساتی نالے کے نشیب میں اترا اور خشک ریت پر چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

برساتی نالا دائیں ہاتھ کو نیم دائرہ بناتا ہوا کچھ دور جا کر اونچے' اونچے ٹیلوں کی اوٹ میں اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرف مڑ گیا۔ کچھ دور تک ٹیلوں کے درمیان چلتا رہا' اس نے سک نالا عبور کیا اور دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

سامنے چڑھائی تھی۔ وہ ناہموار راستوں پر چلتا ہوا بلندی پر پہنچ گیا۔ دور دور تک اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے پھیلے ہوئے تھے۔

وہ رکا نہیں بلکہ قدموں کی رفتار کچھ اور تیز کر دی اور جھاڑیوں اور خود رو جنگلی پودوں کے

درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے، اور آگے بڑھتا گیا۔

ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس نے ٹھٹک کر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور نشیب میں اترنے لگا۔ سامنے کچا راستہ تھا۔ دن میں اس راستے پر آمد و رفت رہتی ہوگی۔ لیکن اس وقت سنسان تھا۔ وہ اس راستے پر چلنے لگا۔

۱۴

شام کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ رحیم داد چلتے، چلتے ایک دم چونکا۔ اسے کچھ فاصلے پر دھندلی، دھندلی روشنی میں سڑک کنارے ایک سائیکل نظر آئی۔ قریب ہی ایک شخص زمین پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی۔ آنکھیں اندر دبی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر رحیم داد ٹھٹکا۔ اس نے چاہا کہ آگے نکل جائے مگر یہ سوچ کر ٹھہر گیا کہ آگے جانے سے پہلے اس شخص سے راستے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرلے۔ ڈرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ وہ شخص تنہا تھا اور لاغر بھی تھا۔

رحیم داد اس کی جانب بڑھا۔ "میں نے کہا جی! یہ رستہ کدھر جاتا ہے؟"

"یہ رستہ تو تخت ہزارہ جاتا ہے۔" اس شخص نے گردن اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "تخت ہزارہ جانا ہے تو سدھا چلا جا۔ تجھے وہیں جانا ہے نا؟"

وہ شخص دھیرے دھیرے ہانپتا رہا۔ رحیم داد نے ہمدردی سے دریافت کیا۔ "تسیں کچھ بیمار ہو؟"

"ہاں جی، بیمار ہی ہوں۔ بخار آتا ہے حکیم، ڈاکٹر ٹی۔بی بتاتے ہیں۔"

"جب اتنا بیمار ہے تو سیکل نہیں چلانی چاہئے۔"

"کہتا تو ٹھیک ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "حکیم نے بھی سیکل چلانے سے منع کیا ہے پر ایک کام ایسا پڑ گیا کہ سیکل اٹھائی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ قادر آباد گیا تھا۔ اب واپس جا رہا ہوں۔"

"کہاں جانا ہے؟"

ebooks.i360.pk

"چک ۵۸' رستے ہی میں پڑتا ہے۔" اس کے لہجے میں عاجزی آگئی۔ "توں ادھر ہی جا رہا ہے۔ سیکل چلانی جانتا ہو تو مجھے چک تک چھوڑ دے۔ تیری مہربانی ہوگی۔ میرا پنڈ بہت دور نہیں۔ تین ساڑھے تین میل سے زیادہ نہیں ہوگا۔"

رحیم داد کو سائیکل چلانا آتی تھی۔ وہ جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا بھی چاہتا تھا۔ اس نے سائیکل کا ہینڈل تھاما' اس شخص سے کہا۔ "آگے بیٹھ جا۔ مجھے بھی اسی طرف جانا ہے۔ تجھے چک ۵۸ پہنچا دوں گا۔"

وہ اپنی پگڑی درست کرتا ہوا اٹھا اور سائیکل پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد سائیکل پر سوار ہو اور آہستہ آہستہ چلانے لگا۔ سائیکل چلاتے چلاتے رحیم داد نے پوچھا۔ "گھر میں تیرا اور کوئی نہیں جو بیماری میں سیکل چلانی پڑی۔ کوئی تو ہوگا ہی؟"

"نہیں جی' میرا ادھر کوئی نہیں۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرا ناں چوہدری نورالٰہی ہے۔ میں گورداس پور کا مہاجر ہوں۔ پچھلے کئی مہینے سے ادھر چک ۵۸ میں ہوں۔"

"تیرے بال بچے تو ہوں گے؟ وہ کہاں ہیں؟"

"یہ نہ پوچھ۔" چوہدری نورالٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پورا ٹبر تھا۔ گھر والی تھی۔ دو بیٹیاں تھیں' تین پتر تھے۔ وڈا پتر تو جوان تھا۔ ۱۷ سال کا رہا ہوگا۔ گورنمنٹ سٹی ہائی اسکول' پٹیالہ میں دسویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ اب وہ ۲۵ سال کا ہوتا۔"

"کدھر ہے وہ؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"وہ تریموں کے پتن پر میرے سامنے شہید ہوا۔" نورالٰہی بجھے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ "پاکستان بنا تو میں نصیرپور میں تھا۔ نصیرپور' ضلع گورداس پور کا موضع ہے۔ میں پہلے تو ریاست پٹیالہ کے ضلع نارنول میں تھا۔ محلّہ لوہاراں میں اپنا مکان بھی تھا۔ جب وہاں گڑبڑ مچی تو مہاراجہ کے حکم پر فوج اور پولیس کے سارے مسلمانوں سے ہتیار رکھوا لیے گئے۔ ان کو غیر مسلح کر کے بہادر گڑھ فورٹ میں بھیج دیا گیا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ لیکن میں وہاں ہفتہ بھر بھی نہ رہا۔ ایک رات جب بارش ہو رہی تھی میں فورٹ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ میرے ساتھ ریاست کے دو مسلمان فوجی بھی تھے۔"

"ان دونوں کا کیا بنا؟"

"پتہ نہیں رات کے اندھیرے میں کدھر نکل گئے۔" چوہدری نورالٰہی نے رحیم داد کو بتایا۔ "گھر والی اور بچوں کو میں نے پہلے ہی نصیرپور بھیج دیا تھا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح نصیرپور پہنچ گیا۔ ویسے

میں رہنے والا نصیرپور ہی کا ہوں۔ وہاں اپنی زمیں داری تھی۔ شریکے اور کنبے دار تھے۔ پٹیالے میں تو میں نوکری کرتا تھا۔ پولیس میں حوالدار تھا۔ اس وقت سب یہی کہتے تھے گورداس پور تو پاکستان کے حصے میں آئے گا۔ مسلمان تھے بھی وہاں زیادہ' پر نصیرپور کے آس پاس دس باراں میل تک سکھوں کی بستیاں تھیں۔ مسلمانوں کو ذرا بھی فکر نہ تھی۔ مسلمان افسر تو اتنے جوش میں تھے کہ انھوں نے سرکاری دفتروں پر پاکستانی جھنڈے لہرا دیے۔ فیر ایسا ہوا جی نصیرپور والے عید کا چاند دیکھ رہے تھے۔ ا تیسواں یا تیسواں روزہ تھا۔ ٹھیک سے کچھ یاد نہیں۔ بیماری سے اب تو دماغ بھی کام نہیں کرتا پر اتنا ضرور یاد ہے۔ میں چھت پر ممٹی کے پاس کھڑا چاند دیکھ کر دعا مانگ رہا تھا۔ ابھی میں نے دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ سکھوں کی بستیوں کی طرف سے بہت زور کے دھماکے ابھرے۔"

وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ ذرا قرار آیا تو بتانے لگا۔ "میں نے گھبرا کر دیکھا' سامنے رڑی میں پنڈ کا ایک نوجوان تیزی سے سیکل دوڑاتا چلا آرہا ہے۔ اس کے کپڑوں پر خون ہی خون تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور زور زور سے چیخ رہا تھا۔ فساد ہوگیا' فساد ہوگیا۔ شور سن کر پنڈ کے لوگ اس کے ارد گرد اکٹھے ہونے لگے۔ میں باہر جانے کے لیے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں' مغرب کی طرف گرد کے بادل اٹھ رہے ہیں۔ سکھوں کے غول کے غول گھوڑے دوڑاتے ادھر ہی آرہے ہیں۔ سکھوں کی بستیوں سے بھی ڈھول اور سنکھ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"میری گل سن رہا ہے؟"

رحیم داد نے اس کی طرف توجہ دیئے بغیر آہستہ سے کہا۔ "سن رہا ہوں۔" اسے نورالٰہی کی باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ منٹگمری میں مدت تک مہاجر کیمپ قائم رہ چکا تھا۔ ضلع بھر میں مہاجر جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔

رحیم داد ان لٹے پٹے مہاجرین سے مل چکا تھا۔ ان کی زبانی سکھوں اور ہندوؤں کے حملوں کی ایسی ہی ہول ناک داستانیں سن چکا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر سائیکل چلاتا رہا۔

"ہاں تو جی' میں یہ کہہ رہا تھا۔" نورالٰہی چند لمحے خاموش رہ کر گویا ہوا۔ "میں چھت سے اتر کر بھاگتا ہوا رڑی میں پہنچا۔ پنڈ کے سارے ہی لوگ بھاگ کر وہاں پہنچ رہے تھے۔ سب پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ پورے پنڈ میں کسی کے پاس ایک بھی بندوق نہیں تھی۔ صرف برچھیاں'

کلہاڑیاں اور ڈانگیں تھیں۔ انھی کو لے کر سب نے پنڈ کی حفاظت کے لیے فٹافٹ تمام ناکوں پر مورچے سنبھال لیے۔ سکھ حملہ آور گھوڑے دوڑاتے چلے آ رہے تھے۔ وہ نزدیک آ گئے پر انھوں نے حملہ نہیں کیا۔ وہ پنڈ سے کوئی فرلانگ بھر دور ٹھیر گئے۔ نہ وہ آگے بڑھے نہ نصیرپور والوں نے انھیں للکارا۔ حملہ آور تعداد میں پنج سو سے اوپر رہے ہوں گے۔ ادھر مسلمان تین سو سے بھی کم تھے۔ نہ بندوق تھی نہ کسی کے پاس پستول تھا۔" نورالٰہی نے گہری سانس بھری۔ "حملہ آور چپ کر کے کھڑے تھے۔ ان کے گھوڑے زور زور سے ہنہنا رہے تھے۔ سکھ بستیوں سے ڈھول اور سنکھ کی آوازیں مسلسل ابھر رہی تھیں۔"

"چوہدری' انھوں نے حملہ کیوں نہیں کیا؟"

"وہ جی ڈر گئے تھے۔ اس مغالطے میں رہے کہ نصیرپور کے مسلمانوں کے پاس بہت اسلحہ ہے۔ ان کا خیال غلط بھی نہیں تھا۔ گورداس پور کے مسلمانوں کے لیے اسلحہ پہنچا بھی تھا۔ اس میں زیادہ تعداد میں رائفلیں اور بندوقیں تھیں۔ ضلع کا ایس پی مسلمان تھا۔ پر گورداس پور کے لیگیوں نے یہ اسلحہ مسلمانوں کو دینے کی بجائے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ مسلمانوں کے پاس ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں اتنا پیسہ ہی کہاں تھا۔ انھوں نے چندا کر کے جو اسلحہ حاصل کیا' وہ بھی ہندوؤں اور سکھوں کو منہ مانگے دام دے کر خریدا تھا۔ ذرا غور تو کر۔ کیسا ظلم ہوا۔ انھی دنوں مجھے کسی نے بتایا بٹالہ کے ایک سکھ زمیں دار نے کسی مسلم لیگی سے رائفل خریدی اور قیمت اپنے گھر چل کر دینے کے بہانے اسے ایک ویران جگہ لے گیا۔ وہاں اس نے کرپان نکالی اور پیسے دینے کی بجائے اس بے غیرت کے پیٹ میں پوری اتار دی۔ وہ وہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ ٹھیک ہی ہوا۔ ایسوں کو ایسی ہی سزا ملنی چاہیے۔"

رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "چوہدری! توں تو سکھ حملہ آوروں کی گل کر رہا تھا؟"

"ہاں جی' یاد آ گیا۔" نورالٰہی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ "ہوا یہ کہ سکھ حملہ کرنے سے ڈر رہے تھے اور ادھر مسلمان انتظار میں تھے' سکھ حملہ کریں تو وہ بڑھ کر ان کا مقابلہ کریں۔ اس شش و پنج میں بہت دیر ہو گئی۔"

وہ کہنے لگا۔ "فیر ایک عجب گل ہوئی۔ نصیرپور میں ایک سائیں جی تھے۔ وہ پنڈ کے قبرستان کی دیکھ بھال کرتے تھے اور اس کے پاس ہی جھگی میں رہتے تھے۔ بالکل اکیلے تھے' نہ گھر والی نہ بچے۔ پنڈ والے جو دیتے' وہی کھا پی کر گزارا کرتے۔ ادھر تو سب ڈرے سہمے ہوئے تھے۔ ادھر کیا دیکھتے ہیں' سائیں جی کندھے پر تلوار رکھے ایک طرف سے نکلے۔ بڑے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ پنڈ

والوں کی طرف منہ کیا' ڈپٹ کر انھیں للکارا۔ اوئے تسیں' مسلمان ہو کر ڈرتے ہو۔ میں اللہ کا نام لے کر اکیلا ہی حملہ کروں گا۔ میرے رب نے چاہا تو سب حملہ آوروں کو بھگا دوں گا۔ سائیں جی نے دوبارہ نعرۂ تکبیر بلند کیا اور تیزی سے حملہ آور سکھوں پر جھپٹے۔ سائیں جی کو اکیلے بڑھتے دیکھا تو پنڈ کے مسلمانوں کی غیرت بھی جاگ اٹھی۔ سو جوانوں کو پنڈ کی حفاظت پر لگا کر سب سائیں کے پیچھے پیچھے چلے' پر سائیں جی پہلے ہی حملہ آور سکھوں کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ گھوڑے زور زور سے ہنہنانے لگے۔ گرد کے بادل اٹھنے لگے۔ نزدیک جا کر دیکھا تو حملہ آور بھاگ چکے تھے۔ تین چار سکھ خون میں لت پت زمین پر پڑے تھے۔ سائیں جی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ذرا دیر بعد دور سے سائیں کی آواز آئی' بڑھے چلے آؤ۔ نکل کر جانے نہ دینا۔ پنڈ والے آگے بڑھے۔ پر حملہ آور اپنے گھوڑے بھگاتے دور جا چکے تھے۔ سائیں جی تلوار سونتے ان کے پیچھے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ سب نے پکار کر انھیں آگے جانے سے روکا۔ سائیں واپس ہوئے تو جگہ جگہ سے ان کا بدن زخمی تھا۔ زخموں سے لال لال خون بہہ رہا تھا۔ انھوں نے اپنے سر پر بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اس پر بھی خون کے دھبے تھے۔ مگر زخمی ہونے پر بھی سائیں کا حوصلہ ویسا ہی تھا۔ وہ تو یہ چاہتے تھے' پٹیالے کی ملٹری پہنچنے سے پہلے پہلے آس پاس کی سکھ بستیوں پر چڑھائی کر دی جائے تاکہ انھیں دوبارہ حملے کی جرات نہ ہو' پر پنڈ کے دوسرے مسلمان تیار نہیں ہوئے۔"

رحیم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "سائیں بہت زور آور تھا۔ اکیلے نے اتنے بہت سے سکھوں کو بھگا دیا۔"

"ہاں جی' بہت زور آور تھا۔" نورالٰہی نے اس کی تائید کی۔ "حملہ آوروں کو بھگانے کے بعد آگے کا حفاظتی پروگرام طے کیا جا رہا تھا کہ دور سے تیز روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ روشنیاں اس طرف سے نہیں ابھر رہی تھیں جدھر سکھ حملہ آور بھاگ کر گئے تھے۔ یہ ریاست پٹیالہ کی ملٹری تھی۔ سکھ فوجی جیپوں اور لاریوں پر مشین گنیں لگائے نصیرپور کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی ریاستی ملٹری کے حملے کا پتہ چلا' سب تیزی سے پنڈ کی طرف لوٹے۔ پر مسلح ملٹری کا حملہ کون روک سکتا تھا۔ سمجھ نہیں آتی تھی کیا کریں۔ فوجی جیپوں اور لاریوں کی تیز روشنی دم بہ دم نزدیک آتی جا رہی تھی۔ ملٹری کا نام سن کر بوڑھے' بچے اور زنانیاں' سبھی گھروں سے نکل نکل کر باہر آ گئے۔ موت سروں پر منڈلا رہی تھی۔ سب گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگے۔"

"ریاستی ملٹری آئی بھی کہ نہیں؟"

"آئی تھی' بالکل آئی تھی۔ پر گیانی ہرنام سنگھ نے سب کو بچا لیا۔"

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "ہرنام سنگھ بھی تو سکھ ہی تھا ناں؟"

"ہاں جی۔ وہ سکھ ہی تھا۔" نورالٰہی نے مستعدی سے جواب دیا۔ "وہ بوڑھا سکھ تھا اور نصیرپور ہی میں رہتا تھا۔ ملٹری کو اس نے نصیرپور کی طرف آتے دیکھا تو بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا اور چیخ چیخ کر سب سے کہنے لگا۔ اوئے مسلو! فٹافٹ چھپ جاؤ۔ فصلوں میں گھس کر بیٹھ جاؤ۔ ریاستی ملٹری حملہ کرنے آ رہی ہے۔ جھیتی کرو جھیتی' میں منت کر کے سکھ فوجیوں کو واپس بھیج دوں گا۔ اس کے مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سب کھیتوں کی جانب دوڑے اور فصلوں میں گھس کر اندھیرے میں چھپ گئے۔ فوجی جیپیں اور لاریاں دھیرے دھیرے نزدیک آتی گئیں۔ پنڈ کے نزدیک پہنچ کر رک گئیں۔ گیانی ہرنام سنگھ اندھیرے سے نکل کر سکھ کمانڈر کی جانب بڑھا۔ ادھر پنڈ کے سارے مسلمان فصلوں میں دبکے سانس روکے بیٹھے تھے۔ ماؤں نے بچوں کے منہ ہاتھوں سے دبا رکھے تھے تاکہ کسی بچے کے رونے اور بولنے کی آواز نہ ابھرے۔ ادھر بوڑھا ہرنام سنگھ فریادیوں کی طرح گلے میں پگڑی ڈالے سکھ فوجی کمانڈر کے آگے ہاتھ جوڑے گڑگڑا رہا تھا۔ سردار جی! پنڈ کے سارے ہی مسلے چلے گئے۔ یہاں سے جاتے ہوئے انھوں نے اپنے سامان کو بھی آگ لگا دی' کچھ بھی نہ چھوڑا۔ کمانڈر جیپ سے اترا اور آگے بڑھ کر غصے سے ہرنام سنگھ کے منہ پر دو تین چپیڑیں ماریں۔ چیخ کر بولا۔ بڈھے کھوسٹ' تو نے فوراً ہمیں اطلاع کیوں نہیں پہنچائی؟ ہم سارے مسلوں کو ختم کر دیتے' انھیں نکل کر نہ جانے دیتے۔ ہرنام سنگھ مار کھا کر بھی گڑگڑاتا رہا' معافی مانگتا رہا۔ اس کے سر کے کیس کھل کر بکھر گئے تھے۔ وہ رو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سکھ فوجی گالاں نکالتے ہوئے جدھر سے آئے تھے' اسی طرف لوٹ گئے۔"

"ہرنام سنگھ بہت نیک بندہ تھا۔" رحیم داد نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

"بہت ہی نیک بندہ تھا جی۔ ملٹری کے جاتے ہی زور کی بارش شروع ہو گئی۔ کھیتوں سے باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سب بھوکے پیاسے بھی تھے۔ بوڑھا ہرنام سنگھ ایک ایک کھیت کے اندر جاتا۔ کھانے کو روٹی پہنچاتا۔ زنانیوں کو تسلی دیتا۔ بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتا۔ سب کے حوصلے بڑھاتا۔ کہتا' فکر نہ کرو۔ حوصلے سے کام لو۔ واہ گرو کی کرپا سے سب ٹھیک ہی ہو گا۔ روٹی کھلا کر وہ سائیں جی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دونوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔" نورالٰہی نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "خطرہ ابھی تک سروں پر منڈلا رہا تھا۔ ریاستی ملٹری کو آس پاس کی بستیوں کے سکھوں سے خبر ہو سکتی تھی کہ نصیرپور کے مسلمان ابھی تک پنڈ میں موجود ہیں۔ یہ خبر ملتے ہی سکھ فوراً لوٹتے اور کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑتے۔ یہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے سائیں جی اور گیانی ہرنام سنگھ نے اسی

وقت پنڈ سے نکل بھاگنے کی سکیم بنائی۔ جو جس حالت میں تھا' ویسے ہی چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ سب قافلہ بنا کر نصیرپور سے نکلے۔ مڑ مڑ کر گھروں کو دیکھتے اور پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے۔ سائیں جی اور ہرنام سنگھ تلواریں اٹھائے آگے' آگے چل رہے تھے۔ بارش اب رک گئی تھی۔ قافلہ رات کے اندھیرے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم تریموں کے پتن پر پہنچ گئے۔ سامنے راوی بہہ رہا تھا اور اس پار پاکستان کی سرحد شروع ہوتی تھی۔"

"چوہدری! تیری گھر والی اور بچے بھی ساتھ ہی تھے؟"

"تریموں کے پتن تک تو ساتھ ہی تھے۔" نورالٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہم نے صرف راوی پار کرنا تھا۔ پر راوی پار کرنا آسان نہیں تھا۔ پتن پر صرف چند بیڑیاں اور کشتیاں تھیں۔ ملاح دریا کے اس پار لے جانے کے سو روپے فی سواری مانگتے تھے۔ ادھر مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ بھی لٹے پٹے تھے۔ جیبوں میں چند روپے تھے یا تمباکو اور نسوار کی تھیلیاں تھیں۔ ملاح بھی مسلمان تھے۔ پر وہ تو زیادہ سے زیادہ کمائی پر لگے تھے۔ ایسے ظالم اور بے درد تھے' جب مسافر منہ مانگا کرایہ دینے پر جھگڑا فساد کرتے تو وہ بیڑی بیچ دریا میں کھڑی کر دیتے۔ اوپر سے تیز بارشیں ہو رہی تھیں۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ لہروں کے تیز بہاؤ میں ملاحوں کی ان بدمعاشیوں سے تین بیڑیاں تو میرے سامنے ڈوبیں۔ کہتے ہیں ان میں ۱۹۲ مسافر تھے۔ صرف ۱۳ بچے۔ دوسرے سب دریا کے پیٹ میں چلے گئے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ڈلہوزی سے بٹالے تک جتنے بھی مسلمان تھے' ان کے لیے پاکستان پہنچنے کا یہی رستہ تھا۔ ویسے گورداسپور کے کتنے ہی لٹے پٹے قافلے راوی کے پتن بھی پہنچے' پر وہاں امرتسر سے آنے والے زیادہ تھے۔ ملاح ادھر بھی اسی طرح تنگ کرتے تھے۔ راوی کے پار پہنچانے کے لیے اپنی مرضی کا کرایہ وصول کرتے تھے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"تریموں کے پتن کا ان دنوں حال یہ تھا کہ ندی کنارے ہزاروں مسلمان پڑے تھے۔ روز نئے قافلے پہنچتے تھے۔ میرے پاس اس وقت اچھی خاصی رقم تھی۔ میں ملاحوں کو کرایہ دے کر دریا کے پار اپنے ٹبر کے ساتھ جا سکتا تھا۔ پر سب نے منع کیا اور ناراض ہوئے کہ تم اپنے فائدے کے لیے دوسرے غریب بندوں کا بیڑا غرق کر دینا چاہتے ہو۔ ساتھ ہی یہ خبریں بھی سننے میں آ رہی تھیں کہ حکومت پاکستان نے کشتیاں اور ملٹری کے سٹیمر بھیجے ہیں' جو مہاجرین کو مفت دریا پار پہنچا دیں گے۔"

سڑک کے دونوں جانب ربیع کی فصلیں تھیں' جن میں ہوا کے جھونکوں سے رک رک کر

سرسراہٹیں ابھر رہی تھیں۔ اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ رحیم داد چپ چاپ سائیکل چلاتا رہا۔ نورا
آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "روز کشتیوں اور سٹیمروں کا انتظار کیا جاتا۔ پر نہ کشتیاں اور بیڑیاں آئ
نہ سٹیمر۔ دوسری طرف تریموں کے پتن پر لٹ پٹ کر آنے والے مسلمانوں کی تعداد ہر روز بڑ
جا رہی تھی۔ پتن پر دریا کے کنارے جہاں تک نظر جاتی' بندے ہی بندے نظر آتے۔ ان
بوڑھے تھے' جوان تھے' زنانیاں تھیں اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ بارش تھم جاتی۔
شروع ہو جاتی اور مسلسل ہوتی رہتی۔ کہیں چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ سب کھلے آسمان کے نیچے
بھیگتے رہے' کشتیوں' سٹیمروں کا انتظار کرتے رہے۔ ملاح پار لے جانے کا کرایہ کم کرنے کے۔
کسی طرح تیار نہیں تھے۔ وہ تو وبا کے کمائی کر رہے تھے۔ تباہ حال مہاجرین کی بے بسی اور پریش
سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ کئی بار مغربی پنجاب کی حکومت کے ہوائی جہاز بھی دریا کے او
اڑتے دکھائی دیے۔ کسی نے بتایا' اس میں وزیر سوار ہیں۔ پتن پر پڑے ہوئے مہاجروں کا معا
کرنے آئے ہیں۔ جب بھی جہاز نظر آتے ہر طرف یہ خبریں پھیل جاتیں سرکاری بیڑیاں ا
کشتیاں آنے والی ہیں۔"

وہ کچھ دیر کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ آخر نورالٰہی کی آو
ابھری۔ "اس روز بارش تھمی ہوئی تھی۔ آسمان بالکل صاف اور نیلا نیلا نظر آرہا تھا۔ سورج ایۓ
چمک رہا تھا جیسے آگ برسا رہا ہو۔ بہت سخت گرمی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ دوپہر کا وقت تھا
اچانک دور سے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی پڑی۔ ذرا دیر بعد سکھوں کے غول کے غول گھوڑ
دوڑاتے نظر آئے۔ دو ہزار سے زیادہ ہی تھے' کم نہیں۔ حملہ آوروں کو دیکھتے ہی جس کا جدھر م
اٹھا' بھاگا اور نزدیک کے کھیتوں میں گھس گیا۔ میں بھی بھاگ کر فصلوں میں چھپ گیا۔ ہر طرف
سے چیخنے چلانے اور زنانیوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ میں کھیت میں د
سادھے بیٹھا رہا۔ سکھ حملہ آور خون میں ڈوبی ہوئی تلواریں اٹھائے' بندوقوں سے گولیاں چلاۓ
اپنے گھوڑوں سے کھیت روندتے پھر رہے تھے۔ جو نظر آتا' اسے قتل کر دیتے۔ پتہ نہیں' میں کیسے
بچ گیا۔ وہیں مر جاتا تو ٹھیک تھا۔"

چوہدری نورالٰہی کے لہجے میں درد کی چبھن تھی۔ اس نے لمبی سانس لی۔ "سورج ڈوبا تو میں
کھیتوں سے باہر نکلا۔ اب حملہ آور جا چکے تھے۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آرہی تھیں۔ زخم
خون میں ڈوبے ہوئے تڑپ رہے تھے' کراہ رہے تھے۔ زنانیوں اور بچوں کے رونے اور سسکیاں
بھرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں لاشوں اور زخمیوں کے درمیان ادھر ادھر پاگلوں کی

طرح گھوم رہا تھا۔ اپنے بال بچوں کو تلاش کر رہا تھا۔ پتن کے پاس سائیں جی اور گیانی ہرنام سنگھ
زخموں سے چور پڑے تھے۔ دونوں مر چکے تھے۔ وہ آخر دم تک حملہ آوروں کے سامنے ڈٹے
رہے۔ نزدیک ہی میرا وڈا پتر کرم الٰہی پڑا تھا۔ وہ تب تک زندہ تھا اور بے چینی سے ادھر ادھر گردن
ہلا رہا تھا۔ میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا' کراہتے ہوئے بولا۔
وہ' وہ صابرہ کو لے گئے۔ وہ مجھے پکارتی رہی پر میں اسے بچا نہیں سکا۔ وہ اسے لے گئے۔ صابرہ میری
۱۶ سال کی جوان بیٹی تھی۔ سکھ حملہ آور اسے اٹھا کر لے گئے۔ کرم الٰہی یہی بتانے کے لیے زندہ تھا۔
اس نے میرے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔" نورالٰہی گلوگیر ہوگیا۔

رحیم داد ہمدردی کا اظہار بھی نہ کرسکا۔ وہ پھولی ہوئی سانس سے پیڈلوں پر پیر مارتا سائیکل
دوڑاتا رہا۔ نورالٰہی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بتایا۔ "شام ہوگئی تھی۔ میں کھیتوں کے اندر
گھس گیا اور اندھیرے میں اونچی آواز سے گھر والی اور بچوں کو پکارنے لگا' پر گھر والی یا بچوں میں
سے کسی کی آواز سنائی نہ دی۔ کچھ ہی دیر بعد فیر شور مچا' سکھ حملہ کرنے آرہے ہیں۔ دور سے
گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ پتن پر ایک بیڑی کھڑی تھی۔ ملاح دریا پار لے
جانے کے اڑھائی سو روپے مانگتے تھے۔ میں نے ایک بار فیر چیخ چیخ کر گھر والی اور بچوں کے نام لے
کر ہانک لگائی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اب صاف سنائی پڑ رہی تھیں۔ میں نے
ملاح کے ہاتھ میں کرائے کے اڑھائی سو روپے رکھے اور بیڑی میں سوار ہوگیا۔ اس طرح میں سب
کچھ لٹا کر پاکستان پہنچا۔" نورالٰہی چپ ہوگیا۔

☆

سائیکل کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کچے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ کچھ دور آگے جاکر
گاؤں کے گھروں میں جلنے والے چراغوں کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ روشنیاں دیکھ کر نورالٰہی نے
کہا۔

"لو جی' چک ۵۸ آگیا۔"

رحیم داد سائیکل چلاتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا۔ نورالٰہی راستہ بتاتا رہا۔ اس کا گھر گاؤں کے
شروع ہی میں تھا اور الگ تھلگ بھی تھا۔ گھر کے آس پاس نیم اور شیشم کے گھنے درخت تھے۔ گھر
کے قریب پہنچ کر رحیم داد نے سائیکل ٹھہرائی۔ دونوں نیچے اترے۔ دروازے پر تالا تھا۔ نورالٰہی
نے تالا کھولا۔

دونوں اندر داخل ہوگئے۔ چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک کمرہ اور اس کے ساتھ کوٹھری تھی۔ کمرے

کے آگے برآمدہ تھا جس پر پھوس کا چھپر تھا۔ البتہ آنگن کشادہ اور کھلا ہوا تھا۔ گھر پر ویرانی چھائی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ نورالٰہی نے سائیکل اپنے ہاتھ میں سنبھالی اور چھپر کے نیچے ایک طرف دیوار سے ٹکا کر کھڑی کردی۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا' اندر گیا۔ طاق سے ماچس اٹھائی اور لالٹین روشن کردی۔

دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر نورالٰہی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "باہر کیوں کھڑا ہے۔ اندر آجا۔ ذرا دیر آرام کرلے فیر چلا جانا۔"

رحیم داد چپ چاپ کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں چارپائی بچھی تھی۔ اس پر میلا کچیلا بستر تھا۔ بستر کے قریب کی دیوار میں طاق تھا۔ طاق میں دوا کی دو شیشیاں رکھی تھیں۔ کوٹھری کا دروازہ بھی کمرے ہی میں کھلتا تھا مگر اس وقت بند تھا۔

کوٹھری سے ذرا ہٹ کر روشن دان جیسی کھلی کھڑکی تھی جس پر حفاظت کے لیے درختوں کی سوکھی شاخیں کیلوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے باہر گہرا اندھیرا تھا۔ کھڑکی سے ہلکے ہلکے جھونکے آرہے تھے۔ پھر بھی کمرے میں گرمی تھی۔ نورالٰہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہاں گرمی تو ہے پر میں یہیں سوتا ہوں۔ مجھے بخار رہتا ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر ماتھے پر رکھا۔ "اس وقت بھی بخار ہے۔ زیادہ ہی تیز لگتا ہے۔" وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ "ٹی بی بھی بہت موذی روگ ہے۔ ایک بار لگ جائے فیر نہیں جاتا۔"

رحیم داد کو شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے نورالٰہی سے پوچھا۔ "چوہدری! گھر میں پانی تو ہوگا؟"

"ضرور ہوگا۔" اس نے کونے میں رکھے ہوئے گھڑے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ رہا پانی' پوری طرح پیاس بجھالے۔ مجھے بھی پانی پلا دے۔"

رحیم داد گھڑے کے پاس گیا۔ قریب ہی المونیم کا گلاس رکھا تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر پانی سے بھرا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ گلاس میں دوبارہ پانی انڈیلا اور اسے لے کر نورالٰہی کے قریب پہنچا۔ نورالٰہی نے گلاس لیتے ہوئے رحیم داد کو مشتبہ نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ "تیری قمیص کی آستین اور شلوار پر یہ خون کیسا لگا ہے؟" وہ چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا۔ "مجھے قادر آباد میں پتہ چلا تھا کہ نہر پاری دو آب کے اس پار ادھر پل پر ایک مفرور قیدی کو کسی نے قتل کردیا۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔ "تیرا تو اس واردات میں کوئی ہاتھ نہیں؟" نورالٰہی کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

رحیم داد کا چہرہ فق ہوگیا۔ مگر اس نے خود کو سنبھال لیا' مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں چوہدری ایسی کوئی گل نہیں۔" وہ مڑا اور دیوار کے قریب رکھے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

نورالٰہی گلاس منہ سے لگا کر دھیرے دھیرے پانی پینے لگا۔ وہ نظریں اٹھا کر بار بار رحیم داد کو دیکھتا رہا۔ پانی پی کر اس نے گلاس فرش پر رکھ دیا۔ یکایک کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام کر دیر تک کھانستا رہا۔ کھانستے کھانستے نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ لمبی لمبی سانس بھر رہا تھا اور خاصا بے چین نظر آرہا تھا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ نورالٰہی کو قرار آگیا تھا مگر اس نے رحیم داد سے بات نہیں کی۔ خاموش لیٹا رہا اور نظریں اٹھائے چھت تکتا رہا۔ باہر اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ سکوت زیادہ دیر نہیں رہا۔ باہر دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی آنگن میں کسی کی چاپ سنائی دی۔

نورالٰہی نے کروٹ بدل کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ دھیرے سے بولا۔ "جیناں روٹی لے کر آئی ہے۔" اس نے کوٹھری کے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "کوٹھری میں چلا جا۔"

رحیم داد نے گھبرا کر اسے دیکھا' اٹھا اور کوٹھری میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ وہ خوف زدہ اور سہما ہوا تھا۔ اسے جیناں کی آواز سنائی دی۔ وہ کمرے میں پہنچ کر نورالٰہی سے کہہ رہی تھی۔ "چوہدری! توں نے بہت دیر کردی۔ میں روٹی لے کر پہلے بھی آئی تھی۔"

"ہاں' واپسی میں کچھ زیادہ دیر ہوگئی۔"

"کچھ پتہ چلا؟" جیناں نے پوچھا۔ "توں کادر آباد اپنی گھروالی اور بچوں کا کھوج لگانے ہی تو گیا تھا ناں؟"

"ہاں جیناں! انھی کو دیکھنے گیا تھا۔" نورالٰہی کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔ "پر اس دفعہ بھی کوئی پتہ نہیں چلا۔ اطلاع صحیح نہیں تھی۔"

"تیں نوں کس نے بتایا تھا وہ ادھر کادر آباد میں ہیں؟"

"کل دن ڈھلے میں نمبردار کی ماڑی پر گیا تھا۔ وہاں قادر آباد کا سٹیشن ماسٹر بھی موجود تھا۔ وہ بھی مہاجر ہے۔ اسی نے بتایا تھا' گورداس پور کے کچھ مہاجر خاندان ٹرین سے پہنچے ہیں۔ سٹیشن کے پاس ہی درختوں کے نیچے انھوں نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ ان میں ایک لاوارث زنانی ہے۔ ساتھ میں بچے بھی ہیں۔ سٹیشن ماسٹر نے کسی کا نام شام تو بتایا نہیں۔ میں نے سوچا کہیں وہ میرے ہی بال بچے نہ ہوں۔" نورالٰہی چند لمحے خاموش رہا۔ "وہ نبی پور کے نکلے۔ میرا پنڈ تو نصیر پور تھا۔"

"چوہدری! توں نے ان سے اپنی گھروالی اور بچوں کے لیے پوچھا تو ہوتا۔"

"پوچھا تھا۔ ان کے بارے میں انہیں کچھ خبر نہیں۔ آٹھ دس میل کا چکر ہو گیا۔ نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"توں اس طرح کب تک انھیں ڈھونڈتا رہے گا؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے' وہ تریموں کے پتن پہ مارے گئے۔"

"ایسا نہ کہہ جیناں!" نورالٰہی نے تڑپ کر کہا۔ "میں انھی سے ملنے کی امید پر زندہ ہوں۔ ہر جگہ انھی کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے' ایک نہ ایک روز وہ ضرور مل جائیں گے۔ یہ تو مجھے پتہ ہے گھروالی بچوں کے ساتھ پاکستان پہنچ گئی تھی۔ اسے لہور کے والٹن کیمپ میں میرے کئی ملنے والوں نے دیکھا بھی تھا۔ میں ان دنوں منگمری کے مہاجر کیمپ میں تھا۔"

"توں یہ گل پہلے بھی بتا چکا ہے۔ پر یہ تو سوچ' آٹھ برس ہو گئے۔ وہ تجھے اب تک کیوں نہیں ملے؟ ویسے جو تیری مرضی' پر بیماری میں سیکل نہ چلایا کر۔ تیری طبیعت اور گڑبڑ ہو جائے گی۔ دیکھ تو کتنا کمزور اور بیمار لگ رہا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے سیکل نہیں چلانی چاہئے۔ پر کیا کروں' جب سے سٹیشن ماسٹر سے بات ہوئی تھی' تب سے بے چین تھا۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔ سویرے اٹھتے ہی سیکل اٹھائی اور قادر آباد روانہ ہو گیا پر واپسی میں بہت مشکل پڑی۔ جگہ جگہ ٹھیر کر آرام کرتا رہا۔ تبھی تو اتنی دیر ہو گئی۔"

چوہدری نورالٰہی نے گہری سانس بھری۔ "اب تو جا۔ میں ذرا دیر بعد روٹی کھاؤں گا۔ ابھی بھوک نہیں ہے۔"

جیناں چلی گئی۔ رحیم داد نے کوٹھری کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ نورالٰہی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلا لیا۔ رحیم داد چپ چاپ کوٹھری سے باہر آ گیا۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ کوٹھری میں سخت حبس تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی برس رہی تھی۔ وہ قریب آیا تو نورالٰہی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"حوصلے سے کام لے' جو ہونا تھا ہو گیا۔ فکر نہ کر' میرا گھر بہت محفوظ ٹھکانا ہے۔ پنڈ سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ یہاں کوئی آتا جاتا بھی نہیں۔ صرف جیناں روٹی لے کر آتی ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "میری طرف سے اطمینان رکھ۔ ویسے میں تیرے کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھتے ہی تاڑ گیا تھا کوئی واردات کر کے آیا ہے۔ ۱۸ سال سے اوپر پولیس کی نوکری کی۔" اس نے آہ سرد کھینچی۔ "پر اب تو بیماری نے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔" رحیم داد چپ کھڑا رہا۔ نورالٰہی ذرا دیر خاموش رہ کر

گویا ہوا۔ "یوں کب تک کھڑا رہے گا؟" اس نے مونڈھے پر رکھی ہوئی چنگیری کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ روٹی رکھی ہے۔ تو بھی کھا اور مجھے بھی کھلا دے۔" اس نے گردن موڑ کر باہر صحن میں دیکھا۔ "پہلے باہر جا کر دروازے کی زنجیر لگا دے۔ اب دروازہ بند ہی رکھنا پڑے گا۔"

رحیم داد کمرے سے گیا اور باہر کھلنے والے دروازے کی کنڈی لگا دی۔

☆

نورالٰہی بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے چنگیری اٹھائی اور نورالٰہی کے سامنے رکھ دی۔ چنگیری میں تین روٹیاں اور ساگ تھا۔ نورالٰہی نے دو روٹیاں اٹھائیں اور ان پر ساگ رکھ کر رحیم داد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میرے لیے ایک روٹی کافی ہے۔ بھوک ہی نہیں لگتی۔ منع بھی کرتا ہوں پر جیناں نہیں مانتی۔ کہتی ہے' چوہدری! خوب پیٹ بھر کر روٹی کھایا کر۔ بہت کمزور ہو گیا ہے مگر آج تو اس نے ٹھیک ہی کیا' تیرا بھی کام بن گیا۔ اب آرام سے بیٹھ کر روٹی کھا۔" اس نے نوالہ توڑا اور کھانا کھانے لگا۔

رحیم داد بھی مونڈھے پر بیٹھ گیا اور ہاتھ میں روٹیاں تھام کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ بھوکا بھی تھا۔ کھانا اسے مزے دار لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر نورالٰہی نے پوچھا۔ "یہ تو بتا' تجھے جانا کہاں ہے؟"

رحیم داد نے گردن جھکا کر جواب دیا۔ "چوہدری اپنا تو اب کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔"

"جب تک تیرا جی چاہے' یہیں رہ۔ میں گھر میں اکیلا پڑا پڑا گھبراتا ہوں۔ تیرے ساتھ بات چیت میں دل بہل جائے گا۔ توں میری کچھ مدد بھی کر سکے گا۔"

"ضرور کروں گا' تیرا ہر کام کروں گا۔" رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ "تیری مہربانی ہے۔ کچھ دن یہیں ٹھیرا رہوں گا۔" اس نے قدرے تامل کیا' پھر دبی زبان سے بولا۔ "چوہدری! اب تجھے کیا بتاؤں' میں کیسے اس چکر میں پھنس گیا۔ بات یہ ہے جی۔"

نورالٰہی اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "مجھے کچھ نہ بتا۔ میں تیرا نام بھی نہیں پوچھوں گا اور تجھے یہی مشورہ دوں گا' آگے بھی کسی سے اپنے بارے میں بات نہ کرنا۔" وہ مسکرانے لگا۔ "ویسے بھی ابھی مجھے سچ بات نہیں بتائے گا۔ پر توں ہے حوصلے والا۔ واردات کے بعد ملزم جتنے گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں توں اتنا پریشان نہیں لگتا۔" اس نے طاق کی طرف ہاتھ اٹھا کر ایک شیشی کی جانب اشارہ کیا۔ "مجھے یہ دوائی پلا دے۔" رحیم داد نے شیشی اور اس کے ساتھ رکھی ہوئی مٹی کی پیالی اٹھائی اور نورالٰہی کو دے دی۔

دوا پینے کے بعد نورالٰہی بستر پر لیٹ گیا۔ کمرے میں ذرا دیر خاموشی رہی پھر نورالٰہی نے رحیم سے دریافت کیا۔ "تجھے نیند تو نہیں لگ رہی؟"

"نہیں، ابھی تو نہیں لگ رہی۔"

"میں تو دیر ہی سے سوتا ہوں۔ نیند بہت کم آتی ہے۔ تجھے نیند لگے تو کوٹھری سے چٹائی نکال! باہر برآمدے میں بچھا کر سو جانا۔ یہاں کمرے میں تجھے گرمی لگے گی۔" اس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔

"سویرے اٹھ کر اپنے کپڑے دھولینا۔ کپڑوں پر اس طرح خون نہیں لگا رہنا چاہیے۔"

رحیم داد نے جھک کر قمیص اور شلوار پر خون کے دھبے دیکھے۔ "میں نے تو پہلے ان پر دھیان نہیں دیا تھا۔ تو نہ بتاتا تو مجھے پتہ ہی نہ چلتا۔"

"گھبراہٹ اور پریشانی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ویسے دھبے زیادہ نمایاں نہیں ہیں۔ غور سے دیکھنے نظر آتے ہیں۔" نورالٰہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "واردات کے بعد ملزم سے ایسی غلطی اور چوک نہ ہو تو پولیس کو جرم کا سراغ کیسے ملے۔"

"تجھے تو اب پتہ چل ہی گیا۔" رحیم داد نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ "میں تجھے سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔"

"سچ سچ بتا دے گا تو میں تجھے ٹھیک ہی مشورہ دوں گا۔ آگے تیرے کام آئے گا۔ پر مجھے اس بارے میں تب بتانا، جب تجھے، مجھ پر بھروسا ہو جائے۔"

"نہیں چودھری! مجھے، تجھ پر بھروسا ہے۔" رحیم داد نے اعتماد کا اظہار کیا۔ "بات یہ ہے، تو بیمار ہے اور دکھی بھی۔ میں تیرا دکھ ٹھیک طرح سمجھتا ہوں۔ میری بھی گھر والی ہے، بچے ہیں۔ میں نے انھیں بہت دنوں سے نہیں دیکھا۔ میں تیری اور جیناں کی باتیں کوٹھری میں بیٹھا سن رہا تھا مجھے اپنی گھر والی اور بچے اتنے یاد آئے کہ آنکھوں میں آنسو آگئے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" نورالٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ "میرا اور تیرا حال ایک ہی سا ہے۔"

"پر توں مجھ سے زیادہ دکھوں کا مارا ہوا ہے۔" رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔ "مجھے تو پتہ ہے میری گھر والی اور بچے کہاں ہیں، پر تجھے تو اپنے بال بچوں کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں۔ پر یہ بات سمجھ نہیں آئی، جب تو پاکستان پہنچ گیا تھا تو لہور میں ٹھہر کر انھیں تلاش کیوں نہیں کیا؟ منٹگمری کے کیمپ نہ جاتا۔"

"میں اپنی مرضی سے تو نہیں گیا تھا۔ کیمپ اتنا بھر گیا تھا کہ حکومت تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجروں کو دوسرے شہروں کے کیمپوں میں بھیجنے لگی۔ لیکن میں منٹگمری سے کئی بار لہور گیا۔ فیر کلیم اور الاٹمنٹوں کا چکر شروع ہو گیا۔ میں اس میں پھنس گیا۔"

"تیرے کلیم کا کیا بنا؟ کہیں زمین شمین بھی الاٹ کرائی؟"

"کلیم تو میرا منظور ہو گیا پر یہ نہ پوچھ اسے منظور کرانے کے لیے مجھے کتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔ میں نے ۱۹۴۸ء میں تحصیل میلسی، ضلع ملتان سے اپنا کلیم داخل کیا تھا۔ میں نصیرپور میں سات مربعے اور پٹیالے میں اڑھائی مربعے سے زیادہ زرعی اراضی چھوڑ کر آیا تھا۔ نصیرپور میں اپنی پکی ماڑی تھی۔ پٹیالے میں بھی مکان تھا۔ میں اپنے پیو کا اکلوتا پتر تھا۔ وہ بھی پولیس میں تھا۔ اس نے ورثے میں میرے لیے بہت کچھ چھوڑا تھا۔ ویسے میری اپنی آمدنی بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔" چودھری نورالٰہی نے قدرے توقف کیا۔ "مہینوں پر مہینے گزرتے گئے پر سنٹرل ریکارڈ آفس لہور سے میری اراضی کی تصدیق ہو کر نہیں آئی۔ میں دفتروں کے چکر کاٹتا رہا۔ دو سال بعد معلوم ہوا، کلیم فارم تصدیق کے لیے ریکارڈ آفس پہنچے ہی نہیں، رستے ہی میں کہیں گم ہو گئے۔ دوبارہ کلیم فارم اسی تحصیل سے داخل کیے۔ سات اٹھ مہینے اور گزر گئے۔ ان کا بھی پتہ نہ چلا۔ فیر عذرداری کی، اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔"

رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "پر کہیں زمین پر تو قبضہ کر ہی لیا ہوتا۔ بہت سے پناہ گیروں نے ایسا ہی کیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کی لاکھوں ایکڑ زمین پڑی تھی۔ ملتان میں بھی ان کی چھوڑی ہوئی بہت زمین تھی۔"

"میں نے میلسی میں، موضع ٹبل چراغ میں متروکہ اراضی پر قبضہ کر لیا تھا۔ پنج سو روپے رشوت دے کر اس کا عارضی الاٹمنٹ بھی اپنے نام کرا لیا تھا۔ اسی لیے اس تحصیل سے میں نے اپنا کلیم داخل کیا تھا۔" چودھری نورالٰہی نے بتایا۔ "دس ایکڑ کے لگ بھگ نہری زمین تھی۔ بہت مشکل سے قبضہ ملا تھا۔ ایک ہندو زمیں دار کی زمین تھی۔ قبضہ حاصل کرنے کے بعد میں کلیم کے چکر میں الجھ گیا۔ ایک روز معلوم ہوا، پٹواری یہ زمین اپنے کسی رشتے دار کے نام الاٹ کروانا چاہتا ہے۔ میں اسے ملا۔ منت سماجت کی پر وہ کسی طرح نہ مانا بلکہ مجھے طرح طرح سے تنگ کرنے لگا۔ جب اس نے بہت تنگ کیا اور زمین ہاتھ سے جاتی نظر آئی تو میں نے اس کے خلاف اوپر درخواستیں لگائیں۔ گورنر، وزیراعلیٰ، وزیر بحالیات، فنانشل کمشنر، سبھی کو لکھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ پٹواری کے خلاف ضرور کارروائی ہوگی اور معاملے کی پوری پوری تفتیش ہوگی۔ مگر ہوا یہ کہ ایک روز پٹواری

نے مجھے بلایا۔ گندی گندی گالاں نکالیں۔ اپنا بستہ کھول کر ایک مسل نکالی اور میرے منہ پر مار کر غصے سے بولا۔ لے اسے پڑھ۔ میں نے اسے اٹھا کر پڑھا تو میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مسل میں میری درخواست اور اس کی وہ تمام نقلیں موجود تھیں جو میں نے اوپر والوں کو بھیجی تھیں۔" نور الٰہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "مجھے حیرت زدہ دیکھ کر اس نے اور زیادہ ننگی ننگی گالاں نکالیں۔"

"توں خاموش بیٹھا رہا' کچھ نہیں کہا؟"

نور الٰہی خاموشی کے ساتھ چارپائی سے اترا۔ قریب رکھے ہوئے ٹرنک کے اندر سے کپڑے میں لپٹے ہوئے کاغذات کا پلندہ نکالا اور پھر بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے کپڑے کی گرہ کھول کر ایک فائل نکالی اور اس کے اوراق الٹ پلٹ کر ایک کاغذ توجہ سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ میری وہ درخواست ہے جو میں نے اوپر والوں کو بھیجی تھی۔" وہ اونچی آواز سے اسے پڑھنے لگا۔

رحیم داد نے درخواست سن کر کہا۔ "چوہدری! عرضی تو تیری زوردار لگتی ہے۔ پٹواری کا تو بیڑا غرق کر دیا۔"

"اس کا بیڑا تو کیا غرق ہوتا البتہ اس نے میرا بیڑا غرق کر دیا۔ ہوا یہ کہ اوپر والوں نے میری تمام درخواستیں ضروری کارروائی کے لیے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو بھیج دیں۔" نور الٰہی نظریں جھکائے کاغذات دیکھتا رہا اور رحیم داد کو بتاتا رہا۔ "ڈپٹی کمشنر کے دفتر والوں نے میری درخواست اور اس کی تمام نقلیں نتھی کر کے حسب ضابطہ اس پر نوٹ لکھا' درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بخدمت جناب افسر مال صاحب مرسل ہوں۔ ڈپٹی کمشنر نے نوٹ کے نیچے اپنے دستخط لگا دیے۔ درخواست افسر مال کو بھیج دی گئی۔ افسر مال نے تحصیل دار کو لکھا' درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بخدمت جناب تحصیل دار صاحب مرسل ہوں۔ تحصیل دار نے اس پر اپنا نوٹ لگایا۔ درخواست ہذا ۔طلب رپورٹ بنام قانون گو مرسل ہوں۔ قانون گو کے پاس درخواست پہنچی تو اس نے اپنے حکم میں لکھا۔ درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بجانب پٹواری حلقہ مرسل ہوں۔" نور الٰہی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"اس طرح وہ درخواست جو میں نے گورنر صاحب' وزیر بحالیات اور فنانشل کمشنر کو بھیجی تھی' اوپر سے سیڑھی سیڑھی نیچے اترتی ہوئی آخری کارروائی کے لیے اسی پٹواری کے پاس پہنچی جس کے خلاف میں نے شکایت کی تھی۔"

"تب تو وہ بہت گرم ہوا ہو گا؟"

"بہت زیادہ۔ غصے سے لال پیلی آنکھیں نکال کر مجھ سے بولا۔ اب جا کر گورنر جنرل اور وزیراعظم کو میرے خلاف شکایت لگا۔ پر جس کو بھی لکھے گا' تیری ہر درخواست آخری کارروائی کے لیے میرے ہی پاس آئے گی۔ فیر اس نے سارے ہی اوپر والوں کی ماؤں اور بہنوں کو ننگی ننگی گالاں نکالیں اور درخواست اٹھا کر اپنے بستے میں رکھ لی۔"

"تبھی تو سب کہتے ہیں۔ اتے یاری تھلے پٹواری۔" رحیم داد نے مسکرا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "توں نے خواہ مخواہ اس سے جھگڑا کیا۔ اس کی مٹھی گرم کر دیتا' تیرا سب کام بن جاتا۔"

"مگر چوہدری! وہ پٹواری ہے تو میں بھی پولیس میں حوالدار رہ چکا ہوں۔" نور الٰہی نے کڑک کر کہا۔ "میں نے بھی ہار نہیں مانی۔ تحصیل اور ضلع کے دفتروں کے چکر کاٹتا رہا۔ کئی مہینے بعد ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے ایک کلرک نے مجھے اپنی درخواست اور اس کی تمام نقلیں ایک مسل میں دکھائیں۔ پٹواری نے درخواست پر جو رپورٹ لگائی تھی' وہ بھی دکھائی۔ نور الٰہی نے ہاتھ بڑھا کر درخواست رحیم کے داد کے حوالے کر دی۔ رحیم داد نے لالٹین کی روشنی میں پڑھا' پٹواری نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔

جناب عالی!

سائل مسمی چوہدری نور الٰہی کی جملہ درخواست ہذا کی مکمل پڑتال کی گئی۔ اس جانچ پڑتال سے ظاہر ہوا کہ سائل فضول درخواست دینے کا عادی ہے۔ اسے متعدد بار سرزنش کی جا چکی ہے کہ اس طرح حکام کا قیمتی وقت ضائع کرنا درست نہیں۔ لیکن سائل اپنی عادت سے مجبور ہے۔ سائل کا چال چلن بھی مشتبہ ہے۔ اس کا اصل ذریعہ معاش فرضی گواہیاں دینا ہے۔ مشرقی پنجاب میں اس کے پاس کوئی اراضی نہیں تھی۔ نہ کسی قسم کی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد تھی۔ اسی وجہ سے اس کے کلیم فارم بھی ابھی تک تصدیق نہیں ہوئے۔ سائل نے دو مرتبہ عذرداری بھی کی لیکن بے سود۔ متعدد مہاجرین اور گواہان کے بیانات قلم بند کیے گئے۔ تحقیق ہوا کہ گورداس پور اور ریاست پٹیالہ میں سائل کی ملکیت میں کوئی زمین نہیں تھی۔ چنانچہ کھیوٹ نمبر۱۵' مقدمہ نمبر۲۸' موضع ٹبل چراغ میں دس ایکڑ متروکہ اراضی' جس پر سائل کا ناجائز قبضہ تھا' اس کے نام سے منسوخ ہو کر مسمی فضل دین کے نام بہ روئے قانون رائج باضابطہ کنفرم ہو چکی ہے۔ مسمی فضل دین' ضلع جالندھر کا مہاجر اور سابق سفید پوش ہے۔ اس کے تصدیق شدہ کلیم بھی موصول ہو چکے ہیں۔ لہٰذا موضع ٹبل چراغ میں متروکہ اراضی ہذا الاٹ کر کے اس کی حق رسی کر دی گئی ہے۔

پٹواری کی رپورٹ پر گرداور اور قانون گو نے یہ نوٹ لگایا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ یہ

مراد حکم مناسب بخدمت جناب نائب تحصیل دار صاحب پیش ہو۔" نائب تحصیل دار نے بھی اسی طرح درخواست پہ اپنا نوٹ لگایا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بہ مراد حکم مناسب بخدمت صاحب مال افسر بہادر پیش ہو۔" افسر مال نے تحریر فرمایا۔ "رپورٹ مفصل ہے۔ بہ مراد حکم مناسب صدر میں پیش ہو۔" صدر کے مسل خواں نے حکم لکھا۔ "رپورٹ مفصل ہے۔ درخواست بائے مسمی چوہدری نورالٰہی فضول ہیں۔ داخل دفتر کی جائیں۔"

رحیم داد نے درخواست نورالٰہی کو واپس کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ "چوہدری! تجھے اپنی درخواست اور اس پہ کی گئی کارروائی اور پٹواری کی رپورٹ کہاں سے مل گئی؟"

"ارے یار! یہ کام بھی کوئی کام ہے۔ اڑھائی سو روپے کا خرچا اور ہوا۔" نورالٰہی نے ہنس کر بتایا۔ "اس پر افسر کے دستخط بھی نہیں ہوئے تھے۔ پٹواری نے تو میرا عارضی الاٹمنٹ منسوخ کرانے اور اپنے رشتے دار فضل دین کے نام پکا الاٹمنٹ کرانے کا پورا بندوبست کرا ہی لیا تھا' پر اس کا کسی پولیس والے سے ٹاکرا نہیں ہوا تھا۔"

"پٹواری آخر پٹواری ہوتا ہے۔ اس نے تجھے بعد میں تنگ کیا ہوگا؟"

"میں نے اسے یہ موقع ہی نہیں دیا۔ ہوشیار پور کا ایک مہاجر متروکہ اراضی کی تلاش میں تھا۔ اس کے پاس تصدیق شدہ کلیم بھی تھا۔ میں نے ساڑھے سات ہزار میں اس سے سودا کر لیا اور ٹبل چراغ کی دس ایکڑ زمین پر اسے قبضہ دے دیا۔ وہ صوبائی اسمبلی کے ممبر کا کچھ لگتا تھا۔ اس کی سفارش پر زمین کا اس کے نام اوپر ہی اوپر پکا الاٹمنٹ بھی ہو گیا۔" نورالٰہی مسکرانے لگا۔ "جب اس کا الاٹمنٹ پوری طرح ہو گیا تو میں پٹواری کے پاس گیا۔ اسے گریبان سے پکڑا۔ جتنی بھی گندی گندی گالاں معلوم تھیں' ساری ہی خالص پولیسوں کی زبان میں نکالیں اور اس سے کہا۔ توں پٹواری ہے تو میں نے بھی پولیس کی حوالداری کی ہے۔"

"چوہدری! توں نے اسے ٹھیک سبک سکھایا۔" رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ "ویسے زمین کے ساڑھے سات ہزار لے کر گھاٹے میں نہیں رہا۔"

"ان ساڑھے سات ہزار کے علاوہ اسی زمین کی بنیاد پر میں مویشی اور بیج کی خریداری' مکان بنانے اور دوسرے اخراجات کے لیے سرکار سے ۵ ہزار روپے کا تقاوی قرضہ پہلے ہی وصول کر چکا تھا۔" نورالٰہی نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "اس قرضے کی کچھ رقم میرے پاس موجود تھی۔ میں نے بھاول نگر سے نئے کلیم فارم داخل کیے۔ چھے ہزار روپے اوپر سے خرچ ہوئے۔ فیر لاہور کے سینٹرل ریکارڈ آفس سے تصدیق بھی ہو گئی۔ دو ہفتے کے اندر اندر کلیم منظور ہو گیا۔ تمہیں

نوں پتہ ہے کتنا وڈا کلیم منظور ہوا؟"

رحیم داد ہونق کی طرح اس کا چہرہ تکتا رہا۔ نورالٰہی نے بتایا۔ "۶۸ مربع اراضی اور دو حویلیوں کا کلیم منظور ہو کر آیا۔ جب سچا حلف نامہ لگایا تھا اور سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک تحریر کیا تھا تو صرف ساڑھے ۵ مربع اراضی اور ایک مکان کا کلیم اڑھائی تین برس کی بھاگ دوڑ اور تمام منت سماجت کے بعد بھی دفتروں کی فائلوں میں دبا رہا۔ عذرداری بھی کی' کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ چھے ہزار کے جادو سے ہر کام اوپر سے نیچے تک ایسے فٹافٹ ہوتا چلا گیا جیسے میرے کلیم کی فائل کو پہیے لگ گئے ہوں۔ لطف یہ کہ جھوٹا کلیم ایک دم سچا بن گیا۔ نہ زیادہ بھاگ دوڑ کرنی پڑی' نہ کسی کے سامنے جا کر فریاد کرنے کی ضرورت پیش آئی۔"

"تجھے کلیم کی منظوری کے ساتھ ساتھ الاٹمنٹ بھی فٹافٹ مل گئی ہوگی؟"

"تمہیں نوں پتہ نہیں' کلیم منظور کرانا تو ایسا مشکل کام نہیں پر الاٹمنٹ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔" نورالٰہی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "الاٹمنٹ کے چکر میں فیر پٹواری سے ٹاکرہ ہوا اور اس بار مجھے سچ مچ اندازہ ہوا' پٹواری کتنا طاقت ور ہوتا ہے۔"

"اس بار کیا ہوا؟"

"یہ پوچھ کیا نہیں ہوا؟ تجھے ان کاموں سے واسطہ نہیں پڑا۔ تجھے کیا معلوم' الاٹمنٹ کے چکر میں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ٹبل چراغ میں تو ایک ملنے والے کی مدد سے زمین پر قبضے کے ساتھ ہی عارضی الاٹمنٹ بھی مل گئی تھی۔ ویسے اس وقت متروکہ اراضی بھی بہت تھی۔ اب تلاش کرنی پڑتی ہے۔ ساری عمدہ زمینیں تو اوپر ہی اوپر بھائی بھتیجوں' شریکوں اور یاروں دوستوں میں بٹ گئیں۔ ادھر وڈے زمیں داروں نے ہندوؤں اور سکھوں کے پرانے مسلمان مزارعوں سے معاملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ الاٹمنٹ کا چکر بھی عجب چکر ہے۔" نورالٰہی کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "اوپر والوں کے پاس جاؤ تو حکم ملتا ہے۔ تحصیل دار کے پاس جاؤ۔ تحصیل دار کے سامنے درخواست پیش کرو تو وہ اس پر لکھتا ہے' نائب تحصیل دار رپوٹ کریں۔ نائب تحصیل دار کے سامنے درخواست جاتی ہے تو وہ اپنا نوٹ لگاتا ہے' گرداور حلقہ رپورٹ کریں' آیا کوئی اراضی برائے الاٹ موجود ہے؟ گرداور حلقہ اپنے حکم میں تحریر کرتا ہے' پٹواری حلقہ رپورٹ کرے آیا کوئی اراضی حلقہ مذکور میں برائے الاٹ پائی جاتی ہے؟ اس طرح اوپر سے جو فائل چلتی ہے' وہ پٹواری ہی کے پاس آکر ٹھہرتی ہے۔"

"یہ تو ویسا ہی چکر ہوا جو پٹواری نے ٹبل چراغ کی الاٹمنٹ ختم کرانے کے لیے تیرے خلاف

چلایا تھا۔"

"سچ تو یہ ہے جی' پٹواری الاٹمنٹ منسوخ بھی کرا سکتا ہے اور وہی الاٹمنٹ دلا بھی سکتا ہے۔" نورالٰہی نے گہری سانس بھری۔ "الاٹمنٹ کی منظوری یا منسوخی کی پوری عمارت پٹواری کی رپورٹ ہی پر کھڑی ہوتی ہے۔ الاٹمنٹ کی درخواست اوپر سے چلتی ہوئی جب پٹواری کے پاس پہنچتی ہے تو پہلے تو وہ اسے دبا کر بیٹھ جاتا ہے اور درخواست لگانے والے کا انتظار کرتا ہے۔ اگر وہ اس کے پاس نہیں پہنچتا اور اوپر ہی اوپر کارروائی کرانے کی کوشش کرتا ہے تو پٹواری درخواست پر لکھ دیتا ہے حلقہ مذکورہ میں کوئی اراضی برائے الاٹ موجود نہیں ہے۔ اور اگر درخواست لگانے والا صرف منت سماجت سے کام نکالنا چاہتا ہے تو پٹواری اسے ٹرخا دیتا ہے یا بنجر زمین دلا کر اپنا پیچھا چھڑا لیتا ہے۔ درخواست پر اپنی رپورٹ میں لکھ دیتا ہے۔ موضع فلاں فلاں میں کسی قدر بنجر قدیم اراضی برائے الاٹ موجود ہے۔ اگر سائل یہ زمین لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ اب درخواست فیر الٹے پیروں چلتی ہوئی اوپر جاتی ہے۔"

"چوہدری! تو تحصیل دار' نائب تحصیل دار اور گرداور کے چکر میں پڑنے کی بجائے سیدھا پٹواری کے پاس کیوں نہیں پہنچا؟ سب کچھ تو اسی کی رپورٹ پر ہوتا ہے۔"

"ہاں جی' محکمہ مال کا سارا انتظام پٹواری ہی کے بل پر چلتا ہے۔ افسر تو صرف حکم چلاتے ہیں۔ بہت ٹھوکریں کھانے اور دفتروں کے چکر کاٹ کاٹ کر جب مجھے پٹواری کی اہمیت معلوم ہوئی تو میں اوپر والوں کے پاس جانے کی بجائے پٹواری کے پاس پہنچا۔ دو ہزار میں اس سے معاملہ طے کیا اور اسی پٹواری کے پاس عمدہ نہری زمین نکل آئی جسے اپنے حلقے میں بنجر اور کلر زمین بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے اپنے بستے سے نقشہ نکالا اور رپورٹ لکھ دی۔ لو جی' تحصیل دار تک درخواست فٹا فٹ پہنچ گئی اور زمین کی الاٹمنٹ بھی مل گئی۔"

"مجھے متروکہ اراضی کی الاٹمنٹوں کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں' پر اتنا میں نے بھی سنا ہے پٹواریوں نے تو یہاں تک کیا' جس نے ان کی مٹھی گرم کی' اسے الاٹمنٹ دے دی۔ ایک ہی زمین کئی کئی کے نام الاٹ ہوئی۔ بعد میں دنگے فساد ہوئے۔ مقدمہ بازی ہوئی۔ میرے نزدیک کے موضع میں ایک ہی زمین کے چار الاٹی ہیں۔ ان میں پچھلے اڑھائی سال سے زبردست مقدمہ بازی ہو رہی ہے۔"

"میرے ساتھ بھی دوبارہ یہی ہوا۔" نورالٰہی نے رحیم داد کو بتایا۔ "تحصیل سنجن آباد میں مجھے ۷۶ کنال زمین الاٹ ہوئی۔ میں قبضہ لینے پہنچا تو پتہ چلا وہی زمین چھ دعویداروں کو پہلے ہی الاٹ

ہو چکی ہے اور ان میں سے چار نے نالش بھی کر دی ہے۔ مہینوں سے عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔ اسی تحصیل میں بعد میں میرے نام ۳۰ ایکڑ زمین کی الاٹمنٹ ہوئی۔ میں پہلے سے زیادہ زمین ملنے پر خوش تھا پر جلد ہی ساری خوشی جاتی رہی۔ پتہ چلا وہ زمین بھی کئی دعویداروں کو مجھ سے پہلے الاٹ کی جا چکی ہے۔ قبضہ حاصل کرنے کے چکر میں دو فریقوں نے تو بندوقوں اور کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر ایک دوسرے پر حملہ کیا۔ پولیس نے دونوں گروہوں کے خلاف مقدمہ قائم کیا۔ کئی کو گرفتار بھی کر لیا۔ زمین کی بجائے انھیں قید کاٹنے کے لیے جیل کی کوٹھری الاٹ ہوئی۔ ان کا انجام دیکھ کر میں نے توبہ کی۔ فوراً اپنی الاٹمنٹ منسوخ کرائی۔ ویسے سنجن آباد میں جعلی فرد حقیت اور بوگس کلیم فارموں کے ذریعے زبردست دھاندلی ہوئی۔ میں نے تو جی وہاں زمین الاٹ کرانے کا خیال ہی چھوڑ دیا تھا۔"

"فیر تجھے کہاں الاٹ ہوئی زمین؟"

"مجھے کئی مہینے بھاگ دوڑ کرنے کے بعد بھاول پور کے موضع نذر محمد جھلن میں پورے چار مربعے الاٹ ہو گئے۔" نورالٰہی کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی سرخی پھیل گئی۔ "جھلن میں ایک سکھ زمیں دار سردار کھڑک سنگھ کی ۲۷ مربع متروکہ اراضی تھی۔ اس پر کھڑک سنگھ کے پرانے مزارعے کاشت کرتے تھے۔ شروع میں انھوں نے ساری زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی لیے اس زمین کی الاٹمنٹ بہت بعد میں ہوئی۔ اس طرح میرے حصے میں بھی ۱۰۰ ایکڑ زمین آ گئی۔"

"۱۰۰ ایکڑ تو بہت ہوئے۔" رحیم داد نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ "پر تیرا کلیم بھی تو ۶۸ مربعے کا منظور ہوا تھا۔ وہ زمین ابھی تک تیرے ہی پاس ہے نا؟"

"وہ زمین میرے پاس رہتی تو میں یہاں کیوں پڑا ہوتا۔" نورالٰہی کا چہرہ لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اور زیادہ زرد نظر آنے لگا۔ اس پر غم کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ وہ بجھے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

"موضع نذر محمد جھلن جس علاقے میں ہے اس علاقے کا سب سے وڈا زمیں دار مخدوم رحمان شاہ ہے۔ اس کے پاس بیس ہزار ایکڑ سے بھی زیادہ زمین ہے۔ وہ میران والی میں رہتا ہے جو صادق آباد سے نزدیک ہے۔ ویسے میران والی بھی وڈا قصبہ ہے۔ آبادی اس کی پنج ہزار سے اوپر ہی ہوگی۔ میران والی کے چاروں طرف اونچی اونچی فصیل ہے۔ فصیل کے دو بڑے پھاٹک ہیں۔ رات کو یہ پھاٹک بند کر دیے جاتے ہیں۔ میران والی سمجھو' بہت وڈا قلعہ ہے جہاں صرف مخدوم رحمان شاہ

کی حکومت ہے۔ بسیں اور لاریاں تک اسی کی چلتی ہیں۔ ایسی واہیات اور کھٹارا کہ سیٹوں پر گدیاں تک نہیں ہوتیں' مگر میران والی کا رہنے والا کوئی بندہ اس کی لاریوں کے علاوہ کسی اور سے سفر نہیں کر سکتا۔ میران والی میں اس نے اپنی کپڑے کی دوکانیں بھی کھول رکھی ہیں۔ اس کے مزارعوں کو صرف انھی دکانوں سے کپڑا خریدنا پڑتا ہے۔ ورنہ سزا ملتی ہے۔"

نورالٰہی نے قدرے توقف کیا۔ چند لمحے گہری گہری سانسیں بھرتا رہا' پھر گویا ہوا۔ "میران والی کے رہنے والوں کو وہ اپنی رعایا کہتا ہے۔ روزانہ عدالت لگاتا ہے۔ سزائیں دیتا ہے۔ اس کی ذاتی جیل بھی ہے' حویلی کے ساتھ ہی ہے۔ جسے چاہتا ہے' سزا دے کر اپنی جیل میں ڈال دیتا ہے۔ اس نے ۱۰۰ کے لگ بھگ مسلح کرندے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کرندے رائفلوں اور پستولوں سے مسلح ہو کر پورے علاقے میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ معمولی معمولی باتوں پر مزارعوں کو گرفتار کر کے رحمان شاہ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس کی کماد کی فصل سے ہاتھ بھر کا ٹوٹا بھی توڑ کر چوپ لے تو جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔"

رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "چوہدری! تجھے میران والی اور مخدوم رحمان شاہ سے کیا لینا۔ تجھے تو موضع جھلن میں زمین الاٹ ہوئی تھی۔ یہی بتایا تھا نا؟"

"میں نے یہ بھی تو بتایا تھا جھلن اسی علاقے میں ہے۔ میں تجھے یہ بتانا چاہتا تھا مخدوم رحمان شاہ کتنا وڈا اور زور آور زمیں دار ہے۔ وہ جھلن کی متروکہ اراضی پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ نئے زمیں داروں اور الاٹیوں کو طرح طرح سے تنگ کرتا رہتا۔ میرے پاس دوسرے نئے زمیں داروں سے کچھ زیادہ ہی زمین تھی اس لیے وہ مجھے زیادہ ہی تنگ کرتا تھا۔ پہلے تو اس نے میرے مزارعوں کو سرکشی پر اکسایا۔ وہ اپنی مرضی کی فصل بوتے' فصل کی واڈھی پر راہ کی اور بٹائی میں زیادہ حصہ مانگتے۔ خاما خا کا جھگڑا فنا کھڑا کرتے۔"

"راہ کی میں جھگڑے ٹنٹے کی کون سی بات۔ وہ تو زمیں دار اور مزارع کے درمیان آدھی آدھی ہوتی ہی ہے بلکہ زمیں دار ہی کئی طرح کے ٹیکس لگا کر زیادہ حصہ وصول کرتے ہیں۔ چوہدری تو بالکل نئی گل کر رہا ہے۔ ظلم تو زمیں دار مزارعوں پر کرتے ہیں۔"

"پر جھلن میں مخدوم رحمان شاہ کے کرندوں کے ہشکانے اور شیری دینے پر مزارعے' مہاجر زمیں داروں کو بہت تنگ کرتے تھے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے ہتھکنڈوں سے گھبرا کر کئی الاٹی اپنی زمینیں چھوڑ کر چلے گئے۔ پر میں نے مزارعوں سے جھگڑا فنا نہیں کیا۔ انھیں راضی خوشی رکھنے کی ہر طرح کوشش کی۔ بات یہ تھی' زمین زرخیز تھی اور پانی بھی بہت تھا۔ میں نے اپنا ایک مربع ایک

مزارعے پیر بخش کے ہاتھ ۲۵ ہزار میں بیچ دیا۔ اس رقم سے تیس ایکڑ پر آم' اور مالٹے کے باغ لگائے۔ مزارعوں کے بچوں کے لیے پرائمری اسکول بھی بنانے کی کوشش کی۔ یہ کام میں نے پیر بخش کے پتر' امیر بخش کے کہنے پر کرنا چاہا۔ وہ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اس نے مزارعوں کے ساتھ میل جول بنانے میں میری بہت مدد کی تھی۔"

چوہدری نورالٰہی سنبھل' سنبھل کر بولتا رہا۔ تھک جاتا تو دم لینے کو رک جاتا۔ رحیم داد توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ "سکول شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ رحمان شاہ نے ایک روز مجھے میران والی بلا لیا۔ ایسے ہی شروع گرمیوں کے دن تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ شاہ جی اپنی حویلی کے باغ میں تھا۔ وہ ململ شلوار اور قمیص پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کے اوپر لمبا کوٹ تھا۔ گلے میں ٹائی بندھی تھی اور سر پر لال رومی ٹوپی تھی۔ وہ کرسی پر شان سے اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ ایک نوکر پیچھے کھڑا دھیرے دھیرے پنکھا جھل رہا تھا۔ اس نے عدالت لگا رکھی تھی۔ باری باری ہر ایک کی پیشی ہو رہی تھی۔ ویسے وہ آنریری مجسٹریٹ بھی ہے۔ میری پیشی ہوئی تو اس وقت اس کے سامنے موضع شیخ بکھر کا ایک دکان دار سر جھکائے ملزموں کی طرح کھڑا تھا۔ مخدوم سید رحمان شاہ نے اس سے پوچھا۔ تو نے مسجد بنائی ہے؟ اس نے گردن ہلا کر ہامی بھری۔ مخدوم رحمان نے غصے سے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔ کیوں مسجد بنائی؟ اور اس کے جواب دینے سے پہلے خود بول پڑا۔ تیں نوں پتہ ہے حاکم کی اجازت کے بغیر رعایا کو مسجد بنانے کا حکم نہیں۔ رحمان شاہ نے اسے چھے مہینے کی سزا بھی دے دی۔ اس کے مسلح کرندے دکان دار کو پکڑ کر اسی وقت جیل میں ڈالنے لے گئے۔"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "مسجد بنانے پر جیل میں بند کر دیا؟"

"مجھے بھی تیری طرح حیرت ہوئی تھی۔" نورالٰہی نے جواب دیا۔ "مخدوم رحمان شاہ نے مجھے دیکھتے ہی تیوری پر بل ڈال کر پوچھا' تو پناہ گیرا ہے؟ میں نے کہا۔ ہاں جی' میں گورداس پور کا مہاجر ہوں۔ موضع جھلن میں میری زمیں داری ہے۔ وہ کڑک کر بولا۔ میں نوں پتہ ہے' میں نوں یہ بھی پتہ ہے تو جھلن میں سکول بنانا چاہتا ہے۔ کیوں سکول بنانا چاہتا ہے؟ مزارعوں کے منڈوں کو بدمعاشی سکھانی ہے؟ تیں نوں پتہ ہے' وہ تیری۔۔۔ کی چائی بنا کر اس میں مدھانی ڈالیں گے۔ اور ایسا رڑکا لگائیں گے تیری ساری زمیں داری لسی بن کر نکل جائے گی۔ جا میریاں اکھیاں اگوں دور ہو جا۔ سکول شکول کے چکر میں نہ پڑ۔ اس بار وارننگ دے کر چھوڑ دیتا ہوں۔ اگے ایسی گل نہ سنوں۔ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا پر یہ ضرور سمجھ گیا اس نے مسجد بنانے پر موضع شیخ بکھر کے دکاندار کو میرے سامنے چھے مہینے کی سزا کیوں سنائی تھی۔"

"فیر تو نے کیا کیا؟"

"میں تو سکول بنانے کا خیال چھوڑ دیتا' پر امیر بخش تیار نہیں ہوا۔ چنگا تکڑا جوان تھا اور حو والا بھی۔ رحمان شاہ کو پتہ چلا تو بہت خفا ہوا' اس نے امیر بخش اور اس کے پیو پیر بخش کے خلا ڈنگر چوری کا جھوٹا مقدمہ بنوا کر دونوں کو بند کروادیا۔ ان کے گھر والوں اور رشتے داروں کو پولیس نے بہت تنگ کیا۔ پیر بخش اتنا ڈرا کہ اس نے اپنی ۲۵ ایکڑ زمین مخدوم رحمان شاہ ہاتھوں صرف ۱۵ ہزار میں بیچ دی اور جھلن چھوڑ کر چلا گیا۔"

"تجھے تو مخدوم نے تنگ نہیں کیا؟"

"اس کے کرندے ایک رات بندوقوں سے مسلح ہو کر آئے۔ انھوں نے مجھے گرفتار کرلیا مخدوم رحمان شاہ کی ذاتی جیل میں لے جا کر ڈال دیا۔ جیل میں چھوٹی چھوٹی کئی تنگ و تار کوٹھڑیاں تھیں۔ مجھے بھی دوسرے قیدیوں کی طرح ایک کوٹھڑی میں بند کردیا گیا۔ اس میں روشندان تھا' نہ ہوا آنے کا کوئی رستہ۔ اتنی گندگی اور بدبو تھی سانس بھی نہ لی جاتی۔ اوپر سے گرمی پڑ رہی تھی۔ کھٹمل اتنے تھے کہ دیواروں پر' زمین پر' جگہ جگہ رینگتے پھرتے۔ ساری رات کھجاتے کٹتی۔ دو روز تو کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ بعد میں جو روٹی کھانے کو ملتی رہی اس میں آو سے زیادہ ریت ہوتی اور دال میں کنکر ہوتے' اوپر مکھیاں تیرتی ہوتیں۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "رحمان شاہ کو سکول سے اتنی نفرت کیوں تھی؟ اس کے بال بچے تو پڑھے لکھے نہیں ہوں گے۔"

"نہیں جی' اس کے خاندان کے صرف منڈے ہی نہیں' کڑیاں تک لندن اور امریکہ میں رہی ہیں۔ بالکل میموں کی طرح رہتی ہیں۔ مخدوم رحمان شاہ کو نفرت تو مزارعوں کے بچوں پڑھائی سے ہے۔ پڑھ لکھ جائیں گے تو اس کی عمل داری کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔"

"تو کتنے دن جیل میں رہا؟"

"چار مہینے سے اوپر ہی رہا۔" نورالٰہی نے چند لمحے خاموش رہ کر بتایا۔ "وہیں مجھے کھانسی شر ہوئی۔ فیر بلغم کے ساتھ خون بھی آنے لگا۔ بخار بھی رہنے لگا۔ یہ ٹی بی کی بیماری مجھے وہیں لگی۔ اس شرط پر مجھے رہائی ملی کہ پہلے الاٹمنٹ منسوخ کرانے کی درخواست لگائی۔ تب جیل سے ملی۔ میری خریف کی واڈھو فصل تھی۔ چھٹی تو چنائی کے لیے بالکل تیار تھی۔ پر رحمان شاہ کرندوں نے مجھے نذر محمد جھلن تک جانے بھی نہیں دیا۔"

"لگتا ہے رحمان شاہ بھی ملتان کے مخدوموں کی طرح کسی درگاہ کا گدی نشین ہے' جن کے

وڈی وڈی زمیں داریاں اور جگیریں ہیں۔" رحیم داد نے نورالٰہی کی باتیں سن کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "انھوں نے بھی اسی طرح ہزاروں ایکڑ متروکہ اراضی دبا رکھی ہے۔ اپنی' اپنی زمیں داریوں میں وہ بھی ایسے ہی حکومت کرتے ہیں۔ موج مستی کرتے ہیں۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہو سکتا۔"

"ویسے رحمان شاہ نہ گدّی نشین ہے' نہ پیر ہے نہ سائیں' پر مخدوم الملک کہلاتا ہے۔" نورالٰہی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "سنا ہے جب ریاست بھاول پور میں آیا تھا تو اس کا حال یہ تھا کہ رہنے کا ٹھکانا بھی نہ تھا۔ ملتان روڈ پر گدّوّل کی سرائے میں رہنے کو ایک آنہ روز کرائے پر منجی لے رکھی تھی۔ بچوں کو کلام مجید پڑھاتا تھا۔ ان کے گھروں سے روٹی ٹکر کھانے کو مل جاتا۔ کبھی کبھار مردوں کی فاتحہ کا کچھ مل جاتا۔ اسی سے گزر بسر ہوتی تھی۔"

"گھر والی نہیں تھی؟"

"پتہ نہیں۔" نورالٰہی مسکرا کر بولا۔ "ویسے بھی فاتحہ کی روٹی کھانے والے ملاں سے کون اپنی کڑی کا ویاہ کرتا ہے۔"

"تب رحمان شاہ اتنا وڈا زمیں دار کیسے بن گیا؟"

"وہ ایسا ہوا کہ منت سماجت کرکے کسی کی سفارش پر نواب صاحب کو کلام مجید پڑھانے پر لگ گیا۔ فیر تو جی اس کے دن ہی بدل گئے۔ ایسا نصیب بدلا کہ نواب صاحب نے کسی بات پر خوش ہو کر میران والی کی پوری جاگیر ہی بخش دی۔ ساتھ ہی مخدوم الملک کا خطاب بھی دے دیا۔ ریاستوں میں ایسے ہی جاگیریں اور خطاب دئے جاتے تھے۔ میں تو ریاست پٹیالہ میں رہ چکا ہوں۔ ایسی بخششیں ہوتی بہت دیکھی ہیں۔"

"موضع نذر محمد جھلن سے نکل کر تو کہاں گیا؟"

"کئی مہینے تک الاٹمنٹ کے چکر میں ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتا پھرا۔" نورالٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چند لمحے خاموش بیٹھا آہستہ' آہستہ ہانپتا رہا۔ جب ذرا قرار آیا تو دل گرفتہ ہو کر بولا۔ "فیر یہاں آگیا۔ یہاں الاٹمنٹ شلاٹمنٹ تو ابھی تک ہوئی نہیں۔ جیناں کے گھر والے اکبر نے باراں ایکڑ متروکہ زمین پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ چاہتا ہے' میں یہ زمین اپنے نام الاٹ کروالوں۔ وہ میرا مزارع بن کر رہے گا بلکہ وہ تو ابھی سے خود کو میرا مزارع سمجھنے لگا ہے۔"

"توں نے یہ زمین الاٹ کرانے کی کوشش نہیں کی؟"

"بیماری نے اس کا قابل نہیں رکھا۔" نورالٰہی نے کلیم کے کاغذات اور دوسری دستاویزات

کپڑے میں احتیاط سے لپیٹ کر گرہ لگائی۔ چارپائی سے اترا اور کاغذات کا بستہ ٹرنک میں رکھ کر تالا ڈال دیا۔ وہ دوبارہ بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "توں دل میں کہتا ہو گا' چوہدری باتیں بہت کرتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اس طرح دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہوں۔ توں آگیا تو ذرا جی بہل گیا۔ ورنہ اکیلا پڑا کھانستا رہتا۔ نیند بھی تو کم آتی ہے۔" نورالٰہی بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے رحیم داد سے کہا۔

"لگتا ہے تجھے نیند آرہی ہے۔ چٹائی نکال لے اور باہر جا کر سو جا۔"

رحیم داد نے کوٹھری سے چٹائی نکال کر برآمدے میں بچھائی اور تھکا ہوا سا لیٹ گیا۔

☆

صبح بہت تڑکے رحیم داد بیدار ہوا۔ اس نے نورالٰہی کی دھوتی باندھی اور اپنے کپڑے دھونے بیٹھ گیا۔ اس نے قمیص اور شلوار رگڑ رگڑ کر خون کے دھبے صاف کرنے کی کوشش کی اور گیلے کپڑے دھوپ میں سوکھنے کے لیے آنگن میں ڈال دیے۔

دوپہر کو جیناں کھانا لے کر آئی۔ رحیم داد کمرے کے اندر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ نورالٰہی برآمدے میں تھا۔ جیناں اسے کھانا دے کر چپ چاپ چلی گئی۔ نورالٰہی کھانا لے کر کمرے میں آیا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔

نورالٰہی آدھی روٹی سے زیادہ نہ کھا سکا۔ وہ صبح سے مسلسل کھانس رہا تھا۔ کھانسی کے ساتھ خون بھی آیا۔ دن ڈھلے بخار تیز ہو گیا۔ وہ بستر پر لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ نقاہت اتنی بڑھ گئی تھی کہ رحیم داد سے زیادہ بات چیت بھی نہیں کر سکا۔

کپڑے سوکھ چکے تھے۔ رحیم داد کپڑے پہن کر نورالٰہی کے قریب مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ نورالٰہی آنکھیں بند کیے بستر پر نڈھال پڑا تھا۔ رحیم داد نے لالٹین روشن کی۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی۔ ذرا دیر بعد بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی جیناں کی آواز بھی ابھری۔

وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا۔ نورالٰہی نے آنکھیں کھول کر رحیم داد کو دیکھا۔ ہانپنے کے انداز میں سانس بھرتا ہوا اٹھا۔ رحیم داد کو کوٹھری میں جانے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر گیا۔

رحیم داد کوٹھری کے بند دروازے کے پیچھے دم سادھے کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے جیناں کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"چوہدری! آج تیری طبیعت کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔ توں کہے تو اکبر کو تخت ہزارہ بھیج کر حکیم

سے دوائی منگوالوں؟"

"دوائی تو ہے۔ سویرے اکبر کو میرے پاس بھیج دینا۔ میں اسے حال بتا دوں گا۔ وہ حکیم کے پاس چلا جائے گا۔ حکیم دوسری دوائی دے گا تو لے آئے گا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "میں خود حکیم کے پاس چلا جاتا مگر کل اٹھ دس میل سیکل چلائی تو طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ بخار بھی کچھ زیادہ ہی لگتا ہے۔ آج تو مجھ سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔"

"توں نے دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے؟ اسے کھولنے کے لیے تیں نوں بکھار میں اٹھنا پڑا۔ پہلے تو ایسا نہیں کرتا تھا۔" جیناں چند لمحے خاموش رہی۔ "کل رات تیرے پاس کوئی آیا تھا؟"

نورالٰہی نے صاف انکار کر دیا۔ "میرے پاس تو کوئی نہیں آیا۔ تیں نوں کیسے پتہ چلا؟"

"اکبر رات تیرے پاس آیا تھا۔ وہ شام کو ساتھ کے پنڈ گیا تھا۔ واپسی پر ادھر آیا۔ تیرے بال بچوں کے بارے میں پتہ کرنا چاہتا تھا۔ اکبر کہتا تھا' تیرے کمرے سے دھیرے دھیرے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔"

"رات تو میرے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔ اکبر کو ویسے ہی شبہ ہوا ہو گا۔"

"شبہ تو مجھے بھی ہوا۔ میں دن میں تیرے پاس روٹی لے کر آئی تو باہر کپڑے بھی سوکھ رہے تھے۔ اب وہ کپڑے توں نے پہن بھی نہیں رکھے۔"

"میں نے دھو کر ٹرنک میں رکھ دیے ہیں۔" نورالٰہی نے فوراً بات بنائی۔ "کپڑے دھونے ہی سے تو آج میری طبیعت اتنی گڑبڑ ہو گئی۔"

"توں نے کپڑے کیوں دھوئے؟ مجھے دے دیتا۔ کیا پہلے دھونے کو نہیں دیتا رہا ہے؟ تیں نوں بیماری میں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اکبر تیرا مزارع بھی تو ہے۔"

"ایسی گل بات نہ کر۔" نورالٰہی نے قدرے اونچی آواز سے کہا۔ "کوئی مزارع شزارع نہیں۔ وہ نیک بندہ ہے۔ اور تو بھی میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ صبح شام روٹی کھلاتی ہے' دوائی منگوا کر دیتی ہے۔ کیا نہیں کرتی؟ تو نہ ہوتی تو میں کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔"

"لے میں تیرا کیا کام کرتی ہوں۔ چوہدری! کیسی گلاں کر رہا ہے۔ گھر کے دھندوں سے چھٹی ہی نہیں ملتی۔ چھوہری الگ بیمار ہے۔ اسے حکیم نے کالی کھانسی بتائی ہے۔ اسی لیے تیرے پاس زیادہ نہیں آتی۔"

"اب جا۔ اکبر تیرا انتظار کر رہا ہو گا۔ چھوہری بیمار ہے۔ روتی ہو گی۔"

نورالٰہی آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ جیناں چلی گئی۔

☆

رحیم داد کوٹھری سے باہر آگیا۔ اس نے آنگن میں جاکر بیرونی دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ واپس کمرے میں آیا تو نورالٰہی نے کہا۔ "سنا' جیناں کیا کہہ رہی تھی؟"

رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔ "لگتا ہے' اسے کچھ شبہ ہوگیا ہے۔"

"میں نے اسے مطمئن تو کردیا ہے۔ پر اب زیادہ احتیاط کرنی ہوگی۔"

دونوں نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے کھانا کھایا۔ نورالٰہی نے اس وقت بھی تھوڑا کھانا کھایا اور کھاتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔

لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ مٹیالا لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمایاں ہوگئے تھے۔ ڈاڑھی اور سر کے بال بے ترتیب تھے۔ ان پر ہلکی ہلکی گرد بھی نظر آتی تھی۔ قادر آباد سے آنے کے بعد اس نے اب تک غسل نہیں کیا تھا۔ وہ چت لیٹا تھا اور آنکھیں کھولے چھت کو تک رہا تھا۔

رحیم داد کچھ دیر اس کے قریب مونڈھے پر بیٹھا رہا اس نے اٹھ کر چٹائی نکالی اور برآمدے میں جاکر لیٹ گیا۔ آنکھ ذرا لگی ہی تھی کہ اس نے نورالٰہی کی آواز سنی۔ وہ اسے بلا رہا تھا۔ رحیم داد اس کے پاس گیا۔ نورالٰہی کہنے لگا۔ "ذرا مجھے پانی پلا دے۔ سخت پیاس لگی ہے۔" رحیم داد نے اسے پانی پلایا۔ پانی پی کر وہ بولا۔ "ذرا دیر میرے نزدیک بیٹھ جا۔ جی بہت گھبرا رہا ہے۔ نیند بھی نہیں آرہی ہے۔"

رحیم داد مونڈھا کھسکا کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس کا ماتھا چھو کر بولا۔ "تجھے تو ابھی تک تیز بخار ہے۔ دوائی پلا دوں؟"

"دوائی تو میں نے شام ہی کو پی لی تھی۔"

رحیم داد ہاتھ بڑھا کر دھیرے دھیرے نورالٰہی کا سر دبانے لگا۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ گاؤں پر سناٹا طاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی میں نورالٰہی کی آواز ابھری۔ "ایسا محسوس ہوتا ہے' اب میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا۔" اس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ اس میں درد کی کسک تھی۔

رحیم داد نے اسے تسلی دی۔ "چوہدری! حوصلے سے کام لے۔ کچھ دنوں میں چنگا ہو جائے گا۔"

"میں نوں پتہ ہے' کیا ہونے والا ہے۔" نورالٰہی نے آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت موذی بیماری ہے۔ مشکل ہی سے کوئی اس سے بھلا چنگا ہوتا ہے۔ میرے پاس لاکھوں روپے کا کلیم

پڑا ہے پر کس کام کا۔ کسی کے بھی کام نہیں آسکتا۔"

"تیرے بال بچوں کے تو کام آہی سکتا ہے۔"

نورالٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہیں کہ تریموں کے پتن ہی پر کرم الٰہی کی طرح شہید ہوگئے۔"

"توں بتاتا تھا' وہ پاکستان آگئے تھے اور لہور کے والٹن کیمپ میں ٹھیرے بھی تھے؟"

"سنا ہی سنا ہے۔ جانے ان کا کیا بنا۔ لگ بھگ ۸ سال ہوگئے انھیں ڈھونڈتے ہوئے۔" وہ خاموش ہوگیا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ "میرا دوسرا پتر ارشاد الٰہی اب ۱۸ برس کا ہوگا۔ وہ میرا سہارا بن سکتا تھا۔" اس نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ "پر رب کو یہ منظور ہی نہیں۔"

رحیم داد نے اس کا کندھا ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ "چوہدری! حوصلہ رکھ۔ تیرا پتر تجھے ضرور مل جائے گا۔ رب نے چاہا' تیری گھر والی اور کڑی بھی مل جائے گی۔ پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"توں مجھے نیک بندہ لگتا ہے۔" نورالٰہی نے رحیم داد کی ہمدردی سے متاثر ہو کر کہا۔ "پر قتل کی واردات میں کیسے پھنس گیا؟ مجھے جرائم پیشہ نہیں لگتا۔ تیرا چہرہ اور تیری بات چیت کا انداز یہی بتاتا ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "توں نے اپنے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔ کچھ اپنے بارے میں گل بات کر' خاموشی میں میرا جی بہت گھبراتا ہے۔ تبھی تو میں تیرے ساتھ کل رات دیر تک باتیں کرتا رہا۔ دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہوا تو تیرے جاتے ہی نیند بھی آگئی۔"

"چوہدری! میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے کسی کا کتل شل نہیں کیا۔" رحیم داد نے صاف جھوٹ بولا۔ "میں اس کے ساتھ سک نالے میں ایک جھاڑی کے نیچے کھڑا تھا۔ پاس ہی اونچے اونچے ٹبے تھے۔ فیر ایسا ہوا جی' اوپر سے ایک بھاری پتھر لڑھک کر نیچے گرا میں تو بچ گیا۔ پتھر ٹھیک اس کے سر پر گرا۔ وہ اسی وکت مرگیا۔ میں بہت ڈر گیا۔ وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ میں گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔"

نورالٰہی نے مشتبہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "پر ادھر ویرانے میں گیا کس لیے تھا؟ ادھر تو کوئی نہیں جاتا۔ میں نے سنا ہے....." وہ اپنی بات پوری نہیں کرسکا۔ باہر درختوں تلے خشک پتوں پر چاپ ابھری۔ دونوں نے چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔

رحیم داد جھپاک سے چارپائی کی اوٹ میں دبک گیا۔ ذرا دیر بعد کھڑکی پر ایک سایہ ابھرا۔ نورالٰہی آہستہ سے کھنکارا۔ سایہ فوراً غائب ہوگیا۔ نورالٰہی نے اونچی آواز سے پوچھا۔ "کون ہے؟" کوئی

جواب نہیں ملا۔ نورالٰہی کراہتا ہوا بستر پر بیٹھ گیا۔ نیچے اترا اور لڑکھڑاتے قدموں سے جا کر کھڑکی پر کھڑا ہو گیا۔

وہ واپس آکر بستر پر بیٹھا تو رحیم داد نے دھیرے سے پوچھا۔ "کون تھا؟"

اس نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔ "مجھے تو کوئی نظر نہیں آیا۔" دونوں خاموش رہے۔ چند لمحے بعد نورالٰہی نے رحیم داد سے کہا۔ "اب جا کر لیٹ جا۔ بتی ذرا دھیمی کر دے۔"

نورالٰہی بستر پر لیٹ گیا۔ رحیم داد نے طاق میں رکھی ہوئی لالٹین کی لو دھیمی کی۔ کمرے سے نکلا اور چٹائی پر جا کے لیٹ گیا۔ مگر وہ سویا نہیں۔ جیناں نے نورالٰہی سے جس طرح شک کا اظہار کیا تھا' اسے سن کر رحیم داد گھبرا گیا تھا۔ بعد میں درختوں کے نیچے آہٹ ابھری اور پراسرار سایہ بھی کھڑکی پر نظر آیا۔ رحیم داد اور خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اپنی صفائی میں اس نے جس حیلے کا سہارا لیا تھا' اس پر نورالٰہی نے یقین نہیں کیا۔ وہ اس سے کرید کر اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ رحیم داد نے سوچا' سویرے نورالٰہی اس سے مزید پوچھ گچھ کرے گا۔ وہ پولیس میں رہ چکا ہے' لہٰذا اسے غچا دینا آسان نہیں۔

رحیم داد نے طے کیا کہ سورج نکلنے سے پہلے ہی کہیں اور چلا جائے گا۔ وہ آنکھیں بند کئے خاموش لیٹا رہا۔ کمرے سے رک رک کر نورالٰہی کے کھانسنے اور آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز ابھر رہی تھی۔ رات گہری ہوتی گئی۔ سناٹا بڑھ گیا۔

پسر رات گزر چکی تھی۔ نورالٰہی کی کھانسی بند ہو گئی اور دیر تک سنائی نہیں دی۔ رحیم داد خاموشی سے اٹھا' دبے قدموں دروازے پر پہنچا۔ جھک کر کمرے میں دیکھا' نورالٰہی چارپائی پر سو رہا ہے۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔

نورالٰہی آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چارپائی کے قریب ہی ٹرنک رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ اسے بستر پر ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا کہ نورالٰہی آنکھیں کھولے اس کی جانب دیکھ رہا ہے۔ وہ آہستہ سے کھنکار کر بولا۔ "ٹرنک میں کچھ نہیں ہے۔ میرے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ ڈاک خانے میں جمع کرا دی۔ صرف کلیم کے کاغذات ہیں' وہ تیرے کسی کام کے نہیں۔" اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر کنجی نکالی۔ "یہ چابی لے اور ٹرنک کھول کر دیکھ لے۔" اس نے کنجی رحیم داد کی جانب بڑھائی۔

رحیم داد گم صم کھڑا چوہدری نورالٰہی کا چہرہ تکتا رہا۔ نورالٰہی کھانسنے لگا اور کھانستے کھانستے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جھک کر چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی مٹی کی کنالی میں تھوکا۔ بلغم کے ساتھ جیتا جیتا بہت سا خون نکلا۔ نورالٰہی لمبی لمبی سانس بھر کر ہانپنے لگا اور نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ کنجی اس کی انگلیوں سے چھوٹ کر بستر پر ایک طرف گر گئی۔

رحیم داد نے کنجی دیکھی پھر نورالٰہی پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دھندلی روشنی میں اس کے چہرے پر چھائی ہوئی زردی گہری ہو گئی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ رحیم داد آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ اس کے سرہانے کھڑے ہو کر اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور نورالٰہی کا گلا دبوچ لیا۔

نورالٰہی نے آنکھیں کھول دیں۔ رحیم داد نے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ نورالٰہی نے بے بسی سے اپنی گردن ادھر ادھر ہلانے کی کوشش کی۔ اس کے حلق سے بلی کی طرح غرانے کی سی آوازیں نکلیں۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ منکا ڈھلک گیا۔ رحیم داد خاموش کھڑا اس کا بے جان چہرہ تکتا رہا۔ اس کے ہونٹوں کے ایک گوشے سے گاڑھے گاڑھے خون کی پتلی سی دھار نکل کر نیچے ٹھوڑی تک پھیل گئی تھی۔

اس نے نورالٰہی کی لاش کے قریب پڑی ہوئی کنجی اٹھائی' ٹرنک کا تالا کھولا۔ ٹرنک میں پہننے کے چند کپڑے رکھے تھے۔ اس نے کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھے۔ نورالٰہی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ٹرنک میں کوئی رقم نہیں تھی۔

رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ باہر نکالا۔ شلوار اور قمیص نکالی۔ اپنے کپڑے اتارے اور نورالٰہی کی قمیص اور شلوار پہن لی۔ حکیم چشتی کے جو کپڑے اب تک اس کے جسم پر تھے' اس نے ٹرنک میں نہیں رکھے۔ بستہ کھولا' کپڑے لپیٹ کر کلیم کے کاغذات کے ساتھ رکھے اور ان کی گٹھری بنائی۔ اس نے ٹرنک کا ڈھکنا بند کیا' تالا لگایا اور کنجی نورالٰہی کی لاش کے سرہانے تکیے کے نیچے رکھ دی۔

وہ کمرے سے باہر گیا' چٹائی اٹھائی اور لپیٹ کر کوٹھری میں رکھ دی۔ اس نے نورالٰہی کی لاش پر گہری نظر ڈالی۔ بے جان آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں کے گوشے سے بہتا ہوا خون جم کر سیاہی مائل سرخ ہو گیا تھا۔

وہ کمرے سے نکل کر آنگن میں گیا۔ اس نے باہر جانے والے دروازے کی کنڈی کھولی مگر کچھ سوچ کر باہر نہیں گیا۔ کنڈی دوبارہ لگائی اور آنگن کی چار دیواری کا جائزہ لیا۔ دیواریں زیادہ اونچی

نہیں تھیں۔

اس نے گٹھری کندھے پر لٹکائی۔ آنگن میں گھوم پھر کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے ایک ٹوٹی ہوئی گھڑونچی مل گئی۔ گھڑونچی اس نے دیوار سے ٹکائی اور اس کے سہارے اوپر پہنچ گیا۔ اس نے ایک پیر نیچے لٹکایا اور آہستہ سے ٹھوکر مار کر گھڑونچی نیچے گرا دی۔

وہ دھیرے سے باہر اتر گیا۔ آگے بڑھا اور درختوں کے نیچے اندھیرے میں دبے دبے قدموں چلنے لگا۔ گاؤں سے نکل کر کچے راستے پر آ گیا۔ وہ تخت ہزارہ کی جانب بڑھنے لگا۔ میل ڈیڑھ میل کے بعد ویران اور بنجر میدان آ گیا۔

رحیم داد کچا راستہ چھوڑ کر ببول کی جھاڑیوں کی جانب بڑھا۔ جھاڑیوں کے نیچے اس نے نرم اور پولی زمین تلاش کی، چاقو نکالا اور خاصا گہرا گڑھا کھودا، گٹھری سے مقتول حکیم چشتی کے کپڑے نکالے اور گڑھے میں دبا کر زمین ہموار کر دی۔

رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ بغل میں دبایا اور کچے راستے پر چلنے لگا۔ تخت ہزارہ قریب آ گیا مگر وہ بستی میں نہیں گیا۔ داہنے ہاتھ کے ایک راستے پر مشرق کی طرف مڑ گیا۔

۱۴

رات کسی قدر گرم تھی، اور ہوا بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ دور سے بیلوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد ان آوازوں کو سن کر ٹھٹکا اور گردن اٹھا کر اس سمت دیکھنے لگا جدھر سے گھنٹیوں کی جھنکار رات کے سناٹے میں بلند ہو رہی تھی۔

رحیم داد کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والے سنسان پگڈنڈی پر کھڑا تھا۔ چند لمحے ٹھہر کر وہ آگے بڑھا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ پگڈنڈی کا سلسلہ ختم ہوا تو کچی سڑک آ گئی۔

اس نے دیکھا، سامنے سڑک پر ایک قطار میں کئی بیل گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ رحیم داد نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ بیل گاڑیوں میں لاوے سوار ہیں۔ وہ اجرت پر فصل کی کٹائی کرنے والے مزدور تھے۔

چیت کا مہینہ ختم ہو چکا تھا، بیساکھ کے ابتدائی دن تھے۔ ربیع کی کٹائی کہیں کہیں شروع ہو چکی تھی۔ لاوے کام کی تلاش میں جا رہے تھے۔

رحیم داد نے ایک درخت کے نیچے رک کر بیل گاڑیوں کو غور سے دیکھا۔ ہمت سے کام لیا۔ آگے بڑھا، ایک بیل گاڑی کے قریب پہنچا اور اس میں بیٹھے ہوئے لاوے کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

"گل سن۔" اس نے قدرے تامل کیا۔

"تمیں نوں کتھے جانا ہے؟"

لاوے نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم تو جی کریم کوٹ سے آ رہے ہیں اور کیمر ہوتے

ہیں بوہڑپور جائیں گے۔ اتھے جانا ہو تو گڈّے میں بہ جا۔"

"جانا تو میں نے آگے ہے۔ بوہڑپور ہی پہنچادے۔"

لاوے نے بیل گاڑی روک لی۔ رحیم داد اس پر سوار ہو گیا۔ بیل گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی سڑک پر چلنے لگی۔ رحیم داد بہت تھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر بیٹھا جھومتا رہا' آخر لڑھک کر سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ بیل گاڑیاں سڑک کے کنارے کھڑی تھیں۔ قریب ہی کوئی بستی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد نے آنکھیں ملتے ہوئے لاوے سے پوچھا۔

"بوہڑپور آ گیا؟"

"ابھی تو کوٹ عالم بھی نہیں آیا۔ بوہڑپور تو بہت آگے ہے۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "ادھر کیسے آ گیا؟"

"ادھر فصل کی واڈھی کا کام مل گیا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمیں نوں بوہڑپور نہیں جانا۔"

"ہاں جی' اب تو ادھر کا کام پورا کرنے کے بعد ہی آگے جانا ہو گا۔"

قریب کھڑے ہوئے دوسرے لاوے نے کہا۔ "ایسا کر' اس ٹرک میں بہ جا۔" اس نے کچھ دور سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ کھڑا ہے ٹرک۔ بوہڑپور سے بھی آگے جا رہا ہے۔ دو روپے ڈریور کو دینا۔ رستے میں جہاں کہے گا' وہیں پہنچا دے گا۔ چل' میں تیری ڈریور سے گل بات کرا دیتا ہوں' اپنا جاننے والا ہے۔"

رحیم داد بیل گاڑی سے نیچے اترا اور لاوے کے ساتھ ٹرک کی جانب بڑھا۔ قریب جا کر لاوے نے ٹرک ڈرائیور سے کہا۔ "جیونا! توں بوہڑپور ہی کی طرف جا رہا ہے ناں؟" اس نے رحیم داد کی جانب اشارہ کیا۔ "اسے اپنے ساتھ بٹھا لے۔ اسے بھی اتھے ہی جانا ہے' پہنچا دے۔ دو روپے اس سے لے لینا۔"

ڈرائیور نے رحیم داد سے کہا۔ "میں نے تو چک بیدی جانا ہے۔ تجھے ادھر جانا ہو تو اگلی سیٹ پر بیٹھ جا۔"

"ہاں جی' میں نے بھی ادھر ہی جانا ہے۔" رحیم داد نے ڈرائیور کو دو روپے دیئے۔ اور ٹرک میں بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد ٹرک اسٹارٹ ہوا اور سڑک پر دوڑنے لگا۔

رحیم داد نے ڈرائیور سے پوچھا۔ "ٹرک ادھر کیوں کھڑا کر رکھا تھا؟"

"انجن گرم ہو گیا تھا۔" ڈرائیور نے بتایا۔ "ریڈی ایٹر میں پانی بھی ڈالنا تھا۔" اس کے بعد کوئی بات چیت نہیں ہوئی' ٹرک سڑک پر دوڑتا رہا۔ رحیم داد کی پھر آنکھ لگ گئی۔

وہ بیدار ہوا تو ٹرک پختہ سڑک پر دوڑ رہا تھا۔ رات ختم ہو چکی تھی۔ مغربی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ رحیم داد نے صبح کی روشنی دیکھی تو گھبرا گیا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"جیونا! ٹرک روک لے۔ میں نوں ایہیں اترنا ہے۔"

ڈرائیور نے ٹرک روک لیا۔ رحیم داد نے اپنا بستہ بغل میں دبایا اور ٹرک سے نیچے اتر گیا۔ ٹرک آگے بڑھا اور تیزی سے دوڑتا ہوا کچھ ہی دیر بعد درختوں کی اوٹ میں اوجھل ہو گیا۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ دونوں طرف کھیت تھے' جن کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ اجالا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ سڑک پر چلتا رہا۔ میل ڈیڑھ میل بعد وہ کھیتوں میں گھس گیا اور ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

ربیع کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ اپریل کا سورج شرینہ کے گھنے درخت کے پیچھے سے آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ دھوپ ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ گندم اور جو کے پودے دھوپ سے سنہرے پڑتے جا رہے تھے۔

ہوا چلتی تو کھیتوں میں سرسراہٹیں ابھرتیں' مدھم سروں میں جل ترنگ بجتے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ مگر دور سے ڈھول پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

رحیم داد آگے بڑھتا گیا۔ وہ ایسی جگہ پہنچ گیا' جہاں راستے کے ایک طرف کھیتوں میں گندم اور جو کی بالیاں ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔ دوسری طرف اجاڑ کھیت تھے۔ فصل تازہ تازہ کٹی تھی۔ جگہ جگہ کٹی ہوئی فصل کے ترنڈے ابھرے ہوئے تھے۔ گندم کے خوشے اور سٹے بکھرے تھے۔

پگڈنڈی سے ذرا ہٹ کر چھ سات سلّے بار عورتیں زمین پر جھکی ہوئی خوشے اٹھا اٹھا کر دوپٹوں کی جھولیوں میں ڈال رہی تھیں۔ ان کے بوسیدہ اور میلے کچیلے لباس صاف چغلی کھا رہے تھے کہ وہ تعلیوں اور کمّیوں کے گھروں کی عورتیں ہیں۔

اس نے ایک سرسری نگاہ سلّے بار عورتوں پر ڈالی۔ ان میں ایک سانولی سلونی مٹیار بھی تھی۔ وہ لمبی دھوتی کا ادھڑونچا باندھے ہوئے تھی اور پلو کندھے سے اتار کر اس میں گندم کے خوشے چن چن کر ڈال رہی تھی۔

چاپ سن کر اس نے گردن کو ذرا سا خم دے کر نظریں موڑیں۔ اس کی ناک میں فیروزے کا کوکا تھا۔ آنکھوں سے بھری جوانی کی دھوپ جھلکتی تھی۔

وہ رحیم داد کو دیکھ کر الھڑپن سے مسکرائی۔ وہ چند ہی قدم کے فاصلے پر تھی' اس قدر قریب کہ رحیم داد اس کے بھرے بھرے کولھوں کا ہر دائرہ اور ہر خم دیکھ سکتا تھا۔ رحیم داد لمحے بھر کو ٹھٹکا پھر جھٹ نظریں نیچی کر کے آگے بڑھ گیا۔

ڈھول بجنے کی آوازیں اب قریب آتی جا رہی تھیں۔ آوازیں دائیں ہاتھ کی کھڑی فصلوں کے پیچھے سے آ رہی تھیں۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ لگ بھگ پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک اجاڑ کھیت کے اس پار گندم کی فصل کٹ رہی تھی۔ بھرائی اور ڈھولی زور زور سے ڈھول پر چوٹ لگا رہے تھے۔

فصل کی کٹائی کرنے والے ہاتھوں میں درانتیاں سنبھالے تیزی سے ہاتھ چلاتے' ڈھول کی تھاپ پر رک رک کر اونچی آواز سے بلے بلے کہتے۔ فصل کاٹنے والے لاوے نہیں تھے۔ وہ مزارعے تھے اور مانگی پر فصل کاٹنے آئے تھے۔

☆

دو سال پہلے ربیع کی فصل پر رحیم داد نے بھی انھی دنوں اسی طرح مانگی پر اپنی فصل کٹوائی تھی۔ واڈھی سے پہلے حسب دستور اس نے مانگی کے لیے کمیوں کے ذریعے گاؤں والوں کو پیغام بھیجا تھا۔ ان دنوں زمین کے مسئلے پر سیف اللہ سے اس کی لاگ ڈاٹ چل رہی تھی۔ معاملہ عدالت تک پہنچ چکا تھا۔

سیف اللہ گاؤں کا کھاتا پیتا زمیں دار تھا اور رحیم داد کے پاس صرف بارہ ایکڑ زمین تھی۔ مگر مقدمہ رحیم داد کے حق میں جا رہا تھا۔ گواہ بھی اس کے پکے تھے۔ پٹواری نے سو روپے اور چار من گندم رشوت میں لے کر رحیم داد کا مقدمہ اور مضبوط بنا دیا تھا۔

سیف اللہ اس کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آیا تھا۔ اس نے اور اس کے بھائیوں نے گاؤں والوں کو ورغلایا کہ رحیم داد کی مانگی پر فصل کاٹنے نہ جائیں۔ مگر صبح جب رحیم داد' بیوی بچوں کے ساتھ اپنے کھیتوں پر پہنچا اور ڈھولیوں نے ڈھولوں پر زور سے چوٹ لگائی تو گاؤں والے گھروں سے نکل نکل کر فصل کی کٹائی کے لیے پہنچنے لگے۔ سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کی باتوں پر ان کے اپنے مزارعوں کے سوا کسی نے کان نہ دھرا۔

دھوپ تیز ہوئی اور اوس کی نمی ذرا خشک ہوئی تو سب درانتیاں سنبھال کر کٹائی پر جٹ گئے

انھوں نے رحیم داد کو کٹائی میں ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ وہ الگ بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا۔ ڈھول بجتے رہے' فصل کٹتی رہی۔

فصل کاٹنے والے سب مرد تھے۔ عورت صرف رحیم داد کی بیوی نوراں تھی۔ وہ کٹے ہوئے پودوں کے پولے باندھ باندھ کر ڈھیر لگاتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ چہرہ پسینے سے تر تھا' تیز دھوپ اور سخت محنت سے گلابی پڑ گیا تھا۔ بچے بھی اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ننھی زینو ضد کرتی یا روتی تو نوراں غصے سے جھڑک دیتی۔ رحیم داد زینو سے بہت پیار کرتا تھا۔ تھی بھی وہ بہت بھولی بھالی اور ماں کی طرح خوب صورت۔ نوراں' جب اسے جھڑکتی یا غصے سے آنکھیں نکال کر چیختی تو وہ حقے کی نے منہ سے ہٹا کر بیوی کو نرمی سے سمجھاتا' کبھی ڈانٹتا' مگر فوراً ہی بے تکلفی سے مسکرانے بھی لگتا۔

اس روز وہ بہت موج میں تھا۔ عالم وارفتگی میں زور زور سے قہقہے لگاتا۔ بار بار کٹائی کرنے والوں کے پاس جاتا' ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا۔ جب ڈھولی کٹائی کرنے والوں کا حوصلہ بڑھانے کی غرض سے ڈھول کی تھاپ تیز کرتے تو ہر طرف سے بلے بلے کی آوازیں ابھرتیں۔ رحیم داد بھی ان کے جوش و خروش میں شامل ہو کر ہاتھ اٹھا اٹھا کے اونچی آواز سے بلے بلے کی صدا لگاتا۔ کٹائی کرنے والوں کے ہاتھ اور تیزی سے چلتے۔

سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے فصل کٹ گئی۔ کٹائی کرنے والے مویشیوں کو چارہ دینے اور دوسرے کام کاج کرنے گھروں کو چلے گئے۔ مگر فصل کی اجتماعی کٹائی' مانگی' کے رواج کے مطابق رات کو وہ منگ کے لیے پھر رحیم داد کے گھر پر اکٹھا ہوئے۔ رحیم داد کے گھر پلاؤ کی دیگ چڑھی تھی۔ اس نے ایک ایک کو بڑی محبت اور چاؤ سے کھانا کھلایا۔ اس ضیافت کے لیے اس نے کھانے میں خاص اہتمام کیا تھا۔

اس رات مشعلوں کی روشنی میں ڈھولوں کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالا گیا۔ بھنگڑا ڈالنے والوں نے ڈھولیوں کے گرد حلقہ بنا لیا تھا۔ رحیم داد نے اجلے کپڑے پہنے تھے۔ سر میں تیل ڈال کر بیچ سے مانگ نکالی تھی۔ دونوں طرف بالوں کی پٹیاں جمائی تھیں۔ مونچھیں مروڑ کر خوب نکیلی بنائی تھیں۔ اس کے قریب ہی نوراں کھڑی تھی۔

اس نے نہا دھو کر ٹرنک سے رکھواں کپڑے نکال کر پہنے تھے۔ سوتی دھوتی اتار کر ریشمی سلارا باندھا تھا' جس پر تلے کی دھاریاں تھیں اور تیز روشنی میں خوب جھلملا رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر دنداسا ملا تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل ڈالا تھا۔ تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ جوان اور

دلکش لگ رہی تھی۔

رحیم داد نے بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور سب کی نظریں بچا کر ہولے سے اس کے رخسار کی چٹکی بھری۔

وہ من چلے نوجوانوں کی طرح سینہ تان کر آگے بڑھا۔ ایک ڈھولی سے ڈھول لے کر گلے میں ڈالا۔ ایک ہاتھ سے ڈھول پر تھاپ دی اور دوسرا کان پر رکھ کر اونچے سر میں ڈھولے کا ایک ٹپّا الاپنے لگا۔

وہ اپنے بالوں کے پٹّوں کو جھٹکا دے کر تیزی سے لہراتا اور جھوم جھوم کے ٹپّا الاپتا۔ دوسرے مل کر آخری بول دہراتے اور بانہیں الار الار کر تیز رقص کرتے۔

جھگڑے کا مزا اس وقت سوا ہوا جب جمال دین بھی بڑھ کر آگے آگیا۔ وہ گبھرو جوان تھا۔ اس کا بدن گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ اب رحیم داد اور جمال دین ایک دوسرے کو للکارتے اور ڈھول پر دھمّال کے ساتھ لہک لہک کر ٹپّا الاپتے۔ رحیم داد مسکرا مسکرا کر نوراں کو دیکھتا۔ وہ کبھی شرماتی، کبھی کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

رحیم داد ڈھول پر زور سے تھاپ دے کر زیادہ اونچی تان لگاتا۔ بول اونچے، اور اونچے ہوتے گئے۔ رقص تیز، اور تیز ہوتا گیا۔

رحیم داد بیتے دنوں کی یادوں میں مگن آگے بڑھتا گیا اور سوچتا رہا کہ اس بار اس کی فصل ابھی کٹی بھی ہوگی یا نہیں۔ وہ خود تو خریف کی فصل کے لیے بھی اپنے کھیتوں میں ہل نہیں چلا سکا تھا۔ حالانکہ ربیع کی فصل کی کٹائی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ زمین کا مقدمہ جیت گیا تھا۔ رات کو مقدمہ جیتنے کی خوشی میں اس کے گھر خوب جشن رہا۔ پٹرومکس کی تیز روشنی میں لڈّی ناچ ہوا۔ بیچ میں ڈھولی تھے اور ان کے گرد رقص کرنے والے باری باری پاؤں اٹھاتے، بانہیں سر کی سیدھ میں لہراتے اور ایک ایڑی پر بیٹھ کر ڈھولیوں کے چاروں طرف تیزی سے گھومتے۔

رقص کرنے والوں میں رحیم داد بھی شامل تھا۔ اس کے سر پر سرخ چیرا تھا جو پاک پتن میں بابا فرید گنج شکر کے مزار پر چادر چڑھانے کے بعد نیک شگون کے طور پر نوراں نے اپنے ہاتھ سے باندھا تھا۔ نوراں اس وقت عورتوں کے جھرمٹ میں سب سے آگے نظر آرہی تھی۔ وہ ریشمی پٹانگل پہنے، بنی سنوری ایسی سج دھج سے کھڑی تھی کہ اس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔

ناچتے ناچتے بیوی پر رحیم داد کی نظر پڑتی تو وہ ترنگ میں آکر ایڑی کے بل تیزی سے گھومتا اور

شیفتگی کے عالم میں زور زور سے نعرہ بلند کرتا۔

ہو ہو، علی علی، لڈّی جھم لڈّی

فتح کے اس جشن کے چند ہی روز بعد سیف اللہ اور اس کے بھائیوں نے اپنے حامیوں کے ساتھ، شام کے جھٹپٹے میں رحیم داد پر حملہ کیا۔ حملہ آور آٹھ تھے اور پوری طرح مسلح بھی تھے۔ رحیم داد کے ساتھ صرف جمال دین اور اللہ ورایو تھے۔ مگر وہ بھی نہتے نہیں تھے۔ رحیم داد کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ جمال دین اور اللہ ورایو کے پاس لمبی لمبی ڈانگیں تھیں۔ تینوں نے جم کر مقابلہ کیا، زخمی بھی ہوئے مگر پیچھے نہیں ہٹے۔

رحیم داد کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ رحیم داد نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ میں بھرا ہوا اپنا جیتا جیتا خون دیکھا۔ وہ جوش سے تڑپ اٹھا۔ اس نے ہونٹ دانتوں میں بھینچے، بڑھ کے کلہاڑی کا بھرپور وار کیا۔ کلہاڑی سیف اللہ کا کندھا کاٹتی ہوئی پسلیوں تک اتر گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔

سیف اللہ کے گرتے ہی اس کے بھائی اور حمایتی بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعد میں سیف اللہ کو زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔ اسے تین دن بعد ہوش آیا۔ رحیم داد، جمال دین اور اللہ ورایو گرفتار کرلئے گئے۔

پولیس نے تگڑی رشوت لے کر سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کی پوری طرف داری کی۔ رحیم داد اور اس کے ساتھیوں پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۷ کے تحت بلوے اور اقدام قتل کا مقدمہ قائم کرکے عدالت میں چالان پیش کردیا۔

تینوں ملزموں کو تفتیش کے لیے کچھ عرصہ ریمانڈ پر حوالات میں رکھا گیا۔ بعد میں منٹگمری جیل میں منتقل کردیا گیا۔ نوراں ملاقات کے دن جیل میں ملنے رحیم داد کے پاس آتی اور اس کے لیے میدے اور چینی سے بنا ہوا گھیور ضرور لاتی۔ گھیور رحیم داد بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔ جب سے رحیم داد جیل گیا تھا نوراں نے رو رو کر برا حال کرلیا تھا۔ اس کا شگفتہ چہرہ مرجھا گیا تھا۔ وہ بیمار اور لاغر نظر آتی۔

مقدمے کی پیشیاں پڑتی رہیں۔ رحیم داد کی ضمانت بھی نہ ہو سکی۔ مقدمے کا فیصلہ ہوا تو جمال دین اور اللہ دیو بری ہوگئے۔ رحیم داد کو سزا ہوگئی۔ اب نوراں مہینے میں دو بار رحیم داد سے ملنے جیل پہنچتی۔

انھی دنوں رحیم داد کو نوراں کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے زمین، کھیتی باڑی کے لیے

جمال دین کو نصف پیداوار کے عوض ادھیارے پر دے دی۔ کرتی بھی کیا۔ دونوں لڑکے ابھی نو عمر تھے اور کسی طور کھیتی باڑی کا کام سنبھالنے کے قابل نہ تھے۔ ادھیارے پر زمین دینے کا مشورہ بھی رحیم داد ہی نے دیا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ نوراں نے اچانک جیل آنا بند کردیا۔ جس وقت وہ لالی کے ساتھ جیل سے فرار ہوا' نوراں مہینے بھر سے نہیں آئی تھی۔ شاید بیمار پڑگئی ہو۔ رحیم داد نے یہی سوچا تھا۔ لالی نے جب جیل سے فرار ہونے پر اکسایا تو تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد اس لیے بھی آمادہ ہوگیا کہ وہ نوراں سے ملنے کے لیے بے قرار تھا اور بچوں کی یاد بھی ہر وقت ستاتی تھی۔

☆

رحیم داد آگے بڑھتا اور سوچتا رہا' نہ جانے نوراں اور بچے کس حال میں ہوں گے۔ نوراں اور بچوں سے ملنے اور انھیں دیکھنے کے لیے اس کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور آگے بڑھتا رہا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہاں جا رہا ہے؟ ڈھولوں کی آواز پیچھے رہ گئی تھی۔

راستے سے کچھ فاصلے پر بکائین کے ایک درخت کے نیچے جوہ میں لڑکے جمع تھے۔ وہ کیڑ کڑا گ کھیل رہے تھے۔

رحیم داد نے دیکھا' ایک کھلاڑی لڑکے نے اپنی ٹانگ کے نیچے سے ایک ٹیڑھی سی لکڑی پوری قوت کے ساتھ پھینکی۔ لکڑی سیدھی رحیم داد کی جانب آئی اور بچتے بچتے بھی رحیم داد کی پنڈلی سے ٹکرا گئی۔

وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا مگر رحیم داد کو دیکھ کر سہم گیا اور چند قدم کے فاصلے پر ٹھہر گیا۔ وہ اس وقت کھیل میں چھوتی تھا۔ اسے جلد سے جلد لکڑی اٹھا کر درخت کے نیچے بنے ہوئے دائرے میں رکھنا تھی اور دوسرے کھلاڑیوں کو درخت پر چڑھنے سے پہلے چھونے کی کوشش بھی کرنا تھی۔ مگر لکڑی اٹھانے کے بجائے لڑکا رحیم داد کے روبرو سہما ہوا کھڑا تھا۔ وہ سب سے کم عمر بھی نظر آتا تھا۔

اسے دیکھ کر رحیم داد کو اپنا بڑا بیٹا کریما یاد آگیا۔ وہ لگ بھگ اتنا ہی بڑا تھا اور صورت شکل سے اسی کی طرح معصوم بھی لگتا تھا۔ رحیم داد اسے اس طرح زیادہ دیر پریشان نہ دیکھ سکا۔ اس نے جھک کر لکڑی اٹھائی اور مسکرا کر لڑکے کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لے پترا! فٹافٹ گھیرے میں جا کر رکھ دے۔"

لڑکے نے چپ چاپ لکڑی رحیم داد کے ہاتھ سے لی اور درخت کی جانب تیزی سے بھاگا۔ لیکن اس وقت تک تمام کھلاڑی درخت پر چڑھ چکے تھے اور شاخوں کے درمیان سے جھانک کر قہقہے ل

رہے تھے۔

جوہ کے اس پار گاؤں کے مکانات نظر آرہے تھے۔ مگر رحیم داد اس طرف نہیں گیا۔ راستہ ابھی سنسان تھا۔ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ کھیتوں کی منڈیر پھاند کر ایک شخص نکلا اور رحیم داد کے عین سامنے آگیا۔ اس نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ لیکن رحیم داد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ وہ بہا عبور کرکے جوہ کی طرف جانے لگا اور مڑ مڑ کر رحیم داد کو دیکھتا بھی رہا۔ رحیم داد اس کی جانب دیکھے بغیر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

سو سوا سو گز طے کرنے کے بعد اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ کچھ دور اسے چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ مسجد گاؤں کے آخری سرے پر تھی۔ آس پاس درختوں کا جھنڈ تھا۔ مگر وہاں بالکل خاموشی چھائی تھی۔

پی ہے سے نکل کر ایک تنگ پگڈنڈی کانگنی کی فصلوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی مسجد کی سمت جاتی تھی۔ رحیم داد کہیں ٹھہر کر سستانا چاہتا تھا۔ ٹھہرنے کے لیے مسجد اسے مناسب جگہ معلوم ہوئی۔

وہ مسجد کی جانب بڑھا اور رفتہ رفتہ اس سے قریب ہوتا گیا۔ جب وہ چری کے کھیتوں سے نکل کر باہر آیا تو درختوں کے نیچے ایک ادھیڑ آدمی دکھائی دیا۔ وضع قطع سے وہ مسجد کا ملّا نظر آتا تھا۔ رحیم داد کی جیب میں ابھی تک مقتول حکیم چشتی کی عینک موجود تھی۔ اس نے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کی غرض سے جھٹ عینک نکالی اور آنکھوں پر لگالی۔

عینک لگا کر اسے ہر چیز بے ڈول اور دھندلی دھندلی نظر آنے لگی۔ مگر وہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ درختوں تلے کوئی زور سے کھنکارا۔ کھنکار سن کر رحیم داد کے قدم ڈگمگائے۔ وہ غڑاپ سے پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں گر گیا۔ عینک بھی آنکھوں سے ڈھلک کر پانی میں چلی گئی۔

گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ پانی گھٹنوں سے کچھ اونچا تھا۔ رحیم داد نے گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا' ملّا اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ دبلا پتلا اور پستہ قد تھا۔ سر پر ململی پگڑی تھی۔ چہرے پر بالشت بھر سے زیادہ لمبی ڈاڑھی تھی جس میں جگہ جگہ سفید بال جھلک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں پر عینک تھی۔

ملّا نے غور سے رحیم داد کو دیکھا' مسکرا کر بولا۔ "تجھے اتنا بڑا پانی کا گڑھا نظر نہیں آیا؟"

رحیم داد نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ "مجھے جی کم نظر

آتا ہے۔ میری عینک بھی پانی میں گر گئی۔" وہ گڑھے سے نکل کر باہر آگیا اور جھک کر اپنی شلوار اور جوتے دیکھنے لگا۔

جوتے پانی اور کیچڑ سے لت پت تھے۔ شلوار بھی گڑھے کے مٹیالے پانی سے شرابور تھی۔ مگر کلیم کے کاغذات کا بستہ حفاظت سے بغل میں دبا ہوا تھا۔

ملّا نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "تیرے تو سارے کپڑے خراب ہوگئے۔ گڑھے کا پانی بھی نجس ہے۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ ملّا نے اسے خاموش پایا تو نرم لہجے میں بولا۔ "اس حالت میں کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟ آ میرے ساتھ۔" اس نے ہاتھ سے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے بتایا۔ "مسجد کے نزدیک ہی میرا حجرہ ہے۔ اسی میں مدرسہ بھی ہے۔ آنگن ہے۔ آنگن میں کھوئی بھی ہے۔ اس سے پانی نکالنا اور اپنے کپڑے دھو کر دھوپ میں سکھانے کے لیے ڈال دینا۔ میں باندھنے کے لیے تجھے دھوتی دے دوں گا۔"

رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "بہت مہربانی ہے جی۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

دونوں مسجد کے سامنے سے گزر کر ایک کچے مکان کے بند دروازے کے سامنے ٹھہر گئے۔ ملّا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ "اندر آجا۔" رحیم داد اس کے ہم راہ گھر میں داخل ہوگیا۔

دروازے کے سامنے کشادہ آنگن تھا۔ آنگن میں ایک طرف کنواں تھا۔ قریب ہی پڑچھتی تھی۔ اس کی چھت کے نیچے مٹی کا بڑا سا چبوترا تھا۔ پڑچھتی خالی تھی۔ آنگن کے آگے دالان تھا۔ فرش پر کھجور کی شاخوں کی بنی ہوئی چٹائی بچھی تھی۔ دالان سے ملحق کوٹھری تھی۔ اس کے دروازے پر قفل پڑا تھا۔

ملّا نے آنگن میں پہنچ کر پوچھا۔ "میں نے تجھے یہاں پہلی بار دیکھا ہے۔ پنڈ میں تیرا کوئی شریکا یا عزیز دار ہے؟"

"نہیں جی' میرا یہاں کوئی جان پہچان کا نہیں۔ میں پہلی بار ادھر آیا ہوں۔"

"جبھی تو میں نے کہا کہ تجھے پہلی بار دیکھا ہے۔ تیرا چہرہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔" ملّا نے اسے تسلی دی۔ "فکر نہ کر۔" اس نے کنویں کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ رہی کھوئی۔ ڈول سے پانی نکال' کپڑے دھو اور غسل کر۔ میں تیرے لیے دھوتی لاتا ہوں۔"

وہ دالان میں گیا۔ جیب سے کنجی نکال کر قفل کھولا اور کوٹھری کے اندر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ

ایک دھوتی ہاتھ میں دبائے کوٹھری سے باہر آیا' رحیم داد کے قریب پہنچا اور دھوتی اس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

"لے! یہ باندھ لے۔"

رحیم داد دھوتی سنبھال کر پڑچھتی کے نیچے گیا۔ شلوار اور قمیص اتاری۔ دھوتی باندھی اور اس کے ڈب میں ہمیانی' چاقو اور کھلے ہوئے روپے اڑس لیے۔ بستہ چبوترے پر سنبھال کر رکھا اور اپنے گندے کپڑے اٹھا کر کنویں پر پہنچ گیا۔

ملّا نے اسے دیکھا' قریب گیا اور اپنے بارے میں بتانے لگا۔ "میرا نام مولوی فضل احمد ہے۔ اس پنڈ میں آئے دو سال سے اوپر ہوگئے۔ میں پہلے ملتان میں ہوتا تھا۔ وہیں مدرسہ قاسم العلوم میں تعلیم پائی اور ایک مسجد میں پیش امام لگ گیا۔ وہاں سے حاجی صاحب مجھے یہاں لے آئے۔ حاجی صاحب پنڈ کے سب سے وڈے زمیں دار ہیں۔ بہت پرہیز گار اور نیک بندے ہیں۔" اس نے دالان کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ جگہ انھوں نے پنڈ کے سارے ہی بچوں کی دینی تعلیم کے لیے بنوائی ہے۔ لیکن اس پنڈ کے بچے سخت نالائق اور پاجی ہیں۔ مدرسے میں آتے ہی نہیں۔ دن بھر ادھر ادھر آوارہ گردی کرتے ہیں۔ کھیل کود میں وقت برباد کرتے ہیں۔ مشکل سے چند بچے پڑھنے کے لیے تیار ہوئے' وہ بھی بدبخت آئے دن ناغہ کرتے ہیں۔ میں خود ان کی تلاش میں جاتا ہوں' پکڑ کر مدرسے میں لاتا ہوں۔"

رحیم داد نے خالی دالان کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ "لگتا ہے' آج تو کوئی بھی منڈا پڑھنے نہیں آیا؟"

"آج میں نے انھیں چھٹی دے رکھی ہے' کل بھی مدرسہ بند رہے گا۔ بات یہ ہے جی' میں حاجی صاحب کے ہم راہ آج شہر جا رہا ہوں۔ کل عشا کی نماز سے پہلے واپس آجاؤں گا۔" اس نے چند لمحے تامل کیا' رحیم داد سے پوچھا۔ "تیرا کیسے ادھر آنا ہوا؟" رحیم داد خاموش کھڑا رہا۔ مولوی فضل احمد نے دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے' اتنا چپ چپ کیوں ہے؟"

"کیا بتاؤں ملاں جی۔" رحیم داد لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "یوں سمجھ لو' نصیب کا چکر ہے۔ بستی بستی گھومتا پھرتا ہوں۔ یہاں بھی اسی چکر میں آگیا۔"

رحیم داد کی باتوں میں درد کی کسک تھی۔ مولوی فضل احمد خاصا متاثر ہوا۔ شفقت سے بولا۔

"توں مجھے دکھی اور غم زدہ معلوم ہوتا ہے۔ تیرا گھر بار نہیں؟ بال بچے تو ہوں گے؟"

"گھر بار بھی تھا' بال بچے بھی تھے۔" رحیم داد کو اپنا گھر اور بیوی بچے یاد آگئے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور تڑپ کر بولا۔ "سب کچھ اجڑ گیا۔ کچھ بھی نہ رہا۔"

"تیری گل سمجھ نہیں آئی۔" مولوی فضل احمد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "یہ جو کیمبر سٹیشن پر پچھلے دنوں ریل کا حادثہ ہوا تھا' تیرے بال بچے اس میں تو کام نہیں آگئے؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے جی۔" مولوی فضل احمد نے کرید کر پوچھا۔ "کسی سے پرانی دشمنی چل رہی تھی جس نے تیرا گھر بار جلا دیا' بیوی بچوں کو اٹھوا لیا؟"

"ایسہ گل بھی نہیں۔" رحیم داد نے جھٹ کہا۔ "بات یہ ہے جی' جب پاکستان بنا تو میں گورداس پور کے موضع نصیر پور میں تھا۔ فسادات ہوئے تو سکھوں نے حملہ کر دیا۔ بہت تباہی مچائی۔ میں تو کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور پاکستان آگیا۔ میرے بعد گھر والی اور بچوں پر کیا گزری' میں نوں کچھ پتہ نہیں۔"

مولوی فضل احمد گویا ہوا۔ "ہاں جی مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر بہت ظلم و ستم ہوا۔" اس نے رحیم داد کے غم زدہ چہرے کی جانب دیکھا۔ "یہ بھی پتہ چلا' تیرے بال بچوں کا کیا بنا؟ زندہ بچے یا سب وہیں شہید ہو گئے؟"

"وڈا پتر تو راوی کے کنارے تریموں کے پتن پر سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ جوان دھی تھی' سکھ اسے بھی اٹھا لے گئے۔" رحیم داد افسردہ لہجے میں مقتول چوہدری نور الٰہی کی دکھ بھری داستان اپنی ذات سے منسوب کر کے سنانے لگا۔ "گھر والی بچوں کو لے کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئی۔ لہور کے والٹن کیمپ میں کئی جاننے والوں نے اسے دیکھا بھی۔ میں ان دنوں منٹگمری کے مہاجر کیمپ میں تھا۔ یہ خبر ملتے ہی لہور پہنچا۔ والٹن کیمپ گیا مگر نہ گھر والی کا کھوج لگا' نہ بچوں کا۔ اب وہ کہاں ہیں؟ کس کے پاس ہیں؟ میں نوں کچھ نہیں معلوم۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"۸ سال سے اوپر ہو گئے انھیں ڈھونڈتے ہوئے۔ جہاں کسی سے پتہ چلتا ہے' وہاں پہنچ جاتا ہوں' اسی چکر میں ادھر آگیا۔"

"میرے خیال میں تو نہ صرف اس پنڈ میں بلکہ پورے موضع میں ایسا کوئی مہاجر کنبہ نہیں ہے۔ میں انھیں جانتا بھی ہوں۔ گورداس پور کا تو کوئی نہیں۔" مولوی فضل احمد کچھ دیر خاموش کھڑا

سوچتا رہا پھر اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"حاجی صاحب سے پوچھوں گا' شاید انھیں کچھ خبر ہو۔ وہ اس موضع کے پرانے زمیں دار ہیں۔ سب کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔"

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہاں سے بھی خالی ہاتھ چلا جاؤں گا۔ پہلی بار ایسا نہیں ہوا۔ بار بار ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔"

"مایوس نہ ہو۔ میں نے کہا نا' حاجی صاحب سے پوچھ لوں گا بلکہ خود تجھے ان کے ڈیرے پر لے چلوں گا۔"

"ان کے پاس بھی چلا جاؤں گا۔ ویسے تسیں خود ہی پوچھ لینا۔"

"مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ وہ تیری ضرور مدد کرے گا۔" مولوی فضل احمد نے رحیم داد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ایک بات سمجھ آتی ہے۔ میں جن دنوں ملتان میں تھا تو لدھیانے کے ایک مولوی صاحب ملے تھے۔ وہاں مشتاق گنج میں ہوزری کا کارخانہ چلاتے تھے۔ پاکستان بنا تو وہ بھی لدھیانے سے لٹ لٹا کر لہور آگئے۔ اپنے ساتھ یتیم بچے بھی لائے۔ ان کا نام تو مجھے اس وقت یاد نہیں پر اتنا پتہ ہے کہ سکھر میں اب یتیم خانہ چلاتے ہیں۔ بتاتے تھے کہ وہ اور ان کے ساتھی کئی بار مشرقی پنجاب گئے اور کتنی ہی مسلمان زنانیوں اور بچوں کو سکھوں اور ہندوؤں کے قبضے سے نکال کر لے آئے۔ بہت نیک بندے ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔"

رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ان کے یتیم خانے کا کیا نام ہے ملاں جی؟"

"فیض الاسلام۔" مولوی فضل نے بتایا۔ "یہی نام یاد پڑتا ہے۔ ویسے سکھر میں سب اس یتیم خانے کو جانتے ہیں۔ میرا کہا مان تو سکھر چلا جا۔ امید ہے' وہاں سے تیرے بال بچوں کا سراغ مل جائے گا۔"

"چلا جاؤں گا۔ ضرور چلا جاؤں گا۔ اپنا تو برسوں سے یہی کام ہے۔ جہاں امید نظر آتی ہے' پہنچ جاتا ہوں۔" رحیم داد کا لہجہ اور افسردہ ہو گیا۔ "ملاں جی! میرے لیے دعا کرو' مجھے اپنے بال بچے مل جائیں۔ ان کے بغیر زندگی میں کوئی مزا نہیں۔ کچھ بھی چنگا نہیں لگتا۔"

"میں تیرے لیے ضرور دعا کروں گا۔ تیرے بچھڑے ہوئے بال بچے ضرور ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ تیری مشکل آسان کرے گا۔"

"ہاں ملاں جی۔" اس نے آسمان کی جانب انگلی اٹھا کر کہا۔ "اب تو اوپر والے ہی کا آسرا ہے۔

دیکھو' کب میری سنی جاتی ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "لوگ کہتے ہیں' کہاں تک انھیں تلاش کرے گا' دوسرا ویاہ کر کے گھر بسالے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انکار میں ہلایا۔ "نہیں' یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ میں اپنی گھر والی کے سوا کسی زنانی کو نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے اس سے بہت پیار ہے اور وہ بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہے۔ بچے تو میرے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ ان سب کو کیسے بھلا دوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

رحیم داد نے اپنی آواز میں سوز پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر مولوی فضل اس کی باتوں سے زیادہ متاثر نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی نہ بیوی تھی نہ بچے تھے۔ شادی ہی نہیں کی تھی۔ بیوی کے انتظار میں سر اور ڈاڑھی کے بال کھچڑی ہو گئے۔ اسے مردوں کو نہلانے والا اور خیرات کی روٹی کھانے والا کمی قرار دے کر کوئی اس سے اپنی بیٹی بیاہنے کو تیار نہیں ہوا۔

مولوی فضل اس کی باتیں سن کر خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد بھی چپ رہا۔ ذرا دیر بعد مولوی فضل کی آواز ابھری۔ "مجھے اب حاجی صاحب کی حویلی جانا ہے۔ وہاں میرا انتظار ہو تا ہو گا۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "شہر سے کچھ منگوانا ہو تو بتا دے' لیتا آؤں گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔

"پر تو کل تک یہاں ٹھیر سکے گا؟"

"ٹھیر جاؤں گا۔ حاجی سے بھی تو ملنا ہے۔ شہر سے میرے لیے ایک کمیس اور شلوار مل جائے تو لے آنا' یہ کپڑے بہت گندے ہو گئے ہیں۔ دھونے پر بھی ٹھیک سے صاف نہیں ہوں گے۔ سر پر باندھنے کے لیے پگڑی بھی خرید لینا۔"

مولوی فضل نے نہایت مستعدی سے کہا۔ "قمیص اور شلوار تیار تو نہیں ملے گی۔ جاتے ہی کپڑا خرید کر درزی کو دوں گا۔ کہوں گا' واپسی سے پہلے پہلے سی کر تیار کر دے۔" اس نے رحیم داد کا قد و قامت غور سے دیکھا۔ بالشت سے قمیص اور شلوار کے لیے اس کے جسم کی ناپ لی۔ "شلوار تو ٹخنے کی ٹھیک رہے گی۔ قمیص کس کپڑے کی ہو؟"

"دھاری دار کپڑا مل جائے تو اس کی ٹھیک رہے گی۔ ویسے جو تمیں نوں پسند آئے' لے آنا۔ میں پہن لوں گا۔" رحیم داد اپنی بات کہتے کہتے رکا پھر اس نے پوچھا۔ "ملاں جی' وہاں عینک بھی مل جائے گی؟"

"مل تو جانی چاہئے۔ لیکن اس کے لیے تیرا موجود ہونا ضروری ہو گا۔"

"میں وہاں کیسے جا سکتا ہوں؟ عینک کے بغیر مجھے ٹھیک سے نظر بھی نہیں آتا۔" اس نے مولوی

کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "ذرا اپنی عینک تو دینا ملاں جی۔"

مولوی فضل نے اپنی عینک اتاری اور رحیم داد کو دیتے ہوئے حیرت سے بولا۔ "اس کا کیا کرے گا؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" رحیم داد نے عینک اپنی آنکھوں پر لگائی۔ ادھر ادھر نظریں گھما کر دیکھا پھر عینک اتار کر بولا۔ "یہ تو جی اونچے نمبروں کی ہے۔ کوئی بہت کم نمبری لے لینا۔ میں اسی سے کام چلا لوں گا۔ میری عینک تو گڑھے میں گرنے کے بعد پیر کے نیچے ایسی آئی کہ بالکل چکنا چور ہو گئی۔ اسے گڑھے سے نکال لیا جائے' تب بھی کسی کام کی نہیں۔"

رحیم داد نے عینک مولوی فضل کو دے دی۔ مولوی نے عینک آنکھوں پر لگائی۔ کوٹھری میں گیا' اندر سے پرانا رجسٹر اور پنسل نکال کر لایا۔ رحیم داد کے قریب آکر بولا۔ "مجھے ڈر ہے کہیں بھول نہ جاؤں۔ تجھے جو کچھ منگانا ہے' لکھ کر اپنے پاس رکھ لوں۔ یہ ٹھیک رہے گا نا؟"

"جیسی تیری مرضی۔"

مولوی فضل نے کچھ نہیں کہا۔ رجسٹر کھولا اور اس کے سادہ ورق پر پنسل سے لکھنے لگا۔ رک رک کر رحیم داد سے پوچھتا بھی جاتا۔ جب وہ رحیم داد کی ہر فرمائش لکھ چکا تو اس نے رجسٹر کا ورق پھاڑا' تہہ کیا اور قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔

رحیم داد نے کہا "پنسل اور کاغذ کی تو مجھے بھی ضرورت ہے۔ اپنا کچھ حساب کتاب لکھنا ہے۔ مجھے یہ پنسل اور کاغذ دے دے۔ تیرے جانے کے بعد اکیلا بیٹھا یہی کام کرتا رہوں گا۔" رحیم داد مسکرایا۔

"ایسا کر۔ اگر تیرے کام کا نہ ہو تو یہ رجسٹر بھی مجھے دے دے۔ شہر سے دو رجسٹر اور دو پنسلیں بھی خرید لینا۔"

"یہ تو بہت پرانا رجسٹر ہے۔ کبھی اس میں مدرسے کے بچوں کی حاضری لگاتا تھا مگر اب تو بیکار پڑا ہے۔ تجھے چاہئے ہے تو لے لے۔" مولوی فضل نے رجسٹر رحیم داد کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پنسل بھی دے دی۔ رحیم داد نے دھوتی کے ڈب میں ہاتھ ڈال کر پچاس روپے کے نوٹ نکالے اور مولوی فضل کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اتنے روپوں سے کام چل جائے گا؟"

مولوی نے روپے لے کر گنے اور سر ہلا کر بولا۔ "ہاں جی' ان سے کام چل جائے گا۔" اس نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! توں کیا کام کرتا ہے؟" وہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹکا۔ "توں

چوہدری ہی ہے نا۔"

"بالکل ہوں جی! گوجرانوالہ میں جی اپنا ڈھلائی کا کارخانہ ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے ٹھیک ٹھاک کام چل رہا ہے۔"

"بس جی' اللہ کی مہربانی ہے۔" رحیم داد نے مولوی کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ "پنڈ میں نائی تو ہوگا؟ سر اور داڑھی کے بال بڑھ گئے ہیں۔"

مولوی فضل نے اس کے چہرے کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ "بہت بڑھ گئے ہیں جی۔ میں ابھی جا کر نائی کو بھیجتا ہوں۔ تو فکر نہ کر۔"

"میں کپڑے دھولیتا ہوں۔ داڑھی اور سر کے بال بنوا کر نہاؤں گا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ تونے صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ رات کی بچی ہوئی روٹی ہے' مرونڈے ہیں۔ ابھی تو اسی سے کام چلا لے۔ دوپہری روٹی مدرسے کا کوئی منڈا لے آئے گا تو کھالینا۔"

مولوی فضل ایک بار پھر دالان میں گیا۔ کوٹھری میں داخل ہوا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کی پرات دبی تھی۔ اس میں رات کی دو باسی روٹیاں تھیں اور مٹی ہی کی ٹھوٹھی میں مرونڈے تھے۔ مولوی نے کوٹھری کی کنڈی لگائی' قفل ڈالا اور کھانے کی اشیاء دالان میں بچھی ہوئی چٹائی پر رکھ کر بولا۔

"لے' یہ کھالے۔ میں غریب بندہ ہوں۔ تیری اس وقت اور کوئی خاطر نہیں کر سکتا۔" مولوی فضل کے رویئے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ رحیم داد سے اب خاصا مرعوب ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ناداری اور پریشان حالی کا اظہار کرنے لگا۔

"چوہدری! اپنی تو ایسے ہی گزر بسر ہوتی ہے۔ حاجی نیک بندہ ہے۔ مدرسے کے نام پر میرے لیے اتنا وڈا حجرہ بنوا دیا۔ رات کی روٹی بھی روز اسی کے گھر سے آتی ہے۔ ویسے بھی مجھے کچھ نہ کچھ دیتا ہی رہتا ہے۔" اس نے تامّل کیا۔ "اب میں چلوں گا۔ دیر ہو رہی ہے۔ چوہدری! شام کو اندھیرا ہو جائے تو چراغ جلا لینا۔ دالان میں چراغ رکھا ہے۔ اس میں تیل بھی کافی ہے۔ ماچس بھی موجود ہے۔ نائی بھی تھوڑی دیر میں آجائے گا۔"

مولوی فضل احمد دروازے کی جانب بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ مولوی نے دروازہ عبور کرتے ہوئے کہا۔ "اب تجھ سے کل شام کو ملنا ہوگا۔ پریشان نہ ہونا۔" وہ اسے تسلی دیتا ہوا چلا گیا۔

☆

رحیم داد کنوئیں کے قریب گیا۔ ڈول سے پانی نکالا اور کیچڑ اور گندے پانی سے لتھڑی ہوئی شلوار

قمیص دھونے بیٹھ گیا۔ کپڑے بار بار رگڑنے کے باوجود صاف نہیں ہوئے۔ صابن تھا نہ تھّی۔ وہ ہاتھ بھر کے ڈنڈے سے پیٹ پیٹ کر کپڑے صاف کرنے کی دیر تک کوشش کرتا رہا۔ اس نے بھیگے ہوئے کپڑے نچوڑے اور کنوئیں کی پختہ منڈیر پر سوکھنے کے لیے ڈال دیے۔ اس کام سے نمٹ کر دالان میں پہنچا۔

اس نے روٹی کھائی اور مرونڈے بھی کھائے۔ مرونڈے ذائقے میں مزے دار تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے پانی پیا اور نائی کا انتظار کرنے لگا۔ مگر نائی نہیں آیا۔ دھوپ تیز ہو گئی۔ پہر دن گزر گیا۔

رحیم داد رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ رہ رہ کر غنودگی کا غلبہ ہوتا۔ کچھ دیر وہ جماہیاں لیتا رہا پھر اس نے کلیم کے کاغذات کا بستہ سرہانے رکھا اور چٹائی پر لیٹ گیا۔ وہ بار بار بند دروازے کی جانب دیکھتا۔ دروازے کی کنڈی اس نے نہیں لگائی تھی 'مگر نہ دروازہ کھلا نہ کسی نے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سو گیا۔

رحیم داد کی آنکھ کھلی تو کوئی اسے آہستہ آہستہ جھنجوڑ رہا تھا۔ "میں رجب نائی ہوں۔ بال کاٹنے آیا ہوں۔"

رحیم داد نے نائی کو غور سے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رجب نے مسکرا کر کہا۔ "توں نے روٹی بھی نہیں کھائی۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ رحیم داد نے حیرت سے اس طرف دیکھا۔ چنگیری میں روٹیاں تھیں اور ان پر چنے کے نرم پتوں کی پکی ہوئی پلی رکھی تھی۔ رحیم داد ایسی گہری نیند سویا کہ اسے مطلق خبر نہ ہوئی' کون کھانا لایا اور کب رکھ کر چلا گیا؟ رجب اسے خاموش دیکھ کر بولا۔ "لگتا ہے' بہت بے خبر ہو کر سویا۔" اس نے چھت کی منڈیر کی طرف اشارہ کیا۔

"بنیرے پر دھوپ پہنچ گئی اور توں پڑا سوتا رہا۔"

رحیم داد نے بات بنائی۔ "رات ریل میں سو نہیں سکا تھا۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "اب دیر نہ کر۔ فٹافٹ سر اور داڑھی کے بال کاٹ دے۔"

"ایسا کر' کنارے آجا۔ چٹائی پر بال گرے تو ملاں ناراض ہوگا۔"

رحیم داد چپ چاپ اٹھا اور رجب کی ہدایت کے مطابق دالان کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ رجب نے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر پھرائیں۔ "توں نے کب سے بال نہیں کٹوائے؟ نہایا بھی نہیں۔ دیکھ تو بال کیسے میلے ہو رہے ہیں۔" وہ بال کنگھے سے سلجھانے لگا۔ "ریل کے سفر میں تو

بالوں اور کپڑوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ رجب قینچی سے بال کاٹنے لگا۔ رحیم داد ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔

"رجبے' بہت دیر لگا دی۔ کہاں رہا اب تک؟"

"وہ ایسا ہوا جی' میں ہفتے بھر سے احمد کوٹ گیا ہوا تھا۔ آج جیسے ہی واپس ہوا' گھر والی نے بتایا' ملاں جی نے اپنے مہمان کے بال کاٹنے کے لیے بلایا ہے۔ بس جی' میں فٹافٹ آ گیا۔"

احمد کوٹ کا نام سن کر رحیم داد کسی قدر گھبرا گیا۔ اس نے گردن ذرا سی جھکالی۔ اسے خدشہ پیدا ہوا کہ رجب کہیں اسے جانتا نہ ہو۔ مگر وہ اس کی گھبراہٹ سے بالکل بے نیاز تھا۔ اطمینان سے رحیم داد کی گدی کے بال مشین سے مونڈ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ بال کاٹتے کاٹتے اس نے کہا۔

"احمد کوٹ میں تو آج کل بہار آئی ہوئی ہے۔" رحیم داد سما ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ رجب بتاتا رہا۔ "میں تو جی پہلی بار احمد کوٹ گیا تھا۔ ساتھ والے پنڈ کی ایک کڑی ادھر ویاہی ہے۔ میں پہلے اسی پنڈ میں ہوتا تھا۔ اس رشتے سے وہ میری انگ ہوتی ہے۔ اس کے ویاہ پر تو میں جا نہ سکا' بیمار میں پڑا تھا۔ اب اس کے یہاں پتر ہوا ہے۔ اس کی جھنڈ لہائی کے لیے اس نے مجھے بلوایا۔ کہتی تھی' میں اپنے کاکے کے سر کے بال رجبے کے سوا کسی اور سے نہیں اتروائوں گی۔ تو جی اس طرح ادھر جانا ہوا۔ چنگا وکت گزرا۔"

رحیم داد نے اس کی باتیں سن کر قدرے سکون محسوس کیا' آہستہ سے پوچھا۔ "ادھر کتنے روز رہا؟"

"آج نواں دن تھا۔"

رحیم داد کو رہ رہ کر احمد کوٹ یاد آ رہا تھا۔ احمد کوٹ اس کا آبائی گاؤں تھا۔ وہاں اس کی بیوی تھی' بچے تھے۔ وہ مدت سے ان سے مل نہیں سکا تھا۔ ان کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین بھی تھا۔

اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "احمد کوٹ میں اپنا ایک ملنے والا ہے۔ رحیم داد نام ہے اس کا۔ وہ بھی تجھے وہاں ملا؟"

"اس رحیم داد کی بات تو نہیں کر رہا جس نے سیف اللہ کو کتل کر دیا؟"

"یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔" رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ "کئی سال سے میں اسے ملا نہیں۔"

"تب تو یہ بھی پتہ نہ ہوگا' اسے جیل ہو گئی تھی۔ پر وہ جیل سے بھاگ نکلا۔"

"جیل سے بھاگ نکلا۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "وہ ایسا لگتا تو نہیں تھا۔ سیدھا سادا نیک بندہ تھا۔ سمجھ نہیں آتی' اس نے یہ سب کیسے کیا؟"

"گل تو جی بہت لمی ہے۔" اس نے حجامت بناتے ہوئے کہا۔ "پر اتنا سن لے' پچھلے دنوں رحیم داد کو بھی کتل کر دیا گیا۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"میں نوں تجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "میں تو اس روز احمد کوٹ ہی میں تھا' جب اس کے کتل ہونے کی خبر وہاں پہنچی تھی۔"

"یہ تو نے بہت بری خبر سنائی۔ اس کے تو بال بچے بھی تھے۔ جانے اس خبر سے ان پر کیا بیتی ہوگی۔"

"پر اب تو اس کا وہاں گھر بار رہا' نہ بال بچے۔"

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ "وہ گھر بار چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟"

"لگتا ہے' تمیں نوں کچھ بھی پتہ نہیں۔ سیف اللہ کے مرنے کے بعد اس کے بھائیوں نے بدلہ لینے کے لیے رات کے اندھیرے میں رحیم داد کے گھر پر حملہ کیا اور آگ لگا دی۔ پورا گھر جل کر راکھ ہو گیا۔ سنا ہے سیف اللہ کے بھائی تڑا تڑ گولیاں چلاتے رہے۔ کوئی بھی ڈر کے مارے گھر سے باہر نہیں نکلا۔ انھوں نے رحیم داد کی کھڑی فصلیں بھی جلا دیں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "رحیم داد کے تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ چھوٹا تو آگ میں جل کر مر گیا۔ گھر والی دو کو لے کر کسی نہ کسی طرح پڑوس کے مکان میں جا کر چھپ گئی۔ حملہ آور تو پاگل ہو رہے تھے۔ اسے اور دونوں بچوں کو بھی کتل کر دینا چاہتے تھے۔ پر رحیم داد کی گھر والی ان کے ہاتھ نہیں آئی۔ ایندھن رکھنے کے اوٹے میں بچوں کے ساتھ چھپ کر بیٹھ گئی' سورج نکلنے سے پہلے پہلے اندھیارے میں بچوں کو لے کے احمد کوٹ سے بہت دور نکل گئی۔"

چھوٹے بیٹے کے جل کر ہلاک ہونے اور گھر بار کی تباہی پر رحیم داد کا دل بھر آیا۔ مگر اس نے خود کو کسی نہ کسی طرح سنبھالا اور آنکھوں میں امڈتے آنسو پی گیا۔

اسے خاموش پا کر رجب نائی نے کہا۔ "لگتا ہے تجھے یہ باتیں سن کر بہت دکھ ہوا۔"

"ہاں۔" رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ اس کی آواز گلوگیر ہو رہی تھی۔ آگے نہ بولا گیا۔ رجب بھی چپ رہا۔ وہ سر کے بال تراش چکا تھا۔ رحیم داد کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی؟"

"کچھ بھی نہیں ہوا جی۔ سیف اللہ کے بھائی شان سے بھڑکیں مارتے پھرتے ہیں۔ ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟ ان کا ایک شریکا وزیر جو لگا ہے۔ ان کی تو سمجھو' آج کل حکومت ہے۔ جب رحیم داد کے قتل کی خبر آئی تو سیف اللہ کے بھائی بہت خوش تھے۔ پنڈ میں اینڈتے پھرتے تھے۔" رحیم داد خاموش رہا۔ رجب سر کے بال تراش کر سامنے آگیا۔ "توں نے کب سے داڑھی کے بال نہیں کٹوائے۔ دیکھ تو بالوں کے کیسے بجھے ہوگئے ہیں۔" وہ زیرلب مسکرایا۔ "لگتا ہے' نئی نئی داڑھی چھوڑی ہے۔" رحیم داد پھر بھی خاموش رہا۔ مگر رجب خاموش نہیں ہوا' پوچھنے لگا۔ "کس سوچ میں پڑگیا۔"

"مجھے رحیم داد یاد آرہا ہے۔ مرنے والا برا بندہ نہیں تھا۔ رجبے تو اسے نہیں جانتا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے' احمد کوٹ کے دوسرے بندے بھی یہی کہتے تھے۔ میں جس کے گھر جھنڈ لمائی پر گیا تھا' اس کا نام شیداں ہے۔ شیداں کا گھروالا بھی رحیم داد کی بہت تعریف کرتا تھا۔ پر جی' ابھی تو سبھی سیف اللہ کے بھائیوں سے ڈرتے ہیں۔ جسے جی چاہیں پکڑوا دیں' جسے چاہیں مکدمے میں پھنسوا دیں۔ تھانے دار' تحصیل دار سبھی ان کے کہنے پر چلتے ہیں۔ انھوں نے رحیم داد کی زمین پر بھی کبضہ کرلیا۔ کسی نے کچھ نہیں کیا۔ رحیم داد کی گھروالی ہوتی تو کوئی کنونی کارروائی کرتی۔ اب تو رحیم داد کا وہاں کوئی نہیں رہا۔"

رحیم داد نے بے قراری سے پوچھا۔ "رجبے! تجھے یہ بھی خبر ملی' رحیم داد کے بال بچے اب کہاں ہوتے ہیں؟"

"سنا ہے جی' وہ اکال گڑھ میں ہیں۔"

"کس کے پاس رہتے ہیں؟"

"یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔" رجب نے داڑھی کے بال تراشتے ہوئے بتایا۔ "کسی شریکے یا رشتے دار ہی کے پاس رہتے ہوں گے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "توں ان کے پاس جانا چاہتا ہے؟"

"ارادہ تو نہیں' تو کہتا ہے تو چلا جاؤں گا۔ ایک زمانے میں تو رحیم داد سے میری بہت یاری تھی۔"

"تب تو اس کی گھروالی بھی تجھے جانتی ہوگی۔ پر جانے اسے یہ بھی پتہ ہے' رحیم داد مرگیا۔ پچھلے ہی دنوں تو اس کا کتل ہوا ہے۔ اتنے تھوڑے دنوں میں اسے کیسے ملوم ہو جائے گا۔" رجب نے قینچی چلاتے چلاتے ہاتھ روک لیا۔ "ایسا کر' جا کر انھیں خبر کردے۔ اس کے سیاپے میں بھی

شریک ہو جائے گا۔ تسلی بھی دے دے گا۔"

"پر میں رحیم داد کے بال بچوں کا پتہ کیسے چلاؤں گا؟"

"احمد کوٹ میں مجھے کسی نے بتایا تھا' رحیم داد کی گھروالی اپنے بچوں کے ساتھ اکال گڑھ میں سکول کے پچھواڑے رہتی ہے۔" اس نے اصرار کیا۔ "ضرور وہاں چلا جا۔ رحیم داد تیرا پرانا یار تھا۔ اس کی گھروالی اور بچوں کو اس کے مرنے کی خبر تو ہونی چاہئے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے۔" رحیم داد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "پر جس نے تجھے اس کا ٹھکانا بتایا' اسی نے یہ خبر بھی اسے پہنچا دی ہوگی۔ میں اب جا کر کیا کروں گا؟ ویسے بھی میں نے بھیتی لوٹنا ہے۔ کچھ دنوں بعد ان کے پاس چلا جاؤں گا۔"

"جیسی تیری مرضی۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ رجب نائی داڑھی کے بال تراشتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے داڑھی گول کتروا ں بنا دی۔ جب رجب حجامت بنا چکا تو رحیم داد نے آئینہ لے کر اپنا چہرہ دیکھا۔ داڑھی رکھنے سے اس کا حلیہ خاصا تبدیل ہوگیا تھا۔ اس نے خوش ہو کر دھوتی کے ڈب سے ٹٹول کر ایک روپے کا نوٹ نکالا اور نائی کو دے دیا۔

روپیہ پاکر وہ ایسا نہال ہوا کہ فوراً بولا۔ "لا' تیرے بدن کی مالش بھی کردوں۔" وہ بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ بال اور داڑھی بنانے کی اجرت اسے توقع سے بہت زیادہ ملی تھی۔ "یہاں تو مالش کے لیے تیل نہیں۔ میں گھر سے سرسوں کا تیل لے کر آتا ہوں۔ مالش سے ساری تھکن دور ہو جائے گی۔"

مگر رحیم داد مالش کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ "نہیں رجبے! میں نوں اب نہانا ہے۔"

"نہالینا۔ آرام سے نہالینا۔ ایسی بھیتی کیا ہے؟ میرا کہا مان' مالش کے بعد نہا۔ دیکھ تو بدن میں کیسی چستی آجاتی ہے۔ جھنڑیا لگانے کو جی کرے گا۔ اپنے پنڈ کے زمیں دار حاجی صاحب تو ہر جمعے کو پہلے مجھ سے مالش کرواتے ہیں' تب نہاتے ہیں۔"

رحیم داد اس کے اصرار کرنے پر بھی راضی نہ ہوا۔ جب سے اپنے چھوٹے بیٹے کی موت اور گھر بار کی تباہی کی خبر سنی تھی' اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ رجب سے جلد سے جلد پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "مجھے اب نہانا ہے' شام ہو رہی ہے۔" وہ کنویں کی جانب بڑھا۔

رجب نے مزید اصرار نہیں کیا' چپ چاپ باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے دروازے کی کنڈی لگائی' دالان میں گیا اور چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل بے اختیار بھر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دھوپ اب گہری زرد پڑ گئی تھی۔ دن کا چل چلاؤ تھا' سائے طویل ہو گئے تھے۔ رحیم داد سسکیاں بھرتا رہا۔ کھانا اس کے قریب ہی رکھا تھا۔ لیکن رحیم داد نے اس پر توجہ نہ دی۔ بھوک ہی نہیں تھی۔

جب رو دھو کر دل کی بھڑاس ذرا کم ہوئی تو اس نے طے کیا کہ وہ نوراں اور بچوں سے ملنے اکال گڑھ ضرور جائے گا۔ وہ انھیں دیکھنے اور ان سے ملنے کے لیے بے قرار تھا۔ اس نے آنسو پونچھے۔ اٹھ کر کنویں کے پاس گیا۔ پانی نکالا اور دھوتی اتار کر نہانے لگا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ رحیم داد کو اپنا جسم سلگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد قدرے سکون ملا۔ اب اس کے کپڑے سوکھ چکے تھے۔

اس نے کپڑے پہنے اور دالان میں جا کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ دیر تک کھویا کھویا بیٹھا رہا۔ سورج ڈوب گیا۔ شام آنگن کے در و دیوار سے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ دن کے ہنگامے سرد پڑ چکے تھے۔

ہر طرف شام کا سناٹا پھیلنے لگا تھا۔ گھروں کو لوٹتے ہوئے کسانوں اور مویشیوں کی آوازیں شام کی بڑھتی ہوئی خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

جب اندھیرا بڑھ گیا تو رحیم داد اٹھا اور طاق میں رکھا ہوا چراغ روشن کر دیا۔ قریب ہی چٹائی پر کھانا رکھا تھا۔ اس نے ایک روٹی توڑ کر چنے کے ساگ کے ساتھ چند لقمے کھائے۔ روٹی خشک اور ٹھنڈی تھی۔ وہ پوری روٹی نہیں کھا سکا۔

اس نے اٹھ کر مٹی کے پیالے میں قریب رکھے ہوئے گھڑے سے پانی نکالا اور پورا پیالہ خالی کر دیا۔ رحیم داد کچھ دیر جاگتا رہا پھر چٹائی پر لیٹ کر سو گیا۔

سویرے سو کر اٹھا تو اس نے چنگیری میں رکھی ہوئی باسی روٹی کھائی' پانی پیا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا اس بستے کو گھورتا رہا جس میں کلیم کے کاغذات تھے۔

اس نے بستہ کھولا' کاغذات نکالے اور ان کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دو بہنیں تھیں مگر ایک بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ اسی لیے وہ ماں باپ کا بہت لاڈلا تھا۔ باپ معمولی زمیں دار ہونے کے باوجود اسے اچھی تعلیم دلانا چاہتا تھا۔ مگر رحیم داد نے پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اس واجبی تعلیم کے باوجود سرکاری اور قانونی دستاویزات نہ صرف پڑھ سکتا تھا بلکہ انھیں بخوبی سمجھ بھی سکتا تھا۔ اس کا سبب مقدمے بازی تھی۔ وہ دو سال سے اوپر سیف اللہ کے ساتھ مقدمے بازی کرتا رہا۔ اس سے پہلے

بھی وہ پانی کے جھگڑے پر کئی سال تک مقدمہ لڑتا رہا۔ وہ ہر مقدمے کے کاغذات بڑے غور سے پڑھتا۔ جو قانونی نکتہ سمجھ میں نہ آتا' اسے اپنے وکیل سے سمجھنے کی کوشش کرتا۔ مقدمے کے مختلف پہلوؤں پر وکیل سے بحث بھی کرتا اور اسے مشورہ بھی دیتا۔ مقدمے لڑتے لڑتے' اسے مقدمے بازی کا چسکا پڑ گیا تھا۔ وہ خود کو کسی وکیل سے کم ماہر قانون نہیں سمجھتا تھا۔ جیل میں لائی اور دوسرے قیدیوں سے بڑے جوش میں کہتا تھا کہ پولیس سیف اللہ کی کھلم کھلا طرف داری نہ کرتی تو اسے کبھی سزا نہ ہوتی۔ اس کا مقدمہ بہت مضبوط تھا۔ مقدمے کا فیصلہ اسی کے حق میں ہوتا۔

رحیم داد نے غیر ضروری دستاویزات اور درخواستیں علیحدہ کر لیں اور اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق وہ کاغذات اور دستاویزات محفوظ کر لیں جن کی بنیاد پر متروکہ جائیداد کا الاٹمنٹ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ایسے تمام کاغذات اور دستاویزات کپڑے میں دوبارہ لپیٹ کر بستہ بنا لیا اور غیر ضروری کاغذات اور درخواستیں آنگن کے ایک کونے میں رکھ کر ماچس سے آگ لگا دی۔ انھیں جلا کر اس طرح تلف کر دیا کہ صرف راکھ رہ گئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے وہ رجسٹر نکالا جو اسے مولوی فضل احمد نے دیا تھا۔ اس نے پنسل اٹھائی اور ایک ایسی سرکاری دستاویز سامنے رکھی جس پر چوہدری نورالٰہی کے تصدیق شدہ دستخط تھے۔ وہ پنسل سے رجسٹر کے سادے ورق پر چوہدری نورالٰہی کے دستخط کی ہوبہو نقل اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کوشش میں اس نے کئی ورق سیاہ کر دیے۔ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ سورج چڑھ کر بیچ آسمان پر آ گیا' دوپہر ہو گئی۔ گرمی بڑھ گئی۔ وہ سر جھکائے اپنے کام میں منہمک تھا کہ اسی اثنا میں دروازے پر آہٹ ہوئی۔

رحیم داد نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا' بستہ کھول کر اس میں دستاویز اور رجسٹر رکھا اور کپڑے میں گرہ لگا کر بستہ بند کر دیا۔ اٹھ کر دروازے پر گیا۔ کنڈی کھولی۔ گاؤں کا ایک لڑکا اس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے کھانا لیا' دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ کھانا سنبھالے ہوئے دالان میں گیا۔ کھانے میں روٹیاں تھیں' سرسوں کا ساگ تھا اور پیاز کی گنٹھی تھی۔

اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور پانی کا بھرا ہوا پیالہ چڑھا کر لیٹ گیا' مگر سویا نہیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اٹھ بیٹھا۔ بستہ کھولا' رجسٹر نکالا' پنسل نکالی' دستاویز سامنے رکھی اور مقتول چوہدری نورالٰہی کے دستخط بنانے کی مشق کرنے لگا۔

☆

شام ہو گئی۔ رحیم داد نے چراغ روشن کیا۔ عین اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی۔

رحیم داد دروازے پر پہنچا' کنڈی کھولی۔ توقع تھی کہ مولوی فضل احمد ہو گا مگر وہ مولوی فضل احمد نہیں تھا۔ اس کی سامنے ایک اجنبی کھڑا تھا۔ وہ تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے گرد سے اٹے تھے۔ وہ نوجوان تھا۔ بدن مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ اس کی دھوتی ملگجی تھی۔ سر برہنہ تھا۔ اس کے لمبے لمبے پٹے کانوں سے نیچے تک گئے ہوئے تھے۔ ان پر خاک کے ذرات بکھرے تھے۔ ہاتھ میں لمبی ڈانگ تھی۔ جسم سے پسینے کی بو اٹھ رہی تھی۔ وضع قطع سے وہ کسان لگتا تھا۔ اس نے شام کی دھندلی روشنی میں رحیم داد کو غور سے دیکھا اور حیرت سے بولا۔

"توں مجھے ملاں تو نہیں لگتا۔"

"ہاں' میں ملاں نہیں ہوں۔ ملاں شہر گیا ہے۔"

"ملاں جی کی کب تک واپسی ہو گی؟"

"کہتا تھا' آج عشاء کی نماز سے پہلے لوٹ آئے گا۔"

"ٹھیک ہے' تب تو وہ آتا ہی ہو گا۔ میں اس کا انتظار کر لوں گا۔" وہ آنگن میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "میرا نام نوردین ہے جی۔"

رحیم داد نے خاموشی سے دروازہ بھیڑ دیا۔ دونوں چپ چاپ دالان میں جا کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔ نوردین تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ دالان کے کھمبے کا سہارا لیے بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے پوچھا۔

"ملاں جی کے پاس تیرا کیسے آنا ہوا؟"

"کیا بتاؤں جی! ایک چکر میں پڑ گیا ہوں۔" نوردین نے بیزاری سے کہا۔ "اسی کے لیے ملاں کے پاس آیا ہوں۔"

"ملاں سے تعویذ شویذ لینا ہے؟ جھاڑ پھونک کرانی ہے؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل نہیں؟ یہ دوسرا ہی چکر ہے۔"

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "نورے! تو مجھے پریشان دکھائی دے رہا ہے۔"

نوردین نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "پانی ہو تو پلا دے۔ مجھے تو جیسے بھڑکی لگ گئی ہے۔ جتنا پانی پیتا ہوں' اتنی ہی زیادہ پیاس لگتی ہے۔"

رحیم داد نے نرم لہجے میں کہا۔ "بھوکا بھی لگتا ہے۔ روٹی رکھی ہے' کھا لے۔" اس نے دن کے بچے ہوئے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں' مجھے صرف پانی پلا دے۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھا' مٹکے سے پیالے میں پانی نکالا اور نوردین کے پاس گیا۔ پیالہ ہاتھ میں لے کر وہ ایک ہی سانس میں غٹاغٹ سارا پانی پی گیا۔ رحیم داد اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ باہر آنگن میں رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ دونوں چراغ کی دھندلی روشنی میں خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد نوردین نے پوچھا۔

"ملاں جی نے آج ہی رات آنے کو کہا تھا ناں؟"

"مجھ سے تو یہی کہہ کر گیا تھا۔ فکر نہ کر' ملاں آتا ہی ہو گا۔"

"میں ۱۲ میل سے زیادہ ہی پیدل چل کر آیا ہوں۔ ملاں سے مل کر ہی جاؤں گا۔ رات یہیں ٹھہر جاؤں گا۔ ملاں سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"کوئی بہت ہی ضروری کام ہے؟"

"ہاں جی ضروری ہی کام ہے۔" نوردین نے رحیم داد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمیں نوں کیہ پتہ میں کس پریشانی میں ہوں۔" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں' چہرے پر جھنجلاہٹ آ گئی۔ "اٹھ مہینے سے اوپر ہو گئے چکر کاٹتے ہوئے۔ اب کے میں دو ٹوک بات کر کے ہی جاؤں گا۔" وہ کندھے پر پڑی ہوئی چادر سے پسینہ پونچھنے لگا۔ اس کے چہرے پر بدستور جھنجلاہٹ تھی۔ وہ بے چین بھی نظر آ رہا تھا۔

رحیم داد نے اسے اس قدر پریشان دیکھا تو دل جوئی کرنے کے انداز میں نرمی سے دریافت کیا۔ "نورے! بات کیا ہے؟ تو کہے تو میں ملاں جی سے تیرے لیے بات کروں۔ وہ میرا کہا مان لے گا۔"

رحیم داد کے نرم لہجے اور اظہار ہمدردی پر نوردین کسی قدر متاثر ہوا۔ "گل ایہہ ہے جی۔ میرا باڑہ اس پنڈ کے زمیں دار حاجی کے پاس ہے۔ یوں سمجھ' حاجی نے اسے دھرو رکھ چھوڑا ہے۔"

"حاجی یہ کام بھی کرتا ہے۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "حاجی سے ادھار شدھار لیا ہو گا' ورنہ وہ تیری گھروالی کو کیسے اپنے پاس دھرو یا گروی رکھ سکتا ہے۔"

"نہیں جی' میں نے اس سے کوئی ادھار شدھار نہیں لیا۔" نوردین نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "گل کچھ اور ہی ہے۔"

"گول مول بات نہ کر۔" رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "بتانا ہے تو صاف صاف بتا۔"

"گل تو بہت لمی ہے۔ وہ ایسا ہے جی۔ میرے پیئو کے پاس تین کلّا زمین ہے۔ وہ ہتھ راوہ ہے۔

خود ہی کھیتی باڑی کرتا ہے۔ بہت تنگی میں گزر بسر ہوتی تھی۔ میں جوان ہوا تو لاوی ہار بن گیا۔ مزدوری پر دوسروں کی فصل کی واڈھی کرتا تھا۔ میں کئی سال لاوی ہار رہا۔ فیر اپنے پنڈ کے لمبردار میاں داد سے ادھلائی پر ۲۷ کنال زمین لے لی۔ بہت خراب اور بڑیلی زمین تھی۔ اس پر جھنگر تھا۔ میں نے زبردست محنت کی۔ جھاڑیاں کاٹ کے صاف کیں۔ زمین تیار کی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "نہ پچھ' میں نے کتنی محنت کی۔ ادھار لے کر بل پنجالی خریدی' بوائی کی۔ ہر فصل بہت چنگی ہوئی۔ انوبندا کے حساب سے فصل کا آدھا اور اوپر سے آٹھواں حصہ بھی زمیں دار کو دے کر میرے پاس اتنا بچنے لگا کہ میں نے ادھار ادا کر دیا۔ تیسرے سال ربیع کی فصل کی واڈھی کے بعد بیو نے میرا ویاہ کر دیا۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ نوردین دالان کے کھمبے سے پیٹھ ٹکائے آہستہ آہستہ بتاتا رہا۔ "راجو میری گھر والی بن کر آئی تو فصل اور چنگی ہونے لگی۔ وہ محنت کرتی' روٹی پکاتی' دوپہر کو میرے لیے کھیت پر بھتا لے کر آتی۔ مویشیوں اور ڈنگروں کے لیے سویرے ہی سویرے دھتا بھتا کرتی۔ چاٹی میں دودھ بلو کر مکھن نکالتی۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔

"فصل تیار ہونے کے بعد میں راجو کو اس کی دیکھ بھال پر لگا دیتا۔ وہ کھیتوں میں پانی لگاتی اور نگرانی بھی کرتی۔ میں لاوی پر فصلیں کاٹنے نکل جاتا یا شہر میں محنت مزدوری کرتا۔ ہم دونوں مل کر محنت کرتے۔ آرام نال گزر بسر ہو رہی تھی۔ فیر ایسا ہوا جی' ایک رات پنڈ میں دھاڑا پڑا۔ شور مچا تو میں بھی نکل آیا۔ ہاتھ میں ڈانگ بھی تھی۔ ڈاکوؤں کو مار بھگایا۔ انھیں دور تک کھدیڑتا ہوا گیا۔"

رحیم داد نے نوردین کو غور سے دیکھا' مسکرا کر بولا۔ "دیکھنے میں بھی تو زور آور لگتا ہے۔"

نوردین اس کی بات نظر انداز کر کے بتاتا رہا۔ "لو جی' میں نے تو ڈاکوؤں کو بھگا کر اپنے تئیں نیک کام کیا پر یہی نیکی گلے پڑ گئی۔ میاں داد نے دوسرے ہی روز سویرے سویرے مجھے اپنی حویلی پر بلایا۔ میری پیٹھ ٹھونکی۔ بہت شاباش دی۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "کچھ ہی روز پہلے پنڈ میں میلہ لگا تھا۔ اس میں دنگل بھی ہوا۔ دوسرے پنڈ کے بھی پہلوان اس میں کشتی لڑنے آئے تھے۔ میں نے اس دنگل میں اپنے سے تگڑے پہلوان کو پچھاڑ دیا۔ بہت واہ واہ ہوئی جی۔ یار بیلیوں نے مجھے کندھے پر بٹھا کر پنڈ کا چکر لگایا۔ ڈھولیوں نے ڈھولوں پر زور زور سے چوٹیں لگائیں۔ میاں داد نے بھی میری جیت کا یہ جشن دیکھا۔ بہت خوش لگتا تھا۔"

"میاں داد کو تو خوش ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس کے پنڈ کا نام اونچا ہوا تھا۔"

"اب آگے کی سنو۔ میاں داد مجھ سے کچھ دیر ادھر ادھر کی گپ شپ کرتا رہا۔ فیر الگ لے جا کر

مجھ سے ایسا کام کرنے کو کہا کہ میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے مجھے رجھانے کی بہت کوشش کی پر میں تیار نہ ہوا۔ بس جی اس بات پر وہ مجھ سے سخت ناراض ہو گیا۔"

رحیم داد نے بے چینی اور حیرت سے پوچھا۔ "وہ تجھ سے کیا کام کروانا چاہتا تھا؟"

"گل ایہہ ہے جی۔ وہ زبردست رسا گیر ہے۔" نوردین نے تیکھے لہجے میں بتایا۔ "وہ مجھ سے ڈنگروں کی چوری کرانا چاہتا تھا۔ میں ایسا گندا دھندہ کیسے کرتا۔ پہلے تو اس نے مجھے تنگ کرنے کے لیے فصل کی بٹائی پر جھگڑا کیا۔ بٹائی کے لیے اپنے ونڈاوے لے کر آیا۔ مجھے کم راہ کی دی اور اپنے حصے سے زیادہ غلہ اٹھوا کر لے گیا۔ میں چپ رہا پر وہ مجھے تنگ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بے دخل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی کچھ نہ چلنے دی۔ بس مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ انھی دنوں لاوی کے لیے پنڈ سے باہر چلا گیا۔ میں نے اس دفعہ اپنی فصل کی پہلے ہی واڈھی کر لی تھی۔"

رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "غلطی کی اس میں کون سی گل ہے۔ تو ہر فصل کی تیاری کے بعد لاوی پر جاتا ہی تھا۔"

"پر اس دفعہ مجھے پنڈ سے جانا نہیں چاہیے تھا۔ میاں داد سے دشمنی جو ہو گئی تھی۔" نوردین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں ادھر لاوی پر دوسروں کی فصلوں کی واڈھی کر رہا تھا' ادھر ایک رات زمیں دار نے اپنے بدمعاشوں اور کرندوں کو میرے گھر بھیجا۔ وہ منہ پر منڈا سا باندھ کر آئے اور راجو کو اٹھا کر لے گئے۔ میں ہفتہ بھر بعد واپس آیا۔ راجو کو نہ پایا تو بہت پریشان ہوا۔ پڑوسیوں سے پوچھا۔ کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ میرے بیو کو بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ جن کو پتہ تھا وہ زمیں دار کے ڈر سے چپ رہے۔"

"تھانے میں پرچا چاک نہیں کرایا؟"

"خود تھانے گیا تھا۔ پر تھانے دار نے رپٹ نہیں لکھی۔ کئی بار تھانے کے چکر لگائے۔ کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ ایک پولسیا جاننے والا تھا۔ اس سے معلوم ہوا' تھانے دار کی میاں داد سے یاری ہے۔ اس لیے وہ کارروائی کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے اوپر درخواست لگائی۔ بہت بھاگ دوڑ کی پر کچھ بھی نہ ہوا۔" نوردین نے گہری سانس بھری۔

"جب میں راجو سے مایوس ہو چکا تو ایک شام زمیں دار نے مجھے اپنے ڈیرے پر بلایا۔ اس روز مجھے معلوم ہوا' راجو کو میاں داد نے اپنے پنڈ سے دور دیماں دیدار پور میں حاجی حبیب کے پاس پہنچا دیا ہے؟"

"راجو کو اس نے اپنی حویلی میں کیوں نہیں رکھا؟ حاجی کے پاس کیوں پہنچا دیا؟"

"گل اصلی ایہہ ہے جی' دونوں ہی رسا گیر ہیں۔" نوردین نے تلخی سے کہا۔ "دونوں چوری کے ڈھور ڈنگر اٹھوا کر ایک دوسرے کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ مانو پولیس چھاپا مارے بھی تو راجو اس کی حویلی سے برآمد نہ ہو۔" وہ چند لمحے خاموش رہ کر گویا ہوا۔

"میں نے زمیں دار کی بہت منت کی تو اس نے راجو کی واپسی کے لیے یہ شرط لگائی' میں اس کے لیے ڈنگروں کی چوری کروں۔ دس ڈنگروں کی چوری کے بعد اس نے راجو کو واپس کرنے کا وعدہ کیا۔"

"تو نے میاں داد کی یہ شرط مان لی؟"

"ہاں جی' ماننی ہی پڑی۔ پولیس کو اور اوپر والوں کو بھی کو آزمالیا۔ کسی نے میری کوئی مدد نہیں کی۔"

"تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔"

"سنتا جا۔ کیا کیا ہوا۔" نوردین بتانے لگا۔ "تو جی اس طرح میں مویشی چور بن گیا۔ رات کے اندھیرے میں میاں داد کی حویلی سے نکلتا۔ کبھی اکیلا ہوتا' کبھی دوسرے مویشی چور بھی ساتھ ہوتے۔ دور دور کے پنڈ سے ڈنگر چراتا۔ کھرے کے نشانات مٹانے کے لیے مویشیوں کے پیروں میں کھسّے ڈالتا۔ لادھ ہوتا تو پیچھا کرنے والوں پر پلٹ کر حملہ بھی کرتا۔ کبھی ان کو بھگانے کے لیے گولی چلائی' کبھی غلط رستے پر ڈالنے کے لیے وڑوچ سے بھی کام لیا۔ کئی بار پکڑے جانے سے بال بال بچا۔ چوری کے مویشی چھپانے کے لیے میاں داد نے اپنا اہر دور جھل میں بنایا ہے۔ چوری کے بعد مویشی وہاں پہنچاتا۔ فیر تو جی میں نے کسی نہ کسی طرح دس مویشی میاں داد کے لیے چرائے۔"

اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ "مویشیوں کی اس چوری میں سب سے زیادہ دکھ مجھے دوبار ہوا۔ میں نے دو مزارعوں کے ڈھگے چرائے اور اس لیے چرائے کہ میاں داد انھیں بے دخل کرنا چاہتا تھا۔ جب ڈھگے نہ رہے تو وہ ہل کیسے چلاتے۔ دونوں برباد ہو گئے۔ پنڈ چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک کے بارے میں تو سنا ہے ملتان میں بھیک مانگتا ہے۔ گھر والی بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ ایک پتر تھا' اسے بھی ساتھ لے گئی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں نے یہ سب کچھ راجو کے لیے کیا۔ وہ تب بھی نہ ملی۔"

"ایسا کیوں ہوا؟" رحیم داد نے چونک کر سوال کیا۔ "تو نے تو زمیں دار کی شرط بھی پوری کر دی تھی۔"

"میں نے یہی بات زمیں دار سے کہی تھی۔ جب میں نے اس کے لیے دس مویشی چرا لیے تو اس نے مجھے کہا' دیدار پور چلا جا اور حاجی حبیب کی ماڑی سے راجو کو واپس لے آ۔ میں اس کے کہنے پر یہاں حاجی کے پاس آیا۔ وہ صاف مکر گیا۔ بگڑ کر بولا' میرے پاس کوئی راجو شاجو نہیں۔ میاں داد نے تجھے بہکا دیا۔ میں ایسا گندا کام نہیں کرتا۔ اس کی باتیں سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ واپس میاں داد کے پاس گیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی۔ وہ شرمندہ ہونے کی بجائے ٹھٹھا مار کر ہنسا' میری پیٹھ ٹھونک کر کہنے لگا۔ مل جائے گی' تیری راجو ضرور مل جائے گی۔ پہلے میرا ایک کام کر دے۔ اس دفعہ اس نے بہت خطرناک کام بتایا۔"

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "مویشی چوری سے بھی زیادہ خطرناک؟"

"ہاں جی' اس سے بھی زیادہ خطرناک۔ ہوا یہ کہ ایک کھوجی نے میاں داد کے اہر کا کھوج نکال لیا۔ وہاں سے چوری کے کئی مویشی پکڑے گئے۔ میاں داد جیل جاتے جاتے بچا۔ کئی ہزار روپے رشوت میں دینے پڑے۔ خود میاں داد کے اپنے کرندے' بھولا نے مرغائی کے لالچ میں مخبری کی تھی۔ وہ بھاگ کر کریشیوں کے پاس چلا گیا۔ وہ جی بہت وڈے زمیں دار ہیں۔ ان کی ہزاروں کلّا زمین ہے۔ اوپر بھی ان کی پہنچ ہے۔ میاں داد کو جب بھولا کی غداری کا علم ہوا تو سخت ناراض ہوا۔ وہ چاہتا تھا میں بھولا کا خون کردوں۔ میاں داد کی بات سن کر میں چپ رہا۔ دو روز تک سوچتا رہا۔ کریشیوں کے علاقے میں گولی چلانا آسان کام نہیں۔ وہاں تو مانو ان کی حکومت ہے۔ تھانہ' پولیس' سب کچھ ان کا ہے۔"

نوردین لمحے بھر خاموش رہ کر بتانے لگا۔ "ادھر میاں داد کو ملوم ہو گیا' میں بھولا کا خون کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ اس نے رات کو مجھے بلایا۔ بہت ناراض ہوا۔ کاربین میرے ہاتھ میں دے کر بولا۔ بھولا کو ختم کر کے آنا ورنہ مجھے اپنا منہ نہ دکھانا۔ تجھے رات بھر کی مہلت دیتا ہوں۔ کام نہ ہوا تو راجو تو تجھے ملے گی ہی نہیں اور تو بھی اس سے ملنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔ ہاں' کام پورا کر کے آیا تو راجو کو اپنے ساتھ لے جانا۔ یہ میرا تجھ سے پکا وعدہ رہا۔ اس کے ناراض ہونے سے میں ڈر گیا۔ راجو کو بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں تیار ہو گیا۔ میاں داد کے کرندوں نے اسی رات مجھے کریشیوں کی زمینوں کے نزدیک پہنچا دیا۔"

"کرندے اس کام میں شریک نہیں ہوئے؟"

"توبہ کرو جی۔ وہ مجھے چھوڑ کر فوراً اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ میں آگے گیا اور رات بھر درختوں کے نیچے بھولا کی گھات میں بیٹھا رہا۔ ابھی صبح کا ذرا اجالا ہوا تھا' کیا دیکھتا ہوں' بھولا اپنے

گھر سے نکلا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا سامنے کے نیا ئیں کی طرف بڑھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ سویرے سویرے ٹٹی کے لیے نیا ئیں ضرور جائے گا۔ میں نیا ئیں کے سامنے ہی اندھیرے میں دبکا بیٹھا تھا۔ جیسے ہی وہ دھوتی اٹھا کر بیٹھا' میں نے جھٹ اس پر گولی چلائی۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ وہ چیخ مار کر اٹھا۔ میں نے دوسری گولی چلائی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ میں نے اسے زمین پر تڑپتے دیکھا اور کھیتوں کے اندر اندر رستہ بناتا ہوا بھاگا۔ کریشیوں کی مسلح کرندے گولی کی آواز سنتے ہی شور مچاتے پہنچے۔ انھوں نے میرا پیچھا بھی کیا۔ بار بار گولیاں چلائیں' پر میں بچ کر صاف نکل آیا۔"

"تو نے کمال کر دیا۔" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔ "کریشیوں کی زمیں داری سے اس طرح بچ کر نکل آنا معمولی بات نہیں۔"

"پر میرا کام تب بھی نہ بنا۔" نوردین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میاں داد نے مجھے فیر حاجی حبیب کے پاس بھیجا۔ اس دفعہ حاجی نے یہ تو بتایا' راجو اس کی ماڑی میں ہے پر اس نے راجو کو دیا نہیں۔ کہنے لگا' کچھ دنوں بعد آنا۔ میں نے میاں داد کو بتایا۔ اس نے مجھے اپنے منشی کے ساتھ حاجی کے پاس بھیجا۔ حاجی نے فیر ٹال مٹول سے کام لیا۔" اس نے گہری سانس لی۔ "میں بار بار حاجی کے پاس جاتا' وہ مجھے لارے لپے دیتا۔ پچھلے دنوں اس کے پاس آیا تو اس نے نئی گل بات کہی۔"

"کیا نئی گل کہی؟"

"حاجی نے کہا' جو زنانی اٹھ مہینے تک دور رہی' وہ اب تیرے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے۔ یہ شرعی مسئلہ ہے' مسجد کے ملاں سے پوچھنا پڑے گا۔"

"اس چکر میں پڑا ہی کیوں؟ میاں داد سے کہتا' وہ خود تیری گھر والی کو حاجی کے پاس سے واپس لائے اور تیرے حوالے کرے۔ تیری تو اس سے یہی بات طے ہوئی تھی نا؟"

"میں نے میاں داد سے پہلے بھی کہا تھا۔ مگر جب میں نے زیادہ زور دیا تو وہ ایک دم گرم ہو گیا۔ دھمکی دینے لگا کہ بھولا کے کتل کے الزام میں مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ میں تو جی یہ بات سن کر ہی ڈر گیا۔ ویسے بھی ان دنوں بھولا کے کتل کے سلسلے میں پولیس نے زبردست بھاگ دوڑ مچا رکھی تھی۔ کریشیوں نے بہت زور ڈالا۔ پولیس تو مجھے پکڑ کر لے بھی جاتی پر میاں داد نے بچا رکھا تھا۔ وہ کریشیوں کے اتنا وڈا زمیں دار تو نہیں پر اس کے بھی شریکے اور رشتے ناتے دار وڈے سرکاری افسر لگے ہیں۔"

نوردین سر جھکا کر چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب تو جی' حاجی ہی میرا کام کر سکتا ہے۔ اسی لیے میں ملاں کے پاس آیا ہوں۔ پہلے بھی آیا تھا۔ ملاں کی منت سماجت کی تو

اس نے کہا اسے ملتان جانا ہو گا۔ شرعی مسئلہ ہے' وہاں کے مفتی سے فتویٰ لینا ہو گا۔ اب تک تو وہ فتویٰ لے آیا ہو گا۔"

اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں التجا تھی۔ "توں کہتا تھا' ملاں تیری بات مان لے گا۔ توں بھی ملاں سے کہنا' میرا بازو مجھے مل جائے' تیری بہت مہربانی ہو گی۔" رحیم داد گردن جھکائے اس طرح خاموش بیٹھا رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ نوردین نے اسے گہری سوچ میں غرق دیکھا تو کرید کر دریافت کیا۔

"کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"سوچ رہا ہوں' میاں داد تجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔"

"بے دخل کرنا چاہتا ہے تو کر دے۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ "جب سے راجو گئی ہے' زمین کا ستیاناس ہو گیا۔ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟ وہ میرے ساتھ برابر سے کام کرتی تھی۔ وہ میرا بازو ہے۔ اس کے بنا میں کیسے کھیتی باڑی کر سکتا ہوں۔" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

"غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے بھی اس کی تائید کی۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے' میاں داد اور حاجی حبیب' دونوں نے اس معاملے میں مسکوٹ کر رکھی ہے۔ میاں داد تجھے بے دخل کر کے زمین ہتھیانا چاہتا ہے۔ حاجی تیری گھر والی کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ دونوں یہی چاہتے ہیں' رسا گیری کے دھندے میں تجھے استعمال کریں۔ تجھ سے مویشیوں کی چوری کرائیں' خون کرائیں' ڈکیتی کروائیں۔ تیں نوں پتہ نہیں' سارے ہی وڈے زمیں دار یہی دھندا کرتے ہیں۔" اس نے انگلی سے سر کھجاتے ہوئے نوردین کی جانب نظریں اٹھائیں۔ "تو رے! مجھے تو راجو کا واپس ملنا مشکل ہی نظر آتا ہے۔"

"ایسا نہ کہہ۔" نوردین تڑپ کر بولا۔ اس نے جھٹ دھوتی کے ڈب سے دیسی ساخت کا پستول نکالا۔ "میں حاجی اور میاں داد دونوں کو جان سے مار دوں گا۔"

"ایک تو یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا سمجھتا ہے۔" رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "فیر یہ بھی تو سوچ' تو خود بھی پھانسی پر لٹک جائے گا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "راجو کا خیال اپنے دل سے نکال کیوں نہیں دیتا؟"

"نہیں جی ایسا نہیں ہو سکتا۔ راجو میرا بازو ہے' میں اسے نہیں بھول سکتا۔" نوردین نے بڑے

جوش سے کہا۔ "ویسے مجھے راجو سے پیار بھی ہے۔ اب مجھے ویسی گھروالی کہاں ملے گی؟ وہ زبردست محنتی اور راہری ہے۔"

☆

آنگن کا دروازہ کھلا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا' چراغ کی دھندلی روشنی میں ایک عورت سر پر کھانے کی چنگیر رکھے اندر داخل ہوئی۔ رحیم داد نظریں اٹھائے اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ نور دین نے پستول فوراً دھوتی کے ڈب میں رکھ لیا۔

عورت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی قریب آ گئی۔ وہ گداز بدن کی نوجوان عورت تھی۔ خوب گھیردار لہنگا پہنے ہوئے تھی۔ اس کے اوپر ململ کا تنگ کرتا تھا۔ گردن میں بھی ململ کا دوپٹا پڑا تھا۔ لباس تو اس کا میلا کچیلا تھا مگر تھی الھڑ اور چلبلی۔ چلتی تو کولھوں کو خم دے کر قدم بڑھاتی۔

وہ دالان میں پہنچی' دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھک کر چہرے پر بکل مارا اور جھک کر کھانا رکھتے ہوئے بولی۔ "زمیں دار کے گھر سے ملاں جی کے لیے روٹی ٹکر لائی ہوں۔"

وہ واپس جانے کے لیے مڑی۔ نور دین نے ٹوکا۔ "تیرا ناں کیہ ہے؟"

"ہے کچھ۔" وہ ٹھنک کر بڑے ناز سے بولی۔ "توں میرا ناں کیوں پوچھتا ہے؟"

"اتنا ناراض کیوں ہوتی ہے؟" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "نام ہی تو پوچھا ہے' بتا دے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

"میرا ناں چھلی ہے جی۔ زمیں دار کی ماڑی میں کام کرتی ہوں۔"

نور دین نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "ایک گل پوچھوں' بتا دے گی؟"

اس نے گردن کو خم دے کر نور دین کی جانب دیکھا۔ "بتانے کی ہوگی' بتا دوں گی۔"

"راجو کو جانتی ہے؟ وہ بھی تو حاجی کی ماڑی میں ہوتی ہے۔"

"راجو!" چھلی نے نور دین کو مشتبہ نظروں سے دیکھا' بے رخی سے بولی۔ "میں نوں کچھ پتہ نہیں۔"

رحیم داد نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "اللہ تعالیٰ نے تجھے ایسی سوہنی شکل صورت دی ہے' بات بھی اسی طرح کیا کر۔"

چھلی کی شکل و صورت ایسی اچھی نہ تھی۔ گہرا سانولا رنگ تھا' ناک نقشہ بھی بھدا تھا۔ رحیم داد کی بات سن کر وہ خوش ہوئی۔ زیرِ لب مسکرائی۔ رحیم داد کو مخاطب کر کے بولی۔

"تیں نوں کچھ پوچھنا ہے؟"

"پہلے بیٹھ تو جا۔" رحیم داد نے شفقت سے کہا۔ "کھڑی کیوں ہے؟ چلی جانا' ایسی جلدی کیا ہے۔"

چھلی نے اپنا لہنگا سمیٹا اور دونوں سے ذرا ہٹ کر چٹائی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔ "بول' تیں نوں کیہ کہنا ہے؟"

"میں نوں تو کچھ نہیں کہنا۔" رحیم داد نے نور دین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جو کچھ پوچھتا ہے' بتا دے۔ بہت دور سے چل کر آیا ہے۔"

چھلی نے نگاہیں موڑ کر نور دین کو دیکھا۔ مسکرا کر بولی۔ "تو راجو کا گھر والا نور دین تو نہیں ہے؟"

"ہاں' میں نور دین ہی ہوں۔ یہ بتا' راجو کیسی ہے؟ تیری مہربانی ہوگی۔"

"مہربانی کی کون سی گل ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "زمیں دار سے ڈر لگتا ہے۔ ویسے راجو ٹھیک ٹھاک ہے۔"

نور دین نے دریافت کیا۔ "تجھ سے تو ملتی ہی ہوگی؟"

"روز ملتی ہے۔ میرے ساتھ ہی ماڑی میں کام کاج کرتی ہے۔ پر وہ ماڑی سے باہر نہیں نکلتی۔ زمیں دار کا اس کے لیے یہی حکم ہے۔"

"کبھی مجھے بھی یاد کرتی ہے؟"

"کرتی تو ہے۔" چھلی نے جواب دیا۔ "پر یاد کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تیرے پاس نہیں جا سکتی۔"

اس دفعہ رحیم داد نے سوال کیا۔ "کیا اس کی مرضی اپنے گھر جانے کی نہیں ہے؟"

"اس کی مرضی سے کیا ہوتا ہے جی۔" چھلی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "مرضی تو اصلی زمیں دار کی ہے۔" اس نے چوکنا نظروں سے آنگن کے دروازے کی جانب دیکھا اور کھسک کر دونوں کے قریب ہو گئی۔ "زمیں دار اسے رکھیل بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ ویسے جی اس کی پہلے ہی دو گھر والیاں ہیں۔ دونوں ہی ماڑی میں رہتی ہیں۔ روز آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں۔ پر راجو سے دونوں ہی کھار کھاتی ہیں۔ اسے بہت تنگ کرتی ہیں۔ زمیں دار کا وڈا پتر کمال بھی راجو کو تنگ کرتا ہے۔ ویسے تو وہ ماڑی میں کام کرنے والی سبھی زنانیوں کو تنگ کرتا ہے۔ ایک نمبر حرام دا ہے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"ابھی میں روٹی لے کر ماڑی سے نکلی تو وہ بھی کہیں جا رہا تھا۔ اندھیرے میں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ لگا نوچنے کھسوٹنے۔ روٹی ہاتھ میں نہ ہوتی تو ابھی پکڑ کر کھیتوں میں لے جاتا۔" وہ شرما گئی۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "تیرا گھر والا نہیں ہے؟"

"ہے تو جی۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ہم تّی کمین ہیں جی' ہماری کیا عزت' کیا آبرو۔ زمیں دار کے پتر کے خلاف ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ماڑی میں کام نہ کریں تو گزارہ کیسے ہو۔"

نوردین بے قرار ہو کر بولا۔ "چھلّی! مجھے راجو سے ملوا دے' تیری بہت مہربانی ہوگی۔"

"تاجی نا' ایسی گل نہ کر۔" وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ "زمیں دار کو پتہ چل گیا تو جان سے مار دے گا مجھے۔"

"اسے پتہ ہی کب چلے گا۔" رحیم داد نے سفارش کی۔ "تو بھی کسی کی گھر والی ہے' ذرا سوچ تو' اور اسے دیکھ۔" اس نے نوردین کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "کتنا پریشان اور دکھی ہے۔ اٹھ مہینے سے اوپر ہو گئے' اس نے اپنی گھر والی کو نہیں دیکھا۔"

وہ بے مروّتی سے بولی۔ "میں کیا کر سکتی ہوں جی؟"

"تو حاجی کی دونوں گھر والیوں کو راضی کرنے کی کوشش کر۔" رحیم داد نے اسے ترکیب بتائی۔ "وہ تو راجو کو نورے کے ساتھ بھگانے پر بھی تیار ہو جائیں گی۔ اسے اپنی سوکن جو سمجھتی ہیں۔ اس کام میں وہ ضرور مدد کریں گی۔"

"نہیں جی' تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔" چھلی نے انکار میں گردن ہلائی۔ "ویسے تو دونوں ہر وکت کڑ کڑ کرتی رہتی ہیں۔ پر زمیں دار سے بہت ڈرتی ہیں۔ باہر وہ جتنا نیک بندہ نظر آتا ہے' گھر کے اندر اتنا ہی ظلم کرتا ہے۔ تجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔" وہ اٹھنے کے لیے کسمسائی۔ "میں نوں اب جانا ہے' کام بھی کرنا ہے۔"

"زمیں دار تو ملاں جی کے ساتھ شہر گیا ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "فیر تو اتنا کیوں ڈرتی ہے۔"

وہ بولی۔ "زمیں دار اب آتا ہی ہوگا۔"

نوردین نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے راجو سے نہیں ملوا سکتی؟ ملوا دے' تیری بہت مہربانی ہوگی۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"نہیں جی' میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "ناراض کیوں ہوتی ہے۔" اس نے دھوتی کا ڈب ٹٹولا اور دس روپے کا نوٹ نکال کر چھلّی کی جانب بڑھایا۔ "لے اسے رکھ لے' نئے کپڑے لتے بنوا لینا۔ دیکھ تو تیرے کپڑے کتنے گندے ہو رہے ہیں۔"

چھلّی نے ہچکچاتے ہوئے نوٹ تو لے لیا مگر خاموش بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے کہا۔ "حوصلے سے کام لے' حوصلے سے۔" اس نے نوردین کی جانب مڑ کر دیکھا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "نورے! بتا تیرا کیا پروگرام ہے۔ کب اور کیسے راجو سے ملنا چاہتا ہے؟"

"ابھی تو جی جگار ہے۔ میں آدھی رات کو ماڑی کے پاس پہنچ جاؤں گا۔" اس نے چھلّی کی طرف اشارہ کیا۔ "آگے یہ جیسا بتائے گی' ویسا کروں گا۔"

"ایسا کر۔" چھلّی نے نوٹ کھڑے کے نیفے میں اڑستے ہوئے کہا۔ "ماڑی کے پچھے ہتھ پہنچ جانا۔ وہاں ٹاہلی کے پیڑوں کا جھنڈ ہے' اندھیرا بھی ہے۔ ماڑی کا ایک دروازہ ادھر کھلتا ہے۔ میں راجو کو وہیں بھیج دوں گی۔ پر آدھی رات گزرنے کے بعد ہی آنا۔" اس نے خوف زدہ نظروں سے نوردین اور رحیم داد کو دیکھا۔ "کوئی گڑ بڑ ہو جائے تو میرا ناں نہ لینا' ہرگز نہیں۔ ورنہ زمیں دار مجھے جان سے مار دے گا۔"

"پکا وعدہ۔ تیرا ناں ہرگز نہیں لوں گا۔ چاہے وہ مجھے جان سے مار دے۔" نوردین نے سینہ تان کر اسے یقین دلایا۔ "بالکل فکر نہ کر۔" اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ "میں آدھی رات کے بعد اس جگہ پہنچ جاؤں گا۔"

"کوئی گڑبڑ نہ ہو۔" چھلی کھڑی ہو گئی۔ "میں نوں بہت ڈر لگتا ہے۔"

وہ واقعی خوف سے گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس نے مزید بات چیت نہیں کی۔ والان سے نکل کر چپ چاپ آنگن میں پہنچی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی باہر چلی گئی۔ نوردین نے اٹھ کر دروازہ بند کیا مگر کنڈی نہیں لگائی۔

نوردین واپس آیا تو خوشی سے چہرہ دمک رہا تھا۔ رحیم داد کے قریب بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ "توں نے اس وکت وہ کام کیا میرا کوئی سگا بھی نہ کرتا۔ میں نوں پتہ نہ تھا' توں اتنا بھلا اور نیک بندہ ہے۔" اس کے انداز میں خوشامد تھی۔

"نورے! مجھے تو تب خوشی ہوگی' جب راجو تجھے مل جائے گی۔"

"میں تو کہتا ہوں جی' بس ایک بار راجو مل جائے' فیر میں اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔"

"ایسا ہو تو سکتا ہے۔ حاجی کی گھر والیاں مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو کام آسان ہو جائے گا۔"

"میری ایک گل مان لے گا؟"

"کیا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"میرے ساتھ ماڑی تک چل سکے گا؟" نوردین نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں' توں میرے ساتھ ہوتا۔ جیسے کہے گا' ویسا ہی کروں گا۔ راجو بھی تیری گل بات مان لے گی۔ وہ ضرور تیری گل مان لے گی۔ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ میری گھروالی ہے۔"

"مجھے نہ لے جا۔" رحیم داد اس کے ہم راہ جانے پر رضامند نہیں ہوا۔ وہ کوئی ایسا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا جس میں گرفتاری کا خدشہ ہو۔ "اکیلا ہی چلا جا۔"

"جیسی تیری مرضی۔" نوردین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے ساتھ رہتا تو ٹھیک تھا۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ نوردین بھی چپ تھا۔ دونوں چٹائی پر گم صم بیٹھے تھے۔ طاق میں چراغ روشن تھا مگر اس کی روشنی بہت کم تھی۔ باہر آنگن میں اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔

☆

مولوی فضل احمد دروازے پر نمودار ہوا۔ آگے بڑھا۔ خاموشی میں اس کے قدموں کی آہٹ ابھری۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دالان میں پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھری دبی تھی۔ اس نے گٹھری رحیم داد کے سامنے ڈال دی۔

"لے بھئی' تیرا سامان آگیا۔"

مولوی فضل ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے اور لباس پر خاک کے ذرات بکھرے ہوئے تھے۔ رحیم داد نے گٹھری کھولی۔ اندر سے پگڑی' شلوار اور قمیص نکلی۔ شلوار سفید لٹھے کی تھی۔ قمیص پر ہلکی ہلکی سبز دھاریاں تھیں۔ کپڑا بھی چکنا اور نرم تھا۔ ساتھ میں ایک پرنا اور دو رجسٹر تھے' پنسلیں بھی تھیں۔ رحیم داد نے ایک ایک چیز غور سے دیکھی' مسکرا کر بولا۔

"ملاں جی' تم نے تو کمال کر دیا۔ اتنی جلدی کمیض اور شلوار تیار کرالی۔"

"میں نے شہر پہنچتے ہی بازار سے کپڑا خریدا۔ درزی کو دے کر کہا' کل دوپہر بارہ بجے تک تیار کردے۔ مزدوری کی فکر نہ کرنا۔" مولوی فضل آہستہ آہستہ بتاتا رہا۔ "بس جی' اس نے فٹافٹ کپڑے تیار کر دیئے۔ میں نے سوچا' کندھے پر ڈالنے کے لیے پرنا بھی چاہیے ہوگا۔ ہر دم منہ ہاتھ پونچھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ سو میں نے ایک پرنا بھی تیرے لیے خرید لیا۔" اس نے اپنے کرتے کی جیب سے عینک نکالی اور رحیم داد کے ہاتھ میں دے دی۔ "لے' یہ تیری عینک بھی آگئی۔ پتہ نہیں' تیری آنکھوں پر ٹھیک بھی لگتی ہے کہ نہیں۔ ویسے میں نے عینک ساز کو بتا دیا تھا کہ کم نمبر کی ہو' جوان بندے کے لیے چاہیے ہے۔"

رحیم داد نے عینک دیکھی۔ اس کا فریم تھا تو استعمال شدہ مگر جدید وضع کا تھا۔ رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ بات یہ تھی کہ حکیم چشتی کی عینک کا فریم چاندی کے پتلے تاروں کا تھا۔ رحیم داد حلیہ بدل کر اب رحیم داد نہیں رہا تھا۔ مگر وہ مقتول حکیم چشتی بھی بننا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کے لیے خطرہ تھا۔

عینک پا کر وہ خوش ہوا۔ عینک کے شیشے ہلکے اور صاف تھے۔ اس نے عینک لگا کر ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔ ہر چیز قدرے بڑی اور صاف نظر آئی۔

رحیم داد نے مسکرا کر اپنی پسند کا اظہار کیا۔ "بالکل فٹ بیٹھی ہے جی۔ مجھے ایسی ہی عینک چاہیے تھی۔"

"وہ تو میری طرح کا فریم لگا رہا تھا۔" مولوی فضل نے اپنی عینک کی طرف اشارہ کیا' اس کا فریم پرانی وضع کا تھا۔ "پر میں نے کہا' نہیں جی' یہ نہیں چلے گا۔ کوئی عمدہ فریم لگا۔ اپنا چوہدری جوان بندہ ہے۔ شہر کا رہنے والا ہے۔" وہ اپنی کارگزاری سناتا رہا۔ "خریداری کے معاملے میں' میں کبھی دوکاندار سے مار نہیں کھاتا۔"

اس نے جیب سے تین روپے نکالے اور رحیم داد کی جانب بڑھائے۔ "لے بھئی چوہدری! تیرا سب سامان بھی آگیا اور ۵۰ میں سے یہ روپے بھی بچ گئے۔"

رحیم داد نے روپے نہیں لیے۔ مسکرا کر کہا۔ "ملاں جی! اسے اپنے ہی پاس رکھ لو۔ میری خوشی سمجھ کر رکھ لو۔"

"تیری یہی خوشی ہے تو رکھے لیتا ہوں۔" مولوی فضل نے روپے پھر جیب میں رکھ لیے۔ رحیم داد کی اس فراخدلی پر وہ بہت خوش ہوا۔ "اب پڑچھتی میں جا کر کپڑے بدل لو اور یہ دیکھ لو' ٹھیک سے فٹ آتے ہیں کہ نہیں۔ میں نے قمیص میں چار جیبیں لگوائی ہیں' دو نیچے ایک اوپر اور ایک روپے پیسے رکھنے کے لیے اندر۔ ٹھیک کیا نا میں نے؟" مولوی فضل نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ رحیم داد نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ تو بہت چنگا کام کیا۔"

رحیم داد کپڑے اٹھا کر دالان سے باہر گیا اور آنگن عبور کر کے پڑچھتی میں پہنچا۔

☆

مولوی فضل احمد نے نوردین کی جانب توجہ دی' کسی قدر تلخ لہجے میں پوچھا۔ "نورے! تو کیسے آیا؟"

"یہ پوچھنے آیا تھا راجو کے معاملے میں توں نے کیا طے کیا؟ اب تک ملتان سے فتویٰ بھی منگوا لیا ہو گا۔"

مولوی فضل نے بے رخی سے کہا۔ "میں ملتان گیا ہی کب۔ وہاں جانے پر خرچ آتا ہے۔ مجھے کچھ دے کر گیا تھا جو میں وہاں جاتا۔"

"میری حالت کا تیں نوں پتہ ہی ہے۔" نوردین نے عاجزی سے کہا۔ "میرا تو سب کچھ تباہ ہو گیا۔ نہ زمین پر ہل چلا سکا' نہ بوائی کی' نہ فصل ہوئی۔ زمین بنجر ہوتی جا رہی ہے۔ ادھیارے پر زمین دینی چاہی تو زمیں دار نے منع کر دیا۔"

"یہ سب کچھ میں نہیں جانتا۔" مولوی نے بے زاری کا اظہار کیا۔ "یہ تیرا اور تیرے زمیں دار کا معاملہ ہے' میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"پر راجو کا معاملہ تو طے کرا سکتا ہے۔" نوردین گڑگڑانے لگا۔ "تیری بہت مہربانی ہو گی۔ میں سارے چکروں سے بچ جاؤں گا۔ میں نوں کچھ اور نہیں چاہیئے۔"

مولوی فضل چند لمحے خاموش رہا پھر اپنی ڈاڑھی کریدتے ہوئے مشورہ دیا۔ "میرا کہا مان' راجو کو تو اب بھول ہی جا۔ اب وہ تیرے کام کی نہیں رہی۔ مجھے پتہ چلا ہے وہ رات کو دیر تک حاجی صاحب کے کمرے میں اکیلی رہتی ہے۔ کبھی کچھ ہو سکتا ہے' شیطان کے بہکانے میں دیر نہیں لگتی۔"

"نہیں جی' ایسا نہیں ہو سکتا۔" نوردین تڑپ کر بولا۔ "راجو ایسی نہیں ہو سکتی۔ میں اسے ٹھیک طرح جانتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے' تو اسے جان کر بھی نہیں جان سکا۔" مولوی نے عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "میں نے تو یہاں تک سنا ہے' وہ تیرے ساتھ جانے پر بالکل رضا مند نہیں۔"

"نہیں ملاں جی' یہ بالکل غلط ہے۔ راجو ایسا نہیں کر سکتی۔"

"میں کہتا ہوں تو ابھی نادان ہے۔ تجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔" مولوی فضل احمد نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "آٹھ مہینے میں وہ بالکل بدل چکی ہے۔ وہ اب تیری پہلے جیسی راجو نہیں رہی۔ تو میری بات کیوں نہیں مانتا؟" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر نرم لہجے میں بولا۔ "میں تیری ایک ہی مدد کر سکتا ہوں۔"

نوردین نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "وہ کیا ہے؟"

"وہ یہ ہے کہ میں راجو کے عوض تجھے حاجی صاحب سے کچھ روپیہ دلوا دوں۔ تو راجو کو طلاق نامہ لکھ دے۔ میں تجھے ہزار روپے تک دلوا دوں گا۔ حاجی صاحب تو پانچ سو سے زیادہ دینے کو تیار نہیں تھے' میں نے منت سماجت کی تو ہزار پر تیار ہو گئے۔" مولوی فضل کھل کر مسکرایا۔ "ویسے تو حاجی کے بارے میں کچھ ہی کہہ' پر وہ دل کا برا نہیں۔ وہ چاہتا تو راجو کو یوں ہی رکھ لیتا' ایسے ہی جیسے دوسرے وڈے زمیں دار داشتہ بنا کر رکھ لیتے ہیں۔ پر وہ نیک اور صالح مسلمان ہے' برائی سے ہمیشہ بچتا ہے۔ وہ باقاعدہ نکاح پڑھوا کر' راجو کو حبالۂ عقد میں لانا چاہتا ہے۔ بات یہ ہے جی' راجو اس کی بہت خدمت کرتی ہے' اس سے پیار کرتی ہے۔ اسی کے پاس رہنا چاہتی ہے۔ اسے ماڑی میں بہت آرام ہے۔ عیش کرتی ہے۔ تیرے گھر میں اسے یہ عیش آرام کہاں ملے گا؟ تو اس سے ڈنگروں کی طرح کام لیتا ہے۔ ہر زنانی عیش آرام چاہتی ہے' راجو بھی ایسا ہی چاہتی ہے۔ اس میں کون سی نئی بات ہے۔ پر تو یہ باتیں نہیں سمجھتا۔"

نوردین نے بیل کی طرح گردن ہلائی۔ "سمجھ نہیں آتی راجو ایسی ہو سکتی ہے۔"

"اب تو الٹی سیدھی باتیں سوچ کر اپنا مغز خراب نہ کر۔ سیدھی سیدھی معاملے کی بات کر۔ ہزار روپے کم نہیں ہوتے۔ اس سے اپنا کام دھندا چلا سکتا ہے' دوسرا ویاہ کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی میں تجھے یہ بھی بتا دوں۔ پچھلے دنوں تیرا زمیں دار میاں داد مویشیوں کا سودا کرنے حاجی صاحب کے پاس آیا تھا۔ میں بھی موجود تھا' تیرا ذکر بھی چلا۔ میاں داد تجھے زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ کہتا تھا' تو نے زمین کا ناس مار دیا۔ کھیتی باڑی میں دلچسپی نہیں لیتا۔ زمین بالکل بنجر پڑتی جا رہی ہے۔ وہ اس پر باغ لگانا چاہتا ہے۔ یہ بات اس نے میرے سامنے حاجی صاحب سے کہی تھی۔ ذرا یہ تو سوچ' زمین ہاتھ سے نکل گئی تو کیا ہو گا۔ بھوکا مرے گا یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جرائم پیشہ اور مویشی چور بن جائے گا۔" مولوی فضل احمد نے شفقت کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضا مند کرنے کی کوشش کی۔ "میں نہیں چاہتا' تو چور اچکا بن جائے۔ یہ تباہی کا رستہ ہے۔ عذاب الٰہی سے ڈر۔ ایسے رستے پر نہ چل۔ میرا کہا مان' ہزار روپے لے لے اور راجو کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"کہنا کیا ہے جی۔" نوردین نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "کچھ سمجھ نہیں آتی۔"

"ایسی جلدی نہیں۔ گھر جا کر آرام سے سوچ لے۔ فیر مجھے آ کر جواب دے' پر زیادہ دیر نہ لگانا' ورنہ ہزار روپے بھی نہیں ملیں گے اور راجو تو تجھے مل ہی نہیں سکتی۔"

نوردین منہ لٹکائے چپ بیٹھا رہا۔

رحیم داد دالان میں داخل ہوا۔ وہ سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر سیاہ فریم کا چشمہ تھا۔ نئی قمیص اور شلوار چراغ کی روشنی میں جھلک رہی تھی۔

مولوی فضل نے اس کی یہ سج دھج دیکھی تو مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! اس لباس میں بہت جچ رہا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا' دیکھنے میں سکول کا ہیڈ ماسٹر لگ رہا ہے۔ بھئی سچ کہہ رہا ہوں' تجھ پر بہت شان آگئی۔"

رحیم داد اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تیری مہربانی ہے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "میرے معاملے میں حاجی سے تو بات نہیں کی؟"

"ضرور کی تھی۔" مولوی نے جواب دیا۔ "پر اس کا بھی یہی خیال ہے' اس پنڈ میں تیرے بال بچوں کی طرح کا کوئی کنبہ نہیں۔ پورے موضع میں صرف ایک مہاجر کنبہ ہے۔ وہ کرنال کے ہیں اور گھر والا' بیوی بچے' سب کے سب شروع ہی سے ایک کنبے کے چلے آ رہے ہیں۔ ویسے صبح حاجی صاحب سے مل لے۔ چاہے تو وہ ان کو اپنے ڈیرے پر بھی بلا لے گا۔ اپنا اطمینان کر لینا۔"

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نہیں ملاں جی' اب اس کی ضرورت نہیں۔ سوچتا ہوں آج ہی چلا جاؤں۔"

"جیسی تیری مرضی' ویسے میں تو چاہتا تھا آج رات یہیں ٹھہر جاتا۔"

"مجھے جانے ہی دے۔ کل کچھ ضروری کام بھی کرنے ہیں۔"

"ایسی گل ہے تو میں تجھے نہیں روک سکتا۔" مولوی نے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ "روٹی تو کھا لے۔" اس نے نوردین کو مخاطب کیا۔ "نورے! تو بھی روٹی کھا لے۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ شام کو رستے میں حاجی صاحب کے ساتھ کچھ کھا پی لیا تھا۔"

مولوی فضل احمد نے نوردین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے' اس پر گھر جا کر آرام سے سوچ اور تین چار روز بعد آ کر بتا دے۔ ویسے میری بات مان لے گا تو خوش و خرم رہے گا۔ مجھے دل سے دعا ہی دے گا۔"

مولوی فضل کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد اور نوردین کو مخاطب کر کے بولا۔ "تم دونوں روٹی کھاؤ۔ میں نے اب مسجد جانا ہے۔" وہ آگے بڑھا۔ دالان کے نکڑ پر پہنچ کر رکا۔ "جاتا تو باہر سے دروازے کی زنجیر چڑھا دینا۔"

☆

رحیم داد نے کھانا کھسکا کر سامنے کیا اور نوردین کے ساتھ کھانے لگا۔

کھانا کھاتے ہوئے رحیم داد نے نوردین سے دریافت کیا۔ "ملاں سے راجو کے بارے میں بات کی تھی۔"

"ہاں۔" نوردین نے جواب دیا۔ "پر وہ دوسرا ہی چکر چلانا چاہتا ہے۔ کہتا ہے' ہزار روپے لے لے اور کاغذ لکھ دے' راجو اب تیرے کام کی نہیں رہی۔"

رحیم داد نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا' حاجی نے اسے خراب کر دیا۔"

"ملاں کے کہنے کا تو کچھ ایسا ہی مطلب ہے۔ پر مجھے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں۔ راجو ایسی نہیں ہو سکتی۔"

"مان لے ملاں نے ٹھیک ہی کہا ہے' تب تو کیا کرے گا۔"

"تب بھی ساتھ لے جاؤں گا۔" نوردین نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "رہے گی تو میری ہی گھر والی۔"

"پر ایسی گھر والی کو کیسے رکھا جا سکتا ہے جو دوسرے کے ساتھ سو چکی ہو۔" رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ "صاف بات یہ ہے میں تو ایسی رن کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔"

"توں مجھے آباد کار لگتا ہے۔" نوردین نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "جبھی ایسی گل کر رہا ہے۔"

"یہ تو سوچ عزت آبرو بھی کچھ ہوتی ہے۔" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔

"ٹھیک ہے۔ پر گھر والی مرد کا بازو بھی ہوتی ہے' ایسے ہی جیسے ہالی کے لیے ہل۔ توں ٹھہرا پیسے والا اور آباد کار۔ توں جس طرح گھر والی کے بارے میں سوچتا ہے' ہم جانگلی اس طرح نہیں سوچتے۔ یہ عزت آبرو کیا ہوتی ہے' پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملے تو کیسی عزت' کہاں کی آبرو؟ اب یہی دیکھ' راجو تھی تو میری فصل کیسی چنگی ہوتی تھی۔ میں لاوی پر بھی نکل جاتا تھا۔ دوسروں کی فصلوں کی واڈھی کر کے کمائی کر لیتا تھا۔ راجو جب سے گئی ہے' میں نہ ٹھیک سے کھیتی باڑی کر سکا' نہ لاوی پر جا سکا۔ میرے باہر رہنے پر فصل کی دیکھ بھال کون کرتا؟" کھیتوں کو پانی کون لگاتا۔؟ نوردین نے گہری سانس بھری۔ "ذرا سوچ تو' راجو میرے لیے کتنی ضروری ہے۔ اس کے بنا تو میرا بازو کٹ گیا۔"

"تو بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔" رحیم داد نے بحث میں الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ "یہ تو اپنی اپنی سوچ کی بات ہے۔ اب یہ بتا' ملاں کی باتیں سن کر کیا طے کیا؟"

"طے کیا کرنا ہے جی۔" نوردین نے گردن اونچی کر لی۔ "راجو سے تو آج رات ملنا ہی ہے۔ پچھلی

نے اسے ملوا دیا تو سمجھ لے کام بن گیا۔"

"پر اتنی دیر رہے گا کہاں؟ اگر آدھی رات کو یہاں سے اٹھ کر گیا تو مجھے ڈر ہے' ملاں کو شبہ نہ ہو جائے۔ ایسا نہ ہو' ادھر تو راجو سے ملنے نکلے' ادھر ملاں جا کر حاجی سے مخبری کر دے۔ تب تو معاملہ بہت گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"میں ایسا کروں گا' روٹی کھا کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ زمیں دار کی ماڑی کے پاس کہیں جھاڑیوں میں چھپ جاؤں گا اور آدھی رات ہونے کا انتظار کروں گا۔"

دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ کھانا کھا کر انھوں نے پیالے سے پانی پیا۔ نوردین کچھ دیر ٹھہر کر جانے لگا۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

"نورے! ایک بات تو بتا تا جا۔"

"پوچھ' کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

"میں نے اکال گڑھ جانا ہے۔ تیں نوں ملوم ہے' اکال گڑھ کدھر ہوتا ہے؟"

"کیوں نہیں ملوم۔" نوردین نے مستعدی سے جواب دیا۔ "چک ۵۵ کے رستے میں پڑتا ہے۔ ادھر کچے رستے سے چلا جا۔" اس نے مغرب کی سمت ہاتھ اٹھایا۔ "پہلے چک بیدی آئے گا فیر نظام اولیا۔ اگے نہر ہے۔ نہر کے کنارے کنارے چلا جانا۔ اگے اکال گڑھ آجائے گا۔ یہاں سے ۹ میل سے زیادہ نہیں ہوگا۔"

"کوئی سڑک وہاں تک جاتی ہے؟"

"سب کچے رستے ہیں۔ نہر کے کنارے کا رستہ سب سے ٹھیک ہے۔"

"اب تو جا۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "راجو مل جائے تو مجھے نہ بھولنا۔"

"کیسی گل کر رہا ہے چوہدری!" نوردین نے بڑے جوش سے کہا۔ "ایسا کیوں نہیں کرتا' میرے ساتھ ہی چل۔ میں نے تو چک ۵۵ جانا ہی جانا ہے۔ اکال گڑھ رستے ہی میں ہے۔ میں تجھے وہاں پہنچا دوں گا۔"

"نہیں' تو اب جا۔" رحیم داد آمادہ نہ ہوا۔ "میں جاؤں گا تو سویرے جاؤں گا اور یہ بھی طے نہیں کہ اکال گڑھ جاؤں بھی یا نہ جاؤں۔ ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

نوردین باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے مقتول چوہدری نور الٰہی کی قمیص اور شلوار سمیٹ کر گٹھری بنائی۔ دونوں رجسٹر اور پنسلیں' کلیم کے کاغذات کے بستے میں رکھے۔ مولوی فضل کے رجسٹر سے تین ورق پھاڑ کر علیحدہ کر لیے۔ ان پر اس نے چوہدری نور الٰہی کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کی

تھی۔

وہ اٹھا اور تینوں ورق چراغ کی لو سے جلا کر ضائع کر دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر چٹائی پر لیٹ گیا مگر سویا نہیں۔ چپ چاپ لیٹا مولوی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ اس سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا۔ بہت دیر ہو گئی' مولوی نہیں آیا۔

ساڑھے گیارہ کا عمل ہو گا' مولوی فضل واپس آیا۔ آہستہ سے کھنکارا۔ "چوہدری! جاگ رہا ہے؟"

"تیرا انتظار کر رہا تھا۔" رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تجھ سے ملے بنا کیسے جا سکتا تھا۔"

مولوی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے دیر ہو گئی۔ پنڈ کے ایک مزارع کی گھر والی پر آسیب ہے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر چیختی ہے۔ میں اس کا آسیب اتارنے گیا تھا۔ اسی میں اتنی دیر ہو گئی۔"

رحیم داد نے کپڑوں کی گٹھری سنبھالی' کلیم کے کاغذات کا بستہ بغل میں دبایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "ملاں جی! مجھے اب جانا ہے۔ تیری بہت بہت مہربانی۔"

"نہیں بھئی؟ مہربانی کی کون سی بات ہے۔ میں چاہتا تھا' رات کو یہیں رہتا' سویرے چلا جاتا۔" اس نے رحیم داد کو روکنے کے لیے اصرار کیا۔

"پنڈ کے ساتھ ہی تو سڑک ہے۔ ابھی تو جانے کے لیے لاری بھی مل جائے گی۔" رحیم داد ٹھہرنے پر رضامند نہ ہوا۔ "اس سڑک پر تو آدھی رات کے بعد بھی لاریاں چلتی ہیں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"زندگی رہی تو فیر ملاپ ہو گا۔"

مولوی فضل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد سے بغل گیر ہوا' اسے چھوڑنے بیرونی دروازے تک گیا۔

☆

ہر طرف رات کا اندھیرا پھیلا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ گاؤں کے گھروں میں کہیں کہیں روشنی جھلملا رہی تھی۔ رحیم داد' جھاڑیوں اور گڑھوں سے بچتا بچاتا کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والی ایک پگڈنڈی پر پہنچ گیا۔ مگر سڑک کی جانب نہیں گیا۔ چپ چاپ پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ کچھ دور آگے جا کر پگڈنڈی کے ساتھ ایک جگہ زمین اس قدر پولی تھی کہ رحیم داد کا ایک پیر تھوڑا سا دھنس گیا۔ آس پاس خودرو پودوں کے جھرمٹ بھی تھے۔

رحیم داد اندھیرے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور خاصا گہرا گڑھا کھودا، کپڑوں کی گٹھری گڑھے میں ڈالی اور زمین ہموار کر دی۔

وہ آگے بڑھا اور پگڈنڈی سے گزر کر گاؤں میں داخل ہو گیا۔ گاؤں بالکل سنسان تھا۔ وہ ایک گلی میں داخل ہوا۔ گلی کے نکڑ پر گاؤں کے زمیں دار حاجی حبیب کا دو منزلہ پختہ مکان تھا۔ وہ چوکنّا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا اندھیرے میں آگے بڑھنے لگا۔ زمیں دار کی ماڑی کے قریب سے گزرا۔ آگے کچا راستہ تھا۔ راستے کے ارد گرد کھیت اور جھاڑیاں تھیں۔ چلتے چلتے وہ ٹھٹکا اور متجسّس نظروں سے کھیت اور جھاڑیاں دیکھنے لگا۔

رحیم داد کو نوردین کی تلاش تھی۔ وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے ادھر آیا تھا۔ اس کے ہم راہ نوراں اور بچوں سے ملنے اکال گڑھ جانا چاہتا تھا۔

مگر نوردین کہیں نظر نہیں آیا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ گاؤں کی رڑی سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد کو اپنے ارد گرد خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ اس نے رفتار تیز کر دی۔

وہ جلد سے جلد گاؤں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ قریب کی جھاڑیوں سے کسی نے ہولے سے سیٹی بجائی۔ رحیم داد نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے اس طرف دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔

ذرا دیر بعد جھاڑیوں میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ ایک سایہ نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا۔ رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جھٹ چاقو نکال لیا۔ اسی وقت مدھم سی آواز آئی۔

"گھبرا نہیں، میں ہوں نوردین۔"

رحیم داد نے چاقو جیب میں ڈالا اور جہاں تھا وہیں رک گیا۔ نوردین نزدیک آ گیا۔ رحیم داد نے سرگوشی کی۔ "تو یہاں چھپا تھا، حاجی کی ماڑی تو ادھر ہے۔" اس نے دو منزلہ مکان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"وہاں میں آدھی رات کے بعد جاؤں گا۔ چوہدری! تینوں یاد نہیں، چھلّی نے کیا کہا تھا۔"

"آدھی رات ہونے میں اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔"

"اب آ ہی گیا ہے تو میرے ساتھ چل۔"

"تو اکال گڑھ ہی کے رستے اپنے پنڈ جائے گا نا؟"

"ہاں، اسی رستے جاؤں گا۔ اکال گڑھ ہے تو رستے سے ذرا ہٹ کر، پر میں تیرے ساتھ وہاں تک چلوں گا، فکر نہ کر۔" نوردین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آ میرے ساتھ۔" وہ آگے بڑھا۔

"توں ماڑی سے دور کھڑا رہنا۔"

اس کے لہجے میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ "تینوں پتہ ہے، میرے ڈب میں بھرا ہوا پستول ہے۔ فیر ڈر آ کیوں ہے؟ مر جاؤں گا پر تجھے چھنے نہیں دوں گا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔

دونوں دبے دبے قدموں ماڑی کی جانب بڑھے۔ نوردین آگے تھا۔ رحیم داد اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں اندھیرے میں چلتے ہوئے ماڑی کے بائیں جانب پہنچ گئے۔ قریب ہی شیشم کے درختوں کا جھنڈ تھا۔

چھلّی نے ٹھیک بتایا تھا۔ درختوں کے عین سامنے ماڑی کا چھوٹا دروازہ تھا۔ نوردین نے چاہا کہ رحیم داد دور ہی ٹھہر جائے، مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔

دونوں درختوں کے نیچے اندھیرے میں کھڑے ہو کر دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ ماڑی پر خاموشی چھائی تھی۔ البتہ بالائی منزل کے کمرے میں روشنی تھی۔ کھڑکی کی شیشوں سے روشنی چھن چھن کر باہر بکھر رہی تھی۔

مویشیوں کا ڈھارا دوسری جانب تھا۔ وہاں کوئی رک رک کر کھانس رہا تھا۔ ہر بار جب کھانسی ابھرتی، دونوں چونک کر اس طرف دیکھتے۔ رحیم داد بہت سہما ہوا تھا۔ نوردین نے پستول نکال لیا تھا اور اسے ہاتھ میں دبائے چوکس کھڑا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی مگر ماڑی کا دروازہ نہیں کھلا۔

رحیم داد نے اکتا کر کہا۔ "مجھے تو راجو آتی معلوم نہیں ہوتی۔"

مگر نوردین مایوس نہیں ہوا۔ "اسے آنا تو چاہئے۔ چھلّی نے پکا وعدہ کیا تھا۔" اسی وقت دروازہ آہستہ سے کھلا۔ نوردین نے مسکرا کر رحیم داد سے کہا۔

"دیکھ، میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔"

دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا، لیکن کوئی باہر نہیں آیا۔ دونوں آنکھیں پھاڑے بے چینی سے ادھر دیکھتے رہے۔ ذرا دیر بعد کوئی باہر آیا۔ کھڑکی کے شیشوں سے پھوٹتی ہوئی دھیمی دھیمی روشنی میں نوردین نے اسے پہچان لیا، آہستہ سے بولا۔ "راجو ہے، ہاں وہی ہے۔" اس کی آواز میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔

رحیم داد نے راجو کی جانب دیکھا۔ وہ چھریرے بدن کی نوجوان عورت تھی۔ اس کے عقب میں چھلّی بھی تھی۔ دونوں خوف زدہ نظروں سے دائیں بائیں دیکھتی ہوئی آگے بڑھیں اور جھپاک سے درختوں کے نیچے آگئیں۔ نوردین آگے بڑھا' اس نے بے قرار ہو کر راجو کو سینے سے لگا لیا۔ ہیجان انگیز لہجے میں بولا۔

"راجو! میں تیرا نورا ہوں۔"

راجو کچھ نہ بولی۔ اس کے سینے سے لگی کھڑی رہی۔ چھلّی نے قریب آکر مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھ' میں تیری راجو کو لے آئی۔ تجھ سے جھوٹا وعدہ نہیں کیا تھا۔"

عین اس وقت اوپر کی منزل کے کمرے میں مردانہ کھنکار ابھری۔ نوردین اور رحیم داد نے پریشان ہو کر اوپر دیکھا۔ راجو ہٹ کر نوردین کے پیچھے چلی گئی مگر چھلّی اطمینان سے کھڑی رہی۔ اٹھلا کر بولی۔ "زمیں دار جاگ رہا ہے۔" وہ مسکرانے لگی۔

"پروا نہ کر' وڈی زمین دارنی اس کے پاس ہے۔ وہ اسے باہر نہیں آنے دے گی۔ زمیں دار نے راجو کو بلوایا تھا پر وہ خود پہنچ گئی۔"

رحیم داد نے دھیرے سے پوچھا۔ "اسے پتہ ہے' راجو یہاں ہے؟"

"بالکل پتہ ہے۔ تیرے کہنے پر میں نے ڈرتے ڈرتے چھوٹی زمیں دارنی سے بات کی۔ وہ بھی مجھ سے اپنے من کی ہر بات بتاتی ہے۔ پہلے تو وہ ڈری' میں نے اسے رجھانا شروع کیا۔ منت بھی کی۔ وہ تیار ہو گئی۔ وڈی کے پاس گئی۔ دونوں بند کمرے میں دیر تک مسکوٹ کرتی رہیں۔ فیر چھوٹی نے مجھے کہا۔ نورے اپنی گھر والی کو لے جانا چاہے تو خوشی سے لے جائے۔" چھلّی نے شوخی سے نوردین کو دیکھا۔

"بول کیا کہتا ہے؟"

"تو نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔" نوردین نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "چھلّی! تو اتنی سوہنی ہے' جی کرتا ہے راجو کے ساتھ تجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

"میں کیوں تیرے ساتھ جانے لگی۔" وہ منہ بگاڑ کر تیکھے لہجے میں بولی۔ "میرا گھر والا نہیں ہے؟" اس نے راجو کو مخاطب کیا۔

"سن رہی راجو! ابھی سے یہ بڑھکیں مارنے لگا۔"

راجو خاموش کھڑی رہی۔ وہ بہت سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔ رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے دو نوٹ نکالے اور چھلّی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔ "لے' یہ رکھ لے۔ گھر والے

کو نہ بتانا' پٹڑی بنوا کر گلے میں پہننا' سوہنی لگے گی۔"

چھلّی نے دونوں نوٹ لے کر اپنے گھگرے کے نیفے میں اڑس لیے۔ رحیم داد نے نوردین سے کہا۔ "چلنا ہے تو فٹافٹ نکل چل' کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟ حاجی جاگ رہا ہے۔ آگیا تو سمجھ لے' سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"نہیں' وہ نہیں آسکتا۔" چھلّی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "وڈی زمیں دارنی اس کے پاس ہے اور چھوٹی دروازے پر کھڑی چوکی داری کر رہی ہے۔ دونوں نے پہلے ہی سے مسکوٹ کر رکھی ہے۔"

"نہیں جی' اب چلنا چاہیے۔ چھلّی! تیری بہت بہت مہربانی۔" نورے نے گردن موڑ کر راجو کو دیکھا۔ "چل راجو!"

تینوں آگے بڑھے۔ نوردین راجو کا ہاتھ تھام کر آگے آگے چل رہا تھا۔ رحیم داد دونوں کے پیچھے تھا۔ چھلّی درختوں کے پیچھے اندھیرے میں چپ چاپ کھڑی انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

تینوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دور ہوتے گئے۔ جب وہ ایک موڑ پر پہنچ کر مڑنے لگے تو رحیم داد نے گردن پیچھے کر کے دیکھا' شیشم کے درختوں کے نیچے دھندلی روشنی میں اسے چھلّی نظر نہیں آئی۔ وہ پہلے ہی جا چکی تھی۔ کچھ دور جا کر تینوں کچے راستے پر آگئے۔ راستے کے دونوں جانب تیار فصلیں کھڑی تھیں۔

انھوں نے رفتار تیز کر دی۔ وہ جلد سے جلد گاؤں کی حدود سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ نوردین پستول ہاتھ میں سنبھالے ہوئے تھا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا۔

انھوں نے فرلانگ بھر سے زیادہ راستہ طے کیا ہوگا کہ رات کے سناٹے میں ٹاپیں سنائی دیں۔ آواز سامنے ہی سے آرہی تھی۔

تینوں خوف زدہ ہو گئے۔ گھوڑے کے دوڑنے کی آواز کے ساتھ ساتھ ہنہناہٹ بھی اب قریب آتی جا رہی تھی۔ نوردین نے راجو کو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور قریب کے ایک کھیت میں گھستے ہوئے رحیم داد سے بولا۔

"چوہدری! اِتھے آجا۔"

رحیم داد بھی ان کے ساتھ کھیت میں گھس گیا۔ مگر وہ زیادہ اندر نہ جا سکا۔ دیکھتے دیکھتے کوئی گھوڑا دوڑتا ہوا ان کے سامنے سے گزرا اور اپنے پیچھے گرد کے بادل چھوڑ گیا۔ راجو نے اسے پہچان لیا۔ جب وہ آگے نکل گیا تو اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہائے یہ تو کمال تھا۔"

نوردین نے پوچھا۔ "کون کمال؟"

"حاجی کا وڈا پتر۔" راجو نے جواب دیا۔ "چک بیدی سے آرہا ہوگا۔ وہاں جاکر جوا کھیلتا ہے' شراب پیتا ہے۔ روز رات کو دیر سے آتا ہے۔ کبھی کبھی تو سویرا ہو جاتا ہے۔"

"حاجی کچھ نہیں کہتا؟"

"کیوں نہیں کہتا؟ نراض بھی ہوتا ہے' پر وہ اس کی کب پروا کرتا ہے۔ اب وہ ماڑی میں جائے گا تو جاگ ہوگی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

رحیم داد پودوں میں پھنسا بیٹھا تھا۔ ایک پودے کا ڈنٹھل ٹوٹ کر اس کی کمر میں اڑا ہوا تھا۔ وہ بے چین ہو کر بولا۔ "اب باہر تو نکل' ساری باتیں یہیں بیٹھ کر کرے گا۔" یہ کہتا ہوا وہ کھیت سے باہر نکلا۔

نوردین اور راجو بھی کھیت سے باہر آگئے۔ تینوں خاموش تھے۔ اب انھوں نے اپنی رفتار بھی تیز کردی تھی۔ راجو بہت ڈری ہوئی تھی۔ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی جاتی۔ مگر عقب سے کوئی آہٹ نہیں ابھری۔

وہ کھیتوں سے نکل کر دور آگئے۔ آگے میدان تھا۔ زمین کھدّل تھی' جگہ جگہ گڑھے تھے۔ ان میں چوہوں کے بل بھی تھے۔ ایک موٹا چوہا راجو کے پیر کے نیچے آگیا۔ وہ ننگے پیر تھی۔ چوہے سے ڈر کر اس کی چیخ نکلی۔ نوردین نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ڈپٹ کر بولا۔

"چپ کر۔ ایسے ڈرے گی تو کیسے کام چلے گا۔"

اسی وقت رحیم داد کا پیر ایک گڑھے میں پڑا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ بیزار ہو کر بولا۔ "یار' تو نے اندھیارے میں یہ کھدّل کا رستہ کیوں پکڑا؟"

"چوہدری! یہ چھوٹا رستہ ہے۔ اگے ٹھیک ٹھاک رستہ مل جائے گا۔ اس کے کنارے گھنے پیڑ ہیں۔ ذرا سنبھل کے چل' زیادہ وڈا کھدّل نہیں ہے۔"

واقعی میدان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ تینوں گڑھوں سے بچتے بچاتے میدان عبور کرکے ایک پی سے پر آگئے۔ پیہا خاصا کشادہ تھا۔ کچھ ہی دور آگے جاکر آم کے درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ رات سنسان تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

تینوں چپ چاپ چلتے رہے۔ انھوں نے دو ڈھائی میل فاصلہ طے کرلیا۔ وہ اب دیدار پور سے بہت دور آگئے تھے۔

رحیم داد نے نوردین سے پوچھا۔ "کیا راجو کو بھی اپنے ساتھ چک ۵۵ لے جائے گا؟"

"کیوں نہیں لے جاؤں گا۔" نوردین نے جھٹ کہا۔ "اسے لایا کس لیے ہوں۔" رحیم داد چپ رہا۔ نوردین نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔

"چوہدری! ایسی بات کیوں کہہ رہا ہے؟"

"میں اس لیے کہہ رہا ہوں' میاں داد فیر راجو کو اٹھوا لے گا اور حاجی کے پاس بھجوا دے گا۔" رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "وہ حاجی کو نراض نہیں کرسکتا۔ دونوں رسا گیر ہیں اور اس دھندے میں ایک دوسرے کے شریک دار ہیں۔ یہ بات تو بھی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے حاجی کے مکابلے میں میاں داد کے سامنے تیری کوئی حیثیت نہیں۔ تو اس کا مزارع ہی تو ہے۔"

"یہ بات تو ہے پر اب وہ کیا کرسکتا ہے؟"

"وہ یہ کرسکتا ہے' راجو کو اپنے کرندوں سے اٹھوا کر حاجی حبیب کے پاس دیدار پور پہنچا دے گا۔" رحیم داد نے اس کی سادہ لوحی پر جل کر کہا۔ "تجھے زمین سے بے دخل کرکے بھولا کے کتل یا مویشیوں کی چوری کے الزام میں پکڑوا دے گا۔"

"کہتا تو یہ ٹھیک ہے۔" راجو بیچ میں بول پڑی۔ اس نے رحیم داد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بھی ڈنگر چوری کرتا ہے؟"

"تیرا گزتو نہیں چل گیا۔" نوردین نے اسے ڈانٹا۔ "چوہدری سے میرا آج ہی میل ملاپ ہوا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو چھلّی یہ کام کبھی نہ کرسکتی۔ چوہدری نے پورے دس روپے اسے دیے تب وہ تیار ہوئی۔ میری تو اس نے بات ہی نہیں مانی تھی۔ یہ نہ ہوتا تو تو مجھے کیسے ملتی۔" اس نے مڑ کر راجو کی جانب دیکھا۔

"۲۰ روپے تو چوہدری نے تیرے سامنے ہی چھلّی کو انعام کے دیئے۔"

رحیم داد نے کسر نفسی سے کام لیا۔ "میں نے کیا کیا جی' سب اوپر والے کی مرضی تھی۔" اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ "نورے! تیری گھروالی تو مل گئی' اب آگے کی سوچ۔"

"سمجھ نہیں آتی۔ بتا' اب کیا کروں؟"

رحیم داد ذرا دیر سر جھکائے سوچتا رہا پھر بولا۔ "میں تو یہ کہتا ہوں' اسے اپنے یا اس کے کسی شریکے کے گھر چھوڑ دے۔ اکیلا اپنے پنڈ چلا جا۔ میاں داد اگر راجو کے بارے میں پوچھے تو صاف انکار کردینا۔ مگر راجو کے حاجی کی ماڑی سے غائب ہونے کی اطلاع چک ۵۵ پہنچنے سے پہلے پہلے تجھے وہاں پہنچ جانا چاہئے۔ کسی کو شبہ ہی نہ ہوگا۔" وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ "ادھر کوئی ایسا پنڈ ہے جہاں

تو راجو کو چھوڑ دے؟"

"آگے تو چک بیدی ہے اور اس سے آگے نظام اولیا۔" راجو نے کہا۔ "وہاں میرا کوئی شریکا یا سگا نہیں' نورے کا بھی نہیں۔" وہ خاموش ہو گئی اور گردن جھکا کر سوچنے لگی۔ نوردین بھی سوچ میں غرق تھا۔ ذرا دیر بعد راجو گردن ہلا کر بولی۔

"ہاں کرتارپور میں میری ایک مسیر ویاہی ہے۔ میری سگی ماسی کی دھی ہے۔ ایک بار میں اس کے پاس گئی بھی تھی۔ اس کا گھر والا منصور بہت نیک بندہ ہے۔" اس نے نوردین کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔

"نورے! وہیں چلا چل۔ منصور کو جانتا ہے۔ فصل کی واڈھی پر کئی بار اس کے پاس جا چکا ہے۔ مجھے بھی اس کے پاس لے کر گیا تھا۔ یاد ہے' کیسے پیار سے دونوں ملے تھے۔"

"تب تو کرتارپور ہی ٹھیک رہے گا۔" رحیم داد گردن اٹھا کر آسمان دیکھنے لگا۔ "اب تو رات تھوڑی رہ گئی ہے۔ تو سویرا ہونے تک چک ۵۵ پہنچ جائے گا؟"

"مشکل ہے۔ دن نکلنے کے بعد ہی پہنچ سکوں گا۔ اب تو دو بج رہا ہو گا۔ یوں سمجھ لے جتنی دور یہاں سے کرتارپور ہے' اس سے کچھ دوری پر میرا پنڈ ہے۔ کرتارپور پہنچتے پہنچتے سویرے کی پکیز پھیلنے لگے گی۔"

راجو نے کہا۔ "ذرا دم لے کر پنڈ روانہ ہو جانا۔"

رحیم داد نے راجو سے اتفاق نہیں کیا۔ "نہیں' اس کا دن میں جانا ٹھیک نہیں۔ ویسے نوردین تو سوچ لے۔"

"نہیں جی' دن ہی میں چلا جاؤں گا۔ تب تک حاجی بھی میاں داد کو خبر نہیں بھجوا سکے گا۔ حاجی کسی کو بھیجے گا بھی تو وہ شام ہونے سے پہلے نہیں پہنچ سکے گا۔"

"بات تو تیری بھی ٹھیک ہے۔" رحیم داد نے تائید کی۔ "تو فیر یہی پروگرام بنا۔ یہاں سے سیدھے کرتارپور چلتے ہیں۔"

نوردین اور راجو پہلے ہی تیار تھے۔ تینوں آگے بڑھے۔ کچھ ہی دور چلے تھے کہ چک بیدی نظر آیا۔ مکانوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ ادھر نہیں گئے اور پگڈنڈیوں اور پہیوں سے گزرتے ہوئے دور ہی سے نکل گئے۔ مویشی چوری کا دھندا کرنے کے باعث نوردین کو اس علاقے کی ہر بستی اور راستے کا بخوبی علم تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں ان راستوں سے بارہا گزرا تھا۔ لہٰذا اسے راستہ تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہ

آئی۔

تینوں نظام اولیاء کی بستی کے قریب پہنچ گئے۔ نظام اولیاء سے نکلتے ہی نہر آ گئی۔ وہ نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔

رات ڈھل رہی تھی۔ راستے سنسان تھے۔ میل سوا میل راستہ طے کرنے کے بعد ایک پلیا آ گئی۔ تینوں پلیا سے گزر کر نہر کے اس پار چلے گئے۔ مگر نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ چلتے چلتے نوردین نے رحیم داد سے پوچھا۔

"چوہدری! توں کرتا کیا ہے اور رہتا کہاں ہے؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" رحیم داد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "یوں سمجھ لے' نہ اپنا کوئی ٹھکانا ہے' نہ کوئی اپنا ہے۔"

نوردین نے پریشان ہو کر کہا۔ "تیری گل بات سمجھ نہیں آئی۔"

"سمجھ آ بھی نہیں سکتی۔ میں نے تجھے بتایا تھا میں گورداس پور کا مہاجر ہوں۔"

"کیا ہوا تھا تیرے ساتھ؟"

"یہ پوچھ' کیا نہیں ہوا۔" اس نے نوردین کو وہی باتیں بتائیں جو مولوی فضل احمد سے کل صبح بیان کی تھیں اور اس کی ہمدردی حاصل کی تھی۔

نوردین بھی اس کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا۔ "توں اتنا دکھی ہے یہ میں نوں پتہ نہیں تھا۔ کیا تو اکال گڑھ بھی اپنے بال بچوں کی تلاش میں جا رہا ہے؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے صاف انکار کر دیا۔ "ادھر اپنا ایک پرانا ملنے والا ہے' اس کے پاس جا رہا ہوں۔"

راجو نے کہا۔ "اٹھ برس سے اوپر ہو گئے' توں نے اب تک اپنا گھر بھی نہیں بسایا۔ اس طرح کب تک کام چلے گا؟"

"بس جیسے چل رہا ہے' ایسے ہی چلتا رہے گا۔ میں اپنی گھر والی اور بچوں کو نہیں بھول سکتا۔"

"چوہدری توں ٹھیک کہہ رہا ہے۔" نوردین نے اس کی تائید کی۔ "بچہ تو اپنا کوئی ہے نہیں پر گھر والی کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔" اس نے مسکرا کر راجو کا چہرہ دیکھا۔ "جب تک تو نہیں ملی تھی' میں تیرے لیے پاگل رہتا تھا۔ پر تینوں کیہ پتہ؟"

راجو شرما کر خاموش ہو گئی۔ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "ہاں جی' جس پر بیتتی ہے' وہی جانتا ہے۔ میں کسی کو اپنا دکھ کیسے بتاؤں۔ برسوں ہو گئے اس آگ میں جلتے ہوئے پر اب تک

ٹھنڈی نہیں پڑی۔"

نوردین اور راجو چپ رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ رحیم داد سے کس طرح اظہار ہمدردی کریں۔ رحیم داد بھی خاموش ہو گیا۔

۱۵

کرتارپور بڑا موضع تھا۔ اس میں کئی پختہ مکانات تھے اور دو منزلہ بھی تھے۔ چھوٹا سا بازار بھی تھا مگر رات کے پچھلے پہر ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ تینوں سنسان گلیوں اور راستوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے۔ کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ قریب کی گلی سے ایک شخص نکلا اور بالکل ان کے سامنے آگیا۔ اس نے راجو کو ایسی نظروں سے گھورا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

راجو کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا' گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "نورے! یہ زمین دار کا کرندہ فیدو لگتا ہے۔ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ ابھی جا کر حاجی سے مخبری کرے گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

نوردین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو اندھیرا ہے۔ اس نے تجھے کیسے پہچان لیا۔ اگر پہچان بھی لیا ہے تو پروا نہ کر' منصور کے گھر سے وہ تجھے نہیں اٹھوا سکتا۔"

تینوں آگے بڑھے۔ منصور کے مکان کے سامنے پہنچے۔ منصور کا مکان تھا تو کچا مگر کشادہ اور بڑا تھا۔ نوردین نے ہانک لگائی۔

منصور جھٹ دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ آتے ہی نوردین سے گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوا اور جیسے ہی راجو پر نظر پڑی' خوشی سے چیخ پڑا۔ "ارے! تو اسے لے آیا۔" اس نے دروازے کے اندر جھانک کر بیوی کو آواز دی۔ "ساجاں! دیکھ تو کون آیا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"سب باہر کیوں کھڑے ہو' اندر آجاؤ۔"

تینوں گھر میں داخل ہوئے۔ راجو کی خالہ زاد بہن ساجاں بھاگتی ہوئی آئی اور راجو سے چمٹ گئی۔ "ہائے' تو آگئی۔"

راجو' ساجاں کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ ساجاں اس کا بدن ٹٹولتے ہوئے بولی۔ "کتنی دبلی ہوگئی۔" وہ خود دوہرے بدن کی نوجوان عورت تھی۔ عمر میں راجو سے بڑی' رنگ کھلتا ہوا مگر ناک نقشہ کسی قدر بھدا۔

سب آنگن میں پڑی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ منصور کے دونوں بچے بھی بیدار ہوگئے تھے اور قریب آکر حیرت سے راجو کو دیکھ رہے تھے۔ راجو بار بار دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اب اجالا خوب پھیل گیا تھا۔

رحیم داد نے اجالے میں راجو کو غور سے دیکھا۔ اس کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ چمپئی رنگت تھی' ناک ستواں تھی' آنکھیں غزالی تھیں۔ وہ خوش شکل عورت تھی۔ ساجاں کے پہلو میں بیٹھی ہوئی وہ اور زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد منصور اٹھا۔ رحیم داد اور نوردین کو ڈیرے میں لے گیا۔ ڈیرا گھر کے برابر ہی تھا' اس میں کھلا صحن تھا۔ صحن کے دو طرف چھپر کی خمیدہ چھت کا برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے تین کمرے اور دو کوٹھریاں تھیں۔

تینوں ایک کمرے میں چلے گئے۔ کمرے میں کھڑکی تھی اور ایک دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا۔ کمرے میں چارپائی بچھی تھی۔ اس پر صاف ستھرا بستر لگا تھا۔ منصور صحن میں گیا اور ایک چارپائی اور اٹھا کر کمرے میں لے آیا۔ ایک چارپائی پر رحیم داد اور نوردین بیٹھ گئے۔ دوسری پر منصور بیٹھ گیا۔

منصور نے رحیم داد کے بارے میں پوچھا۔ نوردین کی زبانی جب یہ معلوم ہوا کہ راجو کو حاجی کی قید سے رہائی دلانے میں رحیم داد نے بڑی مدد کی ہے تو منصور بہت خوش ہوا۔ نوردین اسے ایک ایک بات تفصیل سے بتاتا رہا۔

منصور دلچسپی اور انہماک سے سنتا رہا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اب ہلکی ہلکی دھوپ دیوار و در کی بلندی پر جھلکنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر میں ساجاں پیتل کے تھال میں پراٹھے لے کر آئی۔ اس کے ساتھ کانسی کے گلاسوں میں لبالب بھری ہوئی لسی تھی۔ پراٹھوں پر مکھن کا منحرو تھا' تلے ہوئے انڈے اور اچار تھا۔

ساجاں نے تھال نوردین اور رحیم داد کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں ناشتا کرلو۔ رات بھر کے بھوکے اور تھکے ہوئے ہو۔" وہ منصور سے مخاطب ہوئی۔ "راجو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ انھیں کھانے دے' اٹھ راجو کے پاس آجا۔ تیری تو اس سے کوئی گل بات ہی نہیں ہوئی۔ دیکھ تو اس کا کیا حال ہوگیا ہے۔"

منصور چپ چاپ بیوی کے ساتھ چلا گیا۔ نوردین اور رحیم داد ناشتا کرنے لگے۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی نوردین چلنے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اس وقت تک منصور واپس آگیا تھا۔ اس نے نوردین کو روکنا چاہا۔ "نورے! تو رات بھر کا جاگا ہوا ہے' لمبا سفر بھی کیا ہے' ذرا آرام کرلے۔ دوپہر کو روٹی ٹکر کھا کر چلا جانا۔ ایسی جلدی کیا ہے؟ میری سیکل لے جا۔" مگر نوردین راضی نہیں ہوا۔

"مجھے اب جانے دے۔ سیکل دے دے تو فٹافٹ پنڈ پہنچ جاؤں گا۔"

رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "منصور کی سیکل لے کر نہ جا۔ میاں داد کو شبہ ہوگا' تو پیدل ہی جا۔"

"ہاں' یہ ٹھیک رہے گا۔" نوردین نے اتفاق کیا۔ "آگے تانگا بھی مل جائے گا۔ ویسے میں پیدل بھی جا سکتا ہوں۔ شام تک واپس آجاؤں گا۔"

"شام کو واپس نہ آنا۔" رحیم داد نے منع کیا۔ "کیوں خامخا شبہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تین چار روز بعد آنا جب معاملہ ذرا دب جائے۔ ابھی تو میاں داد اور حاجی' دونوں تجھ پر شبہ کریں گے۔ تیری نگرانی بھی کریں گے۔ تو دیدار پور حاجی کے پنڈ جا چکا ہے۔ رستے میں حاجی کا کرندہ فیدو ملا تھا' تجھ پر انھیں شبہ ہونا بھی چاہئے۔ راجو یہاں ہر طرح ٹھیک ہے' آرام سے بھی رہے گی۔"

"بالکل آرام سے رہے گی۔" منصور نے رحیم داد کی تائید کی۔ "چوہدری ٹھیک کہہ رہا ہے۔ جیسا کہتا ہے' ویسا ہی کر۔ فکر نہ کر' راجو یہاں ہر طرح ٹھیک ٹھاک رہے گی۔"

نوردین نے کچھ نہیں کہا۔ ڈیرے سے نکل کر اپنے گاؤں' چک ۵۵ کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی منصور بیٹھا رہا۔ مگر جلد ہی کھڑا ہوگیا۔

"چوہدری! تو ساری رات کا جاگا ہوا ہے۔ تھکا ہوا بھی بہت ہے' اب سو جا۔ تجھ سے بعد میں گپ شپ رہے گی۔ میری فصلوں کی واڈھی ہونے والی ہے۔ لاوے آئے ہوئے ہیں' ان سے واڈھی کے بارے میں بات چیت کرنی ہے۔"

رحیم داد بھی یہی چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی' تھکن سے جسم میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ منصور کی باتیں سن کر وہ خاموش رہا۔ منصور باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے آنکھوں سے

عینک اتاری۔ عینک سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی تھا۔ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

دوپہر کو منصور نے اسے بیدار کیا اور کھانا کھانے کے لیے کہا۔ مگر رحیم داد کو مطلق بھوک نہیں تھی۔ منصور نے اصرار بھی کیا' وہ کھانا کھانے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ بیدار ہونے کے بعد وہ سویا بھی نہیں۔ باتیں کرنے لگا۔

منصور کی باتوں سے جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ موروثی مزارع ہے۔ اس کے پاس تیس ایکڑ سے اوپر مزروعہ نہری زمین ہے۔ منصور کے ساتھ اس کا منجھلا بھائی خالد بھی رہتا تھا۔ دونوں مل جل کر کھیتی باڑی کرتے تھے۔

مزارع ہونے کے باوجود منصور کھاتا پیتا کسان تھا۔ اس کا ڈھارا بھی بڑا تھا۔ اس میں بیلوں کی دو جوڑیوں کے علاوہ دو بھینسیں اور ایک گائے بھی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی شاکر کرتارپور ہی میں تھا مگر علیحدہ رہتا تھا۔ ماں زندہ تھی۔ کبھی بڑے کے پاس رہتی' کبھی چھوٹے کے پاس۔ مگر زیادہ وقت شاکر کے پاس گزرتا تھا۔

☆

رحیم داد نے باہر نکل کر گاؤں کا چکر لگایا اور ٹہلتا ہوا کرتارپور کے بازار میں چلا گیا۔ بازار سے اس نے ایک چادر' صابن اور کنگھی خریدی۔ بازار ہی میں پیپل کے ایک درخت کے نیچے موچی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس جوتے کا ایک جوڑا تیار رکھا تھا۔ رحیم داد نے پہن کر دیکھا۔ اس کے پیروں میں بالکل فٹ تھا۔

وہ ابھی تک مقتول حکیم چشتی کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ جوتے تنگ تھے اور پرانے ہو کر جگہ جگہ سے پھٹنے لگے تھے۔ ویسے بھی وہ حکیم کی کوئی نشانی اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں سراسر خطرہ تھا۔ اس نے جوتا خرید لیا۔

خریدی ہوئی ساری اشیاء اس نے چادر میں لپیٹ لیں مگر منصور کے گھر نہیں گیا۔ نہر کی طرف چلا گیا۔ نہر گاؤں سے نصف میل کے فاصلے پر تھی۔ نہر کی جانب جاتے ہوئے اس نے پرانے جوتے گندے پانی کے ایک گڑھے میں ڈال کے نئے جوتے پہن لیے۔ اب اس کے جسم پر حکیم چشتی اور نور الٰہی کی کوئی نشانی باقی نہیں تھی۔

نہر پر پہنچ کر رحیم داد نے کپڑے اتارے اور صابن سے جسم رگڑ رگڑ کر نہانے لگا۔ گرمی اس روز کچھ بڑھ گئی تھی۔ وہ دیر تک نہر میں نہاتا رہا۔ نہا دھو کر اس نے چادر سے جسم خشک کیا۔ کپڑے

پہنے اور گیلی چادر نہر کے کنارے ایک جھاڑی پر سوکھنے کے لیے پھیلا دی۔ کنگھی سے سر کے بال جمائے' ڈاڑھی اور مونچھیں سنواریں اور اس وقت تک نہر کے کنارے بیٹھا رہا جب تک گیلی چادر دھوپ میں سوکھ نہ گئی۔

وہ واپس ڈیرے میں آیا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ منصور کھیتوں پر تھا۔ راجو نے رحیم داد کو گلاس میں لسّی لا کر دی۔ وہ بھی نہا دھو کر' اجلے کپڑے پہن کر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ اجلے لباس اور ہلکے سنگھار میں وہ خاصی نکھر گئی تھی' زیادہ شگفتہ اور دلربا نظر آ رہی تھی۔ وہ بھرپور جوان اور دل کش عورت تھی۔

راجو کے جانے کے بعد رحیم داد کو اپنی بیوی نوراں یاد آ گئی۔ بچے بھی یاد آئے۔ وہ بستر پر لیٹ گیا مگر نیند نہیں آئی۔ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اس نے سوچا' نوراں کو اپنے بارے میں ہر بات صاف صاف بتا دے گا۔ وہ اس پر پورا اعتماد کر سکتا تھا۔ وہ اس کی شریک حیات تھی' اس کے بچوں کی ماں تھی' ہمدرد اور غم گسار تھی۔ اس سے ٹوٹ کر محبت بھی کرتی تھی۔ رحیم داد کو کبھی بخار ہو جاتا تو وہ ساری رات اس کے سرہانے بیٹھی رہتی۔ بار بار کہنے پر بھی نہ سوتی۔ اس کا سر' کمر اور پیر دباتی' پیشانی ہولے ہولے سہلاتی' دوا پلاتی' طبیعت کا حال پوچھتی۔ اس کی محبت اور شیفتگی ایک ایک انداز اور ہر رویئے سے صاف جھلکتی تھی۔

رحیم داد نے بستر پر لیٹے لیٹے طے کیا کہ نوراں اور بچوں کو لے کر سندھ چلا جائے گا۔ لالی کی دی ہوئی تین ہزار سے زیادہ رقم اس کے پاس تھی۔ اس رقم سے وہ رشوت دے کر مرحوم چوہدری نور الٰہی کے کلیم کی بنیاد پر خاصی بڑی اور عمدہ زمین الاٹ کرا سکتا تھا۔ گورداس پور کا مہاجر چوہدری نور الٰہی بن کر خوشحال زندگی بسر کر سکتا تھا۔ نوراں سخت محنتی اور سلیقہ مند تھی۔ دونوں مل کر زندگی کا نیا سفر شروع کر سکتے تھے۔ اپنا اجڑا ہوا گھر ایک بار پھر آباد کر سکتے تھے۔

رحیم داد سوچتے سوچتے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سر پر پگڑی باندھی' عینک لگائی' جوتے پہنے' کلیم کے کاغذات کا بستہ حفاظت سے تکیے کے نیچے رکھا۔ کمرے سے باہر آیا اور دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔

وہ ڈیرے سے ایک بار پھر باہر نکلا اور کرتارپور کے بازار پہنچ گیا۔ اس نے سنار سے نوراں کے لیے جھمکے اور اپنی لاڈلی بیٹی زینو کے لیے چاندی کی بُندیاں خریدیں۔ کریما کے لیے بازار میں کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ چھوٹا سا قصباتی بازار تھا' چند دکانیں تھیں۔ اس نے بازار کے کئی چکر لگائے۔ حلوائی سے آدھ سیر مٹھائی خرید کر کندھے پر پڑے ہوئے پرنے کے ایک پلو میں باندھی اور واپس

آگیا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ شام کے سائے گاؤں کے درودیوار پر پھیلتے جا رہے تھے۔ کمرے کے اندر بھی اندھیرا ہو گیا۔ رحیم داد بستر پر لیٹا تھا۔ منصور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ البتہ راجو کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس نے لالٹین طاق میں رکھی اور ماچس جلا کر اسے روشن کرنے لگی۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ راجو نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

"چوہدری! یہاں گرمی میں کیوں لیٹا ہے۔ باہر ویڑے میں منجی پر جا کر بیٹھ جا۔ میں تیرے لیے روٹی لے کر آتی ہوں۔"

راجو چلی گئی۔ رحیم داد کمرے سے نکل کر صحن میں گیا۔ منہ دھویا اور برآمدے کے سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا' رات کا پہلا پہر تھا۔ راجو کھانا لے آئی اور رحیم داد کے سامنے چارپائی پر رکھ دیا۔ وہ کمرے کے اندر گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔

اس نے لالٹین برآمدے کے ایک کھمبے پر لگی ہوئی کیل سے لٹکا دی۔ رحیم داد لالٹین کی روشنی میں کھانا کھانے لگا۔ بھوکا بھی تھا' اس نے رغبت سے کھانا کھایا۔ راجو کچھ دیر ٹھہر کر گھر کے اندر چلی گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر رحیم داد کمرے میں گیا۔ اس نے کنگھی سے سر کے بال جمائے' داڑھی سنواری' جھمکے اور بالیاں کاغذ کے ٹکڑے میں لپیٹ کر احتیاط سے قمیص کی اندرونی جیب میں رکھیں۔ مٹھائی پڑنے سے نکال کر رومال میں باندھی۔ بغل میں کلیم کے کاغذات کا بستہ دبایا' کمرے سے نکل کر باہر سے دروازے کی کنڈی لگائی اور آہستہ آہستہ ڈیرے سے باہر جانے لگا۔

آنگن میں راجو مل گئی' اس نے پوچھا۔ "چوہدری! اکال گڑھ تو نہیں جا رہا؟"

رحیم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں' میں اکال گڑھ ہی جا رہا ہوں۔"

"کب تک لوٹے گا؟"

"کچھ پتہ نہیں۔ جس سے ملنے جا رہا ہوں' مل گیا تو دیر سے واپسی ہوگی۔ تو منصور کو بتا دینا۔"

راجو خاموش رہی۔ رحیم داد ڈیرے سے باہر چلا گیا۔ گاؤں کی گلیوں سے نکل کر کھیتوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نہر کی جانب چل دیا۔

اندھیرا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ نہر پر پہنچا تو ہر طرف سناٹا پھیل چکا تھا۔ اس نے پلیا عبور کی اور نہر کے اس پار پہنچ گیا۔ کچھ دور تک نہر کے کنارے کنارے چلتا رہا پھر کچا راستہ آ گیا۔ راستہ

خاصا کشادہ تھا۔ بیل گاڑیوں اور ریڑھوں کے پہیوں نے راستے میں جگہ جگہ گڑھے ڈال دیے تھے۔

وہ چپ چاپ کچے راستے پر چلنے لگا۔ آگے بڑھا تو سامنے سے ایک سائیکل سوار آتا نظر آیا۔ رحیم داد نے اسے روک کر اکال گڑھ کا راستہ پوچھا۔ وہ وہیں سے آ رہا تھا' کہنے لگا۔ "یہ سدھا رستہ اکال گڑھ ہی جاتا ہے۔"

رحیم داد نے اکال گڑھ کے پرائمری اسکول کا پتہ دریافت کیا۔ اس نے وہ بھی بتا دیا۔ دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ سائیکل سوار نے پیڈل پر پیر مارا اور آگے بڑھ گیا۔ دیکھتے دیکھتے دور نکل گیا۔

☆

راستہ سنسان تھا۔ دونوں طرف کھیت تھے۔ کہیں فصلیں تیار کھڑی تھیں' کہیں کٹ چکی تھیں۔ جگہ جگہ درختوں کے جھنڈ تھے۔ رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ نوراں اور بچوں کے بارے میں سوچتا رہا اور یادوں کی دھندلی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا رہا۔ بیتے دنوں کے خوشگوار لمحات' جو اس نے نوراں اور بچوں کے ساتھ گزارے تھے' روشن چراغوں کی طرح نظروں میں جھلملاتے رہے۔ وہ جتنا آگے بڑھتا گیا بیوی بچوں سے ملنے کا شوق ہیجان انگیز ہوتا گیا۔

رحیم داد اکال گڑھ میں داخل ہوا۔ بستی کی رونق اجڑ چکی تھی۔ گلی کوچے سنسان تھے۔ کہیں کہیں گھروں سے باتیں کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ایک گلی سے نکل کر وہ کھلی جگہ پہنچا تو دھندلی روشنی میں کچھ فاصلے پر اسے ایک راہ گیر نظر آیا۔

رحیم داد ٹھٹکا۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ اس کا پرانا یار جمال دین ہے۔ رحیم داد نہ تو اس سے ملنا چاہتا تھا' نہ قطعی طور پر فیصلہ کر سکا کہ وہ کون ہے؟ ویسے جمال دین کے وہاں ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسے تو احمد کوٹ میں ہونا چاہئے تھا۔

راہ گیر اندھیرے میں اوجھل ہو گیا۔ رحیم داد چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا اسکول کی جانب بڑھا۔ اکال گڑھ بھی بڑا موضع تھا۔ اس میں کئی گاؤں شامل تھے۔ کرتار پور سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ آبادی بھی زیادہ تھی۔ پختہ مکانات بھی تعداد میں زیادہ تھے۔ رحیم داد گلی کوچوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ وہ اسکول کی عمارت کے قریب پہنچ گیا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ مگر اسکول کا چوکیدار جاگ رہا تھا۔ سامنے کھلا میدان تھا۔ چوکیدار اسکول کی عمارت کے باہر چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ وہ ادھیڑ اور دبلا پتلا تھا۔ بار

بار کھانستا اور کھنکار کر اونچی آواز سے بلغم تھوکتا۔

رحیم داد اس کے قریب پہنچا۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ "کون ہے؟" وہ نظریں اٹھا کر رحیم داد کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

رحیم داد نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "میرا نام چوہدری نورالٰہی ہے۔"

"اتنی رات گئے ادھر کیسے آنا ہوا؟"

رحیم داد ایسے سوالوں کے جواب کے لیے خود کو پہلے ہی سے تیار کر چکا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "چاچا! تجھ سے یہ پوچھنا تھا' تیرے سکول میں چن وات کے سکول ماسٹر عبدالشکور کا تبادلہ ہونے والا تھا' وہ آ گیا کہ نہیں؟ اگر آ گیا تو اس کا مکان کون سا ہے؟"

رحیم داد کی بات سن کر چوکیدار سوچ میں پڑ گیا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ "نہیں جی' اس نام اپنے سکول میں کوئی ماسٹر نہیں اور نہ ادھر کوئی نیا ماسٹر تبدیل ہو کر آیا ہے۔ تبدیلی کا اگر حکم جاری ہو چکا ہے تو اس کا اپنے کو پتہ نہیں۔" وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ ذرا قرار آیا تو اس نے بتایا۔ "اس بات کا پتہ تو ہیڈ ماسٹری سے چلے گا اور وہ یہاں ہے نہیں۔ پاک پتن گیا ہے۔ دو تین روز میں واپسی ہو گی۔ ادھر اس کے کسی شریکے کے گھر میں موت ہو گئی ہے۔" وہ آہستہ آہستہ حقے کے کش لگانے لگا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا تمیں نوں عبدالشکور کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔"

"ہاں جی' میں نوں کچھ پتہ نہیں۔" چوکیدار نے نرمی سے کہا۔ "کھڑا کیوں ہے' بیٹھ جا۔ لگتا ہے' دور سے چل کر آیا ہے۔"

رحیم داد اس کے برابر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے حقہ رحیم داد کی جانب بڑھا دیا۔ حقہ لے کر رحیم داد کش لگانے لگا۔ مگر اسے حقے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے چند کش لگانے کے بعد حقہ چوکیدار کو واپس دے دیا۔

رحیم داد نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ چوکیدار باتوں میں لگ گیا۔ وہ حقہ گڑگڑاتا رہا اور رک رک کر بولتا رہا۔

رحیم داد اپنے بڑے بیٹے کریما کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا تاکہ اس مکان کا سراغ مل جائے جس میں نوراں بچوں کے ساتھ مقیم تھی۔ مگر یہ پوچھتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک عورت باہر آئی' چوکیدار نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"جیراں! تو ابھی تک جاگ رہی ہے؟"

"تمیں نوں تو کچھ پتہ نہیں۔ بیٹھا حقہ پیتا رہتا ہے یا کھانستا رہتا ہے۔" وہ کڑوے لہجے میں بولی۔ "میں ابھی کیسے سو سکتی ہوں۔ حیدر کے ہاتھ میں درد ہے۔ ہائے ہائے کر رہا ہے۔ اس پر تیل مل رہی تھی۔"

چوکیدار نے بیوی سے پوچھا۔ "کیا ہوا حیدر کو؟ اس کے ہاتھ میں درد کیوں ہے؟"

"کریمے نے آج فیر اسے مارا ہے۔ ایسا ہاتھ مروڑا اب تک درد کر رہا ہے۔" اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ غصے سے بولی۔ "میں نے کریمے کی ماں سے آج صاف صاف کہہ دیا' سنبھال کر رکھ اسے۔ اب جو اس نے میرے پت کو مارا تو اس کا ہاتھ پتھر پر رکھ کر توڑ دوں گی۔"

کریمے کا نام سن کر رحیم داد چونکا۔ اسے یقین ہو گیا کہ رجب نائی نے غلط اطلاع نہیں دی۔ مگر وہ بالکل خاموش رہا۔

چوکیدار نے بیوی کو نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "جیراں! تمیں نوں ایسی گل نہیں نکالنی چاہئے۔ یہ چھوہرے تو لڑتے جھگڑتے ہی رہتے ہیں۔ ساتھ کھیلیں گے تو آپس میں لڑائی جھگڑا بھی کریں گے۔"

جیراں بگڑ کر بولی۔ "تو کچھ ہی کہہ' میں اب نہیں ماننے کی۔ دیکھ لینا' اس کا ہاتھ نہ توڑ دیا تو میرا ناں جیراں نہیں۔"

چوکیدار نے ایک بار پھر نرمی سے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "اللہ سے ڈر جیراں! یہ تو سوچ کریما بن پیو کا بچہ ہے۔ یتیم مسکین ہے۔"

رحیم داد تڑپ کر بیچ میں بول پڑا۔ "کہاں رہتا ہے کریما؟"

"سکول کے برابر والی گلی میں جاؤ تو پچھواڑے بجے ہتھ کو تیسرا مکان ہے۔" چوکیدار نے بتایا۔ "پر اس کا پتہ کیوں پوچھ رہا ہے۔ اسے جانتا ہے؟"

"نہیں جی! میں اسے نہیں جانتا۔" رحیم داد صاف مکر گیا۔ "میں نے تو یوں ہی پوچھ لیا۔ تیرے تو پڑوس کا چھوہرا ہے۔ پڑھتا بھی تیرے سکول ہی میں ہو گا؟"

"نا جی نا' وہ سکول شکول میں نہیں پڑھتا۔" جیراں نے منہ بگاڑ کر حقارت سے کہا۔ "وہ تو دن بھر شور شرابا کرتا ہے۔ لڑائی جھگڑے کرتا ہے۔ اسے اور کام ہی کیا ہے۔"

چوکیدار نے مسکرا کر کہا۔ "اب تو جا کر سو' رات بہت ہو گئی۔ تمیں نوں سویرے پوہ پھٹنا لے اٹھنا ہوتا ہے۔"

جیراں نے ایک بار پھر منہ بگاڑا۔ شوہر کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی گھر کے اندر

چلی گئی۔

رحیم داد نے کریما کے بارے میں مزید کچھ نہیں پوچھا اور نہ چوکیدار نے اس کا ذکر چھیڑا۔ رحیم داد نے ہیڈ ماسٹر اور اسکول کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں۔ چوکیدار بہت باتونی تھا اور اسے نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ وہ اطمینان سے باتیں کرتا رہا اور حقہ گڑگڑاتا رہا۔ رحیم داد مزید رات گزر جانے کا انتظار کرتا رہا۔

رات اور کالی ہوگئی۔ گاؤں کا سناٹا زیادہ گہرا ہوگیا۔ چوکیدار جماہیاں لینے لگا۔ اسے اب نیند آرہی تھی۔ رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ بوڑھے سے رخصت ہوا اور اندھیرے میں ایک طرف چل دیا۔

میدان سے گزر کر وہ اس گلی میں چلا گیا جو اسکول کے پچھواڑے تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا عین اس جگہ پہنچ گیا جہاں اسکول کے برابر سے گزرنے والی گلی ملتی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا' پھر آہستہ آہستہ تیسرے مکان پر پہنچا۔ خاصی ویران جگہ تھی۔ مکان بھی کم تھے' کچے اور چھوٹے تھے۔

☆

رحیم داد دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے دروازے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ چند لمحے گم صم کھڑا رہا۔ اس نے دروازہ آہستہ آہستہ کھٹکھٹایا اور بے قراری سے کنڈی کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

اس نے سوچا کہ دروازے کا ایک پٹ دھیرے سے چرچراتا ہوا کھلے گا۔ اس کی آڑ سے نوراں کا خوبصورت چہرہ نمودار ہوگا۔ وہ نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھے گی۔ "کون ہے؟" وہ جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دے گا۔ اسے چمٹا کر ہولے سے پیار کرے گا۔ اس کے کان کے پاس منہ لے جاکر سرگوشی کرے گا۔ نوراں! میں ہوں تیرا رحیے۔ اور جھپاک سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گھر کے اندر چلا جائے گا۔

مگر اندر سے نہ کوئی آواز ابھری' نہ دروازہ کھلا۔

رحیم داد بے چینی کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ اس ڈر سے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹانا نہیں چاہتا تھا مبادا پڑوسیوں کی آنکھ کھل جائے۔ وہ خاموشی سے گھر میں داخل ہونا چاہتا تھا تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو' وہ نوراں سے تنہائی میں ملے اور اسے اپنے بارے میں ساری باتیں بتا دے۔ پھر دونوں سر جوڑ کر بیٹھتے اور آئندہ کا منصوبہ بناتے۔

اس نے دروازے پر مزید دستک دینے کا ارادہ ترک کردیا۔ گھر کے برابر گلی تھی وہ گلی میں داخل ہوگیا۔ گلی تنگ تھی' اندھیرا بھی زیادہ تھا۔ اس طرف گھر کا آنگن تھا۔ دیواریں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔

رحیم داد کو جیل میں لالی دیوار پھاندنے اور دیوار پر چڑھنے کے گر بتا چکا تھا۔ جیل سے فرار ہونے سے پہلے تو وہ ہر روز ایسے ہی ہتھکنڈے اور گر بتاتا تھا۔ اس نے لالی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اچھل کر دیوار کا بالائی حصہ پکڑنے اور اسے پکڑ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔

اس کی دونوں ہتھیلیاں دیوار کی رگڑ سے چھل گئیں۔ وہ گھپ اندھیرے میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر آگے بڑھا۔

گھر کے آنگن میں شیشم کا درخت تھا۔ درخت کی ایک ڈال دیوار چھوتی ہوئی گلی میں نکل آئی تھی۔ ڈال مضبوط اور خاصی نیچی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گلی کے بچوں نے لٹک لٹک کر اسے نیچے جھکا دیا ہے۔

رحیم داد نے درخت کی جھکی ہوئی شاخ دیکھی اور اس کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ اس نے پیروں سے جوتے اتارے اور دیوار کے ساتھ اندھیرے میں اس طرح رکھ دیے کہ صاف نظر نہ آئیں۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ بھی وہیں رکھ دیا۔ مٹھائی کی پوٹلی دانتوں میں دبائی۔ گردن اٹھا کر ڈال دیکھی۔ اچھلا اور دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا۔ اس نے اپنے پیر دیوار سے ٹکائے اور ڈال کے سہارے کھسکتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ڈال اس کے بوجھ سے آہستہ آہستہ ہلنے لگی۔ مگر رحیم داد دیوار پر چڑھ گیا۔ اس نے آنگن میں نظر ڈالی۔ وہاں سناٹا تھا۔

وہ کچھ دیر دیوار پر بیٹھا درخت کی آڑ سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ وہ دیوار سے لٹک کر دھیرے سے آنگن میں اتر گیا۔

اس نے اندر جاکر دیکھا۔ آنگن خاصا مختصر تھا۔ اس کے ایک طرف دیوار پر چھپر پڑا تھا۔ چھپر کے ساتھ ہی کوٹھری جیسا چھوٹا کمرہ تھا۔ رحیم داد دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ آنگن میں صرف ایک چارپائی تھی۔ اس پر چادر اوڑھے کوئی سو رہا تھا۔ وہ چارپائی کے قریب پہنچا۔ اس کا بیٹا کریما لیٹا تھا۔ ساتھ ہی اس کی بیٹی زیتو سکڑی سکڑائی پڑی تھی۔ رحیم داد نے پہلی ہی نظر میں دونوں کو پہچان لیا۔

دونوں گہری نیند سو رہے تھے۔ مگر نوراں وہاں نہیں تھی۔ اس نے گردن موڑ کر چھپر کے نیچے

دیکھا' وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اس کی ایک جھری سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔

رحیم داد نے سوچا' نوراں کمرے میں ہوگی۔ وہ بچوں کے سرہانے اندھیرے میں بت بنا کھڑا تھا۔ دونوں بچے ستاروں کی روشنی میں آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ رحیم داد نے غور کیا' کریمے کا قد کچھ لمبا ہوگیا ہے۔ زینو کے چہرے پر وہی پہلی سی معصومیت ہے' وہی بھولپن۔ اس نے دھیرے سے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔ زینو کے بال چھوئے۔ اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ زینو کے بال خاک اور میل سے چیکٹ ہو رہے تھے۔

اسے دکھ ہوا کہ نوراں نے بچوں پر توجہ دینا چھوڑ دی ہے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری' جھکا اور زینو کے ایک رخسار پر اپنے لرزتے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ بے خبر سوتی رہی۔ اس نے آہستہ سے کریمے کی پیشانی چومی۔ وہ بے چین ہو کر کلبلایا۔ رحیم داد جھٹ چارپائی کے سرہانے دبک کر بیٹھ گیا۔ کریمے نے کروٹ بدلی اور پھر گہری نیند سو گیا۔

رحیم داد چارپائی کی آڑ میں بیٹھا رہا اور گردن اٹھائے حسرت بھری نظروں سے بچوں کو تکتا رہا۔ اسے بے اختیار اپنا چھوٹا بیٹا یاد آگیا۔ وہ بھی دونوں بچوں کے ساتھ چارپائی پر لیٹا ہوتا۔ مگر اسے تو سیف اللہ کے بھائیوں نے جلا کر ختم کر دیا تھا۔ اس کی یاد کے ساتھ ہی رحیم داد کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا روتا رہا اور گھر کی بے سروسامانی دیکھ کر اپنی مجبوری اور بے بسی پر کڑھتا رہا۔

رحیم داد نے آنسو پونچھے۔ اٹھا اور دبے دبے قدموں چلتا ہوا چھپر کے نیچے پہنچ گیا۔ وہ چپ چاپ کھڑا کمرے کا بند دروازہ تکتا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اس نے قمیص کی اندرونی جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر کاغذ میں لپٹے ہوئے جھمکے انگلیوں سے ٹٹولے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ نوراں کو جھمکے بہت پسند ہیں۔ اس کے پاس کانوں میں پہننے کے لیے مندرے تھے۔ مگر وہ ہر فصل کی کٹائی کے بعد رحیم داد سے جھمکوں کی فرمائش کرتی۔ وہ اس کے لیے جھمکے نہیں بنوا سکا تھا۔ اس نے سوچا' جھمکے دیکھ کر نوراں کا چہرہ پھول کی طرح کھل جائے گا۔ وہ اپنے ہاتھ سے اس کے کانوں میں جھمکے پہنائے گا۔ اس کا دل کش چہرہ نظر بھر کر دیکھے گا اور بے اختیار اسے گلے لگا لے گا۔ وہ ہانپنے کے سے انداز میں رک رک کر گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

وہ آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا۔ دروازے میں خاصی چوڑی جھری تھی۔ اس نے جھری سے ایک آنکھ لگا کر اندر نظر دوڑائی۔ مگر اندر جھانکتے ہی اس کے ذہن کو زور کا جھٹکا

لگا۔ وہ لرز کر رہ گیا۔

اس نے دیکھا' کمرے کے اندر چارپائی پر نوراں لیٹی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مرد تھا جس کے سینے پر ایک ہاتھ پھیلائے وہ کروٹ کے بل سو رہی تھی۔ مرد کا چہرہ وہ نہیں دیکھ سکا۔ اس کا صرف ماتھا اور سر کے بال نظر آ رہے تھے۔ چہرہ نوراں کے بازو کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ یہ ہولناک منظر وہ زیادہ دیر نہیں دیکھ سکا' الگ ہٹ گیا۔ غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا۔ وہ ذرا دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔

اس نے جھری سے پھر اندر دیکھا۔ اس کا غصہ اور شدید ہوگیا۔ اس نے نظریں ہٹالیں۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکالا۔ اسے آہستہ سے کھولا۔

وہ دونوں کو سوتے ہی میں قتل کر دینا چاہتا تھا۔ دل میں یہ ٹھان کر اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ چرچراتا ہوا ذرا سا کھل گیا۔ مگر دروازے کی چرچراہٹ کے ساتھ ہی نوراں کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ رحیم داد دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں خوں خوار ہو رہی تھیں۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ نوراں نے پہلے تو اسے حیرت سے دیکھا' پھر اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

رحیم داد جھٹ دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ چھپر سے باہر نکلا۔ قریب ہی گھاس پھوس کا مٹھا تھا اور خاصا بڑا تھا۔

فرار ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ رحیم داد مٹھے کی آڑ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے چاقو مضبوطی سے ہاتھ میں تھام لیا۔ ذرا دیر بعد کوئی دھوتی باندھتا ہوا دروازے سے نکل کر چھپر کے نیچے آگیا۔

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہ جمال دین تھا۔ ہاں وہی تھا۔ وہ کمرے کے اندر سے نکلتی ہوئی چراغ کی روشنی میں کھڑا دھوتی باندھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے نوراں تھی' دروازے کی دہلیز سے ذرا آگے بڑھ کر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ رحیم داد دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

جمال دین نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ "یہاں تو کوئی نہیں۔ جانے تو کیا دیکھ کر ڈر گئی۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "میں نے اسے خود دیکھا تھا۔"

"ہمارے پاس دھرا ہی کیا ہے جو کوئی چوری کرنے آئے۔"

"وہ چور تو نہیں لگتا تھا۔"

"فیر کیا لگتا تھا؟"

"اس کی داڑھی تھی۔ مونچھیں تھیں۔ اجلا کرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔"

"چور تو وہ نہیں ہو سکتا۔" جمال دین نے قیاس آرائی کی۔ "چور تو منہ پر منڈاسا باندھ کر آتے ہیں۔ ان کی تو صرف آنکھیں نظر آتی ہیں۔ جانے تو نے کیا دیکھا۔ تیری بات سمجھ نہیں آئی۔"

"نہیں ویئے، میں نے اسے ٹھیک طرح دیکھا ہے۔ بیچ دروازے میں کھڑا مجھے لال لال آنکھوں سے گھور رہا تھا۔" اس نے ذرا رک کر کہا۔ "ہائے کیسی ڈراؤنی آنکھیں تھیں۔ ڈر کے مارے میری تو چیخ بھی نہ نکل سکی۔"

جمال دین جھٹ اندر گیا اور لمبی لاٹھی نکال کر لایا۔ وہ زور زور سے کھنکارتا ہوا آنگن میں آیا۔ شیشم کے درخت کی طرف گیا۔ بچوں کی چارپائی کے پاس پہنچا۔ وہ ابھی تک بے خبر سو رہے تھے۔ جب وہ گھاس پھوس کے ڈھیر کی طرف بڑھا تو رحیم داد سکڑ کر اور دبک گیا۔ اس نے چاقو مضبوطی سے انگلیوں میں بھینچ لیا۔

جمال دین قریب آ گیا۔ جب تک وہاں کھڑا رہا رحیم داد سانس روکے رہا۔ جمال دین چند لمحے ٹھہرا۔ اسے جمال دین کے صرف پیر نظر آ رہے تھے۔ جمال دین مڑا اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ قریب جا کر اس نے دروازہ کھولا اور گھر سے باہر چلا گیا۔

نوراں چھپر کے نیچے دھندلی روشنی میں تنہا کھڑی تھی۔ رحیم داد دکھ اور نفرت کے ملے جلے احساسات کے ساتھ ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا۔ وہ گردن اٹھائے دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے جمال دین کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اس کی خوش نما لمبی گردن میں اس وقت بھی وہی خم تھا جسے دیکھ کر وہ وارفتہ ہو جاتا تھا۔ اس کے لمبے چمکیلے بال پیٹھ پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کا نصف حصہ روشنی میں تھا جو خوب صورت بھی تھا اور دل آویز بھی۔ اس کے ہونٹ ذرا سے کھلے تھے اور ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جمال دین واپس آ گیا۔ اس نے دروازے کی کنڈی لگائی اور لاٹھی اٹھائے سیدھا نوراں کی جانب بڑھا۔ قریب گیا اور سینہ تان کر بولا۔ "کوئی بھی تو نہیں۔ میں نے ہر طرف دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ تو ایں ویں ڈر گئی۔"

"تجھے کیسے بتاؤں، میں نے اسے دیکھا تھا۔" نوراں کی آنکھوں سے خوف صاف جھلک رہا تھا۔

"مجھے تو ایسا لگا جیسے وہ رنجے ہو۔"

"حد کر دی تو نے۔ رنجا اب کیسے آ سکتا ہے۔" نوردین نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اسے تو قتل کر دیا گیا۔ تجھے کتنی بار بتاؤں۔ میں احمد کوٹ میں سیف اللہ کے چھوٹے بھائی بلّے سے خود ملا تھا۔ بلّے نے اپنی آنکھوں سے رنجے کی لاش دیکھی تھی۔ جیل کی وردی اس کے بدن پر تھی۔" اس نے اپنی لاٹھی دیوار سے ٹکا دی۔ "اب تو رنجے کی لاش بھی دفن کر دی گئی۔ وہ کبر سے اٹھ کر تو یہاں آنے سے رہا۔" وہ ایک بار پھر بے نیازی سے ہنسا۔

"تو نے سفنہ دیکھا ہوگا۔"

"میں تجھے کیسے بتاؤں۔" نوراں نے دروازے کی دہلیز کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ اس جگہ آنکھیں نکالے مجھے گھور رہا تھا۔" وہ چند لمحے خاموش کھڑی سوچتی رہی، پھر بڑبڑانے کے سے انداز میں دھیرے دھیرے بولنے لگی۔ "رنجے کے داڑھی نہیں تھی پر لگتا وہی تھا۔"

"اس کا بھوت آیا ہوگا۔" جمال دین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے تو اسے بھولی نہیں!"

نوراں نے کچھ نہیں کہا۔ جمال دین نے اسے خاموش پا کر چھیڑنے کی کوشش کی۔ "لگتا ہے ابھی تک اسی کے چکر میں رہتی ہے۔ یاد تو آتا ہوگا؟"

"یاد تو آتا ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "سات برس اس کا ساتھ رہا ہے۔ ذرا سوچ، سات برس تھوڑے نہیں ہوتے، فیر یہ بچے موجود ہیں۔" اس نے آنگن میں پڑی ہوئی چارپائی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ اسی کے تو ہیں۔ وہ میرے بچوں کا پیو تھا۔"

"فضول باتیں چھوڑ۔" جمال دین نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ "اب تو رنجا آنے سے رہا۔ ٹھیک ہی ہوا۔ جب تک زندہ تھا، ہر دم اس کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔" وہ انگلی سے سر کے بال کریدنے لگا۔ "میں نے اپنی مسجد کے ملّا سے بات کی تھی۔ کہتا تھا، عدّت کے چار مہینے دس دن پورے کر لینے دے۔ اس سے پہلے نکاح حرام ہے۔ عدّت ختم ہونے کے بعد تیرا نکاح پڑھا دوں گا۔ فیر تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے گی۔ نہ کسی کا ڈر، نہ کسی کا خوف۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پر تو کوئی ٹھیک ٹھاک دھندا تو کر۔" نوراں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دیکھ تو گھر کی کیا حالت ہو رہی ہے۔"

"کر لوں گا، کر لوں گا۔ اب تو ضرور کوئی ٹھیک سا دھندا کرنا پڑے گا۔"

"ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔" نوراں نے گلہ کیا۔ "تیری انھی باتوں میں آ کر میں نے اپنا خانہ خراب کر لیا۔"

"کرماں بھری! بیکار میں اپنا ''گا'' خراب نہ کر۔" جمال دین نے نرم لہجے میں اسے منانے کی کوشش کی۔ "پروا نہ کر' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ایسا کر' احمد کوٹ والی زمین واپس لینے کی کوشش کر۔ اب تو سیف اللہ کے بھائیوں کا ''رَٹہ'' ختم ہو گیا ہو گا۔ رحیمے بھی نہیں رہا جس سے ان کی دشمنی تھی۔ اب انھیں ہم سے کیا لینا۔ انھوں نے تو زبردستی ہماری زمین دبا رکھی ہے۔"

"کہتی تو ٹھیک ہے۔" جمال دین نے اتفاق کیا۔ "میں تجھے اور دونوں بچوں کو احمد کوٹ لے جاؤں گا۔ تو سیف اللہ کی ماں کے پاس جانا۔ اس کے سامنے رونا پیٹنا۔ سنا ہے ''رَنّ'' تو اس کا تیز ہے پر دل کی بری نہیں۔ تجھ پر اور بچوں پہ ترس کھا کے زمین واپس کر دے تو کوئی تعجب کی گل نہیں۔"

"ویسے بھی تو ان کا ''بندہ'' غیر کنوتی ہے۔ ان کے خلاف تو مقدمہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"مقدمے شقدمے کے چکر میں نہ پڑ۔ ان کی اوپر تک پہنچ ہے۔ مقدمہ سے کچھ نہیں بنے گا۔ بہت لمبا چکر ہے۔" جمال دین اسے سمجھانے لگا۔ "اور سب سے زیادہ مشکل یہ کہ مقدمہ لڑنے کے لیے' روپیہ بھی چاہیے۔ یہ تو سوچ۔"

"پکی باراں کلاّ زمین ہے۔ باراں کلاّ زمین کم نہیں ہوتی۔"

"میں کب کہتا ہوں' کم ہوتی ہے۔" جمال دین نے مسکرا کر کہا۔ "پر جیسا میں کہتا ہوں' ویسا کر۔ اس طرح کام آسان ہو جائے گا۔ بول کیا کہتی ہے؟"

"جیسا تو کہتا ہے' وہی کروں گی۔ پہلے بھی تیری بات میں نے کب نہیں مانی۔" اس نے ایک خاص ادا سے جمال دین کو دیکھا اور زیرِ لب مسکرانے لگی۔ "رحیمے جیل میں تھا تبھی تیری بن گئی تھی۔ تو نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔"

"میں نے جادو کر دیا تھا یا تو نے؟ ذرا اپنی موٹی موٹی آنکھیں دیکھ۔" جمال دین ہنس کر بولا۔ "میں نے تیرے لیے' پنڈ چھوڑا۔ گھر والوں سے جھگڑا کیا۔ سب کو چھوڑ دیا' تیرا بن گیا۔"

"اور بھی باتیں ہیں۔" نوراں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اس رات مجھے احمد کوٹ سے نکال کر یہاں نہ لاتا تو سیف اللہ کے بھائی مجھے اور میرے ان دو بچوں کو بھی ختم کر دیتے۔"

"تجھے کیا پتہ' تیرے لیے' تو میں جان کی بازی لگا سکتا ہوں۔" جمال دین نے بڑے جوش سے کہا۔ "تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔"

"کیا بات ہے مجھ میں' کچھ بھی تو نہیں۔" وہ بڑے ناز سے مسکرائی۔ اس کے انداز میں لگاوٹ

تھی۔ "پر اتنا ضرور ہے' میں اب تیری ہو گئی۔ تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ تو مجھے چھوڑ دے' یہ دوسری بات ہے۔"

"میں تجھے چھوڑ دوں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے سینے پر داہنا ہاتھ رکھا اور گہری سانس بھر کر بولا۔ "ہائے میں کرباں! تجھے پانے کے بعد بھی کوئی چھوڑ سکتا ہے' ایسی چاندنی کی طرح لشکارے مارتی ہوئی سوہنی کو۔" اس نے شوخی سے نوراں کی کمر میں چٹکی بھری۔ وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ اس کی کمر بل کھا کر دوہری ہو گئی۔ جمال دین نے جھپاک سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ نوراں نے پیار سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور سینے سے چمٹ گئی۔ رحیم داد اندھیرے میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا۔

جمال دین آگے بڑھا۔ وہ نوراں کے چہرے پر جھکا ہوا پیار سے کہہ رہا تھا۔ "دل جانی! منجی پر لیٹ کر آرام نال گلاں ہوں گی۔" جمال دین اسے اٹھائے ہوئے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

نوراں کمرے کے اندر تھی۔ اس کے بچے آنگن میں کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر بے خبر سو رہے تھے اور رحیم داد گھاس کے ڈھیر کی آڑ میں دبکا بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ کمرے سے نوراں اور جمال دین کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد کے دل پر آرے چل رہے تھے۔ کمرے میں زوردار قہقہہ ابھرا۔ غصے اور نفرت سے رحیم داد کا خون کھول اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ اس نے چاقو مضبوطی سے تھام لیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چاقو ہاتھ میں سنبھالے دھیرے دھیرے چھپر کی جانب بڑھا۔ اس کی نظریں کمرے کے دروازے کی جانب تھیں۔

یکایک کمرے میں جلتا ہوا چراغ بجھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی گہری خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ جسم کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ واپس مڑا اور ڈگمگاتے قدموں سے چلتا ہوا آنگن میں آ گیا۔ سامنے چارپائی پر اس کے دونوں بچے بے خبر سو رہے تھے مگر وہ اس طرف نہ گیا۔

اس نے کھلا ہوا چاقو بند کر کے احتیاط سے جیب میں رکھا۔ شیشم کے درخت کے نیچے پہنچ کر ڈال پر چڑھا' دیوار پار کر کے باہر گلی میں آ گیا۔ دیوار کے قریب اندھیرے میں رکھے ہوئے جوتے پہنے۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ اٹھا کے بغل میں دبایا اور دبے دبے قدموں چلتا ہوا اندھیری گلی سے نکل کر اسکول کے پچھواڑے پہنچا۔ میدان عبور کیا اور سنسان گلی کوچوں سے گزرتا ہوا اکال گڑھ

کی حدود سے باہر نکل گیا۔

☆

رحیم داد دل گرفتہ اور نڈھال تھا۔ نوراں کی بے وفائی نے اس کے وجود میں غم و غصے کا جوالاؤ بھڑکایا تھا' اس آگ میں سلگتے سلگتے اب وہ راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا' سب کچھ لٹا چکا تھا۔

رات دم بخود کھڑی تھی۔ ہوا درختوں میں سسکیاں بھر رہی تھی۔ رحیم داد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے ماضی کا لاشہ اٹھائے بوجھل قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ آگے جا کے اس نے نہر کی پلیا عبور کی۔ سامنے کرتارپور کی بستی اندھیرے میں لپٹی اونگھ رہی تھی۔

اس نے نظر بھر کر اس طرف دیکھا۔ ٹھٹکا اور دوسری طرف مڑ گیا۔ کرتارپور نہ گیا۔ اب اسے کرتارپور سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اکال گڑھ جانے سے پہلے اس نے بیوی بچوں کے ساتھ ایک نئی زندگی بسر کرنے کے جو منصوبے باندھے تھے' سب ملیا میٹ ہو چکے تھے۔ اس کے ذہن پر ابھی تک نوراں اور جمال دین بھیانک خواب بن کر چھائے ہوئے تھے۔ اس نے اندرونی جیب سے کاغذ میں لپٹے ہوئے جھمکے نکالے۔ ان پر نظریں جمائے دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں غصے سے دہکنے لگیں۔ چہرے پر وحشت برسنے لگی۔ اس نے جھمکے نہر میں پھینک دیئے۔ پرنا کھول کر مٹھائی نکالی اور اسے بھی حقارت سے پھینک دیا۔ وہ نوراں اور بچوں سے اب کوئی رشتہ کوئی واسطہ رکھنا نہ چاہتا تھا۔

وہ نہر کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ رات تاریک اور بوجھل تھی۔ رحیم داد تھکن اور ذہنی کرب سے نڈھال تھا۔ دل ڈوب رہا تھا۔ آگے جانے کی سکت رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی۔ کھیتوں کا سلسلہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔

نہر سے ہٹ کر جھنگر تھا' ویران اور جنگلی جھاڑیوں سے بھرا ہوا۔ وہ جھنگر میں داخل ہوا۔ لیکن زیادہ دور نہ گیا۔ مٹی کے ایک تودے کے قریب بے حال ہو کر بیٹھ گیا اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

رات اس نے جھنگر میں بسر کی۔ تاروں کی چھاؤں میں اٹھا۔ نہر پر جا کے منہ ہاتھ دھویا۔ نسیم سحر کے نرم نرم جھونکوں میں فرحت اور تازگی تھی۔ زندگی کی ہلچل تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ میں ریت کے ذرے جگمگا رہے تھے۔

رحیم داد راہ گیروں کی نظروں سے بچتا بچاتا ویران اور سنسان راستوں سے گزرتا ڈھولا امیر خاں کی جانب گامزن تھا۔ دھوپ کی تمازت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے

قطرے جھلملا رہے تھے۔

جمال دین خطرہ بن کے اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اسی کے خوف سے رحیم داد نے کرتارپور کو خیرباد کہا تھا۔ وہاں سے چلتے وقت اسے ایک ہی محفوظ ٹھکانا نظر آیا تھا' اور وہ تھا ڈھولا امیر خان' جہاں اس کی چھوٹی بہن بیگماں کا گھر تھا۔ ماں باپ بہت پہلے مر چکے تھے۔ بیگماں کے سوا رحیم داد کی نہ کوئی بہن تھی' نہ بھائی۔

بیگماں کی شادی چچازاد بھائی مولا داد سے ہوئی تھی۔ رحیم داد کا چچا ابھی زندہ تھا۔ وہ ڈھولا امیر خاں میں رہتا تھا۔ خاصا کھاتا پیتا زمیں دار تھا۔ اس کے پاس چالیس ایکڑ سے اوپر نہری زمین تھی جس پر وہ اپنے دو بیٹوں کے ساتھ کاشت کرتا تھا۔

بیگماں کی شادی کے کچھ ہی عرصے بعد چچا سے رحیم داد کے تعلقات خراب ہو گئے۔ سبب یہ تھا کہ بیگماں کی شادی کے وقت رحیم داد کنوارا تھا۔ جب رحیم داد کی شادی کا سلسلہ چھڑا تو چچا نے چاہا کہ رحیم داد کا بیاہ اس کی منجھلی بیٹی بیدی سے ہو جائے۔ مگر رحیم داد دونے بٹے کی شادی پر رضامند نہیں ہوا۔

اس نے نوراں سے بیاہ کر لیا۔ نوراں پر وہ بہت پہلے سے فریفتہ تھا۔ یہ بات بیگماں کو معلوم تھی اور مولا داد کو بھی۔ چچا اس قدر ناراض ہوا کہ نہ تو شادی میں خود شریک ہوا' نہ بیٹے اور بہو کو شریک ہونے دیا۔ تعلقات اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ شادی کے بعد بیگماں اور اس کی سسرال سے کوئی بھی رحیم داد کے گھر نہیں آیا۔

رحیم داد بھی نہیں گیا۔ سالہا سال گزر گئے۔ مگر جن دنوں رحیم داد منٹگمری جیل میں تھا' ایک روز بیگماں سسر اور شوہر سے چھپ کر اس سے ملنے آئی۔ اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کے روئی۔ وہ بے قرار ہو کے سلاخوں سے سر ٹکراتی تھی اور تڑپ تڑپ کر کہتی تھی۔ "ہائے ویر! تو نے یہ کیا کر لیا؟" رحیم داد اسے تسلی دیتے دیتے خود بھی رونے لگتا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بیگماں اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ لیکن بیگماں اس سے ملنے دوبارہ جیل نہیں آئی۔ آنے کا موقع ہی نہیں ملا ہو گا۔

رحیم داد کو یقین تھا کہ اس کے مرنے کی خبر سن کر بیگماں احمد کوٹ ضرور پہنچی ہو گی اور اب تک اسے یاد کر کے آنسو بہاتی ہو گی۔ وہ اگر اس کے پاس پہنچ جائے تو وہ بھائی کو زندہ دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہو جائے گی۔ اسے اپنے گھر میں ضرور پناہ دے گی۔ مولا داد بھی نیک اور بھلا مانس تھا۔ بیوی کو چاہتا بھی بہت تھا۔ لہٰذا رحیم داد سے خلوص اور ہمدردی رکھتا۔ خفگی صرف چچا کی تھی۔

شام کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد خاموش کھڑا سوچ رہا تھا کہ آیا اسے فوراً بیگماں کے پاس

پہنچ جانا چاہئے یا نہیں۔ اس تذبذب کی وجہ اس کا چچا تھا۔ وہ بڑا ضدی اور سخت گیر تھا۔ رحیم داد کو خدشہ تھا کہ اسے دیکھ کر کہیں وہ بھڑک نہ اٹھے' ایسا ہنگامہ نہ برپا کردے کہ اس کا راز فاش ہو جائے' گاؤں والوں کو پتہ چل جائے کہ وہ کون ہے۔

وہ ایسا کوئی خطرہ ہرگز مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہ رحیم داد کے بجائے چوہدری نورالٰہی کے روپ میں زندہ رہنا چاہتا تھا جس کے کلیم کے کاغذات کا بستہ وہ نہایت احتیاط سے سنبھالے ہوئے تھا۔

رحیم داد نے بہت سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ گھر جانے کے بجائے اسے پہلے کسی نہ کسی طرح بیگماں سے ملنا چاہئے اور اس کے مشورے سے ڈھولا امیر خاں میں ٹھہرنے کا فیصلہ کرنا چاہئے۔ وہ خطرے سے بچنا چاہتا تھا۔

۱۹

ڈھولا امیر خاں پرانا گاؤں تھا۔ عام رواج کے مطابق گاؤں کے شروع میں قبرستان تھا۔ جھٹ پٹے میں قبرستان بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اونچی نیچی قبریں خود رو جنگلی جھاڑیوں کے درمیان دھندلے دھندلے دھبّوں کے مانند نظر آرہی تھیں۔

رحیم داد ٹھٹکا اور قبرستان سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ وہ مخمصے میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا کہ اسے ڈھولا امیر خاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ فی الحال کرتارپور ہی میں ٹھہرنا چاہئے تھا۔ مگر کرتارپور اب اس کے لیے' محفوظ ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ اکال گڑھ نزدیک ہی تھا اور وہاں جمال دین موجود تھا جو کسی بھی وقت کرتارپور پہنچ سکتا تھا۔ اگر جمال دین نے اسے پہچان لیا تو ذرا بھی مروت نہیں کرے گا' جھٹ پولیس سے مخبری کردے گا۔ اب وہ اس کا جگری دوست نہیں' رقیب بن چکا تھا۔ نوراں ان کی دوستی کے درمیان دیوار بن کے حائل ہو گئی تھی۔

رحیم داد نے گاؤں کی طرف جانے کا ارادہ ترک کردیا' مڑا اور کھیتوں کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ پہلے بھی کئی بار ڈھولا امیر خاں آچکا تھا۔ لہٰذا راستوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد چاپ سنائی دی۔ رحیم داد نے رفتار سست کرلی اور چوکنا نظروں سے چاپ کی سمت دیکھنے لگا۔ اندھیرا دھیرے دھیرے نیچے اتر رہا تھا۔ گاؤں کے گھروں سے مویشیوں اور انسانوں کی ملی جلی آوازیں شام کے بڑھتے ہوئے سناٹے میں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔

ایک شخص اچانک جھاڑیوں کے عقب سے نکل کر رحیم داد کے سامنے آگیا۔ اسے دیکھ کر رحیم داد لمحے بھر کے لیے' پریشان ہوا مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ قریب آیا تو رحیم داد نے

پوچھا۔ "میں نے کہا جی! ڈھولا امیر خاں یہی ہے نا؟"

"ہاں جی۔" اس نے جواب دیا۔ "تمیں نوں کسے ملنا ہے؟"

رحیم داد اس کا سوال صاف نظرانداز کر گیا۔ لہجے میں کسی قدر رقت پیدا کر کے بولا۔ "بڑی پیاس لگی ہے۔ پانی ہو تو پلا دے۔"

"فکر نہ کر' تجھے ابھی پینے کو پانی مل جائے گا۔" اس نے رحیم داد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے تجھے اس پنڈ میں پہلے نہیں دیکھا۔" اس نے رحیم داد کا گرد سے اٹا ہوا چہرہ اور لباس دیکھا۔ "بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے' سویرے سے روٹی بھی نہیں کھائی۔" وہ تکلفی سے مسکرایا۔ "پانی بھی پی لینا۔ روٹی ٹکر بھی کھا لینا۔ آ میرے ساتھ۔"

وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ رحیم داد کچھ دور تک چپ چاپ چلتا رہا پھر اس نے کسی قدر حیرت سے دریافت کیا۔

"تو مجھے آڈے پانی پلائے گا؟"

"نا جی' ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "ادھر منا ہے۔" اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھایا۔ "وہاں پانی ہے' روٹی ٹکر بھی ہے۔" اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ "دوپہر سے مرو رہی ہے۔ میں اسی لیے ادھر آیا تھا۔ روٹی نہیں کھاؤں گا' توں کھا لینا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھلی جگہ پہنچے۔ سامنے مٹی کا بنا ہوا قدر اونچا چبوترا تھا جس پر چڑھ کر کھیتوں کی رکھوالی کی جاتی ہے۔ یہ منا تھا۔ اس کے اردگرد فصلیں کھڑی تھیں۔ رحیم داد نے فصلیں دیکھ کر کہا۔

"فصلیں تو پک کر بالکل تیار ہو چکی ہیں۔ ابھی ان کی واڈھی نہیں ہوئی؟"

"بس جی ہونے ہی والی ہے۔" وہ چبوترے کی جانب بڑھا جس پر ایک طرف پانی کا گھڑا رکھا تھا۔ اس کے ڈھکنے پر کپڑے میں لپٹا ہوا کھانا دھرا تھا۔ وہ چبوترے پر چڑھ کر اوپر گیا۔ رحیم داد بھی چلا گیا۔ اس شخص نے کھانا اٹھایا اور رحیم داد کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لے' یہ روٹی پکڑ۔" کھانا رحیم داد کے سپرد کر کے اس نے قریب رکھا ہوا مٹی کا پیالہ اٹھایا۔ اس میں گھڑے سے پانی ڈالا اور رحیم داد کے حوالے کیا۔ "پہلے پیاس بجھا لے۔ پر زیادہ پانی نہ پینا۔ الٹی ہو جائے گی۔ روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھا سکے گا۔"

رحیم داد نے بھرا ہوا پیالہ ہاتھ میں سنبھالا۔ اسے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے

پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور آدھا خالی کر دیا۔ پانی پی کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھانا سامنے رکھ لیا۔ وہ شخص بھی قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے کپڑا کھول کے روٹیاں نکالیں۔ روٹیوں کے ساتھ پلی کی چٹنی تھی۔ ایک گٹھی پیاز کی بھی تھی۔ رحیم داد نے روٹی توڑ کر لقمہ بناتے ہوئے کہا۔

"دو روٹیاں ہیں۔ میں دونوں نہیں کھا سکوں گا' تو بھی تھوڑی سی روٹی کھا لے۔"

"مجھے نہ کھلا' میری طبیعت کچھ گڑبڑ ہے۔"

"رات بھر بھوکا رہے گا؟"

"ایسا کر' آدھی روٹی میرے لیے چھوڑ دے۔" اس نے پیاز کی گٹھی اٹھا کر رحیم داد کے سامنے کی۔ "یہ گنڈا ابھی جی چاہے تو چھوڑ دے۔ تو پلی سے روٹی کھا لے۔ رات کو بھوک لگی تو آدھی روٹی گنڈے کے ساتھ کھا لوں گا۔ اپنا کام چل جائے گا۔ ویسے تو میری فکر نہ کر۔ مجھے بالکل بھوک نہیں۔"

رحیم داد دھندلی روشنی میں چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ روٹی اور پلی کی چٹنی مزے دار لگی۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے کھاتا رہا پھر اس نے پوچھا۔

"تو راکھا ہے؟"

"ہاں جی' راکھا ہی ہوں۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

رحیم داد نے اس کے لہجے کی کسک محسوس کی۔ "کتنے دنوں سے یہ کام کر رہا ہے؟"

"دو برس تو ہو گئے ہوں گے۔ پر ڈھولا امیر خاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ پہلے میں چک ۳۲ میں ہوتا تھا۔"

"ادھر کیا کرتا تھا؟"

"کرنا کرانا کیا ہے جی!" وہ بیزاری سے بولا۔ "کبھی مویشی چرانے لگ گیا تو چاک بن گیا۔ کبھی گڑ بنانے والا گڑالا۔ کبھی راکھا۔ جو کام مل گیا' کرنے لگا۔"

"کسی زمیں دار کا مزارع کیوں نہیں بن جاتا؟"

"مزارع بھی رہ چکا ہوں۔"

"زمیں دار نے بے دخل کر دیا؟"

"ہاں جی' پہلے میں بھی زمیں دار ہوتا تھا۔"

"اسی ضلع میں تیری زمیں داری تھی؟"

"نہیں جی۔" اس نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "ملتان کی تحصیل وہاڑی میں اپنا پنڈ

کوڑا نجیب تھا۔ مستاجری پر ۲۵ کلا زمین لے رکھی تھی۔ نہری زمین تھی۔ پانی بھی پورا پورا ملتا تھا۔ ساتھ میں گھروالی کے بھائی ادریس کو بھی لگا رکھا تھا۔ آرام سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ پنڈ کا وڈا زمیں دار عارف سدیرا تھا۔ وہ میری زمین ہتھیانا چاہتا تھا۔ طرح طرح سے تنگ کرتا۔ کبھی مویشی اٹھوالیے' کبھی پانی کاٹ دیا۔ فیر ایسا ہوا جی' ایک دن اس نے مجھے اپنی حویلی میں بلوایا۔ ادریس میرے ساتھ تھا۔ سدیرے نے مجھ سے صاف صاف کہا۔ دلدار اپنی زمین میرے حوالے کردے ورنہ پچھتائے گا۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تیرا نام دلدار ہے؟"

"ہاں جی' کبھی میرا یہی نام ہوتا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "اب تو سب دارا کہتے ہیں' کمّی کمین سمجھتے ہیں۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "ہاں تو جی' میں بتا رہا تھا۔ عارف سدیرا نے مجھے سیدھی سیدھی دھمکی دی۔ میں تو چپ رہا پر ادریس گرمی میں آگیا۔ وہ تھا بھی تگڑا اور زور آور جوان۔ سدیرے سے ذرا نہ ڈرا۔ جب زیادہ گرما گرمی ہوئی تو میں نے ادریس کو منع کیا اور اپنے ساتھ لے آیا۔ کچھ دنوں بعد سدیرے کے پتر کا ویاہ ہوا۔ اس نے پورے پنڈ پر ٹیکس لگایا کہ ہر گھر سے دو بھیڑ بکریاں دی جائیں۔ اس کے کرندے زبردستی بھیڑ بکریاں وصول کرتے۔ وہ میرے گھر آئے تو ادریس نے صاف انکار کردیا۔ کرندے چپ کرکے چلے گئے' پر رات کو انھوں نے میری چار بھیڑیں اٹھانے کی کوشش کی۔ ادریس پہلے ہی چوکس تھا۔ اس کے ساتھ کئی یار دوست بھی تھے۔ اس نے کرندوں کو ٹوکا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ادریس اور اس کے ساتھیوں نے پیچھا کیا اور دو کرندوں کو پکڑ لیا۔ ان میں سے ایک نے بھیڑ بھی کندھے پر اٹھا رکھی تھی۔"

رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے پوچھا۔ "دونوں کو پولیس کے حوالے کردیا ہوگا؟"

"ہاں جی' ارادہ تو یہی تھا۔" دارا نے بتایا۔ "پر سویرے سویرے سدیرے نے پنچایت بھیجی۔ منت سماجت کی۔ ادریس پنچایت پر تیار نہیں تھا' پر میں نے معافی دے دی۔ کرندوں کو چھوڑ دیا۔ گل ایہہ ہے جی' میں سدیرے سے جھگڑا بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بہت وڈا زمیں دار ہے۔ اور جی' ادھر سدیروں کا زور بھی بہت ہے۔ خاکوانیوں' صاحب زادوں' دولتانوں اور گدّی نشینوں سے سدیروں کا بہت میل جول ہے۔ وہ اتنے طاقت ور ہیں' سمجھو حکومت ہی ان کی ہے۔ تھانیدار ہو یا تحصیل دار' کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ سارے سرکاری افسر اور حاکم ان کے بندے ہیں۔"

رحیم داد نے مٹی کا پیالہ دارا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "نُھو نُھے میں گھڑے سے پانی تو ڈال

دے۔"

دارا نے پیالے میں پانی انڈیل کر رحیم داد کو دے دیا۔ رحیم داد نے پانی پیا' گیلی مونچھیں ہاتھ سے پونچھیں' مسکرا کر بولا۔ "ہاں' اب آگے کی بتا۔"

"بتانا کیا ہے جی' سدیرے نے وہی کیا جو چاہتا تھا۔"

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "کیا کیا اس نے؟"

"سدیرے نے گرداور اور پٹواری کے ساتھ جوڑ توڑ کرکے بندوبست اراضی کے کاغذات میں اندراجات منسوخ کرا دیے۔ شاملات دیہہ کی شکل بدلوا کر میری زمین کی مستاجری اپنے نام کرالی۔ ویسے مستاجری میں میرے لگ بھگ تین سال رہتے تھے۔"

"مستاجری تو سرکاری ٹھیکا ہوتا ہے۔ ٹھیکے کی مدت ختم ہونے سے پہلے مستاجری سدیرے کے نام کیسے ہوگئی؟"

"اب کیا بتاؤں' یہ سب کیسے ہوگیا۔" دارا نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "ویسے میری ربیع کی فصلیں واڈھی کے لیے' تیار کھڑی تھیں۔ فصلوں کی واڈھی سے پہلے تو مزارعے کی بھی بے دخلی نہیں ہوتی۔ مستاجری ختم ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تو نے عدالتی چارہ جوئی نہیں کی؟"

"میرا تو ایسا ارادہ نہیں تھا پر ادریس نے مقدمہ دائر کردیا۔"

"مقدمے کا کیا بنا؟"

"مقدمہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ سدیرا ایک روز اپنے کرندوں کو لے کر پہنچا۔ پولیس بھی اس کی ساتھ تھی۔ اس نے میری زمین اور اس پر کھڑی ہوئی فصلوں پر قبضہ کرلیا۔ میرے وکیل نے سدیرا کا قبضہ رکوانے کے لیے' عدالت سے حکم امتناعی بھی لے لیا تھا۔ میں اور ادریس عدالت سے خوش خوش لوٹ رہے تھے۔ ادھر سدیرے نے دوسرا ہی منصوبہ بنایا۔ تمام سڑکیں جو عدالت سے لاریوں کے اڈے کی طرف جاتی تھیں' ان کی ناکابندی کی جا چکی تھی۔ ایک سڑک کے ناکے پر سدیرے اور دین دار' زمین دار بیٹھے تھے۔ دوسری پر منگھیرے اور دولتانے تھے اور تیسری پر خاکوانی اور گھلانے رسا گیر مورچا لگائے ہوئے تھے۔" دارا نے لمبی سانس بھری۔ "ادھر تو پوری تیاری تھی ادھر کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ ادریس آگے آگے چل رہا تھا۔ مجھ سے کوئی تیس چالیس گز کے فاصلے پر تھا۔ اچانک شفیع سدیرا' سکندر کھنڈ اور نادر دین دار ایک گلی سے نکلے اور ادریس پر کلہاڑیوں اور گنڈاسوں سے حملہ کردیا۔ ادریس خون میں لت پت پڑا تھا اور قاتل ہوائی فیر کرتے'

کلھاڑیاں لہراتے صاف نکل گئے۔"

"ادریس کا کیا بنا؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"اس نے وہیں سڑک پر دم توڑ دیا۔" دارا نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "اس کی لاش لے کر پنڈ پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ سدیرے کے کرندے میرے گھر کے سامنے موجود تھے۔ انھوں نے مجھ پر ڈانگیں برسانی شروع کر دیں۔ میں چوٹ کھا کر نزدیک کے کھیتوں میں گھس کر دبک گیا۔ وہ ادریس کی لاش اٹھا کر لے گئے۔ سدیرے کے حکم پر اسے پنڈ کے بیچوں بیچ ایک درخت سے لٹکا دیا گیا۔"

"تھانے جا کر تو نے پرچہ چاک کرایا ہوتا۔"

"وہ تو جی' میں پہلے ہی کرا چکا تھا۔ پر تھانے دار تو اس رات عارف سدیرا کے ساتھ حویلی میں بیٹھا شراب پی رہا تھا اور ادریس کی لاش درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس کے قاتل بھی نشہ کر کے پنڈ میں بڑھکیں مارتے پھر رہے تھے۔ خوشی سے بانہیں الارالار کے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ نے الاپ رہے تھے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میں آدھی رات کے بعد اندھیرے میں چھپتا لکتا کسی طرح اپنے گھر میں گیا۔ پر سویرا ہوتے ہی کرندے مجھے پکڑ کر سدیرے کے سامنے لے گئے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ننگی ننگی گالاں نکالیں۔"

رحیم داد کھانا کھا چکا تھا۔ اس نے بچی ہوئی روٹی اور پیاز کپڑے میں لپیٹ کر ایک طرف رکھی۔ مٹی کے پیالے سے پانی پیا۔ دارا سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔"

"سدیرے نے پہلے تو اپنے کرندوں سے پٹوایا۔" دارا نے آہ سرد بھر کر بتایا۔ "میرا چہرہ کالا کروایا' منہ میں جوتا دیا اور پورے پنڈ میں گھمایا۔ ایک ڈھولی میرے پیچھے پیچھے ڈھول بجاتا تھا۔ میری کمر میں رسی کا پھندا پڑا تھا جسے ایک کرندے نے پکڑ رکھا تھا۔ منہ میں جوتا دبائے' گردن جھکائے میں پنڈ کے ایک ایک گھر کے سامنے سے گزرتا تھا۔"

"ادریس کی لاش کا کیا بنا؟"

"لاش ساری رات اور سارا دن درخت سے لٹکی رہی۔" دارا نے جواب دیا۔ "ایسے ہی گرمی کے دن تھے۔ لاش سے سخت بدبو نکلنے لگی۔ پنڈ کے کچھ بوڑھے سدیرے کے پاس پہنچے اس کی منت سماجت کی۔ سارے پنڈ میں بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ سدیرے کی حویلی میں بھی بدبو پہنچ رہی تھی۔ اس لیے' اس نے لاش دفن کرنے کی اجازت دے دی۔"

"تو نے پنڈ چھوڑ دیا ہو گا؟"

"نہیں' ادریس کو دفن کرنے کے بعد میں گھر میں جا کر بیٹھ گیا۔ کسی کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ ویسے بھی سدیرے نے پورے پنڈ میں ایسا خوف بٹھا دیا تھا کہ اس کی ناراضی کے ڈر سے کوئی میرے گھر کے سامنے سے بھی نہ گزرتا۔ اپنا حال یہ تھا کہ گھر والی بھائی کی موت پر ہر دم روتی رہتی۔ میں چپ بیٹھا اسے دیکھتا رہتا۔ کئی دن ایسے ہی گزر گئے۔ ادھر سدیرے کے منشی نے میری فصل کی واڈھی کرالی۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا؟ تو تو گھر میں بند بیٹھا تھا۔"

"گھر والی نے فصلوں کی واڈھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ وہ ادریس کی کبر پر گئی تھی۔ واپس آئی تو رو رو کر مجھے یہ بات بتائی۔"

"تو نے کوئی کارروائی نہیں کی؟"

"تو بھی کیسی گلاں کرتا ہے۔ کارروائی میں نے کیا کرنی تھی۔" دارا کے ہونٹوں پر زہرخندہ تھا۔ "میں نے صرف یہ کیا' ایک رات چدّر سے منہ چھپا کر سدیرے کی حویلی پر گیا۔ پگڑی اتار کر سامنے ڈالی اور اس کے پیر پکڑ لیے۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ سدیرا ایک دم بھڑک اٹھا۔ ٹھوکر مار کر چیخا۔ یہاں کیوں آیا ہے؟ تھانے جا کر میرے خلاف پرچہ کرا۔ عدالت میں کیس چلا۔ حکم امتناعی نکلوا۔ میں نے اس کی ناراضی کا ذرا برا نہ منایا۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ نمبردار معافی دے دے۔ غلطی ہو گئی۔ جو تو کہے گا وہی کروں گا۔ مکدمہ بھی واپس لے لوں گا۔ زمین بھی تیری' فصلیں بھی تیری۔ میں تیرا مزارع بن کر کام کروں گا۔"

"تب تو وہ راضی ہو گیا ہو گا۔ وہ یہی تو چاہتا تھا۔"

"میں نوں پتہ تھا' وہ یہی چاہتا ہے۔ تبھی تو میں اس کے پاس گیا تھا۔ میری منت سماجت پر وہ تھوڑی دیر چپ کر کے بیٹھا سوچتا رہا۔ فیر بولا۔ "تجھے سٹامپ پیپر پر راضی نامہ کرنا ہو گا۔ میں اپنے وکیل سے کاغذ تیار کروا لوں گا۔ تجھے اس پر انگوٹھا لگانا ہو گا۔ اب تو جا' میں بعد میں بلوا لوں گا۔ میں چپ کر کے چلا آیا۔"

"بعد میں اس نے تجھے بلایا؟"

"ہاں جی' اس نے مجھے بلایا۔" دارا نے رحیم داد کو بتایا۔ "وہ اونچی رنگیل کھٹ پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اپنے پاس بٹھایا۔ محبت سے پوچھا۔ حال سنا اوآ! میں خیر صلاّ ہے' سیں کہتا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے نوکر سے لسّی کا گلاس منگوا کر پینے کو دیا۔ حقّہ تازہ کر کے سامنے رکھوایا۔ تھوڑی دیر بعد سدیرے نے اپنے منشی کو بلایا۔ اس نے سٹامپ پیپر

میرے سامنے نکال کر رکھ دیا۔ سلدیرے نے ہنس کر کہا۔ یہ راضی نامہ وہی ہے جو اس روز تیرے ساتھ طے ہوا تھا۔ اس نے میری پیٹھ تھپکی اور بولا۔ دیکھ کیا رہا ہے۔ انگوٹھا لگا دے۔ منشی نے میرے انگوٹھے پر فاؤنٹ روشنائی لگائی اور دو کاغذوں پر مجھ سے انگوٹھا لگوالیا۔"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "دوسرا کاغذ کس لیے تھا؟"

"وہ راضی نامے کی نقل تھی۔ منشی تو نقل دینے کو تیار نہیں تھا پر میرے مانگنے پر سلدیرا ہنس کر بولا۔ کوئی گل نہیں' دے دے اسے نقل۔ منشی نے مجھے نقل دے دی۔" دارا نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ "راضی نامے پر انگوٹھا لگوانے کے ذرا ہی دیر بعد سلدیرے کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اڑ گئی۔ مونچھ پر ہاتھ پھیر کر کڑک دار آواز سے بولا۔ وارا! اب تو نیچے زمین پر بیٹھ۔ آج سے تو میرا مزارع بن گیا۔ تیں نوں پتہ ہے مزارع' زمیں دار کے برابر نہیں بیٹھ سکتا۔ میں چپ کر کے اٹھا اور سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔"

"مزارع بننے کی گل تونے ہی کی تھی نا؟"

"کیا کرتا' کوئی اور راستہ بھی نہ تھا۔ وہ پہلے ہی مجھے ذلیل کر چکا تھا۔" دارا کے لہجے میں درد کی چبھن تھی۔ "پر وہ مجھے ابھی اور ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ کہنے لگا' کل شام میرے پتر کی جنج چڑھے گی۔ تیری گھر والی جنج کے آگے آگے جھومر ڈالے گی۔ میں نے سنا ہے' وہ بہت زبردست ناچتی ہے اور ہاں' یہ بھی سن لے' میں جیسا کہتا ہوں' ویسا ہی کرنا ہوگا۔ میں انکار شنکار سننا نہیں چاہتا۔ اب تو ٹرجا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور گھر واپس آ گیا۔ پر گھر والی کو کچھ نہیں بتایا۔ دوسرے روز بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ پر جب دن ڈھلنے لگا تو میں نے گھر والی کو ہمت کر کے پوری بات بتائی۔ مجھے جو ڈر تھا وہی ہوا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ بگڑ کر بولی۔ سلدیرے نے پہلے ہی جنج کے آگے ناچنے کے لیے کنجریاں بلا رکھی ہیں۔ اس نے کیا مجھے بھی کنجری سمجھا ہے جو مجھ سے جھومر ڈالوانا چاہتا ہے؟ پر جب میں نے اس کی بہت منت سماجت کی تو وہ رونے لگی۔ چپ چاپ اٹھی' نہائی' کپڑے بدلے اور شام ہونے سے پہلے پہلے سلدیرے کی حویلی پر پہنچ گئی۔"

"واپسی پر ناراض تو نہیں ہوئی؟" رحیم داد نے اس کی روداد میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ نہ پوچھ' جب وہ واپس آئی تو کیا ہوا۔" دارا نے تڑپ کر بتایا۔ "تیسرے روز وہ لوٹی تو اس کا منہ لال ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی زور زور سے چیخنے لگی' میں نے تیرے ایسے بے غیرت کے ساتھ نہیں رہنا۔ توں نے سلدیرے کے پت کی جنج میں مجھے کنجریوں کے ساتھ نچوایا۔ اب میں نے کنجری

ہی بن کے رہنا ہے۔ اس نے میرے منہ پر تھوکا' بچے کو گود میں دبایا اور گھر سے چلی گئی۔"

"اسے روکا نہیں؟"

"روکتا بھی تو نہ رکتی۔ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ گھر والی کے اس طرح چلے جانے پر مجھے بہت شرم آئی۔ سلدیرے پر سخت غصہ آیا۔ جی چاہا حویلی میں جا کر اسے قتل کر دوں۔ پر میں سلدیرے کی حویلی نہیں گیا۔ گھر سے نکلا اور سیدھا اپنے وکیل کے پاس پہنچا۔ اسے راضی نامے کی نقل دکھائی۔ اس نے کئی بار اسے پڑھا۔ غصے سے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا' یہ کیا کیا۔ راضی نامہ کرنے سے پہلے مجھ سے تو صلاح مشورہ کر لیا ہوتا۔ سلدیرے نے تیری زمین بھی اپنے قبضے میں کر لی اور تجھے اس طرح باندھ دیا ہے کہ اس کے خلاف کچھ بھی کارروائی نہیں کر سکتا۔ وہ جب چاہے گا تجھے بے دخل کر دے گا۔ مزارع بن کر بھی زیادہ دن نہیں رہ سکتا۔ راضی نامے میں اس نے ایسی ہی شرطیں ڈالی ہیں۔ اس کی باتیں سن کر میں بہت پریشان ہوا۔"

"وکیل ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ کچے کاغذ پر انگوٹھا لگانے سے پہلے تجھے وکیل سے ضرور گل کر لینی چاہئے تھی۔"

"گل ایہہ ہے جی' میں سلدیرے سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ ادریس کے قتل کے بعد میں بالکل بے سہارا ہو گیا تھا۔ پنڈ میں ہر بندہ مجھ سے بات کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔" دارا نے صفائی پیش کی۔ "اب آگے کی سن۔ وکیل نے میرا حوصلہ بڑھایا تو میں سلدیرے کے خلاف ایک بار پھر عدالتی چارہ جوئی کرنے پر تیار ہو گیا۔ میں نے وکیل کے ساتھ تھانے جا کر رپٹ لکھائی کہ سلدیرے نے ڈرا دھمکا کر زبردستی مجھ سے راضی نامے کے سٹامپ پر انگوٹھا لگوا لیا۔ اس کے بعد وکیل نے میری طرف سے عدالت میں نئی عرضی لگائی۔ یہ توہین عدالت کا مقدمہ تھا جس میں کہا گیا تھا کہ سلدیرے نے حکم امتناعی نہیں مانا اور میری زمین پر ابھی تک قبضہ کیے ہوئے ہے۔ فصلوں کی واڈھی کرائی اور اسے اٹھا کر بھی لے گیا۔ وکیل نے زوردار مقدمہ بنایا تھا۔ عدالت نے فوراً سلدیرے کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے۔"

"لگتا ہے' تگڑا وکیل کیا تھا۔ وارنٹ دیکھ کر سلدیرے کے بھی ہوش اڑ گئے ہوں گے۔ حوالات میں بھی بند رہا ہوگا۔"

"سلدیرا گرفتار کر لیا گیا تھا پر ضمانت پر اسی روز چھوٹ گیا۔ نہ حوالات میں رہا' نہ جیل گیا۔" دارا نے بتایا۔ "وکیل نے مجھے اپنے ایک ملنے والے کے پاس ٹھیرا دیا تھا۔ اس کا پنڈ کوڑا نجیب کے نزدیک ہی تھا۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک رات پولیے مجھے گرفتار کر کے تھانے لے گئے۔

بہت مارا پیٹا اور حوالات میں بند کردیا۔ پولیس نے سلدیرے کے ایک کرندے کی رپٹ پر میرے خلاف بُز کی چوری کا مقدمہ بنایا تھا۔ وکیل نے ضمانت کی درخواست لگائی پر وہ منظور نہ ہوئی۔ مجھے حوالات سے جیل بھیج دیا گیا۔"

"سلدیرے کی ضمانت ہو گئی اور تیری نہ ہو سکی؟ یہ عجب گل سنائی۔" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔

"سلدیرا وڈا زمیں دار ہے۔ صاحب زادوں اور مخدوموں سے اس کی یاری بھی ہے۔" دارا گہری سانس بھر کر بولا۔ "اس کی ضمانت کیسے نہ ہوتی۔ میں مستاجر زمیں دار سے گھٹ کر مزارع رہ گیا تھا۔ مجھے حوالاتی بنا کر پولیسیے جیل لے گئے۔ وہاں پہنچا تو حکم دیا گیا، گھنٹی گھر جاؤ۔ گھنٹی گھر گیا تو حکم ہوا، سکول جاؤ۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، سکول شکول تو کہیں تھا نہیں، بہت سے کیدی مونج کی رسیاں بٹتے تھے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ مشقت پر لگا دیا گیا۔ میں نے انکار کیا تو سڑاک سڑاک چھتر لگائے گئے۔ گندی گندی گالاں نکالی گئیں۔ میں جھٹ مونج بٹنے لگا۔ روز ایکا مشقت کرنی پڑتی۔ میں نے یہ بھی دیکھا جو حوالاتی کھاتا پیتا ہوتا، جیل کے حکام کو خوش رکھتا، اسے ذرا مشقت نہ کرنی پڑتی۔ ادھر میں مشقت کرتے کرتے آدھا رہ گیا۔ ڈاکٹری کے لیے بھیجا گیا۔ گھنٹوں کڑی دھوپ میں بیٹھا رہا، تب ڈاکٹری ہوئی۔ وزن لیا گیا تو مشین نے اتنا ہی وزن بتایا جتنا جیل میں داخل ہوتے وکت تھا۔ مشین میں کچھ ایسا بگاڑ پیدا کیا گیا تھا، جب چاہو وزن بڑھا دو جب چاہے گھٹا دو۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے لیے، یہ انوکھی باتیں نہیں تھیں۔ وہ بھی حوالاتی کے طور پر مہینوں ایسی مصیبتیں اسی جیل میں بھگت چکا تھا۔ دارا بتاتا رہا۔ "حوالاتیوں کو چکیوں اور بارکوں سے باہر نکال کر ہر روز سویرے سویرے گنتی کی جاتی۔ مشقت پر لے جانے کے لیے، ان کی چھانٹ کی جاتی۔ وہ اس طرح ہوتی۔ گھر خوراکی الگ کردیے جاتے۔ صاحب بہادر کے علیحدہ کردیے جاتے۔ دوسرے افسروں کے سفارشی الگ کردیے جاتے۔ جن حوالاتیوں نے مشقت سے بچنے کے لیے ماہانہ بھتا باندھ رکھا تھا، وہ بھی الگ کردیے جاتے۔ صرف میرے ایسے بے سہارا حوالاتیوں کو مشقت خانوں میں لے جایا جاتا اور دبا کے کام لیا جاتا۔ نہ پوچھ، جیل میں کیسی زبردست رشوت چلتی ہے۔ آزادی سے چلنے پھرنے تک کے لیے مٹھی گرم کرنی پڑتی۔ پر وڈے لوگاں کے عیش ہوتے۔ اول تو ایسا کوئی بندہ جیل جاتا نہیں اور جاتا بھی ہے تو سرداری کرتا ہے۔ حکم ماننے کی بجائے الٹا حکم چلاتا ہے۔ تجھ سے کیا کیا بتاؤں۔"

اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "ہر ۸ روز بعد وڈے جیلر کا دورہ ہوتا۔ اس روز اور مصیبت پڑتی۔ حوالاتیوں کو کمبل پریڈ لگا کر تین تین گھنٹے سخت دھوپ میں بٹھایا جاتا۔ دورہ شروع ہوتے ہی حوالاتیوں کو بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں۔ اگر کوئی حوالاتی نظریں اٹھا کر اوپر دیکھتا یا حاکم اعلیٰ کے سامنے فریاد کرنے کی کوشش کرتا تو سڑاک سے چھتر پڑتا۔ دورہ ختم ہونے کے بعد بھی ایسے حوالاتی کی زبردست پٹائی ہوتی۔"

رحیم داد نے ان جان بن کر تبصرہ کیا۔ "جیل میں بہت ظلم ہوتا ہے جی۔"

"یوں سمجھ لے، کون سا ظلم نہیں ہوتا۔ بیمار پڑ جاؤ تو خطرناک بیماریوں تک کا کوئی علاج نہیں۔ اوپر سے سخت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ گندی روٹی کھانی پڑتی ہے۔ بات بات پر پٹائی ہوتی ہے۔ ایک تکلیف ہو تو بتائی جائے۔" دارا نے قدرے تامل کیا۔ "بارک کے اندر سب حوالاتی بند کردیے جاتے ہیں۔ ٹٹی کرنے کے لیے، صرف ایک ٹٹی خانہ ہے جس میں دو بندے بیٹھ سکتے ہیں۔ ایک بارک میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ حوالاتی اور کیدی ہوتے ہیں۔ انھیں بارک کے ٹٹی خانے کا پانی ڈولوں سے نکالنا پڑتا ہے۔ کچی جیل ہے، اسی گندے پانی سے روز حوالاتیوں سے ہر جگہ لیپا پوتی کا کام بھی کرایا جاتا ہے۔ میں نے تجھے بتایا تھا نا کہ رشوت تو ہر معاملے میں چلتی ہے۔ مٹھی گرم کر دو تو گندے بدبو دار پانی سے لیپنا پوتنا نہ پڑے۔ رشوت کی خاطر ملاکاتیوں کو طرح طرح سے تنگ کیا جاتا۔ دو دو منٹ بعد حوالاتیوں اور کیدیوں کو ملاکاتیوں سے بات چیت ختم کرنے کو کہا جاتا۔ ملاکاتی تھوڑی تھوڑی دیر بعد روپے دو روپے دیتے تو بات کرسکتے تھے۔" اس نے بڑی ٹھنڈی سانس بھری۔ "پر اپنا تو کوئی ملاکاتی ہی نہیں تھا۔"

"تیری گھر والی ملاکات کے لیے، نہیں آئی؟"

دارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے چپ چاپ زمین پر انگلیوں سے آڑی ترچھی لکیریں بناتا رہا۔

رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہ کر دریافت کیا۔ "تیری گھر والی کیا دوبارہ نہیں آئی؟"

"ہاں جی۔" دارا نے مختصر جواب دیا۔

"پتہ کیا، اب وہ کہاں ہے؟"

دارا نے رحیم داد کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "جب میں نے تجھ سے ساری ہی باتیں بتا دیں تو یہ بھی سن لے۔ وہ جیسا کہہ کر گھر سے نکلی تھی، اس نے وہی کیا۔"

"کیا وہ سچ مچ کنجری بن گئی؟" رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں جی' وہ کنجری بن گئی ہے۔" دارا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے اسے پچھلے سال ملتان کے حرم گیٹ میں دیکھا تھا۔ خوب بناؤ سنگھار کیے چکلے میں بیٹھی تھی۔ میں دوبارہ ادھر نہیں گیا اور نہ کبھی اسے دیکھا۔ پتہ نہیں اب کہاں ہے۔ کس کے پاس ہے؟ نکّے کا بھی کچھ پتہ نہیں' زندہ ہے یا مر گیا؟"

"تیری زمین کا کیا بنا؟"

"اس پر تو سدیرے کا پہلے ہی قبضہ تھا۔ جیل میں حوالاتی کے طور پر تین مہینے سے زیادہ گزرے تو ایک روز پنڈ کا لوہار مجھے ملنے جیل آیا۔ اس کے ذریعے میں نے ایک بار فیر سدیرے کی منت سماجت کی۔ لگتا ہے' اسے سدیرے ہی نے بھیجا تھا۔ پر سدیرے نے مجھے اس شرط پر معافی دے دی کہ میں اس کے خلاف سارے مکدمے واپس لے لوں۔ میں نے اس کی شرط مان لی۔ سدیرے کا وکیل جیل میں آیا۔ اس نے جس کاغذ پر کہا' میں نے انگوٹھا لگا دیا۔ اس کے بعد پولیس نے میرے خلاف بج کی چوری کا مکدمہ ختم کر دیا۔ میں جیل سے نکلا تو کوٹ نجیب کی طرف جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ سدیرے نے کہلوا دیا تھا' اگر پنڈ میں گیا تو مجھے گولی سے اڑا دے گا' میری لاش بھی ادریس کی طرح درخت سے لٹکا دے گا۔" اس نے گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ "میں نے تبھی سے ملتان چھوڑ دیا' ادھر آ گیا۔"

"تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ تو تو بالکل تباہ ہو گیا۔"

دارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رحیم داد بھی چپ رہا۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔

☆

شام تاریک ہو کر رات کے اولین مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے گندم اور جو کی تیار فصلوں میں سرسراہٹ ابھر رہی تھی۔ دارا اور رحیم داد گم صم بیٹھے تھے اور اپنی اپنی سوچ میں مگن تھے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

دارا نے پہلو بدلا اور رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ادھر کیسے آیا؟ بتایا نہیں' تیں نوں کس سے ملنا ہے؟"

رحیم داد نے آہستہ سے پوچھا۔ "مولا داد کو جانتا ہے؟"

"کیوں نہیں جانتا۔" وہ مستعدی سے بولا۔ "اسے جانتا ہوں۔ اس کے بھائی اللہ داد کو جانتا ہوں۔ دونوں کے پیو کو بھی جانتا ہوں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "تجھے مولا داد سے ملنا ہے؟"

"مولا داد اور اللہ داد اپنے پیو کے ساتھ ہی رہتے ہیں نا؟"

"سمجھو' ساتھ ہی ساتھ رہتے ہیں۔" دارا نے جواب دیا۔ "مکان تو ایک ہی ہے پر دونوں نے بیچ میں دیوار اٹھا کر دو گھر بنا لیے ہیں۔ اللہ داد اور اس کا پیو ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔"

رحیم داد کو اس اطلاع سے کسی قدر تقویت ملی۔ اس نے دبی زبان سے پوچھا۔ "تب تو مولا داد کی گھر والی بیگماں کو بھی تو جانتا ہو گا؟"

"بالکل جانتا ہوں۔ تجھے بیگماں سے ملنا ہے؟"

"ہاں' میں نے اسی سے ملنا ہے۔"

"تیں نوں پہلے مولا داد سے ملنا چاہئے۔" دارا نے مشورہ دیا۔ "یہ ٹھیک رہے گا۔"

"اسے بھی ملوں گا۔ پر مجھے پہلے بیگماں ہی سے ملنا ہے۔"

"کوئی ایسی ویسی گل تو نہیں۔" دارا نے رحیم داد کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "بیگماں سے یاری تو نہیں لگا رکھی؟ مجھے سچ سچ بتا دے۔"

"رب سونہہ' ایسی کوئی گل بات نہیں۔" رحیم داد نے قبلے کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر قسم کھائی۔

دارا نے اس کی بات پر یقین کرتے ہوئے کہا۔ "پر یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ پہلے بیگماں سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔"

"گل ہی کچھ ایسی ہے۔ مجھے پہلے بیگماں سے ملنا ہو گا اور اس طرح ملنا ہو گا' کسی کو پتہ نہ چلے۔ تو میرا یہ کام کر سکتا ہے۔"

"تیری گل ابھی تک سمجھ نہیں آئی۔" اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو شبے سے دیکھا۔

"میں تجھے بعد میں سب کچھ بتا دوں گا۔" رحیم داد نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

دارا نے پھر شک ظاہر کیا۔ "یہ تو سوچ' میں ایسی بات بیگماں سے کیسے کہہ سکتا ہوں؟ وہ برا نہیں منائے گی؟ تیرے بارے میں پوچھے گی تو میں کیا بتاؤں گا؟ اس طرح تو وہ میرے کہنے پر ہرگز تجھے ملنے نہیں آئے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے سخن سازی سے کام لیا۔ "پر تو نے میری پوری گل کہاں سنی۔ وہ ایسا ہے جی' بیگماں کا ایک بھائی تھا' رحیم داد۔ احمد کوٹ میں رہتا تھا۔ پچھلے دنوں اس کا کتل ہو گیا۔ وہ میرا گہرا یار تھا۔ اسے ایک جھگڑے میں سزا ہو گئی تھی۔ میں اسے جیل ملنے گیا تھا۔ اس نے مجھ سے ایک بات کہی تھی' وہ میں نے بیگماں کو بتانی ہے۔ اس نے مجھے سونہہ دی تھی کہ میں یہ بات بیگماں کے سوا کسی کو ہرگز نہ بتاؤں۔" رحیم داد نے نظر بھر کر دارا کو دیکھا۔ "اب مرنے والے

کی گل کا تو مجھے لحاظ کرنا ہی پڑے گا۔"

"تیری گل کچھ کچھ سمجھ تو آتی ہے۔" دارا نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "ویسے مجھے بیگماں کے بھائی رحیم داد کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ میں نے تجھے کہا تھا نا' مجھے اس پنڈ میں آئے زیادہ مدت نہیں ہوئی۔"

"بیگماں سے ملنا تو اسے بتانا' تیرے مرحوم بھائی کا بہت پرانا یار احمد کوٹ سے آیا ہے اور تجھے اس کی ضروری گل بتانا چاہتا ہے۔"

دارا تذبذب میں پڑ گیا۔ "ایسا کر' مولا داد سے مل لے۔ اگر وہ تجھے مہمان بنا کر ٹھیرا لے تو جب وہ گھر پر نہ ہو' بیگماں کو اس کے بھائی کی بتائی ہوئی گل بتا دینا۔"

رحیم داد رضامند نہ ہوا۔ "میں چاہتا ہوں بیگماں سے ملنے سے پہلے' مولا داد' اس کے بھائی یا پیو کو بالکل پتہ نہ چلے' میں ڈھولا امیر خاں میں ہوں۔ گل ہی کچھ ایسی ہے' جسے تو نہیں سمجھ سکتا اور میں تجھے بتا بھی نہیں سکتا۔" رحیم داد نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا۔ "دارا! میرا یہ کام کروے' تیری مہربانی ہوگی۔" اس نے نوٹ دارا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "لے' اسے رکھ لے' نئی کمیس اور دھوتی لے آنا۔ تیرے کپڑے بہت گندے ہوگئے ہیں۔" اس نے دارا کا بوسیدہ لباس گہری نظروں سے دیکھا۔

دارا نے چپ چاپ نوٹ لے کر دھوتی کے ڈب میں رکھ لیا۔ اس کا رویّہ اب بدل گیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔ "میں بیگماں کے پاس چلا جاؤں گا۔ پر تو نے مجھے اب تک اپنا نام نہیں بتایا۔ بیگماں پوچھے گی تو کیا بتاؤں گا۔"

"کیا کرے گا جان کر۔" رحیم داد نے مسکرا کر بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ "بیگماں پوچھے تو اسے کہہ دینا تجھے نام یاد نہیں رہا۔ بس اتنا کہہ دینا احمد کوٹ سے تیرے بھائی رحیم داد کا پرانا یار آیا ہے اور تجھے اکیلے میں کوئی ضروری گل بتانا چاہتا ہے۔ اسے منع کر دینا وہ کسی کو اس بارے میں کچھ نہ بتائے۔ مولا داد کو بھی نہیں۔"

"کام تو ٹیڑھا لگتا ہے۔ پر اب تو کرنا ہی پڑے گا۔ تجھ سے وعدہ جو کر لیا۔"

رحیم داد نے گرم جوشی سے دارا کا ہاتھ پکڑ کر بھینچ لیا۔ "تو بہت نیک بندہ ہے۔ میرا یہ کام کرا دے تو میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ آرام سے رہے گا۔ پروا نہ کر' یہاں سے زیادہ آرام سے رہے گا۔"

دارا پر رحیم داد کی باتوں کا خوش گوار اثر پڑا۔ جوش سے بولا۔ "فکر نہ کر' میں بیگماں سے تجھے

ضرور ملواؤں گا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا اور گردن جھکا کر سوچنے لگا' پھر اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "تیرا اب یہاں ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ کوئی اتھے آ گیا تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ جیسا تو نے کہا' میں ویسا ہی چاہتا ہوں۔ کسی کو تیرے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلنا چاہئے۔"

"مجھے کہاں لے جائے گا۔" رحیم داد نے پوچھا۔ "پنڈ میں جانا تو ٹھیک نہیں۔ بیگماں کو یہاں بلا کر نہیں لا سکتا؟"

"اس ٹیم تو مولا داد گھر پر ہو سکتا ہے۔" دارا نے قیاس آرائی کی۔ "بیگماں سے ایسی بات میں کیسے کر سکتا ہوں اور اسے یہاں کیسے لا سکتا ہوں؟ میرے گھر چل۔ میرا ٹھکانا ادھر پنڈ سے الگ جھنگر کے پاس ہے۔ ادھر کوئی نہیں جاتا۔ میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ وہیں ٹھیر جانا۔ میں سوکھ لگتے ہی بیگماں سے بات کر لوں گا اور اسے تیرے پاس لے آؤں گا۔ یہ سب کیسے ہوگا؟ یہ مجھ پر چھوڑ دے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آ میرے ساتھ۔"

رحیم داد خاموشی سے اس کے ہم راہ چلا گیا۔

☆

ہر طرف سناٹا تھا۔ دارا اور رحیم داد نے جوہ عبور کیا اور ویرانے کی طرف بڑھنے لگے۔ گاؤں کے گھروں میں ٹمٹماتے چراغ دور ہوتے گئے۔ جھنگر نظر آنے لگا۔ وہ اس سے قریب ہوتے گئے۔ مگر جھنگر میں داخل نہیں ہوئے۔ جھنگر سے پہلے ہی درختوں تلے دھندلی دھندلی روشنی میں ایک مکان نظر آیا۔

دارا آگے بڑھ کر مکان کے دروازے پر پہنچا۔ باہر سے کنڈی لگی تھی۔ دارا نے کنڈی کھولی۔ دروازے کا ایک پٹ سرکایا اور رحیم داد کے ساتھ اندر چلا گیا۔ سامنے مختصر صحن تھا۔ ایک طرف مٹی سے بنی ہوئی کوٹھری تھی۔ اس کے ساتھ ہی چھپر تھا۔ اس کے نیچے کھانا پکانے کے لیے چولھا تھا۔

مکان کی دیواریں بھی کچی تھیں اور زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ مکان پر ویرانی برس رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا تھا۔ دارا نے صحن میں ایک بوسیدہ چارپائی ڈال دی۔ کوٹھری کے اندر گیا' گندا سا کھیس نکال کر لایا۔ اسے چارپائی پر بچھایا اور رحیم داد سے گویا ہوا۔

"اب آرام کر۔ میں مولا داد کی طرف جاتا ہوں۔ اگر وہ گھر پر نہ ہوا اور بیگماں اکیلی ہوئی تو ابھی تیرے بارے میں بات کروں گا۔ تیار ہو گئی تو ساتھ لیتا آؤں گا۔ ویسے رات کو مشکل ہی لگتا ہے۔ دن کو تو اس سے گل بات کرنے کا ضرور کوئی بہانہ مل جائے گا۔"

"میں تیری واپسی کا انتظار کروں گا۔"

"نہیں' میرا انتظار نہ کرنا۔ میں نے کہا نا" اس ٹیم مشکل ہی ہوگا۔ اگر بیگماں سے تیرے بارے میں بات نہ ہوئی تو میں ادھر نہیں آؤں گا' مولا داد کے گھر سے سیدھا منھا چلا جاؤں گا۔ مجھے فصل کی رکھوالی کرنی ہے۔"

"بیگماں سے بات کرنے کا موکع مل جائے تو ادھر ادھر دیکھ لینا۔ بہت ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ کسی کو میرے بارے میں بالکل پتہ نہ چلے۔" رحیم داد نے اسے ایک بار پھر خبردار کیا۔

"فکر نہ کر۔ میں کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔" وہ دروازے کی جانب بڑھا۔ "اب میں چلوں' دروازہ بند کرلے اور منجی پر آرام کر۔"

دارا باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ سرہانے رکھا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک دارا کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہیں آیا۔ رحیم سو گیا۔

سویرے بہت تڑکے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ باہر سے دارا کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے دروازہ کھول دیا۔ دارا اندر آگیا۔ وہ اکیلا تھا۔

"رات مولا داد کے گھر گیا تھا؟"

"یہاں سے نکل کر اسی طرف گیا تھا۔" دارا نے جواب دیا۔ "مولا داد گھر پر ہی تھا۔ بیگماں جاگ رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور وہاں سے منھا کی طرف چلا گیا۔ وہیں سے آ رہا ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے' کام نہیں بنا۔" رحیم داد نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔

"اب یہ مجھ پہ چھوڑ دے۔" دارا نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "یہاں آرام سے رہ۔ میں آج کسی نہ کسی طرح بیگماں سے ضرور تیرے بارے میں بات کرلوں گا۔"

رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔ "آج اس سے ملاقات ہو جائے گی؟"

"ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ وہ مان گئی تو خود تیرے پاس پہنچ جائے گی۔ میں اسے بتا دوں گا تو میرے گھر ٹھیرا ہے۔"

رحیم داد اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ صحن کے ایک گوشے میں کنواں تھا۔ رحیم داد نے پانی نکالا۔ غسل کیا۔ اپنے گرد آلود کپڑے دھوئے اور سوکھنے کے لیے پھیلا دیئے۔ وہ دارا کی دھوتی باندھے ہوئے تھا۔

رحیم داد نہا دھو کر کوٹھری میں گیا۔ وہاں مونج کی چٹائی بچھی تھی۔ دارا نے اس عرصے میں روٹی پکالی تھی۔ گاؤں کے کسی گھر سے لسی بھی لے آیا تھا۔ اس نے روٹی اور لسی رحیم داد کے سامنے چٹائی پر رکھ دی۔ دونوں نے ناشتا کیا۔ دارا ناشتے کے بعد لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ذرا دیر بعد گہری نیند سو گیا۔ رحیم داد کو نیند نہیں آئی' وہ لیٹا بھی نہیں۔ صحن میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ سہ پہر دن گزرا تو اس نے باہر کھلنے والے دروازے کی کنڈی لگائی اور چٹائی پر لیٹ کر کروٹیں بدلتا رہا' پھر وہ بھی سو گیا۔

دوپہر کو دارا نے رحیم داد کو بیدار کیا۔ کھانے کے لیے اصرار کیا۔ مگر رحیم داد کو مطلق بھوک نہ تھی۔ دارا نے اکیلے ہی کھانا کھایا۔ بچی ہوئی روٹی چنگیری میں رکھ کر چھت سے لٹکے ہوئے چھینکے میں رکھ دی۔

دارا نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں مولا داد کے گھر جا رہا ہوں۔ اس ٹیم بیگماں اکیلی ہوگی۔ اس سے تیرے بارے میں بات کروں گا۔"

"واپسی پر ادھر ہی آئے گا نا؟"

"ہاں جی' ادھر ہی آؤں گا۔" دارا نے جواب دیا۔ "پر تو آرام کر۔ بھوک لگے تو روٹی کھالینا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر چھینکے کی طرف اشارہ کیا۔ "روٹی کے ساتھ سرسوں کا ساگ بھی ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "میں باہر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دوں گا۔"

دن ڈھلے دارا واپس آیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دارا بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ دھوپ میں چل کر آیا تھا' پسینے سے اس کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "بیگماں سے تیری بات ہوئی؟"

"ہاں جی' ہوئی تھی۔" دارا نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے بتایا۔ "مولا داد گھر پر نہیں تھا۔ وہ فصل کی واڈھی کی تیاری میں لگا ہے۔ بیگماں اکیلی تھی۔"

"تب تو آرام سے گل بات کرنے کا موکع ملا ہوگا۔"

"ہاں' بات تو اس سے آرام ہی سے ہوئی۔" دارا کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔

رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "تیری بات سن کر وہ کیا بولی؟ لگتا ہے' کام بنا نہیں؟"

"بات تو اس نے میری پوری سنی پر وہ تجھے پہچان نہیں سکی۔ کچھ دیر سوچتی رہی فیر کہنے لگی' مجھے کچھ پتہ نہیں۔ جانے کون ہے۔ میں اس کے پاس کیسے جا سکتی ہوں۔"

"لگتا ہے اسے پوری طرح سمجھا نہیں سکا۔"

"تجھے کیا پتہ' میں نے اسے کس کس طرح سمجھانے کی کوشش کی۔" دارا نے اپنی کارگزاری سنائی۔ "وہ تو اپنے بھرا کو یاد کرتی رہی اور روتی رہی۔"

"اسے یہاں لانے کی کوشش نہیں کی؟"

"میں نے تو بار بار کہا۔" دارا نے صفائی پیش کی۔ "یہاں تک کہا' ایک بار چل کر مل تو لے۔ اس نے کوئی ضروری گل بتانی ہے۔ پر اس نے صاف انکار کردیا۔ کسی طرح یہاں آنے پر راضی نہیں ہوئی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیگماں سے ملنا نہیں ہو سکتا۔" رحیم داد کے لہجے میں مایوسی اور افسردگی تھی۔

"کیوں پریشان ہوتا ہے۔" دارا نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "تو اس کے بھلے ہی کی کوئی گل بتانا چاہتا ہوگا۔ وہ نہیں سننا چاہتی تو چھوڑ اسے۔ خامخاہ جی خراب کرنے سے کیا فائدہ۔"

"بات اس طرح نہیں ہے جیسے تو سوچ رہا ہے۔" رحیم داد نے بیگماں سے ملاقات کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مرنے والے سے میں نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنا چاہتا تھا۔ بیگماں سے گل بات ہو جاتی تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" دارا نے اس کی تائید کی۔ "اب میں تجھے اصلی گل بتاتا ہوں۔ ہوا یوں کہ پہلے تو وہ یہاں آنے کو کچھ کچھ تیار تھی۔ اچانک اس نے تیرا نام پوچھا۔ میں نے وہی کہا جو تو نے بتایا تھا۔ بس جی تیرا نام نہ بتانے پر وہ ایک دم اکھڑ گئی۔ کہنے لگی' جانے کون ہے۔ میں اس کے پاس نہیں جاتی۔ اس نے انکار کردیا اور مجھے شک بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔"

چند لمحے بعد رحیم داد نے بیزاری سے کہا۔ "اب اس کا ذکر چھوڑ۔ آگے کی سوچ۔"

"آگے کی تو تجھے سوچنا ہے۔ مجھے کیا سوچنا۔ کہہ تو دوبارہ بیگماں سے بات کرلوں؟ شاید مان جائے۔"

"تیرا خیال ہے وہ مان جائے گی؟"

"مشکل ہی لگتا ہے۔" دارا نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ویسے کوشش کرکے تو دیکھنا ہی چاہئے۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"ایک بار اور کوشش کرلینے میں حرج ہی کیا ہے۔" رحیم داد نے اس سے اتفاق کیا۔ "میں یہاں ایک روز اور ٹھہر جاؤں گا۔"

"آج تو اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔ کل دوپہر کو جاؤں گا۔ دوپہر کو وہ گھر میں اکیلی ہوتی ہے۔"

رحیم داد نے ایک بار پھر دارا کو سمجھایا کہ وہ بیگماں سے کس ڈھب سے بات کرے۔ دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ رحیم داد نے کھانا کھایا۔ کپڑے اب سوکھ گئے تھے۔ رحیم داد نے لباس تبدیل کیا۔

شام ہوگئی۔ دارا فصلوں کی رکھوالی پر چلا گیا۔ رحیم داد اکیلا رہ گیا۔

☆

دوسرے روز دوپہر کو دارا ایک بار پھر بیگماں کے گھر گیا۔ رحیم داد بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر دارا جب واپس آیا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ دارا کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر رحیم داد کو اندازہ ہوگیا کہ اس دفعہ بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ دارا تھکا ہوا سا رحیم داد کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے بات چیت نہیں کی۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اندھیرا بڑھتا رہا۔

کچھ دیر بعد رحیم داد کی آواز خاموشی میں ابھری۔

"لگتا ہے' بیگماں نے آج بھی تیری بات نہیں مانی۔"

"ہاں جی' بالکل نہیں مانی۔" دارا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کہتی تھی' اسے مجھ سے کوئی بات کہنی ہے تو وہ میرے پاس کیوں نہیں آتا۔ تجھے بار بار کیوں بھیجتا ہے؟"

"تو نے کیا کہا؟"

"مجھے کیا کہنا تھا جی! اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔"

"لگتا ہے ٹھیک سے سمجھا نہیں سکا۔" رحیم داد گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔

"ایسا نہ کہہ۔" اس دفعہ دارا کے لہجے میں قدرے تیکھا پن تھا۔ "تجھے کیا پتہ' میں نے اسے کس کس طرح سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔"

"پر ایسی کیا بات ہے کہ وہ یہاں آنے پر تیار نہیں ہوئی؟"

"مجھے تو ایسا لگا وہ مجھ پر شبہ کرنے لگی ہے۔"

"تو برا بندہ تو نہیں لگتا۔ اس نے تیرے بارے میں ایسا کیوں سوچا؟"

"ویسے تو پنڈ میں سبھی مجھے نیک بندہ سمجھتے ہیں۔" دارا نے صفائی پیش کی۔ "اسے کیوں شبہ ہوا؟ یہ تو وہی جانتی ہوگی۔"

"اب تک بیگماں کے پاس بیٹھا تھا؟"

"نا جی! اس نے زیادہ بات ہی نہیں کی۔ میں نے کئی بار اپنی بات دہرائی تو ایک دم بھڑک اٹھی۔ ناراض ہو کر بولی' تو نے منع کیا تھا اس لیے میں نے گھر والے سے تیرے بارے میں بات نہیں کی۔

پر اب ایسی بات کہنے میرے پاس آیا تو اسے صاف صاف کہہ دوں گی۔ تجھے پتہ ہے اس کا سر کتنا خراب ہے۔ ویسے وہ دیکھنے میں سیدھا سادہ لگتا ہے پر جب سنک آجائے تو پاگل ہو جاتا ہے۔ میں یہ بات سن کر گھبرا گیا۔ چپ کر کے اپنے زمیں دار کے پاس چلا گیا۔ وہیں سے آرہا ہوں۔ تیرے لیے روٹی بھی وہیں سے لایا ہوں۔"

دارا نے کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں نکال کر رحیم داد کے سامنے رکھ دیں۔ اٹھا اور ماچس جلا کر چراغ روشن کر دیا۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ وہ اس قدر دل گرفتہ تھا کہ آدھی روٹی کھانے کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ دارا کے اصرار کے باوجود اس نے اور کھانا نہیں کھایا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

"جس کام کے لیے آیا تھا' وہ تو بنا نہیں۔ مجھے اب واپس جانا ہے۔"

"اب تو اندھیرا ہو گیا۔ جانا ہے تو سویرے چلا جانا۔"

"تو کہتا ہے تو سویرے چلا جاؤں گا۔"

دارا کھانے سے فارغ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ "اب آرام سے سو' میں نوں جانا ہے۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ دارا چلا گیا۔ رحیم داد اٹھ کر آنگن میں گیا۔ چارپائی پر کھیس بچھایا۔ چراغ بجھایا اور لیٹ گیا۔

وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور رات کے تاریک ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے رات ہی کو دارا کے گھر سے جانا تھا۔ دن کے اجالے میں نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا' مگر سوال یہ درپیش تھا کہ وہ ڈھولا امیر خاں سے جاتا کہاں؟ صرف بیگماں کا گھر ہی محفوظ ٹھکانا تھا جہاں وہ روپوش رہ سکتا تھا۔ حالات نے ایسے دھارے پر ڈال دیا تھا کہ وہ اپنی اکلوتی بہن سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔ اپنی مجبوری اور بے بسی پر اس کا دل بھر آیا۔ بے قرار ہو کر وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے سینے سے غم کا غبار دھواں بن کر اٹھا' آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور رخساروں پر ٹپکنے لگے۔

وہ سسکیاں بھرتا رہا۔ رات کا اندھیرا بڑھ کر پھیلنے لگا۔ رحیم داد نے قمیص کے دامن سے آنسو پونچھے' چارپائی سے نیچے اترا۔ گھڑے سے پیالے میں پانی انڈیلا اور ہونٹوں سے لگا کر غٹاغٹ چڑھا گیا۔

اس کے دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو چکا تھا۔ وہ صحن میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے اس نے سوچا کہ دارا کے بجائے اسے خود بیگماں کے پاس جانا چاہئے تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوتا کہ مولا داد سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ مولا داد اپنے باپ کی طرح نہ ضدی ہے نہ اس سے شدید نفرت کرتا ہے۔

بیدی کے ساتھ شادی نہ کرنے کا مولا داد کو ملال ضرور تھا۔ رحیم داد سے اس کا اظہار بھی کر چکا تھا مگر وہ پولیس سے مخبری کر کے اس کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کا بڑا سبب بیگماں تھی جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔

رحیم داد نے طے کیا کہ اسے بیگماں کے پاس جانا چاہئے۔ مولا داد مل جائے تو اسے اپنے بارے میں صاف صاف بتا دینا چاہئے۔ رحیم داد کو امید تھی کہ وہ اس کی ضرور مدد کرے گا۔ باپ کے ڈر سے اگر اپنے پاس نہ ٹھہرا سکے گا تو کسی قابل اعتماد دوست کے پاس بندوبست کر دے گا۔ اسے مولا داد سے خیر کی توقع تھی' شر کی نہیں۔ رحیم داد نے بہت غور و فکر کے بعد اسی وقت بیگماں کے گھر جانے کا منصوبہ بنایا۔ آگے بڑھا اور دروازے پر پہنچ گیا۔

اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر باہر سے کنڈی چڑھی تھی۔ رحیم داد چند لمحے جھنجلایا ہوا کھڑا رہا پھر اس نے چارپائی اٹھا کر دیوار سے لگائی۔ اس کے سہارے دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔ قریب ہی جنگل تھا۔ جھاڑیوں میں جھینگر بول رہے تھے۔ رات جاگ رہی تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے چل رہے تھے۔

☆

رحیم داد بستی کی جانب بڑھا۔ وہ راستوں سے بخوبی واقف تھا۔ بارہا ڈھولا امیر خاں آچکا تھا' کئی کئی روز قیام کر چکا تھا۔ سنسان گلیوں سے گزرتا ہوا وہ بیگماں کے گھر کے دروازے پر بے کھٹکے پہنچ گیا۔ گلی ویران تھی۔ قریب ہی کسی گھر میں کوئی بچہ رو رہا تھا۔ لیکن بیگماں کے گھر پر گہری خاموشی طاری تھی۔

رحیم داد دم بخود اور سہما ہوا تھا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور دستک دینے کی غرض سے ایک ہاتھ بڑھا کر دروازے پر رکھا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ ہاتھ رکھتے ہی دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ اسی وقت گلی میں چاپ ابھری۔ رحیم داد نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جھٹ اندر داخل ہو گیا اور دروازہ بھیڑ دیا۔ سامنے کشادہ صحن تھا۔ دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ ایک چارپائی پر دو بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ دوسری خالی تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ رحیم داد نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

باورچی خانے میں چراغ روشن تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی صحن تک پھیلی ہوئی تھی۔ باورچی خانے سے ملا ہوا برآمدہ تھا۔ باورچی خانے اور برآمدے کے درمیان دیوار کے ساتھ کھرا تھا۔ یہ پختہ چبوترا تھا۔

رحیم داد نے دیکھا' بیگماں سر جھکائے کھرے پر بیٹھی برتن دھو رہی ہے۔ اس کی پیٹھ رحیم داد کی جانب تھی۔ وہ دبے دبے قدموں بیگماں کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو اس کا سایہ دیوار پر لہرایا۔ بیگماں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔

"کون ہے؟"

اس کے لہجے میں گھبراہٹ اور سراسیمگی تھی۔ رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیگماں کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ بیگماں نے دھندلی روشنی میں رحیم داد کا چہرہ دیکھا اور ایک دم پریشان ہو کر بولی۔ "توں' توں....." اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرے پر خوف چھایا تھا۔

رحیم داد نے رسان سے کہا۔ "میں رحیمے ہوں' تیرا ویر۔"

"نہیں' نہیں۔" اس نے انکار کرنے کے انداز میں جلدی جلدی گردن ہلائی۔ "توں رحیمے کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا ویر تو مر چکا ہے۔ توں....." اس کے چہرے سے اور زیادہ وحشت برسنے لگی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ پھاڑا۔ رحیم داد نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "ڈر نہیں' میں رحیمے ہی ہوں۔ میں مرا نہیں' زندہ ہوں۔ تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بیگماں! تو بھی مجھے نہیں پہچان سکی۔ میرے منہ کی طرف دیکھ۔ تجھے رحیمے نہیں لگتا؟" اس نے بیگماں کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیں منڈلانے لگیں۔

وہ بدستور خوف زدہ تھی۔ الجھے ہوئے لہجے میں اٹک اٹک کر بولی۔ "لگتا تو رحیمے ہی ہے پر....."

رحیم داد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "پہلے یہ بتا' مولا داد کہاں ہے؟"

"وہ چک ۱۹ گیا ہے۔" اس دفعہ بیگماں کا لہجہ قدرے سنبھلا ہوا تھا۔ "مجھے یقین نہیں آتا رحیمے ہے۔"

رحیم داد نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "تیرے سر کی سونہہ' میں رحیمے ہی ہوں۔ تیرا جایا' تیرا ویر۔ میری آواز نہیں پہچانتی؟ میں مرا نہیں۔ جو مرا ہے' وہ کوئی اور تھا۔ وہ کسی اور لاش تھی۔ ایسا ہوا تھا کہ....." اچانک گلی سے آواز ابھری۔

"بھابو! او بھابو۔"

بیگماں نے رحیم داد کو آہستہ سے دھکا دیا اور کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی جانب اشارہ کر کے بولی۔ "اندر چلا جا۔" رحیم داد تیزی سے لپکا اور کمرے میں چلا گیا۔

بیدی دروازہ کھول کر صحن میں داخل ہوئی۔ اس کی نگاہیں بیگماں کی طرف تھیں۔ بیگماں اسے

دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بیدی اس وکت کیسے آ گئی۔ سوئی نہیں ابھی؟"

اس نے بیگماں کی بات نظر انداز کرتے ہوئے مولا داد کے بارے میں پوچھا۔ "کیا ویر لوٹ آیا؟"

"نہیں۔" بیگماں نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "وہ تو سویرے لوٹے گا۔ یہی کہہ کر گیا تھا۔"

بیدی اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ "فیر تو کس سے گل کر رہی تھی؟"

"لے' میں نے کس سے گل کرنی تھی۔" بیگماں نے اپنی گھبراہٹ کی پردہ پوشی کے لیے مسکرانے کی کوشش کی۔ "وہم تو نہیں ہو گیا؟"

"میں تو سو گئی تھی۔ ایسا لگا' تو کسی سے گل بات کر رہی ہے۔" بیدی نے وضاحت کی۔ "میں نے سوچا' ویرن آ گیا ہے۔ اس سے کہنا تھا' سویرے مجھے کوٹ بہادر پہنچا دے۔ گھر والے کی طبیعت گڑبڑ ہے۔ میں نوں کل واپس جانا ہے۔"

"تیرا بھرا تو اب سویرے ہی آئے گا۔ تیں نوں تو پتہ ہی ہے۔ اللہ داد بھی اس کے ساتھ ہی گیا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی کل تیرے گھر پہنچا دے گا۔ اب تو جا کر آرام سے سو۔ ویسے میں مولا داد کو بتا دوں گی۔ تیں نوں واپس گھر جانا ہے۔"

بیدی خاموش رہی۔ اس نے نظریں اٹھا کر برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی جانب دیکھا جس کے پیچھے رحیم داد اندھیرے میں سہما ہوا کھڑا تھا۔ وہ چند لمحے چپ چاپ کھڑی رہی پھر مڑی اور آہستہ آہستہ بیرونی دروازے کی جانب بڑھی۔

بیگماں نے اسے روکنے کی کوشش کی نہ کوئی بات کی۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی گھبراہٹ چھائی تھی۔ بیدی باہر چلی گئی۔ بیگماں نے ہاتھ دھوئے اور اپنی دھوتی سے پونچھے' چبوترے سے اتری۔ اس نے گلی میں کھلنے والا دروازہ بند کیا۔ باورچی خانے میں گئی' لالٹین روشن کی اور اسے ایک ہاتھ میں لٹکائے ہوئے کمرے میں گئی۔ رحیم داد دروازے کے قریب خاموش کھڑا تھا۔ بیگماں نے لالٹین اٹھا کر رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے اب تک شبہ ہے میں تیرا ویر رحیمے نہیں ہوں؟"

"دیکھنے میں تو رحیمے ہی لگتا ہے۔" بیگماں نے دبی زبان سے بے یقینی اور تذبذب کا اظہار کیا۔ "میں مولا داد کے ساتھ احمد کوٹ گئی تھی۔ لاش تو دیکھی نہیں پر سب تیرا ہی نام لیتے تھے۔ پولیس بھی یہی کہتے تھے رحیم داد کو کتل کر دیا گیا۔ بھابی تو وہاں تھی نہیں۔ جانے کہاں چلی گئی۔ پنڈ والوں

نے لاش دفن کی' کبر بنائی۔ میں کبر پر گئی' اسے دیکھا اور چیخیں مار کر روئی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"توں نہیں تھا تو وہ کس کی لاش تھی؟ کسے دفن کیا گیا تھا؟"

"میں تجھے یہی بتا رہا تھا کہ بیدی آگئی۔ وہی تھی نا؟"

"ہاں وہی تھی۔ وہ کئی روز سے یہیں ہے۔"

"وہ کسی اور بندے کی لاش تھی۔" رحیم داد نے بیگماں کو مطلع کیا۔ "وہ ادھر نہریاری دو آب کے پاس نبوں میں مرگیا تھا۔ میں نے اس کے کپڑے اتار کر پہن لیے' اپنی جیل کی وردی اسے پہنا دی۔ تجھے یہ تو پتہ ہی ہوگا' میں جیل سے فرار ہوگیا تھا۔ پولیس سے چھپتا لکتا پھرتا تھا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "میں نے لاش کا منہ پتھر سے اس طرح کچل دیا تھا کوئی پہچان نہ سکے۔ جیل کی وردی سے سب کو یہی دھوکا ہوا وہ میری لاش ہے۔"

"سچ کہہ رہا ہے؟" بیگماں نے تڑپ کر پوچھا۔ "ہاں' تو رحیے ہی ہے۔ وہی آنکھیں' ویسی ہی آواز' ہائے ربا' میرا ویر زندہ ہے۔" وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی۔ رحیم داد کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ اس کے سر پر شفقت سے آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ دونوں سسکیاں بھرتے رہے۔

کچھ دیر بعد رحیم داد نے آنسو پونچھے۔ آہستہ سے بولا۔ "رونا دھونا بند کر بیگماں! مجھے تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

بیگماں نے علیحدہ ہوتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا دارا کو توں نے ہی میرے پاس بھیجا تھا؟"

"ہاں' میں نے ہی بھیجا تھا۔"

"ہائے' میں مرگئی۔" بیگماں نے پشیمانی کا اظہار کیا۔ "میں نے سوچا' جانے کون ہے؟ کیوں بلاتا ہے؟ تیرا یار بیلی بتا کر اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ میں تو واپسی پر مولا داد کو بھی بتانا چاہتی تھی۔"

"یہ ٹھیک کیا کہ مولا داد کو نہیں بتایا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "بات یہ ہے' میں ابھی تک پولیس سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ اگر پولیس نے مجھے پہچان لیا تو میں فیر جیل میں بند کردیا جاؤں گا۔ اس بار میرے خلاف جیل سے فرار ہونے کے علاوہ کتل کا مکدمہ بھی چلے گا۔"

"جس کی لاش کو توں نے اپنی جیل کی وردی پہنائی تھی۔" بیگماں نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا اسے توں نے کتل بھی کیا تھا؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے حکیم نذر محمد چشتی کے قتل کا اعتراف نہیں کیا۔ "پر سیف اللہ' جس کے ساتھ جھگڑے میں مجھے جیل ہوئی تھی' تجھے پتہ ہے' بعد میں اسپتال میں مرگیا۔ پولیس اسے کتل

کہتی ہے۔ اس نے میرے خلاف کتل کا مکدمہ بھی بنالیا ہے۔"

"اب کیا ہوگا؟" بیگماں کی آنکھوں میں خوف تھا۔

"میں تیرے گھر چھپنے آیا ہوں۔ مولا داد تو مان جائے گا پر چاچا سے ڈر لگتا ہے۔ وہ مجھ سے بہت ناراض ہے۔"

"چاچا سے بھی زیادہ بیدی ناراض ہے۔ ہمیشہ تجھے برا بھلا کہتی ہے۔ میرا کتنی بار اس سے جھگڑا ہوا۔ وہ سمجھتی ہے' توں نے ویاہ نہ کرکے اس کی بے عزتی کی۔ تیرا ذکر آتا ہے تو اس کا منہ لال ہو جاتا ہے۔"

"میں نے اس سے ویاہ نہ کرکے برا کیا۔" رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ "نوراں کے لیے میں نے بیدی اور چاچا کو اتنا ناراض کیا پر وہ میری نہ بن سکی۔ بے وفا اور دھوکے باز نکلی۔"

بیگماں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر استفسار کیا۔ "کیا بھابی کے پاس گیا تھا؟"

"ہاں' پہلے میں اسی کے پاس گیا تھا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ جمال دین کے ساتھ رہتی ہے۔ جب میں جیل میں تھا' تبھی سے اس نے جمال دین سے یاری لگالی تھی۔"

"تب تو وہ پولیس سے تیرے خلاف مخبری کرسکتی ہے۔"

"نہیں' میں رات کے اندھیرے میں چھپ کر اس کے پاس گیا تھا۔ نہ میں اسے ملا' نہ بات کی۔ اس نے مجھے دیکھا بھی نہیں۔"

"اب وہ کہاں رہتی ہے؟"

"اکال گڑھ میں جمال دین کے ساتھ رہتی ہے۔" رحیم داد کے لہجے میں تلخی پیدا ہوگئی۔ "اس کمری کو پتہ چل گیا تو مجھے پکڑوا دے گی۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "تیرے گھر کے علاوہ مجھے چھپنے کا کوئی ٹھکانا نظر نہیں آتا۔ چھپا چھپا پھرتا ہوں۔ ہر دم خطرہ سر پر منڈلاتا ہے۔ جب ہر طرف سے مایوس ہوگیا تو تیرے پاس آگیا۔"

قریب کے گھر سے رات کے سناٹے میں کوئی رک' رک کر کھانسنے لگا۔ بیگماں نے پریشان ہو کر کہا۔ "لگتا ہے' چاچا جاگ رہا ہے۔ وہ ادھر بھی آسکتا ہے۔"

"تب تو مجھے چلا جانا چاہیے؟"

"دارا ہی کے گھر جائے گا ناں؟" بیگماں نے دریافت کیا۔ "وہ بتاتا تھا' توں اس کے گھر میں ٹھہرا ہے؟"

"ہاں' میں اسی کے گھر میں ہوں۔"

"وہاں جا کر سو۔ میں سویرے مولا داد سے تیرے بارے میں بات کروں گی۔ وہ میرا کہنا نہیں ٹالے گا۔ اللہ داد بھی مان جائے گا۔ وہ برا بندہ نہیں ہے صرف چاچا کو منانا پڑے گا۔ بیدی ہے' وہ تو کل اپنے گھر جا رہی ہے۔ مہینوں بعد آتی ہے۔"

"میں کل رات کو آجاؤں گا۔"

"نہیں' تیرا آنا ٹھیک نہیں۔" بیگماں نے منع کر دیا۔ "میں مولا داد کو تیرے پاس بھیجوں گی۔ ویسے وہ آج کل فصل کی واڈھی کی فکر میں لگا ہے۔ وہ واڈھی کے لیے لاوے لانے اللہ داد کے ساتھ چک ۱۹ گیا ہے۔"

"میں دارا کے گھر میں مولا داد کا انتظار کروں گا۔"

بیگماں خاموش رہی۔ رحیم داد آگے بڑھا۔ بیگماں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں کمرے سے نکل کر صحن میں پہنچے۔ بیگماں نے آگے بڑھ کر کنڈی کھولی' گردن باہر نکال کر گلی میں جھانکا اور رحیم داد کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

رحیم داد گلی میں آ گیا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

رات گہری ہو گئی تھی۔ گاؤں سنسان تھا۔ دور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد اس سمت نہیں گیا۔ گلیوں سے گزرتا ہوا کھیتوں کی طرف نکل گیا مگر دارا کے پاس جانے کے بجائے اس کے گھر پہنچا۔ کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ رحیم داد اندر گیا' دروازہ بند کیا اور اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

سویرے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دارا سامنے کھڑا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ دروازے کی کنڈی لگائی۔ وہ حیرت زدہ اور پریشان نظر آتا تھا۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔

"رات تیرے پاس کوئی آیا تھا؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے انکار میں گردن ہلائی۔

"باہر سے دروازے کی کنڈی کیسے کھل گئی؟ میں شام کو کنڈی چڑھا کر گیا تھا۔ مجھے صاف صاف بتا۔"

"میں رات بیگماں کے گھر گیا تھا۔ باہر سے دروازہ بند تھا۔ مجھے دیوار پھاند کر باہر جانا پڑا۔"

"تو دیوار بھی پھاند سکتا ہے؟" دارا نے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

رحیم داد نے اس کا شبہ دور کرنے کی غرض سے وضاحت کی۔ "میں نے منجی دیوار سے لگائی۔ اس پر چڑھا اور باہر کود گیا۔ واپسی پر میں کنڈی کھول کر اندر آیا تھا۔ پر مجھ سے ایسی باتیں کیوں پوچھ رہا ہے؟"

دارا نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "بیگماں کے گھر گیا تھا' کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ میں نے جو کچھ کہنا تھا' کہہ دیا۔"

"یہ تو بہت ہی ٹھیک ہوا۔ بیگماں نے تجھے ملنے سے انکار کیا تو مجھے بڑا دکھ ہوا تھا۔" دارا نے رحیم داد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ "اب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"میں ابھی یہیں ٹھہروں گا۔" رحیم داد نے اسے آگاہ کیا۔ "مولا داد میرے پاس آئے گا۔"

"مولا داد تیرے پاس آئے گا۔" دارا کے لہجے میں تعجب تھا۔ "وہ کیوں آ رہا ہے؟ تجھے اس سے کیا لینا؟" وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ "تیرے پاس تو بیگماں کو آنا چاہئے۔ تجھے تو اسی سے ملنا ہے۔" اس نے شوخی سے آنکھ ماری۔ "تو مجھ سے چھپا رہا ہے' پہلے کچھ اور ہی گل کی تھی۔"

"تجھے ابھی تک میرے بارے میں شبہ ہے؟" رحیم داد نے اسے ایک بار پھر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے تجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دیا' تجھے میری باتوں پر اعتبار نہیں آتا؟ اگر کوئی ایسی ویسی گل ہوتی تو مولا داد میرے پاس کیوں آتا؟ اپنے دل سے شبہ نکال دے۔"

"تو ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔" دارا نے مطمئن ہونے کے انداز میں کہا۔ "میں نوں کیہ لینا ہے۔ مجھے تو یہ خوشی ہے تیرا کام بن گیا۔ توں جو چاہتا تھا وہ ہو گیا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ دارا روٹی پکانے جھلیانی میں چلا گیا۔

دونوں نے ناشتا کیا۔ دارا رات بھر کا جاگا ہوا تھا ناشتے سے فارغ ہوتے ہی سو گیا۔ رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ کھولا۔ ایک سادہ کاغذ نکالا۔ چوہدری نور الٰہی مرحوم کے دستخط سامنے رکھے اور ان کی نقل بنانے کی مشق کرنے لگا۔ فرصت کے لمحات میں وہ چوہدری نور الٰہی کے جعلی دستخط بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ جب سے نور الٰہی کے کلیم کے دستاویزات اس کے قبضے میں آئی تھیں' وقت کاٹنے کے لیے یہ اس کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔

دارا سہ پہر کو بیدار ہوا۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ رحیم داد سے اس نے کہا۔ "تجھے روٹی کھانی ہو تو چھنکے سے اتار لینا۔ سویرے کی پکی ہوئی

روٹی اس میں رکھی ہے۔"

"تجھے روٹی نہیں کھانی؟"

"نہیں' میں زمیں دار کی حویلی جاؤں گا۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ وہیں روٹی کھالوں گا۔"

"شام کو تو واپس آئے گا نا؟"

"اب کل سویرے ہی تجھ سے ملنا ہوگا۔ مجھے زمیں دار کے یہاں کچھ کام کرنا ہے۔ حویلی۔ سیدھا رکھوالی کے لیے کھیتوں کی طرف چلا جاؤں گا۔" دارا نے توقف کیا۔ "تجھے رات کو تو یہا سے جانا نہیں۔ جائے گا تو سویرے ہی جائے گا نا؟"

"رات کو جاؤں یا سویرے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے مل کر ہی جاؤں گا۔"

دارا بھی مسکرایا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے کنڈی لگائی' بستے سے کاغذات نکالے ا ایک بار پھر چوہدری نورالٰہی مرحوم کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کرنے لگا۔

دن ڈھلا' سائے طویل ہوگئے۔ اپریل کے صاف ستھرے نیلے آسمان کی رنگت دھندلی ہوتی گ رحیم داد بار بار نظریں اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھتا۔ اس کے کان آہٹ پر لگے تھے۔ دن ہوا۔ شام نیچے اترنے لگی۔ مگر دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ گھر میں اندھیرا پھیل گیا۔ ر داد نے چراغ روشن نہیں کیا۔ روشنی دور سے نظر آتی تھی جو صاف چغلی کھاتی کہ گھر میں کوئی مو ہے۔ رحیم داد یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بیگماں سے ملنے کے بعد اسے خوشی حاصل تھی' اطمینا ملا تھا۔ مگر ساتھ ہی خطرہ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ ہر خطرے سے بچنے کے لیے پوری پوری احتیاط چاہتا تھا۔

☆

شام تاریک ہوگئی۔ رات آگئی۔ رحیم داد اندھیرے گھر میں خاموش بیٹھا رہا۔ یکایک درواز پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ رحیم داد نے چونک کر اس طرف دیکھا' اٹھا اور آہستہ آہستہ دروازے پہنچا۔ آہٹ رک رک کر ابھرتی رہی۔

اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے؟" کوئی جواب نہ ملا۔ چند لمحے تک خاموش رہ رحیم داد نے پگڑی کھولی۔ چہرہ چھپانے کے لیے ڈھاٹا باندھا۔ جیب سے چاقو نکالا' کھول کر ہاتھ ہوشیاری سے سنبھالا۔ کنڈی آہستہ سے کھولی اور پوری طرح چوکس ہو کر کھڑا ہوگیا۔

دروازہ کھلا مگر وہ مولا داد نہیں تھا۔ بیگماں دہلیز پر کھڑی تھی۔ وہ اندر آگئی۔ رحیم داد نے پھر کن لگا دی۔ بیگماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہاں تو بہت اندھیرا ہے۔ توں نے روشنی بھی نہیں کی؟"

"یہ بتا' تو کیسے آگئی؟ مولا داد کیوں نہیں آیا؟"

"وہ آج بھی لاوے لینے چک ۱۹ گیا ہے۔ پر توں نے منہ پر منڈاسا کیوں باندھ رکھا ہے؟ ہاتھ میں چاکو بھی دیا ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

"تجھے کیا پتہ' مجھے ہر دم کتنا ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔" وہ مسکرایا اور ڈھاٹا کھولتے ہوئے بولا۔ "اتھے منجی پر بیٹھ جا۔"

دونوں چارپائی کے پاس گئے اور ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ بیگماں کے ہاتھ میں پوٹلی دبی تھی۔ رحیم داد نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"تیرے لیے روٹی لائی ہوں۔" اس نے پوٹلی کھول کر کھانا نکالا۔ "تیز خوشبو ابھری۔ بیگماں نے گرم گرم پراٹھے اور تلا ہوا مرغ رحیم داد کے آگے رکھ دیا۔ پیار بھرے لہجے میں بولی۔ "پہلے روٹی کھالے' بعد میں گل بات ہوگی۔"

رحیم داد آلتی پالتی مار کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بھوکا بھی تھا۔ کئی روز بعد اتنا اچھا کھانا ملا تھا۔ پراٹھے کے لقمے توڑ توڑ کر جلدی جلدی کھانے لگا۔ بیگماں ہنس کر بولی۔

"بہت بھوکا لگتا ہے۔"

رحیم داد نے مرغ کی ٹانگ سے گوشت نوچتے ہوئے کہا۔ "پر ونٹے بہت مزے دار ہیں' ککڑ بھی زوردار تلا ہے۔" اس نے گھڑے کی طرف اشارہ کیا۔ "پینے کو پانی دے دے۔"

بیگماں اٹھی' اس نے پیالے میں پانی انڈیلا۔ پیالہ لا کر رحیم داد کو دیا۔ اس نے چند گھونٹ پیئے اور پیالہ سامنے رکھ دیا۔

رحیم داد نے بیگماں کی جانب دیکھا۔ وہ زمیں داروں کی عورتوں کی طرح ریشمی قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا بھی ریشمی تھا۔ بالوں میں خوشبودار تیل پڑا تھا' آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ وہ غسل کرکے عمدہ لباس پہن کر آئی تھی۔ بیگماں نے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہا ہے؟"

"تو نے بہت بناؤ سنگھار کر رکھا ہے۔"

"تجھے کیا پتہ' میں رات سے کتنی خوش ہوں۔ یہ جان کر' توں زندہ ہے' مجھے اتنی خوشی ہوئی' اتنی خوشی ہوئی' بس کیا بتاؤں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "میرا ایک ہی ویر ہے۔ تیرے سوا میرا اور کون

ہے؟ میں نہ خوش ہوں گی تو کون ہوگا؟" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"لے' تونے تو رونا بھی شروع کردیا۔" رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلا۔ "یہ بتا' مولاداد کیوں نہیں آیا؟ میرے بارے میں اس سے بات کی تھی؟"

"نہیں۔" بیگماں نے جواب دیا۔ "تیرے بارے میں ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ سویرے وہ آیا تو اللہ داد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اللہ داد کے سامنے تو ایسی بات کر نہیں سکتی تھی۔"

"بعد میں کرلیتی۔"

"دونوں ساتھ ساتھ آئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ چلے گئے۔ مولا داد دوپہر کو روٹی کھانے آیا تھا پر تھوڑی دیر ٹھیرا۔ روٹی کھاتے ہی باہر چلا گیا۔ وہ اپنے پیو کے پاس گیا تھا۔ دن ڈھلے تک وہیں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ سب فصلوں کی واڈھی کی تیاری میں لگے ہیں۔ کل سویرے نہیں تو پرسوں سے واڈھی شروع ہوجائے گی۔ اب زیادہ دیر نہیں کی جاسکتی۔ بیساکھی شروع ہوچکی ہے۔ ہر طرف فصلوں کی واڈھی ہو رہی ہے' جبھی تو واڈھی کرنے والے لاوے مل نہیں رہے۔ مولا اور اللہ داد اسی لیے تو روز روز لاوؤں کو بلانے کے لیے ادھر ادھر بھاگ دوڑ کررہے ہیں۔"

"جب مولا داد روٹی کھانے آیا تھا' تب تو وہ اکیلا تھا۔ میرے بارے میں بات چھیڑ کر تو دیکھی ہوتی۔"

"نہیں ابھی نہیں۔ میں نے جان کر اس سے کوئی بات نہیں کی۔" بیگماں نے وضاحت کی۔ "بیدی کو آج سویرے اپنے گھر والے کے پاس کوٹ بہادر جانا تھا پر وہ گئی نہیں۔ جب تک وہ موجود ہے' میں تیرے بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے بیدی سے ڈر لگتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں' وہ کتنی کمینی اور چنڈال ہے۔ تیرے تو نام ہی سے اسے آگ لگ جاتی ہے۔ ذرا بھی پتہ چل گیا تو وہ ضرور اپنا کمینہ پن دکھائے گی۔"

"وہ کب تک اور ٹھیرے گی؟"

"کل سویرے جانے کو کہتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ہی مولاداد سے تیرے بارے میں بات کرنا ٹھیک رہے گا۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "بیدی کو میرے بارے میں کوئی شبہ تو نہیں ہوا؟"

"پتہ نہیں۔ کل تو بالکل اچانک گھس آئی تھی۔ دروازہ بھی تو کھلا رہ گیا تھا' پر میں نے اسے اپنے طور پر سمجھا بجھا دیا تھا۔ ویسے وہ ہے بہت مکّار۔"

"ٹھیک ہے' اس کے جانے کے بعد ہی مولاداد سے بات کرنا۔ میں دو ایک روز اور یہاں ٹھیرا

رہوں گا۔ ویسے یہ گھر چھپنے کے لیے ٹھیک ہے۔ پنڈ سے الگ ہے اور جھنگر کے پاس ویرانے میں ہے۔ ادھر دن میں بھی کوئی نہیں آتا۔"

"پر دیوا تو جلالیا ہوتا۔ تجھے اندھیرے سے گھبراہٹ نہیں ہوتی؟"

"میں نے جان کے دیوا نہیں جلایا۔ اس سے شبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں' کوئی دیکھے تو یہی سمجھے گھر بالکل خالی ہے۔"

"اور جو کوئی چور شور آگیا؟"

"یہاں دھرا ہی کیا ہے جو کوئی چوری کرنے آئے گا۔"

رحیم داد نے کٹورا اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگا۔ بیگماں نے کہا۔ "میں تو تجھے یاد کرکے دن رات روتی تھی۔ کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ پر تو نے بھی کبھی مجھے یاد کیا؟"

"کیوں نہیں یاد کیا؟ تجھے یاد نہ کرتا تو تیرے پاس آتا کیوں؟ کسی اور طرف نکل جاتا۔" رحم داد نے پانی کا خالی کٹورا رکھتے ہوئے اس کی دل جوئی کی۔ "تجھے پتہ ہی ہے۔ ماں اور پیو کا مرن ہوا تب تو بہت چھوٹی تھی۔ میں نے تجھے اولاد کی طرح پالا ہے۔ ویسے میں بھی چھوٹا ہی تھا۔ چاچا تجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا پر میرا جی نہ چاہا تجھے اپنے سے دور رکھوں۔ جب تیرا ویاہ ہوا تو میں کتنا رویا تھا۔ تجھے یاد ہے نا؟"

"ہاں' مجھے یاد ہے۔ بار بار روتا تھا۔ سب تجھے سمجھاتے تھے۔ پر میں بھی تو بہت روئی تھی۔"

"میں برابر تیرے گھر آتا تھا۔ تجھے اپنے ساتھ لے آتا تھا۔ تیرے آنے سے ایسا لگتا جیسے میرے اندھیرے گھر میں اجالا ہوگیا۔" رحیم داد بیتے دنوں کی راکھ کریدنے لگا۔ "پر نوراں سے ویاہ کے بعد چاچا نے مجھے تجھ سے جدا کردیا۔ میں ان دنوں چھپ چھپ کر روتا تھا۔" رحیم داد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے قمیص کی آستین سے آنسو پونچھے۔ بیگماں بھی رونے لگی۔ دونوں خاموش بیٹھے یادوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹکتے رہے۔

کچھ دیر بعد بیگماں کی آواز ابھری۔ "پر نوراں بھابی تو تجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس نے تجھ سے دھوکا کیوں کیا؟ وہ ایسی تو نہیں تھی اور جمال دین تو تیرا بہت گہرا یار تھا۔ ہر دم تیرے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ سیف اللہ اور اس کے بھائیوں سے جھگڑا ہوا تو وہ تیرے ساتھ جم کر لڑا۔ زخمی ہوا۔ جیل میں بھی بند رہا۔ چھوٹ گیا تب بھی جیل میں تجھے ملنے جاتا تھا۔ جب میں تجھے ملنے جیل گئی تھی' اس روز وہ بھی موجود تھا۔ بعد میں اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہی تو مجھے دکھ ہے۔ نوراں نے میرے ساتھ ایسا دھوکا کیا کہ مجھے بچوں سے بھی گھن آنے

گی۔ میں نے سب کو بھلا دیا۔ نوراں کو بھی' بچوں کو بھی۔ اب تیرے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں رہا۔"

رحیم داد کی آواز بھرا گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں چپ بیٹھے رہے۔ ذرا دیر بعد بیگماں نے کہا۔ "روٹی تو کھا' تو نے روٹی بھی چھوڑ دی۔"

"نہیں' اب میں نہیں کھاؤں گا۔"

"اب میں تجھے جانے نہیں دوں گی۔ اپنے ساتھ ہی رکھوں گی۔"

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں پر چاچا بھی راضی ہو جائے گا؟"

"مولاداد اسے راضی کرلے گا۔" بیگماں نے اسے تسلی دی۔ "فکر نہ کر۔ مولاداد میری بات ضرور مان لے گا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ کہے گا تو چاچا بھی ضرور مان جائے گا۔ ویسے بھی اب وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ چاچی کے مرنے کے بعد تو زیادہ ہی کمزور ہو گیا۔ طبیعت میں پہلی جیسی گرمی بھی نہیں رہی۔"

"پر بیدی جو موجود ہے۔ وہ ضرور رولا ڈالے گی۔" رحیم داد نے خدشہ ظاہر کیا۔

"وہ روز روز تھوڑا ہی آتی ہے' مہینوں بعد آتی ہے۔ اب اس کا پورا ٹبر ہو گیا۔ گھر والا ہے' چار بچے ہیں۔ انھیں چھوڑ کر کیسے آسکتی ہے؟ سب کو ساتھ لانا بھی آسان نہیں۔ ویسے بھی اس کا گھر والا روز ہی بیمار رہتا ہے۔" بیگماں نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "کل سویرے وہ جا رہی ہے۔ کئی مہینے بعد آئے گی۔ تب تک کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ اتنے دنوں میں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ "کہتی تو ٹھیک ہے۔ تین چار مہینے مل جائیں' تب تک میں کہیں زمین بھی الاٹ کرالوں گا۔"

"زمین الاٹ کرالے گا؟ کیسے؟ تو پناہ گیر تو ہے نہیں۔" بیگماں نے حیرت ظاہر کی۔

"دیکھ لینا' میں کیسے زمین الاٹ کراتا ہوں۔" اس نے سرہانے رکھے ہوئے بستے کی جانب اشارہ کیا۔ "اس میں کلیم کے کاغذ ہیں۔ بہت وڈا کلیم ہے' ہزاروں کلّے زمین کا۔"

"کیسی باتیں کر رہا ہے؟" وہ اور زیادہ حیرت زدہ ہو گئی۔ "تیری باتیں سمجھ نہیں آئیں۔"

"ابھی تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ پر جب میں زمین الاٹ کرالوں گا تب خود دیکھ لے گی۔ میں تجھے اور مولاداد کو بھی اپنے پاس بلا لوں گا۔"

"ایسا ہو جائے تو بیدی کا بیچ سے کانٹا ہی نکل جائے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ "پر یہ سب کچھ ہو گا

کیسے؟"

"میں تجھے سب کچھ بتادوں گا پر ابھی نہیں۔ مجھے چند مہینے اطمینان سے رہنے کا ٹھکانا مل جائے' فیر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

"بھابی نے برا کیا ورنہ وہ تیرے ساتھ عیش کرتی۔"

"اس کی گل نہ کر۔" رحیم داد نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اب اس کا نام بھی نہیں سننا چاہتا۔ یوں سمجھ لے' میرے لیے وہ مر گئی۔ اس کے ساتھ بچے بھی مر گئے۔"

"ویرا ایسا نہ کہہ۔" بیگماں تڑپ کر بولی۔ "بچے تیرے ہی ہیں۔ ان کا تو کوئی کسور نہیں۔"

"پتہ نہیں وہ میرے بچے ہیں یا جمال دین کے۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں نے اپنے کانوں سے نوراں کو یہ کہتے سنا' جمال دین سے اس کی بہت پرانی یاری تھی۔"

"یہ گل اس نے تجھ سے کہی تھی؟"

"مجھے کہتی تو میں اسے زندہ کب چھوڑتا۔ مجھے اتنا بے غیرت سمجھتی ہے؟" رحیم داد نے تلخ لہجے میں بتایا۔ "میں رات کو اس کے گھر چھپ کر گیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا نہیں۔ وہ تو جمال دین سے باتیں کر رہی تھی۔"

"سمجھ نہیں آتی۔ وہ ایسی لگتی تو نہیں تھی۔"

"میں بھی تیری طرح دھوکے میں رہا۔ وہ کیسی ہے؟ تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس رات کی باتیں یاد کرتا ہوں تو سینے میں آگ جل اٹھتی ہے۔" رحیم داد کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔

بیگماں نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔ "تیری احمد کوٹ کی زمین کا کیا بنے گا؟"

"گولی مار اس زمین کو۔ تھی ہی کتنی۔" رحیم داد نے جوش سے کہا۔ "اب تو میں مربعے الاٹ کراؤں گا اور بہت عمدہ زمین دیکھ بھال کر لوں گا۔ الاٹمنٹ ہو جانے دے۔ تب تو دیکھنا' زمیں داری کیا ہوتی ہے۔ باراں چوداں کلّے زمین کی بھی کوئی زمیں داری ہوئی۔"

رحیم داد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ رحیم داد نے جھٹ ایک بار پھر منہ پر ڈھاٹا باندھا۔ دروازے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو باہر سے آواز آئی۔

"دروازہ کھول' میں ہوں دارا۔"

رحیم داد نے کنڈی کھولی' دارا اندر داخل ہوا۔ رحیم داد نے تعجب سے کہا۔ "تو نے تو سویرے آنے کا کہا تھا' اب کیسے آگیا؟"

"میں تیرے لیے روٹی لایا تھا۔" اس نے کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں اس کی طرف بڑھائیں۔ رحیم داد نے کھانا نہیں لیا۔ "میں تو روٹی کھا چکا۔ اسے اپنے ساتھ ہی لے جا۔ مجھے اب کچھ نہیں کھانا۔"

دارا نے دھندلی روشنی میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی بیگماں کو غور سے دیکھا اور پہچان بھی لیا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔ چند لمحے گم صم کھڑا رہا پھر رحیم داد سے باہر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ باہر آ۔ تجھ سے بات کرنی ہے۔"

رحیم داد اس کے ہم راہ چلا گیا۔ باہر گہرا سناٹا تھا۔ اندھیرا ہر طرف پھیلا تھا۔ دارا نے رازداری کے انداز میں دبی زبان سے کہا۔

"تو نے تو کہا تھا' مولا داد تیرے پاس آئے گا۔ پر یہ تو بیگماں ہے' وہی ہے نا؟"

"ہاں' وہی ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "میرے لیے روٹی لے کر آئی تھی۔ پر و نصے تھے' ٹلا ہوا ٹکڑ تھا۔ میں نے ساری روٹی نہیں کھائی۔ تیرے لیے رکھ چھوڑی ہے۔ جی چاہے تو ابھی کھالے نہیں تو سویرے کھالینا۔"

"میں روٹی کھا کر آیا ہوں۔ اب بالکل بھوک نہیں ہے پر مولا داد تیرے پاس کیوں نہیں آیا؟"

"وہ دن ڈھلے اپنی فصلوں کی واڈھی کے لیے لاوے لینے چک ۱۹ چلا گیا۔ رات دیر سے لوٹے گا اس لیے نہیں آیا۔"

"تجھے کس نے بتایا' مولا داد چک ۱۹ گیا ہے۔" دارا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے اپنے زمیں دار کی حویلی میں دیکھا تھا۔ تو کہتا ہے' وہ دن ڈھلے چک ۱۹ چلا گیا۔"

"مجھے تو یہی معلوم ہوا تھا۔" رحیم داد بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ "تیری اس سے کوئی گل بات تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔" دارا نے انکار میں گردن ہلائی' دبی زبان سے بولا۔ "مجھے سچ سچ بتا دے' اصل معاملہ کیا ہے؟ بیگماں سے تیری یاری ہے' تب بھی میں نے کیا لینا۔"

"ہر بار ایسی گل کیوں کرتا ہے۔" رحیم داد جھنجلا گیا۔ "میری بات کا اعتبار کیوں نہیں کرتا؟ تو کیسا بندہ ہے؟"

"ناراض نہ ہو۔" دارا نرم پڑ گیا۔ "میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ اگر کوئی ایسی گل ہے تو میں تیری مدد ہی کروں گا۔" اس نے تامل کیا۔ "مجھے تو یہ ڈر ہے کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے' تو کسی مشکل میں نہ پڑ جائے۔"

"دارا! میں نے تجھے اپنا یار کہا ہے' تجھ سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔ سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا پر جو تو سوچ رہا ہے' ایسا بالکل نہیں ہے۔" رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو ٹھیک ہی کہتا ہو گا۔" اس نے رحیم داد سے الجھنے کی کوشش نہیں۔ "اب میں چلوں گا سویرے آؤں گا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ دارا آگے بڑھ گیا۔ رحیم داد گھر میں واپس آ گیا۔ اس نے کنڈی لگائی اور بیگماں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"دارا باہر گلی میں تجھے کیا کہتا تھا؟"

"اس نے عجب گل بتائی۔ تو کہتی ہے' مولا داد چک ۱۹ چلا گیا۔ دارا کہتا ہے وہ اسے زمین دار کی حویلی میں تھوڑی ہی دیر پہلے ملا تھا۔"

بیگماں بھونچکا ہو کر بولی۔ "مجھ سے تو وہ یہی کہہ کر گیا تھا۔ تب تک سورج بھی نہیں ڈوبا تھا۔ میں نے تیرے لیے روٹی تیار کی' نہائی' کپڑے بدلے اور اندھیرا ہوتے ہی یہاں آ گئی۔"

"مولا داد نے تجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟"

"پتہ نہیں۔" وہ بدستور حیرت زدہ تھی۔ "وہ مجھ سے جھوٹ تو نہیں بولتا۔ ہو سکتا ہے' چک ۱۹ جاتے ہوئے کوئی کام یاد آ گیا اور وہ زمیں دار کے پاس چلا گیا۔"

"ایسا ہی ہو گا۔ اب تجھے جانا چاہئے۔ مولا داد گھر پہنچا اور تجھے وہاں نہ پایا تو جانے کیا سوچے۔"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ مجھے اب چلنا چاہئے۔" بیگماں بھی جانے پر آمادہ ہو گئی۔ "میں آج ہی رات مولے سے گل بات کروں گی۔ فکر نہ کر' وہ میری بات مان جائے گا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا۔"

☆

رحیم داد نے بچا ہوا کھانا کپڑے میں لپیٹا اور اسے چنگیری میں رکھ کر چھینکے پر لٹکا دیا۔ واپس آیا تو بیگماں کھڑی ہو چکی تھی۔ رحیم داد نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"مولا داد اور چاچا کو راضی کر لیا تو میں تیرے ساتھ ہی رہنے کو آ جاؤں گا۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" بیگماں نے اسے یقین دلایا۔ "آگے جو کچھ کرنا ہے' وہ مجھ پر چھوڑ دے۔"

"ہاں تجھے یہ کام کرنا ہے۔"

"میں تو ہر طرح کوشش کروں گی میرا بچھڑا ہوا ویر میرے پاس آ جائے۔" بیگماں نے مسکرا کر کہا۔ "میں کتنی خوش ہوں' تجھے بتا نہیں سکتی۔ بچے بھی اپنے ماماں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

کبھی کبھی تو تجھے بہت یاد کرتے ہیں۔ تیرے آنے سے میرے گھر میں جیسے روشنی آجائے گی۔ ہائے کتنا چنگا لگے گا۔"

دونوں دروازے کی جانب بڑھے۔ رحیم داد نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ مگر دروازہ کھولتے ہی وہ سٹپٹا کے رہ گیا۔ سامنے مولاداد کھڑا تھا۔ دھندلی روشنی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہاتھ میں لمبی کلہاڑی دبی تھی۔ وہ جھپاک سے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے اللہ داد بھی اندر آگیا۔ مولاداد ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانس بھر رہا تھا۔ اس نے بیگماں کو خوں خوار نظروں سے دیکھا۔

بیگماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں مولاداد سے پوچھا۔ "یہاں کیسے آگیا؟"

مولاداد نے چند لمحے خاموش رہ کر تیکھے لہجے میں کہا۔ "مجھے پتہ چل گیا تھا تو' یہاں اپنے یار سے ملنے آئی ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "یہ کل رات بھی میرے جانے کے بعد چھپ کر تیرے پاس آیا تھا۔"

بیگماں نے مڑ کر اللہ داد کو دیکھا پھر اٹکتے ہوئے مولاداد سے کہا۔ "کیسی گل کر رہا ہے؟ مولے تجھے پتہ ہے' یہ کون ہے؟"

"مجھے سب پتہ ہے۔ بیدی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس نے تیرے یار کو کل رات ہی دیکھ لیا تھا۔" مولاداد نے ترش روئی سے کہا۔ "تو نے اسے کمرے میں چھپا دیا تھا۔"

"وہ جھوٹ بولتی ہے۔" بیگماں نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "آرام سے بیٹھ' میں تجھے سب کچھ بتا دوں گی۔"

"بیدی جھوٹ بولتی ہے' دارا بھی جھوٹ بولتا ہے' سب جھوٹ بولتے ہیں۔ صرف تو سچی ہے۔" وہ غصے سے چیخنے لگا۔

رحیم داد نے کہا۔ "مولے! تجھے کچھ پتہ نہیں۔"

اللہ داد نے اسے ڈانٹا۔ "بکواس نہ کر۔"

مولاداد تیزی سے جھپٹا۔ اس نے بیگماں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ چارپائی پر جا کر گری۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی' گڑگڑا کر بولی۔ "میری گل تو سن مولے۔" اس نے رحیم داد کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ' یہ۔" مگر مولاداد نے اسے پوری بات نہیں کہنے دی۔ غضب ناک ہو کر کلہاڑی چلائی۔ ہاتھ بھرپور پڑا۔ کلہاڑی بیگماں کی گردن کاٹتی ہوئی اندر اتر گئی۔ بیگماں کے منہ سے دل دوز چیخ نکلی۔

مولاداد ایک کے بعد دوسرا وار کرتا رہا۔ کلہاڑی نے بیگماں کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے۔ رحیم داد ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے لپکا اور مولاداد کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ مولاداد اس کی جانب پلٹا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ اس نے رحیم داد پر بھی کلہاڑی سے وار کیا۔ مگر رحیم داد جھکائی دے کر صاف بچ گیا۔ مولاداد نے دوسرا وار کرنے کے لیے کلہاڑی اٹھائی۔ رحیم داد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"مولے! تو نے بہت برا کیا۔ میری گل سن۔"

مگر مولاداد نے ایک نہ سنی۔ اس نے کلہاڑی سے وار کرنا چاہا۔ رحیم داد نے جھپٹ کر کلہاڑی پکڑی' جھٹکا دیا اور کلہاڑی چھین لی۔ اسی وقت اللہ داد نے اس پر ڈانگ سے وار کیا۔ رحیم داد نے سر اس طرح جھکایا کہ وار خالی گیا۔ مگر مولاداد نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے تڑاق سے رحیم داد کے منہ پر تھپڑ مارا اور کلہاڑی چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔

اب رحیم داد بھی غصے سے بے قابو ہو چکا تھا۔ وہ پیچھے ہٹا۔ کلہاڑی سنبھالی' مولاداد پر وار کیا۔ کلہاڑی کندھا کاٹتی ہوئی اندر اتر کر پھنس گئی۔ مولاداد کے منہ سے ہائے کی آواز نکلی۔ وہ خون میں لت پت ہو کر زمین پر تڑپنے لگا۔

رحیم داد اس کی جانب متوجہ ہوا تو اللہ داد نے پھر ڈانگ سے وار کیا۔ رحیم داد نے بچنے کی کوشش کی مگر بچتے بچتے بھی ڈانگ اس کے بائیں بازو پر لگی۔ رحیم داد تلملا کے رہ گیا۔ اس نے اچھل کر اللہ داد کے سینے پر لات ماری۔ وہ دور جا گرا۔ ڈانگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ رحیم داد نے اسے جھپٹ کر اٹھا لیا۔

اللہ داد اٹھ کر رحیم داد پر جھپٹا مگر رحیم داد نے اسے قریب نہیں آنے دیا۔ گھما کر ڈانگ کا ہاتھ چلایا۔ ڈانگ اللہ داد کے سر پر لگی۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ خون بہہ کر چہرے پر آگیا' وہ زمین پر گر گیا۔

رحیم داد بڑھ کر بیگماں کے پاس گیا مگر وہ دم توڑ چکی تھی۔ مولاداد زمین پر پڑا سسک رہا تھا اور اللہ داد بے ہوش تھا۔ رحیم داد خاموش کھڑا زور زور سے ہانپتا رہا' تینوں کو جلتی بجھتی نظروں سے دیکھتا رہا۔

مگر اب وہاں ٹھہرنا خطرناک تھا۔ رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ اٹھایا۔ بیگماں کی لاش کے پاس گیا۔ جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو ابل پڑے۔ وہ ہاتھ سے آنسو پونچھتا ہوا گھر سے باہر آیا۔

رحیم داد تیزی سے ایک طرف بڑھا مگر اس سمت سے آہٹ سنائی دی۔ اس نے راستہ بدل

دیا۔ اندھیرے میں اسے دارا کی ائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔
"ٹھیر جا۔ میری گل سن لے!
مگر رحیم داد نہیں ٹھہرا۔ تی اٹھاتا جھنگر کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ زیادہ دور نہیں گیا
ہو گا کہ اسے اپنی پشت پر چاپ ں۔ کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر راستہ
بدلا کھیتوں کی جانب بڑھا اور ا س کر ایک پگڈنڈی پر دوڑنے لگا۔
ڈھولا امیر خاں کی حدود سے باہر آیا تو وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ لیکن وہ رکا نہیں، آگے
اور آگے بڑھتا گیا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے سڑک پر چل رہا تھا۔ سڑک سنسان تھی اور رات کے
اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خبر نہ تھی کدھر جا رہا ہے، کہاں جا رہا ہے؟ نہ اس کی کوئی
منزل تھی، نہ ٹھکانہ۔

کراچی، ستمبر ۱۹۷۸ء

شوکت صدیقی
جانگلوس

۱۵

دیپال پور روڈ پر نیلی بار ٹرانسپورٹ کی ایک لاری شور مچاتی پاک پتن کی سمت جا رہی تھی۔ رحیم داد لاری کو دور تک دیکھتا رہا۔ آخر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس نے سڑک عبور کی' نشیب میں اترا اور آگے بڑھنے لگا۔

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ رحیم داد کہیں ٹھہرے بغیر چلتا رہا۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ وہ حویلی روڈ سے گزر کر دیپال پور تحصیل کی حدود میں داخل ہوا تو رات ہو چکی تھی۔ رحیم داد تھکن سے بے حال ہو رہا تھا۔ راستہ صاف ستھرا اور کشادہ تھا۔ پیاس لگتی تو پینے کو نہر کا پانی مل جاتا۔

ہر سمت اندھیرا چھایا تھا۔ اس کے پیر بوجھل ہو گئے تھے۔ اب اس میں زیادہ دور جانے کی سکت نہ تھی۔ وہ کہیں ٹھہر کر رات بسر کرنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی مناسب اور محفوظ ٹھکانا نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہر کے کنارے کہیں کہیں کھجور کے درخت تھے' کیکر کی جھاڑیاں تھیں جن کی شاخیں پیلے پیلے پھولوں سے لدی جھوم رہی تھیں۔ گندم اور جو کی تیار فصلیں بھی کھڑی تھیں۔ جہاں فصلیں کٹ چکی تھیں وہاں اجاڑ کھیت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

رحیم داد ٹھکانے کی تلاش میں تھکے ہارے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ یکایک عقب میں ٹاپیں سنائی دیں۔ کوئی گھوڑا دوڑتا اسی طرف آ رہا تھا۔ آواز رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ رحیم داد راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ قریب ہی کھیت تھے۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ گھڑسوار بالکل نزدیک آ گیا۔ اس کا گھوڑا زور سے ہنہنایا' ٹھوکر کھائی اور راستے سے اتر کر رحیم داد کی جانب بڑھا۔

RAKTAB
PUBLICATIONS

109' Bombay Hotel,
I. I. Chundrigar Road Karachi.

رحیم داد سراسیمہ ہو کر پیچھے ہٹا اور کھیت کی مینڈ سے ٹکرا کر گر پڑا۔ گرتے ہی اندھیرے میں گھوڑے کا سم کچھ اس طرح اس کے چہرے پر پڑا کہ سر چکرا گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ سانس رک رک کر چلنے لگی۔

ذرا دیر بعد اس نے سنا' کوئی اس پر جھکا ہوا معذرت کے انداز میں کہہ رہا ہے۔ "معاف کرنا جی! گھوڑی ذرا چمک گئی تھی۔ میں نے بہت روکا پر کابو سے نکل گئی۔ رستے سے اتر کر ادھر آگئی۔" اس نے سہارا دے کر رحیم داد کو اٹھایا۔ رحیم داد کراہتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

گھڑسوار نے نرمی سے پوچھا۔ "کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

رحیم داد سے تکلیف کے مارے بولا نہ گیا۔ اس نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا تو ہاتھ خون سے تربتر ہو گیا۔ رحیم داد نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اپنا خون آلود ہاتھ سامنے کر دیا۔ دھندلی روشنی میں اس نے خون سے بھرا ہاتھ دیکھا۔ رحیم داد کے چہرے کا زخم دیکھا' پریشان ہو کر بولا۔

"لگتا ہے' تیرے تو بہت چوٹ آئی ہے۔"

چوٹ واقعی سخت آئی تھی۔ گھوڑے کی پوری ٹاپ رحیم داد کے چہرے پر بیٹھ گئی تھی اور لوہے کی نئی نعل رخسار کی جلد کاٹتی چار انچ تک چلی گئی تھی۔ رحیم داد نے خون بند کرنے کے لیے زخم پر بایاں ہاتھ رکھ لیا تھا۔ وہ ٹیس برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گھڑسوار لمبا چوڑا جوان تھا۔ سفید قمیص اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ سر پر اونچے طرے کی پگ تھی۔ وضع قطع سے بڑا زمیں دار لگتا تھا۔ اس نے جھٹ اپنی پگ اتاری۔ شملہ جھرے سے پھاڑا اور پھٹا ہوا ٹکڑا لے کر تیزی سے نہر کی جانب گیا۔ اسے پانی سے ترکیا۔ واپس آیا۔ رحیم داد کا ہاتھ ہٹایا۔ گیلے کپڑے کے ایک کونے سے خون صاف کیا' پھر کپڑا تہہ کیا' گدی بنائی اور زخم پر رکھ دی۔ اس نے پگ کا ایک حصہ اور پھاڑا اور اسے سر سے تھوڑی تک چہرے کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر گرہ لگا دی۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رک رک کر کراہتا رہا۔ زخم پر پٹی باندھ کر اس شخص نے پوچھا۔ "تیرا ناں کیہہ ہے؟"

رحیم داد نے بولنے کے لیے منہ کھولا اور صرف "چوہدری" کہہ سکا۔

وہ شخص بولا۔ "چوہدری! میرا نام اللہ وسایا ہے۔ ادھر کوٹلہ ہرکشن میں اپنی زمیں داری ہے۔" اس نے رحیم داد کی پیٹھ تھپک کر دل جوئی کی۔ "چوہدری! حوصلے سے کام لے۔ تھوڑی دیر میں درد کم ہو جائے گا۔" وہ رحیم داد کے قریب ہی زمین پر بیٹھا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر اس کی مشکی

گھوڑی کھڑی تھی۔۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اللہ وسایا نے کہا۔ "تیری طبیعت سنبھل گئی ہو تو میرے ساتھ گھوڑی پر بیٹھ جا۔ کوٹلہ ہرکشن یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ وہاں پہنچ کر ٹھیک سے مرہم پٹی ہو جائے گی اور تو آرام سے لیٹ جائے گا۔"

اللہ وسایا نے سہارا دیا' رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کلیم کے کاغذات کا بستہ مضبوطی سے ہاتھ میں دبا لیا۔ اللہ وسایا گھوڑی کے پاس گیا۔ اس کی راس پکڑ کر نہر کے کنارے لے گیا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ اس کے قریب چلا گیا۔ اللہ وسایا گھوڑی پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ تھام کر سہارا دیا اور وہ بھی اللہ وسایا کے پیچھے گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اللہ وسایا کی کمر تھامی اور جم کر بیٹھ گیا۔

اللہ وسایا نے گھوڑی کو ایڑھ لگائی اور آہستہ آہستہ دوڑانے لگا۔ نصف گھنٹے سے بھی کم عرصے میں دونوں کوٹلہ ہرکشن پہنچ گئے۔ اللہ وسایا نے حویلی کے سامنے پہنچ کر گھوڑی ٹھہرالی۔ نیچے اترا۔ اس کے نوکر چاکر قریب پہنچ چکے تھے۔ اللہ وسایا کی ہدایت پر انھوں نے سہارا دے کر رحیم داد کو گھوڑی کی پشت سے نیچے اتارا۔ گھوڑی کی لگام ایک ملازم نے تھام لی۔

اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! میرے ساتھ آ۔"

رحیم داد خاموشی سے اللہ وسایا کے ہم راہ حویلی کے مہمان خانے میں چلا گیا۔ دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ کشادہ اور ہوا دار تھا۔ طاق میں لیمپ روشن تھا۔ ایک طرف خوب چوڑا چکلا پلنگ تھا۔ اس پر اجلا بستر لگا تھا۔

اللہ وسایا نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چوہدری! اب تو منجی پر آرام کر۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گا۔" وہ کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد خاموش لیٹا رہا۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ نوکرانی کانسی کے بڑے سے گلاس میں دودھ لے کر آئی۔ رحیم داد تکیے کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے گلاس نوکرانی سے لے لیا اور دونوں ہاتھوں سے تھام کر دھیرے دھیرے دودھ کے گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ دودھ گاڑھا اور نیم گرم تھا۔

رحیم داد دودھ پیتا رہا۔ نوکرانی نے کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔ کمرے کی پشت پر باغیچہ تھا۔ اس میں لیموں کی درخت بھی تھے اور کھڑکیوں کے قریب ہی تھے۔ لیموں کے درختوں میں پھول آگئے تھے۔ ان کی مہک ہلکے ہلکے جھونکوں میں رچی ہوئی کمرے کے اندر آرہی تھی۔ دودھ پی کر رحیم داد نے گلاس نوکرانی کو دے دیا۔ وہ اسے لے کر خاموشی سے چلی گئی۔

دودھ پینے کے بعد رحیم داد کو خاصا سکون مل گیا تھا۔ نقاہت بھی کم ہو گئی تھی۔ وہ تکیے پر سر رکھ کر چت لیٹ گیا اور خاموشی سے چھت تکنے لگا۔ چند منٹ بعد اللہ وسایا واپس آگیا۔ اس کے ہم راہ ایک بوڑھا بھی آیا۔ اس کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی۔ سر پر پگڑی تھی۔ لباس بوسیدہ اور ملگجا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ رحیم داد کے نزدیک آئے۔ بوڑھے کے جسم سے پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ اس نے جھک کر رحیم داد کا چہرہ دیکھا اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"بخار تو نہیں لگتا۔ چوٹ زیادہ گہری نہیں آئی۔"

اسی وقت ایک سرو قامت نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ تازہ پھول کے مانند نرم اور گلابی تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں پچھلی رات کے ستارے جھلملاتے تھے۔ نقش و نگار بھی سبک اور تیکھے تھے۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کا ریشمی کرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا بھی آسمانی تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لکڑی کا چھوٹا سا بکس لٹک رہا تھا' جس پر صلیب احمر کا بڑا سا نشان بنا تھا۔

رحیم داد نے اسے دیکھا تو مبہوت ہو کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ کمرے میں رنگ و بو کا سیلاب امڈ آیا ہے۔ رحیم داد کی سانس لمحے بھر کو ٹھہر گئی' آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔

اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری!" اس نے ہاتھ اٹھا کر عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جمیلہ ہے' میرے گھر والی۔" جمیلہ کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے دوپٹے کا آنچل سر پر ڈال لیا۔

بوڑھے نے رحیم داد کی پیشانی سے ہاتھ ہٹا کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ "فکر کی کوئی گل نہیں۔ پاتھی کی گرم گرم راکھ چوٹ پر باندھ دے۔ دو تین دن میں چنگا ہو جائے گا۔ ویسے نیم کے پتے کچل کر باندھنے سے بھی آرام آجائے گا۔"

جمیلہ بڑھ کر دونوں کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے مسکرا کر بوڑھے کو دیکھا' بے نیازی سے بولی۔

"بابے! تو اپنا کچا علاج رہنے دے۔ میں نے پہلے گھاؤ دیکھنا ہے۔ اسے دیکھے بنا کیسے علاج ہو سکتا ہے۔"

اللہ وسایا نے نظر بھر کر بیوی کو دیکھا' ہنس کر بولا۔ "جمی لے! تیں نوں پتہ ہے' اپنا بابا بھی بہت سیانا اور تجربہ کار ہے۔" اس نے بوڑھے کی دل جوئی کی۔ "دور دور سے بیمار اور روگی اس کے پاس علاج کرانے آتے ہیں' چنگے ہو کر جاتے ہیں۔"

"تیری گھر والی ڈاکٹرنی بن گئی ہے۔ اسے ہی علاج کرنے دے۔" بوڑھے کے لہجے میں تلخی تھی۔

وہ روٹھنے کے انداز میں جانے کے لیے مڑا۔

اللہ وسایا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "بابے! کدھر چلا۔ میری گل تو سن۔"

بوڑھا منہ بگاڑ کر بولا۔ "جب کام نہ بنے تو مجھے بلا لینا۔ ابھی تجھے میری ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے مڑ کر اللہ وسایا کی طرف نہیں دیکھا۔ کمرے سے نکل گیا۔ جمیلہ نے بوڑھے کی بات پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے کمرے میں رکھی ہوئی چھوٹی سی میز گھسیٹ کر پلنگ کے قریب کی اور اس پر اپنا فرسٹ ایڈ بکس رکھ دیا۔

اللہ وسایا نے اظہار تاسف کیا۔ "جمی لے! تو نے بابے کو ناراض کر دیا۔" جمیلہ خاموش رہی۔ اللہ وسایا جتانے لگا۔ "میں نے اپنی پگ پھاڑ کر چوٹ پر لپیٹ دی تھی تاکہ خون بند ہو جائے۔ زخم گہرا آیا ہے۔ بہت خون نکل رہا تھا۔ بابا تو چلا گیا' اب تو ٹھیک سے چوہدری کی مرہم پٹی کر دے۔"

جمیلہ بدستور خاموش تھی۔ اس نے رحیم داد کی پٹی آہستہ آہستہ کھولی۔ "پٹی خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ جمیلہ نے اسے میز پر ڈال دیا۔ جھک کر دیکھا۔ زخم آنکھ سے ڈیڑھ انچ نیچے ہلال کی شکل بناتا ہوا رخسار کے نشیب میں پھیلتا چلا گیا تھا۔ خون ابھی تک رس رہا تھا۔ اللہ وسایا نے لیمپ کی روشنی میں رحیم داد کا زخم غور سے دیکھا۔ پریشان ہو کر بولا۔ "لگتا ہے گھوڑی کا کھرا سیدھا گال پر لگا۔ خیریت گزری کہ آنکھ بچ گئی۔" رحیم داد آنکھیں کھولے چپ پڑا رہا۔

جمیلہ نے اس کے رخسار پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ اس کے نرم نرم ہاتھ کے لمس سے رحیم داد کو بڑا سکون ملا۔ جمیلہ نے رخسار کی ہڈی ہولے سے دبا کر پوچھا۔

"چوہدری! ہڈی میں درد تو نہیں ہوتا؟"

رحیم داد نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی' مدھم لہجے میں بولا۔ "تھوڑا تھوڑا ہوتا ہے۔"

جمیلہ کے چہرے سے پریشانی کا غبار چھٹ گیا۔ وہ زیر لب مسکرائی۔ "لگتا ہے' ہڈی میں زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ مجھے اسی کا ڈر تھا۔ گھوڑی کے کھرے سے صرف کھال کٹی ہے۔" اس نے بکس کھول کے روئی کا گالا نکالا' اسپرٹ سے اسے تر کیا اور دھیرے دھیرے زخم صاف کرنے لگی۔ زخم پر اسپرٹ لگی تو رحیم داد تکلیف سے بلبلایا۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنے دانت سختی سے بھینچ لیے۔

جمیلہ نے اس کی تکلیف محسوس کی۔ تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "چوہدری! حوصلے سے کام لے۔ تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا۔" وہ اسپرٹ میں بھیگا ہوا گالا زخم پر ہولے ہولے رگڑتی رہی۔ رحیم داد بے چین ہو کر گردن ادھر ادھر ہلانے لگا۔ جمیلہ نے اپنا نرم و گداز ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔

رحیم داد نے اپنے چہرے پر جھکی ہوئی جمیلہ کو دیکھا۔ وہ اس قدر قریب تھی کہ رحیم داد اس کے دل کش خدوخال کا ایک ایک خم اور ایک ایک زاویہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ حسین اور طرح دار عورت تھی۔ اسے نزدیک اور مہربان پاکر رحیم داد کو بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ بار بار اٹھتی ہوئی ٹیس کا احساس بھی کم ہوگیا۔

جمیلہ نے بکس سے ایک شیشی نکالی۔ اس میں مرکیور کروم بھرا تھا۔ جمیلہ نے اسے روئی پر ڈالا اور روئی آہستہ سے زخم پر رکھ دی۔ پھر اس پر احتیاط سے پٹی باندھ دی۔ مرکیور کروم لگانے کے بعد جمیلہ نے مسکرا کر کہا۔ "چوہدری! میں نے تیرے گھاؤ پر لال دوائی لگا دی ہے۔" اس نے ہولے سے اس کا سر تھپکا۔ "چنتا نہ کر۔ جلد آرام آجائے گا۔" رحیم داد چپ پڑا جمیلہ کا مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ تکتا رہا۔

اللہ وسایا نے دبی زبان سے اندیشہ ظاہر کیا۔ "جمی لے! گڑبڑ کی تو کوئی گل نہیں؟ تیری مرضی ہو تو سویرے پاک پتن سے ڈاکٹر بلوالوں یا چوہدری کو اس کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ ٹھیک طرح دوا دارو کردے گا۔"

"ویسے تو چنتا کرنے کی کوئی گل نہیں لگتی۔ گھاؤ زیادہ گہرا نہیں۔ ہڈی پر بھی چوٹ نہیں آئی۔ فوری طور پر جو علاج ہوسکتا تھا' وہ میں نے کردیا۔ رات آرام سے گزرے گی۔ صبح تک دیکھتے ہیں' طبیعت گڑبڑ ہوئی تو ڈاکٹر کو بلوالینا یا سرکاری اسپتال لے جانا۔"

جمیلہ نے بکس بند کیا' ہینڈل تھام کر اسے ہاتھ میں لٹکایا اور باہر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ اللہ وسایا نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ آہستہ سے بولا۔ "گیارہ بجنے والے ہیں۔" اس نے مڑ کر رحیم داد پر نظر ڈالی' اس کا بازو تھپ تھپایا۔

"چوہدری! تو اب آرام سے سوجا۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔ صبح تک چنگا ہوجائے گا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "تو تکڑا جوان ہے۔ ایسی چوٹیں تو روز آتی رہتی ہیں۔"

رحیم داد نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔

اللہ وسایا اپنی بیوی کے ہم راہ کمرے سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک نوکر اندر آیا۔ اور میز پر پڑی ہوئی پٹی اور روئی کے خون آلود ٹکڑے اٹھا کر لے گیا۔ کمرے میں خاموشی ہوگئی۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کرلیں۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ چاپ سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ نوکر کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس تھا۔

وہ آگے بڑھا اور میز پر جگ اور گلاس رکھ دیا۔ اس نے لیمپ کی لو مدھم کی۔ رحیم داد کی جانب

مڑا' آہستہ سے بولا۔ "میرا نام احمد ہے جی۔ میں رات کو یہیں رہوں گا۔ باہر میری منجی پڑی ہے۔ کوئی کام ہو تو بلالینا۔ میں آجاؤں گا۔" وہ دروازے کی جانب بڑھا اور کمرے سے چلا گیا۔

☆

رحیم داد خاموش لیٹا رہا۔ اس کے رخسار میں رک رک کر ٹیس اٹھ رہی تھی۔ مگر اس میں پہلی سی شدت نہیں تھی۔ البتہ اس کا جسم جگہ جگہ سے دکھ رہا تھا۔ کمر اور پنڈلیوں میں سخت اینٹھن تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کرلیں۔ مگر بے چین رہا' نیند نہیں آئی۔ اسے اپنی تکلیف کے ساتھ ساتھ اللہ وسایا کا خیال آرہا تھا۔ وہ اسے بہت بھلا مانس لگا۔ کوئی اور بڑا زمیں دار ہوتا تو اسے روندتا ہوا گزر جاتا' پلٹ کر بھی نہ دیکھتا۔ مگر اللہ وسایا نے نہ صرف پگ پھاڑ کر اس کے زخم پر پٹی باندھی بلکہ علاج معالجے کے لیے اپنی حویلی میں بھی لے آیا۔ اس کی بیوی رحیم داد کو اور بھی زیادہ بھلی معلوم ہوئی۔ وہ جس قدر خوب صورت اور دل ربا تھی' اتنی ہی زیادہ نیک دل اور ہمدرد تھی۔ اس نے رحیم داد کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اسے ایسا لگا جیسے زخم سے اٹھتی ہوئی ٹیس گھٹ کر آدھی رہ گئی ہو۔ اس کے لمس کی لذت رحیم داد اب تک محسوس کر رہا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ رحیم داد نے ایک بار اٹھ کر پانی بھی پیا۔ پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔

سورج طلوع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد اللہ وسایا کمرے میں آیا۔ جمیلہ بھی اس کے ہم راہ تھی۔ رحیم داد جاگ رہا تھا۔ مگر اس کا جسم تیز بخار سے بُھن رہا تھا۔ اس کے زخمی رخسار پر سوجن تھی اور اس قدر زیادہ تھی کہ ایک آنکھ پوری طرح نہیں کھلتی تھی۔ جمیلہ نے قریب جاکر اس کی یہ کیفیت دیکھی تو اس کے تروتازہ اور دمکتے چہرے پر پریشانی چھاگئی۔ اس نے جھک کر رحیم داد کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ گھبرا کر اللہ وسایا کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔ "اسے تو تیز بخار ہے۔" اس نے رحیم داد کا جسم کھیس ڈال کر سینے تک ڈھک دیا۔

اللہ وسایا نے پوچھا۔ "طبیعت کچھ زیادہ گڑبڑ ہے؟" اس نے رحیم داد کا سوجا ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔ "منہ پر ورم بھی آگیا ہے۔"

"ہاں۔" جمیلہ بولی۔ "پاک پتن سے ڈاکٹر خان کو بلوالے۔" اس نے رحیم داد کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "ڈاکٹر کے پاس اسے لے جانے میں بہت تکلیف ہوگی۔"

ان کے جانے کے بعد رحیم داد کراہتا ہوا اٹھا اور پیشاب کرنے کمرے سے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ اسے لیٹے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ احمد دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر آیا مگر رحیم داد سے دودھ نہ پیا گیا۔ اس نے بے دلی کے

ساتھ نصف سے بھی زیادہ دودھ چھوڑ دیا۔ گلاس میز پر رکھ دیا۔ وہ بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی۔ سورج چڑھ کر بلندی پر پہنچ گیا۔

دوپہر کو ڈاکٹر آیا۔ اس کے ساتھ صرف جمیلہ تھی۔ اللہ وسایا نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے رحیم داد کے رخسار ہولے ہولے ایک انگلی سے دبائے۔ جمیلہ اسے بتانے لگی۔ "ڈاکٹر! میں نے فرسٹ ایڈ کے طور پر گھاؤ اسپرٹ سے صاف کر کے لال دوائی لگا دی تھی۔ رات بہت بیت چکی تھی۔ اس سے میں اور کر بھی کیا سکتی تھی۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ "سیپٹک ہونے کا ڈر نہیں رہا۔ ویسے زخم خاصا گہرا آیا ہے۔"

"وہ ہوا یہ جی کہ اندھیرے میں اللہ وسایا کی گھوڑی چمک گئی۔ چوہدری ایک دم سامنے آگیا۔ گھوڑی کا کھر اس کے منہ پر پڑا۔ گھاؤ تو فیر آنا ہی تھا پر آنکھ بچ گئی۔ بالکل آنکھ کے نیچے چوٹ آئی ہے۔"

ڈاکٹر اس کی باتیں سنتا رہا اور خاموشی سے رحیم داد کا ہاتھ تھام کر انگلیوں سے اس کی نبض دیکھتا رہا۔ رحیم داد چپ چاپ لیٹا سامنے کی دیوار تکتا رہا۔ نبض دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے اپنا چرمی بیگ کھولا' سرنج نکالی۔ اس میں دوا بھری اور رحیم داد کے بازو میں انجکشن لگا دیا۔ اس نے پٹی کھولی۔ اسپرٹ سے بھیگی ہوئی روئی سے ازسرنو زخم صاف کیا۔ رحیم داد نے تکلیف سے منہ بگاڑا۔ جب زخم اچھی طرح صاف ہو گیا تو ڈاکٹر نے اس پر مرہم لگایا۔ روئی کا گالا رکھا اور اسے اسٹکنگ پلاسٹر کی پتلی پتلی پٹیوں سے اچھی طرح رخسار پر چپکا دیا۔

ڈاکٹر نے تسلی دینے کی غرض سے آہستہ آہستہ رحیم داد کا بازو تھپکا۔ مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا' شام تک چہرے کی سوجن بھی ختم ہو جائے گی۔ تین چار روز میں طبیعت بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی۔" اس نے اپنا بیگ بند کیا۔ دروازے میں کھڑے ہوئے نوکر نے آگے بڑھ کر بیگ سنبھال لیا۔

ڈاکٹر کمرے سے چلا گیا۔ جمیلہ بھی اس کے ہم راہ چلی گئی۔ رحیم داد انھیں نظریں اٹھائے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ جمیلہ اس وقت ہلکا گلابی لباس پہنے ہوئے تھی اور کچھ زیادہ ہی حسین نظر آرہی تھی۔ اس کے بال سیاہ اور گھنے تھے۔ ہلکے ہلکے گھونگریالے بھی تھے۔ چوٹی لمبی تھی اور کمر سے نیچے جھول رہی تھی۔ کمر پتلی تھی مگر کولہے قدرے بھاری تھے۔ وہ اپنے کولہوں کو آہستہ آہستہ خم دیتی ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

رحیم داد ٹکٹکی باندھے جمیلہ کو دیکھتا رہا اور اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ مہمان خانے کا آنگن عبور کر کے بیرونی دروازے سے باہر نہ چلی گئی۔ رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا کہ روشنی دھندلی پڑ گئی ہے' ہوا ٹھہر گئی ہے۔ کمرے میں حبس اتنا بڑھ گیا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے گہری سانس بھری اور چھت تکنے لگا۔

رات کو جمیلہ پھر رحیم داد کے پاس آئی۔ اللہ وسایا بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کمرے میں پڑی ہوئی بید کی کرسیاں کھسکا کر رحیم داد کے بستر کے قریب بیٹھ گئے۔ رحیم داد کو اب خاصا افاقہ تھا۔ رخسار کا ورم کم ہو گیا تھا' بخار بھی اتر گیا تھا۔

اللہ وسایا نے ہاتھ بڑھایا۔ رحیم داد کا ماتھا چھو کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "چوہدری! اب تو تجھے بخار نہیں ہے۔"

رحیم داد نے نحیف آواز میں اس کی تائید کی۔ "لگتا تو ایسا ہی ہے۔ چوٹ میں تکلیف بھی پہلے سے کم ہے۔"

"اب تو تیری طبیعت کچھ ٹھیک ہے۔ بول بھی سکتا ہے۔" اللہ وسایا نے پوچھا۔ "یہ بتا تیرا پنڈ کدھر ہے؟ میں چاہتا ہوں' تیرے گھر والوں کو خبر بھیج دوں۔ تیرے گھر نہ پہنچنے پر وہ پریشان ہوں گے' تیرا انتظار کرتے ہوں گے۔ تجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ ان کو ضرور پتہ چلنا چاہئے کہ تو یہاں ہے۔"

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بتاتا بھی کیا۔ اب اس کا نہ گھر بار تھا نہ ٹھکانا۔ کوئی اس کا نہیں تھا۔ بیوی بچے پرائے ہو چکے تھے۔ اکلوتی بہن اس کی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ چکی تھی۔ سارے رشتے' سارے بندھن ٹوٹ پھوٹ کر اس طرح بکھر چکے تھے کہ وہ ملبے کا ڈھیر رہ گیا تھا۔ رحیم داد کے چہرے پر دکھ کے سائے منڈلانے لگے۔ آنکھیں گویا منجمد ہو گئی تھیں۔

اللہ وسایا نے اسے خاموش پایا تو اصرار کر کے دریافت کیا۔ "چوہدری! تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

رحیم داد نے مڑ کر اللہ وسایا کی جانب دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری۔ غم کے بوجھ سے دبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اپنا جی نہ کوئی گھر ہے نہ گھر والے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کوئی تو تیرا کہیں گھر بھی ہو گا۔"

"کبھی گھر تھا' گھر والے بھی تھے۔" رحیم داد دل گرفتہ ہو گیا۔

جمیلہ نے دلچسپی سے پوچھا۔ "سب کہاں گئے؟ کیا ہو گیا؟"

رحیم داد رک' رک کر بولنے لگا۔ "میں جی گورداس پور کا مہاجر ہوں۔ فسادات میں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر جو بیتی' وہ تو تیں نوں پتہ ہی ہو گا۔ ادھر اپنی زمینداری تھی۔ رہنے کو ماڑی تھی۔ گھروالی تھی' چار بچے تھے۔ بیٹی سب سے وڈی تھی۔ اسے بلوائی اٹھا کر لے گئے۔ اس سے چھوٹا پتر تھا۔ وہ میرے سامنے مارا گیا۔ میں بلوائیوں سے بچ بچا کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گیا۔" اس نے چوہدری نورالٰہی کی الم ناک داستان اپنی بنا کر سنائی دی۔

رحیم داد آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ اس کا بیمار چہرہ اور مرجھا گیا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کے چہروں پر بھی غم کا ہلکا ہلکا غبار بکھرتا جا رہا تھا۔ جمیلہ کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آتی تھی۔ اس نے رحیم داد کا سوگوار چہرہ نظر بھر کر دیکھا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے بولی۔ "چوہدری! تو بہت نراش اور دکھی لگتا ہے۔ تونے بہت کٹھنائیاں جھیلی ہیں۔" اس کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔

"یہ تو بتا' تیری گھروالی اور دو بچوں کا کیا بنا؟"

"بعد میں پتہ چلا گھروالی دونوں بچوں کے ساتھ پاکستان آگئی تھی۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ لہجہ اور دل دوز ہو گیا۔ "وہ کہاں ہے' کس کے پاس ہے؟ بچوں کا کیا بنا؟ یہ اب تک پتہ نہیں چلا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "۸ سال سے انھیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ ادھر بھی انھیں ڈھونڈنے ہی آیا تھا۔ اندھیرے میں گھوڑی سامنے آگئی۔" اس کے لہجے میں سسکیوں کی سرسراہٹ تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ تڑپ کر بولا۔ "مرجاتا تو ٹھیک تھا۔" رحیم داد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

جمیلہ کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ سرجھکا کر رونے لگی۔ اس کا چہرہ بجھ گیا۔ اللہ وسایا نے اسے روتے دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا سر آہستہ آہستہ تھپکا' دل جوئی کی۔ "لے' تو بھی رونے بیٹھ گئی۔" وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چوہدری! اس کا دل بہت کمزور ہے۔ کسی کو دکھی دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں میں ایسے ہی آنسو آجاتے ہیں۔" اس نے گہری سانس بھری۔

"ویسے جی فسادات میں بہت ظلم ہوا۔" اس نے رحیم داد کو تسلی دی۔

"چوہدری! رب نے چاہا' تیری گھروالی اور بچے ایک نہ ایک دن تجھے ضرور مل جائیں گے۔"

ارس

نیچے جھول رہی خاموش رہا۔ اللہ وسایا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جمیلہ کا بازو تھاما۔ "چل چوہدری کو

دیتی ڈاکٹر کے ساتھ ۔ بہت رات ہو گئی۔" جمیلہ نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور خاموشی سے

ں آگے بڑھے اور آہستہ آہستہ کمرے سے نکل کر آنگن میں پہنچ گئے۔

رحیم داد کچھ دیر خاموش لیٹا رہا پھر اٹھا۔ میز پر رکھے ہوئے جگ سے اس نے گلاس میں پانی انڈیل کر پیا۔ دروازے سے جھانکا۔ احمد اس وقت موجود نہیں تھا۔ اس کی چارپائی خالی تھی۔ رحیم داد پلنگ سے نیچے اترا۔ لیمپ کی لو دھیمی کی اور بستر پر آکر لیٹ گیا۔

☆

سویرے سویرے اللہ وسایا آیا مگر جمیلہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ رحیم داد کی طبیعت اب خاصی سنبھل گئی تھی۔ چہرے پر سوجن بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن وہ کمزور ہو گیا تھا۔ رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ اللہ وسایا اسے اپنے ہم راہ مہمان خانے سے باہر لے گیا۔ سورج شیشم کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ سنہری دھوپ گاؤں کے مکانوں کی منڈیروں پر جھلملا رہی تھی۔ کوٹلہ ہرکشن اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

دونوں بستی کی جانب نہیں گئے' کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ فصلوں کی کٹائی ہو چکی تھی۔ کھیتوں میں کہیں کٹی ہوئی فصل کے ترنڈے دور سے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں خریف کی کاشت کے لیے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ کہیں واہن کھیت تھے' جن میں ہل چلایا جا چکا تھا۔ مگر نہ ساگا پھرا تھا نہ فصل کی بوائی کے لیے زمین تیار ہوئی تھی۔ رحیم داد کو اپنا گاؤں' احمد کوٹ یاد آگیا۔ اور اس کی یاد کے ساتھ ساتھ اپنے کھیت کھلیان یاد آگئے۔ وہ اللہ وسایا کے ہم راہ چلتا رہا۔ دونوں خاموش تھے۔ صبح کی ہوا کے نرم نرم جھونکے خوش گوار تھے۔ ان میں تازگی اور فرحت تھی۔

چلتے چلتے اللہ وسایا نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! جب تک تیری طبیعت پوری طرح ٹھیک ٹھاک نہ ہو جائے' یہیں رہ۔ ویسے اپنا گھر سمجھ کر جب تک جی چاہے' ٹھہرا رہ۔ مہمان گھر میں ہو تو ذرا بہار رہتی ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تیری مہربانی ہے۔" رحیم داد نے انکار نہیں کیا۔ "پر میں اس طرح کب تک یہاں رہ سکتا ہوں؟"

"چلا جانا' چلا جانا۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو تیری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہوئی۔"

دونوں حویلی کے سامنے کے وسیع میدان سے گزر رہے تھے۔ قریب ہی ایک نیم پختہ عمارت تھی۔ اس کی دیواریں اینٹوں سے چنی ہوئی تھیں۔ البتہ پختہ چھت کے بجائے چھپر پڑا تھا۔ اندر سے بچوں کی ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

رحیم داد نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "لگتا ہے' یہ تو سکول ہے؟"

اللہ وسایا نے تائید میں گردن ہلائی۔ "ہاں جی! سکول ہی ہے۔"

"سرکاری سکول ہو گا؟"

"نہیں۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "سرکاری سکول تو یہاں سے دس میل ادھر تاری والا میں ہے۔ یہ سکول تو جمیلہ نے کھولا ہے۔ خود بھی پڑھاتی ہے۔ دو ماسٹر بھی رکھ لیے ہیں۔ اب تو سکول کو چلتے لگ بھگ تین سال ہو گئے۔"

"تیری گھروالی پڑھی لکھی بھی ہے؟" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بہت پڑھی لکھی ہے جی۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "لہور میں پڑھتی تھی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "جب اس کے ساتھ میرا ویاہ ہوا تو میں بالکل ان پڑھ تھا۔ اس نے سب سے پہلے تو مجھے پڑھنا لکھنا سکھایا۔ ویسے وہ تھوڑی بہت ڈاکٹری بھی کرلیتی ہے۔ تونے تو دیکھا ہی ہے۔"

"ہاں جی' بالکل دیکھا ہے۔ اس رات وہ میری مرہم پٹی نہ کرتی تو زخم سڑ جاتا۔ پتہ نہیں کیا ہوتا۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کی تائید کی۔ "میں تو اسے ڈاکٹرنی ہی سمجھا تھا۔ وہ سب کچھ ڈاکٹروں ہی کی طرح کر رہی تھی۔"

"اب تو اس پر پنڈ میں ڈسپنسری بنانے کی دھن سوار ہے۔ پر کوئی ہوشیار ڈاکٹر ہی نہیں ملتا۔ چھوٹا موٹا علاج تو وہ خود کرلیتی ہے۔ وہ حویلی میں ٹھیرتی ہی کب ہے۔ سکول سے بچوں کو پڑھا کر نکلتی ہے تو مزارعوں کے گھروں میں گھس جاتی ہے۔ کمیوں کے پاس بھی بے دھڑک چلی جاتی ہے۔ ان کے ساتھ گھل مل کر گپ شپ کرتی ہے۔ منع کرتا ہوں تب بھی نہیں مانتی۔"

"ویسے تو جی یہ بری عادت نہیں۔ پر تیرے جیسے وڈے زمیں داروں کی گھروالیاں اور زنانیاں ایسا کرتی نہیں۔ وہ تو حویلیوں اور ماڑیوں سے باہر ہی نہیں نکلتیں۔ ایسا کریں تو ان کے خصم طلاق کا کاغذ ہاتھ میں تھما دیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ زمیں داروں میں یہی ہوتا ہے۔ تبھی تو آس پاس کے وڈے زمیں دار جمیلہ سے ناراض ہیں۔ کہتے ہیں' اس نے زمیں داروں کی ساری ٹشک پشک اور عزت خاک میں ملا دی۔ ان کی پگ کے اونچے طرے نیچے کر دیے۔" اللہ وسایا کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔ "کیا بتاؤں جی! سبھی مجھ سے خار کھاتے ہیں۔"

"وہ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ زمیں دار میں اکڑ اور آن بان نہ ہو تو کام کیسے چلے۔" رحیم داد نے زمینداروں کی نفسیات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ "مزارعے فصل سے کچھ بھی نہ دیں۔ اپنی را کی کے ساتھ زمیں دار کا حصہ بھی دبالیں۔ ویسے تیں نوں ایہہ تو پتہ ہی ہوگا کہ فصل کی واڈھی ہوتے ہی مزارعے اس میں سے چوری شروع کر دیتے ہیں۔ زمیں دار اور اس کے کرندے کڑی نظر

نہ رکھیں اور چوری چکاری کرنے والے مزارعوں کو الٹا لٹکا کر پٹائی نہ کریں تو ساری فصل واڈھی سے پہلے ہی غائب ہو جائے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"پر اپنی زمیں داری میں ایسا نہیں ہوتا۔" اللہ وسایا نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر نہ فصلوں کی چوری ہوتی ہے' نہ پانی کی۔ نہ بٹائی دینے میں مزارعے رولا کرتے ہیں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "جب پاکستان بنا تو شروع شروع میں میری زمیں داری میں بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ تو جی عجب زمانہ تھا۔ مزارعے تو ان دنوں زمین دبا کر بیٹھ گئے تھے۔ بٹائی دینے سے صاف انکار کرتے تھے۔ انھوں نے تو گنڈاسے اور ڈانگیں اٹھا کر حویلی پر ہلا بولنے کی بھی کوشش کی تھی۔"

"پولیس کو خبر نہیں کی؟ پرچہ چاک کرایا ہوتا۔ پولیس سب کو الٹا لٹکا دیتی۔ حوالات میں بند کرکے چمڑی ادھیڑ دیتی۔ سب بالکل ٹھیک ہو جاتے۔ پولیس کو ساتھ ملائے بنا تو زمینداری چل ہی نہیں سکتی۔"

"پر مجھے پولیس تھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جمیلہ نے سب ٹھیک کرلیا۔" اللہ وسایا بے تکلفی سے کھلکھلا کر ہنسا۔ "سچ پوچھ چوہدری' زمیں داری تو وہی چلاتی ہے۔ نہ اس نے منشی رکھا' نہ کاردار' نہ منیجر۔ خود ہی ساری لکھا پڑھی کرتی ہے۔ فصل کی بٹائی بھی اپنے سامنے کراتی ہے۔ بٹائی کے لیے ونڈولے بھی نہیں بلاتی۔ مزارعوں ہی سے ونڈائی کراتی ہے۔ بٹائی کے بعد کمیوں کے لیے انگتی کی صورت میں زیادہ سے زیادہ دانے کھلواڑے پر چھوڑ دیتی ہے۔ تبھی تو پنڈ کے سارے مزارعے اور کمی اسے بہت پیار کرتے ہیں۔ عزت اور محبت سے بھین جی کہتے ہیں۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "یہ لمی' لمی سفید داڑھی والے بھی اسے بھین جی کہتے ہیں۔ جمیلہ بھی ذرا برا نہیں مناتی۔ بلکہ بہت خوش ہوتی ہے۔"

اللہ وسایا اور رحیم داد باتیں کرتے ہوئے اسکول کے نزدیک پہنچ گئے۔ رحیم داد نے کھلے ہوئے دروازے سے دیکھا' باقاعدہ کلاس لگی ہے۔ لکڑی کی بینچوں پر بچے قطاروں میں بیٹھے ہیں۔ جمیلہ پیٹھ موڑے بلیک بورڈ پر چاک سے کچھ لکھ رہی تھی۔ دونوں اندر نہیں گئے۔ حویلی کی جانب واپس ہوئے۔

دھوپ اب ہر طرف پھیل گئی تھی۔ گرمی بھی بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد تھکا ہوا اور نڈھال نظر آ رہا تھا۔ مگر دونوں مہمان خانے میں نہیں گئے۔ باغ میں چلے گئے۔ جامن کے ایک گھنے درخت کے نیچے چند کرسیاں پڑی تھیں۔ سامنے چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ اللہ وسایا اور رحیم داد کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ دھوپ میں چلنے سے پسینہ آ گیا تھا۔ سائے میں بیٹھ کر پسینے پر ہوا کے جھونکے لگے تو

تازگی اور فرحت محسوس ہوئی۔

رحیم داد نے شیشم کے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "تیرے پنڈ میں ٹاہلی کے پیڑ کچھ زیادہ ہی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟"

"جمیلہ نے خاص طور پر ٹاہلی کے پیڑ لگوائے ہیں۔ کہتی ہے جب سکول وڈا ہو جائے گا اور ڈسپنسری بھی بن جائے گی تو ان میں ٹاہلی کا فرنیچر بنوا کر لگواؤں گی۔"

"اور حویلی کے لیے فرنیچر نہیں بنے گا؟ ٹاہلی کی لکڑی تو بہت مہنگی ہوتی ہے۔"

اللہ وسایا نے مسکرا کر جواب دیا۔ "چوہدری! اس کی باتیں وہی جانے۔ میں نے یہی گل کہی تو بولی۔ "حویلی میں پہلے ہی بہت فرنیچر ہے۔ ہمیں اور زیادہ فرنیچر بنوا کر کیا لینا۔ چھوٹا سا تو اپنا ٹبر ہے۔ ہم دونوں کے علاوہ صرف دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"تیرے ساتھ اور کوئی نہیں رہتا؟"

"نہیں جی' اپنا بس اتنا ہی ٹبر ہے۔"

نوکروں نے ناشتے کا سامان میز پر رکھ دیا۔ ناشتے میں لسی تھی' ساگ تھا' تلا ہوا مرغ تھا' پراٹھے تھے اور گرم گرم حلوہ تھا۔ رحیم داد نے مرغ اور پراٹھے نہیں کھائے۔ اس نے پراٹھے کا ایک لقمہ بنا کر منہ میں رکھا' چبایا تو زخم میں کسک ہونے لگی۔ اس نے لسی کے گھونٹ پی کر لقمہ حلق سے نیچے اتارا۔

اللہ وسایا نے رحیم داد کے چہرے پر کرب اور بے چینی دیکھ کر ٹوکا۔ "چوہدری! تو پراٹھا نہ کھا' حلوہ کھا۔ یہ تیرے ہی لیے بنایا گیا ہے۔ میں ناشتے میں حلوہ نہیں کھاتا۔ عام طور پر شام کی چائے کے ساتھ حلوہ کھاتا ہوں۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر اللہ وسایا کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری! میں نے کچھ ضروری کام کرنا ہے۔ اب میں چلوں گا۔ تو یہیں بیٹھا رہ۔ دل بہلے گا۔ دھوپ بڑھ جائے تو اندر چلا جانا۔"

☆

ہوا کے نرم اور خنک جھونکے چل رہے تھے۔ رحیم داد نے میز پر دونوں ٹانگیں پھیلا دیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذرا دیر بعد وہ خراٹے بھرنے لگا۔

اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ کی تمازت بڑھ چکی تھی۔ مگر درختوں تلے بدستور ٹھنڈک تھی۔ ایک شخص گھاس پر اکڑوں بیٹھا ہولے ہولے رحیم داد کی پنڈلیاں دبا رہا تھا۔ وہ وضع قطع سے مزارع لگتا تھا۔ رحیم داد آنکھیں کھولے لمحے بھر تک حیرت سے اسے تکتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"کون ہے تو؟"

"میرا ناں ماکھا ہے جی۔"

"مزارع ہے یا حویلی کا نوکر ہے؟"

"میں تو جی پرلے پنڈ' پیراں والہ میں رہتا ہوں۔" اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "یہاں سے چار پنج میل ہو گا۔"

"یہاں کس لیے آیا ہے؟"

"ایک کام تھا جی۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "تیری بہت مہربانی ہو گی۔ میں تیرے پیر پکڑتا ہوں۔"

اس نے پنڈلیاں چھوڑ کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔ رحیم داد نے پریشان ہو کر جھٹ اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں۔

"کیا کام ہے تیرا؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔

"میرا بازو واپس دلوا دے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"میں کیسے واپس دلوا سکتا ہوں۔" رحیم داد ہنوز حیرت زدہ تھا۔ "تیری گھر والی کس کے پاس ہے؟"

وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "وہ جی بہت وڈا زمیں دار ہے۔ اسے شاہ جی کہتے ہیں۔ اس نے میری گھر والی کو اٹھوا کر اپنی حویلی میں رکھ چھوڑا ہے۔ پنج سال سے اوپر ہو گئے۔ سال بھر کا اس سے ایک نکا بھی تھا۔ ماں کے لیے بلکتا ہوا مر گیا۔ زمیں دار سے بہت منت کی۔ پیروں پر پگڑی رکھ دی پر وہ میری ایک نہیں سنتا۔ تو اپنے زمیں دار سے شاہ جی کے نام چٹھی لکھوا دے۔ اس کی گل وہ ضرور مان لے گا۔" ماکھا ہاتھ جوڑ کر بے بسی سے گویا ہوا۔ "تین بچے ہو چکے ہیں اس کے۔ اب تو شاہ جی کے کام کی بھی نہیں رہی۔"

"اور تیرے کام کی کب رہ گئی۔" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

"کیوں نہیں رہی جی۔" اس نے بے جھجک کہا۔ "وہ میرا بازو ہے۔ تجھے کیا پتہ' اس کے جانے کے بعد میں تباہ ہو گیا۔ گھر میں بوڑھی ماں ہے۔ اسے بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ تو ذرا یہ تو سوچ۔ سویرے ڈھور ڈنگروں کا پٹھا دتھا کون کرے؟ روٹی پکا کر دوپہر کو کھیت میں مجھے بھتا کون پہنچائے؟ چاٹی میں دودھ بلو کر مکھن کون نکالے؟" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "وہ کپڑے لتے دھوتی تھی' صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتی تھی۔ فیر یہ بھی تو ہے جی' خریف کی فصل پر پھٹی چنتی۔ چوگی میں جو روئی ملتی' اس کا چرخے پر سوت کاتتی تھی۔ چولھا جلانے کے لیے جنگل سے لکڑیاں اور کماد کی کھوری چن

کرلاتی تھی۔ اور جی....."

رحیم داد نے اکتا کر بیزاری سے کہا۔ "یار! اب بس کر۔ کام کی گل کر۔"

"وہی تو کر رہا تھا جی۔" ماکھا نے سادگی سے اظہار خیال کیا۔ "اب یہی دیکھ' پچھلی برکھا میں آدھے سے زیادہ گھر ڈھے گیا۔ اپنا بازو ہوتا تو دونوں کب کے اسے ٹھیک ٹھاک کر چکے ہوتے۔" اس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میرا یہ کام کر دے۔ جنم جنم تجھے دعائیں دوں گا۔ تیری بہت مہربانی ہو گی۔"

"ایسا کیوں نہیں کرتا' دوسرا ویاہ کر لے۔ نیا اور زیادہ کام کا بازو مل جائے گا۔" رحیم داد نے مسکرا کر مشورہ دیا۔

"حد کر دی توں نے۔" ماکھا منہ بگاڑ کر بولا۔ "ویاہ کرنا کوئی مخول ہے۔ پہلے جب ویاہ کیا تھا' تو سو ادھار لیا تھا۔ اب تک وہی نہیں چکا سکا۔ ہاں' اپنا بازو ہوتا تو کب کا ادا ہو جاتا۔"

"میں آج یا کل سویرے زمیں دار سے بات کروں گا۔" رحیم داد نے ٹالنے کی غرض سے وعدہ کیا۔

"بس' توں مجھے اس سے چٹھی لکھوا دے' میرا کام بن جائے گا۔" اس نے اصرار کیا۔ "تیری مہربانی ہو گی۔"

"کہہ تو دیا تجھ سے۔" رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مہمان خانے کی جانب بڑھا۔ ماکھا اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے گھگیاتا رہا۔ "تو جی' میں سمجھ لوں' میرا کام بن جائے گا؟ کب آؤں تیرے کول؟"

"چار روز بعد آنا۔" رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے کہا۔

ماکھا مستعدی سے بولا۔ "آجاؤں گا جی' بالکل آجاؤں گا۔"

رحیم داد چپ چاپ آگے بڑھتا ہوا مہمان خانے میں داخل ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر ماکھے کو دیکھا بھی نہیں۔ اسے ماکھا اور اس کے بازو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے راجو کو حاجی کی قید سے آزاد کرانے میں نوردین کی صرف اس لیے مدد کی تھی کہ اس وقت اسے نوردین کی ہمدردی حاصل کرنا تھی۔ ماکھا کی ہمدردی کی اسے کیا ضرورت تھی۔ خود اس کے بازو 'نوراں' کو جمال دین لے اڑا تھا۔ وہ اسے نہ واپس لا سکتا تھا نہ ماکھا کی طرح کسی سے فریاد کر سکتا تھا۔

رحیم داد کا دل بوجھل ہو گیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے کمرے میں گیا اور خاموشی سے بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ مضمحل اور دل گرفتہ تھا۔ اپنی بے مصرف زندگی پر دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ وہ پر کٹا

کبوتر بن گیا تھا' جو نہ اڑ سکتا تھا' نہ کہیں جا سکتا تھا۔ بیکار دن تھے اور بیکار راتیں۔ وقت زخمی چھپکلی کے مانند آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ حویلی پر سناٹا چھایا تھا۔ مہمان خانہ سنسان تھا۔

دوپہر ہونے سے کچھ دیر پہلے جمیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔ رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا جیسے کمرہ اچانک روشن ہو گیا' فضا میں رنگ بکھر گیا' خوشبو بس گئی۔ جمیلہ گہرا بسنتی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ گلابی چہرے پر شگفتگی اور رعنائی تھی۔ ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں نئے سلے ہوئے کپڑے تھے اور دوسرے میں سرخ گلاب کا گلدستہ تھا۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے مسکرا کر پوچھا۔ "اب طبیعت کیسی ہے چوہدری؟"

"ٹھیک ہی ہے جی۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "میں تو سویرے ٹہلتا ہوا سکول کی طرف بھی گیا تھا۔"

"تو نے سکول دیکھا؟" جمیلہ کا چہرہ اور شگفتہ ہو گیا۔ "ابھی تو چھوٹا سا سکول ہے۔ میں اسے بہت وڈا بناؤں گی۔ اس میں آس پاس کی بستیوں کے بچوں اور بچیوں کو بھی پڑھانے کا انتظام ہو گا۔ بچوں کا الگ اور بچیوں کا الگ۔" وہ زیرِ لب تبسم کے ساتھ بتاتی رہی۔ "میں نے تو دوا علاج کے لیے ڈسپنسری اور زنانیوں کے لیے زچہ گھر بنانے کی سکیم بھی تیار کر رکھی ہے۔ وہ بھی بن جائیں گے جی! کام کرنے کے لیے من میں لگن اور شکتی بھی ہونی چاہئے۔"

"پیسہ بھی تو چاہئے۔" رحیم داد ہنس کر بولا۔

"ہونا تو چاہئے۔" وہ بدستور مسکراتی رہی۔ "پر خالی پیسے سے کچھ نہیں بنتا۔"

جمیلہ نے کپڑے میز پر رکھ دیئے۔ گل دستہ رحیم داد کو دیا۔ بے تکلفی سے بولی۔ "چوہدری! اپنے باغ میں گلاب کے بہت بوٹے ہیں۔ گوجرانوالہ سے منگوا کر لگائے ہیں۔ دیکھ تو کتنے سندر پھول ہیں۔ تھوڑے ہی سمے پہلے میں نے انھیں توڑ کر تیرے لیے گل دستہ بنایا تھا۔"

رحیم داد کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ پھول سونگھ کر بولا۔ "خوشبو بھی بہت چنگی ہے۔ سونگھ تو لہر آتی ہے۔"

جمیلہ نے کپڑے اٹھا کر رحیم داد کو دکھائے۔ "چوہدری! تیرے لیے یہ کپڑے بھی لائی ہوں۔ تیرے اپنے کپڑے تو بہت گندے ہو گئے ہیں۔ کل دوپہر تک ڈاکٹر آئے گا۔ اس نے اجازت دی تو نہا کر کپڑے بدل لینا۔ دو جوڑے ہیں۔ ایک تو ابھی بدل لے۔"

رحیم داد نے کپڑے دیکھے۔ دو قمیصیں' دو شلواریں اور دو دھوتیاں تھیں۔ خوش ہو کر بولا۔

"کپڑے تو بہت چنگے ہیں زمیں دارنی! تو نے اتنی تکلیف کیوں کی۔"

"لے' اس میں تکلیف کی کون سی گل ہے۔" جمیلہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ کپڑے میز پر رکھ دیئے اور معذرت کے انداز میں بولی۔ "اللہ وسایا کی گھوڑی سے تجھے جو چوٹ لگی ہے' چوہدری جی مان' ہم دونوں کو اس کا بہت دکھ ہے۔" اس کا لہجہ قدرے دل گرفتہ ہوگیا۔ "اور تو تو ویسے بھی بہت دکھیارا ہے۔ گھربار' بال بچے' سب کچھ لٹا کر آیا ہے۔" اس کا شگفتہ چہرہ مرجھا گیا۔ رخساروں کی دھوپ پر بدلی چھا گئی۔

رحیم داد نے جمیلہ کے چہرے پر افسردگی دیکھی تو اسے تسلی دینے کی فوراً کوشش کی۔ "وہ تو جی گھوڑی چمک کر بے کابو ہوگئی تھی۔ زمیں دار کی اس میں کون سی غلطی تھی۔ وہ تو جی ہونے والی گل تھی' ہو کے رہی۔"

"چوہدری! میں تیرے لیے روٹی کے ساتھ دودھ بھجوا دوں گی۔ روٹی دودھ میں بھگو کر کھالینا پر دودھ زیادہ پینا۔ خون بھی تو کتنا نکل گیا۔ گھاؤ گہرا لگا تھا۔ ابھی روٹی چبانے میں تجھے تکلیف ہوتی ہوگی۔ ڈاکٹر نے چاول کھانے سے منع کیا ہے ورنہ چاول کی کھچڑی تیرے لیے ٹھیک رہتی۔" جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "چنتا نہ کر چوہدری! جلد ہی تو سب کچھ کھانے پینے لگے گا۔" وہ دروازے کی جانب مڑی۔ "اب میں نوں جانا ہے۔ روٹی کھانی ہے۔ سکول سے سیدھی تیرے پاس آگئی تھی۔"

جمیلہ چلی گئی۔ رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا کہ کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی دھوپ دھندلی پڑ گئی۔ کمرہ سنسان ہوگیا۔

وہ خاموش لیٹا رہا۔ دوپہر ہوگئی۔ احمد نے کھانا لا کر رکھا۔ کھانے میں دودھ اور نرم نرم توری پراٹھے تھے۔ رحیم داد نے جمیلہ کی ہدایت کے مطابق پراٹھے دودھ میں بھگو کر کھائے۔

☆

باہر تیز دھوپ پھیلی تھی۔ ہوا بھی گرم تھی۔ رحیم داد کمرے میں لیٹا رہا۔ شام ہوگئی۔ احمد نے کرسی باہر صحن میں ڈال دی۔ رحیم داد کی بے چین نگاہیں بار بار اس دروازے کی جانب اٹھ جاتیں جو حویلی میں کھلتا تھا۔ اسے جمیلہ کا انتظار تھا' جس کا مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ دیکھ کر وہ خود بھی شگفتہ ہو جاتا تھا۔

اندھیرا بڑھتا گیا۔ رات ہوگئی مگر جمیلہ نہیں آئی۔ اللہ وسایا بھی نہیں آیا۔ وہ صبح آیا۔ رحیم داد کو اپنے ہمراہ باغ میں لے گیا۔ دونوں آم کے درختوں کے ایک کنج میں پڑی ہوئی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ دھوپ ابھی بہت ہلکی تھی۔ ہوا کے نرم جھونکے چل رہے تھے۔ فضا خوش گوار تھی۔

نوکروں نے ناشتا لگا دیا۔

رحیم داد نے لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے ماکھے کا ذکر چھیڑ دیا۔ "کل جی' دور کے پنڈ کا ایک مزارع آیا تھا۔ ماکھا نام بتاتا تھا۔ بہت پریشان نظر آتا تھا۔ اس کا ایک کام ہے تجھ سے۔"

"کیا کام ہے اس کا؟" اللہ وسایا نے دریافت کیا۔

"اس کی گھر والی کو زمیں دار نے اٹھوا کر اپنی حویلی میں رکھ لیا ہے۔ وہ اپنا بازو واپس لینے کے لیے بہت بے چین اور پریشان ہے۔"

اللہ وسایا نے بے نیازی سے کہا۔ "چوہدری! تو کس چکر میں پڑ گیا۔ وہ کوئی وڈا ہی زمیں دار ہو گا اور ایسے زمیں داروں کو دوسرے کے ڈھور ڈنگر چوری کروا کے ادھر سے ادھر کرنے اور مزارعوں اور کمیوں کی جوان گھر والیوں اور کڑیوں کو اٹھوا کر اپنی رکھیل بنانے کا چسکا ہے۔ پوچھو تو کہیں گے ایسا کیے بنا زمیں داری نہیں چل سکتی۔ مزارعوں اور کمیوں پر زمیں داروں کا رعب اور دبدبہ نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسا نہ کیا جائے تو وہ سر اونچا کر کے چلیں گے۔ بدمعاشی اور سرکشی کریں گے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا' لہجہ کسی قدر تیکھا ہوگیا۔ "چوہدری! تو کس کس کا بازو واپس دلوائے گا۔ میرا کہا مان' اس چکر میں نہ پڑ۔"

"پر ماکھا بہت دکھیارا ہے۔" رحیم داد نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سفارش کی۔ "پنج سال سے اس کی گھر والی زمیں دار کی حویلی میں قید ہے۔ تین بچے اس سے پیدا کرا چکا ہے۔ تب بھی نہیں چھوڑتا۔ ادھر ماکھے کا حال یہ ہے کہ گھر میں صرف بوڑھی ماں ہے۔ پچھلی برکھا میں اس کا مکان بھی ڈھے گیا۔ بے چارا پیر پکڑ کر روتا تھا' گڑگڑاتا تھا۔ تو اس کے زمیں دار کے نام چٹھی لکھ دے' میرے کہنے سے لکھ دے۔ ماکھے کا کام بن جائے گا۔"

"زمیں دار کون ہے؟" اللہ وسایا نے رحیم داد کی سفارش سے متاثر ہو کر نیم رضامندی ظاہر کی۔ "اس کا کچھ اتا پتہ ماکھے نے بتایا تھا؟"

"ادھر اتر میں اس کا پنڈ ہے۔ پیراں والا نام ہے۔" رحیم داد نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "زمیں دار کوم کا سید ہے۔ شاہ جی کہلاتا ہے۔ اس کا پورا نام مجھے ملوم نہیں۔"

"ضرورت بھی نہیں۔ میں سمجھ گیا' وہ کون ہے۔" اللہ وسایا بولا۔ "اس کا نام احسان شاہ ہے۔ ادھر کا وڈا زمیں دار ہے' بلکہ بہت وڈا جاگیر دار ہے۔ اس کی حویلی نہیں' وڈا کوٹ ہے۔ ایسی اونچی اونچی دیواریں ہیں کہ پرانے زمانے کے کسی قلعے کی فصیلیں لگتی ہیں۔ ان فصیلوں کے پیچھے بہت سی کوٹھڑیاں ہیں۔ ہر زنانی کو اٹھوانے کے بعد انھی کوٹھڑیوں میں سے کسی میں رکھا جاتا ہے۔ کوٹ

کے دروازے پر مسلح راکھے دن رات پہرا دیتے ہیں۔ کوئی زنانی دروازے تک نہیں پہنچ سکتی۔ باہر نکلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اتنی زنانیاں اٹھوا کر اس نے کیوں رکھ چھوڑی ہیں؟"

"رات کو نشے میں ڈون ہو کر شاہ جی کوٹھڑیوں کے معائنے پر نکلتا ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔

"جس زنانی پر طبیعت آجاتی ہے' اسے اپنے کمرے میں بلوالیتا ہے۔ سنا ہے کبھی کبھی تو ایک رات میں کئی کئی بلواتا ہے۔ دلی کے دو حکیم اس نے نوکر رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ اسے تگڑا جوان رکھنے کے لیے نئے نئے کشتے اور معجون بناتے ہیں۔ شاہ جی ادھکڑ ہو چکا ہے پر مونچھوں اور سر کے بالوں پر خضاب لگا کر جوان گبھرو کی طرح گھوڑی پر اکڑ کر بیٹھتا ہے۔"

"وہ جیسا بھی ہے' ہم نے اس سے کیا لینا۔ تو صرف اس کے نام چٹھی لکھ دے۔ ماکھا یہی چاہتا ہے۔ کہتا تھا' تیری چٹھی سے اس کا کام بن جائے گا۔"

"بننے کی بجائے اور بگڑ جائے گا۔" اللہ وسایا نے سنجیدگی سے کہا۔ "میری چٹھی دیکھ کر تو اتنا ناراض ہو گا کہ ماکھے کو ہرگز اس کی گھروالی واپس نہیں کرے گا۔"

"گل سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"گل ایہہ ہے جی۔ میری اس کے ساتھ لگتی ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "وہ مجھ سے سخت خار کھاتا ہے۔ میرے خلاف اوپر طرح طرح کی شکائتیں پہنچاتا ہے۔ کتنی بار اس نے میرے چوکھر اٹھوالیے۔ کھڑی فصلیں جلوادیں۔ جھوٹے کیس بنوائے۔ چوہدری' تو نہیں جانتا' وہ کتنا برا اور خطرناک بندہ ہے۔"

"مطلب یہ ہوا کہ ماکھے کے لیے تو کچھ نہیں کر سکتا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بتا' میں کیا کر سکتا ہوں۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "شاہ جی کی حویلی میں اس کی مرضی کے بنا کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ چاروں طرف مسلح پہرا رہتا ہے۔ پولیس اور حکومت بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ سارے ہی وڈے افسروں سے اس کی یاری دوستی ہے۔ ایم ایل اے' ایم سی اے اور وزیر اس کی حویلی میں آکر ٹھہرتے ہیں۔ وہ انھیں ولایتی شرابیں پلاتا ہے۔ جوان اور سوہنی مٹیاریں پیش کرتا ہے۔" اللہ وسایا زیر لب مسکرایا۔ "وہ شاہ جی کی مدد کرتے ہیں' شاہ جی ان کی مدد کرتا ہے۔ وہ اس کی سفارشوں پر کام کر دیتے ہیں۔ شاہ جی ان کے لیے اوپر سفارشیں پہنچاتا ہے۔ تبھی تو تھانے دار' تحصیل دار اور دوسرے افسر اس کی مرضی کے لگائے جاتے ہیں۔ ذرا اس کے خلاف کوئی کام کریں' جھٹ ان کا تبادلہ کرا دیتا ہے۔"

"یہ تو جی اندھیر گردی ہے۔"

"ہے تو۔" اللہ وسایا نے اتفاق رائے کیا۔ "پر ایک احسان شاہ کیا' سارے ہی وڈے زمیں دار اور جاگیر دار ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس دوڑ میں کوئی بہت آگے ہے' کوئی ذرا پیچھے۔ کوئی کشتے اور انجکشن آزمانے کے لیے مزارعوں اور کمیوں کی گھروالیاں اور کڑیاں اٹھواتا ہے' کوئی انھیں صرف ڈرانے' دھمکانے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ چوہدری تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ مزارعے یا کمی کی گھروالی کا جوان اور خوبصورت ہونا' اس کی بدنصیبی بھی ہوتی ہے۔ وہ ایسے وڈے زمیں داروں کے چنگل سے نہیں بچ سکتی۔"

"تو بھی تو وڈا زمیں دار ہے پر تیری حویلی میں تو مجھے ایسا کوئی چکر نظر نہیں آیا۔"

"میری گل چھوڑ۔" اللہ وسایا مسکرایا۔ "میں کب زمیں داری کرتا ہوں' زمین داری تو جیلہ کرتی ہے۔" بات کرتے کرتے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چہرے سے تشویش جھلکنے لگی۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "کس فکر میں پڑ گیا؟"

اللہ وسایا نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔ "چوہدری! سچ پوچھ تو مجھے جیلہ کی طرف سے بھی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ منع بھی کرتا ہوں پر وہ نہیں مانتی۔ دن ہو یا رات' بنّے میں ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہے۔ ذرا پروا نہیں کرتی۔ ڈرتا ہوں' کوئی وڈا زمیں دار اسے بھی نہ اٹھوالے۔ ویسے ہی سب مجھ سے خار کھاتے ہیں۔ حالانکہ سچی گل ایہہ ہے چوہدری' وہ مجھ سے سال دو سال ہی چھوٹی ہو گی۔ ۳۰ سال سے کم نہیں۔ کچھ اوپر ہی ہو گی۔ دو بچے بھی ہو چکے ہیں۔"

"پر تیری گھروالی اتنی لگتی نہیں' جتنی تو اس کی عمر بتا رہا ہے۔"

"بات یہ ہے جی! وہ سخت محنتی اور اہری ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔ ادھر وڈے زمیں داروں کی گھروالیوں کا حال یہ ہے' حویلیوں اور بنگلوں میں بند رہتی ہیں۔ بھر بھر گلاس دودھ اور لسی چڑھاتی ہیں۔ دبا کے گھی اور مکھن کھاتی ہیں۔ کچھ کرنا دھرنا تو ہوتا نہیں۔ کام کاج کے لیے نوکرانیوں کی پوری بٹالین ہوتی ہے۔ ان کا کام تو منجیاں توڑنا اور کھٹا کھٹ بچے جننا ہوتا ہے۔ اس طرح چند ہی سال میں پھیل کر نیلی بار کی مُجھ بن جاتی ہیں۔" وہ شوخی سے ہنسا۔ "مُجھ تو جی! مُجھ ہی ہوتی ہے۔ سو وڈے زمیں دار کچھ ہی مدت بعد اپنی گھروالیوں کو مُجھ سمجھ کر حویلی کے کسی ڈھارے شاڑھے میں ڈال دیتے ہیں۔ اور دوسروں کی جوان اور سوہنی گھروالیوں کو اڑانے کی تاک میں رہتے ہیں۔ مزارعوں اور کمیوں کی گھروالیاں تو اس طرح اٹھوا لیتے ہیں جیسے شیر کٹا منہ میں دبا کر لے جاتا ہے۔"

اللہ وسایا کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری! میں نوں اب جانا ہے۔ شام کو تیرے پاس آؤں گا۔"

اللہ وسایا چلا گیا۔ رحیم داد باغ میں دیر تک بیٹھا رہا۔ جب دھوپ میں شدت آ گئی اور درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر اس پر بھی پڑنے لگی تو وہ بھی اٹھ کر مہمان خانے میں چلا گیا۔ دوپہر کو ڈاکٹر خان آیا۔ اس کے ساتھ جمیلہ بھی تھی۔ ڈاکٹر نے اسٹکنگ پلاسٹر اور روئی ہٹا کر زخم دیکھا۔ زخم اب بھر گیا تھا۔

ڈاکٹر نے رحیم داد کے بازو میں انجکشن لگایا اور ایک شیشی میں مرہم دے کر بولا۔ "اسے صبح شام لگاتے رہنا۔ اب پٹی کی ضرورت نہیں۔ لیکن زخم پر مکھی نہ بیٹھنے پائے۔ ویسے تو یہ صاف ستھری جگہ ہے پر احتیاط کرنا بہت ضروری ہے۔" ڈاکٹر نے اسے غسل کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ گرم پانی سے نہائے۔ اور زخم پر مرہم لگانے سے پہلے نہالے۔

ڈاکٹر چلا گیا۔ جمیلہ بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔

رحیم داد نے نائی بلوایا۔ حجامت بنوائی اور مہمان خانے کے غسل خانے میں گرم پانی سے دیر تک صابن مل مل کر نہاتا رہا۔ غسل سے فارغ ہو کر اس نے اجلے کپڑے پہنے، بالوں میں کنگھی کی اور زخم پر مرہم لگایا۔

دوپہر کو کھانا کھایا مگر بستر پر آرام کرنے کے بجائے اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ اندر سے کنڈی لگائی۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ کھولا، سادہ کاغذ نکالا اور اس پر مقتول چوہدری نورا لی کے جعلی دستخط بنانے کی پوری توجہ سے مشق کرنے لگا۔

دن ڈھلے تک وہ مسلسل مشق کرتا رہا۔ جب کمرے میں روشنی دھندلی پڑ گئی تو اس نے کاغذ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ احمد مہمان خانے میں نہیں تھا۔ رحیم داد نے کاغذ کے ٹکڑے ایک کونے میں ڈال کر ماچس سے آگ لگا دی اور ان کی راکھ مٹی میں ملا دی۔

☆

دھوپ گھروں کے منڈیروں پر پہنچ چکی تھی۔ سائے طویل ہو کر دور دور تک پھیل گئے تھے۔ رحیم داد مہمان خانے سے نکل کر باغ میں پہنچا۔ جمیلہ پہلے سے وہاں موجود تھی۔ وہ گلاب کے پودوں کے تختے کے پاس کرسی پر بیٹھی تھی۔ قریب ہی اس کے دونوں بچے کھیل رہے تھے۔ ایک بیٹا اور دوسری بیٹی۔ بیٹا پانچ سال کے لگ بھگ تھا۔ بیٹی اس سے سال سوا سال چھوٹی تھی۔ دونوں بچے تن درست اور خوب صورت تھے۔ پھولوں کے مانند شگفتہ اور تر و تازہ۔ جمیلہ گردن جھکائے ایک

بوڑھے کے پیر کے زخم پر دوا لگا کر پٹی باندھ رہی تھی۔ آہٹ سن کر جمیلہ نے گردن کو ہلکا سا خم دیا، رحیم داد کو دیکھا، مسکرا کر بولی۔

"آ چوہدری! اِدھر بیٹھ جا۔" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ رحیم داد خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے زخم پر اچھی طرح پٹی باندھ کر بوڑھے سے کہا "چاچا! جب تک چوٹ ٹھیک نہ ہو جائے، منجی پر پڑا رہ۔ دو تین روز میں چنگا ہو جائے گا۔" بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جمیلہ نے اسے ٹوکا۔ "یہ تو بتا، تیری گھر والی کا کیا حال چال ہے؟"

"بھین جی! اس کا بکھار نہیں جاتا۔ ہر تیسرے روز اسے زور سے ٹھنڈ چڑھتی ہے۔ جانے کیسا بکھار ہے، جاتا ہی نہیں۔" بوڑھے نے تشویش کا اظہار کیا۔

"اسے ملیریا ہے۔ میں رات کو اس کے لیے دوائی لے کر تیرے گھر آؤں گی۔ چنتا نہ کر، اس کا بکھار جاتا رہے گا۔" جمیلہ نے اسے تسلی دی۔ "دعا کر اپنی ڈسپنسری بن جائے تو سارے پنڈ کا دوا دارو یہیں ہو گا۔ دیپال پور یا پاک پتن نہیں جانا پڑے گا۔"

بوڑھا اسے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

جمیلہ کے سامنے گھاس پر تین عورتیں بیٹھی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک عورت سے پوچھا۔ "بشیراں! زمیں دار کدھر ہے؟ حویلی میں تو ہے نہیں۔"

جمیلہ کرسی سے اتر کر عورتوں کے ساتھ گھاس پر بیٹھ گئی، مسکرا کر بولی۔ "وہ اس طرح بیٹھنے پر برا مناتا ہے۔ زمیں دار جو ٹھہرا۔" وہ ایک اور عورت کی جانب متوجہ ہوئی۔ "تو کیسے آئی پھاتاں! ٹھیک ٹھاک تو ہے؟"

"ٹھیک ٹھاک ہی ہوں جی۔" پھاتاں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بیٹیاں فصل کی واڈھی کی آس لگاتی ہیں۔ واڈھی ہو تو ان کا ویاہ ہو۔ اپنی تو زمین ہے، نہ فصل۔ گھر والا بھی نہ رہا۔ دھی جوان ہو گئی۔ اس کا ویاہ کیسے کروں؟ بے ساکھی کے بعد پنڈ کی کئی بیٹیوں کا ویاہ ہو رہا ہے۔" اس کا چہرہ سوگوار ہو گیا۔ "مجھے تو کوئی ادھار بھی نہیں دے گا۔ میں کیا کروں بھین جی؟"

"تو اپنی تاجاں کی گل کر رہی ہے؟" جمیلہ نے مسکرا کر دریافت کیا۔ "تو نے اس کے لیے ور بھی ڈھونڈا؟"

"ور تو کب کا دیکھ بھال لیا، پرایا نہیں، اپنی ہی برادری کا ہے۔ سکے ویر کا پتر ہے۔ اس کے گھر والے تو بالکل تیار ہیں۔ تاجاں انھیں پسند بھی ہے۔ پر اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

"چتا نہ کر پھا تاں!" جمیلہ نے چمک کر کہا۔ "تاجاں اپنے پنڈ کی دھی ہے' میری دھی ہے۔ میں اس کی سگائی کروں گی۔ یہیں حویلی سے اس کا ویاہ ہوگا۔ تو اپنی بھرجائی سے کہہ دے' تیاری کرے۔"

"بھین جی! میری دھی بھی جوان ہو گئی۔" بشیراں نے جھٹ اپنا مسئلہ پیش کردیا۔ "مجھے کچھ اور نہیں چاہئے' ادھار مل جاتا تو میں ویاہ کرکے اسے اس کے گھربار کا کردیتی۔"

"تو گلو کی گل کر رہی ہے؟" جمیلہ نے حیرت سے پوچھا۔ "ارے وہ تو ذرا سی چھوہری ہے۔ تو اس کی سگائی کرنا چاہتی ہے۔ حد کردی تو نے۔"

"بیٹی کا بوجھ جتنی جلدی سر سے اتر جائے' اتنا ہی چنگا ہے جی۔" بشیراں نے اپنی دلیل کا سہارا لیا۔

"اس پر کار نہ سوچ' ابھی تو وہ بہت نرل ہے۔ مشکل سے باراں برس کی ہوگی۔ اسے کچھ دن تو کھیل کود لینے دے۔ جوان ہو جائے تو ویاہ کرنا۔ کم سے کم چار سال بعد اس کام کے لیے میرے پاس آنا۔ میں تیری ضرور سہایتا کروں گی۔"

جمیلہ نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دور سے اللہ وسایا آتا نظر آیا۔ جمیلہ اٹھ کر جھٹ کرسی پر بیٹھ گئی۔ تینوں عورتیں چلی گئیں۔ اللہ وسایا تھکا ہوا ایک کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ نڈھال اور بجھا بجھا نظر آرہا تھا۔

جمیلہ نے تشویش سے دریافت کیا۔ "کیا بات ہے۔ اللہ وسائی! تو کچھ پریشان اور نراش نظر آرہا ہے؟"

"پریشانی کی گل ہی ہے۔" وہ ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "پڑ میں کاٹی ہوئی کنک پڑی ہے۔ دھڑ کو پچھوڑنے اور پھٹکنے کے لیے مسلی نہیں مل رہے۔" اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "بارش یا آندھی آجائے تو سب کچھ برباد ہو جائے گا۔"

آسمان پر بادلوں کا ہلکا ہلکا غبار چھایا تھا۔ ہوا میں بھی قدرے تیکھا پن تھا۔ جمیلہ نے بھی آسمان کو دیکھا۔ وہ بھی متفکر نظر آنے لگی۔ "چنتا کرنے کی تو گل ہے پر تو نے کیا اپائے سوچا؟" اس نے بیٹے کو گود میں بٹھالیا اور اس کے بالوں میں انگلیوں سے آہستہ آہستہ کنگھی کرنے لگی۔

"پرسوں سویرے سے پہلے مسلی نہیں آسکتے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "آج کی رات اور کل کے دن رات ٹھیک سے گزر جائیں تو سمجھو کام بن گیا۔"

"میں کہتی ہوں' مزارعے اور زمیں دار یہ کام کیوں نہیں کرسکتے؟"

"نہیں جی! وہ ایسا نیچ کام کیسے کرسکتے ہیں۔" رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "ایسا کام تو مسلی اور کمی ہی کرسکتے ہیں۔"

جمیلہ بولی۔ "اور جو برکھا آجائے' آندھی آجائے؟" اس کا لہجہ تیکھا اور تلخ تھا۔ رحیم داد نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ "یہ تو رب کی مرضی ہے' اس کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے۔"

"چوہدری یہ باتیں جی لے نہیں سمجھتی۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "شہر میں برسوں رہ چکی ہے نا' پڑھ لکھ بھی بہت گئی ہے۔ اسے کیا پتہ' زمیں داری کیا ہوتی ہے۔" وہ بازو سے لگی ہوئی بیٹی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

"پر میں تو گڈو کو پہلے ڈاکٹر بناؤں گی۔" اس نے بیٹے کو سینے سے چمٹا کر پوچھا۔ "گڈو! تو ڈاکٹر بنے گا نا؟"

گڈو نے نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا اور اپنا گول مٹول سر آہستہ آہستہ ہلایا۔

جمیلہ نے بیٹی کو دیکھا' ہنس کر بولی۔ "ڈاکٹر تو بینا بھی بنے گی۔ دونوں مل کر میری ڈسپنسری کو بہت وڈا اسپتال بنادیں گے۔ اپنے ہی پنڈ کا نہیں' دور دور کے پنڈ والوں کا علاج کریں گے۔"

"جی لے! تو سفنا تو نہیں دیکھ رہی؟" اللہ وسایا ہنسنے لگا۔ "تیری ڈسپنسری بنی بھی نہیں اور تو نے خواب دیکھنے شروع کردیئے ابھی سے۔"

"منش پہلے سپنے ہی دیکھتا ہے۔" جمیلہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "من میں لگن ہو تو سپنا ایک روز سچ بن کر سامنے آجاتا ہے۔ سدا ایسا ہی ہوتا ہے۔"

شام دھیرے دھیرے باغ میں تاریکی کے ڈیرے ڈال رہی تھی۔ اللہ وسایا نے اٹھتے ہوئے جمیلہ سے کہا۔ "اندھیرا پھیل رہا ہے' کب تک یہاں بیٹھنے کا ارادہ ہے؟" جمیلہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا مہمان خانے میں چلا گیا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ حویلی کی سمت بڑھے۔ دونوں گردن اٹھا کر بار بار آسمان پر چھایا ہوا غبار دیکھتے تھے۔ وہ بارش اور طوفان کے خطرے سے فکر مند نظر آتے تھے۔ اسی خدشے سے سہمے ہوئے دونوں بچوں کے ہم راہ حویلی میں داخل ہو گئے۔

رات گزری' دن گزرا' دوسری رات بھی گزر گئی مگر نہ بارش ہوئی' نہ طوفان آیا۔ سویرے سویرے مسلی آگئے اور گاہی ہوئی گندم پچھوڑ کر بھوسا اور دانے الگ کرنے لگے۔ پچھوڑنے کے بعد جگہ جگہ مزارعوں کے کھلیانوں میں گندم اور چنے کی ڈھیریاں نظر آنے لگیں۔ کہیں کہیں ڈھیریوں پر مٹی اور راکھ کا لیپ لگا کر ہلکا سا پلستر چڑھا دیا گیا تاکہ چوری چکاری کا امکان نہ رہے۔

اسی طرح بھوسے کی بھی ڈھیریاں بنا کر اوپر سے مٹی کا گاڑھا گاڑھا لیپ چڑھا دیا گیا۔

جمعے کے مبارک دن سے بٹائی کا آغاز ہوا۔ اس روز کو ٹلہ ہر کشن میں بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ مزارعوں اور کمیوں نے نہا دھو کر اجلے کپڑے پہنے۔ نوجوان عورتیں رنگ برنگے راکھواں لباس میں ہنستی مسکراتی ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔ وہ کنواریاں جن کی بٹائی کے بعد شادی ہونے والی تھی، شرمائی شرمائی نظر آتیں، سہیلیاں ان سے چھیڑ چھاڑ کرتیں۔ اس روز گاؤں میں میلے کا سماں تھا۔

پھر دن گزرا تو اللہ وسایا اپنے مزارعے کمال کے کھلیان پر جمیلہ اور رحیم داد کے ہم راہ پہنچا۔ فصل کی بٹائی کا آغاز وہیں سے ہوا۔ کمال کے گھر والے اور بچے کمی پہلے سے وہاں موجود تھے۔ مسجد کا ملا بھی ایک طرف بیٹھا تھا۔ سب اللہ وسایا کے منتظر تھے۔ مٹی سے لپے پتے کھلواڑ پر گندم اور چنے کی ڈھیریاں موجود تھیں۔ اللہ وسایا کے پہنچتے ہی غلغلہ پڑا۔ گندم اور چنوں کی ڈھیریوں پر چڑھا ہوا پلستر اتارا گیا۔ کھلواڑ ایک بار پھر جھاڑو سے صاف کی گئی۔ عود و لوبان سلگایا گیا۔ دھواں لہرا ہوا فضا میں خوشبو بکھیرنے لگا

ہر ڈھیری اس اندازے سے بنائی گئی تھی کہ اس میں لگ بھگ آٹھ من غلہ ہو۔ اللہ وسایا اور کمال نے جوتے اتارے اور کھلواڑے کے چبوترے پر برہنہ پیر چڑھ گئے۔ دونوں ڈھیریوں کے قریب خاموش کھڑے ہو گئے۔ ملا نے کلام پاک کی تلاوت شروع کی۔ کھلواڑ کے اردگرد کھڑی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں نے دوپٹوں کے آنچل سے سر ڈھک لیے۔ سب ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر ادب سے خاموش کھڑے رہے۔

تلاوت ختم کر کے ملا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ سب نے اس کے ساتھ ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ دعا کے بعد بٹائی شروع ہوئی۔ بٹائی کی ذمے داری پیشہ ور ونڈاوے کے بجائے گاؤں کے ایک بوڑھے کے سپرد کی گئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹوپا دیا تھا۔ ٹوپے میں تقریباً ڈھائی سیر غلہ آتا تھا۔ بٹائی شروع ہونے سے پہلے جمیلہ نے بوڑھے سے اونچی آواز میں کہا۔ "چاچا! پتہ ہے، یہ ڈھیریاں زمیں دار اور مزارعے کا مشترکہ کھاتا ہے۔ انھیں دونوں کے درمیان آدھا آدھا بانٹنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے کانونی حکوک بھی پوری طرح دھیان میں رکھنے ہوں گے۔ سرکاری کاغذات میں انھیں اس پرکار بتایا گیا ہے۔" اس نے لمبا کاغذ نکالا اور سنبھل سنبھل کر پڑھنے لگی۔ "ڈھیر جنس ہے۔ نصف نصف مابین مالک و مزارع بعد وضع خرچ ہائے ذیل :

خرچ کمیاں :

ترکھان	ساڑھے چار پائی فی ہل
لوہار	ساڑھے چار پائی فی ہل
چھاجی	۹ پائی فی ڈھیری
موچی	۹ پائی فی ڈھیری
نائی	۹ پائی فی ڈھیری

جنس یافتنی مالک از ڈھیری مشترکہ

سلی (ملازم مالک)	ایک پائی فی ڈھیری
محاصل	ایک نو پائی ڈھیری
مالک کا پٹواری	۳ ٹوپے فی ڈھیری
منشی ڈیرے دار	۳ پائی فی ڈھیری
داد (میراثی)	ایک پائی فی ہل
دھواں دار (برائے تکیہ فقیراں)	ایک پائی فی ڈھیری
خرچ گھوڑا کاہیاں	دو پائی گندم فی ڈھیری

یہ تفصیلات سنانے کے بعد جمیلہ نے بوڑھے کی طرف دیکھا، مسکرا کر بولی۔ "چاچا! تمیں نوں تو پتہ ہی ہوگا ایک پائی چار ٹوپے کے برابر ہوتی ہے۔ ویسے سرکاری کاغذات میں خرچ ڈاک بنگلہ برائے افسران دورہ گشتی کے لیے دو پائی فی ڈھیری بھی درج ہے۔ پٹواری کا فصلانہ اور تھانے دار کا نذرانہ الگ ہوتا ہے۔ پر ہم نے یہ سب کچھ نہیں دینا اور اپنا پٹواری شواری تو ہے ہی نہیں۔ اسے کچھ بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

بوڑھے نے جمیلہ کی تمام باتیں سنیں، مسکرا کر گویا ہوا۔ "فکر نہ کر، میں نوں سب پتہ ہے۔ تمیں نوں یاد نہیں، پچھلے سال ربیع پر بھی میں نے ہی بٹائی شروع کی تھی اور توں نے مجھے سب کچھ ایسے ہی پڑھ کر سنایا تھا۔ میں اسے بھولا نہیں ہوں۔"

"پر چاچا، کانونی کارروائی تو پوری ہونی ہی چاہیے۔ جس کا جتنا حصہ بنتا ہے، اسے پورا پورا ملنا چاہیے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر بوڑھے نے ٹوپے میں پہلے گندم کی ڈھیری سے دانے بھرے اور دو بوریوں میں ایک ایک ٹوپا ڈالنے لگا۔ ایک بوری زمیں دار کی اور دوسری مزارعے کی تھی۔ بوڑھا بوریاں غلے سے بھرتا رہا۔ جمیلہ اپنے مزارعے کمال کی بیوی کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ بیچ بیچ میں بول جاتی۔ اونچی آواز سے بٹائی کرنے والے بوڑھے کو ٹوکتی' ہنس ہنس کر کہتی۔

"چاچا! تو زمیں دار کی بوری میں زیادہ گنک ڈال رہا ہے۔"

"اوپر والا دیکھ رہا ہے چاچا۔"

"ڈنڈی نہ مار۔ کمال کی را کی کا ٹوپا پورا بھر۔"

جمیلہ کی باتوں پر بار بار قہقہہ بلند ہوتا۔ زمیں دار اور مزارعے کے نصف نصف حصے کی بٹائی کے بعد مقررہ مقدار کے مطابق کمیوں اور دوسرے حق داروں کو بھی فصل کی پیداوار میں ان کا حصہ مل گیا تو جمیلہ نے ضد کر کے خاصی مقدار میں اتنی کا گندم فقیروں اور دوسرے حاجت مندوں کے لیے پڑا رہنے دیا۔

شام تک یہ سلسلہ چلتا رہا' دوسرے دن بھی جاری رہا اور مسلسل کئی روز تک جاری رہا۔ آخر بٹائی ختم ہوگئی۔

رحیم داد حیرت زدہ تھا۔ اس نے کسی بڑے زمیں دار کو اس طرح بٹائی میں شریک ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ کام منشی یا کاردار انجام دیتے۔ وہ اپنے ساتھ بٹائی کرانے والے ونڈاوے بھی لاتے' جو ہر طرح یہ کوشش کرتے کہ مزارعے کے مقابلے میں زمین دار کو فصل کا زیادہ حصہ ملے۔ مزارع یا اس کے کنبے کا کوئی فرد احتجاج کرتا تو اسے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کردیا جاتا۔ زمیں دار فصل کا نصف نہ لیتے' ہمیشہ زیادہ لیتے۔ اکثر و بیشتر دو تہائی کے لگ بھگ وصول کرتے۔

جب بٹائی کے حصے کا غلہ بند بوریوں کی صورت میں حویلی کے گودام میں پہنچ گیا تو پاک پتن کی غلہ منڈی کے آڑھتی اللہ وسایا کی حویلی کے چکر کاٹنے لگے۔ سال بھر کی ضرورت کا غلہ رکھ کر بقیہ فروخت کردیا گیا۔ یہ گویا آخری مرحلہ تھا۔ پھر دیگیں چڑھیں' طرح طرح کے پکوان پکے۔ سب نے کھانا کھایا۔

حویلی کے سامنے میدان میں مردوں نے بھنگڑا ڈالا۔ ڈھولیوں نے جھوم جھوم کر ڈھول پر چوٹ لگائی۔ من چلے نوجوانوں نے ان کے گرد حلقہ بنا کر رقص کیا۔ ایک دوسرے کو للکار کر ٹپے کے بول اٹھائے۔

اللہ وسایا اونچی چارپائی پر بیٹھا تھا اور رقص کرنے والوں کا حوصلہ بڑھ رہا تھا۔ ان کی آواز میں

آواز ملا کر بلے بلے کے نعرے بلند کر رہا تھا۔

بھنگڑا ختم ہوگیا تھا۔ اللہ وسایا حویلی میں داخل ہوا۔ رحیم داد بھی اس کے ہم راہ تھا۔ حویلی کے وسیع صحن میں ابھی تک ڈھول بج رہا تھا۔ وسط میں جازم کا فرش تھا۔ اس پر گاؤں کی عورتیں بیٹھی تھیں۔ چاروں طرف مشعلیں روشن تھیں۔ عورتیں ڈھولک کی تھاپ پر لک لک کر گا رہی تھیں۔

اساں ڈھولکی وجائی' ساڈی ریت اے پرانی

اللہ وسایا اور رحیم داد ایک گوشے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے دیکھا کہ گانے والی عورتوں میں جمیلہ بھی شامل ہے۔ اس کی آواز سریلی اور خوب صورت تھی۔ وہ گردن کو بار بار خم دے کر گا رہی تھی' اونچی تان سے گیت کے بول اٹھا رہی تھی۔ وہ اس وقت سنہری ٹلے کا لاچا باندھے ہوئے تھی۔ لاچے کا رنگ زعفرانی تھا' کرتا بھی اسی رنگ کا تھا' گریبان پر سبز اور سیاہ دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ دوپٹا سبز تھا۔ پیروں میں چاندی کی پازیب تھی۔ ماتھے پر جڑاؤ ٹیکا جھلک رہا تھا۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا۔ مشعلوں کی لہراتی روشنی میں وہ بہت دل کش اور دل آرا نظر آرہی تھی۔

گانا ختم ہوا تو جمیلہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ "ہوجائے جی' ہوجائے۔ گدھا ہوجائے۔"

چٹکیاں بجنے لگیں اور کچھ دیر بجتی رہیں۔ جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ساتھ نوجوان عورتیں اور مٹیاریں بھی کھڑی ہوگئیں۔ جمیلہ تالیاں بجاتی ہوئی آگے آئی۔ عورتیں اور مٹیاریں اس کے گرد حلقہ بنا کر ساتھ ساتھ تالیوں کی تھاپ دینے لگیں۔ رفتہ رفتہ تالیوں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی گئی۔ تالیوں کی تھاپ کے ساتھ ساتھ پاؤں گردش کرنے لگے۔ جمیلہ نے ایک ہاتھ اٹھا کر اونچے سروں میں گدھے کی مناسبت سے گیت چھیڑا۔

کڑیاں سد کے گدھے پائیے
ستیاں گلاں جگائیے!!

گیت کے دوسرے بول ہم نوا عورتوں نے اٹھائے۔ تالیوں کی مسلسل تھاپ پر بول اونچے' اور اونچے ہوتے گئے۔ تھرکتے' لچکتے جسموں کی گردش تیز ہوتی گئی۔ ناچ تیز ہوا تو عورتوں نے رک رک کر دائرے میں جمیلہ کے گرد پھیریاں لینا شروع کردیں۔ ان کے پاؤں ایک ہی انداز میں زمین پر پڑ رہے تھے اور اسی ترتیب اور تواتر سے ہاتھ اوپر اٹھ اٹھ کر تالیوں کی تھاپ پر ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ ایک نوجوان لڑکی کے پیر غلط پڑے تو سامنے بیٹھی ہوئی عورتوں میں زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ اس قدر خجل ہوئی کہ سر جھکا کر رقص کرنے والیوں کے حلقے سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔

جمیلہ کی اس پر نظر پڑی' اس نے آگے بڑھ کر جھٹ اس کا ہاتھ پکڑا اور حلقے سے علیحدہ نہ ہونے دیا۔

مشعلوں کے بھڑکتے شعلوں کی مچلتی روشنی میں جوان اور صحت مند جسم پھڑکتے رہے' لہراتے رہے۔ پازیب اور پائلیں جھنکارتی رہیں۔ گیت کے سریلے بول فضا میں بکھرتے رہے۔ ناچ تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ رقص کرنے والیوں کے چہرے خون کی گردش سے گلابی پڑ گئے۔ دہکنے لگے' دمکنے لگے۔

جمیلہ کا دل نواز چہرا ان کے حلقے میں طلوع ہوتے ہوئے سورج کے مانند جگمگا رہا تھا۔ اس کی لمبی چوٹی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ چوٹی میں بندھا ہوا روپہلا پراندا جھلملا رہا تھا۔ وہ اس قدر حسین اور دل کش نظر آرہی تھی کہ رحیم داد مبہوت ہو گیا۔ ٹکٹکی باندھے اس کا تابندہ اور رخشندہ چہرہ تکتا رہا۔ پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح اس کے لچکتے بل کھاتے جسم کے پیچ و خم دیکھتا رہا۔

ناچ ختم ہوا تو رحیم داد کو ایسا لگا جیسے کوئی سہانا خواب دیکھتے دیکھتے اچانک بیدار ہو گیا ہو۔ جمیلہ اس کے ذہن پر برسات کی گھنی گھٹاؤں کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

آدھی رات کے بعد رحیم داد مہمان خانے میں گیا۔ بستر پر لیٹا تو ناچ کے آہنگ اور گیت کی نغمگی سے مسحور تھا۔ وہ خاموش لیٹا دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا۔

صبح وہ دیر سے بیدار ہوا۔ آنکھ کھلی تو مہمان خانے کے صحن کی دیواروں سے دھوپ نیچے اتر رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ واپس آیا تو میز پر ناشتا لگایا جا چکا تھا۔ احمد اجلے لباس میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔

"حمدے! آج تو بہت لشکارے مار رہا ہے؟"

وہ کسی قدر شرما کر بولا۔ "زمیں دارنی نے نئے کپڑے سلوا کر دیے ہیں۔ ہر فصل پر وہ حویلی کے سارے نوکروں اور نوکرانیوں کو نئے کپڑے دیتی ہے۔"

"تب تو تیرے عیش ہو گئے۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔

احمد نے دبی زبان سے کہا۔ "وہ ہے تو جی ہندنی پر دل کی بہت بھلی ہے۔"

رحیم داد چونک پڑا' پراٹھے کا لقمہ ہاتھ میں رہ گیا۔ "زمیں دارنی ہندنی ہے۔ تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"چوہدری! میں تجھ سے کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔ پر اب وہ ہندنی نہیں رہی۔ زمیں دار سے نکاح پڑھانے سے پہلے مسلمان ہو گئی تھی۔ اپنی مسجد کے ملاں نے اسے کلمہ پڑھا کر مسلمان بنا دیا تھا۔" احمد نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ "میں تو جی اس پنڈ کا پرانا رہنے و

ہوں۔ اس زمانے سے رہتا ہوں جب پاکستان نہیں بنا تھا۔ تب یہ ساری زمین' زمیں دارنی کے پیو کی تھی۔ یہ حویلی بھی اسی کی تھی۔ بہت وڈا زمیں دار ہوتا تھا وہ۔"

رحیم داد ششدر رہ گیا۔ گومگو کے عالم میں بولا۔ "تیری باتیں سمجھ نہیں آئیں۔"

"چوہدری! میں نے غلط گل نہیں کی۔" احمد نے بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "یہ تو سارا پنڈ جانتا ہے۔ تجھے اب تک پتہ نہیں چلا؟" وہ زیر لب مسکرایا۔ "پر زمیں دارنی اتنی بھلی ہے کوئی بھی اس کے بارے میں ایسی گل نہیں کرتا۔ سب اس سے پیار کرتے ہیں۔ بھین جی کہتے ہیں۔ سچ مان' میں نے یہ گل برائی سے نہیں کی۔ بس ایسے ہی زبان سے نکل گئی۔" اس نے ایک ہاتھ سے دونوں کان باری باری چھو کر گردن ہلائی۔ "توبہ جی توبہ۔ ربّا جانے' زمیں دارنی کا تو میں کبھی برا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

رحیم داد نے خاموشی سے ناشتا ختم کیا۔ احمد خالی برتن لے گیا۔ وہ دیر تک احمد کی باتوں پر غور کرتا رہا پھر اٹھ کر باغ میں گیا۔ وہاں بھی وہ احمد کی باتوں کی روشنی میں جمیلہ اور اللہ وسایا کے بارے میں سوچتا رہا۔

رحیم داد نے جمیلہ کے بارے میں نہ کسی سے کرید کر پوچھا' نہ احمد کی باتوں کی تصدیق چاہی۔ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اسے کچھ عرصے کے لیے محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی' وہ اسے مل گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی کام کاج تو تھا نہیں' کمرے کا دروازہ بند کرتا اور اطمینان سے چوہدری نورالہی کے دستخط کی مشق کرتا رہتا۔

رفتہ رفتہ رحیم داد کو اتنی مہارت ہو گئی کہ وہ نورالہی کے دستخط کی ہو بہو نقل کرنے لگا۔ اس کامیابی پر وہ خوش بھی تھا' مطمئن بھی۔

ایک شام رحیم داد اللہ وسایا کے ساتھ باغ میں بیٹھا تھا۔ اس نے دبی زبان سے رخصت ہونے کی خواہش ظاہر کی' مگر اللہ وسایا نے اصرار کیا تو اس نے مزید زور نہیں دیا۔ وہ فی الحال وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ صرف یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اللہ وسایا اس سے اکتا تو نہیں گیا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ ہر طرح اس کی دل جوئی کرتے' پورا خیال رکھتے کہ کسی طرح اسے تکلیف نہ ہو' اس کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔

رحیم داد کا وقت اچھا کٹ رہا تھا۔ مہمان خانے میں اسے ہر طرح کا آرام اور سکون میسر تھا البتہ ماکھا بری طرح کھلتا۔ بار بار کے انکار کے باوجود وہ رحیم داد کے پاس آ آ کر گڑگڑاتا' اپنی بپتا سناتا۔

احسان شاہ نے ابھی تک اس کی بیوی واپس نہیں کی تھی۔ اس کے پیٹ میں جو تھا بچہ بھی آ چکا تھا۔

یہ بات بھی اسے ماکھانے بتائی تھی۔ مگر رحیم داد اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ وسایا بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نہایت صاف گوئی سے اپنی مجبوری بتا چکا تھا۔

۱۸

گرمی خوب بڑھ چکی تھی۔ درو دیوار سے چنگاریاں نکلتیں۔ لو کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ اللہ وسایا کی زمینوں پر خریف کی فصل کے لیے مکئی' کماد' کپاس اور باجرے کی بوائی ہو رہی تھی۔ وہ کھیتوں میں کھڑے ہو کر اپنے سامنے بیج ڈلواتا' طرح طرح کی ہدایتیں دیتا۔ دن دن بھر چلچلاتی دھوپ اور لو میں کھڑے رہنے سے اس کا چہرہ جھلس کر سانولا پڑ گیا تھا۔

جمیلہ نے سرکاری اسکولوں کی طرح اپنے اسکول میں بھی موسم گرما کی تعطیل کر دی تھی۔ اسکول بند تھا۔ وہ اکثر اللہ وسایا کے ساتھ کھیتوں پر نکل جاتی اور ادھر ادھر گھومتی پھرتی۔ رحیم داد نے دونوں کو جب بھی کھیتوں سے آتے دیکھا' پسینے سے شرابور اور دھول سے اٹا ہوا پایا۔

ان دنوں اللہ وسایا سے رحیم داد کی ملاقات عام طور پر شام کو ہوتی۔ اللہ وسایا کبھی کبھی رات کا کھانا رحیم داد کے ساتھ مہمان خانے کے صحن میں بیٹھ کر کھاتا۔ زیادہ گرمی ہوتی تو کھانا باغ میں بھی کھایا جاتا۔ گھاس پر دری بچھا دی جاتی' وسط میں چھوٹے پایوں کی لمبی میز رکھ دی جاتی۔ اس پر کھانا چنا جاتا۔ سب دری پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ جمیلہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ موجود ہوتی۔ جس روز باغ میں کھانا کھایا جاتا' رحیم داد بہت خوش ہوتا۔ خود کو اللہ وسایا کے کنبے کا فرد سمجھتا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کے رویئے سے بھی رحیم داد کو بیگانگی مطلق محسوس نہ ہوتی۔

ایک صبح اللہ وسایا مہمان خانے میں رحیم داد کے پاس آیا۔ رحیم داد ذرا ہی دیر پہلے ناشتے سے فارغ ہوا تھا۔ خلاف معمول اللہ وسایا کے ہاتھ میں دو نالی بندوق تھی۔ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔

"سویرے سویرے بندوق لے کر کیسے نکل آیا؟ شکار پر جانے کا ارادہ ہے؟"

اللہ وسایا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "محکمہ آبادکاری میں میری زمین اور جائیداد کا مقدمہ چل رہا ہے۔ اس سلسلے میں ملتان جا رہا ہوں۔ کل صبح پیشی ہے۔"

"کب تک واپسی ہوگی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"دو تین روز تو لگ ہی جائیں گے۔ اگر تاریخ پڑ گئی اور لمی پیشی نہ لگی تو ہفتہ بھر ٹھیرنا پڑے گا۔ وکیل یہی بتاتا تھا۔ میں دوپہر کو روٹی کھا کر ملتان کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"بندوک اپنی حفاظت کے لیے لے جا رہا ہے؟ مقدمہ بازی چل رہی ہو تو حفاظت کے لیے اسلحہ رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

"میرا مقدمہ ایسا نہیں جس میں کسی جھگڑے کا ڈر ہو۔ مقدمہ سرکار کے ساتھ چل رہا ہے۔" اللہ وسایا نے مطلع کیا۔ "ویسے سفر میں اپنے ساتھ میں بھرا ہوا پستول رکھتا ہوں۔ دو نوکر بھی ساتھ جا رہے ہیں۔ وہ بھی مسلح ہوں گے۔ بندوک تو میں تیرے لیے لایا تھا۔ آج کل ڈکیتیاں بہت ہو رہی ہیں۔ فصل کی واڈھی کے بعد عام طور پر ڈکیتی کی وارداتیں بڑھ بھی جاتی ہیں۔ سنا ہے' لائل پور سے ڈکیتوں کی ایک دھاڑ ادھر آئی ہوئی ہے۔ اس نے بڑا رولا کر رکھا ہے۔ روز ہی کہیں نہ کہیں سے ڈکیتی کی خبر سننے میں آتی ہے۔ ایک نیا چکر بھی چل رہا ہے وہ بھی کم خطرناک نہیں۔"

"وہ کیسا چکر ہے؟ کسی سے تیرا جھگڑا ٹنٹا ہو گیا؟"

"میرا تو نہیں پر میرے مزارعے کادو اور اس کے پتر صابر کے ساتھ جھگڑا چل رہا ہے۔ ہے تو پرانی دشمنی پر اب زیادہ سنگین ہو گئی ہے۔"

رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے کرید کر پوچھا۔ "جھگڑا ہوا کس بات پر؟"

"میں نے بتایا نا' پرانی دشمنی ہے۔ لمی کہانی ہے۔ ڈیڑھ' پونے دو سال ادھر کی بات ہے' کادو کی دھی مجیداں کو پڑوس کے چک کا ایک نوجوان طاہرا اٹھا کر لے گیا۔"

"زبردستی اٹھا لے گیا یا آپس میں یاری آشنائی تھی؟"

"یاری آشنائی ہی تھی۔" اللہ وسایا ہنسا۔ "میں نے تو یہی سنا تھا پر کادو اور اس کا پتر نہیں مانتا۔ مجیداں کی واپسی کے لیے میں نے صلح صفائی کی بھی کوشش کی۔ مگر طاہر اور اس کا پیؤ راضی نہیں ہوئے۔ کہتے تھے' مجیداں اپنی مرضی سے آئی ہے' یہاں راضی خوشی ہے۔"

"ایسی گل تھی تو کادو اور اس کے پتر کو چاہیے تھا کہ طاہر سے مجیداں کا ویاہ کر دیتا۔"

"پر کادو اس کا ویاہ اپنے بھانجے سے کرنا چاہتا تھا۔ طاہرا اسے بالکل پسند نہیں۔ ویسے اصلی گل ایہہ تھی کہ مجیداں کے بھاگ جانے سے کادو کی بہت بدنامی ہوئی۔ کئی روز تو شرم کے مارے گھر

سے نہیں نکلا۔"

"عزت بھی تو آخر کوئی چیز ہوتی ہے کادو اور اس کے گھر والوں کی زبردست بے عزتی ہوئی' اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"یہی عزت کا معاملہ تو سارے جھگڑے کی جڑ تھا۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کی تائید کی۔ "کادو کو رہ رہ کر اسی پر تاؤ آتا تھا۔ بات کرتا تو منہ سے جھاگ نکلتے' آنکھیں لال انگارا ہو جاتیں۔ بات ختم ہونے کی بجائے بڑھتی گئی۔ کادو اور اس کا پتر مجیداں کو کسی نہ کسی طرح واپس لانا چاہتے تھے تاکہ طاہر اور اس کے پیؤ کو نیچا دکھا سکیں۔ پاس پڑوس اور برادری میں ان کا سر اونچا ہو جائے اسی چکر میں دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔"

"کادو نے تھانے میں پرچہ چاک نہیں کرایا؟"

"نہیں۔ وہ کہتا تھا' تھانے دار کچھ نہیں کرے گا۔ طاہر نے اس کی مٹھی گرم کر دی ہے۔"

اللہ وسایا بتاتا رہا۔ "پر کادو چپ کر کے نہ بیٹھا۔ وہ اور اس کا پتر تاک میں لگے رہے۔ طاہر ایک روز پاک پتن بابا فرید کی درگاہ پر گیا۔ مجیداں اس کے ساتھ تھی۔ دونوں منت ماننے گئے تھے۔ کادو کو پتہ چل گیا۔ وہ اپنے پتر کے ساتھ نکلا۔ ادھر طاہر اور مجیداں کو واپسی میں دیر ہو گئی۔ لاری سے اتر کر دونوں پنڈ کی طرف چلے تو کافی رات ہو گئی۔ کادو اور اس کا پتر ایک سنسان جگہ جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی وہ نزدیک پہنچے' طاہر کو دونوں نے گھیر لیا۔ وہ نہتا بھی تھا۔ ٹکوے کے پہلے ہی وار میں گر پڑا۔ کادو اور صابر غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ انھوں نے طاہر کے ہاتھ کاٹے' پیر کاٹے اور آنکھیں بھی نکال لیں۔ اس کی لاش جھاڑیوں میں ڈالی اور مجیداں کو اپنے ساتھ لے آئے۔"

"پولیس نہیں آئی؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"کیوں نہیں آئی۔" اللہ وسایا نے جواب دیا۔ "کادو اور اس کے پتر صابر کو گرفتار کر کے لے گئی۔ دونوں پر طاہر کے قتل کا کیس چلایا۔ بعد میں سیشن سے دونوں کی ضمانت ہو گئی۔ ضمانت میں نے ہی دی تھی۔ دونوں میرے مزارعے جو تھے۔ دوسرے یہ کہ کادو کی گھر والی صبح شام جمیلہ کے سامنے آ کر روتی۔ تم نوں پتہ ہے' جمیلہ کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔ وہ مجھ سے کہتی اور اس کا کہا میں ٹال نہیں سکتا۔ مجھے کادو کے کیس کے لیے وکیل بھی کرنا پڑا۔ دوسری طرف طاہر کے پنڈ کا زمیں دار بھی مددگار بن کر سامنے آ گیا۔ سال بھر سے اوپر مقدمہ چلا۔ عینی گواہ تو کوئی تھا نہیں۔ شک کا فائدہ ملزموں کو ملا۔ عدالت نے کادو اور صابر کو پچھلے ہفتے بری کر دیا۔ جب دونوں گھر پہنچے تو بھنگڑا

ڈالا گیا۔ جشن منایا گیا۔ تجھے بھی پتہ چلا ہو گا۔"

"نہیں' میں کسی سے ملتا جلتا ہی کب ہوں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پر ادھر تو خوشیاں منائی جا رہی ہیں' ادھر طاہر کے گھر والوں کے سینوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ وہ طاہر کے خون کا بدلہ لینے کے لیے تاک میں ہیں۔ کادو اور اس کا پتر تو ہر وقت چوکس رہتے ہیں۔" اللہ وسایا کے چہرے سے پریشانی ٹپکنے لگی۔ "میں جب تک باہر رہوں' تو بھی چوکس رہنا' خاص طور پر رات کو۔ ویسے بندوک چلانا تو جانتا ہی ہو گا؟ تو نے بھی زمیں داری کی ہے۔"

"برسوں شکار کھیلتا رہا ہوں۔" رحیم داد نے مستعدی سے کہا۔ "تیں نوں پتہ نہیں' میں نے کیسی زمیں داری کی ہے۔" اس نے اپنے بستے کی طرف اشارہ کیا۔ "تو نے میرا کلیم نہیں دیکھا۔ سو مربعے سے اوپر اپنا کلیم ہے۔"

"سو مربعے سے اوپر؟" اللہ وسایا نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔

"یہ کاغذ رکھے ہیں' دیکھ لے۔" رحیم داد نے فخر سے گردن اونچی کی۔

"میں نوں بالکل پتہ نہ تھا' تو اتا وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔" اللہ وسایا نے بندوق رحیم داد کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اسے اپنے پاس رکھ لے۔ اور یہ رہی کارتوسوں کی تھیلی۔" اس نے چمڑے کی تھیلی بھی رحیم داد کو دے دی۔ "ویسے بندوک استعمال کرنے کی تجھے ضرورت نہیں پڑے گی۔ پر خطرہ ہو تو ہمیشہ ہوشیار اور چوکس رہنا چاہئے اور دیکھ' یہ خیال رکھنا' بندوک بھری ہوئی ہے۔ ویسے رات کو حویلی کی اگواڑے پہرا رہتا ہے۔ یوں بھی بہت نوکر چاکر ہیں۔ تیری ایک ہانک پر وہ کیا' پورا پنڈ نکل آئے گا۔ گھبرانے کی کوئی گل بات نہیں۔"

"فکر نہ کر میں ڈرنے والا بندہ نہیں۔" رحیم داد نے بڑے اعتماد سے اللہ وسایا کو یقین دلایا۔

"کتنی بار گولی چل چکی ہے۔ کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ ہمیشہ جم کر لڑا۔"

"ویسے دیکھنے میں بھی تو جی دار لگتا ہے۔ اچھا تگڑا جوان ہے۔"

اللہ وسایا نے غلط نہیں کہا تھا۔ حویلی میں رہ کر رحیم داد کا رنگ بھی نکھر گیا تھا۔ جسم پر خوب گوشت چڑھ گیا تھا۔ وہ خاصا ہٹا کٹا لگتا تھا۔ ناشتے کے علاوہ دونوں وقت لذیذ اور مرغن غذا کھانے کو ملتی۔ کوئی کام کاج نہ کرنا پڑتا۔ تمام دن کمرے میں بستر پر لیٹا رہتا یا مقتول چودہری نورا لی کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کرتا۔ صبح شام باغ میں گھنٹے دو گھنٹے بیٹھتا۔ زندگی نہایت عیش اور آرام سے بسر ہو رہی تھی۔

اللہ وسایا اٹھ کر حویلی میں چلا گیا۔ رحیم داد نے بندوق کھونٹی پر دیوار کے ساتھ ٹکا دی مگر کارتوس نکال کر تھیلی میں ڈال دیئے اور تھیلی سرہانے بستر کے نیچے رکھ دی۔ پچھلی رات سے احمد کو بخار تھا۔ اس کی غیر حاضری میں حویلی کی ایک بوڑھی نوکرانی کھانا لائی تھی۔ دوسرے کام بھی اسی نے کیے۔

اللہ وسایا پروگرام کے مطابق اسی روز ملتان چلا گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں رہا۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ بڑا حبس تھا۔ آسمان پر گہرا غبار چھایا تھا۔

رحیم داد نے دن ڈھلے غسل کیا۔ اجلے کپڑے پہنے اور باغ میں بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جمیلہ بھی آ گئی۔ گڈو اور بینا' دونوں بچے اس کے ہم راہ تھے۔ جمیلہ ململ کا کڑھا ہوا سفید کرتا اور فیروزی شلوار پہنے ہوئے تھی' دوپٹا بھی فیروزی تھا۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو تڑپ کر رہ گیا۔

جمیلہ دور سے چل کر آئی تھی۔ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔ رخساروں پر سرخی بکھری ہوئی تھی۔ کرتا بدن سے چپکا ہوا تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہ خوب صورت اور دل آرا نظر آ رہی تھی۔

"زمیں دارنی! تھکی ہوئی دکھائی پڑ رہی ہے۔ کہاں گئی تھی؟"

"میں کادو کی دھی مجیداں کو دوائی دینے گئی تھی' اسے بخار ہے۔ لگتا ہے لو لگ گئی۔"

"یہ مجیداں وہی تو نہیں ہے جس کے لیے طاہر کا قتل ہوا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ہاں وہی ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "تیں نوں کیسے پتہ چلا؟"

"اللہ وسایا نے سویرے بتایا تھا۔ لگتا ہے' مجیداں بہت سوہنی ہو گی۔ جبھی تو اس کے لیے خون خرابہ ہوا۔"

"ایسی تو اس کی سندرتا نہیں کہ خون خرابہ ہو۔" وہ مسکرا کر بولی۔

رحیم داد نے بے ساختہ کہا۔ "وہ تیری طرح تو سوہنی نہیں ہو گی۔ تیری تو بات ہی اور ہے۔ اس پنڈ میں کیا' دور دور تک کوئی اتنی سوہنی زنانی نہ ہو گی۔" دل کی بات زبان پر آ گئی۔

"میں اب کیا رہ گئی۔" اس نے شرما کر آنچل سر پر ڈال لیا۔ "میری سندرتا تو بینا اور گڈو ہیں۔ عورت جب ماں بن جاتی ہے تو اس کی سندرتا اس کے بچے چوری چوری لے جاتے ہیں۔ سدا ایسا ہی ہوتا ہے۔"

رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ "پر مجیداں کے بارے میں جو کچھ ہوا برا ہوا۔"

"بہت برا ہوا۔" جمیلہ نے اظہار تاسف کیا۔ "جب طاہر کے ساتھ چلی گئی تو میں نے کادو کو بہت سمجھایا' جو ہوتا تھا' ہوگیا۔ طاہر کو اپنا بنالے۔ پر وہ اسے جنوائی ماننے کو کسی طرح تیار نہ ہوا۔ عجب اکھڑ بندہ ہے اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ طاہر کا خون کیا اور پیو پتر دونوں پھانسی پر لٹکنے سے بال بال بچ نکلے۔ ضمانت سے پہلے مہینوں جیل میں بند رہے۔ آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ دشمنی نے جڑ تو پکڑ ہی لی۔ ایک بار ایسی دشمنی پڑ جائے تو پیڑھیوں تک خون خرابے کا سلسلہ چلتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کادو اور اس کے پتر کی جان کو ہر دم خطرہ ہے۔ دوسری پارٹی بدلہ لینے کی تاک میں لگی ہوگی۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔" جمیلہ نے اس کی تائید کی۔ "اور یہ خون خرابہ کر کے ملا کیا۔ جان بھی خطرے میں اور ادھر مجیداں رو رو کر آدھی بھی نہیں رہی۔ طاہر کا خون اسی کے کارن ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ وہ یہ بات کیسے بھول سکتی ہے۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔ چنگا گبھرو جوان تھا۔"

"بات یہ ہے جی! جب غیرت کا سوال سامنے آجاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بس ایک ہی چکر سر پر سوار رہتا ہے۔"

جمیلہ خاموش رہی۔ رحیم داد بھی چپ بیٹھا رہا۔

وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہری۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی اٹھ کر حویلی میں چلی گئی۔ بچے بھی اس کے ساتھ چلے گئے۔ رحیم داد مہمان خانے میں گیا۔ کھانا کھایا اور چھت پر چلا گیا۔ جب سے گرمی بڑھی تھی' اس نے چھت پر چارپائی ڈلوادی تھی اور اسی پر سوتا تھا۔ شام ہوتے ہی احمد یا کوئی دوسرا نوکر چھت پر چھڑکاؤ کرتا اور صاف ستھرا بستر لگا دیتا۔ رات ہوتے ہوتے چھت اتنی ٹھنڈی ہوجاتی تھی کہ گرم گرم بھبکے نہیں نکلتے تھے۔

☆

اس رات امس کچھ زیادہ تھی۔ رحیم داد بستر پر لیٹا دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بھری ہوئی بندوق اس کے سرہانے رکھی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ غنودگی میں رحیم داد کو کھٹکا محسوس ہوا۔ چارپائی کا سرہانا آنگن کی طرف تھا۔ کھٹکا اسی طرف ہوا تھا۔ رحیم داد کی نیند اچاٹ گئی۔ وہ چند لمحے خاموش لیٹا رہا۔ آسمان پر ابھی تک گاڑھا گاڑھا غبار چھایا تھا۔ ہوا دھیمی تھی اور رک رک کر چل رہی تھی۔

حویلی کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں مدھم روشنی جھلملا رہی تھی۔ مہمان خانے کا اگلا حصہ

صاف نظر آرہا تھا۔ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے گردن ذرا سی اٹھائی' جھک کر نیچے دیکھا۔ وہ سراسیمہ ہوگیا۔ اسے ایک آدمی چار دیواری کی بلندی سے چمٹا ہوا نظر آیا۔ وہ ہولے سے پھسل کر نیچے آنگن میں اترا۔ دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ بیرونی دروازے پر پہنچا اور آہستہ سے کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی چار آدمی اندر داخل ہوئے۔

رحیم داد نے جھٹ گردن جھکالی۔ چند لمحے دم بخود پڑا رہا۔ اس نے خوف اور پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر گردن اٹھائی اور منڈیر کی آڑ لے کر چوکنا نظروں سے پانچوں کو دیکھنے لگا۔ ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے تھے۔ تین آدمی دھوتیاں اور لمبے لمبے کرتے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں قرابین اور بندوقیں دبی تھیں۔ دو قمیص اور شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ مگر جو مسلح تھے' ان میں دو سکھ بھی تھے۔ ان کے بڑے بڑے کیس ڈھاٹوں سے صاف نظر آرہے تھے۔ دھندلی روشنی میں وہ ان کے بارے میں اس سے زیادہ کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔ سکھوں کو دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ وہ کیوں آئے ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟

پانچوں کچھ دیر آنگن میں خاموش کھڑے رہے۔ جب آس پاس کوئی کھٹکا نہیں ہوا تو ایک مسلح شخص آگے بڑھا اور بندر کی طرح اچھل کر قد آدم دیوار پر چڑھ گیا۔ یہ دیوار مہمان خانے کو حویلی سے جدا کرتی تھی۔ اس کا دروازہ حویلی کی جانب سے بند تھا۔

آنگن میں اب صرف چار افراد رہ گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد درمیانی دیوار کا بند دروازہ کھلا اور وہ شخص باہر آگیا جو دیوار سے حویلی کے اندر کودا تھا۔ اس کے نکلتے ہی ان دونوں نے' جو بظاہر غیر مسلح تھے' قمیصوں کے اندر ہاتھ ڈال کر کمر سے لٹکتے ہوئے پستول نکالے اور تینوں کو بیرونی دروازے کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلے گئے تو دونوں حویلی کے اندر داخل ہوگئے۔

رحیم داد کے پاس بھری ہوئی بندوق موجود تھی۔ مگر وہ اکیلا تھا اور پانچوں نووارد پوری طرح مسلح تھے۔ تین دروازے پر پہرا دے رہے تھے' دو اندر جا چکے تھے۔ حویلی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ رات تاریک اور بوجھل تھی۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ سناٹے میں حویلی کی بالائی منزل سے گھٹی ہوئی نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ رحیم داد بے قرار ہوگیا۔ بالائی منزل پر صرف دو کمرے تھے۔ گرمی کے موسم میں اللہ وسایا' بیوی بچوں کے ساتھ رات کو کمروں کے سامنے کھلی چھت پر سوتا تھا مگر وہ ملتان میں تھا۔ بالائی منزل پر صرف بچے تھے اور جمیلہ تھی۔ چیخ جمیلہ ہی کی ہو سکتی تھی۔

رحیم داد کو خطرے کا شدت سے احساس ہوا۔ اس نے سرہانے سے بھری ہوئی بندوق اٹھائی۔

آہستہ سے اتر کر نیچے آیا۔ چند لمحے دم سادھے پڑا رہا۔ پھر زمین پر دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا چھت کی منڈیر کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے گردن قدرے بلند کی۔ آنگن میں نظریں دوڑائیں۔ بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ مہمان خانہ بالکل خالی تھا۔ البتہ دھندلی روشنی میں ایک شخص باہر اس طرح کھڑا تھا کہ اس کی پشت نظر آرہی تھی۔ رحیم داد ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا مگر اس شخص نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

رحیم داد کھسکتا ہوا زینے کے قریب پہنچا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بندوق دبی تھی۔ نظریں مسلح شخص کی جانب اٹھی ہوئی تھیں جو دروازے کی جانب پیٹھ موڑے کھڑا تھا۔ رحیم داد نے ہولے ہولے قدم رکھتے ہوئے سیڑھیاں طے کیں۔ نیچے اترا۔ آنگن میں پہنچ کر وہ دیوار سے لگ گیا۔ اس جگہ اندھیرا بہت گہرا تھا۔

وہ دم سادھے دیوار سے چپکا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ حویلی کے اندر کھلنے والے دروازے پر پہنچا۔ قریب پہنچ کر اس نے حویلی کے اندر نظر ڈالی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ اس نے مڑ کر چوکس نظروں سے بیرونی دروازے پر کھڑے ہوئے مسلح آدمی کو دیکھا اور جھپاک سے حویلی میں داخل ہوگیا۔ حویلی کا اندرونی حصہ وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس نے کسی اور سمت جانے کے بجائے دالان کا رخ کیا جہاں اوپر جانے کا زینہ تھا۔

دالان بالکل خالی تھا۔ سامنے وسیع صحن تھا۔ اس میں دور دور تک چارپائیاں پڑی تھیں جن پر نوکرانیاں سو رہی تھیں۔ گرمی کی راتوں میں ان کے شوہر اور جوان بیٹے باہر میدان میں چارپائیاں ڈال کر سوتے تھے۔ رحیم داد نے صحن میں پڑی ہوئی چارپائیوں پر مطلق توجہ نہیں دی۔ نوکرانیاں بے خبر سو رہی تھیں۔ رحیم داد سنبھل سنبھل کر زینے سے اوپر پہنچا۔ سامنے کھلی چھت تھی۔ دو پلنگوں پر دونوں بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ لیکن جمیلہ کا پلنگ خالی تھا۔ وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ پلنگوں کے قریب ہی کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔

رحیم داد نے بندوق پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کی۔ زینے کی ممٹی سے باہر نکلا۔ جھکا جھکا آگے بڑھا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ چرچراتا ہوا کھلا۔ رحیم داد جھٹ ایک پلنگ کی آڑ میں دبک گیا۔ دروازہ پھر بند ہوگیا۔ رحیم داد دم بخود بیٹھا چوکنا نظروں سے دروازہ تکتا رہا۔

☆

گرم اور غبار آلود رات دم بخود کھڑی تھی۔ حویلی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ دونوں بچے پلنگوں پر بے خبر سو رہے تھے۔ جمیلہ کمرے کے اندر تھی۔ رحیم داد ایک پلنگ کی آڑ میں دبکا بیٹھا تھا۔ اس کی

نظریں کمرے کے دروازے پر لگی تھیں۔

دروازے کے پیچھے سے بہت مدھم لہجے میں باتوں کی مبہم آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ مگر کچھ پلے نہ پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جمیلہ کسی مصیبت میں مبتلا ہے۔

اس نے بندوق سنبھال کر کمرے کے دروازے کا نشانہ لیا اور کبڑوں کی طرح جھکا جھکا کمرے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچ کر اس نے دروازے پر زور سے ٹھوکر ماری۔ دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں دو آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے عین سامنے پلنگ پر پیر لٹکائے جمیلہ بیٹھی تھی۔ رحیم داد نے نشانہ باندھ کر دونوں کو بندوق کی زد پر رکھ لیا۔ وہ بھونچکا رہ گئے۔ ان کے چہروں پر دہشت اور پریشانی طاری ہوگئی۔ رحیم داد ان کے سروں پر ملک الموت بنا کھڑا تھا اور انھیں قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

جمیلہ نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر نہ خوف تھا' نہ گھبراہٹ تھی۔ اس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! بندوق ہٹا لے۔"

رحیم داد نے بندوق نیچے کرلی۔ کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ مگر اس کی لو مدھم تھی۔ رحیم داد نے دونوں اجنبیوں کا جائزہ لیا۔ انھوں نے ڈھاٹے ہٹا دیئے تھے۔ اب ان کے چہرے صاف نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک گورا چٹا جوان تھا۔ اس کی ڈاڑھی مونچھیں بالکل صاف تھیں۔ سر کے بال آڑی مانگ نکال کر جمائے گئے تھے۔ قد اونچا' جسم مضبوط اور بھرا بھرا تھا۔ وہ ڈبل گھوڑا بوسکی کی قمیص اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں سونے کی زنجیر پڑی تھی۔ ہاتھ کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی جس میں جڑا ہوا پکھراج جگمگا رہا تھا۔ دوسرا شخص ادھیڑ تھا۔ اس کے سر کے بال کھچڑی تھے۔ مونچھیں گھنی تھیں' ان میں کہیں کہیں سفید بال جھلک رہے تھے۔ چہرے پر عمر رفتہ کی دھندلی پرچھائیاں تھیں۔ وضع قطع سے وہ بھی کھاتا پیتا آدمی لگتا تھا۔ جمیلہ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد کو بتایا۔ "یہ میرا چاچا ہے اور یہ میرا ویر ہردیال ہے۔" اس نے دوسرے کی سمت نظریں گھمائیں۔ "دونوں مجھے لینے آئے ہیں۔" رحیم داد نے محسوس کیا کہ ہردیال کے چہرے سے جمیلہ کی شباہت صاف جھلک رہی ہے۔

جمیلہ کے چاچا نے رحیم داد کو بغور دیکھا اور پوچھا۔ "یہ حویلی کا چوکیدار ہے؟"

"نہیں چاچا!" جمیلہ نے تردید کی۔ "ایسی گل نہ کر۔ چوہدری' ہمارا مہمان ہے۔ سمجھو گھر ہی کا بندہ ہے۔" اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! کھڑا کیوں ہے' بیٹھ جا۔"

رحیم داد نے دیوار کے قریب رکھے ہوئے سرکنڈوں کے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے جمیلہ کو دیکھا اور بڑے جوش سے بولا۔ "جب تک اللہ وسایا نہیں آئے گا' میں تجھے یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔" اس نے بندوق زانو پر رکھ لی۔ "یہ تجھے یہاں سے مجھے ختم کر کے ہی لے جاسکتے ہیں۔"

کمرے میں پراسرار سکوت چھا گیا۔ ہردیال اور اس کا چاچا چپ بیٹھے رہے مگر جمیلہ خاموش نہیں رہی۔ اس نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! تو چپ کر۔" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ "اس معاملے میں نہ بول۔ تجھے چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔ اس میں تو اللہ وسایا بھی نہیں بول سکتا۔"

چاچا نے بھتیجے کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر ہردیال نے کھنکار کر جمیلہ کو مخاطب کیا۔ "پارو! کیا سوچا تو نے؟ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔" اس کا لہجہ تیکھا اور تلخ ہو گیا۔

"آج ہم تجھے لے کر ہی جائیں گے۔"

"بھا جی! دھیرے بول۔ جاگ ہو گئی تو پورا پنڈ اکٹھا ہو جائے گا۔" جمیلہ نے نرم لہجے میں اسے خبردار کیا۔ "دھیرج سے گل کر' دھیرج سے۔"

چاچا بولا۔ "تیرا پتا تیرے لیے تڑپتا ہوا پچھلے برس سورگ باشی ہو گیا۔ آخری سمے اس کی زبان پر تیرا ہی نام تھا۔ مڑ مڑ کر ادھر ادھر دیکھتا تھا۔ تجھے ڈھونڈتا تھا۔ ایک ایک سے پوچھتا تھا' میری پارو کہاں ہے؟ کیسے بتاؤں تیرے لیے وہ کیسا بیکل تھا۔ میں تو کہتا ہوں' مر کر بھی اس کی آتما کو شانتی نہیں ملی ہو گی۔" اس کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔ "پاروتی! تو بہت کٹھور ہے۔ تیرے سینے میں ہردے نہیں' پتھر ہے۔ تو نے میرے بھائی کو مار ڈالا۔"

"ماتا جی کا بھی سمجھ لے' چل چلاؤ ہے۔" بھائی نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "تیرے لیے روتے روتے اس کی آنکھوں کی روشنی اتنی کم ہو گئی ہے کہ ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں سکتی۔ اتنی کمزور اور بیمار لگتی ہے' دیکھے گی تو پہچان نہیں پائے گی۔ اس کا تو کب کا دیہانت ہو گیا ہوتا پر اس کا دم تو تجھ میں اٹکا ہے۔" ہردیال کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ "پارو! چل کر ماتا جی کو بچا لے۔ پتا چھوٹا' ماتا بھی چھوٹ جائے گی۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

جمیلہ سر جھکا کر رونے لگی۔ بوجھل فضا کرب ناک ہو گئی۔ کمرہ مرگھٹ کی طرح ویران نظر آنے لگا۔ ہردیال نے گہری سانس بھری' آنسو پونچھے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "پارو! میری بہن!" وہ پھر رونے لگا۔

جمیلہ نے ہردیال کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "بھا جی! تیری بہن

پاروتی تو اسی روز مر گئی تھی جب تو اسے بصیر پور سٹیشن پر بلوائیوں کے ہاتھوں میں اکیلا چھوڑ کر ستلج پار چلا گیا تھا۔"

"تجھے پتہ ہے' وہ کیسا کڑا سمے تھا۔" ہردیال نے صفائی پیش کی۔ "میں بالکل مجبور تھا۔ یہ تو سوچ' کوئی بھائی اپنی بہن کو اس پرکار چھوڑ سکتا ہے۔ یہ گل میں نے تجھے پہلے بھی بتائی ہے۔ اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ ستلج پار کرنے سے پہلے میں نے تجھے بار بار پکارا تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "پارو! اٹھ سال سے تو ہم سب کو سزا دے رہی ہے۔ اب تو چھما کر دے۔"

"بھا جی! تو تین بار پہلے بھی آ چکا ہے۔" جمیلہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "دو بار پولیس اور سرکاری افسروں کو لے کر آیا۔ تجھے ٹھیک طرح پتہ ہے' میں نے اب یہاں سے نہیں جانا۔ میں اب تیری پارو نہیں رہی۔ اب میں جمیلہ ہوں۔ اللہ وسایا کی گھر والی اور نینا اور گڈو کی ماں۔" اس کا لہجہ سنبھلا ہوا تھا۔ "میں ۲۲ برس تک پاروتی رہی۔ ۱۹۴۷ء میں پاروتی کا مرن ہو گیا۔ اور میں نے جمیلہ کے روپ میں دوسرا جنم لیا۔ اب تو مجھے یہاں سے لے جائے گا۔ ہردوار یا کاشی میں پنڈتوں اور پروہتوں کے ہاتھوں میری شدھی کرائے گا۔ جمیلہ کو قتل کر کے ایک بار فیر پاروتی بنائے گا۔" اس کی آواز میں تلخی تھی۔ "بھا جی! میں کتنی بار قتل ہوں گی' کتنی بار مروں گی۔ یہ تو سوچ' مجھے وہاں کون چھما دے گا۔ ایسی نار کو کون چھما دے سکتا ہے جو اٹھ برس تک ایک مسلمان کی گھر والی رہ چکی ہو اور اس کے دو بچوں کی ماں بھی ہو۔"

"تو چنتا نہ کر پارو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" چاچا نے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "ہم نے تیرے سنجوگ کے لیے ور بھی ڈھونڈ لیا ہے۔ اپنی ہی جات برادری کا ہے' بہت بھلا....."

جمیلہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "چاچا! تو میرے ساتھ میرے بچوں کو بھی تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اتنا تو سوچ' ان دونوں کا اس معاملے میں کیا دوش ہے؟"

"صاف گل ایہہ ہے پارو! ہم سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ہمارے جیتے جی تو ایک مسلے کے گھر میں رہے۔" چاچا کا لہجہ تند اور تیز تھا۔ "اور وہ بھی ہمارے ایک مزارعے کی پتنی بن کر۔ کچھ تو اپنے دھرم کا' اپنے اونچے خاندان کا دھیان کر۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہا' کیسا غضب ہے۔"

"چاچا! تو بھی ٹھیک کہتا ہے۔" جمیلہ نے دکھ سے کہا۔ "جب بیٹیوں اور بہنوں کو ننگا کر دیا جائے اور بازاروں سے ان کا جلوس نکال کر دھرم کا نام اونچا کیا جائے۔ دھرم کے نام پر کنیاؤں اور ودھواؤں کی آبرو لوٹی جائے۔ کتوں کی طرح ان کو بھنبھوڑا جائے۔ ان کی ہڈیاں چچوڑی جائیں تو یہ

کلجگ ہی ہوا۔" اس نے چچا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "اللہ وسایا اگر ہمارا مزارع تھا تو کیا ہوا؟ اس نے میرے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کیا جو ادھر اور ادھر دونوں طرف دھرم کے نام پر ہوا۔ اس کے اندر کا پرش اس سے بھی زندہ تھا اور آج بھی زندہ ہے۔"

"یہ باتیں تو بار بار کہتی ہے۔ تیری ضد اور ہٹ دھرمی اب تک نہیں گئی۔" ہردیال کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "دیکھ پارو! میں اس بار ماتا جی کو وچن دے کر آیا ہوں۔ آج خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔" اس نے جھپاک سے پستول نکال لیا۔ "تو میرے ساتھ چلے گی۔ میرا رستہ کوئی نہیں روک سکتا۔" اس نے جھپٹ کر جمیلہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "چل اٹھ۔ اگر تو چاہتی ہے' دو چار لاشیں یہاں گر جائیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہو کے آیا ہوں۔" اس کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"میرے بندے کاربینیں اور بندوقیں سنبھالے پنڈ کے نکڑ پر چوکس کھڑے ہیں۔ تین جیپیں' ہتھیار بند بندوں سے بھر کر لایا ہوں۔ اس بار ہر طرح تیار ہو کر آیا ہوں۔ میرا رستہ تو پولیس بھی نہیں روک سکتی۔"

"بھاجی! میرا ہاتھ چھوڑ دے۔" جمیلہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں نوں پتہ ہے' توں بہت زور آور اور ویر ہے۔ مجھے مان ہے کہ تو میرا ویر ہے۔"

ہردیال نے بہن کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جمیلہ اٹھی اور تن کر بھائی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "بھاجی! دوسروں کی لاشیں کیوں گرانا چاہتا ہے' ایسا کر' میرے سینے میں اپنے پستول کی ساری گولیاں اتار دے اور میری لاش ماتا جی کے پاس لے جا۔ وہاں میری ارتھی کو شمشان میں اپنے ہاتھوں سے آگ لگا دینا۔ تیرے دھرم کا پرائشچت ہو جائے گا۔ میری مکتی اسی میں ہے۔" اس نے بھائی کو للکارا۔ "چلا گولی۔"

بھائی خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ چچا بھی چپ تھا۔ رحیم داد دم بخود تھا۔ کمرے میں ایک بار پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ ذرا دیر بعد ہردیال کھڑا ہو گیا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے جمیلہ کو دیکھا۔

"تو نہیں چلے گی میرے سنگ؟"

"تو کس کی بات کر رہا ہے؟ میری؟ میں تو اٹھ برس پہلے ہی مر گئی تھی۔ جمیلہ تو ایک مدہ کا نام ہے۔ اس کا کوئی بھی نام ہو سکتا ہے۔ وہ تو دوسروں کو خوش دیکھنے کے لیے جیتی ہے' بولتی ہے' چلتی پھرتی ہے۔ میں تو مانو' اب ایک لاش ہوں۔ تو لاش اٹھا کر لے جانا چاہتا ہے تو ضرور لے جا۔ پر اس طرح نہیں' خون سے نہلا کر۔" وہ آگے بڑھی اور بھائی کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہردیال پیار سے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ جمیلہ سسکیوں کے ساتھ رک رک کر کہتی رہی۔ "ویر! میرے سینے میں ہردے نہیں رہا۔ میں زخموں سے چور چور ہو چکی ہوں۔ مجھے اور دکھ نہ پہنچا۔ میرے سارے زخم کھل جائیں گے۔" وہ ہانپنے لگی۔ "مجھ مری ہوئی کو ایک بار پھر مارنا چاہتا ہے تو مار دے۔ میں تجھے کچھ نہیں کہوں گی' کچھ بھی نہیں۔"

وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ بھائی بھی بے قرار ہو کے رو پڑا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے۔ کمرے میں سسکیاں ابھرتی رہیں۔ چچا بھی خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔ وہ روتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ بھتیجے کے قریب گیا اور اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔

"ہردیال! تو کب تک روتا رہے گا۔ یہ نہیں جائے گی۔"

"ہاں چاچا! یہ نہیں جائے گی۔" ہردیال نے مایوسی سے کہا۔ "اس کی مرضی یہیں رہنے کی ہے تو یہ یہیں رہے گی۔ اس کی خوشی میں میری خوشی ہے۔ میں اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جمیلہ کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔

مہمان خانے کی جانب سے سناٹے میں ہلکی سی کھٹ ابھری۔ چچا پریشان ہو کر بولا۔ "ہردیال! اب یہاں سے چلنا چاہئے۔"

ہردیال نے بہن کا سر چوما اور اسے علیحدہ کر دیا۔ پھر ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اٹھایا اور بھیگے ہوئے رخسار تھپ تھپائے۔ "آنسو پونچھ لے۔ میں تجھے نہیں لے جاؤں گا۔ تو جیت گئی۔ میرا مان ایک بار پھر ٹوٹ گیا۔ تو پاروتی بن کر زندہ رہے یا جمیلہ بن کر' میں تجھے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تو جس حال میں بھی رہے' میری لاڈلی بھین پارو ہی رہے گی۔ میرے گھر کے دروازے سدا تیرے لیے کھلے رہیں گے۔ جب چاہے چلی آنا۔ میں اتم بار نہیں آیا ہوں۔ جب چاہے مجھے بلا لینا۔ سمگلر مجھے حفاظت سے تیرے پاس پہنچا دیں گے۔ وہ نہ ہندو ہوتے ہیں' نہ سکھ' نہ مسلمان۔ وہ صرف سمگلر ہوتے ہیں۔" وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

کمرے کی فضا آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ ملگجی غبار آلود رات نڈھال ہو گئی تھی۔ سناٹا راکھ بن کر بکھرتا جا رہا تھا۔ ہوا دم بخود تھی۔ "چاچا! اب یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ بہت دیر ہو گئی۔" ہردیال کی آواز ابھری۔

وہ چچا کے ہم راہ دروازے کی جانب بڑھا۔ جمیلہ چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے دروازے تک گئی۔ تیزی سے بڑھ کر دہلیز پر پہنچی' ہاتھ اٹھا کر ہردیال سے بولی۔ "ٹھیر جا ویر! تو بھین کے گھر سے ایسے نہیں جائے گا۔ میں تجھے یوں بدا نہیں ہونے دوں گی۔" وہ کمرے کے اندر گئی' ٹرنک سے ایک

ڈبیا نکال کے لائی۔ ڈبیا کھول کر بھائی اور چاچا کی پیشانیوں پر سیندور کا تلک لگایا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر بھائی اور چاچا کو پرنام کیا۔

دونوں آگے بڑھے۔ جمیلہ دہلیز پر رک گئی۔ انھوں نے چھت عبور کی' زینے کی ممٹی پر پہنچے۔ ہردیال نے مڑ کر جمیلہ کی جانب دیکھا' لمحے بھر کو ٹھٹکا اور پھر اندھیرے میں چاچا کے ساتھ گم ہو گیا۔

رات زخمی پرندے کے مانند پھڑپھڑانے لگی۔ جمیلہ واپس آ کر کرسی پر تھکی ہوئی سی بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد کہیں دور رات کے سناٹے میں جیپوں کے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے گردن کو ذرا سا خم دیا اور جیپوں کی آوازیں توجہ سے سننے لگا۔ آوازیں رفتہ رفتہ گہری خاموشی میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئیں۔

اس نے جمیلہ کو مخاطب کیا۔ "زمیں دارنی! وہ چلے گئے۔"

وہ رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر بولی۔ "ہاں چوہدری' وہ چلے گئے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپایا اور بے اختیار رونے لگی۔

رحیم داد نے جمیلہ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ "زمیں دارنی! اب رونے سے کیا ہو گا' جو ہونا تھا' ہو گیا۔"

"چوہدری! تو جا۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ مجھے جی بھر کے رو لینے دے۔"

کمرے کی خاموشی میں جمیلہ کی سسکیاں رک رک کر ابھرتی رہیں۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ مگر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اس نے بندوق سنبھالی اور کمرے سے چلا گیا۔ جمیلہ نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور سسکیاں بھرتی رہی۔

رحیم داد سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ دالان میں پہنچا۔ سامنے وسیع صحن تھا جس میں کچھ ہی عرصہ پہلے اس نے مشعلوں کی لہراتی روشنی میں جمیلہ کو الھڑ مٹیاروں کے ساتھ گدھا ناچتے دیکھا تھا۔ اب اسی صحن میں چارپائیوں پر نوکرانیاں بے خبر سو رہی تھیں اور جمیلہ اوپر کمرے میں بلک بلک کر رو رہی تھی۔

رحیم داد حویلی سے نکل کر مہمان خانے میں گیا۔ بیرونی دروازہ ابھی تک پاٹوں پاٹ کھلا تھا۔ اس نے دروازہ بھیڑ کر زنجیر چڑھائی۔ چھت پر گیا' بندوق احتیاط سے سرہانے رکھی اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ چت لیٹا اجڑی ہوئی رات کو گزرتے دیکھتا رہا۔

صبح رحیم داد کی طبیعت بوجھل تھی۔ ایسا محسوس ہوا گویا رات کو کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ حویلی کا ملازم' احمہ ابھی تک بیمار تھا۔ ناشتا اور دوپہر کا کھانا ایک نوکرانی لے کر آئی۔ دن ڈھلے رحیم داد باغ میں گیا۔ آسمان ہنوز غبار آلود تھا۔ امس تھی' گرمی تھی۔ فضا بے کیف اور دھواں دھواں تھی۔ اللہ وسایا واپس نہیں آیا۔ دوسرے روز بھی نہیں آیا۔ ان دونوں میں جمیلہ بھی اسے نظر نہیں آئی۔

☆

رات کو بارش کا ہلکا سا چھینٹا پڑا۔ آسمان سے غبار چھٹ گیا مگر گرمی بڑھ گئی۔ زمین سے گرم گرم بھبکے نکلتے تھے۔ رحیم داد کی وہ رات بھی بے چینی میں کٹی۔ سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر وہ باغ میں گیا۔ دن ڈھلے بھی گیا۔ اب موسم قدرے خوش گوار تھا۔ جمیلہ باغ کے ایک گوشے میں چپ بیٹھی تھی۔ رحیم داد اس کی جانب بڑھا۔

جمیلہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ "آ چوہدری!"

رحیم داد خاموشی سے اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جمیلہ کے چہرے پر ابھی تک غم کی پرچھائیاں چھائی ہوئی تھیں۔ وہ بجھی بجھی اور اجڑی اجڑی نظر آ رہی تھی۔ دونوں اپنی اپنی سوچ میں ڈوبے رہے۔ کچھ دیر بعد جمیلہ نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ زیرِ لب مسکرائی' یہ مسکراہٹ نہیں تھی۔ تلخی سی رچ بس گئی تھی۔

"چوہدری! توں نے بہت دنوں تک جمیلہ ہی کو دیکھا تھا۔ اس رات پنڈال میں بھی میلہ لگایا۔"

"حمے نے یہ بات مجھے بتائی تھی۔ پر مجھے یقین نہیں آیا تھا۔"

"یہ گل خالی حما ہی نہیں جانتا' سارا پنڈ جانتا ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "اور میں نے چھپائی بھی نہیں۔ سچ بات کبھی نہیں چھپتی۔ اسے چھپانا' اپنے کو دھوکا دینا ہے۔"

"پر یہ بات اب تک سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا یہ سچ ہے' اللہ وسایا تیرے پیو کا مزارع تھا؟"

"تھا' بالکل تھا۔" جمیلہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "پر وہ مزارعے سے زمیں دار بن کر بھی زمیں دار نہیں بن سکا۔ وہ عجیب بندہ ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کوئی نہیں جانتا۔" وہ بات کرتے کرتے گہری سوچ میں کھو گئی۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ پھر جمیلہ ہی نے خاموشی توڑی۔ "میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو ڈر گئی تھی۔ اس سمے وہ بہت زور آور اور کڑوا تھا۔ بات بات پر شعلے کی طرح بھڑک اٹھتا تھا۔"

"دیکھنے میں تو بالکل کڑوا نہیں لگتا۔"

"اب تو گنو بن گیا ہے۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "اٹھ برس ادھر کی گل ہے۔ جب فسادات کی آگ بھڑکی' ہر طرف خون خرابہ ہونے لگا۔ میں ان دنوں لہور میں ہوتی تھی۔ وہاں میں پڑھتی تھی۔ میرا بی اے کا آخری سال تھا۔ پر فسادات شروع ہونے کے بعد کالج بند کردیا گیا تھا۔ میں ماڈل ٹاؤن میں اپنے ماما کی کوٹھی میں ٹھیری تھی۔ فیر ایسا ہوا کہ فسادات کم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے گئے۔ لہور کے ہندو گھربار چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ تب میرا ایک ویر ہردیال مجھے لہور سے دیپال پور لے آیا۔"

"پر یہ حویلی تو تیرے پیئو کی تھی۔ تیرے گھر والے یہاں نہیں رہتے تھے؟"

"نہیں! یہاں ہمارا منیجر بنسی لال رہتا تھا۔ وہ اور اس کے بال بچے اسی مہمان خانے میں رہتے تھے جس میں آج کل توں ٹھیرا ہے۔ حویلی عام طور پر خالی رہتی تھی۔ ہم بھائی بہین تو یہاں گرمیوں کی چھٹیوں میں کبھی کبھار آجاتے تھے۔ پتا جی بھی بہت کم آتے تھے۔ ان کا نام لالہ کرشن دیال تھا۔" جمیلہ آہستہ آہستہ بتاتی رہی۔ "یہ جو دیپال پور میں کپاس بیلنے کی کرشنا کاٹن فیکٹری ہے' یہ میرے پتا نے ۱۹۳۳ء میں لگائی تھی۔ ان کا اور بھی بہت کاروبار تھا۔ کئی دکانیں تھیں' ساہوکارہ تھا' کئی کمپنیوں اور ایک بینک کے وہ ڈائریکٹر بھی تھے۔ کاروبار میں اتنے الجھے رہتے تھے کہ کئی کئی سال ادھر نہ آتے۔ زمیں داری کی دیکھ بھال ہردیال کرتا تھا یا بنسی لال۔"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "توں اتنے وڈے گھرانے کی دھی ہے' توں نے اپنے مزارعے سے کیسے ویاہ کرلیا؟ بہت عجیب گل ہے۔"

"یہی تو میں تجھے بتا رہی تھی۔" جمیلہ نے جواب دیا۔ "جب فسادات کی آگ منٹگمری میں بھی پھیل گئی تو آس پاس کے دیہات کے ہندو دیپال پور آگئے۔ وہاں پہلے ہی ہندو بہت تھے۔ پر زیادہ تر کھتری ہیں۔ ہماری گوت کھنہ ہے۔ دیپال پور میں کھتریوں کی مشہور تیرتھ بھی ہے۔ یہ بابا لالہ جس راج رائے کی سمادھی ہے۔ سمادھی کے ساتھ مندر ہے' دھرم شالہ ہے۔ ایک دھرم سبھا بھی ہوتی تھی۔ جانے اس کا کیا بنا۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکی۔ "۵ برس ادھر کی بات ہے۔ میں اللہ وسایا کے ساتھ دیپال پور گئی تھی۔ سمادھی' مندر' دھرم شالہ' ہر جگہ مہاجروں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ کبھی اس جگہ زبردست میلہ لگتا تھا۔ ماگھ کے مہینے میں کھتری دور دور سے تیرتھ یاترا کے لیے آتے تھے۔ جب کھتریوں کا کوئی منڈا دس برس کا ہوجاتا تو بابا جس راج کی سمادھی کے سامنے اس کا مونڈن ہوتا۔ سر کے بال صاف کردیئے جاتے۔ کیول بودھی چھوڑ دی جاتی۔ وہ کبھی نہیں کاٹی جاتی

تھی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی منوہر دیال کا مونڈن ہوتے دیکھا تھا۔ اس دن گھر میں زبردست جشن ہوا۔ مہمانوں کے لیے پکوان پکے۔ طرح طرح سے بھوجن پروسے گئے' کیرتن ہوا' بھجن ہوا۔ ہمارا گھر بہت شان دار تھا۔ دو منزل کا تھا۔ اس روز دیوے جلا کر گھر پر خوب روشنی کی گئی تھی۔ بالکل دیوالی کا سماں تھا۔"

"جب تمیں دیپال پور گئی تھیں تو اپنا گھر بھی دیکھا ہوگا۔ کیا حال ہے اس کا؟"

"یہ نہ پوچھ۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں نے اسے دیکھا تو بے کل ہو کر بن سوچے ایک دم اندر گھس گئی۔ اس میں مہاجر کنبے ٹھیرے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ چولہے تھے۔ دھوئیں سے ساری دیواریں کالی پڑ گئی تھیں۔ ماتا جی جہاں پوجا پاٹ کرتی تھیں' وہاں پکا چبوترا تھا۔ اوپر آلا تھا۔ اس میں کرشن جی کی مورتی رکھی رہتی تھی۔ چبوترے کے پاس ہی تلسی کے بوٹے ہوتے تھے۔ ماتا جی ہر روز سورج نکلنے سے پہلے ان میں پانی دیتی تھیں۔ چبوترے کے پاس کوئی اشنان کیے بنا نہیں جا سکتا تھا۔ پر اب چبوترے پر بھی چولھا بن گیا تھا۔ آلے سے مورتی اٹھا کر پھینک دی گئی تھی۔ اب اس میں چراغ جلتا تھا۔ تلسی کے بوٹے سوکھ کر کب کے ختم ہوچکے تھے۔"

وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ رحیم داد آہستہ سے کھنکارا تو وہ چونکی۔ "پتا جی نے بہت چاؤ سے گھر کے لیے ساگوان کا شان دار فرنیچر بنوایا تھا۔ کچھ تو توڑ پھوڑ کر روٹی پکانے کے لیے چولہوں میں جلا دیا گیا۔ جو بچ گیا تھا' وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کر کاٹھ کباڑ بن گیا تھا۔ ہر طرف گندگی ہی گندگی تھی۔ بندے بھی بھلے نہیں تھے۔ زنانیاں مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگیں' میں ڈر گئی۔ میرا کمرہ اوپر تھا۔ میں اسے دیکھنا چاہتی تھی پر حوصلہ نہ ہوا۔ میں جلد ہی گھر سے باہر چلی گئی۔ چوہدری! ذرا سوچ' کیسی عجیب گل ہے۔ اپنا گھر پرایا ہوا سو ہوا' اس سے ڈر بھی لگنے لگا تھا۔ دوبارہ میں کبھی ادھر نہیں گئی۔ جا کے کرتی بھی کیا' دکھ ہی ہوتا۔"

زمیں دارنی! تجھے اپنے گھر والے تو یاد آتے ہوں گے؟"

"تجھے اپنی گھر والی اور بچے یاد نہیں آتے؟"

"کیوں نہیں آتے۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "تبھی تو تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرا دکھ تو سمجھ سکتا ہے۔ میری طرح توں بھی گھائل ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کی جانب افسردہ نظروں سے دیکھا۔ "چوہدری! ہم ۵ بھائی بہین ہوتے تھے۔ میں چار بھائیوں کی اکلوتی بہین تھی۔ پر اب تین رہ گئے ہیں۔ چوتھا بل بیر دیال تھا۔ وہ ہردیال سے چھوٹا اور مجھ سے بڑا

تھا۔ بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ہردیال بتاتا تھا' پتا جی نے اس کی لاش دیکھی تھی۔ بعد میں جانے اس کا کیا بنا۔ چیلیں اور گدھ ماس نوچ نوچ کر کھا گئے ہوں گے' پنجر کہیں دبا دیا گیا ہو گا۔ چوہدری! توں نے اسے نہیں دیکھا۔ ہائے کیسا سندر اور سوہنا تھا۔" اس نے لمبی سانس بھری۔ "سنا ہے' تینوں بھائیوں کا ویاہ ہو گیا ہے۔ بچے بھی ہیں۔ میں نے نہ کسی بھرجائی کو دیکھا نہ بچوں کو۔ سب کو دیکھنے کے لیے من تو بہت مچلتا ہے' پر اب میں ان کے پاس نہیں جا سکتی۔ میں نے سوچ لیا ہے' وہ سب مر گئے۔"

جمیلہ اس المیے کے ورق پلٹتی رہی جس میں بنیادی کردار خود اس نے ادا کیا تھا۔ رحیم داد ہمہ تن گوش رہا۔ وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا تاکہ اس کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جائے۔ وہ خاموش ہو جاتی تو رحیم داد کرید کر پوچھتا۔ اس دفعہ بھی جمیلہ بات کرتے کرتے رکی' مگر رحیم داد نے اسے خاموش نہیں رہنے دیا۔

"تیرے گھر والے تو سرحد پار نکل گئے تھے' توں کیسے ادھر رہ گئی؟"

"اب تو تجھے پتہ چل ہی گیا۔ جو نہیں پتہ' وہ بھی سن لے۔ تجھ سے اب کیا چھپانا۔ ویسے چھپانے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔ سب کو پتہ ہے۔" جمیلہ نے درد میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ بہت ڈراؤنی رات تھی جب میں اور میرے گھر والے ٹرک میں سوار ہو کر دیپال پور سے نکل کر بھاگے۔ اب وہ رات یاد کرتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہی ہوں۔ رستے میں دو بار بلوائیوں نے ٹرک پر ہلا بولا' پر ڈرائیور بہت ہوشیار تھا۔ صاف بچا کر نکال لے گیا۔ آدھی رات کے بعد سب بصیر پور سٹیشن پر پہنچ گئے۔ وہاں پہلے ہی دور دور سے بھاگ کر آئے ہوئے ہندو اور سکھ پڑے تھے اور کسور کے راستے ٹرین سے کھیم کرن اور امرتسر نکل جانا چاہتے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی منو ہردیال پہلے ہی امرتسر پہنچ چکا تھا اور ہم سب کا انتظار کر رہا تھا۔ ادھر ہم ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹرین تو نہیں آئی' بلوائی آ گئے۔ اندھیری رات تھی۔ تڑتڑ گولیاں چلتی تھیں۔ بچے روتے تھے۔ مائیں چیختی تھیں۔ ہر طرف ہاہاکار مچی تھی۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔"

"تریموں کے پتن پر راوی کے کنارے میں نے بھی یہی سماں دیکھا۔" رحیم داد نے بھی جمیلہ کی طرح خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے مقتول چوہدری نورا ہی سے سنی ہوئی باتیں دہرائیں۔ جمیلہ خاموشی سے سنتی رہی۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری اور افسردہ لہجے میں بولا۔ "اس طرح جی! میں راوی پار کر کے اکیلا پاکستان پہنچا۔" اس نے قدرے توقف سے کہا۔ "ہاں اب تو بتا' آگے کیا ہوا؟"

"آگے کیا ہونا تھا۔ بس اتنا یاد ہے' بلوائی شور مچاتے آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ میں ڈر کر ایک طرف بھاگی اور کسی سے ٹکرا کر زور سے گری۔ پر زمین تک نہیں پہنچی۔ ایسا لگا جیسے کوئی مجھے اپنی پیٹھ پر لادے بھاگا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں' کون تھا۔ پوچھا بھی تو نہیں بولا۔ تب میں نے اس کے ہاتھوں کی پکڑ سے نکلنے کی کوشش کی' منت سماجت کی' گڑگڑائی اور روئی بھی۔ پر اس نے نہیں چھوڑا۔ ڈیڑھ میل آگے نہر تھی۔ اس نے نہر کے نزدیک جنڈ اور کیکر کی گھنی جھاڑیوں میں بنی ہوئی ایک سنسان دہڑ میں مجھے اپنی پیٹھ سے ایسے پھینکا جیسے اناج تولنے والا دھڑوائی کنک کی بوری ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈالتا ہے۔"

"بہت ظالم تھا۔" رحیم داد نے نفرت سے منہ بگاڑا۔

"وہ تیری سوچ سے بھی زیادہ ظالم اور کٹھور تھا۔" جمیلہ کی آواز میں درد کی چبھن تھی۔ "وہ اکیلا بھی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ چھے اور کتے تھے۔" جمیلہ کی نظریں جھک گئیں۔ افسردہ چہرے پر ہلکی ہلکی سرخی بکھر گئی۔ "وہ سب تین روز تک باری باری میری ہڈیاں چچوڑتے رہے۔ نہ کھانے کو روٹی دی' نہ پینے کو پانی۔ نہ میں رو سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔ میں تو مانو لاش تھی' ٹھنڈی اور بے جان۔ مجھے سب کچھ ڈراؤنا سپنا لگا۔ آنکھیں بند تھیں اور میں بے سدھ پڑی تھی۔ چوتھے روز دوپہر کو مجھے ہوش آیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو دہڑ خالی تھی۔ اس دہڑ کو چاروں اور باڑ لگا کر جھنگر میں بنایا گیا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ لگتا تھا' مجھے مردہ جان کر وہ چھوڑ گئے تھے۔ مجھے خود اچنبھا تھا کیسے بچ گئی۔ وشواس ہی نہیں آتا تھا کہ زندہ ہوں۔"

چند لمحے رک کے اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں کئی گھنٹے آنکھیں کھولے بے حال پڑی رہی۔ اٹھا ہی نہیں جاتا تھا۔ دن ڈھلے نزدیک رکھی ہوئی کھرلی کا سہارا لے کر اٹھی۔ دہڑ میں ہر طرف گوبر ہی گوبر تھا۔ میرے کپڑے' پیٹھ' ہاتھ پیر اور سر کے بال گوبر سے لتھڑے ہوئے تھے۔ کھرلی میں جھانکا تو اس میں مویشیوں کے لیے کتاوا پڑا ہوا نظر آیا۔ توڑی کے ساتھ ونڈ ملا کر بنایا گیا تھا۔ میں نے چن چن کر ونڈ کھانے شروع کر دیے۔ چھولے کے یہ دلے ہوئے دانے کھا کر بدن میں تھوڑی سی جان آئی پر پیاس بہت لگی۔ دہڑ کی باڑ کے اس پار نہر نظر آتی تھی۔ سوچا نہر پر جا کر پانی پی لوں لیکن کھڑے ہوتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑی۔ دیر تک پڑی ہانپتی رہی۔ ذرا جی سنبھلا تو ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ ایک کونے میں تور کا ڈھیر نظر آیا۔ کھسکتی کھسکتی اس طرف بڑھی' پاس جا کر اٹھی اور تور کے ٹوٹے چوپنے لگی۔ اس کے رس میں مٹھاس تھی۔ نہ پوچھ کیسا سواد آیا۔"

"تور ویسے تو چری ہے پر چوپو تو کماد کی طرح میٹھی لگتی ہے۔" رحیم داد نے جمیلہ کی تائید کی۔

"میں نے تو اپنے جیون میں پہلی بار اسے چوپا تھا۔ پر اس سے ایسا سواد ملا جیسے لور میں گری کے دنوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی گنڈیریاں چوپنے پر آتا تھا۔ ونڈ کھا کر اور تور کا رس چوپ کر اتنا آنند ملا کہ میں پڑ کر سو گئی۔ رات کو کوئی نہیں آیا' دن کو بھی نہیں آیا۔ میں چن چن کر ونڈ کھاتی رہی اور تور کی ٹوٹے دانتوں میں دبا کر چوپتی رہی۔ وہٹر سے باہر نہیں گئی۔ دوسری رات دو بندے ایک بُ لے کر آئے۔ تب مجھے پتہ چلا وہ وہٹر نہیں' کسی رساگیری کی اہر تھی جس میں چوری کے مویشی اور چو کھر چھپا کر رکھے جاتے تھے۔"

"تجھے پتہ ہی نہ چلا وہ رساگیروں کی اہر ہے۔ گوبر اور کھرلی میں گتاوا پڑا دیکھ کر بھی تجھے پتہ نہ چلا؟" رحیم داد کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔

"لے' مجھے کیا پتہ اہر ایسی ہوتی ہے۔ میں نے کوئی رساگیری یا مویشی چوری تو کی نہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا رساگیری کیا ہوتی ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہے۔" رحیم داد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "ہاں' تو جی فیر کیا ہوا؟"

"دونوں نے مجھے اہر میں دیکھا۔ پہلے تو وہ گھبرائے۔ تھوڑی دیر آپس میں کھسر پھسر کی۔ ایک وہیں ٹھیر گیا۔ دوسرے نے مجھے اپنے گڈے میں بٹھالیا۔ وہ اسی گڈّے کے پیچھے چوری کی بُ باندھ کر لایا تھا۔ یہ بھی مجھے بعد میں پتہ چلا۔ وہ مجھے صاحبے والا لے گیا۔ اس کی گھر والی تھی۔ بچے تھے۔ مجھے کچھ اطمینان ہوا۔"

جمیلہ کا لہجہ اچانک تلخ ہو گیا۔ "پر وہ بھی کتا نکلا۔ مجھے گھسیٹ کر زبردستی کوٹھری میں لے گیا۔ اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے اس کی منت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے۔ گڑگڑا کے اسے پچھلے تین روز کی ساری بپتا سنائی۔ پر اس نے ایک نہ سنی۔ رات بھر میری ہڈیاں چچوڑتا رہا۔" جمیلہ روہانسی ہو گئی۔ اس نے آنسو پونچھے اور دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "سویرے اس کی گھر والی نے زبردست رولا کیا۔ روئی پٹی' شور مچایا۔ اس کا گھر والا ڈھیٹ بنا ہنستا رہا۔ کچھ دیر بعد ہل پنجالی سنبھال کر کھیتوں پر چلا گیا۔ گھر والی نے اس کے جانے کے بعد میرے بال کھسوٹے' منہ نوچا۔ دونوں ہاتھوں سے خوب مارا پیٹا۔ میں نے مجبوری بتائی۔ پر اس نے میری ایک نہ مانی' بس مارتی چلی گئی۔ مارتے مارتے تھک گئی تو رونے بیٹھ گئی۔ میں بھی روتی رہی اور روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔ تب اسے کچھ ترس آیا۔ اس نے مجھے پانی پلایا۔ دوپہر ہوئی تو کھانے کو روٹی بھی دی۔ شام کو اس کا گھر والا لوٹا۔ اس کا نام گاما تھا۔ رات کو فیر اس نے مجھے گھسیٹ کر کوٹھری میں بند کر لیا۔ چار روز تک یہی ہوتا رہا۔ اس کی گھر والی روز جھگڑا کرتی پر وہ باز نہ آیا۔"

"گاما تو اور بھی زیادہ گندہ اور کمینہ نکلا۔" رحیم داد نے جل کر کہا۔

"ہاں' وہ بہت گندہ اور کمینہ تھا۔" جمیلہ خلا میں گھورتی رہی اور بولتی رہی۔ "جب گامے کی گھر والی نے ایک روز بہت شور شرابا کیا اور دروازے کی دہلیز پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹنے لگی تو پاس پڑوس والے گاما کے گھر اکٹھے ہو گئے۔ انھوں نے گاما پر دباؤ ڈالا کہ وہ مجھے اپنے گھر سے نکال دے۔ اس نے سب کے سامنے وعدہ کیا اور وعدہ پورا بھی کیا۔ پر اس نے مجھے اپنے گھر سے اس طرح نکالا کہ تین سو روپے میں ولیا کے ہاتھ چپکے سے بیچ دیا۔"

رحیم داد نے استفسار کیا۔ "ولیا بھی صاحبے والے میں رہتا تھا؟"

"نہیں! وہ مجھے بھومان شاہ لے گیا۔ اس کی گھر والی اسے چھوڑ کر تیلی کے منڈے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔" جمیلہ نے مطلع کیا۔ "ولیا کا بوڑھا پیو تھا۔ چھوٹا بھائی تھا اور چھوٹے بھائی کی گھر والی بھی تھی۔ بچے بھی تھے۔ سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔" جمیلہ نے بڑی گہری سانس بھری۔ "ولیا کے ساتھ میں دو مہینے سے اوپر رہی۔ ولیا ادھکڑ تھا۔ پر اس کا بھائی جوان تھا۔ مجھے اس کے گھر میں پہنچے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ولیا کا بھائی مجھے بری نظروں سے گھورنے لگا۔ اکیلے میں پاتا تو نوچتا کھسوٹتا۔ ایک روز اس کی گھر والی نے دیکھ لیا۔ اس نے رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ ولیا کے پیو کو پتہ چلا تو وہ الٹا مجھ پر ناراض ہوا۔ سسر اور نوہ دونوں مجھے گالاں نکالتے اور مارتے پیٹتے۔"

"انھیں اصل گل نہیں بتائی؟"

"کیا بتاتی۔ میرے پاس بتانے کو رہ کیا گیا تھا۔" جمیلہ نے اداسی سے کہا۔ "گالاں سنتی تھی' مار کھاتی تھی اور چپ کر کے بیٹھی رہتی تھی۔ فیر سسر اور نوہ نے مل کر مسکوٹ کی۔ مجھے گھر سے نکالنے کی سکیم بنائی۔ ایک روز ولیا کا پیو ایک موٹی سی زنانی کو لے کر آیا۔ اس کے بدن کا ماس تھل تھل کرتا تھا۔ وہ سگریٹ پیتی تھی اور پان چبا کر جگہ جگہ لال لال پیک تھوکتی تھی۔ بات کرتی تو ہاتھ بھی چلاتی اور آنکھیں بھی مٹکاتی۔ لور سے آئی تھی۔ ہیرا منڈی کی کنجری تھی۔"

"کنجری تھی؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "کس لیے آئی تھی؟"

"وہ فسادات میں اٹھائی جانے والی ان نوجوان ملاؤں اور کنیاؤں کو خریدنے کا دھندا کرتی تھی جنھیں مغویہ کہا جاتا ہے۔ ولیا کے پیو نے ۵ سو روپے میں میرا سودا کر دیا۔"

"تیں نوں اس سودے کا پتہ تھا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"بالکل تھا۔ میرے سامنے ہی تو طے ہوا تھا۔ اس سے ولیا اور اس کے بھائی نہیں تھے۔ اللہ وسایا کی ولیا کے چھوٹے بھائی سے جان پہچان تھی۔ اتفاق سے اسی شام اللہ وسایا اس سے ملنے

آیا۔ وہ آنگن میں منجی پر بیٹھا ولیا کے بھائی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں آنگن سے گزری تو اللہ وسایا نے مجھے دیکھ لیا اور فوراً پہچان لیا۔ اس نے مجھے اپنے پاس بلایا' پوچھا' تو یہاں کیسی آئی؟ میں تو چپ رہی پر ولیا کا بھائی بولا ولیا اسے خرید کر لایا ہے۔ اللہ وسایا نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ یہ میرے زمیں دار کی دھی ہے' یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں اسے اپنے پنڈ لے جاؤں گا۔ ولیا کا بھائی تو کچھ نہیں بولا پر اس کے پیو نے بگڑ کر کہا۔ یہ اس گھر سے نہیں جا سکتی۔ اس کی نو بھی کڑکڑ کرنے لگی۔ دونوں مجھے کنجری کے ہاتھ بیچ کر رات کو ۵ سو روپے وصول کرنا چاہتے تھے۔ وہ مجھے کیسے جانے دیتے۔"

"اللہ وسایا ان کی باتیں سن کر کیا بولا۔؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"وہ آنکھیں نکال کر کھڑا ہو گیا۔" جمیلہ کے چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی میں ہلکی ہلکی سرخی جھلکنے لگی۔ "اس نے کرتے کی دونوں آستینیں چڑھائیں اور اپنی لمبی ڈانگ اٹھا کر جوش سے بولا۔ بابے! میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور ابھی لے جاؤں گا۔ بلالے اپنے پنڈ کے جوانوں کو' دیکھتا ہوں کون میرا رستہ روکتا ہے؟ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور اونچی آواز سے بولا۔ 'چل پاروتی۔ ولیا جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پر اللہ وسایا کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔ ویسے بھی وہ جھگڑالو بندہ نہیں تھا۔ کہنے لگا' اللہ وسایا تو اسے ضرور لے جا پر میرے تین سو روپے دیتا جا۔ میں نے اسے اتنے ہی میں خریدا ہے۔ میری بات کا تجھے وشواس نہ ہو تو صابے والے کے گامے سے پوچھ لے جس سے میں نے اسے خریدا ہے۔ اللہ وسایا نے جھٹ دھوتی کے ڈب سے ۵۰ روپے نکالے اور ولیا کے سامنے ڈال کر کہا۔ یہ ۵۰ رکھ لے۔ اڑھائی سو کل شام اپنے بھائی کو بھیج کر منگوالینا۔ ویسے تجھے میرا اعتبار ہو تو کل میں خود تیری رکم تیرے گھر پہنچا دوں گا۔ اللہ وسایا وہاں ذرا دیر بھی نہیں ٹھیرا۔ مجھے گھر لے آیا۔ سب چپ کر کے بیٹھے رہے۔ کسی نے اس کا رستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔"

"اپنا زمیں دار اتنا زور آور اور جی دار ہے' یہ تو میں نوں پتہ ہی نہیں تھا۔"

"چوہدری! وہ بہت جی دار ہے۔ ان دنوں تو خوب تکڑا جوان تھا۔ اس کے شریر میں بڑی شکتی تھی۔" اللہ وسایا کا ذکر کرتے وقت جمیلہ کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ "بھومان شاہ سے اپنے پنڈ تک دس میل سے کم فاصلہ نہیں ہوگا۔ میں فرلانگ دو فرلانگ چل کر بیٹھ گئی۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ پر اللہ وسایا ذرا بھی نراش نہ ہوا۔ اس نے مجھے اٹھا کر پیٹھ پر لاد لیا۔ دس میل تک وہ مجھے اسی طرح اٹھائے اٹھائے چلتا رہا' کہیں دم نہ لیا۔ اپنے گھر پہنچ کر ہی رکا۔ میں

آنے کو تو اس کے ساتھ آ گئی پر بعد میں مجھے بہت ڈر لگا۔ بات یہ تھی بنسی لال نے اللہ وسایا اور اس کے پیو کو نراض ہو کر بے دخل کر دیا تھا اور ایسے سمے بے دخلی کی تھی جب اس کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔"

"فصل واڈھو ہو تو مزارعے کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا' ایسا کبھی نہیں ہوتا۔" رحیم داد نے بنسی لال کی کارروائی کی مذمت کی۔

"پر بنسی لال نے ایسا ہی کیا۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "اللہ وسایا کے پیو نے دیپال پور جا کر ہرویال سے فریاد کی' پر اس نے بنسی لال ہی کی بات مانی۔ اللہ وسایا اور اس کے گھر والے پنڈ سے نکل کر ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ اس کا پیو اسی دکھ سے مر گیا۔ چھوٹا بھائی شیخوپورہ جا کر اینٹوں کے بھٹے پر مزدوری کرنے لگا۔ جب فسادات بھڑکے تو بنسی لال حویلی چھوڑ کر سرحد پار چلا گیا۔ اللہ وسایا اپنی ماں کے ساتھ واپس پنڈ آ گیا۔ اس نے بنسی لال کے نئے مزارعے سے اپنی زمین خالی کرالی۔ اس پر کھیتی باڑی بھی شروع کر دی۔ پر مجھے جس بات کا ڈر تھا' وہ سامنے آئی۔ اللہ وسایا کی ماں کو پتہ چلا' میں پنڈ کے زمیں دار لالہ ہرکشن کی دھی ہوں تو وہ آگ بگولا ہو گئی' بہت چیخی چلائی۔ مجھے دوش دینے لگی' تیرے پیو نے میرے گھر والے کو بے دخل کر کے مار ڈالا۔ اس کی نراضی پر میں نے سوچا کہ اللہ وسایا بھی مجھ سے اپنے پیو کا بدلہ ضرور لے گا۔ وہ تھا بھی ان دنوں بہت کڑوا اور غصے والا۔ دور دور تک اس کی ٹکر کا جوان نہیں تھا۔ ہرے مونچھیں مروڑتا رہتا اور شیر کی طرح چھاتی تان کر چلتا تھا۔"

رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "پر اب تو اس کی مونچھیں سیدھی سادی رہتی ہیں۔ کبھی نہیں مروڑتا۔"

"ان دنوں تو نے اسے نہیں دیکھا۔ بہت زور آور ہوتا تھا۔" جمیلہ نے فخر سے گردن اونچی کی۔ "میں اتنی ڈری کہ رات بھر جاگتی رہی۔ پر وہ میرے پاس آیا ہی نہیں۔ دوسری رات بھی نہیں آیا۔ نہ اس نے مجھ سے بات کی' نہ کسی طرح کی چھیڑ چھاڑ کی۔ کئی راتیں گزر گئیں۔ البتہ اس کی ماں روز نراض ہوتی۔ ہرے غصے سے کڑکڑ کرتی رہتی۔ ایک روز اس نے مجھے مارا بھی۔ ٹھیک اسی سمے اللہ وسایا آ گیا۔ حویلی خالی پڑی تھی۔ اللہ وسایا نے ماں سے تو کچھ نہیں کہا' مجھے حویلی میں لے آیا۔ حویلی پہنچ کر مجھے اور ڈر لگا۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ میں کمرے میں سوتی اور وہ کمرے کے باہر منجی ڈال کر لیٹ جاتا۔ رات کو وہ کبھی کمرے میں نہیں آیا۔ دوپہر اور شام کو میرے لیے روٹی لے کر آتا مگر بات چیت بہت کم کرتا۔"

"مہاجرین نے تو اس پنڈ میں گڑبڑ نہیں کی؟"

"کیوں نہیں کی' بہت گڑبڑ کی۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "مہاجرین کا کیمپ لہور کی طرح منٹگمری میں بھی کھل گیا تھا۔ انھیں جہاں بھی ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی زمیں یا مکان نظر آتا' اس پر جھٹ کبضہ کرلیتے۔ ویسے ادھر کے وڈے زمیں داروں نے پہلے ہی ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی زمین اور جائیداد طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے دبا رکھی تھی۔ مہاجرین کے لیے بچا ہی کیا تھا۔ کسی طرح انھیں پتہ چل گیا کہ حویلی کسی ہندو زمیں دار کی ہے۔ وہ تو چلا گیا' اس میں اس کی ہندو چتری رہتی ہے۔ فیر تو جی' انھوں نے حویلی پر کبضہ کرنے کی سوچی۔ غول کے غول پنڈ میں آگئے اور حویلی چھین نے کی کوشش کرنے لگے۔ اللہ وسایا اور اس کے ساتھیوں نے ان کی کوئی کوشش سپھل نہ ہونے دی۔ حویلی میں ایک بندوک موجود تھی' یہی جو تیرے پاس ہے۔ کارتوس بھی تھے۔ اللہ وسایا کے ساتھیوں میں سے کئی کے پاس ویسی کاربنیں تھیں۔ سب نے جم کر مکابلہ کیا۔ حملہ آوروں کو پنڈ سے باہر نکال دیا۔ دوسرے تو کسی اور طرف نکل گئے' پر جلندھر کے پٹھان مہاجر نہ گئے۔ انھوں نے پنڈ کے باہر پڑاؤ ڈال دیا۔"

"ان کے بارے میں تو مشہور ہے' اراضی کیسے بھی ہو۔ کہیں بھی ملے' ہرگز نہیں چھوڑتے۔" رحیم داد نے مسکرا کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "کہتے ہیں کہ ایک بار دوزخیوں نے دیکھا' جلندھری پٹھانوں کے غول کے غول دوزخ میں چلے آرہے ہیں۔ گھبرا کر ان سے پوچھا' بادشاہو! اتھے کہاں چلے آئے؟ یہ تو دوزخ ہے۔ وہ بولے' یہ تو ہم نے بھی پتہ ہے' پر سنا ہے' ادھر زمینوں کی الاٹمنٹ ہو رہی ہے۔"

"چوہدری! توں' تو مخول کر رہا ہے۔" جمیلہ نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔ "پر میں ان کے بارے میں اتنا ضرور کہوں گی' انھوں نے بہت تنگ کیا۔ روز اکٹھے ہو کر ہلّا بولتے تھے۔ اتنا شور شرابہ کرتے تھے' میں تجھے کیا بتاؤں۔" جمیلہ نے لمبی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے ایک بار پھر پھیل گئے۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "رات کو حملے کا بہت ڈر رہتا تھا۔ اللہ وسایا بندوک تھامے اپنے دس باراں تگڑے ساتھیوں کے ساتھ رات بھر رکھوالی کرتا۔ میں نے روز روز کے خطرے سے گھبرا کر ایک بار اسے صاف صاف کہہ دیا۔ دیکھ اللہ وسایا! سارا جھگڑا میرے کارن ہے۔ مجھے ان کے حوالے کردے یا گولی مار دے۔ میرے ختم ہوتے ہی سارا ٹنٹا مٹ جائے گا۔ اللہ وسایا آنکھیں نکال کر بولا۔ بیکار کی گڑ گڑ نہ کر' چپ کرکے بیٹھی رہ۔ جب تک میری جان میں جان ہے' کوئی یہاں نہیں آسکتا۔ میری لاش پر سے گزر کر ہی کوئی حویلی میں داخل ہو سکتا ہے۔ فیر جو تیرا

جی کرے' کرنا۔ دن اسی ڈر اور خوف میں گزرتے رہے۔ ایک اندھیری رات انھوں نے اکٹھے ہو کر حویلی پر ہلا بول دیا۔ اللہ وسایا اور اس کے ساتھیوں نے بھی مورچے سنبھال لیے۔ زبردست ٹاکرہ ہوا۔ دونوں طرف سے تڑ تڑ گولیاں چلیں۔ میں نے جی میں ٹھانی اگر بلوائی حویلی میں آئے تو میں ان کے پہنچنے سے پہلے ہی خودکشی کرلوں گی۔ میری آشا تھی کہ انھیں میں نہ ملوں' میری لاش ملے۔"

"توں نے کیا کیا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"میں نے دیوار میں لگی ہوئی ایک اونچی کھونٹی میں اپنی اوڑھنی کا ایک پلو مضبوطی سے باندھا' دوسرے پلو کا پھندا بنایا۔ کھونٹی کے نیچے لکڑی کا سٹول رکھا' اس پر چڑھ کر پھندا اپنی گردن میں ڈال لیا۔" جمیلہ ایک ایک تفصیل بتاتی رہی۔ "حویلی کے باہر شور ہوتا رہا' گولیاں تڑ تڑاتی رہیں۔ بہت دیر بعد شور بند ہوا۔ گولیاں بھی رک گئیں' تھوڑی دیر بعد حویلی کے آنگن میں بول برالا ہوا۔ ملی جلی آوازوں کے ساتھ زور زور سے چلنے کی آہٹ ہوئی۔ مجھے ایسا لگا' بلوائی حویلی میں گھس آئے ہیں۔ میں نے جھٹ اپنا ایک پیر اٹھایا' دوسرے پیر کے بوجھ سے سٹول ڈگمگا کر گر گیا۔ ساتھ ہی میں بھی گری اور اوڑھنی کے ساتھ لٹکنے لگی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلا' فیر کیا ہوا۔"

رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "تسیں پھندے سے لٹکی رہی تھیں؟"

"بالکل لٹکی رہی تھی۔" جمیلہ نے سکون سے جواب دیا۔ "رات گئے مجھے ایسا لگا میں زندہ ہوں۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مجھے دکھ ہوا کہ کیوں بچ گئی؟ میں اس نرک میں دوبارہ نہیں جانا چاہتی تھی جس سے نکل کر آئی تھی۔ ڈرتے ڈرتے آنکھیں گھما کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اللہ وسایا میرے سرہانے بت بنا بیٹھا تھا۔ اس نے میری آنکھیں کھلی دیکھیں تو بھاگا بھاگا گیا' گلاس میں پانی لے کر آیا۔ ایک ہاتھ سے میرا سر اونچا کیا اور میرے منہ میں پانی ڈالا۔ مجھے بہت پیاس لگی تھی۔ سارا پانی پی گئی۔ مانو میں تو مر ہی چکی تھی۔ یہ اللہ وسایا تھا جس نے مجھے مرنے سے بچالیا۔"

"ہاں! وہ نہ ہوتا تو ہرگز نہ بچتی۔" رحیم داد نے اس کی تائید کی۔

"پانی پی کر ذرا جان آئی تو میں نے اللہ وسایا سے پوچھا' بلوائیوں کا کیا بنا؟ وہ ہنس کر بولا' بننا کیا تھا۔ سب بھاگ گئے۔ میں نے کچھ دیر چپ رہ کے کہا۔ پر وہ کل نہیں تو پرسوں ضرور ہلّا بولیں گے۔ اللہ وسایا ذرا بھی نہ گھبرایا' مسکراتا رہا۔ میں نے دیکھا' اس کے کرتے کی آستین خون سے لال ہو رہی ہے۔ کپڑوں پر بھی جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ میں گھبرا گئی۔ وہ ہنس کر بولا' گولی بازو میں لگی تھی۔ پر اندر نہیں اتری۔ گولی چلتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں تکیے کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ اللہ وسایا نے بار بار منع کیا پر میں نے جھٹ اپنی اوڑھنی پھاڑ کر اس کے

گھاؤ پر پٹی باندھ دی۔"

"بلوائیوں نے دوبارہ حملہ کیا ہوگا۔ اللہ وسایا تو زخمی تھا۔ اس نے کیسے ان کا سامنا کیا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"اس رات کے بعد حملہ نہیں ہوا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو وضاحت سے بتایا۔ "میں نے اسی رات فیصلہ کر لیا تھا' مجھے اللہ وسایا سے فوراً ویاہ کر لینا چاہئے۔ ورنہ وہ مجھے بچانے کی کوشش میں مارا جائے گا۔ میں نے جب اسے یہ بات کہی تو وہ تیار نہیں ہوا' کہنے لگا۔ میں ٹھیرا جانگلی اور تو اتنے وڈے زمیں دار کی دھی۔ مزارعے کا زمیں دار کی دھی سے کیسے رشتہ ہو سکتا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تب اللہ وسایا نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے آنسو پونچھے۔ اسی صبح میں اللہ وسایا کے ساتھ پنڈ کی مسجد میں گئی۔ ملاں جی نے سب کے سامنے مجھے کلمہ پڑھایا۔ میں مسلمان ہو گئی۔ میرا نام جمیلہ رکھا گیا۔ اسی روز ملاں نے اللہ وسایا کے ساتھ میرا نکاح پڑھا دیا۔ بس جی اس طرح ہمارا ویاہ ہوا۔ میں پاروتی نہ رہی' اللہ وسایا کی جمیلہ بن گئی۔ یہ میرا نیا جیون تھا اور یہ نیا جیون مجھے اللہ وسایا ہی نے دیا تھا۔"

"اللہ وسایا کی ماں بھی نکاح میں شامل ہوئی تھی؟"

"نہیں جی' وہ تو اتنی نراض ہوئی' اسی روز پنڈ چھوڑ کر اپنے چھوٹے پتر کے پاس شیخوپورہ چلی گئی۔ اللہ وسایا اسے واپس لانے کئی بار شیخوپورے گیا پر وہ نہ آئی۔ بہت ضدی اور ہٹیلی تھی۔ دو برس ہوئے اس کا مرن ہو گیا۔ اللہ وسایا کا بھائی بھی کبھی یہاں نہیں آیا۔ سنا ہے وہ کراچی چلا گیا۔ اس کے بارے میں کچھ اور پتہ نہیں چل سکا۔"

☆

سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ بلندیوں پر پہنچ چکی تھی۔ مزارعے اور کسان مویشیوں کو ہنکاتے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ رحیم داد اور جمیلہ خاموش بیٹھے تھے۔ نوکر نے لسی سے بھرے ہوئے گلاس دونوں کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ جمیلہ نے لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "برسوں بعد میں نے اپنے بارے میں کسی کو اتنی باتیں بتائی ہیں۔ لگتا ہے' بہت ہلکی پھلکی ہو گئی ہوں۔ اس رات سے میں بہت بے کل تھی جب ہرویال اور چاچا مجھے لینے یہاں آئے تھے۔ کچھ بھی چنگا نہیں لگتا تھا۔ بار بار رونے کو جی کرتا' رات کو نیند بھی نہ آئی۔ آج میں آرام نال سو سکوں گی۔ مانو میرے من کا بوجھ اتر گیا۔"

رحیم داد فوری رد عمل کا اظہار نہ کر سکا۔ وہ جمیلہ کی بپتا کے ہوش ربا اور حیرت انگیز تانے بانے میں الجھ کر رہ گیا۔ اسی اثناء میں حویلی کے اندر سے جمیلہ کی بچی بینا کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ جمیلہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی۔ "لگتا ہے بہن بھائی میں جھگڑا ہو گیا۔ کھیلتے کھیلتے لڑنے لگتے ہیں۔" وہ تیز قدم اٹھاتی حویلی کی جانب روانہ ہو گئی۔ رحیم داد اسے دور تک دیکھتا رہا اور اس کے جانے کے بعد گم صم بیٹھا رہا۔

شام ہو گئی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ رحیم داد اٹھا اور بوجھل قدموں سے مہمان خانے کی سمت بڑھا۔ وہ نڈھال نظر آ رہا تھا۔

تیسرے روز اللہ وسایا واپس آ گیا۔ شام کو وہ باغ میں رحیم داد سے ملا۔ خلاف معمول وہ بجھا بجھا لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں خالی خالی اور ویران تھیں رحیم داد نے چاہا' اس کی پریشانی کا سبب معلوم کرے۔ مگر اللہ وسایا زیادہ دیر نہیں بیٹھا' معذرت کے انداز میں بولا۔ "معاف کرنا چوہدری' میری طبیعت آج کچھ گڑبڑ ہے۔ کل تجھ سے آرام سے گل بات کروں گا۔" وہ چلا گیا۔

جمیلہ کے بھائی ہرویال اور چاچا کے بارے میں نہ اللہ وسایا نے کچھ کہا نہ رحیم داد نے ان کا ذکر چھیڑا۔

اللہ وسایا اب ہروقت چپ چپ رہتا۔ بہت کم بات کرتا اور بات کرتے کرتے کھو جاتا۔ جب بھی ملتا کچھ سوچتا نظر آتا۔ کئی روز گزر گئے۔ مگر اللہ وسایا کے چہرے پر پہلی سی تازگی اور شگفتگی دکھائی نہ دی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اندر ہی اندر سلگ رہا ہو۔ اسے کوئی بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ رحیم داد نے کئی بار ہمت کر کے پوچھا بھی مگر وہ ٹال گیا۔

انہی دنوں ایک شام جمیلہ باغ میں آئی۔ رحیم داد پہلے سے بیٹھا تھا۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ گئی۔ اللہ وسایا گاؤں میں نہیں تھا۔ کہیں گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پھاتاں آ گئی۔ وہ جمیلہ کے پیروں کے پاس گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "بھین جی! تاجاں کی سسرال والے اگلے مہینے کے پہلے جمعے کو آ رہے ہیں۔" اس نے انگلیوں پر حساب لگایا۔ "آج کے چھبیسویں دن ویاہ کی تاریخ مانگنے آ رہے ہیں۔"

"کب تک ویاہ کرنا چاہتے ہیں۔" جمیلہ نے پوچھا۔

"ان کا ارادہ تو چھیتی نال کرنے کا ہے۔" پھاتاں نے جواب دیا۔ "پر اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

"تو کیوں چنتا کرتی ہے۔ تجھے مجھ پر وشواس نہیں؟ تجھ سے کہہ تو چکی ہوں' میں تاجاں کا ویاہ

خوب دھوم دھڑکے سے کروں گی۔ تاجاں تیری نہیں' میری بھی دھی ہے۔"

چھاتاں کا چہرہ کھل اٹھا۔ "تو جی میں کہلوادوں' وہ ساھے کے لیے آجائیں۔"

"بالکل کہلوا دے۔ ان کو یہیں حویلی میں لاتا۔ پر یہ تو سوچ' جلدی کیسے ویاہ ہو سکتا ہے اتنی گرمی میں؟" اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا' چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "ساون ٹھیک رہے گا۔" مگر فوراً اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ "پر ساون میں تو زبردست برکھا ہوتی ہے۔ سگائی کا کیا مزا آئے گا۔ یہ کیا گل ہوئی' جنج چڑھے اور اوپر بادل گرجتے ہوں۔ بجلی چمکتی ہو' چاروں طرف پانی ہی پانی ہو۔ نہ ٹھیک سے ملنی ہو نہ سٹھنیاں۔ ماگھ کیسا رہے گا؟"

"نا بھین جی! ماگھ تو بہت دور ہے۔" چھاتاں رضا مند نہیں ہوئی۔ "وہ لوگ ویاہ میں اتنی دیری نہیں چاہتے۔"

"سوچ لے۔ جب کہے گی' تیاری ہو جائے گی۔" جمیلہ نے اڑنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔

"تیری تاجاں تو بہت سندر منیار ہے۔ اس کا ویاہ بھی سندر ہونا چاہئے۔ سے بھی ویسا ہی ہونا چاہئے۔ آگے تیری مرضی۔ میں نے کیا لینا۔"

"میرا کیا ہے جی! تسیں سسرال والوں کو تیار کر لینا۔" چھاتاں نے مسکرا کر کہا۔

"ایہہ گل ہے تو ساھے کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔ میں انھیں راضی کر لوں گی۔ کوئی شبھ گھڑی ہونی چاہئے۔ اس کے بارے میں مل جل کر طے کر لیں گے۔"

چھاتاں اٹھتے ہوئے بولی۔ "بھین جی ساھے کا دن یاد رہے گا ناں؟"

"بالکل یاد رہے گا۔" جمیلہ بھی کھڑی ہو گئی اور چھاتاں کے ساتھ ساتھ باغ سے چلی گئی۔

رحیم داد کو حیرت ہوئی' اللہ وسایا کے برعکس جمیلہ کے چہرے پر پہلی سی تازگی تھی اور ویسا ہی نکھار تھا۔ اس کے رویئے میں بھی وہی شگفتگی تھی جو مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں پر ہر وقت رقصاں رہتی تھی۔

اللہ وسایا نہ باغ میں آیا نہ رات کو مہمان خانے میں۔ وہ دوسرے روز' دن چڑھے رحیم داد کے پاس آیا۔ اس کا چہرہ اب بھی اترا ہوا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "چوہدری میں دو گھنٹے بعد لہور جا رہا ہوں۔ جمیلہ اور دونوں بچے میرے ساتھ جائیں گے۔"

"کوئی خاص کام ہے لہور میں؟" رحیم داد کے استفسار میں حیرت تھی۔

"خاص ہی کام ہے۔" اللہ وسایا نے کام کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ "تجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں نے نوکروں کو بول دیا ہے۔ آرام سے رہ' یہ تیرا ہی گھر ہے۔ جس چیز کی

ضرورت ہو منگوا لینا۔"

"کب تک واپسی ہوگی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"تین چار روز تو لگ ہی جائیں گے۔ زیادہ دن بھی ہو سکتے ہیں۔"

رحیم داد دریافت کرنا چاہتا تھا' وہ ملتان سے واپسی کے چند ہی روز بعد لاہور کیوں جا رہا ہے اور جمیلہ کو کس لیے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ مگر اللہ وسایا نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ فوراً باہر چلا گیا۔

اللہ وسایا اسی روز بیوی بچوں کے ہمراہ لاہور روانہ ہو گیا۔ رحیم داد بالکل تنہا رہ گیا۔ وہ بار بار اللہ وسایا کے بشرے سے ٹپکتی ہوئی پریشانی کے بارے میں غور کرتا۔ جتنا وہ غور کرتا' اللہ وسایا کا رویہ اسے پراسرار نظر آتا۔ وہ دن بھر کمرے میں بند ہو کے حسب معمول چوہدری نور الٰہی مرحوم کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کرتا رہتا۔ شام کو نہا دھو کر ٹہلتا ہوا باغ کی جانب نکل جاتا۔ رات کا کھانا مہمان خانے یا باغ میں کھاتا۔ مہمان خانے کی چھت پر بندوق سرہانے رکھ کر سوتا اور بہت چوکنا سوتا۔ ذرا کھٹکا ہوتا' وہ بندوق پر ہاتھ رکھ کر اٹھ بیٹھتا۔ احمد صحت یاب ہو گیا تھا۔ وہ رات کو آنگن میں سوتا۔ اس کے آنے سے رحیم داد کو خاصی ڈھارس ہو گئی۔

اللہ وسایا نویں روز بیوی بچوں کے ساتھ صبح صبح واپس آ گیا۔ مگر رحیم داد سے نہیں ملا۔ شام کو رحیم داد باغ میں بیٹھا تھا' اللہ وسایا آیا۔ جمیلہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس دفعہ نہ صرف اللہ وسایا کے چہرے پر بلکہ جمیلہ کے چہرے پر بھی پریشانی برس رہی تھی۔ دونوں کچھ دیر گم صم بیٹھے رہے پھر اللہ وسایا نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"چوہدری! یہ حویلی ہم نے جلد ہی خالی کرنی ہوگی۔"

رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہم مقدمہ ہار گئے۔ پہلے ملتان میں ہارے' فیر لہور میں ایڈیشنل کمشنر بحالیات کے پاس اپیل کی۔ اس نے اپیل نامنظور کر دی۔ حویلی اور ہماری ساری اراضی متروکہ جائیداد قرار دے دی گئی۔"

اللہ وسایا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "یہ حویلی اور زمین جمیلہ کے پیئو کی ملکیت تھی۔ اس کی دھی ہونے کے ناتے جمیلہ کے نام پر یہ میرے پاس تھی۔ پر سرکار نے جمیلہ کو وارث ماننے سے انکار کر دیا۔"

"چوہدری! یہ تو دیکھ' میرے پیئو کی تو بہت اراضی تھی۔ اس کی دو ہزار ایکڑ سے اوپر زمین احسان علی شاہ نے دبالی۔ پر اس کا کبنہ مان لیا گیا۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر گلہ کیا۔ "ویسے اس کے پاس

پہلے ہی دو سو مربعے کے لگ بھگ اراضی تھی۔ یہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی مدد کرنے اور وفاداری دکھانے پر اس کے پرکھوں کو ملی تھی۔" اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "انگریز کا راج تھا' تب اس کی چلتی تھی۔ اب انگریز کا راج نہیں رہا تب بھی اس کی چلتی ہے۔ اس نے ہمارے خلاف درخواست لگائی تھی۔ ہم نے اپنی زمین کی واپسی کے لیے اس کے خلاف درخواست لگائی تو کوئی انکوائری شنکوائری نہ ہوئی کیوں اس کی درخواست پر فٹافٹ انکوائری کا حکم جاری کردیا گیا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اللہ وسایا ہار گیا۔ احسان شاہ جیت گیا۔"

"اسے تو جیتنا ہی تھا۔ اس کی اوپر تک پہنچ ہے۔ وزیروں اور افسروں سے یاری ہے۔ اس کے پتر اور جنوائی بھی وڈے افسر ہیں۔ وہ نہ جیتے گا تو کیا میں جیتوں گا۔" اللہ وسایا نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" جمیلہ کا لہجہ تیکھا اور مزید تلخ ہوگیا۔ "احسان شاہ نے تو جیتنا ہی جیتنا تھا۔ احسان شاہ کے پرکھے بھی تیرے پرکھوں سے جیتے تھے' جنھوں نے اپنی دھرتی کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کے لیے جنگ لڑی تھی' بغاوت کی تھی۔ وہ باہنی وال تھے۔ ہار گئے تو ان سے زمین' مویشی' عزت آبرو' سب کچھ چھین لیا گیا۔ انھیں تباہ و برباد کرکے جانگلی بنادیا گیا۔ احسان علی شاہ کے پرکھوں نے انگریزوں کے کارن غداری کی' آزادی کا سودا کیا' ان کے ساتھ مل کر باہنی وال باغیوں اور ودروھیوں کو کچل دیا۔ انگریزوں نے خوش ہوکر انھیں عزت دی' شان دی۔ سید اور شاہ جی کہا اور سید اور شاہ جی بنا بھی دیا۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتی ہے۔" اللہ وسایا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے جھوٹ تو نہیں کہا۔" جمیلہ اسی تلخی سے بولی۔ "میں نے تاریخ کی کتابوں میں جو پڑھا ہے' وہ بتا رہی ہوں۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "سر ڈنزل ایبٹ سن بہت وڈا انگریز افسر ہوتا تھا۔ اس نے پنجاب کی کوموں اور جات برادریوں کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کا نام ہے 'پنجاب کاسٹس'۔ ایبٹ سن نے اس میں لکھا ہے '۱۸۵۷ء کے غدر میں باہنی وال ودروھیوں نے انگریز فوجوں کو بہت تنگ کیا۔ وہ لٹیرے اور جانگلی تھے۔ سو باہنی وال آج تک جانگلی کہلاتے ہیں۔ تو خود سوچ' انگریز کی مونچھ کا بال خاندانی جاگیردار سید احسان علی شاہ' ایک باہنی وال جانگلی اور معمولی مزارعے اللہ وسایا کو کیسے زمیں دار دیکھ سکتا ہے۔ تب ہی تو اس نے اللہ وسایا سے زمیں داری چھین لی۔ اس کی پگ کا طرہ اور اونچا ہوگیا۔"

"احسان شاہ میری زمیں داری ہی سے نہیں' تیرے سکول سے بھی خار کھاتا ہے۔"

"سکول سے کیوں خار کھاتا ہے؟ سکول نے احسان شاہ کا کیا بگاڑا ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہوکر اللہ وسایا سے دریافت کیا۔

"وہ میرے سکول سے سخت نراض ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا' جانگلیوں اور کمیوں کے بچے پڑھ لکھ کر یہ جان لیں کہ وہ جانگلی اور کمی کیوں ہیں اور احسان شاہ کیسے جاگیردار بن گیا؟ انھیں پتہ چل جائے گا کہ اس کے پرکھے اپنے انگریز حاکموں کے جوتے چاٹتے تھے۔ ان کے سامنے کتوں کی طرح دم ہلاتے تھے۔" جمیلہ کے ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ "یہ ہے احسان علی شاہ کی اصلیت جس کے بل پر وہ شاہ جی بنا پھرتا ہے' اپنے کو خاندانی جاگیردار ار کیس بتاتا ہے۔"

اللہ وسایا اور رحیم داد خاموش بیٹھے رہے۔ جمیلہ کے چہرے پر جھنجلاہٹ اور نفرت سرخی بن کر پھیل گئی۔ وہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" رحیم داد نے سکوت توڑا۔

"ہونا کیا ہے' وہی جو میں نے کہا ہے۔" اللہ وسایا نے جواب دیا۔

"کب تک حویلی خالی کرنی ہوگی؟"

"دس روز کے اندر اندر حویلی خالی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

اللہ وسایا کھڑا ہوگیا' جمیلہ اور رحیم داد بھی کھڑے ہوگئے۔ تینوں باغ سے نکلے اور مہمان خانے میں پہنچے۔ مگر اللہ وسایا ٹھہرا نہیں' حویلی میں کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ جمیلہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ رحیم داد نے شام کی دھندلی روشنی میں دیکھا' جمیلہ تھکی ہوئی اور نڈھال نظر آرہی ہے۔ اس کے قدم ڈگمگائے۔ اللہ وسایا نے اسے سنبھال لیا۔ جمیلہ نے اس کے بازو پر اپنا سر ٹکا دیا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ رحیم داد اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ صرف یہ دیکھ سکا' اللہ وسایا اس کا کندھا بڑے پیار سے تھپک رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے سہارے سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے حویلی میں داخل ہوگئے۔

رحیم داد مہمان خانے میں تنہا رہ گیا۔ احمد بھی نہیں تھا۔ وہ آنگن میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ ویران اور اداس شام تھی اور اس سے بھی زیادہ اداس رحیم داد تھا۔ اب کیا ہوگا؟ وہ کس کے پاس جائے گا؟ کہاں جائے گا؟ کیسے جائے گا؟ ان سوالات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ زندگی ایک بار پھر اسے بوجھ نظر آنے لگی۔

وہ بے چین اور مضطرب تھا۔ احمد کھانا لایا مگر وہ آدھی روٹی بھی نہ کھا سکا۔ بستر پر لیٹا تو آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ رات کروٹیں بدلتے کسی نہ کسی طور کٹی۔ سویرے اٹھا تو وہی الجھن اور پریشانی

دامن گیر تھی۔ دوپہر ہوئی' رات ہوئی۔ نہ اللہ وسایا نظر آیا نہ جیلہ۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ رحیم داد نے سوچا' دونوں گاؤں چھوڑنے کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ زمیں داری کا بہت بڑا بکھیڑا ہے۔ انھیں جانے سے پہلے ہر کام نمٹانا ہے۔

رحیم داد کو بھی اب کوٹلہ ہرکشن سے کہیں نہ کہیں جانا تھا۔ اللہ وسایا اسے پہلے ہی صورت احوال سے خبردار کرچکا تھا۔ اس نے سویرے سویرے نائی بلوایا' بال کٹوائے' ڈاڑھی کی تراش خراش کرائی۔ حجامت بنوانے کے بعد غسل خانے میں گیا۔ نہا دھو کر اجلے کپڑے پہنے۔ کنگھی سے سر اور ڈاڑھی کے بال سنوارے۔ آنکھوں پر عینک لگائی اور دیوار میں لگے ہوئے آئینے کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے کا زخم کب کا مندمل ہوچکا تھا۔ مگر اس کے بائیں رخسار پر لگ بھگ چار انچ لمبا نشان ہلال کی شکل میں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے گردن ادھر ادھر گھما کر اپنے چہرے پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالی' زیر لب مسکرایا۔ اب اس کی شکل و شباہت میں اتنا فرق آچکا تھا کہ اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔ چہرے مہرے سے وہ اس قدر مختلف بن چکا تھا۔ لاری یا ٹرین سے بھی سفر کرسکتا تھا۔

آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اس نے طے کیا' وہ کوٹلہ ہرکشن' شام ہونے سے پہلے چھوڑ دے گا۔ منٹگمری اسٹیشن جانے کے بجائے لاری سے پاک پتن جائے گا اور رات کی ٹرین سے لودھراں پہنچ کر بہاول پور کے راستے سندھ کی طرف نکل جائے گا۔ سکھر' شکار پور نواب شاہ یا سندھ کے کسی بھی علاقے میں چلا جائے گا۔ چوہدری نورالٰہی کے کلیم کی بنیاد پر زرعی زمین اور مکان الاٹ کرانے کی کوشش کرے گا۔ جب تک الاٹمنٹ نہیں ملے گا' کہیں دکان کھول لے گا یا کوئی اور کاروبار شروع کردے گا۔ لالی کی دی ہوئی تین ہزار سے اوپر رقم اس کے پاس موجود تھی۔ اس رقم سے وہ بہت کچھ کرسکتا تھا۔ سندھ میں کسی جان پہچان والے کے ملنے کا امکان بھی کم تھا۔ وہ چوہدری نورالٰہی کے روپ میں اطمینان سے نئی زندگی کا آغاز کرسکتا تھا۔

وہ اب چوہدری نورالٰہی بن کر ہی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ رحیم داد کو وہ بہت پہلے ختم کرچکا تھا۔ بیگاں کے قتل کے بعد رحیم داد سے اس کے سماجی وجود کا آخری رشتہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ یہ پھانسی کا خطرہ مول لے کر رحیم داد کو زندہ رکھنے کی آخری کوشش تھی جس میں وہ اپنی اکلوتی بہن کو بھی داؤ پر لگا چکا تھا۔ وہ کس کے لیے رحیم داد بن کر زندہ رہتا؟ نوراں کے لیے؟ بچوں کے لیے؟ اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ نوراں مرگئی۔ اس کے ساتھ بچے بھی مرگئے۔ اب اس کا کوئی رشتہ نہیں رہا تھا۔ رحیم داد اس کے لیے ماضی کے کباڑ خانے کا حصہ بن چکا تھا۔ زنگ خوردہ' بوسیدہ' بیکار اور

فضول۔

☆

احمد ناشتا لے کر کمرے میں آیا۔ اس کا چہرہ بھی مرجھایا ہوا تھا۔ وہ اداس اور مضمحل لگ رہا تھا۔

رحیم داد نے لسی کا گھونٹ بھر کر اظہار ہمدردی کے طور پر پوچھا۔ "احمے! تو پریشان لگ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟"

"پریشانی کی تو جی گل ہی ہے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تیں نوں تو پتہ ہی ہے' زمیں دار مکدمہ ہار گیا۔ وہ زمیں دارنی کے ساتھ پنڈ چھوڑ کر جا رہا ہے۔"

"تیں نوں کیسے پتہ چلا؟"

"میں نوں تو جی پتہ چل ہی جاتا۔ میں تو حویلی کا نوکر ٹھیرا۔ پر اب تو یہ بات سب جانتے ہیں۔ زمیں دار ہی نے سب کو بتایا ہے۔ پنڈ میں ہر جگہ اسی کا چرچا ہے۔ سب دکھی ہیں۔ کیا مزارعے' کیا کمی۔ سبھی زمیں دار اور زمیں دارنی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں نے تو جی کتنوں ہی کو روتے دیکھا۔"

"دکھ کی تو گل ہی ہے۔" رحیم داد نے احمد کی تائید کی۔ "پنڈ والوں کو ایسا زمیں دار نہیں ملے گا۔"

"توبہ کرو جی! وہ زمیں دار ہی کب تھا۔ وہ اور زمیں دارنی تو سب سے اس طرح گھل مل کر رہتے تھے جیسے اس کے اپنے شریکے اور گھر والے ہوں۔" احمد آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "وڈے زمیں دار تو جی! ویاہ ہو یا موت' ہر مزارعے سے بھیڑ بکری' بھاڑو یا مچھندر لیتے ہیں۔ بیماری ہو یا مہمان آئے' جتنے ککڑ چاہے منگوا لیتے ہیں۔ مزارعے کی دودھ دینے والی گاں ہو یا ڈھگی' جب تک جی چاہے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ گاہ کے وکھت ایک جوڑا ڈنگر اور جتنے بندے چاہتے ہیں بلا لیتے ہیں۔ ماڑی یا حویلی کی لپائی' کنک کی پسائی' سب مفت کراتے ہیں۔ ایسی ہی جانے کتنی طرح کی مزارعوں سے ویگار لیتے ہیں۔ مویشی اور چوکھر تو اٹھواتے ہی ہیں نوجوان گھر والیوں اور کڑیوں تک کو اٹھوا لیتے ہیں۔ واپس کرنے کی تکڑی رکم مانگتے ہیں یا بیچ دیتے ہیں۔ کیا کیا بتاؤں جی' وڈے زمیں دار کتنا ظلم کرتے ہیں۔ پر اپنا زمیں دار تو نیک بندہ ہے۔ اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ جبھی تو سب اس کے لیے رو رہے ہیں۔"

"اس کے جانے کے بعد تو کیا کرے گا؟"

"میں تو جی اس کے ساتھ ہی جاؤں گا۔" احمد نے جواب دیا۔

"اگر وہ تجھے اپنے ساتھ نہ لے گیا تو کیا کرے گا؟"

"تب تو جی میں یہ پنڈ ہی چھوڑ دوں گا۔ اس کے جانے کے بعد میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ پنڈ کے جانے کتنے لوگ سوچ رہے ہیں' زمیں دار اور زمیں وارنی کے جاتے ہی کسی اور پنڈ کو چلے جائیں گے۔ جانے نیا زمیں دار کون ہو؟ کیسا ہو؟ اور جی کوئی بھی ہو۔ ہو گا تو وڈا ہی زمیں دار اور ایسے سب زمیں دار ایک ہی سے ہوتے ہیں۔" اس کی آواز بھر آئی۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ "یہ تو جی بہت برا ہوا۔ بہت ہی برا ہوا۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ احمد سامنے فرش پر خاموش بیٹھا بار بار آنسو پونچھتا رہا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہوا تو وہ برتن اٹھا کر باہر چلا گیا۔

پہر دن گزر گیا۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ لو کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ مہمان خانے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فضا بوجھل اور غبار آلود تھی۔ رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوپہر کو قدموں کی آہٹ سے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا' اللہ وسایا کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ جمیلہ بھی تھی۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

رحیم داد نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ "باہر زبردست گرمی ہے۔"

"ہاں جی! آج گرمی کچھ زیادہ ہی ہے۔" اللہ وسایا بولا۔ "سویرے سے لو چلنی شروع ہو گئی۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ "میرا تو آج شام سے پہلے یہاں سے جانے کا ارادہ ہے۔ سوچا تھا' روٹی کھا کر تیرے پاس آؤں گا۔ تم دونوں سے مل کر چلا جاؤں گا۔"

جمیلہ چپ بیٹھی رہی۔ اللہ وسایا نے کہا۔ "چلا جانا' ایسی کیا جلدی ہے۔ دو چار روز ٹھہر جا۔ ہم نے بھی یہاں کب تک رہنا ہے۔ حویلی تو خالی ہی کرنی ہے۔"

"آگے کے لیے تو نے کیا سوچا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں سوچا۔" اللہ وسایا نے سادگی سے جواب دیا۔

"سوچنا کیا ہے۔" جمیلہ نے کرسی پر پہلو بدلا اور اللہ وسایا کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "تیرے پاس ۱۵ کلا زمین تو رہے گی۔ مزارع بن کر تو ہم اس پنڈ میں رہ ہی سکتے ہیں۔"

"لو جی' اس کی سنو۔" اللہ وسایا نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "جس پنڈ میں اٹھ سال تک زمیں داری کی' اب تو اسی میں مجھے مزارع بنا کر ٹھہرانا چاہتی ہے۔ ذرا سوچ تو' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"نہیں جی' یہ نہیں ہو سکتا۔" رحیم داد نے بھی اللہ وسایا کی تائید کی۔ "زمیں دار اپنے ہی پنڈ میں مزارع بن کر نہیں رہ سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ عزت اور آبرو بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"چھوڑ چودھری کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" جمیلہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور جی سب سے وڈی گل ایہہ ہے' میں نے اپنا سکول نہیں چھوڑنا۔ اللہ وسایا! تو زمیں داری بھول جا۔ اپنے تئیں مزارع سمجھنے کی کوشش کر۔ ویسے بھی زمیں دار بن کر تو کب زمیں دار رہا۔ نہ وہ تیری نور تھی' نہ وڈے زمیں داروں والی آن بان تھی۔ مجھے تیری یہی سادگی چنگی لگتی تھی۔"

"چل' تیری گل میں نے مان لی۔ میں تو مزارع بن جاؤں گا۔ پہلے بھی مزارع ہی تھا۔ میرا پیو بھی مزارع تھا۔ زمیں دار تو مجھے تو نے بنایا۔" اللہ وسایا کھل کر مسکرایا۔ "پر تو مزارعے کی گھر والی بن سکے گی؟"

"بالکل بن سکتی ہوں۔" جمیلہ نے جوش سے سینے پر ہاتھ مارا۔ "آزما کے دیکھ لے۔" وہ اور زیادہ جوش میں آ گئی۔ کرتے کی دونوں آستینیں چڑھا لیں۔ اس کے گورے گورے ہاتھ دور تک عریاں ہو گئے۔ "تو نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ سویرے سویرے اٹھ کر مویشیوں کے لیے پٹھاوا کروں گی۔ چاٹی میں مدھانی ڈال کر دودھ بلوؤں گی۔ تو کھیتوں پر جائے گا اور میں بچوں کو لے کر سکول چلی جاؤں گی۔ دوپہر کو روٹی پکاؤں گی اور سر پر چنگیری میں رکھ کر تیرے لیے بھتا لے کر کھیتوں پر جاؤں گی۔ تیرے کپڑے دھوؤں گی۔ چرخے پر سوت کاتوں گی۔ چکی میں دانا پیسوں گی۔ میں کیا نہیں کر سکتی؟"

"چودھری! سن رہا ہے' اس کی باتیں۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا پھر مڑ کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "تجھ سے یہ سب کچھ ہو سکے گا؟ جمیلہ! ایسا کرنا تیرے بس میں نہیں۔ تیرا یہ سارا رنگ روپ مٹ جائے گا۔ آئینہ دیکھے گی تو خود کو پہچان بھی نہ سکے گی۔ کہے گی' ہائے ربا! میں تو برباد ہو گئی۔ یہ کیا ہو گیا؟ تو نے یہ بھی سوچا؟"

"اللہ وسایا! روپ رنگ کا کیا ہے۔ یہ تو دھوپ چھاؤں ہے۔ آج نہیں تو کل اسے مٹنا ہے۔" وہ سنجیدگی سے اپنی بات پر اڑی رہی۔ "میں نے تھوڑا جیون گزار کر ہی بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ کبھی اپنے کو اس پاروتی کے روپ میں دیکھا جو لور میں پڑھتی تھی۔ ایک سے ایک عمدہ کپڑے پہنتی تھی۔ کالج کے ڈراموں میں سوانگ بھر کر ایکٹنگ کرتی تھی' ہنستی تھی' ہنساتی تھی۔ سکھیوں کے ساتھ ناچتی گاتی تھی۔ پتنگ مناتی تھی۔ شام کو راوی پر کشتی چلاتی تھی۔ کار میں سواری کرتی تھی۔ شان دار کوٹھی میں رہتی تھی۔" اس کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ "میں نے اس پاروتی کو بھی دیکھا جسے حتبر

۱۹۴۷ء کی رات بصیر پور سٹیشن سے بلوائی اٹھا لے گئے۔ پھر وہ پاروتی نہ رہی۔ بھوکے کتوں کے لیے ہڈی بن گئی۔ کبھی تین سو میں بکی کبھی پانچ سو میں۔" اس کا چہرہ مرجھا گیا' لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تو مجھے ولیا کے گھر سے نکال کر نہ لاتا تو آج میں ہیرامنڈی کی کسی کنجری کے کوٹھے پر اپنا روپ رنگ اور جوانی بیچ رہی ہوتی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تجھے پتہ ہی ہے' میں پاروتی سے کیسے جمیلہ بنی اور زمیں دارنی کہلانے لگی۔ اب زمیں داری کے ساتھ زمیں دارنی بھی نہ رہی۔ جس طرح پاروتی مرگئی' ویسے ہی زمیں دارنی بھی مرگئی۔ اب میں اللہ وسایا مزارعے کی گھروالی بن جاؤں گی۔ بول میں مزارعے کی گھروالی کیوں نہیں بن سکتی؟ یہ کیوں نہیں کہتا' تو زمیں داری کی شان میں مزارع بننا نہیں چاہتا۔"

"چل' تو ہی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں نے تیری بات مان لی۔" اللہ وسایا نے جمیلہ کے جوش و خروش کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ "پر یہ تو سوچ' اگر نئے زمیں دار نے مجھے بے دخل کر دیا۔ ایسے ہی جیسے بنسی لال نے میرے پیؤ کو اور مجھے بے دخل کر دیا تھا۔ تب کیا بنے گا؟"

"بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔" رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "کوئی زمیں دار یہ نہیں چاہے گا کہ ایسے بندے کو اپنا مزارع بنا کر رکھے جو اسی پنڈ کا اٹھ سال تک زمیں دار رہ چکا ہو۔ مزارعوں پر اپنا رعب جمانے کے لیے وہ سب سے پہلے اللہ وسایا کو بے دخل کرے گا۔ زمیں داری جو چلائی ہوئی۔"

"چوہدری! توں یہ کہنا چاہتا ہے' ہم یہ پنڈ چھوڑ دیں۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "پر میرے سکول کا کیا بنے گا؟"

"سکول کو تو اب بھول ہی جا۔" اللہ وسایا بولا۔ "کوئی بھی وڈا زمیں دار اپنی زمیں داری میں سکول شکول نہیں دیکھ سکتا۔ سرکار نے کتنے ہی زمیں داروں کے پنڈ میں سکول کھولنے چاہے پر انھوں نے نہ صرف زبردست مخالفت کی بلکہ تگڑی رشوت دے کر رکوا دیا۔"

"اللہ وسایا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے تائید کی۔ "میں تجھے ایک واردات کا حال سناتا ہوں۔ ملتان کی تحصیل میلسی میں دو وڈے زمیں داروں میں زبردست جھگڑا چل رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ان میں سے ایک میرا جاننے والا تھا۔ اس سے ڈپٹی کمشنر نے سکول کھولنے کے لیے چندا مانگا۔ چندا تو اس نے دگنا دے دیا پر ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی' سکول اس کے پنڈ کی بجائے' مخالف زمیں دار کے پنڈ میں کھول دیا جائے۔ ڈپٹی کمشنر نے اس کی شرط مان لی اور حکم جاری کر دیا۔ بعد میں سنا' زمیں دار گالاں نکالتا تھا۔ کہتا تھا' میرے ساتھ دھوکا کیا گیا۔"

"ہاں جی' ایسا ہی ہوتا ہے۔" اللہ وسایا نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔ "یہ پنڈ چھوڑنا ہی ہوگا۔ اب تو کچھ اور سوچنا ہوگا۔"

جمیلہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے سے افسردگی ٹپک رہی تھی۔

"اب اس پنڈ میں تم دونوں کا رہنا کسی طرح ٹھیک نہیں۔ کوئی اور ہی رستہ دیکھنا ہوگا۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔

اللہ وسایا بیزاری سے بولا۔ "کچھ سمجھ نہیں آتی۔ میں نے تو ملتان میں کیس ہارنے کے بعد ہی سوچنا شروع کر دیا تھا۔"

"چتا نہ کر' تو مزارع بننا نہیں چاہتا تو نہ بن۔" جمیلہ نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔

اللہ وسایا اس کی بات کاٹ کر گویا ہوا۔ "میں مزارع بننے کو تیار ہوں پر اس پنڈ میں نہیں۔ کسی اور زمیں داری میں مزارع بن کر رہ سکتا ہوں۔"

"یہ بات دل سے نکال دے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "اللہ وسایا! اب تو مزارع نہیں بن سکتا۔ کوئی زمیں دار تجھے مزارع بنائے گا بھی نہیں۔ تو اسے جتنا آسان سمجھتا ہے' ایسا ہے نہیں۔ اب تیں نوں کچھ اور سوچنا ہوگا۔"

"یہی میں کہہ رہی تھی۔ مگر اس نے مجھے یہ بات کہنے ہی نہیں دی۔"

"کہہ' کیا کہنا چاہتی ہے؟" اللہ وسایا بولا۔

"اگر اس پنڈ میں نہیں رہنا تو ایسا کرتے ہیں' لہور چلتے ہیں۔"

"وہاں جا کر کیا کریں گے؟" اللہ وسایا نے حیرت سے پوچھا۔

"میں وہاں کسی سکول میں پڑھانے پر لگ جاؤں گی۔ مجھے کسی نہ کسی سکول میں نوکری ضرور مل جائے گی۔"

"یہ کہنا چاہتی ہے تو نوکری کرے اور میں ہڈحرام بن کر تیری کمائی کھاؤں؟" اللہ وسایا نے منہ بگاڑا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ "چوہدری! اس کی گل سن رہا ہے؟"

"اتنا برا کیوں مناتا ہے۔" جمیلہ نے روٹھے ہوئے اللہ وسایا کو منانے کی کوشش کی۔ "میں نے اپنی طرف سے ایک اپائے بتایا تھا۔ تو اس کے لیے تیار نہیں تو کچھ اور وچار کرتے ہیں۔"

رحیم داد نے کہا۔ "ہاں' کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔"

اللہ وسایا کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری! تو ابھی نہ جا۔ چند روز بعد چلا جانا۔ ویسے اس پنڈ سے تو اب

جاتا ہی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ اللہ وسایا کھڑا ہوا تو جمیلہ بھی کھڑی ہو گئی۔ دونوں کمرے سے چلے گئے۔

رحیم داد نے کوٹلہ ہرکشن چھوڑنے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا۔ وہ اللہ وسایا اور جمیلہ کی دل آزاری نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی اسے جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ نکال کے کھولا۔ چوہدری نورالٰہی کے دستخط بغور دیکھے' سادہ کاغذ پر جعلی دستخط بنائے۔ دونوں کو برابر رکھا۔ ان پر تنقیدی نظر ڈالی۔ دستخط بالکل ہوبہو تھے۔ کسی نقطے' شوشے' یہاں تک کہ اعراب میں بھی سرمو فرق نہ تھا۔ رحیم داد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ مہینوں کی مسلسل مشق کا نتیجہ آج اس کے سامنے تھا۔ وہ دیر تک دستخط دیکھتا اور خوش ہوتا رہا۔

رحیم داد نے کاغذات الٹ پلٹ کے دیکھے۔ جو کاغذ اردو میں تھے' وہ اس نے پڑھ لیے۔ انگریزی میں لکھی ہوئی درخواستیں اور ان پر متعلقہ محکموں کے افسران کے احکام پڑھنے سے وہ قاصر تھا۔ ان کا مفہوم وہ مطلق نہ سمجھ سکا۔ ویسے بھی متروکہ جائیداد اور اس کے الاٹمنٹ کے بارے میں اس کی معلومات نہایت محدود تھی۔ تجربہ بھی نہیں تھا۔ وہ مہاجر نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے کبھی یہ باتیں جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ نورالٰہی نے مرنے سے پہلے اپنے کلیم کے متعلق جو کچھ بتایا تھا' وہی اس کی کل معلومات تھیں اور انھی کی بنیاد پر وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ کلیم منظور شدہ ہے اور اس کے عوض وہ زرعی اراضی اور املاک کا الاٹمنٹ حاصل کر سکتا ہے۔

کاغذات دیکھتے دیکھتے اس کے ذہن میں یکایک خیال آیا کہ جمیلہ کی زمیں اور حویلی مقدمہ ہارنے کے بعد متروکہ جائیداد قرار دی جا چکی ہے۔ چوہدری نورالٰہی کے کلیم کی بنیاد پر وہ یہی زمین الاٹ کرا سکتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ وسایا اور جمیلہ کو پریشانی اور اضطراب سے بچا سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کر کہیں جانے کا خطرہ مول نہیں لینا پڑے گا۔ کوٹلہ ہرکشن اس کے لیے محفوظ ٹھکانا تھا۔ یہاں وہ کئی ماہ سے مقیم تھا۔ اس ماحول سے وہ پوری طرح مانوس ہو چکا تھا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ اس پر مہربان تھے اور اس کے آرام کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ اس کی دل جوئی کرتے تھے۔ مہمان کے بجائے اسے اپنے ہی کنبے کا فرد تصور کرتے تھے۔

اسے اللہ وسایا اور جمیلہ کا احسان چکانے کا نہایت عمدہ موقع ملا تھا۔ اس میں اس کا اپنا فائدہ بھی تھا۔ وہ راتوں رات مہمان سے مالک و مختار بن جاتا' زمیں دار بن جاتا۔ وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ مگر اس کے ساتھ اندیشوں نے بھی سر ابھارا

اور ان کی نوعیت یہ تھی کہ پنجاب کے کسی دور دراز علاقے میں اگر وہ الاٹمنٹ حاصل کرتا تو خطرہ بہت کم تھا۔ سندھ میں بہت ہی کم تھا۔ ضلع منٹگمری میں خطرہ زیادہ اور بہت زیادہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس ضلعے میں اراضی اور املاک الاٹ کرانے کے لیے چوہدری نورالٰہی مرحوم طویل عرصے تک کوشش کرتا رہا تھا۔ دفتروں کے چکر کاٹتا رہا تھا۔ افسروں اور ماتحت عملے سے ملتا رہا تھا۔ ان میں اس کے جاننے والے بھی ہو سکتے تھے۔

کوٹلہ ہرکشن کی حویلی اور اراضی کے الاٹمنٹ کو جب اس نے اس پہلو سے دیکھا تو گھبرا گیا' خوف زدہ ہو گیا۔ جعلی دستخط سے حاصل کیا ہوا الاٹمنٹ اگر کسی وقت پکڑ لیا جاتا تو اس میں صرف جیل جانے کا خطرہ نہیں تھا بلکہ اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ہوتا۔ وہ چوہدری نورالٰہی کا قاتل تھا اور ایک بار جب راز افشا ہو جاتا تو سارے دوسرے راز پیاز کے چھلکوں کی طرح اترتے چلے جاتے۔ وہ حکیم چشتی کا قاتل تھا' سیف اللہ کا قاتل تھا اور جیل کا مفرور قیدی بھی تھا۔ رحیم داد لرز کر رہ گیا۔ اس نے کلیم کے کاغذات کپڑے میں لپیٹ کر گرہ لگائی اور حفاظت سے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔

شام کو اس نے اللہ وسایا اور جمیلہ کے ساتھ کھانا کھایا۔ دونوں شش و پنج میں مبتلا تھے اور آیندہ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکے تھے۔ ان کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے اور آنکھیں ویران ویران نظر آتی تھیں۔ نہ اللہ وسایا نے اس کے کلیم کے بارے میں تذکرہ کیا نہ ہی رحیم داد نے ایسی کوئی بات کی۔ وہ دوپہر ہی کو طے کر چکا تھا کہ نہ صرف کوٹلہ ہرکشن کی متروکہ املاک بلکہ ضلع منٹگمری میں کہیں بھی الاٹمنٹ حاصل کرنے کی مطلق کوشش نہیں کرے گا۔ وہ کوئی خطرہ مول لینے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

صبح جمیلہ مہمان خانے میں آئی۔ وہ اس وقت تنہا تھی۔ رحیم داد ناشتا کر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب ہی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے پوچھا۔ "توں نے اور اللہ وسایا نے آگے کے لیے کیا سوچا؟"

"میں تیرے پاس اسی بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔" جمیلہ نے جواب دیا۔

"کیا بات کرنی ہے؟ کیا توں نے کچھ سوچ لیا؟"

"ہاں! ایک ہی گل سمجھ آتی ہے۔ میں برابر اسی پر سوچ بچار کر رہی ہوں۔ اور تو کچھ مجھے نظر نہیں آتا۔"

"اللہ وسایا کو نہیں بتایا؟"

"اسے میں نے بتایا تو تھا۔ تیرے سامنے ہی تو بات کی تھی پر وہ کہاں راضی ہوا۔ ایک دم ناراض ہو گیا۔"

"وہی لہور جانے کی گل؟"

"ہاں۔" جمیلہ نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ "تو خود ہی سوچ ہم اور کہاں جا سکتے ہیں؟ لہور میں مجھے آسانی سے کسی سکول میں پڑھانے کی نوکری مل سکتی ہے۔"

"پر یہ بات تو وہ ہرگز نہیں مانے گا کہ تو کمائے اور وہ بیٹھ کر کھائے۔"

"بات اس پر کار نہیں ہے۔ جاتے ہی تو نوکری نہیں مل جائے گی۔ پر لہور وڈا شہر ہے۔ وہاں مجھے نوکری ملنے میں زیادہ مشکل نہیں پڑے گی۔ جب تک نوکری نہیں ملے گی' تب تک گزارے کے لیے اپنے پاس کچھ نہ کچھ تو ہے۔ زیور کس دن کے لیے ہیں۔ انھیں بیچ کر بھی کام چلایا جا سکتا ہے۔"

"اللہ وسایا تو اس روز صاف انکار کر چکا ہے۔"

"تو اسے سمجھائے گا تو وہ مان جائے گا۔ میں اسی لیے تیرے پاس آئی ہوں۔"

"کیا تو سمجھتی ہے کہ وہ میری بات مان لے گا؟"

"مجھے پورا وشواس ہے۔" جمیلہ نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ تیری بات نہیں ٹالے گا۔ کہہ کے تو دیکھ۔ اس میں برائی کیا ہے۔"

"تو کہتی ہے تو میں اسے ضرور کہوں گا۔ اسے راضی کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔" رحیم داد نے جمیلہ کو یقین دلایا۔

"چوہدری! تو بھی ہمارے ساتھ لہور چلنا۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

مگر رحیم داد رضامند نہیں ہوا۔ وہ لاہور جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ منٹگمری سے نزدیک ہونے کے باعث کوئی نہ کوئی ایسا جان پہچان کا وہاں کسی بھی وقت پہنچ سکتا تھا جو اسے شناخت کر لیتا۔ حالانکہ وہ اپنا حلیہ بڑی حد تک تبدیل کر چکا تھا۔ مگر کسی ایسے خطرے سے دوچار ہونے کے لیے تیار نہ تھا جو اسے پھانسی گھاٹ تک لے جاتا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ "نہیں' میں نے لہور نہیں جانا۔ میں اپنی گھروالی اور بچوں کو تلاش کرنے رحیم یار خاں جاؤں گا۔ وہاں بھی بہت مہاجر ہیں۔ کسی سے گھروالی اور بچوں کا اتا پتہ مل سکتا ہے۔ ویسے تو اور اللہ وسایا پہلے ہی پریشان ہیں۔ اب میں تم دونوں کے لیے اور بوجھ بننا نہیں چاہتا۔" رحیم داد لمحے بھر خاموش رہا۔

"میری فکر نہ کر۔ اپنے اور اللہ وسایا کے بارے میں سوچ۔"

"وہ تو میں دن رات سوچتی رہتی ہوں۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ گردن جھکائے کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے پوچھا۔ "چوہدری! تجھے ہم دونوں کے چھوٹنے کا کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ میری بات کا وشواس کر' مجھے تو بہت دکھ ہوگا۔ سدا یاد آئے گا۔"

جمیلہ کے انداز میں لگاوٹ تھی' دبی دبی چاہت تھی۔ رحیم داد نے یہی محسوس کیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کو دیکھا۔ وہی ستاروں کی مانند روشن آنکھیں' وہی پھول سا شگفتہ چہرہ' وہی دلکشی' وہی رعنائی' جسے دیکھ کر اس پر خود فراموشی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ اس کے اس قدر قریب بیٹھی تھی کہ رحیم داد اس کے خوب صورت بدن کی مہک سونگھ سکتا تھا۔ وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے اب تک سوچا ہی نہیں تھا کہ جمیلہ سے دور ہونے کے بعد اس پر کیا بیتے گی۔ نہیں' وہ اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ اس پر گویا وارفتگی طاری ہو گئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"تو یہ پنڈ چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ میرے کلیم سے حویلی اور زمین کا الاٹمنٹ ہو سکتا ہے۔"

"تیرا کلیم ہے؟" جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "ضرور ہوگا۔ تو مہاجر ہے نا۔ تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

عین اسی وقت اللہ وسایا کمرے میں داخل ہوا۔ جمیلہ نے اسے دیکھا تو مسکرا کر بولی۔ "اللہ وسایا! تجھے پتہ ہے' اپنے چوہدری کا کلیم موجود ہے۔ اس نے مجھے ابھی بتایا ہے۔"

"بتایا تو اس نے مجھے بھی تھا۔" اللہ وسایا نے کہا۔ "پر ایسی پریشانی رہی کہ یاد ہی نہیں آیا۔ یہ تو کہتا تھا' بہت وڈا کلیم ہے۔"

"وڈا کلیم ہے تو حویلی اور ساری اراضی کا الاٹمنٹ ہو سکتا ہے۔" جمیلہ نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "اب تو سب کچھ متروکہ جائیداد ڈیکلیئر کر دیا گیا ہے۔"

جمیلہ اور اللہ وسایا کے چہروں پر سرخی دوڑ گئی۔ انھیں مسرور دیکھ کر رحیم داد بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ گیا۔ نہ اسے اندیشے یاد آئے' نہ خطرات نے لرزہ براندام کیا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے بستہ نکالا اور اللہ وسایا کو دے کر بولا۔

"یہ رہے! میرے کلیم کے کاغذات۔"

اللہ وسایا نے بستہ جمیلہ کی طرف بڑھا دیا۔ "جمی لے! لے چوہدری کے کلیم کے کاغذات تو دیکھ۔ تو انگریزی بھی پڑھ سکتی ہے۔ سب کچھ سمجھ لے گی۔"

جمیلہ نے بستہ کھولا۔ کاغذات نکالے اور الٹ پلٹ کر پوری توجہ سے پڑھنے لگی۔ ذرا دیر بعد اس نے حیرت زدہ ہو کر اونچی آواز سے کہا۔ "اللہ وسایا! اپنے چوہدری کا تو بہت وڈا کلیم ہے۔ منظور شدہ بھی ہے۔ اس میں زرعی اراضی اور املاک سبھی شامل ہے۔"

"تب تو زمین کے ساتھ حویلی کی الاٹمنٹ بھی ہو سکتی ہے۔"

"بالکل ہو سکتی ہے۔" جمیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "چوہدری نے تو پہلے ہی یہ گل کی تھی۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "چوہدری زمیں دار بن جائے گا' تب تو مزارع بن کر بھی تو اس پنڈ میں رہ سکتا ہے۔ میرا سکول بھی رہے گا۔ نہ کہیں جانا پڑے گا نہ اس بارے میں سوچ سوچ کے بھیجا خراب کرنا پڑے گا۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا اور مسکرائی۔ "چوہدری! تو اللہ وسایا کو اپنا مزارع بنا لے گا نا؟"

"ایسی باتیں نہ کر۔" رحیم داد نے ناراض ہونے کے انداز میں کہا۔ "تو مجھے اتنا کمینہ اور نیچ سمجھتی ہے کہ میں اللہ وسایا کو اپنا مزارع بنا کر رکھوں گا؟ اللہ وسایا زمیں دار تھا' الاٹمنٹ کے بعد بھی زمیں دار ہی رہے گا۔ تو آگے ایسی بات نہ کہنا۔ مجھے بہت دکھ ہو گا۔"

اللہ وسایا بولا۔ "یہ باتیں چھوڑ۔ سب سے پہلے تو وکیل کو کلیم کے کاغذات دکھانے ہوں گے۔ وہی بتا سکتا ہے آگے کیا کرنا ہے۔"

"وکیل کو آج ہی بلوا لے۔" جمیلہ نے اللہ وسایا سے کہا۔

"میں خود اس کے پاس چلا جاؤں گا۔ اب دیر بالکل نہیں ہونی چاہئے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "پہلی لاری سے شہر چلا جاؤں گا۔"

اللہ وسایا اور جمیلہ کے مرجھائے ہوئے چہرے روشن ہو گئے۔ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ رحیم داد انھیں دور تک دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ایک بار پھر طرح طرح کے اندیشوں نے اس پر یلغار کی۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ سامنے میز پر رکھا تھا۔ وہ اسے خوف زدہ نظروں سے گھور رہا تھا۔

۱۹

دن ڈھل رہا تھا۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ فضا دھندلی دھندلی تھی۔ شدید گرمی تھی۔ حبس تھا۔ رحیم داد خوف زدہ اور پریشان تھا۔ اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ اب وہ کمرے میں خاموش بیٹھا سورج غروب ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ اللہ وسایا رات گئے لوٹے گا۔ رحیم داد اس کی واپسی سے پہلے ہی کوٹلہ ہرکشن چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اس نے جذبات کی رو میں بہہ کر چوہدری نور الٰہی مرحوم کے کلیم کی بنیاد پر حویلی اور زمین الاٹ کرانے کا وعدہ تو کر لیا تھا مگر اب پچھتا رہا تھا۔ اسے طرح طرح کے اندیشے ستا رہے تھے۔ جیل اور پھانسی کا پھندا رہ رہ کر ڈرا رہا تھا۔

اللہ وسایا اور جمیلہ کے رخصت ہوتے ہی وہ اس ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ضلع منٹگمری میں جہاں ہر طرف مشرقی پنجاب کے مہاجرین بکھرے ہوئے تھے' الاٹمنٹ حاصل کرنے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ وہ اپنے پچھلے منصوبے کے مطابق کسی ایسے علاقے کی جانب نکل جانا چاہتا تھا جہاں اس کے جعلی کلیم کے پکڑے جانے کا امکان بہت کم ہو اور کسی جان پہچان والے کے ملنے کا بھی خوف نہ ہو۔ وہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی کلیم کے کاغذات کا بستہ سنبھال کر خاموشی سے نکل جانے کا تہیہ کر چکا تھا۔

وہ اسی ادھیڑبن میں الجھا ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ جمیلہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہمراہ اللہ وسایا نہیں تھا' وکیل تھا۔ وہ دہرے بدن کا سنجیدہ اور بردبار شخص تھا۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ سر کے بال اڑے ہوئے تھے۔ اس کا نام محمد عثمان رندھاوا تھا۔ جمیلہ نے رحیم داد کا اس سے تعارف کرایا۔

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ مگر اسے نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا اور اللہ وسایا کے بارے میں پوچھا۔ "زمیں دار نہیں آیا۔ وہ تو تمہارے ہی پاس گیا تھا وکیل صاحب؟"

"جمیلہ نے بھی مجھے یہی بتایا تھا۔" وکیل نے جواب دیا۔ "میں منچن آباد گیا تھا۔ واپسی پر سوچا' اللہ وسایا سے ملتا چلوں۔ وہ میرے دفتر منٹگمری پہنچ گیا ہو گا۔ اسے وہاں پتہ چل گیا ہو گا' واپس آتا ہو گا۔"

"جب سے کیس کا فیصلہ ہمارے خلاف ہوا ہے' وہ بہت پریشان ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "پریشان تو میں بھی ہوں' پر وہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ سمجھ نہیں آتی 'کیا کیا جائے؟ پنڈ چھوڑ کر کہاں جائیں؟ اب تو یہاں زیادہ ٹھہر بھی نہیں سکتے۔"

"پریشانی کی تو ویسے بات ہی ہے' پر ابھی پنڈ چھوڑنے کی ایسی جلدی کیا ہے۔" وکیل نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"تمیں نوں پتہ ہی ہے۔ دس دن میں حویلی خالی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" وکیل بدستور مطمئن نظر آتا تھا۔ "ابھی کمشنر بحالیات سے اپیل کرنے کی گنجائش ہے۔ اس کے بعد اور اوپر جا سکتے ہیں۔ زمیندارنی' تو فکر نہ کر۔"

"کیسے فکر نہ کروں۔" جمیلہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کسٹوڈین والے تاک میں ہیں۔ دس روز گزرتے ہی حویلی اور زمین خالی کرانے سرکاری کرندے پولیس کے ساتھ پہنچ جائیں گے۔ متروکہ جائیداد ڈیکلیئر ہونے کے بعد پہلے سب کچھ کسٹوڈین ہی کی تحویل میں جاتا ہے ناں۔"

"کسٹوڈین کے پاس جانے سے پہلے میں ہائی کورٹ سے حکم امتناعی حاصل کر لوں گا۔" وکیل نے جمیلہ کو آگاہ کیا۔ "میں کل ہی لہور پہنچ کر حکم امتناعی کے لیے درخواست لگا دوں گا۔ درخواست میں نے تیار کر لی ہے۔ اس پر تجھ سے دستخط کرانے ہیں۔"

"کدھر ہے درخواست؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"یہ رہی۔" وکیل نے اپنا بریف کیس کھولا۔ اندر سے ایک فائل نکالی۔ "یہ تیرے کیس کی فائل ہے۔" وکیل نے فائل کے کاغذات الٹ پلٹ کر ایک ٹائپ شدہ درخواست نکال کر جمیلہ کو دی۔ "میں اسے اپنے ساتھ لے کر چلا تھا۔ میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا' آگے کیا کرنا ہے۔"

جمیلہ نے درخواست توجہ سے پڑھی' اس پر دستخط بھی کر دیئے۔ مگر اس کے خدشات کم نہ ہوئے۔ "مان لیا' حکم امتناع مل گیا' پر آگے کیا ہو گا؟ ویسے یہ بھی تو ہو سکتا ہے درخواست منظور نہ ہو اور حکم امتناعی نہ ملے۔"

"اتنا تو مجھے بھروسا ہے کہ حکم امتناعی مل جائے گا۔ تو فکر نہ کر۔" وکیل نے جمیلہ کو اطمینان دلایا۔

جمیلہ تو خاموش رہی مگر رحیم داد نے دریافت کیا۔ "پر اس سے حویلی اور زمین واپس تو نہیں مل جائے گی۔"

"چوہدری! اصل میں تو یہ کیس وراثت کا ہے۔" وکیل محمد عثمان رندھاوا نے مقدمے کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رحیم داد کو سمجھایا۔ "اس کا فیصلہ محکمہ بحالیات سے نہیں' عدالت دیوانی سے ہوتا ہے پر یہ ہے پیچیدہ کیس۔ ہندو ہونے کے ناتے اس پر جمیلہ کا حق نہیں بنتا۔ یہ جائیداد کے مالک لالہ کرشن دیال کی بیٹی جو ہوئی۔ ہندوؤں میں بیٹی کا جائیداد پر حق نہیں بنتا۔ اس کے مسلمان ہو جانے کے بعد کیس کی نوعیت بدل گئی۔ مسلم قانون میں بیٹی کا حق بنتا ہے۔ اب پیچیدگی یہ پیدا ہو گئی کہ جائیداد تو ہوئی ہندو کی اور بیٹی مسلمان ہے۔ اس کا فیصلہ آسان نہیں۔ بڑی قانونی پیچیدگیاں ہیں۔"

"رندھاوا جی! بحالیات والوں نے تو اس کا فیصلہ کر ہی دیا۔" جمیلہ نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "آگے کیس لے بھی گئے تب بھی کیا اس فیصلے کا اثر نہیں پڑے گا؟"

"پڑ تو سکتا ہے۔ پر یہ کوئی نظیر نہیں بنتی۔" وکیل نے جمیلہ کا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔ "زمیں دارنی! تو فکر نہ کر۔ میں ہائی کورٹ بلکہ فیڈرل کورٹ تک کیس لے جاؤں گا۔ صرف یہ زمین اور حویلی نہیں بلکہ وہ زمین بھی دلواؤں گا جو احسان شاہ نے دبا رکھی ہے۔"

"وہ تو بعد کی گل ہے۔ یہ بتا' اب کیا ہو گا؟"

"ویسے کیس تو تیرا اب تک مضبوط ہے۔ اسے لڑنے کی بہت گنجائش ہے۔" وکیل نے جمیلہ کو سمجھایا۔ "تیرے حق میں سب سے اہم بات یہ جاتی ہے کہ حویلی اور زمین پر تیرا قبضہ ہے۔ متروکہ جائیداد کے معاملے میں قبضے کی زبردست اہمیت ہے۔"

رحیم داد کی پریشانی رفتہ رفتہ زائل ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اپنے سر پر منڈلاتا ہوا خطرہ ٹلتا نظر آ رہا تھا۔ بات عدالت اور مقدمے بازی کی ہو رہی تھی۔ جس میں نہ وہ کسی طور فریق تھا' نہ اس کے لیے کوئی کردار ادا کرنے کی گنجائش تھی۔ مگر خطرہ ٹل کر بھی ٹلا نہیں۔

جمیلہ نے وکیل سے کہا۔ "میں تو کہتی ہوں مقدمے بازی کے بکھیڑے میں پڑا ہی کیوں جائے۔ میں نے تو ایک اور اپائے سوچا ہے۔ اسی کے بارے میں بات کرنے اور تجھے یہاں لانے کے لیے اللہ وسایا تیرے پاس گیا تھا۔"

"وہ کیا اپائے ہے؟ تو نے اور اللہ وسایا نے مسئلے کا کیا حل سوچا ہے؟" وکیل نے کسی قدر حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

"اپنے چوہدری کے پاس منظور شدہ کلیم موجود ہے۔" اس نے رحیم داد کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ضلع گورداس پور کا مہاجر ہے۔ اس کے کلیم سے حویلی اور زمین کی الاٹمنٹ لی جاسکتی ہے۔ چوہدری پرایا بندہ بھی نہیں۔ بہت سے چکروں میں پڑنے سے یہ کہیں سیدھا سا راستہ ہے کہ الاٹمنٹ ہی کرالی جائے۔ اب تو یہ متروکہ جائیداد بنا ہی دی گئی۔"

"اگر ایسا ہے تو کیس پر اس پہلو سے بھی غور کیا جاسکتا ہے۔"

جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! اپنے کلیم کے کاغذات رندھاوا جی کو تو دکھا۔"

رحیم داد سناٹے میں آگیا۔ پریشانی اور گھبراہٹ نے اچانک اس کے ذہن پر شب خوں مارا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ بددلی سے ہاتھ بڑھایا۔ تکیے کے نیچے سے بستہ نکالا اور کلیم کے کاغذات وکیل کی طرف بڑھا دیے۔

وکیل نے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے۔ کچھ دیر ان کا مطالعہ کرتا رہا۔ کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ جمیلہ بھی کچھ نہ بولی۔ کاغذات سرسری طور پر دیکھنے کے بعد وکیل نے کہا۔

"کلیم تو پکا ہے۔ منظور شدہ ہے اور بڑا بھی ہے۔"

اس سے کام بن سکتا ہے ناں؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں بن سکتا۔" وکیل مسکرا کر بولا۔ "میں یہ کاغذات اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ دفتر میں اطمینان سے انھیں پڑھوں گا۔ اس کے بعد اگلی کارروائی کی جائے گی۔ فی الحال یہی ہو سکتا ہے۔ میں اس بارے میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"ویسے کلیم تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟" رحیم داد کے دل کا چور بول پڑا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے بھی اسے پڑھا تھا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "منظور شدہ پکا کلیم ہے۔ کیوں رندھاوا جی! میں نے غلط بات تو نہیں کہی؟"

"تو نے ٹھیک ہی کہا۔ بالکل یہی بات ہے۔" وکیل مسکرا کر بولا۔ "لیکن سب سے پہلے مجھے ہائی کورٹ سے حکم امتناعی حاصل کرنا ہوگا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ایک بار جائیداد قبضے سے نکل جائے اور کسٹوڈین کی تحویل میں چلی جائے تو اسے دوبارہ حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جتنے کلیم منظور ہوئے ہیں، متروکہ جائیداد اس سے بہت کم ہے۔ تبھی تو یہ صورت ہے کہ متروکہ

جائیداد کا پتہ چلتے ہی کلیم ہولڈر ایسے جھپٹتے ہیں جیسے چیل گوشت پر گرتی ہے۔ سفارش، رشتے داری، رشوت، سبھی ہتھ کنڈے الاٹمنٹ کے لیے چلائے جاتے ہیں۔" اس نے جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "میں تجھے کیا بتاؤں، متروکہ جائیداد کی کیسی لوٹ مار مچی ہے۔ جسے کچھ نہیں ملا، وہ تو بھاگ دوڑ کرتا ہی ہے۔ مگر جسے مل چکا ہے، وہ اور زیادہ لینے کے چکر میں رہتا ہے۔"

"تب تو جی سب سے پہلے حکم امتناعی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" جمیلہ نے پریشانی کا اظہار کیا۔ "کلیم ہولڈروں کو پتہ چل گیا تو وہ ابھی سے الاٹمنٹ کی درخواستیں لگانی شروع کردیں گے۔"

"پتہ چلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔" وکیل ہنس کر گویا ہوا۔ "محکمہ بحالیات والوں نے تو اب تک کتنے ہی کلیم ہولڈروں کو بتا بھی دیا ہوگا۔ ایسی بات چھپی کہاں رہتی ہے؟" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "اب میں چلتا ہوں۔" اس نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "چوہدری! جلد ہی ملاقات ہوگی۔ میں کلیم کے کاغذات اطمینان سے دیکھوں گا۔ ابھی تو مجھے حکم امتناعی لینے کی تیاری کرنی ہے۔"

وکیل نے جمیلہ کے مقدمے کی فائل کے ساتھ کلیم کے کاغذات بھی اپنے بریف کیس میں رکھ لیے۔ رحیم داد پریشان تو ہوا مگر خاموش رہا۔ کہہ بھی کیا سکتا تھا؟ کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ وکیل دروازے کی جانب بڑھا۔ جمیلہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ رحیم داد حیران و پریشان بیٹھا رہا۔ دونوں کے جانے کے بعد اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ کلیم کے کاغذات اب وکیل کی تحویل میں تھے۔ وہ پوری طرح پھنس چکا تھا۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ اس نے کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کر کہیں اور جانے کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ خاک میں مل چکا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ نہ وہ کسی کو اپنی پریشانی بتا سکتا تھا نہ کوئی مشورہ کرسکتا تھا۔ اس کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

رات کو اللہ وسایا واپس آگیا۔ مگر رحیم داد سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔

رحیم داد کے دن رات الجھن اور طرح طرح کے وسوسوں میں کٹ رہے تھے۔ وہ ہر وقت گم صم رہتا۔

☆

موسم بدل رہا تھا۔ لو کے جھلسا دینے والے گرم گرم جھکڑ چلنا بند ہوگئے تھے۔ پچھلی رات ہلکی ہلکی بارش بھی ہوئی تھی۔ دن میں بھی ابر چھایا رہا۔ ہوا کے نرم اور خنک جھونکوں میں تازگی اور فرحت تھی۔ زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ درختوں کے پتے رات کی بارش سے

ڈھل کر نکھر گئے تھے۔ جدھر نظر اٹھ جاتی' ہریالی نظر آتی۔

یہ ایک خوش گوار سہ پہر تھی۔ رحیم داد کچھ ہی دیر پہلے سو کر اٹھا تھا۔ وہ نہانے کے لیے غسل خانے جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اللہ وسایا نے اسے باغ میں بلوایا۔

رحیم داد باغ میں پہنچا۔ اس نے اللہ وسایا اور جمیلہ کے ساتھ وکیل کو دیکھا۔ اس پر گھبراہٹ کا دورہ پڑا مگر وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا قریب پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اللہ وسایا مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! تجھے خوش خبری سنانے کے لیے بلایا ہے۔"

"حکم امتناعی مل گیا ہے۔" جمیلہ نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مطلع کیا۔ اس کے چہرے پر خوشی' سرخی بن کر بکھری ہوئی تھی۔ اس نے وکیل کی جانب دیکھا۔ "وکیل صاحب یہی بتانے آئے ہیں۔"

"یہ تو بہت چنگا کام ہوا۔" رحیم داد نے سکون کی سانس لی۔

اللہ وسایا گویا ہوا۔ "ہاں جی یہ بہت زبردست کام ہوا۔ اب حویلی خالی کرنے اور پنڈ چھوڑنے کی ایسی جلدی نہیں رہی۔"

رحیم داد نے موقعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کلیم کے چکر سے اپنی جان چھڑانے کے لیے وکیل کو مشورہ دیا۔ "اب تو جی آگے یہی ہونا چاہیے کہ زمیں دارنی کی طرف سے مقدمہ کروا دیا جائے۔ جیسا اس روز بتایا تھا' وہی ٹھیک لگتا ہے۔"

"میں نے بعد میں اس پر سوچا تھا پر کیس بہت کمزور ہے۔" اس نے اللہ وسایا کی جانب دیکھا۔ "زمیں دار! ویسے تیری مرضی ہو تو میں کیس کی تیاری کروں؟"

"جب کیس ہی مضبوط نہیں تو اس چکر میں کیوں پڑا جائے۔" جمیلہ بولی۔ "چوہدری کے کلیم کے کاغذات تو دیکھ ہی لیے ہوں گے۔ الاٹمنٹ کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ اس بارے میں کیا سوچا؟"

"کلیم تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے سارے کاغذات اچھی طرح دیکھ لیے ہیں۔" وکیل نے آگاہ کیا۔ "اس کی بنیاد پر الاٹمنٹ حاصل کرنے میں مشکل بھی نہیں پڑے گی۔"

"میں نے سنا ہے کانون تو یہ ہے کہ حویلی کے علاوہ اڑھائی سو ایکڑ سے زیادہ زمین کی الاٹمنٹ نہیں مل سکتی۔" جمیلہ نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "اس طرح تو صرف دس مربعے کی الاٹمنٹ ملے گی۔ میرے تو ۲۲ مربعے ہیں۔ ۱۲ مربعے کا کیا بنے گا؟"

"زمیں دارنی! تو نے ٹھیک ہی سنا ہے۔" وکیل نے اس کی تائید کی۔ "چوہدری کو ایک جگہ

اڑھائی سو ایکڑ ہی کی الاٹمنٹ ہو سکتی ہے۔ ویسے کلیم تو بہت بڑا ہے۔ دوسرے کسی بھی علاقے میں مزید الاٹمنٹ لی جا سکتی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہو گا۔" اللہ وسایا پریشان ہو کر بولا۔

"زمیں دار! ایسا کر بارہ مربعے کا کلیم کسی کلیم ہولڈر سے خرید لے اور اپنی وہ زمین الاٹ کرا لے جو چوہدری کے الاٹمنٹ کی بعد رہ جائے۔" وکیل نے تجویز پیش کی۔ "میرا ایک مہاجر موکل ہے۔ اس کے پاس پکا کلیم ہے۔ بیچنا بھی چاہتا ہے۔ ضرورت مند بھی ہے' سستے داموں میں دے دے گا۔ تو تیار ہو تو میں اس سے بات کروں۔"

"اپنے پاس تو سمجھو' کچھ بھی نہیں۔" اللہ وسایا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سوچ لے۔ ابھی تو تیرا قبضہ ہے۔ آسانی سے الاٹمنٹ مل سکتی ہے۔" وکیل نے کہا۔ "ورنہ حال یہ ہے کہ ہزاروں مہاجر کلیم کے کاغذات دبائے پھر رہے ہیں۔ الاٹمنٹ ہی نہیں ملتی۔ تبھی تو سستے داموں کلیم مل رہا ہے۔ اب یہی دیکھ' چوہدری کا اتنا بڑا کلیم ہے پر اب تک کہیں الاٹمنٹ نہیں ملی۔"

"ہاں جی' کلیم اتنا مشکل نہیں' جتنا الاٹمنٹ لینا۔" رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ "دفتروں کے چکر کاٹتے کاٹتے ہی جوتے ٹوٹ گئے۔ منت سماجت اور رشوت الگ' پر کام کہیں نہیں بنا۔ کلر زمین تک نہ ملی۔ تبھی تو میں نے مقدمہ کرنے کی بات کی تھی۔"

"پر اب آسانی سے تیرے کلیم پر الاٹمنٹ مل جائے گی۔ قبضہ جو اپنے پاس ہے۔" وکیل نے وضاحت کی۔ وہ اللہ وسایا کی طرف متوجہ ہوا۔ "زمیں دار! تو نے اپنے بارہ مربعوں کے لیے کلیم خریدنے کے بارے میں کیا سوچا؟"

اللہ وسایا نے وکیل کی بات کا جواب نہیں دیا' جمیلہ سے مخاطب ہوا۔ "تو نے کچھ جمع جوڑ کر رکھا ہی نہیں۔ کچھ ہوتا تو آج کام آتا۔"

جمیلہ نے سر اٹھا کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ "چنتا نہ کر۔ میرے پاس سکول اور ڈسپنسری بنانے کا فنڈ ہے۔ اسے میں الگ رکھتی تھی۔" وہ زیر لب مسکرائی۔ "پر یہ روپیہ ایک شرط پر دوں گی۔ ادھار رہے گا' تیں نوں لوٹانا ہو گا۔"

"منظور ہے' تیری یہ شرط بالکل منظور ہے۔" اللہ وسایا خوش ہو کر بولا۔ "میں تیرے ادھار کا ایک ایک پیسہ ادا کر دوں گا۔"

"یہ دونوں گواہ موجود ہیں۔ تو ان کے سامنے وعدہ کر رہا ہے۔" جمیلہ نے ہنس کر وکیل محمد عثمان

رندھاوا اور رحیم داد کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "بعد میں پلٹ نہ جانا۔"

وکیل نے جمیلہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تو گویا یہ طے ہو گیا کہ حویلی اور زمین کی الاٹمنٹ ہی کرانی ہے۔ اب اس کام میں کوئی تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے لیے جلد سے جلد کام شروع کرنا ہوگا۔"

"جب تیرے پاس روپیہ موجود ہے تو اپنے پورے ۲۲ مربعے کا کلیم کیوں نہیں خرید لیتی؟" رحیم داد نے ایک بار پھر اپنا دامن بچانے کی کوشش کی۔

"نہیں چوہدری' اتنا روپیہ میرے پاس نہیں ہے۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "زیور بیچ کر بھی مشکل سے ۱۲ مربعے کا بندوبست ہو سکے گا۔"

وکیل نے مسکرا کر کہا۔ "زمیں دارنی! تجھے اللہ وسایا کو ادھار نہیں دینا پڑے گا۔ کلیم تو تیرے ہی نام سے خریدا جائے گا۔ قبضہ تو تیرے ہی نام سے ہے۔ تجھے آسانی سے الاٹمنٹ مل جائے گی۔ اللہ وسایا کے نام سے کلیم خرید کر الاٹمنٹ لینے میں کوئی رخنہ پڑ سکتا ہے۔"

"میرے نام سے ہو یا اللہ وسایا کے نام سے۔ بات تو ایک ہی ہے۔" جمیلہ ہنس کر بولی۔ "میں اور اللہ وسایا الگ تھوڑا ہی ہیں۔ زمیں دار تو اسی کو رہنا ہے' میں نے زمیں داری سے کیا لینا۔"

"لو جی' اس کی سنو۔" اللہ وسایا بھی ہنسنے لگا۔ "میں کب زمیں دار رہا۔ ساری زمیں داری تو یہی چلاتی رہی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"تو بھی ٹھیک کہہ رہا ہے اور یہ بھی۔" وکیل سنجیدہ ہو گیا۔ "اب کام کی بات ہونی چاہیے۔ میں اپنے ایک موکل زمیں دار کی کار میں آیا ہوں' ادھر حویلی کے اگواڑے کھڑی ہے۔ اللہ وسایا! تو ابھی میرے ساتھ چل۔ رات میرے ساتھ ٹھہرنا۔ سویرے کلیم کا سودا ہو جائے گا۔ سودا طے ہوتے ہی فٹافٹ الاٹمنٹ کے لیے کام شروع کر دیں گے۔" وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوا۔ "تجھے بھی ساتھ ہی چلنا ہوگا۔ الاٹمنٹ کے لیے تجھے بھی موجود رہنا ہوگا۔"

"مجھے لے جا کر کیا کرنا ہے۔ اللہ وسایا تو موجود ہی ہوگا۔" رحیم داد نے پیچھا چھڑانا چاہا۔ وہ شہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے کسی ان جانے خطرے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"چوہدری! تجھے تو چلنا ہی پڑے گا۔ ایسے کس طرح کام چلے گا۔" وکیل نے اصرار کیا۔

"بات یہ ہے جی' وکیل صاحب! میں نے کلیم شلیم سے کچھ نہیں لینا۔" اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "گھر والی اور بچے ہوتے تو اس طرف دھیان دیتا۔ انھیں ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ لگ بھگ اٹھ سال ہو گئے۔"

"اللہ وسایا نے مجھے تیرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ مجھے پتہ ہے' تو بہت مصیبت زدہ ہے۔ پر درخواستوں پر دستخط کرنے اور افسروں کے سامنے پیشی کے لیے تیری ضرورت تو پڑے گی۔"

"صاف گل ایہہ ہے جی' میں پہلے بھی الاٹمنٹ شلاٹمنٹ کے چکر میں نہیں پڑا۔ تبھی تو مجھے اب تک کہیں الاٹمنٹ نہیں ملی۔ تسیں کاغذات دیکھ ہی چکے ہو۔" وہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "میں تو جی اللہ وسایا کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا مجھ پر بہت احسان ہے۔ اس نے مجھے اپنے پاس ٹھیرایا۔ ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ ایسا پیار دیا کہ میرا غم ہلکا ہو گیا۔ لگتا ہے' میں اپنے سگوں کے ساتھ ہوں۔" اس نے وکیل کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ "مجھ سے تو جی' جس کاغذ پر اور جس درخواست پر چاہو' دستخط کرا لو۔ آگے جو کچھ کرنا ہے' اللہ وسایا ہی کو کرنا ہے۔ پہلے بھی یہ زمیں داری چلاتا رہا ہے۔ آگے بھی یہی چلائے گا۔ مجھے زمیں داری شمینداری سے کچھ نہیں لینا۔ سچ پوچھو تو مجھے زندگی ہی سے کچھ دلچسپی نہیں۔" رحیم داد نے کچھ ایسے درد بھرے لہجے میں بات کی کہ فضا سوگوار ہو گئی۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔

وکیل سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "چوہدری! اگر تو پیش ہونا نہیں چاہتا تو ایسی صورت میں تجھے اللہ وسایا کو مختار نامہ دینا ہوگا۔"

"بالکل دے دوں گا جی!" رحیم داد نے مستعدی سے کہا۔ "مجھے اللہ وسایا پر پورا بھروسا ہے۔"

"اچھا جی! یہ مسئلہ بھی طے ہو گیا۔" وکیل نے اطمینان کا اظہار کیا۔ "میں کل مختار نامہ تیار کروا لوں گا۔" وہ مسکرایا۔ "ایک نہیں' دو تیار کرنے ہوں گے۔ ایک چوہدری کی طرف سے اور دوسرا زمیں دارنی کی طرف سے۔" اس نے جمیلہ کو مخاطب کیا۔ "تو بھی دفتروں کے چکر کاٹنے اور پیشیوں سے بچ جائے گی۔"

"بالکل ٹھیک ہے جی!" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "ایک مختار نامہ تو اسے نکاح کے سمے پہلے ہی دے چکی ہوں۔ دوسرا بھی دے دوں گی۔ میں کہاں افسروں کے سامنے پیش ہوتی پھروں گی۔ میرے دونوں بچے چھوٹے ہیں۔ انھیں یہاں چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ ان کی دیکھ بھال کروں گی۔ اللہ وسایا سب کام کر لے گا۔ پہلے بھی کرتا رہا ہے۔ مقدمے بازی کر کے اب تو تجربہ کار بھی بن گیا ہے۔"

"ایسا ویسا تجربہ کار بن گیا۔" وکیل بھی ہنسنے لگا۔ "اب تو یہ مجھے بھی قانونی نکتے سمجھانے لگا ہے۔"

"ایسی گل نہ کریں جی۔" اللہ وسایا نے مسکرا کر وکیل کی جانب دیکھا۔ "اب آگے کی

سوچیں۔" اس نے تجویز پیش کی "ایسا کریں‘ آج یہیں ٹھہر جائیں۔ سویرے سویرے نکل کھڑے ہوں گے۔ جمیلہ اور چوہدری کو بھی ساتھ لے لیں گے۔ یہ مختار ناموں پر دستخط کردیں گے۔ کسی اور درخواست پر دستخط کرانے ہوں تو اس پر بھی کردیں گے۔ میں تیرے ساتھ الاٹمنٹ کے لیے ٹھہر جاؤں گا۔ یہ دونوں واپس آجائیں گے۔"

مگر رحیم داد رضا مند نہ ہوا۔ وہ ان کے ہم راہ جانے سے کترا رہا تھا۔ اس نے فوراً عذر پیش کیا۔ "مجھے نہ لے جا۔ میری طبیعت آج کچھ گڑبڑ ہے۔ مختار نامہ بھجوا دینا۔ میں دستخط کردوں گا۔"

"تو چلا جائے گا تو کام جلدی نمٹ جائے گا۔ ممکن ہے دستخط کی توثیق کے لیے تجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت پڑے۔ ویسے اس کا امکان کم ہی ہے۔ پھر بھی تیرا موجود ہونا مناسب رہے گا۔"

وکیل نے صورت حال کی وضاحت کی۔ "سویرے تک تیری طبیعت بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔ پروا نہ کر‘ طبیعت بگڑی تو شہر میں بہت ہوشیار ڈاکٹر موجود ہیں۔ یہاں سے بہتر ہی علاج معالجہ ہوجائے گا۔"

اللہ وسایا نے کہا۔ "تو یہ طے ہوگیا کہ چاروں صبح چلیں گے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ وکیل نے تائید کی۔ "ہاں جی‘ یہی ٹھیک رہے گا۔ میں رات یہیں گزار لوں گا۔"

سورج غروب ہوچکا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کے باعث روشنی پہلے ہی کم تھی۔ شام جلد ہی ہوگئی۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ نوکروں نے لیمپ روشن کیا اور ایک اسٹول پر رکھ دیا۔ جمیلہ نے کھانا لگانے کی ہدایت کی۔ گھاس پر دری بچھائی گئی۔ لمبی میز لاکر رکھی گئی اور اس پر کھانا چن دیا گیا۔

سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ لیکن گھوم پھر کر ایک بار پھر کلیم اور الاٹمنٹ کا موضوع چھڑ گیا۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ رحیم داد نے بات چیت میں کم ہی حصہ لیا۔ مگر اسے بہت سی ایسی باتوں کا علم ہوگیا جن سے وہ اب تک بے خبر تھا۔

رات کا ایک پہر گزرا تو سب اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اللہ وسایا اور جمیلہ نے حویلی کا رخ کیا۔ رحیم داد اور وکیل محمد عثمان رندھاوا مہمان خانے میں پہنچے۔ آنگن میں پہلے سے دو پلنگ بچھے تھے۔ ان پر اجلے اجلے بستر لگے تھے۔ دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ اپنے اپنے بستروں پر لیٹے

اور سوگئے۔

☆

سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی احمد نے رحیم داد اور رندھاوا کو جگادیا۔ دونوں نے غسل کیا۔ ناشتا میز پر لگ چکا تھا۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اللہ وسایا پہنچ گیا۔ جمیلہ اس کے ساتھ تھی۔ اللہ وسایا کرسی پر بھی نہیں بیٹھا۔ وہ سفر کے لیے تیار ہوکر آیا تھا۔ جمیلہ بھی پوری طرح تیار تھی۔ ذرا دیر بعد وکیل رندھاوا اور رحیم داد اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ مہمان خانے سے باہر نکلے۔

کار حویلی کے سامنے پیپل کے گھنے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھی قریب ہی موجود تھا۔ نوکروں نے ضرورت کا سفری سامان پہلے ہی کار میں رکھ دیا تھا۔ چاروں کار میں سوار ہوئے۔ روانگی سے پہلے اللہ وسایا نے دو نوکروں کو لاری کے ذریعے پہنچنے کی ہدایت کی۔ کار آگے بڑھی اور نہر کے کنارے کنارے دوڑنے لگی۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ہوا میں تازگی اور فرحت تھی۔ اللہ وسایا‘ جمیلہ اور وکیل عثمان رندھاوا کے چہروں پر شگفتگی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے۔ مگر رحیم داد خاموش اور سہما ہوا تھا۔

دوپہر ہونے سے پہلے ہی کار شہر کی حدود میں داخل ہوئی اور وکیل کے دفتر کے سامنے جاکے ٹھہر گئی۔ چاروں کار سے اتر کے دفتر میں چلے گئے۔ دفتر اور گھر علیحدہ علیحدہ نہیں تھے۔ مگر جس کمرے میں دفتر تھا‘ وہ خوب کشادہ اور ہوادار تھا۔ کسی زمانے میں بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ پچھلے حصے میں وکیل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔

مکان پختہ تھا۔ بالائی منزل پر آگے کے رخ کمرہ تھا۔ دفتر کی دیواروں میں لگے ہوئے خوش رنگ ٹائل‘ قیمتی فرنیچر اور الماریوں میں آویزاں قد آدم آئینے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مکان کسی کھاتے پیتے سکھ یا ہندو کی ملکیت رہ چکا ہے۔

اتفاق سے وکیل کا وہ موکل بھی دفتر میں پہلے سے موجود تھا جس سے کلیم کا سودا کرنا تھا۔ وکیل نے اسے دیکھتے ہی مسکرا کر اللہ وسایا کو مخاطب کیا۔ "لو جی‘ اپنے شیخ عنایت اللہ بھی موجود ہیں۔ یہ ہوشیار پور کے مہاجر ہیں۔ انھی سے کلیم کا سودا کرنا ہے۔" اس نے شیخ عنایت اللہ سے اللہ وسایا کا تعارف کرایا۔ "اور شیخ صاحب! یہ کوٹ ہرکشن کا زمیں دار اللہ وسایا ہے۔" شیخ عنایت اللہ کرسی پر بیٹھا تھا‘ جھٹ کھڑا ہوگیا۔

اللہ وسایا نے بڑھ کر گرم جوشی سے مصافحہ کیا‘ مڑ کر جمیلہ کی سمت دیکھا‘ مسکرا کر شیخ عنایت کو بتایا۔ "یہ میری گھروالی ہے جی۔ سودا تو دراصل اس نے کرنا ہے۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کو بھی

شیخ عنایت سے ملایا۔ چاروں کرسیاں سنبھال کر بیٹھ گئے۔

اللہ وسایا ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جلد ہی حرف مطلب پر آگیا۔ اس نے گفتگو کلیم اور متروکہ جائیداد کے الاٹمنٹ کی جانب موڑ دی۔ شیخ عنایت کے پاس کلیم کے کاغذات موجود تھے۔ اس نے اللہ وسایا کے استفسار پر زیادہ تفصیل میں جانے کی کوشش نہیں کی۔ کلیم کے کاغذات نکالے اور اللہ وسایا کی جانب بڑھا دیے۔ اللہ وسایا نے کاغذات الٹ پلٹ کر سرسری مطالعہ کیا۔ رحیم داد قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے بھی کاغذات پر نظر ڈالی مگر جمیلہ نے پوری توجہ سے ضروری دستاویزات اور کاغذات پڑھے۔

وکیل نے اس عرصے میں اللہ وسایا کے لیے اسٹامپ پیپروں پر دو مختار نامے تیار کرائے' ان پر جمیلہ اور رحیم داد سے دستخط کرائے۔ دستخط کرتے وقت رحیم داد کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا اور مختار نامے پر چوہدری نور الٰہی مرحوم کے جعلی دستخط بنا دیے۔ وکیل دستخطوں کی توثیق کے لیے اپنے منشی کے ساتھ کچہری چلا گیا۔ وہ بارسوخ اور منجھا ہوا وکیل تھا۔ رحیم داد اور جمیلہ کو اپنے ہم راہ نہیں لے گیا۔ واپس آیا تو دونوں مختار نامے مکمل تھے۔ ان کی تصدیق بھی ہو چکی تھی اور توثیق بھی۔

مختار ناموں سے فارغ ہو کر وکیل نے نہایت خوش اسلوبی سے کلیم کا سودا بھی طے کرا دیا۔ شیخ عنایت کے رویے سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ مالی طور پر بہت زیادہ پریشان اور ضرورت مند ہے۔ وکیل نے اس کے بارے میں بالکل صحیح بتایا تھا۔ سودا اتنی سستی قیمت پر ہو گیا کہ جمیلہ کو اپنے زیورات فروخت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ حالانکہ وہ زیور اپنے ساتھ ایک پوٹلی میں باندھ کر لائی تھی کہ اگر نقد رقم سے کام نہ بنا تو زیورات بیچ کر کمی پوری کر دے گی۔

ہر کام توقع سے زیادہ اطمینان بخش طور پر ہو گیا۔ مگر جب وہ تمام لکھت پڑھت سے فارغ ہوئے تو دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ دونوں نوکر بھی پہنچ چکے تھے۔ جمیلہ واپس جانے پر مصر تھی۔ وہ اپنے بچوں کو نوکرانیوں کی نگرانی میں چھوڑ کر آئی تھی۔ اب ان کی یاد ستا رہی تھی۔ رحیم داد نے بھی جمیلہ کی تائید کی۔ وہ بھی فوری واپسی کے حق میں تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ اسے ہر طرف خطرہ نظر آتا تھا۔

وکیل کے دفتر میں وہ جتنی دیر رہا' خوف زدہ اور پریشان رہا۔ لمحے بھر کے لیے بھی باہر نہیں گیا۔ تمام وقت کرسی پر گم صم بیٹھا رہا۔ اسے دن ختم ہونے اور شام کا دھندلکا پھیلنے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ شہر سے جلد از جلد دور چلا جانا چاہتا تھا اور خطرات سے بچنے کی خاطر رات کے

اندھیرے میں سفر کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وکیل نے جمیلہ اور رحیم داد کو جانے نہیں دیا۔ اس کے خیال میں اس وقت سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ صبح سے پہلے کوٹلہ ہرکشن نہیں پہنچ سکتے تھے۔ راستہ طویل تھا۔ ویران اور اجاڑ علاقوں سے گزرتا تھا۔ رات کے سفر کے لیے محفوظ نہیں تھا۔ کچھ ہی عرصے قبل اسی راستے پر دن دہاڑے ایک لاری لٹ چکی تھی۔ کوٹلہ ہرکشن سڑک سے دور بھی تھا۔ کچا راستہ تھا اور خاصے پھیر کا تھا۔ دونوں کو' خصوصیت کے ساتھ جمیلہ کو' سفر میں طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیوں سے سابقہ پڑتا۔

شیخ عنایت کلیم کا سودا مکمل ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد چلا گیا۔ اللہ وسایا' جمیلہ اور رحیم داد نے وکیل کے ساتھ کھانا کھایا اور اسی کے مکان پر رات بسر کی۔ صبح ہوئی تو اللہ وسایا طے شدہ پروگرام کے مطابق وکیل کے پاس ٹھہر گیا۔ اس نے ایک نوکر کو اپنے کام کاج کے لیے روک لیا' دوسرے کو جمیلہ اور رحیم داد کے ہم راہ کر دیا۔

راوی ٹرانسپورٹ کی ایک لاری سے تینوں واپس ہوئے۔ جمیلہ کو ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی نشست پر جگہ مل گئی۔ اس کے برابر دو عورتیں اور بیٹھی تھیں۔ دونوں برقع اوڑھے ہوئے تھیں۔ رحیم داد اور ملازم' عالم' پچھلی نشست پر تھے۔

رحیم داد خوف زدہ اور سہما ہوا تھا۔ اسے طرح طرح کے خدشات اور وسوسے پریشان کر رہے تھے۔ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔ لاری جس قدر آگے بڑھتی گئی' رحیم داد کی پریشانی میں اسی قدر اضافہ ہوتا گیا۔ سویرا رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔ زندگی کی چہل پہل اور گہما گہمی بیدار ہو رہی تھی۔

لاریوں کے اڈے پر رحیم داد کو کوئی پولیس والا نظر آتا تو وہ لرز جاتا' سراسیمہ ہو جاتا' عینک قمیض کے دامن سے صاف کر کے دوبارہ آنکھوں پر لگاتا اور گردن جھکا کر اخبار پڑھنے لگتا۔ اخبار اس نے شہر میں ایک ہاکر سے خریدا تھا۔ دھوپ کی تمازت میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ ہوا گرم ہو گئی گو لو کے تیز جھکڑ نہیں چل رہے تھے' لیکن رحیم داد نے لو سے بچاؤ کی آڑ میں گردن اور کانوں کے گرد چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس طرح اس کا چہرہ خاصا چھپ گیا تھا۔ لو تیز ہوتی تو وہ ڈھاٹے سے چہرہ پوری طرح چھپانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ پولیس کی جانب سے تھا۔ لیکن اتفاق سے اس روز کوئی پولس والا لاری میں سوار ہی نہ ہوا۔

سہ پہر کو وہ پاک پتن پہنچے۔ مگر وہاں رکے نہیں۔ نیلی ٹرانسپورٹ کی پہلی لاری سے دیپال پور کی

جانب روانہ ہو گئے۔

☆

چک بیدی کے اڈے پر اللہ وسایا کا مزارع قادر اور اس کا بیٹا صابر لاری میں سوار ہوئے دونوں نے رحیم داد کو پہچان لیا۔ ادب سے سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ وہ بھی کو ٹلہ ہر کشن رہے تھے۔ اللہ وسایا کے ملازم عالم کو' جو شہر سے جیلہ اور رحیم داد کے ہم رہ سفر کر رہا تھا' انھو نے یہی بتایا تھا۔ دونوں مسلح تھے۔ قادر کے پاس مضبوط اور اونچی ڈانگ تھی۔ اس کے دونوا کناروں پر لوہے کی شام چڑھی تھی۔ ایک طرف کی شام میں سیسہ بھرا تھا۔ صابر کے پاس بھ مضبوط اور لمبے ہتھے کی تیز کلہاڑی تھی جس کا چوڑا پھل تیز اور چمک دار تھا۔

لاری مسافروں سے بھری ہوئی تھی اور ہچکولے کھاتی پختہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ دن کا چل چلاؤ تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے گرد کے مٹیالے غبار کے پیچھے ڈوبتا سورج الاؤ کی مانند دہک رہا تھا مغرب میں سرمئی مائل سرخ روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لاری بھی اسی سمت جا رہی تھی سڑک ویران تھی۔ دونوں طرف کیکر کے درختوں اور گھنی جھاڑیوں کا جھنگر تھا۔ کہیں کہیں اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے بھی تھے۔

لاری دو ٹبوں کے درمیان سے ڈھلان پر اترتے ہوئے دائیں ہاتھ کو مڑی تو اس کی رفتار سست پڑ گئی اور کچھ ہی دور جانے کے بعد ٹھہر گئی۔

ڈرائیور لاری سے نیچے اترا۔ باہر کچھ ملی جلی مدھم آوازیں ابھریں۔ رحیم داد کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے گردن باہر نکال کر نظریں دوڑائیں۔ اگلے دروازے کے عین سامنے دو آدمی نہایت مشتبہ حالت میں کھڑے تھے۔ ایک وضع قطع سے کسان نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی لاٹھی تھی جس پر گنڈاسا لگا تھا۔ لاٹھی کندھے پر رکھی تھی اور پشت کی جانب اس میں ایک گٹھری اس طرح جھول رہی تھی کہ گنڈاسے کا تیز پھل دور سے صاف نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا تھا۔ اس کے پاس پرانی وضع کی دیسی بندوق تھی۔ یہ مسکٹ تھی جو عام پیدل سپاہیوں کے پاس ہوتی ہے۔

ڈرائیور ان کے نرغے میں خاموش کھڑا تھا۔ دیکھتے دیکھتے قریب کی جھاڑیوں سے تین آدمی نکلے اور ڈرائیور کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے چہروں پر بھی ڈھاٹے بندھے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں جو تیزی سے ادھر ادھر گردش کر رہی تھیں۔ تینوں نیزوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ رحیم داد خوف زدہ ہو گیا۔ لاری کے دوسرے مسافر بھی دم بخود اور سہمے ہوئے تھے۔ ان میں مرد تھے'

عورتیں تھیں' بچے تھے۔ مگر نہ کوئی بولا نہ اپنی جگہ سے اٹھا۔

مسلح افراد نے مسافروں کو مزید دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔ جس شخص کے ہاتھ میں مسکٹ تھی' اس نے نال آسمان کی سمت بلند کی اور ٹھائیں ٹھائیں دو ہوائی فیر کیے۔ ان میں سے جو اونچے قد کا تھا' ڈپٹ کر زور سے چیخا۔

"سارے بندے باہر آ جائیں۔ اپنا سامان اندر ہی رہنے دیں۔"

رحیم داد کے پیچھے بیٹھے ہوئے بوڑھے نے ساتھ والے مسافر سے کھسر پھسر کی۔ "ڈکیت جان پڑتے ہیں۔ دھاڑا پڑا ہے۔"

لباس کی سرسراہٹیں ابھریں۔ مسافر نشستوں سے اٹھنے لگے۔ ایک عورت کی بغل میں دبا ہوا بچہ منہ پھاڑ کر رویا۔ عورت نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کا منہ بند کر دیا۔ بچہ سہمی ہوئی نظروں سے ماں کا جھنجلایا ہوا چہرہ تکنے لگا۔

کنڈکٹر جو کلینر بھی تھا' سب سے پہلے دروازے کی جانب بڑھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے مسافر لاری سے اترنے لگے۔ رحیم داد بھی اترا۔ وہ ابھی تک پریشان اور ڈرا ہوا تھا۔ وہ سڑک پر ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ قادر اور صابر بھی مسافروں کے ساتھ باہر نکل رہے تھے۔

ان دونوں کو دیکھ کر مسلح افراد میں سے ایک غصے سے دہاڑا۔ "یہ رہا کادو اور اس کا پتر۔"

قادر اور صابر نے جھٹ اپنی ڈانگ اور کلہاڑی اٹھائی اور اچھل کر مسلح افراد پر جھپٹے۔ انھوں نے پینترا بدل کر تیزی سے حملہ کیا۔ پانچوں حملہ آور بدحواس ہو گئے۔ ایک تو پہلے ہی ہلے میں تیورا کر گرا۔ اس کی کنپٹی سے لال لال خون نکل کر گردن اور کپڑوں پر پھیلنے لگا۔ بقیہ چاروں مسلح افراد سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر تتربتر ہو گئے۔ ان کے بکھرتے ہی مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا' ادھر بھاگا اور درختوں کے نیچے گھس گیا۔

رحیم داد بھی ایک گھنی جھاڑی کی آڑ میں حیران و پریشان کھڑا تھا۔ جب وہ ذرا سنبھلا تو اسے جیلہ کا خیال آیا۔ اس نے نظریں گھما پھرا کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ کچھ فاصلے پر چھتری جیسے ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑی تھی اور نگاہیں اٹھائے بے چینی سے لاری کی جانب دیکھ رہی تھی۔

قادر اور اس کا بیٹا تیزی سے اپنی ڈانگ اور کلہاڑی گھما رہے تھے۔ جھپٹ جھپٹ کر وار کر رہے تھے۔ صورت حال اب رحیم داد پر واضح ہوتی جا رہی تھی۔ مسلح افراد جو ڈاکو سمجھے جا رہے

تھے دراصل مقتول طاہر کے شریکے اور بھائی بند تھے۔ انھوں نے طاہر کے قتل کا انتقام لینے کے لیے لاری رکوائی تھی۔ انھیں قادر اور صابر کی تلاش تھی جو ان سے مقابلہ کرنے کے لیے سامنے آچکے تھے۔

قادر کی عمر ۴۵ سے تجاوز کر چکی تھی مگر اس کا جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ اس میں توانائی کے ساتھ ساتھ پھرتی بھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی ڈانگ بجلی کے مانند لہرا رہی تھی۔ صابر بیس بائیس سال کا قد آور نوجوان تھا۔ اس میں بھی باپ کی طرح پھرتی اور حوصلہ تھا۔ حملہ آور اب سنبھل چکے تھے۔ وہ بھی گھوم پھر کر وار کر رہے تھے اور قادر اور اس کے بیٹے کو نرغے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر دونوں ہر بار ان کا گھیرا توڑ کر نکل جاتے۔ وہ جھک کر، سمٹ کر، پلٹ کر ہر طرح اپنا سر بچانے کے لیے کوشاں تھے۔ جھکائی دے کر اور پینترے بدل بدل کر حملے بھی کر رہے تھے۔

دونوں فریق لڑائی میں اس طرح گتھے ہوئے تھے کہ جس کے پاس مسکٹ تھی، وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فاصلہ اس قدر کم تھا اور فریقین اس طرح جلدی جلدی اپنی جگہ بدل رہے تھے کہ گولی چلانے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں مسکٹ سنبھالے ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ آخر اس نے ایک بار ٹریگر دبا ہی دیا۔ گولی چیختی ہوئی نکلی مگر کسی کے جسم میں نہیں لگی۔ گولی کی آواز سن کر مسافر اور بدحواس ہو گئے۔ بھاگے اور درختوں اور جھاڑیوں کے نیچے دور دور تک بکھر کر دبکنے اور روپوش ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

قادر اور اس کے بیٹے کے مقابلے پر دراصل تین ہی مسلح افراد تھے۔ دونوں اس بے جگری سے جم کر لڑ رہے تھے کہ تینوں حملہ آوروں میں سے ہر ایک چوٹ کھا چکا تھا۔ کسی کے ہونٹ سے، کسی کے کندھے سے اور کسی کی ٹانگ سے خون رس رس کر پھیلتا جا رہا تھا۔ مگر کسی کو کاری زخم نہیں آیا تھا۔

قادر اور صابر بھی گھائل ہو چکے تھے۔ زخموں سے بے نیاز ہنوز بڑھ بڑھ کر تیزی سے وار کر رہے تھے۔ تینوں حملہ آوروں کو اپنے بچاؤ کے لیے زیادہ کوشاں ہونا پڑا۔ اب ان میں پہلی سی پھرتی اور حوصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ کسی قدر پریشان اور تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور رفتہ رفتہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔

وہ حملہ آور جسے قادر اور صابر نے پہلے ہی ہلّے میں شدید زخمی کر دیا تھا، سڑک پر چت لیٹا تھا۔ قریب ہی اس کا نیزہ پڑا تھا۔ وہ کچھ دیر بے حال پڑا رک رک کر سانس بھرتا رہا، پھر اس نے کروٹ

بدلی۔ قادر اور صابر چند گز کے فاصلے پر تھے اور بھڑ بھڑ کر حملے کر رہے تھے۔ وہ دونوں کو ٹکٹکی باندھے تکتا رہا۔ وہ ان کے عقب میں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نیزہ مضبوطی سے تھام لیا۔ اٹھا اور دونوں ہاتھوں میں نیزہ دبائے ہوئے تیزی سے قادر پر جھپٹا، وار کیا، نیزے کا نصف سے زیادہ پھل قادر کی پیٹھ میں اتر گیا۔ وہ تلملا کر پلٹا۔ اسی وقت سامنے سے کلہاڑی کا وار ہوا، ہاتھ بھرپور پڑا۔ قادر کا ایک بازو جھول گیا۔ ڈانگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ لڑکھڑایا اور سنبھلنے کی کوشش کی مگر نیزے کے تازہ وار نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس دفعہ نیزے کا پھل اس کے پہلو میں گوشت چیرتا ہوا پسلیوں تک اتر گیا۔

قادر ڈگمگایا۔ گہری سانس بھری، دونوں ہاتھوں سے نیزہ پکڑا اور سڑک پر گر پڑا۔ نیزہ بدستور اس کی پسلیوں میں پھنسا ہوا تھا۔

قادر نے زور لگا کر نیزہ کھینچا۔ نیزہ تو باہر نکل آیا، مگر ساتھ ہی پہلو سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ قادر نے ایک ہاتھ زخم پر رکھا، اٹھنے کی کوشش کی مگر جس کے پاس مسکٹ تھی، وہ قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے اچھل کر پوری قوت سے قادر کے منہ پر لات ماری۔ وہ اس حملے کی تاب نہ لا سکا۔ بے سدھ ہو کر گر گیا۔ حملہ آور نے مسکٹ ایک طرف رکھی، دھوتی کے ڈب سے چھری نکالی اور قادر کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس کا گلا ایک ہاتھ سے دبا کر بولا۔ "میں طاہر کا چیو عطا محمد ہوں۔" اس نے غصے سے قادر کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ مارا۔

قادر کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے لڑکھڑاتی نظروں سے عطا محمد کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ عطا محمد نے چھری ایک آنکھ میں بھونک دی اور اسے نکالنے کے لیے بے دردی سے گھمانے لگا۔

قادر تڑپ کر بے بسی سے گردن ادھر ادھر ہلانے لگا۔ صابر پلٹ کر باپ کی جانب دیکھ بھی نہ سکا۔ حملہ آوروں نے اسے نرغے میں لے لیا تھا اور ہر طرف سے تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ صابر کے جسم پر جگہ جگہ زخم تھے لیکن وہ ڈٹا رہا اور ہر وار کلہاڑی کے ڈنڈے پر روکتا رہا۔ موقع ملتا تو پینترا بدل کر حملہ کرنے سے بھی نہ چوکتا۔

چار افراد کے مقابلے میں صابر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اس کے زخموں سے برابر خون بہہ رہا تھا۔ قدم بار بار ڈگمگاتے۔ کلہاڑی پر انگلیوں کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کلہاڑی کا لمبا ڈنڈا بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ اپنا موثر دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حملہ آوروں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ گھیر کے ہر طرف سے پے در پے وار کر رہے تھے۔ صابر

بھی گر پڑا۔

☆

سورج ڈوب چکا تھا۔ مغربی افق پر ابھی تک لہو رنگ روشنی بکھری ہوئی تھی۔ شام بلندی سے نیچے اترنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد نے دیکھا کہ جمیلہ درخت کے نیچے سے نکل کر سڑک کے اس جانب بڑھی جدھر قادر اور صابر زخموں سے نڈھال پڑے تھے۔ عطا محمد ابھی تک قادر کے سینے پر سوار تھا۔ جمیلہ زور سے چیخی۔ "بہت ہو گیا۔ اب بند کرو یہ ہتیا چار۔" اس کے لہجے میں بے قراری اور جھنجلاہٹ تھی۔

رحیم داد گھبرا گیا۔ اس نے چاہا کہ جمیلہ کو آگے جانے سے روکے۔ وہ ایک ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز سے بولا۔ "ٹھہر جا زمیں دارنی! ادھر نہ جا۔" جمیلہ نے پلٹ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اسی وقت ہارن کی آواز ابھری۔ سڑک کی مخالف سمت سے ایک لاری آتی نظر آئی۔ سب ادھر دیکھنے لگے۔ عطا محمد نے بے سدھ پڑے ہوئے قادر کو چھوڑ دیا۔ اس کے سینے پر سے نیچے اترا۔ مسکٹ سنبھالی اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے اونچی آواز سے بولا۔ "کام ہو گیا۔ اب نکل چلو۔"

سب نے جلدی جلدی اپنے اسلحہ سنبھال لیے۔ عطا محمد نے مسکٹ کی نال اونچی کی۔ خوف اور دہشت پھیلانے کے لیے تڑتڑ ہوائی فائر کیے۔ وہ فائر کرتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ہم راہ سڑک پر دوڑنے لگا۔ فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ راستہ طے کرنے کے بعد سڑک سے اتر کر نشیب میں چلا گیا اور گھنے درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کے اندر داخل ہو کر نظروں سے او[illegible]ں ہو گیا۔

سامنے سے آنے والی لاری قریب آ کر ٹھہر گئی۔ اس میں بھی مسافر سوار تھے اور کھڑکیوں سے گردنیں نکال کر قادر اور صابر کو دیکھ رہے تھے جو خون میں لت پت سڑک کے بیچوں بیچ پڑے تھے۔ جمیلہ بڑھ کر زخمیوں کے پاس پہنچی۔ رحیم داد، ڈرائیور، کلینر اور مسافر بھی درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر نکلے اور سہمے ہوئے قادر اور صابر کی جانب بڑھے۔ دوسری لاری کا ڈرائیور بھی اپنے مسافروں کے ساتھ نیچے اترا۔

جمیلہ نے دیکھا کہ عطا محمد نے قادر کی دونوں آنکھیں نکال دی ہیں۔ وہ گردن پر بھی چھری چلا چکا تھا مگر صرف اوپر کی ذرا سی کھال کاٹ سکا تھا۔ جمیلہ نے کلائی تھام کر قادر اور صابر کی باری باری نبض دیکھی پھر گردن ہلا کر بولی۔ "ابھی زندہ ہیں، پر بری طرح گھائل ہوئے ہیں۔" اس نے مڑ کر دوسری لاری کے ڈرائیور کی جانب دیکھا۔ "تمیں نوں پاک پتن جانا ہے؟"

"جانا تو ہے جی۔" اس نے زخمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جھگڑے میں زخمی ہوئے ہیں؟"

"ہاں جھگڑا ہی ہوا تھا۔" جمیلہ نے آہستہ سے جواب دیا۔

ڈرائیور نے پوچھا۔ "دوسری پارٹی کدھر گئی؟"

"انھوں نے جی لاری رکوائی، سارے مسافروں کو باہر بلایا۔" ایک بوڑھا مسافر بتانے لگا۔ "وہ ان دونوں کی کھوج میں آئے تھے۔ دیکھتے ہی حملہ کر دیا۔ پر جی یہ دونوں بھی زبردست حوصلے والے نکلے۔ وہ پنج تھے اور یہ صرف دو۔ انھوں نے ڈٹ کر ٹاکرہ لیا۔"

بوڑھے نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ جو جس کے جی میں آ رہا تھا، کہہ رہا تھا، اپنی سوجھ بوجھ کے اعتبار سے اظہار خیال کر رہا تھا۔ مگر جمیلہ بہت پریشان تھی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "بے کار کی باتیں چھوڑ۔ ان دونوں کو پاک پتن کے سرکاری اسپتال لے جا۔ اگر ان کی جلد ہی مرہم پٹی کر دی گئی تو بچ جائیں گے۔ ویسے خون بہت بہہ گیا۔" وہ دونوں زخمیوں کے قریب بیٹھ گئی اور خون بند کرنے کے لیے انھی کی پگڑیاں پھاڑ پھاڑ کر زخموں کے گرد باندھنے لگی۔

ڈرائیور زخمیوں کو اسپتال کے جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ "میں جی انھیں نہیں لے جاؤں گا۔"

"کیوں نہیں لے جائے گا؟" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "تو چاہتا ہے، یہ دونوں یہیں سڑک پر مر جائیں۔ تو اتنا بے رحم اور کٹھور کیوں ہے؟"

"گل ایہہ ہے جی۔" ڈرائیور نے صفائی پیش کی۔ "بعد میں پولیسے بہت ستاتے ہیں۔ روز روز گواہی کے لیے بلاتے ہیں۔ اوپر سے وکیل الٹے سیدھے سوال کر کے بھیجا خراب کر دیتے ہیں۔ دوسری پارٹی کا بھی ڈر رہتا ہے۔ گواہی خلاف دو تو عدالت سے نکلتے ہی حملہ ہوتا ہے۔"

"تو گواہی شواہی نہ دینا۔" جمیلہ نے اسے سمجھایا۔ "میں اپنے نوکر کو زخمیوں کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ وہی تھانے میں پرچہ چاک کرائے گا۔ اسپتال میں بھی لے جائے گا۔ تمیں نوں تو انھیں صرف اسپتال تک پہنچانا ہے۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔"

ڈرائیور نے پھر بھی کترانے کی کوشش کی۔ جمیلہ نے جھٹ اس کے ہاتھ پر دس روپے کا نوٹ رکھا۔ مسافروں نے بھی اصرار کیا، سمجھایا بجھایا۔ آخر وہ زخمی قادر اور صابر کو پاک پتن لے جانے پر رضا مند ہو گیا۔ جمیلہ کا ملازم، عالم زخمیوں کے ساتھ پاک پتن جانے والی لاری میں سوار ہو گیا۔ جمیلہ نے اسے ضروری ہدایات دیں، پچیس روپے بھی دیے۔ لاری پاک پتن کی سمت روانہ ہو گئی۔ دیپال پور جانے والی لاری کے مسافر بھی سوار ہو گئے۔ ان میں قادر اور صابر نہیں تھے جن کا لال لال خون سڑک پر جگہ جگہ پھیلا ہوا تھا۔ جمیلہ اپنی نشست پر بیٹھی ان دونوں کے بارے میں

سوچ رہی تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ افسردہ اور مرجھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ باہر شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ مغرب میں دہکتا ہوا الاؤ بجھ چکا تھا۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ لاری سڑک پر دوڑنے لگی۔

نبی رحمان کے اڈے پر لاری ٹھہری۔ جمیلہ اور رحیم داد نے لاری سے اتر کر تانگا لیا۔ دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ تانگا نہر کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ جب تانگا کوٹلہ ہرکشن میں داخل ہوا پہر رات گزر چکی تھی۔ جمیلہ حویلی میں نہیں گئی' سیدھی قادر اور صابر کے گھر پہنچی۔ رحیم داد اس کے ہم راہ تھا۔ اطلاع ملتے ہی قادر کی بیوی ایک ہاتھ میں لالٹین سنبھالے باہر آئی۔ اس کے ساتھ بہو بھی تھی۔ دونوں کے پیچھے مجیداں تھی۔ وہ کمزور اور بیمار نظر آ رہی تھی۔

قادر کی بیوی نے جمیلہ کو دیکھتے ہی کہا۔ "بھین جی! تو اس وکت کیسے آ گئی؟" وہ مسکرائی۔ "اندر آ جا۔ منجی پر آرام سے بیٹھ۔"

"نہیں' میں نے اندر نہیں جانا۔ تجھے یہ بتانا ہے کہ کادو اور صابر کا طاہر کے پیئو عطا محمد اور اس کے شریکوں سے جھگڑا ہو گیا۔"

"ہائے ربا۔" وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "زمیں داری! ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"میں لاری میں چودہری اور عالم کے ساتھ شہر سے آ رہی تھی۔ چک بیدی کے اڈے پر کادو اور صابر بھی لاری میں سوار ہو گئے۔ رستے میں عطا محمد اور اس کے ساتھیوں نے کسی بہانے سے لاری رکوائی' مسافروں کو نیچے اتروایا۔ وہ ۵ تھے اور سب مسلح تھے۔ انھوں نے کادو اور صابر پر ہلا بول دیا۔" جمیلہ نے مطلع کیا۔

"ہائے میں مرگئی۔" قادر کی بیوی بے قرار ہو کر چیخی۔ "صابر اور اس کا پیئو کہاں ہے؟ دونوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لائی؟"

"وہ گھائل ہو گئے ہیں۔ میں نے عالم کے ساتھ دونوں کو لاری میں ڈال کر پاک پتن کے سرکاری اسپتال بھجوایا ہے۔"

قادر کی بیوی یہ سنتے ہی دروازے کی دہلیز پر بیٹھ کر بین کرنے لگی۔ بہو بھی سینہ پیٹتے ہوئے ساس کے ساتھ رونے لگی۔ مجیداں بت بنی گم صم کھڑی تھی۔ نہ وہ بولی' نہ روئی۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا مرجھایا ہوا چہرہ مٹی کی طرح مٹیالا پڑ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑائی اور ماں کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ ماں نے پلٹ کر اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ زور سے اس کی پیٹھ پر دوہتڑ مار کر چیخی۔ "کرماں

ماری! تو مر کیوں نہ گئی؟ تیرے یار کے پیئو نے اس کے خون کا بدلہ چکا لیا ناں!" مجیداں پھر بھی کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

قادر کی بیوی اور بہو کے رونے اور چیخنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں ابھریں تو گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ گھروں کے دروازے کھلنے لگے۔ سب قادر کے گھر پہنچنے لگے۔ آن کی آن میں خاصا بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ان میں مرد بھی تھے' عورتیں بھی تھیں۔ سبھی پریشان تھے' تشویش میں مبتلا تھے۔ قادر اور صابر کی بیویاں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

جمیلہ نے دونوں کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ "چنتا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہی ہو گا۔" ساتھ ہی انہیں ڈانٹا بھی۔ "تم نے تو خاما خا کی پٹی شروع کر دی۔ یہ برا شگون ہے۔ ٹسوے بہانا بند کرو۔ دونوں کی دیکھ بھال کے لیے کسی کو اسپتال بھیجو۔ ابھی تو لاری مل جائے گی۔"

"مجیداں کے دونوں ماما جائیں گے۔" قادر کی بیوی نے رونا بند کر دیا۔ "میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی۔"

"چاچا اکبر کو بھی ساتھ لیتی جا۔" بہو نے مشورہ دیا۔

اکبر وہاں موجود تھا' مستعدی سے بولا۔ "ہاں جی' میں بھی چلوں گا۔" اس نے قادر کی بیوی کی طرف دیکھا۔ "بھابی تو فٹافٹ چلنے کو تیار ہو جا۔"

قادر کی بیوی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے دونوں بھائی اور بھاوجیں بھی موجود تھیں۔ روانگی کا پروگرام فوراً بن گیا۔ جمیلہ اور رحیم داد جس تانگے سے پہنچے تھے' وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ قادر کی بیوی اپنے بھائیوں اور دیور کے ساتھ تانگے میں سوار ہو گئی۔ جمیلہ نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔ "مجیداں کی ماں! حوصلے سے کام لے۔ کوئی پریشانی کی گل ہو تو مجھے فوراً اطلاع بھیجنا۔ عالم تو وہاں موجود ہی ہو گا' میں بھی تیرے پاس پہنچ جاؤں گی۔ ویسے تو سویرے سویرے عالم کو واپس بھیج دینا تاکہ پتہ چل جائے' دونوں کیسے ہیں۔"

قادر کی بیوی نے جمیلہ کی ہر ہدایت پوری توجہ سے سنی اور عالم کے ذریعے اطلاع دینے کا وعدہ کیا۔ تانگا آگے بڑھا اور گاؤں سے دور نکل گیا۔

بھیڑ اب چھٹ چکی تھی۔ جانے والے واپس گھروں کو جا چکے تھے۔ مگر جمیلہ نہیں گئی۔ اس کے دونوں بچے سو چکے تھے۔ نوکرانیوں سے اسے یہ اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ قادر کے گھر کے دروازے پر صابر کی بیوی ابھی تک مضمحل اور نڈھال کھڑی تھی۔ اس کی اوٹ میں مجیداں تھی۔ وہ پتھر کی مانند ساکت تھی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب گئی

شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ جمیلہ کے سینے پر سر رکھ کر جیسے پھوٹ پڑی۔ "بھین جی! میں بہت پاپی ہوں۔ مجھ بختاں ماری کو موت کیوں نہیں آجاتی؟" اس کی سسکیاں خاموشی میں ابھرنے لگیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ جمیلہ اس کا سر آہستہ آہستہ تھپکنے لگی۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا' البتہ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ آنسو ڈھلک ڈھلک کر اس کے رخساروں پر ٹپکنے لگے۔

رحیم داد خاموش کھڑا مجیداں اور جمیلہ کو روتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مگر وہ یہ رقت انگیز منظر زیادہ دیر نہ دیکھ سکا۔ اسے مجیداں کے باپ قادر کی آنکھیں یاد آگئیں جنھیں مقتول طاہر کے باپ نے چھری ڈال کر نکال دیا تھا۔ وہ خون سے لتھڑے ہوئے دو بھیانک غار بن کر رہ گئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر خوف اور کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ رحیم داد سے وہاں نہ ٹھہرا گیا۔ وہ خاموشی سے مہمان خانے کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆

بستر پر لیٹ کر رحیم داد دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بوجھل رات بھی زخمی تھی اور رحیم داد کی نیند بھی زخمی تھی۔ ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔

دن چڑھے جمیلہ مہمان خانے میں آئی۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ جمیلہ کو دیکھتے ہی اس نے بے چینی سے پوچھا۔ "کادو اور صابر کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟"

"ہاں' عالم آیا تھا۔ بتاتا تھا۔ صابر کی حالت تو زیادہ خراب نہیں' پر کادو کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔"

"کادو کو زخم بھی زیادہ آئے تھے۔ توں نے تو دیکھا ہی تھا۔ سارا بدن خون سے لت پت تھا۔ طاہر کے پیو نے اس کی آنکھیں تو نکال ہی لیں' وہ تو اس کی گردن بھی کاٹ دینا چاہتا تھا۔ بہت ظالم ہے۔"

"یہ غصہ ہتیارا ہوتا ہے۔ اندھا بنا دیتا ہے۔" جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب طاہر کا کتل ہوا تھا' تبھی میں نے کہا تھا' یہ جھگڑا اب کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ویسے کادو اور صابر کتل کے مکدمے سے صاف چھوٹ گئے تھے۔ پر طاہر کے پیو' بھائیوں اور شریکوں نے تو بدلہ لینے کا ارادہ نہیں چھوڑا تھا۔ آخر انھوں نے بدلہ لے لیا۔ کادو مر گیا تو صابر اور اس کے چاچے' مامے بدلہ چکائیں گے۔ یہ جھگڑا ایسا ہی چلتا رہے گا۔ جانے کب تک چلے۔" جمیلہ کا چہرہ افسردہ ہو گیا' آنکھیں ویران ہو گئیں۔ وہ پریشان اور مضمحل ہو گئی۔

رحیم داد نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "زمین دارنی! توں نے اپنے کو کیوں پریشانی میں ڈال لیا؟ ایسے جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کس کس کا دکھ اٹھائے گی۔" اس نے گفتگو کا رخ بدلا۔ "یہ بتا' عالم کدھر ہے؟"

"توں اس سے کادو اور صابر کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے؟"

"نہیں' ان کے بارے میں توں نے بتا ہی دیا۔" رحیم داد نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "میں تو عالم سے اپنی دھوپ کی عینک کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ شہر میں اسے اپنی عینک فریم بدلوانے کے لیے دی تھی۔ پچھلے دنوں فریم کی ایک کمانی ٹوٹ گئی تھی۔ پتہ نہیں' عینک کا کیا بنا۔ اس نے مجھے بعد میں کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"اب تو شام سے پہلے پتہ نہیں چلے گا۔ میں نے عالم کو اللہ وسایا کے پاس بھیجا ہے۔ وہ اسے کادو اور صابر کے بارے میں بتا دے گا۔"

"اللہ وسایا کو اس جھگڑے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ یہ ٹھیک نہیں کیا۔" رحیم داد کو جمیلہ کا اقدام پسند نہیں آیا۔ وہ قادر اور صابر کے معاملے کو اتنی زیادہ اہمیت دینے کے حق میں نہیں تھا۔

"اس میں غلط بات کیا ہوئی؟" جمیلہ کا لہجہ تیکھا تھا۔ رحیم داد کے رویے سے اس کے احساسات کو ٹھیس پہنچی تھی۔ "کادو کیول مزارع ہی نہیں' اس پنڈ کا رہنے والا بھی ہے۔ مزارع بھی ہوا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کادو فصل پیدا کرے تو اللہ وسایا زمیں دار بن کر اپنا حصہ لینے تو پہنچ جائے' پر وہ گھائل ہو کر موت کے منہ میں پڑا ہو تو اللہ وسایا اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ نہ اس کی خبر گیری کرے' نہ اس کی مدد کرے' نہ اسے حوصلہ دے۔ توخود ہی سوچ' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

رحیم داد نے خاموشی سے جمیلہ کی باتیں سنیں۔ لہجے کی تلخی بھی محسوس کی۔ مگر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ جمیلہ بھی کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ وہ اٹھی اور باہر چلی گئی۔ وہ مضطرب اور بے چین نظر آ رہی تھی۔

اللہ وسایا رات گئے واپس آیا۔ رحیم داد اس وقت جاگ رہا تھا۔ حویلی کی چھت پر اسے اللہ وسایا کی آواز بھی سنائی دی مگر وہ رحیم داد کے پاس نہیں آیا۔ زیادہ دیر ٹھہرا بھی نہیں۔ وہ کیوں آیا تھا اور کیوں چلا گیا؟ رحیم داد کو دو روز تک کچھ پتہ نہ چلا۔ نہ جمیلہ آئی اور نہ احمد نے کچھ بتایا۔ چوتھے روز اللہ وسایا آیا تو رحیم داد سے اس کی ملاقات ہوئی۔ رحیم داد اپنی بے قراری کی زیادہ دیر پردہ پوشی نہ کر سکا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔

"تو منگل وار کی رات کو بھی آیا تھا؟"

"ہاں آیا تو تھا۔" اللہ وسایا نے بے نیازی سے کہا۔

"میں اس وکت جاگ رہا تھا۔ پر تو ٹھیرا نہیں، تھوڑی ہی دیر بعد چلا گیا تھا۔ کیوں آیا اور کیوں اتنی جھیتی چلا گیا، یہ بھید نہ کھلا۔"

"تجھے جمیلہ نے نہیں بتایا؟"

"وہ آج کل نظر ہی نہیں آتی۔ جانے کہاں رہتی ہے۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "ویسے یہ تو میں نوں پتہ ہے، وہ تیرے ساتھ نہیں گئی تھی۔"

"سمجھ گیا، وہ تجھے کیوں نظر نہیں آئی۔" اللہ وسایا نے مسکرا کر کہا۔ "وہ ان دنوں کادو کے گھر میں زیادہ رہتی ہے۔ مجیداں اور صابر کی گھر والی کو تسلی دیتی رہتی ہے۔ چوہدری! اسے تو ایسے کاموں کے لیے جیلہ چاہیے۔ وہ کسی کو دکھی دیکھ نہیں سکتی۔"

"اس نے دکھ بھی تو بہت سہے ہیں۔" رحیم داد نے جمیلہ کی حمایت کی، چند لمحے خاموش رہا پھر دریافت کیا۔ "یہ تو بتا کادو اب کیسا ہے؟ جمیلہ بتاتی تھی، ایک رات تو اسے ہوش ہی نہیں آیا۔ اسے زخم بھی تو بہت آئے تھے۔ میں نے تو سارا خون خرابہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔"

"کادو کو دوسرے روز بھی ہوش نہیں آیا تھا۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "مجھے جیسے ہی پتہ چلا، سیدھا اسپتال پہنچا۔ کادو چپ پڑا تھا۔ صرف سانس لے رہا تھا۔ وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا، اسے لہور لے جاؤ، شاید بچ جائے۔ ویسے امید کم ہی لگتی ہے۔ میرے پاس وکیل کے زمین دار دوست کی کار تھی۔ میں نے کادو اور صابر دونوں کو اس میں ڈالا۔ جمیلہ بھی اسپتال پہنچی ہوئی تھی۔"

"یہ مجھے پتہ نہیں تھا۔" رحیم داد نے حیرت سے کہا۔

"میں جمیلہ ہی کو چھوڑنے منگل وار کی رات یہاں آیا تھا۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "وہ تو لہور جانے کو بھی کہتی تھی پر میں نے سمجھا بجھا کر اسے روکا۔ دونوں زخمیوں کو لہور لے گیا۔ اسپتال میں داخل کرایا۔ کادو کو تو شام کو ہوش آیا۔ مرتے مرتے بچا ہے۔ اب تو کچھ ٹھیک ہے پر اندھا ہو گیا ہے۔"

"طاہر کے پیو نے کادو کے سینے پر چڑھ کر میرے سامنے چھری ڈال کر آنکھیں نکالی تھیں۔ کادو ایسا زور زور سے چیخا اور اس کی آنکھوں سے ایسے خون نکلا کہ مجھے متلی ہونے لگی۔ مجھ سے ادھر دیکھا نہ گیا۔"

"عالم نے مجھے بتایا، جمیلہ تو رو پڑی تھی۔"

"صابر تو اب بالکل چنگا ہو گیا ہو گا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"بالکل چنگا تو نہیں ہوا پر آٹھ دس روز بعد اسے اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔ البتہ کادو کو زیادہ دن اسپتال میں رہنا پڑے گا۔"

"حملہ کرنے والوں کے خلاف پولیس نے بھی کوئی کارروائی کی؟"

"تین ملزم تو دوسرے ہی روز گرفتار کر لیے گئے تھے۔ طاہر کا پیو عطا محمد اور چاچا سلطان محمد ایک روز مفرور رہے، بعد میں وہ بھی پکڑ لیے گئے۔ پانچوں ابھی تک پولیس کی حراست میں ہیں۔ کیس رجسٹر کر کے پولیس نے ابھی عدالت میں چالان پیش نہیں کیا۔"

"ملزموں کے خلاف پرچہ تو نے چاک کرایا تھا؟"

"نہیں! عالم تھانے گیا تھا، اس نے رپٹ لکھوائی تھی۔ عینی گواہ بھی وہی ہے۔ بعد میں وکیل کے ساتھ میں بھی تھانے گیا تھا۔"

"وکیل نے الاٹمنٹ کے لیے کیا کیا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "ادھر تو میں کادو اور صابر کے معاملے میں پھنسا رہا۔"

"اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نوں اب اسی طرف دھیان دینا ہے۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔

جمیلہ بھی آ گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اللہ وسایا سے پوچھا۔ "تیں نوں شہر نہیں جانا؟ وکیل انتظار کرتا ہو گا۔"

اللہ وسایا مسکرا کر بولا۔ "چوہدری سے اسی بارے میں بات کر رہا تھا۔ فکر نہ کر، الاٹمنٹ کا سارا کام کر کے ہی لوٹوں گا۔"

رحیم داد نے جمیلہ سے کہا۔ "زمین دارنی! کھڑی کیوں ہے؟ آرام سے بیٹھ کے بات کر لے۔"

"چوہدری! اب اسے نہ روک۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اللہ وسایا کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے آج ہی شہر جانا ہے۔"

"پر ابھی تو بہت گرمی ہے۔ ایسے میں یہ کیسے سفر کر سکتا ہے؟"

"جانا تو اسے دن ڈھلے ہے پر کچھ دیر آرام تو کرنا ہو گا۔ سفر بھی لمبا ہے۔ رات دیر سے پہنچے گا۔"

اللہ وسایا کھڑا ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "چوہدری! یہ زمیں دارنی نہیں

تھانے دارنی ہے۔ اس کی بات تو ماننی ہی پڑے گی۔ اب تجھ سے واپسی پر ملوں گا۔ جلدی نال لوٹنے کی کوشش کروں گا۔" اللہ وسایا دروازے کی جانب بڑھا۔ رحیم داد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اللہ وسایا باہر گیا۔ جمیلہ بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔

☆

شام کو رحیم داد نہا دھو کر باغ میں گیا۔ خلافِ معمول باغ میں خوب چہل پہل تھی۔ گھاس پر قالین بچھا تھا۔ جمیلہ بڑی سج دھج سے قالین پر بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت ہلکا گلابی کرتا اور گلابی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا بھی اسی رنگ کا تھا۔ اس کا سر دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ کرتے کے گریبان اور آستینوں پر کلابتو کی کشیدہ کاری تھی۔ پیشانی پر جڑاؤ داؤنی جھلملا رہی تھی۔ کانوں میں سونے کے مندرے، گلے میں نگینوں کا ہار اور ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن تھے۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ وہ باوقار اور حسین نظر آ رہی تھی۔

جمیلہ کے قریب ہی پھاتاں سیاہ پھلکاری سے سر اور چہرے کا کچھ حصہ چھپائے بکل مارے بیٹھی تھی۔ اس نے بھی غسل کیا تھا۔ اجلی دھوتی باندھی تھی اور اس کے اوپر بوٹی دار سفید جھگا پہنا تھا۔ دونوں کے روبرو کچھ فاصلے پر نیم دائرے میں سات مرد بیٹھے تھے۔ وہ سفید کرتے پہنے ہوئے تھے۔ ان کی دھوتیاں اور پگڑیاں بھی سفید اور اجلی تھیں۔ درمیان میں ایک بوڑھا بیٹھا آہستہ آہستہ حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بوڑھا تھا۔ پانچ ادھیڑ تھے۔ ان کی ڈاڑھیوں اور سروں کے بال کھچڑی تھے۔

جمیلہ نے رحیم داد کو آتے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر اونچی آواز سے کہا۔ "چوہدری! ادھر ہی آجا۔"

رحیم داد آگے بڑھا اور جمیلہ اور پھاتاں سے ذرا ہٹ کر قالین پر بیٹھ گیا۔ اسے اللہ وسایا نظر نہیں آیا۔ بیٹھتے ہی دریافت کیا۔ "زمیں دار دکھائی نہیں دے رہا، کدھر ہے؟"

"وہ تو سہ پہر ہی کو شہر چلا گیا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو یاد دلایا۔ "تیرے سامنے ہی تو پروگرام بنا تھا۔"

رحیم داد خفیف ہو کر بولا۔ "مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔"

"ویسے اللہ وسایا نے وعدہ کیا تھا، پر تجھے تو پتہ ہی ہے، اسے ضروری کام سے جانا پڑا۔ میں تجھے بلوانے ہی والی تھی۔" جمیلہ نے سامنے بیٹھے ہوئے مردوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تاجاں کے سَکّن کے لیے دن متھنے آئے ہیں۔ اب کوئی شبھ گھڑی سوچ کر ویاہ کی تاریخ طے کرنی ہے۔"

"یہ ساہے کے لیے آئے ہیں۔" رحیم داد نے مسکرا کر روبرو بیٹھے ہوئے مردوں کو دیکھا۔ "یہ تو نیک کام ہے۔ اس میں دیری کیا کرنی۔"

"لے زمیں دارنی! چوہدری بھی وہی گل کہہ رہا ہے، جو ہم اتنی دیر سے کہہ رہے ہیں۔" سامنے بیٹھے ہوئے سفید ڈاڑھی والے بوڑھے نے حقے کی نے منہ سے ہٹائی اور بے تکلفی سے جمیلہ کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"دیکھ بابے! جلدی نہ کر۔ تاجاں اب پھاتاں کی نہیں، میری دھی ہے۔ میں اس کا ویاہ دھوم دھام سے کروں گی۔ اس کا پیو نہ ہوا تو کیا ہوا، میں تو ہوں۔" جمیلہ نے اپنے سینے پر ہولے سے ہاتھ مارا۔ "تو اس بات کی ذرا چنتا نہ کر۔ میں چاہتی ہوں، تو اپنے پتر کی جنج لے کر آئے تو ذرا موسم اچھا ہو۔ ساری ہی رسمیں رتیاں ہوں۔ ملنی ہو، سٹھنیاں ہوں، چھانتی وکھاونی ہو۔" وہ گردن کو ہلکا سا خم دے کر مسکرائی۔ "چلچلاتی گرمی یا بھری برکھا میں کیا مزا آئے گا۔ جنج چڑھے اور دھوم دھڑکا نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

بوڑھا ہنس کر بولا۔ "ہم نے اڑنا نہیں ہے۔ زمیں دارنی! چل تیری ہی بات اچھی۔ توں ہی ویاہ کے لیے دن تاریکھ بتا دے۔ ویسے بھی تاریکھ تو دھی کے گھر والے ہی دیتے ہیں۔"

"ماگھ کیسا رہے گا؟ تین ہی مہینے تو بیچ میں ہیں۔" جمیلہ نے تجویز پیش کی۔ "اس سے تک خریف کی فصل کی واڈھی بھی ہو جائے گی۔ پھٹی کی چنائی ہو چکی ہو گی۔ بہت سہانا موسم ہو گا۔ گلابی سردی ہو گی۔"

"چلو جی ماگھ ہی رہا۔" بوڑھے نے رضامندی کا اظہار کیا۔ "اب تاریکھ طے کرنی ہو گی۔"

"وہ تو زنانیاں ہی بیٹھ کر طے کریں گی۔" جمیلہ نے نظریں جھکا کر قدرے آہستہ سے کہا۔

"تو نے اپنی بھرجائی سے اس بارے میں گل بات تو کی تھی۔" ایک ادھیڑ شخص بولا۔ وہ پھاتاں کا بڑا بھائی اور ہونے والا سمدھی، اللہ یار، تھا۔ "گھر والی کہتی تھی، ماگھ کی سات تاریکھ کی گل ہوئی تھی۔"

"ایسی گل ہوئی تو تھی۔" پھاتاں نے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کیا۔ "دن کون سا ہو گا؟" وہ گردن اٹھا کر سوچنے لگی۔

"جمعرات یا جمعے کا دن ہو گا۔ چاند کی ۱۳ یا ۱۷ ہو گی۔" بوڑھے نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور زیرِ لب مسکرا کر گویا ہوا۔ "ہم نے پہلے ہی حساب لگا لیا تھا۔"

جمیلہ ہنس کر بولی۔ "بابے! یہ گل تھی تو پہلے ہی بتا دی ہوتی۔ اتنی دیر جھک جھک کیوں کی؟"

"زمیں دارنی! شادی ویاہ میں تھوڑی جھک جھک بک بک نہ ہو تو مزا نہیں آتا۔" بوڑھا بدستور مسکراتا رہا۔

"مجھے تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔ سمجھو پورن ماشی ہی ہوگی۔ دو دن میں چندرما زیادہ نہیں گھٹتا۔ بھری چاندنی رات ہوگی۔" جمیلہ نے مڑ کر بھاتاں کی جانب دیکھا۔ "ٹھیک ہی رہے گا ناں؟"

بھاتاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انگلیوں پر خاموشی سے حساب لگاتی رہی پھر مسکرا کر بولی۔

"ٹھیک ہے جی! ٹھیک ہے۔ ویسے جو دن ویاہ کا سب نے طے کیا' میں نے اس میں کیا بولنا۔"

"تو فیر جی دن تاریخ تو طے ہو گیا۔" بوڑھے نے یہ کہہ کر ذرا دور بیٹھے ہوئے نائی کی جانب دیکھا جو ان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس نے اونچی آواز سے کہا۔ "دینے! ٹوکرا لے آ۔"

نائی نے قریب رکھا ہوا مٹھائی کا ٹوکرا سنبھالا اور آگے بڑھ کر بوڑھے کے سامنے رکھ دیا۔ بوڑھے نے ٹوکرے کے اوپر رکھا ہوا رنگ برنگے سوت کا کلاوا اٹھایا۔ اس میں دو گرہیں لگائیں اور ٹوکرے پر رکھ دیا۔ نائی نے جھک کر مٹھائی کا ٹوکرا پھر اٹھایا اور جمیلہ کے آگے رکھ دیا۔ جمیلہ نے اسے پانچ روپے لاگی کے دیئے۔ لاگی لے کر وہ اونچی آواز سے دعائیں دیتا ہوا اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے پیچھے کھڑے ہوئے ملازم کو شربت لانے کا اشارہ کیا۔ شام کا دھندلکا پھیل گیا تھا۔ باغ میں گیس بتی روشن کر دی گئی تھی۔ اس کی تیز روشنی میں بوڑھے نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دوسروں نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے۔ دعا کے بعد سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ذرا دیر میں دودھ کا شربت آ گیا۔ جمیلہ نے اپنے ہاتھ سے شربت کا گلاس بوڑھے کو پیش کیا۔ اس نے گلاس لیتے ہوئے بڑی شفقت سے کہا۔

"زمیں دارنی! تو جتنی سوہنی ہے' اتنی ہی بھلی اور نیک بھی ہے۔ ربّا تینوں زمیں دارنی سے رانی بنائے۔ تیرے لیے تو اندر سے دعا ہی دعا نکلتی ہے۔"

بھاتاں کے بھائی نے بھی جمیلہ کو کلمۂ خیر سے یاد کیا۔ "تیری ایسی زمیں دارنی تو نہ دیکھی' نہ سنی۔ کون وڈا زمیں دار مزارعوں کے ساتھ ایسا میل جول رکھتا ہے۔ انھیں اس طرح اپنے ساتھ بٹھاتا ہے۔ ان کی آؤ بھگت کرتا ہے۔"

جمیلہ نے کچھ نہ کہا۔ مسکرا مسکرا کر سب کے سامنے خود ہی گلاس بھر بھر کر شربت رکھا۔ بھاتاں نے اس کا ہاتھ بٹانا چاہا تو جمیلہ نے اسے پیار سے ڈانٹ دیا۔ "چپ کر کے بیٹھی رہ۔ ابھی تینوں بہت کام کرنے ہیں۔"

سب مہمانوں نے شربت پیا۔ رحیم داد نے بھی پیا۔ شربت پینے کے کچھ دیر بعد گھاس پر دری

ڈالی گئی۔ اس پر دسترخوان بچھایا گیا۔ نوکروں نے نہایت مستعدی سے کھانا چنا۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مہمانوں نے واپس جانے کی خواہش کا اظہار کیا مگر جمیلہ نے اصرار کر کے انھیں روک لیا۔

حویلی کے سامنے کے میدان میں خوب چھڑکاؤ کیا گیا۔ چارپائیاں بچھا کر اجلے بستر لگا دیے گئے اور یہ طے ہوا کہ مہمان رات بسر کرنے کے بعد سویرے تاروں کی چھاؤں میں اپنے گاؤں واپس چلے جائیں گے۔

بھاتاں' بیٹی کا رشتہ اس شان سے طے ہو جانے پر بہت خوش تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ مسرت جمیلہ کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ وہ بات بات پر ہنستی' مہمانوں کی دل جوئی کرتی۔ رات گئے تک محفل جمی۔ پھر سب سونے چلے گئے۔ رحیم داد بھی ساہے کی رسم میں شریک ہو کر بہت خوش تھا۔ اس رات وہ بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔

دوسرے روز مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد جمیلہ بھاتاں کے گھر گئی اور تاجاں کو اپنے ہم راہ حویلی میں لے آئی۔ اب وہ ساہے بندھی لڑکی تھی اور ایسی لڑکی گھر کی لاج اور عزت ہوتی ہے۔ نہ وہ کھیتوں پر جا سکتی ہے نہ پانی بھرنے کنوئیں یا پنگھٹ پر۔ اسے گھر کی دہلیز سے آگے قدم نکالنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ تاجاں حویلی میں آنے کے بعد جمیلہ کے لیے امانت بن چکی تھی۔ وہ حویلی کی چار دیواری سے باہر صرف اپنے دولہا کے ساتھ ہی رخصت ہو کر جا سکتی تھی۔

☆

گرمی کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی تھی۔ صبح ہی سے لو چلنے لگتی۔ دوپہر ہوتے ہوتے ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔ گاؤں کا جوہڑ دن بھر بھینسوں سے بھرا رہتا۔ وہ کیچڑ اور پانی میں لیٹی جگالی کرتی رہتیں۔ اللہ دسایا ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ ایک شام جمیلہ باغ میں بیٹھی تھی۔ رحیم داد بھی موجود تھا۔ فضا بوجھل اور نیالی تھی۔ جمیلہ مسکرا مسکرا کر رحیم داد کو تاجاں کی شادی کی تیاریوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسرت کی ایسی لہریں مچل رہی تھیں جیسے وہ اپنی سگی بیٹی بیاہنے جا رہی ہو۔ اسی اثنا میں قادر کی بیوی آ گئی۔ اس کا چھوٹا بھائی سردار بھی ہم راہ تھا۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا مضبوط اور توانا جوان تھا۔ مونچھیں نوکیلی اور گھنی تھیں' چہرہ کسی قدر کرخت تھا۔

جمیلہ نے قادر کی بیوی سے پوچھا۔ "تو لہور ہی سے آ رہی ہے ناں؟ کادو اور صابر اب کیسے ہیں؟"

"اب تو دونوں ٹھیک ہی ہیں۔ صابر کو جلد ہی اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔" قادر کی بیوی نے

جواب دیا اور مڑ کر سردار کی جانب دیکھا۔ "بھین جی! یہ نئی کھبرلایا ہے۔ میں اسی کے بارے میں تجھے بتانے آئی ہوں۔"

جمیلہ نے قادر کی بیوی کو نظرانداز کرتے ہوئے براہ راست سردار سے دریافت کیا۔ "کیا نئی خبر لایا ہے؟ کوئی پریشانی کی گل تو نہیں؟"

"پریشانی ہی کی گل ہے جی!" سردار نے بتایا۔ "عطامحمد اور اس کے ساتھ کے چاروں دوسرے ملزم ضمانت پر چھوٹ گئے ہیں۔"

"ضمانت پر تو انھیں چھوٹنا ہی تھا۔ اس میں پریشانی کی کون سی گل ہوئی؟"

"تیرے لیے یہ پریشانی کی گل ہی نہیں ہے۔" سردار کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ "تیں نوں تو پتہ ہی ہے' انھوں نے کادو کی آنکھیں نکال لی ہیں۔ یہ معمولی جرم نہیں۔ اس پر تو ان کی ضمانت ہی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ عطامحمد کی تو بالکل نہیں ہونی چاہیے تھی۔ مگر پانچوں کی نہ صرف ضمانت ہوگئی بلکہ اتنی چھیتی ہوگئی کہ ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ ہر طرف بڑھکیں مارتے پھر رہے ہیں۔"

"اب کیا کرسکتے ہیں وہ؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"میں نے سنا ہے جی! وہ کادو اور صابر پر دوبارہ حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہی پریشانی کی گل ہے۔"

"ان کی طرف سے ایسا خطرہ ہو تو سکتا ہے۔" رحیم داد نے بھی سردار کے خدشات کی تائید کی۔

"پر کادو اور صابر تو سرکاری اسپتال میں ہیں۔" جمیلہ نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "وہ اسپتال میں گھس کر کیسے حملہ کرسکتے ہیں؟"

"بالکل کرسکتے ہیں۔" سردار نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "تیں نوں ان کے بارے میں اندازہ نہیں' وہ کتنے خطرناک ہیں۔ کہتے ہیں' طاہر کے خون کا تو ابھی بدلہ لینا ہے۔ وہ تو کادو اور صابر کا خون کرنے کے بعد ہی پورا ہوگا۔"

"تو اب کیا کرنا ہوگا؟" جمیلہ کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ "اللہ وسایا بھی موجود نہیں۔ میں کل ہی صبح اس کی طرف کسی نوکر کو بھیج دوں گی۔ وہ اسے سب کچھ بتادے گا۔ کیوں نہ تم دونوں نوکر کے ساتھ اللہ وسایا کے پاس چلے جاؤ۔ اسے خطرے سے آگاہ کردو۔"

"زمیں دارنی! تو فکر نہ کر۔" سردار نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "میں اور میرا بھائی ابھی موجود ہیں۔ صابر کا چاچا اکبر بھی ہے۔ اور بھی اپنے شریکے ہیں۔ ڈٹ کر سامنا کریں گے۔ ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔ دیکھیں وہ کادو اور صابر پر کیسے حملہ کرتے ہیں۔ اس بار ایک بھی ان

میں سے بچ کر نہیں جائے گا۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہوگا۔" جمیلہ اور پریشان ہوگئی۔ اس نے جھگڑا ختم کرنے کی غرض سے تجویز پیش کی۔ "پنچایت بھیج کر صلح صفائی نہیں ہوسکتی؟"

"میں نوں پتہ ہے' وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ وہ خون خرابہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔" قادر کی بیوی نے خدشہ ظاہر کیا۔

رحیم داد نے جمیلہ کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "پر کوشش تو کرنی چاہیے۔"

"اس میں برائی کیا ہے؟" جمیلہ بولی۔ "پنچایت تو میں اپنی طرف سے بھیجوں گی۔ تمھاری آن پر کوئی آنچ نہیں آئے گی؟"

"آئے گی تو۔ وہ یہی کہیں گے' کادو اور اس کے شریکے ڈر گئے۔" سردار بولا۔ "پر تیری بات بھی مانی ہے۔ یہی چاہتی ہے تو کوشش کرکے دیکھ لے۔"

"یہ تو ہوتا رہے گا۔ پر تم کو چوکس رہنا پڑے گا۔" رحیم داد نے سردار کو خبردار کیا۔

"میں اسی لیے تو یہاں آئی ہوں۔" قادر کی بیوی نے کہا۔ "ضمانت کی خبر ملتے ہی میں سردار کے ساتھ لہور سے چل کھڑی ہوئی۔ آج ہی شام تیاری کرکے سب کے ساتھ واپس جانے کا ارادہ ہے۔ تجھے تو بتانے آئے تھے۔ ویسے صابر کے چاچا اور اپنے ویر کو لہور چھوڑ کے آئی ہوں۔"

"اب تو اندھیرا ہوگیا۔ کل سویرے جانا۔" جمیلہ نے کہا۔

"نہیں' بھین جی! ہم نے آج ہی جانا ہے اور ابھی جانا ہے۔" قادر کی بیوی آمادہ نہیں ہوئی۔ "لہور ہم نے چھیتی نال پہنچ جانا چاہیے۔"

رحیم داد نے بھی اس کی تائید کی۔ "زمیں دارنی! انھیں نہ روک' جانے دے۔ تیں نوں پنچایت بھیجنی ہے تو کل یا پرسوں تک بھیج دینا۔"

"نہیں۔" جمیلہ نے کہا۔ "پنچایت تو میں کل سویرے ہی بھیجنے کی کوشش کروں گی۔ اس معاملے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

"جیسی تیری مرضی۔" قادر کی بیوی نے کہا۔ "ہم نے اب جانا ہے۔"

جمیلہ اور رحیم داد خاموش رہے۔ قادر کی بیوی اپنے چھوٹے بھائی کے ہم راہ چلی گئی۔ شام کا دھندلکا گہرا ہوگیا تھا۔ جمیلہ بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہری۔ وہ حویلی کی جانب روانہ ہوگئی۔ مگر رحیم داد باغ ہی میں بیٹھا رہا۔ اس نے کھانا بھی وہیں کھایا۔ رات گئے وہ مہمان خانے کی چھت پر جاکر سوگیا۔

پچھلے پہر احمد نے رحیم داد کو آہستہ سے جھنجوڑا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ احمد حیران و پریشان سامنے کھڑا تھا۔ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیہ گل اے حمے؟"

"غضب ہو گیا جی! وہ مجیداں کو اٹھا لے گئے۔"

"مجیداں کو اٹھا لے گئے؟" رحیم داد کو یقین نہیں آیا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں جی۔"

"کب اٹھا لے گئے؟ کیسے اٹھا لے گئے؟" رحیم داد ہنوز حیرت زدہ تھا۔

"یہ تو جی میں نوں پتہ نہیں' وہ کیسے مجیداں کو اٹھا لے گئے۔ مجھے تو تھوڑی ہی دیر پہلے عالم سے ملوم ہوا۔ سیدھا تیرے پاس آ رہا ہوں۔"

"زمیں دارنی کو بھی پتہ چلا کہ نہیں؟"

"اسے تو جی فوراً ہی پتہ چل گیا تھا۔ وہ کادر کے گھر دیر سے پہنچی ہوئی ہے۔ پورے پنڈ میں ہلچل مچی ہے۔ سبھی کادو کے گھر جمع ہیں۔ یہ تو بہت برا ہوا جی!"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ نیند آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ آسمان کی رنگت بدل رہی تھی۔ رات کی سیاہی دھندلی پڑ چکی تھی۔ مغربی افق پر سرمئی اجالا پھوٹ رہا تھا۔ رحیم داد نے انگڑائی لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چھت سے اتر کر نیچے آنگن میں آ گیا۔ احمد بھی اس کے ہم راہ تھا۔

دونوں مہمان خانے سے نکلے اور قادر کے گھر کی جانب چلے۔ مگر وہ کچھ ہی دور گئے تھے کہ جمیلہ آتی ہوئی نظر آئی۔ اس کی ساتھ حویلی کے نوکر اور کچھ مزارعے تھے۔ رحیم داد قریب پہنچا تو جمیلہ نے حیرت سے کہا۔

"چوہدری! تو اب تک کہاں تھا؟"

"مجھے تو ذرا ہی دیر پہلے حمے نے بتایا۔ سیدھا ادھر چلا آیا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ اس کے چہرے سے ندامت جھلک رہی تھی۔ چند لمحے وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے دریافت کیا۔ "پر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟"

"مجیداں کی بھرجائی بتاتی تھی۔ وہ اونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔ اوتھ دیوار سے لگا کر پہلے ایک آنگن میں اترا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ دوسرے بھی اندر آ گئے۔ چار تھے اور سب کاربینوں اور دوسرے ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح تھے۔"

"پر مجیداں اور اس کی بھرجائی نے کوئی شور دور بھی نہیں مچایا۔ ایسا ہوتا تو میری آنکھ ضرور کھل جاتی۔ بندوک تو اپنے پاس بھی ہے۔ جھٹ پہنچ جاتا۔ پنڈ کے دوسرے بندے بھی آ جاتے۔ آسانی سے تو وہ مجیداں کو اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے۔ لگتا ہے انھوں نے ڈرانے دھمکانے کے لیے ہوائی فیر شیر بھی نہیں کیے۔"

"انھوں نے جی! گھر میں گھستے ہی مجیداں اور اس کی بھرجائی کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تاکہ آواز نہ نکال سکیں۔" ایک بوڑھے مزارعے نے بتایا۔ "بھرجائی کو تو انھوں نے منجی سے باندھ دیا اور مجیداں کو اٹھا کر لے گئے۔ کسی کو پتہ چلتا تو کیسے؟ وہ پوری تیاری کر کے آئے تھے۔" اس نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ "کادو کی نوہ یہی بتاتی تھی ناں؟"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "ان دو کے سوا گھر میں اور کوئی نہیں تھا؟"

"بچے تھے۔" جمیلہ بولی۔ "مجیداں کی ماں تو اپنے بھائیوں اور شریکوں کے ساتھ شام ہی کو لہور چلی گئی تھی۔ تیرے سامنے ہی تو اس نے بتایا تھا۔ گھر میں تو صرف مجیداں اور اس کی بھرجائی تھی۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انھیں پتہ تھا' گھر میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" جمیلہ نے بھی رحیم داد کے خیال سے اتفاق کیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "آگے کے لیے تو نے کیا سوچا؟"

"اس بارے میں بات کرنے تیرے پاس آؤں گی۔" جمیلہ حویلی کی طرف مڑ گئی۔ رحیم داد مہمان خانے میں چلا گیا۔ اس نے نہا دھو کر ناشتا کیا اور جمیلہ کا انتظار کرنے لگا مگر وہ نہیں آئی۔ دوپہر ہو گئی۔

دن ڈھلے رحیم داد باغ میں پہنچا تو جمیلہ موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔ "معاف کرنا چوہدری! میں تیری طرف آ نہ سکی۔ دن بھر پنڈ والے میرے پاس آتے رہے۔ مرد بھی تھے' زنانیاں بھی تھیں۔ سبھی پریشان ہیں۔ اس پنڈ میں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"زمیں دار کو بھی یہ خبر بھجوا دی؟"

"نہیں وہ سنے گا تو پریشان ہو جائے گا۔ مجھے ڈر ہے' واپس نہ آ جائے۔ ادھر بھی اسے بہت ضروری کام ہے۔ تیں نوں تو پتہ ہی ہے' وہ کتنا ضروری کام ہے۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ پر زمیں دار کو اس بات کا پتہ تو چلنا چاہیے۔ بعد میں وہ برا نہیں منائے گا۔"

"اس کی تو چنتا نہ کر۔" جمیلہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میں اسے سمجھا بجھا دوں گی۔ وہ خاماخا کی اکڑ نہیں دکھاتا' نہ مجھ پر رعب جمانے کی کوشش کرتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرائی۔

"مجیداں کے ماے چاچے کو پتہ چلے گا تو غصے سے پاگل ہو جائیں گے۔ یہ ان کی عزت اور آن کا معاملہ ہے۔ وہ پہلے ہی جوش میں تھے' اب تو ان کے آگ ہی لگ جائے گی۔" رحیم داد نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "وہ مجیداں کو واپس لانے کی ضرور کوشش کریں گے۔"

"مجیداں کو واپس لانا اب آسان نہیں رہا۔"

"یہ تو مجھے بھی اندازہ ہے۔ پر مجیداں کے گھر والے اور شریکے چپ کر کے تو نہیں بیٹھیں گے۔ کسی نہ کسی طور ضرور بدلہ لینے کی کوشش کریں گے۔ پہلے اتنا خون خرابہ نہیں ہوا' جتنا اس دفعہ ہو گا۔ دونوں ہی پارٹیاں ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"سویرے سے اب تک میں اسی بارے میں سوچتی رہی۔"

"تو نے کوئی فیصلہ بھی نہیں کیا؟ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ زمیں دار کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتی اور خود بھی کچھ کرنا نہیں چاہتی۔ اب بنے گا کیا؟"

"ایک ہی گل سمجھ آتی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے مضطرب ہو کر دریافت کیا۔

"طاہر کے پیو عطا محمد کے پاس پنچایت بھیجی جائے۔"

"تو سمجھتی ہے وہ پنچایت کی بات مان لے گا؟" رحیم داد نے اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا۔ "اب تو مشکل ہی لگتا ہے' مجیداں جو ان کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اسے ہرگز واپس نہیں کریں گے۔ سارا جھگڑا تو اسی کا ہے۔"

"میں خود پنچایت لے کر جاؤں گی۔ تو بھی میرے ساتھ چلنا۔"

"زمیں دارنی تو پنچایت لے کر کیسے جا سکتی ہے۔" رحیم داد کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ "وہ مزارعے ہیں۔ تیرے نہ سہی کسی اور کے تو ہیں۔ تجھے تو مزارعے ہی جائیں گے۔ اور تو ٹھہری زمین دارنی۔ تیرا جانا بالکل ٹھیک نہیں۔ یہ بات تو اپنے دل سے نکال دے۔"

"تجھے زمیں داری کی ایسی ہی شان ہے تو نہ جا' پر میں تو جاؤں گی۔"

"یہ شان اور گھمنڈ کی گل نہیں۔ پر عزت کا بھی تو کچھ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو مزارعے اور زمیں دار میں فرق ہی کیا رہا۔"

"تیرا مطلب ہے' عزت اور مان کے کارن میں چپ کر کے خون خرابہ ہوتے دیکھتی رہوں۔"

جمیلہ نے رحیم داد کی دلیل سختی سے مسترد کر دی۔ "میں چلی جاؤں گی تو ہو سکتا ہے' عطا محمد اور اس کے شریکے صلح صفائی پر راضی ہو جائیں اور مجیداں کو واپس بھیج دیں۔ میں انھیں سمجھانے بجھانے

کی کوشش کروں گی۔ میں نے سنا ہے' عطا محمد کا پیو بہت نیک بندہ ہے۔ کلانور خاں موضع ہے۔ اس کے سارے ہی مزارعے اور زمیں دار عطا محمد کے پیو کی بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ میری بات ضرور مان لے گا۔"

"اور جو تیری پنچایت کی بات نہ مانی گئی تو؟"

"تو کیا ہو گا؟ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ کوشش تو کر کے دیکھ ہی لینا چاہیے۔" جمیلہ بے نیازی سے بولی۔ "میری عزت اور آن ایسے نہیں جاتی۔ تیں نوں کیہ پتہ' میں نے عزت اور لاج کو برباد ہوتے کیسے کیسے دیکھا ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "چوہدری! یہ عزت اور شان کا بھی عجب چکر دیکھا۔ جب سے یہ سب کچھ دیکھا ہے' میرا تو عزت اور آن پر سے وشواس ہی اٹھ گیا۔"

"تیری یہی مرضی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" رحیم داد نے جمیلہ کے عزم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ "یہ بتا' کب تک پنچایت لے جانے کا ارادہ ہے؟"

"یہ کام تو جھتیتی نال ہونا چاہیے۔ کل سویرے ہی چلیں گے۔ روانگی سے پہلے کسی بندے کو بھیج کر عطا محمد کو اطلاع کرا دیں گے۔" جمیلہ نے اپنا پروگرام بتایا۔ "اور ہاں' تو نے اپنے جانے کے بارے میں کیا سوچا؟"

"جب تو جا رہی ہے تو میں بھی تیرے ساتھ چلا جاؤں گا۔" رحیم داد نے اظہار رضامندی کیا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد جمیلہ نے رحیم داد کے ساتھ ہی باغ میں کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر جمیلہ نے گاؤں کے ان بڑے بوڑھوں کو بلایا' جنھیں پنچایت میں شریک کر کے اپنے ہمراہ موضع کلانور خاں لے جانا چاہتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ رات گئے تک صلاح مشورہ کرتی رہی۔

سویرے سویرے اس نے اپنے ایک ملازم کو عطا محمد کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ پنچایت کی آمد سے اسے مطلع کر دے۔ دن چڑھے اس نے تین تانگے بلوائے۔ سب اس میں سوار ہوئے۔ پنچایت اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ کلانور خاں لگ بھگ نو میل تھا۔

جمیلہ کی سربراہی میں پنچایت جب عطا محمد کے گاؤں میں داخل ہوئی تو سورج آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ چکا تھا۔ گرمی شباب پر تھی' البتہ لو نہیں چل رہی تھی۔ حبس اور امس سے سب پسینے میں شرابور تھے۔

تانگے گاؤں کے گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے عطا محمد کے گھر پہنچے۔ جمیلہ نے دیکھا' گھر کے

سامنے ایک درخت کے نیچے گاؤں کے کچھ بوڑھے اور جوان جمع ہیں۔ ان میں عطا محمد بھی شامل تھا۔ سب خاموش تھے۔ ان کے چہروں پر افسردگی تھی' سنجیدگی تھی۔ ایک کانسٹیبل بھی موجود تھا۔ اسے دیکھ کر رحیم داد پریشان اور خوف زدہ ہو گیا۔

جمیلہ تانگے سے نیچے اتری۔ رحیم داد اور دوسرے لوگ بھی اترے۔ عطا محمد نے جمیلہ کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا' آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا۔ سر جھکا کر بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "زمیں دارنی! تو جسے لینے آئی تھی' اس نے تیرا انتظار بھی نہیں کیا۔ وہ چلی گئی۔"

جمیلہ نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "تیرا مطلب مجیداں سے ہے؟ وہ کہاں چلی گئی؟ کس کے پاس چلی گئی؟"

ایک بوڑھے نے اپنی لمبی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا۔ "وہ اپنے رب کے پاس چلی گئی۔ جس کی امانت تھی' اسی کے پاس پہنچ گئی۔ ایک دن سب کو وہیں جانا ہے۔" وہ کالا نور خاں کی مسجد کا ملا تھا۔

جمیلہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ اس نے عطا محمد سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟" اس نے قدرے تامل کیا۔ "لگتا ہے' تو نے اس کا خون کر دیا۔ طاہر کا بدلہ مجیداں سے لے کر تو نے ٹھیک نہیں کیا۔ وہ تو پہلے ہی بہت دکھی تھی۔ وہ ابھاگن تو خود اپنی آگ میں اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ "کہاں ہے وہ؟ کدھر ہے اس کی لاش؟"

"اندر منجی پر پڑی ہے۔" عطا محمد دل گرفتہ ہو کر بولا۔ "زمیں دارنی! تو بھی پولیس کی طرح مجھ پر شبہ کر رہی ہے؟ میں نے اس کا خون نہیں کیا۔ اس نے رات کو اپنے کپڑوں پر لالٹین سے تیل چھڑک کر آگ لگائی اور جل کر مر گئی۔ اس کا کسی نے خون نہیں کیا۔ جا اندر جا کر دیکھ لے۔"

جمیلہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ آنگن کے ایک طرف چھپر کے نیچے چارپائی پر سیاہ چادر بچھی تھی۔ اس کے نیچے مجیداں کی لاش تھی۔ چارپائی کے قریب چٹائی پر دو بوڑھی عورتیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ ہر طرف جلے ہوئے گوشت کی بو پھیلی تھی۔ جمیلہ آگے بڑھی اور چارپائی کے سرہانے کھڑے ہو کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

☆

آسمان دھواں دھواں تھا۔ فضا نڈھال اور بوجھل تھی۔ باغ میں جمیلہ خاموش بیٹھی تھی۔ رحیم داد بھی موجود تھا۔ جمیلہ کا شگفتہ اور حسین چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ دیر تک نظریں جھکائے کچھ سوچتی رہی پھر اس نے گردن اونچی کر کے رحیم داد کو دیکھا اور بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"چوہدری! سمجھ نہیں آتی' اللہ وسایا اب تک کیوں نہیں لوٹا؟ اسے گئے ہوئے دس بارہ روز ہو گئے۔"

"کام میں پھنسا ہو گا۔ الاٹمنٹ کرانی آسان نہیں۔ لما چکر ہوتا ہے۔"

"پر اس نے کوئی اطلاع نہیں بھیجی؟ پہلے تو اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔" جمیلہ کے چہرے پر غم کا ہلکا ہلکا سایہ پھیلنے لگا۔ "سویرے سے جانے کیوں میرا من بے کل ہے۔ بار بار رونے کو جی چاہتا ہے۔"

"زمیں دارنی! تو بہت جلد گھبرا جاتی ہے۔ پریشان نہ ہو' وہ دو چار دن میں آجائے گا۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔ "لگتا ہے' تجھے اللہ وسایا سے بہت پیار ہے۔"

"ہے تو۔" جمیلہ نے سر دوپٹے کے آنچل سے ڈھانکا اور شرما کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ "وہ میرے بچوں کا پیو ہے۔ اٹھ سال سے میرا اس کا ساتھ ہے۔ مجھے ذرا نراش دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے۔ پوچھتا ہے' جی لے! تجھے کیا ہو گیا؟ تو اتنی پریشان کیوں ہے؟ جب وہ میرے لیے اتنا بے کل ہو جاتا ہے تو میں اس کے لیے کیوں نہ چنتا کروں؟ چوہدری' تالی تو دونوں ہاتھ سے بجتی ہے نا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پر تجھے خاماخا اتا پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ چند روز انتظار کر لے۔ وہ واپس آتا ہی ہو گا۔ حوصلے سے کام لے۔"

"میں اس کا کل تک اور انتظار کروں گی۔" جمیلہ نے اپنا عندیہ بتایا۔ "اگر وہ چراغ جلے تک نہ پلٹا تو میں شام کو حویلی سٹیشن چلی جاؤں گی۔ یہاں سے حویلی سٹیشن نزدیک ہی ہے۔ دونوں بچوں اور ایک نوکر کو ساتھ لیتی جاؤں گی۔ رات کی ٹرین سے کسور کے رستے رائے ونڈ ہوتی ہوئی لہور پہنچ جاؤں گی۔"

"تیں نوں پتہ ہے' وہ لہور ہی میں ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "وہ ملتان میں بھی ہو سکتا ہے۔"

"مجیداں کا ماما' سردار پرسوں آیا تھا۔ بتاتا تھا' اللہ وسایا کو اس نے لہور میں دیکھا تھا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ کھڑی ہوئی' آگے بڑھی اور جھٹ پٹے میں درختوں کے نیچے اوجھل ہو گئی۔ وہ بڑی بے قرار نظر آ رہی تھی۔ اسے اس طرح پریشان دیکھ کر رحیم داد کو بھی اللہ وسایا کے بارے میں تشویش ہوئی۔

دوسرے روز سہ پہر کو رحیم داد ٹہلتا ہوا کھیتوں کی جانب چلا گیا۔ کماد اور کپاس کے پودے ہاتھ ہاتھ بھر اونچے ہو گئے تھے۔ ان کے پتوں سے خاک کے ذرے چمٹے ہوئے تھے۔ مکئی کے پودوں پر بل

چلا کر ڈنٹھل توڑے جا رہے تھے تاکہ زیادہ شاخیں پھوٹیں اور زیادہ سٹے لگیں۔ جیٹھ کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ چلچلاتی گرمی کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ فضا ہنوز غبار آلود تھی۔ سانس لیتے ہوئے گھٹن محسوس ہوتی۔ دھوپ میلی اور مٹیالی تھی۔ سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔

رحیم داد باغ میں پہنچا۔ جمیلہ پہلے سے وہاں تھی۔ موسم گرما کی سلگتی شام کے دھندلکے میں جمیلہ کا چہرہ مٹیالے آسمان کے مانند اجڑا اجڑا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جمیلہ نے بتایا کہ وہ گھنٹے سوا گھنٹے میں لاہور روانہ ہو جائے گی۔ اتنا بتا کر وہ پھر چپ ہو گئی۔

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ یکایک قریب بیٹھے ہوئے نوکروں میں سے ایک کی آواز ابھری۔

"لو جی' زمیں دار تو آ گیا۔"

جمیلہ بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ذرا دیر بعد اللہ وسایا درختوں کے ایک جھنڈ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ جمیلہ نے اسے دیکھا تو جہاں تھی' وہیں کھڑی رہ گئی۔ اللہ وسایا آہستہ آہستہ نزدیک آ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چہرہ اور کپڑے خاک سے اٹے ہوئے تھے۔ جمیلہ کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"مجھے پتہ تھا' تو ادھر ہی ہو گی۔ سامان نوکروں کے حوالے کیا اور سیدھا تیرے پاس چلا آیا۔" جمیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنی کھڑی رہی۔

اللہ وسایا نے اس کا سنجیدہ اور سپاٹ چہرہ دیکھا اور بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "کیا بات ہے جی لے! بہت ناراض لگ رہی ہے۔" اس کے لہجے میں پیار کی مٹھاس تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تجھے میری ناراضی کی کیوں چنتا ہونے لگی۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولی۔ "تو' تو لہور میں عیش کر رہا تھا۔"

"لے چوہدری' اس کی گل سن۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "کہتی ہے' میں لہور میں عیش کر رہا تھا۔ یہ تو پوچھا نہیں' میں اتنے دنوں کیسے کیسے چکروں میں پھنسا رہا۔"

"تو نے بتایا تھا؟" جمیلہ نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر ترچھی نگاہوں سے اللہ وسایا کو دیکھا۔ "کسی نوکر ہی کو بھیج کر اپنی خیر خبر بھجوا دیتا۔ میں نے تو تیرے پاس پہلے ہی ایک نوکر اور بھجوا دیا تھا۔"

"ہاں جی' اپنے سے یہ غلطی ہو گئی۔" اس نے آہستہ آہستہ سر ہلا کر نہایت معصومیت سے اعتراف کیا۔ "لے اب غصہ تھوک دے۔ لسی شربت پلا' سخت پیاس لگی ہے۔"

جمیلہ نے سامنے کھڑے ہوئے ایک ملازم کو لسی لانے کی ہدایت کی اور اللہ وسایا سے پوچھا۔

"یہ تو بتا' جس کام سے تو لہور گیا تھا' اس کا کیا بنا؟"

اللہ وسایا نے ہنس کر جواب دیا۔ "فکر نہ کر۔ تیں نوں خوش خبری ہی سناواں گا۔"

جمیلہ نے کرسی کھسکا کر اللہ وسایا کے قریب کر لی۔ "کیا خوش خبری سنانا چاہتا ہے؟"

"سارا ہی کام ٹھیک ٹھیک ہو گیا۔"

"کیا کیا ہو گیا؟" جمیلہ نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"چوہدری کے نام حویلی اور اڑھائی سو ایکڑ زمین کی الاٹمنٹ ہو گئی۔ خریدے ہوئے کلیم کی بنیاد پر اپنی ۱۲ مربع زمین کی بھی تیرے نام الاٹمنٹ ہو گئی۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "لے بھئی چوہدری تجھے حویلی اور دس مربع زمین کی الاٹمنٹ مبارک ہو۔"

"میرا کیا ہے اللہ وسایا! سب تیرا ہی ہے۔ تیری ہی کوششوں سے اور تیرے ہی خرچے سے سب کچھ ہوا ہے۔" رحیم داد نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب یہ میرا تیرا چھوڑ۔ مجھے تیری یہ گل چنگی نہیں لگی۔ آگے ایسی گل نہ سوچنا۔ مجھے دکھ ہو گا۔"

"تو برا مناتا ہے تو نہیں کہوں گا۔" اللہ وسایا نے بے نیازی سے قہقہہ لگایا۔ "پر یہ ضرور سن لے' احسان شاہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس کے تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ وہ بھی لہور پہنچا ہوا تھا۔ بہت بڑھکیں مار رہا تھا۔ اس نے تو اپنے تئیں حویلی اور زمین کو اپنی ہی ملکیت سمجھ لیا تھا۔ پر ہائی کورٹ کے حکم امتناعی نے اس کا سارا کھیل بگاڑ دیا۔ ویسے جی اپنا وکیل بھی بہت زوردار ہے۔ اس نے ادھر حکم امتناعی لیا اور دوسری طرف فائنل الاٹمنٹ کی درخواست بھی لگا دی۔ کنبہ تو اپنا تھا ہی' اس نے بہت کام کیا۔ احسان شاہ نے بہت زور لگایا' الاٹمنٹ نہ ہو پر اس کی ایک نہ چلی۔" اللہ وسایا نے مڑ کر جمیلہ کو دیکھا' محبت سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ "اب تو تیں نوں پتہ چل گیا۔ اتنی دیر کیوں ہوئی؟ الاٹمنٹ کے چکر میں دن رات پھنسا رہا' اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ اپنی خیر خبر بھجوا دیتا۔ ویسے یہ بات بھی تھی' میں الاٹمنٹ ملنے کی خوش خبری تجھے خود سنانا چاہتا تھا۔ تو سن کر خوش تو ہو جاتی پر یہ مزا نہ آتا جو اب آ رہا ہے۔"

"تجھے کیا پتہ' تیرا انتظار کرتے کرتے میں کتنی بے کل رہی۔ ہر سمے تیرا دھیان رہتا۔ بار بار من گھبراتا۔ رات کو سوتے سوتے گھبرا کر اٹھ بیٹھتی۔ پر تو یہ باتیں کیوں سوچنے لگا۔" جمیلہ نے گلہ کیا۔ "میں تو آج ہی شام بچوں کے ساتھ تیرے پاس لہور پہنچنے والی تھی۔ چوہدری سے پوچھ لے۔ اسے سب پتہ ہے۔ ساری تیاری کر لی تھی۔" وہ گردن کو خم دے کر ایک خاص ادا سے مسکرائی۔ "اللہ

وسایا! تو نے اس بار مجھے بہت تنگ کیا۔"

"روئی تو نہیں تھی؟" اللہ وسایا نے ہنس کر پوچھا۔

"روئی بھی تھی پر مجیداں کے لیے۔" جمیلہ کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تجھے تو پتہ چل گیا ہوگا۔ اس نے کپڑوں میں آگ لگا کر خودکشی کرلی۔"

"مجھے تو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ پولیس نے مجیداں کی موت پر عطا محمد اور اس کے بھائی کو قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔ مجھے الاٹمنٹوں کے چکر سے جب بھی فرصت ملتی' کادو اور صابر کو دیکھنے اسپتال چلا جاتا۔ وہیں مجھے مجیداں کے چاچا' اکبر نے یہ خبر دی۔ میں تو پنڈ واپس آنا چاہتا تھا پر ان دنوں روز ہی پیشی لگ رہی تھی۔ حاضر نہ ہوتا تو کام بگڑنے کا ڈر تھا۔ احسان شاہ ضرور گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔"

"پھر تو ٹھیک ہی ہوا' جو تو نہیں آیا۔ تجھے دکھ ہی ہوتا۔" جمیلہ کی آواز بھرا گئی۔ "پوسٹ مارٹم کے بعد لاش پنڈ میں آئی تو سبھی رو پڑے۔ سنا ہے' جب اسے قبر میں اتارا گیا تو کہرام مچ گیا۔ ہائے' کیسی ابھاگن تھی مجیداں۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو پونچھے۔

"اس کا جیون تو دکھ جھیلتے ہی کٹا۔ کیسا کیسا اس پر اپرادہ ہوا۔ زندہ رہنے کو اس کے پاس رہ ہی کیا گیا تھا۔ سب کچھ تو ملیا میٹ ہوگیا تھا۔"

"بہت ظلم ہوا جی اس کے ساتھ۔" رحیم داد نے جمیلہ کی تائید کی۔

"ویسے مر کر اس کی مکتی ہوگئی۔ سارا جھگڑا تو اسی کے کارن تھا۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

"وہ تو جان سے گئی پر جھگڑا تو جہاں تھا' ابھی تک وہیں ہے۔" اللہ وسایا نے کہا۔

"اب تو اسے ختم ہو جانا چاہیے۔" جمیلہ نے مشورہ دیا۔ "اللہ وسایا! جھگڑا چکانے کے لیے صلح صفائی کرادے۔ جھگڑا ختم نہ ہوا تو آگے نہ جانے کتنے اور خون ہوں گے۔"

"یہ تو پنچایت لے کر مجیداں کو واپس لانے کے لیے طاہر کے پیو کے پاس گئی بھی تھی۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کو مطلع کیا۔

"کیا بنا پنچایت کا؟" اللہ وسایا نے دریافت کیا۔

"بننا کیا تھا۔ جسے لینے گئی تھی وہی نہ رہی۔ پر جھگڑا ختم کرنے کے لیے تیں نوں کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

"تو کہتی ہے تو ضرور کوشش کروں گا۔" اللہ وسایا نے جمیلہ کو اطمینان دلایا۔

"کادو اور صابر کا کیا حال ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"صابر کو تو اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ میرے ساتھ ہی واپس آیا ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "کادو ابھی کچھ دن اسپتال ہی میں رہے گا۔ اس کی گھر والی اور چھوٹا بھائی دیکھ بھال کے لیے لاہور ہی میں ہیں۔"

نوکر لسی لے کر آگیا۔ اللہ وسایا نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور خالی کردیا۔ نوکر گلاس اٹھا کر چلا گیا۔ جمیلہ نے کہا۔ "اللہ وسایا! اب تو نہالے۔ دیکھ تو تیرے بدن اور کپڑوں پر کتنی گرد جمی ہے۔"

وہ خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ جمیلہ بھی کھڑی ہوگئی۔

دونوں حویلی کی جانب روانہ ہوگئے۔ رحیم داد بیٹھا رہا۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ نوکروں نے لیمپ جلا کر اسٹول پر رکھ دیا۔

اللہ وسایا نہا دھو کر اجلے کپڑے پہنے ہوئے جمیلہ اور دونوں بچوں کے ہم راہ واپس آگیا۔ اس کے پہنچتے ہی کھانا چن دیا گیا۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اللہ وسایا کھانے کے بعد زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا' جلد ہی سونے چلا گیا۔

چند روز بعد اللہ وسایا نے مقدمہ جیتنے کی خوشی میں جشن منایا۔ حویلی کے سامنے کھلے میدان میں چھڑکاؤ کیا گیا۔ شام ہوتے ہی گیس بتیاں روشن کی گئیں' دیگیں چڑھیں' طرح طرح کے پکوان پکے۔ گاؤں کے تمام مزارعوں اور کمیوں نے کھانا کھایا۔ رحیم داد محفل میں اللہ وسایا کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس روز وہ اجلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ سر پر اونچے طرے کی پگ تھی جو اللہ وسایا اس کے لیے خاص طور پر لاہور سے لایا تھا۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کا ایک ایک مزارعے اور کمی سے تعارف کرایا۔ انھیں صاف صاف بتایا کہ حویلی اور گاؤں کی زیر کاشت ڈھائی سو ایکڑ زمین رحیم داد کے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ اب وہ گاؤں کا دوسرا زمیں دار بن گیا ہے۔

مگر رحیم داد نے بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ہر ایک سے یہی کہا کہ اللہ وسایا اس کے بھائی کی مانند ہے۔ پہلے کی طرح سب کچھ اسی کا ہے اور وہی پورے گاؤں کا زمیں دار ہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز سے اعلان کیا۔ "گل ایہہ ہے جی! اللہ وسایا کی کوششوں ہی سے میرے نام الاٹمنٹ ہوئی ہے۔ زمیں داری اسی نے چلائی ہے اور وہی چلائے گا۔" اس نے اپنی پگ اتاری اور اللہ وسایا کے سر پر رکھ دی اور اس کی پگ اپنے سر پر رکھ لی۔ سب نے خوش ہو کر قہقہے لگائے۔

پہر رات گزری تو نوجوانوں نے لڈی ناچ شروع کیا۔ ڈھولیوں نے جھوم جھوم کر ڈھولکوں پر چوٹ لگائی۔ رقص کرنے والے نوجوان باری باری پاؤں اوپر اٹھاتے' بائیں سر کی سیدھ میں

لہراتے آگے بڑھتے۔ انھوں نے ڈھولیوں کے گرد حلقہ بنالیا اور ایک ایڑی کے بل بیٹھ کر دائرے میں رقص کرنے لگے۔ وہ چٹکیاں بجاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھاتے۔ کبھی سینے کے سامنے اور کبھی گھٹنوں کے قریب لاکر ہاتھوں کی جنبش کے ساتھ ساتھ جسم کو اس طرح حرکت دیتے کہ کمر اور کولھوں کے ساتھ ساتھ ایک ایک عضو لچکتا اور لہراتا نظر آتا۔ رقص رفتہ رفتہ تیز ہوتا گیا۔ ڈھولیوں نے گردنیں جھٹک جھٹک کر ڈھولکوں پر تیزی سے چوٹ لگانا شروع کردی۔ رقص تیز، اور تیز ہوتا گیا۔ اور جب شباب پر پہنچا تو سرخوشی کے عالم میں ناچنے والوں کے منہ سے اونچے سروں میں گیت کے بول نکل نکل کر فضا میں گونجنے لگے۔ وہ اونچی آواز میں الاپتے۔

ہو، ہو، علی علی، لڈھی ھمھم منڈی

آدھی رات تک رقص و موسیقی کا سلسلہ جاری رہا۔ رقص کرنے والے اور ڈھولی پسینے میں شرابور ہوگئے۔ رقص ختم ہوا تو ستاروں کے کنول روشن ہوچکے تھے۔ ہوا گنگنا رہی تھی۔ رات نشے سے مدہوش تھی۔

۳۲

رحیم داد بھی اب بڑے زمیں داروں کی طرح اونچے طرے کی پگ سر پر رکھ کر باہر نکلتا۔ مگر اس کا بیشتر وقت مہمان خانے میں گزرتا۔ البتہ وہ اکثر گھوڑی پر سوار ہوکر دن ڈھلے اللہ وسایا کے ہم راہ نہر کی طرف چلا جاتا۔ نہر گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ دونوں، گھوڑیاں آہستہ آہستہ دوڑاتے ہوئے نہر کے کنارے کنارے دور تک چلے جاتے، باغ میں واپس آتے اور عام طور پر وہیں ساتھ بیٹھ کر رات کا کھانا کھاتے۔ جمیلہ اور اس کے دونوں بچے بھی کھانے میں شریک ہوتے۔

اساڑھ کا مہینہ لگ چکا تھا۔ لیکن گرمی کم نہیں ہوئی تھی۔ موسم میں صرف اس قدر تبدیلی ہوئی تھی کہ لو کے جھکڑوں کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی ہوتی تو حبس بڑھ جاتا۔ آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے بگلوں کی ڈار کی مانند منڈلاتے۔ کبھی کبھار بادل سرمئی غبار بن کر چھا جاتے۔ مگر بارش نہیں ہوئی۔

ایک روز سخت گرمی اور حبس کے بعد شام کو بارش کا پہلا چھینٹا پڑا۔ گرد و غبار بیٹھ گیا۔ فضا نکھر کر اجلی ہوگئی۔ ہوا خوش گوار اور بھیگی ہوئی تھی۔ زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی تھی۔ دن ڈھلے اللہ وسایا اپنے دونوں بچوں اور جمیلہ کے ہم راہ ٹہلتا ہوا نہر کی طرف پیدل ہی چلا گیا۔ رحیم داد باغ میں تنہا بیٹھا تھا۔ شام سہانی اور فرحت افزا تھی۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ اس نے دونوں ٹانگیں سامنے رکھی ہوئی میز پر پھیلا دیں اور موسم کی شگفتگی سے لطف اٹھانے لگا۔ یکایک اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے پیروں پر ہاتھ رکھا اور ہولے ہولے دبانے لگا۔ رحیم داد نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ اس کے پیروں میں ماکھا بیٹھا تھا۔

رحیم داد نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "تو فیر آگیا؟"

"فیر کس کے پاس جاؤں جی۔" اس نے رحیم داد کے پیر دباتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ "پیا ساتو جی دوڑ کر کھوئی پر ہی جاتا ہے۔"

"میں کتنی بار تجھے کہہ چکا ہوں' اللہ وسایا تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔" رحیم داد نے بیزاری سے کہا۔

"میں نوں پتہ ہے' وہ کچھ نہیں کرے گا۔ پر چوہدری! اب تو میرا کام توں بھی کر سکتا ہے۔" ماکھا مسکین سی شکل بنا کر بولا۔ "اب توں بھی وڈا زمیں دار بن گیا ہے۔ توں چاہے تو میرا بازو شاہ جی سے واپس دلا سکتا ہے۔ شاہ جی تیری گل ضرور مان لے گا۔"

"میری گل وہ کیسے مان سکتا ہے۔ تیں نوں پتہ ہے اللہ وسایا کی احسان شاہ سے لگتی ہے۔" رحیم داد نے ماکھا سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

ماکھا گڑگڑا کر بولا۔ "شاہ جی کی اللہ وسایا سے لگتی ہے پر تجھ سے تو نہیں لگتی۔ سچ جان' وہ بہت خوش ہے کہ اللہ وسایا اب اس پنڈ کا زمیں دار نہیں رہا اور تو وڈا زمیں دار بن گیا ہے' حویلی بھی اب تیری ہی ہے۔ اللہ وسایا کے پاس تو خالی پٹی رہ گئی۔ سب کچھ تیرا ہی ہے۔"

رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تیں نوں کیسے پتہ چلا' احسان شاہ اس طرح سوچتا ہے؟ وہ اللہ وسایا کا دشمن ہے تو میرا بھی ہے۔"

"چوہدری! تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔" ماکھا مسکرا کر بولا۔ "اللہ وسایا سے تو شاہ جی اس لیے خار کھاتا ہے' وہ مزارعے سے وڈا زمیں دار بن گیا۔ اس کے برابر پہنچ گیا۔ اسے تو اللہ وسایا سے خار کھانا ہی چاہیے۔ تجھے تو وہ خاندانی زمیں دار جانتا ہے۔ رب سونہہ' میں نے اپنے کانوں سے سنا' شاہ جی کہہ رہا تھا' چلو جی' یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ پتہ چلا ہے' چوہدری ویسے جات کا ہے تو جاٹ پر خاندانی زمیں دار ہے۔ اللہ وسایا کی طرح مزارع یا جانگی نہیں رہا۔"

"وہ میرے بارے میں کچھ ہی کہے' میں اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ اللہ وسایا یہ بات پسند نہیں کرے گا اور میں اسے ناراض نہیں کر سکتا۔"

"چوہدری! میرے لیے ایک بار چپکے سے شاہ جی سے مل لے۔" اس نے رحیم داد کے پیر ایک بار پھر پکڑ لیے۔ "اللہ وسایا کو پتہ ہی نہیں چلے گا۔ شاہ جی تیری گل مان لے گا۔ میرا بازو مجھے مل جائے گا۔ پنج سال ہوگئے اسے دیکھے ہوئے۔" اس نے آسمان کی سمت نظریں اٹھا کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "جب سے وہ گئی ہے' میرا گھربار بالکل تباہ ہوگیا۔"

رحیم داد نے اپنے دونوں پیر سمیٹ لیے اور بے رخی سے بولا۔ "صاف صاف سن لے۔ احسان شاہ اگر اللہ وسایا سے خار کھاتا ہے تو وہ میرا بھی دشمن ہے۔ میں اس کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گا۔ تو کوئی اور رستہ ڈھونڈ۔ میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔" رحیم داد کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ "اور دیکھ' آگے بھی تو میرے پاس نہ آنا۔ مجھے تیرا یہاں آنا بالکل پسند نہیں۔ اب تو ٹر جا۔" رحیم داد کا لہجہ تیکھا اور تلخ ہوگیا۔

ماکھا سر جھکائے کچھ دیر بت بنا بیٹھا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری' اٹھا اور چپ چاپ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی طبیعت مکدّر ہوگئی تھی۔ وہ بیزار ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ احمد آگیا۔ اس کے ہاتھ میں لیمپ تھا۔ اس نے لیمپ اسٹول پر رکھا' اسے روشن کیا اور رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "زمیں دار حویلی میں ہے۔ اس نے کہا ہے۔ چوہدری سے کہنا باغ میں ٹھہرے۔ میں بھی ذرا دیر میں پہنچ جاؤں گا۔ روٹی اس کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔"

رحیم داد کو احمد کی زبانی اللہ وسایا کا پیغام ملا تو اس نے مہمان خانے میں جانے کا ارادہ ترک کردیا' باغ میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اللہ وسایا آگیا۔ اس کے ساتھ جمیلہ بھی تھی۔ ان کے پہنچتے ہی نوکروں نے کھانا لگایا۔ تینوں نے کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اللہ وسایا بولا۔ "آج تو بہت چنگا موسم ہے۔ بارش کا ایک ہی چھینٹا پڑا۔ نہ حبس رہا' نہ گرمی۔ ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی ہے۔"

جمیلہ نے مسکرا کر کہا۔ "موسم کو تو بدلنا ہی تھا۔ جولائی کا مہینہ شروع ہوچکا ہے۔"

رحیم داد نے گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ "ابھی تو آسمان بالکل صاف ہے۔ پر پتہ نہیں' کب برکھا شروع ہوجائے۔"

"کوئی پتہ نہیں' کب بادل گھر کر آجائیں۔" جمیلہ بولی۔ "چوہدری! توں ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس مہینے ایسا ہی ہوتا ہے۔ یاد آتا ہے' جب کالج میں چھٹیاں ہوتیں تو ہم بہن بھائی' ماں جی کے ساتھ عام طور پر ڈلہوزی چلے جاتے۔ مجھے تو ڈلہوزی ہمیشہ مری سے بہتر لگا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "وین کنڈ اور دھولدھر کی صنوبر کے درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں اور ان کی برف پوش سفید چوٹیاں' بہت سندر دکھائی پڑتی تھیں۔ بارش ہوتی تو اور مزا آتا۔ ادھر برکھا ہوئی' ادھر ذرا ہی دیر میں سڑکیں اور رستے ایسے صاف ستھرے' مانو پانی برسا ہی نہیں۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری' تو ڈلہوزی تو گیا ہوگا؟ ضلع گورداس پور ہی میں تو ہے؟"

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اس نے نہ گورداس پور دیکھا تھا' نہ کبھی ڈلہوزی گیا تھا۔ وہ سوچ ہی

رہا تھا کہ کیا جواب دے' اتنے میں اللہ وسایا بول پڑا۔ "جی لے! ڈلہوزی اور گورداس پور کو چھوڑ' یہ بتا کیمبل پور جانے کے بارے میں تو نے کیا سوچا؟ اگلے جمعے کو چلنا ہے۔"

"چنتا نہ کر۔ میں نے سفر کی پوری تیاری کرلی ہے۔" جمیلہ نے اعتماد سے کہا۔

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اللہ وسایا! کیا تو کیمبل پور جا رہا ہے؟"

"جانا ہی پڑے گا جی!" اللہ وسایا نے جواب دیا۔ "میری بھتیجی شرفاں کا ویاہ ہے۔ اس میں شرکت ضروری ہے۔ جمیلہ اور بچے بھی ساتھ جائیں گے۔" اس کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ ٹھنڈی سانس لے کر اس نے بتایا۔ "بات یہ ہے چوہدری! اس کا نہ پیئو ہے' نہ ماں۔ بہن بھائی بھی سگے نہیں۔ میرا پھوپھا فوج میں تھا۔ پچھلی جنگ میں جاپانیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ سرکار نے اس کے مرنے کے بعد کیمبل پور میں تھوڑی سی زمین گزارے کے لیے دے دی تھی۔ تب سے پھوپھی وہیں رہنے لگی تھی۔ پر بے چاری زیادہ دن زندہ نہیں رہی۔ اس کے مرنے کے بعد سرکاری پنشن بھی بند ہو گئی۔ اب پھوپھی کی نشانی شرفاں ہی رہ گئی ہے۔ چاچے نے اسے پالا ہے۔ وہ بھی کیمبل پور میں ہوتا ہے۔ میں نے تو شرفاں کو برسوں سے نہیں دیکھا اور جمیلہ نے تو اسے صرف ایک بار دیکھا ہے۔ گڈو کے مونڈن پر میں نے اسے یہاں بلایا تھا۔"

"اس سے تو وہ بارہ تیرہ برس کی چھوہری تھی۔ پر اب تو جوان مٹیار ہوگی۔ پر بہت سیدھی سادی تھی۔ سدا چپ' چپ رہتی۔" جمیلہ کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ "جس کے سب مر جائیں' اس کا یہی حال ہوتا ہے۔"

"پر تجھ سے تو وہ بہت پیار کرتی تھی۔ ہر وکت تیرے ہی ساتھ لگی رہتی تھی۔"

"ایسے ہی پیار نہیں کرتی تھی۔" جمیلہ کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "تیں نوں کیہہ پتہ' میں کتنی بار اسے چھاتی سے لگا کر روئی ہوں۔"

"ضرور روئی ہوگی۔" اللہ وسایا بولا۔ "کسی کڑی کا پیئو یا ماں گزر جائے تو سب سے بڑھ کر تو ہی جا کر سیاپا کرتی ہے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! اس کا دل بہت کمزور ہے۔ ذرا سی بات پر اسے رونا آجاتا ہے۔ ویسے گلاں بہت کرتی ہے۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیمبل پور سے واپسی کب تک ہوگی؟"

"ہفتہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔ زیادہ دن بھی لگ جائیں تو کوئی تعجب نہیں۔"

"ایک روز تو لہور ٹھہرنا پڑے گا۔ میں نے شرفاں کو تاگی چھک دینے کے لیے کپڑے لتے اور

زیور بھی انارکلی سے خریدنے ہیں۔ دو ریشمی پٹانگل تو میں نے پہلے ہی تیار کرلیے ہیں۔" جمیلہ نے مسکرا کر بتایا۔

اللہ وسایا حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "وہ تو نے کب تیار کیے؟ میں نوں پتہ ہی نہ چلا۔"

"لے یہ بھی کوئی بتانے کی گل ہے۔" جمیلہ نے شوخی سے کہا۔ "یہ تو سوچ ننھیال میں تیرے علاوہ شرفاں کا اور کون ہے۔ ویسے تو وڈا زمیں دار بھی کہلاتا ہے۔ میں کنبے برادری میں تیرا سر نیچے نہیں ہونے دوں گی۔" جمیلہ نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "چنتا نہ کر' شرفاں کی ماں نہیں' میں تو موجود ہوں۔ دیکھ لینا' کیسی دھوم دھام سے سگائی ہوگی۔ ویاہ کی ساری رسماں رساں ہوں گی۔ شرفاں کے سسرال والوں کے سامنے میں نے ناک نہیں کٹوانی۔"

"میں نوں پتہ ہے' تو سب کچھ کرے گی۔" اللہ وسایا نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ڈھولکی بجائی گی' گھوڑیاں اور سہاگ کے گیت گائے گی۔ جھمریا ماہیا ناچے گی اور سلامی میں سب سے بڑھ چڑھ کر روپیہ بھی دے گی۔ اسی لیے تو اپنے پاس کچھ بچتا بچاتا نہیں۔"

"کیا کرے گا پیسہ جوڑ کر۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس کے لابھ میں پڑ کر مورکھ نہ بن۔ اس میں کچھ نہیں رکھا۔ جتنا جوڑ جمع کرو' اتنا ہی لالچ بڑھتا ہے۔ منش خود غرض اور کٹھور بن جاتا ہے۔ دن رات اسی چکر میں رہتا ہے۔"

اسی وقت ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ اسٹول پر رکھا ہوا لیمپ بھڑکا اور بجھ گیا۔ روشنی نہیں رہی تو اندھیرا چھا گیا۔ تینوں ذرا دیر گھور اندھیرے میں خاموش بیٹھے رہے' پھر محفل برخاست ہو گئی۔ اللہ وسایا اور جمیلہ حویلی کی سمت چلے گئے۔ رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا۔

اللہ وسایا اور جمیلہ سفر کی تیاریوں میں الجھے ہوئے تھے۔ رحیم داد سے شام کو ان کی سرسری ملاقات ہوتی۔ ایک صبح تاروں کی چھاؤں میں دو تانگے حویلی کے سامنے نظر آئے۔ ایک میں جمیلہ اور دونوں بچے اور دوسرے میں دونوں نوکر سامان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ رحیم داد بیدار ہو چکا تھا۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے وہ اللہ وسایا سے ملا۔ اللہ وسایا نے رخصت ہوتے وقت رحیم داد کو گلے سے لگایا اور پیٹھ محبت سے تھپک کر بولا۔

"چوہدری! میں جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ تو زمیں داری کی دیکھ بھال کرتا رہنا۔ ویسے بھی اب تجھے زمیں داری کے معاملات میں پوری دلچسپی لینی چاہیے۔ تو بھی اس پنڈ کا زمیں دار بن چکا ہے۔"

"ایسی گل نہ کر اللہ وسایا!" رحیم داد نے جھٹ اسے ٹوکا۔ "اس پنڈ کا زمیں دار تو ہی ہے اور تو

ہی رہے گا۔"

"یہ تو تیری محبت ہے چوہدری۔ میں نوں پتہ نہیں تھا' تیرا دل اتنا وڈا ہے۔"

"میرا دل کتنا وڈا ہے' یہ تو تیں نوں آگے پتہ چلے گا۔" رحیم داد نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "جو کہہ رہا ہوں' وہی کروں گا اور ثابت کرکے دکھاؤں گا۔" اس کا چہرہ مضمحل ہو گیا۔ "یہ تو سوچ' تیرے سوا دنیا میں اب میرا کون ہے۔ میرے لیے تو سب کچھ تو ہی ہے۔"

جمیلہ ہنس کر بولی۔ "تم دونوں ساری گلاں اسی سے کرلو گے۔ کچھ واپسی کے لیے بھی چھوڑ دو۔"

رحیم داد نے جمیلہ کی بات سن کر اللہ وسایا سے کہا۔ "اب تو جا۔ دیر ہو رہی ہے۔ دیکھ' جلد آنے کی کوشش کرنا۔"

اللہ وسایا خاموشی سے تانگے کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جمیلہ اور بچے بھی اسی تانگے میں تھے۔ دونوں تانگے آگے پیچھے روانہ ہوئے۔ رحیم داد حویلی کے نوکروں اور نوکرانیوں کے ساتھ خاموش کھڑا تانگوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تانگے دھول اڑاتے رفتہ رفتہ دور ہوتے گئے۔ آخر ایک موڑ پر درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

رحیم داد بوجھل قدموں سے چلتا ہوا مہمان خانے میں واپس آگیا اور اپنے کمرے میں جاکر تھکا ہوا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مضمحل نظر آ رہا تھا۔ اس نے ناشتا بھی رغبت سے نہیں کیا۔ دن بھر کمرے میں رہا۔ شام کو باغ میں گیا مگر وہاں بھی دل نہ لگا۔ اسے تنہائی کا شدید احساس تھا۔ وہ جلد ہی اٹھ کر مہمان خانے میں چلا گیا اور کھانا کھا کے بستر پر لیٹ گیا۔

دوسرے روز بھی اس کی طبیعت اچاٹ رہی۔ موسم بھی دھندلا دھندلا اور بے کیف تھا۔ آسمان پر بادلوں کا غبار چھایا تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ بارش بھی نہیں ہوئی۔ فضا میں حبس تھا' گھٹن تھی۔ رحیم داد مہمان خانے سے نکلا۔ کھیتوں کی طرف گیا۔ مزارعوں سے فصل کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ واپس آیا تو جسم پسینے پسینے تھا۔ اس نے غسل کرکے لباس تبدیل کیا۔

☆

دن ڈھلے رحیم داد کا دل اور بوجھل ہو گیا۔ اس روز وہ باغ میں نہیں گیا۔ گھوڑی نکلوائی۔ اس پر سوار ہوا اور دل بہلانے کے لیے نہر کی طرف چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور بادلوں کے ایک ٹکڑے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ اس کی نارنجی روشنی سے نہر کا پانی جھلملا رہا تھا۔ رحیم داد گھوڑی دوڑاتا دور نکل گیا۔ ہلکے ہلکے جھونکے اس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ ان میں تازگی اور فرحت تھی۔ فضا میں جنگلی پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ رحیم داد کو قدرے سکون ملا۔ وہ گھوڑی

دوڑاتا چلا گیا۔ سورج ڈوب گیا۔ شام نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ فضا میں تاریکی گھلنے لگی۔

رحیم داد نے واپسی کے ارادے سے گھوڑی کی رفتار سست کی۔ گھوڑی پیاسی بھی تھی۔ وہ نیچے اترا اور اسے پانی پلانے کے لیے نہر کے قریب لے گیا۔ گھوڑی پانی پی چکی تو رحیم داد نے اسے کچھ دیر ستانے کا موقع دیا۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگ کر سیاہ پڑ گیا تھا۔ رحیم داد نہر کے قریب ریت کے ایک تودے پر بیٹھ گیا۔ اس کی قمیض پسینے سے شرابور تھی۔ نہر کی سمت سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔

واپسی کے لیے وہ گھوڑی پر سوار ہوا۔ عین اسی وقت ہلچھی کے اونچے اونچے پودوں کے گھنے جھنڈ کے پیچھے سے ماکھا نکل کر سامنے آگیا۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔

"اوئے ماکھے! تو ادھر کیسے آگیا؟"

"چوہدری! تیں نوں یہ بھی پتہ نہیں۔ وہ ادھر درختوں کے اس پار اپنا پنڈ پیراں والہ ہے۔" ماکھا نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

رحیم داد مزید بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس نے گھوڑی موڑی مگر ماکھا جھپاک سے گھوڑی کے سامنے آگیا۔ گڑگڑا کر بولا۔ "چوہدری! میری ایک گل سن لے۔"

رحیم داد نے گھوڑی ٹھہراتے ہوئے دریافت کیا۔ "تجھے کیا کہنا ہے؟" اس نے تیکھی نظروں سے ماکھا کو دیکھا۔ "میں تجھے پہلے ہی صاف صاف کہہ چکا ہوں' میں تیرا کام نہیں کر سکتا۔ میرا پیچھا چھوڑ دے۔"

"میری گل تو سن لے۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "شاہ جی اپنی گھوڑی پر آگے گیا ہے۔ واپس آتا ہی ہوگا۔"

"میں نوں اس سے کیا لینا۔ سامنے سے ہٹ۔" رحیم داد نے ڈپٹ کر بے رخی سے کہا۔ ماکھا ڈھیٹ بن کر بولا۔ "تو اسے میرے بازو کے بارے میں کہے گا تو وہ ضرور مان لے گا۔"

"پر میں نے اس سے کوئی گل شل نہیں کرنی۔" رحیم داد کے لہجے میں بدستور بیزاری تھی۔ "الگ ہٹ۔ میرا رستہ چھوڑ۔"

ماکھا گھوڑی کے سامنے سے تو ہٹ گیا مگر اس نے جھٹ رکاب میں پڑا ہوا رحیم داد کا پیر تھام لیا۔ "چوہدری! تیری ایک گل سے مجھے اپنا بازو مل جائے گا۔ مجھے تباہی سے بچا لے۔ تیری مہربانی ہوگی۔" اس نے رحیم داد کے پیر پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ رحیم داد تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ وہ گھوڑی پر گم صم بیٹھا رہا۔ شام کے سناٹے میں ماکھا کی دبی دبی سسکیاں ابھر رہی تھیں

اور اس کی پیشانی رحیم داد کے پیروں پر ٹکی ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں دور سے ٹاپیں ابھریں۔ ماکھا نے گردن اٹھا کر رحم طلب نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ گلوگیر آواز میں بولا۔

"چوہدری! وہ آرہا ہے۔ بس ذرا دیر ٹھیر جا۔ وہ یہیں سے گزرے گا۔ تو شاہ جی سے گل کر کے تو دیکھ۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ ٹاپیں رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ ماکھا گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "شاہ جی پہنچنے ہی والا ہے۔ مجھے تیرے پاس دیکھے گا تو ناراض ہوگا۔" یہ کہتا ہوا وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ساتھ ہی گڑگڑاتا رہا۔ "چوہدری! اس سے میرے بارے میں گل کر لے۔ تو کہے گا تو میرا کام بن جائے گا۔ زندگی بھر تجھے دعائیں دوں گا۔" ماکھا آنسو پونچھتا ہوا لپک کر کیکر کی ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے چلا گیا۔

رحیم داد پس و پیش میں جہاں تھا، وہیں کھڑا رہا۔ ٹاپیں بالکل قریب سنائی دینے لگیں۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ شام کے دھندلکے میں احسان شاہ اپنی گھوڑی دوڑاتا، گرد کے بادل اڑاتا، ایک موڑ سے نمودار ہوا۔ وہ رحیم داد ہی کی طرف آرہا تھا۔ آن کی آن میں وہ نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے گھوڑی کی راسیں زور سے کھینچیں۔ گھوڑی اونچی آواز سے ہنہنائی اور ٹھہر گئی۔ احسان شاہ نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔ رحیم داد نے سلام کیا۔

احسان شاہ نے سلام کا جواب دیا اور گردن اٹھا کر پوچھا۔ "میں نے تجھے پہچانا نہیں۔ پہلی بار ادھر دیکھ رہا ہوں۔"

رحیم داد نے بتایا۔ "میرا نام جی، چوہدری نور الٰہی ہے۔ کوٹ ہرکشن میں اپنی زمیں داری ہے۔"

"تو ہے چوہدری نور الٰہی!" احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ "نام تو تیرا سنا تھا، آج تجھے دیکھ بھی لیا۔" اس کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "پر آج تو ادھر کیسے نکل آیا؟"

رحیم داد نے نظر بھر کر احسان شاہ کو دیکھا۔ سن و سال کے اعتبار سے وہ چھپن ستاون سال کے پیٹے میں تھا مگر جسم مضبوط اور بھاری بھرکم تھا۔ چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ پگ کا اونچا طرہ ہوا سے آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا۔ وہ اپنے ڈیل ڈول اور وضع قطع سے بہت بارعب لگتا تھا۔

رحیم داد اس کی شخصیت سے خاصا مرعوب ہوا، ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "شاہ جی! تجھ سے ایک گل کرنی تھی۔"

"ضرور کر۔" احسان شاہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "پر یہاں کھڑے کھڑے کیا گل ہو سکتی ہے۔ اپنی حویلی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ موسم بھی سہانا ہے، وہیں آرام سے بیٹھ کر بات

چیت ہوگی۔"

رحیم داد اس کی حویلی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کترانے کی کوشش کی۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "کوئی لمبی چوڑی گل نہیں کرنی۔"

"چھوٹی ہو یا لمبی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "پر یہ تو کوئی بات کرنے کی جگہ نہیں۔"

احسان شاہ نے بات ختم ہی کی تھی کہ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ وہ بے تکلفی سے قہقہہ مار کر بولا۔ "لے چوہدری! اب تو بوندا باندی بھی شروع ہو گئی۔ آ میرے ساتھ۔ اب حویلی میں بیٹھ کر آرام سے گل بات ہوگی۔"

بارش اور تیز ہو گئی۔ رحیم داد کے لیے انکار کرنے کی گنجائش نہ رہی۔ احسان شاہ نے ایڑ لگا کر گھوڑی آگے بڑھائی۔ رحیم داد بھی چپ چاپ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دونوں گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے پیراں والہ کی جانب روانہ ہوئے۔

بارش بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پیراں والہ میں داخل ہوئے تو بارش خاصی تیز ہو چکی تھی۔ دونوں جلدی جلدی اترے۔ گھوڑیاں ملازموں کے حوالے کیں اور حویلی کے اندر چلے گئے۔ حویلی نہایت شاندار تھی۔ اس کے چاروں طرف فصیل نما اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کو ٹھیک ہی بتایا تھا کہ احسان شاہ کی حویلی دور سے پرانے زمانے کا قلعہ لگتی ہے۔ اس کا پھاٹک اس قدر اونچا تھا کہ ہاتھی گزر سکتا تھا۔ دروازے بھاری اور مضبوط لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ پھاٹک پر مسلح پہرا تھا۔

حویلی کے تین حصے تھے۔ ایک حصے میں احسان شاہ کی منکوحہ بیویاں اور بچے رہتے تھے۔ یہ حویلی کا عقبی حصہ تھا۔ سامنے کے رخ پر ڈیرا تھا جو دیوان خانہ کہلاتا تھا۔ حویلی کے نوکر چاکر اسے مہمان گھر بھی کہتے تھے۔ دیوان خانہ پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہی نظر آتا تھا۔ احسان شاہ اس دیوان خانے میں صبح شام کچہری لگاتا تھا۔ منیجر، منشیوں اور کارندوں کے ساتھ بیٹھ کر زمیں داری کے معاملات طے کرتا تھا۔ مزارعوں کے خلاف شکایات پیش ہوتیں تو ان کے مقدمات کا فیصلہ بھی دیوان خانے ہی میں کرتا تھا۔

دیوان خانے کے آگے وسیع پائیں باغ تھا۔ دیوان خانے سے متصل اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا حصہ کوٹ کہلاتا تھا۔ کوٹ میں احسان شاہ کی داشتائیں اور مزارعوں کی وہ نوجوان عورتیں قید رکھی جاتی تھیں جنہیں اغوا کر کے لایا جاتا تھا۔ کوٹ میں آمد و رفت کا صرف ایک دروازہ تھا اور

اس پر چوبیس گھنٹے مسلح پہرا رہتا تھا۔

دیوان خانے میں کشادہ ہال تھا جس پر دبیز قالین کا فرش تھا۔ جگہ جگہ صوفے اور دیوان قرینے سے رکھے تھے۔ صوفے پرانی وضع کے مگر قیمتی اور آرام دہ تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ہلکے ریشمی پردے پڑے تھے۔ احسان شاہ دیوان خانے میں داخل ہوتے ہی ہال کی جانب بڑھا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ تھا۔ دونوں ہال میں پہنچے تو نوکروں نے نہایت مستعدی سے پردے ہٹا دیئے اور کھڑکیوں کے پٹ کھول دیئے۔ ہال کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ اس میں بید کی کرسیاں پڑی تھیں۔

احسان شاہ نے ہال میں پہنچ کر گرمی محسوس کی۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری یہاں تو حبس ہے۔ باہر برآمدے میں بیٹھا جائے۔" اس نے قریب کھڑے ہوئے ملازم کی جانب دیکھا۔ "شیدے! دروازہ کھول دے۔ کرسیاں اور میز برآمدے میں ٹھیک سے لگا دے۔ یہاں گرمی ہے۔ ہم نے برآمدے میں بیٹھنا ہے۔"

"شیدا آگے بڑھا۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ باہر گیا' کرسیاں قرینے سے لگائیں اور درمیان میں میز رکھ دی۔ احسان شاہ اور رحیم داد ہال سے نکل کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ برآمدے کے آگے دور تک پھیلا ہوا نرم نرم گھاس کا لان تھا۔ اونچے اور گھنے درخت تھے۔ ان کے درمیان جگہ جگہ روشیں اور کیاریاں تھیں۔ پھولوں سے مہکتی ہوئی بھیگی بھیگی شاخیں تیز جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔

باغ میں رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بارش کے چھینٹے کبھی کبھار برآمدے میں بھی آجاتے۔ رحیم داد حویلی کی شان و شوکت اور احسان شاہ کی آن بان سے بڑا مرعوب نظر آتا تھا۔ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ احسان شاہ کی پشت پر شیدا سر جھکائے مودب کھڑا تھا۔

احسان شاہ نے اپنی پگ اتار کر شیدے کو دی' ہنس کر بولا۔ "کچھ پینے پلانے کو لا۔ دیکھ تو کیا ظالم موسم ہے۔"

شیدے نے پگ سنبھالی اور ہال کے اندر چلا گیا۔ رحیم داد ہنوز خاموش تھا۔ احسان شاہ نے اس کی جانب دیکھا' مسکرا کر پوچھا۔ "ہاں چوہدری' اب بتا' تو کیا کہنا چاہتا تھا؟"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے ماکھا کا ذکر چھیڑا۔ "شاہ جی! میں نے جو گل کرنی ہے' وہ ایسہ ہے۔"

"کوئی خاص گل ہے؟" احسان شاہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"خاص ہی گل ہے۔" رحیم داد نے آہستہ آہستہ اثبات میں گردن ہلائی۔

"تب تو آرام سے گل ہوگی۔ ایسی جلدی کیا ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اس بارش میں تو واپس جانے سے رہا۔ کوٹ ہر کشن دور ہے اور رستہ بھی کچا اور پیچ کا ہے۔ بارش تھم جائے تو روٹی کھا کر چلا جانا ورنہ رات یہیں ٹھیر جانا۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "میں نے سنا ہے' اللہ وسایا تو گھر والی اور بچوں کے ساتھ پنڈ سے باہر گیا ہے۔"

"وہ اپنی بھتیجی کے ویاہ میں شرکت کے لیے کیمبل پور گیا ہے۔"

"جب ہی تو ادھر نکل آیا۔" احسان شاہ نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "وہ پنڈ میں ہوتا تو تجھے ادھر آنے نہ دیتا۔"

رحیم داد نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا' خاموش بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد شیدا ایک ٹرے میں وہسکی کی بوتل' دو گلاس اور پانی سے بھرا ہوا جگ لے کر آگیا۔ اس نے بوتل' جگ اور گلاس میز پر رکھ دیئے۔ رحیم داد نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو بہت گھبرایا۔ اس نے پہلے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ البتہ میلوں ٹھیلوں میں بھنگ اور سادی بارہا پی چکا تھا۔ جن دنوں منٹگمری جیل میں تھا' لالی اور دوسرے قیدیوں کے اصرار پر چرس بھری سگریٹیں بھی پی لیتا تھا۔ مگر چرس پینے کی لت نہیں لگی تھی۔

شیدے نے پہلے احسان شاہ کے لیے وہسکی کا پیگ بنایا اور گلاس اس کے سامنے رکھ دیا۔ مگر جب وہ دوسرا پیگ بنانے لگا تو رحیم داد کسی قدر پریشان ہو کر بولا۔ "میرے لیے نہ بنا۔" شیدے نے ہاتھ روک لیا۔

"کیسی گل کر رہا ہے چوہدری! ایسے کافر موسم میں تو وڈے وڈے زاہدوں اور پرہیزگاروں کی توبہ ٹوٹ جاتی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ شیدا کی جانب متوجہ ہوا۔ "منہ کیا تک رہا ہے؟ اپنا کام کر۔"

اس نے نہایت مستعدی سے پیگ تیار کیا اور رحیم داد کے سامنے رکھ دیا۔ احسان شاہ نے اشارہ کیا۔ شیدا فوراً چلا گیا۔ احسان شاہ نے گلاس اٹھایا۔ رحیم داد کو مخاطب کیا۔

"چوہدری! اٹھا اپنا گلاس۔"

لیکن رحیم داد نے گلاس نہیں اٹھایا' حیران و پریشان بیٹھا رہا۔ احسان شاہ نے اصرار کیا۔ "اب تکلف شکلف چھوڑ۔ گلاس اٹھا۔"

"شاہ جی' گل ایسہ ہے۔ میں نے آج تک نہیں پی' مجھے نہ پلا۔"

"نہیں پی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آج سے شروع کر دے۔" احسان شاہ کا اصرار جاری

رہا۔ "اللہ وسایا کے رستے پر نہ چل۔ وہ تو مزارع تھا' زمیں دار بن کر بھی مزارع ہی رہا۔ وہ تجھے بھی زمیں دار نہیں بننے دے گا۔" احسان شاہ نے گلاس اٹھا کر رحیم داد کے ہاتھ میں تھما دیا' اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرایا۔ "چل' شروع ہو جا۔ میں نے آج تک کسی مہمان کی اس طرح ناز برداری نہیں کی۔" اس نے ایک ہاتھ مونچھ پر پھیرا۔ "میں متروکہ جائیداد کی لوٹ مار سے زمیں دار نہیں بنا' خاندانی جگیر دار ہوں۔ یہ حویلی میرے دادے نے بنوائی تھی۔ وہ بہت وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔ لاٹ گورنر کے دربار میں اسے کرسی ملتی تھی۔ کیا سمجھا؟"

احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ رحیم داد اس کی باتوں سے ایسا مرعوب ہوا کہ گلاس اس کے ہونٹوں تک پہنچ گیا۔ اس نے بھی گھونٹ بھرا اور منہ ذرا سا بگاڑ کر بولا۔

"شاہ جی' توں نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔"

"بچوں جیسی گلاں نہ کر۔" احسان شاہ نے ہنس کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "تیں نوں ابھی پتہ نہیں۔ زندگی کا اس کے بناں کیا مزا۔ تھوڑی سی اور لگا۔ تیں نوں خود ہی اندازہ ہو جائے گا' یہ کیا بہار دکھاتی ہے۔"

اسی وقت بادل زور سے گرجا۔ رحیم داد نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا' خاموشی سے ایک گھونٹ اور بھرا اور بھیگی ہوئی مونچھیں ہاتھ سے پونچھنے لگا۔ بارش تیز ہو گئی۔ ہوا کے نم آلود جھونکے برآمدے کے اندر آنے لگے۔ فضا میں خنکی رچ گئی۔

شیدا دو پلیٹوں میں تلے ہوئے مرغ اور تکے لے آیا۔ احسان شاہ اور رحیم داد پیتے رہے' مرغ اور تکے کھاتے رہے۔ باہر موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔

احسان شاہ بولا۔ "ہاں چوہدری' اب سنا اپنی گل' تیں نوں کیہ کہنا ہے؟ بار بار ذکر کرتا تھا۔ ایسی کیا خاص گل ہے؟"

"گل شل کیا ہے جی! وہ تیرا ایک مزارع ہے نا۔ ماکھا نام ہے اس کا۔" رحیم داد نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ احسان شاہ کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔

مگر احسان شاہ پر کوئی خاص رد عمل نہیں ہوا۔ بے نیازی سے بولا۔ "یاد تو پڑتا ہے' اپنا ایک مزارع ماکھا بھی ہے' پر چوہدری' تجھے اس سے کیا لینا۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اس کی گھر والی تیری حویلی میں ہے۔"

"ہو گی۔" احسان شاہ نے ایک تکا اٹھا کر چباتے ہوئے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "تجھے کیسے اس کی یاد آ گئی؟"

"ماکھا کئی بار میرے پاس آ چکا ہے۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "وہ اپنی گھر والی واپس لے جانا چاہتا ہے۔"

"اس کی بات نہ کر۔ وہ تو ایسے ہی سب کے پاس پہنچتا رہتا ہے۔ تیرے پاس بھی جا کر گڑگڑایا ہو گا۔ یہی گل ہے نا؟"

"ہے تو جی یہی گل۔" رحیم داد نے وہسکی کی چسکی لگا کر کہا۔ "ماکھا اپنے بازو کے لیے بہت پریشان ہے۔ کہتا تھا' اس کے بغیر وہ تباہ ہو گیا۔" رحیم داد پر اب وہسکی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ وہ پہلی بار کھل کر مسکرایا۔ "شاہ جی' وہ ۵ سال سے تیری حویلی میں ہے۔ کئی بچے بھی جن چکی ہے۔ اب وہ تیرے کس کام کی رہ گئی؟"

"کام کی تو وہ اب بھی ہے۔ چوہدری! تو نے اسے دیکھا نہیں۔" احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "بچہ جن نے کے بعد وہ اور رسیلی ہو جاتی ہے۔ تب ہی تو میں نے اس کا نام رسیلی رکھ چھوڑا ہے۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں پہلے اس کا کیا نام ہوتا تھا۔ اب تو میں اسے رسیلی ہی کے طور پر پچھانتا ہوں۔ سچ کہتا ہوں' وہ ہے بھی رسیلی۔"

"اب تو وہ بوڑھی ہو گئی ہو گی؟"

"لگتی تو وہ ابھی تک جوان ہے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تیری گل سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد نے چہرے کے تاثرات سے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں نے تو جی یہ دیکھا ہے' دو تین بچوں کے بعد تو مزارعوں اور کمیوں کی گھر والیاں ایسی مریل اور بوڑھی لگتی ہیں کہ دیکھنے کو جی نہیں کرتا۔"

"چوہدری تو بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔" احسان شاہ نے اس کی تائید کی۔ "بات یہ ہے جی! مزارعے اور کمی ان سے دن رات سخت محنت کراتے ہیں۔ پر روٹی ٹکر دینے کو ان کے پاس اتنا ہوتا نہیں کہ انھیں ٹھیک ٹھاک رکھیں۔ وہ بوڑھی اور مریل نہیں لگیں گی تو اور کیا لگیں گی۔"

"پر یہ بھی تو ہے جی' ادھر کڑی تیراں چوداں کی ہوئی' ادھر جھٹ اس کا ویاہ ہو جاتا ہے۔ پوری طرح جوان بھی نہیں ہوتی کہ ٹھکا ٹھک بچے پیدا ہونے لگتے ہیں۔"

"جبھی تو مزارعوں اور کمیوں کے گھروں میں جوان اور خوب صورت زنانیاں نظر نہیں آتیں۔" احسان شاہ نے منہ بگاڑا۔ "میں جسے بھی اٹھواتا ہوں' پہلے اسے مکھن دودھ کھلا پلا کر تیار کراتا ہوں۔ تب اس پر جوبن آتا ہے۔ وہ نکھرتی ہے۔ چہرے پر رنگ روپ آ جاتا ہے۔ بدن بھی گدازا اور کسا ہوا ہو جاتا ہے۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ چپ بیٹھا مرغ کی ٹانگ چباتا رہا۔ بارش کا زور اب ٹوٹ گیا تھا البتہ ہوا کی شوریدہ سری کم نہیں ہوئی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں نشے سے ستارے جھلملا رہے تھے۔

احسان شاہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہا۔ اس نے ہنس کر پوچھا۔ "چوہدری! کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"سوچ رہا تھا' تیری تن درستی بہت شان دار ہے۔ اب بھی جوان گبھرو لگتا ہے۔" رحیم داد نے اسے خوش کرنے کی کوشش کی۔

"اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ دو سال ادھر میرا جگر خراب ہو گیا تھا۔ تب سے صحت ذرا گر گئی۔ تو نے اس زمانے میں مجھے نہیں دیکھا۔"

"برا نہ منا تو ایک گل پوچھوں۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ "شاہ جی! تو مزارعوں کی گھر والیاں کیوں اٹھواتا ہے؟"

"مزارعوں کی زنانیاں تب اٹھواتا ہوں جب وہ سرکشی کرتے ہیں۔ ویگار سے جی چراتے ہیں۔ حرام خوری اور بد معاشی کرتے ہیں۔" احسان شاہ تیکھے لہجے میں بولا۔

"ایسے مزارعوں کو بے دخل کیوں نہیں کر دیتا؟"

"بے دخل کرنے کا سب سے آسان اور مجرب نسخہ یہ ہے' جس مزارعے کو بے دخل کرنا ہو' اس کی گھر والی اٹھوا لو۔ سمجھو اس کا ایک بازو کٹ گیا۔ وہ بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔" احسان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "ویسے کبھی کبھی مزارعوں اور کمیوں پر رعب اور دہشت بٹھانے کے لیے بھی ایسا کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ تیں نوں تو پتہ ہی ہے' مزارعوں میں ایک سے ایک نمبری' نکما اور بڑ حرام پڑا ہے۔ ذرا ڈھیل دو' جھٹ کانون چھانتا ہے' اوپر درخواستیں پہنچاتا ہے۔ خود بد معاشی کرتا ہے دوسروں کو بھی اکساتا ہے۔ زمیں داری کرنا ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ زمیں دار کا رعب اٹھ جائے تو سمجھ لے گئی زمیں داری۔ اسے چلانے کے لیے ضروری ہے' ایسا وار کرو کہ مزارع سر ہی نہ اٹھا سکے۔ عورت تو مرد کی عزت ہوتی ہے نا۔ بس اس سے وہی چھین لو۔ ہمیشہ کے لیے اس کا سر جھک جاتا ہے۔"

"پر شاہ جی! تو نے تو بہت زنانیاں رکھ چھوڑی ہیں۔ میں نے تو سنا ہے' ان کے لیے بہت وڈا کوٹ بنوا رکھا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"تو نے ٹھیک ہی سنا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "کوٹ ساتھ ہی ہے۔ دیکھنا چاہے تو ابھی دیکھ لے۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"دیکھ لوں گا' پر آج نہیں۔" رحیم داد رضامند نہ ہوا۔ "ویسے بارش بھی ہو رہی ہے۔"

"اب میں تجھے راز کی گل بتاتا ہوں۔ ان رکھیلوں سے بہت کام نکلتا ہے۔ میں تو ان کو اپنے کمرے میں رات کو کم ہی بلاتا ہوں۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "تھانے دار' تحصیل دار' اور کبھی کبھی تو ان سے بھی وڈے افسر' بلکہ اسمبلی کے ممبر بھی میری حویلی میں آ کر ٹھیرتے ہیں۔ تیرے ایسے یار دوست بھی آتے ہی رہتے ہیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ نشے کی جھونک میں لہرا کر بولا۔ "شراب کا دور بھی چلتا ہے۔ مہمانوں کی خاطر مدارت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔" اس نے بے تکلفی سے آنکھ ماری۔ "ان میں رنگین مزاج بھی ہوتے ہیں۔ ان کا دل بہلانے کے لیے یہ زنانیاں بہت کام آتی ہیں۔ نہ کسی کو بلوانے کی ضرورت نہ ڈھونڈنے شونڈھنے کا چکر۔ کوٹ میں ہر طرح کی رن موجود ہے۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔

نشے کا ریلا آیا۔ احسان شاہ کے ہاتھ میں دبا ہوا گلاس چھلک اٹھا۔ اس نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ ہنس کر گویا ہوا۔ "چوہدری اک گل اور بھی ہے۔ پتر جوان ہو گئے ہیں۔ تیں نوں پتہ ہے' جوانی تو دیوانی ہوتی ہے نا۔ چھپ چھپ کر کنجریوں کے پاس جائیں گے۔ لہور جا کر ہیرا منڈی کے چکر کاٹیں گے۔ روپیہ پیسہ برباد کریں گے۔ بدنامی الگ ہوتی ہے۔ فیر ایسا بھی تو ہے۔ کنجریوں کے پاس جائیں گے تو پوشیدہ اور خطرناک بیماریاں لگا کر لائیں گے۔" اس نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ "کوٹ کی یہ رکھیلیں ان کے کام بھی آتی ہیں۔"

"پر شاہ جی! تجھے یہ بات بری نہیں لگتی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"چوہدری! تو برائی کی گل کر رہا ہے۔ میں پوری طرح جوان بھی نہ ہوا تھا کہ پنڈ کی ایک چھوہری پر دل آ گیا۔ میں نے اسے اٹھا کر زبردستی گھوڑی پر ڈالا اور حویلی میں لے آیا۔ میں نے ایک فلم میں ہیرو کو اسی طرح ہیروئن کو اٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" احسان شاہ بتاتا رہا۔ "وہ جی کمہاروں کی چھوہری تھی۔ وہ اکٹھے ہو کر پیچھے پیچھے آئے۔ بہت رولا گولا کیا۔ اسی دیوان خانے میں میرے پیو کے سامنے مکدمہ پیش ہوا۔ میں بہت ڈرا۔ میرا پیو بہت رعب داب والا زمیں دار تھا۔ کمہاروں کی شکایات سنتے ہی بھڑک اٹھا۔ سب کو الٹا لٹکا کر جوتے لگوائے۔ اسی روز ان کی کئی کڑیاں اور جوان زنانیاں اٹھوا لیں۔ کئی روز سب کو جیل میں بند رکھا۔ اس کی اپنی جیل ہوتی تھی۔ اسی حویلی میں ایک تہ خانہ ہے۔ پہلے وہ جیل کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جو مزارع یا کمی سرکشی یا نافرمانی کرتا' اس میں ڈال دیا جاتا۔"

"تو بھی اسے جیل کی طرح کام میں لاتا ہے؟"

"نہیں میں نے اسے ختم کردیا۔ دو کیدی مرگئے تو پنڈ کے مزارعوں اور کمیوں نے بہت شو مچایا۔ آس پاس کے مزارعے اور کسان بھی ان کے ساتھ لگ گئے۔ انھیں دبانے کے لیے پولیس بلانا پڑا۔ معاملہ تو دب گیا پر میں نے اس کے ساتھ ہی جیل بھی ختم کردی۔ تہہ خانے میں اب تو غا رکھا جاتا ہے۔"

"کمہاروں کی چھوہری اٹھالایا تو تیرے پیؤ نے تجھے کچھ نہیں کہا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"کچھ تو ناراض ہوا ہوگا؟"

"بالکل ناراض نہیں ہوا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ ماں جی کے پاس جاکر ہنستے ہوئے بولا لے نیک بخت' تیرا پتر جوان ہوگیا۔ زور آور بھی ہے۔ تکڑا زمیں دار بنے گا۔" احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "میں اپنے پیؤ کا اکلوتا پتر تھا۔ لاڈلا بھی بہت تھا۔" اس نے نظر بھر کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "بعد میں تو جی' اس کی رکھیلیں اپنے کام میں آنے لگیں۔ اس نے ایک سے ایک زبردست دانا چھانٹ کر رکھ چھوڑا تھا۔ میرا پیؤ بھی یوں سمجھ لے بادشاہ ہوتا تھا۔ رعب ایسا زبردست تھا کہ مزارعے اور کمی اس کے نام سے کانپتے تھے۔ سر اٹھا کر اس کے روبہ رو بات نہیں کرسکتے تھے۔"

"ایک گل سمجھ نہیں آئی۔ تو جن زنانیوں کو اٹھواتا ہے' کوٹ میں رکھتا ہے' ان کے گھر والے انھیں واپس لے جاتے ہیں۔ وہ برا نہیں مناتے؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "ان کی غیرت ذرا نہیں جاگتی؟"

"تو غیرت کی گل کر رہا ہے۔ وہ تو انھیں واپس لینے کے لیے منت کرتے ہیں' پیر پکڑتے ہیں۔ کئی تو ایسے ہوتے ہیں' منہ مانگی کیمت ادا کرکے لے جاتے ہیں۔"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟"

"یہ سوال تو اسمبلی میں بھی اٹھایا گیا تھا۔ ہوا یہ کہ بیگم شاہنواز نے زنانیوں کے حکوک کے لیے اسمبلی میں بہت زبردست تکریر کی۔ گلہ کیا کہ انھیں کوئی حکوک حاصل نہیں۔ مردوں نے ان کے سارے حکوک دبا رکھے ہیں۔ اپنا غلام بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔ ملک فیروز خاں نون بھی ان دنوں اسمبلی کا ممبر ہوتا تھا۔ وہ جھٹ کھڑا ہوگیا۔ ایسا مسکت جواب دیا کہ بیگم شاہنواز چپ کرکے رہ گئی۔"

"کیا جواب تھا اس کا؟ میں بھی سنوں۔"

"اس نے گرج کر کہا' بیگم شاہنواز کو پتہ نہیں' پاکستان میں زنانیوں کو کتنے حکوک حاصل ہیں۔

میں اس سلسلے میں اپنے ایک مزارعے کا ذکر مثال کے طور پر ایوان کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں' جس سے پوری طرح اندازہ ہوجائے گا' مردوں کے مکابلے میں عورتوں کو کتنے زیادہ حکوک ملے ہوئے ہیں۔ میرے مزارعے کا نام کرم دین ہے۔ اس کے بارے میں میرے پاس شکائتیں پہنچیں کہ اسے اپنی عزت آبرو کا ذرا لحاظ نہیں۔ میں نے اسے بلا کر ایک روز پوچھا' کرمے! میں نے سنا ہے تیری گھر والی نے کسی سے یاری لگا رکھی ہے۔ تو اسے کچھ نہیں کہتا۔ تیری غیرت نہیں جاگتی؟ وہ بولا' ملک صاحب! ہے تو یہ بالکل سچی گل۔ میری گھر والی نے پنڈ کے لوہار سے یاری لگا رکھی ہے۔ وہ ہر رات اس کے پاس چلی جاتی ہے۔ میں نے اسے بہت منع کیا۔ جھگڑا کیا' پر وہ نہیں مانتی۔ میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ گل ایہہ ہے جی۔ وہ سویرے ہی سویرے واپس آجاتی ہے۔ ڈھور ڈنگروں کو چارہ پانی دیتی ہے۔ میرے لیے روٹی تیار کرتی ہے۔ شام تک سارے ہی کام کرتی رہتی ہے۔ بچوں کو روٹی کھلا کر سلاتی ہے۔ میرے پاس آکر پوچھتی ہے اور کوئی کام تو نہیں کرنا؟ میں جب تک روکتا ہوں' رک جاتی ہے' فیر لوہار کے پاس چلی جاتی ہے۔ ملک صاحب! میں نے اس سے اور کیا لینا۔ دن بھر تو وہ میری گھر والی ہی رہتی ہے نا۔ ویسے کبھی کبھار رات کو میرے پاس ٹھیر بھی جاتی ہے۔ پر یہ اس کی مرضی پر ہے۔" احسان شاہ نے نشے کی ترنگ میں زور کا قہقہہ لگایا۔ "تو ہی بتا فیروز خاں نے کیسی زبردست دلیل پیش کی۔ اور سچ پوچھ تو بالکل صحیح پیش کی۔"

"تو نے جو کچھ بتایا' کیا یہ سچ ہے؟"

"بالکل سچ ہے۔" احسان شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "ملک فیروز خاں نون کی یہ تکریر تو دستور ساز اسمبلی کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ سارے ہی اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ میں نے بھی اسے اخبار ہی میں پڑھا تھا۔ میں کب اسمبلی میں بیٹھا تھا۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ بارش اب رک چکی تھی۔ رحیم داد نے گردن اٹھا کر باہر دیکھا اور برآمدے میں چھائی ہوئی خاموشی توڑی۔ "پانی تو اب تھم چکا ہے۔" اس نے احسان شاہ کا چہرہ نظر بھر کر دیکھا۔

"شاہ جی! میری گل کا اب تک کوئی جواب نہیں ملا؟"

"کون سی گل؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"وہی ماکھے کے بازو کی واپسی کی گل۔" رحیم داد نے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "شاہ جی! میری خوشی ہے کہ تو اس کی گھر والی واپس دے دے۔"

"چوہدری' تو کہتا ہے تو دے دوں گا۔" احسان شاہ رضامند ہوگیا۔ "پر ماکھا اس کا ناس مار دے

گا۔ تونے اسے دیکھا نہیں۔ بہت زوردار جٹی ہے۔ ایک نمبر دانا ہے۔"

"وہ جیسی بھی ہے' میں چاہتا ہوں تو اسے ماکھے کے حوالے کر دے۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔ "شاہ جی! تیں نوں یہ بات مانی ہوگی۔"

"میں نے کب انکار کیا۔ تیری گل ضرور مانوں گا۔ اب تو تجھ سے یاری ہو گئی ہے۔" احسان شاہ نے سرخوشی کے عالم میں کہا۔ "پر ایک شرط پر واپس کروں گا۔"

"کیا شرط ہے؟ وہ بھی بتا دے۔"

"تو آج رات یہیں ٹھہرے گا۔ ویسے بھی رستہ خراب ہے۔ بارش کیچڑ میں اتنی رات گئے کیسے واپس جائے گا؟"

"شاہ جی! تیری یہی شرط ہے تو ٹھہر جاؤں گا۔" رحیم داد ہنس کر بولا۔ وہ واپسی کے متعلق پہلے ہی تذبذب میں مبتلا تھا۔ احسان شاہ نے زور دیا تو وہ بلا جھجک ٹھہرنے پر راضی ہو گیا۔

"پر چوہدری تو نے میری پوری گل نہیں سنی۔"

"وہ بھی بتا دے۔" رحیم داد بدستور مسکراتا رہا۔

"شرط ورط کیا ہے' یوں سمجھ لے' یہ میری خوشی ہے۔ ریشی آج تیرے کمرے میں رہے گی تاکہ تجھے بھی پتہ چل جائے' میں نے ۵ سال سے اسے اپنے پاس کیوں رکھ چھوڑا ہے۔"

"نہیں شاہ جی! ایسا نہیں ہوگا۔" رحیم داد نے صاف انکار کر دیا۔

"تو جوان بندہ ہے۔" احسان شاہ نے تیوری پر بل ڈال کر تیکھے لہجے میں کہا۔ "جانے تو نے کیسی زمینداری کی ہے۔ اللہ وسایا کی طرح تو بھی پہلے مزارع تو نہیں رہ چکا ہے؟"

رحیم داد سراسیمہ ہو گیا۔ اس نے جھٹ صفائی پیش کی۔ "ایسی گل نہیں۔ میں کتنا وڈا زمیندار تھا' یہ تو میرا کلیم دیکھ کر تو اندازہ لگا سکتا ہے۔" اس نے بات بنائی۔ "گل ایہہ ہے جی! میرا پیو تھا تو وڈا زمیندار پر بہت نیک بندہ تھا۔ اس نے میری ماں کے سوا زندگی بھر کسی دوسری زنانی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔"

"پر تو اپنے پیو کے رستے پر چل کر ادھر زمینداری نہیں چلا سکتا۔ مزارعے تیرے بس میں نہیں آئیں گے۔ ان کو دبا کر رکھنے کے لیے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔" احسان شان نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے اصرار کیا۔ "تجھے میری یہ گل تو ماننی ہی پڑے گی۔ دیکھ' ضد نہ کر۔ میں نے تیری گل مانی ہے تو تجھے بھی میری گل ماننی ہوگی۔" وہ نشے سے جھوم کر ہنسا۔ "اب یاری کی ہے تو اسے نباہنا بھی پڑے گا۔ میں تو یاروں کا یار ہوں۔"

احسان شاہ نے گلاس ختم کیا۔ شیدا کو بلایا۔ وہ آیا تو اسے کھانا چننے کی ہدایت کی۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔

کھانے کا کمرہ برابر ہی تھا۔ دونوں نے وہاں جا کر کھانا کھایا۔ کھانا مرغن اور خوش ذائقہ تھا مگر رحیم داد زیادہ نہ کھا سکا۔ کھانے سے فارغ ہو کر احسان شاہ حویلی کے زنان خانے کی جانب چلا گیا۔

☆

دیوان خانے کا ایک دروازہ ایک طویل راہداری میں کھلتا تھا۔ آگے مختصر باغیچہ تھا۔ باغیچے کے ایک طرف برآمدہ تھا۔ اس میں ایک سلسلے سے کئی کمرے تھے جو مہمانوں کے قیام کے لیے تھے۔

شیدا نے ایک کمرے میں رحیم داد کو پہنچا دیا۔ کمرہ خوب ہوادار تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ کمرے کے ایک طرف مسہری بچھی تھی۔ اس پر اجلا بستر تھا۔ قریب ہی میز رکھی تھی۔ اس پر لیمپ روشن تھا۔ شیدا اسے کمرے میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے لیمپ کی لو مدھم کر دی۔ بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بجلی بھی کڑک رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی باغ کی جانب کھلتی تھی۔ ہوا کے بھیگے ہوئے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا کہ دھندلی روشنی میں ایک عورت دہلیز کے پاس کھڑی دروازہ بند کر رہی ہے۔ اس کی پشت رحیم داد کی جانب تھی۔ وہ سبز کنارے کا سرخ ریشمی لاچا باندھے ہوئے تھی۔

دروازہ بند کرنے کے بعد وہ مڑی۔ اس کا رنگ چمپئی تھا۔ صورت شکل گوارا تھی۔ البتہ آنکھیں روشن اور خوب صورت تھیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی ناک کا کوکا درست کیا اور آہستہ آہستہ رحیم داد کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ پچیس چھبیس سال کی جوان اور صحت مند عورت تھی۔

رحیم داد خاموش لیٹا رہا۔

عورت چپ چاپ آ کر پائنتی کی جانب بستر پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ بادل ایک بار زور سے گرجے۔ بارش تیز ہو گئی۔ رحیم داد تکیے کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ عورت کو ایک ٹک دیکھتا رہا' پھر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"تو ماکھے کی گھر والی ہے؟"

"ہاں جی! میں اس کی گھر والی ہوں۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

"تیرا نام کیا ہے؟" رحیم داد نے بات چیت آگے بڑھائی۔

"نام تو جی میرا سگراں ہے پر شاہ جی مجھے رسیلی کہتا ہے۔ اب سب اسی نام سے پکارتے ہیں۔" وہ آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ "تو نے ماکھے کا نام لیا' تو اسے جانتا ہے؟"

"ہاں۔" رحیم داد نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ "یہ بتا' تجھے کبھی وہ یاد بھی آتا ہے؟"

"آتا تو ہے۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے جی۔" رسیلی کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔ "پنج سال سے اوپر ہو گئے میں نے اسے نہیں دیکھا۔"

"اگر شاہ جی تجھے واپس بھیج دے' تو اس کے پاس چلی جائے گی؟"

"کیوں نہیں چلی جاؤں گی۔ وہ میرا گھر والا ہے۔"

"وہ تجھ سے دن رات محنت کرائے گا' نہ کھانے کو ٹھیک طرح روٹی دے گا۔ نہ ایسے عمدہ کپڑے لتے پہننے کو دے گا اور نہ تجھے ایسا آرام ملے گا' جو یہاں حویلی میں مل رہا ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تو یہ سب کچھ چھوڑ کر اس کے پاس چلی جائے گی؟"

"یہ بھی کوئی زندگی ہے جی۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی' دبا دبا کرب تھا۔ "کبھی شاہ جی کے ساتھ سوتی ہوں' کبھی اس کے پتروں کے ساتھ۔ تیرے ایسے مہمان ادھر آکر ٹھیرتے ہیں' تو ان کے ساتھ بھی سونا پڑتا ہے۔" اس کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ "کئی تو ایسے مہمان آتے ہیں' پوری روشنی میں سارے کپڑے لتے اترا دیتے ہیں۔ شراب کے نشے میں جانے کیسی گندی گندی حرکتیں کرتے ہیں۔ میں تجھے کیا کیا بتاؤں؟ کیسے بتاؤں مجھ پر کیا کیا بیتی ہے؟" اس نے گہری سانس بھری' چہرہ غم زدہ ہو گیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ رحیم داد' دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ ٹھیک سے نہ دیکھ سکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ رسیلی بھی خاموش رہی۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کے بھیگے ہوئے جھونکے کمرے کے اندر آتے' لیمپ کی لو بار بار بھڑکتی' دونوں کے سائے دیوار پر لہرا کر گڈمڈ ہو جاتے۔ پھر رسیلی کی آواز خاموشی میں ابھری۔ "مجھے جھونک آرہی ہے' تو نہیں سوئے گا؟" اس نے انگڑائی لی۔

"تو کہہ تو لیمپ بجھا کر کپڑے اتار دوں۔"

اس نے یہ باتیں ایسی بے باکی اور دھڑلے سے کہیں کہ رحیم داد حیرت سے چونک پڑا۔ نظریں اٹھا کر رسیلی کو دیکھا' منہ بگاڑ کر کسی قدر حقارت سے گویا ہوا۔ "تجھے اس طرح گل کرتے لاج بھی نہیں آتی؟"

"کیسی لاج' اور کیسی عزت۔" اس نے تیکھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "پنج سال سے اوپر

ہو گئے' اور تو مجھ میں لاج ڈھونڈتا ہے۔ وہ میرے پاس رہی کہاں۔ مزارعوں اور کمیوں کی کڑیوں اور گھر والیوں کی عزت اور آبرو ہوتی ہی کب ہے؟ عزت شجت تو زمیں دارنیوں کے پاس ہوتی ہے۔ وہ تو اپنے شریکوں کے سامنے بھی اوڑھنی کا بکل مار کر' منہ چھپا کے بیٹھتی ہیں۔ تانگے اور موٹر میں سوار ہو کر کہیں جاتی ہیں تو چاروں طرف چدر باندھ دی جاتی ہے۔" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے منڈلانے لگے۔ "اپنا حال ایسا ہے۔ دو برس ہوئے۔ اسی کمرے میں ایک وڈا افسر آکر ٹھیرا۔ اس نے ایک نہیں' دو لیمپ جلوائے اور سویرے تک ننگا نچوایا۔"

"وہ تجھ سے اتنا نراض کیوں ہو گیا تھا؟"

"میں نے جی اس سے صرف اتنی گل کی تھی کہ جب اس نے پوری روشنی میں میرے کپڑے اتروانے چاہے تو میں نے انکار کر دیا۔ صاف' صاف کہہ دیا' میں کنجری نہیں ہوں۔ فیر تو جی' وہ اتنا نراض ہوا کہ خود تو آرام سے بیٹھا شراب پیتا رہا' اور مجھے ننگا نچواتا رہا۔ تھک جاتی تو گالاں نکالتا۔ کبھی گلاس میں بھری ہوئی شراب اچھالتا۔ گر پڑتی تو اپنی چمڑے کی پیٹی سے مارتا۔ منہ میں پیشاب کرنے کی دھمکی دیتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"تو نے منت سماجت نہیں کی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"بہت کی جی۔ پر وہ تو جی نشے میں دھت ہو رہا تھا۔" رسیلی نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "اب تو یہ بات پرانی ہو گئی۔ اس کے بعد تو جو جیسا کہتا ہے' ویسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ مہمان نراض ہو جائے اور شاہ جی سے شکایت لگا دے تو وہ گندی' گندی گالاں نکالتا ہے۔ زور زور سے ٹھڈے مارتا ہے۔"

"شاہ جی' جن دوسری زنانیوں کو اٹھوا کر یہاں لاتا ہے' وہ سب ایسا ہی کرتی ہیں؟"

"کرنا ہی پڑتا ہے جی۔ ایسا نہ کریں تو شاہ جی چمڑی ادھیڑ ڈالے۔" اس کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ "روٹی ٹکر بند کر دیتا ہے۔ کئی کئی روز بھوکا رکھتا ہے۔"

"میں بھی شاہ جی کا مہمان ہوں۔" رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔ "میرے بارے میں تو نے کیا سوچ رکھا ہے؟"

"میں نوں کیہ پتہ تو کیسا بندہ ہے۔" اس نے دبی زبان سے کہا۔ "جب تو نے مجھے اپنے کول ای لیا تو میں نوں تیرے بارے میں کیہ سوچنا۔"

"میں نے تجھے نہیں بلوایا۔ تو واپس چلی جا۔"

"کیسے جا سکتی ہوں۔ دروازے پر شیدے کی ڈیوٹی لگی ہے۔ اس نے شکایت لگا دی تو شاہ جی

میرے گلے پڑ جائے گا۔ تو اسے نہیں جانتا۔ وہ بہت ظالم ہے۔ روٹی تو ٹھیک ٹھاک کھلاتا ہے
کپڑے لتے بھی بنوا کر دیتا ہے پر ظلم بھی ایسے ہی کرتا ہے۔"

"ایسا کر ریلی!" رحیم داد نے کمرے میں پڑے ہوئے قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا
"تو اس پر سوجا۔ میں نوں تجھ سے کچھ نہیں لینا۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ "تو سچ کہہ رہا ہے۔" مگر فوراً ہی اس کا چہرہ مرجھا گیا۔ "لگتا ہے' میں تجھے
پسند نہیں آئی۔"

"ایسی کوئی گل بات نہیں۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ چند لمحے خاموش رہا' پھر اس نے کرید
پوچھا۔ "یہ بتا' تیرے پیٹ میں تو بچہ تھا نا؟ ماکھا ہی بتا تا تھا۔"

"تھا تو' پر حکیم جی نے پرانے چھپر کا پھوس اور گڑ ملا کر کھلایا۔ دوائی بھی دی۔ حمل گر گیا۔
ٹھیک ہو گیا۔ پر بہت تکلیف ہوئی جی۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ دبی زبان سے پوچھا
"ماکھا تجھے کہاں ملا تھا؟"

"وہ مجھے کئی بار مل چکا ہے۔ تیرے لیے بہت پریشان رہتا ہے۔"

"پریشان تو جی رہتا ہی ہو گا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ "میں اس کے لیے کم پریشان رہتی ہوں
شروع شروع میں تو بہت یاد آتا تھا۔ چھپ چھپ کر روتی تھی۔ شاہ جی کو پتہ چل جاتا تو گالاں نکا
روٹی بند کر دیتا۔ وہ تو جی رونے بھی نہیں دیتا۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے گہری سوچ میں ڈوب گئی
رحیم داد نے پوچھا۔ "کیا سوچنے لگی؟"

"ماکھے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں

"کیسا ہے وہ؟"

"لگتا ہے' تو اسے ابھی تک بہت یاد کرتی ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "پر اب تو اس
لیے پریشان نہیں رہے گی۔ کل سویرے وہ یہاں آکر تجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

"نہیں جی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا
وہ شاہ جی کے پاس بار بار آتا رہا' منت ساجت کی' پیروں پر سر رکھ دیا پر شاہ جی نہ مانا۔ اب وہ
مان جائے گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "گوٹ کی جس زنانی سے اس کا جی بھر جاتا ہے' اسے
دیتا ہے۔ واپس بھی کر دیتا ہے پر اس کے لیے لمبی رقم مانگتا ہے۔ ماکھا مجھے واپس لینے کے لیے
سے اتنا روپیہ لائے گا؟ تیری گل سمجھ نہیں آئی۔"

"کل سویرے تجھے سمجھ آجائے گی۔" رحیم داد نشے سے جھوم کر بولا۔ ریلی نے رحیم داد

گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات صاف چغلی کھا رہے تھے کہ اسے رحیم داد کی
بات پر یقین نہیں آیا۔ مگر اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ رحیم داد کسی قدر بیزاری سے بولا۔

"اب میں نوں سونے دے اور خود بھی سوجا۔ کل تیرا ماکھا' تجھے آکر لے جائے گا۔" وہ ٹانگیں
پھیلا کر لیٹ گیا۔

ریلی خاموشی سے اٹھی اور قالین پر جا کر بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی' پھونک مار کر لیمپ
بجھا دیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ باہر ابھی تک بارش ہو رہی تھی۔ تیز ہوا درختوں کی شاخوں سے
الجھ کر پھڑ پھڑا رہی تھی۔ رحیم داد پر نیند کا غلبہ ہوا۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

سویرے اس کی آنکھ کھلی تو کمرہ خالی تھا۔ ریلی جا چکی تھی۔ بارش بھی بند ہو چکی تھی۔ کمرے
کے باہر صبح کا اجالا پھیلا تھا۔ رحیم داد اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد شیدا آگیا۔ کمرے سے
متصل غسل خانہ تھا۔ شیدا نے رحیم داد کو غسل خانے میں پہنچا دیا۔

رحیم داد نہا دھو کر غسل خانے سے نکلا تو برآمدے کے سامنے باغیچے میں ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی
تھی۔ درخت رات کی بارش سے ابھی تک بھیگے ہوئے تھے۔ وہ شیدا کے ہم راہ کھانے کے کمرے
میں چلا گیا۔ میز پر ناشتا لگایا جا چکا تھا۔ رحیم داد کے پہنچنے کے چند ہی منٹ بعد احسان شاہ بھی آگیا۔
وہ اس وقت بوسکی کا لمبا کرتا اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ کرتے میں سونے کے بٹن لگے تھے جن
پر جڑے ہوئے پکھراج کے نگینے جھل ملا رہے تھے۔

رحیم داد کو دیکھتے ہی احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "چوہدری! آرام نال نیند آئی؟ کوئی تکلیف تو
نہیں ہوئی؟" وہ کرسی کھسکا کر رحیم داد کے مقابل بیٹھ گیا۔ اس نے لسی کا گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ
چڑھا گیا۔ مونچھیں ہاتھ سے صاف کیں' کھل کر مسکرایا۔ رحیم داد کی جانب ذرا سا جھکا۔

"رن کیسی تھی؟"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "شاہ جی! میں نوں اپنے پنڈ واپس جانا ہے۔
ادھر سب پریشان ہوں گے۔ کسی کو پتہ نہیں' میں رات تیری حویلی میں رہا۔"

"کسی کو پتہ نہ چلے تو ٹھیک ہی ہے۔" احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ "اور اللہ وسایا کو تو بالکل پتہ
نہیں چلنا چاہیے۔"

"یہ تو میں بھی چاہتا ہوں' اسے پتہ نہ چلے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "میں نوں
پتہ ہے' تیری اس کے ساتھ پرانی لگتی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا تو برا منائے گا۔"

"اس بارے میں تو میں تجھ سے آگے آرام سے گل بات کروں گا۔ تجھے کئی باتیں بتانی ہیں۔ تو

ابھی کچھ نہیں جانتا۔"

رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلا اور مطلب پر آگیا۔ "شاہ جی! تو نے ماکھے کے بارے میں کیا سوچا؟"

"سوچنا کیا ہے۔ تجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کروں گا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ویسے بھی اب تیری گل تو ماننی ہی پڑے گی۔ یارانہ جو ہو گیا۔ ساتھ بیٹھ کر پینے کے بعد تو سمجھ لے' یاری پکی ہو گئی' اس پر مہر لگ گئی۔ ایسی یاری دوستی کبھی نہیں ٹوٹتی' زندگی بھر چلتی ہے۔ ابھی نہیں' آگے تجھے اس کا ٹھیک سے اندازہ ہو جائے گا۔"

رحیم داد مسکرایا اور احسان شاہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرم جوشی سے بھینچ لیا۔ رحیم داد کا قیاس غلط نہیں نکلا۔ احسان شاہ کے چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے شیدا کو بلایا۔ اسے ہدایت کی کہ ماکھا کو اس کے گھر سے بلا لائے۔ پھر وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چوہدری! تیں نوں اتنا بتا دوں کہ ماکھا' ریلی کا ناس مار دے گا۔ دو چار مہینے بعد ہی دیکھ لینا' وہ کھانگڑ اور مریل مج بن کر رہ جائے گی۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "میں نوں تو یہ خوشی ہے' شاہ جی' تو نے میری بات مان لی۔"

احسان شاہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

دونوں ناشتے سے فارغ ہو کر برآمدے میں گئے اور اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سامنے لان پر ہلکی زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بھیگی ہوئی گھاس پر بارش کے قطرے جھل ملا رہے تھے۔ آسمان بارش کے بعد گہرا نیلا نظر آ رہا تھا۔ بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے بلندی پر ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ہوا دھیمی تھی۔ حویلی کی دیواریں ابھی تک گیلی تھیں۔ احسان شاہ خوش گوار موڈ میں تھا۔ چہرے پر تازگی اور ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔

مگر جیسے ہی ماکھا سر جھکائے شیدا کے ہم راہ سامنے آیا' احسان شاہ کے چہرے سے تازگی اڑ گئی' تیوری پر بل پڑ گئے۔ آنکھوں سے جھنجلاہٹ جھلکنے لگی۔ ماکھا چند لمحے خاموش کھڑا رہا' پھر وہ جھکا اور تیزی سے آگے بڑھ کر احسان شاہ کے قدموں پر گر پڑا' پیر پکڑے اور زار و قطار رونے لگا۔

احسان شاہ اور برہم ہو گیا۔ اس نے غصے سے ماکھا کی کمر پر ٹھوکر لگائی۔ گرج کر بولا۔ "سدھا کھڑا ہو۔ زنانیوں کی طرح میرے سامنے ٹسوے نہ بہا۔"

احسان شاہ خاموش بیٹھا غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ماکھا اٹھ کر سیدھا ہو گیا تھا اور ایک

گوشے میں ڈرا سہا نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ احسان شاہ نے مڑ کر قریب کھڑے ہوئے شیدا کو دیکھا' تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔

"شیدے! ریلی اور اس کے بچوں کو یہاں لے آ۔"

رحیم داد نے احسان شاہ کو اس طرح جلال کے عالم میں دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ اس نے کچھ کہا نہیں۔ چپ بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد شیدا کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی ریلی بھی آ گئی۔ اس کے ہم راہ چار چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ ریلی کا لباس بدلا ہوا تھا۔ وہ نہا دھو کر آئی تھی اور نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔ مگر اس کے بچے اتنے ہی گندے تھے۔ لباس بھی ان کے جسم پر میلے اور بوسیدہ تھے۔

احسان شاہ نے نظر بھر کر ریلی کو دیکھا اور حاکمانہ انداز میں پوچھا۔ "ماکھا تجھے لینے آیا ہے' تو اس کے ساتھ جائے گی؟" ریلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے گھبرائی ہوئی خاموش کھڑی رہی۔ ماکھا ہونق کی طرح منہ اٹھائے اسے بے چینی سے دیکھتا رہا۔ رحیم داد بھی ریلی کی خاموشی پر حیرت زدہ تھا۔

احسان شاہ نے ریلی کی جانب ایک بار پھر دیکھا' اونچی آواز سے بولا۔ "چپ کر کے کیوں کھڑی ہے؟ صاف صاف بتا' تو نے ماکھے کے ساتھ جانا ہے کہ نہیں۔ اپنی مرضی بتا' کیا چاہتی ہے؟"

"میری کیا مرضی ہے جی!" ریلی نے سر اٹھائے بغیر رسان سے کہا۔ "جو حکم کرے گا ویسا ہی کروں گی۔"

"میرے حکم کو چھوڑ' اپنی گل کر۔"

"چلی جاؤں گی جی اس کے ساتھ۔" ریلی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا گھر والا ہے' ویاہ کر لایا ہے۔"

"لے سنبھال اپنا بازو اور اس کے چھوہرے' چھوہریاں۔" احسان شاہ نے ماکھا سے کہا۔ پھر رحیم داد کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "چوہدری کی خاطر واپس دے رہا ہوں۔ اس کی گل تو میں نے ماننی ہی تھی۔"

ماکھا ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "تیری مہربانی ہے شاہ جی۔"

احسان شاہ خاموش بیٹھا رہا۔ ماکھا نے چھوٹے بچے کو گود میں اٹھا لیا' ریلی کا ہاتھ تھاما' احسان شاہ کی جانب خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔ اس سے اجازت چاہی۔

"اسے لے جاؤں جی؟"

"لے جا۔ دفع ہو یہاں سے۔" احسان شاہ نے بے زاری سے کہا۔

ماکھا آگے بڑھا' رسیلی اس کے ساتھ چلی۔ بچے بھی اس کے ہم راہ تھے۔ وہ سب آہستہ آہستہ برآمدے سے نکل گئے۔

رحیم داد نے احسان شاہ کا شکریہ ادا کرنے کے انداز میں کہا۔ "شاہ جی! تیری بہت بہت مہربانی۔ تو نے میری بات کی لاج رکھ لی۔" اس کے لہجے سے خوشامد آشکارہ تھی۔

"چوہدری میں یاروں کا یار ہوں۔" احسان شاہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "آگے بھی آزما لینا۔ احسان شاہ کو اپنی بات کا ہمیشہ دھنی پائے گا۔ ایک بار وعدہ کرلوں گا تو اسے ضرور پورا کروں گا۔"

رحیم داد نے کچھ دیر ٹھہر کر جانا چاہا تو احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ "اب تجھ سے آئندہ بھی ملنا جلنا رہنا چاہیے۔ تو اپنا پڑوسی زمیں دار ٹھیرا۔ آپس میں میل ملاپ بہت ضروری ہے۔ ایک دوسرے سے کام پڑتا ہی رہتا ہے۔" وہ بے تکلفی سے ہنسا۔ "دیکھ یہ آخری ملاقات نہیں ہونی چاہیے۔ یہاں آتا جاتا رہے گا تو میرا بھی چنگا وکت کٹے گا۔ تیرا دل بھی بہل جائے گا۔"

رحیم داد نے ایک بار پھر احسان شاہ کا شکریہ ادا کیا۔ احسان شاہ اسے رخصت کرنے حویلی کے پھاٹک تک آیا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ پیٹھ تھپک کر بولا۔ "تجھ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" رحیم داد نے علیحدہ ہوتے ہوئے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔ اپنی گھوڑی پر سوار ہوا اور کوٹلہ ہرکشن کی سمت روانہ ہوگیا۔

رات بھر کی بارش کے بعد پانی اور کیچڑ سے راستہ بہت خراب ہوگیا تھا۔ رحیم داد گھوڑی سنبھال سنبھال کر دوڑا رہا تھا۔ وہ گاؤں میں داخل ہوا تو پہردن گزر چکا تھا۔ مہمان خانے کا ملازم' احمد اس کے انتظار میں پریشان بیٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی اس نے جلدی سے پوچھا۔

"چوہدری! تو اب تک کہاں رہا؟ رات زبردست بارش ہوئی۔"

رحیم داد نے حیلے سے کام لیا۔ "گھوڑی دوڑاتا نہر کے پار دور تک نکل گیا۔ واپسی پر بارش شروع ہوگئی۔ عالم پور نزدیک ہی تھا' ادھر چلا گیا۔ وہاں کے ایک زمیں دار سے اپنی جان پہچان ہے۔ بارش بہت تیز تھی۔ رات اسی کے پاس ٹھیر گیا۔"

"ہاں جی! اتنی زور کی برکھا میں واپسی کیسے ہو سکتی تھی؟" احمد نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ "ناشتا لے آؤں تیرے لیے؟"

"نہیں' ناشتا میں نے ادھر ہی کرلیا تھا۔ بہت تھک گیا ہوں' اب آرام کروں گا۔ تو زجا۔"

احمد چلا گیا۔ رحیم داد بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا۔ دن ڈھلے تک پڑا سوتا رہا۔ بیدار ہوا تو جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے غسل کیا' لباس تبدیل کیا اور باغ میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ شام تک تنہا بیٹھا رہا۔ رات کا کھانا کھا کر وہ مہمان خانے میں واپس چلا گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ اللہ وسایا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے بغیر رحیم داد کو شدید احساس تنہائی ہوا۔ گاؤں میں کسی اور سے اس کا میل جول نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی ایسا تھا جس سے میل جول پیدا کیا جاتا۔ سارے ہی مزارعے اور کمی تھے۔ مگر تنہائی سے اکتانے کے باوجود نہ اس نے گھڑسواری کی' نہ نہر کی جانب گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ احسان شاہ سے دوبارہ مڈبھیڑ نہ ہو جائے اور وہ اصرار کرکے اپنے ہم راہ پیراں والہ نہ لے جائے۔ وہ اب احسان شاہ سے ملنا اور اس کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔

☆

اس شام موسم بڑا سہانا تھا۔ دوپہر تک بارش ہوتی رہی۔ دن ڈھلے بادل چھٹ گئے' مطلع صاف ہوگیا۔ گرد و غبار سے اٹے ہوئے درختوں اور پودوں کے پتے بارش سے دھل کر خوب صاف ستھرے ہوگئے تھے' ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں میں دمک رہے تھے۔ ہوا سنساتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس میں فرحت اور تازگی تھی۔ رحیم داد باغ میں خاموش بیٹھا نکھری نکھری خوش گوار فضا سے لطف اٹھا رہا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ ماکھا کب اس کے پہلو میں آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ آہستہ سے کھنکارا تو رحیم داد نے پلٹ کر دیکھا۔ ماکھا اپنے گندے دانت نکال کر مسکرانے لگا۔

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "تو کب آیا اور کیسے آیا؟"

"بس جی آ ہی گیا۔" اس کے لہجے میں خوشامد تھی۔ "چوہدری! تو نے میرا بازو واپس دلا دیا' میں تجھے کیسے بھول سکتا ہوں۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "رسیلی ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"کیوں نہیں ٹھیک ٹھاک ہوگی جی!" ماکھا خوشی سے چہک کر بولا۔ "اپنے گھر میں لوٹ آئی ہے۔ بہت خوش ہے۔ اپنا گھر جی اپنا ہی ہوتا ہے۔ وہ بھی تیرے پاس آنا چاہتی تھی پر میں اسے نہیں لایا۔ سوچا' پہلے تجھ سے پوچھ لوں۔"

"تو اسے نہیں لایا۔ یہ ٹھیک کیا۔ بلکہ تو بھی نہ آیا کر۔ تو احسان شاہ کا مزارع ہے۔ اللہ وسایا کو تیرا اس طرح بار بار آنا برا لگے گا۔ تیرا کام بن گیا۔ جا موج اں کر۔ اب یہاں نہ آنا۔" اس نے ماکھا کو تنبیہہ بھی کی۔ "اور دیکھ' کسی کو پتہ نہ چلے' میں شاہ جی کی حویلی میں ٹھیرا تھا۔"

"اطمینان رکھ' میں کسی سے ایسی گل نہیں کروں گا۔ پر میں آج تیرے پاس ایک ضروری کام سے آیا تھا۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "شاہ جی نے تجھے بلایا ہے۔ کوئی ضروری گل کرنی ہے۔ کہا ہے' آج ہی شام آجا۔"

"نہیں جی! میں اب اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں صرف تیری خاطر گیا تھا۔ تیرا کام بن گیا' اس کے ساتھ ہی میرا آنا جانا بھی بند ہو گیا۔"

"پر وہ کوئی بہت ضروری گل کرنا چاہتا ہے۔" ماکھا نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ "سن لینے میں کیا جاتا ہے۔ وہاں دیر تک نہ ٹھیرنا۔ نہیں جائے گا تو مجھ پر ناراض ہو گا۔"

"تیں نوں پتہ ہے' وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟" رحیم داد کے لہجے میں پہلی سی بیزاری اور بے رخی نہیں تھی۔

ماکھا نے اس کے رویے میں لچک پائی تو مسکرا کر بولا۔ "یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔ پر اتنا ضرور لگتا ہے' گل کچھ تیرے کام ہی کی ہوگی۔ شاہ جی کہتا بھی یہی تھا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ سر جھکا کر سوچنے لگا کہ احسان شاہ کون سی ایسی اہم بات کہنا چاہتا ہے جس کے لیے ماکھا کو بھیج کر اسے بلایا ہے۔ ماکھا نے رحیم داد کو خاموش پایا تو قدرے عاجزی سے بولا۔ "تو چلا جائے گا تو شاہ جی مجھ سے خوش ہو جائے گا۔ تیں نوں تو ذرا دیر گل بات کرنی ہے۔ جب جی چاہے' لوٹ آنا۔ ہو سکتا ہے' کوئی بہت کام ہی کی گل ہو۔"

رحیم داد نے احسان شاہ کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ماکھا سے کہا۔ "تو جا' میں آج ہی شاہ جی کی حویلی پر پہنچ جاؤں گا۔ اسے بتا دینا۔"

ماکھا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باغ سے چلا گیا۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گھاس پر ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا کہ احسان شاہ اس سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ اس کے ذہن میں کرید پیدا ہوئی' جس نے دھیرے دھیرے تجسس پھر بے چینی کی کیفیت اختیار کر لی۔

رحیم داد نے گھوڑی اصطبل سے نکلوائی۔ اس پر سوار ہوا اور احسان شاہ کی حویلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر شفق کی سرخی نے فضا کو لالہ رنگ بنا دیا تھا۔ وہ گھوڑی دوڑاتا ہوا کوٹلہ ہرکشن سے نکلا' نہر کی طرف بڑھا۔

شفق کی گہری سرخ روشنی میں اسے نہر کے کنارے ایک شخص نظر آیا جسے دیکھتے ہی وہ سراسیمہ ہو گیا۔ وہ دارا تھا۔ رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ رحیم داد نے اسے اچھی طرح پہچان لیا' ہاں وہ دارا ہی تھا۔

رحیم داد نے ایڑ لگا کر گھوڑی کی رفتار میں اضافہ کیا اور تیزی سے دارا کے قریب سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اسے گمان گزرا کہ دارا نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔ مگر رحیم داد نے اس کی جانب مطلق توجہ نہ دی' پلٹ کر دیکھا بھی نہیں' گھوڑی سرپٹ دوڑاتا رہا۔ وہ پیراں والہ کی جانب بڑھ رہا تھا اور دارا خطرہ بن کر اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ وہ رہ رہ کر سوچ رہا تھا کہ دارا' اس کی مقتول بن بیگماں کے گاؤں ڈھولہ امیر خان سے ادھر کیوں آگیا؟ کیسے آگیا؟ یہ سوالات اس کے ذہن میں منڈلاتے رہے اور وہ آگے بڑھتا گیا۔ دارا بہت پیچھے رہ گیا۔

☆

احسان شاہ اپنی حویلی کے سبزہ زار پر تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد کئی خالی کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر اسکاچ کی بوتل' گلاس اور ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا جگ رکھا تھا۔ رات نکھری نکھری تھی' آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے' ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ قریب ہی برآمدہ تھا۔ اس میں لیمپ روشن تھا۔ لیمپ کی روشنی میں احسان شاہ کا چہرہ نشے سے تمتا رہا تھا۔ وہ رک رک کر وہسکی کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار برآمدے کی جانب اٹھ جاتیں۔ وہ بے چینی سے رحیم داد کا انتظار کر رہا تھا۔

رحیم داد برآمدے سے گزر کر لان میں پہنچا۔ احسان شاہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "چوہدری! بہت انتظار دکھایا۔ کہاں لگا دی اتنی دیر؟" اس نے گرم جوشی سے رحیم داد کا ہاتھ تھاما اور اپنے برابر ہی ایک کرسی پر بٹھا لیا۔

رحیم داد نے صفائی پیش کرنے کے انداز میں کہا۔ "میں تو ماکھے سے تیرا پیغام ملتے ہی چل کھڑا ہوا تھا' پر تیں نوں پتہ ہے' برسات کے دن ہیں۔ ہر طرف پانی اور کیچڑ ہے' رستہ کچا ہے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ گھوڑی کو سنبھال سنبھال کر دوڑانا پڑا۔"

"ایسے موسم میں تو ان راستوں پر جیپ بہت کام دیتی ہے۔"

"وہ تو اپنے پاس ہے نہیں۔"

"اللہ وسایا نے تو تانگا بھی نہیں رکھا۔ وہ تو کسی طور زمیں دار ہی نہیں لگتا۔" احسان شاہ نے اللہ وسایا کے خلاف اپنی کدورت کا اظہار کیا۔ "بنسی لال' تھا تو منیجر' پر اس کے زمانے میں ایک چھوڑ دو تانگے ہوتے تھے اور ہردیال تو ہمیشہ جیپ ہی میں کوٹلہ ہرکشن آتا جاتا تھا۔ اس میں زمیں داروں کی شان تھی۔ تھا بھی وڈے زمیں دار کا پتر۔"

"میں نے تو جی' ایک بھی تانگا نہیں دیکھا۔"

"فسادات شروع ہوئے تو بنسی لال بھاگ گیا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "کوچوانوں نے لوٹ مار سے فائدہ اٹھایا۔ دونوں ہی تانگے لے کر نکل گئے۔" احسان شاہ نے خالی گلاس میں بوتل سے اسکاچ وہسکی انڈیلی' پانی ڈالا اور پیگ بنا کر رحیم داد کی جانب بڑھا دیا۔ "لے' پہلے تھوڑی سی لگا لے۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔"

رحیم داد نے گلاس تو لے لیا مگر دبی زبان سے بچنے کی کوشش بھی کی۔ "شاہ جی! آج رہنے دے۔ میں نوں پنڈ واپس بھی جانا ہے' زیادہ دیر نہیں ٹھیرنا۔ تو نے بلایا' میں چلا آیا۔"

"چوہدری! خاماخا کی بات نہ کر۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "بس اب شروع ہو جا۔ واپسی کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

احسان شاہ نے رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرا کر ہاتھ اونچا کیا' ہلکا قہقہہ لگایا اور گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ رحیم داد نے بھی گھونٹ بھرا' بھیگی ہوئی مونچھیں ہاتھ سے صاف کیں اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "شاہ جی! ایسی کون سی خاص گل تھی جس کے لیے تو نے مجھے بلوایا؟"

احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "بس تجھ سے ذرا گپ شپ کرنے کو جی کرتا تھا۔ سوچا تو ادھر اکیلا ہے' آجائے گا تو تیرے ساتھ اپنا دل بھی بہل جائے گا۔"

"پر ماکھا تو کہتا تھا' کوئی خاص گل کرنی ہے' فوراً آنے کو کہا ہے۔"

"ماکھا ٹھیک ہی کہتا تھا۔" احسان شاہ نے خمار آلود نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "خاص گل شل کیا ہے۔ تجھ سے کچھ پوچھنا تھا۔ تیرے ہی مطلب کی گل ہے۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "ہاتھ کیوں روک لیا؟ سارا گلاس ویسا ہی رکھا ہے۔ اسے آدھا تو کر۔ تجھے کچھ سرور ہو جائے تو گل کرنے میں مزا بھی آئے۔"

رحیم داد نے بڑا گھونٹ بھرا اور ایک تہائی گلاس خالی کر دیا۔ اس نے منہ بگاڑا۔ احسان شاہ نے تکوں کی پلیٹ سامنے کر دی۔ رحیم داد ایک تکا اٹھا کر چبانے لگا۔ چٹ پٹا تھا۔ رحیم داد کے منہ کی کڑواہٹ کم ہو گئی۔ تھوڑا سا سرور بھی ہوا مگر وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ احسان شاہ کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ تجسس کے ساتھ ساتھ خدشات اور وسوسے بھی تھے۔

احسان شاہ نے رحیم داد کو زیادہ دیر ذہنی خلفشار میں مبتلا نہیں رکھا۔ اس نے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ "چوہدری! تو نے اپنی زمین داری کا مختار تو اللہ وسایا کو بنا دیا' پر یہ بھی پتہ ہے کہ مختار نامے میں لکھا کیا تھا؟"

"یہ تو جی پتہ نہیں۔ میں نوں انگریزی نہیں آتی۔ مختار نامہ انگریزی میں تھا۔" رحیم داد نے سادگی سے کہا۔ "وکیل نے جہاں جہاں بتایا' میں نے دستخط لگا دیے۔" اس کے لہجے میں تجسس پیدا ہو گیا۔ "پر یہ گل تو کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"لگتا ہے تو اپنی زمین داری کے بارے میں لکھا پڑھی کے سارے کام منشی یا کاردار کے ذریعے کراتا رہا ہے۔ تجھے اس پر پورا پورا بھروسہ بھی ہو گا۔" احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ "میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا' بالکل یہی بات ہے۔" رحیم داد نے احسان شاہ سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی لاعلمی کی پردہ پوشی کی۔

"تبھی تو نے آنکھ بند کر کے ایسی پکی دستاویز پر دستخط کر دیے۔ مختار نامہ تو شامپ پیپر ہی پر ہو گا؟"

"ہاں جی' شامپ پیپر ہی پر تھا۔" رحیم داد کے چہرے سے ہلکی ہلکی پریشانی جھلکنے لگی۔ "پر تو اس کے بارے میں کیا بتانا چاہتا ہے؟"

"یہ بتانا ہے' تو نے یہ غلط کام کیا۔ اس طرح دستخط نہیں کیے جاتے۔"

"وہ تو ہو گئے۔ اب اس کے بارے میں کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"اللہ وسایا نے اگر مختار نامے کی بجائے بیع نامے پر تجھ سے دستخط کروا لیے تو؟" احسان شاہ نے رحیم داد کے ذہن میں شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد نے تذبذب میں مبتلا ہونے کے باوجود اس کا اظہار نہیں کیا۔ "نہیں شاہ جی! تمیں نوں پتہ نہیں' اللہ وسایا میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔"

"یہ جائیداد اور ملکیت بہت ظالم ہوتی ہے۔" احسان شاہ نے وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے کہا۔ "بھائی کو بھائی کے خلاف' پیو کے خلاف پتر کو مدعی اور مدعا علیہ بنا کر عدالت تک پہنچا دیتی ہے۔ ایسی دشمنی ڈالتی ہے کہ خون ہو جاتے ہیں۔ تو نے بھی ایسے کتنے ہی جھگڑے دیکھے ہوں گے۔ اللہ وسایا سے تیرا سگا رشتہ بھی نہیں۔ فیر وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟"

"یہ تو ٹھیک ہے جائیداد اور زمین کی ملکیت پر سگے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ مقدمے بازی بھی ہوتی ہے۔ خون بھی ہو جاتے ہیں' پر میں نوں اتنا پتہ ہے' اللہ وسایا ایسا نہیں ہو سکتا۔" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ "یہ بتا' ایسی گل تو نے اللہ وسایا کے بارے میں کیوں سوچی؟"

"ٹھیک ٹھیک سننا چاہتا ہے تو سن لے۔" احسان شاہ کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔ "میں

نوں پتہ چلا ہے' اللہ وسایا نے تجھ سے بیع نامے ہی پر دستخط کرائے ہیں۔ وہ زمیں اور حویلی کی ملکیت اپنے نام کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا منیجر مہربان علی ایک کیس کی پیروی کے سلسلے میں کل شہر گیا تھا۔ وہیں صدر دفتر کے ایک محرر نے اسے یہ گل بتائی۔ اللہ وسایا بھی وہاں موجود تھا۔ اس کا وکیل کوشش کر رہا ہے کہ کام جھیتی نال پورا ہو جائے۔"

"تیرے منیجر نے غلط بتایا۔" رحیم داد نے احسان شاہ کی اطلاع درست تسلیم نہیں کی۔ "اللہ وسایا تو کیمبل پور میں ہے اور میں نوں پتہ ہے' اس کا شہر میں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ وہ تو ابھی تک کیمبل پور ہی میں ہوگا۔ وہاں سے سیدھا اپنے پنڈ آئے گا۔"

"تو بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔" احسان شاہ نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ "اللہ وسایا نے یہی بتایا ہوگا۔ پر میرا منیجر مجھ سے غلط بات نہیں کہہ سکتا۔" اس نے پہلو بدلا۔ "یہ بتا' تو جسے مختار نامہ بتاتا ہے' اس کی تیرے پاس کوئی نقل شقل بھی ہے؟"

"وہ تو جی میرے پاس نہیں ہے۔ نہ میں نے مانگی اور نہ وکیل نے مجھے دی۔ میں نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ برا نہ منانا شاہ جی! تیری گل سمجھ نہیں آتی۔ اگر اللہ وسایا کے دل میں کھوٹ ہوتی تو وہ حویلی اور زمین کی الاٹمنٹ کے بعد پنڈ کے سارے مزارعوں اور کمیوں کو اکٹھا کرکے یہ بات سب کو صاف صاف نہ بتاتا۔ تیں نوں پتہ نہیں' اس نے ایسا ہی کیا تھا۔"

"تیرا مطلب ہے' میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" احسان شاہ بھڑک اٹھا۔ "چوہدری! تیں نوں معلوم نہیں' تو کس سے بات کر رہا ہے۔ پہلے میں آنریری مجسٹریٹ ہوتا تھا۔ عدالت لگاتا تھا۔ مکدموں کے فیصلے سناتا تھا' پر میں نے خود ہی مجسٹریٹی چھوڑ دی۔ زمیں داری کے بکھیڑے کیا تھوڑے تھے جو اس بکھیڑے میں پڑا رہتا۔ بہت اصرار کیا پر میں راضی نہ ہوا۔ دوسرے اس کے لیے جانے کیسی کیسی کوشش کرتے ہیں۔ منتیں کرتے ہیں۔ سفارشیں پہنچاتے ہیں۔" اس نے جھنجلا کر منہ بگاڑا۔ "میں نوں تیری جائیداد اور ملکیت سے کیا لینا۔ میرے پاس کچھ کم مربعے ہیں۔"

رحیم داد اس کی برہمی سے سخت مرعوب ہوا۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "شاہ جی! تو میری بات کا غلط مطلب سمجھا۔"

"تیرا مطلب کچھ ہی ہو۔ گل اصلی ایہہ ہے' میں یاری کرتا ہوں تو اسے نباہتا بھی ہوں۔ اب یہی دیکھ' مجھے جیسے ہی مہربان علی سے معلوم ہوا' فوراً تجھے بلایا اور سب کچھ بتادیا تاکہ تو ہوشیار ہو جائے۔ آگے تیری مرضی۔"

"شاہ جی! یہ تیری مہربانی ہے۔" رحیم داد کے لہجے سے خوشامد صاف جھلک رہی تھی۔

احسان شاہ یہی سننا بھی چاہتا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی خشونت مٹنے لگی۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "ویسے یہ بتادوں' مہربان علی پٹواری سے ملا تھا۔ اس نے رجسٹر خسرہ گرداوری دیکھا ہے۔ ابھی تک انتقالات تیرے ہی نام ہیں۔" احسان شاہ نے وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا' شیدا کو بلایا اور کھانا لگانے کی ہدایت کی۔

کھانے سے فارغ ہو کر احسان شاہ نے رحیم داد کو روکنا چاہا مگر رحیم داد رضامند نہیں ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ صبح واپس گیا تو دارا پھر نہ مل جائے۔ رحیم داد نے جب سے دارا کو دیکھا تھا' سخت پریشان تھا۔ دارا خطرہ بن کر اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ہو سکتا ہے' دارا اسے پہچان نہ سکا ہو۔ وہ منہ موڑ کر تیزی سے گھوڑا دوڑاتا اس کے پاس سے نکل گیا تھا۔ اب وہ دوبارہ ایسا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ احسان شاہ کے اصرار کے باوجود نہیں ٹھہرا۔

جب وہ گھوڑی پر سوار ہو کر واپس ہوا تو آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ صاف شفاف آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ ہر طرف اجلی اجلی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ رحیم داد نہر کے ساتھ ساتھ گھوڑی دوڑانے لگا۔ اور رفتار بتدریج تیز کرتا گیا۔

وہ کوٹلہ ہر کشن میں داخل ہوا تو رات ڈھل رہی تھی۔ مہمان خانے میں پہنچا تو احمد نے دروازہ کھول کر رحیم داد کو پہلی خبر یہ سنائی کہ اللہ وسایا سرشام ہی واپس آگیا۔

رحیم داد پریشان ہوگیا۔ وہ شراب کے نشے میں چور تھا اور سیدھا احسان شاہ کے پاس سے آرہا تھا۔ اس نے سوچا' اگر اس وقت اللہ وسایا کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس سے ملنے مہمان خانے میں آگیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی' لہٰذا اس نے احمد سے بات چیت نہیں کی' جو کچھ اس نے کہا خاموشی سے سن لیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ شلوار اتار کر دھوتی باندھی اور چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ مگر اسے جلد نیند نہیں آئی۔ وہ دیر تک احسان شاہ کی بات پر غور کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ وہ برابر یہ کوشش کرتا رہا کہ اللہ وسایا کے بارے میں کوئی بدگمانی دل میں نہ آنے دے۔ مگر شبہات بار بار سر اٹھاتے اور دماغ میں کھلبلی مچادیتے۔ اسی ذہنی انتشار میں وہ سو گیا۔

سویرے سویرے اللہ وسایا مہمان خانے میں آگیا۔ اس نے دروازے سے داخل ہوتے ہی پوچھا۔ "چوہدری! رات کہاں رہا؟ میں تو تیرے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد پہنچ گیا تھا۔ پتہ چلا تو

گھوڑی پر بیٹھ کر شہر کی طرف گیا ہے۔ میں دیر تک انتظار کرتا رہا۔"

رحیم داد اس سوال کے لیے خود کو پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا۔ "تو چلا گیا تو اکیلے میں جی بہت گھبرایا۔ تیں نوں پتہ ہے' اپنا یہاں اور کوئی میل جول کا نہیں۔ کل شام گھوڑی پر بیٹھ کر دل بہلانے شہر کی طرف نکل گیا۔ رستے میں ایک پرانا جاننے والا مل گیا۔ ضد کر کے اپنے گھر لے گیا۔ عالم پور کے نزدیک اس کا پنڈ ہے۔ ڈیڑھ سو کلا کے لگ بھگ زمیں داری ہے۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ رات کی روٹی بھی میں نے اس کے ساتھ کھائی۔ بعد میں گپ شپ لگی تو آدھی رات ہو گئی۔ وہ تو روکتا تھا پر میں نہ رکا۔"

"تو پہلے بھی تو ایک رات اسی کے ہاں ٹھیرا تھا۔" اللہ وسایا نے کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی پرانا یار لگتا ہے۔ پر تو نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

رحیم داد نے یہ سنا تو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا کہ احمد نے اللہ وسایا کو اس کے بارے میں ایک ایک بات کی رپورٹ پہنچا دی ہے۔ اس نے اپنی جھنجلاہٹ دبا کے جھٹ بات بنائی۔ "مجھے تو پہلی بار پتہ چلا کہ وہ ادھر ہے' برسوں بعد ملا تھا۔ شکور نام ہے اس کا۔ پٹیالہ کا مہاجر ہے۔ جن دنوں میں خوشاب میں ہوتا تھا' وہ ساتھ ہی کے مکان میں رہتا تھا۔" وہ اطمینان سے جھوٹ پر جھوٹ بولتا رہا۔ "پچھلی بار تو اس لیے اس کے پاس ٹھیرنا پڑا کہ اچانک برکھا شروع ہو گئی' ساری رات ہوتی رہی۔ ایسے میں کیسے واپس آسکتا تھا۔"

"تو نے ٹھیک کیا جو ادھر ہی ٹھیر گیا۔ بارش میں تو سارے ہی رستے خراب ہو جاتے ہیں۔ برسات کی اندھیری راتوں میں تو ان کچے رستوں پر ہرگز سفر نہیں کرنا چاہیے۔"

رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "گھر والی اور بچے بھی تیرے ساتھ ہی واپس آگئے یا ابھی کیمبل پور ہی میں ہیں؟" اس نے قدرے توقف کیا۔ "تو کچھ جلدی نہیں آگیا؟"

"ہاں جی' میں جلد ہی آگیا۔ کیمبل پور میں گرمی بہت تھی۔ ادھر اب تک بارش نہیں ہوئی۔ میں تو بہت گھبرا گیا تھا۔ پر جمیلہ جلد آنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ تو جاتے ہی ویاہ کی رتاں رساں میں ایسی الجھی کہ اس سے ملنا ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ تو ویاہ کے بعد بھی وہاں کچھ روز ٹھیرنا چاہتی تھی۔ پر میں ضد کر کے اسے اور بچوں کو اپنے ساتھ ہی لے آیا۔"

"ویاہ تو ٹھیک ٹھاک ہو گیا؟"

"ہاں جی' سب ٹھیک ٹھاک رہا۔" اللہ وسایا نے جواب دیا۔ "جمیلہ نے سارے کام کاج ایسی شان سے کیے کہ شرفاں کے سسرال والے خوش ہو گئے۔ اتنے خوش کہ چوہدری' میں تجھے کیا

بتاؤں۔ انھوں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی دھوم دھام سے ویاہ ہوگا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"ادھر جمیلہ بھی بہت خوش تھی۔ جب ملی' ہنستی مسکراتی ملی۔ اسے تو مزا آرہا تھا۔ پر اپنا جی اکتا گیا۔ کچھ ضروری کام بھی کرنے تھے۔"

آخری جملہ سن کر رحیم داد چونکا۔ معاً اسے وہ بات یاد آگئی جو گزشتہ شب احسان شاہ نے اللہ وسایا کے بارے میں بتائی تھی۔ اس نے اللہ وسایا کو ٹٹولنے کی غرض سے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"تو پرسوں شہر میں تھا؟ واپسی میں وہاں بھی ٹھیرا تھا؟"

اللہ وسایا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ "ٹھیرا تو تھا پر تیں نوں کیسے پتہ چلا؟"

"شکور ہی نے بتایا تھا۔ وہ بھی اس روز شہر میں تھا۔" رحیم داد نے بات نباہنے کی کوشش کی۔

"پر میں تو اسے بالکل نہیں جانتا۔" اللہ وسایا بدستور حیرت زدہ تھا۔

"تو اسے نہیں جانتا پر وہ تو تجھے جانتا ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا' اس کے لہجے سے خوشامد عیاں تھی۔ "تو اتنا وڈا زمیں دار ہے' تجھے ادھر کا کون بندہ نہیں جانتا۔ زمیں دار تو سب ہی جانتے ہیں۔" اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "وہ تجھ سے بہت ملنا چاہتا ہے۔ تو کہہ تو اسے کسی روز بلوا لوں؟"

"ضرور بلوا لے۔ تیرا پرانا ملنے والا ہے۔ بھلا ہی بندہ ہوگا۔" اللہ وسایا نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔

"میں کسی روز اس کی طرف جاؤں گا اور اپنے ساتھ ہی لیتا آؤں گا۔ اس سے مل کر تو خوش ہوگا۔"

اللہ وسایا نے شکور کے ذکر میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بات کا رخ شرفاں کی شادی کی جانب موڑ دیا اور اس میں جمیلہ کی سرگرمی اور انہماک مسکرا مسکرا کر بیان کرتا رہا۔ اس کے طرز اظہار سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ جمیلہ نے اس کی پھوپھی زاد بہن کے بیاہ میں جوش و خروش کا جو مظاہرہ کیا تھا' وہ اس سے بہت خوش ہے۔ وہ کچھ دیر تک بیٹھا شرفاں کی شادی کے ہنگاموں کا ذکر کرتا رہا پھر کھڑا ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد رحیم داد فکر مند ہو گیا۔ سوچنے لگا' احسان شاہ نے گزشتہ شب جو کچھ بتایا تھا' وہ درست تھا؟ کیا اللہ وسایا نے وکیل کے ساتھ سازباز کر کے مختار نامے کے بجائے اس سے بیع نامے پر دستخط کرائے ہیں؟ کیا وہ حویلی اور زمیں دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟

واپسی میں اس نے شہر میں ایک روز کیوں قیام کیا تھا؟ اور وکیل کے ہمراہ صدر دفتر کس لیے گیا تھا؟ یہ اور ایسے کتنے ہی سوالات اس کے ذہن میں ابھرتے رہے' ڈوبتے رہے۔ رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا اور تمام وقت اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہا۔

☆

برسات کی سہانی شام تھی۔ گہرا نیلا آسمان آئینے کی مانند جھلک رہا تھا۔ بھیگی بھیگی ہوا میں سرسراہٹ تھی۔ درخت اور پودے جھوم رہے تھے۔ گھاس میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ باغ میں رحیم داد کے ساتھ اللہ وسایا بیٹھا تھا۔ جمیلہ بھی موجود تھی۔ وہ نہا دھو کر آئی تھی۔ شگفتہ اور نکھری نکھری نظر آرہی تھی۔ موسم کی مناسبت سے وہ دھانی کرتا اور اسی رنگ کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ البتہ چندری رنگ برنگی تھی مگر اس پر سبز دھاریں بہت نمایاں تھیں۔ ہر طرف پھیلی ہوئی ہریالی کے پس منظر میں اس کی خوبصورتی میں تابندگی تھی' نئی سج دھج تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو سینے میں دھواں سا اٹھتا محسوس کیا۔ وہ مبہوت ہو کر ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

جمیلہ کا ہر انداز صاف چغلی کھا رہا تھا کہ اسے اپنی دل کشی اور رعنائی کا پورا پورا احساس ہے۔ رحیم داد کی بہکی بہکی نظریں دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس کے گلابی ہونٹ تازہ پھول کی پنکھڑیاں بن گئے۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر پوچھا۔

"چوہدری! کل رات تو کدھر رہا؟"

اللہ وسایا نے رحیم داد کے جواب دینے سے پہلے ہی ہنس کر کہا۔ "جمی لے! اصلی گل ایہ ہے' اکیلے اس کا جی گھبراتا ہے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! اب تو ویاہ کر لے۔ اس طرح کب تک گزارا ہو گا۔ اٹھ سال تو ہو گئے گھر والی اور بچوں کو ڈھونڈتے ہوئے۔ جانے و پاکستان پہنچے بھی کہ نہیں۔"

"ہاں جی' لاکھوں ہی خاندان لوور پروار بکھر کے ایسے اجڑے کہ کسی کو کسی کا کچھ پتہ نہیں۔" جمیلہ بولی۔ اس کا دبا ہوا غم ابھرا اور سورج کی مانند دمکتے چہرے پر بادل کا ٹکڑا بن کر پھیل گیا۔ "ہر ایک کو نئے سرے سے اپنا جیون شروع کرنا پڑا۔"

"کہتی تو ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ "پر اب تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی سفنہ دیکھ رہا ہوں۔"

"کب تک ایسے سفنے دیکھتا رہے گا۔" اللہ وسایا نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی تو جوان ہے۔ تینوں اب آگے کی فکر کرنی چاہیے۔"

"یہ کام تو تجھے ہی کرنا ہو گا اللہ وسایا۔" جمیلہ نے مشورہ دیا۔

"میں تو اس بارے میں اسی روز سے سوچ رہا ہوں' جب سے چوہدری کے نام حویلی اور زمین کی الاٹمنٹ ہوئی ہے۔"

"ہاں' اب تو اسے یہیں رہنا ہے۔ گھر بھی بسانا ہو گا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! تو برسوں ادھر ادھر بھٹکتا رہا' اب وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ے آگیا ہے کہ تو آگے کے لیے سوچ۔"

"سچ پوچھ' میں نے تو اس بارے میں ابھی تک سوچا ہی نہیں۔"

"تو نے نہیں سوچا تو کیا ہوا' اللہ وسایا کو تو سوچنا چاہیے۔" جمیلہ نے اللہ وسایا کی جانب دیکھا۔ وہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں الجھا ہوا نظر آرہا تھا۔ جمیلہ نے اسے اس عالم میں پایا تو مسکرا کر پوچھا۔ "اللہ وسایا! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"چوہدری کے لیے رشتے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"کوئی ہے رشتہ تیرے سامنے؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"چوہدری کے لیے رشتے تو کوئی تلاش کرنے پر مل سکتے ہیں۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "پر ایک رشتہ ٹھیک لگتا ہے۔ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"اللہ وسایا! تیری گل سن کر مجھے ڈر لگتا ہے۔"

اللہ وسایا حیرت سے رحیم داد کا منہ تکنے لگا۔ "ڈر کیوں لگتا ہے؟"

"تیری گل مجھے بھی سمجھ نہیں آئی۔" جمیلہ بھی حیرت زدہ نظر آرہی تھی۔

"صاف صاف بتا' تو کہنا کیا چاہتا ہے؟" اللہ وسایا نے پوچھا۔

"دیکھ' ابھی تو میرے اور تیرے درمیان بہت پیار ہے۔ تیرا گھر مجھے اپنا ہی گھر لگتا ہے۔ برسوں بعد مجھے ایسا لگا کہ میرا بھی کوئی ایسا ٹھکانا ہے جہاں میں آرام سے رہ سکتا ہوں۔" رحیم داد ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "سوچتا ہوں' بعد میں شاید تیرے ساتھ یہ پیار محبت نہ رہے۔ پتہ نہیں' کیسی وہتی' میری گھر والی بن کر آئے۔ ہمارے اتنے اچھے میل جول کا ناس مار دے۔ ایک دوسرے سے دور کر دے۔" اس نے اللہ وسایا کو بغور دیکھا۔ "ایسا بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"چنتا نہ کر چوہدری!" جمیلہ نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اپنا من اجلا ہے اور وڈا بھی ہے۔ ایسے ہی مل جل کر رہیں گے تو آگے بھی گزارا ہو جائے گا۔" وہ کھل کر مسکرائی' مڑ کر اللہ وسایا کی جانب دیکھا۔ "یہ تو بتا اللہ وسایا! تو نے چوہدری کے لیے کہاں رشتہ سوچا ہے؟ پہلے تو کبھی اس بارے میں

گل نہیں کی؟"

"وہ ایسا ہوا جی لے! کیمبل پور سے واپسی میں تو زنانیوں کے ڈبے میں تھی۔ میرے ساتھ ملتان کا ایک زمیں دار' چوہدری اکرم' سفر کر رہا تھا۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "وہ پشاور سے آ رہا تھا۔ ۶۰ برس سے اوپر ہو گا۔ نیک اور بھلا بندہ ہے۔ تحصیل کبیر والا کے احمد پور پنڈ میں اس کی زمیں داری ہے۔"

"جات برادری کے بارے میں کچھ اتا پتہ ہے۔" جمیلہ نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" اللہ وسایا نے مسکرا کر بتایا۔ "اسے پہلے بار نہیں ملا' پرانی جان پچھان ہے۔ اپنے وکیل محمد عثمان رندھاوا نے ملوایا تھا۔ اکرم اس کا بھی موکل رہ چکا ہے۔ کئی بار اس سے وکیل کے دفتر میں ملنا ہوا۔ وہ بھی جاٹ ہے اور ساہو ہے۔ لگتا ہے' اس کے وڈیرے اور بزرگ پہلے منٹگمری میں رہے ہوں گے۔ ملتانی اور جھنگی سے زیادہ وہ اپنی طرح پنجابی بولتا ہے۔ اسی سے میں نے اندازہ لگایا۔"

"ویسے تجھے پتہ نہیں' کبیر والا اور پوربی میلسی میں جھنگی اور ملتانی سے زیادہ پنجابی کا رواج ہے۔ پر ادھر جلال پور اور لودھراں میں ملتانی ہی چلتی ہے۔ کوئی اسے جھنگی کہتا ہے' کوئی اچی۔" جمیلہ نے بات کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو نے یہ بھی معلوم کیا' کڑی کی عمر کتنی ہے۔ بھائی بھین کتنے ہیں؟"

"نہ اس کا کوئی بھائی ہے نہ بھین۔ یوں سمجھ لے' اپنی شرفاں کی طرح ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کا پیو زندہ ہے۔" اللہ وسایا نے جواب دیا۔ "پر ایک گل ذرا سوچنے کی ہے۔"

"وہ بھی بتا دے۔ تو چبا چبا کر کیوں بول رہا ہے؟" جمیلہ نے ہنس کر کہا۔

"گل صاف صاف ایہہ ہے کہ اس کا پہلے بھی ایک ویاہ ہو چکا ہے پر کوئی بال بچہ نہیں۔ وہ چھے مہینے بھی سسرال میں نہیں رہی۔" اللہ وسایا نے کسی قدر اٹکتے ہوئے بتایا۔ "اس کا گھر والا ٹھیک بندہ نہیں تھا' مار پیٹ کرتا تھا' اوپر سے ایک کنجری سے بھی یاری لگا رکھی تھی۔ جب اس نے بہت تنگ کیا تو اکرم نے کاغذ لکھوا لیا' دھی کو اپنے گھر لے آیا۔"

"ضرور تنگ کرتا ہو گا اس کا گھر والا۔" رحیم داد بولا۔ "ملتانیوں میں نن کھلا مشہور ہے۔ مطلب یہ کہ جیسے گھوڑی کے لیے گھاس ضروری ہے' ویسے ہی زال یا گھر والی کے لیے جتی سے پٹائی۔"

"فضول باتیں نہ کر۔" جمیلہ نے تڑپ کر تیکھے لہجے میں اسے ٹوکا۔ "پتہ نہیں' تو نے کہاں سے یہ کہاوت سن رکھی ہے۔ میری چھوٹی ماسی ملتان شہر میں رہتی تھی' وہاں کھتریوں کے وڈے وڈے کنبے

اور پروار آباد تھے۔ میرا موسا' رائے زادہ رام چند' کنہ گھرانے کا تھا۔ مشہور خاندان ہوتا تھا۔ رائے زادہ کو تو میں نے دیکھا نہیں' اس کا تو میرے پیدا ہونے سے پہلے دیہانت ہو چکا تھا۔ وہ اپنے زمانے کا بہت مشہور رئیس تھا۔ آنریری مجسٹریٹ بھی تھا۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تجھے تو میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ میں موسی کے گھر ملتان اکثر جاتی تھی۔ ہفتوں اس کے پاس رہتی۔ میرا موسا اتنا بھلا تھا کہ چوہدری' تجھ سے کیا بتاؤں۔ موسی سے تو بہت ہی زیادہ پیار کرتا تھا۔ وہ تھی بھی بہت سندر۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب تو ملتان کے سارے ہی کھتری محلے اجڑ گئے۔ میری موسی کا گھر بھی برباد ہو گیا۔ سنا ہے' اب وہ بمبئی میں ہے۔ اس بات کو سنے ہوئے بھی ایک جگ بیت گیا۔ جانے زندہ ہے یا وہ بھی سورگ باشی ہو گئی۔"

جمیلہ کے دل کش چہرے پر دکھ کے سائے منڈلانے لگے۔ رحیم داد نے اسے اس طرح افسردہ پایا تو صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔ زمیں دارنی! تو برا نہ منا۔ میں نے تو ملتانیوں کے بارے میں صرف سنا ہی سنا ہے۔ اس ضلعے میں تھوڑے ہی دن رہا ہوں۔ وہاں کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں۔"

"ویسے جی ایسی باتیں اور کہاوتیں ہر شہر اور ضلعے کے بارے میں مشہور ہیں۔" اللہ وسایا نے بیوی کی جانب پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ "جی لے! میں تو یہ جانتا ہوں کہ چوہدری اکرم بہت بھلا مانس ہے۔ وہ چاہتا ہے اس کی زندگی ہی میں دھی کے لیے کوئی نیک ور مل جائے۔ ٹرین میں مجھ سے یہی گل کرتا تھا۔ بے چارہ بیمار بھی رہتا ہے۔ دھی کی طرف سے بہت پریشان ہے۔ کہتا تھا مجھے تو یہ فکر کھائے جاتی ہے' میرے مرنے کے بعد اس کا کیا بنے گا۔ برادری اور کنبے والے بھلے بندے نہیں ہیں۔ زمیں داری پر کبضہ کرنے کے لیے بعد میں جانے کیا کریں۔"

"پر میں پہلے کڑی کو دیکھوں گی۔ اس کے بناں کیسے فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ خود کبیر والا جاؤں گی۔" جمیلہ نے اپنا عندیہ بیان کیا۔

"تو ضرور کبیر والا چل۔ میں بھی چلوں گا۔ چوہدری بھی ساتھ ہو گا۔" اللہ وسایا نے جمیلہ کی تائید کی۔

"مجھے لے جا کر کیا کرے گا۔ تو اور جمیلہ جو بھی طے کریں گے' مجھے منظور ہو گا۔" رحیم داد نے کبیر والا جانے سے انکار کر دیا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" جمیلہ نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ "چوہدری! تجھے تو چلنا ہی پڑے گا۔ اکرم سے تیری ملاقات ہونی ضروری ہے تاکہ وہ بھی تجھ سے مل کر اپنا اطمینان کر لے۔ وہ

پہلے ہی چوٹ کھایا ہوا ہے۔ اس بار پوری طرح سوچ بچار کرنے کے بعد رشتہ طے کرے گا۔"

"چوہدری! اگر رشتہ ٹھیک ٹھاک ہو تو میں تجھے یہی کہوں گا ضرور ویاہ کر لے۔" اللہ وسایا نے اصرار کیا۔

رحیم داد خاموش رہا لیکن جمیلہ خاموش نہیں رہی، مسکرا کر بولی۔ "پہلے کیروالا چلنے کا پروگرام بنا۔ اس کے بعد کچھ طے ہوگا۔" "بول، کب کا ارادہ ہے؟"

"ابھی تو کیمبل پور سے لوٹی ہے، ذرا دم تو لینے دے۔"

"کیمبل پور کی بات دوسری تھی۔" وہ پچھم کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "کیروالا تو یہ رہا۔ منٹگمری سے خانیوال کے لیے ٹرین پکڑیں گے اور خانیوال سے کیروالا دور ہی کتنا ہے۔ پکی سڑک جاتی ہے۔ ویسے تو یہاں سے بھی سڑک کے رستے جا سکتے ہیں۔ پر برکھا میں لاریوں کا سفر کٹھن ہوتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں، میں پہلے بھی ایک بار کیروالا جا چکی ہوں۔ پر اب تو اس بات کو برسوں ہو گئے۔"

"تو کہاں نہیں گئی۔" اللہ وسایا نے ہنس کر کہا۔ "یہ بتا، کب چلنا ہے؟"

"آج سوموار ہے۔" جمیلہ چند لمحے سوچتی رہی۔ "جمعرات کی صبح روانہ ہو جائیں گے۔ جمعے کو کیروالا ٹھہریں گے۔ سنیچر کی رات لوٹ آئیں گے۔ ٹھیک رہے گا پروگرام؟"

"مجھے نہ لے جا تو اچھا ہے۔" رحیم داد نے ایک بار پھر کترانے کی کوشش کی۔

"ویاہ تجھے ہی کرنا ہے نا؟ تو نہیں جائے گا تو کیسے کام بنے گا۔ اکرم نے تجھے بھی دیکھنا ہوگا۔ تو موجود رہے گا تو جلد ہی رشتہ طے ہو جائے گا۔ بار بار چکر نہیں کاٹنا پڑے گا۔" جمیلہ کھل کھلا کر ہنسی۔ "دوبارہ جائے گا تو وہٹی کو بدا کرا کے ساتھ ہی لائے گا۔" رحیم داد نے کچھ کہنا چاہا۔ جمیلہ نے اسے روک دیا۔ "اب تو چپ کر کے بیٹھا رہ۔ مجھ پر وشواس رکھ۔ تیرے لیے چنگی ہی گھر والی لاؤں گی۔ تجھے اس بارے میں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

رحیم داد چپ رہا۔ جمعرات کی روانگی طے ہو گئی۔ نوکروں نے کھانا چن دیا۔ کھانے پر بھی رحیم داد کی شادی کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی۔ اللہ وسایا سے زیادہ جمیلہ نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔ رحیم داد چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ وہ شادی کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆

جمعرات کو تاروں کی چھاؤں میں اللہ وسایا، جمیلہ اور رحیم داد کیروالا کے لیے روانہ ہو گئے۔ جمیلہ نے اس دفعہ دونوں بچوں کو ساتھ نہیں لیا۔ انہیں نوکرانیوں کی نگرانی میں چھوڑ دیا۔ اللہ وسایا

نے ایک روز پیشتر اپنا ایک ملازم چوہدری اکرم کے گاؤں احمد پور بھیج دیا تھا تاکہ تینوں کی آمد سے اسے مطلع کر دے۔

رحیم داد سفر پر روانہ تو ہو گیا مگر کسی قدر گھبرایا ہوا تھا۔ وہ طرح طرح کے خدشات اور وسوسوں میں مبتلا تھا۔ پاک پتن روڈ پر پہنچ کر وہ لاری میں سوار ہوا تو اور زیادہ سہما ہوا نظر آنے لگا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ نے بار بار ادھر ادھر کی باتیں چھیڑیں مگر وہ مختصر جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔

منٹگمری اسٹیشن پہنچنے پر معلوم ہوا کہ گاڑی آنے میں دو گھنٹے کی دیر ہے۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کے ہم راہ رحیم داد بھی ویٹنگ روم میں چلا گیا۔ وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھا تھا کہ ایک انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہم راہ داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ کچھ دیر سہما ہوا بیٹھا رہا پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

ویٹنگ روم سے نکل کر وہ پلیٹ فارم پر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ بار بار خوف زدہ نظروں سے ویٹنگ روم کی طرف دیکھتا جاتا۔ پولیس والے ویٹنگ روم کے اندر ہی تھے۔ رحیم داد ٹہلتے ٹہلتے پلیٹ فارم کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ گرمی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ رحیم داد کو پیاس محسوس ہوئی۔ پانی پینے کے لیے وہ نلکے کی جانب چلا۔ سامنے سے ایک نوجوان عورت آتی نظر آئی۔ وہ سفید دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ نیلی قمیص کے اوپر سیاہ دوپٹہ تھا۔ عورت نے رحیم داد کو بغور دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

رحیم داد نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ شاداں تھی۔ اس کے سر پر گٹھڑی تھی۔ اس کی چال میں وہی پہلی سی آن بان تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ جسم بدستور مضبوط اور کسا ہوا تھا لیکن اب وہ کسی قدر دبلی ہو گئی تھی۔ چہرے کی رنگت بھی خاصی ماند پڑ گئی تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو سراسیمہ ہو گیا۔ وہ عین اس کے سامنے تھی۔ رحیم داد نے چاہا کہ کترا کر قریب سے گزر جائے مگر وہ ٹھٹکی اور اس طرح کھڑی ہو گئی کہ رحیم داد کو بھی قدموں کی رفتار روکنی پڑی۔

"گل سن۔" شاداں نے اسے ٹوکا۔ "لگتا ہے، میں نے تجھے پہلے بھی دیکھا ہے؟"

"پر میں نے تو تجھے کبھی نہیں دیکھا۔" رحیم داد نے بے رخی سے کہا۔

"ناراض نہ ہو۔" وہ مسکرائی۔ "میں نوں سوچنے دے۔"

رحیم داد نے خود کو سنبھالا۔ یہ سوچ کر گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی کہ اس نے لالی کے ہم راہ شاداں کے گھر میں ایک دن اور دو راتوں سے بھی کم وقت کے لیے پناہ لی تھی اور اس وقت اس کی وضع قطع بھی قطعی مختلف تھی۔ عالم یہ تھا کہ جسم پر جیل کی میلی کچیلی وردی تھی۔ حجامت بڑی

ہوئی تھی۔ وہ اس کے سامنے بھی کم ہی رہا تھا۔ بیشتر وقت اس نے کوٹھری میں زمین کھود کر بالے کی
لاش دبانے میں گزارا تھا۔ بالے کو قتل کرنے کے باعث شاداں کے حواس بھی بجا نہیں تھے۔ بہکی
بہکی باتیں کرتی تھی۔ اب طویل مدت گزرنے کے بعد دوبارہ ملی تھی۔ اس عرصے میں رحیم داد بہت
سی تبدیلیوں سے گزر چکا تھا۔ حلیہ اس قدر بدل چکا تھا کہ اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔

"لگتا ہے' میرے بارے میں تیں نوں دھوکا ہوا۔" رحیم داد نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے
کے لیے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تو رحیم داد تو نہیں ہے؟" شاداں اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "ہو بھی نہیں
سکتا۔ اسے تو مرے ہوئے بھی بہت دن ہوگئے۔ پتہ نہیں' اسے کس نے کتل کردیا۔" وہ چند لمحے
سوچتی رہی۔ "تو اس کا بھائی تو نہیں ہے؟ دیکھنے میں ایسا ہی لگتا ہے۔"

"جانے تو کس کی گل کررہی ہے۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر چہرے پر جھنجلاہٹ طاری کی۔ مگر وہ
اس کی جھنجلاہٹ سے متاثر نہیں ہوئی۔ اپنی حسین آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے بولی۔ "میں کسی
کو ایک بار دیکھ لوں تو بھولتی نہیں۔ سچ مان' میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"

رحیم داد ایک بار پھر گھبرا گیا اور اپنی گھبراہٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے بگڑ کر گویا ہوا۔ "پر تو نے مجھے
پہلے کب دیکھا؟" اس نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا۔

شاداں نے اسے روکا' نرم لہجے میں بولی۔ "نراض نہ ہو۔ آرام سے گل کر۔" وہ بے تکلفی سے
مسکرائی۔ "تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے' میں نوں دھوکا ہوا۔ یہ تو بتادے' تیرا نام کیا ہے؟"

"چوہدری نورالٰہی۔" رحیم داد نے جواب دیا۔

"تب تو ٹھیک ہی سوچا تو نے۔ میں نوں دھوکا ہی ہوا۔" شاداں نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی
کوشش کی۔ "پر تو کچھ کچھ رحیم داد سے ملتا ہے۔ میں نوں ایسا ہی لگا تھا۔"

"کون تھا رحیم داد؟" رحیم داد نے بے نیازی سے پوچھا۔ اس کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا
تھا' گھبراہٹ رفع ہو چکی تھی۔

"وہ لالی کا ساتھی تھا۔ دونوں جیل میں اکٹھے ہوتے تھے' اور جیل سے بھاگے بھی اکٹھے تھے۔ لالی
اسے اب تک یاد کرتا ہے۔"

رحیم داد کے ذہن میں لالی کے لیے کرید پیدا ہوئی۔ اس نے دریافت کیا۔ "یہ لالی کون ہے؟ اور
اب کہاں ہے؟"

"جیل میں ہے۔ پہلے منٹگمری جیل میں ہوتا تھا' اب ملتان جیل بھیج دیا گیا ہے۔ میں اسی سے ملنے

ملتان جارہی ہوں۔ کل ملاقات کا دن ہے۔"

"تیرا کون لگتا ہے؟" رحیم داد نے چندرا کر پوچھا۔

"یہ نہ پوچھ۔" شاداں نے گہری سانس بھری۔ "کچھ تو لگتا ہی ہے۔ تبھی تو اسے ملنے جارہی
ہوں۔" شاداں نے گٹھری اتار کر فرش پر رکھ دی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اس کے لہجے سے تھکن
کے ساتھ ساتھ افسردگی بھی جھلکنے لگی۔ "ویسے اس کا میرے سوا کوئی بھی نہیں۔"

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "تو اس کے لیے بہت دکھی معلوم ہوتی ہے۔"

شاداں نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ کچھ دیر خاموشی
رہی پھر شاداں نے جھک کر گٹھری اٹھائی۔ ایک بار پھر سر پر رکھی اور چپ چاپ ایک طرف چل
دی۔ رحیم داد جہاں تھا' وہیں کھڑا رہا۔ وہ شاداں کی جانب دیکھتا رہا۔ شاداں پہلے ہی کی طرح خوب
صورت اور طرح دار نظر آرہی تھی۔ اس کے گھنے بالوں کی لمبی چوٹی کمر کے نیچے تک لٹک رہی
تھی۔

رحیم داد کو لالی یاد آگیا۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے دن رات یاد آگئے۔ وہ عہد و پیمان یاد
آگئے جو دونوں نے ایک دوسرے سے کیے تھے۔ یادوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو دور تک پھیلتا چلا
گیا۔

ٹرین آگئی مگر وہ لاہور جارہی تھی۔ رحیم داد نے دور سے دیکھا۔ انسپکٹر ویٹنگ روم سے نکلا۔
دونوں کانسٹیبل اس کا سامان اٹھائے عقب سے نمودار ہوئے۔ انسپکٹر اور کانسٹیبل ٹرین میں سوار
ہوئے۔ ٹرین لاہور کے لیے روانہ ہوگئی۔

رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ویٹنگ روم کی جانب بڑھا۔ اندر
پہنچا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ اس کے لیے بے چین نظر آرہے تھے۔ جمیلہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"چوہدری! تو کدھر چلا گیا تھا؟"

"بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا تو پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔" رحیم داد نے بات بنائی۔

"پر تو بالکل اچانک اٹھ کر چلا گیا' بتایا بھی نہیں' کہاں جارہا ہے؟" جمیلہ نے گلہ کرنے کے انداز
میں کہا۔

رحیم داد کے بولنے سے پہلے اللہ وسایا بول پڑا۔ "تو ہر بات پوچھتی ہے۔ اس نے بتا تو دیا' پلیٹ
فارم پر ٹہلنے کے لیے نکل گیا تھا۔" اللہ وسایا بے تکلفی سے مسکرایا۔ "تو کوئی تھانے دارنی لگی ہے
کہ ہر کام تجھ سے پوچھ کر کرے۔ آگے بھی تو نے ایسا کیا تو اس کی گھر والی تجھ سے خار کھانے لگے

گی۔ یہ سوچ لے۔"

"لے تو نے مجھے ابھی سے دوش دینا شروع کردیا۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

رحیم داد دونوں کی نوک جھونک پر چپ رہا۔ مسکراتا ہوا خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹرین آئی تو قلی نے سامان اٹھایا اور تینوں سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں جاکر بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے کھڑکی سے جھک کر دیکھا۔ شاداں بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہونے کی کوشش کررہی تھی۔ ذرا دیر میں ٹرین روانہ ہوگئی۔

خانیوال کا اسٹیشن آیا تو اللہ وسایا اور جمیلہ کے ساتھ رحیم داد بھی اتر گیا۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی انھیں کبیروالا جانے والی لاری مل گئی۔ وہ اس میں سوار ہوگئے۔ ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ بھیگی ہوئی سڑک پر لاری زیادہ تیز رفتار سے نہیں دوڑ رہی تھی۔ مگر جب تینوں کبیروالا کے اڈے پر پہنچے تو بارش رک چکی تھی۔ انھوں نے تانگا کرائے پر لیا اور اس میں بیٹھ کر احمد پور کی جانب روانہ ہوگئے۔

وہ احمد پور پہنچے تو جھٹ پٹا ہوچکا تھا۔ چوہدری اکرم اپنے دو منزلہ مکان کے باہر ان کا منتظر تھا۔ وہ اللہ وسایا اور رحیم داد سے بڑی گرم جوشی سے ملا۔ جمیلہ تو گھر کے اندر چلی گئی، اللہ وسایا اور رحیم داد کو چوہدری اکرم ڈیرے پر لے گیا۔ ڈیرا گھر کے ساتھ ہی تھا۔ اس میں دو کشادہ کمرے تھے۔ آگے کھلا صحن تھا۔ کمروں میں پلنگ بچھے تھے۔ ان پر صاف ستھرے بستر لگے تھے۔ بیٹھنے کے لیے کرسیاں اور مونڈھے تھے۔

دونوں کے ڈیرے میں پہنچتے ہی مالیشا آگیا۔ اس کے ہاتھ میں تیل کی شیشی دبی ہوئی تھی، وہ تیل کی مالش اور مساج کے ذریعے سفر کی تکان اتارنے کے لیے نہایت مستعد نظر آتا تھا۔ مگر اللہ وسایا اور رحیم داد نے مالش کرانے سے انکار کردیا۔ انھوں نے نہادھو کر لباس تبدیل کیا اور صحن میں قرینے سے لگی ہوئی کرسیوں پر جاکر بیٹھ گئے۔ غسل کرنے سے اللہ وسایا اور رحیم داد ترو تازہ ہوگئے تھے۔ ذرا ہی دیر میں نوکر لسی لے کر آگیا۔ دونوں نے ٹھنڈی ٹھنڈی لسی پی۔ بڑا سکون ملا۔

رات کے کھانے پر بات چیت شروع ہوئی۔ اللہ وسایا نے چوہدری اکرم سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ صرف ایک روز ٹھہرے گا اور ہفتے کے روز علی الصباح چلا جائے گا، جو کچھ طے کرنا ہے، جمعے ہی کو طے ہوجانا چاہیے۔ رحیم داد کو چوہدری اکرم نیک اور بھلا مانس لگا۔ وہ کم گو اور حلیم الطبع تھا۔ مزاج میں نرمی اور رکھ رکھاؤ تھا۔

چوہدری اکرم نے مہمانوں کی خاطر مدارت میں سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ ہر طرح ان کی دل داری

کی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر شادی بیاہ کے بارے میں کھل کر گفتگو نہ ہوئی۔ چوہدری اکرم کے ساتھ رشتے کا ایک چچا زاد بھائی بھی تھا۔ وہ اکرم سے عمر میں بڑا تھا۔ اس نے کئی بار شادی کے سلسلے میں بات چھیڑی مگر اللہ وسایا نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ وہ جمیلہ سے مشورہ کیے بغیر اس مسئلے پر کوئی بات چیت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رات گئے محفل برخاست ہوئی۔

سویرے سویرے جمیلہ ڈیرے پر آگئی۔ اللہ وسایا اور رحیم داد کمرے میں ناشتا کررہے تھے۔ چوہدری اکرم بھی موجود تھا مگر ناشتے میں شریک نہیں تھا۔ جمیلہ کے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اللہ وسایا نے جمیلہ سے پوچھا۔ "جمی لے! کڑی دیکھی تو نے، کیسی ہے؟"

"سندر ہے اور سیدھی سادھی بھی ہے۔ عمر بھی چوی پنچھی سے زیادہ نہیں ہوگی۔ چوہدری کے لیے بالکل ٹھیک رہے گی۔" جمیلہ مسکرا مسکرا کر بتاتی رہی۔ "دیکھنے میں تو ایسی شرمیلی اور کومل لگتی ہے، جیسے اس کا کبھی ویاہ ہی نہیں ہوا۔ پتہ نہیں، اس کے پہلے گھر والے نے ایسی بھولی بھالی کڑی کو کیوں تنگ کیا۔" اس نے منہ بگاڑا۔ "گل ایہہ ہے، بعضے مرد ہوتے ہی خراب ہیں۔ انھیں اپنی گھر والیوں کو تنگ کرنے میں سواد ملتا ہے۔ لگتا ہے، اس کا گھر والا ایسا ہی خراب بندہ تھا۔"

"تیری باتوں سے لگتا ہے کڑی تجھے پسند آگئی۔ ویسے چوہدری اکرم کو تو میں بھی ٹھیک طرح جانتا ہوں۔ نیک بندہ ہے۔" اللہ وسایا نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا جی، آج اکرم سے بات چیت شروع کی جائے۔"

"تو نے ابھی تک اس بارے میں گل بات ہی نہیں چھیڑی؟" جمیلہ نے حیرت سے پوچھا۔

"تجھ سے صلاح مشورہ کیے بناں کیسے شروع کرتا۔" اللہ وسایا ہنس کر بولا۔

جمیلہ نے کہا۔ "اکرم کا چچیرا بھی تو آیا ہے۔ لگتا ہے، اکرم نے اسے بات چیت ہی کے لیے بلایا ہے۔ اس کی گھر والی بھی آئی ہے۔ میری تو اس سے کھل کر گل بات ہوئی۔ اس نے اپنے چوہدری کے بارے میں کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھی۔ میں نے اسے سب کچھ صاف صاف بتادیا۔ لگتا ہے، اس نے اکرم اور اپنے گھر والوں کو بھی یہ باتیں بتادیں۔ ان دونوں سے میری زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ شام کو وہ میرے پاس آئے تھے۔ اکرم تو چپ رہا پر اس کے چچیرے نے کئی باتیں پوچھیں۔ میں نے اسے بھی ہر بات صفائی سے بتادی۔"

"ان کے رویے سے تو نے کیا اندازہ لگایا؟" اللہ وسایا نے دریافت کیا۔

"مجھے تو دونوں خوش اور مطمئن نظر آئے۔ اکرم کی بھرجائی تو بہت مطمئن لگتی ہے۔ سمجھ لے' وہ لوگ تو تیار ہیں۔"

"تو فیر بات پکی کرلی جائے؟" اللہ وسایا نے استفسار کیا۔

"ضرور کرلے۔ مجھے تو یہ رشتہ ہر طرح پسند ہے۔" جمیلہ نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ لمحے بھر خاموش رہی پھر اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا اور اس کی رائے معلوم کرنے کے لیے براہ راست سوال کیا۔ "بول چوہدری' تجھے کیا کہنا ہے۔ تو اپنی مرضی بتا؟"

"میں نوں اپنی مرضی کیہ بتانا؟" رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "میری مرضی تو وہی جان جو تیری اور اللہ وسایا کی ہے۔ تمیں نوں پتہ ہے' میں نے اللہ وسایا کو بھائی کہا ہے' پگڑی بدلی ہے۔ وہ بھائی ہے۔ اور تو بھرجائی۔ تم دونوں جو بھی طے کرو گے' مجھے منظور ہو گا۔"

"تب تو آج ہی ساہا ہو جائے۔" جمیلہ خوشی سے چہک کر بولی۔ "میرا من کہتا تھا' یہ رشتہ طے ہو جائے گا۔ اللہ وسایا! تجھے پتہ نہیں' میں نے تو مٹھائی اور میوے کا بھی بندوبست کرلیا ہے۔ ادھر آنے سے پہلے نوکر کو ضروری سامان لانے خانیوال بھیج دیا ہے۔ دوپہر تک آجائے گا۔ شام کو سگائی کے لیے کوئی شبھ دن سوچ کر تاریخ طے کرلی جائے۔"

"ساری تیاری تو کرلی' اب میری اور چوہدری کی مرضی پوچھنے آئی ہے۔" اللہ وسایا نے ہنس کر بیوی کی جانب دیکھا۔

"ایسے فیصلے زنانیاں ہی کرتی ہیں۔" جمیلہ بھی اللہ وسایا کے ساتھ ہنسنے لگی۔ "بات پکی کرنے سے پہلے اکرم سے کہہ دینا' ساہے کے لیے شریکے برادری کے کسی اور کو بلانا چاہے تو بلا لے۔ یہ بات تو اسے دوپہر کو روٹی کھاتے ہوئے بتا دینا۔ یوں سمجھ لے' آج ویاہ کی تاریخ طے کرکے ہی جانا ہے۔"

جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کمرے سے باہر گئی تو کچھ ہی دیر بعد چوہدری اکرم آگیا۔ اس سے ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ دوپہر ہو گئی۔ نوکروں نے کھانا چن دیا۔ کھانے پر اللہ وسایا اور رحیم داد کے ساتھ چوہدری اکرم اور اس کا چچا زاد بھائی بھی شریک ہو گئے۔ رحیم داد تو خاموش بیٹھا رہا مگر اللہ وسایا نے بات چھیڑی اور چوہدری اکرم کو اپنی مرضی سے مطلع کردیا۔ صاف صاف بتا دیا کہ اسے اور رحیم داد کو رشتہ منظور ہے۔ اگر وہ بھی اس کے لیے رضامند ہو تو شام کو ساہے کی رسم ادا کرلی جائے۔ دن تاریخ مقرر کرکے شادی کی تیاری شروع کردی جائے۔ اکرم اور اس کے چچا زاد بھائی نے اللہ وسایا کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ان کی بات چیت سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ذہنی

طور پر پہلے سے تیار ہو کر آئے تھے۔

دن ڈھلے صحن میں خوب چھڑکاؤ ہوا۔ کرسیاں نکال کر ترتیب سے لگائی گئیں۔ لیمپ کے بجائے پیٹرومیکس روشن کیا گیا۔ جب سب کرسیوں اور چارپائیوں پر بیٹھ گئے تو شادی کی باقاعدہ بات چیت شروع ہوئی۔ یہ ساہا تھا۔ اس میں چوہدری اکرم کی طرف سے اس کا چچا زاد بھائی شریک ہوا۔ پڑوس کے گاؤں کے ایک زمیں دار کو بھی اکرم نے بلا لیا تھا۔ وہ اکرم کا ہم عمر ہی تھا۔ اس کے انداز میں معاملہ فہمی اور رکھ رکھاؤ تھا' بات چیت بھی سلجھی ہوئی کرتا تھا۔

گفتگو کے دوران کسی بھی مرحلے پر الجھن یا تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ ہر بات خوش اسلوبی سے طے ہو گئی۔ چوہدری اکرم نے بات چیت کے آغاز ہی میں اپنی اس خواہش کا صاف گوئی سے اظہار کردیا تھا کہ نکاح سادگی سے ہو گا اور رخصتی بھی خاموشی سے ہو گی۔ نہ کوئی دھوم دھڑکا ہو گا' نہ شادی کی دوسری رسمیں ہوں گی۔ براتیوں کی تعداد بھی مختصر ہو گی۔ بات معقول تھی لہٰذا اللہ وسایا نے مطلق بحث نہیں کی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ دیہات میں' خاص طور پر جاٹوں میں بیوہ یا طلاق کا عقد ثانی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ دھوم دھڑکا کرنے کی صورت میں خوشی کے بجائے ذات برادری والوں کے طعنے سننا پڑتے۔

بات چیت جاری تھی کہ اللہ وسایا اٹھ کر کمرے میں گیا۔ جمیلہ کو وہاں بلایا۔ اس سے مشورہ کیا اور اس کی روشنی میں شادی کی تاریخ طے کی' جو ۲ اگست مقرر ہوئی۔ مہمانوں کی دودھ کے شربت سے تواضع کی گئی۔ جمیلہ واپس زنان خانے میں جا چکی تھی۔ تاریخ مقرر ہونے کی اطلاع پہنچی تو اس نے اپنے نوکر کے ذریعے چوہدری اکرم کے پاس شگن کی مٹھائی کے ساتھ خشک میوہ بھیجا۔ ساہے کی خوشی میں نائی اور لاگیوں کو نقد انعام کے علاوہ ایک ایک لنگی بھی دی۔

رات کے کھانے میں چوہدری اکرم نے خاص اہتمام کیا۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ بات بات پر مسکراتا۔ پلیٹیں اٹھا اٹھا کر رحیم داد اور اللہ وسایا کے سامنے رکھتا۔ کھانے پر اصرار کرتا' دل جوئی کرتا۔ شفقت اور محبت کا اظہار کرتا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد بھی وہ دیر تک دونوں کے پاس بیٹھا رہا۔

صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی اللہ وسایا اور رحیم داد تیار ہو گئے۔ جمیلہ بھی تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہو گئی تھی اور اللہ وسایا اور رحیم داد کے ساتھ سفر کے لیے تیار تھی۔ گھر کے باہر دو تانگے موجود تھے۔ تینوں ان میں سوار ہوئے۔ نوکر بھی ہم راہ تھے۔ چوہدری اکرم ان کے ساتھ کبیر والا تک آیا۔ اس نے اللہ وسایا اور رحیم داد کو گلے لگا کر گرم جوشی سے رخصت کیا۔

رات گئے تینوں واپس کوٹلہ ہرکشن پہنچ گئے۔ صبح ہوئی۔ دن گزرا۔ شام کو معمول کے مطابق باغ میں محفل جمی۔ جمیلہ اور اللہ وسایا کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ چوہدری اکرم کی بیٹی سے رحیم داد کا رشتہ طے ہو جانے پر دونوں بہت خوش ہیں۔ جمیلہ مسکرا مسکرا کر ساہے کی رسم کی ایک ایک تفصیل بیان کر رہی تھی۔ اکرم کے حسن سلوک اور مہمان نوازی کی تعریف کر رہی تھی۔

رات کا کھانا انھوں نے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے پر بھی شادی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔

رحیم داد کم بلکہ بہت کم بول رہا تھا۔ جمیلہ نے اس کی جانب دیکھا اور ہنس کر بولی۔ "تو ابھی سے وٹا بن گیا۔ شرما اور لجا تو اس طرح رہا ہے جیسے آج ہی تیری جنج چڑھنے والی ہے۔" وہ اللہ وسایا کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اللہ وسایا! تو دیکھ رہا ہے۔ چوہدری کیسے شرما شرما کر بول رہا ہے۔" وہ لمحے بھر تک گردن جھکا کر سوچتی رہی۔ "آج جولائی کی ۱۷ تاریخ ہے۔ یہ ۳۱ دن کا مہینہ ہے۔ ویاہ میں کل سولاں دن رہ گئے ہیں۔"

"تیاری ہی کون سی کرنی ہے۔" اللہ وسایا بولا۔ "جنج شنج تو دھوم دھام سے جانی نہیں۔ بس ایک رسم ادا کرنی ہے۔" وہ مسکرایا۔ "ویسے اپنا ویاہ تو بالکل ہی خاموشی سے ہوا تھا۔ پر بہت نیک گھڑی تھی۔ اب تو سب کچھ سفنہ لگتا ہے۔"

جمیلہ نے کچھ نہیں کہا' رحیم داد بھی چپ رہا مگر اللہ وسایا خاموش نہ رہا۔ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "چلو جی' یہ بہت چنگا ہو گیا۔ چوہدری کا دل اکیلے میں بہت گھبراتا ہے۔ اب نہیں گھبرائے گا۔" اس نے رحیم داد کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ "اکرم کی پوری زمیں داری ورثے میں تیری ہونے والی گھروالی ہی کو ملے گی۔ وہ تو یہاں تک کہتا تھا' ویاہ کے بعد ہی زمیں داری تیرے حوالے کر دے گا۔ اٹھ مربعے سے اوپر زمین ہے اور بہت زرخیز زمین ہے۔ پانی کی بھی کمی نہیں۔"

"تب تو اپنا چوہدری اور وڈا زمیں دار بن جائے گا۔" جمیلہ بولی۔

"اب تو اس کا ہرگز جی نہ گھبرائے گا۔ وڈی زمیں داری ہو اور بھلی گھروالی تو کس کا جی گھبرا سکتا ہے۔" اللہ وسایا نے کہا۔ "میں تو کہوں گا تو احمد پور کی زمیں داری سنبھال لینا۔ ادھر کی دیکھ بھال تو میں کر ہی رہا ہوں۔ اس کی تو بالکل فکر نہ کر۔"

رحیم داد نے چونک کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ اسے فی الفور احسان شاہ کی باتیں یاد آ گئیں۔ اس کے ذہن میں شبہات اور وسوسے کلبلانے لگے۔ مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ مسکرانے کی کوشش کی اور نرم لہجے میں گویا ہوا۔

"یہ زمیں داری بھی تیری اور وہ بھی تیری۔ میں تیرے لیے پرایا نہیں ہوں۔"

"میرا مطلب ہے دونوں مل جل کر ہی زمیں داری چلائیں گے۔" اللہ وسایا نے زیر لب مسکرا کر وضاحت کی۔

☆

رحیم داد مطمئن نہ ہوا۔ اللہ وسایا کی وضاحت کے باوجود اس کا شبہ رفع نہ ہوا۔ رات کو دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

دوسرے روز ایک اور واقعہ پیش آیا۔ رحیم داد زیادہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ہوا یہ کہ اللہ وسایا اچانک اپنے وکیل کے ساتھ رحیم داد کے پاس آیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔ "چوہدری تیرے کلیم کے کاغذات کہاں ہیں؟" اس نے وکیل کی طرف اشارہ کیا۔ "وکیل صاحب کو کاغذات دیکھنے ہیں۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھا۔ ملحقہ کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر گیا۔ اپنے ٹرنک کا تالا کھولا۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ نکالا اور کاغذات وکیل کے حوالے کر دیے۔ وہ کچھ دیر تک پوری توجہ سے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "یہ کاغذات میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا' ان کی ضرورت پڑ گئی ہے۔"

رحیم داد تو چپ رہا مگر اللہ وسایا بول پڑا۔ "ضرورت ہے تو جی' ضرور لے جاؤ۔"

وکیل نے کاغذات اپنے بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک درخواست بھی لگانی ہے۔" اس نے انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی ایک درخواست نکالی اور رحیم داد کے سامنے رکھی۔ "چوہدری! اس جگہ اپنے دستخط لگا دے۔" اس نے درخواست کے آخر میں ایک جگہ انگلی رکھ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

رحیم داد دستخط کرتے ہوئے جھجکا۔ ہمت کر کے پوچھا۔ "وکیل صاحب' یہ درخواست کیوں لگانی ہے؟ میں نوں بھی تو کچھ پتہ چلنا چاہیے۔"

"یہ میں بعد میں آرام سے بتاؤں گا۔ اگر ابھی بتاؤں بھی تو تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔" وکیل ہنس کر بولا۔ "یہ قانونی نکات ہیں۔ یوں سمجھ لے یہ درخواست لگانی بہت ضروری ہے اور جلد سے جلد لگانی ہے۔"

رحیم داد نے درخواست پر دستخط نہیں کیے۔ خاموش بیٹھا رہا۔ وکیل نے اللہ وسایا کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اللہ وسایا اٹھ کر رحیم داد کے نزدیک گیا' اس کا شانہ تھپک کر نرم لہجے میں بولا۔ "لگا دے دستخط۔ تیری جانب سے یہ درخواست لگانی بہت ضروری ہے۔ اس میں دیر

نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ آگے گڑبڑ پڑ سکتی ہے۔" اس طرح اصرار کرنے پر رحیم داد نے نظریں اٹھا کر اللہ وسایا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب اور بے اطمینانی کے تاثرات تھے۔ اللہ وسایا نے مسکرا کر کہا۔

"چوہدری! تیں نوں مجھ پر بھروسا نہیں؟"

"ایسی گل نہ کر۔" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا اور درخواست پر دستخط کر دیے۔

وکیل نے درخواست رحیم داد کے ہاتھ سے لے کر اپنے بریف کیس میں رکھی اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کمرے سے نکلا تو اللہ وسایا بھی اس کے ہم راہ تھا۔

دونوں کے جانے کے بعد رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اللہ وسایا کے رویے نے اس کے شبہات میں اضافہ کر دیا تھا۔ دن ڈھلے تک وہ اسی الجھن میں مبتلا رہا۔ اسی عالم میں اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا اور باغ کی جانب روانہ ہوا۔ مہمان خانے کے دروازے پر احمد مل گیا۔ احمد نے بتایا کہ اللہ وسایا بھی وکیل کے ساتھ شہر گیا ہے۔ رحیم داد اور پریشان ہو گیا۔

اس نے دور سے دیکھا کہ جمیلہ باغ میں بیٹھی ہے۔ قریب ہی اسکول ماسٹر بیٹھا تھا۔ جمیلہ اس کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھی۔ رحیم داد باغ کی طرف نہیں گیا، اصطبل پہنچا۔ گھوڑی نکلوائی اس پر سوار ہوا اور جمیلہ کو اطلاع دیے بغیر گھوڑی دوڑاتا شہر کی طرف نکل گیا۔

۴۳

احسان شاہ کا خاص ملازم شیدا حویلی کے پھاٹک ہی پر رحیم داد کو مل گیا۔ اس کی زبانی رحیم داد کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ احسان شاہ حویلی میں موجود ہے۔ شیدا نے رحیم داد کی گھوڑی ایک ملازم کے سپرد کی اور رحیم داد کو دیوان خانے میں لے گیا۔ مگر باغ کی سمت نہیں گیا۔ دیوان خانے کے پچھواڑے کی باڑی میں پہنچا۔ اس نے جھپاک جھپاک کرسیاں نکال کر باہر رکھ دیں اور ایک طرف ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "شاہ جی، کتھے ہے؟"

"وہ تو جی باغ میں ہے۔ شہر سے کئی وڈے افسر آئے ہوئے ہیں، وہ ان کے ساتھ بیٹھا ہے۔ میں اسے تیرے آنے کی اطلاع کرتا ہوں۔ اتنی دیر تو آرام سے بیٹھ، تھکا ہوا بھی ہے۔ میں جھیتی نال واپس آتا ہوں۔"

رحیم داد خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ شیدا چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ درختوں کی بلند شاخوں پر سنہری دھوپ دھندلی پڑتی جا رہی تھی۔ شام دھیرے دھیرے اپنے بازو پھیلا رہی تھی۔ باڑی میں دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد نے باڑی پہلی بار دیکھی تھی۔ یہ درختوں سے گھرا ہوا ہرا بھرا گوشہ تھا۔ وسط میں گھاس کا قطعہ تھا۔ پھولوں کی چند کیاریاں بھی تھیں۔ دائیں طرف نیم کے ایک گھنے درخت کے پہلو میں مختصر سی عمارت تھی جو ایک کمرے اور غسل خانے پر مشتمل تھی۔ کمرے کے آگے برآمدہ تھا، اس پر کھپریل کی خمیدہ چھت تھی۔ کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ کھلی کھڑکی سے لیمپ کی روشنی باہر جھانک رہی تھی۔ باڑی ہرچند کہ حویلی کی چاردیواری کے اندر تھی مگر الگ تھلگ تھی۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ شام گہری ہوتی گئی۔ خاموشی اور بڑھ گئی۔ احسان شاہ نہیں آیا۔ کچھ
دیر بعد شیدا واپس آیا۔ اس نے رحیم داد کے آگے میز رکھی۔ اس پر وہسکی کی بوتل' پانی سے بھرا
ہوا جگ اور گلاس سلیقے سے رکھ دیئے۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ "شیدے! شاہ جی نہیں آیا؟"
اس کے لہجے سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

"شاہ جی نے کہا ہے' میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔ چوہدری سے کہنا' روٹی ساتھ ہی کھانی ہے۔
آرام سے گپ شپ ہوگی۔ ابھی میں سرکاری افسروں سے کچھ ضروری باتیں کر رہا ہوں۔" شیدے
نے احسان شاہ کا پیغام رحیم داد کو پہنچا کر وہسکی کا پیگ تیار کیا اور رحیم داد کے سامنے رکھ کر بولا۔
"تو شروع کر' شاہ جی ادھر بیٹھا لگا رہا ہے۔ جھیتی تیرے پاس آئے گا۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ شیدا چلا گیا۔ گلاس سامنے رکھا رہا۔ اس میں وہسکی کا رنگ جھلکتا رہا
مگر رحیم داد نے گلاس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ چپ بیٹھا احسان شاہ کا انتظار کرتا رہا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا
تھا۔ باڑی پر پراسرار سکوت طاری تھا۔ آس پاس نہ کوئی آواز تھی نہ آہٹ۔ رحیم داد بالکل تنہا
تھا۔ رات باڑی میں اتر کالی پڑتی جا رہی تھی۔ کھڑکی سے جھانکتی ہوئی لیمپ کی روشنی زرد و مبہم ہو
کر رہ گئی تھی۔

لگ بھگ گھنٹے بھر بعد احسان شاہ آیا اور معذرت کے انداز میں بولا۔ "معاف کرنا چوہدری' مجھے
دیر ہو گئی' پر تو آج اچانک کیسے آ گیا؟" وہ قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے رحیم داد کے
سامنے رکھا ہوا گلاس دیکھا۔ "اوئے! یہ گلاس ایسے ہی پڑا ہے۔ لگتا ہے تو نے ایک گھونٹ بھی
نہیں لیا۔" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"نہیں شاہ جی! میں نے آج نہیں پینی۔" رحیم داد نے انکار میں گردن ہلائی۔ "واپسی میں جیلے
مل گئی تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ میں اس کے یا اللہ وسایا کے سامنے پی کر جانا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی میں
نے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔ صرف تیرے ساتھ روٹی ٹکر کھا لوں گا۔"

احسان شاہ نے اصرار کیا۔ مگر رحیم داد آمادہ نہیں ہوا۔ احسان شاہ نے زچ ہو کر کہا۔ "جیسی
تیری مرضی۔" اس نے گلاس اٹھایا' بڑا گھونٹ بھرا۔ چڑھی ہوئی آنکھیں اور تمتماتا ہوا چہرہ صاف
ظاہر کر رہا تھا کہ وہ پہلے ہی خوب چڑھا چکا ہے۔

"یہ بتا' ادھر کیسے آنا ہوا؟"

"تجھ سے کچھ ضروری گل کرنی تھی۔" رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص گل ہے؟"

"خاص ہی گل سمجھ لے۔ آج دوپہر اللہ وسایا اپنے وکیل کے ساتھ میرے پاس آیا اور مجھ سے
ایک درخواست پر دستخط لگوا لیے۔"

"کیسی درخواست تھی؟" احسان شاہ نے پوچھا۔

"انگریزی میں تھی۔ تیں نوں پتہ ہے میں نوں انگریزی نہیں آتی۔ میں نے اس کے بارے میں
وکیل سے پوچھا بھی' پر اس نے کہا یہ کنون کی باتیں ہیں' تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ میں بعد میں
تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔ ابھی تو جلدی میں ہوں۔ درخواست فوراً لگانی ہے۔"

"حد کر دی تو نے۔" احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "جب اس نے درخواست کی نوعیت اور
اس کا سبب ہی نہ بتایا تو آنکھ بند کر کے تو نے اس پر دستخط کیوں کر دیئے؟"

"کیا کرتا جی!" رحیم داد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔ "اللہ وسایا میرے گلے پڑ گیا۔ بار بار
دستخط کرنے کو کہا۔ پہلے تو میں چپ کر کے بیٹھا رہا۔ جب وہ ضد کرنے لگا تو دستخط لگانے ہی پڑے۔
میں اسے نراض بھی تو نہیں کر سکتا۔"

"تو نے بہت برا کیا۔" احسان شاہ کے چہرے پر جھنجلاہٹ طاری ہو گئی۔ "لگتا ہے' اللہ وسایا
نے اپنا کام پکا کر لیا۔ میں نے پہلے ہی خبردار کیا تھا۔ پر تو نے میری بات پر بھروسہ نہیں کیا۔" اس
کے لہجے میں تلخی کا اضافہ ہو گیا۔ "کبھی یہ بھی سوچا اس نے دو تین ہزار روپے خرچ کر کے حویلی اور
زرعی اراضی تیرے نام کیوں الاٹ کرا دی؟ تو اس کا کون سا سگا لگتا ہے۔ آخر اس نے الاٹمنٹ
کے لیے اتنا پیسہ کیوں خرچ کیا؟ کیوں اتنی بھاگ دوڑ کی؟ تو ہی بتا' اس نے ایسا کیوں کیا؟ کوئی تو بات
ہوگی' کچھ تو اسے فائدہ ہوگا۔ اتنا تو کوئی اپنے بھائی کے لیے بھی نہیں کرتا۔ تو اس کا کچھ بھی تو نہیں
لگتا۔ پرانی یاری بھی نہیں۔ اپنی سمجھ میں تو یہ چکر آتا نہیں۔ اس میں ضرور کچھ ہیر پھیر ہے۔"

"شاہ جی! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اپنا مغز بھی کام نہیں کرتا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں
کہا۔ "وکیل نے درخواست پر دستخط کرانے کے ساتھ میرے کلیم کے سارے کاغذات بھی اپنے
پاس رکھ لیے ہیں۔"

"کیا کہا! کلیم کے کاغذات بھی اس نے اپنے کبجے میں کر لیے؟" احسان شاہ نے حیران و پریشان
ہو کر پوچھا۔ "اس نے تجھے بالکل ہی ختم کر دیا۔ تو اندھے اعتماد میں مارا گیا۔ اب تو تیرے پاس
دستاویزی ثبوت بھی نہیں رہا۔ مختار نامہ اسے پہلے ہی دے چکا ہے۔ اس نے اپنی مرضی کی
درخواست پر تجھ سے دستخط بھی لگوا لیے۔ پہلے جو کمی رہ گئی تھی' اب پوری کر لی۔ اب تو وہ جو جی
چاہے کر سکتا ہے۔ جب مرضی ہوگی' تجھے بے دخل کر دے گا۔ اب تو اسے صرف پٹواری کے رجسٹر

ملکیت میں اپنے نام کا اندراج کرانے کے بعد تحصیل دار کے پاس جانا ہے۔ ہزار دو ہزار میں یہ کام بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "اب تو وہ ساری جائیداد پر اپنا ہی کبضہ رکھے گا۔ ویسے بھی اس کے کہنے میں ہے۔ لگتا ہے وہ اپنی کارروائی پوری کرنے کے لیے جلد ہی شہر جائے گا۔"

"وہ تو آج ہی وکیل کے ساتھ شہر چلا گیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا' وہ اپنی کارروائی مکمل کر کے جلد سے جلد تیرا پتا کاٹ دینا چاہتا ہے۔"

رحیم داد نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

"کس سوچ میں پڑ گیا چوہدری؟" احسان شاہ نے رحیم داد کو خاموش دیکھ کر دریافت کیا۔

"شاہ جی! سچ پوچھ تو مجھے یقین نہیں آتا اللہ وسایا میرے خلاف ایسا بھی کر سکتا ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا۔" رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "سمجھ نہیں آتی' وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ تجھے پتہ نہیں' پچھلے دنوں وہ مجھے کیروالا کے ایک زمیں دار کے گھر لے گیا۔ جمیلہ بھی ساتھ تھی۔ دونوں اس کی دھی سے میرا ویاہ کرانا چاہتے ہیں۔ اب تجھ سے کیا چھپانا۔ ویاہ کے لیے اگلے مہینے کی ۲ تاریخ طے بھی ہو چکی ہے۔" رحیم داد نے نظر بھر کر احسان شاہ کی طرف دیکھا۔ "ان کے دل میں اگر میرے خلاف کوئی بدی ہوتی تو وہ ایسا کیوں کرتے؟ مجھے بے دخل ہی کرنا ہوتا تو اللہ وسایا اور جمیلہ میرا گھر بسانے کی کوشش کیوں کرتے؟"

"یہ کب کی گل ہے؟" احسان شاہ کے لہجے میں تحیّر تھا۔

"پچھلے جمعے کی۔" رحیم داد نے بتایا۔ "زمیں دار کا نام چوہدری اکرم ہے۔ تحصیل کیروالا کے پنڈ احمد پور میں اس کی زمیں داری ہے۔ اٹھ مربعے سے اوپر زمین ہے۔ پکی ماڑی ہے اور جس کڑی کے ساتھ وہ میرا ویاہ کرنا چاہتا ہے' اس کے سوا اس کا کوئی نہیں۔ وہی اس کی ساری جائیداد کی وارث ہے۔ بلکہ اللہ وسایا تو یہ بھی کہتا تھا کہ اکرم ویاہ کے بعد اپنی ساری زمیں داری میرے سپرد کر دے گا۔"

"مجھے تو یہ بھی کوئی اونچا چکر لگتا ہے۔" احسان شاہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "اپنی سمجھ میں تو یہ گل آتی نہیں۔ جس کی اکلوتی اولاد صرف ایک دھی ہو اور اچھی خاصی زمیں داری بھی ہو' کیا اسے اپنی جات برادری میں رشتہ نہیں مل سکتا تھا جو وہ تجھے اپنا جنوائی بنانے پر اتنی جلدی تیار ہو گیا؟"

"پر ایک گل اور بھی ہے۔ اس کی دھی کا پہلے بھی ویاہ ہو چکا ہے۔ جنوائی چنگا بندہ نہیں تھا۔ اس

لیے اکرم کاغذ لکھوا کر دھی کو اپنے گھر لے آیا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "اکرم بوڑھا ہے اور بیمار بھی رہتا ہے۔ چاہتا ہے اپنی زندگی میں دھی کا ویاہ کر دے تاکہ اس کے بعد وہ بے سہارا نہ رہ جائے۔ شریکے اور برادری والے جائیداد پر کبضہ کرنے کے لیے اسے تنگ نہ کریں۔"

"چوہدری' مجھے تو یہ شادی ویاہ سب ڈھونگ لگتا ہے۔ پتہ نہیں' اکرم کون ہے' کیسا بندہ ہے؟" سید احسان علی نے نشے کی جھونک میں قہقہہ بلند کیا۔ "چوہدری تو ٹھہرا مہاجر۔ تو ان ملتانیوں کو نہیں جانتا۔ ان کے لیے تو مشہور ہے کہ صورت ملاں کی اور آنکھیں چور کی۔ پورے پنجاب میں ملتانی زمینداروں سے بڑا رسہ گیر نہیں ملے گا۔ جتنا وڈا زمیں دار ہو گا' اتنا ہی وڈا رسہ گیر ہو گا۔ ویسے نام کو کوئی سید ہے۔ کوئی کریشی' کوئی گردیزی ہے۔ کوئی گیلانی ہے۔ کوئی نواب اور کوئی مخدوم ہے۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "وہ کوئی بھی ہو پر رسہ گیری کو جرم اور برائی نہیں سمجھتا۔ رسہ گیری تو ان کے لیے دل بہلانے کا مشغلہ اور تفریح ہے۔"

"پر چوہدری اکرم ایسا نہیں ہے۔ دیکھنے میں نیک بندہ لگتا ہے۔"

"کسی کی صورت پر تو اندر کا حال لکھا نہیں ہوتا۔" احسان شاہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ "چوہدری تجھے ملتانی زمیں داروں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ پنجاب گزیٹیر میں تو ان کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک بتایا گیا ہے کہ وہ رسہ گیری کو بالکل چوری چکاری نہیں سمجھتے۔ زور آور اور کامیاب نمبر دار وہی سمجھا جاتا ہے جو دن میں حکومت کرے اور رات کو چوری اور رسہ گیری۔ ان کے بارے میں تو جانے کتنی کہاوتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں چاچا چور بھتیجا کاضی۔ ملاں چور موذن گواہ۔ کہاں تک تجھے بتاؤں۔" اس نے وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا اور گلاس خالی کر دیا۔ "نوجوان زنانیوں اور مٹیاروں کو اٹھوا لینا اور ان کی عزت لوٹنا ملتانی زمیں داروں میں بالکل عام بات ہے۔ چاہے وہ نواب زادہ ہو یا گدی نشین۔"

رحیم داد نے حیرت سے احسان شاہ کو دیکھا۔ وہ نشے میں بالکل بھول گیا تھا کہ جتنی بھی برائیاں نفرت سے منہ بگاڑ بگاڑ کر وہ ملتانی زمیں داروں کی گنوا رہا ہے' وہی حرکتیں اور وہی جرائم وہ خود کرتا ہے اور نہایت دھڑلے سے کرتا ہے۔ زمیں داری چلانے کے لیے انھیں ناگزیر قرار دیتا ہے۔

مگر احسان شاہ اس کے احساسات سے بے نیاز کہتا رہا۔ "تو کس چکر میں پڑ گیا۔ ہرگز ہرگز ادھر ویاہ نہ کرنا۔ بعد میں بہت پچھتائے گا۔ ویسے مجھے تو یہ ویاہ شیاہ ہوتا نظر نہیں آتا۔ اللہ وسایا اس بہانے تجھ سے پیار جتانا چاہتا ہے' پر اس کے ارادے کچھ اور ہی ہیں۔ یوں سمجھ لے' وہ ایک ہاتھ سے حویلی اور زمین تجھے دے کر دوسرے ہاتھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔ میرا کام تجھے خبردار کرنا ہے'

آگے تیری مرضی۔"

رحیم داد کو فوراً یاد آگیا' اللہ وسایا نے باتوں باتوں میں یہ بھی کہا تھا کہ چوہدری تو احمد پور کی زمیں داری سنبھال لیتا' ادھر کی دیکھ بھال میں کر ہی رہا ہوں۔ رحیم داد ایک بار پھر ذہنی الجھن میں مبتلا ہوگیا۔ اس نے پوچھا۔ "شاہ جی! یہ بتا' اب میں نوں کیہ کرنا ہے؟ میں تیرے کول اسی لیے آیا تھا۔" اس کے لہجے سے بے چارگی اور پریشانی جھلک رہی تھی۔

"تونے تو خود اپنے ہاتھ کٹوا لیے۔" احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اللہ وسایا نے تجھ سے سب کچھ تو لے لیا۔ اب میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"میں اللہ وسایا کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پر یہ تو جانتا ہی ہے کہ اللہ وسایا صرف مزارع ہی نہیں رہا' کوم کا جانگلی بھی ہے اور وہ جانگلی ہی کیا جو چوری' ڈکیتی اور لوٹ مار نہ کرے۔ جانگلی تو ماں کے پیٹ ہی سے جرائم پیشہ پیدا ہوتا ہے۔" احسان شاہ کے چہرے سے سخت برہمی جھلکنے لگی۔ "مجھے اس سے اتنی سخت نفرت ہی اس لیے ہے کہ ایک جانگلی میرے ضلعے' بلکہ میری ہی تحصیل میں زمیں دار بنا بیٹھا ہے۔ شان سے حویلی میں رہتا ہے' اونچے طرے کی پگ لگا کر نکلتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں' اس کی یہ آن بان دیکھ کر میرا خون کس طرح کھولتا ہے۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور سنبھل سنبھل کر بولنے لگا۔ "مشکل یہ ہے کہ یہ بھی تو پتہ نہیں' تونے اللہ وسایا کے لیے مختار نامے پر دستخط کیے ہیں یا بیع نامے پر۔ کلیم کے کاغذات بھی اس نے تجھ سے ہتھیا لیے۔ اب تو معاملہ بہت آگے نکل چکا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا؟"

"اب تیرے سامنے صرف دو رستے ہیں۔"

"وہ رستے کیا ہیں؟" رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

"اگر تو کانونی چارہ جوئی کرنا چاہے تو میں تیرا کیس اپنے وکیل سے لڑواؤں گا۔ حالانکہ تونے اپنا کیس خود اپنے ہاتھوں کمزور کر دیا ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کی جانب بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "بول کیا کہتا ہے؟"

"نہیں شاہ جی!" رحیم داد نے اتفاق نہیں کیا۔ "میں مکدمے بازی کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ یہ دیوانی مکدمہ ہے۔ برسوں عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑیں گے۔ کہتے ہیں دیوانی کیس تو دیوانہ بنا دیتا

ہے۔"

انکار کے باوجود احسان شاہ نے مقدمہ لڑنے پر زور دیا مگر رحیم داد تیار نہیں ہوا۔ وہ اس کے لیے تیار ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس پر تو پولیس کو صرف دیکھ کر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی۔ عدالت میں پیش ہونے اور بیان دینے کی اس میں جرات ہی نہیں تھی۔ اسے سراسر خطرہ نظر آتا تھا۔ جائیداد اور املاک حاصل کرنے کی کوشش میں اگر اسے شناخت کر لیا جاتا تو صرف جیل ہی نہ جانا پڑتا' حکیم نذر محمد چشتی اور چوہدری نورالہی کے قتل کے جرم میں پھانسی بھی ہو سکتی تھی۔ اسی کمزوری کے باعث اس نے اللہ وسایا کو مختار نامہ دیا تھا تاکہ اسے عدالتوں میں اور سرکاری افسروں کے سامنے پیش نہ ہونا پڑے۔ وہ ہرگز کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

"مکدمہ لڑنا نہیں چاہتا تو صرف ایک ہی رستہ رہ جاتا ہے۔" احسان شاہ نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"وہ کون سا رستہ ہے؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"وہ یہ کہ اللہ وسایا کو رستے سے صاف کر دیا جائے۔" اس کی خمار آلود آنکھوں میں مجرمانہ چمک پیدا ہوگئی۔

"تیرا مطلب ہے' اللہ وسایا کا صفایا کر دیا جائے؟" رحیم داد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بالکل یہی مطلب ہے۔" احسان شاہ کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہوگئی۔ "اللہ وسایا کا صفایا کرنے کے بعد حویلی اور زمین پوری طرح تیرے کبضے میں آجائے گی۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔ "تجھے کبیر والا میں ویاہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ جمیلہ تو موجود ہی ہے۔ وہ سوہنی ہے اور جوان بھی۔ اس سے نکاح پڑھا لینا۔ اس کے دس مربعے بھی تیری تحویل میں آجائیں گے۔ تو پورے کوٹلہ ہرکشن کا زمیں دار بن جائے گا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "پر تجھ میں اتنی ہمت بھی ہے؟"

"نہیں شاہ جی! یہ ٹھیک نہیں۔" رحیم داد کے ذہن کو زور کا جھٹکا لگا۔ اس کے چہرے سے پریشانی برسنے لگی۔

"تو یہ بھی سن لے۔" احسان شاہ کا لہجہ گمبھیر ہوگیا۔ "اگر تونے اللہ وسایا کا صفایا نہ کیا تو وہ جلد ہی تجھے اپنے رستے سے صاف کر دے گا۔"

"تو یہ کہنا چاہتا ہے' اللہ وسایا مجھے کتل کرا دے گا؟"

"بالکل کرا سکتا ہے۔ مت بھول کہ اللہ وسایا جانگلی بھی ہے۔" احسان شاہ کے لہجے میں تلخی

تھی۔ "جانگلی تو نہ صرف لوٹ مار کے لیے خون کرتا ہے' بلکہ پیسے لے کر دوسروں کے لیے بھی قتل کرتا ہے۔ وہ تو پیشہ ور قاتل ہوتا ہے۔ اگر اس نے تجھے قتل نہ بھی کیا تو کسی کیس میں پھنسوا کر جیل بھجوا سکتا ہے۔ اس کا وکیل بہت تیز ہے۔ مجھے پتہ ہے' وہ کتنا تیز ہے۔"

رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر احسان شاہ کی طرف دیکھا۔ "شاہ جی! تیری باتیں بالکل سمجھ نہیں آئیں نہ۔"

"سوچ لے' ٹھنڈے دل سے سوچ لے۔" احسان شاہ اس کی سراسیمگی اور گھبراہٹ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے تیری پریشانی کا پتہ ہے' تبھی میں نے تجھے ہر پہلو دکھا دیا۔ اب تو اپنے طور پر سوچ بچار کر لے۔ مگر تجھے جلد ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ وقت بہت کم ہے۔"

"میں تیرے پاس چند روز بعد آؤں گا۔ اب میں نوں چلنا ہے۔" رحیم داد کھڑا ہو گیا۔

احسان شاہ نے اسے جانے نہیں دیا۔ "ایسی کیا جلدی ہے؟ روٹی کھا کر جانا۔" احسان شاہ بھی کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد ٹھہر گیا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔ رحیم داد کھانے کے دوران خاموش رہا۔ احسان شاہ نے بھی کم بات چیت کی۔ لیکن اس نے اللہ وسایا کی جانب سے رحیم داد کو برگشتہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ کھانے سے فارغ ہو کر رحیم داد اپنی گھوڑی پر سوار ہو کے واپس ہوا۔

☆

رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا تو احمد سو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا مگر بات چیت نہیں کی۔ گہری نیند سے اٹھا تھا' آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ لیکن رحیم داد کو اس کی زبانی یہ اطلاع مل گئی کہ اللہ وسایا شہر سے لوٹا نہیں ہے۔

اللہ وسایا دوسرے روز شام کو واپس آیا۔ رحیم داد باغ میں تنہا بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ اس کے پاس نہیں آیا۔ واپسی کے کچھ ہی دیر بعد وہ قادر کے گھر چلا گیا۔ جیلہ بھی اس کے ہمراہ تھی۔ یہ اطلاع بھی احمد ہی نے دی تھی۔ رحیم داد کے دریافت کرنے پہ اس نے بتایا۔

"زمیں دار اور زمیں دارنی کادو کے پاس گئے ہیں۔ وہ آج دوپہر کو لہور سے لوٹا ہے۔"

"کادو اب کیسا ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"بالکل کمزور پڑ گیا ہے جی! آنکھیں تو اس کی دونوں ہی جاتی رہیں۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اندھا ہو گیا ہے۔"

کئی روز گزر گئے۔ نہ اللہ وسایا اس کے پاس آیا نہ جیلہ۔ دونوں قادر اور عطا محمد کا جھگڑا ختم کرانے کے لیے صلح صفائی کی کوشش کر رہے تھے۔ عطا محمد تو تیار تھا۔ وہ اور اس کا بھائی گرفتار ہونے کے بعد ضمانت پر رہا ہو چکے تھے۔ پولیس نے دونوں کو مجیداں کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ دوسری طرف قادر صلح کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ وہ ایسی شرائط پیش کرتا جو عطا محمد کے لیے قابل قبول نہ ہوتیں۔

ہر روز دونوں فریقوں کے نمائندے اکٹھا ہوتے۔ پنچایت بیٹھتی' لیکن قادر کے بگڑے ہوئے رویے کے باعث کچھ نہ طے ہوتا۔ بار بار تلخ کلامی کی نوبت آ جاتی' بات بنتے بنتے بگڑ جاتی۔ لیکن جیلہ نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے قادر اور اس کے بیٹے صابر کو سمجھا بجھا کر کسی نہ کسی طور راضی کر ہی لیا۔

رحیم داد پنچایت میں شریک نہیں ہوا۔ اس کا وقت تنہائی میں کٹتا رہا۔ احمد یا دوسرے نوکروں سے اسے اللہ وسایا اور جیلہ کی سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہا۔

☆

اللہ وسایا مہمان خانے میں رحیم داد کے پاس آیا مگر وہ کمرے میں نہیں بیٹھا۔ رحیم داد کو باہر لے گیا۔ دونوں ٹہلتے ہوئے کھیتوں کی طرف چلے گئے۔ دن کے ساڑھے بارہ بجے تھے' لیکن دھوپ نہیں تھی۔ آسمان پر سرمئی بادل چھائے تھے۔ بارش کے بعد ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ ہوا قدرے بھری ہوئی تھی۔ درختوں کی شاخیں اور پودے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔

فضا خوشگوار اور سہانی تھی۔ لیکن اللہ وسایا کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ چپ چپ تھا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ کچھ دیر تک دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ آخر رحیم داد نے خاموشی توڑی۔

"تو شہر گیا تھا' درخواست کا کیا بنا؟"

"وکیل نے دوسرے ہی روز درخواست لگا دی تھی۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے استفسار کی۔ "یہ نئی درخواست کیسی ہے؟ نہ تو نے کچھ بتایا نہ وکیل نے۔"

"تو درخواست کے بارے میں بار بار اس طرح کیوں پوچھ رہا ہے؟" اللہ وسایا کا لہجہ تیکھا تھا۔

رحیم داد نرم پڑ گیا۔ "برا منا رہا ہے تو نہیں پوچھوں گا۔" اس نے لمحے بھر خاموش رہ کر پوچھا۔

"میں تو یہ پتہ کرنا چاہتا تھا' الاٹمنٹ میں کوئی گڑبڑ تو نہیں پڑ گئی؟"

"گڑبڑ ہو سکتی تھی' اگر فوراً درخواست نہ لگائی جاتی۔"

"پریشانی کی تو کوئی گل نہیں؟" رحیم داد نے بے چینی کا اظہار کیا۔

"ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" اللہ وسایا نے بے نیازی سے جواب دیا۔

رحیم داد نے محسوس کیا کہ اللہ وسایا خلاف توقع کچھ اکھڑا اکھڑا ہے۔ وہ ہر بات کا مختصر اور ادھورا جواب دیتا۔ رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔ "تو نے یہ نہیں بتایا' یہ درخواست لگانے کی ضرورت کیوں پڑی؟"

"یہ تو وکیل سے پوچھنا' وہی بتائے گا۔"

"تیں نوں کچھ پتہ ہو تو بتا دے۔" رحیم داد کا لہجہ بہت نرم تھا۔ "وکیل تو کانونی نکات بتائے گا وہ سمجھ نہیں آئیں گے۔"

"جب کانونی نکات تجھے سمجھ نہیں آتے تو چپ کر کے بیٹھا رہ۔ آگے تجھے سب کچھ خود ہی پتہ چل جائے گا۔" اللہ وسایا کے انداز میں ہلکی ہلکی تلخی تھی۔ وہ چند لمحے خاموشی سے چلتا رہا۔ رحیم داد نے بھی خاموشی توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر اللہ وسایا نے خود ہی گفتگو شروع کی۔ "تجھ سے ایک ضروری گل پوچھنی ہے۔"

"کیسی گل؟" رحیم داد نے مضطرب ہو کر دریافت کیا۔

اللہ وسایا کا چہرہ اور گمبھیر ہو گیا۔ اس نے مڑ کر تیکھی نظروں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تو یہاں آنے سے پہلے ڈھول امیر خاں میں ہوتا تھا؟"

رحیم داد کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ نظریں جھکائے چپ چاپ چلتا رہا۔ اس کے چہرے پر اچانک سراسیمگی چھا گئی تھی اور صاف نظر بھی آ رہی تھی۔

اللہ وسایا گردن اٹھائے چلتا رہا۔ اس کا چہرہ اور سنجیدہ ہو گیا۔ چند قدم خاموشی سے آگے بڑھنے کے بعد اللہ وسایا کی آواز ابھری۔ "تو نے ادھر دو کتل بھی کیے ہیں؟" رحیم داد کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اس پر سکتہ طاری تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کا ذہن ستار کے تاروں کی مانند جھن جھنا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرے کے جال پھیلنے لگے۔

"چپ کیوں ہے' بولتا کیوں نہیں؟" اللہ وسایا کا لہجہ تیکھا اور قدرے اونچا تھا۔

رحیم داد شدید مخمصے میں پڑ گیا۔ نہ وہ اعتراف کر سکتا تھا' نہ صاف انکار۔ دونوں صورتوں میں اس کے لیے پریشانی تھی۔ اس نے صاف جواب دینے سے گریز کیا۔ ذہنی خلفشار پر قابو پانے کی

پوری پوری کوشش کی' ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"دارا تجھ سے ملا تھا؟"

"ہاں!" اللہ وسایا نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "پچھلے دنوں وہ تجھے ڈھونڈتا ہوا میرے پاس آیا تھا۔ دیر تک باتیں کرتا رہا۔"

"کیا کہتا تھا؟" رحیم داد کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

"وہی جو میں نے تجھے بتایا۔"

رحیم داد نے فوراً پینترا بدلا۔ "میں نے تجھے بھائی کہا ہے' تجھ سے ہرگز جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

اللہ وسایا پر خاطر خواہ ردعمل ہوا۔ اس کے انداز میں قدرے نرمی پیدا ہوئی۔ وہ گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔ "چوہدری! میں تجھے اتنا خطرناک بندہ نہیں سمجھتا تھا۔"

"تو پہلے میری پوری گل سن لے۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کو رام کرنے کی کوشش کی۔

"تجھے پتہ نہیں۔ میں نے ان باتوں کا ابھی تک کسی سے بالکل تذکرہ نہیں کیا۔ جمیلہ تک کو نہیں بتایا۔ حالانکہ میں اس سے کبھی کوئی بات نہیں چھپاتا۔" اللہ وسایا نے لمبی سانس بھری۔ "چوہدری! تو نے مجھے سخت الجھن میں ڈال دیا ہے۔ تو خود سوچ' اگر یہ باتیں سچ ہیں تو آگے کیا بنے گا۔"

"تو میری بات پوری طرح سن لے گا تو سب کچھ تیری سمجھ میں آ جائے گا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کرنا چاہی۔ "تو جس طرح سوچ رہا ہے' بات اس طرح نہیں ہے۔"

اللہ وسایا اس کی صفائی سننے پر رضامند نہ ہوا۔ "تجھے اس معاملے میں جو کچھ کہنا ہے' دارا ہی کے سامنے کہنا تاکہ ہر بات کھل کر سامنے آ جائے۔ وہ جلد ہی میرے پاس آئے گا۔"

رحیم داد نے اصرار کیا۔ "اس کے سامنے بھی بات ہو جائے گی۔ مگر تو اس سے پہلے میری گل بھی سن لے۔"

"تو کہتا ہے تو ضرور سنوں گا۔" اللہ وسایا نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ "اس بارے میں آرام سے بیٹھ کر تجھ سے گل بات ہو گی۔ آج تو میں نوں وکیل کے پاس شہر جانا ہے۔"

"درخواست ہی کے سلسلے میں جا رہا ہے؟"

"ہاں' تجھ سے مختار نامہ لینے کے بعد اب تو مجھی کو ہر افسر کے سامنے پیش ہونا پڑتا ہے۔"

"کب جائے گا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"دوپہر کی روٹی کھا کر روانہ ہو جاؤں گا۔"

"واپسی کتنے روز میں ہوگی؟"

"کچھ پتہ نہیں۔ تین چار روز تو لگ ہی جائیں گے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے کھیتوں سے گزر کر اسکول کی جانب نکل آئے۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر دیکھا' جمیلہ اسکول سے باہر آرہی ہے۔ اس کے ہم راہ دونوں بچے بھی تھے۔ اللہ وسایا نے بھی اسے دیکھ لیا۔ رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"لگتا ہے' سکول کی چھٹی ہوگئی۔ زمیں دارنی آرہی ہے۔"

اللہ وسایا نے آہستہ سے کہا۔ "میرے جانے کے بعد اس معاملے میں جمیلہ سے کوئی گل بات نہ کرنا۔ میں تجھے بتا ہی چکا ہوں' میں نے اسے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔ جب تک تجھ سے پوری طرح بات چیت نہ ہو جائے گی' اس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ ایسی باتوں سے جلد گھبرا جاتی ہے۔"

"نہیں' میں اس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ تو فکر نہ کر۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کو یقین دلایا۔

جمیلہ قریب آگئی۔ اللہ وسایا اور رحیم داد اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے حویلی کی جانب چل دیے۔

رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا تو سخت پریشان اور خوف زدہ تھا۔ پریشانی کے عالم میں اس سے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ وہ شام تک کمرے میں بستر پر لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے اپنے سر پر خطرہ منڈلاتا نظر آرہا تھا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تو وہ مہمان خانے سے نکلا۔ باغ میں گیا اور تنہا بیٹھا رہا۔ اللہ وسایا شہر جا چکا تھا۔ جمیلہ بھی باغ میں نہیں آئی۔

☆

بادل چھائے تھے مگر بارش نہیں ہوئی۔ رحیم داد نے باغ ہی میں کھانا کھایا اور کھانے سے فارغ ہو کر دیر تک بیٹھا رہا۔ اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ رحیم داد اٹھا اور مہمان خانے کی جانب چلا۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک جھنڈ کے نیچے سے دارا نکلا اور رحیم داد کے سامنے آگیا۔ رحیم داد سراسیمہ ہو کر کھڑا ہوگیا۔ دارا کو دیکھ کر خوف اور پریشانی کے ساتھ ساتھ اس پر غصہ بھی طاری ہوا۔ مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"تو نے مجھے پہچان لیا؟" دارا نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں۔" رحیم داد آگے بڑھنے لگا۔ "میرے ساتھ آ۔"

رحیم داد نے مہمان خانے کی جانب جانے کا ارادہ ترک کر دیا' مڑا اور دارا کے ہم راہ نہر کی

سمت بڑھنے لگا۔ عقب میں گاؤں تھا۔ مکانوں میں چراغوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ آسمان پر ہلکا ابر چھایا تھا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا تھا۔ دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

کچھ دور جا کے رحیم داد نے پوچھا۔ "تو یہاں کیسے آیا؟" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

"میں نے تجھے اس روز نہر کے کنارے دیکھا تھا۔ یاد ہے نا جب تو اپنی گھوڑی دوڑاتا جا رہا تھا۔" دارا آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "تبھی سے میں تیرے پاس آنا چاہتا تھا' پر تو اتنا بدل گیا ہے کہ بالکل پہچانا نہیں جاتا۔ تیرے منہ پر یہ چوٹ کا نشان بھی نہیں تھا۔ تو گھوڑی پر بیٹھا بھی بہت شان سے تھا۔ سچ کہتا ہوں' میں تجھے پہچان نہیں سکا تھا۔"

"ایسا تھا تو ادھر کیوں آیا؟"

"گل ایمہ ہے جی! تیرے بارے میں کچھ شبہ سا ہوا۔" دارا نے وضاحت کی۔ "میں نے تجھے ادھر سے گھوڑی پر نکلتے دیکھا تھا۔ اب تجھ سے صاف صاف بتا دوں۔ میں دو بار پہلے بھی یہاں آیا اور چھپ کر تجھے خوب غور سے دیکھتا رہا۔"

"پر تو ادھر کیسے آگیا؟ تو ڈھولہ امیر خاں میں ہوتا تھا نا؟ میں نے تجھے وہیں چھوڑا تھا۔"

"تیں نوں پتہ ہی نہ ہوگا' تیرے آنے کے بعد مجھ پر کیا بیتی۔" دارا نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "جب تو بیگماں اور اس کے گھر والے مولا داد کا خون کر کے بھاگا۔"

"تیں نوں کیسے پتہ چلا' میں نے بیگماں اور مولا داد کا خون کیا؟" رحیم داد نے اس کی بات کاٹ کر دریافت کیا۔ اس کی آواز سے جھنجلاہٹ صاف جھلک رہی تھی۔

"ناراض نہ ہو۔ تیں نوں پتہ ہی ہے' میں موجود نہیں تھا۔" دارا سہم کر نرم پڑ گیا۔ "میں جب پہنچا تو بیگماں مرچکی تھی' مولا داد دم توڑ رہا تھا۔ اس کا بھائی اللہ داد زخمی تھا' پر زندہ تھا۔ اسی نے بتایا بیگماں اور مولا داد کا خون تو نے کیا۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔" رحیم داد برافروختہ ہو کر بولا۔ "اسے پتہ ہے' بیگماں کو میں نے نہیں' مولا داد نے کلہاڑی سے قتل کیا۔ میں نے اسے روکنا چاہا تو اس نے مجھ پر بھی وار کیا۔ میں برابر بچنے کی کوشش کرتا رہا' پر جب میں نے دیکھا' وہ بیگماں کی طرح مجھے بھی ختم کرنے پر تلا ہوا ہے تو میں نے اپنے بچاؤ کے لیے وار کیا اور اسی کی کلہاڑی چھین کر کیا۔ کرتا بھی کیا۔ وہ بالکل پاگل ہو رہا تھا۔ اللہ داد بھی اسی لیے زخمی ہوا کہ وہ بھی مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" دارا نے جھٹ اس کی تائید کی۔ "پر تیں نوں یاد ہوگا' جب تو میرے گھر سے نکل کر کھیتوں کی طرف بھاگا' تو میں نے تجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ تو رک کر اصلی گل

بتا دیتا تو میں اللہ داد کی بات ہرگز نہ مانتا۔" وہ صفائی پیش کرتے کرتے شکوہ کرنے لگا۔ "میں نے تو تجھ سے پہلے ہی پوچھا تھا' اگر تو نے بیگماں سے یاری لگا رکھی ہے۔"

رحیم داد نے اسے آگے نہیں بولنے دیا۔ غصے سے آگ بگولا ہو کر ڈانٹا۔ "چپ کر۔ تو نے فیر وہی بکواس شروع کر دی۔"

"اللہ داد بھی ایسی ہی گل کرتا تھا۔ دوسرے بھی یہی کہتے تھے۔" دارا نے گڑگڑانے کے انداز میں آہستہ آہستہ کہا۔ "اللہ داد نے پولیس کو بھی یہی بتایا۔"

"پولیس نے تجھ سے بھی پوچھ تاچھ کی تھی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں کی۔ میرے گھر ہی میں دونوں کا خون ہوا تھا۔ پولیس مجھے کیسے چھوڑ دیتی۔ تھانے دار سویرے پہنچا تھا اور مجھے پکڑ کر تھانے لے گیا۔"

"تو نے کیا بیان دیا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"میں نے کیا بیان دینا تھا جی! میں نوں تو کچھ پتہ نہیں تھا۔ پولیس نے چھتر مار مار کر چمڑی ادھیڑ ڈالی۔ پیٹھ اور کمر پر لمبے لمبے لاس پڑ گئے۔ انھوں نے مجھے ننگا کیا اور الٹا لٹکا دیا۔ ایک پولسا میرے دونوں ہاتھ اپنے بوٹ سے دبا کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا زور زور سے ٹھڈے مارتا تھا۔ میں درد سے چیخنے چلانے لگا' پر اس نے ترس نہ کھایا۔ وہ مارتے مارتے تھک گیا تو تھانے دار کے حکم پر ایک اور پولیسیا لگایا گیا۔ وہ خوب تکڑا تھا۔ اس نے سڑاک سڑاک پانی میں بھیگے ہوئے چمڑے کے چھترے مارے۔ میں نے ڈر کے وہی بیان دے دیا جو اللہ داد نے دیا تھا۔"

"پر تو وہاں موجود ہی کب تھا' جب مولا داد نے بیگماں کو قتل کیا اور مجھے قتل کرنے کے ارادے سے کلہاڑی اٹھا کر حملہ آور ہوا۔ تو تو پہلے ہی گھر سے نکل کر جا چکا تھا۔ اللہ داد اور مولا داد تو تیرے جانے کے بہت بعد پہنچے تھے۔"

"تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پر میں کب تک مار کھاتا۔" دارا نے اپنی صفائی پیش کی۔ "میں نے تو مار سے بچنے کے لیے ایسا بیان دیا تھا۔"

"تب تو پولیس نے تجھے چھوڑ دیا ہو گا۔"

"کہاں چھوڑا جی! وہ تیرے بارے میں بار بار پوچھتے تھے۔ تیں نوں پتہ ہی ہے' میں نوں تیرے بارے میں کچھ بھی ملوم نہ تھا۔ نام تک کا پتہ نہ تھا۔ پر تھانے دار نے میری ایک نہ سنی۔ گندی گندی گالاں نکالتا تھا۔ چیخ چیخ کر کہتا تھا' تیرے گھر میں واردات ہوئی۔ کاتل تیرے ساتھ کئی روز ٹھیرا رہا اور تیں نوں اس کے بارے میں کچھ اتا پتہ نہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں جتنی اپنی صفائی

پیش کرتا' اتنی ہی زیادہ دبا کے وہ میری پٹائی کرواتا۔"

رحیم داد اس کی روداد سن کر متاثر ہوا۔ اظہار ہمدردی کے طور پر بولا۔ "پولیس نے تجھ پر بہت ظلم کیا۔"

"نہ پوچھ کتنا ظلم کیا۔" دارا نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "تھانے لے جانے کے بعد پولیس نے کئی راتوں تک بالکل نہیں سونے دیا۔ کھانے کو بھی نہیں دیا۔ پیاس لگتی' پانی مانگتا تو تھانے دار پیچھے ہٹا لیتا' پانی نہ پلاتا۔ میں ہتھ جوڑتا' منتیں کرتا پر پانی دینے کی بجائے پولیسے اور پٹائی کرتے۔ کئی بار میں بے ہوش ہوا۔ ہر بار وہ پانی کے چھینٹے میرے منہ پر مار مار کر ہوش میں لاتے اور تیرے بارے میں پوچھتے۔ کبھی نرمی دکھاتے' پیار سے گل بات کرتے۔ کبھی گرمی دکھاتے اور گالاں نکالتے۔ تھانے دار چلا جاتا تو ہیڈ کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگ جاتی ہے۔ وہ اپنی کارگزاری ڈالنے کے لیے اور زیادہ ظلم کرتا۔"

"تو پولیس کے پنجے سے چھوٹا کیسے؟"

"وہ ایسا ہے جی! میرا زمیں دار بہت نیک بندہ ہے۔ تھانے دار سے اس کی یاری بھی ہے۔" دارا نے رحیم داد کو بتایا۔ "وہ ایک روز تھانے آیا۔ میری حالت دیکھ کر اسے رحم آ گیا۔ وہ اپنی ضمانت پر مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ تھانے دار سے اس نے وعدہ کیا' جب ضرورت پڑے گی' مجھے پیش کر دے گا۔"

"پر تو وہاں سے نکل کر ادھر کیسے پہنچ گیا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"ویسے تو جی زمیں دار کے پاس جب تک رہا' میری کڑی نگرانی ہوتی رہی۔" دارا نے رحیم داد کو بتایا۔ "مجھے باہر جانے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ رات کو تو کوٹھری میں بند کر دیا جاتا۔ فیر ایسا ہوا' ایک صبح میں ٹٹی کرنے نیائیں کی طرف گیا۔ ایک راکھا میرے ساتھ ساتھ تھا' وہ بھی ٹٹی کرنے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ میں نے رات ہی کو بھاگنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اٹھ کر اچانک اس پر جھپٹا اور اسے نیچے گرا کر اس کا منہ دبایا' پگڑی سے اس کے ہاتھ اور پیر باندھے اور پگڑی کا ایک سرا اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ ہر طرف ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میں جھٹ کھیتوں میں گھس گیا' چھپتا لکتا پنڈ سے باہر نکلا اور تیزی سے دوڑ لگائی۔ میں سورج نکلنے سے پہلے ڈھولہ امیر خاں سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔" دارا نے گہری سانس بھری۔ "کئی روز تک برابر چلتا رہا۔ دن کو کسی جھنگر یا ویران بستی کے کھنڈر میں چھپ جاتا۔ رات کو سفر کرتا۔ بھوکا بھی رہا' پیاسا بھی۔ کسی نہ کسی طرح ادھر آ گیا۔"

"اب توکہاں رہتا ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔ "لگتا ہے' نزدیک ہی کے کسی پنڈ میں ٹھہ
ہوا ہے۔"

"ہاں جی! میں چک ۸۴ میں رہتا ہوں۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں' ۵ میل کے لگ بھگ ہوگا۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے نہر کے قریب پہنچ گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ برسات کی اندھیری رات تھی۔ جگنوؤں کا غول ہوا کے جھونکے کے ساتھ ایک سمت سے نمودار ہوا اور اپنی جلتی بجھ روشنیوں کا غبار فضا میں بکھیرتا ہوا درختوں کے گھنے جھنڈ میں غائب ہوگیا۔ رحیم داد نے جگنوؤں قافلہ گزرتے دیکھا' ٹھٹکا اور دارا کی طرف متوجہ ہوا۔

"توکس کے پاس ٹھہرا ہے؟"

"میں تو جی ریاست بہاول پور کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ رستے میں کامل مل گیا۔ میں نے تو چا تھا' اس کی نظروں سے بچ کر نکل جاؤں پر' اس نے دیکھتے ہی دور سے ہانک لگائی۔ پاس آکر چمٹ گیا۔ بہت دنوں بعد ملا تھا۔ میرا پرانا یار ہے۔ وہ میرے گلے پڑ گیا' ضد کرکے اپنے گھر لے گیا۔ وہ اپ پیو کے ساتھ چک ۸۴ میں رہتا ہے۔"

"کامل زمیں دار ہے یا مزارع؟"

"وہ نہ زمیں دار ہے' نہ مزارع۔" دارا نے جواب دیا۔ "وہ تو جی پاکستان سے باہر کوئی جگہ ہے بحرین' ادھر ہوتا ہے۔ وہاں بحرین پٹرولیم کمپنی میں کام کرتا ہے۔ آج کل چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ لگ ہے' کمائی چنگی ہے۔ شان سے رہتا ہے۔"

"اس کی چھٹی ختم ہوجائے گی تو واپس چلا جائے گا۔" رحیم داد نے کریدا۔ "تب تو کیا کرے گا' کس کے پاس ٹھہرے گا؟"

"یہی تو جی فکر ہے۔ سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔" دارا نے تشویش کا اظہار کیا۔ "تیں نوں پتہ ہو ہے' پولیس میری تلاش میں ہے۔ کامل کے گھر میں آرام سے چھپا بیٹھا ہوں۔ کامل کے بحرین جانے کے بعد وہاں کیسے ٹھہر سکوں گا۔ اس کا پیو مجھے نہیں ٹھہرائے گا۔ وہ ٹھیک بندہ نہیں ہے۔ ویسے ہی میرے ٹھہرنے پر اکثر کڑ کڑ کرتا رہتا ہے۔ وہ تو کامل ہے جس نے روک رکھا ہے۔"

"کامل جانتا ہے' پولیس تیری تلاش میں ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"ہاں جی! اسے پتہ ہے۔ پر اپنے پیو اور چاچا کو اس نے کچھ نہیں بتایا۔ چاچا بھی ساتھ ہی رہ ہے۔ ۱۸ کلا سے اوپر ہتھ راوہ زمین ہے۔ کامل کا پیو اور چاچا مل جل کر اس پر کاشت کرتے ہیں۔" دارا اطمینان سے بتاتا رہا۔ "کامل کمائی کرکے لایا ہے۔ اس سے اور زمین خریدنے کی

کوشش ہو رہی ہے۔ ویسے وڈا ٹبر نہیں۔ آرام نال گزر بسر ہو رہی ہے۔ کامل کی ایک ہی بہن ہے۔ اس کا ویاہ بھی پچھلے دنوں ہوگیا۔ کامل اس میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ وہ....."

رحیم داد کو کامل اور اس کی بہن کی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بات کاٹ کر بولا۔ "یہ بتا' تو نے آگے کے لیے کیا سوچا؟"

"کامل کہتا ہے تو میرے ساتھ بحرین چل۔ تیں نوں بھی ادھر پٹرولیم کمپنی میں لگوا دوں گا۔ آج کل کمپنی میں بھرتی بھی ہو رہی ہے۔ مزدوری چنگی ملے گی' عیش کرے گا۔ وہ جی! میرا بہت ہی گہرا یار ہے۔ میری مدد بھی کرنا چاہتا ہے۔"

"اس میں سوچنا کیا۔ چلا جا اس کے ساتھ۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔

"کیسے چلا جاؤں جی!" دارا نے مجبوری ظاہر کی۔ "پہلے کراچی جانا ہوگا۔ وہاں کمپنی کے لیے بھرتی کا دفتر ہے۔ بھرتی کرنے والے افسروں کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بنا کام نہیں بنتا۔ کامل بتاتا تھا' ۵ سو روپے کی ضرورت ہوگی۔ تیں نوں پتہ ہے' میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ اکٹھے ۵ سو روپے تو کامل بھی نہیں دے سکتا۔ ویسے اس کے پاس اتنے روپے ہیں بھی نہیں۔ میں نے تو اسے کہا تھا' روپے ادھار دے دے تو بحرین میں مزدوری کرکے ادا کردوں گا۔ پر وہ جو کچھ کما کر لایا تھا' سب اپنے پیو کو دے چکا ہے۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ دونوں چپ چاپ چلتے رہے اور نہر سے ہٹ کر کھجور کے ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑے ہوگئے۔

دارا زیادہ دیر چپ نہ رہا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں تیرے پاس اسی لیے آیا تھا۔" اس کے لہجے میں خوشامد اور عاجزی تھی۔ "تیری بہت مہربانی ہوگی۔ تو نے مجھے ۵ سو روپے دے دیئے تو میں کامل کے ساتھ نکل جاؤں گا۔" اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تو وڈا زمیں دار ہے' میری اتنی مدد کرسکتا ہے۔ میرا بھی پولیس سے پنڈ چھوٹ جائے گا اور تیں نوں بھی آگے خطرہ نہیں رہے گا۔" اس نے دبی زبان سے رحیم داد کو خبردار کیا۔ "تیں نوں پتہ ہے' پولیس نے پکڑ لیا تو مار مار کر تیرے بارے میں سب کچھ اگلوا لے گی۔"

رحیم داد نے چونک کر دارا کو دیکھا۔ وہ دیکھنے میں جتنا سادہ لوح نظر آتا تھا' اتنا تھا نہیں۔ اندر سے کھاگ نکلا۔ وہ رحیم داد کو بلیک میل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ رحیم داد نے صورت حال کی نزاکت محسوس کی۔ دارا اس کے لیے اتنا سنگین خطرہ بن گیا تھا کہ سرکاری گواہ بن کر اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکوا سکتا تھا۔ مگر رحیم داد نے دارا پر کمزوری ظاہر نہیں ہونے دی' تیوری پر بل ڈال کر

تیکھے لہجے میں بولا۔ "مجھے کوئی خطرہ شطرہ نہیں۔ اپنے دل سے یہ خیال نکال دے۔ خالی تیرے بیا
دینے سے کیا ہوتا ہے۔ تیرے سوا ڈھولہ امیر خاں میں کسی اور نے مجھے نہیں دیکھا۔ ایک بیگماں
تھی' وہ بھی اب نہیں رہی۔ اللہ داد بھی مجھے پہچان نہیں سکا۔ میں اس کے سامنے منہ پر منڈا
باندھے ہوئے تھا۔ تیری اکیلی گواہی سے کیا بنتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" دارا نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ "ویسے بھی تو وڈا زمیں د
ہے۔ پولیسے تجھ پر آسانی سے ہتھ نہیں ڈال سکتے۔" اس نے اپنے لہجے میں اور زیادہ نرمی پیدا کر
کی کوشش کی۔ "پر پولیسے مجھے تنگ کرسکتے ہیں۔ تجھے بھی کچھ نہ کچھ پریشانی ہو سکتی ہے۔"

"تو میری فکر نہ کر۔" رحیم داد نے اپنے رویے سے خوف کی پردہ پوشی کی۔ چند لمحے خاموش ک
سوچتا رہا پھر اس نے اپنے تند و تیز لہجے میں اعتدال پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو یہ سوچ رہا ہو
پولیس نے تجھے دوبارہ پکڑ لیا تو زبردست مار لگائے گی۔ تیری جان بھی جا سکتی ہے۔ پہلے تھانے
تجھ پر جو ظلم کیا گیا' اسے سن کر تو ایسا سوچنا غلط نہیں۔"

دارا ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "تو نے ٹھیک ہی کہا۔ اس بار تو پولیسے مجھے جان سے مار دی
گے۔" اس نے جھک کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔ "تو میری اتنی مدد کردے کہ میں کال کے سا
ادھر سے نکل کر بحرین چلا جاؤں۔ تیرا بہت احسان ہوگا۔ زندگی بھر دعائیں دوں گا۔"

"سیدھا کھڑا ہو۔" رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔

دارا اٹھا اور نظریں جھکا کر رحیم داد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے جان بوجھ کر اللہ وسایا کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ ملزموں کی مانند
ہوئے دارا کو نظر بھر کے دیکھا اور بھاری بھرکم لہجے میں بولا۔ "دارا تو پریشان نہ ہو۔ تو نے بھی میر
مدد کی ہے۔ میں اسے بھولا نہیں ہوں۔" دارا نے نگاہیں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا مگر زبا
سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ رحیم داد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کر۔ میں تیری ضرور
کروں گا۔ تو کل سورج ڈوبنے کے بعد اسی جگہ پہنچ جانا۔ میرے پاس پنڈ میں آنے کی ہرگز کوشش
نہ کرنا۔ میں تیرے پاس خود ہی پہنچ جاؤں گا۔ دیر ہو جائے تو انتظار کر لینا۔ میں ضرور آؤں گا۔"

"جیسا تو نے کہا ہے' ویسا ہی کروں گا۔ تیری بہت بہت مہربانی۔"

"اب تو ٹر جا۔ میں کل شام تجھ سے یہیں ملوں گا۔"

دارا خاموشی سے چلا گیا۔ رحیم داد کھجور کے درخت تلے چپ کھڑا' اسے جاتے ہوئے دیکھ
رہا۔ جب وہ اندھیرے میں گم ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو رحیم داد مڑا اور گاؤں کی سمت بڑھنے

لگا۔ اندھیرا بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ مہمان خانے میں پہنچا تو پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد کو دیر تک
نیند نہیں آئی۔ آدھی رات سے بارش شروع ہو گئی مگر صبح مطلع صاف تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔
بھیگے ہوئے درختوں اور ہرے بھرے پودوں پر سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔

رحیم داد کمرے سے باہر نکلا۔ تمام وقت دارا کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے دیوار پر کھونٹی
سے لٹکی ہوئی بندوق کی جانب نظریں اٹھا کر کئی بار دیکھا اور ہر بار سوچا کہ شام کو جب دارا نہر کے
کنارے ملے تو اسے اندھیرے میں گولی مار کر ٹھکانے لگا دے۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی اسے
خوف زدہ کرتا رہا کہ گولی کی آواز سن کر گاؤں والے اکٹھے ہو سکتے ہیں اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو وہ
اکیلا لاش کیسے چھپائے گا اور کہاں چھپائے گا؟ لاش سارا بھانڈا پھوڑ سکتی تھی۔ پولیس آتی' تفتیش
ہوتی' اللہ وسایا کو خبر پہنچتی۔ وہ لاش دیکھتے ہی دارا کو پہچان لیتا اور فوراً سمجھ جاتا کہ اسے کس نے
اور کیوں قتل کیا؟ اللہ وسایا اس کے لیے دارا سے کم خطرناک نہیں تھا۔ وہ بیگماں اور مولا داد کے
قتل کے بارے میں دارا کی زبانی پہلے ہی بہت کچھ سن چکا تھا۔

کیا وہ اللہ وسایا کو بھی قتل کردے؟ لیکن وہ کتنے قتل کرے گا؟ خود کو بچانے کے لیے کس کس کی
جان لے گا؟ بیگماں کو اسی پردہ پوشی کی کوشش میں مولا داد کے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا
پڑا۔ مولا داد کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ بیگماں اس کی اکلوتی بہن تھی' اسے ٹوٹ کر
چاہتی تھی۔ اس کا شوہر مولا داد بھی باپ کی خفگی کے باوجود اس سے محبت اور خلوص سے ملتا۔
حالات نے اسے ایسے خطرناک راستے پر ڈال دیا کہ وہ اتنی چاہنے والی بہن کے قتل کا سبب بنا۔
بیگماں کی یاد کے ساتھ سینے میں دھواں سا اٹھا اور آنکھوں میں آنسو بن کر منڈلانے لگا۔ وہ منہ بسور
کر رونے لگا۔

دن ڈھلے تک وہ شدید الجھن میں رہا' کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ اسے دارا کے ساتھ ساتھ اللہ وسایا
کے بارے میں بھی فیصلہ کرنا تھا۔ اور جلد سے جلد کرنا تھا۔ وہ دارا کو پانچ سو روپے دے کر بحرین
جانے میں مدد دے سکتا تھا۔ اس طرح اس کی طرف سے جو خطرہ تھا' خود بخود ٹل جاتا۔ مگر اللہ وسایا
بھی اس کے سر پر تلوار بن کر لٹک رہا تھا۔ بہت غور و فکر کے بعد رحیم داد نے طے کیا کہ اس
معاملے میں احسان شاہ سے رجوع کرنا چاہیے۔ وہ ان خطرات سے نمٹنے میں اس کی رہنمائی کرسکتا
ہے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ دھوپ' شام کے پھیلتے اور
بڑھتے دھندلکے میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئی۔ رحیم داد نے گھوڑی نکالی اور نہر کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس نے دارا کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیا۔ وہ کھجور کے درخت تلے سائے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ بارش سے نہر کی سطح بلند ہو گئی تھی۔ پانی گنگناتا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا۔

رحیم داد نے قریب پہنچ کر کہا۔ "تو آ گیا؟"

"کیسے نہ آتا' تو نے بلایا جو تھا۔" دارا نے مستعدی سے جواب دیا۔

رحیم داد گھوڑی سے نیچے نہیں اترا۔ اس نے گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے طے کیا کہ دارا کو بھی پیراں والہ لے جانا چاہیے۔ اس نے دارا سے کہا۔ "آ' میرے پیچھے گھوڑی پر بیٹھ جا۔"

دارا اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ رحیم داد نے گھوڑی کو ایڑ لگائی' وہ آ... بڑھی۔

دارا حیرت زدہ تھا۔ "مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟" اس نے بے چینی کا اظہار کیا۔

"تو نے پیراں والہ دیکھا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"نہیں جی! میں ادھر کبھی نہیں گیا۔" دارا نے جواب دیا۔ "میں نے اسے نہیں دیکھا۔"

"آج دیکھ لینا۔"

"ادھر جا کر کیا لینا ہے؟" دارا ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

"تیں نوں بحرین جانا ہے کہ نہیں؟" رحیم داد نے اسے جھڑک دیا۔

دارا سہم کر رہ گیا۔ رحیم داد گھوڑی سنبھال سنبھال کر دوڑاتا رہا۔ بارش سے کچے راستے پر ... جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ اندھیرا بھی تھا۔ رحیم داد گھوڑی پر چوکس بیٹھا تھا۔ دارا دم بخود تھا۔ ... رحیم داد کسی قدر پریشان تھا۔ وہ دارا کے ہم راہ پیراں والہ جا تو رہا تھا مگر کچھ دور جانے کے بعد ا... کے ذہن میں یہ خدشہ بھی پیدا ہوا کہ دارا نے اگر اللہ وسایا کی طرح احسان شاہ یا اس کے ... ملازم کو بھی بیگماں اور مولاداد کی ہلاکت کے بارے میں بتا دیا تو اس کے لیے نئی الجھن پیدا ہو جا... گی۔ وہ احسان شاہ کو بھی اس معاملے میں اعتماد میں لینا نہیں چاہتا تھا۔

رحیم داد نے دارا کو تنبیہہ کی۔ "تجھے پیراں والہ لیے تو جا رہا ہوں پر وہاں بیگماں اور مولاداد... بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا۔ اپنے بارے میں بھی کچھ نہ بتانا۔ ہر ایک سے یہی کہنا' تو میرا پرانا ... رہ چکا ہے۔ بیچ میں کسی اور زمیں دار کی نوکری کر لی تھی' اب میرے پاس واپس آ گیا ہے۔ مے... بات سن رہا ہے نا؟"

"بالکل سن رہا ہوں جی!" دارا نے اونچی آواز میں کہا۔ "جیسا تو کہہ رہا ہے' ویسا ہی کروں ... کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ میں نے ایسی باتیں بتا کر اپنے تئیں مصیبت ...

نہیں ڈالنا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تیرے لیے تو اب یہی ٹھیک ہے' کسی کو بھی اپنے بارے میں کچھ نہ بتا۔ جلد سے جلد پاکستان سے نکل کر بحرین پہنچ جا۔ کراچی جا کر اپنا نام بدل لینا بلکہ ابھی سے بدل لے۔"

"میں نے جی' یہ پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔ کامل کہتا ہے' بحرین جانے کے لیے کمپنی کی طرف سے وہ کیا ہوتا ہے جی' ہاں یاد آیا' پاسپورٹ بنایا جائے گا۔ اس پر میری تصویر بھی لگے گی۔" دارا رک رک کر بولتا رہا۔ "داڑھی بڑھا لوں گا۔ تب تصویر اتراوؤں گا۔ ویسے بھی جی میرے لیے یہ ضروری ہے۔ پولیس میری تلاش میں ہے۔"

"تو نے نیا نام کیا سوچا؟ مجھے بتا دے تاکہ پیراں والہ میں تیرا وہی نام بتاؤں۔"

"ہاشم۔ میں نے اور کامل نے یہی نام سوچا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔ تو یہ طے رہا کہ پیراں والہ میں تجھے میں ہاشم کے نام سے پکاروں گا اور سب کو تیرا یہی نام بتاؤں گا۔ یاد رکھنا۔ بھول نہ جانا۔"

"بالکل نہیں بھولوں گا۔ فکر نہ کر۔"

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ رحیم داد گھوڑی بہت احتیاط سے دوڑا رہا تھا۔ ایک موڑ پر کیچڑ میں گھوڑی کا پیر رپٹا' وہ لڑکھڑائی۔ دارا بھی ایک طرف جھکا۔ اس نے رحیم داد کی کمر مضبوطی سے تھام لی اور گرنے سے بال بال بچ گیا۔ رحیم داد نے بھی نہایت ہوشیاری سے گھوڑی کو سنبھال لیا۔ اسے بے قابو نہیں ہونے دیا۔ زیادہ محتاط ہو کر گھوڑی دوڑانے لگا۔

وہ دارا کے ہم راہ پیراں والہ پہنچا تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ شیدے نے دونوں کو دیوان خانے میں پہنچا دیا۔ رحیم داد نے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے احسان شاہ کے بارے میں دریافت کیا۔

"شاہ جی کدھر ہے؟"

"وہ تو جی حویلی میں ہے۔" شیدا نے جواب دیا۔ "میں اسے تیرے آنے کی اطلاع کیے دیتا ہوں۔ تو آرام نال بیٹھ۔"

وہ جانے کے لیے مڑا۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "گل سن شیدے۔" اس نے قریب کھڑے ہوئے دارا کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرا نوکر ہاشم ہے۔ اسے بھی یہیں ٹھیرنا ہے۔ اسے روٹی کھلا دے۔"

شیدا نے دارا کو مخاطب کیا۔ "ہاشم! ادھر آ میرے ساتھ۔" دارا اس کے ساتھ چپ چاپ

برآمدے سے چلا گیا۔

رحیم داد کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد احسان شاہ آگیا اور کرسی کھسکا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا چوہدری' میں روٹی کھا رہا تھا۔"

"آج اتنی جلدی روٹی کھالی؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

احسان شاہ نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔ "آج سورج ڈوبنے سے پہلے ہی پینے پلانے کا سا شروع ہو گیا تھا۔ دو پرانے یار آگئے تھے۔ موسم بھی سہانا ہے۔ میں نے خاصی لگالی ہے۔ ویسے رات اوکاڑے بھی جانا ہے۔"

"تمیں نوں اوکاڑے جانا ہے تب تو میں نوں چلنا چاہیے۔" رحیم داد نے بے چین ہو کر بدلا۔ "میں کل شام تیرے پاس آنے کی کوشش کروں گا۔" اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہ "پر یہ بھی تو پتہ نہیں' تو کب تک لوٹے گا۔" اس نے قدرے تامل کیا' مسکرا کر پوچھا۔ "تو واپس آجائے گا نا؟"

"کل تو نہیں' پرسوں شام تک ضرور آجاؤں گا۔ پر تو اتنی جلدی واپس کیوں جانا چاہتا ہے؟ تو آہی گیا ہے میں گھنٹے سوا گھنٹے بعد چلا جاؤں گا۔ ایسی جلدی بھی نہیں۔ اوکاڑہ دور ہی کتنا ہے۔ بارش کی وجہ سے سڑکیں خراب ہو رہی ہیں۔ ورنہ کار سے لگ بھگ گھنٹے بھر کا سفر بنتا ہے احسان علی شاہ نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "میں تو روٹی کھا چکا پر تو نے ابھی تک نہیں کھائی ہوگی۔ تھوڑی سی وہسکی لگالے۔ ساری تھکن دور ہو جائے گی۔ ایک دم تازہ اور چاک چوبند ہو جائے گا۔"

رحیم داد نے انکار کر دیا۔ "میں کچھ لگاؤں گا نہیں۔ روٹی بھی بعد میں کھاؤں گا۔ آج تو میں تجھ سے بہت ضروری گل بات کرنے آیا ہوں۔"

"اللہ وسایا نے کچھ زیادہ گڑبڑ شروع کر دی؟"

"ہاں۔" رحیم داد نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "تو نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ اس کی نیت برائی لگتی ہے۔"

"میں نے تجھے غلط نہیں بتایا تھا۔ میرا منیجر غلط اطلاع دے ہی نہیں سکتا۔ وہ بہت ہوشیار ہے' وفادار بھی ہے۔" احسان شاہ گردن اونچی کر کے بول رہا تھا۔ "یہ بتا نئی گل کیا ہوئی؟"

"میں نے درخواست کے بارے میں پوچھا تو اس نے پہلے کی طرح اس بار بھی گول مول جو دیا۔ کچھ بتانے کی بجائے آنکھیں نکال کر بولا۔ تو بار بار درخواست کے بارے میں کیوں پوچھتا

ساتھ ہی اس نے ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے لگتا ہے' وہ مجھے ڈرانا دھمکانا چاہتا ہے۔ کسی کیس میں پھنسانا چاہتا ہے۔"

"اس کے ان ارادوں کے بارے میں مجھے بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا۔ تجھ سے بتا بھی چکا ہوں۔" احسان شاہ نے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھ' اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ فی الحال تو اس نے حویلی اور زمین اپنے قبضے میں لینے کا چکر چلایا ہے۔" اس نے گہری نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "مجھے تو ایسا نظر آرہا ہے' وہ حویلی اور زمین لینے کے بعد تیرا پورا کلیم ہی ہتھیانے کی کوشش کرے گا۔ جس طرح اس نے پہلے دستاویزوں پر دستخط لگوالیے' کسی نئے بہانے سے ایسے سٹامپ پیپر بھی دستخط لگوالے گا کہ تو اپنے کلیم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ایک روز اچانک پتہ چلے گا تو اپنا کلیم اللہ وسایا کے ہاتھ کب کا بیچ چکا ہے۔"

رحیم داد نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔ "کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس نے دس مربعے زمین پر دوبارہ جو قبضہ کیا ہے' وہ جمیلہ کے نام سے کلیم خرید کر ہی تو کیا ہے نا؟ تجھے تو ٹھیک طرح پتہ ہے۔ تیرے سامنے ہی تو کلیم کا سودا ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا ہو گا کہ تیرے کلیم کا سودا بھی ہو جائے گا' اللہ وسایا کے نام منتقل بھی ہو جائے گا اور تجھے پتہ بھی نہ چلے گا۔ کاغذات اور دستاویزات میں جعل سازی اسی طرح ہوتی ہے۔ اللہ وسایا تو وکیل کے مشورے پر ہر کام پکا کر رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے' وہ تجھے اپنے جال میں پوری طرح جکڑ چکا ہے۔"

رحیم داد نے بے بسی سے کہا۔ "صاف گل ایہہ جی! میرے ساتھ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اپنا تو بالکل مغز کام نہیں کرتا۔" اس کے چہرے پر پریشانی برسنے لگی۔

"میں نے تو تجھے پہلے ہی کہا تھا پر تو نے میری بات مانی ہی کب۔"

"تیرا مطلب ہے' اللہ وسایا کو ختم کر دیا جائے؟" رحیم داد ہچکچاتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

"بالکل یہی مطلب ہے۔ اس کے سوا اللہ وسایا کے پھیلائے ہوئے جال سے بچنے کا تیرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں۔"

"پر یہ کام میں کیسے کر سکتا ہوں۔" رحیم داد نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے تو پہلے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ویسے بھی سارے نوکر اور مزارعے اللہ وسایا کے بندے ہیں۔ میرا تو پنڈ میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔"

"میں تو ہوں۔ تو کیوں فکر کرتا ہے؟" احسان شاہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "ایک بار تجھ سے یاری کرلی تو پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ ہر مشکل میں تیرا پورا ساتھ دوں گا۔ آگے تجھے خود پتہ چل جائے گا۔"

"یہ کام تو خود کرے گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"نہیں۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "ایسے کاموں کے لیے میرے پاس کئی بندے ہیں۔" وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ "اللہ وسایا پر تو میں دینے کو لگا دوں گا۔ وہ بہت ہوشیار اور زور آور ہے۔ تو ڈرتا ہے تو میں خود بھی موجود رہوں گا۔ تیری یاری میں ایسا بھی کرلوں گا۔"

احسان شاہ کی بات سن کر رحیم داد کو فوراً دارا یاد آگیا۔ اللہ وسایا کے قتل میں اسے بھی شریک کیا جاسکتا ہے۔ رحیم داد نے اس کے بارے میں اس پہلو سے بھی غور کیا تھا اور اسی مقصد سے وہ اسے اپنے ہم راہ پیراں والہ لایا بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اللہ وسایا کے قتل میں دارا ملوث ہوجائے گا تو وہ بیگماں اور مولاداد کے قتل کی بنیاد پر اسے خوف زدہ اور بلیک میل نہیں کرسکے گا۔ پولیس سے بچنے کے لیے سیدھا بحرین جانے کی کوشش کرے گا۔ قاتل بننے کے بعد وہ اس کے لیے اتنا بڑا خطرہ نہیں رہے گا۔ رحیم داد کو دارا اور اللہ وسایا دونوں سے شدید خطرہ تھا۔ وہ دونوں ہی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دارا کے ہاتھوں اللہ وسایا کا قتل نہایت کارگر حربہ تھا۔ مگر دارا سے ایسا خطرناک کام لینے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ احسان شاہ کے مشورے کے بغیر ایسا کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ ایسے کاموں کے لیے احسان شاہ نہایت تجربہ کار اور پرانا گھاگ ہے۔ اللہ وسایا کے قتل کے لیے اسی نے رحیم داد کو اکسایا بھی تھا۔

رحیم داد کو گہری سوچ میں دیکھ کر احسان شاہ نے پوچھا۔ "چوہدری! تو کس سوچ میں پڑگیا؟"

"میں سوچ رہا تھا جی' میرے پاس بھی ایک ایسا ہی بندہ ہے۔" رحیم داد نے کھل کر بات کرنے کی کوشش کی۔ "پہلے وہ میرا نوکر ہوتا تھا۔ برسوں میرے پاس رہا۔ سال سوا سال سے اس نے ایک اور زمیں دار کی نوکری کرلی تھی۔ اب وہ کوئی سنگین جرم کرکے آیا ہے اور میرے ہی پاس چھپا ہوا ہے۔ وہ اپنے کسی یار کے ساتھ بحرین کی طرف نکل جانا چاہتا ہے۔ وہ اس کے لیے مجھ سے ۵ سو روپے مانگ رہا ہے۔ اس کا نام ہاشم ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

"یہ تو نے چنگا کام کیا کہ اسے ادھر لے آیا۔ وہ تو بہت کام کا بندہ ہے۔" احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "سچ پوچھ تو سنگین واردات کرانے کے لیے ایسے ہی بندوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ تو نے

ٹھیک ہی سوچا' اسے دینے کے ساتھ لگا دوں گا۔ وہ اللہ وسایا کو ٹھکانے لگا دے گا۔"

احسان شاہ نے شیدا کو بلایا۔ وہ آیا تو احسان شاہ نے حکم دیا۔ "دینا ابھی سویا تو نہیں ہوگا۔ سو بھی گیا ہو تو اسے جگا کرلے آ۔" شیدا چلا گیا۔

احسان شاہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چوہدری! تو اس کی فکر نہ کر' اللہ وسایا کو کس طرح صاف کیا جائے؟ کیسے اس کا قتل ہوگا؟ یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے ٹھٹکا۔ "تو نے وہ بیلا تو آتے جاتے ہوئے دیکھا ہوگا جو نہر کی پلی سے آگے پنڈ کی طرف مڑتے ہوئے رستے میں پڑتا ہے۔"

رحیم داد کو وہ مختصر جنگل یاد آگیا جس کے درمیان سے ایک راستہ پیراں والہ کو جاتا تھا۔ وہ اس راستے سے کئی بار گزرا بھی تھا۔ اس نے احسان شاہ سے کہا۔ "بیلا میں نے دیکھا تو ہے۔"

"تیرا کام صرف اتنا ہے' کسی طرح اللہ وسایا کو شام کا اندھیرا ہونے کے بعد ادھر اپنے ساتھ لے کر آجا۔ آگے کی مجھ پر چھوڑ دے۔ تو فوراً واپس چلا جانا تاکہ تجھ پر شبہ نہ ہو۔ ویسے بھی تو ایسے کام کے لیے کچا ہے۔ اللہ وسایا کا خون ہوتے دیکھ کر نہ جانے تیرا کیا حال بنے۔ تجھے تو جائے واردات پر موجود ہونا ہی نہیں چاہیے۔"

"میں اسے ادھر کسی نہ کسی بہانے لے تو آؤں گا پر تجھے اطلاع کیسے پہنچاؤں گا۔ میرے پاس تو ایسا کوئی بندہ نہیں۔ ہاشم اب ادھر ہی تیرے پاس رہے گا۔ ویسے میں اب اسے اپنے ساتھ رکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

احسان شاہ نے دریافت کیا۔ "یہ بتا' اللہ وسایا کہاں ہے؟"

"وہ وکیل کے پاس شہر گیا ہے۔"

"تب تو اس کی واپسی کے فوراً بعد یہ کام ہونا چاہیے۔" احسان شاہ کے لہجے میں تشویش تھی۔ "اس بار وہ کام پکا کرکے لوٹے گا۔ تجھے بے دخل کرنے کی کوشش کرے گا یا کوئی نیا چکر چلائے گا؟"

"تو نے اس کا جواب نہیں دیا' میں اللہ وسایا کو بیلے میں لے آیا تو تجھے کیسے پتہ چلے گا؟"

"اللہ وسایا دو تین روز سے پہلے تو نہیں لوٹے گا' اس لیے تو اسے جلدی نہیں لاسکے گا۔ کل تو دینا بیلے میں جاکر دیکھے گا' کس جگہ اور کہاں گھات لگا کر بیٹھا جائے؟ پرسوں سے میں اس کی ڈیوٹی لگا دوں گا۔ وہ ہر شام اندھیرا ہوتے ہی اپنے بندوں کے ساتھ ادھر موجود رہے گا اور اللہ وسایا کا انتظار کرے گا۔ تو جب بھی آئے گا' دینے کو بیلے میں پائے گا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" رحیم داد نے اتفاق کیا۔

احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ "اطمینان رکھ' اللہ وسایا کا کانٹا جلد ہی نکل جائے گا۔ پر جمیلہ ہاتھ سے نہ نکلنے پائے۔ نرمی اور پیار سے اسے جلد سے جلد کابو کرنے کی کوشش کرنا۔" اس نے بدمعاشی سے آنکھ دبائی۔ "جمیلہ ایسی سوہنی اور پھڑک دار رن مل گئی تو زندگی کا لطف آجائے گا۔ تو ابھی سے اسے اپنی گھر والی کے روپ میں دیکھنا شروع کردے۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "جمیلہ کے ساتھ اس کے دس مربعے بھی تو تجھے دہیج میں ملیں گے۔" رحیم داد مسکرا کر رہ گیا۔

شیدا آگیا۔ اس کے ساتھ دینا بھی تھا۔ اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کچی نیند سے بیدار ہوا ہے۔ مگر احسان شاہ پر نظر پڑتے ہی مستعدی سے ایک طرف سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

احسان شاہ نے دینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! یہ رہا دینا۔" وہ دینا کی طرف متوجہ ہوا۔ "دینے! کل بیلے میں جا کر موقع شوقع دیکھ لینا۔ تجھے ادھر کاروائی کرنی ہے۔ کیسے کرنی ہے اور کیا کرنی ہے' یہ میں اوکاڑے سے واپسی پر بتاؤں گا۔"

"اسے ہاشم سے بھی ملانا ہے۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو یاد دلایا۔

"سویرے ملا دینا! جی چاہے تو ابھی ملا دے۔"

"سویرے ہی ملادوں گا۔"

"جیسے تیری مرضی۔" احسان شاہ نے شیدا کی جانب دیکھا۔ "شیدے! تو چوہدری کے لیے روٹی ٹکر کا بندوبست کر دینا۔" اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! تجھے اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف شیدے کو بتا دینا۔ آرام سے رات بسر کرنا۔" وہ مسکرایا۔ مڑ کر شیدا اور دینا پر نظر ڈالی۔ "اب تم دونوں جاؤ۔"

دونوں خاموشی سے چلے گئے۔

رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ "شاہ جی! ایک گل اور ہے۔"

"کیا؟ وہ بھی بتا دے۔ صاف صاف بات کر۔"

"میں سوچ رہا تھا' آگے کیا ہوگا۔" رحیم داد نے کھل کر کہا۔ "پولیس بعد میں تفتیش کو آئے گی۔ مجھ سے بھی پوچھ تاچھ کرے گی۔ میں نوں ڈر لگتا ہے' جانے کیا بات زبان سے نکل جائے۔"

"میں نوں پتہ ہے' تو بہت کچا ہے۔" وہ آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ "پروا نہ کر' کوئی پولسیا تیرے پاس تفتیش کے لیے نہیں آئے گا۔ ادھر کا تھانیدار اپنا بندہ ہے۔ سب کام ٹھیک ٹھاک ہوگا۔ تو اطمینان رکھ۔ میں کبھی کچا کام نہیں کرتا۔" اس نے پہلو بدلا۔ "اب تو روٹی کھا' آرام سے سو۔ برسات کی بھیگی رات ہے۔ اکیلے کیسے سوئے گا۔ کسی رن کو بلا لینا۔ شیدا پہنچا دے گا۔" احسان شاہ کھڑا

ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ احسان شاہ کے ساتھ ساتھ دیوان خانے کے دروازے تک گیا۔

احسان شاہ کو رخصت کرنے کے بعد رحیم داد نے کھانا کھایا۔

☆

کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ پلنگ پر صاف ستھرا بستر لگا تھا۔ باغ میں کھلنے والی کھڑکی سے بھیگے بھیگے جھونکے آرہے تھے۔ شیدا دہلیز پر چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "اور کوئی حکم جی؟" رحیم داد اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ مگر اس نے کوئی فرمائش نہیں کی۔ وہ اکیلا ہی سونا چاہتا تھا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ اللہ وسایا اور دارا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے شیدا کی حوصلہ افزائی نہیں کی' بے نیازی سے بولا۔ "نہیں' میں نوں اب کچھ نہیں چاہیے۔ اب صرف سونا ہے۔" شیدا مڑا اور برآمدے کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے دارا کو بلوایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شیدا کے ہم راہ آیا۔ شیدا چلا گیا تو رحیم داد نے کہا۔ "دروازہ بند کردے۔" دارا نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ رحیم داد کرسی پر بیٹھا تھا۔ دارا اس کے روبرو فرش پر بیٹھ گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "رات آرام نال سویا؟"

"بہت آرام نال سویا' روٹی بھی چنگی کھانے کو ملی۔ شاہ جی تو بہت وڈا زمین دار ہے۔ بہت شان ہے اس کی۔ حویلی بھی بہت شان دار ہے۔ نوکروں چاکروں کی پوری پلٹن موجود ہے۔ پر جی اس کے نام سے سب کی جان نکلتی ہے۔ بہت رعب ہے اس کا۔"

"تو نے اپنے بارے میں کچھ بتایا تو نہیں؟"

"وہی بتایا جو تو نے کہا تھا۔" دارا نے مستعدی سے جواب دیا۔ "شیدے اور دوسرے نوکروں کو یہی پتہ ہے' میرا نام ہاشم ہے اور میں تیرا پرانا نوکر ہوں۔"

رحیم داد نے دارا کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ لمحے بھر تک گھورتا رہا۔ "تو زمیں دار اللہ وسایا سے بھی ملا تھا؟"

دارا کچھ نہ بولا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ چھا گئی۔

رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔ "چپ کیوں ہے؟ صاف صاف بتا؟"

"ملا تو تھا۔" اس کی آواز میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔ "میں نوں تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔"

"تو نے اپنے اور میرے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا' یہ ٹھیک ہے نا؟" رحیم داد کی تیوری پر

بل پڑ گئے۔

"میں تو جی اسے کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو تجھے ڈھونڈتا ہوا پنڈ میں گیا تھا۔" دارا نے گڑگڑا کر کہا۔ "اس نے ایسے الٹے سیدھے سوال کیے کہ میں تو جی چکرا گیا۔ ویسے اس نے یہ بھی کہا تھا' وہ تجھے اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ تب میں نے اسے بتایا' ڈھولہ امیر خاں میں میرے گھر کے اندر بیگماں اور مولا داد کا کیسے خون ہوا۔"

"تو نے اور کس کس سے یہ باتیں میرے بارے میں بتائیں؟"

"اور کسی سے بھی ایسی گل بات نہیں ہوئی۔ میں تجھ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" دارا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"غلط مت بول۔ کامل سے بھی تو نے ایسی ہی باتیں کی ہیں' تو نے مجھے خود بتایا تھا۔" رحیم داد کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "اب کہتا ہے' میں نے اور کسی کو ایسی باتیں نہیں بتائیں۔"

"میں نے غلط نہیں کہا۔" دارا نے عاجزی سے کہا۔ "میری کامل سے جب تیرے بارے میں گل بات ہوئی تب تک تو مجھے تیرا نام بھی ملوم نہیں تھا۔ یہ بھی پتہ نہ تھا تو چوہدری ہے یا میاں' جاٹ ہے یا آرائیں۔" وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے حلق تر کرنے کی کوشش کی۔ "زمیں دار اللہ وسایا سے ملنے کے بعد میری کامل سے تیرے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔" اس نے مغرب کی سمت مڑ کر دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ "رب دی سونہہ' ان دو کے سوا تیرے بارے میں کسی سے بھی میں نے کچھ نہیں بتایا۔"

"پر اللہ وسایا سے تو نے سب کچھ بتا دیا۔"

"ہاں جی' یہ غلطی ہو گئی۔" اس نے جھک کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔ "معافی دے دے' اب ایسی غلطی کبھی نہیں ہو گی۔"

"سیدھا بیٹھ۔" رحیم داد نے اسے ڈانٹا۔ دارا نے اس کے پیر چھوڑ دیئے اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت ڈرا سہما دکھائی دے رہا تھا۔ رحیم داد گردن جھکائے سوچتا رہا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری' گردن اٹھا کر دارا کو دیکھا۔ "تو نے اللہ وسایا کو میرے بارے میں بتا کر بہت خطرناک کام کیا۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ مجھے کوئی بھائی شائی نہیں سمجھتا۔ میری اس کے ساتھ سخت لگتی ہے۔ حویلی میری ہے۔ میرے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ وہ اس میں پہلے سے رہتا تھا۔ وہ اسے خالی نہیں کرنا چاہتا۔ تمیں نوں کیہ پتہ' میرا اس کے ساتھ کیسا زبردست جھگڑا چل رہا ہے۔"

"تب تو جی' مجھ سے سخت غلطی ہو گئی۔" دارا نے تاسف سے کہا۔ "اب تو غلطی ہو گئی ہے' میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"جو غلطی ہو ہی گئی' اسے ٹھیک بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"کیسے جی؟" دارا نے حیرت سے منہ پھاڑا۔

"اللہ وسایا میرے ہی لیے نہیں' تیرے لیے بھی خطرناک بن گیا ہے۔ وہ پولیس سے مخبری کر کے دونوں کو پکڑوا سکتا ہے۔" رحیم داد نے اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ "اب تو ایک ہی رستہ ہے' اور وہ یہ ہے کہ اللہ وسایا کو قتل کر کے خطرہ ہی مٹا دیا جائے۔"

"پر اسے کیسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ اسے کون قتل کرے گا؟"

"تمیں نوں اسے قتل کرنا ہو گا۔" رحیم داد نے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "تو نے غلطی کی ہے' اب تو ہی اسے مٹا بھی سکتا ہے۔"

"میں نے تو جی ایسا کام کبھی نہیں کیا۔" دارا کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ "ویسے میں اکیلا اسے کیسے قتل کر سکتا ہوں۔ وہ تو مجھ سے بہت تگڑا اور زور آور ہے۔"

"فکر نہ کر' تو اکیلا نہیں ہو گا۔" رحیم داد نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ "تیرے ساتھ میں ہو گا۔ اور بھی کئی بندے ہوں گے۔"

"تو جی یہ کام تو انھی سے کیوں نہیں کرا لیتا؟" دارا نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "مجھ سے یہ کام نہیں ہو گا۔"

"تجھے بحرین جانا ہے یا نہیں؟"

"جانا تو ہے اور ضرور جانا ہے۔ نہ گیا تو پولیس پکڑ کر اس دفعہ بالکل میری چمڑی ادھیڑ ڈالے گی۔ پتہ نہیں کیا کیا ظلم کرے۔" دارا کا چہرہ خوف اور دہشت سے مٹیالا پڑ گیا۔

"حوصلے سے کام لے۔ تو پولیس کے چکر سے بھی بچ جائے گا اور بحرین جا کر کام سے بھی لگ جائے گا۔" رحیم داد نے اسے پھسلایا۔ "تو جو سوہا تکتا ہے' میں تجھے ہزار روپے دوں گا۔"

دارا گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا مگر رحیم داد نے اسے زیادہ دیر سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ "بول کیا کہتا ہے؟"

دارا نے گردن اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "میں نے کرنا کیا ہو گا؟"

رحیم داد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "یہ دینا بتائے گا۔ میں تجھے اس سے ملا دوں گا۔ یوں سمجھ لے' اب تو اس کے ساتھ ہی رہے گا۔"

"روپیہ کب ملے گا؟" دارا خوف اور دہشت کے حصار سے کسی قدر نکل چکا تھا۔ ہزار روپے کی چکاچوند نے اسے گھبراہٹ اور پریشانی سے خاصا بے نیاز کر دیا تھا۔

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ "واردات کے بعد سیدھا میرے پاس حویلی کے مہمان خانے میں آنا۔ ہزار روپے لینا اور رات کے اندھیرے میں چک ۴۸ پہنچ جانا۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔" رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے جی!" دارا کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

"دروازہ کھول اور شیدے کو میرے پاس بلا لا۔"

دارا نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو شیدا اس کے ساتھ تھا۔ رحیم داد اسے دیکھتے ہی بولا۔ "شیدے! جا کر دینے کو ادھر لے آ۔"

تھوڑی دیر بعد شیدا کے ہمراہ دینا آ گیا' ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "کیا حکم ہے جی؟"

رحیم داد نے دارا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہاشم ہے' میرا پرانا نوکر۔ جو کام شاہ جی کل شام تمہیں بتائے گا' اس میں یہ بھی تیرے ساتھ شریک رہے گا۔"

"ٹھیک ہے جی۔" دینا نے مستعدی سے جواب دیا۔

"تو اسے لے جا۔ اب یہ تیرے ساتھ ہی رہے گا۔" رحیم داد نے کہا۔

دینا' دارا اور شیدا کمرے سے چلے گئے۔ رحیم داد بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ سورج چڑھ کر اوپر آ گیا تھا۔ ہر طرف چمکیلی دھوپ پھیلی تھی۔ رحیم داد کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا۔ شیدا اس کا منتظر تھا۔ رحیم داد اس کے ہمراہ حویلی کے پھاٹک پر پہنچا۔ اس کی گھوڑی تیار کھڑی تھی۔ رحیم داد سوار ہوا اور گھوڑی کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گیا۔

نہر سے پہلے جنگل تھا۔ جنگل میں شیشم اور سرس کے گنجان درخت تھے۔ جنگل زیادہ وسیع نہیں تھا مگر خوب گھنا تھا۔ جنگل کے درمیان سے ایک راستہ گزرتا تھا۔ رحیم داد نے گھوڑی جنگل کے اندر داخل کی اور اس کی رفتار سست کر دی۔ درختوں کے نیچے خاصا اندھیرا تھا۔ احسان شاہ کی ہدایت کے مطابق اللہ وسایا کو یہیں لانا تھا۔ رحیم داد نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ درختوں میں پرندے چہچہا رہے تھے۔ مگر تنہائی اتنی شدید تھی کہ گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ اس نے گھوڑی کی رفتار تیز کی اور جنگل سے نکل گیا۔ آگے کھلا میدان تھا۔ چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

وہ نہر کے قریب پہنچا۔ آگے پلیا تھی۔ رحیم داد نہر کے کنارے کنارے گھوڑی دوڑاتا کوٹلہ

ہرکشن پہنچ گیا۔ مہمان خانے میں داخل ہوا۔ احمد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا۔

"آج واپسی میں بہت دیری کر دی۔ بتا کر بھی نہیں جاتا۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اللہ وسایا آیا؟"

"نہیں جی' ابھی نہیں آیا۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ تیز دھوپ میں سفر کرنے سے اس کا جسم شرابور ہو رہا تھا۔ وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ نہا دھو کر نکلا تو تازگی اور فرحت محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت وہ دھوتی باندھے ہوئے تھا اور اس کے اوپر صرف بنیان تھی۔ وہ تھکا ہوا سا بستر پر دراز ہو گیا۔

دوپہر کو وہ کھانا کھانے بیٹھا تو دھوپ غائب ہو چکی تھی۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ شام کو بارش قدرے تیز ہو گئی۔ رحیم داد کمرے سے باہر نہ جا سکا۔ رات کا کھانا بھی اس نے کمرے میں کھایا۔ پہر رات گزری تو بارش بند ہو گئی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لیکن ہوا بند تھی۔ کمرے میں حبس تھا۔ رحیم داد کی ہدایت پر احمد نے پلنگ اٹھا کر صحن میں بچھا دیا۔ اس پر بستر بھی لگا دیا۔

رحیم داد بستر پر نہیں لیٹا۔ تمام دن کمرے میں پڑے رہنے سے اکتا گیا تھا۔ وہ مہمان خانے سے باہر نکلا۔ اس کا ارادہ کچھ دیر چہل قدمی کرنے کا تھا مگر دور تک نہ جا سکا۔ راستوں میں جگہ جگہ بارش کا پانی کھڑا تھا۔ کیچڑ بھی تھی اور ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ واپس مہمان خانے میں آیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ رات گئے تک اسے نیند نہیں آئی۔ وہ خاموش لیٹا اس خطرناک منصوبے کے بارے میں سوچتا رہا جو اللہ وسایا کے قتل کے لیے احسان شاہ نے تیار کیا تھا۔ اس میں اسے اہم کردار ادا کرنا تھا۔

اس کے تصور میں بار بار اللہ وسایا سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کے دو واضح روپ تھے۔ ایک اللہ وسایا وہ تھا' جس نے اسے سہارا دیا تھا' پناہ دی تھی۔ اگر اللہ وسایا پناہ نہ دیتا تو ممکن تھا کہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا۔ گرفتاری کے بعد اس کے خلاف جیل سے فرار ہونے اور سیف اللہ' حکیم نذر محمد چشتی' چوہدری نورالہٰی اور مولا داد کے قتل کے الزام میں مقدمہ چلتا اور پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ یہ اللہ وسایا' مہربان اور شفیق تھا۔ اس نے نہ صرف اسے سزائے موت سے بچا رکھا تھا بلکہ اپنی کوششوں سے اس کے نام حویلی کے ساتھ ساتھ دس مربعے بھی الاٹ کروائے تھے' اسے بڑا زمیں دار بنا دیا تھا۔ دوسرا اللہ وسایا وہ تھا جو دارا سے ملنے کے بعد نہایت خطرناک بن گیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت پولیس سے مخبری کر کے اسے تختہ دار تک

پہنچا سکتا تھا۔ وہ مختلف ہتھکنڈوں سے حویلی اور زمین دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ رحیم داد ایک بار بڑا زمیں دار بن جانے کے بعد' دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اللہ وسایا کے ساتھ جمیلہ بھی تھی۔ اس کی دل کشی اور رعنائی سے وہ پہلے ہی روز سخت متاثر ہوا تھا۔ اسے اپنانے کی خواہش سینے میں کبھی کبھی ہوک بن کر اٹھتی' وہ بے قرار ہو جاتا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ دوراہے پر کھڑا ہے اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ کون سا راستہ اختیار کرے؟ اللہ وسایا کے قتل کا خیال دل سے نکال دے' کوٹلہ ہرکشن چھوڑ دے اور رات کے اندھیرے میں چھپتا چھپاتا کسی طرف نکل جائے یا احسان شاہ سے ساز باز کر کے اللہ وسایا کو راستے سے ہٹا دے' اس خطرے سے خود کو محفوظ کر لے جو اللہ وسایا کی جانب سے اسے لاحق تھا۔ اپنی زمیں داری برقرار رکھے اور جمیلہ سے نکاح پڑھوا کے اس کے بارہ مربعے بھی اپنے قبضے میں کر لے۔ عیش و آرام سے زندگی بسر کرے؟ یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی مگر صبح ہونے سے پہلے پھر بارش شروع ہو گئی۔ احمد نے اس کا پلنگ اٹھا کر کمرے میں ڈال دیا۔ رحیم داد کچھ دیر بعد سو گیا۔

☆

برسات کی بھیگی' بھیگی صبح تھی۔

رحیم داد' کمرے سے باہر نکل کر صحن میں گیا۔ احمد موجود نہیں تھا۔ آسمان پر اودی اودی گھٹائیں تھیں۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ بار بار کوئی تیز جھونکا آتا اور سرسراتا ہوا گزر جاتا۔

موسم بڑا سہانا تھا۔ فضا میں فرحت اور شگفتگی رچی ہوئی تھی۔ حویلی کا باورچی خانہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ادھر سے ملی جلی آوازوں کے ساتھ پکوان کی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ غسل خانے میں گیا' باہر آیا اور کمرے میں پہنچ کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ اسے باغ کی جانب سے نسوانی قہقہوں کے ساتھ ساتھ ڈھولک کی تھاپ پر گانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔

وہ اس کھڑکی پر پہنچا' جو باغ کے ایک گوشے میں کھلتی تھی مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ کچھ فاصلے پر آم اور جامن کے اونچے اونچے درخت تھے۔ رحیم داد ذرا ترچھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ درختوں میں جھولے پڑے ہیں۔ گاؤں کی نوجوان مٹیاریں اونچے سروں میں لک لک کر گا رہی ہیں۔ ان کی سریلی آوازوں میں جمیلہ کی آواز بھی شامل تھی۔ رحیم داد نے اس کی آواز پہچان لی اور جھک کر دیکھا۔ درختوں کے جھنڈ کے نیچے اسے جمیلہ کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ جھولے پر لمبے لمبے پینگ لے رہی تھی' گا رہی تھی اور رک رک کر قہقہے بھی بلند کر رہی تھی۔

بادل ایک بار زور سے گرجے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ بارش سے بھیگے ہوئے جھونکے کھڑکی کی راہ سے کمرے کے اندر آنے لگے۔ رحیم داد کھڑکی سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد احمد آیا مگر ناشتے میں صرف لسی کا ایک گلاس لایا۔

رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو سویرے سے اب تک کہاں تھا؟"

وہ دانت نکال کر ہنستے ہوئے بولا۔ "زمیں دارنی نے آج ساونی منائی ہے۔" اس نے باورچی خانے کی جانب ہاتھ اٹھایا۔ "ادھر پکوان پک رہا ہے۔ تو ابھی صرف لسی پی لے ورنہ پکوان کھانے کا مزا نہیں آئے گا۔"

رحیم داد نے لسی کا گھونٹ بھر کر دریافت کیا۔ "زمیں دار ابھی تک نہیں لوٹا؟"

"نہیں جی! وہ ابھی تک تو آیا نہیں پر زمین دارنی ادھر باغ میں ساونی منا رہی ہے۔ درختوں میں جھولے ڈالے ہیں۔ گانے ہو رہے ہیں۔ آج تو جی زبردست جشن رہے گا۔"

"تو ادھر نہیں گیا؟" رحیم داد نے مسکرا کر استفسار کیا۔

"میں نوں اتھے جا کر کیہہ لینا؟ ادھر تو جی سب زنانیاں ہی ہیں۔"

رحیم داد نے لسی پی کر گلاس خالی کر دیا۔ احمد نے گلاس اٹھایا اور باہر چلا گیا۔

باغ کی سمت سے گانے اور قہقہوں کی آوازیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔ باورچی خانے سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ پکوان کی تیز خوشبو فضا میں بکھرتی جا رہی تھی۔ بارش رفتہ رفتہ تیز ہو گئی۔ اب موٹی موٹی بوندیں گر رہی تھیں۔ ان کی آواز کمرے کی چھت پر صاف سنائی دے رہی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بارش بڑھتی جا رہی تھی۔

کہیں قریب ہی زور کے قہقہے بلند ہوئے۔ رحیم داد اٹھ کر ایک بار پھر کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اس نے باغ میں جھک کر دیکھا۔ دائیں ہاتھ کو گل چاندنی کی گھنی جھاڑی کے پیچھے جمیلہ دبک کر چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ منہ پر رکھ لیا تھا تاکہ اس کی ہنسی نہ ابھرے۔ مگر اس کے چہرے پر شوخی اور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ انگ انگ تازہ مچھلی کے مانند پھڑک رہا تھا۔ جھاڑی سے کچھ ہی فاصلے پر درختوں تلے گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ گانے والیاں اونچے سروں میں بار بار گیت کا یہ بول الاپ رہی تھیں۔

گدھے دے پیریے نی!

تیرے روپ نے پائیاں دھاماں!

گیت کے اس بول کے ذریعے گانے والیاں جمیلہ سے براہ راست مخاطب تھیں۔ "اے رقص

کرنے والی حسینہ! تیرے حسن اور رعنائی نے دھاک بٹھا دی ہے۔" رحیم داد نے جمیلہ کی جانب دیکھ کر سوچا' گانے والیاں ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ جمیلہ اس وقت گہرا سبز لاچا باندھے ہوئے تھی۔ اس کے اوپر نصف آستینوں کی اودی کرتی تھی۔ گورے گورے سڈول بازوؤں پر ہاتھی دانت کا چوڑا تھا۔ پیروں میں چاندی کی پازیب تھی۔ بالوں میں ٹلے کا سرخ اور سنہرا پراندہ تھا جس سے اس کی چوٹی کی لمبائی بڑھ گئی تھی اور کمر کے نیچے جھول رہی تھی۔ اوڑھنی بھاگ دوڑ میں کہیں گر گئی تھی۔ رم جھم بارش میں اس کا پورا بدن پانی سے اس طرح شرابور تھا کہ لباس جسم کے ساتھ پیوست ہو گیا تھا۔ اس کے شفاف اور گلابی بدن کے پیچ و خم سنگ مرمر کے ترشے ہوئے مجسمے کے مانند ابھر کر نمایاں ہو گئے تھے۔

رحیم داد نے جمیلہ کو اس عالم میں دیکھا تو تڑپ اٹھا۔ اس نے بے قرار ہو کر سوچا' احسان شاہ ٹھیک ہی کہتا ہے' جمیلہ کو اس کے قبضے میں ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر نہ وہ زمیں دار بن سکتا ہے نہ ہی زمیں داری کا مزا آئے گا۔

رحیم داد نے تصور میں پہلی بار اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے دیکھا۔ اس کی سانس تیز ہو گئی' دل کی دھڑکن بڑھ گئی اور وارفتگی سی طاری ہو گئی۔ وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ اس کے نرم اور گداز جسم کی حرارت اور خوشبو اس نے اپنے قریب' بہت قریب پائی۔ یہ لذت اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

مگر جمیلہ اس کی بے قراری اور احساسات سے بے نیاز الھڑ دوشیزہ کی طرح شوخی سے مسکراتی گل چاندنی کے پودوں کے ساتھ چپٹی کھڑی تھی۔ اس کے دل آویز چہرے پر بکھرا ہوا تبسم دم بدم بڑھتا گیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کی جھنکار سنتے ہی گانے والیاں قہقہے بلند کرتی ہر طرف سے اس کی جانب بڑھیں۔ سب ہی نوجوان' تن درست اور چنچل تھیں اور بارش کے پانی سے شرابور تھیں۔ قریب پہنچ کر وہ ٹھٹھا مار کر ہنسیں۔ انھوں نے بڑھ کر جمیلہ کا بازو پکڑا' اسے آگے کھینچا۔

وہ تلملائی اور شرما کر سر جھکا لیا۔ وہ سب اس کے گرد حلقہ بنا کر پہلے چٹکیاں بجاتی رہیں پھر دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر تالیاں بجانے لگیں۔ رفتہ رفتہ تالیوں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی گئی۔ ساتھ ساتھ ان کے جسم ڈولنے اور گردش کرنے لگے۔ وہ اپنے بازو اور گردن لچکاتی' کمر کو خم دیتی اسے گھیرے میں لے کر رقص کرنے لگیں۔ رقص کرتے کرتے انھوں نے تالیوں کی تھاپ پر ایک گیت چھیڑ دیا۔

گدھا پا لے نی

سون کد ہُندا اوتا!

اس دفعہ بھی' وہ جمیلہ سے مخاطب تھیں اور اسے خاموش پا کر شوخی سے چھیڑ رہی تھیں۔ "سکھی گدھا ناچ لے' ساون روز روز نہیں آتا۔" جمیلہ گیت کے بول سن کر ذرا دیر تو چپ چاپ کھڑی رہی' پھر وہ بھی ہاتھ اٹھا کر تالیاں بجانے لگی۔ اس نے اپنے جسم کو جھٹکے کے ساتھ لہرایا اور تالیوں کے تال پر رقص کرنے لگی۔ مینہ چھما چھم برس رہا تھا۔ ہوا فرانے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ بادل گرجتے رہے۔ رقص تیز اور تیز ہو تا گیا۔

رحیم داد کھڑکی سے لگا' دم بخود کھڑا تھا۔ اس کی بے تاب نگاہیں جمیلہ پر جمی ہوئی تھیں جس کا ترشا ہوا بدن تیز بارش سے بھیگ کر اور نمایاں ہو گیا تھا۔ وہ نوجوان نیاروں کے حلقے میں سب سے زیادہ حسین اور دل کش نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد اسے تیکھی اور بھوکی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس پر محویت طاری تھی۔ یکایک اس نے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کی حرارت محسوس کی۔ چونک کر پلٹا۔ سامنے اللہ وسایا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر اسے دیکھا پھر سراسیمگی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ "کب واپس آیا اللہ وسایا؟"

"تھوڑی ہی دیر پہلے لوٹا ہوں۔ سیدھا تیرے پاس چلا آیا۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "تجھے دیر سے کھڑا دیکھ رہا تھا پر تو کھڑکی سے لگا ایسا ہکا بکا کھڑا تھا کہ تجھے پتہ نہ چلا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "زنانیوں کو ساونی مناتے دیکھ رہا تھا۔"

رحیم داد نے اللہ وسایا کے لہجے میں ہلکا ہلکا طنز محسوس کیا۔ اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "اکیلے بیٹھے گھبرا رہا تھا۔ اٹھ کر کھڑکی پر چلا گیا۔"

اللہ وسایا نے کھڑکی سے لگ کر دیکھا۔ باغ میں جمیلہ نوجوان عورتوں کے ساتھ تالیاں بجا رہی تھی' ناچ رہی تھی' گا رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی' بارش میں بھیگ رہی تھی۔ ساون کا لطف اٹھا رہی تھی۔ اللہ وسایا نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا اور ہنس کر بولا۔ "جمیلہ کو دیکھ رہا ہے۔ اسے تو ایسے ہی کھیل تماشوں میں مزا آتا ہے۔ کس طرح خوشی خوشی ناچ رہی ہے۔" اس کے چہرے پر یکایک بھید کی چھا گئی۔ "مزارعوں کے گھروں کی زنانیاں اور نیاریں ہوں' تب بھی ٹھیک ہے۔ پر کیوں ور لڑکیوں کی زنانیوں کے ساتھ ناچتے گاتے' ذرا بھی تو نہیں سوچتی کہ وہ زمیں دارنی ہے۔ اس کی ھی حرکتوں پر آس پاس کے سارے زمیں دار مجھ سے خار کھاتے ہیں۔"

"ویسے برا منانے کی تو گل ہے جی! زمیں دارنی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ تو زمیں داری کی ن رکھنا چاہیے۔"

"منع کرتا ہوں پر وہ کہاں سنتی ہے۔ ہر بار یہی کہتی ہے' تو زمیں دار ہے تو زمیں داری اور اس کی نور اپنے ساتھ رکھ' میں نوں اس سے کچھ نہیں لینا۔ چوہدری! ذرا سوچ یہ کیسے ہو سکتا ہے' میں اور وہ کوئی الگ تو نہیں ہیں۔"

اللہ وسایا کھڑکی سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ باغ میں شوخ اور چنچل قہقہوں اور تالیوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ مینہ رم جھم رم جھم برس رہا تھا۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ احمد دو نوکروں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے میز اٹھا کر اللہ وسایا اور رحیم داد کے درمیان رکھی اور اس پر طرح طرح کے پکوان چن دیے۔ ان میں بھلے اور پکوڑے تھے۔ پوریاں تھیں۔ باجرے اور مکئی کی میٹھی روٹیاں تھیں۔ ڈوڈا تھا۔ سوجی کا حلوہ تھا۔ طرح طرح کے ساگ تھے۔ بھاجی تھی۔ اچار' رائتا' چٹنی' سبھی کچھ تھا۔ پکوان چٹ پٹا بھی تھا' نمکین بھی تھا' میٹھا بھی تھا۔ ساونی کی خاص سوغات' دودھ اور خربوزے کی کھیر بھی تھی۔ باہر سے اونچے سروں میں گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

ساون کھیر نہ کھاری نا'

کیوں لی تمیوں اپرادھیا!

اللہ وسایا نے رحیم داد کی جانب دیکھا' مسکرا کر بولا۔ "سن رہا ہے چوہدری! باہر زنانیاں کیا گا رہی ہیں؟" اس نے کھیر کی طرف اشارہ کیا۔ "پہلے اسے کھا۔" باغ میں لہک لہک کر گانے والیاں بھی گیت کے بولوں میں کہہ رہی تھیں۔ "ساون میں بھی تو نے کھیر نہیں کھائی۔ ایسی زندگی کا کیا مزا۔" دونوں کھلکھلا کر بے تکلفی سے ہنسے۔ انھوں نے پہلے کھیر کھانا شروع کی۔ پکوان ڈھیر سارا تھا۔ ساتھ ہی پیتل کی بڑی بالٹی تھی جس میں اوپر تک آم بھرے تھے۔

اللہ وسایا نے کھیر کھاتے ہوئے رحیم داد سے پوچھا۔ "میرے پیچھے ادھر دارا تو نہیں آیا؟"

رحیم داد پریشان ہو گیا۔ مگر اس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا۔ "میں نے تو اسے دیکھا نہیں۔ آیا بھی ہو گا تو زمیں دارنی کو پتہ ہو گا۔ میرے پاس نہیں آیا۔ آئے گا بھی نہیں۔" اس کے لہجے میں تلخی کا عنصر غالب تھا۔

اللہ وسایا چند لمحے خاموش رہا۔ باغ میں قہقہے اور گانے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ قدرے نرم لہجے میں دریافت کیا۔ "سچ سچ بتا' تو نے جس زنانی کو ڈھوک امیر خاں میں کتل کیا تھا' اس سے تیری یاری تھی؟"

"میں نے کسی کو کتل شتل نہیں کیا۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

ڈھٹائی سے کہا۔ "میں تیرے ساتھ اتنے دنوں سے ٹھہرا ہوں۔ تیں نوں پتہ ہے' میں نے ادھر کتنی زنانیوں سے یاری لگا رکھی ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نوں پتہ ہے' تو ایسا بندہ نہیں۔ برائی زیادہ دن نہیں چھپتی' سامنے آہی جاتی ہے۔" اللہ وسایا نے اظہار اطمینان کرتے ہوئے کہا۔ "پر دارا نے تیرے بارے میں ایسی گل بات کیوں کہی؟" اس نے لسی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ "میں نوں ٹھیک ٹھیک بتا' اصلی گل کیہ ہے؟"

رحیم داد کو پورا پورا یقین تھا کہ اب اللہ وسایا سے دارا کی ملاقات کا کوئی امکان نہیں لہٰذا وہ شیر ہو کر بولا۔ "ٹھیک ٹھیک گل تو دارا کو سامنے بٹھا کر ہی ہو گی۔ تو نے بھی پہلے یہی کہا تھا نا۔ اسے آنے دے' تبھی میں اس معاملے میں گل بات کروں گا۔ تجھے بھی پوری طرح پتہ چل جائے گا' میرے بارے میں اس نے تجھ سے جو کچھ کہا ہے' اس میں کتنی سچائی ہے۔"

"ٹھیک ہے' اس کے آنے ہی پر گل بات ہو گی۔" اللہ وسایا نے بات آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے رویے میں کسی قسم کی تلخی یا کدورت نہیں تھی۔

دونوں اطمینان سے پکوان کھاتے رہے۔ اللہ وسایا سے زیادہ نہیں کھایا گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بالٹی سے چھانٹ کر اس نے ایک آم نکالا اور چوسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے جمیلہ کا چہرا ابھرا۔ بھیگے ہوئے بالوں سے پانی کے قطرے اس کے شفاف گلابی رخساروں پر ٹپک کر بکھرتے جا رہے تھے۔

جمیلہ نے شوخ نظروں سے اللہ وسایا کو دیکھا' مسکرا کر پوچھا۔ "تو آ گیا اللہ وسایا؟"

اللہ وسایا نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا' اس کا پانی سے شرابور جسم دیکھا۔ قدرے تیکھے لہجے میں بولا۔ "میں تو کب کا آ گیا' پر تو کب تک ساونی مناتی رہے گی؟ دیکھ تو پانی سے کتنی بھیگ گئی ہے۔ ختم کر یہ رنگ رنگلیاں۔ جا کر کپڑے بدل۔ بیمار پڑ جائے گی۔"

"ارے ارے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "تو اپدیشک کب سے بن گیا۔" اس نے شوخی سے آنکھوں کو گردش دی۔ "ساون روز روز نہیں آتا۔ ایک روز تو جی بھر کر ساونی منا لینے دے۔"

"میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔" اللہ وسایا نے پیار سے کہا۔

"میرے بھلے کی چھوڑ۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "لا مجھے ایک آم تو دے دے۔"

اللہ وسایا نے جھٹ بالٹی میں ہاتھ ڈالا۔ ایک آم نکالا' کھڑکی کے نزدیک گیا۔ آم جمیلہ کی طرف بڑھایا۔ جمیلہ نے انکار میں گردن ہلائی۔ "یہ نہیں۔" اس نے ہاتھ آگے کیا اور اللہ وسایا کے ہاتھ سے وہ آم اچک لیا جو وہ چوس رہا تھا۔ جمیلہ نے آم چوستے ہوئے محبت سے اللہ وسایا کو دیکھا اور

آنکھیں نچا کر بولی۔ "بہت مزے دار ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی اور آم چوستی ہوئی دور چلی گئی۔

رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر نفرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات تھے۔

اس نے تیکھی نظروں سے اللہ وسایا کو دیکھا' جو رحیم داد کے احساسات سے بے نیاز کھڑکی کے نزدیک کھڑا جمیلہ ہی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ وہ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ رحیم داد آہستہ سے کھنکارا۔ اللہ وسایا نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا' زیر لب مسکرایا' بالٹی سے ایک آم نکال کر چوستے ہوئے بولا۔

"تو نے آم نہیں کھائے؟"

اللہ وسایا آہستہ آہستہ قریب آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں بالٹی سے آم نکال نکال کر چوسنے لگے۔ آم میٹھے اور خوش ذائقہ تھے۔ انھوں نے خوب سیر ہو کر کھائے۔ آموں سے فارغ ہو کر دونوں نے گلاس بھر بھر کر دودھ پیا۔ نوکر بچا ہوا پکوان اور کھانے پینے کی دوسری اشیا اٹھا کر لے گئے۔ اللہ وسایا پر سفر کی تھکن کا غلبہ ہوا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری میں نوں اب آرام کرنا ہے' بہت تھک گیا ہوں۔" وہ کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد بھی کرسی سے اٹھا اور بستر پر لیٹ گیا۔ باغ میں رم جھم برستی ہوئی بوندوں کے مدھم آہنگ کے ساتھ ساتھ نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کے جھنکارتے قہقہے اور سریلے گیتوں کے بول ابھر رہے تھے' ڈوب رہے تھے۔ کبھی شور' کبھی خاموشی۔ شور اور خاموشی کے درمیان رحیم داد کا ذہن ڈولتا رہا' جمیلہ کی آواز ٹٹولتا رہا' پہچانتا رہا۔ پھر وہ سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ بارش ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔ احمد نے کمرے میں لیمپ روشن کر دیا تھا۔ دوپہر کو اتنا کھا چکا تھا کہ رات کے کھانے کی اسے کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس نے صرف لسی کا گلاس پیا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ صحن میں گرتی ہوئی بارش کی بوندوں کی جھالر ہوا کے تیز جھونکوں سے لہرا رہی تھی۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ مینہ کی ایسی جھڑی لگی کہ دو روز تک آسمان پر بادلوں کی سرمئی چادر پھیلی رہی۔ تیسرے روز سہ پہر کو بادل ذرا چھٹے۔ ان کے درمیان سے شیشے کی طرح جھلکتا ہوا نیلا نیلا آسمان نظر آنے لگا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بادلوں سے دھوپ جھانکنے لگی۔

☆

رحیم داد مسلسل بارش کے باعث کہیں جا نہیں سکا تھا۔ تمام وقت کمرے ہی میں رہا۔ اس عرصے میں اللہ وسایا سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ جمیلہ سے تو اور بھی زیادہ عرصے سے نہیں مل سکا تھا۔ وہ سویرے سویرے اسکول چلی جاتی۔ دوپہر کو اپنے دونوں بچوں کے ساتھ لوٹتی تو بہت

تھکی ہوئی ہوتی۔ شام کو وہ عام طور پر اسکول یا ڈسپنسری کے سلسلے میں کسی نہ کسی سے بات چیت میں مصروف ہوتی۔ کیرو والا سے واپسی کے بعد اس نے جمیلہ کو جس وقت بھی دیکھا' وہ مصروف نظر آئی۔ ان دنوں اس پر ڈسپنسری قائم کرنے کی دھن سوار تھی۔ ڈسپنسری کی تعمیر کا کام اس نے شروع کر دیا تھا مگر بارش کے باعث ملتوی کرنا پڑا۔ رحیم داد بھی اس عرصے میں دارا کے باعث ذہنی طور پر بہت پریشان رہا۔

وہ مہمان خانے سے نکلا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور دھوپ بہت تیز تھی۔ وہ کیچڑ اور پانی سے بچتا بچاتا کچھ دور گیا پھر واپس آ گیا۔

شام کو رحیم داد باغ میں پہنچا۔ ہرے بھرے درخت اور پودے بارش کے پانی سے دھل کر نکھر گئے تھے۔ جدھر نظر اٹھتی' ہریالی ہی ہریالی نظر آتی۔ بادل چھٹ چکے تھے۔ شام کے ہلکے ہلکے دھندلکے میں گہرے نیلے آسمان پر کہیں کہیں تارے ٹمٹمانے لگے تھے۔ رحیم داد کو باغ میں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اللہ وسایا آ گیا۔

اللہ وسایا کے چہرے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ وہ ایک کرسی پر نڈھال ہو کر بیٹھ گیا۔

رحیم داد بولا۔ "اللہ وسایا تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ پریشان پریشان نظر آ رہا ہے۔"

"میری طبیعت تو ٹھیک ٹھاک ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "پر جمیلہ کو سخت بخار ہے۔ ویسے طبیعت تو اس کی سویرے سے گڑبڑ تھی۔ خود ہی دوا دارو کرتی رہی۔"

"اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بہت تیز بخار ہے۔ اس روز ساؤنی مناتی رہی اور بارش میں بھیگتی رہی۔ تیرے سامنے ہی میں نے منع بھی کیا تھا' پر وہ میری سنتی ہی کب ہے۔ اب بخار میں بھن رہی ہے۔ سر میں درد اتنا ہے کہ بار بار سر ادھر ادھر پٹکتی ہے۔"

"اب تو شام ہو گئی۔ برکھا سے رستے بھی خراب ہو گئے ہیں۔ پاک پتن جانا اور ڈاکٹر خاں کو لانا تو بہت مشکل ہو گا۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔" اللہ وسایا بولا۔ "پر کسی ڈاکٹر حکیم کو تو لانا ہی پڑے گا۔ جمیلہ کی طبیعت بہت گڑبڑ ہو رہی ہے۔" اس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ "سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔"

"لگتا ہے' زمیں دارنی کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔"

"ہاں جی' بالکل پیلی پڑ گئی ہے۔ بخار سے سارا بدن جل رہا ہے۔ ہائے ہائے کر رہی ہے۔"

اللہ وسایا گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے بشرے سے شدید پریشانی جھلک ر
تھی۔ رحیم داد بھی خاموش بیٹھا رہا۔ برسات کی بھیگی بھیگی شام سرمئی پڑ گئی تھی۔ ہوا کے
جھونکے درختوں کے درمیان سے گزرتے۔ سرسراہٹیں ابھرتیں، ہلکی ہلکی سیٹیاں بجتیں۔ سا
سلونی شام گنگنا رہی تھی۔

رحیم داد نے نظریں اٹھا کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ چند لمحے اس کا چہرہ تکتا رہا۔ اس نے کھنکار کر
صاف کیا۔ اللہ وسایا کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ "اللہ دسایا! ادھر عالم پور کے نزدیک ایک پنڈ
حکیم ہے۔ شکور، اس کی بہت تعریف کرتا ہے۔ ایک بار مجھے بھی اس کے پاس لے گیا تھا۔ پی
میں کچھ گڑبڑ تھی۔ بار بار سخت مروڑ اٹھتی تھی۔ رات بھی زیادہ ہو چکی تھی، درد سے نیند ہی نہ
آتی تھی۔ یہ ان دنوں کی گل ہے، جب تو شریفاں کے ویاہ میں شرکت کرنے کیمبل پور گیا تھا۔
کی دوائی سے میں فوراً چنگا ہو گیا تھا۔ ایسا آرام ملا کہ سویرے دیر تک سوتا رہا۔"

"کتنی دور ہے وہ پنڈ جہاں حکیم رہتا ہے؟"

"پنج چھے میل سے زیادہ دور نہ ہو گا۔"

"فاصلہ تو کوئی زیادہ نہیں۔" اللہ وسایا نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ "پر حکیم رات کو یہاں آ
جائے گا؟"

"ضرور آ جائے گا۔ ابھی تو شام ہے، ویسے وہ بہت نیک بندہ ہے۔ میں تو اس کے پاس آ
رات کو گیا تھا۔ اس نے نکھرا شکرا نہیں کیا۔ شکور نے ہانک لگائی تو جھٹ باہر آ گیا۔ بہت پیار
حال پوچھا، نبض دیکھی اور دوائی دے دی۔"

"تو کہتا ہے تو اسی کو لے آتے ہیں ورنہ رات میں جمیلہ کی طبیعت اور زیادہ گڑبڑ ہو جائے
تیں نوں پتہ نہیں، میں اس کی حالت دیکھ کر کتنا پریشان ہوں۔"

"وہ تو تیرا منہ دیکھ کر ہی پتہ چل رہا ہے فکر نہ کر۔ حکیم کی دوائی سے تیری گھر والی بالکل
ہو جائے گی۔"

"حکیم کے پاس ہی چلتے ہیں۔" اللہ وسایا کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ اللہ وسایا
کہا۔ "چوہدری! تو میرا انتظار کر۔ میں ذرا جمیلہ کا حال معلوم کر لوں۔ حکیم پوچھے گا تو کیا بتا
گا۔"

رحیم داد نے چونک کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جمیلہ کو یا کسی کو بھی یہ پتہ نہ چلے ک
اس کے ساتھ گیا ہے۔ اس نے فوراً اللہ وسایا کو منع کیا۔ "زمیں دارنی کو نہ بتانا کہ تو میرے سا

حکیم کو لینے جا رہا ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں، وہ حکیم سے علاج کرانے پر راضی نہیں ہو گی۔
وہ تو ڈاکٹری علاج ہی کو مانتی ہے۔"

"کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے تو۔" اللہ وسایا نے اتفاق کیا۔

رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "اسے تو یہی کہنا ہے، پاک پتن سے ڈاکٹر خان کو لینے جا رہا ہے۔"

"پر جب ڈاکٹر کی بجائے میں حکیم کو لے کر پہنچوں گا تو کیا ہو گا؟ یہ بھی تو سوچنا پڑے گا۔"

"تب کی تب دیکھی جائے گی۔" رحیم داد نے اسے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ "ابھی
سے کیوں پریشان ہو رہا ہے؟ کہہ دینا، ڈاکٹر نہیں ملا۔ حکیم کو لے آیا ہوں۔ تو ابھی اس کی دوائی پی
لے۔ سویرے ڈاکٹر کو بلوا لوں گا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے، حکیم حال سن کر ہی دوائی دے دے اور اسے
لانا نہ پڑے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ حکیم دوائی دے دے تو ٹھیک ہے۔ اسے یہاں لانے میں تو دوائی لینے اس کے
ساتھ دوبارہ جانا پڑے گا۔ ڈاکٹروں کی طرح حکیم اپنے ساتھ دوائیاں تو رکھتے نہیں۔ حکیم کو تو لانے
کی بجائے حال بتا کر دوائی لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آگے اس کی مرضی۔ جیسا وہ کہے گا، کیا
جائے گا۔"

اللہ وسایا حویلی کی جانب بڑھا۔ "میں جلد ہی واپس آتا ہوں۔"

"میں نہر پر تیرا انتظار کروں گا۔" رحیم داد بہت محتاط تھا۔ "میں گھوڑی لے کر اسی طرف جا رہا
ہوں۔"

"ذرا دیر صبر کر لے، میں جلد ہی آ جاؤں گا۔" اللہ وسایا نے اصرار کیا۔

"میں کب کہہ رہا ہوں تو جلدی نہیں آئے گا۔" رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ "ادھر ہی آ جائے گا تو
کیا حرج ہو گا۔ یہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے جی گھبرائے گا۔ پہلے ہی بارش کی وجہ سے کئی روز سے کمرے
میں اکیلا پڑا ہوں۔"

"جیسی تیری مرضی۔" اللہ وسایا نے ضد سے کام نہیں لیا۔ آگے بڑھ گیا۔

رحیم داد اصطبل کی جانب بڑھا، گھوڑی نکالی۔ اس پر سوار ہوا اور تیزی سے دوڑاتا ہوا نہر کی
جانب روانہ ہو گیا۔ نہر میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ شام کا سرمئی دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔
رحیم داد نے نہر کے قریب پہنچ کر گھوڑی روک لی اور اللہ وسایا کا انتظار کرنے لگا۔

مگر اللہ وسایا جلدی نہیں آیا۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ اللہ وسایا کے آنے میں دیر ہوئی تو رحیم داد کو
تشویش ہوئی۔ پندرہ سولہ منٹ گزرے ہوں گے کہ دور سے گھوڑا دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ ٹاپیں

رفتہ رفتہ نزدیک آتی گئیں۔ اللہ وسایا ایک جھنڈ کی آڑ سے گھوڑی دوڑاتا ہوا نکلا۔ قریب پہنچ کر اس نے معذرت کے انداز میں کہا۔

"معاف کرنا چوہدری' مجھے کچھ دیر ہو گئی۔"

"میں نوں پتہ تھا تو جلدی نہیں آئے گا۔ زمیں دارنی نے روک لیا ہو گا۔"

"تونے ٹھیک سوچا۔" اللہ وسایا ہنسنے لگا۔ "جمیلہ نے روکے رکھا۔ بار بار کہتی تھی' اندھیرا ہو گیا اس سے نہ جا۔ سویرے ڈاکٹر کو لے آنا۔ میں دیر تک اسے سمجھاتا رہا' تب اس نے آنے دیا۔"

رحیم داد نے دیکھا اللہ وسایا کے آگے بندوق رکھی ہے۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "تو بندوک کس لیے لے آیا؟"

"اندھیرا بھی بڑھ گیا ہے اور آگے احسان شاہ کا پنڈ ہے۔ تیں نوں پتہ ہے' اس سے میری پرانی لگی ہے۔ اس طرف رات کو مسلح ہو کر ہی چلنا چاہیے۔" اللہ وسایا نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"زمیں دارنی نے بندوک لے جانے کو کہا ہو گا؟" رحیم داد نے اللہ وسایا کو ٹٹولا۔

"اسے تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ اس طرف جانا ہے۔" اللہ وسایا نے وضاحت کی۔ "اسے تو میں نے یہی بتایا' ڈاکٹر خاں کو لینے پاک پتن جا رہا ہوں۔"

"تو ادھر آنے کو کہتا تو وہ تجھے ضرور روک لیتی۔"

"بالکل۔" اللہ وسایا نے تائید کی۔ "رات کو تو وہ مجھے ہرگز اس طرف نہ جانے دیتی۔"

دونوں نے اپنی اپنی گھوڑی کو ایڑ لگائی اور نہر کے کنارے کنارے گھوڑیاں دوڑانے لگے۔ کچھ اور اندھیرے کے باعث وہ بہت محتاط نظر آ رہے تھے۔ جھٹ پٹے میں دونوں آگے اور آگے بڑھتے گئے۔ سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی گاؤں قریب آتا تو گھروں کی روشنیاں دور سے ٹمٹماتی نظر آتیں۔ مویشیوں اور انسانوں کی ملی جلی مدھم آوازیں بھی سنائی دیتیں۔ ابھی گاؤں جاگ رہے تھے۔ نہر کا پانی گنگناتا رہا تھا۔ آس پاس کے جھنگروں میں مینڈک زور زور سے ٹرا رہے تھے۔

دونوں نہر کی پلیا سے آگے بڑھے تو اللہ وسایا نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیکھا۔ وہ رحیم داد کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی جانب گردن بڑھا کر بولا۔ "چوہدری! اب چوکس رہنا ہو گا۔ یہ رستہ خطرناک ہے۔ یہاں سے احسان شاہ کا علاقہ لگتا ہے۔"

"میں تو اس رستے سے کئی بار گزرا ہوں۔ میں نے کبھی کھٹکا محسوس نہیں کیا۔" رحیم داد نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"تیری بات اور ہے۔ شاہ جی تو مجھ سے خار کھاتا ہے۔"

"حوصلے سے کام لے۔ تیرے پاس تو بندوک ہے اور بھری ہوئی بھی ہو گی؟"

"بھری ہوئی تو ہے' پر ہم دو ہی ہیں اور بندوک صرف ایک ہے۔" اللہ وسایا نے صورت حال رحیم داد پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ "احسان شاہ کے پاس تو مسلح غنڈوں کی پوری پلٹن ہے۔"

"ایسا ہے تو بندوک مجھے دے دے۔ میں آگے آگے چلتا ہوں۔" رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر بندوق مانگی۔ اللہ وسایا نے سادگی سے دے بھی دی' ہنس کر بولا۔ "تیری مرضی ہے تو رکھ لے۔ ویسے میں ڈرنے مرنے والا بندہ نہیں۔ پہلے بھی احسان شاہ کئی بار مجھ پر قاتلانہ حملے کرا چکا ہے پر کبھی سامنے نہیں آیا۔"

رحیم داد نے بندوق سنبھال کر آگے رکھ لی۔ گھوڑی کو ایڑ لگائی اور اللہ وسایا سے کچھ دور آگے نکل گیا۔ اللہ وسایا اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ دونوں آگے بڑھے تو شیشم ار سرس کے درختوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ یہی وہ جنگل تھا جس میں احسان شاہ کے منصوبے کے مطابق دینا کو دارا اور دوسرے مسلح افراد کے ہم راہ موجود ہونا چاہیے تھا۔ رحیم داد نے اس راہ پر گھوڑی ڈال دی جو جنگل کے درمیان سے گزرتی تھی۔ اللہ وسایا نے گھوڑی بڑھائی۔ رفتار کسی قدر تیز کی۔ رحیم داد کے قریب پہنچا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

دونوں گھنے درختوں کے نیچے تھے۔ شام کا مدھم اجالا شاخوں کے درمیان سے کہیں کہیں جھانک رہا تھا مگر ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ دبی دبی آہٹیں ابھریں مگر کوئی نظر نہیں آیا۔

اللہ وسایا نے خطرے کی بو محسوس کی۔ اس نے رحیم داد سے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "چوہدری! تونے ٹھیک راستہ نہیں پکڑا۔ یہ بہت ہی خطرناک بیلا ہے۔"

رحیم داد زور سے کھنکارا اور گھوڑی آگے بڑھاتے ہوئے اونچی آواز سے بولا۔ "اللہ وسایا حوصلے سے کام لے۔ رستہ ہی کتنا ہے۔ ذرا دیر میں بیلے سے دونوں باہر ہوں گے۔ گھوڑی تیز کر۔"

رحیم داد گھوڑی تیزی سے دوڑاتا آگے نکل گیا۔ اللہ وسایا نے بھی رفتار تیز کی مگر چند ہی قدم چلنے کے بعد گھوڑی زور سے ہنہنائی۔ اللہ وسایا نے دھندلی روشنی میں دیکھا کہ راستے میں موٹی رسی تنی ہے۔ اس نے رکابیں سنبھال کر گھوڑی روکنے کی کوشش کی مگر اس کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ وہ رک نہ سکی۔ رسی سے الجھی اور لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اللہ وسایا بھی اس کے ساتھ ہی لڑھک کر نیچے آ گیا۔ وہ زمین پر آتے ہی زور سے چیخا۔

"چوہدری! بندوک مجھے دے۔"

اسی وقت ایک طرف سے ٹارچ کی تیز روشنی ابھری۔ رحیم داد نے گھوڑی روک لی۔ پلٹ کر دیکھا کہ ٹارچ کی تیز روشنی میں اللہ وسایا زمین پر پڑا ہے اور ادھر ادھر نظریں دوڑا کر بے بسی سے پکار رہا ہے۔ "چوہدری! چوہدری! تو کدھر چلا گیا؟" اللہ وسایا نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ درختوں کے نیچے سے سات آٹھ آدمی نکلے اور اللہ وسایا کی جانب تیزی سے بڑھے۔ ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ وہ بندوقوں' کلہاڑیوں' گنڈاسوں اور دوسرے خطرناک اسلحہ سے لیس تھے۔

انھیں دیکھ کر اللہ وسایا تڑپ کر چیخا۔ "چوہدری!" مگر وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ ڈھاٹے باندھے ہوئے افراد چاروں طرف سے جھپٹے اور اللہ وسایا کو دبوچ لیا۔ ایک بار وہ زور لگا کر ان کی گرفت سے نکل گیا' تیزی سے پلٹا اور دوڑ کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر پیچھے سے کسی نے گنڈاسے کا ایسا بھرپور وار کیا کہ اس کا تیز پھل کئی انچ اللہ وسایا کے سر کے اندر اتر گیا۔

اللہ وسایا کے حلق سے ہائے کی دل دوز چیخ نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کا چہرہ خون سے لت پت ہو گیا تھا۔ حملہ آوروں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اللہ وسایا کی مشکیں کس لیں۔ ٹارچ کی روشنی بجھ گئی۔ ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔

رحیم داد نے اللہ وسایا کی بندوق وہیں پھینک دی۔ گھوڑی کی باگ موڑی۔ رفتار تیز کی اور جنگل سے باہر نکل گیا۔

۳۳

گاؤں کی چہل پہل اجڑ چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ گھروں سے کہیں کہیں روشنی جھلک رہی تھی۔ رات کالی کاجل بن چکی تھی۔ بادل گھر گھر کر آرہے تھے۔ آسمان تاریک ہو گیا تھا۔ ہوا تیز اور بھیگی ہوئی تھی۔ رحیم داد گھوڑی دوڑاتا حویلی کے باڑے پر پہنچا۔ باڑے کے مویشیوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی پیتل کی گھنٹیوں اور گھنگرالوں کی جھنکار سناٹے میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ باڑے کا رکھوالا دروازے پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد گھوڑی سے نیچے اترا۔ رکھوالے نے بڑھ کر راسیں سنبھال لیں۔

رحیم داد آگے بڑھا تو رکھوالے نے ٹوکا۔ "زمیں دار تیرے ساتھ نہیں لوٹا؟"

"زمیں دار؟" رحیم داد پہلے تو گھبرایا پھر سنبھل کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "وہ تو میرے ساتھ نہیں گیا تھا۔ کدھر ہے وہ؟"

"یہ تو جی میں نوں پتہ نہیں۔ تیرے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی گھوڑی لے کر نکلا تھا۔ میں سمجھا آگے تجھے مل گیا ہوگا۔ وہ بھی سوئے کی طرف گیا تھا۔"

"سوا تو سامنے ہی ہے۔" رحیم داد نے نہر کی سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "وہ ادھر تو نہیں پہنچا۔ کہیں اور گیا ہوگا۔ آتا ہوگا۔"

رحیم داد مہمان خانے کی جانب روانہ ہوا۔ رکھوالا گھوڑی کی راسیں سنبھالے اصطبل کی جانب بڑھا۔ رحیم داد مہمان خانے میں گیا۔ دروازہ کھلا تھا مگر احمد موجود نہیں تھا۔ رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ اس وقت احمد سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ احمد مہمان خانے میں ہوتا تو ضرور

بات کرتا۔ عین ممکن تھا کہ اللہ وسایا کے بارے میں پوچھتا۔ رحیم داد پر گھبراہٹ اور پریشانی نے یلغار کر رکھی تھی۔ اس عالم میں نہ جانے کیا بات زبان سے نکل جاتی۔

رحیم داد نے صحن عبور کیا۔ کمرے کے آگے برآمدے میں اس کا پلنگ بچھا تھا۔ بستر بھی لگا ہوا تھا۔ اندر کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ رحیم داد کمرے میں گیا‘ کپڑے اتارے دھوتی باندھی۔ لیمپ کی لو مدھم کی اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اس نے رات کا کھانا کھانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بھوک ہی نہیں تھی۔ وہ دم بخود لیٹا رہا۔ دور دور تک نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ شدید ذہنی الجھن میں جکڑا تھا۔ اسے رہ رہ کر اللہ وسایا یاد آ رہا تھا‘ اس کا خون میں لتھڑا ہوا چہرہ یاد آ رہا تھا‘ اس کا تڑپ کر بار بار "چوہدری! چوہدری!" پکارنا یاد آ رہا تھا۔

اس پر خوف اور دکھ کے ملے جلے احساسات کا غلبہ تھا۔ وہ بے چین ہو کر ادھر ادھر کروٹ بدلتا مگر کسی پہلو قرار نہ آتا۔ آنکھیں بند کرتا۔ نیند کو بلانے کی کوشش کرتا مگر نیند روٹھی ہوئی تھی۔ اندھیرا کچھ اور گاڑھا ہو گیا۔ سناٹا زیادہ گہرا ہو گیا۔ رات دم بخود کھڑی تھی۔ یکایک گہری خاموشی میں مہمان خانے کے باہر کتوں کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے بدحواس ہو کر آنکھیں کھول دیں‘ کروٹ بدلی اور اس دروازے کی جانب دیکھنے لگا جو مہمان خانے کے باہر میدان میں کھلتا تھا۔ کتوں کے رونے کی ڈراؤنی آوازیں سناٹے میں رک رک کر ابھرتی رہیں۔

رحیم داد چپ لیٹا تھا۔ ذرا دیر بعد حویلی سے مہمان خانے میں داخلے کا دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ صحن میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد کو گمان گزرا کہ احمد آیا ہو گا۔ اس وقت وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور مست مارے اس طرح خاموش پڑا رہا گویا بے خبر سو رہا ہو۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آ گئی اور اس کے پلنگ کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ رحیم داد نے آنکھیں کھولیں نہ کروٹ بدلی۔ چند لمحے خاموشی سے گزرے پھر اس کے سرہانے چوڑیوں کی ہلکی ہلکی کھنک سنائی دی‘ ساتھ ہی آواز ابھری۔

"چوہدری! سو گیا؟"

رحیم داد نے آواز پہچان لی۔ یہ احمد کی بیوی تھی۔ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر سوچا کہ اتنی رات گئے وہ اس کے پاس کیوں آئی ہے؟ معاً اسے خیال آیا‘ کہیں جمیلہ کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہو گئی؟ رحیم داد خاموش پڑا رہا۔ احمد کی بیوی زیادہ دیر چپ نہیں رہی۔ اس نے رحیم داد کا بازو پکڑ کر آہستہ سے جھنجوڑا اور کسی قدر اونچی آواز سے بولی۔

"چوہدری! چوہدری!"

اب رحیم داد کے لیے چپ رہنا ممکن نہ رہا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور دونوں ہاتھوں سے انہیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ احمد کی نوجوان بیوی اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ لیمپ کی مدھم روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا مگر نقش و نگار تیکھے تھے۔ جسم سڈول اور صحت مند تھا۔

"میں حمے کی گھر والی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "میرا نام تاراں ہے جی۔"

اس کی مسکراہٹ سے رحیم داد کو اندازہ ہو گیا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ وہ حیرت کے انداز میں بولا۔ "یہ میں نوں بھی پتہ ہے کہ تو حمے کی گھر والی ہے‘ پر اتنی رات کو تو یہاں کیوں آئی ہے؟"

"وہ ایسا ہی جی‘ حمے کو شام سے بکھار ہے۔ اسی نے تیرے پاس بھیجا ہے۔ تو نے روٹی نہیں کھائی‘ بھوکا ہی سو گیا۔" تاراں ایک بار پھر الھڑپن سے مسکرائی۔ "تیرے لیے روٹی لے آؤں۔ روٹی کھا لے‘ فیر آرام نال سو جانا۔"

رحیم داد منہ بگاڑ کر بولا۔ "میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے‘ روٹی نہیں کھاؤں گا۔"

تاراں خاموش کھڑی رہی۔ رحیم داد کا جی چاہا کہ وہ اس سے جمیلہ کی طبیعت کا حال معلوم کرے لیکن صورت حال کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ایسی بات نہ پوچھے اور زیادہ سے زیادہ محتاط رویّہ اختیار کرے۔ وہ چپ رہا لیکن جو بات معلوم کرنا چاہتا تھا‘ خود بخود تاراں کی زبان پر آ گئی۔ "آج کل جی موسم بھی بہت گڑبڑ ہے۔ حمے کو بکھار ہے۔ زمیں دارنی کو بھی بکھار ہے۔ پر اب تو اس کی طبیعت ٹھیک لگتی ہے۔ آرام نال سو رہی ہے۔ میں تھوڑی دیر پہلے اس کے پاس گئی تھی۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی چھائی‘ لہجے سے بھی تشویش جھلکنے لگی۔ "پر زمیں دار اب تک نہیں لوٹا۔ ڈاکٹر لینے گیا تھا۔"

رحیم داد نے اس کی تشویش نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "زمیں دارنی کو کب بکھار ہوا؟"

"وہ جی ایسا ہے‘ اس نے پچھلے دنوں ساونی منائی تھی۔ برکھا میں سارا دن بھیگتی رہی‘ ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرتی رہی۔ جھولا جھولتی رہی۔ فیر بکھار تو آنا ہی آنا تھا۔" اس نے شوخی سے آنکھوں کو گردش دی۔ "میں نے بھی جی اس کے ساتھ ساونی منائی تھی۔ بھیگی بھی بہت تھی‘ پر اپنے کو تو کچھ ہوا نہیں۔"

"تو زمیں دارنی سے بھی زیادہ جوان ہے۔" رحیم داد نے اسے چھیڑا۔

"پر اپنی زمیں دارنی ہے بہت سندر۔"

"ویسے تو بھی کم سوہنی نہیں۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "حمرے کا نصیب تگڑا ہے' اسے تیری ایسی چنگی گھر والی ملی۔"

"پر وہ میری کب پروا کرتا ہے۔" تاراں نے گلہ کیا۔ "وہ تو جی پنڈ کی ایک مٹیار کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ اس کا نام شدو ہے۔ ویسے اس نے اور بھی کیسوں سے یاری لگا رکھی ہے۔ زبردست ٹھرکی ہے۔" اس کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔ "میں نے کتنی بار اسے منع کیا' منت ساجت کی' جھگڑا بھی کیا' پر اسے تو جب موقع ملتا ہے' شدو کے گھر کی طرف نکل جاتا ہے۔ ایک بار تو اس کے سامنے ہی میں نے حمرے سے جھگڑا کیا پر وہ باز نہیں آتا۔ اب بکھار میں پڑا ہائے ہائے کر رہا ہے۔ مجھ پر حکم چلاتا ہے۔ سر دبا دے' دودھ گرم کر کے پلا دے۔ یہ کر دے' وہ کر دے۔" اس کی زبان کترنی کی طرح چل رہی تھی۔ "اب تیرے پاس بھیجا ہے' روٹی کھلا دوں۔"

تاراں سے باتیں کر کے رحیم داد کو قدرے سکون ملا۔ اس کا ذہنی کرب دب گیا۔ رحیم داد نے ذہنی خلفشار سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کی جوانی نے انگڑائی لی۔ موسم بھی فتنہ انگیز تھا۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ رات اندھیری اور سنسان تھی اور تاراں اس کے قریب کھڑی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اسے کسی لمحے قرار نہ تھا۔

رحیم داد تیکھی نظروں سے اسے ٹٹولنے لگا۔ اب اسے اللہ وسایا کا ڈر بھی نہیں تھا۔ اب وہی گاؤں کا زمیں دار تھا۔ زمیں داری کا ٹھاٹ باٹ اور دبدبہ وہ احسان شاہ کی حویلی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور یہ بھی جان چکا تھا کہ زمین کے ساتھ ساتھ مزارعوں اور کمیوں کی نوجوان بیویاں اور بیٹیاں بھی بڑے زمیں داروں کی ملکیت ہوتی ہیں۔ زمیں دار جب چاہے اور جسے چاہے اٹھوا لے' اپنی حویلی میں ڈال لے۔ جب تک جی چاہے' داشتہ یا رکھیل بنا کر اپنے پاس رکھے اور جب جی چاہے' کسی دوسرے زمیں دار کے ہاتھ فروخت کر دے' قیمت لے کر یا بلا قیمت واپس کر دے۔ مزارع اور کمی نہ اس کے خلاف احتجاج کر سکتا ہے' نہ قانون اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

رحیم داد نے تاراں کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ مسکرا کر گویا ہوا۔ "لے' اب برکھا شروع ہو گئی۔ کہاں بھیگتی ہوئی جائے گی۔ تو بھی بیمار پڑ جائے گی۔ یہیں ٹھہر جا۔ سویرے چلی جانا۔"

تاراں اس کی بھوکی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے شرما کر اوڑھنی کے پلو سے اپنا سر ڈھکا اور آہستہ سے بولی۔ "نہیں جی' میں نوں جانا ہے۔ حمرا بکھار میں بھن رہا ہے۔ نہ گئی تو بہت ناراض ہو گا۔"

"چلی جانا' ایسی جلدی کیا ہے۔" رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "حمرے سے تو کیوں ڈرتی ہے؟ وہ تیرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

"ایسی گل نہیں۔" وہ آنکھیں نچا کر بولی۔ "ناراض ہوتا ہے تو مارنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ تیں نوں پتہ نہیں' وہ کیسا زور آور ہے۔"

"زور آور!" رحیم داد حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ہنسا۔ "تو نے بھی حد کر دی۔ دیکھنے میں تو وہ ٹڈا لگتا ہے۔" رحیم داد نے مڑ کر صحن کی طرف دیکھا۔ بارش کسی قدر تیز ہو گئی تھی۔ ہوا کے بپھرے ہوئے جھونکوں کے ساتھ مینہ کی ہلکی ہلکی پھوار برآمدے میں آ رہی تھی۔ تاراں قریب کھڑی تھی' اتنے قریب کہ اس کے بوسیدہ لباس سے اٹھتی ہوئی پسینے کی تیز بو اس کے نتھنوں میں داخل ہو رہی تھی۔ رحیم داد نے تاراں کو نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ "نہا دھو کر کپڑے تو اجلے پہنا کر۔"

"حمرا مجھے کپڑے لتے لا کر دیتا ہی کب ہے۔" اس نے منہ بگاڑ کر شکوہ کیا۔ "اسے میری ذرا پروا نہیں۔"

رحیم داد نے بے تکلفی سے مسکرا کر کہا۔ "تو بھی اس کی پروا کرنا چھوڑ دے۔ میں تیرے لیے اتنے ڈھیر سے کپڑے لتے بنوا دوں گا' روز نئے نئے پہننا۔ فکر نہ کر' حمرا تجھ پر اب ناراض نہیں ہو گا۔" اس نے لہجے میں دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "میں نوں بھی دیکھنا ہے' وہ کیسے ناراض ہوتا ہے۔ میں اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔" رحیم داد نے گردن اونچی کی' مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور تاراں کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔

وہ خاموش رہی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے حویلی میں کھلنے والے دروازے کی جانب دیکھا۔ دبی زبان سے کہا۔ "حمرا میرا انتظار کرتا ہو گا۔ وہ ابھی سویا نہیں۔" وہ آگے بڑھی۔

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "کہاں چلی؟" اس نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "میں نوں اب جانے دے۔ حمرا سو جائے گا تو تیرے پاس آ جاؤں گی۔" وہ تیز قدموں سے صحن میں پہنچی اور بارش سے بچتی بچاتی حویلی کی سمت بڑھی' ذرا دیر بعد اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا اور مڑ مڑ کر بے چین نگاہوں سے وہ دروازہ تکنے لگا' جس سے گزر کر تاراں نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔ رم جھم ہوتی رہی۔ رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتی رہی مگر تاراں نہیں آئی۔ رحیم داد انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ رحیم داد کی آنکھ آہٹ سے کھل گئی۔ مہمان خانے کے

بیرونی دروازے پر آہستہ آہستہ آہٹ ہو رہی تھی۔ بارش اب تھم گئی تھی۔ رحیم داد خاموش رہا اور چوکنا نظروں سے دروازہ تکتا رہا۔ دروازے پر کوئی رک رک کر ہولے ہولے دستک دے رہا تھا۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ زور سے کھنکارا' پلنگ سے نیچے اترا۔ آگے بڑھا۔ صحن کا فرش بارش سے تر بتر تھا۔ ہر طرف پانی تھا' کیچڑ تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا دروازے تک پہنچا اور چند لمحے حیران و پریشان کھڑا رہا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولی اور ایک پٹ آہستہ سے کھینچا۔ اندھیرے میں کوئی سائے کی مانند کھڑا تھا۔ اس نے فوراً سرگوشی کی۔

"چوہدری! میں دارا ہوں۔"

رحیم داد نے اسے پہچان لیا۔ دھیمے لہجے میں بولا۔ "اندر آجا۔"

دارا اندر آگیا۔ رحیم داد نے جھٹ زنجیر چڑھا دی۔ برآمدے کی سمت ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر چل۔" دارا برآمدے کی طرف چلا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ حویلی کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا' دروازے کی کنڈی لگائی اور واپس برآمدے میں آیا۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ خاموش کھڑا تھا۔ اس کے پیر کیچڑ میں لت پت تھے۔ لباس بھی بھیگا ہوا تھا۔ رحیم داد بستر پر پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"اللہ وسایا کا کیا بنا؟"

"اسے تو تیرے جاتے ہی ختم کر دیا گیا تھا۔" دارا نے بتایا۔

رحیم داد لرز کر رہ گیا۔ اس کے ذہن میں غبار منڈلانے لگا۔ سینے سے دھواں اٹھا۔ وہ خاموش بیٹھا خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"اسے کس نے ختم کیا؟"

"میں نے کیا۔" دارا نے سینے پر ہاتھ مارا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے سرخی جھلک رہی تھی۔ چہرے پر وحشت طاری تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"چوہدری! پانی پلا دے۔ میں نوں تو جیسے بھڑکی لگ گئی۔ رستے بھر نہر سے پانی پیتا رہا۔ پر پیاس نہیں بجھی۔"

رحیم داد نے کمرے کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اندر چلا جا۔ میز پر جگ میں پانی بھرا ہے۔ گلاس بھی پاس رکھا ہے۔ جتنا جی چاہے' پی لے۔"

دارا کمرے میں چلا گیا۔ وہ پانی پی کر آیا تو کسی قدر پرسکون نظر آ رہا تھا۔ وہ رحیم داد کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ "گولی چلائی تھی یا کلہاڑی سے کتل کیا تھا؟"

"ایک نہیں' دو گولیاں چلائی تھیں۔" دارا نے بتایا۔ "دونوں ٹھیک نشانے پر بیٹھیں۔ پہلی سینے میں لگی' دوسری سر میں۔ تیں نوں پتہ ہے' میں بھی زمیندار رہ چکا ہوں۔ بہت شکار کھیلا ہے۔ نشانہ بہت سچا ہے۔ پہلی گولی کھا کر' وہ زور سے تڑپا پر دوسری پر نہ سنبھل سکا۔ اس نے دم توڑ دیا' منٹ میں سارا کھیل ختم ہو گیا۔"

"دینے نے گولی نہیں چلائی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"نہیں جی۔ جب اللہ وسایا نے نکل بھاگنے کی کوشش کی تو اس پر دینے نے ہی گنڈاسا چلایا تھا' سر پر لگا تھا۔ اس چوٹ کے ساتھ ہی وہ گر پڑا۔ تو اس وکھت تو موجود ہی تھا۔"

"دینے نے گولی نہیں چلائی' یہ تو اچنبھے کی گل ہے۔"

"شاہ جی سے پوچھ لے۔ وہ تو موجود ہی تھا۔" دارا نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "دونوں بار گولی میں نے ہی چلائی تھی۔"

"شاہ جی وہاں کب پہنچا تھا؟"

"لگتا ہے تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔" دارا نے تفصیل بیان کی۔ "ہوا یہ کہ سورج ڈوبتے ہی دینا' میں اور دوسرے بندے بیلے میں پہنچ گئے۔ ساری سکیم تو پہلے ہی سے تیار تھی۔ دو بندے نہر کی پلی سے کچھ آگے لگا دیے گئے تھے۔ انھوں نے جیسے ہی تم دونوں کی گھوڑیاں دوڑنے کی آواز سنی' فوراً بھاگتے ہوئے آئے اور اطلاع دی۔ اطلاع ملتے ہی سب گھات لگا کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ شاہ جی بھی اسی وکت پہنچا تھا۔ ویسے اس کا ادھر آنے کا بالکل پروگرام نہیں تھا۔ دینے نے یہی بتایا تھا۔ جانے وہ کیوں آگیا؟ اسی نے سب کی ڈیوٹی لگائی۔" دارا نے رحیم داد کا پریشان چہرہ غور سے دیکھا۔ "شاہ جی تو جی' ایک نمبر خرانٹ لگتا ہے۔ سارا کام اس طرح کرایا کہ ذرا بھی گڑبڑ نہیں ہوئی۔"

"پر یہ سارا کام ہوا کیسے؟" رحیم داد نے مزید تفصیل معلوم کرنے کی غرض سے استفسار کیا۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ باخبر رکھنا چاہتا تھا۔ "میں جب وہاں سے چلا تھا' اللہ وسایا چوٹ کھا کر زمین پر پڑا تھا۔"

"تیرے جانے کے بعد وہی رسی کام میں لائی گئی جسے رستے میں تان کر اس کی گھوڑی کو گرایا گیا تھا۔" دارا نے بتایا۔ "وہ ایسے ہوا جی' اللہ وسایا کو زمین سے اٹھایا گیا اور ایک درخت کے ساتھ رسی سے باندھ دیا گیا۔ شاہ جی نے بندوک مجھے دے دی۔ اس نے رسی سے بندھے ہوئے اللہ وسایا پر ٹارچ سے روشنی ڈالی۔ میں نے دیکھا اس کے کپڑے لتے کیچڑ سے گندے ہو گئے تھے۔ پگ ایک طرف پڑی تھی۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ سر کے بال بکھر کر منہ پر پھیل گئے تھے۔ ان

میں بھی کیچڑ اور مٹی لگی ہوئی تھی۔" اس نے لمبی سانس بھری۔ "اللہ وسایا نے گردن اٹھا کر مج
دیکھا۔ اس کا منہ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔" دارا کے چہرے پر دکھ کا
ہلکا غبار پھیل گیا۔

"سچی گل ایسہ ہے جی' مجھے اس پر اتنا ترس آیا کہ میں بندوق تان کر نشانہ باندھے کھڑا رہا۔ م
سے گولی نہیں چلائی گئی۔ تب شاہ جی نے ناراض ہو کر زور سے ڈانٹا "گولی چلا۔ اس کی ڈانٹ
ساتھ ہی میں نے گولی چلا دی۔ دوسری بھی اس کے کہنے پر چلائی۔"

"اللہ وسایا کی لاش کا کیا بنا؟"

"وہ دینے نے ٹھکانے لگا دی ہوگی۔ جیسا شاہ جی نے کہا ہوگا' اس نے ویسا ہی کیا ہوگا۔" دار
نے جواب دیا۔ "گولی مارنے کے بعد شاہ جی نے مجھ سے کہا' تیرا کام ختم ہو گیا۔ اب تو نس جا۔ می
فوراً ادھر آنے کے لیے بیلے سے باہر آ گیا۔ آگے کیا ہوا' میں نوں کچھ پتہ نہیں۔"

"اللہ وسایا کی گھوڑی کہاں گئی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"میں نے تو سنا ہے جی! شاہ جی زبردست رسہ گیر ہے۔ اللہ وسایا کی گھوڑی کو چھپانے کے ل
اس نے اپنے بندوں کے ذریعے فوراً ادھر میں پہنچا دیا ہوگا۔" وہ بے ڈھنگے پن سے مسکرایا۔ "وہ ا
زبردست گھوڑی کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ میرا تو جی ایسا ہی خیال ہے۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔" رحیم داد نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ "پر تو یہاں اتنی دی
میں کیسے پہنچا؟ اب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"تیں نوں تو سب کچھ پتہ ہی ہے۔ میں نے تیرا کام ٹھیک ٹھاک طرح سے کر دیا۔ شاہ جی تجھے خو
بتا دے گا۔ اب اپنا وعدہ پورا کر۔ مجھے ہزار روپے دے دے۔ میں کامل کے پاس جاؤں۔ کئی رو
ہو گئے چک ۴۸ سے آئے ہوئے۔ کامل پریشان ہوگا۔ میں نوں اس کے پاس اب پہنچ جانا
چاہیے۔"

"میں نے جو وعدہ کیا ہے' پورا کر دوں گا۔ ویسے سچی گل پوچھ تو مجھے شاہ جی سے ملنے کے بعد ہی
تجھے روپیہ دینا چاہیے۔ ایسے معاملوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

دارا بے چین ہو کر بیچ میں بول اٹھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا' تیں نوں میری بات کا اعتبار
نہیں۔"

"تو نے پوری گل بات ہی نہیں سنی۔ میں نے کب کہا' مجھے تجھ پر اعتبار نہیں۔ میں تجھے ابھی
اور اسی وکت ہزار روپے دے دوں گا۔" رحیم داد نے کہا۔ دارا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ لیے بھ

بیلے اس کے چہرہ پر جو کدورت نظر آ رہی تھی' مٹ گئی۔ "تو مجھے یہ بتا' ادھر سے نکل کر بحرین جانے
کے لیے تو کراچی جائے گا کیسے؟ یہ سمجھ لے' پولیس تیری تاک میں ہے۔ جو کچھ کرنا ہے' بہت ہی
سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔" رحیم داد نے اسے خبردار کیا۔ "اب تو پہلے سے زیادہ سنگین جرم کر چکا
ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے چوہدری!" دارا کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ شاید اسے پہلی بار اپنے
جرم کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس نے رحیم داد کو بتایا۔ "اپنا تو جی یہ ارادہ تھا کامل کے ساتھ اونٹوں
پر بیٹھ کر بھاول پور کی طرف نکل جاؤں۔ ریاستی بولی اچھی طرح بول سکتا ہوں۔ برسوں بولتا رہا
ہوں۔ کپڑے لتے بھی بھاول پوری پہن لوں گا۔ کسی کو ذرا شبہ نہ ہوگا۔ ریاست میں پہنچ کر کسی
چھوٹے سٹیشن سے کراچی کی گڈی پکڑ لوں گا۔" اس نے رحیم داد کی جانب سوالیہ نظروں سے
دیکھا۔ "یہ ٹھیک نہ ہو تو جیسا تو بتا' ویسے کروں؟"

"پروگرام تو تیرا ٹھیک ہی لگتا ہے۔" رحیم داد نے اختلاف نہیں کیا۔ "یہ بتا کامل تیری اتنی مدد
کرنے کو تیار ہو جائے گا؟"

"وہ تو جی پہلے ہی سے تیار ہے بلکہ ساری سکیم ہی میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کر تیار کی ہے۔"
دارا نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ "چوہدری! وہ میرا بہت گہرا یار ہے۔ سچ پوچھ' میں نوں تو صرف
روپے کا بندوبست کرنا تھا۔ اسی کی فکر تھی۔ ورنہ پروگرام تو بہت دنوں سے بنا رکھا تھا۔ روپیہ پاس
ہو تو کیا نہیں ہو سکتا۔ کوئی مصیبت بھی پڑ جائے تو کچھ دے دلا کر جان چھڑائی جا سکتی ہے۔"

رحیم داد اس کی باتوں سے خاصا مطمئن ہو گیا۔ وہ اٹھا' کمرے میں گیا۔ لیمپ کی لو اونچی کی۔ اسے
ہاتھ میں سنبھالے کوٹھری کے دروازے پر پہنچا۔ اس پر تالا لگا تھا۔ رحیم داد نے کنجی سے تالا کھولا۔
لیمپ اٹھائے کوٹھری میں گیا۔ دروازہ اندر سے بند کیا۔ ٹرنک کھولا۔ ہزار روپے کے نوٹ نکال کر
گنے۔ انھیں دھوتی کے ڈب میں رکھا' باہر آ کر کوٹھری کے دروازے میں پھر تالا ڈالا۔

وہ برآمدے میں واپس پہنچا۔ دارا بے چین بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے ڈب سے ہزار روپے نکال کر
بڑھائے۔ نوٹ لیتے ہوئے دارا کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے نوٹ گنے
اور نہایت احتیاط سے اپنی دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔

رحیم داد نے کہا۔ "تو ابھی چک ۵۸ جائے گا نا؟"

"ہاں جی ابھی چلا جاؤں تو ٹھیک رہے گا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "میرا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ ویسے
میرا چک یہاں سے بہت زیادہ دور بھی نہیں۔ فکر نہ کر۔ میں آرام کے ساتھ سویرا ہونے سے پہلے

وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"اب تیرا چک ۴۸ میں زیادہ ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "ہوسکے تو کل اندھیرا ہوتے ہی نکل جانا اور راتوں رات ریاست کی سرحد میں داخل ہوجانا۔"

"بالکل ایسا ہی کروں گا جی۔ روپیہ پاس ہوتا تو میں پہلے ہی نکل جاتا۔"

رحیم داد بھی کھڑا ہوگیا۔ وہ آگے بڑھا۔ دارا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں نے صحن عبور کیا دروازے پر پہنچے۔ رحیم داد نے دروازہ کھولا۔ دارا نے جھک کر رحیم داد کے گھٹنے کو ہاتھ لگایا اور چپ چاپ باہر چلا گیا۔

رحیم داد نے دروازے کی کنڈی ایک بار پھر چڑھا دی۔ آگے بڑھا' حویلی میں کھلنے والے دروازے پر پہنچا اور اس کی کنڈی کھول دی۔ برآمدے میں واپس پہنچ کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔

☆

یہ ایک گرم صبح تھی۔ زرد زرد چمکیلی دھوپ دیواروں سے نیچے اتر رہی تھی۔ فضا میں حبس تھا۔ رحیم داد نہا دھو کر اجلا لباس پہن چکا تھا۔

تاراں ناشتا لے کر آئی تو رحیم داد کرسی پر بیٹھا تھا۔ تاراں نے جھک کر ناشتا میز پر لگا دیا۔

رحیم داد نے کوئی بات نہیں کی' نہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ خاموشی سے ناشتا کرنے لگا۔ تاراں اس کے سامنے خاموش کھڑی رہی۔ ذرا دیر بعد اس نے خود ہی خاموشی توڑی' معذرت کے انداز میں بولی۔ "معاف کرنا جی! رات حمے نے آنے ہی نہیں دیا۔ اسے بہت زور کا بخار ہے۔ رات بھر نہیں سویا۔ ہائے ہائے کرتا رہا۔"

رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر پوچھا۔ "اب کیسی ہے اس کی طبیعت؟"

"اب تو جی ٹھیک ہی لگتی ہے۔ کہتا تھا' زمیں دارنی سے دوائی لے کر کھاؤں گا۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "زمیں دارنی اب کیسی ہے؟"

"میں سویرے سویرے اس کے پاس گئی تھی۔" تاراں نے بتایا۔ "اب تو وہ بالکل چنگی لگتی ہے پر بخار سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ ویسے وہ پریشان بھی ہے۔ زمیں دار شام کا گیا' اب تک نہیں لوٹا۔"

"آتا ہی ہوگا۔" رحیم داد نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ "رات بھر بارش ہوتی رہی' آتا کیسے۔ پڑوس کے کسی زمیں دار کے پاس ٹھیر گیا ہوگا۔"

"پر اب تو سویرا ہوئے بہت دیر ہوگئی' اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔ زمیں دارنی تو اداس

بیٹھی ہے۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ ناشتے سے فارغ ہوکر کھڑا ہوگیا۔ تاراں نے برتن اٹھائے اور کمرے سے چلی گئی۔ رحیم داد کھڑکی کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا۔ باغ میں گھاس اور پودوں پر بارش کی بوندیں جھلملا رہی تھیں۔ ایک کیاری کے پاس بوڑھا مالی سر جھکائے کھرپی سے جنگلی بوٹیاں اور گھاس پھوس کھود کھود کر نکال رہا تھا۔ آسمان پر بکھرے ہوئے بادلوں کے سفید گالے تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ ان کے پیچھے گہرا نیلا آسمان کہیں کہیں سے جھانک رہا تھا۔ بادل کا ٹکڑا گزرا تو سورج بھی چمکتا نظر آیا۔ بھیگے ہوئے درختوں پر دھوپ پھیل گئی۔ دھوپ کی تیزی اور چمک دمک دیکھ کر رحیم داد نے اندازہ لگایا کہ پہر دن گزر چکا ہے۔ وہ پریشان ہوگیا۔ اسے اللہ وسایا یاد آگیا۔ وہ سوچنے لگا' احسان شاہ نے اللہ وسایا کی لاش نہ معلوم کس طرح ٹھکانے لگائی۔

اس کے چہرے پر پریشانی بکھر گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مہمان خانے میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ تاراں بھی دوبارہ نہیں آئی۔ وہ خوف اور تشویش میں جلا چپ بیٹھا تھا۔ اسی اثنا میں حویلی کے اندر سے رونے اور بین کرنے کی آوازیں ابھریں اور رفتہ رفتہ اونچی ہوتی گئیں۔

رحیم داد فوراً تاڑ گیا کہ اللہ وسایا کی ہلاکت کی خبر حویلی میں پہنچ گئی ہے۔

رحیم داد کی پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اسی وقت تاراں صحن میں داخل ہوئی اور سینے پر دوہتڑ مار کر زور سے چیخی۔ "ہائے ربا میں مرگئی۔ زمیں دار کو قتل کردیا گیا۔"

رحیم داد تیزی سے آگے بڑھا۔ قریب پہنچا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تیں نوں کیسے پتہ چلا' زمیں دار کو قتل کردیا گیا؟"

"اس کی لاش نہر میں پڑی ہوئی ملی ہے۔" وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ "پڑوس کے چک کے دو مزارعوں نے لاش پہچان لی۔ وہی ادھر آئے تھے۔ بتاتے تھے' زمیں دار کو قتل کردیا گیا۔"

رحیم داد گھبرایا ہوا حویلی کی جانب بڑھا۔ تاراں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں دروازے سے گزر کر حویلی کے اندر پہنچے۔ وہاں ہر طرف کہرام برپا تھا۔ رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر جمیلہ کو تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ البتہ اس کے دونوں معصوم بچے طویل دالان کے ایک گوشے میں چپ کھڑے تھے۔ وہ حیرت سے ایک ایک کا منہ تک رہے تھے۔ رحیم داد کی ان پر نظر پڑی تو تڑپ اٹھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب گیا۔ دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ نہ نینا نے کچھ کہا' نہ گڈو بولا۔ دونوں بچے گم صم رحیم داد کو منہ اٹھائے دیکھ رہے تھے۔

آگے بڑھا اور سر جھکا کر ان کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ حویلی کے ایک نوکر نے جھٹ چارپائی لا کر ڈال دی۔

رحیم داد بیٹھ گیا۔ بادلوں کے درمیان سے جھانکتا ہوا سورج اب بہت بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ رحیم داد سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ آیا وہ گھوڑی پر بیٹھ کر وہاں جائے جہاں لاش پڑی ہے یا حویلی کے باہر پرسے کے لیے آنے والوں کے درمیان بیٹھا رہے اور لاش آنے کا انتظار کرے؟ وہ اسی تذبذب میں افسردہ بیٹھا تھا کہ نہر کی جانب سے ایک نوجوان سائیکل دوڑاتا ہوا درختوں کی آڑ سے نکلا۔ رحیم داد نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ اللہ وسایا کا ملازم نام دار تھا۔ تمام نظریں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ اطلاع ملتے ہی سائیکل پر لاش دیکھنے چلا گیا تھا' اب واپسی ہوئی تھی۔

نام دار قریب آیا تو سب اس کے چاروں طرف حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف سے سوالات کی بوچھار شروع ہو گئی۔ رحیم داد نے اسے اپنے پاس بلایا۔

"نام دار کیا خبر لایا۔ پتہ چلا' لاش کس کی ہے؟"

اس نے منہ بسور کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لاش تو جی اپنے زمیں دار ہی کی ہے۔ زمیں دارنی بھی پہنچ گئی ہے۔ اس نے بھی لاش پہچان لی ہے۔"

یہ سنتے ہی امید کی ہلکی سی رمق بھی مٹ گئی۔ مجمع میں کہرام مچ گیا۔ کچھ لوگ تو اس قدر دل گرفتہ ہوئے کہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ سوگوار چہرے اور دھندلے پڑ گئے۔ ویران آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ آہوں اور سسکیوں سے فضا دھواں دھواں ہو گئی۔

آہ و زاری کا طوفان ذرا تھما تو رحیم داد نے نام دار سے دریافت کیا۔ "زمیں دارنی کب تک آئے گی؟"

"پتہ نہیں جی لگتا ہے' وہ تو دیر ہی سے لوٹے گی۔"

"پولیس بھی پہنچی کہ نہیں؟"

"کیوں نہیں پہنچی جی۔" نام دار نے مستعدی سے جواب دیا۔ "تھانے دار دو کانسٹیبلوں کے ساتھ سویرے سویرے پہنچ گیا تھا۔ اسی نے لاش نہر سے باہر نکلوائی۔ میں پہنچا تو لاش نہر کے پاس ریت پر چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ تھانے دار ان بندوں سے پوچھ تاچھ کر رہا تھا جنھوں نے سب سے پہلے لاش نہر کی پلی کے نیچے پڑی دیکھی تھی۔ وہ پاس کے پنڈ کے رہنے والے ہیں۔"

"تیں نوں پتہ ہے' لاش کب تک آئے گی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

دالان اور صحن میں گاؤں کی عورتیں اور حویلی کی خادمائیں اداس اور غم زدہ کھڑی تھیں۔ نو چاکر حیران و پریشان ادھر ادھر آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ ایک کونے میں احمد دیوار سے لگ لگائے' منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے نزدیک جا کر دریافت کیا۔

"احمدے! زمیں دارنی کدھر ہے؟"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ تو جی لاش دیکھنے نہر کی طرف گئی ہے۔"

"اسے گئے کتنی دیر ہو گئی؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "اکیلی ہی چلی گئی؟"

"وہ اکیلی کیسے جا سکتی ہے۔ اسے تو کئی روز سے بخار بھی ہے۔" احمد کی آنکھوں سے آنسو ب لگے۔ "وہ تانگے میں گئی ہے۔ نوکر بھی ساتھ گئے ہیں۔ اسے گئے ہوئے دیر ہو گئی۔ اب تو وہاں پہ بھی گئی ہوگی۔"

"لاش نہر میں کہاں پائی گئی؟"

"یہاں سے چھ سات میل ادھر حویلی روڈ پر ڈیرا میراں کے پاس ملی ہے۔" احمد نے مشرق کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "لاش نہر کی پلی کے ساتھ پڑی ہے۔"

رحیم داد خاموشی سے حویلی کے پھاٹک کی جانب بڑھا۔ احمد کی باتوں سے اسے یہ سراغ مل گیا تھا کہ احسان شاہ نے قتل کے بعد لاش راتوں رات اپنے علاقے سے میلوں دور نہر میں ڈلوادی۔ اس کا گاؤں' پیراں والہ تحصیل دیپالپور میں واقع تھا اور مغرب کی سمت تھا۔ لاش تحصیل دیپال پور کی حدود سے باہر تحصیل پاک پتن کی سرحد پر ڈلوائی تھی تاکہ پولیس کو مغالطے میں ڈال دیا جائے اور قتل کا مقدمہ درج کرنے کے معاملے میں دونوں تحصیلوں کے تھانوں میں تنازع پیدا ہو جائے اور ابتدائی مرحلے ہی میں تفتیش التوا میں پڑ جائے۔

رحیم داد حویلی سے نکل کر باہر گیا۔ پھاٹک کے سامنے میدان میں درختوں تلے گاؤں کے بہت سے بوڑھے اور جوان جمع تھے۔ جو اب تک نہیں پہنچ سکے تھے' وہ کھیتوں اور گھروں سے نکل نکل کر حویلی کی سمت آرہے تھے۔ مرد بھی تھے' عورتیں بھی تھیں۔ سب کے چہرے سوگوار اور آنکھیں ویران تھیں۔ کچھ زار و قطار رو رہے تھے' کچھ سر جھکائے غم سے نڈھال کھڑے تھے۔ عورتیں اونچی آواز سے بین کر رہی تھیں۔ رحیم داد کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوا کہ گاؤں کے سبھی رہنے والے اللہ وسایا سے پرستش کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ ان کی گریہ و زاری اور بے قراری یہی بتاتی تھی۔

رحیم داد کو دیکھ کر پھاٹک کے سامنے کھڑے ہوئے لوگوں نے اونچی آواز سے سلام کیا۔ رحیم دا

"میں کیا بتا سکتا ہوں جی!" نام دار نے سادگی سے کہا۔ "ابھی تو جی تھانے دار بیانات شہادات لکھ رہا ہے۔ بعد میں اپنی کارروائی ڈالے گا۔" اس نے رحیم داد کی جانب غور سے دیکھا۔ "تیں نوں پتہ ہی ہوگا۔ کارروائی ختم ہونے کے بعد تھانے دار لاش کو' وہ کیا کہتے ہیں جی!" وہ بولتے بولتے اٹکا۔ "یاد آیا' پوسٹ مارٹم کے لیے شہر لے جائے گا۔ زمیں دارنی کہتی تھی' وہ بھی لاش کے ساتھ شہر جائے گی اور اسے اپنے ساتھ ہی لے کر آئے گی۔" رحیم داد نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ نام دار آگے بڑھا اور تعزیت کے لیے آنے والوں کے ہجوم میں مل گیا۔

رحیم داد چارپائی پر خاموش بیٹھا تھا۔ کتنے ہی مزارعے اور کمی اس کی چارپائی کے اردگرد فرش پر بیٹھے تھے۔ سب اللہ وسایا کی موت پر رنج والم کا اظہار کر رہے تھے۔ سرگوشیوں میں قتل کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ رحیم داد نے نہ کسی کو ٹوکا' نہ کسی کے سامنے اپنی رائے ظاہر کی۔ وہ غم زدہ بھی تھا اور خوف زدہ بھی۔

آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ کبھی دھوپ نکل آتی' کبھی سایہ ہو جاتا۔ وقت گزرتا رہا۔ دوپہر ہوگئی' سہ پہر ہوگئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ نہ کوئی اپنے گھر گیا نہ کھیتوں پر۔ کسی نے بھی اللہ وسایا کے سوگ میں کچھ نہیں کھایا۔ پیاس لگتی تو وہ ایک درخت کے نیچے رکھے ہوئے مٹی کے بڑے مٹکے سے پیالے میں پانی نکال کر پی لیتے۔ رحیم داد بھی ان کے ساتھ بھوکا بیٹھا رہا۔ البتہ پانی بار بار پیتا رہا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے سرکاری اسپتال کی ایمبولنس گاؤں میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی ہلچل مچ گئی۔ ایمبولنس حویلی کے پھاٹک کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ دروازہ کھلا۔ جمیلہ ایک نوکر کے ہم راہ اتری۔ اس کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ بال بکھر کر پریشان ہوگئے تھے۔ پھول کی مانند شگفتہ چہرہ مرجھا کر مٹیالا پڑ گیا تھا۔ اللہ وسایا کی لاش اسٹریچر پر ڈال کر نیچے اتاری گئی۔ مرد بے قرار ہو کر لاش کی طرف بڑھے۔ عورتیں بھی حویلی سے باہر آگئیں۔ زبردست ماتم ہونے لگا۔ رحیم داد لرز کر رہ گیا۔

لاش اسٹریچر سے اٹھا کر اس چارپائی پر لٹا دی گئی جس پر کچھ دیر پہلے رحیم داد بیٹھا تھا۔ لاش پر اسپتال کی سفید چادر پڑی تھی' اسے جلد ہی ہٹا کر دوسری چادر ڈال دی گئی۔ ڈرائیور اور اسپتال کے دوسرے ملازمین نے' جو لاش کے ساتھ ہی آئے تھے' چادر اور اسٹریچر اٹھا کر ایمبولنس میں رکھا۔ اس میں دوبارہ سوار ہوئے۔ ایمبولنس کا انجن اسٹارٹ ہوا۔ ذرا دیر بعد ایمبولنس گاؤں کی حدود سے نکل گئی۔ لاش کچھ دیر پھاٹک کے سامنے میدان میں رکھی رہی' پھر حویلی کے اندر پہنچا دی گئی۔ جمیلہ پہلے ہی اندر جا چکی تھی۔

رحیم داد مزارعوں اور کمیوں کے درمیان باہر کھڑا رہا۔ لاش پہنچنے کی اطلاع ملتے ہی آس پاس کے گاؤں اور چکوں کے لوگ بھی پرسے کو پہنچنے لگے۔ مجمع بہت بڑھ گیا تھا۔ حویلی سے عورتوں کے بین کرنے اور زور زور سے رونے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ برسات کی ملگجی شام آہستہ آہستہ در و دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ دھندلکا پھیل کر تاریک ہو گیا۔ گاؤں کی مسجد سے اذان بلند ہوئی۔ رحیم داد دوسرے لوگوں کے ساتھ مسجد کی جانب روانہ ہوا۔

حویلی کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹین کی چھت کا طویل سائبان تھا۔ اس میں کبھی حویلی کے تانگے کھڑے ہوتے تھے۔ مگر فرقہ وارانہ فسادات کے دنوں میں جب تانگے بان دونوں تانگے لے کر چمپت ہوگئے تو سائبان عرصے تک اجاڑ پڑا رہا۔ پھر اللہ وسایا نے اسے صاف کرایا۔ وہ اکثر شام کو وہاں کچہری لگاتا اور چارپائی پر بیٹھ کر مزارعوں کے ساتھ بات چیت کرتا۔ زمین داری کے مسائل طے کرتا۔ اب اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ ایک پیٹرومیکس روشن کر کے سائبان کے نیچے اسٹول پر رکھ دیا گیا تھا۔

سائبان کے نیچے اور سامنے کے میدان میں دریاں اور چٹائیاں بچھا دی گئی تھیں۔ پرسے کے لیے آنے والے چٹائیوں اور دریوں پر بیٹھتے جا رہے تھے۔ سائبان کے قریب ہی ایک درخت کے نیچے گاؤں کا درزی چٹائی پر بیٹھا کفن تیار کر رہا تھا۔ رحیم داد نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے سیدھا سائبان کے نیچے پہنچا اور دیر تک پرسا دینے والوں کے درمیان دری پر بیٹھا رہا۔

رات اداس اور تاریک تھی۔ ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔ رحیم داد سائبان کے نیچے سے نکلا اور حویلی میں چلا گیا۔ دالان میں بھی پیٹرومیکس روشن تھا۔ اس کی تیز روشنی میں چارپائی پر اللہ وسایا کی میت رکھی تھی۔ اس پر چادر پڑی تھی۔ جمیلہ چارپائی کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ تڑپ کر زور سے چیخی۔ "چوہدری! میں لٹ گئی۔ ہائے ربا میں کیا کروں۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ چارپائی کی پٹی پر زور سے مارے۔ کلائیوں میں پڑی ہوئی شیشے کی چوڑیاں چھناکے سے ٹوٹ کر دور تک بکھر گئیں۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کے دونوں بچے قریب ہی بیٹھے تھے۔ ماں کی آہ وزاری دیکھ کر گڈو سہمی سہمی نظروں سے اس کا منہ تکنے لگا۔ نینا نے رونے کے لیے منہ بسورا۔ چارپائی کے اردگرد بیٹھی ہوئی عورتیں بھی اونچی آواز سے رونے لگیں۔

رحیم داد کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ وہ سر جھکائے جمیلہ کے قریب چپ کھڑا رہا اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرتا رہا۔ اس نے آنسو پونچھے اور جمیلہ کو تسلی دینے لگا۔ "زمیں دارنی! صبر کر۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔" اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ آنکھوں میں دوبارہ آنسو امڈ آئے۔ وہ مڑا اور جمیلہ

سے کچھ فاصلے پر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔

عورتیں مسلسل پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ جمیلہ نے ایک بار پھر بے قرار ہو کر چیخ ماری۔ "ہائے وے شیر جوانا۔" اس نے اپنا سر چارپائی کی پٹی پر رکھ دیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ یکایک گریہ وزاری کی دردناک آوازوں کے درمیان ایک اونچی آواز ابھری۔ یہ حویلی کی میراثن کی آواز تھی۔ اس نے جواں مرگ اللہ وسایا کی پٹی پر الاہنی شروع کی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی ساری آوازیں دھیمی پڑ گئیں۔ میراثن سوز کے انداز میں بین کرنے لگی۔

موت چھپیندی آئی بیٹھی پاواتل' ہائے وے شیر جوانا!!

کفن نہ دیندی ساہ' کرن نہ دیندی گل' ہائے وے شیر جوانا

الاہنی کے بول پر عورتیں سینے پر دوہتڑ مارتیں۔ اونچی آواز سے تڑپ کر کہتیں۔ "ہائے ہا' ہائے ہا۔"

لیکن جمیلہ پٹی پر اپنی پیشانی ٹکائے صرف سسکیاں بھر رہی تھی۔ میّت کے سرہانے عود ولوبان سلگ رہا تھا۔ اس کے بل کھاتے' لہراتے مرغولوں میں سارے سوگوار چہرے دھواں دھواں نظر آرہے تھے۔ فضا پر موت کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ میراثن درد بھری آواز میں نوحہ کر رہی تھی۔

پانی تتا کرایا شرطاں نال نہوایو!!

کفن منگوایو زری دا' لاڑے نو پوایو!

چونہ جنیاں رل چکیو' منزلو منزل پچایو!

جنگل آئی رات' اوس ہنیر کدی نہ مایو

ہائے وے شیر جوانا' ہائے وے شیر جوانا!

ساون کی کالی کلوٹی رات دم بخود تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کے جھونکے سوز کی لے میں گھل مل کر میراثن کے ساتھ بین کر رہے تھے۔

پانی گرم کرایا گیا

میت کو رواج کے مطابق غسل دیا گیا

زری کا کفن منگوایا گیا' دولھا کو پہنایا گیا

چار آدمیوں نے مل کر جنازے کو کندھا دیا

اسے آخری منزل تک پہنچایا گیا

آج اس کی زندگی کی شام ہے

جنگل کی رات ہے اور تاریکی نے ڈیرا ڈال رکھا ہے

اس اندھیری قبر میں کوئی نہ جائے

ہائے جواں مرگ شیر' ہائے جواں مرگ شیر!

میراثن دھیمے سر میں الاہنی کے بول الاپتی رہی' بین کرتی رہی۔ ہوا کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ جنازے کے پاس بیٹھی ہوئی عورتیں سینہ کوبی کرتی رہیں۔ بے قرار ہو کر ہائے ہا' ہائے ہا کی دل دوز صدائیں بلند کرتی رہیں۔ عود ولوبان کا دھواں لہراتا اور پھیلتا رہا' دکھ کا سایہ بن کر فضا میں منڈلاتا رہا۔ ساری آوازیں سو گئی تھیں۔ صرف ایک آواز جاگ رہی تھی۔ یہ الاہنی کے بولوں کی شکل میں موت کی آواز تھی۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رحیم داد خاموشی سے اٹھا اور حویلی سے باہر آ گیا۔ سائبان کے نیچے پہنچ کر اس نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے مشورہ کیا اور یہ طے کیا گیا کہ لاش اب زیادہ دیر رکھنا ٹھیک نہیں۔ اسے عشاء کے بعد دفنا دیا جائے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد رحیم داد نے مسجد کے ملّا کو بلایا اور اس کے ہم راہ دوبارہ حویلی میں گیا۔ جمیلہ ابھی تک چارپائی کی پٹی پر سر رکھے سسکیاں بھر رہی تھی۔ دو عورتوں نے اسے سنبھالا۔ ہولے سے کھینچ کر چارپائی کے قریب سے اٹھایا۔ چارپائی میت کے ساتھ اٹھا کر صحن کی پڑچھتی میں پہنچا دی گئی۔ ملا نے میّت کو غسل دیا۔ درزی نے کفن تیار کر دیا تھا۔ میّت کفنا کر اس پر سیاہ چادر ڈال دی گئی اور چارپائی پر رکھ کے آخری دیدار کے لیے ایک بار پھر اسے دالان میں رکھ دیا گیا۔ دالان میں ہر سو کافور کی تیز بو پھیل گئی۔

کچھ دیر بعد جنازہ حویلی سے باہر لے جایا گیا۔ جمیلہ چیخ چیخ کر روتی ہوئی پھاٹک تک گئی۔ کئی عورتیں اسے سنبھالے ہوئے تھیں۔ مردوں نے بڑھ کر جنازہ اٹھایا۔ ایک بار پھر زبردست کہرام مچ گیا۔ رونے کی آوازیں رات کے سناٹے میں گونجنے لگیں۔ جنازہ مسجد کے دروازے تک پہنچایا گیا۔ نماز عشاء کے بعد نماز جنازہ ہوئی۔ جنازہ دوبارہ کندھوں پر اٹھایا گیا اور گاؤں کے قبرستان میں پہنچا دیا گیا۔ قبر پہلے ہی سے تیار تھی۔ میت قبر میں اتاری گئی۔ مٹی ڈال کر قبر بھر دی گئی۔ مسجد کے ملا نے فاتحہ خوانی کی۔ ہاتھ اٹھا کر اللہ وسایا کے لیے مغفرت کی دعا کی۔ سب لوگ واپس حویلی پہنچ گئے۔

کوڑا وتایا کڑوی روٹی مزارعے لائے تھے۔ اللہ وسایا یا جمیلہ کا کوئی ایسا رشتہ دار یا شریکا نہ تھا جو کوڑا وتا لاتا۔ مزارعے یہ جانتے بھی نہیں تھے۔ وہ اللہ وسایا کے غم میں بری طرح دل گرفتہ تھے۔

اس روز گاؤں کے کسی گھر میں کھانا نہیں پکا۔ کسی باورچی خانے سے دھواں نہ اٹھا۔ کھانے
فارغ ہو کر لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ البتہ گاؤں کی کئی عورتیں حویلی میں موجو
رہیں۔

رحیم داد نے بھی سب کی ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد وہ حویلی میں گیا۔ مہمان خا
پہنچا۔ احمد کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں تھی۔ مگر وہ بھی مہمان خانے میں تھا۔

☆

صبح رحیم داد نہا دھو کر بیٹھا ہی تھا کہ احمد نے آ کر اطلاع دی کہ تھانے دار ایک کانسٹیبل کے ہ
آ رہا ہے۔ رحیم داد کا چہرہ فق ہو گیا۔ احمد اطلاع دے کر چلا گیا۔ رحیم داد کی پریشانی اور گھبراہٹ
اس قدر بڑھی کہ اس نے گھوڑی پر سوار ہو کر احسان شاہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ مگر اس ڈ
سے نہیں گیا کہ گاؤں سے باہر جانے پر شک وشبہ پیدا نہ ہو۔ اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی
کوشش کی اور تھانے دار کا انتظار کرنے لگا۔

رحیم داد کی نظریں ہر آہٹ پر بیرونی دروازے کی جانب اٹھ جاتی تھیں۔

پہر دن گزر گیا۔ سورج چڑھ کر اوپر آ گیا۔ مگر تھانے دار مہمان خانے میں نہیں آیا' صرف احمد
آیا۔ رحیم داد نے پرسے کے لیے آنے والوں کے بارے میں ادھر ادھر کی بات کی پھر اٹکتے ہوئے
دریافت کیا۔

"پولیسے ابھی تک حویلی میں ہیں؟"

"وہ تو جی کب کے چلے گئے۔ انھوں نے صرف زمیں دارنی سے پوچھ تاچھ کی تھی۔"

"کیا پوچھتے تھے؟"

"پتہ نہیں۔" احمد نے جواب دیا۔ "زمیں دارنی ہی کو ملوم ہوگا' پر جی وہ کیا گل بات کر سکتی ہے۔
اس سے تو بولا بھی نہیں جاتا۔ چپ بیٹھی رہتی ہے یا رونے لگتی ہے۔ اس کا تو جی بہت برا حال
ہے۔ کئی بار تو بے ہوش ہو چکی ہے۔"

رحیم داد مہمان خانے سے نکلا' سائبان کے نیچے پہنچا۔ وہاں سویرے سویرے پھوہڑی بچھا دی گئی
تھی۔ پرسے کے لیے آنے والے اس پر بیٹھے تھے۔ رحیم داد بھی دیوار سے ٹیک لگا کر پھوہڑی پر بیٹھ
گیا۔

مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں۔ عورتیں حویلی کے اندر چلی جاتیں۔ دالان میں بھی پھوہڑی
بچھی تھی۔ یہ دریوں کا فرش تھا' جن پر چھپی ہوئی چادریں پڑی تھیں۔ جمیلہ دالان کے ایک ستون

کے سہارے پھوہڑی پر نڈھال بیٹھی تھی۔ ہر ایسی عورت جو پہلی بار پاس پڑوس کے کسی گاؤں سے
آتی یا اللہ وسایا کے کنبے برادری سے اس کا کوئی رشتہ ناتا ہوتا' وہ جمیلہ کے گلے سے لگ کر زور زور
سے روتی۔ جمیلہ کے گرد نیم دائرے میں بیٹھی دوسری عورتیں بھی رونے لگتیں۔ سینے پر دو ہتڑ
مارتیں اور ہائے ہا! کے نعرے بلند کرتیں۔

حویلی کے اندر سے عورتوں کی آہ وزاری سن کر باہر پھوہڑی پر بیٹھے ہوئے مرد اونچی آواز سے
کلمہ پڑھتے۔ دوپہر کو تعزیت کرنے والوں کی تعداد گھٹ کر بہت کم رہ گئی۔ وہ کھانا کھانے یا اپنے
ضروری کام کاج کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔ مگر شام ہوتے ہوتے تعزیت کرنے والوں کی تعداد
میں پھر اضافہ ہو گیا۔ اندھیرا بڑھا تو پیٹرومیکس روشن کر دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد تاراں خوان پوش
سے ڈھکا ہوا تھال سر پر رکھے حویلی سے نکلی اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی مسجد کی طرف
روانہ ہو گئی۔ وہ ملّا کے لیے فاتحہ کا توشہ لے کر جا رہی تھی۔ یہ ج کڑ کا تھا۔

تیسرے روز تیجا تھا۔ اس روز بھی گاؤں کے سارے مرد اور عورتیں حویلی پہنچے۔ مسجد کے ملّا نے
فاتحہ خوانی کی۔ سب نے کھانا کھایا۔ کھانے کے ساتھ گیہوں کی ٹکنکیاں بھی تھیں۔ رحیم داد ڈرا
سہا ہوا تھا۔ اس کی نظریں بار بار اس راستے کی طرف اٹھ جاتیں جو نہر کی سمت جاتا تھا۔ اسے
پولیس کے آنے کا دھڑکا تھا۔ وہ رات گئے تک پریشان رہا مگر کوئی پولیس والا نہیں آیا۔

تیجے کے چند روز بعد ایک پولیس انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہم راہ آیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ رحیم داد
مہمان خانے میں کھانا کھا رہا تھا۔ اسے احمد سے پولیس کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ ایک بار پھر
سراسیمہ ہو گیا۔ اس کے لیے کھانا دوبھر ہو گیا۔ لیکن اس روز بھی کوئی پولیس والا اس کے پاس نہیں
آیا۔ مگر جب تک انسپکٹر اور کانسٹیبل حویلی میں موجود رہے' اس پر خوف طاری رہا۔ بعد میں اسے
احمد کی زبانی معلوم ہوا کہ پولیس نے جمیلہ کا بیان لیا' حویلی کے بعض نوکروں سے پوچھ گچھ کی۔ دن
ڈھلے پولیس والے ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے چلے گئے۔

دن گزرتے رہے۔ سات روز تک مسجد میں ہر شام ملّا کے لیے ج کڑ کا بھیجا گیا۔ خیرات دی گئی۔
فاتحہ خوانی ہوئی۔ پرسے کے لیے اکٹھا ہونے والوں نے بھی فاتحہ کے بعد کھانا کھایا۔

تیرہ روز تک حویلی کے اندر اور باہر پھوہڑی بچھی رہی۔ صبح سے شام تک پرسا دینے والے آتے
رہے۔ رحیم داد سائبان میں ان کے ساتھ بیٹھتا۔ بات چیت کرتا۔ اس تمام عرصے میں نہ اس نے
جمیلہ کو دیکھا' نہ اس سے ملاقات ہوئی۔ عورتیں ہر وقت حویلی میں جمیلہ کے گرد اکٹھا رہتیں۔
رات گئے تک اس کے ساتھ بیٹھی رہتیں۔ اس کی دل جوئی کرتیں' تسلی دیتیں۔

رحیم داد نہ حویلی میں گیا نہ اس نے جمیلہ سے ملنے کی کوشش کی۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ جمیلہ عدّت میں تھی۔ وہ حویلی کی چار دیواری سے باہر نہیں جا سکتی تھی نہ کسی نامحرم کے سامنے آسکتی تھی۔ مسجد کے ملّا نے یہی بتایا تھا۔ رحیم داد بھی نامحرم تھا لہٰذا وہ جمیلہ سے نہیں ملا۔ نہ احسان شاہ کی حویلی گیا اور نہ اس سے کوئی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔

تیرھویں روز شام کو پھوہڑی اٹھا دی گئی اور رسمی طور پر اللہ وسایا کا سوگ ختم کر دیا گیا۔ البتہ عورتوں کی حد تک تعزیت کرنے کا سلسلہ چلتا رہا۔ گاؤں کی عورتیں جمیلہ کی دل جوئی کے لیے آتی رہیں۔ جمیلہ بات بات پر رونے لگتی۔ اللہ وسایا کی موت سے جو رنج و غم مسلط ہوا تھا' وہ اس سے ہنوز نہیں سنبھلی تھی۔

رحیم داد پھوہڑی اٹھنے کے بعد مہمان خانے ہی میں رہتا۔ بارش نہ ہوتی تو شام کو باغ میں جا کر بیٹھ جاتا۔ ایک شام وہ تنہا بیٹھا تھا کہ جمیلہ نے اسے حویلی میں بلوایا۔ رحیم داد گیا۔ جمیلہ دالان کے ایک گوشے میں پیٹھ موڑے کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے پلو سے بکل مار کر اپنا پورا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ قریب ہی فرش پر پھاتاں بیٹھی تھی۔ رحیم داد دونوں سے ذرا ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جھٹ پٹے میں حویلی پر ویرانی برس رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔

کچھ دیر بعد جمیلہ کی آواز ابھری۔

"چودھری! میں نے تجھے اس لیے بلایا ہے' کل کبیر والا سے چودھری اکرم کا چچیرا اور بھرجائی آئے تھے۔ ویسے تو اللہ وسایا کے پرسے کو آئے تھے پر چلتے چلتے انھوں نے بتایا کہ اکرم نے اپنی دھی کا رشتہ تیرے ساتھ توڑ دیا۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں تو رانڈ ہو گئی چودھری' پر میرے رانڈ ہونے سے تیرا گھر کیوں نہ بس سکا؟ لگتا ہے' اللہ وسایا کی موت کو اکرم نے بدشگونی سمجھا اور رشتہ ختم کر دیا۔"

"زمیں دارنی! تیرے رانڈ ہونے سے میرے ویاہ کا کیا ناتا۔ تو خوا مخا اپنا دل میلا نہ کر۔ میرا تو پہلے بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تیں نوں پتہ ہی ہے' رشتہ جوڑنے والا تو اللہ وسایا ہی تھا۔ اس کے ساتھ ہی رشتہ بھی ختم ہو گیا۔ اب چودھری اکرم کچھ ہی کہے' سچ پوچھ تو میں خود اسے توڑنے والا تھا۔ ذرا سوچ' ابھی اللہ وسایا کو گزرے دو ہی ہفتے ہوئے ہیں۔ میں کیسے ویاہ شیاہ کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔" رحیم داد نے جمیلہ کی دل جوئی کرنے کی کوشش کی۔ "زمیں دارنی! میری فکر نہ کر۔ اللہ وسایا کے بعد مجھے کچھ چنگا نہیں لگتا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے چودھری!" جمیلہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "اللہ وسایا کے بنا ایسا لگتا ہے جیسے

حویلی اجڑ گئی' کچھ بھی نہ رہا۔ مجھ ابھاگن کو وہ اس حویلی میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔"

جمیلہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ پھاتاں نے جمیلہ کو روتے دیکھا تو خود بھی رونے لگی۔ چند لمحے فضا بے حد سوگوار رہی پھر پھاتاں نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے دل گرفتہ آواز میں کہا۔ "بھین جی! اس طرح کب تک روتی رہے گی۔ مجھے دیکھ' سات سال پہلے میرا گھر والا بھی ایسے ہی چھوڑ کر اپنے رب کے پاس چلا گیا۔ تاجاں تو ان دنوں ذرا سی چھوہری تھی۔"

"پھاتاں!" جمیلہ کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ "اب تاجاں حویلی میں نہیں رہ سکتی۔ تو اسے اپنے گھر لے جا' میں ٹھیری رانڈ۔ میرا تو اس پر سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ اب تو سہاگنیں مجھ سے دور بھاگیں گی۔ تاجاں تو ساہا بندھی کڑی ہے۔ مہینے دو مہینے بعد وہ بھی سہاگن بن جائے گی۔ اسے اب میرے ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔"

"بھین جی! تو کیسی گل کر رہی ہے۔" پھاتاں نے کہا۔ "تو رانڈ ہے تو میں کون سی سہاگن ہوں' میں بھی تو رانڈ ہوں۔ تاجاں اسی رانڈ کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ یہ تو سوچ' وہ تیرے پاس نہیں رہ سکتی تو میرے پاس کیسے رہے گی؟"

"تیری بات دوسری ہے۔ تو اس کی ماں ہے۔ یہ سوچ تیرے کنبے برادری والے کیا کہیں گے؟ رانڈ بیوہ کو تو بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔ ویسے میں تو چاہتی تھی تاجاں میرے ساتھ رہے اور یہیں سے ویاہ کرا کے اپنے گھر والے کے سنگ جائے پر کیا کیا جائے' رانڈ کو برا سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کی یہی ریت ہے۔"

پھاتاں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "بھین جی! میں نوں کسی کی پروا نہیں کرنی۔ سات سال سے ساری بدشگونیاں دیکھ رہی ہوں اور سن رہی ہوں۔ میرے لیے یہ نئی گل نہیں۔ تو کچھ ہی کہے' تاجاں یہیں رہے گی اور تیرے ہی نال رہے گی۔ اس کا ویاہ بھی تو کرے گی اور جب چاہے تب کرے گی۔"

"سوچ لے۔" جمیلہ آہستہ سے بولی۔ "کنبے برادری والوں کے طعنے سننے پڑیں گے۔"

"پہلے بھی بہت سن چکی ہوں اور سن لوں گی۔ میں نوں کنبے برادری سے کیہ لینا۔" پھاتاں اپنی بات پر اڑی رہی۔ "ویسے دوسروں کے منہ میں زبان ہے تو میں بھی گونگی نہیں۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ تاجاں حویلی سے جائے گی تو ویاہ کر کے ہی جائے گی' ایسے نہیں۔ اب وہ میری نہیں' تیری امانت ہے۔ میں نے تو اسے تیرے حوالے کر دیا۔ اب تو جانے اور تیری تاجاں جانے۔ ساہے کے بعد تو نے بھی

تو یہی گل کہی تھی۔ اپنی ہی گل اور اپنا ہی وعدہ بھول گئی۔"

رحیم داد آہستہ سے کھنکارا اور جمیلہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "زمیں دارنی! سنا ہے' پولیس تفتیش کو آئی تھی۔ تجھ سے پوچھ تاچھ بھی کی تھی۔ اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں بھی پولیس سے کچھ پتہ چلا؟"

"پولیس نے کیا بتانا۔ اس نے تو اب تک کچھ نہیں کیا۔" جمیلہ کے لہجے میں تلخی تھی۔ "پہلے وہ تھانے دار آیا جس نے رپورٹ درج کی تھی۔ تفتیشی ٹیم کے ساتھ جائے واردات کا معائنہ کیا تھا۔ نہر سے لاش نکلوائی تھی۔ مشیر نامہ تیار کیا تھا۔ ضروری لکھا پڑھی کی تھی اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے پولیس سرجن کے پاس بھجوائی تھی۔ وہ دیر تک مجھ سے الٹے سیدھے سوال کرتا رہا۔ اس کی باتوں سے تو ایسا لگتا تھا مانو اللہ وسایا کو میں نے ہی قتل کرایا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "تیں نوں کیسے پتہ چلا' اسے تجھ پر شبہ ہے؟"

"کہتا تھا' ہر قتل کے پیچھے کسی رن کا ہاتھ ہوتا ہے اور اگر مقتول کے گھر میں منویہ رن ہو' تب تو قتل کا سبب عام طور پر وہی ہوتی ہے۔" جمیلہ نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "اس کے بعد وہ مجھ سے ایسی گلاں کرنے لگا کہ میرا جی چاہا' اس کا منہ نوچ لوں۔ پر میں نے دھیرج سے کام لیا۔ رو کر صرف اتنا کہا' قتل کی وجہ پرانی دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔ زمیں داروں کے قتل تو عام طور پر پرانی دشمنی ہی کے کارن ہوتے ہیں۔ میں نے تو یہی سنا ہے۔ اخباروں میں پڑھا بھی ہے۔"

"یہ بات سن کر وہ کیا بولا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"پہلے تو اس نے کہا کہ اب تک کی کارروائی سے تو کوئی ایسا سراغ ملا نہیں۔ فیر اس نے پوچھا' مجھے کس کس پر شبہ ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا' اللہ وسایا کی صرف احسان شاہ سے دشمنی تھی۔ میں نے اسے دشمنی کی ساری وجہ بھی بتا دی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مجھ سے گل بات کرنے کے بعد اس نے حویلی کے نوکروں سے بھی پوچھ تاچھ کی۔ فیر دوبارہ آنے کا کہہ کر چلا گیا۔"

"وہ دوبارہ پوچھ تاچھ کرنے آیا تھا؟"

"وہ تو نہیں آیا۔ آنا بھی نہیں چاہیے تھا اسے۔ میں نے اپنے وکیل عثمان رندھاوا کو بلوایا۔ اسے ساری پتا سنائی۔ وہ فوراً تھانیدار سے ملا اور جب اسے بھی اندازہ ہو گیا کہ تھانیدار کیس دبا دینا چاہتا ہے تو اس نے اعلیٰ حکام کو درخواستیں بھیجیں۔ اس کی دوڑ بھاگ اور کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک نئے انسپکٹر کو تفتیش کے لیے لگایا گیا۔ اس نے نئے سرے سے تفتیش شروع کی۔"

جمیلہ آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ "وہ پچھلے دنوں میرے پاس آیا تھا پر اس نے پہلے تھانے دار کی طرح الٹے سیدھے سوال نہیں کیے۔ میرا بیان لکھا' مجھے تسلی دی کہ کاتلوں کو جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس نے بھی حویلی کے نوکروں سے پوچھ تاچھ کی۔ وہ تیرے بارے میں بھی پوچھتا تھا۔"

"میرے بارے میں؟" رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر کہا۔ "میرے بارے میں کیوں پوچھتا تھا؟"

"پولیس کے بندوں کو تو جانتا ہی ہے وہ ہر ایک پر شبہ کرتے ہیں۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "پر [illegible]ں نے جھٹ اس کا شبہ دور کر دیا۔ اسے صاف صاف کہہ دیا' چوہدری تو میرے بھائی سمان ہے۔ [illegible]س کے بارے میں تو کسی شک و شبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری باتوں سے وہ ایسا مطمئن ہوا [illegible]کہ تیرے پاس پوچھ تاچھ کے لیے بھی نہ گیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اس کے جانے کے بعد [illegible]ب تک کوئی تفتیش کو نہیں آیا۔"

"تیں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں ہو گا کہ دونوں تھانے داروں کی تفتیش کا کیا نتیجہ نکلا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"جب کوئی آیا ہی نہیں تو کیسے پتہ چلتا۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نے وکیل کو فیر بلوایا [illegible]ہے۔ وہ پتہ لگا کر بتائے گا' پولیس نے اب تک ضابطے کی کیا کارروائی کی ہے۔"

وکیل کے آنے کی اطلاع سے رحیم داد پریشان ہو گیا۔ مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ جمیلہ کی [illegible]خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے بولا۔ "لگتا ہے' پولیس کیس میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی [illegible]ور جب پولیس ہی دلچسپی نہ لے تو مجرموں کو کیسے پکڑا جا سکتا ہے۔ پر یہ تو بالکل طے ہے اللہ وسایا کو قتل کیا گیا ہے۔"

"یہ تو سبھی کو پتہ ہے۔ پولیس بھی مانتی ہے۔ تھانے دار کہتا تھا' پوسٹ مارٹم رپورٹ مل گئی ہے' [illegible]ں میں بتایا گیا ہے اللہ وسایا کو گولی مار کر قتل کیا گیا۔ ایک گولی اس کی چھاتی میں لگی' دوسری سر [illegible]ں۔ پر کس نے قتل کیا' کیوں کیا؟ اس کا اب تک کوئی سراغ نہیں ملا۔" جمیلہ نے گہری سانس [illegible]ی۔ "وہ جو بھی ہو اس نے مجھے برباد کر دیا۔ ہائے ربا یہ کیا ہو گیا۔" جمیلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے [illegible]ی۔ رحیم داد اسے تسلی دیتا رہا۔ صبر کی تلقین کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد رحیم داد حویلی سے اٹھ کر مہمان خانے میں آ گیا۔ احمد موجود نہیں تھا لیکن کمرے [illegible]لیمپ روشن تھا۔ رحیم داد مہمان خانے میں نہیں ٹھہرا۔ جمیلہ سے ملنے کے بعد وہ شدید ذہنی [illegible]سں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں وہ باغ میں پہنچا۔ وہاں گہرا سناٹا تھا۔ رحیم داد وہاں بھی نہیں

رکا۔ باغ سے نکل کر نہر کی سمت چلنے لگا۔ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ ماکھا اندھیرے سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے پوچھا۔

"ماکھے! تو اس طرح اندھیرے میں کیوں چھپا کھڑا ہے؟"

"میں تو شام سے تیرا انتظار کر رہا تھا۔" ماکھا گڑگڑا کر بولا۔ "کئی بار باغ کی طرف بھی گیا پر تو نظر نہیں آیا۔ تجھ سے ملے بناں واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔"

"مجھ سے ملنا کیوں ضروری تھا؟"

"نراض نہ ہو۔" ماکھا عاجزی سے بولا۔ "شاہ جی نے کہلوایا ہے' تو کل شام تک اسے ضرور مل لے۔ کوئی ضروری گل کرنی ہوگی۔"

"ابھی تو میں اس کے پاس نہیں جا سکتا۔" رحیم داد تذبذب میں پڑ گیا۔ "شاہ جی سے کہنا' موقع ملا تو آجاؤں گا۔"

"میں نے تو جی' جو بتانا تھا' بتا دیا۔ آگے تیری مرضی۔"

"اب تو ٹر جا۔" رحیم داد نے بیزاری سے کہا۔

ماکھا چپ چاپ چلا گیا مگر رحیم داد کے ذہن میں تلاطم برپا کر گیا۔ وہ احسان شاہ سے ملنا تو چاہتا تھا مگر کچھ عرصے بعد۔ فی الحال وہ اس سے ملنے جلنے میں پوری احتیاط سے کام لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے کانوں سے سن چکا تھا کہ جیلہ کو احسان شاہ پر شبہ ہے۔ وہ پولیس سے بھی اس کا برملا اظہار کر چکی تھی۔ گاؤں میں ہر طرف ابھی تک اللہ وسایا کے قتل کا چرچا تھا۔ ایسی صورت میں اس کا گاؤں سے باہر جانا خواہ مخواہ بدگمانی پیدا کر سکتا تھا۔ دوسری طرف اسے یہ خیال بھی رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا کہ احسان شاہ نے کوئی اہم اور ضروری ہی بات بتانے کے لیے اسے بلایا ہوگا' ورنہ وہ ماکھا کو اس کے پاس ہرگز نہ بھیجتا۔

رحیم داد کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے آگے جانے کا فیصلہ ملتوی کر دیا' مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا مہمان خانے میں پہنچ گیا۔ احمد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رحیم داد کے پہنچتے ہی وہ کھانا لے آیا اور میز پر چن کر خاموشی سے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

احمد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "چوہدری! کچھ پتہ چلا' زمیں دار کو کس نے قتل کیا؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں۔" رحیم داد بے نیازی سے بولا۔ "ابھی تو کوئی گرفتاری بھی نہیں ہوئی میں نے یہی سنا ہے۔"

"کاتل تو جی پکڑے جا بھی نہیں سکتے۔"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

احمد نے ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھا اور سرگوشی کرنے کے انداز میں آہستہ سے بولا۔

"میں نوں تو جی ایسا لگتا ہے۔ اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے کتل کرایا ہے۔ وہ تو جی کتل کر کے کب کے سرحد پار نکل گئے ہوں گے۔ اب انہیں کون پکڑ سکتا ہے۔"

رحیم داد نے چونک کر احمد کو دیکھا۔ دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "تجھے کیسے پتہ چلا اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے کتل کیا ہے؟"

"میں نے تو جی' یہ بات لوہار کے منڈے بابر سے سنی ہے اور اسے پٹواری کے چھوٹے بھائی نے بتائی تھی۔ وہ برابر کے پنڈ میں رہتا ہے۔ بابر سے اس کی پرانی یاری ہے۔" احمد دھیرے دھیرے بولتا رہا۔ "ویسے دیکھا جائے تو بات ٹھیک ہی لگتی ہے۔ زمیں دارنی کے بھائی اسے اپنے ساتھ سرحد پار لے جانے کے لیے سمگلروں کے ساتھ کئی بار آ چکے ہیں پر وہ نہیں گئی۔ انھوں نے سوچا ہوگا' اللہ وسایا کا نکا ہی ختم کر دو' تب تو وہ ان کے ساتھ چلی ہی جائے گی۔ اپنی سمجھ میں تو جی یہی آتا ہے۔"

"صرف بابر ایسی گل کرتا ہے یا پنڈ کے دوسرے بندے بھی ایسے ہی سوچتے ہیں؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"یہی گل تو ایہہ ہے جی' جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے' کوئی کچھ۔" احمد نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھائیں۔ "تیرا اپنا کیا وچار ہے چوہدری؟"

"تیری اور بابر کی گل سمجھ تو آتی ہے۔" رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "ایسا بالکل ہو سکتا ہے پر زمیں دارنی کو پتہ نہ چلے۔ وہ بہت نراض ہوگی۔ اپنے بھائیوں کے بارے میں وہ ایسی گل کیسے سن سکتی ہے۔"

"توبہ کرو جی! اسے تو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ ایک دم بھڑک جائے گی۔"

رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا۔ احمد برتن اٹھا کر جانے لگا۔ مگر جاتے جاتے ٹھٹکا اور الجھتے ہوئے بولا۔ "میں جی دیر سے لوٹوں گا۔"

"ویسے بھی رات کی روٹی کھلا کر تو کب چھیتی لوٹتا ہے۔ کبھی کبھی تو ساری رات نہیں آتا۔"

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تو نے شدو کے پاس جانا ہوگا؟"

"تاراں نے تجھے شکایت لگائی ہوگی۔" احمد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔ "وہ تو جی ایسے ہی الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی ہے۔"

"تو اسے ایسی باتیں سوچنے ہی کیوں دیتا ہے؟" رحیم داد نے کسی قدر سختی سے کہا۔ "وہ تیری گھر

والی ہے‘ تیرے بچوں کی ماں ہے۔ تجھے چاہیے کہ اسے خوش رکھے۔"

"میں تو جی اسے خوش رکھنے کی اپنے طور پر بہت کوشش کرتا ہوں‘ پر وہ تو بیکار کا جھگڑا کھڑا کر دیتی ہے۔"

رحیم داد نے تاراں کا ذکر جان بوجھ کر چھیڑا تھا۔ وہ اسے احمد کے ذریعے بلانا چاہتا تھا‘ مگر ہمت نہ پڑی۔ احمد چلا گیا۔

رحیم داد صحن میں پڑی ہوئی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ ہوا نرم اور خنک تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل بکھرے ہوئے تھے۔ بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ بیٹھ سکا‘ بے چین ہو کر اٹھا اور آہستہ آہستہ صحن میں ٹہلنے لگا۔ وہ ادھیڑبن میں مبتلا تھا۔ بار بار سوچ رہا تھا کہ احمد نے اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے‘ اگر اسے گاؤں میں پھیلا دیا جائے اور پولیس کے کانوں میں بھی ڈال دیا جائے تو نہ صرف تفتیش کی نوعیت بدل جائے گی بلکہ قتل کی واردات دبانا بھی آسان ہو جائے گا۔ مگر پولیس کو اس انداز سے سوچنے پر صرف احسان شاہ تیار کر سکتا ہے۔

اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے طے کیا کہ اسے فوری طور پر احسان شاہ سے ملنا چاہیے۔ رحیم داد کو اس نے بلایا بھی تھا۔

احمد رات بھر نہیں آیا۔ مگر صبح وہ مہمان خانے میں موجود تھا۔ اس نے نہایت مستعدی سے ناشتا میز پر چنا۔ رحیم داد ناشتا کرنے لگا۔ احمد نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے رات کو پتہ کیا‘ پنڈ کے کئی مزارعوں کا بھی یہی خیال ہے‘ اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے کتل کیا ہے۔"

"یا برہی نے ان سے بھی کہا ہو گا۔"

"پتہ نہیں جی! ویسے گل سمجھ بھی آتی ہے۔ وہ ایسا ہے جی‘ زمیں دارنی کا پیو ادھر کا بہت وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔ اللہ وسایا اور اس کا پیو تو اس کے بہت معمولی مزارعے تھے۔ میں تو جی ان دنوں بھی اسی پنڈ میں تھا۔ جسی لال مینجر ہوتا تھا۔ ساری زمیں داری کی دیکھ بھال‘ سچ تو یہ ہے‘ وہی کرتا تھا۔ اس نے ناراض ہو کر اللہ وسایا اور اس کے پیو کو بے دخل کر دیا تھا۔"

رحیم داد درمیان میں بول پڑا۔ "یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"

احمد نے اس کے ٹوکنے پر مطلق توجہ نہ دی۔ "یہ تو سوچ‘ زمیں دارنی کے بھائی یہ کیسے دیکھ سکتے ہیں‘ ان کی بہین انھی کے معمولی مزارعے اور وہ بھی مسلمان کی گھر والی بن کر رہے۔ عزت اور شان بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں نے تو جی زمیں دارنی کے بھائی ہرویال کو دیکھا ہے۔ کیا اکڑ اور

آن بان تھی اس کی۔ جب پنڈ میں آتا تھا تو مزارعے اس کے سامنے چپ کر کے کھڑے رہتے تھے۔ اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔"

رحیم داد نے اسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ کس طرح احسان شاہ کے پاس پہنچے۔ گھوڑی پر بیٹھ کر وہ اس کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔ شک و شبہ پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ اس نے احسان شاہ کے پاس جانے کے لیے سڑک کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ طویل اور خاصے چکر کا راستہ تھا مگر محفوظ تھا۔

رحیم داد نے ناشتے کے بعد احمد سے کہا۔ "دوپہر کی روٹی کے بعد تانگا لے آنا۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"میں نے چک بیدی جانا ہے۔ وہاں سے لاری پکڑوں گا۔ پاک پتن جاؤں گا۔"

احمد نے دریافت کیا۔ "ادھر کوئی کام ہے؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "پاک پتن میں بابا شاہ فرید گنج شکر کے مزار پر حاضری دوں گا۔"

"وہاں جانے کا مزا تو جی عرس پر آتا ہے۔ پنج محرم کو عرس ہوتا ہے۔ دور دور سے بندے آتے ہیں۔ زبردست میلہ لگتا ہے۔"

"عرس پر بھی چلا جاؤں گا۔ پہلے بھی عرس پر جا چکا ہوں۔" رحیم داد نے لہجے میں افسردگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "سچی گل پوچھ تو اللہ وسایا کے بعد دل بہت گھبراتا ہے۔ مزار پر حاضری دینے سے دل کو آرام ملے گا۔ اسی لیے جانا چاہتا ہوں۔"

"کب تک واپسی ہو گی؟" احمد نے پوچھا۔

"ارادہ تو رات ہی کو لوٹنے کا ہے پر مشکل لگتا ہے۔ بارشوں نے رستے خراب کر دیے ہیں۔ رات کو سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ کل شام تک واپس آ جاؤں گا۔ زمیں دارنی پوچھے تو بتا دینا۔"

"وہ تو جی کچھ نہیں پوچھے گی۔ وہ تو روتی رہتی ہے۔ نہ بولتی ہے نہ بات کرتی ہے۔ اسے تو جی زمیں دار کی موت کا بہت دکھ ہے۔ میں نوں نہیں پتہ تھا‘ وہ اس سے اتنا زیادہ پیار کرتی ہے۔"

رحیم داد نے بات کا رخ موڑا۔ "تاراں بھی تجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہے۔"

"توبہ کرو جی! وہ میری ذرا پروا نہیں کرتی۔" احمد نے گلہ کیا۔ "تیں نوں کیہہ پتہ‘ وہ مجھ سے کتنا لڑا کرتی ہے۔ ذرا ذرا سی گل بات پر رولا گولا کرتی ہے۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ احمد چلا گیا۔

رحیم داد مہمان خانے سے نکلا اور کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ مزارعوں سے ملا' خریف کی فصل کے بارے میں ان سے ادھرادھر کی بات چیت کی۔ اللہ وسایا کے بعد اب زمیں داری کی دیکھ بھال اسی کو کرنا تھی۔ وہ رفتہ رفتہ خود کو اس کے لیے تیار بھی کرنے لگا تھا۔ اس نے زمیں داری کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔

وہ مہمان خانے میں واپس آیا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ رحیم داد منہ ہاتھ دھو کر بیٹھا تھا کہ احمد کھانا لے کر آگیا۔ کھانا چن کر اس نے بتایا۔ "زمیں دارنی کے پاس وکیل آیا بیٹھا ہے۔"

رحیم داد پریشان ہو گیا۔ اس نے جھٹ گلاس اٹھا کر پانی پیا اور احمد سے پوچھا۔ "وکیل کب آیا؟"

"اسے آئے تو دیر ہو گئی۔"

"تمیں نوں پتہ ہے' زمیں دارنی سے کیا گل بات کر رہا تھا؟"

"میں تو جی زمیں دارنی کے پاس گیا ہی نہیں۔"

"ایسی گل ہے تو تمیں نوں وکیل کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟"

"تاراں نے بتایا۔ وہ زمیں دارنی کے پاس بیٹھی تھی۔"

"ادھر تو وکیل کا آنے کا ارادہ نہیں؟"

"ہاں جی' تاراں کہتی تھی' وہ تیرے پاس آنے کو بھی کہتا تھا۔"

رحیم داد پر ایک بار پھر گھبراہٹ نے حملہ کیا۔ اس نے روٹی کا لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ گھبراہٹ پر ذرا قابو پایا تو اس نے احمد سے کہا۔ "تو میرے لیے تانگا نہ لانا۔"

"کیوں' پاک پتن نہیں جانا؟"

"وکیل سے بات چیت میں نہ جانے کتنی دیر لگ جائے۔" رحیم داد نے بات بنائی۔ "فیر کسی روز چلا جاؤں گا۔"

رحیم داد کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ وکیل محمد عثمان رندھاوا آگیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے رسمی انداز میں پوچھا۔ "چوہدری! کیا حال چال ہے؟"

رحیم داد نے اپنی گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پانے کے لیے چہرے پر افسردگی طاری کرنے کی کوشش کی۔ لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "اب کیا حال چال رہ گیا جی!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اللہ وسایا کے بعد کچھ بھی چنگا نہیں لگتا۔ وہ اپنے ساتھ حویلی کی ساری خوشیاں اور ساری چہل پہل لے گیا۔"

"بہت نیک بندہ تھا۔ اس کا قتل بہت الم ناک حادثہ ہے۔" وکیل نے بھی غم زدہ لہجے میں اظہار خیال کیا۔

"زمیں دارنی کیا کہتی ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ بے چاری کیا کہے گی۔ اسے تو کچھ پتہ نہیں۔ وہ تو حویلی کی چار دیواری کے اندر عدت میں بیٹھی ہے۔"

"ایک چھوڑ دو تھانے دار تفتیش کے لیے آئے۔ لگتا ہے' کسی نے کچھ نہیں کیا۔ زمیں دارنی تو یہی بتاتی تھی۔"

"بتاتی تو مجھ سے بھی یہی تھی۔ پر میں نے کہا ناں' اسے کچھ پتہ نہیں۔"

رحیم داد نے چوکنا ہو کر وکیل کو دیکھا۔ اس نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ "قاتلوں کا بھی کچھ سراغ ملا؟ کوئی گرفتاری شرفتاری ہوئی؟"

"ابھی تک تو کوئی گرفتاری نہیں ہوئی۔ میں یہاں آنے سے پہلے اس سب انسپکٹر سے ملا تھا' جسے اب تفتیش پر لگایا گیا ہے۔ پہلے جو انسپکٹر تفتیش کرتا رہا تھا' اس نے نامعلوم ملزمان کے خلاف صرف کیس رجسٹر کیا تھا اور کیس بگاڑنے کے لیے ایف آئی آر میں توڑ مروڑ کر غلط حالات اور واقعات درج کر دیے۔ زمیں دارنی نے جو ابتدائی رپورٹ لکھوائی تھی' اس میں اس طرح رد و بدل کر دیا جس سے ملزمان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

"یہ تو اس نے بہت گندی حرکت کی۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر جھنجلاہٹ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی؟"

"ہو تو سکتی ہے۔" وکیل نے توجیہہ پیش کی۔ "دفعہ ۱۵۴ ضابطہ فوجداری کی رو سے متعلقہ پولیس افسر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ابتدائی رپورٹ میں کسی بھی قسم کی ترمیم یا تبدیلی نہ کی جائے۔ اگر وہ خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۱۸ کے تحت کارروائی ہو سکتی ہے اور جرم ثابت ہونے پر ایسے پولیس افسر کو تین سال کی قید اور جرمانے کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔" وکیل نے قدرے توقف کیا پھر گویا ہوا۔ "مگر میں نے اس سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کرنے سے گریز کیا۔ سوچا اس مرحلہ پر پولیس سے بگاڑنا مناسب نہیں' البتہ انسپکٹر جنرل پولیس کو میں نے جو درخواست پیش کی تھی اس میں اس قانونی پہلو پر روشنی ڈالی تھی۔ آئی جی نے اس کا ضرور نوٹس لیا ہوگا۔ چنانچہ اس کے حکم پر ایس پی نے اس کی بجائے ایک اور انسپکٹر کو تفتیشی افسر مقرر کر دیا۔ لگتا ہے' وہ کیس میں پوری دلچسپی لے رہا ہے۔"

"وہ کیا بتاتا تھا؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"اس کا خیال ہے' اللہ وسایا کا قتل پرانی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ اللہ وسایا کی صرف ایک ہی شخص سے دشمنی تھی۔ اور وہ احسان علی شاہ ہے۔ زمیں دارنی نے بھی اپنے بیان میں اسی پر شبہ ظاہر کیا ہے۔"

"میں نے تو جی احسان شاہ کو دیکھا بھی نہیں۔ سنا ہے بھلا بندہ نہیں ہے۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی اور وکیل کو گمراہ کرنے کے لیے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "پر میں نے ایک گل اور بھی سنی ہے۔"

وکیل رندھاوا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ "وہ کیا گل ہے؟"

"سنا ہے' اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے کتل کیا اور رات ہی کو سرحد پار لوٹ بھی گئے۔" رحیم داد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔ "ایک بار تو آدھی رات کو زمیں دارنی کا بھائی اور چاچا اسے لینے آئے تھے۔ ان کے ساتھ مسلح بندے بھی تھے' خود ان کے پاس بھی بھرے ہوئے پستول تھے۔ پر زمیں دارنی نے ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اللہ وسایا تو اس رات شہر گیا ہوا تھا پر میں پہنچ گیا۔ ساری گل بات میرے سامنے ہوئی تھی۔"

"چوہدری! تو نے یہ بات کس سے سنی؟"

"مجھے تو حویلی کے نوکر حمدے نے سنائی تھی اور اسے لوہار کے منڈے نے بتائی تھی۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔

"ویسے زمیں دارنی کے کانوں تک یہ گل پہنچ چکی ہے۔"

"اس نے کیا کہا؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔

"وہ کہتی ہے' یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اس کے بھائی اور چاچا ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ اللہ وسایا کو کیوں کتل کرتے؟ وہ کبھی ان کے راستے میں نہیں آیا۔ اس کا فیصلہ تو اس نے زمیں دارنی ہی پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ خود ہی اپنے بھائیوں کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔" وکیل نے جمیلہ کا موقف بیان کیا۔ "زمیں دارنی کا خیال ہے کہ تفتیش کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے یہ افواہ جان بوجھ کر پھیلائی گئی ہے۔"

"اور وکیل صاحب' تمہارا کیا خیال ہے جی؟" رحیم داد نے زور زور سے دھڑکتا ہوا دل قابو میں کرنے کی کوشش کی۔

"چوہدری! میرا بھی یہی خیال ہے۔" رندھاوا نے نہایت اعتماد سے کہا۔ رحیم داد پر گھبراہٹ

ری ہونے لگی۔ اسے وکیل سے اس ردعمل کی توقع نہ تھی۔ وہ دم بخود بیٹھا رہا۔ وکیل نے بتایا۔ میں نے تفتیش کرنے والے پولیس انسپکٹر جنجوعہ سے جو کچھ معلوم کیا ہے' اس سے اندازہ ہوتا ہے . اس نے اللہ وسایا کے قتل کا کچھ سراغ نکال لیا ہے۔ اس نے نئے سرے سے تحقیقات شروع ی ہے۔ وہ تو بہت پرامید نظر آتا ہے۔ کہتا تھا' جلد ہی گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی۔"

رحیم داد نے بڑی مشکل سے اپنی سراسیمگی چھپائی اور سینے پر ہاتھ مار کے جوش و خروش سے لا۔ "اگر یہ پتہ چل جائے کہ اللہ وسایا کا خون احسان شاہ نے کرایا ہے تو میں اسے زندہ نہیں ہوڑوں گا۔ چاہے جان جائے یا پھانسی ہو۔ میں اللہ وسایا کا بدلہ اس سے ضرور لوں گا۔" اس نے یل کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "برا نہ منانا' مجھے تو پولیس کچھ کرتی لگتی نہیں۔ تھانے ر تو خالی پیلی باتیں کرتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں کریں گے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" وکیل نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "پولیس میں سارے فسر برے نہیں ہیں۔ ایسے فرض شناس بھی ہیں' جن کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہے۔ جو ھانے دار اب تفتیش کر رہا ہے' وہ بھی ایسا ہی پولیس افسر ہے۔ وہ تیرے پاس بھی آئے گا اور لدی آئے گا۔ پوچھ گچھ کرے گا' تیرا بیان بھی لے گا۔ تجھے جو کچھ معلوم ہو' صاف صاف بتا ینا۔"

"مان لو' کاتل اگر زمیں دارنی کے بھائی ہوئے' تب تھانے دار کیا کرے گا؟" رحیم داد نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی غرض سے ایک بار پھر وکیل کو ورغلانے کی کوشش کی۔ "وہ تو اب ہاتھ آنے ے رہے' راتوں رات سرحد پار چلے گئے ہوں گے۔ وہاں سے انھیں کیسے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر ایسا ہے' تب تو قاتلوں کو گرفتار کرنا ممکن نہیں۔ مگر میرا خیال ہے' اللہ وسایا کو انھوں نے تل نہیں کیا۔ زمیں دارنی کا بھی یہی خیال ہے اور انسپکٹر جنجوعہ کی باتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا جی!" رحیم داد نے ہتھیار ڈال دیے۔

وکیل نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "چوہدری! میں تیرے پاس یہ بتانے آیا تھا کہ میں تیرے ملیم کے کاغذات جلد ہی لوٹا دوں گا۔ ابھی مجھے ان کی ضرورت پڑے گی۔"

"جب تک جی چاہے' اپنے پاس رکھیں۔ میں نوں واپس لینے کی جلدی نہیں۔ ان کے بارے ں مجھے کوئی فکر نہیں۔"

اس درخواست کے بارے میں نہ رحیم داد نے کچھ کہا نہ وکیل نے بتایا' جس پر رحیم داد نے

دستخط کیے تھے۔ جلد ہی وکیل کھڑا ہو گیا' مسکرا کر بولا۔ "مجھے اب جانا ہے۔" رحیم داد اس کے ہم راہ بیرونی دروازے تک گیا۔

وکیل سے گفتگو کے بعد رحیم داد سخت پریشان ہو گیا۔ اسے سب سے زیادہ تشویش اس بات کی تھی کہ اگر پولیس انسپکٹر جنجوعہ تفتیش کے لیے آیا تو اسے تمام وقت یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔ اسی خطرے کے پیش نظر وہ کسی پولیس والے کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ وہ تفتیشی کارروائی میں کسی طور شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بات وہ احسان شاہ سے بھی کہہ چکا تھا۔ احسان شاہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ اللہ وسایا کے قتل کے معاملے میں اس سے مطلق پوچھ گچھ نہیں کی جائے گی۔ رحیم داد مطمئن بھی ہو گیا تھا اور یہ معلوم ہونے کے بعد اسے مزید اطمینان ہو گیا تھا کہ دونوں پولیس انسپکٹروں میں سے کوئی بھی اب تک اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ مگر اب وکیل سے ملنے کے بعد اس کا اطمینان اور سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔

دن اسی الجھن میں گزرا۔ شام بھی پریشانی میں کٹی۔ غروب آفتاب کے وقت ہلکی سی بارش ہوئی مگر اب آسمان صاف تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے تیزی سے دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ رحیم داد کا پلنگ برآمدے میں بچھا تھا۔ وہ بستر پر خاموش لیٹا تھا۔ احمد بھی موجود تھا۔ رات گزرتی رہی۔ احمد اپنے بستر سے اٹھا۔ آہستہ سے کھنکارا۔ رحیم داد جاگ رہا تھا مگر خاموش لیٹا رہا۔ اس نے دیکھا کہ احمد دبے پاؤں دروازے پر پہنچا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

☆

آدھی رات کے بعد بیرونی دروازہ دھیرے سے کھلا۔ رحیم داد ابھی تک جاگ رہا تھا اور کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ نظریں دروازے ہی کی جانب تھیں۔ دروازہ کھلا تو اس نے سوچا کہ احمد آیا ہو گا۔ آنے والا دروازے میں داخل ہو کر آگے بڑھا تو تاروں کی دھندلی روشنی میں رحیم داد نے اس کی وضع قطع سے اندازہ لگایا کہ وہ احمد نہیں ہے۔ رحیم داد گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ غور سے دیکھا تو وہ دارا تھا۔ رحیم داد سخت گھبرایا۔

دارا قریب آیا تو رحیم داد نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "دارا! تو کیسے آیا؟" وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رحیم داد نے اسے روک دیا' دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "پہلے کنڈی چڑھا دے۔"

دارا نے کنڈی لگائی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا رحیم داد کے روبرو آ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔ "تو نے تو مجھے سخت پریشان کر دیا۔ اب تک کہاں رہا؟ تیں نوں تو ریاست بھاول پور کی طرف نکل جانا تھا؟" دارا فرش پر بیٹھتے ہوئے عاجزی سے بولا۔ "بالکل یہی ارادہ تھا۔ آدھی رات کے حد میں اور کامل بھاول پور جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔"

"پر تو ادھر کیسے آیا؟" رحیم داد جھنجلا گیا۔

"وہ ایسا ہوا جی میں روٹی کھا کر جلد ہی سو گیا۔" دارا نے بتایا۔ "آنکھ کھلی تو کامل سامنے کھڑا ہو رہا تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ اس نے بتایا پولیسے تیری تلاش میں آئے ہیں۔ تو فوراً پیچھے سے نکل جا۔" دارا نے دھیرے سے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "میں نے جی ایسا ہی کیا۔ دیوار پھاند کر دوڑ گیا۔ ادھر مکئی کے کھیت تھے۔ میں ان میں گھس گیا اور چھپتا لکتا چک سے باہر نکل گیا۔"

"کامل نے تجھے یہ نہیں بتایا پولیسے تیری تلاش میں کیوں آئے تھے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"یہ تو جی اس نے نہیں بتایا' وہ تو بہت ڈرا ہوا تھا۔ لگتا ہے' پولیس نے اللہ وسایا کے قتل کا سراغ لگا لیا ہے۔"

رحیم داد کو فوراً وکیل کی بات یاد آ گئی۔ وہ خوف زدہ ہو کے دارا کو دیکھنے لگا۔ دارا نے اسے اس طرح گھورتے دیکھا تو پریشان ہو کر بولا۔ "تو مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے؟"

"تجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ پولیسے پہلے ہی ادھر کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ روز ہی تفتیش کے لیے آتے ہیں۔"

"پر جاتا کہاں۔" دارا نے مجبوری کا اظہار کیا۔ "چھپنے کا یہی ٹھکانا نظر آیا۔ تیں نوں پتہ ہے' کتنی مشکلوں سے پہنچا ہوں۔" دارا کے لہجے میں عاجزی تھی۔

رحیم داد کو غصہ تو بہت آیا مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ "آگے کے لیے تو نے کیا سوچا؟"

"تو مجھے کسی طرح ادھر سے نکال کر ریاست میں پہنچا دے۔ آگے کی فکر نہ کر۔ کامل رحیم یار خاں پہنچ کر میرا انتظار کرے گا۔ وہ اپنے ایک یار کے ساتھ ٹھیرے گا۔ میں نوں اس کا پتہ ملوم ہے۔ کامل کل کسی وکھت ادھر نکل جائے گا۔ میں پہلے پہنچ گیا تو رحیم یار خاں میں اس کے یار کے پاس رک کر انتظار کروں گا۔ یہ پروگرام ہم دونوں پہلے ہی بنا چکے ہیں۔ رحیم یار خاں سے ہم گڈی پکڑیں گے اور کراچی نکل جائیں گے۔"

رحیم داد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے بھاول پور کیسے پہنچائے۔ کوٹلہ ہرکشن میں اس کے اعتماد کا کوئی ایسا شخص نہیں تھا۔ لیکن اس نے اپنی مجبوری ظاہر نہیں کی۔ دارا کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "تو اب سو جا۔ فکر نہ کر۔ میں کل تجھے ادھر پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا۔" اس نے دارا کو اوڑھنے کے لیے ایک چادر دے دی۔

دارا چادر لے کر برآمدے کے ایک گوشے میں فرش پر خاموشی سے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ

خرانٹے بھر رہا تھا۔ مگر رحیم داد نہیں سویا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ دارا خطرہ بن کر بالکل اس کے قریب آگیا تھا۔ وہ خاموش لیٹا اس خطرے سے چھٹکارا پانے کی تدابیر سوچتا رہا۔ نہ وہ اسے بھاول پور پہنچا سکتا تھا نہ اپنے پاس روپوش رہنے کی اجازت دے سکتا تھا۔ وہ شدید ذہنی الجھن میں تھا۔

تھکا ہارا دارا اطمینان سے چادر اوڑھے سو رہا تھا اور رحیم داد بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ احمد کی طرف سے وہ مطمئن تھا کہ صبح سے پہلے اس کی واپسی ممکن نہیں۔ وہ اکثر رات گئے چپ چاپ نکل جاتا تھا اور صبح تک غائب رہتا تھا۔ رحیم داد نے سوچا' رات تو کسی نہ کسی طرح گزر جائے گی۔ صبح دارا کو کوٹھری میں چھپا کر باہر سے تالا ڈال دے گا۔

مگر وہ اسے اس طرح کب تک چھپا کر رکھ سکتا ہے؟ وہ اسے سویرا ہونے سے پہلے گاؤں سے نکل جانے کے لیے بھی کہہ سکتا تھا یا دن کوٹھری میں گزارنے کے بعد رات کو چلے جانے کے لیے کہتا۔ گاؤں کی حدود کے باہر نہر کے کنارے تک جا کر اسے چھوڑ بھی آتا۔ مگر اس میں خطرہ یہ تھا کہ اگر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو کیا ہو گا؟ رحیم داد لرز کر رہ گیا۔ اسے پھانسی کا پھندا سامنے لہراتا نظر آنے لگا۔

بہت غور و فکر کے بعد اسے دارا سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ نظر آیا اور وہ یہ تھا کہ دارا کا خطرہ سرے سے مٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں اس نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ دن بھر دارا کو نہایت رازداری سے کوٹھری میں چھپائے رکھے گا۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی احمد کو چھٹی دے دے گا۔ احمد خوشی سے چلا جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد دارا سے کہے گا کہ وہ نہر کے کنارے پہنچ جائے اور اس کا انتظار کرے۔ بعد میں وہ بندوق لے کر جائے گا۔ دارا کو گھوڑی پر بٹھا کر دور ویرانے میں لے جائے گا۔ اور اسے گولی مار دے گا۔ لاش نہر میں ڈال دے گا۔ بارش کی وجہ سے نہر کا بہاؤ بہت تیز ہے۔ لاش بہتی ہوئی دور نکل جائے گی۔

یہ منصوبہ باندھ کر اسے کسی قدر سکون ملا۔ وہ گہری نیند سو گیا۔ صبح ہونے سے بہت پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پریشان ہو کر دیکھا کہ دارا غائب ہے اور مہمان خانے کا دروازہ کھلا ہے۔

۴۲

تانگا ہچکولے کھاتا ہوا نہر کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ بارش کے باعث راستہ خراب تھا۔ جگہ جگہ کیچڑ تھی' گڑھے تھے۔ کوچوان بہت احتیاط سے تانگا چلا رہا تھا۔ مگر جب کوئی پہیہ گڑھے میں چلا جاتا تو تانگا ایک طرف جھک جاتا یا الار ہو جاتا۔ رحیم داد کو بار بار پہلو بدلنا پڑتا۔ وہ بہت چوکس اور محتاط بیٹھا تھا۔

آسمان پر ابر چھایا تھا۔ نہر کی جانب سے بھیگے ہوئے جھونکے آ رہے تھے۔ فضا سہانی اور خوشگوار تھی۔ مگر رحیم داد گم صم بیٹھا تھا۔ چہرے سے تشویش جھلکتی تھی۔ تانگا چک بیدی کی سمت جا رہا تھا۔ رحیم داد سویرے سویرے کوٹلہ ہر کشن سے روانہ ہوا تھا۔ اب پہر دن گزر چکا تھا۔ تانگا نشیب سے نکل کر پلیا کی چڑھائی طے کرنے لگا تو معاً رحیم داد کو اللہ وسایا یاد آگیا۔ اسی پلیا کے نیچے اس کی لاش نہر میں تیرتی ہوئی ملی تھی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا تو چہرے پر خوف اور پریشانی طاری ہو گئی۔ کوچوان اس کے احساسات سے بے نیاز گھوڑے کی پیٹھ پر سڑاک سڑاک چابکیں مار رہا تھا۔ چڑھائی پر اس کی رفتار بہت سست پڑ گئی تھی۔ چابکیں پڑیں تو گھوڑے نے تیز قدم اٹھائے۔ تانگا اوپر پہنچ گیا اور پختہ سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگا۔

رحیم داد چک بیدی نہ گیا۔ اسے دراصل وہاں جانا بھی نہ تھا۔ چک بیدی سے پہلے فاضل پورہ کا اڈہ تھا۔ وہاں سے اسے لاری میں سوار ہونا تھا اور پاک پتن کے بجائے حویلی اسٹیشن پہنچنا تھا۔ لیکن اسے فاضل پورہ بھی نہ جانا پڑا۔ نظیر والی کے قریب حویلی اسٹیشن جانے کے لیے نیلی ٹرانسپورٹ کی لاری مل گئی۔ لاری روانہ ہونے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

رحیم داد جھٹ تانگے سے اترا۔ کرایہ ادا کیا۔ اور لاری میں جا کر بیٹھ گیا۔ دوپہر کو وہ حویلی اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں سے اسے احسان شاہ کے گاؤں 'پیراں والہ' جانا تھا۔ اسٹیشن سے متن والہ تک کنکر کی بنی ہوئی سڑک تھی۔ سڑک بہت دور تک آگے بھی جاتی تھی۔ اسی سڑک سے ایک پختہ سڑک پیراں والہ کو جاتی تھی۔ یہ سڑک احسان شاہ کی جاگیر میں واقع تھی۔ اسی نے بنوائی تھی اور اسی کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ متن والہ کی سمت جانے والی کنکر کی سڑک شدید بارشوں سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ لہٰذا ان دنوں اس پر بہت کم لاریاں چلتی تھیں۔

رحیم داد نے لاری کا انتظار کرنے کے بجائے تانگا لیا اور اس میں بیٹھ کر پیراں والہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ سڑک خراب ہونے کے باوجود تانگا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی احسان شاہ کی حویلی پر پہنچ گیا۔ احسان شاہ گھوڑی پر سوار ہو کر ہواخوری کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ حویلی کے پھاٹک پر رحیم داد سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ دیکھتے ہی جھٹ گھوڑی سے نیچے اترا۔ بڑھ کر گرم جوشی سے رحیم داد کو گلے لگایا۔ ہواخوری کا ارادہ ترک کیا۔ رحیم داد کو اپنے ہمراہ دیوان خانے میں لے گیا۔

احسان شاہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد کو بھی قریب بٹھایا۔ مسکرا کر پوچھا۔ "چوہدری تو تانگے میں کہاں سے آ رہا ہے؟"

"آتو میں کوٹ ہر کشن ہی سے رہا ہوں۔ آگے بھی اسی رستے سے آتا رہوں گا۔"

"پر یہ تو بہت لمبا اور چکر کا راستہ ہے۔" احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ "تو نے یہ راستہ کیوں پکڑا؟"

"نہر کے کنارے کا رستہ چھوٹا ہے۔ میں گھوڑی پر بیٹھ کر آرام سے آ جا بھی سکتا ہوں۔ پر اس رستے کو استعمال کرنے سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے یہ چکر کا رستہ پکڑا۔"

"جیسی تیری مرضی۔" احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اب تجھے کس کی پروا کرنی ہے؟ میں نے تیرا راستہ بالکل صاف کر دیا ہے۔ اللہ دسایا سے ڈرتا تھا' وہ تو اب رہا نہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے' پر مجھے بہت خوف لگ رہا ہے۔ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ نظر آتا ہے۔" رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"پروا نہ کر چوہدری۔ کوئی خطرے شطرے کی گل نہیں۔" احسان علی شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "یہ بتا تیرے پاس کوئی پولیسا تو پوچھ گچھ کے لیے نہیں آیا؟"

"ابھی تک تو کوئی نہیں آیا۔ دو تھانے دار تفتیش کے لیے آئے۔ پہلے اس تحصیل کا پنچا۔ پر اب تفتیش پاک پتن تحصیل کے تھانے دار کے حوالے کر دی گئی ہے۔ وہ بھی جمیلہ اور حویلی کے نوکروں سے پوچھ تاچھ کر کے اور ان کے بیانات لے کر چلا گیا۔"

"مجھے اس کا پتہ ہے۔" احسان شاہ بیچ میں بول پڑا۔ "پر تجھ سے تو کسی نے بیان شیان نہیں لیا۔ نہ تیرے پاس آیا؟"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ پر پچھلے دنوں وکیل آیا تھا۔ بتاتا تھا اس نے زمیں داری کی طرف سے اوپر درخواست لگائی تھی۔ اسی درخواست پر تفتیش کا کام دوسرے تھانے دار کو دیا گیا۔ وکیل اس تھانیدار سے ملا تھا۔ کہتا تھا اس نے سراغ نکال لیا ہے۔ جلد ہی گرفتاریاں بھی ہونے والی ہیں۔" رحیم داد کے چہرے پر سراسیمگی اور پریشانی چھا گئی۔ "وکیل نے یہ بھی بتایا' تھانے دار جلد ہی میرے پاس بھی پوچھ تاچھ کرنے آئے گا۔"

"تو گویا گل اس طرح ہے۔" احسان شاہ نے بڑبڑانے کے انداز میں آہستہ سے کہا اور گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ "تجھے یہ اطلاع ملتے ہی فوراً میرے پاس آنا چاہیے تھا۔" احسان شاہ کے لہجے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ "میں نے ماکھے کو تجھے بلانے کے لیے بھیجا بھی تھا۔"

"میں تو جی وکیل سے بات کرنے کے بعد دوسرے ہی روز آنا چاہتا تھا پر کئی روز تک ایسی زبردست برکھا ہوئی کہ رکی ہی نہیں۔ رستے بھی خراب ہیں۔ میں ایسے میں کیسے آتا۔ رات کو مینہ رکا تو میں سویرے سویرے تیرے پاس آنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔

"اچھا کیا تو آ گیا اور ساری باتیں مجھے بتا دیں۔" احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔ "فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ تھانے دار جو اب تفتیش کر رہا ہے' اس کا نام اسلم حیات جنجوعہ ہے نا؟"

"وکیل نے اس کا یہی نام بتایا تھا۔"

"لگتا ہے جمیلہ کی درخواست پر ہی اسے ڈی۔ ایس۔ پی نے لگایا ہے۔ جنجوعہ کارگزاری دکھانے پر تلا ہوا ہے۔" احسان شاہ مسکرایا۔ "تو اس کی پروا نہ کر۔ اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔"

"میں نوں تو اس سے خوف آنے لگا ہے۔ میرے پاس پوچھ تاچھ کے لیے آیا اور اس نے الٹے سیدھے سوال کیے تو ڈر ہے نہ جانے کیا زبان سے نکل جائے۔ سچ پوچھ تو میں کبھی کتل شل کے معاملوں میں پڑا نہیں۔ اسی لیے تجھ سے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایسا بندوبست کر دے کہ میں نوں پولیس کے چکروں میں نہ پڑنا پڑے۔"

احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "ابھی بہت کچا ہے۔ جلدی گھبرا جاتا ہے۔ ڈرتا بھی ہے۔ چوہدری! زمیں داری کرنی ہے تو وڈا دل رکھ۔ حوصلے سے کام لے۔" اس کا لہجہ بھاری بھرکم ہو گیا۔ "ایسے

خطرے تو آگے روز ہی آتے رہیں گے۔ کب تک ڈرتا رہے گا؟" اس نے رحیم داد کو گہری نظروں سے دیکھا۔ "پریشان نہ ہو۔ ایسا بھی وکت آئے گا اور جلد ہی آئے گا جب تجھے خطرہ' خطرہ نہ لگے گا بلکہ خطرہ مول لینے میں مزا آئے گا۔"

"میں نوں ڈر اس لیے بھی لگ رہا ہے کہ وکیل کہتا تھا' تھانے دار نے اللہ وسایا کے کتل کا پتہ چلا لیا ہے۔ لگتا ہے وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تیں نوں پتہ نہیں پولیس نے دارا کے ٹھکانے پر پچھلے دنوں رات کو چھاپہ مارا۔ وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل بھاگا۔ سیدھا میرے پاس آیا۔ میں حویلی کے مہمان خانے میں اس رات اکیلا ہی تھا۔ اسے اپنے ساتھ ٹھیرا لیا۔ پر وہ صبح ہونے سے پہلے ہی چپکے سے اٹھ کر بھاگ گیا۔ جانے کہاں ہے؟ پولیس کے ہاتھ لگ گیا تب تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ اس کے اس طرح فرار ہونے نے مجھے اور بھی زیادہ خوف میں ڈال دیا۔" رحیم داد کے بشرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ "شاہ جی! یہ تو سوچ' وہ گرفتار کر لیا گیا تو پولیس کو پکا ثبوت مل جائے گا۔"

"تجھے اب تک یہ بھی پتہ نہیں کہ دارا کہاں ہے؟"

"میں نوں کیہ پتہ جی۔" رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ "اس رات کے بعد سے وہ ملا ہی کب۔"

"میں تجھے بتاتا ہوں' دارا کہاں ہے۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "تیرے پاس سے وہ سیدھا ادھر آیا۔ اور یہ اس نے ٹھیک ہی کیا۔ شیدا اسے میرے پاس لایا۔ میری اطلاع یہ ہے کہ پولیس نے اللہ وسایا کے کتل کے سلسلے میں چھاپہ نہیں مارا تھا۔ وہ اسے کسی دوسرے ہی کیس میں گرفتار کرنا چاہتی تھی۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "یہ بات تجھے دارا نے بتائی؟" رحیم داد کا دل خوف سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"نہیں۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔ "نہ میں نے اس بارے میں اس سے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ ویسے مجھے اس وکت تک کچھ پتہ بھی نہیں تھا۔ بعد میں معلوم کرنے پر یہ اطلاع ملی کہ پولیس کسی اور کیس میں اسے تلاش کر رہی ہے۔"

اب شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ دیوان خانے اور اس سے متصل برآمدے میں لیمپ روشن کر دیے گئے تھے۔ نوکروں نے برآمدے کے آگے لان میں میز اور کرسیاں لگا دی تھیں۔ شیدا آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ احسان شاہ نے پوچھا۔ "شیدے! تو نے اب تک کچھ بندوبست نہیں کیا؟" وہ مسکرایا۔ "برسات کی یہ سوہنی شام ایسے ہی گزرتی جا رہی ہے۔

چوہدری بھی آیا ہوا ہے۔"

شیدا نظریں جھکا کر بولا۔ "کرسیاں اور میز تو لگا دی ہیں جی۔ بوتل اور گلاس بھی لے آتا ہوں۔"

احسان شاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری' باہر آ جا۔ وہیں گل بات ہو گی۔"

رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں لان میں پہنچے اور کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ شیدا اسکاچ کی بوتل' گلاس اور جگ میں پانی لے آیا۔ اس نے نہایت مستعدی سے دو پیگ بنائے اور گلاس احسان شاہ اور رحیم داد کے آگے رکھ دیے۔ دونوں نے گلاس اٹھا کر وہسکی کے گھونٹ بھرے۔

رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "تو نے یہ نہیں بتایا دارا اب کہاں ہے؟ اس کا کیا بنا؟"

"وہ ریاست بہاول پور کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسی رات اسے ریاست کی حدود میں پہنچا دیا۔"

"تیں نوں ٹھیک طرح پتہ ہے' وہ ادھر پہنچ گیا؟"

"میرے کرندے ساتھ گئے تھے۔ اسے ادھر پہنچا کر مجھے انہوں نے اطلاع بھی پہنچا دی تھی۔" احسان شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میرا تو خیال ہے اب تک وہ کراچی پہنچ چکا ہو گا تو اس کی طرف سے بالکل فکر نہ کر۔ ویسے وہ بہت ہوشیار بندہ ہے۔ وہ جلد ہی کراچی سے بحرین کی طرف نکل جائے گا۔ مجھے تو وہیں جانے کے لیے کہتا تھا۔"

رحیم داد وہسکی کی ہلکی ہلکی چسکی لگاتا رہا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "شاہ جی! تجھ سے ایک گل پوچھنی تھی؟"

"ضرور پوچھ۔" احسان ہنس کر بولا۔

"اللہ وسایا کے کتل کے موکع پر تو بھی موجود تھا؟"

"ہاں!" احسان شاہ نے اعتراف کیا۔ "ویسے میں عام طور پر ایسے موکعوں پر موجود نہیں رہتا۔ ایسے کام کے لیے میرے بندے بہت ہوشیار ہیں۔ پر اللہ وسایا ادھر کا وڈا زمیں دار تھا۔ ہوشیاری سے سوچ سمجھ کر کام کرنا تھا۔ آگے کا بھی تو دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے میں خود پہنچ گیا۔ تجھے پتہ ہے' بیلا میری حویلی سے بہت زیادہ دور نہیں۔ نزدیک کا معاملہ تھا۔ سوچا' اپنے سامنے ہی یہ کام کرا دوں۔ بات یہ ہے' پہلے بھی کئی بار میرے بندوں نے اسے کتل کرنے کی کوشش کی۔ پر وہ بچ کر صاف نکل گیا۔ میں چاہتا تھا اس بار بچ کر نکلنے نہ پائے۔" اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ "پر یہ بات تجھے دارا نے بتائی ہو گی۔"

"وہ یہ بھی بتاتا تھا کہ اسی نے دونوں بار گولیاں چلائیں اور انھیں کے لگنے سے وہ مرا۔" رحیم

داد نے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"دارا نے ٹھیک ہی بتایا۔ میں نے جان بوجھ کر اسی سے گولیاں چلوائیں۔" احسان شاہ ایک آنکھ دبا کر عیاری سے مسکرایا۔ "میں نے تیری باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ تو اسے کسی سنگین جرم میں پھنسا کر اپنے قابو میں رکھنا چاہتا ہے۔" وہ ہنسا۔ "میں نے غلط تو نہیں سوچا۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔" رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ مگر وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کے لیے وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ مسکرانے کی کوشش کی۔ "شاہ جی! تیرا بھی جواب نہیں۔ حد کر دی تو نے۔"

"تجھے پتہ نہیں' مجھے روز ہی طرح طرح کے بندوں سے ملنا پڑتا ہے۔" احسان شاہ نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے بتایا۔ "اگر اتنی سمجھ نہ رکھتا تو کوئی میرے پاس مشورے کے لیے کیوں آنے لگا؟ ساتھ رہے گا تو تجھے خود پتہ چل جائے گا۔ ابھی تو تیرے ساتھ میرا نیا نیا ملنا جلنا ہوا ہے۔"

"یہ تو بتا شاہ جی' تھانے دار جنجوعہ کا کیا بندوبست کرنے والا ہے۔" رحیم داد نے اپنی تشویش ظاہر کی۔ "جلد ہی کچھ ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ کسی روز میرے پاس پہنچ جائے گا۔"

"فکر نہ کر۔ وہ تیرے پاس کبھی نہیں پہنچے گا۔" احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔ "ادھر کا ایس پی فتح علی مرزا ہے۔ وہ ڈی۔ آئی۔ جی بن نے کے چکر میں لگا ہے۔ ویسے ہے بھی سینئر افسر۔ میرے پاس کئی بار آ چکا ہے۔ تجھے پتہ نہیں' میرا ایک پتر کراچی میں مرکزی حکومت میں وڈا افسر لگا ہے۔ دوسرا لاہور میں ہوتا ہے۔ تیسرا پنڈی میں۔ وہ دونوں بھی وڈے افسر ہیں۔ ویسے دوسرے افسروں اور اسمبلیوں کے ممبروں سے بھی یاری دوستی ہے۔ ان کے کام کراتا ہوں تو ان سے کام لیتا بھی ہوں۔" وہ نشے سے جھوم کر مسکرایا۔ "اطمینان رکھ۔ ایس۔ پی سے کہہ کر جنجوعہ کا تبادلہ کرا دوں گا۔ اور جلد ہی کرا دوں گا۔"

"ایسا ہو جائے تو بہت ٹھیک رہے گا۔ وکیل کی باتیں سن کر میں نوں خوف آنے لگا تھا۔"

"تیرے کہنے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا' تھانے دار جنجوعہ کارگزاری دکھانے کے لیے کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور کرے گا۔ میں نے اس کے تبادلے کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ کل ہی مرزا سے بات کروں گا۔"

شیدا پلیٹوں میں تلے ہوئے مرغ اور کباب لے کر آیا اور میز پر رکھ کر چپ چاپ چلا گیا۔ رحیم داد نے کباب اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا۔ "شاہ جی' اس بار کسی ایسے تھانے دار کو لگوا جو کیس کو بالکل

دبا دے۔"

"پروا نہ کر۔ بالکل ایسا ہی ہو گا۔"

"ویسے میں تجھے یہ بتا دوں' جمیلہ اپنے وکیل کے ذریعے معاملہ اوپر تک لے جائے گی۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"لے جانے دے۔ جتنا چاہے اوپر لے جائے۔" احسان شاہ نے پلیٹ سے تلا ہوا مرغ اٹھایا اور اس کی ایک ٹانگ نوچ کر علیحدہ کرنے لگا۔ "پر کچھ ہونے کا نہیں۔"

"باتوں میں ایسا پھنسا کہ تیں نوں ایک گل بتانا بھول ہی گیا۔ اور وہ بہت کام کی گل ہے۔"

"کیا گل ہے' صاف صاف بتا۔"

"تھانے دار کا خیال ہے اللہ وسایا کا قتل پرانی دشمنی کی وجہ سے ہوا۔" رحیم داد نے احسان کو آگاہ کیا۔ "یہ گل جمیلہ نے اسے سمجھائی۔ جمیلہ نے پچھلے دنوں مجھے بلایا تھا۔ کہتی تھی اس نے تھانے دار سے یہی کہا ہے۔ پہلا تھانے دار تو نہ مانا۔ پر اب جو تفتیش کر رہا ہے' وہ اسے مانتا ہے۔ جمیلہ نے تیرے بارے میں تھانے دار سے شبہ ظاہر کیا ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا۔"

"یہ تو بہت پہلے ہی مجھے پتہ چل گیا تھا۔" احسان شاہ کا لہجہ تیکھا تھا۔ "تو نے یہ کوئی نئی گل نہیں بتائی۔ جمیلہ کو تو یہ کہنا ہی تھا۔"

"تو نے میری پوری گل نہیں سنی۔" رحیم داد نشے کی ترنگ میں مسکرایا۔ "میں نوں تجھے یہ بتانا ہے' اللہ وسایا کی پرانی دشمنی تو جمیلہ کے بھائیوں سے بھی تھی اور تجھ سے زیادہ تھی۔ اللہ وسایا ان کا مزارع تھا۔ اپنے معمولی مزارعے' اور وہ بھی مسلمان مزارعے کے گھر میں اپنی بہن کو اس کی گھر والی کے طور پر کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ بھی تو اسے قتل کر سکتے ہیں۔"

"یہ بات تو نے سوچی ہے؟" احسان شاہ نے پوچھا۔

"نہیں مجھے حویلی کے ایک نوکر نے بتائی ہے۔" رحیم داد نے کھل کر اظہار خیال کیا۔ "وہ کہتا تھا کو ملہ ہرکشن میں اس کا بہت چرچا ہے کہ اللہ وسایا کو جمیلہ کے بھائیوں نے قتل کیا اور رات ہی کو واردات کے بعد سرحد پار چلے گئے۔"

"نکتہ تو یہ بہت زوردار ہے۔" احسان شاہ نے اظہار پسندیدگی کیا۔ "ان پر بالکل شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح تفتیش کو ایسے رخ پر ڈالا جا سکتا ہے کہ آگے بڑھنے ہی نہ پائے۔"

"میں چاہتا ہوں تو اوپر کے پولس افسروں کے کان میں یہ بات ڈال دے۔" رحیم داد نے تجویز پیش کی۔ "نیا تھانے دار تفتیش پر لگایا جائے تو وہ اس طرح آسانی سے کیس یہ کہہ کر دبا سکتا ہے کہ

قاتل جمیلہ کے بھائی تھے جو سرحد پار جاچکے ہیں۔ ان کے خلاف کارروائی نہیں ہو سکتی۔" اس نے داد طلب نظروں سے احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ "ویسے یہ بات پنڈ میں سب ہی جانتے ہیں کہ جمیلہ کے بھائی کئی بار اسے لینے آئے۔ ایک بار تو میرے سامنے آئے تھے پر وہ نہیں گئی۔"

"تونے ٹھیک سوچا چوہدری۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "یہ نکتہ پیدا کرکے تونے دل خوش کردیا۔ تو اندر سے اتنا گہرا ہے یہ مجھے پتہ نہ تھا۔"

احسان شاہ کھلکھلا کر ہنسا اور چند لمحے تک ہنستا رہا۔ وہ بہت خوش اور مگن نظر آرہا تھا۔ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ بات جمیلہ تک بھی پہنچ چکی ہے۔ وکیل کہتا تھا' وہ یہ سن کر بہت ناراض ہوئی۔"

"اسے تو ناراض ہونا ہی تھا۔ وہ کیسے چاہے گی' اللہ وسایا کے قتل کا الزام اس کے بھائیوں پر لگے۔" احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ "وہ تو اسے کبھی نہیں مانے گی۔ پر اس کے ماننے نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس نے نشے کی جھونک میں لہرا کر رحیم داد کو خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ "چوہدری تونے بہت چنگا نکتہ نکالا' بہت چنگا نکتہ نکالا۔ اس بنیاد پر آسانی سے کیس دبایا جاسکتا ہے۔ شبہ بھی نہ ہوگا۔ سننے والے اسے مان بھی لیں گے۔ جمیلہ کے مغویہ ہونے سے یہ فائدہ تو اٹھایا ہی جاسکتا ہے۔ یہ بات تو آس پاس کے علاقے میں بھی پھیلائی جاسکتی ہے۔ جلد ہی پھیل بھی جائے گی۔ یہاں سے سرحد ۳۰ میل سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ حویلی سٹیشن سے سرحد تک پکی سڑک جاتی ہے۔ اس سڑک پر رات تو رات' دن کو بھی سمگلروں کے اونٹ اور ٹرک دوڑتے پھرتے ہیں۔ قاتل آسانی سے واردات کے بعد فرار ہوسکتے ہیں۔"

"ایک گل تجھے اور بتانی تھی۔"

"بتا بتا' ضرور بتا۔" وہ خوش ہو کر ہنسا۔ "آج تو بہت چنگی باتیں کر رہا ہے۔"

"گل ایسہ ہے جی' کیسروالا کے جس زمیں دار کی کڑی سے میرا ویاہ ہونے والا تھا' وہ رشتہ اس نے خود ہی توڑ دیا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "جمیلہ نے یہی بتانے کے لیے مجھے بلایا تھا۔ اس کے پاس چوہدری اکرم کا چچیرا اور بھرجائی آئے تھے۔"

"یہ تو بہت ٹھیک ہوا۔ ویسے میں تجھے پہلے ہی خبردار کرچکا تھا کہ یہ بھی اللہ وسایا کا چکر ہے۔ اب تونے خود ہی دیکھ لیا' اس کے مرتے ہی رشتہ ٹوٹ گیا۔ چوہدری! اچی گل تو ایسہ ہے' تجھ سے حویلی اور اراضی ہتھیانے کے لیے اللہ وسایا کی یہ بھی چال تھی۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "تجھے اب

ہیں اور ویاہ کرنے کی کیا ضرورت۔ جمیلہ موجود ہی ہے۔ اس سے نکاح پڑھا لینا۔"

"مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لگتا ہے' وہ تو اب کسی ے نکاح شکاح نہیں کرنے کی۔ تونے اس کا سیاپا نہیں دیکھا۔ ہر دم روتی ہی رہتی ہے۔"

"رانڈ ہونے کے بعد ہر زنانی ایسے ہی سیاپا کرتی ہے۔ بعد میں سب کچھ بھول جاتی ہے۔ جمیلہ ی زنانی نہیں۔ ابھی تو وہ بھرپور جوان ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ، وہ نہ مانا۔ "شاہ جی' وہ اور ہی طرح کی زنانی ہے۔ تمیں نوں اس کے بارے میں ٹھیک سے پتہ ں۔"

"مجھے سب پتہ ہے۔" احسان علی شاہ ہنس کر بولا۔ "تو دیکھتا جا۔ جیسا کہوں ویسا کر۔ جلد بازی کی ورت نہیں۔ ابھی تو چوٹ تازہ ہے۔ اس سے ہمدردی جتا۔ اسے تسلی دے۔ اس کا دل بہلانے کوشش کر۔ اس کے بچوں سے پیار کر۔ ہر طرح اس کا غم بھلانے اور اس کے دل میں اپنی جگہ ا کرنے کی کوشش کر۔ فیر دیکھ وہ کیسے کابو آتی ہے۔ پکے پھل کی طرح تیری جھولی میں گرے ے۔"

"پر ابھی تو وہ عدت میں ہے۔ مجھ سے گل بات کی تو منہ بکل مار کر چھپالیا تھا۔ پیٹھ موڑ کر بیٹھی ں۔ ابھی تو وہ میرے سامنے آتی بھی نہیں۔ نہ ہی میں اس کے پاس جاسکتا ہوں۔ ملا کہتا ہے عدت ے دنوں میں وہ نامحرم کے سامنے نہیں آسکتی۔ میں اس کے لیے نامحرم ہی تو ہوں۔ میں اس کا کون گا یا شریکا لگتا ہوں۔"

"اور وہ کون سی پکی مسلمان ہے۔ مجھے پتہ ہے وہ کیسے مسلمان ہوئی اور کیوں ہوئی؟" احسان شاہ لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ "نہ کبھی اس نے پردہ شردہ کیا نہ وڈے زمینداروں کی زنانیوں کی طرح گھر ے اندر بیٹھی۔ اس کا رہن سہن تو ہمیشہ ہندنیوں جیسا رہا۔ تونے اسے بہت نزدیک سے دیکھا ہے۔ ب بن سنور کر ادھر سے ادھر تتلی کی طرح اڑی اڑی پھرتی تھی۔ وہ زیادہ دن ایسے بند ہو کر نہیں ھے گی۔ زیادہ سے زیادہ عدت کے دنوں میں حویلی سے باہر نہیں جائے گی۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر احسان شاہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے لا۔ "چوہدری۔ آج رات ادھر ہی ٹھہر جا۔"

"آیا تو اسی ارادے سے تھا۔ واپسی کے لیے گھوڑی بھی میرے پاس نہیں۔"

"گھوڑی تو تجھے مل جائے گی پر اس سے شبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ بھلے آگے بھی تو گھوڑی کی بجائے ں رستے سے آیا کر جس سے آج آیا ہے۔ جمیلہ کو ہرگز پتہ نہیں چلنا چاہیے میرا تیرا میل ملاپ

ہے ورنہ بھڑک جائے گی۔"

"میں نے یہی سوچ کر یہ رستہ پکڑا ہے۔"

"اللہ وسایا تو مزارع ہی رہا۔ اپنا تانگا بھی نہ رکھا۔ پر تو ایسا نہ کرنا۔ تانگا ضرور رکھنا۔ زمیں داری کے چکر میں روز ہی ادھر ادھر جانا پڑتا ہے۔ میرے پاس تو کار بھی تھی۔ پر اب تو پرانی ہو کر بے کار پڑی ہے۔ ویسے پچھلے دنوں میں نے ایک جیپ خرید لی ہے۔ لہور میں ہے۔ جلد ہی پہنچ جائے گی۔ اس کی مجھے سخت ضرورت تھی۔"

"شاہ جی تو ٹھہرا وڈا زمیں دار بلکہ جاگیردار۔ سواری کے لیے چاہے تو نئی موٹر بھی خرید سکتا ہے۔ پر میرے پاس اتنی رکم کہاں۔" رحیم داد نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "اللہ وسایا کے پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ تھا اس سے ۱۲ مربع کلیم خرید لیا تھا۔ وہ بھی جمیلہ نے سکول اور ڈسپنسری بنانے کے لیے بچا کر رکھا تھا۔"

"سب بکواس ہے۔" احسان شاہ نے تلخی سے کہا۔ "اس کے پاس بہت پیسہ تھا۔ یہ تو اس نے تجھ سے چھپانے کے لیے سب کچھ کیا تھا۔ اسے زمیں داری اپنے کبنے میں ہی رکھنی تھی۔ یہ دکھا کر وہ زمیں داری میں سے تجھے کچھ دینا نہیں چاہتا تھا۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"اب تجھے زمیں داری سنبھالنی ہے اور اس طرح نہیں چلانی جیسے اب تک چلتی رہی۔ اللہ وسایا نے تو مزارعوں کے اتنے دماغ خراب کر دیے تھے کہ سارے ہی اپنے تئیں زمیں دار بن گئے۔ سنا ہے ویگار وہ نہیں کرتے۔ بٹائی میں بھی پورا پورا انصف حصہ لیتے ہیں۔ ایک گل ہو تو بتاؤں تیرے پنڈ اور تیری زمیں داری کی ہر گل نرالی ہے۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "سمجھ نہیں آتی تو ان بگڑے ہوئے مزارعوں اور کمیوں کے ساتھ کیسے کام چلائے گا۔"

"شاہ جی! تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ پنڈ میں بالکل ایسا ہی ہوتا رہا۔ جب تک اللہ وسایا زندہ تھا میں نے زمیں داری کے معاملے میں کبھی نہ کچھ پوچھا اور نہ ہی اس میں حصہ لینے کی کوشش کی۔ ویسے میں نے جمیلہ سے بھی ابھی تک زمیں داری کے بارے میں کوئی گل بات نہیں کی۔"

"ابھی اس سے ایسی گل بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔" احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ "پر آگے کے لیے تجھے ابھی سے سوچنا ہوگا۔ اور ویسے ہی زمیں داری چلانی ہوگی جیسے زمیں داری چلائی جاتی ہے۔"

"جیسا تو کہتا ہے ویسا ہی کروں گا۔" رحیم داد نے مشورہ قبول کرتے ہوئے اسے صورت حال سے بھی آگاہ کیا۔ "شاہ جی! ویسے تو زمیندار اللہ وسایا ہی تھا۔ پر زمیں داری کے سارے معاملات

ر پر جمیلہ ہی طے کرتی رہی ہے۔ حساب کتاب تو سارا ہی اسی کے پاس رہتا ہے۔ کسی ے کو ادھار دینا ہو یا وصولی کرنی ہو ایسا ہر کام وہی کرتی ہے۔ مزارعے اس سے خوش بھی ہں۔ اسے پیار سے بھین جی کہتے ہیں۔" اس کے لہجے سے مجبوری جھلکنے لگی۔ "تو خود سوچ ہیں داری کا کام اپنی مرضی سے کیسے چلا سکوں گا۔"

ر جمیلہ تو اب حویلی سے باہر نہیں جا سکتی۔ اسے تو عدت کے چار مہینے دس دن پورے کرنے اس عرصے میں تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا۔ "لگتا ہے تو زمین سنبھالنے کو تیار ہی نہیں۔"

ی گل نہیں۔ میں تو بالکل تیار ہوں۔" اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ "ایسا ارادہ نہ ہوتا تو سایا کو اپنے رستے سے کیوں ہٹانے پر آمادہ ہوتا۔ مشکل یہ ہے زمیں داری کو کیسے اپنے ہاتھ یا جائے۔ جمیلہ سے اس معاملے میں ابھی گل بات کرنی ٹھیک نہیں۔ ڈرتا ہوں اسے شبہ نہ ے۔"

نہیں تو جمیلہ سے ایسی بات نہ کرنا۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔"

حیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔ "وہ کیا ہے جی؟"

تو زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے مینجر اور منشی رکھ لے۔ اسی کے ذریعے زمیں داری کا کام نے کی کوشش کر۔ وہ تیرا تنخواہ دار بندہ ہوگا۔ جیسا تو کہے گا ویسا ہی کرے گا۔ یوں سمجھ لے اس ریعے ساری زمیں داری تیرے ہاتھ میں آجائے گی۔"

گل سمجھ تو آتی ہے۔" رحیم داد نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ "پر ایسا بندہ میں لاؤں گا کہاں ؟"

فکر نہ کر۔ اس کا بندوبست میں کر دوں گا۔ بلکہ میری نظر میں اس کام کے لیے پہلے ہی سے بندہ ہے۔" احسان شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام نادر خاں ہے۔ محکمہ مال میں رہ ہے۔ ڈیرہ غازی خاں کے ایک تمن دار کا کاردار بھی رہ چکا ہے۔ بہت تجربہ کار اور کام کا بندہ ۔ آج کل خالی ہے۔ پچھلے دنوں میرے پاس آیا تھا۔ ادھر رحمت والی میں اس کی سسرال ہے۔ ال وہیں ٹھہرا ہے۔"

"تنخواہ کیا لے گا؟"

"تنخواہ کی فکر نہ کر۔ وہ مجھ پر چھوڑ دے۔ وہ اتنا کام کا بندہ ہے کہ جتنی تنخواہ لے گا اس سے ں زیادہ تجھے فائدہ پہنچائے گا۔" احسان شاہ بے تکلفی سے کھلکھلا کر ہنسا۔ "وہ تجھے پکا زمیں

دار بنا دے گا۔ تو مہاجر ہے 'ادھر کی زمیں داری کے رنگ ڈھنگ کا تجھے زیادہ پتہ نہیں۔ ایسا بند تجھے دوں گا کہ زمیں داری کا لطف آجائے گا۔"

رحیم داد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ یکایک موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ بجلی زور سے کڑکی۔ آسمان میں روشنی کی تیز لکیر دور تک پھیل گئی۔ ساتھ ہی تیز بارش شروع ہو گئی۔ دونوں لان سے اٹھ کر برآمدے میں پہنچ گئے۔ شیدا اور دوسرے نوکروں نے بھاگم بھاگ میز اور کرسیاں اٹھا کر برآمدے میں لگا دیں۔

احسان شاہ اور رحیم داد پھر وہسکی سے شغل کرنے لگے۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بادل زور زور سے گرجتے۔ برآمدے میں تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کبھی کبھی ہلکی سی بوچھاڑ بھی آجاتی۔ دونوں بارش سے لطف اٹھاتے رہے اور وہسکی کے نشے کو دو آتشہ بناتے رہے۔ احسان شاہ تو غٹاغٹ چڑھاتا رہا۔ مگر رحیم داد بھی اس رات حد سے تجاوز کر گیا۔ احتیاط کے باوجود کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ وہ بے تکلفی سے قہقہے لگاتا۔ بات کرتا تو زبان کسی قدر لڑکھڑاتی۔ بہک کر کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ احسان شاہ بھی نشے کے ریلے میں بار بار بہہ جاتا۔ دونوں ہی سرخوشی کے عالم میں تھے۔

دس بجے سے کچھ دیر پہلے دونوں اٹھے اور ڈگمگاتے قدموں سے کھانے کی میز پر پہنچے۔ کھانا پر تکلف اور خوش ذائقہ تھا۔ رحیم داد مزا لے لے کر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ مگر احسان شاہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے ایک طرف ادب سے کھڑے ہوئے شیدا کو دیکھا۔ اشارے سے قریب بلایا۔

شیدا نزدیک آیا تو احسان شاہ نے کہا۔ "چوہدری 'آج رات یہیں ٹھہرے گا۔ کمرہ ٹھیک ٹھاک کرا دے۔" اس نے اپنی مخمور آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ اس نے آنکھیں کھول کر شیدا کی جانب دیکھا۔ "تاجو کو چوہدری کے کمرے میں پہنچا دے۔"

شیدا خاموش رہا۔ کچھ نہ بولا۔ احسان شاہ نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ "چپ کر کے کیوں کھڑا ہے؟"

شیدا نے دبی زبان سے کہا۔ "تاجو تو جی۔" وہ بات کہتے کہتے رک گیا۔

احسان شاہ نے اونچی آواز سے کہا۔ "کیا ہو گیا تاجو کو؟ صاف صاف بتا۔ کوٹ سے نکل کر بھاگ تو نہیں گئی؟"

"نہیں جی ایسی کوئی گل نہیں۔" شیدا بدستور خوف زدہ تھا۔

"فیر کیہ۔ گل ہے؟ ٹھیک ٹھیک بتا۔ کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"وہ ایسا ہے جی۔" وہ ایک بار پھر اٹکا۔ لمحہ بھر خاموش رہ کر آہستہ سے بولا۔ "اسے تو جی ۔ ہوئے شاہ جی نے اپنے کمرے میں بلا رکھا ہے۔"

"اس کھوتی کے جنے نے یہ بھی نہ سوچا تاجو عمر میں اس سے کتنی بڑی ہے۔" وہ غصہ سے آنکھیں نکال کر بولا۔ مگر جلد ہی نرم پڑ گیا۔ آہستہ سے ہنسا۔ رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "یہ انی بھی بہت ظالم ہوتی ہے۔ نہ جوڑ دیکھے نہ بے جوڑ۔ اندھا بنا دیتی ہے۔" اس نے زور کا قہقہہ یا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ جاڑے میں اس کا ویاہ کرنے والا ہوں۔ تاجو اسے سارے گر بتا دے ں۔ بہت زوروں کی رن ہے۔"

رحیم داد بے نیازی سے بریانی کی پلیٹ سے لقمے اٹھا اٹھا کر کھاتا رہا۔ شیدا سر جھکائے چپ کھڑا ہا۔ احسان شاہ آنکھیں بند کر کے ایک بار پھر مراقبے میں چلا گیا۔ چند لمحوں بعد گردن اٹھا کر شیدا ں جانب متوجہ ہوا۔ "شیدے!" وہ بات کہتے کہتے بھٹکا۔ "ٹھیک ہے 'ٹھیک ہے۔ بلو کیسی رہے گی؟ لکل ٹھیک۔ اسے پہنچا دے۔ وہ نخرا نخرا بھی نہیں کرے گی۔ چوہدری کو تو ایسی ہی رن ا ہیے۔" اس نے رحیم داد کی سمت دیکھا۔ "کیوں چوہدری کیا خیال ہے تیرا؟ اگر تجھے تیز اور گرم ا ہیے تو بتا دے۔"

"میں نوں تو جی نہ گرم چاہیے نہ ٹھنڈی۔ میں تو ایسے ہی سو جاؤں گا۔ میری فکر نہ کر۔"

"چوہدری تو زنانیوں کی طرح شرما کیوں رہا ہے؟ داڑھی رکھ کر تو بالکل ملاں بن گیا۔" وہ ٹھٹھا مار ر ہنسا۔ "ملاں بن کر زمین داری نہیں چل سکتی۔ اور ملاں بے چارے کو تو زنانی ملتی ہی کہاں ہے؟ ا تو صرف اس کے خواب دیکھتا ہے۔ اور تو 'تو۔" وہ ایک بار پھر بہکا اور دوسری طرف نکل گیا۔ جمیلہ بھی بہت زوروں کی رن ہے۔ جب اللہ وسایا اسے اٹھا کر لایا۔ یہ کوئی اٹھ سال ادھر کی گل ہے۔ میں اسے دو ہزار دیتا رہا کہ میری حویلی میں بھیج دے۔ پر وہ نہ مانا۔" اس نے پلٹ کر شیدا کی انب دیکھا جو سر جھکائے بت بنا کھڑا تھا۔ "تو ابھی گیا نہیں۔ جا' جا کر چوہدری کے ٹھہرنے کا ندوبست کر۔ بلو کو پہنچا دے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو پھر چھیڑا۔ "چوہدری! ساون کی یہ گرجتی سی کالی راتیں روز روز نہیں آتیں۔ کیا سمجھا؟"

شیدا جانے کے لیے مڑا۔ احسان شاہ نے اسے ٹوکا۔ "ٹھیر! میں آج باڑی والے کمرے میں ہوں گا۔ رانی اور دلاراں' دونوں کو بھیج دے۔ جو ٹھیک لگے گی اسے روک لوں گا۔ اب تو ٹرجا ر فافٹ سارا بندوبست کر دے۔"

شیدا چلا گیا۔ رحیم داد اطمینان سے کھانا کھانے میں جتا تھا۔ احسان شاہ نے اسے مخاطب کیا۔

"چوہدری! یہ اپنا شیدا، بہت کام کا بندہ ہے۔ تجھے بھی ایسے ہی بندے کی ضرورت پڑے گی۔ فکر نہ کر۔ نادر خاں تیرا مینیجر لگ گیا تو تیرے لیے کسی ایسے ہی بندے کا انتظام کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔ پانی کا گلاس اٹھایا۔ اس کا ہاتھ ڈگمگایا۔ گلاس چھوٹ کر میز پر گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ پانی میز پر دور تک پھیل گیا۔

رحیم داد نے چونک کر احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ خفیف ہو کر بولا۔ "معاف کرنا شاہ جی۔"

"کوئی گل نہیں۔" احسان شاہ نے اسے احساس ندامت میں مبتلا نہ ہونے دیا۔ "پانی کے بجائے تو لسی پی لے۔ نشے کی تیزی ذرا کم ہو جائے گی۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "آج تم نے بھی ہم کر لگائی ہے۔" احسان شاہ نے میز پر رکھے ہوئے جگ سے لسی ایک گلاس میں انڈیلی اور گلاس رحیم داد کی جانب بڑھایا۔

رحیم داد نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ لسی سے بھرا ہوا گلاس سنبھالا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔

☆

بارش کا زور اب ٹوٹ چکا تھا۔ بپھری ہوئی ہوا بھی مدھم پڑ گئی تھی۔ مگر بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ کچھ دیر بعد شیدا آ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی رحیم داد اور احسان شاہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ احسان شاہ باڑی کی طرف چلا گیا۔ رحیم داد نے شیدا کی رہنمائی میں آگے قدم بڑھائے۔ اس کے قدم بہکے بہکے تھے۔ نظریں کسی قدر دھندلی پڑ گئیں تھیں۔ دونوں راہداری سے گزر کر برآمدے میں پہنچ گئے۔

شیدا آگے آگے تھا۔ رحیم داد اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

شیدا ایک کمرے کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے کمرے کا بند دروازہ کھول دیا۔ اندر لیمپ روشن تھا۔ برآمدے کے آگے باغیچے میں سرس کے دو اونچے اور گھنے درخت تھے۔ درختوں تلے اندھیرا تھا۔ اندھیرا میں کوئی دھندلے سائے کی مانند چپ چاپ کھڑا تھا۔ شیدا نے مڑ کر ادھر دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"اٹھے آ جا۔"

درختوں کے نیچے آہٹ ابھری۔ ذرا دیر بعد برآمدے کی سیڑھیاں طے کر کے ایک نوجوان عورت اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئی۔ رحیم داد نے دیکھا، کمرے کے اندر سے پھوٹتی ہوئی لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ شیدا کے قریب گم صم کھڑی ہے۔ اس کی عمر تیئس چوبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ چھینٹ کی شکریل پہنے تھی۔ سر پر لہریا دوپٹہ تھا۔ اس کا جسم قدرے پھیلا ہوا

ا۔ چہرہ بھی چوڑا چکلا تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ اسے دیکھ کر پہلی نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ ذرا ہی دیر پہلے اس نے تیل ڈال کر سر کے بال سنورے ہیں، آنکھوں میں کاجل لگایا ہے۔ اس کا لباس شوخ اور اجلا تھا۔ مگر وہ خود سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

شیدا نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "یہ بلو ہے جی۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔ شیدا نے بلو کا بازو پکڑ کر ہولے سے گھسیٹا اور اس کے ہم راہ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دہلیز کے پاس رک کر کہا۔ "چوہدری! دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ میں نوں شاہ جی کے پاس جاتا ہے۔" وہ دروازے کے دونوں پٹ بھیڑ کر چلا گیا۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ برآمدے میں گہرا سناٹا چھایا تھا۔ رات کالی اور بھیگی ہوئی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے نرم اور خنک جھونکے اندر آ رہے تھے۔ باغ میں بارش کی بوندیں پتوں پر جل ترنگ بجا رہی تھیں۔ رحیم داد نے بلو کو گہری نظروں سے دیکھا۔ نشے کا ایک زور دار ریلا آیا۔ بلو ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی، دھندلی پڑ گئی۔ ریلا گزر گیا تو وہ اور نکھر کر سامنے آ گئی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں چراغ جل رہے تھے، بجھ رہے تھے۔ بلو اوجھل ہو جاتی، نئی چھب دکھا کر سامنے آ جاتی۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور لیمپ بجھ گیا۔

سویرے سویرے جب رحیم داد کمرے سے نکلا تو بلو موجود نہ تھی۔ اس وقت بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رحیم داد نے نہا دھو کر ناشتا کیا۔ ناشتے پر اس کے ساتھ احسان شاہ بھی موجود تھا۔ اس کی آنکھیں نشے کے خمار سے اب تک سرخ تھیں۔ ناشتے پر وہ خاموش رہا۔

رحیم داد نے ناشتے سے فارغ ہو کر واپس جانے کا اظہار کیا۔

احسان شاہ نے پوچھا۔ "چوہدری! اب تو کب آئے گا؟"

"میں خود ہی آ جاؤں گا۔" رحیم داد نے دبی زبان سی کہا۔ "پر تو مالکے کو میرے پاس نہ بھیجنا۔ اس کے آنے جانے سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔" اس نے اپنا خدشہ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"تو کہتا ہے تو اسے تیرے پاس نہیں بھیجوں گا۔ پر تجھ سے ملاقات ہوتی رہنی چاہیے۔"

رحیم داد نے کہا۔ "میں جلد ہی تیرے پاس آنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے بھی ادھر اکیلے میں بہت جی گھبراتا ہے۔" وہ بے تکلفی سے ہنسا۔

"پر تو جلدی نہ آنا۔" احسان شاہ نے کہا۔ "میں ہفتہ بھر کے لیے لہور جا رہا ہوں۔ کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ دس باراں روز بعد آنا۔ میں اس بیچ میں نادر خاں کو بھی بلوا لوں گا۔ کام کا بندہ

ہے۔ کہیں اور لگ گیا تو ایسا مینجر ملے گا نہیں۔ تیرے لیے تو وہ بہت ضروری ہے۔ تجھے ادھر کی زمیں داری کا کچھ اتا پتا نہیں۔ نادر تیرے ساتھ لگ گیا تو زمیں داری ایسی چکا دے گا کہ تیرا بالکل جی نہ گھبرائے گا۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "حد ہو گئی جی' زمیں دار کا اپنی ہی زمیں داری میں دل گھبرائے۔"

رحیم داد نے اس کی باتیں سنیں اور صرف مسکرا کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ احسان شاہ سے رخصت ہوا۔ اسی کے ذاتی تانگے سے حویلی اسٹیشن پہنچا۔ جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے کوٹ ہرکشن واپس گیا۔ پچھلی رات کی موسلا دھار بارش نے سڑکیں اور راستے اس قدر خراب کر دیے تھے کہ جب وہ مہمان خانے میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ احمد اس کا بے چینی سے منتظر تھا۔ دیکھتے ہی بولا۔

"چوہدری! تو نے بہت دیر لگا دی۔ میں تو رات سے تیرا انتظار کر رہا تھا۔"

"تیرا مغز تو نہیں چل گیا۔" رحیم داد نے جھنجلائے ہوئے انداز میں اسے ڈانٹا۔ "رات بھر بارش ہوتی رہی۔ میں ایسے میں کیسے سفر کر سکتا تھا۔"

احمد اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ جلدی سے صحن میں کرسی لا کر ڈال دی۔ رحیم داد اس پر بیٹھ گیا۔ احمد کمرے کے اندر سے دھوتی اور سلیپر نکال کر لایا۔ اس نے رحیم داد کے جوتے اتارے' پگڑی سنبھالی اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے کپڑے اتار کر دھوتی باندھی اور غسل خانے میں چلا گیا۔ نہا کر آیا۔ اجلا لباس پہنا۔ مہمان خانے سے نکل کر باغ میں چلا گیا۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ فضا میں حبس تھا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔

رحیم داد دن بھر کا بھوکا تھا۔ احسان شاہ کی حویلی میں ناشتا کرنے کے بعد اس نے راستے میں کچھ نہیں کھایا تھا۔ باغ میں پہنچتے ہی اس نے احمد سے کھانا لانے کو کہا۔ کھانا آیا تو اس نے سیر ہو کر کھایا۔ رات گئے تک باغ میں بیٹھا رہا۔ جب سناٹا گہرا ہو گیا تو وہ مہمان خانے میں گیا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔

☆

ساون بھادوں مل رہے تھے۔ کالے کالے بادل گھر گھر کر امڈتے رہے۔ زور زور سے گرجتے رہے' برستے رہے۔ پانچ روز تک مینہ کی جھڑی لگی رہی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا' بادل اب برس کر نہ رکیں گے۔ آسمان سرمئی چادر بن گیا تھا۔ چھلنی کی مانند پانی برستا تھا۔ خدا خدا کر کے مینہ برسنا بند ہوا۔ ہر طرف جل تھل ہو گیا تھا۔ جدھر نظر اٹھتی پانی ہی پانی نظر آتا۔ گاؤں کے گلی کوچوں میں جگہ

جگہ پانی کھڑا تھا یا کیچڑ تھی۔

پہر دن گزر چکا تھا۔ رحیم داد کمرے میں تھا۔ وہ باہر نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور وکیل محمد عثمان رندھاوا اندر داخل ہوا۔

آسمان پر بادلوں کا ہلکا ہلکا غبار چھایا تھا۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ موسم خوش گوار تھا۔ مگر وکیل کا چہرہ خلاف معمول زیادہ ہی سنجیدہ نظر آتا تھا۔ وہ بجھا بجھا لگتا تھا۔ جمیلہ سے وہ پہلے ہی مل چکا تھا۔

رحیم داد نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو اظہار ہمدردی کے طور پر پوچھا۔ "وکیل صاحب! کیا بات ہے جی۔ بہت پریشان نظر آ رہے ہو؟"

"پریشانی کی بات ہی ہے۔ اندھیر ہے' سراسر اندھیر ہے۔" وکیل نے شکوہ کیا۔

"کیا ہو گیا جی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہونا کیا تھا' پولیس' اللہ وسایا کے قتل کو دبانے کی ہر طرح کوشش کر رہی ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"پچھلی بار تو کہا تھا تھانے دار نے کتل کا پتہ چلا لیا ہے۔ جلد ہی ملزموں کی گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی۔ اب کیا ہو گیا؟"

"اب کچھ بھی نہیں ہو گا۔" وکیل نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "انسپکٹر محمد حیات جنجوعہ پوری تن دہی اور دلچسپی سے تفتیش کر رہا تھا۔ اچانک اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔"

"اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ کیوں؟ کوئی تو وجہ ہو گی۔"

"یہ تو افسران بالا ہی کو علم ہو گا۔ میں تو یہ جانتا ہوں پچھلے دنوں اس کا تبادلہ کر کے دوسرا تفتیشی افسر لگا دیا گیا۔" وکیل محمد عثمان رندھاوا نے بتایا۔ "یہاں آنے سے پہلے میں اس سے ملا تھا۔ کہتا تھا اللہ وسایا کو اس کی گھر والی کے بھائیوں نے رات کے اندھیرے میں قتل کیا اور سرحد پار نکل گئے۔ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس نے اپنی تفتیش ختم کر دی۔ آگے کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔"

"ایسا ہی لگتا ہے۔" رندھاوا نے کہا۔ "چوہدری! تجھے تو پتہ ہے۔ ایسی افواہ تو پہلے ہی سن نے میں آ رہی تھی۔ تو نے بھی مجھ سے یہی بات بتائی تھی۔ زمیں دارنی کو بھی اس کا پتہ چلا تھا۔ وہ اسے سن کر خفا بھی ہوئی تھی۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میں تو کہتا ہوں ایسی افواہ جان بوجھ کر پھیلائی گئی تاکہ کیس دبانے میں آسانی ہو۔ اسی لیے انسپکٹر جنجوعہ کا تبادلہ ہوا۔ مجھے تو اللہ وسایا کے کتل کے پیچھے گہری سازش نظر آتی ہے۔"

"آگے کچھ نہیں ہو سکتا؟" رحیم داد نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

"زمیں دارنی گورنر، وزیر اعلیٰ اور آئی۔ جی پولیس کو درخواستیں بھیجنے کو کہتی تھی۔ درخواستیں میں اس کے کہنے پر لگا دوں گا پر اب کچھ ہوتا نظر نہیں آتا۔ کیس تفتیش کے ابتدائی مرحلے پر خراب کردیا جائے تو اس کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے یہی دیکھا ہے۔"

"اس کا مطلب تو صاف یہ ہوا تفتیش آگے نہیں چلے گی۔"

"فی الحال تو تفتیش کا کام ختم کر کے کیس دبا دیا گیا۔ حالانکہ پولیس کے پاس زمیں دارنی کے بھائیوں کو ملزم ٹھیرانے کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ تھانے دار نے خانہ پری کے لیے اپنے لگے بندھے گرگوں کی شہادت کا سہارا لیا ہے اور یہ پولیس کا پرانا حربہ ہے۔ کوئی نئی گل نہیں۔" وکیل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کچھ دنوں بعد سن لینا پولیس نے کیس داخل دفتر کردیا۔"

"یہ تو جی بہت اندھیر گردی ہے۔"

"ہے تو۔" وکیل نے موضوع بدلتے ہوئے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! میں تیرے پاس اس لیے آیا تھا کہ اللہ وسایا کے مرنے کے بعد مختار نامہ تو خود بخود ختم ہوگیا۔ اب کلیم کے ہر معاملے سے تجھے خود نمٹنا پڑے گا۔"

"میں نوں کیہہ نمٹنا شمٹنا جی۔" رحیم داد نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "جیسا کہو گے ویسا کروں گا۔ پر ابھی تو کچھ نہیں کرنا۔"

"بات یہ ہے چوہدری! تیرے کلیم میں کچھ گڑبڑ ہے۔ اللہ وسایا نے اس کے بارے میں تجھے بتایا بھی ہوگا۔"

"اس نے تو جی مجھے کچھ نہیں بتایا۔" رحیم داد نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "گھبرانے کی تو کوئی گل نہیں؟"

"معاملہ ویسے تو پیچیدہ ہے۔ پر میں کوشش کر رہا ہوں کہ ٹھیک ہو جائے۔" وکیل نے اسے آگاہ کیا۔ "مگر اس کے لیے پیسے کی ضرورت ہے۔ میں نے زمیں دارنی سے ذکر کیا تو اس نے ہزار روپے خرچ کے لیے دیئے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ویسے اس کے پاس پیسہ بالکل نہیں۔ سب کچھ تو ۱۲ مربع اراضی کے کلیم کی خریداری میں دے دیا۔ ابھی اسے اللہ وسایا کا چالیسواں بھی کرنا ہے۔"

"تمہارا مطلب چاہلیا کرنے سے ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ہاں میرا یہی مطلب ہے۔" وکیل نے جواب دیا۔ "زمیں دارنی اسے اپنی حیثیت کے مطابق

ہی کرے گی۔ ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں ابھی تو ہزار روپے سے کام چلانے کی کوشش کروں گا۔" اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ "اگر معاملہ زیادہ الجھ گیا تو تگڑی رقم کھلائے بغیر کام نہیں بنے گا۔ مہینے، دو مہینے کے اندر کم از کم چار ہزار کا بندوبست کرنا ہوگا۔ ویسے یہ بات میں نے زمیں دارنی سے نہیں کہی۔ وہ اور پریشان ہو جاتی۔ پر اب تم کو ہی زمیں داری کی دیکھ بھال کرنی ہے اور اس کلیم کا تو براہ راست تعلق اس جائیداد سے ہے جو تم کو الاٹ ہوئی ہے۔"

رحیم داد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر وکیل صاحب میں تو ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔ زمین کا الاٹمنٹ ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ خریف کی فصل تیار ہو تو کچھ رکم ہاتھ آئے۔ تیں نوں پتہ ہی ہے، پہلے بھی سب کچھ اللہ وسایا اور اس کی گھر والی ہی نے خرچ کیا تھا۔ زمیں داری کی اب تک دیکھ بھال بھی وہی دونوں کر رہے تھے۔ میں نے تو اس بارے میں ابھی کچھ سوچا بھی نہیں۔"

"اسی لیے میں نے تم کو دو مہینے دیئے ہیں۔ اس عرصہ میں رقم کا بندوبست کرنا ہوگا۔ جی چاہے تو زمیں دارنی سے بات کرلو۔ میں نے پہلے سے آگاہ کردیا۔"

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ وکیل اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ چلتے چلتے اس نے خبردار کیا۔ "چوہدری! رقم کا انتظام کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ الاٹمنٹ منسوخ ہونے کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔" وکیل مڑا اور کمرے سے چلا گیا۔

وکیل محمد عثمان رندھاوا سے گفتگو کے بعد رحیم داد کو یہ تو اطمینان ہوگیا کہ تھانے دار جنجوعہ کا تبادلہ کردیا گیا ہے اور نئے تھانے دار نے ملزموں کو مفرور قرار دے کر تحقیقات ختم کردی ہے۔ اللہ وسایا کا قتل اب اس کے لیے باعث تشویش نہ رہا تھا۔ احسان شاہ نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا تھا بالکل ویسا ہی ہوا۔ رحیم داد اس کے اثر و رسوخ سے بہت متاثر ہوا۔ مگر اس تشویش سے نجات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک نئی پریشانی میں مبتلا ہوگیا۔ یہ کلیم اور اس کی بنیاد پر الاٹ ہونے والی اراضی اور جائیداد کا مسئلہ تھا۔ وکیل کی باتوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کلیم میں کوئی گڑبڑ ہے۔ ہرچند کہ وہ بہت معمولی زمین دار رہ چکا تھا مگر ہر زمیں دار کی طرح زمین اور جائیداد اس کی بھی بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ ہر قیمت پر کوٹلہ ہرکشن کے دس مربعے اور حویلی اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا۔ بلکہ جمیلہ کے بارہ مربعوں پر بھی اس کی نظر تھی۔ اللہ وسایا کے قتل میں احسان شاہ کا آلۂ کار بننے کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی۔

رحیم داد مہمان خانے سے نکل کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے فصلوں کو دیکھا۔ مزارعوں سے ان کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ بہت دیر تک مزارعوں کے ساتھ ہی رہا۔

اب اس کا یہ معمول ہو گیا کہ دن میں کسی وقت کھیتوں کی طرف چلا جاتا اور مزارعوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتا۔ وہ زمیں داری کے کاموں میں ذاتی طور پر دلچسپی لینے لگا تھا۔ شام کو وہ باغ میں بیٹھتا۔ وہاں بھی مزارعوں کو بلالیتا۔ ان کے ساتھ موسم اور فصلوں کے علاوہ بیماری اور شادی بیاہ کے بارے میں بھی باتیں ہوتیں۔ مگر گھوم پھر کر اللہ وسایا کا ذکر ضرور ہوتا۔ اور ایک بار اس کا ذکر چھڑ جاتا تو دیر تک چلتا رہتا۔ رحیم داد کو ان کے رویّے سے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ اللہ وسایا اور جمیلہ' دونوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور اس حد تک کرتے ہیں کہ اللہ وسایا مرحوم کے بارے میں گفتگو کرتے کرتے ان کے چہرے اداس اور غم زدہ ہو جاتے۔ وہ دل گرفتہ ہو کر رو پڑتے۔ کبھی کبھی رحیم داد کو ان کا یہ رویّہ بڑا شاق گزرتا۔

اللہ وسایا مر کر بھی زندہ تھا۔ اور جب تک وہ کسی نہ کسی روپ میں زندہ تھا' رحیم داد کو زمیں داری کے معاملات میں اپنا سکہ بٹھانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے ایک ایسے تجربہ کار اور قابل اعتماد آدمی کی ضرورت تھی جو مزارعوں کے ذہنوں میں جھلملاتا ہوا اللہ وسایا کی یادوں کا چراغ بجھا کر رحیم داد کی شخصیت کا چراغ روشن کر سکے۔ ایسا آدمی احسان شاہ نے مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ اب تک پہنچا نہیں تھا۔ رحیم داد بھی احسان شاہ کے پاس جا نہ سکا تھا۔ موقع ہی نہ ملا۔

☆

کئی روز سے بارش نہ ہوئی تھی۔ ہوا بھی بند تھی۔ آسمان پر بادل چھائے رہتے۔ مگر کھل کر نہ برستے۔ کبھی کبھار ہلکا سا چھینٹا پڑتا۔ اس کے بعد حبس اور بڑھ جاتا۔ دن بھر سخت تپش رہتی۔ جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ سورج کبھی بادلوں کے پیچھے روپوش ہو جاتا کبھی نکل کر سامنے آجاتا۔ اس کی چمک دمک بہت تیز ہوتی۔ دھوپ میں اس قدر تمازت اور چبھن ہوتی کہ بدن پگھلتا ہوا محسوس ہوتا۔

انھی دنوں اللہ وسایا کا چالیسواں ہوا۔ جمیلہ نے اس سلسلے میں رحیم داد سے کوئی مشورہ نہ کیا۔ صرف اتنا کیا کہ ایک شام جب وہ مہمان خانے سے باغ میں جانے کا ارادہ کر رہا تھا تو احمد حویلی کے دروازے سے نکل کر آیا اور اسے مطلع کیا۔

"چوہدری! زمیں دارنی نے کہا ہے' اللہ وسایا کا چالیا ہونے والا ہے۔"

"کب ہو رہا ہے چالیا؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"کل ہے جی۔" احمد نے بتایا۔

"اللہ وسایا تو ایسا نیک اور چنگا بندہ تھا کہ اس کا چالیا تو اکٹھ کھلانا چاہیے۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چہرے کو افسردہ بنانے کی کوشش کی۔ "وکھت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ کل اللہ وسایا کی موت کو ۴۰ دن ہو جائیں گے۔ اس کا چالیا اور اکٹھ ہو گا۔ سال بھر بعد وڈا اکٹھ ہو گا۔ دوسرے سال دو رھیا' تیسرے سال تو رھیا اور چوتھے سال چورھیا ہو گا۔ وکھت دھیرے دھیرے ایسے دھوپ چھاؤں کی طرح گزر جاتا ہے' کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

احمد کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے رحیم داد کا چہرہ ٹکر ٹکر تکتا رہا۔ رحیم داد کچھ دیر گم صم کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا مہمان خانے سے باہر چلا گیا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کے ہلکے ہلکے سائے پھیلے تھے۔ آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔

جمیلہ نے چالیسویں کے لیے بڑے اہتمام سے کھانا پکوایا۔ گاؤں کے تمام ہی مزارعے اور کمی' مرد اور عورتیں حویلی کے باہر اور اندر جمع ہوئے۔ پاس پڑوس کے گاؤں اور چکوں سے بھی لوگ آئے۔ مسجد کے ملاّ نے فاتحہ خوانی کی۔ وہ نیا لباس پہنے ہوئے تھا جو جمیلہ نے اللہ وسایا کے نام پر اسے خیرات میں دیا تھا۔ فاتحہ کے بعد سب نے کھانا کھایا اور اللہ وسایا کے لیے دعائے مغفرت کی۔ رحیم داد اس روز بہت مصروف رہا۔ رات گئے تک حویلی کے باہر سائبان کے نیچے چالیسویں کی فاتحہ میں شریک ہونے والوں کی ساتھ رہا۔

حویلی کے اندر اور باہر خاصی چہل پہل رہی۔ مگر چالیسویں کے بعد حویلی اور زیادہ اجاڑ اور سنسان نظر آنے لگی۔ رحیم داد کی بیشتر شامیں تنہا گزرتیں۔ جمیلہ سے بھی اس کی ملاقات نہ ہوئی۔ نہ اس نے بلایا اور نہ ہی بلائے بغیر وہ اس کے پاس جا سکتا تھا۔ شام کو وہ باغ میں مزارعوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا یا اکیلا بیٹھا رہتا۔

☆

یہ ایک اداس اور بے کیف شام تھی۔ رحیم داد باغ میں خاموش بیٹھا تھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ شام کا دھندلکا دھیرے دھیرے فضا میں گھل رہا تھا۔

شام کی اس خاموشی میں دفعتہ درختوں تلے قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے گردن کو خم دے کر اس طرف دیکھا' درختوں کے نیچے سے ایک شخص نکل کر آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ رحیم داد نے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ وہ نظریں جھکائے آگے بڑھ رہا تھا۔ رحیم داد کے سامنے پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔ اس کی عمر پچپن سے تجاوز کر چکی تھی۔ مگر

جسم ابھی تک مضبوط اور صحت مند تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ سر پر پگڑی بھی ڈھیلی ڈھالی تھی۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ وہ قمیض اور شلوار پہنے تھا۔ گرمی اور حبس کے باوجود کوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔

رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ پہچاننے کی کوشش کی۔ مگر پہچان نہ سکا۔ اجنبی نے نظریں جھکا لیں۔ ادب سے خاموش کھڑا رہا۔ رحیم داد نے پوچھا۔ "تیں نوں کسے ملنا ہے؟"

"میں نے جی چوہدری نوراللی سے ملنا ہے۔" اس کا لہجہ نرم اور محتاط تھا۔ "میرا نام نادر خاں ہے۔ مجھے سید احسان علی شاہ نے بھیجا ہے۔"

"تجھے شاہ جی نے بھیجا ہے۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یاد آیا' شاہ جی نے تیرے بارے میں مجھ سے پچھلے دنوں بات کی تھی۔"

نادر خاں نے' جو اب تک رحیم داد کے روبرو کھڑا تھا' نہایت ادب سے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ "بیٹھ سکتا ہوں جی؟"

"بیٹھ جا' ضرور بیٹھ جا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "شاہ جی آج کل پیراں والہ ہی میں ہوتا ہے نا؟ لہور سے تو لوٹ آیا ہوگا۔"

"یہ تو جی میں نوں پتہ نہیں۔" نادر خاں کرسی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ "شاہ جی نے پرسوں مجھے بلوایا تھا۔ دیر تک تیرے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ سمجھاتا رہا مجھے کیا کیا کام یہاں کرنے ہوں گے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنی جیپ لے کر ادھر آیا تھا اور نہر کے پاس مجھے چھوڑ کر آگے چلا گیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہ جی لہور سے جیپ بھی لے آیا۔"

"اس کے لیے ضروری بھی تھی۔ زمینداری چلانے کے لیے جیپ یا کم از کم اپنی سواری بہت ضروری ہے۔ اب خالی گھوڑی سے کام نہیں چلتا۔ ویسے گھوڑی اور سیکل تو اب ہر چھوٹے موٹے زمیندار کے پاس بھی ہے۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کب سے کام شروع کرنے کا ارادہ ہے؟"

"حکم کریں جی۔ میں کل ہی سے کام شروع کر دوں گا۔ میں تو آیا ہی اسی ارادے سے ہوں۔" نادر نے مستعدی سے جواب دیا۔

رحیم داد نے نادر کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا جو اس کے سامنے کرسی پر سکڑا سکڑایا' قدرے

جھکا ہوا ادب سے بیٹھا تھا۔ رحیم داد کی گردن کچھ اور تن گئی۔ اس نے لہجے میں رعب داب پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"تیرے بال بچے بھی ہیں؟"

"ہیں تو جی۔" نادر نے مسکین سی شکل بنا کر جواب دیا۔ "میں جی انھیں بعد میں لے آؤں گا۔ ابھی ایسی جلدی بھی نہیں۔" اس نے اپنی مستعدی اور فرض شناسی سے رحیم داد کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے تو جی سب سے پہلے گھوم پھر کر پنڈ کا جائزہ لینا ہوگا۔ فصلوں کو دیکھنا ہوگا۔ مزارعوں سے ملنا ہوگا۔ پٹواری کے پاس جانا ہوگا۔ اس کے بعد میں رپورٹ پیش کروں گا۔ فیر جو فیصلہ آپ نے کرنا ہے اسے سامنے رکھ کر کام کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" رحیم داد کی آواز گونج دار تھی۔ "آج رات ادھر ہی ٹھیر جا۔ سویرے سے کام شروع کر دے۔ تیری تنخواہ وغیرہ کا معاملہ شاہ جی سے ملنے کے بعد طے ہوگا۔ میں اسے جلد ہی ملنے کی کوشش کروں گا۔"

"جیسی مرضی جی۔" نادر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "شاہ جی نے بھی مجھ سے ایسی ہی گل بات کی تھی۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ نادر گردن جھکائے ادب سے بیٹھا رہا۔ شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ نوکر نے لیمپ روشن کیا اور احتیاط سے اسٹول پر رکھ دیا۔ نادر نے لیمپ کی روشنی میں رحیم داد کے چہرے پر نظر ڈالی۔ زیر لب مسکرایا۔ "چوہدری! تسیں دیکھنے میں بلوچ سردار یا تمن دار لگتے ہو۔ ڈیرے جات میں تو پہلے نہیں رہے۔" اس کے انداز میں خوشامد کا پہلو نمایاں تھا۔

رحیم داد اس کے رویئے سے خوش بھی ہوا۔ اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مونچھوں کی نوکوں کو مروڑتے ہوئے بولا۔ "نہیں جی' میں ادھر نہیں گیا۔"

"حیرت کی گل ہے۔" نادر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "میں تو پہلی نظر میں یہ سمجھا تسیں کھوسہ تمن دار ہو؟"

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر نادر زیادہ چپ نہ بیٹھ سکا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی پچھلی ملازمتوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس نے رحیم داد کو بتایا کہ محکمہ مال کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد وہ ڈیرہ غازی خاں کے ایک دریشک تمن دار کی جاگیر کا کاردار مقرر ہو گیا تھا۔ اس ملازمت کے دوران اس نے کیا کیا کارگزاری دکھائی اور کیسے کیسے کارنامے انجام دیئے؟ انھیں وہ تفصیل سے سناتا رہا۔ اس نے تمن داروں اور سرداروں کے رعب و دبدبے کے ساتھ ان کی

دہشت گردی کی ہولناک داستانیں بھی سنائیں۔ مزاریوں اور لغاریوں کی رقابتوں اور ان کے مسلح تصادم کی واردات بیان کیں۔ باتوں باتوں میں وہ مزارعوں کو قابو میں رکھنے اور زمیں داری پھیلانے اور بڑھانے کے ہتھکنڈے اور گر بھی بتاتا رہا۔ سرکاری افسروں سے تعلقات پیدا کرنے، ان سے کام نکالنے اور انہیں خوش رکھنے کے طور طریقے بھی بتاتا رہا۔

نادر خاں کا لہجہ شہری تھا۔ سرکاری نوکری کے سلسلے میں وہ برسوں لاہور اور دوسرے شہروں میں رہ چکا تھا۔ جاگیرداروں اور رئیسوں کی ملازمت میں رہنے کے باعث خاصا مزاج شناس بھی بن گیا تھا۔ نادر خاں نے اپنی دلچسپ اور لچھے دار باتوں سے جلد ہی رحیم داد کے دل میں جگہ پیدا کرلی۔ وہ نادر خاں کے تجربے اور سوجھ بوجھ سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اسے کام کا آدمی نظر آیا۔ دیر تک خاموش بیٹھا توجہ اور انہماک سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

جب وہ خاموش ہوا تو رحیم داد نے پوچھا۔ "نادر! تو نے تمن داروں کی نوکری کیوں چھوڑی؟"

"وہ ہوا یہ جی کہ میری پہلی گھروالی گزر گئی۔" نادر نے بتایا۔ "کچھ عرصے بعد ادھر رحمت والی میں دوسرا ویاہ کرلیا۔ چھ سات مہینے تو وہ میرے ساتھ ڈیرہ غازی خاں میں رہی۔ فیر اس کا دل ایسا اچاٹ ہوا کہ کسی طور وہاں رہنے کو تیار نہ ہوئی۔ مجبوراً مجھے ملازمت چھوڑنی پڑی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "ملازمت نہ چھوڑتا تو گھروالی کو چھوڑنا پڑتا۔ اس طرح میں نوکری چھوڑ چھاڑ ادھر آگیا۔ کچھ مدت تک آڑھت کا کاروبار کیا۔ وہ چل نہ سکا تو اسسٹنٹ کمشنر کے دفتر میں عرائض نویسی کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ کلیم بنوانے اور الاٹمنٹ کروانے کا دھندا بھی کرتا رہا۔ مگر اس دھندے میں اب پہلی سی بات نہیں رہی۔ ایسی اندھیر گردی مچی ہے کیا بتاؤں۔ اوپر سے نیچے تک ہر جگہ رشوت کا بازار گرم ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "چار پانچ مہینے ہوئے عرائض نویسی کا کام ختم کرکے رحمت والی آگیا۔ اس دوران سردار عزیز اللہ دریشک نے راجن پور بلوایا بھی پر گھروالی کسی طور راضی نہیں ہوئی۔"

"شاہ جی سے تیری کب سے جان پہچان ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

نادر خاں نے بتایا۔ "ویسے تو جی کوئی سال بھر سے اوپر ہوا لاہور میں پہلی بار شاہ جی سے ملا تھا۔ لیکن جب میں رحمت والی آگیا تو ان سے اکثر ملتا رہا۔"

رحیم داد نے سلسلہ گفتگو منقطع کردیا۔ نوکر سے کھانا لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں کھانا چن دیا گیا۔ رحیم داد نے نادر خاں کو بھی کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر اس نے انکساری اور حفظ مراتب کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار کردیا۔ "میری یہ حیثیت نہیں جی کہ آپ کے ساتھ بیٹھ کر

روٹی کھاؤں۔ میں نے تو صرف یہ معلوم کرنا ہے، مجھے کہاں ٹھیرنا ہوگا۔ اس کا انتظام کون کرے گا؟! آگے میرے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

رحیم داد نے احمد کو بلوایا۔ وہ آیا تو رحیم داد نے نادر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ مہمان خانے میں ٹھیرے گا۔ اسے اپنے ساتھ لے جا۔ اس کے ٹھیرنے اور روٹی ٹکر کا بندوبست کردے۔"

نادر خاں نے احمد کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر اس کے ہم راہ چلا گیا۔ رحیم داد نے کھانا کھایا مگر دیر تک مہمان خانے میں نہ گیا۔ باغ میں بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ رات گئے وہ مہمان خانے میں گیا۔ دیکھا صحن کے ایک گوشے میں نادر خاں چارپائی پر گہری نیند سو رہا ہے۔ البتہ احمد جاگ رہا تھا۔ رحیم داد نے اس سے کوئی بات چیت نہ کی۔ کمرے میں گیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ رات گرم تھی۔ آسمان صاف تھا۔ مگر حبس تھا۔ احمد نے رحیم داد کا بستر چھت پر پلنگ بچھا کر لگا دیا تھا۔ رحیم داد نے دھوتی باندھی۔ بندوق اٹھائی اور چھت پر چلا گیا۔ اس نے بندوق سرہانے رکھی اور بستر پر لیٹ گیا۔

سویرے وہ چھت سے اتر کر صحن میں آیا۔ نادر خاں کا بستر خالی تھا۔ احمد نے بتایا کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے ناشتا کیا مگر نادر خاں ابھی واپس نہ آیا تھا۔ وہ دن بھر نظر نہ آیا۔ غروب آفتاب کے وقت جب رحیم داد باغ میں بیٹھا تھا نادر خاں اسکول کی سمت سے باغ کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ قریب آتا گیا۔ اس کا لباس گرد و غبار سے اٹا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

وہ سامنے آکر کھڑا ہوا تو رحیم داد نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نادر خاں بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے اس سے پوچھا۔ "سویرے سویرے کہاں چلا گیا تھا؟ دوپہر کی روٹی بھی نہیں کھائی۔"

"کیا کیا جائے جی، کام جو کرنا ہوا۔ ایک نہیں، کئی کام کرنے ہیں اور جلد سے جلد کرنے ہیں۔" اس نے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

رحیم داد اس کی کارکردگی اور فرض شناسی سے متاثر بھی ہوا۔ مسکرا کر بولا۔ "شاہ جی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تو لگتا تو محنتی بندہ ہے۔ کیا کر آیا آج؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا جی۔" اس نے ہاتھ باندھ کر انکساری سے کہا۔ "مجھے چند روز کی مہلت دیں۔ ہر معاملے کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد ہی میں اپنی رپورٹ پیش کروں گا۔" اس نے اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔ "اس وقت تو جی مجھے اجازت دی جائے۔ میں نے ابھی جاکر نہانا ہے۔

روٹی کھائی ہے۔ جلد ہی سو بھی جاؤں گا۔ کل بھی میں نے سویرے سویرے پنڈ کا راؤنڈ لگانا ہے۔ مزارعوں سے ملنا ہے۔ فصل کے بارے میں گل بات کرنی ہے۔ اور بھی کئی ضروری کام کرنے ہیں۔"

وہ اٹھا اور مہمان خانے کی سمت روانہ ہوگیا۔ اس کے بعد کئی روز تک رحیم داد سے نادر خاں کی ملاقات نہ ہوئی۔ رحیم داد جب سو کر اٹھتا تو نادر خاں کا بستر خالی ہوتا۔ پھر رات گئے وہ باغ سے واپس آتا تو نادر خاں گہری نیند سویا ہوتا۔ وہ کھانا کھا کر جلد ہی سو جاتا اور فجر کی اذان سے پہلے ہی بیدار ہو جاتا۔

☆

دوپہر کو بارش کا چھینٹا پڑا تھا۔ دن ڈھلے موسم خوشگوار تھا۔ آسمان پر سرمئی بادل چھائے تھے۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ رحیم داد باغ میں اجلا لباس پہنے زمیں دارانہ طمطراق کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا نادر خاں پہلے روز کی طرح خاک دھول سے اٹا اس کی جانب آرہا ہے۔ وہ قریب آیا تو رحیم داد نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو اس کا بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "نادر! تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"کام کرنا جو ہوا جی۔" نادر خاں نے بے نیازی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ "ہر چیز کو جب تک اپنی نظر سے دیکھا نہ جائے تب تک نہ کوئی مسئلہ سمجھ آتا ہے اور نہ اس کا حل۔"

"یہ بتا' اتنے دنوں میں تو نے کیا کیا دیکھا' کیا معلوم کیا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ اس کے رویے سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ زمیں داری کے معاملات جاننے کے لیے بہت بے چین ہے۔

"ایسا لگتا ہے جی' جیسے یہاں کا کوئی زمیں دار ہی نہیں۔ ہر مزارع خود کو زمیں دار سمجھتا ہے۔ کمیوں تک کے دماغ آسمان پر ہیں۔" نادر خاں کا لہجہ قدرے نرم پڑ گیا۔ "اللہ وسایا مر گیا۔ اب اس کی کیا برائی کرنی جی۔ خدا اسے جنت نصیب کرے۔ پر اسے زمیں داری چلانے کا ذرا تجربہ نہ تھا۔ مزارعوں کے مزاج ایسے بگاڑ دیئے کہ وہ تو جی سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ جو جس کا جی کرتا ہے' کر رہا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

"ویسے فصل تو ٹھیک لگتی ہے۔ پچھلے دنوں میں بھی کھیتوں پر جاتا رہا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" نادر خاں نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ "خاص طور پر کماد اور مکئی کی فصل بہت چنگی جا رہی ہے۔ پھٹی بھی ٹھیک ٹھاک جان پڑتی ہے۔ پر پھٹی کی کاشت کا رکبہ بڑھانے

کی ضرورت ہے۔ اصلی کمائی تو آج کل کپاس کی فصل سے ہے۔ ادھر اب تک کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ کوریا کی جنگ کی وجہ سے باہر کے ملکوں میں پاکستانی کپاس کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔ کپاس کے ایکسپورٹرز کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ انھوں نے دبا کے کمائی کی۔"

نادر خاں نے اپنی معلومات سے رحیم داد کو مرعوب کرنے کی کوشش کی اور وہ مرعوب بھی ہو گیا۔ "تو جن باتوں کو سمجھتا ہے اللہ وسایا نہیں جانتا تھا۔ تب ہی تو اس نے پھٹی کا نہ رکبہ بڑھایا نہ کمائی کر سکا۔ اب تو بتا پھٹی کی فصل کا رکبہ کیسے بڑھایا جائے؟"

"بہت سی زمین پڑیلی پڑی ہے۔ جگہ جگہ ڈھنڈل اور جھلن ہیں۔ نہر کے نزدیک کا اپنا بہت سا رکبہ جھنگر بن گیا ہے۔ اتنی بہت سی زمین ادھلاپی پر آسانی سے کابل کاشت بنائی جا سکتی ہے۔" نادر خاں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "اپنی زمین پر آم اور مالٹے کے باغ لگائے جا سکتے ہیں۔ فارم بنائے جا سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے جی' اتنی بہت ساری زمین بیکار دیکھ کر مجھے بہت دکھ پہنچا۔"

"پر اس میں بہت سی تو شاملات کی زمین ہے۔" رحیم داد نے نادر خاں کو آگاہ کیا۔

"چوہدری تسیں کیسی باتیں کر رہے ہو۔" نادر نے مسکرا کر کہا۔ "تحصیل دار اور پٹواری کس لیے ہیں۔ ان کی مٹھی گرم کی جائے تو ساری زمین آسانی سے اپنے کھاتے میں منتقل ہو جائے گی۔ ویسے بھی جی شاملات والملات کی کون پروا کرتا ہے۔ زمیں دار کا رعب اور دبدبہ ہو تو کوئی چوں بھی نہیں کر سکتا۔"

رحیم داد نے دبی زبان سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "پر تحصیل دار اور پٹواری شواری کی مٹھی گرم کرنے کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟ اب تک ساری زمیں داری کی دیکھ بھال تو اللہ وسایا کرتا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ جمیلہ کے پاس جو کچھ تھا وہ اس نے اللہ وسایا کی فاتحہ اور چالیہا پر خرچ کر دیا۔"

نادر نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ "جو کچھ ہونا تھا جی وہ ہو چکا۔ اب تو آگے کی سوچنا ہے۔ میں نے پتہ کیا ہے۔ مزارعوں پر اللہ وسایا مرحوم بہت ادھار چھوڑ گیا ہے۔ اس کی فوری وصولی ہونی چاہیے۔ کچھ تو ابھی مل ہی جائے گا۔ ورنہ کماد کی فصل سے قرضہ وصول کیا جا سکتا ہے۔"

"کماد کی فصل ہی سے کیسے قرضہ وصول کیا جا سکتا ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے دریافت کیا۔

"وہ اس طرح جی کہ کٹائی کے بعد کماد کو شکر مل پہنچانے اور وزن کروانے کی پوری ذمہ داری تو زمیں دار ہی کی ہوتی ہے نا۔ ویسے تو تول ہی میں خاصی گنجائش نکل سکتی ہے۔" وہ عیاری سے مسکرایا۔ "میرا مطلب تسیں سمجھ گئے نا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔ آگے بتا۔" رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"اس کے علاوہ کماد کی سپلائی بھی زمیں دار ہی کرتا ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "اس میں سے کماد سپلائی کرنے کا نصف کرایہ بھاڑا مزارعے کے حصے سے کٹتا ہے۔ آیانہ اور چری کی فصل کی کٹت بجرا کرکے ہر مزارعے کو رسید دے دی جاتی ہے۔ کانون تو یہی ہے پر کون زمیں دار اس پر عمل کرتا ہے۔" اس نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ نرم پڑگیا۔ "معاف کرنا جی۔ شاہ جی ٹھیک ہی بتاتا تھا۔ اللہ وسایا تو زمیں دار تھا ہی نہیں اور نہ اس نے کبھی زمیں دار بننے کی کوشش کی۔ وہ تو پیدائشی مزارع تھا۔ مرتے دم تک مزارع ہی رہا۔"

"اس نے کون سی غلطی کی؟"

"ایک غلطی ہو تو بتاؤں۔" نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔ "شکر مل کو کماد کی سپلائی کا معاملہ ہی لے لیں۔ اللہ وسایا ہر مزارعے کو پابندی سے رسید دیتا تھا۔ اسے ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تب ہی تو وہ مزارعوں سے اپنا کرض وصول نہ کرسکا۔"

"رسید دینے سے کرض کی وصولی کا کیا واسطہ؟"

"بہت اہم واسطہ ہے اور وہ اس طرح ہے کہ مزارعوں کو کماد کی سپلائی میں سے ان کی پیداوار کی رکم کا جو بھی حصہ دیا جائے، پہلے اس میں سے کرض کی رکم کاٹ لی جائے۔ اس کے بغیر کرض ادھار آسانی سے وصول نہیں ہوتا۔ سارے ہوشیار زمیں دار ایسا ہی کرتے ہیں۔ مزارعوں کو رسید دینے کی صورت میں ادھار کی رکم نہیں کاٹی جاسکتی۔ رسید کو سامنے رکھ کر ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔"

"بات تو تیری سمجھ آتی ہے۔" رحیم داد نے اظہار پسندیدگی کیا۔

"آگے یہ رسید کا چکر ختم کرنا ہوگا۔"

"پر اس میں ایک خطرہ ہے۔" رحیم داد نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"وہ کیا ہے جی؟" نادر نے حیرت سے دریافت کیا۔

"اب تک ایسا ہوا نہیں۔ مزارعے ناراض ہوں گے۔ کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہو۔"

"فکر نہ کریں جی، کوئی گڑبڑ شڑبڑ نہیں ہوگی۔"

"مان لے انھوں نے کوئی گڑبڑ نہیں ڈالی، پر وہ جمیلہ کے پاس جاکر فریاد کریں گے۔ وہ ان کی بات ضرور مان لے گی۔ میں نوں پتہ ہے وہ ضرور ایسا کرے گی۔"

"اس کا تو مجھے بھی چند ہی دنوں میں اندازہ ہوگیا۔" نادر نے رحیم داد سے اتفاق کیا۔

"مزارعوں کا تو جی یہ حال ہے وہ ہر معاملے میں اللہ وسایا کا حوالہ دیتے ہیں۔ بار بار اس کا ذکر

کرتے ہیں یا جمیلہ کا۔" اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے بات کہتے کہتے ٹھٹکا۔

"سچی گل تو ایہہ ہے جی۔ اللہ وسایا کے بعد پوری زمیں داری جمیلہ ہی کی سمجھتے ہیں۔ تجھے تو وہ زمیں دار مانتے ہی نہیں۔ ان کی باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے۔"

"یہ تو میں نوں بھی پتہ ہے۔" رحیم داد نے اعتراف کیا۔ "اسی لیے تو تجھے لگایا ہے۔"

"شاہ جی نے بھی مجھ سے یہ گل بتائی تھی۔ پر فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ وسایا تو اب رہا نہیں۔ جمیلہ بھی ان دنوں عدت میں بیٹھی ہے۔ نہ وہ حویلی کی چار دیواری سے باہر جاسکتی ہے نہ مزارعوں سے مل سکتی ہے۔ یہ اچھا موکع ہے۔ اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔"

"کیا کرے گا تو؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"جمیلہ کا اثر ختم کرکے مزارعوں پر تیری دھاک بٹھانی ہوگی۔ اس کے لیے زمیں داروں کا آزمودہ حربہ استعمال کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔

"وہ یہ ہوتا ہے کہ مزارعوں کے درمیان پھوٹ پیدا کرنی ہوگی۔ ہر زمیں داری میں مزارعوں کے درمیان چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہوتے ہی ہیں۔ اس پنڈ کے مزارعوں میں بھی ہیں۔ ایسے جھگڑوں کو بڑھانا ہوگا۔ کچھ کی طرف داری کرنی ہوگی اور انھیں رعائتیں دے کر اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔" نادر زیرِ لب مسکرایا۔ "جو اپنے ساتھ نہ آئیں ان پر طرح طرح کے دباؤ ڈال کر تنگ کرنا ہوگا۔ فیر ایسا وکھت بھی آئے گا جب سارے ہی مزارع تیرے بندے ہوں گے۔ جو کہے گا وہی کریں گے۔ تجھے ہی پنڈ کا اصلی زمیں دار مانیں گے۔"

"تیری گل ویسے تو ٹھیک ہی لگتی ہے۔ میں نوں پسند بھی آئی پر اتنا دھیان رکھنا جب اللہ وسایا زندہ تھا تب بھی جمیلہ زمیں داری کے معاملوں میں برابر حصہ لیتی تھی۔ بلکہ سچ پوچھ تو زمیں داری وہی چلاتی تھی۔" رحیم داد نے نادر خاں کو خبردار کیا۔ "تو نے یہ بھی اندازہ کرلیا ہوگا سارے ہی مزارعے اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ پیار سے اسے بھین جی کہتے ہیں۔ وہی ضرورت پڑنے پر انھیں ادھار دیتی ہے۔ سارا حساب کتاب اسی کے پاس رہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے مزارعوں کو اپنا طرف دار بنانے میں جمیلہ ناراض نہ ہوجائے۔ تیں نوں پتہ ہے اس کے تو زمیں داری میں باراں مربعے ہیں۔"

"میں نوں اس کا پتہ ہے جی۔"

"مزارعوں سے کرض ادھار کی وصولی میں سختی کی گئی یا انھیں تنگ کیا گیا تو جمیلہ میرے گلے پڑ

جائے گی۔ بہت ناراض ہوگی۔ میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں آگے بھی زمیں داری اس طرح چلائی جائے' نہ جمیلہ ناراض ہو اور نہ ہی کسی طرح ایسا ظاہر ہو کہ اس کی اور میری زمیں داری الگ الگ ہے۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "زمیں داری تو پوری پوری ساتھ ساتھ ہی چلائی ہوگی۔ تیں نوں اسے سامنے رکھ کر کام کرنا ہوگا۔"

"ایسا ہی ہوگا جی۔ فکر نہ کریں۔" نادر نے اسے اطمینان دلایا۔ "میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ آگے ہر معاملے میں احتیاط سے کام لوں گا۔ جمیلہ کو شکایت کا موقع نہ دوں گا۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ وہ نظریں جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ نادر خاں نے چند لمحے خاموش رہ کر دریافت کیا۔ "کس سوچ میں پڑ گئے جی؟"

"سوچ رہا تھا تو نے زمیں داری بڑھانے اور پھیلانے کے بارے میں کہا ہے۔ ہونا تو ایسا چاہیے پر اس کے لیے روپے کی ضرورت ہوگی۔" رحیم داد نے اپنی مالی مشکلات کا ایک بار پھر اظہار کیا۔ "خریف کی فصل کی واڈھی میں تو ابھی کئی مہینے رہتے ہیں۔ مزارعوں سے کماد کی پیداوار میں کرض کی وصولی بھی تب ہی ہوگی۔ اب کیسے کام چلایا جائے۔"

"مزارعوں سے کچھ نہ کچھ وصولی تو ابھی ہو سکتی ہے۔" نادر نے تجویز پیش کی۔

رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ "جمیلہ سے پہلے مشورہ کرنا ہوگا۔ اس سے بات کیے بنا اس معاملے میں کچھ نہ کرنا۔ تو نہیں سمجھتا یہ بہت ضروری ہے۔"

"ایک تجویز اس سلسلے میں سمجھ آتی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔ اسے دراصل اس رقم کی فکر تھی جس کے بارے میں وکیل نے سختی سے تاکید کی تھی۔ اس کے پاس لالی کی رقم میں سے دارا کو ایک ہزار دے کر اب دو ہزار سے کچھ اوپر روپے رہ گئے تھے۔ مگر وکیل زیادہ رقم مانگتا تھا۔ رحیم داد اس سلسلے میں نادر کو ابھی اعتماد میں لینا نہ چاہتا تھا۔

نادر نے گردن آگے بڑھا کر رازداری کے انداز میں کہا۔ "شاہ جی سے بھی کرض ادھار مل سکتا ہے۔ مجھے یکین ہے وہ ضرور مدد کرے گا۔ وہ تیری بہت تعریف کرتا ہے اور مانتا بھی بہت ہے۔ وہ اتنا وڈا زمیں دار ہے چار پانچ ہزار روپے ادھار دینا اس کے لیے معمولی بات ہے۔"

"امید تو ہے وہ میری مدد کرے گا۔" رحیم داد نے نادر کی تائید کی۔ "پر میں چاہتا ہوں تو پہلے اس سلسلے میں گل بات کر۔"

"کرلوں گا جی۔ مجھے اسے ملنا بھی ہے۔"

"اور دیکھ کسی سے ہرگز یہ نہ بتانا تجھے شاہ جی نے ادھر بھیجا ہے اور نہ ہی کسی کو یہ پتہ چلے تیرا اس کے پاس آنا جانا ہے۔" رحیم داد نے تنبیہہ کی۔ "اور نہ کسی کو یہ بتانا میرا اس کے ساتھ میل جول ہے۔" اس کا لہجہ اور مدھم پڑ گیا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ "کسی کو ادھر بالکل پتہ نہیں میں اس کے پاس آتا جاتا ہوں۔"

"شاہ جی نے مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی اس بارے میں خبردار کر دیا تھا۔ تب ہی تو میں نے کسی سے یہاں ایسی بات نہیں کی۔ اشارہ تک نہ دیا۔" نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "پر تیں نوں بھی سخت احتیاط کرنی چاہیے۔"

"وہ تو میں کرتا ہی ہوں۔"

"مجھے تو مہمان خانے کا نوکر احمد بھی اعتبار کا بندہ نہیں لگتا۔ وہ باتیں بہت کرتا ہے اور پیٹ کا بھی ہلکا ہے۔ اس پر بالکل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ہٹا کر اپنے بھروسے کا بندہ رکھنا ہوگا۔ ویسے بھی جی نوکر تو اعتبار ہی کا ہونا چاہیے جیسے شاہ جی کے پاس شیدا ہے۔ مجھے تیرے لیے بھی ایسا بندہ تلاش کرنا ہوگا جس پر پورا پورا بھروسہ ہو اور جس سے ہر طرح کا کام لیا جا سکے۔"

"مجھے بھی احمد ایسا بندہ نہیں لگتا جس پر بھروسہ کیا جا سکے۔ اسی لیے میں نے کبھی اس سے کوئی ایسی گل بات نہیں کی۔ شاہ جی کے پاس بھی جاتا ہوں تو اسے اشارہ تک نہیں دیتا۔ اسے پتہ لگ جائے تو جھٹ جا کر جمیلہ سے بتا دے گا۔ وہ ایسا ہی بندہ ہے۔"

"تب تو اسے جلد سے جلد ہٹانا چاہیے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جلد ہی ایسا اعتبار کا بندہ تلاش کر لوں گا۔ یہاں نہ ملا تو اپنے پنڈ سے لیتا آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے' اب نہا کر کپڑے بدل لے۔" رحیم داد نے نادر خاں کا میلا کچیلا لباس غور سے دیکھا۔ "تیرے کپڑے لتے بہت گندے ہو گئے ہیں۔"

"کپڑے لتے تو جی میں اپنے ساتھ لایا نہیں۔ اپنے پاس تو یہی کپڑے ہیں۔ دو بار انہیں دھو بھی چکا ہوں۔" نادر نے بتایا۔ "بات یہ ہے جی' میں یہاں ٹھیرنے کے ارادے سے تو آیا نہیں تھا۔ ورنہ کپڑے لتے لے کر تیاری سے آتا۔ برا نہ منائیں تو جی میں آج ہی اپنے پنڈ چلا جاؤں۔ کل شام نہیں تو پرسوں ضرور واپس آ جاؤں گا۔"

"اس وکت کیسے جائے گا۔" رحیم داد نے گردن گھما پھرا کر بڑھتے ہوئے اندھیرے کو دیکھا۔ "پہلے ہی بہت تھکا ہوا ہے۔ کس طرح جا سکے گا؟"

"فکر نہ کریں جی۔" نادر نے مسکرا کر بتایا۔ "سورج ڈوبے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ میں آرام سے

چلا جاؤں گا۔"

"تو پیدل جائے گا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"حویلی میں نوکروں کے لیے دو سیکلیں ہیں۔ ایک مل جائے تو اس پر چلا جاؤں گا۔ جلد ہی اپنے پنڈ پہنچ جاؤں گا۔ ورنہ رات بہت دیر سے پہنچوں گا۔"

رحیم داد نے ایک نوکر کو بلایا اور اس سے سائیکل منگوائی۔ وہ سائیکل لینے چلا گیا۔ رحیم داد نے کہا۔ "نادر! تو جلد ہی آجانا۔ ویسے میرا ارادہ بھی شاہ جی کی طرف کل جانے کا ہے۔ تیں نوں پتہ ہے وہ اپنے پنڈ میں ہے؟"

"ہاں جی! وہ پیراں والہ ہی میں ہے۔" نادر نے جواب دیا۔ "جہاں تک میرا خیال ہے ان کا فی الحال پنڈ سے باہر جانے کا کوئی پروگرام بھی نہیں۔"

نوکر سائیکل لے کر آ گیا۔ رحیم داد کی ہدایت پر اس نے سائیکل نادر خاں کے حوالے کر دی۔ سائیکل سنبھال کر وہ کھڑا ہو گیا۔ آہستہ سے بولا۔ "مہمان خانے میں جا کر روٹی کھا لوں۔ اس کے بعد رحمت والی چلا جاؤں گا۔ اب واپسی ہی پر حاضر ہو سکوں گا۔"

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد نے باغ ہی میں کھانا کھایا اور دیر تک بیٹھا ان باتوں پر غور کرتا رہا جو نادر خاں نے پچھلے چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد رپورٹ کی صورت میں اس کے سامنے پیش کی تھیں۔ یہ باتیں رحیم داد کے لیے قطعی نئی تھیں اور معلومات افزا بھی تھیں۔ اسے کو مدہر کشن کے متعلق بحیثیت زمیں دار بہت کم بلکہ کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ پہلے بھی وہ نام کا زمیں دار رہ چکا تھا۔ صرف گیارہ ایکڑ زمین اس کی ملکیت تھی۔ بنیادی طور پر وہ کاشت کار تھا۔ اس کا شمار چھوٹے کھاتے داروں میں ہوتا تھا۔ بڑے زمیں داروں کے ہتھکنڈوں اور طور طریقوں سے وہ بڑی حد تک ناواقف تھا۔ نادر خاں نے اس کے سامنے جو تجاویز رکھیں تھیں وہ اسے پسند آئیں اور اس قدر زیادہ پسند آئیں کہ انھیں عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

رات کو بستر پر لیٹا تو نادر خاں اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ وہ اسے بے حد ہوشیار اور تجربہ کار آدمی نظر آیا۔ اسے زمیں داری چلانے کے لیے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ نادر خاں سے ملنے سے پہلے وہ بالکل اندھیرے میں تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ مزارعے کس انداز سے سوچ رہے ہیں؟ کتنے خود سر اور بے لگام ہو گئے ہیں؟ انھیں قابو میں لانے کے لیے کیا کیا جائے اور کیسا رویہ اختیار کیا جائے؟ یہ کام وہ نادر خاں کی مدد ہی سے کر سکتا تھا۔

رحیم داد نے نائی بلوایا۔ حجامت بنوائی۔ غسل کیا۔ صاف ستھرا لباس پہنا۔ وہ احسان شاہ کے س جا رہا تھا۔ احمد اس وقت مہمان خانے میں موجود تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "چوہدری آج ـہ تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ "تیں نوں پتہ نہیں آج تو منگل وار ہے۔"

"لگتا ہے تو کہیں جا رہا ہے۔"

"میں نوں تو کہیں نہیں جانا۔" رحیم داد نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اسے کچھ بتانا نہ چاہتا تھا۔ س نے اس روز تانگا بھی نہ بلوایا۔

احمد خاموش ہو گیا۔ رحیم داد کچھ دیر بعد مہمان خانے سے نکلا اور اس راستے پر چل دیا جو کرمان پورہ جاتا تھا۔ کرمان پورہ تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے ایک نیم پختہ سڑک گزرتی تھی۔ کرمان پورہ موضع تھا۔ وہاں تانگوں کا اڈا بھی تھا۔ گاؤں سے کہیں دور جانا ہوتا تو کرمان پورہ ہی سے نگا بلوایا جاتا تھا۔

راستے کے دونوں جانب سائے دار درخت تھے۔ کسی زمانہ میں یہ کنکر کی بنی ہوئی پختہ سڑک تھی ے جمیلہ کے باپ لالہ کرشن دیال نے بنوایا تھا۔ وہ جب گاؤں آتا تو ہمیشہ کار میں آتا اور اسی سڑک سے آتا تھا۔ ہردیال اور جمیلہ کے دوسرے بھائی بھی جیپ یا کار سے اسی سڑک سے آتے جاتے تھے۔ مگر اب یہ سڑک ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ بارش نے جگہ جگہ گڑھے ڈال دیئے تھے جن میں پانی بھرا تھا۔

سڑک کے نشان دھندلے پڑ چکے تھے۔ وہ کچا راستہ بن کر رہ گئی تھی۔ رحیم داد اس پر چلتا رہا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہوا بھی چل رہی تھی۔ سہ پہر ڈھل گئی تو رحیم داد کسان پورہ پہنچ چکا تھا۔ اس نے تانگا لیا اور اس میں سوار ہو کر حویلی روڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔

حویلی روڈ پر اسے زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ پہلے ہی اڈے پر لاری مل گئی۔ اس نے تانگا چھوڑا، کوچوان کو کرایہ ادا کیا اور لاری کے اندر داخل ہو گیا۔ لاری مسافروں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ رحیم داد کو کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑا۔ مگر لاری نے میل سوا میل فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک بستی آگئی۔ کئی مسافر اتر گئے۔ رحیم داد کو بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔

رحیم داد اطمینان سے بیٹھ گیا۔ لاری سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑتی رہی۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ موسم سہانا ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے مسافروں پر ایک نظر ڈالی۔ مگر ایک مسافر پر نظر پڑتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ جمال دین تھا اور آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نوراں بیٹھی تھی۔

دونوں بچے 'کریما اور زینو' بھی ماں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ رحیم داد نے اپنی بیوی' بیٹے اور بیٹی کو دیکھا۔ وہ خوف زدہ بھی ہو گیا اور اسے دکھ بھی ہوا۔ نوراں کا رنگ روپ دھندلا گیا تھا۔ لباس بوسیدہ اور میلا کچیلا تھا۔ بچوں کا لباس اس سے بھی زیادہ پھٹا پرانا تھا۔ نوراں' بچوں کے ساتھ داہنے ہاتھ کی اگلی نشست پر بیٹھی تھی۔

رحیم داد دم بخود بیٹھا نوراں اور بچوں کو دیکھتا رہا۔ یکایک نوراں نے گردن موڑی۔ رحیم داد کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے نوراں کی طرف جھجکتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ رحیم داد نے فوراً نظریں موڑ لیں اور خود بھی اس قدر مڑا کہ اس کا چہرہ دوسری طرف ہو گیا۔

رحیم داد بہت پریشان تھا۔ وہ خود کو خطرے میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جمال دین یا نوراں اسے پہچان لیتے تو وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ اگلا اڈا آنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے سرسری نظروں سے دیکھا۔ جمال دین ابھی تک آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔

نوراں خاموش بیٹھی تھی۔ وہ بدحال اور اجڑی اجڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا نکھار میلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ دل میں کسک اور چبھن محسوس کی۔ نوراں نے ایک بار پھر گردن موڑی۔ اسی لمحے لاری ٹھہر گئی۔ رحیم داد لاری سے اتر کر

لا گیا۔

ہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رحیم داد لاری کی جانب پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ لاری سے ور مسافر اترے کچھ سوار ہوئے۔ انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ ذرا دیر میں لاری پھر سڑک پر مڑی لمحوں سے اوجھل ہو گئی۔

یم داد کے سینے میں دھواں سا اٹھا۔ آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اس نے احسان شاہ کے پاس کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ اس وقت بہت غم زدہ اور دل گرفتہ تھا۔ کچھ دیر بعد مخالف سمت سے اری آ گئی۔ وہ اس میں داخل ہو گیا۔

☆

یم داد کوٹلہ ہرکشن واپس پہنچا۔ مہمان خانے میں گیا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ بوندا جاری تھی۔ رحیم داد کے کپڑے بارش سے بھیگ گئے تھے۔ اس نے گیلے کپڑے اتار کر دھوتی ں۔ غسل خانے میں جا کر نہایا۔ اجلا لباس پہنا۔ دوپہر کا کھانا تاخیر سے کھایا۔ سہ پہر کا وقت دبستر پر لیٹ کر سفر کی تکان دور کرنے لگا۔

راں' کریما اور زینو ابھی تک اس کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ کریما اس کا پہلوٹی کا بیٹا تھا ہو لاڈلی بیٹی تھی۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب کریما یا زینو میں سے کوئی بیمار پڑتا یا کسی تکلیف میں تا تو وہ تڑپ اٹھتا' بے قرار ہو جاتا۔

ج اس نے دونوں کو طویل مدت کے بعد دیکھا تھا۔ ان کے چہروں پر برستی ہوئی محرومی دیکھی ان کے لاغر اور گندے جسم دیکھے تھے۔ ان کا پھٹا پرانا لباس دیکھا تھا۔ مگر وہ ان کے سر پر سے ہاتھ بھی نہ پھیر سکا۔ ان کے رخسار چومنے اور انھیں سینے سے لگانے کے بجائے انھیں ڈر گیا تھا' سہم گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوا گویا بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔ حالات نے اسے کیا بنا دیا تھا؟

اں' جس کی محبت سے سرشار ہو کر اس نے اپنے حقیقی چچا کو دشمن بنا لیا تھا۔ اس کی بیٹی' کا رشتہ ٹھکرا کر نوراں کو بیاہ کر اپنے گھر لے آیا تھا اور اکلوتی بہن' بیگماں سے اس طرح جدا ا کہ اس کے گھر کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس پر بند ہو گئے تھے اور جب وہ چھپ کر ے گاؤں ڈھولہ امیر خاں پہنچا اور اس سے ملا تو چوری چھپے کی یہ ملاقات بیگماں اور اس کے ولاداد کی ہلاکت کا سبب بن گئی۔ اسے دونوں کو خون میں لت پت تڑپتے اور دم توڑتے دیکھنا

چند ہی گھنٹے پہلے وہی چھتی نوراں اسے نظر آئی تو وہ خوف اور دہشت سے لرز کر رہ گیا تھا۔ وہ اس کے لیے شدید خطرہ بن گئی تھی۔ جب تک وہ لاری میں رہا' اسے رہ رہ کر یہ اندیشہ ستاتا رہا کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔

اسے نوراں کا اجڑا ہوا چہرہ اور اس پر پھیلی ہوئی ویرانی دیکھ کر دکھ بھی ہوا اور سخت نفرت بھی ہوئی۔ وہ اپنے آشنا' جمال دین کے ساتھ بیٹھی تھی جو کبھی اس کا گہرا دوست تھا۔ ہر وقت کا ساتھی اور رفیق تھا۔ نوراں کی بے وفائی یاد کر کے وہ غصے سے تلملا اٹھا۔ اس نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی اور ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

وہ اسی بے چینی کے عالم لیٹا تھا کہ تاراں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی ہلکی ہلکی شوخ مسکراہٹ تھی۔ رحیم داد نے بستر پر لیٹے لیٹے بے نیازی سے پوچھا۔

"حمیدا کدھر ہے؟"

"میں نوں پتہ نہیں جی وہ کدھر ہے۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "شدّو کے چکر میں گیا ہوگا۔"

"تو کیسے آئی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"زمیں دارنی نے تجھے بلایا ہے۔ وہ حویلی میں تیرا انتظار کر رہی ہے۔"

رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پلنگ سے نیچے اترا۔ سر پہ پگ رکھی۔ پیروں میں جوتے پہنے اور تاراں کے ہم راہ بوندا باندی سے بچتا بچاتا حویلی کے اندر چلا گیا۔ جمیلہ اس وقت گول کمرے میں پرانی وضع کے چوڑے چکلے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسی کمرے میں کبھی جمیلہ کا بڑا بھائی' لالہ ہر دیال کچہری لگاتا تھا۔ زمیں داری کے معاملات طے کرتا تھا۔ سرکاری افسروں' بڑے زمیں داروں اور جاگیرداروں سے ملاقات کرتا تھا۔

کمرے میں دبیز قالین کا فرش تھا جس کے نقش و نگار قدرے دھندلے پڑ گئے تھے۔ دروازوں پر پڑے ہوئے پردوں کے رنگ بھی اڑ گئے تھے۔ کمرے کا فرنیچر پرانا تھا مگر قیمتی تھا۔ کمرے کی آرائش سے جاگیردارانہ آن بان ابھی تک جھلکتی تھی۔

جمیلہ اس وقت سفید ململ کا کرتا اور لٹھے کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹہ بھی سفید ہی تھا۔ وہ اس کے اوپر سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے چادر سے سر اور چہرے کو بکل مار کر بڑی حد تک چھپا رکھا تھا۔ اس کی گوری گوری کلائیاں بالکل خالی تھیں۔ چہرہ جو کبھی تازہ پھولوں کی مانند

ہ اور دل کش نظر آتا تھا' اب پچھلی رات کا زرد اور خیالا چاند بن گیا تھا۔

رحیم داد کمرے میں داخل ہوا۔ جمیلہ نے ہاتھ کے اشارے سے قریبی صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ اور اپنا چہرہ دیوار کی جانب موڑ لیا۔ تاراں اس کے قدموں کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔ اب کا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ چند لمحے بعد جمیلہ کی آواز ابھری۔ نے رحیم داد سے دریافت کیا۔

'چوہدری! میں نے سنا ہے' تو نے زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے مینجر رکھ لیا ہے۔" اچی بات کہتے وہ ٹھٹکی۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

'ہاں جی۔" رحیم داد کے لہجے سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ اس سوال کے لیے پہلے سے ذہنی طور پر ہے۔ اس نے بلا جھجک جواب دیا۔ "تو نے ٹھیک ہی سنا۔"

میلہ چند لمحے تک گم صم بیٹھی رہی۔ اس نے گہری سانس بھری۔ شکوہ کرنے کے انداز میں ۔"تو نے اتنا وڈا فیصلہ کر لیا اور مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔"

'کیسے پوچھتا۔ تجھ سے ملنا ہی کب ہوا؟" رحیم داد نے بات بنائی۔ "فیر یہ بھی تو ہے' تو اللہ وسایا یا پے میں اتنی کھوئی ہوئی ہے کہ ایسے میں تجھ سے کیا گل بات کی جائے۔"

میلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر تو نے یہ تو سوچا ہوتا' ہمارے پاس کل ۲۲ مربع زمین ہے۔ میرے پتا کے پاس ۲۲ سو مربعے سے اوپر اراضی تھی تب اس کے پاس مینجر ہوتا تھا۔" اس ھنڈی سانس بھری۔ "پاکستان بنا تو سو سے بھی زیادہ مربعے احسان علی شاہ نے دبا لیے۔ کچھ پر ے زمیں داروں کے ساتھ مزارعوں نے بھی قبضہ کر لیا۔ ۲۲ مربعے بھی اللہ وسایا نے زور ا ں دکھا کر بچا لیے۔ اب اتنی سی زمیں داری کے لیے مینجر یا کاردار کی کیا ضرورت ہے؟" جمیلہ لہجے میں تلخی تھی۔

حیم داد اس کے لہجے میں رچی ہوئی تلخی نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "ضرورت تو ہے اور بہت ہے۔ تو عدت میں بیٹھی ہے۔ حویلی کی چار دیواری سے باہر نہیں جا سکتی۔ اور مجھے یہاں کے ت کا کچھ اتا پتا نہیں۔ زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے کوئی تو ہونا چاہیے۔ اس طرح کب ام چلے گا؟"

یسے پہلے چل رہا تھا۔" جمیلہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ "ہمارے مزارعے جان لڑا کر محنت کرتے جب ہی تو فصل چنگی ہوتی ہے۔ تو نے ربیع کی فصل دیکھی تھی۔ اب خریف کی فصل تیرے ہے۔ ایمان نال بتا کیسی فصل ہے؟"

"فصل تو ویسے چنگی اور ٹھیک ٹھاک ہی لگتی ہے۔" رحیم داد نے اعتراف کیا۔ "پر تو نے کبھی بھی سوچا کتنی زمین پڑیلی ہے۔ کہیں ڈھل اور جھلن ہے کہیں جھنگر۔ یہ ساری غیر مزروعہ زمین ز کاشت لائی جا سکتی ہے۔ اس طرح زمین کے ساتھ ساتھ پیداوار میں بھی اضافہ ہوگا۔ زمیں دار کو بھی بڑھایا جا سکتا ہے۔"

"مگر اس میں سے بہت سی زمین تو شاملات کی ہے۔ وہ تو سارے پنڈ کی مشترکہ ملکیت ہے۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے' ہماری ایسی پڑیلی اور بنجر زمیں بھی ہے جسے کھیتی باڑی کے لیے ٹھیک ٹھاک کیا جا سکتا ہے۔ پر میں اور اللہ وسایا' دونوں غافل نہیں تھے۔ احسان شاہ نے ایک کے بعد دوسرا کیس چلا کر مقدمہ بازی میں ایسا پھنسایا اللہ وسایا کو اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ وہ اس کار اور بنجر زمین کی طرف دھیان دیتا۔" اس کا لہجہ پھر تلخ ہو گیا۔ "تجھے پتہ ہے احسان شاہ نے یہ کچی زمین بلکہ حویلی تک ہمارے کبنے سے نکلوا دی تھی۔ وہ تو ہم کو بالکل تباہ کر دینا چاہتا تھا۔"

اسی وقت کمرے کے باہر تاراں کی بچی کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ تاراں نے بے چینی سے فوراً پہلو بدلا۔ جمیلہ نے کہا۔ "تاراں! دیکھ تو تیری چھوہری کیوں بلک بلک کر رو رہی ہے؟" تاراں خاموشی سے اٹھی اور تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ "جو ہونا تھا جی وہ تو ہو گیا۔" اس کے لہجے میں قدرے اکھڑپن تھا۔ "صاف بات یہ ہے جی' اب تو میں نے نادر خاں کو مینجر لگا ہی دیا۔ وہ جلد ہی کام شروع کر دے گا۔" رحیم داد کے رویئے سے صاف ظاہر تھا کہ نادر خاں کے سلسلے میں وہ اپنی رائے بدلنے پر آمادہ نہیں۔

"جب تو نے فیصلہ کر ہی لیا تو اب بات کرنے سے کیا فائدہ۔ تجھے خرچ ہی بڑھانا ہے تو ضرور بڑھا۔ جو مرضی میں آئے کر۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں؟" جمیلہ کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔

رحیم داد نے بھی اس جھنجلاہٹ کو محسوس کیا۔ فوراً نرم پڑ گیا' اپنا رویہ بدلا۔ "تو فکر نہ کر۔ جتنا خرچہ بڑھے گا' اس سے زیادہ ہی فائدہ ہوگا۔ اپنی سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔ یہی سوچ کر نادر خاں کو لگانے کا بھی فیصلہ کیا تھا۔ میرا مطلب تو صرف اتنا ہے کہ زمیں داری کو بڑھایا جائے۔ ٹھیک ٹھاک طور پر چلایا جائے۔"

"مجھے اس معاملے میں تجھ سے زیادہ پتہ ہے۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ہمارا مینجر جسی لال تھا۔ تنخواہ تو کیول اس کی اسی روپے تھی۔ وہ بھی سولاں' ستاراں برس کی نوکری کے بعد ہوئی تھی۔ پر ہیرا پھیری اور گڑبڑ کر کے اس نے لودھراں میں اپنے پتر کے نام سے اتنی زمین خرید لی تھی

ر اس کا شمار تحصیل کے وڈے زمیں داروں میں کیا جاتا تھا۔ زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے س نے اپنا منشی بھی لگا رکھا تھا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "ایسا بھی نہیں تھا کہ پتاجی یا ہردیال و پتہ نہ تھا۔"

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔ "جب انھیں ملوم تھا تو انھوں نے جسی لال کو کیوں رکھ چھوڑا تھا؟"

"اسے ہٹانا آسان نہ تھا۔ اصلی جاگیردار تو سمجھو جسی لال ہی تھا۔" جمیلہ نے بتایا۔ "سب کچھ ہی کرتا تھا۔ ہر کام اسی کی مرضی سے ہوتا تھا۔ وہ تو ہر فصل پر ایک مقررہ رقم دے دیتا تھا۔ پتاجی ور ہردیال ہر بکھیڑے سے بچے رہتے۔ نہ بھاگ دوڑ کی ضرورت' نہ مزارعوں کے ساتھ بک بک جھک جھک۔ انھیں برس کے برس اتنی رقم مل جاتی جتنی وہ چاہتے تھے۔ جسی لال خوشامد اور چاپلوسی الگ کرتا تھا۔ جب بھی دیپال پور ہمارے گھر آتا' ماتاجی کے لیے طرح طرح کی سوغات اور تحفے لے کر ضرور آتا۔"

"پر یہ تو زمیں داری نہ ہوئی' ٹھیکیداری ہوئی۔"

"عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔" جمیلہ نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ "جب مینجر زمیں داری پر پوری طرح چھا جاتا ہے تو وہ ایک طرح سے ٹھیکے ہی پر زمیں داری چلانے لگتا ہے۔"

"تیری گل سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد نے مزید وضاحت چاہی۔

"بات یہ ہے چودھری! زیادہ تر وڈے زمیں دار یا جاگیردار شہر میں کوٹھیاں بنگلے بنوا کر رہتے ہیں۔ وہاں عیش کرتے ہیں اور زمیں داری مینجر' کاردار اور منشی چلاتے ہیں۔ ایسے ہی زمیں داروں کو انگریزی میں ابسن ٹیز لینڈلارڈز کہا جاتا ہے۔"

"ایسا تو بہت ہوتا ہے۔ میں کئی زمیں داروں کو جانتا ہوں' وہ لہور میں کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ ان کے مینجر اور کاردار زمیں داری چلاتے ہیں۔ اس میں برائی کیا ہے۔ زمینداروں کا تو کوئی نکصان نہیں ہوتا۔ انھیں فصل سے جتنا ملنا چاہیے وہ تو مل ہی جاتا ہے۔"

"پر اس طرح کی زمیں داری میں بے چارے مزارعے بالکل تباہ ہو جاتے ہیں۔" جمیلہ نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "انھیں زمیں دار کے ساتھ ساتھ فصل میں سے مینجر کا حصہ بھی دینا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ کریں تو انھیں بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ بے دخل کرنے کے لیے انھیں جھوٹے مقدموں میں پھنسایا جاتا ہے۔ ڈھور ڈنگر اٹھوا لیے جاتے ہیں۔ جوان گھروالیوں اور کڑیوں کو اٹھوا لیا جاتا ہے۔ گھربار جلوا دیا جاتا ہے۔ واڈھو فصلیں کاٹ لی جاتی ہیں۔ ان پر ہر ظلم اور

اپرادھ ہوتا ہے۔ انھیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا ہے۔ بنسی لال نے اللہ وسایا اور اس کے
کو اسی طرح بے دخل کیا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "اللہ وسایا اور میں نے اس چند
کبھی ایسا نہیں کیا۔ کسی مزارعے کو نہ تنگ کیا نہ بے دخل۔ مجھے ڈر ہے' آگے چل کر یہاں بھی ا
ہی ہونے لگے گا۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" رحیم داد نے جمیلہ کو یقین دلایا۔ "زمیں دارنی! جو تو کہے گی وہی ہوگا۔ تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ اپنے دل سے ایسا شبہ بالکل نکال دے۔ پہلے بھی تو نے زمی داری چلائی ہے۔ آگے بھی تیں نوں ہی چلانی ہے۔"

"میرا کیا ہے۔ میں تو اب کچھ بھی نہیں رہی۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "اللہ وسایا کے ساتھ میرا سب کچھ چلا گیا۔ سب کچھ اجڑ گیا۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ آگے نہ بول سکی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک ڈھلک بکھرنے لگے۔ کمرے میں گہرا سکوت پھیل گیا۔ جمیلہ سر جھکائے خاموشی سے روتی رہی۔

☆

بوندا باندی کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ کمرے میں بھیگے ہوئے جھونکے آرہے تھے۔ ہوا کی سرسراہٹ خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ تاراں ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "زمیں دارنی! میں نوں پتہ نہیں تھا' تجھے اللہ وسایا سے اتنا زیادہ پیار ہے۔"

"پیار!" جمیلہ نے چادر کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "نہیں چوہدری! مجھے کسی سے پیار نہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پیار تو وہ کرتا ہے جسے اپنے سے پیار ہو۔ مجھے اپنے جیون سے' اپنی ذات سے کوئی پیار نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ تو اس گل کو نہیں سمجھ سکتا۔"

رحیم داد واقعی اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ ہونق کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد خاموشی میں گہری سانس بھرنے کی مدھم آواز ابھری۔ جمیلہ بڑبڑانے کے انداز میں آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ "کبھی ایسا بھی تھا جب مجھے اپنے سے پیار تھا۔ یہ بیتے دنوں کی گل ہے۔ پر اب تو اسے ایک جگ بیت گیا۔ اس سمے میں پاروتی تھی اور کالج میں پڑھتی تھی۔ تب میں نے کسی سے پیار کیا تھا۔ اب تو وہ ساری ہی باتیں ایسی لگتی ہیں جیسے کوئی سہانا سپنا دیکھا ہو۔" اس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "ہاں وہ سپنا ہی تھا۔ ایک

کلپنا۔"

"کون تھا وہ؟" رحیم داد نے نہایت بھونڈے پن سے پوچھا۔

جمیلہ نے چونک کر گردن موڑی۔ رحیم داد کو دیکھا۔ حیرت سے اس کے چہرے کو تکتی رہی پھر
نے سر جھکا لیا۔ اس کا افسردہ چہرہ اور مرجھا گیا۔

رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔ "لگتا ہے تو نے میری گل کا برا منایا۔"

"ایسی گل نہیں۔" وہ مدھم لہجے میں بولی۔ "چوہدری! تجھے سب ہی کچھ پتہ ہے۔ تجھ سے اب
چھپا رہ گیا۔ تو اس کے بارے میں نہیں جانتا' وہ بھی جان لے۔" جمیلہ کی آواز میں درد گھلا ہوا
۔ "اس کا نام ویریندر تھا۔ وہ لہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔"

"تیرا اس سے میل جول کیسے ہوا۔ تو بھی اسی کالج میں پڑھتی تھی؟"

"نہیں' میں تو کینیئرڈ کالج میں پڑھتی تھی۔" جمیلہ نے بتایا۔ "جب تک مجھے ہوسٹل میں رہنے کو
نہ ملی میں ویریندر کے پتا کی کوٹھی میں ٹھہری رہی۔ وہ میرے پتا جی کے بہت پرانے دوست تھے۔
ت کے کھتری تھے اور کٹر بھی تھے۔ ویسے تو میں ویریندر کو پہلے سے جانتی تھی۔ پر جب ایک ہی
ٹھی میں ساتھ ساتھ رہنا ہوا تو میل ملاپ بڑھ گیا۔ میں ہوسٹل چلی گئی۔ تب بھی اسے ملتی رہی۔
ب ہمارا میل جول زیادہ بڑھا تو بات بڑوں تک پہنچی۔"

"تب تو گڑبڑ پیدا ہوئی ہوگی؟" رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے
یافت کیا۔

"نہیں' ویریندر کے پتا مجھے اپنی نوہ بنانا چاہتے تھے۔ پر ماں جی نے صاف انکار کر دیا۔"

"ماں جی نے ایسا کیوں کیا؟" رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔

"بات یہ تھی کہ ماں جی نے ہرویال کا رشتہ ویریندر کی بہن سے بہت پہلے دیا تھا۔ پر ویریندر کی ماتا
نے انکار کر دیا۔ اس کا کارن یہ تھا ہرویال ان دنوں شراب پی کر گانا سننے اور ناچ دیکھنے
روں کے چوباروں پر جاتا تھا۔" جمیلہ دھیمے لہجے میں بتاتی رہی۔ "ماں جی کو آشا تھی ہرویال کا
ہ ہو جائے تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ کنجروں کے پاس جانا چھوڑ دے گا۔ پر ویریندر کی بہن کا ہرویال
ے ویاہ نہ ہو سکا۔"

"یہ تو وٹے سٹے کا ویاہ ہوا۔"

"ہاں کچھ ایسا ہی تھا۔" جمیلہ بولی۔ "ویریندر کی بہن کے ساتھ ہرویال کا رشتہ نہ ہو سکا۔ اسی
ے ویریندر کے ساتھ میرے ویاہ کا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا۔ ہم دونوں کو بہت دکھ ہوا۔ ہرویال

کو کسی طرح اس کا پتہ چل گیا۔ ہوا یہ کہ ایک روز اس نے مجھے روتے ہوئے دیکھ لیا۔ ان دنوں میں دیپال پور میں اپنے گھر ہی پر تھی۔ اس نے کوشش کرکے ماں جی کو راضی کر لیا۔ پتا جی تو پہلے ہی تیار تھے۔ کچھ سے بعد شبھ گھڑی دیکھ کر سگن ہو گئی۔ اور یہ طے ہوا کہ اگلی پورن ماشی کو ویریندر کے ساتھ میری سگائی ہو جائے گی۔ میڈیکل کالج میں ویریندر کا آخری سال تھا اور اس کے بعد ہی ہمارا ویاہ ہونے والا تھا۔"

جمیلہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ یادوں کی اونچی نیچی لہروں پر ڈولتی نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئی۔ وہ گم صم بیٹھی تھی اور سامنے کی دیوار تک رہی تھی۔

بارش کا سلسلہ ابھی تک ختم نہ ہوا تھا۔ بھیگی ہوا مدھم سروں میں گنگنا رہی تھی۔ کمرے میں روشنی کم تھی اور سکوت گہرا تھا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "فیر کیا ہوا؟"

"فیر پاکستان بن گیا۔" جمیلہ بدستور دیوار کو تکتی رہی۔ "اس کے بعد مجھ پر جو کچھ بیتی وہ تجھے پتہ ہی ہے۔ مجھے اللہ وسایا کسی نہ کسی طرح ولیا کے گھر سے نکال کر حویلی میں لے آیا۔" جمیلہ نے صوفے پر پہلو بدلا۔

"ادھر ویریندر لہور سے بچ بچا کر اوکاڑے پہنچ گیا۔ وہاں اس کے چاچا کا گھر تھا۔ میں دیپال پور ہی میں تھی تو مجھے اس کے اوکاڑے پہنچنے کی خبر ملی تھی۔ بعد میں اس پر کیا بیتی مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ پر اسے پتہ چل گیا میں کوٹلہ ہرکشن میں ہوں۔"

"اسے کیسے پتہ چل گیا تو یہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" جمیلہ نے نہایت سادگی سے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی پتہ نہ تھا وہ زندہ ہے یا فسادات میں اوروں کی طرح مارا گیا۔ وہ ایسا سمے تھا، کسی کو کسی کا کچھ پتہ نہ تھا۔ چاروں اور ہاہاکار مچی تھی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں اسے بھول چکی تھی۔ سب ہی کچھ بھول چکی تھی۔ یہ بھی بھول چکی تھی کہ میں کبھی پاروتی تھی۔ جیون مانو ڈراؤنا سپنا بن گیا تھا۔"

"تیری فیر ملاقات نہیں ہوئی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"بہت دنوں بعد کی گل ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "ان دنوں مردولا سارا بائی، مغویہ اور لاوارث زنانیوں کا کھوج لگانے اور ان کی واپسی کے لیے پنجاب کا دورہ کر رہی تھیں۔ ایک روز وہ ادھر بھی آ گئیں۔ ان کے ساتھ ویریندر بھی تھا۔ وہ لوگ فوجی گاڑیوں میں آئے تھے۔ دونوں طرف کے سرکاری افسر بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس روز اللہ وسایا بھی موجود نہ تھا۔ وہ ملتان گیا تھا۔ مجھے جیسے

ان لوگوں کے پنڈ میں پہنچنے کی خبر ملی، میں جھٹ حویلی سے نکلی اور کھیتوں میں گھس گئی۔ خریف کی فصل تیار کھڑی تھی۔ میں کماد کی اونچی اونچی فصلوں کے اندر چھپ کر بیٹھ گئی۔"

جمیلہ خاموش ہو گئی۔ رحیم داد بھی چپ بیٹھا رہا۔ جمیلہ نے مڑ کر دروازے کی سمت دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ دالان خالی تھا اور صحن میں مینہ کی ہلکی ہلکی بوندیں آہستہ آہستہ گر رہی تھیں۔ کمرے کی خاموشی میں جمیلہ کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "کماد کے بوٹوں کی اوٹ میں سے ویریندر کو بہت دنوں بعد پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بالکل پہلے ہی جیسا تھا۔ وہی ہلکے گھونگھریالے بال۔ وہی آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ اور ان کے پیچھے چمکتی ہوئی اس کی موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ رنگ روپ بھی پہلے ہی جیسا تھا۔ بلکہ دھوپ میں اس کا چہرہ اور گلابی ہو گیا تھا۔ پر اب وہ کچھ دبلا ہو گیا تھا۔ سوٹ کی بجائے کھادی کا سفید کرتا، پائجامہ اور نہرو کٹ اونی جیکٹ پہنے تھا۔" جمیلہ نے ایک بار پھر گہری سانس بھری۔ "وہ سب سویرے سویرے آئے تھے پر دوپہر تک میرا کھوج نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ حویلی تو انھوں نے پوری طرح چھان ہی ڈالی اور پنڈ کے بھی ایک ایک گھر کی تلاشی لی۔"

"کماد کی فصل میں تلاشی نہیں لی؟"

"اس میں بھی بار بار جھانکا۔ پر میں ایسی دبکی بیٹھی تھی کسی کو نظر ہی نہ آئی۔ اس سے میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا ویریندر بہت بے کل تھا۔ کبھی ادھر جاتا کبھی ادھر۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ پر بھاگ دوڑ سے اس کا سارا بدن پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ وہ بار بار ماتھے سے پسینہ پونچھتا۔ فیر میں نے یہ بھی دیکھا، جب مردولا سارا بائی اور ان کے ساتھ کے تمام بندے واپس جا رہے تھے تو ویریندر کا چہرہ بیماروں کی طرح مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ دور تک پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا اور میں کماد کی فصل کے اندر بیٹھی اسے چپ چاپ تکتی رہی۔ میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ ایسا لگا میں اسے بھول کر بھی بھول نہ سکی تھی۔"

"جب ایسی گل تھی تو کماد کی فصل میں کیوں چھپ کر بیٹھ گئی تھی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اس کے ساتھ چلی کیوں نہ گئی؟"

"کیسے چلی جاتی۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "ان دنوں نینا میرے پیٹ میں تھی۔ وہ میرے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر جانے کیا سوچتا۔ اسے دکھ ہی ہوتا۔ میں نے سوچا ایسی حالت میں وہ مجھے کیسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ویسے بھی لاج کے مارے میں اس کے سامنے جانے کے لیے کہاں سے حوصلہ لاتی؟ میں تو ان میں سے کسی کے بھی سامنے جانا نہ چاہتی تھی۔ میں نے بار بار اٹھ کر باہر نکلنا چاہا پر ایسا لگا مانو پیروں میں اٹھنے کی شکتی نہ رہی۔"

"اس کے بعد وہ دوبارہ نہیں آیا؟" رحیم داد نے ویرندر کے ذکر میں دلچسپی کا اظہار کیا۔

"آیا تھا اور بالکل اکیلا آیا تھا۔" جمیلہ نے بتایا۔ "جاڑے کی ٹھنڈی رات تھی۔ اور میں مرے میں بالکل اکیلی تھی۔ ان دنوں میں اور اللہ وسایا نیچے ہی کے کمروں میں رہتے تھے۔ اس روز بھی اللہ وسایا موجود نہ تھا۔ دوپہر کو عارف والا گیا تھا اور واپس نہ آیا تھا۔ میں اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا۔ میں نے دیکھا' ویرندر دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا ہے۔ اس کے کندھے پر اسٹین گن لٹک رہی تھی۔ اب وہ زیادہ ہی دبلا ہو گیا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ رنگ بھی کم پڑ گیا تھا۔ سر کے بال خشک اور بکھرے ہوئے تھے۔ لیمپ کی پیلی پیلی روشنی میں وہ بیمار بیمار لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گئی۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔"

"وہ تیرے کمرے تک پہنچا کیسے۔ حویلی کے راکھے اور نوکر چاکر اسے نہ دیکھ سکے۔ کسی نے اسے نہ روکا۔"

"پتہ نہیں وہ کیسے آیا۔ نہ میں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ پر اتنا ضرور ہے۔ اس رات کہر بہت زیادہ تھی۔ چاروں اور گہری دھند کی چادر تنی تھی۔ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لگتا ہے وہ مہمان خانے کی اور سے آیا تھا جو ان دنوں بالکل خالی تھا۔" جمیلہ نے آہستہ آہستہ بتایا۔ "ہم دونوں ذرا دیر چپ چاپ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ فیر وہ آگے بڑھا۔ نزدیک آیا۔ مسکرا کر بولا۔ پارو! میں تجھے لینے آیا ہوں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور بستر پر سوتی ہوئی نینا کو ایک ہاتھ سے ہولے ہولے تھپکنے لگی۔ وہ اس سے سال بھر سے کچھ اوپر تھی۔"

"نینا کو دیکھ کر تو وہ پریشان ہو گیا ہو گا؟"

"نہیں! وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور نینا کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ پارو' یہ تیری بچی ہے؟ میں نے گردن ہلا کر ہاں کی۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ آہستہ سے میرے نزدیک بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے نینا کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ مسکرا کر بولا۔ کتنی سوہنی ہے' بالکل تیری طرح۔ وہ جھکا اور نینا کا گال چوم لیا۔"

"حد کر دی جی اس نے۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ "عجب بندہ تھا۔"

"ہاں وہ عجب ہی بندہ تھا۔" جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے چاہا وہ چلا جائے پر میں اسے یہ بات کہہ نہ سکی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ وہ چپ نہ رہا۔ میرے منہ کی اور دیکھ کر بولا۔ تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے

پ چھا۔ تو اب تک کہاں تھا؟ کہنے لگا کیا کرے گی جان کر۔ ویسے میں ایک بار پہلے بھی تیری کھوج بں ادھر آیا تھا پر تو نہیں ملی۔ لگتا ہے اللہ وسایا تجھے اپنے ساتھ کہیں اور لے گیا تھا۔ کسی نے ں مخبری کر دی ہو گی۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ چپ کر کے بیٹھی رہی۔"

"اس نے اپنے بارے میں تجھے کچھ نہیں بتایا؟"

"بتایا تھا۔ کہتا تھا جب فسادات کی آگ بھڑکی تو اس کے ماتا پتا اور ایک بھائی لوہری میں مارے گئے۔ وہ دو مہینوں کے ساتھ نکل کر کسی نہ کسی طرح چاچا کے پاس اوکاڑے پہنچ گیا۔ لیکن اس کے ہنچنے کے چند ہی روز بعد بلوائیوں نے ہلّا بول دیا۔ ویرندر کے چاچا کا نام زیندر ناتھ تھا۔ اس کے اس اپنے بچاؤ کے لیے صرف ایک شاٹ گن تھی اور دو درجن کے لگ بھگ کارتوس تھے۔ وہ اپنی ڑی کی چھت پر چڑھ گیا اور بلوائیوں کو گولی چلا کر روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ویرندر اس کی مدد رتا رہا۔ دوسری اور گھر کی زنانیوں نے دیکھا کہ بلوائیوں نے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور وبے کا دروازہ توڑ ڈالا تو جن کے بچے تھے انھوں نے بچوں کو چھاتی سے لگا کر دودھ پلایا۔ گھر میں ٹی کے تیل کے دو کنستر موجود تھے۔ چاچی نے سب پر تیل چھڑکا اور اپنے اوپر بھی ڈالا اور آگ کالی۔ آگ کے شعلے بھڑکے تو چاچا نیچے بھاگا۔ اس کی بندوق میں صرف ایک کارتوس رہ گیا تھا۔ یرندر دیوار پھاند کر برابر والے مکان کی چھت پر چلا گیا اور اس پر جھکے ہوئے ایک پیڑ پر چڑھ کر ثاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ چاچا کے گھر سے گوشت کے جلنے کی تیز بو ابھر رہی تھی۔ بلوائی لوٹ ار کرنے کے بعد چلے گئے تو رات کے اندھیرے میں وہ درخت سے اتر کر گھر میں گیا۔ دیکھا ساری زنانیاں جل کر مر چکی ہیں۔ ان کی لاشوں کے نزدیک ہی چاچا خون میں ڈوبا ہوا پڑا تھا۔ اس نے گولی چلا کر خود کشی کر لی تھی۔"

"ویرندر وہاں سے کیسے نکلا؟" رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"وہ سویرا ہونے سے پہلے نکل کر اپنے پتا کے ایک دوست سردار جسونت سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنے ٹبّر کے ساتھ سرحد پار جانے والے تھے۔ انھوں نے ایک ٹرک کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔" بیلہ دھیمے لہجے میں بتاتی رہی۔ "ویرندر بھی ان کے ٹبّر کے ساتھ ٹرک میں بیٹھ گیا۔ سردار جسونت سنگھ کے ساتھ اس کے دو پتر بھی تھے۔ ان کے علاوہ گھر والی تھی۔ جوان بہو بیٹیاں تھیں۔ رات کا ندھیرا ہوتے ہی ٹرک روانہ ہوا۔ دیپال پور ہی کے رستے سے گزرا تھا۔"

"ویرندر تیرے گھر نہیں پہنچا۔ تو بھی تو ان دنوں دیپال پور میں تھی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"اس نے کوشش تو کی تھی' پر ڈرائیور تیار نہ ہوا۔ میرا گھر رستے سے تین میل دور تھا۔ ادھر گڑبڑ بھی بہت تھی۔ فیروریندر کو یہ بھی پتہ نہ تھا میں دیپال پور ہی میں ہوں۔ ان دنوں کچھ پتہ نہ تھا کون کہاں ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "ٹرک دیپال پور سے گزرتا ہوا چک بیدی کے رستے حویلی روڈ پر بڑھا۔ یہی سڑک سرحد پار جاتی تھی۔ پر نانک پورہ سے آگے درختوں کو کاٹ کر سڑک پر رکاوٹ کھڑی کردی گئی تھی۔ اس سمے ڈرائیور آرام کر رہا تھا اور ٹرک سردار جسونت سنگھ کا پتر چلا رہا تھا۔ اس نے سڑک پر دور سے رکاوٹ دیکھ لی۔ جھٹ ٹرک کو کچے راستے پر ڈال دیا پر چند ہی میل جانے کے بعد پٹرول ختم ہوگیا۔ سب نے دھکا لگا کر ٹرک ایک جھنگر میں چھپا کر کھڑا کردیا۔ پروگرام یہ تھا کہ دن جھنگر میں گزار کر رات کو پیدل سفر کیا جائے۔ دن ٹھیک ٹھاک گزر گیا۔ شام ہوئی تو آگے جانے کے لیے اندھیرا ہونے کا انتظار ہونے لگا۔ نہ جانے کدھر سے ایک بوڑھا مسلمان اپنی گؤ ہنکاتا ہوا ادھر سے گزرا۔ اس نے سب کو دیکھا تو گؤ چھوڑ کر بھاگا۔ اس کا پنڈ نزدیک ہی تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے پنڈ بلکہ آس پاس جتنے بھی پنڈ تھے' سب کو خبر کردی۔ اندھیرا بڑھنے کے ساتھ دور سے شور سنائی دینے لگا۔ مشعلوں کی روشنی بھی دکھائی دی۔ بلوائی حملہ کرنے کے لیے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔"

"سردار اور اس کے پتروں کے پاس کوئی ہتھیار شتھیار نہیں تھا؟"

"ویریندر بتاتا تھا ان کے پاس ریوالور کے علاوہ ایک تھری ناٹ تھری رائفل اور ایک سٹین گن بھی تھی؟"

"تب تو ان کے پاس اتنا اسلحہ تھا کہ بلوائیوں کو بھگایا جاسکتا تھا۔" رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"پر بلوائی بہت زیادہ تھے۔ ان کے پاس بھی اسلحہ تھا۔ وہ ہوائی فیر چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ سردار جسونت سنگھ کے دونوں پتر رائفل اور سٹین گن کے ساتھ مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ ادھر سردار جسونت سنگھ نے اپنے ٹبر کی زنانیوں کو تین لائینوں میں پاس پاس بٹھا دیا۔ ہر ایک کی آنکھ پر اس کی اوڑھنی سے پٹی باندھ دی۔ سردار کی ایک نوہ اپنے ننھے کاکے کو چھاتی سے لگا کر دودھ پلانے لگی۔ بیچ میں وڈی سردارنی تھی۔ اس کے دائیں بائیں جوان کڑیاں تھیں۔ تینوں آگے کی لائن میں تھیں۔ ان کے پیچھے پتروں کی گھروالیاں اور پوتیاں تھیں۔ سردار جی نے ہولسٹر سے بھرا ہوا ریوالور نکالا اور گورو گرنتھ صاحب کے وار ملہار اشوک کے ان شبدوں کا اونچی آواز سے جاپ شروع کردیا۔

چلبل بسیار دنیا چھائی
کالو بے اکل من گور نہ مانی
من کین کترین تو دریاؤ کھدایا
ایک چیج مجھے دے اور جر چیج نہ بھایا

سردار جی کی زبان پر گورو گرنتھ صاحب کا جاپ تھا اور آنکھوں سے آنسو ٹپکتے تھے۔"

رحیم داد نے جمیلہ کی بات کاٹ کر کہا۔ "زمیں وارنی تجھے گورو گرنتھ صاحب کے شبد کیسے یاد رہ گئے؟" اس کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

"میں بچپن میں خالصہ سکول میں پڑھتی تھی۔ وہاں گورو گرنتھ صاحب کے اشلوکوں کا ہر صبح جاپ کرایا جاتا تھا۔ مجھے ان اشلوکوں کے اب تک بہت شبد یاد ہیں۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔

"میں نے تو یہ بات ایسے ہی پوچھ لی تھی۔ تو سردار جسونت کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کا کیا بنا؟"

"میں بتا رہی تھی' سردار جی گورو گرنتھ صاحب کے شبدوں کا جاپ کر رہے تھے۔ ریوالور ان کے ہاتھ میں تھا اور سامنے زمیں پر ان کے گھر کی ملائیں تین لائینوں میں زمین پر بیٹھی تھیں۔ بلوائیوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا' نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔"

"سردار نے یہ سب کیوں کیا تھا؟" رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

"سیدھی سی گل ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس کے گھر کی زنانیوں اور کڑیوں کو بلوائی اٹھا کر لے جائیں۔ ان کی عزت آبرو لوٹیں۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "پر بلوائیوں کا شور جب بالکل نزدیک آگیا اور روشنی درختوں کی اوٹ سے صاف نظر آنے لگی تو سردار جسونت سنگھ نے ریوالور ویریندر کے ہاتھ میں دے دیا۔ جیب سے سفید رومال نکالا اور ویریندر سے کہا۔ میں رومال ہلا کر تین تک گنتی گنوں گا۔ جب میں تین کہوں تو ریوالور سے سامنے بیٹھی ہوئی زنانیوں پر گولیاں چلنی شروع ہو جائیں۔"

"یہ کام تو سردار خود بھی کر سکتا تھا؟"

"کر تو سکتا تھا پر اس لیے کرنا نہ چاہتا تھا کہ آخری سمے شاید اس سے گولی نہ چلائی جائے۔ کوئی بھی اتنا کٹھور نہیں ہو سکتا کہ اپنے ہی بال بچوں کو اپنے ہی ہاتھوں کتل کردے۔ سردار اسی لیے یہ کام ویریندر سے کرانا چاہتا تھا۔ شور بہت نزدیک آگیا تو سردار جی نے رومال ہلا کر ایک کہا۔ ذرا دیر بعد دوسری بار رومال ہلایا اور دو کہا۔ اس نے رومال ہلانے کے لیے تیسری بار ہاتھ اٹھایا تو دور

سڑک پر تیز روشنی ابھری۔"

"یہ بھی مشالوں کی روشنی تھی؟"

"نہیں' ٹرک کی روشنی تھی اور تیزی سے نزدیک آتی جا رہی تھی۔ ویرندر نے روشنی دیکھی تو مدد کے لیے اس طرف بڑھا۔ سردار جی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اونچی آواز سے کہا۔ اگر وہ مسلے ہوئے تو کیا ہو گا؟ پر ویرندر نہ رکا۔ اس نے سردار جسونت سنگھ کو سمجھایا۔ بلوائی بھی تو مسلے ہی ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ آنے والے ہندو یا سکھ ہوں۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا سڑک پر پہنچ گیا۔ دیکھا سامنے سے ایک ٹرک آ رہا ہے۔ ویرندر نے ہاتھ ہلا کر اسے روکا۔ ٹرک رک گیا۔"

"اس میں کون سوار تھا؟" رحیم داد نے سراپا استعجاب بن کر دریافت کیا۔

"وہ مسلمان فوجی تھے۔"

"مسلمان فوجی تھے۔" رحیم داحیرت سے چونک کر بولا۔ "تب تو بہت مشکل پڑی ہو گی۔"

"کوئی مشکل پڑی نہ کٹھنائی۔" جمیلہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "ویرندر نے ان کی منت کی۔ وہ نیک اور بھلے بندے تھے۔ فوراً مدد کرنے پر تیار ہو گئے۔ انھوں نے ویرندر کے ساتھ سردار جسونت سنگھ کے پورے ٹبر کو اپنے فوجی ٹرک میں بٹھا لیا۔ بلوائی شور مچاتے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ پر جب انھوں نے فوجیوں کو برین گنیں اور رائیفلیں سنبھالے دیکھا تو لوٹ گئے۔ فوجیوں نے ویرندر اور جسونت سنگھ کے بال بچوں کو آرام سے سرحد پار پہنچا دیا۔"

"یہ تو نے عجب گل سنائی۔" رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "ویرندر سرحد پار جا کر کیا کرتا رہا؟"

"بتاتا تھا' اس نے آگرہ جا کر میڈیکل کالج میں کسی نہ کسی طرح اپنی پڑھائی پوری کی اور ڈاکٹر بن گیا۔ اس سنسار میں اس کا کوئی نہ رہا تھا۔ سب مارے جا چکے تھے۔ وہ اکیلا بچا تھا۔ وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کے مفت علاج کے لیے اسپتال بنانا چاہتا تھا۔ اس کی آشا تھی کہ اس نیک کام میں' میں اس کی مدد کروں۔ دونوں مل جل کر اسپتال چلائیں۔"

"تو نے اس کی گل سن کر کیا جواب دیا؟"

"میں چپ بیٹھی رہی۔ وہ بولتا رہا۔ میں سنتی رہی۔ سر جھکائے پاس لیٹی ہوئی نینا کو ہولے' ہولے تھپکتی رہی۔ ویرندر نہ جانے اور کیا کیا کہتا۔ اچانک کمرے کے باہر چاپ ابھری۔ میں نے پریشان ہو کر دروازے کی اور دیکھا' اللہ وسایا کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے ویرندر کو میرے برابر بستر پہ بیٹھے ہوئے دیکھا تو ٹھٹک کر دہلیز پہ رہ گیا۔"

"اللہ وسایا اسے تیرے ساتھ اس طرح بیٹھے دیکھ کر غصے سے پاگل ہو گیا ہو گا۔" رحیم داد کے
ہ میں استعجاب تھا۔

"نہیں' وہ چپ کر کے کھڑا ہم دونوں کو دیکھتا رہا۔" جمیلہ نے نہایت اطمینان سے بتایا۔ "ذرا دیر
پ رہنے کے بعد اس نے ویرندر کی اور ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔ یہ کون ہے؟ کس لیے آیا ہے؟ تیرا
ئی بھی نہیں لگتا۔ میں تو خاموش بیٹھی رہی پر ویرندر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بتایا۔ میرا نام
ٹر ویرندر ناتھ کھنہ ہے۔ میرا اس کا کیا ناتا ہے؟ یوں سمجھ لے' میں اس کا منگیتر ہوں اور اسے
نے آیا ہوں۔ یہ کہتے کہتے اس نے جھٹ کندھے سے سٹین گن اتاری۔ اسے اللہ وسایا کی سمت
ن کر بولا۔ میں اسے آج اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرا رستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ اللہ وسایا تو
نا نہیں چاہتا تو میرے رستے سے ہٹ جا۔ اس کی آنکھیں غصے سے لال ہو رہی تھیں۔"

"اللہ وسایا تو نہتا تھا۔ ڈر کر اس کے سامنے سے ہٹ گیا ہو گا۔" رحیم داد نے اپنا خیال ظاہر
یا۔

"نہیں! وہ بالکل نہیں ڈرا۔ اسی طرح ویرندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ وہ بہت
ر اور حوصلے والا تھا۔" جمیلہ فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے بولی۔ "کچھ دیر تو وہ چپ رہا فیر اس
نے میری اور ہاتھ اٹھا کر ویرندر سے کہا۔ یہ تیرے ساتھ جانا چاہتی ہے تو خوشی سے جا سکتی ہے۔
سے پوری طرح پتہ ہے' میں نے کبھی اس کا رستہ نہیں روکا اور اگر یہ نہیں جانا چاہتی تو ڈاکٹر
ریندر تو اسے صرف میری لاش کے اوپر سے گزر کر ہی لے جا سکتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔
ریندر کی سٹین گن کی نالی ایک ہاتھ سے کھسکا کر بولا۔ اسے ہٹا۔ اس نے مڑ کر میری اور دیکھا'
چھا۔ جمی لے! تو کیا کہتی ہے؟ وہ تن کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔"

"تو نے کیا جواب دیا؟ اللہ وسایا نے تجھے کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "مجھے سمجھ نہیں آئی' کیا کہوں؟ میں خاموش
بیٹھی رہی پر ویرندر خاموش نہ رہا۔ کہنے لگا۔ اس نے کیا کہنا ہے۔ یہ میرے ساتھ جائے گی۔ یہ کہہ
کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ تب اللہ وسایا نے اسے گھور کر دیکھا۔
مے سے بولا۔ ڈاکٹر اس کا بازو چھوڑ دے۔ تو اسے اس طرح یہاں سے نہیں لے جا سکتا۔ اللہ
سایا اس سے بالکل سٹین گن کی نالی کے سامنے کھڑا تھا۔"

"ویرندر نے تیرا بازو چھوڑ دیا؟"

"نہیں! اس نے میرا بازو اسی طرح پکڑے رکھا۔ اس نے اللہ وسایا کی اور نہیں دیکھا۔ میرا بازو

ہولے ہولے جھنجوڑ کر بولا۔ تجھے میرے ساتھ چلنا ہے؟ صاف صاف بتا دے۔ مجھے پورا وشواس ہے تو انکار نہیں کر سکتی۔ اس کی آواز میں منت تھی۔ آنکھوں میں جیسے آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں الجھن میں پڑ گئی۔ ایسا لگا میں جمیلہ سے پھر پاروتی بن گئی ہوں۔ بھولے بسرے سپنے جاگ اٹھے تھے اور ان سپنوں میں بسنے والا ویرندر میرے سامنے کھڑا تھا۔ ہاں وہی تھا۔ وہی الجھے ہوئے بال' وہی سنہری چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ وہ سرحد پار سے مجھے لینے آیا تھا۔" جمیلہ خود فراموشی کے عالم میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ "میں بالکل چپ تھی۔ کھوئی کھوئی بیٹھی رہی۔"

"اللہ وسایا بھی چپ کر کے کھڑا رہا۔ وہ کچھ نہ بولا؟"

"نہیں اس نے اونچی آواز سے کہا تھا۔ بول' بولتی کیوں نہیں؟ تیں نوں اس کے ساتھ جانا ہے؟ اس کی آواز سے نینا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ نینا کو روتا دیکھ کر میں چونک پڑی۔ مڑ کر نینا کو دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا' میں پاروتی نہیں جمیلہ ہوں۔ اللہ وسایا کی گھر والی اور اس کی دھی' نینا کی ماں ہوں۔ میں بے کل ہو گئی۔ تڑپ کر میں نے نینا کو اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں نے آنسو بہاتے ہوئے ویرندر کی اور دیکھا' اسے کہا۔ ڈاکٹر ویرندر تو جس پاروتی کو لینے آیا تھا وہ تو کب کی مر چکی ہے۔ میں جمیلہ ہوں اور جمیلہ تیرے ساتھ نہیں جا سکتی۔ تو جا۔ میرا تیرا کوئی سنبندھ نہیں۔"

"تیری یہ بات سن کر ویرندر کیا بولا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔" جمیلہ نے جواب دیا۔ "اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ کہنے لگا تو جمیلہ ہو یا شمیلہ' میرے لیے تو پارو ہی ہے۔ میں آج یہ طے کر کے آیا ہوں کہ اکیلا واپس نہیں جاؤں گا۔ تجھے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اس نے سٹین گن کی نالی کا رخ اللہ وسایا کی اور کر دیا اور میری طرف مڑ کر تیزی سے بولا۔ میں نے یہ سوچ کر ہی سرحد پار کی تھی کہ تجھے اپنے ساتھ لے کر ہی لوٹوں گا۔ جو میرا رستہ روکے گا اسے ختم کر دوں گا یا خود ختم ہو جاؤں گا۔ میں آج سردھڑ کی بازی لگانے آیا ہوں۔ بول تجھے کیا کہنا ہے۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔"

"تو نے کیا کیا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تو ڈر گئی ہو گی۔ ویرندر تو صاف صاف کہہ چکا تھا وہ تیرے بنا نہیں جائے گا۔"

"میں بالکل نہیں ڈری۔ میں نے بھی اسے صاف صاف کہہ دیا۔ تیری پارو مر گئی۔ وہ زندہ نہیں ہو سکتی۔ میں اب صرف جمیلہ ہوں۔ تو جمیلہ کو قتل کر کے اس کی لاش اپنے ساتھ لے جا۔ میں زندہ

ے ساتھ نہیں جا سکتی' ہرگز نہیں جا سکتی۔ یہ کہہ کر میں نینا کو چھاتی سے لگا کر رونے لگی۔
ندر خاموش کھڑا رہا۔"

"تیری گل سن کر تو اسے چلا جانا چاہیے تھا۔" رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

"نہیں۔" جمیلہ نے بتایا۔ "اس نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں مجھے کہا۔ ایک بار پھر سوچ
ے۔ میں دوبارہ کبھی نہیں آؤں گا۔ وہ ٹکٹکی باندھے مجھے تکتا رہا۔" جمیلہ نے لمبی سانس بھری۔
ں نے سسکیاں بھرتے ہوئے اسے کہا۔ میں چاہتی بھی یہی ہوں تو دوبارہ یہاں نہ آئے۔ اس کے
ر وہ کچھ نہ بولا۔ سٹین گن کندھے پر لٹکائی اور میری اور دیکھے بنا دروازے کی طرف بڑھا۔ اللہ
ایا بھی اس کے ساتھ ہی مڑا' آگے بڑھا۔ دونوں چپ چاپ کمرے سے باہر چلے گئے۔"

"تو نے اللہ وسایا کو اس کے ساتھ جانے دیا۔ روکا کیوں نہیں؟"

"میرا جی تو یہی چاہتا تھا' اللہ وسایا کو اس کے ساتھ جانے نہ دوں پر مجھ سے یہ بات کہی نہ گئی۔
ہونٹوں پر جیسے تالا لگ گیا۔ میں نینا کو چھاتی سے چمٹائے خاموش بیٹھی روتی رہی۔" جمیلہ نے بتایا۔

"اللہ وسایا دیر تک نہ لوٹا۔ میں اس کا انتظار کرتی رہی۔ وہ صبح تک نہ آیا۔"

"اللہ وسایا کہاں چلا گیا تھا؟"

"وہ ویرندر کے ساتھ سرحدی پنڈ شامار کے گیا تھا۔ دوپہر کو واپس آیا تو بہت تھکا ہوا اور اداس
ا۔ اس نے مجھے بتایا' ویرندر جیپ میں بیٹھ کر یہاں آیا تھا۔ اس کے ساتھ دو سمگلر تھے۔ وہ بھی
پوری طرح مسلح تھے۔ ویرندر اصرار کر کے اللہ وسایا کو اپنے ساتھ سرحد تک لے گیا تھا۔"

"اور اللہ وسایا اس کے ساتھ چلا بھی گیا۔" رحیم داد حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "اسے
ویرندر اور اس کے ساتھ آنے والے مسلح سمگلروں سے ڈر بھی نہ لگا۔"

"وہ ڈرنے والا بندہ نہیں تھا۔ سدا کا نڈر اور جیالا تھا۔" جمیلہ نے اپنے لہجے میں زور پیدا کرتے
ہوئے کہا۔ "تب ہی تو وہ بے دھڑک ویرندر کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ رات انھوں نے
شامار کے میں گزاری۔ سویرے بہت تڑکے پہلے ویرندر اٹھا۔ وہ رات بھر سویا نہیں تھا۔ اس نے
اللہ وسایا کو جگایا اور اس کے ساتھ ستلج کی اور چلا۔" جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر اسے
مخاطب کیا۔ "چوہدری! تجھے پتہ ہے ستلج پار فیروز پور کی سرحد لگتی ہے اور فیروز پور اب ہندوستان
میں ہے۔" جمیلہ نے لحہ بھر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "جب دونوں ستلج پر پہنچے تو ویرندر
نے اللہ وسایا کو گرم جوشی کے ساتھ گلے لگا لیا۔ اس کے ماتھے کو چوما اور چپ چاپ آگے بڑھ
گیا۔"

"سرحد پار چلا گیا ہو گا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر استفسار کیا۔

"نہیں وہ ستلج کے اس پار نہ گیا۔ جہاں دونوں ملکوں کی سرحدیں ملتی تھیں وہاں ٹھہر گیا۔ اس نے اچانک کندھے پر لٹکی ہوئی سٹین گن اتاری اور کنپٹی پر رکھ کر چلا دی۔"

"تب تو وہ مر گیا ہو گا؟" رحیم داد کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔

"ہاں! اسی سے اس کی مرتی ہو گئی۔ اس کی لاش سرحد کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ ادھر پاکستان تھا ادھر ہندوستان۔" جمیلہ نے رسان سے کہا۔ اس کی آواز میں درد کی کسک تھی۔ "مرنے سے پہلے اس نے اللہ وسایا کو سونے کی ایک انگوٹھی دی۔ اسے بتایا' وہ انگوٹھی 'کڑمائی' پر مجھے پہنانا چاہتا تھا پر وہ دن ہی نہ آیا' کڑمائی ہوتی اور وہ اپنی منگ کے طور پر مجھے انگوٹھی پہناتا۔ اس کی آشا تھی میں اس کی نشانی سمجھ کر اسے پہن لوں۔ ویرندر اس رات مجھے لینے اور کڑمائی کی انگوٹھی پہنانے ہی کے لیے آیا تھا۔"

"اس انگوٹھی کا کیا بنا؟"

"یہ رہی وہ انگوٹھی۔" جمیلہ نے اپنا ہاتھ رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ اس کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی جس میں جڑا ہوا ہیرے کا سرخ نگینہ جھلملا رہا تھا۔ "میں نے انگوٹھی اسی سے پہن لی تھی۔ اور آج تک نہیں اتاری۔"

"اللہ وسایا نے اس کا برا نہیں منایا؟"

"نہیں!" جمیلہ نے آہستہ آہستہ انکار میں گردن ہلائی۔ "انگوٹھی اس نے خود اپنے ہاتھ سے پہنائی تھی۔ اس سے اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ رہے تھے۔ انگوٹھی پہنا کر وہ رونے لگا تھا۔"

"اللہ وسایا بھی عجب بندہ تھا۔"

"ہاں! وہ بہت عجب بندہ تھا۔" جمیلہ کے لہجے میں دکھ کی چبھن تھی۔ "اسے تو یہ بھی پتہ تھا' میں ڈسپنسری' ڈاکٹر ویرندر ہی کی یادگار کے طور پر بنانا چاہتی ہوں۔ میں نے اسے جب اپنی اس آشا سے آگاہ کیا تو اس نے ذرا بھی برا نہ منایا۔ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ چوہدری! سچ پوچھ تو ویرندر کی موت پر اللہ وسایا بھی نراش اور دکھی تھا۔ بار بار کہتا تھا' تو اس کے ساتھ چلی جاتی تو وہ کبھی خودکشی نہ کرتا۔"

"اللہ وسایا ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ تو چلی جاتی تو وہ یوں جان نہ دیتا۔"

"پر میں اس کے ساتھ کیسے جا سکتی تھی۔" جمیلہ نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "میں ویرندر کے ساتھ سرحد پار چلی جاتی تو زمیں داری اللہ وسایا کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ وہ زمیں دار سے غیر مزارع

ن جاتا۔ جانے کیا ہوتا۔ میری بینا کا کیا بنتا۔ پتہ نہیں ادھر والے اس کے ساتھ کیسا سلوک کرتے؟ ایک نہیں' کتنی باتیں تھیں جو زنجیر بن کر میرے پیروں سے چمٹ گئی تھیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اللہ وسایا کو چھوڑ کر ویرندر کے ساتھ جانا آسان نہ تھا۔ میرے تو بھاگ جاگے تھے' مجھے اللہ وسایا کے روپ میں ایسا نیک بندہ مل گیا تھا۔ اس کا من بہت اجلا تھا۔ وہ بہت ہی بھلا بندہ تھا۔"

رحیم داد نے جمیلہ سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "پر زمیں دارنی تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔"

"میں اکیلی اس ظلم اور اپرادھ کا نشانہ نہیں بنی۔" جمیلہ نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "تجھے بھی پوری طرح پتہ ہے' ادھر اور ادھر' دونوں طرف لاکھوں ٹمیاریں اور زنانیاں اٹھائی گئیں اور اپنا سب کچھ لٹا کر مغویہ کہلائیں۔ میری طرح انھوں نے بھی آئندہ کے لیے جانے کیسے کیسے سپنے دیکھے ہوں گے۔ ان میں خوشیاں تھیں۔ چمکتی دمکتی آشائیں تھیں۔ زندہ رہنے اور سندر جیون بتانے کی امنگیں تھیں۔" اس کا لہجہ اور غم زدہ ہو گیا۔ "فیر ایک روز اچانک سب کچھ ملیا میٹ ہو گیا۔ جیون ڈراؤنا سپنا بن گیا۔ تجھے کیا پتہ ان پر کیا کیا نہ بیتی اور اب تک بیت رہی ہے۔"

رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری مگر خاموش رہا۔

☆

آسمان پر گہرا ابر چھایا تھا۔ ہوا تیز نہ تھی مگر بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ حویلی پر سناٹا چھایا تھا۔ کمرے میں رحیم داد اور جمیلہ صوفوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں خاموش تھے اور دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر دکھ کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"زمیں دارنی تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ فسادات میں زنانیوں کے ساتھ بہت ہی ظلم ہوا۔"

"نہ پوچھ' کیا کیا ظلم نہیں ہوا۔" جمیلہ نے تڑپ کر کہا۔ "کالج میں میری ایک کلاس فیلو ہوتی تھی۔ اس کا نام چترا کپور تھا۔ لگتی بھی سندر چتر کی طرح تھی۔ اسے اپنی سندرتا پر مان بھی تھا۔ تھی بھی چترکار۔ میں نے اس کی بنائی ہوئی کئی پینٹنگ دیکھیں۔ اچھی خاصی سندر تصویریں بنا لیتی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں پتلی پتلی تھیں اور لمبی لمبی' بہت کومل اور بہت سوہنی تھی۔ میرے ساتھ اس کی بہت گہری دوستی تھی۔ وہ بی۔ اے کرنے کے بعد پینٹنگ سیکھنے بمبئی جانا چاہتی تھی۔ جے جے سکول آف آرٹس میں داخلہ لینے کا ارادہ تھا۔ اسے پینٹنگ سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔

ویسے بھی بات چیت، کپڑے لتے، رہن سہن، ہر انداز سے آرٹسٹ لگتی تھی۔"

"کسی اچھے ہی گھر کی کڑی ہو گی؟"

"ہاں!" جمیلہ نے بتایا۔ "اس کا پتا انجینئر ہوتا تھا۔ میں اس کے پتا سے کئی بار ملی بھی تھی۔ اس میں ذرا بھی اکڑفوں نہ تھی۔ پر چترا میں ایسی اکڑ تھی، سب اسے گھمنڈی کہتے تھے۔ پر پیار بھی بہت کرتے تھے۔ اس میں بات ہی ایسی تھی۔ بادام کی سی لمبی کالی کالی آنکھیں۔ اور رنگت ایسی اجلی جیسے صبح کی ہنستی ہوئی دھوپ۔ جب وہ اپنی سوہنی گردن، راج ہنس کی طرح اٹھائے، ماتھے پر بکھری ہوئی بالوں کی لٹوں کو بار بار جھٹکتی ہوئی گزرتی تو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ مجھے اب تک یاد ہے ان دنوں وہ کتنی سوہنی اور شاندار لگتی تھی۔"

"پر اس کا بنا کیا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"یہ نہ پوچھ چوہدری۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "دو ڈھائی برس ادھر کی گل ہے۔ میں پڑوس کے ایک زمیں دار کے پتر کی جنج کے ساتھ پکھیالہ گئی۔ اللہ وسایا، بینا اور گڈو بھی ساتھ تھے۔ جنج کئی روز پکھیالہ میں ٹھیری۔ ستمبر کا مہینہ تھا۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ ورکھا ختم ہو چکی تھی۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ خریف کی فصلیں سمجھو تیار ہی کھڑی تھیں۔ کپاس کے کھیتوں میں سفید سفید تو بنے پھوٹنے لگے تھے۔ ایک روز میں بینا کی انگلی تھامے ٹہلتی ہوئی پنڈ کی ایک گلی میں چلی گئی۔"

"یہ پکھیالہ کہاں ہوا جی؟"

"پکھیالہ، ضلع شیخوپورہ کی تحصیل فیروزوالا میں ہے۔ اچھا وڈا موضع ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ گلی سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا ایک زنانی دونوں ہاتھوں میں گوبر اٹھا اٹھا کر دیوار پر پاتھیاں تھاپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سدھے ہوئے تھے اور تیز تیز چل رہے تھے۔ دیوار پر تھپ تھپ پاتھیاں بنتی جا رہی تھیں۔ گوبر کے ڈھیر کے پاس دو گندے اور مریل سے بالک بیٹھے تھے۔ ان کے کپڑے میلے کچیلے تھے۔ وہ ٹانگوں سے بالکل ننگے تھے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ لحہ بھر کے لیے رکی۔

"مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ اس میں مجھے چترا کی جھلک نظر آئی۔ پر مجھے اپنی آنکھوں پر وشواس نہ آیا۔ اسے اچنبھے سے دیکھتی دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ وہ بالکل بے خبر اپنی دھن میں مگن پاتھیوں کی تھپائی میں لگی تھی۔"

"دیکھنے میں کیسی نظر آتی تھی؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"وہ بالکل بدل چکی تھی۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس کے گندے اور الجھے ہوئے بال بار بار بکھر کر منہ پر پھیل جاتے اور وہ ہاتھوں کو چلاتے ہوئے بار بار ایک خاص انداز سے گردن جھٹک کر بالوں کو پیچھے لے جاتی۔ یہ انداز چترا کور ہی کا تھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچ گئی۔ غور سے دیکھا تو وہ چترا ہی تھی۔ نہ اب اس کا پہلا سا رنگ روپ رہا تھا نہ سندرتا ہی رہی تھی۔ کالی کالی جگ مگ جگ مگ کرتی آنکھیں بجھ کر دھندلی پڑ گئی تھیں۔ کپڑے لتے پھٹے پرانے تھے۔ ان پر گوبر اور کیچڑ کے جگہ جگہ داغ دھبے تھے۔ اس کے بدن سے جو کبھی چنبیلی کی سندر کلیوں کی مانند لچکتا تھا، مہکتا تھا، اس سے گوبر اور پسینے کی تیز بو کے بھبکے اٹھتے تھے۔ صورت سے وہ ادھیڑ اور بیمار لگتی تھی۔ میں دکھ اور خوف سے کپکپا کے رہ گئی۔"

"کیا وہ سچ مچ چترا کور ہی تھی؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں جمیلہ سے دریافت کیا۔

"ہاں وہی تھی۔" جمیلہ نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "پر اب وہ چترا سے سکینہ بن چکی تھی۔ میں نے پاس جا کر پوچھا، 'تو چترا کور ہے نا؟' اس نے چونک کر میری اور دیکھا۔ پر کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھوں میں گھڑی بھر کے لیے دیوے جگمگائے اور بجھ گئے۔ میں نے غور کیا، اس کے ہاتھوں کی لمبی اور کومل انگلیاں بھدی اور کھردری پڑ گئی تھیں۔ اسے ان کی ذرا چنتا نہیں تھی۔ اسے تو اپنی بھی کوئی چنتا نہ تھی۔ وہ مڑی اور اس کی انگلیاں ہاتھوں کے ساتھ ساتھ تیزی سے چلنے لگیں۔ وہ برابر تھپائی کرتی رہی۔"

"اس نے تجھے پہچان لیا تھا؟"

"ہاں، اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ پر مجھے مل کر وہ ذرا خوش نہ ہوئی۔ اس کے اجڑے ہوئے چہرے پر بکھری ہوئی جھنجلاہٹ اور نفرت صاف نظر آ رہی تھی۔ ہونٹ اس طرح سکڑ گئے تھے مانو کڑوے پڑ گئے ہوں۔ وہ پیٹھ موڑے جھک جھک کر گوبر اٹھا رہی تھی۔"

"تو نے اس سے گل بات نہیں کی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"کی تھی۔" جمیلہ نے بتایا۔ "میں نے اپنی آواز میں نرمی اور مٹھاس پیدا کرتے ہوئے اس سے کہا۔ چترا رانی! میں اسے پیار سے چترا رانی ہی کہتی تھی۔ وہ تب بھی خوش نہ ہوئی۔ بگڑ کر بولی۔ کون چترا، کیسی چترا؟ میں کسی چترا شترا کو نہیں جانتی۔ میرا نام سکینہ ہے۔ میں نے اس کے ناراض ہونے کا ذرا برا نہ منایا۔ خاموش کھڑی رہی۔"

"بس اتنی ہی گل بات ہوئی؟"

"نہیں! میں نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد آہستہ سے پوچھا۔ یہ تجھے کیا ہو گیا۔ تیری اندر کی

آرٹسٹ اور اس کا آرٹ کہاں چلا گیا؟ اس نے میری طرف دیکھے بنا گوبر کی تھاپی دیوار پر مارتے ہوئے جواب دیا۔ یہ آرٹ دیکھ رہی ہے؟ اس نے دیوار پر تھپی ہوئی پاتھیوں کی سمت اشارہ کیا۔ یہ بھی تو آرٹ ہی ہے نا۔ دیوار کو کینوس سمجھ لے۔ اور پاتھیوں کو گل بوٹے۔ دیکھ کیسا شاندار لینڈ سکیپ بن گیا۔ وہ پلٹی' مجھے تیز اور تیکھی نگاہوں سے دیکھا اور گوبر کے ڈھیر کے پاس بیٹھے ہوئے بالکوں کی اور ایک ہاتھ اٹھا کر بتایا' یہ میرے آرٹ کے زندہ شاہکار ہیں۔ وہ ٹھٹھا مار کر پاگلوں کی طرح ہنسی۔ تجھے میرا یہ آرٹ پسند آیا؟ اس نے گوبر پر تیزی سے ہاتھ مارا۔ گوبر کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی مکھیاں اڑیں اور بھنبھناتی ہوئی ادھر ادھر بکھر گئیں۔ میں ہاتھ ہلا کر انہیں منہ پر سے اڑانے لگی پر چترا نے ان پر کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ آرام سے دیوار پر پاتھیاں تھوپتی رہی۔ وہ بیمار اور مریل دکھائی دینے کے ساتھ ساتھ پگلی بھی لگ رہی تھی۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کرتی تھی۔"

"اسے واپس لینے کوئی نہ آیا؟ اس کا بھی کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔"

"پتہ نہیں۔ نہ میں نے اس بارے میں پوچھا نہ اس نے بتایا۔ اس کے ساتھ زیادہ بات چیت کا موقع ہی نہ ملا۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "میرے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد گھر کا دروازہ کھلا۔ اندر سے ایک بوڑھی بڑبڑاتی ہوئی نکلی اور چترا کو چیخ چیخ کر کوسنے لگی۔"

"وہ اس سے اتنی ناراض کیوں تھی۔ کوئی تو وجہ ہوگی؟"

"وہ اس لیے اتنے غصے میں تھی کہ چترا نے پاتھیاں تھوپنے میں دیر لگا دی تھی اور گھر والے کے لیے کھیت پر بھتا نہ پہنچا سکی تھی۔ بوڑھی اصل میں چترا کی ساس تھی۔ بہت کڑوی اور کٹھور لگتی تھی۔"

"چترا نے اس کے رولا گولا کرنے پر کچھ نہ کہا؟"

"نہیں' وہ خاموشی سے دیوار پر پاتھیاں تھوپتی رہی۔ اس کے ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگے۔ بوڑھی کھڑی چیخ ہی رہی تھی کہ گلی میں ایک ادھکڑ بندا داخل ہوا۔ اس نے چترا کو دیکھتے ہی ننگی ننگی گالاں نکالنی شروع کر دیں۔ وہ سخت غصے میں تھا۔"

"چترا کا گھر والا ہوگا۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"ہاں جی' وہ اس کا گھر والا ہی تھا۔ وہ چھوٹے کد کا بھدا اور بے ڈول بندہ تھا۔ یہ لمبے لمبے تو اس کے دانت تھے۔ پیلے پیلے اور گندے۔" جمیلہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "ساس اونچی آواز سے کوستی رہی۔ چترا ساس کے کوسنے اور گھر والے کی گالیاں آرام سے سنتی رہی۔ زبان سے کچھ نہ بولی۔ پر اس شور شرابے سے گھبرا کر اس کے دونوں بالک منہ پھاڑ کر زور زور سے رونے لگے۔ چترا

ہوئی تو پہلے ہی تھی۔ بالکوں کے رونے پر اور جھلا گئی۔ تیزی سے ایک پر جھپٹی اور اس کی پٹائی ...ع کر دی۔ وہ بلبلا کر زیادہ زور سے رونے لگا۔ یہ دیکھ کر چترا کا گھر والا اور بھڑک اٹھا۔ وہ گالاں ...تا ہوا اس کی اور تیزی سے بڑھا۔ اسے بالوں سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ وہ دور جا کر گری۔ ...لنے بھی نہ پائی تھی' گھر والا اس کے سر پر پہنچ گیا اور لگا لاتیں اور ٹھڈے مارنے۔ چترا کی دھوتی ...گئی۔ ٹانگیں ننگی ہو گئیں۔ تب بھی وہ چپ کر کے پڑی رہی۔ نہ روئی' نہ چیخی۔ آنکھیں کھولے ...روالے کو گھورتی رہی۔" جمیلہ نے گہری سانس بھری۔ "لگتا تھا لاج کے ساتھ ساتھ اس کے ...ر کی نار بھی مر گئی تھی۔"

"تو بھی چپ کھڑی رہی۔ کچھ نہ بولی؟" رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں تبصرہ کیا۔

جمیلہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوئی۔ "اس کا گھر والا مارتے مارتے تھک گیا۔ ...نپنے لگا اور چپ کر کے کھڑا ہو گیا۔ چترا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس ...نے پونچھا بھی نہیں۔ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کا گھر والا آنکھیں نکال کر چیخا۔ اٹھ اندر چل' پر نہ ...اٹھی اور نہ ہی زبان سے کچھ کہا۔ جیسے بیٹھی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ اس بار گھر والے نے چترا کو ...وں سے پکڑ کر گھسیٹا۔ دروازے کی اور بڑھا۔ میں اب چپ نہ رہ سکی۔ اس کے سامنے گئی۔ ...سے غیرت دلائی۔ غصے سے کہا' تمیں نوں ایک کمزور زنانی پر ایسے ظلم کرتے شرم نہیں آتی۔ تو کیسا ...رد ہے؟ اس نے پلٹ کر مجھے لال لال آنکھوں سے گھورا۔"

"تجھ پر بھی وہ ناراض ہوا ہوگا۔"

"بالکل ناراض ہوا۔ غصے سے بولا۔ تو ہمارے بیچ میں بولنے والی کون ہوتی ہے؟ یہ میرا اور میری ...ھر والی کا معاملہ ہے۔ چل اپنا رستہ پکڑ۔ وہ چترا کو بالوں سے فیر گھسیٹنے لگا۔ میں کچھ بولنے ہی والی ...تی کہ پیچھے سے آواز آئی۔ کیہہ گل اے جی لے؟ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے اللہ وسایا کھڑا ...ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے چترا کی اور اشارہ کیا۔ یہ چترا کپور ہے۔ میرے ...ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ فیر میں نے گھر والے کی اور ہاتھ اٹھا کر کہا۔ یہ اس کا گھر والا لگتا ہے۔ چترا کو ...رتا تھا۔ میں نے روکا تو میرے گلے پڑ گیا۔ مجھے اس سے بہت غصہ تھا۔"

"تیری باتیں سن کر اللہ وسایا کیا بولا؟" رحیم داد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"وہ چپ رہا۔ پر چترا کا گھر والا تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ہاں' میں نے اسے مارا ہے۔ ابھی اور ...روں گا۔ یہ کہہ کر اس نے بالوں سے پکڑ کر چترا کو اٹھایا اور اس کے منہ پر زور زور سے چپیڑ ...ارنے لگا۔ اللہ وسایا نے اسے روکا۔ بس کر۔ وہ ناراض ہو کر اللہ وسایا پر چیخا۔ اوئے تو کون ہے؟

تمیں نوں کیہہ لینا؟ تو تھانے دار لگا ہے؟ اس نے اور زور سے چڑا کے گال پر ایک چپیڑ مارا۔ جمیلہ کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔

"اللہ وسایا ایک دم ویسا ہی بن گیا' جیسے میں نے برسوں پہلے اسے ولیا کے گھر میں دیکھا تھا۔ بہت عرصے بعد وہ مجھے اتنا غصے میں نظر آیا۔ زور سے چیخا۔ بکواس بند کر۔ ساتھ ہی تیزی سے جھپٹا۔ گنے کی کمر پر اس زور سے لات ماری' وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ پر اللہ وسایا کا غصہ کم نہ ہوا۔ وہ نزدیک پہنچا اور اسے گردن سے پکڑ کر اوپر اٹھالیا۔ وہ اس کے ہاتھ میں جھولنے لگا۔ اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ منہ پھاڑ کر ہائے ہائے کرنے لگا۔"

"لگتا ہے اللہ وسایا کو بہت ہی زیادہ غصہ آگیا تھا۔"

"ہاں' وہ بہت غصے میں تھا۔ چڑا پہلے تو چپ کر کے کھڑی رہی فیر گڑگڑا کر اللہ وسایا کی منت کرنے لگی' اسے چھوڑ دے۔ اللہ وسایا نے اسے چھوڑ دیا۔ چڑا بہت سہمی ہوئی تھی۔ اس کا گھر والا منہ پھاڑ کر زور زور سے سانس بھر رہا تھا۔ چڑا کی بوڑھی ساس نے چیخ چیخ کر سارا پنڈ اکٹھا کرلیا۔ نمبردار بھی آگیا۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "نمبردار کیا بولا؟"

"اس نے بھی چڑا کے گھر والے کو شرم دلائی۔ ناراض بھی ہوا۔ اللہ وسایا کو سمجھا بجھا کر اپنی حویلی میں لے گیا۔ رستے میں اس نے بتایا' چڑا کے گھر والے کا نام کرم دین ہے۔ وہ معمولی زمین دار تھا۔ اس کے پاس ۷ ایکڑ خود کاشت زمین تھی۔ اس نے چڑا کو جو پہلے ہی سکینہ بن چکی تھی' ایک کانسٹیبل کے ذریعے چھے سو روپے میں خریدا تھا۔ وہ پہلے ایک جواری کے پاس تھی۔ وہ شیخوپورہ میں جوئے کا اڈہ چلاتا تھا۔ چرسیا بھی تھا۔ اس نے چڑا کو بھی اپنے رستے پر لگا دیا تھا۔ وہ چرس اور گانجا پینے لگی تھی۔ جواریوں کی سنگت میں کنجریوں کا سا جیون گزارتی تھی۔ فیر ایسا ہوا اس کا جواری گھر والا جوا خانہ چلانے کے جرم میں پکڑا گیا۔ اسے جیل ہوگئی۔ چڑا بالکل اکیلی رہ گئی اور ایک کانسٹیبل کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے رکھیل بنا کر اپنے پاس رکھا۔ جب اس کا جی چڑا کی طرف سے بھر گیا تو اس نے کرم دین کے ہاتھ اسے بیچ دیا۔"

"تجھے جب وہ ملی تب بھی چرس پیتی تھی؟"

"مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔" جمیلہ نے بے نیازی سے کہا۔ "نمبردار سے نہ میں نے پوچھا اور نہ ہی اس بارے میں اس نے بتایا۔ پر میرا وچار ہے ان دنوں وہ چرس شرس نہیں پیتی تھی۔ ملتی ہی نہ ہوگی۔ کرم دین ظالم اور کٹھور ہونے کے ساتھ ساتھ چڑا کی کڑی نگرانی بھی کرتا تھا۔ نمبردار یہی

تا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا' چڑا کو بخار رہتا ہے۔ منہ سے خون آتا ہے۔ اسے ٹی۔ بی ہوگئی ہے۔"

رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ وہ چڑا کے بارے میں جمیلہ سے مزید بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ اسی اثناء میں احمد ٹرے میں چائے لے کر آیا۔ چائے کے ساتھ سوجی کا گرم گرم حلوہ بھی تھا۔ احمد نے چائے کی پیالیاں اور حلوے کی پلیٹیں جمیلہ اور رحیم داد کے سامنے میز پر رکھ دیں۔

جمیلہ نے احمد سے پوچھا۔ "تو اب تک کدھر رہا؟"

"میں تو جی باہر دروازے پر دیر سے بیٹھا ہوں۔" احمد نے جواب دیا۔

جمیلہ مسکرا کر خاموش ہوگئی۔ احمد فوراً ہی واپس چلا گیا۔

رحیم داد نے حلوہ کھاتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "زمین دارنی تو نے بہت دردناک بات سنائی۔"

"ایسی تو ان گنت دردناک اور دکھ بھری کہانیاں ہیں۔" جمیلہ کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "ہر مغویہ اپنی جگہ ایک دکھ بھری کہانی ہے۔"

"چڑا سے تیرا دوبارہ ملنا نہیں ہوا؟" رحیم داد نے پوچھا۔ ابھی تک اس کے ذہن پر چڑا چھائی ہوئی تھی۔

"نہیں! وہ مجھے بعد میں کبھی نہیں ملی۔ میں دوبارہ پکھیالہ نہیں گئی۔ کسی سے اس کے بارے میں بات بھی نہیں ہوئی۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "جانے اب تک زندہ بھی ہے کہ مرگئی۔"

☆

یکایک بادل زور سے گرجے۔ بارش تیز ہوگئی۔ کمرے میں خاموشی پھیلی تھی۔ دونوں ہی خاموش تھے اور اپنی اپنی جگہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ رحیم داد نے چائے کی پیالی ختم کی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ہچکچاتے ہوئے جمیلہ سے پوچھا۔ "زمیں دارنی' تیری باتوں سے لگتا ہے۔ تمیں نوں اللہ وسایا سے پیار نہ تھا۔ تو اس سے پیار کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ حالات ہی ایسے ہوگئے تھے۔ میں نے غلط تو نہیں سوچا؟" رحیم داد نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ مگر وہ منہ موڑے دیوار کی سمت دیکھ رہی تھی۔

"تو نے اپنے تئیں ٹھیک ہی سوچا۔" جمیلہ نے چند لمحے خاموشی اختیار کرنے کے بعد جواب دیا۔ "اور یہ بھی ٹھیک ہے مجھے اللہ وسایا سے ویسا پیار نہ تھا جیسا ویرندر سے تھا۔ یہ بات اللہ وسایا بھی

پوری طرح جانتا تھا۔ پر اس نے اتنا بہت سا پیار دیا کہ اگر وہ مجھے اتنا پیار نہ دیتا تو جانے کب کی مر کھپ چکی ہوتی۔ اس نے اپنے پیار سے میرا من جیت لیا۔"

"اس کا نصیب بھی تو چنگا تھا' تیری ایسی سوہنی اور بھاگ بھری گھروالی ملی جس نے مزارعے سے اسے وڈا زمیں دار بنا دیا۔" رحیم داد نے جمیلہ کی خوش نودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

مگر وہ متاثر نہ ہوئی۔ بے نیازی سے بولی۔ "چوہدری! تجھے پتہ نہیں' شروع شروع میں تو مجھے اپنے سے گھن آتی تھی۔ جی چاہتا تھا موت آ جائے۔ ان دنوں تو میں کئی کئی روز بے حال پڑی رہتی۔ نہ نہاتی' نہ کپڑے بدلتی' نہ روٹی کھانے کو جی کرتا نہ بات کرنے کو۔ پر اللہ وسایا نے کبھی برا نہ منایا۔ جو میں نے کہا' اس نے وہی کیا۔ وہ مجھے خوش دیکھتا تو خوش ہو جاتا۔ نراش پاتا تو خود بھی نراش ہو جاتا۔"

"تو بھی تو اس کی ہر بات مانتی تھی۔ اس کے لیے تو نے اپنے بھائی اور چاچا کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے' پر اللہ وسایا نے اپنی بات منوانے کے لیے کبھی ضد نہ کی۔ زمیں دار بن کر بھی وہ کبھی زمیں دار نہ بنا۔ جیون بھر اپنے تئیں مزارع اور مجھے اپنے زمیں دار کی پتری سمجھتا رہا۔ بلکہ مجھے ہی زمیں دار سمجھتا رہا۔ میں نے بہت چاہا' پر وہ زمیں دار نہ بنا۔ بہت لاڈ آتا تو مجھے زمیں دارنی کہہ کر پکارتا۔ یہی اس کا پیار تھا۔" جمیلہ کو اللہ وسایا کی خوبیاں بیان کرنے میں لذت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ روانی سے بولتی رہی۔ "ایسا پیار کرتا تھا' مجھے پریشان یا بیمار دیکھتا تو گھبرا جاتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"تجھے شاید پتہ نہیں' آخری بار جب وہ مجھ سے بدا ہوا تو مجھے تیز بخار تھا۔ سرہانے بیٹھ کر دیر تک میرا سر دباتا رہا۔ فیر یہ کہہ کر چلنے کے لیے کھڑا ہو گیا' جی لے! میں تیرے لیے ڈاکٹر بلا کر لاتا ہوں۔ میں نے روکا بھی۔ پر وہ نہ رکا۔ ایسا گیا کہ لاش ہی واپس آئی۔"

جمیلہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ آنکھیں چھلک پڑیں۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ باہر مینہ کی بوندیں جل ترنگ بجاتی رہیں۔ ہوا چلتی تو ایسا محسوس ہوتا سسکیاں بھر رہی ہے۔ بادل رک رک کر گرجے بارش تیز اور تیز ہوتی گئی۔

رحیم داد نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "اس طرح کب تک روتی رہے گی۔" اس نے لمبی سانس بھری۔ "اللہ کی یہی مرضی تھی' جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تو اگے کی سوچ۔"

"کیا سوچوں۔ میرا تو مغز بھی کام نہیں کرتا۔"

رحیم داد ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ جمیلہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد نے اس عالم میں دیکھا تو ٹوہ لگانے کی غرض سے دریافت کیا۔ "کیا سوچ رہی ہے؟"

جمیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

رحیم داد نے چند لمحے چپ رہنے کے بعد اٹکتے ہوئے کہا۔ "ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہیں منائے گی؟"

"کیا کہنا چاہتا ہے؟" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

رحیم داد نے اس کے لہجے کی کاٹ محسوس کی۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ جو کہنا چاہتا تھا' کہہ نہ سکا۔ اتنی جرات ہی نہ ہوئی۔ صرف اتنا کہا۔ "تو نے اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں اب تک کچھ نہیں کیا۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں؟ حویلی کی چار دیواری سے باہر بھی نہیں نکل سکتی۔" جمیلہ نے اپنی مجبوری بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شکوہ بھی کیا۔ "پر چوہدری' تو نے اس بارے میں کیا کیا؟"

رحیم داد خفیف ہو کر صفائی پیش کرنے لگا۔ "تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ پر تینوں یہ بھی پتہ ہے میں تو ادھر کسی کو جانتا بھی نہیں۔ نہ میرا کبھی قتل شل کے کسی کیس سے کوئی واسطہ پڑا۔ وکیل جب بھی آیا میں نے اس سے گل بات کی۔ پولیس کی تفتیش کے بارے میں پوچھا۔ تھانے دار کو میں بالکل نہیں جانتا۔ تینوں پتہ ہی ہے کبھی اس سے ملا ہی نہیں۔ تو کہہ تو وکیل کے پاس چلا جاؤں۔ اس کے ساتھ تھانے دار سے مل کر پتہ کروں اس نے اب تک کیا کیا؟ کوئی گرفتاری شرفتاری بھی کی کہ نہیں؟"

"میں نے تو ویسے ہی ایک بات کہی تھی۔" جمیلہ نے اس کی صفائی سے متاثر ہو کر کہا۔ "مجھے پتہ ہے تیری ادھر کسی سے جان پہچان نہیں۔ ایسے میں تو کیا کر سکتا ہے؟" اس کا لہجہ دل گرفتہ ہو گیا۔ "ویسے اب کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ جس تھانے دار نے کیس میں دلچسپی لی اور تفتیش کا کام آگے بڑھایا' اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ دوسرے نے کیس دبا دیا۔ تفتیش ختم کر دی۔ اسے لگایا ہی اس لیے گیا تھا۔"

"وکیل نے مجھے یہ باتیں بتائی تھیں۔ وہ بھی پریشان تھا۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ "وہ بتاتا تھا' تفتیش کے لیے جو نیا تھانے دار لگایا گیا ہے' اس نے قتل کا الزام تیرے بھائیوں اور

شریکوں پر لگایا ہے۔"

"تفتیش ختم کرنے اور کیس داخل دفتر کرنے کے لیے وہ یہی کر سکتا تھا۔" جمیلہ نے گہری سانس بھری۔ "یہ اصلی ملزموں کو چھپانے کی کوشش ہے۔ اسی لیے پہلے ہی سے ایسی افواہیں پھیلا دی گئیں تھیں۔ میرے بھائی آخر اللہ وسایا کا قتل کیوں کرتے؟ اس نے مجھے ان کے ساتھ جانے سے کب روکا؟ تجھے پتہ ہے میں خود ہی نہیں گئی۔"

"اوپر درخواست نہیں لگائی جا سکتی؟" رحیم داد نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

"اوپر درخواست لگانے سے بھی کیا ہوگا۔ درخواست بھی دبا دی جائے گی۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" رحیم داد نے مزید زور نہ دیا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اللہ وسایا کے قاتل کبھی نہیں پکڑے جائیں گے۔"

"نظر تو یہی آ رہا ہے۔ لگتا ہے اللہ وسایا کو پہلے سے سوچی سمجھی سکیم کے تحت قتل کیا گیا۔ وکیل کا بھی یہی وچار ہے۔" جمیلہ کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈا۔ وہ منہ پھیر کر چادر کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "بہت ظلم ہوا جی۔"

جمیلہ نے کچھ نہ کہا۔

رحیم داد چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے لہجے میں اور نرمی پیدا کی۔ "پر تو اس طرح کب تک اللہ وسایا کے لیے روتی رہے گی؟"

"جب تک آنکھوں میں رونے کے لیے آنسو ہیں۔" جمیلہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

رحیم داد ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ بارش اب تھم گئی تھی مگر ہوا تیز تھی۔ رحیم داد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ رسان سے بولا۔ "اب آگے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"کیا سوچوں۔ کچھ سمجھ نہیں آتی۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہی پڑے گا۔ تیرے دونوں بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔" رحیم داد آہستہ سے بولا۔ "تو ابھی جوان ہے۔ ایسے کس طرح کام چلے گا۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ میں تیری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

رحیم داد نے اس کے لہجے کی تیزی اور کاٹ محسوس کی۔ مگر اس نے خاموشی اختیار کرنے کے بجائے جرات سے کام لیا۔ بہت سنبھلے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں جس طرح تو دیر ندر کو بھول گئی، تجھے اللہ وسایا کو بھی اسی طرح بھولنا ہوگا۔ حوصلے سے کام لے۔ تو بہت حوصلے

ہے۔ پہلے تجھ پر کم ظلم نہیں ہوا۔ پر تو نے اسے جھیل لیا۔ بھول بھی گئی۔" رحیم داد کے لہجہ
خوشامد کا پہلو نمایاں تھا۔ "تیرا دل بہت وڈا ہے۔ تو، تو یہ بھی بھول گئی کہ کبھی تو پاروتی ہوتی
۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" جمیلہ کے رویئے سے اندازہ ہوتا تھا، رحیم داد کی باتوں نے
ہ متاثر کیا تھا۔

"تیری طرح مجھ پر بھی ظلم ہوا۔ سب کچھ تباہ ہو گیا۔ بال بچے، گھربار، کچھ بھی نہ رہا۔ فیر بھی زندہ
ں۔" اس نے جمیلہ کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی، آواز میں رقت پیدا کی۔ "کیا کیا
ے جب زندگی ملی ہے تو زندہ رہنا ہی پڑتا ہے۔ پر میرا جو دکھ ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔" اس نے
ری سانس بھری۔ "تو میرے دکھ کو سمجھ سکتی ہے تو بھی تو ایسے ہی دکھوں کی ماری ہوئی ہے۔"

"ہاں چوہدری! تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔" جمیلہ کے رویئے سے ہمدردی کا پہلو عیاں تھا۔
یم داد کی حوصلہ افزائی ہوئی تو اس نے کھل کر کسی قدر اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کی۔
پاتے ہوئے بولا۔

"تو چاہے تو ہم دونوں ایک دوسرے کا دکھ بانٹ سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔"

جمیلہ نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے آگے نہ بولنے دیا۔ "میں تیرا مطلب سمجھتی
ں۔"

اس کا لہجہ تیز اور تیکھا تھا۔ مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ لہجے میں زیادہ نرمی اور حلاوت پیدا
رتے ہوئے گویا ہوا۔ "اس میں ہم دونوں کا بھلا ہے۔ پوری زمیں داری بھی اپنے پاس رہے گی۔
سے پھیلانے اور بڑھانے میں دونوں مل جل کر کام کریں گے۔ تو پہلے ہی کی طرح پورے پنڈ کی
یں دارنی رہے گی۔ ہر کام تیری مرضی سے ہوگا۔"

جمیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر رخساروں
پر گرنے لگے۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ وہ جمیلہ کا ردعمل جاننا چاہتا تھا۔ مگر وہ نہ بولی۔ رحیم داد اٹھ
کر کھڑا ہو گیا۔ "میں نوں اب چلنا ہے۔" وہ آگے بڑھا، ٹھٹکا۔ مڑ کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ آہستہ
سے بولا۔

"میں نے جو گل کی ہے، اس پر آرام نال سوچ لے۔ ابھی سوچنے کے لیے بہت وکت پڑا ہے۔
مجھے جلدی بھی نہیں۔ پر یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں، میں نے یہ بات بہت سوچ بچار کر اور اپنے اور
تیرے فائدے کو سامنے رکھ کر کی ہے۔"

جمیلہ نے کچھ نہ کہا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر چہرے پر رکھ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رحیم داد دروازے کی سمت بڑھا۔ اسے اپنے عقب میں جمیلہ کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

☆

رحیم داد کمرے سے نکل کر دالان میں پہنچا۔ صحن میں پانی تھا۔ کیچڑ تھی۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ رحیم داد سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا مہمان خانے میں پہنچ گیا۔ وہ برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔ برسات کی بھیگی ہوئی شام نے تاریکی کا ڈیرا ڈال دیا تھا۔ احمد نے لیمپ روشن کر دیا اور رحیم داد کے پاس خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ اس نے احمد کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ احمد آہستہ سے صحن میں اترا اور حویلی میں چلا گیا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا ان باتوں پر غور کرتا رہا جو اس نے کچھ دیر پہلے جمیلہ سے کی تھیں۔ وہ پہلے سے کوئی منصوبہ بنا کر نہیں گیا تھا۔ گفتگو کچھ اس ڈھب سے چلی کہ دل کی بات زبان تک آ گئی۔ اب رہ رہ کر یہ خیال پریشان کر رہا تھا' اس نے جلد بازی سے کام لیا۔ نہ جانے جمیلہ نے اس کے بارے میں کیا سوچا؟ اس نے جمیلہ کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے تھے اور اس کی سسکیاں بھی سنی تھیں۔

اس کے ذہن میں کھلبلی مچی تھی۔ الجھن اور خلفشار سے گھبرا کر وہ کھڑا ہو گیا اور برآمدے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ احمد واپس آیا۔ اس نے کمرے میں میز پر کھانا چن دیا۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے رحیم داد سے کہا۔

"چوہدری' روٹی کھا لے۔"

رحیم داد نے ہاتھ دھوئے اور کمرے میں جا کر چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ احمد دہلیز کے پاس فرش پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے کھانا کھاتے کھاتے نظریں اٹھا کر احمد کو دیکھا۔ آہستہ سے پوچھا۔

"آج حویلی میں کچھ زیادہ ہی سناٹا لگ رہا ہے۔"

"ہاں جی' اب تو حویلی میں سناٹا ہی رہتا ہے۔" احمد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "زمیں دار اللہ وسایا کے بعد تو حویلی بالکل اجڑ گئی۔" اس نے مڑ کر حویلی کی جانب دیکھا۔ "دیکھ کیسی ویرانی برس رہی ہے۔"

"برسات میں رات کو ویسے بھی سناٹا کچھ زیادہ ہی لگتا ہے۔" رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔

"کچھ یہ بات بھی ہے۔" احمد نے اس کی تائید کی۔

رحیم داد اپنی بے چینی پر زیادہ دیر قابو نہ رکھ سکا۔ دبی زبان سے پوچھا۔ "زمیں دارنی کا کیا حال احوال ہے؟"

"اس کا حال احوال کیا ہونا ہے جی۔" احمد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "وہ تو جی گپ چپ رہتی ہے یا روتی رہتی ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھا کر غور سے دیکھا۔ "تجھ سے تو آج دیر تک باتیں کرتی رہی۔"

"ابھی تک کمرے میں بیٹھی ہے؟"

"نا جی' وہ تو تیرے جانے کے بعد ہی اٹھ گئی تھی۔"

رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "اب کیا کر رہی ہے؟"

"میں تو جی اس کے پاس گیا نہیں۔ تاراں روٹی لے کر گئی تھی۔ کہتی تھی اس نے روٹی بھی نہیں کھائی' نہ بات کی۔ وہ تو چادر سے منہ ڈھانکے رو رہی تھی۔ تاراں دیر تک بیٹھی رہی۔ پر اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔"

رحیم داد گھبرا گیا۔ اس نے گلاس اٹھا کر پانی پیا اور مونچھوں اور ڈاڑھی پر سے پانی کے قطرے پونچھتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے بھی بات کرتے کرتے کئی بار روئی۔"

اسی اثنا میں تاراں آ گئی۔ اس نے تیکھی نظروں سے احمد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ مگر اس نے احمد سے کچھ نہ کہا۔ رحیم داد سے مخاطب ہوئی۔

"یہ مجھے بہت تنگ کرتا ہے جی۔"

رحیم داد نے احمد کو ڈانٹا۔ "تو اسے کیوں تنگ کرتا ہے؟"

"میں نے تو جی کچھ نہیں کیا۔ یہ تو ایسے ہی میرے گلے پڑ جاتی ہے۔" احمد مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

"بتاؤں تو کیا کرتا ہے؟" تاراں نے دھمکی دی۔

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو زمیں دارنی کے پاس سے آ رہی ہے نا۔ کیسی طبیعت ہے اس کی؟"

"تیرے جانے کے بعد کمرے سے نکلی تو رو رہی تھی۔ اب تک اس کے آنسو نہیں تھمے۔ آج تو بہت زیادہ اداس لگتی ہے۔"

رحیم داد تو خاموش رہا۔ مگر احمد بول پڑا۔ "جب سے زمیں دار کی موت ہوئی ہے تب سے اس کے آنسو ہی کہاں رکے ہیں۔ جب دیکھو روتی ہی رہتی ہے۔"

"بات تو یہی ہے۔" تاراں نے اتفاق رائے کیا۔ "دونوں میں بہت پیار تھا۔ وہ بھی تو زمیں دار کو کتنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ڈاکٹر لانے ہی تو نکلا تھا' نہ جانے کس نے اسے کتل کردیا۔"

رحیم داد کھانے سے فارغ ہوچکا تھا۔ اس نے دونوں کو مزید بات چیت کا موقع نہ دیا۔ احمد سے مخاطب ہو کر کہا۔ "حمدے! برتن اٹھا اور واپسی میں دیر نہ کرنا۔"

احمد نے برتن اٹھائے اور تاراں کے ساتھ چلا گیا۔ رحیم داد کمرے سے نکل کر برآمدے میں پہنچا۔ صحن میں ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ باہر نہ جاسکا۔ برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ اس وقت بھی جمیلہ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے پہلے ہی خدشہ تھا' جمیلہ نے اس کی بات پسند نہیں کی۔ اسے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ تاراں کی باتوں سے نہ صرف اس کی تصدیق ہوگئی تھی بلکہ اس کے اندیشے اور وسوسے سوا ہوگئے۔ وہ اپنی جلد بازی پر پشیماں تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا' اس نے جو بے موقع قدم اٹھایا ہے اس کی تلافی کس طرح کرے؟ جمیلہ کے دل سے کدورت کیوں کر اور کیسے رفع کرے؟

وہ بستر پر لیٹ کر بھی اسی مسئلہ پر غور کرتا رہا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے طے کیا کہ جمیلہ سے جلد سے جلد ملنے کی کوشش کرے گا۔ معذرت کرے گا اور ایسا رویّہ اختیار کرے گا کہ جمیلہ کی خفگی اور آزردگی کسی نہ کسی طرح دور ہوجائے۔

صبح اٹھ کر اس نے احمد کے ذریعے جمیلہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر وہ شام تک واپس نہ آیا۔ دوپہر کا کھانا حویلی کا ایک اور نوکر لے کر آیا۔

رحیم داد نے اس سے احمد کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ وہ احمد کا انتظار کرتا رہا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد احمد آیا۔

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں پوچھا۔ "حمدے! تو دن بھر کہاں رہا؟"

"مجھے جی' زمیں دارنی نے ایک ضروری کام سے پڑوس کے چک بھیجا تھا۔"

"تو نے زمیں دارنی سے میرے بارے میں بات کی تھی؟" رحیم داد کے انداز سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

"تو نے جو کہا تھا وہ میں نے اسے کہہ دیا۔ پر وہ کچھ نہ بولی۔ چپ کر کے بیٹھی رہی۔"

"لگتا ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" رحیم داد نے بات بنائی۔ "میں بھی اس کی طبیعت ہی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ کل شام تاراں کی باتیں سن کر میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔"

"ہاں جی اس کی طبیعت گڑبڑ ہی لگتی ہے۔"

"تو میری طرف سے اس کی طبیعت پوچھنا۔ کہنا میں نے زمیں داری کے بارے میں کچھ ضروری گل کرنی ہے۔" رحیم داد نے جمیلہ سے ملاقات کرنے کا بہانہ تلاش کیا۔

"اب تو جی کل ہی اس سے گل ہوگی۔"

"کوئی حرج نہیں' کل ہی گل کرلینا۔"

دوسرے روز رحیم داد بے چینی سے احمد کا انتظار کرتا رہا۔ صبح کے ناشتے کے بعد وہ دوپہر کا کھانا لے کر آیا تو رحیم داد نے دریافت کیا۔ "حمدے! تو نے زمیں دارنی سے بات کی تھی؟"

"ہاں جی! میں نے تیری بات اسے پہنچا دی تھی۔"

"کیا کہا اس نے؟" رحیم داد اپنی بے چینی چھپا نہ سکا۔ احمد بھی بھانپ گیا۔ "تو اس سے ملنا چاہتا ہے۔ کوئی ضروری کام ہوگا۔ پر ایسا لگتا ہے وہ تجھ سے ملنا نہیں چاہتی۔"

"تو نے کیسے سمجھا وہ ملنا نہیں چاہتی؟"

"میری گل سن کر وہ پہلے کی طرح چپ کر کے بیٹھی رہی۔" میں نے دوبارہ کہا تو منہ بگاڑ کر بولی۔ "مجھے زمیں داری سے کیا لینا؟ چوہدری سے کہنا جو اس کا جی چاہے کرے۔ بس جی اس نے اتنا ہی کہا۔"

رحیم داد نے احمد سے مزید استفسار نہ کیا۔ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ مگر رغبت سے کھانا نہ کھا سکا۔ اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ دن ڈھلا' شام ہوئی' رات ہوگئی۔ مگر رحیم داد کی ذہنی الجھن کم نہ ہوئی۔ اسی عالم میں وہ سوگیا۔

☆

رحیم داد سویرے بیدار ہوا تو اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ ہاتھ پیروں میں اینٹھن کے ساتھ ساتھ سر میں درد تھا۔ ہلکا ہلکا بخار بھی تھا۔ دوپہر کو دو چار لقمے کھانے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ کھانا کھایا ہی نہ گیا۔ طبیعت اس قدر مضمحل اور گری گری تھی کہ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں بھی نہ گیا۔ صحن میں چھما چھم بارش ہو رہی تھی۔

رحیم داد بستر پر لیٹا بوندوں کا جل ترنگ سنتا رہا۔

شام ہوتے اسے جوڑی چڑھی۔ جسم کپکپانے لگا۔ اس نے کھیس اچھی طرح لپیٹی اور بدن سکیڑ کر گٹھڑی بن گیا۔ اب بخار تیز ہوگیا تھا۔ احمد کھانا لے کر آیا تو رحیم داد نے جوڑی سے کپکپاتے ہوئے کہا۔ "حمدے کمبل لا کر مجھ پر ڈال دے۔" احمد نے اس کی پیشانی چھو کر بخار کی شدت کا

اندازہ لگایا اور خاموشی سے چلا گیا۔

رحیم داد کا جسم بخار کی تپش سے بھن رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے سکڑا سکڑایا بے سدھ پڑا رہا۔ اسے کچھ خبر نہ ہوئی کہ احمد کب واپس آیا۔ کب اس کے تھرتھراتے بدن پر اس نے کمبل ڈالا اور کب کمرے سے باہر گیا۔

رحیم داد پر گہری غنودگی طاری تھی۔ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ وہ رک رک کر سانس لے رہا تھا اور آہستہ آہستہ کراہ بھی رہا تھا۔

رات نہ معلوم کتنی گزر چکی تھی۔ باہر چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ یکایک رحیم داد نے اپنی تپتی ہوئی پیشانی پر ٹھنڈک محسوس کی۔ یہ کسی کا نرم اور گداز ہاتھ تھا۔ اس نے لمبی سانس بھری اور آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا' جمیلہ اس پر جھکی ہوئی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ رحیم داد کی پیشانی پر تھا۔

رحیم داد کو یقین نہ آیا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ ہاں وہ جمیلہ ہی تھی۔ وہی ستاروں کی مانند روشن آنکھیں' وہی گلابی ہونٹ' وہی تابندہ پیشانی۔ لیمپ کی زرد زرد روشنی میں اس کا چہرہ سوگوار اور بجھا بجھا ہونے کے باوجود دلکش نظر آ رہا تھا۔

وہ آنکھیں کھولے حیران و پریشان نظروں سے جمیلہ کے خوب صورت چہرے کو تکتا رہا۔ اس کے خشک ہونٹ آہستہ آہستہ لرز رہے تھے۔ وہ بولنا چاہتا تھا مگر بول نہ سکا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا خواب دیکھ رہا ہے۔

جمیلہ بستر کے قریب پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئی بولی۔ "چوہدری تجھے تو بہت تیز بخار ہے۔ ملیریا لگتا ہے۔ جوڑی چڑھی تھی؟"

"ہاں!" رحیم داد نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتے ہوئے کہا۔ "طبیعت تو سویرے ہی سے گڑبڑ تھی۔ شام کو جوڑی چڑھی' پھر ایسا تیز بخار ہو گیا کہ میں تو بالکل سدھ بدھ نہ رہی۔"

"چنتا نہ کر۔ کل پرسوں تک چنگا ہو جائے گا۔ تجھے ملیریا ہو گیا ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو تشفی دی۔ مڑ کر دروازے کے پاس کھڑے ہوئے احمد کی جانب دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ احمد نے بڑھ کر میز پر رکھا ہوا لکڑی کا بکس اٹھایا اور جمیلہ کو دے دیا۔ جمیلہ نے بکس کھولا۔ تھرمامیٹر نکالا۔ اسے ہاتھ میں دبا کر جھٹکا دیا۔ رحیم داد سے کہا۔

"چوہدری! منہ کھول۔"

رحیم داد نے چپ چاپ منہ کھول دیا۔ جمیلہ نے تھرمامیٹر اس کے منہ میں لگا دیا اور کلائی پر

بندھی ہوئی گھڑی جھک کر توجہ سے دیکھنے لگی۔

جمیلہ نے تھرمامیٹر رحیم داد کے منہ سے نکالا۔ لیمپ کی روشنی میں ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ آہستہ سے بولی۔ "تجھے تو ۱۰۴ ٹمپریچر ہے۔" اس نے تھرمامیٹر دھو کر حفاظت سے بکس میں رکھ دیا۔ احمد سے گلاس میں پانی منگوایا۔ بکس کے اندر سے کونین کی ٹکیہ نکالی۔ احمد نے جمیلہ کی ہدایت پر رحیم داد کو تکیے کے سہارے بٹھا دیا۔ رحیم داد گہری گہری سانس بھر کر آہستہ آہستہ ہانپتا رہا۔

جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رحیم داد کو مخاطب کرتے ہوئے نرم لہجے میں بولی۔ "چوہدری! یہ دوائی کھا لے۔ آرام آ جائے گا۔" رحیم داد نے ایک بار پھر منہ کھولا۔ جمیلہ نے جھک کر کونین کی ٹکیہ اس کے حلق میں ڈال دی۔ گلاس اٹھا کر رحیم داد کے ہونٹوں سے لگایا۔ رحیم داد پانی کے ساتھ ٹکیہ نگل گیا۔ دوا کھلانے کے بعد جمیلہ بولی۔

"اب تو آرام سے لیٹ جا۔"

رحیم داد چپ چاپ ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ جمیلہ نے ایک بار پھر اس کی پیشانی چھو کر دیکھی۔ احمد سے کٹورے میں ٹھنڈا پانی منگوایا۔ احمد کمرے سے چلا گیا۔

کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ جمیلہ کرسی پر گم صم بیٹھی تھی۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ رحیم داد آنکھیں بند کیے نڈھال لیٹا رہا۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں پڑا رہا۔ پھر اس نے کراہتے ہوئے گردن موڑی۔ جمیلہ کی جانب دیکھا۔ رک رک کر کہنے لگا۔

"زمیں دارنی! میں نے پچھلے دنوں تجھ سے ایسی بات کی تھی' جس پر تو نے برا منایا۔ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ مجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ زمیں دارنی تو۔"

جمیلہ نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا۔ بات کاٹ کر بولی۔ "چپ کر کے لیٹا رہ۔ تجھے بہت تیز بخار ہے۔ سویرے سے تیری طبیعت اتنی گڑبڑ ہے۔ تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ احمد تو یہیں تھا۔ مجھے پتہ چل جاتا تو اسی سے دوائی کھلا دیتی۔ اتنا تیز بخار نہ چڑھتا۔"

"میں نے تجھے اس لیے خبر نہ کی تو عدت میں ہے۔ سوچا تو یہاں کیسے آ سکتی ہے؟" رحیم داد نے جمیلہ کی جانب دیکھے بغیر ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

"ایسے ہی آ سکتی تھی جیسے اب آئی ہوں۔ دکھی بیماری کی تو بات ہی الگ ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "میں نے مسجد کے ملا کو بلا کر پوچھ لیا تھا۔"

احمد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا بڑا کٹورہ تھا۔ احمد نے کٹورہ میز پر

رکھ دیا اور میز اٹھا کر جمیلہ کے سامنے رکھ دی۔ جمیلہ نے پانی میں انگلیاں ڈبوئیں۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ اس نے بکس کھولا۔ اندر سے ململ کا اجلا ٹکڑا نکالا۔ اسے پانی میں ڈال کر تر کیا۔ تہہ کر کے اس کی چار انگل چوڑی پٹی بنائی اور بھیگی ہوئی پٹی رحیم داد کی تپتی ہوئی پیشانی پر رکھ دی۔ رحیم داد کو اس کی ٹھنڈک سے بڑا سکون ملا۔

رحیم داد نے ایک بار پھر آنکھیں کھولیں۔ آہستہ سے بولا۔ "زمیں دارنی' سچ تیرا دل بہت وڈا ہے۔ تو۔"

جمیلہ نے اسے ٹوکا۔ "چوہدری چپ کر کے پڑا رہ۔ تجھے آرام کی ضرورت ہے۔"

رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ سانس بھرنے لگا۔

جمیلہ اس کی پیشانی پر پٹی رکھتی رہی۔ گرم ہو جاتی تو دوبارہ کٹورے کے ٹھنڈے پانی میں تر کرتی اور پیشانی پر رکھ دیتی۔ بخار کی تیزی دھیرے دھیرے کم ہوتی گئی۔ رحیم داد کو ایسا سکون ملا کہ وہ سو گیا۔ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ جمیلہ کتنی دیر اس کے سرہانے بیٹھی رہی اور کب اٹھ کر چلی گئی

۲۵

دن ڈھلے ایک تانگا حویلی کے مہمان خانے کے دروازے پر رکا۔ نادر خاں تانگے سے نیچے اترا۔ اس بار وہ اپنے ساتھ بستر اور ٹرنک لے کر آیا تھا۔ وہ سائیکل بھی تانگے میں رکھی تھی' جس پر وہ رحمت والی گیا تھا۔ اس نے تانگے والے کو کرایہ ادا کیا۔ سامان احمد کے سپرد کیا اور سیدھا رحیم داد کے پاس پہنچا۔

رحیم داد اس وقت کمرے کے باہر برآمدے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ صحن میں دھوپ پھیلی تھی۔ مگر اس کی تمازت میں تیزی نہ تھی۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ درخت جھوم رہے تھے۔ آسمان پر بکھرے ہوئے بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے سرپٹ بھاگتے نظر آتے تھے۔

نادر خاں کو دیکھتے ہی رحیم داد نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "تو نے تو دوسرے روز آنے کا وعدہ کیا تھا' اتنے دن کہاں غائب رہا؟ بیمار تو نہیں پڑ گیا تھا؟" اس نے نادر خاں کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "ویسے تو بیمار شمار لگتا نہیں۔"

"نہیں جی' بیمار تو نہیں رہا۔" نادر خاں سر جھکا کر معذرت کرنے لگا۔ "معاف کرنا جی' وہ ایسا ہوا کہ مجھے ملتان جانا پڑا۔"

"ملتان کیوں گیا تھا؟ تیں نوں یہاں پہنچنا تھا۔"

"آنا تو جی میں نے یہیں تھا' پر کچھ ایسی مجبوری ہوئی کہ اچانک ملتان جانا پڑ گیا۔" نادر خاں کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"کیا مجبوری ہوئی؟ تو کچھ پریشان دکھائی پڑ رہا ہے۔" رحیم داد نرمی سے بولا۔ "کھڑا کیوں

ہے؟ بیٹھ جا۔ آرام سے بتا‘ بات کیا ہے؟"

نادر خاں نے قریب پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "وہ ایسا ہے جی‘ میری گھروالی کا چھوٹا بھائی ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں ہے۔"

"جیل میں ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ جیل کیسے چلا گیا؟"

"قتل کے ایک مقدمے میں پھنس گیا تھا۔ سال بھر سے اوپر ہوگیا جیل کاٹتے ہوئے۔" نادر خاں نے رحیم داد کو آگاہ کیا۔ "میں یہاں سے رحمت والی گیا۔ دیکھا گھروالی بہت پریشان ہے۔ کسی نے اطلاع دی کہ اس کا بھائی سخت بیمار ہے۔ ایک ہی بھائی ہے اس کا۔ روتے روتے برا حال کرلیا تھا اس نے۔ اس کی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ اسے تسلی دی اور فوراً ملتان چلا گیا۔"

"اب وہ کیسا ہے؟ ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"اسے تو جی میں مل ہی نہ سکا۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "بات یہ ہے جی۔ اس بار تو اوپر سخت بارش ہوئی ہے۔ چناب میں زبردست سیلاب آگیا۔ بستیاں کی بستیاں اجڑ گئیں۔ خریف کی فصلیں تباہ ہوگئیں۔ بھکری سے آگے لوپ بند ٹوٹ گیا۔ جلال آباد اور شیر شاہ کو شدید خطرہ ہے۔ نہروں میں شگاف پڑگئے ہیں۔ ریلوے لائن پانی کے تیز ریلے سے بہہ گئی ہے۔ جگہ جگہ سے اکھڑ گئی ہے۔ جدھر نظر جاتی ہے پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔"

"اس بار تو بہت تباہی مچادی سیلاب نے۔" رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔ "پر یہ تو بتا تیری گھروالی کے بھائی کا کیا بنا؟"

"ہوا یہ جی کہ لوپ بند کی مرمت کے لیے ڈسٹرکٹ جیل کے کیدیوں کو بھی لگا دیا گیا۔ ان میں میرا سالا بھی ہے۔ میں ملتان پہنچا تو پتہ چلا کیدی بند کی مرمت کا کام ختم کرکے جلد ہی واپس آجائیں گے۔ میں انتظار کرنے لگا۔ دو ہفتے سے اوپر ہوگئے پر کیدی واپس جیل نہ آئے۔ بند کی مرمت کا کام ختم ہی نہ ہوا تھا۔"

"پر تیری گھروالی نے تو کہا تھا اس کا بھائی سخت بیمار ہے۔ تو اور ہی گل سنا رہا ہے۔ یہ کیا چکر ہے؟" رحیم داد نے مسکرا کر نادر خاں سے پوچھا۔

"اطلاع ٹھیک نہیں ملی تھی جی۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "بات سچی یہ ہے جی۔ بند کی مرمت کرنے والے کئی کیدیوں نے رات کے اندھیرے میں فرار ہونے کی کوشش کی۔ بلکہ کچھ تو فرار بھی ہوگئے۔" نادر نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "پر جب وہ فرار ہونے لگے تو ان کی نگرانی کرنے والے پہرے داروں کو پتہ چل گیا۔ انھوں نے بھاگتے ہوئے کیدیوں کا پیچھا کیا۔ گولی بھی چلائی۔"

"کئی تو جان سے مارے بھی گئے ہوں گے۔" رحیم داد نے لقمہ دیا۔

"نہیں جی مرا تو کوئی بھی نہیں۔ پر چار زخمی ضرور ہوئے۔ زخمی کیدیوں کو سرکاری ہسپتال میں داخل کردیا گیا۔ میری گھروالی کو اطلاع ملی تھی کہ ان میں اس کا بھائی بھی شامل ہے۔ پر وہ ان میں نہیں تھا۔ میں نے اسپتال جاکر خود معلوم کیا تھا۔ جیل کے افسروں سے پوچھ گچھ کرنے پر پتہ چلا‘ میرے سالے نے فرار ہونے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ دوسرے کیدیوں کے ساتھ بند کی ابھی تک مرمت کررہا ہے۔"

قیدیوں کے فرار ہونے کی اطلاع سے رحیم داد قدرے پریشان ہوگیا۔ اسے فوراً لالی کا خیال آیا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ اللہ وسایا اور جمیلہ کے ہم راہ کبیروالا جاتے ہوئے منگری اسٹیشن پر اچانک شاداں سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔ وہ اسے پہچان تو نہ سکی‘ لیکن اس کی زبانی یہ معلوم ہوگیا تھا کہ لالی بھی ڈسٹرکٹ جیل‘ ملتان میں ہے۔ وہ اس سے ملنے ملتان جارہی تھی۔ رحیم داد سوچنے لگا‘ اگر لالی بھی بند کی مرمت کرنے والے قیدیوں میں شامل ہوگا تو اس نے ضرور نکل بھاگنے کی کوشش کی ہوگی اور کامیاب بھی ہوگیا ہوگا۔ وہ ایسے معاملات میں بڑا ہوشیار اور منجھا ہوا تھا۔ وہ ضرور فرار ہوگیا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی روز کوٹلہ ہرکشن بھی پہنچ سکتا ہے۔ یہ سوال ذہن میں ابھرتے ہی رحیم داد کو تشویش ہوئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے خدشات اور وسوسوں پر قابو پالیا۔

رحیم داد کو معاً خیال آیا کہ لالی‘ کوٹلہ ہرکشن کیسے پہنچ سکتا ہے؟ اسے تو یہی معلوم تھا کہ رحیم داد مرچکا ہے۔ پولیس پارٹی کے ساتھ لاش کی شناخت بھی اسی نے کی تھی۔ اسے تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ رحیم داد نام بدل کر چوہدری نورالٰہی کی حیثیت سے کوٹلہ ہرکشن میں مقیم ہے۔ ویسے بھی رحیم داد کی وضع قطع اور حلیہ اس قدر تبدیل ہوچکا تھا کہ لالی اسے اب پہچان بھی نہ سکتا۔

وہ خاموش بیٹھا لالی کے بارے میں سوچتا رہا۔ نادر نے اسے خاموش پایا تو دریافت کیا۔

"چوہدری! تو کس سوچ میں پڑگیا؟"

رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ "میں شاہ جی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بہت دنوں سے اس کے پاس گیا نہیں۔ ایک تو مینہ کی جھڑی لگی رہی۔ اوپر سے میں بیمار بھی پڑگیا۔"

"اوہو‘ تسیں پچھلے دنوں بیمار بھی رہے۔" نادر نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "جب ہی تو کچھ کمزور‘ کمزور دکھائی دے رہے ہو۔ چہرہ بھی مرجھایا ہوا لگتا ہے۔ کس ڈاکٹر سے علاج کرایا تھا؟"

"ایسی زبردست برسات میں ڈاکٹر کہاں سے آتا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ رستے بند تھے۔ جمیلہ

نے دوائی دی تھی۔ اسی سے چنگا ہو گیا۔"

"زمیں دارنی ویسے تو بہت پڑھی لکھی ہے پر مجھے یہ پتہ نہ تھا وہ ڈاکٹری بھی کر لیتی ہے۔"

رحیم داد نے مسکرا کر بتایا۔ "ڈاکٹری شاکٹری تو اس نے نہیں پڑھی۔ پر چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج کر لیتی ہے۔ چوٹ یا زخم آجائے تو مرہم پٹی بھی کر لیتی ہے۔ اس کے پاس دوائیوں سے بھرا ہوا بکسا ہے۔ اس میں دوا دارو کا ہر طرح کا سامان رہتا ہے۔ پنڈ میں کوئی بھی بیمار پڑے۔ چاہے مزارع ہو یا کمی' وہ جھٹ دوائیوں کا بکسا سنبھال' اس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اس معاملے میں اس کا دل بہت نرم ہے۔ آس پاس کے کسی پنڈ یا چک میں بھی کوئی بیمار پڑ جائے تو پتہ لگتے ہی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے دوائی کھلاتی ہے۔ خود ہی مرہم پٹی کرتی ہے۔" رحیم داد کو جمیلہ کی دردمندی اور خوبیاں بیان کرنے میں لذت محسوس ہو رہی تھی۔

نادر خاں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "پر آج کل تو جی وہ عدت میں ہے۔ حویلی سے باہر نہیں جا سکتی۔ تمیں نوں دوائی دینے ادھر کیسے چلی آئی؟ ویسے تو اسے تیرے سامنے بھی نہیں آنا چاہیے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ بات تو ایسی ہی ہے۔" رحیم داد نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے بتایا تھا نا کہ اس کا دل بہت نرم ہے۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا' مجھے بہت تیز بخار ہے' فوراً دوائیوں کا بکسا لے کر آگئی۔ ویسے یہ مہمان خانہ بھی حویلی سے الگ کہاں ہے۔" اس نے وضاحت کی۔ "وہ میرے سامنے کب آتی ہے۔ چادر کے پلو سے بکل مار کر منہ اس طرح چھپا لیتی ہے کہ آنکھیں بھی مشکل سے دکھائی پڑتی ہیں۔ عام طور پر تو منہ موڑ کر دوسری طرف کر لیتی ہے۔ اس معاملے میں اس نے پنڈ کے ملاّ سے بات کر رکھی ہے۔"

رحیم داد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ احمد کھانا لے کر آگیا۔ اس نے کھانا میز پر لگا دیا۔ رحیم داد نے نادر خاں کی طرف دیکھا۔ "تو نے روٹی کھائی؟"

"کھا لوں گا جی۔ میں نے تو ابھی نہا دھو کر کپڑے بدلنے ہیں۔"

نادر خاں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور احمد کے ہم راہ کمرے سے چلا گیا۔ رحیم داد اطمینان سے کھانا کھانے لگا۔ کھانے سے فارغ ہو کر حسب معمول وہ بستر پر لیٹ کر آرام کرنے لگا۔

دن ڈھلے رحیم داد کمرے سے باہر گیا۔ غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ رحیم داد مہمان خانے سے نکل کر باغ میں پہنچا۔ نوکروں نے پہلے ہی کرسیاں لگا دی تھیں۔ رحیم داد ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ برسات کی سہانی شام تھی۔ مشرق میں شفق کا الاؤ دہک رہا تھا۔ فضا گل

رنگ تھی۔ ہوا مسکی ہوئی تھی۔ رحیم داد تنہا بیٹھا موسم کی رنگینی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر تاجاں پر پڑی۔ وہ مہمان خانے کے عقب سے نکل کر مویشیوں کے باڑے کی جانب جا رہی تھی۔

تاجاں کی عمر سولہ سترہ برس کے لگ بھگ تھی۔ مگر وہ صحت مند اور بھرپور جوان تھی۔ حویلی ہی میں رہتی تھی۔ مگر اس کی حیثیت نوکرانیوں اور خادماؤں سے قدرے مختلف تھی۔ جمیلہ اس پر بہت مہربان تھی۔ ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آتی تھی۔ اسے اپنے پاس ہی رکھتی تھی۔ تاجاں کا باپ مر چکا تھا۔ بھاتاں اس کی بیوہ ماں تھی۔ اس نے تاجاں کو جمیلہ کی سپردگی میں دے دیا تھا۔ پچھلے چھ سال سے وہ حویلی میں تھی۔ وہیں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ کھانے کو اچھی غذا اور رہنے کو بہتر ماحول ملا تو اس کا رنگ روپ نکھر گیا۔ صحت بھی اچھی رہی۔ کام کاج اور محنت سے جسم بھی سڈول اور خوبصورت ہو گیا۔ جمیلہ اسے اس قدر عزیز رکھتی تھی کہ اس نے خود تاجاں کا رشتہ طے کیا تھا۔ شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی۔

رحیم داد نے تاجاں کو حویلی میں پہلے بھی دیکھا تھا۔ مگر اس وقت وہ اسے زیادہ ہی خوب صورت اور پرکشش نظر آئی۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی شلوار اور اسی رنگ کا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ سر پر گہرا دھانی دوپٹہ تھا۔ یہی لباس ایک بار رحیم داد نے جمیلہ کے جسم پر بھی دیکھا تھا۔ مگر اللہ وسایا کی موت کے بعد جمیلہ صرف سفید لباس پہنتی تھی۔ اس نے اپنے رنگین کپڑے لتے نوکرانیوں کو دے دیئے تھے۔ مگر سب سے زیادہ تاجاں کے حصے میں آئے۔ گلابی لباس میں رحیم داد کو تاجاں میں جمیلہ کی جھلک نظر آئی۔

شفق کی گہری نارنجی روشنی میں تاجاں کا چہرہ نکھر کر زیادہ ہی شگفتہ اور زیادہ ہی گلابی ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ تاجاں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ رحیم داد چپ چاپ بیٹھا دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ تاجاں قریب' اور قریب آ گئی۔ چلتے چلتے اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر خاموشی سے سلام کیا۔ رحیم داد مسکرایا۔ انگلی کے اشارے سے اسے بلایا۔ وہ ٹھٹکی۔ چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر سر کو دوپٹے سے ڈھکتی' شرماتی' لجاتی آگے بڑھی اور رحیم داد کے روبرو نظر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

رحیم داد نے نرم لہجے میں پوچھا۔ "تو بھاتاں کی دھی ہے نا؟"

"ہاں جی!" اس نے رحیم داد سے نظریں ملائے بغیر رسان سے جواب دیا۔ "میرا ناں تاجاں ہے جی۔"

"تو" تاجاں ہے!" رحیم داد نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "پر تو اس وکت کہاں جا رہی ہے؟ تو سا ہے بند ھی منیار ہے۔ حویلی سے باہر کیسے آ گئی؟ میں تو تیرے شگن میں بھی شریک ہوا تھا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ لہجے سے بے تکلفی جھلکنے لگی۔ "تیری سسرال سے آئی ہوئی مٹھائی بھی میں نے کھائی تھی۔ یہیں باغ میں تو شگن کی ساری رسماں رِیتاں ہوئی تھیں۔ پر تیں نوں ان کے بارے میں کیہ پتہ؟"

تاجاں اور شرما گئی۔ اس کے چہرے کے گلاب اور دہکنے لگے۔ آنکھوں میں چراغ جل اٹھے۔ وہ نظریں جھکا کر دوپٹے کا آنچل انگلی میں لپیٹتے ہوئے بولی۔ "وہ ایسا ہے جی۔ بھین جی نے حمے کو بلایا ہے۔ کوئی کام ہے۔ حویلی میں کوئی بھی نہ تھا۔ مجھے بھیج دیا۔ پر حما تو مہمان خانے میں نہیں ہے ڈھارے پر ہوگا۔ ادھر ہی جا رہی تھی۔" اس نے نگاہیں اٹھا کر رحیم داد کی جانب نہ دیکھا۔

"ایسے ادھر ادھر نہ گھوما کر۔" رحیم داد نے لہجے میں دبدبہ پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "تیری سسرال والوں کو پتہ چل گیا تو برا منائیں گے۔" یہ کہتے کہتے وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "پنڈ کے کسی گبھرو کی نظر پڑ گئی تو تجھے اٹھا لے جائے گا۔"

"نہیں جی، میں ایسی نہیں ہوں۔" وہ گھبرا کر الھڑپن سے بولی۔ "میں تو جی حویلی سے کبھی باہر نہیں جاتی۔"

"ٹھیک ہی کرتی ہے۔" رحیم داد نے دبی زبان سے اسے ٹٹولا۔ "تو ہے بھی تو سوہنی منیار۔ ان ریشمی کپڑے لتوں میں تو زیادہ ہی سوہنی لگتی ہے۔"

"پر جی یہ تو مجھے بھین جی نے دیئے ہیں۔"

"میں نوں پتہ ہے۔" رحیم داد آہستہ سے ہنسا۔ "یہ کپڑے لتے تجھے زمیں دارنی ہی نے دیئے ہیں۔ پر انھیں پہن کر تو رانجھا تاں کی دھی نظر نہیں آتی۔ زمیں دارنی لگتی ہے۔"

تاجاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ نظریں نیچی کیے چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ بکھری تھی۔ شفق کی سرخی کا الاؤ ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔ شام کا دھندلکا فضا میں گھلنے لگا تھا۔ رحیم داد کچھ دیر اور تاجاں سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی اثناء میں نادر خاں جامن کے ایک پیڑ کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ رحیم داد نے چاپ سن کر اس کی جانب دیکھا۔

نادر اس کی طرف بڑھا۔ رحیم داد تاجاں کی سمت مڑا۔ اسے مخاطب کیا۔ "تاجاں! حویلی میں جا۔ اندھیرا بڑھ گیا ہے۔ میں حمے کو زمیں دارنی کے پاس بھیج دوں گا۔ تو اسے بتا دینا۔"

تاجاں نے اس کی جانب دیکھے بغیر دھیمے لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے۔" وہ مڑی اور آہستہ آہستہ

قدم اٹھاتی ہوئی حویلی کی جانب چل دی۔

نادر خاں قریب پہنچا۔ اس نے گردن کو خم دے کر تاجاں کی سمت دیکھا اور رحیم داد کے روبرو نظریں جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے سر کو خفیف سی جنبش دی بے نیازی سے بولا۔

"بیٹھ جا نادر۔"

نادر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر تاجاں کی جانب دیکھا۔ وہ درختوں کے نیچے پھیلتے ہوئے شام کے دھندلکے میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ نادر خاں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ دبی زبان سے بولا۔

"سوہنی منیار ہے۔ کون ہے جی یہ؟"

"تاجاں نام ہے اس کا۔ حویلی ہی میں رہتی ہے۔ حمے کو بلانے ادھر آئی تھی۔"

نادر خاں نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ "میں نے تو جی حویلی کو اب تک دیکھا ہی نہیں۔"

"دیکھ لینا، ضرور دیکھ لینا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے جمیلہ سے بھی ملانا ہے۔ وہ حویلی کے اندر ہی ملے گی۔" اس نے نظر بھر کر نادر کو دیکھا۔ "پر وہ تجھ سے خوش نہیں ہے۔ یہ سوچ لے۔"

"مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ پر ایک بار میں اس سے مل لوں۔ فیر وہ مجھ سے ناراض نہیں رہے گی۔"

رحیم داد نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "تو اسے جانتا نہیں۔ وہ اور ہی طرح کی زنانی ہے۔ بہت تیز اور ہوشیار ہے۔"

"میں نے بھی یہی سنا ہے جی۔" نادر خاں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "پر ہے تو وہ وڈے جاگیردار کی دھی۔ ویسے خود بھی چھوٹی موٹی جاگیردارنی ہی ہے۔ میں جاگیرداروں کے مزاج بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ برسوں ان کی ملازمت میں رہا ہوں۔ کتنے ہی ٹیڑھے اور اونچے طرّوں والے جاگیرداروں اور وڈے زمیں داروں سے اپنا واسطہ رہا ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انگلیوں سے کان چھوا۔ "اللہ کے فضل سے کوئی مجھ سے ناراض نہیں رہا۔"

"تو کہتا ہے تو جلد ہی تجھے اس سے ملوا دوں گا۔"

"میں نے اس سے کئی کام لینے ہیں۔" نادر خاں نے ذرا آگے جھک کر آہستہ سے کہا۔ "اور وہ کام میں ہی کرا سکتا ہوں جی۔ میں نے اس سے زمیں داری کے کاغذات لینے ہیں۔ مزارعوں سے قرض ادھار کی وصولی کے لیے رجسٹر اور بہی کھاتے لینے ہیں۔ اور بھی ایسی ہی کئی دستاویزات ہیں جو اس کے پاس ہیں۔ ان کا اب تیری تحویل میں ہونا بہت ضروری ہے۔"

"کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کرتے ہوئے کہا۔ "پر اتنا دھیان رکھنا' وہ نراض ہو تو چپ کر جانا۔ بات یہ ہے میں اسے نراض کرنا نہیں چاہتا۔" اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "ویسے وہ دل کی بری نہیں۔ اب یہی دیکھ۔ میں بیمار پڑا تو عدّت میں ہوتے ہوئے بھی گھبرا کر جھٹ چلی آئی۔ دوائی کھلائی۔ صبح تک میرے بستر کے پاس بیٹھی رہی۔ جب تک میں چنگا نہیں ہو گیا روز ہی آتی رہی۔ وہ جتنی خوب صورت اور سوہنی ہے اتنی ہی دل کی چنگی بھی ہے۔"

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے کہ زمیں دارنی بہت حسین اور خوب صورت ہے۔"

"اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ ویسے اللہ وسایا کی موت کے بعد سے وہ مرجھا کر رہ گئی ہے۔ پر اب بھی بہت شاندار لگتی ہے۔"

"ویسے تو جی تاجاں بھی بہت زوردار مٹیار ہے۔" نادر خان نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

مگر رحیم داد نے حوصلہ افزائی نہ کی۔ اس کی بات صاف نظر انداز کر گیا۔ کہنے لگا۔ "نادر! تو دو چار روز آرام کر۔ مزارعوں کے پاس تیرا ابھی جانا ٹھیک نہیں۔ پرسوں جمعرات ہے۔ جمیلہ' جمعرات کو اللہ وسایا کی نذر نیاز میں لگی رہتی ہے۔ جمعے یا ہفتے کو تجھے اس کے پاس لے چلوں گا۔" وہ گردن اٹھا کر سوچنے لگا۔ پھر نادر خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ "ہفتہ ہی ٹھیک رہے گا۔"

نادر خاں نے رحیم داد کی تجویز سے اتفاق کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نوکروں نے کھانا لگا دیا۔ نادر بھی کھانا کھانے مہمان خانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا تو دو مزارعے آ گئے۔ وہ ان کے ساتھ دیر تک بیٹھا سیلاب اور شدید بارش کی تباہ کاریوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔

☆

ہفتے کی صبح ناشتا کرتے ہوئے رحیم داد نے احمد کو جمیلہ کے پاس بھیجا اور اس کی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد احمد نے واپس آ کر بتایا کہ جمیلہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔ رحیم داد نے نادر خاں کو بھی بلوالیا۔ دونوں احمد کے ہم راہ حویلی میں گئے۔ جمیلہ بڑے کمرے میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت بھی سفید لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے بکل مار کر چادر سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ دونوں نے اونچی آواز سے سلام کیا۔ جمیلہ نے پہلو بدلا اور ترچھی ہو کر اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کا منہ دیوار کی طرف ہو گیا۔ رحیم داد قریب پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مگر نادر خاں نہ بیٹھا۔ نظریں نیچی کیے خاموش کھڑا رہا۔

جمیلہ نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر سرسری نگاہ سے نادر کی جانب دیکھا۔ رحیم داد کو مخاطب

کرتے ہوئے پوچھا۔ "چوہدری! یہ نادر خاں تو نہیں ہے؟"

"ہاں جی' یہ نادر ہی ہے۔" رحیم داد نے یہ کہتے ہوئے نادر خاں کو دیکھا۔ "بیٹھ جا نادر۔"

نادر خاں دونوں سے ذرا ہٹ کر صوفے کے بجائے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے جمیلہ کی جانب دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ جمیلہ نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دریافت کیا۔ "چوہدری! تو اسے میرے پاس کیوں لایا ہے؟" اس کے لہجے سے خفگی صاف عیاں تھی۔

رحیم داد نے جمیلہ کے لہجے کی ترشی محسوس کی۔ نرمی سے بولا۔ "زمیں دارنی! میں نے سوچا اسے بھی تجھ سے ملوا دوں۔ اسے کام تو تیری ہی مرضی سے کرنا ہے۔"

"میری مرضی کیا ہے۔" جمیلہ نے بے رخی سے کہا۔ "تیرا منیجر ہے۔ تو جانے اور یہ جانے۔ مجھے اس سے کیا لینا۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "تو نے اسے مجھ سے پوچھ کر رکھا ہے؟"

"تیری مرضی نہیں تو میں اسے نہیں رکھتا۔ نراض کیوں ہوتی ہے؟" رحیم داد نے ایک بار پھر مڑ کر نادر کی جانب دیکھا۔ "سن لے بھئی نادر۔"

نادر خاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ بیٹھا رہا۔

"چوہدری! تو کیا چاہتا ہے؟" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "میرے سامنے ایسی بات کیوں کر رہا ہے؟ تجھے پتہ ہے' اس کے بارے میں تجھ سے میں پہلے ہی گل بات کر چکی ہوں۔"

"تب ہی تو میں اسے تیرے پاس لایا ہوں۔" رحیم داد کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "زمیں دارنی جو تو کہے گی وہی ہو گا۔ یہ بات میں اسے صاف صاف کہہ چکا ہوں۔" رحیم داد نے پہلو بدلا۔ نادر خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ "یہی گل ہے نا' نادر؟ خاموش کیوں بیٹھا ہے۔ بولتا کیوں نہیں؟"

"میں نے کیا بولنا جی۔" نادر خاں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چوہدری! تو مجھے یہ بات نہ بھی بتاتا تب بھی میں نوں پتہ تھا کہ جو زمیں دارنی کی مرضی ہو گی وہی ہو گا۔ یہ بات تو اس پنڈ ہی کی نہیں' پورے موضعے کو معلوم ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ خوشامد پر اتر آیا۔ "میں نوں پتہ ہے یہ بہت وڈے زمیں دار کی دھی ہے اور میں نے یہ بھی سنا ہے جی کہ اس کا دل بھی وڈا ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں تو جی بال بچے دار ہوں۔ پریشان ہوں۔ سوچتا تھا زندگی کے جو دن رہ گئے ہیں' اس حویلی کی خدمت کرتے گزار دوں گا۔ زمیں دارنی کی مرضی نہیں تو میں یہی سمجھوں گا' میرا نصیبہ ہی خراب ہے۔"

"مجھے کیوں دوش دیتا ہے۔" مگر اس دفعہ جمیلہ کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

"تجھے کیوں دوش دینے لگا۔ میں تو اپنی بد نصیبی کی گل کر رہا ہوں۔" نادر خاں نے خوشامد کے ساتھ ساتھ لہجے میں رقت پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔

جمیلہ پر اس کوشش کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "تیرا کوئی پتر نہیں؟"

"نہیں زمیں دارنی' اب کوئی نہیں رہا۔ وڈا پتر پچھلی جنگ عظیم کے دوران فوج میں بھرتی ہو کر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ افریقہ میں العلمین کے محاذ پر تھا۔ واپس نہ آیا۔ صرف مرنے کی اطلاع ملی۔" نادر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "دوسرا سال ہی بھر بعد ایک جھگڑے میں مارا گیا۔ یہی دو پتر تھے۔ دونوں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی موت سے میری کمر ٹوٹ گئی۔ گھر والی تو ان کے غم کو برداشت ہی نہ کر سکی۔ روتے ہی روتے ایک روز چل بسی۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اپنی بات کہتے کہتے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں گی۔

"تب تو' تو بالکل اکیلا رہ گیا۔" جمیلہ نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا۔ "کوئی بھی نہ رہا؟"

"نہیں زمیں دارنی' ایسا نہیں ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "پاکستان بننے کے کچھ ہی دنوں بعد میں نے ادھر رحمت والی میں دوسرا ویاہ کر لیا تھا۔ اس سے تین اولادیں ہیں۔ پر ان میں پتر کوئی نہیں۔ تینوں ہی چھوہریاں ہیں۔ لگ بھگ سال بھر سے بے روزگار ہوں۔ زندگی بھر نوکری کی۔ وہی کر سکتا ہوں۔ اور کوئی کام نہ آتا ہے نہ کر سکتا ہوں۔"

تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ جمیلہ اس کی پریشان حالی سے بہت متاثر ہوئی۔ تڑپ کر بولی۔ "نادر خاں! تو بہت دکھی ہے۔ تیری باتوں سے ایسا ہی لگتا ہے۔ تجھے دکھ پہنچا کر مجھے کیا لینا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں تو خود دکھ جھیلتے جھیلتے راکھ ہو گئی۔ اللہ وسایا تھا' وہ بھی مجھے دکھ سہنے کے لیے اکیلا چھوڑ گیا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں کے آبگینے چھلک پڑے۔ فضا میں غم کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ سب چپ بیٹھے تھے۔ باہر ملگجی دھوپ پھیلی تھی۔ آسمان پر بادلوں کا غبار تھا۔

جمیلہ نے چادر کے پلو سے آنسو پونچھے اور رحیم داد کی جانب متوجہ ہوئی۔ "چوہدری! اب تو نے اسے رکھ ہی لیا ہے تو لگا رہنے دے۔ اپنی مرضی میں میری مرضی بھی شامل کر لے۔"

"ایسا نہ کہہ۔ مرضی تو تیری ہی چلے گی زمیں دارنی۔" رحیم داد نے جمیلہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے چاپلوسی سے کام لیا۔ "تینوں ٹھیک طرح پتہ ہے۔ نہ میں نے پہلے کبھی اپنی مرضی چلائی نہ آگے چلاؤں گا۔ نادر خاں کے معاملے میں یہ بھول ہو گئی کہ جو گل بات آج تیرے سامنے ہوئی ہے' پہلے ہو جاتی تو ٹھیک تھا۔"

جمیلہ نے رحیم داد کو نظر انداز کیا۔ نادر خاں کو مخاطب کیا۔ "نادر! اچھی بات یہ ہے کہ ہمیں مینیجر کی ضرورت نہیں۔ اپنی اتنی زمیں داری نہیں۔ اور نہ ہی ہمیں مزارعوں کی چمڑی اتارنی ہے۔ یہ بات چوہدری جانتا ہے۔ میں چاہتی ہوں تو بھی جان لے۔"

"میں نے کیا کرنا ہے جی' جیسا حکم ہو گا ویسا ہی کروں گا۔" نادر نے نہایت مستعدی سے اسے یقین دلایا۔ "پر ایک گل میں نوں ضرور کہنی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"اگر پڑیلی' جھنگر یا غیر مزروعہ زمین کو قابل کاشت بنانے کی کوشش کی جائے' اس میں تو کوئی حرج نہیں؟ میرا مطلب یہ ہے جی' تنخواہ لوں تو اس کے بدلے کچھ کارگزاری بھی دکھاؤں۔ میں نے کسی سے خیرات تو لینی نہیں۔" نادر نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "پچھلے دنوں میں نے گھوم پھر کر زمیں داری کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے بہت سی زمین غیر مزروعہ اور بے کار پڑی نظر آئی۔"

جمیلہ نے بتایا۔ "ایسی غیر مزروعہ زمین کو اللہ وسایا بھی قابل کاشت بنانا چاہتا تھا پر مقدمے بازی نے اس طرف دھیان دینے کی اسے مہلت ہی نہ دی۔ کئی بار پروگرام بنایا اور ہر بار کوئی نہ کوئی الجھن کھڑی ہو گئی۔"

"ایک گل اور بھی تجھ سے پوچھنی ہے۔"

"وہ بھی پوچھ لے۔"

"کتنے ہی مزارعوں پر برسوں سے ادھار چلا آ رہا ہے۔ ان کی وصولی کی ٹھیک طرح کبھی کوشش نہیں کی گئی۔" نادر خاں نے تجویز پیش کی۔ "یہ ادھار فصل کی واڈھی پر' خاص طور پر کماد کی پیداوار سے آسانی کے ساتھ وصول کیا جا سکتا ہے۔"

"ایسے نہیں۔" جمیلہ نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ "تو روز ناشتے کے بعد میرے پاس آ جا۔ میں سارے رجسٹر اور کاغذات تیرے سامنے رکھ دوں گی۔ تجھے بتاتی جاؤں گی' کس سے اگلی فصل کی واڈھی پر کتنا ادھار وصول کیا جا سکتا ہے۔ مجھے سب کا پتہ ہے۔ جو ادھار ادا کر ہی نہ سکتا ہو اس سے زبردستی تو وصولی نہیں کی جا سکتی۔"

نادر خاں انگلی سے گدی کے بال کھجاتے ہوئے بولا۔ "زمیں دارنی! اس طرح تو ادھار وصول کرنا مشکل ہو گا۔"

"ہوا کرے۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نے اپنے کسی مزارعے کو بھوکا نہیں مارنا اور نہ ہی بے دخل کرنا ہے۔ یہ بات میں تجھے صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہوں۔ تو نے اپنی کارگزاری

دکھانے کے چکر میں مزارعوں کو تنگ کرنے کی کوشش کی تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ تو خود پریشان ہ
ویسے ہی دوسروں کی پریشانیوں کا دچار کر۔"

"نہیں جی' جیسا کہے گی زمیں دارنی ویسا ہی ہوگا۔ میں نوں تیرے حکم کے خلاف کوئی کاروا
نہیں کرنی۔" نادر خاں نے جھٹ پینترا بدلا۔ "ویسے بھی میں روز کے روز تجھے کام کی رپورٹ پیش
کرتا رہوں گا۔ جو بھی اگلی کارروائی کرنی ہوگی تجھ سے اس کے بارے میں مشورہ کرلوں گا۔"

"زمیں داری کا سارا بوجھ مجھ پر ڈالنے کی بجائے تو چوہدری کو کیوں نہیں ذمہ داری میں شریک
کرتا؟ یہ کب تک زمیں داری کے کاموں سے دور دور اور الگ الگ رہے گا۔" جمیلہ نے بات کہتے
کہتے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اسے براہ راست مخاطب کیا۔ "چوہدری! ایسے کام نہیں چلے
گا۔ تجھے بھی اب کچھ نہ کچھ ذمہ داری سنبھالنی ہی ہوگی۔ بلکہ ساری ہی سنبھال لے۔"

"جلدی نہ کر۔ تو جو کہے گی ویسا ہی کروں۔" رحیم داد نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔ "پہلے
نادر کو زمیں داری کے معاملات سمجھ لینے دے۔ تو کہہ تو میں بھی اس کے ساتھ آجایا کروں' ابھی تو
مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"ضرور آجایا کر۔ تجھے یہاں آنے سے کس نے روکا ہے۔" جمیلہ نے اس کی حوصلہ شکنی نہ کی۔
"چوہدری! جب تو نے اپنی مدد کے لیے نادر کو منیجر رکھ ہی لیا ہے تو زمیں داری کی دیکھ بھال بھی تجھے
ہی کرنی چاہیے۔ میں کہاں تحصیل دار اور گرداور کے دفتروں اور کچہریوں کے چکر کاٹتی پھروں گی۔
زمیں داری تو سچ پوچھ اسی کا نام ہے۔ ورنہ زمیں دار کون سا ہل چلاتے ہیں۔ نہ بوائی کرتے ہیں نہ
فصل کی واڈھی۔ پر تو پیداوار سے آدھا حصہ وصول کرلیتے ہیں۔ عام طور پر تو اس سے بھی زیادہ
لیتے ہیں۔ ویسے بھی پیداگیری کے لیے زمیں داروں کے اور بھی نہ جانے کتنے دھندے اور
ہتھکنڈے ہیں۔ طرح طرح کے ٹیکس اور ابواب ہیں۔"

نادر خاں نے دبی زبان سے اختلاف کیا۔ "زمیں داری میں تو جی ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ زمیں
دار کا کام کیسے چلے۔ میں تجھ سے کیا بتاؤں زمیں دارنی' ان آنکھوں سے میں نے کیا کیا دیکھا ہے۔"

"ضرور دیکھا ہوگا۔" جمیلہ نے بے زاری سے کہا۔ "مجھے بھی تھوڑا بہت پتہ ہے۔ تب ہی تو میں
ہیرا پھیری کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میں تو سچ پوچھ' اب سکول اور ڈسپنسری پر پوری طرح دھیان
دینا چاہتی ہوں۔ عدت میں ہونے کے کارن سکول بھی نہیں جاسکتی۔ ڈسپنسری کا کام بھی ٹھیک سے
شروع نہ ہوسکا۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہوگیا۔ "پر میں سکول میں پڑھائی بند نہیں کرسکتی۔ اب
تو ایک ہی ٹیچر رہ گیا ہے۔ وہ بھی روز روز بیمار رہتا ہے۔ چھٹی بھی مانگ رہا تھا۔ تب ہی تو بالکوں نے

ل جانا چھوڑ دیا۔ پہلے تو دور دور کے پنڈ سے بچے بالک پڑھنے آتے تھے۔" اس کے رویئے سے
ہلاہٹ جھلکنے لگی۔ "میں سکول بند نہیں ہونے دوں گی۔ میں زیادہ دنوں تک اس طرح حویلی میں
نہیں رہ سکتی۔"

"ملاں جی سے پوچھ لے۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔

"اس سے بھی پوچھ لوں گی۔" جمیلہ کا لہجہ بدستور تیز اور تیکھا تھا۔ "ویسے سکول' حویلی کے
منے ہی تو ہے۔ سو' سوا سو گز دور ہوگا۔ اور اس میں کیول بالک ہی تو ہوتے ہیں۔"

کرے میں خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ مگر نادر خاں زیادہ دیر چپ نہ رہ سکا گا۔ اس
کہا۔ "اچھا جی یہ تو طے ہوگیا' میں کل سویرے سے زمیں دارنی کے پاس پابندی سے آتا رہوں
. زمیں داری کے حالات سمجھوں گا۔ آگے جو کرنا ہوگا وہ زمیں دارنی ہی کے حکم اور مشورے
. کروں گا۔"

رحیم داد نے کہا۔ "میں بھی تیرے ساتھ آتا رہوں گا۔ مہمان خانے میں خالی پڑے پڑے دل
۔ آگیا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی رہنا چاہیے۔"

"چوہدری! تجھے تو اب بہت کچھ کرنا ہے۔" جمیلہ بولی۔ "تو نے بہت دن آرام کرلیا۔ تو ضرور
ر کے ساتھ آنا۔ میں تو پہلے ہی یہ کہہ چکی ہوں۔"

بات چیت کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ محفل برخاست ہوگئی۔ دونوں جمیلہ سے رخصت ہوکر باہر
۔۔ واپسی پر وہ بہت مطمئن اور خوش نظر آتے تھے۔ وہ جو کچھ چاہتے تھے اور جیسا چاہتے تھے وہی
۔ جمیلہ ان کی راہ میں حائل نہ ہوئی۔ وہ بغیر کسی تلخی اور جھک جھک کے سب کچھ ان کے
لے کرنے پر رضامند ہوگئی تھی۔

☆

مہمان خانہ خالی تھا۔ احمد موجود نہ تھا۔ رحیم داد اور نادر خاں کمرے میں جاکر کرسیوں پر بیٹھ
۔ نادر خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تو جی ڈر رہا تھا' زمیں دارنی گڑبڑ کرے گی۔ آسانی
، نہ مانے گی۔ جھگڑا کھڑا کرے گی۔ پر اس نے تو کچھ بھی نہ کہا۔ شروع میں ذرا اکھڑی اکھڑی
ا۔ بعد میں تو بالکل پٹڑی پر آگئی۔"

"میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا' وہ دل کی بری نہیں۔ پر ایک بات ہے۔ تو ہے بہت ہوشیار۔ ایسے
بھرے انداز میں اپنے بارے میں اسے بتایا کہ میرا دل بھی ڈوبنے لگا۔ جمیلہ تو اس معاملے میں
ے ہی بہت کمزور اور نرم دل ہے۔ وہ کسی کو تکلیف اور دکھ میں تو دیکھ ہی نہیں سکتی۔"

"پر چوہدری، میں نے اسے جو کچھ کہا، ٹھیک ہی کہا تھا۔" نادر خاں نے صفائی پیش کی۔ "یہ
بات ہے، میں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا، اسے اس طرح بیان کیا کہ وہ موم کی طرح پگھل
تیرا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ وہ دل کی بری نہیں۔ اور جی یہ بھی سچی گل ہے وہ دل کی جتنی بھلی
اتنی ہی خوبصورت اور سوہنی بھی ہے۔ رانڈ ہونے کے بعد بھی اس کا چہرہ اب بھی ایسا دکھتا ہے
نظر نہیں ٹھیرتی۔ جب رنگین ریشمی کپڑے پہن کر، سنگھار کیے ہوتی ہوگی تب تو اس کی اور ہی
ہوتی ہوگی۔"

"تو نے جمیلہ کو ان دنوں نہیں دیکھا۔" رحیم داد نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر صحن میں قدموں
آہٹ ابھری۔ رحیم داد خاموش ہوگیا۔ گردن بڑھا کر کمرے سے باہر دیکھا۔ وکیل، مہمان خانے
کے ملازم احمد کے ہم راہ صحن عبور کرکے برآمدے میں داخل ہو رہا تھا۔

وکیل محمد عثمان رندھاوا کمرے کے اندر آگیا۔ احمد واپس چلا گیا۔ رحیم داد نے اٹھ کر وکیل سے
مصافحہ کیا۔ کرسی پر بٹھایا۔ خیریت پوچھی۔ ہنس کر آنے کا مقصد معلوم کیا۔

"آج کیسے ادھر آنا ہوا؟"

"چوہدری! میں تیرے کلیم کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔" وکیل بات کہتے کہتے ٹھٹکا۔ پلٹ
کر نادر خاں کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

رحیم داد فوراً بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "یہ نادر خاں ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر نادر خاں کی
طرف اشارہ کیا۔ "میں نے اسے زمیں داری کے لیے مینجر لگایا ہے۔ اپنا ہی بندہ ہے۔ بے فکر ہو کر
گل بات کر جی۔"

"یہ تیرا مینجر ہے۔" وکیل نے نادر خاں کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "ویسے میں نے اسے پہلی
بار یہاں دیکھا ہے۔"

"اسے زیادہ دن نہیں ہوئے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "کچھ ہی دیر پہلے اسے زمیں دارنی کے پاس
بھی لے گیا تھا۔ اس نے بھی اسے پہلی ہی بار دیکھا تھا۔" اس نے بات کا رخ بدلا۔ "تسی زمیں
دارنی سے نہیں ملے؟"

"نہیں، میں اس کے پاس نہیں گیا۔ اس معاملے میں تجھ سے ہی بات کرنی ہے۔ زمیں دارنی تو
عدت میں ہے۔ ویسے بھی وہ کیا کر سکتی ہے۔"

"میں تو جی ابھی تک یہی نہیں سمجھ سکا، چکر کیا ہے۔ مجھے تو اس بارے میں کسی نے بھی کچھ نہیں
بتایا۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کے قتل کی تفتیش کے بارے میں بھی پوچھا۔ "اور جی اللہ وسایا کے

بتا؟ کوئی گرفتاری شرفتاری ہوئی؟"
نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "اب تک کچھ نہیں ہوا۔ لگتا ہے پولس نے کیس بالکل دبا
نے جب بھی پوچھا، یہی جواب ملا، قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں لگا۔ پولس کا خیال ہے، اللہ
زمیں دارنی کے بھائیوں نے کرایا ہے۔ قاتل سرحد پار سے آئے اور واردات کے فوراً
کے اندھیرے میں نکل گئے۔"

خاموش رہا۔ مگر نادر خاں بول پڑا۔ "وکیل صاحب! یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ زمیندار
کے قتل کو اڑھائی مہینے سے اوپر ہی ہوگئے ہوں گے۔ اگر زمیں دارنی کے بھائیوں نے
کرایا ہوتا تو وہ اب تک زمیں دارنی کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے۔"
نے بھی پولس سے یہی سوال کیا تھا۔" وکیل نے بتایا۔
اب ملا؟" نادر خاں نے دریافت کیا۔
کا کہنا ہے، واردات کے بعد سے اس علاقے کی کڑی نگرانی شروع کردی گئی۔ زمیں
بھائیوں کو کسی نے یہ اطلاع پہنچا دی ہے۔ اس لیے انھوں نے ابھی ادھر آنے کی کوشش
کی۔"
تو کہتا ہوں جی، زمیں دارنی ان کے ساتھ جائے گی بھی نہیں۔" رحیم داد نے اپنی رائے
۔ "وہ جانا چاہتی تو اللہ وسایا کی زندگی ہی میں جا سکتی تھی۔ پر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ تو
بنا چاہتی ہے۔ سچی بات یہ ہے جی، وہ جمیلہ سے دوبارہ پاروتی بننا نہیں چاہتی۔ ایک بار
ہونے کے بعد وہ کیسے ہندنی بن سکتی ہے۔"
نے بھی اس کی باتوں سے یہی اندازہ لگایا ہے۔" وکیل نے رحیم داد کی تائید کی۔ "وہ یہاں
نہیں جائے گی۔"
داد نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "اچھا جی، اب یہ تو علوم ہونا چاہیے کہ اپنے
کیا گڑبڑ ہے؟"
للہ وسایا تو یہ بات بتانا نہیں چاہتا تھا پر میں تجھے بتاتا ہوں۔" وکیل نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔
یہ ہے چوہدری، کسی نے اوپر درخواست لگائی ہے کہ تیرا کلیم جعلی ہے۔ لہٰذا اس کلیم کی بنیاد
جو اراضی اور جائیداد الاٹ ہوئی ہے، منسوخ کی جائے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اللہ
تجھے اسی لیے کچھ بتانا نہ چاہتا تھا کہ تو پریشان ہوگا۔"
پریشانی کی تو جی بات ہی ہے۔ پر درخواست لگانے والا ہے کون؟"

"اس کا نام محمد بشیر ہے۔ وہ بھی خود کو ضلع گورداسپور کا مہاجر بتاتا ہے۔" وکیل نے رحیم دا[د کو]
مطلع کیا۔

"میں تو کسی محمد بشیر کو نہیں جانتا۔" رحیم داد بدستور پریشان تھا۔ "پر اسے میرے خلا[ف]
درخواست لگانے سے کیا ملے گا؟"

"اگر درخواست درست ثابت ہوئی تو اسے انعام مل سکتا ہے۔" وکیل نے نہایت سنجیدگی [سے]
کہا۔ "حکومت نے جعلی کلیموں کا سراغ بتانے والوں کے لیے انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ [یہ]
بات تو تجھے بھی معلوم ہوگی۔"

"میں نوں تو جی کچھ پتہ نہیں۔" رحیم داد نے سادگی سے اپنی بے خبری کا اعتراف کیا۔ "پر ا[س]
درخواست کا بنا کیا؟"

"اس پر انکوائری کا حکم دیا جا چکا ہے۔" وکیل نے کھل کر بتایا۔ "کلیم دوبارہ تصدیق کے [لیے]
بھیجا جا سکتا ہے۔ اور اس وقت تک کے لیے تیری الاٹمنٹ بھی معطل ہو سکتی ہے۔"

"تو فیر اپنی طرف سے کیا کارروائی کی گئی؟ میں نوں تو کچھ بھی علوم نہیں۔" رحیم داد کے چہر[ے]
سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وکیل کو باور کرانے [کے]
لیے زور دے کر کہا۔ "ویسے جی، یہ درخواست بالکل جھوٹی ہے۔ میرے کلیم میں ذرا بھی گڑ[بڑ]
نہیں۔"

"چوہدری! تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" وکیل نے اسے تسلی دی۔ "لیکن جعلی کلیموں کا کارو[بار]
آج کل اتنا بڑھ گیا ہے کہ سرکار کو ذرا بھی شبہ ہوتا ہے تو فوراً کارروائی کی جاتی ہے۔ محکمہ آ[باد]
کاری بہت چوکنا اور چوکس ہے۔ ہر درخواست پر جھٹ انکوائری کا حکم جاری کر دیا جاتا ہے۔"
رحیم داد نے دریافت کیا۔ "کیا بنا انکوائری شنکوائری کا؟"

"اللہ وسایا کے مشورے پر میں نے انکوائری رکوا دی تھی اس طرح اس وقت معاملہ دب [گیا]
تھا۔ پر اب اطلاع ملی ہے دوبارہ انکوائری شروع ہونے والی ہے۔ اس سے بچنے کی یہی صورت [ہے]
کہ فائل ایک بار پھر دبوا دی جائے۔ پہلے ہزار روپے دیئے تھے، اب دو ہزار دینے پڑیں گے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دو ہزار روپے دے کر ایک بار فیر معاملہ دبا بھی دیا گیا تب بھی آ[گے]
کسی وقت اٹھ سکتا ہے۔"

"بالکل اٹھ سکتا ہے۔" وکیل نے اعتراف کیا۔ "اور یہ بھی سمجھ لے کہ انکوائری اگر ایک با[ر]
شروع ہو گئی تو تیری الاٹمنٹ بھی منسوخ ہو جائے گی۔ یہی سب سے بڑا خطرہ ہے اور اسی سے بچ[نے]

[کے] لیے پہلے بھی معاملے کو دبا دیا گیا تھا۔"

"یہ تو بہت پریشانی کی گل ہے۔" رحیم داد کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے
ٹپکنے لگے جن کو وہ بار بار پونچھتا۔

"اس خطرے سے مکمل طور پر بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"جو کلیم افسر انکوائری کر رہا ہے۔" وکیل نے بتایا۔ "وہ پانچ ہزار روپے مانگتا ہے۔ کہتا ہے کہ
[د]رخواست کے ساتھ پوری فائل ہی تیرے سامنے پھاڑ کر جلا دے گا۔"

"ایسا ہو جائے تو سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔" رحیم داد کے چہرے سے قدرے اطمینان
ٹپکنے لگا۔ مگر جلد ہی پھر پریشانی چھا گئی۔ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پر سوال تو یہ ہے کہ پنج ہزار
[ر]وپے آئیں گے کہاں سے؟ اتنا روپیہ نہ میرے پاس ہے نہ زمیں دارنی کے۔"

"سوچ لے چوہدری! اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ افسر
تحقیقات سے کچھ دنوں کی مہلت لے لوں۔"

"کتنے دنوں کی مہلت مل جائے گی؟" رحیم داد نے وکیل سے پوچھا۔

"میرے کہنے پر وہ مہینہ بھر انتظار کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔" وکیل اٹھ کر
کھڑا ہو گیا۔ "مجھے اب جانا ہے۔ چوہدری! تو جلد سے جلد روپے کا بندوبست کر لے ورنہ الاٹمنٹ
[ا]یک بار معطل یا منسوخ ہو گئی تو دوبارہ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ بات اصلی یہ ہے جی کلیم ہولڈر
[بہ]ت زیادہ تعداد میں ہیں اور متروکہ جائیداد اب اتنی کم رہ گئی ہے کہ کلیم ہولڈر چھپی ہوئی متروکہ
[ج]ائیداد کا پتہ لگانے کے لیے روپیہ بھی خرچ کر رہے ہیں اور بھاگ دوڑ میں بھی مصروف ہیں، تاکہ
[ح]الیہ سرکاری احکامات کی رو سے اس خدمت کے صلے میں انھیں اس کی الاٹ منٹ مل جائے۔"

"تیں نوں زمیں دارنی سے نہیں ملنا؟" رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

"میں دوبارہ آؤں گا۔ اس سے بھی ملوں گا اور تجھے صحیح صورت حال بتاؤں گا۔ اس عرصے میں
رقم کا بندوبست کرنے کی کوشش کر۔"

وکیل عثمان رندھاوا چلا گیا۔ کمرے میں سکوت پھیل گیا۔ رحیم داد کے چہرے پر پریشانی چھائی
تھی۔ نادر خاں نے اسے اس قدر پریشان پایا تو دل جوئی کی کوشش کی۔

"چوہدری! فکر کرنے کی کوئی گل نہیں۔ ویسے تو شاہ جی سے مل کر پانچ ہزار روپے کا بندوبست
بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے پورا پورا بھروسہ ہے وہ انکار نہیں کرے گا۔ تیری ہر طرح مدد کرے گا۔"

اس نے نظر بھر کر رحیم داد کے چہرے کو دیکھا۔ "پر میں سمجھتا ہوں اس سے کم میں بھی کام ہو سکتا ہے۔ آباد کاری کے محکمے میں اپنی بہت جان پہچان ہے۔ آئندہ وکیل آئے تو اس سے کلیم کے کاغذات واپس لے لینا۔ آگے کی تو مجھ پر چھوڑ دے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "ایک فائل ہی غائب کرانی ہے۔ اس کے لیے پانچ ہزار کی رقم بہت زیادہ ہے۔ میں بہت کم میں کام کرا دوں گا۔ ہو سکتا ہے ہزار روپے میں کام ہو جائے۔ میری تو یہی کوشش ہوگی۔"

"صرف ہزار روپے میں!" رحیم داد حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "نہیں جی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

نادر نے گردن اونچی کی۔ مستعدی سے بولا۔ "چوہدری! تو نے مجھے مینجر لگایا ہے۔ اب مجھے اپنی کارگزاری دکھانے کا موقع بھی تو دے۔ یہ تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ وکت آنے پر تو خود دیکھ لے گا میں کتنے کام کا بندہ ہوں اور کیسی کیسی خدمت انجام دے سکتا ہوں؟ تو مجھ پر پورا پورا اعتماد کر سکتا ہے۔" اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو تسلی دی۔ "فکر کرنے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

دونوں کچھ دیر اس مسئلہ پر بات کرتے رہے۔ رحیم داد اپنے کلیم کے بارے میں بہت پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ اسے اپنی زمیں داری نکل جانے کا خطرہ رہ رہ کر ڈرا رہا تھا۔ لیکن نادر خاں نے اس طرح تسلی دی اور اس اعتماد کے ساتھ حوصلہ بڑھایا کہ وہ بہت حد تک مطمئن ہو گیا۔ نادر اب اس کی ایک اہم ضرورت بن گیا تھا۔

☆

رحیم داد اور نادر خاں پروگرام کے مطابق جمیلہ کے پاس پہنچے۔ وہ گول کمرے میں دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کے پہنچتے ہی اس نے زمیں داری کے کاغذات اور رجسٹر منگوائے۔ وہ انھیں دیکھتی رہی اور ضروری تفصیلات بتاتی رہی۔ نادر خاں بیچ بیچ میں سوالات کرتا جاتا۔ جمیلہ ان کے جواب دیتی، وضاحت کرتی۔ جو بات نادر خاں کی سمجھ میں نہ آتی اسے دوبارہ بیان کرتی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا اور زمیں داری کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔

کئی روز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نادر خاں ایک ایک دستاویز اور کاغذ دیکھتا۔ رجسٹروں کے اوراق الٹتا پلٹتا۔ ہر تحریر کو توجہ سے پڑھتا۔ جو پوچھنا ہوتا بے دھڑک پوچھتا۔ کہیں کہیں اپنی رائے کا بھی اظہار کرتا۔ مشورہ بھی دیتا جاتا۔ تبصرہ بھی کرتا۔ اس طرح وہ جمیلہ پر اپنے تجربے اور معلومات کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس میں وہ کامیاب بھی رہا۔ جمیلہ اس کی باتوں سے خاصی متاثر نظر آتی تھی۔

انھی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک شام رحیم داد باغ میں بیٹھا تھا۔ نادر بھی موجود تھا۔ ان کے سروں پر صاف شفاف نیلا آسمان جھلک رہا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہوا میں نرمی اور شگفتگی تھی۔ برسات کے آخری ایام کی یہ دم بہ دم رنگ بدلتی شام بڑی سہانی اور خوشگوار تھی۔ رحیم داد فضا کی رنگینی سے کچھ اس قدر متاثر ہوا کہ اس کا چہل قدمی کو جی چاہا۔ وہ اٹھا تو نادر خاں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں ٹہلتے ہوئے نہر کی طرف نکل گئے۔

سورج کی الوداعی کرنیں درختوں کی بلندیوں پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ شام کا دھندلکا ہولے ہولے فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ روشنی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ رحیم داد اور نادر خاں واپسی کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ دور سے شیدا آتا نظر آیا۔ نادر خاں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ کہنے لگا۔ "چوہدری! یہ تو شاہ جی کا ملازم 'شیدا' نظر آتا ہے۔ لگتا ہے اسے شاہ جی نے تیرے پاس بھیجا ہے۔" دونوں ٹھہر گئے۔ ذرا دیر میں شیدا قریب آگیا۔

رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ "شیدے! تو آج ادھر کیسے آگیا؟"

"شاہ جی نے تجھے بلوایا ہے۔ کہا ہے کل شام اس کی جیپ یہاں پہنچ جائے گی۔ وہ تیرا انتظار کرے گا۔"

"شاہ جی سے بولنا' جیپ ادھر نہ بھیجے۔" رحیم داد نے تاکید کی۔ "میں کل نہیں' پرسوں شام تک اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ "کوئی بہت ضروری کام تو نہیں؟"

"پتہ نہیں جی۔" شیدے نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "کوئی کام ہی ہوگا۔ تب ہی تو بلوایا ہے۔"

رحیم داد نے مزید بات نہ کی۔ صرف اس قدر کہا۔ "اب تو جا۔ شاہ جی سے کہنا' میں ضرور آؤں گا۔"

شیدا چلا گیا۔ رحیم داد اور نادر گاؤں کی طرف واپس ہوئے۔ رحیم داد نے چلتے چلتے نادر سے کہا۔ "میں شاہ جی سے خود بھی ملنا چاہتا تھا۔ ضروری بات چیت کرنی تھی۔ اب تو اس نے خود ہی بلوایا ہے۔ جانا ہی پڑے گا۔"

"شاہ جی' تیں نوں بہت مانتا ہے۔ جب بھی میرے سامنے ذکر آیا اس نے ہمیشہ محبت اور پیار سے یاد کیا۔ کہنے کو تو وہ ادھر کا بہت وڈا جاگیردار ہے پر یاروں کا یار ہے۔ وکت پر کام آنے والا۔ ایک بار جو وعدہ کرے گا اسے پورا کرنے کی ہر طرح کوشش کرے گا۔ بڑے لوگوں کی یہی تو خوبی ہوتی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ اس نے نادر خاں کی باتوں پر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ کچھ دور تک خاموش چلتا رہا' پھر اس نے مڑ کر نادر خاں کی جانب دیکھا۔

"نادر! تو جمیلہ سے زمیں داری کے معاملات جلد سے جلد سمجھنے کی کوشش کر۔"

"وہ تو جی میں کر ہی رہا ہوں۔"

"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ پر اب میں تیرے ساتھ جمیلہ کے پاس نہ جاسکوں گا۔ شاہ جی کے پاس جانا ضروری ہے۔ اس نے بلایا بھی ہے۔ مہمان خانے میں خالی پڑے پڑے دل بھی گھبرا ہے۔ شاہ جی کے ساتھ اچھا وقت گزرے گا۔"

"چوہدری! میں تو کہتا ہوں اس دفعہ شاہ جی کے ساتھ ہفتہ دس روز گزار۔ ذرا طبیعت بہل جائے گی۔" نادر نے مشورہ دیا۔ "ادھر کی فکر نہ کر۔ میں زمیں دارنی سے سارا حساب کتاب سمجھ لوں گا۔ اگر اس نے کاغذات اور رجسٹر دے دیئے تو انھیں اپنی تحویل میں لے لوں گا۔ شاہ جی کے ساتھ آرام سے وقت گزار۔ ادھر مجھے جس کام پر لگایا ہے اسے جیتی نال پورا کرلوں گا۔"

"کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کرنے کا عندیہ دیا۔ "جمیلہ کے پاس جاکر میں کرتا بھی کیا ہوں۔ چپ کرکے بیٹھا ہی رہتا ہوں۔ تم دونوں کی باتیں سنتا رہتا ہوں۔ زمینداری کے بارے میں میں توں جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ لیا۔ اب تو تیرے سمجھنے اور جاننے کی باتیں ہیں۔ تو انھیں سمجھ ہی لے گا۔ کاغذات اور رجسٹر جمیلہ آسانی سے دے سکے تو انھیں ضرور اپنی تحویل میں لینے کی کوشش کرنا۔"

"وہ تو جی میں کر ہی لوں گا۔ امید تو ہے وہ کاغذات اور رجسٹر میرے حوالے کردے گی۔" نادر خاں نے اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔ "پر ایک گل سمجھ نہیں آرہی۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے بے چین ہوکر پوچھا۔

"چوہدری! تسیں اتنے دن پنڈ سے غیر حاضر رہنے کا زمیں دارنی سے کیا بہانہ بناؤ گے؟" نادر خاں نے اپنی الجھن بیان کی۔

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" رحیم داد نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے باغ میں واپس پہنچ گئے۔ شام کا اندھیرا اب ہر طرف پھیل گیا تھا۔ گاؤں کے گھروں سے چولہوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ جگہ جگہ چراغ جھلملاتے نظر آتے تھے۔ باغ کے ایک گوشے میں نوکروں نے لیمپ روشن کردیا تھا۔ رحیم داد تھکا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا مگر نادر خاں نہ ٹھہرا۔ وہ رحیم داد سے اجازت لے کر مہمان خانے کی سمت چلا گیا۔

صبح ناشتے کے بعد معمول کے مطابق دونوں جمیلہ کے پاس پہنچے۔ نادر دیر تک جمیلہ سے زمیں داری کے بارے میں تبادلہ خیالات کرتا رہا۔ ضروری باتیں پوچھتا رہا۔ وہ اسے بتاتی رہی۔ ہدایات سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ لگ بھگ سات سال کا حساب تھا۔ کچھ رجسٹروں میں درج تھا' کچھ رسیدوں اور کاغذ کے پرزوں پر متفرق شکل میں تھا۔ دستاویزات بھی اسی طرح منتشر اور بے ترتیب تھیں۔ نادر خاں ہدایات اور ہر تفصیل سمجھنا چاہتا تھا۔

جمیلہ حافظے اور یادداشت سے کام لیتی۔ بار بار الجھتی اور جب کسی معاملے میں زیادہ الجھن میں پڑ جاتی تو بات ادھوری چھوڑ کر دوسرے روز بتانے کا وعدہ کرتی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ نادر ایک پرانے بیع نامے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ جمیلہ کو صحیح طور پر اس کی نوعیت کا علم نہ تھا۔ اس نے بار بار ذہن پر زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ آخر اس نے زچ ہوکر بے زاری سے کہا۔

"نادر! میں اس کے بارے میں کل سوچ کر بتاؤں گی۔ آج مجھے یاد نہیں آرہا۔ اللہ وسایا کے مرنے کے بعد مجھے بھولنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ پہلے ایسی نہ تھی۔ دماغ پر ذرا زور دیا فوراً یاد آجاتا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "جانے مجھے کیا ہوگیا۔" اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے نادر کو دیکھا۔ "اب تو جا۔ تجھ سے کل سویرے گل بات ہوگی۔"

نادر خاں نے کسی قسم کا اصرار نہ کیا۔ مودب ہوکر بولا۔ "ٹھیک ہے زمیں دارنی! جیسی تیری مرضی۔ کل بات ہوجائے گی۔" اس نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹے۔ مسلیں اکٹھا کیں انھیں تہہ کرکے رجسٹروں پر رکھا اور بستہ باندھ کر جمیلہ کے سامنے بڑھا دیا۔ وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھا۔ جمیلہ سے پوچھا۔

"مجھے اجازت ہے جی۔ میں کل صبح آجاؤں گا۔"

رحیم داد' جو دیر سے چپ بیٹھا تھا۔ نادر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "نادر! تو جا۔ میں نوں زمیں دارنی سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔"

نادر خاں خاموشی سے چلا گیا۔

جمیلہ نے رحیم داد سے دریافت کیا۔ "چوہدری! تجھے ایسی کیا ضروری گل بات کرنی ہے۔ کوئی خاص بات ہے؟"

"خاص بات تو نہیں۔" رحیم داد نے رسان سے کہا۔ "تیں نوں یہ بتانا تھا' میں کل بھاول نگر جا رہا ہوں۔ اب تجھ سے واپسی پر ہی مل سکوں گا۔"

جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔ "چوہدری! تو بھاول نگر جا رہا ہے؟"

"جانا تو مجھے تخت محل ہے۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "پہلے پاک پتن جاؤں گا۔ وہاں سے بہاول نگر کے رستے تخت محل چلا جاؤں گا۔"

"پر تیں نوں وہاں کس لیے جانا ہے؟ پہلے تو کبھی بتایا نہیں۔" جمیلہ ابھی تک حیرت زدہ تھی۔

"کل شام ایسا ہوا میں ٹہلتا ہوا نہر کی طرف چلا گیا۔ اچانک ادھر اپنا ایک پرانا یار مل گیا۔ وہ بھی مہاجر ہے۔ اس کا نام سلامت ہے۔ رہنے والا تو وہ ہوشیار پور کا ہے پر جب ہم مہاجر بن کر لہور پہنچے تو دونوں والٹن کیمپ میں اکٹھے تھے۔ مجھے خوشاب بھیجا گیا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ برسوں ہم اکٹھے رہے۔ کئی سال بعد کل اس سے ملاقات ہوگئی۔"

"وہ کہاں رہتا ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"آج کل وہ اوکاڑے میں ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں بہاول نگر گیا تھا۔ واپسی پر دیپال پور جا رہا تھا۔ اس سے یہ پتہ چلا میری گھروالی اور بچے تخت محل کے نزدیک ایک پنڈ میں ہیں۔ جب سے یہ سنا ہے' دل چاہتا ہے چھیتی نال وہاں پہنچ جاؤں۔"

"یہ تو بہت ہی چنگی خبر ہے۔" جمیلہ خوشی سے مسکرانے لگی۔ "چوہدری! تو آج ہی کیوں نہ چلا گیا؟"

"تیں نوں بھی تو یہ اطلاع پہنچانی تھی۔ اچانک چلا جاتا تو جانے میرے بارے میں کیا سوچتی۔"

رحیم داد بھی مسکرانے لگا۔ "اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے سلامت کل دوپہر تک پاک پتن پہنچے گا۔ وہاں میرا انتظار کرے گا۔ میں ایک روز پاک پتن میں اس کے ساتھ ہی ٹھہروں گا۔ اسے اپنے کاروبار کے سلسلے میں ادھر کچھ ضروری کام ہے۔ دوسرے روز وہ مجھے تخت محل لے جائے گا۔"

"چوہدری! تو نے سلامت کو یہیں بلا لیا ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی پاک پتن چلا جاتا۔"

"میں نے تو یہی کہا تھا پر وہ تیار نہ ہوا۔ اسے کچھ بہت ضروری کام کرنے ہیں۔ وہ مجھے پاک پتن ہی میں ملنے کو کہہ گیا ہے۔" رحیم داد نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "زمیں دارنی! دعا کر' مجھے میرے بچھڑے ہوئے بال بچے مل جائیں۔ یوں سمجھ' مجھے سب کچھ مل جائے گا۔ اپنی کھوئی ہوئی ساری خوشیاں پالوں گا۔"

"میں نوں پتہ ہے چوہدری تو ان سے بچھڑ کر کتنا دکھی ہے۔" جمیلہ نے اظہار ہمدردی کیا۔ "وہ تجھے مل جائیں تو نہ پوچھ مجھے کتنی خوشی ہوگی۔ میں انھیں اپنے ساتھ یہیں حویلی کے اندر ہی ٹھہرا لوں گی۔"

"نہیں زمیں دارنی! ان کے یہاں رہنے سے تجھے تکلیف ہوگی۔"

"کوئی تکلیف شکلیف نہیں ہوگی۔" جمیلہ نے زور دے کر کہا۔ "تو چنتا نہ کر۔ میرے پاس رہنے کو اوپر کی منزل پر کئی کمرے ہیں۔ چوہدری! ویسے یہ حویلی تو اب تیری ہی ہے۔ میں تو صرف دن کے سے نیچے رہتی ہوں۔ سارے ہی کمرے خالی پڑے ہیں۔"

رحیم داد خاموش رہا مگر جمیلہ خاموش نہ رہی۔ اس نے چند ہی لمحے سکوت کے بعد دریافت کیا۔

"چوہدری! تجھے پورا وشواس ہے کہ اطلاع بالکل صحیح ہے۔"

"میں نوں تو پکا یقین ہے۔" رحیم داد نے جمیلہ کو باور کرانے کی کوشش کی۔ "سلامت جھوٹا لپاڑی نہیں ہے۔ اسے مجھ سے ہمدردی بھی ہے۔ ویسے بھی اس نے ہمیشہ میری مدد کی ہے۔"

جمیلہ کے چہرے پر مسرت سے سرخی پھیل گئی۔ "چوہدری! تو تخت محل جا کر فوراً انھیں یہاں لے آ۔ میں تیرے اور تیرے ٹبّر کے رہنے کے لیے حویلی کے نچلے حصے میں بندوبست کرائے دیتی ہوں۔ تو واپس آئے گا تو تجھے سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک ملے گا۔ تو ان کے ساتھ آرام سے رہے گا۔"

رحیم داد نے جمیلہ کی بات مان لی۔ یہ وعدہ کیا کہ بیوی بچوں کو لے کر وہ حویلی ہی میں آئے گا اور یہیں قیام کرے گا۔ جمیلہ بہت خوش ہوئی۔ بات بات پر مسکراتی۔ اسے اس قدر خوش دیکھ کر رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے یقین ہو گیا کہ پچھلے دنوں اس کے بارے میں جمیلہ کے ذہن میں جو شک و شبہ پیدا ہو گیا تھا' اس اطلاع سے پوری طرح رفع ہو جائے گا۔ رحیم داد زیادہ دیر جمیلہ کے پاس نہ ٹھہرا۔ اٹھ کر مہمان خانے میں آ گیا۔

☆

رحیم داد نے تانگا بلوایا۔ اس میں سوار ہوا۔ بس اسٹینڈ پہنچا اور لاری سے حویلی اسٹیشن کے راستے سہ پہر تک احسان شاہ کے پاس پیراں والہ پہنچ گیا۔ احسان شاہ اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ حسب معمول بہت گرم جوشی سے ملا۔

دونوں باغ میں گئے اور ایک گھنے درخت کے سائے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ آسمان پر بادل تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ کبھی سورج نکل آتا کبھی سایہ پھیل جاتا۔ ڈھلتے دن کی دھوپ میں تمازت کم ہو چکی تھی۔ مگر ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ امس اور گھٹن بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد لمبے سفر سے آیا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ چہرے اور کپڑوں پر گرد جمی تھی۔

احسان شاہ نے اس کی یہ حالت دیکھی تو ہنس کر بولا۔ "چوہدری! تو بہت تھکا ہوا نظر آ رہا ہے۔ پہلے نہا دھولے' فیر آرام سے گل بات ہوگی۔ تجھ سے تو بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تو آج رات

یہیں ٹھہرے گا۔"

"اس بار تو میں تیرے ساتھ زیادہ ہی دن ٹھہرنے کے ارادے سے آیا ہوں۔ کپڑے لتے بھی لایا ہوں۔ مہمان خانے میں خالی پڑے پڑے دل بہت گھبراتا تھا۔"

"تیرا ہی گھر ہے۔ چوہدری! جب تک جی چاہے ٹھہر۔" احسان شاہ نے قہقہہ بلند کیا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی گل ہے۔ مجھے تو خوشی ہوگی۔ تیرے ساتھ اچھا وکت کٹ جائے گا۔ اب تو غسل خانے میں جا کر فٹافٹ نہا لے۔ شام کو تیرے ساتھ محفل جمے گی۔"

احسان شاہ نے شیدا کو بلایا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ چلا گیا۔ شیدا نے اس کے ٹھہرنے کے لیے پہلے ہی ایک کمرے میں بندوبست کر دیا تھا۔ رحیم داد نے غسل کیا۔ کمرے میں آیا۔ ٹرنک سے اجلے کپڑے نکال کر پہنے۔ ترو تازہ ہو کر دوبارہ باغ میں پہنچا۔ شام دبے قدموں درختوں کی بلندی سے نیچے اتر رہی تھی۔ احسان شاہ باغ کے ایک گوشے میں بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر اسکاچ وہسکی کی بوتل اور دو گلاس رکھے تھے۔

رحیم داد بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "شاہ جی! تو شام ہونے سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔" احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھا۔ بھیگی ہوئی مونچھوں کو ہاتھ سے صاف کیا۔ ہنس کر گویا ہوا۔ "چوہدری! اس کے بغیر زندگی میں کوئی لطف نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے سو رہا ہوں، تھک گیا ہوں۔ طبیعت بجھی بجھی رہتی ہے۔ پر دو ڈبل لگاتے ہی نہ سستی رہتی ہے نہ تھکن۔ انگ انگ چہکنے لگتا ہے۔ ایمان نگی گل ایہہ اے چوہدری۔" اس نے بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بھی کیا زوردار چیز ہے۔ وہ کیا کہا ہے، کسی شاعر نے۔

ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

اس مصرعے کو اپنی بھونڈی آواز میں گنگناتے ہوئے اس نے میز پر رکھے ہوئے دوسرے گلاس میں وہسکی انڈیلی۔ پانی ڈالا اور ایک بڑا پیگ بنا کر بولا۔ "چوہدری! اب تو بھی شروع ہو جا۔"

رحیم داد نے گلاس اٹھایا۔ گھونٹ بھرا۔ چند لمحے خاموش رہا۔ وہسکی کی تلخی کا احساس کم ہوا تو بولا۔ "پچھلے دنوں بہت گڑبڑ معاملہ ہو گیا تھا۔"

"کیا ہو گیا۔ کوئی خاص گل بات؟"

"خاص ہی گل بات کہہ لے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "وہ ایسا ہوا جی میں ایک روز جمیلہ کے پاس گیا۔ اس نے باتوں باتوں میں اپنے بارے میں پچھلی باتیں سنائیں۔ سب ہی کچھ بتا دیا۔ کچھ بھی نہ چھپایا۔ اس کی باتیں سن کر طبیعت میں ایسی ایل اٹھی کہ میں نے دل کی بات کہہ دی۔"

"دل کی بات کہہ دی؟" احسان شاہ نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ "صاف صاف بتا۔"

"پہلے تو میں نے گول مول بات کی۔ فیر ای زبان سے کہا کہ وہ میری گھر والی بن جائے۔" رحیم داد نے بڑا گھونٹ بھرا۔

"کیا بولی وہ؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"بولی تو وہ کچھ نہیں۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خوب ٹسوے بہائے۔ اس نے میری بات کو پسند نہیں کیا۔ اس کے اس طرح رونے پر میں نے یہی اندازہ لگایا۔"

"تو نے جلدی کی چوہدری۔" احسان شاہ کے لہجے میں تشویش کا پہلو نمایاں تھا۔ "ابھی ایسی بات کہنے کا وکت نہیں آیا۔ تجھے صبر سے کام لینا تھا۔ ایسی باتیں اس طرح نہیں کی جاتیں۔ تیں نوں اسے یہ بات کہنی ہی تھی تو کسی اور کے ذریعے کہلواتا۔ یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ تیرے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے؟" وہ لمحہ بھر سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر گردن اٹھا کر قدرے تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو نے سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔ اب...."

"گڑبڑ تو ہو گیا تھا۔" رحیم داد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "پر بعد میں سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔"

"وہ کیسے؟" احسان شاہ نے تعجب سے پوچھا۔

"بس ہو گیا۔ شاہ جی تو فکر نہ کر۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو اطمینان دلایا۔ "اب اس کے دل میں میری طرف سے کوئی شک و شبہ نہیں رہا۔"

"تجھے یکین ہے؟" احسان شاہ نے استفسار کیا۔

"بالکل یکین ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔ "واپس جاؤں گا تو مہمان خانے کی بجائے حویلی کے اندر ہی ٹھہروں گا۔ وہ اوپر کی منزل پر رہے گی اور میں نیچے کے حصے میں۔ اس نے خود ہی کہا۔ بلکہ زور دے کر کہا۔ میں تو انکار کرتا رہا۔"

"چوہدری! تو نے کیا چکر چلایا۔ حویلی میں اس کے ساتھ رہا تو وہ آسانی سے تیرے ہاتھ آ جائے گی۔" احسان شاہ کھلکھلا کر ہنسا۔ "پر اب جلد بازی نہ کرنا ورنہ کام خراب ہو جائے گا۔"

رحیم داد نے مزید تفصیل نہ بتائی۔ یہ بھی نہ بتایا کہ وہ تخت محل جا کر اپنے بچھڑے ہوئے بیوی بچوں کو لانے کا بہانہ کر کے پیراں والہ آیا ہے۔ وہ خاموشی سے وہسکی کی چسکی لگا رہا۔

احسان شاہ نے پوچھا۔ "نادر کیسا چل رہا ہے؟"

"وہ تو جی بہت کام کا بندہ ہے۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اس نے جمیلہ کو ایسا رام کیا کہ وہ ساری زمینداری اور اس کی دستاویزات میرے حوالے کرنے پر خود ہی راضی ہو گئی۔

آج کل وہ نادر کو زمیں داری کے بارے میں ایک ایک بات سمجھا رہی ہے۔ ہر کاغذ اور ہر د
کے بارے میں بتا رہی ہے۔ ویسے شاہ جی وہ دیکھنے میں جتنی ہوشیار اور تیز لگتی ہے اتنی ہے نہ
اس کا دل بہت نرم ہے۔ پہلے تو وہ نادر سے بہت ناراض تھی۔ اسے مینیجر لگانے کے بہت خلا
تھی۔ پر جب نادر نے اپنی پریشانی اور بے روزگاری کا حال سنایا تو ایک دم موم کی طرح پگھل
اسے رکھنے پر فوراً تیار ہو گئی۔ سچی گل تو ایہہ اے وہ کسی کو تکلیف اور پریشانی میں نہیں
سکتی۔"

"مجھے جمیلہ کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں۔ سنا ہی سنا ہے۔ پر نادر بہت اونچی چیز ہے۔ وہ تیر
لیے بہت کار آمد ثابت ہو گا۔ اب تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ زمیں داری ایسے چلا
کہ تجھے بھی زمیں داری کا مزا آ جائے گا۔ ابھی تک تو کوٹ ہرکشن میں مزارعوں کی چل رہی تھ
تجھے پتہ ہے اللہ وسایا تو مزارع تھا اور مزارع ہی رہا۔ اس نے مزارعوں کا ناس مار دیا تھا۔ ان
دماغ خراب کر دیا تھا۔"

"ان کا دماغ تو اب تک خراب ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اس کا اثر آس پاس کے زمیں داروں پر بھی پڑا۔ وڈے زمیں دار، جن کے پاس مزارعوں
تعداد بہت زیادہ تھی، بہت پریشان رہتے تھے۔" احسان شاہ نے اللہ وسایا مرحوم کے خلاف اپ
نفرت اور کدورت کا اظہار کیا۔ "تجھے معلوم نہیں اللہ وسایا کے قتل پر ادھر کے سارے ہی وڈ
زمیں دار کتنے خوش ہوئے۔ سب اس سے خار کھاتے تھے۔"

"خطرہ تو اس کی طرف سے مجھے بھی تھا۔"

"بالکل تھا۔" احسان شاہ نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! تیرے رستے کا کانٹا صاف ہو گیا۔ م
کہتا ہوں اگر اللہ وسایا کا صفایا نہ ہوتا تو وہ کب کا تجھے صاف کر چکا ہوتا۔ وہ تیری جائیداد پر قبضہ
کرنے کی پوری تیاری کر چکا تھا۔ اس کے ارادے بہت خطرناک تھے۔"

رحیم داد نے اس کی باتیں سنیں۔ مگر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ چپ بیٹھا وہسکی کی چسکی لگاتا
رہا۔ احسان شاہ کو اس کی خاموشی ناگوار گزری۔ تیکھے لہجے میں بولا۔

"چوہدری، تجھے میری باتوں کا یقین نہیں؟"

رحیم داد ہڑبڑا کر بولا۔ "ہے، بالکل ہے۔" اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے بات بنائی۔

"وہ ایسا ہے جی۔ میں جمیلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شاہ جی وہ بری زنانی نہیں ہے۔"

"میں نے کب کہا کہ وہ بری ہے۔ وہ تو ایسی زوردار چیز ہے کہ تیرے تو عیش ہو جائیں گے۔ پر

پہلے جو غلطی کر چکا ہے اب اسے نہ دھرانا۔ اسے دھیرے دھیرے رستے پر لانا ہو گا، سمجھا؟"

"سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا۔" رحیم داد گردن ہلا کر بولا۔

احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ رحیم داد بھی ہنسنے لگا۔ احسان شاہ نے ترنگ میں آ کر رحیم داد کے
گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا۔ وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔

"شاہ جی، میں نے ایک خوش خبری تو سنائی نہیں۔"

"سنا، ضرور سنا۔" احسان شاہ لہرا کر بولا۔

"یہ تو تیں نوں پہلے ہی بتا چکا ہوں، جمیلہ تھوڑے دنوں بعد زمیں داری کے سارے کاغذات اور
دستاویزات نادر کے حوالے کر دے گی۔" رحیم داد نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "وہ تو زمیں داری
سے بالکل الگ ہونا چاہتی ہے۔ کہتی تھی، میں نے زمیں داری سے کیا لینا۔ تو پوری ذمہ داری
سنبھال لے میں نے تو اب سکول چلانا اور ڈسپنسری بنانا ہے۔"

احسان شاہ کے چہرے پر مسرت کے بجائے جھنجلاہٹ بکھر گئی۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "یہ
سکول شکول کا چکر ختم کر۔ اسے تو اللہ وسایا کے ساتھ ہی ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ
مزارعوں اور کمیوں کے بچے پڑھ لکھ کر ہمارے بچوں کی برابری کریں؟ قانون اور انصاف کی باتیں
کریں؟ زمیں داروں کو طرح طرح سے تنگ کریں۔ ان کے خلاف گڑبڑ پھیلائیں؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے شاہ جی، پر جمیلہ اس کے لیے تیار نہیں ہو گی۔" رحیم داد نے احسان
شاہ کی خفگی رفع کرنے کی غرض سے اپنی مجبوری بھی بیان کی۔ "تیں نوں پتہ ہے، میں ابھی اسے
ناراض نہیں کر سکتا۔ ورنہ سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"میں فوری طور پر سکول بند کرانے کو نہیں کہہ رہا۔ پر تجھے آگے چل کر ایسا کرنا پڑے گا۔"
احسان شاہ نے رحیم داد کی مجبوری محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "پر تجھے یہ بات ضرور دھیان میں رکھنا
چاہیے کہ زمیں داری شان سے چلانی ہے تو مزارعوں کو ان پڑھ رکھنا ہو گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔
ہر وڈا زمیں دار اور جاگیردار اس معاملے میں چوکس رہتا ہے۔ میں اس سلسلے میں تجھے سردار امام
بخش مزاری کا واقعہ بطور مثال سناتا ہوں۔"

"کون تھا وہ؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"وہ ڈیرہ غازی خاں کی تحصیل راجن پور میں روجھان کے مزاریوں کا تمن دار تھا۔ بہت وڈا
جاگیردار ہوتا تھا۔ میرے پیو کا گہرا یار تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں جب بلوچوں نے بغاوت کی تو اسے
دبانے میں سردار امام بخش نے بھی انگریزوں کی بہت مدد کی۔" احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔

سرخوشی کے عالم میں قہقہہ بلند کیا۔ "انگریزوں کی بھی کیا بات تھی۔ اپنے دشمنوں کو کچلنے میں جتنے سخت تھے' دوستوں کے لیے اتنا ہی وڈا دل رکھتے تھے۔ سردار امام بخش نے ان کی بھرپور مدد کی تو اس کے صلے میں انھوں نے اسے آنرری مجسٹریٹ بنادیا۔ جب رابرٹ سنڈیمن 'ڈپٹی کمشنر لگا تو سردار امام بخش نے انگریزوں کی ہر طرح خدمت کی۔"

"یہ فورٹ سنڈیمن اسی رابرٹ سنڈیمن کے نام پر رکھا گیا؟"

"ہاں جی' یہ وہی سنڈیمن تھا۔ اپنے زمانے کا بہت نامور افسر ہوتا تھا۔ بلوچوں نے بار بار بغاوت کی۔ ان میں بگٹیوں کے علاوہ مزاری بلوچ بھی شامل تھے۔ پر سردار امام بخش کی مدد نے ان کی بغاوتوں کو دبانے میں زبردست کام کیا۔" احسان شاہ ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "اس خدمت پر انگریز بہت خوش ہوئے۔ پہلے اسے نواب 'فیر سر اور فیر صوبائی درباری بنادیا۔ خطابات کے ساتھ بہت وڈی جگیر بھی دی۔ انگریز اس پر ایسے مہربان ہوئے کہ پنجاب اسمبلی کا ممبر بھی بنا دیا۔ ویسے سردار سر امام بخش ان کا بہت وفادار بندہ تھا۔ بہت ہوشیار اور سمجھ دار بھی تھا۔"

"تسیں اس کے بارے میں کوئی واقعہ سنانا چاہتے تھے۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو یاد دلایا۔

"ہاں' میں تجھے یہ بتانا چاہتا تھا کہ سردار امام بخش مزاری کتنا ہوشیار تھا۔ ہمیشہ آگے کی سوچتا تھا۔ سچ پوچھ تو دریشکوں نے مزاریوں کو کب کا مٹادیا ہوتا۔ ان کے ساتھ مزاریوں کی مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں۔ دونوں قبیلوں کے درمیان زبردست دشمنی رہی ہے۔"

"دشمنی ہوئی کس بات پر؟" رحیم داد نے جھوم کر پوچھا۔

"ان دنوں مزاری' خانہ بدوش گلے بان اور چرواہے ہوتے تھے۔ اپنی بھیڑ بکریاں اور چوکھر گنڈاری کی پہاڑیوں پر چرایا کرتے تھے۔ دریشک بھی خانہ بدوش ہوتے تھے۔ وہ مزاریوں کے چوکھر اور مویشی اٹھا کر لے جاتے۔ تب جمال خاں مزاریوں کا سردار ہوتا تھا۔ اس نے دریشکوں پر چڑھائی کردی اور کوئی پندرہ دریشک مار ڈالے۔ اس کے بعد دونوں قبیلوں نے ایک دوسرے پر حملے کرنے شروع کردیئے۔ دریشکوں کے ایک حملے میں سردار جمال خاں کی گھروالی بھی ماری گئی اور سردار کی ماں بھی زخمی ہوگئی۔ مزاریوں کے لیے یہ بہت بے عزتی کی بات تھی۔ اس بے عزتی کو وہ برسوں نہ بھولے۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے دریشکوں سے لڑائیاں لڑتے رہے۔" احسان شاہ نے اچانک قہقہہ بلند کیا۔ "پر اب مزاری اور دریشک تمن داروں نے مل کر لغاریوں' لنڈ اور کھتران تمن داروں کے خلاف مورچہ لگا رکھا ہے۔"

"تیرا مطلب ہے مزاریوں اور دریشکوں کی پرانی دشمنی ختم ہوگئی؟"

"ختم ہی ہوگئی۔ پر جب تک دونوں میں دشمنی رہی بہت خون خرابہ ہوا۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔ "ویسے رنجیت سنگھ کے زمانے میں سکھوں نے بھی مزاریوں کو بہت تنگ کیا۔ دیوان ساون مل کا نام تو سنا ہی ہوگا تو نے۔ وہ رنجیت سنگھ کی طرف سے حاکم لگا ہوا تھا۔ اس نے مزاریوں پر سات ہزار فوج کے ساتھ چڑھائی کردی۔ ان کے مال مویشی چھین لیے۔ انھیں بھاگ کر پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور کردیا۔ آخر لغاریوں کے سردار رحیم خاں نے سکھوں کے ساتھ مزاریوں کی صلح کرا دی۔ ساون مل نے ملتان میں دربار لگایا جس میں مزاریوں کا سردار بہرام خاں خود حاضر ہوا۔ ساون مل نے اسے جگیر کے ساتھ خلعت بھی دی۔"

"یہ عجب گل سنائی۔ لغاری پہلے مزاریوں کے دوست ہوتے تھے اور اب دشمن ہیں۔" رحیم داد آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ "یہ سردار بہرام خاں کیا سردار امام بخش کا پیو ہوتا تھا؟"

"ہاں' پر بہرام خاں کا پتر دوست علی خاں بھی تھا۔ بہرام خاں کے مرنے پر وہی مزاریوں کا سردار بنا۔ اس کے زمانے میں مزاریوں کا سکھوں سے دوبارہ جھگڑا شروع ہوا۔ سکھوں نے مزاریوں کی بغاوت کو کچل دیا۔ انھیں سندھ کی جانب بھگا دیا۔ ادھر دیوان ساون مل بھی کچھ عرصہ بعد ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے پتر مول راج نے اس کی جگہ سنبھالی اور مزاریوں سے صلح کرلی۔ پر سردار دوست علی خاں بری عادتوں میں پڑگیا تھا۔ اس لیے اسے ہٹا کر اس کے چھوٹے بھائی امام بخش خاں کو مزاریوں کے سردار کی حیثیت سے جرگے میں منتخب کرلیا گیا۔"

احسان شاہ نشے کی جھونک میں بھٹک کر اصل موضوع سے ہٹ کر دوسری طرف نکل گیا۔ رحیم داد بھی نشے کی دھن میں بھول چکا تھا کہ بات کہاں سے شروع ہوئی؟ سردار امام بخش کا نام دوبارہ سن کر وہ چونکا۔ اس نے احسان شاہ کو ٹوکا۔

"شاہ جی! اس واقعہ کا کیا بنا؟ وہی سردار امام بخش والا جسے تو سنانا چاہتا تھا۔"

"یاد آگیا' بالکل یاد آگیا۔" احسان شاہ خجل ہو کر بولا۔ "بات کدھر سے نکل کر کدھر چلی گئی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "وہ ایسا ہوا کہ جن دنوں سردار امام بخش اسمبلی کا ممبر ہوتا تھا اسے کسی کام سے کراچی جانا پڑا۔ سٹیشن سے باہر نکل رہا تھا تو ریلوے کا ایک بابو دوڑ کر آگے بڑھا۔ جھک کر سردار کے پیروں کو چھوا اور ہاتھ باندھ کر ادب سے اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ سردار اسے پہچان نہ سکا۔"

"وہ بندہ تھا کون؟" رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ سردار امام بخش مزاری کے ایک مزارعے کا پتر تھا۔ بچپن میں گھر سے بھاگ کر کراچی پہنچ گیا

تھا۔ وہاں کسی پارسی کا نوکر لگ گیا۔ اس نے اسے اتنا پڑھا لکھا دیا کہ جوان ہو کر ریلوے میں گیا۔ ویاہ بھی کر لیا تھا۔ بچے بھی تھے۔ اس نے خود ہی سردار کو بتایا۔ سردار میں تیرے پانے کا ہوں۔ فیر اس نے اپنا اور اپنے پیو کا نام بتایا۔"

"کیا نام تھا اس کا؟" رحیم داد نے نشے سے لہرا کر پوچھا۔

"یہ تو مجھے پتہ نہیں۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔ "سردار امام بخش خاں نے اسے غور دیکھا۔ کچھ سوچا اور سوچ کر پوچھا۔ ادھر تجھے کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ اس نے بتایا اسے ریلوے سے روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سردار بولا۔ میں تجھے سو روپے تنخواہ دوں گا۔ ادھر کی نوکری چھوڑ اور میر ساتھ روجھان چل۔ وہ تیار ہو گیا۔ سردار امام بخش مزاری اسے اپنے ساتھ روجھان لے آیا۔ رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔ "شاہ جی' بات سمجھ نہیں آئی۔ سردار ا بخش مزاری اسے دگنی تنخواہ پر کراچی سے اپنے ساتھ کیوں لے آیا؟"

"یہی تو اصلی گل ہے جو میں تجھے بتانا چاہتا ہوں۔" احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "سردار منیجر کو اس کے بارے میں پتہ چلا تو وہ بھی تیری طرح بہت حیران ہوا۔ اسے یہ بات پسند بھی آئی۔ ایک روز باتوں باتوں میں اس نے سردار سے اس کے بارے میں گلہ کیا۔ سردار ایسا بندہ تو روپے سے بھی کم میں مل جائے گا۔ تو اسے سو روپے تنخواہ دے رہا ہے۔ منیجر نے اسے بالکل بیکا اور بہت مہنگا ثابت کر کے نوکری سے نکلوانے کی کوشش کی۔ مگر سردار تیار نہ ہوا۔" احسان شا نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ "چوہدری! تجھے پتہ ہے۔ سردار نے منیجر سارا گلہ شکوہ سن کر کیا جواب دیا؟"

"کیا جواب دیا اس نے؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"سردار نے اپنے منیجر سے ہنس کر کہا۔ تو اس راز کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ سو روپے مہینے میں بھی بہت سستا ہے۔ اور اس لیے سستا ہے کہ وہ کراچی میں رہتا تو اس کے بال بچے بھی پڑھتے لکھتے ادھر روجھان میں اپنے رشتے دار مزارعوں کو ملنے آتے تو ان کے دماغ خراب کرتے۔ انھیں طرح طرح سے بھڑکاتے۔ میں نے وہ رستہ ہی بند کر دیا۔ یہاں رہ کر وہ ان پڑھ کے ان پڑھ ہی رہیں گے۔ کبھی خطرہ بن کر سامنے نہیں آئیں گے۔ یہ بات سردار امام بخش مزاری نے میرے پیو کو سنائی تھی۔ اور میں نے اپنے پیو سے سنی۔" احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ "چوہدری! غور کر سردار امام بخش مزاری کتنا ہوشیار اور سمجھ دار تھا۔ تب ہی تو مزاریوں کا تمن دار اور اتنا وڈا سردار تھا۔ اسے خطابات ملے' جگیر ملی۔ بہت عزت ملی۔ انگریز اسے بہت مانتے تھے۔ اپنا دوست وفادار

سمجھتے تھے۔"

"سردار امام بخش نے اپنے بال بچوں کو تو بالکل پڑھایا لکھایا نہیں ہو گا؟"

"چوہدری! تو بھی کیسی بچوں کی سی گل کرتا ہے۔" احسان شاہ ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔ "امام خاں اپنے کبیلے کا سردار تھا۔ بہت وڈا جگیر دار تھا۔ اس کے بال بچے بھی سردار اور جگیر دار بال بچے تھے۔ کسی مزارعے کے تو نہیں تھے۔ وہ کیوں نہ پڑھتے؟ انہیں تو تعلیم دلانے کے لیے نے لندن بھیجا' امریکہ بھیجا۔ بہت پڑھایا لکھایا۔ وہ اور ان کے پتر بھی وڈے وڈے سرکاری لگے۔ انگریزی راج نہ رہا جی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ آج بھی وڈے جگیر دار ہیں' سردار اور دار ہیں اور سرکاری افسر بھی لگے ہوئے ہیں۔ یہ سب سردار سر امام بخش کی زبردست خدمات صلہ ہے۔" اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "سردار امام بخش مزاری کی طرح کے دور اندیش اور سمجھ جگیر دار نہ ہوتے تو اب تک کتنی ہی جاگیریں کب کی ختم ہو چکی ہوتیں۔ بلکہ جگیر داری اور داری ہی سرے سے ختم ہو جاتی۔ ایسے ہی جیسے ہندوستان میں ہوا اور مشرقی بنگال میں ہو رہا ہے۔"

☆

شیدا اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گیا اور ادب سے سر جھکا کھڑا ہو گیا۔" احسان شاہ نے پوچھا۔ "شیدے' تو نے کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں جی' میں نے یہ بتانا ہے' سردار مراد خاں شاہانی آیا ہے۔"

"وہ اپنا بھکروالا شاہانی؟" احسان شاہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کدھر ہے وہ؟ کب یا؟" وہ اٹھ کھڑا ہو گیا اور شیدے کے ہم راہ چلا گیا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا وہسکی سے شغل کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد احسان علی شاہ واپس آیا۔ رحیم نے برآمدے میں رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی میں دیکھا' مراد خاں شاہانی اس کے ہم راہ ہے۔ شاہانی کا قد اونچا تھا۔ جسم مضبوط اور صحت مند تھا۔ خوب گھیردار بڑی سی شلوار اور ڈھیلی ڈھالی کھلی بوسکی کی قمیص میں وہ کچھ زیادہ ہی قوی ہیکل لگ رہا تھا۔ رنگت گندمی تھی۔ ڈاڑھی صاف تھی۔ مونچھیں زیادہ گھنی نہ تھیں۔ مگر چہرے پر رعب اور دبدبہ تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ عمر میں وہ احسان شاہ سے بہت چھوٹا تھا۔ رحیم داد اس کی بھاری بھرکم شخصیت سے خاصا مرعوب ہوا۔ وہ احسان شاہ کے ساتھ بے تکلفی سے ہنستا' قہقہے لگاتا آگے بڑھا اور رحیم داد کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ احسان شاہ نے رحیم داد کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے شاہانی سے تعارف کرایا۔

"یہ اپنا یار چوہدری نور الٰہی ہے۔ کوٹلہ ہر کشن میں اس کی زمیں داری ہے۔ گورداسپور کا
ہے۔ میں پہلے بھی تجھ سے اس کا ذکر کر چکا ہوں۔"

مراد خاں شاہانی نے مسکراتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "سیں چوہدری! تو ہے تو جاٹ پ
ایسا بنا رکھا ہے کہ پہلی نظر میں بلوچ سردار لگتا ہے۔" اس نے احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ "
میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

"پتہ نہیں چوہدری نے یہ داڑھی کیوں رکھ چھوڑی ہے۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "
بھی نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ ورنہ مسجد کا حجرہ چھوڑ کر یہاں کیوں بیٹھا ہوتا؟"

"شاہ جی' تو نے چوہدری کو میرے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"تجھے کون نہیں جانتا۔" احسان شاہ بولا۔ اس نے مسکراتے ہوئے رحیم داد کی طرف د
"چوہدری! یہ بھکر میں بیٹ کے علاقے کا وڈا زمیں دار ہے۔ بیٹ میں تین ہی تو زمیندار خا
ہیں۔ شاہانی' نوانی اور ڈھانڈلے۔" اس نے گلاس میں وہسکی ڈالی۔ "زمیں داری کیا ان کی تو
اپنی حکمرانی ہے۔ جو چاہیں کریں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ان سے تو پولس اور حکومت بھی
ہے۔" احسان شاہ نے پیگ بنا کر شاہانی کی جانب بڑھایا۔ "لے میں نے تیرے لیے ڈبل
بنایا ہے۔ آیا بھی تو دیر سے ہے۔ ہمارا ساتھ کیسے دے گا۔ ہم دونوں تو شام سے لگے ہوئے ہیں
شاہانی نے گلاس سنبھالا۔ ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں غٹاغٹ آدھا گلاس
گیا۔ احسان شاہ نے دریافت کیا۔ "شاہانی! تو اچانک کیسے آگیا؟"

"سیں' بال بچوں کے ساتھ لور آیا تھا۔" شاہانی نے بتایا تھا۔ "لہور آ کر تیرے پاس نہ
کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے بال بچوں کو واپس بھکر بھیجا اور خود تیرے پاس آگیا۔ لہور سے ایک
کی گاڑی مل گئی تھی۔ اچھا سفر گزرا۔" اس نے گلاس اٹھایا۔ "پر ادھر تو بارشوں کا کوئی خاص
دکھائی نہیں دیتا۔"

"سنا ہے بیٹ کے علاقے میں سیلاب نے بہت تباہی مچائی۔" احسان شاہ نے کہا۔ "بہت
جھوک اور پنڈ سیلاب کی زد میں آگئے۔ بستیاں کی بستیاں ویران ہو گئیں۔"

"شاہ جی' وستیاں تو اجڑتی ہی رہتی ہیں۔" شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔ "بر کھا میں ہمیشہ
چڑھتا ہے اور سال کے سال اپنا بھینٹ اور صدقہ بھی لیتا ہے۔ پر منجی کی فصلوں کو خوب
کرتا ہے۔ اگر دریا نہ چڑھے تو بیٹ کے علاقے میں منجی کے بوٹے سوکھ کر زرد پڑ جائیں۔ یوں

اپنا تو ناس مار دے۔" رحیم داد خاموش نہ رہ سکا۔ "پر سیلاب سے کسان اور مزارعے تو برباد
ہو جاتے ہوں گے۔ کتنے تو مر بھی جاتے ہوں گے۔"

"مرتے بھی رہتے ہیں۔ بے گھر بھی ہوتے ہیں۔" مراد خاں کی بے نیازی میں فرق نہ آیا۔
"سیلاب کا ریلا وستیوں میں داخل ہوتا ہے تو مال مویشی سب بہا کر لے جاتا ہے۔ جس کا جدھر منہ
اٹھتا ہے نکل بھاگتا ہے۔ پر سیلاب کے اترتے ہی سب واپس آجاتے ہیں اور راضی باضی ہو کر
اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "چوہدری! تو میری طرف کے
مزارعوں کو نہیں جانتا۔ بہت صابر و شاکر بندے ہیں۔ کئی تو ایسے سیدھے سادے ہیں کہ ہوائی جہاز
اڑتا ہوا اوپر گزرتا ہے تو ڈر کر کھٹ کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ آج بھی بہت سے ایسے بندے تجھے
ملیں گے جنھوں نے ریل تک نہیں دیکھی۔"

"اچھا جی' تیرے علاقے میں ایسے بندے بھی ہیں؟" رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر
کہا۔ "یہ تو بہت انوکھی گل سنائی تو نے۔"

شاہانی نے اس دفعہ احسان شاہ کو مخاطب کیا۔ "شاہ جی' ایسا کر۔ تو میرے ساتھ چل۔ چوہدری کو
بھی لے لے۔ یہ اپنا علاقہ دیکھ لے گا۔ تیرا اچھا وقت کٹے گا۔"

"تیری طرف جانے کا یہ زمانہ نہیں۔ ابھی تک ادھر سیلاب کی تباہی مچی ہوگی۔" احسان شاہ
رضامند نہ ہوا۔ شاہانی نے مطلع کیا۔ "شاہ جی' تجھے پتہ نہیں۔ سیلاب تو کب کا اتر گیا۔ اب تو بہت
عمدہ موسم ہے۔"

"جاڑے میں تیرے پاس آؤں گا۔ چوہدری کو بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔" احسان شاہ نے یہ کہہ کر
قہقہہ لگایا۔ "ویسے تیرے علاقے میں چنگی رن نہیں ملتی۔"

"میری بکیر میں رن نہیں ملتی۔ ایسی گالہ نہ کر شاہ جی۔" مراد خاں شاہانی نے گردن اونچی کی۔
سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ "بیٹ میں تو مزارع' سردار کی اجازت کے بغیر دمی کا پرنا بھی نہیں
کر سکتا۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "تو کہہ تو شاہ جی ریل کی ویگن بھر کر رناں بھیج دوں۔"

"ویگن سے اپنا کیا بنے گا۔ پوری سپیشل ٹرین بھیجنی ہوگی۔" احسان شاہ بھی ہنسنے لگا۔ "ویسے
تیرے علاقے کی رن ٹھنڈی ہوتی ہے۔ گوشت تو اس کے بدن پر ہوتا ہی نہیں۔ تو انھیں کھانے کو
روٹی نہیں دیتا۔"

"یہ بات نہیں شاہ جی۔ تیرا علاقہ ماجھے کی سرحد پر ہے' بلکہ ماجھے ہی میں ہوتا ہے۔" شاہانی نے
وضاحت کی۔ "تجھے تو ماجھے کی جٹیاں مل جاتی ہیں۔ مکھن کی طرح چکنی اور ملائم۔ ہاتھ رکھو تو پھسل

جائے۔"

"کھلا پلا کر تیار کرتا ہوں انھیں۔ ایسے ہی چکنی اور ملائم نہیں بن جاتیں۔" احسان شاہ نے بڑے فخر سے کہا۔ "جب انھیں اٹھواتا ہوں تو کوئی تو کسائی کے کھونٹے پر باندھنے والی بچ کی مانند کمزور اور مریل ہوتی ہیں۔ دو چار ہفتے یہاں رہنے کے بعد ان کا رنگ روپ نکھرتا ہے۔ ایسی جوانی چڑھتی ہے کہ روکھی سوکھی روٹی سے ایک دم گرما گرم پکوان بن جاتی ہیں۔ کیا سمجھا؟"

"میں سمجھتا ہوں' خوب سمجھتا ہوں۔" شاہانی نے گھونٹ بھرا۔ "تیرے پاس تو باقاعدہ حرم ہے۔ ایک سے ایک فسٹ کلاس دانا چھانٹ کر رکھا ہے۔" وہ بے تکلفی سے ہنسا۔ "اپنا حرم دکھا۔ میرا مطلب تیرے کوٹ سے ہے۔ بہت عرصہ ہوا اسے دیکھے ہوئے۔ کچھ نیا تازہ مال آیا؟ کوئی نئی رن' کوئی نئی ڈال؟"

"وہ تو آتی ہی رہتی ہیں۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "تو تھوڑی سی اور لگالے' فیر تجھے کوٹ میں لے چلوں گا۔" اس نے شیدا کو بلایا۔ وہ آیا تو احسان شاہ نے اسے مطلع کیا۔ "میں کوٹ میں آ رہا ہوں۔ شاہانی اور چوہدری بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ تو اندر خبر کر دے۔ میں پہنچوں تو سب ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیے۔ سمجھ گیا؟"

شیدے نے سر کو ذرا سا جھکا کر نہایت ادب سے کہا۔ "سب ٹھیک ہی ٹھاک ملے گا جی۔"

شیدا چلا گیا۔ احسان شاہ' سردار مراد خاں شاہانی اور رحیم داد وہسکی سے شغل کرتے رہے۔ ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ تینوں نشے میں جھومتے جھامتے کوٹ کی جانب بڑھے۔ شیدا ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ حویلی کے پچھواڑے مختصر سا کھلا میدان تھا۔ اس میں ببول اور بیری کی جھاڑیاں تھیں۔ میدان کی دوسری طرف کوٹ تھا۔ یہ حویلی کی فصیل نما چار دیواری کے اندر اونچی اونچی دیواروں کا ایک اور حصار تھا۔ دونوں میں فرق صرف اس قدر تھا کہ حویلی کی فصیل پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور کوٹ کی دیواریں بلندی میں تو اتنی ہی تھیں مگر کچی تھیں۔ کوٹ کا دروازہ خاصا اونچا اور مضبوط تھا۔

کوٹ کی ڈیوڑھی میں لالٹین روشن تھی۔ اس کی روشنی میں مسلح پہریدار دروازے کے سامنے فرش پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ قریب ہی دیوار کے سہارے ان کی بندوقیں رکھی تھیں۔ شیدا بڑھ کر جھٹ ان کے سامنے پہنچا۔ پہریداروں نے جھپاک جھپاک اپنی بندوقیں سنبھالیں اور نظریں جھکا کر ادب سے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

۳۶

ڈیوڑھی کے آگے دور تک پھیلا ہوا وسیع آنگن تھا۔ آنگن کے تین طرف سلسلے وار کوٹھریاں تھیں۔ کوٹ کی فصیل نما اونچی چار دیواری کی طرح کوٹھریوں کی دیواریں بھی کچی اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔ کسی کوٹھری میں نہ کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ آمد و رفت کے لیے صرف ایک دروازہ تھا۔ کوٹھریوں کے آگے پھوس کی چھت کا طویل برآمدہ تھا۔ برآمدہ آنگن کی سطح سے ڈیڑھ دو فٹ اونچا تھا اور اتنا کشادہ تھا کہ چارپائی بچھانے کے بعد بھی اتنی جگہ بچ جاتی تھی کہ برآمدے میں گزرنے والوں کے لیے کوئی دشواری پیدا نہ ہوتی۔ آنگن کا فرش بھی کچا تھا۔ اس میں کہیں کہیں نیم اور جنڈ کے گھنے درخت تھے۔ برآمدے میں کوٹھریوں کے آگے جگہ جگہ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہر کوٹھری میں چراغ روشن تھا۔

احسان شاہ' رحیم داد اور سردار مراد خاں شاہانی کے ہم راہ کوٹ کے صدر دروازے سے ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ شیدا تیزی سے آگے بڑھا اور اس دروازے کو کھولا جو آنگن میں کھلتا تھا۔ کوٹ میں عورتوں اور بچوں کی ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ مگر احسان شاہ کے داخل ہوتے ہی کوٹ کے صدر دروازے پر لٹکے ہوئے پیتل کے گھنٹے پر گھڑیالی نے چوٹ لگائی۔ رات کے سناٹے میں گھڑیال کی آواز گونجی۔ کوٹ کے اندر تمام آوازیں اچانک اس طرح گہری خاموشی میں ڈوب کر گم ہو گئیں جیسے سوئچ دبانے سے بجلی کی روشنی بجھ جاتی ہے۔

احسان علی شاہ گردن اٹھائے نہایت رعب اور دبدبے کے ساتھ ڈیوڑھی سے نکل کر آنگن میں پہنچا۔ آگے بڑھا۔ شاہانی اور رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ شیدا' تینوں سے چند قدم

آگے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔

آنگن سے گزرتے ہوئے وہ برآمدے میں پہنچے۔ شیدا ایک کوٹھری کے دروازے پر رکا۔ چراغ روشن تھا۔ سامنے مونج کی چٹائی پر ایک نوجوان عورت پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل تھا۔ بالوں میں خوشبودار تیل چمک رہا تھا۔ وہ بھڑک دار لباس پہنے ہوئے تھی۔ چراغ کی ہلکی زرد روشنی میں اس کا چہرہ اجلا اجلا نظر آ رہا تھا۔ احسان شاہ کو دیکھتے ہی وہ اپنا ریشمی [illegible] سنبھالتی ہوئی جھٹ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

شیدا نے لالٹین اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ احسان شاہ نے اسے غور سے دیکھا۔ شیدا [illegible] پوچھا۔ "کیا نام ہے اس کا؟"

مگر شیدا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ خود بول پڑی۔ "میرا نام جیداں ہے جی۔"

جیداں کا جسم چھریرا تھا۔ ناک نقشہ تیکھا اور سبک تھا۔ عمر بیس سال سے کچھ ہی اوپر تھی۔ اس کی شادی کو تین سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ صرف ایک بچی تھی اور وہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ جیداں سہمی ہوئی چپ چاپ کھڑی تھی۔ نظریں جھکی تھیں۔ سردار مراد خاں خمار آلود نظروں سے قصائی کی طرح جیداں کے بدن کا انگ انگ ٹٹول رہا تھا، پرکھ رہا تھا۔

احسان شاہ نے شاہانی کی بھوکی نظروں پر توجہ نہ دی۔ مڑ کر شیدا کو دیکھا۔ "شیدے! یہ اتنی [illegible] پتلی کیوں ہے؟ تو اسے کھانے کو روٹی نہیں دیتا۔"

شیدا نے دبی زبان سے بتایا۔ "اسے آئے ہوئے جی، دو ہی مہینے ہوئے ہیں۔ میں رتھتے سے کہوں گا، اسے کھانے کو ٹھیک طرح روٹی ٹکر دے۔ وہی ان کی انچارج ہوتی ہے جی۔"

"رتھتے کہاں ہے؟" احسان شاہ نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "وہ کیوں نہیں آئی۔ کدھر ہے وہ؟"

"شاہ جی!" شیدا گڑگڑانے لگا۔ "اس کے سر میں شام ہی سے سخت درد ہے۔ اوپر چوبارے میں پڑی ہائے ہائے کر رہی ہے۔" شیدا نے زینے کے اوپر بنی ہوئی ممٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں پہلے اسی کے پاس گیا تھا۔ پر اسے تو بخار بھی ہے۔"

احسان شاہ نے رتھتے کے بارے میں مزید پوچھ گچھ نہ کی۔ وہ آگے بڑھنے لگا۔ لیکن شاہانی اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ احسان شاہ کو آگے بڑھتے دیکھ کر اس نے ٹوکا۔ "شاہ جی! ذرا اسے ٹھیک سے دیکھ لینے دے۔" وہ جیداں کو چبھتی ہوئی نظروں سے گھور رہا تھا۔ مسکرا کر احسان علی شاہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"بس شاہ جی! میں تو کہتا ہوں، آج رات یہی چلے گی۔"

"تو یہیں پسر گیا۔ اسی کو بلوا لینا۔ پر آگے چل کر تو دیکھ۔ تو کوٹ میں میرا حرم دیکھنے آیا ہے ناں؟ اور بہت مدت کے بعد ادھر آیا ہے۔ پوری طرح دیکھ بھال لے۔ فیر طے کرنا۔"

شاہانی نے اصرار نہ کیا۔ تینوں آگے بڑھ کر دوسری کوٹھری پر پہنچے۔ اس کوٹھری میں بھی ایک نوجوان عورت خوب سنگھار کیے بیٹھی تھی۔ وہ انھیں دیکھ کر کھڑی ہوئی تو اس کا پھولا ہوا پیٹ صاف نظر آنے لگا۔

مراد خاں شاہانی ہنس کر بولا۔ "بس! یہ تو پہلے ہی گابھن ہے۔ اس سے کیا لینا۔ آگے بڑھ شاہ جی۔"

احسان شاہ آگے بڑھا۔ شاہانی اور رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ شیدا ابھی ان کے ہم راہ لالٹین سنبھالے آگے آگے چل رہا تھا۔ تیسری کوٹھری میں جو عورت تھی، وہ دلکش اور طرح دار تھی۔ رنگت تو سانولی تھی مگر آنکھیں ایسی خوبصورت تھیں کہ ان میں ستارے جھلملاتے تھے۔ شاہانی اسے دیکھ کر پھڑک اٹھا۔ اس نے گرسنہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ مگر فوراً ہی اس نے بے زاری سے منہ بگاڑا۔

"یہ تو دھری ہوئی لگتی ہے۔"

عورت کی ابھری ہوئی چھاتیوں سے دودھ بہہ بہہ کر اس کے کرتے کے گریبان اور بالائی حصے کو گیلا کر رہا تھا۔ وہ سر جھکائے کبوتری کی مانند سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ کوٹھری کے عین سامنے برآمدے میں بچھی ہوئی چارپائی پر دو کم سن بچے سو رہے تھے۔ چھوٹا بار بار کلبلاتا۔ بے چین ہو کر ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا۔ وہ ماں کو تلاش کر رہا تھا اور اس کی ماں چراغ کی پیلی پیلی روشنی میں اس طرح چپ چاپ کھڑی تھی کہ نگاہیں زمیں میں گڑی تھیں اور دل زور زور سے دھڑکتا تھا۔

رحیم داد بدستور خاموش رہا۔ شاہانی بولا۔ "شاہ جی! آگے بڑھ۔"

تینوں آگے بڑھے۔ اگلی کوٹھری میں جو عورت تھی، وہ بھی بھرپور جوان تھی مگر اس کے چہرے پر زردی چھائی تھی۔ وہ بیمار تھی۔ ماتھے کے گرد دوپٹہ لپیٹے ہوئے تھی۔ اس کے سر میں شدید درد تھا جس کا اظہار آنکھوں میں منڈلاتی ہوئی بے چینی اور اضمحلال سے ہوتا تھا۔

احسان شاہ کے چہرے سے جھنجلاہٹ برسنے لگی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے شیدا کو دیکھا۔ تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "نوری کدھر ہے؟"

"وہ آگے ہے جی۔" شیدا نے خوف زدہ ہو کر آہستہ سے بولا۔

"اور رانو کہاں ہے؟"

شیدا نے مستعدی سے جواب دیا۔ "وہ بھی آگے ہے جی۔"

مردار خاں شاہانی نے ہنس کر کہا۔ "سیں شاہ جی! جلدی کیا ہے۔ انھیں بھی دیکھ لیں گے۔"

احسان شاہ کچھ نہ بولا۔ اس کا چہرہ غصے اور جھنجلاہٹ سے تمتمایا ہوا تھا۔ تینوں آہستہ آ[ہستہ] آگے بڑھے اور ہر کوٹھری پر رکتے رہے۔ انھوں نے آٹھ کوٹھریاں دیکھیں مگر کوئی عورت اح[سان] شاہ کی نظروں میں نہ جچی۔ اس کی آنکھوں سے بے قراری جھلک رہی تھی۔ شاہانی کی نگاہوں [میں] ابھی تک جیداں گھوم رہی تھی۔ کسی اور میں اس نے دلچسپی اور رغبت کا اظہار نہ کیا۔

انھوں نے مزید کوٹھریاں دیکھیں۔ مگر احسان شاہ کی چہرے پر چھائی ہوئی خشونت کم نہ ہوئی [وہ] بے چینی سے کسی نوجوان عورت کو تلاش کر رہا تھا۔ اور وہ ہنوز نظر نہ آئی تھی۔ ایک کے [بعد] دوسری کوٹھری کا دروازہ آتا اور ہر دروازے کی دہلیز کے پاس بناؤ سنگھار کیے ہوئے کوئی نوجو[ان] عورت نظر آتی۔

احسان شاہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا ایک دروازے پر ٹھٹکا اور جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا [چہرہ] کھل اٹھا۔ ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔ سامنے چراغ کی روشنی میں ایک عورت پتھر کے ترشے ہو[ئے] مجسمے کی مانند استادہ تھی۔ کھلتی ہوئی سرمئی رنگت' آنکھیں روشن' بال گھنے اور چمکیلے' کو[لہے] چوڑے۔ وہ بھرپور جوان تھی۔ جسم بھرا بھرا اور گداز تھا۔ ناک میں فیروزے کا کوکا تھا۔ ہونٹ قدرے موٹے تھے اور ان کے بالائی حصے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔

احسان شاہ نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں مراد خاں شاہانی سے کہا۔ "لے بھئی شاہانی! یہ رہ[ی] رانو۔" وہ کوٹھری کے اندر داخل ہو گیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے رانو کے پاس گیا۔ ہولے سے اس کے رخسار میں چٹکی بھری۔ رانو نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر مسکراتے ہوئے احسان شاہ کو ایک خاص ادا سے دیکھا۔

احسان شاہ نے اونچی آواز سے شاہانی کو مخاطب کیا۔ "شاہانی! بول کیا کہتا ہے؟"

"کہنا کیا ہے' ایک دم فسٹ کلاس ہے۔" شاہانی نے قہقہہ لگایا۔

احسان شاہ کوٹھری سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "آگے بھی دیکھ لے۔"

تینوں آگے کی کوٹھریوں کی جانب بڑھے۔ وہ ہر کوٹھری میں بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھتے' پرکھتے آگے بڑھتے گئے۔ ایک کوٹھری کے دروازے پر رک کر احسان شاہ نے شیدا سے پوچھا۔

"شیدے! یہ نوراں ہے ناں؟"

نوراں کا نام سن کر رحیم داد ٹھٹکا۔ اسے اپنی بیوی نوراں یاد آ گئی۔ اس نے دھڑکتے دل اور سہمی

ہوئی نظروں سے کوٹھری میں مونج کی چٹائی پر بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا۔ وہ فوراً اپنا لاچا سنبھالتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مگر وہ رحیم داد کی نوراں نہ تھی۔ اس کی بیوی کی طرح خوبصورت اور طرح دار بھی نہ تھی۔ مگر یہ نوراں بھی بری نہ تھی۔ رنگت اجلی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور گہری سیاہ تھیں۔ لیکن رحیم داد کو اس کا کسا ہوا سڈول جسم زیادہ پسند آیا۔

رحیم داد نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا نوراں کو دیکھتا رہا۔ جب تینوں اس کوٹھری کے دروازے سے آگے بڑھے تو رحیم داد نے چلتے چلتے مڑ کر نوراں کو ایک بار پھر دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔

احسان شاہ نوری کی کوٹھری پر رکا۔ اندر گیا۔ نوری کے رخسار میں اس نے پیار سے چٹکی بھری۔ مسکرایا اور باہر آ گیا۔ آگے بڑھا۔ اس نے نوری کے بجائے اپنے لیے ر-شماں کو پسند کیا۔ اسے تین سال قبل اٹھوا کر کوٹ میں لایا گیا تھا۔ یہیں اس کے دو بچے بھی ہوئے۔ دو پہلے بھی تھے جو اس کے شوہر کے پاس تھے۔ لیکن ر-شماں پر چار بچوں کی ماں ہونے کے باوجود پچھپن تھا۔ اس کا لاچا ہلکا نیلا تھا اور قمیص گہری سرخ تھی۔ ہونٹوں پر سرخی تھی اور آنکھوں میں کاجل تھا۔ احسان شاہ کو دیکھتے ہی اس نے اپنا لاچا اشتعال انگیز انداز میں ایک ہاتھ سے سنبھالا اور گردن کو ذرا سا خم دے کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ترچھی نظروں سے احسان شاہ کو دیکھا۔ مسکرا کر اس طرح شرمائی کہ احسان شاہ تڑپ اٹھا۔ جھومتا جھومتا اس کی جانب جھپٹا۔ قریب گیا اور ر-شماں کو سینے سے لگا کر شیدا کی جانب دیکھا۔

"شیدے! اسے میرے کمرے میں پہنچا دے۔"

تینوں نے ۲۱ عورتیں دیکھیں۔ کچھ کوٹھریوں کے دروازے بند تھے۔ کچھ خالی تھیں۔ ان میں رہنے والی عورتیں حویلی میں کام کاج کر رہی تھیں یا اس حالت میں نہیں تھیں کہ نہا دھو کر اور بن سنور کر احسان شاہ اور اس کے مہمانوں کے سامنے آ سکیں اور ان کے خلوت کدوں کی زینت بن سکیں۔

کوٹ کی کوٹھریوں کا معائنہ کرنے کے بعد احسان شاہ نے چلتے چلتے رحیم داد سے دریافت کیا۔

"چوہدری! تو نے اپنے لیے کوئی رن پسند نہیں کی؟"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموش رہا۔

احسان شاہ مسکرایا' اصرار کیا۔ "چوہدری! ایسے کام نہیں چلے گا۔ کھل کر بتا۔ کسے اپنے پاس بلانا چاہتا ہے؟"

رحیم داد اب چپ نہ رہ سکا۔ نشے سے جھوم کر بولا۔ "نوراں میرے لیے ٹھیک رہے گی۔"

"نوراں!" احسان شاہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "وہ کون سی تھی؟" نشے کی جھو
میں نوراں کا نام احسان شاہ کے ذہن سے نکل گیا تھا۔

"شاہ جی! تجھے تو سب کے نام بھی یاد نہیں۔" شاہانی ہنس کر بولا۔ "یاد پڑتا ہے ان میں نورا
بھی تھی اور تو نے ہی اسے پچھاڑا بھی تھا۔"

"ہوگی' ضرور ہوگی۔" احسان شاہ کھلکھلا کر زور سے ہنسا۔ "کس کس کے نام یاد رکھوں
سوچتا ہوں' ان کے لیے رجسٹر رکھنا پڑے گا۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ شیدا کی جانب متوجہ ہوا
"نوراں کو چوہدری کے کمرے میں پہنچا دینا۔" اس نے مڑ کر مراد خاں شاہانی کی طرف دیکھا
"تو نے تو رانو کو پسند کیا ہے نا؟"

"پر جیداں کو ایک بار اور دیکھ لینے دے۔" شاہانی نے نشے کی ترنگ میں لہرا کر کہا۔

مراد خاں شاہانی آگے بڑھا۔ احسان شاہ نے اسے ٹوکا۔ "گل سن۔" مگر شاہانی سنی ان سنی کر
ہوئے جیداں کی کوٹھری کی جانب بڑھنے لگا۔ احسان شاہ نے شیدا کو اشارہ کیا۔ وہ ہاتھ میں لالٹین
سنبھالے شاہانی کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں جیداں کے پاس پہنچے۔ وہ دروازے کی جانب پیٹھ
موڑے چراغ کی دھندلی روشنی میں مونج کی چٹائی پر گم صم بیٹھی تھی۔

قدموں کی آہٹ سن کر جیداں نے مڑ کر دیکھا۔ دہلیز پر شاہانی کھڑا تھا۔ اس کے ہم راہ شیدا بھی
تھا۔ جیداں ہڑبڑا کر اپنا چالا سنبھالتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھوں
کا کاجل پھیل گیا تھا۔

شاہانی نے حیرت سے کہا۔ "لگتا ہے تو رو رہی ہے۔"

جیداں خاموش کھڑی رہی۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے
تھے اور پلکیں صاف بھیگی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ شاہانی نے اسے خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ جھوم
کر بولا۔ "تو ضرور رو رہی تھی۔ صاف صاف بتا۔ تو رو رہی تھی نا؟"

"ہاں جی۔" جیداں نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ "مجھے اپنی نکی یاد آ رہی ہے۔" اس کی آنکھوں
میں آنسو امڈے اور چھلک پڑے۔

شاہانی بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ پوچھا۔ "کہاں ہے تیری نکی؟"

"میرے گھر والے کے پاس ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے میری نکی سے ملوا
دے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رخساروں پر بکھرنے لگے۔ شاہانی نے اس کی پیٹھ تھپکتے

ہوئے کہا۔ "ضرور ملواؤں گا بلکہ اسے تیرے ہی پاس منگوا دوں گا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔
"لے' اب تو ہنس دے۔"

جیداں مسکرائی اور جلدی جلدی آنسو پونچھنے لگی۔

احسان شاہ بھی رحیم داد کے ہم راہ جیداں کی کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گیا۔ شاہانی کو جیداں
کے قریب کھڑے ہوئے دیکھا۔ ہنس کر بے تکلفی سے بولا۔ "لگتا ہے' تجھے یہ زیادہ ہی پسند آ گئی۔"

"بس شاہ جی! اسی کو میرے پاس بھجوا دے۔" اس نے احسان شاہ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

احسان شاہ نے مڑ کر شیدا کی جانب دیکھا۔ جیداں کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا نام ہے اس کا؟"

شیدا نے مستعدی سے جواب دیا۔ "جیداں۔"

"جیداں' جیداں۔" احسان شاہ نشے کی ترنگ میں جیداں کے نام کی گردان کرنے لگا۔ پھر وہ
مسکرایا۔ شیدا کو مخاطب کیا۔ "شیدے! اسے شاہانی کے کمرے میں پہنچا دینا۔"

"پہنچا دوں گا جی' بالکل پہنچا دوں گا۔" شیدا نے احسان شاہ کو یقین دلایا۔

احسان شاہ خاموش رہا۔ اس نے نہ جیداں کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا اور نہ ہی اس کی
آنکھوں کے پھیلے ہوئے کاجل کی جانب توجہ دی۔ اس نے شاہانی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ آہستہ
آہستہ تھپ تھپایا اور اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ رحیم داد بھی آگے بڑھا۔

تینوں برآمدے سے اتر کر آنگن میں پہنچے۔ اسے عبور کیا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ کوٹ کی
اونچی اونچی فصیلوں سے باہر نکلے۔ پہریدار صدر دروازے پر سر جھکائے ادب سے کھڑے تھے۔
تینوں نے پہریداروں کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ دیوان
خانے کی جانب بڑھنے لگے۔

☆

شیدا' ڈیوڑھی کے دروازے ہی پر ٹھیر گیا۔ اسے ابھی کئی اہم کام انجام دینا تھے۔ رشماں'
جیداں اور نوراں کو علیحدہ کوٹھری میں اکٹھا کرتا تھا اور وہاں سے انھیں احسان شاہ' مراد خاں شاہانی
اور رحیم داد کے کمروں میں پہنچاتا تھا۔ ان کی اس وقت تک کڑی نگرانی بھی کرنا تھی جب تک وہ
مقررہ ٹھکانوں پر نہ پہنچ جائیں۔ اسے ڈر تھا' کہیں ایسا نہ ہو کہ تینوں عورتوں میں سے کسی کو احسان
شاہ کا کوئی بیٹا پہلے ہی اچک لے جائے۔ احسان شاہ کے ایک دو نہیں پورے دس بیٹے تھے۔
دو سرکاری ملازمتوں میں تھے اور اعلیٰ افسر تھے۔ ایک انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہا
تھا۔ اس سے چھوٹا لاہور میں پڑھ رہا تھا۔ حویلی میں چھ بیٹے تھے مگر تین جوان ہو چکے تھے اور ان و

سال کے اعتبار سے کچھ پہلے ہی جوان ہو گئے تھے۔

احسان شاہ کے یہ تمام بیٹے صرف دو نکا حتا بیویوں سے تھے۔ ویسے اس نے چار عورتوں باقاعدہ نکاح کیا۔ پہلی ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئی۔ اس سے احسان شاہ کی کوئی اولاد نہ تیسری سے چار بیٹیاں ہوئیں۔ وہ اولاد نرینہ کے لیے سخت پریشان رہتی تھی۔ چھپ چھپ درگاہوں اور مزاروں پر حاضری دیتی۔ منتیں مانتی۔ گڑگڑا کر دعائیں مانگتی۔ بیٹے کے ارمان میں وقت سرگرداں رہتی۔ اسی ارمان میں وہ ایک پیر کے چکر میں آ گئی۔ پیر کے حجرے میں جاتی تو گھنٹ اس کے ساتھ خلوت میں رہتی۔ حویلی کی ایک خادمہ 'فیروزہ اس کی محرم راز تھی۔ مگر وہ احسان کی بھی منظور نظر تھی۔ اس نے احسان شاہ کو ایک روز تنہائی میں سب کچھ بتا دیا۔

اسے بیوی کی ان حرکتوں کا علم ہوا تو غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ یہ اس کی عزت و ناموس کا سو تھا۔ اس نے ایک رات برافروختہ ہو کر بیوی کا اس طرح گلا گھونٹا کہ وہ مر گئی۔ احسان شاہ رازداری سے لاش ٹھکانے بھی لگا دی۔ لیکن پیر سے باز پرس کرنے یا انتقام لینے کی اسے جرات ہوئی۔

اب اس کی دو منکوحہ بیویاں رہ گئیں تھیں۔ ان کے تین جوان بیٹے حویلی ہی میں رہتے تھے مزارعوں اور کمیوں کی لڑکیوں اور بیویوں کے بارے میں ان کا رویہ اپنے باپ سے مختلف نہ تھا احسان شاہ جن عورتوں کو اٹھوا کر کوٹ میں قید رکھتا' وہ اس کے تصرف میں بھی رہتیں اور اس کے نوجوان بیٹوں کے شبستانوں کی بھی زینت بنتیں۔

شیدا حویلی کے ہر راز سے واقف تھا۔ وہ احسان شاہ کا نہایت قابل اعتماد اور منہ چڑھا ملازم تھا مگر اس کے غصے اور خونخوار مزاج سے خائف بھی رہتا۔ کوشش کرتا کہ ہر کام احسان شاہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ اگر اس رات احسان شاہ کا کوئی بیٹا ر۔شماں' جیداں یا نوراں میں سے کسی کو بھی اپنے کمرے میں لے جاتا تو احسان شاہ بیٹے سے تو کچھ نہ کہتا مگر شیدا کی شامت آ جاتی۔ لہٰذا شیدا پوری طرح چوکنا اور چوکس تھا۔ اس نے کوٹ سے باہر قدم ہی نہ نکالا۔ وہ ر۔شماں' جیداں اور نوراں کو جلد سے جلد احسان شاہ' مرلو خاں شاہانی اور رحیم داد کے کمروں میں پہنچانے کے بندوبست میں لگا رہا۔

☆

احسان علی شاہ کوٹ سے نکل کر شاہانی اور رحیم داد کے ہم راہ ایک بار پھر دیوان خانے میں پہنچا۔ تینوں باغ میں نہ بیٹھے۔ اب وہاں خنکی تھی۔ اوس بھی پڑ رہی تھی۔ وہ باغ سے ملحقہ

برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رات کسی قدر گہری ہو چکی تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے سرسراتے ہوئے چلتے تھے۔ انھوں نے کچھ دیر وہسکی سے اور شغل کیا۔ اس عرصے میں نوکروں نے کھانا لگا دیا۔ تینوں شراب نوشی سے فارغ ہوئے تو کھانے پر جٹ گئے۔ کھانا کھا کر وہ اپنے اپنے کمروں کی جانب چلے گئے۔

رحیم داد نے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ دیکھا نوراں وہاں موجود ہے۔ وہ بستر کے ایک کونے پر پیر نیچے لٹکائے خاموش بیٹھی تھی۔ رحیم داد نے خمار آلود نگاہوں سے اسے دیکھا اور لمحہ بھر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی بیوی 'نوراں' اپنے آشنا' جمال دین' کو چھوڑ کر واپس آ گئی ہے۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ اور نوراں کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

وہ کچھ نہ بولی۔ نہ پہلو بدلا نہ کسمسائی۔

رحیم داد بھی خاموش رہا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ کمرے میں گہرا سکوت چھایا تھا۔

آخر رحیم داد نے خاموشی سے اکتا کر بات چھیڑی۔ "تیرا نام نوراں ہے ناں؟"

"آ خو جی!" اس نے مختصر جواب دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ ایک بار پھر رحیم داد نے خاموشی کو توڑا' دریافت کیا۔ "تیرا گھر والا ہے؟"

وہ رحیم داد کی جانب نظریں اٹھائے بغیر بولی۔ "ہے تو جی۔"

"بچے بھی ہیں؟"

"دو ہیں جی۔" نوراں نے بتایا۔

رحیم داد نے اجنبیت کا احساس زائل کرنے کی غرض سے بات آگے بڑھائی۔ "تو اسی پنڈ کی رہنے والی ہے؟"

"نہیں جی' میرا پنڈ تو ادھر ماڑی کمبوہ کے پاس ہے۔" اس نے مغرب کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "میرا زمیں دار تو میاں رحمان وٹو ہے۔"

"تو شاہ جی کے کوٹ میں کیسے آئی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "شاہ جی تو تیرا زمیں دار بھی نہیں۔ فیر تو کیسے ادھر پہنچی؟"

"یہ تو میں نوں بھی پتہ نہیں۔" نوراں نے سادگی سے بتایا۔ "میں نوں تو جی اتنا یاد ہے۔ سویرے بہت تڑکے ٹٹی کرنے نیائیں گئی تھی۔ زمین پر بیٹھنے کے لیے جھکی تو کسی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر میرا منہ دبا لیا۔ وہ ۵ تھے۔ منہ پر منڈاسے باندھے ہوئے تھے۔ مجھے اٹھا کر زمیں دار کی ماڑی میں لے گئے۔ کئی مہینے میں وٹو کی ماڑی میں رہی۔ فیر ایک رات اس نے مجھے شاہ جی کے پنڈ پہنچا دیا۔ تب

سے جی میں یہاں ہوں۔"

"کتنے دن ہو گئے تیں نوں یہاں آئے ہوئے؟"

"اگلے جاڑوں میں جی پورے دو سال ہو جائیں گے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میرے گھر والے کو تو سال بھر بعد پتہ چلا' میں ادھر پیراں والہ میں ہوں۔ وہ ایک بار یہاں آیا بھی تھا۔"

"تجھے ملا تھا؟" رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"نا جی ناں۔ شاہ جی نے مجھے اس سے بالکل ملنے نہ دیا۔ اسے چار روز حویلی میں کیدی بنا کر رکھا۔ چھت سے الٹا لٹکا کر بہت پٹائی کی۔ فیر پتہ نہیں دوبارہ آیا' میں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے' کیسا ہے؟ بچوں کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں۔"

"یاد تو آتے ہوں گے۔" رحیم داد نے غیر شعوری طور پر اس کے زخموں کو چھیڑ دیا۔

نوراں تڑپ کر بولی۔ "کیوں نہیں یاد آتے۔ جب بہت یاد آتے ہیں تو چپکے چپکے رو لیتی ہوں۔"

اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملانے لگے۔ رحیم داد نے اس کی جانب نہ دیکھا۔ بستر پر خاموش بیٹھا رہا۔

باغ میں کھلنے والی کھڑکی سے ہوا کے بے قرار جھونکے اندر آ رہے تھے۔ رحیم داد اٹھا اور کھڑکی کے ایک پٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ باغ میں گہرا سناٹا تھا۔ قریب ہی پھولوں سے لدی رات کی رانی مہک رہی تھی۔

گیارہ بجے کا عمل تھا۔ سونے والے سو رہے تھے' رات جاگ رہی تھی۔ خوشبو میں بسے ہوئے جھونکے بار بار امنڈتی لہروں کی مانند آتے۔ رحیم داد گہری سانس بھرتا۔ نشے کا ریلا رک رک کر آتا۔ رحیم داد کا سر ہر ریلے کے ساتھ جھومتا۔ قدم ڈگمگاتے۔ آنکھوں میں چراغ جلتے بجھتے۔ سیاہ پردے لہراتے۔ وہ دیر تک کھڑکی کا سہارا لیے جھومتا رہا۔ کھڑکی کا پٹ ساتھ نہ دے سکا تو اس نے چوکھٹ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

رحیم داد نے پلٹ کر نوراں کو دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ نوراں نے بھی نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔

"تو نوراں ہی ہے ناں؟"

وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگی۔ رحیم داد کا چہرہ دہکنے لگا۔ آنکھیں نشے سے مدہوش ہو گئیں۔ وہ وارفتگی کے عالم میں جھومتا جھامتا نوراں کی طرف بڑھا۔ اب وہ تند اور تیز بگولہ تھا جو امڈنے اور اڈ کر بکھرنے کے لیے بے تاب تھا۔

سویرے رحیم داد کی آنکھ کھلی تو نوراں موجود نہ تھی۔

☆

سردار مراد خاں شاہانی اب جا چکا تھا۔

وہ پیراں والہ میں پانچ روز قیام کرنے کے بعد لاہور چلا گیا۔ مگر پانچ ہی روز میں وہ رحیم داد سے بہت گھل مل گیا تھا۔ وہ بیٹ کے علاقے کا خاندانی جاگیردار تھا۔ لیکن رحیم داد نے اس میں خاندانی جاگیرداروں والا طنطنہ اور طمطراق نہ پایا۔ وہ یاروں کا یار تھا۔ ہنس مکھ اور فراخ دل تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے زور دے کر رحیم داد کو اپنی جاگیر میں آنے اور چند روز قیام کرنے کی دعوت دی۔

مراد خاں شاہانی کے جانے کے بعد رات کی محفلیں قدرے سونی پڑ گئیں۔ بات یہ تھی کہ شاہانی بڑا زندہ دل اور یار باش تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا۔ دبا کے شراب پیتا مگر مطلق نہ بہکتا۔ جاگیرداروں اور بڑے زمیں داروں کی عام روایت کے مطابق عورت اس کی بھی کمزوری تھی اور اس حد تک تھی کہ اسے ہر عورت گوارہ تھی۔ اپنی اس کمزوری کو وہ چھپاتا بھی نہ تھا۔ نہایت دھڑلے سے بتاتا تھا۔ لاہور روانہ ہونے سے ایک روز قبل رات کو معمول کے مطابق وسکی کا دور چل رہا تھا۔ شاہانی عورتوں کے بارے میں اپنے تجربات ہنس ہنس کر سنا رہا تھا۔ بات کہتے کہتے اس نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔

"مرد کے بڑھاپے کی پہچان تو یہ ہے سئیں' جب وہ بڈھی اور جوان' خوبصورت اور بدصورت زن میں فرق محسوس کرنے لگے تو سمجھو وہ بڈھا ہو گیا۔"

رحیم داد اس کی یہ منطق سن کر چونکا۔ حیرت سے بولا۔ "نہیں جی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ بھی اس وقت نشے کی ترنگ میں تھا۔ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "ایہہ گل اے تو یہ بتا تو رتے کے ساتھ سو سکتا ہے؟"

"سو سکتا ہوں' ضرور سو سکتا ہوں۔" مراد خاں شاہانی اپنی بات پر اڑا رہا۔ "آزما کے دیکھ لے۔"

احسان شاہ نے مداخلت کی۔ وہ سردار شاہانی کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ مدت سے شناسائی تھی۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! اس سے اڑی نہ کر۔" وہ کھلکھلا کر زور سے ہنسا۔ "یہ بہت خنزیر ہے۔" اس نے بے تکلفی سے شاہانی کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "تو اسے نہیں جانتا۔ یہ رتے کے ساتھ بھی سو جائے گا۔"

رحیم داد کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ کہنے لگا۔ "نہیں شاہ جی! ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے شاہانی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ "شاہانی! تو نے رمتے کو دیکھا ہے؟" یہ کہہ کر وہ احسان شاہ کی جانب متوجہ ہوا۔

"شاہ جی! رمتے کو بلوا لے۔ تب دیکھوں گا یہ اس کے ساتھ سو سکتا ہے کہ نہیں۔"

"شاہ جی' بلوا لے' اسے ابھی بلوا لے۔" شاہانی کے رویئے میں مطلق فرق نہ آیا۔ وہ زندہ دلی سے مسکراتا رہا۔

احسان شاہ نے منع بھی کیا۔ مگر شاہانی باز نہ آیا۔ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس نے اصرار کیا۔ "سئیں شاہ جی! تو رمتے کو بلوا لے۔ میری خاطر بلوا لے۔"

احسان شاہ نے شیدا کو بلایا۔ اس سے کہا۔ "رمتے کو یہاں لے آ۔"

شیدا خاموشی سے مڑا اور برآمدے سے چلا گیا۔ واپس آیا تو رمتے اس کے ساتھ تھی۔ وہ ڈھلتی عمر کی پستہ قد عورت تھی۔ جسم پھیلا ہوا تھا۔ رنگت گہری سانولی تھی۔ چہرہ چوڑا چکلا اور گوشت سے بھرا ہوا تھا۔ ناک بھونڈی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ایک رخسار پر بڑا سا مسا تھا۔ بال خوب گھنے اور سیاہ تھے۔ جن میں کہیں کہیں سے سفیدی جھلکتی تھی۔ وہ کم رو بھی تھی اور سن بھی چالیس سے اوپر ہی تھا۔ وہ اس وقت میلے کچیلے کپڑے پہنے تھی جن سے پسینے کی تیز بو اٹھتی تھی۔

سردار شاہانی نے نظر بھر کر رمتے کو دیکھا۔ قہقہہ مار کر ہنسا۔ احسان شاہ کو مخاطب کیا۔ "شاہ جی! تو نے یہ سانول دانا کہاں چھپا رکھا تھا۔" یہ کہتا ہوا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہسکی سے بھرا ہوا گلاس ہونٹوں سے لگایا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ اس نے خالی گلاس میز پر رکھا۔ رمتے کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا اور اس کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رمتے کے پھولے پھولے گالوں کو انگلیوں سے پکڑ کر ہولے ہولے ہلایا۔ بے تکلفی سے ہنسا۔

"میں صدقے و نجاں۔" اور رمتے کے بازو میں بازو ڈال کر بولا۔ "ادھر آ دل جانی۔"

رمتے اس کے پہلو میں کسمسائی۔ شاہانی نے قہقہہ بلند کیا۔ "نخرا شکرا چھوڑ۔ رناں دے چالے نہ کر۔ سدھی سدھی چل۔" شاہانی نے ہولے سے ٹھوکا دیا اور رمتے کے سہارے ڈگمگاتے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔

رحیم داد حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔ احسان شاہ بے نیازی سے بیٹھا وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔

اس واقعے کے دوسرے ہی روز شاہانی چلا گیا۔ مگر رحیم داد ٹھہرا رہا۔ تیسرے روز تحصیل دار آگیا۔ وہ سرکاری دورے پر نکلا تھا۔ لیکن اس کا قیام احسان شاہ کی حویلی میں رہا۔ تحصیل دار جب

پہنچا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ احسان شاہ اور رحیم داد باغ کے ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ وہسکی کا دور چل رہا تھا۔ احسان شاہ تحصیل دار کو دیکھتے ہی اٹھا اور بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔

دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ احسان شاہ نے تحصیل دار کی طرف ہاتھ اٹھا کر رحیم داد سے کہا۔ "یہ اپنی تحصیل کے تحصیل دار' منور خاں ہیں۔" تحصیل دار کو اپنے روبرو بیٹھے دیکھ کر رحیم داد بدکا' گھبرایا بھی۔ لیکن احسان شاہ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی سے بے نیاز کہتا رہا۔

"اور جی یہ کوٹلہ ہرکشن کا زمیں دار' اپنا یار' نور الٰہی ہے۔"

شیدا نے جھٹ گلاس میز پر رکھا۔ احسان شاہ نے گلاس میں وہسکی ڈالی۔ ہلکا قہقہہ لگایا۔ "جان پہچان کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" اس نے باری باری تحصیل دار اور رحیم داد کو دیکھا۔ "جو کمی رہ گئی ہے وہ تم دونوں ابھی خود ہی پوری کر لو گے۔" اس نے پیگ بنا کر تحصیل دار کے سامنے رکھا اور بے تکلفی سے بولا۔ "یار منور خاں! اب تو شروع ہو جا۔" تحصیل دار نے گلاس اٹھا کر ہاتھ بلند کیا۔ مسکرایا' گلاس ہونٹوں سے لگایا اور فوراً شروع ہو گیا۔

تحصیل دار بھی بڑا یار باش اور زندہ دل تھا۔ رحیم داد کا ہم عمر بھی تھا۔ اس نے سردار مراد خاں شاہانی کی کمی پوری کر دی۔ ایک ہی رات میں وہ رحیم داد سے اس قدر مانوس اور بے تکلف ہو گیا کہ عورت کا انتخاب بھی اس نے رحیم داد کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ رحیم داد نے گریز کیا تو وہ سر ہو گیا۔ نشے میں جھوم کر بار بار شیدا سے کہتا۔ "شیدے! میرے لیے تو وہی آئے گی جسے چوہدری کہے گا۔"

احسان شاہ بے نیازی سے گھونٹ گھونٹ وہسکی پیتا رہا۔

اس کی ضد کے سامنے رحیم داد کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ شیدا سے کہا۔ "تحصیل دار کے لیے رانو کو لے آ۔"

شیدا تھوڑی دیر بعد رانو کو لے آیا۔ اسے دیکھ کر تحصیل دار منور خاں بہت خوش ہوا اور اس قدر خوش ہوا کہ رانو کے بجائے بڑھ کر رحیم داد کا منہ چوم لیا۔ اس وقت وہ نشے میں دھت تھا۔ چڑھا بھی زیادہ گیا تھا۔

تحصیل دار سویرے ہی سویرے دورے پر نکل گیا اور شام تک نہ لوٹا۔ احسان شاہ اور رحیم داد حسب معمول وہسکی سے شغل کر رہے تھے۔ شام کی رنگت کالی ہوئی اور اندھیرا بڑھا تو تحصیل دار بھی آگیا۔ سیدھا باغ کے اس گوشے میں پہنچا جہاں احسان شاہ اور رحیم داد بیٹھے تھے۔ تحصیل دار منور خاں کے ہم راہ علاقے کا تھانے دار بھی تھا۔ وہ اس وقت وردی میں تھا۔

تھانے دار کو دیکھتے ہی رحیم داد کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کا ہاتھ لرز کر رہ گیا۔ گلاس بھرا ہوا

نہ تھا ورنہ جھلک پڑتا۔ لیکن تھانے دار نے رحیم داد پر کوئی توجہ نہ دی۔ بیٹھتے ہی ڈکیتی کی ایک واردات کا ذکر چھیڑ دیا جس میں گاؤں والوں نے جم کر ڈاکوؤں سے مقابلہ کیا تھا۔ اور انھیں فرار ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ مگر گاؤں کا ایک نوجوان ڈاکوؤں کی اندھا دھند فائرنگ سے ہلاک بھی ہو گیا تھا۔ تھانے دار اسی واردات کی تفتیش کے بعد لوٹا تھا۔

تھانے دار ڈاکے کی واردات کے بارے میں ایک ایک تفصیل احسان شاہ کو سناتا رہا اور رحیم داد سہا ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ نے تحصیل دار اور تھانے دار کے سامنے بوتل کے ساتھ گلاس بھی رکھ دیے۔ دونوں نے خود ہی اپنے لیے پیگ تیار کیے اور گلاس ہونٹوں سے لگا کر ایک ایک گھونٹ بھرا۔

وہسکی کا دور چلتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہونے لگیں۔ حجابات اٹھنے لگے۔ تکلفات مٹتے گئے۔ قہقہے بلند ہونے لگے۔ نشہ چڑھا اور تیز ہوا تو سب ایک ہی رنگ میں رنگ گئے۔ فاصلے قربتوں میں بدل گئے۔ رحیم داد کے ذہن پر چھایا ہوا خوف اور خطرے کا احساس رفتہ رفتہ زائل ہو گیا۔ وہ بھی گفتگو میں حصہ لینے لگا اور پھر ایسا مرحلہ آگیا کہ احسان شاہ اور تحصیل دار منور خاں کی طرح وہ تھانے دار سے بھی مانوس اور بے تکلف ہو گیا۔

شغل بادہ نوشی سے جب چاروں فارغ ہوئے تو رات بھیگ چکی تھی۔ رحیم داد اور تھانیدار ایک دوسرے کے اس قدر زیادہ قریب آچکے تھے کہ ہنس ہنس کر بے دھڑک باتیں کرتے تھے۔ مگر رحیم داد نے نشے میں چور ہونے کے باوجود تھانے دار سے اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ احسان شاہ نے بھی اس سلسلے میں اجتناب برتا اور تھانے دار نے بھی اس کا ذکر نہ چھیڑا۔

☆

تھانے دار نے صرف رات بھر حویلی میں قیام کیا۔ وہ سویرے اٹھ کر چلا گیا۔ البتہ تحصیل دار منور خاں چار روز ٹھہرا۔

رحیم داد نے دو ہفتے سے بھی زیادہ عرصے تک قیام کیا۔

دن کا بیشتر حصہ وہ سو کر گزارتا۔ شام ہوتے ہی احسان شاہ کے ساتھ مے نوشی کرتا۔ ہر رات نوراں کو اپنے کمرے میں بلوالیتا۔ وہ رحیم داد سے خوش بھی تھی۔ ہر رات خوب بن سنور کے اس کے پاس آتی۔ رحیم داد نشے سے جھومتا جھومتا کمرے میں داخل ہوتا تو وہ ہنستی مسکراتی اٹھ کر کھڑی ہو جاتی۔ آگے بڑھتی اور جھٹ رحیم داد کا بازو تھام لیتی۔ اسے سہارا دے کر بستر پر لاتی اور اس کے پہلو میں سمٹ کر بیٹھ جاتی۔

رحیم داد کبھی اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتا۔ کبھی ہولے سے رخسار میں چٹکی بھرتا۔ کبھی پیار سے اس کا سر اپنے سینے سے لگالیتا' چھیڑ چھاڑ کرتا۔ ہنستا' قہقہے لگاتا اور ہر رات نوراں کو پانچ روپے دیتا۔ کبھی وہ روٹھ جاتی تو مناتا۔ مضمحل اور پریشان نظر آتی تو اس کی دل جوئی کرتا۔

نوراں میں رحیم داد کی بڑھتی ہوئی دلچسپی دیکھ کر ایک شام وہسکی کا گھونٹ بھرتے ہوئے احسان شاہ نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔

"چوہدری! تجھے نوراں بہت پسند ہے تو اسے ساتھ لے جا۔"

مگر رحیم داد آمادہ نہ ہوا۔ "شاہ جی! میں تو یہ بھی نہیں چاہتا کہ جمیلہ کو یہ پتہ چلے' میں تیرے پاس ٹھیرا تھا۔ نوراں پہنچ گئی تو جمیلہ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ تیں نوں پتہ ہی ہے' میں ہمیشہ اس سے چھپ کر تیرے پاس آتا ہوں۔"

"جیسی تیری مرضی۔" احسان شاہ بے نیازی سے بولا۔ "پر جمیلہ سے تو اس طرح کب تک ڈرتا رہے گا؟"

"شاہ جی! تو نے ہی تو مشورہ دیا تھا کہ جلد بازی سے کام نہ لے۔" رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ "اب خود ہی کہہ رہا ہے کہ ڈرنے سے کام نہیں چلے گا۔ میں تیری کون سی گل ٹھیک سمجھوں۔"

"میرا کہا مان' تو یہاں سے جاتے ہی جمیلہ کو کابو کرنے کی کوشش کر۔" احسان شاہ نے آنکھ مار کر کہا۔ "وہ رن ہے اور جوان بھی ہے۔ میں نے تو نہ جانے کتنی ٹیڑھی زنانیوں کو سیدھا کر دیا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "جمیلہ تیرے کابو نہ آئے تو میرے پاس بھیج دے۔ منہ زور اور اڑیل گھوڑی کو جیسے سدھایا جاتا ہے' ویسے ہی اسے بھی ٹھیک ٹھاک کروں گا۔ ایک دم لائن پر آجائے گی۔ کیا سمجھا؟"

مگر رحیم داد نے اس کی بات سمجھ کر بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ اس کی حوصلہ افزائی سے گریز کیا۔ نہایت سنجیدگی سے بولا۔ "فکر نہ کر شاہ جی' وہ کابو آجائے گی اور تو دیکھ لینا جلد ہی آجائے گی۔ میں نے اسے رکھیل بنا کر نہیں رکھنا۔ گھر والی بنا کر رکھوں گا۔ ملاں کو بلا کر باقاعدہ نکاح پڑھواؤں گا۔"

"یہ ضروری بھی ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کی تائید کی۔ ساتھ ہی مشورہ بھی دیا۔ "پوری زمین داری اب تیرے ہی پاس ہونی چاہیے۔ ویسے بھی تو جوان ہے۔ تجھے ایک زنانی کی ضرورت بھی ہے۔ جمیلہ ہتھے چڑھ گئی تو عیش ہو جائیں گے تیرے۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ رحیم داد بھی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

اسی طرح ہنستے، قہقہے لگاتے اور وہسکی کی چسکی لگاتے سترہ روز گزر گئے۔

☆

رحیم داد حویلی اسٹیشن کے راستے واپس کوٹلہ ہرکشن پہنچا۔ وہ اسی راستے سے احسان شاہ کے پاس پیراں والہ آیا تھا۔ گاؤں میں پہنچ کر اس نے تانگا حویلی کے پھاٹک پر رکوایا۔ نوکروں نے سامان اتروایا اور سیدھا حویلی کے اندر چلا گیا۔ احمد اسے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرہ صاف ستھرا اور کشادہ بھی تھا۔ کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ ان پر اجلے بستر لگے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ہلکے سبز رنگ کے پردے لہرا رہے تھے۔ وسط میں بڑی سی گول میز تھی۔ اس پر رکھے ہوئے گلدان میں تازہ پھول مہک رہے تھے۔

احمد نے بتایا کہ کمرے کی صفائی اور اس کی آرائش جمیلہ نے اپنی نگرانی میں کرائی ہے۔ اسی کی ہدایت پر ہر صبح گل دان میں تازہ پھول لگائے جاتے۔ جھاڑ پونچھ کی جاتی۔ وہ ہر روز بے چینی سے رحیم داد کی واپسی کا انتظار کرتی۔ مگر وہ اس وقت اسکول میں تھی۔ رحیم داد کے جانے کے چند روز بعد اس نے اسکول میں بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

مہمان خانے کی طرح اس کمرے کے ساتھ بھی کوٹھری تھی۔ رحیم داد نے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ دیکھا، اس کا سامان مہمان خانے سے لاکر کوٹھری میں حفاظت کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے۔ کمرے کا ایک دروازہ ملحقہ کمرے میں کھلتا تھا۔ رحیم داد اس کمرے میں گیا۔ اس میں بھی دو پلنگ بچھے تھے۔ ان پر بھی بستر لگے تھے۔ دروازے اور کھڑکیوں پر پردے بھی پڑے تھے۔ یہ کمرہ دیکھتے ہی رحیم داد سمجھ گیا کہ وہ بچوں کے قیام کے لیے ہے۔ اس کی صفائی اور آرائش بھی جمیلہ کی نگرانی میں کی گئی تھی۔

رحیم داد کمرے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ رحیم داد سفر کی تکان سے نڈھال ہو رہا تھا۔ کپڑے گرد آلود تھے۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ مگر اس نے غسل نہ کیا۔ چپ چاپ بیٹھا جمیلہ کا انتظار کرنے لگا۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی جمیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔ لیکن دہلیز ہی پر رک گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "چوہدری! تو بھائی کو نہیں لایا۔ بچے کدھر ہیں؟"

رحیم داد نے پہلے سے سوچے منصوبے کے تحت کوئی جواب نہ دیا۔ منہ لٹکائے خاموش بیٹھا رہا۔ جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی رحیم داد کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ حیران و پریشان نظر آ رہی تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے دبی زبان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"کیا اس بار بھی تیری گھروالی اور بچے نہیں ملے۔ سلامت نے تجھے غلط اطلاع دی تھی؟"

"نہیں، اس نے ٹھیک ہی اطلاع دی تھی۔" رحیم داد نے چہرے پر افسردگی طاری کرنے کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "میری گھروالی، رابعہ، تخت محل ہی میں ہے۔ بچے بھی اس کی ساتھ ہیں۔"

"پر وہ تیرے ساتھ آئی کیوں نہیں؟"

رحیم داد کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ "وہ اب میرے پاس نہیں آسکتی۔"

"وہ تیرے پاس کیوں نہیں آسکتی؟" جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "ایسا کیوں ہے؟ صاف صاف بتا۔"

"صاف گل سننا چاہتی ہے تو وہ بھی سن لے۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چند لمحے نظریں اٹھائے چپ چاپ دیوار کو تکتا رہا۔ اس نے جمیلہ کی طرف نہ دیکھا۔ کھوئے کھوئے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "وہ اب کسی اور کی ہو چکی ہے۔ اس نے ایک پٹواری سے ویاہ کرلیا ہے اور اس بات کو بھی تین سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔ پٹواری سے اس کے دو بچے بھی ہیں۔" اس نے مڑ کر افسردہ نگاہوں سے جمیلہ کو دیکھا۔ "زمیں دارنی! تو ہی بتا، اب وہ میرے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے۔"

"پر اس نے ایسا کیوں کیا؟ تیرا انتظار بھی نہ کیا۔" جمیلہ کا لہجہ بھی دکھ بھرا تھا۔

"پانچ سال تک رابعہ میرا انتظار کرتی رہی۔" رحیم داد نے بوجھل لہجے میں رک رک کر بتایا۔ "وہ بچوں کو ساتھ لیے جگہ جگہ مجھے ڈھونڈتی رہی۔ زیور بیچ کر اور گھروں میں کام کاج کر کے کسی نہ کسی طرح اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتی رہی۔" رحیم داد ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ "جب بہت پریشان ہو گئی اور میرے ملنے کی کوئی آس نہ رہی، تب یہ سوچ کر کہ میں بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح فسادات میں مارا گیا، اس نے مجبور ہو کر پٹواری سے نکاح پڑھوالیا۔ وہ اس کی دوسری گھروالی ہے۔ پہلی مدت ہوئی مر گئی۔"

"تجھے یہ ساری گل بات کیسے معلوم ہوئی؟"

رحیم داد نے بتایا۔ "میں دو ہفتے تک تخت محل میں سلامت کے ایک یار کے ساتھ ٹھہرا رہا۔ رابعہ سے کسی نہ کسی طرح ملنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک رات جب پٹواری بھاول نگر گیا تھا میں چپکے سے اس کے گھر میں گھس گیا۔ رابعہ نے مجھے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ دیر تک اسے یقین ہی نہ آیا کہ میں زندہ ہوں۔"

"جب اسے وشواس ہو گیا تو اس کا گھر والا چوہدری نور الٰہی ہے' تب اس نے کیا کیا؟" جمیلہ اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

"وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دیر تک آنسو بہاتی رہی۔" رحیم داد نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ ہولے سے آہ بھری۔ "اس نے رو رو کر مجھے اپنی بپتا سنائی۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ خ "کیا' کیا جائے اپنے نصیب ہی میں اس طرح مل کر بچھڑنا لکھا تھا۔ گھر ایسا اجڑا کہ اب اس دوبارہ بسنے کی کوئی امید نہیں۔"

"ہاں تیری طرح نہ جانے کتنوں کے گھر اسی طرح اجڑ گئے۔" جمیلہ کی آواز بھرا گئی۔ رحیم خاموش بیٹھا رہا۔ جمیلہ بھی چپ ہو گئی۔ اس نے آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کوشش کی۔ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "تو اپنے بچوں سے بھی ملا؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "انھیں صرف نزدیک سے دیکھا تھا۔ وہ وکت سو رہے تھے۔ میں نے انھیں جگانے کی کوشش نہیں کی۔ اب تو اتنے دن بیت گئے کہ وہ پہچان بھی نہ پاتے۔" اس نے جمیلہ کی طرف غم زدہ نظروں سے دیکھا۔ "زمیں دارنی! ویسے انھیں کیا پتہ ہے ان کا پیو مر چکا ہے۔ ماں نے ان کو یہی بتا رکھا ہے۔" رحیم داد نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ "آٹھ سال میں سب کچھ بدل گیا۔ بچے بڑے ہو گئے۔ ایک بیٹی تو جوان ہو چکی ہے۔"

"چوہدری! تو ایسا کر جوان دھی کو یہاں لے آ۔" جمیلہ نے مشورہ دیا۔ "یہاں رہے گی تو تجھے آرام ملے گا۔ ٹھیک ٹھاک ور مل جائے تو اس کا ویاہ کر دینا۔"

"رابعہ اس کے لیے تیار نہ ہو گی۔" رحیم داد نے فوراً بات بنائی۔

"کیوں نہیں تیار ہو گی؟" جمیلہ نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میں تو صرف ایک بیٹی کو نہیں' سب بچوں کو اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔" رحیم داد نے بتایا۔ "میری یہ بات سن کر رابعہ رونے لگی۔ سسکیاں بھر کر بولی۔ انھیں مجھ سے الگ نہ کر۔ میں نے بہت دکھ جھیل کر انھیں پالا پوسا ہے۔ انھی کے سہارے تو میں اب تک زندہ رہی۔ تیں نوں ان سے کیا لینا۔ تو انھیں بھی میری طرح مرا ہوا سمجھ کر صبر کر چکا تھا۔ آگے بھی صبر کر لے۔ اس کی باتیں سن کر میں چپ ہو گیا۔ کر بھی کیا سکتا تھا۔ چوری سے چھپ کر تو اس کے گھر میں گیا تھا۔"

"پر یہ تو کوئی گل بات نہ ہوئی۔" جمیلہ اپنی بات پر بدستور اڑی رہی۔ "سب نہیں' وڈی کڑی کو تو وہ دے ہی سکتی ہے۔ اس میں اس کا بھی لابھ ہے۔ کبھی نہ کبھی تو رابعہ کو بیٹی کا ویاہ کرنا ہی ہو گا۔ وہ ہر طرح کی چنتا سے بچ جائے گی۔"

"وہ یہ بات نہیں سمجھتی۔"

"تو مجھے رابعہ کے پاس لے چل۔ میں اسے راضی کر لوں گی۔"

"نہیں زمیں دارنی' تیرا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی تو عدّت میں ہے۔ تو کیسے تخت محل جا سکتی ہے؟" رحیم داد نے ٹالنے کی کوشش کی۔ "میں نے تیرے بارے میں رابعہ کو کچھ نہیں بتایا۔ تجھے دیکھ کر جانے وہ کیا سوچے۔"

"سوچنے دے۔ اس کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔" جمیلہ نے بے نیازی سے کہا۔ "تو اپنی بتا۔ تیری کیا مرضی ہے؟"

"پہلے مجھے کوشش کر لینے دے۔ فیر تو کوشش کرنا۔" رحیم داد نے جمیلہ کو دلاسا دیا۔ "میں کچھ دنوں بعد دوبارہ تخت محل جاؤں گا۔"

"جیسی تیری مرضی۔" جمیلہ نے مزید اصرار نہ کیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رحیم داد سے مخاطب ہو کر بولی۔ "چوہدری! اب تو اشنان کر لے۔ تھکا ہوا بھی ہے۔ روٹی کھا کر آرام سے سو جا۔"

جمیلہ چلی گئی۔ رحیم داد بہت خوش اور مطمئن تھا کہ جمیلہ نے اس کی ہر بات پر یقین کر لیا۔ کسی بھی حیلے بہانے پر اس نے مطلق شک وشبہ کا اظہار نہ کیا۔ وہ جمیلہ کی ہمدردی حاصل کرنے میں پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ ساتھ ہی احسان شاہ کے پاس جانے اور اس کی حویلی میں گل چھرے اڑانے کا موثر بہانہ بھی ہاتھ آ گیا تھا۔

سویرے رحیم داد نے حویلی کے نائی کو بلوایا۔ ویسے اسے نائی کو بلوانے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ ہر جمعہ کی صبح' وہ نہایت باقاعدگی سے رحیم داد کی حجامت بنانے پہنچ جاتا۔ مگر پچھلے سترہ روز کی غیر حاضری نے اس معمول میں خلل پیدا کر دیا تھا۔ نائی آیا اس نے رحیم داد کی ڈاڑھی اور سر کے بال تراشے۔ تیل ڈال کر دیر تک سر کی مالش کی۔ رحیم داد نے اس روز بالوں کی تراش خراش اس طرح کرائی کہ ڈاڑھی ہلکی اور قدرے مختصر ہو گئی۔

حجامت سے فارغ ہونے کے بعد اس نے غسل کیا۔ اجلے کپڑے پہنے۔ ڈاڑھی اور سر کے بالوں میں کنگھی کی۔ اور جب بن سنور کر حویلی کے بڑے کمرے میں پہنچا تو نادر خاں وہاں پہلے سے موجود تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی وہ ادب سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد کو غور سے دیکھا' مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! اچھی بات یہ ہے کہ اب تو تجھ پر بہت شان آ گئی ہے۔" اس نے رحیم داد کی خوش نودی کے لیے خوشامد سے کام لیا۔ مگر اس خوشامد میں بڑی حد تک صداقت بھی تھی۔ رحیم داد اس وقت خاصا وجیہ اور باوقار نظر آ رہا تھا۔ اس کی رنگت نکھر کر اجلی ہو گئی تھی۔ رخساروں سے سرخی جھلکتی

تھی۔ وہ قد آور جوان تھا۔ دبلے پتلے لمبے جسم پر گوشت چڑھنے اور بڑھنے سے زیادہ ہی جچنے لگا تھا۔

رحیم داد نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے نادر خاں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خاموشی سے اپنی مونچھوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور دبدبہ تھا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھیں سوچتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ احسان شاہ کی صحبت میں رہ کر وہ جاگیرداروں اور رئیسوں کے طور طریق کسی قدر سیکھ گیا تھا اور انھیں اپنا بھی چکا تھا۔

نادر خاں زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ دبی زبان سے بولا۔ "اجازت ہو تو جی ایک بات کہوں؟"

"کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟" رحیم داد ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے بولا۔

"چشمے کا یہ فریم ٹھیک نہیں لگتا جی۔" نادر نے رحیم داد کی آنکھوں پر لگی ہوئی عینک کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے تو بدل دینا چاہیے۔"

"اس میں تیں نوں کیہ خرابی نظر آئی ہے؟ ویسے تیرے خیال میں کیسا فریم ہونا چاہیے؟"

"چوہدری! یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ ویسے تو یہ کپڑے بھی تیری شان کے مطابک نہیں لگتے۔ لہور سے میرا ایک بھتیجا آیا ہے۔ شام کو واپس جا رہا ہے۔ وہاں ایک راشن ڈپو پر نوکری کرتا ہے۔ لہور سے تیرے لیے عمدہ فریم کا چشمہ بنوا کر اور نئے کپڑے سلوا کر لے آئے گا۔ مجھے اپنا چشمہ اور ناپ کے لیے ایک جوڑا قمیص اور شلوار دے دینا۔ وہ جلدی واپس آجائے گا۔ دیر نہیں لگے گی۔"

"اس پر خرچ کتنا آئے گا؟"

"اس کی فکر نہ کر، تیری غیر حاضری میں مزارعوں سے میں نے کچھ وصولی کی ہے۔ وہ میرے پاس موجود ہے۔ چوہدری! تیرا حکم ہو تو میں نئے چشمے اور کپڑوں کے لیے کچھ روپے اپنے بھتیجے کو دے دوں؟"

"دیدے پر یہ بتا مزارعوں سے وصولی کیسے ہوئی اور کتنی ہوئی؟" رحیم داد نے قدرے تیکھی نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ "تو پہلے تو کہتا تھا مزارعے ادھار ادا کرنے کو تیار نہیں۔"

"ویسے تو جی کوئی خاص وصولی نہیں ہوئی۔ باراں سو کے لگ بھگ روپیہ ہے۔ ادھار تو زیادہ ہی وصول ہو جاتا۔ پر زمیں دارنی بار بار اڑچن ڈال دیتی تھی۔ جو مزارع اُس کے پاس پہنچ کر فریاد کرتا اسے معاف کر دیتی۔ میں نے اسے کہا بھی یہ طریکہ ٹھیک نہیں۔ وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ میں اس کی ناراضی سے ڈر گیا۔ تو نے بھی یہی حکم دیا تھا کہ اسے ناراض نہ کیا جائے۔"

"ٹھیک ہی کیا تو نے۔" رحیم داد نے سنجیدگی سے کہا۔ "جتنی بھی وصولی ہو گئی ٹھیک ہے۔ خریف کی فصل تو اب تیار ہی ہونے والی ہے۔ اس کی واڈھی پر اپنی سکیم کے مطابک ادھار وصول

کر لینا۔"

"مجھے ڈر ہے، فصل کی واڈھی پر بھی زمیں دارنی اڑنگا ڈالے گی۔"

"تو فکر نہ کر۔ میں اسے سمجھا بجھا لوں گا۔ پیسے کی تو سچ پوچھ اسے بھی ضرورت ہے۔ وصولی کی رقم کے بارے میں تو نے زمیں دارنی کو بتا دیا تھا؟"

"بالکل بتا دیا تھا جی۔" نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔ "ایک ایک پیسے کا اسے حساب دے دیا تھا۔"

"اس نے وصولی کی رقم تجھ سے مانگی تو نہیں؟"

"میں نے اسے کہا بھی تھا۔ پر اس نے رقم نہ لی۔ کہنے لگی اپنے ہی پاس رکھ۔ چوہدری کو بتا دینا۔ رجسٹر میں اسے وصولی کی مد میں لکھ لے۔ جو خرچ ہو وہ بھی روز کے روز رجسٹر میں لکھ لیا کر۔"

"جیسا اس نے بتایا تو ویسا ہی کر رہا ہے ناں؟"

"بالکل ویسا ہی کر رہا ہوں جی۔ ویسے میں نے کاغذات دیکھ کر اور مزارعوں سے ملنے جلنے کے بعد زمیں داری چلانے کے لیے آگے کا ایک پروگرام بنایا ہے۔ اس کے مطابک ہی کام کرنا ہو گا جی۔ ایسے تو زمیں داری نہیں چل سکتی۔"

"تو نے زمیں دارنی کو بھی اپنا پروگرام بتایا؟"

"نہیں جی۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "میں تیری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ تو جب موجود ہو گا تو تیرے سامنے ہی زمیں دارنی سے اس کے بارے میں گل بات کروں گا۔ مجھے اس کی ناراضی سے خوف آتا ہے۔"

رحیم داد نے نادر سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اس سلسلے میں جمیلہ سے ملنے اور بات کرنے کی کوشش کرے گا۔

کئی روز گزر گئے مگر جمیلہ سے رحیم داد کی ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ منہ اندھیرے چادر سے اپنے جسم کو پوری طرح چھپائے ہوئے اسکول چلی جاتی۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں منگوا لیتی۔ اور جب شام کا دھندلکا ہر سو پھیل جاتا تو ددوں بچوں کے ہم راہ اسکول سے واپس آتی۔ ان دنوں وہ اسکول کی ترقی اور ڈسپنسری کی تعمیر کے کاموں میں الجھی ہوئی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ خریف کی فصل کی کٹائی سے رقم حاصل ہو تو تعمیر کا کام پوری سرگرمی سے شروع کیا جائے۔

☆

اتوار کو اسکول میں چھٹی تھی۔ جمیلہ حویلی کی بالائی منزل پر تھی۔ اس کا تمام وقت اب اسکول یا

اوپر کی منزل کے کمروں کے ہی میں گزرتا تھا۔ وہیں وہ گاؤں کی عورتوں سے ملتی جلتی تھی۔ جب سے رحیم داد کا قیام حویلی میں شروع ہوا تھا' اس نے یہی معمول بنا لیا تھا۔

اس روز رحیم داد نے تاراں کے ذریعے جمیلہ کو حویلی کے بڑے کمرے میں بلوایا اور نادر خاں کے ہم راہ اس سے بات چیت کرنے کی غرض سے پہنچا۔ کچھ دیر تک اسکول اور ڈسپنسری کے بار میں باتیں ہوتی رہیں۔ جمیلہ نہایت جوش و خروش سے اپنا منصوبہ بتاتی رہی۔ رحیم داد اور نا خاموشی سے سنتے رہے۔ رحیم داد کوئی بات پوچھتا۔ جمیلہ اس کا جواب دیتی۔ اپنے منصوبے تفصیل سے آگاہ کرتی۔

جمیلہ نے اسکول اور ڈسپنسری کا ذکر ختم کیا تو رحیم داد نے نادر خاں کی طرف دیکھا۔ اسے مخاطہ کیا۔ "نادر! تو آگے کے لیے زمیں داری چلانے کی گل بات کرنا چاہتا تھا۔ اب زمیں دارنی کے سامنے اسے بتا۔"

نادر خاں نے رحیم داد کے بجائے جمیلہ ہی کو مخاطب کیا۔ "زمیں دارنی! میں نے کاغذات او حسابات کے رجسٹر ایک بار نہیں' کئی بار دیکھے۔ انھیں دیکھ کر میں تو جی اسے نتیجے پر پہنچا کہ زمینداری اسی طرح چلتی رہی تو حویلی کا خرچ بھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ تسیں سکول کو بڑھانا اور ترکی دینا چاہتی ہو۔ ڈسپنسری لگانا چاہتی ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گا؟ کل بادی مرنے کی تو زمیں داری ہے۔ اسے بھی اب تک ٹھیک سے نہیں چلایا گیا۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں نادر خاں سے کہا۔

"برا نہ منائے زمیں دارنی تو میں نے صاف ہی صاف گل بات کرنی ہے۔" نادر خاں نے لہجے میں نرمی اور عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔

"میں ہر بات صاف ہی صاف سننا چاہتی ہوں۔"

"اپنی زمیں داری کا حال تو یہ ہے جی' نہ مزارعوں سے وگار لی جاتی ہے' نہ خرچہ' نہ منشیانا اور نہ کمیالہ ہی وصول کیا جاتا ہے۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "دوسرے سارے ہی وڈے زمیں دار تو مزارعوں سے گھر میں نیا دروازہ یا کھڑکی بنانے پر بھی دروازہ ٹیکس اور کھڑکی ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ مزارع نئی نئی خریدے تو نئی ٹیکس' گنڈ پالے تو گنڈ ٹیکس تک وصول کرتے ہیں۔ زمیں دار کے یہاں موت ہو جائے یا زچگی ہو' مونڈن ہو یا ختنہ' سب ہی کا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔"

"کہہ تو ٹھیک ہی رہا تو۔" رحیم داد نے نادر خاں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "سارے ہی وڈے زمیں داری کرتے ہیں اور جی سدا سے کر رہے ہیں۔"

"پر اپنی زمیں داری میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔" نادر خاں نے لہجے میں افسردگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "اپنے زمیں دار اللہ وسایا کا انتقال ہوا۔" اس نے جمیلہ کو مخاطب کیا۔ "زمیں دارنی! اس کا کفن دفن' تیجا' چالیسواں' سب تو نے اپنے ہی ڈب سے کیا۔ مزارعوں نے کچھ بھی نہ دیا۔ اپنی زمیں داری میں تو مزارعوں کو بٹائی کا حصہ بھی نصفا نصف دیا جاتا ہے جب کہ دوسرے زمیں دار ۷۵ بلکہ ۸۰ فی صد سے بھی اوپر حصہ وصول کرتے ہیں۔"

"نادر خاں تو کیسی گل کر رہا ہے؟ جب ۱۹۵۲ء کے کانون میں زمیں دار کا حصہ پیداوار میں ۴۰ فی صد مکرر کیا گیا ہے تو ہم اس سے زیادہ کیسے وصول کر سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نصفا نصف بٹائی بھی غلط ہی ہے۔ پتہ نہیں اب تک مزارعوں نے چپ کیوں سادھ رکھی ہے۔"

"زمیں دارنی! تو تو آدھی سے بھی زیادہ بٹائی دینے کی گل کر رہی ہے۔ لگتا ہے' میری باتوں کا تو الٹا ہی اثر ہوا۔" نادر نے جمیلہ کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "میں تو جی ان ٹیکسوں کی گل بات کر رہا تھا جو وصول نہیں کیے جاتے۔ میرا مطلب ہے۔"

"میں تیرا مطلب ٹھیک طرح سمجھتی ہوں۔" جمیلہ اس کی بات کاٹ کر تیکھے لہجے میں بولی۔ "تیری یہ طرح طرح کے ٹیکسوں والی گل سمجھ نہیں آتی۔ تجھے پتہ نہیں' میں نے تو اللہ وسایا کو نمبردار بھی بننے نہ دیا۔ اسے بار بار نمبرداری پیش کی گئی۔ پر میں نے ہر بار اس کی مندا کی۔"

"تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا زمیں دارنی۔ نمبرداری سے زمیں داری کی شان اونچی ہو جاتی ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے تو تگڑی رشوت چلتی ہے۔ سفارشیں پہنچائی جاتی ہیں۔ افسروں کی منت سماجت کی جاتی ہے۔" نادر خاں نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔ "برا نہ منانا زمیں دارنی' جب ہی تو اپنی زمیں داری بڑھنے کی بجائے سکڑتی جا رہی ہے۔"

"میں نے زمیں داری بڑھانی بھی نہیں۔" جمیلہ نے تیکھی نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ "میرے پیا کی پانچ ہزار ایکڑ سے بھی اوپر زمیں داری تھی۔ اسے اپنے پیو کی طرف سے ترکے میں اتنی وڈی زمیں داری نہیں ملی تھی۔ میرا پیا جات کا کراڑ تو نہیں تھا پر اس کا ساہوکارے کا بھی کاروبار تھا۔ اور بہت پھیلا ہوا تھا۔ سچ پوچھ تو اس نے اپنے ساہوکارے ہی سے اتنی وڈی زمیں داری بنائی تھی۔"

"وہ کیسے؟" رحیم داد نے حیرت سے دریافت کیا۔

"وہ زمین اور جائیداد رہن رکھتا تھا۔ اگاہی پر زمیں داروں اور کسانوں کو ادھار دیتا تھا۔ جب ادھار بیاج کے ساتھ بہت بڑھ جاتا تو وہ وصولی کے لیے عدالت میں نالش کرتا۔ زمیں دار اور

کرضائی کے خلاف ڈگری نکلواتا۔ ان کے گھربار' ڈھور ڈنگر' زمیں کرک کراتا۔ انھیں بے د
کرکے زمین ہتھیاتا۔ اس طرح وہ اپنی زمیں داری بڑھاتا رہا۔" جمیلہ کا لہجہ تلخ ہوتا گیا۔ "تجھے
پتہ' اس کے منیم اور کرندے زمیں سے بے دخلی کے لیے کیسا کیسا ظلم اور اپرادہ کرتے۔ گھروا
کرکی بٹھاتے۔ فصلیں اٹھوالے جاتے۔ پولیس کو رشوت دے کر گرفتاریاں کراتے۔" اس
آواز رفتہ رفتہ تیز اور اونچی ہوتی گئی۔ " زمیں داری کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے کارن جو
ڈھایا گیا۔ اس کا کیا نتیجہ نکلا؟"

جمیلہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ رحیم داد اور نادر کی جانب دیکھا۔ دونوں خاموش بیٹ
رہے۔ جمیلہ نے گہری سانس بھری۔ "یہ فسادات اور بلوے کیا تھے؟ کراڑوں اور ساہوکاروں
اپرادہ اور لوٹ مار کے خلاف کرض ادھار میں جکڑے ہوئے مسلمان کسانوں اور زمیں داروں
نفرت ہی تو تھی۔ میں نے تو کتابوں میں پڑھا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں بھی ملتان' مظفر گڑھ' جھنگ او
دوسرے ضلعوں میں اسی طرح کراڑوں اور ساہوکاروں کے خلاف مسلمان کسان اور زمین دار ا
کھڑے ہوئے تھے۔ کسان دوردہیوں نے ہندو ساہوکاروں کے گھروں پر ہلہ بول دیا۔ ان کے گھ
لوٹ لیے۔ آگ لگائی۔ بہت خون خرابہ کیا۔ اتنی گڑبڑ مچائی کہ دوردہی کسانوں پر کابو پانے کے لی
انگریزوں کو فوج لگانی پڑی۔ جگہ جگہ دوردہیوں اور فوج کے درمیان زبردست لڑائیاں ہوئیں۔
گڑبڑ تھوڑے دنوں نہیں' سال ڈیڑھ سال تک چلتی رہی۔"

"پر زمیں دارنی ۴۷ء کے فسادات اور بلووں میں تو ہزاروں کتل ہوئے۔ پورے پورے پنڈ اج
گئے۔ بستیاں کی بستیاں لوٹ لی گئیں۔ بہت زبردست تباہی ہوئی۔ بہت خون خرابہ ہوا۔" نادر نے
جمیلہ کی طرف دیکھا اور اس کی خوش نودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ "تو نے ٹھیک ہی کہا
فسادات اور بلوے ہندو بنیوں اور ساہوکاروں کے ظلم و ستم اور ان کی دھاندلیوں کے خلاف
مسلمان کسانوں اور دوسرے کرض داروں کی نفرت کا اظہار تھا۔ مگر فسادات کی صرف یہی ایک
وجہ تو نہیں تھی۔"

"اور بھی وجہ تھی۔ کئی طرح کی باتیں تھیں۔" رحیم داد نے نادر خاں کی تائید کی۔

"پنڈی' ملتان' منٹگمری' لہور اور نہ جانے کتنی جگہ تو یہ بھی ہوا کہ ہندوؤں اور سکھوں کا مال
اسباب لوٹنے' ان کی زمینوں اور املاک پر کبضہ کرنے کی غرض سے سیاسی لیڈروں اور وڈے زمیں
داروں نے باکاعدہ منصوبے کے تحت مسلمانوں کو طرح طرح سے اشتعال دلایا۔ اپنے بندوں کے
ذریعہ فسادات اور بلوے کرائے۔ لوٹ مار اور خون خرابہ کرایا۔" نادر خاں نے اپنی بات کہتے کہتے

ایک بار پھر نظریں اٹھا کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "زمیں دارنی! یہ تو تمیں نوں پتہ ہی ہے' ایک بار جب
نفرت اور غصے کی آگ سلگ جاتی ہے تو فیر ہر طرف پھیلنے لگتی ہے۔ سوال صرف چنگاری لگانے کا
ہے۔ میں نے ان گنہگار آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لہور میں کس طرح لیڈروں اور وڈے لوگوں نے
مختلف ہتھکنڈوں سے فسادات کی آگ بھڑکائی۔"

جمیلہ تو خاموش رہی' مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ اس نے پوچھا۔ "فسادات کے دنوں میں تو
ادھر ہی ہوتا تھا؟"

"میں ان دنوں لہور میں تھا۔ پر مجھے امرتسر بھی جانا پڑا تھا۔"

"مسلمان بھاگ کر ادھر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تو کیوں امرتسر چلا گیا؟ وہاں تو اس وکت
ہر طرف مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا تھا۔ گھربار لوٹے جا رہے تھے۔ تجھے اس جلتی آگ میں جانے
کی کیا سوجھی؟"

"وہ ایسا ہوا جی' میرا وڈا بھرا' منظور خاں' امرتسر کی ایک کپڑا مل میں سپروائزر لگا تھا۔" نادر خاں
نے بتایا۔ "جب اس نے حالات بگڑتے دیکھے اور آنے والے خطرے کی بو محسوس کی تو گھروالی کو
بچوں کے ساتھ لہور بھیج دیا۔ خود نوکری کی خاطر امرتسر میں رہا۔ جب امرتسر اور مشرکی پنجاب کے
دوسرے حصوں سے مسلمانوں کے خون خرابے اور لوٹ مار کی خبریں ادھر پہنچنے لگیں تو میری بھابی
نے گھر والے کے لیے رو رو کر برا حال کرلیا۔ گڑگڑا کر میری منت کی۔ مجھ سے اس کا یہ دکھ دیکھا نہ
گیا۔ ویسے بھی منظور میرا سگا بھرا تھا۔ آخر اسے لینے مجھے امرتسر جانا ہی پڑا۔ یہ نہ پوچھ کیسے وہاں
پہنچا۔"

"حد کردی تو نے۔" رحیم داد کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "تو وہاں سے نکل کر ادھر پہنچا کیسے؟
منظور تجھے مل گیا تھا؟"

"ہاں جی! وہ مجھے مل گیا تھا۔ وہ کٹڑا کنہیاں میں اپنے ایک ہندو جاننے والے' گنیش پرشاد' کے
گھر میں چھپا ہوا تھا۔ میں امرتسر پہنچنے کے بعد مسجد غزنویہ میں ٹھہر گیا۔ مسجد کے ساتھ مدرسہ بھی
تھا۔ اس کے مہتمم سے میری جان پہچان تھی۔ تب ہی تو میں وہاں ٹھہر سکا تھا۔ دوسرے محلوں اور
علاکوں کے مسلمان بھی بھاگ بھاگ کر شریف پورہ یا مسجد غزنویہ پہنچ رہے تھے۔ میں نے منظور کو
کسی نہ کسی طرح اپنے پہنچنے کی اطلاع بھجوائی اور اسے کہا کہ وہ بھی کوشش کرکے مسجد غزنویہ پہنچ
جائے۔ مسجد غزنویہ ان دنوں بہت محفوظ جگہ تھی۔ فیر جی ایسا ہوا کہ ایک رات منظور مسجد غزنویہ
پہنچ ہی گیا۔ اس نے ایسا بھیس بنایا تھا کہ پہلی نظر میں تو میں اسے ہندو سمجھا۔ دوسرے بھی یہی سمجھے

اور اسے پکڑ کر میرے پاس لائے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گلے سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو
لگا۔" نادر خاں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "وہ تو جی سمجھو موت کے منہ سے نکل کر آیا تھا۔ ان دنو
مسجد میں اور اس کے آس پاس بہت مسلمان اکٹھے تھے اور روز بروز ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہ
تھی۔"

"میں نے تو سنا ہے امرتسر کی مسجد غزنویہ میں مسلمانوں کا بہت خون بہا۔ بہت تباہی ہوئی۔
رحیم داد نے دریافت کیا۔ "میں نے غلط تو نہیں سنا؟"

"تو نے ٹھیک ہی سنا چوہدری۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "میں نوں اب تک وہ بھیانک رات
یاد ہے۔" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیلنے لگے۔ "میں بھولا نہیں۔ ایک ایک بات یاد ہے
رمضان کا مہینہ تھا۔ مسجد میں دن رات کلام پاک کی تلاوت ہوتی' وعظ ہوتا۔ دعائیں مانگی جاتیں
۱۴ اگست کو جب پاکستان بننے کا اعلان ہوا تو ہم دونوں بھائی مسجد غزنویہ ہی میں تھے۔ رمضان کی ۷
تاریخ تھی۔ نہ پوچھ کیسی خوشی منائی گئی۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے تھے۔ گرم جوشی سے
گلے ملتے تھے۔"

"اس وکت تک مسجد محفوظ رہی ہوگی؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"ہاں جی۔ پر تباہی بھی اس روز ساتھ ہی آئی۔" نادر خاں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "عید
سے تین روز پہلے کا ذکر ہے۔ مجھے ٹھیک طرح یاد ہے۔ مسجد کے صحن میں اور اس کے آس پاس
پڑے ہوئے مسلمان رات کو بھی جاگ ہی رہے تھے۔ ہر طرف سے تلاوت کی آوازیں آ رہی
تھیں۔ اچانک آدھی رات کو زبردست شور اٹھا۔ پتہ چلا' ریاستی اور گورکھا فوج نے مسجد پر دھاوا
بول دیا۔"

"فیر کیا ہوا جی؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ نہتے مسلمان فوج کے مسلح سپاہیوں کا کس طرح مقابلہ کر سکتے تھے۔ ڈر کے ادھر
ادھر چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم دونوں بھائی بھی مدرسے کے ایک حجرے میں چھپ گئے۔ رات
کے اندھیرے میں ہر طرف چیخ پکار مچی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کیا ہو رہا ہے۔ بہت دیر بعد
جب شور شرابہ رکا اور یہ اطلاع ملی کہ حملہ آور فوجی کتل غارت گری کر کے چلے گئے تو منظور کے
ساتھ میں حجرے سے نکل کر مسجد میں پہنچا۔ دیکھا صحن میں ہر طرف لاشیں بکھری ہیں کچھ سسک
رہے تھے۔ کچھ دم توڑ رہے تھے۔ کچھ زخموں سے تڑپ رہے تھے۔ کوئی مرہم پٹی کرنے والا بھی نہ
تھا۔ مسجد میں جدھر نظر جاتی' خون ہی خون نظر آتا۔"

"زنانیاں اور غیاریں نہیں تھیں؟" جمیلہ بہت دیر بعد بولی۔

"بہت تھیں جی۔" نادر خاں نے بتایا۔ "کچھ کی تو ننگی لاشیں مسجد کے صحن میں خون میں لتھڑی
پڑی تھیں۔ کسی کا پیٹ چاک تھا کسی کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ کچھ کو حملہ آور فوجی اور بلوائی اٹھا
کر لے گئے۔ کچھ نے اپنی آبرو بچانے کے لیے مسجد کے کنوئیں میں چھلانگیں لگائیں اور ڈوب کر
مر گئیں۔ ان کی لاشیں پانی پر تیرتی دکھائی دے رہیں تھیں۔"

"بہت ظلم اور اپراوہ ہوا۔" جمیلہ نے دکھ بھرے لہجے میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے نادر خاں سے دریافت کیا۔ "تو اور منظور اس خون خرابے کے بعد مسجد ہی میں
ٹھیرے رہے؟"

"نہیں جی' بلوچ رجمنٹ کی نگرانی میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہم دونوں کو بھی شریف پورہ
کے ریلیف کیمپ میں پہنچا دیا گیا تھا۔" نادر نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "ایک روز ایسا ہوا کہ علاکہ
مجسٹریٹ میجر پورن سنگھ' شریف پورہ کیمپ کے مسلمان پناہ گزینوں کا حال احوال معلوم کرنے آیا۔
اس سے فریاد کی گئی۔ ظلم و ستم کا حال بتایا گیا۔ میجر پورن سنگھ بہت متاثر ہوا۔ اس نے شہر کے
معائنے کا ارادہ کیا۔ ساتھ ہی کئی مسلمانوں کو بھی لیا۔ ان میں' میں بھی شامل تھا۔"

"تو بھی معائنے پر مجسٹریٹ کے ساتھ گیا تھا۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "کیا حال تھا شہر
کا؟"

"حال کی کیا پوچھتے ہو جی۔" نادر نے رقت انگیز آواز میں کہا۔ "مسلمان محلوں میں تو ہر طرف
تباہی نظر آتی تھی۔ جدھر نظر اٹھتی جلے ہوئے مکانات اور کھنڈر دکھائی دیتے۔ شہر کے گلی کوچوں
میں رستوں اور سڑکوں پر خون نظر آتا۔ لاشیں پڑی سڑتی تھیں۔ کسی کا سر کٹا ہوا' ہاتھ اور کسی کے
پیر۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "کوچہ رنگریزاں سے معائنہ ٹیم میجر پورن سنگھ کے ساتھ باہر نکلی
تو ایک مکان کے پرنالے سے لال لال اور تازہ خون بہہ رہا تھا۔ میجر کے ساتھ مکان کی چھت پر جا کر
دیکھا کہ ایک نوجوان زنانی اور اس کا ننھا سا نکا خون میں ڈوبے پڑے ہیں۔ زنانی کے بدن کے
ٹکڑے ہو گئے تھے۔ پر نکا اس نے چھاتی سے لگا رکھا تھا۔ دونوں ہی مر چکے تھے اور انھیں مرے
ہوئے زیادہ دیر بھی نہ گزری تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک جلتے ہوئے مکان کی چھت کے جنگلے کی
سلاخوں سے ایک زنانی کی جلی ہوئی بے جان ٹانگیں نیچے جھول رہیں تھیں۔ ہر طرف گوشت کے
جلنے کی بو پھیلی تھی اور مردہ زنانی کی جھولتی ہوئی ٹانگوں سے چربی پگھل پگھل کر نیچے گر رہی تھی۔"

"بس کر نادر۔" جمیلہ نے پریشان ہو کر نادر خاں کو منع کیا۔ "تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بہت ظلم اور

اپرادھ ہوا۔ کہتے ہیں سب پاگل ہو گئے تھے۔ پر سوال یہ ہے' وہ پاگل کیوں ہو گئے تھے؟ اس کا کوئی کارن تو ضرور ہی ہو گا؟ ایسے ہی تو کوئی پاگل نہیں ہو جاتا۔ میں تجھے یہی بتانا چاہتی تھی' پاگل پن کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟"

نادر خاں نے کہا۔ "ایک گل اور بھی ہے۔ فسادات اور بلوؤں کے بعد ہندو بنیے اور ساہوکار چلے گئے۔ پر ان کی جگہ مسلمان سناریوں اور زمیں داروں نے لے لی۔ وہ بھی اگاہی پر کرض ادھار دیتے ہیں۔ سود اور بیاج کھاتے ہیں۔ فرک کیا پڑا جی۔"

"تیرا مطلب ہے مزارعوں سے ویگار لی جائے۔ منشیانا اور کمالیہ لیا جائے۔ زبردستی طرح طرح کے ٹیکس وصول کیے جائیں۔" جمیلہ کے چہرے پر جھنجلاہٹ بکھر گئی' لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تو یہی چاہتا ہے ناں؟" اس نے صاف انکار کر دیا۔ "مجھے اس طرح زمیں داری نہیں بڑھانی۔"

"برا نہ منا۔" نادر خاں کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "زمیں دارنی! تو اپنا سکول وڈا بنانا چاہتی۔ ڈسپنسری بھی لگانی چاہتی ہے۔ میں کہتا ہوں ضرور ایسا کر۔ مزارعوں سے کوئی اور ٹیکس وصول نہ کر پر سکول اور ڈسپنسری ٹیکس تو فصل کی واڈھی پر وصول کرنا ہی چاہیے۔"

"کیوں وصول کرنا چاہیے؟" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"اس لیے کہ سکول اور ڈسپنسری تو انھیں کے لیے ہوں گے نا؟" نادر خاں نے جمیلہ کی خفگی نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مشورے پر زور دیا۔

"نہیں نادر! مجھے سکول اور ڈسپنسری کے لیے کوئی ٹیکس ٹیکس نہیں لینے۔" جمیلہ کا لہجہ بدستور تیکھا تھا۔ "مجھے ٹیکس کے چکروں میں نہ ڈال۔ ایک بار ٹیکسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو نت نئے شروع ہو جائیں گے۔ غیر بے دخلیاں ہوں گی۔ ظلم ہو گا' اپرادھ ہو گا۔ مجھے اس سے خوف ہے۔" اس نے انکار میں ہاتھ ہلایا۔ "میں نے تجھے بتایا تا کہ میرے پتا کی بہت وڈی زمیں داری تھی۔ میں نے وہ زمیں داری دیکھی ہے۔ مزارعوں سے طرح طرح کے ٹیکس وصول ہوتے ہوئے بھی دیکھے ہیں اور ان کے بل بوتے پر زمیں داری کے ٹھاٹھ باٹ بھی دیکھے ہیں۔ میں نے بہت کچھ دیکھا۔" اس نے بڑے جوش سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "فسادات اور بلوے دیکھے۔ بھلے چنگے بندوں کو پاگل اور وحشی ہوتے دیکھا۔ اور اس پاگل پن کا شکار بھی ہوئی۔ تجھے کیا پتہ وہ پاگل پن کیسا بھیانک تھا۔ ایک ڈراؤنا سپنا۔ ہاں' اب تو سپنا ہی لگتا ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "مجھے اس بھینکر کلپنا کی یاد نہ دلا۔"

رحیم داد اور نادر خاں دم بخود بیٹھے رہے۔ جمیلہ نے چادر کے پلو سے قطرہ قطرہ ٹپکتے ہوئے آنسو

پونچھے۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نادر خاں بھی کھڑا ہو گیا۔ جمیلہ نے مڑ کر اس کی سمت دیکھا۔ "نادر! میں بہت ابھاگن اور دکھی ہوں۔ ایسا نہ کر کہ مجھے اور دکھ پہنچے۔" اس کی آواز میں زخمی دل کی فریاد پنہاں تھی۔

"نہیں زمیں دارنی' تو ایسا نہ سوچ۔" نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔

رحیم داد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جمیلہ کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "تو جیسا کہے گی بالکل ویسا ہی ہو گا۔ فکر نہ کر۔ تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو گا۔"

"چودھری! مجھے تجھ سے یہی امید تھی۔" جمیلہ مطمئن ہو کر بولی۔ "تو بھی تو کم دکھی نہیں۔ تو نے بھی بہت ظلم اور اپرادھ اٹھایا ہے۔ تو جانتا ہے اور ٹھیک طرح جانتا ہے کہ ظلم اور اپرادھ کیا ہوتا ہے؟"

جمیلہ آگے بڑھی۔ کمرے سے نکل کر دالان میں گئی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اوپر کی منزل کے زینے پر پہنچی اور سیڑھیاں طے کرنے لگی۔

اس ملاقات کے بعد جمیلہ سے پھر بات چیت نہ ہوئی۔ نہ رحیم داد نے کوشش کی اور نہ ہی جمیلہ نے۔

☆

رحیم داد نے زمیں داری کے معاملات میں پوری توجہ کے ساتھ دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ وہ روزانہ نادر خاں کے ساتھ کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ فصلوں کو دیکھتا۔ کپاس کے پودوں میں ڈوڈے پھوٹنے لگے تھے۔ مکئی کے لمبے لمبے پتوں کے درمیان گنڈیاں اور ٹے ہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے جھومتے اور کماد کے اونچے اونچے پودوں پر پاندے پھیلتے جا رہے تھے۔

رحیم داد مزاروں سے ملتا۔ بات چیت کرتا۔ فصلوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نجی معاملات میں بھی دلچسپی کا اظہار کرتا۔ ان سے نرمی اور ہمدردی کا اظہار کرتا۔ دوپہر تک اس کا وقت عام طور پر کھیتوں کے درمیان گھومتے پھرتے اور مزاروں سے باتیں کرتے ہوئے گزرتا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ سو جاتا۔ شام کو پابندی سے باغ میں جا کر بیٹھ جاتا۔ وہاں بھی مزارعوں سے ملتا۔ مگر حویلی کے باہر کے اس سائبان کے نیچے وہ کسی روز نہیں بیٹھا جہاں اللہ وسایا مزارعوں سے اکثر و بیشتر ملتا تھا اور گھنٹوں بیٹھا ان کے ساتھ بات چیت کرتا رہتا تھا۔ رحیم داد کبھی کبھی ٹہلتا ہوا گاؤں میں چلا جاتا یا نہر کی طرف نکل جاتا۔ نادر ہمیشہ اس کے ہم راہ ہوتا۔

زمیں داری کی مصروفیات سے اکتا جاتا تو وہ دل بہلانے کے لیے احسان شاہ کے پاس چلا جاتا۔

دو تین روز ٹھیرتا۔ شام کو وسکی کی چسکی لگاتا۔ رات کو کبھی نوراں اور کبھی کسی اور نوجوان عورت کو کوٹ سے بلوالیتا۔ مگر احسان شاہ کی حویلی میں اس کا قیام اب طویل نہ ہوتا۔ چند ہی روز ٹھیرنے کے بعد واپس کوٹلہ ہرکشن آجاتا۔

احسان شاہ کی حویلی میں قیام کرنے اور اس کے ساتھ وقت گزارنے کا رحیم داد کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سرکاری افسروں اور بڑے زمیں داروں سے ملنے اور تعلقات پیدا کرنے کا پورا پورا موقع ملا۔ اس کے ذہن میں پولیس کے افسروں کی طرف سے جو خوف و خطرے کا احساس تھا وہ بھی رفتہ رفتہ زائل ہوچکا تھا۔ وہ سب سے بے دھڑک ملتا۔ لیکن وہ احسان شاہ کے پاس ہمیشہ چوری چھپے جاتا اور تخت محل جانے کا بہانہ کرتا۔

موسم دھیرے دھیرے بدلتا جا رہا تھا۔ دوپہر کو کسی قدر گرمی ہوجاتی مگر صبح خوش گوار اور سہانی ہوتی۔ شام کو ہلکی ہلکی خنکی ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ رحیم داد نے اب شام کو باغ میں بیٹھنے کا سلسلہ بند کردیا تھا۔

☆

جمیلہ سے پچھلے کئی ہفتوں سے رحیم داد کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں رحیم داد کو نظر ہی نہ آتی۔ عدت میں ہونے کے باعث اس نے چاچاں کے مشورے سے تاجاں کی شادی کی تاریخ بڑھا دی تھی۔ سسرال والوں نے بھی اس عذر کو قبول کرلیا تھا۔ جمیلہ نے جیسا کہا انھوں نے ویسا ہی کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ نہ حجت کی نہ اصرار کیا۔

عدت ختم ہونے میں اب تھوڑی ہی مدت رہ گئی تھی۔ خریف کی فصل تیار ہوچکی تھی۔ جمیلہ فصل کی کٹائی کے بعد ہی تاجاں کی شادی کردینا چاہتی تھی۔ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جمیلہ اسکول کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ شادی کی تیاریوں میں الجھی ہوئی تھی۔

نادر خاں نے بھی اب اپنی بیوی کو بلالیا تھا۔ بیوی اور تینوں بچیوں کے ساتھ وہ مہمان خانے ہی کے ایک حصے میں مقیم تھا۔ مگر وہاں مستقل رہنا نہ چاہتا تھا۔ رحیم داد بھی یہی چاہتا تھا۔ نادر کا ارادہ تھا کہ فصل کی کٹائی کے بعد ڈسپنسری کی تعمیر شروع ہوتو بھٹے سے آنے والی اینٹوں سے مہمان خانے کے قریب ہی اپنی رہائش کے لیے مکان بنوالے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار وہ رحیم داد سے کرچکا تھا۔ اور رحیم داد نے اسے مکان بنانے کی اجازت بھی دے دی تھی۔

نادر کی بیوی کا نام جنت بی بی تھا۔ وہ خوب صورت تو نہ تھی مگر رنگ صاف تھا۔ جسم گداز اور بھرا بھرا تھا۔ عمر ۳۵ برس کے لگ بھگ تھی۔ نادر خاں بھی اس کا دوسرا شوہر تھا۔ پہلے شوہر سے

اس نے طلاق لے لی تھی۔ اس سے دو بچے بھی تھے جو باپ کے ساتھ ہی قصور میں رہتے تھے۔

جنت گھر کے کام کاج سے فارغ ہوکر روزانہ جمیلہ کے پاس چلی جاتی۔ شام کو تو اس کا بیشتر وقت جمیلہ ہی کے پاس گزرتا۔ وہ رفتہ رفتہ جمیلہ سے قریب ہوتی جارہی تھی۔ جمیلہ کا رویہ بھی اس کے ساتھ خوش گوار اور مشفقانہ تھا۔ تاجاں کی شادی کی تیاریوں میں اس نے جنت کو بھی شریک کرلیا تھا۔ اس طرح وہ جمیلہ سے اور قریب ہوگئی۔ شادی بیاہ کی رسم و رواج کے سلسلے میں وہ جمیلہ کو مشورے بھی دیتی۔ جمیلہ ان کو مان بھی لیتی۔ وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اور اسی ماحول میں پروان چڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ لہٰذا مسلمانوں کی رسوم اور روایات سے پوری طرح اسے واقفیت نہ تھی۔ جنت اس سلسلے میں اس کی اچھی مشیر ثابت ہوئی۔

جنت بی بی ایک بار عدت کی مدت بھی گزار چکی تھی۔ اس معاملے میں وہ تجربہ کار بھی تھی۔ جمیلہ کی عدت ختم ہونے کو آئی تو اس نے نادر کو بتایا کہ عدت کے خاتمہ پر کیا کیا ہونا چاہیے۔ وہ چاہتی تھی کہ عدت جس روز ختم ہو رحیم داد کی جانب سے جمیلہ کو نیا جوڑا اور چوڑیاں بھیجی جائیں۔ ویسے جوڑا اور چوڑیاں میکے سے آنا چاہیے تھیں۔ مگر جمیلہ کا کوٹلہ ہرکشن میں بیٹھا ہی کون تھا جو اس فرض کو ادا کرتا۔

نادر خاں نے رحیم داد سے اس سلسلے میں بات کی۔ وہ اس وقت رحیم داد کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ نادر کی بات سن کر رحیم داد بولا۔ "ایسا کر نادر تو جمیلہ سے بھی پوچھ لے۔"

"اس سے کیا پوچھنا ہے جی۔" نادر نے مستعدی سے جواب دیا۔ "ویسے تو یہ زمیں دارنی کے کسی رشتے ناتے دار کی طرف سے ہونا چاہیے تھا۔ لیکن تیں نوں پتہ ہی ہے ادھر اس کا کوئی بھی نہیں۔ اب تیری ہی طرف سے اس کا بندوبست ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں جمیلہ سے بات کرنا مناسب نہیں لگتا۔ یہ رسم اسی طرح ہوتی ہے۔"

رحیم داد نے کوئی حجت نہ کی۔ صرف اتنا کہا۔ "کسی کو آج ہی لہور بھیج کر کپڑا منگوالے۔ مگر کپڑا ریشمی ہو۔" وہ چند لمحے نظریں جھکائے سوچتا رہا۔ "رنگ گلابی ہونا چاہیے۔ جمیلہ کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ چوڑیاں بھی عمدہ ہوں۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "میں تو کہتا ہوں تو خود ہی چلا جا۔ کپڑا لاکر اپنی گھر والی کو دے دینا۔ وہ ناپ لے کر خود ہی تیار کروالے گی۔ یہ زنانیوں کا کام ہے۔ اس کا نہ تجھے پتہ ہے اور نہ مجھے۔ ایسے سارے ہی کام ہمیشہ زنانیوں ہی کے لیے چھوڑ دینے چاہئیں۔" وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

دوسرے ہی روز نادر خاں لاہور چلا گیا۔ دوپہر کو رحیم داد بھی احسان شاہ کے گاؤں، پیراں والہ

چلا گیا۔ مگر رحیم داد نے وہاں صرف رات بھر کے لیے قیام کیا۔ سویرے اٹھ کر حویلی اسٹیشن
راستے پاک پتن پہنچا۔ بازار گیا۔ بھاول پوری چوڑی گروں کے بنائے ہوئے ہاتھی دانت
چوڑے خریدے۔ باہوں میں پہننے کے لیے باہیں خریدیں۔ بھاول پوری لہریا ریشمی لنگی
گل بوٹوں کا کڑھا ہوا دوشالہ' چاندی کے کرن پھول' مندریاں اور چھلوں کے علاوہ ناک میں
نے کا قیمتی بھاول پوری پوپا اور سونے کے کنگن خریدے۔ وہ اسی شام واپس آ گیا۔ نادر خاں دو
بعد لاہور سے لوٹا۔

عدت کی مدت کے چار مہینے دس دن پورے ہونے سے پہلے ہی جنت نے ریشمی جوڑا سلوا لیا
بس روز عدت ختم ہوئی۔ جمیلہ نے صبح اٹھ کر غسل کیا۔ جنت نے اصرار کیا تو اس نے گلابی ر
جوڑا پہن لیا۔ کلائی میں چوڑیاں بھی ڈال لیں۔ مگر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اللہ دسایا اسے
بار بار یاد آتا۔ اس نے آنسو پونچھے۔ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا۔ جنت نے کنگھی سے جمیلہ کے
سنوارے۔ آنکھوں میں کاجل لگایا۔ پھر وہ حویلی کی چند خادماؤں کے ہم راہ جمیلہ کو مسجد لے گئ
مسجد کے دروازے پر پہنچ کر جمیلہ نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ جنت نے جمیلہ ہی کے ہاتھ سے مسجد
ملا کو پانچ روپے دلوائے۔

اب جمیلہ پر حویلی سے بے دھڑک باہر جانے اور کسی نامحرم کے سامنے آنے کی پابندی اٹھ
تھی۔ مگر جمیلہ مسجد سے واپس آنے کے بعد سیدھی اوپر کی منزل پر گئی اور اپنے کمرے میں تنہا
رہی۔ رحیم داد بڑے کمرے میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نیچے نہ اتری۔

دن ڈھلنے لگا۔ رحیم داد غسل خانے میں گیا۔ نہا دھو کر ڈبل گھوڑا بوسکی کی نئی قمیص اور شلوار
پہنی۔ آنکھوں پر سنہری فریم کا نیا چشمہ لگایا۔ یہ لباس اور چشمہ نادر خاں کا بھتیجا لاہور سے خرید
لایا تھا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد رحیم داد نے سر کے بال خوشبودار تیل ڈال کر جمائے
داڑھی کو کنگھی سے سنوارا۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالا۔ عطر لگایا۔ اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو
دیر تک اپنی سج دھج دیکھتا رہا۔ وہ اس وقت وجیہہ اور باوقار لگ رہا تھا۔ چہرے پر تازگی تھی
رخساروں پر سرخی جھلکتی تھی۔ آنکھوں میں طراوت اور تابندگی تھی۔

اس نے احمد کی بیوی تاراں کو بلوایا اور وہ تمام ساز و سامان' جو اس نے چند روز قبل پاک پتن
سے خریدا تھا ایک طشت میں رکھ کر جمیلہ کے پاس بھجوایا۔ وہ کچھ دیر اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر
حویلی سے باہر جانے کے ارادے سے نکلا تو تاراں کی زبانی یہ پیغام ملا کہ جمیلہ نے اسے اپنے کمرے
میں بلایا ہے۔

☆

یہ گلابی جاڑوں کی ہنستی مسکراتی شام تھی۔ فضا میں خنکی تھی۔ کہر کا ہلکا نیل گوں دھندلکا ڈوبتے
سورج کی نارنجی شعاعوں میں گھلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد کی آنکھوں میں سنہرے خواب جاگ رہے
تھے۔ اس نے دھڑکتے دل سے سیڑھیاں طے کیں۔ اوپر پہنچا۔ زینے کی ممٹی کے سامنے کھلی چھت
تھی۔ چھت کے ایک سرے پر تین کمرے تھے۔ دو کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔ تیسرے کی صرف
کھڑکیاں چھت کی جانب کھلتی تھیں۔ اس میں آمد و رفت کے لیے دروازہ ملحقہ کمرے ہی میں کھلتا
تھا۔

رحیم داد نے دیکھا' بائیں ہاتھ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ اس کمرے میں وہ ایک بار پہلے بھی
آ چکا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے کمرے کے اندر نظر دوڑائی۔ لیمپ کی گہری زرد
روشنی میں جمیلہ مونڈھے پر بیٹھی تھی۔ وہ گلابی لباس میں پھول کی مانند شگفتہ اور دل کش نظر آ رہی
تھی۔ سامنے میز پر طشت میں وہ تمام اشیاء اسی طرح رکھی تھیں جس طرح رحیم داد نے تاراں
کے ہاتھ بھجوائی تھیں۔

رحیم داد کو دیکھ کر جمیلہ نے کہا۔ "چوہدری! اندر آ جا۔" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ
کیا۔ "بیٹھ جا۔"

وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ جمیلہ نے سامنے رکھے ہوئے طشت کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔
"تو نے یہ سب کچھ کس لیے بھیجا ہے؟"

"تیرے ہی لیے بھیجا ہے۔" رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "سوچا تیری عدت تو ختم
ہو چکی ہے۔ تجھے ان کی ضرورت ہو گی۔ اب تو انھیں پہن سکتی ہے۔" وہ بے تکلفی سے کھل کر
مسکرایا۔ "میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

"ہاں' اب میں انھیں پہن سکتی ہوں۔ تو نے ٹھیک ہی سوچا۔"

"ہوا یہ کہ تخت محل سے واپسی پر میں بھاول نگر گیا تھا۔" رحیم داد نے بتایا۔ "بازار گیا تو تیرے
لیے یہ چیزیں خرید لیں۔ پہلے بھی خرید لیتا۔ پر تب تو انھیں پہن نہیں سکتی تھی۔"

"لایا تو بہت شاندار چیزیں ہے۔" جمیلہ نے طشت سے کنگن اٹھائے۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں
میں ہاتھی دانت کے چوڑے دبائے۔ "بھاول پوری چوڑی گروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں ناں؟
بہت سندر ہیں۔"

"تیری کلائیوں اور باہوں پر بہت شان دار لگیں گے۔" رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ "انھیں پہن

لے۔"

"نہیں! میرے پمن نے کا سے بیت گیا۔" وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ "یہ داجلو گہنے پاتے ہیں۔ ناجاں کے دسیج کے لیے ٹھیک رہیں گے۔ وہ ڈیڑھ دو مہینے بعد مائیاں بیٹھ جائے گی۔"

"اس کی دسیج کے لیے اور لے آؤں گا۔" رحیم داد نے اصرار کیا۔ "میری خوشی ہے تو انھیں ابھی میرے سامنے پمن لے۔" اس نے جمیلہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "تو ناجاں کی فکر نہ کر۔"

"نہیں۔ میں انھیں نہیں پہنوں گی۔" جمیلہ نے صاف انکار کردیا۔

مگر رحیم داد ناامید نہ ہوا۔ ہنس کر پوچھا۔ "کیوں نہیں پہنے گی؟"

"میرا من نہیں چاہتا۔" جمیلہ کے چہرے پر دکھ کا غبار بکھرنے لگا۔ "مجھے مجبور نہ کر۔"

رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھرپور نظروں سے دیکھا۔ اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

جمیلہ نے نگاہیں نیچی کرلیں۔ رحیم داد نے آہ بھرنے کے انداز میں گہری سانس بھری۔ آہستہ سے کہا۔

"جمی لے!"

جمیلہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ رحیم داد نے پہلی بار اللہ وسایا کے پیار بھرے انداز سے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ تڑپ کر بولی۔ "تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"برا نہ منا۔" رحیم داد موم کی طرح پگھل گیا۔ اس کے لہجے میں عاجزی کے ساتھ ساتھ لگاوٹ بھی تھی۔ "تیں نوں پتہ نہیں' تو کتنی سوہنی ہے۔ اور جوان بھی ہے۔ کب تک اللہ وسایا کو یاد کرتی رہے گی۔ وہ اب واپس آنے سے تو رہا۔"

"میں نوں پتہ ہے وہ واپس نہیں آسکتا۔" جمیلہ نے بہت سنبھلے ہوئے انداز میں کہا۔ "سچ پوچھ تو اب مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ بہت دن بیتے جب مجھے ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اللہ وسایا کے روپ میں مجھے وہ سہارا مل بھی گیا تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب میرا سہارا نینا اور گڈو ہیں۔ مجھے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں کیول ان دونوں کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔"

"تو ضرور ان کے لیے زندہ رہ پر کچھ اپنا بھی تو خیال کر۔" رحیم داد نے لہجے میں رقت پیدا کی۔ "تیں نوں کسی کے سہارے کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ پر مجھے تیرے سہارے کی ضرورت ہے۔ میں تو

یہ چاہتا ہوں۔"

"میں نوں پتہ ہے تو کیا چاہتا ہے؟" جمیلہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "پر جو تو چاہتا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ اس وچار کو اپنے من سے نکال دے۔ اسے بھول جا۔"

"کیسے بھول جاؤں۔" رحیم داد نے چہرے پر افسردگی طاری کرنے کی کوشش کی۔ عاجزی سے بولا۔ "میں بھی تیری طرح دکھی ہوں۔ اجڑا ہوا ہوں۔ برباد ہوا ہوں۔" اس نے بجھی بجھی نظروں سے جمیلہ کو دیکھا۔ "اجڑ کر ایک بار فیر سنبھلنے کا موقع ملا تھا۔ تیں نوں پتہ ہے' اب وہ بھی نہ رہا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ رابعہ دوسرے کی ہو چکی ہے۔ اس نے منت کرنے پر بھی بیٹی کو میرے ساتھ نہ آنے دیا۔"

جمیلہ نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ چپ بیٹھی رہی۔

رحیم داد چند لمحے خاموش رہنے کے بعد غم زدہ لہجے میں گویا ہوا۔ "مجھے سمجھنے کی کوشش کر۔ میرا دکھ تو جانتی ہے۔"

"میں تجھے اور تیرے دکھ کو ٹھیک طرح جان چکی ہوں۔" جمیلہ کے لہجے میں تلوار کی کاٹ تھی۔ "صاف صاف سن نا چاہتا ہے تو سن لے۔" وہ ہانپنے کے انداز میں تیز تیز سانسیں بھرنے لگی۔ "تو مجھ سے بہانہ کر کے احسان شاہ کے پاس جاتا رہا۔ اس کی حویلی میں ٹھیرتا اور ہر بار مجھ سے جھوٹ بولتا رہا۔"

رحیم داد سخت سٹ پٹایا۔ بدحواس ہو کر بولا۔

"تجھے یہ کس نے بتایا؟ یہ بالکل غلط ہے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے الجھا۔ "کسی نے تجھے بہکا دیا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"چوہدری! چپ کر۔ زیادہ بکواس نہ کر۔" جمیلہ نے اسے غصے سے ڈانٹا۔ "احسان شاہ کا پنڈ پیراں والہ یہاں سے دور ہی کتنا ہے۔ چند میل کا تو فاصلہ ہی ہے۔ تونے یہ نہ سوچا یہ بات کب تک چھپی رہے گی۔ کسی پنڈ میں کوئی نیا بندہ آجائے تو آس پاس کے ہر پنڈ میں اس کی خبر پھیل جاتی ہے۔ تو تو بہت دنوں سے احسان شاہ کے پاس جارہا ہے۔ اس کے ساتھ کئی کئی روز ٹھیرتا رہا ہے۔"

جمیلہ ابھی کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ اسی اثنا میں تاراں دروازے پر نمودار ہوئی۔ وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ جمیلہ نے تاراں کو دیکھتے ہی کہا۔

"چوہدری' اب تو جا۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ کمرے سے باہر آیا۔ رات در و دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ ہر طرف
اندھیرا چھایا تھا۔ گہری دھند میں لپٹی ہوئی حویلی اونگھ رہی تھی۔

[illegible]

حویلی کے شمال میں گاؤں کا رڑ تھا۔ رڑ کے اس پار دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ خریف کی
فصل تیار ہو چکی تھی۔ مکئی اور کماد کے پودے خوب اونچے ہو گئے تھے۔ ان کے لمبے لمبے پتے کہیں
کہیں سے زرد پڑ گئے تھے۔ مکئی کے سٹوں سے ادھر ادھر نکلے ہوئے مبلوں کے سفید اور باریک
سوت بکھرے ہوتے تو جھالر بن کر لہراتے۔ سمٹ کر گتھ جاتے تو پھندنے معلوم ہوتے۔ کماد کے
بعض پودے اتنے زیادہ پک گئے تھے کہ پتوں پر آگری نکل آئی تھی۔

کپاس کے پودے گھنے اور چھوٹے تھے۔ ان کے ڈوڈوں سے روئی کے سفید سفید توبے پھوٹ کر
باہر نکل آئے تھے۔ یہ چھٹی تھی۔ مکئی، چری اور کماد کے پودوں کی کٹائی کے ساتھ چھٹی کی چنائی بھی
شروع ہونے والی تھی۔

رحیم داد ناشتا کر چکا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے رڑ کے اس پار کھیتوں کو دیکھ رہا تھا۔
کھیتوں پر ابھی تک پالا پڑ رہا تھا۔ دھند کی ہلکی ہلکی سرمئی تہہ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ پچھلے کئی روز
سے وہ کھیتوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ اس کا بیشتر وقت کمرے کے اندر ہی گزرتا۔ دن ڈھلے کبھی
کبھار نہر کی طرف نکل جاتا۔ مگر نہ احسان شاہ کے گاؤں پیراں والہ گیا نہ اس کا ایسا ارادہ تھا۔

نادر خاں سے اس کی ملاقات ان دنوں عام طور پر صبح کے وقت ہوتی۔ نادر نے اس کی خلاف
معمول بڑھی ہوئی عزلت پسندی اور خاموشی محسوس کی۔ ایک روز کرید کر سبب معلوم کرنے کی
کوشش بھی کی۔ لیکن رحیم داد نے اس کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ نہ کچھ بتایا نہ اعتماد میں لینے
کی کوشش کی۔ اس نے جمیلہ سے اپنی ملاقات تک کا اس سے ذکر نہیں کیا۔ البتہ زمیں داری کے

بارے میں وہ ہر روز نادر خاں سے بات چیت کرتا اور اکثر دیر تک کرتا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا نادر خاں کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے اندازہ لگا لیا کہ جمیلہ اوپر کی منزل سے نیچے آ رہی ہے۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ پچھلے سات آٹھ روز سے جمیلہ سے اس کی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ نہ رحیم داد نے کوشش کی اور نہ ہی جمیلہ نے اس کی جانب کوئی توجہ دی۔ جمیلہ ہر صبح اوپر سے نیچے آتی۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے چپ چاپ گزرتی اور اپنے دونوں بچوں کے ہم راہ اسکول چلی جاتی۔ واپسی پر بھی وہ بے نیازی سے اوپر چلی جاتی۔ اسکول کے علاوہ اس کا زیادہ وقت اوپر کی منزل پر گزرتا۔ کوئی ملنے آتا تو اسے بھی وہ اوپر ہی بلوا لیتی۔

جمیلہ ذرا دیر بعد رحیم داد کے سامنے پہنچ گئی۔ گڈو اس کی انگلی پکڑے ہوئے تھا۔ اور نینا ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ان کے پیچھے تاجاں تھی۔ وہ بچوں کے بستے، سرخ اون کا بڑا سا گولا اور اس میں پھنسی ہوئی بنائی کی سلائیاں اٹھائے ہوئے تھی۔ جمیلہ کا لباس سفید اور صاف ستھرا تھا۔ وہ ہلکا اونی شال اوڑھے ہوئے تھی۔ سیاہ شال پر سنہری بوٹیوں کی کشیدہ کاری تھی۔ زری کے کام کے ساتھ سبز اور سرخ ریشمی دھاگوں کی کڑھائی بھی تھی۔ وہ گردن اونچی کیے چل رہی تھی۔ رحیم داد اسے بجھی بجھی نظروں سے دیکھتا رہا۔

جمیلہ چلتے چلتے ٹھٹکی، دہلیز پر رکی۔ گردن کو خم دے کر اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ رحیم داد جھٹ کھڑا ہو گیا۔ جمیلہ نے اسے مخاطب کیا۔ "چوہدری! تو آج کل کھیتوں کی اور نہیں جاتا۔ خریف کی فصل تیار ہے۔ اس کی واڈھی کا بھی بندوبست کرنا ہے۔"

"زمیں دارنی! میری طبیعت پچھلے کئی روز سے گڑبڑ رہتی ہے۔" رحیم داد نے معذرت کے انداز میں رسان سے کہا۔ "فکر نہ کر۔ نادر خاں ہر کام کی پوری طرح دیکھ بھال کر رہا ہے۔"

"کیا دیکھ بھال کر رہا ہے؟" جمیلہ کا لہجہ تیز اور تیکھا تھا۔ "اسے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ پھٹی میں لال سونڈی لگ گئی ہے۔ کئی بوٹوں پر چست تیلا اور سفید مکھی بھی نظر آئی۔ ڈوڈے سکڑ کر رہ گئے ہیں۔ کئی کھیتوں میں تو ڈوڈوں سے تو نبے پھوٹے ہی نہیں۔ مجھے کل ہی رحمان نے بتایا۔ میں خود دیکھنے گئی تھی۔ اپنی آنکھوں سے پھٹی کے بوٹوں میں سونڈی اور دوسرے کیڑے دیکھے۔" اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی جھنجلاہٹ ابھرنے لگی۔ "اس طرح کیسے کام چلے گا؟ کپاس کی ساری فصل تباہ ہو جائے گی۔"

"ابھی نادر آتا ہو گا۔ میں اس سے بات کروں گا۔" رحیم داد نے کرسی کی جانب اشارہ کیا اور

لہجے میں عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ذرا دیر یہاں ٹھہر جا۔ نادر سے بات کر لے۔ جو کچھ کرنا ہے اسے سمجھا دے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کے لیے رکا اور سر کے بال انگلی سے کریدنے لگا۔

"سمجھ نہیں آتی پھٹی میں سونڈی کیسے لگ گئی اور نادر نے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟ روز سویرے میرے پاس آتا ہے۔ پہلے مجھ سے گل بات کرتا ہے۔ بعد میں کھیتوں کی طرف جاتا ہے۔"

"مجھے کیا پتہ، وہ کیا کرتا ہے اور تجھے کیا بتاتا ہے؟" وہ بے زاری سے بولی۔

"تو ذرا دیر کے لیے بیٹھ تو جا۔" رحیم داد نے نرمی سے اصرار کیا۔ "نادر آنے ہی والا ہے۔ میں چاہتا ہوں تیرے سامنے ہی اس سے گل بات ہو۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں تو خود پوچھ تاچھ کر۔ تنخواہ لیتا ہے مفت تو کام نہیں کرتا۔"

"میں نے تو اب سکول جانا ہے۔" جمیلہ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ تو خود ہی نادر سے گل کرنا۔ ویسے بھی زمیں داری تجھے ہی سنبھالنی ہے۔ میں نے اس سے کیا لینا؟"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے جمیلہ کی سمت دیکھا۔ لہجے میں اور زیادہ نرمی پیدا کی۔ "زمیں دارنی! ایسی بات نہ کر۔ یہ بتا میں نوں نادر سے کیا کہنا ہے؟"

"کیا کہنا ہے؟" اس دفعہ جمیلہ کے رویے میں جھنجلاہٹ کے بجائے سنجیدگی کا پہلو نمایاں تھا۔ "اس سے کہہ کہ پھٹی کے بوٹوں پر فوراً کیڑے مار دوا کا سپرے کرائے۔ ورنہ کپاس کی فصل کا ستیاناس ہو جائے گا۔"

ننھے گڈو نے ماں کے کرتے کا دامن کھینچا اور مچلنے کے انداز میں بولا۔ "ماں جی! سکول نہیں جانا۔ میں نے پڑھائی کرنی ہے۔"

"چلتی ہوں، ابھی چلتی ہوں۔" جمیلہ نے پیار سے گڈو کا رخسار تھپ تھپایا پھر رحیم داد کی جانب متوجہ ہوئی۔ "چوہدری! میں تو سکول جا رہی ہوں۔ تو نادر سے بات کر لینا۔ بات کیا کرنی ہے۔ یہ کام تو تجھی کو کرنا ہو گا اور ترنت کرنا ہو گا۔ آج ہی بوٹوں پر دوائی چھڑکنے کا بندوبست کر۔ پہلے ہی بہت خرابی ہو چکی ہے۔" جمیلہ آگے بڑھی۔

"ٹھیک ہے، جیسا تو کہتی ہے وہی کروں گا۔" رحیم داد رسان سے بولا۔ "نینا اور گڈو کو سکول جانے دے، تو تھوڑی دیر ٹھہر جا۔"

"اب مجھے ٹھہر کر کیا کرنا ہے؟ جو گل بات نادر سے کرنی تھی وہ میں نے تجھے سمجھا ہی دی۔ ا[ب] مجھے کیوں روک رہا ہے؟"

"میں نوں تجھ سے کچھ اور ضروری گل کرنی ہے۔" رحیم داد کے لہجے میں التجا تھی۔

جمیلہ کچھ نہ بولی۔ آگے بھی نہ بڑھی۔ وہ گردن اٹھائے کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس کی آواز ابھری

"میں دوپہر کو واپسی پر تیرے پاس آؤں گی۔" اس نے رحیم داد کی جانب نہ دیکھا' خاموشی سے آ[گے] بڑھ گئی۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ چلے۔ تاجاں بھی ان کے پیچھے پیچھے بڑھی۔

رحیم داد نظریں اٹھائے جمیلہ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی چال میں وہی پہلی سی تمکنت تھی۔ وہی بانک پن تھا۔ سادگی کے باوجود اس کے گلابی چہرے کے تیکھے نقش و نگار دل کش او[ر] حسین نظر آ رہے تھے۔ جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ رحیم داد مضمحل ہوگیا۔ اس نے گہری سانس بھری' پلٹا اور کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

رحیم داد کمرے سے باہر نہیں گیا۔

پہر دن گزر گیا۔ سورج چڑھ کر بلندی پر پہنچ گیا۔ مگر نادر نہیں آیا۔ رحیم داد نے حویلی کے ملاز[م] نام دار کو بلایا۔ اسے نادر خاں کی تلاش میں بھیجا۔ وہ جلد ہی واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ نادر کسی ضروری کام سے نزدیک کے چک میں گیا ہے۔ وہ سویرے سویرے نکل گیا تھا۔ دوپہر تک لوٹے گا۔

یہ اطلاع نادر کی بیوی جنت بی بی نے دی تھی۔ رحیم داد نے نام دار سے مزید بات نہیں کی۔ وہ چلا گیا۔

رحیم داد بے قراری سے جمیلہ کا انتظار کرنے لگا۔

☆

وقت زخمی سانپ بن گیا۔ آہستہ آہستہ رینگتا رہا۔ رحیم داد کی بے قراری بڑھتی گئی۔ سورج آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ حویلی کے وسیع صحن میں دور تک پھیلی ہوئی چمکیلی دھوپ کی تمازت بڑھ گئی۔ دوپہر ہوگئی۔ جمیلہ واپس ہوئی۔ دونوں بچے اس کے ہم راہ تھے۔ اس دفعہ ان کی کتابیں احمد اٹھائے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر رحیم داد کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

جمیلہ کمرے کے سامنے پہنچی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ اس نے رحیم داد کے کمرے کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ رحیم داد کا دل ایک بار زور سے دھڑکا۔ پھر ٹھہر کر گویا سرد پڑ گیا۔ وہ بجھ کر رہ گیا۔ اس نے کرسی کی پشت سے گردن ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

اس عالم میں وہ نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ یکایک چاپ ابھری۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول

دیں۔ دیکھا' دہلیز پر جمیلہ کھڑی ہے۔ رحیم داد چند لمحے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا پھر ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔ الجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "میں تو سمجھا تھا' آج تو نہیں آئے گی۔"

جمیلہ نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک فائل دبی تھی۔

رحیم داد بھی چپ چاپ قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد پوچھا۔ "بتا' تو نے کون سی ضروری گل بات کہنے کے لیے مجھے بلایا ہے؟" اس کے لہجے سے بے زاری صاف ظاہر تھی۔

"تجھ سے کسی نے غلط بتایا میں احسان شاہ کے پاس جاتا ہوں۔" رحیم داد نے صفائی پیش کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ "اس روز بہت نراش تھی۔ اس لیے میں تجھے ٹھیک سے سمجھا نہ سکا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے تو کیا کہنا چاہتا ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ "چوہدری! مجھے بہت پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ تو احسان شاہ کے پنڈ پیراں والہ جاتا ہے۔ اس کی حویلی میں کئی کئی روز ٹھہرتا ہے۔ پر میں نے وشواس نہ کیا۔ ہر بار یہی سوچ کر من کو سمجھا لیا کہ تو ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"اب تو نے کیسے وشواس کرلیا؟" رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ بھی سننا چاہتا ہے تو سن لے۔" جمیلہ کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔ "پچھلے دنوں اپنا وکیل محمد عثمان رندھاوا آیا تھا۔ تو اس روز احسان شاہ کے پاس گیا تھا۔" جمیلہ نے رحیم داد کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تجھے پتہ نہیں' رندھاوا نے لہور میں پریکٹس شروع کردی ہے۔ آج کل وہ تیرے اور احسان شاہ کے یار' سردار مراد خاں شاہانی کے ایک کیس میں پیروی کررہا ہے۔ شاہانی نے احسان شاہ کے ساتھ تیرے میل ملاپ کے بارے میں جو کچھ بتایا' اس کے بعد میرے وشواس نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔" جمیلہ نے ہاتھ میں دبی ہوئی فائل رحیم داد کی جانب بڑھا دی۔ "یہ تیرے کلیم کے کاغذات ہیں۔ وکیل انھیں واپس دے گیا ہے۔ کلیم میں جو گڑبڑ ہے وہ تجھے خود ٹھیک کرانی ہوگی۔ وکیل اب یہ کام نہیں کرے گا۔"

رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔ "میں کلیم شلیم کو کہاں ٹھیک کراتا پھروں گا؟" اس نے کاغذات کی فائل سنبھال لی۔

"یہ مجھے نہیں پتہ تو نے کیا کرنا ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔ "میں تو کول یہی کاغذات واپس کرنے آئی تھی۔ ورنہ میں نوں پتہ تھا' تو نے مجھ سے کیا کہنا ہے۔"

رحیم داد نظریں جھکائے پریشان بیٹھا رہا۔ کمرے پر سکوت طاری ہوگیا۔ جمیلہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ رحیم داد نے اس کی بے چینی شدت سے محسوس کی۔ دبی زبان سے پوچھا۔

"وکیل کب آیا تھا؟"

جمیلہ نے تیکھے لہجے میں بتایا۔ "جن دنوں تو تخت محل جانے کا بہانہ کرکے احسان شاہ کی حویلی میں ٹھہرا ہوا تھا۔"

"تیرا مطلب ہے' میں تخت محل نہیں گیا تھا؟" رحیم داد نے ہڑبڑا کر تردید کی کوشش کی۔ "نہیں میرے بارے میں تو نے ایسی باتیں کہاں سے سن رکھی ہیں؟"

"چوہدری! خاما خاہ ٹ دھری نہ کر۔" جمیلہ نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ "مجھے ایک ایک بات کا پتہ ہے۔ میں نوں پتہ ہے تو کبھی تخت محل نہیں گیا اور نہ تخت محل میں تیرے بال بچے ہیں۔ میں نے کھوج لگایا تو معلوم ہوا تخت محل کے پٹواری کی گھروالی کا نام رابعہ نہیں' نسیم بی بی ہے۔ وہ اس کی پہلی گھروالی ہے۔ پچھلے سولاں سال سے اس کے ساتھ ہے۔ وہ بھاول نگر ہی کی رہنے والی ہے۔ کبھی گورداس پور نہیں گئی۔ اس کی کوئی جوان دھی نہیں۔ پتر سب سے وڈا تھا' پچھلے سال مر گیا۔ اور کچھ جاننا چاہتا ہے' وہ بھی بتا دوں؟"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جمیلہ نے گہری سانس بھری۔ اس کے لہجے کی تلخی افسردگی میں بدل گئی۔ "میں نے تو یہ بھی سنا ہے' اللہ وسایا کے قتل میں تو بھی احسان شاہ کے ساتھ شریک تھا۔"

اب رحیم داد خاموش نہ رہ سکا' اس نے احتجاج کیا۔ "یہ بالکل جھوٹ ہے۔" رحیم داد نے تلملاتے ہوئے کہا۔ "میں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں' اللہ وسایا کو کس نے قتل کیا اور کیسے کیا؟ تو مجھے اتنا نیچ اور کمینہ سمجھتی ہے۔ میں تو کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"شاید تو ٹھیک کہہ رہا ہو۔" جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ظاہر کر رہے تھے کہ رحیم داد نے اپنی باتوں سے اسے خاصا متاثر کیا ہے۔ جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "میں تجھے دوش نہیں دیتی' کسی کو بھی نہیں دیتی۔ میرے بھاگ ہی میں یہ دکھ جھیلنا لکھا تھا۔ اب ان باتوں میں الجھنے سے کیا ملے گا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو امڈے اور پلکوں پر لرزنے لگے۔ رحیم داد نے لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "زمیں دارنی! تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ میں نوں پتہ ہے تو بہت دکھی ہے۔ اس طرح نہ رو۔" اس نے جمیلہ کی دل جوئی کے ساتھ ساتھ اپنی صفائی پیش کرنے کی بھی کوشش کی۔ "میرے بارے میں تو نے جو کچھ سنا ہے' اس میں کتنا سچ ہے کتنا جھوٹ میں نوں اب کچھ نہیں کہنا۔" اس نے آواز میں مزید افسردگی پیدا کی اور آخری حربے کے طور پر جمیلہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ "اب تو میرے لیے ایک ہی رستہ رہ گیا ہے۔ کہہ تو میں یہاں سے چلا جاؤں۔"

"نہیں چوہدری! تجھے یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں۔" جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اپنے دونوں بچوں کو لے کر خود یہاں سے چلی جاؤں گی۔ اب یہ حویلی میری نہیں رہی' یہ پنڈ میرا نہیں رہا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں نے بہت پہلے یہ بات سوچ لی تھی۔ تجھے چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" رحیم داد منت سماجت پر اتر آیا۔ عاجزی سے بولا۔ "مجھے معاف کر دے زمیں دارنی! جو کہے گی ویسا ہی ہو گا۔ سچ کہتا ہوں' ویسا ہی ہو گا۔ تو مجھے آزما لے۔"

"دیکھ چوہدری! میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں نے تو اب یہاں سے چلا ہی جانا ہے۔"

"سرحد پار اپنے گھر والوں کے پاس جائے گی؟" رحیم داد نے الجھتے ہوئے اپنے شبے کا اظہار کیا۔

"نہیں۔" جمیلہ نے سختی سے انکار کیا۔ اس کے چہرے پر جھلاہٹ آگئی۔ "ان کے پاس جانا ہوتا تو پہلے کس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا؟ اب تو میرے وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تو کہیں بھی جا۔ پر یہاں سے جا کر کیا کرے گی؟" رحیم داد نے نرمی سے کہا۔ "ایسا خیال دل سے نکال دے۔ یہ تو سوچ' تو یہاں سے جا کر کہاں رہے گی؟ کیا کرے گی' کس کے پاس رہے گی؟"

"چنتا نہ کر چوہدری!" جمیلہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میں اتنی پڑھی لکھی ہوں' آرام سے کسی سکول میں لگ جاؤں گی۔ رہ گئی زمیں داری' تو مجھے نہ پہلے اس سے کوئی دلچسپی تھی نہ اب ہے۔ میں تو اپنے گڈو کو بھی زمیں دار نہیں بنانا چاہتی۔ میں نے اسے ڈاکٹر بنانا ہے۔ تجھے پتہ ہے میں اسے کیوں ڈاکٹر بنانا چاہتی ہوں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ایسا کر کے میں ویرندر کی آتما کو آنند پہنچانا چاہتی ہوں۔"

"تو یہاں رہ کر بھی گڈو کو ڈاکٹری پڑھا سکتی ہے۔"

"چوہدری! مجھے روکنے کی کوشش نہ کر۔ میں یہاں زیادہ دن نہیں رہوں گی۔" جمیلہ نے دوٹوک جواب دیا۔ "میں تو پہلے ہی یہاں سے چلی جاتی پر اب تک اس کارن نہیں گئی کہ میری آشا ہے کہ تاجاں کا ویاہ کروں۔ اسے گلے لگا کر بدا کروں۔ میں نے اس کی ماں پھاتاں کو جو وچن دیا ہے اسے

پورا کرنا چاہتی ہوں۔" اس کا لہجہ دل گرفتہ ہو گیا۔ "چوہدری! تو اگر مجھے سکھ پہنچانا چاہتا ہے۔ مجھے سکھی دیکھنا چاہتا ہے تو اس کام میں میری مدد کر۔ میرا ارادہ ہے فصل کٹنے کے بعد ناجاں کا ویاہ کردوں۔ اس کے بعد نینا اور گڈو کے ساتھ لور چلی جاؤں گی۔"

"مجھ سے ناراض ہو کر جا رہی ہے' یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ایسا نہیں ہو گا۔" رحیم داد نے جوش و خروش سے کہا۔

اسی وقت نادر خاں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد نے جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "لے زمیں دارنی! اب تو نادر آ ہی گیا۔ تیں نوں پھٹی کے بارے میں جو کچھ کہنا ہے' خود اس سے کہہ دے۔"

"میں نے اسے کچھ نہیں کہنا۔ سب کچھ تجھے بتا چکی ہوں۔ تو اسے بتا دینا۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ "میں نے جا کر اب روٹی کھانی ہے۔"

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کمرے سے چلی گئی۔ نادر نے اس کے جانے کے بعد پوچھا۔ "زمیں دارنی کو مجھ سے کیا گل بات کہنی تھی؟" وہ پریشان اور گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

"بیٹھ جا۔ آرام سے بات ہو گی۔" رحیم داد نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

نادر خاں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر چپ رہ کر بولا۔ "پریشانی کی تو کوئی گل بات نہیں؟"

"پریشانی ہی کی گل ہے۔" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "پھٹی میں سونڈی لگ گئی اور تیں نوں پتہ ہی نہ چلا؟ میں پوچھتا ہوں تو کرتا کیا ہے؟" رحیم داد کے چہرے سے جھنجلاہٹ ٹپکنے لگی۔

"گلاں تو وڈی وڈی کرتا ہے۔ یہ کروں گا جی وہ کروں گا جی۔ اور کیا کرایا کچھ نہیں۔" اس نے قہر آلود نظروں سے نادر کو دیکھا۔ "اس طرح تو نے مینجری کی تو اپنی زمیں داری کا تو بیڑا ہی غرک ہو جائے گا۔ میں نوں پتہ ہے' خریف کی فصل کی تو اصل کمائی کپاس سے ہوتی ہے۔ اور تو نے اسی پر دھیان نہیں دیا۔"

نادر نے گردن جھکا کر نرم لہجے میں کہا۔ "چوہدری! ٹھیک کہہ رہا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ پھٹی میں سونڈی لگ گئی ہے۔ پر بہت تھوڑے سے بوٹوں میں لگی ہے۔ جیسے ہی مجھے پتہ چلا خود جا کر وہ بوٹے دیکھے۔"

"پر تو نے مجھے کچھ نہیں بتایا جب کہ تو روز میرے پاس آ رہا۔"

"میں نے تجھے اس لیے نہیں بتایا کہ خاما خا پریشان ہو گا۔" نادر خاں نے اسے مطمئن کرنے کی

کوشش کی۔ "فکر کی کوئی گل نہیں۔ میں نے سونڈی لگے بوٹوں پر کرم کش دوائی چھڑکنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ اسی سلسلے میں سویرے سویرے نکل گیا تھا۔ آج ہی بوٹوں پر سپرے کر دیا جائے گا۔ پریشانی کی کوئی گل بات نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ پروا نہ کر۔ کپاس کی پیداوار اس دفعہ پہلے سے کم نہیں زیادہ ہو گی۔"

"تیرے آنے سے پہلے زمیں دارنی سے بات ہوئی تھی۔" رحیم داد کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ وہ نادر خاں کی باتوں سے مطمئن ہو گیا تھا۔ "وہ پھٹی میں سونڈی لگنے سے بہت پریشان نظر آتی ہے۔ تو اسے بھی سمجھا دینا۔"

"اطمینان رکھیں جی۔ میں اسے آج ہی سب کچھ بتا دوں گا۔ تو کہہ تو ابھی اس کے پاس چلا جاؤں؟"

"ابھی جانے کی ضرورت نہیں۔" رحیم داد نے اسے منع کر دیا۔ "بوٹوں پر کیڑے مار دوائی چھڑک جائے تب جمیلہ سے بات کرنا۔" اس نے اپنی بات پر زور دے کر پوچھا۔ "سپرے آج ہی ہو جائے گا ناں؟ اس میں بالکل دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

"آج ہی سپرے ہو جائے گا۔ بالکل ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں جی۔" نادر خاں نے اعتماد کا اظہار کیا۔ "میں فصل کی واڈھی کی تیاری میں پھنسا رہا۔ پھٹی کی طرف پوری طرح دھیان ہی نہ دے سکا ورنہ سونڈی لگتے ہی دوائی چھڑکنے کا کب کا بندوبست ہو چکا ہوتا۔ تیں نوں پتہ نہیں چوہدری' میں نے تو پھٹی کی چنائی کے لیے چوگیوں سے بات چیت بھی کر لی ہے۔"

"پر ابھی تو اپنی فصل پوری طرح تیار نہیں ہوئی۔ تین چار ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پر کہیں کہیں خریف کی واڈھی شروع بھی ہو چکی ہے۔ اپنی فصل کچھ دیر میں تیار ہوئی۔ پر واڈھی کی تیاری تو پہلے ہی کر لینی چاہیے۔ یہ تو تیں نوں بھی پتہ ہے۔"

رحیم داد نے وہ فائل نادر خاں کی طرف بڑھائی جو جمیلہ نے اسے دے گئی تھی۔ نادر خاں نے فائل سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟" وہ حیرت زدہ نظر آ رہا تھا۔

"یہ میرے کلیم کے کاغذات ہیں۔ جمیلہ واپس دے گئی ہے۔ آگے جو کچھ کرنا ہے تیں نوں ہی کرنا ہو گا۔ وکیل کا ٹنٹا بیچ سے نکل گیا۔"

"یہ تو ٹھیک ہی ہوا جی۔ فکر نہ کریں جلد ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ آبادکاری کے محکمے میں اپنی جان پہچان کے بہت بندے ہیں۔ خوشی سے اپنا کام کر دیں گے اور تھوڑی رشوت لے کر کر دیں گے۔"

"ویسے تو کام جلد ہی کرانے کا ہے۔ پر تو ابھی کہیں نہ جانا۔ میری طبیعت ادھر ٹھیک نہیں رہتی۔ سوچتا ہوں کچھ دنوں کے لیے شاہ جی کے پاس چلا جاؤں۔"

"ضرور چلا جا۔" نادر نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "میں نے غور کیا ہے' چوہدری تو کچھ عرصے سے پریشان پریشان نظر آتا ہے۔ لگتا ہے جیسے بیمار ہو۔ شاہ جی کے پاس چلا جائے گا تو وہاں طبیعت بالکل چنگی ہو جائے گی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "ادھر کی فکر نہ کر۔ ہر کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ چھٹی پر سہرے تو آج ہی ہو جائے گا۔ آبادکاری کے محکمے میں کچھ روز بعد چلا جاؤں گا۔" اس نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "شاہ جی کے پاس کب تک جانے کا ارادہ ہے؟"

"آہستہ بول۔" رحیم داد نے چوکنا نظروں سے کمرے کے باہر دیکھا۔ "ارادہ تو آج ہی جانے کا تھا پر اب تو دیر ہو گئی۔ کل چلا جاؤں گا۔ تو جمیلہ سے آج ہی ملنے کی کوشش کرنا۔ وہ آج نہ ملے تو کل میرے جانے کے بعد ضرور ملنا۔ بلکہ کل ہی تیرا ملنا ٹھیک رہے گا۔ اس کو چھٹی کے بوٹوں پر سہرے اور فصل کی واڈھی کے بارے میں ہر بات اس طرح بتا دینا کہ وہ بالکل مطمئن ہو جائے۔ سمجھ گیا نا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" نادر نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "پروا نہ کر۔ میں زمیں دارنی کو پوری طرح مطمئن کردوں گا۔ پر تیرے بارے میں اگر وہ پوچھے تو کیا کہوں؟"

"ویسے تو ہو سکتا ہے وہ یہ بات پوچھے ہی نہ۔ پر تو خود اس کے کان میں ڈال دینا کہ میں کلیم کے چکر میں ملتان گیا ہوں۔" رحیم داد نے نادر خاں کو سمجھایا۔

نادر خاں نے اسے باور کرایا۔ "جیسا کہتا ہے وہی کروں گا۔ بالکل بے فکر ہو کر شاہ جی کے پاس جا۔ واپسی پر تجھے ہر کام ٹھیک ٹھاک ملے گا۔" اس نے پہلو بدلا۔ "اجازت ہو تو جی گھر جا کر روٹی کھالوں؟"

"ضرور روٹی کھا۔"

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد نے کھانا منگوایا۔ کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے لیٹ گیا۔ شام کو کچھ دیر کے لیے ٹہلتا ہوا نہر کی طرف چلا گیا۔ واپسی پر وہ جمیلہ کا انتظار کرنے لگا۔

جمیلہ کچھ ہی دیر قبل پھاتاں کے ہمراہ حویلی سے باہر گئی تھی۔ رحیم داد نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

☆

رحیم داد چاہتا تھا کہ احسان شاہ کے پاس جانے سے قبل جمیلہ سے ایک بار اور مل لے۔ اس کی

کدورت دور کرنے کی کوشش کرے۔

جمیلہ واپس آئی تو خاموشی سے رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزر گئی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ رحیم داد بے چین بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ وہ اس کی طرف دیکھے تو بات کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر جمیلہ نے یہ موقع ہی نہیں دیا۔ رحیم داد دل برداشتہ ہو کر دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا پھر بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

سویرے جمیلہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ سکول چلی گئی۔ اس وقت بھی رحیم داد کی جانب اس نے مطلق توجہ نہ دی۔ گردن اٹھائے بے نیازی سے اس کے کمرے کے سامنے سے گزر گئی۔

پہر دن گزر گیا۔ رحیم داد نے تانگا منگوایا۔ اس میں ضرورت کا سفری ساز و سامان رکھوایا اور احسان شاہ کے گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس دفعہ بھی وہ ہفتے بھر سے زیادہ ٹھہرنے کے ارادے سے چلا تھا۔ ۔۔ سہ پہر کو وہ احسان شاہ کی حویلی پر پہنچ گیا۔ شیدا پھاٹک ہی پر مل گیا۔ اس کی زبانی اطلاع ملی کہ احسان شاہ گاؤں سے باہر گیا ہے۔ رحیم داد کو سخت کوفت ہوئی۔

رحیم داد واپسی کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ شیدا بولا۔ "چوہدری! تو سردار مراد خاں شاہانی سے تو مل لے۔ وہ کئی روز سے ادھر ہی ٹھہرا ہے۔"

رحیم داد نے واپس کوٹ ہر کشن جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ شیدا کے ہمراہ حویلی کے دیوان خانے میں پہنچا۔ شاہانی کچھ ہی دیر پہلے سو کر اٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی اس نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ بڑھ کر گرم جوشی سے گلے لگایا۔ "سیں چوہدری! تو بہت موکے سے آیا۔ میں اکیلا یہاں گھبرا رہا تھا۔ تیرے ساتھ چنگی شام گزرے گی۔ سویرے میں لہور چلا جاؤں گا۔"

"چند روز ٹھہر نہیں سکتا؟ چلا جائے گا تو میرا کیا بنے گا۔ میں تو یہاں ہفتے دو ہفتے ٹھہرنے کے ارادے سے آیا تھا۔"

"چوہدری، ٹھیک ٹھیک بتا تو یہاں کب تک ٹھہرنا چاہتا ہے؟"

"شاہ جی سے مل کر ہی جاؤں گا۔ آیا تو یہی سوچ کر ہوں۔ اس سے ملنا ضروری بھی ہے۔"

"پر شاہ جی کا تو جلد لوٹنے کا کوئی پروگرام نہیں۔ پتہ نہیں کب تک آئے۔ تو کہاں تک انتظار کرے گا؟" شاہانی نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ "ایسا کر، پہلے نہا دھو کر کپڑے بدل۔ جانے کس رستے سے آیا ہے۔ ذرا اپنا حلیہ تو دیکھ، کپڑوں پر کتنی خاک دھول ہے۔ تھکا ہوا بھی نظر آ رہا ہے۔ میں بھی نہانے ہی جا رہا ہوں۔ تو بھی تیار ہو جا۔ فیر محفل جمے گی۔"

سردار شاہانی غسل کرنے چلا گیا۔ رحیم داد بھی اس کمرے میں پہنچا جس میں شیدا نے اس کے

قیام کا بندوبست کیا تھا۔ رحیم داد نے کمرے میں پہنچتے ہی ٹرنک سے اجلے کپڑے نکالے اور نہ
کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ پانی گرم تھا۔ رحیم داد کو غسل کرنے میں لطف آیا۔ وہ دیر
نہاتا رہا۔ غسل کرنے کے بعد طبیعت ترو تازہ ہوگئی۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور بن سنور کر
میں پہنچ گیا۔ مراد خاں شاہانی پہلے ہی سے موجود تھا۔ وہ رحیم داد کا انتظار کر رہا تھا۔

شام دبے قدموں حویلی کی اونچی اونچی فصیل نما دیواروں سے نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیرا آ
آہستہ فضا میں گھلتا جا رہا تھا۔ شیدا نے لیمپ روشن کیا اور کونے میں رکھے ہوئے اونچے اسٹو
رکھ دیا۔ کمرے کے باہر برآمدے میں پیٹرومکس بھی جل رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی باغ میں دور
پھیلی ہوئی تھی۔ باغ سنسان تھا۔ درختوں پر پالا پڑ رہا تھا۔

شیدا نے وہسکی کی بوتل مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کے سامنے پڑی ہوئی میز پر رکھ دی۔
کے ساتھ طشت میں گلاس تھے اور پانی سے بھرا ہوا جگ تھا۔ وہسکی کے دو پیگ پہلے شیدا ہی
بنائے۔ شاہانی اور رحیم داد کو پیش کیے۔ وہ چند لمحے ان کے قریب ادب سے سر جھکائے کھڑا رہا۔
آہستہ آہستہ چلتا ہوا دور چلا گیا۔

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا۔ ہاتھ اونچا کیا اور مسکرا کر د
گھونٹ بھرا۔ رحیم داد نے بھی گھونٹ بھرا۔ ذرا دیر تک دونوں چپ بیٹھے مے نوشی کرتے رہے
شاہانی کی آواز ابھری۔ اس نے پوچھا۔ "چوہدری! تیں نوں یہاں کتنے روز ٹھہرنا ہے؟"

"اب یہاں ٹھہر کر کیا کروں گا۔ تو نے ہی تو بتایا تھا' شاہ جی کی واپسی کا کچھ ٹھیک سے پتہ نہیں
جانے کب آئے۔ میں کب تک اس کا یہاں انتظار کروں گا۔"

"تو کیا تو بھی کل صبح یہاں سے چلا جائے گا؟"

"کل صبح نہیں۔" رحیم داد کھل کر مسکرایا۔ "دو تین روز ٹھہر کر ہی جاؤں گا۔"

"نوراں کے لیے ٹھہرنا چاہتا ہے؟" مراد خاں شاہانی نے آنکھ مار کر قہقہہ بلند کیا۔ "پر نوراں
اب یہاں ہے نہیں۔ پچھلے دنوں جہان آباد سے ملک منصور خاں ٹوانہ ادھر آیا تھا۔ نوراں اس
اتنی پسند آئی کہ وہ اسے لے گیا۔ شاہ جی بھی منصور خاں کے ہم راہ گیا ہے۔"

"تجھے یہ اطلاع کیسے ملی؟" رحیم داد کا چہرا اتر گیا۔ نوراں کے جانے کی خبر سن کر اسے ملال ہوا

"شاہ جی اور ملک منصور ٹوانہ کل ہی دوپہر کو یہاں سے گئے ہیں۔ مجھے حویلی میں ٹھہرے ہو
۵ روز ہو گئے۔"

"شاہ جی نے بتایا نہیں کب تک لوٹے گا؟"

"اس کا لمبا ہی پروگرام ہے۔ جہاں آباد سے وہ کچھ دنوں کے لیے ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کے
پاس کالرا اسٹیٹ جائے گا۔" شاہانی نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "ویسے اس کا ارادہ ٹوانوں کے علاوہ
نونوں سے بھی ملنے کا ہے۔ وہ سردار پور نون' نور پور اور بھلوال شہر جانے کو کہتا تھا۔" اس نے ہلکا
قہقہہ لگایا۔ "سئیں! مجھے تو یہ اس کا سیاسی دورہ لگتا ہے۔ تیں نوں پتہ ہے۔ شاہ جی سیاست بھی تو
لڑاتا ہے اور بہت اونچی سیاست لڑاتا ہے۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو اس کے ساتھ ہی لمور کیوں
نہیں چلا گیا؟"

"چلا تو جاتا۔ ارادہ بھی یہی تھا۔ پر زینت کے لیے ایک رات اور رک گیا۔"

"زینت کون؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"بہت زور دار رن ہے۔ ایک دم پوپٹ۔ دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے گا۔" شاہانی نے ہنس کر
بتایا۔ "پچھلے ہی ہفتے شاہ جی اسے اٹھوا کر کوٹ میں لایا ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

"ایک بات اور بھی ہے اس میں۔" سردار شاہانی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"وہ کیا بات ہے؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"پہلے وہ ہندنی ہوتی تھی۔ فسادات کے دنوں میں ایک مسلمان کمہار کے ہتھ چڑھ گئی۔" شاہانی
نے وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے بتایا۔ "میں اس بار یہاں آیا تو شاہ جی نے زینت کا ذکر اس طرح کیا
کہ میں نے زور دے کر اسی رات اسے اپنے کمرے میں بلوایا۔ مجھے اتنی پسند آئی کہ روز ہی اسے
بلوا لیتا ہوں۔ دو روز تو چپ چپ رہی۔ پوچھنے پر بھی نہ بولی۔ بعد میں اس نے اپنے بارے میں سب
کچھ بتا دیا۔"

"کیا کیا بتاتی تھی؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"کہتی تھی پہلے اس کا نام شکنتلا ہوتا تھا۔ پیو ملتان میں ڈاکٹری کرتا تھا۔" مراد خاں شاہانی ٹھہر
ٹھہر کر بتاتا رہا۔ "فسادات اور بلوؤں میں اس کا سارا ہی ٹبر تتر بتر ہو گیا۔ وہ اکیلی رہ گئی تو ہندوؤں کے
ساتھ سرحد پار جانے کے ارادے سے چیچہ وطنی پہنچی۔ وہیں ان کے کارواں پر رات کے
اندھیرے میں حملہ ہوا۔ بلوائیوں میں ایک کمہار بھی تھا۔ وہ اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ اسی نے
اسے مسلمان بنایا۔ شکنتلا سے اس کا نام زینت بی بی رکھا۔"

"اب تک وہ کمہار ہی کے گھر میں تھی؟"

"نہیں!" شاہانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ کمہار کے گھر میں لگ بھگ تین سال رہی۔ ایک

نکا بھی پیدا ہوا۔ بعد میں کمہار نے اسے بیچ دیا۔ اس بار اسے رکن پور کے ایک سکول ماسٹر کی والی بننا پڑا۔ زینت مجھے بتاتی تھی۔ ماسٹر بہت نیک بندہ تھا اس کے پاس وہ بہت آرام سے تھی۔ سے بھی ایک بچہ ہوا۔ دوبارہ حاملہ تھی کہ مغویہ عورتوں کی بازیابی کرنے والی ایک فوجی پارٹی اس کا کھوج نکال لیا اور اپنے ساتھ فیروز پور لے گئی۔" شاہانی نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ " پور میں اس کا ایک چاچا ہوتا تھا۔ زینت کو اس کے سپرد کر دیا گیا۔ وہ زینت بی بی سے ایک تماشا بن گئی۔"

"پر وہ واپس کیسے آ گئی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

شاہانی ہنس کر بولا۔ "جو ذال تین سال سے بھی اوپر مسلمانوں کے پاس رہ چکی ہو۔ دو جن چکی ہو اور تیسرا پیٹ میں ہو' اسے ہندو کیسے کبول کر لیتے؟ کہتی تھی خود اس کا چاچا اور اس کے ساتھ اچھوتوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ اپنے کھانے پینے کے برتن تک اسے چھونے نہ تھے۔ زینت کے دو چچیرے بھی تھے۔ وہ اس کے دونوں بچوں کو مار ڈالنے کی گھات میں تھے۔ کو اس کا پتہ چل گیا۔ بہت پریشان ہوئی۔ آخر ایک رات وہ گھر سے چھپتی چھپاتی نکلی۔ دونوں ساتھ تھے۔ سرحد کے نزدیک ایک مسلمان سمگلر مل گیا۔ اس نے اپنے سارے زیور اور روپیہ کو دے دیا۔ اس نے زینت اور اس کے بچوں کو کسی نہ کسی طرح سرحد پار پہنچا دیا۔ وہ دوبارہ پور گئی۔"

"وہاں تو اسے اپنا گھر والا سکول ماسٹر مل ہی گیا ہو گا؟"

"بس اس کا نصیبہ ہی خراب تھا۔ سکول ماسٹر کا رکن پور سے دیپال پور تبادلہ ہو گیا تھا۔" خاں شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔ "وہ اس کی تلاش میں دیپال پور جا رہی تھی کہ رستے میں شا ایک مزارع' سلامو' اسے مل گیا۔ اس نے زینت کو اکیلا پایا تو ڈرا دھمکا کر زبردستی اپنے گھر گیا۔"

"اور سلامو کے گھر سے اسے شاہ جی نے اٹھوا لیا۔" رحیم داد نے ہنس کر اپنے فوری رد اظہار کیا۔ "لگتا ہے زینت بہت سوہنی زنانی ہو گی۔"

"سوہنی ہے۔ بھرپور جوان ہے اور پڑھی لکھی بھی ہے۔ گھر والے نے اسے ایک سکول پڑھانے پر بھی لگوا دیا تھا۔ پر دوسری مسلمان استانیاں ہندنی کہہ کر اتنا تنگ کرتی تھیں کہ اس سکول کی نوکری چھوڑ دی۔" شاہانی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "میں کہتا ہوں زینت اتنی سوہنی ہے کہ اس سے جلتی ہوں گی۔ خار کھاتی ہوں گی۔"

"پر تجھے تو سوہنی اور جوان رن پسند نہیں۔" رحیم داد نے مراد خاں شاہانی کو مسکرا کر چھیڑا۔

"تیں نوں تو رتے پسند ہے۔"

"چوہدری! تو اس رمز کو نہیں سمجھ سکتا۔ اناڑی جو ٹھیرا۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "کبھی کبھی تو رتے بھی مزا دے جاتی ہے۔ پر روز روز نہیں۔" اس نے گلاس اٹھا کر وہسکی کی چسکی لگائی۔

"تو نے زینت کو دیکھا نہیں۔ تین شوہروں کے پاس رہ چکی ہے۔ بچے بھی جن چکی ہے پر اب تک اس کا بدن ریشم کی طرح ہے۔ نرم اور ملائم۔ چہرہ تو ایسے دمکتا ہے جیسے صبح کی اجلی دھوپ۔"

"لگتا ہے زینت تجھے کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی ہے۔" رحیم داد نے شوخی سے کہا۔ "ساتھ لے جانے کا تو ارادہ نہیں؟"

"شاہ جی راضی ہو جائے تو ضرور لے جاؤں گا۔" شاہانی نے نشے میں جھوم کر کہا۔ "پر وہ زینت کو ابھی اپنے کوٹ سے کہیں جانے نہ دے گا۔ زینت اسے بھی پسند ہے۔"

اس دفعہ رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شاہانی بھی چپ رہا۔ دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے اور رک رک کر وہسکی کے گھونٹ بھرتے رہے۔ آخر رحیم داد نے خاموشی ختم کی۔

"شاہانی! میں نوں ایک گلہ ہے تجھ سے۔"

"مجھ سے گلہ ہے؟" شاہانی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "کس بات کا گلہ؟"

"محمد عثمان رندھاوا تیرا وکیل ہوتا ہے ناں؟"

"بالکل ہوتا ہے۔" مراد خاں شاہانی ہنوز حیرت زدہ تھا۔ "پر تجھے اس سے کیا لینا؟"

"تیں نوں پتہ ہے' وہ اللہ وسایا کا بھی وکیل ہوتا تھا۔"

"یہ تو رندھاوا ہی نے مجھے بتایا تھا۔" شاہانی نے وضاحت کی۔ "میں تو کبھی اللہ وسایا سے نہیں ملا۔ شاہ جی سے کبھی کبھار اس کا ذکر ضرور سنا تھا۔ رندھاوا نے اللہ وسایا کے بارے میں بات کرتے کرتے تیرا بھی تذکرہ کیا تھا۔ ویسے صاف گل بات یہ ہے چوہدری' میں رندھاوا کو زیادہ عرصے سے نہیں جانتا۔ میں نے پہلی بار اپنے کیس کی پیروی کے لیے اسے کھڑا کیا ہے۔"

"پر تو اتنے جلدی اس پر ایسا مہربان ہو گیا کہ میرے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ میں شاہ جی سے برابر ملتا جلتا رہتا ہوں۔ اس کے ساتھ گہری یاری ہے اور اس کی حویلی میں کئی کئی روز ٹھیرتا بھی ہوں۔"

"میں نے جھوٹ تو نہیں کہا۔" مراد خاں شاہانی نہایت سادگی سے بولا۔ "اس میں برا منانے کی کون سی گالہ ہے۔"

رحیم داد جل کر بولا۔ "بیڑا غرق کر دیا اپنا۔ اوپر سے پوچھتا ہے اس میں برا منانے کی کون سی
گل ہے؟" نشے کی ایک تیز لہر اٹھی۔ رحیم داد غصے سے بھڑک اٹھا۔ مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا
لیا۔ وہ شاہانی سے خواہ مخواہ الجھنا نہ چاہتا تھا۔ صرف اتنا شکوہ کرنے پر اکتفا کیا۔ "رنداوا سے گل
بات کرنے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔"

"صاف صاف بتا۔ گالہ کیہہ اے؟" شاہانی نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ "تیری باتیں اب
تک بالکل سمجھ نہیں آئیں۔ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

"صاف بات یہ ہے جی! میں یہ نہیں چاہتا جمیلہ کو یہ معلوم ہو کہ میں شاہ جی سے ملتا ہوں۔
رحیم داد نے وضاحت کی۔ "میں اس سے چھپ کر یہاں آتا ہوں۔"

"یہ جمیلہ تو اللہ وسایا کی رانڈ ہے نا؟"

"ہاں وہی ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "اور تجھے یہ بھی پتہ ہے۔ زمیں داری میں وہ میرے ساتھ
ساجھے دار بھی ہے۔"

شاہانی نے کسی قدر بے نیازی سے کہا۔ "پر میں جمیلہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ تو نے کبھی
نہیں بتایا۔" اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے کیا پتہ تو اس سے چھپ کر یہاں آتا
ہے۔ میں نے تو ایسے ہی باتوں باتوں میں وکیل سے تیرا ذکر کیا تھا۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "جمیلہ کو
اس کا پتہ چل گیا تو کیا ہو گا۔ وہ تیرا کیا بگاڑ سکتی ہے؟"

"تجھے کیا پتہ' اپنا تو سارا کھیل بگڑ گیا۔ جمیلہ مجھ سے سخت ناراض ہے۔"

"اسے گھر والی بنانے کا تو ارادہ نہیں تیرا؟" شاہانی نے مسکرا کر بے تکلفی کا اظہار کیا۔ "سنا ہے
جمیلہ بہت سوہنڑی ہے۔ مجھ سے دل کی صاف صاف بات بتا؟"

"دل کی بات پوچھتا ہے تو سن لے۔ جمیلہ مجھے نہ صرف پسند بلکہ بہت پسند ہے۔ میں اس سے
ویاہ کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ جی کی بھی یہی رائے ہے۔" رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ "پر تو نے وکیل
سے میرے اور شاہ جی کے میل ملاپ کے بارے میں بات کر کے سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔ جب سے
اسے اس کا پتہ چلا ہے' بہت روٹھی ہوئی ہے۔ سمجھ نہیں آتی اب کیا کروں؟" رحیم داد نے جلدی
سے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "سچ پوچھ تو میں اسی سلسلے میں شاہ جی کے پاس مشورہ کرنے آیا تھا۔
وہ یہاں ہے نہیں۔ یہ بھی پتہ نہیں کب تک لوٹے گا۔"

"معاف کرنا چوہدری' مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ ورنہ میں وکیل سے کیوں ایسی گالہ
کرتا۔" شاہانی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "ایسا کر' تو میرے ساتھ لہور چل۔ وہاں سے دو تور

بھکر چلیں گے۔ تو کچھ روز میرے ساتھ بھکر میں رہ کر یہاں آ جانا۔ تب تک شاہ جی بھی واپس
آ جائے گا۔" شاہانی نے اصرار کیا۔ "اب تو میرے ساتھ تجھے ضرور چلنا ہو گا۔ بھکر میں تیرا دل بہل
جائے گا۔ یہاں اکیلا پڑا پڑا کیا کرے گا۔ اپنے پنڈ جائے گا تو وہاں بھی پریشان ہی رہے گا۔" اس نے
پیار سے رحیم داد کو ڈانٹا۔ "دیکھ چوہدری' انکار نہ کرنا۔ جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کر۔ جو ہونا تھا
ہو گیا۔" اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ "شاہ جی سے ضرور مل لے۔ وہ بہتر ہی مشورہ دے گا۔
فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

رحیم داد نے شاہانی کی بات مان لی۔ اس کے ہم راہ جانے پر رضامند ہو گیا۔

دونوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

رحیم داد کمرے میں داخل ہوا تو میداں پہلے سے موجود تھی۔ وہ چھریرے بدن کی خوش شکل
عورت تھی۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی وہ اسے احسان شاہ اور مراد خاں شاہانی کے ساتھ کوٹ کی ایک
کوٹھری میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ وہ اسے اچھی بھی لگی تھی۔ میداں کو دیکھ کر اس کی ساری
کدورت رفع ہو گئی۔

☆

پہر دن چڑھے رحیم داد اور شاہانی لاہور چلے گئے۔ سہ پہر تک دونوں لاہور پہنچ گئے۔ رات
انھوں نے لارنس روڈ پر واقع ایک کوٹھی میں بسر کی۔ دوسرے روز دوپہر کی ٹرین سے سرگودھا کے
راستے بھکر روانہ ہو گئے۔

سرگودھا شہر سے گزر کر ٹرین خوشاب کی حدود میں داخل ہوئی۔ ہڈالی سے آگے مٹھاٹوانہ ریلوے
اسٹیشن تھا۔ ٹرین مٹھاٹوانہ پہنچی تو رحیم داد نے وہاں اترنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ جہان آباد جا کر
احسان شاہ سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے بھکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر مراد خاں شاہانی آمادہ نہیں
ہوا۔ اس نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

"چوہدری! یہ بھی تو ٹھیک سے پتہ نہیں کہ شاہ جی جہان آباد میں ہے یا کالرا اسٹیٹ میں۔"

رحیم داد نے اصرار کیا۔ "جہان آباد سے یہ تو معلوم ہو جائے گا' شاہ جی کہاں ہے۔ اس کے
سارے پروگرام کا پتہ چل جائے گا۔"

سردار مراد خاں نے رحیم داد سے اتفاق نہیں کیا۔ "خاما خا پریشان ہو گا۔ اول تو شاہ جی سے ملنا
ہی مشکل ہے۔ مل بھی گیا تو ٹھیک سے بات نہیں ہو گی۔ اسے تو واپسی پر ملنا۔ اس کی حویلی ہی میں
ٹھیک سے بات ہو سکتی ہے۔"

رحیم داد نے کوشش بھی کی مگر شاہانی کو آمادہ نہ کر سکا۔ مراد خاں شاہانی سیدھا کندیاں پہنچنا چاہتا تھا۔ وہاں اسے ضروری کام تھا جو فوری طور پر نمٹانا تھا۔ چنانچہ سفر جاری رہا۔ کندیاں پہنچ کر دونوں اسٹیشن سے نکلے۔ انھوں نے میاں شاہ علی کی حویلی میں قیام کیا۔ شاہ علی بڑا زمیں دار اور شاہانی کا گہرا یار تھا۔ مگر کندیاں میں دونوں صرف ایک روز ٹھہرے۔

کندیاں سے وہ بھکر کی جانب ٹرین میں چلے۔ تھل سے گزرے۔ راستے میں دور دور تک بنجر اور ریتلے ٹیلے نظر آتے تھے۔ اس قدر خاک دھول اڑی کہ بھکر پہنچتے پہنچتے دونوں گرد سے اٹ گئے۔

بھکر میں شاہانی کی خاندانی حویلی تھی۔ اس کے آس پاس بھی شاہانیوں کے مکانات اور حویلیاں تھیں۔ مگر مراد خاں دوسرے محلے میں رہتا تھا۔ اس کی یہ حویلی دو منزلہ تھی اور کسی زمانے میں دیوان لدّا مل کے خاندان کے ایک ہندو رئیس دیوان کرم چند کی ملکیت تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکی تو بھکر بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ کرم چند کے کنبے کو بھی شہر کے دوسرے ہندوؤں کے ساتھ بھکر چھوڑنا پڑا۔ مراد خاں نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ صرف تین ہزار میں کرم چند کی عالی شان حویلی خریدلی اور اسی میں مستقل رہائش اختیار کرلی۔

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد نے لمبا سفر کیا تھا۔ دونوں تھکن سے نڈھال تھے۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ مراد خاں شاہانی ذرا دیر ٹھہر کر زنان خانے میں چلا گیا۔ رحیم داد کے قیام کا بندوبست مہمان خانے کے ایک کمرے میں کردیا گیا۔ یہ مہمان خانہ ڈیرا کہلاتا تھا۔

رحیم داد کے کمرے میں پہنچتے ہی فوراً نائی آگیا۔ اس نے رحیم داد کی ڈاڑھی اور سر کے بال تراشے۔ نائی کے جاتے ہی حویلی کا ماشیا آگیا۔ اس نے رحیم داد کے سر میں موتیے کے پھولوں میں بسا ہوا کرنے کا تیل ڈالا جس کی دور دور تک شہرت ہے۔ بھکر کی خاص سوغات ہے۔ ماشیے نے ایسی چابک دستی اور مہارت سے چمپی کی کہ رحیم داد کی آنکھیں غنودگی سے بند ہونے لگیں۔ سر کی چمپی کے بعد ماشیے نے بدن کی مالش کی۔ ایک ایک جوڑا اور ایک ایک پٹھے کی اینٹھن اور تشنج انگلیوں اور ہاتھوں کے مساج سے رفع کیا۔ رحیم داد کو بہت سکون ملا۔ ساری تھکن کافور ہوگئی۔ مالش سے فارغ ہو کر اس نے غسل کیا۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ کر گہری نیند سوگیا۔

شام ہوئی اور اندھیرا پھیلا تو شاہانی کمرے میں آیا۔ رحیم داد بیدار ہو چکا تھا۔ مراد خاں شاہانی اسے قریب کے کمرے میں لے گیا۔ ذرا ہی دیر میں بوتل آگئی۔ گلاس آگئے۔ پانی آگیا۔ دونوں شغل کرنے لگے۔ شاہانی بہت مسرور اور تروتازہ نظر آرہا تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا۔ مگر رحیم داد چپ چپ تھا۔ اس کا چہرہ مضمحل تھا اور آنکھوں کی چمک دھندلی اور دھواں دھواں تھی۔

مراد خاں نے اسے افسردہ اور پریشان دیکھا تو سرگوشی کے عالم میں ہنس کر بولا۔ "چودھری! تیری بات دیکھ کر تو صاف پتہ چلتا ہے، تجھے جمیلہ سے پیار ہوگیا ہے۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "یہی بات ہے ناں؟"

رحیم داد دل کی بات چھپا نہ سکا۔ گہری سانس بھر کر بولا۔ "جب سے جمیلہ نے مجھ سے یہ کہا ہے وہ پنڈ چھوڑ کر لہور چلی جائے گی، اس وکت سے جی پریشان رہتا ہے۔" اس کے لہجے میں کسک تھی۔ "سچ کہتا ہوں کچھ بھی بھلا نہیں لگتا۔"

"پریشانی کی ایک بات یہ بھی تو ہے کہ جمیلہ کے ساتھ اس کے مربعے بھی چلے جائیں گے۔" شاہانی نے رحیم داد پر چوٹ کی۔ "تجھے مربعوں کی فکر زیادہ ہوگی۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ "نکاح پڑھالے۔ جمیلہ کے ساتھ اس کی زمین اور جائیداد سب تیرے ہتھ میں آجائے گی۔ میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"مجھے مربعوں کے نکل جانے کی فکر تو ہے پر جمیلہ چلی جائے یہ میں کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ ویسے اس کی باتوں سے لگتا ہے اپنی زمین تو شاید مجھی کو دے جائے۔ وہ بہت حوصلے والی ہے۔ دل بھی اتنا وڈا رکھتی ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ "سمجھ نہیں آتی، وہ چلی گئی تو میرا کیا بنے گا؟" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ گلاس ہونٹوں سے لگایا اور آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگا۔ اس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیلتا جارہا تھا۔

سردار مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا اور چند لمحے ٹکٹکی باندھے تکتا رہا۔ پھر اس نے نشہ کی ترنگ میں لہرا کر کہا۔ "چودھری! پروا نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشان نہ ہو۔ میں تجھے کل شام تک کھے پیر کی زیارت پر لے چلوں گا۔ تک کھے پیر کے مزار پر دور دور سے بندے آتے ہیں۔ منت مانتے ہیں اور ان کی مراد پوری ہوتی ہے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "تو بالکل فکر نہ کر۔ اٹھا گلاس۔ تو نے تو ابھی کچھ پی ہی نہیں۔ جم کر لگالے۔ طبیعت بالکل چنگی ہو جائے گی۔" اس نے گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔

دونوں رات گئے تک شغل بادہ نوشی کرتے رہے۔

☆

دن ڈھلے مراد خاں شاہانی نے گیرج سے اپنی لمبی چوڑی پیکارڈ نکالی۔ رحیم داد کو ساتھ بٹھایا اور تک کھے پیر کی درگاہ کی جانب روانہ ہوگیا۔ کار مراد خاں خود چلا رہا تھا۔ وہ بہت تیز رفتار سے کار دوڑاتا رہا۔ اچھا اور ماہر ڈرائیور تھا۔ اس نے کئی موڑ خطرناک تیزی سے کاٹے۔ رحیم داد کا

چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔ مگر شاہانی اطمینان سے اسٹرنگ سنبھالے بیٹھا رہا۔ ہنس ہنس کر ر
سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

مراد خاں نے روانگی سے قبل دودھ اور گھی میں گندھی ہوئی میدے کی پانچ بڑی بڑی
گوگیاں تیار کرائیں۔ منوتی کی یہ گوگیاں حویلی کے تنوریے نے غسل کر کے اور اجلے کپڑے
تنور میں لگائی تھیں۔ صاف ستھرے کپڑے میں لپیٹ کر ان کو مٹی کے کورے کونڈے میں رکھ
گوگیاں اب کار کی پچھلی سیٹ پر احتیاط سے رکھی تھیں۔ منڈی بیلہ کے بڑے بازار سے گز
ہوئے مراد خاں شاہانی نے چاندی کا ایک چراغ بھی خریدا۔

سڑک کے دونوں کناروں پر خوانچے والے بیٹھے تھے اور طرح طرح کی صدائیں بلند کر
تھے۔ انگور بیچنے والا جھوم جھوم کر صدا لگاتا۔

"موتی' بچے موتی۔ آ بھئی مو تے دیاں لڑیاں کھا۔ چمن دے میوے کھا۔"

اسی طرح گنڈیریاں بیچنے والا لہک لہک کر گاہکوں کو اس طور بلاتا۔ "مکھن پیڑے' کھا یار آ
پیڑے کھا۔"

خوانچے والوں' دکانداروں اور گاہکوں کی ملی جلی آوازیں ابھرتی رہیں۔ رحیم داد سنتا رہا۔
خاں شاہانی چراغ خرید کر دکان سے باہر آیا۔

کار آن کی آن میں تیزی سے دوڑتی بازار سے نکل گئی۔ بازار میں ابھرتی ہوئی آوازوں کا
رفتہ رفتہ دھیما پڑ گیا۔

دونوں بھکر اسٹیشن پہنچے۔ یہ نیچی چھت کا مختصر سا ریلوے اسٹیشن تھا۔ مگر اس کا احاطہ خاصا
تھا۔ احاطے کے ایک حصے میں تک کھے پیر کا مزار تھا۔ مراد خاں شاہانی نے کار اسٹیشن کے باہر
طرف کھڑی کی اور رحیم داد کے ہم راہ تک کھے پیر کی زیارت کی جانب چلا۔

مزار پر زائرین اور منت مرادیں ماننے والوں کا ہجوم تھا۔ عورتیں بڑی تعداد میں تھیں۔ شاہا
دیکھتے ہی مجاوروں نے آگے بڑھ کر گرم جوشی اور تپاک سے اس کا اور رحیم داد کا خیر مقدم
رحیم داد نے مجاوروں کی ہدایت کے مطابق مزار پر میٹھی گوگیاں چڑھائیں۔

وہ جھکا ہوا گوگیاں چڑھا رہا تھا تو قریب کھڑی ہوئی ایک نوجوان عورت اولاد نرینہ کے لیے گڑ
کر منت مان رہی تھی۔ "سوہناں پیر پیرا' خدا کنوں میکوں پتر گھن ڈے۔ میں وجدی وا
آؤساں تے تیڈی خنگا تے اتا گھتا ڈیساں۔"

میٹھی روٹی اور گوگیاں مزار پر چڑھانے کے بعد ایک مجاور کی ہدایت پر رحیم داد نے اپنے

سے چاندی کا چراغ روشن کیا' آگے بڑھا اور نہایت عقیدت اور احترام سے اسے قبر کے سرہانے
رکھ دیا۔ سر سے پگڑی اتاری۔ شملے میں گرہ لگائی۔ پگڑی دوبارہ سر پر رکھی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر زیر
لب یہ دعا مانگی۔

"پیر سیّیں' جمیلہ میری بن جائے۔ مجھ سے ویاہ کرنے پر راضی ہو جائے۔ جب تک میری منت
پوری نہیں ہوگی پگ کی گرہ نہیں کھولوں گا۔ میری مراد پوری ہو جائے گی تو میں تیری خنگاہ پر دوبارہ
حاضری دوں گا۔ میٹھی روٹیاں چڑھاؤں گا اور نیا چراغ روشن کروں گا۔"

منت ماننے کے بعد رحیم داد اور مراد خاں شاہانی واپس ہوئے۔ باہر جاتے ہوئے شاہانی نے
مجاوروں کو دس دس روپے دیئے۔ دونوں اسٹیشن کے احاطے سے نکلے تو شام کا دھندلکا رفتہ رفتہ فضا
میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ مراد خاں نے کار اسٹارٹ کی اور واپس گھر جانے کے بجائے بھکر کی
معروف تفریح گاہ' باغ دل کشا کی جانب روانہ ہوا۔ دونوں وہاں پہنچے تو اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ باغ
سنسان پڑا تھا۔

حویلی کی سمت لوٹتے ہوئے کار ایک ٹیلے کے قریب سے گزری۔ ٹیلے پر پیلو کے درختوں کے
ایک جھنڈ کے نیچے ملیوں اور کتانوں کا جمگھٹا تھا۔ جھوم جھوم کر بھنگ گھوٹی جا رہی تھی' مٹی کے
کوزوں اور المونیم کے گلاسوں میں بھر بھر کر پی جا رہی تھی۔ ایک طرف مشعل روشن تھی۔ اس کی
تیز روشنی میں ہیجڑے ڈھولک کی تھاپ پر کولہے مٹکا کر ناچ رہے تھے۔ لہک لہک کر جھمر کا مقبول
مقامی گیت گا رہے تھے۔

نائیں ہے یاری تولہ پراتا
میں متاری تروی نہ جاتاں
دوی بگیندی لانگھے
دل پئے تانگے
رکھاں میں امید ماہی دے پلٹن دی

ناچنے والوں کے ارد گرد بیٹھے ہوئے بھنگڑ' ملی اور کتانے گہرے نیلے نیلے جھلے اور دھوتیاں
باندھے اور میلے کچیلے کرتے پہنے زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے' تالیاں بجا کر تھاپ دے رہے
تھے۔ نشے کی ترنگ میں کوئی من چلا اٹھ کر ہیجڑوں کے ساتھ ناچنے لگتا تو قہقہوں کا زبردست شور
بلند ہوتا۔ ڈھولک پر زور سے چوٹ لگائی جاتی۔ ناچ اور تیز ہو جاتا۔ مراد خاں شاہانی نے کار ٹیلے
سے ذرا ہٹ کر ایک طرف کھڑی کر دی۔

دونوں کار سے اتر کر باہر نکلے اور کار کے مڈ گارڈ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ مراد خاں شا
نے ٹیلے کی سمت ہاتھ اٹھا کر رحیم داد کو بتایا۔ "چوہدری! اس ٹبے پر اکثر ایسی ہی میل لگتی ہے
ساوی پی جاتی ہے اور اس کے نشے میں مست ہو کر عیش ہوتے ہیں۔ ہیجڑوں اور منشوروں کے عا
ناچ گانے کے لیے کنجریاں بھی آتی ہیں۔ زبردست رونق رہتی ہے۔" اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گ
"یہ غریب کمی ہیں۔ ان کی یہی تفریح ہے۔ دن بھر ڈٹ کر محنت مزدوری کرتے ہیں۔ شام کو میل
کر ساوی سے شغل کرتے ہیں' تھکن اتارتے ہیں۔ اپنے دل خوش کرتے ہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"لگتا ہے ادھر بھی ساوی کا زیادہ ہی رواج ہے۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"بہت زیادہ" مراد خاں شاہانی گویا ہوا۔ "تجھے بھی ساوی پلواؤں گا۔ میرے پاس ایک مظ
گزھیا ہنگیرا ہے۔ بہت محنت سے گھٹائی کر کے ساوی تیار کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ کی تیار کی ہو
ساوی پیے گا تو لطف آ جائے گا۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ "تو نے کبھی ساوی پی ہے؟"

"ملتان میں تھا تو کبھی کبھی پی لیتا تھا۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "پر ادھر ایک مدت سے بالکا
نہیں پی۔ ملی ہی نہیں۔ جمیلہ کسی طرح کا نشہ پسند نہیں کرتی۔ اس لیے میں نے اپنی حویلی میں بھ
نشہ پانی نہیں کیا۔ اللہ وسایا بھی نہیں کرتا تھا۔"

"تب تو تجھے ضرور ساوی پلواؤں گا۔" شاہانی نے مسکرا کر رحیم داد کے کندھے پر بے تکلفی سے
ہاتھ مارا۔ "تک کھے پیر کی زیارت پر تو نے منت مانی ہے۔ تیری منت ضرور پوری ہوگی۔ جمیلہ بھ
تجھے ملے گی اور اس کے مربّے بھی۔ تک کھے پیر کی زیارت پر مانی ہوئی منت خالی نہیں جاتی۔" اس
نے حسب معمول قہقہہ بلند کیا۔ "اسی خوشی میں ایک جشن ہو جائے۔ اپنی حویلی میں میل لگے۔
اس میں تجھے بلوچوں کا جھمر دکھاؤں گا۔ اس نے ٹیلے پر ناچتے ہوئے ہیجڑوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر
اشارہ کیا۔ ناچ تو یہ بھی جھمری ہے پر یہ کوئی جھمر ہے۔" اس نے ناپسندیدگی کے طور پر منہ بگاڑا۔

"میں واپسی پر میل کا بندوبست کراتا ہوں۔"

رحیم داد خاموشی سے شاہانی کی باتیں سنتا رہا۔ تک کھے پیر کے مزار پر منت ماننے کے بعد و
سکون محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کا غبار کسی قدر چھٹ چکا تھا۔ مگر مرا
خاں شاہانی نے اسے خاموش دیکھا تو سمجھا کہ منت کے بعد بھی اس کی پریشانی رفع نہیں ہوئی۔ مرا
خاں نے رحیم داد کی پیٹھ آہستہ سے تھپ تھپائی۔

"اب تو پریشان کیوں نظر آ رہا ہے؟"

"ایسی تو کوئی گل نہیں۔"

"کچھ ہی کہہ' پر تو پریشان ضرور ہے۔" مراد خاں نے اس کی دل جوئی کی۔ "پریشان نہ ہو۔ تجھے
بلیاں والا پیر کے مزار پر بھی لے چلوں گا۔ وہاں بھی منت ماننا۔ ضرور پوری ہوگی۔ زبردست
زیارت ہے۔ بلیاں والا پیر کی خنگاہ پر بھی دور دور سے منتیں ماننے والے آتے ہیں۔ تیری منت
پوری ہو جائے تو بلیوں کو دودھ پلا دینا۔ منوتی پیر کی زیارت پر تجھے بہت بلیاں نظر آئیں گی۔ وہ منت
کا دودھ پیتی ہیں۔"

اس نے ایک بار پھر محبت سے رحیم داد کی پیٹھ تھپ تھپائی۔ "چوہدری! پروا نہ کر۔ زیارتیں اور
مزار بہت ہیں۔ ان کے بارے میں زبردست کرامتیں اور معجزے مشہور ہیں۔ ویسے زیارتوں کے
علاوہ پیر بھی ہیں۔ یہ میاں والی کا علاقہ ہے۔ اسے بھی ایک پیر میاں علی نے بسایا تھا۔ اسی کے نام
پر اس کا نام میاں والی پڑ گیا۔"

"اس ضلعے کا نام میاں والی اس لیے پڑ گیا؟" رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"یہ پیروں اور پہنچے ہوئے بزرگوں کی سرزمین ہے۔" مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ "یہاں ہر
موضع' ہر ڈھوک بلکہ ہر خاندان کا اپنا پیر ہوتا ہے۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تب تو تیرا بھی پیر ہوگا۔"

"ہاں سئیں' میرا بھی ایک پیر ہے۔ بہت اللہ والا بزرگ ہے۔ چہرہ ایسا نورانی' دیکھو تو دیکھتے ہی رہ
جاؤ۔ میرا پیر خریف کی واڈھی کے بعد آئے گا۔ دو سال میں ایک بار دورے پر نکلتا ہے۔ اپنے
خاص خاص مریدوں کے پاس چند روز کے لیے ٹھہرتا بھی ہے۔"

رحیم داد چپ رہا۔ اس نے شاہانی کے پیر میں دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ مراد خاں نے چند لمحے
خاموش رہ کر پوچھا۔ "کیا ارادہ ہے تیرا؟ بلیاں والا پیر کی زیارت پر چلے گا؟ وہاں بھی منت مان
لینا۔"

"نہیں جی' ایک ہی منت کافی ہے۔ میرا دل کہتا ہے تک کھے پیر کی منت کا ضرور اثر ہوگا۔"

شاہانی نے مزید اصرار نہیں کیا۔ دونوں کچھ دیر ٹیلے کے پاس ٹھہرے رہے۔ ڈھولک کی تھاپ پر
ہیجڑے ناچتے گاتے رہے۔ کمّانے اور مسلی بھنگ چڑھا کر قہقہے لگاتے رہے' شور مچاتے رہے۔ اب
اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ مشعل کی روشنی میں وہ سایوں کی مانند لہراتے نظر آ رہے تھے۔

شاہانی اور رحیم داد کار میں سوار ہوئے اور حویلی میں پہنچ گئے۔

☆

صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو اپنا ڈاگ ہاؤس دکھایا۔ ڈاگ

ہاوس حویلی سے متصل ہی تھا۔ ڈاگ ہاوس کیا تھا، اچھا خاصا بڑا مکان تھا۔ طرز تعمیر کے اعت
کسی سرکاری افسر کا بنگلہ لگتا تھا۔

اس میں کتوں کے رہنے اور آرام کرنے کے لیے کمرے تھے، کوٹھریاں تھیں۔ کتوں کو
کے لیے غسل خانے تھے، چہل قدمی کے لیے برآمدے تھے۔

ڈاگ ہاوس میں دو درجن سے زیادہ کتے تھے۔ ان میں بیشتر نایاب اور اعلیٰ نسل کے کتے
کتوں کو نہلانے دھلانے، راتب دینے، چہل قدمی کرانے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے پندر
تھے۔ وہ کوتی کہلاتے تھے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ڈاگ ہاوس کے وسیع احاطے کے ایک
میں رہتے تھے۔ کتوں کے علاج معالجے کے لیے ایک سلوتری بھی مقرر تھا۔ وہ صبح شام با
سے کتوں کا معائنہ کرتا تھا۔

شاہانی کو کتے پالنے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ وہ گھر میں ہوتا تو ہر صبح کتوں کو دیکھنے
ہاوس ضرور جاتا۔ انھیں بڑے لاڈ پیار سے پچکارتا۔ ان کے منہ سہلاتا۔ پیٹھ اور گردن پر پیا
ہاتھ پھیرتا۔ کوتیوں سے ان کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتا۔ کسی کتے کو ست
تشویش کا اظہار کرتا۔ فوراً سلوتری کو بلواتا۔ کتے کو دکھاتا اور اس کی بیماری اور تکلیف کے
میں تحقیقات کراتا۔ پوری دلچسپی کے ساتھ اس کا علاج کراتا۔ روز اس کے متعلق پوچھ گچھ کر
کتوں کو سویرے سویرے غسل دیا جاتا تھا۔ دو بکرے روزانہ ذبح ہوتے تھے۔ ان کے گ
سے کتوں کے لیے راتب تیار کیا جاتا۔ راتب دیتے وقت مراد خاں شاہانی عام طور پر خود
ہوتا۔ کرسی ڈال کر سامنے بیٹھ جاتا اور کتوں کو گوشت کھاتے دیکھتا رہتا۔

مراد خاں شاہانی کو اپنے کتوں پر بڑا ناز تھا۔ وہ بڑے فخر سے مہمانوں کو اپنا ڈاگ ہاوس او
میں رہنے والے کتے دکھاتا۔ ہر کتے کے بارے میں ایک ایک تفصیل نہایت وضاحت سے
کرتا۔ کسی سرکاری افسر یا جاگیردار کے پاس اعلیٰ نسل کا کتا دیکھتا تو اس کے بچے حاصل کر
کوشش کرتا۔ یہاں تک کہ انھیں چوری چھپے اٹھوا لینے میں مطلق عار محسوس نہ کرتا اور
دھڑلے سے ہنس کر ایسے کتوں کے بارے میں بتاتا کہ انھیں اس نے کس طرح حاصل کیا۔

کتے اس کی جاگیردارانہ شان و شوکت کی علامت تھے اور شکار کے لیے بھی کام آتے تھ
اکثر کتوں کی دوڑ کراتا۔ کبھی کبھی انھیں ریچھوں سے بھی لڑاتا۔ اور ان پر لمبی لمبی شرطیں ل
کتوں کی دوڑ کرانا اور انھیں لڑانا، علاقے کے دوسرے بلوچ سرداروں اور جاگیرداروں کی
مراد خاں شاہانی کا بھی محبوب مشغلہ تھا۔

ڈاگ ہاوس حویلی کے پچھواڑے تھا۔ مویشیوں کا باڑا اور گھوڑوں کا اصطبل بھی قریب ہی تھا۔
مراد خاں کے پاس اچھی نسل کے گھوڑے بھی تھے۔ مگر اسے کتوں سے زیادہ دلچسپی اور انسیت
تھی۔ جب سے اس نے نئی کار اور جیپ خریدی تھی گھوڑے کی سواری چھوڑ دی تھی۔ ایک زمانہ
تھا جب وہ صبح تڑکے اٹھ کر اصطبل میں جاتا۔ کوئی گھوڑا نکلواتا اور اس پر سوار ہو کر دور تک دوڑاتا
چلا جاتا۔ مگر اب اس نے گھوڑوں پر توجہ دینا کم کر دیا تھا۔ کتوں ہی میں اس کی دلچسپی روز بروز بڑھتی
جا رہی تھی۔

مراد خاں نے چلتے چلتے رحیم داد کو مخاطب کیا اور فخر سے کہا۔ "چوہدری! اپنے کو تو صرف دو
چیزوں کا چسکا ہے۔ کتے اور رناں۔ پر کتا اونچی نسل کا ہو۔ رن تو جیسی بھی مل جائے کام چل جاتا
ہے۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "مطلب یہ ہے کہ رن ہونی چاہیے اور نئی سے نئی ہونی
چاہیے۔"

رحیم داد صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے نہ کوئی تبصرہ کیا نہ کسی خاص ردعمل کا اظہار کیا۔
دونوں ڈاگ ہاوس میں داخل ہوئے تو سورج چڑھ کر آسمان کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ رحیم داد نے اندر
جا کر دیکھا۔ سامنے وسیع احاطہ تھا۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ سلسلے وار کچے مکانات تھے۔
مکانوں کے سامنے جال اور کیکر کے درخت تھے۔ درختوں کے نیچے کہیں کہیں چارپائیاں پڑی
تھیں۔ چارپائیوں کے پائے اونچے اونچے تھے۔ کئی چارپائیوں کے ساتھ چادروں کے بنے ہوئے
پنگوڑے لٹک رہے تھے۔ ان میں شیر خوار بچے لیٹے تھے۔ قریب ہی عورتیں بیٹھی چاٹی میں دودھ بلو
رہی تھیں۔ ٹوکریاں بن رہی تھیں یا کسی اور کام کاج میں مصروف تھیں۔ وہ اپنا کام بھی کرتی
رہتیں اور رک رک کر پنگوڑا بھی ہلاتی جاتیں۔ دھیمے سروں میں کوئی لوری بھی گنگناتیں۔

کوتیوں اور کمیوں کے کچے اور بوسیدہ مکانات سے ہٹ کر احاطے کے مشرقی گوشے میں پختہ
عمارت تھی۔ اس پر کھپریل کی خمیدہ چھت تھی۔ سامنے کے رخ پر طویل برآمدہ تھا۔ برآمدہ خوب
کشادہ تھا۔ درمیان سے تنگ راستہ گزرتا تھا جس کے دوسرے سرے پر دروازہ تھا۔ وہ ایک بڑے
کمرے میں کھلتا تھا۔ راستے کے دونوں طرف لوہے کی سلاخوں کا مضبوط جنگلا تھا۔ جنگلے کے اندر
کتے بند تھے اور اس وقت راتب کھا رہے تھے۔

ڈاگ ہاوس میں ہر طرف کچے گوشت کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ جنگلے کے قریب ہی ایک گھنے
درخت کے نیچے چند کوتی زمین پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں جوار اور باجرے کی روٹیاں
تھیں۔ ایسی روٹیوں کو ڈوڈھا کہا جاتا ہے۔ کوتی شلجم کے پتوں کے ساگ اور لہسن کے ساتھ

ڈوڈھے کھانے میں مشغول تھے۔ مٹی کے ایک پیالے میں مکھن اور دوسرے میں جنڈی کا
اچار بھی کھانے کے لیے موجود تھا۔

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کو دیکھتے ہی وہ کھانا چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف ہلچل
عورتیں بھی کام کاج چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہر گوشے اور ہر سمت سے صدائیں بلند
لگیں۔

"سیں 'صدا جیویں' سکھی صحت ہوویں۔"

دو کوتی بھاگم بھاگ کرسیاں اٹھا کر لائے اور لوہے کے جنگلے کے عین سامنے درخت کے
میں رکھ دیں۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کوتی کرسیوں کے پیچھے نکل
کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔

شاہانی نے کچھ دیر بعد پلیٹ کراں کی جانب سرسری سی نظر ڈالی۔ ہاتھ سے اشارہ کیا' اور
سے کہا۔ "جاؤ روٹی کھاؤ۔" اس کے لہجے میں رعونت تھی۔

وہ چپ چاپ چلے گئے اور فرش پر بیٹھ کر ساگ ڈوڈھا کھانے میں جٹ گئے۔ مراد خاں
گوشت کا راتب کھاتے دیکھتا رہا اور ہر کتے کی جانب انگلی اٹھا کر رحیم داد کو بتاتا رہا۔ "
کالے دھبوں والا فاکس ہاؤنڈ ہے۔ یہ کوکر سپینیل ہے' یہ السیشن ہے۔ وہ گرے ہاؤنڈ ہے'
ساتھ والا مستیف ہے' یہ بل ٹیریر ہے' یہ پوڈل ہے' وہ کونے والا برنارڈ ہے۔ یہ باکسر ہے
ریٹریور ہے' یہ نیوفاؤنڈلینڈ ہے۔ وہ دیوار کی ساتھ ابرڈین ٹیریر ہے۔ یہ کولی ہے۔" وہ جس
جانب انگلی اٹھاتا اس کی نسل اور خصوصیات کے بارے میں بھی نہایت ذوق و شوق سے بتا

رحیم داد کو کتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ مگر مراد خاں شاہانی کی خوش نودی کی
بات توجہ سے سنتا رہا۔ ویسے وہ شاہانی کا ڈاگ ہاؤس دیکھ کر خاصا مرعوب ہوا تھا۔ حیرت سے
اٹھا کر ایک طرف دیکھتا اور شاہانی کی باتیں سنتا۔

اسی حیرت اور استعجاب کے عالم میں اس نے شاہانی سے پوچھا۔ "شاہانی! اتنا شان دا
ہاؤس رکھنے پر تو بہت خرچ آتا ہوگا؟"

"ہا سیں! کوئی دس بارھاں ہزار روپے مہینہ تو خرچ ہوتا ہی ہوگا۔" سردار شاہانی نے
سے کہا۔

رحیم داد کی حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ "یہ تو بہت ہوا جی۔"

"کہاں بہت ہوا۔" شاہانی بے تکلفی سے قہقہہ لگا کر بولا۔ "چوہدری! یہ تو اپنے اپنے

بات ہے۔ میں نے تو کتوں کے ایسے شوقین اور ان سے گہری دلچسپی رکھنے والے دیکھے ہیں جو ایک
کتے کے صرف دوا دارو پر ۵ ہزار خرچ کر دیتے ہیں۔"

"نہیں جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔

"میں نے تجھ سے غلط نہیں کہا۔" شاہانی نے اپنی بات پر زور دیا۔ "میرا ایک یار دشت خاں
بگٹی ہے۔ وڈا بلوچ سردار ہے۔ زیادہ تر کوئٹہ میں ملتا ہے۔ اسے بھی کتے رکھنے کا زبردست شوق
ہے۔ بہت اعلیٰ نسل کے کتے اس کے پاس ہیں۔ میں کبھی کبھی گرمیوں میں اس کے پاس چلا جاتا
ہوں۔ سچ پوچھ تو اس کے کتے ہی دیکھنے جاتا ہوں۔"

"اس کے پاس بھی ڈاگ ہاؤس ہوگا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"بالکل ہے اور بہت شاندار ہے۔ میں تجھے اس کے ایک کتے کی دوا دارو کے بارے میں بتا رہا
تھا جس پر ۵ ہزار روپے خرچ آیا تھا۔"

"پنج ہزار تو بہت ہوا' اور وہ بھی ایک کتے کے علاج پر۔"

"بالکل اتنا ہی روپیہ خرچ ہوا تھا۔" مراد خاں شاہانی نے زور دے کر کہا۔ "میں ان دنوں کوئٹہ
ہی میں تھا جب سردار دشت خاں بگٹی کا ایک سپینیل بیمار ہوا تھا۔ تین ہفتے کے لگ بھگ اس کی
دوا دارو ہوتی رہی۔ پہلے اسے گھوڑا ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ وہاں اس کی بیماری کم نہیں ہوئی تو
بروری روڈ کے ریسرچ سینٹر میں علاج کے لیے بھیجا گیا۔ سینٹر میں چار ونٹری ڈاکٹروں نے تین مرتبہ
آپریشن کیا۔ تین انجکشن روزانہ صبح' دوپہر اور شام کو پابندی سے لگائے جاتے تھے۔ ایک انجکشن
۳۰ روپے میں آتا تھا۔"

"تیس روپے کا انجکشن!" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہا سیں! اتنے ہی میں آتا تھا۔ میں تو وہاں موجود تھا۔ کئی بار تو انجکشن میرے سامنے منگوائے
گئے۔" مراد خاں شاہانی تفصیل سے بتاتا رہا۔ "ان انجکشنوں کے علاوہ آپریشن کے دوران کتے کو
گلوکوز چڑھایا گیا اور طاقت کے انجکشن بھی ساتھ ساتھ لگائے جاتے۔ اسے روزانہ ریسرچ سینٹر
کار میں بھیجا جاتا۔ سینٹر شہر سے چھ میل دور ہے۔ جب تک کتا بیمار رہا دو نرسیں دن رات اس کی
دیکھ بھال کرتی تھیں۔" سردار شاہانی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ململ کا پورا ایک تھان تو
کتے کے زخموں کی مرہم پٹی پر لگا۔"

"تب تو ۵ ہزار سے اوپر ہی خرچ آیا ہوگا۔" رحیم داد نے شاہانی کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔

"پر اتنے مہنگے علاج کے بعد کتا بالکل چنگا ہو گیا ہوگا۔"

"نہیں! وہ تمام دوا دارو کے بعد بھی نہ بچ سکا۔" سردار شاہانی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا
"بیماری ایسی خطرناک تھی کہ اس کی جان ہی لے کر ٹلی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری
"چوہدری! بہت شاندار کتا تھا۔ ایسے شاندار اور خالص نسل کے کتے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔"
اس نے قدرے تامل کے بعد بتایا۔ "سردار دشت خاں بگٹی اس کے غم میں پاگل ہو گیا تھا
سارے کوتیوں کی مار مار کر چمڑی ادھیڑ ڈالی۔ دو کو تو جیل میں ڈال دیا۔ دوسرے وڈے بلو
سرداروں کی طرح اس کی بھی اپنی جیل ہے۔"

رحیم داد نے مزید تبصرے سے گریز کیا۔ سردار شاہانی بھی خاموش رہا۔

سامنے بنگلے کے اندر کتے گوشت کھا رہے تھے اور ان کے نزدیک ہی زمین پر بیٹھے ہوئے کو
شلجم کے پتوں کے ساتھ جوار باجرے کا ڈوڈھا کھا رہے تھے۔ خشک ڈوڈھا حلق میں پھنستا تو وہ جلد
جلدی لسی پیتے یا مٹی کے پیالے میں انگلی ڈال کر ذرا سا مکھن نکالتے اور منہ میں رکھنے سے پہ
ڈوڈھے پر لگاتے تاکہ آسانی سے حلق کے نیچے اتر جائے۔

سردار مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کتوں کی جانب توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک
نوجوان عورت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دونوں کے قریب آئی۔ وہ اجلی مجھلی باندھے ہوئے تھی
اس کے اوپر چھینٹ کا کرتا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں نوزائیدہ بچہ دبا تھا۔ بچے کے جسم کے گرد سفید کپ
اس طرح کس کر لپیٹا گیا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر رہ گئے تھے۔ صرف گردن کا کچھ حصہ او
چہرہ نظر آتا تھا۔ بچے کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ پیشانی پر کاجل کا سیاہ ٹیکہ لگا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے ماں
چہرہ تک رہا تھا۔

عورت نے ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھالا اور دوسرے سے دوپٹے کا آنچل کھینچ کر سر اس طر
ڈھکا کہ اس کے چہرے کا بیشتر حصہ بھی چھپ گیا۔ وہ آگے بڑھی اور جھک کر بچے کو مراد خاں شاہا
کے سامنے کر دیا۔ شاہانی نے پہلے بچے کو دیکھا پھر مڑ کر عورت پر نظر ڈالی۔ مسکرایا اور رحیم داد ک
مخاطب کیا۔

"چوہدری! یہ کچھ کمزور لگتا ہے۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے تعجب سے دریافت کیا۔ "اس کے بدن پر ات
کپڑا کیوں لپیٹا ہوا ہے؟ یہ تو ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتا۔"

"ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔" سردار شاہانی نے مسکرا کر کہا۔ "ایسا نہ کیا جائے تو یہ زور آور اور
تگڑا کیسے ہو گا۔ بال بھولے کو زور آور بنانے کے لیے اپنی طرف کا یہی دستور ہے۔ ہم تو پیدا ہوتے

سے مکھن کھلاتے ہیں۔ تب ہی تو ادھر تگڑے اور جڑیا جوان نظر آتے ہیں۔" اس نے نگاہیں
ر عورت کی جانب دیکھا۔ بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "اسے مکھن کھلاتی ہے
؟"

"ہا سائیں!" عورت نے مستعدی سے جواب دیا۔ "کھلاتی ہوں، روز کھلاتی ہوں۔"

سردار مراد خاں شاہانی نے بچے کا رخسار ہولے سے تھپ تھپایا۔ اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور
ت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دریافت کیا۔ "اس کی شکل تو تیرے خاوند جیسی لگتی ہے۔"

"خاوند سے شکل نہیں ملے گی تو کس سے ملے گی؟" رحیم داد بے تکلفی سے مسکرا کر بولا۔
سردار شاہانی! تو بھی کمال کرتا ہے۔"

"چوہدری! تو یہ گالہ نہیں سمجھ سکتا۔ ایسی چٹی اور پوپٹ رن میں چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ اس کا
تھا ہے۔ کس کا ہے؟ اس بھید کو یہ ٹھیک طرح جانتی ہے۔" شاہانی نے گردن کو خم دے کر تیکھی
روں سے دیکھا۔ مسکرایا اور نہایت ڈھٹائی سے پوچھا۔ "جانتی ہے ناں؟"

عورت نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ البتہ اقرار کرنے کے انداز میں ہولے ہولے گردن
ی۔ اس کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا دونوں کو حیرت سے دیکھتا رہا۔

شاہانی نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اونچی آواز سے کہا۔ "بختاور ہووے۔ بھاگیں بھریا
وے۔"

یہ دعائیہ کلمات سردار کی زبان سے سن کر عورت کا چہرہ خوشی اور وفور جذبات سے دمک اٹھا۔
س نے بچے کو سینے سے لگایا اور چپ چاپ چلی گئی۔

☆

کتے نہایت انہماک سے راتب کھا رہے تھے۔ کتوں کے چپڑ چپڑ گوشت کھانے اور ہڈیاں چبانے
ی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ یکایک کسی بچے کی چیخ ابھری۔ شاہانی اور رحیم داد نے
ٹ کر اس طرف دیکھا کہ ڈاگ ہاؤس کے پھاٹک کے نزدیک ایک بچہ کھڑا ہے۔ اس کے منہ میں
بے ہوئے گوشت کی بوٹی دبی تھی۔ ایک عورت اس پر جھکی ہوئی منہ سے گوشت کی بوٹی نکالنے کی
وشش کر رہی تھی۔ وہ اس کی ماں تھی۔ بچہ ضد کر رہا تھا۔ تلملا کر چیخ رہا تھا۔ شاہانی لمحے بھر تک
ونوں کو دیکھتا رہا۔ پھر دیکھتے دیکھتے اس کا چہرہ غصے سے خونخوار ہو گیا۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ رحیم داد
بی اس کے چہرے سے ٹپکتی ہوئی جھنجلاہٹ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

شاہانی نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈپٹ کر عورت سے کہا۔ "اسے ادھر لا۔"

عورت نے گردن اٹھا کر سہمی ہوئی نظروں سے شاہانی کو دیکھا۔

بچہ بھی خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ جنگلے کے قریب کھانا والے کوتیوں کے ہاتھ رک گئے۔ احاطے کی دوسری عورتوں کے چہرے بھی خوف اور دہشت زرد پڑ گئے۔ ڈاگ ہاؤس پر گہری خاموشی چھا گئی۔

سردار مراد خاں شاہانی کی آواز دوبارہ ابھری۔ اس نے ڈپٹ کر عورت سے کہا۔ "تو نہیں۔ اسے لے کر میرے پاس آ۔"

عورت نے بچے کا بازو پکڑا اور ڈری سہمی ہوئی مراد خاں شاہانی کی جانب بڑھی۔ قریب اس نے گڑگڑا کر کہا۔ "سیں سردار! یہ باہر سے گوشت لایا ہے۔ یہاں تو پکتا ہی نہیں۔ اجازت نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "اس سے بھول ہو گئی' معافی دے دے۔ تیرا جیوے۔ رب راضی ہووے۔"

"بکواس نہ کر۔" مراد خاں شاہانی زور سے دھاڑا۔ "خانہ خراب تجھے پتہ ہے یہاں گوشت پک سکتا اور نہ اندر آ سکتا ہے۔"

"پتہ ہے سیں' بالکل پتہ ہے۔" عورت نے جلدی جلدی گردن ہلا کر اس کی تائید کی۔

سردار شاہانی نے اسے نظر انداز کر کے جنگلے کے نزدیک بیٹھے ہوئے کوتیوں کی جانب دیکھا بلند آواز سے کہا۔ "رمضے! ادھر آ۔" فوراً ایک کوتی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تیزی سے مراد خاں جانب لپکا' نزدیک آیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ وہ اونچے قد کا قوی ہیکل جوان تھا۔ عورت اس عقب میں خوف اور دہشت سے آنکھیں پھاڑے خاموش کھڑی تھی۔ بچہ اس کے پہلو سے حیران اور ششدر کھڑا تھا۔ اس کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

سردار شاہانی نے رمضے سے پوچھا۔ "تجھے پتہ ہے' ڈاگ ہاؤس میں گوشت پکانے یا لانے کی کیا ہے؟"

"خیر ہو سیں سردار! میں کوں سب پتہ ہے۔" رمضے نے سینہ تان کر نہایت مستعدی سے جواب دیا۔

"تو جیسا ہمیشہ اس معاملے میں ہوتا ہے ویسا ہی کر۔" سردار شاہانی نے تحکمانہ انداز میں کہا "دروازہ کھول۔" اس نے لوہے کے جنگلے کی جانب اشارہ کیا۔ جس میں کتے بند تھے۔ اس نے مڑ کر بچے کو دیکھا۔ "اسے بھیلے کے سامنے ڈال دے۔"

"سردار سیں! ایسا نہ کر۔" عورت نے تڑپ کر کہا۔ "اسے معافی دے دے۔"

"چپ کر۔" شاہانی نے اسے زور سے ڈانٹا۔

مگر وہ چپ نہ رہی۔ "سزا ہی دینی ہے تو مجھے کتوں کے سامنے ڈال دے۔" یہ کہتی ہوئی وہ مراد خاں کے قدموں پر جھکی۔ مراد خاں شاہانی نے اس کے پیٹ پر زور سے لات ماری۔

"ہٹ جا سامنے سے۔"

عورت لات کھا کر گری اور زمین پر دور تک گیند کی مانند لڑھکتی چلی گئی۔ مراد خاں نے رمضے کو حکم دیا۔ "منہ کیا تک رہا ہے؟ دروازہ کھول۔" اس نے بچے کی طرف ہاتھ اٹھایا۔

"اسے اندر ڈال دے۔"

رمضے نے آگے بڑھ کر جنگلے کے دروازے کا قفل کھولا' واپس آیا اور بچے کا ہاتھ پکڑ کر جنگلے کی سمت بڑھا۔ بچے نے تلملا کر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ رمضے نے جھٹکا دے کر اسے زور سے کھینچا۔ بچہ سہم کر دم بخود رہ گیا۔ رمضا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا' دروازہ کھولا اور دھکا دے کر بچے کو جنگلے کے اندر پھینک دیا۔ بچے کے اندر پہنچتے ہی کئی کتے غرا کر زور زور سے بھونکنے لگے۔

بچے کی ماں اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھی۔ اس کے بال بکھر کر منہ پر آ گئے تھے۔ ان پر خاک جمی تھی۔ چہرہ خوف اور دہشت سے ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ بے قرار ہو کر بار بار پہلو بدل رہی تھی اور مراد خاں شاہانی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

شاہانی نے اس کی جانب مطلق توجہ نہیں دی۔ اس نے جنگلے کے اندر گوشت کھاتے ہوئے ایک خوں خوار بل ٹیریر کو للکارا۔ "بھیلے!" کتے نے گردن اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ سردار شاہانی نے بچے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بل ٹیریر کو شُشکارا۔ کتے نے غرا کر بچے کو خوف ناک نظروں سے دیکھا۔ بچے نے اسے غراتے دیکھا تو سہم کر پیچھے ہٹنے لگا۔

اس کی ماں اٹھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور رحیم داد کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ادھر جنگلے کے اندر بل ٹیریر زور سے بھونکا اور غراتا ہوا بچے پر جھپٹا۔ اس نے دانت نکال کر بچے کی گردن دبوچ لی۔ بچہ بلبلا کر زور سے چیخا۔ اس کی دل سوز چیخ سن کر ماں رحیم داد کے پیروں سے چمٹ کر پھڑکنے لگی اور رو رو کر فریادی ہوئی۔

"سیں! میرے بچے کو بچا لے۔" وہ تڑپ کی چیخی۔ "سیں! میری زاری سن لے' اسے بچا لے۔ رب راضی ہووے۔ تیرا لال جیوے' میرے بچے کو چھڑا لے۔"

اس کی آہ و زاری پر رحیم داد تڑپ اٹھا۔ بے قرار ہو کر اس نے مراد خاں کو مخاطب
"شاہانی! اسے معافی دے دے۔"

"چوہدری! چپ کر کے بیٹھا رہ۔" مراد خاں نے اسے غصے سے جھڑک دیا۔ "اس معاملے
بول۔"

بچے کی ماں رحیم داد کے پیروں سے چمٹی گڑگڑاتی رہی۔ بچہ بار بار تلملا کر چیختا رہا۔ بل ٹیریر
اسے فرش پر گرا دیا تھا اور دانت نکال کر اس کا بدن جھنجھوڑ رہا تھا۔ بچہ تکلیف سے بے چین
چیخا۔ "اماں!"

اس کی آواز کے ساتھ ہی ماں نے رحیم داد کے پیروں پر زور سے سر مارا اور مچھلی کی ما
تڑپنے لگی۔ وہ بار بار دہائی دیتی۔ "میں صدقے تھیواں' سیں! میں کوں معافی دلا دے' سردار ج
سن لے گا۔"

وہ بلبلا کر چیخی۔ "بچا لے میرے بچے کو۔ سیں بچا لے اسے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
عورت کی بے قراری دیکھ کر رحیم داد کا دل پسیج گیا۔ ماں کی ممتا اس کے قدموں پر تڑپ ر
تھی' گریہ وزاری کر رہی تھی۔ اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سردار مراد خاں شاہانی کی جان
دیکھا' اس کی طرف جھکا' ایک ہاتھ آگے بڑھایا' ٹھوڑی چھو کر عاجزی سے بولا۔
"سردار شاہانی! اسے معافی دے دے۔ میری خاطر معاف کر دے۔"
مراد شاہانی نے رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ خونخوار نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں سے
چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ چند لمحے رحیم داد کی جانب گھورتا رہا پھر اس نے مڑ کر اپنے بل ٹیریر
نظر ڈالی۔
"بکھیلے! چھوڑ دے اسے۔"

کتے نے دھیان نہیں دیا' بدستور بچے کو جھنجھوڑتا رہا۔ سردار شاہانی نے اسے زور سے ڈانٹا۔
"ہٹ جا بکھیلے۔" کتا اس قدر سدھا ہوا تھا کہ ڈانٹ سنتے ہی اس نے بچے کو چھوڑ دیا۔ گردن اٹھا
کر شاہانی کو دیکھا' اپنی جگہ واپس گیا اور گردن جھکا کر راتب کھانے لگا۔
شاہانی نے رمضے کو حکم دیا۔ "رمضے! اسے باہر نکال لے۔" اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔
"چوہدری! میرا مہمان ہے اور مہمان کی بات ماننی ہی پڑتی ہے۔"
رمضا جنگلے کے اندر گیا اور بچے کو اٹھا کر باہر لے آیا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ بل ٹیریر کے
دانتوں اور پنجوں کے کھرونچے تھے' خراشیں تھیں۔ ان سے خون رس رہا تھا۔ بچہ خوف اور دہشت

سے نیم جان ہو رہا تھا۔ بچے کے باہر آتے ہی ماں دیوانہ وار دوڑی' بچے کو اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔
اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔
رحیم داد نے کہا۔ "اسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جا یا اسپتال چلی جا۔"
عورت نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اس کے دل میں رحیم داد کے لیے جو جذبہ عقیدت تھا' وہ پلکوں
پر آنسوؤں کے قطرے بن کر جھلملا رہا تھا۔ وہ بچے کو اپنے بازوؤں میں دبوچے ہوئے چپ چاپ
آنسو بہاتی کچے اور بوسیدہ مکانات کی طرف چلی گئی۔ شاہانی گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہنوز
خشونت طاری تھی۔
سردار مراد خاں شاہانی خاموش بیٹھا کتوں کو راتب کھاتے دیکھتا رہا۔ مگر زیادہ دیر نہیں ٹھیرا' اٹھ
کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ اٹھ گیا۔
رحیم داد اور سردار شاہانی ڈاگ ہاؤس سے باہر نکلے۔ خاموشی سے آگے بڑھے۔ حویلی کے صدر
دروازے پر پہنچے۔ دروازہ خوب کشادہ ہونے کے ساتھ اس قدر اونچا بھی تھا کہ اونٹ کجاوے کے
ساتھ اس کے نیچے سے بہ آسانی گزر سکتا تھا۔ حویلی کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ملازم ہڑبڑا کر
کھڑے ہو گئے۔
شاہانی نے ان پر توجہ نہیں دی' اندر چلا گیا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ تھا۔ دروازے کے سامنے
کھلی جگہ تھی۔
یہ حویلی کا چوک تھا۔ چوک کے وسط میں طویل پختہ چبوترا تھا۔ گرمیوں میں اسے شہ نشین کے
طور پر استعمال کیا جاتا۔ دن ڈھلتے ہی اس پر چھڑکاؤ کر دیا جاتا۔ کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ بیچ میں
سردار شاہانی کی کرسی ہوتی۔ وہ اس پر بیٹھ کر ملنے جلنے والوں اور سرکاری افسروں سے ملاقات کرتا
تھا۔ کبھی کبھی کچہری بھی لگاتا۔ اس میں جاگیر کے معاملات طے کیے جاتے۔ یہیں جاگیر سے آنے
والوں کی پیشی ہوتی۔ وہ اس کے روبرو فرش پر بیٹھتے۔ شاہانی ان کے بارے میں شکایات سنتا اور
فیصلے صادر کرتا۔
چبوترے کے آخری کنارے سے کچھ ہی فاصلے پر پاکھر کا گھنا درخت تھا۔ اس کے نیچے باورچی
خانہ تھا۔ قریب ہی پانی کھینچنے کا ہینڈ پمپ تھا۔ چبوترے کے دونوں طرف برآمدے جیسی طویل راہ
داری تھی۔
راہ داری کے عقب میں کمرے تھے۔ ان کے دروازے برآمدے میں کھلتے تھے۔ البتہ کمروں کی
کھڑکیاں پچھواڑے گلی میں کھلتی تھیں۔ گلی حویلی ہی کا ایک حصہ تھی۔ اس کی دیواریں قد آدم

اونچی تھیں۔

چوک حویلی کا مردانہ حصہ تھا۔ اسی میں ڈیرہ تھا۔ باہر سے آنے والے مہمان ڈیرے کی دو عمارت میں نیچے یا اوپر کی منزل کے کمروں میں ٹھہرتے تھے۔ مگر حویلی کا دیوان خانہ نیچے ہی اسے بیٹھک کہا جاتا تھا۔ یہ کشادہ ہال تھا۔ اس میں قیمتی قالین کا فرش تھا۔ بڑے بڑے دبیز صو تھے۔ کرسیاں اور میزیں تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ ہال کے بیچوں بیچ سے بلوریں جھاڑ لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر شاہانی کے بزرگوں اور معروف بلوچ سرداروں کی بڑی روغنی تصویروں کے علاوہ پرانی وضع کی بندوقیں قرابینیں، ڈھالیں اور تلواریں سلیقے آویزاں تھیں۔ کمرے کی آرائش سے مراد خاں شاہانی کی جاگیردارانہ سطوت اور شان و شو جھلکتی تھی۔

مراد خاں بیٹھک میں داخل ہوا اور ایک صوفے پر تھکا ہوا سا چپ چاپ بیٹھ گیا۔ رحیم دا قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

مراد خاں کے چہرے پر خلاف معمول سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی۔ رحیم داد نے اسے اس خاموش اور سنجیدہ پایا تو اسے شاہانی کی خفگی کا شدت سے احساس ہوا۔

رحیم داد نے سردار مراد خاں شاہانی کو منانے کی کوشش کی۔ "تو ابھی تک مجھ سے ناراض ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں نرمی اور معذرت کرنے کا انداز تھا۔

"سیں! یہ گالہ نہیں۔ تو ان کمیوں اور ہڈحراموں کو نہیں جانتا۔ ان کے ساتھ ذرا بھی نر رحم دلی دکھائی جائے تو یہ میرے کتوں کو بھوکا مار دیں۔ ان کا سارا راتب چرا کر کھا جائیں۔ میری جاگیر تک کھا جائیں۔" شاہانی کا لہجہ رفتہ رفتہ تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ ابھر آ تھی۔

"یہ سارے ہی بے ایمان اور حرام کے تخم ہیں۔ انھیں تو بے رحم اور سخت بن کر ہی کابو جا سکتا ہے۔ ہمارے وڈے اور جدی پشتی ان کے ساتھ ایسا سخت سلوک نہ کرتے تو یہ زمیں دا اور جاگیر کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ اس علاکے میں زمیں داری چلانا مخول نہیں ہے۔ دل کی جگہ پ رکھنا پڑتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے خوش نودی حاصل کرنے کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملا

"پر یہ بھی تو ہو سکتا تھا تیرا کتا چھوہرے کو چیر پھاڑ کر ختم کر دیتا۔ لگتا تو ایسا ہی تھا۔ تب کیا ہوتا؟"

"کچھ بھی نہ ہوتا۔" شاہانی نے نہایت بے نیازی سے کہا۔ "پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔

پتہ نہیں۔ پہلے یہ کتوں کے راتب کا گوشت نہ صرف چرا کر کھا جاتے تھے بلکہ بازار میں بیچ بھی دیتے تھے۔ میں نے منع کیا، ڈانٹا، پٹائی بھی کی پر چوری کی عادت ختم نہیں ہوئی تب میں نے ڈاگ ہاوس میں رہنے والے کوتیوں اور دوسرے ملازموں کے لیے گوشت کھانے پر سخت پابندی لگا دی۔"

"پر ایسا تو نہیں کیا ہوگا کہ سزا ہی میں کتے چیر پھاڑ کر کھا جائیں۔"

"میں نے کہا نا، کئی بار ایسا بھی ہوا۔" شاہانی نے بتایا۔ "دو کوتیوں کو تو کتوں نے نہ صرف گرا دیا بلکہ ان کا گوشت بھی نوچ نوچ کر کھا گئے۔ ان میں سے ایک نے تو میرا بہت اعلیٰ الیشن چوری کیا اور ڈیرہ غازی خاں کے ایک کھوسہ سردار کے پاس پہنچا دیا اور خود تھل کلاں کی ایک جنگل میں روپوش ہو گیا۔ پر میرے کرندے اور کامے تلاش کر کے اسے پکڑ ہی لائے۔ میں نے سویرے سویرے اسے کتوں کے سامنے ڈال دیا۔ وہ رات بھر کے بھوکے بھی تھے۔ ایسے جھپٹے کہ ذرا ہی دیر بعد بدن سے گوشت غائب تھا۔ صرف ہڈیوں کا پنجر پڑا تھا۔ دوسرے نے راتب چوری کیا تھا۔ اس کا بھی یہی انجام ہوا۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے؟" رحیم داد نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ "کسی نے تیرے خلاف تھانے میں پرچہ چاک نہیں کرایا؟ صاف ۳۰۲ کیس بن سکتا تھا۔"

"سیں چوہدری! تو کیسی گل کر رہا ہے۔" شاہانی نے ناگواری سے گھور کر رحیم داد کو دیکھا۔ "تو پناہ گیرا ہے، تجھے ادھر کا کچھ پتہ نہیں۔ کوئی میرے خلاف پرچہ چاک کرانے جاتا تو الٹا اس کے خلاف چوری کا مکدمہ بن جاتا۔ حوالات میں بند کر کے چھتر سے ایسی پٹائی ہوتی کہ چمڑی ادھڑ جاتی۔"

اس نے گردن اونچی کی اور نہایت رعونت سے بولا۔ "چوہدری! یہ ہماری جدی جاگیر ہے۔ یہاں ہمیشہ ہماری عمل داری رہی ہے۔ انگریز کے راج میں بھی اور آج بھی۔ ادھری ہمارا ہی کنون چلتا ہے۔"

"اور پولیس کیا کرتی ہے؟" رحیم داد بدستور حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

"پلسے اور تھانے دار بھی ہمارے ہی بندے ہیں۔ ہماری مرضی کے بغیر کوئی بھی سرکاری افسر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔"

وہ بے تکلفی سے ٹھٹھا مار کر پہلی بار ہنسا۔ "سیں، تو ابھی اس علاکے کو ٹھیک سے نہیں سمجھ سکتا۔ کچھ روز اپنے ساتھ رہے گا تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ وہ سردار مراد خاں کی باتوں سے بہت مرعوب نظر آ رہا تھا۔ مراد خاں زیادہ

دیر نہیں ٹھہرا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری! مجھے اب جانا ہے۔ تو روٹی کھا لینا۔ مجھے بالکل نہیں۔"

مراد خاں آہستہ آہستہ زنان خانے کی جانب چلا گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں جا کر بستر پر گر گیا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

۲۹

شام ہو گئی۔ ایک دن اور ختم ہوا۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ فضا دھواں دھواں ہو گئی۔ سردار مراد خاں شاہانی اور رحیم داد پھر مل بیٹھے۔ شراب کا دور چلا۔ شاہانی نے شیواز ریگل کی بوتل منگوائی تھی۔ قیمتی اور عمدہ اسکاچ وہسکی تھی۔ اس کے ساتھ ویسا ہی اہتمام بھی کیا تھا۔ پانی کی بجائے میز پر سوڈے کی بوتلیں تھیں۔ تلے ہوئے مرغ مسلم تھے۔ تکے اور کباب تھے۔

مراد خاں نے وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! کل شام میل ہے۔ حویلی کے چوک میں محفل جمے گی۔ ساوی کا دور چلے گا۔ ناچ گانا ہو گا۔ راگ رنگ ہو گا۔ کچھ اور مہمانوں کو بھی بلایا ہے۔ اچھا زوردار میل ہو گا۔"

"کون کون آ رہا ہے۔" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"یہ تو کل ہی تجھے پتہ چلے گا۔" مراد خان شاہانی نے ہنس کر بتایا۔ "رات بھر جشن رہے گا۔ سب سے تیری جان پہچان ہو جائے گی۔ ویسے سارے ہی اپنے بے تکلف یار ہوں گے۔" اس نے مسکرا کر آنکھ ماری۔ "لہور سے بھی میں نے ایک کنجری بلائی ہے۔ ایسی پوپٹ اور پھڑک دار ہے کہ بدن میں جیسے بجلی بھری ہو۔ مجرا تو اس کا ایسا زوردار ہوتا ہے کہ محفل میں آگ لگا دیتی ہے۔ اپنی پرانی یاری ہے اس سے۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "تیری رکھیل ہے؟"

"نہیں۔" شاہانی نے صاف گوئی سے بتایا۔ "پر جب بھی لہور جاتا ہوں، گانا سننے کے لیے اس کے کوٹھے کا ضرور چکر لگاتا ہوں۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "سچ پوچھ تو کبھی کبھی

صرف اس کے مجرے کی خاطر لور جاتا ہوں۔ اس میں بات ہی کچھ ایسی ہے۔ تجھ سے زیادہ کیا بتاؤں۔ کل خود دیکھ لینا۔"

رحیم داد طوائف کا نام پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ حویلی کے زنان خانے سے نسوانی چیخیں ابھریں۔ کوئی عورت پاگلوں کی مانند زور زور سے چیخ چلا رہی تھی' آہ وزاری کر رہی تھی۔ چیخوں کے ابھرنے کے ساتھ ہی مراد خاں شاہانی کی آنکھوں میں ڈولتا ہوا نشے کا تلاطم غائب ہو گیا۔ دمکتا ہوا چہرہ بجھ گیا۔ اس پر رفتہ رفتہ پریشانی چھانے لگی۔

رحیم داد نے نہ تو پراسرار چیخوں کے بارے میں پوچھا نہ شاہانی سے پریشانی کا سبب معلوم کیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شاہانی بھی گم صم تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے چینی جھلک رہی تھی۔ وہ اس عالم میں زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ گلاس میز پر رکھا' گھبرایا ہوا اٹھا' کمرے سے نکلا' دہلیز پر ٹھٹک کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ الجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "چوہدری! میں تھوڑی دیر بعد آتا ہوں۔" اس نے رحیم داد کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ تیزی سے قدم اٹھاتا راہداری میں داخل ہوا اور اس سے گزر کر زنان خانے کی جانب چلا گیا۔

☆

زنان خانہ ڈیرے سے ملحق ہی تھا مگر بیچ میں کشادہ گلی تھی۔ زنان خانے کے گرد اونچی چاردیواری تھی۔ چاردیواری کے پیچھے وسیع صحن تھا۔ اس میں تین طرف کمرے تھے' دالان تھے۔ صحن چیاں اور کوٹھریاں تھیں۔ کمروں میں شاہانی کی بیوی کے علاوہ بیوہ ماں اور بہنیں رہتی تھیں۔ کوٹھریاں خادماؤں اور باندیوں کے رہنے کے لیے تھیں اور صحن کے ایک گوشے میں کمروں اور صحن چیوں سے ذرا ہٹ کر الگ تھلگ تھیں۔ یہ ساری تفصیلات حویلی کا ماشیا باتوں باتوں میں رحیم داد کو بتا چکا تھا۔ وہ حویلی کا پرانا ملازم تھا۔ اس کا بچپن حویلی ہی میں گزار تھا۔ اب وہ پورا جوان ہو چکا تھا۔ سخت باتونی بھی تھا۔ مالش کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل بولتا رہتا تھا۔

رحیم داد وہسکی کی چسکی لگاتا رہا اور شاہانی کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ زنان خانے سے رک رک کر چیخیں ابھرتی رہیں۔ کبھی دھیمی پڑ جاتیں' کبھی تیز ہو جاتیں۔ اب رات گہری ہو کر کاجل ہو چکی تھی۔ زنان خانے سے بلند ہوتی ہوئی چیخیں بڑی پراسرار معلوم ہو رہی تھیں۔

پہر رات گزر گئی مگر شاہانی واپس نہیں آیا۔ رحیم داد تنہائی سے اکتا گیا۔ اٹھا اور باہر چوک میں چلا گیا۔ نوکر چاکر معمول کے مطابق ادھر ادھر آ جا رہے تھے' باتیں کر رہے تھے۔ رحیم داد نے غور کیا' نہ وہ پریشان تھے نہ گھبرائے ہوئے۔ حالانکہ زنان خانے کی طرف سے چیخیں بار بار ابھر رہی

تھیں۔ رحیم داد واپس ہوا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم کھانا لے کر آیا۔ اس کے چہرے سے بھی کوئی تشویش ظاہر نہ ہوتی تھی۔ اس نے نہایت اطمینان سے میز پر کھانا لگا دیا۔

رحیم داد اس سے ان پراسرار چیخوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا مگر جرات نہ ہوئی۔ ملازم چلا گیا۔ رحیم داد خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

چیخیں اب بند ہو چکی تھیں۔ رحیم داد بھی کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ نوکر برتن اٹھا کر لے گیا مگر مراد خاں شاہانی نہ آیا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا نسوانی چیخوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ حیرت زدہ بھی تھا اور کسی قدر پریشان بھی۔ رات کالی ہو کر گونگی ہو گئی۔

رحیم داد کے قیاس کے مطابق گیارہ بجنے والے تھے۔ رات سرد اور کہر آلود تھی۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ ناگاہ گہرے سناٹے میں گیرج سے جیپ نکلنے اور انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی زنان خانے میں گانے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ان کے لہجے سے رحیم داد نے اندازہ لگایا کہ وہ حویلی کی مراثنیں اور خادمائیں ہیں۔ وہ دھیمے سروں میں گا رہی تھیں۔

تیری ڈاچی دے ملیاں
میں پیر مناون ٹریاں
ڈاچی والیاں موڑ مہاراں

گیت کے بولوں سے صاف عیاں تھا کہ وہ کسی پیر کی زیارت یا خانقاہ کی جانب جا رہی ہیں۔ مگر اونٹ یا ڈاچی کے کجاووں میں بیٹھنے کے بجائے وہ جیپ میں سوار ہو کر سفر کر رہی تھیں۔ جیپ آگے بڑھ گئی۔ گیت کے بول دھیمے ہو کر رات کی خاموشی میں تحلیل ہو گئے۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا اور مراد خاں شاہانی کا انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

دوسرے روز دوپہر کو شاہانی آیا۔ لیکن رات کے واقعے کے بارے میں نہ اس نے کوئی تذکرہ کیا نہ رحیم داد پوچھ سکا۔ شاہانی نے اس سلسلے میں بات کرنے کا موقع بھی نہ دیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی گویا ہوا۔

"سیں چوہدری! رات کو میل ہے۔ تجھے یاد ہے نا؟"

"یاد ہے' بالکل یاد ہے۔" رحیم داد نے بلند آواز سے کہا۔ "پر تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔"

"نہیں' میں نے بیٹھنا نہیں ہے۔" اس نے کلائی اٹھا کر گھڑی دیکھی۔ "مجھے فورا سٹیشن جانا

ہے۔ شام کو تجھ سے ملوں گا۔" شاہانی مڑا اور باہر چلا گیا۔

☆

شام درودیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ حویلی کے چوک میں خوب گہما گہمی تھی۔ باورچی کے سامنے مرغیاں کٹ رہی تھیں۔ پاکھر کے پیڑ تلے ایک تومند آدمی بہت بڑے کونڈے میں گھوٹ رہا تھا۔ اس کا بھن گھٹنا شیشم کی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ وزنی بھی تھا۔ اس میں ری دھاگوں کے رنگ برنگے پھندنے اور گھنگرو بندھے تھے۔ گھنگرو چھنا چھن بج رہے تھے۔ ا چھناکے کے ساتھ وہ جھوم جھوم کر گنگنا رہا تھا۔

سوہنا لال وے پکاراں دمی دیاں

ڈے خوشیاں غم ٹال دے پکاراں دمی دیاں

بھنگ گھوٹنے والا ہنگیرام' مظفر گڑھیا تھا۔ مظفر گڑھ ہی میں لال حسین کی درگاہ ہے ا زیارت کے لیے مظفر گڑھ کے علاوہ ملتان' جھنگ' میاں والی اور دوسرے اضلاع سے ہر ہزاروں عقیدت مند آتے ہیں۔ بھادوں کی چودہ تاریخ کو مزار پر بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ میلے شرکت کے لیے دور دور سے زائرین آتے ہیں۔ چیت کی ہر جمعرات کو بھی صبح سے عقیدت م کے قافلے پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ میلوں کا طویل سفر پیدل طے کرتے ہیں۔ رات بھر در' جاگتے رہتے ہیں۔ پورے تھل کے علاقے میں لال حسین کے مزار کی زبردست دھوم ہے۔: آسیب زدہ عورتوں کا علاج معالجہ ہوتا ہے۔ بھوت پریت اور جن اتارے جاتے ہیں۔ زائرین عقیدت مند چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ منتیں مانتے ہیں۔ لہک لہک کر یہی گیت گاتے ہیں جو حو ہنگیرام اس وقت گنگنا رہا تھا۔

رحیم داد نے غسل کیا' اجلا لباس پہنا اور بن سنور کر کمرے سے باہر نکلا۔ سامنے بیٹھک تھی بیٹھک سے باتوں اور قہقہوں کی ملی جلی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ اسی طرف چلا گیا۔ اندر دا ہوا تو سردار مراد خاں شاہانی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس کے ساتھ مہمان بھی بیٹھے تھے۔ رحیم نے انھیں پہلی بار دیکھا تھا۔ ان میں محکمہ نہر کا ایک انجینئر تھا۔ بھکر کا تحصیل دار تھا۔ بیٹ علاقے کا جاگیردار' سردار عبدالرحمان خاں نوانی تھا۔ تھانے دار عطا محمد تھا۔ کندیاں کا میاں شا تھا۔ بھکر آتے ہوئے رحیم داد اس سے مل چکا تھا۔ اس کے پاس شاہانی کے ہم راہ ایک روز بھی تھا۔

میاں شاہ علی کے علاوہ ملک نیاز محمد خاں اعوان تھا۔ اس کا تعلق کالا باغ کے نواب زادگان.

تھا۔ راجن پور کا سردار سطوت خاں مزاری تھا۔ مظفر گڑھ کا علی نواز گورمانی اور لیہ کا عمردراز خاں جسکانی بھی تھا۔ سارے ہی مہمان سردار مراد خاں شاہانی کے بے تکلف دوست تھے اور ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

رحیم داد کو دیکھتے ہی شاہانی نے ہنستے ہوئے نعرہ بلند کیا۔ "سیں چوہدری' تو کدھر تھا؟" اس نے کمرے میں بیٹھے ہوئے مہمانوں پر ایک نظر ڈالی۔

"لو جی' اپنا چوہدری نورالٰہی بھی آگیا۔"

تمام نگاہیں رحیم داد کی جانب اٹھ گئیں۔ مراد خاں شاہانی نے مسکرا مسکرا کر سب سے اس کا تعارف کرایا۔ سرکاری افسروں کو چھوڑ کر سب ہی جاگیردار اور بڑے زمیں دار تھے۔ شاہانی نے اسے اپنے قریب ہی بٹھالیا۔ رحیم داد اجنبیت محسوس کر رہا تھا۔ وہ خاموش اور کسی قدر گھبرایا ہوا تھا۔

کمرے میں بھنگ کے ساتھ ساتھ وہسکی کا دور بھی چل رہا تھا۔ حویلی کے دو ملازم اجلے لباس پہنے' سروں پر کلف دار پگڑیاں باندھے' ٹرے میں وہسکی کی بوتل' گلاس اور سوڈے کی بوتلیں اور پانی سے بھرے ہوئے جگ رکھے صدر دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے۔ صوفوں کے آگے چھوٹی چھوٹی میزیں تھیں۔ ان پر مہمانوں کے گلاس رکھے تھے۔ کسی کا گلاس خالی ہوتا' ملازم فوراً قریب پہنچتا' خالی گلاس اٹھا کر ٹرے میں رکھتا اور وہسکی کا گلاس جھک کر میز پر رکھ دیتا۔ مہمان کی مرضی کے مطابق جگ سے سوڈا یا پانی گلاس میں ڈال دیتا۔

کچھ ایسے دھاکڑ پینے والے بھی تھے جنھوں نے تکلفات سے بے نیاز ہو کر وہسکی کی بوتل اور پانی سے بھرے ہوئے جگ سامنے میز پر رکھ لیے تھے۔ خود ہی بوتل سے وہسکی انڈیلتے اور پانی یا سوڈا ملا کر پیگ بناتے اور غٹا غٹ چڑھاتے یا آہستہ آہستہ چسکی لگاتے۔

مراد خان شاہانی کے سامنے خاصی لمبی میز تھی۔ اس پر وہسکی کی بوتل نہیں تھی۔ بھنگ سے بھرا ہوا بڑا سا شیشے کا قرابہ رکھا تھا۔ شاہانی کے ساتھ کچھ دوسرے بھی نہایت ذوق شوق سے بھنگ پی رہے تھے۔

شاہانی نے رحیم داد کے لیے گلاس منگوایا اس میں دودھ کی مانند سفید سفید بھنگ انڈیل کر بولا۔ "چوہدری! تو نے ساوی پہلے بھی پی ہے۔ آج اپنی حویلی کی پی کر دیکھ' اسے پینے کو تو دور دور سے شوکین آتے ہیں۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے بھنگ سے بھرا ہوا گلاس اٹھایا' ہونٹوں سے لگایا اور ہلکا سا گھونٹ

بھرا۔ بھنگ خوش ذائقہ تھی۔ اس میں بادام' پستے' خشخاش اور چاروں مغز گھٹے ہوئے تھے۔ خاصی گاڑھی تھی اور اس میں زعفران کی ہلکی ہلکی مہک بھی تھی۔ رحیم داد نے بھنگ کے گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھ دیا۔

شاہانی نے داد طلب نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "چوہدری! کیسی ہے ساوی؟ سچ سچ بتا۔"

"مزا آگیا جی۔ بہت زوردار ساوی ہے۔" رحیم داد نے مونچھوں اور ڈاڑھی کے بھیگے ہوئے بال ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے پسندیدگی کا اظہار کیا۔

مراد خاں شاہانی اس کے جواب پر بہت خوش ہوا۔ ہنس ہنس کر بتانے لگا کہ بھنگ کے ساتھ ملا کر گھوٹا جاتا ہے۔ جو ملنگ گھٹائی کرتا ہے اسے مظفر گڑھ سے خاص طور پر بلوا کر ملازم رکھا ہے۔ وہ بھنگ گھوٹنے کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا ذکر کرتے کرتے شاہانی نے زور کا قہقہہ لگایا اونچی آواز سے بولا۔

"وہ ساوی گھوٹتا ہے' ساوی پیتا ہے اور پی کر سوتا رہتا ہے۔ اس بندے کو اور کوئی کام نہیں۔ وہسکی اور بھنگ کا دور چلتا رہا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ قہقہے بلند ہوتے رہے۔ رات تاریک ہو گئی۔ اس عرصے میں کچھ اور مہمان بھی محفل میں شریک ہوگئے۔ پہر رات گزرنے کے بعد سب نے کھانا کھایا۔ کھانے میں خاص اہتمام اور تکلف کیا گیا تھا۔ کھانا مرغن اور خوش ذائقہ تھا۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی مراد خاں شاہانی مہمانوں کے ہمراہ چوک میں پہنچا۔ پختہ چبوترے پر شام ہی سے شامیانہ لگا کر قناتیں کھڑی کردی گئی تھیں۔ پختہ زمین پر اجلی چاندنی کا فرش تھا۔ اس کے ایک حصے پر قالین بچھا کر گاؤ تکیے لگا دیئے گئے تھے۔ نوکروں نے حقے تازہ کرکے مہمانوں کے لیے رکھ دیئے۔ حقوں کے علاوہ چاندی کی منقش طشتریوں میں ماچس اور سگرٹیں تھیں اور ایش ٹرے بھی تھے۔

سردار مراد خاں اور مہمانوں کے بیٹھنے کے کچھ ہی دیر بعد بیس بائیس بلوچوں کا طائفہ قناتوں کے عقب سے نکل کر سامنے آیا۔ ان کے قد اونچے تھے۔ جسم مضبوط اور سڈول تھے۔ چہروں پر گھنی ڈاڑھیاں تھیں۔ سروں پر گردن اور کانوں تک لٹکتے ہوئے لمبے لمبے پٹے تھے۔ وہ ململ کے لمبے کرتے پہنے ہوئے تھے۔ کمر کے گرد دو پلوؤں والی چادریں لپیٹے ہوئے تھے۔ ان کی شلواریں خوب گھیردار تھیں۔ وہ نیم دائرے میں آکر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے جھک کر مہمانوں کو سلام کیا۔

مراد خاں شاہانی نے رقص شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ اشارہ ملتے ہی ایک بلوچ گلے میں ڈھول ڈالے ہوئے آگے بڑھ کر بیچ میں آگیا۔ وہ ڈھولی تھا۔ دوسرے اس کے گرد دائرے میں کھڑے

ہوگئے۔ ڈھول پر چوٹ پڑی اور ناچ شروع ہوگیا۔ ناچنے والے ڈھولی کے گرد کچھ دیر دائرے میں رقص کرتے رہے۔ ان کے ہاتھ اور پیر نہایت متوازن انداز میں لہراتے رہے' حرکت کرتے رہے۔ رقص کرتے کرتے ایک ناچنے والے نے کان پر ہاتھ رکھ کر تان لگائی۔ اس کی آواز سریلی اور پاٹ دار تھی۔ ڈھول پر زور سے چوٹ پڑی۔ اس نے جھمر کا سرائیکی گیت چھیڑا۔

انہاں سوہنیاں کوں دل ڈے بیٹھڑے!
دل دے کے جہاں ارماں تھیںڈے!!

گیت کے بول رفتہ رفتہ اونچے ہوتے گئے۔ رقص کرنے والے لہک لہک کر کورس میں گاتے رہے۔ "ان حسینوں کو ہم بھولے بھالے لوگ دل دے بیٹھے۔ مگر دل دے کے اب پچھتانا پڑتا ہے۔" گیت کے بول جتنے اونچے ہوتے گئے' ڈھول پر اتنی ہی تیزی سے چوٹ پڑتی رہی۔ گانے کے ساتھ ساتھ ناچ کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی۔ رقص کرنے والوں کے ہاتھ اور پیر بھی گردش کرتے رہے۔ وہ ڈھولی کے گرد دائرے میں گھوم گھوم کر رقص کی رفتار تیز کرتے رہے۔

رحیم داد نہایت محویت سے رقص دیکھ رہا تھا۔ اس کے خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ سر' ناچ کی تیزی کے ساتھ ساتھ ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔ مراد خاں شاہانی اس کے برابر ہی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے مسند پر بیٹھا تھا۔ ناچ دیکھتے دیکھتے اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا اور جھک کر آہستہ سے کہا۔

"چوہدری! اصلی جھمر تو یہ ہے۔ یہ اپنے علاقے کے بلوچوں کا خاص جھمر ہے۔ کیسا ہے؟"

"زوردار ہے جی' بہت زوردار ہے۔" رحیم داد نے بے ساختہ داد دی۔

ناچ تیز ہوتا گیا۔ گیت کے بول اونچے ہوتے گئے۔ ڈھولی جھوم جھوم کر ڈھول پر چوٹ لگانے لگا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے چلتا رہا۔ ڈھول کی تھاپ میں تیزی سے رقص میں بھی تیزی اور گرمی پیدا ہوگئی۔ ناچنے والوں کے سروں کے لمبے لمبے بال لہرا رہے تھے' گردش کر رہے تھے۔ رقص اس قدر تیز ہوگیا کہ دائرے میں ناچنے والے بلوچ بگولے کی مانند نظر آنے لگے۔

رقص اپنے عروج پر پہنچ کر ختم ہوگیا۔ ہر طرف سے "شاباش' واہ وا" کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ رقص مہمانوں کو بہت پسند آیا اور انھوں نے دل کھول کر داد بھی دی۔ رات اب خاصی سرد ہوچکی تھی۔ مگر ناچنے والے پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ وہ ذرا دیر خاموش کھڑے رہے پھر اپنی پیشانیوں سے پسینہ پونچھتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ رخصت ہونے سے پہلے سردار شاہانی نے اشارے سے ڈھول بجانے والے کو قریب بلوایا۔ جیب سے سو سو کے دو نوٹ نکالے اور ڈھولی کو

دیدیے۔ اس نے ادب سے جھک کر نوٹ لیے' اونچی آواز سے دعائیں دیں۔

"سئیں سردار' فی امان اللہ۔ بالیں بچیں' یاریں دوستیں' سب کوں خیر سلا ہووے۔"

ڈھولی الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

رقص کے کچھ دیر بعد ایک نوجوان طوائف اپنے سازندوں کے ساتھ آئی۔ سازندوں نے سا[ز] چھیڑے۔ طوائف نے دوھڑا گایا۔ مگر چلا نہیں۔ خواجہ غلام فرید کی کافیاں بھی نہیں چلیں۔ محفل [کا] رنگ پھیکا دیکھ کر اس نے سمیں چھیڑی۔ سمیں سے محفل کا رنگ کچھ بدلا مگر جلد ہی پھیکا اور س[رد] پڑ گیا۔ حالانکہ سمیں تھل کے علاقے کا بے حد مقبول عوامی گانا ہے۔ سمیں گیتوں میں عام طور [پر] یاس و حرماں کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور شاید اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے پس منظر میں ایک الم[یہ] داستان کار فرما ہے۔

اس داستان کی نوعیت کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ کسی زمانے میں تونسہ میں ایک بیو[ہ] موچن رہتی تھی۔ اس کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ صرف ایک بیٹی تھی۔ اس کا نام سمیں تھا۔ وہ بہت حسین اور دل ربا تھی۔ ماں کی زندگی کا سہارا اور آنکھوں کا تارا تھی۔ سمیں جوان ہوئی تو اس کے حسن اور رعنائی کا ہر طرف شہرہ ہوا۔ شیرل نامی ایک نوجوان ایسا فریفتہ ہوا کہ اسے اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ کبھی واپس نہیں آیا۔ سمیں بھی نہیں لوٹی۔ اس کی بیوہ اور لاوارث ما[ں] جب تک زندہ رہی بیٹی کی جدائی میں تڑپتی رہی اور ایسے حزنیہ گیت گاتی رہی۔

آ سمیں اسان آؤ چلوں

تھل لوں وچ چھک

سارا ساتھ سمولڑا

میں پردیسن بک

طوائف خوش شکل تھی۔ خوش گلو بھی تھی مگر محفل کے مزاج کا صحیح اندازہ نہ لگا سکی۔ اس کا رنگ جما نہیں۔ وہ گئی تو دوسری طوائف آئی۔ وہ بھی نہ چل سکی' محفل میں ہلچل اور گرمی پیدا نہ کر سکی۔ صورت شکل واجبی تھی۔ آواز البتہ خوب صورت اور رسیلی تھی مگر نغمس تھی۔ ناز و ادا میں شوخی اور لگاوٹ نہ تھی۔ محفل کا مطالبہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ بھی اس کیفیت کو سمجھ نہ سکی۔

وہ محفل سے رخصت ہوئی تو ایک گویا آیا۔ اس نے ماہیا چھیڑا جس میں بعض مقامات ایسے آئے جن میں شوخی کے ساتھ ساتھ عریانی کا پہلو نمایاں تھا۔ گانے والے کی آواز میں شیرینی اور حلاوت بھی تھی۔ اس نے سونی محفل میں کسی قدر گرمی اور حرارت پیدا کی۔ وہ ماہیا کے ہر ٹپے کے آغاز پر

[ا]ٹک کر اونچی تان لگاتا اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے سامعین کے جذبات میں ہلچل پیدا کر دیتا۔

اس نے ایک مزاحیہ مقبول گیت "منڈی گھوڑی" بھی خوب لٹک لٹک کر گایا۔ یہ حکایت کے [ان]داز میں ایک لنگڑی گھوڑی کی ہجو تھی۔ اسے گیت کے بولوں میں اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ پیر [ب]کری نامی ایک رئیس نے خوش ہو کر شاعر کو ایک گھوڑی بطور انعام عطا کی۔ مگر وہ ذرا لنگڑی تھی۔ [ش]اعر نے گھوڑی تو قبول کر لی لیکن قصیدہ گوئی کے طرز پر ایک تند اور تیکھی ہجو لکھی۔

اس مزاحیہ گیت نے محفل زعفران زار بنا دی۔ سامعین ہنستے تھے' قہقہے لگاتے تھے۔ گیت کے [بع]ض بند بار بار گانے کی فرمائش کرتے تھے۔ گانے والے کو انعام بھی ملا۔

[گ]ویا گیا تو محفل کا جمود اور پھیکا پن دور ہو چکا تھا۔ بے تکلفی اور غیر سنجیدگی کا رنگ غالب آ چکا تھا۔ اسی عالم کیف و سرور میں ایک نئی طوائف آئی۔ وہ شوخ اور طرح دار تھی۔ رنگ کھلتا ہوا تھا۔ چہرے کے خدوخال بھی سبک تھے۔ جسم چنبیلی کی شاخ کی مانند لچکتا تھا۔ اس کے پیروں میں گھنگرو بندے تھے۔ جیسے ہی وہ آئی' گھنگرو کا چھناکا ہوا۔ اسے مراد خاں شاہانی نے اپنے کاردار کریم بخش رادھانی کے ذریعہ لاہور کی ہیرا منڈی سے بلوایا تھا۔ وہ ابھی نوخیز تھی۔ بیس سال سے زیادہ عمر [ن]ہ تھی۔ اس کا نام شہناز تھا۔ نائکہ بھی لاہور سے ساتھ آئی تھی۔ وہ منجھی ہوئی گھاگ طوائف تھی۔ آگرے کی رہنے والی تھی۔ شہناز اس کی نوچی تھی۔ اس نے شہناز کو رقص و موسیقی کی تعلیم ماہر استادوں سے دلوائی تھی۔ وہ اسے بڑی گلوکارہ بنانا چاہتی تھی۔ اس کے مستقبل کا سہارا بھی تھی۔ آگرے میں کاروبار نہ جما تو وہ شہناز کو بمبئی لے گئی اور یہ کوشش کرتی رہی کہ اسے فلموں میں کام کرنے کا موقع مل جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ پاکستان بنا تو مہاجر بن کر لاہور پہنچ گئی۔ ہیرا منڈی میں اسے ٹھکانہ بھی مل گیا تھا۔ یہیں شہناز سے مراد خاں شاہانی کے مراسم پیدا ہوئے۔ وہ اس کے پاس آنے جانے لگا۔ اس نے شہناز کو آج کی تقریب کے لیے خاص طور پر بلوایا تھا۔

نائکہ کو محفل کے رنگ ڈھنگ کا پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے اشارے پر شہناز نے رقص کے ساتھ ایک تند و تیز عامیانہ گیت بھی چھیڑا۔

پچھی تیریاں گول پنیاں!

اس کی گائیکی بھی اچھی تھی۔ رقص و موسیقی کے امتزاج نے محفل کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ گیت کے ہیجان انگیز بولوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ شہناز پر نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ ہر سمت [س]ے واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ حوصلہ افزائی ہوئی تو اس نے اور جذبے سے اپنے فن کا [م]ظاہرہ کیا۔

گیت ختم ہو گیا مگر وہ بیٹھی نہیں۔ اس نے ایک دادرا شروع کر دیا۔ نائیکہ چونکی۔ چاہا کہ باز رکھے مگر وہ گاتی رہی۔ ایک ایک بول ایسے ناز و ادا سے ادا کیا کہ محفل کی گرمی بڑھ رقص کرتی رہی اور لہک لہک کر دادرے کے بول ادا کرتی رہی۔ جسم کو گردش دے کر میں آنکھیں ڈال کر وہ دادرے کے بول اٹھاتی۔

اندھیریا ہے رات سجن رہیو کہ جیہو!

پلنگ لچک دار سجن رہیو کہ جیہو!!

دادرے کے بول ٹھیٹ پوربی تھے۔ مگر ہندوستانی فلموں کی مقبولیت کی بدولت محا سامعین کے لیے زیادہ نامانوس نہیں تھے۔ وہ جسم کے پیچ و خم' ہاتھوں کی گردش اور آنکھ اتار چڑھاؤ کے ساتھ بول اس طرح پیش کرتی کہ وہ گیت کے پیکر سے نکل کر شہناز کا روپ کر لیتے۔ طبلچی بھی آگرے کا تھا اور شہناز اور اس کی ماں کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ ہر بول پر جھوم جھوم کر طبلے پر تھاپ دیتا' ٹھیکا لگاتا' گانے میں شدت اور حرارت بڑھاتا۔

اس نے ایسا سماں باندھا' محفل کو اس طرح زیر و زبر کیا کہ مراد خاں شاہانی نے لہرا کاردار رادھانی کو شراب لانے کا اشارہ کیا۔ آن کی آن میں بوتلیں کھلنے لگیں۔ جام گر آئے اور مے نوشی کا از سر نو دور شروع ہو گیا۔

نائیکہ' سازندوں کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ سامنے پاندان رکھا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر پان؛ گلوری منہ میں رکھتی۔ اگالدان بھی پاس ہی فرش پر رکھا تھا۔ اسے اٹھاتی اور بار بار پیک اس کی خرانٹ اور تیکھی نظریں محفل میں بیٹھے ہوئے ایک ایک فرد کا جائزہ لے رہی دادرے نے رنگ جمایا تو اس کا اعتماد بحال ہوا۔ سازندوں کو اشارہ کیا' سارنگی نواز بھی؛ جہاں دیدہ تھا۔ اور طبلچی کی طرح آگرے سے بائی جی کے ساتھ آیا تھا۔ نائیکہ نے جھک کر نواز کے کان میں سرگوشی کی۔ دادرا ختم ہوتے ہی سارنگی نواز نے ٹھمری کی ایک دھن؛ ٹھمری بھی اچھی چلی۔

رات گزرتی رہی' بھیگتی رہی' سرد ہوتی گئی۔ محفل میں وہسکی کا دور چلتا رہا۔ شہناز نے مح رنگ کی مناسبت سے اور سامعین کی فرمائش پر ایسے مقبول فلمی گیت گانے شروع کر دیے اور ہیجان انگیز تھے۔ وہ گاتی رہی' ناچتی رہی۔ محفل کی شوریدگی بڑھتی گئی۔ بار بار قہقہے بلند طوائف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ بازاری اور عامیانہ فقرے چست کیے جاتے۔ نشے میں ڈو صدائیں بلند ہوتیں۔

بھلے' بھلے!

ہائے! میں صدقے ونجاں

رات ڈھلنے لگی۔ شہناز نوعمر اور صحت مند طوائف تھی۔ آواز کے ساتھ بدن میں بھی جان تھی مگر جس تیزی سے وہ رقص کر رہی تھی اور ایک کے بعد دوسرا گیت چھیڑ رہی تھی' اس عمل نے اس کے چہکتے بولتے جسم میں تھکن پیدا کر دی۔ وہ نڈھال نظر آ رہی تھی۔ کئی بار اس نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ لیکن اسے اصرار کر کے روک لیا جاتا اور ہر بار نئی فرمائش ہوتی۔ نوٹوں کی ہر طرف سے ایسی بارش ہو رہی تھی کہ تھکنے کے باوجود اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ وہ ہر بار نئے جوش اور جذبے سے نئے گانے کے بول چھیڑتی۔ البتہ اس نے رقص بند کر دیا تھا۔ مگر بول ادا کرتے وقت بھاؤ اس طرح بتاتی کہ محفل کی ہل چل اور گرمی کم ہونے کے بجائے سوا ہو گئی۔

بوتلوں پر بوتلیں کھلتی رہیں' خالی ہوتی گئیں۔ سردار مراد خاں شاہانی اور اس کے مہمان غٹاغٹ پیتے رہے۔ گلاس پر گلاس چڑھاتے رہے۔ نشے سے مدہوش ہوتے گئے۔ ان میں رحیم داد بھی شامل تھا۔ بھنگ کا نشہ ہی کیا کم تھا۔ وہسکی کے چند پیگ لگائے تو نگاہیں بھٹکنے لگیں' زبان لڑکھڑانے لگی۔ مگر محفل میں رقص و سرود نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ وہ بھی مبہوت ہو گیا۔ گلاس پر گلاس خالی کرتا گیا۔ بہت دیر بعد جب طوائف کا پیکر اسے دھندلا دھندلا نظر آنے لگا اور اس کے ساتھ ہر شے گردش کرتی' جھومتی اور لہراتی محسوس ہونے لگی تو وہ چونکا۔ اس نے گلاس ایک طرف رکھ دیا اور گاؤ تکیے کے سہارے بے تکلفی سے پھیل کر بیٹھ گیا۔

رات اور ڈھل گئی۔ اب تکلفات کے پردے اٹھ چکے تھے۔ ہر شخص اپنے انداز سے بیٹھا تھا۔ پینے والوں کا یہ عالم تھا کہ جس طرح جس کا جی چاہتا' پیتا تھا' بہک جاتا تھا۔ پھر پینا شروع کر دیتا۔ محفل میں رفتہ رفتہ بے ترتیبی اور افراتفری پیدا ہونے لگی۔ میاں شاہ علی پیتے پیتے مدہوش ہو کر سو گیا اور زور زور سے خراٹے لینے لگا۔ کچھ اور مہمان بھی سو رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔

عبدالرحمان خان نوانی جھومتے جھومتے ایک طرف لڑھک گیا۔ وہ پھر نہیں اٹھا۔ سردار سطوت خاں مزاری اور علی نواز گورمانی ایک دوسرے کے گلوں میں بانہیں ڈالے لہرا رہے تھے۔ وہ گیت کے کسی بول یا کسی تان سے بہت زیادہ متاثر ہوتے تو تڑپ کر ایک دوسرے کا منہ چوم لیتے۔ وہ منجھے ہوئے تماش بینوں کی طرح طوائف سے اشارے کنائے کرتے۔ کبھی سر پر رکھ کر' کبھی کان میں لگا کر' کبھی انگلیوں میں دبا کر طوائف کو نوٹ پیش کرتے۔ علی نواز گورمانی بدتمیزی سے ٹانگیں پسارے نیم دراز تھا۔ وہ بار بار ایک آنکھ دبا کر ٹکٹکی باندھے طوائف کو تکنے لگتا۔

مراد خاں شاہانی بھی اپنے آپے میں نہ تھا۔ دو بار اس کے ہاتھ سے بھرا ہوا گلاس چھوٹا۔ شلوار اور قمیص جگہ جگہ سے بھیگ گئی۔ نشے سے چور آنکھیں بار بار بند ہو جاتیں۔ اچانک وہ ا کھڑا ہو گیا۔ اس نے مہمانوں سے نظر بچا کر محفل سے نکل جانا چاہا۔ سطوت خاں مزاری نے قہقہہ بلند کیا۔ شاہانی کو ٹوکا۔ "سیں شاہانی! میل تو اب جوبن پر آیا ہے اور تو اسے چھوڑ کر ہے۔" مزاری کے ساتھ ساتھ گورمانی نے بھی قہقہہ لگایا۔

"نہیں، تو ابھی نہیں جا سکتا۔"

مراد خاں شاہانی نے مسکرا کر مزاری اور گورمانی کو دیکھا اور جھوم کر بولا۔ "سیں عیش عیش۔" مگر وہ ٹھیرا نہیں۔ لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف بڑھا۔ کریم بخش رادھانی نے ا پہنچ کر اسے سہارا دیا۔ شاہانی آہستہ آہستہ چلتا ہوا محفل سے چلا گیا۔ کچھ دور جا کر اس نے کاردار کو ہدایت کی۔ "رادھانی! مجرا ختم کرا۔ میاں والی سے جو کنجری آئی ہے اسے میرے کر میں پہنچا دے۔" یہ کہتا ہوا وہ بالائی منزل پر جانے والے زینے کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ راد بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر شاہانی نے رادھانی کو ڈانٹا۔

"میری فکر نہ کر۔ میں آرام سے پہنچ جاؤں گا۔ تو اب جا۔"

کریم بخش رادھانی خاموشی سے واپس ہوا۔ شامیانے کے نیچے پہنچا۔ محفل میں شوریدگی افراتفری تھی۔ رادھانی سیدھا نائیکہ کے پاس پہنچا۔ سرگوشی میں مجرا ختم کرنے کی ہدایت کی۔ نا چاہتی بھی یہی تھی۔ بلکہ مجرا ختم کرنے کے لیے بے چین تھی۔ اس کی نوچی شہناز بھی اب تھک چکی تھی۔ بار بار بے بسی سے نائیکہ کی جانب دیکھتی تھی۔

کسی رسمی اعلان کے بغیر مجرا خاموشی سے ختم کر دیا گیا۔ شہناز نے گانا بند کر دیا۔ گانا ختم ہو مہمان اٹھنے لگے۔ ملازم سہارا دے کر انہیں ڈیرے کے کمروں میں پہنچانے لگے۔ جن کی حال نشے سے ابتر ہوتی انہیں بستروں پر لیٹنے میں بھی مدد دیتے۔

نوابزادہ ملک نیاز محمد اعوان نے قالین پر قے کر دی تھی اور اس میں لت پت پڑا بے چینی۔ ادھر ادھر گردن ہلا رہا تھا۔ اس کے قریب ہی سردار عبدالرحمان خاں نوانی بے سدھ پڑا تھا۔ ذ ہٹ کر بارڈر ملٹری پولیس کا کمانڈر شیر خاں نیازی آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ اور رک رک بڑبڑا رہا تھا۔

"گاؤ، گاؤ، جان من گاؤ، گاتی جاؤ، ناچتی جاؤ۔"

ایک ملازم نے بڑھ کر نواب زادہ نیاز محمد خاں اعوان کا چہرہ تولیے سے صاف کیا۔ دو ملازموں

مدد کے لیے بلایا اور تنومند نواب زادے کو ہاتھوں پر اٹھا کر لے گئے۔ وہ نشے میں مدہوش تھا۔ اسے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہوا تو ڈگمگا کر گرتے گرتے بچا۔ محکمہ نہر کے انجینئر نے زور سے قہقہہ بلند کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر خود لڑکھڑا کر دھڑام سے فرش پر گرا۔ رحیم داد مسکراتا ہوا اس کے قریب گیا۔ اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑایا اور ایک طرف لڑھک گیا۔ رحیم داد بھی بے حال ہو رہا تھا۔ ایک ملازم نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ بستر پر لیٹا تو ہر شے گردش کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بے سدھ پڑا رہا۔ اس کا جسم نشے سے اس طرح ڈول رہا تھا جیسے ہنڈولے میں بیٹھا ہو۔ کبھی اوپر چلا جاتا۔ کبھی نیچے آ جاتا۔ آخر اسی عالم میں وہ سو گیا۔

☆

کچھ مہمان صبح ہی چلے گئے۔ البتہ نواب زادہ ملک نیاز محمد خاں اعوان، علی نواز گورمانی اور عمرداز خاں جسکانی موجود تھے۔ رحیم داد رات کی محفل رقص و سرود میں ان سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ دوپہر کے کھانے پر بھی ان سے بات چیت ہوتی رہی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سارے مہمان رخصت ہو گئے۔ مراد خاں شاہانی بھی عمرداز خاں جسکانی کے ہم راہ لیہ چلا گیا۔

شاہانی لیہ جانے سے قبل رحیم داد کے کمرے میں آیا، معذرت کے انداز میں بولا۔ "سیں چوہدری! برا نہ منانا عمرداز میرے گلے پڑ گیا ہے۔ ویسے لیہ میں مجھے ایک کام بھی ہے۔ میں اس کے ساتھ لیہ جا رہا ہوں۔"

"کب تک واپسی ہوگی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

کل شام تک آ جاؤں گا۔ ارادہ تو یہی ہے پر جسکانی مجھے جلد نہیں آنے دے گا۔ اس نے مجھے روک لیا تو پرسوں ضرور پہنچ جاؤں گا۔"

"تو آرام سے لوٹنا۔ ایسا کر اب مجھے بھی جانے دے۔ میں زیادہ دن نہیں ٹھیر سکتا۔ میں نوں شاہ جی سے ضرور ملنا ہے۔" رحیم داد نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔ "یہ بتا لہور کے لیے ٹرین کب چھوٹتی ہے؟"

"وہ تو رات کے نو بجے جائے گی۔" شاہانی نے مطلع کیا۔

"بس میں اسی سے چلا جاؤں گا۔ تو فکر نہ کر۔ اپنے کاردار رادھانی سے کہتا جا کہ مجھے رات کو سٹیشن پہنچا دے۔"

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو لاہور جانے کی اجازت نہیں دی۔ زور دے کر بولا۔ "نہیں اس طرح نہیں جاسکتا۔ میرے آنے کے بعد ہی جانا۔ ابھی تو شاہ جی بھی نہیں لوٹا ہوگا۔ دوا اکٹھے اس کے پاس چلیں گے۔ مجھے بھی اسے ملنا ہے۔"

شاہانی کے اصرار پر رحیم داد کو رکنا پڑا۔ ویسے بھی اس کا جلد واپس جانے کا پختہ ارادہ نہیں ت وہ چند روز شاہانی کے پاس اور رکنا چاہتا تھا تاکہ احسان علی شاہ اس وقت تک اپنے گاؤں پیراں و واپس پہنچ جائے۔ وہ اس سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد ہی کوٹ ہرکشن جانا چاہتا تھا۔ مراد خا شاہانی تیسرے روز ضرور واپس آنے کا وعدہ کرکے عمردار خاں جسکانی کے ہمراہ لیے چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ جاگا تو کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر گیا۔ حویلی چوک میں پہنچا۔ دن کا چل چلاؤ تھا۔ ملگجی دھوپ کہیں کہیں بلندی پر جھلک رہی تھی۔ ڈیرا بالکا خالی تھا۔ گذشتہ شب جو رونق اور چہل پہل تھی وہ یکسر اجڑ چکی تھی۔ نہ شامیانہ تھا نہ قناتیں تھیں۔ چبوترا ویران تھا۔ حویلی میں ٹھہرے ہوئے تمام مہمان جاچکے تھے۔ صرف نوکر چاکر رہ گ تھے۔ مراد خاں کے جاتے ہی بیشتر نوکر بھی حویلی سے چلے گئے۔

چوک میں ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ صرف باورچی خانے کی سمت بولنے اور باتیں کرنے کی دھیمی دھیمی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ شام کا دھندلکا فضا میں گھلتا جا رہا تھا۔ یہ نومبر کی آخری تاریخوں کی سنسان شام تھی۔ رحیم داد حویلی سے باہر نہیں گیا۔ چبوترے پر گیا اور آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ کہرے میں لپٹی ہوئی شام جلد ہی کالی پڑ گئی۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ پاکھر کے نیچے تنور دہک ر تھا۔ اندھیرا پھیلتے ہی تنور سے نکلتی ہوئی چنگاریاں زیادہ روشن اور چمک دار نظر آنے لگیں۔

خنکی میں بھی اب اضافہ ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے بدن میں ہلکی ہلکی تھرتھری محسوس کی۔ سردی پچھلی رات سے زیادہ تھی۔ رحیم داد نے ایسا ہی محسوس کیا اور اس نے ٹھیک ہی محسوس کیا تھا۔ سردی اچانک بڑھ گئی تھی۔ ہوا بھی تھمی ہوئی تھی۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر باورچی خانے کی جانب دیکھا۔ تنور کے گرد نوکروں کی بھیڑ بڑھ گئی تھی۔ وہ دور سے سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ رحیم داد چبوترے سے نیچے اترا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں واپس پہنچا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی۔ دن بھر سوتا رہا تھا لہٰذا نیند نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ پہر رات گزر گئی۔ باہر چوک میں ملازموں کی آوازیں دھیمی پڑتے پڑتے اب خاموشی میں تحلیل ہو کر ختم ہو چکی تھیں۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور باہر گہرا

ناٹا چھایا تھا۔

وہ آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی عالم میں اس نے دروازہ کھلنے کی آہٹ سوس کی۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول کر دیکھا' ایک ملازم کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ ادھیڑ عا۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ چہرے پر چھدری ڈاڑھی تھی اور چیچک کے داغ نمایاں تھے۔ رحیم داد نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ ملازم نے رحیم داد کو بیدار پایا تو خاموشی سے آگے بڑھا اور بستر کے پائنتی بیٹھ کر ہولے ہولے اس کے پیر دبانے لگا۔ رحیم داد نے کوئی بات نہیں کی۔ ذرا دیر بعد ملازم نے خود ہی بات چھیڑی۔

"سیں! میرا ناں کرامت ہے۔ میں تحصیل علی پور کا رہنے والا ہوں۔ ویسے سب مجھے کرا کہتے ہیں۔"

"کرے! تو مظفر گڑھ سے ادھر کیسے آگیا؟"

"سیں' وہ ایسا ہوا کہ برکھا میں دریا چڑھا تو اپنا سب کچھ اجڑ گیا۔ تجھے تو پتہ ہی ہوگا' سیلاب آتا ہے تو علی پور تحصیل کا سب کچھ بہا لے جاتا ہے۔ اپنے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ پنڈ چھوڑ کر میں ادھر آگیا۔ تب سے یہیں نوکر ہوں۔" رحیم داد خاموش رہا۔ مگر کرامت خاموش نہ رہا۔ اس نے دبی زبان سے پوچھا۔ "سیں' تو سردار کے ساتھ نہیں گیا؟"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کرے! یہ بتا' باہر چوک میں آج اتنا سناٹا کیوں ہے؟ سب کہاں چلے گئے؟"

"وہ ایسا ہی جی' جب سردار نہیں ہوتا اور ڈیرے میں مہمان بھی ٹھیرے نہیں ہوتے تو نوکر اور کامے کام کاج کرکے اپنے سکوں اور شریکوں سے ملنے جلنے چلے جاتے ہیں اور آج تو کمدار بھی چلا گیا۔ وہ نہیں ہوتا تو سب ہی کھسک جاتے ہیں۔" کرامت اپنے گندے دانت نکال کر بھونڈے پن سے ہنسنے لگا۔ "باورچی تک چلا گیا جی۔ اب تو ڈیرے میں کوئی نہیں رہا۔"

"سردار کے جانے کے بعد ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے؟"

"نا سیں نا! ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کچھ کامے چلے جاتے ہیں پر کل رات میل تھا ناں۔ سب سویرے تک جاگتے رہے۔ اب ادھر ادھر نکل گئے پر کل صبح ہوتے ہی پہنچ جائیں گے۔ اندر پتہ بھی نہ چلے گا۔"

"تو کیوں نہیں چلا گیا؟"

"میں کیسے جاسکتا ہوں؟ سیں! تو بھی تو مہمان ہے۔ کسی کو تو ڈیرے میں رہنا ہی چاہیے۔ ویسے

جی ادھر میرا کوئی نہیں۔ میں تو ڈیرے کی کوٹھڑی ہی میں رہتا ہوں۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ اسے کرامت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے آنکھیں بند اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ بار بار بے چین ہو کر بدلتا۔ کرامت ابھی تک پائنتی بیٹھا تھا اور سدھے ہوئے ہاتھوں سے رحیم داد کے پاؤں دبا رہا اسے بے چین دیکھ کر کرامت نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

"سیں لگتا ہے تجھے نیند نہیں آرہی۔"

"میں دوپہر بعد سو گیا تھا اور شام تک سوتا رہا۔" رحیم داد نے نیند نہ آنے کا جواز پیش کیا۔

"سیں! چی گالیہ ایہہ ہے' تو جوان ہے۔ جوان بندے کو اکیلے نیند نہیں آتی۔" وہ شوخی مسکرایا۔ رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ اسے خاموش پا کر کرامت کی حوصلہ افزائی وہ زیادہ بے باک ہو گیا۔ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ایک آنکھ د گویا ہوا۔ "سیں! تو کہہ تو آلس دور کرنے کو کسی کو تیرے پاس بھیج دوں؟"

رحیم داد اس کی بات سمجھ کر بھی سمجھ نہ سکا۔ اسے معلوم تھا کہ احسان علی شاہ کی طرح سر مراد خاں شاہانی کی حویلی میں کوئی ایسا کوٹ نہیں ہے جس میں مزارعوں اور کمیوں کی نوجو عورتوں کو اٹھوا کر قید رکھا جاتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو شاہانی اس کا اظہار ضرور کرتا۔ وہ اس سلسلے کرید کر پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کرامت اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جا نہیں دیکھا۔ چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد الجھن میں پڑ گیا۔ نیند پہلے ہی آنکھوں میں نہیں تھی۔ اب بالکل اڑ گئی۔ اس نے دروازے کی جانب بے قرار نظروں سے دیکھا۔ کچھ دیر کروٹ کے بل لیٹا رہا اور دروازے کو رہا۔ مگر نہ دروازہ کھلا نہ کوئی اندر آیا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ سناٹا گہرا ہو گیا۔ رحیم د نے کروٹ بدلی' آنکھیں بند کیں اور ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے کرامت خیال جھٹک کر ذہن سے نکال دیا۔

نیند دھیرے دھیرے رحیم داد کی آنکھوں میں اترنے لگی۔ رات خاصی گزر چکی تھی۔ ہوا بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ یکایک گہری خاموشی میں کمرے کا دروازہ ہولے سے چرچرایا۔ رحیم دا کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں سامنے دیوار پر ایک پرچھائیں لہرائی۔ رحیم داد نے جھٹ گردن موڑ کر دروازے کی جانب دیکھا کہ دروازے کے قریب کرامت کے بجائے ایک عورت کھڑی ہے۔ اس کی پیٹھ رحیم داد کی جانب تھی۔ اس نے کمرے

دروازہ آہستہ سے بند کیا اور پلٹی۔ رحیم داد نے دیکھا' وہ سرمئی رنگ کی اونی دوہر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ دوہر سے اس طرح چھپا تھا کہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ سرو قامت تھی۔ جسم گداز اور قدرے بھاری تھا۔ کولھے چوڑے تھے اور نچلا دھڑ خاصا پھیلا ہوا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے رحیم داد کی جانب بڑھی۔

رحیم داد اٹھ کر تکیے کے سہارے بیٹھ گیا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ خوب گھیردار ریشمی گھگرا پہنے ہوئے تھی۔ وہ نظریں جھکائے خاموشی سے قریب آئی اور اپنا گھگرا سمیٹ کر رحیم داد کے قریب بستر پر بیٹھ گئی۔

وہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔ اس کی سانسیں کمرے کے سکوت میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

رحیم داد نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا' ہاتھ بڑھایا اور اس کے چہرے سے دوہر ہٹا دی۔ اس کا چہرہ اب رحیم داد کے سامنے عیاں تھا۔ اس کا رنگ صبح کی دھوپ کی مانند اجلا تھا۔ رخساروں پر شفق کی سرخی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور کالی تھیں۔ سر کے بال لمبے اور گھنے تھے۔ وہ سرخ اور نیلے دھاگوں سے کڑھا ہوا جوگیا چولا پہنے ہوئے تھی۔ وہ خوبصورت اور طرح دار عورت تھی۔ آنکھوں میں کاجل لگا کر اور بال سنوار کر بن ٹھن کر آئی تھی۔ مگر اس کا سن چالیس برس سے کم نہیں تھا۔ اس کی جوانی کا سورج ہر چند کہ ڈھل چکا تھا لیکن ابھی تک اس میں غضب کی دلکشی اور رعنائی تھی۔

رحیم داد کو وہ بہت اچھی لگی۔ اس نے مسکرا کر بات چیت شروع کی۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرہ اور سرخ ہو گیا تھا۔

رحیم داد نے دوبارہ اس کا نام پوچھا وہ پھر بھی نہ بولی۔ رحیم داد نے زچ ہو کر تیکھے لہجے میں کہا۔

"بولتی کیوں نہیں۔ تو گونگی تو نہیں ہے؟"

اس دفعہ اس نے اپنی نظریں اٹھائیں۔ اس کی سیاہ اور روشن آنکھیں جھلملائیں۔ لمحے بھر کے لیے دونوں کی نظریں ملیں مگر اس نے جھٹ نظریں ایک بار پھر نیچی کر لیں۔ رسان سے بولی۔ "میں تجھ سے باتیں کرنے نہیں آئی ہوں۔"

رحیم داد نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کے منہ پر رکھ دیا۔ رحیم داد نے بے ساختہ اس کا نرم و گداز ہاتھ تھام لیا۔ اس کی کلائی میں پڑی ہوئی چوڑیاں آہستہ سے جھن جھنائیں۔ اس کے لب تھرتھرا رہے تھے۔ رحیم داد گومگو کے عالم میں اسے تکتا رہا۔

☆

کمرے میں سکوت چھایا تھا۔ رات کا قافلہ دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر وہ اٹھ کر جانے لگی تو رحیم داد نے اس کی کلائی تھام کر نرم لہجے میں کہا۔ "چلی جانا۔ ابھی بہت رات رہتی ہے۔"

وہ مزید ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ "سیں! میکوں اب جانا ہے۔" اس نے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ "میری تلی چھوڑ دے۔ میں اب نہیں رک سکتی۔"

"تونے تو کوئی گل بات ہی نہیں کی۔" رحیم داد نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔ "اپنا نام تو بتا دے۔"

وہ قدرے تیکھے لہجے میں بولی۔ "یہ نہ پوچھ۔" اس نے جھٹکا دے کر اپنی کلائی رحیم داد کی گرفت سے آزاد کرالی۔ بستر پر پڑی ہوئی اونی دوہر اٹھائی' اسے اس طرح اوڑھا کہ ایک بار پھر اس کا چہرہ چھپ گیا۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ آہستہ سے ایک پٹ کھولا۔ جاتے جاتے دہلیز پر ٹھٹکی۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔ "سردار سے میرے بارے میں گالہ نہ کرنا۔ ہرگز ہرگز نہ کرنا۔" اس نے سختی سے تاکید کی۔

"قسم کھا۔ اس سے کچھ کہے گا تو نہیں۔"

"جیسی چاہے قسم لے لے۔" رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ "رب سونہہ' میں توں اسے ایک لفظ نہیں کہتا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ مجھ پر بھروسہ کر۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "کل بھی آئے گی ناں' سردار تو کل رات بھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ پرسوں شام سے پہلے نہیں آئے گا۔ مجھے یہی پتا لگا ہے۔" اس نے زور دے کر پوچھا۔

"بول' کیا کہتی ہے؟"

اس نے رحیم داد کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دھیرے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ رحیم داد گم صم بیٹھا رہا اور نظریں اٹھائے دروازے کو تکتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ پلنگ سے نیچے اترا۔ دروازہ بند کیا اور بستر پر واپس جا کر لیٹ گیا۔

وہ دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ عورت نے اپنے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہاں تک کہ نام بتانے سے بھی گریز کیا تھا۔ وہ کون تھی' کہاں سے آئی تھی اور کیسے آئی تھی؟ رحیم داد کو کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ نہ جانے کب تک اس پراسرار عورت کے بارے میں غلطاں و پیچاں رہا۔ آخر اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو رحیم داد نے دیکھا کہ بستر پر ایک طرف چادر کی سلوٹوں میں دبا ہوا سونے کے

موٹے موٹے منکوں کا ایک کنٹھا پڑا ہے۔ کنٹھا خاصا وزنی اور قیمتی تھا۔ اسے فوراً رات والی عورت یاد آگئی۔ اس نے کنٹھا اٹھا کر تکیے کے نیچے رکھ دیا اور خاموش بیٹھا عورت کے بارے میں اندازے لگاتا رہا۔ مگر بہت سوچ بچار کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

رحیم داد نے نہا دھو کر ناشتا کیا۔ لیکن تمام عرصے وہ اس عورت کے متعلق سوچتا رہا جو ہنوز اس کے لیے ایک معمہ تھی۔ کرامت بھی نہیں آیا۔ اس کی تلاش میں رحیم داد کمرے سے نکل کر چوک میں گیا۔ وہ تمام نوکر چاکر واپس آگئے تھے جو رات کو حویلی سے غائب ہو گئے تھے۔ وہ اپنے کام کاج میں مصروف تھے۔ رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ مگر نوکروں میں اسے کرامت نظر نہ آیا۔

ڈیرا ابھی تک خالی تھا۔ شام ہو گئی۔ لیکن نہ کوئی مہمان آکر ٹھہرا نہ سردار مراد خان شاہانی واپس آیا۔ چوک میں کہرے کا نیل گوں غبار گاڑھا پڑتا جا رہا تھا۔ فضا دھواں دھواں تھی۔ خاموشی بڑھتی جا رہی تھی۔ رحیم داد کو رات کا انتظار تھا اور رات جیسے رینگ رینگ کر بڑھ رہی تھی۔

رحیم داد اول شب ہی اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا باہر سے ابھرنے والی آوازیں سنتا رہا۔ بے قراری کا یہ عالم تھا کہ ٹھیک سے کھانا بھی نہ کھا سکا۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا کبھی دروازے پر جا کر چوک کی طرف دیکھتا۔ چوک رفتہ رفتہ سنسان پڑ گیا۔ نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھریوں میں جا کر لیٹ چکے تھے۔ رحیم داد کو توقع تھی کہ وہ ضرور آئے گی۔ اس کا سونے کا کنٹھا رحیم داد کے پاس تھا۔ کنٹھا واپس لینے اسے آنا چاہیے تھا۔

وہ بے چینی سے اس کی راہ تکتا رہا۔ باہر گونگی رات ساکت کھڑی تھی۔ ہر طرف پالا پڑ رہا تھا۔ فضا پر گہری خاموشی چھائی تھی۔

آدھی رات سے کچھ پہلے دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رحیم داد بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے دروازے کی جانب اشتیاق سے دیکھا۔ مگر دروازے پر وہ نہیں تھی کرامت تھا۔ وہ چپ چاپ چند لمحے تک دروازے کے قریب کھڑا رہا۔ پھر نظریں اٹھا کر رحیم داد کی طرف دیکھا' دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔

رحیم داد نے گلہ کیا۔ "کرمے! تو دن بھر کہاں رہا؟ نظر ہی نہیں آیا۔"

"سیں' میں سویرے سویرے دریا خاں چلا گیا تھا۔ اندھارا ہونے کے بعد لوٹا ہوں۔"

رحیم داد نے اس کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر گرد جمی ہوئی تھی۔ وہ سفر کی تکان سے نڈھال نظر آرہا تھا۔ رحیم داد نے ہمدردی کے طور پر کہا۔ "کرمے! میں توں پیر نہیں دبوانے۔ تو بہت تھکا ہوا لگتا

ہے۔ جا کر آرام کر۔"

"سیں! جیسی تیری مرضی۔" کرامت نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "تجھ سے ایک گالہ پوچھنی تھی۔"

"ضرور پوچھ۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ کرامت نے دبی زبان سے پوچھا۔ "سیں! تو نے سونے کی ایک مالھان تو نہیں دیکھی؟"

"کیسی مالھان؟" رحیم داد نے انجان بن نے کی کوشش کی۔

"سیں، رات اس کے گلے سے مالھان اتر کر یہاں گر گئی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت پریشان ہے۔ میں اس کی مالھان لینے آیا ہوں۔"

رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر تکیے کے نیچے سے کنٹھا نکالا، کرامت کے سامنے کیا اور زیر لب کر بولا۔ "یہ رہی اس کی مالھان۔ اسے لینے تو کیوں آیا؟ وہ خود کیوں نہیں آئی؟"

"یہ تو جی وہی بتا سکتی ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" کرامت نے گول مول جواب دیا۔

"ٹھیک ٹھیک بات کر۔" رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔

"سیں، میکوں کیہ کہنا اے؟" کرامت مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "اس کی مرضی۔ آنا چاہے تو آ جائے گی۔"

"پر کل رات تو اسے تو یہاں لایا تھا نا؟"

"نا سیں، ایسی گالہ نہیں۔" کرامت نے انکار میں گردن ہلائی۔ "اس کی مرضی نہ ہوتی اسے کیسے لاتا۔"

"تو اس کے ساتھ ساتھ آیا تھا؟ پر وہ کمرے میں بالکل اکیلی آئی تھی۔"

"میں تو اسے تیرے کمرے تک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔" کرامت نے وضاحت کی۔

"جب وہ واپس گئی تب تو کہاں تھا؟"

"سیں! میں اس کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ میکوں پتہ تھا وہ دیر سے لوٹے گی۔" اس نے مسکرا کر رحیم داد کو بتایا۔ "اس نے واپسی پر مجھے جگایا تھا۔"

"آج بھی وہ آئے گی؟" رحیم داد نے بے قرار نظروں سے کرامت کو دیکھا۔

"پتہ نہیں جی۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "ویسے سچی گالہ پوچھ تو مجھے لگتا نہیں وہ آج بھی آئے گی۔"

"تو نے کیسے اندازہ لگایا، وہ نہیں آئے گی؟"

"سیں! اسے آنا ہوتا تو مالھان لینے خود آتی۔ میکوں تیرے پاس نہ بھیجتی۔"

"اچھا یہ بتا، وہ ہے کون؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"سیں، یہ تو میں ہرگز ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ کرامت نے صاف انکار کر دیا۔ "میں اس کے بارے میں تیکوں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں نہیں بتا سکتا؟" رحیم داد نے جھلا کر سوال کیا۔

کرامت نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ بت بنا خاموش کھڑا رہا۔

"بولتا کیوں نہیں؟" رحیم داد نے اسے ڈانٹا۔ "صاف صاف بتا۔" اس کی آواز قدرے اونچی تھی۔

"سیں، دھیرے بول۔" کرامت نے مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ "تیکوں پتہ نہیں، یہ عزت اور لاج کی گالہ ہے۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "میں تجھے کیسے بتا سکتا ہوں؟" اس کے چہرے پر خوف کی جگہ جھنجلاہٹ آ گئی۔ "میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا اس کے بارے میں نہ پوچھ۔ میکوں کچھ نہیں بتانا۔"

رحیم داد نے اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو رام کرنے کی کوشش کی۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "نہ بتا، تیری مرضی۔ پر اتنا بتا دے اس کا نام کیا ہے؟"

رحیم داد کو توقع تھی کہ کرامت اس کا نام بتا دے گا مگر اس کی توقع پوری نہ ہوئی۔ کرامت آمادہ نہ ہوا۔ "نا سیں نا، میں یہ بھی نہیں بتا سکتا۔ اس کے بارے میں تو میں تجھے کچھ نہیں بتا سکتا۔"

عورت کی شخصیت کا معمہ کرامت نے اپنی باتوں سے اور پیچیدہ بنا دیا۔ رحیم داد کا اشتیاق بڑھا۔ "تو عجب گل کر رہا ہے۔" رحیم داد کے لہجے میں اس دفعہ کسی قدر تلخی تھی۔

"ہا سیں، یہ عجب ہی گالہ ہے۔ اس میں بدنامی اور لنک کا ڈر ہے۔" وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ "تو ہزار پوچھ۔ میکوں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ میں ہرگز کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"تو فیر یہ بھی صاف صاف سن لے، میں نے مالھان تجھے نہیں دینی۔" رحیم داد جل کر بولا۔ اس نے کنٹھا ایک بار پھر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ "اسے کہہ دے، مالھان لینی ہے تو خود آ کر لے جائے۔ میں تجھے نہیں دوں گا۔"

"سیں ناراض نہ ہو۔" کرامت نرم پڑ گیا۔ اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ "مالھان دیدے، تیری مہربانی ہوگی۔ رب راضی ہووے، تو سدا راضی ہو، خوش ہو۔"

"تو کچھ ہی کہہ مالھان میں نے تجھی نہیں دینی۔" رحیم داد اپنی بات پر جما رہا۔ "مالھان صرف

اور صرف اسی کو دے سکتا ہوں۔" کرامت سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ رحیم داد نے ڈپٹ کر "کھڑا کیوں ہے؟ جو میں نے کہا ہے اسے جا کر بتا دے۔ وہ کوئی بھی ہو مالھان لینی ہے تو اسے خو کر یہاں آنا پڑے گا۔" رحیم داد بستر پر دراز ہو گیا۔ "اب تو یہاں سے پھوٹ جا۔ میں نو ہے۔ اونگھ آرہی ہے۔ رات بھی بہت ہو گئی۔"

کرامت مڑا اور ہولے ہولے کولہے مٹکاتا باہر چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹا انتظار کرتا رہا۔ رات گزرتی گئی۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ رات آدھی ہو گئی۔ ہو کر ڈھلنے لگی۔ لیکن نہ کرامت آیا' نہ وہ آئی۔ رحیم داد انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ صبح اٹھ کمرے سے باہر آیا تو ملازموں کی زبانی معلوم ہوا کہ مراد خاں شاہانی واپس آگیا ہے۔

ناشتے پر شاہانی بھی پہنچ گیا۔ اس نے رحیم داد کے ساتھ ہی ناشتا کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر خاں نے جیپ نکالنے کا حکم دیا اور خود بھی گیرج کی طرف چلا گیا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ ؛ والی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے دروازے پر آہٹ سنی' مڑ کر دیکھا کہ کرامت سامنے ہے۔ رحیم داد نے پوچھا۔

"تو پچھلی رات کیوں نہیں آیا؟ اب کس لیے آیا ہے؟"

"سیں! تو نے صاف انکار کر دیا تھا۔ میکوں آکر یہ لینا تھا؟"

"اسے اپنے ساتھ لاتا۔ وہ کیوں نہیں آئی؟"

"سیں' آہستہ بول۔" اس نے سراسیمہ نظروں سے باہر چوک میں دیکھا۔ "میکوں پتہ سردار واپس آگیا ہے۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "میں نوں یہ بتا' وہ کیوں نہیں آئی؟" رحیم کا لہجہ اس دفعہ دھیما تھا۔

"سیں' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" کرامت نے سرگوشی کی۔ "اس کی مرضی' نہیں آئی۔ تو نے کہا تھا' میں نے اسے کہہ دیا۔"

"کیا بولی وہ؟"

"اس نے میری گالہہ سنی پر کچھ بولی نہیں۔ سیں! اس کی مالھان دیدے۔" وہ گڑگڑانے "تیری بہت مہربانی ہوگی۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "وہ بہت پریشان ہے۔ اسے کرے گا تو وہ تجھ سے ناراض ہو جائے گی۔"

"اسے کہنا ناراض نہ ہو۔ میں چند روز بعد واپس آجاؤں گا۔ اس کی مالھان تب ہی دوں گا۔

آکر خود لے جائے گی۔ فکر نہ کر مالھان میرے پاس حفاظت سے رہے گی۔"

کرامت کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مراد خاں شاہانی مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن کرامت پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ اڑ گئی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے کرامت کو دیکھا۔

"کرمے! تو ادھر کیا کر رہا ہے؟" اس کا لہجہ تند اور کڑوا تھا۔

رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ "شاہانی! میں نے اسے بلایا تھا۔" اس نے مڑ کر کرامت کی جانب دیکھا۔ "مجھے فافٹ ایک گلاس پانی لادے۔ تجھے اسی لیے بلایا تھا۔"

کرامت کمرے سے چلا گیا۔ مراد خاں شاہانی کھڑا رہا۔ رحیم داد نے اس کے بشرے سے اندازہ لگایا کہ کرامت کا وہاں آنا اسے ناگوار گزرا ہے۔ رحیم داد نے غور کیا کہ کرامت اس کے لیے پانی نہیں لایا بلکہ حویلی کا ایک اور ملازم پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر اندر آیا۔ رحیم داد نے اس سے کرامت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ گلاس لیا اور اس طرح ہونٹوں سے لگا کر غٹاغٹ پی گیا گویا بہت پیاسا ہو۔

☆

جیپ حویلی کے صدر دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ رحیم داد اور سردار مراد خاں جیپ میں بیٹھ گئے۔ جیپ نے حرکت کی اور آگے بڑھ گئی۔ اسے ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اس کے برابر شاہانی کا ایک نوجوان ملازم ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق سنبھالے بیٹھا تھا۔ مراد خاں شاہانی پچھلی نشست پر رحیم داد کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ جیپ گرد کے بادل اڑاتی تیزی سے پرپیچ راستوں پر دوڑ رہی تھی۔

بھکر شہر سے نکل کر جیپ اس سڑک پر پہنچ گئی جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ وہ بہل اسٹیشن کی سمت تیز رفتار سے جا رہی تھی۔ سڑک کے بائیں طرف ریلوے لائن تھی اور دائیں طرف کھیتوں سے گھری ہوئی بستیاں تھیں۔ جھاڑ اور جنگل تھے جو حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ دریائے سندھ کا ساحلی علاقہ ہے جو بیٹ کہلاتا ہے۔ یہ بھکر سے بہل تک پندرہ میل لمبی اور پانچ میل چوڑی سرسبز و شاداب پٹی ہے اور اپنی زرخیزی کے لیے مشہور ہے۔ جدھر آنکھ اٹھتی ہے۔ ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔

بیٹ کا علاقہ شاہانیوں' ڈھانڈلوں اور توانیوں کی جاگیروں میں بٹا ہوا ہے۔ مگر ڈھانڈلوں کی زمیں داری شاہانیوں اور توانیوں کے مقابلے میں زیادہ بڑی ہے۔

بیٹ نشیب میں واقع ہے۔ سامنے دریائے سندھ بہتا ہے جس کا پاٹ میلوں تک پھیلا ہے۔ دریا

کے درمیان جگہ جگہ خشکی کے دو آبے نظر آتے ہیں جنھوں نے جزیروں کی شکل اختیار کر لی ان جزیروں کو کچے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ کچے غیر آباد اور ویران نہیں ہیں۔ ان میں بہ آباد ہیں۔ زمین نہایت زرخیز ہے اور ان کے باشندے سخت محنتی اور جفاکش ہیں۔ کھیتی باڑ اور مویشی پالنا ان کا پیشہ ہے اور یہی ان کا ذریعہ معاش ہے۔ ان کا رہن سہن بہت سیدھا ہے۔

مکانات مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور ان کی چھتیں عام طور پر پھوس اور جوار کی ہوتی ہ گھروں کی چار دیواری کے اندر کشادہ آنگن ہیں جن میں گھنے اور سایہ دار درخت ہوتے ہ آنگنوں میں چارپائیاں بچھی ہوتی ہیں۔ مرد فرصت کے اوقات میں چارپائیوں پر بیٹھ کر گزگزاتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ دل بہلاتے ہیں۔ آنگنوں میں درختوں اور کھونٹوں سے بند ہوئے مویشی جگالی کرتے رہتے ہیں۔ مرغیاں کڑکڑاتی ہوئی ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہیں۔ مرد سو طلوع ہوتے ہی جب ہل پنجالی سنبھال کر کھیتوں پر کام کرنے نکل جاتے ہیں تو عورتیں گھروں مشین پر چارہ کاٹتی ہیں۔ گائے بھینسوں اور بکریوں کے لیے غذا مہیا کرتی ہیں۔ گائے بھینسوں تھنوں سے بالٹیاں بھر بھر کر دودھ نکالتی ہیں جس سے مکھن اور کھوئے کے علاوہ طرح طرح کے مٹھائیاں تیار کی جاتی ہیں۔

مرد دودھ 'کھویا اور مٹھائیاں لے کر دریا عبور کرتے ہیں اور گرد و نواح کے بازاروں میں فرو کرتے ہیں۔ دریا عبور کرنا بھی ان کا ایک فن ہے۔ وہ دودھ سے بھری ہوئی گاگریں اور مٹھائیوں اور سبزیوں کے ٹوکرے کمر اور ٹانگوں سے باندھ کر یا سر پر رکھ کر اس مہارت ہوشیاری سے دریا سے گزرتے ہیں کہ کوئی بھی شے پانی سے خراب نہیں ہوتی۔ دریا پار کرنے لیے وہ اپنے سینے سے چمڑے کی چھوٹی سی مشک باندھ لیتے ہیں جسے سندھاری کہا جاتا ہے۔ ان سفر بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سندھاری کا چمڑا کہیں سے کھل جاتا ہے یا پانی بہتی ہوئی درختوں کی شاخوں کی کوئی نوک یا کانٹا چبھ جاتا ہے تو وہ سخت مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ ایسے خطرات سے نمٹنا جانتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ دریا کی لہریں اڑ نگل جاتی ہیں۔

مگر عورتیں 'بوڑھے اور بچے ملاحوں کو کرایہ دے کر کشتیوں سے دریا عبور کرتے ہیں اور ایہ وہ شادی بیاہ 'میلوں ٹھیلوں اور کسی خاص تقریب کے موقع ہی پر کرتے ہیں۔ مرد بھی کشتیوں۔ سفر کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنا اور اپنے ساز و سامان کا بھاری کرایہ ملاحوں کو ادا کرنے کے متحمل نہ

ہو سکتے۔

کچے کا علاقہ اس کے باسیوں کے لیے اس وقت میدان حشر بن جاتا ہے جب دریا میں سیلاب آتا ہے جسے مقامی بولی میں ڈھا کہا جاتا ہے۔ ڈھا آتا ہے اور دریا کا پانی چڑھتا ہے تو ہر چیز کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ بستیاں پانی میں ڈوب جاتی ہیں۔ کچے مکانات گر جاتے ہیں۔ ہر طرف تباہی پھیل جاتی ہے۔ نشیب میں ہونے کے باعث بیٹ بھی ڈھا سے محفوظ نہیں رہتا۔ وہ بھی تباہی اور بربادی کا شکار ہوتا ہے۔ ڈھا بالکل اچانک آتا ہے اور اگر رات کے اندھیرے میں آتا ہے تو لوگوں کے لیے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ جس کا جدھر منہ اٹھتا ہے ادھر بھاگتا ہے۔ جسے بھاگنے کا موقع نہیں ملتا وہ جان بچانے کے لیے درختوں پر چڑھ جاتا ہے۔ ڈھا کی تباہی اور بربادی کے باوجود کچے کے رہنے والے اسے چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاتے۔ وہ ہر تباہی و بربادی کے بعد از سر نو اپنی آباد کاری کرتے ہیں۔ منہدم مکانوں کی تعمیر کرتے ہیں اور زندگی کا سفر نئے عزم سے شروع کرتے ہیں۔

ڈھا اگر زحمت ہے تو باعث رحمت بھی ہے۔ سیلاب کا زور جب ٹوٹتا ہے اور پانی اترتا ہے تو ڈھا اپنے ساتھ جو مٹی لاتا ہے اس سے کچے کی زمین خوب زرخیز ہو جاتی ہے 'جس پر گندم' چنے' جوار' باجرے' کماد' تارہ میرا اور گوار کے ساتھ ساتھ سبزیاں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔ یہاں خربوزے اور تربوز بھی پیدا ہوتے ہیں جو نہایت خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ دریا کی رفتار جن دنوں سست پڑ جاتی ہے اور اس میں ٹھہراؤ آجاتا ہے تو دوسرے خودرو پودوں کی طرح پیڑا بھی اگتا ہے۔ اسے کوندر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے ریشوں سے بان تیار کیے جاتے ہیں اور پتلی پتلی شاخوں سے جو جھاؤ کہلاتی ہے 'جھاڑو اور ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ جھاڑو اور ٹوکریاں تیار کرنا کچے کی گھریلو صنعت میں شامل ہے 'جن کی بازار میں ہمیشہ مانگ رہتی ہے۔

کچے کے جزیروں کا علاقہ بھی بیٹ کے ساتھ شاہانیوں' ڈھانڈلوں اور توانیوں کی جاگیر میں بٹا ہوا ہے۔

☆

جیپ بھل سے پہلے ہی کچے راستے پر مڑ گئی اور ہچکولے کھاتی ہوئی موضع ہموں والی کی جانب بڑھنے لگی۔ ہموں والی ہی میں مراد خاں کی جاگیر تھی جو کم و بیش تین ہزار مربع ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔ جیپ گاؤں میں داخل ہوئی تو ہر طرف مراد خاں کی آمد کا غلغلہ مچ گیا۔ ڈرائیور نے جیپ اس کی قیام گاہ کے سامنے روکی۔ یہ قدیم وضع کی حویلی تھی۔ اس کی بوسیدہ چار دیواری جگہ جگہ سے

ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

سردار شاہانی کا کاردار رحیم بخش رادھانی پہلے ہی سے موجود تھا۔ مراد خاں شاہانی اور ر[illegible] جیپ سے اتر کر اندر چلے گئے۔ حویلی بہت بڑی تھی۔ اس کا احاطہ کشادہ اور وسیع تھا۔ کہیں گھنے اور سایہ دار درخت تھے۔ احاطے کے ایک حصے میں مہمانوں کے قیام کے لیے ڈیرا تھا۔ حویلی کی عمارت سے الگ تھلگ کچھ فاصلے پر تھا۔ ڈیرے کے ایک کمرے میں رحیم داد کے ٹھ[illegible] کا بندوبست کیا گیا۔

شام کو سردار مراد خاں شاہانی نے کچہری لگائی۔ وہ ایک کرسی پر گردن اونچی کیے نہایت آن[illegible] اور دبدبے سے بیٹھا تھا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ کمرے کے دالان میں دور تک گاؤں کے مزارعے اور کمی جمع تھے۔ وہ باری باری سردار کے روبرو حاضر ہو[کر] دروازے سے داخل ہوتے ہی اونچی آواز سے کہتے۔

"سیں سردار! سلام ولادن، خوش ہو، راضی ہو، بالیں بچیں، جان، مال، ڈھگی خیر اے۔ ئ[illegible] سب خیر اے۔"

سردار مراد خاں شاہانی ہولے ہولے نخوت سے گردن ہلا کر جواب دیتا۔ "شکر اے، اے۔"

آنے والے نظریں نیچی کیے سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے۔ قریب پہنچ کر مراد خاں شاہانی کے [گھٹنے] چھوتے اور ہاتھ جوڑ کر بلند آواز سے دعائیں دیتے۔

"سیں سدا جیوے۔ سکھی صحت ہووے۔ حیاتی والا ہوویں۔"

دو گھنٹے بعد کچہری برخاست ہو گئی۔ باہر بیٹھے ہوئے جن لوگوں کو سردار کے روبرو حاضر ہو[نے کا] موقع نہیں ملا تھا، وہ دوسرے روز آنے کا ارمان دلوں میں لیے واپس چلے گئے۔ ان میں مرد بھی[تھے،] عورتیں بھی تھیں۔ بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی۔

سردار مراد خاں نے دوسرے روز صبح کچہری لگائی۔ شام کو بھی کچہری لگائی۔ ہر روز ایسا ہی ہ[وتا۔] مزارعے اور جاگیر میں بسنے والے دوسرے لوگ سردار کے سامنے حاضری دیتے، اپنے تنازعات، مسائل، مقدمات کی صورت میں اس کے سامنے پیش کرتے۔ سردار شاہانی منصف کی صورت [ہر] ایک کا مقدمہ سنتا۔ ان پر غور کرتا۔ ضروری سمجھتا تو اپنے کاردار رادھانی سے بھی مشورہ کر لیتا۔ رادھانی اس کے قریب ہی ذرا پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھا تھا۔ سردار شاہانی کسی مقدمے کو آ[ئندہ] پیشی کے لیے ملتوی کر دیتا۔ کسی کا فوری فیصلہ سناتا۔ اس کا ہر فیصلہ قطعی اور آخری ہوتا۔ اس[کے]

کوئی بھی فیصلہ عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

چار روز تک صبح شام، دونوں وقت یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کسی بھی روز کچہری دو گھنٹے سے پہلے ختم نہ ہوتی۔ کبھی کبھی صبح سے دوپہر ہو جاتی۔ مگر سردار مراد خاں شام کی کچہری زیادہ طویل نہ ہونے دیتا۔ اندھیرا بڑھتے ہی اس کے معمولات کا وقت شروع ہو جاتا، بدن ٹوٹنے لگتا اور ذہن بوجھل ہو جاتا۔ یہ گویا بادہ نوشی کا تقاضا ہوتا اور اس میں تاخیر رفتہ رفتہ اذیت ناک بنتی جاتی۔ اس کی قوت فیصلہ جواب دینے لگتی۔ وہ اکتا کر اچانک کھڑا ہو جاتا۔ رادھانی اس کا مزاج شناس تھا۔ وہ اٹھنے سے پہلے ہی سردار شاہانی کی کیفیت بھانپ جاتا اور کچہری برخاست ہونے کا اعلان کر دیتا۔

کچہری کا سلسلہ ختم ہوا تو مراد خاں بستی چانڈیہ کے ایک بڑے زمیں دار اور بارڈر ملٹری پولیس کے ایک کمانڈر کے ہم راہ شکار کھیلنے چلا گیا۔ اس کے ساتھ شکاری کتے تھے اور شکار کا ہانکا کرنے والے ملازم اور مزارعے بھی تھے۔ ان کے پاس لمبی لمبی لاٹھیاں، ڈھول اور ٹین کے پیپے تھے۔ کریم بخش رادھانی بھی سردار شاہانی کے ساتھ چلا گیا۔ مگر رحیم داد نہ جا سکا۔ اسے پچھلی رات سے ہلکا ہلکا بخار تھا۔ سر میں درد بھی تھا۔ گاؤں کے حکیم نے اسے دوا دی تھی اور آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ویسے بھی جب سردار مراد خاں شاہانی شکاریوں کے ہم راہ روانہ ہو رہا تھا تو رحیم داد اس قدر نڈھال اور مضمحل تھا کہ اس میں شکار پر جانے کی نہ سکت تھی اور نہ کوئی خواہش۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا رہا۔ سردار شاہانی شکار پر جانے سے پہلے دیر تک اس کے پاس بیٹھا تسلی اور دل جوئی کی باتیں کرتا رہا۔

مراد خاں دن چڑھے شکار کے لیے روانہ ہوا اور رحیم داد سے دوسرے روز صبح واپس آنے کا وعدہ کر گیا۔ رحیم داد نے اس روز کھانے کے بجائے صرف گرم دودھ پر گزارہ کیا۔ شام کو بھی وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ مگر اس کی طبیعت میں افاقہ تھا۔ بخار اتر چکا تھا۔ صرف کمزوری باقی تھی۔

وہ بستر پر خاموش لیٹا تھا۔ رات کہر آلود اور سرد تھی۔ گاؤں دھند میں لپٹا خاموش نظر آ رہا تھا۔ سکوت لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دور سے رک رک کر کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد ابھی سویا نہیں تھا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی غنودگی تھی۔ اسی عالم میں اس نے کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ سنی۔ آہٹ قریب آتی گئی، پھر دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔

رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رحیم داد نے حیرت سے دیکھا کہ

کرامت کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے دروازہ بند کیا اور رحیم داد کے روبرو نظریں جھ
ادب سے کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "کرے! تو کیسے آیا؟"

"تیکوں پتہ ہی ہے سیں میں کیوں آیا ہوں۔" اس نے رسان سے کہا۔

رحیم داد خاموش رہا۔ اس نے ہولے سے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔ کرامت نے چہر
پریشانی کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے اظہار ہمدردی کے طور پر پوچھا۔ "سیں! تیری طبیعت تو
ہے؟ خیر و عافیت اے؟"

"سر میں درد ہے۔ بخار بھی تھا۔ پر اب نہیں لگتا۔ حکیم نے دوائی دی ہے۔" رحیم داد نے
ٹھہر کر بتایا۔

کرامت آگے بڑھا اور سرہانے بیٹھ کر آہستہ آہستہ رحیم داد کا سر دبانے لگا۔ رحیم داد چپ
رہا۔ سر دباتے دباتے کرامت نے دبی زبان سے پوچھا۔ "سیں! تو نے مالھان کے بارے میں
سوچا؟"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "تو آیا کب؟"

"میں تو جی کل ہی آ گیا تھا۔ پر مجھے مالھان لے کر ضرور جانا ہے۔ دے دے تو سویرے سویر
بھکر چلا جاؤں گا۔"

"سردار کو پتہ ہے' تو یہاں ہے؟"

"نہیں سیں! اسے بالکل پتہ نہیں۔ اسے میرے آنے کا پتہ بھی نہ لگے۔ میں چاہتا ہوں ا
واپسی سے پہلے ہی یہاں سے چلا جاؤں۔ تو نے دیکھ ہی لیا' اس روز تیرے کمرے میں مجھے دیکھ ک
کتنا ناراض ہوا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تو سیں وہ بہت ظلم کرے گا۔ اس کا سر بہت خطرناک ہے۔"

رحیم داد چند لمحے ٹکٹکی باندھے سامنے کی دیوار تکتا رہا۔ دیوار پر کرامت کا سایہ لیمپ کی رو
میں دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ رحیم داد نے لمبی سانس بھری۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف
مسکراہٹ ابھری۔

"کرے! سچ سچ بتا' وہ تیری بھین تو نہیں ہے؟"

"توبہ کرو جی۔" وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "سیں! تو نے تو حد کر دی۔ وہ میری بھین کیسے ہو س
ہے؟ میں تو حویلی کا بہت معمولی نوکر ہوں۔"

"سردار کی رکھیل ہے؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"سیں! تو کیسی گالہ کر رہا ہے؟" کرامت کے لہجے میں ناگواری کا پہلو نمایاں تھا۔ "تیکوں ایسا
نہیں سوچنا چاہیے۔"

"فیر کون ہے وہ؟" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو بتاتا کیوں نہیں۔ صاف صاف بات
کر۔"

"سیں! میں صاف صاف بات نہیں کر سکتا۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"نہیں بتاتا تو نہ بتا۔" رحیم داد جھنجلا کر بولا۔ "میں تجھے مالھان نہیں دوں گا۔ ہرگز نہیں دوں
گا۔" اس نے نظریں اٹھا کر کرامت کے چہرے کی جانب دیکھا اور سیدھی سیدھی دھمکی دی۔

"تو نہیں بتائے گا تو مالھان سردار کو دے دوں گا۔"

"سیں! ایسا نہ کرنا۔" کرامت کا پورا جسم لرز اٹھا۔ رحیم داد نے بھی اس کی شدید پریشانی
محسوس کی۔ کرامت نے رحیم داد کا سر دبانا بند کر دیا۔ چند لمحے بت بنا بیٹھا رہا۔ پھر اس کی مدھم آواز
ابھری۔ "سیں! کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔" اس نے مڑ کر دروازے کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے
دیکھا۔ اس کے لہجے میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی۔ "سیں! سچی گالہ یہ ہے کہ وہ ملوک زادی
ہے۔" کرامت بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ "وہ سردار کی بھین ہے سیں۔"

رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ "تیرا مطلب ہے وہ مراد خاں کی بھین ہے۔" وہ گھبرا کر اٹھ
بیٹھا۔ "کرے! تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"ہا سیں! بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ نہایت اعتماد سے بولا۔ "وہ سردار کی سگی وڈی بھین ہے۔
اس کا ناں حمیدہ ہے۔"

رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا' رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "تو نے
میرے پاس اس کے آنے سے پہلے ہی یہ بات کیوں نہیں بتائی؟"

"سیں! اس نے منع کر دیا تھا۔ میں اس کے حکم کے خلاف کیسے بول سکتا تھا۔" وہ صفائی پیش
کرنے لگا۔ "میں مصیبت دا ماریا غریب نوکر ہوں۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "سردار کو بالکل پتہ نہ چلے۔
وہ جی بہت ظالم ہے۔ اسے پتہ چل گیا تو مجھے جان سے مار دے گا۔ تجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔"
اس نے گہری سانس بھری۔

"اسی بھین کے چکر میں پہلے بھی دو خون کر چکا ہے۔"

"کون تھے وہ؟" رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر پوچھا۔

"ایک تو کونداں والی کا وڈا زمیندار ہوتا تھا۔ تیری ہی طرح وہ بھی سردار کا یار تھا۔ حویلی کے

ڈیرے میں کچھ روز کے لیے مہمان کے طور پر ٹھیرا تھا۔ ایسا ڈاڈھا چنگا جوان تھا' تجھے کیا بتاؤں
کرامت رک رک کر بتاتا رہا۔ "دوسرا سردار کا کم دار تھا۔ یہ کریم بخش راداحانی تو پچھلے ہی م…
ہے۔ اس سے پہلے جو کم دار ہوتا تھا' اس کا ناں اکبر خاں نیازی تھا۔ میانوالی کا رہنے والا تھا
روپ رنگ تھا۔ جڑیا جوان تھا۔"

"پولیس شولیس نہیں آئی؟"

"پولیس کیسے آتی سیں!" کرامت نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پولیسے بھی ادھر آتے ڈ…
ہیں۔" اس کے لہجے سے خوف اور گھبراہٹ کا عنصر ختم ہوتا جا رہا تھا۔ "سارے وڈے افسروں
سردار کی یاری ہے۔ اس کی ساتھ بیٹھ کر روز ہی رات کو پیتے پلاتے ہیں۔"

رحیم داد اس کی باتیں سن کر گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ کرامت نے اسے اس طرح گم م…
تو کرید کے پوچھا۔ "سیں تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"حمیدہ کا گھر والا نہیں ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"گھر والا کیسے ہو سکتا ہے اس کا پرنا ہی کب ہوا۔" اس نے چوکنا نظروں سے ایک بار
دروازے کی جانب دیکھا۔ "سردار اس کا پرنا کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

رحیم داد کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا کہ حمیدہ کا اب تک بیاہ نہیں ہوا اور شاہانی اس کا بیاہ کرنا
نہیں چاہتا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے یہ راز معلوم کرنے کی غرض سے دریافت کیا۔ "کر…
یہ تو بتا' سردار نے اب تک حمیدہ کا پرنا یا ویاہ کیوں نہیں کیا؟"

"گالہ یہ ہے سیں۔" کرامت نے بتایا۔ "حمیدہ کا پرنا ہو گیا تو اس کے ساتھ زمیں داری کا …
بھی دینا ہوگا۔ اب تو جی اس کی عمر بھی زیادہ ہو گئی۔ اس سے چھوٹی بہن رشیدہ ہے۔ اس کا بھی
نہیں ہوا۔ اس کی عمر بھی پکی ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بھی سردار سے وڈی ہے۔ سردار سب سے چ…
ہے۔ اس کا کوئی بھائی نہیں۔ صرف دو بھینیں ہیں۔ تب ہی تو وہ نہیں چاہتا کہ زمیں داری
ہو جائے۔ وہ تو زمیں داری بڑھانا چاہتا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند ہویدا ہوا۔ "ادھر کے
سارے ہی جگیردار اور وڈے زمیں دار ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کی بھینیں اور بیٹیاں بنا پرنے…
حویلیوں کے کمروں میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جاتی ہیں اور جی ان کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔"

"نگرانی کی جاتی ہے تو حمیدہ اس طرح رات کو کیسے میرے کمرے میں چلی آئی؟ اسے بلا کر تو تو
لایا تھا نا؟"

"اس کی مرضی جو تھی۔ مجھے اس نے بخشش میں پنج روپے بھی دیے تھے۔" کرامت نے ر…

دار کو مطلع کیا۔ "وہ شام کو تجھے حویلی کے چوک میں ٹہلتے دیکھ چکی تھی۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ ڈیرا
خالی ہے۔ تیرے سوا نہ کوئی مہمان ہے' نہ نوکر۔" اس کا لہجہ مدھم ہو گیا۔ اس پر سنجیدگی غالب
آ گئی۔ "جوانی تو جی بری ہوتی ہے۔ بس وہ چلی آئی۔" اس نے قدرے توقف کیا' پھر مسکرا کر گویا
ہوا۔ "ابھی تو جی وہ جوان ہی ہے۔ سوہنڑی بھی ہے۔ ویسے سیں' ایک گالہ اور بھی ہے۔ اس کا
مغز ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو اتنی چیخیں چلاتی ہے کہ دور دور تک اس کی آواز جاتی
ہے۔"

چند ہی روز پہلے حویلی کے زنان خانے سے نسوانی چیخیں رحیم داد نے بھی سنی تھیں اور سردار
سردار خاں شاہانی انھیں سنتے ہی گھبرایا ہوا اٹھ کر زنان خانے میں چلا گیا تھا۔ ذہن میں اس پس منظر
کے ساتھ رحیم داد نے کہا۔ "ایک رات تو میں نے بھی چیخیں سنی تھیں۔ حمیدہ ہی چیخیں چلاتی ہو گی پر
وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟"

"اس کے تو سیں چیختے چیختے ہاتھ پیر بھی اکڑ جاتے ہیں۔ منہ سے سفید جھاگ نکلتا ہے۔"

"مرگی تو نہیں ہے اسے؟" رحیم داد کے چہرے پر پریشانی کا غبار بکھر گیا۔ اسے معاً حکیم نذر محمد
چشتی یاد آ گیا جسے مرگی کا دورہ پڑنے کے دوران اس نے شہباری دوآب کے پار ویران ٹیلوں کے
درمیان بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔

"مرگی شرگی بالکل نہیں ہے۔" کرامت نے رحیم داد کی غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی۔
"اسے تو جی جن تھیون ہے۔ آسیب بتاتے ہیں۔ جب اس پر جن آتا ہے تو اس کی آنکھیں لال
انگارا ہو جاتی ہیں۔ ایسی لال لال کہ دیکھ کر خوف آتا ہے۔ اس وقت تو سیں اس کی آواز بھی بدل
کر ایک دم بھاری ہو جاتی ہے۔ کسی ذال یا رن کی آواز ہی نہیں رہتی۔ لگتا ہے کوئی مرد بول رہا
ہے۔ ساں آسیب اتارنے کے لیے کتنے ہی پیروں' فقیروں اور اللہ والوں کو بلا چکی ہے۔ اس کا اپنا
خاندانی پیر بھی ہے۔" کرامت دھیمے لہجے میں حمیدہ کے بارے میں بتاتا رہا۔ "کسی نے تعویذ دیا کسی
نے جھاڑ پھونک کی۔ ماں اسے زیارتوں اور خانگاہوں پر بھی لے گئی۔ منت بھی مانی۔ پر سیں! کچھ
نہیں ہوا۔ جن اب تک اس پر آتا ہے۔ تب ہی تو سردار بھی اس سے ڈرتا ہے۔" وہ زیر لب
مسکرایا۔ "ڈرتا تو جی سچ پوچھو وہ اس کے آسیب سے ہے۔ اسے تو کبھی کچھ نہیں کہتا پر اس کے
یاروں کو ضرور کتل کرا دیتا ہے۔ دو تو میرے سامنے ہوئے۔ پہلے بھی ہو چکے ہوں گے۔"

رحیم داد کی سٹی گم ہو گئی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ آہستہ سے پلنگ سے اترا۔ کونے میں رکھے
ہوئے ٹرنک کے پاس گیا۔ اسے کھولا' اندر سے سونے کا کنٹھا نکالا' کرامت کے پاس پہنچا۔ کنٹھا

کرامت کے حوالے کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "لے' یہ حمیدہ کو دے دینا۔" اس نے تیکھی ن
سے کرامت کو دیکھا۔ "کرمے! دیکھ آگے نہ تو میرے پاس کبھی آنا اور نہ حمیدہ کو لانا۔" اس
تلخ ہو گیا۔ "ورنہ سردار مجھے بھی قتل کرا دے گا اور تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔" رحیم دا
چہرے پر خوف کا سایہ منڈلانے لگا۔ "میں نوں اچھی طرح پتہ ہے سردار کتنا ظالم اور خوں
ہے۔"

"سیں! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ایک گالہہ تو تیکوں بتانا بھول ہی گیا۔" کرامت نے ہاتھ
دبا ہوا کنٹھا رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ "یہ مالھان حمیدہ کی نہیں' اس کی بھرجائی کی ہے۔ وہ سرو
ذال ہے۔ تب ہی تو حمیدہ اس مالھان کے لیے اتنی پریشان اور گھبرائی ہوئی ہے۔ اسے لینے
تیرے پاس ضرور آجاتی۔ لگتا ہے اسے موقع نہیں ملا۔ ویسے اس کی بھرجائی کو مالھان کے با
میں ابھی تک کچھ پتہ نہیں۔"

رحیم داد نے جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکالے اور کرامت کو دیتے ہوئے بولا۔ "یہ
لے اور اب تو ٹر جا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے نکل جانا۔ تیرا اس پنڈ میں زیادہ
خطرے سے خالی نہیں۔"

کرامت نے نوٹ لے کر کنٹھے کے ساتھ ہی اپنے تھیلے کے ڈب میں احتیاط سے رکھے اور
داد سے رخصت ہوتے ہوئے گویا ہوا۔ "سیں' تو راضی سکھی ہو۔" وہ آگے بڑھا اور دروازہ
کر کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر بت بنا بیٹھا رہا۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے سنا' کتے زور زور سے بھونک رہے ہ
وہ خوف زدہ ہو گیا۔ جلدی سے دروازے پر پہنچا۔ ایک پٹ کھول کر باہر دیکھا۔ کہرے کی دھند
قدر گاڑھی تھی کہ اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ حویلی کے احاطے کے باہر کتوں کے بھونکنے کی آوا
رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

رحیم داد نے دروازہ بند کیا اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ خود کو تھکا ہوا محسوس کر رہا
ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ کتے اب حویلی سے کہیں دور بھونک رہے
ان کی آوازیں رفتہ رفتہ رات کی خاموشی میں ڈوب کر ختم ہو گئیں مگر رحیم داد دیر تک جاگتا رہا
مراد خاں کی بہن حمیدہ کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆

مراد خاں شاہانی سہ پہر کو شکار سے واپس آ گیا۔ وہ کئی خرگوش اور بہت سی مرغابیاں مار کر

تھا۔ واپسی پر وہ سیدھا رحیم داد کے پاس پہنچا۔ اس کا حال معلوم کیا۔ رحیم داد کی طبیعت اب ٹھیک تھی۔ بخار اتر چکا تھا۔ سر میں درد بھی نہیں تھا۔ سردار شاہانی اس کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ کچھ دیر شکار کے بارے میں باتیں کرتا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

شام کو سردار مراد خاں نے رحیم داد کو اس کمرے میں بلوایا جسے دربار ہال کہا جاتا تھا۔ ہال میں روشنی بھی زیادہ تھی اور فرش پر قالین بچھا تھا۔ مراد خاں اونچی کرسی پر بیٹھا تھا۔ کرسی پر زربفت کا غلاف چڑھا تھا۔ غلاف کا رنگ اڑ کر پھیکا پڑ گیا تھا۔ مگر اس کے سنہری گل بوٹے تیز روشنی میں جھل ملا رہے تھے۔ دو نوکر مستعدی سے کرسی کے پیچھے کھڑے تھے۔

سردار مراد خاں نے اس شام دربار لگایا تھا۔ وہ بارہ کلیوں والا ریشمی پیراہن پہنے ہوئے تھا۔ اس میں سامنے کے رخ پر دوہرے تسمے لگے تھے جنہیں تنیاں کہا جاتا ہے۔ پیراہن کے تین تسمے چاندی کے تھے۔ گریبان اور گلے پر کلابتو لگا تھا۔ تکمہ بھی کلابتو کا تھا۔ سر پر بڑی سی ریشمی پگڑی تھی۔ کمر پر سنہرا پٹکا تھا۔ یہ وہ خلعت تھی جو اس کے باپ سردار نجیب خاں شاہانی کو انگریزوں کی خدمات کے صلے میں لاٹ گورنر کی جانب سے عطا کی گئی تھی۔ نوانی اور ڈھانڈلہ سرداروں کو بھی ان کی وفاداری اور خدمات کے صلے میں ایسی ہی خلعتیں دی گئی تھیں۔ یہ خلعتیں جب علاقے کے خیر خواہ اور جاں نثار بلوچ سرداروں کو پیش کی گئی تھیں تو انگریز ڈپٹی کمشنر نے باقاعدہ دربار لگایا تھا۔ وفادار سرداروں کی اعلیٰ خدمات کو سراہا تھا۔ ان کی کارگزاری کی تعریف اور توصیف کی تھی۔ ہر خلعت کے ساتھ ایک قیمتی پیش قبض بھی دیا گیا تھا۔ اس کا دستہ سونے اور چاندی سے مرصع تھا۔

انگریز افسروں کی تقلید میں بلوچ سردار بھی دربار لگاتے تھے' خاص طور پر ہر فصل کی کٹائی کے بعد جب وہ اپنے مزارعوں سے طرح طرح کے ٹیکس اور نذرانے وصول کرتے۔ انھوں نے اپنی شان دار حویلیوں میں دربار لگانے کے لیے باقاعدہ ہال تعمیر کرائے تھے۔ یہ دربار ہال کہلاتے تھے۔ مراد خاں کا باپ سردار نجیب خاں بھی اسی ہال میں دربار لگاتا تھا۔ اس موقعے پر وہ لاٹ گورنر کی عطا کی ہوئی خلعت پہنتا تھا۔ پٹکے کے ساتھ پیش قبض لگاتا تھا۔ اس کرسی پر بیٹھتا تھا جس پر اس وقت مراد خاں شاہانی نہایت آن بان اور کروفر سے بیٹھا تھا۔ وہ بھی سنہرے پٹکے کے ساتھ مرصع دستے کا پیش قبض لگائے ہوئے تھا۔ اس کی مونچھیں موم لگا کر حویلی کے نائی نے بڑی مہارت سے چڑھائی تھیں' نوکیلی اور سخت بنائی تھیں۔

سردار مراد خاں شاہانی کے کندھوں پر کشمیری شال پڑی تھی۔ وہ بہت وجیہہ اور باوقار نظر آ رہا تھا۔ چہرے سے رعب اور دبدبہ ٹپک رہا تھا۔

دربار ہال کے باہر گاؤں کے مزارعے ٹھنڈے فرش پر جگہ جگہ ٹولیوں میں بٹے ہوئے بیٹھے تھے وہ سرگوشیوں میں آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ ان میں اکثریت بوڑھوں کی تھی۔ وہ خریف کی فصل کی کٹائی کے بعد اپنے بیٹوں' بیٹیوں' بھائیوں اور بہنوں کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ مگر شادی سے پہلے سردار کی اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شادی بیاہ نہیں ہو سکتا تھا۔ شادی کی اجازت کے لیے انھیں سردار کو نذرانہ پیش کرنا پڑتا جسے ڈالی کہا جاتا ہے۔ یہ پرنا ٹیکس تھا۔ اس ٹیکس کی شرح فی مربع ایکڑ زیر کاشت رقبے پر تیس روپے مقرر تھی۔ دوسرے ٹیکسوں کے برعکس پرنا ٹیکس کی وصولی غلے کے بجائے نقدی کی صورت میں کی جاتی ہے۔ البتہ کاردار فصل کی کیفیت کے مطابق ٹیکس یا ڈالی کی مقررہ رقم میں کمی بیشی کی سفارش کر سکتا ہے۔ ایسی سفارش سردار عام طور پر منظور کرلیتا ہے۔ علاقے کا ہر جاگیردار اور بڑا زمیں دار پرنا ٹیکس وصول کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔

کریم بخش رادھانی ایک کرسی پر سردار مراد خاں شاہانی کے بائیں طرف بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے چھوٹی سی میز تھی۔ میز پر رجسٹر رکھا تھا۔ پہلے ایک بوڑھا ہال میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ بیوی بھی تھی۔ دونوں کے درمیان ان کی نوجوان بیٹی تھی۔ وہ دوپٹے سے اپنا چہرہ ناک تک چھپائے ہوئے تھی۔ تینوں سہمے ہوئے آگے بڑھے۔ انھوں نے پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر سردار کو سلام کیا۔ بیٹی چند قدم آگے بڑھنے کے بعد سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ بوڑھا باپ بھی اس کے ساتھ ہی رک گیا۔ البتہ ماں آگے بڑھتی گئی۔ اس نے سردار مراد خاں شاہانی کی درازی عمر اور ترقی درجات کے لیے گڑگڑا کر روایتی دعائیہ جملے کہے' جھک کر اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور الٹے قدموں واپس بیٹی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے واپس آنے کے بعد لڑکی کا باپ آگے بڑھا۔ اس نے بھی سردار کے قدم چھوئے۔ بیوی کی طرح اونچی آواز سے دعائیں دیں۔

"سیں سدا جیوے۔ سکھی صحت ہووے۔ رب راضی ہووے!"

بوڑھے نے جیب سے نوٹ نکالے اور دونوں ہاتھوں پر رکھ کر سردار مراد خاں شاہانی کو ڈالی پیش کی۔ سردار نے نوٹوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر ہٹا لیا۔ بوڑھے نے ٹیکس کی رقم کریم بخش رادھانی کو دے دی۔ اس نے رقم لے کر رجسٹر میں اندراج کرلیا۔ بوڑھا ہاتھ باندھ کر بیوی اور بیٹی کے ساتھ سردار کے روبرو نظریں جھکائے کھڑا رہا۔

سردار مراد خاں شاہانی نے مسکرا کر کہا۔ "راضی باضی ہو۔ دھی کا پرنجن کر۔ بختاور ہووے۔"

یہ سردار کی جانب سے شادی کی اجازت تھی۔

بوڑھے نے خوش ہو کر دونوں ہاتھ اٹھائے اور بلند آواز سے بولا۔ "رب راکھا' اللہ بیلی۔" وہ پیچھے ہٹا اور بیوی اور بیٹی کے ساتھ ہال سے چلا گیا۔

دوسرا آیا۔ وہ ادھیڑ تھا۔ بیٹے کے بیاہ کا طلب گار تھا۔ وہ بھی بیوی اور نوجوان بیٹے کو حسب دستور ساتھ لایا تھا۔ اس نے پرنا ٹیکس ادا کیا۔ اجازت حاصل کی اور سردار کی جان و مال کو دعائیں دیتا رخصت ہو گیا۔

اسی طرح دوسرے بھی بیٹی یا بیٹے کو اور اگر بیوی حیات ہوتی تو اسے بھی ساتھ لاتے۔ سردار شاہانی کی اجازت حاصل کرتے اور خوش و خرم دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوتے۔ چار ایسی عورتیں بھی بیٹی یا بیٹے کے ہم راہ سردار کے روبرو حاضر ہوئیں جن کے شوہر انتقال کر گئے تھے یا بیمار اور معذور تھے یا طلاق دے کر چھوڑ چکے تھے۔ ایسے نوجوان بھی آئے جن کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہی اپنے کنبے کے کفیل تھے۔ وہ بہن یا بھائی کے بیاہ کی اجازت لینے سردار کے دربار میں حاضر ہوئے۔ پرنا ٹیکس نذرانے کی صورت میں پیش کیا اور مسکراتے چہروں کے ساتھ دعائیں دیتے واپس گئے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا سردار مراد خاں کا طنطنہ اور جاگیردارانہ جاہ و جلال دیکھتا رہا۔ اس نے اس نوجوان کو بھی دربار میں حاضر ہوتے دیکھا جس کا لباس بہت میلا کچیلا اور بوسیدہ تھا۔ دبلا پتلا مریل بدن' ڈاڑھی بڑھی ہوئی' چہرے پر ویرانی برس رہی تھی۔ اس کے ساتھ نوجوان لڑکی تھی۔ وہ ملگجے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھی۔

دونوں ڈرے سہمے لرزتے قدموں سے آگے بڑھے۔ لڑکی چند قدم چل کر دستور کے مطابق رک گئی۔ نوجوان آگے بڑھا' سردار کے قریب پہنچا۔ اس کے قدموں کو ہاتھ لگا کر پیروں پڑ گیا۔ سر سے پگڑی اتاری اور سردار کے قدموں پر ڈال دی۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور ہاتھ باندھ کر سردار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے دوسروں کی طرح سردار کو ڈالی کی رقم پیش نہیں کی تھی۔

سردار مراد خاں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا' رعب دار لہجے میں ڈپٹ کر بولا۔ "کیا چاہتا ہے؟"

وہ عاجزی سے گویا ہوا۔ "سیں سردار! میں تیرا راجی رعیت ہوں۔ شامت دا مارا ہوں۔ میرے کھیت کھارے دریا کنارے ہیں۔ پچھلی برکھا میں دریا چڑھا۔ ایک رات اچانک زبردست ڈھا آیا۔ میری ساری رڑھ فصل' چھپل میں بہہ گئی۔ پانی کا ریلا گھر بار' جمع جتھا' سب کچھ بہا لے گیا۔ میرے

پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ رات کے اندھارے میں ڈھا کا پانی تیزی سے داخل ہوا' سب جان بچا کے لیے جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگے۔ جن کو بھاگنے کا رستہ نہ ملا وہ درختوں پر چڑھ گئے۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میری بھین ہے۔ یہ میرے ساتھ کسی نہ طر نکل آئی۔ اماں اندھی تھی' وہ نہیں آسکی۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "بعد اس کی لاش دو میل آگے دریا کنارے ملی۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "سیں! میں مصیبت دا ماریا بالکل ہو گیا۔"

سردار مراد خاں نے مڑ کر رادھانی کی جانب دیکھا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے یہ؟"

"سیں! ابھی بتاتا ہوں۔" رادھانی نے سردار سے مہلت مانگی اور نوجوان کی جانب متوجہ ہوا "تیرا ناں کیہ ہے؟"

وہ لکنت سے بولا۔ "سیں! میرا ناں فرید خاں شاہانی ہے۔"

"یوں کہہ تو فریدا ہے۔" کریم بخش رادھانی نے درشت لہجے میں اس کے نام کی تصحیح کی۔ فر نے جھٹ اپنی غلطی تسلیم کرلی' عاجزی سے بولا۔ "ہا سیں! میں فریدا ہی ہوں۔ میں تو تیرے پا پہلے بھی آتا رہا ہوں۔"

رادھانی نے فریدا کی بات نظرانداز کرتے ہوئے سردار مراد خاں شاہانی کو مخاطب کیا۔ "سیے سردار! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کی فصل اور گھر بار سیلاب میں برباد ہو گئے۔"

مراد خاں نے سرسری نظر سے فریدا کو دیکھا' بے زاری سے پوچھا۔ "جب تجھے ڈالی نہیں دیا یہاں آیا کیوں ہے؟"

"سیں سردار! میرے کولہ ڈالی دینے کے لیے کچھ نہیں۔ میں سوالی ہوں' اللہ راسی ہوں' فیاضی اے۔" فریدا ہاتھ جوڑ کر فریادی ہوا۔ "سیں میں ابھی ڈالی نہیں دے سکتا۔ ربیع کی واو پر ڈالی کی رقم ادا کروں گا۔"

"اس کے پرنے کی تیکوں اتنی جلدی کیوں ہے؟" سردار نے لڑکی کی طرف ہاتھ سے اشار کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ "پہلے ربیع کی بوائی کر۔ فصل کی واڈی کے بعد ڈالی دینا' تب ہی ا کا پرنا کرنا۔"

"سیں! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تیرا کہا سر آنکھوں تے' سرہا تھے تے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ " میں ربیع کی بوائی کیسے کروں گا۔ میرے تو ڈنگر مویشی بھی چھل کا تیز پانی اپنے ساتھ لے گیا۔" ا نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ "سیں اس کا پرنا کردوں گا تو اس کا گھوٹ خاوند بوائی کر سکتا ہے۔

اس کے کولہ ایک جوڑی ہل بھی ہے۔ وہ میرا شریکا ہے اور یہ اس کی منگ ہے۔" اس نے نگاہیں نیچی کرلیں۔ "میں نے اس کا سنگراں کردیا پر ڈالی نہ دے سکا۔ سیں! میکوں معافی دے دے۔"

سردار مراد خاں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

فریدا قدرے تامل کے بعد عاجزی سے گویا ہوا۔ "سیں اس کا پرنا ہو جائے تو میں لائل پور چلا جاؤں گا۔ وہاں کسی کارخانے میں لگ جاؤں گا۔ میرا ایک سکا لیر وہاں مزدوری کرتا ہے۔ اس نے مجھے لائل پور آنے کو کہا ہے۔"

"فریدے! تو اتنی غریبی میں اس کا پرنا کیسے کرے گا؟ اس کے لیے کچھ نہ کچھ رقم تو چاہیے ہوگی۔" مراد خاں شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔

"خرچ ہی کیا کرنا ہے سیں۔ میں نے تو جی قرض ادا کرنا ہے۔" فریدا نے وضاحت کی۔ "دو سو روپے وستی کے سناریے نے ادھار دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اتنی رکم سے کام چل جائے گا۔" وہ ہاتھ جوڑ کر ایک بار پھر گڑگڑانے لگا۔ "سیں سردار! معافی دے دے۔ میں بہت غریب مسکین ہوں۔" اس نے مڑ کر لڑکی کی جانب دیکھا۔ "اس کا پرنا ہو گیا تو ربیع کی بوائی بھی ہو جائے گی۔ میں بھی محنت مزدوری سے کچھ کمائی کرلوں گا۔ یہ ابھی کنواری ہے' بکر ہے۔ میں اسے گھر پر اکیلا چھوڑ کر کیسے لائل پور جا سکتا ہوں۔ اب تو اماں بھی نہیں رہی۔ میری کھیتی باڑی سب تباہ ہو جائے گی۔" اس نے تڑپ کر دھائی دی۔ "میکوں بچالے سیں! تو سدا جیوے' رب راضی ہووے۔" وہ فریاد کرتا رہا۔

سردار مراد خاں شاہانی خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس کا کاردار کریم بخش رادھانی بھی خاموش تھا۔ مراد خاں نے نگاہیں اٹھا کر لڑکی کی سمت دیکھا۔ وہ دوپٹے کے آنچل سے اپنا چہرہ چھپائے بت بنی کھڑی تھی۔ مراد خاں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر پشت پر کھڑے ہوئے ملازم کو مخاطب کیا۔

"جوڑے!" اس نے لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ "اس کے منہ پر سے ما نچھل بکل تو ہٹا۔"

اللہ بخش جوڑا حکم ملتے ہی لڑکی کے قریب پہنچا۔ لڑکی بے چین ہو کر کسمائی۔ جوڑا نے اس کی بے چینی اور گھبراہٹ پر مطلق توجہ نہیں دی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور آنچل ہٹادیا مگر لڑکی کا سر اور سینہ ہنوز دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ لڑکی نے اسے اور ڈھانپ لیا۔

سردار کو لڑکی کی یہ ادا ناگوار گزری۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے جوڑا کو ڈانٹا۔ "جوڑے! بوچھن بالکل ہٹادے۔"

اللہ بخش جوڑا نے حکم کی تعمیل میں مستعدی دکھائی۔ پلو پکڑ کر اس قدر زور سے جھٹکا دیا کہ وہ لڑکی کے سر سے اتر گیا۔ اس نے دوپٹہ ایک طرف پھینک دیا۔ لڑکی شرم سے سمٹ کر دوہری ہوگئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ چھپالیا۔ گردن اور زیادہ جھکالی۔ اس کی عمر سولہ برس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ چہرہ بیضوی تھا۔ ناک ستواں' ہونٹ گلابی اور بھرے بھرے تھے۔ دہانا کسی قدر چوڑا' بدن چھریرا اور سڈول تھا۔ میلے کچیلے بوسیدہ لباس کے باوجود دربار ہال کی تیز روشنی میں اس کا نوخیز سراپا دمک رہا تھا۔ وہ خاصی کشش انگیز نظر آرہی تھی۔ اس کا بھائی فریدا سہما ہوا چپ چاپ کھڑا تھا۔

مراد خاں کو لڑکی کا شرمانا لجانا نہایت شاق گزرا۔ اس نے غصے سے ڈپٹ کر کہا۔ "اکھ اوپر اٹھا۔" مگر لڑکی نے نظریں اونچی نہ کیں۔ گردن جھکائے دم بخود کھڑی رہی۔ سردار مراد خاں شاہانی کے چہرے پر جھنجلاہٹ طاری ہوگئی۔ وہ زور سے دھاڑا۔ "سراونچا کر۔ ٹھیک سے کھڑی ہو۔" اس دفعہ لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے گردن اٹھائی۔ مراد خاں کی جانب بے بسی سے دیکھا اور نظریں جھکالیں۔

مراد خاں نے دیکھا' لڑکی کی آنکھیں بھی خوبصورت اور دل کش ہیں۔ وہ زیر لب مسکرایا۔ چہرے پر چھائی ہوئی خشونت اور برہمی زائل ہوگئی۔ "رنگ روپ سے تو یہ انگوری لگتی ہے۔" اس نے فریدا کی جانب رخ کیا۔ "فریدے! اس کا ناں کیہ ہے؟"

"سیں! اس کا ناں حمیدہ ہے۔" فریدا نے سردار کو بتایا۔

رحیم داد نے چونک کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ سردار مراد خاں شاہانی کی نہیں' فرید خاں شاہانی کی بہن تھی جو فرید خاں شاہانی نہیں صرف فریدا رہ گیا تھا۔ مراد خاں کا چہرہ بھی متغیر ہوگیا۔ مگر فریدا نے بھی شاید اپنی غلطی محسوس کی۔ وہ ہکلانے لگا۔

"سس سس سیں! یہ میدہ ہے' میدہ۔ اسے سب میدہ ہی کہتے ہیں۔"

سردار مراد خاں کے چہرے پر چھایا ہوا غبار چھٹ گیا۔ وہ زیر لب مسکراتا رہا۔ اس نے اللہ بخش جوڑا کو مخاطب کیا۔ "جوڑے! میدہ کو اس کا بوچھن دے دے۔"

جوڑا نے فرش پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھایا اور لڑکی کے سر پر ڈال دیا لیکن دوپٹہ پھسل کر نیچے گر گیا۔ میدہ خاموش کھڑی رہی۔ اس نے دوپٹے کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی حیا پر رفتہ رفتہ جھنجلاہٹ حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ ہال میں گہری خاموشی تھی۔ چند لمحے بعد سردار مراد خاں کی گرج دار آواز خاموشی میں ابھری۔

"جوڑے! میدہ کو اندر پہنچا دے۔"

رحیم داد نے دیکھا' فریدا کی بہن میدہ لمحے بھر تک ہونٹ بھینچے خاموش کھڑی رہی۔ پھر اس نے جھک کر اپنا دوپٹہ اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جھل ملانے لگے۔ پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے ابھرے اور ٹپ ٹپ رخساروں پر ٹپکنے لگے۔ اس نے میلے کچیلے دوپٹے کے آنچل سے بلکل مار کر ایک بار پھر اپنا چہرہ چھپا لیا۔ جوڑا نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے اس دروازے کی سمت بڑھی جو مراد خاں شاہانی کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹکی' مڑ کر فریدا کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں مگر فریدا نے نظریں موڑ کر سرنیچا کرلیا۔

میدہ آگے بڑھی اور سردار مراد خاں کی خواب گاہ میں داخل ہوگئی۔ مراد خاں نے پلٹ کر کریم بخش رادھانی کی جانب دیکھا۔ نرم لہجے میں گویا ہوا۔ "فریدا نے منگتاں کرن سے پہلے ڈالی نہ دینے کی معافی چاہی تھی' اسے معافی دے دی گئی۔ پر میدہ اب ادھر ہی رہے گی۔ یہ فیصلہ بعد میں ہوگا کہ میدہ کو کب فریدا کے حوالے کیا جائے۔"

"جیسی سیں کی مرضی۔" رادھانی نے مستعدی سے جواب دیا اور جھک کر رجسٹر میں سردار کے حکم کا اندراج کرلیا۔

سردار مراد خاں نے فریدا کو مخاطب کیا۔ "فریدے!" وہ کھل کر مسکرایا۔ "اب تو راضی باضی ہے۔ اپنے حالات ٹھیک کرلے۔ فیر جب چاہے میدہ کا پرنا کرنا' مکلاوا کرنا' اسے اپنے گھر سے بدا کر کے سسرال ساہورے بھیجنا۔ ڈالی کی رکم فصل کی واڈھی پر ادا کردینا۔" سردار نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"فریدے! جا عیش کر' ماجاں اڑا۔ میری طرف سے تجھے میدہ کے پرنے کی اجازت ہے۔"

فرید خاں شاہانی عرف فریدا چند لمحے بت بنا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ پھر اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ آگے بڑھا۔ سردار کے قدموں پر پڑی ہوئی اپنی پگڑی اٹھائی۔ چار پانچ پیچ دے کر اسے سر پر باندھا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیں۔ "سیں سردار! تو سدا جیوے' سکھی صحت ہووے' رب راضی ہووے۔"

اس نے نظریں گھما کر اس دروازے کی جانب دیکھا جس میں اس کی بہن اللہ بخش جوڑا کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند ہوچکا تھا اور جوڑا واپس آکر سردار مراد خاں شاہانی کی پشت پر مستعدی سے کھڑا ہوگیا تھا۔

فریدا ذرا دیر ٹھہر کر الٹے قدموں پیچھے ہٹا' مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دربار ہال کے صدر

دروازے پر پہنچا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پشت پر پڑا ہوا پگڑی کا شملہ ایک ہاتھ بڑ
پکڑا' چہرے پر لے گیا اور اس سے رک رک کر آنکھوں کو ملنے لگا۔ رحیم داد نے محسوس کیا کہ وہ
رہا ہے۔

سردار مراد خاں شاہانی اونچی کرسی پر لباس فاخرہ زیب تن کئے نہایت آن بان سے بیٹھا تھا۔ ا
کا چہرہ جاہ و جلال سے دمک رہا تھا۔ فریدا کا چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بڑ
دروازہ عبور کیا اور باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

ہموں والی میں رحیم داد کے قیام کا نواں روز تھا کہ سویرے سویرے نادر خاں پہنچا۔ رحیم داد کمرے میں ناشتا کر رہا تھا۔ نادر خاں کو اچانک اپنے روبرو پا کر وہ گھبرا گیا۔ اس نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "نادر! تو یہاں کیسے پہنچ گیا۔ کوئی پریشانی کی گل بات تو نہیں؟" اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔

"نہیں جی! گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔" نادر خاں نے مسکرا کر رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "میں تو یہ بتانے آیا تھا کہ کلیم کا معاملہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ میں نے محکمہ آبادکاری کے دفتر جا کر اپنے سامنے وہ درخواست ہی پھڑوا دی جو تیرے خلاف لگائی گئی تھی اور جس پر تیرے کلیم کے بارے میں انکوائری کرنے کے احکامات جاری ہوئے تھے۔ میں نے درخواست کے ساتھ متعلقہ کاغذات بھی ضائع کروا دیے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

وہ اپنی کارگزاری پر مسرور نظر آ رہا تھا۔

"یہ تو نے بہت زوردار کام کیا۔" رحیم داد نے بھی مسرت کا اظہار کیا۔ "اس پر خرچ کتنا آیا؟"

"صرف چار سو روپے۔" نادر خاں نے فخر سے گردن اونچی کی۔ "وکیل اسی کام کے دو ہزار مانگتا تھا۔ چوہدری' یہ وکیل تو ایسے ہی چکر چلا کر جیب کاٹتے ہیں۔ میرا تو ان سے بہت معاملہ رہا ہے۔"

نادر خاں ابھی تک رحیم داد کے سامنے کھڑا تھا اور نہایت مستعدی سے اپنی کارگزاری سنا رہا تھا۔ رحیم داد اس کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا۔ ہنس کر بولا۔ "کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ آرام سے بات کر۔"

نادر خاں کرسی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ "محکمہ آبادکاری میں جانے سے کئی عجیب باتوں کا
چلا۔" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "ایک تو بالکل تعجب انگیزیات کا
چلا۔"

"کون سی ایسی عجیب گل تھی جس پر تجھے اتنا تعجب ہوا؟"

"تیں نوں پتہ ہے۔ تیرے خلاف کس نے درخواست لگوائی تھی؟" نادر خاں نے جواب د
کے بجائے سوال کیا۔

"وکیل بتاتا تھا گورداس پور ہی کا کوئی مہاجر ہے جس نے میرا کلیم ختم کرا کے اپنے نام کو
ہرکشن کی اراضی اور حویلی الاٹ کرانے کے لالچ میں درخواست لگائی تھی۔" رحیم داد نے
خاں کو مطلع کیا۔ "یاد پڑتا ہے وکیل نے اس کا نام محمد بشیر بتایا تھا۔"

"اس کا تو جی صرف نام ہی نام تھا۔" نادر خاں نے ہنس کر کہا۔ "چوہدری! تجھے یہ سن کر
اچنبھا ہوگا کہ تیرے خلاف احسان شاہ نے درخواست لگوائی تھی۔"

"تیرا مطلب ہے اپنے شاہ جی نے؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔ "نادر
کیسے ہو سکتا ہے؟ شاہ جی ایسا نہیں کر سکتا۔" اس نے نادر خاں کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "تیں نو
یقین ہے؟"

"پہلے تو جی مجھے بھی یقین نہیں آیا۔" نادر نے اسے باور کرایا۔ "پر میں نے درخواست خو
آنکھوں سے دیکھی ہے۔ اس پر محمد شفیع گیلانی کا پتہ لکھا تھا۔ دستخط البتہ محمد بشیر کے تھے۔ تیر
پتہ ہے محمد شفیع گیلانی کون ہے؟"

"میں نے تو اس کا نام پہلی بار سنا ہے۔" رحیم داد نے استفسار کیا۔ "کون ہے یہ محمد
گیلانی؟"

"وہ شاہ جی کے پتر حسن شاہ کا سگا سالا ہے۔ لہور میں رہتا ہے۔ اس کی بسیں اور لاریاں
ہیں۔ وڈا ٹرانسپورٹر ہے۔ شاہ جی کا پتر بھی اس کے کاروبار میں ساجھے دار ہے۔"

"سمجھ نہیں آتی، شاہ جی نے ایسا کیوں کیا؟" رحیم داد بدستور تذبذب میں مبتلا تھا۔ اس
رویئے سے صاف جھلکتا تھا کہ اسے نادر کے بیان پر ابھی تک شبہ ہے۔ رحیم داد نے اس
اظہار بھی کیا۔ "نادر! تو سچ بول رہا ہے؟"

"بالکل سچ بول رہا ہوں جی! مجھے تو محکمہ آبادکاری والوں نے یہاں تک بتایا کہ اس معا
شاہ جی محکمہ آبادکاری کے افسروں سے کئی بار ملا بھی۔ اسی کے زور دینے پر انکوائری کرا

آرڈر ہوئے تھے۔"

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر شاہ جی نے میرے خلاف یہ کارروائی کیوں کی؟ وہ تو مجھے اپنا یار بیلی کہتا ہے۔ تیں نوں بھی پتہ ہے، وہ مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔"

"تو نے ٹھیک ہی کہا چوہدری! اس نے ہمیشہ میرے سامنے تیری تعریف کی۔ محبت ہی کا اظہار کیا۔"

ایسا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے اس نے یہ کارروائی میرے خلاف کیوں کی؟ تو نے اس بارے میں کچھ سوچا؟"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے، شاہ جی نے تیرے خلاف یہ کارروائی اللہ وسایا کی دشمنی میں کی ہوگی۔" نادر نے اظہار خیال کیا۔ "اللہ وسایا کا تو نام سنتے ہی آج بھی شاہ جی کے منہ پر جھنجلاہٹ چھا جاتی ہے۔ حالانکہ اب وہ زندہ بھی نہیں ہے۔ اسے مرے ہوئے مدت ہوگئی پر شاہ جی کی نفرت کم نہیں ہوئی۔ وہ اس سے سخت نفرت کرتا ہے۔" نادر نے سوالیہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "مجھے تو جی یہی وجہ سمجھ آتی ہے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے تجھ سے تو اسے کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ جب بھی تیرے بارے میں اس سے بات چھڑی، اس نے ہر بار تجھے اچھے لفظوں سے یاد کیا۔"

"تیرا خیال ٹھیک لگتا ہے۔" رحیم داد نے نادر خاں سے اتفاق کیا۔ "یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ اللہ وسایا سے شاہ جی بہت زیادہ خار کھاتا ہے۔" رحیم داد اب کسی قدر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھرا ہوا غبار صاف ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ احسان شاہ کے بارے میں اس کے ذہن میں جو شبہات اور خدشات پیدا ہوئے تھے اب زائل ہو چکے ہیں۔ اس نے سوچا احسان شاہ نے اللہ وسایا سے عداوت کے باعث ہی اس کا کلیم اور الاٹمنٹ منسوخ کرانے کی کوشش کی ہوگی۔ اسے یاد آیا کہ درخواست اس زمانے میں داخل کی گئی تھی جب اللہ وسایا زندہ تھا اور تمام زمیں داری کی دیکھ بھال وہی کرتا تھا۔

رحیم داد اسی سوچ میں غرق تھا۔ نادر خاں نے اسے اس قدر محویت سے سوچتے دیکھا تو خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے دریافت کیا۔ "چوہدری! کس سوچ میں پڑ گیا؟"

رحیم داد نے چونک کر نادر کو دیکھا اور بات کا رخ موڑتے ہوئے دبی زبان سے پوچھا۔ "جمیلہ کا کیا حال چال ہے؟ تو نے پھٹی پر کیڑے مار دوائی چھڑکوادی تھی اور جمیلہ کو اس کے بارے میں بتا بھی دیا تھا؟"

"وہ تو جی اب پرانی گل ہوگئی۔" نادر خاں نے مسکرا کر بتایا۔ "دوائی تو اسی روز سپرے کرادی

گئی تھی اور شام ہی کو میں نے اس کے بارے میں زمیں دارنی کو بتا بھی دیا تھا۔"

"اب تو پھٹی پر سونڈی نہیں رہی؟"

"نہیں جی' بالکل نہیں رہی۔ سپرے کے بعد ہی ختم ہو گئی۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "زمیں دارنی نے پھٹی کے بوٹے خود جا کر دیکھے تھے۔"

"تو اس سے ملتا جلتا رہتا ہے؟"

"روز تو جی وہ ملتی نہیں۔ اسے تو سکول ہی سے فرصت نہیں۔ پر مجھے جب بھی موکع ملا' اسے خریف کی واڈھی اور ربیع کی بوائی کے بارے میں ایک ایک بات بتاتا رہا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا وہ زمیں داری میں دلچسپی لے رہی ہے۔"

"نہیں چوہدری! اس پر تو آج کل ناجاں کے ویاہ کی فکر زیادہ سوار نظر آتی ہے۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "میرے بارے میں بھی اس نے کوئی گل بات کی۔"

"مجھ سے تو نہیں کی پر میری گھر والی سے اس نے تیرے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔" نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

"کیا کہتی تھی میرے بارے میں؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔ "تیری گھر والی نے تجھے بتایا تو ہو گا۔"

نادر خاں کی تیز نظروں نے رحیم داد کی بے قراری فوراً بھانپ لی۔ اس نے شکوے کے انداز میں کہا۔ "اس نے مجھے ساری ہی باتیں بتائیں پر چوہدری! تو نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں تو تیرا ہی بندہ ہوں۔ مجھے زمیں دارنی سے کیا لینا؟"

رحیم داد پریشان ہو کر بولا۔ "پہلے یہ بتا' جمیلہ نے میرے بارے میں تیری گھر والی کو کیا کیا بتایا؟"

"وہ تجھ سے بہت ناراض تھی۔ چوہدری! تو نے اپنی گھر والی اور بچوں کے بارے میں جو جھوٹ بولا تھا اس کا اس نے بہت برا منایا۔"

رحیم داد بلبلا کر رہ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ نادر خاں جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ اگر جمیلہ اس کی بیوی کو یہ بات نہ بتاتی تو اسے ہرگز علم نہ ہوتا۔ اس نے نادر کی جانب نظر اٹھا کر نہیں دیکھا' خاموش بیٹھا رہا۔ نادر بتاتا رہا۔ "اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ تو چھپ چھپ کر شاہ جی کے پاس جاتا ہے۔ اس کی حویلی میں کئی کئی روز ٹھہرتا ہے۔ وہ شاہ جی سے سخت نفرت کرتی ہے۔ کہتی ہے اللہ وسایا کو احسان شاہ ہی نے کتل کرایا ہے۔"

رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔ "اس نے تیری گھر والی سے ایسی بات بھی کہی؟" وہ نادر خاں

سے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اس کے بارے میں تو جمیلہ نے کوئی ایسی بات نہیں کہی کہ وہ بھی احسان شاہ کے ساتھ اللہ وسایا کے قتل میں شریک تھا۔ مگر یہ بات اس کی زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ اس نے فوراً خود کو سنبھالا' لہجے میں تیکھا پن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "اسے شاہ جی کے بارے میں ایسی بات نہیں سوچنی چاہیے۔ شاہ جی ایسا نہیں کر سکتا۔ پتہ نہیں اسے کیسے ایسا شبہ ہوا۔" احسان شاہ کی حمایت دراصل وہ خود اپنے دفاع میں کر رہا تھا۔

"مجھے تو جی جب اپنی گھر والی سے ان باتوں کا پتہ چلا تو میں بہت پریشان ہوا۔" نادر خاں نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کہا۔ "سچی گل پوچھ تو میں نے شاہ جی کے بارے میں زمیں دارنی سے کوئی بات نہیں کی۔ ورنہ وہ مجھ سے بھی ناراض ہو جاتی۔ ناراض نہ ہوتی تب بھی اس کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔" اس نے رحیم داد کو مرعوب کرنے کا سیدھا سادا حربہ استعمال کیا۔ "میں نے تو جی صرف تیرے بارے میں اس سے گل بات کی۔ اس کے دل میں تیری طرف سے جو ناراضی اور غصہ تھا اسے دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔"

"تو نے اس کی ناراضی ختم کرا دی؟" رحیم داد نے بے اختیار پوچھا۔

"چوہدری! ایسے معاملے میں نے بہت نمٹائے ہیں۔" نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "زمیں دارنی تو زنانی ہی ہے نا۔ میں نے تو جاگیرداروں اور وڈے وڈے زمینداروں کے نہ جانے کیسے کیسے الجھے ہوئے جھگڑے نبٹے ملے کرائے ہیں۔" بات کہتے کہتے وہ ٹھٹکا۔ رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "چوہدری! میں تجھ سے ایک گل پوچھوں' صاف صاف بتائے گا؟"

"پوچھ' کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

"تو زمیں دارنی سے ویاہ کرنا چاہتا ہے؟" نادر نے رحیم داد کو اور زیادہ مرعوب کرنے کے لیے ہیر پھیر کے بجائے براہ راست سوال کیا۔

رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ "میں نے ایسا سوچا تو تھا۔" رحیم داد نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ نادر خاں کی توقع کے مطابق وہ خاصا مرعوب نظر آ رہا تھا۔

"نہ بھی بتاتا تب بھی مجھے یہ بات پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی۔" نادر خاں اب اس کی شخصیت پر پوری طرح چھا چکا تھا۔

"جمیلہ نے تیری گھر والی کو یہ گل بتائی ہو گی؟" رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔

"ہاں جی!" نادر خاں گویا ہوا۔ "ساتھ ہی زمیں دارنی نے یہ بھی بتایا کہ اس نے صاف انکار

کر دیا۔" نادر نے اپنا سکہ اچھی طرح جمانے کے لیے سوال کیا۔ "یہی گل ہے نا؟"

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نادر! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" اس کے چہرے پر افسردگی پھیلنے لگی۔

نادر خاں نے اس کی افسردگی کا فوراً اندازہ کرلیا اور اس کی ہم دردی حاصل کرنے کی غرض سے گویا ہوا۔ "چوہدری! پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تو دیکھنا' سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ جو چاہے گا وہی ہو گا۔"

رحیم داد نے مڑ کر کھونٹی پر لٹکی ہوئی اپنی پگڑی دیکھی اور وہ گرہ تلاش کی جو اس نے بھکر میں تک کھے پیر کے مزار پر منت ماننے کے بعد پگڑی کے شملے میں لگائی تھی۔ گرہ ابھی تک موجود تھی۔ رحیم داد اپنی بے چینی چھپانے کی کوشش کے باوجود چھپا نہ سکا۔

"نادر! تو جو کچھ کہہ رہا ہے' وہ کیسے ہو گا؟"

نادر خاں اس کی دل جوئی کرتے ہوئے شگفتہ لہجے میں بولا۔ "چوہدری! فکر نہ کر۔ جب تو نے اپنا سمجھ کر مجھے دل کی بات بتا ہی دی تو یہ بھی سن لے' زمیں دارنی لہور شہور نہیں جائے گی۔ حویلی ہی میں رہے گی اور تیری بن کر رہے گی۔" اس نے مسکرا کر رحیم داد کا چہرہ دیکھا اور اس کا رد عمل چہرے کے تاثرات سے معلوم کرنے کی کوشش کی۔

رحیم داد خود کو سنبھال نہ سکا۔ جذبات کی رو میں بہہ گیا' تڑپ کر بولا۔ "یقین نہیں آتا نادر؟"

"آجائے گا' آجائے گا۔" نادر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "پہلے آرام سے میری گل سن لے۔"

"سنا' ضرور سنا۔" رحیم داد کی بے قراری بڑھتی گئی۔ "میں یہی تو سننا چاہتا ہوں۔ یہ بتا' ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ صاف صاف بتا۔"

"سب کچھ بتادوں گا' آرام سے سن۔" نادر خاں بے تکلفی سے مسکرایا۔ اسے رحیم داد کو اپنے قابو میں کرنے کا نہایت مناسب موقع ملا تھا۔ اس نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔ "مجھے گھر والی کے ذریعے ان باتوں کا پتہ چلا تو میں نے اس کی ڈیوٹی لگائی۔ اسے سمجھا بجھا کر تیار کیا کہ تیری طرف سے زمیں دارنی کے دل میں جو میل پیدا ہو گیا ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔" نادر خاں نے اپنے کارگزاری کی روداد ٹھہر ٹھہر کر سنانا شروع کی۔ "میں نے اسے کہا کہ زمیں دارنی کو سمجھائے کہ چوہدری سیدھا سادا نیک بندہ ہے۔ احسان شاہ کے بہکانے اور پھسلانے میں آگیا۔ میں نے گھر والی سے یہ بھی کہا کہ زمیں دارنی کے سامنے تیری تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ شاہ جی کو برا بھلا بھی کہتی رہے' اس کے بارے میں کڑوی گلاں کرے۔"

"یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔" رحیم داد کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔ "شاہ جی کو پتہ چل گیا تو بہت ناراض ہو گا۔ میں اس سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتا۔"

"چوہدری! تو کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔ شاہ جی کو پتہ ہی کیسے چلے گا۔ زمیں دارنی تو اسے بتانے سے رہی۔" نادر نے رحیم داد کو بزرگوں کے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔ "یہ تو تجھے بھی پتہ ہے زمیں دارنی کو شاہ جی سے کتنی نفرت اور گھن ہے۔ جب کسی سے سخت نفرت اور گھن ہوتی ہے تو اس کی برائی سن کر خوشی ہوتی ہے' مزا آتا ہے۔ شاہ جی کو برا بھلا کہہ کر ہی میری گھر والی زمیں دارنی کی ہم دردی اور اعتماد حاصل کر سکتی ہے اور تیرے بارے میں اس کی بدگمانی دور کرا سکتی ہے۔" نادر خاں کھل کر مسکرایا۔ "نتیجہ وہی نکلا جو میں نے سوچا تھا۔"

"کیا نتیجہ نکلا؟" رحیم داد نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"ہوا یہ کہ پہلے جب میری گھر والی تیری تعریف کرتی تو زمیں دارنی کے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ منہ بگاڑ کر اسے کہتی۔ جنت! تو چوہدری کو نہیں جانتی۔ وہ بھلا بندہ نہیں ہے۔ یہ بات میری گھر والی نے مجھے کئی بار بتائی۔"

"پر تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔" رحیم داد نے مداخلت کی۔

"آرام سے پہلے پوری گل سن لے۔" نادر خاں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ تیری تعریف سن کر پہلے تو زمیں دارنی خوش نہیں ہوئی تھی۔ پر جب گھر والی نے میری ہدایت پر شاہ جی کو برا بھلا کہنا شروع کیا تو وہ رفتہ رفتہ بدلنے لگی۔ تیرے بارے میں تعریف کے بول سن کر چپ ہو جاتی۔ اس کے ماتھے پر بل پڑتے نہ منہ بگاڑتی۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "پر اس کے دل کا میل پوری طرح صاف نہیں ہوا تھا۔"

"کیا ابھی تک صاف نہیں ہوا؟" رحیم داد نے بے صبری سے پوچھا۔

"اب تو صاف ہو چکا ہے۔ دراصل اسے شبہ تھا' تو شاہ جی کی حویلی میں ٹھہرا ہے۔ اپنے شبے کا اظہار اس نے مجھ سے بھی کیا تھا۔"

"کیا پوچھا تھا اس نے؟"

"ایک روز باتوں باتوں میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ سنا ہے چوہدری آج کل احسان شاہ کے پاس ہوتا ہے۔ تجھے پتہ ہے؟ میں اس کی بات سن کر الجھن میں پڑ گیا۔"

"تو نے کیا بتایا؟" رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"میں کیا بتاتا جی۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "وہی کہا جو یہاں آنے سے پہلے تو نے مجھے ہدایت

کی تھی۔ میں نے زمیں دارنی سے کہا چوہدری تو اپنے کلیم کے سلسلے میں ملتان گیا ہے۔ تو نے مجھ
یہی تو کہا تھا؟" نادر نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"جمیلہ نے تیری بات مان لی تھی؟"

"نہیں۔" نادر خاں نے انکار میں گردن ہلائی۔ "میری گل سن کر وہ چپ ہو گئی۔ بعد میں مجھے
چلا اس نے میری بات پر اعتبار نہیں کیا بلکہ برکت دودھی کے ذریعے کھوج لگایا کہ تو شاہ جی کے
پیراں والہ میں تو نہیں ہے؟"

"پر میں تو پیراں والہ میں تھا ہی نہیں۔ دوسرے ہی روز لہور چلا گیا تھا۔"

"ٹھیک ہی ہوا تو وہاں نہیں تھا۔ ورنہ بہت گڑبڑ ہوتی۔ وہ مجھے بھی جھوٹا فریبی سمجھتی۔" نادر
خاں زیرِ لب مسکرایا۔ "میری گل سچی نکلی اور اسے معلوم ہو گیا تو شاہ جی کی حویلی میں نہیں ہے
تو میرے ساتھ ٹھیک طرح پیش آنے لگی اور میری گھر والی پر تو اتنی مہربان ہو گئی کہ شام کو گھنٹوں
کر اس کے ساتھ باتیں کرتی۔ گھر والی کی طبیعت گڑبڑ ہوتی' وہ نہ جاتی تو خود اسے دیکھنے آتی' د
کھلاتی۔ دیر تک اس کے پاس بیٹھی تسلی دیتی رہتی۔"

رحیم داد نے نادر خاں کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بیمار کوئی بھی پڑے
جمیلہ دوائیوں کا بکسا اٹھائے فوراً پہنچ جاتی ہے' دوائی دیتی ہے' دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس معاملے
اس کا دل بہت کھلا ہوا ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ میرا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے۔" اس نے رحیم داد کی تائید کی۔ "سچ تو یہ
چوہدری! وہ جتنی سوہنی ہے' من کی بھی اتنی ہی سوہنی ہے۔" اس نے رحیم داد کا چہرہ دیکھا جو خ
سے سرخ ہو رہا تھا۔ "اب یہی دیکھ' جب ہفتے بھر سے اوپر ہو گیا اور تو واپس نہیں پہنچا تو وہ پریشا
ہو گئی۔"

"تیں نوں کیسے پتہ چلا وہ پریشان ہو گئی؟"

"ہوا یہ کہ ایک روز وہ مجھ سے کہنے لگی۔ نادر! لگتا ہے چوہدری ناراض ہو کر یہاں سے چلا گ
اس کا ادھر کوئی بھی تو نہیں۔ کہاں جائے گا؟ کس کے پاس جائے گا؟ خیر یہ زمیں داری بھی تو اس
ہے۔ مجھے اس سے کیا لینا؟ یہ باتیں جب اس نے مجھ سے کہیں تو اس کے منہ پر پریشانی صاف ن
آ رہی تھی۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے نادر؟" رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

"اب میں تجھے صاف صاف ہی بتا دوں۔"

"میں صاف صاف ہی سننا بھی چاہتا ہوں۔" اس کی بے قراری سارے بندھن توڑ کر سامنے
آ گئی۔

"چوہدری! سچ تو یہ ہے میں اسی کے کہنے پر ادھر آیا ہوں۔"

"تو اس کے کہنے پر ادھر آیا ہے؟"

"ہاں جی' بالکل یہی گل ہے۔" نادر خاں نے رحیم داد کو باور کرایا۔ "زمیں دارنی نے مجھے کہا کہ
میں تجھے منا کر کوٹلہ ہرکشن واپس لے آؤں۔"

"اسے پتہ تھا میں یہاں ہوں؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "اسے کیسے پتہ چلا؟"

"نہیں چوہدری! ایسی کوئی گل نہیں۔" نادر خاں نے اس کی غلط فہمی رفع کی۔ "اس کا خیال تھا
تو ملتان میں ہو گا اور محکمہ آبادکاری سے تیرا پتہ معلوم ہو جائے گا۔ میں نے کیا بھی ایسا ہی۔ سیدھا
ملتان پہنچا۔ وہاں دو روز ٹھہر کر تیرے کلیم کا معاملہ طے کرایا اور کوٹلہ ہرکشن لوٹنے کی بجائے سیدھا
شاہ جی کی حویلی پہنچا۔ وہاں شیدا سے پتہ چلا تو مراد خاں شاہانی کے ساتھ بھکر گیا ہے۔ بھکر گیا تو
معلوم ہوا تو ادھر ہموں والی میں ہے۔ سو میں یہاں آ گیا۔"

"ٹھیک ہی ہوا تو یہاں آ گیا۔ تیرے آنے سے بہت سی باتوں کا پتہ چل گیا ورنہ میں تو پریشان
تھا۔ سوچ رہا تھا شاہ جی کے پاس جاؤں۔ اس سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد کوٹلہ ہرکشن لوٹنے کا
فیصلہ کروں۔ مجھے جمیلہ کی ناراضی نے بہت تنگ کر رکھا تھا۔"

"پر اب تو وہ تجھ سے ذرا بھی ناراض نہیں۔ جی چاہے تو اور گھوم لے۔ پنڈ پہنچ کر خود دیکھ لینا
زمیں دارنی تجھ سے کس طرح پیش آتی ہے۔ اب وہ بہت بدل چکی ہے۔ تیری طرف سے اس کا دل
بالکل صاف ہو چکا ہے۔"

"یہ سب تو نے ہی کیا ہے۔" رحیم داد نے نادر خاں کی کارگزاری سے خوش ہو کر اپنے ردعمل کا
اظہار کیا۔ "سچ پوچھ' میں تو سمجھتا تھا' جمیلہ کی خفگی اب کبھی ختم نہ ہو گی۔ بات ہی اس طرح بگڑی
تھی کہ میں چاہتا بھی تو اس کے دل کا میل صاف نہ ہوتا۔" وہ بے ساختہ مسکرانے لگا۔ "پر نادر!
تو نے تو کمال ہی کر دیا۔ شاہ جی سچ کہتا ہے' نادر تو بہت کام کا بندہ ہے۔"

نادر خاں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی مگر اس نے انکسار سے کام لیا۔ "چوہدری! یہ تو کوئی ایسا
پیچیدہ معاملہ نہیں تھا۔ تیری مہربانی چاہیے۔ آگے اس سے بھی زبردست کام کر کے دکھاؤں گا۔
ابھی تیری ملازمت کرتے مجھے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔"

"فکر نہ کر۔' اب تو ہمیشہ میرے پاس رہے گا۔ مجھے تیرے ہی جیسے وفادار اور ہوشیار بندے کی

ضرورت تھی۔" رحیم داد نے نادر خاں کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ "یہ بتا' کیا مجھے تیرے ساتھ واپس چلنا چاہیے؟ ویسے مراد خاں مجھے ابھی جانے نہیں دے گا۔" اس نے اچانک بات کا رخ دیا۔ "اور ہاں' یہ تو بتا' شاہ جی اپنے پنڈ واپس پہنچ گیا کہ نہیں؟"

"جب میں پیراں والہ میں تھا تب تک وہ نہیں لوٹا تھا۔ شیدا کہتا تھا شاہ جی پیراں والہ وا آنے سے پہلے کراچی جائے گا۔ وہاں اسے کچھ ضروری کام ہے۔ مجھے تو اس کا لمبا ہی پروگرام ہے۔"

"ویسے اب شاہ جی سے ملنے اور مشورہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔" رحیم داد نے اپنا ا بدل دیا۔ "تو نے سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرا دیا۔ اب شاہ جی سے مل کر کیا لینا؟" اس نے سوا نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ "سچ پوچھ تو مجھے اب شاہ جی کے پاس جانا بھی نہیں چاہیے۔ جمیل پتہ چل گیا تو فیر ناراض ہو جائی گی۔ تیری کیا رائے ہے؟"

"چوہدری! تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ تجھے اب شاہ جی سے ملنے جلنے میں احتیاط سے کام چاہیے۔" نادر خاں نے اس کی تائید کرنے کے ساتھ مشورہ بھی دیا۔ "بہتر تو یہی ہے کچھ عرصے لیے تو شاہ جی سے دور ہی رہ۔ بلکہ میں بھی اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ دراصل زمیں دارنی کو جی سے اتنی سخت نفرت ہے کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔"

"میں نوں پتہ ہے وہ شاہ جی سے کتنی زبردست نفرت کرتی ہے۔" رحیم داد نے نادر کی را سے اتفاق کیا۔ "یہ بتا میں نوں اب کیہ کرنا ہے۔ تو کہہ تو آج ہی تیرے ساتھ چل سکتا ہوں۔ خاں نے مجھے کید تو کر نہیں رکھا۔ صرف اتنا خیال آتا ہے اس نے بہت محبت سے روکا ہے۔ اس نے شکار کا پروگرام بنایا ہے اور میری ہی خاطر بنایا ہے۔ پچھلی بار وہ شکار پر گیا تو میں اچا بیمار پڑ گیا تھا۔ اس دفعہ بھی نہ گیا تو اسے دکھ ہو گا۔"

"ایسی گل ہے تو چوہدری تو ٹھیر جا۔ فکر نہ کر' میں زمیں دارنی کو سمجھا دوں گا۔" نادر خاں قدرے توقف کے بعد کہا۔ "ویسے بھی تجھے ابھی واپس نہیں جانا چاہیے۔"

"کیوں نہیں جانا چاہیے؟" رحیم داد بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔

"ابھی نہیں جائے گا تو زمیں دارنی پر تیرا رعب پڑے گا۔ اسے بھی تو پتہ چلنا چاہیے' تو بھی ہو سکتا ہے۔"

"سوچ لے' کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"پروا نہ کر چوہدری!" نادر خاں نے اسے یقین دلایا۔ "میں تیرے بارے میں زمیں دارنی۔

ں ڈھب سے بات کروں گا کہ معاملہ بگڑنے نہ پائے اور تیری آن بھی رہے۔"

"ٹھیک ہے' میں نے ابھی واپس نہیں جانا۔" رحیم داد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں فصل ی واڈھی سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔"

"چوہدری! تو فصل کی واڈھی کی بالکل فکر نہ کر۔ میں نے پوری تیاری کر لی ہے۔ جاتے ہی شروع کرا دوں گا۔ ویسے تیری مرضی جب چاہے واپس آ جانا۔ زمیں داری کا کام تو چل ہی رہا ہے۔ ور ایسا ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے دیکھے گا تو بہت خوش ہو گا۔"

"میں نوں پتہ ہے' تیری مینجری میں کام بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا ہو گا۔"

نادر خاں نے رحیم داد کو اس قدر مہربان پایا تو خوش ہوا' اپنی کارگزاری اور زیادہ جوش و خروش سے سنانے لگا۔ ربیع کی بوائی' خریف کی کٹائی اور کپاس کی چنائی کے بارے میں ایک ایک تفصیل بتانے لگا۔ دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سورج چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ نادر خاں سے باتیں کرنے کے بعد رحیم داد اتنا مسرور اور مطمئن ہوا کہ دوپہر کا کھانا اس نے نادر کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلایا۔

نادر خاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ اس نے رحیم داد سے اجازت لی اور کوٹلہ ہر کشن جانے کے لیے ہموں والی سے بھکر کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا مگر سویا نہیں۔ گھنٹے سوا گھنٹے بعد وہ کمرے سے نکلا اور دیرے سے حویلی کے پھاٹک کی جانب چلا۔ اس نے دیکھا' دالان کی سیڑھیوں پر دھوپ میں حمیدہ بیٹھی ہے جسے سب میدہ کہتے تھے۔ وہ اس وقت چھینٹ کا گھگرا اور چست آستینوں والا سرخ رنگ کا لنڈا چولا پہنے تھی۔ چولے کے گلے پر سیاہ اور سبز دھاگے کی خوش نما کشیدہ کاری تھی۔ شانوں پر لہریا چندری پڑی تھی۔ اس کا لباس نیا اور خوش رنگ تھا۔

حمیدہ کے گیلے بال دیکھ کر رحیم داد کو اندازہ ہو گیا کہ اس نے کچھ ہی دیر پہلے غسل کیا ہے۔ اس کے چہرے پر نکھار تھا۔ دھوپ سے رخسار سرخ پڑ گئے تھے۔ وہ خوب رو اور دل کش نظر آ رہی تھی۔ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی پشت پر سلطری تھی۔ وہ لکڑی کی کنگھی سے میدہ کے گیلے بال آہستہ آہستہ سلجھا رہی تھی' سنوار رہی تھی۔

سلطری کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ رنگ سانولا تھا مگر نقش و نگار تیکھے اور سبک تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور خوب صورت تھیں۔ ان میں کاجل لگا تھا۔ پوپٹ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ہر وقت

خوب بنی ٹھنی رہتی تھی۔ مزاج میں ابھی تک شوخی تھی' لگاوٹ اور عشوہ طرازی تھی۔ ؟
کا ایک ایک عضو بولتا تھا' چھلکتا تھا۔ اسے اپنی دل کشی اور رعنائی کا پورا پورا احساس تھا۔ و
پہلو سے کشش انگیز بنا کر رکھتی بھی تھی۔ اپنے تین بچوں کے ساتھ حویلی کے عقبی حصے
تھی۔ وہ مراد خاں شاہانی کی منہ چڑھی خادمہ تھی۔ حویلی میں مزارعوں اور کمیوں کی ج
لڑکیاں اور بیویاں' سردار مراد خاں شاہانی کا عشرت کدہ آباد کرنے کے لیے اٹھا کر لائی
سلطری ان کی دیکھ بھال کرتی اور کڑی نگرانی کا فرض انجام دیتی۔ انھیں بنا سنوار کر سردار
گاہ میں پہنچانا بھی اسی کے ذمے تھا۔

رحیم داد نے اپنے قیام کے دوران سلطری کے شوہر کو کبھی حویلی میں نہیں دیکھا۔ نہ
کون تھا؟ رحیم داد کو اس کے بارے میں مطلق علم نہ تھا۔ اس نے حویلی کے کسی ملازم سے
کے بارے میں اور نہ ہی اس کے شوہر کے متعلق پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی۔ البتہ وہ
جانتا تھا کہ مراد خاں اس پر بہت زیادہ مہربان ہے اور مکمل اعتماد بھی کرتا ہے۔

قدموں کی آہٹ سن کر میدہ نے نظریں اٹھائیں۔ رحیم داد کو دیکھا مگر جھٹ گردن جھ
خاموش بیٹھی رہی۔ سلطری نے بھی مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ایک خاص ادا سے مسکر
اونچی آواز سے سلام کیا۔ "سیں چوہدری! سلام ولادوں۔ سب خیراے' تکڑا اے' راضی
خوش اے!!"

رحیم داد نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ "شکر اے!"

میدہ نے ایک بار پھر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "اس کی آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔ اا
ویرانی تھی۔ رحیم داد نے اس کی افسردگی محسوس کی۔ مگر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ نہ رکا:
کی۔ مراد خاں شاہانی سویرے سویرے جھوک مٹھو بندہ چلا گیا تھا۔ کریم بخش راودھانی بھی اہ
ہم راہ تھا۔ دونوں ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔

رحیم داد حویلی سے باہر نکلا۔ پھاٹک پر خانن بندوق سنبھالے بیٹھا تھا۔ وہ حویلی کا پرانا پ
تھا۔ خانن نے رحیم داد کو دیکھا تو جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے رحیم داد کو سلام کیا۔ رح
نے گردن ہلا کر جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ ٹہلتا ہوا گاؤں کی جانب بڑھا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اس نے دیکھا' حویلی کے احاطے کی
چار دیواری سے کچھ فاصلے پر نیم کے ایک گھنے درخت کے نیچے میدہ کا بڑا بھائی فریدا خاموش اد
ہوا کھڑا ہے۔ اس کی حجامت اور بڑھ گئی تھی۔ سر کے بال خشک اور میلے چیکٹ ہو گئے تھے۔ ؟

گلے میں پڑی تھی' چہرہ اجاڑ اور بے رونق تھا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ اسے فریدا سے ہم دردی تھی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ حال احوال معلوم کرنا چاہتا تھا۔ فریدا نے اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہاتھ اٹھا کر سلام کیا' دعائیں دیں۔ "سیں سدا جیویں' سیں سکھی صحت ہو دیں۔"

رحیم داد نے نزدیک پہنچ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "فریدے' تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟"

"میدہ سے ملنے آیا تھا۔" اس کے لہجے میں نرمی اور حلاوت تھی۔

"اسے مل لیا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "میدہ ادھر حویلی میں سلطری کے ساتھ دھوپ میں بیٹھی ہے۔ میں ادھر ہی سے آ رہا ہوں۔"

"سیں! میں میدہ سے نہیں مل سکتا۔" اس نے حویلی کے پھاٹک کی سمت ہاتھ اٹھا کر کہا۔
"ادھر راکھا بیٹھا ہے۔ اس نے نہیں ملنے دیا۔"

رحیم داد نے مڑ کر دیکھا' خانن بندوق سنبھالے پھاٹک کے باہر اللہ بخش جوڑا کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ فریدا نے بھی دونوں کو دیکھا اور رحیم داد کو بتانے لگا۔ "میں نے راکھے سے منت کی' زاری کی پروہ نہ مانا۔" اس کا لہجہ رقت انگیز ہو گیا۔ "پہلے بھی آیا تھا۔ میدہ سے نہیں مل سکا۔ سیں! سردار کی اجازت نہیں۔ راکھا یہی بولتا تھا۔"

رحیم داد اس معاملے میں اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ خانن ہرگز مراد خاں کی حکم عدولی نہیں کرے گا۔ رحیم داد کے کہنے پر بھی نہیں۔ وہ بہت سخت گیر تھا اور مراد خاں کے اعتماد کا آدمی تھا۔ ویسے بھی سردار مراد خاں شاہانی کے سامنے سارے نوکر چاکر مجبور اور بے بس تھے' اس کے غیظ و غضب سے ڈرتے تھے۔ اسے اپنے کسی ملازم یا مزارع کی کوئی بات بری لگتی تو غصے میں اس قدر دیوانہ ہو جاتا کہ اپنے شکاری کتے جھنجوڑنے اور نوچنے کھسوٹنے کے لیے ان پر چھوڑ دیتا۔ ہموں والی میں اپنے قیام کے دوران وہ کئی بار ایسے ہولناک مناظر دیکھ چکا تھا۔ یہ مظالم دیکھ کر وہ خود بھی سردار شاہانی سے خائف رہتا تھا۔ لہٰذا رحیم داد نے فریدا کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"فریدے! یہ بتا میدہ کب تک حویلی میں رہے گی؟"

"سردار کی مرضی ہے سیں۔" فریدا افسردہ لہجے میں بولا۔ "وہ جب چاہے گا تب ہی میدہ حویلی سے باہر نکلے گی۔ ویسے پرناٹیکس کی ڈالی نہ ملنے تک وہ اسے اپنے پاس رکھ ہی سکتا ہے۔ ریت اور رواج تو یہی ہے۔"

"پر سردار نے تو تجھے معافی دے دی تھی۔ میرے سامنے دی تھی۔"

"سیں! تو سمجھا نہیں' معافی تو اس نے میدہ کا منگاواں کرنے سے پہلے ڈالی نہ دینے کے ج
دی تھی۔" فریدا نے وضاحت کی۔

یہ بتا' سردار چاہے تو ڈالی بالکل معاف کر سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں معاف کر سکتا' بالکل کر سکتا ہے۔" فریدا نے مستعدی سے جواب دیا۔

"وہ سردار ہے' بادشاہ ہے' سب کچھ کر سکتا ہے۔"

"ایسا کر' تو سردار سے مل لے۔" رحیم داد نے فریدا کو مشورہ دیا۔ "منت سماجت کرے گ
مان جائے گا۔ ڈالی معاف کر دے گا اور میدہ کو بھی واپس کر دے گا۔"

"ناں سیں! میں ایسا نہیں کر سکتا۔" فریدا کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ "میں اس کا
رعیت ہوں' اس کا مزارع ہوں۔ میں سردار سے کچھ نہیں بول سکتا۔ وہ ناراض ہو جائے
ناراض ہو گیا تو ڈالی دینے پر بھی میدہ کو واپس نہیں کرے گا۔ کسی اور سردار کے پاس بھیج دے
اپنے ہی پاس رکھے گا۔ تھکا تھک بچے جنوائے گا۔ اس کے بعد بھی زاری کرنے پر' منت کر۔
اگر واپس کرے گا تو جرمانہ لگا کر زیادہ ہی رقم مانگے گا۔"

"یہ تو نے بالکل نرالی گل سنائی۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"سیں! لگتا ہے تو ادھر پہلی بار آیا ہے۔ تیکوں یہاں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ یہ
ہے۔" فریدا کا دبا ہوا غم یکایک ابل پڑا۔ اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ "یہاں او پ
دی خدائی ہے اور نیچے سرداروں کی۔" اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "سیں
غریب ہوں' حلیم ہوں' شامت دا ماریا ہوں۔"

رحیم داد اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ چند لمحے سر جھکائے خاموش کھڑا سوچتا رہا' پھر ف
کندھا تھپک کر تسلی دی۔ "فریدے! پریشان نہ ہو۔ میں سردار سے میدہ کے بارے میں بات ک
گا۔ شاید وہ میری بات مان لے اور ڈالی بالکل معاف کر دے۔ تب میدہ جلد ہی تیرے پاس
جائے گی۔ تو اس کا ویاہ کرنا۔ میرا مطلب ہے۔" وہ بات کہتے کہتے الجھا۔ "کیا کہتے ہیں اسے'
ہاں' پرنا کر دینا۔ اس کی منگنی یا منگاوا تو پہلے ہی کر چکا ہے۔"

فریدا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ گڑگڑا کر رحیم داد کو دعائیں دینے لگا۔ "سیں! تو جیا ج
ہووین' رب راضی ہووے' میں صدقے تھیواں۔" وہ گلے میں پڑی ہوئی پگڑی ایک ہاتھ سے
کر آنسو پونچھنے لگا۔ "سیں! سردار تیری گالھ ضرور مان لے گا۔ تو اس کا مہمان ہے۔ اس

ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ بادشاہ ہے۔"

"فکر نہ کر۔" رحیم داد نے ایک بار پھر اس کا کندھا تھپکا۔ "اب تو ٹر جا۔"

فریدا نے جھک کر رحیم داد کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور چپ چاپ چلا گیا۔ رحیم داد آگے نہ گیا۔
واپس حویلی میں آ گیا۔ ڈیرے میں پہنچا اور کمرے کے سامنے کرسی کھسکا کر دھوپ میں بیٹھ گیا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے مراد خاں آ گیا۔ شام کا اندھیرا پھیلا۔ سردی بڑھی۔ سردار
شاہانی اور رحیم داد کمرے میں کرسیوں پر بیٹھے۔ شغل بادہ نوشی شروع ہوا۔ ہموں والی کے قیام کے
دوران عام طور پر دیسی شراب چلتی جسے مقامی کلال "گڑ" آلو یا کھجور سے کشید کرتے تھے۔ اس شام
بھی میز پر دیسی شراب کی بوتل تھی مگر کچھ زیادہ ہی تند اور تیز تھی۔ ذائقہ بھی مختلف تھا۔ یہ شراب
جھوک منصو بندہ میں اسے ایک نوانی زمیں دار نے تحفے کے طور پر پیش کی تھی۔

سردار شاہانی نے گلاس خالی کیا۔ اس میں دوبارہ شراب انڈیلتے ہوئے گویا ہوا۔ "عبداللہ خاں
نوانی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ زوردار چیز ہے' ٹک مارتی ہے۔"

رحیم داد نے گھونٹ بھرا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بہت زوردار لگتی ہے۔"

"تجھے پتہ ہے یہ کیسے تیار کی جاتی ہے؟"

"میں نوں اس بارے میں کیہ پتہ؟" رحیم داد سادگی سے بولا۔

"تیکوں کچھ بھی پتہ نہیں۔" سردار شاہانی نے ہنس کر کہا۔ "یہ لاہن سے بنتی ہے۔ اسے بنانے
کے لیے' بیری' پیپل اور بوہڑ کے درختوں کی چھال مٹی کے کورے گھڑوں میں ڈال کر کچی زمین کھود
کے دبا دی جاتی ہے۔ جتنے زیادہ دنوں بعد گھڑا باہر نکالا جاتا ہے' اتنا ہی عمدہ خمیرا اٹھتا ہے۔ اسی کو
لاہن کہتے ہیں۔ جس سے بعد میں یہ کشید کی جاتی ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ "میں
نے تو دس بارھاں سال پرانے لاہن سے کشید کی ہوئی شراب پی ہے۔ بہت زوردار ہوتی ہے۔ یہ
بھی پرانے لاہن کی لگتی ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تجھے کیسی لگی؟"

"زبردست ہے۔ ابھی سے چڑھنے لگی۔" رحیم داد نے بڑا گھونٹ بھرا اور گلاس میز پر رکھ دیا۔

"پر لاہن کی تیز دارو کے ساتھ رن بھی تیز اور گرم ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر اسے پینے کا مزا
نہیں۔" شاہانی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔

رحیم داد بھی ہنسنے لگا۔ شاہانی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "شاہانی! تو نے میدہ کو واپس
نہیں بھیجا۔ کب تک رکھنے کا ارادہ ہے۔"

"چلی جائے گی' چلی جائے گی۔" مراد خاں نے بے نیازی سے کہا۔ "جلدی کیا ہے۔"

"اب تو اسے اپنے گھر جانے دے۔" رحیم داد نے نرم لہجے میں سفارش کی۔

"کیوں؟" مراد خاں شاہانی نے تیکھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تجھے اس سے کیا لینا؟"

رحیم داد نے فریدا سے اپنی ملاقات کا ذکر نہ کیا' چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ "
نے آج دوپہرا سے دیکھا تھا۔ بیمار بیمار لگتی ہے۔ ویسے بھی وہ کمزور اور دبلی پتلی ہے۔"

"چوہدری! تو اسے نہیں جانتا۔" سردار نشے کی ترنگ میں جھوم کر بولا۔ "وہ انگوری۔ انگوری۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "انگور کے پکے دانے کی طرح رس بھری۔ تو نے اس کا رنگ رو
دیکھا ہے' سچ بتا' تجھے وہ انگوری نہیں لگتی؟"

"مجھے تو وہ کسی طرف سے انگوری سنگوری نہیں لگتی۔" رحیم داد نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا
لہجے میں اور نرمی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "میں چاہتا ہوں تو اسے واپس بھیج دے۔ اس کی سگا
پہلے ہی ہو چکی ہے۔ میدہ کا منگیڈر اس کا انتظار کرتا ہوگا۔ اس کا بھرا' فریدا بھی اس کا ویاہ کرنے
تیار ہے۔"

"تو میدہ کی اس طرح سفارش کیوں کر رہا ہے؟" سردار نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس ک
طرف دیکھا۔ "بات کیا ہے؟"

"کوئی خاص گل بات نہیں۔" رحیم داد نے فوراً بات بنائی۔ "میدہ کو دیکھا تو سوچا تجھ سے کہو
گا' اسے اپنے گھر جانے دے۔" اس نے لہجے میں عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "میں تو چاہتا
ہوں تو اس کی ڈالی بھی معاف کر دے۔" رحیم داد نے اصرار کیا۔ "معاف کر دے گا ناں؟"

"تو کہتا ہے تو اسے واپس بھیج دوں گا۔ ڈالی بھی معاف کر دوں گا۔" سردار مراد خاں خلاف توق
فوراً رضامند ہو گیا۔ شاید نشہ کچھ زیادہ چڑھ گیا تھا۔ "پر گھر جانے سے پہلے وہ ایک رات تیرے پاس
رہے گی اور آج ہی رات رہے گی۔"

"نہیں! تو آج رات بھی اسے اپنے ہی پاس رکھ۔" رحیم داد رضامند نہ ہوا۔

"میری فکر نہ کر چوہدری!" شاہانی لہرا کر بولا۔ "میں نے اپنے لیے آج رات ایک پولانی اٹھوالی
ہے۔ بہت گرم رن ہے۔ دن میں سوت سے کپڑا بنتے ہوئے اس کے ہاتھ فافٹ چلتے ہیں پر رات
کی نہ پوچھ۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "وہ پہلے بھی ایک بار میرے پاس رہ چکی ہے۔"

"ایسا ہے تو میدہ کو آج ہی رات جانے دے۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "ابھی تو رات
زیادہ نہیں گزری۔"

"نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ آج رات نہیں جائے گی۔ تیرے پاس رہے گی۔ دیکھ انکار نہ

کرنا۔" وہ نشے کی جھونک میں بڑبڑانے لگا۔ "تو میرا مہمان ہے' میرا یار بیلی ہے۔ میدہ آج رات
میرے پاس نہ رہے' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ذرا سوچ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ نہیں ہوگا۔ ہرگز' ہرگز
نہیں ہوگا۔"

رحیم داد نے سردار کی برہمی سے خائف ہو کر خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ سردار مراد خاں
شاہانی نے اسی دم سلطری کو بلوایا۔ وہ فوراً آ گئی' جیسے شاہانی کے بلاوے کا انتظار ہی کر رہی تھی۔
اس وقت وہ کچھ زیادہ ہی بن سنور کر آئی تھی۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا' ہونٹوں پر سرخی تھی۔
بال موتیے کے پھولوں میں بسے ہوئے کرنے کے تیل سے جگمگا رہے تھے۔ سر پر بسنتی دوپٹہ تھا۔ وہ
ریشم کی بسنتی منجھلی بھی باندھے ہوئے تھی' دل ربا اور عشوہ طراز نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد کو بھی وہ
بہت اچھی لگی۔ اس کے لیے دھڑکن اور بے قراری بھی محسوس کی۔

سلطری کو دیکھتے ہی مراد خاں کی آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ لمحے بھر تک ٹکٹکی باندھے پیار
بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گلاس اٹھا کر بڑا گھونٹ بھرا اور جھوم کر گویا ہوا۔

"جند جانی! آج تو بھری ہوئی بندوک لگ رہی ہے۔ ادھر آ میرے پاس۔"

سلطری نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر ترچھی نظروں سے مراد خاں کو دیکھا۔ اس کے انداز میں
لگاوٹ تھی۔ بڑی چاہت سے بولی۔ "سیں! میں صدکے تھیواں۔" وہ آگے بڑی اور مراد خاں کے
پہلو سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

شاہانی نے اسے مخاطب کیا۔ "سلطری! انگوری کو کیا نام ہے اس کا؟" نشے کی جھونک میں اسے
میدہ کا نام یاد نہیں آیا۔

سلطری نے جھٹ بتایا۔ "سیں! تو میدہ کو تو نہیں پوچھ رہا؟"

"ہاں' ہاں! وہی' بالکل وہی' میدہ' میدہ۔ وہ انگوری ہے نا؟" شاہانی نے سلطری کو سوالیہ نظروں
سے دیکھا۔ "میدہ کو چوہدری کے کمرے میں پہنچا دے۔ وہ آج رات چوہدری کے پاس رہے گی۔
صبح اسے اپنے گھر بھیج دینا۔ رادھانی سے کہنا۔ اس کی ڈالی بھی میں نے معاف کر دی۔ سن لیا
تو نے؟"

"جی سیں!" سلطری نے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ٹھسے سے بولی۔
"پولانی کو تیرے کوٹھے وچہ پہنچا دوں؟"

"پولانی کو گولی مار۔ آج تو ہی میرے پاس رہے گی۔" سردار شاہانی نے سلطری کے لیے حکم صادر
کیا۔ "اب تو جا' میدہ کو چوہدری کے کمرے میں لے جا۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

"یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ میرا انتظار کر۔ میں جلد ہی تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

سلحری کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ آنکھیں مسکرانے لگیں۔ وہ گردن اٹھائے ہو
قدم بڑھاتی چلی گئی۔ سردار شاہانی نگاہیں اٹھائے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ با
مڑ کر اوجھل ہو گئی تو سردار نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! اپنی سلحری کا بھی جواب
سدا بہار ہے۔ برسوں سے میرے پاس ہے پر اب تک پرانی نہیں ہوئی۔ ہر بار کچھ زیادہ
ہے۔ کیا خیال ہے تیرا؟"

رحیم داد صرف مسکرا کر رہ گیا۔ سردار شاہانی نے بھی مزید بات نہیں کی۔ دونوں شر
شغل کرتے رہے۔ مراد خاں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اٹھا اور ڈگمگاتے قدموں سے جھومتا جھ
بڑھ گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا اور شاہانی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

سلحری خواب گاہ کے دروازے پر مراد خاں کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے
بڑھی اور ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے سہارا دیا۔ دونوں کھلے دروازے سے اندر چلے گ
داد ڈیرے کی جانب چل دیا۔ کمرے کے قریب پہنچا۔ دروازہ کھول کر کمرے میں قدم ر
ٹھٹک گیا۔ میدہ بستر پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ رحیم داد نے دروازہ بند کیا۔ آگے بڑھا اور
قریب پہنچا۔ میدہ کسمسا کر سکڑنے لگی۔ اس نے نہ گردن اٹھائی نہ رحیم داد کی جانب دیکھ
بیٹھی رہی۔

رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ "میدہ!" مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بہت سہمی
مضمحل نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد نے اس کی پریشانی محسوس کی۔ اسے اپنی جانب متوجہ
غرض سے بولا۔ "فریدا تیرا بھائی ہے نا؟ وہ آج دوپہر حویلی سے باہر مجھے ملا تھا۔"

تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ میدہ نے فوراً نظریں اٹھائیں اور بے قرار ہو کر پوچھا۔ "فریدا
تھا؟"

"ہاں!" رحیم داد نے بتایا۔ "وہ تجھے ملنے آیا تھا۔"

"پر میں نے تو اسے نہیں دیکھا۔ سیں! وہ کب آیا تھا؟" اس کی آنکھوں سے بے قرا
ساتھ ساتھ حیرت بھی جھلک رہی تھی۔

"میں نے کہا نا، وہ آج دوپہر کو آیا تھا۔ تو سلحری کے ساتھ دھوپ میں بیٹھی تھی۔ تمھ
ہے نا۔ میں تیرے اور سلحری کے سامنے سے گزرا تھا۔ باہر گیا تو وہ مجھے مل گیا۔" رحیم
تفصیل بتائی۔ "پر راکھے نے فریدا کو اندر نہیں آنے دیا۔ وہ حویلی کے اندر نہ آسکا۔ باہر

اسے کیسے دیکھتی؟ وہ تجھے ملے بنا چلا گیا۔"

"ہا سیں! وہ میکوں کیسے مل سکتا ہے؟" میدہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سردار کی اجازت نہیں۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "فریدا کیا کہتا تھا؟ وہ تجھے ملا تھا نا؟"

"تیرے لیے وہ بہت پریشان ہے۔"

"پر اس کے پریشان ہونے سے کیا ہوتا ہے؟" میدہ کے چہرے پر غم کی بدلی چھا گئی۔ "سیں! وہ غریبی مسکینی میں کیا کر سکتا ہے۔ پرنا ٹیکس کی ڈالی دے سکتا تو مجھے مل لیتا۔ اپنے ساتھ بھی لے جاتا۔"

"تیرے سوا یہاں اور بھی نیاریں ہوں گی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ہا سیں!" میدہ رفتہ رفتہ رحیم داد سے مانوس ہوتی جا رہی تھی۔ "میری طرح یہاں تین اور بکر کیدہیں۔ ان کا پرنا ماپیؤ نے سردار کی اجازت کے بنا چوری سے کر دیا تھا۔ ڈالی دینے کو رکم نہیں تھی۔ وہ میرے آنے سے پہلے حویلی میں تھیں۔ انھیں تو چھ چھ مہینے سے بھی اوپر ہو گئے۔ کنڑک دے موسم توں اودھر ہیں۔ اب تک سیں نہ ان کی ڈالی سردار کو پہنچی اور نہ وہ جا سکیں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "میں بھی نہیں جا سکتی۔ فریدا ڈالی کی رکم کہاں سے لائے گا؟"

"تو فکر نہ کر فریدا کو اب ڈالی نہیں دینی پڑے گی۔" رحیم داد نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

"سیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اسے رحیم داد کی بات پر یقین نہ آیا۔

"ایسے ہی، جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ تیرا پرنا ٹیکس سردار نے معاف کر دیا۔ تو کل سویرے اپنے گھر چلی جائے گی۔"

میدہ کی آنکھوں میں روشنی کے ستارے جگمگائے مگر جلد ہی ان کا چکا چوند ماند پڑ گئی۔ وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "سردار ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے جانے نہیں دے گا۔ کل رات ہی اس نے مجھے کہا تھا۔"

"کل کی بات چھوڑ۔ سردار نے آج مجھ سے وعدہ کیا ہے۔"

"سیں! تو سچ بول رہا ہے؟" میدہ کا چہرہ فرط مسرت سے پھول کی مانند کھل گیا۔ "سردار نے تجھے خود کہا تھا؟"

"ہاں، آج ہی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا۔ میں اس کا مہمان ہوں۔ میں نے تیرے بارے میں اسے کہا تو وہ راضی ہو گیا۔" رحیم داد کھسک کر اور قریب ہو گیا۔ "اس نے سلحری کو بلا کر میرے سامنے

ہی کہہ دیا کہ وہ کل تجھے فریدا کے پاس پہنچا دے۔"

"پر سلطری نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔" وہ ہنوز تذبذب میں تھی۔ "سیں! تو اجازت دے ت سلطری کے پاس جا کر ابھی پوچھ لوں؟ ذرا دیر بعد لوٹ آؤں گی۔"

"سلطری تجھے نہیں ملے گی۔ وہ اس وکت سردار کے کمرے میں ہے۔ وہ تجھے صبح ملے گی اور تیرے گھر پہنچا دے گی۔"

"فریدے کو بھی اس کا پتہ ہے؟"

"وہ ابھی تو نہیں جانتا۔ کل جب تو اس کے پاس جائے گی تو جان جائے گا۔" رحیم داد نے کو بتایا۔ "ویسے میں نے اسے ولا سا دے دیا تھا۔"

"سیں! تیرے ہی کہنے پر سردار نے ایسا کیا ہے؟" میدہ نے پوچھا۔ "تیری باتوں سے ایسا ہی ہے۔"

رحیم داد نے خوش ہو کر اسے اور مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ "ہاں' میں نے ہی اسے کہا تھا وہ میرا یار ہے' میری بات کیسے نہ مانتا؟"

"سیں! تو سدا جیویں۔ رب راضی ہووے۔" اس کا چہرہ مسرت سے شگفتہ ہو گیا۔ "سیں تو چنگا ہے۔"

"میں تو چنگا ہوں۔" رحیم داد نشے سے جھوم کر بولا۔ "اب تو بھی چنگی بن جا۔" رحیم داد چ لگا۔ میدہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کا چہرہ شرم سے گلابی پڑ گیا' نظریں جھک گئیں' لانبی لانبی پلکوں سائے پھیل گئے۔

رحیم داد سویرے بیدار ہوا۔ میدہ نہ جانے کب کمرے سے جا چکی تھی۔ رحیم داد اٹھا' نہا دھو شاہانی کے پاس چلا گیا۔ وہ ناشتے پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں نے ناشتا کیا۔ اسی اثنا میں کر بخش رادھانی آ گیا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہو کر کمرے سے چلا گیا۔ اب صبح کی کہر کا دھند چھٹ چکا تھا۔ ہر طرف چمکیلی بسنتی دھوپ پھیلی تھی۔

حویلی کے پچھواڑے سے سلطری نمودار ہوئی۔ اس کے ہم راہ میدہ تھی۔ اللہ بخش جوڑا دونو کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر سلطری کی آواز سنائی دی۔ "جوڑے!" اس نے میدہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے فریدا کے گھر پہنچا دے۔ واپسی پر مجھے بتا دینا۔ دیری نہ کرنا۔"

"جوڑا آگے بڑھا۔ میدہ اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ پھاٹک سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹکی' مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کا اجالا تھا۔ ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔

رحیم داد بھی مسکرا دیا۔ میدہ پھاٹک سے باہر چلی گئی۔ رحیم داد اسے دور تک دیکھتا رہا۔

سلطری پھاٹک سے واپسی پر رحیم داد کے قریب سے گزری۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "میدہ اپنے گھر چلی گئی؟"

"ہاں سیں! بہت راضی باضی تھی۔" سلطری نے ٹھٹک کر زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔ "تجھ سے بہت خوش تھی۔ بار بار کہتی تھی' سیں چوہدری بہت چنگا بندہ ہے۔" اس نے گردن کو خم دے کر ایک خاص ادا سے رحیم داد کو دیکھا۔ "سیں! تو نے اسے کیوں جانے دیا؟ کچھ دن تو اپنے پاس رکھتا۔ میدہ سوہنڑی ہے اور بھرپور جوان ہے۔"

"پر تو اس سے بھی زیادہ سوہنی اور چنگی ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر شوخی سے اسے چھیڑا۔ "میرا تو جی کرتا تھا۔ رات تو میرے پاس ہوتی۔"

سلطری نے رحیم داد کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔ "سیں! تو سردار سے پوچھ لے۔" اس نے دوپٹہ کھینچ کر ہلکا سا گھونگھٹ نکال لیا۔

رحیم داد اس کی اس ادا پر بے قرار ہو گیا۔ وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ مراد خاں کمرے سے نکلا۔ اس کے پیچھے رادھانی تھا۔ دونوں رحیم داد ہی کی جانب آ رہے تھے۔ سلطری نے سردار کو دیکھا تو فوراً آگے بڑھی اور چپ چاپ حویلی کے پچھواڑے چلی گئی۔

مراد خاں قریب آ گیا۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔ "چوہدری! تو تیار ہے نا؟" شکار پر چلنا ہے۔" اس نے مڑ کر رادھانی کی جانب دیکھا۔ "رادھانی جیپ باہر نکال۔ شکار پر چلنے کا بندوبست کر۔" رادھانی حکم ملتے ہی چلا گیا۔

مراد خاں شاہانی دھوپ میں رحیم داد کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر رحیم داد سے وہی بات کہی جو ذرا دیر پہلے سلطری کہہ چکی تھی۔ "چوہدری تو نے میدہ کو کیوں جانے دیا؟ میں نے تو سلطری سے کہہ دیا تھا' چوہدری کی مرضی ہو تو میدہ کو روک لینا۔"

رادھانی واپس آ گیا۔ اس نے مراد خاں کو اطلاع دی کہ شکار پر چلنے کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ مراد خاں اور رحیم داد آگے بڑھے' پھاٹک سے باہر نکلے اور سامنے کھڑی ہوئی جیپ میں جا کر بیٹھ گئے۔

☆

مراد خاں خود جیپ چلا رہا تھا۔ رحیم داد اس کے برابر بیٹھا تھا۔ پچھلی نشست پر کریم بخش رادھانی اور دو ملازم بیٹھے تھے۔ جیپ میں کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ بندوقیں تھیں۔ کارتوس

اور شکار کا دوسرا ساز و سامان بھی موجود تھا۔ راستہ کچا تھا' جگہ جگہ گڑھے تھے۔ جیپ ہچکولے کھا ہوئی دوڑ رہی تھی۔ مراد خاں اسے بہت سنبھال کر چلا رہا تھا۔

جیپ چار میل سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک بستی کے باہر جا کر ٹھہر گئی۔ یہ چھوٹا گاؤں تھا۔ راودھانی نے شکاری کتوں اور ان کی دیکھ بھال کرنے والے کوتیوں کو شکار کا ہانکا کر والوں کے ساتھ رات ہی کو بھیج دیا تھا۔ وہ سب راستے کے کنارے ایک سالیے میں ٹھہرے ہو تھے۔ یہ ایسی جھونپڑی تھی جس کی دیواروں پر پھوس اور سرکنڈوں کا چھپر تھا۔ چھپر کے نیچے شہتی کے بجائے اڑیاں جڑی تھیں۔ اڑیاں مثلث کی شکل کی مضبوط لکڑیاں تھیں۔ سالیے میں کئی اڑیا تھیں جن کے درمیان ٹیڑھی ترچھی کڑیاں اور لڑے تھے۔ ان پر بڑا سا چھپر تھا۔ گاؤں میں عام ط پر ایسے ہی سالیے نظر آرہے تھے۔

گاؤں سے چند فرلانگ پر دریائے سندھ بہتا تھا۔ دریا کے کنارے دور دور تک جھاڑیاں تھیں جنگل اور اوجھڑ تھے۔ گھنے درختوں کے گنجان جھنڈ بھی تھے۔ انھی جھنڈوں میں جنگلی سور رہ تھے۔ وہ دن میں جھنڈوں کے اندر دور تک پھیلی ہوئی دلدل اور کیچڑ میں روپوش رہتے۔ رات تاریکی پھیلتے ہی ان کے غول کے غول نکلتے اور کھڑی فصلیں تباہ کرتے۔ اس حیثیت سے سور کا شکا زمیں داروں کے لیے مشغلے اور کھیل سے زیادہ ایک بڑی ضرورت بھی تھی۔ یہ فصلوں کی تباہی س بچانے کی ضرورت تھی۔ سور کا شکار عام طور پر فصلوں کی تیاری کے دنوں میں کثرت سے ہوتا ہے یہ ایسے ہی دن تھے۔ خریف کی فصل کہیں کٹ چکی تھی' کہیں کٹائی کے لیے تیار کھڑی تھی۔

مراد خاں کی ہدایت پر راودھانی نے شکاری کتوں اور ہانکا کرنے والوں کو جھنڈوں کی جانب پہلے ہی روانہ کردیا تھا۔ آگے آگے کوتی تھے۔ وہ کتوں کی زنجیریں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے ہانکا کرنے والے گردنوں میں ڈھول ڈالے' ہاتھوں میں ٹین کے پیپے' نیزے اور برچھے سنبھالے چل رہے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے نڈر اور بے باک تھے جن کے پاس صرف لمبے شکاری چاقو یا خنجر تھے۔

اس شکار میں ایسے کتے بڑی تعداد میں تھے جو بل ٹیریئر اور بوبی نسل کے کتوں کے باہمی ملاپ کی پیداوار تھے۔ نسلی طور پر یہ دوغلے کتے سور کے شکار میں بہت موثر اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ مراد خاں شاہانی نے سور کے شکار کے لیے ایسے کتوں کی خاص طور پر افزائش نسل کی تھی۔ ان کے دانت اور جبڑے اس قدر مضبوط تھے کہ ایک بار گردن منہ میں آجانے کے بعد سور کے لیے ان کی گرفت سے آزاد ہونا ممکن نہیں تھا۔ یہ کتے دوڑتے بھی تیز تھے' خونخوار اور نڈر بھی تھے۔

مراد خاں اور رحیم داد جیپ کے اندر ہی بیٹھے رہے۔ راودھانی نے تھرماس سے چائے انڈیلی۔ دونوں کو ایک ایک پیالی پیش کی۔ دونوں آہستہ آہستہ چائے پینے لگے۔

جب کوتی اور ہانکا کرنے والے جنگلی درختوں سے ڈھکے ہوئے گنجان جھنڈوں میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہوگئے تو کچھ ہی دیر بعد مراد خاں شاہانی نے دوبارہ جیپ اسٹارٹ کی۔ اب پچھلی نشست پر صرف راودھانی بیٹھا تھا۔ دونوں ملازم بھی ہانکا کرنے والوں کے ساتھ چلے گئے تھے۔ دونوں منجھے ہوئے شکاری تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بندوقیں اور کارتوس بھی لے گئے تھے۔ سردار مراد خاں اور رحیم داد کے زانوؤں پر بھی بھری ہوئی بندوقیں رکھی تھیں۔ دونوں جھنڈوں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رک رک کر جھنڈوں میں گونج رہی تھیں۔

راودھانی پچھلی نشست پر بندوق سنبھالے بیٹھا تھا۔ سردار مراد خاں اسے شکار پر ضرور ساتھ لے جاتا تھا۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ ویسے مراد خاں بھی بہت اچھا نشانے باز تھا۔ اس نے کم عمری ہی سے شکار کھیلنا شروع کردیا تھا اور اب تو وہ ماہر شکاری ہوگیا تھا۔ البتہ رحیم داد نے سور کا شکار بہت کم کھیلا تھا۔ لیکن اس کا نشانہ بھی برا نہیں تھا۔

جیپ ہچکولے کھاتی ہوئی ایک اوجھڑ پر آہستہ آہستہ دوڑ رہی تھی۔ یہ اوجھڑ خود رو جنگلی پودوں سے بھرا ہوا دشوار گزار اور دلدلی راستہ تھا۔ جیپ سنبھل سنبھل کر آگے اور آگے بڑھتی گئی۔ آخر ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں اس قدر بہتات سے گھنی جھاڑیاں تھیں کہ ان کے درمیان سے جیپ نہیں گزر سکتی تھی۔ شاہانی نے جیپ روک لی۔ بندوق سنبھالے ہوئے نیچے اترا۔ رحیم داد اور کریم بخش راودھانی بھی باہر آگئے۔ ہر طرف پر ہول سناٹا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد سناٹے میں ایک طرف سے ڈھولوں اور پیپوں کی تیز آوازیں ابھریں۔

تینوں جھاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتے ڈھولوں اور پیپوں کی آوازوں کی سمت بڑھے۔ وہ شاخوں سے الجھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ اب کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ مراد خاں شاہانی آگے آگے تھا۔ ایک مقام پر وہ ٹھہر گیا۔ ہاتھ اٹھا کر اس نے رحیم داد اور راودھانی کو بھی ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔

سامنے جھاڑی میں ایک سور دبکا کھڑا تھا۔ مراد خاں نے اپنی چھوٹی رائفل اٹھا کر نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ گولی سور کی ٹانگ میں لگی۔ وہ زخمی ہو کر جھاڑیاں چیرتا تیزی سے ایک طرف بھاگا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد ایک گھنے درخت کے تنے کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ چوٹ کھا کر وہ زیادہ خونخوار ہوگیا تھا۔ وہ غراتا ہوا اپنے تیز اور نوکیلے دانت نکالے تینوں پر بگولے کی مانند اچانک جھپٹا۔

رادھانی نے فوراً گولی چلائی۔ لیکن نشانہ خطا کر گیا۔ مراد خاں نے جھٹ رائفل اٹھائی۔ اس کی انگلیوں سے پھسل کر نیچے گر گئی۔ سور منہ پھاڑے دانت نکالے بالکل سامنے تھا اور چ... کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔ مراد خان آگے تھا۔ وہ نہتا بھی تھا اور بالکل اس کی زد پر تھا۔ رحیم دا... پاس ۱۲ بور کی بندوق تھی۔ اس نے نہایت پھرتی سے بندوق اٹھائی' نشانہ لیا اور جھٹ گولی چلا... نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ گولی سور کا ماتھا چیرتی پھاڑتی اندر اتر گئی۔ سور فوراً وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پلک جھپکتے ہی سور کی مادہ نکلی۔ وہ بھی غراتی چیختی دانت نکالے تیزی سے جھپٹی۔ رحیم داد نے ا... بھی گولی چلا دی۔ اس دفعہ بھی نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ وہ بھی گولی کھاتے ہی گر کر تڑپنے لگی۔

سور اور اس کی مادہ چند گز دور کیچڑ میں پڑے دم توڑ رہے تھے۔ تینوں چند لمحے انھیں سسکتے تڑپتے دیکھتے رہے پھر مراد خاں ہنستا ہوا آگے بڑھا اور نہایت گرم جوشی سے رحیم داد کو اپنے دو بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اس کی پیٹھ تھپک کر بولا۔

"چوہدری! تو نے تو آج کمال کر دیا۔ ایسا سچا نشانہ لگایا کہ دل خوش کر دیا۔ مجھے پتہ نہیں تھا... زبردست شکاری ہے۔"

رحیم داد کچھ نہیں بولا۔ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ لیکن مراد خاں بہت مسرور تھا۔ رادھانی نے رحیم داد کے نشانے کی تعریف کی۔ اسی اثناء میں ہانکا کرنے والے اور دوسرے شکاری بھی گولی... کی آوازیں سن کر پہنچ گئے۔ مگر شاہانی وہاں نہیں ٹھہرا۔ اس نے جھک کر اپنی رائفل اٹھائی۔ ر... داد اور رادھانی کے ہم راہ اس طرف بڑھا جس طرف سے کتوں کے زور زور سے بھونکنے آوازیں ابھر رہی تھیں۔

تینوں نے چونک کر دیکھا' کچھ فاصلے پر سوروں کا ایک غول جھاڑیوں کے درمیان سے گزر... ہے۔ وہ کتوں کے نرغے سے نکل کر بھاگے تھے۔ تینوں نے بھاگتے ہوئے سوروں پر تابڑ توڑ گولیا... چلائیں۔ دو سور فوراً گر کر تڑپنے لگے۔ غول کے بقیہ سور گھنی جھاڑیوں میں گھس کر آن کی آن... نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جھک جھک کر ادھر ادھر دیکھنے پر بھی نظر نہیں آئے۔

مراد خاں' رحیم داد اور رادھانی آگے بڑھے۔ گھنی جھاڑیوں سے گزر کر کھلی جگہ پہنچے تو خوف... ناک منظر سامنے تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ہانکا کرنے والا ایک شکاری کٹانا خون میں لت پت پ... تھا۔ تینوں نے جھپاک سے اس کے قریب پہنچے۔ وہ تکلیف سے گردن ادھر ادھر ہلا رہا تھا۔ اس... ہاتھ میں ابھی تک شکاری چاقو دبا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک سور بھی خون میں ڈوبا بے جان پڑا تھا۔ اس کا پیٹ پھٹا ہوا تھا' آنتیں باہر نکل آئی تھیں۔

زخمی کٹانے کا ایک پیر پنڈلی سے ران تک جنگلی سور نے اپنے تیز اور خونخوار دانتوں سے چیر ڈالا تھا۔ زخم نہایت گہرا آیا تھا۔ ٹانگ کی چربی اور ہڈی تک نظر آ رہی تھی۔ خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ اس کے جسم کے نیچے خون ہی خون تھا۔ رحیم داد اسے دیکھ کر لرز گیا۔

مراد خاں نے زخمی کو فوراً پہچان لیا۔ وہ رادھانی سے مخاطب ہوا۔ "رادھانی! یہ تو سینا ہے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "بہت دلیر اور زبردست شکاری ہے۔ ایسا زبردست کہ سور تیزی سے دوڑ کر حملہ کرنے کے لیے جھپٹے تو یہ بھاگنے کی بجائے اس سے ٹاکرہ لینے کے لیے دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا۔ سور عام طور پر ٹانگوں ہی میں گھس کر حملہ کرتا ہے۔ سینا کا یہ کمال ہے کہ جیسے ہی سور ٹانگوں کے بیچ میں گھستا' یہ نہایت پھرتی سے اس کا پچھلا حصہ ٹانگوں سے دبا کر سوار ہو جاتا اور تیزی سے چاقو پیٹ میں گھسیڑ کر اسے چیر پھاڑ ڈالتا۔"

رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ "بہت زور آور اور جی دار لگتا ہے۔"

"میں نے اپنی آنکھوں سے کئی بار اسے اسی دلیری سے سور کا شکار کرتے دیکھا ہے۔" مراد خاں نے بتایا۔ "بہت خطرناک انداز میں شکار کرتا ہے۔ میں نے کئی بار منع بھی کیا ہے مگر یہ نہیں مانا۔" اس نے مردہ سور کی طرف اشارہ کیا۔ "لگتا ہے' اس کا شکار بھی سینا ہی نے کیا ہے۔ پر اس بار کچھ چوک ہو گئی۔ سور نے پھر کر اپنے دانتوں سے پوری ٹانگ چیر ڈالی۔" اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ اس نے رادھانی سے کہا۔ "رادھانی! خون بہت بہہ گیا۔ اس کی مرہم پٹی کے لیے کسی کو فوراً بلا ورنہ یہ مر جائے گا۔"

رادھانی نے حکم ملتے ہی اونچی آواز سے چیخ چیخ کر ہانکا کرنے والوں کو پکارا۔ ذرا دیر میں کئی معلی اور کٹانے وہاں پہنچ گئے۔ ایک نے جھٹ پگڑی اتاری اور خون بند کرنے کی غرض سے اسے جلدی جلدی زخم پر لپیٹنے لگا۔ دوسرے بھی زخمی سینا کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ انھوں نے کئی اور پگڑیاں لیں اور زخمی ٹانگ پر لپیٹ دیں۔ خون بند ہو گیا۔ سب نے زخمی کٹانے کو ہاتھوں پر اٹھایا اور ایک طرف بڑھنے لگے۔ سینا اب بے سدھ ہو چکا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ جھولتے ہوئے ہاتھ بے جان نظر آ رہے تھے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔

اس خوفناک حادثے کے باوجود شکار کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر جب دن ڈھلے ہنجروں کے گھنے درختوں کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا تو شکار ختم کر دیا گیا۔ مراد خاں جیپ کی جانب بڑھا۔ رحیم داد اور رادھانی اس کے ساتھ تھے۔ ہانکا کرنے والے مراد خاں کے مزارعے اور کمی ہی تھے۔ وہ بیگار پر

لگائے گئے تھے۔ کتوں اور ان کے شکاری کتوں کے ساتھ وہ بستی کی طرف چلے گئے۔ جیپ قریب پہنچ کر رادھانی نے مراد خاں اور رحیم داد کو تھرماس سے ایک بار پھر چائے پلائی۔ اس چائے کے ساتھ پلیٹوں میں بھنا ہوا گوشت اور بسکٹ بھی تھے۔

تینوں جیپ میں سوار ہوئے۔ شاہانی نے جیپ اسٹارٹ کی۔ جیپ ادھر سے نکل کر بستی پہنچی۔ مگر شاہانی وہاں نہیں ٹھہرا۔ وہ اس سالمہ کے پاس بھی نہیں رکا جس میں ہانکا کرنے والوں کتوں کے علاوہ زخمی سینا بھی پڑا تھا۔ شاہانی نے نہ زخمی کا حال پوچھا اور نہ ہی اس کے بارے رحیم داد اور رادھانی سے کوئی بات کی۔ ویسے اس کے لیے یہ کوئی نیا یا انوکھا حادثہ نہیں تھا۔ کے شکار میں پہلے بھی ایسے کئی واقعات پیش آ چکے تھے۔ ان حادثات کے نتیجے میں دو ہانکا کر والے زخمی ہو کر ہلاک بھی ہو چکے تھے۔

☆

جیپ ہچکولے کھاتی کچے راستے پر دوڑتی رہی اور جب ہموں والی میں داخل ہوئی تو سورج مغ کے اندھیرے غار میں اتر چکا تھا۔ اس کی الوداعی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر دھندلی جا رہی تھیں۔ کہر میں لپٹی ہوئی سرد شام آہستہ آہستہ فضا میں پھیلتی جا رہی تھی۔ شاہانی اور رحیم جیپ سے اتر کر حویلی کے اندر چلے گئے۔ رادھانی باہر ہی ٹھہرا رہا۔

رحیم داد بہت تھک گیا تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور کرسی پر نڈھال ہو کر نیم د ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ملازم نے غسل خانے میں گرم پانی کی بالٹی رکھ دی۔ رحیم داد نے گرم پانی غسل کیا۔ اجلے کپڑے پہنے اور حویلی کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔ مراد خاں شاہانی ابھی تک نہیں پہنچ مگر رحیم داد کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شاہانی نہا دھو کر اور صاف ستھرا لباس پہنے چند ہی م بعد آ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی بوتل اور گلاس بھی آ گئے۔ دو بڑی بڑی تھالیوں میں تلے ہوئے مرغ میز پر رکھ دیئے گئے۔ فوراً پینے پلانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

شاہانی نے دو گلاس چڑھانے کے بعد تیسری بار گلاس بھرا اور رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! آج زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔" اس نے ہلکا۔ قہقہہ بلند کیا۔ "پولانی میرا انتظ کر رہی ہے۔ ادھر آتے ہوئے میں نے اسے دیکھا تھا۔ ایسی بوڈا اور پوپٹ لگ رہی تھی کہ طبیع ایک دم پھڑک اٹھی۔ جواب نہیں اس کا۔"

"یہی گل تو کل رات سلمیٰ کے بارے میں کہہ رہا تھا۔"

"وہ کچھ اور چیز ہے۔" شاہانی ہنس کر بولا۔ "سچ بتا' ہے کہ نہیں؟"

رحیم داد نے نشے میں جھوم کر بے ساختہ کہا۔ "دل کی بات پوچھ تو سلمیٰ ہی مجھے بھی پسند ہے۔"

"جب ہی آج صبح تو اسے مٹھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "میں تاڑ گیا تھا کہ تیری طبیعت سلمیٰ ہی پر آ گئی ہے۔ وہ رن ہی ایسی پھڑک دار ہے۔"

"تیرے پاس تو پولانی رہے گی۔" دل کی بات رحیم داد کی زبان پر آ گئی۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "سلمیٰ ہی تو آج رات خالی ہے۔"

"کیا مطلب؟" شاہانی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ "صاف گالہ کر۔ تو چاہتا کیا ہے؟"

"تیری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔" رحیم داد نے شاہانی سے نظریں نہیں ملائیں۔ قاب سے مرغ کی ٹانگ اٹھا کر گوشت دانتوں سے نوچنے لگا۔

"چوہدری! سلمیٰ کی گالہ نہ کر۔" شاہانی اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ "سلمیٰ کے معاملے میں میرے کئی یار مجھ سے ناراض ہو گئے۔ ڈیرہ غازی خاں کے تمن دار سربلند خاں دریشک سے تو ایسا بگاڑ پیدا ہوا کہ اب تک اس سے بول چال بند ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "وہ میری جن ہے۔ ایسی جند جانی ہے کہ میں اسے کسی کے پاس نہیں جانے دیتا۔ تیکوں پتہ نہیں سولہ سال سے اوپر ہو گئے' وہ میرے پاس ہے۔ پر اس سے کبھی میرا دل نہیں بھرتا۔ سچ پوچھ تو میں اسی کے لیے ہموں والی آتا ہوں۔ وہ اس حویلی کی جان ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ شاہانی نے ایک اور بڑا گھونٹ بھرا۔ رحیم داد کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ "چوہدری! میں تیرے پاس کسی دوسری پھڑک دار اور پوپٹ رن کو بھجوا دوں گا۔ حویلی میں کئی زور دار اور سوہنڑی رنان موجود ہیں۔ تیرا جی خوش ہو جائے گا۔" اس نے نشے میں لہرا کر قہقہہ لگایا۔ "فکر نہ کر۔ اپنی پسند تو مجھ پر چھوڑ دے۔"

"پہلے بھی میں نے کب تجھ سے اپنی پسند کی گل کی۔ سلمیٰ کی بات تو ایسے ہی نکل آئی۔" رحیم داد کا لہجہ دھیما اور بجھا ہوا تھا۔ "تو میری بالکل فکر نہ کر۔ کسی کو میرے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنی حویلی میں اکیلا ہی سوتا ہوں۔ مدت ہو گئی اس طرح سوتے ہوئے۔"

"لگتا ہے تو بھی ناراض ہو گیا۔" شاہانی نے رحیم داد کی افسردگی اور دبا دبا احتجاج محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سلمیٰ بہت ظالم رن ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیشہ یار دوستوں سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔"

"پر اس معاملے میں مجھ سے تیرا کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہو گا۔" رحیم داد نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "تو میرا یار ہے اور سدا یار رہے گا۔ اول تو میں کسی سے یاری کرتا نہیں اور جب کرتا

ہوں تو جی جان سے کرتا ہوں۔ ابھی تو میرا اور تیرا نیا نیا معاملہ ہے۔" اس کے لہجے میں خروش پیدا ہو گیا۔ "آگے تو خود دیکھ لے گا۔ میں خالی پیلی گلاں نہیں کرتا۔"

"میرے دل کی بات جاننا چاہتا ہے تو سن لے۔" مراد خاں شاہانی نے ایک ہاتھ سے ا تھپکتے ہوئے کسی قدر جوشیلے لہجے میں کہا۔ "میرا رب جانتا ہے' میں تجھے کتنا چاہتا ہوں۔" گہری سانس بھری۔ "چوہدری! میرا کوئی بھائی نہیں۔ سچ کہتا ہوں' تجھے اپنے چھوٹے بھائی سا کرتا ہوں۔ ویسے بھی تو بہت چنگا بندہ ہے۔" اس نے شراب کی چسکی لگائی۔ "اور آج تو تو۔ ہی کر دیا۔" مراد خاں نے حملہ آور سور کا حوالہ دیا۔ "باہروالا مجھ پر کیسا دانت نکال کر جھ تو نے دیکھا نہیں' میری رائفل ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی اور میں بالکل اس کے سامنے تیرے گولی چلانے سے میں بال بال بچ گیا ورنہ میں بھی سینا کی طرح زخمی پڑا ہوتا۔"

"ایسی گل نہ کر۔" رحیم داد نے انکسار سے کام لیا۔ "میں نے کیا کمال دکھایا۔ شکار میں ہوتا ہی ہے۔ تو تو پرانا شکاری ہے۔ ایسے حادثے تو نے شکار میں بہت دیکھے ہوں گے۔"

مراد خاں شاہانی نے کچھ نہیں کہا۔ چپ بیٹھا دانتوں سے تلے ہوئے مرغ کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا رہا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ خالی گلاس میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری! اب میں چلوں گا۔ تو بھی اپنا گلاس ختم کر۔"

رحیم داد نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔

"چوہدری! تو اپنے کمرے میں جا۔" مراد خاں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "سلطری تیرے پاس پہنچ جائے گی۔"

"رہنے دے شاہانی۔" رحیم داد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "سلطری کی گل تو پہلے ہی ختم ہو گئی۔"

"بکواس نہ کر۔" سردار شاہانی نے مسکرا کر رحیم داد کو پیار سے ڈانٹا۔ "سلطری آج تیرے ہی پاس رہے گی۔" وہ نشے سے جھوم کر ڈگمگایا۔ "یوں سمجھ یہ تیرے سچے نشانے کا انعام ہے۔ اب تو جا۔" شاہانی لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رحیم داد بھی بیٹھک سے نکلا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ تھکا تھکا سا کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بار بار دروازے کی جانب اٹھ جاتیں۔

چند منٹ بعد دروازہ کھلا۔ رحیم داد نے بے تاب ہو کر پہلو بدلا۔ مگر وہ سلطری نہیں تھی' کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے کھانا میز پر رکھ دیا اور دبے قدموں واپس چلا گیا۔ رحیم داد نے کھانا نہیں کھایا۔ اشتہا ہی نہیں تھی۔ اس نے اپنی پگ اتار کر کھونٹی پر لٹکائی۔ جوتے اتارے اور لیٹ گیا۔ اس نے رضائی اٹھا کر سینے پر ڈال لی۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ لیکن نہ کوئی آہٹ ہوئی نہ آواز۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ رحیم داد جاگ رہا تھا اور بستر پر خاموش لیٹا تھا۔ مگر وہ زیادہ دیر تک چین سے نہ لیٹ سکا۔ اس نے کروٹ لی' بے قرار ہو کر اٹھا اور تکیے کے سہارے اونچا ہو کر بیٹھ گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ پانچ منٹ گزرے' دس منٹ گزرے' آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ اس کی زرد زرد روشنی در و دیوار پر پھیلی تھی۔

رحیم داد نے کئی بار بے چینی سے پہلو بدلا پھر پلنگ سے اترا' سلیپر پہنے' لیمپ کی طرف بڑھا' قریب گیا' ہاتھ بڑھایا' ٹھٹکا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ لیمپ کی لو مدھم نہیں کی' واپس آیا اور بستر کے بجائے چپ چاپ ایک بار پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ رات اور سنسان ہو گئی۔

گھنٹہ بھر سے زیادہ وقت گزر گیا۔ دروازہ بدستور بھڑا ہوا تھا۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری' اٹھا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں مگر سویا نہیں۔ اسی عالم میں اس نے کمرے کے باہر چاپ سنی۔ چاپ دھیرے دھیرے قریب آ گئی۔ دروازہ چرچرایا۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا' سلطری دہلیز پر کھڑی ہے۔ اس نے زیر لب مسکرا کر رحیم داد پر ایک نظر ڈالی' مڑی دروازہ بند کیا اور کنڈی چڑھا دی۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی رحیم داد کی جانب بڑھی اور اس کے روبرو تیر کے مانند تن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ سرخ دوشالہ اوڑھے ہوئے تھی۔ چولا ڈھیلا ڈھالا اور سفید تھا مگر منجلی کے بجائے وہ گھگرا پہنے ہوئے تھی جس پر سرخ اور سیاہ گل بوٹے تھے۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا۔ ناک میں بڑا سا کوکا تھا۔ ہونٹ گہرے گلابی تھے۔ چہرے پر نکھار اور شگفتگی تھی۔ وہ خوب سج دھج کے ساتھ آئی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی سنگھار کیا ہے۔ رحیم داد نے اسے بے قرار نظروں سے دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا' مسکرا کر بولا۔ "کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا سلطری۔"

"تو نے مجھے بلا ہی لیا۔" سلطری نے گردن ترچھی کی اور مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ "سیں چوہدری! تو بہت تکھا اور زور آور ہے۔" اس نے ایک ہاتھ سے اپنے گھگرے کا گھیر سنبھالا۔ لچکتی بل کھاتی آگے بڑھی اور پاؤں لٹکا کر بستر پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے خاموش رہی پھر مسکراتے ہوئے بڑے نسے سے بولی۔ "سردار مجھے کسی کے پاس جانے نہیں دیتا۔ تیری گالہ اس نے کیسے مان لی۔ یہ بھید سمجھ نہیں آیا۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بتا' تو نے دیر کیوں لگا دی؟" اس نے سلطری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "سردار نے روک لیا ہو گا؟"

"نا سیں!" وہ گردن ہلا کر بولی۔ "وہ تو پولانی کے پاس ہے۔"

"پر وہ تجھے چاہتا بہت ہے۔" رحیم داد نے اسے چھیڑا۔ "تجھ میں ایسی کیا بات ہے جو وہ تجھ
چاہتا ہے؟"

"پتہ نہیں سیں!" سلوہی نے نظریں جھکا کر شرمانے کی کوشش کی۔ "پر میں بھی اسے اتا
پیار کرتی ہوں۔ برسوں سے اس کے ساتھ ہوں۔" اس نے گردن اونچی کی۔ "اس حویلی میں
بیں سال تو ہوگئے ہوں گے۔"

"بیس سال۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "جب تو یہاں آئی ہوگی شاہانی تب چھوہرا
ہوگا۔ تو اس سے عمر میں زیادہ تو نہیں لگتی۔"

"نا سیں! میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہوں گی۔" سلوہی انکار نہ کر سکی۔ "سردار کو بھی اس کا
ہے۔" رحیم داد کا تجسس اور بڑھا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ "صاف بتا۔ تیری گل سمجھ نہیں آئی۔
"تو سمجھ بھی نہیں سکتا۔" وہ شوخی سے مسکرائی۔ "تب وڈا سردار نجیب خاں زندہ تھا۔" سلوہی
نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میں پہلے اسی کے پاس ہوتی تھی۔ وہ بہت ڈاڈھا اور زور آور سردا
تھا۔ کھرا بلوچ۔ یہ وڈی اس کی داڑھی تھی۔" سلوہی نے ہاتھ پھیلا کر بتایا۔ "تیری داڑھی اس
کے آگے کچھ نہیں۔ وہ بہت رن رسیا تھا۔ جو سوہنڑی اور پوپٹ رن نظر آتی اٹھوا کر حویلی میں ڈال
لیتا۔ روز ہی نئی نویلی رن اٹھواتا تھا۔"

"تجھے بھی اس نے اٹھوایا تھا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "میرا مطلب ہے' مراد خاں کے
سردار نجیب خاں نے تجھے اٹھوا کر اپنے پاس رکھا ہوا تھا؟"

"نا سیں!" سلوہی نے فوراً وضاحت کی۔ "اس کا مرن ہوگیا۔ مجھے اس کے پیچھے جھوٹ نہیں
بولنا۔ مجھے تو منصور خاں ڈھانڈلے نے اٹھوایا تھا۔ وہ بھی بیٹ کا بہت وڈا سردار تھا۔ میں ان دنوں
بھل میں ہوتی تھی۔ میرا پرنا ہوچکا تھا۔ میرا گھروالا تھا۔ اس کا ناں ہاتو تھا۔ وہ جتوال تھا۔ اپنے اٹھ
پر مال اسباب لاد کر دور دور لے جاتا تھا۔ اس کے پاس دو اٹھ تھے۔ ٹھیک ٹھاک گزر بسر ہوتی تھی۔
اس سے میرا ایک پتر بھی ہوا۔"

"پر تجھے تو ڈھانڈلہ سردار نے اٹھوالیا تھا۔" رحیم داد کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "تو یہی بتا رہی
تھی نا؟ فیر تو مراد خاں کے پیو کے پاس کیسے پہنچ گئی؟"

"وہ ایسا ہوا سیں! سردار منصور نے جب مجھے اٹھوالیا تو میں اس کی حویلی میں لگ بھگ سال بھر
رہی۔ ویسے وہ بھی مجھے بہت پیار کرتا تھا۔ پر بہت ظالم اور خونی تھا۔ اس نے بہت خون کیے۔ ہاتو کا

بھی اسی نے خون کیا۔" سلوہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے تابندہ چہرے پر دکھ کا ہلکا ہلکا غبار
بکھر گیا۔ "ہوا یہ کہ ہاتو ایک اندھیاری رات کو اٹھ پر بیٹھ کر بھل سے ادھر آیا۔ اس نے اٹھ
ڈھانڈلے کی حویلی کی دیوار سے لگایا' کود کر اندر پہنچا۔ وہ مجھے لینے آیا تھا۔ بہت جی دار اور دلیر تھا'
ذرا بھی نہ ڈرا۔ وہ مجھے بہت پیار کرتا تھا۔"

"سب ہی تجھے پیار کرتے ہیں۔" رحیم داد نشے میں لہرا کر بولا۔ "تو ہے بھی تو کتنی سوہنی۔" وہ
بہکا مگر فوراً سنبھل گیا۔ اس نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ "اب آگے کی سنا۔"

"ہاتو حویلی کے اندر پہنچا تو سردار منصور ڈھانڈلے کو کسی طرح اس کے آنے کا پتہ چل گیا۔"
سلوہی نے رحیم داد کی مداخلت نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "ہاتو پڑچھتی میں
میرے پاس کھڑا تھا اور مجھے اپنے سنگ لے جانے کے لیے گھات میں تھا۔ پر جیسے ہی ہم دونوں
حویلی سے نکلے' دیکھا' سامنے ڈھانڈلہ کھڑا ہے۔ اس کے کئی کرندے بھی موجود تھے۔ انھوں نے
جھپٹ کر ہاتو کو دبوچ لیا۔ مجھے بھی پکڑ لیا۔ سردار نے مجھے تو ایک کوٹھڑی میں بند کر کے باہر سے تالا
ڈال دیا اور ہاتو کو اپنے سنگ لے گیا۔ وہ اتنا غصے میں تھا کہ صبح بھی نہ ہونے دی۔ رات ہی کو ہاتو پر
اپنے شکاری کتے چھوڑ دیے۔ کتوں نے چیر پھاڑ کے اسے ختم کردیا۔ اس کی کٹی پھٹی لاش میرے
پاس کوٹھری میں بھجوا دی۔"

"اس کی لاش دیکھ کر تیں نوں بہت دکھ ہوا ہوگا۔"

"سیں! یہ بھی بتانے کی گل ہے؟" سلوہی کا چہرہ اور افسردہ ہوگیا۔ "ہاتو کے ساتھ میرا پرنا ہوا
تھا۔ وہ پیو کے گھر سے میلوں دور کر کے لایا تھا۔ میرے پتر کا پیو تھا' بہت جڑیا اور گبھرو جوان تھا۔"

"ایسی بات تھی تو سوتے میں کسی رات چھری سے ڈھانڈلے کا گلا کاٹ دیتی۔" رحیم داد نے
سردار منصور خاں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

"تو کیسی گالہ کر رہا ہے سیں!" وہ حیران و پریشان ہو کر بولی۔ "میں ایسا کیسے کر سکتی تھی؟ سردار
منصور بہت جڑیا اور زور آور تھا۔" اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ "ظالم اور خونی اتنا
زبردست تھا کہ ایک بار تو اپنے سگے بھائی کا اس نے خون کردیا تھا۔ ویسے اس کا بھائی بھی سردار تھا
اور زور آور بھی تھا۔ اس کا ناں محمود خاں ڈھانڈلہ تھا۔ وہ بھی بہت ٹھرکی اور رن رسیا تھا۔"

"وہ بھی تجھے پیار کرنے لگا تھا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ایسی ہی گالہ تھی سیں!" سلوہی نے گردن ہلا کر اعتراف کیا۔ "وہ بھی مجھے پیار کرتا تھا۔
رات کے اندھیارے میں چھپ چھپ کر میرے پاس آتا۔ ایک رات وہ میری کوٹھری میں تھا۔

منصور کو پتہ چل گیا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ اسے میرے ساتھ دیکھ کر غصے سے پاگل ہو گیا۔ بھری ہوئی رائفل اس کے ہاتھ میں دبی تھی۔ اس نے ہم دونوں پر گولی چلا دی۔ میں تو صاف بچ گئی پر ایک گولی محمود خاں کے کندھے میں اتر گئی۔ منصور نے تو اپنے تئیں اس کا خون کر ہی دیا تھا پر وہ مرا نہیں۔ گھاؤ زیادہ گہرا نہیں تھا۔"

"بہت ہنگامہ اور رولا پڑا ہوگا؟"

"مجھے تو سئیں اتنا پتا ہے کہ جھگڑا دونوں بھائیوں کا تھا پر میں شامت دی ماری ڈھانڈلوں کی نظر میں بھوت بلا بن گئی۔" سلمیٰ نے بجھے ہوئے لہجے میں آگاہ کیا۔ "انھوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گھسیٹا۔ بہت مارا پیٹا۔ بدن پر ہر جگہ چوٹ آئی پر میں نے کچھ نہیں کہا۔ کوٹھڑی میں اکیلی پڑی درد سے بلکتی رہی، روتی رہی۔ ادھر ڈھانڈلوں نے طے کیا کہ مجھے حویلی سے نکال دیا جائے۔"

"اس طرح تجھے اپنے گھر جانے کا موقع تو مل ہی گیا ہوگا؟"

"ایسا نہیں ہوا سئیں! سردار منصور مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ تب ڈھانڈلہ تمن نے جرگہ بلایا۔ جرگے میں خاندان والے ہی بیٹھے۔ کوئی مکدم یا معتبر نہیں بیٹھا۔ جرگے نے مجھے حویلی سے نکالنے کا فیصلہ کیا پر منصور نے مجھے ماپیو کے پاس نہیں جانے دیا۔ وہ تب تک زندہ تھے۔ اس نے مجھے دو ہزار میں سردار نجیب خاں کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس طرح میں اس حویلی میں آگئی۔"

"تو اس حویلی میں تو اس طرح آگئی۔" رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ "پر مراد خاں تیرے ساتھ کیسے لگ گیا؟"

"سئیں! اب تجھ سے کیا چھپانا۔ اس کے پیو سردار نجیب ہی نے لگایا تھا۔" سلمیٰ نے تیکھے لہجے میں بتایا۔

"سردار نجیب نے لگایا تھا؟" رحیم داد نے حیرت سے چونک کر سوال کیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بس ایسے ہی جیسے کہہ رہی ہوں۔" سلمیٰ نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "میں سردار نجیب کے پاس لگ بھگ تین سال رہی۔ ان دنوں مراد خان لہور میں پڑھتا تھا۔ رہتا بھی وہیں تھا۔ چھٹیوں میں صرف بھگر آتا تھا۔ ہموں والی کبھی نہیں آیا تھا۔ کم سے کم میں نے تو اسے ان دنوں نہیں دیکھا۔ فیر ایسا ہوا سئیں کہ مراد کے پرنے کی بات چلی۔ تب وہ ستارہ اٹھارہ برس کا رہا ہوگا۔" اس نے رحیم داد کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ "انھی دنوں وہ پہلی بار میرے سامنے ہموں والی آیا۔ سردار نجیب بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ حویلی میں مراد خان کے رہنے کے لیے علیحدہ کمرے میں بندوبست کیا گیا۔"

یہی کمرہ ہوگا جس میں وہ آج کل ٹھہرا ہوا ہے؟"

"ہاں سئیں! وہ سدا اسی کمرے میں ٹھہرتا ہے۔" وہ رحیم داد کو صاف گوئی سے سب کچھ بتاتی رہی۔ "مراد خان کو ہموں والی میں آئے ہوئے دوسرا یا تیسرا روز تھا کہ ایک شام سردار نجیب نے مجھے بلایا کہنے لگا، سلمیٰ! تیکوں پتہ ہی ہے۔ مراد کا پرنا ہونے والا ہے پر وہ بالکل بھولا بلا ہے۔ رن کے بارے میں اسے کچھ اتا پتا نہیں۔ تو آج رات اس کے ساتھ سو اور اسے سب کچھ سمجھا دے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے شرما گئی۔ دھیمے لہجے میں بولی۔ "وڈے سردار کے حکم پر میں رات کو مراد خان کے کمرے میں گئی اور اس کے ساتھ سوئی۔"

"تو یہ گل ہے۔" رحیم داد کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ "یہ کیوں نہیں کہتی اس لائن پر تو نے مراد خان کو لگایا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نا سئیں! ایسی گالہ بالکل نہیں۔" سلمیٰ نے فوراً انکار میں گردن ہلائی۔ "وہ ایسا بھولا بلا نہیں تھا جیسا اس کا پیو سمجھتا تھا۔ وہ پہلے ہی سے سب کچھ جانتا تھا۔ لہور میں کنجریوں کے پاس جاتا رہتا تھا۔" وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ "ہیرا منڈی کی کنجریوں نے اسے ایک دم فروٹ بنا دیا تھا۔ یہ گالہ اس نے مجھے خود بتائی تھی۔"

"یہ بتا اس رات کے بعد مراد خان بعد میں بھی تیرے پاس آیا؟" رحیم داد نے دلچسپی سے دریافت کیا۔

"بالکل آتا رہا۔ پرنا ہو گیا تب بھی آتا رہا۔" سلمیٰ نے رسان سے کہا۔ "وڈے سردار سے چھپ چھپ کر میرے پاس آتا تھا۔"

"سردار نجیب خاں کو بالکل پتہ نہ چلا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"کچھ ہی دنوں بعد اسے پتہ چل گیا تھا۔" سلمیٰ نے انکشاف کیا۔ "مجھ پر وہ بہت ناراض ہوا پر مراد خان سے کچھ نہیں بولا۔ وہ اس کا اکلوتا پتر تھا۔ بہت لاڈلا بھی تھا۔ پہلے تو اس نے غصے میں کئی بار میری مار کٹائی بھی کی۔ فیر ایک روز اپنے یار سردار سکندر خان کھوسہ کے پاس راجن پور بھیج دیا۔ مجھے اس کے حوالے کر کے اسے دکھ بھی ہوا۔ وہ مجھے بہت چاہتا تھا۔ اس سے میری ایک بچی بھی پیدا ہوئی پر وہ کچھ ہی مہینوں بعد مر گئی۔ سردار نجیب خان بھی زیادہ دن زندہ نہ رہا۔ میرے راجن پور جانے کے سال ہی بھر کے اندر اندر اس کا مرن ہو گیا۔"

"تو کھوسہ سردار کے پاس راجن پور میں ہوتی تھی دوبارہ یہاں کیسے آگئی؟" رحیم داد نے مسکرا کر اسے ایک بار پھر چھیڑا۔ "کھوسے کے گھر میں بھی تیری وجہ سے جھگڑا کھڑا ہو گیا ہوگا۔"

"ایسا جھگڑا کھڑا تو ہوا تھا۔ سردار سکندر خان کا ایک چاچا بھی مجھ سے چپکے چپکے پیار ...
تھا۔وہ تو زبردست نخرکیا تھا۔ ادھکڑ تھا پر ایسا رن رسیا کہ تجھے کیا بتاؤں۔ وہ مجھے اٹھوا کر ...
میں لے جانا چاہتا تھا۔" سلطری مسکرا مسکرا کر بتاتی رہی۔ "پر چاچا بھتیجے کا جھگڑا زیادہ ...
نہیں پایا۔ ہوا یہ کہ سردار نجیب کے مرن کے کچھ ہی مہینے بعد مراد خان مجھے واپس لینے سردار ...
خاں کھوسہ کے پاس پہنچا اور تین ہزار روپے دے کر مجھے راجن پور سے لے آیا۔ تب سے ...
خاں کے پاس ہوں۔ اس حویلی سے اب تک کہیں نہیں گئی۔"

سلطری کے چہرے پر باتیں کرتے ہوئے باربار مختلف تاثرا ہویدا ہوتے۔ کبھی اس کا چہرہ ...
کبھی دمکنے لگتا۔ اسے ماضی کے ہنگامے بیان کرنے میں یکسوئی حاصل ہو رہی تھی۔ رحیم داد ...
اہمیت جتانے کا بہانہ مل گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ صاف گوئی سے ایک ایک تفصیل ...
رہی۔ رحیم داد نے گفتگو بدلتے ہوئے پوچھا۔ "ایک گل تو بتا۔ تیرا نام سلطری کیوں ہے؟ سل...
سیدھی سادھی گئو کو کہتے ہیں۔" رحیم داد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تو کسی طرف سے سیدھی سا...
نہیں لگتی۔"

"میں جب چھوٹی سی نکی تھی تو بہت بھولی بھلی تھی۔" وہ نظریں جھکا کر شرماتے ہوئے بولی۔ "...
نے اسی لیے میرا نام سلطری رکھ دیا۔ وہ مجھے یہی بتاتی تھی۔"

"تو کچھ ہی کہے پر تو سلطری تو ہرگز نہیں لگتی۔" رحیم داد بدستور ہنستا رہا۔ "تو' تو امربیل ...
ایک بار جس سے لگ جائے فیر وہ تیرے پیچ سے نہیں نکل سکتا۔ تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔" ...
نے چبھتی ہوئی نظروں سے سلطری کو دیکھا۔ "تو نے کبھی یہ بھی سوچا' تیرے اتنے چاہنے وا...
کیوں ہیں؟"

"میکوں کیہ پتہ؟" وہ بڑے ناز سے بولی۔

رحیم داد نے گہری سانس بھری اور سلطری کا چہرہ تکنے لگا۔ سلطری کا چہرہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ ...
نکھر کر اور شگفتہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں کہکشاں اتر آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑا...
لی۔ سرخ دوشالہ ڈھلک کر نیچے گر گیا۔ اس کے سینے پر لہریں اٹھنے لگیں۔ رحیم داد کی آنکھوں میں ...
چکاچوند پیدا ہو گئی۔ وہ بے قرار ہو گیا۔

صبح تاروں کی چھاؤں میں سلطری اٹھ کر جانے لگی تو رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ ...
گیا۔ رسان سے بولا۔ "سلطری تو جا رہی ہے!" سلطری نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر ...
گویا ہوئی۔ "جی سیں!" وہ آگے بڑھی۔ دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔

[illegible]

شام' کہرے کی چادر اوڑھ کر روز بہ روز دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔ تیز اور چمکیلی دھوپ کی تمازت کم ہو گئی۔ راتیں طویل اور سرد ہو گئیں۔ رحیم داد ہموں والی میں ٹھہرا رہا۔ سردار مراد خاں شاہ نے اسے واپس کوٹلہ ہرکشن جانے نہ دیا۔

سلطری دوبارہ رحیم داد کے کمرے میں نہ آئی۔ تنہائی میں بھی مڈھ بھیڑ نہیں ہوئی۔ نہ بات چیت کی نوبت آئی۔ نظر بھی آتی تو اپنے مچلتے اچھلتے جسم کو لہراتی ہوئی بے نیازی سے گزر جاتی۔ رحیم داد کی جانب مطلق توجہ نہ دیتی۔ مگر وہ جتنا نظرانداز کرنے کی کوشش کرتی رحیم داد اس کے لیے اتنا ہی بے قرار ہوتا جا رہا تھا۔ ان دنوں اس کے ذہن پر سلطری ساون کی گھٹا بن کر چھائی ہوئی تھی۔

رحیم داد نے مراد خاں کو ٹٹولا۔ باتوں باتوں میں سلطری کا ذکر کئی بار چھیڑا۔ لیکن اس نے حوصلہ افزائی نہ کی' صاف ٹال گیا۔ ویسے وہ اپنی زمیں داری کے بکھیڑوں میں کچھ زیادہ ہی الجھا ہوا تھا۔ ہموں والی میں اس کے قیام میں اسی باعث اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ربیع کی فصل پر بہت توجہ دے رہا تھا۔ اس دفعہ وہ زیادہ بڑے رقبے پر گندم کی بوائی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے جنگل اور جھجر بھی صاف کرانے شروع کر دیے تھے۔ یہ زمین وہ قابل کاشت بنانا چاہتا تھا' کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ اس پر آم کے باغات بھی لگانا چاہتا تھا۔

مراد خاں نے اپنی ان سرگرمیوں میں رحیم داد کو بھی شریک کر لیا تھا۔ وہ اسے اپنے ہم راہ ناشتے کے بعد لے جاتا۔ دن کھیتوں کے درمیان ادھر ادھر گھومنے' مزارعوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے' فصل کی آب پاشی کے لیے آڈ' بنیے اور نکے درست کرانے اور ایسی ہی دوسری مصروفیات میں گزر جاتا۔ سورج

غروب ہوتا تو مراد خاں اور رحیم داد طلوع ہوتے۔ نہا دھو کر تازہ ہوتے، صاف ستھرے لباس پہ
اور شغل بادہ نوشی کرتے۔

حویلی میں نئی نئی نوجوان عورتیں اور لڑکیاں اٹھا کر لائی جاتیں۔ کسی کو رکھ لیا جاتا، کسی کی قیمہ
وصول کر کے واپس کردیا جاتا۔ کسی کو بلا معاوضہ چھوڑ دیا جاتا۔ کسی کو تحفے کے طور پر شناسا زمی
داروں کو بخش دیا جاتا۔ اس معاملے میں فیصلے کا انحصار سردار مراد خاں کی مرضی اور موڈ پر تھا۔

عام طور پر ان مزارعوں کی نوجوان عورتیں اٹھوائی جاتیں جو جھگڑا اور جھگڑا صاف کرنے کی بجا
سے کتراتے، احتجاج کرتے اور دوسرے مزارعوں کو اکسانے کی کوشش کرتے۔ مراد خاں زیادہ
ہوتا تو عورتوں کے ساتھ مویشی بھی اٹھوالیتا، مزارعوں کو بے دخل کردیتا۔ ان کے گھروں میں ا
کارندوں کے ذریعے آگ لگوا دیتا۔ پولیس سے سازباز کر کے جھوٹے مقدمے بنواتا۔ جب
ہموں والی آیا تھا اس کی وسیع زمیں داری کے ہر مزارعے اور ہر فرد پر خوف طاری تھا۔

انھی دنوں بیٹ کے ایک جاگیردار 'فرط خاں ڈھانڈلہ' کے بچے کے موٹن کی تقریب ہوئی
پہلوئی کا بیٹا تھا اور بڑی منت مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ لہٰذا دھوم دھام سے جشن منایا گیا
تقریب کا آغاز حسب دستور پیر کی درگاہ پر حاضری دینے اور منت کے مطابق منوتی چڑھانے
ہوا۔ سرداروں اور بڑے زمیں دار ڈھانڈلوں کے گھرانوں کی عورتیں اور لڑکیاں تو — پیر کو ا
جیپوں اور کاروں میں بیٹھ کر درگاہ کی جانب روانہ ہوئیں جن کے گرد چادریں بندھی تھیں تا
ملوک زادیوں کی کسی طور بے پردگی نہ ہو اور ان پر کسی نامحرم کی نظر نہ پڑے۔

لیکن مزارعوں کی عورتیں اپنے جاگیردار کی خوشی میں شرکت کے لیے بچوں کے ساتھ سویر
سویرے اونٹوں کے کجاووں میں بیٹھ کر نکل کھڑی ہوئیں۔ وہ منوتی پیر کی زیارت کی جانب جار
تھیں، خوب بن سنور کر نکلی تھیں۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا، مانگ بھر کر دھڑی گوندھی تھ
ہونٹوں پر سرخی لگائی تھی، شوخ اور بھڑک دار لباس پہنے تھے۔ ریشمی گھگروں پر سنہرے
چوڑی چوڑی گوٹ لگی تھی۔ چولوں اور کرتیوں کے گریبانوں اور آستینوں پر موتیوں، شیشوں او
رنگین دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ سروں پر پچ رنگی چنریاں تھیں۔ دوپٹے اور بوچھن
جن پر ستارے ٹکے تھے۔ گلوں میں چاندی یا گلٹ کے کنٹھالے اور مالھان تھے۔ ناک میں فیرو
جڑے تولے اور پوپے جھل ملا رہے تھے۔ ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں اور بازوؤں پر چوڑے او
پہنوٹے تھے جن کے خوش رنگ دھاگوں کے پھندنے ہولے ہولے جھولتے تھے۔ کانوں میں بالیو
کے گچھے لٹکتے تھے۔

وہ قافلے کی صورت میں گاؤں سے نکلیں۔ ایک اونٹ پر نقاروں کی جوڑی سمیت میراثی سوار
۔ اس کا اونٹ سب سے آگے تھا جس کی مہار ایک جتوال سنبھالے ہوئے تھا۔ دوسرے تمام
نٹ اور اونٹنیاں پیچھے پیچھے تھیں۔ ان کے گھٹنوں پر پہنوٹے بندھے تھے جن کے گھنگھرو ٹخنوں میں
ی جھانجروں کے ساتھ بجتے تھے، جھنکارتے تھے۔ گلوں میں گانیاں تھیں اور سروں پر بندھے
ے موروں کے پھندنوں کے ساتھ ساتھ موتیوں اور کوڑیوں کی جھالریں ادھر ادھر جھول رہی
یں، لہرا رہی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کے مانند اونٹ اور اونٹنیاں بھی خوب سجی ہوئی تھیں۔ چند
ٹنوں پر جتوالوں اور ساربانوں کے ساتھ بین بجانے والے بھی بیٹھے تھے۔

قافلہ روانہ ہوا تو میراثی نے نقارے پر چوٹ لگائی۔ بین باجے والوں نے نقارے کی گت پر ایک
قبول دھن چھیڑی۔ میراثی کے اونٹ سے بھی آگے نوجوانوں کی ٹولی تھی۔ وہ ریشمی کرتے پہنے
وئے تھے۔ سروں پر پگڑیاں بندھی تھیں۔ ان کے تہبند بھی ریشمی اور رنگین تھے۔ قافلے کی
روانگی سے پہلے انھوں نے بھنگ اور ساوی دبا کے پی تھی۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ
نشے سے جھوم جھوم کر اپنے مضبوط اور کسے ہوئے جسموں کی نمائش کر رہے تھے اور بلوچوں کا ایک
قدیم جھمر ناچ رہے تھے۔

رقص کرنے والے نوجوانوں کے درمیان ڈھولیا تھا۔ وہ گلے میں پڑے ہوئے ڈھول پر زور زور
سے چوٹ لگا کر ناچنے والوں کو للکار رہا تھا جو اس کے چاروں طرف دائرے میں ہاتھوں اور پیروں کی
گردش کے ساتھ لنک لنک کر رقص کر رہے تھے۔

اونٹ ایک قطار میں کچے راستے پر ہچکولے کھاتے گرد و غبار کے بادل اڑاتے قافلے کی صورت
میں دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے گلوں میں لٹکتی گھنٹیاں اور گھنگھرو اور پیروں میں
پڑی ہوئی جھانجریں نوجوانوں کے رقص کے ساتھ بج رہی تھیں، جھنکار رہی تھیں۔ عورتیں اور
بچے خوشی سے قہقہے لگا رہے تھے، چہک رہے تھے، اونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔ رقص کرتے
کرتے ایک نوجوان نے کان پر ہاتھ رکھ کر لمبی اور اونچی تان لگائی۔ اور اپنے علاقے کا ایک عوامی
جھمر گیت چھیڑا۔

رکھاں میں امید ماہی دے ملن دی
مکہ وی دور ہے
ونجناں ضرور ہے
حسن حسین دے ماتگے

دل پٹی تانگے
رکھاں میں امید ماہی دے ملنڑ دی

گیت کے بول جھمر ناچنے والے نوجوانوں اور کجاووں میں بیٹھے ہوئی عورتوں اور کنواریوں نے اٹھائے۔ سب آواز سے آواز ملا کر گانے لگے۔ ڈھولیے نے ڈھول پر اور زور سے چوٹ لگائی۔ میراثی اور بین والوں نے جھمر کی لے کے ساتھ ساتھ نقارے اور بین کے تال سر کو ہم آہنگ کیا۔ گیت کے بول اونچے ہوتے گئے۔ آوازوں کے ساتھ ساتھ ساز بھی تیز ہوتے گئے۔ ساز و آواز کے زیروبم کے ساتھ رقص کی گردش کبھی تیز ہو جاتی کبھی دھیمی پڑ جاتی۔ اسی طرح منوتی کے لیے جانے والا یہ قافلہ گاؤں سے نکل کر آگے بڑھا۔ دور' اور دور ہو تا گیا۔ رفتہ رفتہ گرد کے ابھرتے اور پھیلتے ہوئے بادلوں میں گم ہو گیا۔

دن گزرا' شام ہوئی۔ رات کو کھانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ مہمانوں کے لیے جی بہلانے اور ناچ گانے کا بھی پروگرام تھا۔ تقریب کی دھوم دھام دوبالا کرنے کی غرض سے ملتان اور لاہور سے طوائفوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ رات بھر کا پروگرام تھا اور اس میں شرکت کے لیے سردار مراد خاں شاہانی خاص طور پر مدعو تھا۔ ہموں والی میں اس کے قیام میں اضافے کا سبب موتذن کی اس تقریب میں شریک ہونا بھی تھا۔

سورج ڈوبتے ہی مراد خاں شاہانی نے سردار قرط خاں ڈھانڈلہ کی حویلی جانے کی تیاری کی۔ اس نے غسل کیا' بوسکی کی لمبی قمیص اور لٹھے کی خوب گھیردار اجلی شلوار پہنی۔ قیمتی اونی شال اوڑھی۔ کپڑوں پر خوشبو لگائی۔ اسی سج دھج کے ساتھ کمرے سے نکلا تو زیادہ وجیہہ اور باوقار لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھبن تھی۔ آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ اس کے ہم راہ سلمیٰ بھی تھی۔ وہ بھی پورا سنگھار کیے ہوئے تھی۔ شاہانی آگے آگے تھا۔ سلمیٰ اس سے ایک قدم پیچھے تھی۔

رحیم داد کمرے کے باہر دالان میں موجود تھا۔ مراد خاں شاہانی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "چوہدری' تجھے ڈھانڈلے کی حویلی نہیں چلنا؟" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "زبردست میل ہے۔ ڈھانڈلے نے شراب بھی عمدہ منگوائی ہے۔ کنجریاں بھی پوپٹ اور زوردار ہیں۔"

رحیم داد نے حیلہ سازی سے کام لیا۔ منہ بگاڑ کر رسان سے بولا۔ "میرے سر میں بہت درد ہے۔ میں نوں نہیں جانا۔ تسی نوں یہی بتانے آیا تھا۔" وہ اونی دوہر اوڑھے ہوئے تھا' بال پریشان تھے اور چہرہ بھی اجڑا اجڑا نظر آرہا تھا۔

شاہانی نے اصرار کیا۔ "فٹافٹ تیار ہو جا۔ اسکاچ وہسکی کے دو پیگ لگاتے ہی سارا درد شرد جاتا رہے گا۔ ایک دم چنگا ہو جائے گا۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے نہ لے جا۔ طبیعت اور گڑبڑ ہو جائے گی۔" رحیم داد رضامند نہ ہوا۔

"چلتا تو اچھا ہی تھا۔" شاہانی نے زور دے کر کہا۔ "بہت لطف آئے گا۔ طبیعت اگر نہ لگے تو جب تیرا جی کرے اٹھ کر چلا آنا۔ پروگرام تو ویسے رات بھر کا ہے۔"

"سیں چوہدری! چلا جا۔" سلمیٰ نے بھی شاہانی کی تائید کی۔

رحیم داد نے اسے نظر بھر کر دیکھا' اس کا مسکراتا چہرہ نکھرا ہوا تھا۔ جسم پھڑک رہا تھا۔ آنکھیں جادو جگا رہی تھیں۔ رحیم داد تڑپ کر رہ گیا۔

مراد خاں شاہانی نے ایک بار پھر رحیم داد پر زور دیا۔ "نخرا نہ کر۔" وہ مسکرایا۔ "تھوڑی ہی دیر کے لیے میل میں شریک ہو جا۔ ڈھانڈلے کا دل خوش ہو جائے گا۔ تجھے ساتھ لانے کے لیے اس نے مجھے بار بار کہا تھا۔" مگر رحیم داد کسی طور آمادہ نہ ہوا۔ طبیعت ناساز ہونے کا عذر تراشتا رہا۔

شاہانی چلا گیا۔ سلمیٰ اس کے پیچھے پیچھے حویلی کے پھاٹک تک گئی۔ رحیم داد نظریں اٹھائے مراد خاں شاہانی کے بجائے سلمیٰ کو دیکھتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری' اٹھا اور آہستہ آہستہ ڈیرے میں پہنچا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆

رحیم داد بستر پر چپ لیٹا تھا۔ نہ اس نے کھانا کھایا نہ سویا۔ پہر رات گزر گئی۔ حویلی سنسان ہو گئی۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ ہوا میں تیزی آگئی تھی۔ سرمائی اندھیری رات ساکت کھڑی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔

رحیم داد پلنگ سے نیچے اترا' اونی دوہر اوڑھی' سلیپر پہنے' لیمپ کی لو دھیمی کی' آہستہ سے دروازہ کھولا' کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ وہ اندھیرے میں دم سادھے کھڑا تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ حویلی کے تمام نوکر اپنی اپنی کوٹھریوں کے دروازے بند کیے گہری نیند سو رہے تھے۔ رحیم داد کی طرح حویلی کے ہر فرد کو معلوم تھا کہ مراد خاں شاہانی سویرے سے پہلے نہیں لوٹے گا۔ وہ ناچ گانے کا زبردست شوقین تھا۔ ایسی محفل چھوڑ کر نہیں آسکتا تھا۔

رحیم داد احاطے میں پہنچا اور دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ مڑا اور حویلی کے عقبی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ خاموشی بہت گہری تھی اور کہرے کی دھند بھی اس قدر تھی

کہ وہ سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔ وہ سلمہی کی کوٹھری پر پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ مگر دروازے کی جھریوں سے اندر جلتے ہوئے چراغ کی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ وہ دروازے کے نزدیک سانس روکے کھڑا رہا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ سناٹا اور بڑھ گیا تھا۔ رحیم داد نے آہستہ سے دروازے پر ہاتھ رکھا' ہولے سے دھکا دیا' دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ وہ آہستہ سے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے پلنگ کی پٹی سے ٹیک لگائے سلمہی فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ رحیم داد نے مڑ کر نہایت احتیاط سے کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا۔

آہٹ سن کر سلمہی نے پلٹ کر دیکھا۔ رحیم داد کو اپنے سامنے پا کر وہ سخت حیرت زدہ ہوئی اور سٹ پٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "سیں چوہدری!" اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورنے لگی۔ "توں یہاں کیسے آگیا؟"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی حیرت زدہ تھا۔ یہ وہ سلمہی نہیں تھی جس کی چھب دیکھ کر بے قرار ہو جاتا تھا' جس کے بدن کے پیچ و خم کے ڈولنے اور گردش کرنے سے اس کا دل ڈولنے لگتا تھا۔ وہ اسی سلمہی کے لیے بے قرار ہو کر چوروں کی طرح چھپ کر رات کے سناٹے میں آیا تھا مگر اس کے سامنے جو سلمہی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ ویران اور اجاڑ تھا۔ آنکھوں کے ہر دم جھلملانے والے کنول بجھے بجھے تھے' بال خشک اور الجھے ہوئے تھے۔ وہ میلا کچیلا لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کی آنکھوں کا کاجل پھیلا ہوا تھا' جوانی پگھلتی اور ڈھلتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد کو گم صم اور حیرت زدہ دیکھ کر سلمہی نے ایک بار پھر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سیں چوہدری! تو یہاں کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ تیکوں اس طرح میرے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا وہ بدستور پریشان اور سراسیمہ نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد ہکا بکا کھڑا رہا۔ سلمہی بھی خاموش رہی۔ مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا۔ کندھوں پر پڑا ہوا دوپٹہ سر کے پیچھے سے کھینچ کر اس طرح اوڑھا کہ اس کا چہرہ کسی قدر چھپ گیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

رحیم داد ٹکٹکی باندھے حیران و پریشان سلمہی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دوپٹے سے چہرہ چھپانے کی کوشش کی تو رحیم داد چونکا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دائیں طرف کی دیوار کی کھونٹیوں پر شوخ اور بھڑک دار دوپٹے' چولے اور گھگرے لٹک رہے تھے۔ ان کے ساتھ ریشمی منجھیاں اور کرتیاں بھی جھول رہی تھیں۔ سامنے کی دیوار کے طاق میں سرخی' کاجل' کنگھی اور سنگھار کا دوسرا

سازو سامان رکھا تھا۔ طاق کے قریب ہی دیوار پر آئینہ آویزاں تھا۔

سلمہی کی آواز خاموشی میں ابھری۔ "سیں! تو یہاں کیوں آگیا؟ میری گالہہ کا جواب کیوں نہیں دیتا؟" اس کے لہجے میں پریشانی اور گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ عاجزی بھی تھی۔ رحیم داد اب خاموش نہ رہ سکا' آہستہ سے بولا۔ "تو میرے آنے پر اتنی پریشان کیوں ہو گئی؟"

"پریشانی کی بات ہی ہے۔" وہ بے زاری سے بولی۔ "سیں تیکوں پتہ نہیں' سردار کو علوم ہو گیا تو بہت گڑبڑ ہو گی۔ تو جانتا ہے' اس کا سر کتنا خراب ہے۔ غصے میں وہ پاگل بن جاتا ہے۔"

"یہ تو بتا تو میرے پاس بعد میں کیوں نہیں آئی؟" رحیم داد نے سلمہی کی سراسیمگی نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"سیں! میں سردار کی مرضی بنا تیرے پاس کیسے آسکتی ہوں۔" اس نے صاف گوئی سے بتایا۔ "اس رات اس نے مجھے تیرے پاس بھیج تو دیا پر بعد میں مجھ پر بہت ناراض ہوا۔ غصے سے بار بار گالاں نکالتا تھا۔"

"تب ہی تو مجھ سے دور دور اور کٹی کٹی رہتی ہے؟"

"ہا سیں!" اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "سردار یہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ میں اس کے سوا کسی اور کے ساتھ میل جول پیدا کروں۔ یاری لگانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" اس نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ "سیں! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ سردار بہت غصے والا ہے' ظالم بھی ہے۔ اس کا مزاج بہت گرم ہے۔"

"اس کی پروا نہ کر۔" رحیم داد نے سلمہی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "وہ صبح سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔" اس نے نظر بھر کر سلمہی کو دیکھا۔ "ویسے تو کہتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔"

"ہا سیں! اب تو جا۔" وہ بے رخی سے بولی۔ "مجھے کچھ بھلا نہیں لگتا۔ میں بہت موجھی ماندی اور پریشان ہوں۔"

"سلمہی! تو کچھ زیادہ ہی پریشان اور اداس لگ رہی۔ صاف صاف بتا' بات کیا ہے؟" رحیم داد نے سلمہی کے چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی شدت سے محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"تیکوں کیہہ پتہ' میرا پتر کتنا بیمار ہے؟" سلمہی نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ "دیکھ کیسا چپ کر کے پڑا ہے۔ اسے بہت زور کی تپ چڑھی ہے۔" اس نے رحیم داد کی طرف افسردہ نظروں سے دیکھا۔ "یہ میرا مندوں ہے۔ تینوں بچوں میں سب سے وڈا ہے۔"

رحیم داد نے توجہ سے دیکھا۔ پلنگ پر بوسیدہ اور میلی رضائی میں لپٹا لپٹایا مندوں بے سدھ پڑا

تھا۔ اس کی عمر گیارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے چہرے کے نقوش سے مراد خاں شاہانی کی شباہت صاف جھلک رہی تھی۔ ناک اور آنکھیں تو ہو بہو مراد خاں سے ملتی تھیں۔

مندوں نے بے چینی سے پہلو بدلا اور گردن ادھر ادھر ہلانے لگا۔ آہستہ سے بولا۔ "اماں!" رک رک کر سانس بھر رہا تھا۔ حلق سے خر خر کی آواز نکل رہی تھی۔

سلمٰی جھپاک سے مندوں کے قریب پہنچی' جھک کر اس کی پیشانی چومی اور سرہانے بیٹھ کر ہولے ہولے سر دبانے لگی۔ اس نے پیار بھری نظروں سے مندوں کو دیکھا اور تڑپ کر بولی "جیوے میرا لعل۔ میں صدقے وتجاں' تو حیاتی والا ہوویں۔"

رحیم داد بھی نزدیک چلا گیا۔ چراغ کی ہلکی زرد زرد روشنی میں مندوں کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر رکھا۔ وہ آگ کے مانند دہک رہی تھی۔ اسے تیز بخار تھا رحیم داد پریشان ہو گیا۔ تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"اسے تو بہت تیز تپ ہے۔ تو نے اس کا دوا دارو بھی کیا؟"

"تیرے آنے سے تھوڑی ہی دیر پہلے دوائی کھلائی تھی۔" سلمٰی نے رحیم داد کو بتایا۔ "حکیم سے خود جا کر سویرے لائی تھی۔ مندوں تو پچھلے چار روز سے بیمار ہے پر تپ کم نہیں ہوتی۔ کھانسی بھی آتی ہے۔ کل رات تک اتنا بیمار نہ تھا۔ میں نے گرم دودھ پلایا تو پی لیا تھا۔ پر آج صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا پیا۔ ایسے ہی آنکھیں بند کیے پڑا ہے۔ بار بار پانی مانگتا ہے۔"

"بخار بھی بہت تیز ہے۔" رحیم داد نے پوچھا۔ "تو نے حکیم سے پتہ کیا' اسے روگ کیا ہے؟"

"کہتا تھا' نمونیا ہو گیا ہے۔ اسی کی دوائی دی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ تین تین گھنٹے بعد دوائی پلانا۔ سویرے آ کر حال بتانا۔"

"تیرے پاس تو گھڑی بھی نہیں۔ تین تین گھنٹے بعد کیسے دوائی پلائے گی۔" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی اتار دی اور سلمٰی کو دیتے ہوئے کہا۔ "لے اسے رکھ لے۔"

"نہیں' اسے تو اپنے ہی پاس رکھ۔" اس نے گھڑی لینے سے صاف انکار کر دیا۔ "سردار نے گھڑی میرے پاس دیکھ لی تو اسے پتہ چل جائے گا' تو میرے پاس آیا تھا۔ بہت ناراض ہو گا۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "سیں! برا نہ منانا۔ میں اسے دوائی ٹھیک وقت ہی پر پلاتی رہوں گی۔"

رحیم داد نے گھڑی اس کے حوالے کرنے پر اصرار نہیں کیا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے بولا۔

"پر دوائی پلانے کے لیے تم نوں رات بھر جاگنا پڑے گا۔"

"جاگ لوں گی۔" وہ مستعدی سے بولی۔ "سیں! دعا کر۔ میرا لال چنگا ہو جائے۔ یہ میرا آگے کا سہارا ہے۔" اس کا لہجہ دکھ بھرا ہو گیا۔ "میں کب تک جوان رہوں گی۔ ایک دن تو بوڑھا ہونا ہی ہے۔ بوڑھی ہو گئی تو سردار مجھے حویلی میں کیوں رکھے گا؟ منجھ بوڑھی ہو جاتی ہے تو اسے کسائی کو دے دیتے ہیں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ اس کے چہرے کی افسردگی اور بڑھ گئی۔

"ہاتو سے بھی تو تیرا ایک پتر تھا۔ اس کا کیا بنا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ تو میرا پلوٹھا ہے۔ پر وہ کس کام کا۔" سلمٰی کا لہجہ پھر غمگین ہو گیا۔ "ایک بار اس کے پاس بھی گئی تھی۔ وہ وہیں رہتا ہے۔ اس نے پرنا کر لیا ہے۔ ذال ہے۔ اس سے ایک نکی بھی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس نے مجھے دیکھا تو نوہ کے سامنے ننگی ننگی گالاں اور مندا نکالیں۔" اس کی آواز بھر آئی۔ "دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔" سلمٰی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "سیں! میرا لال چنگا ہو جائے۔ یہ میرا بازو ہے' بڑھاپے کا سہارا ہے۔ میرا اور کوئی بھی تو نہیں۔" وہ سسکیاں بھر کر بے بسی سے رونے لگی۔

رحیم داد مبہوت کھڑا تھا اور ہر دم ہنستی مسکراتی سلمٰی کو پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس پر پہلی بار یہ راز آشکار ہوا کہ سلمٰی اندر سے کس قدر غم زدہ اور شکستہ ہے۔ اس نے سلمٰی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تو فکر نہ کر' تیرا مندوں ضرور چنگا ہو جائے گا۔ حوصلے سے کام لے۔" رحیم داد نے اس کی جانب دیکھا' دل گرفتہ ہو کر بولا۔ "سلمٰی! تو سچ مچ سلمٰی ہے۔ میں نوں پتہ ہی نہیں تھا تو اتنی دکھی ہے۔" اس نے آہستہ آہستہ اس کا بازو تھپکا۔ "اس طرح نہ رو سلمٰی! تو کہہ تو میں خود جا کر حکیم کو بلا لاؤں۔ پھاٹک پر راکھا خان بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ حکیم کے گھر چلا جاؤں گا۔"

"نا سیں! تو ایسا نہ کرنا۔" وہ نرم لہجے میں بولی۔ "میں خود چلی جاتی پر حکیم نہیں آئے گا۔ میں تو اسے سویرے ہی لانا چاہتی تھی۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ دوائی دے کر بولا۔ "یہ کھلاتی رہنا' چنگا ہو جائے گا۔ وہ تب نہ آیا تو اب اتنی رات کو کیسے آ جائے گا۔"

"میں جاؤں گا تو ضرور آ جائے گا۔"

"پر تیرا اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔" وہ پریشان ہو کر بولی۔ "سردار تجھے تو کچھ نہیں بولے گا پر میرے گلے پڑ جائے گا۔ سخت ناراض ہو گا۔"

"تو ایسا کر مندوں کے متھے پر کپڑا گیلا کر کے رکھ۔" رحیم داد نے اسے مشورہ دیا۔ "مجھے بھی ایک بار ایسی ہی زوروں کی تپ چڑھی تھی۔ گیلا کپڑا رکھنے سے کم ہو گئی تھی۔" اس نے کوٹھری میں

ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ "مجھے کوئی اجلا کپڑا دے دے۔ میں بھگو کر فوراً اس کے متھے پر رکھوں گا۔"
اس نے تیکھی نظروں سے سلمٰی کو دیکھا۔

"میرا منہ کیا تک رہی ہے۔ جا کپڑا لے کر آ۔"

وہ اٹھی اور ٹرنک کھول کر کپڑا تلاش کرنے لگی۔ رحیم داد نے انتظار نہ کیا۔ بڑھ کر کھونٹی پر لٹکا ہوا اجلا دوپٹہ اتارا اور کونے میں رکھے ہوئے گھڑے سے پانی نکال کر پلو بھگونے لگا۔

سلمٰی نے اس کی جانب دیکھا تو گھبرا کر بولی۔ "سئیں! تو نے یہ کیا کر دیا۔ یہ بوچھن تجھے اس طرح خراب نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

رحیم داد نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے دوپٹے کا گیلا پلو تہہ کر کے چار انگل کی ویسی ہی پٹی بنائی جیسی جمیلہ نے ایک بار تیز بخار کی حالت میں اس کے لیے بنائی تھی۔ اس نے گیلی پٹی مندوں کی پیشانی پر رکھی اور سلمٰی کو مخاطب کیا۔

"سلمٰی! فکر نہ کر۔ تھوڑی دیر میں اس کی تپ کم ہو جائے گی۔"

سلمٰی بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ رحیم داد کے پاس پلنگ کے سرہانے بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے اس سے کٹورے میں پانی منگوایا۔ پانی سرد تھا۔ رحیم داد بار بار دوپٹے کا پلو پانی میں تر کرتا اور اسے مندوں کی پیشانی پر رکھتا۔ سلمٰی چپ بیٹھی رحیم داد کو دیکھتی رہی۔ اس نے مندوں کی گردن کو ہاتھ لگایا۔ اس کے چہرے سے قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔

"لگتا ہے تپ تو کم ہو گئی۔" سلمٰی نے رحیم داد سے کہا۔ "سئیں! تو بہت چنگا اور نیک بندہ ہے۔" وہ اسے دعائیں دینے لگی۔ "سئیں! تو سدا جیویں، رب راضی ہووے۔" اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ "سئیں! بوچھن اب مجھے دے دے۔" اس نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب مڑ کر دیکھا۔

"اب تو جا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تیرا اس طرح یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔"

رحیم داد نے اس کی پریشانی اور سراسیمگی محسوس کرتے ہوئے دوپٹہ سلمٰی کو دے دیا۔ خاموشی سے اٹھا، کوٹھری سے نکلا، باہر سے دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ مگر وہ اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ دل ہی نہ چاہا۔ آنکھوں میں دور دور تک نیند نہیں تھی۔ ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ عجیب سا اضطراب تھا۔ اضطراب دور کرنے کی غرض سے اس نے اللہ بخش جوڑا کو آواز دے کر بلایا۔

اس سے شراب اور گلاس لانے کو کہا اور بیٹھک میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جوڑا نے

تھوڑی ہی دیر بعد بوتل، گلاس اور جگ میں پانی لا کر میز پر رکھ دیا۔ رحیم داد نے پیگ بنایا اور ایک بڑا گھونٹ بھرا۔

☆

حویلی کے پھاٹک پر جیپ ٹھہرنے کی آواز رات کے پرہول سناٹے میں ابھری۔ ذرا ہی دیر بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ رحیم داد نے چونک کر دروازے کے باہر دیکھا، اندھیرے میں ایک سایہ لہرایا اور مراد خاں شاہانی ڈگمگاتے قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد کو دیکھ کر وہ زور سے ہنسا۔

"چوہدری! پینی ہی تھی تو میرے ساتھ چلتا۔ ادھر بہت عمدہ وہسکی تھی۔"

وہ آگے بڑھا اور کرسی کھسکا کر رحیم داد کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔

"میں نے سوچا، پینے سے سر کا درد کچھ کم ہو جائے گا۔ ویسے میرا بالکل ارادہ نہیں تھا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ مگر فوراً بات پلٹتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو نے تو سویرے آنے کو کہا تھا۔ ابھی سے اٹھ کر کیسے واپس آ گیا؟ لگتا ہے، مجرا زوردار نہیں تھا۔"

"سئیں! ایسی گل نہیں۔" شاہانی نشے میں جھوم کر بولا۔ "وہاں ایک کنجری بہت پھڑک دار تھی، خانہ خراب نے ایسی طبیعت گرمائی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "لا مجھے بھی ایک ڈبل بنا کر دے۔ اکیلا ہی پیتا رہے گا؟"

رحیم داد نے مسکرا کر اپنا گلاس مراد خاں شاہانی کے سامنے رکھ دیا۔ دوسرا گلاس ہی نہ تھا۔ شاہانی نے رحیم داد کے گلاس سے ایک گھونٹ بھرا اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے اللہ بخش جوڑا کو آواز دی۔

جوڑا گھبرایا ہوا آیا۔ شاہانی نے حکم دیا۔ "جوڑے! گلاس لے کر آ۔" جوڑا چلنے کے لیے مڑا تو شاہانی نے اسے ٹوکا۔ "اور دیکھ، سلمٰی کو بھی یہاں بھیج دے۔"

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اسے فوراً بیمار مندوں یاد آ گیا۔ اس نے چاہا کہ شاہانی اس وقت سلمٰی کو نہ بلائے۔ اس وقت اپنے بیمار بیٹے کے پاس اس کا موجود ہونا ضروری تھا۔ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "سلمٰی کو بلا کر کیا کرے گا؟ اس نے کسی رن کو پہلے ہی تیرے کمرے میں پہنچا دیا ہوگا۔ سلمٰی تو اب سوتی ہوگی۔" رحیم داد مسکرایا۔ "بہت کام کرتی ہے۔ صبح سے رات گئے تک ادھر سے ادھر بھاگ دوڑ کرتی رہتی ہے۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ کرتی نظر آتی ہے۔ بہت ہی محنتی رن ہے۔"

"پروہ ابھی سو نہیں سکتی اور سو بھی گئی ہو تو جاگ سکتی ہے۔" سردار مراد خاں شاہانی نے نہا[یت] بے نیازی سے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "سیں چوہدری! تو اسے نہیں جانتا۔ وہ میرے لیے ہر دم تیا[ر] رہتی ہے۔"

اللہ بخش جوڑا گلاس لے کر آ گیا۔ رحیم داد نے خالی گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے ایک با[ر] پھر مراد خاں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "سلطری کو چھوڑ' پولانی ٹھیک رہے گی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"میں نے کل ہی اسے دیکھا تھا۔ ابھی تو بیس ہے۔ سوہنی ہے اور تکڑی جوان ہے۔"

"نہیں! آج سلطری ہی چلے گی۔" مراد خاں نشے میں لہرا کر بولا۔ وہ خوب چڑھا کر آیا تھا۔ بات کرتا تو زبان لڑکھڑاتی۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے بہکی بہکی نظروں سے جوڑا کو گھور [کر] دیکھا۔

"سوردے پتر' تو ابھی تک کھڑا ہے۔ سلطری کو لانے نہیں گیا۔"

"سیں! سراکھوں تے۔" جوڑا سراسیمہ ہو کر گڑگڑانے لگا۔ "ابھی جا کر اسے بولتا ہوں۔ [و] ضرور آئے گی۔"

اللہ بخش جوڑا تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔ مراد خاں اور رحیم داد شراب سے شغل کرنے لگے اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔ رات بھیگتی گئی۔ مراد خاں نے بے چینی سے دروازے کی جانب دیکھا "سلطری ابھی تک نہیں آئی۔ وہ کیوں نہیں آئی؟" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ رحیم داد کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے گلاس ہونٹوں سے لگا کر آہستہ آہستہ چسکی لگانے لگا۔

وقت کچھ اور گزر گیا۔ مراد خاں شاہانی کے چہرے پر جھنجلاہٹ پھیلنے لگی۔ وہ غصے سے بڑبڑا[نے] لگا۔ "لگتا ہے' اس کا نخرا بہت بڑھ گیا ہے۔ سمجھتی ہے' میں اسے بہت چاہتا ہوں۔" اس [کی] آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ عین اسی وقت کمرے کے باہر چاپ ابھری۔ سلطری اندھیرے سے نکل کر اندر داخل ہوئی۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ رحیم داد نے حیرت سے دیکھا۔ سلطری گو[ٹے] کناری لگا گلابی دوپٹہ اوڑھے اور گلابی ہی منجھلی باندھے ہوئے تھی۔ بالوں میں چمک دمک تھی ماتھے پر ٹیکا سجا تھا۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ چہرے پر ملاحت تھی' نکھار تھا۔ اس کا جسم ہو[لے] ہولے لہرا رہا تھا' مچل رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی آئی اور ایک خاص ادا سے مراد خاں کے روبرو کھڑ[ی] ہو گئی۔

مراد خاں شاہانی نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "بہت دیر لگا دی تو نے۔ لگتا ہے تیرا نخرا کچھ زیا[دہ]

بڑھ گیا ہے۔"

"سیں سردار!! ایسا نہ سوچ۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "میں صدقے تھیواں' تو بلائے اور میں نہ آؤں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

شاہانی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سلطری کی جانب جھومتا ہوا بڑھا۔ بے قرار ہو کر گویا ہوا۔ "میرے گلے سے تو لگ جا جند جانی۔" اس نے سلطری کو بازوؤں میں دبوچ لیا' مڑ کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "چوہدری! میں تو اب چلا۔ میں تو اسی کے لیے ڈھانڈلے کی میل سے اٹھ کر آیا تھا۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھایا۔ ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

رحیم داد نے بھی گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مراد خاں مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! آج یہ گل چاندنی میرے پاس رہے گی۔ پولانی تیرے پاس پہنچ جائے گی۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "تجھے وہ پسند بھی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا' حیرت سے سلطری کو دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے بیمار بیٹے منڈوں کے بارے میں مراد خاں شاہانی سے کچھ نہیں کہا جس کے لیے وہ کچھ ہی دیر پہلے اپنی کوٹھری میں رو رہی تھی گر یہ وزاری کر رہی تھی۔

مراد خاں جھومتا جھامتا کمرے سے چلا گیا۔ سلطری سہمی ہوئی تھی۔ وہ چہرے پر ابھرتی ہوئی افسردگی چھپانے کے لیے بار بار مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ رحیم داد بھی کمرے سے نکلا' کچھ دور تک مراد خاں اور سلطری کے پیچھے پیچھے اندھیرے میں چلتا رہا۔ حویلی سنسان تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

رحیم داد مڑا' ڈیرے کی جانب بڑھا' اپنے کمرے میں پہنچا اور چپ چاپ بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ وہ سلطری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی مجبوری اور بے بسی پر مضطرب تھا۔ اسے رہ رہ کر سلطری کا بیٹا یاد آ رہا تھا جسے حکیم نے نمونیا بتایا تھا۔ وہ بخار سے بھن رہا تھا اور اس کی ماں سردار مراد خاں شاہانی کے بپھرے ہوئے جذبات کے گرداب میں تھی۔

کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رحیم داد نے چونک کر دیکھا۔ پولانی اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کا قد نکلتا ہوا تھا۔ رنگ گورا اور زردی مائل تھا۔ جسم مضبوط اور چھریرا تھا۔ وہ گاؤں کے نوجوان جولاہے کی بیوی تھی۔ رحیم داد کی تیز نظروں نے تاڑ لیا کہ بناؤ سنگھار کے باوجود اس کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ آنکھوں میں کچی نیند سے بیدار ہونے کا خمار ہے۔ اس نے دروازہ بند کیا' مسکرانے کی کوشش کی' آگے بڑھی اور بستر پر سمٹ [کر] ایک طرف بیٹھ گئی۔

☆

رحیم داد غسل کرنے کے بعد تولیا سے بدن پونچھ رہا تھا کہ حویلی کے پچھواڑے سے عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے گھبرا کر تولیا ایک طرف پھینکا۔ جلدی جلدی کپڑے پہنے' باہر نکلا۔ ابھی تک پالا پڑ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھند فضا پر چھائی ہوئی تھی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا مگر دھند میں لپٹی ہوئی دھوپ مٹیالی اور پھیکی پھیکی تھی۔

رحیم داد حویلی کے پچھواڑے بڑھا جدھر سے رونے کی آوازیں صبح کی گہری خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ وہ آگے گیا تو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ رونا پیٹنا سلمہی کی کوٹھری کے اندر ہو رہا ہے۔

رحیم داد کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بڑھ کر کوٹھری کے دروازے پر پہنچا' اندر داخل ہوا۔ سامنے چارپائی پر سلمہی کا بیٹا منددوں بے جان پڑا تھا۔ اس کے مردہ جسم پر میلی سی چادر پڑی تھی۔ سلمہی اس کے سرہانے چارپائی کی پٹی سے سر لگائے بین کر رہی تھی۔ چارپائی کے اردگرد چند عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ وہ بھی رو رہی تھیں۔ رک رک کر سینے پر ہاتھ مارتیں اور دل گرفتہ ہو کر "ہائے ہا' ہائے ہا!" کی صدائیں بلند کرتیں۔ کوٹھری میں عود و لوبان کا دھواں لہرا رہا تھا۔ فضا دھندلی اور افسردہ تھی۔

سلمہی نے گردن اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ چہرہ اجڑا اجڑا تھا۔ بال بکھر کر منہ پر آ گئے تھے۔ بدن پر وہی لباس تھا جسے پہن کر وہ پچھلی رات سردار مراد خاں شاہانی کے پاس آئی تھی۔ البتہ اس کا گلابی دوپٹہ ایک طرف پڑا تھا۔ سر برہنہ تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے کھوئی کھوئی نظروں سے رحیم داد کو دیکھتی رہی۔ پھر سینے پر دوہتڑ مار کر بین کرنے لگی۔

"سئیں! میں لٹ گئی' میرا منددوں گزر گیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ ڈائن موت اسے رات ہی کو اپنے ساتھ لے گئی۔ میں سویرے لوٹی تو وہ مرا پڑا تھا۔ سئیں! میں شامت دی ماریا' آخری گھڑی اس سے مل بھی نہ سکی۔ میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکی۔" اس نے بے بسی سے گردن ادھر ادھر ہلائی۔ "وہ یہاں اکیلا تھا۔ کوئی پانی پلانے والا بھی نہ تھا۔"

سلمہی رک رک کر بین کر رہی تھی۔ قریب بیٹھی ہوئی عورتیں اس کے ساتھ ساتھ بین کرتیں۔ سینے پر بار بار ہاتھ مار کر "ہائے ہا!" کی صدا بلند کرتیں۔ سلمہی بین کرتے کرتے بے قرار ہو کر چیختی۔ "ہائے ربا! میں کیہ کراں۔ میں لٹ گئی۔ میرا سارا ختم ہو گیا۔" اس نے تڑپ کر اپنا سر چارپائی پر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رحیم داد قریب گیا اور سلمہی کا سر آہستہ آہستہ تھپک کر بولا۔ "صبر کر سلمہی! صبر کر' رب کی یہی مرضی تھی۔" اس کا دل بھر آیا' آنکھیں چھلک پڑیں' آنسو پلکوں سے بہہ کر رخساروں پر ٹپکنے لگے۔ وہ کچھ دیر میت کے نزدیک خاموش کھڑا آنسو بہاتا رہا۔ پھر اس نے آنسو پونچھے مڑا اور کوٹھری سے نکل گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مراد خاں شاہانی کے کمرے میں پہنچا۔ مراد خاں نہایت اطمینان سے ناشتا کر رہا تھا۔ رحیم داد کرسی کھسکا کر قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "شاہانی! تیری سلمہی کا پتر مر گیا۔"

"مجھے پتہ ہے۔" وہ تلے ہوئے مرغ کا گوشت نوچتے ہوئے بولا۔ "چوہدری! تو سلمہی کی کوٹھری میں کیوں گیا تھا؟" اس کا لہجہ تیکھا تھا اور چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ "تجھے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ تجھے پتہ ہونا چاہیے ہم سردار کمیوں کے پاس اس طرح نہیں جاتے۔" مراد خاں کے رویئے میں اور تلخی پیدا ہو گئی۔ "تو میرا مہمان ہے تجھے اس طرح میری آن اور رتبہ نہیں بگاڑنا چاہیے تھا۔ یہ عزت اور دبدبہ قائم رکھنے کا معاملہ ہے۔ اس کے لیے خود کو بہت اونچا رکھنا پڑتا ہے۔ مزارعوں اور کمیوں کو جتی کے نیچے دبا کر رکھنا پڑتا ہے۔"

رحیم داد حیران و پریشان بیٹھا رہا۔ سردار مراد خاں تیزی سے بولتا رہا۔ "وڈے اور بزرگ کہہ گئے ہیں۔ سور اور گیدڑ کو گولی مار دو تاکہ وہ فصل خراب نہ کریں۔ مزارعوں اور کمیوں کی گردن سدا نیچی رکھنے کے لیے ان کی رن کو اپنا بستر سمجھو تاکہ وہ فصل پر حق نہ جتائیں۔" اس نے رحیم داد کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "اسی لیے ہمیں ان کی نوجوان رناں اور پالڑیاں اٹھوانی پڑتی ہیں تاکہ ان کی آنکھ اونچی نہ ہو۔ ان سے الگ اور دور رہنا پڑتا ہے تاکہ وہ سر نہ چڑھیں۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رحیم داد اس کے غصے سے مرعوب ہو کر معذرت کے انداز میں بولا۔ "سچی بات یہ ہے' تو سردار ہے' وڈا جاگیر دار ہے۔ میں تیرے سامنے معمولی زمیں دار ہوں' مہاجر بھی ہوں۔ میں تو ان باتوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" مراد خاں بھی نرم پڑ گیا۔ اس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تجھے پتہ نہیں' مجھے بھی سلمہی کے پتر کے مرن کا رنج ہوا۔ پر کیا کیا جائے۔ رب کی یہی مرضی تھی۔" اس نے تولیا اٹھا کر ہاتھ پونچھے۔ "میں نے آدھ گھنٹہ پہلے سلمہی کو بلایا تھا' اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ دلاسا دیا تھا' حوصلہ بڑھایا تھا۔ سو روپے بھی دیئے۔"

رحیم داد اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے نہ مداخلت کی نہ کسی فوری ردعمل کا اظہار کیا۔ مراد خاں نے ہاتھ پونچھ کر رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! تو بھی فٹافٹ ناشتا کر لے بھکر واپس جانا

ہے۔ تجھے بھی ساتھ ہی چلنا ہے۔"

"کیا آج بھکر جانا ضروری ہے؟" رحیم داد نے انکتے ہوئے پوچھا۔

"بہت ضروری ہے۔ ملتان سے میرا یار مرشد علی گردیزی آیا ہے۔ وہ کل رات ہی بھکر پہنچا ہے اور میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ملتان لے جائے گا۔ اس کی بہن کا پرنا ہے۔ اس میں مجھے شرکت کرنا بہت ضروری ہے۔"

"کیوں بہت ضروری ہے؟" رحیم داد نے بے خیالی میں پوچھ لیا۔

سردار مراد خاں شاہانی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "سن چوہدری! تجھے پتہ نہیں۔ مرشد کا ... ملتان کے گدی نشینوں میں سے ہے۔ اس کا ایک شریکا بھی وزیر لگا ہے' وہ بھی آئے گا۔ اس کے ساتھ دوسرے وزیر اور وڈے سرکاری افسر بھی آئیں گے۔ ان سب سے وہاں ملنا جلنا ہوگا۔ وزیروں اور افسروں سے میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ زمیں داری چلانے میں ان سے بہت کام ... ہے۔" اس نے رحیم داد کا ہاتھ تھام کر ہولے سے دبایا۔ "تجھے بھی ملتان لے چلوں گا۔ سب سے تجھے ملواؤں گا۔ چوہدری! ایسا موکع روز روز نہیں ملتا۔"

"تیرے ساتھ میں ضرور ملتان چلوں گا۔" رحیم داد نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "یہ تو سوچ' سلطو ہی کا پتر آج ہی مرا ہے۔ وہ بڑی بہت چہیتی اور پرانی رکھیل ہے۔ تیرے اس طرح چلے جانے پر اسے بہت دکھ ہوگا۔ تیرے بارے میں وہ کیا سوچے گی؟"

"تو اس کی فکر نہ کر۔" مراد خاں شاہانی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "چند روز میں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی۔ پہلے کی طرح مسکراتی' چہکتی' بل کھاتی رات کو میرے پاس آئے گی۔ تو اسے نہیں جانتا۔ میکوں پتہ ہے' وہ میری کسی گالھ کا ذرا برا نہیں مناتی۔ وہ مجھ سے کبھی روٹھ نہیں سکتی۔" اس نے ہلکا قہقہہ بلند کیا۔ "بس ذرا کمر پر ہاتھ پھیرا' گلے لگا کر پیار سے کہا 'ہائے جدجانی!' او ایک دم موم کی طرح پگھل جاتی ہے۔ خوشی سے ایسی مست ہو جاتی ہے جیسے پھول کھلتا ہے۔ میں اسے بہت ٹھیک طرح جانتا ہوں۔ برسوں سے میرے پاس ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کون جان سکتا ہے۔"

"ویسے جیسی تیری مرضی۔ میں چاہتا تھا تو ایک روز یہاں ٹھہر جاتا تو ٹھیک تھا۔" رحیم داد نے اسے روکنے کے لیے دبی زبان سے اصرار کیا۔

"چوہدری! میرے یہاں ٹھہرنے سے کیا ہوگا۔" مراد خاں شاہانی رضامند نہ ہوا۔ "راودھانی موجود ہی رہے گا۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے' گور کفن کا بندوبست کر دے۔ وہ سارا کام ٹھیک ٹھاک

طور سے کرا دے گا۔ تجھے پتہ ہے وہ کتنا ہوشیار بندہ ہے۔" اس نے گردن اونچی کی اور ذرا پھیل کر بیٹھ گیا۔ "چوہدری! اطمینان رکھ۔ سلطو ہی کے پتر کا کفن دفن پوری شان سے ہوگا۔ غریب غربا کو روٹی کھلائی جائے گی۔ مندر جھوڑوے چاول ہوں گے' کل ہوگا' فاتحہ ہوگی۔ جمعراتیں ہوں گی۔ سب ہی کچھ ہوگا اور میری طرف سے ہوگا۔" اس نے مسکرا کر رحیم داد کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "چوہدری! تجھے پتہ ہے' میں سلطو ہی کو کتنا پیار کرتا ہوں۔ وہ میری چہیتی ذال ہے۔"

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد ناشتا آ گیا۔ رحیم داد نے بے دلی سے ناشتا کیا اور جلد ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ خاصا افسردہ اور دل گرفتہ تھا۔ لیکن شاہانی اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کا نام و نشان نہ تھا۔

پہر دن گزرا۔ سورج چڑھ کر آسمان کی بلندی پر پہنچا۔ مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور اس کے ہم راہ حویلی کے پھاٹک پر پہنچا۔ دونوں جیپ میں سوار ہو گئے۔ حویلی کے پچھواڑے سلطو ہی کی کوٹھری میں پٹی ہو رہی تھی۔ رونے اور بین کرنے کی دل دوز آوازیں ابھر رہی تھیں۔

جیپ آگے بڑھی۔ رحیم داد اور سردار مراد خاں رونے اور بین کرنے کی دل دوز آوازیں دور تک سنتے رہے۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ جیپ ہچکولے کھاتی' گرد کے بادل اڑاتی گاؤں کے کچے راستے پر دوڑتی رہی۔ رونے پیٹنے کی آوازیں پیچھے رہ گئیں۔ جیپ پختہ سڑک پر آ گئی اور تیز رفتار سے بھکر شہر کی جانب دوڑنے لگی۔

☆

مرشد علی گردیزی حویلی کے چوک ہی میں مل گیا۔ مراد خاں شاہانی کو دیکھتے ہی دوڑ کر گلے سے لپٹ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگے ہوئے خاصی دیر تک جوش و مسرت سے قہقہے لگاتے رہے' گلے شکوے کرتے رہے۔ پھر ہنستے مسکراتے بیٹھک کی جانب بڑھے۔ رحیم داد بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ مراد خاں نے مرشد علی کا تعارف کراتے ہوئے رحیم داد کو مخاطب کیا۔

"چوہدری! یہ مرشد گردیزی میرا بہت پرانا یار ہے۔ جب میں لہور میں پڑھتا تھا۔ یہ میرا کلاس فیلو ہوتا تھا۔ ہم اکٹھے ہوسٹل میں رہتے تھے۔"

"اور اکٹھے ہی چھپ چھپ کر کنجریوں کے پاس ہیرا منڈی بھی جاتے تھے۔" گردیزی نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "پر اس نے پرنا پہلے کر لیا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔"

مراد خاں نے بھی زور کا قہقہہ بلند کیا۔ رحیم داد کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مرشد! یہ چوہدری نور الٰہی ہے۔ ننگری کا وڈا زمیں دار ہے۔ احسان شاہ کی حویلی میں' پہلی بار اس سے ملا تھا۔ تب سے ایسی یاری ہو گئی کہ اب تو یہ میرا جگری یار ہے۔"

مرشد علی نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا' گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔ "چوہدری! تو مراد کا یار ہے تو آج سے میرا بھی یار بن گیا۔" اس نے بات کا رخ موڑ کر اچانک مراد خاں کو مخاطب کیا۔ "یار شاہانی! آج تک احسان شاہ سے تیری یاری کا راز سمجھ نہیں آیا۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ "خدا جھوٹ نہ بلوائے' وہ عمر میں لگ بھگ تیرے پیّو کے برابر ہو گا۔ تیری اس کے ساتھ کیسے یاری ہو سکتی ہے؟"

"تو اس راز کو نہیں جانتا۔" مراد خاں نے صاف گوئی سے بتایا۔ "وہ عمدہ اسکاچ وہسکی پلاتا ہے اور سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس کے کوٹ میں ایک سے ایک زور دار اور پوپٹ رن ہے۔ خود تو عیش کرتا ہی ہے پر یاروں کو کرا کے زیادہ خوش ہوتا ہے۔"

"تو اس سے کہاں ٹکر گیا؟" مرشد علی شاہ گردیزی نے پوچھا۔ "پہلے تو تیری اس سے یاری نہیں تھی۔ سال سوا سال سے سن رہا ہوں تو اس کے پاس بہت جانے لگا ہے۔ کئی کئی روز اس کی حویلی میں ٹھہرتا ہے۔ یہ چکر کیا ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے سیں! شاہ جی کا ایک جنوائی سی ایس پی افسر ہے۔ وہ ضلع میانوالی میں ڈپٹی کمشنر لگا ہے اور میرا ایک کام اس سے اٹکا ہے۔ اس چکر میں شاہ جی سے ملنا پڑا۔ نواب زادہ نیاز محمد خاں کو تو جانتا ہی ہے۔ وہی اپنا کالا باغ والا۔ اسی نے شاہ جی سے مجھے ملایا تھا۔" اس نے ہنس کر مرشد علی گردیزی کے زانو پر ہاتھ مارا۔ "پر یہ باتیں میں تجھے پہلے بھی بتا چکا ہوں۔"

"کہاں بتا چکا ہے؟" مرشد علی شاہ نے شکوہ کیا۔ "تجھ سے پچھلے دنوں میرا ملنا جلنا ہی کتنا رہا۔ دو تین بار ملا بھی تو کبھی ٹھیک سے بات نہیں ہوئی۔ تو نے ہر بار ملتان آنے اور میرے ساتھ کچھ دن گزارنے کا وعدہ بھی کیا پر کبھی آیا نہیں۔"

"اب تو تیرے ساتھ ملتان چل ہی رہا ہوں۔ روز ہی مل بیٹھیں گے' جی کھول کر باتیں ہوں گی۔ پرانی یادیں تازہ ہوں گی۔"

نوکروں نے بیٹھک ہی میں کھانا لا کر میز پر چن دیا۔ تینوں نے کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مراد خاں اور مرشد علی شہر چلے گئے۔ رحیم داد زینہ طے کر کے اوپر کی منزل کے اس کمرے میں چلا گیا جس میں اس کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مرشد علی گردیزی کا کمرہ برابر ہی تھا۔

شام کو پینے پلانے کا دور چلا۔ مرشد علی گردیزی اور رحیم داد کے درمیان جو حجاب اور تکلف تھا

وہ چند ہی پیگ لگانے کے بعد دور ہو گیا۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ مراد خاں زیادہ دیر ان کے ساتھ نہ بیٹھ سکا۔ ساڑھے آٹھ بجے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے ٹوکا۔ "کہاں چلا شاہانی؟"

"چوہدری! میں نے اب اندر جانا ہے۔" مراد خاں شاہانی نے سنجیدگی سے کہا۔ "گردیزی تو تیرے ساتھ بیٹھا ہی ہے۔"

"کچھ دیر اور ٹھہر جاتا تو ٹھیک تھا۔" رحیم داد نے اصرار کیا۔ "چلا جانا' ابھی تو بہت رات پڑی ہے۔"

"نہیں! اب میں نہیں ٹھہر سکتا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "اپنی ذال انتظار کر رہی ہے۔ ۲۵ روز بعد لوٹا ہوں۔ کچھ اس کا بھی تو حق ہے۔"

"جا یار جا۔" مرشد علی نے ہنس کر بے تکلفی سے کہا۔ "چوہدری! اسے جانے دے۔ اس نے اب نہیں رکنا۔"

مراد خاں شاہانی چلا گیا۔

ذرا دیر خاموشی رہی۔ مرشد علی نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا اور مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! تجھے پتہ نہیں' شاہانی اپنی گھر والی سے بہت ڈرتا ہے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں جی' وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "اور کسی زنانی سے تو وہ ڈر ہی نہیں سکتا۔ گھر والی تو صرف بچوں کی ماں ہوتی ہے۔ اس سے کیا ڈرنا شرنا۔"

"پر شاہانی کی گھر والی کی بات ہی دوسری ہے۔" مرشد علی گردیزی نے نشے میں لہرا کر رحیم داد کو گہری نظروں سے دیکھا۔ "وہ وڈی جاگیردارنی بھی ہے۔ اسے ترکے میں بہت وڈی جائیداد ملی ہے۔" وہ کچھ زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ قہقہہ لگا کر بولا۔ "ایسی گھر والی سے تو ڈرنا ہی پڑتا ہے۔"

"یہ تو میں نوں پتہ نہیں تھا۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"تجھے تو یہ بھی پتہ نہ ہو گا کہ شاہانی اس کا دوسرا خصم ہے۔ دہیج میں ایک آگوایا بھی ساتھ لائی ہے۔" مرشد علی پر نشہ تیزی سے چڑھا تھا۔ بار بار زور کا ریلا آتا۔ اس کی جھونک میں وہ رحیم داد سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا۔ شاہانی کی نجی زندگی کے بارے میں کھل کر بات کرنے لگا۔ "اس کا پہلا خصم بہت وڈا جاگیردار ہوتا تھا۔ وہ گھوڑی سے گر کر مر گیا۔ اس کے مرن کے بعد ساری جائیداد اور زمیں داری گھر والی اور اس کے اکلوتے پتر کو ملی۔"

"اس کی زمیں داری بھی بیٹ میں ہے؟" رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے

دریافت کیا۔

"نہیں!" مرشد علی گردیزی نے جواب دیا۔ "تواں کوٹ میں اس کے مربعے ہیں۔ باغات ہیں۔ ان کی دیکھ بھال شاہانی کا سالا کرتا ہے۔ پر اب تو اس جائیداد اور اراضی کا مالک بھی مراد ہی ہے۔"

مرشد علی گردیزی نے نشے میں جھوم کر قہقہہ لگایا۔ "اسی بکیر کے چکر میں تو مراد کے پیئو نے اس سے پرنا کر دیا حالانکہ عمر میں بھی وہ وڈی تھی اور ایک پتر کی ماں بھی تھی۔ یہ جائیداد اور بکیر بھی بہت ظالم ہوتی ہے۔"

"یہ باتیں تو شاہانی نے مجھے کبھی بتائی ہی نہیں۔" رحیم داد بدستور حیرت زدہ تھا۔

"ایسی باتیں کہیں بتانے والی ہوتی ہیں۔ سئیں چوہدری! تونے بھی حد کر دی۔" وہ رحیم داد کی سادہ لوحی پر ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "مجھے تو اس لیے معلوم ہیں کہ مراد کے پرنے میں شریک ہوا تھا۔ ویسے میں اس کی ذال کے پہلے کھسم کو بھی جانتا تھا۔" مرشد علی نے گردن بڑھا کر سرگوشی کی۔ "تجھے راز کی ایک گالہہ بتاؤں۔ شاہانی سے اب تک اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں۔ ایک کی ہوئی تھی۔ بچپن ہی میں مرگئی۔ اب تو پہلے ہی کھسم کا پتر رہ گیا ہے۔ اسے کا نام محمد سلمان خاں ہے۔ اچھا گبھرو جوان ہے۔ بالکل اپنے پیئو پر گیا ہے۔ وہ جڑیا اور تکڑا جوان ہوتا تھا۔"

رحیم داد نے ہنس کر تبصرہ کیا۔ "تب ہی تو شاہانی نت نئی زنانیوں کے چکر میں رہتا ہے۔"

"چوہدری! ویسے یہ انوکھی گالہہ نہیں۔ سارے ہی وڈے زمیں دار اور بکیر دار اسی چکر میں رہتے ہیں۔ گھر والیاں بھی سب کچھ جانتی ہیں پر انھیں پتہ ہوتا ہے کہ جائیداد کی اصلی مالکن وہی ہوتی ہیں۔ انھی کی اولادیں جائیداد کی وارث بنتی ہیں۔ یہ حق ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

مرشد بہکنے کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔ "یار چوہدری! اپنے بادشاہ اور شہنشاہ بھی تو حرم رکھتے تھے۔ ان میں چھانٹ چھانٹ کر ایک سے ایک خوبصورت اور پوپٹ کنیزیں رکھتے تھے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "عیش کرتے تھے جی۔ جب چاہتے تھے اور جسے چاہتے تھے اس کے ساتھ سوتے تھے۔ انھیں کوئی روکنے والا یا منع کرنے والا تو ہوتا نہیں تھا۔ پر ملکہ 'ملکہ ہی ہوتی تھی۔ تخت و تاج اسی کے پتر سنبھالتے تھے۔ اسی سے ان کی نسل چلتی تھی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بالکل ٹھیک کہہ رہا۔" رحیم داد بھی نشے کے ایک زوردار ریلے میں بہہ گیا۔ "اس معاملے میں اپنا مراد خاں بھی کسی بادشاہ سے کم نہیں۔ اسے تو روز نئی رن چاہیے۔"

"پر شاہانی کچھ زیادہ ہی رناں کے چکر میں رہتا ہے۔ میں نے اوروں سے بھی سنا ہے 'اب وہ بہت رن رسیا ہو گیا ہے۔"

رات گزرتی رہی۔ مے نوشی کا دور چلتا رہا۔ بات سے بات نکلتی رہی۔ شاہانی سے ہٹ کر بات سیاست پر آ گئی۔ رحیم داد کو سیاست کے بارے میں کوئی شدبد نہیں تھی۔ مگر مرشد علی شاہ سیاسی جوڑ توڑ سے خاصا باخبر تھا۔ وہ ملک کے سیاسی حالات کے بارے میں ایسی باتیں سناتا رہا جو رحیم داد کے لیے نئی تھیں اور حیرت انگیز بھی۔

دونوں نے جم کر پی۔ کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں جا کر بستر پر لیٹ گئے۔

دوسرے روز دوپہر کو ملتان جانے کا پروگرام تھا۔ مگر صبح کی ٹرین سے اچانک مراد خاں کی بیوی کا پچھلگ یا اگوایا محمد سلمان خاں آ گیا۔ وہ انیس بیس سال کا خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ گورڈن کالج، راولپنڈی میں پڑھتا تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔ دو ہفتے کی چھٹی پر بھکر آیا تھا۔ اس کے پہنچنے کے بعد مراد خاں کا پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ وہ ملتان نہیں جا سکا۔ اس نے مرشد علی گردیزی کو بھی روک لیا۔ مراد خاں کا بیشتر وقت سلمان کے ساتھ گزرتا۔ وہ اسے بہت چاہتا تھا۔ اس کی بڑی نازبرداری کرتا۔ اس کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھتا۔

مرشد علی اور رحیم داد ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے۔ دونوں شام کو دیر تک بیٹھتے، شغل بادہ نوشی کرتے اور ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کرتے۔ شاہانی ان کی صحبت میں کم ہی وقت گزارتا۔ پہر رات گزرتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ چار روز گزر گئے۔ مرشد علی کے لیے بہن کی شادی کے باعث زیادہ قیام کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے بار بار اپنی مجبوری کا مراد خاں سے اظہار کیا۔ اس کے زور دینے پر پانچویں روز مراد خاں اور رحیم داد شام کی ٹرین سے مرشد علی گردیزی کے ہم راہ ملتان روانہ ہو گئے۔

☆

ملتان میں دو روز ٹھہرنے کے بعد مرشد علی سویرے سویرے مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کو قاسم بیلہ لے گیا۔ وہاں اس کی زمینیں تھیں۔ آم اور مالٹے کے باغات تھے۔ چند میل کے فاصلے پر دریائے چناب بہتا تھا۔ اس کے کنارے گھنے جنگل تھے جن میں مرشد علی کی اپنی شکارگاہ بھی تھی۔ قاسم بیلہ میں اس کی ایک حویلی بھی تھی۔ اسی میں تینوں کے قیام کا بندوبست کیا گیا۔

رات گزری، صبح ہوئی۔ مراد خاں اور مرشد علی شکار کھیلنے نکل گئے۔ رحیم داد نہیں گیا۔ اسے شکار سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ طبیعت بھی کچھ مضمحل تھی۔ پچھلی رات بہت زیادہ شراب پی گیا تھا۔ اس کا خمار ابھی تک باقی تھا۔ سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ اس نے گرم پانی سے غسل کیا۔ لسی کے کئی گلاس چڑھائے لیکن خمار اور ہینگ اوور میں کمی نہ آئی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر رحیم داد باغ میں چلا گیا۔ باغ حویلی کی چار دیواری کے اندر ہی تھا۔ خاصا وسیع بھی تھا۔ اس میں پھلوں کے درخت تھے۔ رات کی رانی اور چنبیلی کے بیلوں سے مہکتے ہوئے فرحت افزا کنج تھے۔ گلاب کے پودے کثرت سے تھے اور قسم قسم کے تھے۔ ان کے چمن بندی سلیقے اور نفاست سے کی گئی تھی۔ سرما کی ہلکی ہلکی دھوپ میں گلاب کے شگفتہ پھول مہک رہے تھے۔ ان کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے جھل ملا رہے تھے۔

رحیم داد کو باغ بہت پسند آیا۔ وہ سبزہ زار میں پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور دھوپ سے لطف اندوز ہونے لگا مگر وہ زیادہ دیر باغ میں نہ بیٹھ سکا۔ طبیعت بے مزہ ہو رہی تھی۔ سر چکرا رہا تھا اور آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ وہ کمرے میں گیا اور بستر پر سو گیا۔

دوپہر کو وہ سو کر اٹھا۔ ایک بار پھر خوب گرم پانی سے غسل کیا۔ اب اسے کچھ قرار آیا۔ وہ فرحت اور تازگی محسوس کرنے لگا۔ اس نے کھانا کھایا اور مرشد علی کے مینیجر خادم علی جویا کے ہم راہ کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ خریف کی فصل کی کٹائی ہو چکی تھی۔ کھیتوں میں جگہ جگہ مکئی اور کماد کے کٹے ہوئے پودوں کے مہارے اور ڈھیر لگے تھے۔

دونوں پگڈنڈیوں اور پیہوں سے گزرتے ہوئے کپاس کے کھیتوں میں چلے گئے۔ کپاس کی فصل بہت اچھی تھی۔ اس کی کاشت بہت بڑے رقبے پر کی گئی تھی۔ سورج بیچ آسمان سے گزر کر تھوڑا سا مغرب کی طرف ڈھلک گیا تھا۔ دھوپ میں تمازت آگئی تھی۔ کپاس کے پودوں میں روئی کے سفید سفید گالے ڈوڈوں سے پھوٹ کر باہر جھانک رہے تھے۔ یہ پھٹی تھی۔ سرائیکی میں اسے ونواڑ بھی کہا جاتا ہے۔ اجلی اجلی ونواڑ کھیتوں میں حد نظر تک پھیلی ہوئی تھی، سورج کی چمکیلی اور ترچھی کرنوں میں جھلکتی نظر آ رہی تھی۔ کپاس کے پودے دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ ونواڑ کی چنائی بہت پہلے شروع ہو چکی ہے۔

اس وقت بھی نوجوان چوگی عورتیں اور لڑکیاں ٹولیاں بنائے کھیتوں میں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ونواڑ کی چنائی کر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے دوپٹے پیشانی سے سر تک لپیٹ کر پیچھے کر لیے تھے اور ان کے دو پلو کمر کے گرد باندھ رکھے تھے۔ وہ انگلیوں سے ونواڑ چنتیں اور دائیں بائیں کر کے پیچھے ڈالتی جاتیں۔ ان کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے، چہروں پر پسینے کے قطرے جھل ملا رہے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہی تھیں اور ونواڑ کی چنائی کے گیت گا رہی تھیں۔ رحیم داد جب خادم علی جویا کے ہم راہ چوگیوں کے قریب سے گزرا تو انھوں نے نظریں اٹھا کر دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ ونواڑ چن چن کر دائیں بائیں تیزی سے اڑس رہی تھیں اور ہنس ہنس کر گا رہی تھیں۔

ملک تاں تیڈا یار ہے، تو کیوں میر ہنڈیں بولیاں
موسم آئی ونواڑ دی چڑیاں کملیاں بھولیاں

خادم علی جویا گیت کے بول سن کر مسکرایا۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔ "سیں چوہدری! تو ملتانی سمجھتا ہے؟"

"کچھ زیادہ نہیں جانتا جی!"

جویا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ چوگیاں تجھے دیکھ کر آپس میں چھیڑ چھاڑ کر رہی ہیں۔ ایک دوسرے سے کہہ رہی ہیں، زمیں دار تیرا یار ہے۔ تو مجھے کیوں طعنے دیتی ہے۔ کپاس چننے کا موسم آگیا ہے۔ بھولی بھالی نیاریں کپاس چن رہی ہیں۔ ان بولوں کا یہی مطلب ہے۔" اس بے تکلفی سے قہقہ لگایا۔

رحیم داد مسکرایا، اس نے چوگیوں کی جانب دیکھا۔ وہ گا رہی تھیں، ہنس رہی تھیں اور ونواڑ چننے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دونوں کپاس کے کھیتوں کے درمیان گزرتی ہوئی ایک پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ کچھ دور جانے کے بعد رحیم داد کپاس کی چنائی کرنے والی ایک چوگی کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔ رحیم داد نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ شاداں تھی۔ ہاں وہی تھی۔ وہی کسا ہوا سڈول جسم، وہی قلیچے جھگے سے جھانکتا ہوا ابھرا ابھرا سینہ۔ وہی بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔

شاداں کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اور دھوپ میں اجلے تانبے کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کے بالوں میں پھٹی کے ریشے الجھے ہوئے تھے۔ لمبی لمبی پلکوں پر خاک کے ذروں کی تہہ نظر آ رہی تھی۔ وہ انگلیوں سے پھٹی چنتی، چوگیوں کے غول سے نکل کر کبھی اس پودے پر جاتی کبھی اس پر۔ اس کے چہرے پر نہ شوخی تھی نہ اس کے انداز میں چلبلا پن تھا۔ وہ نظریں جھکائے محویت سے چوگیوں کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر گا رہی تھی۔

روزی دے کھاطر وطن سیٹو سے
ملک بگانے ان ولیوں سے
غربت دی مانگ
دلبر دی تانگ
تیراں دی وانگ
دیس دیس وچ پیٹ دی کھاطر در در عزتاں رولیاں

خادم علی جویا نے شاداں کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد کو بتایا۔ "سیں! اس کا نام شاداں ہے۔ یہ گا نہیں رہی۔ گیت کے بولوں میں اپنے دل کا حال بیان کر رہی ہے۔ یہ کہہ رہی ہے۔

میں نے روزی کے لیے وطن چھوڑا

اب پرائے دیس میں ماری ماری پھرتی ہوں

غربت کی برچھی ہے

دل بر کا انتظار ہے

دونوں ہی تیر کی طرح چھیدتے ہیں

پیٹ کی خاطر دیس بدیس ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ عزت اور لاج خاک میں ملا دی ہے۔

رحیم داد نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ خادم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "سیں! یہ بھی تیرے ہی ضلعے کی رہنے والی ہے۔ پچھلے کئی مہینوں سے ادھر آئی ہے۔ بہت محنتی اور جفاکش چوگی ہے پر اتنی ہی کڑوی اور سرکش بھی ہے۔" وہ ایک آنکھ دبا کر شوخی سے مسکرایا۔ "سونہڑی اور پوپٹ رن ہے پر جنگلی گھوڑی کی طرح بدکتی ہے۔" رحیم داد نے خادم علی جویا کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ چپ چاپ چلتا رہا۔

شاداں نے ناگاہ نظریں اٹھا کر رحیم داد کی طرف دیکھا اور ایک ٹک دیکھتی رہی۔ وہ بالکل رحیم داد کے سامنے تھی۔ دونوں کے درمیان صرف کپاس کے چند پودے حائل تھے۔ رحیم داد نے جھٹ نظریں گھمائیں اور گردن اٹھائے جویا کے ہم راہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ شاداں کو دیکھ کر اسے لالی یاد آگیا اور وہ دن یاد آگئے جب وہ جیل میں اس کے ساتھ تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی جیل سے فرار ہوا تھا۔ گرفتاری کے ڈر سے ویرانوں اور جنگلوں میں چھپتا پھرتا تھا۔ ان یادوں کی یلغار نے اس کے ذہن میں کھلبلی مچا دی۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا۔ حویلی میں واپس آگیا۔

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا مگر مرشد علی شاہ اور مراد خاں نہیں آئے۔ ڈیرے کے ایک دالان میں چوگیاں پھٹی کی گٹھڑیاں سنبھالے بیٹھی تھیں۔ رحیم داد بھی ایک کرسی پر الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ تین چار کارندے فرش پر بیٹھے تھے۔ وہ خادم علی جویا کی ہدایت کے مطابق چوگیوں کو ان کی چگائی کے حصے کی پھٹی دے رہے تھے۔

چنائی شروع ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ مگر ہر چوگی نے اچھی مقدار میں پھٹی چنی تھی۔ قاعدے کے مطابق چنائی کے ابتدائی دنوں میں ہر چوگی کو اس کی چنی ہوئی پھٹی یا ونواڑ کا سولھواں

حصہ دیا جاتا ہے۔ بعد میں گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ کپاس کے کھیتوں میں جوں جوں ونواڑ کم ہوتی جاتی ہے چگائی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چوگیوں کو چنی ہوئی ونواڑ میں سے آٹھواں، یہاں تک کہ چھٹا حصہ ملنے لگتا ہے۔

ہر چوگی باری باری آتی، اپنی گٹھڑی کھول کر ونواڑ سامنے ڈالتی۔ کارندے بارہ حصے کرتے اور ایک حصہ چوگی کو چگائی کے طور پر دے دیتے۔ چنائی کے اس مرحلے پر چگائی کی تقسیم اسی طرح مقرر کی گئی تھی۔ حصہ کرتے وقت چوگیاں عام طور پر جھگڑتیں، کارندوں کے خلاف احتجاج کرتیں، جو ڈھیری سب سے بڑی سمجھتیں، اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتیں۔ مگر یہ فیصلہ خادم علی جویا کرتا کہ کس چوگی کو چگائی میں کون سی ڈھیری دی جائے۔ وہ چاہتا تو کسی کو چگائی میں زیادہ ونواڑ دے دیتا کسی کو کم۔

دالان میں چوگیاں چائیں چائیں کر رہی تھیں۔ اونچی آواز سے بول رہی تھیں۔ لڑنے جھگڑنے کے ساتھ قہقہے بھی لگا رہی تھیں۔ جویا انہیں بار بار ڈانٹتا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش بھی ہو جاتیں لیکن پھر شور مچانا شروع کر دیتیں۔ چوگیوں میں شاداں بھی تھی۔ ابھی اس کی باری نہیں آئی تھی۔ وہ ایک کونے میں دیوار سے پیٹھ لگائے چپ بیٹھی تھی۔ قریب ہی اس کی ونواڑ سے بھری ہوئی گٹھڑی رکھی تھی۔ وہ نڈھال اور تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد اکتا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مہمان سرا کی طرف بڑھا جو ڈیرے ہی کے ایک حصے میں تھی۔ ڈیرے میں بھی مہمان ٹھہرتے تھے مگر مہمان سرا میں سرکاری افسر اور بڑے زمیں دار ٹھہرائے جاتے تھے۔ اس کے کمرے کشادہ تھے۔ بستر اور فرنیچر بھی عمدہ تھا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں گیا اور تھکا ہوا سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مرشد علی اور مراد خاں ہنوز شکار سے نہیں لوٹے تھے۔

کمرے کے باہر کہرے کا دھندلکا پھیلا تھا۔ رات دبے قدموں در و دیوار سے اتر رہی تھی۔ ڈیرے کے جس حصے میں چوگیوں کو چگائی ادا کی جا رہی تھی، وہاں سے ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ رحیم داد کو کمرے میں آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شاداں دفعتاً اندھیرے سے نکل کر کمرے میں داخل ہوئی اور دہلیز کے پاس پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ وہ احاطے میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ پر منہ دھو کر آئی تھی۔ اس کے چہرے پر پانی کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ کانوں پر پڑی ہوئی لٹیں بھیگی ہوئی تھیں۔

شاداں نے بیٹھتے ہی دوپٹے کے پلو سے منہ پونچھا، مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "لگتا ہے، میں نے تجھے پہلے بھی دیکھا ہے۔"

رحیم داد نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کا چہرہ اب تر و تازہ اور نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ ناک سبک اور ستواں تھی' ہونٹ بھرے بھرے تھے۔ اس کی گول گول سڈول پنڈلیاں سبز لاچے سے جھانک رہی تھیں۔ شاداں اسے دل کش اور طرح دار لگی۔ وہ اس کی نظروں میں اسی روز سما گئی تھی جب اس نے پہلی بار اسے جہانگیرہ میں دیکھا تھا۔

شاداں نے اپنا سر دوپٹے سے ڈھکتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو مجھے اس طرح گھور کیوں رہا ہے؟"

"پہچان نے کی کوشش کر رہا ہوں۔" رحیم داد نے مسکرا کر بات بنائی۔ "یاد تو میں نوں بھی آتا ہے کہ تیں نوں پہلے کہیں دیکھا ہے۔" وہ سوچنے کے انداز میں گردن جھکا کر چند لمحے خاموش بیٹھا رہا' پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر شاداں کی جانب دیکھا۔ "یاد آیا' تو مجھے منٹگمری سٹیشن پر ملی تھی۔ کسی کیدی سے ملنے جا رہی تھی۔" اس نے قدرے توقف سے کہا۔

"میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں لالی سے ملنے جا رہی تھی۔ تو منٹگمری سٹیشن پر ملا تھا پر یہ تو بہت پرانی گل ہے۔ میں تو بھول بھی گئی تھی۔"

"تیں نوں ایک بار دیکھ کر کوئی بھول سکتا ہے۔" رحیم داد نے اسے چھیڑا۔

شاداں کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ وہ شرمانے کے انداز میں فرش پر انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں بناتے ہوئے بولی۔ "لالی بھی جب بہت خوش ہوتا ہے تو یہی کہتا ہے۔"

"یہ لالی کون ہے؟" رحیم داد نے ان جان بننے کی کوشش کی۔

"وہی ہے جسے اس روز ملنے جا رہی تھی۔ ادھر ڈسٹرکٹ جیل میں کید کاٹ رہا ہے۔"

"لالی تیرا کیا لگتا ہے؟"

"کچھ لگتا ہی ہے۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "اسی کے لیے میں کادر آباد چھوڑ کر یہاں آ گئی۔" اس نے رفتہ رفتہ نظریں بلند کیں' رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "اس سے پہلے میں جہانگیرہ میں ہوتی تھی۔ کادر آباد سے ملتان آنے میں جی بہت چکر تھا۔"

"لالی کو جیل کیوں ہو گئی؟" رحیم داد نے بے نیازی سے پوچھا۔

"وہ جی ایسا ہے' پہلے تو اسے چوری چکاری میں سزا ہوئی' فیر جیل سے بھاگا۔ اس کے ساتھ ایک کیدی اور بھی فرار ہوا تھا۔ اس کا ناں رحیم داد تھا۔" وہ بات کہتے کہتے بے تکلفی سے ہنسنے لگی۔

"تجھ سے کچھ ملتا جلتا تھا۔"

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ مگر شاداں نے فوراً صفائی پیش کی۔ "وہ تو جی کب کا مر گیا۔ کسی نے اسے کتل کر دیا تھا۔ سنا ہے پرانی دشمنی تھی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ادھر لالی کی پولیس کے ساتھ گولی چلی۔ زخمی ہوا' پکڑا گیا۔"

"تب تو اسے لمبی سزا ہوئی ہو گی۔"

"زیادہ لمبی نہیں ہوئی۔" شاداں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "منٹگمری کا مجسٹریٹ لالی کو جانتا تھا۔ اس نے بہت کم سزا دی۔ ویسے میں نے اس کے مکدمے میں وکیل بھی تگڑا کیا تھا۔ ہر پیشی پر خود عدالت میں جاتی تھی۔"

"ایک گل پوچھوں شاداں!" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "سچ سچ بتانا۔"

"پوچھ' کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

"یہ جتا لالی چور اچکا ہے' نمبری بدمعاش ہے' جیل بھی کاٹ رہا ہے۔ تب بھی تو اس سے اتنا پیار کرتی ہے کہ اس کے لیے گھربار چھوڑ کر یہاں آ گئی۔"

"پہلے تو جی وہ بالکل چنگا نہیں لگتا تھا۔" شاداں نے صاف گوئی سے بتایا۔ "فیر جانے کیوں اس سے اتنا پیار ہو گیا۔" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "پر اب تو اس نے مجھ سے پکا وعدہ کر لیا ہے کہ بالکل چوری چکاری نہیں کرے گا۔ لگتا بھی ہے کہ اب وہ ایسا نہیں کرے گا۔"

"تیں نوں کیسے اندازہ ہوا وہ چوری چکاری کی پرانی عادت چھوڑ دے گا؟ یہ بات بالکل سمجھ نہیں آئی۔"

"سمجھ آ بھی نہیں سکتی' پر میں اسے سمجھتی ہوں۔" شاداں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "اب کی دیکھو' پچھلے دنوں چناب میں زبردست سیلاب آیا۔ بھکری سے آگے لوپ بند ٹوٹ گیا۔ بہت تباہی ہوئی۔ کئی پنڈ بالکل پانی میں ڈوب گئے۔ جیل سے کیدی بند کی مرمت کرنے بھیجے گئے۔" اس نے رحیم داد کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ "میں نے کیدیوں کو بند پر کام کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دن رات زبردست کام ہوتا تھا۔ کئی کیدی رات کے اندھیرے میں نکل بھاگے۔"

"لالی بھی بھاگنے والوں کے ساتھ نکل گیا ہو گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"نہیں۔" شاداں نے انکار میں گردن ہلائی۔ "بھاگنے والے کیدیوں نے لالی سے اپنے ساتھ چلنے کو بہت کہا' پر وہ اس چکر میں نہیں پڑا' بند پر محنت سے کام کرتا رہا۔" اس نے فخر سے گردن

اونچی کی۔ "جیل کا وڈا افسر اتنا خوش ہوا کہ اس نے لالی کی سزا میں کمی کر دی اور اب تو اسے چٹھی بھی مل گئی ہے۔ میں ہر ملاقات کے دن اسے ملنے سویرے سویرے جیل کے پھاٹک پر پہنچ جاتی ہوں۔"

"لگتا ہے تجھے لالی سے بہت زیادہ پیار ہے۔"

"وہ بھی تو جی مجھے اتنا ہی پیار کرتا ہے۔" شاداں نے نظریں جھکا کر بتایا۔ "مجھے دیکھتے ہی خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ تجھ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔"

"کب تک تیرا لالی چھوٹ جائے گا؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔ اس کے چہرے پر خوف اور پریشانی کے سائے پھیلنے لگے۔

"سال بھر سے کچھ اوپر رہتا ہے۔" شاداں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ بھی گزر ہی جائے گا جی۔ سزا میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔ لالی یہی بتاتا ہے۔"

رحیم داد اس اطلاع سے زیادہ پریشان نہیں ہوا۔ لالی کے فوری طور پر رہا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مگر وہ لالی سے خائف ضرور تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ لالی اس کے ساتھ جیل میں اور جیل سے فرار ہونے کے بعد بھی اتنی زیادہ مدت تک رہا ہے کہ اس کی تیز نظریں اسے پہچان سکتی ہیں۔ لالی اس حیثیت سے اب اس کے لیے سنگین خطرہ بن گیا تھا۔ رحیم داد لالی کے بارے میں سوچنے لگا۔

"تو کس سوچ میں پڑ گیا؟" شاداں نے اسے ٹوکا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "یہ بتا تو میرے پاس کیسے آئی؟ تو نے پچھی چھننے کی چگائی لے لی؟"

"اسی کے لیے تو تیرے پاس آئی ہوں۔"

"میرے پاس کیوں آئی ہے؟" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں نوں تیری چگائی سے کیا لینا؟"

"تو خادم علی جویا کو تو جانتا ہی ہے۔ میں نوں اسی کے بارے میں تجھ سے گل کرنی ہے۔"

"کیا گل کرنی ہے؟"

"جویا میرے حصے کی پوری چگائی نہیں دیتا۔" شاداں نے شکوہ کیا۔ "وہ جس جوگی سے راضی باضی ہوتا ہے اسے زیادہ پچھی حصے میں دیتا ہے۔ کسیں کو تو دو دو ڈھیریاں تک دے دیتا ہے۔"

"پر تجھ سے جویا کیوں ناراض ہے؟"

"گل ایہہ ہے جی!" وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ "وہ رات کو اپنے ڈیرے پر جوگیوں کو بلاتا ہے۔ جو چلی

جاتی ہیں' ان سے خوش رہتا ہے' جو نہیں جاتی انھیں پریشان کرتا ہے' طرح طرح سے تنگ کرتا ہے' ڈانٹتا ڈپٹتا ہے' چگائی بھی کم دیتا ہے۔"

"تو بھی کسی رات اس کے ڈیرے پر چلی جا۔" رحیم داد نے ہنس کر شاداں کو چھیڑا۔ "تب خادم علی جویا تجھ سے بھی خوش رہے گا۔ زیادہ ہی چگائی دے گا۔" اس نے شاداں کا رد عمل معلوم کرنے کے لیے اس لے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"ویسے خادم علی چاہے تو تجھے اٹھوا بھی سکتا ہے۔"

"مجھے اٹھوا لینا کوئی تخول ہے۔" شاداں نے تند و تیز لہجے میں گھور کر رحیم داد کو دیکھا۔ اسے رحیم داد کی بات سخت ناگوار گزری تھی۔ "تو کیسی گل کر رہا ہے۔" وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "میں کوئی کنجری ہوں' چھنال ہوں۔ کیوں جاؤں اس کے ڈیرے پر؟" اس کی جھنجلاہٹ سوا ہو گئی۔ "مجھے اٹھوا کر ڈیرے پر بلوایا تو اس کی گردن مروڑ دوں گی۔" اس نے اپنا مضبوط اور ٹھوس ہاتھ رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ "اس میں بہت زور ہے۔ میں ہوں تو زنانی پر بہت زور آور بھی ہوں۔ تو مجھے ٹھیک سے نہیں جانتا۔"

"اتنا ناراض کیوں ہوتی ہے؟" رحیم داد نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ لہجے میں سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "یہ بتا تو یہاں بھی اکیلی رہتی ہے؟"

"میری ایک ممیری ادھر ویاہی ہے۔ اسی کے ساتھ رہتی ہوں۔ پر میں نوں اس سے کچھ نہیں لینا۔ میرے پاس دو مجھ ہیں' اصلی نیلی بار کی ہیں۔"

رحیم داد نے مداخلت کی۔ "ویسے تو میں گورداس پور کا مہاجر ہوں پر اب میری زمینداری نیلی بار ہی میں ہے۔ تیں نوں پتہ ہے ستلج کو پاک پتن میں نیلی کہتے ہیں اور اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں اس کا پانی نیلا نیلا دکھائی پڑتا ہے۔ پر دیپال پور میں ہے۔ اسے ستلج ہی کہا جاتا ہے۔ میرا چنڈ ہے تو تحصیل دیپال پور میں اور دیپال پور بیاس بار میں ہے۔ میرا چنڈ دیپال پور سے دور اور اس علاقے سے بالکل ملتا ہے جو پاک پتن تحصیل کہلاتا ہے۔ پاک پتن تحصیل نیلی بار ہی میں ہے۔"

"وے تیرا چنڈ نیلی بار میں ہے۔" شاداں نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ مگر رحیم داد کی بات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ اپنی بھینسوں کی تعریف و توصیف کرتی رہی۔ "تیں نوں پتہ ہے' میری دونوں مجھ کتنا دودھ دیتی ہیں؟" اس نے فخر سے گردن اونچی کی۔ "من بھر تو روزانہ دودھی لے جاتا ہے۔ جو بچتا ہے اس کا مکھن نکال لیتی ہوں۔ چنگی آمدنی ہو جاتی ہے۔"

"لگتا ہے تو مکھن بہت کھاتی ہے۔" رحیم داد نے اسے ایک بار پھر چھیڑا۔ "جبھی تو ایسی سوہنی

نیار دکھائی دیتی ہے۔"

"لے' میں نیار لگتی ہوں؟ تو کیسی گل بات کرتا ہے۔" اس نے رحیم داد کی چھیڑ چھاڑ پر ناراضگی کا اظہار نہ کیا' شرما کر بولی۔ "اب تو کچھ بھی نہیں رہی' جل کر راکھ ہو گئی۔ تو نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔"

"اب بھی تو کیا کم ہے۔ تب ہی تو خادم علی جویا کا تجھ پر دل آ گیا۔"

"نہیں جی' وہ بندہ ہی برا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔" شاداں نے ایک بار پھر جویا کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے اس کی شکایت نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "تیرے پاس جب نیلی بار کی دو گائیں ہیں اور ان کے دودھ سے آمدنی بھی چنگی ہو جاتی ہے فیر تو پھٹی کی چنائی کیوں کرتی ہے؟" اس نے قدرے تامل کے بعد وضاحت کی۔ "میرا مطلب ہے تو چوگی کیسے بن گئی؟"

"کیا کیا جائے جی! آگے کے لیے بھی تو سوچنا چاہیے۔ لالی جیل سے نکلے گا تو کیا کرے گا؟ اب اس نے چوری چکاری تو کرنی نہیں۔ کوئی نہ کوئی دھندا کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے لیے روپے کی ضرورت ہوگی۔ روپے کے بنا تیں نوں پتہ ہے' کچھ نہیں ہو سکتا۔"

شاداں نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ خادم علی جویا کمرے میں داخل ہوا۔ شاداں کو دیکھ کر تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو ادھر بیٹھی ہے' تیری چگائی کون لے گا؟"

"میں لوں گی اور کون لے گا۔" وہ خادم علی جویا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے بولی۔ "چنائی میں نے کی ہے اور سب سے زیادہ ہی کی ہے۔"

"تو روز ایسی ہی بڑھکیں مارتی ہے۔" جویا نے ڈپٹ کر تیکھے لہجے میں کہا۔ "بکواس نہ کر' چل اپنی ونواڑ کی ڈھیریاں بنوا اور اپنی چگائی کی ڈھیری اٹھا کر لے جا۔ دیری کی تو کوئی چگائی شگائی نہیں ملے گی۔"

رحیم داد خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے مداخلت کی۔ "خاما خا ناراض کیوں ہوتا ہے۔ تو نے ہی تو مجھے بتایا تھا یہ بہت محنتی اور اہری چوگی ہے۔ سب سے زیادہ ونواڑ چنتی ہے۔ تو نے مجھے یہی کہا تھا نا؟" رحیم داد کا لہجہ تیکھا تھا۔

"محنتی تو جی یہ ہے۔ پر جھگڑا ٹنٹا بہت کرتی ہے۔" خادم علی جویا نے جھٹ پینترا بدلا' دبی زبان سے شکوہ کیا۔ "چوہدری' میں تجھے کیسے بتاؤں یہ کتنا جھگڑا کرتی ہے۔"

"لے' میں تجھ سے کیا جھگڑا کرتی ہوں۔ جتنی محنت کرتی ہوں' اتنی ہی چگائی مانگتی ہوں۔ تو ایویں

پھیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

خادم علی کے چہرے پر جھنجلاہٹ نمودار ہوئی۔ رحیم داد نے اس کی خفگی بھانپ لی۔ اس نے مسکرا کر نرمی سے کہا۔ "جویا! اسے ٹھیک ٹھیک چگائی دے دے۔"

"جویا فوراً نرم پڑ گیا' گردن جھکا کر ادب سے بولا۔ "سیں چوہدری! تو حکم کر' ایک چھوڑ میں اسے چگائی میں ونواڑ کی دو ڈھیریاں دے دوں گا۔"

"میں نوں تیری دو ڈھیریاں نہیں لینی۔" شاداں نے تیکھی نظروں سے جویا کو دیکھا۔ "محنت کی ہے' اس کی چگائی لوں گی' خیرات نہیں لینی۔"

"چپ کر شاداں۔ خاما خا کی کڑ کڑ نہ کر۔" رحیم داد نے اسے پیار سے ڈانٹا اور خادم علی جویا کو مخاطب کیا۔ "خادم! اسے دو ہی ڈھیریاں دے دے۔ تیں نوں پتہ ہے۔ یہ اپنے ضلعے کی ہے اور پریشان بھی ہے۔ برائی اس میں یہ ہے' بول کڑوا بولتی ہے۔"

"سیں! تیرا حکم' سر اکھیں تے' سر ماتھے تے!" خادم علی جویا نے خوشامد کے انداز میں کہا۔ "میں اسے دو ڈھیری ہی چگائی دوں گا۔"

"آگے بھی اس کا خیال رکھنا۔ اسے تنگ نہ کر۔" رحیم داد نے شاداں کی سفارش کی۔

"سیں چوہدری! تو بالکل فکر نہ کر۔" جویا نے رحیم داد کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "جیسا تو نے کہا ہے' ویسا ہی ہوگا۔"

رحیم داد نے شاداں سے کہا۔ "جا اپنی چگائی لے۔ خادم علی بہت نیک بندہ ہے۔ آگے تجھ سے ناراض نہیں ہوگا۔"

شاداں خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر شگفتگی تھی' آنکھوں میں کنول کھل رہے تھے۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔ "چوہدری! تیں نوں ادھر کب تک ٹھیرنا ہے؟"

رحیم داد کے بولنے سے پہلے ہی خادم علی جویا نے شاداں سے سوقیانا مذاق کیا۔ "تو نے رات کو ادھر آنا ہے؟"

شاداں ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ "چپ کر۔ تو نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ میں کنجری ہوں' پاپی ہوں' کیا ہوں' بتا؟"

رحیم داد نے فوراً مداخلت کی۔ "خادم! تو اس طرح اس سے چھیڑ چھاڑ نہ کیا کر۔ یہ بہت کڑوی زنانی ہے۔ خاما خا جھگڑا ٹنٹا نہ کر۔"

جویا جھینپ کر بولا۔ "سیں! یہ تو مخول بھی نہیں سمجھتی۔ تیکوں پتہ ہے' میں نے کسی بر
ارادے سے گالہ نہیں کی تھی۔"

شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں تیری گل بات کا مطلب ٹھیک طرح جانتی ہوں۔"

"بے کار کی گلاں نہ کر۔" رحیم داد نے شاداں کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ "میں نے جویا کو سمجھا
ہے۔ اب وہ تجھے تنگ نہیں کرے گا۔ اب جا اور اپنی چگائی کی چھٹی لے۔ تیری میری گھر میں انتظ
کرتی ہوگی۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "اتا ناراض نہ ہوا کر۔"

شاداں خاموشی سے خادم علی جویا کے ہم راہ چلی گئی۔

☆

مرشد علی اور مراد خاں رات گئے واپس آئے تو رحیم داد سو چکا تھا۔ دونوں نے اس کی نیند
خراب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ علیحدہ کمرے میں بیٹھے۔ آدھی رات تک باتیں کرتے رہے
قہقہے لگاتے رہے۔

رحیم داد قاسم بیلہ میں مراد خاں اور مرشد علی گردیزی کے ساتھ ٹھہرا رہا۔ شاداں اسے کئی با
نظر آئی۔ مڈبھیڑ بھی ہوئی مگر بات چیت کرنے کی نوبت نہ آئی۔ رحیم داد نے مراد خاں شاہانی سے
شاداں کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ خادم علی جویا نے شاہانی کی سامنے شاداں کی بات بھی
چھیڑی مگر رحیم داد صاف نظرانداز کر گیا۔

قاسم بیلہ میں چار روز قیام کے بعد تینوں ملتان روانہ ہوگئے۔ شام کو پہنچے۔ مگر ملتان پہنچتے ہی مرا
خاں کو بھکر سے تار ملا۔ لکھا تھا' محمد سلمان خاں کار کے حادثے میں زخمی ہوگیا ہے۔ تار دیکھتے ہی
مراد خاں سخت پریشان ہوگیا۔ وہ رات گئے تک سلمان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بھکر ٹیلی فون
کرتا رہا۔ مگر لائن میں ایسی گڑبڑ تھی کہ بار بار کوشش کے باوجود بات نہ ہو سکی۔

مراد خاں شاہانی کو جب سے سلمان کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی تھی' اسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔
ادھر مرشد علی گردیزی کی بہن کی شادی کی تیاریاں مکمل تھیں۔ رات کو صادق آباد سے برات
آرہی تھی اور دوسرے روز شام کو پہنچنے والی تھی۔

مرشد علی گردیزی کا اصرار تھا کہ مراد خاں دو روز ٹھہر کر بھکر چلا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ شادی کی
تقریب میں مراد خاں شاہانی ضرور شریک ہو۔ شادی کا نہایت دھوم دھام سے اہتمام کیا گیا تھا اور
اس میں شریک کرنے کے لیے مرشد علی شاہ خود بھکر جاکر مراد خاں شاہانی کو اپنے ہم راہ لایا تھا۔

رحیم داد نے تنہائی میں مراد خاں پر زور دیا۔ "شاہانی! ویاہ کے لیے ٹھہر جاتا تو ٹھیک تھا۔ ایک

روز کی تو بات ہی ہے۔ رات کو نکاح میں شریک ہو کر چلا جانا۔ مرشد علی خوش ہو جائے گا۔" مگر
مراد خاں رضامند نہ ہوا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"چوہدری! مجھے نہ روک۔ مجھے کچھ چنگا نہیں لگ رہا ہے۔" اس کے چہرے پر وحشت برس رہی
تھی۔ "تیکوں پتہ ہے' سلمان میرا اکلوتا پتر ہے۔"

رحیم داد نے چونک کر مراد خاں کو دیکھا۔ اسے مرشد علی کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ سلمان اس
کا نہیں' اس کی بیوی کے پہلے شوہر کا بیٹا ہے۔

رحیم داد کو سلطو ہی کا مندوق یاد آگیا۔ وہ مراد خاں کا سگا بیٹا تھا مگر اس کے مرنے پر نہ وہ پریشان
ہوا' نہ آنسو بہائے' نہ کسی قسم کا سیاپا کیا۔ یہاں تک کہ آخری بار اس کا دیدار بھی نہ کیا۔ اس کے
جنازے میں بھی شریک نہ ہوا۔ رحیم داد کے اصرار کے باوجود شریک نہ ہوا۔ اس نے ہموں والی
میں ٹھہرنا تک گوارا نہ کیا۔

رحیم داد کو مراد خاں شاہانی کے اس رویے پر سخت حیرت تھی مگر مراد خاں اس کی حیرت سے
بالکل بے نیاز تھا۔ وہ اس قدر پریشانی اور گھبراہٹ میں مبتلا تھا کہ کھانا بھی نہ کھاسکا۔ رات بھر بستر پر
بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بار بار اٹھتا اور بے قراری کے عالم میں ٹہلنے لگتا۔ رحیم داد کی آنکھ
کئی بار کھلی۔ اس نے مراد خاں کو پریشانی کے عالم میں دیکھا مگر بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ خاموش
لیٹا رہا۔

صبح بہت تڑکے کہرے کی گہری دھند کے باوجود مراد خاں شاہانی نے گیرج سے مرشد علی کی کار
نکلوائی اور شیر شاہ کی جانب روانہ ہوگیا۔ شیر شاہ کا فاصلہ دس میل سے بھی کم تھا اور وہاں سے بھکر
جانے والی ٹرین گیارہ بجے جاتی تھی۔

مراد خاں شاہانی نے ناشتا بھی نہ کیا۔ وہ جلد سے جلد شیر شاہ پہنچ کر بھکر جانے والی ٹرین میں سوار
ہو جانا چاہتا تھا۔

رحیم داد بھی کار میں مراد خاں کے ہم راہ تھا۔ وہ تمام راستے اسے تسلی دیتا رہا' مگر شاہانی کی بے
چینی کم نہ ہوئی۔ وہ بے قرار ہو کر رحیم داد سے بار بار کہتا۔

"چوہدری! اگر میرے سلمان کو خدانخواستہ کچھ ہوگیا تو میں یہ غم برداشت نہ کر سکوں گا۔ میرا تو
دماغ کام نہیں کرتا۔"

لیکن رحیم داد کو علم تھا کہ اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ اگر سلمان مرگیا تو نواں
کوٹ کی جاگیر' جو اس کے قبضے میں ہے' خطرے میں پڑجائے گی۔ سلمان کے حقیقی چچا اور چچا زاد

بھائی فوراً تنازعہ کھڑا کر دیں گے۔ جائیداد اور جاگیر حاصل کرنے کے لیے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیں گے۔

کار ملتان اسٹیشن پہنچی تو رحیم داد اتر گیا۔ وہ بھکر نہیں گیا' مراد خاں شاہانی نے بھی اصرار نہ کیا۔ ساڑھے آٹھ بجے صبح لاہور جانے والی ریل گاڑی پہنچی۔ وہ اس میں سوار ہو کر چلا گیا۔ وہ کوٹ ہرکشن واپس جا رہا تھا۔

سردار مراد خاں شاہانی تنہا رہ گیا۔ وہ سخت بے چینی کے عالم میں پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بہت پریشان اور دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔

۳۴

ہوا سرد تھی۔ ہر طرف کہرے کا نیل گوں دھندلکا چھایا تھا۔ کوٹلہ ہرکشن پر سرشام ہی سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ رحیم داد گھنٹہ' سوا گھنٹہ پہلے واپس پہنچا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ لباس تبدیل کیا اور اب اپنے کمرے میں سفر کی تکان دور کرنے کی غرض سے بستر پر ٹانگیں پسارے خاموش لیٹا تھا۔ حویلی پر خاموشی چھائی تھی۔ نادر خاں اور جمیلہ سے اس کی اب تک ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

حویلی کا صحن بہت کشادہ تھا۔ اس کے آخری سرے پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ درختوں کے آس پاس نوکر چاکروں کی کوٹھریاں تھیں۔ باورچی خانہ کوٹھریوں کے عین مقابل تھا۔ اس کی چھت چار ستونوں پر قائم تھی۔ کوئی دروازہ یا کھڑکی نہ تھی۔ ہر طرف سے بالکل کھلا ہوا تھا۔ باورچی خانے میں تنور روشن تھا۔

تنور کے اندر سے نکلتی ہوئی آنچ کے ابھرتے لپکتے شعلے کہرے کی دھند میں دور سے سرخ دھبوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ یہ روشن دھبے کبھی نمایاں ہو جاتے' کبھی اندھیرے میں گھل مل کر غائب ہو جاتے۔

باورچی خانے سے ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور رک رک کر ابھر رہا تھا اور ہر طرف چھائے ہوئے سکوت میں ارتعاش اور ہلچل پیدا کر رہا تھا۔

ایک نوکر اندھیرے سے نکل کر کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ نادر تھا۔ رحیم داد کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے میز پر کھانا لگا دیا۔ رحیم داد بھوکا بھی تھا۔ وہ بستر سے نیچے اترا اور میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

نادار ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ "نادار! یہ تو بتا، زمینداراں اوپر اپنے کمرے ہی میں ہے ناں؟"

"نہیں جی' زمیں دارنی تو پھاتاں کے گھر گئی ہے۔"

"پھاتاں کے گھر گئی ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "پھاتاں بیمار ہے کیا؟"

"بیمار شیمار تو نہیں ہے جی۔" نادار نے جواب دیا۔ "وہ ایسا ہے جی' پرسوں تاجاں کے سسرال سے بچولیا آیا تھا۔ سگائی کی انگوٹھی اور دوسرا سامان لوٹا گیا۔ بہت برا ہوا۔"

رحیم داد کی حیرت میں اضافہ ہوگیا۔ "پر تاجاں کی سگائی ہوئی کب؟"

"پچھلے ہی دنوں تو یہیں حویلی میں اس کی سگائی ہوئی تھی۔ ان دنوں تسیں ادھر نہیں تھے۔ بہت رونق لگی تھی۔ ڈھولک بجی تھی۔ گانا ہوا۔ زمیں دارنی نے اپنے ہاتھ سے تاجاں کو انگوٹھی پہنائی تھی۔ پر اب تو سگائی ٹوٹ ہی گئی۔"

"کیوں توڑ دی انھوں نے کڑمائی' میرا مطلب ہے سگائی؟ ویسے بات ایک ہی ہے۔ کڑمائی کہو یا سگائی۔ پر ایک بار سگائی ہونے کے بعد ٹوٹ کیسے گئی؟ یہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی تو اس کی وجہ ہوگی۔ ایسے ہی تو نہیں ٹوٹی ہوگی۔"

"کسی نے جی بھانجی ماردی۔ میں تو کہتا ہوں جی' یہ شیرا کا کام ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ایسا کر ہی نہیں سکتا۔"

"یہ شیرا کون ہے' اور اس نے کیوں بھانجی ماری؟" رحیم داد نے کرید کر دریافت کیا۔

"وہ تاجاں سے ویاہ کرنا چاہتا ہے۔" نادار کا لہجہ تیکھا اور قدرے تلخ تھا۔ "کرتا دھرتا کچھ نہیں۔ بھومان شاہ کے زمیں دار محمد حنیف وٹو کے لیے مویشی اور چوکر چوری کرتا ہے۔ محمد حنیف وٹو بہت وڈا رسہ گیر ہے جی۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "چوہدری! تو ہی سوچ۔ پھاتاں کیسے اپنی دھی شیرے کو ویاہ دیتی۔ اس نے صاف انکار کردیا۔ شیرے کے ساتھ اس کے گھر والے بھی ناراض ہوگئے۔ بس اس کا بدلہ لینے کے لیے ایسا چکر چلایا گیا کہ سگائی ٹوٹ گئی۔"

"پر تاجاں کے سسرال والوں نے شیرے کی بات کیسے مان لی۔ انھوں نے کیوں سگائی توڑ دی؟" رحیم داد نے روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے استفسار کیا۔ "تاجاں کا ساہا تو میرے سامنے ہی ہوا تھا۔ تب تو سسرال والے بہت خوش تھے۔ انھوں نے سگائی پر بھی خوشی منائی ہوگی؟"

"ہاں جی' بہت خوش تھے۔"

"یہ بتا' نادار' کیا شیرا کسی طرح تاجاں کے سسرال والوں کا شریکا لگتا ہے؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔ اس نے کسی ملا سیانے کے ذریعے تاجاں کے سسرال والوں کو بہکا دیا۔ وہ اس کے بہکانے میں آ بھی گئے۔ کہتے ہیں جنج اس حویلی میں نہیں اترے گی۔ نہ یہاں ویاہ ہوگا نہ زمیں دارنی ویاہ میں بیٹھے گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ زمیں دارنی سے انھیں کیا بیر ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اس نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟"

"گل ایہہ ہے جی' وہ کہتے ہیں زمیں دارنی رنڈ یوہ ہے۔ اس کے بیٹھنے سے ویاہ میں بدشگونی اور نحوست ہوگی۔" نادار نے ناگواری سے منہ بگاڑا۔ "زمیں دارنی نے یہ سنا تو اس نے تاجاں کے سسرال والوں کی بات مان لی پر تاجاں کی ماں پھاتاں نہ مانی۔ وہ اڑ گئی۔ صاف صاف کہہ دیا' ویاہ ہوگا تو حویلی ہی سے ہوگا اور بھین جی اس میں ضرور بیٹھے گی۔ اس کے بناں تو ویاہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"گل تو اس نے ٹھیک ہی کہی۔ پھاتاں ہے حوصلے والی۔"

"سنا ہے جی' وہ تو ان سے لڑ پڑی۔ بولی' رنڈ یوہ تو میں بھی ہوں۔ میرا گھر والا تو مدت ہوئی گزر گیا۔ فیر میں کیسے ویاہ میں بیٹھ سکتی ہوں۔ میرے گھر تاجاں کی جنج کیسے چڑھ سکتی ہے؟" نادار تفصیل سے ایک ایک بات بتاتا رہا۔ "کہتی تو جی وہ بالکل ٹھیک ہی ہے۔ اگر حویلی سے تاجاں کا ویاہ نہیں ہو سکتا تو پھاتاں کے گھر سے کیسے ہو سکتا ہے؟ گل تو ایک ہی سی ہوئی ناں۔"

"جب سگائی ٹوٹ ہی گئی تو اب زمیں دارنی پھاتاں کے گھر کیوں گئی ہے؟" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"زمیں دارنی سگائی توڑنا نہیں چاہتی۔" نادار نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "اس نے تاجاں کی ہونے والی سسرال کے وڈوں کو پھاتاں کے گھر بلوایا ہے۔ تاجاں کا سسر اس کا ماما بھی تو ہوتا ہے۔ پھاتاں کا سگا بھرا ہے۔ لگتا ہے آج زمیں دارنی انہیں سے گل بات کرنے گئی ہے۔"

"کب تک واپس آئے گی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"پتہ نہیں جی۔ دیر ہی سے لوٹے گی۔ لمی گل ہوگی۔ ایک بار سگائی ٹوٹ جائے تو مشکل سے رشتہ جڑتا ہے۔ میں نے تو یہی دیکھا ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ نادار نے بھی بات آگے بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا تو نادار نے جھوٹے برتن اٹھائے۔ دروازے کی جانب بڑھا۔ رحیم داد نے ٹوکا۔

"حمرا کہاں ہے نادار؟ وہ مجھے نظر ہی نہیں آیا۔"

"اس کا کیا ہے جی۔ کسی چکر میں گیا ہوگا۔ شام ہوتے ہی غائب ہوجاتا ہے۔ شدّو کے گھر آس پاس منڈلاتا ہوگا۔" نامدار نے مسکرا کر کہا۔ "اور آج تو اس کی گھر والی تاراں بھی زمیں دا کے ساتھ گئی ہے۔ پر حمدا اس کی کب پروا کرتا ہے۔ ویسے تجھ سے کیا چھپانا۔ تاراں بھی کم نہیں حمدا نہیں ہوتا تو وہ بھی اصطبل کے راکھے کے پاس چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو ساری رات اسی ساتھ رہتی ہے۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ "اور ہاں تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں، نادر خاں کد ہے؟ وہ بھی نظر نہیں آیا۔"

"وہ تو جی دوپہر کو تانگے میں بیٹھ کر کہیں گیا ہے۔"

"کچھ پتہ ہے، کہاں گیا ہے؟" رحیم داد نے نادر خاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کوشش کی۔

"یہ تو جی، میں نوں پتہ نہیں۔ میں نے تو اسے صرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ زمین دارنی ہی کسی کام سے بھیجا ہوگا۔" نامدار نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے مزید بات چیت نہ کی۔ نامدار باہر چلا گیا۔

☆

رات سنسان ہوتی گئی۔ دھند گاڑھی اور بوجھل ہوتی گئی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا سوچتا رہا نادر خاں اس طرح اچانک کہاں چلا گیا؟ اسے احسان شاہ کا خیال آیا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا نادر نے وعدہ کیا تھا کہ احسان شاہ کے پاس نہیں جائے گا۔ بلکہ اس نے رحیم داد کو بھی مشورہ دیا کہ احسان شاہ سے ملنے جلنے میں احتیاط سے کام لے۔ پھر وہ کہاں گیا؟ کس کے پاس گیا، کس۔ گیا؟ رحیم داد تنہا بیٹھا نادر کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا رہا۔ اسے جمیلہ واپسی کا بھی بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ جلد سے جلد اس کا ردعمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

پہر رات گزر گئی۔ جمیلہ ہنوز لوٹی نہ تھی۔ رحیم داد کو نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ کچھ عرصے۔ رات گئے تک جاگنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ اس کی غیر حاضر میں کیا کیا ہوتا رہا؟ کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں؟ اسے الجھن ہو رہی تھی۔ آخر اکتا کر وہ کھ ہوگیا۔

اس نے اونی دھسّا اوڑھا۔ سر اور کانوں کو اچھی طرح دھسّے سے ڈھک کر کمرے سے باہر نکا سردی چمک گئی تھی۔ حویلی خاموشی میں ڈوبی اونگھ رہی تھی۔ سارے ہی نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھریو

میں چلے گئے تھے۔ حویلی کے پھاٹک پر پہریدار کے رک رک کر کھانسنے اور کھنکارنے کی آواز رات کے سناٹے میں ابھر رہی تھی۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دروازے کی جانب بڑھا جو مہمان خانے میں کھلتا تھا اس نے دروازے کو دھیرے سے کھولا اور مہمان خانے کے صحن میں پہنچ گیا۔ خیال تھا کہ احمد اب تک واپس آگیا ہوگا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ مہمان خانہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ مہمان خانے کے باہر کہیں قریب ہی گیدڑ بول رہے تھے۔

اس نے مہمان خانے کو خالی پایا تو رک گیا۔ چند لمحے خاموش کھڑا رہا، سوچتا رہا۔ مہمان خانے سے ملحق دو بڑی بڑی اور کشادہ کوٹھریاں تھیں۔ ان میں کبھی مہمان خانے کے نوکر چاکر رہتے تھے۔ مگر بعد میں انھیں کاٹ کباڑ رکھنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا۔ نادر خاں نے اپنی رہائش کے لیے انھیں خالی کرایا تھا۔ کوٹھریوں میں کھڑکیاں نکال کر انھیں کمروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔ سامنے کھلا صحن تھا۔ صحن کے تین طرف قد آدم چار دیواری تھی۔ اس گھر میں نادر خاں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ رحیم داد اس طرف بڑھنے لگا۔

مہمان خانے کا ایک بیرونی دروازہ نادر خاں کے گھر کے عین سامنے کھلتا تھا۔ اسے نادر خاں نے اپنی سہولت کے لیے کچھ ہی عرصہ قبل لگوایا تھا۔ رحیم داد نے دروازہ کھولا اور مہمان خانے سے باہر چلا گیا۔ قریب ہی نادر خاں کے گھر کا ایک دروازہ تھا۔ لیکن عام آمد و رفت کا دروازہ صحن میں تھا۔ رحیم داد اس طرف نہ گیا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا، پھر ہاتھ بڑھا کر دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

دروازہ دھیرے سے کھلا۔ رحیم داد نے دیکھا، لالٹین کی مدھم روشنی میں نادر خاں کی بیوی جنت سامنے کھڑی ہے۔ وہ کچی نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ سردی سے کپکپا بھی رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے آنکھیں ملیں۔ غور سے رحیم داد کو دیکھا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "چوہدری! تو اتنی رات کو کیسے آیا؟ واپس کب پہنچا؟" اس کے چہرے پر گھبراہٹ بکھر گئی۔

"تو گھبرا کیوں گئی؟" رحیم داد نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔ "میں آج ہی شام واپس آیا ہوں۔"

"باہر اتنی سردی میں کیوں کھڑا ہے؟" اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ "اندر آجا۔"

رحیم داد چپ چاپ اندر چلا گیا۔ جنت نے دروازہ بند کیا مگر کنڈی نہ لگائی۔ جھٹ ایک مونڈھا

اٹھا کر لائی اور رحیم داد کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ "بیٹھ جا چوہدری۔"

وہ سردی سے بدستور کپکپا رہی تھی۔ "آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے۔"

"ہاں' سردی آج زیادہ ہی ہے۔" رحیم داد نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

جنت نے لالٹین کی مدھم لو اونچی کی۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ وہ تھر تھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ "سردی زیادہ تھی اس لیے میں تو چراغ جلنے کے بعد گھر سے باہر ہی نہیں گئی۔" اس نے اپنا سر سے ڈھک لیا۔

"کوئی دوہرا کمبل اوڑھ لے۔ سردی سے تیرے ہونٹ نیلے پڑتے جا رہے ہیں۔"

جنت نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی موٹی کھیس اتاری۔ اسے اوڑھا اور رحیم داد کے سامنے پلنگ پر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کی گوری چٹی عورت تھی۔ چہرہ گول اور بھرا بھرا تھا۔ ناک میں سا فیروزہ تھا۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ کئی بچوں کی تھی۔ تین تو نادر خاں ہی سے تھے۔ ایک شوہر چھوڑ چکی تھی۔ مگر اس کی کاٹھی بہت اچھی تھی اس کا جسم بے ڈھنگے پن سے پھیل کر بگڑا تھا نہ چہرے کے نقش و نگار دھندلے پڑے تھے۔ وہ ماں کے مقابلے میں زیادہ جوان اور تندرست نظر آتی تھی۔ ویسے بھی وہ نادر خاں سے پندرہ برس کم سن تھی۔

وہ پھول دار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ شلوار سفید لٹھے کی تھی۔ دوپٹہ ہلکے نیلے رنگ کا تھا۔ ا کے لباس پر شکنیں اور سلوٹیں پڑی تھیں' مگر میلا نہیں تھا۔ وہ نظریں جھکائے رحیم داد کے رو خاموش بیٹھی تھی۔

"نادر کہاں ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ تو جی دیپال پور گیا ہے۔ زمیں دارنی نے کسی ضروری کام سے بھیجا ہے۔"

"نادر' دیپال پور گیا ہے!" رحیم داد حیرت سے چونک کر بولا۔ "تینوں پتہ ہے کس کام گیا ہے؟"

"یہ تو جی اس نے مجھے بتایا نہیں۔ بس چلتے چلتے اتنا کہہ گیا تھا کہ کل شام لوٹے گا۔ دیر بھ ہو سکتی ہے۔ میں نے پوچھا بھی۔ تب بھی اس نے آگے کچھ نہ بتایا۔"

"کام کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"میں نے بتایا ناں کہ اس نے زیادہ گل بات ہی نہیں کی۔ جلدی میں لگتا تھا۔ میرے بار با پوچھنے پر صرف اتنا کہا زمیں دارنی کے ایک ضروری کام سے دیپال پور جا رہا ہوں۔"

"جمیلہ کا کیا حال چال ہے؟" رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔" جنت مسکرا کر بولی۔ "تو اسے نہیں ملا؟"

"نہیں؟" رحیم داد نے جنت کو آگاہ کیا۔ "وہ پھاتاں کے گھر گئی ہے۔ ابھی تک لوٹی نہیں۔ نادر بتاتا تھا دیر سے لوٹے گی۔"

"سمجھ گئی۔" جنت نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ "وہ پھاتاں کے گھر تاجاں کے سسرال والوں سے بات چیت کرنے گئی ہے۔ وہ ایسا ہے جی' تاجاں کے رشتے میں کچھ گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے؟"

"میں نے تو سنا ہے پچھلے دنوں تاجاں کی سگائی ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹ گئی۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"ہاں' ایسا ہی ہوا ہے۔"

"جمیلہ سے میرے بارے میں بھی تیری بات چیت ہوئی؟" رحیم داد نے جنت کو ٹٹولا۔

"کئی بار ہوئی۔ اور دیر تک ہوتی رہی۔ نادر نے تجھے بتایا ہی ہو گا۔"

"کچھ بتایا تو تھا' پر نادر سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے۔" رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ "یہ بتا۔ اب وہ میرے بارے میں کیا کہتی ہے؟ ناراض شراض تو نہیں ہے؟"

"پہلے تو سخت ناراض تھی۔" جنت کھل کر مسکرائی۔ "پر میں نے اس کی ساری ناراضگی ختم کرا دی۔ اب اس کے دل میں تیری طرف سے بالکل میل نہیں۔ اس کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

"تجھے یہ تو پتہ ہی ہو گا وہ پنڈ چھوڑ کر لہور جانا چاہتی تھی۔" رحیم داد نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "اب اس کا کیا ارادہ ہے؟ اس بارے میں بھی تیری اس سے بات ہوئی؟"

"اس بارے میں پہلے بہت بات کرتی تھی۔ پر اب بالکل نہیں کرتی۔" جنت نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ وہ شوخی سے مسکرائی۔ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "چوہدری! برا نہ منانا۔ تو اسے سمجھ نہ سکا۔ زمیں دارنی جتنی سوہنی ہے' اتنا ہی سوہنا اس کا دل بھی ہے۔ وہ کسی سے بھی زیادہ دنوں تک ناراض نہیں رہ سکتی۔ اسے منانا تو بہت آسان ہے۔" اس نے پہلو بدلا۔ "ویسے بھی جی وہ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ بلکہ خود پریشان ہو جاتی ہے۔" اس نے آنکھوں کو گردش دے کر ہونٹوں پر تبسم پیدا کیا۔ "تیرے بارے میں اس نے مجھے ساری ہی باتیں بتا دیں۔"

"میرے بارے میں کوئی خاص گل بات ہوئی؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔ "میرا مطلب ہے۔"

"میں تیرا مطلب سمجھ گئی۔" جنت اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "نادر مجھے بتا چکا ہے تو کیا ہے۔" جنت سنجیدہ ہو گئی۔ "پر تو جو کچھ چاہتا ہے' ابھی اس سلسلے میں زمیں دارنی سے بات ٹھیک نہیں۔ آج کل تو وہ تاجاں کے ویاہ میں بری طرح الجھی ہوئی ہے۔ اسے کسی اور طرف دھیان دینے کا ہوش ہی نہیں۔ ہر گھڑی اسی کے بارے میں باتیں کرتی رہتی ہے۔" اس کا لہجہ اور شگفتہ ہو گیا۔ "چوہدری! ایسی لگن اور چاہ سے ویاہ کی تیاریاں کر رہی ہے جیسے تاجاں اس کی دھی ہو۔" اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ "وہ بہت دھوم دھڑکے سے ویاہ کرنا چاہتی ہے پر اب تو تاجاں کی سگائی ٹوٹ گئی۔ بہت برا ہوا۔ زمیں دارنی کو اس کا بہت دکھ ہے۔ جب سے یہ ہوا ہے گھبرائی ہوئی اور پریشان رہتی ہے۔"

رحیم داد نے بات کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "جنت! تیری تینوں چھوریاں کدھر ہیں؟"

"برابر کے کمرے میں سو رہی ہیں۔" اس نے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ "میں بھی وہیں ہوں۔"

رحیم داد نے جنت کے جسم کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ اس نے کسمسا کر پہلو بدلا اور ٹانگ پر دوسری رکھ کر ذرا ترچھی ہو کر بیٹھ گئی۔

رحیم داد کو اس کا یہ انداز اچھا لگا۔ مسکرا کر بولا۔ "جنت تو لاچا کیوں نہیں باندھتی؟"

"نہیں جی' میرے میکے میں زنانیاں دھوتی اور لاچا نہیں باندھتیں۔" اس نے گردن اونچی کرتے ہوئے غصے سے کہا۔ "میرا پیو زمیں دار ہے۔ اس کی ۳۰ کلا سے اوپر زمیں ہے۔ ویسے بھی آبادکار ہیں۔ ادھر کے جانگلی شانگلی نہیں ہیں۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے ٹھٹکی۔ زیر لب مسکرائی۔ "چوہدری تیرے دھیان میں یہ بات کیسے آئی کہ مجھے لاچا باندھنا چاہیے۔ شلوار مجھے بری لگتی ہے؟"

رحیم داد نے ہیجان انگیز نظروں سے جنت کو دیکھا۔ وہ احسان شاہ اور سردار مراد خاں شاہ کی صحبت میں خاصا اوباش اور بد نظر ہو گیا تھا۔ جنت اس وقت اسے اچھی لگی۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا گورا چٹا چہرہ دمک رہا تھا۔

جنت اس کی چبھتی ہوئی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ اس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی پھیل گئی۔

"جنت! تو لاچا باندھے تو زیادہ سوہنی لگے گی۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہاں سوہنی ہوں جی۔" وہ بڑے ناز سے بولی۔ "سوہنی تو سچ پوچھ اپنی زمیں دارنی ہے۔ اسے جو بھی دیکھتا ہے' دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اس کا رنگ روپ ہی ایسا ہے۔"

جمیلہ کا ذکر سن کر رحیم داد کے سارے ابلتے' مچلتے ولولے جھاگ کی مانند بیٹھ گئے۔ وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جنت نے ٹوکا۔ "کہاں چلا چوہدری؟"

"نیند لگ رہی ہے۔ جا کر سوؤں گا۔"

"چلا جانا۔ ایک گلاس گرم دودھ تو پی لے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔ "تو پہلی بار میرے گھر آیا ہے۔ میں تجھے ایسے ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ میں ابھی دودھ لائی۔ گرم ہی ہو گا۔ میں رات کو بھڑولی پر دودھ رکھ دیتی ہوں۔ صبح تک گرم رہتا ہے۔"

رحیم داد بیٹھ گیا۔ جنت کمرے سے نکل کر صحن میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہاتھوں میں بھڑولی اٹھائے ہوئے آئی۔ یہ پیالے کی شکل کی کھلے منہ اور چوڑے پیندے کی انگیٹھی تھی۔ اس کے بالائی کناروں میں چاروں طرف چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ اسے چکنی مٹی میں توڑی شامل کر کے اس طرح بنایا گیا تھا کہ پہلے مٹی کو اچھی طرح گوندھا گیا۔ پھر اسے ہاتھوں کی مدد سے تیار کر کے دھوپ میں سکھایا گیا تھا۔ اس میں اوپلے سلگا کر رکھ دیے جاتے جن کی ہلکی ہلکی آنچ رات بھر دہکتی رہتی۔

بھڑولی کے اوپر پیتل کی گڑوی میں دودھ بھرا تھا۔ جنت نے بھڑولی کمرے میں لا کر رکھ دی۔ وہ دوبارہ باہر گئی اور کانسی کا لمبا گلاس لے کر آئی۔ گلاس میں اس نے گڑوی سے گرم گرم دودھ انڈیلا۔ شکر ملائی اور گلاس رحیم داد کی طرف بڑھا کر بولی۔

"چوہدری! لے اسے پی لے۔ زیادہ گرم نہیں ہے۔"

رحیم داد نے گلاس ہاتھ میں لیا۔ ہونٹوں سے لگایا اور گھونٹ گھونٹ گرم دودھ پینے لگا۔ جنت نے بھڑولی اپنے سامنے رکھ لی اور اس میں سلگتے ہوئے اپلوں کی آنچ پر دونوں ہاتھ پھیلا کر سینکنے لگی۔ رحیم داد نے دودھ پی کر گلاس جنت کو دے دیا۔ اس نے گلاس ایک طرف رکھ دیا اور بھڑولی پر جھک کر ایک بار پھر دونوں ہاتھ سینکنے لگی۔

رحیم داد نے دیکھا' بھڑولی کی سرخ سرخ آنچ سے جنت کا چہرہ دمک رہا ہے۔ اس پر پھبن آ گئی ہے۔ رحیم داد اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ مسکرایا۔ اس نے جنت کو ٹٹولنے کے لیے چھیڑا۔ "جنت! صرف دودھ ہی پلائے گی؟"

"اور تجھے کیا چاہیے؟" وہ بدستور بھڑولی پر جھکی ہوئی بیٹھی رہی۔

"یہ تو تجھے بھی پتہ ہے۔" رحیم داد دھیرے دھیرے کھلنے لگا۔

"مجھے کیا پتہ جی۔" اس نے رحیم داد کی جانب پھر بھی نہ دیکھا۔

"تو سوہنی تو ہے پر اتنی بھولی نہیں کہ تجھے کچھ پتہ نہیں۔" وہ ہولے ہولے ہنسنے لگا۔

جنت نے زبان سے تو کچھ نہ کہا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ مسکرائی اور پھر گردن جھکالی۔ اس کے رخسار بھڑولی کی آنچ سے لال بھبھوکا ہو رہے تھے۔ لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں چراغ جھل ملا رہے تھے۔ رحیم داد ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

جنت نے گردن اونچی کی۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔ "چوہدری! تجھے سردی نہیں لگ رہی؟"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ اٹھ کر جنت کے پاس جانے کے لیے کسمسایا۔ اسی وقت دروا چرچرایا۔ رحیم داد نے پلٹ کر دیکھا کہ جمیلہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ وہ اند آئی۔ اس کے پیچھے تاراں بھی تھی۔

"چوہدری! تو ادھر بیٹھا ہے۔" جمیلہ نے کہا۔ "میں تیرا کھوج لگاتی پھر رہی ہوں۔" وہ مسکرا ہوئی آگے بڑھی۔ "مجھے تو چاچاں کے گھر سے واپسی پر پتہ چلا' تو آگیا ہے۔ کب آیا؟"

"میں تو شام ہونے سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ کمرے میں بیٹھا تیرا انتظار کرتا رہا۔ جب تو دیر تک نہ آئی تو نادر سے ملنے ادھر آگیا۔ یہاں جنت سے پتہ چلا' وہ دیپال پور گیا ہے۔" رحیم داد بو بولتے ٹھٹکا۔ "زمیں دارنی! تو اس طرح کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا؟"

"ادھر آجا زمیں دارنی۔" جنت نے بھی رحیم داد کی تائید کی۔ اور کھڑے ہو کر پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہیں بیٹھ جا۔" اس نے اٹھ کر جھپاک جھپاک بستر کی شکنیں درست کرنا شرو کردیں۔

جمیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جنت! میں نے یہاں بیٹھنا نہیں ہے۔" اس نے رحیم داد جانب مڑ کر دیکھا۔ "چوہدری! میرے ساتھ چل۔ تجھ سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔ میں تیرا کئی روز سے سخت انتظار کر رہی تھی۔"

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ جمیلہ دروازے کی جانب بڑھی۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ سا بڑھا۔ تاراں دونوں کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ تینوں باہر نکلے اور مہمان خانے میں داخ ہوگئے۔ تاراں نے مہمان خانے کا دروازہ بند کردیا۔

☆

رحیم داد اپنے کمرے میں گیا۔ جمیلہ بھی اس کے ہم راہ تھی۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ج

سنہری کنارے کی سفید شال اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا لباس بھی سفید ہی تھا۔ اس سادگی میں بھی اس کا دلکش چہرہ کندن کی مانند دمک رہا تھا۔ رخساروں پر گلاب کھل رہے تھے۔ غزالی آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔

دونوں کے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد نامدار نے انگیٹھی لا کر کمرے میں رکھ دی۔ انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔ انگیٹھی رحیم داد اور جمیلہ کے درمیان رکھی تھی۔ دونوں جھک کر ہاتھ تاپنے لگے۔ انگاروں کی آنچ سے جمیلہ کا گلابی چہرہ اور سرخ ہوگیا' خوبصورت اور تابندہ ہوگیا۔

رحیم داد انگیٹھی پر ہاتھ پھیلا کر جسم میں حرارت اور گرمی پہنچاتا رہا۔ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اور خدشے منڈلا رہے تھے۔ ہرچند وہ جنت کی زبانی سن چکا تھا کہ جمیلہ اب اس سے خفا نہیں ہے' مگر اس کے دل میں چونکہ چور تھا لہٰذا سہما ہوا تھا۔ بار بار یہ خیال اسے پریشان کرتا کہ جمیلہ اتنی رات گئے کون سی اہم بات کرنا چاہتی ہے جس کے لیے اس نے نہ صرف چاچاں کے گھر سے لوٹتے ہی اس کی تلاش شروع کردی تھی بلکہ کئی روز سے اس کا بے چینی سے انتظار بھی کر رہی ہے۔

اس نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کے دل آویز دمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ لمحہ بھر تک بے قراری سے دیکھتا رہا' پھر اس نے ہولے سے گہری سانس بھری اور نظریں جھکالیں۔

جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر خاموشی کو توڑا۔ "چوہدری! اتنے دن کہاں رہا؟" وہ زیر لب مسکرائی۔ "خریف کی واڈھی پر تیرا بہت انتظار رہا۔ تجھے واڈھی پر تو یہاں ہونا ہی چاہیے تھا۔"

"خریف کی واڈھی ہوگئی۔ بہت ٹھیک ہوا۔"

"واڈھی تو کرانا ہی تھی۔ جب تو نہیں آیا تو شروع کرانی پڑی۔ بلکہ دیر سے شروع ہوئی۔ ایسا تیرا لمبا انتظار کرنے کے کارن کرنا پڑا۔ میں پوچھتی ہوں تو واڈھی پر پہنچا کیوں نہیں؟"

"میں ہوتا بھی تو کیا کرتا؟" رحیم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تو موجود ہی تھی۔"

"کمال کرتا ہے۔ یہ بھی کوئی گل بات ہوئی۔" اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کا لہجہ تیکھا تھا مگر اس کی آنکھوں میں خفگی یا کدورت کا غبار مطلق نہ تھا۔ "میرا کیا ہے۔ واڈھی پر تو تیرا موجود ہونا ضروری تھا۔ میں نے کون سی زمیں داری چلانی ہے۔" جمیلہ کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "یہ بتا تو اب تک رہا کہاں؟"

"میں کلیم کے چکر میں پہلے منٹگمری گیا۔ فیر ملتان جانا پڑا۔"

"وہ تو میں نوں پتہ ہے۔ نادر مجھے بتا بھی چکا ہے اور یہ بھی بتا چکا ہے تیرے کلیم کے بارے م
جو گڑبڑ پیدا ہو گئی تھی' وہ بھی بالکل دور ہو گئی۔ یہ بہت ٹھیک ہوا۔ مجھے تیرے کلیم کے کارن بہ
چنتا تھی۔" جیلہ نے اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا۔ "پر اس کے بعد تو رہا کہاں' واپس کیوں
آیا؟"

"کیا کرتا واپس آکر۔" رحیم داد نے چہرے پر افسردگی کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "م
نوں اس زمیں اور حویلی کی الاٹمنٹ سے کیا لینا۔ تو نے ہی دلائی تھی اور تیری ہی زمین اور حویلی
بھی۔" اس نے نظریں اٹھا کر جیلہ کے شگفتہ اور دمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ "میں تو برسوں گ
آبادکاری کے دفتروں کے چکر کاٹ کاٹ کر اور گرداوروں اور پٹواریوں کی خوشامد کرتے کر۔
مایوس ہو کر اپنے کلیم کو بھول ہی چکا تھا۔"

"پر یہ گلاں تو اب پرانی ہو چکی ہیں۔" جیلہ نے اسے ٹوکا۔

"میں تو یہ سوچ کر یہاں سے گیا تھا کہ اب میں نے واپس نہیں آنا۔" اس نے لہجے میں رق
پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "پہلے ملتان میں کوشش کی۔ وہاں کام نہ بنا تو بھکر چلا گیا۔ سنا تھا و
الاٹمنٹ مل رہی ہیں۔ پر ساری زرخیز زمینیں وڈے زمیں داروں نے اپنے مزارعے لگا کر دبا لیں
فیر بوگس اور جعلی کلیموں کے ذریعے اپنے کبضے میں کر لیں۔ محکمہ آبادکاری والوں نے وہاں
زبردست دھاندلی مچا رکھی ہے۔ چھانٹ چھانٹ کر عمدہ زمینیں اپنے ناتے داروں' شریکوں ا
جاننے والوں کے نام الاٹ کرا دیں۔" رحیم داد کے لبوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ "اب تو وہاں
اور کلر زمین رہ گئی ہے۔ اس کے لیے بھی درخواستوں کے ڈھیر لگے ہیں۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گ
"زبردست اندھیر گردی ہے جی۔ دبا کے رشوت لی جا رہی ہے۔ اس کے بنا تو کوئی بات سن۔
بھی تیار نہیں۔"

"اس دھاندلی میں تو چھوٹے بڑے سرکاری افسروں اور اہل کاروں سے لے کر صوبائی
مرکزی وزیر تک سب ہی شامل ہیں۔ رشوت کے ساتھ ساتھ سفارش بھی چل رہی ہے۔"
نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔ "پر چوہدری' تو الاٹمنٹ کے چکر میں پڑا ہی کیوں؟ یہاں
اراضی کچھ کم ہے۔ تو کیوں الاٹمنٹوں کی لوٹ مار میں شامل ہو گیا؟ تیرے لیے تو یہی زمین
ہے۔"

"سوچا تھا' تھوڑی سی زمین کہیں اور مل جائے تو زمیں داری شروع کر دوں گا۔ کچھ نہ کچھ ا
ہی تھا۔ اس زمین اور جائیداد کو تو کبھی میں نے اپنا سمجھا ہی نہیں۔ یہ تو بھی ٹھیک طرح جانتی۔

رحیم داد نے آواز میں اور زیادہ رقت پیدا کی۔ "جب تو مجھ سے ناراض ہو گئی تو میں نے یہاں رہ کر
کیا کرنا؟" اس نے بجھی بجھی نظروں سے جیلہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "زمیں
دارنی! تجھے لور شور جانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ سنا ہے سندھ
میں آسانی سے الاٹمنٹ مل جاتی ہے۔ ادھر بہت متروکہ زمین اور جائیداد ہے۔ اب وہیں چلا جاؤں
گا۔"

"ایسا ہی ارادہ تھا تو ادھر واپس ہی کیوں آیا؟" جیلہ کے لہجے میں طنز کا پہلو نمایاں تھا۔ رحیم داد
نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ لہجے میں اور زیادہ غم گھول کر بولا۔ "میں تو اس لیے آیا تھا کہ تیرے
دل میں میری طرف سے میل نہ رہے۔ جو کچھ ہو گیا اسے بھول جا۔ ہاں' تیرا اور اللہ وسایا کا مجھ پر
جو احسان ہے وہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ تو نے اور اس نے مجھے ایسے وکت سہارا دیا' جب
میرا کوئی ٹھکانہ نہ تھا' کوئی اپنا نہ تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب تیری زمین اور حویلی
تیرے پاس رہے گی۔ وکیل کو بلا لے۔ میں زمین اور حویلی کا بیع نامہ تیرے نام کر دوں۔ میرا کیا
ہے۔ جب ایک بار گھر سے بے گھر ہو گیا' اجڑ گیا' تباہ ہو گیا' تو کہیں بھی پڑاؤ ڈال لوں گا۔ جیسے تیسے
زندگی گزر ہی جائے گی۔"

جیلہ اس کے دکھ بھرے لہجے اور غم زدہ باتوں سے بہت متاثر ہوئی۔ پیار سے ڈانٹ کر بولی۔
"فضول باتیں نہ کر۔" جیلہ مسکرائی۔ "چوہدری! تو نے مجھے سمجھا ہی نہیں۔ میں تو کسی سے بھی
ناراض نہیں رہ سکتی اور تو تو میری ہی طرح فسادات کی بھڑکتی آگ کا جھلسا ہوا ہے۔ خون کا دریا تیر
کر نکلا ہے۔ میں تیرا دکھ جانتی ہوں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ اس
میں تڑپ تھی' درد کی چبھن تھی۔ "میں نے آگ اور خون کا یہ خوف ناک کھیل دیکھا ہے۔ اس
دکھ اور اپرادھ کو جھیلا ہے' بھگتا ہے۔ یہ بھیانک کلپنا ہے۔ رات کو بھی اس کی یاد آجاتی ہے تو آج
بھی ساری ساری رات نیند نہیں آتی۔" اس کے خوبصورت اور تابناک چہرے پر غم کا سایہ پھیل
گیا۔ "چوہدری! ایسی باتیں کر کے میرے گھاؤ نہ چھیڑ۔ تیں نوں پتہ نہیں' میں کتنی ابھاگن اور
دکھی ہوں۔"

"تو پنڈ چھوڑ کر لور تو نہیں جا رہی ہے؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ "پہلے مجھے یہ بتا'
تو نے اس بارے میں کیا سوچا؟"

"میں تو آج کل' تاجاں کے ویاہ کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"سنا ہے تاجاں کی تو نے سگائی بھی کر دی۔" رحیم داد نے پوچھا۔

"میری تو آشا تھی تو اس کی سگائی پر یہاں ہوتا۔ پر تیرا تو کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کہاں ہے اور لوٹے گا؟ لوٹے گا بھی یا نہیں۔" جمیلہ کا لہجہ اچانک غم ناک ہو گیا۔ "پر اب تو ناجاں کے سسر والوں نے سگائی توڑ دی۔"

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔ نادر بتاتا تھا' تو آج اسی معاملے میں پھاتاں کے گھر گئی تھی۔ بات چیت کا؟"

"سگائی کے ساتھ رشتہ تو سمجھو ٹوٹ ہی چکا ہے۔ پر ناجاں کا ہونے والا سسر نیک بندہ۔ ویسے ناجاں کا سگا ماما بھی ہوتا ہے۔ اس نے سب کو سمجھا بجھا کر راضی تو کر لیا ہے۔ بہت بک جھک کے بعد فیصلہ ہوا۔"

"کیا فیصلہ ہوا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"ویاہ نہ حویلی سے ہو گا نہ پھاتاں کے گھر سے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "نادر خاں' جس گھر میں ہے' وہاں سے تو ویاہ ہو گا۔ جنج سکول میں اترے گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہی فیصلہ ہوا۔ ویسے حویلی سے ویاہ ہوتا تو ٹھیک تھا۔ تو ویاہ میں بیٹھے گی نا؟ میں۔ تھا ناجاں کے سسرال والوں کو تیرے ویاہ میں بیٹھنے پر بھی اعتراض تھا۔ یہ تو انھوں نے بہت سخ شرط لگائی تھی۔ ویاہ کے لیے سب کچھ تو کرے اور تجھے ہی ویاہ میں نہ بیٹھنے دیا جائے' یہ کیسے ہو ہے؟"

"اب یہ طے ہوا ہے کہ میں ویاہ میں بیٹھوں گی۔ ویسے میں تو خود بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔" اس آواز میں دبا دبا کرب تھا۔

"تو کیوں نہیں ویاہ میں بیٹھنا چاہتی تھی؟"

"رنڈودھوا جو ہوئی۔" جمیلہ کا لہجہ اور افسردہ ہو گیا۔ "رنڈ کا تو ویاہی جانے والی کڑی پر سایہ نہیں پڑنا چاہیے۔ اسے برا شگون سمجھا جاتا ہے۔ کیا کیا جائے' ریتاں رسماں ہی ایسی ہیں۔"

رحیم داد نے جمیلہ کو غم زدہ اور دل گرفتہ پایا تو گفتگو کا رخ بدل دیا' پوچھا۔ "زمیں دارنی! تو نادر کو دیپال پور کس لیے بھیجا ہے؟ کوئی خاص کام ہے؟"

"خاص ہی کام ہے تجھ سے اسی کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ بلکہ اس معاملے میں مجھے تیرا سخت انتظار تھا۔ نہ آتا تو میں نادر خاں کو دوبارہ تیرے پاس بھیجتی۔"

"گل کیہ ایہہ۔ خیر اے ناں؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"خیر ہی ہے۔ تو احسان شاہ کو تو جانتا ہے۔"

رحیم داد گھبرا گیا۔ لہجے میں عاجزی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "تجھے سب کچھ پتہ ہے۔ فیر ایسی گل بات کیوں پوچھتی ہے؟" اس نے لہجے میں تلخی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "پر اب میرے سامنے اس کا نام نہ لے۔ اسی کی جہ سے تجھ سے ساری ناراضگی ہوئی۔" اس نے چہرے پر غصے اور ناگواری کے تاثرات پیدا کیے' تیوری پر بل پڑ گئے۔ "تجھے پتہ نہیں وہ کتنا کینہ ہے۔ اسی نے میرا کلیم منسوخ کرانے کے لیے درخواست لگوائی تھی۔ تفتیش کروانے کا حکم نکلوایا تھا۔"

"میں نوں سب پتہ ہے۔ نادر مجھے اس بارے میں پہلے ہی سب کچھ بتا چکا ہے۔ احسان شاہ کتنا کینہ اور گندہ ہے۔ یہ مجھے ٹھیک طرح پتہ ہے۔"

"جب ایسی بات ہے تو اس کا ذکر تو نے میرے سامنے کیوں چھیڑا؟" رحیم داد نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "مجھے تنگ کرنا چاہتی ہے' ذلیل کرنا چاہتی ہے؟"

"ایسی گل نہیں۔" جمیلہ مسکرا کر نرم لہجے میں بولی۔ "ناراض نہ ہو۔" اس نے رحیم داد کے چہرے کی جانب نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں پچھلی رات کے چاند کی چاندنی اتر آئی تھی۔ "مجھے احسان شاہ سے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔"

"احسان شاہ سے ضروری کام پڑ گیا ہے! اور تجھے؟" رحیم داد حیران و پریشان ہو کر گویا ہوا۔

"ہاں' ایسی ہی گل ہے اور تجھے اس کام کے سلسلے میں احسان شاہ کے پاس جانا ہو گا۔"

"زمیں دارنی تو کیسی گل کر رہی ہے؟" رحیم داد نے چہرے پر جھنجلاہٹ پیدا کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ "میں نے اس کے پاس نہیں جانا۔ مجھے تو اب اس کے نام سے بھی گھن آتی ہے۔"

"میری گل تو سن۔" جمیلہ نرمی سے بولی۔

"سنا' کیا سنانا چاہتی ہے۔" رحیم داد کے چہرے پر بدستور تناؤ تھا۔

"بات یہ ہے۔" جمیلہ نے سنبھل سنبھل کر اپنا مقصد بیان کیا۔ "یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا' احسان شاہ اپنے مزارعوں اور کمیوں کی نوجوان گھر والیوں اور کڑیوں کو اٹھوا کر قید کر لیتا ہے۔ سنا ہے ان کو رکھنے کے لیے اس نے بہت وڈا کوٹ بنوا رکھا ہے۔ سمجھو ایک طرح کی جیل ہے وہ۔ اس کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔"

"سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر کبھی دیکھا نہیں۔" رحیم داد نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

"ان ہی قیدی زنانیوں میں سے ایک نے کسی نہ کسی طرح کوٹ کی جیل سے بھاگنے کی کوشش کی اور اس کی کوشش سپھل بھی ہو گئی۔"

"جب جیل ہوگی تو زنانیاں اس سے نکل کر بھاگنے کی کوشش بھی کرتی ہوں گی اور کوئی کوئی کامیاب بھی ہو جاتی ہوگی۔" رحیم داد نے اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ "پر تو نے ان سے لینا؟"

"ہوا یہ کہ ایک ایسی ہی زنانی چند روز ہوئے یہاں پہنچ گئی۔" جمیلہ نے رحیم داد کو اپنی بات وضاحت سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ایسی کڑاکے کی سردی میں وہ رات بھر جھاڑیوں میں چھپی رہی۔ میں سویرے سکول پہنچی تو وہ جھاڑیوں سے نکل کر میرے پیروں پر گر پڑی۔ سردی سے اس کا بدن مانو برف ہو رہا تھا۔"

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اسے خدشہ لاحق ہوا کہ کوئی ایسی عورت نہ ہو جو احسان شاہ کی حویلی میں اس کے ساتھ رات بسر کر چکی ہو۔ وہ اسے فوراً پہچان لیتی۔ اور اس کے لیے خطرہ بن جاتی۔ جمیلہ ایک بار پھر اس سے ناراض ہو جاتی اور اب اسے منانا بھی مشکل ہوتا۔

وہ سخت الجھن میں پڑ گیا۔ ہچکچاتے ہوئے گویا ہوا۔ "اب وہ کہاں ہے؟"

"میرے کمرے میں ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔

رحیم داد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اور اس قدر بڑھ گئی کہ وہ اس کے بارے میں پوچھ گچھ بھی نہ کر سکا۔ دم بخود بیٹھا رہا۔ جمیلہ بولتی رہی۔ "میری طرح وہ بھی مغویہ ہے۔ پہلے ہندو ہوتی تھی۔ اب مسلمان ہو چکی ہے۔ اس کا نام زینت بی بی ہے۔ میری ہی طرح ابھاگن ہے۔" جمیلہ کا چہرہ ذرا کرب سے مرجھا گیا۔

رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے فوراً یاد آگیا کہ پچھلی بار جب وہ احسان شاہ کی حویلی میں تھا تو مراد خاں شاہانی نے مزا لے لے کر زینت کا ذکر کیا تھا۔ وہ کوٹ میں ان دنوں نئی نئی اٹھا کر لائی گئی تھی۔ رحیم داد نے اس کے بارے میں مراد خاں سے بہت کچھ سنا تھا۔ مگر زینت سے اس کا آمنا سامنا نہ ہوا تھا۔ نہ اس نے رحیم داد کو دیکھا تھا اور نہ ہی رحیم داد نے اسے دیکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی اور انجان تھے۔

رحیم داد نے زینت کے بارے میں کسی تبصرے سے گریز کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس پر بھی بہت اپرادھ ہوا۔ جس کے ہاتھوں میں پڑ گئی اس نے نوچا کھسوٹا ذرا بھی ترس نہ کھایا۔ آخر اسے ایک نیک بندہ مل گیا۔ وہ سکول ماسٹر تھا۔ اس نے زینت سے باقاعدہ ویاہ کر لیا۔ اب وہ اسی کے پاس جانا چاہتی ہے۔"

"وہ کہاں ہوتا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"وہ آج کل دیپال پور کے پرائمری سکول میں ماسٹر لگا ہے۔ اس کا نام جلیل ہے۔"

"تو نے اسی کو بلانے کے لیے نادر کو دیپال پور بھیجا ہے؟"

"ہاں جی، میں نے نادر خاں کو اسی لیے دیپال پور بھیجا ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "وہ آکر زینت کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

"جب ایسی گل بات ہے تو احسان شاہ کے پاس میرے جانے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے استفہامیہ نظروں سے جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "میں تو کہتا ہوں زمیں دارنی، احسان شاہ کو تو اس کا بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ تیں نوں پتہ نہیں وہ کتنا خطرناک اور کینہ ہے۔" اس کے چہرے سے خوف اور پریشانی صاف عیاں تھی۔

"میں نوں پتہ ہے، وہ کتنا خطرناک ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد سے اتفاق کیا۔ "اس کا اثر و رسوخ بھی بہت ہے۔ وڈے سرکاری افسروں بلکہ اسمبلی کے ممبروں اور وزیروں تک سے اس کی یاری ہے۔ اس کی پہنچ تو بہت اوپر تک ہے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ چہرے کی شگفتگی اور رعنائی دھندلی پڑ گئی۔ "سچ پوچھ تو حکومت ہی ایسے بندوں کی ہے۔ اس کے دو پتر تو وڈے سرکاری افسر لگے ہیں۔ جنوائی اور بھتیجے بھی اونچے عہدوں پر ہیں۔"

"تو بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ پر سمجھ نہیں آتی مجھے اس کے پاس کیوں بھیجنا چاہتی ہے؟"

"یہی تو تجھے بتانا ہے۔" جمیلہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "زینت کے دو بچے ہیں۔ دونوں احسان شاہ کے مزارعے سلامو کے پاس ہیں۔ سلامو ہی اسے اغوا کر کے پیراں والہ لایا تھا۔ اور اس کے گھر سے احسان شاہ نے اپنے کرندوں کے ذریعے زینت کو اٹھوا لیا۔"

"زینت کو اپنے بچے تو یاد آتے ہی ہوں گے۔"

"کیوں نہیں یاد آتے۔ زینت کے سینے میں بھی ماں کا ہردے دھڑکتا ہے۔" جمیلہ نے تڑپ کر کہا۔ "ان کے لیے وہ بلک بلک کر روتی ہے۔ اسے روتا دیکھتی ہوں تو میری آنکھوں میں بھی آنسو آجاتے ہیں۔ میں بھی تو ماں ہوں۔" اس کے چہرے پر دکھ برسات کے بادلوں کی مانند منڈلانے لگا۔

"چوہدری! تجھے ماں کی ممتا کا پتہ نہیں۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ چپ بیٹھا رہا۔

"تو احسان شاہ کے پاس چلا جا۔" اس دفعہ جمیلہ کے لہجے میں التجا کا پہلو نمایاں تھا۔ "اس کی منت سماجت کر لینا۔ میری خاطر کر لینا۔" اس کے رویے میں عاجزی اور بڑھ گئی۔ "چوہدری! تو زینت کے بچے دلوا دے۔ تیری بہت مہربانی ہوگی۔ مجھے وشواس ہے احسان شاہ تیری گل ضرور مان

لے گا۔"

"بالکل نہیں مانے گا۔ تو نے بالکل غلط اندازہ لگا رکھا ہے۔" رحیم داد نے جھٹ صفائی پیش
"میری اس کے ساتھ ایسی یاری نہیں کہ وہ میری ہر گل بات مان لے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں و
دشمن نہ ہو جائے۔"

"ہو جائے' کون سا فرق پڑتا ہے۔ پہلے ہی وہ کون سا مجھ پر مہربان رہا ہے۔" جمیلہ کے ہونٹو
زہر خند نمودار ہوا۔ "وہ تو مجھے اپنی رکھیل بنانے کے لیے خریدنا چاہتا تھا۔ دو ہزار بولی لگائی تھی
اللہ وسایا نے صاف انکار کر دیا۔" جمیلہ نے اپنی بات کا رخ بدل دیا' ایک بار پھر حرف مطلب
آ گئی۔ "چوہدری! تو زینت کے بچوں کے لیے احسان شاہ سے بات کر کے تو دیکھ۔"

"تو بھی کمال کرتی ہے زمیں دارنی۔" رحیم داد کسی قدر جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "
سے بات کرنے کا تو یہ مطلب ہو گا کہ اسے پتہ چل جائے گا زینت یہاں ہے۔"

اس نے جمیلہ کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو نے یہ نہیں سوچا' اگر احسان شاہ نے میری بات
مانی تو کیا ہو گا؟ میں تو کہتا ہوں اسے پتہ چل گیا تو زینت اپنے گھر والے کے پاس بھی نہ جا سکے
احسان شاہ اسے رستے ہی سے اٹھوا لے گا۔ وہ ایسا ہی خطرناک بندہ ہے۔"

جمیلہ تذبذب میں پڑ گئی۔ رحیم داد نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا' ان کی اہمیت کو اس نے
محسوس کیا۔

☆

رات کالی کاجل ہو گئی۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ حویلی پر سناٹا چھایا تھا۔ اسی اثنا میں رات
گہرے سناٹے میں کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔ چاپ ہولے ہولے قریب آ گئی
دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ جمیلہ اور رحیم داد نے گردن موڑ کر اس طرف دیکھا۔

زینت دروازے پر کھڑی تھی۔ مگر وہ اندر نہ آئی۔ جمیلہ نے نرمی سے کہا۔ "اندر آ جا۔ با
سردی میں کیوں کھڑی ہے؟"

وہ سہمی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور دہلیز کے پاس فرش پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ رحیم داد
نظر بھر کر اسے دیکھا۔ اس کا رنگ ہلکا گلابی تھا۔ بال سنہری مائل تھے۔ آنکھیں بھوری تھیں مگر
بڑی اور کشش انگیز تھیں۔ ناک نقشہ سبک اور کھڑا کھڑا تھا۔ جسم نرم اور گداز تھا۔ عمر ۲۴
سے زیادہ نہ تھی۔ مگر وہ اتنی ہی عمر میں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن چکی تھی۔ آنکھیں ویران ا
دھواں دھواں تھیں۔ چہرہ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح شگفتگی سے عاری تھا۔ جلد کھردری پڑ گئی

تھی۔ وہ گہری نیلی دھوتی باندھے ہوئے تھی اور ملگجی قمیص اوڑھے سکڑی سکڑائی حسرت کا مرقع اور
عبرت کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

جمیلہ نے پوچھا۔ "زینت! کیسے آ گئی؟"

"بھین جی' نیند نہیں آ رہی تھی۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مجھے پتہ چلا' تو یہاں ہے۔ من
گھبرایا تو ادھر آ گئی۔ تو نے برا تو نہیں منایا؟"

"ایسی گل نہ سوچ۔" جمیلہ نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "وہاں کیوں بیٹھی ہے۔ ادھر میرے پاس
کرسی پر آ کر بیٹھ جا۔"

اس نے گردن ہلا کر آہستہ سے کہا۔ "نہیں بھین جی' میں یہیں ٹھیک ہوں۔" وہ اپنی جگہ پر بیٹھی
رہی۔

جمیلہ نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ "چوہدری! اس نے دسویں تک پڑھا ہے۔ پیا ڈاکٹر تھا۔ پنڈ توں
کا کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ سمے بدلا تو سب کچھ بدل گیا۔ اب یہ اپنی ہی نظروں میں اتنی گر گئی ہے کہ خود
کو کمی سمجھتی ہے۔ میرے ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ڈرتی ہے۔"

رحیم داد نے جمیلہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے زینت سے پوچھا۔ "تو احسان شاہ کے کوٹ
سے کیسے نکل آئی؟ سنا ہے ادھر بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے۔ ہر وقت مسلح راکھے پہرہ دیتے ہیں۔
میں نے غلط تو نہیں سنا؟" رحیم داد نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"تو نے ٹھیک ہی سنا۔" اس نے رحیم داد کی تائید کی۔ "وہ ایسا ہوا جی' میں اس رات کوٹ میں
نہیں تھی۔ مجھے شاہ جی کے نوکر' شیدا نے ان کمروں میں سے ایک میں پہنچا دیا تھا جن میں مہمان
ٹھہرتے ہیں۔ وہ جی بہت گندی اور خراب جگہ ہے۔" اس کا لہجہ دھیما اور افسردہ پڑ گیا۔ "پہلے بھی
ان کمروں میں کئی بار جا چکی تھی۔ اس رات محکمہ آبادکاری کا کوئی وڈا افسر ٹھیرا تھا۔ اس نے
دانتوں سے ایسے زور زور سے کاٹا کہ مجھے رونا آ گیا۔ پر وہ ہنستا رہا' ٹھول کرتا رہا۔ نشے سے بالکل
پاگل ہو رہا تھا۔"

رحیم داد نے مسکرا کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "سن لے' زمیں دارنی۔ اس طرح ہو رہی ہے
آبادکاری۔" جمیلہ کچھ نہ بولی۔ نگاہیں نیچی کیے خاموش بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے نگاہیں گھمائیں۔
زینت کو دیکھا' پوچھا۔ "یہ بتا زینت' تو وہاں سے نکلی کیسے؟ راکھوں نے تجھے نہیں روکا؟" اس کی
آنکھوں میں حیرت اور استعجاب تھا۔

"بات سچی یہ ہے جی۔" زینت نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر بتایا۔ "نشے میں تو وہ تھا ہی۔ ایسا

بے خبر ہو کر سویا کہ اسے بالکل سدھ بدھ نہ رہی۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ اس نے ایسے کٹھور پن سے بدن میں جگہ جگہ کاٹا تھا کہ بار بار ٹیس اٹھتی تھی۔" اس نے سردی سے بچنے کے لیے کھیس ٹانگوں تک پھیلا دی۔

"فیر کیا ہوا؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"جب وہ بے سدھ ہو کر سو گیا تو میں اٹھی۔ چپکے سے دروازہ کھولا۔" زینت آہستہ آہستہ بتاتی رہی۔ "کمرے کے باہر برآمدہ تھا۔ اس میں راکھا بیٹھا تھا۔ اس کے پاس بندوک تھی۔ پر وہ دیوار سے پیٹھ ٹکائے اس سے اونگھ گیا تھا۔ میں چوری چوری چلتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیوں سے نیچے اتری۔ سامنے گھنے پیڑ تھے۔ اندھیرا بھی بہت تھا۔ میں درختوں تلے پہنچ گئی۔ اگے بڑھی اور ایک پیڑ پر چڑھ گئی۔"

"تو پیڑ پر بھی چڑھ لیتی ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں جی مجھے بچپن سے پیڑوں پر چڑھنے کی خوب پریکٹس ہے۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "پیڑ دیوار کے ساتھ ہی تھا۔ میں ایک ڈالی سے لٹک کر جھولتی رہی اور ایک جی کڑا کر کے باہر کود گئی۔"

"پر حویلی کی دیوار تو بہت اونچی ہے۔" رحیم داد نے پوچھا۔ "تجھے چوٹ نہیں آئی۔"

"آئی تھی۔ پر زیادہ نہیں آئی۔ اس سے تو بالکل پتہ نہ چلا۔ میں پیراں والہ سے بھاگتی ہوئی رات کے اندھیرے میں نکلی اور نہر کے ساتھ ساتھ چلتی ادھر آ گئی۔ پر بعد میں ایک ٹانگ درد کرنے لگی۔ اب بھی کرتی ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کو دیکھا۔ "بھین جی کو میں نے بتایا اس نے تاراں سے مالش کرائی۔ اس سے درد کم ہو گیا۔"

جمیلہ زیادہ دیر خاموش نہ رہی۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "زینت! تیرا اصلی درد تو تیرے بالک ہیں۔ جن کو تو ہر سمے یاد کرتی رہتی ہے، روتی رہتی ہے، آنسو بہاتی ہے۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "یہی گل ہے نا؟"

"میرا اصلی درد تو بھین جی یہی ہے۔ ان کے لیے تو میں شاہ جی کی حویلی میں بھی روتی رہتی تھی۔" زینت نے دکھ بھرے لہجے میں جمیلہ کی بات کی تائید کی۔ "کوٹ کی کیدی زنانیوں کی انچارج رہتی ہے۔ مجھے روتا ہوا دیکھ کر وہ ڈانٹتی ڈپٹتی تھی۔ بالوں سے پکڑ کر مارتی تھی۔ وہ جی بہت کٹھور ہے۔ اس کے ڈر سے میں چھپ چھپ کر روتی تھی۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی، آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ کھیس کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! یہ بھی ٹھیک ہی ہوا زینت اس سے یہاں آ گئی۔ تو نے بھی اس کا دکھ جان لیا۔ یہ اپنے بچوں کے لیے بہت دکھی ہے۔ اسے کچھ چنگا نہیں لگتا۔ روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھاتی۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "یہ بتا اس کے بچوں کو لانے کے لیے کیا رستہ نکالا جائے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"میں تو کہتا ہوں جی، پہلے اس کے گھر والے کا انتظار کر لیا جائے۔ وہ کل شام تک نادر خاں کے ساتھ پہنچ ہی جائے گا۔ جنت نے مجھے یہی بتایا ہے۔" رحیم داد نے اپنے خدشات کا دبی زبان سے اظہار کیا۔ "پہلے اس کے گھر والے سے گل بات کرنی ضروری ہے۔ مان لے وہ اسے لے جانے پر تیار نہ ہوا، تب کیا ہو گا؟ مجھے یا تجھے اس کے دل کا کیا پتہ؟"

"چوہدری! تو کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔ ایسا ہے لگا ہے، کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کبھی کبھی تو میں بھی اس پرکار سوچتی ہوں۔" جمیلہ نے بھی رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ "سال بھر سے اوپر ہو گیا۔ پتہ نہیں گھر والے کے من میں اس کے بارے میں کیا ہو؟ اس نے کیا سوچ رکھا ہو؟"

"بھین جی، ایسا نہ کہہ۔" زینت تڑپ کر بولی۔ "وہ مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ بہت نیک اور بھلا بندہ ہے۔ وہ مجھے اتنا پیار نہ کرتا تو میں اپنے کنبے والوں کو چھوڑ کر فیروز پور سے ادھر واپس ہی کیوں آتی؟ تجھے تو ساری باتوں کا پتہ ہی ہے۔ سب کچھ بتا چکی ہوں تجھ سے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" رحیم داد نے اس کی دل شکنی نہ کی۔ "پر پہلے اس سے مل کر بات کر لینی ضروری ہے۔" اس نے جمیلہ کو مخاطب کیا۔ "زمیں وارنی! میں تو ایسا ہی سوچتا ہوں۔ تو کیا کہتی ہے؟"

"وہی جو تیرا وچار ہے۔" جمیلہ نے اس کی تائید کی۔ "زینت کے گھر والے کا پہلے انتظار کر لینا چاہیے۔ اس سے بات چیت کرنے پر صاف پتہ چل جائے گا، وہ کیا چاہتا ہے؟" اس نے زینت کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "مان لے، وہ تجھے اپنے ساتھ لے جانے پر تیار نہ ہوا۔" اپنے اس شک و شبہ کے اظہار کے ساتھ ہی اس نے زینت کو یقین بھی دلایا۔ "چنتا نہ کر زینت۔ میں تجھے اور تیرے بچوں کو اپنے پاس رکھوں گی۔ ویسے تیرا گھر والا جلیل چاہے تو اسے بھی یہاں ٹھہرا لوں گی۔"

"بھین جی! وہ یہاں کیسے رہ سکتا ہے؟ دیپال پور میں تو وہ نوکری کرتا ہے۔ سکول میں پڑھاتا ہے۔"

"یہاں بھی سکول میں پڑھائے گا۔" جمیلہ نے مسکرا کر زینت کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"تونے تو میرا سکول دیکھا ہے۔ وہیں تو مجھے پہلی بار ملی تھی۔ بھول گئی؟"

"زینت نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "پر جلیل تو سرکاری سکول کا ماسٹر ہے۔ وہ کیسے سرکاری نو
چھوڑ دے گا؟"

"یہ بھی سرکاری سکول بن جائے گا۔" جمیلہ نے اسے یقین دلایا۔ "میں تو یہی چاہوں گی
ادھر ہی ٹھہر جائے اور یہ سکول چلائے۔ مجھے تو ویسے بھی تجربے کار سکول ماسٹروں کی ضرور
ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوئی۔ "چوہدری! میں تجھے یہ بتانا تو بھول
گئی کہ اپنے سکول کے بارے میں بات چیت کرنے شہر گئی تھی۔ محکمہ تعلیم والوں نے تو ٹال م
سے کام لیا۔ میں ڈپٹی کمشنر سے ملی۔ بہت اچھی طرح پیش آیا۔ چنگا بندہ لگتا ہے۔ اس نے مدد کر
کا وعدہ بھی کیا۔ مجھے وشواس دلایا کہ میرے سکول کو سرکاری پرائمری سکول بنا دیا جائے گا۔"

"کب تک ایسا ہو جائے گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"یہ تو بتانا مشکل ہے۔" جمیلہ نے جواب دیا۔ "ڈپٹی کمشنر نے کہا ہے 'اگر فوری طور پر ایسا نہ
تو سکول کو منظور شدہ تو ضرور بنا دیا جائے گا۔ سرکار کی طرف سے مالی مدد بھی ملے گی۔ اس کی و
مجھے پتا نہیں۔ پر ریکگنائزڈ یا منظور شدہ ہو جانے کے بعد سکول کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ ابھی ا
کچھ بھی نہیں۔"

"یہ تو بہت زبردست کام ہو گا۔" رحیم داد نے جمیلہ کی خوشنودی کے لیے کہا۔ ویسے اسے سک
سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ احسان شاہ سے سکول کے بارے میں تفصیلی بات چیت کرنے کے
وہ اس کے قیام کے حق میں نہ رہا تھا۔

مگر جمیلہ اس کے احساسات سے بے نیاز بڑے جوش و خروش سے بتاتی رہی۔ "ڈپٹی کمشنر نے
مجھے یہاں تک وشواش دلایا کہ وہ ڈسٹرکٹ بورڈ والوں سے بات چیت کرے گا اور انسپکٹر آف سک
کو جلد ہی معائنے کے لیے بھجوانے کی کوشش کرے گا۔ خود بھی ادھر آنے کو کہتا تھا۔"

"بھین جی' تیرا سکول سرکاری بن گیا' تب تو جلیل ضرور یہاں آ جائے گا۔" زینت خوش ہو
بولی۔ "میں بھی اسے کہوں گی۔ وہ میری بات مان لے گا۔ پر اسے ادھر اپنا تبادلہ کرانا پڑے گا۔"

"پر ابھی اسے آنے تو دے۔ تو نے تو ابھی سے اونچی اونچی گلاں سوچنی شروع کر دیں۔" رحیم د
نے ہنس کر زینت سے کہا۔ "پہلے تو اس سے مل کر یہ معلوم کرنا ہو گا' اس کا ارادہ کیا ہے؟ جب ا
سے ملے اور بات کیے تو کچھ بھی نہیں طے کیا جا سکتا۔"

"چوہدری! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پہلے جلیل کا انتظار کرنا ہو گا۔" جمیلہ نے رحیم داد

رائے سے پورا پورا اتفاق کیا۔ "اسے کل شام تک نادر کے ساتھ یہاں پہنچ جانا چاہیے۔" اس
نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "ساڑھے بارہ بج گئے۔ آدھی رات ہو گئی' باتوں میں سے کا
پتہ نہ چلا۔ بہت دیر ہو گئی۔ اب چلنا چاہیے۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"پر تو نے طے کیا کیا؟" رحیم داد نے جمیلہ کو ٹوکا۔

"طے کیا کرنا ہے۔" جمیلہ نے جواب دیا۔ "پہلے جلیل سے مل کر بات کرنی ضروری ہے۔ ہونا
بھی یہی چاہیے۔ اس کے آنے کے بعد ہی آگے کے لیے سوچ وچار کیا جائے گا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ آگے بڑھی۔ زینت بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں کمرے سے چلی
گئیں۔

☆

زینت کے شوہر' جلیل کا صبح ہوتے ہی انتظار شروع ہو گیا۔ دن ڈھلنے لگا۔ سورج غروب ہو گیا۔
شام ہو گئی۔ مگر جلیل نہ آیا۔ نادر خاں بھی نہ لوٹا۔ پھر رات ہو گئی۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی
تھی۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ رحیم داد جاگ رہا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ویسے بھی
کچھ عرصے سے اسے دیر سے سونے کی عادت پڑ گئی تھی۔

رات گئے بالائی منزل پر جا... والے زینے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد پوری طرح
بیدار تھا۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی اور کمرے کے پاس پہنچ کر ختم ہو گئی۔ رحیم داد نے بے چین
نظروں سے بند دروازے کی جانب دیکھا۔

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ رحیم داد نے اٹھ کر لیمپ کی لو اونچی کی۔ آگے بڑھا۔
دروازہ کھولا۔ سامنے جمیلہ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دواؤں کا تھیلا لٹک رہا تھا۔ اس کے قریب
حویلی کی نوکرانی تاجو کھڑی تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی لالٹین سنبھالے ہوئے تھی۔

جمیلہ نے رحیم داد کو دیکھتے ہی دریافت کیا۔ "چوہدری! تو ابھی سویا نہیں؟"

"نہیں جی' میں جاگ رہا تھا۔ دن میں دیر تک سوتا رہا۔ اب نیند نہیں آ رہی تھی۔" رحیم داد
نے وضاحت کی' پوچھا۔ "پر زمیں دارنی تو اتنی رات کو کہاں جا رہی ہے؟"

"پنڈ کے موچی کی طبیعت بہت گڑبڑ ہے۔" جمیلہ نے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شام
سے اسے الٹیاں ہو رہی ہیں۔ حکیم سے دوائی بھی لایا تھا۔ پر طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر
پہلے حمزا کے ساتھ اس کا پتر آیا تھا۔ بہت پریشان لگتا تھا۔ اسے تو میں نے جھٹ واپس بھیج دیا۔
اب موچی کے گھر جا رہی ہوں۔"

"پر اب تو بہت رات ہو گئی۔" رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔

جمیلہ کچھ نہ بولی۔ دواؤں کا بکسا فرش پر رکھا۔ شال دوبارہ اس طرح سنبھال کر اوڑھی کہ کان اور چہرے کا بیشتر حصہ ڈھک گیا۔

"زمیں دارنی! سردی بہت ہے۔ تو نے خالی شال اوڑھ رکھی ہے۔"

"نہیں' میں نے موٹا اونی سوئیٹر بھی پہن رکھا ہے۔ تو چنتا نہ کر۔" جمیلہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ "ویسے مجھ سے کمبل یا دھسا اوڑھ کر چلا نہیں جاتا۔ نہ جانے کیسا لگتا ہے۔" بات کہتے کہتے اس کے چہرے سے گھبراہٹ جھلکنے لگی۔ "چوہدری! میں تیرے پاس اس کارن آئی تھی کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ احسان شاہ کا ایک کرندہ شام کو ادھر آیا تھا۔ تجھ سے تو نہیں ملا۔"

"مجھے تو نہیں ملا۔ پر وہ آیا کیوں؟" رحیم داد بھی گھبرا گیا۔ "زینت تو تیرے ہی ساتھ ہے نا؟"

"وہ تو میرے ہی کمرے میں ہے۔ اسے نینا اور گڈو کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔ جاگ رہی ہے۔"

"وہ جلیل کا انتظار کر رہی ہوگی۔ پر نہ وہ آیا اور نہ ہی نادر لوٹا۔"

"پتہ نہیں کیوں نہیں آیا۔ لگتا ہے نادر اسے لے کر ہی آئے گا۔ کل تک دونوں کو آجانا چاہیے۔"

"زمیں دارنی! اندر آجا۔ باہر کیوں کھڑی ہے؟"

"میں نے ٹھہرنا نہیں ہے۔ تجھے احسان شاہ کے کرندے کے بارے میں بتانے آئی تھی۔ مجھے اب موچی کے گھر جانا ہے۔"

"ٹھہر جا' میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ تیرا اتنی رات گزرے اس طرح جانا ٹھیک نہیں۔"

جمیلہ نے منع بھی کیا' مگر رحیم داد باز نہ آیا۔ اس نے جلدی جلدی جوتے پہنے' سر پر پگڑی رکھی' اونی دھسا اوڑھا' باہر نکلا' دروازہ بند کیا اور جمیلہ کے انکار کے باوجود اصرار کر کے دواؤں کا بکسا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

رحیم داد بکسا سنبھالے جمیلہ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ناجو لالٹین لیے آگے آگے تھی۔ تینوں حویلی سے باہر نکلے۔ پھاٹک پر پہریدار موجود تھا۔ رحیم داد نے اسے چوکنا اور محتاط رہنے کی ہدایت کی۔ حویلی کے باہر پالا پڑ رہا تھا۔ ہر طرف نیل گوں دھندلکا پھیلا تھا۔ اس کی تہہ اس قدر گاڑھی اور دبیز تھی کہ لالٹین کی روشنی ہلکا سا دھبا نظر آتی تھی۔

گاؤں پالے میں لپٹا سو رہا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ یہ جاڑے کی سرد اور خون منجمد کر دینے وا

رات تھی۔ رحیم داد کا بدن موٹے دھسے میں بھی کپکپا رہا تھا۔ ناجو بھی سکڑی سکڑائی نظر آتی تھی۔ مگر جمیلہ گردن اٹھائے نہایت سکون سے چل رہی تھی۔ تینوں نے رڑ عبور کیا اور گاؤں کی جانب بڑھے۔

ابھی تینوں گاؤں کے مکانات سے دور ہی تھے کہ رات کے پرہول سناٹے میں عقب سے تیز ٹاپیں سنائی دیں۔ کوئی گھوڑا سرپٹ دوڑتا اسی طرف آرہا تھا۔ جمیلہ' رحیم داد اور ناجو نے ٹاپیں سنیں تو ٹھٹک کر رہ گئے۔ ان کی آنکھوں میں خوف تھا' چہروں پر پریشانی تھی۔ وہ اس سمت دھڑکتے دل سے دیکھنے لگے جدھر سے آہٹ ابھر رہی تھی اور دم بدم قریب سے قریب تر ہوتی جارہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے گھڑ سوار ان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے گھوڑا ٹھہرایا۔ نیچے اترا اور رکابیں سنبھالے ہوئے ان کی طرف بڑھا۔ تینوں دم بخود تھے۔ پالے کا دھندلکا اتنا دبیز تھا کہ آنے والا سائے کی مانند نظر آرہا تھا۔ رحیم داد گوموگو کے عالم میں حیران و پریشان کھڑا رہا۔ مگر جمیلہ نے جرات سے کام لیا۔ آگے بڑھی۔ ناجو کے ہاتھ سے لالٹین لی۔ اسے اٹھا کر اونچا کیا۔ اور آنے والے کو آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا۔ وہ اب ٹھہر گیا تھا اور دھندلکے میں لپٹا ہوا چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ اندھیرے میں اونی دوہر سے اس طرح چہرہ چھپائے ہوئے تھا کہ صرف تیز چمکتی ہوئی آنکھیں لالٹین کی دھندلی روشنی میں نظر آرہی تھیں۔

جمیلہ نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے تو؟" اس کی آواز میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہی۔

وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے خاموشی سے قدم اٹھایا اور آگے بڑھنے لگا۔ اب رحیم داد کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ اس نے ڈپٹ کر کہا۔ "بولتا کیوں نہیں۔ صاف صاف بتا۔ تو کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟"

وہ تینوں کے مقابل پہنچ کر پھر رک گیا' مگر کچھ بولا نہیں۔ چہرے پر سے دوہر ہٹائی اور جمیلہ کو مخاطب کیا۔ "بھین جی' گھبرا نہیں۔ میں جیرا ہوں۔"

جمیلہ نے لالٹین اٹھا کر اس کے چہرے کے سامنے کر دی۔ وہ جیرا ہی تھا۔ اس کے مزارعے دین محمد کا بڑا بیٹا۔ جمیلہ نے لالٹین نیچے کر لی۔ اطمینان کی سانس لی' مسکرا کر بولی۔

"جیرے! تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

جیرا نے کچھ نہ کہا۔ گم صم کھڑا رہا۔ جمیلہ نے زور دے کر پوچھا۔ "جیرے! اس سمے کہاں سے آرہا ہے؟"

"میں اپنی گھر والی لاڈو کو لینے سلیمان پورے گیا تھا۔"

"تو اسے اپنے ساتھ نہیں لایا؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔ "کہاں ہے وہ؟"

"بھین جی تمیں نوں پتہ ہی ہے۔ وہ دونوں بچے چھوڑ کر اسلم کے ساتھ چلی گئی۔" جیرا نے دبی زبان سے بتایا۔

"میں نوں پتہ ہے' بالکل پتہ ہے۔ تیرا پیؤ میرے پاس آیا تھا۔ اس سے دیر تک گل بات ہوئی تھی۔ وہ اسے لینے سلیمان پورہ بھی گیا تھا۔ آگے کا مجھے پتہ نہیں۔ نہ دین محمد نے کچھ بتایا اور نہ تیری ماں نے۔ دونوں میں سے کوئی بھی میرے پاس نہ آیا۔"

"آ کر کرتے بھی کیا۔" جیرا تیکھے لہجے میں بولا۔ "اس نے واپس آنے سے صاف انکار کر دیا۔"

"پر تیرے پیؤ دین محمد کو بتانا تو چاہیے تھا۔" جمیلہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "وہ میرے پاس آتا تو آگے کی سوچی جاتی۔ لاڈو کو واپس لانے کے لیے کوئی اپائے کیا جاتا۔ وہ تیری گھر والی ہے۔ تیرا اس پر ادھیکار ہے۔ اسے تیرے پاس آنا چاہیے۔ بچے بھی اس کے بنا بہت پریشان ہوں گے۔"

"بہت تنگ کرتے ہیں جی۔ چھوٹے چھوٹے نکے ہی تو ہیں۔ بہت ضد کرتے ہیں جی۔ ہر دم روتے رہتے ہیں۔ بھین جی! تجھ سے اب کیا بتاؤں۔"

"میں نوں پتہ ہے۔ ضرور تنگ کرتے ہوں گے۔" جمیلہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "پر لاڈو کیسی ماں ہے؟ اسے اپنے بچے بھی یاد نہیں آتے۔ اس کی ممتا بھی نہیں جاگی۔"

"اسے تو جی کسی کی یاد نہیں آتی۔ تین مہینے سے اوپر ہو گئے۔ سب نے مشورہ دیا۔ تھانے میں پرچہ چاک کرا دو۔ پر میرے پیو نے منع کر دیا۔ خود اسلم کے گھر گیا۔ لاڈو سے ملا۔ سمجھانے بجھانے کی کوشش کی پر وہ آنے پر راضی نہیں ہوئی۔ دوبارہ چاچا کو لے کر گیا۔ اس نے ملنے اور گل بات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "آج دوپہر مجھے پتہ چلا' وہ کل سویرے کی گڈی سے اسلم کے ساتھ کراچی جا رہی ہے۔ اپنے پنڈ سے بھاگنے کی تیاری اسلم چپکے چپکے کر رہا تھا۔ پر مجھے کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا۔" اس نے قدرے تامل کیا پھر جمیلہ کو بتایا۔ "میں آج طے کر کے سلیمان پورہ گیا تھا' لاڈو کو اپنے ساتھ لے کر ہی آؤں گا۔" بولتے بولتے اچانک اس کا لہجہ تند اور تیکھا ہو گیا۔ "پر اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔"

"کیوں نہیں آئے گی؟" جمیلہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "تو نے ایسا کیسے سوچا؟"

جیرا کا چہرہ کرخت ہو گیا' آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگیں' منہ بگاڑ کر بولا۔ "میں اسلم کے گھر اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ گیا۔ یار دوستوں کو پہرے پر لگایا۔ گھوڑی بڑھا کر آنگن کی دیوار

کے ساتھ کھڑی کی۔ دیوار پر پہنچا اور دھیرے سے کود کر اندر چلا گیا۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔

"لاڈو اپنے یار اسلم کے ساتھ لیٹی تھی۔ دونوں کو دیکھتے ہی میں پاگل ہو گیا۔" جیرا نے دوہرے اندر سے ہاتھ نکالا۔ اس میں خون سے لتھڑی ہوئی چھری دبی تھی۔

لال لال خون دیکھ کر جمیلہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ رحیم داد بھی دہشت زدہ ہو گیا۔ تاجو نے چیخنے کے لیے منہ پھاڑا مگر آواز نہ نکلی۔ جیرا خون آلود چھری ہاتھ میں دبائے تینوں کے عین سامنے گز' سوا گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ اس وقت بہت خونخوار نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چھری سامنے کر دی۔ "میں نے جی دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس وقت تک وار کرتا رہا جب تک بالکل ختم نہ ہو گئے۔" جیرا نے گہری سانس بھری اور جمیلہ کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔

"جیرے! تو نے بہت برا کیا۔" جمیلہ اب سنبھل چکی تھی۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "تجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ایسا کر کے تجھے کیا ملا؟"

"جو ہونا تھا جی' وہ ہو گیا۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

"یہ کب کی گل ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"سدھا سلیمان پورے سے آ رہا ہوں میں اپنے گھر جا رہا تھا۔ اب نہیں جاؤں گا۔ بھین جی' تو میرے پیؤ کو بتا دینا تیرے پتر نے اپنی بے عزتی کا حساب چکا دیا۔ اب وہ پنڈ میں گردن اونچی کر کے چلے گا۔"

جمیلہ کا چہرہ بدستور پریشان تھا۔ "تو کچھ ہی کہہ' جیرے تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔"

جیرا نے کچھ نہ کہا۔ آگے بڑھا' جھکا۔ جمیلہ کے پیروں کو چھو کر عاجزی سے بولا۔ "بھین مجھے معاف کر دینا۔" وہ چند لمحے گردن جھکائے جمیلہ کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر اس نے دوہرے اپنے چہرے کو ڈھاٹا باندھ کر چھپایا۔ گھوڑے کی طرف بڑھا اور اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔

جمیلہ نے گھبرا کر ٹوکا۔ "جیرے اب تو کہاں جا رہا ہے؟"

"سوئے کے کنارے میرا یار ملکان انتظار کر رہا ہے۔ میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ بھی میرے ساتھ سلیمان پورے گیا تھا۔"

"پر تو اس کے ساتھ کہاں جائے گا؟"

"ملکان کو اس کے گھر بھیج دوں گا۔" جیرا نے جمیلہ کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "میں تھانے چلا جاؤں گا۔"

جمیلہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ چیخ کر بولی۔ "جیرے ٹھہر جا۔ میری گل تو سن۔"

مگر جیرا نے کچھ نہ سنا۔ اس نے گھوڑے کو موڑا' ایڑ لگائی اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف
گھوڑا تیزی سے دوڑاتا ہوا آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ رحیم داد' جمیلہ اور ناجو
کے سے عالم میں کھڑے رہے۔ رات کے سناٹے میں دور ہوتی ہوئی ٹاپیں سنتے رہے۔ آخر وہ
گہری خاموشی میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئیں۔

جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیسا گبھرو جوان ہے۔ غصے میں پاگل ہو کر بہتیا کر بیٹھا۔"

"اور کیا کرتا؟" رحیم داد نے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی
کرتا۔ عزت اور آن بھی تو کچھ ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں' جیرا حوصلے والا اور جی دار جوان ہے۔"

"چوہدری' چھوڑ جی داری شی داری کو۔ اس میں کیا دھرا ہے۔" جمیلہ نے جل کر تیکھے لہجے
کہا۔ "کوئی جاگیردار اور وڈا زمیں دار کسی بھی زنانی کو اغوا لے۔ اسے رکھیل بنا کر رکھے۔
جنوائے' تب نہ عزت یاد آتی ہے نہ غیرت اور آبرو۔ ساری جی داری دھری کی دھری رہ جاتی۔
اس کے تو پیر پکڑتے ہیں۔ منتیں کرتے ہیں' گڑگڑاتے ہیں' میرا بازو واپس دے دے۔" اس کا
اور تلخ ہو گیا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ بکھر گئی۔ "دھتکارے جاتے ہیں' گالاں سنتے ہیں۔ بار بار
ہاتھ جوڑتے ہیں' پیروں پر پگڑی ڈال دیتے ہیں اور عام طور پر رقم ادا کر کے واپس لاتے ہیں۔"
نے منہ بگاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔

"ایک طرف تو غیرت اور آن کا یہ حال ہے اور دوسری طرف اپنی ہی طرح کا مزارع
بھگا لے جائے تو جھٹ غیرت اور آبرو جاگ اٹھتی ہے۔ تب جی داری بھی دکھاتے ہیں۔
کرتے ہیں اور پھانسی کے پھندے پر لٹک جاتے ہیں۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ وہ جمیلہ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر مرعوب ہو گیا تھا۔ جمیلہ
لالٹین ناجو کو دے دی' آگے بڑھی۔

رحیم داد اور ناجو نے بھی قدم بڑھائے۔ تینوں گاؤں میں پہنچے اور گلیوں سے گزرتے ہوئے
موچی کے دروازے پر جا کر ٹھہر گئے۔

جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! اب تو جا۔ میں یہاں سے جیرا کے پیو دین محمد کے
جاؤں گی۔ اسے ساری گل بات بتاؤں گی۔"

"میں بھی تیرے ساتھ دین محمد کے گھر چلا جاؤں گا۔ تو اکیلی کیسے اتنی رات کو واپس آئے گی"

"مجھے دیر لگ جائے گی۔ تو واپس حویلی میں جا۔ میری چنتا نہ کر۔ میں موچی کے پتر کے
آجاؤں گی۔ ویسے چوہدری' یہ میرا اپنا پنڈ ہے۔ مجھے یہاں ڈر نہیں لگتا۔ میرے لیے ادھر دن

سب برابر ہے۔"

رحیم داد نے مزید اصرار نہ کیا۔ خاموشی سے پلٹا اور اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا
ہوا آگے بڑھا۔ حویلی پر پہنچا۔

پہریدار جاگ رہا تھا۔ اس نے پھاٹک کھولا۔ رحیم داد اندر داخل ہوا اور اپنے کمرے میں جا کر
بستر پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا تھا۔ اس کے ذہن پر جیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ جب
تک جاگتا رہا اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆

نادر خاں دوسرے روز بھی واپس نہ آیا۔ تیسرا روز گزرا' چوتھا گزرا۔ کئی روز گزر گئے۔ مگر وہ نہ
آیا۔ جلیل کی بھی کوئی خیر خبر نہ ملی۔ جمیلہ پریشان تھی۔ زینت اس سے بھی زیادہ پریشان تھی۔ وہ ہر
وقت روتی رہتی۔ جمیلہ اسے تسلی دیتے دیتے خود بھی رونے لگتی۔ جنت موجود ہوتی تو تینوں مل کر
روتیں۔

رحیم داد بھی پریشان تھا۔ مگر زینت اور جمیلہ کی پریشانی نے اسے اور پریشان کر دیا تھا۔ جمعے کو
دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے نامدار کے ہمراہ دیپال پور جانے کا منصوبہ بنایا۔ تانگا آ چکا
تھا۔ رحیم داد حویلی سے نکل کر اس میں سوار ہونے جا رہا تھا کہ منصب داد بھاگتا ہوا آیا۔ وہ بھی
حویلی کا ملازم تھا۔ اس نے نادر خاں کے واپس آنے کی اطلاع دی۔ رحیم داد واپس اپنے کمرے
میں آگیا۔

نادر خاں کے ہمراہ جلیل بھی تھا۔ دونوں رحیم داد کے کمرے میں پہنچے۔ رحیم داد ان کا
بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جلیل کو دیکھا۔ وہ چھریرے بدن کا جوان تھا۔ عمر تیس سال
سے نکلتی ہوئی تھی۔ رنگ گندمی تھا۔ صورت شکل بھی گوارہ تھی۔ قد اونچا تھا۔ مگر بیمار اور پریشان
حال نظر آتا تھا۔ کم گو بھی تھا۔

جمیلہ اس وقت اسکول میں تھی اور زینت کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

"نادر! تو نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ "ادھر تیری
گھروالی نے تو رو رو کے برا حال کر ہی لیا تھا' جمیلہ اور زینت بھی اس کے ساتھ رونے پیٹنے میں
شریک ہو جاتیں۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "نادر' تو نے بہت پریشان کیا۔ میں تیری
تلاش میں نکلنے ہی والا تھا۔ دیپال پور جا رہا تھا۔ تو نے حویلی کے پھاٹک پر تانگا بھی دیکھا ہوگا۔"

"مجھے پتہ تھا' ادھر سب پریشان ہوں گے۔" نادر خاں نے دبی زبان سے کہا۔

"جب تمیں نوں پتہ تھا' سب پریشان ہوں گے' تب بھی تونے اتنی دیر کردی۔ کیا کرتا رہا؟" رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تونے ٹھیک نہیں کیا۔ ایک روز کے لیے کہہ کر گیا اور ہفتہ بھر بعد لوٹا۔"

"کیا کرتا جی۔ یہ لہور گیا تھا۔" نادر خاں نے جلیل کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "مجھے اس کا انتظار کرنا پڑا۔ سوچا' اب آیا ہوں تو اسے مل تو لوں۔ دیپال پور میں میرا ایک پرانا یار ہے' عبدالصمد۔ اسی کے ساتھ ٹھیرا تھا۔"

رحیم داد نے جلیل کو نظر بھر کر دیکھا۔ پھر مڑ کر نادر کی طرف متوجہ ہوا۔ "یہ کب لہور سے واپس آیا؟"

"کل رات ہی آیا تھا جی۔ میں نے اسے کہا تو یہ چلنے کو تیار بھی ہو گیا۔ ہم دونوں سویرے ہی سویرے روانہ ہو گئے تھے۔" نادر خاں نے لمحہ بھر کے لیے تامل کیا' پھر دریافت کیا۔ "چوہدری! تو کب واپس آیا؟"

"جس روز تو دیپال پور گیا' میں اسی شام لوٹا تھا۔"

نادر خاں بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی بیوی جنت کو اس کی واپسی کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ دو بار ناراں کو اور اپنی بچی کو بھیج چکی تھی۔ ہر بار نادر سے گھر پہنچنے کا تقاضا کیا جاتا۔ آخر رحیم داد نے زچ ہو کر نادر خاں سے کہا۔

"نادر تو جا۔ تیری گھر والی تیرے لیے بہت بے چین ہے۔"

نادر خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔ جلیل کرسی پر گم صم بیٹھا رہا۔ اس کی نگاہیں بار بار دروازے کی جانب اٹھ جاتیں۔ رحیم داد اس کی بے قراری کا سبب فوراً بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "جلیل! لگتا ہے تو زینت کے لیے بہت بے چین ہے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "یہ بتا۔ تو اسے اپنے ساتھ لے جائے گا؟"

"آیا تو جی بالکل اسی ارادے سے ہوں۔" جلیل نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مگر زینت ہے کہاں؟"

"وہ بھی آجائے گی۔" رحیم داد زیر لب مسکراتا رہا۔ اسے جلیل کی بے قراری میں لذت محسوس ہو رہی تھی۔ "اب تو اتنا بے تاب ہو رہا ہے۔ پہلے اس کی یاد نہ آئی۔"

"میں تو جی یہ سمجھے ہوئے تھا' وہ ابھی تک اپنے خاندان والوں کے پاس فیروز پور میں ہو گی۔ اس کی واپسی کی امید تو بالکل ختم ہو چکی تھی۔ ایک بار سرحد پار جانے کے بعد کون مغویہ واپس آسکتی

ہے۔ یہ تو بالکل انہونی بات ہے۔" جلیل نے وضاحت کی۔ "نادر خاں نے مجھے زینت کے بارے میں بتایا تو پہلے مجھے یقین ہی نہ آیا۔"

"تجھے یہ بھی پتہ ہے' سرحد پار سے واپسی کے بعد وہ سال بھر تک کسی اور کے پاس تھی؟ بلکہ اس کے بچے بھی ابھی تک اس کے پاس ہیں۔" رحیم داد نے اس کا عندیہ معلوم کرنے کے لیے صاف گوئی سے کام لیا۔ "تجھے یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ پیراں والہ کے زمیں دار سید احسان علی شاہ نے زینت کو اٹھوا کر اپنی حویلی کے کوٹ میں رکھیل بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ وہ وہاں سے کسی نہ کسی طرح بھاگ کر ادھر پہنچی ہے۔"

"نادر خاں' کل رات زینت کے بارے میں مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔" جلیل نے پر سکون لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر نہ جھنجلاہٹ تھی اور نہ ہی کسی قسم کی کدورت نظر آتی تھی۔ "نادر نے کوئی بھی بات مجھ سے بالکل نہیں چھپائی۔ سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔"

"ٹھیک ہی کیا اس نے۔" رحیم داد نے مطمئن ہو کر کہا۔ "لگتا ہے تونے پوری طرح سوچ سمجھ کر زینت کو لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"بات یہ ہے جی' مجھے زینت سے تب شکایت ہوتی جب اس کا اپنا کوئی قصور ہوتا۔" جلیل بڑے اعتماد سے گویا ہوا۔ "وہ تو حالات کا شکار ہوئی۔ گیند کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے میں جاتی رہی۔" اس کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔ "زینت پر جو کچھ بیتی اسے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

"تو مہاجر تو نہیں ہے؟" رحیم داد نے اس کی بات سن کر معاً سوال کیا۔

"ویسے تو جی میں شیخوپورہ کا رہنے والا ہوں' لیکن جب فسادات کی آگ بھڑکی تو میں ملازمت کے سلسلے میں کرنال میں تھا۔ گھر والے بھی ساتھ تھے۔" جلیل نے سنبھل سنبھل کر بتایا۔ "ماں تھی' چھوٹا بھائی تھا' دو جوان بہنیں تھیں۔ میرا پیؤ پہلے ہی مر چکا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ستمبر ۱۹۴۷ء کا مہینہ تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ سکھوں اور ہندوؤں کے حملوں سے تنگ آکر میں گھر والوں کے ساتھ بچ بچا کر حصار پہنچ گیا۔ وہاں بھی حالات خراب تھے اور روز بروز بگڑتے ہی جا رہے تھے۔ حملے ہوتے' آگ لگائی جاتی۔ خون خرابہ ہوتا۔ آخر کسی نہ کسی طرح میں ریلیف کیمپ پہنچ گیا۔ گھر سے نکلتے ہی بلوائیوں نے اس میں آگ لگا دی۔ میں نے دور سے اپنے گھر کو شعلوں میں جلتے ہوئے دیکھا۔ کیا بتاؤں وہ کتنی بھیانک رات تھی۔"

"کیمپ میں پہنچ کر تو سب بچ گئے ہوں گے۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"میں صرف اکیلا کیمپ میں پہنچ سکا تھا۔" جلیل کا چہرہ مرجھا گیا' آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔

"راستے میں بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ ماں اور چھوٹا بھائی میرے سامنے مارے گئے۔ ان کی لاشو
کے درمیان میں خون میں ڈوبا ہوا پڑا تھا۔ بلوائی دونوں بہنوں کو اٹھا کر لے جانے لگے تو وہ مجھے مد
کے لیے پکارنے لگیں۔ ان کی آہ وزاری سنتا رہا۔ انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لیکن مجھ میں تو
اٹھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ زخموں سے چور چور ہو رہا تھا۔" اس کا لہجہ اور رقت آمیز ہو گیا۔

"مر جاتا تو اچھا ہی تھا۔ پر اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔" وہ لمحہ بھر تک گردن جھکائے خاموش بیٹھا رہا' پھر
اس نے بتایا۔ "بعد میں دوسرے زخمیوں کے ساتھ نہ جانے کس طرح کیمپ میں پہنچا۔ وہیں مرہم
پٹی ہوئی۔ میں نومبر تک ریلیف کیمپ میں رہا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ کیمپ محفوظ رہا۔"

"روز ہی اس پر حملے کی خبریں ملتی تھیں' پر حملہ نہ ہو سکا۔" جلیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

"ویسے کئی دوسرے مسلمان افسروں کے علاوہ حصار کا ڈپٹی کمشنر بھی مسلمان تھا۔"

"اسی نے مسلمانوں کو حملہ کرنے والوں سے بچائے رکھا ہو گا۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"توبہ کرو جی۔" جلیل کے چہرے پر جھنجلاہٹ بکھر گئی۔ "مسلمان وفد بنا کر اس کے پاس گئے۔
میں بھی اس میں شامل تھا۔ ڈپٹی کمشنر کو سکھوں اور ہندوؤں کے ظلم و ستم بتائے۔ پولیس کے بار
میں آگاہ کیا کہ ہندو اور سکھ پولیس والے کس طرح کھلم کھلا ہندوؤں اور سکھوں کی حمایت کر رہ
ہیں اور مسلمانوں کو اندھا دھند گولیاں چلا کر ہلاک کر رہے ہیں۔ اس کے دفتر میں کانگریس اور جن
سنگھ کے کئی نیتا بھی بیٹھے تھے۔ ان کے سروں پر یہ لمبی لمبی بودیاں تھیں۔ ماتھے پر تلک تھے۔ وہ بھی
اس سے ملنے آئے تھے۔" جلیل کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "انھیں خوش کرنے کے لیے ڈپٹی کمشنر
مسلمانوں کے وفد کو غصے سے گھورا' منہ بگاڑ کر بولا۔ تم نے پاکستان مانگا تھا۔ اس کی خاطر مسلم لیگ
کو الیکشن میں ووٹ دے کر کامیاب بنایا تھا۔ اب پاکستان بن گیا۔ جاؤ اپنے پاکستان۔ یہاں کیو
ٹھیرے ہو؟ اس نے تو مدد کیا کرنی تھی۔ الٹی مسلمانوں کو دھمکیاں دیں۔ سخت ناراض ہوا۔"

"وہ کیسا بندہ تھا۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔ "اسے اپ
مسلمان بھائیوں کا ذرا بھی خیال نہ آیا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "ہندوؤں کے سامنے نمبر بڑھان
کے لیے اس نے ایسا کیا ہو گا۔"

"ایسا ہی ہو گا جی۔" جلیل نے رحیم داد سے اختلاف رائے نہ کیا۔ اس کے ہونٹوں پر زہر خن
نمودار ہوا۔ "لیکن ہندوؤں اور سکھوں کی چاپلوسی اور خوشامد کے بعد بھی وہ وہاں تک نہ سکا۔ و
آئی سی ایس تھا اور جلندھر کا رہنے والا تھا۔"

"کہاں گیا وہ؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"حصار سے وہ دلی گیا۔ وہاں سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بال بچوں اور مال اسباب کے ساتھ
آرام سے پاکستان پہنچ گیا۔ وہاں ڈپٹی کمشنر تھا۔ یہاں پہنچ کر زیادہ بڑا افسر لگ گیا۔"

"کبھی تجھے ملا بھی؟"

"نہیں۔" جلیل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سنا ہے پہلے سیشن جج ہوتا تھا۔ اب ترقی کر کے
ہائی کورٹ کا جج بن گیا ہے۔"

"حد ہو گئی جی۔" رحیم داد نے اس کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔ "پر جلیل' تو نے بہت دکھ سے۔
تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔"

"سب کچھ ختم ہو گیا۔ گھر بار۔ ماں' بھائی' بہنیں' سب بچھڑ گئے۔ کوئی بھی تو نہ رہا۔"

"تیری بہنوں کا کیا بنا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "ان کا پتہ چلانے کی تو نے کوشش نہیں
کی؟"

"چوہدری! یہ نہ پوچھ۔" جلیل بے زاری سے بولا۔ "تجھے کیا کیا بتاؤں۔"

"جلیل! میں بھی تیری ہی طرح مہاجر ہوں۔" رحیم داد نے جلیل کی ہمدردی حاصل کرنے کے
لیے متوفی چوہدری نور الٰہی کی الم ناک داستان اپنی آپ بیتی بنا کر سنائی۔ "فسادات اور بلوے ہوئے تو
میں ضلع گورداس پور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا۔ پٹیالہ کی ریاستی فوج نے سکھوں اور ہندوؤں
کے ساتھ نصیر پور پر حملہ کیا تو رات کے اندھیرے میں کسی نہ کسی طرح سارے ہی مسلمان نکلنے میں
کامیاب ہو گئے۔ کافلہ بنا کر تریموں کے پتن پر پہنچے۔ وہاں بھی حملہ ہوا۔ میرا پتر میری آنکھوں کے
سامنے مارا گیا۔ جوان دھی کو حملہ آور اٹھا کر لے گئے۔ میں نے بیڑی میں بیٹھ کر راوی پار کیا اور
پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ گھر والی اور بچے پیچھے رہ گئے۔ وہ بعد میں پہنچے۔ بس سنا ہی سنا
ہے۔ انھیں بہت تلاش کیا پر اب تک نہ ملے۔" اس نے جلیل کے افسردہ چہرے کو دیکھا۔ "تو کیسے
ادھر پہنچا؟"

"میں جی ٹرین سے آیا تھا۔ کیمپ سے دوسرے پناہ گزینوں کے قافلے کے ساتھ نکلا اور ٹرین میں
سوار ہو گیا۔ راستے بھر بلوائیوں کے حملے کا خطرہ منڈلاتا رہا۔ پر پورا قافلہ خیریت سے لہور پہنچ گیا۔"

"تو نے بعد میں اپنی بہنوں کا کھوج نکالنے کی کوشش نہیں کی؟"

"کی تھی۔ دو بار فوجیوں اور رضاکاروں کے ساتھ سرحد پار گیا۔ مردولا سارا بھائی سے ملا۔ اسی
کے رضاکاروں کی کوشش سے دونوں کا سراغ بھی لگا لیا تھا۔"

"اپنے ساتھ نہیں لایا انھیں؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"کیسے لاتا انھیں۔" جلیل نے دل گرفتہ ہو کر لمبی سانس بھری۔ "بڑی' حصار ہی میں ہے۔ سٹیشن کے ساتھ موتی پورہ کی بستی ہے۔ وہاں ایک سکھ کانسٹیبل کے گھر میں ہے۔ اس کا نام منگل سنگھ ہے۔ وہ اس کا تیسرا گھر والا ہے۔ اس نے ملنے ہی نہ دیا۔ ہر بار جب میں مغویہ زنانیوں کی بازیابی کرنے والی پارٹی کے ساتھ اس کے گھر پر جاتا تو وہ اسے پڑوس کے کسی مکان میں چھپا دیتا۔ ایک رات جب منگل سنگھ ڈیوٹی پر تھانے میں تعینات تھا۔ میں اکیلا چھپتا چھپاتا اس کے گھر پر پہنچا۔ وہ مل گئی۔ گھر میں اکیلی ہی تھی۔ پر وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئی۔ منگل سنگھ سے اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بچے کو دکھا کر بولی۔ اسے لے کر میں کس منہ سے وہاں جاؤں گی۔ میرے ساتھ جو ہونا تھا ہو گیا۔ تجھے خاما خا بدنامی مول لینی ہوگی۔ میں نے اسے سمجھایا۔ فکر نہ کر میں تیری خاطر سب کچھ برداشت کرلوں گا پر وہ نہ مانی۔ سمجھانے بجھانے کے ساتھ ساتھ منت سماجت بھی کی۔ وہ سر جھکائے کچھ دیر چپ کر کے بیٹھی رہی فیر اپنے بچے کو بغل میں دبا کر ایسی تیزی سے باہر چلی گئی کہ میں دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں رک رک کر ایک ایک تفصیل بتاتا رہا۔ "بعد میں کئی بار کوشش کی مگر وہ مجھے ملی ہی نہیں۔"

"چھوٹی کا کیا بنا؟"

"اب تجھے کیا بتاؤں چوہدری' اس کا کیا بنا۔ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔" جلیل نے نظریں نیچی کر کے دبی زبان سے بتایا۔ "وہ کنجری بن گئی ہے۔ چکلے میں بیٹھتی ہے۔ ان دنوں تو جلندھر میں ہوتی تھی۔ جانے اب کہاں ہے؟ میں اسے ملنے ہی نہ گیا۔ کیا کرتا اسے مل کر۔" اس کی آواز میں درد کی کسک تھی۔ "ماں اور بھائی کی طرح دونوں بہنیں بھی مر جاتیں تو اچھا تھا۔ میں نے ہی ان کو مار دیا ہوتا تو ٹھیک تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ویسے بھی میرے لیے دونوں مر چکی ہیں۔ کبھی یاد بھی نہیں کرتا۔"

"بہت ظلم ہوا جی۔" رحیم داد بھی افسردہ ہو گیا۔ "تو نے ظلم دیکھا ہے اور اسے جھیلا بھی ہے۔ تب ہی تو نے زینت کو معاف کر دیا اور اسے لینے چلا بھی آیا۔"

"معاف تو جی میں نے اسے تب ہی کر دیا تھا جب وہ متّا کمھار کے گھر سے بھاگ کر میرے پاس آگئی تھی۔ میں اس زمانے میں چیچہ وطنی کے نزدیک سکھاں والا کے پرائمری سکول میں ماسٹر تھا۔ متّا میرے گھر کے پاس ہی رہتا تھا۔ ہر رات شراب پی کر نشے میں دھت ہو جاتا اور گندی گندی گالاں نکال کر زینت کو بہت بے رحمی سے مارتا پیٹتا۔ میں نے اور پاس پڑوس کے دوسرے رہنے والوں

نے منع بھی کیا۔ سمجھایا بجھایا پر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔" جلیل آہستہ آہستہ بولتا رہا اور رحیم داد توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ "پھر ایسا ہوا جی' ایک رات زینت متّا کی مار کھاتے کھاتے ایسی بدحواس ہو گئی کہ پناہ لینے کے لیے بھاگ کر میرے گھر آگئی۔ میں نے اسے واپس متّا کے گھر بھیجنا چاہا تو میرے پیر پکڑ کر رونے لگی۔ مجھے بھی اس پر ترس آگیا۔ اس رات کے بعد وہ دوبارہ متّا کمھار کے گھر نہیں گئی۔"

"متّا نے جھگڑا تنٹا تو نہیں کیا؟" رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ صبح میرے پاس آیا۔ ساتھ میں اس کے شریکے اور برادری والے بھی تھے۔" جلیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "لیکن زینت نے سب کے سامنے متّا کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ رو رو کے متّا کا ظلم و ستم بیان کیا۔ اس روز تو وہ چلے گئے پر دوسرے روز فیر آئے۔ کئی روز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ زینت کسی طرح متّا کے گھر جانے کے لیے تیار نہ تھی۔"

"کمھار نے تیرے خلاف تھانے میں اغوا کا پرچہ چاک نہیں کرایا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔
"زینت اس کی گھر والی تھی۔ تو اس کی مرضی کے خلاف زینت کو کیسے اپنے پاس رکھ سکتا تھا؟"

"وہ پولیس کے پاس کیسے جاتا؟ ان دنوں مغویہ عورتوں کی بازیابی کرنے والی سرکاری جماعتیں ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ ہر طرح ان کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔" جلیل نے وضاحت کی۔ "جیسے ہی کسی مغویہ کا پتہ چلتا فوراً چھاپہ مار کر اسے برآمد کیا جاتا اور سرکاری تحویل میں لے لیا جاتا۔ یہ بات متّا بھی جانتا تھا اور میں نے اسے خبردار بھی کر دیا تھا۔ اسی لیے اس نے زیادہ شور شرابا نہیں کیا۔ وہ بات چیت کے ذریعے زینت کو واپس لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب وہ کسی طرح اس کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوئی تو ایک شام وہ اکیلا میرے پاس آیا۔" جلیل نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ "اس نے زینت کے عوض مجھ سے پانچ سو روپے مانگے۔ میرے پاس اتنے روپے نہیں تھے۔ میں نے تین سو ادھار لے کر کسی نہ کسی طرح اکٹھے کیے اور متّا سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس سے زیادہ کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ وہ اسی پر راضی ہو گیا۔ اس نے روپے لے کر زینت کو طلاق دے دی۔ ایک بچہ تھا وہ بھی دے دیا۔"

"بعد میں تو اس نے تجھے تنگ نہیں کیا؟"

"وہ بہت کینہ اور گندہ بندہ تھا۔" جلیل نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "زینت کبھی گھر سے باہر نکلتی تو راستے میں اسے چھیڑتا۔ اٹھا لینے کی دھمکی دیتا۔ میں نے جب یہ صورت دیکھی تو کوشش کر کے سکھاں والا سے اپنا تبادلہ رکن پور کرالیا۔ وہیں عدت کی مدت پوری ہونے کے بعد میں نے زینت

سے نکاح کرلیا۔ ہم دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ ایک پتر بھی ہوا۔" اپنی بات کہتے کہتے دفعتاً ا
کا چہرہ مرجھا کر راکھ ہوگیا۔ "زینت حاملہ تھی کہ انہی دنوں کسی نے مخبری کردی۔ بازیابی کرنے و
سرکاری جماعت نے رات کو میرے گھر پر چھاپا مارا۔ زینت کو بچوں کے ساتھ اپنی نگرانی میں سر
پار پہنچا دیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اپنے چاچا کے پاس فیروزپور گئی ہے۔ فیر مجھے اس کی کوئی
نہیں ملی۔ لیکن میں کبھی اسے بھول نہ سکا۔"

"ویسے میں تجھے یہ بتادوں کہ وہ بھی تجھے بالکل نہیں بھولی۔" رحیم داد نے ہنس کر جلیل کو بتا
"تجھ سے اتنا پیار کرتی ہے کہ تیرے ہی لیے چھپتی چھپاتی کسی نہ کسی طرح فیروزپور سے بھاگ
پاکستان پہنچ گئی۔"

"پچی بات یہ ہے چوہدری ادھر اس کا کوئی سگا ہے بھی نہیں۔ سارا ہی ٹبر بلوائیوں کے ہاتھو
فسادات میں مارا گیا۔ ماں باپ' بھائی بہین' کوئی نہیں بچا۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ جلیل بھی چپ رہا۔ وہ مڑ مڑ کر بے چینی سے دروازے کی سمت د
رہا۔ کچھ دیر بعد باہر دالان میں آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے دروازے کی جانب دیکھا کہ جمیلہ کمر
میں داخل ہو رہی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے زینت بھی تھی۔ جلیل اسے دیکھتے ہی بے قرار ہو کر کھ
ہوگیا۔ زینت آنکھیں پھاڑے خوشی اور حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے زبان سے ایک
لفظ نہ نکالا۔ آگے بڑھی اور جلیل کے بازو پر سر لگا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

جلیل اس کا سر ایک ہاتھ سے ہولے ہولے تھپکتے ہوئے تسلی دینے لگا۔ "اس طرح نہ ر
زینت۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں' پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

جمیلہ اور رحیم داد گم صم تھے اور دونوں کو تک رہے تھے۔ لیکن جمیلہ زیادہ دیر خاموش نہ رہی
رحیم داد کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "لے چوہدری! دیکھ لے۔ زینت ٹھیک ہی کہتی تھی ناں۔"
زیر لب مسکراتی ہوئی زینت کے پاس گئی۔ اس کا بازو تھاما' اپنے قریب کیا اور سینے سے لگا کر د
جوئی کرنے لگی۔ "رونا دھونا چھوڑ۔ اوپر کمرے میں جا۔ منہ ہاتھ دھو۔ کپڑے لتے تبدیل کر۔ جلیل
یہیں رہے گا۔ مہمان خانے میں ٹھہرے گا۔ تو بھی اس کے ساتھ ہی رہنا۔ جی بھر کے باتیں کرنا۔"

زینت کچھ نہ بولی۔ مڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

۴۴

دن ڈھل رہا تھا۔ دھوپ پھیکی پڑ گئی تھی۔

رحیم داد اور جلیل کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ قریب ہی جمیلہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ جلیل کے چہرے سے اطمینان اور سکون نمایاں تھا۔

جمیلہ نے نظریں اٹھا کر جلیل کو دیکھا۔ آہستہ سے پوچھا۔ "جلیل! اب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"میں تو جی زینت کو لینے آیا ہوں۔" اس نے نہایت اعتماد سے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔

"ضرور لے جا زینت کو۔ تجھے بلایا ہی اسی لیے ہے۔" جمیلہ نے مسکرا کر کہا۔ "پر بچوں کے بارے میں تو نے کیا سوچا؟ وہ تو احسان شاہ کے مزارعے سلامو کے پاس ہیں۔"

"نادر خاں اس بارے میں مجھے پہلے ہی بتا چکا ہے۔ اور یہ بھی بتا چکا ہے کہ زینت بچوں کے لیے کتنی پریشان اور غم زدہ ہے۔"

جمیلہ نے مڑ کر رحیم داد کی جانب نظریں گھمائیں۔ "چوہدری! تو نے احسان شاہ کے پاس جانے کے بارے میں کیا سوچا؟ مجھے آشا ہے' تیرے کہنے پر وہ سلامو سے زینت کے بچے واپس دلا دے گا۔"

"مجھے اس کے پاس نہ بھیج۔" رحیم داد نے انکار کردیا۔ "مجھے ڈر ہے' کوئی گڑبڑ نہ پڑ جائے۔" اس نے جلیل کو مخاطب کیا۔ "جلیل تو بتا' بچوں کو کیسے واپس لائے گا۔ تو احسان شاہ کے پاس جا سکتا ہے؟"

جلیل کے بولنے سے پہلے ہی جمیلہ نے کہا۔ "چوہدری! اسے احسان شاہ کے پاس نہ بھیج۔ اسے

دیکھ کر تو وہ سخت ناراض ہو گا۔ غصے سے بھڑک اٹھے گا۔ پھر تو وہ ضرور گڑبڑ ڈالے گا۔ مجھے پتہ ہے' وہ کتنا خطرناک بندہ ہے۔"

"میں تو جی احسان شاہ کو بالکل ہی نہیں جانتا۔ نہ کبھی اس کے پنڈ گیا اور نہ ہی کبھی اس سے ملا۔" جلیل نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ چپ بیٹھا رہا۔ وہ احسان شاہ کے پاس جانے اور زینت اور اس کے بچوں کے بارے میں بات کرنے سے کترا رہا تھا۔ مراد خاں شاہانی کی زبانی رحیم داد پہلے ہی سن چکا تھا کہ زینت احسان شاہ کو بہت پسند ہے۔ اسے خدشہ تھا کہ کوٹ سے زینت کے فرار ہونے پر وہ سخت برہم ہو گا۔ عین ممکن ہے رحیم داد سے بھی خفا ہو جاتا کہ اس نے اپنی حویلی میں زینت کو پناہ کیوں دی؟ وہ احسان شاہ سے کسی طور بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

جمیلہ نے رحیم داد کو خاموش پایا تو اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "چوہدری' ایسے تو کام نہیں چلے گا۔ زینت کے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ ان کے بنا کیسے شانت رہ سکتی ہے۔ انہیں یاد کر کے ہر سمے روتی رہتی ہے۔"

"اپنی سمجھ میں تو ایک بات آتی ہے۔" جلیل نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "دیپال پور کا تھانے دار' زماں خاں' مجھ پر بہت مہربان ہے۔ میں اس کے بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ وہ ہمیشہ مجھ سے محبت اور پیار سے پیش آتا ہے۔" اس نے جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "زمیں دارنی! تیرا مشورہ ہو تو میں تھانے دار زماں خاں سے بچوں کی واپسی کے لیے بات کروں۔ امید تو یہی ہے کہ وہ میری ضرور مدد کرے گا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" رحیم داد نے اپنا پیچھا چھڑانے کی غرض سے جھٹ جلیل کی تائید کی۔ "احسان شاہ سے اگر تھانے دار نے کہا تو وہ اس کی بات ٹالے گا نہیں۔ میں نے تو اس کے بارے میں یہی اندازہ لگایا ہے کہ وہ تھانے دار اور دوسرے سرکاری افسروں کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔" اس نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ "ویسے زمیں دارنی آگے تیری مرضی۔"

جمیلہ نے رحیم داد کو نظرانداز کرتے ہوئے جلیل کو مخاطب کیا۔ "جلیل اگر تجھے وشواس ہے کہ تھانے دار زماں خاں تیری ضرور مدد کرے گا تو بچوں کی واپسی کے لیے اس سے ضرور بات کر۔"

"میں کل ہی دیپال پور چلا جاؤں گا اور تھانے دار سے بچوں کی واپسی کے لیے بات کروں گا۔" جلیل نے اپنے ارادے سے جمیلہ کو آگاہ کیا۔ "ویسے بھی میں نے کل ہی واپس جانا ہے۔ پرسوں انسپکٹر آف سکولز معائنے کے لیے آ رہا ہے۔ ہیڈ ماسٹر نے تاکید سے کہا ہے کہ معائنے پر میں ضرور

حاضر رہوں۔ بعد میں لمبی چھٹی لے کر آ جاؤں گا۔"

رحیم داد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "تو کل صبح ضرور چلا جا۔ تھانے دار کی منت سماجت کر کے راضی کر لینا۔ اس نے تیرے بارے میں احسان شاہ سے کہا تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ مجھے اتنا تو پتہ ہے احسان شاہ تھانے دار کی بات آسانی سے ٹال نہیں سکتا۔"

نادر خاں بھی آ گیا۔ وہ نہا دھو کر اور اجلے کپڑے پہن کر آیا تھا۔ جمیلہ نے اسے دیکھتے ہی جلیل کی جانب اشارہ کیا۔ "نادر! اسے مہمان خانے میں لے جا۔ یہ وہیں ٹھیرے گا۔" وہ جلیل کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اب تو جا۔ بہت تھکا ہوا لگ رہا ہے۔ زینت کچھ دیر بعد تیرے پاس پہنچ جائے گی۔"

جلیل خاموشی سے اٹھا اور نادر خاں کے ہم راہ مہمان خانے کی جانب چلا گیا۔

جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ "تھانے دار زماں خاں نے جلیل کی مدد کرنے کی حامی بھرلی تو ضرور کام بن جائے گا۔"

"جلیل تو کہتا ہے تھانے دار اس کی ضرور مدد کرے گا۔ ویسے سچی بات یہ ہے زمیں دارنی۔ اب میں احسان شاہ کے پاس جانا اور اس سے ملنا نہیں چاہتا۔ وہ گندہ اور خطرناک بندہ ہے۔"

"بہت خطرناک اور گندہ ہے۔" جمیلہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "میرا من تو یہی کہتا ہے' اللہ وسایا کا قتل اسی نے کرایا۔ اس کے سوا اللہ وسایا کا کوئی دشمن تھا ہی نہیں۔"

"میں اسے اتنا ظالم نہیں سمجھتا تھا۔" رحیم داد نے اپنی صفائی پیش کی۔ "مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ اللہ وسایا کے قتل میں احسان شاہ کا ہاتھ ہے تو کبھی اس سے نہ ملتا۔ ویسے تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ زمیں دارنی' احسان شاہ نے کبھی میرے سامنے اللہ وسایا کی برائی نہیں کی۔"

"چوہدری' تجھے پتہ نہیں' احسان شاہ اس سے کتنا خار کھاتا تھا۔ اس کی جان کا دشمن تھا۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اپنے کرندوں اور بدمعاشوں کے ذریعے پہلے تو پرانے مزارعوں کو بے دخل کر کے میرے پتا کی بہت سی اراضی پر کبضہ کر لیا۔ میرے اور اللہ وسایا کے خلاف جھوٹے کیس بنوائے۔ وہ تو یہ حویلی اور ساری ہی اراضی ہتیا لینا چاہتا تھا۔"

رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں نوں تو پہلے ان باتوں کا کچھ پتہ ہی نہ تھا۔"

"تو اس کے پاس پہنچ کیسے گیا؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"مجھے تو ماکھا خوشامد کر کے اس کے پاس لے گیا تھا۔" رحیم داد نے اپنی صفائی پیش کی۔ "میں نے اسے بہت ٹالا پر وہ میرے گلے پڑ گیا۔"

"وہ تجھے احسان شاہ کے پاس کیوں لے جانا چاہتا تھا؟"

"ماکھے کی گھروالی 'سگراں' کو اٹھوا کر احسان شاہ نے اپنے کوٹ میں ڈال رکھا تھا۔ ۵ سال سے وہ اس کی کید میں تھی۔ پتہ نہیں کس نے ماکھا کو میرے پیچھے لگا دیا۔ وہ میرے پیر پکڑ کر منت کرنے لگا 'چوہدری' میرا بازو ولا دے۔ میں نے اس کے بارے میں اللہ وسایا سے بھی ذکر کیا تھا پر اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا احسان شاہ اس کی بات ماننے کی بجائے ماکھے کا اور دشمن ہو جائے گا۔ اس پر اور اس کی گھروالی دونوں پر بہت ظلم کرے گا۔ میں نے یہ بات ماکھا کو صاف صاف بتا دی تھی۔"

"تب تو اس نے تیرا پیچھا چھوڑ دیا ہو گا؟"

"نہیں جی' وہ فیر بھی لگا رہا۔ میں اسے ڈانٹتا' پر وہ اتنا ڈھیٹ نکلا کہ چھپتا چھپاتا میرے پاس پہنچ جاتا۔ میں ہر بار انکار ہی کرتا رہا۔ جب تو کیمبل پور' اللہ وسایا اور بچوں کے ساتھ شرفاں کے ویاہ میں شریک ہونے گئی تھی' انھی دنوں ایک شام میں گھوڑی پر بیٹھ کر شہر کی طرف نکل گیا۔ نہ جانے کدھر سے ماکھا آ گیا۔ اس نے میرے پیروں پر پگڑی ڈال کر منت کی کہ میں احسان شاہ سے مل لوں اور اس کے بازو کو ولانے کی سفارش کروں۔ اسی وقت احسان شاہ بھی اپنی گھوڑی پر آ گیا۔ ماکھا اسے دیکھتے ہی درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔ پر ماکھا کی خاطر مجھے احسان شاہ سے ملنا پڑا۔ وہ مجھے اپنی حویلی لے گیا۔" رحیم داد نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ "زمیں دارنی' اس طرح میں احسان شاہ سے ملا۔"

"تیرے کہنے پر احسان شاہ نے ماکھے کی گھروالی واپس کر دی تھی؟"

"ہاں جی۔ اس نے میرے کہنے پر دوسرے ہی روز ماکھے کی گھروالی کو اس کے بچوں کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔"

"تب تو مجھے وشواس ہے' تیرے کہنے پر وہ زینت کے بچوں کو بھی سلاموسے واپس دلا دے گا۔"

"تو کہتی ہے تو احسان شاہ کے پاس چلا جاؤں گا۔ اس سے زینت کے بچوں کی واپسی کے لیے بات کر لوں گا۔ آگے اس کی مرضی۔" رحیم داد نے اس دفعہ جمیلہ کی بات مسترد نہ کی مگر ساتھ ہی مشورہ بھی دیا۔ "پہلے جلیل کو تھانے دار زماں خاں کے ذریعے کوشش کر لینے دے۔ اگر اس طرح کام نہ بنا تو میں احسان شاہ کے پاس چلا جاؤں گا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "زمیں دارنی تیری بات تو میں ٹال بھی تو نہیں سکتا۔"

جمیلہ نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ "یہ ٹھیک رہے گا۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے

اب جانا ہے۔ زینت کو لے کر جلیل کے پاس جاؤں گی۔"

رحیم داد چپ رہا۔ جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے نکل کر دالان میں چلی گئی۔

☆

شام گہری ہو چکی تھی۔ دھندلکا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ رحیم داد نے کھانا کھایا۔ دیر تک کرسی پر چپ بیٹھا رہا۔ نہ جمیلہ آئی اور نہ ہی نادر خاں۔ پہر رات گزری تو رحیم داد نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا۔ لیمپ کی لو دھیمی کی اور بستر پر لیٹ گیا۔

صبح دیپال پور جانے سے قبل جلیل اس کے کمرے میں پہنچا۔ کچھ دیر رحیم داد کے پاس بیٹھا رہا۔ جمیلہ بھی پہنچ گئی۔ زینت اس کے ہم راہ تھی۔ جلیل سب سے رخصت ہوا۔ تانگے میں سوار ہوا اور دیپال پور کی جانب روانہ ہو گیا۔

جلیل کو گئے ہوئے نو روز ہو گئے۔ دسویں روز وہ واپس آ گیا۔ بچوں کو اپنے ساتھ لایا۔ رحیم داد اس وقت کھیتوں پر گیا تھا۔ بوائی کے بعد وہ ربیع کی فصل کی دیکھ بھال سرگرمی اور لگن سے کر رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا جب اسے جلیل کے پہنچنے کی اطلاع ملی۔ وہ بے چین ہو کر حویلی کی طرف واپس ہوا۔ مہمان خانے میں پہنچا۔ زینت اپنے بچوں کے ساتھ جمیلہ کے پاس بالائی منزل پر جا چکی تھی۔ جلیل مہمان خانے کے صحن میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ بیٹھنے کے لیے بڑی انکساری اور احترام سے کرسی پیش کی۔ رحیم داد مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔

اس نے پوچھا۔ "سنا ہے تو بچوں کو لے آیا ہے؟"

"ہاں جی' لے ہی آیا۔" جلیل نے بتایا۔ "زینت بچوں کو لے کر اوپر زمیں دارنی کے پاس گئی ہے۔"

"پر تو نے بہت دیر لگا دی۔ کہاں رہا اب تک؟"

"وہ ایسا ہوا جی' میں یہاں سے جاتے ہی تھانے دار زماں خاں سے ملا۔" جلیل نے اپنی روداد سنائی۔ "وہ حسب معمول مہربانی سے ملا۔ میں نے اسے زینت اور بچوں کے بارے میں بتایا۔ زینت کی واپسی کی اطلاع پر بہت خوش ہوا۔" اس نے نظریں جھکا لیں۔ لہجہ دھیما پڑ گیا۔ "زینت کے بارے میں اسے پتہ تھا اور یہ بھی جانتا تھا مجھے اس کے ساتھ اتنا پیار ہے کہ میں نے ویاہ کرنے کا ارادہ ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا میں فوراً زینت کو دیپال پور اپنے گھر میں لے آؤں۔ لیکن میں نے زور دیا' بچوں کی واپسی کے بعد اسے لانا مناسب رہے گا۔"

رحیم داد طویل تفصیل سے جلد ہی اکتا گیا۔ "یہ بتا بچے کیسے ملے؟"

"تھانے دار نے اپنے ایک پرچے کے ساتھ مجھے احسان شاہ کے پاس بھیجا۔ میں پیراں والہ گیا احسان شاہ سے ملا۔ تھانے دار کا پرچہ دیا۔ پہلے تو وہ زینت کا نام سنتے ہی ایک دم مجھ پر گرم ہو گیا زینت کو گندی گندی گالاں نکالنے لگا۔ دھمکی دی کہ اسے دوبارہ اٹھوا لوں گا۔ پر جب اس نے زماں خاں کا پرچہ پورا پڑھ لیا تو ذرا نرم پڑ گیا۔ اس نے سلامو کو بلوایا جس کے پاس بچے تھے۔ مگر آیا نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا سلامو' مزارع ہو کر احسان شاہ کے بلانے پر نہ آئے۔" رحیم داد نے حیرت ہو کر کہا۔

"سلامو اب احسان شاہ کا مزارع نہیں رہا۔ اسے احسان شاہ نے بے دخل کر دیا ہے۔ پر اب رہتا پیراں والہ ہی میں ہے۔ احسان شاہ کا کرندہ پیغام لے کر سلامو کے پاس پہنچا۔ اس نے آ۔ بہانہ کیا اور بچوں کو لے کر چک ۲۷۲ میں اپنے چچیرے کے پاس چلا گیا۔"

"تب تو بہت مشکل پڑی ہو گی؟"

"ہاں جی' بہت مشکل پڑی۔ احسان شاہ کا مینجر کوشش کرتا رہا۔ پر نہ سلامو آیا اور نہ ہی اس نے بچے بھیجے۔ میں ٹھہرا رہا۔ سوچا اب آیا ہوں تو بچوں کو لے کر ہی جاؤں گا۔ اسی میں دیر ہو گئی پانچ روز پیراں والہ میں ٹھہرا رہا مگر کام نہ بنا۔ احسان شاہ لہور جا چکا تھا۔" جلیل نے بجھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "جب کام نہ بنا اور بچوں کے ملنے کی کوئی امید نظر نہ آئی تو میں دا دیپال پور چلا گیا۔"

"تھانے دار سے ملا تھا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"سیدھا اس کے پاس پہنچا۔ اسے سب حال بتایا۔"

جلیل نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ کمرے سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے رحیم داد کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ احسان شاہ کا کرندہ' دینا تھا جس کے ذریعے رحیم داد نے احسان شاہ سازباز کر کے اللہ وسایا کو دارا کے ہاتھوں قتل کرایا تھا۔ دینا اس سے احسان شاہ کی حویلی میں بھی مل چکا تھا۔

دینا کمرے سے نکل کر دونوں کی جانب بڑھا۔ جلیل نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم سے کہا۔ "یہ دینا ہے چوہدری' سچی بات یہ ہے جی' اسی کی کوششوں سے بچے ملے ہیں۔ یہی ان کو لے کر آیا بھی۔ تھانے دار نے بچوں کو سلامو کے قبضے سے نکالنے کے لیے اسی کو لگایا تھا۔"

دینا نے بھی فوراً رحیم داد کو پہچان لیا۔ مسکرا کر بولا۔ "جلیل! میں چوہدری کو پہلے سے جانتا ہوں۔" رحیم داد اور پریشان ہو گیا۔ دینا براہ راست رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ "چوہدری! تو ٹھیک ٹھاک تو رہا۔ بہت دنوں بعد میں نے آج تجھے دیکھا ہے۔"

رحیم داد نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ پوچھا۔ "شاہ جی کا کیا حال احوال ہے؟"

"ٹھیک ہی ہے جی۔" دینا نے بے نیازی سے کہا۔ "ویسے جی میں نے اس کی نوکری بہت دن ہوئے چھوڑ دی۔"

"اب کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"آج کل دیپال پور میں ہوں جی۔ مویشی چوری کے ایک کیس میں پھنس گیا تھا۔" دینا نے بتایا۔ "اپنے تھانے دار زماں خاں نے بچا لیا۔ تب سے جی ان ہی کے ساتھ لگا ہوں۔ مخبری کرتا ہوں۔ اکیلا ہوں۔ اسی میں گزارہ ہو جاتا ہے۔ دو تین ڈکیتیوں اور چوریوں کا کھوج لگایا۔ سمگلروں کے ایک وڈے گروہ کو بھی پکڑوایا۔ اس پر انعام بھی ملا۔" وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ "بس جی ایسے ہی کام چل رہا ہے۔"

"پر تو نے زینت کے بچوں کو واپس دلا کر بہت زبردست کام کیا۔" رحیم داد نے اسے خوش کرنے کے لیے اچھے الفاظ سے یاد کیا۔ "دینے! ویسے تو ہے بھی بہت حوصلے والا۔ بہت کام کا بندہ ہے۔ تو نہ ہوتا تو میں کہتا ہوں' جلیل کو بچے ہرگز سلامو سے واپس نہ ملتے۔" رحیم داد نے مڑ کر جلیل کو دیکھا۔ "یہی گل ہے نا جی؟"

"ہاں جی' دینا نہ ہوتا تو بچے نہ آتے۔ پتہ نہیں کتنی دشواری پڑتی۔" جلیل نے رحیم داد کی تائید کی۔

"زینت نے تو بچوں کے لیے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ روٹی تو اس سے کھائی نہیں جاتی تھی۔" رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے تین نوٹ نکالے۔ دینا کی طرف بڑھائے' ہنس کر بولا۔ "لے رکھ لے۔ یہ میری طرف سے تیرا انعام ہے۔ ویسے تو نے ایسا کام کیا ہے کہ زینت کو تو دوسری زندگی مل گئی۔" رحیم داد نے گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ "دینے تو نے رات یہیں ٹھہرنا ہے؟"

"نہیں جی' میں نوں واپس دیپال پور جانا ہے۔"

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا کہ دینا جلد سے جلد چلا جائے۔ اس نے جلیل سے کہا۔ "اسے اب جانے دے ورنہ یہ رات گئے دیپال پور پہنچے گا۔ سردی بھی زوروں پر ہے۔ رستے میں اسے بہت

تنگ کرے گی۔"

جلیل تو خاموش رہا‘ مگر دینا چپ نہ رہا۔ اس نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ "مجھے تو اب روانہ ہو جانا چاہیے۔ دیر ہو گئی تو بہت مشکل پڑے گی۔ میرے پاس تو صرف ایک کھیس ہے۔ کمبل یا دھسا بھی نہیں لایا۔ ادھر سردی بھی بڑھ گئی ہے۔"

دینا نے مزید بات چیت نہ کی۔ کمرے میں جا کر کھیس اوڑھی۔ لمبی ڈانگ ہاتھ میں دبائی۔ جلیل کے پاس آیا‘ بولا۔ "ماسٹر جی! میں تو اب چلا۔ دیپال پور میں ملوں گا۔ تسیں تو بعد میں آؤ گے۔ تھانے دار سے بتا دوں گا۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ جلیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دینا کے ساتھ ساتھ مہمان خانے کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ عین اس وقت جمیلہ مہمان خانے میں داخل ہوئی۔ جلیل نے اسے دیکھا تو ٹھہر گیا۔ دینا بھی رک گیا۔ جمیلہ قریب پہنچ گئی۔ جلیل نے اسے سلام کیا۔

جمیلہ نے ہاتھ اٹھا کر دینا کی طرف اشارہ کیا۔ "دینا ہی ہے جو بچوں کو سلامو کی قید سے نکال لایا ہے؟"

جلیل کے بولنے سے پہلے ہی دینا بول پڑا۔ "یہ تو جی ایسا مشکل کام نہ تھا۔ ماسٹر جی جانتے ہیں میں نے کیسے کیسے مشکل کام کیے ہیں۔"

رحیم داد کی پریشانی جمیلہ کو دیکھتے ہی سوا ہو گئی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ "زمیں دارنی! اب دینے کو جانے دے۔ کڑاکے کی سردی ہے اور اسے دور جانا ہے۔" وہ چاہتا تھا کہ دینا کو جمیلہ سے مزید گفتگو کرنے کا موقع نہ ملے اور وہ جلد سے جلد چلا جائے۔

جمیلہ نے رحیم داد کو نظر انداز کرتے ہوئے نرم لہجے میں دینا سے کہا۔ "دینے‘ تو بہت نیک ہے۔ زینت کے بچے واپس دلا کر تو نے ایسا بھلا کام کیا ہے‘ نہ صرف زینت اور جلیل بلکہ میرے من سے بھی تیرے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے سو سو کے دو نوٹ نکالے اور اس کو دے دیے۔ "یہ تیرا انعام ہے۔ ویسے تیری اتنی وڈی نیکی کا یہ کچھ بھی انعام نہیں۔"

رحیم داد کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

دینا نے دو سو روپے لے کر دھوتی کے ڈب میں اڑس لیے۔ روپے پا کر اتنا خوش ہوا کہ بول نہ سکا۔ دانت نکال کر ہنسنے کی کوشش کرنے لگا۔ رحیم داد نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ دینا سے بولا۔ "اب تو جا۔ دیر کرنا تیرے لیے ٹھیک نہیں۔ سردی آج بہت زیادہ ہے۔"

مگر جمیلہ نے دینا کو جانے نہ دیا‘ بولی۔ "جلدی کیا ہے۔ رات کی روٹی کھا کر جائے گا۔"

رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "زمیں دارنی تو نے بھی حد کر دی۔ اسے روٹی کھلانے کے لیے سردی میں تنگ کرنا چاہتی ہے۔ رات کو یہ کیسے دیپال پور جا سکے گا؟"

"آج ہی اس کا جانا کوئی ضروری ہے؟" جمیلہ کا لہجہ بھی تیکھا تھا۔ "رات کو حویلی میں ٹھہر جائے گا۔ کل دن چڑھے چلا جائے گا۔"

رحیم داد دم بخود ہو کر رہ گیا۔ مگر دینا رکنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ "زمیں دارنی! مجھے تو اب جانے ہی دے۔ چک بیدی سے دیپال پور کے لیے لاری پکڑ لوں گا۔ میں ادھر ٹھہر نہیں سکتا۔ تھانے دار سے مجھے بخشیش ملنا ہے۔ پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ اب اور دیری نہ کرا۔" اس نے عاجزی کا مظاہرہ کیا۔ "مجھے نہ روک۔ اب جانے ہی دے۔ تیری بہت بہت مہربانی۔"

جمیلہ نے مزید اصرار نہ کیا۔ دینا آگے بڑھا۔ جلیل اس کے ہم راہ چلا۔ دونوں مہمان خانے سے باہر چلے گئے۔

دینا کے جانے کے بعد رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی رفع ہو گئی۔ جب تک دینا موجود رہا‘ خطرہ اس کے سر پر منڈلاتا رہا۔ مگر جمیلہ اس کے احساسات سے بے نیاز قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

جلیل واپس آ گیا اور دونوں کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ دھوپ کی رنگت بدلنے لگی تھی۔ دن ڈھل رہا تھا۔

جمیلہ بچوں کے واپس آنے پر بہت مسرور تھی‘ جلیل سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اسے اپنے سکول کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ لمبی چھٹی لے کر کوٹلہ ہرکشن آ جائے اور اسکول کا انتظام درست کرنے میں اس کی مدد کرے تاکہ وہ نہ صرف منظور شدہ اسکول بن جائے بلکہ بعد میں ڈسٹرکٹ بورڈ اسے اپنی تحویل میں لے کر باقاعدہ سرکاری پرائمری اسکول بنا دے۔ جمیلہ یہ بھی چاہتی تھی کہ زینت اور جلیل اپنے بچوں کے ساتھ اس کے پاس ہی رہیں۔ لیکن یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ اسکول سرکاری بن جائے اور جلیل دیپال پور سے تبادلہ کرانے کے بعد کوٹلہ ہرکشن آ جائے۔

جلیل ہر طرح جمیلہ کی مدد کرنے کو تیار تھا۔ وہ اس کی دردمندی اور ہنس مکھ طبیعت سے بہت متاثر تھا۔ اس کا احسان مند بھی تھا۔ اس کے وسیلے سے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیوی بچے مل گئے تھے۔ ویسے بھی زینت اور جلیل کے ساتھ جمیلہ کا رویہ بڑا مشفقانہ تھا۔ جلیل دیر تک جمیلہ سے باتیں کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جلیل اور زینت اپنے بچوں کے ساتھ مہمان خانے میں ٹھہرے رہے۔ جلیل روزانہ جمیلہ کا
ہم راہ اسکول جاتا۔ تمام وقت وہیں رہتا اور جمیلہ کے ساتھ ہی واپس آتا۔ رحیم داد ہر صبح جلیل ا
جمیلہ کو جاتے ہوئے دیکھتا۔ وہ اس کے کمرے کے سامنے سے گزرتے تھے۔ لیکن پورا ہفتہ بھی
گزرا تھا کہ وہ زینت اور بچوں کے ساتھ دیپال پور چلا گیا۔ حالانکہ جلیل دو ہفتے کی چھٹی لے کر
تھا۔ اس نے رحیم داد کو یہی بتایا تھا۔ رحیم داد کو اس کے اچانک چلے جانے پر حیرت ہوئی اور ا
سے بھی زیادہ حیرت اور تکلیف ان کے اس رویے پر ہوئی کہ وہ اس سے مل کر بھی نہ گئے۔

سہ پہر کو جمیلہ اسکول سے واپس لوٹی تو رحیم داد نے روک کر اس سے اپنی بے چینی اور حیرت
اظہار کیا۔ "زمیں دارنی! میں نے سنا ہے جلیل اور زینت دیپال پور چلے گئے۔ جلیل تو لمبی چھٹی
آیا تھا۔ میں تو ان سے مل بھی نہ سکا۔ جب وہ گئے تو میں کھیتوں کی طرف تھا۔ وہ اس طرح اچانک
کیسے چلے گئے؟"

"وہ ایسا ہے چوہدری۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "تاجاں کا ویاہ تو نادر خاں کے گھر ہی سے ہ
ہے نا۔ تاجاں اسی کے گھر میں مائیاں بیٹھے گی۔ نادر خاں بیوی بچوں کے ساتھ تب تک مہمان خا
میں ٹھہرے گا۔ اور کہاں جائے گا؟"

"سکول کا کیا بنے گا؟" رحیم داد نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔ "تو مائیاں میں لگ جائے گی۔"

"سکول بھی بند رہے گا۔ جنج بھی تو سکول ہی میں اترے گی۔ اور وہیں ٹھہرے گی۔" جمیلہ
رحیم داد کو بتایا۔ "یہی طے ہوا ہے۔ ایسی صورت میں جلیل یہاں کیسے ٹھہر سکتا تھا۔"

رحیم داد سے جمیلہ نے مزید بات چیت نہ کی۔ وہ اسکول سے تھکی ہوئی آئی تھی۔ جلد سے جا
اپنے کمرے میں پہنچ کر آرام کرنا چاہتی تھی۔

☆

رحیم داد دوپہر کا کھانا کھا کر کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ نادر خاں اس کے ہم راہ تھا۔ اسکو
سامنے ہی تھا۔ رحیم داد کی نظر اسکول کی طرف گئی۔ اس نے ایک شخص کو اسکول سے نکلتے ہو
دیکھا۔ وہ سردی سے بچنے کے لیے چادر اس طرح سر اور کانوں کے گرد لپیٹے ہوئے تھا کہ چہرہ دو
سے نظر نہ آتا تھا۔ رحیم داد کو شبہ ہوا کہ وہ دینا ہے۔ فوراً اس کا ماتھا ٹھنکا۔ طرح طرح کے وسوسو
نے اس کے ذہن میں کھلبلی پیدا کی۔ وہ حیران و پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ دینا خلاف توقع جمیلہ سے
ملنے اسکول میں کیوں آیا ہے؟

رحیم داد نے دیکھا' دینا اسکول سے نکل کر درختوں کے نیچے چلا گیا۔ وہ نہر کی طرف جا رہا تھا۔

رحیم داد نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نادر سے کہا۔ "نادر! مجھے یہ دینا لگتا ہے۔"

"وہی ہو گا جی۔ میں نے اسے ٹھیک سے دیکھا نہیں۔" نادر خاں بے نیازی سے بولا۔

اب دینا کی پشت نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد کو تشویش لاحق ہوئی۔ اس نے نادر سے کہا۔ "نادر
خاں' تو جا کر پتہ کر یہ دینا ہی ہے نا؟ ہو سکے تو یہ بھی معلوم کرنا' وہ زمیں دارنی کے پاس کیسے آیا تھا۔"

رحیم داد نے کھیتوں کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ "میں واپس اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔
نادر تو وہیں آ جا۔ میں تیرا انتظار کروں گا۔"

رحیم داد حویلی کی جانب واپس ہوا۔ نادر قدم بڑھاتا ہوا اس طرف چلا جدھر دینا گیا تھا۔

رحیم داد کمرے میں پہنچا اور بے چینی سے نادر خاں کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ گھنٹہ' سوا گھنٹہ
بعد نادر خاں لوٹا۔ وہ تھکا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی
تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تیز رفتار سے چل کر آیا ہے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ جب نادر خاں کو ذرا قرار آیا تو رحیم داد نے پوچھا۔ "وہ دینا ہی
تھا نا؟" اس کے لہجے سے بے قراری صاف عیاں تھی۔

"ہاں جی' دینا ہی تھا۔" نادر خاں نے بتایا۔ "میں نے اسے بہت آگے جا کے پکڑا۔"

"تو نے اس سے بات چیت کی تھی؟"

"بالکل کی تھی۔"

"تو نے پوچھا' وہ ادھر کس لیے آیا تھا؟"

"کہتا تھا زمیں دارنی نے بلایا تھا۔" نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "جلیل نے دیپال پور جا
کر اسے زمیں دارنی کے پاس بھیجا تھا۔"

"تو نے دینے سے پوچھا کہ زمیں دارنی نے اسے کس لیے بلایا تھا؟" رحیم داد نے کرید کر دریافت
کیا۔

"کہتا تھا زمیں دارنی نے ایک ضروری کام کے لیے اسے بلایا تھا۔"

"اس سے تو نے پوچھا نہیں کہ وہ ضروری کام کیا تھا؟"

"میں نے اس سے پوچھا بھی۔ گھما پھرا کر بات کی پر اس نے کچھ نہ بتایا۔ میں نے تو اس کی باتو
سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ خود ہی زمیں دارنی کے پاس آیا تھا۔ زمیں دارنی نے اسے بلایا نہیں تھا۔"

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ "پر یہ مجھ نہیں آئی' اگر وہ جمیلہ کے پاس آی
تھا تو کیوں آیا تھا؟"

"میں تو سمجھتا ہوں جی' وہ زمیں دارنی سے سلامو کے نام پر کچھ اینٹھنے کے لیے آیا ہو گا۔ اور تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔" نادر خاں نے رحیم داد کو بے چین اور پریشان پایا تو زور دے کر پوچھا۔ "پر اس کے زمیں دارنی کے پاس آنے سے تو کیوں پریشان ہے؟"

"پریشانی کی گل ہی ہے۔ دینا بہت عرصہ تک احسان شاہ کے پاس ملازم رہ چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا وہ میرے اور شاہ جی کے میل ملاپ کے بارے میں جمیلہ کو بتائے۔ اس نے مجھے احسان شاہ کی حویلی میں کتنی ہی بار دیکھا ہے۔"

"پر دینا کے بتانے سے بھی کیا ہو گا۔" نادر خاں نے دینا کی آمد کو خاص اہمیت نہ دی۔ "اب تو زمیں دارنی کو پتہ چل ہی چکا ہے' تسیں شاہ جی کے پاس جاتے رہے ہو۔ زمیں دارنی کے سامنے اسے مان بھی چکے ہو۔ اب دینا یا کسی اور کے زمیں دارنی سے ملنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

رحیم داد اپنی پریشانی کی اصل وجہ نادر خاں کو بتانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے اللہ وسایا کے قتل کے سلسلے میں نادر خاں کو اعتماد میں نہ لیا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں کبھی تفصیل سے بات ہی کی تھی۔ رحیم داد نے پردہ پوشی کے لیے بات بنائی "نادر! تیں نوں پتہ ہے ادھر شاہ جی کی حویلی میں پینا پلانا بھی ہوتا تھا۔ میں چاہتا ہوں جمیلہ کو اس کا پتہ نہ چلے۔ وہ شراب بلکہ کسی بھی نشہ بازی کو برا سمجھتی ہے۔"

"چوہدری' میں تو سمجھتا ہوں دینا نے زمیں دارنی سے تیرے بارے میں کوئی ایسی گل بات نہیں کی ہو گی۔" نادر خاں نے رحیم داد کی تشویش رفع کرنے کی کوشش کی۔ "اسے تجھ سے کوئی گلہ شکوہ بھی نہیں۔ وہ خوا مخواہ زمیں دارنی سے کیوں تیری برائی کرنے لگا؟ وہ تو اپنے ہی کسی کام سے آیا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے جلیل اور اس کے بال بچوں کے بارے میں بتانے آیا ہو۔ جلیل کو چھٹی نہ ملی ہو گی۔ اس نے دینا کو زمیں دارنی کے پاس بھیج دیا ہو گا۔"

نادر نے اپنے طور پر رحیم داد کو ہر طرح مطمئن کرنے اور اس کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد کے ذہن میں وسوسے اور خدشات منڈلاتے رہے۔ نادر خاں اجازت لے کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

رحیم داد کمرے میں خاموش بیٹھا رہا۔

سہ پہر ہو گئی۔ جمیلہ اسکول سے واپس ہوئی۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزری تو مسکرا کر بولی۔ "چوہدری' کمرے میں خالی پڑے پڑے تیرا من نہیں گھبراتا۔" مگر وہ رکی نہیں آگے بڑھ گئی۔

اس کے خوشگوار رویے سے رحیم داد کی پریشانی بڑی حد تک زائل ہو گئی۔ اس نے ذہنی سکون محسوس کیا۔

☆

اس روز اتوار تھا۔ جمیلہ حویلی ہی میں تھی اور اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں تھی۔ وہ صبح سے نیچے نہیں آئی تھی۔ دوپہر کو محمد عثمان رندھاوا وکیل آیا۔ وہ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزرا مگر اس سے نہ ملا۔ سیدھا جمیلہ کے پاس اوپر کی منزل پر گیا۔ وہ گھنٹہ' ڈیڑھ گھنٹہ تک جمیلہ کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ کھانا بھی اس نے جمیلہ کے ساتھ ہی کھایا۔ یہ ساری اطلاعات اسے حویلی کے ملازم نامدار سے ملتی رہیں جو بار بار جمیلہ کے پاس آجا رہا تھا۔

سہ پہر کو وکیل واپس چلا گیا۔ رحیم داد نے نہ اسے ٹوکا اور نہ ہی اس نے رحیم داد کی جانب کوئی توجہ دی۔ وہ سر جھکائے لمبے لمبے قدم اٹھاتا کمرے کے سامنے سے گزر گیا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ وکیل کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ رات ہو گئی مگر جمیلہ نیچے نہ آئی۔

سویرے وکیل پھر آیا۔ رحیم داد نے اسے زینے پر چڑھتے اور سیڑھیاں طے کر کے اوپر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس وقت کرسی پر صحن میں بیٹھا تھا۔ ہر طرف گہری بسنتی دھوپ پھیلی تھی۔ رحیم داد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ جمیلہ اور وکیل دو نوکروں کے ہم راہ نیچے آئے۔ نہ جمیلہ نے اور نہ ہی وکیل نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ وہ حویلی کا پھاٹک عبور کر کے باہر گئے۔ تانگوں میں سوار ہوئے اور گاؤں سے باہر چلے گئے۔ رحیم داد کو تشویش لاحق ہوئی۔ وہ دینا کی اچانک آمد ہی سے گھبرا گیا تھا۔ مگر جمیلہ سے بات چیت کرنے کے بعد مطمئن بھی ہو گیا تھا۔ وکیل کی آمد و رفت نے اسے ایک بار پھر طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا کر دیا۔

رحیم داد نے اپنی پریشانی اور خدشات کا نادر خاں سے کوئی ذکر نہ کیا۔ وہ جمیلہ کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ شام کو جمیلہ نوکروں کے ساتھ واپس آئی۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزری۔

وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آگیا۔ بڑھ کر جمیلہ کے قریب پہنچا۔ مسکرا کر دریافت کیا۔ "زمیں دارنی تو سویرے ہی سویرے وکیل کے ساتھ کہاں گئی تھی۔ کوئی خاص گل بات تھی؟"

"نہیں کوئی خاص گل نہیں۔" جمیلہ نے بے نیازی سے بتایا۔ "میں نے وکیل سے لہور میں

مکان کا بندوبست کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اسی کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔"

"تو کیا تو لہور جا رہی ہے؟" رحیم داد نے پریشانی کا اظہار کیا۔

"ابھی تو نہیں جا رہی۔"

"زمیں دارنی' تو لہور جانے کا خیال دل سے نکال دے۔ تیں نوں تو ابھی اپنے سکول کو منظور شدہ بنوانا ہے۔ اس روز یہی کہتی تھی۔"

"ارادہ تو ایسا ہی ہے۔"

"جب تیرا یہ ارادہ ہے تو لہور کیوں جا رہی ہے؟" رحیم داد نے اس کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا' مشورہ دیا۔ "نادر کو لگا دے' وہ تیرے سکول کو منظور شدہ بنوا دے گا۔ فکر نہ کر۔ وہ یہ کام ضرور کردے گا۔ تو جانتی نہیں' وہ ایسے معاملوں میں بہت ہوشیار ہے۔"

جمیلہ خاموش رہی۔ مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔ "تجھے لہور ہی جانا تھا تو مجھے یہاں کیوں بلوایا؟" اس نے جمیلہ کے چہرے کی جانب دیکھا جس پر تھکن کے اثرات ہویدا تھے۔ "اس دفعہ پھٹی اور کماد کی فصل بہت چنگی گئی ہے۔ اس کی آمدنی سے شاندار سکول بنا' ڈسپنسری بنا۔ تجھے روکنے والا کون ہے؟ سب ہی کچھ تیرا ہے۔ میں نے کیا لینا۔" اس نے لہجے میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "تو لہور جانے کا خیال بالکل دل سے نکال دے۔"

"پر میں لہور جا کب رہی ہوں۔" جمیلہ مسکرا کر بولی۔ "وکیل تو یہ بتانے آیا تھا کہ لہور میں اس نے میرے لیے جس مکان کا بندوبست کیا تھا' اس کا معاہدہ ختم کر دیا ہے۔ کل وہ اس سلسلے میں مجھے پوچھنے آیا تھا کہ آگے کے لیے میرا کیا ارادہ ہے؟ جب میں نے اسے بتایا لہور جانے کا وچار چھوڑ دیا ہے تو آج وہ معاہدہ ختم ہونے کی بات بتانے آیا تھا۔"

"تو اس کے ساتھ کہاں گئی تھی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"وہ واپس جا رہا تھا۔ میں نے بھی شہر میں تاجاں کے ویاہ کے لیے خریداری کرنی تھی۔ سو میں اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرائی۔ "تو کیا سمجھا؟"

رحیم داد کچھ نہ کہہ سکا۔ جمیلہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "تجھ سے کل بات ہوگی۔ اس سے تو میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی زینے کی جانب بڑھی۔

رحیم داد ایک بار پھر پریشانی میں مبتلا ہو گیا اور جمیلہ سے گفتگو کرنے کے بعد مطمئن بھی ہو گیا۔ اس کے ذہن میں جو وسوسے اور شبہات کل سہ پہر سے بار بار ابھر رہے تھے' رفع ہو چکے تھے۔ رحیم داد اپنے کمرے میں گیا۔ رات کا کھانا کھایا اور سکون سے گہری نیند سو گیا۔

دن چڑھے نادر خاں اس کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فہرست تھی جو اسے جمیلہ نے دی تھی۔ اس میں تاجاں کے جہیز اور شادی بیاہ کے ساز و سامان کی ضروری اشیاء درج تھیں۔ وہ فہرست کے مطابق خریداری کرنے لاہور جا رہا تھا۔ مگر لاہور جانے سے پہلے وہ رحیم داد کے ساتھ کپاس کی فروخت کے بارے میں بھی بات کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے رحیم داد کو ضروری اطلاعات فراہم کیں۔

وہ اٹھا اور لاہور کے سفر کے لیے روانہ ہو گیا۔

شام ہوئی۔ اندھیرا بڑھا۔ رات ہو گئی' مگر نہ جمیلہ آئی اور نہ رحیم داد اس کے پاس گیا۔

دوسرے روز شام کا اندھیرا بڑھتے ہی اس نے جمیلہ سے ملنے کا ارادہ کیا۔ نادر خاں ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اور اس کا فوری طور پر لوٹنے کا امکان بھی نہ تھا۔ اسے خریداری کے لیے وقت درکار تھا۔ لاہور میں اس کا بھتیجا موجود تھا۔ لہٰذا ٹھہرنے کا بھی مسئلہ نہ تھا۔

رحیم داد اس وقت جمیلہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اسکول کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے ساتھ وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آیا۔ حویلی میں ابھی تک کسی قدر چہل پہل تھی۔ وہ اوپر کی منزل پر جانے والے زینے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو سیڑھیوں پر جنت مل گئی۔ وہ اوپر سے اتر کر نیچے آ رہی تھی۔

رحیم داد نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "کہاں چلی جنت؟"

"گھر جا رہی ہوں جی۔" وہ سر کو دوپٹے سے ڈھکتے ہوئے بولی۔ "چھوہریاں گھر میں اکیلی ڈرتی ہیں۔"

"نادر خاں' کب تک واپس آ رہا ہے؟"

"ٹھیک سے جی پتہ نہیں۔ آج تو آتا ہوا نہیں لگتا۔"

"پوری خریداری کر کے ہی لوٹے گا۔" رحیم داد نے جنت کو نظر بھر کر دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ اس نے جنت سے پوچھا۔ "تو رات کو جلدی تو نہیں سوتی؟"

"نہیں جی' میں تو دیر ہی سے سوتی ہوں۔"

"پر اس رات تو جلد ہی سو گئی تھی۔" رحیم داد نے اسے چھیڑا۔ "تو نے جو گرم گرم دودھ پلایا تھا۔ بہت مزا دیا تھا اس نے۔"

"تجھے پسند آیا؟" وہ خوش ہو کر بولی۔ "ابھی چل کر پی لے۔ گرم ہو گا۔"

"ابھی تو میں زمیں دارنی کے پاس جا رہا ہوں۔ اس کے ساتھ کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔"

بعد میں....." رحیم داد اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اسی وقت کمرے کے دھندلکے میں سیڑھیوں پر آہٹ ابھری۔ کوئی اوپر سے نیچے آرہا تھا۔ آہٹ سنتے ہی جنت مہمان خانے میں کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھی اور دروازے سے گزر کر چلی گئی۔

رحیم داد اوپر جانے کے بجائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس نے جمیلہ کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ رات کے تاریک اور سنسان ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

☆

حویلی پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ رحیم داد باہر نکلا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا۔ دالان میں آیا۔ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سردی زیادہ تھی۔ نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھریوں کے اندر جا چکے تھے۔ صحن میں کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی' نہ آواز۔

رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا۔ احمد حسب معمول غائب تھا۔ مہمان خانہ خالی تھا۔ رحیم داد مہمان خانے سے گزر کر نادر خاں کے گھر پر پہنچا۔ اس نے دروازے پر ہولے سے دستک دینے کے لیے ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ رحیم داد اندر داخل ہو گیا۔

اس نے دیکھا' سامنے پلنگ پر جنت لیریا چندری اوڑ [illegible]۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ ہونٹوں پر سرخی کی دھڑی تھی۔ سر کے بال تیل سے چمک رہے تھے۔ پلنگ کے نیچے انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی تیز روشنی میں جنت کے گورے چٹے چہرے پر تازگی اور نکھار نظر آرہا تھا۔ اس کی سج دھج صاف چغلی کھا رہی تھی کہ وہ رحیم داد ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ پلنگ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت شلوار کے بجائے لاچا باندھے ہوئے تھی۔ لاچا نارنجی رنگ کا تھا۔ اس کا ریشم بھی نرم تھا۔ اور نچلا کنارہ سنہری کلابتو کا تھا۔

رحیم داد نے مسکرا کر شوخی سے پوچھا۔ "تو نے تو آج لاچا باندھ رکھا ہے؟"

"تو نے ہی تو مجھے لاچا باندھنے کو کہا تھا۔" وہ آنکھوں کو ترچھا کر کے بے باکی سے مسکرائی۔ "میں نے نادر سے کہا مجھے لاچا لا دے۔ میں لاچا باندھوں گی۔ وہ پچھلے دنوں لہور گیا تو یہ لاچا لیتا آیا۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ غور سے لاچا دیکھتے ہوئے موڑھے پر بیٹھ گیا۔

جنت اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ اٹھلا کر بولی۔ "کیسا لگ رہا ہے لاچا؟"

"لشکارے مار رہی ہے۔ اسے پہن کر تو سچ مچ بہت سوہنی لگ رہی ہے۔"

"اب کہاں رہی سوہنی۔ تو نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔

"بھڑولی پر تیرے لیے گرم دودھ رکھا ہے۔ لے آؤں؟"

"دودھ بعد میں پی لوں گا۔ پہلے تو دروازے کی زنجیر چڑھا دے۔" رحیم داد اٹھا اور پلنگ پر جا کر بیٹھ گیا۔

جنت اپنے کولھوں کو ہولے ہولے خم دیتی دروازے کی جانب بڑھی۔ کنڈی لگائی اور نظریں نیچی کیے شرماتی' لجاتی رحیم داد کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔

رات اپنا سفر طے کرتی رہی۔ نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں پریشان ہو گئے۔ جنت نے جھٹ رحیم داد کا ہاتھ پکڑا اور برابر والے کمرے میں لے گئی۔ اس نے الگنی پر چادر ڈال دی اور رحیم داد کو اس کے پیچھے چھپا دیا۔

جنت نے رنگین چنری اتار کر سوتی کھیس اوڑھی جلدی جلدی لاچا اتار کر ایک طرف ڈالا۔ شلوار پہنی۔ باہر نادر کی آواز ابھری۔ "جنت دروازہ کھول۔ میرے ساتھ زمیں دارنی بھی ہے۔"

رحیم داد نے یہ سنا تو سخت سراسیمہ ہوا۔ اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سہما ہوا پردے کی آڑ میں دبکا ہوا کھڑا رہا۔ جنت لالٹین سنبھالے ہوئے باہر چلی گئی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ رحیم داد اندھیرے میں لمبی لمبی سانس بھرنے لگا اور اپنی گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

جنت برابر والے کمرے میں پہنچی۔ آگے بڑھی' دروازہ کھولا۔ دیکھا' نادر سامنے کھڑا ہے۔ جمیلہ اس کے ہم راہ تھی۔ دونوں کے عقب میں تاراں تھی۔ نادر نے جنت کو مخاطب کیا۔ "جنت اتنی گہری نیند نہ سویا کر۔ جا زمیں دارنی کے لیے فٹافٹ گرم دودھ لے کر آ۔" اس نے مڑ کر جمیلہ کی طرف دیکھا' موڑھا اٹھایا اور اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "زمیں دارنی اسی پر بیٹھ جا۔ اپنے پاس کرسی تو ہے نہیں۔"

جمیلہ سنجیدگی سے بولی۔ "میں نے بیٹھنا نہیں ہے۔ میں تو یہ دیکھنے آئی ہوں کہ ویاہ کے لیے تیرا گھر ٹھیک رہے گا ناں؟" اس نے ملحقہ کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "تاجاں اس میں مائیاں بیٹھ سکتی ہے۔"

"بالکل بیٹھ سکتی ہے جی۔" جنت نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

جمیلہ نے نادر سے کہا۔ "نادر' لالٹین اٹھا' میں ساتھ والا کمرہ دیکھوں گی۔"

جنت نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "کیا کرے گی اسے دیکھ کر۔ زمیں دارنی! وہ کمرہ بھی اتنا ہی وڈا ہے۔"

"نہیں میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔" جمیلہ نے اصرار کیا۔

"دیکھنا ہی ہے تو دن میں آرام سے دیکھ لینا۔" جنت نے ایک بار پھر جمیلہ کو کمرے میں جانے سے روکنے کی کوشش کی۔ "کل میں اسے صاف کروں گی۔"

مگر جمیلہ نہ مانی۔ اس نے نادر خاں سے کہا۔ "نادر لالٹین اٹھا۔ اب آئی ہوں تو اس کمرے کو بھی دیکھ کر ہی جاؤں گی۔ کل مجھے اور بھی بہت کام کرنے ہیں۔"

نادر خاں نے لالٹین اٹھالی۔ جنت کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس پر خوف اور پریشانی کا غبار چھا گیا۔ مگر جمیلہ اس کی گھبراہٹ اور سراسیمگی سے بے نیاز' نادر خاں کے ساتھ برابر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ جنت نہ گئی۔ جمیلہ نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا' کمرے میں دو چارپائیوں پر نادر خاں کی تینوں بیٹیاں بے خبر سو رہی ہیں۔ ایک گوشے میں جنت کا نارنجی لاچا بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ قریب ہی لہریا چنری پڑی تھی۔

جمیلہ نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ رحیم داد دم بخود کھڑا تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے سنا جمیلہ کہہ رہی تھی۔ "مجھے تو یہ کمرہ برابر کے کمرے سے کچھ وڈا ہی لگتا ہے۔" وہ الگنی پر پڑی ہوئی چادر کے بالکل برابر پہنچ چکی تھی۔ اتنی قریب کہ رحیم داد اس کے خوبصورت جسم کی مہک سونگھ سکتا تھا۔ مگر اس کا خوف سے برا حال تھا۔ اس نے سانس روک لی اور آنے والے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔

اسے خدشہ تھا کہ الگنی پر پڑا ہوا پردہ ایک طرف کھسک جائے گا اور جمیلہ اس کے سامنے ہوگی۔ اس تصور ہی سے وہ کانپ اٹھا۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر پردہ بدستور لٹکتا رہا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔

جمیلہ کی آواز ابھری۔ "نادر! مائیاں بیٹھنے کے لیے یہ کمرہ ٹھیک رہے گا۔ اس کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا ہے ناں؟"

"ہاں جی' بالکل کھلتا ہے۔" نادر خاں نے الگنی پر لٹکی ہوئی چادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "زمیں دارنی اسی کے پیچھے دروازہ ہے۔ پر اس میں تالا پڑا ہے۔ کنجی جنت کے پاس ہوگی۔ اسے دیکھنا چاہتی ہے تو جنت سے چابی لے لے۔"

"نہیں' میں نے اسے نہیں دیکھنا۔"

رحیم داد کی پیشانی پر سخت سردی کے باوجود پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ اس کی نظریں سامنے لٹکی ہوئی چادر پر ٹکی تھیں اور کان قدموں کی آہٹ پر لگے تھے۔ جمیلہ نہ آگے بڑھی اور نہ ہی اس نے چادر ہٹائی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ نادر خان بھی لالٹین اٹھائے اس کے ہم

چلا گیا۔

جمیلہ مونڈھے پر بیٹھی نہیں۔ پلنگ کے نیچے رحیم داد کے جوتے پڑے تھے۔ جمیلہ کی ان پر نظر ۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری' نادر خاں سے مخاطب ہوئی۔

'نادر! تو نے بھی چوہدری کی طرح کے بوٹ پہن نے شروع کر دیے؟"

در خاں نے جوتوں کو دیکھا تو اس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ مگر اس نے جھٹ اپنی نی پر قابو پالیا۔ آہستہ سے بولا۔ "وہ ایسا ہے زمیں دارنی' لمور سے پچھلے دنوں میرا بھتیجا آیا تھا۔ یرے لیے یہ بوٹ لیتا آیا تھا۔"

نت دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر صحن سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے گلاس جمیلہ کی ، بڑھایا۔ "زمیں دارنی دودھ پی لے۔ گرم گرم ہے۔ کوسا ہے۔"

میں رات کے سمے دودھ نہیں پیتی۔" جمیلہ نے صاف انکار کر دیا۔ لالٹین کی روشنی میں اس نت کے چہرے کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ جنت کی نظریں جھک گئیں۔ "جنت! لگتا ہے۔ تو ، سے پہلے رات کو سنگھار بھی کرتی ہے۔"

نہیں بھین جی۔ ایسی کوئی گل نہیں۔" جنت گھبرا کر بولی۔ "سنگھار شنگھار کیہ کرنا۔ بس ذرا تھ دھو لیا تھا۔ میں تو تیرے ہی پاس آنے والی تھی۔"

یلہ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے نادر سے کہا۔ "نادر' کل تو یہ گھر خالی کر کے مہمان میں چلا جانا۔ یہاں کی ٹھیک طرح صفائی بھی کرا دینا۔ ویاہ تو یہیں سے ہو گا ناں۔" وہ مڑی۔ میں چلوں گی۔" جمیلہ دروازے کی جانب بڑھی۔

یز کے پاس تاراں بیٹھی تھی۔ جمیلہ اس کے ہم راہ باہر نکلی اور مہمان خانے سے گزر کر حویلی ، گئی۔

ول کے جانے کے بعد نادر نے دروازہ بند کیا۔ جنت سے کہا۔ "دودھ واپس لے جا۔"

چپ چاپ صحن میں چلی گئی۔ نادر خاں نے لالٹین اٹھائی۔ برابر کے کمرے میں گیا۔ الگنی پر ئی چادر کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا۔ اس نے ایک ہاتھ بڑھا کر چادر ایک طرف کر دی۔ کی زرد زرد روشنی میں رحیم داد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور خوف اور دہشت کے سائے پھیلے تھے۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ دونوں ایک دوسرے منے چپ چاپ کھڑے تھے۔

م داد نے دھڑکتے دل سے نظریں اٹھائیں۔ نادر اس کے روبرو کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر

ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کا بازو پکڑا۔ آہستہ سے کہا۔

"چوہدری باہر آ جا۔ زمیں دارنی چلی گئی۔"

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر نادر خاں کو دیکھا اور خاموشی سے آگے بڑھا۔ نادر خا
کے ہم راہ ملحقہ کمرے میں گیا۔ جنت ابھی تک کمرے میں واپس نہیں آئی۔

"چوہدری تو نے اپنے جوتے بھی یہیں چھوڑ دیئے تھے۔ زمیں دارنی نے انھیں دیکھ لیا۔ پو
بھی۔ پر میں نے جھٹ بات بنا دی۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا اور سر جھکا کر اپنے جوتے پہن نے لگا۔

"چوہدری! میں نے تجھ سے کچھ ضروری گل کرنی ہے۔"

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اس کی چہرے پر کچھ دیر کے لیے جو سکون نمودار ہوا تھا' غائ
ہو گیا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ جلدی جلدی جوتے پہنے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نادر کی جا
دیکھے بغیر کہا۔

"ابھی گل کرنی ہے؟"

"توں چاہتا ہے تو سویرے کرلوں گا۔" نادر خاں نے اصرار نہ کیا۔ "پر گل ہے بہت ضروری
رحیم داد اس قدر خفیف ہو رہا تھا کہ اس نے مڑ کر نادر خاں کی طرف نہ دیکھا۔ آگے بڑ
دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ مہمان خانے میں احمد موجود تھا مگر بے خبر سو رہا تھا۔ رحیم داد مہ
خانے سے گزر کر حویلی میں پہنچا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ گیارہ کا عمل تھا۔ سردی بھری ہوئی تھ
جسم تھر تھراتا تھا۔ رحیم داد دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆

دوسرے روز رحیم داد دن چڑھے تک سوتا رہا۔ رات کو اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ ش
انتشار اور خلفشار میں جکڑا رہا۔

نادر خاں حسب وعدہ رحیم داد کے پاس نہ آیا۔ اس نے نوکروں اور کمیوں کی مدد سے اپنا
خالی کیا۔ گھر گرہستی کا سامان مہمان خانے کے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ جنت اور اس کی
بچیاں بھی مہمان خانے میں منتقل ہو گئیں۔ خالی مکان خوب اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر صاف کیا
جمیلہ نے خود جا کر اس کا معائنہ کیا۔ اپنی نگرانی میں سجا کر اسے شادی کا گھر بنایا۔ کمروں میں د
بچھی تھیں' ان پر جازم اور چاندنی کا فرش تھا۔ کمروں کے باہر دالان میں بھی دریاں اور چٹ
بچھائی گئی تھیں۔

ہ پہر تک سارے انتظامات مکمل ہو گئے۔ تاجاں کو گھر کے پچھلے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ
خ سالو باندھے ہوئے تھی۔ سر پر ہلدی میں رنگا ہوا زرد دوپٹہ تھا۔ کرتا بھی زرد ہی تھا۔ سورج
بنے سے کچھ دیر پہلے تاجاں کی سسرال سے کچھ عورتیں اور نوجوان لڑکیاں آئیں۔ کمروں اور باہر
ن میں پیڑومیکس روشن تھے۔ ان کی تیز روشنی دور تک پھیلی تھی۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔
ے تھے اور ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ مسرت و شادمانی تھی۔ بڑا خوشگوار ہنگامہ تھا۔ ہر چہرہ چمکتا
دمکتا تھا۔

سسرال سے آنے والی عورتیں اور لڑکیاں جب تاجاں کے پاس پہنچیں تو آوازوں اور قہقہوں کا
اور بھی سوا ہو گیا۔ تاجاں کے چھوٹے ماموں نے' جو دولہا کا چچا بھی تھا' قریب جا کر اپنا ہاتھ
ایا' شفقت سے تاجاں کے سر پر پھیرا۔ بازو پکڑ کر اسے اٹھایا اور سہارا دے کر تیل چڑھانے کی
ں پر لے گیا۔ وہ سر جھکا کر چوکی پر شرماتی لجاتی سمٹی سمٹائی بیٹھ گئی۔

سات نوجوان عورتیں آگے بڑھیں اور تاجاں کے ارد گرد بیٹھ گئیں۔ ساتوں سہاگنیں تھیں۔
تاجاں کے گندھے ہوئے بال آہستہ آہستہ کھولنے لگیں۔ لیکن بال کھولنے سے قبل ایک عورت
۔ تاجاں کی ہتھیلی پر ناریل اور گھی ملی ہوئی تھوڑی سی مہندی رکھ دی۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور دیوار
پاس لے گئی۔ تاجاں نے اس کی ہدایت کے مطابق شرم سے جھجکتے ہوئے ہتھیلی کی مہندی دیوار
ل دی۔

وہ عورت پیچھے ہٹی تو دوسری سہاگن نے بڑھ کر تاجاں کی ہتھیلی پر پھر مہندی رکھ دی اور تاجاں
نے اس کے ہاتھ کی مدد سے اس دفعہ بھی مہندی دیوار پر مل دی۔ ساتوں سہاگنوں نے باری باری
اں کے ہاتھ سے دیوار پر مہندی لگوائی۔ لیکن ہر بار جب تاجاں دیوار پر مہندی لگاتی' تو ساتوں
ں سے ایک سہاگن سرسوں کے تیل میں انگلی ڈبو کر اس کے سر میں لگاتی اور بالوں کی مینڈھی
ول دیتی۔

یہ تیل چڑھانے کی رسم تھی۔ اس رسم کے دوران میں تاجاں کی سہیلیاں اور دوسری نوجوان
لیاں اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔ تاجاں اب سر جھکائے خاموش بیٹھی
ں۔ میراثنوں میں سے ایک نے ڈھولک پر تھاپ دی اور اونچی آواز سے یہ گیت چھیڑا۔

میری میڈھی نہ کھولو' میری میڈھی نہ کھولو' سہاگیو!
میرے بابل توں پچھو' سہاگیو' جس میرا داج بنایا!
میرے چاچے توں پچھو' جس میرا کاج رچایا!

میرے ویر توں پچھو' جس مینو بوچھیں دوایا!

گیت شروع ہوتے ہی دوسری میراثنیں بھی ڈھولک کی تھاپ پر گانے لگیں۔ تاجاں کے گر
حلقہ بنا کر کھڑی ہوئی لڑکیاں بھی ان کی آواز سے آواز ملا کر گانے لگیں۔ وہ گیت کے بول اٹھاتیں
خوشی سے کھلکھلا کر قہقہے بلند کرتیں۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ کرتیں' مگر تاجاں حیا سے سمٹی سمٹا
چپ بیٹھی تھی۔ گیتوں کے بول سن رہی تھی جن میں اس کی آرزوؤں اور خواہشوں کا اظہار "
طرح کیا جا رہا تھا۔

پیاری سلیو! میرے بال نہ کھولو' میرے بال پریشان نہ کرو
میرے بابل سے تو پوچھو سلیو جس نے میرا جہیز بنایا!!
میرے چاچا سے تو پوچھو جس نے میرا بیاہ رچایا!!
میرے بھائی سے تو پوچھو سلیو جس نے مجھے دوپٹہ اوڑھایا

مگر نہ اس کا باپ تھا' نہ چاچا تھا' نہ کوئی بھائی تھا۔ اس کی آنکھوں سے اپنی بے بسی پر ٹپ ٹ
آنسو گرنے لگے۔ اور جمیلہ جس نے سارا جہیز تیار کیا' شادی کا اہتمام کیا' لباس عروسی تیار کرا
وہاں موجود نہ تھی۔ وہ سہاگن نہ تھی' رانڈ بیوہ تھی اور کسی بیوہ کا سایہ مائیوں بیٹھنے والی لڑکی پر
نحوست اور بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔

جمیلہ مہمان خانے میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ گیت کے فضا میں بکھرتے ہوئے بولوں کو سن ر
تھی۔ مہمان خانے کے صحن میں بھی گیس بتی جل رہی تھی۔ اس کی ہر سو بکھری ہوئی روشنی
بڑے بڑے چولہوں پر دیگچے چڑھے تھے۔ کڑاہیاں رکھی تھیں۔ دیگچوں میں گھنگھنیاں ابل ر
تھیں۔ کڑاہیوں میں گلگلے تلے جا رہے تھے۔ گلگلے تلے جانے کے بعد ٹوکروں میں ڈالے جا ر
تھے۔ قریب ہی پیتل کے بڑے بڑے تھالوں میں سوجی کی چوری اور ملیدہ تیار کیا جا رہا تھا۔ ج
پکوان اپنی نگرانی میں تیار کرا رہی تھی۔

مائیوں کی رسم پر جمیلہ نے کوٹلہ ہرکشن کی تمام عورتوں اور لڑکیوں کو مدعو کیا تھا۔ ہر عو
تاجاں کے پاس جانے سے قبل مہمان خانے میں پہنچتی۔ اس کے ہاتھوں میں گندم سے بھری
تھالی ہوتی۔ وہ جمیلہ کے سامنے جاتی۔ اونچی آواز سے کہتی۔ "سلام بھین جی۔" اور تھالی میں ب
ہوئی گندم دالان میں رکھے ہوئے مٹی کے بڑے بڑے کونڈوں میں انڈیل دیتی۔ پھر وہ دیگچوں
پاس جاتی۔ ڈوئی کا دستہ پکڑ کر اندر سے گھنگھنیاں نکالتی' ٹوکروں سے گلگلے اٹھاتی' پیتل کے تھا
سے چوری اور ملیدہ لیتی اور اپنی تھالی میں رکھتی جاتی' پھر ہنستی مسکراتی اس طرف چلی جاتی ج

تیل چڑھانے کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔

تیل چڑھانے کی رسم ختم ہوئی تو تاجاں کے ماموں نے ایک بار پھر اس کا بازو تھاما۔ اسے اٹھایا
اور سہارا دے کر اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ اس نے تاجاں کو پردے کے پیچھے بیٹھا دیا۔
تاجاں اب باقاعدہ مائیوں بیٹھ چکی تھی۔

پھاتاں بھاگی بھاگی جمیلہ کے پاس آئی' گڑگڑا کر بولی۔ "بھین جی' تیری تاجاں مائیاں بیٹھ گئی ہے۔
اب تو بھی چل۔"

وہ تیل چڑھانے کی رسم کے موقع پر بھی جمیلہ کے پاس آئی تھی اور اس میں شرکت کرنے پر
اصرار بھی کیا تھا۔ مگر جمیلہ نے انکار کر دیا تھا۔ اس دفعہ بھی اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔ "پھاتاں'
تو جا' میں تھوڑی دیر بعد آجاؤں گی۔ مجھے ادھر کئی ضروری کام نمٹانے ہیں۔ دیکھ رہی ہے ادھر کتنا
کام ہو رہا ہے۔"

"وہ تو تیرے بناں بھی ہوتا رہے گا۔" پھاتاں نہ مانی' اپنی بات پر اڑ گئی۔ اس نے اپنا دوپٹہ اتار
کر جمیلہ کے قدموں پر ڈال دیا۔ "بھین جی' میری لاج رکھ لے۔ تو نہ گئی تو میں بھی اب تاجاں کے
پاس نہیں جاؤں گی۔"

رحیم داد' جو شام ہی سے مہمان خانے میں پہنچ کر جمیلہ کے قریب ہی بیٹھا تھا اور بہت دیر سے
خاموش تھا' پھاتاں کے گڑگڑانے سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے جمیلہ کی جانب دیکھا اور نرم لہجے
میں مخاطب کیا۔ "زمیں دارنی' اب تو چلی جا۔" اس کے لہجے میں بھی عاجزی تھی۔

جمیلہ نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا لباس اس وقت بھی حسب معمول سفید ہی تھا۔
البتہ وہ دو شالہ سبز رنگ کا اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کے کنارے سنہری تھے۔ آنکھوں میں دنبالہ
جل تھا۔ چہرے پر سردی سے گلاب کھل رہے تھے۔ کانوں میں سونے کے مندرے پڑے تھے۔
رومیکس کی تیز روشنی میں وہ جگمگا رہی تھی' دل کش اور دل آرا نظر آ رہی تھی۔

جمیلہ راج ہنس کی مانند اپنی صراحی دار گردن اونچی اٹھائے گم صم بیٹھی سوچتی رہی۔ پھاتاں اس
ے روبہ رو مجسم التجا بنی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب کے سائے منڈلا رہے
ے۔ رحیم داد نے ایک بار پھر نرم لہجے میں جمیلہ سے درخواست کی۔ "زمیں دارنی' اب چلی بھی
۔ تاجاں تو پھاتاں سے زیادہ تیری دھی ہے۔ تو اس کے مائیاں بیٹھنے پر نہیں جائے گی۔ یہ کیسے
سکتا ہے؟ ذرا سوچ تو یہ کیسا لگے گا؟"

جمیلہ نے اس دفعہ بھی کچھ نہ کہا۔ جھک کر پیروں پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھایا۔ پھاتاں کے سر پر ڈالا اور

اٹھ کر کھڑی ہوگئی' آگے بڑھی۔ بھاتاں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ رحیم داد دونوں کو جاتے ہوئے بڑے اشتیاق سے دیکھتا رہا۔ جب وہ مہمان خانے کا دروازہ کھول کر باہر چلی گئیں تو رحیم داد نے گہری سانس بھری اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کمرے کے سامنے سے گزرا جس میں نادر خاں بیوی بچوں کے ساتھ عارضی طور پر مقیم تھا۔ جنت اس وقت کمرے میں موجود نہ تھی۔ وہ اپنی تینوں بچیوں کے ہم راہ مائیوں کی تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ نادر خاں بھی کمرے میں نہیں تھا۔ رحیم داد نے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور آگے نکل گیا۔ وہ پھر واپس مہمان خانے میں آیا۔

☆

تاجاں کو مائیوں بیٹھے ہوئے چار روز گزر چکے تھے اور ابھی اسے مزید سات روز مائیوں بیٹھنا تھا۔ اس عرصے میں رحیم داد کو نادر خاں کم ہی نظر آیا۔ وہ ان دنوں جمیلہ کی اردلی میں تھا اور تاجاں کی شادی کی تیاری میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ مگر رحیم داد کو تاجاں کے بیاہ کی سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ہر وقت اکتایا ہوا سا رہتا۔ خود کو تنہا محسوس کرتا' بے چین اور مضطرب رہتا۔

انھی دنوں ایک سہ پہر کو رحیم داد نے وکیل عثمان رندھاوا کو ایک بار پھر حویلی میں دیکھا۔ وہ سیدھا جمیلہ کے پاس اوپر چلا گیا۔ جب وہ جمیلہ سے طویل بات چیت کے بعد نیچے آیا تو کمرے میں دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ شام مشرقی افق سے زینہ زینہ نیچے اتر رہی تھی۔ وکیل اپنے کسی زمیں دار موکل کی کار میں آیا تھا۔ وہ اس میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔

وکیل کی اچانک آمد رحیم داد کو بہت پراسرار معلوم ہوئی۔ وہ ایک بار پھر تشویش اور بے چینی میں مبتلا ہوگیا۔ اس کے ذہن میں دبے دبے وسوسوں اور شبہات نے از سر نو سر ابھارا۔ وہ پریشان اور اضطراب کے عالم میں تنہا بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔

ملازم کھانا لایا تو رحیم داد ذہنی انتشار کے باعث رغبت سے نہ کھا سکا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ مہمان خانے میں چلا گیا۔ مگر نہ وہاں نادر خاں تھا نہ جنت تھی۔ نادر خاں کے کمرے کا دروازہ اس وقت بھی کھلا تھا۔ چارپائیاں خالی تھیں۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ جمیلہ بھی اسے مہمان خانے میں کہیں نظر نہ آئی۔ صرف نوکر چاکر ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بہت مصروف اور سرگرم معلوم ہو رہے تھے۔

تاجاں جہاں مائیوں بیٹھی تھی' وہاں ڈھولک ٹھنک رہی تھی۔ لڑکیوں کے گانے کی ملی

آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اس وقت تاجاں کے بدن پر بٹنا ملا جا رہا تھا۔ گیت کے بولوں سے رحیم داد نے یہی اندازہ لگایا۔ لڑکیاں بٹنا مل رہی تھیں اور تالیوں کی تھاپ پر لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ تاجاں سے یوں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔

تیں نوں مائیں پاون آئیاں بی بی
کچھ بھیناں تے کچھ تائیاں بی بی
کچھ چاچیاں' تے کچھ تائیاں بی بی
تے کچھ چاچے تائے دیاں جائیاں بی بی

رحیم داد ذرا دیر خاموشی سے گیت سنتا رہا' پھر اکتا گیا اور حویلی میں واپس چلا گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اوپر کی منزل پر جائے اور باتوں باتوں میں جمیلہ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ وکیل اس کے پاس کیوں آیا تھا' کس مقصد سے آیا تھا؟

وہ کمرے سے نکل کر زینے پر پہنچا تو سیڑھیوں پر حویلی کی ملازمہ تاجو نظر آئی۔ وہ اوپر ہی سے آرہی تھی۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "گل سن تاجو۔ یہ بتا' زمیں دارنی اوپر ہی ہے ناں؟"

"نہیں جی' وہ تو شام ہی سے تاجاں کے پاس ہے۔"

"کب تک واپس آئے گی؟"

"دیر ہی سے آئے گی جی۔" تاجو نے رحیم داد کو بتایا۔ "روز ہی وہاں سے دیر کو لوٹتی ہے۔"

رحیم داد نے تاجو سے مزید بات چیت غیر ضروری سمجھی۔ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ نہ جانے کتنی رات گزری تھی۔ اس کی آنکھ آہٹ سے کھل گئی۔ اس نے سنا دروازے پر آہستہ آہستہ دستک ہو رہی ہے۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ پلنگ سے نیچے اترا۔ آگے بڑھا' دروازہ کھولا۔ دیکھا' سامنے جنت کھڑی ہے۔ وہ سردی سے تھرتھرا رہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی جھٹ اندر داخل ہوگئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ سارے نوکر چاکر تھک کر بستروں میں دبکے گہری نیند سو رہے تھے۔

رحیم داد نے دروازہ بند کرتے ہوئے جنت سے پوچھا۔ "تو اتنی رات گزرے کیسے آگئی؟ نادر کہاں ہے؟"

"وہ تو جی لور گیا ہے۔" جنت نے جواب دیا۔ "زمیں دارنی نے اسے شام ہی کو بھیجا ہے۔ اب تو وہ کل ہی واپس آئے گا۔"

جنت رحیم داد کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کا بدن سردی سے ہنوز کپکپا رہا تھا۔ اس نے لحاف اٹھا کر

پیروں پر ڈال لیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ "اس رات جب میں تیرے پاس گیا تھا' نادر خا
نہیں ہوا؟ کیا کہتا تھا وہ؟"

"اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ تیرے بارے میں کوئی گل بات ہی نہیں ہوئی۔"

"بعد میں بھی کوئی گل بات نہیں ہوئی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"بس اتنا کہا تھا' تاجاں کے ویاہ کے بعد اپنے پیئو کے پاس رحمت والی چلی جا۔" جنت نے بتا

"چوہدری! اس نے تجھ سے تو کچھ نہیں پوچھا؟"

"اس رات کے بعد وہ میرے پاس آیا ہی نہیں۔" رحیم داد نے جنت کو مطلع کیا۔ "ہاں!
سے یہ کہتا تھا کچھ ضروری گل کرنی ہے۔ پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا؟"

جنت اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ "میں تو تیرے پاس پہلے ہی آتی پر زمیں دارنی
مجھے تاجاں کے ساتھ لگا دیا ہے۔ رات کو میں اسی کے پاس ہوتی ہوں۔"

"آج کیسے ادھر نکل آئی؟"

"وہ ایسا ہوا جی' نادر لہور گیا ہے۔ چوہدریوں کے پاس کوئی نہیں۔ اکیلے میں ڈرتی ہیں۔ زمیں
دارنی نے آج رات چھاتاں کو تاجاں کے پاس لگا دیا ہے۔ میں مہمان خانے کے کمرے میں ر
رات گزری تو تیرے پاس آگئی۔"

"زمیں دارنی نے تو تجھ سے اس رات کے بارے میں پوچھ تاچھ نہیں کی؟"

"وہ ایسا کیوں کرتی؟ اس نے کیسے پتہ؟" جنت نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"نادر خاں نے اسی رات مجھے بتایا تھا کہ زمیں دارنی کو میرے جوتے منجی کے نیچے پڑے دیکھ
شبہ ہو گیا تھا۔"

"مجھ سے تو اس نے کچھ پوچھا نہیں۔" جنت نے بے نیازی سے کہا۔ "پر تو اتنا گھبرا گیا تھا
جوتے پہن نے بھی بھول گیا۔ حد کر دی تو نے۔"

"لگتا ہے نادر مجھ سے کچھ ناراض ہے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "جب ہی
میرے پاس اب تک نہیں آیا۔"

"مجھے تو ایسا لگتا نہیں۔" جنت نے اطمینان سے کہا۔ "ویسے آج کل تاجاں کے ویاہ کی تیا
میں نادر بری طرح الجھا ہوا ہے۔ زمیں دارنی نے ویاہ کا سارا ہی بوجھ اس پر ڈال رکھا ہے۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ جنت بھی خاموش رہی۔

علی الصباح رحیم داد کی آنکھ کھلی تو جنت اٹھ کر جا رہی تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا مگر خاموش

رہا۔ جنت کمرے سے باہر نکلی تو ہوا کا سرد جھونکا اندر آیا۔ باہر ہلکی ہلکی دودھیا دھند کی چادر ہر
طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جنت نے دہلیز عبور کرنے کے بعد آہستہ سے دروازہ بھیڑ دیا۔ ابھی بہت تڑکا
تھا۔ ہر سو گہری خاموشی طاری تھی۔ سردی بھی شدید تھی۔ رحیم داد لحاف میں دبکا ہوا بستر پر لیٹا رہا۔

☆

پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد کھانا کھا رہا تھا کہ نادر خاں اچانک کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم
داد اسے دیکھ کر قدرے پریشان ہو گیا۔ اس نے نادر کی جانب دیکھے بغیر نرم لہجے میں دریافت کیا۔

"نادر' تو اتنے روز کہاں رہا؟ میرے پاس آیا ہی نہیں۔"

"زمیں دارنی نے ویاہ کے کاموں میں ایسا الجھا دیا ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔" نادر خاں نے
صفائی پیش کی۔ "لہور گیا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے واپس آیا ہوں۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا کھانا کھاتا رہا۔ نادر خاں بھی خاموش رہا۔
کمرے میں سکوت چھایا تھا۔ ذرا دیر بعد نادر خاں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ سنبھلے ہوئے لہجے
میں گویا ہوا۔ "چوہدری' تجھ سے بہت ضروری گل کرنی تھی۔"

"اس رات کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہے؟" رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر ہچکچاتے
ہوئے پوچھا۔

"اسے چھوڑ۔ چوہدری' یہ اور ہی گل ہے اور بہت پریشانی کی گل ہے۔" نادر خاں نے اپنی بات
کی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔

رحیم داد نے اس دفعہ مڑ کر اس کی طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ مگر چپ رہا۔

"میں تجھ سے اس بارے میں بہت پہلے بات کرنا چاہتا تھا۔" نادر خاں نے کہا۔ "پر موقع ہی نہ
ملا۔"

"ایسی کیا پریشانی کی گل بات ہے؟" رحیم داد کے لہجے سے تشویش آشکارہ تھی۔

"تو سنے گا تو دنگ رہ جائے گا۔" نادر خاں نے کھل کر بات نہ کی۔

"تو فیر بتا نا۔ اس طرح چبا چبا کر کیوں بات کر رہا ہے؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر کہا۔

"شبہ تو جی مجھے پہلے ہی تھا پر اب تو تصدیق بھی ہو گئی۔" نادر خاں نے بتایا۔ "اسی لیے میں نے
تجھ سے اب تک اس معاملے میں بات نہیں کی۔ سوچا پہلے تصدیق کر لوں تب تجھے آگاہ کروں کہ
کیا ہو رہا ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے؟" رحیم داد کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ اس نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا۔ "صاف صاف

گل کر۔ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

"لگتا ہے تجھے کچھ پتہ نہیں۔" نادر خاں نے گردن آگے بڑھا کر رازداری کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "تیں نوں پتہ نہیں۔ زمیں دارنی اپنی ساری اراضی بیچ رہی ہے۔"

رحیم داد ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ بھوک اڑ گئی۔ حیران و پریشان ہو کر بولا۔ "پر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نادر! تجھے کس نے بتایا کہ زمیں دارنی اپنی اراضی بیچ رہی ہے؟"

"یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔" نادر خاں گویا ہوا۔ "پر تیری باتوں سے لگتا ہے تجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ زمیں دارنی نے وکیل عثمان رندھاوا کی معرفت لور میں کرائے پر مکان بھی لے لیا ہے۔"

"مجھے شبہ تو ہوا تھا اور میں نے اپنے شبے کا جمیلہ سے اظہار بھی کیا تھا۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" رحیم داد نے قدرے توقف کیا۔ "لیکن وکیل کا روز روز آنا یہ ظاہر کرتا ہے' تیری بات میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔"

"چوہدری! یہ چکر تو بہت دن سے چل رہا ہے۔"

"وکیل' کل بھی جمیلہ کے پاس آیا تھا اور شام تک اوپر بیٹھا جمیلہ سے باتیں کرتا رہا۔" رحیم داد نے شکوہ کیا۔ "میرے دروازے کے سامنے سے گزرتا ہے پر مجھ سے ایک بار بھی اس نے ملنے اور بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح گزر جاتا ہے جیسے مجھ سے کبھی ملا نہ ہو' کوئی جان پہچان نہ ہو۔" اس نے لمحہ بھر کے لیے تامل کیا پھر گویا ہوا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے دینے نے بھی جمیلہ سے کچھ الٹی سیدھی گل بات کی ہے۔"

"دینا کیا الٹی سیدھی بات کر سکتا ہے؟" نادر خاں کے لہجے میں استعجاب تھا۔

وہ نادر خاں کو اعتماد میں لینا نہ چاہتا تھا۔ اس نے فوراً بات کا رخ بدل دیا۔ "یہ بتا' تجھے ان باتوں کا کیسے پتہ چلا؟"

"مجھے تو جی اس طرح پتہ چلا کہ پچھلی بار جب میں لور گیا تھا تو وکیل کے دفتر بھی گیا۔ یہ تو تجھے پتہ ہی ہوگا اس نے اب لور میں پریکٹس شروع کر دی ہے۔"

"میں نوں اس کا پتہ ہے۔ جمیلہ ہی نے بتایا تھا۔"

"وہ ایسا ہوا جی' میں نے وکیل کا بورڈ دیکھا تو اس کے دفتر میں چلا گیا۔ کام تو اس سے کچھ تھا نہیں۔ سوچا سلام دعا کر لوں۔ اس سے میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ زمیں داری میں تو وکیل کی کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" نادر خاں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "وکیل تو دفتر میں موجود نہ تھا پر اس کا منشی مل گیا۔ اس نے مجھے چائے بھی پلائی۔ باتوں باتوں میں اس سے پتہ چلا کہ زمیں دارنی

وکیل سے بیع نامہ تیار کرایا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "منشی سمجھا میں بیع نامے کے بارے میں دم کرنے آیا ہوں۔ اس نے یہ تو بتا دیا کہ بیع نامہ تیار ہو گیا ہے پر اس کے بارے میں اور کچھ نہ۔ میں نے بہت کوشش کی پر وہ کچھ بتانے پر آمادہ نہ ہوا۔"

"ایسی بات تھی تو مجھے فوراً بتانا چاہیے تھا۔"

"میں نے سوچا جی' پہلے تصدیق ہو جائے تب ہی اس معاملے میں تجھ سے بات کروں۔" نادر ں نے وضاحت کی۔ "مان لے' میرا شبہ غلط ہوتا اور تو اس بارے میں زمیں دارنی سے بات لیتا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ میں بیچ میں مارا جاتا۔ زمیں دارنی مجھ سے ناراض ہو جاتی۔ وڈے لوکاں کے ڑے میں ہمیشہ چھوٹا ہی مارا جاتا ہے۔ برا نہ منانا چوہدری' میں اسی وجہ سے تجھ سے بات کرتے ے ہچکچا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا' تجھ سے بات کروں تو پکی ہو۔ اس میں کوئی اگر مگر نہ ہو۔"

"تو نے تصدیق کیسے کی؟"

"اس بار جب میں لور گیا تو وکیل کے دفتر بھی گیا۔" نادر خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ "اتفاق ے اس بار بھی وکیل اپنے دفتر میں موجود نہ تھا۔ میں سیدھا منشی کے پاس پہنچا۔ اس سے ادھر ادھر ں باتیں کیں۔ گھما پھرا کر بیع نامے کے بارے میں پوچھا۔ پر وہ کھلا نہیں۔ شاید وکیل نے منع کر دیا وگا۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "تب میں نے جی سدھی سدھی ترکیب نمبر ۱۳ استعمال کی۔ دس ں کے دو نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھے۔ فیر تو جی اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ بیع نامہ بھی دکھا یا۔"

رحیم داد نے پریشان ہو کر بولا۔ "اب تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔"

"ہاں جی' اب تو سب کچھ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ ۲۰ روپے میں نے زمیں دارنی کی رکم میں سے دیئے ہیں۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کے ٹین کے ٹرنک کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! تو وڈا زمیں دار ہے۔ تیں نوں یہ ٹرنک لے کر سفر نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تجھے زیب نہیں دیتا۔ میں تیرے لیے چمڑے کا ایک سوٹ کیس بھی خرید کر لایا ہوں۔ بہت عمدہ ہے۔ ۵۰ روپے میں ملا ہے۔ اب سفر پر سے ہی لے جانا۔ ٹین کا ٹرنک تیری شان کے خلاف لگتا ہے۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھا۔ ٹرنک کا تالا کھولا۔ سو روپے نکالے۔ اٹھ کر نادر خاں کے پاس گیا اور روپے اس کے ہاتھ پر رکھ کر بولا۔ "لے' یہ روپے رکھ لے۔"

"سوٹ کیس میرے پاس ہے۔ بعد میں تجھے پہنچا دوں گا۔"

"جب جی چاہے پہنچا دینا۔" رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔ "تو مجھے ٹھیک ٹھیک بتا۔ وکیل کے

منشی سے تیری کیا کیا گل بات ہوئی؟ تو نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔"

"پریشانی کی تو جی بات ہی ہے۔" نادر نے نوٹ کوٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "منشی نے مجھے بتایا کہ کوٹلہ ہرکشن میں زمیں دارنی کی جو اراضی ہے' اس کا سودا پکا ہو چکا ہے۔ وکیل نے بیع نامہ اور دوسری ضروری دستاویزات بھی تیار کر لی ہیں۔ اس نے مجھے سارے ہی کاغذات دکھا دیئے۔"

"یہ تو نے بہت بری خبر سنائی۔" رحیم داد نے کرسی کھسکا کر نادر کے قریب کر لی۔ "یہ بتا' اب کیا کیا جائے۔ اپنا تو مغز بالکل کام نہیں کرتا۔ سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔"

"فکر نہ کر چوہدری' ابھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔" نادر خاں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تیرا حکم ہونا چاہیے' سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میں تیرا بندہ ہوں۔ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"مجھے' تجھ سے ایسی ہی امید ہے۔" رحیم داد دفعتاً" جذباتی ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں نادر خاں کا ہاتھ پکڑ کر گرم جوشی سے دبایا۔ "تیرا دل بہت وڈا ہے۔ نادر! میں نے سوچا بھی نہ تھا تو میرا اتنا وفادار ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "سچ کہتا ہوں' میں نے تجھے اب تک اتنا چنگا اور وفادار بندہ نہیں سمجھا تھا۔"

"چوہدری! جب تو نے مجھے اپنا وفادار بندہ کہا ہے تو اب میرا بھی فرض ہے کہ تجھے یہ بتا دوں کہ زمیں دارنی سے نکاح کرنے کا خیال دل سے نکال دے۔ وہ کبھی تیری نہیں بن سکتی۔" نادر خاں نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "وہ لہور جاتی ہے تو جانے دے۔ پر اس کی اراضی نہیں جانی چاہئے۔"

"جب تک جمیلہ سے نکاح نہ ہو اور دونوں بچے میرے پاس نہ ہوں تب تک اراضی کیسے مل سکتی ہے۔" رحیم داد نے اپنی سمجھ کے مطابق مسئلہ کا قانونی پہلو پیش کیا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے۔ اراضی کسی طرح نہیں جانی چاہیے۔ نکاح کے بعد وہ میرے کبضے میں آ جائے گی۔ شاہ جی کا بھی یہی خیال ہے۔"

"شاہ جی بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ہونا تو یہی چاہئے۔"

"میں تو کہتا ہوں نادر' ساری گل بات شاہ جی کو فوراً بتا دینی چاہئے۔" رحیم داد نے نادر کا عندیہ معلوم کرنے کی غرض سے کہا۔ "تو کیا کہتا ہے؟ میرا تو خیال ہے وہ بالکل ٹھیک مشورہ دے سکتا ہے۔ ایسے معاملات کو وہ ٹھیک طرح سمجھتا ہے۔ وہ بہت ہوشیار اور تجربہ کار بندہ ہے۔"

"تب تو شاہ جی سے جلد ہی ملنے اور بات کرنے کی ضرورت ہے۔" نادر خاں نے اس کی رائے

سے اتفاق کیا۔ "اب تو فوری کارروائی کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔"

"نادر! ایسا کر۔ تو کل سویرے شاہ جی کے پاس چلا جا۔"

"چوہدری' مجھے اس وکت شاہ جی کے پاس نہ بھیج۔ زمیں دارنی کو فوراً میرے بارے میں۔ شبہ ہو جائے گا۔ ابھی تک اسے پتہ نہیں کہ میرا شاہ جی سے میل ملاپ ہے۔ تجھے تو خود ہی شاہ جی کے پاس جانا ہو گا۔"

"جمیلہ کو شبہ تو میرے بارے میں بھی ہو سکتا ہے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"میں اسے کہہ دوں گا' چوہدری کا ویاہ کے شور شرابے سے دل گھبرا رہا تھا۔ وہ اپنے کسی یار دوست سے ملنے ملتان گیا ہے۔" نادر خاں نے مشورہ دیا۔ "ویسے اسے شبہ ہو بھی جائے تو کیا ہو گا۔ وہ تو اپنی کارروائی سمجھو پوری کر ہی چکی ہے۔ اب تو تیں نوں کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا اور جھیتی نال کرنا ہو گا۔ میں تو کہتا ہوں تو کل ہی صبح شاہ جی کے پاس چلا جا۔"

نادر خاں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "کہاں چلا نادر؟"

"چوہدری' مجھے اب جانے دے۔ زمیں دارنی میرا انتظار کرتی ہو گی۔"

نادر خان چلا گیا۔ رحیم داد سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس رات بھی وہ دیر تک جاگتا رہا۔

☆

جنوری کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ مگر سردی میں کمی نہ آئی تھی بلکہ کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔ دن چڑھ چکا تھا۔ سرما کی ہلکی ہلکی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ رحیم داد ناشتا کرنے کے بعد صحن میں آ گیا تھا اور کرسی پر دھوپ میں بیٹھا تھا۔ وہ پریشانی میں مبتلا تھا۔ اسے رہ رہ کر نادر کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ احسان علی شاہ کے پاس جانے اور اس سے ملنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

رحیم داد کو صحن میں پہنچے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ جمیلہ زینے سے اتری۔ اس نے رحیم داد کو دھوپ میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ تاجاں کے پاس جانے کے لیے نکلی تھی۔ مگر کچھ سوچ کر اس نے تاجاں کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مڑی اور رحیم داد کی جانب بڑھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ نوکر نے فوراً اس کے لیے کرسی لا کر رکھ دی۔ جمیلہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "چوہدری تو کچھ پریشان پریشان دکھائی دے رہا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" جمیلہ کے رویئے میں پہلی سی ہم دردی اور لگاؤ تھا۔ رحیم داد نے اسے محسوس کیا' نرم لہجے میں گویا ہوا۔ "زمیں دارنی طبیعت ویسے ٹھیک ہی ٹھاک ہے۔ پر خالی بیٹھے بیٹھے

دل گھبراتا ہے۔ کوئی کام کاج تو کرنے کو ہے نہیں۔"

"وڈا زمین دار بن نے میں یہی تو کھٹنائی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "تو نے اوپر سے منیجر بھی لگا رکھا ہے۔ تیرے لیے اب کرنے کو رہ کیا گیا ہے۔ اسی کارن تو جاگیردار اور وڈے زمین دار رسہ گیری کا دھندا کرتے ہیں۔ مزاروں کی جوان گھر والیوں اور کڑیوں کو اٹھوا لیتے ہیں۔" وہ بے تکلفی سے کھلکھلا کر ہنسی۔ "پنڈ میں من نہیں لگتا تو لہور یا کسی دوسرے شہر میں کوٹھیاں اور بنگلے بنواتے ہیں۔ منیجر اور منشی زمین داری چلاتے ہیں اور وہ عیش کرتے ہیں۔ شراب اور دارو پیتے ہیں۔ نت نئے ویاہ رچاتے ہیں۔ ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر سیاست لڑاتے ہیں۔ من بہلانے کے لیے کوئی تو شغل ہونا چاہئے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "اور سیاست کے مشغلے میں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ جاگیر اور زمین داری کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عیش کرنے کے لیے آمدنی بھی بڑھتی جاتی ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تو بھی تو لہور جانا چاہتی ہے۔"

"میں نے کون سی سیاست لڑانی ہے۔" جمیلہ نے فوراً صفائی پیش کی۔ "میں تو گڈّو اور نینا کی پڑھائی کے لیے لہور جانا چاہتی تھی۔ سوچا تھا وہاں کسی اسکول میں نوکری کرلوں گی۔ میری آشا ایم۔اے کرنے کی ہے۔"

"زمین دارنی اتنا تو نے پڑھ لیا، اب اور پڑھ کر کیا کرے گی؟" رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تو اپنے اسکول کو سرکاری بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلی گئی تو کیا بنے گا؟"

"یہی سوچ کر تو میں نے لہور جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ تجھے تو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔" جمیلہ کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "اسکول کا معاملہ ٹھیک ہو جائے تو میں ڈسپنسری بنانے کا کام شروع کردوں گی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے میں ڈسپنسری کیوں بنانا چاہتی ہوں۔"

"وہی ڈاکٹر ویریندر والی گل ہے ناں؟" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔ "لگتا ہے تو ابھی تک اسے بھولی نہیں۔"

"بہت سی یادیں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی بھولنے والی نہیں ہوتیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر دکھ کا سایہ پھیل گیا۔ "اس کی تو بات ہی اور ہے۔ میں تو اللہ وسایا کو بھی نہیں بھول سکی۔ جب تک اس کے دونوں بچے موجود ہیں، میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں؟"

"کیا کیا جائے زمین دارنی رب کی یہی مرضی تھی۔" رحیم داد نے اظہار ہم دردی کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے نصیب میں یہی لکھا تھا۔"

"اللہ وسایا نے تو کسی کی ہتیا نہیں کی تھی پر اسے کتل کر دیا گیا۔" جمیلہ نے رقت انگیز لہجے میں

کہا۔ "جیرا نے اپنی گھر والی لاڈو کے ساتھ اس کے یار سلیم کا بھی خون کر دیا۔ اب پولیس ریمانڈ پر حوالات میں پڑا ہے۔ منتیں کرتا ہے، پچھتاتا ہے۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا جیرا پچھتاتا ہے۔" رحیم داد نے استفسار کیا۔ "وہ تو خود ہی تھانے گیا تھا۔ تو نے روکا تو تیری بات بھی نہ سنی۔"

"اس سے تو اس کے سر پر خون سوار تھا۔ وہ اپنے ہوش ہی میں کب تھا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "پچھلے دنوں اس کا پیؤ دین محمد آیا تھا۔ روتا تھا، جیرا کا حال بتاتا تھا۔ جوان پتر ہے۔ اسے تو دکھی ہونا ہی چاہئے۔ اس کی تو جیون بھر کی کمائی ہے۔" اس نے اپنی شال اتار کر زانو پر رکھ لی۔ اس کا گلابی چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتما رہا تھا۔ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔

"دین محمد اب کیا چاہتا ہے؟"

"جیرا کی ضمانت کرانا چاہتا ہے۔ وکیل کھڑا کر کے کیس لڑانا چاہتا ہے۔ اسی کارن میرے پاس آیا تھا۔ اسی کے لیے میں نے اپنے وکیل عثمان اندھاوا کو بلایا تھا۔"

رحیم داد اس کی بات سن کر مخمصے میں پڑ گیا۔ جمیلہ کی باتوں سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا لاہور جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس نے وکیل کو بھی کسی بیع نامے کی تیاری کے لیے نہیں بلکہ جیرا کے مقدمے کی پیروی کی خاطر بلایا تھا۔ مگر نادر خاں کا بیان قطعی مختلف تھا۔ اس نے وکیل کے منشی سے جو کچھ سنا تھا اور جو دستاویزات اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں وہ ساری ہی تفصیلات نہ صرف بے حد پریشان کن تھیں بلکہ اس سلسلے میں جلد سے جلد قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ جمیلہ اور نادر خان میں سے کون سچا تھا اور کون جھوٹا، کس کا بیان درست تھا اور کس کا غلط؟ رحیم داد کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ اس معاملے میں احسان شاہ ہی اس کی رہنمائی کر سکتا تھا۔ وہ پرانا گھاگ اور جہاں دیدہ تھا۔ وہ رحیم داد کی رہنمائی اور مدد کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔

رحیم داد کو گم صم دیکھ کر جمیلہ نے پوچھا۔ "چوہدری! کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"سوچ رہا تھا کچھ دنوں کے لیے ملتان چلا جاؤں۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "ادھر میرا ایک پرانا ملنے والا ہے۔ اس کے ساتھ اچھا وکت گزر جاتا ہے۔"

"تجھ پر کسی نئی الاٹمنٹ کی دھن تو سوار نہیں ہو گئی؟" وہ ہنس کر بولی۔

"نہیں، زمین دارنی ایسی کوئی گل بات نہیں۔" اس نے جمیلہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "یہاں دل گھبراتا ہے۔ اس کے پاس گیا تو شکار کھیلوں گا۔ تم نوں تو پتہ نہیں، پہلے میں شکار کا بہت رسیا تھا۔ پچھلے دنوں جب ملتان اور بھکر میں تھا تو زیادہ دن شکار کھیلنے ہی میں گزرے۔"

"میری آشا ہے کہ تاجاں کی جنج چڑھے تو اس کے سسرال والوں کا تو سواگت کرے۔ تیرے سوا ادھر کون ایسا ہے؟" جمیلہ نے نرمی سے کہا۔ "مکلاوے کے سمے تو تیرا موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ تو تاجاں کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرے گا' اسے بدا کرے گا۔ وہ تو اپنے پنڈ ہی کی نہیں اس گھر کی بیٹی ہے۔" اس کا لہجہ معاً" غم ناک ہو گیا۔ "اس بے چاری کا تو نہ پیئو ہے نہ بھرا۔ ایسے میں تیرا ادھر ہونا بہت ضروری ہے۔ آگے تیری مرضی۔" اس نے گلہ کیا۔ "جو من کرے ویسا کر۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"فکر نہ کر زمین دارنی' میں جنج پہنچنے سے پہلے ہی واپس آجاؤں گا۔" رحیم داد نے جمیلہ کو باور کرانے کی کوشش کی۔ "ویسے جنج کے آنے میں تو ابھی ہفتے بھر سے زیادہ رہتا ہے۔ ابھی تو زنانیوں کی شورا شوری ہے۔ میں تو ادھر رہ کر ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "ویسے تو جو موجود ہے فیر فکر کا ہے کی۔"

"جانا چاہتا ہے تو چلا جا۔" جمیلہ نے اسے روکنے پر زیادہ اصرار نہ کیا۔ "پر جنج آنے سے پہلے ضرور آجانا۔ ورنہ مجھے دکھ ہو گا۔"

"کیسی گل بات کر رہی ہے زمین دارنی۔ تجھے دکھ پہنچانے کی تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" اس نے کسی قدر جوش و خروش کا اظہار کیا۔ "جیسا تو کہہ رہی ہے بالکل ویسا ہی کروں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔" رحیم داد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ جنت آگئی۔

جنت نے قریب پہنچ کر رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! تو نے زمین دارنی کو ادھر باتوں میں لگا رکھا ہے۔ ادھر سب ہی اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ تاجاں تو بار بار پوچھ رہی ہے۔" رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے شال اوڑھی اور جنت کے ہم راہ چلی گئی۔

رحیم داد بھی زیادہ دیر صحن میں نہ ٹھہرا۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نادر خان کے لائے ہوئے سوٹ کیس میں اس نے کپڑے اور سفر کا ضروری سامان رکھا۔ تانگا بلوایا' حویلی سے باہر نکلا۔ تانگے میں سوار ہوا اور احسان شاہ کے گاؤں پیراں والہ جانے کے لیے لاری اسٹینڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔ مگر جب وہ کوٹ ہر کشن کی حدود سے باہر نکل رہا تھا تو اس نے دیکھا' دینا سامنے سے آرہا ہے۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد گھبرا گیا۔ لیکن دینا اسے دیکھ نہ سکا۔

آتش دان میں انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی گہری سرخ روشنی کمرے میں پھیلی تھی۔ باہر سرد ہوا درختوں میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ رات ٹھنڈی اور سنسان تھی۔ رحیم داد اور احسان شاہ آتش دان کے قریب آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بیچ میں میز تھی۔ میز پر گلاس تھے' وہسکی کی بوتل تھی اور پانی سے بھرا ہوا شیشے کا جگ تھا۔

احسان شاہ کے بشرے سے غور و فکر کے تاثرات عیاں تھے۔ اس نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور وہسکی کا گھونٹ بھر کے رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ "چوہدری! اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمیلہ ساری تیاریاں کر چکی ہے۔ اس نے اپنی زمین کا سودا کیا۔ وکیل سے بیع نامہ بھی کرا لیا۔ وہ لہور جا رہی ہے۔ اور وکیل کی معرفت اس نے وہاں مکان بھی کرائے پر لے لیا ہے۔ نادر خاں نے تجھے یہی بتایا ہے نا؟" اس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "تو نے جمیلہ سے بھی نوہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کیا کہتی ہے؟"

"جمیلہ سے میری بات چیت ہوئی تھی۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "اس کی باتوں سے تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ نہ تو وہ زمین بیچنے کا کوئی ارادہ رکھتی ہے اور نہ ہی لہور جا رہی ہے۔"

"تو نے کیسے یہ اندازہ لگایا؟"

"بات یہ ہے شاہ جی' وہ تو اپنے سکول کو سرکاری بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کام کے لیے وہ پچھلے دنوں منٹگمری میں ڈپٹی کمشنر سے بھی ملی تھی۔ کہتی تھی اس نے مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

رحیم داد مزید بتانا چاہتا تھا مگر احسان شاہ نے اسے آگے بولنے نہ دیا۔ "سکول تو سرکاری بننا بنانا

نہیں۔" اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ اور تلخی تھی۔ "اور نہ ہی تو بننے دینا۔ اس چکر میں ہرگز ہرگز نہ پڑنا۔ تونے یہ بھی سوچا۔ مزارعوں اور کمیوں کے منڈے پڑھ لکھ گئے تو میرے اور تیرے پتر کیا کریں گے؟ میں اس بارے میں پہلے بھی تجھ سے کہہ چکا ہوں۔ لگتا ہے تونے میری بات پر پوری توجہ ہی نہیں دی۔"

"ایسی گل بات نہیں۔ میں تو تجھے یہ بتا رہا تھا جمیلہ آج کل کیا کر رہی ہے اور کس انداز سے سوچ رہی ہے؟" رحیم داد نے احسان شاہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے اور جیسا تو کہہ رہا ہے' میں ویسا ہی کروں گا۔" اس نے بات کا رخ بدلا۔ "شاہ جی! سکول کا چکر تو آگے کی گل ہے۔ یہ بتا میں نے اب کیا کرنا چاہیے؟ اپنی سمجھ کام نہیں کرتی۔ نادر کچھ بتاتا ہے۔ جمیلہ کی باتوں سے کچھ اور ہی پتہ چلتا ہے۔ میں تو تیرے پاس آیا ہی اس لیے ہوں کہ تو ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"نادر خاں تجھ سے غلط بات نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو مجھے پکا یقین ہے۔"

"میں یہ نہیں کہتا نادر نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے وکیل کے منشی ہی نے نادر سے غلط بات کی ہو۔ یہ میں نے اس لیے سوچا کہ جمیلہ کو زمین بیچ کر لور جانا ہوتا تو وہ اپنے سکول کو سرکاری بنانے کے چکر میں کیوں پڑتی؟ جب اسے کوٹلہ ہرکشن میں رہنا ہی نہیں تو سکول سرکاری بنے یا نہ بنے' رہے نہ رہے' اسے کیا لینا۔" رحیم داد نے اپنے موقف کی تائید میں دلیل پیش کی۔ "پچھلے دنوں جمیلہ نے لور جانا تھا۔ تب اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا تھا اور میں اسے سنتے ہی گھبرا کر سیدھا تیرے پاس آیا تھا۔ پر تو ان دنوں یہاں موجود نہیں تھا۔ اپنا مراد خاں شاہانی ادھری مل گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ بھکر چلا گیا۔ اس کے بعد سے اب تجھ سے مل رہا ہوں۔"

احسان شاہ مخمصے میں پڑ گیا۔ ذرا دیر تک نظریں جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری' یہ بتا جمیلہ کا تیرے ساتھ برتاؤ کیسا ہے؟"

"ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "پہلے تو سخت ناراض تھی اور اتنی ناراض تھی کہ پنڈ چھوڑ کر اپنے بچوں کے ساتھ لور جانے کو کہتی تھی۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "تجھے تو پتہ ہی ہے کہ جمیلہ سے چھپ کر تیرے پاس آتا ہوں اور ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر آتا ہوں' پر اسے پتہ چل گیا۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا' یکدم بھڑک گئی۔ بات چیت کرنی چھوڑ دی۔ پر جب میں بھکر چلا گیا تو اس کا غصہ ختم ہو گیا۔ ویسے سچ پوچھ تو نادر اور اس کی گھر والی جنت نے جمیلہ کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں زبردست کام کیا۔"

"نادر بہت ہوشیار بندہ ہے۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر اسے تیرے پاس لگایا ہے۔ آگے بھی تیرے بہت کام آئے گا۔ وہ بہت وفادار ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں' نادر تجھ سے غلط گل نہیں کہہ سکتا۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "چوہدری! تو نے یہ بھی تو کہا تھا' زمیں کی بیچ کے کاغذات اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔"

"کہتا تو وہ یہی تھا۔" رحیم داد نے اعتراف کیا۔

"تب تو کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے۔" احسان شاہ آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگا۔ "تجھے جمیلہ کی باتوں پر اعتبار ہو تو ہو پر مجھے بالکل نہیں۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔ بہت تیز اور چالاک ہے۔ اپنے دل کی بات تجھے ہرگز نہیں بتائے گی۔"

رحیم داد نے احسان شاہ سے اختلاف نہیں کیا۔ "تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ اس کے بارے میں شبہ تو مجھے بھی ہے' تبھی تو تیرے پاس مشورہ کرنے آیا ہوں۔ یہ بتا اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"میں کل سویرے لور جا رہا ہوں۔ میرا منیجر' مہان علی بھی ساتھ ہی ہو گا۔ وہ نادر سے بھی زیادہ ہوشیار بندہ ہے۔ میں اسے لگا دوں گا۔ وہ اپنے طور پر سب پتہ چلا لے گا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "تجھے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں شام ہی کو لوٹ آؤں گا۔ تب تک تو صبر کر۔ جمیلہ نے آگے کے لیے جو بھی منصوبے بنا رکھے ہیں' سب کا سراغ مل جائے گا۔"

"یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔" رحیم داد مطمئن ہو کے بولا۔

احسان شاہ خاموش ہو گیا اور گلاس اٹھا کر وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ چپ دیکھ کے رحیم داد اپنی بے چینی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ "شاہ جی' کیا سوچ رہا ہے۔ کوئی خاص گل ہے؟"

"خاص گل تو نہیں۔ پر مجھے' تجھ سے سخت گلہ ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"مجھ سے گلہ ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"تو نے زینت کو اپنی حویلی میں کیوں چھپا کر رکھا؟" احسان شاہ نے تلخی سے کہا۔ "تیں نوں پتہ ہے' وہ میرے کوٹ سے فرار ہو کر تیرے پنڈ پہنچی تھی۔ تو نے اسے میرے پاس پہنچانے کی بجائے پناہ دے کر اپنے پاس ٹھیرا لیا۔"

"وہ تو ان دنوں حویلی میں پہنچی جب میں پنڈ میں تھا ہی نہیں۔ مراد خاں شاہانی کے پاس بھکر میں تھا۔ شاہانی سے پوچھ لے۔ زینت کو تو جمیلہ نے پناہ دی تھی۔ مجھے تو واپسی پر اس کے بارے میں پتہ

چلا۔" رحیم داد نے باور کرانے کی کوشش کی۔ "شاہ جی میں تجھ سے غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ ویسے
بھی میں نے زینت سے کیا لینا ہے۔"

احسان شاہ نے پوچھا۔ "اب زینت کہاں ہے؟" اس کے رویئے سے صاف عیاں تھا کہ وہ رحیم
داد کی صفائی سے مطمئن ہو گیا ہے۔

"وہ جلیل کے ساتھ دیپال پور چلی گئی۔ یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا جلیل اس کا گھر والا ہے۔ تیرے
پاس تو وہ آیا بھی تھا۔"

"آیا تو تھا۔ تھانے دار زماں خاں کا خط لے کر آیا تھا۔ زینت اپنے گھر والے کے ساتھ چلی گئی
چلو یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ تھی بھی ایک دم ٹھنڈی۔ پتھر کی طرح بے جان۔ ہر دم روتی ہی رہتی
تھی۔"

"شاہ جی' میرا کہا مان' ایسی زنانی اپنے کوٹ میں نہ رکھا کر۔"

"ویسے تو عام طور پر ہر زنانی جب نئی نئی آتی ہے تو ایسے ہی ٹسوے بہاتی ہے۔ بعد میں سب
راضی خوشی ہو جاتی ہیں۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "پر اب تو میں نے کوٹ کا بہت سا کوڑا
کرکٹ صاف کر دیا۔ جو بھی مزارع اپنی گھر والی لینے آیا اس سے سودا طے کیا' رقم وصول کی اور
اس کا بازو اسے واپس دے دیا۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے شاہ جی؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں حیرت سے کہا۔ "پر تو نے
ایسا کیوں کیا؟"

"چوہدری' بات سچی یہ ہے۔ کئی کئی سال سے کوٹ میں پڑی تھیں۔ ان پر خرچ بھی بہت آتا
تھا۔ ادھر مجھے روپے کی سخت ضرورت بھی پڑ گئی۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "زمین خریدنے کا ارادہ ہے؟"

"زمین تو اپنے پاس پہلے ہی بہت ہے۔ لہور میں کوٹھی خریدی ہے۔ اگلے مہینے لندن سے میرا پتر
رحمان شاہ آ رہا ہے۔" اس کے چہرے پر خوشی سے سرخی بکھر گئی' آنکھیں جگ مگانے لگیں۔
"بیرسٹر بن گیا ہے۔ لہور ہی میں رہے گا۔"

"ادھر کیوں رہے گا؟" رحیم داد کے انداز میں استعجاب تھا۔

"اسے وہاں پریکٹس جو کرنی ہے۔ اب مجھے اپنے مکدموں کے لیے وکیلوں کے نخرے نہیں
اٹھانے پڑیں گے۔" احسان شاہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ "ویسے میں اسے سیاست میں بھی لانا
چاہتا ہوں۔ اس کا بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔ چوہدری! سچ پوچھ تو سارے ہی سیاسی لیڈر عام طور پر

وکیل یا بیرسٹر ہی ہوتے ہیں۔ انھیں کسی کی نوکری چاکری تو کرنی نہیں ہوتی' اپنی مرضی کے مالک
ہوتے ہیں۔ یہ وکالت اور بیرسٹری بھی بہت آزاد پیشہ ہے۔"

رحیم داد کو نہ سیاست سے دلچسپی تھی' نہ وکالت سے اور نہ ہی وکالت کے پیشے کی آزادی سے۔
اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا اور وہسکی سے شغل کرتا رہا۔ دونوں ہی خاموش تھے۔

کچھ دیر بعد احسان شاہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "معاف کرنا چوہدری' میں آج تیرے
ساتھ زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔"

"کیوں شاہ جی؟" رحیم داد تجسس سے بولا۔ "بات کیا ہے؟ ابھی رات تو اتنی زیادہ نہیں
ہوئی۔"

"گل ایہہ اے جی۔" احسان شاہ مسکرا کے بولا۔ "میں نے آج اندر حویلی میں اپنی چھوٹی گھر
والی کے ساتھ روٹی کھانی ہے۔ وہ تین مہینے سے اوپر میکے میں رہ کر ملتان سے سویرے ہی آئی ہے۔"

"چلا جانا۔ ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔"

"نہیں' اب مجھے جانے دے۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "شام ہی کو اس نے مجھے کہہ دیا تھا' انتظار
کر رہی ہو گی۔ وڈے گھر کی ہے۔ نخرے بھی اس کے اتنے ہی وڈے اور اونچے ہیں۔"

"جیسی تیری مرضی۔" رحیم داد نے مزید اصرار نہ کیا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا' ہونٹوں سے
لگایا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔

☆

رحیم داد گرم کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔ قاب سے تلے ہوئے مرغ کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا رہا۔
کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ باہر ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ پہر رات گزر گئی۔ رحیم
داد ترنگ میں تھا اور اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ آہستہ سے دروازہ کھلا۔ رحیم داد
نے مڑ کے دیکھا' رتنے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی ہے۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی آتش
دان کے قریب پہنچی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دھسا اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کے باوجود سردی
سے کپکپا رہی تھی۔ اس نے اپنا بدن قدرے ترچھا کیا اور دونوں ہاتھ دہکتے ہوئے انگاروں پر پھیلا
دیئے۔

"آج سردی بہت زبردست ہے۔" خاموشی میں رتنے کی آواز ابھری۔

رحیم داد نے نظریں اٹھا کے رتنے کو دیکھا۔ اس کا سانولا چہرا انگاروں کی سرخ روشنی میں تانبے
کے مانند دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل تھا۔ تیل سے سر کے بال چمک رہے تھے۔ وہ سرخ

کنارے کا سبز لاچا باندھے ہوئے تھی اور نیچی نظروں سے آتش دان میں دہکتے ہوئے لال لال انگارے دیکھ رہی تھی۔ رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "رحمتے کیہ حال اے؟ آج بہت سست لگ رہی ہے۔"

رحیم داد کی جانب نظریں اٹھائے بغیر وہ بولی۔ "آج میرا جی ٹھیک نہیں ہے۔"

"فیر کیوں چلی آئی؟" رحیم داد جھوم کر ہنسا۔ "رحمتے! لگتا ہے' اب تو بوڑھی ہو گئی ہے۔"

رحمتے نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "شاہ جی بھی یہی کہتا ہے۔"

رحیم داد نے رحمتے کو دیکھا۔ "مجھ سے بھی یہی کہہ رہا تھا۔"

"اب تو وہ ایسی ہی گلاں کرے گا۔" رحمتے تلملا گئی۔ "آٹھ سال پہلے جب میں اس حویلی میں آئی تھی تب ایسی نہیں تھی۔" اس کا چہرہ راکھ بن گیا۔ "ان دنوں تو شاہ جی بہت پیار جتاتا تھا۔ کہتا تھا' میں تیرے بناں نہیں رہ سکتا۔ تجھ سے ویاہ کرلوں گا۔ زمیں دارنی بنا کر رکھوں گا۔"

"ایسا ارادہ تھا تو اس نے تجھ سے ویاہ کیوں نہیں کیا؟ اسے کون روک سکتا تھا؟"

"روک تو نہ جب اسے کوئی سکتا تھا' نہ اب۔" رحمتے کے لہجے میں زیادہ تلخی پیدا ہو گئی۔ "چوہدری! سچی بات تو یہ ہے۔ وہ مجھ سے کیسے ویاہ کر سکتا تھا؟ میں کسی وڈے زمیں دار یا جگیردار کی تو دھی ہوں نہیں۔ شاہ جی وڈا زمیں دار ہے اور وڈے زمیں دار کا ویاہ وڈے زمیں دار ہی کی دھی سے ہو سکتا ہے۔" وہ نظریں جھکا کے سرخ سرخ شعلے تکنے لگی۔ "میرا پیو تو کمی تھا۔ وہ کنوئیں سے ریت مٹی نکالنے والا ٹوبھا تھا۔ ٹوبھے کی کڑی وڈے زمیں دار کی گھر والی کیسے بن سکتی ہے؟ وہ تو صرف اس کا بستر ہی گرم کرنے کے کام آ سکتی ہے۔"

رحیم داد کو پہلی بار اس حقیقت کا اندازہ ہوا کہ کوٹ کی قیدی عورتوں میں رحمتے جس قدر سفاک اور سخت گیر مشہور ہے' اندر سے ایسی ہے نہیں۔ یہ بھی غم زدہ اور زخم خوردہ ہے۔ رحیم داد نے رحمتے سے دریافت کیا۔

"شاہ جی نے تجھے بھی اٹھوایا ہو گا؟"

"نہیں جی! میں تو منگری کے مہاجر کیمپ میں تھی۔" رحمتے نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "بالکل اکیلی اور بے سہارا۔"

"تیرا ادھر کوئی نہیں تھا؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "تو مہاجر ہے ناں' پر تو پاکستان پہنچی کیسے؟"

"کیا کرے گا سن کر۔ اب تو یہ بہت پرانی گل ہو گئی۔" رحمتے آتش دان کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔ "میں تو ں اب تک یاد ہے۔ وہ جمعے کا دن تھا۔ شاہ جی رضا کاروں کے ساتھ کیمپ میں آیا۔ وہ

اجرین میں لنگر بانٹنے کے لیے دیگیں بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔" رحمتے کے لبوں پر زہر خند نمودار ا۔ "رضا کار لنگر بانٹتے تھے اور شاہ جی لٹے پٹے بے سہارا اور بے گھر مہاجروں کے حوصلے بڑھاتا ا۔ آنکھوں میں آنسو لا کر بہت ہم دردی جتاتا تھا۔ میں اب تک اس کی وہ باتیں نہیں بھولی۔ کیسا ب اور بھلا بندہ لگتا تھا۔"

"پر تو کیسے شاہ جی کے ہتھے چڑھ گئی؟"

"وہ ایسا ہوا جی۔ کیمپ سے واپسی پر شاہ جی اپنی حویلی میں کام کاج کے لیے تین پناہ گیر زنانیوں کو ی ساتھ لے گیا۔ دو کو تو اس نے خراب کر کے اپنے مزارعوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ مجھے اپنے پاس رکھ یا۔ شاہ جی پیار جتاتا تو مست ہو کر کہتا تو ماجھے دی جٹی ہے۔" رحمتے نے شرم سے نظریں جھکا لیں۔ ویسے جی! میں ماجھے ہی کی ہوں۔ فسادات ہوئے اور میرے پنڈ پر رات کے اندھیرے میں حملہ ہوا ؛ میں گھر سے نکل کر فصلوں میں چھپ گئی۔ بعد میں ایک قافلے کے ساتھ کسی نہ کسی طرح پاکستان ہنچ گئی۔" اس نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "شاہ جی بتاتا تھا' تو بھی گورداس پور کا مہاجر ہے۔ اس نے تیرے بارے میں ٹھیک ہی بتایا ناں؟"

"شاہ جی نے ٹھیک کہا۔ میں بھی مہاجر ہوں۔" رحیم داد نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ چند لمحے خاموش رہا' پھر اس نے اچانک بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "تب تک تیرا ویاہ نہیں ہوا تھا؟"

"کیوں نہیں ہوا تھا۔ دو بچے بھی تھے۔" وہ نہایت اطمینان سے بولی۔ "میرا گھر والا لوہار تھا۔ اس کا ٹھیک ٹھاک کام چلتا تھا۔"

"وہ بھی پاکستان آیا یا دوسرے مسلمانوں کی طرح ادھر ہی شہید کر دیا گیا؟"

"وہ بھی بچ بچا کر پاکستان آ گیا تھا۔" رحمتے نے گہری سانس بھری۔ "مجھے ڈھونڈتا ہوا شاہ جی کے پاس آیا تھا۔ بچے بھی اس کے ساتھ ہی تھے' پر شاہ جی نے مجھے اس سے نہیں ملنے دیا اور نہ جانے دیا۔ وہ مجھے لینے ہی کے لیے یہاں آیا تھا۔"

"پر تو نے تو اس کے ساتھ جانے کی کوشش کی ہو گی۔" رحیم داد نے رحمتے کی آنکھوں میں جھانک کر ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ "وہ تیرا گھر والا تھا' تیرے بچوں کا پیو تھا اور انھیں اپنے ساتھ بھی لایا تھا۔"

"چوہدری! اب تجھ سے جھوٹ کیا بولنا۔" رحمتے کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی' آنکھوں کے چراغ دھندلے پڑ گئے۔ "میں خود اس کے ساتھ جانے پر تیار نہیں ہوئی۔ ان دنوں شاہ جی مجھے اتنا پیار کرتا تھا جیسے میرے لیے دیوانہ ہو گیا ہو۔ اس کے پیار نے مجھے اندھا کر دیا تھا' نہ بچے یاد آئے'

نہ گھر والا۔ نہ ماستا جائی' نہ آگے کی سوجھی۔ لگتا ہے جیسے شاہ جی نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "بہت برا کیا۔ میں نے بہت برا کیا۔"

"ایسا نہ سوچ۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔" رحیم داد نے ہم دردی سے کہا۔ "تجھے شاہ جی سے ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے تو لگتا ہے شاہ جی اب تک تجھ سے پیار کرتا ہے۔ تجھے کوٹ کا انچارج رکھا ہے۔ یہ معمولی گل ہے؟"

"چوہدری! تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔" رجتے کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ "ناراض ہوتا ہے غصے میں ٹھڈے مارتا ہے۔ زمین پر گرا دیتا ہے' بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہے۔" اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر کولھے پر رکھا۔ "میری کمر میں ایسے ہی درد نہیں ہوتا۔ شاہ جی نے ایک بار غصے میں زور زور سے ٹھڈے مارے۔ اس کے بوٹ سے میری پسلیاں دب گئیں تھیں۔ ہفتے بھر تک بستر پر پڑی رہی' اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"شاہ جی تجھ سے اتنا ناراض کیوں ہو گیا تھا۔" رحیم داد نے کریدا۔ "کوئی نہ کوئی تو اتنے زبردست غصے کی وجہ ہو گی؟"

"وہ جی ہوا یہ کہ کوٹ سے ایک زنانی بھاگ گئی۔ ان دنوں کوٹ کے دروازے پر ایک ہی راکھا ہوتا تھا۔ رات کو اسے اونگھ آ گئی۔ میں بھی سو گئی تھی۔ وہ چپکے سے نہ جانے کب نکل گئی۔"

"پر تیرا اس میں کیا قصور ہوا؟ تو رات بھر تو جاگنے سے رہی۔ تجھے تو سونا ہی تھا۔ اس میں کون سی غلط بات ہوئی؟"

"شاہ جی تو یہ نہیں سمجھتا۔ سویرے اسے پتہ چلا تو ایسا گرم ہوا کہ بالکل پاگل ہو گیا۔ راکھے کو تو اس نے الٹا لٹکا کر کرندوں سے پٹوایا۔" رجتے کا چہرہ مرجھا گیا۔ "مجھے اس نے کمرے میں بند کیا اور ٹھوکروں سے مار لگائی۔ غصے سے اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔"

"پچھلے دنوں زینت بھی تو یہاں سے بھاگ گئی تھی۔ تب بھی شاہ جی نے تجھے اس طرح مار لگائی ہو گی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ کوٹ سے نہیں' مہمانوں کے کمرے سے بھاگی تھی۔" رجتے نے وضاحت کی۔ "شاہ جی نے اس کے بھاگنے پر شیدے کو ایسی دبا کے مار لگائی کہ اب تک منجی سے نہیں اٹھا۔ ایک ہاتھ ٹوٹ گیا۔ اس پر پٹی بندھی ہے۔ ہر دم پڑا ہائے ہائے کرتا ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تبھی تو شاہ جی نے ادھر میری ڈیوٹی لگائی ہے۔ مجھے تو کوٹ کے اندر زنانیوں کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنی ہوتی ہے۔"

"جبھی شیدا نظر نہیں آیا۔ ایک دوسرا ہی بندہ اس کی جگہ ہر کام کرتا رہا۔" رحیم داد نے قدرے تامل کے بعد رجتے سے دریافت کیا۔ "تجھ سے تو شاہ جی نے کچھ نہیں کہا؟" مگر سوال کا جواب ملنے سے پہلے اس نے خود ہی صفائی پیش کی۔ "ویسے تیری تو غلطی بھی نہیں تھی۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے جی۔" رجتے کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں منڈلانے لگی۔ "وہ مجھ سے بھی سخت ناراض ہوا۔ مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ غصے سے آنکھیں نکال کر ایسے زور سے ٹھڈا مارا کہ میں گر پڑی۔ پر اس کے بعد کچھ نہ بولا۔"

"پر شیدے کی تو اس نے زبردست پٹائی کی۔ تجھے تو صرف ایک ٹھڈا مار کر چھوڑ دیا۔"

"بعد میں اس نے جو چوٹ لگائی' وہ ٹھڈے سے بھی زیادہ سخت تھی۔"

"کیا کیا اس نے؟" رحیم داد کے لہجے میں تجسس تھا۔

"تیں نوں پتہ ہے' اس نے مجھے کیا کہا۔" رجتے آتش دان میں دہکتے ہوئے انگارے تکنے لگی۔ "پہلے تو وہ گندی گندی گالاں نکالتا رہا۔ فیر غصے سے چیخا 'تو اب بڈھی ہو گئی ہے' بالکل بڈھی کھوسٹ۔ میں نوں ایسی رن کی ضرورت نہیں۔ تو یہاں سے چلی جا۔ میں تیرا اور تیرے بچوں کا خرچا اب نہیں اٹھا سکتا۔ سن لیا تو نے چوہدری۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ قریب رکھا ہوا پوکر اٹھایا اور لکڑی کا دستہ پکڑ کر لوہے کے آنکڑے سے راکھ کی تہہ کے نیچے دبے ہوئے انگارے کریدنے لگی۔ آتش دان میں آنچ تیز ہو گئی۔ کوئلے دہکنے لگے۔ کمرے میں بکھری ہوئی سرخی گہری ہو گئی۔ "تو ہی انصاف سے بتا۔ بچے میں اپنے ساتھ تو نہیں لائی تھی۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ مگر رجتے زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکی۔ "چوہدری' تو کیا سوچنے لگا؟"

"سوچ رہا تھا' شاہ جی نے اگر تجھے نکال دیا تو کہاں جائے گی؟"

"یہی تو میں سوچتی رہتی ہوں۔" اس کی آواز میں کسک تھی۔

"یہ بتا رجتے! تیرا گھر والا اب کہاں ہے؟"

"میں نوں تو جی اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ جانے زندہ ہے کہ مر گیا۔" رجتے نے بتایا۔ "تیں نوں علوم ہے' میں تو حویلی سے باہر جاتی ہی نہیں۔ شاہ جی کی بالکل اجازت نہیں۔"

"شاہ جی تجھے تنخواہ شنخواہ بھی دیتا ہے؟"

"توبہ کرو جی! وہ کیا تنخواہ دے گا۔ کبھی ایک پیسہ بھی نہیں دیتا۔" وہ لمحے بھر خاموش رہی۔ "پر اتنا ضرور ہے' مہمانوں سے کبھی کبھار کچھ مل جاتا ہے۔ سردار مراد خاں شاہانی وڈے دل والا ہے۔" اس کے بجھے ہوئے چہرے پر اجالے کی رمق ابھری۔ "ایک بار تو اس نے مجھے اکٹھے تیسہ

روپے دیئے۔"

رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے تین نوٹ نکالے اور رحمتے کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرایا۔ "لے یہ بھی تیس روپے ہیں۔ اب تو راضی خوشی ہے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "انہیں رکھ لے اور اب جا کے آرام کر۔"

رحمتے نے نوٹ لے کر لاچے کے ڈب میں نہایت احتیاط سے رکھے۔ اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ "تو ابھی جاگ رہا ہے ناں؟" وہ رازدرانہ لہجے میں بولی۔

رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

رحمتے کچھ نہیں بولی۔ مڑی اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔

☆

رحیم داد خاموش بیٹھا وسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ آتش دان میں انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی سرخ سرخ روشنی در و دیوار پر بکھری ہوئی تھی۔ کمرہ خوب گرم تھا اور رحیم داد نشے سے جھوم رہا تھا۔

دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ رحیم داد نے چونک کر دیکھا ہے۔ سامنے رحمتے کھڑی ہے۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "چوہدری! آ میرے ساتھ۔"

رحیم داد اٹھا مگر لڑکھڑا کر پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ "مجھے کہیں نہیں جانا۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"چوہدری، تو نے آج بہت پی رکھی ہے۔" رحمتے نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے اب اپنے کمرے میں چل کر آرام کرنا چاہیے۔" وہ آگے بڑھی اور رحیم داد کے قریب پہنچ گئی۔ "چوہدری اب کھڑا ہو جا۔"

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحمتے نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو تھام لیا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے اور برآمدے میں آ گئے۔

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ شدید سردی تھی۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ دونوں سردی سے کپکپاتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کے قدموں کی آہٹ گہرے سناٹے میں رک رک کر ابھری رہی تھی۔

برآمدے کے آگے باغیچہ تھا۔ باغیچے کی بیرونی چار دیواری کے پاس سرس کے ایک گھنے درخت کے نیچے کوٹھری تھی۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا۔ دہلیز کے پاس پہرے دار چادر اوڑھے خاموش بیٹھا

آگ تاپ رہا تھا۔ آہٹ سن کر وہ زور سے کھنکارا۔ نظریں اٹھا کر اس نے برآمدے کی سمت دیکھا اور قریب رکھی ہوئی لالٹین اٹھائی۔

"کون ہے؟"

رحمتے بڑھتی ہوئی برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔ ایک کمرے کے دروازے کے سامنے ٹھہر کے اس نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری، میں نے اب کوٹ میں جانا ہے۔" اس نے پہرے دار کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "نواز موجود ہے۔ تیرے کمرے کے دروازے پر کوئی راکھا نہیں رہے گا۔ آج سردی بہت زیادہ ہے۔" اس نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "نواز رات بھر جاگتا رہے گا۔ کوئی ضرورت ہو تو اسے کہہ دینا۔ میں اب سویرے تیرے پاس آؤں گی۔ تیں نوں پتہ ہے۔ شیدا بیمار ہے، تیری دیکھ بھال میں نے ہی کرنی ہے۔" رحمتے نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کا ایک پٹ کھولا۔ "اب تو اندر جا۔" رحیم داد کمرے میں چلا گیا۔

رحمتے باہر رہ گئی۔ رحیم داد نے دروازہ بند کر لیا۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ آگے کے حصے میں پرانی وضع کا بھدا سا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ میز تھی، کرسیاں تھیں۔ پچھلے حصے میں خواب گاہ تھی۔ دونوں حصوں کے درمیان پردہ پڑا ہوا تھا۔ رحیم داد نے پردہ ہٹایا اور خواب گاہ میں چلا گیا۔ ایک کونے میں اونچا اسٹول تھا۔ اس پر لیمپ روشن تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں مسہری تھی۔ مسہری کے سرہانے کھڑکی تھی، وہ بند تھی۔ مسہری سے ذرا ہٹ کر پختہ چبوترا تھا۔ چبوترے کے اوپر دیوار میں مختصر روشن دان تھا۔ چبوترے پر رکھی ہوئی انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔

رحیم داد نے لیمپ کی روشنی میں دیکھا، انگیٹھی کے پاس فرش پر ایک نوجوان عورت سر جھکائے بیٹھی ہے۔ وہ کھیس اوڑھے تھی۔ انگاروں کی گہری سرخ روشنی میں اس کا چہرہ گلابی نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد انگیٹھی کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ عورت سکڑی سمٹی چپ بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"تیرا ناں کیہ ہے؟"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میرا ناں جی ہاجراں ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں دنبالہ کاجل اور بالوں میں تیل تھا۔ رحیم داد نے ہاتھ بڑھایا اور ہاجرہ کے سر سے جھٹ کھیس ہٹا دی۔ اس کا پورا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ بری طرح گھبرا گئی۔ اس کا بدن اور سمٹ گیا۔ اس کے چہرے سے اضطراب عیاں تھا۔ رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "ذرا گردن تو اونچی

کر۔" مگر اس نے گردن نہ اٹھائی بلکہ کچھ اور سکڑ گئی۔

رحیم داد نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر کیا۔ ہاجراں کی پلکیں جھکیں ہوئی تھیں۔ آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک کر اس کے رخساروں پر بکھر گئے۔

"ارے، تو رو رہی ہے۔" رحیم داد بجھے ہوئے انداز میں بولا۔ "لگتا ہے نئی نئی یہاں آئی ہے۔"

وہ چپ بیٹھی رہی۔ رحیم داد کی کیفیت لحہ بہ لحہ بدل رہی تھی۔ نشے کا ایسا تیز ریلا آیا کہ اس پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس نے جھنجلا کر ہاجراں کی قمیص کھینچ کر ایک طرف پھینک دی۔ ہاجراں دوپٹہ نہیں اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ پھول دار جگی پہنے ہوئے تھی۔ لاچا ہلکا نیلا تھا۔ پنڈلیوں میں چاندی کی پڑیاں پڑی تھیں۔

رحیم داد ڈگمگا کر کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کے ہاجراں کی طرف بڑھائے۔ "لے یہ رکھ لے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "رکھ لے۔"

ہاجراں نے نوٹوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، عاجزی سے بولی۔

"میں کنجری نہیں ہوں۔"

"تو کوئی بھی ہو، اب تو یہاں آہی گئی۔"

"میں اپنی مرضی سے تو نہیں آئی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تو اپنے گھر میں منجی پر بیٹھی تھی۔ گھر والا فصلوں کو پانی لگانے کے لیے آڈ کا ناکا کھولنے گیا تھا۔ پانی لگانے کی اس کی باری رات ہی کو آتی ہے۔"

ہاجراں کی عاجزی سے رحیم داد متاثر نہ ہوا۔ اس نے مسکرا کر بے نیازی سے پوچھا۔ "تو گھر میں بالکل اکیلی تھی؟"

"ہاں جی اکیلی تھی، یہی سمجھ لو۔ دونوں بچے بہت چھوٹے ہیں۔"

"فیر کیا ہوا؟" رحیم داد نخوت سے بولا۔

"مجھے تین بندے وہڑے کی دیوار پر نظر آئے۔" ہاجراں سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ "اس وکھت میری آنکھ کھلی ہوئی تھی۔ ان کے منہ پر منڈاسے بندھے تھے۔ وہ دیوار سے اتر کر نیچے آ گئے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر جھٹ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔"

"فیر تو نے کیا کیا؟"

"وہ مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے۔" ہاجراں ٹھنڈی سانس بھر کے بولی۔ "میرا گھر والا جانے کیا سوچتا ہوگا، بچوں کا کیا حال ہوگا۔"

"گھر والے کو پتہ نہیں، تو یہاں ہے؟"

"لگتا ہے، اسے پتہ نہیں۔ اسے پتہ ہوتا تو مجھے لینے ضرور آتا۔"

"ہاجراں! تیرے گھر والے کا کیا نام ہے؟"

"اس کا نام عالم ہے۔ کیا تو اسے جانتا ہے؟"

"نہیں!" رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چند لمحوں تک خمار آلود نظروں سے گھورتا رہا، پھر اس نے لپک کر اچانک ہاجراں کا بازو پکڑا۔ "باتیں بند کر۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"

ہاجراں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ رحیم داد گہری نیند سو رہا تھا۔ یکایک کمرے میں آہٹ ہوئی۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ گہری خاموشی میں ایسی آواز سنائی دی جیسے بلی آہستہ آہستہ غرا رہی ہو۔ رحیم داد نے دوبارہ سونا چاہا لیکن اس کی نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی تو محسوس ہوا کہ ہاجراں کمرے میں نہیں ہے۔ رحیم داد نے سوچا، سویرا ہو گیا ہے۔ مگر باہر گہرا سکوت تھا۔ وہ کچھ دیر لیٹا غور کرتا رہا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیمپ اسٹول کے بجائے فرش پر رکھا تھا اور اسٹول غائب تھا۔

رحیم داد نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ایک بجنے والا تھا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔ مگر ہاجراں کہیں نظر نہیں آئی۔ البتہ انگیٹھی کے پاس اس کی قمیص پڑی تھی۔ رحیم داد گھبرا کر بستر سے نیچے اترا، جوتے پہنے اور فوراً کمرے کے دوسرے حصے کی جانب بڑھا۔ پردہ سرکا ہوا تھا۔ رحیم داد نے آگے بڑھ کر دیکھا، خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

رحیم داد کی آنکھوں کے سامنے نہایت ہول ناک منظر تھا۔ ہاجراں چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے اسٹول پڑا تھا۔ ہاجراں کے نیلے لاچے کا ایک پلو چھت کی کڑیوں میں ایک کنڈے سے بندھا تھا اور دوسرے پلو کا پھندا بنا کر اس نے اپنی گردن میں ڈال لیا تھا۔ ہاجراں کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ زبان ہونٹوں کے بائیں گوشے سے لٹک رہی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا اور گردن کھنچ کر لمبی ہو گئی تھی۔

رحیم داد بدحواس ہو کر کمرے سے باہر نکلا اور برآمدے میں پہنچ گیا۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ مگر اس نے سردی کی پروا نہیں کی، تیزی سے پہرے دار نواز کی کوٹھری کی

جانب بڑھا۔ نواز سلگتی آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ رحیم داد قریب پہنچا' تو وہ پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"چوہدری! توں اتنی رات کو ادھر کیسے آگیا؟ بہت گھبرایا ہوا نظر آرہا ہے۔ گل کیہ اے؟"

"شیدا کدھر ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ تو جی بیمار پڑا ہے۔ کئی روز سے نہیں آیا۔"

رحیم داد کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "میں نوں پتہ ہے' وہ بیمار ہے۔ میرا مطلب ہے' رحمتے کہاں ہے؟ تو جا کر اسے فاٹافٹ بلا لا۔"

"کوئی خاص گل ہے جی؟" نواز نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔

"خاص ہی گل ہے۔ بعد میں بتاؤں گا۔ تو پہلے رحمتے کو یہاں بلا کر لا۔"

نواز نے مستعدی سے اپنی ملگجی چادر سر اور کانوں کے گرد لپیٹی' سردی سے کپکپا کر بولا۔ "چوہدری! تونے چدر بھی نہیں اوڑھ رکھی۔" رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ گم صم کھڑا رہا۔ نواز آگے بڑھا اور درختوں کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

رحیم داد کوٹھری میں چلا گیا۔ دہلیز کے پاس اپلے سلگ رہے تھے۔ رحیم داد نے دونوں ہاتھ جھٹ آگ پر پھیلا دیئے۔ ہوا درختوں میں سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی۔ ہر طرف ویرانی تھی' سناٹا تھا۔ رحیم داد خوف زدہ نظروں سے بار بار کمرے کی جانب دیکھتا۔ کمرے کے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔

درختوں تلے آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے قریب رکھی ہوئی لالٹین کی دھندلی روشنی میں دیکھا' رحمتے اونی دھسا اوڑھے تیز تیز قدم اٹھاتی حیران و پریشان کوٹھری کی طرف آرہی ہے۔ نواز بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کپکپا رہے تھے۔ رحمتے نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"چوہدری! تونے مجھے بلایا ہے؟" اس کی آنکھیں کچی نیند سے جاگنے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔ "چوہدری' تو یہاں کیوں بیٹھا ہے؟ تجھے تو کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔ ہاجراں کدھر ہے؟"

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کوٹھری سے نکلتے ہوئے اس نے رحمتے سے کہا۔ "میرے ساتھ کمرے میں آ۔" وہ آگے بڑھا۔ رحمتے اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ نواز بھی ان کے ساتھ تھا۔ تینوں نے باغیچہ طے کیا اور سیڑھیوں پر چڑھ کر برآمدے میں پہنچے۔

رحیم داد کمرے کے دروازے پر ٹھٹک گیا۔ رحمتے کو مخاطب کرکے اس نے کہا۔ "اندر جا کر دیکھ۔"

رحمتے اور نواز کمرے میں چلے گئے۔ رحیم داد بھی سہما ہوا ان کے پیچھے پیچھے بڑھا مگر دہلیز کے قریب رک گیا۔ سامنے چھت سے ہاجراں کی برہنہ لاش لٹکی ہوئی تھی۔ رحمتے کے چہرے سے وحشت برسنے لگی۔ "ہائے ربا' یہ کیا ہوا؟" رحمتے نے سراسیمہ ہو کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! یہ کیا ہو گیا؟"

"میں تو سو رہا تھا۔" رحیم داد نے بے چارگی اور بے بسی سے کہا۔ "کھٹ پٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔" اس نے فرش پر پڑے ہوئے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ "لگتا ہے یہ گرا تھا۔"

رحمتے پردہ سرکا کر خواب گاہ میں گئی۔ بستر سے چادر اٹھا کر لائی' میز پر چڑھی۔ اس نے جلدی جلدی ہاجراں کی برہنہ لاش کے گرد چادر لپیٹ دی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ رحمتے جلد ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔ نواز بھی اس کے ساتھ نکل کر برآمدے میں آگیا۔ رحمتے نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر برآمدے میں سہمی ہوئی کھڑی رہی۔ رحیم داد اور نواز کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

رحمتے نے دھسا ایک بار پھر اچھی طرح اپنے بدن پر لپیٹا اور رحیم داد سے بولی۔ "چوہدری میں شاہ جی کو جا کر خبر کرتی ہوں۔" اس کے لہجے میں تھرتھراہٹ تھی۔ "پر وہ ایک دم گرم ہو جائے گا۔ ننگی ننگی گالاں نکالے گا۔"

"تیری اس میں کیا غلطی۔" رحیم داد نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "کسی کی بھی غلطی نہیں ہے' یہ تو ہاجراں نے خود کیا ہے۔"

رحمتے نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ "پر شاہ جی کیسے جانے گا۔ نیند سے اٹھنے پر اور سردی میں باہر آنے پر ویسے ہی اسے کت چڑھا ہو گا۔ میری ایک نہیں سنے گا۔ بتا چوہدری' میں کیا کروں؟ اس معاملے میں میرا کیا دوش؟"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "پر ہاجراں نے ایسا کیوں کیا؟"

رحمتے نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے اودے اودے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "چوہدری' یہ گلاں چھوڑ' تو نواز کے پاس جا کر بیٹھ۔ میں شاہ جی کے پاس جاتی ہوں۔ فوراً اسے بتانا ہو گا۔ دیر نہیں ہونی چاہئے۔" وہ آگے بڑھی اور تیز قدموں سے چلنے لگی۔

رحیم داد اور نواز کوٹھری میں رہ گئے اور آگ تاپنے لگے۔ دونوں گم صم اور سہمے ہوئے تھے۔ نواز نے آہستہ سے کہا۔ "چوہدری! تو بہت ڈرا ہوا لگ رہا ہے۔ فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

پہلے بھی ایک رن ایسے ہی خودکشی کر چکی ہے۔ پر اس نے گردن میں پھندا نہیں ڈالا تھا۔"

"وہ کون تھی' اس نے کیا کیا؟" رحیم داد نے ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے تو جی لیمپ سے تیل نکال کر کپڑوں پر چھڑکا' کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آگئی۔" نواز نے رحیم داد کو بتایا۔ "برسات کی اندھیری رات تھی۔ اوپر بادل گھرے ہوئے تھے۔ اس نے کپڑوں پر آگ لگائی۔ میں پہنچا تو وہ بہت جل چکی تھی۔ بس سسک رہی تھی۔"

نواز تھا تو ادھیڑ مگر اس کا جسم ابھی تک مضبوط اور کسا ہوا تھا۔ نڈر اور حوصلہ مند بھی تھا۔

رحیم داد نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"اس کی لاش شاہ جی نے نہر کے کنارے کئی میل دور ادھر جنگل میں پھنکوا دی تھی۔ رات ہی کو جانوروں نے گوشت نوچ نوچ کر لاش اتنی بگاڑ دی کہ پہچان میں نہیں آتی تھی۔"

"کیا اس بار بھی وہ ایسا ہی کرے گا؟" رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"پتہ نہیں جی' اس دفعہ لاش کا کیا بنے؟" نواز نے آگ کریدتے ہوئے کہا۔ "ویسے باغیچے کے اس طرف درختوں کے نیچے پہلے بھی دو لاشیں دبائی گئی تھیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ "ایک کو تو جی نشے میں شاہ جی کے یار نواب امتیاز خاں اعوان نے گلا دبا کر مار ڈالا تھا۔ وہ لہور میں ہوتا ہے۔ پہلے اس کا ادھر بہت آنا جانا تھا۔ پر اب اس کا آنا جانا کم ہو گیا ہے۔ بہت دنوں سے تو آیا ہی نہیں۔ ویسے اس کے پتر سے شاہ جی کی ایک دھی بیاہی ہوئی ہے۔"

رحیم داد سخت پریشان تھا۔ گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "نواز تو یہاں کب سے لگا ہے؟"

"پندرہ سال سے اوپر تو ہو گئے ہوں گے۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔ "ہاں جی اتنا ہی عرصہ ہوا ہو گا۔ پاکستان بننے سے بہت پہلے میں شاہ جی کے پاس لگ گیا تھا۔ ان دنوں تو جی تگڑا جوان ہوتا تھا۔ ساری جوانی یہاں ختم کر دی۔ میں نے کیا کیا نہیں دیکھا؟ رحتے بھی میرے سامنے ہی آئی تھی۔"

"تو نے رحتے سے ویاہ کیوں نہ کر لیا؟ تیرے ٹکر کی ہے۔" رحیم داد نے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے اسے چھیڑا۔

"نہیں جی' اب بھی اس کا نخرا بہت ہے۔ ویسے جی' میری اپنی گھر والی ہے۔ حویلی کے اندر نوکرانی ہے۔ وہ رحتے سے بہت خار کھاتی ہے۔ حویلی کی ساری ہی زنانیاں اور زمیں دارنیاں رحتے سے خار کھاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ رحتے بھی بہت تیز ہے۔ تیں نوں پتہ نہیں' بہت کڑوی اور

جھگڑالو ہے۔"

☆

برآمدے کے پختہ فرش پر رات کے پرہول سناٹے میں آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے دھندلی روشنی میں دیکھا۔ احسان شاہ اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے پیچھے رحتے سر جھکائے چپ چاپ چل رہی تھی۔ رحیم داد اور نواز اٹھ کر تیز قدموں سے احسان شاہ اور رحتے کے قریب پہنچ گئے۔

احسان شاہ نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ کمرے کے دروازے پر جا کر ٹھہر گیا۔ رحیم داد' رحتے اور نواز جہاں تھے' وہیں رک گئے۔

احسان شاہ کے اشارے پر نواز نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ احسان شاہ اندر داخل ہوا۔ نواز اور رحتے نے بھی اس کے ساتھ کمرے کی دہلیز عبور کی۔ رحیم داد دروازے کے باہر ہی کھڑا رہا۔

احسان شاہ نے ہاجراں کی لاش دیکھی اور فوراً کمرے سے باہر آگیا۔ رحتے بھی باہر آگئی' نواز بھی۔ رحتے نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر دیا۔

احسان شاہ نے نواز سے کہا۔ "تو جا کر مہران علی کو بلا لا۔"

نواز نے لالٹین رحتے کے حوالے کی اور برآمدے کی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ احسان شاہ نے اسے ٹوکا۔ "ٹھہر جا۔" نواز رک گیا۔ احسان شاہ نے کہا۔ "مہران کے آنے تک میں دیوان خانے کے پچھلے کمرے میں رہوں گا۔" اس نے برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "تو مہران کو پہلے ادھر ہی لانا۔ جب وہ لاش دیکھ لے تب اسے میرے پاس بھیج دینا۔"

نواز چلا گیا۔ احسان شاہ نے رحتے سے کہا۔ "رحتے! تو جا کر کمرے کے آتش دان میں کوئلے سلگا دے۔ میں چوہدری کے ساتھ وہیں آ رہا ہوں۔"

رحتے نے خاموشی سے لالٹین دیوار کے پاس رکھ دی۔ رحیم داد گم صم تھا۔ رات ڈھلنے لگی تھی' سردی بڑھ گئی تھی۔ ہوا میں تیزی اور کاٹ تھی۔ احسان شاہ نے کمرے کے دروازے کی باہر سے کنڈی چڑھا دی اور رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری' میرے ساتھ آ۔" رحیم داد خاموشی سے اس کے ہم راہ چلنے لگا۔

دونوں کے قدموں کی آہٹ فرش پر آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ رحیم داد سردی سے تھرتھرا رہا تھا۔ دونوں نے برآمدہ عبور کیا' کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئے۔ آتش دان میں آگ

روشن تھی۔ رمتے سر جھکائے پوکرے سے کوئلے اور لکڑی کے ٹکڑے الٹ پلٹ کر آنچ تیز کر رہی تھی۔

احسان شاہ اور رحیم داد آتش دان کے قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رمتے دونوں سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ احسان شاہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ ابھری اور تیوری پر بل پڑ گئے۔ وہ زور سے دہاڑا۔ "کتّی۔" شدید غصے سے اس کی گھنی مونچھیں ابابیل کے پروں کے مانند پھڑپھڑانے لگیں' آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

رمتے نگاہیں جھکائے دم بخود کھڑی تھی۔

احسان شاہ برسنے لگا۔ "یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہوا۔ تو نے اسی کنجری کو چوہدری کے پاس پہنچانا تھا۔ کوٹ میں کوئی اور رن نہیں تھی؟"

رمتے نے دبی زبان سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے تو جی یہ سوچا....."

احسان شاہ نے رمتے کو پوری بات کہنے کا موقع نہ دیا۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "بکواس نہ کر۔ تیرا مغز ہی کام نہیں کرتا۔" وہ غصے سے آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ "اب تو بڈھی ہو گئی۔ تجھ سے یہ کام نہیں چل سکتا۔ کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔" وہ غیظ و غضب کے عالم میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر ڈپٹ کر رمتے سے بولا۔ "تو اب یہاں کیوں کھڑی ہے؟ ادھر جا جدھر لاش لٹک رہی ہے۔ نواز کی کوٹھری میں بیٹھ کر مہران علی کے پہنچنے کا انتظار کر۔"

رمتے نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا' گردن جھکائے چپ چاپ چلی گئی۔ رحیم داد ہنوز منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ احسان شاہ نے مڑ کر دیکھا اور اس کی دل جوئی کرتے ہوئے بولا۔ "چوہدری' پریشان نہ ہو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"شاہ جی! مجھے کیا پتہ تھا' وہ ایسا کرے گی۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔

احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "لگتا ہے' تو بہت گہری نیند سو رہا تھا۔"

"وہ ایسا ہوا کہ تیرے جانے کے بعد بھی پیتا رہا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ "آج کچھ زیادہ ہی ہو گئی۔ تب ہی تو ایسا بے خبر ہو کر سویا۔ پتہ ہی نہ چلا' وہ کب کمرے سے گئی اور کب اس نے یہ کارروائی کی؟ میری آنکھ تو سٹول کے گرنے سے کھلی جس پر چڑھ کر اس نے اپنی گردن میں پھندا ڈالا تھا۔" رحیم داد نے احسان شاہ کے چہرے کی جانب دیکھا۔ "شاہ جی' ویسے دیکھنے میں تو بہت سیدھی سادی لگتی تھی۔"

"تو ابھی بالکل اناڑی ہے۔" احسان شاہ نے اپنی مونچھ کو انگلیوں سے آہستہ آہستہ مروڑا۔ "ہر

زنانی ایک سی نہیں ہوتی۔ کوئی ایک دم ڈھرے پر آجاتی ہے۔ کوئی بہت دھیرے دھیرے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "لگتا ہے یہ بھی ایسی ہی تھی۔ ابھی کچی تھی۔ رمتے اسے جلدی ہی نکال لائی۔ مہینے دو مہینے کوٹ میں رہتی۔ دوسری زنانیوں سے ملتی جلتی۔ انھیں دیکھتی تو خود ہی ایک دم لائن پر لگ جاتی۔ میں تجھے ایک واقعہ سناتا ہوں۔"

لیکن احسان شاہ وہ واقعہ نہ سنا سکا۔ مہران علی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دونوں کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ پستہ قد اور تنومند تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں مگر ان میں تیز چمک تھی۔ ہلکی ہلکی مونچھوں میں سفید بال زیادہ تھے۔ رنگت سرخی مائل گندمی تھی۔ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھا مگر کاٹھی اچھی تھی۔ وہ اس وقت اونی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔

"لاش تو نے دیکھ لی؟" احسان شاہ نے مہران علی سے پوچھا۔

"دیکھ لی جی۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اسے اتار بھی لیا ہے۔ میں رانا اور علیا کو اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ ویسے راکھا نواز بھی موجود ہے۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" احسان شاہ نے مہران علی کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ "رات ہی کو سب کچھ کرنا ہے۔" احسان شاہ نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ "چوہدری ٹائم کیا ہو گیا؟"

رحیم داد نے گھڑی دیکھ کر بتایا۔ "ڈھائی بجنے والا ہے۔"

"ٹائم تو اب زیادہ نہیں رہا۔ جو کچھ کرنا ہے' جلدی کرنا ہو گا۔" مہران علی نے رسان سے کہا۔ "میں نے تو جی یہ سوچا ہے' سر کاٹ کر کسی جنگل میں دبا دیا جائے اور صرف دھڑ چار پانچ میل آگے نہر میں ڈال دیا جائے۔" وہ نہایت سکون سے سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ اس کا چہرہ جذبات سے خالی تھا۔ "ایسا کرنے سے لاش کے بارے میں سراغ ہی نہ لگ پائے گا۔ ویسے آگے شاہ جی' جیسی تیری مرضی۔"

"کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔" احسان شاہ نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر کہا۔ "پر یہ بھی سوچ لے پولیس آخر پولیس ہی ہوتی ہے۔ اپنے ہی موضعے کی رن ہے۔ پولیس تفتیش کرتی ادھر بھی آ سکتی ہے۔ اسے یہ پتہ تو چل ہی جائے گا' کس کی گھر والی ادھر غائب ہوئی ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کر غور سے مہران علی کا چہرہ دیکھا۔ "اسے پچھلے ہی ہفتے تو اٹھوایا ہے۔ تازہ تازہ معاملہ ہے گڑبڑ نہ ہو جائے۔ ویسے ہونا ہوانا کیا ہے۔ خاما خا ہزار دو ہزار خرچ ہو جائیں گے۔ مہران کچھ اور ہی سوچ۔"

"سوچنا کیا ہے جی۔" مہران علی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہیں باغیچے میں گڑھا کھود کر دبا دیتے ہیں۔"

"یہی ٹھیک رہے گا۔ ٹائم بھی زیادہ نہیں۔ تو بھی سارے چکروں سے بچ جائے گا۔" احسان شاہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"تو فیر جی میں رانا اور علیا کو گڑھا کھودنے پر لگائے دیتا ہوں۔ ابھی تو رات رہتی ہے۔ سناٹا بھی ہے۔ گڑھا کھودنے کی آہٹ بھی نہ ابھرے گی۔"

"ٹھیک ہے ایسا ہی کر۔" احسان شاہ نے سرہلا کر کہا۔ "اب دیر نہ کر۔ یہاں سے جا۔"

مہران علی خاموشی سے مڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

آتش دان میں انگارے خوب دہک رہے تھے۔ کمرے میں بکھری ہوئی روشنی زیادہ گہری سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ احسان شاہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس نے منہ پھاڑ کر جماہی لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "کہاں چلا شاہ جی؟"

"چوہدری! میں نوں اب جانا ہے۔ نیند لگ رہی ہے اور میں نے سویرے لہور بھی جانا ہے۔ تو آرام سے یہیں بیٹھا رہ۔ تیرا سامان دوسرے کمرے میں پہنچتے ہی تجھے لینے کوئی نہ کوئی آہی جائے گا۔ چوہدری فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

احسان علی شاہ دروازے کی جانب بڑھا اور باہر چلا گیا۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ کمرہ اب خوب گرم ہو چکا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہیں سو جائے لیکن کچھ ہی دیر بعد رتّے کمرے میں داخل ہوئی۔

"چوہدری! میں نے تیرا سامان دوسرے کمرے میں پہنچا دیا ہے۔ چل میں تجھے بھی وہیں پہنچا دوں۔"

کمرے سے باہر نکل کر رحیم داد سردی کی اچانک یلغار سے کپکپانے لگا۔ چند قدموں کے فاصلے پر اس نے دیکھا' برآمدے کی نکڑ پر نواز لالٹین لیے کھڑا ہے۔ اس کی زرد زرد روشنی میں رانا اور علیا ہاتھوں پر ہاجراں کی لاش اٹھائے کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ مہران علی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ دور سے تینوں سایوں کی مانند دھندلے نظر آرہے تھے۔ انھوں نے برآمدہ طے کیا۔ باغیچے میں پہنچے اور درختوں کے جھنڈ کی جانب بڑھنے لگے۔

رحیم داد انھیں دیکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے ان کی سمت دیکھ رہا تھا۔ نواز لالٹین سنبھالے آگے آگے چل رہا تھا۔ رتّے بھی ٹھہر گئی۔ اس کی نظریں بھی ادھر ہی اٹھی تھیں۔ رانا اور علیا لاش سنبھالے درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مہران علی اور نواز بھی

اب نظر نہ آتے تھے۔ درختوں کے نیچے لالٹین کی روشنی' دھندلا زرد دھبا بن کر چمک رہی تھی۔ رتّے زیادہ دور نہ گئی۔ قریب کے ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔ رحیم داد اندر چلا گیا۔ رتّے بھی اندر داخل ہو گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

رحیم داد کو رہ رہ کر ہاجراں کا خیال آرہا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں' خوف ناک سیاہ چہرہ' ہونٹوں سے باہر نکلی ہوئی زبان اور کھنچی ہوئی لمبی گردن۔ وہ سخت بے چین اور پریشان تھا' بے زاری سے بولا۔

"رتّے تو جا۔ میں سو جاؤں گا' فکر نہ کر۔"

"سوچ لے۔ تو اکیلا گھبرائے گا تو نہیں۔ ہاجراں کا خیال تجھے زیادہ ہی تنگ کرے گا۔" اس کے لہجے میں ہم دردی تھی' چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ "گھبرا نہیں' تو بول تو ادھر ہی رہ جاتی ہوں۔ تو اپنے بستر پر سو۔ میں دھسّا اوڑھ کر دری پر پڑ جاؤں گی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انگیٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تو سلگ ہی رہی ہے۔ کمرہ گرم ہے' مجھے سردی نہیں لگے گی۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا۔ رتّے بھی انگیٹھی کے نزدیک ہی اپنا دھسّا اوڑھ کر فرش پر بچھی ہوئی دری پر لیٹ گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ باہر تیز ہوا درختوں میں سسکیاں بھر رہی تھی۔ ہوا کے شور کے درمیان رک رک کر کدال سے زمین کھودنے کی آواز رات کے سناٹے میں ابھر رہی تھی۔ کئی منٹ تک یہ آواز ابھرتی رہی۔ پھر بیلچے سے مٹی اٹھانے اور ڈالنے کی آواز سنائی دی۔ آخر یہ آواز بھی بند ہو گئی۔

پچھلا پہر تھا۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ رات کی گہری خاموشی میں باہر برآمدے میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ یہ ایک سے زیادہ افراد کی چاپ تھی۔ چاپ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔ سناٹے میں ڈوب کر ختم ہو گئی۔

☆

نہ معلوم رات کتنی گزر چکی تھی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں دور دور تک نیند نہ تھی۔ وہ کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا' پھر اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ انگیٹھی میں انگارے راکھ کی تہ کے نیچے دھندلے پڑ چکے تھے۔ انگیٹھی کے نزدیک رتّے کروٹ کے بل سو رہی تھی۔ رحیم داد کا اندازہ یہی تھا۔ وہ ٹانگیں پسارے' تکیے کے سہارے کمر لگائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔

اس نے سامنے دری پر لیٹی ہوئی رتّے کو گردن موڑ کر ایک بار پھر دیکھا۔ بستر سے نیچے اترا اور

دبے دبے قدموں چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ رمتے کی پشت اس کی جانب تھی۔ رحیم داد نے رسان سے پکارا۔ "رمتے!" مگر اس نے نہ کروٹ بدلی نہ کچھ بولی۔ خاموش لیٹی رہی۔ رحیم داد نے جھک کر اسے آہستہ سے جھنجوڑا۔ وہ اس وقت گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔

اس بار رمتے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن سر جھکائے فرش کو تکتی رہی۔

"انگیٹھی بجھ گئی ہے۔" رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔ "تجھے سردی تو نہیں لگ رہی؟"

رمتے نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ بیٹھی رہی۔

رحیم داد نے اس دفعہ بھی نرمی سے کہا۔ "لگتا ہے تجھے نیند نہیں آرہی۔"

وہ پھر بھی نہ بولی۔ خاموشی سے گردن کو خم دے کر اپنا چہرہ رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں رحیم داد نے دیکھا' رمتے کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں۔ رخساروں پر ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

"رمتے! تو رو رہی ہے۔" رحیم داد اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔

"ہاں چوہدری' مجھے نیند نہیں آرہی۔" رمتے دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "سمجھ نہیں آتی یہ کیا ہو گیا؟"

"جو ہونا تھا ہو گیا۔" رحیم داد نے اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کی۔ "اتنا نہ سوچ۔ کچھ دیر آرام کر لے۔"

"کیا کروں' نیند ہی نہیں آرہی۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "غلطی تیری نہیں۔ سارا قصور میرا ہی ہے۔ شاہ جی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں ہاجراں کو تیرے کمرے میں نہ لاتی تو وہ اس طرح گلے میں پھندا ڈال کر نہ مرتی۔ اس کی لاش اس طرح چوری چوری رات کے اندھیرے میں درختوں تلے گڑھا کھود کر نہ دبائی جاتی۔" رمتے بات کہتے کہتے سسکیاں بھرنے لگی۔ رحیم داد بھی افسردہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر غم کے سائے منڈلانے لگے۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ چند لمحوں بعد خاموشی میں رمتے کی بوجھل آواز ابھری۔ "چوہدری! میں نے بہت برا کیا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہاجراں کے دو ننھے ننھے بچے ہیں۔ گھر والا بھی ہے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں کہ ہاجراں کا کیا بنا۔ وہ تو اس کا انتظار کرتے ہوں گے۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ رمتے نے آنسو پونچھے اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں بت بنے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ رک رک کر سانس بھرتے رہے۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا اور باہر درختوں میں سرما کی بپھری ہوئی ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔

رحیم داد نے نظر بھر کر رمتے کو دیکھا۔ اس کا بدن قدرے پھیل گیا تھا مگر ابھی تک گداز اور کسا ا تھا۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ بے قرار ہو کر ایک ہاتھ بڑھایا۔ رمتے کی کمر کو آہستہ سے پکا۔ نرم لہجے میں بولا۔ "تو نے کوئی غلطی نہیں کی۔ اب ہاجراں کو بھول جا۔" اس نے رمتے ہولے سے اپنے قریب لانے کی کوشش کی۔ "چل' ذرا دیر منجی پر آرام کر لے۔"

رمتے کسمسائی۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے علیحدہ کر دیا۔ عاجزی سے بولی۔ نہیں چوہدری' میں نے اب آرام نہیں کرنا۔" وہ ہٹ کر ذرا دور چلی گئی اور آہستہ آہستہ دازے کی جانب بڑھی۔

"کہاں جا رہی ہے؟" رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

"مجھے اپنے بچوں کے پاس جانا ہے' وہ اکیلے ہیں۔" رمتے ٹھہرنے پر رضامند نہیں ہوئی۔

"ایسا ہی تھا تو ادھر آئی کیوں تھی؟" رحیم داد نے ناگواری سے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

"ناراض نہ ہو۔" رمتے نے عاجزی سے کہا۔ "تو بہت ڈرا ہوا تھا' اکیلا بھی تھا۔ اب تو نہ ڈرا ا ہے' نہ اکیلا ہے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ لہجے میں اور زیادہ نرمی پیدا کرنے کی کوشش ،۔ "چوہدری' مجھے اب جانے دے۔ راکھا اپنی کوٹھری میں موجود ہے۔ جاگ بھی رہا ہے۔ کوئی م ہو تو اسے بتا دینا۔"

اسی وقت باہر پہرے دار نواز زور سے کھنکارا۔

رمتے نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔ رحیم داد کو دوبارہ اسے روکنے کی ہمت نہیں ئی۔ برآمدے میں رمتے کے قدموں کی آہٹ چند لحوں تک سنائی دیتی رہی۔

صبح رحیم داد نے احسان شاہ کے ساتھ ناشتا کیا۔ احسان شاہ نہا دھو کر آیا تھا۔ وہ تروتازہ اور ہاس بشاش نظر آرہا تھا۔ اس نے ہاجراں کی خودکشی اور اس کی لاش ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں ی قسم کا تذکرہ نہ کیا۔ رحیم داد نے بھی ایسی کوئی بات نہ چھیڑی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر احسان شاہ حویلی سے باہر نکلا۔ رحیم داد بھی اس کے ہم راہ تھا۔ حویلی کے ٹک کے عین سامنے احسان شاہ کی لمبی چوڑی امپالا صبح کی ہنستی دھوپ میں جھلملا رہی تھی۔ سان شاہ نے یہ کار پچھلے ہی دنوں خریدی تھی۔ وہ رحیم داد کو اسے دکھانے ہی کے لیے حویلی سے رلایا تھا۔ رحیم داد چمکتی دمکتی امپالا دیکھ کر بہت مرعوب ہوا۔

احسان شاہ اپنے مینیجر مہربان علی اور ایک خدمت گار کے ہم راہ کار میں سوار ہوا۔ کار کا انجن لے سے اسٹارٹ ہوا۔ کار آگے بڑھی۔ رحیم داد خاموش کھڑا لاہور کی سمت دوڑتی ہوئی امپالا کو

دیکھتا رہا۔

☆

پہر دن گزر چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد کو چمکتی ہوئی اجلی اجلی دھوپ خو
گوار معلوم ہوئی۔ وہ حویلی میں واپس نہ گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھیتوں کی جانب نکل گیا۔ ربیع
بوائی ہو چکی تھی۔ گندم کے نازک پودے بیجوں سے پھوٹ کر ہاتھ بھر اونچے ہو گئے تھے۔ سرسوں
اور مٹر کے پودے بھی ہوا کے نرم جھونکوں سے گندم کے ساتھ جھوم رہے تھے۔ کھیتوں میں
سبزے کی اونچی نیچی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ رحیم داد لوئی اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے نیچے گرم کو
بھی تھا۔ سرد ہوا سے محفوظ رہنے کے لیے گردن اور کانوں کے گرد اونی مفلر لپیٹے ہوئے تھا۔ ہلکی
دھوپ کی حرارت اور گرمی سے لطف اندوز ہوتا وہ آگے بڑھتا گیا۔

کھیتوں کے ایک طرف جوہڑ تھا۔ جوہڑ میں نوعمر لڑکے کوکلا چھپاکی کھیل رہے تھے' شور مچا ر
تھے۔ ہر طرف پھیلی ہوئی دھوپ اور بھاگ دوڑ سے جسموں میں حرارت اور چستی پیدا کر ر
تھے۔ ان کے آس پاس مویشی اور چوکھر گردنیں جھکائے' جگہ جگہ چرائی میں مصروف تھے۔ ان
گلوں میں پڑی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں رک رک کر بج رہی تھیں۔ جوہڑ کے اختتام پر مٹی سے لپے
مکانات دھوپ میں کچھ اور نکھر گئے تھے۔

رحیم داد لی ہے پر چلتا ہوا ایک موڑ پر مڑا تو سامنے سے ماکھا آتا ہوا نظر آیا۔ رحیم داد نے ا
دور ہی سے پہچان لیا۔ مگر ماکھا نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ وہ قریب پہنچا تو رحیم داد کو اپنے روبرو
کر حیرت سے بولا۔ "چوہدری! تو ادھر ہے! میں نوں بالکل پتہ نہ تھا تو یہاں بھی ہو سکتا ہے۔
تیرے پنڈ آنے والا تھا۔" خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

رحیم داد نے مسکرا کے پوچھا۔ "تیری گھر والی رسیلی۔" وہ ٹھٹکا اور بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔
مطلب ہے سگراں تو ٹھیک ٹھاک ہے' راضی خوشی ہے۔"

"بالکل راضی خوشی ہے جی۔ تیرے بارے میں تو اکثر پوچھتی رہتی ہے۔ تو میرے ساتھ
چل۔ تجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوگی۔"

رحیم داد اس کے ہم راہ چلنے پر رضامند نہ ہوا' سنجیدہ چہرہ بنا کر بولا۔ "ماکھے مجھے حویلی واپ
ہے۔ وہاں کئی ضروری کام کرنے ہیں۔"

"حویلی تو تیں نوں واپس جانا ہی ہے۔" ماکھا گڑگڑا کر عاجزی سے بولا۔ "میں معمولی م
ہوں۔ تو میرے گھر چلا جائے گا تو میری عزت بڑھ جائے گی۔ مجھے اور سگراں دونوں کو بہت

ہوگی۔" اس کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی۔ "چوہدری! تو نے میرا اجڑا ہوا گھر آباد کرا دیا۔ میرا بازو
واپس دلا کے مجھے بربادی سے بچالیا۔ تیرے لیے میرے دل سے کتنی دعا نکلتی ہے' میں تجھے بتا نہیں
سکتا۔"

رحیم داد پھر بھی ماکھا کے گھر جانے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ مگر اس کے بار بار انکار کے باوجود ماکھا
نہ مانا۔ وہ منت سماجت پر اتر آیا۔ اصرار کر کے رحیم داد کو اپنے گھر لے ہی گیا۔ ماکھا اس کے ساتھ
گھر کے صحن میں داخل ہوا۔ اس نے جھپاک سے دھوپ میں چارپائی لا کر ڈالی' کھیس بچھائی۔ رحیم
داد سے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ ماکھا خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اس نے اونچی آواز سے پکارا۔

"سگراں ادھر تو آ' دیکھ آج اپنے گھر کون آیا ہے۔"

صغراں' اوپلے کے عقب سے نکل کر سامنے آ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ گوبر سے لتھڑے ہوئے
تھے۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی
حیرت مسرت میں بدل گئی۔ اس نے رحیم داد کو سلام کیا اور معذرت کی۔ "چوہدری' معاف کرنا۔
میں ابھی تیرے پاس آتی ہوں۔" صغراں کچھ ہی دیر بعد دھوتی کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی واپس
آ گئی۔

ماکھا نے بیوی سے کہا۔ "سگراں! تو چوہدری کو لسی پلا۔ آرام سے گل بات کر۔ میں باہر جا رہا
ہوں' فٹافٹ لوٹ آؤں گا۔"

رحیم داد نے ماکھا کو روکنا چاہا مگر وہ تیزی سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ رحیم داد دھوپ
میں چارپائی پر بیٹھا رہا۔ صغراں بھی جا چکی تھی۔ رحیم داد تنہا رہ گیا تھا۔ دھوپ میں حرارت بڑھتی جا
رہی تھی۔ رحیم داد نے گردن اور کانوں کے گرد لپٹا ہوا مفلر اتار دیا۔ لوئی بھی اتار کر ایک طرف
رکھ دی۔

صغراں لسی سے بھرا ہوا گلاس لائی اور رحیم داد کے سامنے جھک کر پیش کیا۔ صغراں نے چہرے
کو سوتی دوہرے سے ڈھک لیا اور رحیم داد کے سامنے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے لسی کا
گھونٹ بھرتے ہوئے صغراں کو غور سے دیکھا۔ یہ وہ صغراں نہ تھی جس کے گلابی چہرے پر ہر لمحے
بکھرتی ہوئی مسکراہٹ کے باعث احسان شاہ چاہت اور پیار سے رسیلی کہتا تھا۔ وہ ایک مرتبہ رحیم
داد کے پاس بھی آئی تھی۔ مگر اب اس کا نرم و گداز بدن درخت کی خشک شاخ کی مانند مرجھا گیا
تھا۔ جھلمل کرتی سیاہ آنکھوں کے چمکتے دمکتے ستارے بجھ گئے تھے۔ چہرہ زرد اور مٹیالا پڑ گیا تھا۔ وہ
میلا کچیلا دوہرا اوڑھے تھی۔ اس کی بوسیدہ نیلی جھگی کمر کے پاس سے ادھڑی ہوئی تھی۔ وہ میلی سفید

دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ دھوتی پر جگہ جگہ دھبے تھے۔ وہ اجڑی اجڑی نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "سگراں' یہ تجھے کیا ہو گیا؟"

"میں نوں تو جی کچھ نہیں ہوا۔" وہ سادگی سے بولی۔

"تو پہلی سی سگراں ہی نہیں رہی۔" رحیم داد کے لہجے میں ہم دردی نمایاں تھی۔ "سچ کہہ رہا ہوں۔ بالکل ہی بدل گئی۔ جب تک شاہ جی کے کوٹ میں تھی' سوہنی اور جوان ہوتی تھی۔ لگتا ہے تو یہاں راضی خوشی نہیں۔" رحیم داد نے تیکھی نگاہوں سے دیکھا۔ "تو نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ماکھا نے تیرا ناس مار دیا۔"

"چوہدری! ایسا نہ کہہ۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "ماکھا تو مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ سر میں ذرا درد بھی ہو جائے تو گھبرا جاتا ہے۔ بھاگا بھاگا حکیم کے پاس جاتا ہے۔ میرا سر دباتا ہے' اپنے ہاتھ سے دوائی کھلاتا ہے۔" وہ لک لک کرتا رہی تھی۔

"میں جی اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔"

"مجھے تو خوش نہیں لگتی۔ حویلی میں تو تیری اور ہی بات تھی۔ برا نہ منانا۔ اب تو جیسے لال لال انگارے سے بجھ کر راکھ رہ گئی ہے۔"

"چوہدری' ایسی باتیں نہ کر۔ وہ بھی کوئی زندگی تھی۔" اس دفعہ صغراں کا لہجہ تند اور تیکھا تھا۔ "کنجریوں سے بھی خراب زندگی تھی وہ۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "ویسے کھانے پینے کو تو ادھر کوٹ میں بہت چنگا ملتا تھا۔ کام کاج بھی کرنا نہیں پڑتا تھا۔ پر ہر روز شام کو بناؤ سنگھار کرنا پڑتا۔ کب شاہ جی کا بلاوا آ جائے اور کب اس کا کوئی مہمان آ جائے؟ ایک سے بڑھ کے ایک شرابی کبابی مہمان۔ ایک سے ایک گندا کتا۔ تو ہی بتا' یہ کیا زندگی ہوئی؟"

"پر دیکھنے میں تو وہاں بہت خوش نظر آتی تھی۔"

"تجھے کیا پتہ چوہدری۔ توں نیک بندہ ہے۔ میں تیرے پاس پوری ایک رات رہی تو توں مجھ سے الگ رہا۔" اس کے چہرے پر یاسیت چھا گئی۔ "پر شاہ جی! میں تجھ کو کیا بتاؤں کیسا گندہ ہے وہ' شراب پی کے تو وہ آدمی ہی نہیں رہتا۔ اور اس کے یار' وہ بھی اتنے گندے اور خراب ہیں کہ ان کے بارے میں جب سوچتی ہوں تو اپنے سے بھی گھن آتی ہے۔ میں پانچ سال تک اس کنجر خانے میں رہی۔ اس میں جا کر زنانی' زنانی نہیں رہتی کنجری بن جاتی ہے۔"

رحیم داد نے محسوس کیا کہ احسان شاہ کی حویلی کے ذکر نے صغراں کو اداس کر دیا ہے۔ اس کا روکھا اور مرجھایا ہوا چہرہ کھنڈر نظر آنے لگا۔ رحیم داد نے فوراً گفتگو کا رخ موڑ دیا' ادھر ادھر گردن

گھما کر پوچھا۔

"یہ ماکھا کہاں چلا گیا؟"

"آتا ہی ہو گا جی۔ چوہدری' توں آرام نال بیٹھ۔ اب آیا ہے تو روٹی کھا کر ہی جانا۔"

"میں اتنی دیر یہاں نہیں ٹھیر سکتا۔" رحیم داد نے اپنی مجبوری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "حویلی میں میرا انتظار ہوتا ہو گا۔"

"پر شاہ جی تو اپنی موٹر میں بیٹھ کر لہور گیا ہے۔ ماکھا مجھے بتاتا تھا۔" صغراں نے دبی زبان سے کہا۔ "ویسے میرا کہا مان توں شاہ جی کی حویلی میں نہ ٹھیرا کر۔ گندی جگہ ہے۔ میں تو تجھے کہتی ہوں' اس کی یاری بھی چھوڑ دے۔ وہ بہت خطرناک بندہ ہے' توں اسے نہیں جانتا۔"

"میں تو اس کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ کسی کام کے بغیر میں اس کے پاس نہیں آتا۔"

"یہ تو مجھے بھی لگتا ہے۔" صغراں آزردگی سے بولی۔ "میں تجھے ٹھیک طرح جانتی ہوں' سمجھتی ہوں۔ توں بہت نیک بندہ ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ صغراں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "چوہدری! میں ابھی آتی ہوں۔" جواب کا انتظار کیے بغیر وہ گھر سے باہر چلی گئی۔

رحیم داد اکیلا صحن میں چارپائی پر بیٹھا رہا۔ پانچ منٹ گزرے' دس منٹ گزرے' پندرہ منٹ گزر گئے۔ رحیم داد اکتا گیا۔ صغراں واپس نہ آئی' البتہ ماکھا آ گیا۔ اس کے ہم راہ ایک اجنبی تھا۔ وضع قطع سے وہ بھی مزارع ہی لگتا تھا۔

وہ سانولی رنگت کا دراز قد' مضبوط اور چھریرا آدمی تھا۔ سر اور کانوں کو میلی کچیلی چادر کے کونے سے چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے رحیم داد کو اونچی آواز سے سلام کیا۔ ماکھا کی ساتھ وہ بھی رحیم داد کے سامنے صحن کے کچے فرش پر بیٹھ گیا۔

ماکھا بولا۔ "چوہدری' میں اسی کے بارے میں بات کرنے تیرے پاس آنے والا تھا۔" اس نے مڑ کر قریب بیٹھے ہوئے دراز قد شخص کی جانب دیکھا۔ "اس کی گھر والی کو شاہ جی نے اٹھوا لیا ہے۔ دس بارہ روز ہو گئے۔"

ماکھا کے لہجے میں التجا تھی۔ "چوہدری' جیسے تو نے میری مدد کی' ایسے ہی اس کی بھی مدد کر دے۔ اس کا بازو واپس دلا دے۔ شاہ جی تیری گل ضرور مان لے گا۔" ماکھا نے اس شخص کی جانب اشارہ کیا۔ "اس کا ناں عالم ہے جی۔"

عالم کا نام سنتے ہی رحیم داد سخت پریشان ہو گیا۔ وہ ہاجراں کا شوہر تھا۔ رحیم داد کو فوراً کمرے کی
چھت سے لٹکتی ہوئی برہنہ لاش کا خوف ناک چہرہ یاد آ گیا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالنے
کی کوشش کی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا' ماکھا کو بے چینی سے دیکھا۔

"ماکھے! تجھے کیسے پتہ چلا شاہ جی نے عالم کی گھر والی کو اٹھوا لیا؟"

ماکھا کے بجائے عالم بولا۔ "وہ ایسا ہے چوہدری' شاہ جی مجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔"

"شاہ جی' تجھے کیوں بے دخل کرنا چاہتا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"بہت پرانا جھگڑا ہے جی۔" عالم نے بتایا۔ "میرا پنڈ پہلے لالہ کرشن دیال کی زمین داری میں ہوتا
تھا۔" اس نے رحیم داد کا چہرہ نظر بھر کے دیکھا۔ "لالہ کرشن دیال تیرے پنڈ کی زمین داری جیلے کا
پیو تھا۔ سنا ہے اب تو وہ مر گیا۔"

عالم کے چہرے پر جھنجلاہٹ ابھرنے لگی۔ "پر جی وہ اور اس کا منیجر بنسی لال مزارعوں پر بہت
ظلم کرتے تھے۔ میں بھی اس کا مزارع تھا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے عالم۔" رحیم داد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "میرا پنڈ کوٹلہ ہرکشن
بھی اس کی زمین داری میں ہوتا تھا۔ میرے مزارعے بھی لالہ کرشن دیال اور بنسی لال کے بارے
میں یہی بتاتے ہیں۔"

"چوہدری! اصل بات یہ ہے۔" عالم نے بتایا۔ "ادھار دے دے کر اس نے بیاج کے پھندے
میں مزارعوں کو ایسا باندھ رکھا تھا کہ واڈھی کے بعد ساری کی ساری فصل ان کے گوداموں میں
چلی جاتی۔ ادھار تب بھی ختم نہ ہوتا۔ اس کے منیم اور منشی اپنے بہی کھاتے میں جو چاہتے لکھ لیتے
اور مزارعوں سے انگوٹھا لگوا لیتے۔ تیں نوں پتہ ہے چوہدری' مزارعے پڑھے لکھے تو ہوتے نہیں۔"
اس کی آواز میں غم گھلا ہوا تھا۔

"منیم' ادھار کی رقم جتنی چاہتا بڑھا کر لکھ دیتا۔ کسی بھی مزارعے کو ادھار لے کر انگوٹھا لگاتے
ہوئے کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔"

رحیم داد نے بے زاری سے کہا۔ "تجھے تو شاہ جی سے گلہ ہے۔ یہ لالہ کرشن دیال کی بات کہاں
لے بیٹھا؟"

"میں شاہ جی ہی کی گل بتانے لگا ہوں۔" عالم نے جھٹ وضاحت کی۔ "گل ایہہ اے جی' جب
۱۹۴۶ء میں الیکشن ہو رہا تھا تو شہر سے روز ہی مسلم لیگی لیڈر آتے۔ کہتے پاکستان بن گیا تو ہر مزارع
اپنی زمین کا مالک بن جائے گا۔ مزارعوں اور کمیوں کو بنیوں اور لالوں کی کرش ادھار کے چکر سے

چھٹکارا مل جائے گا۔۔ زمین اس کی ہوگی جو اس پر ہل چلائے گا۔"

"شاہ جی بھی لیگی لیڈروں میں شامل تھا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"نہیں جی' وہ تو سدا کا یونینسٹ ہے۔" عالم نے زہرخند سے کہا۔ "وہ تب بھی یونینسٹ پارٹی
میں تھا۔ اس نے پاکستان کی سخت مخالفت کی۔ طرح طرح سے بہکایا' ڈرایا' دھمکایا' دباؤ بھی ڈالا۔ پر
جب الیکشن ہوا تو جی سارے ہی مسلمانوں نے مسلم لیگ ہی کے بکسوں میں پرچی ڈالی اور میں نے تو
جی' لیگ کو ووٹ دلوانے کے لیے بہت بھاگ دوڑ بھی کی۔ کسانوں کے جتھے بنا کر دور دور کے پنڈ جاتا
تھا۔ ہر مسلمان بندے کو پاکستان کا حامی بناتا تھا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد بتایا۔ "میں تو جی
شاہ جی اور پولیسوں کی بار بار کی دھمکیوں سے بھی نہ ڈرا۔ ان دنوں جی بہت جوش بھرا ہوا تھا۔"
عالم کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "پاکستان آخر بن ہی گیا۔ پر پاکستان بنتے ہی تیں نوں پتہ ہے شاہ جی نے کیا
کیا؟"

"کیا کیا اس نے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ جھٹ مسلم لیگی بن گیا۔ اس نے اپنی حویلی پر لیگ کا ہرا جھنڈا لگایا اور پورے پیراں والہ
میں مٹھائی بٹوائی۔ اس نے لالہ کرشن دیال کے مزارعوں کو اکسایا۔ کہا' اس کی زمین پر زبردستی
قبضہ کر لو۔ وہ تو جی مزارعوں کو کرنا ہی تھا۔ یہ تو پہلے ہی طے تھا۔ لالہ کرشن دیال اور اس کا منیجر
بنسی لال سب کچھ چھوڑ چھاڑ بال بچوں کے ساتھ سرحد پار چلے گئے۔"

ماکھا نے عالم کو ٹوکا۔ "گل چھوٹی کر' تو نے تو لمی کہانی شروع کر دی۔"

"ٹھیک ہے جی' چھوٹی ہی گل کروں گا۔" عالم سنبھل کر بولا۔ "فیر ایسا ہوا جی' شاہ جی نے لالہ
کرشن دیال کی چھوڑی ہوئی زمینوں پر خود قبضہ کرنے کا چکر چلایا۔ وہ محکمہ بحالیات کے افسروں
سے ملا' ان کو اپنے ساتھ لایا۔ افسروں نے مزارعوں سے کہا' اپنی اپنی زمین میں سے مہاجروں کو
حصہ دو۔ ان دنوں منٹگمری میں مہاجرین کا بہت وڈا کیمپ لگا تھا۔ سرکاری افسروں کے ساتھ
مہاجروں کے بھی جتھے کے جتھے آنے لگے۔"

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "ادھر مزارعے اپنی زمین میں سے کوئی حصہ دینے کو تیار نہ تھے۔
روز مہاجروں اور مزارعوں کے درمیان جھگڑے ہوتے۔ خون خرابہ تک ہوتا۔ پولیس آتی۔ جسے
جی چاہتا پکڑ کر لے جاتی۔" عالم نے دھوپ کی تپش محسوس کرتے ہوئے چادر سر اور کانوں پر سے
ہٹا دی۔

"وہی تھانے دار جو پاکستان کو گندی گندی گالاں نکالتا تھا اور یونینسٹوں اور ان کی حکومت کو

طرح طرح سے خوش کرنے کی کوشش کرتا تھا' اب ہر گھڑی پاکستان' پاکستان کی رٹ لگاتا تھا۔ اور جن مزارعوں اور کسانوں نے پاکستان کے لیے اپنی پرچی ڈالی تھی ان کو حوالات میں الٹا لٹکا کر زبردست مار لگاتا تھا۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "اب وہ تھانے دار کہاں ہے؟"

"وہ تو جی بہت وڈا پولس افسر بن گیا۔ اس کے کندھے پر زیادہ ہی پھول نظر آتے ہیں۔ آج کل لور میں ہوتا ہے۔" عالم کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ "ادھر تو مہاجروں اور غیر مہاجروں میں دنگے فساد ہوتے تھے اور دونوں ہی کی پولیس کے ہاتھوں پٹائی ہوتی تھی' دوسری طرف شاہ جی نے اپنے مینجر مہربان علی اور کرندوں کے ذریعے مزارعوں کو بہلایا پھسلایا کہ وہ اپنی اپنی زمین کا شاہ جی کے ساتھ بیع کرلیں ورنہ سرکار سارے ہی کابعض مزارعوں کو بے دخل کرکے زمین مہاجروں میں بانٹ دے گی۔ پولیس نے پہلے ہی بہت تنگ کر رکھا تھا۔ بعد میں پتہ چلا' پولیس بھی شاہ جی کے اشارے پر مزارعوں اور کسانوں کو تنگ کرتی تھی۔ شاہ جی کیمپ میں اپنے بندے بھیج کر مہاجروں کو بھی جھگڑا کرنے پر اکساتا تھا۔ آخر ایک ایک کرکے سبھی نے شاہ جی کے ہاتھ بیع کرکے اسے تین ہزار ایکڑ سے بھی اوپر زمین کا مالک بنا دیا۔"

اس نے گردن اٹھا کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "مزارعے مزارعے ہی رہ گئے۔ زمین کا مالک بننے کا سفنا' سفنا ہی رہ گیا۔" عالم نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ "اس طرح جی میں بھی شاہ جی کا مزارع بن گیا۔ جب لالہ کرشن دیال کی زمینیں شاہ جی کے پاس چلی گئیں تو مجھے بھی فیر اس کا مزارع تو بننا ہی بنناتھا۔"

ماکھا نے اسے پھر ٹوکا۔ "عالم تو گل چھوٹی نہیں کرسکتا۔ تیری ایسی ہی گلاں سے تو شاہ جی خار کھاتا ہے۔ تجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔"

"تو بھی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے ماکھے۔" عالم نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر چوہدری یہ تو بتا' ہندو بنئے اور وڈے زمیں دار جب کسی مزارعے کو بے دخل کرنا چاہتے تو اس کے خلاف عدالت میں نالش کرتے' ڈگری نکلواتے' کرکی لاتے۔ زمین کرک کراتے۔ مال مویشی کرک کرا کے اٹھا لے جاتے۔"

اس کی آنکھوں کی چمک تیز ہوگئی۔ "پر شاہ جی کسی کو بے دخل کرنا چاہتا ہے تو اس کی گھروالی اور جوان دھی تک کو اٹھوا لیتا ہے۔" عالم کی آواز بجھنے لگی۔ "سکھ اور ہندو ادھر سے گئے تو مسلمان کسان اور مزارعے بہت خوش تھے کہ بنیوں کے ظلم و ستم اور بیاج کے چکر سے چھٹکارا مل

جائے گا۔ پر یہ پتہ نہ تھا کہ اس سے بھی زیادہ ظلم ہوگا۔ عزت اور آبرو بھی جاتی رہے گی۔"

"چوہدری' یہ تو ایسی ہی گلاں کرتا ہے۔" ماکھے نے مداخلت کی۔ "تو شاہ جی سے اس کا بازو دلا دے۔ اس کی گھروالی کا نام ہاجراں ہے۔"

"شاہ جی مجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ چوہدری' میں اس کے لیے تیار ہوں۔ وہ میرا بازو مجھے واپس دے دے۔ میں پنڈ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" عالم کے لہجے میں درد کی کسک پیدا ہوئی۔ "کیا کیا جائے جی' اپنے نصیب میں یہی لکھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ماں کے لیے ہردم روتے ہیں۔ انھیں روتا دیکھتا ہوں تو میری آنکھیں بھی بھیگ جاتی ہیں۔ کہتے ہیں زمین کسان کی ماں ہوتی ہے۔ وہ اس سے ویسا ہی پیار کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زمین سے ایسا ہی پیار ہے۔ میں اسی پر پیدا ہوا۔ پلا بڑھا' جوان ہوا۔ پر مجھے اپنی گھروالی سے پیار ہے۔ وہ میرا بازو ہے۔ اس کے بناں یہ زمین کس کام کی۔ ہاجراں کے جانے کے بعد میں کچھ نہیں کرسکتا۔ کھیتوں کو دیکھوں یا گھر کو۔ دونوں ہی برباد ہو رہے ہیں۔ ویسے بھی جی' شاہ جی مجھے رہنے نہیں دے گا۔" اس نے بے بسی سے رحیم داد کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"چوہدری! مجھے بے دخلی منظور ہے۔ میں ہار گیا' شاہ جی جیت گیا۔"

رحیم داد گم بیٹھا تھا۔ تاہم اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ اس نے نرم لہجے میں مشورہ دیا۔ "عالم تو ایسا کر۔ شاہ جی سے مل لے' خود جا کے اس سے منت سماجت کر۔ شاہ جی سے نہ ملنا چاہے تو مہربان علی سے گل بات کر۔ جب تو بے دخل ہونے کو تیار ہی ہے تو شاہ جی تیری گھروالی کو ضرور واپس کردے گا۔ اس نے تجھے بے دخل کرنے ہی کے لیے تو تیری گھروالی کو اٹھوایا ہے۔ یہی گل ہے ناں؟"

ماکھا بولا۔ "سچی بات تو یہی ہے جی۔" اس نے مڑ کر عالم کی جانب دیکھا۔ "عالم تو ایسا کر مہربان علی سے ضرور مل لے۔ شاہ جی تو تجھے ملے گا نہیں۔"

ماکھا کھسک کر رحیم داد کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے پیروں کو پکڑ کر ہولے ہولے دبانے لگا۔

"چوہدری' یہ تو مہربان علی سے مل ہی لے گا پر تو بھی شاہ جی سے اس کا بازو دلانے کے لیے کہنا۔ وہ تیری گل ضرور مان لے گا۔"

رحیم داد کے پاس احسان شاہ سے بات کرنے کا وعدہ کرلینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ ان سے کیا کہتا کہ ہاجراں اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ وہ پیوند خاک ہوچکی ہے۔ اس نے عالم اور ماکھا کو تسلی دی اور کھڑا ہوگیا۔

اسی وقت صغراں بھاگی بھاگی آئی۔ وہ رحیم داد کے لیے مرغ تل رہی تھی۔ مسالوں کی تیز خوشبو گھر بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔

صغراں کو جب یہ معلوم ہوا کہ رحیم داد جا رہا ہے تو وہ اسے روکنے کے لیے اصرار کرنے لگی۔ بار بار عاجزی سے روکا مگر رحیم داد نہ رکا۔

۳۴

سورج درختوں کی بلندیوں سے اوپر نکل گیا تھا۔ سائے سمٹتے جا رہے تھے۔ جاڑے کی چمکیلی اور شفاف دھوپ میں خوش گوار تمازت تھی۔ رحیم داد واپس احسان شاہ کی حویلی میں پہنچا۔ اس نے حیران و پریشان ہو کر دیکھا' نادر خاں باغ میں کرسی پر بیٹھا ہے۔ رحیم داد تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھا۔

نادر اسے دیکھتے ہی احتراماً کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو کیسے ادھر آ گیا؟" اس کے لہجے میں حیرت سے زیادہ تشویش غالب تھی۔

"ایک نئی بات کا پتہ چلا ہے' سوچا تجھے بتا دوں۔" نادر نے جواب دیا۔ "ویسے مجھے زمیں دارنی نے سامان کی خریداری کے لیے پاک پتن بھیجا ہے۔ پر میں نے تجھ سے ملنا ضروری سمجھا۔ بعد میں پاک پتن چلا جاؤں گا۔"

"تو ابھی تک کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔" رحیم داد نے نرمی سے کہا۔ "آرام سے بتا کون سی نئی گل کا پتہ چلا ہے؟"

"تیرے یہاں آنے کے بعد جلیل اور زینت شام کو اپنے بچوں کے ساتھ پہنچ گئے۔" نادر کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

"حویلی ہی میں ٹھیرے ہیں ناں؟"

"ہاں جی' زمیں دارنی نے انھیں حویلی ہی میں ٹھیرایا ہے۔ تیرے برابر والے خالی کمرے میں تاجاں کے ویاہ تک ٹھہرے رہیں گے۔"

"پر یہ کون سی ایسی بات ہے جسے بتانے تو سویرے ہی سویرے آ گیا۔" رحیم داد نے قدرے بے زاری سے کہا۔ "جلیل اور زینت کو تو تاجاں کے ویاہ میں شریک ہونے کے لیے آنا ہی تھا۔"

"بات تو جی اصل میں وہ ہے جو کل رات جنت کی زینت سے ہوئی۔ میں تجھے وہی بتانے آیا ہوں۔" نادر خاں کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ "ہوا یہ کہ زینت نے باتوں باتوں میں جنت کو بتایا کہ وہ دینا تھا نا' وہی جو سلامو سے زینت کے بچے لے کر آیا تھا' بعد میں زمیں دارنی سے ملا۔ تیرے اور شاہ جی کے بارے میں اس نے بہت خطرناک باتیں بتائیں۔"

"وہ تو جمیلہ کے پاس کئی بار آ چکا ہے۔" رحیم داد تذبذب سے بولا۔ "ایک بار تو تیرے سامنے بھی آیا تھا۔ میں جب یہاں آ رہا تھا تب بھی وہ مجھے نظر آیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ جمیلہ ہی کے پاس جا رہا تھا۔ ورنہ وہ کوٹلہ ہرکشن کیوں آنے لگا؟ ادھر تو اس کا کوئی میل جول کا بھی نہیں۔ جلیل اور زینت بھی تب تک نہیں پہنچے تھے۔"

رحیم داد کے چہرے سے وحشت صاف عیاں تھی۔ "یہ بتا' دینے نے کیا خطرناک باتیں میرے اور شاہ جی کے بارے میں جمیلہ کو بتائیں؟"

نادر خاں نے کرسی رحیم داد کے اور قریب کر لی' گردن اٹھا کے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "زینت کہتی تھی' دینے نے زمیں دارنی کو بتایا کہ تو نے شاہ جی کے ساتھ مل کر اللہ وسایا کو کہاں اور کیسے قتل کرایا؟" وہ کہتے کہتے ٹھٹکا۔ "اس نے تو یہاں تک کہا کہ اللہ وسایا کا قتل اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔" رحیم داد نے جھنجلا کر کہا۔

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" نادر خاں نے اس کی تائید کی اور فوراً صفائی پیش کی۔ "میں نے تو جو سنا وہ بتا دیا۔ یہ میرا فرض تھا۔ پر یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ اس نے زمیں دارنی سے تیرے اور شاہ جی کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کہیں؟ تیرے ساتھ تو اس کا جھگڑا ٹنٹا بھی نہیں۔"

"جھگڑا ٹنٹا تو تب ہوتا جب میری اس کے ساتھ جان پہچان ہوتی۔ پتہ نہیں اس نے جمیلہ سے میرے خلاف ایسی الٹی سیدھی باتیں کیوں کہیں؟" رحیم داد کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ گردن جھکائے چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ "نادر! یہ بھی پتہ کیا۔ دینے نے یہ باتیں جمیلہ کو کب بتائیں؟ یاد پڑتا ہے' پہلی بار جب وہ جلیل کے ساتھ آیا تھا تو میرے سامنے ہی دیپال پور واپس چلا گیا تھا۔ جمیلہ سے اس کی کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے دوبارہ آنے کو کہا تھا۔"

"پر وہ دوسرے روز آیا اور زمیں دارنی سے سکون میں دیر تک باتیں کرتا رہا۔ جلیل بھی موجود تھا۔ جلیل نے اس کی باتیں سنیں تو اپنی گھر والی زینت کو بھی بتائیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دینا خود ہی جمیلہ کے پاس آیا تھا۔ یہ تو میں نوں بھی پتہ ہے وہ جمیلہ کے پاس دوسرے روز آیا تھا۔ میں نے اسے سکول سے نکلتے دیکھا تھا۔" رحیم داد سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ وہ اللہ وسایا کے قتل کے سلسلے میں نادر خاں کو اعتماد میں لینا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اس کا رویّہ بہت محتاط تھا۔ مگر وہ اپنی بڑھتی ہوئی سراسیمگی زیادہ دیر نہ چھپا سکا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ "زینت نے جنت کو اور کیا کیا بتایا؟"

"زینت کہتی تھی' زمیں دارنی لہور جانے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ وہاں اللہ وسایا کے کیس کی نئے سرے سے تفتیش کرانے کے لیے حکام بالا سے ملے گی۔ وکیل محمد عثمان رندھاوا کو اس نے اسی سلسلے میں صلاح مشورہ کرنے کی غرض سے بلایا تھا۔ اسے بلانے جلیل گیا تھا۔ وہ تو جی زمین دارنی کے بہت بھروسے کا بندہ ہے۔"

"وکیل تو جمیلہ کے پاس کئی بار آیا اور ایک بار بھی مجھ سے نہ ملا۔ میرا تو تب ہی ماتھا ٹھنکا تھا' کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ میں نے اس کی آمد و رفت کے بارے میں جمیلہ سے پوچھا تو اس نے مجھے کچھ اور ہی گل بتائی۔"

"کیا کہا اس نے؟" نادر خاں نے پوچھا۔

"کہنے لگی' وکیل کو تو میں نے تیرے ہی کیس کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے بلایا تھا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا زمیں دارنی نے تجھے مغالطے میں رکھنے کی کوشش کی۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ زینت کی باتوں سے صاف اندازہ ہوتا ہے' اس نے جنت سے جھوٹ نہیں بولا۔ اس نے جو کچھ بتایا' بار بار تاکید کی کہ ان باتوں کا تجھے کسی طور پتہ نہ چلے۔"

"تیرا خیال ٹھیک ہی ہے۔ زینت کیوں جھوٹ بولنے لگی؟"

"جنت نے زینت سے یہ باتیں سنیں تو وہ بہت گھبرا گئی۔ سچ تو یہ ہے جی' میں خود بہت گھبرا گیا۔ رات بھر بے چین رہا اور سویرے اٹھتے ہی تیرے پاس چلا آیا تاکہ تجھے پتہ چل جائے زمیں دارنی کے ارادے کتنے خطرناک ہیں۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا' خاموش بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ بکھری ہوئی تھی۔ آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس نے غصے پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر جب تند و تیز جذبات نے شدت سے یلغار کی تو وہ پھٹ پڑا۔ "پر اس سور دے پتر دینے نے جمیلہ کو یہ

باتیں بتانے کی ہمت کیسے کی؟" رحیم داد نے تیکھی نظروں سے نادر کو دیکھا۔ "تفتیش دوبارہ شروع ہوئی تو وہ سب سے پہلے پھنسے گا۔"

نہ بتانے کی کوشش کے باوجود رحیم داد نے جذبات کی رو میں نادر خاں کو بہت کچھ بتا دیا۔ نادر پرانا گھاگ تھا۔ فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اس نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے رحیم داد کو خطرے سے خبردار کیا۔

"وہ تو وعدہ معاف گواہ بن کر صاف بچ سکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے یہ نکتہ اسے کسی نے بتایا ہوگا' اسے خود پتہ ہوگا۔ وہ پولس کا مخبر ہے۔ گواہیاں پیش کرنا اور سرکاری گواہ مہیا کرنا اس کا روز کا کام ہے۔" اس نے قیاس آرائی کی۔ "میرا تو یہ بھی اندازہ ہے جی' زمین دارنی نے دینے کو رشوت کے طور پر کچھ روپے بھی دئے ہیں۔ آگے بھی دینے کا وعدہ کیا ہوگا۔"

"دو سو روپے تو اسے جمیلہ نے زینت کے بچوں کو لانے کے انعام کے طور پر میرے سامنے ہی دیئے تھے۔" رحیم داد نے سرہلا کے کہا۔ "میرا تو خیال ہے اسی سے اس کا حوصلہ بڑھا۔ جمیلہ سے زیادہ روپیہ اینٹھنے کے چکر میں وہ خود ہی اس کے پاس آیا ہوگا۔" ایک بار پھر اس کا لہجہ تلخ ہو گیا' چہرے پر خشونت برسنے لگی۔ "یہ ساری بکواس اس نے اسی لیے کی ہے۔"

"ایسا ہی لگتا ہے جی۔" نادر نے رحیم داد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اب وہ زیادہ دیر رکنا نہ چاہتا تھا۔ "میں نوں پاک پتن جانا ہے۔ شام تک واپس پنڈ بھی پہنچنا ہے۔ زمین دارنی انتظار کرے گی۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "ایسی باتیں سننے کے بعد تجھے بتانا نہ صرف ضروری تھا بلکہ یہ میرا فرض بنتا تھا۔"

"تونے بالکل ٹھیک کیا' یہ باتیں مجھے بتا دیں۔" رحیم داد نے نرمی سے کہا۔ "آگے بھی ایسی کوئی گل بات معلوم ہو تو فوراً مجھے بتانا۔ میرا تو خیال ہے' آگے جنت کو لگا دے۔ وہ زینت کے ذریعے یہ معلوم کرتی رہے جمیلہ آگے کیا کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟"

"وہ تو میں نے جنت سے پہلے سے ہی کہہ رکھا ہے۔ کوئی حرج نہ ہو تو اس بارے میں شاہ جی سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ ویسے دینے نے اس کے خلاف بھی بہت سنگین الزام لگایا ہے۔ حالانکہ وہ برسوں اس کا ملازم رہ چکا ہے۔ شاہ جی تو اس کو ایسا فٹ کر دے گا کہ ساری بکواس بھول جائے گا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں شاہ جی سے ضرور مشورہ کروں گا۔ ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔" رحیم داد نے اس کی رائے سے اختلاف نہ کیا۔ "اب تو جا۔ تجھے زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد دھوپ میں کرسی پر بیٹھا رہا۔ نادر سے گفتگو کرنے کے بعد وہ سخت

الجھن میں مبتلا تھا۔ وہ مسلسل دینا کے بارے میں سوچتا رہا جو سنگین خطرہ بن کر اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔

☆

شام کو احسان شاہ حسب وعدہ واپس آ گیا۔ واپسی کے کوئی دو گھنٹے بعد اس نے رحیم داد کو اپنے پاس بلایا۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ سرخ روشنی نے فضا کو رنگین بنا دیا تھا۔

رحیم داد میز کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے خشک میوے' مٹھائی اور پھلوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "شاہ جی' آج یہ تبدیلی کیوں؟" اس نے مسکرا کے پوچھا۔

"لہور سے میرے ساتھ میاں عبدالسبحان بھی آیا ہے۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "چوہدری' تو میاں سبحان کو نہیں جانتا۔ بہت وڈا زمیں دار ہے۔ تیرے سامنے یہاں کبھی نہیں آیا۔ ویسے بھی بہت ہی کم آتا ہے۔"

"لگتا ہے بالکل ہی صوفی ہے؟"

احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ "پہلے تو بہت پیتا پلاتا تھا۔ پر پچھلے کئی سال سے بالکل چھوڑ رکھی ہے۔"

رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "مہربان علی تو تیرے ساتھ ہی گیا تھا ناں۔ اس نے جمیلہ کے بارے میں کیا پتہ لگایا؟"

"ابھی تو کچھ پتہ نہیں چل سکا۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔ "میں نے مہربان علی کو لہور چھوڑ دیا ہے۔ وہ ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی لوٹے گا۔"

"کب تک واپس آجائے گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"اسے کل شام تک واپس آجانا چاہیے۔ ویسے ساری باتوں کا پتہ کر کے ہی آئے گا۔"

"آج صبح تیرے لہور جانے کے کچھ ہی دیر بعد نادر یہاں آیا تھا۔" رحیم داد نے گہری سانس لے کے کہا۔

"کیسے آیا تھا وہ۔ کوئی خاص گل بات تو نہیں؟"

"اس نے تو بہت عجیب گل سنائی۔" رحیم داد نے اضطراب سے کہا۔ "میں تو اسے سن کر گھبرا گیا۔ تب سے انتظار کر رہا تھا' تو آئے تو ساری گل بات تجھے بتاؤں۔"

"کیا کہتا تھا؟" احسان شاہ نے رحیم داد کے چہرے پر بکھری ہوئی سراسیمگی محسوس کی۔ "تو کچھ

زیادہ ہی پریشان نظر آرہا ہے۔"

"پریشان ہونے کی بات ہی ہے۔ تیرے پاس ایک نوکر ہوتا تھا۔" رحیم داد کا لہجہ مدھم پڑ گیا۔ "دینا' وہی جسے تو نے دارا کے ساتھ اللہ وسایا کے قتل پر لگایا تھا۔"

"اس کی تو میں نے کب کی چھٹی کر دی۔ ایک رات ساوی کے نشے میں دھت ہو کر اس نے بہت رولا کیا۔ میں نے جوتے لگوا کر اسی رات اسے پنڈ سے نکال دیا تھا۔ بہت زیادہ تنگ کرنے لگا تھا۔" اس نے نظر بھر کر رحیم داد کا چہرہ دیکھا۔ "پر تجھے اس سے کیا لینا؟"

"تجھے یہ بھی پتہ ہے' اب وہ کہاں ہے؟"

"بالکل پتہ ہے۔" احسان شاہ نے نہایت اطمینان سے بتایا۔ "وہ پولیس کا چڑی چور بن گیا ہے۔ تھانے دار زمان خاں نے اسے مخبر لگا رکھا ہے۔"

"پر تجھے یہ پتہ نہیں' دینے ہی نے زینت کے بچے سلامو سے واپس دلائے تھے۔ بچوں کو لے کر وہ زینت کے خصم جلیل کے ساتھ جمیلہ کے پاس پہنچا۔ زینت ان دنوں جمیلہ ہی کے پاس تھی۔" اس نے قدرے تامل کیا' احسان شاہ کی آنکھوں میں جھانک کر گویا ہوا۔ "تب سے وہ کئی بار جمیلہ کے پاس جا چکا ہے۔ نادر اسی کے بارے میں بتانے میرے پاس آیا تھا۔"

"کیا کہتا تھا نادر؟" احسان شاہ نے چونک کر پوچھا۔

"نادر کہتا تھا' دینے نے اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں جمیلہ کو سب کچھ بتا دیا۔"

"نادر کو کیسے اس بات کا پتہ چلا' جمیلہ نے اسے بتایا ہے؟" احسان شاہ کے چہرے پر غبار پھیل گیا۔

"بات کچھ اس طرح ہے' زینت نے جنت کو بتایا اور اس نے ساری بات نادر کو بتا دی۔"

کمرے میں سکوت چھا گیا۔ دہکتے انگاروں کی روشنی میں رحیم داد اور احسان شاہ کے چہرے سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ رحیم داد اور زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ صبح نادر خاں سے جو کچھ سنا تھا' احسان شاہ کو تفصیل سے بتا دیا۔

احسان شاہ کچھ دیر کے لیے فکر میں ڈوب گیا۔ مگر جلد ہی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ وہ زیر لب مسکرایا۔ "چوہدری' تو فکر نہ کر۔ دینے کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔"

مگر رحیم داد مطمئن نہ ہوا۔ اس نے دبی زبان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "شاہ جی' یہ تو سوچ دینا اب تیرا نوکر نہیں رہا۔"

"پر وہ تھانے دار زماں خاں کے ساتھ تو لگا ہوا ہے ناں۔ زمان میرا گہرا یار ہے۔ وہ دینے کو بالکل

ٹھیک ٹھاک کر دے گا۔ تجھے پتہ نہیں' دینے کے خلاف ایک نہیں' جانے کتنے جرائم اور خطرناک وارداتوں کے کیس ہیں۔ کسی میں بھی اس کو جب چاہے اور جس طرح چاہے گردن سے پکڑ کر دبوچ سکتا ہے۔ وہ اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتا۔"

"دینے کو تو زماں خاں سنبھال لے گا پر جمیلہ کا کیا بنے گا؟ اسے تو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ وکیل بھی اس کی مدد کر رہا ہے۔" رحیم داد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

احسان شاہ نے اس دفعہ کچھ نہ کہا۔ وہ نظریں جھکائے سوچتا رہا۔ اسی اثناء میں کمرے کا دروازہ کھلا۔ میاں عبدالسبحان داخل ہوا۔ حویلی کا ایک ملازم اس کے ہم راہ تھا۔ وہ نظریں جھکا کر ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا۔

میاں سبحان ادھیڑ تھا' جسم بھاری بھرکم تھا اور رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ وہ اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ احسان شاہ اسے دیکھتے ہی تپاک سے بولا۔ "بہت دیر کر دی میاں صاحب' میں تو کب سے انتظار کر رہا تھا۔" میاں سبحان نے اوور کوٹ اتار کر ملازم کو دیا۔ اس نے اوور کوٹ سنبھال کر احتیاط سے کھونٹی پر لٹکا دیا۔ ملازم چند لمحے ادب سے گردن نیچی کیے کھڑا رہا' پھر چپ چاپ کمرے سے باہر چلا گیا۔

میاں سبحان آتش دان کے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ احسان شاہ نے رحیم داد سے اس کا تعارف کرایا۔ میاں سبحان بہت بڑا زمین دار تھا۔ رحیم یار خان کے علاوہ لائل پور میں بھی اس کے مربعے تھے۔ ہزاروں ایکڑ اراضی پر پھیلی ہوئی کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ آم' امرود اور مالٹے کے باغات تھے۔ ذاتی شکار گاہ تھی۔ لیکن زمین داری سے زیادہ اسے سیاست سے گہری دلچسپی تھی۔

میاں سبحان نے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سیاست کا ذکر چھیڑ دیا۔ احسان علی شاہ سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر تھا اور حکمران طبقے میں اس کا اثر ورسوخ بھی بہت تھا۔ میاں سبحان اس کے پاس ایک سیاسی غرض سے آیا تھا۔

لیکن رحیم داد کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ جلد ہی ان کی سیاسی گفتگو سے بے زار ہو گیا۔ اس نے اکتا کر جماہی لی۔ احسان شاہ نے اسے دیکھا' مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! لگتا ہے تجھے نیند آرہی ہے۔ تو روٹی کھا کر سو جا۔ میں نے میاں صاحب سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے' دیر تک سلسلہ چلے گا۔ تجھ سے اب صبح آرام سے بات چیت ہو گی۔"

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے

ملازم سے کھانا منگوایا اور کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

☆

مہراں علی دوسرے روز بھی نہ آیا۔ تیسرے روز بھی رحیم داد اس کا انتظار کرتا رہا۔ رحیم داد کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ باجراں کی خودکشی کے واقعے کے بعد وہ اس قدر خوف زدہ ہو گیا تھا کہ احسان شاہ کے زور دینے پر بھی اس نے کوٹ سے کسی کو نہ بلوایا۔ وہ کمرے میں اکیلا ہی سوتا۔ چوتھے روز مہراں علی سہ پہر کو لاہور سے واپس آیا۔ لیکن رحیم داد سے اس کی ملاقات شام کو ہوئی۔

رحیم داد اس وقت احسان شاہ کے ساتھ گرم کمرے میں بیٹھا شغل بادہ نوشی کر رہا تھا۔ کمرے کے باہر سرما کی ٹھٹھرتی رات پھیل کر دھواں دھواں ہو گئی تھی۔ ہوا بپھری ہوئی تھی۔ اس کے تیز اور تند تھپیڑے دروازوں اور کھڑکیوں پر دستک دے رہے تھے۔ آتش دان کے دہکتے انگاروں کی سرخ آنچ سے رحیم داد اور احسان شاہ کے چہرے دمک رہے تھے۔ خمار آلود آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔

مہراں علی سردی سے کپکپا رہا تھا۔ اس نے اونچی آواز سے سلام کیا اور آہستہ آہستہ آتش دان کی جانب بڑھا۔ احسان شاہ نے پوچھا۔ "مہراں! تو لور سے کیا خبر لایا؟ چودھری تیرا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔"

"میں جی وکیل کے منشی سے ملا تھا اور اپنے طور پر بھی پوری چھان بین اور پوچھ تاچھ کی۔" مہراں علی نے سنبھل سنبھل کر بتایا۔ "نادر خاں کی اطلاع بالکل درست ہے جی۔ جمیلہ نے بیڈن روڈ پر کرائے کے مکان کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ مکان میں نے دیکھا ہے۔ اس کے مالک سے بھی ملا تھا۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "اور زمین کی بیع کے بارے میں تو نے کیا پتہ لگایا؟"

"زمین کا سودا بھی جی، بالکل طے ہو چکا ہے۔ پولیس کا ایک ریٹائرڈ انسپکٹر زمین خرید رہا ہے۔ اس کا نام عبداللہ خان ہے، امرتسر کا مہاجر ہے۔ ویسے اوکاڑے میں اس کے آم اور مالٹے کے باغات بھی ہیں۔"

احسان شاہ نے کرید کر پوچھا۔ "تو نے یہ بھی پتہ چلایا کہ زمین کی لکھا پڑھی کا کام کب تک پکا اور مکمل ہو جائے گا؟"

"وکیل کا منشی کہتا تھا سارے کاغذات تیار ہیں۔" مہراں علی نے بتایا۔ "جمیلہ اگلے مہینے کے

شروع میں لور پہنچ جائے گی۔ اس کے پہنچنے کے بعد بیع کی رجسٹری کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔"

"مہراں علی، اب تو جا آرام کر۔" احسان شاہ مزید بات چیت کرنا نہ چاہتا تھا۔

مہراں علی چلا گیا۔

رحیم داد اس کی باتیں سن کر سخت پریشان ہو گیا۔ احسان نے گلاس اٹھا کر بڑا گھونٹ بھرا اور رحیم داد کو تسلی دینے لگا۔ "چودھری! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بتا، تیرے اندازے میں جمیلہ کب تک لور چلی جائے گی؟"

"مہراں علی نے بتایا تو تھا، وہ اگلے مہینے کے شروع میں لور پہنچ جائے گی۔"

"اس کو چھوڑ۔" احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اپنی گل کر۔"

"تاجاں کے ویاہ تک وہ کوٹ ہر کشن میں ضرور ٹھہرے گی۔ ویاہ سے نمٹنے کے بعد لور جائے گی۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

"اس معاملے میں نادر خان سے بھی گل بات کرنی ہو گی۔ اسے ہر بات کا تجھ سے زیادہ پتہ ہے۔ اسے مشورے کے لیے کل ہی بلانا ہو گا۔"

"ہاں جی اس سے بات کرنی بہت ضروری ہے۔" رحیم داد نے احسان شاہ کی رائے سے اتفاق کیا۔ "وہ جنت کے ذریعے جمیلہ کے ارادوں کا پتہ چلا سکتا ہے۔"

"تیری باتوں سے لگتا ہے، جنت بھی نادر خان کی طرح ہوشیار اور تیز ہے۔"

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تیز ہے۔"

"کیا بات ہے چودھری، تیری طبیعت تو اس پر نہیں آ گئی۔" احسان شاہ نشے میں جھوم کر ہنسنے لگا۔ "میں نے تو جنت کو ایک ہی بار دیکھا ہے۔ نادر کے ساتھ آئی تھی۔ رنگ روپ تو اس کا ٹھیک ٹھاک ہے۔ عمر بھی زیادہ نہیں۔"

مگر رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی، چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں شاہ جی ایسی کوئی گل شل نہیں۔"

احسان شاہ نے کچھ نہ کہا۔ گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں باہر نکلے۔ احسان شاہ مڑا اور حویلی کے زنان خانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے روز شام کا اندھیرا پھیلتے ہی نادر خان آ گیا۔ احسان شاہ اور رحیم داد آتش دان کے سامنے بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

احسان شاہ نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔ "نادر تیری اطلاع کی تو میں نے تصدیق کرالی ہے۔ یہ تو پتہ چل گیا' جمیلہ نے لہور میں رہنے کے لیے مکان کا بندوبست کرلیا ہے۔ زمین بیچنے کا سودا طے ہوچکا ہے۔ اب رجسٹری ہونی رہ گئی ہے۔"

"تو بھی یہی خبر لایا تھا ناں؟" رحیم داد نے مداخلت کی۔

لیکن احسان شاہ نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی اور نہ ہی نادر خان کو بولنے کا موقع دیا۔ اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ "نادر یہ بتا' تیرے اندازے میں جمیلہ کب تک کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کے لہور چلی جائے گی؟"

"مجھے تو جی لگتا ہے کہ وہ تاجاں کے ویاہ کے فوراً ہی بعد لہور چلی جائے گی۔ میں نے اس بارے میں جنت سے پوچھا تھا۔ وہ یہی بتاتی تھی۔ میرے خیال میں وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا' تاجاں کے ویاہ تک تو وہ اپنے پنڈ میں ضرور ٹھہرے گی۔" احسان شاہ نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

"ہاں جی' یہ تو طے ہے۔" نادر خان نے وثوق سے کہا۔ "تاجاں کا ویاہ تو وہ ایسے چاؤ اور لگن سے کررہی ہے جیسے اپنی سگی دھی کا ویاہ کررہی ہو۔ اس پر تو آج کل اسی کی دھن سوار ہے۔ کسی اور گل بات کا اسے ہوش ہی نہیں۔ جب دیکھو تاجاں کے ویاہ کے بارے میں باتیں کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔"

احسان شاہ سوچتا رہا۔ اس نے نادر خان کی باتوں پر کسی ردعمل کا فوری طور پر اظہار نہ کیا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ جلتا ہوا ایک کوئلہ زور سے چٹخا۔ چنگاریاں اڑیں اور آتش دان کے باہر تک بکھر گئیں۔ احسان شاہ نے مڑ کر آتش دان کے دہکتے ہوئے سرخ سرخ انگارے دیکھے پھر نادر سے پوچھا۔

"نادر یہ بتا' تاجاں کی جنج کس روز آئے گی؟"

"آج منگل ہے جی۔" نادر خان سر اٹھا کر سوچنے لگا۔ "جمعے کی شام کو جنج چڑھے گی۔ زمین دارنی نے مجھے یہی بتایا ہے اور اسی حساب سے ویاہ کی تیاریاں بھی ہورہی ہیں۔"

"مطلب یہ کہ اب صرف تین راتیں رہ گئیں ہیں۔" احسان شاہ نے کہا۔ "جو کچھ کرنا ہے انہی تین راتوں میں کرنا ہوگا۔ آج کی رات تو سمجھو گزر گئی۔ دو راتیں رہ جاتی ہیں۔"

رحیم داد اس کی بات کا مفہوم مطلق نہ سمجھ سکا۔ نادر خاں کے بشرے سے بھی ایسی ہی کیفیت ہویدا تھی۔ وہ تو خاموش رہا مگر رحیم داد نے بے چین ہو کر کہا۔ "اب کیا ہوسکتا ہے؟"

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے' کیا ہوسکتا ہے اور کیا ہوگا۔"

"پر تاجاں کے ویاہ سے جمیلہ کے لہور جانے کا کیا ناتا؟" وہ ابھی تک احسان شاہ کی بات کا مقصد نہ سمجھ سکا تھا۔

"تو چپ کرکے دیکھتا جا۔" احسان شاہ بے پروائی سے بولا۔ قدرے تامل کیا' پھر نادر خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ "تاجاں تو اب مائیاں بیٹھ چکی ہوگی۔"

"ہاں جی' مائیاں تو وہ کئی روز پہلے بیٹھ چکی ہے۔"

"رات کو اس کے پاس کون رہتا ہے؟" احسان شاہ نے استفسار کیا۔

"ویسے تو جی کئی زنانیاں رہتی ہیں۔ تاجاں کی ماں پھاتاں بھی رہتی ہے۔ پر زمین دارنی نے جنت کو خاص طور پر لگایا ہے کہ وہ رات کو تاجاں کے پاس رہے۔" نادر خان نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ "وہ تو جی آج کل تاجاں کے ساتھ ہی سوتی ہے۔"

"یہ تو اور بھی بہتر ہے۔" احسان شاہ کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ "اب تو کام آسان ہوجائے گا۔"

رحیم داد نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "شاہ جی تو کرنا کیا چاہتا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں جنج پہنچنے سے پہلے ہی تاجاں کو اٹھوالیا جائے۔ اسے لاکر یہاں حویلی میں رکھا جائے۔" احسان شاہ نے نگاہیں اٹھا کر نادر خاں کو تیز نظروں سے دیکھا۔ "تو نے بھی سن لیا نادر؟"

"بالکل سن لیا جی۔" نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔

احسان شاہ کے چہرے پر خشونت پھیل گئی۔ وہ ایک ہاتھ اٹھا کے انگلیوں سے بائیں طرف کی مونچھ مروڑنے لگا۔ اس نے نادر خاں کو استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ "وہ جمعرات کی رات ہوگی۔" احسان شاہ سنبھل سنبھل کے بولنے لگا۔ "اس رات نیکا دوسرے کرندوں کے ساتھ کوٹلہ ہرکشن پہنچ جائے گا۔ سب جیپ میں ہوں گے۔ جیپ درختوں تلے کھڑی کردی جائے گی۔ نیکا اور اس کے ساتھی بندے آدھی رات سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔ اور اس گھر کے پاس چھپ کر بیٹھ جائیں گے جہاں تاجاں مائیاں بیٹھی ہے۔ اب تو یہ بتا' اس کام میں کوئی مشکل تو نہیں پڑے گی؟"

"نہیں جی' کوئی مشکل نہیں ہوگی۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "تاجاں جس گھر میں مائیاں بیٹھی ہے' اس کے نزدیک صرف مہمان خانہ ہے جس میں ان دنوں میں اپنی بچیوں کے ساتھ رہتا ہوں۔"

آس پاس اور کوئی مکان شکان نہیں۔ آگے رڑی ہے۔ اس کے ساتھ جنگل ہے جو گھر کے پچھواڑے تک پھیلا ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر باغ ہے۔" نادر خاں نے پورا حدود اربعہ بتایا۔

"یوں سمجھ لیں جی' ادھر ادھر ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" احسان شاہ سرہلا کے بولا۔ "جس کمرے میں تاجاں مائیاں بیٹھی ہے اس کا کوئی دروازہ آنگن میں یا گھر کے باہر بھی کھلتا ہے؟"

نادر خاں جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ احسان شاہ نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔ "مجھے نہ بتا۔ یہ ساری باتیں تو نیکا کے سامنے ہی بتانا۔ مجھ سے زیادہ اس کے لیے ان کا جاننا ضروری ہے۔" اس نے اونچی آواز سے کمرے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ملازم کو اندر بلایا۔ وہ آیا تو اسے ہدایت کی کہ رفیق عرف نیکا کو کمرے میں بھیج دے۔

وہ خاموشی سے چلا گیا۔ ذرا ہی دیر بعد رفیق آگیا۔ چہرے مہرے سے وہ خاصا ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ اس کا جسم لمبا اور مضبوط تھا۔ رنگ سیاہ تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمک دار تھیں۔ انداز میں اکھڑپن تھا۔ آواز بھدی اور کرخت تھی۔ وہ احسان شاہ کے روبہ رو نظریں جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

احسان شاہ نے نادر خاں سے کہا۔ "ہاں' اب بتا۔"

"وہ ایسا ہے جی' تاجاں جس کمرے میں مائیاں بیٹھی ہے' اس کے آدھے سے بھی کم حصے میں پردہ پڑا ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "تاجاں پردے کے پیچھے رہتی ہے۔ اس حصے میں دروازہ بھی ہے جو گھر کے پچھواڑے کھلتا ہے' پر اس میں تالا پڑا رہتا ہے۔ اسے تب کھولا جاتا ہے جب تاجاں ٹٹی پیشاب کے لیے سویرے ہی سویرے باہر نکلتی ہے۔ وہاں جی کیکر کے درخت اور گھنی جھاڑیاں ہیں۔ اس کے آگے تھوڑا سا کھلا میدان ہے۔ میدان کے ایک طرف باغ ہے۔ جہاں باغ ختم ہوتا ہے وہاں حویلی کا کڑہ ہے جس میں ڈھور ڈنگر رہتے ہیں۔ اس سے ملا ہوا اصطبل ہے۔ کڑے اور اصطبل کی نگرانی کے لیے رکھوالا موجود رہتا ہے۔"

احسان شاہ نے رفیق کو مخاطب کیا۔ "نی کے! تو نے ساری گلاں سن لیں' پر تو آج یا کل رات خود موقعے پر جا کر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے' پوری طرح سمجھ لے۔ تجھے پرسوں رات کارروائی کرنی ہے۔" اس نے مڑ کر نادر خاں کی جانب دیکھا۔

"تو جا کر جنت کی ڈیوٹی لگا دے کہ وہ اس رات نیکا کے پہنچنے کے بعد تاجاں کو کسی بہانے باہر لے جائے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو چپکے سے دروازے کا تالا کھول دے۔ ہاں' یہ تو بتا' تالے کی چابی کس

کے پاس رہتی ہے؟"

"جنت ہی کے پاس رہتی ہے۔ پہلے میں اسی گھر میں رہتا تھا۔ اسے تو میں نے ویاہ کے لیے خالی کیا ہے۔"

احسان شاہ نے رفیق کو مخاطب کیا۔ "نی کے! ویسے تو تیرا کام زیادہ مشکل نہیں پر میں چاہتا ہوں' ذرا بھی گڑبڑ نہ ہو۔ ہر کام خاموشی سے ہو جائے۔"

رفیق سینہ تان کر بولا۔ "شاہ جی' تیرا حکم چاہیے۔ سب کچھ ٹھیک ہی ہو گا۔ فکر کی کوئی گل نہیں۔"

"تو اب بہت پکا ہو گیا ہے۔" احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ پھر اس نے مڑ کے نادر کو دیکھا۔ "جب تاجاں کو نیکا اٹھا کر لے جائے تب تجھے کیا کرنا ہو گا؟ یہ گل بات تجھے مہربان علی سمجھا دے گا۔ آگے جو کچھ ہو گا اسے سب کچھ پتہ ہے۔ اس بارے میں وہ مجھ سے پہلے ہی بات کر چکا ہے۔ جیسا وہ کہے تیں نوں ویسا ہی کرنا ہو گا۔ سمجھ گیا نا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" نادر خاں نے احسان شاہ کو اطمینان دلایا۔ "ہر کام ویسے ہی ہو گا جیسی مجھے ہدایت دی جائے گی۔"

احسان شاہ بولا۔ "اب تو نیکا کے ساتھ جا اور مہربان سے مل لے۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

نادر خاں اور رفیق چلے گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ احسان شاہ بھی تھوڑی ہی دیر بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے پوچھا۔ "تو ابھی سے جا رہا ہے؟ آگے کیا کرنا ہے۔ اس بارے میں تجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"اب تو کل ہی بات ہو گی۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔ "آگے کی فکر نہ کر۔ اسے مجھ پر چھوڑ دے۔ چپ کر کے دیکھتا جا۔"

"پر مجھے یہ تو سمجھ لینے دے کہ کیا کیا کرنا ہو گا؟" رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا ہو گا۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہی ہو گا۔ میں کل تجھے ہر گل بات ٹھیک طرح سمجھا دوں گا۔ مجھے اب جانا ہے۔ میاں سبحان ایک ایم۔ پی۔ اے اور ڈپٹی کمشنر کے ہم راہ لائل پور سے آرہا ہے۔ تینوں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ میں نے ان سے بہت اہم باتیں کرنی ہیں۔"

"ان سے اسی کمرے میں گل بات کرنی ہے؟" رحیم داد نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں' ان سے بڑے کمرے میں بات چیت ہو گی۔ تیرا جی چاہے تو یہیں بیٹھ۔ پینے پلانے کا

ارادہ ہو تو اپنے لیے منگوا لے۔ میں نے آج نہیں پینی۔"

رحیم داد کی بے قراری دیکھ کر احسان شاہ نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور اس کے ساتھ ساتھ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ "چوہدری' تو جا کر آرام سے اپنے کمرے میں روٹی کھا۔"

اپنے کمرے میں پہنچ کر رحیم داد چپ چاپ لیٹا رہا۔ احسان شاہ کے اطمینان دلانے کے باوجود وہ خائف تھا۔ اس نے کھانا بھی نہ کھایا۔ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح ہوئی تو اس کا یہی عالم تھا۔ احسان شاہ سے بھی اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ میاں سبحان اور لائل پور کے ڈپٹی کمشنر کے ساتھ تمام دن اور رات گئے تک مصروف رہا۔ جمعرات کو رحیم داد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

میاں سبحان اور ڈپٹی کمشنر سہ پہر کو لاہور چلے گئے۔ مگر احسان شاہ سے رحیم داد کی ملاقات شام ہی کو ہوئی۔ وہ حسب معمول مطمئن اور چاق چوبند نظر آ رہا تھا۔ ملازم نے بوتل کے علاوہ گلاس بھی میز پر رکھ دیے تھے۔ لیکن رحیم داد کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ احسان شاہ کے اشارے پر ملازم بوتل جگ اور گلاس واپس لے گیا۔

رحیم داد اس کے اس رویئے کا سبب جاننا چاہتا تھا' لیکن وہ چپ رہا۔ دونوں نے ساتھ کھانا کھایا پھر رات گزری' تاریکی بڑھی' سناٹا گہرا ہوتا گیا۔ رحیم داد کی بے چینی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ مگر احسان شاہ سیاسی جوڑ توڑ کے بارے میں اپنے کارنامے سناتا رہا۔ رحیم داد بت بنا اس کی باتیں سنتا رہا۔ اسے احسان شاہ کی سیاسی سرگرمیوں سے ذرا لگاؤ نہ تھا۔ وہ اپنی سوچ میں گم تھا اور جمیلہ کے بارے میں غور کر رہا تھا۔

رات آدھی ہو گئی۔ آتش دان میں انگارے دہکتے رہے۔ کمرے کا دروازہ چرچراتا ہوا کھلا۔ رجتے اندر داخل ہوئی۔

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔ رجتے کے عقب میں تاجاں سکڑی سکڑائی سہمی ہوئی کھڑی ہے۔ وہ ماجھے کا زرد لباس پہنے ہوئے تھی۔ جو اب ملگجا ہو گیا تھا۔ وہ سردی سے کپکپا رہی تھی۔ اس کا چہرہ دوپٹے کے آنچل سے چھپا تھا۔ تاجاں کے داخل ہوتے ہی کمرے میں بٹنے کی تیز بو پھیل گئی۔

"یہ تاجاں آ گئی ہے جی۔" رجتے نے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "نیکا اسے جیپ میں ڈال کر لایا ہے۔"

احسان شاہ نے تاجاں کو دیکھا اور لمحے بھر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر رجتے کی جانب متوجہ ہوا۔ "رجتے! اسے ساتھ کے کمرے میں پہنچا کر باہر سے دروازہ بند کر دے۔ تیں نوں کہیں اور نہیں جانا۔ دروازے پر ہی رہنا ہے۔"

رجتے نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سی مڑی اور تاجاں کے ساتھ باہر چلی گئی۔ دونوں کے جانے کے بعد رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ "تاجاں تو آ گئی پر اس کے آنے سے کیا ہو گا؟ مجھے اس سے کیا لینا۔"

"تجھے اس سے کچھ نہیں لینا پر جمیلہ کو تو اس کی سخت ضرورت ہے۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "چپ کر کے دیکھتا جا۔" احسان شاہ نے قدرے تامل کے بعد پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "تھوڑی دیر میں جمیلہ بھی یہاں آ جائے گی۔"

"کیا نیکا اسے بھی اٹھا کر لائے گا؟"

"نہیں وہ یہاں اپنی مرضی سے آئے گی۔" احسان شاہ نے زور دے کر کہا۔ "اسے یہاں آنا پڑے گا۔"

رحیم داد کو احسان شاہ کی بات پر یقین نہ آیا لیکن وہ خاموش رہا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب جھلک رہا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے کلبلا رہے تھے۔

مگر احسان شاہ کا کہا بالکل درست نکلا۔ تاجاں کو پہنچے ہوئے گھنٹہ' سوا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ نادر خاں کمرے کے اندر آیا۔ اس کے ہم راہ جمیلہ بھی تھی۔ رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس کی رگوں میں خون جمنے لگا۔

آتش دان میں دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ روشنی میں جمیلہ کا خوب صورت چہرہ تمتما رہا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ بکھر کر ماتھے پر جھول رہی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جھنجلاہٹ اور غصے کی تیز چمک تھی۔ وہ سفید اونی دوشالہ اوڑھے ہوئے تھی۔

وہ احسان شاہ کے روبہ رو سر اٹھا کے کھڑی ہو گئی۔ احسان شاہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی' مسکرایا اور بے تکلفی سے بولا۔ "آخر تو آ ہی گئی۔" اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور کھل اٹھی۔

"کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی آئی ہے۔ ذرا گرم ہو جا۔"

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔" جمیلہ نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ بتا' تاجاں کہاں ہے؟"

"فکر نہ کر۔ وہ یہیں ہے اور بہت آرام سے ہے۔ اسے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ تجھے خو بتادے گی۔"

"میں اسے ملنا چاہتی ہوں اور ابھی ملنا چاہتی ہوں۔" اس کے لہجے میں بڑی سوزش تھی۔ رحیم داد نے نرم لہجے میں اسے تسلی دینے کی کوشش۔ "تو بالکل فکر نہ کر۔ تاجاں ٹھیک ٹھاک ہے۔"

جمیلہ نے سر کو خم دے کر رحیم داد کو قہر آلود نظروں سے دیکھا' مگر کوئی بات نہ کی۔ احسان شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "شاہ جی! مجھے ٹھیک ٹھیک بتا۔ تو نے تاجاں کو کہاں رکھا ہے؟ مجھے پہلے اسے ملنا ہے۔"

"ضرور مل لے' اپنا اطمینان کر لے۔" احسان شاہ نے جمیلہ کے لہجے کی تلخی پر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا' زیر لب مسکراتا رہا۔ "اس سے ملنے اور اطمینان کرنے کے بعد یہاں واپس آجانا۔" اس نے آواز میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"تو اسے واپس لینے ہی کے لیے یہاں آئی ہے ناں؟"

"میں اسے لینے ہی کے لیے آئی ہوں اور اسے لے کر ہی جاؤں گی۔"

"ضرور لے جا۔" احسان شاہ کا لہجہ بدستور نرم اور شگفتہ تھا۔ "پر اس سے مل تو لے۔" احسان شاہ نے رحمتے کو بلایا اور جمیلہ کو اپنے ہم راہ لے جانے کا حکم دیا۔

جمیلہ کے جانے کے بعد احسان شاہ نے نادر خان سے دریافت کیا۔ "نادر یہ تو بتا' تو جمیلہ کو یہاں لایا کیسے؟ چوہدری' یہ راز جاننے کے لیے بہت بے چین ہے۔ دیکھ تو کیسا حیران پریشان بیٹھا ہے۔" وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگا۔

"وہ ایسا ہوا جی جنت نے چپکے سے دروازہ کھول دیا تھا۔" نادر خان نے بتایا۔ "نیکا آرام سے اندر پہنچا۔ تاجاں بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے نزدیک پہنچ کر تاجاں کا جھٹ منہ دبا دیا۔ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور ایسی خاموشی سے باہر لے گیا کہ کمرے میں سوئی ہوئی زنانیوں میں سے کسی کو ذرا بھی پتہ نہ چلا۔"

"پر جنت تو جاگ رہی تھی ناں؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"بالکل جاگ رہی تھی جی بلکہ نیکا کے پہنچنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اسے کہہ جو رکھا تھا۔" نادر خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ "جب نیکا اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاجاں کو جیپ میں ڈال کر لے گیا تب جنت میرے پاس آئی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس نے سب کچھ مجھے بتا دیا۔"

"جمیلہ اس وقت کہاں تھی؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"وہ جی اوپر اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔" نادر خان گویا ہوا۔ "جنت کی زبانی جب مجھے یہ پتہ چل گیا کہ نیکا تاجاں کو اٹھا کر لے گیا ہے' تب مہان علی کی ہدایت پر میں زمیں دارنی کے پاس گیا جنت میرے ساتھ تھی۔ اس نے زمین دارنی کو جگایا اور صاف صاف بتا دیا کہ تاجاں کو اغوا کر لیا گیا۔ یہ سنتے ہی وہ بدحواس ہو گئی۔ گھبرائی ہوئی نیچے اتری اور اس کمرے میں گئی جہاں تاجاں مائیاں بیٹھی تھی۔ تاجاں کو وہاں نہ پا کر وہ پریشان ہو گئی۔"

"اس نے کوئی شور شرابا تو نہیں کیا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

نہیں جی' وہ بالکل چپ کر کے رہ گئی۔ اس نے کسی کو بھی تاجاں کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ جنت کو بھی منع کر دیا۔ وہ وہاں زیادہ دیر ٹھہری نہیں' فوراً مہمان خانے میں آگئی۔ میں اور جنت اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ ساری زنانیاں بے خبر سوتی رہیں۔ انھیں کچھ بھی پتہ نہ چلا؟"

"مہمان خانے میں پہنچ کر تو اس نے تجھ سے بھی پوچھ تاچھ کی ہوگی؟" احسان شاہ نے استفسار کیا۔

"پہلے تو جی وہ جنت سے پوچھ تاچھ کرتی رہی پر اس نے زیادہ گل بات نہ کی۔ اسے جلد ہی واپس کمرے میں بھیج دیا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت کی کہ خاموشی سے اپنی جگہ پر جا کر لیٹ جائے اور پوری طرح کوشش کرے کہ تاجاں کے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہ چلے۔" نادر خاں سنبھل سنبھل کر ایک ایک تفصیل بیان کرتا رہا۔ "جنت کے جانے کے بعد زمیں دارنی نے مجھ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تاجاں کو کون اٹھا کر لے گیا۔"

رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ "تو نے کیا بتایا؟"

"میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا' شاہ جی کے بندے تاجاں کو اٹھا کر جیپ میں لے گئے ہیں۔"

"جمیلہ نے تجھ سے یہ نہیں پوچھا' تجھے کیسے پتہ چلا؟"

"اس نے مجھ سے یہ گل پوچھی تھی۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "میں نے اسے بتایا' تاجاں کو اٹھا کر لے جانے کے بعد شاہ جی کا ایک کرندہ میرے پاس مہمان خانے میں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا۔ اس نے مجھے کہا' زمیں دارنی اگر تاجاں کو واپس لانا چاہتی ہے تو وہ شاہ جی کی حویلی پہنچ جائے۔ نہر کے کنارے جیپ کھڑی ہے' وہ اسے لے جائے گی۔"

"کیا تیرے پاس شاہ جی کا کوئی کرندہ سچ مچ آیا تھا؟" رحیم داد نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔

رحیم داد کے احمقانہ سوال پر احسان شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مگر نادر نے نہایت

متانت سے کہا۔

"میرے پاس آنا شانا کس کو تھا جی۔ میں نے تو مہران علی کی ہدایت پر یہ بات زمیں دارنی سے کہی تھی۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "یہ سنتے ہی اس کا تو برا حال ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کے بولی۔ یہ کیا ہو گیا نادر؟ میری تو سمجھ کام نہیں کر رہی۔ کل تاجاں کی جنج آ رہی ہے۔ جب تاجاں ہی نہ ہوئی تو کیسے ویاہ ہو گا؟ میں سب کو کیا جواب دوں گی؟ یہ کہتے کہتے جی وہ بلک بلک کر رونے لگی۔"

"وہ تو بالکل پاگل ہو گئی ہو گی۔" رحیم داد نے کہا۔

"پاگل تو جی اسے ہونا ہی تھا۔" نادر خاں بولا۔ "میں نے پہلے تو اسے دلاسا دیا۔ جب اس نے رونا بند کیا تو مشورہ دیا اب تو بے عزتی سے بچنے کی یہی صورت ہے' شاہ جی کے پاس چلا جائے اور تاجاں کو واپس لانے کے لیے منت سماجت کی جائے۔ ساتھ ہی میں نے زور دیا وقت بہت کم ہے جو کرنا ہے جلد سے جلد کرنا ہے۔ تاجاں کو سویرا ہونے سے پہلے ہی واپس آجانا چاہیے۔ ورنہ بات سارے پنڈ میں پھیل جائے گی۔ جنج آئی بھی تو واپس چلی جائے گی۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "یہ سن کر وہ تجھ سے ناراض تو نہیں ہوئی؟"

"پتہ نہیں جی' اس نے میرے بارے میں کیا سوچا۔" نادر خاں کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ "میری باتیں سنتے ہی وہ ہاتھوں سے منہ چھپا کر ایک بار فیر رونے لگی۔ میں چپ کر کے بیٹھا رہا پر ذرا ہی دیر بعد وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہوئی اور یہاں آنے کے لیے تیار ہو گئی۔ میرے ہم راہ وہ مہمان خانے سے باہر نکلی۔ جیپ بھی تب تک تاجاں کو ادھر پہنچا کر واپس آگئی تھی۔ زمین دارنی میرے ساتھ اس میں سوار ہو گئی۔"

احسان شاہ پوری روداد سن کر بولا۔ "نادر تو سچ مچ بہت کام کا بندہ ہے۔" وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔

"چوہدری! تو نادر کو تگڑا انعام دینا۔ اس نے زبردست کام کیا ہے۔"

"کام تو اس نے انعام ہی کا کیا ہے۔" رحیم داد نے بے ساختہ کہا۔ "اسے ضرور انعام ملے گا۔ شاہ جی تیری بات خالی نہیں جائے گی۔ فکر نہ کر۔"

احسان شاہ نے نادر خاں کو جلد ہی رخصت کر دیا۔ "نادر! اب تو مہران علی کے پاس جا۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہو گا۔" یہ کہتے کہتے وہ ٹھٹکا۔ "اور دیکھ باہر رتے ہو گی۔ اس سے کہہ کہ جیلہ کو یہاں بھیج دے۔"

نادر خاموشی سے چلا گیا۔

"لے چوہدری' تیرا کام تو بن گیا۔" احسان شاہ نے ہنس کر رحیم داد سے کہا۔

رحیم داد سادگی سے بولا۔ "سچ پوچھ تو اب تک سمجھ نہیں آئی' کیا کام بنا۔"

"گھبرا نہیں' جیلہ کو آنے دے۔ تھوڑی دیر میں سب کام پورا ہو جائے گا اور تجھے بھی سب پتہ چل جائے گا۔"

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ اس کی سانس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ وہ بے چینی کے عالم میں بار بار پہلو بدلنے لگا۔ ٹھہر ٹھہر کر دروازے کی جانب دیکھتا۔ کمرے میں سکوت تھا۔ احسان شاہ بھی چپ تھا۔

☆

جیلہ شکست خوردہ انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ سوگوار تھا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ نڈھال اور بہت تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کرسی کھسکائی اور احسان شاہ کے روبہ رو بیٹھ گئی۔ رحیم داد کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر دکھ کے سائے منڈلا رہے تھے۔

"تاجاں سے مل لی۔ وہ ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟" احسان شاہ نے جیلہ سے پوچھا۔

"ہاں' میں اس سے مل لی۔" جیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے دیکھتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری' نظریں اٹھا کر احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ "تیں نوں پتہ نہیں شاہ جی' وہ مجھے اپنی ماں کی طرح پیار کرتی ہے۔ چھوٹی سی تھی تو اس کا پیو مر گیا۔ بعد میں اسے میں نے ہی پالا۔ پچھلے سات سال سے میرے ہی پاس ہے۔ مانو اب تو وہ میری ہی دھی ہے۔"

اس کے لہجے میں فریاد کا انداز تھا۔

"شاہ جی' تو نے ٹھیک نہیں کیا۔ تو اسے کیوں برباد کرنا چاہتا ہے؟ اس کا تو کیول ایک رانڈ ماں کے اور کوئی بھی نہیں۔"

"میں نوں تو اس سے کچھ نہیں لینا۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "تو چاہے تو وہ تیرے ساتھ واپس جا سکتی ہے۔ اس کی زندگی برباد ہونے سے بھی بچ سکتی ہے۔ سب کچھ تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔"

"شاہ جی' فیر تو کیا چاہتا ہے؟" جیلہ کی آواز بھرا گئی۔ "میں تاجاں کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے تیری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔" اس نے کسی مزاحمت کے بغیر احسان شاہ کے سامنے ہتھیار

ڈال دیئے۔ وہ اس کے پاس آنے سے پہلے ہی شاید یہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میں تاجاں کو اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔"

جمیلہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ آنکھوں میں ستارے جھل ملائے اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے بے قرار ہو کر اپنا چہرہ چھپا لیا۔ کمرے کی گہری خاموشی میں اس کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ آتش دان میں سلگتے ہوئے انگاروں پر راکھ کی تہہ جم گئی تھی۔ احسان شاہ نے قریب رکھے ہوئے پوکر کا دستہ پکڑا اور لوہے کے آنکڑے سے انگارے کریدنے لگا۔

انگاروں کی آنچ تیز کرنے کے بعد اس نے پوکر ایک طرف رکھ دیا۔ مڑ کے جمیلہ کو دیکھا' بے رخی سے بولا۔ "اس طرح ٹسوے بہانے سے کام نہیں چلے گا۔" اس کا لہجہ تند ہو گیا۔ "تاجاں کو واپس لے جانے کے ارادے سے آئی ہے تو ٹھیک سے کھل بات کر۔"

"کیا چاہتا ہے توں؟" جمیلہ کی شکستہ آواز ابھری۔

"میں یہ چاہتا ہوں' نہ تو اپنی زمین بیچ کرے گی اور نہ کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کر لہور جائے گی۔" احسان شاہ کے لہجے میں گونج اور دبدبہ تھا۔ "تیرے سارے منصوبوں کا مجھے اور چوہدری کو پتہ چل چکا ہے۔" اس نے قہر آلود نظروں سے جمیلہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ درشت ہو گیا۔ ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔

"اب بیٹھی ٹسوے بہا رہی ہے' جب تو لہور جانے کے لیے اپنے وکیل رندھاوا سے چپکے چپکے سکیمیں بنا رہی تھی' تب یہ نہ سوچا' تو کیا کرنے جا رہی ہے؟ چوہدری کو مغالطے میں رکھ کر کس طرح دھوکا دے رہی ہے؟"

"میں کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کر رہی۔" اس نے سر اٹھا کے تیکھی نظروں سے احسان شاہ کو دیکھا۔ "میں اگر اپنی زمین بیچنا چاہوں اور لہور جا کر رہنا چاہوں تو یہ دھوکا کس طرح ہوا؟ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ توں یا چوہدری اس بارے میں مجھ سے پوچھنے والا کون ہوتا ہے؟"

"زیادہ تیزی نہ دکھا۔" احسان شاہ نے ڈپٹ کر کہا۔ "یہ بتا اور صاف صاف بتا' تاجاں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے یا نہیں؟"

"تجھے پہلے ہی بتا چکی ہوں' میں اسی کارن یہاں آئی ہوں۔" جمیلہ کی آواز پھر بجھ گئی۔ "میں اسے اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔"

"ضرور اسے لے جا' خوشی سے لے جا۔" احسان شاہ کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "پر تاجاں کے ویاہ سے

پہلے تیرا چوہدری کے ساتھ نکاح ہو گا۔"

جمیلہ کرسی پر پتھر کی طرح بیٹھی رہی۔ اس کے ذہن میں منڈلاتا ہوا جذبات کا سیلاب چہرے پر دھوپ چھاؤں بن کر لہرا رہا تھا۔

مگر احسان شاہ نے اسے زیادہ دیر غور کرنے کا موقع نہ دیا۔ "تجھے جو کچھ طے کرنا ہے' جلدی کر۔ ٹائم کم ہے۔ سویرا ہو گیا تو تاجاں کو واپس لے جانے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ بات پنڈ میں پھیل گئی تو آئی ہوئی جنج واپس چلی جائے گی۔ پوری طرح یہ سوچ لے۔"

جمیلہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ احسان شاہ کی درشتی پر اس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "شاہ جی جیت تو ہمیشہ تیری ہی ہوتی ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں تاجاں کو لے کر ہی جاؤں گی۔ تاجاں کو بلا لے۔ میں نے جلد سے جلد پنڈ پہنچنا ہے۔"

"تاجاں بھی آ جائے گی۔" احسان شاہ کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "پر اس کے یہاں آنے سے پہلے چوہدری کے ساتھ تیرا انتظام بھی تو ہو گا۔ نکاح ابھی ہو گا۔ بول کیا کہتی ہے؟"

"میں نے کیا کہنا ہے۔" اس نے مڑ کر خونخوار نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ رحیم داد نے گھبرا کے نگاہیں نیچی کر لیں۔ جمیلہ چند لمحے تک ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتی رہی۔ "میں نے تو تاجاں کو یہاں سے لے کر ہی جانا ہے۔ میں اسے وچن دے کر آئی ہوں۔" اس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔

احسان شاہ نے مزید بات نہ کی۔ فوراً مہربان علی اور نادر خاں کو بلایا۔ ان کے ہم راہ مسجد کا ملّا بھی تھا جسے مہربان علی نے عشاء کی نماز کے بعد ہی بلوا لیا تھا۔ وہ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے نکاح نامہ تیار کر رکھا تھا۔ اسٹامپ پیپر پر جمیلہ کی زمین کی بیع کا رحیم داد کے ساتھ معاہدہ بھی لکھا ہوا اس کے پاس موجود تھا۔

ملّا نے احسان شاہ کے حکم پر رحیم داد کا جمیلہ سے نکاح پڑھایا۔ نادر خاں نے جمیلہ کی جانب سے وکیل کے فرائض انجام دیئے۔

احسان شاہ اور مہربان علی گواہ بنے۔ ایجاب و قبول ہوا۔ رحیم داد کے ساتھ جمیلہ نے بھی ہنکاری بھری۔ نکاح نامے پر دستخط بھی کر دیئے۔ مسجد کے ملّا' رحیم داد' احسان شاہ' مہربان علی اور نادر خاں نے بھی دستخط کر دیئے۔

نکاح کے بعد مہربان علی نے زمین کی بیع کی دستاویز جمیلہ کے سامنے پیش کی۔ جمیلہ کی آنکھیں آتش دان کے انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔ اس نے نہ کوئی مین میخ نکالی نہ کسی برہمی کا اظہار

کیا۔ چپ چاپ بیع نامے پر بھی دستخط کر دیئے۔

مہربان علی' نادر خاں اور ملّا باہر چلے گئے۔ احسان شاہ نے رحمتے کو بلایا۔ وہ جمیلہ کو اپنے ہم راہ لے گئی۔

جمیلہ کو علیحدہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ اس کا حجلہ عروسی تھا۔ جمیلہ نے بجھی بجھی نظروں سے درودیوار پر ایک نظر ڈالی' تڑپ کر نچلا ہونٹ دانتوں کے نیچے دبایا اور نڈھال ہو کے بستر پر گر پڑی۔